عالم اسلام کے اکابر علمائے کرام کے جدید فقہی مسائل پر مقالہ جات اور مناقشات کا مجموعہ نئی ترتیب کے ساتھ

سلسلہ

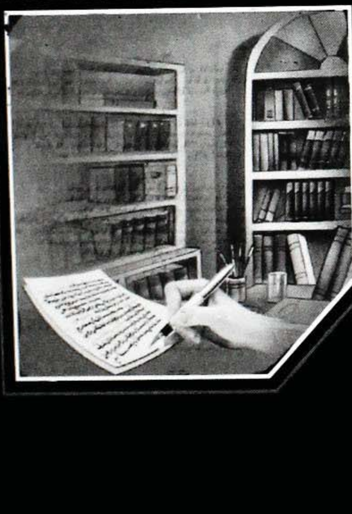
جدید فقہی مباحث

مع تقاریظ علمائے کرام

۱۸

- اسلام میں بچوں کے حقوق
(تعلیم و تربیت کے تناظر میں)
- اسلام میں معذوروں اور بوڑھوں کے حقوق (ایک تحقیقی جائزہ)

تحقیقات اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا



زیر سرپرستی

حضرت مولانا مجاہد الاسلام قاسمی
حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی دامت برکاتہم

تاثرات

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی
مفتی اعظم پاکستان جناب مولانا محمد رفیع عثمانی صاحب دامت برکاتہم
شیخ الاسلام جناب حضرت مولانا مفتی محمد تقی صاحب دامت برکاتہم

دارالاشاعت
اردو بازار ○ ایم اے جناح روڈ ○ کراچی پاکستان

علم اسلام کے اکابر علمائے کرام کے جدید فقہی مسائل پر مقالہ جات اور مناقشات کا مجموعہ نئی ترتیب کے ساتھ

سلسلہ

جدید فقہی مباحث

مع تقاریظ علمائے کرام

جلد 18

اسلام میں بچوں کے حقوق (تعلیم وتربیت کے تناظر میں)

اسلام میں معذوروں اور بوڑھوں کے حقوق (ایک تحقیقی جائزہ)

تحقیقات اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا

زیر سرپرستی

حضرت مولانا مجاہد الاسلام قاسمی

حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی دامت برکاتہم

تاثرات

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

مفتی اعظم پاکستان جناب مولانا محمد رفیع عثمانی صاحب دامت برکاتہم

شیخ الاسلام جناب حضرت مولانا مفتی محمد تقی صاحب دامت برکاتہم

دارالاشاعت

اردو بازار ○ ایم اے جناح روڈ ○ کراچی پاکستان

ہمارے اس ایڈیشن میں 80 میں سے تقریباً 58 مباحث پہلی مرتبہ صرف پاکستان میں طبع ہوئے ہیں۔ ہم اسلامی فقہ اکیڈمی کے شکر گزار ہیں کہ انہوں نے تمام مسودات وکمپوزنگ بذریعہ ای میل مرحمت فرمائے۔ جزاک اللہ

باہتمام: خلیل اشرف عثمانی

طبع اول: نومبر 2017ء

تعداد: 500

طباعت: عابد پرنٹنگ پریس غریب آباد کراچی

﴿......ملنے کے پتے......﴾

ادارۃ المعارف جامعہ دارالعلوم کراچی

مکتبہ معارف القرآن جامعہ دارالعلوم کراچی

بیت القرآن اردو بازار کراچی

بیت القلم اردو بازار کراچی

مکتبہ اسلامیہ امین پور بازار۔ فیصل آباد

ادارہ اسلامیات ۱۹۰۔ انارکلی لاہور و اردو بازار کراچی

مسٹر بکس جناح سپر مارکیٹ اسلام آباد

دارالاخلاص صدف پلازہ محلہ جنگی پشاور

مکتبہ سید احمد شہیدؒ اردو بازار لاہور

کتب خانہ رشیدیہ۔ مدینہ مارکیٹ راجہ بازار راولپنڈی

﴿انگلینڈ میں ملنے کے پتے﴾

AZHAR ACADEMY LTD.
54-68 LITTLE ILFORD LANE
MANOR PARK, LONDON E12 5QA

ISLAMIC BOOKS CENTRE
119-121, HALLI WELL ROAD
BOLTON BL 3NE, U.K.

﴿امریکہ میں ملنے کے پتے﴾

MADRASAH ISLAMIAH BOOK STORE
6665 BINTLIFF, HOUSTON,
TX-77074, U.S.A.

DARUL-ULOOM AL-MADANIA
182 SOBIESKI STREET,
BUFFALO, NY 14212, U.S.A

فہرست مضامین سلسلہ جدید فقہی مباحث

اسلام میں بچوں کے حقوق

تمت

بسم الله الرحمن الرحيم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرض ناشر

نحمده ونصلي على رسوله الكريم

اللہ تبارک وتعالیٰ کا جتنا بھی شکر ادا کیا جائے کم ہے دارالاشاعت کراچی کو پاکستان میں 1949ء سے تمام موضوعات پر اسلامی کتب کی طباعت اور اشاعت کی سعادت حاصل رہی ہے، یہ محض اللہ تعالیٰ کے فضل، تمام بزرگوں کی دعاؤں اور اکابر کی خدمات کا ثمرہ ہے، اسی محنت ولگن اور جذبے سے یہ خدمت تیسری نسل یعنی موجودہ ذمہ داران بھی کررہی ہے اور اب چوتھی نسل کے نمائندے بھی ماشاء اللہ اس کام میں شریک ہو گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس کام کو مکمل اخلاص کے ساتھ جاری رکھنے کی توفیق عطا فرمائے اور اپنی بارگاہ میں شرف قبولیت عطا فرمائے جو کمی کوتاہی اس میں رہ جاتی ہے اس پر معاف فرمائے۔ (آمین)

تمام قارئین جو ماشاء اللہ ذی علم حضرات ہیں ان کے تعاون اور دعاؤں سے ہی یہ کام انجام پاسکا ان سب حضرات سے بھی دونوں جہاں میں کامیابی کی دعا کی درخواست ہے۔

زیر نظر مجموعہ ''سلسلہ جدید فقہی مباحث'' کا موجودہ ایڈیشن جو بڑے سائز کی 26 جلدوں میں طبع ہوئی ہے اس میں تقریباً 70 مختلف مستقل موضوعات پر کتب جو ہندوستان میں قائم ادارہ ''اسلامی فقہ اکیڈمی'' کی طویل کوششوں سے وجود میں آئیں، فقہ اکیڈمی کے سرپرست حضرات مدظلہم کی بصیرت اور کوششوں سے بڑے بڑے نامور اکابر علماء کے مقالے ان جدید فقہی موضوعات پر جمع ہو کر علمی تحقیقات کرنے والوں کے لیے بڑا زبردست ذخیرہ جمع کردیا ہے، جسے نامور اکابر ملت نے بڑی خدمت قرار دیا ہے، آئندہ صفحات میں ان بزرگوں کی تقاریظ شامل ہیں۔

ہمارے اس ایڈیشن سے قبل اس کتاب کا تقریباً چوتھائی سے بھی کم حصہ طبع ہوا تھا، جس کا معیار بھی مناسب نہ تھا اور اس کی دستیابی بھی مستقل نہ ہونے کی وجہ سے اہل علم پریشان رہتے تھے، ضرورت تھی کہ نہ صرف معیار بہتر ہو اور مستقل فراہمی بھی رہے۔ ''منتظمین اسلامی فقہ اکیڈمی دہلی انڈیا'' کی خواہش تھی کہ پاکستان میں کوئی ایسا ادارہ ہو جو ان کے مقاصد کو بھی پورا کرتا ہو اور مکمل اشاعت بھی کرسکتا ہو، تاکہ اس علمی ذخیرہ کی پاکستان میں اشاعت کی ذمہ داری اس کے سپرد کی جائے۔

اس مقصد کے لیے تقریباً اب سے سات سال قبل انہوں نے دارالاشاعت کراچی کو تحریری اجازت مرحمت فرمادی تھی، ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اگر ہماری طرف سے اس میں تساہل یا کوتاہی کی گئی تو وہ کسی اور ناشر کو خدمات سونپ دیں گے۔ ارادے کے باوجود بعض مصالح اور حکمتوں کے سبب اسلامی فقہ اکیڈمی سے اپنے عذر کو واضح کردیا گیا اور اس کی اشاعت کا ارادہ ترک کردیا گیا۔

2015ء میں اسلامی فقہ اکیڈمی انڈیا کے سابقہ داعیہ کے ایک صاحب علم نے پیغام دیا کہ پاکستان میں اس کتاب کی مکمل اور مستقل اشاعت نہ ہونے کے سبب وہ پھر چاہتے ہیں کہ اس کا کوئی مستقل انتظام ان کے مطلوبہ معیار ومقاصد کے مطابق ہوجائے بہرحال! پھر دوبارہ ایک مفصل تحریری اجازت نامہ ان حضرات نے پاکستان کے لیے ہمیں جاری فرمایا اور تمام مطبوعہ وغیرمطبوعہ کمپیوٹر کمپوزنگ یا جس شکل میں بھی یہ ذخیرہ تھا انہوں نے مذکورہ صاحب علم صاحب کے ذریعے ہمیں فراہم کیا، ان دو سالوں میں طویل محنت واخراجات کرکے اب اسے طبع کرنے کے لیے تیار کرلیا گیا ہے۔ اب پاکستان میں اس ذخیرہ کی اشاعت کے حقوق

قانونی طور پر بھی دارالاشاعت کراچی ہی کے پاس ہیں، تقریباً 22 کتب اس میں سے پہلے شائع ہوئی تھیں، ان کے علاوہ تمام ذخیرہ پہلی مرتبہ طبع ہوکر آپ کے ہاتھوں میں ہے، یہ ذخیرہ پہلے انڈیا میں شائع نہیں ہوا تھا۔

ہم نے اپنے اس جدید ایڈیشن میں ترتیب یا جن دیگر خصوصیات سے اسے مزین کیا ہے وہ درج ذیل ہیں:

۱......اسلامی فقہ اکیڈمی کی طرف سے پرانے شائع شدہ نسخوں میں کسی بھی بحث کے نتیجے میں جمع ہونے والے مقالے شائع کردیے جاتے تھے، پھر بعد میں ان میں یہ اضافہ کیا گیا کافی جگہ اکیڈمی نے ان بحثوں کے نتیجے میں جو فیصلہ کیا اس کا اضافہ اس موجودہ نسخے میں شامل ہے۔

۲......پورے علمی ذخیرے کو ازسرِنو بڑے سائز میں کمپوزوسیٹنگ سے آراستہ کیا گیا ہے بعض مقامات پر ایسا محسوس ہوتا ہے بات ادھوری رہ گئی ہے تو قدیم نسخوں اور اصل مسودے میں بھی اسی طرح نامکمل ہے۔

۳......پورے علمی ذخیرے کی نئی ترتیب یا جلد بندی اس طریقہ پر کی گئی ہے کہ ممکنہ طور پر ایک جیسے موضوعات پر مباحث ایک جلد میں آجائیں، پہلے طبع شدہ نسخے میں یہ صورت نہ تھی۔ مثلاً اسلامی بینکنگ کے عنوان سے ایک موضوع چوتھی جلد میں ہے تو اسی عنوان سے دوسرا موضوع ۱۳ رنمبر جلد میں ہے، اب یہ کوشش کی گئی ہے کہ ایک جیسے موضوع ایک ہی جلد میں آجائیں۔

۴......ممکن ہے کہ استفادہ کرنے والے حضرات کو ایسا محسوس ہو کہ کمپوزنگ بہت جلی نہیں ہے اسے ذرا بڑا بھی رکھا جاسکتا تھا لیکن اس سے مجموعہ کے صفحات اور جلدوں میں بہت اضافہ ہورہا تھا اور اس کی قیمت بھی قارئین پر ایک بوجھ ہوتی۔ مزید یہ کہ گزشتہ طبع شدہ نسخوں کا قلم بھی تقریباً اس جیسا ہی تھا۔

۵......بحمد للہ! اب ”سلسلہ جدید فقہی مباحث“ کا سائز بھی دیگر فقہی کتب کی طرز پر ہوگیا، کاغذ، طباعت اور جلد سازی کا معیار بھی بہت نمایاں اور بہتر ہوگیا۔

۶......اس ذخیرہ کی قیمت بھی بازار میں دستیاب کتب کے مقابلے میں معیار وغیرہ کو دیکھتے ہوئے بہت مناسب رکھی گئی ہے۔

امید ہے کہ اہل علم حضرات، یونیورسٹیاں، لائبریریاں، اس علمی ذخیرے کی پذیرائی کریں گی اللہ تعالیٰ سے عاجزانہ درخواست اور دعا ہے کہ ہماری اس کوشش کو اپنی بارگاہ میں شرف قبول عطا فرمائیں اور دنیا وآخرت دونوں کے لیے نافع بنادیں (آمین)

والسلام

خلیل اشرف عثمانی

مدیر کتب خانہ دارالاشاعت

اردو بازار کراچی

8/7/2017

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

چند تاثرات برائے اسلامی فقہ اکیڈمی ہند

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب مدظلہ العالی

صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ

"اسلامک فقہ اکیڈمی ہند" ایک ایسا ادارہ اور تنظیم ہے جس پر ہندوستانی مسلمانوں...... بالخصوص علماء اور دینی غیرت وفکر رکھنے والے ہندوستانی مسلمانوں کو فخر اور فخر سے زیادہ خدا کا شکر کرنے کا حق حاصل ہے، یہ ایک خالص تعمیری وفکری، علمی اور فقہی تنظیم اور اجتماعیت ہے جس میں ملک کے ممتاز، صحیح العقیدہ وصحیح الفکر اور وسیع العلم علماء اور کارکن شامل ہیں۔

مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب مدظلہ العالی

صدر دار العلوم کراچی پاکستان

"مجھے بے انتہا مسرت بھی اور کسی قدر حسرت بھی، مسرت اس بات کی کہ ہندوستان کے علمائے کرام نے وہ عظیم الشان کام شروع کیا ہے جس کی پورے عالم کو اور اقلیت والے ملکوں کو شدید ضرورت ہے اور حسرت یہ ہے کہ ہم پاکستان میں ہونے کے باوجود منظم اور بڑے پیمانے پر یہ کام شروع نہ کر سکے۔...... فقہ اکیڈمی نے بڑا اہل قدم اٹھایا ہے، مدت سے اس کا انتظار تھا۔

تقدیم

شیخ الاسلام جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہ العالی

نائب رئیس مجمع الفقہ الاسلامی جدہ

بمناسبت خطبۂ صدارت چوتھے فقہی سیمینار منعقدہ ۱۹۹۲ء حیدرآباد (دکن)

الحمد لله وكفى وسلام على عباده الذين اصطفى: اما بعد!

میرے لیے یہ بات بہت بڑے اعزاز اور خوشی و مسرت اور یادگار کی حیثیت رکھتی ہے کہ اللہ جل جلالہ کے فضل و کرم سے مجھے اس عظیم الشان علمی ادارے کے چوتھے فقہی مذاکرہ میں شرکت کی سعادت حاصل ہوئی۔ میں اپنے محترم بزرگ جناب مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی دامت برکاتہم کا اور اس اسلامک فقہ اکیڈمی کے تمام منتظمین کا تہ دل سے شکرگزار ہوں کہ انہوں نے مجھے اس محفل میں شرکت کا موقع عنایت فرمایا اور نہ صرف ایک سامع اور شریک کی حیثیت میں بلکہ اس افتتاحی اجلاس کی صدارت کی ذمہ داری بھی مجھ ناچیز کو سونپی۔ اس سے پہلے اگرچہ اکیڈمی کی طرف سے ہر سال مجھے دعوت موصول ہوتی رہی لیکن میں اپنے بعض مشاغل کی وجہ سے حاضر خدمت نہ ہو سکا۔ مولانا مجاہد الاسلام قاسمی دامت برکاتہم سے میرا غائبانہ تعارف ایک طویل مدت سے ہے، لیکن میں ان کو ایک فقیہ، ایک عالم کی حیثیت سے جانتا تھا، مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے اندر ایک مخفی جوہر، مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کا بھی ودیعت کر رکھا ہے۔ آج اس محفل میں شرکت کرنے کے بعد ہندوستان کے علماء اور علم وفضل کے پیکر حضرات سے ملاقات کر کے اس بات کا اندازہ ہو رہا ہے کہ انہوں نے اس اکیڈمی کو قائم کر کے کتنا بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ان کے اس کارنامے کو قبول فرمائے اور اس کے اغراض و مقاصد کو اپنی رضا کے مطابق پورا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

اس موقع پر اس اکیڈمی کے اغراض و مقاصد کو مدنظر رکھتے ہوئے مجھے یہ محسوس ہو رہا ہے کہ اس اکیڈمی کا قیام جناب نبی کریم ﷺ کے ایک ارشاد کی تعمیل ہے۔ وہ ارشاد معجم طبرانی میں ایک روایت میں ہے جسے علامہ ہیثمیؒ نے مجمع الزوائد میں بھی ذکر کیا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا کہ یا رسول اللہ!

”اذا جاء نا امر ليس فيه أمرو لانهي فما ذا تأمرنا فيه“

یا رسول اللہ! اگر ہمارے سامنے کوئی ایسا سوال آجائے، ایسا قضیہ سامنے آجائے جس کے بارے میں کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ میں کوئی صریح حکم موجود نہ ہو تو اس صورت حال میں آپ ہمیں کس بات کا حکم دیتے ہیں، ایسے موقع پر مجھے کیا کرنا چاہیے۔ حضرت نبی کریم سرور دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

”شاوروا الفقهاء العابدين ولا تمضوا فيه برای خاص“

کہ ایسے موقع پر فقہاء عابدین سے مشورہ کرو اور اس میں انفرادی رائے کو نافذ نہ کرو، محض انفرادی فتویٰ کو، محض انفرادی رائے کو لوگوں پر مسلط کرنے کی بجائے فقہاء عابدین سے مشورہ کرو، اور اس مشورہ کے نتیجہ میں جس مقام پر پہنچو اس کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کا حکم سمجھو۔

یہ ہے وہ ارشاد جس کے ذریعہ نبی کریم سرور عالم ﷺ نے قیام قیامت تک پیدا ہونے والے تمام نت نئے مسائل کا حل ہمارے لیے تجویز فرمایا اور وہ یہ کہ آخری وقت میں جب کہ اجتہاد مطلق کا تصور تقریباً مفقود ہو گیا ہے، اس دور میں نئے مسائل کو حل کرنے کا راستہ یہ ہے کہ فقہاء عابدین

کو جمع کیا جائے۔ مگر اس میں نبی کریم ﷺ نے دو صفتیں بیان فرمائی: ایک یہ کہ جن لوگوں کو جمع کیا جائے وہ تفقہ فی الدین رکھنے والے ہوں، دین کی صحیح سمجھ رکھنے والے ہوں۔ دین کے مزاج و مذاق کو اچھی طرح محفوظ کرنے والے ہوں، اور دوسری قید یہ لگادی کہ وہ فقہاء محض فلسفی قسم کے نہ ہوں، جو نظریاتی طور پر فقیہ ہوں، نظریاتی طور پر اسلام کے احکام کو جانتے ہوں، جو محض علم رکھتے ہوں، لیکن اس علم پر خود عمل پیرا نہ ہوں۔ اس علم کو اپنی زندگی میں اپنائے ہوئے نہ ہوں، اور اس علم کو اپنی زندگی کا منتہائے مقصود نہ بنایا ہو، تو ایسے فقہاء سے مشورہ کرنے کا کوئی حاصل نہیں، اس لیے کہ دین، یہ محض ایک نظریہ اور فلسفہ نہیں کہ ایک شخص محض فلسفہ کے طور پر اس کو اپنالے، اس کے حکم بیان کردے اور پھر بھی اس کا ماہر کہلائے، بلکہ یہ ایک عمل ہے۔ ایک پیغام ہے، ایک دعوت ہے۔ جب تک اس پر عمل صحیح طور پر نہیں ہوگا، اس وقت تک دین کی صحیح سمجھ حاصل نہیں ہوسکتی۔ میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس اللہ سرہ یہ بات فرمایا کرتے تھے:

”کہ اگر میرا علم بمعنی جان لینا کوئی کمال کی بات ہوتی تو شاید ابلیس سے بڑا صاحب کمال اس کائنات میں کوئی نہ ہوتا۔“

اس لیے کہ جہاں تک جاننے کا تعلق ہے صرف جان لینے کا، علم حاصل کر لینے کا، تو ابلیس کو علم بہت بڑا حاصل تھا، بہت کچھ علم اس کو اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا تھا، اور عقل کے اعتبار سے بھی آپ دیکھیں تو عقل، خالص عقل، جو وحی کی رہنمائی سے آزاد ہو، اس عقل کے اعتبار سے اس نے جو دلیل پیش کی، سجدہ نہ کرنے کی، کہ اے اللہ! تو نے آدم کو مٹی سے پیدا کیا اور مجھ کو آگ سے پیدا کیا، تو میں افضل ہوں، اس لیے کہ آگ افضل ہے مٹی کے مقابلے میں، تو اگر عقل کو وحی کی رہنمائی سے آزاد کردیا جائے تو خالص عقل کی بنیاد پر اس کی دلیل کا توڑ پیش نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن اس سارے عقل اور اس سارے علم کے باوجود وہ راندۂ درگاہ ہوا۔ اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے نکالا گیا، اس لیے کہ وہ علم نرا علم تھا، دانستن کے معنی میں اس پر عمل نہیں تھا۔ اس کو اپنی زندگی میں اپنائے ہوئے نہیں تھا، آپ کو معلوم ہے کہ آج ہمارے اس دور میں جتنے مستشرقین ہیں، اگر آپ ان کی لکھی ہوئی کتابیں دیکھیں تو ان میں اسلامی کتابوں کے ڈھیر ملیں گے۔ اتنی کتابوں کے حوالے ملیں گے کہ بسا اوقات ہمارے عالم دین اتنی کتابوں کا مطالعہ نہیں کرتے ہیں۔ لیکن سارا علم اور ساری معلومات حاصل کرنے کے بعد اس علم کا اتنا فائدہ نہیں اٹھا سکے کہ ایمان کی دولت حاصل کر لیتے۔ یہودی کے یہودی، عیسائی کے عیسائی رہے۔ تو معلوم ہوا کہ صرف فقہ کا عالم ہوجانا کافی نہیں، اور صرف فقہ کے عالم ہوجانے سے وہ مقام حاصل نہیں ہوجاتا جو نبی کریم ﷺ نے نئے مسائل کو حل کرنے کے لیے تجویز فرمایا بلکہ قید لگادی کہ فقہاء کے ساتھ عابدین ہونے چاہیے، عبادت گزار ہونے چاہیے۔ یہ حدیث میں نے اس وجہ سے سنائی کہ آج کثرت سے یہ آوازہ بلند ہوتا رہتا ہے، مختلف حلقوں کی طرف سے کہ صاحب دین کی تفہیم اور دین کی تعبیر کا حق صرف علماء ہی کو کیوں حاصل ہے۔ ہر مسلمان بہ حیثیت ایک مسلمان وہ دین کی تفہیم و تشریح کیوں نہیں کرسکتا۔ ہر آدمی کھڑا ہو کر بہ آواز بلند کہتا ہے کہ میں قرآن کریم سے احکام شرعیہ کا استنباط کرسکتا ہوں۔ یہ دین کی تفہیم و تعبیر کا سارا حق اٹھا کر علماء کی جھولی میں کیوں ڈال دیا گیا۔ علماء کی اجارہ داری کیوں قائم کردی گئی۔

تو جواب دیا نبی کریم ﷺ نے کہ یہ تشریح و تعبیر کا حق صرف فقہاء عابدین کو حاصل ہے، صرف فقہاء کو بھی نہیں بلکہ فقہاء عابدین کو، اس کے سوا کوئی قرآن و سنت کے احکام کی صحیح تفسیر و تشریح نہیں کرسکتا۔

یہ عجیب واقعہ ہے کہ دنیا کے ہر علم و فن میں کوئی ذمہ دارانہ بات کہنے کے لیے ساری دنیا میں یہ شرط عائد کی جاتی ہے کہ اس فن کا اس نے علم حاصل کیا ہو، اس کی ڈگری حاصل کی ہو، کوئی شخص آج تک ایسا پیدا نہیں ہوا جو کہتا ہو کہ انگریزی جانتا ہوں، میڈیکل سائنس کی کتابیں مطالعہ کر کے میں علاج کرسکتا ہوں، اگر میڈیکل سائنس کی کتابیں پڑھ کر محض مطالعہ کر کے ڈکشنریوں کے ذریعہ اس کے ترجے دیکھ کر آدمی علاج کرنا شروع کردے تو سوائے قبرستان آباد کرنے کے اور کوئی خدمت انسانیت کی وہ انجام نہیں دے سکتا۔ تو اللہ تعالیٰ نے دین کے اندر بھی یہ راستہ رکھا ہے کہ جب کتاب بھیجی تو نبی کریم ﷺ کو ساتھ بھیجا تاکہ آپ اس کی تعلیم دیں، اس کی تربیت دیں، اس کے معانی سکھائیں اور صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین نے سالہا سال کی محنت کر کے قرآن کریم کی ایک سورۃ سرکار دو عالم ﷺ سے پڑھی۔ اس لیے یہ نعرہ جو لگایا جاتا ہے کہ ہر شخص قرآن و سنت کے بارے میں جو چاہے کہہ سکتا ہے اس کا جواب اس مکمل حدیث کے اندر موجود ہے۔ اور جیسا کہ میں نے عرض کیا مجمع الفقہ الاسلامی اسی حدیث کی

تعلیم معلوم ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس حدیث پر عمل کرنے کا صحیح نور، اس کی صحیح برکت اور اس کا صحیح فائدہ مجمع کو عطا فرمائے۔

جیسا کہ مجھ سے پہلے کئی حضرات اس پر روشنی ڈال چکے ہیں کہ اس مجمع (اکیڈمی) کے قیام کا اصل مقصد ان نئے مسائل کا حل تلاش کرنا ہے جو اس امت مسلمہ کو درپیش ہیں اور کوئی شک نہیں کہ علماء کے نقطۂ نظر سے یہ وقت کا اہم ترین تقاضہ ہے کہ علماء باہم سر جوڑ کر ان مسائل کا حل امت مسلمہ کے سامنے پیش کریں جو آج امت مسلمہ کے لیے چیلنج بنے ہوئے ہیں۔ لیکن جب میں یہ کہتا ہوں کہ وقت کا بہت بڑا تقاضہ ہے کہ علماء یہ کام کریں تو مجھے چند وہ جملے بھی یاد آتے ہیں جو بسا اوقات مختلف حلقوں کی طرف سے بار بار اٹھائے جاتے ہیں کہ علماء کو وقت کے تقاضے کے پیچھے چلنا چاہیے۔ علماء کو وقت کے تقاضوں کے مطابق کام کرنا چاہیے۔ اور وقت کے تقاضوں کو سمجھنا چاہیے۔ یہ جملہ جس اجمال کے ساتھ بولا جاتا ہے اس کا صحیح مطلب بھی ہوسکتا ہے اور غلط مطلب بھی ہوسکتا ہے وقت کے تقاضہ کا مفہوم بسا اوقات لوگ یہ بیان کرتے ہیں کہ مغرب میں جو ہوا چل کر آ دے، مغرب سے جو فکر، جو فلسفہ جو نظریہ، جو طرز عمل ہمارے ملکوں میں درآمد ہو گیا، بجائے اس کے کہ اس کو بدلا جائے، اس کے بجائے اسلام کو بدل کر اس کے مطابق کیا جائے، اسے وقت کا تقاضہ قرار دیا جاتا ہے۔

ایک زمانہ تھا کہ سود، ربوا کا چلن ہوا تو لوگوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ صاحب اس وقت کا تقاضہ یہ ہے کہ مسلمان سود کو جوں کا توں قبول کر لیں...... ایک زمانہ آیا کہ اشتراکیت اور سوشلزم کا ڈنکا بجا، اور انہوں نے دنیا کے اندر اپنے نظریات کو پھیلانا شروع کیا، دنیا کے مختلف ملکوں اور سلطنتوں میں ان کا نظام رائج ہوا۔ اس کا شور شرابہ ہوا تو اس کے نتیجہ میں ایک جماعت نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ اس وقت کا تقاضہ یہ ہے کہ سوشلزم کو، اشتراکیت کو اسلام کے مطابق ڈھال دیا جائے وقت کا تقاضہ یہ ہے۔ غرض جو نئی وبا مغرب سے درآمد ہوا اسلام کو اس کے مطابق بنانے اور اس کو اسلام کے اندر داخل کرنے کے لیے وقت کے تقاضہ کا عنوان استعمال کر لیا جاتا ہے۔

لیکن یہ مجمع الفقہ الاسلامی درحقیقت ایسے وقت کے نام نہاد تقاضوں کے پیچھے نہ ہے اور نہ ہوگی انشاء اللہ تعالیٰ...... یہاں وقت کے تقاضوں سے مراد یہ ہے کہ بے شمار مسائل آپ کی زندگی کے اندر سے پیش آ گئے ہیں کہ ہمیں ان کا صریح حکم کتاب اللہ میں یا سنت رسول اللہ ﷺ میں یا فقہاء کرام کے کلام میں نہیں ملتا، جسے آپ اصلاحی اعتبار سے اجتہاد فی المسائل کہہ سکتے ہیں۔ تو اجتہاد فی المسائل کے ذریعہ ان مسائل کا حل تلاش کیا جائے اور وسعتِ نظر کے ساتھ کیا جائے۔ پورے اسلامی مزاج کے ساتھ کیا جائے، اس کے اندر کسی اجنبی نظریہ اور فلسفہ سے مرعوب ہو کر نہیں، بلکہ حقیقی اسلامی ضروریات کو مد نظر رکھتے ہوئے اس کا حل اسلامی اصولوں کے دائرہ میں رہ کر تلاش کیا جائے اس سے باہر نہ جایا جائے، یہ ہے اس مجمع (اکیڈمی) کا اصل مقصد اور اسی لیے اس میں الحمد للہ مختلف الخیال، مختلف اداروں سے تعلق رکھنے والے موجود ہیں اور پچھلے دنوں جو تحقیقات سامنے آئی ہیں اللہ کے فضل و کرم سے ان میں ان بنیادی اصولوں کا لحاظ نظر آتا ہے۔ امید ہے کہ یہ اکیڈمی ان راستوں پر چلے گی، تو انشاء اللہ اس امت کے لیے بہترین مسائل کا حل پیش کرے گی...... لیکن میں آخر میں اس سلسلہ کے ایک اہم نکتہ کی طرف آپ حضرات کو توجہ دلانا چاہتا ہوں، بلکہ توجہ دلانا تو بے ادبی کی بات ہوگی۔ سارے حضرات اکابر علماء ہیں۔ محض تذکیر اور تکرار کے طور پر عرض کرنا چاہتا ہوں، وہ یہ کہ چوں کہ ہم ایک ایسے معاشرہ میں جی رہے ہیں جس میں مغرب کا سیاسی اور فکری تسلط قائم ہے۔ سیاسی اور فکری سیاسی اعتبار سے پوری دنیا کے اوپر مغرب مسلط ہے۔ فکری اعتبار سے بھی مغرب کے افکار اور ان کے نظریات و فلسفے مسلط ہیں۔ اور یہ قاعدہ ہوتا ہے کہ "جس کی لاٹھی اس کی بھینس" جس کے پاس ہتھیار، جس کے پاس قوت ہو تو لوگوں کو بات بھی اسی کی سمجھ میں آتی ہے اور جلدی سے سینے میں اتر جاتی ہے۔ تو اس واسطے مغرب نے جو افکار ہمارے یہاں پھیلا دیئے اور صدیوں کی محنت کے بعد پھیلائے، ہمارے نظام تعلیم کے اندر [illegible] پھیلا دیئے۔ ان کی موجودگی میں اس بات کا بڑا قوی اندیشہ ہے کہ بعض ایسی چیزوں کو وقت کی ضرورت قرار دیا جائے جو درحقیقت وقت کی ضرورت نہیں ہے۔ محض مغرب کے پروپیگنڈہ نے اسے وقت کی ضرورت قرار دے دیا۔ یہ وقت کی ضرورت ایک ایسا مجمل لفظ ہے جس کے اندر بہت کچھ سما سکتا ہے اس لیے وقت کی ضرورت کے ہتھیار کو استعمال کرتے ہوئے ان کی دو دھاریں اپنے ذہن میں رکھنی ضروری ہے۔ یہ دو دھاریں ہتھیار ہیں، اس سے امت مسلمہ کے مسائل بھی حل ہو سکتے ہیں اور اس سے امت مسلمہ کا کام

بھی تمام ہو سکتا ہے۔ اس لیے ہم جب وقت کی ضرورت کا لفظ استعمال کریں تو یہ بات ہمارے ذہن میں ہونی چاہیے کہ محض پروپیگنڈہ کے شور و شغب سے مرعوب ہو کر ہم یہ نہ کہہ بیٹھیں کہ یہ بھی وقت کی ضرورت ہے۔ بلکہ ہم یہ دیکھیں کہ ہمارے اپنے اصول، ہمارے اپنے قواعد کے لحاظ سے یہ ضرورت ہے یا نہیں؟

اسی ضمن میں یہ سوال بہ کثرت اٹھتا ہے کہ کیا ان مسائل کو طے کرتے وقت کسی ایک فقہی مذہب کی پیروی کرنی چاہیے یا مختلف فقہی مذاہب کو سامنے رکھ کر اور اس میں جو ضرورت کے مطابق معلوم ہو اس کو اختیار کر لینا چاہیے۔

میں خاص طور پر آپ حضرات سے باادب عرض کرنا چاہتا ہوں کہ خاص طور پر اس دور میں معاملات کے شعبہ میں چوں کہ معاملات پیچیدہ ہوتے ہیں، بے شمار مسائل سامنے آ گئے ہیں، لہٰذا اگر یہ شخص حنفی مذہب کا پیروکار ہے اور وہ کسی ضرورت کی وجہ سے، عموم بلویٰ کی خاطر، وہ مسائل وقت کو حل کرنے کی خاطر دوسرے کسی امام کے قول کو اختیار کر لے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ یہ جائز ہے اور نہ صرف جائز ہے بلکہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کو باضابطہ یہ وصیت فرمائی تھی کہ اس دور میں جب کہ معاملات پیچیدہ ہو گئے ہیں، اگر آئمہ اربعہ کے دائرہ میں رہتے ہوئے کسی بھی فقہی مذہب میں کوئی گنجائش مل جائے تو اس دور کے لوگوں کے لیے آسانی پیدا کرنی چاہیے۔

لیکن اس میں ادق ترین جو نکتہ ہے جو بسا اوقات افراط و تفریط کا شکار ہو کر فراموش ہو جاتا ہے وہ یہ کہ مختلف مذاہب میں سے عموم بلویٰ کی خاطر کوئی قول اختیار کر لینا اور بات ہے اور اپنی خواہشات نفسانی کو پورا کرنے کی خاطر مذاہب کو گڈمڈ کرنا بالکل جدا شئے ہے یعنی اگر کوئی شخص محض اس بنیاد پر کہ میری خواہش نفسانی میرے مفاد ایک مذہب سے پورے ہو رہے ہیں دوسرے سے پورے نہیں ہو رہے ہیں تو اس بنیاد پر اگر وہ ایک مذہب کو چھوڑ کر دوسرا مذہب اختیار کرتا ہے اپنے ذاتی مفاد کی خاطر تو اس کی کسی کے نزدیک اجازت نہیں، یہ اتباع ہویٰ ہے۔ یہ خواہشات نفسانی کی اتباع ہے۔ اس کو تشہی کہا گیا ہے، یہ شہوت پرستی ہے، یہ خواہش پرستی ہے، محض اپنے ذاتی فائدہ یا ذاتی سہولت کی خاطر ایک مذہب کو چھوڑ کر دوسرا مذہب اختیار کر لیتا ہے اس کی مثال آپ حضرات کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

آج جب کہ ان مسائل کو حل کرنے کے لیے یہ عام رجحان پیدا ہوا۔ پورے عالم اسلام میں خاص طور پر عرب ممالک میں یہ رجحان بہت پیدا ہوا کہ ان معاملات کو حل کرنے کے لیے مختلف مذاہب سے رہنمائی حاصل کی جائے اور کسی ایک مذہب کی اتباع نہ کی جائے۔ جب یہ لے آگے بڑھی تو اس نے بعض اوقات یہ صورت اختیار کر لی کہ محض ضرورت کی خاطر نہیں، بلکہ محض ذاتی مفاد، ذاتی سہولت کی خاطر "جمع بین المذاہب" اور تلفیق بین المذاہب کا راستہ اختیار کر لیا...... اتباع ہویٰ کے بارے میں علامہ ابن تیمیہ فتاویٰ کے اندر لکھتے ہیں:

"اگر کوئی شخص ذاتی خواہش کی خاطر دوسرے مذہب کو اختیار کرتا ہے تو یہ کسی کے نزدیک جائز نہیں بلکہ حرام ہے۔"

حالانکہ علامہ ابن تیمیہ تقلید کے سخت مخالف ہیں۔ اتباع ہویٰ کو وہ بھی حرام قرار دیتے ہیں۔ اس کی چھوٹی سی مثال پیش کرتا ہوں۔

ایک صاحب سے میری ایک بار ملاقات ہوئی میں اور وہ دونوں سفر پر تھے اور دونوں سفر کے عالم میں مقیم تھے۔ ہفتہ دس دن ایک جگہ ٹھہرنا تھا تو میں نے دیکھا کہ وہ "جمع بین الصلوٰتین" کر رہے ہیں۔ دو نمازوں کو جمع کر رہے ہیں۔ حضرت امام شافعیؒ کے نزدیک جائز ہے، امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک جائز ہے، امام مالکؒ کے نزدیک جائز ہے، امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک جمع حقیقی جائز نہیں ہے۔ جمع صوری کو جائز کہتے ہیں۔ تو وہ جمع کر رہے تھے، انہوں نے امام شافعیؒ کے قول پر عمل کیا ہوگا۔ مگر میں نے دیکھا کہ وہ ہفتہ بھر مقیم رہے اور جمع بین الصلوٰتین کرتے رہے، تو میں نے ان سے پوچھا کہ کیا آپ نے شافعی مسلک کو لے لیا تاکہ دو نمازوں کو جمع کرنے کی گنجائش مل جائے، میں نے عرض کیا کہ شافعی مسلک یہ بھی ہے کہ چار دن سے زیادہ ان کے یہاں قصر نہیں ہو سکتی۔ ان کے نزدیک مدت قصر صرف چار دن ہے، تو چار دن سے زیادہ مدت سفر نہیں ہوتی اور آپ تو ہفتہ بھر سے مقیم ہیں۔ تو کہنے لگے کہ میں نے اس معاملہ میں حنفی مسلک کو لے لیا۔ تو میں نے پوچھا کہ کیا آپ دلائل کے نقطۂ نظر سے یہ سمجھتے ہیں کہ اس مسئلہ میں حنفیہ کا مسلک زیادہ قوی ہے اور اس معاملہ میں شافعیہ کا مسلک زیادہ قوی ہے۔ کہنے لگے کہ دلیل کے اعتبار سے تو میں نہیں سمجھتا لیکن میں نے دیکھا کہ یہ

میرے لیے زیادہ سوٹ کرتا ہے تو اس واسطے میں نے اس میں حنفی کا مسلک لے لیا اور اس میں شافعی کا مسلک لے لیا...... تو میری گزارش یہ ہے کہ محض ذاتی سہولت اور ذاتی مفاد، ذاتی راحت کے پیش نظر ایک مسئلہ میں ایک قول کو لے لینا اور دوسرے مسئلہ میں دوسرے قول کو لے لینا، یہ کسی کے نزدیک جائز نہیں ہے۔ یہ طریقہ اختیار کیا گیا تو اس سے دین کا حلیہ بگڑنے کا اندیشہ ہے۔ اس واسطے کہ ہر مذہب میں جو قول اختیار کیا گیا اس کے کچھ شرائط ہیں اس کے کچھ حدود ہیں۔ آپ نے ان شرائط کو مدنظر نہیں رکھا چھوڑ دیا اور ان شرائط کو مدنظر رکھے بغیر اور اس طرح سے "تلفیق بین المذاھب" کا سلسلہ شروع کر دیا تو اس کا نتیجہ سوائے اتباع ہویٰ کے اور کچھ نہیں ہو سکتا، اس لیے میری گزارش یہ ہے کہ بے شک دوسرے مذاہب خاص طور پر معاملات کے اندر دوسرے مذاہب سے لے لینے کی گنجائش ہے لیکن یہ اس وقت جب کہ واقعی کوئی ضرورت داعی ہو اور واقعۃً اس سے مسلمانوں کے کسی اجتماعی مسئلہ کا حل نکالنا مقصود ہو اور اس کا مقصد اتباع ہویٰ، تشہی اور ذاتی منفعت کو حاصل کرنا نہ ہو، اس صورت میں اس کی گنجائش ہے۔ یہ بات ظاہر ہے کہ یہ علماء کا مجمع ہے، ان کے سامنے کہنے کی ضرورت نہیں تھی، لیکن یہ اس لیے میں نے تذکیراً اور تکراراً عرض کر دی کہ جب ہم کسی ایک جانب جھکیں تو ایسا نہ ہو کہ دوسری جانب کا خیال ہمارے دل سے اوجھل ہو...... یہ کام بڑا نازک ہے، یہ پل صراط ہے۔ تلوار سے زیادہ تیز اور بال سے زیادہ باریک ہے۔ اس میں اس کا خیال رکھنا ہے کہ وقت کی ضروریات پوری ہوں، مسلمانوں کے مسائل حل ہوں اور دوسری طرف اس بات کا لحاظ رکھنا ہے کہ آپ مغرب کے اس جھوٹے پروپیگنڈے سے مرعوب نہ ہوں جو ہر نئی وبا کو وقت کی ضرورت کہہ کر ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔ اس واسطے اس کا لحاظ رکھتے ہوئے ہم اس کام کو انجام دیں گے تو ان شاء اللہ تعالیٰ اس شریعت کے اندر اللہ تعالیٰ نے یہ صلاحیت رکھی ہے کہ یہ آنے والے ہر بڑے سے بڑے مسئلہ کا حل رکھتی ہے اور جب یہ تصور آپ کے سامنے رکھتے ہوئے جواب دیں گے تو ان شاء اللہ امت کے مسائل حل ہوں گے ...... جیسا کہ مجھ سے پہلے حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی مدظلہم نے فرمایا کہ عالم کا کام صرف یہ نہیں ہے کہ وہ یہ کہہ دے کہ یہ حرام ہے بلکہ اس کا کام یہ بھی ہے کہ اگر کسی چیز کو حرام کہا ہے اور لوگوں کو اس کی ضرورت ہے تو اس کا متبادل حلال طریقہ بھی بتائے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ میں جب حضرت یوسف علیہ السلام سے خواب کی تعبیر پوچھی گئی کہ بادشاہ نے خواب دیکھا ہے کہ:

"انی اری سبع بقرات سمان یاکلھن سبع عجاف..."

جب یہ پوچھا تو یوسف علیہ السلام نے خواب کی تعبیر بعد میں بتائی کہ قحط آنے والا ہے لیکن اس قحط سے بچنے کا راستہ پہلے بتا دیا:

"تزرعون سبع سنین دابا... فما حصدتم فذروہ فی سنبلہ..."

تعبیر تو بعد میں بتائی کہ قحط آنے والا ہے اور پہلے قحط سے بچنے کا یہ راستہ بتایا کہ سات سال تک خوب جم کر زراعت کرو، اور خوشہ کے اندر گیہوں کو چھوڑ دو۔ تو بچنے کا طریقہ پہلے بتا دیا اور خواب کی تعبیر بعد میں بتائی...... تو عالم کا کام محض حرام قرار دے کر ختم نہیں ہو جاتا، بلکہ متبادل راستہ بتانا بھی اس کی ذمہ داری ہے۔ اور یہ اکیڈمی درحقیقت اسی لیے قائم کی گئی ہے۔ اس کے لیے میں سمجھتا ہوں کہ دوسرے علوم وفنون کے ماہرین کی بھی ضرورت ہوگی۔ متبادل طریقوں کے سمجھنے اور اس کے تعین کے لیے وہ طریقے تجویز کئے جاسکیں جو قابل عمل ہیں۔

الحمدللہ! دیکھتا ہوں کہ مجمع الفقہ الاسلامی نے اس اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے دیگر علوم وفنون کے ماہرین سے بھی استفادہ کا سلسلہ جاری کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے اپنی رحمت سے اس اکیڈمی کو اپنے مقاصد حسنہ میں کامیابی عطا فرمائے، قدم قدم پر اس کی نصرت ودستگیری فرمائے، اس کے راستے کی دشواریوں کو دور فرمائے اور دین کی صحیح خدمت کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

میں اخیر میں ایک بار پھر اس کانفرنس کے منتظمین کا اور تمام حاضرین کا تہ دل سے شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اس ناچیز کی گزارشات کو غور وتوجہ کے ساتھ سنا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

وآخر دعوانا ان الحمدللہ رب العالمین

علم اسلام کے اکابر علمائے کرام کے جدید فقہی مسائل پر مقالہ جات اور مناقشات کا مجموعہ نئی ترتیب کے ساتھ

سلسلہ
جدید فقہی مباحث

اسلام میں بچوں کے حقوق

اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا) کے چوبیسویں فقہی سمینار منعقدہ مؤرخہ ۹-۱۱/جمادی الاولی ۱۴۳۶ھ مطابق ۱ تا ۳/مارچ ۲۰۱۵ء کو دار العلوم الاسلامیہ اوچرا، کلم (کیرالہ) میں پیش کئے گئے علمی، فقہی اور تحقیقی مقالات کا مجموعہ

تحقیقاتِ اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا

زیر سرپرستی

حضرت مولانا مجاہد الاسلام قاسمی
حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی دامت برکاتہم

دارالاشاعت
اُردو بازار ○ ایم اے جناح روڈ ○ کراچی پاکستان

پیش لفظ

بچے اللہ کی بڑی نعمت ہیں، اس نعمت کی قدر ان لوگوں سے پوچھئے، جن کو اللہ نے اولاد سے محروم رکھا ہے، انسان عمر کے جن مرحلوں سے گزرتا ہے، ان میں وہ سب سے زیادہ بچپن میں دوسروں کی مدد اور توجہ کا محتاج ہوتا ہے؛ اس لئے قرآن وحدیث میں بچوں کی پرورش، ان کی ضروریات کی کفالت اور ان کی تعلیم وتربیت کے سلسلہ میں واضح احکام دیئے گئے ہیں، جن میں سے بعض اصولی نوعیت کے ہیں، فقہاء نے ان اصولوں کو سامنے رکھ کر اپنے اجتہادات کے ذریعہ اس باب میں اور جامعیت اور وسعت پیدا کردی ہے۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بچوں کے بہت سے حقوق ادا نہیں کئے جاتے، ان کی تعلیم وتربیت سے غفلت برتی جاتی ہے، جو زمانہ ان کی صلاحیتوں کی نشو ونما کا ہے، اس میں انہیں پُر مشقت جسمانی کام میں لگا دیا جاتا ہے، جو بچے معذور ہوتے ہیں، وہ خاندان کی طرف سے غفلت اور تحقیر کے شکار بنتے ہیں اور خاص کر جن کے والدین کا سایہ اٹھ جاتا ہے، انہیں خود اپنے نازک کاندھوں پر اپنے مسائل کا بوجھ اٹھانا پڑتا ہے؛ اسی لئے دنیا بھر میں انسانی حقوق کی تنظیمیں بچوں کے حقوق اور ان کے مسائل کے سلسلہ میں فکر مند ہیں۔

ظاہر ہے ان مسائل کا بہترین، منصفانہ اور مبنی بر اعتدال حل شریعت اسلامی میں موجود ہے؛ اس لئے علماء امت کا فریضہ ہے کہ وہ ایک طرف مسلم سماج کو اس سلسلہ میں ان کی ذمہ داریوں سے آگاہ کریں اور دوسری طرف دنیا پر اس حقیقت کو واضح کریں کہ اسلام کے پاس اس کا ایک ایسا نسخہ موجود ہے، جو انسانیت کے تمام مسائل کے لئے اکسیر کا درجہ رکھتا ہے، موضوع کی اہمیت کے پیش نظر اکیڈمی نے اپنے چوبیسویں فقہی سمینار منعقدہ دار العلوم اسلامیہ اوچرا (کیرالہ) مورخہ ۹-۱۱ / جمادی الاولی ۱۴۳۶ھ مطابق ۱-۳ / مارچ ۲۰۱۵ء میں اس موضوع کو بھی شامل رکھا اور اس موضوع پر ۷۳ مقالات اکیڈمی کو موصول ہوئے، جو سوالنامہ اس موضوع کے لئے مرتب کیا گیا ہے، وہ نہایت جامع اور مختلف پہلوؤں کو شامل ہے، چنانچہ سمینار کے ان مقالات اور سمینار میں ہونے والے مباحث کا مجموعہ اصحاب ذوق کی بارگاہ میں پیش ہے، جس کو محب عزیز مولانا امتیاز احمد قاسمی رفیق شعبہ علمی نے بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ مرتب کیا ہے۔ اس میں سوالنامہ، تلخیص مقالات، عرض مسئلہ اور تجاویز بھی شامل ہیں؛ البتہ قارئین اس کو ملحوظ رکھیں کہ اکیڈمی کے نقطہ نظر کی ترجمانی ان تجاویز سے ہوتی ہے، جو شرکاء کے اتفاق سے طے پاتی ہیں اور اختلاف کی صورت میں دونوں آراء نقل کردی جاتی ہیں۔

امید ہے کہ اکیڈمی کی یہ کاوش شوق کے ہاتھوں لی جائے گی اور امت کے لئے نفع کا ذریعہ بنے گی۔

(مولانا) خالد سیف اللہ رحمانی (جنرل سکریٹری اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا)

یکم ربیع الاول ۱۴۳۷ھ / ۱۳ / دسمبر ۲۰۱۵ء

☆☆☆

باب اول تمہیدی امور

سوالنامہ:

اسلام میں بچوں کے حقوق

ہمارا عقیدہ ہے کہ اسلام نے تمام انسانوں خصوصاً سماج کے کمزور طبقات (بچوں، بوڑھوں، عورتوں، مریضوں وغیرہ) کے حقوق کا تحفظ اپنے قانونی احکام اور اخلاقی تعلیمات کے ذریعہ جس طول و اعتدال کے ساتھ کیا ہے، اس کی نظیر کسی مذہب اور قانون میں نہیں ملتی، دور حاضر میں بچوں کے وہ حقوق جو ہمارے سماج میں پامال ہو رہے ہیں، ان کی نشاندہی اور ان کے بارے میں اسلامی نقطہ نظر کی وضاحت بہت ضروری ہے۔ دور حاضر میں بچوں کے حقوق کی حفاظت کے لئے ملکی اور عالمی سطح پر بہت سے قوانین بنائے گئے، اقوام متحدہ نے اپنے ممبر ممالک کے لئے بھی حقوق اطفال کے بارے میں قوانین بنائے ہیں اور ہدایات جاری کی ہیں۔

اس پس منظر میں چند سوالات پیش خدمت ہیں، ان کا جواب آپ تفصیل اور دلائل کے ساتھ دیں اور خلاصہ جوابات بھی آخر میں تحریر کریں، نیز اگر آپ محسوس کریں کہ بچوں کے حقوق سے متعلق کوئی زیادہ اہم موضوع سوالنامہ میں رہ گیا ہے تو اسے بھی شامل کر کے جواب لکھیں:

الف: بچوں کے حق پرورش (حق حضانت) کے سلسلے میں اسلام کی بنیادی ہدایات کیا ہیں؟ نیز عمر کے جس مرحلہ میں ماں کو یا باپ کو پرورش کا اولین حقدار تسلیم کیا گیا ہے؟ اگر بچہ کو اس کے حوالہ کرنے میں تعلیمی، تربیتی، جسمانی یا نفسیاتی پہلو سے بچہ کے لئے مضرت کا اندیشہ ہو تو حق پرورش کے سلسلہ میں کیا حکم ہوگا، اور وہ کیا صورتیں ہوسکتی ہیں، جب بچوں کے مفاد میں کسی مرد یا عورت کو حق پرورش سے محروم کیا جاسکتا ہے؟

ب: (۱) اسلام میں بچوں کے حق تعلیم و تربیت کے بارے میں کیا بنیادی ہدایات ہیں؟

(۲) بچوں اور بچیوں کو کس قدر دینی تعلیم دینا ضروری ہے اور عصری تعلیم کس حد تک دینا ضروری ہے؟

(۳) اگر حکومت کسی سطح تک کی تعلیم کو بچوں اور بچیوں کے لئے لازم قرار دے تو کیا شرعاً اس کی پابندی مسلمانوں کے لئے لازم ہے؟

(۴) کیا جنس کی تعلیم بھی بچوں کا حق ہے جیسا کہ آج کل کہا جارہا ہے، اس سلسلہ میں اسلام کی ہدایات کیا ہیں؟

ج: نکاح کے بارے میں بچے اور بچیوں کے کیا حقوق ہیں؟ اس سلسلہ میں ہمارے سماج میں افراط و تفریط پائی جاتی ہے، ایک طرف بعض برادریوں میں بہت کم عمری میں نکاح کردیئے جاتے ہیں، جو بعد کو پیش آنے والے حالات میں بچوں کے لئے یہ غیر موزوں ہوتے ہیں، کبھی بالغ ہونے کے بعد بھی لڑکوں اور لڑکیوں کی شادی میں غیر معمولی تاخیر کی جاتی ہے، جس سے اخلاقی بگاڑ پیدا ہونا فطری بات ہے، اس سلسلہ میں اسلامی تعلیمات اور شرعی ہدایات کیا ہیں؟

د: بہت سے ملکوں میں بچہ مزدوری قابل سزا جرم قرار دی گئی ہے، خود ہمارے ملک میں بھی اس طرح کا قانون موجود ہے، بلکہ عالمی ادارہ ''اقوام متحدہ'' نے اس کو ایک جرم شمار کیا ہے، اس قانون کا مقصد یہ ہے کہ کم عمری میں بچے کو مزدوری اور کام پر لگانے سے بچہ تعلیم حاصل نہیں کرپاتا اور اس کی جسمانی اور دماغی نشوونما صحیح طور پر نہیں ہو پاتی، بسا اوقات بچے اور بچیوں سے اتنے پر مشقت کام لیے جاتے ہیں، جو ان کے تحمل سے باہر ہوتے ہیں، اس کے نتیجے میں بچے موذی اور مہلک بیماریوں میں مبتلا ہوجاتے ہیں، اسی پس منظر میں درج ذیل سوالات پیش خدمت ہیں:

ا۔ بچہ مزدوری کے بارے میں اسلام کا موقف کیا ہے؟

۲۔ والدین یا اولیاء، نابالغ بچے اور بچیوں سے اپنے گھر کا کام کس حد تک لے سکتے ہیں؟ اور کیا اپنی معاشی ضروریات پورا کرنے یا بہتر بنانے کے لئے ان سے مزدوری کرا سکتے ہیں؟ اسی طرح انہیں کوئی پیشہ ورانہ کام سکھانے کے لئے کام سے لگا سکتے ہیں یا نہیں؟

۳۔ بعض والدین اپنی انتہائی غربت اور معاشی بدحالی کی بنا پر بچوں کو مزدوری پر لگاتے ہیں، نہ وہ خود کمانے کے لائق ہوتے ہیں، نہ حکومت ان کا تکفل کرتی ہے، ایسے والدین کا نابالغ بچوں کو مزدوری پر لگانا درست ہے یا نہیں، اس بابت اسلام کی کیا ہدایات ہیں؟

ہ: شرعاً بالغ ہونے سے پہلے اگر لڑکوں یا لڑکیوں سے جرائم سرزد ہوں مثلاً: قتل، غارت گری، چوری، زنا بالرضا یا زنا بالجبر، تو ان پر سزا جاری کی جائے گی یا نابالغ ہونے کی بنا پر انہیں چھوڑ دیا جائے گا، واضح ہو کہ دور حاضر میں نابالغوں میں پھیلتے ہوئے جرائم کے رجحان سے حکومتیں پریشان ہیں، ان پر قابو پانے اور ان کا سد باب کرنے کے لئے اسلام کی کیا ہدایات ہیں؟

و: مجرمانہ ذہن رکھنے والے بچوں کی سرزنش اور اصلاح کے لئے بچوں کی جیلیں قائم ہیں، ان جیلوں میں بھی بچوں سے پر مشقت کام لئے جاتے ہیں، اور سخت مار پیٹ کی جاتی ہے، ایسی جیلوں میں موجود نابالغ قیدیوں کے لئے کیا احکام ہیں، ان کو کیا سزائیں دی جاسکتی ہیں؟ ان سے کیا کام لئے جاسکتے ہیں؟ اور ان کی اصلاح کے لئے کیا تدبیریں اختیار کی جاسکتی ہیں؟

ز: بہت سے بچے بے سہارا ہو جاتے ہیں، کسی حادثہ میں ان کے والدین کے گذر جانے یا والدین سے بچھڑ جانے نیز ولادت کے بعد ماں باپ کی طرف سے پھینک دیئے جانے کی وجہ سے یا کسی اور سبب یہ صورت حال پیش آتی ہے، اسلام ایسے بچوں کی پرورش، ان کی تعلیم وتربیت اور ان کے لئے خاندانی ماحول فراہم کرنے کے سلسلہ میں کیا ہدایات دیتا ہے، اس سلسلہ میں حکومت کی ذمہ داریاں کیا ہیں اور خود سماج کا کیا فریضہ ہے؟

ح: ہندوستان کی ایک تازہ رپورٹ کے مطابق ہر سال تقریباً دس لاکھ بچے گم ہو جاتے ہیں، یہ صورتحال اکثر پسماندہ اور ترقی پذیر ممالک میں پائی جاتی ہے، خیال کیا جاتا ہے کہ یہ بچے مختلف مقاصد کے لئے فروخت کردیئے جاتے ہیں، بعض بچوں کو وہ لوگ حاصل کر لیتے ہیں جن کے پاس اولاد نہیں ہوتی، بعضوں سے بندھوا مزدور کا کام لیا جاتا ہے، بعض گداگری کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں، بعض ایسے بدقسمت بھی ہیں جن کے اعضاء کی خرید وفروخت کی جاتی ہے یا ان کا جنسی استحصال کیا جاتا ہے، ان صورتوں کے بارے میں شرعی نقطہ نظر بنیادی طور پر واضح ہے، لیکن دو باتیں قابل وضاحت ہیں: اول یہ کہ کیا خود بچہ کے گارجین حد درجہ بڑھے ہوئے افلاس اور پرورش کی استطاعت نہ رکھنے کی وجہ سے کسی کو اپنا بچہ حوالہ کر کے اس سے بے تعلق ہو سکتے ہیں؟ اور اپنی فوری ضروریات کو پوری کر کے نیز دوسرے، بچہ کی پرورش کی غرض سے، بچہ حاصل کرنے والے کی طرف سے پیش کیا جانے والا ہدیہ قبول کر سکتے ہیں؟ دوسری قابل وضاحت بات یہ ہے کہ ایسے واقعات کی روک تھام کے لئے شریعت اسلامی کی تعلیمات کیا ہیں؟

ط: بعض بچے ذہنی یا جسمانی طور پر معذور پیدا ہوتے ہیں یا پیدا ہونے کے بعد معذور ہو جاتے ہیں، ان بچوں کی پرورش ایک بڑا مسئلہ ہوتا ہے، ان کے لئے مسلسل علاج اور نگہداشت کی ضرورت ہوتی ہے، خاص کر اگر والدین ملازمت کرتے ہوں تو ان کی دیکھ ریکھ کا مسئلہ خاصا گمبھیر ہو جاتا ہے، اس ذمہ داری سے فراغ یا فرار حاصل کرنے کے لئے بعض اوقات ایسے بچوں کو دماغی ہسپتال میں داخل کر دیا جاتا ہے یا دوسرے ہسپتالوں میں رکھوا دیا جاتا ہے، جس کا مقصد علاج سے زیادہ ان کی نگہداشت ہوتی ہے، ایسے بچوں کے بارے میں اسلامی تعلیمات کیا ہیں؟ کس حد تک ان کا علاج کرانا واجب ہے، اور کیا ان کو باپ کی شفقت اور ماں کی ممتا سے محروم کر کے کسی ہسپتال میں داخل کر دینا ماں باپ کا اپنی ذمہ داری سے غفلت برتنا اور فرار اختیار کرنا متصور ہوگا؟

☆☆☆

تجاویز:

تجاویز بابت ''اسلام میں بچوں کے حقوق''

۱۔ بچوں کے حق پرورش کے سلسلے میں بنیادی ہدایات یہ ہیں:

الف: حضانت شرعاً واجب ہے اور یہ فریضہ اصلاً ماں کا ہے، اس کو یہ کام انجام دینا چاہئے، اگر ماں نہ ہو اور حضانت کی حقدار اگر ایک ہی عورت موجود ہو تو بچہ کی پرورش اس پر واجب عینی، اور متعدد ہوں تو واجب کفائی ہے۔

ب: پرورش میں بچہ اور پرورش کنندہ، دونوں کی رعایت ملحوظ رکھی جائے گی۔

ج: عام حالات میں ماں کو پرورش کے لئے مجبور نہیں کیا جائے گا، البتہ بعض مخصوص حالات میں جبکہ کوئی دوسرا موجود نہ ہو اور بچہ کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہو تو مجبور کیا جائے گا۔

د: پرورش کے لئے بچہ ماں کے پاس اس وقت تک رہے گا جب تک کہ اپنی بنیادی ضروریات مثلاً کھانا، پینا اور استنجا کے لائق نہ ہو جائے، بچہ میں سات سال کی عمر ہے اور لڑکی بالغہ یا قریب البلوغ تک ماں کے پاس رہے گی۔

ہ: پرورش کرنے والے کا عاقل، بالغ، امانت دار اور پرورش پر قدرت رکھنے والا ہونا ضروری ہے، اور عورت ہو تو یہ بات بھی ضروری ہے کہ وہ جس شخص کے نکاح میں ہو وہ زیر پرورش بچہ کا غیر محرم نہ ہو۔

و: جن صورتوں میں بچہ کو تعلیمی، تربیتی، جسمانی یا نفسیاتی پہلو سے مضرت کا اندیشہ ہو، ان صورتوں میں حق پرورش ساقط ہو جائے گا۔

۲۔ حق تعلیم وتربیت:

الف: والدین اور سرپرستوں پر بچوں اور بچیوں کو اتنی تعلیم دینا ضروری ہے جس سے وہ اپنی دینی ذمہ داریاں ادا کرنے کے اہل ہو جائیں، اسی طرح حسب ضرورت عصری تعلیم بھی دی جائے اور اس سلسلہ میں شرعی حدود کی رعایت رکھی جائے۔

ب: اگر حکومت کسی سطح تک کی تعلیم بچوں اور بچیوں کے لئے لازم قرار دے اور وہ تعلیم شرعی اصول سے متصادم نہ ہو، اور کوئی بات ایمان و اخلاقیات کے منافی نہ ہو اور نہ ہی بے راہ روی وانحراف کا باعث ہو تو اس کی پابندی مسلمانوں کو کرنی چاہئے۔

ج: آج کل بچوں کے لئے جس جنسی تعلیم کا مطالبہ کیا جا رہا ہے اس کی گنجائش اسلام میں بالکل نہیں ہے کیونکہ اس کے مفاسد بہت ہیں اور اس سے بے راہ روی پیدا ہوتی ہے، ایسی عمر میں بچوں کو اخلاقیات کی تعلیم دی جانی چاہئے۔

۳۔ نکاح کے بارے میں اسلامی تعلیم اور شرعی ہدایت یہ ہے کہ بلوغ کے بعد بچہ اور بچی کی شادی میں زیادہ تاخیر نہ کی جائے، کیونکہ اس سے جسمانی، روحانی اور سماجی نقصانات پیدا ہوتے ہیں، بعض مصالح کی وجہ سے کمسنی میں نکاح کا جواز ہے لیکن بہتر اور پسندیدہ بلوغ کے بعد کا نکاح ہی ہے۔

۴۔ بچہ مزدوری کے بارے میں اسلام کا موقف ہے کہ بچہ قابل رحم اور لائق شفقت ہے، لہٰذا حسب استطاعت اس کی بہتر تعلیم وتربیت کا انتظام کیا جائے اور ذہنی وجسمانی نشوونما کے لئے بہتر مواقع فراہم کئے جائیں۔

۵۔ والدین یا اولیاء بچوں سے بقدر استطاعت ایسے گھریلو کام لے سکتے ہیں جن کا تعلق تربیت اور آداب زندگی سکھانے سے ہو، اسی طرح انہیں ایسا پیشہ ورانہ کام بھی سکھا سکتے ہیں جو ان کے حق میں مفید ہو۔

۶۔ جو والدین معاشی تنگی کا شکار ہوں، حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ ان کا تکفل کرے اور ان کے لئے وظائف جاری کرے۔

۷۔ اگر اسلام کے اصول تعلیم وتربیت کی رعایت رکھی جائے تو بچوں سے جرائم کا صدور نہیں ہوگا۔ جرائم کی شرعی سزا جاری کرنے کے لئے بلوغ شرط ہے، لہٰذا نابالغ چوری، قتل اور زنا جیسے جرائم کا ارتکاب کرے تو اس پر حدود وقصاص کا اجراء نہیں کیا جائے گا، البتہ تادیب کی جائے گی۔

۸۔ والدین، اولیاء اور اساتذہ کو بچوں کی تادیب کا حق حاصل ہے، لیکن ضروری ہے کہ یہ تکلیف دہ اور مضرت رساں نہ ہو، اور شرعی حدود کے اندر ہو۔

۹۔ تادیب کے طور پر انہیں بچہ جیل میں رکھا جاسکتا ہے، لیکن ان کو سخت سزائیں دینا ناجائز ہے، سزائیں ان کی قوت برداشت کے مطابق دی جائیں، اور پُرمشقت کام نہ لیا جائے اور ان کی اصلاح کے لئے جیلوں میں تعلیم وتربیت کا نظم کیا جائے۔

۱۰۔ بے سہارا بچوں کی پرورش اور ان کی تعلیم وتربیت کی ذمہ داری اور خبر گیری اولاً ان کے رشتہ داروں پر، پھر حکومت پر، پھر سماج یا بالفاظ دیگر عامۃ المسلمین پر ہے، اس سلسلہ میں ہر شعبہ کو اپنی ذمہ داری کا احساس رکھنا چاہئے۔

۱۱۔ حد درجہ افلاس کی وجہ سے اپنا بچہ دوسرے کے حوالہ کر کے اس سے مکمل طور پر لاتعلق ہو جانا درست نہیں ہے، اس سلسلہ میں حکومت اور سماج کو سامنے آنا اور اپنا کردار ادا کرنا چاہئے۔

۱۲۔ والدین اور اولیاء پر ذہنی یا جسمانی طور پر معذور بچوں کی دیکھ ریکھ لازم ہے، خواہ گھر میں رکھ کر ہو یا ناگزیر ضرورت پر ہسپتال میں رکھ کر ہو، اور ایسے بچوں کا علاج حتی المقدور صبر واستقامت کے ساتھ کیا جائے، اور اللہ سے اس پر اجر کی امید رکھی جائے۔

☆☆☆

۱۴۰۸۹۸

تلخیص مقالات:

اسلام میں بچوں کے حقوق

مفتی امتیاز احمد قاسمی [1]

اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا) کے زیر اہتمام منعقد ہونے والے ۲۴ ویں فقہی سمینار میں جن پانچ اہم موضوعات پر بحث ومناقشہ ہونا ہے ان میں ایک اہم موضوع ''اسلام میں بچوں کے حقوق'' ہے، جس کے تحت پندرہ سوالات قائم کئے گئے تھے اور اہل علم وتحقیق سے گزارش کی گئی تھی کہ وہ ان سوالات کا مفصل جواب قرآن وحدیث اور فقہ اسلامی کی روشنی میں تحریر فرمائیں۔

اس موضوع پر تلخیص کی تیاری تک اکیڈمی کو فقہاء وعلماء کے جتنے مقالات موصول ہوئے ہیں، ان کے اسماء گرامی یہ ہیں:

مولانا ڈاکٹر شاہجہاں ندوی، مفتی آصف یسین پالنپوری، مفتی غلام اللہ کاوی والا، مفتی راشد حسین ندوی، مفتی عبداللہ کاوی والا، مولانا حافظ کلیم اللہ عمری، مولانا رحمت اللہ ندوی، مولانا عبدالتواب اناوی، مفتی لطیف الرحمن، مفتی عارف کنجروی، مولانا حبیب بن یوسف قاسمی، مولانا عبداللہ خالد اوناواڑی، مفتی محمد شفیق، مفتی محمد اخلاق حسین قاسمی، قاضی محمد ریاض ارمان قاسمی، مولانا محمد عمران ندوی، مولوی اکرام لوناواڑہ، مفتی صادق پٹیل دیولوی، مفتی شاہد علی قاسمی، مولانا محمد احسن عبدالحق ندوی، قاضی محمد کامل قاسمی، مولانا سید قمر الدین محمود قاسمی، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مفتی محمد الیاس قاسمی، مولانا مبارک حسین ندوی، مفتی محمد منصف بدایونی، قاضی عبدالجلیل قاسمی، مولانا محمد حذیفہ بن محمود ٹیلر داحودی، مفتی تنظیم عالم قاسمی، مفتی محمد عثمان بستوی، مولانا نعیم اختر قاسمی، مولانا خورشید انور اعظمی، مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی، مفتی حافظ سید صادق محی الدین فہیم، مولانا محمد صابر حسین ندوی، مفتی محمد جہانگیر حیدر قاسمی، مفتی محمد یاسر قاسمی۔

اس موضوع کا پہلا سوال یہ تھا:

سوال: (الف)۔ بچوں کے حق پرورش (حق حضانت) کے سلسلے میں اسلام کی بنیادی ہدایات کیا ہیں؟ نیز عمر کے جس مرحلہ میں ماں کو یا باپ کو پرورش کا اولین حقدار تسلیم کیا گیا ہے؟ اگر بچہ کو اس کے حوالہ کرنے میں تعلیمی، تربیتی، جسمانی یا نفسیاتی پہلو سے بچہ کے لئے مضرت کا اندیشہ ہو تو حق پرورش کے سلسلہ میں کیا حکم ہوگا، اور وہ کیا صورتیں ہو سکتی ہیں، جب بچوں کے مفاد میں کسی مرد یا عورت کو حق پرورش سے محروم کیا جا سکتا ہے؟

حق پرورش:

اس کے جواب میں اکثر مقالہ نگاران کی رائے ہے کہ بچوں اور بچیوں کی ہلاکت سے سلامتی اور تکلیف دہ شئی سے حفاظت کی خاطر اور ضائع ہونے کے اندیشہ کی وجہ سے ان کی پرورش واجب ہے، اسلام نے بچوں کی پرورش کے تعلق سے ایک نہایت جامع اور مکمل نظام قانون بنایا ہے، تاکہ بچوں کی پیدائش سے قبل از بلوغ تک کے تمام مراحل کی بطور خاص نگہداشت ہو سکے اور ان کی جسمانی، ذہنی، فکری اور تعلیمی وتربیتی کفالت کا ایسا مناسب اور عمدہ بندوبست ہو کہ بچے ضائع نہ ہونے پائیں۔

دلائل:

۱۔ ''والوالدات يرضعن أولادهن حولين كاملين لمن أراد أن يتم الرضاعة، وعلى المولود له رزقهن وكسوتهن بالمعروف، لا تكلف نفس إلا وسعها، لا تضار والدة بولدها ولا مولود له بولده، وعلى الوارث مثل ذلك .... واتقوا الله واعلموا أن الله بما تعملون بصير'' (سورۂ بقرہ: ۲۳۳)

۲۔ ''فإن أرضعن لكم فآتوهن أجورهن، وائتمروا بينكم بمعروف وإن تعاسرتم فسترضع له أخرى'' (سورہ طلاق: ۶)

---

[1] شعبہ علمی، اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا)۔

(دیکھئے: مقالہ: مقالہ مولانا شاہجہاں ندوی، قاضی عبدالجلیل قاسمی، مفتی لطیف الرحمن بمبئی، مفتی عبداللہ کاوی، مولانا قمر امین، مفتی تنظیم عالم قاسمی، قاضی محمد کامل قاسمی، مولانا عبداللہ خالد لوناواڑہ، مولانا رحمت اللہ ندوی، مولانا حذیفہ لوناواڑی، مفتی شفیق صاحب)۔

اور چونکہ پرورش نام ہے مکمل طور پر نگہداشت کا، جس میں جسمانی، ذہنی، فکری اور تعلیمی ہر طرح کی تربیت شامل ہے، اس لئے اکثر مقالہ نگار نے مندرجہ ذیل آیات واحادیث پیش کی ہیں:

۱۔ ''یأیہا الذین آمنوا قوا أنفسکم وأھلیکم ناراً وقودہا الناس والحجارۃ''۔ (سورہ تحریم: ۶)

۲۔ ''وأنذر عشیرتك الأقربین''۔ (سورۂ شعراء: ۲۱۴)

۳۔ ''وأمر أھلك بالصلاۃ واصطبر علیہا'' (سورہ طہ: ۱۳۲)

(مفتی عبداللہ کاوی والا، مولانا قمر الدین بروڈوی، مولانا خورشید انور اعظمی وغیرہ)۔

۴۔ ''کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ۔۔۔''۔ (صحیح بخاری)

۵۔ ''عن ابن عباس عن النبی ﷺ أنہ قال: افتحوا علی صبیانکم أول کلمۃ بلا إلہ إلا اللہ''۔ (رواہ الحاکم، کنز العمال ۱۶۔۴۵۳۳۲)

۶۔ ''علموا أولادکم وأھلیکم الخیر وأدبوھم''۔ (رواہ عبد الرزاق وسعید بن منصور فی مصنفہ)

۷۔ ''عن ابن عمر أن امرأۃ قالت: یا رسول اللہ! إن ابنی ھذا کلہ بطنی لہ وعاء، وثدی لہ سقاء وحجری لہ حواء وإن أباہ طلقنی وأراد أن ینتزعہ منی، فقال لہا ﷺ: أنت أحق بہ ما لم تنکحی'' (سنن ابوداؤد ۲۸۳،۲)

(مقالہ: مولانا خورشید انور اعظمی، ڈاکٹر شاہجہاں ندوی، مفتی راشد حسین ندوی، مفتی لطیف الرحمن صاحب، مولانا عبداللہ خالد، مفتی غنام اللہ کاوی، مفتی عثمان بستوی وغیرہ)۔

۸۔ ''إن اللہ سائل کل راعٍ عما استرعاہ حفظ أم ضیع حتی یسئل الرجل عن اھل بیتہ''۔ (رواہ ابن حبان)

۹۔ ''اعملوا بطاعۃ اللہ واتقوا معاصی اللہ ومروا أولادکم بامتثال الأوامر واجتناب النواھی فذلك وقایۃ لہم ولکم من النار'' (ابن جریر وابن منذر)

(دیکھئے: مقالہ: مفتی عبداللہ کاوی والا، مولانا قمر الدین بروڈوی، مولانا خورشید انور اعظمی وغیرہ)۔

۱۰۔ ''لما کانت الحضانۃ تفتقر إلی وفور الصبر علی الأطفال فی کثرۃ البکاء والتضجر من الھیئات العارضۃ للصبیان ومزید الشفقۃ والرقۃ الباعثۃ علی الرفق بالصغار والرفق بہم وکانت النسوۃ أتم من الرجال فی ذلك کلہ قدمن علیہم''۔ (کتاب الفروق ۳۔۱۰۰۶)

۱۱۔ ''لا تضار والدۃ بولدھا'' (بقرہ: ۲۳۲) کی تفسیر میں علامہ جصاص رازی لکھتے ہیں:

''وفیہ دلالۃ علی أن الأم أحق بإمساك الولد ما دام صغیراً واستغنی عن الرضاع بعد ما یکون ممایحتاج إلی الحضانۃ، لأن الحاجۃ إلی الأم بعد الرضاع کہی قبلہ، فإذا کانت فی حال الرضاع أحق بہ، وإن کانت المرضعۃ غیرھا، علمنا فی کونہ عند الأم حقا لہا'' (احکام القرآن ۲۔۱۰۷) (مقالہ: مولانا خورشید انور اعظمی، ڈاکٹر شاہجہاں ندوی)۔

۱۲۔ ''الحضانۃ واجبۃ شرعاً؛ لأن المحضون قد یہلك أو یتضرر بترك الحفظ فیجب حفظہ عن الہلاك. فحکمہا الوجوب العینی إذا لم یوجد إلا الحاضن أو وجد ولکن لم یقبل الصبی غیرہ والوجوب الکفائی عند تعدد الحاضن'' (الموسوعۃ الفقہیہ ۱۷۔۳۰۰) (مقالہ: خورشید انور اعظمی وغیرہ)۔

اسلام میں بچے کی پرورش اور ان کی دیکھ بھال کو ایک حق کے طور پر مانا ہے (مفتی آصف پالنپوری، مفتی عارف کنجروی)۔

پرورش کے اولین حقدار:

• پرورش و پرداخت کی بنیاد شفقت ومحبت اور انس پر ہے، اس لئے بچوں کی پرورش کی اولین حقدار ان کی مائیں، اور محرم عورتیں ہیں، اس لئے کہ خواتین بچوں

کی تربیت و پرورش سے زیادہ واقف اوران کی ضرورتوں کو زیادہ سمجھنے والی ہوتی ہیں۔

۱۔ ''أن امرأة أتت النبی ﷺ فقالت یا رسول الله! إن ابنی ھذا کان بطنی له وعاء، وحجری له حواء. وثدی له سقاء وزعم أبوه أنه ینزعه منی؟ فقال: أنت أحق به ما لم تنکحی'' (سنن ابوداؤد، حدیث: ۲۲۷۶، مسند احمد، حدیث: ۶۷۰۷، سنن دارقطنی، حدیث: ۳۸۰۸) (مقالہ: ڈاکٹر شاہجہاں ندوی، مفتی راشد حسین ندوی، مفتی لطیف الرحمن، مولانا عبداللہ خالد، مفتی غلام اللہ کاوی، مفتی عثمان بستوی، مولانا خورشید انور اعظمی وغیرہ)۔

۲۔ ''عن یحییٰ بن سعید قال: سمعت القاسم بن محمد یقول: کانت عند عمر بن الخطاب امرأة من الأنصار، فولدت له عاصم بن عمر، ثم إن عمر فارقها، فجاء عمر قباء، فوجد ابن عاصماً یلعب بفناء المسجد، فأخذ یعضده بین یدیه علی الدابة. فأدرکته جدة الغلام، فنازعته إیاه، حتی أتیا أبابکر الصدیق، فقا ل عمر: ابنی. وقالت المرأة ابنی. فقال أبوبکر: خل بینها وبینه فما راجعه عمر الکلام'' (مؤطا، کتاب النکاح، حدیث: ۱۲۸۴) (مقالہ: مفتی راشد حسین ندوی، مفتی لطیف الرحمن صاحب وغیرہ)۔

۳۔ علامہ جصاص رازی رقمطراز ہیں:

''وفی ھذا دلالة علی أن الأم أحق بإمساك الولد ما دام صغیراً، وإن استغنی عن الرضاع بعد ما یکون ممن یحتاج إلی الحضانة، لأن حاجته إلی الأم بعد الرضاع کھی قبله، فإذا کانت فی حال الرضاع أحق به، وإن کانت المرضعة غیرھا، علمنا أن فی کونه عند الأم حقا لها، وفیه حق للولد أیضاً. وھو أن الأم أرفق به وأحنی علیه، وذلك فی الغلام عندنا إلی أن یأکل وحده ویشرب وحده، ویتوضأ وحده، وفی الجاریة حتی تحیض.....'' (احکام القرآن للجصاص ۱۔ ۴۹۰) (مقالہ: مفتی شاہجہاں ندوی، مولانا خورشید انور اعظمی وغیرہ)۔

۴۔ ''الأصل فیها النساء، لأنھن أشفق وأرفق وأھدی لتربیة الصغار'' (بدائع الصنائع ۵۔ ۲۲۵۴) (مقالہ: مولانا عبداللہ خالد، مفتی محمد الیاس قاسمی، مفتی عثمان بستوی وغیرہ)۔

۵۔ ''حق الحضانة جعل إلی النساء لأنھن أبصر وأقوم علی حفظ الصبیان من الرجال لزیادة شفقتھن وملازمتھن للبیوت''۔ (البحر الرائق ۴۔ ۲۸۰)

۶۔ ''أحق الناس لحضانة الصغیر حال قیام النکاح أو بعد الفرقة الأم'' (الفتاوی الہندیہ ۱/ ۱۶۵، نیز دیکھئے: البحر الرائق ۴/ ۲۸۲، ہدایہ ۲۔ ۴۳۴ وغیرہ) (مقالہ: مولانا عبداللہ خالد لوناواڑا وغیرہ، مولانا سید قمر الدین بروڈوی، مفتی فروغ احمد قاسمی، مولانا محمد منصف بدایونی وغیرہ)۔

ماں کی عدم موجودگی یا حضانت کی حقدار نہ ہونے کی وجہ سے حق حضانت حسب ذیل ترتیب کے ساتھ بچہ کے ان رشتہ داروں کو حاصل ہوگا:

نانی، دادی، حقیقی بہن، اخیافی بہن، علاتی بہن، حقیقی بھانجی، اخیافی بھانجی، حقیقی خالہ، اخیافی خالہ، علاتی خالہ، علاتی بھانجی، حقیقی بھتیجی، اخیافی بھتیجی، علاتی بھتیجی، حقیقی پھوپھی علاتی پھوپی۔

۷۔ ''ثم أی بعد الأم بأن ماتت أو لم تقبل أو أسقطت حقها أو تزوجت بأجنبی أم الأم وإن علت عند عدم أھلیة القربی ثم أم الأب وإن علت.....'' (رد المحتار ۵۔ ۲۶۲) (مقالہ: مولانا عبداللہ خالد لوناواڑہ)۔

ترتیب میں تھوڑی تبدیلی کے ساتھ مولانا عثمان بستوی، مولانا محمد منصف بدایونی، مفتی راشد حسین اور مولانا مبارک حسین ندوی نے بدائع الصنائع اور فتاوی ہندیہ، ہدایہ مع فتح القدیر کے حوالہ سے ذکر کیا ہے۔

پھر اگر ماں یا محرم خواتین نہ ہوں یا بچہ سات سال کا ہو جائے تو حق پرورش باپ دادا اور مرد رشتہ داروں کی طرف منتقل ہوگا۔ (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۱/ ۷۳۰)

۱۔ ''یعنی إن لم یکن للصغیر أحد من محارمه من النساء واختصم فیه الرجال فأولاھم به أقربھم تعصیباً'' (البحر الرائق ۴۔ ۲۸۶، ھدایہ مع فتح القدیر) (مقالہ: مولانا محمد منصف بدایونی، مولانا عثمان بستوی، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی وغیرہ)۔

۲۔ صاحب ہدایہ اس کی وجہ بیان کرتے ہیں: "ووجهه أنه إذا استغنى يحتاج إلى التأديب والخلق بآداب الرجال وأخلاقهم والأب أقدر على التأديب والتثقيف" (ہدایہ مع فتح القدیر ۴/ ۱۸۷) (مقالہ: مفتی راشد حسین ندوی)۔

۳۔ لڑکا اس وقت تک ماں کے پاس رہے گا جب تک کہ خود کھانے پینے اور استنجاء وضوء وغیرہ کرنے کے لائق ہو جائے، عام طور پر فقہاء نے اس کی عمر سات، آٹھ سال بتائی ہے، اور لڑکی بالغ ہونے تک ماں کے پاس رہے گی، پھر باپ کے پاس رہے گی۔

''لأن الغلام إذا بلغ إلى الحد الذي يحتاج فيه إلى التأديب ويعقله، ففي كونه عند الأم دون الأب ضرر عليه، والأب مع ذلك أقوم بتأديبه وهي الحالة التي قال فيها النبي ﷺ: ''مروهم بالصلاة لسبع واضربوهم عليها لعشر، وفرقوا بينهم في المضاجع'' (سنن ابی داؤد، حدیث: ۴۹۵) ''فمن كان سنه سبعاً، فهو مأمور بالصلاة على وجه التعليم والتأديب.....'' (احکام القرآن للجصاص ۱۔ ۴۹۰) (مقالہ: ڈاکٹر شاہجہاں ندوی، مفتی راشد حسین ندوی وغیرہ)۔

۴۔ ''والأم والجدة أحق بالغلام حتى يستغني وقدر بسبع سنين وقال القدوري حتى يأكل وحده ويشرب وحده ويستنجي وحده وقدره أبوبكر الرازي بتسع سنين والفتوى على الأول، والأم والجدة أحق بالجارية حتى تحيض، وفي (نوادر) هشام عن محمد: إذا بلغت حد الشهوة فالأب أحق، وهذا صحيح كذا في التبيين'' (فتاوی ہندیہ ۱۔ ۵۴۲) (مقالہ: مولانا سید قمر الدین محمود بروڈوی، مولانا خورشید انور اعظمی، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی وغیرہ)۔

مولانا رحمت اللہ ندوی اور مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی نے فقہ مالکی اور فقہ حنبلی میں حق حضانت کی ترتیب کو بھی اپنے مقالے میں بیان کیا ہے۔

مضرت کا اندیشہ ہو تو حق پرورش کے سلسلہ میں کیا حکم ہوگا؟

دوران پرورش ہر وہ چیز جس کی وجہ سے ضیاع ولد کا اندیشہ ہو، خواہ وہ اخلاقی، جسمانی، فکری اور عقلی ضیاع ہو اور بچہ کی مضرت کے وہ تمام پہلو جس کی فقہاء نے صراحت کی ہے اور مضرت کے وہ پہلو جو عرف وعادات ناس اور سماجی نقطۂ نظر سے مضرت کے دائرہ میں آتے ہوں وہ سب ''ضیاع ولد'' کے دائرہ میں ہیں اور اس کی بنیاد پر اس کا حق پرورش دوسرے کی طرف منتقل ہو جائے گا یا سرے سے بچہ اس کے حوالہ ہی نہیں کیا جائے گا۔ (مقالہ: مفتی محمد شاہد قاسمی، مفتی راشد حسین ندوی، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مفتی عثمان بستوی وغیرہ)۔

اسلامی شریعت میں حق حضانت کے لئے شرائط ذکر کی گئی ہیں، بعض مشترک ہیں، بعض حاضن عورتوں کے ساتھ خاص ہیں اور بعض حاضن مردوں کے ساتھ خاص ہیں:

مشترک شرائط:

بالغ ہونا، عاقل ہونا، پرورش پر قدرت رکھنا، حاضن کی اخلاقی کمزوریوں سے بچہ کو محفوظ رہنے کا اطمینان ہونا، شافعیہ وحنابلہ کے نزدیک حاضن کا مسلمان ہونا، حنفیہ اور مالکیہ کے نزدیک یہ شرط نہیں ہے۔

''يشترط في الحاضن من النساء والرجال ما يأتي، البلوغ، فلا حضانة للصغير ولو كان مميزاً، العقل؛ فلا حضانة للمجنون والمعتوه، القدرة على تربية المحضون: وهي الاستطاعة على صون الصغير في خلقه وصحته، فلا حضانة للعاجز لكبر سن أو مرض أو شغل، الأمانة على الأخلاق: فلا حضانة لغير الأمين..... ما لم يصبح الولد في سن يعقل فيها فجور أمه، فينتزع منها صونا لأخلاقه من الفساد، الإسلام: شرط عند الشافعية والحنابلة، فلا حضانة لكافر على مسلم، وقال الحنفية أنه يبقى عندها إلى أن يعقل الأديان أو يتضح أن في بقائه معها خطراً على دينه، بأن بدأت تعلمه أمور دينها أو تذهب به إلى معبدها أو تعوده على شرب.....'' (المعتصر من الفقه الاسلامي ۷۔ ۷۲۷، رد المحتار ۵۔ ۲۵۳، کتاب الفقه على المذاهب الاربعه ۴۔ ۵۶۲) (مقالہ: مفتی عثمان بستوی، مولانا خورشید انور اعظمی، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مفتی شاہد قاسمی، قاری ریاض ارمان قاسمی وغیرہ)۔

وہ شرائط جو عورتوں کے ساتھ خاص ہیں:

پرورش کرنے والی عورت بچے کے اجنبی سے نکاح نہ کرائے، پرورش کرنے والی عورت بچے کی ذی رحم محرم ہو، باپ کی تنگدستی کی صورت میں مفت پرورش کرنے سے انکار نہ کیا ہو، بچے کو لے کر کسی ایسے گھر میں قیام پذیر نہ ہو جس میں بچے سے نفرت و بغض رکھا جاتا ہو۔

''ویشترط فی المرأة أیضاً ما یأتی: ألا تکون متزوجة بأجنبی عن الصغیر أو بقریب غیر محرم منه، أن تکون ذات محرم من الصغیر، فلا حضانة لبنات العم والعمة وألا تکون قد امتنعت من حضانته مجاناً والأب معسر لا یستطیع رفع أجرة الحضانة، ألا تقیم الحاضن بالصغیر فی بیت یبغضه ویکرهه. ولو کان قریباً له'' (المعتصر من الفقه الاسلامی ۷۔۴۲۸، ۴۲۹) (مقالہ: مفتی عثمان بستوی وغیرہ)۔

وہ شرائط جو مردوں کے ساتھ خاص ہیں:

پرورش پانے والا بچہ اگر لڑکی ہے اور وہ حد شہوت کو پہنچ گئی ہے تو پرورش کرنے والے کا محرم ہونا ضروری ہے، حاضن مرد کے پاس ایسی عورت موجود ہو جو پرورش پانے والے بچہ کی پرورش کر سکے۔

''ویشترط فی الرجل الحاضن ما یأتی: أن یکون محرماً للمحضون إذا کان أنثی مشتهاة، أن یکون عند الحاضن من أب وغیره من یصلح للحضانة من النساء کزوجة أو أم أو خالة أو عمة'' (المعتصر من الفقه الاسلامی ۷۔۴۲۹، ۴۳۰) (مقالہ: مفتی عثمان بستوی وغیرہ)۔

اسباب حرمان:

وہ اسباب و وجوہ جن کی وجہ سے بچوں کے مفاد میں کسی مرد و عورت کو حق پرورش سے محروم کیا جا سکتا ہے، مقالہ نگاران کے الفاظ میں یہ ہیں:

۱۔ مرد و عورت مرتد ہو جائیں، مرد و عورت شراب نوشی میں منہمک رہتے ہوں، مرد و عورت بدکاری میں مشہور ہوں، ایسے بدکردار ہوں کہ بچہ کے ضائع ہونے کا غالب گمان ہو، یا ایسے بداخلاق اور بدطینت ہوں کہ ان کی بداعمالیوں اور فسق سے بچہ کے اخلاق و کردار بگڑنے کا اندیشہ ہو، چوری، ناچنے، گانے اور نوحہ خانی میں منہمک اور غرق رہتے ہوں۔

مرد و عورت مغربی فحاشی اور عریانیت کے دلدادہ ہوں، اور الحاد و بے دینی کی دعوت دیتے ہوں، نیز اعلانیہ احکام الٰہی کا مذاق اڑاتے ہوں، مرد و عورت بچے کے حق کی ادائیگی میں ایسی کوتاہی کرتے ہوں جس سے بچہ کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہو، مرد و خاتون نیم پاگل ہوں، مرد و عورت متعدی امراض میں مبتلا ہوں، جیسے برص، جذام اور ایڈز وغیرہ، خاتون کسی ایسے شخص سے نکاح کر لے جو بچہ کا محرم نہ ہو۔ (دیکھئے مقالہ: ڈاکٹر محمد شاہجہاں ندوی، مولانا سید قمر الدین محمود بروڈوی، مفتی راشد حسین ندوی، مولانا خورشید انور اعظمی، مفتی تنظیم عالم قاسمی، قاضی محمد کامل قاسمی، مفتی عثمان بستوی، مفتی لطیف الرحمن، مولانا محمد منصف بدایونی، مولانا رحمت اللہ ندوی، مفتی محمد الیاس، مولانا عبداللہ خالد، مفتی محمد شاہد قاسمی، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی وغیرہ)۔

۱۔ ''إلا أن تکون مرتدة......'' ۔ (رد المحتار ۲۔۶۸۸)

۲۔ ''ضرر فی بدن الحاضن کالجنون والجذام والبرص'' (القوانین الفقهیه: ۱۳۹)

۳۔ ''إذا کان بالأم برص أو جذام سقط حقها من الحضانة.....'' ۔ (الاقناع ۴۔۱۵۸)

۴۔ ''وقال غیر واحد: وهو واضح فی کل عیب متعد ضرره إلی غیره..... فالجذام ممنوعون من مخالطة الأصحاء، فمنعهم من حضانتهم أولی'' ۔ (کشاف القناع ۵۔۴۹۹)

۵۔ ''ولا حضانة لمن تخرج کل وقت وتترك البنت ضائعة'' ۔ (الهندیه ۱۔۵۴۲)

۶۔ ''أو فاجرة فجوراً یضیع الولد به کزنا وغناء وسرقة ونیاحة .....'' ۔ (شامی ۲۔۶۸۸)

۷۔ ''.....إلا أن تکون مرتدة أو فاجرة غیر مأمونة..... وکذا لو کانت سارقة أو مغنیة أو نائحة فلا حق لها'' ۔

(الهندیہ ا-۵۴۱)

۸- ''والحاصل أن الحاضنة إن كانت فاسقة فسقاً يلزم منه ضياع الولد عندها سقط حقها وإلا فهي أحق به إلى أن يعقل فينزع منها كالكتابية''۔(رد المحتار ۳-۵۵۶)

۹- ''أو متزوجة بغير محرم الصغير''۔(شامی ۲-۶۸۹)

۱۰- ''لو كان في المحارم من الأخوة والأعمام من لا يؤمن على صبي وصبية بفسقه، ليس له حق في الإمساك''۔
(هدايه مع فتح القدير ۴-۱۸۷)

بچوں کے حق تعلیم وتربیت:

سوال: (ب:۱) اسلام میں بچوں کے حق تعلیم وتربیت کے بارے میں کیا بنیادی ہدایات ہیں؟

بچوں کو اس قدر بنیادی دینی تعلیم دینا ضروری اور واجب ہے جس سے وہ بلوغ کے بعد اپنے اوپر عائد ہونے والے دینی فرائض کو سمجھ سکیں اور جہنم کی آگ سے بچ سکیں اور وہ ایمان، اسلام، آخرت، عبادات، حلال وحرام، حقوق، اخلاق حسنہ اور عادات حسنہ وغیرہ کی تعلیم ہے (مقالہ: مولانا شاہجہاں ندوی، مولانا غلام اللہ کاوی، قاضی عبدالجلیل قاسمی، مفتی شاہد قاسمی، مولانا عبداللہ کاوی، مفتی عثمان بستوی، حافظ کلیم اللہ عمری، مفتی تنظیم عالم قاسمی، مولانا خورشید انور اعظمی، مفتی محمد الیاس قاسمی، مولانا نعیم اختر قاسمی، مفتی محمد شفیق، مولانا عبداللہ خالد، مفتی عارف کنجروی، مولانا حذیفہ محمود، مولانا عمران ندوی، مولانا مبارک حسین ندوی، قاضی محمد کامل قاسمی، مولانا احسن عبدالحق ندوی، قاضی ریاض ارمان قاسمی، مفتی اخلاق قاسمی، مولانا عبدالتواب اناوی وغیرہ)۔

دلائل:

۱- ''يأيها الذين آمنوا قوا أنفسكم وأهليكم ناراً وقودها الناس والحجارة'' (التحريم: ۶) (تمام مقالہ نگار)۔

۲- ''أدبوا أولادكم وأحسنوا أدبهم''۔ (سنن ابن ماجه، حديث: ۳۶۷۱)

۳- ''علموا أولادكم وأهليكم الخير وأدبهم'' (مصنف عبد الرزاق) (مفتی تنظیم عالم قاسمی)۔

۴- ''أدبوا أولادكم على ثلاث خصال: حب نبيكم وحب آل بيته وتلاوة القرآن فإن حملة القرآن في ظل عرش الله يوم لا ظل إلا ظله'' (رواه الطبراني) (مفتی محمد شاہد قاسمی، مفتی تنظیم عالم قاسمی وغیرہ)۔

۵- ''لأن يؤدب الرجل ولده خير من أن يتصدق بصاع'' (سنن ترمذی) (مفتی محمد شاہد قاسمی، مولانا خورشید انور اعظمی، مولانا حذیفہ لوناواڑا)۔

۶- ''ما نحل والد ولداً أفضل من أدب حسن'' (سنن ترمذی، باب ما جاء في أدب الولد) (مولانا محبوب فروغ احمد، مولانا غلام اللہ کاوی، مفتی محمد شاہد قاسمی، مولانا خورشید انور اعظمی، مفتی محمد آصف، مفتی عارف کنجروی، مولانا حذیفہ لوناواڑا، مولانا محمد عمران ندوی، مولانا عبداللہ لوناواڑا، مفتی شفیق قاسمی)۔

۷- ''مروا أولادكم بالصلاة وهم أبناء سبع سنين واضربوهم عليها وهم أبناء عشر سنين وفرقوا بينهم في المضاجع'' (سنن ابوداؤد-۴۹۵) (مقالہ: مفتی راشد حسین ندوی، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، قاضی محمد کامل قاسمی، مولانا محمد منصف بدایونی، مولانا نعیم اختر قاسمی، مولانا عمران ندوی اور مولانا حذیفہ لوناواڑا)۔

۸- ''كلكم راع وكلكم مسئول عن رعيته، والرجل راع في أهله ومسئول عن رعيته.....'' (صحیح بخاری-۸۹۳، صحیح مسلم: ۴۷۲۴) (مفتی راشد حسین ندوی)۔

۹- ''افتحوا على صبيانكم أول كلمة لا إله إلا الله'' (کنز العمال ۱۶/۴۴۱) (مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، قاضی محمد کامل، مولانا عمران ندوی وغیرہ)۔

۱۰- مفسرین اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں: ''يأيها الذين آمنوا قوا أنفسكم بأداء الواجبات وترك المعاصي وأهليكم

بالتعليم والتأديب ولأمر بالمعروف والنهى عن المنكر ناراً''۔ (التفسیر المظہری ۹ر۳۴۴)

۱۱۔ ''وقوله: أهليكم ناراً، يقول: وعلموا أهليكم من العمل بطاعة الله ما يقومون به أنفسهم من النار، وبنحو الذى قلنا فى ذلك، قال أهل التأويل: من قال ذلك..... عن على بن أبى طالب فى قول ''قوا أنفسكم ..... قال: علموهم، أدبوهم.....'' (تفسیر الطبری ۲۸ر۱۸۵،۱۸۶) (مقالہ: مفتی محمد شاہد قاسمی، قاضی ریاض ارمان قاسمی، مفتی شاہجہاں ندوی، مولانا راشد حسین ندوی، مولانا محبوب فروغ احمد، مفتی عثمان بستوی، مولانا غلام اللہ کاوی، مولانا عمران ندوی، مولانا حذیفہ محمود وغیرہ)۔

۱۲۔ ''وعلى الآباء والأمهات تعليم أولادهن ما سيتعين عليهم بعد البلوغ، فيعلمه الولى الطهارة والصلاة والصوم ونحوها ويعرفه تحريم الزنا واللواط والسرقة وشرب المسكر والكذب والغيبة وشبهها ويعرفه أن بالبلوغ يدخل فى التكليف ويعرفه ما يبلغ به، وقيل: هذا العلم مستحب والصحيح وجوبه وهو ظاهر نص الشافعى'' (المجموع ۵۰) (مقالہ: مولانا خورشید انور اعظمی وغیرہ)۔

۱۳۔ ''يجب على الولى تأديب الصغار بالآداب الشرعية التى تغرس فى نفس الطفل الأخلاق الكريمة والسلوك القويم''۔ (الموسوعة الفقهيه ۲۷۔۲۳) (مقالہ: مفتی تنظیم عالم قاسمی)

۱۴۔ ''أهليكم بالنصح والتأديب'' (انوار التنزيل واسرار التاويل ۵۔۲۲۵) (مولانا شاہجہاں ندوی، مفتی راشد حسین ندوی وغیرہ)۔

۱۵۔ ''.....استدل بها على أنه يجب على الرجل تعلم ما يجب من الفرائض وتعليمه لهؤلاء.....'' (روح المعانی ۱۔۱۵۶/۲۸) (مقالہ: مفتی محمد شاہد قاسمی، مولانا شاہجہاں ندوی، مفتی راشد حسین ندوی، مولانا خورشید انور اعظمی وغیرہ)۔

مفتی لطیف الرحمن صاحب اور بعض دوسرے مقالہ نگار مثلاً مولانا منصف بدایونی، مفتی صادق پٹیل، مفتی الیاس قاسمی اور مولانا عبداللہ خالد صاحب نے بچوں کی تربیت کے سلسلہ میں تفصیل سے آداب ذکر کئے ہیں، مفتی لطیف الرحمن صاحب نے ۱۷ر آداب شمار کرائے ہیں۔

اسی طرح قاضی محمد کامل قاسمی نے بچوں کے حق تعلیم وتربیت پر تفصیلی بحث کی ہے، مثلاً تحنیک، بچہ کا نام، اس کا عقیقہ، حلق، ختنہ، دودھ پلانے اور چھڑانے کے احکام، پرورش کا طریقہ، ابتدائی تعلیم وغیرہ۔

مولانا رحمت اللہ ندوی صاحب لکھتے ہیں کہ اسلام بچہ کی مکمل تربیت کا تصور پیش کرتا ہے، جس میں دینی، اخلاقی جسمانی، عقلی وذہنی، معاشرتی، حسی، جذباتی وجبلی، نفسیاتی اور جنسی تمام تربیت شامل ہوں۔ (تربیت اولاد فی الاسلام)

بچوں کے لئے دینی وعصری تعلیم کی حد ومقدار:

سوال: (ب: ۲) بچوں اور بچیوں کو کس قدر دینی تعلیم دینا ضروری ہے اور عصری تعلیم کس حد تک دینا ضروری ہے؟

بچے اور بچیوں کو دینی تعلیم اس قدر دلانا ضروری اور واجب ہے جس سے وہ اپنے اوپر عائد ہونے والے فرائض وواجبات کو بحسن وخوبی انجام دے سکیں، تمام مقالہ نگار نے اس کے ذیل میں بطور دلائل وہی آیات واحادیث اور فقہی عبارات ذکر کی ہیں جو جواب نمبر ''ب۔۱'' کے تحت ذکر کی گئیں۔

اور عصری ودنیوی تعلیم اس قدر دینا ضروری ہے کہ وہ باعزت طریقہ پر اپنی معاشی ضرورتوں کو پورا کرسکے اور حلال طریقہ پر کمانے کھانے پر قادر ہوسکے۔ (دیکھئے: مقالہ: مولانا شاہجہاں ندوی، مفتی راشد حسین ندوی، قاضی عبدالجلیل قاسمی، مولانا خورشید انور اعظمی، مفتی محمد شاہد قاسمی، مفتی عثمان بستوی، مفتی لطیف الرحمن، قاضی محمد کامل قاسمی، مولانا رحمت اللہ ندوی، مولانا محمد منصف بدایونی، مولانا نعیم اختر قاسمی، مفتی الیاس قاسمی، مفتی آصف قاسمی، حافظ کلیم اللہ عمری، مولانا مبارک حسین ندوی، مفتی شفیق قاسمی، مولانا عمران ندوی، مفتی صادق پٹیل، مولانا عبداللہ خالد، مفتی اخلاق حسین قاسمی، قاضی ریاض ارمان قاسمی، مولانا عبدالتواب اناوی وغیرہ)۔

دلائل:

۱۔ ''عن خارجة بن زيد بن ثابت عن أبيه زيد بن ثابت قال: ''أمرنى رسول اللهﷺ أن أتعلم له كلمات من كتاب

یہود، قال: إني والله ما آمن يهود على كتابي قال: فما مرّ بي نصف شهر حتى تعلمته له قال: فلما تعلمته كان إذا كتب إلى يهود كتبت إليهم وإذا كتبوا إليه قرأت له كتابهم'' (سنن ترمذی، حدیث نمبر: ۲۷۱۰) عہد نبوی میں اس کی مثالیں ملتی ہیں کہ دینی تعلیم کے ساتھ عصری تعلیم دلائی جائے (مقالہ: مفتی الیاس قاسمی، مولانا احسن عبدالحق ندوی وغیرہ)۔

۲۔ ''طلب كسب الحلال فريضة بعد الفريضة'' (مشکوۃ) (مقالہ: قاضی محمد کامل قاسمی)۔

۳۔ ''أمرني رسول الله ﷺ أن أتعلم سريانية'' (سنن ترمذی، حدیث: ۲۷۱۰) (مقالہ: مفتی الیاس قاسمی، مولانا احسن عبدالحق ندوی وغیرہ)۔

۴۔ ''طلب الحلال واجب على كل مسلم'' (مسند الفردوس للدیلمی، حدیث: ۳۹۱۴) (مقالہ: مولانا شاہجہاں ندوی)۔

۵۔ ''طلب الكسب فريضة على كل مسلم، كما أن طلب العلم فريضة'' (الكسب: ۳۲)۔ پتہ چلا کہ حلال کمائی کرنا فرض ہے، لہذا حلال کمائی کے لئے درکار علم حاصل کرنا بھی فرض ہوگا، لہذا اولاد کو اس حد تک علم دلانا بھی فرض ہوگا۔ (مقالہ: ڈاکٹر مولانا شاہجہاں ندوی)

۶۔ ''طلب العلم فريضة بقدر الشرائع وما يحتاج ...... ولأمور معاشه وما وراء ذلك ليس بفرض، فإن تعلمها فهو أفضل، وإن تركها، فلا إثم عليه''۔ (فتاوی ہندیہ: ۵۔ ۳۷۷) (مقالہ: ڈاکٹر محمد شاہجہاں ندوی، مفتی راشد حسین ندوی)

۷۔ ''وينبغي أن يعلمه أيضا من أمور الدنيا وما يحتاج إليه من السباحة والرمي وغير ذلك مما ينفعه في كل زمان بحسبه، قال عمر رضی اللہ عنہ: علموا أولادكم السباحة والرماية ومروهم فليثبوا على الخيل وثبا'' (الموسوعة الفقهيه ۱۲۔ ۱۲) (مقالہ: مولانا خورشید انور اعظمی، مفتی عثمان بستوی وغیرہ)۔

۸۔ ''وحجتنا في ذلك قوله تعالى: ''وأنفقوا من طيبات ما كسبتم'' والأمر حقيقة للوجوب، ولا يتصور الإنفاق من المكسوب إلا بعد الكسب، ولا يتوصل إلى إقامة الفرض إلا به يكون فرضاً....... ''۔ (المبسوط للسرخسی ۳۰۔ ۲۵۰)

۹۔ ''ولو استأجر لتعليم ولده الكتابة أو النجوم أو الطب أو التعبير جاز بالاتفاق''۔ (فتاوی ہندیہ) (مولانا شاہجہاں ندوی وغیرہ)

۱۰۔ ''ويسلمه في صناعة، لأنه من باب تثقيفه واستجلاب المنافع له'' (الجوہرۃ النیرۃ ۱۔ ۲۵۵) (مقالہ: مولانا شاہجہاں ندوی)۔

۱۱۔ ''وله دفعها للامرأة تعلمها حرفة لتطريز وخياطة مثلاً'' (رد المحتار ۳۔ ۶۱۲) (مقالہ: مولانا شاہجہاں ندوی، مفتی اخلاق قاسمی، قاضی ریاض قاسمی)۔

۱۲۔ ''قال الشافعي وأصحابه رحمهم الله: على الآباء والأمهات تعليم أولادهم الصغار ما يتعين عليه بعد البلوغ.......''۔ (المجموع شرح المهذب ۱۔ ۶۴)

۱۳۔ ضروری اور انسانی سماج کو کام آنے والے مفید علم کو حاصل کرنا ''فرض کفایہ'' ہے، جیسا کہ علامہ شامی نے لکھا ہے: ''أما فرض الكفاية من العلم فهو كل علم لا يستغني عنه في قوام أمور الدنيا كالطب والحساب'' (رد المحتار: ۱۲۶) (مقالہ: مفتی محمد شاہد قاسمی، حافظ کلیم اللہ عمری، مفتی الیاس قاسمی، مولانا عبداللہ خالد اوناواڑہ وغیرہ)۔

۱۴۔ بچے اور بچیوں کو دینی تعلیم مکمل طور پر دینا ضروری ہے: ''طلب العلم فريضة على كل مسلم ومسلمة'' کی رو سے اور عصری و دنیوی بقدر ضرورت سیکھنا ضروری ہے، ضرورت سے زائد سیکھنا بہتر ہے، اور تا کہ دنیا کے ہر شعبہ میں کچھ تعلیم یافتہ مسلمان ہونا چاہئے (مقالہ: مولانا عبداللہ کاوی، مولانا اخلاق قاسمی، قاضی ریاض قاسمی وغیرہ)۔

۱۵۔ علوم عصریہ دوسرے درجہ کا علم ہیں، جو وسیلہ اور ذریعہ کی حیثیت رکھتے ہیں:

"أما فرض الكفاية من العلم فهو كل علم لا يستغني عنه في قوام أمور الدنيا كالطب والحساب" (ردالمحتار ۱/۱۲۶) (مفتی شاہد قاسمی)۔

۱۶۔ فقہاء کرام نے فرض کفایہ علوم کی تعریف کی ہے کہ ان سے وہ علوم مراد ہیں جن کی دنیوی امور کی درستگی میں لازمی طور پر ضرورت پیش آتی ہو اور اس میں طب اور حساب کے علاوہ تمام صنعت وحرفت کو شامل کیا ہے۔ (ردالمحتار ۱/۱۲۶) (مولانا خورشید انور اعظمی، مفتی شاہد قاسمی)

۱۷۔ بنیادی دینی علوم حاصل کرنے اور ایمان وعقائد کی پختگی کے بعد موجودہ حالات میں دور حاضر کے تقاضوں کی تکمیل کے لئے اعلی وعصری علوم کے حصول کے لئے ہر ممکن کوشش کرنی چاہئے اور معاشی تنگ ودور میں لگنا چاہئے۔ (مقالہ: مفتی محبوب فروغ احمد قاسمی، مفتی خورشید احمد اعظمی، مولانا قمر الدین بروڈوی، مفتی تنظیم عالم قاسمی، مفتی لطیف الرحمن، مفتی حبیب بن یوسف صاحب وغیرہ)

مولانا سید قمر الدین بروڈوی، مفتی لطیف الرحمن اور مفتی حبیب بن یوسف، مولانا منصف بدایونی وغیرہ لکھتے ہیں کہ بچیوں کو یونیورسٹی یا کالج میں داخل کر کے اعلی تعلیم اور عصری تعلیم دلانا یا ڈگریاں حاصل کرنا جائز نہیں ہے، اس لئے کہ:

۱۔ انگریزی تعلیم اور یونیورسٹی کے ماحول سے اسلامی عقائد واخلاق اور عادات بگڑ جاتے ہیں، آزادی، بے شرمی اور بے حیائی بڑھ جاتی ہے۔

۲۔ شریعت کا قانون ہے: "درء المفاسد أولى من جلب المنافع فإذا تعارضت مفسدة ومصلحة قدم دفع المفسدة غالباً؛ لأن اعتبار الشرع المنهيات أشد من اعتنائه بالمأمورات"۔ (الاشباہ والنظائر ر ۱۱۴)

۳۔ "أن عائشة زوج النبي ﷺ قالت: "لو أدرك رسول الله ﷺ ما حدث النساء لمنعهن المسجد" (سنن ابوداؤد، باب ما جاء في خروج النساء إلى المساجد)۔

۴۔ بچیوں پر مذہبی لحاظ سے معاشی ذمہ داریاں نہیں ڈالی گئی ہیں۔

مولانا غلام اللہ کاوی، قاضی محمد کامل قاسمی، مولانا عمران ندوی، مفتی عارف کنجروی، مفتی آصف اور مفتی صادق پٹیل صاحبان بچے اور بچیوں کی حد تعلیم کا ذکر کئے بغیر لکھتے ہیں:

"عصری تعلیم کو حسب ضرورت واستطاعت حاصل کیا جائے، لیکن یہ ضروری ہے کہ کالج واسکول کا ماحول ایسا ہو کہ جہاں بچوں کے عقائد واخلاق کی درستگی پر بھی توجہ دی جاتی ہو اور حسب عمر میں شریعت میں بستر الگ کرنے کی ہدایت ہے اس عمر سے ان کی تعلیم گاہیں بھی الگ ہوں۔

مفتی محمد الیاس قاسمی لکھتے ہیں: بچیوں کے لئے بھی عصری تعلیم ضروری ہے، بشرطیکہ وہ درج ذیل شرعی حدود کے اندر ہو:

۱۔ یہ تعلیم بہ پردہ ہو، غیر محرم مردوں کے ساتھ خلوت وتنہائی اختیار کرنے سے اجتناب کیا جائے۔

۲۔ یہ علم شرعاً ناجائز نہ ہو، مثلاً رقص وموسیقی۔

۳۔ یہ تعلیم عورتوں کی فطری صلاحیت کے دائرہ کار کے مغائر نہ ہو، مثلاً: عورتوں کو ٹریفک پولیس کی تعلیم۔

۴۔ اپنے سرپرستوں یا شوہر کی اجازت سے تعلیم حاصل کی جائے۔

- "ويمنعها من زيارة الأجانب وعيادتهم والوليمة وإن أذن كانا عاصيين"۔ (الدر المختار ورد المحتار ۵۔ ۲۲۴، ۲۲۵)

مفتی الیاس قاسمی نے بچیوں کے لئے عصری ودنیوی تعلیم کے حصول پر مندرجہ ذیل دلائل پیش کئے ہیں:

۱۔ عن الربيع بنت معوذ قالت: "كنا مع النبي ﷺ نسقي الماء ونداوي الجرحى ونرد القتلى" (كتاب الجهاد، باب مداواة النساء: ۶/۷)۔

۲۔ "........ وينبغي للطبيب أن يعلم امرأة إن أمكن، وإن لم يكن ستر كل عضو منها سوى موضع الوجع ...." (البحر الرائق: ۸/۳۵۳، ۵۳۹)

مفتی تنظیم عالم قاسمی لکھتے ہیں کہ تعلیم وتربیت کے وجوب میں لڑکا اور لڑکی کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔

مولانا محمد عمران ندوی لکھتے ہیں: تعلیم کو عصری ودینی عنوان سے تقسیم کرنے کے نتائج آج بالکل واضح ہوکر ہمارے سامنے آچکے ہیں، ایک طرف عصری درسگاہوں کے طلبہ اپنے نبی کا نام بھی نہیں جانتے تو دوسری طرف دینی درسگاہوں کے فارغین کی اکثریت کو ریاضی سے اتنی واقفیت نہیں ہوتی ہے کہ میراث کے مسائل کو حل کرسکیں۔

مسلمانوں پر لازمی تعلیم کی پابندی:

سوال: (ب: ۳) اگر حکومت کسی سطح تک کی تعلیم کو بچوں اور بچیوں کے لئے لازم قرار دے تو کیا شرعاً اس کی پابندی مسلمانوں کے لئے لازم ہے؟

اگر حکومت کسی سطح تک کی صرف عصری تعلیم کو بچوں اور بچیوں کے لئے لازم قرار دے تو شرعاً اس کی پابندی مسلمانوں پر لازم نہیں ہے (مقالہ: ڈاکٹر شاہجہاں ندوی، مفتی محمد شاہد قاسمی، قاضی محمد کامل قاسمی، مولانا احسن عبدالحق ندوی وغیرہ)۔

البتہ اگر حکومت اس طرح کا قانون بنائے کہ فلاں کلاس تک عصری یا اس کے مساوی مذہبی تعلیم دلانا ہر گارجین پر لازم ہے تو شرعاً اس کی پابندی مسلمانوں پر لازم ہوگی (ڈاکٹر محمد شاہجہاں ندوی، مفتی عثمان بستوی، مفتی اخلاق قاسمی، قاضی ریاض ارمان قاسمی وغیرہ)۔

اگر حکومت کی طرف سے لازم تعلیم کا حکم شرعی اصول اور کتاب وسنت کے قطعی نصوص سے متصادم نہ ہو تو اس کی پابندی کی جائے گی، اس لئے کہ مباح امور میں امام اور حاکم وقت کی اطاعت واجب ہے)۔

۱۔ ”فی شرح الجواهر: تجب إطاعته فيما أباحه الدين وهو ما يعود نفعه إلى العامة كعمارة دار الإسلام والمسلمين وما تناوله الكتاب والسنة والإجماع“ (رد المحتار ۱-۶۷) (مقالہ: مولانا خورشید انور اعظمی وغیرہ)۔

۲۔ ”لأن طاعة الإمام فيما ليس بمعصية واجبة“ (رد المحتار ۱-۵۳، احکام القرآن، بدائع الصنائع، البحر الرائق) (مقالہ: مولانا خورشید انور اعظمی، مفتی شاہجہاں ندوی، مفتی عثمان بستوی وغیرہ)۔

۳۔ اس لئے کہ یہ خیر خواہی کے باب سے ہے۔ (مولانا شاہجہاں ندوی، مفتی تنظیم عالم قاسمی، حافظ کلیم اللہ عمری وغیرہ)

مولانا نعیم اختر قاسمی لکھتے ہیں: بنیادی دینی علوم کے بعد اگر حکومت مجبور کرتی ہے تو اس کی گنجائش ہے۔

مولانا سید قمر الدین بروڈوی، مفتی غلام اللہ کاوی، مولانا حذیفہ لوناواڑا اور مفتی صادق پٹیل صاحبان لکھتے ہیں کہ اگر پرائمری سطح تک کی تعلیم کو لازم قرار دیتی ہے تو اس کو اختیار کرنے کی اجازت ہے، اس صورت میں دینی مکتب میں بھی بچہ پڑھ سکتا ہے، جیسا کہ یورپ اور امریکہ میں یہ نظام رائج ہے اور کامیاب ہے۔

مولانا تنظیم عالم قاسمی اور حافظ کلیم اللہ عمری کی رائے ہے کہ حکومت کی طرف سے لازمی تعلیم کا قانون قابل عمل ہے، اس کی پابندی مسلمانوں پر لازم ہوگی، اس لئے تعلیم فی نفسہ بہتر چیز ہے، خواہ وہ عصری تعلیم ہی کیوں نہ ہو، حکومت کو اس بات کا اختیار ہے کہ وہ مصالح عامہ، عدل وانصاف اور ضرر وضرار سے بچانے کے لئے جو قوانین وضع کرے شرعاً مسلمانوں پر ان کی پابندی لازم ہوگی، بشرطیکہ وہ قوانین خلاف شریعت نہ ہوں، البتہ حکومت سے مطالبہ کیا جائے کہ لڑکے اور لڑکیوں کے لئے الگ الگ تعلیم گاہوں کا نظم کرے۔

مفتی محمد الیاس قاسمی لکھتے ہیں: شرعاً اس کی پابندی مسلمانوں پر درج ذیل شرطوں کے ساتھ لازم ہے:

۱۔ لازمی تعلیم مفت ہو۔

۲۔ غیر مستطیع طلبہ کو لوازمات تعلیم خود حکومت مہیا کرے۔

۳۔ قریب البلوغ وبالغ بچیوں کے لئے علاحدہ تعلیمی ادارے مہیا کئے جائیں۔

۴۔ مواد تعلیم اسلام کے خلاف نہ ہو یا اخلاقی بے راہ روی کا باعث نہ بنے۔

۵۔ اس تعلیم کی وجہ سے طلبہ وطالبات میں دین سے دوری اور دیگر مفاسد پیدا نہ ہوں۔

تعلیمی نصاب مسلمان بچوں کے لئے ایمانی واسلامی اعتبار سے ضرر رساں ہو تو اس کو چھوڑنا ضروری ہوگا۔

اگر ایسا نہ ہو تو اس کی پابندی میں کوئی حرج نہیں ہے، بلکہ اس کی پابندی سے مسلمانوں کو فائدہ ہوگا۔ (مقالہ: مفتی عبداللہ کاوی، قاضی عبدالجلیل قاسمی، مفتی تنظیم عالم قاسمی، مفتی لطیف الرحمن، مفتی عثمان بستوی، مولانا رحمت اللہ ندوی، مولانا محمد منصف بدایونی، مولانا نعیم اختر قاسمی، مفتی عارف کنجروی، مولانا عبداللہ خالد، مفتی اخلاق قاسمی، قاضی ریاض ارمان قاسمی، مولانا عبدالتواب اناوی وغیرہ)

مفتی آصف، مولانا محمد عمران ندوی اور مفتی حبیب بن یوسف کی نظر میں یہ تجویز مذہب اسلام کے سراسر خلاف ہے، لہذا ایسے قانون کی پابندی کرنا شرعاً لازم نہیں ہے۔

مفتی محمد شاہد قاسمی لکھتے ہیں: اس قانون کے ماننے کو نتیجہ میں دینی مدارس کی کاردگی متاثر ہوگی۔

مولانا مبارک حسین ندوی لکھتے ہیں: اگر کوئی حکومت کسی نظریہ کے تحت ایک خاص سطح کی تعلیم کی بچوں اور بچیوں کے لئے لازم قرار دیتی ہے تو دستور ہند میں ہر ایک شہری کو جو آزادی دی گئی ہے اس کی رو سے اس پر پابندی ہر ایک کے لئے ضروری اور لازمی نہیں ہونا چاہئے۔

مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی فرماتے ہیں کہ اگر حکومت غیر اسلامیہ میں لازمی اور جبری تعلیم کا قانون رائج ہو تو اس کی خلاف ورزی باعث تذلیل اور موجب سزا ہو سکتی ہے، اس لئے بھی اس کی پابندی لازمی ہے (دیکھئے: موصوف کا مقالہ)۔

بچوں کے لئے جنسی تعلیم:

سوال: (ب: ۴) کیا جنس کی تعلیم بھی بچوں کا حق ہے جیسا کہ آج کل کہا جارہا ہے، اس سلسلہ میں اسلام کی ہدایات کیا ہیں؟

موجودہ دور میں جنسی تعلیم کی جس پیمانہ پر زور دیا جارہا ہے اور جو طریقہ اپنایا جارہا ہے وہ اسلامی نقطہ نظر سے حرام ہے اور ہر پہلو سے منکر ہے (مقالہ: ڈاکٹر شاہجہاں ندوی، مولانا سید قمر الدین محمود، مفتی عبداللہ کاوی، مفتی غلام اللہ کاوی، قاضی عبدالجلیل قاسمی، مفتی لطیف الرحمن، مولانا خورشید انور اعظمی، مولانا منصف بدایونی، مفتی عارف کنجروی، مولانا مبارک حسین ندوی، مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی وغیرہ)۔

دلائل:

اللہ تعالی نے جائز فطری جنسی تقاضوں کے احکام کے بیان میں تک کے لئے کنائی الفاظ اختیار کئے ہیں، تاکہ شرم وحیا متاثر نہ ہو، چنانچہ میاں بیوی کے جائز تعلق کے لئے "ملامسہ"، "مباشرۃ"، "قضاء الوطر" جیسے الفاظ استعمال ہوئے ہیں، قرآن کریم میں ہے:

الف۔ "أولا مستم النساء" (النساء: ۴۳)۔

ب۔ "ولا تباشروهن وأنتم عاكفون فى المساجد" (البقرہ: ۱۸۷)۔

ج۔ "فلما قضى زيد منها وطراً زوجناكم لكى لا يكون على المؤمنين حرج فى أزواج أدعيائكم إذا قضوا منهن وطراً وكان أمر الله مفعولاً" (الاحزاب: ۳۷) (مقالہ: مولانا شاہجہاں ندوی وغیرہ)۔

۲۔ اسلام فسق وفجور، فحش وفحاشی، بے شرمی کی باتوں اور برائیوں کے اظہار کو پسند نہیں کرتا ہے، "لا يحب الله الجهر من القول إلا من ظلم" (النساء: ۱۴۸) (مقالہ: مولانا شاہجہاں ندوی، مولانا محمد عمران ندوی وغیرہ)۔

۳۔ "إن الذين يحبون أن تشيع الفاحشة فى الذين آمنوا لهم عذاب أليم فى الدنيا والآخرة" (النور: ۱۹)۔

۴۔ مقدس شریعت کی بنیادی تعلیم ہے: "ينهى عن الفحشاء والمنكر" (النحل) (مولانا حذیفہ داحودی)۔

۵۔ "لأن الأصل: أن سبب الحرام حرام" (ہدایہ)۔

۶۔ "لا تقربوا الزنا" سے اسباب زنا بھی مراد ہے۔ (مفتی عبداللہ کاوی، مفتی مفتی شاہد قاسمی، مولانا محمد عمران ندوی)۔

۷۔ جنسی تعلیم فحاشی کی دعوت دیتی ہے، جنسی بے راہ روی کا ذریعہ اور بے شرمی کے عمیق غار میں لے جانے کا سبب ہے۔ (مولانا شاہجہاں ندوی، مولانا عبداللہ کاوی، مفتی راشد حسین ندوی، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مفتی الیاس قاسمی، قاضی ریاض ارمان قاسمی، مفتی اخلاق قاسمی، مولانا عبدالتواب اناوی وغیرہ)

۸۔ سد الذریعہ اسے درست قرار نہیں دیا جائے گا۔ (مولانا خورشید انور اعظمی)

۹۔ وہ شہوت بھڑکانے کا ذریعہ ہے۔ (مولانا شاہجہاں ندوی، مولانا قمر الدین بروڈوی، مفتی لطیف الرحمن، مفتی الیاس قاسمی، مفتی عارف کنجروی، قاضی ریاض ارمان قاسمی وغیرہ)

۱۰۔ ''ما أدى إلى الحرام فهو حرام'' (بدائع الصنائع) (مفتی الیاس قاسمی)

۱۱۔ بلوغ کے وقت سے پہلے بلوغ کے بعد ہونے والی تبدیلیوں اور ان تبدیلیوں کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی ضرورتوں کا ادراک عام طور پر انسان کی بے راہ روی کا سبب بنتا ہے۔ (مولانا شاہجہاں ندوی، مفتی محمد شاہد قاسمی، مفتی تنظیم عالم قاسمی، مفتی لطیف الرحمن، مفتی عثمان بستوی، مولانا حذیفہ لوناواڑا، مفتی شفیق قاسمی وغیرہ)

مفتی حبیب بن یوسف، مفتی شفیق قاسمی، مولانا مبارک حسین ندوی، مولانا احسن عبدالحق اور مولانا عبدالتواب اناوی کی رائے ہے کہ جنسی تعلیم کی شرعاً گنجائش نہیں ہے۔

مولانا مبارک حسین ندوی لکھتے ہیں: جنسی تعلیم کو مسترد کرنا ہر مسلمان کا فریضہ ہے۔

مفتی حبیب بن یوسف صاحب لکھتے ہیں: شرعاً اس کی پابندی کرنا لازم نہیں ہوگا، البتہ دفع مضرت اور بہت سے مواقع پر حکومت کی طرف سے عائد کردہ قوانین کے تحت اپنے نجی حقوق کی حصولیابی...... دلائی جاسکتی ہے۔

مولانا شاہجہاں ندوی اور مولانا محمد عمران ندوی لکھتے ہیں: البتہ اسلام مردوں اور عورتوں کے درمیان غیر شرعی تعلق کی قباحت کو اجاگر کرتا ہے اور عفت و پاکدامنی کی تعلیم دیتا ہے۔

اسی طرح مفتی محمد شاہد قاسمی، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مولانا شاہجہاں ندوی، مفتی لطیف الرحمن اور قاضی ریاض قاسمی لکھتے ہیں: اسلام بچوں اور بچیوں کو برائی اور بدکاری سے بچانے کے لئے اخلاقی تعلیم و تربیت کی طرف توجہ دلاتا ہے۔

اسلام نگاہ نیچی رکھنے کی ہدایت دیتا ہے، اور جذبات وخیالات ابھارنے والی چیزوں سے دور کرنے کا حکم دیتا ہے: "قل للمؤمنين يغضوا من أبصارهم ويحفظوا فروجهم ذلك أزكى لهم. إن الله خبير بما يصنعون وقل للمؤمنات يغضضن من أبصارهن ويحفظن فروجهن ولا يبدين زينتهن إلا ما ظهر" (النور: ۳۰، ۳۱) (مولانا شاہجہاں ندوی، مفتی الیاس قاسمی وغیرہ)۔

وہ ایک فطری چیز ہے اس کو سکھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ (مولانا عبداللہ کاوی، مولانا شاہجہاں ندوی، مولانا منصف قاسمی، مفتی غلام اللہ کادی، مفتی عارف، مولانا عمران ندوی، مولانا حذیفہ لوناواڑا، مفتی شفیق قاسمی، قاضی ریاض قاسمی وغیرہ)

البتہ جنسی تعلیم کی بعض صورتیں ایسی ہیں جن کا تعلق بنیادی دینی تعلیم سے اور جس کا حاصل کرنا ضروری ہے، مثلاً احتلام سے غسل واجب ہونا، حیض وغیرہ کے ایام، طہارت وجنابت کے مسائل وغیرہ۔ (مفتی محمد راشد حسین ندوی، مولانا سید قمر الدین بروڈوی، مفتی تنظیم عالم قاسمی، مفتی آصف صاحب، حافظ کلیم اللہ عمری، مفتی صادق پٹیل وغیرہ)

اس بارے میں دو باتوں کا لحاظ رکھا جائے:

۱۔ عمر کے ہر حصہ سے متعلق احکام کی تعلیم اسی کی مناسبت سے دی جائے۔

۲۔ لڑکیوں کو یہ تعلیم ماں، دادی یا معلمات دیں۔ (مقالہ: مولانا سید قمر الدین بروڈوی، مفتی راشد حسین ندوی، مفتی تنظیم عالم قاسمی، مفتی عثمان بستوی، قاضی عبدالجلیل قاسمی، مولانا رحمت اللہ ندوی، مولانا منصف قاسمی، حافظ کلیم اللہ عمری، مفتی آصف صاحبان وغیرہ)

بچوں اور بچیوں کے نکاح:

ج: نکاح کے بارے میں بچے اور بچیوں کے کیا حقوق ہیں؟ اس سلسلہ میں ہمارے سماج میں افراط وتفریط پائی جاتی ہے، ایک طرف بعض برادریوں میں بہت کم عمری میں نکاح کردیئے جاتے ہیں، جو بعد کو پیش آنے والے حالات میں بچوں کے لئے یہ غیر موزوں ہوتے ہیں، کبھی بالغ ہونے کے بعد بھی لڑکوں اور لڑکیوں کی شادی میں غیر معمولی تاخیر کی جاتی ہے، جس سے اخلاقی بگاڑ پیدا ہونا فطری بات ہے، اس سلسلہ میں اسلامی تعلیمات اور شرعی ہدایات کیا ہیں؟

اکثر مقالہ نگار کی رائے ہے کہ جب بچہ یا بچی بالغ ہوجائے اور مناسب رشتہ مل جائے تو اس میں تاخیر نہیں کرنی چاہئے، یہی نکاح کے بارے میں اسلام کا مزاج ہے۔ (مولانا خورشید انور اعظمی، مفتی عبداللہ کاوی، مفتی راشد حسین ندوی، قاضی عبدالجلیل قاسمی، مولانا قمر الدین بروڈوی، مولانا شاہجہاں ندوی، مولانا محبوب فروغ قاسمی، مفتی تنظیم عالم، مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی وغیرہ)

دلائل:

۱۔ ''......إذا بلغوا النكاح'' (النساء:٦) (مفتی شاہد قاسمی، مولانا شاہجہاں ندوی، مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی وغیرہ)

۲۔ ''فإنه إذا بلغوا الحلم'' (جامع البیان ۷۔۵۷۵) (مولانا شاہجہاں ندوی، مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی وغیرہ)۔

۳۔ ''يا معشر الشباب من استطاع منكم الباءة فليتزوج فإنه أغض للبصر وأحصن للفرج'' (صحیح بخاری حدیث: ۵۰۶۵، ۵۰۶۶، صحیح مسلم، حدیث: ۱۴۰۰) (مفتی تنظیم عالم قاسمی، مولانا شاہجہاں ندوی، مفتی الیاس قاسمی، مولانا عبداللہ کاوی والا، مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی وغیرہ)۔

۴۔ بلوغ کے بعد والدین کو یہ محسوس ہو کہ نکاح نہ کرانے پر گناہ میں مبتلا ہونے کا قوی اندیشہ ہے تو جلد نکاح کرانا ضروری ہوگا، ورنہ خود گناہ گار ہوگا، جیسا کہ حدیث میں ہے: ''من ولد لهولد فليحسن اسمه... فإذا بلغ فيلزوجه، فإنه بلغ ولم يزوجه فأصاب إثماً فإنما إثمه على أبيه'' (مشکوۃ) (مولانا خورشید انور اعظمی، قاضی عبدالجلیل قاسمی، مفتی شاہد قاسمی، سید قمر الدین بروڈوی، مفتی عبداللہ کاوی، مفتی عثمان بستوی، مولانا منصف قاسمی، قاضی کامل قاسمی، مولانا شاہجہاں ندوی، مولانا عمران وغیرہ)

۵۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''يا علي ثلاث لا تؤخرها: الصلاة إذا أتت والجنازة إذا حضرت والأيم إذا وجدت لها كفواً'' (مشکوۃ) (مولانا خورشید انور اعظمی، قاضی عبدالجلیل قاسمی، مفتی راشد حسین ندوی، مفتی عثمان بستوی، قاضی محمد کامل قاسمی، مولانا نعیم اختر، مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی وغیرہ)۔

۶۔ ''فانكحوا ما طاب لكم من النساء......'' (النساء: ۳)، اس آیت میں لفظ ''نساء'' ''امرأۃ'' کی جمع ہے اور اس کا اطلاق بالغہ خاتون پر ہوتا ہے، جیسے ''رجل'' کا اطلاق بالغ مرد پر ہوتا ہے، اس کی تائید ایک حدیث سے بھی ہوتی ہے، حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا:

''تزوجت امرأة من الأنصار'' (صحیح بخاری، حدیث: ۲۰۴۹، صحیح مسلم، حدیث: ۱۴۲۷) (مقالہ: مولانا شاہجہاں ندوی وغیرہ)۔

۷۔ ''عن حاتم بن إسماعيل قال: سمعت عبد الله بن هرمز قال: قال رسول الله ﷺ: ''إذا جاءكم من ترضون دينه وخلقه فانكحوه، إلا تفعلوا تكن فتنة في الأرض وفساد عريض''۔ (احکام القرآن ۱۔۴۸۵) (مقالہ: مفتی عثمان بستوی، قاضی محمد کامل قاسمی، مفتی صادق پٹیل، مولانا عبداللہ لوناواڑا وغیرہ)۔

۸۔ ''ويكون واجباً عند التوقان، فإن تيقن الزنا إلا به فرض، هذا إن ملك المهر والنفقة، وإلا فلا إثم بتركه، قوله عند التوقان: والمراد شدة الاشتياق أي بحيث يخاف الوقوع في الزنا لم يتزوج.......'' (شامی ۴۔ ۶۳، ۶۵، نہر الفائق) (مقالہ: مفتی عبداللہ کاوی والا، مفتی عثمان بستوی، مفتی محمد شاہد قاسمی وغیرہ)۔

۹۔ تاخیر سے فساد عریض کا اندیشہ ہے، جس کا سد باب ہر مسلمان کا فریضہ ہے۔ (مقالہ: مفتی تنظیم عالم قاسمی، حافظ کلیم اللہ عمری، مولانا عبداللہ خالد لوناواڑا وغیرہ)

۱۰۔ ''ولا يجوز نكاح اليتيمة حتى تبلغ'' (سنن ترمذی ۱/۲۱۱)۔

۱۱۔ ''الحكمة تحكم بإيثار البكر بعد أن تكون عاقلة بالغة'' (حجۃ اللہ البالغہ ۱/۱۲۴) (مفتی الیاس قاسمی)۔

۱۲۔ بلوغ کے ساتھ نکاح کردینے سے بچے کے جذبات پاک رہتے ہیں اوران کی توجہ فعل حرام کی طرف نہیں جاتی ہے، جس سے عفت، طہارت اور معاشرہ کی پاکیزگی قائم ہوسکتی ہے۔ (مفتی تنظیم عالم قاسمی، مفتی عثمان بستوی وغیرہ)

تاہم اکثر مقالہ نگار کی رائے ہے کہ اگر مصلحت وضرورت کے پیش نظر والدین اپنے بچوں اور بچیوں کا نکاح نابالغی میں کردے تو وہ شرعاً درست ہے۔ (مولانا خورشید انور اعظمی، قاضی عبدالجلیل قاسمی، مفتی راشد حسین ندوی، مفتی شاہد قاسمی، مولانا محبوب فروغ قاسمی، مفتی تنظیم عالم قاسمی، مفتی عثمان بستوی، قاضی محمد کامل قاسمی، مولانا شاہجہاں ندوی، مولانا رحمت اللہ ندوی، حافظ کلیم اللہ عمری وغیرہ)۔

دلائل:

۱۔ ''أن النبي ﷺ تزوجها وهي بنت سبع سنين وزفت إليه وهي بنت تسع سنين'' (رواہ مسلم، مشکوۃ ۲/۲۷۰) (مولانا خورشید اعظمی، مفتی راشد حسین ندوی، مولانا شاہجہاں ندوی، مولانا محبوب فروغ قاسمی، مفتی تنظیم عالم قاسمی، قاضی کامل قاسمی، مولانا رحمت اللہ ندوی، مفتی صادق پٹیل، حافظ کلیم اللہ عمری وغیرہ)۔

۲۔ ''أجمع المسلمون على جواز تزويج الأب بنته البكر الصغيرة'' (مرقاۃ المفاتیح ۶/۲۰۶) (مولانا خورشید اعظمی، مفتی تنظیم عالم قاسمی، قاضی محمد کامل قاسمی، مولانا حذیفہ داحودی وغیرہ)۔

۳۔ ''فزوجه رسول الله ﷺ بنت حمزة وهما صبيان صغيران فلم يجتمعا حتى ماتا ......'' (احکام القرآن للجصاص ۲۔۶۲) (مفتی عثمان بستوی، مولانا عبداللہ خالد لوناواڑا)۔

۴۔ ''ففي الحديث دليل على جواز نكاح الصغير والصغيرة بتزويج الآباء'' (المبسوط للسرخسی) (مولانا خورشید انور اعظمی وغیرہ)۔

۵۔ ''ويجوز تزويج الصغير والصغيرة إذا زوجهما الولي لقوله تعالى: ''واللائي لم يحضن'' فأثبت العدة للصغيرة وهي فرع تصور نكاحها شرعاً'' (مرقاۃ المفاتیح ۲۔۲۰۶) (مولانا خورشید انور اعظمی، مفتی راشد حسین ندوی، مفتی محمد شاہد قاسمی، مولانا شاہجہاں ندوی، مفتی تنظیم عالم قاسمی، مفتی صادق پٹیل، حافظ کلیم اللہ عمری، مفتی الیاس قاسمی، مولانا حذیفہ داحودی، مولانا عبداللہ خالد وغیرہ)۔

۶۔ ''حضرت قدامہ بن مظعون کا نکاح حضرت زبیرؓ کی بیٹی سے ان کی پیدائش کے دن کرایا تھا'' (مرقاۃ المفاتیح) (مفتی تنظیم عالم قاسمی وغیرہ)۔

بعض مقالہ نگار کی رائے ہے کہ اگرچہ کم سنی میں نکاح جائز ودرست ہے، لیکن شریعت نے اس کی ترغیب نہیں دی ہے اور نہ پسندیدہ ہے، بلکہ بعض اعتبار سے نقصان دہ ہے (دیکھئے مقالہ: ڈاکٹر شاہجہاں ندوی، مفتی لطیف الرحمن، مولانا خورشید اعظمی، مفتی راشد حسین ندوی، مفتی آصف، مفتی عثمان بستوی وغیرہ)۔

دلائل:

۱۔ ''اعلم أن الشافعي وأصحابه قالوا يستحب أن لا يزوج الأب والجد حتى تبلغ'' (شرح النووی) (مولانا خورشید اعظمی، مفتی راشد حسین ندوی)۔

۲۔ ''ويستحب أن لا يزوج الأب والجد البكر حتى تبلغ ويستأذنها لئلا يوقعها في أسر الزوج وهي كارهة'' (شرح مسلم للنووی ۱۔۴۵۶)۔

۳۔ ''ولا تتزوج إلا بعد أن تعلم أنك تقدر على القيام بجميع حوائجها.......'' (الاشباہ والنظائر) (مولانا نعیم اختر قاسمی)۔

بہتر صورت یہ ہے کہ رخصتی کو بلوغ تک مؤخر کیا جائے۔

''وفي وقت الدخول بالصغيرة، فقيل: لا يدخل بها ما لم تبلغ، وقيل يدخل إذا بلغت تسع سنين ......'' (فتاوی ہندیہ ۱۔۲۸۷) (مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مولانا خورشید انور اعظمی وغیرہ)۔

حافظ کلیم اللہ عمری کی رائے ہے کہ نکاح کے تعلق سے بچوں اور بچیوں کی رضامندی آج کے دور میں جاننا ضروری ہے، ان کی مرضی کے بغیر نکاح کرنا یا انہیں

مجبور کرنا صحیح نہیں ہے، انہوں نے حضرت خنساء کے واقعہ سے استدلال کیا ہے۔

مولانا محمد عمران ندوی کی رائے ہے کہ بچوں کو اس بات کا پابند کیا جائے کہ وہ اولیاء کے ذریعہ اپنا نکاح کرائیں، انہوں نے "أیما امرأة نکحت بغیر إذن ولیہا فنکاحہا باطل......" سے استدلال کیا ہے۔

بعض مقالہ نگار حضرات نے اپنے مقالات میں اس کا بھی ذکر کیا ہے کہ اگر زنا یا معصیت میں مبتلا ہونے کا یقین ہو تو نکاح فرض ہے، نکاح کا شدید اشتیاق ہو، زنا میں پڑنے کا اندیشہ ہو تو ہو واجب ہے، اعتدال ہو اور نکاح سے پاکدامنی اور اولاد کے حصول کا ارادہ ہو تو نکاح سنت ہے۔ (الدر المختار ورد المحتار ۲ / ۲۸۳ وغیرہ) (مقالہ: مفتی عثمان بستوی، مولانا محمد منصف قاسمی، مفتی غلام اللہ کاوی، مولانا شاہجہاں ندوی، مولانا عمران ندوی، قاضی ریاض قاسمی، مولانا احسن عبدالحق ندوی وغیرہ)۔

مفتی عثمان بستوی کی رائے ہے کہ اگر کوئی معصیت وغیرہ کا خطرہ نہ ہو تو اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے نکاح کو موخر کرنا جائز ہے۔

مفتی لطیف الرحمن صاحب نے حضرت تھانوی اور مفتی محمد تقی عثمانی کی تحریروں کی روشنی میں نابالغی کے نکاح کی صورت میں ہونے والے نقصانات کو واضح کیا ہے۔

بچہ مزدوری:

سوال (د): بہت سے ملکوں میں بچہ مزدوری قابل سزا جرم قرار دی گئی ہے، خود ہمارے ملک میں بھی اس طرح کا قانون موجود ہے، بلکہ عالمی ادارہ "اقوام متحدہ" نے اس کو ایک جرم شمار کیا ہے، اس قانون کا مقصد یہ ہے کہ کم عمری میں بچے کو مزدوری اور کام پر لگانے سے بچہ تعلیم حاصل نہیں کر پاتا اور اس کی جسمانی اور دماغی نشوونما صحیح طور پر نہیں ہو پاتی، بسا اوقات بچے اور بچیوں سے اتنے پر مشقت کام لیے جاتے ہیں، جو ان کے تحمل سے باہر ہوتے ہیں، اس کے نتیجے میں بچے موذی اور مہلک بیماریوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں، اسی پس منظر میں درج ذیل سوالات پیش خدمت ہیں:

اکثر مقالہ نگاران کی رائے ہے کہ اسلام میں بچوں اور بچیوں کی تعلیم و تربیت اور صحت وتندرستی کا جس قدر خیال رکھا گیا ہے اور جو جامع نظام دیا ہے اس کی رو سے بچوں کو تعلیم و تربیت کے مرحلہ میں مزدوری پر لگانا جائز نہیں ہے، بلکہ بعض اعتبار سے حرام اور ظلم ہے۔ (مولانا خورشید انور اعظمی، مولانا شاہجہاں ندوی، مفتی عبداللہ کاوی، مفتی لطیف الرحمن، مفتی عثمان بستوی، مفتی منصف قاسمی، حافظ کلیم اللہ عمری وغیرہ)۔

دلائل:

۱۔ "یاأیہا الذین آمنوا قوا أنفسکم وأہلیکم ناراً ...." (التحریم: ۶)۔

"واستدل بہا علی أنہ یجب علی الرجل تعلم ما یجب من الفرائض وتعلیمہ لہؤلاء"۔ (روح المعانی ۱۵-۲۳۲)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بلاوجہ بچوں کو مزدوری پر لگانا انتہائی نامناسب بات ہے۔ (مفتی شاہد قاسمی)

۲۔ "ودلیل وجوب نفقۃ الولد ما دام صغیراً لم یبلغ علی أبیہ، قولہ تعالی: "وعلی المولود لہ رزقہن وکسوتہن بالمعروف ...." (البقرۃ: ۲۳۴) (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۷ / ۷۲۴) (مفتی غلام اللہ کاوی، مفتی شاہجہاں ندوی، مولانا عبدالشکور لوناواڑا وغیرہ)۔

۳۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "لا تکلفوا الصغیر الکسب فإنہ إذا لم یجد سرق" (موطا مالک، باب الامر بالرفق بالمملوک) (مفتی محمد شاہد، مفتی لطیف الرحمن، مفتی الیاس قاسمی، مولانا حذیفہ، مولانا عبداللہ خالد لوناواڑا وغیرہ)۔

۴۔ ".......الرجل راع علی أہل بیتہ ومسئول عنہ رعیتہ والمرأۃ راعیۃ علی أہل بیت زوجہا وولدہ وہی مسئولۃ عنہم" (صحیح بخاری، حدیث: ۷۱۳۸، صحیح مسلم، حدیث: ۱۸۲۹) (مولانا شاہجہاں ندوی، مولانا منصف قاسمی وغیرہ)۔

۵۔ اس لئے کہ بچوں کا نفقہ والد پر ہے: "نفقہ الأولاد الصغار علی الأب لا یشارکہ فیہا أحد" (فتاوی ہندیہ ۱ / ۵۶۵) (مولانا خورشید انور اعظمی، مولانا شاہجہاں ندوی، مفتی لطیف الرحمن، مفتی غلام اللہ کاوی والا، مولانا رحمت اللہ ندوی، مولانا نعیم اختر قاسمی، مولانا حذیفہ داحودی، مولانا عبداللہ خالد لوناوارڑا وغیرہ)۔

۶۔ "فعلیہ نفقتہم إلی أن یبلغ الذکر حد الکسب وإن لم یبلغ الحلم" (فتح القدیر ۴ / ۲۱۶) (مولانا تنظیم عالم قاسمی، مولانا نعیم اختر قاسمی، مولانا عبداللہ لوناواڑا وغیرہ)۔

۷۔ ''رجل معسر له ولد صغير إن كان الرجل يقدر على الكسب يجب عليه أن يكتسب وينفق عليه، فإن أبي أن يكتسب وينفق عليهم يجبر على ذلك ويحبس، وإن كان لا يقدر على الكسب يفرض القاضي عليه النفقة......'' (فتاوی ہندیہ ۱/۵۶۵) (مولانا خورشید انور اعظمی، مولانا رحمت اللہ ندوی وغیرہ)۔

مولانا شاہجہاں ندوی لکھتے ہیں: بچپن کا مرحلہ انتہائی اہم ہے، کیونکہ فرد کی تشکیل کا آغاز اسی مرحلہ میں ہوتا ہے، والدین کی ذمہ داری ہے کہ بچوں کی ایسی تربیت سے آراستہ کریں کہ وہ مستقبل میں سماج کا بہتر فرد، نیک با صلاحیت ممبر بن سکیں۔

مزدوری سے بچہ کی صحت متاثر ہوتی ہے، اس کی جسمانی اور دماغی نشوونما صحیح طور پر نہیں ہو پاتی ہے، پر مشقت کام سے اس کی قوت سماعت وبصارت پر اثر پڑتا ہے تعلیم سے محرومی کی صورت لکھنے پڑھنے کی خوابیدہ صلاحیت کم ہونے لگتی ہے، اپنے خاندان سے دور رہنے کی وجہ سے اس کے اندر سنگدلی، تلخی پیدا ہو جاتی ہے، سماج سے کٹنے کی وجہ سے صحیح وغلط میں تمیز کرنے کی صلاحیت سے محروم ہو جاتا ہے۔

بچوں سے گھریلو کام لینا:

سوال: (د:۱) بچہ مزدوری کے بارے میں اسلام کا موقف کیا ہے؟

اس سوال کے جواب میں تقریباً تمام مقالہ نگار کی رائے ہے کہ والدین نابالغ بچوں اور بچیوں سے اپنے گھر کا ہر وہ کام جو از قبیل خدمت ہیں، لے سکتے ہیں، اس لئے کہ بچوں پر والدین کی خدمت واجب ہے اور شرعی حق ہے، خدمت سے انکار نافرمانی وحرام ہے۔ البتہ کسی درجہ میں بچوں کی تعلیم وتربیت متاثر نہ ہو۔

دلائل:

۱۔ ''أما خدمة الولد لوالده أو استخدام الأب لولده فجائز بلا خلاف، بل إن ذلك في البر المأمور به شرعاً، ويكون واجباً على الولد خدمة أو إخدام والده عند الحاجة'' (الموسوعة الفقهية) (دیکھئے مقالہ: مولانا خورشید انور اعظمی، مفتی راشد حسین ندوی، مولانا سید قمر الدین محمود بروڈوی، مولانا شاہجہاں ندوی، مفتی شاہد قاسمی، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مفتی لطیف الرحمن، مفتی عثمان بستوی، مولانا رحمت اللہ ندوی، مولانا منصف بدایونی، مفتی غلام اللہ کاوی، حافظ کلیم اللہ عمری، مولانا عمران ندوی، مفتی صادق پٹیل، مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی وغیرہ)۔

۲۔ ''وحرموا بأن الأب إذا كان مريضاً أو به زمانة يحتاج إلى الخدمة فعلى ابنه خادمه فكذا الابن'' (رد المحتار ۳/ ۶۱۲) (مولانا خورشید انور اعظمی، مفتی اخلاق قاسمی، قاضی ریاض قاسمی)۔

۳۔ ''من سوى الأم والجدة أحق بالجارية حتى تبلغ حدا تشتهى وفي الجامع الصغير: حتى تستغني لأنها لا تقدر على استخدامها، ولهذا لا تواجرها للخدمة فلا يحصل المقصود بخلاف الأم والجدة لقدرتها عليه شرعاً'' (ہدایہ ۲-۴۳۵) (مولانا محمد عمران ندوی وغیرہ)۔

معیشت کی بہتری کے لئے بچوں کو مزدوری پر لگانا:

سوال: (د:۲) والدین یا اولیاء، نابالغ بچے اور بچیوں سے اپنے گھر کا کام کس حد تک لے سکتے ہیں؟ اور کیا اپنی معاشی ضروریات پورا کرنے یا بہتر بنانے کے لئے ان سے مزدوری کرا سکتے ہیں؟ اسی طرح نہیں کوئی پیشہ ورانہ کام سکھانے کے لئے کام سے لگا سکتے ہیں یا نہیں؟

اکثر مقالہ نگار کی رائے ہے کہ اپنی معاشی ضرورتوں کو پورا کرنے یا اپنی معیشت کو بہتر بنانے کے لئے اپنے نابالغ بچوں اور بچیوں کو مزدوری پر نہیں لگایا جا سکتا ہے، ہاں اگر والدین محتاج ہوں اور نفقہ کا کوئی نظم نہ ہو تو اس کی گنجائش ہے، لیکن دو باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے:

۱۔ اس صورت میں بھی اس کی تعلیم وتربیت متاثر نہ ہو۔

۲۔ وہ کام ایسی صنعت وحرفت سے متعلق ہو جو مستقبل میں بچوں کو کام آسکے۔

دلائل:

۱۔ ''والذکور من الأولاد إذا بلغوا حد الکسب ولم یبلغوا فی أنفسهم بدفعهم إلى عمل لیکتسبوا أو یواجرهم وینفق علیهم من أجرتهم وکسبهم'' (فتاوی ہندیہ ۱/۵۶۵، رد المحتار ۳/۶۱۳) (مقالہ: مولانا خورشید اعظمی، قاضی عبد الجلیل قاسمی، مفتی عبد اللہ کاوی، مفتی راشد حسین ندوی، قاضی محمد کامل قاسمی وغیرہ)۔

۲۔ ''فللأب أن یواجر ابنه الصغیر فی عمل من الأعمال؛ لأن ولایته على الصغیر کولایته على نفسه، لأن شفقته علیه کشفقته على نفسه وله أن یواجر نفسه فکذا ابنه، لأن فیه نظراً للصغیر من وجهین: ....والثانی أن إیجاره فی الصنائع من باب التهذیب والتأدیب والریاضة وفیه نظر للصبی فیملکه الأب'' (بدائع الصنائع ۴/۱۷۸) (مولانا خورشید اعظمی، مفتی راشد ندوی، مفتی شاہد قاسمی، مفتی عبد اللہ کاوی، مفتی تنظیم عالم قاسمی، مولانا منصف بدایونی، مولانا شاہجہاں ندوی، مفتی عارف کجروی، مفتی آصف، مفتی الیاس قاسمی، مولانا عمران ندوی، مفتی صادق پٹیل وغیرہ)۔

۳۔ ''وله دفعها للمرأة تعلمها حرفة لتطریز وخیاطة مثلاً'' (رد المحتار ۳/۶۱۲) (مولانا خورشید اعظمی، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مولانا شاہجہاں ندوی، مولانا عبد اللہ خالد، مفتی الیاس قاسمی، مولانا عبد التواب اناوی)۔

۴۔ ''فإن بلغ کان للأب أن یواجره أو یدفعه فی حرفة لیکتسب وینفق علیه من کسبه لو کان ذکراً بخلاف الأنثى.......''۔ (الدر مع رد المحتار ۳/۶۲۸) (مولانا محبوب فروغ قاسمی، مفتی عثمان بستوی، مفتی الیاس وغیرہ)۔

حافظ کلیم اللہ عمری کی رائے ہے کہ بلوغت سے قبل بچوں کو کسی پیشہ ورانہ کام سکھانے کے لئے لگانا جائز نہیں ہے۔

مولانا شاہجہاں ندوی لکھتے ہیں کہ جو کام عرف میں تربیت کا حصہ ہو، اسے کرانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

قاضی عبد الجلیل قاسمی، مفتی لطیف الرحمن، مفتی تنظیم عالم قاسمی، اور مولانا رحمت اللہ ندوی کی رائے ہے کہ اگر بچے کند ذہن ہوں اور اعلیٰ تعلیم کی صلاحیت ان میں نہ ہو یا خواہش کے باوجود مالی وسائل مہیا نہ ہو تو ابتدائی تعلیم کے بعد ان کو کوئی ہنر سکھا دینا بہتر ہے۔

مفتی راشد حسین ندوی، قاضی عبد الجلیل قاسمی، مولانا محبوب فروغ قاسمی اور مفتی الیاس قاسمی کہتے ہیں کہ یہ تفصیلات لڑکوں کے لئے ہے، لڑکیوں کو کام پر لگانا درست نہیں ہے، صرف ماں دادی وغیرہ تادیب کے لئے ان سے کام لے سکتی ہیں۔

مولانا عبد اللہ کاوی کی رائے ہے کہ اگر اس سلسلہ میں مزدوری کرانا بھی ضروری سمجھتے ہوں تو وہ بھی درست ہے۔

غربت کو دور کرنے کے لئے مزدوری کرانا:

سوال: (د:۳) بعض والدین اپنی انتہائی غربت اور معاشی بدحالی کی بنا پر بچوں کو مزدوری پر لگاتے ہیں، نہ وہ خود کمانے کے لائق ہوتے ہیں، نہ حکومت ان کا تکفل کرتی ہے، ایسے والدین کا نابالغ بچوں کو مزدوری پر لگانا درست ہے یا نہیں، اس بابت اسلام کی کیا ہدایات ہیں؟

اس سلسلہ میں تقریباً تمام مقالہ نگار کی رائے ہے کہ اگر والدین انتہائی غربت وافلاس کے سبب جبکہ کوئی دوسرا حل نہ ہو اپنے چھوٹے بچوں کو مزدوری پر لگا سکتے ہیں۔

۱۔ ''الأب والجد أبو الأب أو وصیها إذا آجر الصغیر فی عمل من الأعمال التی یقدر علیها الصغیر جاز'' (فتاوی ہندیہ ۴/۴۳۶) (مولانا خورشید اعظمی، قاضی عبد الجلیل قاسمی، مولانا شاہجہاں ندوی، مفتی شاہد قاسمی، مولانا محبوب فروغ قاسمی، مفتی تنظیم عالم قاسمی، مولانا منصف قاسمی، مفتی لطیف الرحمن، حافظ کلیم اللہ عمری، مولانا حذیفہ محمود، مولانا عمران ندوی، مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی وغیرہم)۔

۲۔ ''صغیر بلغ حد الکسب ولم یبلغ مبلغ الرجال کان للأب أن یسلمه فی عمل أو یواجره لعمل أو خدمة وینفق علیه من ذلك وإن کان الولد بنتا لا یملك دفعها إلى غیر محرم للخدمة؛ لأن الخلوة مع الأجنبی حرام'' (فتاوی قاضی خان علی ہامش الہندیہ ۱/۴۴۷) (قاضی عبد الجلیل قاسمی وغیرہ)۔

۳۔ ''فإن کان للصغیر أم بانت عن زوجها واحتاجت إلى النفقة کان لها أن تأکل من کسب ولدها صغیراً

كان الولد أو كبيراً'' (فتاوی قاضی خان علی ہامش الہندیہ ۱/ ۴۴۷) (قاضی عبدالجلیل قاسمی، مولانا محبوب فروغ قاسمی)۔

۴۔ ''وتجب على موسر ولو صغير....... وفي الخلاصة: المختار أن الكسوب يدخل أبويه في نفقته، النفقة لأصوله الفقراء الخ (ولو صغيراً)؛ لأنه كالكبير فيما يجب في ماله من حق عبد فيطالب به وليه. كما يطالب بنفقة زوجته'' (فتاوی شامی ۲/ ۵۷۳) (مفتی راشد حسین ندوی وغیرہ)۔

بعض مقالہ نگار کی رائے ہے کہ اسلام میں فقیر وغریب والدین کے نفقہ وکفالت کا ایک نظام ہے، وہ یہ کہ اس صورت میں ان کا نفقہ قریب وبعید کے رشتہ داروں پر ہے، اگر وہ نہ ہوں تو ان کا نفقہ بیت المال پر ہے، مگر کسی ملک میں بیت المال کا نظام نہ ہو تو عامۃ الناس پر ان کا نفقہ ہے، یعنی حتی الامکان بچوں کو مزدوری پر لگانے سے پرہیز کریں اور صبر سے کام لیں۔

''والرابع أن يكونوا فقراء وهم صغار أو كبار عاجزون والأب أيضاً عاجز عن الكسب فالخصاف قال: يكفف الناس وينفق عليهم'' (فتح القدیر ۴/ ۳۷۱) (مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی)۔

نابالغ بچوں کی سزا:

سوال: (۵) شرعاً بالغ ہونے سے پہلے اگر لڑکوں یا لڑکیوں سے جرائم سرزد ہوں مثلاً: قتل، غارت گری، چوری، زنا بالرضا یا زنا بالجبر، تو ان پر سزا جاری کی جائے گی یا نابالغ ہونے کی بنا پر انہیں چھوڑ دیا جائے گا، واضح ہو کہ دور حاضر میں نابالغوں میں پھیلتے ہوئے جرائم کے رجحان سے حکومتیں پریشان ہیں، ان پر قابو پانے اور ان کا سدباب کرنے کے لئے اسلام کی کیا ہدایات ہیں؟

اکثر مقالہ نگار کی رائے ہے کہ شریعت میں ان جرائم کے سدباب کے لئے تعزیرات کا نظام ہے، ایسا نہیں ہے کہ بچہ سمجھ کر انہیں نظر انداز کر دیا جائے گا، بلکہ شرعی نقطہ نظر سے اگر چہ وہ اہل عقوبت میں سے نہ ہونے کی وجہ سے ان پر حد جاری نہیں ہوتی تاہم ان کی مجرمانہ سرگرمیوں اور مذموم حرکتوں پر قدغن لگانے کے لئے اور ان کی زجر وتوبیخ کے لئے تعزیری اور تادیبی کارروائی کی جائے گی۔

دلائل:

۱۔ ''أما شرط وجوبه: فالعقل فقط، فيعزر كل فاعل ارتكب جناية ليس لها حد مقرر، سواء كان حراً أو عبداً ذكراً أو أنثى، مسلماً أو كافراً، بالغاً أو صبياً بعد أن يكون عاقلاً، لأن هؤلاء من أهل العقوبة إلى الصبي العاقل، فإنه يعزر تأديباً لا عقوبة؛ لأنه من أهل التأديب'' (بدائع الصنائع ۵/ ۵۳۴) (قاضی عبدالجلیل قاسمی، مفتی نعیم اختر قاسمی وغیرہ)۔

۲۔ ''الصغير لا يمنع وجوب التعزير فيجري بين الصبيان'' (درمختار ۶/ ۱۳۰) (مولانا خورشید اعظمی، مفتی راشد ندوی، قاضی عبدالجلیل قاسمی، مولانا قمر الدین بروڈوی، مفتی محمد شاہد قاسمی، مولانا محبوب فروغ قاسمی، مفتی عثمان بستوی، مفتی لطیف الرحمن، قاضی محمد کامل قاسمی، مولانا منصف قاسمی، مفتی غلام اللہ کاوی، حافظ کلیم اللہ عمری، مولانا عمران ندوی، مولانا مبارک حسین ندوی، مفتی الیاس قاسمی، مولانا احسن عبدالحق ندوی وغیرہ)۔

۳۔ ''يقام التعزير عليه تأديباً'' (الاشباہ ۱/ ۲۶۵) (مولانا خورشید اعظمی، مفتی عبداللہ کاوی، قاضی عبدالجلیل قاسمی، مفتی راشد حسین ندوی، مفتی تنظیم عالم قاسمی وغیرہ)۔

۴۔ ''لا يحبس الصبي إلا بطريق التأديب حتى يتجاسر إلى مثله إذا باشر شيئاً من أسباب التعدي قصداً، أما إذا كان خطأً فلا، كذا في المبسوط'' (البحر الرائق ۶/ ۳۱۵، المبسوط للسرخسی ۲۰/ ۹۱) (مولانا محبوب فروغ قاسمی، مولانا خورشید اعظمی، مفتی راشد ندوی، مفتی تنظیم عالم قاسمی)۔

۵۔ اس تادیبی کارروائی کا مقصد یہ ہے کہ وہ آئندہ غلط حرکتوں کی طرف قدم نہ بڑھائے: ''للقاضي أن يحبس الصبي التاجر على وجه التأديب لا على وجه العقوبة حتى يماطل حقوق العباد، فإن الصبي يؤدب لينزجر عن الأفعال الذميمة'' (البحر الرائق ۶/ ۳۱۵) (مولانا خورشید اعظمی، مفتی شاہد قاسمی، مفتی عثمان بستوی، مفتی لطیف الرحمن، مولانا محمد عمران ندوی، مولانا نعیم اختر قاسمی، مفتی الیاس وغیرہ)۔

۶۔ ''اتفق أئمة المذاهب على أنه لا يجب الحد على الصبي والمجنون .... لقوله عليه السلام: رفع القلم عن

ثلاث: عن الصبی حتی یکبر وعن النائم حتی یستیقظ وعن المجنون حتی یفیق'' (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۵/۲۷۴)(مولانا منصف قاسمی، حافظ کلیم اللہ عمری، ڈاکٹر شاہجہاں ندوی، مولانا عبداللہ خالد، مفتی محمد آصف صاحب وغیرہ)۔

۷۔ حد سرقہ: ''فأهلية وجوب القطع وهو العقل والبلوغ فلا يقطع الصبی والمجنون لما روى عن النبیﷺ: رفع القلم عن ثلاثة: عن الصبی حتی یحتلم وعن المجنون حتی یفیق وعن النائم حتی یستیقظ'' (بدائع الصنائع ۷/۷۷،۸، فتاویٰ شامی ۳/۲۱۱)(قاضی عبدالجلیل قاسمی، مفتی محمد شاہد قاسمی، مفتی راشد حسین ندوی، مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی وغیرہ)۔

۸۔ حد زنا: ''إذا زنى صبی أو مجنون بامرأة عاقلة وهی مطاوعة فلا حد على الصبی والمجنون بلا خلاف...... وإذا زنى بصبية فلا حد عليهما وعليه المهر......'' (فتاویٰ ہندیہ ۲/۱۵۰)(مفتی محمد راشد حسین ندوی، مولانا محمد عمران ندوی، مفتی الیاس قاسمی وغیرہ)۔

۹۔ ''الصبی والمجنون إذا وطئ امرأة أجنبية لا حد عليه؛ لأن فعلها لا یوصف بالحرمة فلا یکون الوطأ زنا'' (بدائع الصنائع ۵/۴۸۷، الدر المختار مع الرد ۳/۱۵۴، ۱۵۵)(قاضی عبدالجلیل قاسمی، مولانا شاہجہاں ندوی، مفتی محمد شاہد قاسمی، مفتی راشد حسین ندوی وغیرہ)۔

۱۰۔ حد قتل: ''أما الذی یرجع إلى القاتل فخمسة: أحدها أن یکون عاقلاً، والثانی أن یکون بالغاً'' (بدائع الصنائع ۱۰/۲۳۶، کتاب الجنایات)(مفتی شاہد قاسمی، مولانا عمران ندوی، مولانا عبداللہ خالد، مفتی آصف صاحبان وغیرہ)۔

۱۱۔ ''ولا قصاص فیما بین الصبیان وعمد الصبی وخطؤه سواء عندنا'' (ہندیہ)(مفتی الیاس قاسمی)۔

۱۲۔ ڈاکہ زنی: ''فإن کان من القطاع صبی أو مجنون أو ذو رحم محرم من المقطوع علیه سقط الحد عن الباقین وإذا سقط الحد صار القتل إلى الأولياء فإن شاؤا قتلوا وإن شاؤوا عفوا'' (ہدایہ ۲/۵۵۷)(مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مولانا رحمت اللہ ندوی وغیرہ)۔

۱۳۔ مفتی راشد ندوی، مولانا محبوب فروغ قاسمی، مفتی تنظیم عالم قاسمی، مولانا منصف قاسمی وغیرہم لکھتے ہیں: البتہ کسی کا مال ضائع کریں تو اس کا ضمان لازم ہوگا، چوری کریں تو مال کا ضمان دینا ہوگا، قتل کریں تو عاقلہ پر دیت ہوگی اور زنا کریں تو مہر ادا کرنا ہوگا، "وفی الأشباه: الصبی المحجور مواخذ بأفعاله متضمن ما أتلفه من المال للمال، وإذا قتل فالدية على عاقلته" (الدر المختار مع الرد ۵/۱۰۱، مجلۃ الاحکام العدلیہ ۱/۱۸۶)(مفتی راشد حسین ندوی، مولانا خورشید انور اعظمی، مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی)۔

مولانا خورشید انور اعظمی اور مفتی اخلاق قاسمی کی رائے ہے کہ بچہ اگر جان وآبرو پر زبر دستی کرتے ہوں اور بغیر قتل کئے انہیں اس سے باز بھی نہیں رکھا جاسکتا ہو تو ان کے قتل کرنے کا فیصلہ کیا جائے گا۔ (الفروق ۴/۲۸۴)

مفتی شاہد قاسمی، مفتی غلام اللہ کاوی، مولانا عمران ندوی، مفتی عبداللہ کاوی، مولانا رحمت اللہ ندوی، حافظ کلیم اللہ عمری اور مفتی صادق پٹیل صاحبان نے بچوں کو ان جرائم سے روکنے کے لئے اسباب ذکر کئے ہیں کہ:

۱۔ بچوں کو برے اور مجرمانہ ماحول سے دور رکھا جائے۔

۲۔ جرائم سے نفرت، آخرت، حساب وکتاب اور خوف خدا استحضار پیدا کیا جائے۔

۳۔ یہ تصور پیدا کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ تمام چیزوں کو دیکھتا ہے اور ہر جگہ حاضر وناظر ہے۔

۴۔ تعلیم وتربیت کا مضبوط ومنظم طریقہ اختیار کیا جائے اور اچھے ماحول مراہم کیا جائے، اچھی صحبت کی طرف دلچسپی پیدا کی جائے وغیرہ۔

قاضی عبدالجلیل قاسمی، مولانا قمر الدین بروڈوی اور مفتی تنظیم عالم قاسمی لکھتے ہیں:

حکومت نے بلوغ کی جو عمر مقرر کی ہے وہ اسلامی قانون کے مطابق صحیح نہیں ہے، اس وجہ سے بہت سے ایسے مجرم جو اسلام کی نظر میں حد کے مستحق ہیں وہ جرم ثابت ہونے کے بعد بھی حد سے بچ جاتے ہیں، اگر اسلامی قانون کی رعایت کی جائے تو جرائم پر بہت حد تک قابو پایا جاسکتا ہے۔

مفتی تنظیم عالم قاسمی اور مولانا رحمت اللہ ندوی نے صبی کی دو قسمیں کی ہیں۔

مفتی لطیف الرحمن اور مفتی عثمان بستوی نے تعزیر کے آداب کی رعایت پر گفتگو کی ہے۔

قاضی عبدالجلیل قاسمی اور مولانا رحمت اللہ ندوی نے حد اور تعزیر کا فرق بیان کرتے ہوئے لکھا ہے: حد اس سزا کو کہتے ہیں جس کی تعیین شریعت میں ہو اور وہ اللہ تعالی کے حق بھی ہو، اس کی پانچ قسمیں ہیں: حد سرقہ، حد زنا، حد شرب، حد سکر اور حد قذف۔

تعزیر وہ سزا ہے جس کی مقدار شریعت میں متعین نہ ہو، بلکہ امام وقاضی کی صوابدید پر موقوف ہو۔

بچوں کے لئے قید وجیل کی سزا:

سوال: (و) مجرمانہ ذہن رکھنے والے بچوں کی سرزنش اور اصلاح کے لئے بچوں کی جیلیں قائم ہیں، ان جیلوں میں بھی بچوں سے پر مشقت کام لئے جاتے ہیں، اور سخت مار پیٹ کی جاتی ہے، ایسی جیلوں میں موجود نابالغ قیدیوں کے لئے کیا احکام ہیں، ان کو کیا سزائیں دی جاسکتی ہیں؟ ان سے کیا کام لئے جاسکتے ہیں؟ او ران کی اصلاح کے لئے کیا تدبیریں اختیار کی جاسکتی ہیں؟

تمام مقالہ نگار کی رائے ہے کہ اصلاح وتربیت کی غرض سے ایسے بچوں کو مخصوص جیل میں داخل کیا جاسکتا ہے، البتہ مقالہ نگار نے اس پر بھی گفتگو کی ہے کہ بچوں کے جیل کیسے ہوں، کس طرح کا کام بچوں سے لیا جاسکتا ہے، تربیت واصلاح کے ذرائع کیا ہوں گے، تربیت دینے کے کیا آداب ہیں، ذیل بعض آراء کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

۱۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ بچوں کی جیلیں علاحدہ ہونی چاہئے، تاکہ بڑے قیدیوں کے ساتھ رہ کر مزید نہ بگڑ جائے (مولانا خورشید اعظمی، مولانا رحمت اللہ ندوی، حافظ کلیم اللہ عمری)۔

۲۔ دوسری بات یہ ہے کہ بہتر یہ ہے کہ ایسے بچوں کو باپ دادا کے گھر میں ہی قید کیا جائے۔

"تدل أكثر النصوص على أن يكون حبس الحدث في بيت أبيه أو وليه على أنه يجوز حبس في السجن إلا إذا خشي عليه ما يفسده فيتوجب حبسه عند أبيه لا في السجن" (الموسوعة الفقهيه ۱۶-۲۱۸) (مولانا خورشید اعظمی، مفتی عارف کنجروی، مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی)۔

۳۔ ان سے پر مشقت کام لینا اور جیل میں ان کا استحصال کرنا ظلم ہے، "لا يكلف الله نفساً إلا وسعها" (البقرۃ: ۲۳۳) (مفتی راشد ندوی، مولانا محبوب فروغ قاسمی، مفتی شاہد قاسمی، مولانا شاہجہاں ندوی، مفتی تنظیم عالم قاسمی، مفتی لطیف الرحمن، مفتی عثمان بستوی، مولانا رحمت اللہ ندوی، مولانا منصف قاسمی، حافظ کلیم اللہ عمری، مولانا عمران ندوی، مفتی عارف کنجروی وغیرہ)۔

۴۔ ذہنی وفکری تربیت کے لئے وعظ ونصیحت کی باتیں کی جائیں، ان کے ذہن میں اعمال حسنہ کی اہمیت وفضیلت اور اعمال قبیحہ کی شناعت وقباحت بٹھائی جائے۔ (مولانا خورشید اعظمی، مفتی عبداللہ کادی، مفتی شاہد قاسمی، مولانا قمر الدین بروڈوی، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مفتی تنظیم عالم قاسمی، مفتی غلام اللہ کادی، قاضی محمد کامل قاسمی، مفتی لطیف الرحمن وغیرہ)۔

۵۔ تادیباً ہلکی پھلکی سزائیں دی جائیں جس کو برداشت کر سکے، سخت مار پیٹ کی قطعاً اجازت نہیں ہے:

"لا ينبغي للقاضي أن يضرب محبوساً في دين ولا غيره ولا لصقد ولا يقيد ......" (فتاوی ہندیہ)

"في المحيط للقاضي حبس الصبي الفاجر تاديباً لا عقوبة......" (فتاوی شامی ۴/۳۸۵) (مفتی عبداللہ کادی، مولانا قمر الدین، مفتی راشد ندوی، مولانا شاہجہاں ندوی، مفتی تنظیم، مولانا محبوب فروغ، مفتی شاہد، مولانا منصف، مفتی عثمان، حافظ کلیم اللہ عمری، مفتی الیاس، مولانا مبارک، مفتی اخلاق، قاضی ریاض اور مولانا احسن عبدالحق صاحبان)۔

۶۔ مجرمانہ ذہن رکھنے والے بچوں کو تدریجاً سزا دی جائے گی، سزا کی مقدار سزا دینے والے صوابدید پر ہے۔ (مولانا شاہجہاں ندوی، قاضی عبدالجلیل قاسمی، مولانا رحمت اللہ ندوی، مفتی آصف اور مولانا احسن عبدالحق ندوی)۔

۷۔ قیدیوں کو تنگ جگہوں پر رکھنا، کھانے پینے سے روکنا، نہایت گرم پانی یا ٹھنڈی جگہ رکھنا، دھوپ میں کھڑا کرنا، دھواں والے گھر میں محبوس کرنا، اور اس طرح کی دوسری غیر انسانی حرکتیں کرنا عام قیدیوں کے ساتھ بھی درست نہیں، بچوں کے ساتھ تو بدرجہ اولی جائز نہیں ہوگا (فتح القدیر ۷/۲۶۰، فتاوی ابن تیمیہ ۵/۲۹۸) (مفتی تنظیم عالم قاسمی)۔

بے سہارا بچوں کی پرورش و تعلیم و تربیت:

سوال: (ز) بہت سے بچے بے سہارا ہو جاتے ہیں، کسی حادثہ میں ان کے والدین کے گذر جانے یا والدین سے بچھڑ جانے نیز ولادت کے بعد ماں باپ کی طرف سے پھینک دیئے جانے کی وجہ سے یا کسی اور سبب یہ صورت حال پیش آتی ہے، اسلام ایسے بچوں کی پرورش، ان کی تعلیم و تربیت اور ان کے لئے خاندانی ماحول فراہم کرنے کے سلسلہ میں کیا ہدایات دیتا ہے، اس سلسلہ میں حکومت کی ذمہ داریاں کیا ہیں اور خود سماج کا کیا فریضہ ہے؟

تقریباً تمام مقالہ نگار نے اسلامی ہدایات کو واضح کرتے ہوئے یتیم و بے سہارا بچوں کو پرورش کی فضیلت، پرورش کے درجات، ذمہ داریوں کی ترتیب وغیرہ ذکر کی ہے۔

۱۔ یتیم و بے سہارا بچوں کی پرورش و پرداخت پر بڑی فضیلت وارد ہے، حدیث میں ہے: "أنا و كافل اليتيم في الجنة هكذا" (صحیح بخاری ۲/۸۸۸) (قاضی عبدالجلیل قاسمی، مولانا قمر الدین بروڈوی، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مفتی تنظیم عالم قاسمی، مفتی لطیف الرحمن، مفتی عثمان بستوی، مولانا رحمت اللہ ندوی، مولانا عمران ندوی، مفتی الیاس قاسمی، مفتی صادق پٹیل وغیرہ)۔

۲۔ ''من أحياها فكأنما أحيا الناس جميعاً'' (المائدہ: ۳۲)۔

۳۔ ''وتعاونوا على البر والتقوى ولا تعاونوا على الإثم والعدوان'' (المائدہ: ۲) (مولانا خورشید اعظمی، مولانا شاہجہاں ندوی، مفتی تنظیم عالم قاسمی وغیرہ)۔

۴۔ ''يسئلونك عن اليتامى قل إصلاح لهم خير وإن تخالطوهم فإخوانكم، والله يعلم المفسد من المصلح'' (البقرہ: ۲۲۰) (مفتی الیاس قاسمی وغیرہ)۔

۵۔ ''عن أبي هريرة رضي الله عنه عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: ''خير بيت في المسلمين بيت فيه يتيم يحسن إليه ......'' (سنن ابن ماجہ ۲۶۲) (مفتی الیاس قاسمی، مفتی آصف صاحب وغیرہ)۔

۶۔ ''من ضم يتيماً بين أبوين مسلمين إلى طعامه وشرابه حتى يغنيه الله، وجبت له الجنة'' (مجمع الزوائد ۸/۱۶۱) (مفتی عثمان بستوی، مفتی آصف صاحب)۔

۷۔ ''من وضع يده على رأس يتيم رحمة كتب الله له بكل شعرة مرت على يده حسنة'' (مسند احمد و ابن حبان) (مولانا رحمت اللہ ندوی)۔

اگر بے سہارا بچوں کے ضائع ہونے کا ظن غالب ہو تو اس کو اٹھانا اور پرورش کرنا واجب ہے اور عام حالات میں مستحب ہے۔

''والالتقاط مندوب إليه وإن غلب على ظنه ضياعه كأن وجد في الماء أو بين يدي سبع فواجب'' (فتاوی ہندیہ ۲/۲۸۵، اسی مفہوم کی عبارت موسوعہ فقہیہ، درمختار اور تبیین الحقائق وغیرہ میں ہے) (مولانا خورشید اعظمی، مولانا شاہجہاں ندوی، مولانا خورشید اعظمی، مفتی تنظیم عالم قاسمی، مولانا محبوب فروغ احمد، مفتی عثمان بستوی، مولانا عمران ندوی، مفتی عارف کنجروی، مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی وغیرہ)۔

بے سہارا اور یتیم بچوں کی پرورش و تعلیم کی ذمہ داری سب سے پہلے قریبی رشتہ داروں پر عائد ہوتی ہے، ان کی عدم موجودگی میں دور کے رشتہ داروں پر، وہ بھی نہ ہوں تو بیت المال یا حکومت وقت پر ایسے بچوں کی کفالت واجب ہوتی ہے، جن ملکوں میں بیت المال کا نظام نہ ہو تو پھر یہ ذمہ داری عامۃ الناس پر عائد ہوتی ہے۔

۱۔ ''ونفقته في بيت المال روي ذلك عن عمر و علي رضي الله عنهما. ولأنه عاجز محتاج لا مال له ولا قريب، ومال بيت المال

معد للصرف إلى مثله'' (تبیین الحقائق ۳/۲۹۷) (مولانا خورشید اعظمی، مولانا شاہجہاں ندوی، مولانا محبوب فروغ قاسمی، قاضی محمد کامل قاسمی، مفتی عثمان بستوی، مولانا رحمت اللہ ندوی، مولانا محمد منصف قاسمی، مفتی عبداللہ کاوی والا، مفتی راشد ندوی، مولانا قمر الدین بروڈوی، مفتی شاہد قاسمی، مولانا عمران ندوی وغیرہ)۔

۲۔ ''فإن تعذر الإنفاق عليه من بيت المال لكونه لا مال فيه أو كان في مكان لا إمام فيه أو لم يعط شيئاً فعلى من علم من المسلمين الإنفاق عليه، لقوله تعالى: ''وتعانوا على البر والتقوى'' ولأن في ترك الإنفاق عليه هلاكه وحفظه عن ذلك واجب'' (المغنی لابن قدامہ ۶/۱۱۵) (مولانا خورشید اعظمی، مفتی شاہد قاسمی وغیرہ)۔

۳۔ ''فإن لم يكن فعلى المسلمين تكفينه، فإن عجزوا سألوا الناس كذا في الزاهدي'' (فتاوی ہندیہ) (مفتی راشد حسین ندوی)۔

۴۔ ''ويقوم المسلمون بكفايته نفقة لا قرضاً؛ لأنه محتاج عاجز، وإن قام بها بعضهم اندفع الحرج عن الباقين...... لأن في ترك الإنفاق عليه هلاكه وحفظه عن ذلك واجب كإنقاذه من الغرق'' (الموسوعۃ الفقہیہ ۳۵/۳۲۴) (مفتی تنظیم عالم قاسمی)۔

یہی بات مولانا شاہجہاں ندوی نے ان الفاظ میں لکھی ہے: ''بے سہارا بچے جو ہلاکت کے دہانے پر کھڑے ہوں، ان کی ہلاکت کے اسباب کو دور کر کے زندہ انسان کو بچانا فرض ہے، ان کو یوں ہی چھوڑ دینا ناحق انسانی جان کا قتل ہے۔

مولانا خورشید اعظمی، مولانا عبداللہ کاوی، مفتی راشد حسین ندوی، مولانا شاہجہاں ندوی، مفتی عثمان بستوی، مفتی شاہد قاسمی وغیرہم لکھتے ہیں: ہندوستان جیسے ملک میں یہ ذمہ داری حکومت پر جاتی ہے، لیکن آج حکومت اس طرح کی ذمہ داریوں سے جس طرح غفلت میں ہے وہ سب پر عیاں ہے، ایسے حالات میں تمام مسلم رفاہی اداروں، دارالیتامی اور مدارس کو چاہئے کہ ان بے سہارا بچوں کی کفالت اور پرورش کا انتظام کریں۔

مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی نے اس پر بھی بحث کی ہے کہ جس بے سہارا بچہ کے بارے میں معلوم نہ ہو کہ وہ مسلم ہے یا کافر، اس کے بارے میں کیا فیصلہ کیا جائے گا، انہوں نے اس کی چار صورتیں ذکر کی ہیں (ملاحظہ فرمائیں موصوف کا مقالہ)۔

غربت وافلاس کی وجہ سے بچہ دوسرے کے حوالہ کرنا:

سوال: (ح) ہندوستان کی ایک تازہ رپورٹ کے مطابق ہر سال تقریباً دس لاکھ بچے گم ہوجاتے ہیں، یہ صورتحال اکثر پسماندہ اور ترقی پذیر ممالک میں پائی جاتی ہے، خیال کیا جاتا ہے کہ یہ بچے مختلف مقاصد کے لئے فروخت کردیئے جاتے ہیں، بعض بچوں کو وہ لوگ حاصل کرلیتے ہیں جن کے پاس اولاد نہیں ہوتی، بعضوں سے بندھوا مزدور کا کام لیا جاتا ہے، بعض گداگری کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں، بعض ایسے بدقسمت بھی ہیں جن کے اعضاء کی خرید وفروخت کی جاتی ہے یا ان کا جنسی استحصال کیا جاتا ہے، ان صورتوں کے بارے میں شرعی نقطہ نظر بنیادی طور پر واضح ہے، لیکن دو باتیں قابل وضاحت ہیں: اول یہ کہ کیا خود بچہ کے گارجین حد درجہ بڑھتے ہوئے افلاس اور پرورش کی استطاعت نہ رکھنے کی وجہ سے کسی کو اپنا بچہ حوالہ کر کے اس سے بے تعلق ہوسکتے ہیں؟ اور اپنی فوری ضروریات کو پوری کر کے نیز دوسرے بچہ کی پرورش کی غرض سے، بچہ حاصل کرنے والے کی طرف سے پیش کیا جانے والا ہدیہ قبول کرسکتے ہیں؟ دوسری قابل وضاحت بات یہ ہے کہ ایسے واقعات کی روک تھام کے لئے شریعت اسلامی کی تعلیمات کیا ہیں؟

اس سوال کے جواب میں ۲۷ حضرات مقالہ نگاران کی رائے یہ ہے کہ غربت وافلاس اور تنگ دستی کی وجہ سے اپنا بچہ اس طرح کسی کے حوالہ کرنا جائز نہیں ہے کہ اس سے بالکل لاتعلق ہوجائے اور بچے کا نام ونسب حقیقی باپ سے منقطع ہوجائے، اور نہ ہی یہ جائز ہے کہ اس کے عوض کوئی ہدیہ قبول کیا جائے، ورنہ یہ بچوں کو قتل اور فروخت کردینے کے مترادف ہوگا جو حرام وناجائز ہے، البتہ بچے کا رشتہ اس کے حقیقی ماں باپ سے برقرار رکھتے ہوئے اگر کوئی شخص محض پرورش اور کفالت کی نیت سے کسی کا بچہ طلب کرتا ہے تو اس کے حوالہ کیا جاسکتا ہے اور اس کو اس نیک جذبہ کا اجر بھی ملے گا، مندرجہ ذیل حضرات نے اس موقف کو اختیار کیا ہے:

مفتی صادق محی الدین، مفتی ڈاکٹر شاہجہاں ندوی، مفتی محمد یاسر قاسمی، مولانا خورشید انور اعظمی، قاضی عبدالجلیل قاسمی، مولانا راشد حسین ندوی، مفتی شاہد علی قاسمی، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مفتی محمد عثمان بستوی، مفتی تنظیم عالم قاسمی، مفتی عبداللہ کاوی والا، مولانا سید قمر الدین محمود بروڈوی، مولانا محمد منصف بدایونی، مولانا رحمت اللہ ندوی، حافظ کلیم اللہ عمری، مولانا مبارک حسین ندوی، مفتی لطیف الرحمن ممبئی، مفتی الیاس قاسمی، مفتی صادق پٹیل دیولوی، مولانا محمد احسن عبدالحق ندوی، مفتی اخلاق حسین قاسمی، قاضی ریاض ارمان قاسمی، مفتی آصف رتن پور گجرات، مولانا حبیب بن یوسف قاسمی، مولانا عبدالتواب اناوی، مولانا صابر حسین ندوی، مولانا نعیم اختر قاسمی، مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی۔

دلائل:

مذکورہ حضرات نے اپنے موقف کو مدلل کرنے کے لیے مندرجہ ذیل نصوص کا سہارا لیا ہے۔

''لا تقتلوا أولادكم خشية إملاق، نحن نرزقكم وإياهم إن قتلهم كان خطأً كبيراً'' (سورۂ اسراء: ۳۱)۔

''لا تقتلوا أولادكم من إملاق'' (سورۂ انعام: ۱۵۱)۔

''يا أيها الذين آمنوا قوا أنفسكم وأهليكم ناراً'' (التحریم: ۶)۔

''قد خسر الذين قتلوا أولادهم سفهاً بغير علم'' (سورۂ انعام: ۱۴۱)۔

''وما جعل أدعيائكم أبناءكم ذلكم قولكم بأفواهكم والله يقول الحق وهو يهدى السبيل ادعوهم لآبائهم هو أقسط عند الله، فإن لم تعلموا آباءهم، فإخوانكم فى الدين ومواليكم وليس عليكم جناح فيما أخطأتم به، ولكن ما تعمدت قلوبكم وكان الله غفوراً رحيماً'' (سورۂ احزاب: ۵-۹)۔

''وترى كثيراً منهم يسارعون فى الإثم والعدوان وأكلهم السحت لبئس ما كانوا يعملون'' (سورۂ مائدہ: ۶۲)

''وتعاونوا على البر والتقوى'' (سورۂ مائدہ: ۱)۔

''وأحسن كما أحسن الله إليك'' (سورۂ القصص: ۷۷)۔

''وآتى المال على حبه ذوى القربى واليتامى والمساكين وابن السبيل وفى الرقاب'' (بقرہ: ۱۷۷)۔

''فأما اليتيم فلا تقهر''. (الضحیٰ: ۹)۔

''وأنا وكافل اليتيم فى الجنة هكذا وأشار بالسبابة والوسطى وفرج بينهما شيئاً'' (بخاری حدیث نمبر: ۵۳۵۹، مسلم حدیث: ۲۹۸۳)۔

''خير بيت فى المسلمين بيت فيه يتيم يحسن إليه، وشر بيت فى المسلمين بيت فيه يتيم يساء إليه'' (اس روایت کی تخریج ماقبل میں گذر چکی ہے)۔

''الساعى على الأرملة والمسكين كالمجاهد فى سبيل الله أو القائم الليل الصائم النهار'' (بخاری حدیث: ۵۳۵۳، مسلم حدیث نمبر: ۲۹۸۲)۔

''أنا أولى بكل مؤمن من نفسه، فمن ترك ديناً أو ضيعة، فإليّ ومن ترك مالاً فلورثته. وأنا مولى من لا ولى له'' (ابوداؤد، حدیث نمبر: ۲۹۵۵)۔

''إن أحدكم من يموت حتى يستكمل رزقه فلا تستبطؤ الرزق واتقوا الله أيها الناس فاجملوا فى الطلب خذوا ما حل، ودعوا ما حرم'' (حدیث)۔

''من نفس عن مؤمن كربة من كرب الدنيا نفس الله عنه كربة من كرب يوم القيامة والله فى عون العبد ما كان العبد فى عون أخيه'' (مسلم ۴/ ۱۰۷۴)۔

''ألا كلكم راع وكلكم مسئول عن رعيته، فالإمام الذى على الناس راع وهو مسئول عن رعيته، والرجل راع على أهل بيته وهو مسئول عن رعيته، والمرأة راعية على أهل بيت زوجها وولده وهى مسئولة عنهم'' (الجامع الصحیح للبخاری ۲/ ۱۰۵۷، کتاب الاحکام)۔

''عن أبي هريرة ﷺ عن النبى ﷺ: ثلاثة أنا خصمهم يوم القيامة، رجل أعطى بى ثم غدر، ورجل باع حراً فأكل ثمنه،

ورجل استأجر أجيراً فاستوفى منه ولم يعط أجره'' (بخاری کتاب البیوع ر ۴۵۳ حدیث نمبر: ۲۲۲۷، ۲۲۷۰، ابن ماجہ حدیث نمبر: ۲۴۴۲)۔

''عن ابن مسعود ﷺ قال: قال رسول اللہ ﷺ: الخلق عيال الله، فأحب الخلق إلى الله من أحسن إلى عياله'' (مشکوۃ المصابیح ر ۴۲۵، باب الشفقۃ والرحمۃ علی الخلق)۔

''فلو كان فقيرين فالأب يكتسب أو يتكفف وينفق عليهم'' (درمختار مع الرد ۵ ر ۳۳۷)۔

''بطل بيع ما ليس بمال كالدم والميتة والحر'' (تنویر الابصار مع رد المحتار ۷ ر ۲۳۵، ۲۳۶)۔

''يعني انتفع به على أي وجه كان، وخص الأكل، لأنه أخص المنافع وذلك؛ لأن من باع حراً فهو غاصب لعبد الله الذي ليس لأحد غير الله عليه سبيل. فالمغصوب منه خصم الغاصب'' (فيض القدير، شرح الجامع الصغير من أحاديث البشير والنذير: ۴۱۶)۔

''بيع الأبناء للفقر حرام قطعي لا نعلم فيه رأياً مخالفاً، بل هو يجمع بين معصيتين: الأولى بيع إنسان حر، وهذا لا يجوز، الثانية التفريط في حقوق الأبناء وأبهما الحرية، وهذا أيضاً لا يجوز. والفقر ليس سبباً مبيحاً لذلك'' (موقف الانسان من الرق للشيخ لفيصل مولوي طرابلسي عليه الرحمة)۔

''وقال ابن التين: هو سبحانه وتعالى خصم لجميع الظالمين، إلا أنه أراد التشديد على لهؤلاء بالتصريح'' (فتح الباري ۴ ـ ۴۱۸)۔

''فقد كان الأنبياء والرسل صلوات الله وسلاماً عليهم يقبلون الهدية'' (مبسوط: ۱۴۰)۔

(دلائل کی تفصیل کے لیے دیکھئے مقالات: ڈاکٹر مفتی شاہجہاں ندوی، حضرت مفتی محمد صادق محی الدین حیدر آباد، مولانا محمد الیاس قاسمی، مولانا خورشید انور اعظمی، مولانا محمد عثمان بستوی، مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی وغیرہ)۔

اس سوال کے جواب میں حضرت مولانا مبارک حسین ندوی نیپالی اور مولانا محمد عمران ندوی نے بغیر کسی قید کے اس بات کو جائز قرار دیا ہے کہ غربت وافلاس اور تنگ دستی کی وجہ سے بچہ دوسرے کے حوالہ کر سکتے ہیں، اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے اور اس کے جواز کو حضرت علیؓ کو حضور نبی کریم ﷺ کے اپنے چچا ابوطالب سے مانگ لینے، اور حضرت زید بن حارثہ کے متبنی بنانے پر قیاس کیا ہے۔

بچہ دینے والے کا ہدیہ قبول کرنا:

بعض مقالہ نگار حضرات نے اس کی بھی وضاحت کی ہے کہ اگر بچہ حوالہ کرنے میں اس طرح کی کوئی شرط اور قید نہیں ہوتی اور نہ ہی اس طرح کا رواج ہو اور بچہ حوالہ کرنے والے کی غربت وتنگ دستی پر ترس کھا کر ازراہ تعاون ہدیہ وغیرہ پیش کرتا ہے لینے اور دینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے (دیکھئے: مقالات: مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مفتی محمد عثمان بستوی، مفتی شاہد علی قاسمی، قاضی عبدالجلیل قاسمی، مفتی تنظیم عالم قاسمی، مولانا محمد عمران ندوی)۔

جبکہ مفتی غلام اللہ کاوی والا، مولانا محمد الیاس قاسمی، مولانا خورشید انور اعظمی، مولانا راشد حسین ندوی، مفتی لطیف الرحمن ممبئی، قاضی ریاض ارمان قاسمی، مفتی آصف رتن پور، گجرات، مولانا حبیب بن یوسف قاسمی، مولانا محمد منصف بدایونی اور مولانا مفتی صادق محی الدین وغیرہ اس مناسبت سے کسی بھی صورت میں ہدیہ قبول کرنے کی اجازت نہیں ہیں، ان کا خیال ہے کہ اس سے فروخت کا شبہ پیدا ہوتا ہے۔

علی الاطلاق بچہ حوالہ کرنے کے عدم جواز کے قائلین میں مولانا محمد احسن عبدالحق ندوی، اور مولانا عبدالتواب اناوی نے سختی کے ساتھ اس کی وضاحت کی ہے کہ بچہ اس حالت میں کسی بھی قیمت پر دوسرے کے حوالہ نہ کیا جائے کہ اس سے بہت سے مفاسد کے دروازے کھلنے کا اندیشہ ہے۔

بچوں کی خرید وفروخت جیسے جرائم کی روک تھام:

بچوں کی خرید وفروخت اور استحصال جیسے جرائم اور معاشرے کے مفلوک الحال لوگوں کی اعانت کے سلسلہ میں اکثر مقالہ نگاران نے مندرجہ ذیل وضاحتیں کی ہیں:

حکومت وقت کی ذمہ داری ہے کہ ایسے کمزور اور مفلوک الحال کے لیے بیت المال سے وظائف جاری کرے، اور ان کی ضروریات زندگی کا بندوبست کرے۔

معاشرے کے ذی حیثیت اور مالدار لوگ ایسے لوگوں کا تعاون کریں اور شریعت کے انفاق فی سبیل اللہ کے اصولوں پر عمل کرتے ہوئے معاشرے کے محروموں کو بے سہارا نہ چھوڑیں کہ وہ غربت کی وجہ سے طرح طرح کی آزمائشوں میں مبتلا ہوں۔

رفاہی ادارے قائم کئے جائیں جو ان کی کفالت کا انتظام کریں۔

جو منتظمین ہیں وہ اپنے یہاں زکوۃ وصدقات کے نظام کو منظم کریں اور ایسے لوگوں کی ذمہ داریاں اٹھائیں۔

عوام میں بیداری پیدا کی جائے کہ غریب، مسکین، یتیم اور بیواؤں کی کفالت پر شریعت نے کس قدر زور دیا ہے اس کی ترغیب دی جائے۔

زکوۃ وصدقات اور فطرے کی رقوم کا مناسب انتظام ہو، تاکہ مستحقین تک صحیح طریقے سے پہنچایا جائے۔

یتامی کی کفالت پر خود ہمارے پیغمبر محمد ﷺ نے جو عملی نمونہ پیش کیا ہے اسے اختیار کئے جانے کی طرف لوگوں کی توجہ دلائی جائے، وغیرہ۔

اگر مذکورہ امور کی پابندی معاشرے میں حکومت کی طرف سے اور انفرادی طور پر بھی کی جاتی ہے تو اس طرح کی صورت حال پر قابو پایا جاسکتا ہے۔

"إن الله يأمر بالعدل والإحسان وإيتاء ذي القربى وينهى عن الفحشاء والمنكر" (سورہ نحل: ۹۰)۔

اس سوال (ح) کے کسی بھی طرح کے منفی یا اثبات میں جواب تحریر کرنے سے مندرجہ ذیل حضرات نے خاموشی اختیار کی ہے، تاہم دوسرے سوالوں کے جوابات بسط وتفصیل سے تحریر کیے ہیں ان کے اسماء گرامی یہ ہیں:

مولانا محمد جہانگیر حیدر قاسمی، مفتی عبداللہ کاوی والا، قاضی محمد کامل قاسمی، مفتی عارف کنجروی، مفتی حذیفہ داحودی، مولانا عبداللہ خالد لونا واڑا۔

دماغی اور جسمانی طور پر معذور بچوں کو اسپتال میں رکھنا:

سوال: (ط) بعض بچے ذہنی یا جسمانی طور پر معذور پیدا ہوتے ہیں یا پیدا ہونے کے بعد معذور ہو جاتے ہیں، ان بچوں کی پرورش ایک بڑا مسئلہ ہوتا ہے، ان کے لئے مسلسل علاج اور نگہداشت کی ضرورت ہوتی ہے، خاص کر اگر والدین ملازمت کرتے ہوں تو ان کی دیکھ ریکھ کا مسئلہ خاصا گمبھیر ہو جاتا ہے، اس ذمہ داری سے فراغ یا فرار حاصل کرنے کے لئے بعض اوقات ایسے بچوں کو دماغی ہسپتال میں داخل کر دیا جاتا ہے یا دوسرے ہسپتالوں میں رکھوا دیا جاتا ہے، جس کا مقصد علاج سے زیادہ ان کی نگہداشت ہوتی ہے، ایسے بچوں کے بارے میں اسلامی تعلیمات کیا ہیں؟ کس حد تک ان کا علاج کرانا واجب ہے، اور کیا ان کو باپ کی شفقت اور ماں کی ممتا سے محروم کر کے کسی ہسپتال میں داخل کر دینا ماں باپ کا اپنی ذمہ داری سے غفلت برتنا اور فرار اختیار کرنا متصور ہوگا؟

اس سوال کے جواب میں اکثر مقالہ نگار حضرات کی رائے یہ ہے کہ بہتر نگہداشت اور علاج ومعالجہ کی غرض سے ایسے دماغی مریض اور جسمانی طور پر معذور وکمزور بچوں کو ہسپتال میں ضرورت کی وجہ سے داخل کیا جاسکتا ہے، محض اپنی تن آسانی یا دنیاوی منافع اور معذور بچہ کی پریشانی سے تنگ آ کر ہسپتال میں داخل کرنا یقیناً اپنی ذمہ داری سے راہ فرار اختیار کرنا ہے، مگر بچے کی تیمارداری، ان کو ہر طرح کی سہولت مہیات کرانے کی غرض سے کوئی شخص بچہ کو ہسپتال اور بے بی کینسر سینٹر میں داخل کرتا ہے تو مجبوری میں اس کی گنجائش ہے، البتہ اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کے بعد بچہ سے بالکل لاتعلق نہ ہو، بلکہ وقفہ وقفہ سے دیکھ ریکھ کرتا رہے، اس رائے کو مندرجہ ذیل حضرات نے اختیار کیا ہے:

- مولانا مبارک حسین ندوی، مولانا محمد عمران ندوی، مولانا قاضی عبدالجلیل قاسمی، مولانا عبدالتواب اناوی، مولانا صابر حسین ندوی، مولانا عبداللہ خالد لوناواڑا، مولانا ریاض ارمان قاسمی، مفتی محمد اخلاق حسین قاسمی، مفتی صادق پٹیل دیولوی، مفتی لطیف الرحمن، قاضی محمد کامل قاسمی، مولانا نعیم اختر قاسمی، مولانا رحمت اللہ ندوی، مولانا محمد منصف بدایونی، مولانا قمرالدین محمود، مفتی عبداللہ کاوی، مفتی تنظیم عالم قاسمی، مفتی محمد عثمان بستوی، مفتی شاہد علی قاسمی، مولانا راشد حسین ندوی، مولانا خورشید انور اعظمی، مولانا محمد حبیب بن یوسف قاسمی، مفتی محمد یاسر القاسمی، مفتی حافظ صادق محی الدین حیدرآباد۔

مجوزین میں مفتی صادق محی الدین اور مفتی شاہد علی قاسمی صاحبان کی رائے یہ ہے کہ اگر کوئی ملازمت پیشہ خاتون بھی اپنی سہولت کے لئے ایسا کرتی ہے تو اس کی گنجائش ہے، بالخصوص مؤخر الذکر مفتی شاہد علی قاسمی لکھتے ہیں کہ یہ دراصل مبتلی بہ کے حالات پر موقوف ہے، جہاں بچہ کی تیمارداری بہتر طور پر ہو اس کو اختیار کیا جائے گا، جبکہ دوسرے جملہ حضرات تقریباً اس اجازت کو محض مجبوری اور علاج ومعالجہ کی ضرورت تک محدود رکھنے کے قائل ہیں۔

دلائل:

مذکورہ حضرات مقالہ نگاران نے مندرجہ ذیل نصوص سے استدلال کیا ہے:

......"ولا تلقوا بأيديكم إلى التهلكة" (بقرہ:۹۵)۔

......"إن العبد إذا سبقت له من الله منزلة لم يبلغها بعمله ابتلاه الله في جسده أو في ماله أو في ولده، ثم صبّره على ذلك، حتى يبلغه المنزلة التي سبقت له من الله" (المعجم الکبیر للطبرانی ۲۲/۳۱۸، حدیث نمبر:۸۰۱)۔

......"الخلق عيال الله وأحب عباد الله إلى الله أنفعهم لعياله" (فصل فی نصیحۃ الولاۃ ووعظہم ۶/۴۳)۔

......"إذا دخلت على مريض فمره أن يدعولك، فإن دعاءه كدعاء الملائكة" (ابن ماجہ باب ما جاء فی عیادۃ المریض ۱/۴۶۳، حدیث نمبر:۱۴۴۱) (دیکھئے مقالہ: حافظ مفتی صادق محی الدین)۔

......"عن أبي هريرة قال: قال رسول الله ﷺ: ما أنزل الله داء إلا أنزل به شفاءا" (مشکاۃ ۲/۳۸۷)۔

......"كلكم راع وكلكم مسئول عن رعيته" (مسلم)۔

......"هل تنصرون وترزقون لضعفائكم" (رواہ البخاری حدیث نمبر:۲۷۳۹)۔

......"كان لها أن تحمل الولد إلى منزلها فترضعن" (ہدایہ ۱/۵۶۱) (مولانا راشد حسین ندوی)۔

......"الضرر الأشد يزال بالضرر الأخف" (مفتی شاہد علی قاسمی)۔

......"إذا كان الولد عند الحاصنة فلأبيه حق رؤيته بأن يخرج الصغير إلى مكان يمكن الأب أن يراه فيه كل يوم" (الفقہ الاسلامی ۷/۶۹۹) (مولانا محمد منصف بدایونی)۔

......"تجب عليه الخدمة أو الإخدام لولده الصغير أو لمريض أو العاجز إذا كان فقيراً" (الموسوعۃ الفقہیہ ۱۹/۳۸، ۳۹)۔

......"وفي الشرع: حفظ الصغير والعاجز والمجنون والمعتوه مما يضره بقدر المستطاع" (کتاب الفقہ علی المذاہب الأربعۃ ۴/۵۲۰) (اخلاق حسین قاسمی)۔

......"إذا تعارضا مفسدتان روعي أعظمهما بارتكاب أخفهما" (مولانا عبداللہ خالد ٹیٹی)۔

......"ومن واجبات المجتمع وأصحاب المنازل والآباء أن يهتموا بالمصابين بالأمراض اهتماماً بالغاً من ملاطفة وعلاقة ورحمة ورفق وعطف كما تحضر الشريعة على هذه الأعمال الحسنة ويعامل مع المريض معاملة حسنة لئلا يفزع ولا يتطرق إليه أي قلق واضطراب ويعيش حياة طيبة" (نوازل فقہیہ معاصرۃ)۔

......"وإن كان رضيعاً فليس على أمه أن ترضعه، ولأنها عساها لا تقدر عليه لعذر بها فلا معنى للجبر عليه، وقيل في تأويل قوله تعالى: "ولا تضار والدة بولدها" بإلزامها الإرضاع مع كراهتها، وذلك إذا كان يوجد من ترضعه أما إذا كان لا توجد من ترضعه تجبر الأم على الإرضاع صيانة للصبي عن الضياع" (ہدایہ ۲/۴۴۴) (محمد عمران ندوی)۔

دماغی اور جسمانی طور پر معذور بچوں کے بارے میں دوسرا موقف:

اس بارے میں دوسرا موقف یہ ہے کہ ماں باپ کا اس طرح بچے کو ہسپتال میں داخل کردینا اولاد کے ساتھ نابرابری، اسے جان بوجھ کر ضائع کرنا، حد درجہ سنگ دلی اور سفاکیت اور پرورش کی ذمہ داری سے راہ فرار اختیار کرنا ہے، اس لئے اس کی اجازت نہیں دی جاسکتی اس موقف کو مندرجہ ذیل حضرات نے اختیار کیا ہے:

مولانا محمد الیاس قاسمی، مولانا محمد آصف پالنپوری، مفتی ڈاکٹر شاہجہاں ندوی، مولانا احسن عبدالحق ندوی، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی۔

جبکہ مولانا محمد شفیق قاسمی، مفتی عارف کنجروی، مفتی غلام اللہ کاوی والا، مفتی محمد حذیفہ داحودی اور مولانا جہانگیر حیدر قاسمی نے اس سوال کے جواب سے صرف نظر کیا ہے اور خاموشی اختیار کی ہے۔

البتہ مانعین میں مفتی آصف پالنپوری نے اس قید کا اضافہ کیا ہے کہ وقتی طور پر تو بچہ کو ہسپتال میں رکھا جاسکتا ہے، مستقل نہیں، اور مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی کہتے ہیں کہ اگر ہسپتال کے اخراجات اور کفالت ماں باپ برداشت کرتے ہیں تو اس کو راہ فرار نہیں کہا جائے گا۔

مانعین کے دلائل:

......''قد خسر الذين قتلوا أولادهم سفهاً بغير علم وحرموا ما رزقهم الله افتراء على الله قد ضلوا وما كانوا مهتدين'' (انعام: ۱۴۰)۔

......''ولا تقتلوا أولادكم خشية إملاق نحن نرزقهم وإياكم إن قتلهم كان خطأ كبيراً'' (اسراء: ۳۱) (مولانا محمد احسن عبد الحق ندوی)۔

......''يا أيها الذين آمنوا لا تخونوا الله والرسول وتخونوا أماناتكم وأنتم تعلمون'' (سورہ انفال: ۲۷)۔

......''وبشر الصابرين الذين إذا أصابتهم مصيبة قالوا إنا لله وإنا إليه راجعون'' (بقرہ: ۱۵۵)۔

......''أو أملك لك إذا نزع الله من قلبك الرحمة'' (بخاری ۲/ ۸۸۷) (مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی)۔

......''أدبوا أولادكم وأحسنوا أدبهم'' (ابن ماجہ)۔

......''من لا يرحم لا يرحم'' (بخاری حدیث نمبر: ۵۹۹۷)۔

......''ما من مصيبة تصيب المسلم إلا كفر الله بها عنه حتى الشوكة يشاكها'' (بخاری، حدیث نمبر: ۵۶۹۰، مسلم حدیث: ۲۵۷۲)۔

......''من يرد الله به خيراً يصيب منه'' (بخاری حدیث نمبر: ۵۶۹۵)۔

......''من وسع على مكروب كربة في الدنيا وسع الله كربة في الآخرة'' (صحیح ابن حبان حدیث نمبر: ۵۳۹، مسند احمد، حدیث نمبر: ۷۷۵۱)۔

......علموا أولادكم الخير وأدبوهم'' (حدیث)۔

......''سؤوا أولادكم بامتثال الأوامر واجتناب النواهي فذلك وقايتهم من النار'' (مذکورہ دلائل مفتی ڈاکٹر ڈ شاہجہاں ندوی کے مقالہ سے ماخوذ ہیں)۔

......''أدبوا أولادكم على ثلاث خصال حب نبيكم وحب أهل بيته وتلاوة القرآن فإن حملة القرآن في ظل عرش الله يوم لا ظل إلا ظله'' (بحوالہ تربیت اولاد کا اسلامی نظام/ ۱۱۸) (ماخوذ از مقالہ: مفتی آصف پالنپوری)۔

مذکورہ دلائل اور مزید فقہاء کی عبارتوں کو سامنے رکھتے ہوئے ان حضرات مانعین نے دماغی اور جسمانی طور سے مریض بچوں کو کسی ہسپتال یا بے بی سینٹر میں داخل کر کے چھوڑ دینے کو ممنوع اور ذمہ داری سے راہ فرار اختیار کیا جانا قرار دیا ہے۔

☆ ☆ ☆

عرض مسئلہ:

اسلام میں بچوں کے حقوق

(سوال الف، ب، ج)

مولانا رحمت اللہ ندوی[1]

الحمد لله، والصلوة والسلام على رسول الله، وعلى آله وصحبه ومن والاه، وبعد!

اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کے چوبیسویں فقہی سمینار کے زیر بحث موضوعات میں ایک اہم موضوع ''اسلام میں بچوں کے حقوق'' ہے، جس کے سوال (الف، ب، ج) کا عرض پیش کرنے کے لیے ناچیز کا انتخاب ہوا ہے، اس موضوع پر اکیڈمی کو کل ۳۳ مقالات موصول ہوئے، جن میں اکثر تفصیلی ہیں اور بعض بہت مختصر، تمام مقالات بحث وتحقیق اور محنت وجانفشانی کے ساتھ تحریر کیے گئے ہیں، اور درست نتیجہ اور بہتر رائے تک پہنچنے کی کوشش کی گئی ہے، مقالہ نگار حضرات کے اسماء گرامی یہ ہیں:

قاضی عبدالجلیل قاسمی، مفتی راشد حسین ندوی، مولانا خورشید انور اعظمی، ڈاکٹر محمد شاہجہاں ندوی، مفتی محفوظ الرحمن شاہین جمالی، حافظ کلیم اللہ عمری مدنی، مولانا مبارک حسین ندوی، مولانا شاہد علی قاسمی، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مفتی تنظیم عالم قاسمی، مفتی محمد عثمان بستوی، مفتی محمد منصف بدایونی، مولانا محمد عمران ندوی، مفتی عبداللہ کاوی والا، مولانا احسن عبدالحق ندوی، مفتی غلام اللہ کاوی والا، مولانا نعیم اختر قاسمی، مولانا محمد حذیفہ داحودی، مولانا عبداللہ خالد لوناواڑی، مولانا عبدالتواب انادی، مفتی آصف پالنپوری، مولانا خبیب قاسمی، مفتی عارف کنجروی، مفتی لطیف الرحمن فلاحی، مولانا سید قمر الدین محمود قاسمی، مفتی محمد الیاس قاسمی، مفتی محمد شفیق، قاضی محمد ریاض ارمان قاسمی، مفتی محمد اخلاق حسین قاسمی، قاضی محمد کامل قاسمی، مفتی صادق پٹیل دیولوی، مولوی اکرم رشید لوناواڑہ (متعلم المعهد العالی الاسلامی حیدرآباد) اور راقم الحروف رحمت اللہ ندوی۔

سوال الف:

بچوں کے حق پرورش (حق حضانت) کے سلسلہ میں اسلام کی بنیادی ہدایات کیا ہیں؟ نیز عمر کے جس مرحلہ میں ماں کو یا باپ کو پرورش کا اولین حقدار تسلیم کیا گیا ہے، اگر بچہ کو اس کے حوالہ کرنے میں تعلیمی، تربیتی، جسمانی یا نفسیاتی پہلو سے بچہ کے لیے مضرت کا اندیشہ ہو تو حق پرورش کے سلسلہ میں کیا حکم ہوگا، اور وہ کیا صورتیں ہوسکتی ہیں جب بچوں کے مفاد میں کسی مرد یا عورت کو حق پرورش سے محروم کیا جاسکتا ہے؟

تمام مقالہ نگار حضرات اس پر متفق ہیں کہ بچوں کے حق پرورش کے سلسلہ میں اسلام کی بنیادی ہدایات یہ ہیں:

☆ حضانت (حق پرورش) شرعاً واجب ہے، اگر دیکھ بھال نہ کرنے کی وجہ سے بچہ کے ضائع ہوجانے کا اندیشہ ہو اور پرورش کرنے والی ایک ہی عورت موجود ہو تو حضانت اس پر واجب عینی ہے، اور اگر چند ہوں تو واجب کفائی ہے۔

☆ پرورش میں بچہ اور پرورش کنندہ دونوں کی رعایت ہوگی، البتہ بچہ کی رعایت کرنا مقدم ہوگا۔

☆ پرورش کے لیے ماں کو عام حالات میں مجبور نہیں کیا جائے گا، البتہ اگر پرورش کے لیے دوسری عورت موجود نہ ہو یا موجود تو ہو لیکن بچہ اسے قبول نہ کرتا ہو، یا باپ کے پاس اجرت حضانت ادا کرنے کے لیے مال نہ ہو تو ان صورتوں میں ماں کو حضانت کے لیے مجبور کیا جائے گا۔

☆ لڑکا ماں کے پاس اس وقت تک رہے گا جب تک وہ خود اپنی بنیادی ضروریات مثلاً کھانا پینا اور استنجاء وغیرہ پوری کرنے کے لائق نہ ہوجائے، فقہاء نے اس کا اندازہ سات..... آٹھ سال کی عمر سے کیا ہے، جبکہ لڑکی بالغہ یا قریب البلوغ ہونے تک ماں کے پاس رہے گی۔

☆ حضانت کا دارومدار بچہ کے ساتھ شفقت ومحبت اور اس کی مناسب تربیت پر ہے، لہٰذا عمر کے جس مرحلہ میں ماں یا باپ کو حق حضانت حاصل ہے اگر اس

---

[1] استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ۔

مدت میں بچہ کے ضائع ہوجانے یا اس کو ضرر لاحق ہونے کا اندیشہ ہو تو بچہ کو اس کے حوالہ نہیں کیا جائے گا۔

☆ زوجین کے درمیان رشتۂ ازدواج قائم ہونے کی صورت میں، بچہ ماں باپ دونوں کی شفقتوں سے لطف اندوز ہوگا، اور تفریق ہوجانے کی صورت میں ماں حضانت کی حقدار ہوگی۔

☆ بچہ کی جسمانی نشوونما اور اس کے لیے متوازن غذا کی فراہمی، پیار ومحبت والا سلوک، اخلاقی قدروں کو پامال کرنے والے امور سے اجتناب، تعلیمی وتربیتی پہلو کا خیال "حضانت" کے بنیادی عناصر ہیں، اگر ان میں سے تمام یا بعض امور کا فقدان ہو تو حق پرورش ساقط ہوجاتا ہے۔

☆ فقہاء کرام نے پرورش کرنے والوں کے لیے کچھ شرطیں مقرر کی ہیں تاکہ بچوں کا پورے طور پر تحفظ ہوسکے، مثلاً عاقل، بالغ، آزاد، امانت دار، قدرت رکھنے والا ہونا، اور عورت ہے تو کسی اجنبی کی زوجیت سے خالی ہونا۔

حق پرورش ساقط ہونے کی جو صورتیں ذکر کی گئی ہیں، ان سب کا خلاصہ وہی ہے جو کہ سوالنامہ میں مذکور ہے، یعنی ہر وہ صورت جس میں تعلیمی، تربیتی، جسمانی یا نفسیاتی پہلو سے بچہ کو مضرت کا اندیشہ ہو، تمام مقالہ نگار حضرات نے اجمال یا تفصیل کے ساتھ وہ صورتیں ذکر کی ہیں، مثلاً مجنون، معتوہ، فاتر العقل ہونا، ٹی بی، ایڈز، جذام یا برص جیسے کسی متعدی مرض میں مبتلا ہونا، فسق وفجور مثلاً زنا، قحبہ گری، بیئر بار، چوری، ڈکیتی، ناچ گانا، نوحہ خوانی وغیرہ امور میں مصروف رہنا، یا نابینا ہونے کی وجہ سے خود اپنی ضرورت پوری کرنے میں دوسروں کا محتاج ہونا، یا کثرت عبادات کی وجہ سے بچہ کی صحیح دیکھ ریکھ نہ کرپانا وغیرہ وغیرہ۔

استدلال کتب فقہ وفتاوی کے "باب الحضانۃ" کی عبارات اور رضاعت وپرورش سے متعلق آیات واحادیث سے ہے۔

سوال ب (۱):

اسلام میں بچوں کے حق تعلیم وتربیت کے بارے میں کیا بنیادی ہدایات ہیں؟

اس سلسلہ میں باتفاق آراء اسلام کی بنیادی ہدایات کا خلاصہ اور نچوڑ یہ ہے:

ایمان وعقائد کے اصول اور ارکان اسلام کا علم، اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معرفت، والدین کے حقوق سے واقفیت، نماز کی کیفیت کا علم، مبادیات دین کی تعلیم، عبادات کی ترغیب، حلال وحرام کی تفہیم، قرآن مجید کی تعلیم، کلمہ طیبہ، دعائے ماثورہ، محبت رسول، اطاعت نبی، آل بیت کی محبت اور قرآن مجید کی تلاوت سے شغف، سیرت رسول، سیرت صحابہ وصحابیات کی تعلیم اور مختلف مواقع، مناسبات اور حالات کے آداب واخلاق سکھانا، بچوں کے حقوق اور والدین کے واجبات میں ہے، ان امور میں بچہ اور بچی میں کوئی تفریق نہیں۔

سوال ب (۲):

دینی تعلیم کی مقدار اور عصری تعلیم کی حد کیا ہے؟

اس سوال کے جواب میں تمام مقالہ نگار حضرات متفق ہیں کہ:

☆ والدین اور سرپرستوں پر بچوں اور بچیوں کو اتنی دینی تعلیم دینا ضروری ہے جس سے وہ اللہ ورسول کی معرفت حاصل کرسکیں، ان کا ایمان وعقیدہ درست ہوجائے، اور ضروری اور بنیادی احکام شریعت سے واقف ہوکر ان کو انجام دینے کے اہل ہوسکیں، اسی طرح عصری تعلیم اتنی حد تک دینا ضروری ہے جو باعزت زندگی گزارنے اور روزمرہ کی زندگی کے جملہ امور بحسن وخوبی انجام دینے کے لیے ناگزیر ہے، البتہ علوم شرعیہ مقدم ہے۔

- مفتی شاہجہاں ندوی نے تفصیل کے ساتھ اس پر دلائل قائم کیے ہیں، اور مذاہب اربعہ کی کتب سے بھی استدلال کیا ہے۔
- مفتی محمد الیاس قاسمی نے دلائل کے ساتھ عصری تعلیم کی ضرورت پر اچھی بحث کی ہے، اور یہ بتایا ہے کہ اسلام میں دینی ودنیوی علوم کی کوئی تقسیم نہیں کی گئی ہے، بلکہ علم کی دو ہی قسمیں ہیں: علم نافع اور علم غیر نافع۔ جو علم انسانیت کے لیے مفید اور کارآمد ہو وہ علم نافع ہے اور جو اس کے برعکس ہو وہ غیر نافع ہے، پھر بہت سے ایسے دلائل پیش کیے ہیں جو جدید علوم اور عصری تقاضوں کو سامنے رکھ کر حاصل کیے جانے والے علوم پر دلالت کرتے ہیں۔
- مفتی لطیف الرحمن فلاحی نے مذکورہ بالا رائے سے اتفاق کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ بچیوں کو بقدر ضرورت دنیوی تعلیم کے حصول کے بعد مزید اونچی تعلیم

دلوانے کی غرض سے کالج میں داخل کروانا اور ڈگریاں حاصل کروانے کی اجازت نہیں ہے، کیونکہ اس میں نفع سے کہیں زیادہ نقصان ہے، مولانا سید قمر الدین قاسمی کی بھی یہی رائے ہے۔

جبکہ مولانا محفوظ الرحمن شاہین کا کہنا ہے کہ بچیوں کی عصری تعلیم کے سلسلہ میں باپ کو زیادہ حساس رہنا پڑے گا، اور بچے، بچیوں کے مخلوط اور آزاد ماحول والی تعلیم گاہوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں سے الگ مخصوص طور پر گرل کالجوں میں ہی تعلیم دلانا ہوگا تا کہ ان کی دینی اور اخلاقی زندگی بگاڑ سے محفوظ رہ سکے۔

- ناچیز کے نزدیک ان حضرات کی رائے زیادہ مناسب ہے جو اختلاط سے دور رکھ کر بچیوں کو بھی اعلیٰ تعلیم دلانے کی اجازت دیتے ہیں، کیونکہ عورتوں میں بھی مختلف علوم کی ماہرات کی ضرورت ہوتی ہے، اگر چہ اس کی حیثیت واجب کفائی کی ہے۔

چند دلائل:

۱۔ ''طلب العلم فريضة بقدر الشرائع وما يحتاج إليه الأمر لابد منه من أحكام الوضوء والصلاة وسائر الشرائع ولأمور معاشه، وما وراء ذلك ليس بفرض، فإن تعلمها فهو أفضل، وإن تركها فلا إثم عليه. كذا في السراجية'' (ہندیہ ۵/ ۳۷۷) (مفتی راشد حسین ندوی، مفتی منصف بدایونی)۔

۲۔ ''لو استأجر لتعليم ولده الكتابة أو النجوم أو الطب أو التعبير جاز بالاتفاق'' (ہندیہ ۴/ ۴۴۸)۔

۳۔ ''ويسلمه في صناعة، لأنه من جاب تثقيفه واستجلاب المنافع له'' (الجوہرۃ النیرۃ ۱/ ۳۵۵) (مفتی شاہجہاں ندوی)۔

۴۔ ''وينبغي أن يعلمه أيضا من أمور الدنيا وما يحتاج إليه من السباحة والرمي وغير ذلك مما ينفعه في كل زمان بحسبه، قال عمر رضي الله عنه: ''علموا أولادكم السباحة والرماية ومروهم فليثبوا على الخيل وثبا'' (الموسوعة الفقهية ۱۳/ ۱۲) (مولانا خورشید انور اعظمی)۔

۵۔ ''واصنع الفلك بأعيننا''، ''إن أفضل الكسب كسب الرجل يده۔'' (مسند أحمد)، ''إن الله يحب العبد المحترف'' (الترمذی) (یہ دلائل مفتی محمد عثمان بستوی نے دیئے ہیں)۔

سوال ب (۳):

اگر حکومت کسی سطح تک کی تعلیم بچوں اور بچیوں کے لیے لازم قرار دے تو کیا شرعاً اس کی پابندی مسلمانوں کے لیے لازم ہے؟

اس سوال کے جواب میں مفتی راشد حسین ندوی اور مفتی محمد شفیق نے کوئی رائے ظاہر نہیں کی ہے، حافظ کلیم اللہ عمری نے مطلق لزوم کا موقف اختیار کیا ہے۔

جبکہ مولانا احسن عبدالحق ندوی، مولانا محمد عمران ندوی، قاضی محمد کامل قاسمی، مفتی آصف، مولانا شاہد علی قاسمی نے عدم لزوم کی رائے اختیار کی ہے۔

مولانا احسن عبدالحق ندوی نے آیات قرآنیہ "إنما يخشى الله من عباده العلماء"، "اقرأ باسم ربك الذي خلق" اور حدیث نبوی "من سلك طريقا يلتمس فيه علما سهل الله له طريقا إلى الجنة" سے استدلال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان تمام دلائل میں علم سے مراد وہ علم ہے جو معرفت الٰہی کا زینہ ہو اور اسم رب سے جڑا ہوا ہو، ورنہ حقیقت میں وہ علم کہلانے کا مستحق نہیں۔

مولانا شاہد علی قاسمی کا کہنا ہے کہ ہندوستان کے پس منظر میں اس سے موافقت زہر ہلاہل ہے، دینی مدارس کا کردار متاثر ہوگا، سیکڑوں مدارس بند ہو جانے کا اندیشہ رہے گا، ہندوستانی مسلمانوں کا دین وایمان خطرہ میں پڑ جائے گا، اگر حکومت اس طرح کا کوئی قانون بناتی ہے تو اس کی مخالفت ناگزیر ہوگی اور اس کے خلاف آواز اٹھانا پوری ملت کی ذمہ داری ہوگی۔

مفتی اخلاق حسین قاسمی، قاضی محمد ریاض ارمان قاسمی اور مولانا خبیب یوسف قاسمی کا کہنا ہے کہ شرعاً تو لازم نہیں لیکن قانوناً لازم ہے۔

ان حضرات کا کہنا ہے کہ دینی تعلیم میں فرائض کی حد تک لزوم ہے، دوسری تعلیم میں عمل کی گنجائش ہے، لیکن لزوم نہیں ہے، اس پر عمل کرنا مسلمانوں کے لیے بحیثیت شریعت لازم نہ ہوگا۔ البتہ مکمل قانون کی حیثیت سے لازم ہوگا، بشرطیکہ وہ تعلیم کفر وشرک کی نہ ہو اور اس کا اخلاقیات پر اثر نہ پڑتا ہو۔

مولانا خبیب قاسمی نے لکھا ہے کہ شرعاً پابندی کرنا تو لازم نہیں البتہ دفع مضرت اور بہت سے مواقع پر حکومت کی طرف سے عائد کردہ قوانین کے تحت اپنے نجی حقوق کی وصولیابی کی غرض سے اس سطح تک تعلیم اپنے بچوں کو دلوائی جاسکتی ہے۔

☆ مذکورہ بالا حضرات کے علاوہ دیگر حضرات کا اس پر اتفاق ہے کہ اگر حکومت بچوں اور بچیوں کی تعلیم کسی سطح تک لازم قرار دے اور وہ تعلیم شرعی اصول سے متصادم نہ ہو، اور کوئی بات ایمان وعقیدہ یا اخلاقیات کے منافی یا بے راہ روی وانحراف کا باعث نہ ہو تو شرعاً اس کی پابندی مسلمانوں پر لازم ہوگی، ان حضرات کا موقف دلائل کی قوت وکثرت اور مبنی برحق ہونے کی وجہ سے راجح ہے۔

دلائل:

۱۔ ''طاعة الإمام فيما ليس بمعصية فرض'' (بدائع ۷/ ۱۴۰) (مفتی شاہجہاں ندوی)۔

۲۔ في شرح الجواهر: ''تجب إطاعته فيما أباحه الدين وهو ما يعود نفعه إلى العامة كعمارة دار الإسلام والمسلمين وما تناوله الكتاب والسنة والإجماع'' (رد المحتار ۱۱/ ۶۷) (مولانا خورشید انور اعظمی)۔

۳۔ ''إن الذين يخالفون القانون الذي يحفظ الحقوق ويقر العدل ويقيم ميزانه. هؤلاء يعتبرون شرعاً مخالفين للدين نفسه، لأن الدين يأمر بطاعة مثل هذه القوانين التنظيمية ما دامت بالمعروف وفي غير معصية'' (فتاوی معاصرہ للقرضاوی/ ۵۹۷ د) (مفتی تنظیم عالم قاسمی)۔

۴۔ ''يا أيها الذين آمنوا أوفوا بالعقود'' ... والظاهر عموم العقود في كل ربط يوافق الشرع سواء كان إسلاميا أو جاهليا'' (بحر محیط)۔

وجہ استدلال یہ ہے کہ دنیا کے ہر ملک کا باشندہ اس ملک کے قانون سے وفاداری کا معاہدہ کر کے ہی وہاں کے حقوق شہریت حاصل کرتا ہے، اس لیے حکومت کی طرف سے کسی سطح تک کی تعلیم کے لازم ہونے کی پابندی مسلمانوں کو بھی کرنی پڑے گی، قانون کی خلاف ورزی موجب سزا اور باعث تذلیل ہوگی۔

''ولكونه عرضا للنفس لعقوبات قانونية إذا كانت الحكومة غير إسلامية'' (تكملة فتح الملهم ۱/۵۹۰)۔

یہ دونوں دلائل مولانا شاہین جمالی کے ہیں، ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ حکومت کے جبری نظام تعلیم میں دینی، اخلاقی اعتبار سے مضرت رساں مواد شامل ہو تو اس کے ازالہ کی خاطر علاحدہ پرائیویٹ تعلیم گاہ قائم کرنا ضروری ہے، جیسا کہ یورپین وافریقن ممالک میں مسلمانوں نے کر رکھا ہے۔

سوال ب (۴):

کیا جنس کی تعلیم بھی بچوں کا حق ہے جیسا کہ آج کل کہا جارہا ہے، اس سلسلہ میں اسلام کی ہدایات کیا ہیں؟

اس سوال کے جواب میں جو آراء بالاتفاق آئی ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے:

☆ جنسیات سے متعلق جو احکام ومسائل قرآن وحدیث اور کتب فقہ وفتاوی میں موجود ہیں، ان کی تعلیم بچوں اور بچیوں کو ان کی عمر اور شرم وحیا کا پاس ولحاظ رکھتے ہوئے، غیر مخلوط طریقہ پر دی جائے گی، البتہ لڑکوں کو مرد اور لڑکیوں کو عورتیں یہ احکام بتائیں، لیکن اس کی ضرورت بلوغ کے بعد یا عند البلوغ ہے، اس کے لیے اس نام پر علاحدہ نصاب تیار کرنے یا پیریڈ مقرر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

☆ جنسی تعلیم نہ بچوں کا حق ہے اور نہ اس عمر میں ان کو ضرورت ہے، اس کے بجائے انہیں اخلاقیات کی تعلیم وتربیت دی جانی چاہیے۔

☆ آج کل جس جنسی تعلیم کا مطالبہ ہو رہا ہے وہ فحاشی وبے حیائی کا ذریعہ اور جنسی انحراف وبے راہ روی کا سبب ہونے کی وجہ سے اسلامی تعلیمات کے بالکل مغائر ہے اور اسلام میں قطعاً اس کی گنجائش نہیں ہے، خواہ کسی بھی خوشنما اور پرکشش عنوان سے پیش کیا جائے، فطری تقاضوں کی تکمیل کے طریقے عمر اور وقت پر خود سیکھ لیے جاتے ہیں، فطرت خود رہنمائی کرتی ہے، مچھلی کو تیراکی اور پرندہ کو ہوابازی سکھانے کی ضرورت نہیں ہوتی، اس مسئلہ پر اسلامک فقہ اکیڈمی کا فیصلہ آچکا ہے۔

جنسی تعلیم کے سلسلہ میں اسلام کی بنیادی تعلیمات کا خلاصہ یہ ہے کہ:

☆ قبل از بلوغ بچوں اور بچیوں کے سامنے جنسی مسائل اور امور کا ذکر نہ کیا جائے، اور نہ ان کے سامنے ماں باپ اس قبیل کا کوئی ایسا عمل کریں جس کا منفی اثر ان کے ذہن ودماغ پر پڑے۔

☆ جب بچہ اور بچی باشعور ہوجائیں تو ان کا بستر الگ کردیا جائے، اور ایسے ماحول اور صحبت سے دور رکھا جائے جس سے وہ بے راہ روی کی طرف جاسکتے ہیں، اسی طرح ان کو ان آلات سے دور رکھا جائے تو مخرب اخلاق ہونے کے ساتھ مفسد بھی ہیں۔

☆ گناہوں کی شناعت اور سزا بیان کی جائے اور نیک کاموں کی ترغیب دی جائے تاکہ نیکی کی رغبت اور بدی سے نفرت پیدا ہو، آداب کی تعلیم دی جائے اور اخلاقی تربیت کی جائے۔

☆ بلوغ کے بعد جنسی احکام وامور کی تعلیم عمر اور ضرورت کے لحاظ سے دی جائے، الفاظ کنائی اور مہذب استعمال کیے جائیں، بچوں کو مرد اور بچیوں کو عورتیں ان کے مخصوص مسائل بتائیں۔

سوال ج:

نکاح کے بارے میں بچوں اور بچیوں کے کیا حقوق ہیں؟ اس سلسلہ میں ہمارے سماج میں افراط وتفریط پائی جاتی ہے، ایک طرف بہت کم عمری میں نکاح کردیا جاتا ہے اور دوسری طرف بالغ ہونے کے بعد غیر معمولی تاخیر کی جاتی ہے، اس سلسلہ میں اسلامی تعلیمات اور شرعی ہدایات کیا ہیں؟

اس سوال کے جواب میں تمام آراء متفق ہیں کہ:

☆ اخلاقی بگاڑ، جنسی بے راہ روی اور غیر شرعی تعلق سے محفوظ رکھنے کے لیے اسلام کی تعلیم اور ہدایت بچوں اور بچیوں کے اولیاء کے لیے یہ ہے کہ جب وہ جوان ہوجائیں تو ان کی شادی جلد از جلد کفو میں کردیں، بغیر کسی سخت مجبوری اور معذوری کے ان کے نکاح میں تاخیر ہرگز نہ کریں، ورنہ ان کے گناہ میں مبتلا ہونے کی وجہ سے اولیاء بھی گنہگار ہوں گے۔

☆ اگر بلوغ سے قبل ہی مناسب رشتہ مل جائے تو بھی نکاح کردینا چاہیے، بچپن کے غیر موزوں نکاح کی تلافی اور اس کا حل اسلامی شریعت میں موجود ہے۔

☆ بوجہ مصلحت اگرچہ کم سنی کے نکاح کا جواز ہے لیکن نہ اس کی ترغیب دی گئی ہے اور نہ پسندیدہ سمجھا گیا ہے اور نہ ہی عام حالات میں اس کی ضرورت ہے، بہتر اور پسندیدہ نکاح بلوغ کے بعد ہے۔

☆ بلا وجہ نکاح میں تاخیر سے جہاں سماجی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں، وہیں جسمانی، نفسیاتی اور روحانی نقصان بھی پہنچتا ہے۔

☆ معاشی حالت کی درستگی اور معیار زندگی کی بلندی کے لیے نکاح میں غیر معمولی تاخیر کی اجازت نہیں، یہ ایک نامعقول بات اور بہت سے مفاسد کا ذریعہ ہے۔

☆☆☆

عرض مسئلہ:

اسلام میں بچوں کے حقوق

(سوال نمبر د)

مفتی تنظیم عالم قاسمی [1]

الحمد لله رب العالمين والصلوة والسلام على سيد المرسلين و على اله و صحبه اجمعين اما بعد! قابل قدر حضرات علمائے کرام، اصحاب علم وفن، ارباب افتاء وفقہ!

اسلام میں بچوں کے حقوق کے سوال نمبر (د) کا عرض مسئلہ احقر کو سپرد کیا گیا تھا، اس موضوع سے متعلق ۳۳ مقالات مجھے موصول ہوئے جن کے اسماء گرامی درج ذیل ہیں:

ڈاکٹر شاہ جہاں ندوی، مفتی آصف یاسین پالنپوری، مفتی غلام اللہ کاوی والا، مفتی راشد حسین ندوی، مفتی عبداللہ کاوی والا، مولانا حافظ کلیم اللہ عمری، مولانا رحمت اللہ ندوی، مولانا عبدالتواب اناوی، مفتی لطیف الرحمن ممبئی، مفتی عارف کنجروی، مولانا حبیب یوسف قاسمی، مولانا عبداللہ خالد لوناواڑی، مفتی محمد شفیق صاحب، مفتی محمد اخلاق حسین قاسمی، قاضی محمد ریاض ارمان قاسمی، مولانا محمد عمران ندوی، مفتی صادق پٹیل دیولوی، مفتی شاہد علی قاسمی مولانا محمد احسن عبدالحق ندوی، قاضی محمد کامل قاسمی، مولانا سید قمر الدین محمود قاسمی، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مفتی محمد الیاس قاسمی، مولانا مبارک حسین ندوی، مفتی محمد منصف بدایونی، قاضی عبدالجلیل قاسمی، مولانا محمد حذیفہ داحودی، مفتی تنظیم عالم قاسمی، مفتی محمد عثمان بستوی، مولانا نعیم اختر قاسمی، مولانا خورشید انور اعظمی، مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی۔

سوال نمبر (د) کے تین جزئیات ہیں:

پہلا جزئیہ ہے کہ بچہ مزدوری کے بارے میں اسلام کا موقف کیا ہے؟ اس سوال کے جواب میں تقریباً ۲۶ر مقالہ نگار حضرات نے تحریر فرمایا ہے کہ بچہ قابل رحم اور لائق شفقت ہوتا ہے، شفقت کا تقاضا یہ ہے کہ اس کی حسب استطاعت بہتر تعلیم کا انتظام کیا جائے اس کی اچھی تربیت کی جائے ذہنی اور جسمانی نشو ونما کو بہتر سے بہتر بنانے کی سعی کی جائے تا کہ ان کا مستقبل روشن ہو اور وہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہو سکیں۔ اسی لئے احادیث میں اولاد کو تعلیم و تربیت دینے کی سخت تاکید کی گئی ہے اور متعدد روایات میں باپ کو مخاطب کر کے کہا گیا ہے کہ وہ اپنے بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھائے ان کو ادب اور تہذیب سے آراستہ کرے کہ یہ ان کے لئے باپ کی طرف سے بہترین عطیہ ہے۔ اسی حکمت اور مصلحت کے پیش نظر ان کا نان نفقہ اور تمام اخراجات کی تکمیل کی ذمہ داری باپ اور دیگر اولیاء پر یکے بعد دیگرے رکھی گئی ہے تا کہ بچہ کسب معاش کی فکر سے بالکل آزاد رہے اور مکمل انہماک کے ساتھ وہ تعلیم حاصل کر سکیں، بچوں کو اگر مزدوری یا کسب معاش سے وابستہ کر دیا جائے تو اس سے ان کی زندگی تباہ ہو جائے گی قویٰ متاثر ہوں گے اور ذہنی، فکری اور جسمانی اعتبار سے پسماندہ ہو جائیں گے جو بچوں کے لئے نہایت نقصان دہ اور مہلک ہے۔

مفتی لطیف الرحمن ممبئی اور مفتی الیاس قاسمی نے "من لم يرحم صغيرنا ولم يوقر كبيرنا فليس منا" سے استدلال کرتے ہوئے اسے بے رحمی اور بد خواہی سے تعبیر کیا ہے جب کہ مفتی عبداللہ کاوی والا، مولانا عبدالتواب اناوی اور مولانا حبیب یوسف قاسمی نے اسے ضرر عظیم اور ظلم و زیادتی میں شمار کیا ہے۔ مولانا خورشید انور اعظمی نے "لا يكلف الله نفسا إلا وسعها" سے استدلال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ حالت صغر سنی میں مزدوری اور کسب معاش تکلیف مالا یطاق ہے، اسلام نے بچوں کی پرورش تعلیم و تربیت اور ان کی صحت و تندرستی کے لئے جو جامع نظام بنایا ہے اس میں بچہ مزدوری کی کوئی گنجائش نہیں۔ ڈاکٹر شاہ جہاں ندوی نے بچہ مزدوری کو حرام قرار دیتے ہوئے سماج اور بالخصوص حکومت سے سفارش کی ہے کہ اس گھناؤنے عمل کی روک تھام کے لئے ہر ممکن کوشش کی جائے۔

پانچ مقالہ نگار حضرات نے ارشاد نبوی: "لا تكلفوا الصغير الكسب فإنه إذا لم يجد سرق" "من شاق شاق الله عليه" اور فقہی اصول "لا ضرر

---

[1] استاذ حدیث وفقہ دار العلوم سبیل السلام حیدرآباد۔

ولا ضرار" اور بعض نے قرآنی آیت "قوا أنفسكم وأهليكم نارا" وغیرہ سے استدلال کیا ہے جب کہ مفتی عثمان بستوی نے الموسوعۃ الفقہیہ کی یہ عبارت پیش کی ہے:

"ندب الإسلام على الاستغناء والتنزه عن تكليف الصغير بالكسب فقد أخرج مالك من حديث أبي سهيل بن مالك عن أبيه أنه سمع عثمان بن عفان وهو يخطب ويقول لا تكلفوا الأمة غير ذات الصنعة الكسب فإنكم متى كلفتموها ذلك كسبت بفرجها ولا تكلفوا الصغير الكسب فإنه إذا لم يجد سرق وعفوا إذا أعفكم الله" (الموسوعة الفقهية ۲۴۲/۳۴)۔

چھ مقالہ نگار حضرات کی رائے ہے کہ بچہ جب شعور اور کسب معاش کی عمر کو پہنچ جائے خواہ وہ نابالغ ہو مزدوری کرائی جاسکتی ہے بشرطیکہ جسمانی و دماغی قوت متاثر نہ ہو ان حضرات نے ابوداؤد کی روایت: "إن أولادكم من أطيب كسبكم كلوا من كسب أولادكم" اور بعض فقہی عبارتیں پیش کی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر بچوں نے از خود اپنے آپ کو یا اولیاء نے ان کو اجرت پر دیا تو عقد درست ہو جائے گا جیسے بدائع الصنائع کی یہ عبارت ہے: "أن الصبي العاقل لو آجر ماله أو نفسه فإن كان مأذونا ينفذ وإن كان محجورا يتقف على إجازة الولي" (بدائع الصنائع ۱۸/۴)

لیکن اس طرح کی عبارتوں سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ بچوں کا عقد اجارہ درست ہے مگر یہاں مسئلہ جواز اور عدم جواز کا نہیں بلکہ میں جہاں تک سمجھتا ہوں سوال کا مقصد یہ ہے کہ کیا اسلام بچوں کی مزدوری کی حوصلہ افزائی کرتا ہے؛ ظاہر ہے کہ اولاد کی تعلیم و تربیت سے متعلق شریعت نے جو ہدایات دی ہیں اور ان کے اخراجات کی تکمیل کا جو نظام وضع کیا ہے اس سے بچہ مزدوری کی حوصلہ افزائی ہرگز نہیں ہوتی۔

سوال کا دوسرا جزء یہ ہے کہ والدین یا اولیاء نابالغ بچے اور بچیوں سے اپنے گھر کا کام کس حد تک لے سکتے ہیں اور کیا اپنے معاشی ضروریات پوار کرنے یا بہتر بنانے کے لئے مزدوری کرا سکتے ہیں اسی طرح انہیں پیشہ ورانہ کام سکھانے کے لئے کام سے لگا سکتے ہیں یا نہیں؟

اس سوال کی پہلی شق کے جواب میں تمام مقالہ نگار حضرات نے لکھا ہے کہ بقدر استطاعت ایسا کام جس کا تعلق تربیت، تہذیب و تمدن اور طریقہ زندگی کے سیکھنے سے ہو، لے سکتے ہیں۔ جیسے بچوں سے سودا سلف لانے، خرید و فروخت کرنے، پانی بھرنے، کھیت اور باغات کی نگرانی کرنے اور بچیوں سے امور خانہ داری کا کام لینا۔ صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت انسؓ حضرت ابن عباسؓ اور بعض دیگر کمسن صحابہ کرام سے خدمت لیا کرتے تھے۔ اسی طرح ایک عورت نے اپنے بچے سے مختلف طرح کی خدمات لینے کا ذکر کیا مگر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی نکیر نہیں فرمائی۔ (مشکوۃ ر ۲۹۳)

لیکن کام لینے کے درج ذیل شرائط ہیں:

(۱) کام طاقت اور تحمل سے زیادہ نہ ہو۔

(۲) ایسا کام نہ ہو جس سے اس کی صحت اور قویٰ متاثر ہوتے ہوں۔

(۳) ایسا کام نہ ہو جو جسمانی و دماغی نشو و نما میں خلل پیدا کرے۔

(۴) اس طرح خدمت نہ لی جائے جس سے تعلیمی نقصان ہو۔

بعض حضرات کی رائے میں ایسا کام جو تربیت اور تہذیب و تمدن سے متعلق ہو نہ صرف جائز بلکہ بہتر ہے۔

سوال کی دوسری شق تھی کیا والدین اپنی معاشی ضروریات پورا کرنے یا بہتر بنانے کے لیے اپنے بچے یا بچیوں سے مزدوری کرا سکتے ہیں؟

اس سوال کے جواب میں اکثر مقالہ نگار حضرات کی رائے یہ ہے کہ معاش کو بہتر بنانے بلکہ معاشی ضروریات کی تکمیل کے لیے بھی مزدوری کرانا درست نہیں ہے، یہ زمانہ ان کے پڑھنے لکھنے، تعلیم و تربیت کا ہے، انہیں اسی کام کے لیے وقف کر دینا چاہئے، اس سے ان کا مستقبل تابناک ہوگا اور وہ بعد میں کسی کے دست نگر نہیں بنیں گے، اولاد کے ساتھ محبت اور ہمدردی کا یہی تقاضا ہے۔ اگر والدین از خود اپنی معاشی ضروریات پورا نہ کر سکتے ہوں تو رشتہ داروں یا رفاہی اداروں کو چاہئے کہ ان کا تعاون کریں، خاص طور پر حکومت کی ذمہ داری ہے کہ ایسے لوگوں کے لیے وظائف جاری کرے، قاضی محمد کامل قاسمی نے امام خصافؒ کے حوالے سے ایسے وقت لوگوں کے سامنے دست سوال دراز کرنے کی اجازت دی ہے، مفتی محمد منصف بدایونی اور مولانا خورشید انور اعظمی کی رائے ہے کہ معاش

کو بہتر بنانے کے لیے بچوں سے مزدوری کرانے کی کوئی گنجائش نہیں، ہاں البتہ معاشی ضرورت کی تکمیل نہ ہوتی ہو تو تعلیم و تربیت کے ساتھ اس کی اجازت دی جاسکتی ہے۔

مولانا محمد محبوب فروغ احمد قاسمی کی رائے ہے کہ اگر بغرض تربیت اولیاء مزدوری بھی کرانا چاہیں تو گنجائش معلوم ہوتی ہے، اس سے کوئی بحث نہیں کہ یہ مزدوری معاشی ضروریات کی تکمیل کے لئے ہو یا معاش کو بہتر بنانے کے لئے جب کہ سات مقالہ نگار حضرات نے مطلقاً مزدوری کرانے کی اجازت دی ہے بشرطیکہ بچہ اس کا متحمل ہو۔ ان لوگوں نے درج ذیل عبارت استدلال میں پیش کیا ہے:

''فللأب أن يواجر ابنه الصغير في عمل من الأعمال لأن ولايته على الصغير كولايته على نفسه لأن شفقته عليه كشفقته على نفسه وله أن يواجر نفسه فكذا ابنه ولأنه فيه نظراً للصغير''۔ (بدائع، ۴/ ۲۲)

''والأب والجد أبو الأب أو وصيهما إذا آجر الصغير في عمل من الأعمال التي يقدر عليه الصغير جاز'' (ہندیہ، ۴/ ۳۳)

''ولو أراد الأب أن يؤاجرهم أي الذكور في عمل أو أخدمه فله ذلك لأن فيه منفعة للصغير لأنه يتعلم الكسب'' (البحر الرائق، ۱/ ۲۴۲)۔

اس طرح کی دیگر عبارتیں موجود ہیں، لیکن ان تمام میں مزدوری کے جواز کی علت خود بچوں کی منفعت اور ان کی خیر خواہی کو بتایا گیا ہے جیسا کہ "فيه منفعة للصغير لأنه يتعلم الكسب اور ولأنه فيه نظراً للصغير" سے اس کی طرف اشارہ ہے، یہ اس زمانے کی بات ہے جب کہ علوم وفنون کی راہیں کھلی ہوئی نہیں تھیں، وسائل محدود تھے، کسب معاش کے لئے مزدوری، نوکری چاکری اور چھوٹی چھوٹی ملازمتوں کی طرف رخ کرتے تھے، اس وقت کے حالات کے اعتبار سے حضرات فقہاء نے کسب معاش سے لگانے کی اجازت دی تھی تاکہ وہ سیکھ کر مستقبل میں اپنی کفالت پر قادر ہوسکیں، یہی اس زمانے میں ان کے لیے شفقت تھی لیکن آج سیکڑوں وسائل موجود ہیں ٹیکنالوجی اور جدید سائنس نے کسب معاش کی اعلی سے اعلی صورتیں پیدا کردی ہیں، اس لئے دور حاضر میں ان کے ساتھ شفقت ومحبت اور ہمدردی کا تقاضہ ہے کہ مزدوری جیسی گھٹیا چیز میں لگا کر ان کے مستقبل اور امکانی صلاحیتوں کو برباد نہ کیا جائے، ذریعہ معاش اگر تنگ اور محدود بھی ہو پھر بھی ان کے روشن مستقبل کے لئے اس تھوڑی مشقت کو برداشت کر لینی چاہئے کہ اسی میں ان کے ساتھ خیر خواہی ہے۔

سوال کی تیسری شق تھی کہ بچوں اور بچیوں کو کوئی پیشہ ورانہ کام سکھانے کے لئے لگا سکتے ہیں یا نہیں؟

اس کے جواب میں تقریباً تمام مقالہ نگار حضرات نے اثبات میں جواب دیا ہے، اس لئے کہ اس میں بچوں کے لئے نفع اور خیر ہے اور ہر وہ کام جو بچوں کے حق میں مفید اور نفع بخش ہو اس کے جواز میں کوئی کلام نہیں، البتہ لڑکیوں کو پیشہ ورانہ کام سکھانے کے لئے پردے کے اسلامی اصول کی رعایت ضروری ہوگی، بہتر ہے کہ ان کو عورتوں کے پاس بھیج کر کشیدہ کاری، سلائی وغیرہ سکھائی جائے۔ استدلال میں درج ذیل عبارتیں پیش کی گئی ہیں۔

''والثاني أن إجاره في الصنائع من باب التهذيب والتأديب والرياضة وفيه نظر للصبي فيملكه الأب'' (بدائع، ۶/ ۱۰۱)۔

اور شامی کی یہ عبارت: له دفعها لامرأة تعلمها حرفة كتطريز وخياطة مثلاً" (رد المحتار، ۳/ ۶۱۲)۔

ان تمام عبارتوں سے پیشہ ورانہ کام سکھانے کی اجازت واضح طور معلوم ہوتی ہے، البتہ مفتی شاہد علی قاسمی نے یہ مشورہ دیا ہے کہ پیشہ ورانہ کام سکھانے کے ساتھ ان کی تعلیم کا بھی نظم کیا جائے، جب کہ مفتی محمد اخلاق حسین قاسمی اور مفتی لطیف الرحمن مدنی نے لکھا ہے کہ پیشہ ورانہ کام سکھانا اسی وقت درست ہوگا جب کہ بچوں کی تعلیم مکمل ہوچکی ہو یا کسی وجہ سے ان کی تعلیم کا سلسلہ باقی رکھنا ممکن نہ ہو۔ احقر کی رائے یہ ہے کہ اسے والدین اور سرپرستوں کی صوابدید پر چھوڑ دینا چاہئے۔ جذبہ خیر اور جذبہ شفقت ومحبت ملحوظ رکھتے ہوئے انہیں فیصلہ کرنے کا حق ہوگا، اس لئے کہ سب کے حالات یکساں نہیں ہوتے، بعض بچے کند ذہن ہوتے ہیں اور بعض بچوں کو پڑھنے سے دلچسپی نہیں ہوتی، اسی طرح بعض سرپرست مکمل تعلیم دلانے پر قدرت نہیں رکھتے ہیں ایسے وقت میں بچوں کے مستقبل کو بہتر بنانے کے لئے پیشہ ورانہ کام سکھا دینا بہتر ہے۔

سوال کا تیسرا جزئیہ تھا کہ والدین انتہائی غربت اور معاشی بدحالی کی بناء پر بچوں کو مزدوری پر لگاتے ہیں، نہ وہ خود کمانے کے لائق ہوتے ہیں نہ حکومت ان کا تکفل کرتی ہے، ایسے والدین کا نابالغ بچوں کو مزدوری پر لگانا درست ہے یا نہیں اس بابت اسلام کی کیا ہدایات ہیں؟

اس سوال کے جواب میں تین مقالہ نگار کو چھوڑ کر تقریباً تمام مقالہ نگار حضرات کی رائے ہے کہ اگر معاشی بدحالی اتنی بڑھی ہوئی ہو کہ گذر بسر دشوار ہو جائے، ماں باپ غربت سے نڈھال ہوں، بچوں سے مزدوری کرانے کے علاوہ کوئی چارۂ کار نہ ہو تو بچوں کو مزدوری پر لگانا درست ہے بشرطیکہ بچے مزدوری کے متحمل ہوں، ان حضرات نے قرآن کریم کی معروف آیت: "فَلَا تَقُل لَّهُمَا أُفٍّ وَلَا تَنْهَرْهُمَا" سے استدلال کیا ہے کہ کسی بات پر اف کہنے میں جتنی تکلیف ہوتی ہے اس سے کہیں زیادہ والدین کو تنگ دستی کی مشقت میں ڈالنا ہے۔ اسی طرح قرآن کی یہ آیت: "وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوفًا" اور دنیا میں ان دونوں کے ساتھ حسن سلوک کا معاملہ کرو، بھوک و پیاس میں مبتلا رکھنا اور ان کی ضروریات زندگی کی تکمیل نہ کرنا حسن سلوک کے خلاف ہے، بعض حضرات نے فقہی ضابطہ "الضرورات تبيح المحذورات" اور "إذا تعارضا مفسدتان روعی أعظمهما ضرراً بارتكاب أخفهما" سے بھی استدلال کیا ہے۔ اکثر حضرات نے درج ذیل فقہی عبارتیں پیش کی ہیں: "فللأب أن يواجر ابنه الصغير في عمل من الأعمال" (بدائع، ۴/۲۲)۔

''الذكور من الأولاد إذا بلغوا حد الكسب ولم يبلغوا في أنفسهم يدفعهم الأب إلى عمل ليكسبوا''

(هنديه، ۱- ۵۶۳)

''فإن بلغه كان للأب أن يواجره أو يدفعه في حرفة ليكتسب وينفق عليه من كسبه''۔ (شامی ۳- ۶۱۲)

اس طرح کی متعدد عبارتیں ہیں جن سے بچوں کو مزدوری سے لگانے کا جواز معلوم ہوتا ہے بالخصوص جب کہ ماں باپ معذور اور لاچار ہوں اور کسمپرسی کی حالت میں ان کی زندگی گذر رہی ہو۔

البتہ پانچ مقالہ نگار حضرات نے یہ وضاحت کی ہے کہ اگر کوئی شخص معاشی بدحالی کا شکار ہے، پیرانہ سالی، بیماری یا اپاہج ہونے کے سبب خود سے اپنے اخراجات کی تکمیل نہیں کر سکتا تو حکومت کو چاہئے کہ اس کے لیے اتنا وظیفہ جاری کرے جو اس کے لئے اور اس کے زیر کفالت تمام افراد کے لئے کافی ہو، اگر حکومت اپنا فریضہ ادا نہیں کرتی تو خاندان اور رشتہ داروں کو تعاون باہمی سے کام لیتے ہوئے ایسے مجبور افراد کا تعاون کرنا چاہئے جیسا کہ بعض کفارہ کی ادائیگی میں شریعت نے یہی اصول رکھا ہے، اگر ایسا نہ ہو سکے تو بیت المال اور خیراتی ادارے اس ذمہ داروں کو پوری کریں، اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو مسلم معاشرہ اور سماج تکافل اجتماعی کا نظم بنائے، اگر مسلم معاشرہ بھی بے حسی کا شکار ہو جائے تو بدرجۂ مجبوری اپنے نابالغ بچوں کو مزدوری پر بھیج سکتے ہیں۔

مولانا سید قمر الدین محمود قاسمی، مولانا عبد التواب اناوی اور مفتی لطیف الرحمن ممبئی کی رائے ہے کہ ان حالات میں بھی بچوں کو مزدوری پر نہیں بھیجنا چاہئے، بلکہ دست سوال دراز کر کے اپنی ضرورت پوری کرے لیکن ظاہر ہے کہ دست سوال دراز کرنا ہر ایک کی ضمیر گوارہ نہیں کرتا یا وہ بیمار اور اپاہج ہونے کی وجہ سے اس پر قادر نہیں اور اگر وہ ہاتھ پھیلائے بھی تو کیا ضروری ہے کہ ضرورت پوری ہو جائے، اس لئے بہتر ہے کہ خاندان کے افراد اپنی اخلاقی حس کو بیدار کریں اور ایسے افراد کو زکوۃ، صدقات اور دوسری مد سے بھر پور تعاون کریں کہ اس سے انفاق کا ثواب ہوگا اور صلہ رحمی کا بھی، اسی طرح مسلم معاشرے میں ایسے ادارے بھی قائم کئے جائیں جو دبے کچلے اور محتاج افراد کا تعاون کریں۔ جن علاقوں میں ایسی کوئی صورت نہ بن سکے تو اخیر میں بچوں سے مزدوری کرانے کی صورت باقی رہ جاتی ہے تاہم اس وقت بھی کوشش کی جائے کہ مزدوری محض کے بجائے کسی پیشہ ورانہ کام سے لگا دیں جہاں کام سیکھنے کے ساتھ محنت کے پیسے بھی دیئے جاتے ہیں اس سے ضرورت بھی پوری ہوگی اور مستقبل بھی محفوظ رہے گا۔

ہذا ما عندی واللہ اعلم بالصواب

اسلام میں بچوں کے حقوق

(سوال نمبر ھ سے آخر تک)

مولانا راشد حسین ندوی[1]

چوبیسویں فقہی سیمینار کا ایک اہم موضوع ''اسلام میں بچوں کے حقوق'' ہے، اس موضوع کے سوال (ھ) سے آخر تک کے عرض مسئلہ کے لیے راقم کو حکم دیا گیا ہے، سوال (ھ) کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر بچوں سے شرعاً بلوغ سے پہلے قتل وغارت گری، چوری اور زنا جیسے جرائم سرزد ہوں، تو کیا ان پر سزا جاری کی جائے گی، یا نابالغ ہونے کی بناء پر ان کو چھوڑ دیا جائے گا؟

اس موضوع پر عرض مسئلہ کے لیے راقم کو ۳۳ مقالات بھیجے گئے ہیں، دو کو چھوڑ کر بقیہ فاضل نگاروں نے مندرجہ بالا سوال کا جواب دیا ہے، اور سبھی اس بات پر متفق ہیں کہ ان جرائم کی شرعی سزا جاری کرنے کے لیے بلوغ شرط ہے، لہٰذا نابالغ چوری قتل اور زنا جیسے جرائم کا ارتکاب کرے تو اس پر حدود قصاص کا اجراء نہیں ہوسکتا، البتہ جرائم کے سدباب کے لیے اس پر تعزیر کی جائے گی، اس پر استدلال کرتے ہوئے مقالہ نگاروں نے تفصیل کے ساتھ فقہی عبارات نقل کی ہیں، بعض حضرات نے اس حدیث کو بھی پیش کیا ہے، "رفع القلم عن ثلاثة. عن النائم حتى يستيقظ. وعن الصبي حتى يحتلم، وعن المجنون حتى يعقل" (ابوداؤد) (مولانا خورشید انور اعظمی، مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی، مولانا عبد الجلیل قاسمی، مولانا منصف بدایونی، مولانا عبد اللہ خالد لوناواڑی، مولانا حافظ کلیم اللہ عمری مدنی، مولانا ڈاکٹر شاہ جہاں ندوی)

پھر کئی حضرات نے اس پر زور دیا ہے کہ بچوں کے سرپرست بچوں کی تربیت کرتے رہیں، اگر بچہ سے کوئی جرم ہو جائے تو جرم کی نوعیت کے اعتبار سے اس پر زجر و توبیخ کریں، مار پیٹ کی نوبت آخری مراحل میں آنی چاہیے۔ (مفتی آصف، مفتی شاہ جہاں، مفتی غلام اللہ کاوی والا، مفتی عبد اللہ کاوی والا، مولانا حافظ کلیم اللہ عمری مدنی، مولانا حبیب بن یوسف قاسمی، مولانا محمد عمران ندوی، مولانا سید قمر الدین محمود قاسمی، مولانا محمد کامل قاسمی، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مولانا منصف بدایونی، مفتی تنظیم عالم قاسمی، مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی)۔

اکثر مقالہ نگاروں نے وضاحت کی ہے کہ بچے جرائم کے مرتکب ہوں تو ان پر تعزیر کی جائے گی، اس لیے کہ تعزیر کے لیے بلوغ کی شرط نہیں ہے، البتہ یہ تعزیر تادیب کے لیے ہوگی نہ کہ عقوبت کے لیے (مولانا عبد الجلیل قاسمی، مولانا منصف بدایونی، مولانا مبارک حسین ندوی، مفتی الیاس قاسمی، مولانا خورشید انور اعظمی، مولانا نعیم اختر قاسمی)۔

ان حضرات کے دلائل مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) "إلا الصبي العاقل، فإنه يعزر تاديبا لا عقوبة" (بدائع) (مولانا عبد الجلیل قاسمی، مولانا نعیم اختر قاسمی)

(۲) "والتعزير يشرع عليه" (تاتارخانیہ) (مولانا منصف بدایونی)

بعض حضرات نے اس تعزیر کے لیے یہ شرط بھی لگائی ہے کہ بچہ نابالغ ہونے کے باوجود باشعور اور ممیز ہوگیا ہو، چنانچہ غیر ممیز بچہ پر تعزیر جاری نہیں کی جائے گی۔ (مولانا عثمان بستوی، مولانا نعیم اختر قاسمی، مفتی تنظیم عالم قاسمی، راشد حسین ندوی)۔

ان حضرات کا مستدل مندرجہ ذیل عبارات ہیں:

(۱) "أو صبيا بعد أن يكون عاقلا" (بدائع) (مولانا نعیم اختر قاسمی)۔

---

[1] مدرسہ ضیاء العلوم، میدان پور، تکیہ کلاں، رائے بریلی۔

(۲) "بخلاف المجنون والصبی الذی لا یعقل، لأنہما لیسا من أھل العقوبة ولا من أھل التأدیب" (بدائع) (مفتی تنظیم عالم قاسمی، راشد حسین ندوی)

کچھ مقالہ نگاروں نے تعزیر کی کیفیت سے متعلق بھی بحث کی ہے، اور اس میں دو آراء ظاہر کی گئی ہیں:

پہلی رائے: یہ ہے کہ عام حالات میں تین چھڑی سے زیادہ نہ مارا جائے، لیکن بچہ دس سال کا ہو جائے، اور قتل و چوری اور زنا جیسے جرائم کا مرتکب ہو تو اس کو دس کوڑے مارنے کی اجازت ہے، اس سے زیادہ نہیں، اس لیے کہ بخاری میں ہے: "لا یجلد فوق عشر جلدات إلا فی حد من حدود الله" (مفتی عارف کنجروی، مولانا احسن عبدالحق ندوی، مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی، مفتی لطیف الرحمن، مفتی عثمان بستوی)

دوسری رائے: یہ ہے کہ تعزیر کی حد حکومت کی صوابدید پر ہوگی، حالات اور ضرورت کے اعتبار سے حکومت کمی زیادتی کا فیصلہ کر سکتی ہے، اس لیے کہ رد المحتار میں ہے: "والتعزیر مفوض إلی رأی الإمام" (مولانا عبداللہ خالد لوناواڑی، مولانا اخلاق حسین قاسمی، مولانا ریاض ارمان قاسمی)۔

جسمانی تعزیر کے ساتھ کئی حضرات نے مالی ضمان کا بھی ذکر کیا ہے، ان حضرات نے وضاحت کی ہے کہ بچے کسی کا مال ضائع کریں یا چوری کریں تو مال کا ضمان دینا ہوگا، قتل کریں تو عاقلہ پر دیت ہوگی، زنا کریں تو عقر لازم ہوگا۔ (راقم راشد حسین ندوی، مولانا رحمت اللہ ندوی، مولانا عبدالتواب اناوی، مفتی صادق دیولوی، مولانا شاہد علی قاسمی، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مفتی تنظیم عالم قاسمی، مولانا نعیم اختر قاسمی، مفتی عثمان بستوی)

دلائل:

(۱) "الصبی المحجور مؤاخذ بأفعاله، متضمن ما أتلفه من المال للحال، وإذا قتل فالدیة علی عاقلته" (الأشباہ) (مولانا عبدالتواب اناوی، راشد حسین ندوی)۔

(۲) "لکنہما یضمنان المال" (رد المحتار) (مولانا شاہد علی قاسمی)۔

جرائم کے سد باب کے لیے کئی حضرات نے لکھا ہے کہ حکومت نے بلوغت کی عمر اٹھارہ سال مقرر کی ہے، اس کو بدل کر پندرہ سال کیا جائے۔ (مولانا عبدالجلیل قاسمی، مولانا سید قمر الدین محمود قاسمی، مولانا الیاس قاسمی)

مولانا شاہد علی قاسمی اور مولانا الیاس قاسمی نے اضافہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس کے لیے اسباب قریبہ پر پابندی لگائی جائے، بچوں کی اخلاقی تربیت کی جائے، بچوں میں خوف خدا پیدا کیا جائے، مخلوط تعلیم بند کی جائے، شراب پر پابندی لگائی جائے، پردہ کا نظام قائم کیا جائے، فحش لٹریچر اور فلموں پر روک لگائی جائے وغیرہ۔

اس پوری بحث سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگرچہ مقالہ نگاروں نے الگ الگ پہلوؤں کا ذکر کیا ہے لیکن دراصل یہ تمام پہلو اہمیت کے حامل ہیں، بچوں پر گھر والوں کو نظر رکھنی چاہیے، ان کی تربیت کرنی چاہیے، لیکن ظاہر ہے اس کے باوجود ان سے کوئی جرم ہو جائے تو اگر اتلاف مال سے متعلق ہو تو ضمان ہوگا، قتل کا ارتکاب ہو تو عاقلہ پر دیت ہوگی، قابل تعزیر جرم ہو تو تعزیر ہوگی، البتہ تعزیر کی حد کے سلسلہ میں دو آراء آئی ہیں، ایک یہ کہ دس کوڑوں سے تجاوز جائز نہیں، دوسری یہ کہ اس باب میں اختیار حاکم کو ہے، میری رائے میں دوسری رائے راجح ہے، اس لیے کہ فقہاء نے اس کی تصریح کی ہے اور حدیث کی تاویل کی ہے، الدر المختار میں ہے: "والتعزیر لیس فیه تقدیر بل ھو مفوض إلی رأی القاضی (إلی) ویکون التعزیر بالقتل" الخ. (مع حاشیہ شامی: ۱۹۶/۳)۔

راقم سے متعلق سوال (د) کا حاصل یہ ہے کہ مجرمانہ ذہن رکھنے والے بچوں کے لیے جیل قائم ہیں، ان جیلوں میں بچوں سے پر مشقت کام لیا جاتا ہے، اور سخت مار پیٹ کی جاتی ہے، ایسی جیلوں میں موجود نابالغ قیدیوں کے لیے کیا احکام ہیں؟ ان کو کیا سزائیں دی جا سکتی ہیں؟ کیا کام لیے جا سکتے ہیں؟ اور ان کی اصلاح کے لیے کیا تدبیریں اختیار کی جا سکتی ہیں؟

اس سوال کا جواب دیتے ہوئے اکثر مقالہ نگاروں نے لکھا ہے کہ بچوں کو جیل میں رکھا جا سکتا ہے، لیکن ان کو سخت سزائیں دینا ناجائز ہے، سزائیں ان کی قوت برداشت کے مطابق دی جائیں، سخت سزا جس کے نشانات بدن پر پڑیں منع ہے، ان کی اصلاح کے لیے جیلوں میں تعلیم و تربیت

کا نظم کیا جائے، رقاق واخلاق سے متعلق احادیث کی تعلیم کی جائے، پر مشقت کام نہ لیے جائیں، سخت مار پیٹ جب بالغوں کے ساتھ جائز نہیں تو بچوں کے ساتھ اس کی اجازت کیسے ہوسکتی ہے۔ (مفتی عبداللہ کاوی، حافظ کلیم اللہ عمری مدنی، مولانا رحمت اللہ ندوی، مولانا عبدالتواب اناوی، مفتی عارف کنجروی، مفتی محمد اخلاق حسین قاسمی، مولانا محمد عمران ندوی، قاضی محمد ریاض ارمان قاسمی، مولانا شاہد علی قاسمی، مولانا احسن عبدالحق ندوی، مولانا سید قمرالدین محمود قاسمی، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مولانا محمد منصف بدایونی، مفتی تنظیم عالم قاسمی، مولانا نعیم اختر قاسمی، مفتی آصف صاحب پالنپوری، مفتی شاہ جہاں ندوی، مفتی لطف الرحمن قاسمی، راشد حسین ندوی، مولانا کامل قاسمی، مولانا الیاس قاسمی)۔

دلائل:

(۱) "لا یکلف اللہ نفسا إلا وسعها"۔

(۲) غلام کے بارے میں حدیث میں ہے: "ولا یکلف من العمل إلا ما یطیق"۔

(۳) "الخامس أن لا یضرب الصبیان ضربا مبرحا" (ہندیہ) (مفتی الیاس قاسمی)۔

(۴) "وفی المحیط للقاضی: حبس الصبی الفاجر تادیبا" (شامی)۔

(۵) "ولا یجوز الحبس فی مکان یمنع فیه المحبوس الطعام والشراب أو فی مکان حار أو تحت الشمس أو فی مکان بارد أو فی بیت تتوسد نوافذه وفیه دخان" (فتح القدیر) (مفتی تنظیم عالم قاسمی)۔

(۶) "الحبس للصبی بطریق التادیب من لا یتجاسر علی مثله" (مبسوط) (مولانا مبارک حسین ندوی)۔

(۷) "لا ینبغی للقاضی أن یضرب محبوسا فی دین ولا فی غیره ولا یحتقد الخ" (ہندیہ) (مفتی راشد حسین ندوی)۔

مولانا محفوظ الرحمان شاہین جمالی صاحب نے لکھا ہے کہ بچہ کو قید کرنے کی ضرورت ہو تو اولاً اسے اسی کے گھر میں قید کردیا جائے، ناگزیر حالات میں ہی اسے جیل میں رکھا جائے، اور اس کی قوت برداشت کے مطابق ہی کام لیا جائے، "تدل أکثر النصوص علی أن یکون حبس الحدث فیبیت أبیه أو ولیه علی أن یجوز حبسه فی السجن إلا إذا خشی علیه ما یفسده فتوجب حبسه عند أبیه لا فی السجن" (موسوعہ فقہیہ)۔

مولانا خورشید انور اعظمی صاحب نے موسوعہ کی مذکورہ بالا عبارت نقل کرکے لکھا ہے کہ بچوں کی جیل علیحدہ ہونی چاہیے اور ان سے پر مشقت کام نہیں لینا چاہیے۔

سوال (ز): کا خلاصہ یہ ہے کہ بہت سے بچے بے سہارا ہوتے ہیں، اسلام ایسے بچوں کی پرورش، ان کی تعلیم وتربیت اور ان کے لیے خاندانی ماحول فراہم کرنے کے سلسلے میں کیا ہدایات دیتا ہے، اس سلسلہ میں حکومت کی ذمہ داریاں کیا ہیں اور خود سماج کا کیا فریضہ ہے؟

اس سوال کا حل پیش کرتے ہوئے مقالہ نگاروں نے مندرجہ ذیل آراء ظاہر کی ہیں:

(۱) یہ بچہ لقیط کے حکم میں ہے، اس کا اٹھانا واجب کفائی ہے، اگر اس کو نہ اٹھایا گیا تو وہ تمام لوگ گناہگار ہوں گے جو اس سلسلہ میں علم رکھتے تھے، اور اس بچہ کا نفقہ اور خبر گیری اصلاً حکومت کی ذمہ داری ہے، وہ کچھ نہ کرے تو یہ ذمہ داری سماج کی ہے۔ (مفتی شاہ جہاں ندوی، مفتی عثمان بستوی قاسمی، مولانا خورشید انور اعظمی، مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی، مفتی تنظیم عالم قاسمی، مفتی محمد منصف بدایونی، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، قاضی محمد کامل قاسمی، مولانا شاہد علی قاسمی، مولانا اکرم رشید لوناواڑہ، مولانا محمد عمران ندوی، مولانا عبدالتواب اناوی، مفتی عبداللہ کاوی والا)

دلائل:

(۱) "ومن أحیاها فکأنما أحیا الناس جمیعا" (مفتی شاہ جہاں ندوی، مولانا خورشید انور اعظمی، مفتی محمد منصف بدایونی، مفتی محمد الیاس قاسمی)۔

(۲) "کلا بل لا تکرمون الیتیم" (مفتی شاہ جہاں ندوی)۔

(۳) "لیس منا من لم یرحم صغیرنا" (ترمذی) (مفتی شاہجہاں ندوی)۔

(۴) ہندیہ، البحر الرائق اور شامی میں ہے: "والتقاط مندوب إلیه وإن غلب علی ظنه ضیاعه کأن وجده فی الماء أو بین یدی سبع فواجب" (مفتی شاہجہاں ندوی، مولانا خورشید انور اعظمی، مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی، مفتی منصف بدایونی، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مولانا محمد عمران ندوی)۔

(۵) "وتجب نفقته فی بیت المال" (شرح مشکل الآثار للطحاوی) (مفتی شاہجہاں ندوی)۔

(٦) "ونفقة اللقیط علی ولی الامر" (الفقه الحنفی فی ثوبه الجدید) (مفتی عثمان بستوی)۔

(۷) "فإن تعذر الإنفاق علیه من بیت المال (الی) فعلی من علم من المسلمین الإنفاق علیه" (المغنی) (مولانا خورشید انور اعظمی)۔

(۸) "ونفقته من بیت المال" (ہدایہ، شامی، بحر) (مولانا منصف بدایونی، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی مولانا محمد عمران ندوی)۔

دوسری رائے: یہ ہے کہ کتاب وسنت میں یتیموں کی خبر گیری پر کثرت سے ابھارا گیا ہے، لہٰذا اس کی خبر گیری اولاً ان کے رشتہ داروں کی ذمہ داری ہے جس کی تفصیلات کتاب النفقات میں کی گئی ہیں، پھر حکومت یا بیت المال کی پھر سماج یا بالفاظ دیگر عامۃ المسلمین کی۔ (مفتی آصف، مولانا نعیم اختر قاسمی، مولانا عبد الجلیل قاسمی، مولانا مبارک حسین ندوی، مولانا سید قمر الدین محمود قاسمی، مولانا احسن عبد الحق ندوی، مفتی صادق دیولوی، مولانا عبد اللہ خالد لوناواڑہ، مفتی عارف کنجروی، مولانا حبیب بن یوسف قاسمی، مولانا رحمت اللہ ندوی، مولانا حافظ کلیم اللہ عمری مدنی، راشد حسین ندوی، مفتی اخلاق حسین قاسمی)

دلائل:

(۱) "فإن تساؤوا فی القرب الخ" (شامی) (راشد حسین ندوی)۔

(۲) "فإن لم یکن له جد موسر۔ الخ" (کتاب الفقه علی المذاهب الأربعة) (مفتی اخلاق حسین قاسمی)۔

تیسری رائے: یہ ہے کہ دار الیتامی قائم کئے جائیں، اور اسے کسی مناسب دار الیتامی میں رکھ دیا جائے۔ (مفتی غلام اللہ کاوی، مفتی لطیف الرحمان فلاحی)

اس بحث کے جواب میں ظاہری طور سے اگرچہ کچھ اختلاف معلوم ہوتا ہے لیکن درحقیقت اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے، جن حضرات نے بچہ کو لقیط کے حکم میں رکھا ہے انہوں نے یہ صورت فرض کی ہے کہ بچہ کے عزیز واقارب کا کوئی پتہ نہیں ہے، ورنہ وہ بھی باب النفقات کی تفصیلات کا ذکر کرتے، لہٰذا صحیح ترتیب یہی معلوم ہوتی ہے کہ بچہ کے عزیز واقارب ہوں، تو خبر گیری کے وہی ذمہ دار ہوں گے، یہ ممکن نہ ہو تو یہ ذمہ داری حکومت کی ہے، یہ بھی ممکن نہ ہو تو یہ ذمہ داری سماج کی ہے۔ واللہ اعلم

راقم سے متعلق سوال (ح) کا خلاصہ یہ ہے کہ بچہ کے گارجین Gaurdian حد درجہ افلاس کی وجہ سے کیا کسی کو اپنا بچہ حوالہ کرکے اس سے بے تعلق ہو سکتے ہیں؟ اور بچہ لینے والے سے ہدیہ قبول کر سکتے ہیں؟ ایسے واقعات کی روک تھام کے لیے شریعت اسلامیہ کی تعلیمات کیا ہیں؟ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے مقالہ نگاروں نے مندرجہ ذیل آراء ظاہر کی ہیں:

پہلی رائے: یہ ہے کہ بچہ حوالہ کر سکتے ہیں لیکن ہدیہ قبول نہیں کر سکتے، نہ ہی بچہ سے کلی طور پر لاتعلق ہو سکتے ہیں، اس لیے کہ یہ آزاد کی بیع ہے جو باطل ہے اس کی روک تھام کے لیے والدین کی سرزنش کرنی چاہیے۔ (مفتی عبد اللہ کاوی والا، حافظ کلیم اللہ عمری مدنی، مفتی عارف کنجروی، مولانا اخلاق حسین قاسمی، مفتی صادق دیولوی، مولانا شاہد علی قاسمی، مولانا سید قمر الدین محمود، مولانا محبوب احمد فروغ قاسمی، مفتی تنظیم عالم قاسمی، مولانا خورشید انور اعظمی، مولانا ریاض ارمان قاسمی، مفتی شاہجہاں ندوی، مولانا منصف بدایونی)

کچھ مقالہ نگاروں نے لکھا ہے کہ بچہ کو لینے والا اپنی خوشی سے ہدیہ دے تو اسے بھی قبول کیا جا سکتا ہے۔ (مولانا عبد الجلیل قاسمی، مولانا عمران ندوی، مولانا عثمان بستوی)

اس کی دلیل دیتے ہوئے مولانا محمد عمران ندوی اور مولانا منصف بدایونی نے لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی اور حضرت زید بن

حارثہ کی کفالت کی اور حضرت عباس نے حضرت جعفر کی کفالت کی، کئی حضرات نے حضانت کے مسئلہ کو بھی دلیل بنایا ہے۔

دوسری رائے یہ ہے کہ اپنا بچہ دوسروں کو حوالہ کر کے اس سے لاتعلق ہونے کی گنجائش نہیں ہے، اس طرح کی خرابیاں دور کرنے کے لیے حکومت اور سماج کو سامنے آنا چاہئے (مولانا رحمت اللہ ندوی، راشد حسین ندوی، مولانا احسن عبدالحق ندوی، مفتی الیاس قاسمی، مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی، مولانا نعیم اختر قاسمی، مفتی آصف پالنپوری، مفتی لطیف الرحمن فلاحی)۔

اور اس کی روک تھام کا طریقہ یہ ہے کہ ماں باپ مفلس ہوں تو ان کو غیر موجود مان کر ان کے بعد والے رشتہ داروں پر یہ ذمہ داری ڈالی جائے وہ بھی نہ ہوں تو عامۃ المسلمین یہ ذمہ داری سنبھالیں "مالم یکن الاب معسرا فیلحق بالمیت فیجب علی غیرہ بلا رجوع علیہ" (الدر المختار، البحر الرائق، ھندیہ) (مولانا مبارک حسین ندوی، مولانا محفوظ الرحمان شاہین جمالی، راشد حسین ندوی)

مولانا عبدالتواب اناوی صاحب نے بچہ سونپنے کو حرام قرار دے کر اس کو قتل اولاد قرار دیا ہے، "لاتقتلوا أولادکم خشیۃ إملاق" اور مولانا حبیب بن یوسف قاسمی نے بھی یہی رائے اختیار کی ہے۔

جبکہ مفتی غلام اللہ کاوی صاحب نے لکھا ہے کہ سات سال تک پرورش کا حق ماں کو ہے، پھر باپ کو، پھر اقرباء، پڑوسی اور اہل قریہ توجہ دیں، ورنہ اداروں کے سپرد کردیں۔

ظاہری طور سے لگتا ہے کہ بعض حضرات نے اپنا بچہ دوسروں کے حوالے کرنے کو ناجائز قرار دیا ہے اور بعض نے جائز قرار دیا ہے، لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اختلاف صرف لفظی ہے، اس لیے کہ منع کرنے والوں نے بالکل لاتعلق ہوجانے کو ممنوع قرار دیا ہے، اور جائز قرار دینے والوں نے تعلق رکھتے ہوئے اس کی اجازت دی ہے، ہدیہ مشروط ہو تو ظاہر ہے یہ آزاد کی بیع ہے جس کی اجازت نہیں ہوسکتی، خوشی سے اجازت ہوسکتی، لیکن اس میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ واللہ اعلم

راقم سے متعلق سوال (ط) کا حاصل یہ ہے کہ بہت سے بچے ذہنی یا جسمانی طور پر معذور ہوتے ہیں ایسے بچوں کا کس حد تک علاج کرانا واجب ہے؟ ایسے بچوں کو دیکھ بھال کے لیے دماغی ہسپتال میں داخل کرادینا کیا ماں باپ کا اپنی ذمہ داریوں سے غفلت برتنا متصور ہوگا؟

اس سوال کی ہسپتال میں داخل کرانے سے متعلق شق کا جواب دیتے ہوئے فاضل مقالہ نگاروں نے دو آراء ظاہر کی ہیں:

پہلی رائے یہ ہے کہ اصل یہی ہے کہ بچوں کی دیکھ بھال گھر میں رکھ کر کی جائے، لیکن کوئی ناگزیر ضرورت ہو اور اس میں بچوں کے مصالح مضمر ہوں تو بچوں کو اسپتال میں داخل کرایا جاسکتا ہے، لیکن ضروری ہے کہ ان کے پاس آنا جاتا رہے اور ان کی دیکھ بھال کرتا رہے، مقصد ان کے مصالح کا خیال ہو نہ کہ اپنی ذمہ داریوں سے فرار حاصل کرنا۔ (مفتی عثمان بستوی، مولانا خورشید انور اعظمی، مفتی تنظیم عالم قاسمی، مولانا عبدالجلیل قاسمی، مفتی منصف بدایونی، مولانا مبارک حسین ندوی، مولانا محمد کامل قاسمی، مولانا سید قمر الدین محمود قاسمی، مولانا احسن عبدالحق ندوی، مولانا شاہد علی قاسمی، مولانا محمد عمران ندوی، راشد حسین ندوی، قاضی ریاض ارمان قاسمی، مولانا اخلاق حسین قاسمی، مولانا عبداللہ خالد لوناواڑی، مفتی عارف کنجروی، مولانا عبدالتواب اناوی، مولانا رحمت اللہ ندوی، مفتی عبداللہ کاوی والا)

دلائل:

(۱) "الضرر الأشد یزال بالضرر الأخف"۔ (الأشباہ)

(۲) "وإن کان للصغیر رضیعا، فلیس علی أمہ أن ترضعہ"۔ (ہدایہ)

لہٰذا متبادل موجود ہونے کی وجہ سے اسپتال میں داخل کرایا جاسکتا ہے۔ (مولانا عمران ندوی)

(۳) حضانت کے واسطے بھیجے جانے کے جواز پر قیاس۔ (مفتی عثمان بستوی، راشد حسین ندوی)

دوسری رائے: یہ ہے کہ بچوں کو ادب سکھانا، ان کی تربیت کرنا، اور ذمہ داریاں سنبھالنا، والدین کی ذمہ داری ہے، لہٰذا انہیں وقتی طور پر اسپتال میں داخل کرایا جاسکتا ہے، لیکن مستقلاً داخل کرانا کھلی غفلت ہے۔ (مفتی آصف پالنپوری، مولانا نعیم اختر قاسمی، مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی، مفتی محمد الیاس قاسمی، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مفتی صادق دیولوی، حافظ کلیم اللہ عمری مدنی، مفتی شاہ جہاں ندوی)

ان حضرات کی دلیل وہ نصوص ہیں جن میں تربیت اولاد پر زور دیا گیا ہے مثلاً مفتی آصف پالنپوری نے یہ حدیث نقل کی ہے: أدبوا أولادكم وأحسنوا أدبهم۔

ان دونوں آراء میں سے پہلی رائے میں جن شرائط کے ساتھ اسپتال میں داخل کرنے کی اجازت دی گئی ہے اگر بچہ کے مصالح اسپتال میں رکھنے کے متقاضی ہوں تو ان شرائط کا خیال رکھتے ہوئے داخل کرنے کی اجازت ہونی چاہیے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"لا يكلف الله نفسا إلا وسعها" اور فقہی قاعدہ ہے: "الضرر الأشد يزال بالضرر الأخف" واللہ اعلم۔

سوال (ط) کی ایک شق یہ بھی ہے کہ ایسے معذور بچوں کا علاج کس حد تک کروانا واجب ہے؟

اس کا جواب دیتے ہوئے اکثر مقالہ نگاروں نے حد مقرر کرنے کے بجائے یہ لکھا ہے کہ حتی المقدور علاج کرایا جائے، (مولانا عبداللہ کاوی، حافظ کلیم اللہ عمری مدنی، مولانا رحمت اللہ ندوی، مفتی عارف کھجروی، مفتی اخلاق حسین قاسمی، مولانا ریاض ارمان قاسمی، مفتی تنظیم عالم قاسمی، مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی)۔

جب کہ مفتی شاہ جہاں ندوی، اور مولانا شاہد علی صاحب نے لکھا ہے کہ اگر شفاء کا گمان غالب ہو تو علاج کروانا واجب ہے ورنہ مستحب ہے، اس کے لیے مفتی شاہ جہاں صاحب نے مندرجہ ذیل دلائل نقل کئے ہیں:

(۱) "وأمر عليه السلام بالتداوي ونهى عن تركه" (المحلی)۔

(۲) "وأما التداوي فليس بواجب عند جماهير العلماء" (الفتاوی الکبریٰ)۔

کچھ مقالہ نگاروں نے علاج کو واجب قرار دیا ہے (مولانا عبدالتواب اناوی، مولانا عمران ندوی، راشد حسین ندوی، مفتی الیاس قاسمی)۔

بعض کی رائے یہ ہے کہ علاج کرانا واجب نہیں، بلکہ سنت ہے (مفتی عثمان بستوی، مفتی لطیف الرحمان فلاحی)۔

مولانا خورشید انور اعظمی صاحب کی رائے یہ ہے کہ جب تک مرض زائل نہ ہو جائے، علاج کا سلسلہ جاری رکھا جائے۔

ان آراء میں سے پہلی رائے جو اکثر مقالہ نگاروں کی ہے راجح معلوم ہوتی ہے، اس لیے کہ انسان کو اس کی طاقت سے زیادہ کا مکلف نہیں بنایا گیا ہے (لا يكلف الله نفسا إلا وسعها) اور اس رائے میں اس کا خیال رکھا گیا ہے۔ واللہ اعلم

☆☆☆

باب دوم تفصیلی مقالات

اسلام میں بچوں کے حقوق

مولانا خورشید انور اعظمی [1]

بچے اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت اور اس کا عظیم عطیہ ہیں، ان کے دم سے انسانی زندگی میں چہل پہل، خوشی و مسرت، قلبی سکون و راحت اور احساس خود اعتمادی کا ماحول قائم رہتا ہے، نیز ان کے وجود پر بقائے نسل انسانی کا مدار اور خاندانی نظام کی تعمیر و ترقی کا مکمل انحصار ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ انبیاء کرام نے ان کے لئے بارگاہ خداوندی میں بطور خاص دعا کی ہے، قرآن کریم میں حضرت زکریا علیہ السلام کے بچے کے لئے دعا کا تذکرہ موجود ہے:

"ھنالك دعا زكريا ربه قال رب ھب لي من لدنك ذرية طيبة إنك سميع الدعاء" (آل عمران: ۳۸) (وہیں دعا کی زکریا نے اپنے رب سے، کہا: اے رب عطا کر مجھ کو اپنے پاس سے اولاد پاکیزہ، بے شک تو سننے والا ہے)۔

مفتی محمد شفیع صاحب عثمانی اس آیت کے ذیل میں تحریر فرماتے ہیں:

''اس آیت سے معلوم ہوا کہ اولاد کے لئے دعا کرنا انبیاء و صالحین کی سنت ہے'' (معارف القرآن ۲؍۶۰)۔

اسی وجہ سے اسلام نے بچوں کی پرورش و نگہداشت، تعلیم و تربیت اور ان کے دیگر حقوق کی ادائیگی پر کافی زور دیا ہے، جس کی مثال دیگر ادیان و ملل میں بمشکل نظر آتی ہے، شاہ معین الدین ندوی کے بقول: ''اولاد پر والدین کے حقوق کو سب مذاہب نے تسلیم کیا ہے، اور ان کی ادائیگی اور والدین کی خدمت کی بڑی تاکید ہے، لیکن اسلام کے علاوہ غالباً کسی مذہب نے ماں باپ پر اولاد کا کوئی حق نہیں مانا ہے یا اس کا دائرہ بہت محدود رکھا ہے'' (دین رحمت ؍۱۰۱)۔

بچوں کی پرورش کا مسئلہ:

اسلام نے بچوں کی پرورش کے تعلق سے ایک نہایت جامع اور مکمل قانون بنایا ہے، تاکہ بچوں کے عہد طفلی سے قبل از بلوغ تک کے تمام مراحل کی بطور خاص نگہداشت ہو سکے، اور ان کی جسمانی، ذہنی، فکری اور تعلیمی و تربیتی کفالت کا ایسا مناسب اور عمدہ بندوبست ہو کہ بچے ضائع نہ ہونے پائیں۔

بچے کو دنیا میں آنے کے بعد سب سے پہلے کسی ایسے شخص کی ضرورت ہوتی ہے، جو اس کے ساتھ غایت درجہ شفقت و محبت کا معاملہ کرے، اس کی جملہ ضروریات کا پوری فکر مندی کے ساتھ لحاظ کرے، اور اس کے لئے اپنے نہاں خانۂ دل میں بے پناہ جذبۂ ہمدردی رکھے، اس تناظر میں دیکھا جائے تو اس اہم کام کی انجام دہی کے لئے ماں سے زیادہ مستحق کوئی اور نظر نہیں آتا، اسی وجہ سے شریعت مطہرہ نے بچے کی پرورش کا سب سے زیادہ حقدار ماں کو قرار دیا ہے، علامہ قرافی لکھتے ہیں:

> ''چونکہ پرورش کرنے میں بچوں کے زیادہ رونے اور ان کو پیش آنے والی کیفیات کی الجھنوں میں بے حد صبر کی، اور کمزوروں اور بچوں کے ساتھ نرمی برتنے پر ابھارنے والی رقت قلبی اور زیادتی شفقت کی ضرورت ہوتی ہے اور عورتیں ان تمام امور میں مردوں سے کافی فائق ہیں، اس لئے انہیں مردوں پر مقدم رکھا گیا'' (کتاب الفروق ۳؍۱۰۰۶)۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ماں کے حق پرورش کے تعلق سے ارشاد فرمایا ہے:

"لا تضار والدة بولدها" (البقرۃ: ۲۳۳) (والدہ کو اس کے بچے کی وجہ سے تکلیف نہ دی جائے)۔

---

[1] صدر مدرس جامعہ مظہر العلوم بنارس۔

علامہ جصاص رازی اپنی شہرہ آفاق تصنیف ''احکام القرآن'' میں اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''وفيه دلالة على أن الأم أحق بإمساك الولد ما دام صغيراً، وإن استغنى عن الرضاع بعد ما يكون مما يحتاج إلى الحضانة، لأن الحاجة إلى الأم بعد الرضاع كهي قبله، فإذا كانت في حال الرضاع أحق به وإن كانت المرضعة غيرها، علمنا في كونه عند الأم حقا لها'' (احکام القرآن ۲-۱۰۷)۔

(اس میں اس پر دلالت ہے کہ بچہ جب تک چھوٹا ہے، ماں کو اپنے پاس روکنے کا زیادہ حق ہے، اگر چہ وہ دودھ پینے سے مستغنی ہو چکا ہو، اس لئے کہ اس کے بعد بھی پرورش کا محتاج رہتا ہے، کیونکہ رضاعت کے بعد بھی اسے پہلے ہی کی طرح ماں کی ضرورت ہوتی ہے، جب مرضعہ کوئی اور ہو، اس وقت بھی ماں حالت رضاعت میں بچے کی زیادہ حقدار ہے، تو معلوم ہوا کہ بچے کا ماں کے پاس رہنا ماں کا حق ہے)۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی بچوں کی پرورش کے مسئلے کو کافی اہمیت دی ہے اور اس سلسلہ میں ماں کو حقدار بنایا ہے:

''عن ابن عمر أن امرأة قالت: يا رسول الله، إن ابني هذا كان بطني له وعاء، وثديي له سقاء وحجري له حواء، وإن أباه طلقني وأراد أن ينتزعه مني، فقال لها رسول الله ﷺ أنت أحق به ما لم تنكحي'' (سنن ابوداؤد ۲-۲۸۳)۔

(ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ ایک عورت نے کہا، اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم، یہ میرا بیٹا ہے جو میرے پیٹ میں ایک مدت تک رہا، میری پستان سے ایک زمانے تک دودھ پیا، میری گود میں پلا بڑھا، اس کے والد نے مجھے طلاق دیدی اور اس کو مجھ سے لینا چاہتا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم اس کی زیادہ حقدار ہو جب تک تم نکاح نہ کرلو)۔

اسی طرح بچوں کی پرورش کا ثبوت اجماع صحابہ سے بھی ہوتا ہے، چنانچہ جب حضرت عمر فاروقؓ نے اپنی اہلیہ کو طلاق دی اور مسئلہ حضرت ابوبکرؓ کے سامنے آیا تو آپ نے بچے کی پرورش کے سلسلے میں صحابہ کرام کی موجودگی میں ماں کو حقدار بنایا، اور حضرت عمرؓ سے فرمایا: "ريحها ومسها ومسحها وريقها خير له من الشهد عندك" (ماں کی مہک، اس کا چھونا، اس کا ہاتھ پھیرنا، اس کا تھوک، بچے کے لئے تمہارے شہد سے کہیں بہتر ہے) صحابہ نے اس بات پر سکوت فرمایا، کوئی نکیر نہیں فرمائی (تبیین الحقائق ۳/ ۴۷)۔

شریعت اسلامی میں بچوں کو ضائع ہونے سے بچانے کے لئے ان کی پرورش کو واجب قرار دیا گیا ہے، اور کسی نہ کسی کو اس کام کا کرنا لازم کر دیا گیا، تاکہ بچوں کی بحسن وخوبی پرورش ہو سکے، الموسوعة الفقهية میں ہے:

''پرورش شرعاً واجب ہے، اس وجہ سے کہ جس کی پرورش ہوتی ہے کبھی حفاظت نہ ہونے سے ہلاک ہو جاتا ہے، یا اسے نقصان پہنچ جاتا ہے، لہذا ہلاکت سے اس کا بچانا واجب ہوگا، چنانچہ پرورش کرنے والا صرف ایک ہو یا بچہ اس کے علاوہ کو قبول نہ کرتا ہو تو واجب عین ہوگا، اور اگر پرورش کرنے والے کئی ایک ہوں تو واجب کفایہ ہوگا'' (الموسوعة الفقهية ۱۷/ ۳۰۰)۔

مذکورہ تفصیل سے واضح ہوتا ہے کہ اسلام نے بچوں کی پرورش پر خاص دھیان دیا ہے اور ایسا جامع اور فطرت کے مطابق نظام بنایا ہے کہ بچوں کی صحیح ڈھنگ سے جسمانی، تعلیمی، اخلاقی اور ذہنی وفکری تربیت ہو سکے اور بچے کسی بھی حالت میں ضائع نہ ہونے پائیں، وہ اس طرح کہ جب تک بچے چھوٹے ہوں، ان کی پرورش ماں کے سپرد کی جائے اور جب بڑے ہونے لگیں تو انہیں باپ کے حوالے کر دیا جائے، چنانچہ فقہاء کرام نے اس بات کی وضاحت کی ہے کہ بچہ جب تک ازخود کھانے، پینے، کپڑا پہننے اور استنجاء کرنے کے لائق نہیں ہو جاتا، تب تک وہ ماں کے پاس رہے گا، اس لئے کہ عمر کے اس مرحلے میں اس کی دیکھ بھال ایک ماں ہی کر سکتی ہے، اور جب بچہ اس مرحلے سے آگے بڑھ جائے تو اس کو زندگی گزارنے کے آداب جاننے کی ضرورت ہوتی ہے، اور اس کام کے لئے باپ سے بہتر اور موزوں کوئی اور نہیں ہو سکتا، اس اب اسے باپ کے حوالہ کر دیا جائے گا، علامہ مرغینانی ''ہدایہ'' میں لکھتے ہیں:

''ماں اور دادی، بچے کی زیادہ حقدار ہیں، یہاں تک کہ وہ ازخود کھانے، پینے، کپڑا پہننے اور استنجاء کرنے لگے اور جامع صغیر میں ہے کہ یہاں تک کہ مستغنی ہو جائے اور اپنے سے کھانے، پینے لگے، دونوں کا مطلب ایک ہے، اس وجہ سے کہ تمام استغناء، استنجاء پر قدرت سے ہوتا ہے، اس وجہ سے کہ جب وہ مستغنی

ہوجائے گا تو اسے ادب سیکھنے اور مردوں کے آداب واخلاق اپنانے کی ضرورت ہوگی، اور باپ، ادب سکھانے اور تعلیم دینے پر زیادہ قادر ہوتا ہے، خصاف نے اکثریت کا لحاظ کرتے ہوئے استغناء کی تحدید سات سال سے کی ہے'' (ہدایہ ۲/ ۲۸۴)۔

ملا علی قاری نے (مرقاۃ المفاتیح ۶/ ۲۲۷۹) میں خصاف کی بات کو بھی مفتی بہ بتایا ہے۔

بچیوں کا معاملہ بچوں سے مختلف ہوتا ہے، اس لئے ان کو از خود کھانے، پینے، کپڑا پہننے اور استنجاء کرنے کی عمر میں ہونے کے بعد بھی ان کے مزاج ونفسیات اور طبعی وصنفی حالات کا لحاظ کرتے ہوئے حیض آنے تک ماں کے پاس ہی رکھا جائے گا، تاکہ انہیں نسوانی آداب کی معرفت ہوسکے، اور یہ ماں کے پاس رہنے کی صورت ہی میں صحیح ڈھنگ سے ممکن ہے، البتہ بالغ ہونے کے بعد اسے باپ کے سپرد کردیا جائے گا، تاکہ انہیں باپ کی نگرانی میں پورے طور پر تحفظ حاصل رہے، اور اس کے لئے باپ ہی زیادہ موزوں ومناسب ہے، ہدایہ میں ہے:

''والأم والجدة أحق بالجارية حتى تحيض لأن بعد الاستغناء تحتاج إلى معرفة آداب النساء والمرأة على ذلك أقدر، وبعد البلوغ تحتاج إلى التحصين والحفظ والأب أقوى وأهدى'' (ہدایہ ۲/ ۲۸۴) (ماں اور دادی بچی کی زیادہ حقدار ہیں، یہاں تک کہ اسے حیض آجائے، اس وجہ سے کہ استغناء کے بعد اسے نسوانی آداب کی معرفت کی ضرورت ہوتی ہے، اور عورت اس پر زیادہ قادر ہے، اور بالغ ہونے کے بعد اسے تحفظ کی ضرورت ہوتی ہے اور باپ اس پر زیادہ قدرت رکھتا ہے)۔

اسی کے ساتھ فقہاء کرام نے پرورش کرنے والوں کے لئے کچھ شرطیں مقرر کی ہیں، تاکہ بچوں کا پورے طور پر تحفظ ہوسکے، وہ عاقل، بالغ، آزاد، بچوں کے تئیں امانتدار اور قادر ہوں، یعنی زیادہ مریض یا زیادہ بوڑھے نہ ہوں، اور اگر پرورش کرنے والی عورت ہو تو کسی اجنبی شوہر کے ساتھ اس کا عقد نہ ہوا ہو، علامہ ابن عابدین شامی نے ردالمحتار میں علامہ رملی کے حوالہ سے تحریر فرمایا ہے:

''قال الرملي: ويشترط في الحاضنة أن تكون حرة بالغة عاقلة أمينة، قادرة وأن تخلو من زوج أجنبي وكذا في الحاضن سوى الشرط الأخير'' (ردالمحتار ۵/ ۲۵۳) (رملی نے کہا: پرورش کرنے والی عورت کے لئے یہ شرط ہے کہ وہ آزاد، بالغ، عاقل، امانت دار، قادر ہو نیز اس کی کسی اجنبی سے شادی نہ ہوئی ہو، اسی طرح اگر پرورش کرنے والا مرد ہو تو اس کے لئے بھی آخری شرط کے علاوہ بقیہ شرطیں لازم ہیں)۔

ان شرطوں کا حاصل یہ ہے کہ بچوں کو ضائع ہونے سے بچایا جاسکے، حتی کہ اگر کوئی عورت اس قدر نیک اور صالح ہے کہ محبت الٰہی میں غرق ہے، اور ہمہ وقت نماز میں مشغول رہتی ہے، اسے بچے کی کوئی پرواہ نہیں رہتی، تو بچے کے تحفظ کی غرض سے اس کے صلاح وتقوی کے باوجود اس سے لے لیا جائے گا، ردالمحتار میں ہے:

''اگر عورت نیک اور بے حد نمازی ہو، اور اس پر اللہ کی محبت وخوف کا غلبہ ہو، یہاں تک کہ اس کی وجہ سے وہ بچے سے غافل رہتی ہو، اور بچہ ضائع ہو رہا ہو تو اس سے لے لیا جائے گا'' (ردالمحتار ۵/ ۲۵۴)۔

نیز اگر عورت فاسق وفاجر ہو اور بچے کے اس کے پاس رہنے میں اندیشہ ہو کہ اس کے دین وایمان کو خطرہ لاحق ہوسکتا ہے، تب بھی اس کے سپرد نہیں کیا جائے گا، اس لئے کہ پرورش کا بنیادی اور اہم مقصد بچے کو ضائع ہونے سے بہر حال محفوظ رکھنا ہے، ردالمحتار میں ہے:

"إن الحاضنة إن كانت فاسقة فسقاً يلزم فيه ضياع الولد عندها سقط حقها" (ردالمحتار ۵/ ۲۵۴) (اگر پرورش کرنے والی عورت میں اس قدر فسق ہو کہ اس سے بچہ کا ضائع ہونا لازم ہو تو اس کا حق ساقط ہوجائے گا)۔

حاصل یہ کہ اگر پرورش کرنے والوں میں مطلوبہ شرطیں موجود ہوں تو پرورش کرنے کے مستحق ہوں گے ورنہ نہیں۔

بچوں کی تعلیم کا مسئلہ:

اسلام نے تعلیم پر بے حد زور دیا ہے، اللہ تعالی نے قرآن کریم میں مختلف عنوان سے علم کی فضیلت اور اس کی اہمیت کو واضح فرمایا ہے، اور بتایا ہے کہ علم سے درجات بلند ہوتے ہیں، ارشاد خداوندی ہے:

"يرفع الله الذين آمنوا منكم والذين أوتوا العلم درجات" (المجادلہ: ۱۱) (اللہ بلند کرے گا ان کے لئے جو ایمان رکھتے ہیں تم میں سے اور علم، ان کے درجات)۔

علامہ ابن حجر عسقلانی اس آیت کریمہ کی تفسیر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''اس کی تفسیر میں کہا گیا ہے کہ اللہ تعالی مومن عالم کو مومن غیر عالم پر بلند کرے گا، درجات کی بلندی سے فضل کا پتہ چلتا ہے، اس وجہ سے کہ اس سے مراد ثواب کی کثرت ہے، اور اس سے درجات بلند ہوتے ہیں'' (فتح الباری ۱؍ ۵۹)۔

نیز طلب علم کی اہمیت کو بتانے کے لئے اللہ تعالی کا واضح ارشاد ہے:

"فلولا نفر من کل فرقة منهم طائفة ليتفقهوا في الدين" (التوبہ: ۱۲۲) (سو کیوں نہ نکلی ہر فرقہ میں سے انکی ایک جماعت تاکہ سمجھ پیدا کریں دین میں)۔

علامہ قرطبی نے اس آیت کی تفسیر میں کہا:

"هذه أصل في وجوب طلب العلم" (تفسیر قرطبی ۸؍ ۲۹۳) (یہ آیت طلب علم کے واجب ہونے کے سلسلہ میں اصل ہے)۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے علم کے طلب کرنے کو ہر مسلمان پر فرض قرار دیا ہے، آپ نے ارشاد فرمایا: "طلب العلم فريضة على كل مسلم" (ابن ماجہ ۲۲۴) (علم کا طلب کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے)۔

یہی وجہ ہے کہ امام مالک اور امام ابوحنیفہ کے نزدیک اشتغال بالعلم، اشتغال بالنوافل سے بہتر ہے (فیض الباری ۱؍ ۱۶۲)۔

علم کی اسی اہمیت وفضیلت کے پیش نظر شریعت اسلامیہ میں والدین کے ذمہ یہ لازم قرار دیا ہے کہ وہ بچوں کو زیور تعلیم سے آراستہ کریں اور اس سلسلہ میں کسی طرح کی غفلت نہ برتیں، اللہ تعالی نے بچوں کی تعلیم وتربیت کے تعلق سے ارشاد فرمایا ہے:

"یا أیها الذین آمنوا قوا أنفسکم وأهلیکم نارا" (التحریم: ۶) (اے ایمان والو! اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو دوزخ کی آگ سے بچاؤ)۔

اس آیت کریمہ کی تشریح کرتے ہوئے علامہ جصاص رازی رقم طراز ہیں:

"هذا يدل على أن علينا تعليم أولادنا وأهلينا الدين والخير وما لا يستغنى عنه من الآداب" (احکام القرآن ۳؍ ۶۲۴) (اس سے پتہ چلتا ہے کہ ہمارے اوپر اپنے بچوں اور دیگر اہل وعیال کو دین وخیر اور ناگزیر آداب کی تعلیم دینا واجب ہے)۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف احادیث میں بچوں کی تعلیم وتربیت کی اہمیت بتائی ہے، آپ نے فرمایا:

"ما نحل والد ولدا من نحل أفضل من أدب" (سنن ترمذی ۳؍ ۴۰۲) (والد کا اولاد کے لئے سب سے بہترین عطیہ، ادب کی تعلیم ہے)۔

نیز آپ نے فرمایا: "لأن يؤدب الرجل ولده خير له من أن يتصدق بصاع" (سنن ترمذی ۳؍ ۴۰۱) (آدمی کا اپنی اولاد کو ادب سکھانا ایک صاع خیرات کرنے سے بہتر ہے)۔

اس سلسلہ میں حضرت عبداللہ بن عمر نے باپ کی ذمہ داری بیان کرتے ہوئے بہت ہی واضح اور چشم کشا بات کہی ہے، فرماتے ہیں:

''اپنے بیٹے کو ادب سکھاؤ، اس لئے کہ تم سے تمہارے بیٹے کے بارے میں باز پرس ہوگی کہ تم نے اسے کیا ادب سکھایا اور کیا تعلیم دی، اور اس سے تمہارے ساتھ حسن سلوک اور فرمانبرداری کے بارے میں باز پرس ہوگی''۔

مذکورہ تفصیل سے واضح ہوتا ہے کہ اسلام نے بچوں کی تعلیم وتربیت پر کافی زور دیا ہے، تاکہ ان کا مستقبل تابناک رہے، اور زندگی کے ہر گام پر کامیاب وکامراں نظر آئیں، اس لئے کہ بچپن کی عمر میں اگر انہیں تعلیم وتربیت سے آراستہ نہیں کیا گیا، اور اس سلسلے میں غفلت برتی گئی تو اس کے نتائج اچھے نہیں ہوں گے، علامہ ابن قیم نے اس پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

''جس شخص نے اپنے بچے کو اس کے لئے نفع بخش باتوں کی تعلیم نہیں دی اور اسے یوں ہی چھوڑ دیا تو اس نے اس کے ساتھ بہت برا کیا، اکثر بچوں میں بگاڑ، والدین کی بے توجہی اور ان کے اپنے بچوں کو دین کے فرائض وسنن کی تعلیم نہ دینے کے سبب ہوتا ہے، انہوں نے بچوں کو صغرسنی میں ضائع کردیا جس کی وجہ سے بڑے ہوکر نہ انہوں نے اپنی ذات سے فائدہ اٹھایا اور نہ اپنے والدین کو نفع پہنچایا، جیسا کہ کسی نے اپنے بیٹے کو نافرمانی پر ملامت کی تو اس نے کہا: اے والد!

آپ نے بچپن میں شفقت نہیں کی، میں نے بڑے ہو کر آپ کی نافرمانی کی، آپ نے مجھے بچپن میں ضائع کیا تو میں نے آپ کو بڑھاپے میں ضائع کیا" (تحفۃ المودود ر ۲۲۹)۔

یہی وجہ ہے کہ فقہاء نے صراحت کی ہے کہ باپ اپنے بچے کو قرآن، ادب اور علم سیکھنے پر مجبور کر سکتا ہے، درمختار میں ہے:

"وله إكراه طفله على تعلم قرآن وأدب وعلم لفريضته على الوالدين" (درمختار ۶ / ۱۳۰) (باپ اپنے بچے کو قرآن، ادب اور علم سیکھنے پر مجبور کر سکتا ہے، اس وجہ سے کہ یہ والدین پر فرض ہے)۔

اس لئے والدین کو چاہئے کہ بچوں کو دین کا اتنا علم ضرور دیں، جس کی بعد از بلوغ انہیں ضرورت پیش آتی ہے۔

امام نووی لکھتے ہیں:

"على الآباء والأمهات تعليم أولادهم ما سيتعين عليهم بعد البلوغ فيعلمه الولى الطهارة والصلاة والصوم ونحوها، ويعرفه تحريم الزنا واللواط والسرقة وشرب المسكر والكذب والغيبة وشبهها، ويعرفه أن بالبلوغ يدخل فى التكليف ويعرفه مايبلغ به وقيل هذا العلم مستحب والصحيح وجوبه وهو ظاهر نص الشافعى" (المجموع ۱-۵۰)۔

(والدین پر اپنے بچوں کو ان باتوں کی تعلیم دینا ضروری ہے جو بالغ ہونے کے بعد ان پر لازم ہوں گی، لہذا ولی ان کو طہارت نماز، روزہ، وغیرہ کی تعلیم دے، اور ان کو زنا، لواطت، چوری، شراب نوشی، جھوٹ، غیبت وغیرہ کی حرمت بتائے، اور یہ بھی بتائے کہ بالغ ہونے کے بعد وہ مکلف ہو جائے گا، نیز وہ چیزیں بھی بتائے جن سے وہ بالغ ہو جائے گا، کہا گیا ہے کہ یہ علم مستحب ہے، اور صحیح یہ ہے کہ یہ واجب ہے، امام شافعی کا ظاہری قول یہی ہے)۔

ردالمحتار میں ہے: "إن الصبى ينبغى أن يومر بجميع المامورات وينهى عن جميع المنهيات" (ردالمحتار ۲/ ۵) (مناسب ہے کہ بچے کو تمام مامورات کا حکم دیا جائے اور تمام منہیات سے روکا جائے)۔

اسی طرح بچوں کو دنیاوی علوم سے بھی واقف کرانا ضروری ہوتا ہے، جن کے ذریعہ روز مرہ زندگی کے جملہ امور بحسن وخوبی انجام پاسکیں، اور بچہ مستقبل میں ہر موڑ پر کامیاب رہے، اس لئے کہ دنیاوی علوم، مادی ترقی اور کسب معاش کا ذریعہ ہیں، اور زمانے کے اعتبار سے ان میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے، الموسوعۃ الفقہیہ میں ہے:

"مناسب ہے کہ بچے کو دنیوی امور اور مستقبل میں کام آنے والی ضروری چیزوں مثلاً تیراکی و تیر اندازی وغیرہ اور ان کے علاوہ ہر زمانے کے اعتبار سے نفع بخش باتوں کی تعلیم دے، حضرت عمرؓ نے کہا: اپنے بچوں کو تیراکی اور تیر اندازی سکھاؤ اور انہیں گھوڑے پر کود کر بیٹھنے کا حکم دو" (الموسوعۃ الفقہیہ ۱۳ / ۱۲)۔

اسی لئے فقہاء کرام نے فرض کفایہ علوم کی تعریف کی ہے کہ ان سے وہ علوم مراد ہیں جن کی دنیوی امور کی درستگی میں لازمی طور پر ضرورت پیش آتی ہو، اور اس میں طب اور حساب کے علاوہ تمام صنعت وحرفت کو شامل کیا ہے (ردالمحتار ۱/ ۱۲۶)۔

موجودہ صورت حال میں مسلمانوں کو حدود شرع کے دائرے میں رہتے ہوئے عصری علوم کے حصول کے لئے ہر ممکن کوشش کرنی چاہئے اور بچوں کو حتی الوسع اس سے بہرہ یاب ہونے کا موقع فراہم کرنا چاہئے۔

(۳) اگر حکومت کسی سطح تک کی تعلیم کو بچوں اور بچیوں کے لئے لازم قرار دیدے اور وہ شرعی اصول سے متصادم نہ ہو تو اس کی پابندی کی جائے گی، اس لئے کہ مباح امور میں امام کی اطاعت واجب ہے، علامہ ابن شامی نے شرح الجواہر کے حوالے سے تحریر فرمایا ہے:

"شرح الجواہر میں ہے: امام کی ان امور میں اطاعت کرنا واجب ہے جن کو دین نے مباح بتایا ہے، اور یہ وہ چیزیں ہیں جن کا نفع عام لوگوں کو پہنچتا ہے، جیسے دارالاسلام والمسلمین کی آبادکاری، اور وہ امور جو کتاب وسنت اور اجماع سے ثابت ہوں" (ردالمحتار ۱۱/ ۶۷)۔

ایک جگہ اور لکھتے ہیں: "لأن طاعة الإمام فيما ليس بمعصية واجبة" (ردالمحتار ۱/ ۵۳) (اس وجہ سے کہ ان امور میں امام کی فرمانبرداری واجب ہے جو معصیت نہیں ہیں)۔

(۴) آج کل بعض حلقوں میں بچوں کو جنس کی تعلیم دینے کی بات کہی جارہی ہے، اگر اس سے مراد یہ ہے کہ دیگر مضامین کی طرح جنس کو بھی ایک مضمون کی حیثیت دے کر شامل نصاب کر دیا جائے، تو درست نہیں ہوگا، اس وجہ سے کہ اس میں خدا معلوم جنس کے کن کن پہلوؤں کو اجاگر کیا جائے گا، جن سے بچوں کی فطری حیا متاثر ہو جائے گی، اور اشاروں، کنایوں میں کہی اور سمجھی جانے والی باتیں، برملا کہی جائیں گی، جس کے مضر اثرات کا رونما ہونا لازم ہے، لہذا سداً للذریعہ اسے درست قرار نہیں دیا جائے گا۔

اور اگر اس سے مراد جنابت وغیرہ کے مسائل سے آگاہ کرنا ہے تو یہ مسائل کتب فقہ میں بصراحت موجود ہیں، جن سے عام قاری بھی تھوڑے سے مطالعے سے واقف ہو جاتا ہے، اور اگر کسی کو جنسی معلومات کی واقفیت ہی مطلوب ہے تو بڑے ہو کر مارکیٹ میں دستیاب جنسی کتابوں سے حسب ضرورت اپنی معلومات میں اضافہ کر سکتا ہے۔

ج: بچوں، بچیوں کے نکاح کا مسئلہ:

بچوں اور بچیوں کے نکاح کے سلسلہ میں شریعت کا مزاج یہ ہے کہ جب بچے بالغ ہو جائیں اور ان کا مناسب رشتہ مل جائے تو اس میں تاخیر نہیں کرنی چاہئے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''من ولد له ولد فليحسن اسمه وأدبه فإذا بلغ فليزوجه فإن بلغ ولم يزوجه فأصاب إثماً فإنما إثمه على أبيه'' (مشکوۃ ۲۷۱/۲) (جسے بچہ پیدا ہو تو چاہئے کہ اس کا اچھا نام رکھے اور بہتر ادب سکھائے اور جب بالغ ہو جائے تو اس کی شادی کردے، اور اگر بالغ ہونے کے بعد شادی نہیں کی اور وہ کسی گناہ میں مبتلا ہو گیا تو اس کا گناہ باپ پر ہوگا)۔

نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کو مخاطب کر کے فرمایا:

''يا علي! ثلاث لا تؤخرها: الصلاة إذا أتت والجنازة إذا حضرت، والأيم إذا وجدت لها كفواً'' (مشکوۃ ۶۱/۱) (اے علی تین چیزوں میں تاخیر نہ کرو، نماز جب اس کا وقت آجائے، جنازہ جب وہ حاضر ہو جائے، غیر شادی شدہ عورت جب کہ تم اس کا مناسب رشتہ پا جاؤ)۔

لیکن اگر باپ نے کسی مصلحت کے پیش نظر بچوں کا نکاح بحالت نابالغی کر دیا، تب بھی درست ہے، جیسا کہ حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عائشہؓ کا نکاح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سات سال کی عمر میں کیا، حضرت عائشہؓ روایت کرتی ہیں:

''إن النبي صلى الله عليه وسلم تزوجها وهي بنت سبع سنين وزفت إليه وهو بنت تسع سنين'' (رواہ مسلم، مشکوۃ ۲۷۰/۲) (نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے شادی کی جب کہ وہ سات سال کی تھیں، اور آپ کے پاس بھیجی گئیں جبکہ وہ نو سال کی تھیں)۔

اس حدیث کو نقل کر کے علامہ سرخسی لکھتے ہیں:

''ففي الحديث دليل على جواز نكاح الصغير والصغيرة بتزويج الآباء'' (مبسوط ۲۱۲/۴) (اس حدیث میں اس بات کی دلیل ہے کہ باپ کے شادی کرنے سے چھوٹے بچوں بچیوں کا نکاح جائز ہے)۔

علامہ ابن ہمام بچوں اور بچیوں کے نکاح کے جواز کی دلیل پیش کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''بچے اور بچی کی شادی کرنا جائز ہے، اگر ولی نے کیا ہو، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "واللائی لم یحضن" اللہ تعالیٰ نے چھوٹی بچی کے لئے عدت ثابت کی، جو اس کے شرعی نکاح کے ماننے کی بنیاد پر ہی ہو سکتا ہے'' (مرقاۃ ۲۰۶/۶)۔

چھوٹی بچیوں کے نکاح کی صحت پر علامہ ابن حجر نے فتح الباری (۳۱۹/۳) میں، علامہ نووی نے شرح نووی علی مسلم (۲۰۶/۹) میں، علامہ عینی نے عمدۃ القاری (۱۲۶/۲۰) میں علماء کا اجماع نقل کیا ہے، علامہ کاسانی نے بدائع الصنائع ۲۴۰/۲ میں اجماع صحابہ بتایا ہے، اس تعلق سے علامہ ابن بطال کی ''صراحت اجماع'' ہدیہ قارئین ہے:

''أجمع العلماء على أنه يجوز للآباء بتزويج الصغار من بناتهم وإن كن في المهد إلا أنه لا يجوز لأزواجهن البناء بهن إلا إذا صلحن'' (شرح صحیح البخاری لابن بطال ۱۷۲/۲) (علماء کا اس بات پر اجماع ہے کہ باپ کے لئے اپنی چھوٹی بچیوں کی شادی کرنا جائز ہے،

اگر چہ وہ گہوارے میں ہوں، مگران کے شوہروں کے لئے ان کے پاس جانا جائز نہیں ہے تاوقتیکہ وہ اس کے لائق نہ ہوجائیں)۔

البتہ بچی کو شوہر کے پاس اس وقت بھیجا جائے گا، جب ولی اور شوہر بچی کے نفع ونقصان کو مدنظر رکھتے ہوئے کوئی مناسب وقت طے کرلیں، لیکن اگر دونوں میں اختلاف ہوجائے تو صحیح قول کے مطابق اس کو اس وقت بھیجا جائے گا، جبکہ اس میں جماع کی طاقت ہوجائے۔

علامہ نووی تحریر فرماتے ہیں:

''أما وقت زفاف الصغيرة المزوجة والدخول بها، فإن أنفق الزوج والولي على شئي لا ضرر فيه على الصغيرة عمل به، وإن اختلفا فقال أحمد وأبوعبيدة تجبر على ذلك بنت تسع سنين دون غيرها، وقال مالك والشافعي وأبوحنيفة حد ذلك أن تطيق الجماع ويختلف ذلك باختلافهن ولا يضبط بسن وهذا هو الصحيح'' (شرح النووی علی مسلم ۹۔۲۰۶، نیز دیکھئے: عمدۃ القاری ۲۰۔۱۲۷)۔

(رہا شادی شدہ چھوٹی بچی کے شوہر کے پاس روانہ کرنے کا وقت تو اگر شوہر اور ولی کسی بات پر متفق ہوجائیں اور اس میں بچی کے لئے کوئی ضرر نہ ہو تو اس پر عمل کیا جائے گا اور اگر اختلاف ہوجائے تو امام احمد اور ابوعبیدہ نے کہا کہ نوسال کی بچی کو شوہر کے پاس جانے پر مجبور کیا جائے گا، اس سے کم عمر کو نہیں، اور امام مالک، شافعی اور ابوحنیفہ نے کہا کہ اس کی حد یہ ہے کہ اس میں جماع کی طاقت ہوجائے، اور یہ بچیوں کے اعتبار سے مختلف ہوتا ہے، اسے سن و سال کے ساتھ محدود نہیں کیا جائے گا اور یہی صحیح ہے)۔

امام شافعی اور ان کے اصحاب نے کہا ہے کہ بچیوں کا نکاح بالغ ہونے کے بعد کرنا مستحب ہے:

''جاننا چاہئے کہ امام شافعی اور ان کے اصحاب نے کہا کہ مستحب یہ ہے کہ باپ، دادا بچی کی شادی اس کے بالغ ہونے کے بعد اس سے اجازت لے کر کریں، تاکہ ایسا نہ ہو کہ اس کی مرضی کے بغیر شوہر کے ہاتھ میں دیدیں'' (شرح النووی ۹/۲۰۶)۔

حاصل یہ کہ بچوں اور بچیوں کا نکاح بحالت نابالغ درست ہے، البتہ بہتر ہے کہ بالغ ہونے کے بعد کیا جائے، اور اس میں تاخیر نہ کی جائے۔

بچہ مزدوری کا مسئلہ:

اسلام نے بچوں کی پرورش، تعلیم وتربیت اور ان کی صحت وتندرستی کے لئے جو جامع نظام بنایا ہے، اس میں بچہ مزدوری کی گنجائش نہیں معلوم ہوتی، کہ حالت صغرسنی میں ان سے مزدوری کا کام لیا جائے اور ایسے کاموں کا بوجھ ان پر لاد دیا جائے، جن کا تحمل کرنا ان کے بس میں نہیں ہے، اللہ تعالی نے فرمایا ہے:

"لا يكلف الله نفساً إلا وسعها" (البقرہ: ۲۸۶) (اللہ تکلیف نہیں دیتا کسی کو مگر جس قدر اس کی گنجائش ہے)۔

اسی وجہ سے بچوں کا نفقہ والد کے ذمہ کردیا گیا، فتاوی ہندیہ میں ہے:

"نفقة الأولاد الصغار على الأب لايشاركه فيها أحد" (ہندیہ ۱/۵۶۵) (چھوٹے بچوں کا نفقہ باپ پر ہے، اس میں اس کا کوئی شریک نہیں ہوگا)۔

حتی کہ اگر باپ تنگ حال ہے اور کمانے کی طاقت رکھتا ہے تو اس پر واجب ہے کہ کما کر بچوں کا نفقہ ادا کرے، اور اگر وہ کما کر نفقہ ادا کرنے سے انکار کرے تو اسے اس پر مجبور کیا جائے گا، اور اگر کمانے پر قادر نہ ہو تو قاضی اس کی عورت سے کہے گا کہ شوہر کے نام پر قرض لے کر اخراجات پورے کرو اور جب وہ خوشحال ہوجائے تو اس سے لے لو (ہندیہ ۱/۵۶۵)۔

اسی طرح اگر بچہ بڑا ہوگیا، مگر طلب علم میں مشغول ہونے کے سبب کمانے سے قاصر ہے، تب بھی اس کا نفقہ والدین پر واجب ہوتا ہے:

''وكذا طلبة العلم إذا كانوا عاجزين عن الكسب لا يهتدون إليه لا تسقط نفقتهم عن آبائهم إذا كانوا مشتغلين بالعلوم الشرعية'' (ہندیہ ۱۔۵۶۵)۔

مذکورہ تفصیل سے واضح ہوتا ہے کہ شریعت اسلامی کا مزاج بچوں سے صغرسنی کی حالت میں مزدوری کرانے کا نہیں ہے، مجبوری کی بات اور ہے۔

(۲) والدین، نابالغ بچے اور بچیوں سے اپنے گھر کا کام لے سکتے ہیں، اس لئے کہ بچوں پر والدین کی خدمت کرنا واجب ہے، الموسوعۃ الفقہیہ میں ہے:

''أما خدمة الولد لوالده أو استخدام الأب لولده فجائز بلا خلاف، بل إن ذلك في البر المأمور به شرعاً، ويكون واجباً على الولد خدمة أو إخدام والده عند الحاجة'' (لڑکے کا اپنے والد کی خدمت کرنا یا باپ کا اپنے بیٹے سے خدمت لینا بالاتفاق جائز ہے، بلکہ یہ اس حسن سلوک میں داخل ہے جس کا شریعت نے حکم دیا ہے، اور لڑکے پر باپ کی خدمت کرنا یا باپ کا خدمت لینا بوقت ضرورت واجب ہے)۔

ردالمحتار میں ہے: "صرحوا بأن الأب إذا كان مريضاً أو به زمانة يحتاج إلى الخدمة فعلى ابنه خادمه فكذا الابن" (ردالمحتار ۳/ ۶۱۲) (علماء نے صراحت کی ہے کہ اگر باپ مریض ہو یا اسے مزمن مرض لاحق ہو اور اسے خدمت کی ضرورت ہو تو بیٹے پر اسکا خادم لازم ہے اس طرح وہ خود بھی خدمت کرسکتا ہے)۔

یعنی والدین ان تمام امور میں بچوں سے کام لے سکتے ہیں، جو از قبیل خدمت ہیں، اس لئے کہ بیٹے پر باپ کی خدمت کرنا شرعی حق ہے، اور عرف میں اس کا مطالبہ ہوا کرتا ہے، نیز عدم خدمت والدین کی نافرمانی ہے جو حرام ہے، اس لئے عرف میں جو چیزیں خدمت کے زمرے میں آتی ہیں، والدین انہیں کرا سکتے ہیں۔

اگر بچہ کمانے کی عمر کو پہنچ جائے تو باپ اسے مزدوری کے کام میں لگا سکتا ہے، فتاوی ہندیہ میں ہے:

"والذكور من الأولاد إذا بلغوا حد الكسب ولم يبلغوا في أنفسهم يدفعهم إلى عمل ليكتسبوا أو يؤاجرهم وينفق عليهم من أجرتهم وكسبهم" (ہندیہ ۱/ ۵۶۵، ردالمحتار ۳/ ۶۱۳) (بچے جب کمانے کی حد کو پہنچ جائیں اور فی نفسہ وہ بالغ نہ ہوئے ہوں تو انہیں باپ کسی کام میں لگا سکتا ہے، کہ ان کی اجرت و کمائی سے ان پر خرچ کرے)۔

بدائع الصنائع میں ہے: ''باپ اپنے چھوٹے بچے کو کسی کام میں اجیر بنا سکتا ہے، اس وجہ سے کہ اس کی چھوٹے پر ولایت، خود اس کے اوپر ولایت کی طرح ہے، اس وجہ سے کہ اس کی بچے پر شفقت، خود اس کے اوپر شفقت کی طرح ہے، وہ اپنے کو اجیر بنا سکتا ہے تو اپنے بیٹے کو بھی بنا سکتا ہے، اس لئے کہ اس میں بچے کے لئے شفقت ہے، دو طرح سے...... دوسرے یہ کہ اس کو پیشوں میں اجیر بنانا، اس کو سنوارنے، ادب سکھانے، اور تربیت دینے کے قبیل سے ہے، اور اس میں بچے کے لئے شفقت ہے، لہذا باپ اس کا مالک ہوگا'' (بدائع ۴/ ۱۷۸)۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ باپ بچوں کو حسب ضرورت و مصلحت ایسے کام میں اجیر بنا سکتا ہے جو اس کے بس میں ہو، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اپنی معیشت درست کرنے اور اپنے حالات بہتر بنانے کے لئے مزدوری کرائے، جبکہ یہ عمر ان کے بننے، سنورنے اور مستقبل کے لئے تیار ہونے کی ہے۔

والدین کو چاہئے کہ اس عمر میں ان امور کو سکھانے کی کوشش کریں جو ان کو مستقبل میں کام آئیں، اس سلسلہ میں اگر مزدوری کرانا بھی ضروری سمجھتے ہوں تو وہ بھی درست ہوگا۔

اسی طرح بچوں کو کسی پیشہ ورانہ کام سکھانے کے لئے کام میں لگایا جا سکتا ہے، ردالمحتار میں ہے:

"له دفعها لامرأة تعلمها حرفة كتطريز وخياطة مثلاً" (ردالمحتار ۳/ ۶۱۲) (باپ بچی کو کسی عورت کے پاس پیشہ ورانہ کام سیکھانے کے لئے بھیج سکتا ہے، جیسے کشیدہ کاری اور سلائی وغیرہ)۔

جیسا کہ بدائع (۴/ ۱۷۸) سے بھی اس بات کی جانب واضح اشارہ ملتا ہے کہ باپ حسب مصلحت بچوں کو صنعت و حرفت کے کاموں میں لگا سکتا ہے۔

حالت غربت میں بچوں سے مزدوری کرانے کا مسئلہ:

بعض دفعہ والدین بے حد عسرت و تنگدستی میں رہتے ہیں، نہ خود کمانے کی طاقت رکھتے ہیں اور نہ حکومتی سطح پر ان کی امداد ہوتی ہے تو علامہ شامی نے ذخیرہ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ ایسی صورت میں لوگوں کے سامنے دست سوال دراز کر کے بچوں کا نفقہ پورا کرے۔

''اگر باپ مزمن مریض یا اپاہج ہونے کے سبب کمانے سے عاجز ہو تو لوگوں سے مانگ کر بچوں پر خرچ کرے گا'' (ردالمحتار ۵/ ۳۴۷)۔

اور اگر یہ بھی نہ ہو سکے، اور اقرباء کی جانب سے بھی نفقہ کی کوئی صورت نہ نکلتی ہو تو باپ اپنے چھوٹے بچوں کو مزدوری کے کام میں لگا سکتا ہے، یہ دیکھتے ہوئے کہ یہ کام اس کے بس کا ہے اور وہ کمانے کی پوزیشن میں ہے، ردالمحتار میں ہے:

"فإن بلغه كان للأب أن يواجره أو يدفعه في حرفة ليكتسب وينفق عليه من كسبه" (رد المحتار ۳؍ ۶۱۳) (اگر بچہ کمانے کی حد کو پہنچ جائے تو باپ اس سے مزدوری کا کام لے سکتا ہے یا کسی پیشہ ورانہ کام کے لئے بھیج سکتا ہے، تاکہ وہ کمائے اور یہ اس کی کمائی سے اس پر خرچ کرے)۔

فتاوی ہندیہ میں ہے: ''باپ، دادا اور ان کے وصی اگر چھوٹے بچے کو کسی ایسے کام میں مزدور بنائیں جس کو وہ کر سکتا ہو تو جائز ہے'' (فتاوی ہندیہ ۴؍ ۴۳۶)۔

حاصل یہ کہ بچوں کو صغرسنی کی حالت میں والدین اپنی انتہائی غربت وافلاس کے سبب جب کہ کوئی دوسرا حل نہ ہو تو مزدوری کے کام میں لگا سکتے ہیں۔

بچوں کے جرم وسزا کا مسئلہ:

شریعت نے جرائم کے سدباب کے لئے حدود وتعزیرات کا ایک جامع، نفع بخش اور دوررس نتائج پر مبنی موثر قانون بنایا ہے، تاکہ معاشرے میں پنپنے والے جرائم کا قلع قمع ہو سکے، تاریخ شاہد ہے کہ ان قوانین کے نفاذ سے جرائم کا انسداد نادر المثال حد تک ہوا ہے۔

اسلام میں ان حدود شرعیہ کا نفاذ عاقل وبالغ افراد پر ہوتا ہے، نابالغ اور مجنون پر نہیں ہوتا، اس وجہ سے کہ وہ شرعی احکام کے مکلف نہیں ہوتے، جبکہ احکام شرعیہ کے اجراء کے مکلف ہونا ضروری ہے، علامہ ابن نجیم لکھتے ہیں:

''فلا تكليف عليه بشئ من العبادات حتى الزكاة عندنا، ولا بشئ من المنهيات. فلا حد عليه ولو فعل شيئاً منها، ولا قصاص عليه وعمده خطأ'' (الاشباہ والنظائر ۱؍ ۲۶۳) (بچہ کسی بھی عبادت کا مکلف نہیں ہے، حتی کہ ہمارے نزدیک زکوۃ کا بھی، اسی طرح منہیات کا بھی مکلف نہیں ہے، اسی لئے اگر وہ کسی منہیات کا ارتکاب کرتا ہے تو اس پر حد نہیں ہے اور نہ ان پر قصاص ہے، اس کا عمد، خطا ہے)۔

اس لئے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''رفع القلم عن ثلاثة: عن النائم حتى يستيقظ، وعن الصبي حتى يحتلم، وعن المجنون حتى يعقل'' (سنن ابوداؤد ۴؍ ۱۴۱) (تین شخص مرفوع القلم ہیں، سویا ہوا شخص یہاں تک کہ بیدار ہو جائے، بچہ یہاں تک کہ بالغ ہو جائے، مجنون یہاں تک کہ عاقل ہو جائے)۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ ارتکاب جرائم کے تعلق سے بچے آزاد ہیں، جو چاہیں کریں، ان سے کسی طرح کا مواخذہ نہیں کیا جائے گا، بلکہ شریعت میں ان جرائم کے سدباب کے لئے تعزیرات کا نظام ہے، ایسا نہیں ہے کہ بچہ سمجھ کر انہیں نظر انداز کر دیا جائے گا۔ درمختار میں ہے:

"الصغر لا يمنع وجوب التعزير فيجري بين الصبيان" (درمختار ۶؍ ۱۳۰) (صغرسنی، وجوب تعزیر کے لئے مانع نہیں ہے، لہذا یہ بچوں میں بھی جاری ہوگا)۔

اس لئے اگر کسی بچے سے کوئی غلطی ہوتی ہے تو اس کی زجر وتوبیخ کے لئے اس پر تعزیری کارروائی کی جائے گی، الاشباہ والنظائر میں بھی اس کی صراحت موجود ہے:

"ويقام التعزير عليه تأديباً" (الاشباہ والنظائر ۱؍ ۲۶۵) (بچے پر تعزیر تادیباً جاری کی جائے گی)۔

البحر الرائق میں ہے: ''بچے کو تادیباً قید کیا جائے گا، یہاں تک کہ اس طرح کے امور پر پھر جسارت نہ کر سکے، جبکہ اس نے سبب تعدی کو بالقصد اختیار کیا ہو، اور اگر خطا ہو تو نہیں'' (البحر الرائق ۶؍ ۱۵؍ ۳، مبسوط ۲۰؍ ۹۱)۔

اس تادیبی کارروائی کا مقصد یہ ہے کہ بچے کا قدم غلط حرکتوں کی طرف آئندہ نہ بڑھ سکے، چنانچہ تاجر بچے کو قید کئے جانے کے تعلق سے علامہ ابن نجیم نے اپنی کتاب البحر الرائق میں اس بات کی وضاحت فرمائی ہے، لکھتے ہیں:

''قاضی (صبی تاجر) کو عقوبۃً نہیں تادیباً قید کر سکتا ہے، یہاں تک کہ حقوق العباد میں ٹال مٹول نہ کرے، اس وجہ سے کہ بچے کو سزا اسی لئے دی جاتی ہے کہ وہ مذموم حرکتوں سے باز آجائے'' (البحر الرائق ۶؍ ۳۱۵)۔

اسی طرح کتب فقہ میں صراحت ہے کہ بچوں کی مجرمانہ حرکتوں کو یکسر نظر انداز نہیں کیا جائے گا، چنانچہ بچے کی جنایت پر دیت کا وجوب (الدر المختار ۶؍ ۵۸۳)، دوسرے کے مال کو تلف کرنے پر لزوم ضمان (مجلۃ الاحکام العدلیہ ۱؍ ۱۸۶) اور اگر وہ جان وآبرو پر زبردستی کرتے ہوں اور بغیر قتل کئے انہیں اس سے باز بھی نہیں رکھا جا سکتا ہو تو ان کے قتل کرنے کا فیصلہ (الفروق ۴؍ ۲۸۴) واضح کرتا ہے کہ بچے شرعی نقطہ نظر سے گرچہ اہل عقوبت میں سے نہیں ہیں، تاہم ان کی مجرمانہ

سرگرمیوں اور مذموم حرکتوں پر قدغن لگانے کے لئے تادیبی کارروائی کی جائے۔

بچوں کی جیل کا مسئلہ:

اسلام نے جرائم کے سدباب کے لئے جیلوں کا نظام بنایا ہے، اور وہاں کے کچھ اصول وضوابط طے کئے ہیں تاکہ مجرمین کو قرار واقعی سزا تو ضرور ملے مگر ان کے ساتھ زیادتی بھی نہ ہو، چنانچہ انہیں ادائیگی نماز کی اجازت، خورد ونوش اور علاج ومعالجہ کی سہولت دی جائے گی، سفہا، بدکار اور فسادی لوگوں کے پاؤں میں بیڑی ڈالی جائے گی (رد ۶/۱۱۶)۔ مگر مدیون کو نہ مارا جائے گا، نہ بیڑی ڈالی جائے گی، نہ ہتھکڑی پہنائی جائے گی، نہ اسے ننگا کیا جائے گا، نہ اس سے مزدوری لی جائے گی، اور نہ اس کو صاحب حق کے سامنے بطور اہانت کھڑا کیا جائے گا (البحر ۶/ ۲۸۳)، نیز قیدی کی رضامندی کے بغیر اس سے مزدوری کا کام بھی نہیں لیا جائے گا (البحر ۶/ ۲۸۳)، یہ اور اس طرح کے بہت سارے حقوق، قیدیوں کے تعلق سے کتب فقہ میں بصراحت موجود ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ اسلام نے مجرم کو قید خانے میں بھیج کر ان کی اصلاح کرنی چاہی ہے، اس کا مقصد ذلیل ورسوا کرنا نہیں ہے۔

رہا مسئلہ بچوں کا تو ان کی جیل علیحدہ ہونی چاہئے، تاکہ بڑوں کے ساتھ رہ کر وہ مزید نہ بگڑ جائیں، اور غیر شعوری طور پر ان کی ذہنیت فاسد نہ ہوجائے، الموسوعۃ الفقہیہ میں ہے:

"تدل أكثر النصوص على أن يكون حبس الحدث في بيت أبيه أو وليه على أنه يجوز حبسه في السجن إلا إذا خشي عليه ما يفسده فيتوجب حبسه عند أبيه لا في السجن" (الموسوعۃ الفقہیہ ۱۶/ ۳۱۸) (اکثر نصوص سے پتہ چلتا ہے کہ نو عمر کو اس کے والد یا ولی کے گھر میں قید کیا جائے گا، اس کے ساتھ اس کو قید خانے میں قید کرنا بھی جائز ہے، الا یہ کہ اس بات کا اندیشہ ہو کہ وہ بگڑ جائے گا تو اس قید خانے کے بجائے اس کے والد کے پاس کرنا واجب ہوگا)۔

اس لئے بچوں کے قید خانے میں نہ مشقت کا کام لیا جائے، نہ انہیں زیادہ مارا پیٹا جاسکتا ہے، اور نہ انہیں قیدیوں کے عمومی حقوق سے مستثنیٰ کیا جائے، بلکہ مناسب یہ ہے کہ ان کی ذہنی وفکری اصلاح کے لئے ان سے وعظ ونصیحت کی باتیں کی جائیں، اور ان کے ذہن میں اعمال حسنہ کی اہمیت وفضیلت اور اعمال قبیحہ کی شناعت وقباحت بٹھائی جائے تاکہ ان کی سوچ، مثبت ہوجائے اور منفی سرگرمیوں سے ہمیشہ کے لئے دور رہیں۔

بے سہارا بچوں کی کفالت کا مسئلہ:

اسلام نے لاوارث اور بے سہارا افراد کے تعاون اور ان کی دستگیری کی بہت تاکید فرمائی ہے، اس لئے اگر کہیں ایسے بچے پائے جائیں جن کا کوئی پرسان حال نہیں ہے۔ تو ان کی کفالت کرنا، اسلامی معاشرے کی شرعی واخلاقی ذمہ داری ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"من أحياها فكأنما أحيا الناس جميعاً" (المائدہ: ۳۲) (اور جس نے زندہ رکھا ایک جان تو گویا زندہ کردیا سب لوگوں کو)۔

دوسری جگہ ارشاد باری ہے: "وما تفعلوا من خير فإن الله به عليم" (البقرہ: ۲۱۵) (اور جو کچھ کرو گے تم بھلائی سو وہ بے شک اللہ کو خوب معلوم ہے)۔

"وتعاونوا على البر والتقوى ولا تعاونوا على الإثم والعدوان" (المائدہ: ۲) (اور آپس میں مدد کرو نیک کام پر اور پرہیزگاری پر اور مدد نہ کرو گناہ پر اور ظلم پر)۔

چنانچہ اگر لاوارث وبے سہارا بچے کہیں پائے جائیں اور ظن غالب ہے کہ اگر انہیں وہاں سے نہ اٹھالیا گیا تو وہ ضائع ہوجائیں گے، تو ایسے بچوں کو اٹھالینا واجب ہوگا ورنہ مستحب۔

فتاویٰ ہندیہ میں ہے: "ایسے بچے کو اٹھالینا مستحب ہے اور اگر ظن غالب ہو کہ وہ ضائع ہوجائے گا، مثلاً وہ پانی میں یا درندے کے سامنے ملا ہو تو واجب ہے" (فتاوی ہندیہ ۲/ ۲۸۵)۔

تبیین الحقائق میں ہے: "یہ مستحب ہے اگر غالب رائے یہ ہے کہ وہ ہلاک نہیں ہوگا، بایں طور کہ وہ شہر میں ملا ہو، اور فرض ہے اگر ظن غالب ہو کہ وہ ضائع ہوجائے گا، اور وہ فرض کفایہ ہے اگر کوئی دوسرا بھی اس کی دیکھ ریکھ کرنے والا ہو، اس لئے کہ اصل مقصود حفاظت ہی ہے" (تبیین الحقائق ۳/ ۲۹۷)۔

اور اس طرح کے بچوں کے اخراجات بیت المال کے ذمہ ہوں گے، تبیین الحقائق میں ہے:

''ونفقته في بيت المال، روى ذلك عن عمر وعلي رضي الله عنهما، ولأنه عاجز محتاج لا مال له ولا قريب، ومال بيت المال معد للصرف إلى مثله'' (تبيين الحقائق ۳-۲۹۷)۔

(اس کا نفقہ بیت المال کے ذمہ ہوگا، یہ حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ سے مروی ہے اور اس وجہ سے کہ وہ عاجز ومحتاج ہے، نہ اس کے پاس مال ہے اور نہ اس کا کوئی رشتہ دار، اور بیت المال کا مال اس طرح کے لوگوں پر خرچ کرنے کے لئے رکھا گیا ہے)۔

اگر اتفاق سے بیت المال میں پیسے نہ ہوں، یا ایسی جگہ ہو جہاں امام المسلمین نہ ہو، اور اس کے پاس کچھ موجود بھی نہ ہو تو عام مسلمانوں کی ذمہ داری بنتی ہے کہ اس طرح کے بے سہارا، لاوارث اور غریب ونادار بچوں کے اخراجات برداشت کریں، المغنی میں ہے:

''اگر بیت المال سے اس میں مال نہ ہونے کے سبب خرچ کرنا متعذر ہو، یا ایسی جگہ ہو کہ وہاں امام نہ ہو یا اس کو کچھ دیا نہ گیا ہو تو جس مسلمان کو معلوم ہوا اس پر خرچ کرنا واجب ہے، اس وجہ سے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "وتعاونوا على البر والتقوى" اور اس وجہ سے کہ اس پر خرچ نہ کرنے سے وہ ہلاک ہو جائے گا اور اس کا ہلاکت سے بچانا واجب ہے'' (المغنی لابن قدامہ ۶/۱۱۵)۔

اس طرح کے پائے ہوئے بے سہارا بچے شریعت کی نگاہ میں آزاد متصور ہوتے ہیں اور انہیں حق ہوتا ہے کہ تمام انسانی حقوق سے پورے طور پر مستفید ہوں، اور کفالت کرنے والے افراد کا بھی شرعی واخلاقی فرض بنتا ہے کہ اس کی اس انداز سے تربیت کریں کہ انہیں خاندانی ماحول فراہم ہو اور تعلیم وتربیت سے آراستہ ہو کر کامیاب زندگی گزاردیں۔ علامہ طبرانی نے اپنی کتاب ''مکارم الاخلاق'' میں "باب فضل تربية المنبوذين والانفاق عليهم حتى يكبروا" کے تحت حضرت عائشہؓ سے مروی ایک حدیث نقل کی ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے لاوارث بچوں کی تعلیم وتربیت پر کس قدر زور دیا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا:

"من ربى صغيراً حتى يقول لا إله إلا الله لم يحاسبه الله عز وجل" (مکارم الاخلاق ۱/۳۵۳) (جس شخص نے کسی چھوٹے بچے کی تربیت کی یہاں تک وہ کہے لا الہ الا اللہ تو اللہ تعالیٰ اس سے محاسبہ نہیں کرے گا)۔

بچوں کو دوسروں کے حوالہ کرنے کا مسئلہ:

شرعی نقطہ نظر سے متبنی بنانا درست ہے، لیکن اگر کسی نے حد درجہ غربت وافلاس کے سبب اپنے بچے کو دوسرے کے حوالہ کر کے اس سے بے تعلق ہو گیا تو یہ درست نہیں معلوم ہوتا، اس وجہ سے کہ کچھ تعلقات تو بہر حال باقی رہتے ہیں، جنہیں منقطع نہیں کیا جا سکتا، جیسے حق ولایت، نسب، محرمیت، وراثت وغیرہ، پھر اگر اسے کسی اجنبی گھرانے کے حوالہ کیا گیا تو بالغ ہونے کے بعد غیر محرم سے پردے کا مسئلہ بھی درپیش ہوگا، اس وجہ سے کہ متبنی کی حیثیت صلبی اولاد کی نہیں ہوتی۔

اور اگر بچہ حوالہ کرنے والا، بچہ حاصل کرنے والے سے ہدیہ قبول کرتا ہے تو یہ بھی درست نہیں ہوگا، اس وجہ سے کہ گویا وہ بچے کے عوض ایک رقم وصول کر رہا ہے جو ایک طرح کی بیع کی صورت ہے، اور انسان کی بیع درست نہیں ہے، علامہ ابن قدامہ لکھتے ہیں:

"إنما حرم بيع الإنسان لأنه ليس بمملوك" (المغنی ۶/۳۶۴) (انسان کی بیع حرام ہے، اس وجہ سے کہ وہ مملوک نہیں ہے)۔

یہ سچ ہے کہ کبھی کبھی انسان کی عسرت وتنگدستی اس درجہ بڑھ جاتی ہے کہ وہ اپنے لخت جگر کو بھی اپنی نظروں سے اوجھل کرنے پر راضی ہو جاتا ہے، بلاشبہ یہ بہت بڑا المیہ ہے، اس سلسلہ میں والدین کو چاہئے کہ باحوصلہ زندگی گزاریں اور دائرہ شریعت میں رہتے ہوئے طلب معاش کی کوشش کریں، نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

''إن أحدكم لن يموت حتى يستكمل رزقه فلا تستبطئوا الرزق واتقوا الله. أيها الناس فاجملوا في الطلب خذوا ما حل ودعوا ما حرم'' (القضاء والقدر للبیہقی ۱/۲۰۸۰) (تم میں سے کسی کی موت اس وقت تک نہیں آئے گی جب تک کہ وہ اپنا رزق پورا نہ کرلے، لہذا یہ نہ سمجھو کہ رزق دیر میں آئے گا، اے لوگو! اللہ سے ڈرو، اور خوبی کے ساتھ اسے طلب کرو، جو حلال ہو اسے لے لو اور جو حرام ہے اسے چھوڑ دو)۔

نیز اصحاب خیر کو اس جانب متوجہ ہونے کی ضرورت ہے کہ معاشرے کے غریب ونادار اور پریشان حال افراد کی خبر گیری کریں، اور ان کی حسب ضرورت

مدد کرتے رہیں، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کی مدد کرنے کی تاکید فرمائی ہے، آپ نے فرمایا:

"من نفس عن مومن كربة من كرب الدنيا نفس الله عنه كربة من كرب يوم القيامة.... والله في عون العبد ما كان العبد في عون أخيه" (صحیح مسلم ۴/ ۲۰۷۴) (جو شخص کسی مومن کی کوئی دنیوی مصیبت کو دور کرے گا، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی کوئی مصیبت دور فرمائیں گے.... اللہ تعالیٰ بندے کی مدد فرماتے ہیں، جب تک بندہ اپنے بھائی کی مدد کرتا ہے)۔

یہ واقعہ ہے کہ اگر اسلام کا نظام تکافل اسلامی معاشرے میں عام ہو جائے تو اس طرح کے واقعات وحالات کا پورے طور پر خاتمہ ہو جائے، اور معاشرے کی بہت ساری الجھنیں از خود کافور ہو جائیں۔

بچوں کے علاج کا مسئلہ:

اگر بچے کسی بیماری میں مبتلا ہوں تو والدین کی ذمہ داری بنتی ہے کہ ان کے حفظان صحت کا معقول نظم، اور ان کے علاج ومعالجہ کا مناسب بندوبست کریں، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے علاج کرنے اور ازالہ مرض کی طبی تدابیر اختیار کرنے کا حکم دیا ہے، آپ نے فرمایا:

"يا عباد الله تداووا فإن الله لم يضع داء إلا وضع له شفاء" (سنن ترمذی ۴/ ۳۸۳) (اے اللہ کے بندو! علاج کرو اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی مرض کو نہیں بنایا مگر یہ کہ اس کے لئے شفا بھی بنائی)۔

نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بچوں کے امراض کے تعلق سے حد درجہ فکر مندی فرمائی ہے، اور ان کے علاج پر نہ صرف یہ کہ زور دیا ہے، بلکہ ان کی نفع بخش اور موثر دوا کی نشاندہی بھی فرمائی ہے، حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ ام المؤمنین حضرت عائشہؓ کے پاس ایک بچہ تھا جس کی ناک سے خون ٹپک رہا تھا، آپ تشریف لائے تو پوچھا، اس بچے کو کیا ہو گیا؟ حضرت عائشہؓ نے کہا: اسے عذرہ (درد حلق) کا مرض ہے، آپ نے فرمایا: تم عورتیں بھی عجیب ہو، تم اپنے بچوں کو ہلاکت میں نہ ڈالو، جب کسی عورت کو عذرہ یا درد سر ہو تو اسے عود ہندی استعمال کرنا چاہئے، چنانچہ حضرت عائشہؓ نے آپ کے حکم سے ایسا کیا تو وہ بچہ شفایاب ہو گیا" (مستدرک حاکم ۴/ ۲۲۸)۔

اس لئے والدین کا دینی فریضہ ہے کہ بچوں کی دیگر ضروریات زندگی کی طرح ان کی جسماجی وذہنی صحت کا بھی خیال رکھیں، اور خدانخواستہ کسی مرض میں گرفتار ہو جائیں تو ان کے علاج کی فکر کریں اور ان کی نگہداشت میں غفلت سے کام نہ لیں، اس لئے کہ یہ ان کی دینی واخلاقی ذمہ داری ہے جس کے بارے میں عند اللہ باز پرس ہوگی، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"الرجل راع على أهل بيته وهو مسئول عن رعيته، والمرأة راعية على بيت زوجها وولده وهي مسئولة عنهم" (متفق علیہ مشکوۃ ۲/ ۳۲۱) (آدمی اپنے اہل خانہ کا نگراں ہے، اور اس سے اس کے ماتحت کے بارے میں باز پرس ہوگی، عورت اپنے شوہر کے گھر اور اس کے لڑکے کی نگراں ہے اور اس سے ان کے بارے میں باز پرس ہوگی)۔

لیکن اگر والدین ملازمت یا کسی دیگر مصروفیت کے سبب بچوں کی دیکھ ریکھ سے قاصر ہوں اور انہیں کسی اسپتال میں داخل کر کے ان کے علاج ونگہداشت کا مناسب نظم کر دیں، تو درست ہوگا، اور اسے والدین کی جانب سے غفلت اور ذمہ داری سے فرار تصور نہیں کیا جائے گا، بلکہ اس صورت حال میں اسے اچھا عمل اور مستحسن قدم قرار دیا جائے گا، البتہ والدین کو چاہئے کہ حسب موقع اسپتال جا کر ان کی دل جوئی اور خبر گیری کرتے رہیں، تاکہ ان کی دلبستگی ہوتی رہے، اس لئے کہ بچوں کو والدین کی شفقت بھری نگاہ کی ہر آں ضرورت ہوتی ہے، بالخصوص حالت مرض میں۔

پھر یہ سلسلہ علاج اس وقت تک جاری رہے گا جب تک مرض زائل نہ ہو جائے، اس لئے کہ علاج کی کوئی حد نہیں ہے، فتاوی دار العلوم میں ہے:

"علاج کے لئے کوئی حد شرعی نہیں ہے، جب تک مرض کا ازالہ نہ ہو اس وقت تک دوا کرنا مسنون ہے" (فتاوی دار العلوم ۱۶/ ۲۰۹)۔

ظاہر ہے کہ جب تک بچہ نابالغ ہے اس وقت تک اس کا نفقہ باپ کے ذمہ ہے، اور جب بڑا ہو گیا اور بیماری کے سبب کمانے سے عاجز ہے تو اس وقت بھی اس کا نفقہ باپ ہی کے ذمہ رہتا ہے، رد المحتار میں ہے:

"اسی طرح نفقہ انثی علی الاطلاق کی طرح اس کے بڑے لڑکے کا نفقہ بھی اس پر واجب ہوگا جو کمانے سے عاجز ہو اور کسی مزمن مرض میں گرفتار ہو، یہاں اس سے مراد وہ مرض ہے جس کی وجہ سے وہ کما نہ سکے" (رد المحتار ۳/ ۶۱۴)۔

☆☆☆

بچوں کے حقوق، اسلامی تعلیمات کی روشنی میں

مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی[1]

بچوں کے حق پرورش (حق حضانت) کے سلسلے میں اسلام کی بنیادی ہدایات:

اسلام ایک مکمل خدائی قانون نظام ہے، جو حیات اور مابعد الحیات کے تمام گوشوں پر محیط ہے، اس نے کسی گوشے کو تشنہ اور ادھورا نہیں چھوڑا ہے، جس سے صالح زندگی کی تعمیر و تشکل رک جائے اور انسانی مقاصد حیات ضائع ہو کر رہ جائیں، اس سلسلے میں بچے کی مصالح حیات کی تکمیل کے لئے حق پرورش کو تین جہات میں تقسیم کیا گیا ہے:

(۱) بچہ، (۲) پرورش کرنے والی ماں، دادی، نانی، (۳) پھر باپ۔

اسلام میں بچوں کے حق پرورش کے لئے پرورش کرنے والی ماں یا دیگر مستحق پرورش افراد کا (۱) مسلمان ہونا۔ (۲) صاحب عقل وخرد ہونا۔ (۳) بالغ اور باخبر ہونا۔ (۴) بچہ کی جسمانی اور اخلاقی تربیت کی صلاحیت رکھنا۔ (۵) بچہ کی نشوونما اور صحیح دیکھ بھال میں امانت دار ہونا تاکہ گھر سے باہر کی مصروفیت میں بچہ ضائع نہ ہو۔ (۶) صاف ستھرے اور صحت بخش مکان میں پرورش کرنا۔ (۷) ذی رحم محرم ہونا۔ (۸) مطلقہ ہونے کی صورت میں کسی اجنبی شخص کے نکاح میں نہ ہونا۔ جو بچے کا ذی رحم محرم نہ ہو۔ (۹) کھلی بدچلنی میں مبتلا نہ ہونا۔ (۱۰) اسلام سے خارج (مرتدہ) نہ ہونا۔

واضح رہے کہ مسلمان ہونے کی شرط مالکیہ، حنابلہ، شافعیہ کے مذہب میں مرد عورت دونوں کے لئے اور مذہب حنفیہ میں صرف مرد کیلئے ہے (الموسوعۃ الفقہیہ ۱۷/۳۰۵)۔

علامہ ابن عابدین شامیؒ لکھتے ہیں:

"ویشرط فی الحاضنة أن تكون حرةً بالغةً عاقلةً أمينة قادرةً وأن تخلو من زوج أجنبي، وكذا في الحاضن الذكر سوى الشرط الأخير هذا ما يؤخذ من كلامهم. قلت وينبغي أن يزيد بعد قوله حرة أو مكاتبة ولدت في الكتابة وأن يزيد أن تكون رحما محرماً ولم تكن مرتدة ولم تمسكه في بيت المبغض للولد ولم تمتنع عن تربيته مجانا عند إعسار الأب" (ردالمحتار على الدر المختار ۲-۶۳۳)۔

علامہ رملیؒ فرماتے ہیں:

"پرورش کرنے والی عورت کے لئے حق پرورش حاصل کرنے کے واسطے شرط یہ ہے کہ وہ آزاد، بالغہ، عاقلہ، امانت دار، دیکھ ریکھ پر قدرت رکھنے والی ہو، اور یہ بھی کہ وہ بچہ کیلئے کسی اجنبی شخص کی بیوی نہ ہو، یہی شرطیں پرورش کرنے والے مرد کے لئے بھی ہیں، آخری شرط کے علاوہ، یہ حضرات فقہاء کا کلام ہے۔"

علامہ شامیؒ فرماتے ہیں: "اس میں یہ بھی اضافہ کیا جانا مناسب ہے کہ یا وہ مکاتبہ باندی ہو، جس نے حالت مکاتبت میں بچہ جنا ہو، اور یہ اضافہ بھی ہونا چاہئے کہ وہ بچہ کے لئے ذی رحم محرم ہو (جس سے نکاح کی حرمت کا رشتہ ہوتا ہے) اور مرتدہ یعنی اسلام سے خارج نہ ہو اور بچہ کی صحت کے لئے مضر مکان میں نہ رکھتی ہو۔ اور باپ کے غریب ہونے کی صورت میں مفت پرورش سے انکار نہ کرتی ہو"۔

حق پرورش کے تقاضے:

اسلام میں بچہ کے حق پرورش حاصل کرنے کے لئے ان ذمہ داریوں کو نبھانا بھی بنیادی ہدایات میں شامل ہے۔

---

[1] شیخ الحدیث مدرسہ امداد الاسلام میرٹھ یوپی۔

"مقتضی الحضانة حفظ المحضون وإمساكه عمايؤذيه وتربيته لينمووذالك بعمل مايصلحه وتعهده بطعامه وشرابه وغسله وغسل ثيابه ودهنه وتعهدنومه ويقظته" (الموسوعة الفقهيه الكويتيه ۱۷-۳۰۱، بدائع الصنائع ۴-۶۰، مغنی المحتاج ۳-۴۵۲، كشاف القناع ۵-۴۹۶، الشرح الصغير ۲-۷۵۵)۔

(پرورش کی ذمہ داری کا تقاضا یہ ہے کہ پرورش کنندہ بچے کی پوری نگہداشت کرے اور اس کی زندگی کے لئے ہر طرح کی نقصان دہ چیزوں سے اس کو بچائے، اس کی تربیت اور دیکھ بھال اور حفظان صحت کا پورا خیال رکھے تاکہ اس کی صحیح نشوونما ہوسکے، اور یہ ایسے تمام اسباب فراہم کرنے سے ممکن ہوگا جو بچے کے لئے ہر طرح لائق اور مناسب ہو، اس کے کھانے اور پینے اور اس کو نہلانے دھلانے اور اس کے گندے کپڑے دھونے اور اس کو تیل لگانے اور مالش کرنے کی ضرورت کا بھرپور خیال رکھے۔ اور اس کے سونے اور جاگنے کی ضروری سہولت مہیا کرے)۔

بچے اور بچی کا حق:

اللہ تعالیٰ نے ماں باپ کے ذریعہ بچہ اور بچی کو دنیا میں عبث اور بے سہارا ضائع ہونے کیلئے پیدا نہیں کیا بلکہ اس کو بامقصد زندگی گذارنے کے اسباب ووسائل مہیا فرمائے، پیدائش کے بعد عقل وتمیز کے حصول تک جس کو اصطلاح فقہاء میں صبی غیر ممیز کہتے ہیں، اور ایام زندگی کے حساب سے اس کی مدت پرورش سات سال مقرر کی گئی ہے، اس کو حق پرورش عطا فرمایا۔ اس دہلیز پر قدم رکھتے ہی بچے میں خوب وناخوب، پاکی وناپاکی، استنجاء اور کپڑا پہننے کا شعور، خبیث وطیب، بھلے برے اور تلخ وشیریں کی پہچان اور اسلام کا سبب نجات ہونا، خرید وفروخت میں قیمت کی کمی بیشی اور خرید کردہ سامان پر اپنی ملکیت کا حصول اور اس کے عوض بیچنے والے کو قیمت ادا کرنے کا احساس عمومی طور پر ہونے لگتا ہے۔ اور وہ صبی ممیز ہوجاتا ہے اور اس حد عمر سے آگے اس کو اپنی زندگی کی خود کفالت کے دور میں پہلا قدم رکھنے کا حوصلہ فطری طور پر ملنے لگتا ہے۔ اس لئے بچے کا واجبی حق پرورش اس حد تک پہنچنے سے پہلے تک ہی قائم رہتا ہے۔

بچے کو اپنی پرورش کا حق بایں معنی بھی حاصل ہوتا ہے کہ وہ ماں کے علاوہ کسی دوسری عورت کی چھاتی سے دودھ پینا قبول نہیں کرتا۔ یا ماں کے علاوہ دوسرا پرورش کنندہ موجود نہ ہو یا اس کے باپ یا خود بچے کا کوئی مال نہ ہو تو شرعی طور پر پرورش کیلئے ماں متعین ہوجائے گی اور اس کو پرورش کیلئے مجبور کیا جائے گا۔ یہاں تک کہ بچے کے حق پرورش سے دست بردار ہونے کی شرط پر خلع کرے گی تو اس کی شرط باطل قرار دی جائے گی اور بچے کے حق کو باطل نہیں ہونے دیا جائے گا۔

"وهی حق المحضون بمعنى أنه لولم يقبل المحضون غير أمه أولم يوجد غيرها أولم يكن للأب ولا للصغير مال تعينت الأم للحضانة وتجبر عليها ولذلك يقول الحنفية۔ لواختلعت الزوجة على ان تترك ولدهاعندالزوج صح الخلع وبطل الشرط، وهذاعندالحنفيه والشافعيه والحنابله ويوافقهم المالكيه فى المشهور عندهم" (ردالمحتار ابن عابدين ۲-۶۳۶، الدسوق ۲-۵۳۲، نهاية المحتاج ۷-۲۱۳، مغنى المحتاج ۳-۴۵۶، كشاف القناع ۵-۴۹۶، المغنى ۷-۶۲۴، الموسوعة الفقهيه الكويتيه ۱۷-۳۰۱)۔

(۲) اسلام میں عورتوں کی بچوں سے فطری محبت وشفقت اور مادری جذبات کی فراوانی اور ماں کی ممتا کے پیش نظر بچوں کی پرورش کی اولین حقدار عورتوں کو قرار دیا گیا ہے۔ علامہ کاسانی تحریر فرماتے ہیں:

"الأصل فيها النساء لأنهن أشفق وأرفق وأهدى إلى تربية الصغار" (بدائع الصنائع ۳/۵۶۴ مطبوعہ زکریا دیوبند)۔

جنھیں حق پرورش حاصل ہے:

بچوں کی پرورش کا حق بنیادی طور پر عورتوں کا ہے، کیونکہ وہ بچے پر سب سے زیادہ شفقت نچھاور کرنے والی اور سب سے زیادہ مہربان اور چھوٹے بچوں کی مصالح اور تربیت میں سب سے زیادہ واقف کار ہوتی ہیں۔

چنانچہ قانون شریعت میں حسب ذیل ترتیب کے مطابق عورتوں کو حق پرورش عطا کیا گیا ہے:

(۱) ماں (۲) نانی (۳) دادی (۴) بہن حقیقی (۵) بہن اخیافی، ماں شریک بہن (۶) بہن علاتی، باپ شریک بہن (۷) حقیقی بھانجی، بہن کی بیٹی (۸) اخیافی بھانجی، ماں شریک بہن کی بیٹی (۹) خالہ حقیقی، ماں کی سگی بہن (۱۰) خالہ اخیافی، ماں کی ماں شریک بہن (۱۱) خالہ علاتی، ماں کی باپ شریک بہن (۱۲)

بھانجی علاتی، باپ شریک بہن کی بیٹی (۱۳) بھتیجی حقیقی (۱۴) بھتیجی اخیافی، ماں شریک بھائی کی بیٹی (۱۵) بھتیجی علاتی، باپ شریک بھائی کی بیٹی (۱۶) پھوپھی حقیقی، باپ کی سگی بہن (۱۷) پھوپی اخیافی، باپ کی ماں شریک بہن (۱۸) پھوپھی علاتی، باپ کی باپ شریک بہن (اسلامی قانون متعلق مسلم پرسنل لا ص ۱۵۶، نیز دیکھئے: الدر المختار علی ہامش رد المحتار ۲/ ۶۳۸)۔

اگر مندرجہ بالا خواتین میں سے کوئی خاتون نہ ہو یا حضانت کی اہل نہ ہو تو حق حضانت حسب ترتیب ذیل وراثت کے حقدار عصبہ کی طرف منتقل ہوگا، سب سے پہلے باپ، پھر دادا، پھر حقیقی بھائی، پھر باپ شریک بھائی، پھر ان کی اولاد، پھر چچا، پھر ان کی اولاد بشرطیکہ وہ کھلے طور پر بد چلن اور بد عقل نہ ہوں۔

''ثم العصبات بترتيب الإرث فيقدم الأب ثم الجد ثم الأخ الشقيق ثم لاب ثم بنوه كذالك ثم العم ثم بنوه سوى فاسق و معتوه'' (الدر المختار على هامش رد المحتار ۲-۶۳۸)۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک مذکورہ بالا ترتیب میں تھوڑا سا فرق ہے، علاتی بہن مقدم ہے اخیافی بہن پر، اسی طرح علاتی خالہ پہلے اور اس کے بعد اخیافی خالہ ہے، البتہ اخیافی پھوپھی مقدم ہے اور علاتی پھوپھی موخر ہے، اس کے بعد وراثت کی ترتیب کے مطابق عصبہ کا نمبر ہے (المھذب ۲/ ۱۷۰، مغنی المحتاج ۳/ ۴۵۲)

فقہ مالکی میں ماں، پھر نانی اور اس کے بعد تیسرے نمبر پر حقیقی خالہ پھر اخیافی خالہ پھر علاتی خالہ اور اس کے بعد دادی کا نمبر ہے۔ پھر حقیقی، اخیافی اور علاتی بہن کے بعد پھوپھی پھر بھانجی۔ پھر جس کو وصیت کی جائے۔ پھر وراثت کی ترتیب کے مطابق عصبہ (القوانین الفقہیہ / ۲۲۳، الشرح الصغیر ۲/ ۶۳۴)۔

امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک ماں اور نانی کے بعد اس کی مائیں پھر باپ دادی پھر اس کی مائیں، اس کے بعد دادا اور اس کے بعد اس کی مائیں اور ان کے بعد بہن حقیقی، اخیافی، علاتی، پھر خالہ حقیقی، اخیافی، علاتی، پھر پھوپھی حقیقی، اخیافی، علاتی، پھر اسی ترتیب پر ماں کی خالائیں، پھر اسی ترتیب پر بات کی خالائیں پھر باپ پھوپھیاں پھر بھانجیاں پھر بھتیجیاں، پھر چچازاد بہن، پھر پھوپھی زاد بہن اسی ترتیب کے مطابق، پھر اخیر میں وراثت کی ترتیب کے مطابق عصبہ۔ (کشاف القناع ۵/ ۴۹۶، المغنی ۱۱/ ۴۲۵، ۴۲۶)۔

آگے یہ مسئلہ فقہاء اربعہ کے یہاں متفق علیہ ہے کہ اگر کوئی لڑکی شہوت کی عمر میں پہنچ گئی ہو تو اس کی پرورش کے لئے اس کو غیر محرم وارث مثلاً چچازاد بھائی کے حوالے نہیں کیا جاسکتا، تاکہ فتنہ اور گناہ سے حفاظت رہے، البتہ چھوٹی بچی کی پرورش کا حق اس کو حاصل ہوسکتا ہے۔ (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۱۰/ ۷۳۰۰)۔

یہاں یہ بھی قابل ذکر ہے کہ اگر عصبہ میں سے کوئی بھی نہ ہو، یا حضانت کا اہل نہ ہو تو ذوی الارحام جیسے اخیافی بھائی پھر اس کی اولاد پھر اخیافی چچا پھر حقیقی ماموں پھر اخیافی ماموں کو حق حضانت ملے گا۔

''ثم إذا لم يكن عصبة فلذوى الأرحام فتدفع لأخ لأم، ثم لابنه ثم للعم لأم ثم للخال لأبوين ثم لأم'' (الدر المختار ۲-۶۳۹، اسلامی قانون، ص: ۱۵۶)۔

اگر ایک ہی درجہ کے دو مستحق حضانت موجود ہوں تو جو زیادہ بہتر تربیت کی صلاحیت رکھتا ہو اس کا حق حضانت مقدم ہوگا، اس کے بعد جو زیادہ پرہیزگار ہو پھر جو زیادہ عمر رسیدہ ہو اس کو یہ حق ملے گا۔

''فإن تساووا فأصلحهم ثم أورعهم ثم أكبرهم'' (الدر المختار ۲-۶۳۹)۔

عمر کے جس مرحلے میں ماں کو یا باپ کو پرورش کا اولین حقدار تسلیم کیا گیا ہے:

بچہ کی پیدائش کے بعد ہی ماں باپ سے تین حقوق کا تعلق قائم ہوجاتا ہے: پہلا حق رضاعت، دوسرا حق حضانت، تیسرا حق تعلیم و تربیت، ان تینوں میں پہلا اور دوسرا حق خصوصی طور پر ماں سے وابستہ ہے، پہلے حق رضاعت کی مدت دو سال اور دوسرے حق حضانت کی مدت سات سال یا سن شعور و تمیز کے آغاز تک ہے، ان دونوں مرحلوں میں ماں کی غیر موجودگی یا انکار یا کسی دیگر مانع کے سبب محرمات نسبیہ سے جڑی ہوئی عورتیں مذکورہ بالا ترتیب کے مطابق دونوں حقوق کی شرعی طور پر اولین حقدار قرار دی گئی ہیں، یہاں باپ کو ثانوی درجہ میں ان سب کے بعد ہی حق حضانت حاصل ہوتا ہے، البتہ تیسرے حق تعلیم و تربیت کے دور میں باپ کو خصوصی طور پر اولین حقدار مانا گیا ہے، سن شعور کے آغاز سے بلوغ تک بچے کی زندگی کے مفاد کا تعلق باپ سے زیادہ ہوتا ہے اور وہی بہتر طور پر اس پوری مدت میں اپنے ذمہ واجب حق کی ادائیگی کا اہل ہوتا ہے، اس لئے اس دور میں بچے کے شخص کو شخصیت بنانے اور اس کی ذہنی فکری نفسیاتی اور تعلیمی و تربیتی اور

جسمانی ضروریات کی تکمیل میں باپ جو سرگرم کردار ادا کرسکتا ہے وہ دوسرے نہیں کرسکتے اور یہ سب باپ کی اہلیت وصلاحیت کے بغیر ممکن نہیں۔

شرائط پرورش:

پرورش کنندہ ماں یا باپ میں شرائط حضانت مفقود ہونے کے سبب بچہ کیلئے جسمانی، تعلیمی، تربیتی یا نفسیاتی مضرت کا اندیشہ ہو، مثال کے طور پر وہ عاقل نہ ہو بلکہ مجنوں، پاگل یا معتوہ فاتر العقل ہو یا ٹی۔بی، ایڈز، جذام یا برص یا کسی متعدی مرض میں مبتلا ہو، یا ایسے فسق وفجور میں مبتلا ہو جس کا اثر بچہ کی اخلاقی صحت پر پڑتا ہو جیسے: زنا کار ہو یا چکلہ وقحبہ خانہ یا بیئر بار چلاتا ہو، یا چوری ڈکیتی یا گانے بجانے کا کاروبار کرتا ہو، یا نیاحۃ یعنی مُردے پر رونے دھونے کے پیشہ میں مصروفیت رکھتا ہو جس سے بچے کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہو یا نابینا ہو کہ خود اپنی ضروریات پوری کرنے میں دوسرے کا محتاج ہو چہ جائیکہ وہ بچے کی ضروریات پرورش پوری کرسکے، یا اس درجہ کثیر العبادۃ ہو کہ اس میں زیادہ سے زیادہ مصروفیت کے باعث بچہ کی صحیح دیکھ ریکھ سے بے پروا ہو۔ یا پرورش کنندہ مطلقہ یا بیوہ ہو اور کسی غیر ذی رحم محرم مرد سے شادی کرلے جو بچہ کیلئے اجنبی ہو اور وہ اپنے شوہر کے حقوق کی ادائیگی میں مشغولیت کے سبب بچہ کا حق حضانت ادا کرنے سے قاصر رہتی ہو، جیسا کہ غلام یا باندی ہونے کی وجہ سے حق مولیٰ میں مصروفیت حق حضانت کی ادائیگی میں نقصان وہ کوتاہی ہے اور اس کا اثر بچہ کی ذہنی، فکری آزادی پر ہوتا ہے۔

علامہ اقبالؒ نے سچ کہا ہے ؎

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے تزئین حیات
اور آزادی میں بحر بیکراں ہے زندگی

ان سب صورتوں میں پرورش کنندہ کا حق حضانت ساقط ہوجائے گا۔

موسوعہ فقہیہ میں مزید صراحت ہے: ''شرطِ بلوغ وعقل سے ثابت ہوتا ہے کہ حق پرورش بچے، پاگل بدعقل کو حاصل نہیں ہوگا، کیونکہ یہ سب خود اپنی اور جو زیر پرورش ہوں ان کی ضرورت پوری نہیں کرسکتے، لہٰذا کسی اپنے علاوہ کی پرورش ان کے حوالے نہیں کی جاسکتی اور یہ مسئلہ مجموعی طور پر متفق علیہ ہے، اگرچہ مالکیہ حضرات کے یہاں بلوغ کی شرط کے سلسلے میں کچھ تفصیل ہے'' (۱۷/۳۰۶)۔

''پرورش کنندہ کا دین میں امانت دار ہونا ضروری ہے۔ لہٰذا فاسق وبددین کو حق پرورش نہیں ملے گا، کیونکہ اس پر اطمینان نہیں کیا جاسکتا، فسق سے مراد ایسی بددینی ہے جو زیر پرورش بچے پر اثر انداز ہو، مثلاً وہ کھلے عام شراب پیتا ہو، چوری، زنا، حرام کاری میں شہرت رکھتا ہو، البتہ جس کا حال پوشیدہ ہو اس کو حق پرورش حاصل ہوگا'' (ردالمحتار ۲/۶۳۳، دسوقی ۲/۵۲۹، نہایۃ المحتاج)۔

ابن عابدینؒ کہتے ہیں کہ پرورش کرنے والی ایسی فاسقہ ہو کہ جس کے فسق کے سبب اس کے پاس بچے کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہو تو اس کا حق ساقط ہو جائے گا، اور اگر اس درجہ کا فسق نہ ہو تو بچہ میں ماں کے فسق وفجور کی سمجھ پیدا ہونے تک بچہ کو چھوڑا جاسکتا ہے، ورنہ شعور فسق کی حالت میں بچہ کو اس سے چھین لیا جائے گا۔

''القدرة على القيام بشأن المحضون فلاحضانةلمن كان عاجزاًعن ذلك لكبرسنّ أو مرض يعوق عن ذلك، أوعاهته كالعمى وأخرس والصمم أوكانت الحاضنة تخرج كثيرألعمل أوغيره وتترك الولد ضائعا، فكل هولاء لاحضانة لهم إلا إذاكان لديهم من يعني بالمحضون ويقوم على شئونه فحينئذ لاتسقط حضانتهم'' (ردالمحتار ۲۔۶۳۴، الدسوقی ۵۔۲۸، مغنی المحتاج ۳۔۴۵۶، اسنی المطالب ۳۔۴۴۸، کشاف القناع ۵۔۴۹۹، موسوعة الفقهيه ۱۷۔۳۰۶)۔

''أن لايكون بالحاضن مرض معد أو منفر يتعدى ضرره إلى المحضون كالجذام والبرص وشبه ذلك من كل مايتعدى ضررة إلى المحضون'' (الدسوقی ۲۔۵۲۸، مغنی المحتاج ۳۔۴۵۶، کشاف القناع ۵۔۴۹۹)۔

(اور یہ شرط بھی ہے کہ پرورش کرنے والے میں کوئی چھوت کی بیماری یا نفرت انگیز مرض جس کا ضرر بچہ تک پہنچ جائے جیسے کوڑھ، سفید داغ اور اسی جیسا ہر وہ مرض جس کا نقصان دہ اثر زیر پرورش بچہ تک پہنچ جائے)۔

حق دار پرورش کی غیر موجودگی میں:

مذکورہ بالا ساری وہ حالتیں ہیں جو بچوں کے مفاد میں کسی مرد یا عورت کو حق پرورش سے محروم کردیتی ہیں، ان کے علاوہ کچھ وہ صورتیں بھی ہیں جو اوپر شرائط پرورش کے ذیل میں بیان کی جاچکی ہیں، جن کے مفقود ہونے پر حق پرورش کے سوخت ہونے کے احکام نافذ ہوں گے، رہ گئی یہ بات کہ صفات مذکورہ بالا کے کسی ماں یا باپ یا مرد وعورت میں موجود ہونے کے سبب بچہ کو ان کے حوالہ کرنے میں تعلیمی، تربیتی، جسمانی یا نفسیاتی پہلو سے بچہ کے لئے مضرت کا اندیشہ ہے، تو اب سوال یہ ہے کہ بچے کو کس کے حوالہ کیا جائے، اس کا پہلا جواب تو یہ ہے کہ حضانت عورتوں اور مردوں کی فہرست میں نسبی رشتہ محرمیت رکھنے والی عورتوں میں حسب ترتیب اولیٰ فالاولیٰ کے حوالہ کیا جائے، جن میں شرائط حضانت پائی جاتی ہوں۔ اور بظاہر ان اٹھارہ میں کوئی نہ کوئی یقیناً اس حضانت کے لئے معیار حضانت پر کھری اترے گی۔ اسی واسطے شریعت نے یہ ترتیب اور درجہ قائم کیا ہے، اور اگر عورتوں میں خدانخواستہ کوئی اہل اور اشفق دستیاب نہ ہو تو پھر ان کے بعد مردوں کی ترتیب حضانت موجود ہے، اسی کے مطابق عمل کیا جائے گا، جس کی ہر فقہی مذہب میں گنجائش پائی جاتی ہے۔

اس مسئلہ کا دوسرا حل یہ ہے کہ اگر بچہ کے لئے مضرت رساں ماحول سے بچا کر پرورش کا حق پورا کرنے والا کوئی نہ ہو تو اس صورت مسئلہ کو بطور نظیر سامنے رکھا جائے جس میں کسی غیر مسلمہ کتابیہ مجوسیہ کے زیر پرورش بچہ کو اس کے دین کی طرف میلان یا جھکاؤ کے اندیشہ سے اس کی پرورش سے ہٹا کر مسلمانوں کو پرورش کا ذمہ دار بنانا ضروری ہو جاتا ہے۔ موجودہ صورت حال میں بھی اس بچہ کو مسلمانوں کے حوالہ کیا جائے گا۔ اور اس کی پرورش کا خرچ باپ یا بچہ کے مال سے وصول کیا جائے گا۔ اور غریب ونادار ہونے کی صورت میں یہ خرچ بچہ پر قرض مانا جائے گا جسے قدرت علی الکسب ہونے پر بچہ ادا کر سکے گا۔

''أو يخشى أن يألف الكفر فإنه حينئذٍ ينزع منها ويضم إلى أناس من المسلمين'' (الموسوعة الفقهيه ۱۷۔۳۰۶، بحواله ردالمحتار ۲۔ ۶۹۳، ۶۳۳)۔

تیسری صورت یہ ہے کہ بچے کو کسی ایسے مسلم ادارہ، یتیم خانہ، مسلم بے بی سینٹر میں داخل کرا دیا جائے جہاں اسلامی ماحول میں اس کی تعلیم وتربیت کے ساتھ پرورش کا نظم ہو، اور جہاں یہ ماحول فراہم نہ ہو وہاں ہرگز داخل نہ کیا جائے، ورنہ جس ماحول سے بچہ کو بچانا ضروری تھا وہ اسی میں پھنس کر دین سے منحرف ہو جانے کے خطرے میں پڑ جائے گا۔

اسلام میں بچوں کے حق تعلیم وتربیت کے بارے میں بنیادی ہدایات:

اسلام میں بچوں کے حق تعلیم وتربیت کی بنیادی ہدایت کا سلسلہ وہیں سے شروع ہو جاتا ہے، جہاں سے وحی الٰہی کا آغاز ہوتا ہے، قرآن پاک کی سب سے پہلی آیت میں ہی حکم تعلیم وتربیت دے کر خالق انفس وآیات نے تمام نوع انسانی کی تزئین حیات کا سامان فراہم کردیا ہے۔

"اقرأ باسم ربك الذي خلق" (سورہ علق:۱)۔ (پڑھو اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا)۔

یہاں قابل غور یہ ہے کہ حکم تعلیم کو اللہ تعالیٰ نے اسم ذات کے بجائے اپنی صفت ربوبیت سے مربوط کیا ہے، جس کے معنی قاضی بیضاویؒ کے الفاظ میں یہ ہیں:

''الرب في الأصل بمعنى التربية وهي تبليغ الشيئ إلى كماله شيئاً فشيئاً'' (التفسير للبيضاوی ۱۔۶)۔

(رب اصل میں تربیت کے معنی میں ہے جس کی حقیقت یہ ہے کہ کسی چیز کو ادنیٰ حالت سے درجہ بدرجہ ترتیت کر کے درجہ کمال تک پہنچا دیا جائے)۔

ذرا عقل وشعور کی آنکھیں کھولئے اور دیکھئے کہ سب سے پہلے ارشاد ربانی میں تعلیم کے واجبی حکم کے ساتھ تربیت کو بھی شامل رکھا گیا ہے کیونکہ خود خالق کائنات اپنی تمام مخلوقات کو صفت تربیت کے ذریعہ ہی اس کے مقاصد حیات کی تکمیل کے اعلیٰ درجہ تک پہنچاتا ہے۔ اگر اس کے وجود میں خصوصی طور پر حق سبحانہ کی تربیت شامل نہ ہو تو انسان ضعیف البنیان اور کوئی بھی صاحب جسم وجان زندگی کی پہلی سیڑھی پر قدم رکھنے کے قابل بھی نہیں ہو سکتا، چہ جائیکہ اسے درجہ کمال تک رسائی نصیب ہو۔

قرآن پاک میں اسی سلسلے کا دوسرا حکم یہ ہے:

"یا أیها الذین آمنوا قوا أنفسکم وأهلیکم نارا" (سورہ تحریم:۶)۔

(اے ایمان والو! بچاؤ اپنے آپ کو اور اپنے گھرانے (بیوی بچوں) کو دوزخ کی آگ سے)۔

اس حکم ربانی کا تقاضا ہے کہ ایماندار ماں باپ اپنے ساتھ اپنے بال بچوں کو بھی جہنم کی آگ سے بچائیں اور یہ بچاؤ اس کے بغیر ممکن نہیں کہ وہ بال بچوں کی دینی تعلیم وتربیت اعلیٰ پیمانے پر کریں۔ اچھے اخلاق وآداب سکھائیں، احکام شریعت اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں سے واقف کرائیں۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "إن من حق الولد علی الوالد أن یحسن أدبه" (مجمع الزوائد حدیث ۱۳۸۲۹، بچے کے حقوق واحکام ص ۳۰۰) (باپ پر بیٹے کا ضروری حق یہ ہے کہ وہ اسے اچھا ادب سکھائے)۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: "بچوں کو تعلیم دو اور ان کو ادب سکھاؤ" (بیہقی شعب الایمان ۱۱/ ۱۲۷)۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں: "اپنے بیٹے کو اخلاق وادب سکھاؤ، تم سے پوچھا جائے گا کہ کیا تم نے اس کو ادب سکھایا اور تعلیم دی اور فرماں برداری اور بات ماننے کے سلسلے میں اس سے سوال ہوگا (العیال لابن ابی الدنیا ص: ۳۲۹، ۳۳۴، السنن الکبری بیہقی ۳/ ۸۳)۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے: "جس طرح تم پر اپنے والد کا حق ہے اسی طرح تم پر اپنے بچوں کا بھی حق ہے" (بخاری، الادب المفرد حدیث نمبر: ۹۸ بچوں کے احکام ومسائل: ۲۶۵)۔

بچوں کی تعلیم وتربیت کے سلسلہ میں احادیث نبویہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ اپنے بچوں کو بنیادی طور پر پانچ باتیں سکھاتے تھے:

(۱) ایمان وتوحید اور ارکانِ اسلام کی تعلیم۔

(۲) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور آپؐ کی سیرت کی تعلیم۔

(۳) قرآن کی تعلیم صحت لفظی کے ساتھ اور حفظ القرآن الکریم۔

(۴) دعائے ماثورہ کو یاد کرنا اور اس کے مقام پر وہ دعا کرنا۔

(۵) آداب واخلاق کی تعلیم۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سب سے پہلا بول اپنے بچوں کو لا الٰہ الا اللہ سکھاؤ اور مرتے وقت بھی اسی کی تلقین کرو" (شعب الایمان ۱۱/ ۱۲۸)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم خاص حضرت انس رضی اللہ عنہ کی والدہ حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا اپنے بچوں کو پورا کلمہ طیبہ سکھاتی تھیں، وہ اپنے بچے انسؓ کو اس طرح پورا کلمہ سکھاتی تھیں: کہو لا الٰہ الا اللہ کہو اشہد ان محمداً رسول اللہ (مصنف عبدالرزاق ۴/ ۲۵، مصنف ابن ابی شیبہ ۳/ ۲۰۵)۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ما نحل والد ولداً من نحل أفضل من أدب حسن" (ترمذی ۲/ ۱۷) (کسی باپ نے اپنے بچہ کو علم وادب سے زیادہ بہتر عطیہ نہیں دیا)۔

ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "علموا أولادکم علی ثلث خصال: حب نبیکم، حب آل بیتکم وتلاوة القرآن فإن حملة القرآن فی ظل عرش اللّٰه یوم لاظل إلا ظله" (اسلام اور تربیت اولاد ۱/ ۲۷۶، بحوالہ طبرانی الجامع الصغیر حدیث نمبر: ۳۱۱، اخرجہ ابونصر عبدالکریم الشیر ازی فی فوائدہ وابن النجار عن علی، بچوں کے احکام ومسائل ص ۲۷۰) (اپنے بچوں کو تین باتیں سکھاؤ: ۱۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت۔ ۲۔ آل بیت کی محبت۔ ۳۔ قرآن کی تلاوت، اس لئے کہ حاملین قرآن عرش الٰہی کے سایہ میں ہوں گے جس دن (قیامت میں) عرش الٰہی کے علاوہ کوئی سایہ نہ ہوگا)۔

حضرت امام مالکؒ فرماتے ہیں: "سلف صالحین اپنے بچوں کو حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کی محبت سکھاتے تھے جس طرح قرآن کی سورت سکھاتے تھے (تاریخ دمشق ۴۴/ ۳۸۶، احکام ومسائل ص: ۲۷۱)۔

اس کا واضح ترین مطلب یہ ہے کہ صحابہؓ وتابعینؒ وائمہ دین جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور صحابہ واہل بیت رضوان اللہ علیہم اجمعین کی دینی

خدمات وکارنامے اور ان کی دینی قربانیوں کے واقعات سکھاتے تھے تاکہ بچوں میں یہ دینی جذبات سرایت کریں۔

امام غزالیؒ نے ''احیاء العلوم'' میں یہ وصیت کی ہے کہ بچوں کو قرآن کریم اور احادیث و واقعات اور نیک لوگوں کی سیرت وحالات اور کہانیاں سکھائی پڑھائی جائیں اور بعض دینی احکام اور ایسے اشعار پڑھائے اور یاد کرائے جائیں جن میں عاشق ومعشوق کا تذکرہ نہ ہو (شیخ عبداللہ ناصح علوان، تربیت الاولاد فی الاسلام ۱/۲۷۷)

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کرام وصحابیات رضوان اللہ علیہم اجمعین کی اس تعلیم وتربیت کا اثر تھا کہ پانچ سے دس سال تک کی عمر کے درجنوں صحابہ احادیث نبویہ کا ایک بڑا ذخیرہ امت تک پہنچانے میں کامیاب رہے۔

حضرت حسن رضی اللہ عنہ جن کی عمر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے وقت آٹھ برس کی تھی فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے دعائے قنوت سکھائی (جامع ترمذی ۱/۱۰۶، اشرفی دیوبند، ابوداؤد حدیث: ۱۴۲۵ مطبوعہ دار العلوم، نسائی حدیث: ۱۷۴۶، ابن ماجہ حدیث: ۱۱۷۸، مسند احمد ۱/۱۹۹)۔

حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما جن کی عمر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے وقت نو دس سال کی تھی بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر نماز کے سلام پھیرنے کے بعد یہ دعا پڑھتے تھے:

''لا إله إلا الله وحده لاشريك له، له الملك وله الحمد وهو على كل شيئٍ قدير'' (مسند احمد ۱-۲۰۱)۔

حضرات تابعینؒ میں بھی بچوں کو مسنون دعائیں سکھانے کا اہتمام تھا، مشہور تابعی امام نخعیؒ بیان فرماتے ہیں کہ ''ہمارے بڑے ہمیں حکم دیتے تھے جبکہ ہم بچے تھے کہ ہم جب سونے کے لئے بستر پر جائیں تو ۳۳ مرتبہ سبحان اللہ ۳۳ مرتبہ الحمد للہ اور ۳۴ مرتبہ اللہ اکبر پڑھیں۔ (مصنف ابن شیبہ ۱۳/۵۰۸)۔

اسلام میں بچوں کی تعلیم وتربیت کی بنیادی ہدایات کے ذیل میں نماز، روزہ کے احکام کی ہدایات بھی آتی ہیں۔

''قال رسول الله ﷺ مروا أولادكم بالصلاة وهم أبناء سبع سنين واضربوهم عليهم وهم أبناء عشر سنين وفرقوا بينهم في المضاجع'' (سنن ابی داؤد ص ۱۳۵۹ حدیث ۴۹۵ مطبوعہ دار السلام)۔

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اپنی اولاد کو نماز کا حکم دو جب وہ سات سال کے ہو جائیں اور جب دس سال کے ہو جائیں نماز نہ پڑھنے پر ان کی تادیبی پٹائی کرو اور ان کے بستر علیحدہ کردو)۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ سے پوچھا گیا کہ بچہ نماز کب پڑھے تو فرمایا: "إذا عرف يمينه عن شماله فمروه بالصلوٰة" (سنن ابی داؤد، حدیث: ۴۹۷)۔

حضرت ربیع بنت معوذ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے جب بچہ اپنے دائیں بائیں ہاتھ کے فرق کو پہچان لے تو اس کو نماز کا حکم کرو۔

''ربیع بنت معوذؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عاشورہ کی صبح انصاری صحابہؓ کے محلہ میں یہ کہلا بھیجا کہ جس کا روزہ نہ ہو تو وہ بقیہ دن روزہ دار کی طرح رکے رہیں اور جنہوں نے روزے کی نیت سے صبح کی ہو تو وہ روزہ پورا کریں، وہ فرماتی ہیں کہ اس حکم کے بعد ہم خود بھی روزہ رکھتے تھے اور اپنے بچوں کو بھی روزہ رکھواتے تھے اور ان کے لئے سوتی کھلونے تیار رکھتے تھے، پھر اگر وہ کھانے کے لئے روتے تو انہیں یہی کھلونے تھما دیتے تھے یہاں تک کہ وہ افطار کے قریب کے پہنچ جاتے تھے'' (صحیح بخاری باب صوم الصبیان ص ۱۵۳ حدیث ۱۹۶۰ مطبوعہ دار السلام)۔

فقہ شافعی وحنبلی میں یہ صریح حکم موجود ہے: ''بچہ اگر سات کی عمر میں روزے کی طاقت رکھتا ہو تو اس کو روزہ رکھنے کا حکم دیا جائے اور اگر دس سال کا ہو جائے تو روزہ چھوڑنے پر اس کی پٹائی (تادیباً) کی جائے گی'' (المجموع شرح المہذب ۶/۲۵۳، عمدۃ السالک ص ۸۵۔ متن ابی شجاع ص ۲۰، الاقناع ۱/۴۸۹)۔

بچوں کی ادبی واخلاقی تعلیم وتربیت کے سلسلہ میں والدین کو چند باتوں کا مزید اہتمام کرنا چاہئے:

(۱) بچوں کو سلام کرنے کی تعلیم دیں۔ حدیث میں ہے:

''حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ اے بیٹے! جب تو اپنے گھر والوں کے پاس آئے تو انھیں سلام کیا کر، اس سے تجھ پر برکت آئے گی اور تیرے گھر والوں پر بھی'' (جامع ترمذی حدیث ۲۶۹۸ مطبوعہ دار السلام)۔

(۲) بچہ کے بنیادی حق تربیت میں باپ پر یہ بھی لازم ہے کہ اسے عفت وعصمت کی حفاظت اور پاکدامنی سکھائے، اسلام اس معاملہ میں اتنا حساس ہے کہ دس برس کی عمر سے ہی ماں باپ کو حکم ہے کہ بچوں کے بستر الگ الگ کردو (سنن ابی داؤد حدیث ۴۹۵ مطبوع دار السلام)۔

(۳) اسی طرح ماں باپ کو حق تربیت ادا کرنے کی بنیادی ہدایت یہ بھی دی گئی ہے کہ وہ بچوں کو سچ بولنے اور جھوٹ سے بچنے کی عادت ڈلوائے۔ عبداللہ ابن عامر رضی اللہ عنہ ایک نوعمر صحابی ہیں وہ خود اپنا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ ایک دن میری ماں نے اس حال میں جب کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے گھر میں ہی تشریف رکھتے تھے، میری ماں نے کہا آہا آہا! آؤ تم کو ایک چیز دیتی ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سن کر ان سے پوچھا تم نے کیا دینے کا ارادہ کیا تھا۔ انھوں نے کہا، میں کھجور دینا چاہتی تھی۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر تم اس کو کچھ نہ دیتی تو تم پر بچہ سے جھوٹ (کا گناہ) لکھا جاتا: "فقال لها رسول الله ﷺ أما إنك لولم تعطيه شيئاً كتبت عليك كذبة" (سنن ابی داؤد حدیث ۴۹۹۱ مطبوعہ دار السلام)۔

ایک دوسری حدیث میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جو کسی بچے سے کہے آؤ یہ لو پھر اس کو نہ دے تو یہ جھوٹ ہے" (مسند احمد ۲/ ۴۵۲)۔

ماں باپ کی اس طرح لبھاؤنی باتوں سے بچوں کے اندر جھوٹ بولنے کی جو عادت ابھرتی ہے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا کتنا انوکھا علاج تجویز فرمایا۔

(۴) بچوں میں بچپنے کی وجہ سے لاابالی پن اور غیر سنجیدہ حرکتیں کرنے اور شوخی اور شرارت کرنے کا مزاج ہوا ہی کرتا ہے، ایسے میں اگر ان کی شروع ہی سے مناسب تربیت نہ کی جائے تو ان میں چوری اور خیانت کا جذبہ ابھرنے لگتا ہے اور بعد میں ان کی امانت ودیانت مجروح ہونے لگتی ہے، جو دین اور معاشرت دونوں کے لئے نقصان دہ ہوتا ہے۔ اس لئے ماں باپ کو اسلام میں ہدایت دی گئی ہے کہ وہ بچوں میں امانت میں خیانت کی معمولی حرکت پر بھی نظر رکھیں، اور ان کی تادیب وتنبیہ کریں۔

حضرت عبداللہ بن بسر رضی اللہ عنہما رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بچے تھے وہ کہتے ہیں کہ ایک دن میری ماں نے انگور کا خوشہ دے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیجا، میں نے پہنچانے سے پہلے اس میں سے کچھ کھالیا، جب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اس کو لے کر پہنچا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم (اس خیانت کو سمجھ گئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حرکت پر) میرا کان پکڑا اور (تنبیہاً) فرمایا او بے ایمان۔ (ابن سنی عمل الیوم واللیلۃ ۴۰۱، بچوں کے احکام ومسائل ص ۲۹۳)۔

(۵) بچے کھانے پینے کے شوقین ہوتے ہیں، اور وہ کم سنی کی وجہ سے حلال وحرام کی تمیز نہیں رکھتے، اسی طرح بچپن کی وجہ سے انھیں کھانے پینے کے اسلامی آداب سے واقفیت نہیں ہوتی، اس لئے ماں باپ پر لازم ہے کہ وہ بچوں میں ان باتوں کا شعور بیدار کریں اور ان میں دینی اخلاقی حس کی نشوونما کریں، اور ان کی خودداری کو پروان چڑھانے کی کوشش کریں۔ اس سلسلے میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان تربیت کا انداز ملاحظہ فرمائیں۔

حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کھجوروں کی فصل کی کٹائی کے بعد کھجوروں کا ڈھیر لگا ہوا تھا، حضرت حسن اور حسین (دونوں سات آٹھ سال کے بچے تھے) کھجوروں سے کھیل رہے تھے۔ اسی درمیان آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک نواسے نے ایک کھجور اپنے منہ میں ڈال لیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُدھر نظر پڑ گئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے منہ سے اسے نکال دیا اور فرمایا: "أما علمت أن آل محمد لا يأكلون الصدقة" (صحیح بخاری حدیث ۱۴۸۵)۔

(۶) جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے انداز تربیت کا دوسرا نمونہ بھی دیکھیں، حضرت عمرو بن ابی سلمہ رضی اللہ عنہ جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی گود کے پلے ہوئے بچے تھے، بیان کرتے ہیں کہ میں بچہ تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی گود میں پرورش پاتا تھا، ایک مرتبہ کھانے کی پلیٹ میں میرا ہاتھ کبھی ادھر کبھی ادھر پڑتا تھا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا بیٹے! بسم اللہ کہو دائیں ہاتھ سے کھاؤ اور اپنے سامنے سے کھاؤ، عمرو بن ابی سلمہؓ کہتے ہیں، پھر اس کے بعد اس طرح میں نے کبھی نہیں کھایا (صحیح بخاری حدیث ۵۳۷۶ و ۵۳۷۷ و ۵۳۷۸ مطبوعہ دار السلام)۔

بچوں اور بچیوں کے لئے دینی وعصری تعلیم:

حدیث مشہور کے مطابق جو بچاس طریق سے مروی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "طلب العلم فريضة على كل مسلم" (سنن ابن ماجہ ص ۲۰ رحدیث ۲۲۴ رمطبوعہ دیوبند) (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے)۔

اور بعض روایت میں مسلمۃ بھی وارد ہے (حاشیہ مشکوۃ المصابیح ص ۳۴ حاشیہ ۱۱)۔

جس سے واضح ہے کہ فریضۂ علم اور اس کے حصول میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی فرق نہیں رکھا ہے، لیکن اس علم سے کونسا علم مراد ہے جس کا حاصل کرنا فرض ہے، دنیا کے عصری علوم وفنون کو تو چھوڑ یئے صرف عربی علوم وفنون کی تفصیلات پر ایک نظر ڈالئے جن کو حاجی خلیفہؒ نے اپنی کتاب ''کشف الظنون علی اسامی الکتب والفنون'' میں ذکر کیا ہے۔ جس سے سرسری انتخاب کر کے صرف ان علوم کے ناموں کو صاحب ''حدائق العلوم'' نے ایک سو انیس (۱۱۹) کی تعداد میں شمار کرایا ہے (الرسائل الغالیہ فی العلوم العالیہ ص ۸۸۔ ۱۳۴ مطبوعہ جامعۃ القرأۃ کفلیہ گجرات)۔

ان میں سے کس علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان مرد وعورت پر فرض ہے، اس سلسلہ میں فقہاء اسلام نے صراحت کی ہے کہ:

''قال فی شرح التنویر واعلم أن تعلم العلم یکون (۱) فرض عین وھو بقدر ما یحتاج لدینہ (۲) وفرض کفایۃ وھو ما زاد علیہ لنفع غیرہ (۳) ومندوب وھو التبحر فی الفقہ وعلم القلب'' (ردالمحتار)۔

(شرح تنویر الابصار میں ہے کہ یہ بات اچھی طرح سمجھ لو کہ علم حاصل کرنا تین قسموں پر ہے: (۱) فرض عین، یہ وہ علم ہے جو دین کی ضرورت کو حاوی ہو، (۲) فرض کفایہ، یہ وہ علم ہے جو قدر ضرورت سے زائد ہو، اور اس کا نفع حاصل کرنے والے کے غیر سے ہو (جس کا انسانی معاشرے سے نفع رسانی کا تعلق ہو جیسے ڈاکٹری یا صنعت وحرفت کا علم)، (۳) مندوب، یہ وہ علم ہے جو دینی تفقہ اور مہارت سے تعلق رکھتا ہو)۔

اس فرض علم کی مزید تفصیل مشہور مفسر حضرت قاضی بیضاویؒ نے بیان کی ہے: ''قال البیضاوی المراد من العلم ھنا مالا مندوحۃ للعبد عن تعلمہ کمعرفۃ الصانع والعلم لوحدانیتہ ونبوۃ رسولہ وکیفیتہ الصلوٰۃ فإن تعلمہ فرض عین'' (السیوطی مصباح الزجاجۃ حاشیہ ابن ماجہ ص ۲۰ مطبوعہ دیوبند) (بیضاویؒ فرماتے ہیں کہ یہاں حدیث میں فرض علم سے مراد وہ علم ہے جس کا سیکھنا ہر طرح سے بندے کے لئے ضروری ہو جیسے اللہ کی پہچان اور اس کی توحید کا علم اور اس کے رسول کی نبوت کا علم اور نماز پڑھنے کی کیفیت کا علم، کہ ان سب کا سیکھنا بہر حال فرض عین ہے)۔

مذکورہ بالا تفصیلات کا خلاصہ یہ نکلا کہ (۱) علم احسان وسلوک وتصوف۔ جس میں علم الاخلاص اور علم الباطن شامل ہے۔ (۲) اسی طرح علم الفقہ جس میں علم الحلال، علم الفرائض أخص اور علم البیع والشراء والنکاح والطلاق سب داخل ہیں۔ (۳) اور علم کلام جس کا خصوصی تعلق اللہ کی توحید ذات وصفات سے ہے، ان سب علوم کا حاصل کرنا فرض عین ہے، عرب کے مشہور عالم دین ومصنف شیخ عبداللہ ناصح علوان اپنی کتاب ''تربیۃ الاولاد فی الاسلام'' میں لکھتے ہیں:

''اگر تحصیل علم کا تعلق مسلم فرد کی روحانی، عقلی اور جسمانی واخلاقی شخصیت سازی سے ہے تو ایسا علم بقدر ضرورت وحاجت فرض ہے اور اتنا علم حاصل کرنا سب پر فرض ہے چاہے مرد ہو یا عورت، بچہ ہو یا بڑا، ملازم ہو یا مزدور غرضیکہ امت مسلمہ کے ہر طبقہ پر فرض ہے۔ اور اس اعتبار سے تلاوتِ قرآن کریم کا سیکھنا اور عبادات کے احکام اور بلند بنیادی اخلاق کے اصول وبنیادی باتیں اور حلال وحرام کے مسائل اور عمومی صحت سے متعلق قواعد اور تمام وہ چیزیں جن کی ضرورت ایک مسلمان کو اپنے دین ودنیا کے معاملات کے لئے پڑتی ہے۔ دنیاوی زندگی میں ان سب کا سیکھنا ہر مسلمان مرد وعورت پر فرض عین ہے'' (اسلام میں اولاد کی تربیت ۱/۲۷۵، ترجمہ مولانا ڈاکٹر حبیب اللہ مختار شہیدؒ)۔

رہ گیا علوم عصریہ کا مسئلہ تو وہ حسب تصریح فقہاء مازاد علیہ لنفع غیرہ یعنی علوم دینیہ کی ضرورت سے زائد علم کا نام ہے جس کی ضرورت کا تعلق مسلم فرد کی ذات سے نہیں بلکہ اس کے غیر کے نفع سے ہے جو انسانی معاشرہ کی ضرورت ہے۔ اس لئے وہ فرض کفایہ میں داخل ہے اور اس میں علوم عصریہ کی بہت سی قسمیں شامل ہیں۔

شیخ عبداللہ ناصح علوان لکھتے ہیں:

''اور اگر اس علم کا تعلق زراعت، صناعت، طب، انجینئرنگ، بجلی، ایٹم وغیرہ دیگر علوم نافعہ سے ہو تو ایسا علم فرض کفایہ ہے، اگر بعض آدمی اس کو حاصل کرلیں تو سب سے گناہ ساقط ہوجائے گا اور اگر اسلامی معاشرہ میں سے کوئی شخص بھی اسے حاصل نہ کرے تو سب کے سب گنہگار اور اس سلسلہ میں مسئول ہوں گے (اسلام اور تربیت اولاد ۱/۲۷۶)۔

فقہی اعتبار سے پہلی قسم کے فرض علوم کی تحصیل میں اگر بچہ مصروف ہو خواہ بڑی عمر کا ہوگیا ہو اور اس مشغولیت کی وجہ سے وہ کمانے کی قدرت کے باوجود کمانہ سکتا ہو تو اس کی تعلیم کا خرچ باپ پر واجب ہوگا۔

اور اگر دوسرے قسم کے علوم کی تحصیل میں مصروف ہو جو ''فرض کفایہ'' کے ذیل میں آتے ہیں تو ایسے علم کی مشغولیت کی وجہ سے کمانہ سکنے کو عذر قرار نہیں دیا

جائے گا، اور باپ پر اس مدت میں اس کا نفقہ واجب نہیں ہوگا بلکہ اس کو اختیار ہوگا چاہے اس کو اس علم میں مشغول رکھ کر اس پر خرچ کرے، چاہے تو خرچ روک دے اور اس کو کسی کام پر لگادے (الفقہ المنہجی ۴؍۱۷۲، احکام ومسائل ص ۲۴۲)۔

لیکن مشہور فقیہ ڈاکٹر وھبہ زحیلی نے علم کی تفصیل بیان کئے بغیر لکھا ہے:

علم کا حاصل کرنا فرض کفایہ ہے اگر طلبہ کو کمانے پر مجبور کیا جائے گا تو امت کی ضرورتیں معطل ہو کر رہ جائیں گی اس لئے طالب علم ہونے کی صورت میں خرچ باپ کے ذمہ ہوگا لیکن اس شرط کے ساتھ کہ طالب علم محنتی اور کامیاب ہو، اگر وہ پھسڈی ہے تو اس کو پڑھانے کا کوئی فائدہ نہیں، اس کے لئے ضروری ہے کہ کسی پیشے اور کام کو سیکھ کر اپنی معاشی ضرورت پوری کرے (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۱۰؍۱۴۷، بچوں کے احکام ومسائل ص ۲۴۲ مطبوعہ لکھنؤ)۔

اوپر کی ذکر کردہ تحریروں سے یہ واضح ہوا کہ امت مسلمہ کے سمجھدار اور تحصیل علم کیلئے بیدار ذہن رکھنے والے باشعور بچے اور بچیوں پر علوم عصریہ کو اس مقدار اور اس تعداد میں سیکھنا واجب ہے جس سے ہر مقام کی معاشرتی ضرورت پوری ہو سکے اور اس کے لئے سن تمیز سے عمر بلوغ تک باپ کو تعلیم کی ذمہ داری سنبھالنی ہوگی خواہ اپنے خرچ پر خواہ بچے کی کمائی سے یا دونوں کے اشتراک سے۔ تاہم بچیوں کی عصری تعلیم کے سلسلہ میں باپ کو زیادہ حساس رہنا پڑے گا اور بچے، بچیوں کے مخلوط اور آزاد ماحول والے تعلیم گاہوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں سے الگ مخصوص طور پر گرل کالجوں میں ہی پڑھوائیں تا کہ ان کی دینی اور اخلاقی زندگی بگاڑ سے محفوظ رہ سکے۔

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی بات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنے "وصیت نامہ" کی سب سے پہلی وصیت میں تحریر فرمایا تھا: "اپنی اولاد کو اسکول اور کالج کی تعلیم سے اس طرح بچائیں جس طرح شیر یا بھیڑیئے سے بچایا جاتا ہے۔"

اور اپنی کتاب "بہشتی زیور" حصہ چہارم ص ۲۲۴ کی آخری سطر میں لکھا تھا:

"لڑکیوں کو اتنا لکھنا سکھادو کہ ضروری خط اور گھر کا حساب و کتاب لکھ سکیں" (مفتی رشید احمد صاحب، احسن الفتاوی ۸؍۳۴۴)۔

کہیں بعد میں خون کے آنسو روتے ہوئے یہ نہ کہنا پڑے

وہ اندھیرے ہی بھلے تھے کہ قدم راہ پہ تھے
روشنی لے گئی منزل سے بہت دور انہیں

باقی رہا تیسری قسم کا علم جس کو فقہاء کرام نے "مندوب" کہا ہے تو اس کا حکم شرعی یہ ہے کہ وہ باپ اور تحصیل علم کرنے والے کے اختیار پر موقوف ہے وہ فرض اور واجب نہیں ہے، کیونکہ کسی علم میں گہرائی فنی مہارت اور علمی تبحر حاصل کرنا صرف مستحب کے درجہ میں ہے خواہ اس کا تعلق دینی علوم سے ہو یا عصری علوم سے شریعت کی نگاہ میں دونوں یکساں طور پر "جوائس" کے معنی میں ہیں، کثیر المطالعہ فقیہ عالم دین حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب زید فضلھم لکھتے ہیں:

"فقہاء کے یہاں مندوب ان افعال کو کہتے ہیں کہ جن کی طرف بہ طریقۂ ترغیب دعوت دی گئی ہو، اسے واجب قرار نہ دیا گیا ہو، اس کے کرنے پر اجر تو ہو، لیکن نہ کرنے پر گناہ بھی نہ ہو" (قاموس الفقہ ۵؍۱۴۲ نعیمیہ دیوبند)۔

اگر حکومت کسی سطح تک تعلیم کو بچوں اور بچیوں کے لئے لازم قرار دے تو کیا شرعاً اس کی پابندی مسلمانوں پر لازم ہے:

دنیا کے ہر ملک کا باشندہ اس ملک کے قانون سے وفاداری کا معاہدہ کر کے ہی وہاں کے حقوق شہریت حاصل کرتا ہے، اس لئے اس حکومت کی طرف سے کسی سطح تک کی تعلیم کے لازم ہونے کی پابندی مسلمانوں کو بھی کرنی پڑے گی۔ قرآن پاک کے سورۂ مائدہ کی سب سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ کا حکم ہے:

"یأیھا الذین آمنوا أفوا بالعقود" (سورہ مائدہ:۱) (اے ایمان والو! معاہدوں کو پورا کرو)۔

مفسرین نے لکھا ہے کہ اس میں ہر طرح کے معاہدے شامل ہیں خواہ وہ اللہ اور بندوں کے درمیان ہوں، یا آپس میں ایک دوسرے کے مابین ہوں یا مسلمانوں کے مشرکین سے معاہدے ہوں یا حکومتوں سے شہریوں کے قانونی عہد و قرار ہوں، سب کی پابندی لازم ہوگی بشرطیکہ وہ معاہدہ خلاف شریعت نہ ہو (تفسیر ماجدی ۱؍۸۴۵ نشریات اسلام لکھنؤ)۔

اگر حکومت غیر اسلامیہ میں لازمی اور جبری تعلیم کا قانون رائج ہو تو اس کی خلاف ورزی موجب سزا اور باعث تذلیل بھی ہوسکتی ہے، اس لئے بھی اس کی پابندی کرنا لازم ہے۔ علامہ عثمانیؒ لکھتے ہیں:

"جب حکومت غیر اسلامی ہو تو خلاف ورزی کی صورت میں اپنی جان کو قانونی سزاؤں کا سامنا کرنے کیلئے پیش کرنا پڑسکتا ہے" (تکملہ فتح الملہم شرح صحیح مسلم ۱/ ۵۹۰)۔

البتہ اس جبری نظام تعلیم میں دینی اخلاقی اعتبار سے مضرت رساں مواد شامل ہو تو اس کے ازالہ کی خاطر علیحدہ سے بچے اور بچیوں کے لئے نجی تعلیم گاہوں کا نظام قائم کرنا ضروری ہوگا جیسا کہ یورپین وافریقین ممالک میں مسلمانوں نے کر رکھا ہے۔

بچوں کے لئے جنس کی تعلیم:

جو اسلام جنس (سیکس) کے سلسلہ میں اتنا زیادہ حساس ہو کہ ایک ہی رشتۂ خون سے تعلق رکھنے والے بچوں کے مابین دس سال کی عمر میں ہی ان کے بستر الگ الگ کروادیتا ہو، وہ جنس کی تعلیم کے نام پر بچے بچیوں میں جنسی آوارگی پیدا کرانے کا کس طرح روادار ہوسکتا ہے۔ جو قرآن حکیم جنس کے معاملہ میں اس درجہ احتیاط برتنے کی تعلیم دیتا ہو کہ:

"تمام مومن اور مومنات کو اپنی نظر جھکائے رکھنے اور شرمگاہ کی حفاظت کرنے اور گھریلو خادم وخادمہ اور نابالغ بچوں تک کو تین اوقات میں خصوصی طور پر گھر میں داخلہ کیلئے اجازت لینے کا پابند کرتا ہو، جو نبی ﷺ کی پاکیزہ سیرت بیویوں کو بھی لوچ دار آواز میں بولنے سے منع کرتا ہو مبادا کوئی دل میں جنسی خواہشات چھپائے رکھنے والا مریض شخص کوئی غلط امید لگا بیٹھے" (دیکھئے سورۂ نور: ۳۰، ۳۱، ۵۸، ۵۹، ۶۰ سورۂ احزاب: ۳۲)۔

کیا وہ جنسی تعلیم کے حیا سوز طریقے اور اس کے پس پردہ عصمت فروشی کی اجازت دے سکتا ہے؟ جواب یہ ہے کہ نہیں بلکہ سو بار نہیں دے سکتا۔ اور جو پیغمبر اسلام ﷺ بچپن کے زمانے میں بچوں کو یہ سکھاتا ہو کہ "ناف سے گھٹنے کے درمیان پردہ ہے" (مستدرک للحاکم ۳/ ۵۶۸، عن عبد اللہ بن جعفر عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم)۔

یعنی اس حصہ جسم کو کسی کے سامنے کھولنا جائز نہیں، کیونکہ اسے ننگا دیکھنے سے شہوت ابھرتی ہے۔ وہی پیغمبر جنس کی تعلیم کا جواز پیش کر کے عورت اور مرد کو عزت باختہ بنادے اور حرام شہوت کے دلدل میں گرا کر انسان کو حیوان کی صف میں کھڑا کردے، کیا اس سے یہ تصور کیا جاسکتا ہے؟ ایں خیال ست ومحال ست وجنوں۔

جنسی تعلیم کے بدبختانہ نتائج پر ایک سرسری نگاہ آپ بھی ڈال لیں تا کہ اس کے عدم جواز کا فیصلہ کرنے میں آپ حق بجانب ہوسکیں۔ علامہ عبد اللہ ناصح علوانؒ لکھتے ہیں:

"ترقی یافتہ اور متمدن طبقہ میں بھی اب یہ بات کوئی انوکھی اور تعجب خیز نہیں رہی ہے کہ سات یا آٹھ سال کی بچیاں، بچوں سے یاری کریں اور بسا اوقات وہ ان کے ساتھ گناہ میں مبتلا ہوجاتی ہیں۔ برطانوی اخبارات نے ایک خبر شائع کی ہے کہ پچیس سال کی ایک نوجوان استانی قریب البلوغ لڑکوں کی ایک جماعت کو جنسی تجربہ کی عملی مشق کرایا کرتی تھی۔ چنانچہ وہ اپنے تمام طلباء اور شاگردوں کے سامنے ایک ایک کر کے اپنے تمام کپڑے اتار دیا کرتی تھی اور مکمل طور سے بے حیائی اور ڈھٹائی کے ساتھ اس کام کی عملی تربیت دیا کرتی تھی۔ لبنان کے رسالہ "الامان" نے اپنی اشاعت ۳۰/ ۱۱/ ۱۹۷۹ء میں لکھا ہے کہ ایک آزاد قسم کا عرب نوجوان ڈنمارک گیا۔ اور وہاں کے ایک تھیٹر میں اچانک اس نے کیا دیکھا کہ ایک ایکٹرس ایک ایک کر کے اپنے تمام کپڑے اتار رہی ہے پھر تمام لوگوں کے سامنے وہ مکمل برہنہ ہو کر کھڑی ہوگئی اور پھر اس نے اپنے پالتو کتے کو بلایا تا کہ وہ سب کے سامنے اس کے ساتھ زنا کرے، اور پھر تھوڑی دیر بعد اس نے حاضرین کو چیلنج دیا کہ وہ بھی ساز وآواز وموسیقی کے شور وغل اور نگاہوں کو چکا چوند کردینے والی روشنی میں اس کے ساتھ وہی کام کریں جو کتے نے کیا تھا۔ اور پھر اس عرب نوجوان نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ ایک مدہوش افریقی تھیٹر کے تخت پر اس کتے کی پیروی کرنے کے لئے اس عورت کی طرف بڑھا....." (اسلام اور تربیت اولاد ۱/ ۲۹۲، ۲۹۳)۔

نکاح کے بارے میں بچے اور بچیوں کے حقوق ہیں:

اصل یہ ہے کہ اسلام میں شادی صرف شہوت رانی کا ذریعہ نہیں بلکہ مرد وعورت کی باعفت اور پاکیزہ زندگی گذارنے کا انسانی اور ایمانی تقاضا ہے۔ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''یا معشر الشباب من استطاع منکم الباءۃ فلیتزوج فإنه أغض للبصر وأحسن للفرج'' (صحیح مسلم ۱/۴۴۹)(اے نوجوانو! تم میں سے جو شخص نکاح کر لینے کی پوزیشن میں ہو وہ ضرور بلا تاخیر نکاح کر لے، اسلئے کہ نکاح نظر کی آوارگی اور شرمگاہ کی بہتر حفاظت کا ذریعہ ہے)۔

''وعن أنس رضی اللہ عنہ قال قال رسول الله ﷺ إذا تزوج العبد فقد استکمل نصف الدین فلیتق الله فی النصف الباقی'' (مشکوۃ المصابیح ص۲۶۸)۔

(جب آدمی نکاح کر لیتا ہے تو اس کا آدھا دین مکمل ہو جاتا ہے، اب باقی آدھے کے بارے میں اللہ سے ڈرتا رہے)۔

اسی مصلحت کے پیش نظر کبھی ضرورت پڑ جاتی ہے کہ ماں باپ بچے اور بچی کے لئے مناسب جوڑ ملنے پر بچپن ہی میں رشتہ ازدواج سے منسلک کر دیں۔ تاہم یہ ماں باپ کے حسن انتخاب اور بہتر سے بہتر پسند کے شعور پر موقوف ہے، محض رسم ورواج یا برادری کی روایات کو پورا کرنے یا ذاتی تعلقات کو نبھانے کیلئے ایسا کرنا درست نہیں ہے، بچپن کی شادی کا جواز قرآن وحدیث اور آثار صحابہ سب سے ملتا ہے۔ قرآن پاک کی آیت واللائی لم یحضن سے استدلال کرتے ہوئے مشہور حنفی محقق ابن الہمام تحریر فرماتے ہیں:

''یجوز تزویج الصغیر والصغیرۃ إذا زوجهما الولی لقوله تعالی واللائی لم یحضن. فأثبت العدۃ للصغیرۃ وهی فرع تصور نکاحها شرعاً'' (فتح القدیر ۳-۲۷۴ مطبوعہ مصر)۔

(بچے اور بچی کا نکاح جائز ہے اگر ولی اس کو انجام دے۔ اللہ تعالی کے قول ''واللائی لم یحضن'' کی دلیل سے۔ اس آیت میں اللہ تعالی نے صغیرہ کیلئے عدت کو ثابت کیا ہے جو بچی کے تصور نکاح کی فرع ہے)۔

حدیث صحیح میں جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے چھ سال کی عمر میں نکاح مصرح ہے (صحیح بخاری حدیث ۵۱۳۳ باب تزویج الاب ابنته من الامام مطبوعہ دارالسلام)۔

بچپن کی شادی کا یہ واقعہ تو اور بھی عجیب ہے کہ:

''حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کی بیٹی سے ان کی پیدائش کے دن ہی قدامہ بن مظعون رضی اللہ عنہ کی شادی ہوگئی'' (مرقات المفاتیح شرح مشکوۃ المصابیح ۶/۲۰۶)۔

حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "إذا زوجه وهو صغیر جاز نکاحه" (مصنف ابن ابی شیبہ حدیث ۲۰۰۴ باب فی رجل یزوج ابنه وهو صغیر)۔ جب باپ نے اپنے نابالغ بچے کی شادی کر دی تو یہ جائز ہے)۔

اسی طرح آثار صحابہؓ سے بھی بچپن کی شادی کا جواز ملتا ہے۔

"إن ابن عمر زوج ابنا له ابنة أخيه وابنه صغير يومئذ" (السنن الکبری حدیث ۱۳۸۱۷، باب الاب یزوج ابنه الصغیر)۔ (ابن عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے کی شادی اپنے بھائی کی بیٹی سے کی جبکہ ان دنوں ان کے بیٹے بچے تھے)۔

حضرت عروہ ابن الزبیرؓ کا اپنے کم سن لڑکے کی شادی حضرت مصعبؓ کی کم سن لڑکی سے کرا دینے کا واقعہ بھی ملتا ہے (مصنف ابن عبدالرزاق حدیث ۱۰۳۵۸، بچے کے حقوق واحکام ص ۲۶۳)۔

محدث علامہ نوویؒ نے بچپن کی شادی کے جواز پر اجماع نقل کیا ہے: "أجمع المسلمون علی جواز تزویج الأب بنته البکر الصغیر لهذا الحدیث" (شرح مسلم للنووی ۱/۴۵۶، مرقاۃ المفاتیح شرح مشکوۃ المصابیح ۶/۲۰۶)۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ہندوستان پر برطانوی عہد حکومت میں بچپن کی شادی پر پابندی کے خلاف ایک مستقل رسالہ تصنیف فرمایا تھا جس کا نام تھا "شر الاہل فی ذم شار داہل" لیکن ان ساری تصریحات کے باوجود اس حقیقت کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ اب حالات بدل چکے ہیں، چند برسوں پہلے تک اولادیں شادی کے معاملے میں ماں باپ کی پسند کے سامنے سر جھکا دیتی تھیں اور زندگی بھر ان کی پسند کے رشتے کو نبھاتی تھیں مگر اب حالات بالکل برعکس ہیں۔ ماں باپ کی پسند کردہ گھریلو دیندار بہو کے بجائے بیٹے کو اسمارٹ لیڈی اور فیشن ایبل لڑکی چاہئے۔ خواہ ان کی پسند کا رشتہ زندگی بھر کا ساتھ نہ دے سکے اور خواہ میاں بیوی دونوں "سیپریٹ فیملی" میں جینے کی نحوست سے ماں باپ کو اس شادی کے بعد "اولڈ ایج ہوم" یعنی بوڑھا گھر میں

بھیج کر دم لیں اور اپنے لئے جہنم خرید کر "وائف از لائف" کا پرفریب نعرہ لگاتے رہیں۔ ان حالات میں بچپن کی شادیوں کو کامیاب رکھنا بیحد مشکل ہے، اس لئے مناسب یہی ہے کہ بچپن کی شادیوں سے پرہیز کیا جائے۔ تاہم یہ بھی ضروری ہے کہ اس کو کھینچ تان کر بچپن سے پچپن تک نہ پہنچایا جائے، ورنہ جوانی کے شہوانی جذبات کی دیوانگی میں اولاد کی حرام کاری کے گناہ میں ماں باپ بھی حصہ دار بنیں گے۔ شادی کے سلسلے میں اسلامی ہدایات کا تقاضا یہ ہے کہ بچہ اور بچی کے جوان ہوتے ہی ان کا نکاح کرا دیا جائے۔

حضرت ابوسعید اور ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "جس شخص کے یہاں لڑکا پیدا ہو تو ضروری ہے کہ باپ اس کا اچھا نام رکھے اور اس کو اچھا علم و ادب سکھائے۔ پھر جب بالغ ہو جائے تو بلاتاخیر اس کی شادی کر دے، اگر بالغ ہونے کے بعد اس کی شادی نہیں کی اور وہ کسی گناہ میں مبتلا ہو گیا تو اس کا گناہ اس کے باپ پر ہوگا" (مشکوۃ المصابیح ص ۲۷۴)۔

یہی حکم لڑکی کے سلسلے میں بھی ہے:

"عن عمر بن الخطاب وأنس بن مالك عن رسول الله ﷺ قال في التوراة مكتوب من بلغت ابنته اثنتي عشرة سنة ولم يزوجها فأصابت إثما فإثم ذلك عليه" رواهما البيهقي في شعب الايمان (مشکوۃ المصابیح ص ۲۷۱) حضرت عمر ابن الخطاب اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہما رسول اللہ ﷺ سے روایت فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ توراۃ میں لکھا ہے کہ جس شخص کی بیٹی بارہ سال کی عمر میں پہنچ جائے (کچھ لڑکیاں اس عمر میں بالغہ ہو جاتی ہیں) اور باپ اس کی شادی نہ کرے پھر وہ گناہ میں مبتلا ہو جائے تو اس کا گناہ اس کے باپ پر ہوگا)۔

ایک اور حدیث میں بالغ ہونے کے بعد مناسب جوڑ ملتے ہی بلاتاخیر شادی کر دینے کا حکم ہے۔

"علی ابن طالب کی روایت ہے کہ حضرت ﷺ نے ان سے فرمایا کہ اے علی! تین چیزوں میں بالکل تاخیر مت کرنا: ۱۔ نماز میں جب اس کا وقت آجائے۔ ۲۔ جنازہ جب سامنے آجائے۔ ۳۔ اور بالغہ کنواری لڑکی کی شادی میں جب اس کے برابر درجہ کا جوڑ مل جائے" (جامع الترمذی ۱/۴۴، مطبوعہ دیوبند)۔

آج کل مسلمانوں میں لڑکے کے اپنے پیر پر کھڑے ہونے کی صلاحیت یعنی سروس، جوب، عہدہ، بزنس، کاروبار وغیرہ کے بہانے بنا کر جوان اولاد کی شادی میں جو غیر معمولی تاخیر کی جاتی ہے اس کے بھیانک نتائج سے پندرہ سو برس پہلے حضرت نبی کریم ﷺ نے آگاہ فرما دیا تھا۔

"عن أبي هريرة ﷺ قال قال رسول الله ﷺ إذا خطب إليكم من ترضون دينه وخلقه تزوجوه، إلا تفعلوه تكن فتنة في الأرض وفساد عريض" رواه الترمذی (مشکوۃ المصابیح ص ۲۶۷ مطبوعہ نعیمیہ دیوبند)۔

(ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ جب تمہارے یہاں کوئی ایسا شخص پیغام نکاح بھیجے جس کے دین و اخلاق کو تم بہتر سمجھتے ہو تو اس سے شادی کر دو، اگر ایسا نہیں کرو گے تو زمین میں فتنہ برپا ہو جائے گا، اور بہت بڑا فساد پھیل جائے گا)۔

محدث کبیر حضرت شیخ عبدالحق دہلویؒ اس کی شرح میں لکھتے ہیں:

"حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جس شخص میں دین و اخلاق کی یہ پسندیدہ صفت پائی جائے پھر بھی اس سے صرف اس وجہ سے نکاح نہ کرو کہ تم مال و دولت کی کثرت اور خاندانی بڑائی کے طالب ہو تو اس سے زمین میں فتنہ و فساد برپا ہو جائے گا، کیونکہ حب مال و حسب سرکشی اور فساد کا سبب ہوتے ہیں جس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ بڑی تعداد میں عورتیں بلا شوہر رہ جائیں گی اور کثیر تعداد میں مرد بلا بیوی باقی رہ جائیں گے اور اس طرح زنا کی کثرت ہو جائے گی اور فتنہ برپا ہونے لگے گا" (اشعۃ اللمعات حاشیہ مشکوۃ ص ۱۰)۔

حقیقت یہ ہے کہ آج کا انسانی معاشرہ رسول عربی ﷺ کی پیشین گوئی کے مطابق سنت نکاح سے روگردانی کے نتیجہ میں جس طرح قتل و غارت گری اور زنا کی کثرت ہوم سیکسولٹی اور فرینڈشپ کی لعنت کا شکار ہے، اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ انسانیت اپنی تباہی کے لئے بارود کے ڈھیر پر کھڑی ہے۔ یہاں اس واقعہ کے چہرے سے نقاب کشائی بھی ضروری ہے کہ اسلام میں بچپن کی شادی کا جواز اس مصلحت کے پیش نظر ہے کہ باپ شرعی طور پر اپنی اولاد کی خیر خواہی اور اس کے مصالح حیات کی تکمیل پر مامور ہے۔ لہٰذا اس کو شرعاً اختیار ہے کہ نکاح کی تاخیر سے اس کی اولاد کی خیر خواہی اور اس کی بہتر خوشگوار زندگی کی مصلحت فوت ہو سکتی ہو تو وہ حصول مصالح کی خاطر بچپن ہی میں نکاح کر دے جیسا کہ پچھلے احادیث و آثار صحابہ کے حوالے سے بیان کیا جا چکا ہے۔ ورنہ تو شریعت میں پسندیدہ

اور بہتر شادی بلوغ کے بعد کی ہے۔ وہ بھی اس شرط کے ساتھ کہ باپ لڑکا اور لڑکی دونوں کے مشورہ اور اجازت سے ان کے صحیح جذبات اور جائز پسند کی رعایت کرتے ہوئے دیندار خاندان، ہم عمر، خوشحال، سمجھ دار، خوش اخلاق، مناسب شکل وصورت والے دولہا دلہن کو دیکھ کر برابر درجہ کے وقار و مرتبہ و پیشہ یعنی ''کفو'' میں شادی کرے۔ تاکہ دونوں کا مستقبل شاندار، جاندار، خوشگوار اور محفوظ رہے۔

یہاں راقم سطور کا خیال یہ ہے کہ چونکہ دوسرے ائمہ کرام اور فقہاء عظام سے کوئی مخالف رائے منقول نہیں، اس لئے بالاتفاق معقول بات یہی ہے کہ حسب ارشادات نبوی علیہ السلام شادی بلوغ کے بعد ہی غیر ضروری تاخیر کے بغیر کردی جائے تاکہ مقاصد نکاح بھی پورے ہوں اور باپ بھی بطریق احسن اپنے فریضہ سے سبکدوش ہو۔

بچہ مزدوری کے بارے میں اسلام کا موقف:

بچپن کے جس زمانے میں ماں باپ پر رضاعت وحضانت کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے، وہ بچے کے سن شعور وتمیز تک پہنچنے کا زمانہ ہوتا ہے۔ اس میں بنیادی طور پر بچے کے لئے ماں باپ سے حق پرورش حاصل کرنے کا دور ہوتا ہے، اس عرصے میں کوئی پتھر دل ماں باپ بھی بچہ سے مزدوری کرانے کا تصور نہیں کرسکتا، کسی بھی ماں کی ممتا اور باپ کی شفقت بچہ مزدوری کی اجازت نہیں دے سکتی، اسی لئے اسلام بھی اس عمر کے دوران بچہ مزدوری کے سلسلے میں کوئی حکم جاری نہیں کرتا، البتہ عمر کی اگلی دہلیز پر قدم رکھنے کے بعد باپ کی مجبوری اور بچہ کی فقیری کی حالت میں بچہ مزدوری کے جواز کا موقف رکھتا ہے۔

صبی ممیز یا سن شعور یا سات سال سے آگے کی عمر میں داخل ہونے والا بچہ یا بچی دراصل اپنے باپ کی مالی استطاعت کے مطابق جملہ ضروریات نان نفقہ اور تعلیم وتربیت کے اخراجات کا حقدار ہے، جب تک حد کسب یعنی کمائی کے لائق عمر تک نہ پہنچ جائے، لیکن بچی کے لئے حد کسب تک پہنچنے کا اعتبار نہیں ہوگا بلکہ شادی ہوجانے تک اس کے جملہ اخراجات کی ذمہ داری باپ پر ہوگی، اگر بچی اس دوران کسی سلائی کڑھائی یا دست کاری سیکھ کر کچھ کمانے لگے تب بھی اس کا نفقہ باپ پر ہی لازم ہوگا، اس کو اپنی کمائی سے خرچ چلانے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا، علامہ ابن نجیم لکھتے ہیں:

''اگر باپ مالدار ہو اور بچہ فقیر ہو تو بچے کے کمانے کے لائق ہونے تک اگر چہ وہ احتلام کی حد تک نہ پہنچا ہو اس کا خرچہ باپ پر واجب ہے اور اگر وہ کمانے کے لائق ہوگیا ہو تو باپ اس کو مزدوری پر لگا سکتا ہے، اور اس کی کمائی کو بچہ کی ضرورت پر خرچ کرے لیکن بچی کے لئے یہ حکم نہیں کہ باپ اسے کمانے پر لگائے'' (البحر الرائق ۴؍ ۴۴۱)۔

علامہ ابن عابدین شامی اس کی تائید کرتے ہیں: ''أراد بالطفل العاجز عن الكسب لأنه إذا بلغ حد الكسب ولم يبلغ في نفسه لاتجب نفقته على أبيه بل يوجر وينفق عليه من أجرته'' (منحة الخالق على البحر الرائق ۴؍ ۲۴۰)۔

(طفل کا مطلب کمائی کے لائق نہ ہونا ہے کیونکہ جب کمائی کے لائق ہوجائے گا تو اگر چہ فی نفسہ (حقیقت میں) بالغ نہ ہو تو اس کا خرچ باپ پر واجب نہیں رہے گا بلکہ اس کو مزدوری پر لگا کر اس کی اجرت کو اسی پر خرچ کیا جائے گا)۔

فتاویٰ تاتارخانیہ میں لکھا ہے: ''اگر باپ کا ارادہ ہو کہ بچوں کو کسی کام یا خدمت میں لگادیں تو اس کو یہ حق ہے، کیونکہ اس میں خود چھوٹے بچے کا نفع ہے یا تو تعلیم سے پہلے سیکھے یا تعلیم کے بعد، لیکن اگر وہ ڈھنگ سے کام کاج نہیں کرسکتا تو اس کا خرچ باپ پر ہی لازم ہے، اھ، رملی فرماتے ہیں کہ ہمارے اکثر علماء نے اس کی صراحت کی ہے'' (منحۃ الخالق علی البحر الرائق ۱ر ۲۴۲)۔

اوپر عبارت سے ظاہر ہوا کہ بچہ کی مزدوری کی منشا خود بچے کی تعلیمی یا ذاتی ضروریات کی خود کفالت ہے نہ کہ باپ کی معاشی ضرورت کو بہتر بنانا یا سنبھالنا۔ لہٰذا محض اپنی معاشی ضرورت پورا کرنے کے لئے بچہ کو مزدوری پر لگانا جائز نہیں ہوگا۔ یہاں یہ بھی واضح ہوا کہ خود بچے کی منفعت کیلئے باپ اسے کسی کام کو سیکھنے میں لگائے تو یہ جائز ہوگا۔ البتہ چھوٹے موٹے گھریلو کام میں لگانا جس کا نفع خود ماں باپ یا اولیاء کو ہو تو یہ درست ہے، مثال کے طور کنویں سے پانی بھر کر لانا، یا دکان سے کوئی سودا سلف خرید کر گھر والوں کو پہنچانا یا ایندھن کے گٹھر اٹھا کر لانا بھی جائز ہوگا، اس کی تائید مندرجہ ذیل روایت سے ہوتی ہے، جسے اپنے فیصلہ کی تائید میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے:

ایک فارسیہ عورت نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے شوہر چاہتے ہیں کہ میرے بچے کو مجھ سے چھین کر

لے جائیں جبکہ میرے بچے نے ابوعنبہ کے کنویں سے پانی لاکر مجھے پلایا ہے اور مجھے نفع پہنچایا ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم دونوں قرعہ اندازی کرلو، اس پر اس کے شوہر نے کہا کہ کون میرا حق چھین سکتا ہے اور مجھ سے کون جھگڑا کرسکتا ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سن کر بچے سے کہا کہ یہ تمہارے باپ ہیں اور یہ تمہاری ماں ہے، تو جس کا چاہے ہاتھ پکڑ لے۔ تو اس نے اپنی ماں کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ماں اس کو لے کر چلی گئی (سنن ابوداؤد حدیث ۲۲۷۷ باب من احق بالولد، سنن نسائی حدیث ۲۵۲۶ باب اسلام احد الزوجین وتخییر الولد)۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بچہ گھریلو کام میں ماں کا ہاتھ بٹانے لگا تھا اور مدینہ کے ابوعنبہ کے کنویں سے جو ایک میل کی دوری پر تھا پانی لاکر ماں کو نفع پہنچاتا تھا، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا بچہ کو یہ فرمانا کہ "یہ تیرا باپ ہے اور یہ تیری ماں ہے تو جس کا چاہے ہاتھ پکڑ لے اور اسی کے ساتھ چلا جا"۔ بتارہا ہے کہ وہ بچہ سن تمیز کو پہنچ چکا تھا لہٰذا اس عمر میں بچہ گھریلو کام کاج میں والدین یا اولیاء کا ہاتھ بٹائے تو یہ جائز ہے۔

انتہائی غربت اور معاشی بدحالی کی بنا پر بچوں کو مزدوری پر لگانا:

اس سلسلے میں پہلی ہدایت وہ ہے جس کا ذکر قرآن کریم میں ہے۔

"وصاحبهما في الدنيا معروفا" (سورۂ لقمان: ۱۵) (اور والدین کے ساتھ دنیا میں ان کی ضرورتوں کی کفالت کرو)۔

علامہ ابن نجیم مصری لکھتے ہیں کہ یہ آیت کافر والدین کے بارے میں نازل ہوئی ہے، اور یہ معروف بات (بہتر سے بہتر کفالت) نہیں ہے کہ بیٹا تو اللہ کی نعمت سے فائدہ اٹھائے اور ماں باپ کو مرنے کے لئے بھوکا چھوڑ دے (البحر الرائق ص ۳۴۸ ج ۴، زکریا دیوبند)۔

ماں باپ کی انتہائی غربت اور کام کاج کے قابل نہ ہونے کی صورت میں ان کی نابالغ اولاد پر مزدوری اور کوئی بھی مناسب کام کرکے والدین کا خرچ اٹھانا واجب ہے، مذکورہ بالا قرآنی حکم کا تقاضا یہی ہے، اس کے علاوہ فقہاء نے بھی اس کی صراحت کی ہے:

"نفقۂ والدین کے واجب ہونے کے سلسلے میں اصل اعتبار والدین کے صرف محتاج وتنگدست ہونے کا ہے اس لئے کہ انھیں مشقت ودقت کی خوراک کھلانے میں جو تکلیف اٹھانی ہوگی، وہ والدین کو اف کہنے کی تکلیف سے کہیں زیادہ ہے جس کی حرمت اللہ تعالیٰ نے فلا تقل لهما الآیۃ میں بیان فرمائی ہے" (فتح القدیر)۔

اب اگر والدین کی تنگدستی اور مجبوری اس سے بھی زیادہ ہو کہ وہ بیچارے کمانے کے لائق بھی نہ رہے ہوں یا اپاہج اور محتاج ہوں تو اولاد کو مزدوری کرکے ان کی کفالت کرنی لازم ہوگی۔ یہاں تک کہ اگر کمسنی کی وجہ سے اتنی کم یافت ہو کہ وہ بچہ صرف اپنا گزارہ کرسکتا ہے تب بھی ماں باپ کو اپنی خوراک میں اسے شریک کرنا ہوگا اور خود اتنا ہی کھانے پر اکتفا کرنا ہوگا جس سے اس کے بدن میں کمانے کے لائق قوت برقرار رہے، علامہ شامی تحریر فرماتے ہیں:

"بعض علماء فرماتے ہیں کہ بیٹے کو مجبور کیا جائے گا کہ وہ اپنے باپ کو اپنی خوراک میں شامل کرے جبکہ بیٹے کو اس خوراک سے اتنا ہی مل پارہا ہو جس سے اس کا بدن صحیح کام کرتا رہے اور اس کو ایسی تکلیف نہ پہنچے جو اسے کمانے سے روک دے۔ اور امام ابو یوسفؒ سے بھی روایت کی گئی ہے کہ انھوں نے فرمایا اگر بیٹا ایسا نہ کرسکے تو باپ ضائع ہوکر رہ جائے گا" (منحۃ الخالق علی البحر الرائق ۴/۳۴۹)۔

علامہ ابن نجیم لکھتے ہیں: "ولا يجبر الابن على نفقة أبويه المعسرين إذا كان معسراً إلا إذا كان بهما زمانة أو بهما فقر فقط فإنهما يدخلان مع الابن ويأكلان معه ولا يفرض لهما نفقة على حدة" (البحر الرائق ۴-۳۴۹)۔

(بیٹے کو تنگدست ماں باپ کے نفقہ پر مجبور نہیں کیا جائے گا جبکہ وہ خود بھی تنگ دست ہو، مگر جب ماں باپ اپاہج ہوں یا وہ دونوں محتاج ہوں تب بھی (بیٹے پر واجب ہوگا) اور والدین اس کے ساتھ کھانے میں شامل رہیں گے، علیحدہ سے خرچ مقرر نہیں کیا جائے گا)۔

حدیث نبوی کے اشارۃ النص سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اولاد جس حال میں بھی ہو اگر حسب حال وہ محنت مزدوری کرکے والدین کی کفالت نہ کرے تو وہ نافرمانی کے گناہ میں مبتلا ہوگا۔ امام احمد، نسائی، بزار، حاکم، حضرت عبداللہ بن عمر بن عاص رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"ثلاثة حرم الله تبارك وتعالى عليهم الجنة مدمن الخمر، والعاق لوالديه والديوث الذي يقر الخبث في أهله"۔

(تین آدمی ایسے ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے جنت حرام کردی ہے۔ شراب پینے پر مداومت کرنے والا، اور اپنے والدین کی نافرمانی کرنے والا، اور وہ دیوث

شخص جو اپنی بیوی میں بدکرداری کو برقرار رکھے)۔

عبداللہ ناصح علوان لکھتے ہیں کہ: "نافرمانی میں یہ بھی داخل ہے کہ لڑکا اپنے ضرورت مند والدین کے نان نفقہ کا خیال نہ کرے اور وہ اس پر دعوی کرنے پر مجبور ہو جائیں تا کہ قاضی ان کا نان نفقہ لڑکے پر لازم کردے" (اسلام اور تربیت اولاد ۱/۳۷۹)۔

جرائم اور نابالغ بچے:

اسلام میں بالغ ہونے سے پہلے لڑکے اور لڑکیاں دونوں مرفوع القلم قرار دی گئی ہیں، اس لئے ان پر کوئی انتہائی درجہ کی سزا جاری نہیں ہوگی۔ حدیث میں ہے:

"عن علی رضی الله عنه قال قال رسول الله ﷺ رفع القلم عن ثلثة: عن النائم حتی یستیقظ وعن الصبی حتی یبلغ وعن المعتوه والمغلوب علی عقله" رواه الترمذی وابوداؤدورواه الدارمی عن عائشة وابن ماجه عنهما (مشکوٰة المصابیح ص ۲۸۴ باب الخلع والطلاق)۔

(حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تین شخصوں کی خطائیں معاف ہیں: سونے والے کی جب تک بیدار نہ ہو، بچے کی جب تک بالغ نہ ہو، پاگل اور بدعقل کی)۔

چنانچہ اسی اصول پر فقہاء کرام نے نابالغ بچے اور بچیوں کے مذکورہ بالا جرائم میں سے ہر ایک کے احکام تفصیل کے ساتھ بیان فرمائے ہیں جن کو مختصراً یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

قتل:

اسلام میں قتل کی سزا یہ ہے کہ عاقل، بالغ شخص جان بوجھ کر دھار دار آلہ سے کسی کو قتل کردے تو اس جرم قتل میں اس کو بھی قتل کیا جائے گا۔ اصطلاح شریعت میں اسی کو قصاص کہتے ہیں لیکن یہی جرم کسی نابالغ سے عمداً یا خطاءً سرزد ہو تو اس کو قصاصاً قتل نہیں کیا جائے گا۔ البتہ اس جرم پر اس کے خاندان والوں سے دیت یعنی خوں بہا لیا جائے گا تا کہ خون ناحق رائیگاں نہ ہو۔ محقق ابن الہمام لکھتے ہیں:

"منهما کون القاتل عاقلا بالغا إذ لا یجب القود علی الصبی أصلا" (فتح القدیر ۹-۱۳۸، فتاوی ہندیہ ۶-۲۲)۔

(حکم قصاص میں سے قاتل کا عاقل بالغ ہونا ہے کیونکہ نابالغ بچے پر بالکل قصاص نہیں ہے)۔

غارت گری اور ڈکیتی:

اسلام میں غارت گری اور ڈکیتی کی سخت سزا مقرر ہے، جسے قرآن پاک کی سورۂ مائدہ آیت ۳۳ میں ذکر کیا گیا ہے، لیکن اسی جرم غارت گری وڈکیتی پر بچے کی سزا کو معاف رکھا گیا ہے، یہاں تک کہ اگر ڈاکوؤں اور غارت گروں میں بچہ بھی شامل ہو تو غارت گروں کی سزا کا معاملہ ہلکا ہو جائے گا اور یہ مسئلہ حقوق اللہ کے بجائے حقوق العباد کا ہو جائے گا۔ امام قدوری لکھتے ہیں:

"فإن کان فیهم صبی... لسقط الحق عن الباقین وصار القتل إلی أولیاء إن شاؤا قتلوا وإن شاؤا عفوا" (مختصر القدوری، ص ۲۲۲ مطبوعہ دیوبند)۔

(اگر ان غارت گروں میں بچہ بھی شامل ہو تو باقی لوگوں سے حق ساقط ہو جائے گا اور حق کا معاملہ اولیاء مقتول کے حوالے ہو جائے گا وہ چاہیں تو لوٹ مار کرنے والوں کو قتل کردیں اور اگر چاہیں تو معاف کردیں)۔

چوری:

اسلام میں چوری کی سزا بھی بہت سخت ہے، قرآن کریم میں حکم ہے:

"والسارق والسارقة فاقطعوا أیدیهما جزاء بما کسبا نکالا من الله والله عزیز حکیم" (سورۂ مائدہ: ۳۸)

(اور چور مرد اور چور عورت دونوں کے داہنے ہاتھ (پہنچوں تک) کاٹ دو، اللہ کی طرف سے عبرتناک سزا کے طور پر، اور اللہ بڑا قوت والا، بڑا حکمت والا ہے)۔

چوری شریعت اسلامی میں ایک بدترین جرم ہے، اسلام نے فرد و جماعت دونوں کے لئے امن وامان اور سکون خاطر کا جو بہترین کامل ترین نظام قائم کیا ہے، چوراس میں رخنہ ڈالنا اور اس ساری فضا کو درہم برہم کرڈالنا چاہتا ہے، آیت کے اس ٹکڑے نے واضح کردیا کہ چوری کا بدبخت مجرم ہے ہی ایسی سزا کا مستحق (تفسیر ماجدی ۱/۹۰۹)۔

لیکن اگر نابالغ یا نابالغہ نے چوری کرلی ہے خواہ کسی مقدار مال میں کی ہو تو اس چوری کی سزا جاری نہیں کی جائے گی، البتہ چوری کردہ رقم اور سامان کو واپس کرنا لازم ہوگا اور وہ ضائع ہوگیا تو اس کا ضمان دینا ہوگا، علامہ ابن نجیم مصریؒ اس سزا سے بچے بچیوں کے مستثنیٰ ہونے کی وجہ بتاتے ہوئے لکھتے ہیں:

”اور مکلف کی قید سے بچے اور پاگل اس سزا سے خارج ہوگئے کیونکہ ہاتھ کاٹنا عقوبت ہے اور دونوں میں اس کی اہلیت نہیں ہے، پس یہ دونوں آیت سرقہ سے مستثنیٰ ہوں گے، البتہ دونوں مال کے ضامن ہوں گے“ (البحر الرائق ۵/۸۴)۔

بلکہ اگر چوروں کے گروہ نے چوری کی اور اس میں بچہ بھی شامل تھا تو امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک کسی پر بھی چوری کی سزا نافذ نہیں ہوگی، کیونکہ ممکن ہے کہ اصل چوری کرنے والا نابالغ رہا ہو اور اگر چوری کرنے والے بالغ ہی رہے ہوں تب بھی کم از کم شبہ تو پیدا ہو ہی گیا (اور اصول یہ ہے کہ الحدود تندرئ بالشبہات، حدود شبہ پیدا ہونے سے ساقط ہوجاتے ہیں) اور نابالغ ہو تو حد جاری نہیں ہوگی (جامع احکام الصغار ۱/۱۹۸)۔

زنا:

اسلام میں زنا انتہائی بدترین معاشرتی گناہ ہے جس کی نحوست حسب نسب، معاشرت اور امن عامہ سب پر پڑتی ہے، اسی لئے اس کی سزا ”الرجم للثیب والجلد للبکر“ (صحیح بخاری کتاب التفسیر ۲/۶۵۷) (شادی شدہ بالغ مرد وعورت کے لئے سنگساری اور غیر شادی شدہ کیلئے سو کوڑوں کی مار (رکھی گئی ہے)۔

اور اس سزا کو نمونۂ عبرت بنانے کے لئے قرآن پاک میں یہ حکم بھی دیا گیا ہے:

”ولا تأخذ کم بہما رأفۃ فی دین اللہ إن کنتم تؤمنون باللہ والیوم الآخر ولیشہد عذابہما طائفۃ من المؤمنین“ (سورۂ نور: ۲) (اور ان دونوں پر اس سزا کے لئے اللہ کے حکم کو جاری کرنے میں تمہیں ترس نہیں کھانا چاہئے، اگر تم اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہو، اور یہ بھی چاہئے کہ ان دونوں کی سزا کو ایمان والوں کی ایک جماعت مشاہدہ کرے)۔

اس کے باوجود اسی جرم کے نابالغ اور نابالغہ سے سرزد ہوجانے پر ان کے غیر مکلف ہونے کی وجہ سے اسلام میں ان کے اس فعل بد کو حرمت زنا سے تعبیر نہیں کیا گیا۔ امام سرخسیؒ کی ”المحیط“ کے حوالے سے منقول ہے:

”حتی إن وطأ المجنون والصبی العاقل لایکون زنا لأن فعلہما لایوصف بالحرمۃ“ (فتاوی ہندیہ ۲/۱۴۲) (یہاں تک کہ اگر کسی پاگل اور باشعور بچے نے ہمبستری کرلی تو وہ زنا نہیں کہلائے گا کیونکہ ان دونوں کے اس فعل کو زنا سے تعبیر نہیں کیا جاتا)۔

تاہم ان نابالغوں کے سرپرستوں کو اس فعل کے ارتکاب پر سرزنش کرنی ہوگی تاکہ ان کی اصلاح ہوجائے۔

”وإنما یؤدب أی یجب علی من تولی أمور الناس أن یودبہ لأجل إصلاح حالہ“ (حاشیۃ الثمر الدانی ص ۵۹۳، روضۃ الطالبین ۱۰/ [illegible]) (لوگوں کے معاملات کے ذمہ داروں پر واجب ہے کہ اس نابالغ کی سرزنش ان کے اصلاح حال کی خاطر ضرور کریں)۔

فقہاء کا بالاتفاق فیصلہ یہ ہے کہ اگر نابالغ لڑکا یا لڑکی شادی شدہ بھی ہو تب بھی رجم کی سزا جاری نہیں ہوگی (بدائع الصنائع ۴/۹۳، روضۃ الطالبین ۱۰/۶۸، الروض المربع ص ۴۳۴، الثمر الدانی ص ۵۹۱)۔

بچوں کے جرائم کی روک تھام:

بچوں میں جرائم کی پرورش کے اصل ذمہ دار خود بچے نہیں بلکہ ہماری فریڈم سوسائٹی ہے جس میں ماں باپ اور عام لوگ اپنی بے لگام آزادی کا استعمال کرتے ہوئے بچوں کے سامنے حیوانی کردار کا مظاہرہ کرتے ہیں اور انھیں بڑوں کی حرکتوں کو دیکھ کر بچے بھی ان برائیوں میں لت پت ہوجاتے ہیں، جیسا کہ حدیث میں ارشاد ہے: ”الناس علی دین خلیلہم“ لوگ اپنے ہم صحبت دوست کے طریقہ پر چلتے ہیں، اس لئے بچوں کے جرائم کی روک تھام کا سب سے

پہلا طریقہ یہ ہے کہ "فرینڈشپ" اور "فری سیکس" کے ماحول سے دور رکھا جائے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ بچوں کے لئے کچھ قانونی اخلاقی بندش کو ضروری قرار دیا جائے، مثال کے طور پر دس سال کی عمر کے بعد ان کی تادیبی کارروائی کے طور پر انہیں شرعی حدود میں رہتے ہوئے مارنے کی گنجائش رکھی جائے، مثال کے طور پر بچہ اگر اپنا نفع نقصان سمجھتا ہے تو اس کو کچھ سختی سے مارا جائے تا کہ مارنے کا فائدہ حاصل ہو۔

حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے ایک بچے کو زور سے ایک تھپڑ مارا جس سے وہ تلملانے لگا، لوگوں نے ان سے کہا، آپ چھوٹے بچے کو مار رہے ہیں جس پر ابھی شرعی احکام واجب نہیں ہوئے، انھوں نے جواب دیا کہ میں نے دیکھا یہ اپنا نفع نقصان سمجھتا ہے تو میں نے مناسب سمجھا کہ اس کو ادب سکھاؤں (تاریخ دمشق ۳۰/۳۰/۱۵۲)۔

لیکن مارنے میں تادیب مقصود ہو تعذیب نہ ہو، مناسب یہ ہے کہ ایک ساتھ تین دفعہ سے زیادہ نہ مارے۔ چنانچہ خلیفۃ المسلمین حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے تمام شہروں میں پیغام بھیجا تھا کہ "استاذ ایک ساتھ تین مار سے زیادہ نہ مارے، اس سے بچہ ڈر جائے گا" (العیال لابن ابی الدنیا ص ۵۳۳)۔

البتہ قریب البلوغ بچہ اگر بہت بدتمیز اور شرارتی ہے اور تین مار سے وہ کوئی اثر نہیں لیتا اور مربی کو اس سے زیادہ مار کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اور بچہ اس کا تحمل بھی کر سکتا ہے تو اسے اوسط درجہ کے کوڑے یا چھڑی سے اعتدال کے ساتھ دس مرتبہ ضرب لگائی جا سکتی ہے۔ حدیث میں ہے:

"لا عقوبة فوق عشر ضربات إلا في حد من حدود الله وفي رواية لا تجلدوا فوق عشرة أسواط" (صحیح بخاری حدیث ۶۸۴۹ و ۶۸۵۰ مطبوعہ دارالسلام) (دس ضربوں سے زیادہ سزا نہیں ہے سوائے حد کے اللہ کے حدود میں سے)۔

لیکن بچوں کے شرارتی مزاج اور حرکت کے اعتبار سے کبھی اس سے زیادہ کی ضرورت محسوس ہو تو صرف تادیب کی نیت سے غصہ اور بھڑاس نکالنے یا انتقام لینے کی غرض سے نہیں، دس ضربات پر اضافہ کیا جا سکتا ہے، علامہ قابسی فرماتے ہیں:

"انشاء اللہ اس میں کوئی حرج نہیں ہے کہ دس سے زیادہ مارے لیکن اللہ جانتا ہے کون اصلاح چاہتا ہے اور کون بھڑاس نکالتا ہے (الرسالۃ المفصلۃ ص ۱۵۰، ۱۵۱۔ بچوں کے احکام و مسائل ص ۳۴۷)۔

تاہم بطور تادیب مارنے میں یہ احتیاط لازم ہے:

(۱) ایسی چھڑی سے مارے جو نہ بہت سخت ہو نہ بہت نرم بلکہ بیچ والے درجہ کی ہو، اور مارتے وقت ہاتھ بہت تان کر نہ مارے اور ایک ہی جگہ نہ مارے، ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بیچ کا کوڑا منگوایا اور مارنے والے سے کہا مارو لیکن تمہاری بغل نظر نہ آئے (ہاتھ تان کر نہ مارو) اور ہر عضو کو اس کا حق دو (ایک ہی جگہ نہ مارو) (مصنف عبدالرزاق ۲۹۶/۷، مصنف ابن ابی شیبہ ۵۰/۱۴، السنن الکبریٰ ۵۶۵/۸)۔

(۲) لٹا کر، بیڑی ڈال کر، کپڑے اتار کر نہ مارے، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے یہی مروی ہے (مصنف عبدالرزاق ۳۷۳/۷، السنن الکبریٰ ۳۲۶/۸)۔

(۳) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "إذا ضرب أحدكم فليتق الوجه" (جب تم میں سے کوئی مارے تو چہرے پر مارنے سے بچے) (سنن ابوداؤد حدیث ۴۴۹۳، مسند احمد ۲۴۴/۲، الادب المفرد ص ۱۷۴)۔

(۴) سر پر، نازک اعضا جیسے شرمگاہ پر مارنا جس سے جان کو خطرہ ہو جائے جائز نہیں۔

(۵) ایسی سخت مار مارنا بھی جائز نہیں جس سے خون نکلے یا ایسا زخم لگے جس کا اثر گوشت تک پہنچے یا ہڈی ٹوٹے (مصنف عبدالرزاق ۲۹۶/۷، ۲۹۸، ۳۶۹، ۳۷۹، ۳۷۱، مصنف ابن ابی شیبہ ۵۰۱/۱۴، ۱۵۲)۔

یہ واضح رہے کہ اسلام میں بچوں کو صالح معاشرے کا صالح فرد بننے اور تعلیم و تربیت کے نقطۂ نظر ہی ان تنبیہات کو اعتدال و توازن کے ساتھ گوارا کیا گیا ہے، جن لوگوں کو بچوں کے جرائم سے شکایت ہے وہ خود بہت حد تک بچوں کو مجرم بنانے کے ذمہ دار ہیں، آج ایک طرف پورے یورپ اور امریکہ نے اسکول کے ٹیچرس اور تعلیم گاہوں کے استاذوں اور انتہا یہ کہ ماں باپ سے بچوں کو تنبیہاً و تادیباً مارنے کے حق کو قانون کے ذریعہ چھین کر پولس کسٹڈی میں فریڈم کلچرل سوسائٹی کا حصہ بنا دیا ہے، جس سے بچوں میں جرم کا حوصلہ اور قانون شکنی کا جذبہ ابھرتا ہے، وہ استاذوں کو جوتے ہی نہیں بلکہ گولی مارنے لگتے ہیں اور ماں

باپ کو فالتو مدکی چیز سمجھتے ہیں، جس کا بھیانک نتیجہ سب کی آنکھوں کے سامنے ہے۔

(۶) اس سلسلے میں بچوں کے جرائم کے سدباب کیلئے موجودہ حالات میں سب سے زیادہ ضروری یہ ہے کہ حکومتیں ماں باپ کو حق تادیب وتنبیہ واپس کریں اور ماں باپ بچوں اور بچیوں کو ٹیلی ویژن، انٹرنیٹ، موبائل اور فیس بک کے استعمال سے دور رکھیں۔ اور بہت ناگریز صورت حال میں اپنے ساتھ بٹھا کر معلوماتی فیچر، ڈسکوری یا دینی پروگرام دکھا کر سب کو لاک کردیں۔ حکومت اور سوسائٹی دونوں کو یہ ذمہ داری قبول کرنی چاہئے کہ بچوں اور بچیوں کو جرائم پیشہ بننے سے روکنے کے لئے ان پر اخلاقی بندش اور ان کی بے لگام آزادی پر پابندی لگانا بے حد ضروری ہے۔ یہ ساری باتیں قرآن پاک کی ہدایت: "ولا تقربوا الفواحش ماظهر منها وما بطن" (سورۃ الانعام: ۱۵۱) (اور کھلی اور چھپی بے حیائی کی باتوں کے قریب مت جاؤ) کے تحت آتی ہیں۔

حضرت مولانا عبدالماجد دریابادی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"الفواحش کے معنی بہت وسیع ہیں، تنہا زناکاری کے نہیں۔ بدکاری، بے حیائی فاشی کی تمام صورتیں اس کے اندر آگئیں، پھر لاتقربوا کی تعمیم یعنی اس کے قریب بھی نہ جاؤ۔ اور پھر ماظہر منہا وما بطن نے تعمیم کی حد ہی کردی۔ بے حجابی، لباس میں بے ستری وغیرہ کی تمام حقیقی صورتیں خواہ پبلک میں ہوں یا پرائیوٹ میں یکساں حرام قرار پاگئیں۔ چہرہ پر پوڈر لپ اسٹک وغیرہ لگا کر بن سنور کر، نیم برہنہ لباس پہن کر، خوشبو لگا کر عورتوں کا آزادی کے ساتھ بے تکلف باہر نکلنا۔ مردوں کے مجمع میں بے تکلف چلنا پھرنا، ہنسنا بولنا، سنیما اور تھیٹر میں شہوانی نظاروں سے لطف اندوز ہونا، آرٹ گیلری میں برہنہ تصویریں دیکھنا۔ غرض تہذیب جدید کے سارے جاہلی عنصر اس آیت کی رو سے حرام ٹھہر جاتے ہیں۔ اخلاق کی پاکیزگی اور پاکیزہ خیالی جو فرد و جماعت دونوں کی حقیقی ترقی کا پہلا زینہ ہے، اس کی جو نظیر شریعت اسلام نے قائم کردی ہے، وہ کہیں تلاش سے بھی نہ ملے گی (تفسیر ماجدی ۱۲۱/۲ مطبوعہ لکھنؤ)۔

مجرمانہ ذہن رکھنے والے بچوں کی سرزنش اور اصلاح کے لئے بچوں کی جیلیں قائم کرنا:

اصل یہ ہے کہ اسلام میں نابالغ نوعمر بچوں کے لئے جیل کی سزا مقرر نہیں ہے، الا یہ کہ ان سے ایسا جرم سرزد ہوجائے جس کی اصلاح کیلئے جیل بھیجنا ناگزیر ہوجائے۔

"یعنی فقہاء نے صراحت کی ہے کہ نابالغ کو جرم اور اس جیسے فعل کے ارتکاب پر جیل کی سزا نہیں دی جائے گی لیکن دوسرے فقہاء کہتے ہیں کہ بدکار نابالغ کو بطور تادیب نہ کہ بطور سزا جیل میں ڈالا جاسکتا ہے، وہ بھی اس وقت جبکہ اس کے کھلا چھوڑنے کے مقابلہ میں جیل زیادہ مناسب ہو اور اسی میں اس کی تادیب و اصلاح ہوسکتی ہو، اور ان جرائم میں سے جن پر فقہاء نے جیل کی سزا کی صراحت کی ہے نابالغ کا مرتد ہونا (اسلام سے پھر جانا) ہے، مرتد ہوجانے پر بچے کو جیل میں ڈالا جائے گا یہاں تک کہ وہ توبہ کرلے (اسلام میں لوٹ آئے)، یہی قول ہے امام ابوحنیفہ اور امام محمد رحمہما اللہ کا، اسی طرح سرکش وباغی بچوں کو بھی اس وقت تک جیل میں رکھا جائے گا جب تک ان کی سرکشی اور جنگ جوئی ختم نہ ہو" (الموسوعۃ الفقہیہ الکویتیہ ۳۱۸/۱۶، حاشیہ ابن عابدین ۲۵۷/۴، ۴۲۹/۵، المعیار ۲۵۸/۲، ۴۱۸/۸، المغنی لابن قدامہ ۱۱۵/۸، الانصاف ۳۱۶/۱۰، معین الحکام ص ۱۷۴۔ بدائع الصنائع ۶۳/۷، جواہر الاکلیل ۱۴۸/۲، مغنی المحتاج للشربینی ۱۲۷/۴)۔

غیر بالغ لڑکا تجارتی لین دین میں کسی سے مال لے کر ضائع کردے یا قرض کا معاملہ کرلے اور ادائیگی نہ کرے تو مالکیہ، شافعیہ، حنابلہ اور دو میں سے ایک قول کے مطابق حنفیہ کا مذہب یہ ہے کہ اس کو جیل میں نہیں ڈالا جائے گا۔ اس کے غیر مکلف ہونے کی وجہ سے۔ لیکن جیل کے بغیر بھی اس کی تادیب ممنوع نہیں ہے۔ لیکن مالی معاملات میں بھی نابالغ کیلئے امام سرخسی نے جیل کی سزا تجویز کی ہے۔

"وصحح السرخسي من فقهاء الحنفية حبس الولي لتقصيره في حفظ ولده ولأنه المخاطب بأداء المال عنه" (المبسوط ۹۱/۲۰، الفتاوی الہندیہ ۴۱۳/۳، حاشیہ ابن عابدین ۴۲۶/۵، اسنی المطالب وحاشیہ للرملی ۳۰۶/۴، حاشیہ الدسوقی ۲۸۰/۳) (اور فقہاء حنفیہ میں سے امام سرخسی نے نابالغ کیلئے جیل کی سزا کو صحیح قرار دیا ہے، اس وقت جب بچے کا سرپرست یا ولی یا باپ اپنے بچے کی حفاظت ونگرانی سے قاصر ہو کیونکہ بچے کی طرف سے ضائع کردہ مال کی ادائیگی کا ذمہ دار تو ولی ہی ہے)۔

مجرمانہ ذہنیت رکھنے والے بچوں کو قائم شدہ سرکاری "بچہ جیل" میں ڈالنے سے پہلے ان کی سرزنش اور اصلاح کیلئے ضروری ہے کہ اپنے ہی گھر کو جیل خانہ بنادیا جائے تاکہ باپ یا ولی کی نگرانی میں تادیب ہوتی رہے۔

''اکثر نصوص (واضح احکام فقہیہ) اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ نوعمر نابالغ کو اپنے باپ یا اس کے ولی (سرپرست) کے گھر میں قید کیا جائے باوجودیکہ قید خانہ میں بھی ڈالنا جائز ہے، مگر جب جیل میں اس کے اور بگڑ جانے کا خطرہ ہو تو اس کو اپنے ہی باپ کی قید میں ڈالنا واجب قرار دیا جائے گا نہ کہ جیل میں'' (الدر المختار ۴/ ۲۵۳، المعیار ۸/ ۲۵۲، احکام السوق لیحییٰ بن عمر ص ۱۳۵۔ الفتاویٰ لابن تیمیہ ۳۴/ ۱۷۹، حاشیۃ الدسوقی ۲/ ۲۸۰، حاشیۃ الصعیدی علی کفایۃ الطالب ۲/ ۳۰۱)۔

آج کل ایسی مشینی بیڑیاں ایجاد کی جا چکی ہیں جو قیدی کے پاؤں میں باندھ دی جاتی ہیں اور ان میں قید کا ٹائم فکس کر دیا جاتا ہے، اگر قیدی مقررہ ٹائم سے پہلے گھر سے باہر نکل جائے تو کنٹرول روم میں اس کی اطلاع پہنچ جاتی ہے اور گھریلو جیل کی معیاد اور بڑھا دی جاتی ہے۔ بچوں کو سرکاری بچہ جیل میں ڈالنے سے ایک شرعی خرابی یہ بھی پیدا ہوتی ہے کہ نابالغ بچیاں بھی ان کے ساتھ اسی جیل میں ہوتی ہیں جبکہ شریعت میں بچیوں کے لئے علیحدہ جیل ہونا ضروری ہے مگر رواجی طور پر بچے اور بچیوں کے مخلوط جیل میں ایک دوسرے کی صحبت میں رہنے کے باعث دونوں کے مزید اخلاقی اور دینی بگاڑ کا خطرہ بڑھ جاتا ہے۔ جس سے بچاؤ کا بہتر طریقہ گھریلو جیل ہی ہو سکتا ہے۔ دوسری خرابی یہ ہے کہ موجودہ بچہ جیلوں میں بچوں کے جرائم کی نوعیتوں کے اعتبار سے انہیں ایک دوسرے سے الگ نہیں رکھا جاتا مثلاً قرض کے معاملہ کا قیدی، اور مختلف جرائم کا قیدی، جیسے چوری کا قیدی، چوروں کی عادت اختیار کرنے والا قیدی، کسی کو جسمانی اذیت پہنچانے والا قیدی، سب کو ایک ہی جگہ رکھا جاتا ہے جبکہ فقہاء اس بات پر زور دیتے ہیں کہ ان کو ایک دوسرے کے ساتھ ہی قید میں جمع نہ کیا جائے، اس خوف کی وجہ سے کہ ایک کے جرم کا اثر دوسرے پر نہ پڑے، حالانکہ ہر قیدوالے کے لئے وہی معاملہ کیا جانا چاہئے جو ان کے جرم و گناہ کے مناسب ہو۔

قیدی بالغ ہو یا نابالغ اس کو ایسی غیر انسانی سزا دینا جائز نہیں ہے جس سے اس کی تحقیر و تذلیل ہو یا اس کے کسی حصہ جسم کو تلف و برباد کیا جائے۔ کیونکہ قید کی مشروعیت قیدی کے احوال کی درستگی اور اصلاح کیلئے ہے نہ کہ اس کی توہین و بربادی کے لئے۔ فقہاء فرماتے ہیں۔

''لا يجوز للحاكم التأديب بما فيه الإهانة والخطر كضرب الوجه وموضع المقاتل وكذا جعل الأغلال في أعناق المحبوسين وكذا لا يجوز أن يمد المحبوس على الأرض عند ضربه سواء كان للحد أو التعزيز على ما تقدم'' (الفتاویٰ الهندیہ ۳/ ۴۱۴)۔

(حاکم کے لئے جائز نہیں کہ وہ ایسی سزا دے جس میں اہانت یا جان کا خطرہ ہو، جیسے چہرہ پر پٹائی اور قتل واقع ہونے کی جگہ پر مارنا، اسی طرح قیدیوں کی گردنوں میں بیڑیاں ڈالنا اور یہ بھی جائز نہیں کہ مارتے وقت اس کو زمین پر پھیلا دیا جائے، خواہ حد جاری کرنے کیلئے ہو یا تعزیر و تادیب کے لئے)۔

چونکہ موجودہ دور کے حکام ان باتوں کی خلاف ورزی کرتے ہیں اس لئے حتی الامکان بچوں اور بچیوں کو سرکاری جیلوں سے بچایا جائے اور تادیب کیلئے گھریلو جیل کا نظم کیا جائے، رہا یہ مسئلہ کہ جیل میں بچوں سے کیا کام لیا جا سکتا ہے تو اس سلسلے میں تین نقاطِ نظر ہیں (الفتاویٰ الھندیہ ۳/ ۴۱۸، الدر المختار و حاشیۃ ۵/ ۳۷۹، اسنی المطالب مع حاشیۃ الرملی ۲/ ۱۸۸، ۱۸۹ و ۱۹۴، البحر الزخار ۵/ ۸۲، المغنی ۴/ ۴۹۵، موسوعہ فقہیہ ۱۶/ ۳۲۱)۔

''پہلا قول یہ ہے کہ قیدی کو اپنی قید کے دوران کوئی کام کرنے سے منع نہ کیا جائے بلکہ اس کو کام کرنے کا موقع دیا جائے، کیونکہ کام ہی اس کے نفقہ اور ادائے قرض وغیرہ کا سبب ہے اور یہی قول ہے شوافع، حنابلہ وغیرہ ہم کا اور اسی پر بعض حنفیہ نے فتویٰ دیا ہے'' (حاشیہ ابن عابدین ۵/ ۳۷۸، الفتاویٰ الھندیہ ۳/ ۴۱۸، ۵/ ۳، البحر الزخار ۵/ ۸۲)۔

''دوسرا قول یہ ہے کہ زیر قید، قیدی کو کام کرنے سے منع کیا جائے گا اور اس کو اس کا موقع نہیں دیا جائے گا تاکہ جیل اس کے لئے آسان نہ بن جائے ورنہ جیل اس کیلئے دکان کے درجہ میں ہو جائے گا۔ حنفیہ کے مذہب میں یہی قول معتمد ہے اور ان کے علاوہ دیگر فقہاء نے بھی یہی کہا ہے'' (البحر الزخار ۵/ ۸۲، وتری الجنۃ الاخذ بهذا الرأی هو الاوفق اذ اروعی فی ذالک المصلحۃ العامۃ والخاصۃ)۔

''تیسرا قول یہ ہے کہ دوران قید قیدی کو کام کا موقع فراہم کرنے کا معاملہ حاکم کی صوابدید اور اس کے اجتہاد پر چھوڑ دیا جائے، یہی علامہ مرتضیٰ کا قول ہے، کویت کی فقہ کمیٹی اسی رائے کو اختیار کرنا زیادہ مناسب سمجھتی ہے بشرطیکہ اس میں مصلحت عامہ و خاصہ کی رعایت کی جائے'' (الموسوعۃ الفقہیہ ۱۶/ ۳۲۲)۔

جیل میں نابالغ بچوں کو نکما ہو جانے سے بچانے کے لئے بچوں سے قوت برداشت کے مطابق کوئی کام لیا جانا چاہئے۔ مثلاً خیاطی، امبرائڈی، کمپیوٹرنگ ورکس، کیٹرنگ کوکنگ وغیرہ۔ یہ سب کام جیل میں بآسانی فراہم کئے جا سکتے ہیں۔ جہاں تک جیل میں نابالغ بچوں کو سزائیں دینے کی بات کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں عرض یہ ہے کہ کسی کا نابالغ بچے کا جیل میں ہونا ہی سب سے بڑی سزا ہے۔ کیونکہ ماں باپ گھر بار، کھیل کود، اعزا و اقربا، دوست احباب سے میل ملاپ اور آزادی

کے ساتھ زندگی گذارنے کے آرام وراحت کی جگہ قید تنہائی کو جھیلنا کسی عذاب سے کم نہیں ہے۔ پھر بھی اگر جیل کے حکام تادیبی سزا دینے کی ضرورت محسوس کریں تو ان سزاؤں سے زیادہ بڑی سزا دینا ان کے لئے جائز نہیں جو نابالغ بچے کا باپ یا ولی تادیباً دے سکتا ہے۔ ان کا ذکر پوری تفصیل کے ساتھ پچھلے صفحات میں کیا جا چکا ہے یہاں ان کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔

باقی رہی ان کی اصلاح کی تدبیر تو ایک مناسب تدبیر یہ ہے کہ بچہ جیل کے قانون کو زیادہ سے زیادہ نرم کیا جائے۔ جیل ہی میں بچوں کی پڑھائی لکھائی کا نظم کیا جائے، خواہ کورس پورا ہو یا نہ ہو۔ ٹیوٹر اور کوچنگ سسٹم اس کے لئے کافی ہوسکتا ہے۔ اسی کے ساتھ جیل کے حکام ان بچوں کے ساتھ شفقت ومحبت کا رویہ اپنائیں۔ تاکہ جیل ان کے لئے گھر کا آنگن بن جائے۔ کچھ اصلاحی چیزیں جیل حکام کی صوابدید پر چھوڑی جائیں جنھیں مصلحت عامہ وخاصہ کی رعایت سے اپنایا جانا چاہئے۔

لاوارث اور بے سہارا بچے:

ماں باپ کے کسی حادثہ میں انتقال یا بچھڑ جانے کے سبب نابالغ بچے یتیم یا یتیم کے حکم میں ہوتے ہیں۔ اگر ایسے بچوں کا خاندان ان کا حسب نسب معلوم ہے تو ان کی کفالت وپرورش اور تعلیم وتربیت کی ذمہ داری اہل خاندان پر اسی ترتیب سے واجب ہوتی ہے جس کی پوری تفصیل بچوں کے حق پرورش (حق حضانت) کے ذیل میں پیچھے گذر چکی ہے، اور اگر مذکورہ وجوہات یا ولادت کے بعد ماں باپ کی طرف سے پھینک دیئے جانے کے بعد وہ "لاوارث" ہو گئے ہوں تو اسلامی فقہ کی اصطلاح میں "لقیط" کہلائیں گے، اور ان کے لئے اسلامی ہدایات کی تفصیل حسب ذیل ہوگی:

"وفی الشرع اسم لما یطرح علی الأرض من صغار بنی آدم خوفا من العیلة أو فرارا من التھمة" (کتاب التعریفات ص ۲۴۸) (لقیط اصطلاح شریعت میں انسان کے چھوٹے بچے کو کہتے ہیں جسکو فقر وفاقہ یا تہمت زنا کی بدنامی کے ڈر سے زمین پر پھینک دیا گیا ہو)۔

ایسے بچوں کے لئے اسلامی ہدایت یہ ہے:

''التقاطه فرض كفاية إن غلب على ظنه هلاكه لولم يرفعه ولولم يعلم به غيره ففرض عين'' (الدر المختار علی رد المحتار ۶۔ ۴۲۳)۔

(ایسے نابالغ بچوں کو پالنے والے کا ظن غالب (بدرجۂ یقین) یہ ہو کہ اگر اسے اٹھایا نہیں گیا تو وہ ہلاک ہو جائے گا تو اس کا اٹھالینا فرض کفایہ ہے اور اگر اس کا غالب گمان یہ ہو کہ کوئی دوسرا اسے نہیں جانتا تو فرض عین ہے)۔

"اگر چہ بچہ کسی عام راستے کے کنارے یا ایسی جگہ پایا گیا جہاں سے گزرنے والوں کی نظریں اس پر پڑتی ہوں تو اسے اٹھالینا مستحب ہے، اگر اسے یقین ہو کہ فوری طور پر اسے نہیں اٹھایا گیا تو وہ ہلاک ہو جائے گا، جیسے پانی میں ڈوبتا ہوا یا کسی درندے کے سامنے پایا گیا تو اس کا اٹھالینا واجب ہے" (فتاوی ہندیہ ۲/۲۸۵)۔

اس بچے کے سلسلے میں دوسری اسلامی ہدایت یہ ہے: "ایسے بچے کو اٹھالینے کے بعد دوبارہ اسی جگہ پھینک دینا حرام قرار دیا جائے گا، کیونکہ اٹھالینے کے بعد اس کی حفاظت وپرورش کی ذمہ داری اٹھانے والے پر واجب ہوگئی، لہٰذا اب اس کو پائے جانے کی جگہ پھینک دینے کا اختیار نہیں ہوگا" (البحر الرائق ۵/۲۴۱)۔

تیسری اسلامی ہدایت یہ ہے: "اگر کسی مسلم شہر یا مسلم گاؤں میں پایا گیا تو مسلمان مانا جائے گا۔ ایسی جگہ بچے کو پانے والا اگر غیر مسلم ہو تو تب بھی بچہ کو مسلمان قرار دیا جائے گا" (بدائع الصنائع ۵/ ۱۹۹، فتح القدیر ۵/ ۳۴۵)۔

"اور اگر غیر مسلموں کے مذہبی مقامات، مندر، گرجا گھر یا غیر مسلم آبادی میں پایا جائے اور اٹھانے والا بھی غیر مسلم ہو تو بچہ کو غیر مسلم سمجھا جائے گا" (فتح القدیر ۵/۳۴۵)۔

لیکن مسلم ملک میں پایا جانے والا لاوارث بچہ مسلم ملک یا دار الاسلام کی نسبت سے مسلمان قرار دیا جائے گا (شرح الزیادات ۶/ ۲۱۰)۔

اور علامہ کاسانیؒ نے اسی کو راجح کہا ہے۔

"فکان اعتبار المکان اولی" (البدائع الصنائع ۵/ ۲۹۱) (پائے جانے کی جگہ کا اعتبار زیادہ بہتر ہے)۔

اسی طرح غیر مسلم ملک میں غیر مسلم آبادی میں پایا جائے تو وہ غیر مسلم ہوگا اور مسلم آبادی میں ملے تو مسلمان تصور کیا جائے گا۔ امام محمدؒ کی ایک روایت یہی ہے اور صاحب ''مجمع الانھر'' نے اسے راجح کہا ہے۔ شوافع اور حنابلہ کی رائے میں تردد ہے (مجمع الانھر ۱/۷۰۳)۔

اور اگر مسلم و کافر دونوں ایسے بچے کو پائیں تو مسلمان کے سپرد ہوگا (الدر المختار مع رد المحتار ۶/۴۲۵)۔

انسانی سماج میں زندگی گزارنے والے عاقل، بالغ انسان کا فریضہ ہے کہ وہ لاوارث بچے کو مرنے کے لئے نہ چھوڑے بلکہ اسے اٹھا کر اپنی حفاظت میں رکھے، اس کی اچھی پرورش کرے اور اس کی تعلیم و تربیت کا انتظام کرے، مذکورہ بالا اسلامی ہدایات دراصل اسی انسانی سماجی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کی طرف ایک قانونی پیش رفت ہے جو شخصی اور انفرادی دائرے میں آتا ہے۔

حکومت کی ذمہ داری:

اسلامی قانون کے مطابق لاوارث بچہ ''بحق سرکار محفوظ'' ہوتا ہے۔ اس لئے اس کی کفالت کی بنیادی ذمہ داری سربراہ مملکت کی ہوتی ہے، اس کے کھانے پینے، پہنے اوڑھنے اور دیگر ضروری اخراجات بیت المال پر واجب ہوتے ہیں (البحر الرائق ۵/۲۴۱)۔

ولایت و سرپرستی بھی حاکم و قاضی سے متعلق ہوتی ہے، اسی واسطے پرورش کے مرحلے سے آگے کی ساری ذمہ داریاں سربراہ حکومت کے حوالے ہوتی ہیں۔ معاملات نکاح، خرید و فروخت کے اختیارات بھی حاکم کے سپرد ہوتے ہیں۔ اٹھانے والا اگر خود ہی شادی کرا دے، یا بچے کے لئے خرید و فروخت کرے تو یہ درست نہیں ہوگا۔ کیونکہ بچہ کو اٹھانے والے کے ذمہ اپنی حقیقی اولاد کے نان و نفقہ، حق پرورش تعلیم و تربیت کے مصارف، ماں باپ بیوی، نابالغ بھائی بہن کے حقوق اتنے زیادہ ہیں کہ انھیں سے عہدہ برآ ہونا مشکل ہے۔ بنابریں شریعت اس پر مزید بوجھ ڈال کر اس کی پریشانیوں میں اضافہ کرنا نہیں چاہتی۔ یہ ہے اسلام کا نظام عدل جس کی نظیر ملنی مشکل ہے۔

''ولیه السلطان حتی أن الملتقط إذا زوجه امرأة أوكانت جارية فزوجها من آخرلم يجز'' (فتاویٰ ہندیہ ۲-۲۸۵)۔

(اور اٹھائے ہوئے بچہ کا ولی حکومت کا سلطان ہوگا یہاں تک کہ اگر اٹھانے والے نے اس کی شادی کسی عورت سے کرادی، یا وہ لاوارث بچی تھی اور اس کی شادی کسی لڑکے سے کرادی تو یہ جائز نہیں ہوگا)۔

''اور اٹھانے والے کا عقد نکاح کرنا جائز نہیں اور عقد خرید و فروخت بھی جائز نہیں ہے'' (فتاویٰ تاتارخانیہ ۵/۵۷۲)۔

اسی طرح حاکم کو یہ بھی اختیار ہے کہ ایسے بچہ کے ساتھ اگر مال بھی ہو جو اس کے جسم سے بندھا ہوا ہو یا ایسی پوزیشن میں ہو جس سے سمجھا جائے کہ یہ مال بچہ کیلئے ہی ہے تو اس میں تصرف کا اختیار کسی کو منتقل کرسکتا ہے۔ خواہ بچہ اٹھانے والے کو یا اس کے علاوہ کسی دوسرے کو۔

''وللقاضي ولايت صرف مثله إليه كذا، ولغيرالواجد'' (الدرالمختار ۴-۴۳۰)۔

(قاضی کو خود اس کے مال میں تصرف کا اختیار ہے اور اپنے مثل وہ دوسرے کو بھی اختیار منتقل کرسکتا ہے، پانے والے کو یا اس کے علاوہ کسی اور کو)۔

اس سے واضح ہوا کہ بچہ کو پانے والا اگر پرورش اور تحفظ کے دوران اس پر جو کچھ خرچ کرے وہ بچے پر احسان مانا جائے گا قرض نہیں ہوگا جس کو بعد میں بچہ سے یا اس کے مال سے وصول کرے۔ البتہ قاضی نے ہی اس کے حق میں خرچ کرنے کا اس کو حکم دے دیا ہو تو وہ بچہ کے مال سے خرچ کردہ رقم وصول کرسکتا ہے (فتاویٰ ہندیہ ۲/۲۸۸، تاتارخانیہ ۳/۲۹۶، الدر المختار علی رد المحتار ۶/۴۲۹، البحر الرائق ۵/۲۴۲)۔

یہاں یہ بھی ملحوظ رہے کہ بحکم قاضی تصرف کا نفاذ صرف مسلم حکومت یا دار الاسلام میں ممکن ہے ورنہ جس ملک میں نظام قضا نہ ہو یا وہاں نفاذ فیصلہ کا دائرہ محدود ہو تو وہاں اٹھانے والا اسکے مال میں تصرف کرسکتا ہے، قاضی کے فیصلے کی ضرورت نہیں (فتح القدیر ۶/۱۱۶)۔

لاوارث بچہ اگر غلطی سے قتل کردیا جائے تو اس کا خون بہا (دیت) قاتل کے اہل خاندان پر واجب ہوگی اور یہ مال دیت مسلم حکومت کے بیت المال میں جمع کیا جائے گا اور اگر جان بوجھ کر قصد و ارادہ سے قتل کیا گیا اور امام المسلمین نے قاتل سے صلح کرلی (تاکہ معاملہ رفع دفع ہوجائے اور خون رائیگاں ہوجائے) تو یہ جائز نہیں ہوگا اور اگر امام و حاکم قاتل کو قصاصاً قتل کرنے کا ارادہ کرے تو امام ابوحنیفہ اور امام محمد کے نزدیک یہ درست ہے اور امام کو خون بہا (دیت) معاف کردینے

کا حق حاصل نہیں ہوگا۔

''ولو قتله عمداً فالخيار للإمام بين القتل والصلح على الدية وليس له العفو'' (البحر الرائق ۵۔۱۴۲)۔

اور اگر لاوارث بچہ انتقال کر جائے تو اس کا چھوڑا ہوا مال مسلمانوں کیلئے حکومت کے بیت المال میں جمع ہوگا (فتاوی ہندیہ ۲/۲۸۶)۔

اپنا بچہ دوسرے کے حوالہ کر کے اس کے عوض ہدیہ لینا:

بچہ کے کارجینن (باپ) حد درجہ افلاس اور تنگی معیشت کے باوجود اپنی اولاد کو دوسرے کے حوالے کر کے اس سے بے تعلق نہیں ہو سکتے، شریعت میں رشتہ ولادت ایک فطری رشتہ ہے جو ہر حال میں ایک دوسرے کے ساتھ قائم رہتا ہے اور اس رشتے کو نبھانے کیلئے شریعت نے پورا نظام نفقہ مقرر کیا ہے جس کی ادائیگی مدت حضانت (بچہ کے سن تمیز یا سات سال پورا ہونے تک باپ پر فقر و محتاجی کے باوجود واجب ہے، اور اس کا شرعی حکم یہ ہے (البحر الرائق ۴؍۲۱۴ زکریا دیوبند)۔

''او پر مذکورہ مسئلہ کی بنیاد پر حکم شرعی یہ ہے کہ اگر مفلس، تنگ دست باپ کی چھوٹی اولادیں ہوں اور باپ ان کی پرورش کی استطاعت نہ رکھتا ہو اور خرچ پورا کرنے پر قادر نہ ہو تو ان چھوٹے بچوں کا نفقہ باپ کی غیر موجودگی (مثلاً انتقال ہو جانے) میں جن لوگوں پر واجب ہوتا ہے انہیں پر (استطاعت نہ رکھنے والے باپ کی موجودگی میں بھی) واجب ہوگا، جیسے ماں، بھائی اور چچا (پرورش کا خرچ اٹھائیں گے) اور ان کو یہ حق ہوگا کہ قرض لے کر بچوں کی کفالت کریں اور جب باپ تنگدستی سے نکل آئے اور مالدار ہو جائے تو وہ اپنا قرض ان سے وصول کر لیں، البتہ بڑی عمر کی اولاد کیلئے یہ حکم نہیں ہوگا۔ کیونکہ ان کا نفقہ باپ پر افلاس و غربت کی حالت میں واجب نہیں۔ ان کے لئے باپ تو میت کے درجہ میں ہے، لہٰذا قرض لے کر خرچ کی صورت میں وہ باپ سے مالدار ہونے کے بعد وصول نہیں کر سکتے، اس سے صاف ظاہر ہوا کہ اس نظام شرعی کی موجودگی میں باپ کسی غیر ذی رحم محرم شخص کے حوالے کر کے اپنے بچہ سے بے تعلق نہیں ہو سکتا، اسی طرح اپنی فوری ضرورت پوری کرنے یا دوسرے بچے پالنے کی غرض سے اپنے بچے کو واسطہ بنا کر بچہ حاصل کرنے والے سے کوئی ہدیہ بھی قبول نہیں کر سکتا، کیونکہ اس صورت میں وہ ہدیہ کے نام پر رشوت دے رہا ہے جس کا لینا حرام ہے، اس مسئلہ کی نظیر یہ ہے:

''رجل خطب امرأة وهي تسكن في بيت أختها وزوج أختها لا يرضى بنكاح هذا الرجل إلا أن يدفع إليه دراهم فدفع الخاطب إليه دراهم وتزوجها كان للزوج أن يسترد ما دفع إليه لأنه رشوة''۔

(ایک شخص نے ایک عورت کو پیغام نکاح دیا اور وہ عورت اپنی بہن کے گھر میں رہتی ہے اور اس کی بہن کا شوہر (مخطوبہ کا بہنوئی) اس شخص سے نکاح پر جبھی راضی ہو سکتا ہے جب اسے کچھ درہم دیئے جائیں۔ چنانچہ پیغام نکاح دینے والا شخص اس کے بہنوئی کو کچھ درہم دے کر اس عورت سے نکاح کر لیتا ہے، تو اب شوہر کے لئے ضروری ہے کہ جو درہم اس نے بیوی کے بہنوئی کو دیئے ہیں وہ واپس لے لے اس لئے کہ یہ رشوت ہے)۔

دوسری صورت مسئلہ یہ بھی ہے کہ بچہ حاصل کرنے والے سے ہدیہ لینا بچہ حاصل کرنے والے کی طرف سے در پردہ بچہ حاصل کرنے کے لئے شرط کے درجہ میں ہے جو قانون فقہ کی نگاہ میں حرام ہے (فتاویٰ قاضی خاں علی هامش الفتاویٰ العالمگیریہ ۱/۳۹۱، ۳۹۲)۔

''ایک عورت کسی شوہر کی عدت میں ہو اور کوئی دوسرا شخص اس سے کہے تو جب تک عدت میں رہے گی میں تیرا خرچ برداشت کروں گا۔ عدت گزرنے کے بعد مجھ سے نکاح کر لینا، اور وہ راضی ہو گئی تو اس صورت مسئلہ کے بارے میں ہمارے مولانا رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مناسب یہ ہے کہ وہ شخص اپنی خرچ کردہ رقم اس عورت سے واپس لے لے کیونکہ جب وہ سمجھ گیا تھا کہ اگر وہ شخص اس عورت سے نکاح نہیں کرے گا تو وہ اس پر خرچ نہیں کرے گا۔ تو یہ خرچ کرنا شرط ہی کے درجہ میں ہو گیا۔ جیسے کوئی قرض لینے والا شخص قرض دینے والے کو کوئی چیز ہدیہ میں دے جبکہ قرض لینے سے پہلے اس نے کوئی ہدیہ نہیں دیا تو یہ حرام ہوگا۔ اسی طرح کوئی قاضی بننے کے بعد کسی خاص آدمی کی دعوت قبول نہیں کر سکتا نہ اس کا ہدیہ قبول کر سکتا ہے کیونکہ قاضی بننے سے پہلے وہ کوئی ہدیہ نہیں دیتا تھا تو اب یہ ہدیہ شرط کے درجہ میں ہو جائے گا، اگرچہ لفظاً یہ ہدیہ مشروط نہیں تھا'' (فتاویٰ قاضی خاں علی هامش الفتاوی العالمگیریہ ۱/۳۹۱۔۳۹۲)۔

اس مسئلہ کا تیسرا پہلو یہ بھی ہے کہ جو باپ اپنی مفلسی کی وجہ سے بچہ حاصل کرنے والے سے ہدیہ لے کر اپنی ضرورت پوری کر رہا ہے اور بچہ سے بے تعلق ہو رہا ہے، وہ بظاہر تو ہدیہ لے رہا ہے لیکن حقیقت میں اپنے آزاد بچے کو بچہ حاصل کرنے والے کے ہاتھ فروخت کر کے اس کا دام (ثمن) کھا رہا ہے جو اتنا سخت گناہ ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''قال اللہ ثلاثة أنا خصمهم يوم القيامة، رجل أعطى بي ثم غدر ورجل باع حراً فأكل ثمنه، ورجل استاجر أجيرا فستوفى منه ولم يعطه أجره'' (صحیح بخاری، حدیث: ۲۲۲۷ باب اثم من باع حراً)۔

(اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ قیامت کے دن تین شخصوں کو اپنا فریق مخالف بناؤں گا۔ایک وہ شخص جس نے مجھ سے عہد کر کے غداری کی۔دوسرا وہ شخص جس نے کسی آزاد آدمی کو فروخت کر کے اس کا دام (ثمن) کھایا۔تیسرا وہ جس نے کسی آدمی سے مزدوری کرائی کام تو پورا لیا اور اس کی اجرت ادا نہیں کی)۔

انسانی اسمگلنگ اور اسلامی ہدایات:

ان واقعات کی روک تھام کے لئے قرآن وحدیث میں جو قانون بیان کیا گیا ہے وہ اتنا موثر ہے کہ اگر اس پر عمل کر لیا جائے تو دنیا سے ایسے واقعات کا وجود ہی ناپید ہو جائے گا:

''إنما جزاء الذين يحاربون الله ورسوله ويسعون في الأرض فساداً أن يقتلوا أو يصلبوا أو تقطع أيديهم وأرجلهم من خلاف أو ينفوا من الأرض ذلك لهم خزي في الدنيا ولهم في الآخرة عذاب عظيم'' (سورۃ المائدہ: ۳۳) (جو لوگ اللہ اور اس کے رسولؐ سے لڑتے ہیں اور ملک میں فساد پھیلانے میں لگے رہتے ہیں ان کی سزا یہی ہے کہ وہ قتل کئے جائیں، یا سولی دیئے جائیں، یا ان کے ہاتھ اور پیر مخالف جانب سے کاٹے جائیں یا وہ ملک سے نکال دیئے جائیں، یہ تو ان کی رسوائی دنیا میں ہوئی اور آخرت میں ان کے لئے بڑا عذاب ہے)۔

اہل تحقیق کے نزدیک دونوں فقروں کے درمیان کا "و" واؤ تفسیری ہے اور اس لئے دوسرا فقرہ "یسعون فی الأرض فساداً" پہلے فقرہ "الذین یحاربون الله ورسوله" کی تشریح وتفسیر اور اس کی مراد متعین کر رہا ہے۔ھذا ھو معنی محاربۃ المسلمین (جمل) مراد یہاں رہزنوں اور ڈاکوؤں کے گروہ سے ہے، عام اس سے کہ وہ کافر ہوں یا مسلم (ابن کثیر وتفسیر کبیر)۔

محاربہ اپنے لفظی معنی میں اللہ سے تو کسی کا ممکن ہی نہیں، رسول اللہ ﷺ سے ممکن تھا، لیکن کسی بھی مسلم سے واقع نہیں ہوا اور بعد وفات شریف تو اس کا امکان ہی نہ رہا، یہاں محاربہ سے مراد مخالفت یا اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے قانون کو توڑنا اور اس سے مقابلہ کرنا ہے، اہل لغت نے یہی معنی لئے، "أي يعصونه" (لسان العرب وتاج العروس)۔

اور اہل تفسیر تو سب اسی طرف گئے ہیں۔

مسلمان تو خیر مسلمان ہی ہیں، ان کے ساتھ ذمیوں کے بھی مال اور جان دونوں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے بخشے ہوئے حفظ وامن میں ہوتے ہیں، اب جو کوئی ان پر بلا عذر حملہ کرتا ہے وہ پوری طرح فساد فی الارض کا مرتکب ہوتا ہے اور یہی اللہ اور رسول سے محاربہ بھی ہے۔

یہاں قابل غور بات یہ ہے کہ چاروں سزائیں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے قانون کو توڑنے اور فساد فی الارض اور امن عامہ کو برباد کرنے پر رکھی گئی ہیں اور بلاشبہ قتل، سلب مال یا دونوں ایک ساتھ یا صرف ڈرانا دھمکانا اس میں شامل ہیں۔اور جرم کی نوعیت اور شدت وخفت کے اعتبار سے ان کا نفاذ کیا گیا جیسا کہ اس کی پوری تفصیل بروایت ابن عباسؓ رسول اکرم ﷺ سے ابو بردہ اسلمی کے معاہدہ شکنی کے واقعہ میں جبرئیل امین لے کر نازل ہوئے (رواہ احمد بن حنبل فی تفسیرہ، تفسیر مظہری ۳/۳۵۵)۔

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ غیر معمولی طور پر جو جرم اپنی سنگینی اور ہولناکی میں اس سے بڑھ کر ہو اگر چہ اس کا تعلق مالی معاملات سے نہ ہو یا فقہاء کے نزدیک چوری کی اصطلاحی تعریف اس پر صادق نہ آتی ہو تو اس کو آیت کے ذیل میں شامل نہیں کیا جائے گا، چنانچہ خود رسول اللہ ﷺ نے ''سرقۃ الصبیان'' یا بچہ چوری کو اس آیت میں بیان کردہ سزا کی ایک شق میں شامل فرمایا۔

''عن عائشة رضي الله عنها أنه ﷺ أتي برجل يسرق الصبيان ثم يخرج بهم فيبيعهم في أرض أخرى فأمر به رسول الله ﷺ فقطعت يده'' (سنن دارقطنی ۳-۱۴۱ حدیث: ۳۴۲۶، السنن الکبریٰ ۸-۲۶۶، حدیث: ۱۷۲۳۲)۔

یہاں کسی طاقت ور گروہ کی طرف سے جرم سرقہ کا ثبوت نہیں ہوا تھا بلکہ صرف ایک شخص کی چوری کا جرم تھا اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف ہاتھ کٹوانے پر اکتفاء فرمایا، اور مخالف جانب سے پیر کو نہیں کٹوایا۔

اس سے واضح ہوا کہ مال غیر متقوم جیسے صبیان (بچہ) کے چرانے پر بھی حد جاری کی جائے گی، رہا فقہاء کا مذہب:

احناف: "فلا قطع علی سارق الصبی الحر" (فتاویٰ ہندیہ ۱۷۸/۲) (آزاد بچے کو چرانے پر ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا)۔

امام مالک: "أما إذا سرق الصبی الحر غیر الممیز وھو الذی لا یمشی ولا یتکلم فإنه یجب علیه القطع لأنه کالمال المحترم"۔

"وروی عن أبی یوسف أنه یجب القطع فی سرقة الصبی الحر غیر الممیز" (کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ ۱۷۵/۵) (جب بے شعور آزاد بچہ کو جو ابھی نہ چل سکتا ہو نہ بات کرتا ہو، چرائے تو ہاتھ کاٹنا واجب ہے)۔

امام شافعی: "من سرق حراً فإن کان صغیراً فلا یجب علیه القطع لأن الحر لیس بمال" (کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ ۱۷۴/۵) (جو کسی آزاد آدمی کو چرائے، اگر وہ چھوٹا بچہ ہے تو چور کا ہاتھ کاٹنا واجب نہیں، کیونکہ آزاد انسان مال نہیں ہے)۔

تمام حضرات فقہاء وائمہ کرام کے نزدیک چونکہ چوری کی سزا کا تعلق "مال چرانے" سے ہے اور آزاد بچہ مال نہیں ہوتا، اس لئے "قطع ید" کا حکم جاری نہیں ہوگا، اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اگرچہ بہت ہی کمسن "جو نہ چلے پھرے نہ بات کرے" کو مال محترم کا درجہ دیا ہے، لیکن جو اس عمر سے آگے ہو وہ بالاتفاق مال نہیں ہوگا اور نہ حکم سرقہ لاگو ہوگا، لیکن ان حضرات کے زمانہ میں بچہ چوری کی وہ نوعیت نہیں تھی جو موجودہ دور تمدن میں پائی جاتی ہے، اس لئے مذکورہ حکم کا تعلق ان کے زمانے کے حالات سے ہے، آج کے حالات میں جبکہ بچہ چور گروہ پوری طاقت کے ساتھ بندوق کی نوک پر چوری کرتا ہے اور بچوں کا جنسی استحصال کر کے قتل بھی کر دیتا ہے، اس کے علاوہ بچہ کو قتل کر کے یا زندہ بچہ کے دل، گردہ، دماغ اور دیگر اعضاء کو جسم سے کاٹ کر طبی تجربے یا پیوندکاری کیلئے بڑے پیمانہ پر فروخت کیا جاتا ہے، یا گداگری کیلئے ہاتھ پیر کاٹ کر زندہ لاش بنا دیا جاتا ہے، اور ان سب باتوں کے علاوہ انہیں ماں باپ سے اتنی دور کر دیا جاتا ہے کہ ان کے حق میں یہ بچے مقتول ہی بن جاتے ہیں، ایسی دردناک وہولناک صورت کو فقہاء کرام دیکھتے تو کیا وہی حکم دیتے جس کا اوپر ذکر ہوا، یقیناً کہا جا سکتا ہے کہ وہ اللہ اور رسولؐ کے قانون کو توڑنے والے اور فساد فی الارض پھیلانے والے بھیانک مجرموں کو انہیں چار سزاؤں میں سے کسی ایک کا مستحق ضرور قرار دیتے، کیونکہ معاملہ "نفس محترم" کی حفاظت کا ہے جو "مال محترم" کی حفاظت سے کہیں زیادہ اہم ہے۔ آج کے حالات کے تقاضے میں تیسری سزا قطع ید ورجل من خلاف پہنچے تک داہنا ہاتھ اور ٹخنوں تک بایاں پاؤں کاٹنے کی سزا بلاتردد نافذ کی جائے۔ اس میں قرآن کی پوری اور حدیث کی نصف سزا کی تعمیل ہو جائے گی اور لوگوں کے لئے عبرت کا سامان بھی ہوگا۔ اور انسانی معاشرے سے اس جرم کی بیخ کنی ہو کر رہے گی۔ کم سے کم درجہ میں "أو ینفوا من الأرض" یعنی پکی سچی تو بہ تک طویل قید بامشقت پر عمل کر لیا جائے تب بھی بہت حد تک ان جرائم کے انسداد کی راہ ہموار ہو سکتی ہے۔

ذہنی یا جسمانی طور پر معذور بچوں کی پرورش اور نگہداشت کا مسئلہ:

جسمانی طور پر معذور بچوں کے لئے اسلامی ہدایات یہ ہیں کہ باپ اور ماں دونوں اس کی دیکھ ریکھ علاج اور نگہداشت کے پورے طور پر ذمہ دار ہیں، باپ ملازمت اور سروس کی مصروفیات میں خدمت کا پورا وقت فارغ نہیں کر سکتا تو اس کی ماں گھر میں اس کی نگہداشت کرے اور ملازمت سے فارغ اوقات میں باپ اس کی خدمت کی ذمہ داری سنبھالے اور اگر دونوں کو اس کی خدمت کے لئے کم وقت ملتا ہو تو کسی باتنخواہ خدمت گار کے ذریعہ گھر پر اس کی دیکھ بھال کرائے۔ اور باپ کی شفقت اور ماں کی ممتا کا حق معذور بچے سے نہ چھینے، اور جہاں تک اس کی زندگی کی بقا و تحفظ کا تعلق ہے، اس حد تک اس کے علاج معالجے سے پہلو تہی نہ کرے، اس کڑی آزمائش بھری ذمہ داری کو نبھانے پر وہ عند اللہ ماجور ہوں گے ورنہ ماخوذ ہوں گے، حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"عن أبی الدرداء رضی اللہ عنه عن النبی ﷺ قال ابغونی فی ضعفاءکم فإنما ترزقون وتنصرون بضعفاءکم" (مشکوٰۃ المصابیح ص ۴۴۷)۔

(ابودرداءؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میری خوشنودی اپنے کمزوروں (معذوروں) میں تلاش کرو، کیونکہ تمہیں معذوروں کے طفیل روزی اور نصرت خداوندی ملتی ہے)۔

دوسری حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہے: "أنس بن مالك یحدث عن رسول اللہ ﷺ قال أکرموا أولادکم وأحسنوا أدبھم" (سنن ابن ماجہ: ۲۶۱ باب برالوالد والاحسان الی البنات)۔

(انس بن مالکؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے حدیث بیان فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم فرمایا: اپنی اولاد کی عزت کرو اور ان کی اچھی طرح دیکھ بھال کرو)۔

جو باپ اور ماں اپنے معذور بچے کو باپ کی فطری شفقت اور ماں کی ممتا سے دوری کی اذیت میں مبتلا کر کے دماغی ہسپتال میں داخل کر دیتے ہیں اور اپنی ذمہ داریوں سے فراغ اور فرار حاصل کر کے اسے احساس بے تعلقی کے روحانی کرب واضطراب اور زندگی کا عذاب جھیلنے اور گھٹ گھٹ کر مرنے کے لئے تنہا چھوڑ دیتے ہیں وہ حکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روگردانی کے گنہگار ہیں، کیونکہ اس صورت میں باپ اور ماں کے ذریعہ بچے کی عزت کے بجائے اس کی قابل رحم ذلت کا سامان فراہم ہوتا ہے نہ کہ اکرام کا، اسپتال اس کیلئے کسی بھی درجہ میں باپ کی آغوش شفقت اور ماں کی محبت بھری گود کا بدل نہیں ہوسکتا، اسپتال کا عملہ لاکھ اپنی دیکھ ریکھ اور نگہداشت کی ذمہ داریوں کو پوری کرلے لیکن بچے کے باپ ماں سے دوری کے احساس اذیت کو دور کر کے اس کی عزت اور شفائیت کو بحال نہیں کرسکتا، البتہ اس کی کربناکی اور بیماری کو بڑھا سکتا ہے۔

اس سلسلہ میں فقہاء کرام نے جو اسلامی ہدایت ذکر فرمائی ہے وہ بھی بہت اہم ہے۔

”بالغ مرد اگر لنجا، اپاہج، دونوں ہاتھوں سے ایسا لاچار ہو کہ ان سے کوئی کام نہ لے سکتا ہو، یا بے عقل، فالج زدہ ہو تو اگر اس کے پاس مال ہو تو اس کے مال کو اس پر خرچ کیا جائے گا اور اگر نہ ہو اور اس کا باپ مالدار یا ماں مالدار ہو تو خرچہ اس کے باپ پر واجب ہے، اور اگر وہ قاضی سے یہ طلب کرے کہ وہ اس کے واسطے باپ پر خرچ مقرر کر دے تو قاضی اس کا مطالبہ مان کر مقرر کردہ خرچہ اس کو دلوائے، ”محیط“ میں ایسا ہی لکھا ہے“ (الفتاویٰ الھندیہ ۱ر ۵۶۳، زکریا دیوبند)۔

اور ”فتاویٰ تاتارخانیہ“ میں ایسے بالغ معذور کو چھوٹے بچہ کے درجہ میں رکھا گیا ہے جس کا خرچ بہرحال باپ پر واجب ہوتا ہے (الفتاویٰ التاتارخانیہ علی حامش الفتاویٰ الھندیہ ۱ر ۴۴۸، زکریا دیوبند)۔

یہاں یہ بھی واضح رہے کہ شریعت نے کسی کی زندگی کی بقا کیلئے جو خرچ ضروری قرار دیا ہے وہ نفقہ ہے (اسلامی قانون متعلقہ مسلم پرسنل لاء ۱ر ۱۲۸، الدرالمختار ۲ر ۶۴۳)۔

اس سے معلوم ہوا کہ کھانے پینے کا سامان اور کپڑا اور مکان کے علاوہ اولاد کی زندگی کی بقاء وتحفظ کے لئے جو ضروری علاج معالجہ کا خرچ ہے وہ سب نفقہ میں شامل ہے اور خاص طور پر معذور اولاد کی تمام ضروریات کی کفالت باپ اور ماں کا دینی فریضہ ہے جس سے وہ بچے کی زندگی کے آخری لمحات تک سبکدوش نہیں ہوسکتے اور اگر وہ اس فرض سے سبکدوشی کے لئے کسی دماغی ہسپتال یا کسی اور نگہداشت کے ادارے کا سہارا لیتے ہیں تو اس کو حکم شریعت سے فرار سمجھا جائے گا۔

☆☆☆

اسلام میں بچوں کے حقوق، تعلیم و تربیت کے تناظر میں

ڈاکٹر مفتی محمد شاہجہاں ندوی [1]

تمہید:

اسلام دین فطرت ہے، چنانچہ اس نے انسانی جذبات اور خواہشات کا اپنی تعلیمات اور قوانین میں بھرپور خیال رکھا ہے، اور انسان کی مختلف خواہشات میں سے شہوانی خواہش کی نفی نہیں کی ہے، اور رہبانیت کی تعلیم نہیں دی ہے، بلکہ اسے ضابطہ کا پابند بنا کر جائز طریقہ سے جنسی خواہش کی تسکین کی رغبت دلائی ہے (سورہ مومنون: ۵، ۶، صحیح بخاری حدیث نمبر: ۱۴۰۰)۔

اس طرح اسلام نے خاندان کی تشکیل کی طرف انسانی سماج کی توجہ منعطف کی، اور انسانی نسل کی بقا اور استمرار کا احساس دلایا۔

اسلام کا یہ امتیاز ہے کہ اس نے بچہ کے وجود سے پہلے ہی مختلف امراض، آفات اور عیوب سے تحفظ کی طرف توجہ دلائی ہے۔

پھر بچہ دانی میں نطفہ کے استقرار کے بعد سے ہی اس کے تحفظ کا حکم دیا ہے اور اس کے اسقاط کی کوشش کو قتل کے حکم میں گردانا ہے، الغرض اسلام نے بچہ کے تحفظ کا جو نظم کیا ہے، اس کی نظیر دنیا کے کسی قانون اور مذہب میں نہیں ملتی ہے۔

اس مختصر تمہید کے بعد سوالات کے جوابات درج ذیل ہیں:

جواب نمبر: ۱:

بچوں کے حق پرورش کے سلسلہ میں اسلام کی بنیادی ہدایات مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ بچہ کی ہلاکت سے سلامتی اور تکلیف دہ شئی سے حفاظت کی خاطر، اس کی پرورش واجب ہے، اور بچہ کو اس کے حوالہ کیا جائے جو اسے زیادہ شفقت، محبت اور انسیت فراہم کر سکے، اور تربیت کا حق بحسن و خوبی نبھا سکے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

”والوالدات يرضعن أولادهن حولين كاملين لمن أراد أن يتم الرضاعة، وعلى المولود له رزقهن وكسوتهن بالمعروف لا تكلف نفس إلا وسعها، لا تضار والدة بولدها، ولا مولود له بولده، وعلى الوارث مثل ذلك، فإن أرادا فصالاً عن تراض منهما وتشاور فلا جناح عليهما، وإن أردتم أن تسترضعوا أولادكم فلا جناح عليكم إذا سلمتم ما آتيتم بالمعروف واتقوا الله واعلموا أن الله بما تعملون بصير“ (البقرہ: ۲۳۳)۔

(اور مائیں اپنے بچوں کو ان لوگوں کے لئے پورے دو سال دودھ پلائیں جو پوری مدت دودھ پلوانا چاہتے ہوں، اور بچے والے کے ذمہ بچوں کی ماؤں کا دستور کے مطابق کھانا اور کپڑا ہے، کسی پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہ ڈالا جائے، نہ کسی ماں کو اس کے بچے کے سبب سے نقصان پہنچایا جائے، اور نہ کسی باپ کو اس کے بچے کے سبب سے، اور اسی طرح کی ذمہ داری وارث پر بھی ہے، پھر اگر دونوں باہمی رضامندگی اور صلاح سے دودھ چھڑا دینا چاہیں، تو دونوں پر کوئی گناہ نہیں، اور اگر تم اپنے بچوں کو کسی اور سے دودھ پلوانا چاہو، تو اس میں کوئی حرج نہیں، جبکہ تم ان کو دستور کے مطابق وہ ادا کرو جو تم نے دینے کا وعدہ کیا ہے، اور اللہ سے ڈرتے رہو، اور جان رکھو کہ جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ اس سے باخبر ہے)۔

اور ایک جگہ ارشاد ہے:

---

[1] عمید کلیۃ القرآن، جامعہ اسلامیہ شانتاپورم، کیرالہ۔

"فإن أرضعن لكم فآتوهن أجورهن وأتمروا بينكم بمعروف وإن تعاسرتم فسترضع له أخرى" (الطلاق:٦) (سو اگر وہ تمہارے بچے کو دودھ پلائیں، تو ان کو ان کا معاوضہ دو، اور دستور کے مطابق ایک قرارداد کرلو، اگر تم کوئی زحمت محسوس کرو، تو اس کے لئے کوئی اور دودھ پلائے گی)۔

چونکہ خواتین بچوں کے حق میں زیادہ شفیق، بچوں کی تربیت اور پرورش سے زیادہ واقف اور ان کی ضروریات کو زیادہ سمجھنے والیاں ہیں، لہذا بچوں کے حق پرورش کے سلسلہ میں ان کو تقدم حاصل ہے اور ان میں بھی ماں سب پر مقدم ہے، چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص ؓ سے روایت ہے:

"أن امرأة أتت النبي ﷺ فقالت: يا رسول الله! إن ابني هذا كان بطني له وعاء، وحجري له حواء، وثديي له سقاء، وزعم أبوه أنه ينزعه مني؟ قال: أنت أحق به ما لم تنكحي" (سنن ابی داؤد حدیث نمبر: ۲۲۷۶، مسند احمد: ۶۷۰۷، سنن دارقطنی حدیث نمبر: ۳۸۰۸، اور اس کی سند حسن درجہ کی ہے)۔

(ایک خاتون نبی کریم ﷺ کے پاس آئی، اور اس نے کہا کہ اے اللہ کے رسول، میرے اس بیٹے کے لئے میرا پیٹ ظرف، اور میری گود اس کے لئے جائے پناہ اور میری پستان اس کے لئے مشکیزہ تھی، اور اس کے باپ کا خیال ہے کہ وہ اسے مجھ سے لے لیگا، اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: تو اس کی زیادہ حقدار ہے جب تک کہ تو شادی نہ کرے)۔

اور امام جصاص رازی رقمطراز ہیں:

"اور آیت کے اندر اس بات کی دلیل ہے کہ ماں بچہ کو اپنے پاس رکھنے کی زیادہ حقدار ہے، جب تک کہ وہ چھوٹا ہو، اگرچہ وہ دودھ پینے سے بے نیاز ہو چکا ہو جبکہ اسے پرورش کی ضرورت ہو، اس لئے کہ دودھ پینے کی عمر کے بعد وہ ماں کا اسی طرح محتاج ہے جس طرح دودھ پینے سے پہلے تھا، پھر جب ماں دودھ پینے کی حالت میں بچہ کی زیادہ حقدار ہے، خواہ دودھ پلانے والی دوسری خاتون ہو، تو اس سے معلوم ہوا کہ بچہ ماں کے پاس ہو، یہ اس کا حق ہے، اور اس میں بچہ کا بھی حق ہے، اور وہ اس طرح کہ ماں، بچہ کے حق میں زیادہ مہربان اور شفیق ہوتی ہے، اور ہم احناف کے نزدیک یہ حق بچے کے اندر اس وقت تک ہے کہ وہ تنہا کھانے پینے اور وضو کرنے لگے اور بچی کے اندر یہ حق اس کے بالغ ہونے تک ہے، اس لئے کہ بچہ جب اس حد کو پہنچ جائے جس میں اسے تادیب کی ضرورت ہوتی ہے اور ادب سکھائے جانے کے مفہوم کو سمجھنے لگے، تو بچہ کا باپ کے پاس نہ ہو کر ماں کے پاس ہونا، اس کے حق میں ضرر کا باعث ہے، اور اس کے ساتھ باپ بچہ کو ادب سکھانے پر زیادہ قادر ہے، اور تادیب کی حالت وہ حالت ہے جس کے بارے میں نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: "اپنی اولاد کو سات سال کی عمر میں نماز کا حکم دو، اور دس سال کی عمر میں نماز کے ترک کی بنا پر مارو، اور ان کی خوابگاہوں کو الگ کردو"، سو جس بچہ کی عمر سات سال ہو تو اسے تعلیم اور تادیب کے طریقہ پر نماز کا حکم ہے، اس لئے کہ وہ نماز کو سمجھتا، تو ایسے ہی دوسرے آداب حاصل کرنے کا بھی اسے حکم ہے، جس کے سیکھنے کا وہ محتاج ہے، اور ماں کے پاس اس حالت میں ہونا اس کے حق میں ضرر کا باعث ہے، اور جو چیز بچہ کے حق میں باعث ضرر ہو اس سلسلہ میں اس پر کسی کو ولایت حاصل نہیں ہے۔ اور جہاں تک بچی کا تعلق ہے تو اس کے بلوغ تک ماں کے پاس ہونے میں کوئی ضرر نہیں ہے، بلکہ اس کے پاس اس کا ہونا اس کے حق میں زیادہ مفید ہے، اس لئے کہ اسے خواتین کے امور و آداب کی ضرورت ہے۔ اور ماں کی یہ ولایت بلوغ کی وجہ سے ہی ختم ہوگی، اس لئے کہ پیدائش کی بنا پر بچی پر وہ ولایت کی حقدار ہے، اور اس کے پاس رہنے میں اس کا کوئی نقصان نہیں ہے، لہذا ماں بلوغ کے وقت تک زیادہ حقدار ہے، پھر جب بچی بالغ ہو جائے تو اسے حفاظت اور پاکدامن رہنے کی ضرورت ہے، اور باپ کو اسے پاکدامن رکھنے اور شادی بیاہ کرانے کی زیادہ قدرت ہے، سو اسی وجہ سے اس حالت میں باپ اس کا زیادہ حقدار ہے" (احکام القرآن للجصاص ۱/۴۹۰، ط:۱، بیروت، العلمیہ ۱۴۱۵ھ-۱۹۹۴ء)۔

چونکہ حق پرورش کا تعلق شفقت سے ہے، لہذا محرم خواتین رشتہ داروں کو ترجیح حاصل ہے اور ان میں بھی زیادہ قریبی خاتون مقدم ہے چنانچہ سب سے پہلا حق ماں کا ہے پھر نانی کا ہے پھر دادی کا ہے پھر حقیقی بہن کا ہے پھر اخیافی بہن کا ہے پھر علاتی بہن کا پھر بہنوں کی لڑکیوں کا حق اسی ترتیب سے ہے، پھر بھائی کی لڑکیوں کا حق اسی ترتیب کے مطابق ہے پھر اسی ترتیب کے مطابق خالاؤں کا حق ہے، جبکہ امام محمد اور زفر کے نزدیک خالہ علاتی بہن سے مقدم ہے، اور یہی امام ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف سے ایک روایت ہے، پھر حقیقی پھوپھی مقدم ہے پھر اخیافی پھوپھی مقدم ہے پھر علاتی پھوپھی کا حق ہے۔

پھر محرم مردوں میں سے عصبہ کو حق پرورش ملے گا، اور وراثت کی ترتیب کے مطابق زیادہ قریبی عصبہ مقدم ہوگا۔

البتہ چچازاد بھائیوں کو بچی کی پرورش کا حق فتنہ کے اندیشہ کی بنا پر نہیں ملے گا، کیونکہ اس سے ان کا نکاح حلال ہے (تحفۃ الفقہاء ۲/۲۳۰، احکام القرآن

۱/۴۳۱)۔

۲۔ ماں اور دیگر خواتین کو پرورش پر مجبور نہیں کیا جائے گا، البتہ اگر وہ خاتون پرورش کے لئے متعین ہو اس طرح کہ اس بچہ کا کوئی ذو رحم محرم رشتہ دار نہ ہو، تو اس خاتون پر بچہ کی پرورش واجب ہوگی، تاکہ بچہ ضائع نہ ہو، چنانچہ علامہ ابن نجیم رقمطراز ہیں:

''إنما يكون لها ذلك، إذا كان للولد ذو رحم محرم .... أما إذا لم يكن أجبرت على الحضانة، كي لا يضيع الولد'' (البحر الرائق ۴-۱۸۰)۔

۳۔ اگر پرورش کا حق رکھنے والی خاتون اجنبی شخص سے یا بچہ کے غیر محرم رشتہ دار سے نکاح کرلے تو اس کا حق پرورش ساقط ہوجائے گا، اس لئے کہ وہ شوہر کی خدمت میں لگ کر بچہ کا حق ادا نہیں کرپائے گی، اور اس کا اجنبی شوہر بچہ کے جذبات کو مجروح کرسکتا ہے، اور اس پر تمام فقہاء کا اتفاق ہے، کیونکہ حدیث شریف میں ہے:

"أنت أحق به ما لم تنكحي" (سنن ابی داؤد، حدیث نمبر: ۲۲۷۶، مسند احمد حدیث نمبر: ۶۷۰۷، اور یہ حسن درجہ کی حدیث ہے) (تو اس بچہ کی زیادہ حقدار ہے جب تک کہ تو شادی نہ کرے)۔

اور علامہ ابن مودود موصلی حنفی رقمطراز ہیں: "ومن لها الحضانة إذا تزوجت بأجنبي سقط حقها" (الاختیار لتعلیل المختار ۴/۱۵) (جس خاتون کو پرورش کا حق حاصل ہو، وہ اگر اجنبی شخص سے شادی کرلے تو اس کا حق ساقط ہوجائے گا)۔

۴۔ اگر ایسی صورت ہو کہ مرد کو حق پرورش حاصل ہو تو شرط یہ ہے کہ اس کے پاس ایسی عورت ہو، جو پرورش کرسکے، جیسے بیوی یا ماں ہو یا خالہ ہو یا پھوپھی ہو یا خادمہ ہو، کیونکہ بچوں کی کیفیات اور حالات پر خواتین ہی صبر کرسکتی ہیں۔

خیال رہے کہ یہ شرط صرف مالکیہ کے نزدیک ہے، چنانچہ دردیر مالکی لکھتے ہیں:

''وشرط الحضانة للذكر من أب أو غيره أن يكون عنده من يحضن من الإناث، أي من يصلح لها من زوجة أو سرية أو أمة لخدمة أو مستأجرة لذلك أو متبرعة، لأن الذكر لا صبر له على أحوال الأطفال كالنساء، فإن لم يكن عنده ذلك، فلا حق له في الحضانة'' (الشرح الكبير ۲-۵۲۹)۔

(اور مرد کی پرورش کی شرط، خواہ باپ ہو یا کوئی اور شخص، یہ ہے کہ اس کے پاس پرورش کی صلاحیت رکھنے والی خواتین میں سے کوئی ہو، یعنی بیوی ہو یا مملوکہ لونڈی یا خدمت کے لئے باندی ہو، یا اس مقصد کے لئے اجرت پر لی گئی خاتون ہو یا رضاکارانہ خدمت انجام دینے والی خاتون ہو، اس لئے کہ مرد عورتوں کی طرح بچوں کے حالات پر صبر نہیں کرسکتا ہے، سو اگر ایسا کوئی انتظام اس کے پاس نہ ہو تو اسے پرورش کا حق حاصل نہ ہوگا)۔

اور یہ مناسب شرط معلوم ہوتی ہے۔

۵۔ حق پرورش رکھنے والے مرد یا خاتون کے جسم کے اندر نفرت انگیز عیوب جیسے کوڑھ اور برص (سفید داغ) وغیرہ ہو، یا وہ مجنون ہوجائے تو حق پرورش ساقط ہوجائے گا، چنانچہ ابوالقاسم محمد بن احمد ابن جزی مالکی لکھتے ہیں:

"ضرر في بدن الحاضن كالجنون والجذام والبرص" (القوانين الفقهيہ / ۱۴۹) (حق پرورش رکھنے والے شخص کے بدن میں ضرر جیسے جنون، کوڑھ اور برص ہو تو یہ حق ساقط ہوجائے گا)۔

اور دردیر مالکی رقمطراز ہیں: "وعدم كجذام مضر ريحه أو رؤيته .... وكل عاهة مضرة يخشى على ولدها منها، ولو كان بالولد مثله؛ لأنه بالانضمام قد تحصل زيادة على ما كان عند المحضون على سبيل جري العادة" (الشرح الکبیر مع حاشیۃ الدسوقی ۲/۵۲۸، ۵۲۹، بیروت، دارالفکر)۔

(اور نفرت انگیز عیب نہ ہو، جیسے جذام جس کی بو یا جس کا دیکھنا ضرر رساں ہو...... اور ہر ضرر رساں آفت جس سے بچہ کے حق میں اندیشہ ہو، خواہ بچہ میں اس جیسا عیب موجود ہو، اس لئے کہ اختلاط کی وجہ سے بطور عادت بچہ کے اندر موجود عیب پر اضافہ ہوسکتا ہے)۔

اور ابوالنجا موسی حجاوی حنبلی لکھتے ہیں:

''وإذا كان بالأم برص أو جذام سقط حقها من الحضانة، وصرح بذلك العلائي الشافعي في ''قواعده'' وقال: لأنه يخشى على الولد من لبنها ومخالطتها'' (الاقناع ۴/ ۱۵۸، بیروت، دار المعرفہ، بہوتی حنبلی کشاف القناع ۵/ ۴۹۹، بیروت، العلمیہ، رحیبانی حنبلی مطالب اولی النہی ۵/ ۶۶۷، ط: ۲، المکتب الاسلامی، ۱۴۱۵ھ) (اور اگر ماں کے اندر برص یا کوڑھ ہوتو اس کا حق پرورش ساقط ہوجائے گا، اور علائی شافعی نے اپنی ''القواعد'' نامی کتاب میں اس کی صراحت کی ہے، اور لکھا ہے کہ اس کے دودھ اور اختلاط سے بچہ کے حق میں اندیشہ ہے)۔

اور بہوتی حنبلی ''الانصاف'' نامی کتاب کے حوالہ سے لکھتے ہیں:

''وقال غير واحد: وهو واضح في كل عيب متعد ضرره إلى غيره .... فالجذامي ممنوعون من مخالطة الأصحاء، فمنعهم من حضانتهم أولى'' (کشاف القناع ۵-۴۹۹)۔

(اور کئی اہل علم نے یہ بات کہی ہے کہ یہ ہر اس عیب میں واضح ہے، جس کا ضرر دوسرے کی طرف متعدی ہوسکتا ہو.... چنانچہ کوڑھ والوں کو صحت مند اشخاص کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے سے روک دیا گیا ہے، تو صحتمندوں کی پرورش سے بدرجہ اولی ان کو روکا جائے گا)۔

ان فقہی اقتباسات سے واضح ہے کہ ہر وہ مرض جس سے بچہ کو مادی یا روحانی ضرر لاحق ہوسکتا ہو، اس کا حکم بھی برص کی طرح ہوگا۔

۶۔ پرورش پر قدرت نہ ہونے کی صورت میں بھی پرورش کا حق ساقط ہوجائے گا، چنانچہ خطیب شربینی شافعی (م: ۹۷۷ھ) لکھتے ہیں:

''وتاسعها أن لا يكون به مرض دائم كالسل والفالج، إن عاق تألمه عن نظر المحضون بحيث يشغله تألمه عن كفالته وتدبير أمره، أو عن حركة من يباشر الحضانة، فتسقط في حقه دون من يدبر الأمور بنظره، ويباشرها غيره'' (الاقناع ۲-۴۹۲، بیروت دار لفکر)۔

(اور ان شرائط میں سے نویں شرط یہ ہے کہ اس کے اندر دائمی بیماری نہ ہو جیسے سل کی بیماری اور فالج، اگر اس کی دردمندی بچہ کی رعایت سے روک دے، اس طرح کہ اس کی دردمندی، اس کی پرورش اور اخراجات کی ذمہ داری اور اس کے معاملات کا انتظام کرنے سے غافل کردے، یا براہ راست پرورش کرنے والے کو حرکت سے روک دے، سو اس کا حق پرورش ساقط ہوجائے گا، نہ کہ اس شخص کا جو معاملات کا انتظام اپنے غور وفکر کے ذریعہ کرتا ہو اور دوسرا شخص ان معاملات کو انجام دیتا ہو)۔

۷۔ حق پرورش رکھنے والی خاتون، بچہ کے حق میں کوتاہی کرنے والی نہ ہو، خواہ نیک ہی کیوں نہ ہو، لہذا اگر وہ کوتاہی کرنے والی ہو تو اس کا حق پرورش ساقط ہوجائے گا، جیسا کہ ''عالمگیری'' میں ہے:

''ولا حضانة لمن تخرج كل وقت، وتترك البنت ضائعة'' (ہندیہ ۱/ ۵۴۲) (اور اس خاتون کو حق پرورش حاصل نہ ہوگا، جو ہر وقت گھر سے باہر رہے اور بچی کو ضائع ہونے کی حالت میں چھوڑ دے)۔

اور علامہ شامی رقمطراز ہیں:

''ہر وقت باہر نکلنے سے مراد بہ کثرت باہر نکلنا ہے، اس لئے کہ دار و مدار بچہ کو ضائع ہونے کی حالت میں چھوڑ دینے پر ہے، اور بچہ اس کے پاس امانت کے حکم میں ہے، اور امانت کو ضائع کرنے والے پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا ہے، اور اس سے یہ بات لازم نہیں ہے کہ اس کا نکلنا معصیت کی خاطر ہو، کیونکہ غیر معصیت کے لئے بھی نکلنا ہوسکتا ہے، جیسے وہ خاتون دایہ ہو، یا غسل دلانے والی ہو یا غسل خانہ میں غسل دینے والی ہو، یا اسی طرح کا کوئی مباح پیشہ اختیار کرنے والی ہو، اور اسی وجہ سے ''فتح القدیر'' میں لکھا ہے کہ ''خاتون فاسقہ ہو یا ہر وقت گھر سے باہر نکلتی ہو، لہذا ان کا ''فاسقہ'' پر عطف کرنا اس بات کا فائدہ دیتا ہے جو ہم نے کہا'' (رد المحتار ۳/ ۵۵۷)۔

اور مرد حق پرورش رکھنے والے کا بھی یہی حکم ہے۔

۸۔ حق پرورش کسی خاتون یا مرد کو صرف اسی صورت میں حاصل ہوگا، جبکہ بچہ کو اس کی جانب سے روحانی، اخلاقی، عقلی، ذہنی، نفسیاتی وجذباتی اور جسمانی مضرت پہنچنے کا گمان غالب نہ ہو، چنانچہ فقہاء نے صراحت کی ہے کہ اگر کوئی خاتون مرتد ہوجائے یا فاسقہ فاجرہ، یا چور یا ناچنے گانے والی یا نوحہ خوانی کا پیشہ اختیار

کرنے والی ہو، اور بچہ کی جسمانی، اخلاقی، روحانی، عقلی اور نفسیاتی وجذباتی تربیت کے سلسلہ میں اس پر اعتماد نہ کیا جاسکتا ہو تو اس کا حق پرورش ساقط ہوجائے گا۔

عالمگیری میں ہے: ''أحق الناس بحضانة الصغير حال قيام النكاح أو بعد الفرقة الأم إلا أن تكون مرتدة أو فاجرة غير مأمونة... وكذا لو كانت سارقة أو مغنية أو نائحة فلاحق لها'' (ہندیہ ۱/۵۴۱) (نکاح کے قائم ہونے کی حالت میں یا جدائی کے بعد لوگوں میں بچے کی پرورش کی زیادہ حقدار ماں ہے، مگر یہ کہ وہ مرتد ہو یا بدکار ہو کہ اس پر بھروسہ نہ کیا جاسکتا ہو، اور ایسے ہی اگر وہ چور ہو یا گانے والی ہو یا نوحہ خوانی کا پیشہ کرنے والی ہو تو اس کے لئے حق پرورش نہیں ہے)۔

اور علامہ شامی رقمطراز ہیں: ''البحر'' میں لکھا ہے کہ اس محل میں فقہاء کے کلام کے اندر فسق وفساد مراد نہ ہو جس کا مصداق نماز کو چھوڑ نا بھی ہے، اس لئے کہ عنقریب آرہا ہے کہ کتابیہ ذمیہ اپنے مسلم بچہ کی زیادہ حقدار ہے، جب تک وہ ادیان ومذاہب سمجھنے نہ لگے، لہذا مسلمان فاسقہ خاتون اپنے بچہ کی بدرجہ اولی حقدار ہوگی، ''النہر'' میں لکھا ہے کہ مولف کے فسق کو زنا تک محدود رکھنے میں خلل ہے، اس لئے کہ خاتون اگر چور ہو یا گانے بجانے والی ہو یا نوحہ خوانی کا پیشہ کرنے والی ہو تو بھی یہی حکم ہے، چنانچہ ایسا فسق مراد ہے جس کی وجہ سے بچہ ضائع ہوجائے'' (ردالمحتار ۳/۵۵۶)۔

اور آگے تحریر فرماتے ہیں: ''والحاصل أن الحاضنة إن كانت فاسقة فسقاً يلزم منه ضياع الولد عندها سقط حقها، وإلا فهي أحق به إلى أن يعقل، فينزع منها كالكتابية'' (مرجع سابق ۳/۵۵۷) (حاصل کلام یہ کہ پرورش کرنے والی خاتون ایسی فاسقہ ہو جس سے اس کے پاس بچہ کا ضائع ہونا لازم آئے تو اس کا حق ساقط ہوجائے گا، ورنہ وہ اس کی زیادہ حقدار ہوگی، یہاں تک کہ وہ دینداری کو سمجھنے لگے، تو کتابیہ خاتون کی طرح اس سے بچہ کو الگ کردیا جائے گا)۔

محقق علامہ شامی کی تحقیق راجح معلوم ہوتی ہے کہ حق پرورش سے وہ فسق محروم کرنے کا سبب بنے گا جس کی وجہ سے بچہ کے ضائع ہونے یا اس کے اخلاق وکردار کے بگڑنے کا اندیشہ ہو، لہذا ایسے مرد یا خاتون سے بچہ کو اس وقت الگ کردیا جائے گا، جبکہ وہ دین اور دینداری کو سمجھنے لگے، اور اس کے بعد والے حقدار کے حوالہ کردیا جائے گا، اس لئے کہ ایسی صورت میں اس کے پاس رہنے کی حالت میں بچہ کی مصلحت فوت ہوجائے گی۔

اور مالکیہ کا بھی یہی مسلک ہے، جیسا کہ ابن جزی مالکی (م: ۷۴۱ھ) رقمطراز ہیں:

"قلة دينه وصونه" (القوانين الفقهية ص: ۱۴۹) (اور حق پرورش دینداری اور پرہیزگاری کی کمی کی وجہ سے ساقط ہوجاتا ہے)۔

اسی سے قریب شافعیہ کا مذہب ہے جیسا کہ شیرازی شافعی لکھتے ہیں:

''اور حق پرورش ناقص العقل کے لئے ثابت نہیں ہوتا ہے، اس لئے کہ وہ پرورش کی مکمل صلاحیت نہیں رکھتا ہے، اور نہ ہی فاسق کے لئے ثابت ہوتا ہے، اس لئے کہ وہ پرورش کا حق ادا نہیں کرے گا، اور اس لئے کہ حق پرورش بچہ کی رعایت میں متقرر کیا گیا ہے اور فاسق کی پرورش میں بچہ کی کوئی رعایت نہیں ہے، اس لئے کہ وہ اس کے طریقہ پر نشوونما پائے گا، اور مسلمان پر کافر کے لئے حق پرورش ثابت نہ ہوگا...... اس لئے کہ حق پرورش بچہ کی رعایت میں مقرر کیا گیا ہے اور کافر کی پرورش میں مسلمان بچہ کی کوئی رعایت نہیں ہے، اس لئے کہ وہ اسے دین سے منحرف کردے گا، اور یہ عظیم تر ضرر ہے...... اور عورت کو حق پرورش حاصل نہ ہوگا جبکہ وہ شادی کرلے'' (المہذب مع المجموع ۱۸/۳۲۰)۔

اور حنابلہ کا مسلک شافعیہ سے ملتا جلتا ہے، جیسا کہ ابن قدامہ حنبلی لکھتے ہیں:

''اور حق پرورش بچہ اور ناقص العقل کے لئے ثابت نہ ہوگا، اس لئے کہ وہ پرورش پر قادر نہیں، اور خود ان کو پرورش کرنے والے کی ضرورت ہے، تو وہ فاسق کو حاصل ہوگا، اس لئے کہ پرورش کے فرائض کی ادائیگی میں وہ قابل اعتماد نہیں، اور اس کی پرورش میں بچہ کی رعایت نہیں ہے، اس لئے کہ وہ ان کے طریقے پر نشوونما پائے گا...... اور نہ ہی کافر کو مسلمان پر حق پرورش حاصل ہوگا'' (المغنی ۸/۲۳۷)۔

اور ضرر کے پیش نظر امام ابوبکر جصاص رازی حنفی کی رائے یہ تھی کہ کتابیہ خاتون کے پاس بچے سمجھنے بوجھنے کی عمر تک رہیں گے، اور اس کے بعد اس کا حق ساقط ہوجائے گا، چنانچہ کاسانی لکھتے ہیں:

''وكان أبوبكر أحمد بن علي الرازي يقول: إنما أحق بالصغير والصغيرة حتى يعقلا، فإذا عقلا، سقط حقها؛

لأنها تعودهما أخلاق الكفرة، وفيه ضرر عليهما'' (بدائع الصنائع ۴/۴۲) (اور ابو بکر احمد بن علی رازی کہتے تھے کہ کتابیہ خاتون بچہ اور بچی کی زیادہ حقدار ہے یہاں تک کہ وہ سمجھنے لگیں، پھر جب وہ سمجھنے لگیں، تو اس کا حق ساقط ہو جائے گا، اس لئے کہ وہ انہیں کافروں کے اخلاق وعادات کے عادی بنادیں گے، اور اس میں ان کے حق میں ضرر ہے)۔

خلاصہ یہ کہ درج ذیل صورتوں میں مرد یا خاتون کو حق پرورش سے محروم کردیا جائے گا:

۱۔ مرد یا خاتون شراب نوشی میں منہمک رہتے ہوں۔

۲۔ مرد یا خاتون بدکاری کے ساتھ مشہور ہوں۔

۳۔ ایسے بدکردار ہوں کہ بچہ کے ضائع ہونے کا گمان غالب ہو۔

۴۔ چوری میں منہمک رہتے ہوں۔

۵۔ ناچنے گانے میں منہمک رہتے ہوں۔

۶۔ نوحہ خوانی میں غرق رہتے ہوں۔

۷۔ ایسے بداخلاق اور بدطینت ہوں کہ بچہ کے اخلاق اور کردار کے بگڑنے کا اندیشہ ہو۔

۸۔ ان کی بداعمالی اور فسق سے بچہ کے بگڑنے کا اندیشہ ہو۔

۹۔ مرد یا خاتون مغربی فحاشی اور عریانیت کے دلدادہ ہوں۔

۱۰۔ مرد یا خاتون الحاد اور بے دینی کی دعوت دیتے ہوں۔

۱۱۔ مرد یا خاتون اعلانیہ احکام الٰہی کا مذاق اڑاتے ہوں۔

۱۲۔ مرد یا خاتون اعلانیہ رمضان کی بے حرمتی کرتے ہوں۔

۱۳۔ مرد یا خاتون بچہ کے حق کی ادائیگی میں ایسی کوتاہی کرتے ہوں جس سے بچہ کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہو۔

۱۴۔ مرد یا خاتون پاگل یا نیم پاگل ہوں۔

۱۵۔ مرد یا خاتون برص اور جذام وغیرہ نفرت انگیز عیوب میں مبتلا ہوں۔

جواب نمبر: ب:

(ا): ''تربیت'' عربی زبان کا لفظ ہے، اس کے لغوی معنی ہیں: بچہ کے معاملات کو اس طرح انجام دینا، جو ان کے جسمانی، عقلی اور ذہنی ارتقا کا ذریعہ بنے، چنانچہ علامہ زبیدی (م: ۱۲۰۵ھ) رقمطراز ہیں: "أدبته أدبا، من باب ضرب: علمته رياضة النفس ومحاسن الأخلاق. وأدبته تأديباً، مبالغة وتكثير" (تاج العروس ۲/۱۲، دار الہدایہ) (أدبته أدبا، باب ضرب سے آتا ہے، اس کے معنی ہیں کہ میں نے فلاں کو تربیت نفس، عمدہ اخلاق اور اچھے طور طریقے کی تعلیم دی، اور ''أدبته'' باب تفعیل سے مبالغہ اور کثرت کو بتاتا ہے)۔

اور اس کا اصطلاحی معنی لغوی معنی سے ہم آہنگ ہے۔

اسلام میں بچوں کے حق تعلیم وتربیت کے بارے میں درج ذیل بنیادی ہدایات ہیں:

۱۔ بچوں کو اس قدر دینی تعلیم دینا واجب ہے، جس سے وہ اپنے اوپر بلوغ کے بعد عائد ہونے والے دینی فرائض کو سمجھ سکیں، اور جہنم کی آگ سے بچ سکیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"یا أیها الذین آمنوا قوا أنفسکم وأهلیکم نارا" (التحریم:۶) (اے ایمان والو، اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو آگ سے بچاؤ)۔

اور بیضاوی اس کی تفسیر میں رقمطراز ہیں:

"وأهليكم بالنصح والتأديب" (انوار التنزیل وأسرار التأویل، ۲۲۵/۵، بیروت دار الاحیاء، ط: ۱۴۱۸/۱)۔ (اور اپنے اہل وعیال کو خیر خواہی اور ادب سکھا کر جہنم کی آگ سے بچاؤ)۔

اور علامہ آلوسی تحریر فرماتے ہیں:

''والمراد بالأهل على ما قيل: ما يشمل الزوجة والولد والعبد والأمة، واستدل بها على أنه يجب على الرجل تعلم ما يجب من الفرائض وتعليمه لهؤلاء، وأدخل بعضهم الأولاد في الأنفس؛ لأن الولد بعض من أبيه'' (روح المعانی ۳۵۱/۱۴) (اور بعض کے نزدیک اہل کی مراد میں بیوی، بچے، غلام اور باندی سب شامل ہیں، اور اس آیت کے ذریعہ اس بات پر استدلال کیا گیا ہے کہ مرد پر واجب ہونے والے فرائض کا سیکھنا اور ان لوگوں کو سکھانا واجب ہے، اور بعض نے اولاد کو ''نفس'' میں شامل کیا ہے، اس لئے کہ بچہ باپ کا جزو اور حصہ ہوتا ہے)۔

۲۔ والدین خود اپنی اولاد کو دین کے ضروری احکام سکھائیں اور ان کو ایمان کے اصول اور اسلام کے ارکان سے واقف کرائیں، وضو اور نماز کا طریقہ بتائیں اور روزہ اور حج کا مطلب سمجھائیں، اور اگر ان کو قدرت نہ ہو، تو اہل علم سے مدد لیں، اور ان کو مکاتب اور مدارس روانہ کریں، چنانچہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے: "فسألوا أهل الذكر إن كنتم لا تعلمون" (النحل: ۴۳) (سو اہل علم سے پوچھ لو، اگر تم خود نہیں جانتے ہو)۔

بیضاوی اس کی تفسیر میں رقمطراز ہیں:

"وعلى وجوب المراجعة إلى العلماء فيما لا يعلم" (تفسیر البیضاوی ۲۲۷/۳) (نیز آیت کے اندر اس بات کی دلیل ہے کہ جو بات معلوم نہ ہو، اس کے سلسلہ میں اہل علم کی طرف رجوع واجب ہے)۔

۳۔ والدین اولاد کو اللہ تعالی کی شریعت کا پابند بنائیں، اور ان کے اندر عمل کی اسپرٹ (Spirit) پیدا کریں، اور احکام الٰہی سے بے پروائی کا سد باب کریں، خواہ یہ چیز ان کی طبیعت پر گراں گزرے، چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

''ألا كلكم راع وكلكم مسؤول عن رعيته، فالإمام الأعظم الذي على الناس راع، وهو مسؤول عن رعيته، والرجل راع على أهل بيته، وهو مسؤول عن رعيته والمرأة راعية على أهل بيت زوجها وولده، وهي مسؤولة عنهم'' (صحیح البخاری حدیث نمبر: ۲۵۵۴، ۵۱۸۸، ۵۲۰۰، ۷۱۳۸، صحیح مسلم حدیث نمبر: ۱۸۲۹)۔

(سن لو تم میں سے ہر ایک نگہبان ہے اور اس سے اس کے ماتحت کے بارے میں پوچھا جائے گا، چنانچہ سربراہ اعظم جو لوگوں کا حاکم ہے، اس سے اس کی رعایا کے بارے میں پوچھا جائے گا، اور مرد اپنے گھر والوں کا نگراں ہے، اور اس سے اس کے ماتحت کے بارے میں پوچھ ہوگی، اور خاتون اپنے شوہر کے گھر والوں اور اس کی اولاد کی نگراں ہے، اور اس سے ان کے بارے میں سوال ہوگا)۔

اس حدیث سے پتہ چلا کہ ماں باپ کی ذمہ داری ہے کہ اولاد کو اسلامی عقائد اور احکام کی تعلیم دیں اور ان کو شریعت الٰہی سے منحرف ہونے سے بچائیں، چنانچہ ضحاک اور مقاتل کا قول ہے: "حق على المسلم أن يعلم أهله من قرابته وإمائه وعبيده ما فرض الله عليهم وما نهاهم عنه" (تفسیر ابن کثیر ۱۶۷/۸، ط: ۲، دار طیبہ، ۱۴۲۰ھ) (مسلمان پر لازم ہے کہ اپنے رشتہ داروں، باندیوں اور غلاموں کو اللہ تعالی کے فرائض اور ممنوعات کی تعلیم دے)۔

اور حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص ؓ سے مروی ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"مروا أولادكم بالصلاة وهم أبناء سبع سنين، واضربوهم عليها، وهم أبناء عشر، وفرقوا بينهم في المضاجع" (سنن ابی داؤد حدیث نمبر: ۴۹۵، مسند احمد حدیث نمبر: ۱۵۳۳۹، اور اس کی سند حسن درجہ کی ہے) (اپنی اولاد کو نماز کا حکم دو، جبکہ وہ سات سال کے ہوں، اور نماز کے چھوڑنے پر ان کو مارو، جبکہ وہ دس سال کے ہوں، اور انکی خوابگاہوں کو علیحدہ کردو)۔

اس حدیث سے پتہ چلا کہ والدین پر واجب ہے کہ اولاد کو نماز کی عادت ڈلوائیں تاکہ فرض ہونے کے بعد وہ اس فریضہ میں کوتاہی نہ کریں، اور نماز پر قیاس کرتے ہوئے روزہ وغیرہ دیگر فرائض کی بھی مشق کرانی ضروری ہوگی، تاکہ نیکی کی عادت بن جائے، چنانچہ امام مناوی عبد الرؤف (م: ۱۰۳۱ھ)

رقمطراز ہیں:

"مروا وجوباً أولادکم بالصلاۃ المکتوبۃ إذا بلغوا سبعاً لیعتادوھا ویأنسوا بھا" (فیض القدیر شرح الجامع الصغیر ۵/۵۲۱، ط: ا، مصر، المکتبۃ التجاریۃ، ۱۳۵۶ھ) (اپنی اولاد کو بہ طور وجوب فرض نماز کا حکم دو جبکہ وہ سات سال کے ہوجائیں تاکہ وہ اس کے عادی بن جائیں، اور اس سے مانوس ہوجائیں)۔

۴۔ والدین کو چاہئے کہ فرائض کی تعلیم کے ساتھ اولاد کو قرآن مجید کی تعلیم دیں، پورا قرآن یا کچھ سورتیں یاد کرائیں، ان کے مفاہیم سے آگاہ کریں، اسلامی اصطلاحات مثلاً کلمہ طیبہ، اللہ جل جلالہ کے نام، قرآن وحدیث کے دینی مرجع، اللہ کے رب، اسلام کے دین، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نبی، قرآن کے کتاب مقدس اور کعبہ کے قبلہ ہونے کا مطلب بتائیں، نیز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت صبح وشام اور مختلف اوقات کی دعائیں انہیں یاد کرائیں، اور بعض مختصر اور اہم حدیثیں ان کو حفظ کرائیں، چنانچہ حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"تعلموا الفرائض والقرآن وعلموا الناس فإني مقبوض" (سنن ترمذی حدیث نمبر: ۲۰۹۱، اور اس کی سند میں کچھ کلام ہے) (فرائض اور قرآن سیکھو اور لوگوں کو سکھاؤ، کیونکہ میری موت ہونے والی ہے)۔

اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"خیرکم من تعلم القرآن وعلمہ" (صحیح البخاری حدیث نمبر: ۵۰۲۷، سنن ابی داؤد، حدیث نمبر: ۱۴۵۲) (تم میں بہتر وہ ہے جو قرآن سیکھے اور سکھائے)۔

اس حدیث شریف میں قرآن کی تعلیم کی ترغیب دلائی گئی ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ اولاد کو تعلیم دینا زیادہ اجر وثواب کا باعث ہے۔

۵۔ والدین اولاد کو مہذب، شائستہ اور خوش اخلاق بنائیں، ان کو تکبر گھمنڈ اور بری عادتوں اور خصلتوں سے دور رکھنے کی کوشش کریں، ان کے اندر اسلامی شخصیت بنانے کے لئے وقتاً فوقتاً حضرت لقمان علیہ السلام کے طرز پر نصیحت کرتے رہیں، اور ان کے سامنے نیک لوگوں کے واقعات اور نمونہ پیش کرتے رہیں، چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "ما نحل والد ولدہ أفضل من أدب حسن" (سنن ترمذی حدیث نمبر: ۱۹۵۲، المستدرک للحاکم حدیث نمبر: ۷۶۷۹، مسند احمد حدیث نمبر: ۱۵۴۰۳، اور اس کی سند میں کچھ کلام ہے) (کسی والد نے اپنی اولاد کو عمدہ اخلاق کے تحفہ سے بڑھ کر کوئی تحفہ نہیں دیا)۔

اور حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"من بلي من ھذہ البنات شیئاً فأحسن إلیھن، کن لہ ستراً من النار" (صحیح البخاری حدیث نمبر: ۱۴۱۸، ۵۹۹۵، صحیح مسلم حدیث نمبر: ۲۶۲۹) (جوان بیٹیوں میں سے کسی بیٹی کے ذریعہ آزمایا گیا، اور اس نے ان کے ساتھ اچھا سلوک کیا، تو یہ بیٹیاں اس کے لئے جہنم کی آگ سے ڈھال بن جائیں گی)۔

اور یہ واضح ہے کہ اچھے برتاؤ میں ان کو مؤدب، شائستہ اور عمدہ اخلاق سے متصف کرنا بھی داخل ہے۔

اور حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "من عال ثلاث بنات فأدبھن وزوجھن وأحسن إلیھن، فلہ الجنۃ" (سنن ابی داؤد، حدیث نمبر: ۵۱۴۷، اور یہ حدیث صحیح لغیرہ ہے) (جو تین بیٹیوں کی پرورش کرے اور ان کو شائستہ بنائے اور ان کی شادی کردے اور ان کے ساتھ بہتر سلوک کرے، تو اس کے لئے جنت ہے)۔

اور حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "أکرموا أولادکم وأحسنوا أدبھم" (سنن ابن ماجہ حدیث نمبر: ۳۶۷۱، اور اس کی سند میں کچھ کلام ہے) (اپنی اولاد کی عزت کرو اور انہیں عمدہ اخلاق سے آراستہ کرو)۔

ان تمام احادیث سے واضح ہے کہ والدین کو چاہئے کہ بچپن سے ہی اولاد کو خوش اخلاق اور عمدہ صفات کے زیور سے آراستہ کرنے کی کوشش کریں، خاص طور پر اس وقت مزید کوشش کریں، جب وہ اچھی اور بری صفات کو سمجھنے لگیں، چنانچہ امام جصاص رازی رقمطراز ہیں:

"فمن کان سنہ سبعاً، فھو مأمور بالصلاۃ علی وجہ التعلیم والتأدیب؛ لأنہ یعقلھا فکذلک سائر الأدب الذي یحتاج إلی تعلمہ" (احکام القرآن ۱/۴۹۰) (سو جس کی عمر سات سال ہو تو تعلیم اور تربیت کے طور پر اسے نماز کا حکم ہے، اس لئے کہ وہ اسے سمجھتا ہے، تو دیگر عمدہ طور طریقے جسے سیکھنے کی اسے حاجت ہے، اس کا بھی یہی حکم ہے)۔

(۲): بچے اور بچیوں کو اس قدر دینی تعلیم دینا واجب ہے کہ وہ مکلف ہونے کے بعد اپنے اوپر عائد ہونے والے فرائض کو بحسن وخوبی انجام دے سکیں، یعنی انہیں استنجاء، وضو، غسل، نماز اور روزہ وغیرہ کے احکام معلوم ہوسکیں، نیز بچیوں کو حیض اور اس سے غسل وغیرہ کے احکام معلوم ہوجائیں۔

اور عصری تعلیم اس حد تک دینا واجب ہے کہ وہ باعزت طریقہ سے کمانے کھانے پر قادر ہوسکیں۔

عالمگیری میں ہے:

''طلب العلم فريضة بقدر الشرائع وما يحتاج إليه لأمر لابد منه من أحكام الوضوء والصلاة، وسائر الشرائع، ولأمور معاشه، وما وراء ذلك ليس بفرض، فإن تعلمها فهو أفضل، وإن تركها فلا إثم عليه'' (ہندیہ، کتاب الکراہیۃ، الباب الثلاثون فی المتفرقات ۵/۳۷۷) (ضروری الٰہی احکام اور ضروری اعمال کے ان احکام کے بقدر علم کی تحصیل فرض ہے جن کی ضرورت پڑتی رہتی ہے جیسے وضوء، نماز اور دیگر لازمی اعمال کے احکام، اور جن احکام کی معاشی معاملات کے لئے ضرورت پڑتی رہتی ہے، اور اس کے علاوہ علم کی تحصیل فرض نہیں ہے، سو اگر اسے حاصل کرے تو وہ بہتر ہے، اور اگر اسے چھوڑ دے تو اس پر گناہ نہیں ہے)۔

اور حضرت انس بن مالکؓ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "طلب الحلال واجب على كل مسلم" (مسند الفردوس للدیلمی حدیث نمبر: ۳۹۱۴، اور اس کی سند حسن درجہ کی ہے) (حلال کمائی کی تحصیل ہر مسلمان پر فرض ہے)۔

اس حدیث سے پتہ چلا کہ حلال کمائی کرنا فرض ہے، لہذا حلال کمائی کے لئے درکار علم حاصل کرنا بھی فرض ہوگا، لہذا اولاد کو اس حد تک علم دلانا بھی فرض ہوگا۔

اور امام محمد بن الحسن شیبانی (م: ۱۸۹ھ) رقمطراز ہیں: "طلب الكسب فريضة على كل مسلم، كما أن طلب العلم فريضة" (الکسب، ص: ۳۲، ط: ا تحقیق: زکار، دمشق، حرصونی، ۱۴۰۰ھ) (ہر مسلمان پر مال کی تحصیل فرض ہے جس طرح تحصیل علم فرض ہے)۔

مزید لکھتے ہیں کہ فرائض کی ادائیگی کی قدرت اس وقت ہوگی، جبکہ بدن کو قوت حاصل ہو، اور بدن کو قوت کھانے پینے سے حاصل ہوگی، اور کھانے کا سامان عام طور سے کمائی سے حاصل ہوتا ہے، اور جس چیز کے بغیر فرض کو قائم نہ کیا جاسکتا ہو، وہ چیز بھی بذات خود فرض ہوجاتی ہے، لہذا کمانا بھی فرض ہے (الکسب، ص: ۳۴)۔

اور علامہ سرخسی لکھتے ہیں:

''وحجتنا في ذلك قوله تعالى: ''أنفقوا من طيبات ما كسبتم'' (البقرہ: ۲۶۷)، والأمر حقيقة للوجوب، ولا يتصور الإنفاق من المكسوب إلا بعد الكسب، وما لا يتوصل إلى إقامة الفرض إلا به يكون فرضاً، وقال تعالى: ''فإذا قضيت الصلاة فانتشروا'' (الجمعہ: ۱۰) يعني الكسب، والأمر حقيقة للوجوب، ويؤيده قول الرسول ﷺ: ''طلب الكسب بعد الصلاة المكتوبة، هي الفريضة بعد الفريضة'' (المعجم الکبیر للطبرانی حدیث نمبر: ۹۹۹۳، الفردوس بماثور الخطاب للدیلمی، حدیث نمبر: ۳۹۱۸، اور اس کی سند میں کلام ہے)، فلا يترك ذلك'' (المبسوط، کتاب الکسب ۳۰/۲۵۰)۔

(اور کمائی کرنے کی فرضیت کے سلسلہ میں ہماری دلیل اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''اپنے کمائے ہوئے پاکیزہ مال میں سے خرچ کرو، اور کمائے ہوئے مال سے خرچ کرنے کا تصور کمانے کے بعد ہی ہوسکتا ہے، اور جس چیز کے بغیر فرض قائم نہ کیا جاسکتا ہو، وہ بھی فرض ہوجاتی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''پھر جب نماز پوری ہوجائے تو زمین میں پھیل جاؤ'' یعنی پھیل جانے سے مراد کمائی کرنا ہے، اور امر کا صیغہ حقیقت میں وجوب کے لئے ہے، اور اس کی تائید رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد: ''فرض نماز کے بعد کمانا فرض کے بعد فرض ہے'' سے ہوتی ہے۔ لہذا اس پہلو کو ترک نہیں کیا جائے گا)۔

اس سے پتہ چلا کہ جب جائز اسباب کے ذریعہ مال کا حاصل کرنا فرض ہے، تو مال کمانے کے لئے ضروری علم کی تحصیل بھی فرض ہوگی، لہذا اس حد تک اولاد کو عصری تعلیم دینا یا دلانا بھی فرض ہوگا، جو کسب معاش کے لئے ضروری ہو، اس سلسلہ میں مزید فقہی نقول مسئلہ کو واضح کریں گی، چنانچہ

''ہندیہ'' میں ہے:

''ولو استأجر لتعليم ولده الكتابة أو النجوم أو الطب أو التعبير جاز بالاتفاق'' (ہندیہ ۴/ ۴۴۸) (اور اگر لکھائی یا علم نجوم یا طبابت یا تعبیر وانشاء سکھانے کے لئے معلم کو اجرت پر رکھا، تو یہ بالاتفاق جائز ہے)۔

اور زبیدی حنفی رقمطراز ہیں: "ويسلمه في صناعة، لأنه من باب تثقيفه واستجلاب المنافع له" (الجوہرة النیرة ۱/ ۳۵۵، ط:۱، المطبعة الخیریہ ۱۳۲۲ھ) (اور بچہ کو کاری گری سیکھنے کے لئے پیشہ ور کے حوالہ کرے، اس لئے یہ اسے ہنر مند بنانے اور اس کے لئے منافع حاصل کرنے سے متعلق ہے)۔

اور علامہ شامی ''جامع الفصولین'' کے حوالہ سے لکھتے ہیں: ''اور باپ کو اختیار ہے کہ اپنے نابالغ بچہ کو عاریۃً دے تاکہ پیشہ سکھانے کے لئے اپنے استاذ کی خدمت کرے، اور باپ یا دادا یا وصی بطور تربیت اور شائستہ بنانے کے بے عوض اسے استعمال کرسکتا ہے'' (رد المحتار ۶/ ۴۴۰)۔

اور ایک دوسری جگہ رقمطراز ہیں: "وإذا استغنى الغلام عن الخدمة أجبر الأب أو الوصي أو الولي على أخذه، لأنه أقدر على تأديبه وتعليمه" (رد المحتار عزوا إلی شرح المجمع ۳/ ۵۶۶) (اور جب بچہ خدمت سے بے نیاز ہوجائے، تو باپ یا وصی یا ولی کو اس کے لینے پر مجبور کیا جائے گا، اس لئے کہ وہ اس کی تعلیم وتربیت پر زیادہ قادر ہے)۔

اور ایک جگہ سپرد قرطاس فرماتے ہیں: "فله دفعها لامرأة تعلمها حرفة كتطريز وخياطة مثلاً" (رد المحتار ۳/ ۶۱۲) (سو باپ کو حق ہے کہ بچی کو ایسی عورت کے حوالہ کرے جو اسے ہنر جیسے کشیدہ کاری اور سلائی مثال کے طور پر سکھادے)۔

اور مالکیہ کے نزدیک بھی ضروری دینی اور دنیاوی علم کی تعلیم کی ذمہ داری والدین پر ہے، چنانچہ موافق مالکی (م: ۸۹۷ھ) علامہ باجی کے حوالہ سے لکھتے ہیں: "إذا كان الابن في حضانة أمه، لم يمنع من الاختلاف لأبيه يعلمه، ويأوي لأمه. لأن للأب تعليمه وتأديبه وإسلامه في المكتب والصنائع" (التاج والإکلیل لمختصر خلیل ۵/ ۵۹۵، ط: العلمیہ، ۱۴۱۶ھ-۱۹۹۴ء) (اگر بچہ اپنی ماں کی پرورش میں ہو تو اسے باپ کے پاس آنے جانے سے روکا نہیں جائے گا جو اسے تعلیم دے، اور وہ اپنی ماں کے پاس لوٹ جائے گا، اس لئے کہ باپ کو اسے تعلیم وتربیت اور مکتب اور کاری گری کے مرکز میں حوالہ کرنے کا حق ہے)

اور یہی مسلک شوافع کا ہے، جیسا کہ خطیب شربینی شافعی (م: ۹۷۷ھ) لکھتے ہیں: "وإن اختارها. أي الأم. ذكر، فعندها ليلاً، وعند الأب نهاراً، يعلمه الأمور الدينية والدنيوية على ما يليق به" (مغنی المحتاج ۵/ ۲۰۰، ط:۱، العلمیة ۱۴۱۵ھ) (اور اگر لڑکے نے ماں کو اختیار کیا، تو وہ اس کے پاس رات میں رہے گا، اور باپ کے پاس دن میں رہے گا جو اسے دینی اور دنیوی امور مناسب طریقہ پر سکھائے)۔

اور حنابلہ کا بھی یہی مسلک ہے، چنانچہ علامہ ابن قدامہ مقدسی لکھتے ہیں:

''اور اگر لڑکا سات سال کی عمر کے بعد ماں کے پاس رہے، اسے اختیار کرنے کی وجہ سے، تو رات میں وہ ماں کے پاس رہے گا، اور دن میں باپ اسے لے گا، تاکہ اسے مکتب یا کاریگری کی جگہ حوالہ کرے، اس لئے کہ مقصد لڑکے کی رعایت ہے اور اس کی رعایت ذکر کردہ بات میں ہے'' (المغنی ۸/ ۲۴۲، الکافی فی فقہ الامام أحمد ۳/ ۲۴۷، ط:۱، بیروت، العلمیہ ۱۴۱۴ھ-۱۹۹۴)۔

فقہاء کے ان اقوال سے واضح ہے کہ اولاد کو ضروری دینی تعلیم دلانا نیز اس حد تک عصری تعلیم دلانا کہ بچہ باعزت زندگی گزار سکے، اور اپنی معاشی ضروریات پوری کرسکے، والد کی ذمہ داری ہے۔

خلاصہ یہ کہ حلال مال کمانا فرض ہے، اس لئے کہ وہی تقوی اور ورع کی بنیاد ہے، لہذا اس کے لئے درکار علم بھی فرض ہوگا، اور اس حد تک اولاد کو علم دلانا بھی فرض ہوگا۔

(۳): اگر حکومت کسی سطح تک کی تعلیم کو بچوں اور بچیوں کے لئے لازم قرار دے، اور وہ صرف عصری تعلیم ہو تو شرعاً اس کی پابندی مسلمانوں پر لازم نہیں ہے۔

البتہ اگر حکومت اس طرح قانون بنائے کہ فلاں کلاس تک عصری یا اس کے مساوی مذہبی تعلیم دلانا ہر گارجین پر لازم ہے، تو شرعاً اس کی پابندی مسلمانوں پر لازم ہوگی، کیونکہ حکومت کو اس طرح کی پابندی عائد کرنے کا حق ہے، اس لئے کہ یہ خیر خواہی کے باب سے ہے، اور جو حکم کتاب وسنت کی قطعی نصوص سے نہ ٹکرائے، اس میں حاکم وقت کی اطاعت واجب ہے۔

کاسانی رقمطراز ہیں: "طاعة الإمام فيما ليس بمعصية فرض" (بدائع الصنائع ۷ / ۱۴۰) (غیر معصیت میں حاکم کی اطاعت فرض ہے)۔

اور ابن نجیم لکھتے ہیں: "طاعة الإمام فيما ليس بمعصية واجبة" (البحر الرائق ۲ / ۱۷۳) (غیر معصیت میں حکمران کی طاعت واجب ہے)۔

اور ماوردی شافعی (م: ۴۵۰ھ) تحریر فرماتے ہیں: "طاعة الإمام لا تلزم في المعاصي" (الحاوی الکبیر ۱۲ / ۷۲، ط: ۱، بیروت، العلمیہ، ۱۴۱۹ھ-۱۹۹۹ء) (معصیت کے اندر حکمران کی طاعت لازم نہیں)۔

اور یہ واضح ہے کہ ایک حد تک تعلیم کو ہر شخص پر لازم کرنا، معصیت نہیں ہے، کیونکہ اسلامی نقطہ نظر سے ہر مسلمان مرد اور عورت پر تحصیل علم فرض ہے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے: "قل هل يستوي الذين يعلمون والذين لا يعلمون، إنما يتذكر أولوا الألباب" (الزمر: ۹) (پوچھو، کیا علم وبصیرت رکھنے والے، اور وہ جو علم وبصیرت نہیں رکھتے دونوں برابر ہوں گے؟ یاد دہانی تو اہل عقل ہی حاصل کرتے ہیں)۔

بیضاوی اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں: "نفي لاستواء الفريقين باعتبار القوة العلمية بعد نفيه باعتبار القوة العملية على وجه أبلغ لمزيد فضل العلم" (تفسیر البیضاوی ۵ / ۳۸) (علمی قوت کے لحاظ سے دونوں فریق کے برابر ہونے کی نفی ہے، عملی قوت کی حیثیت سے برابری کی نفی کے بعد اس طریقہ پر کہ جس سے علم کی مزید خوبی موثر طور سے بیان ہو جائے)۔

اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "طلب العلم فريضة على كل مسلم" (سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر: ۲۲۴، مسند ابی یعلی حدیث نمبر: ۲۸۳۷، اور اس کی سند حسن درجہ کی ہے) (علم کی تحصیل ہر مسلمان پر فرض ہے)۔

ہاں یہ ضروری ہے کہ مساوی مذہبی علم کی بھی گنجائش رکھی جائے، اس لئے کہ شرعی نقطہ نظر سے دینی علم روح کے درجہ میں ہے اور مقدم ہے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

"اقرأ باسم ربك الذي خلق" (العلق: ۱) (پڑھ اپنے اس پروردگار کے نام سے جس نے پیدا کیا)۔

اور حضرت صفوان بن عسال مرادیؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"إن الملائكة لتضع أجنحتها لطالب العلم رضى بما يطلب" (مسند احمد، حدیث نمبر: ۸۰۸۹، اور اس کی سند حسن درجہ کی ہے) (یقیناً فرشتے طالب علم کے لیے اس کی تحصیل علم سے خوش ہو کر اپنے بازو بچھا دیتے ہیں)۔

اور حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"من سلك طريقاً يلتمس فيه علما سهل الله له طريقاً إلى الجنة" (سنن ترمذی حدیث نمبر: ۲۶۴۶، اور اس کی سند صحیح ہے) (جو ایسی راہ پر چلے جس میں علم طلب کرے، تو اللہ تعالی اس کے لئے جنت کی راہ آسان فرما دے گا)۔

اور مبارکپوری رقمطراز ہیں: "علماً" نكرة يشمل كل نوع من أنواع علوم الدين، قليلة أو كثيرة، إذا كان بنية القربة والنفع والانتفاع" (تحفۃ الاحوذی ۷ / ۳۳۹، بیروت، العلمیہ) (علم کو نکرہ رکھا، تاکہ دینی علوم کی قسموں میں سے ہر قسم کو کم ہو یا زیادہ شامل رہے، جبکہ قربت، نفع اور استفادہ کی نیت سے ہو)۔

(۴): عیار یہودیوں نے ساری دنیا پر قبضہ جمانے کے لئے اپنی ماکرانہ ذہنیت سے جو خبیث ایجنڈے تیار کئے ہیں، ان ہی میں سے ایک ایجنڈہ "جنسی تعلیم" بھی ہے، جس کا مقصد نوجوان نسل کو حیا باختہ بنا کر ان کو ہوس ناکی اور شہوت رانی میں غرق کر دینا ہے، تاکہ ان کے اندر بلند ہمتی، عالی حوصلگی اور جرأت ناپید ہو جائے اور وہ حق کو حق نہ کہہ سکیں، اور باطل کی لذت فانی سے شادکام رہا کریں۔

چنانچہ ''جنسی تعلیم'' اسلامی نقطہ نظر سے حرام ہے، کیونکہ وہ فحاشی کی دعوت، جنسی بے راہ روی کا ذریعہ اور بے شرمی کے عمیق غار میں جانے کا سبب ہے۔

قرآن وحدیث کے مطالعہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ تعالی اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے جائز فطری جنسی تقاضوں کے احکام کے بیان تک کے لئے کنائی الفاظ اختیار کئے ہیں، تاکہ شرم وحیا متاثر نہ ہو، چنانچہ میاں بیوی کے جائز تعلق کے لئے ''ملامسہ'' (باہم مس کرنا) ''مباشرہ'' (کھال کا کھال سے ملانا) اور ''قضاء الوطر'' (حاجت پوری کرنا) استعمال فرمایا ہے، چنانچہ ارشاد ہے: "أو لامستم النساء" (النساء: ۴۳) (یا عورتوں سے ہم صحبت ہوا ہو)۔ اور ایک موقع پر ارشاد ہے: "ولا تباشروهن وأنتم عاكفون في المساجد" (البقرہ: ۱۸۷) (اور جب تم مسجد میں اعتکاف میں ہو تو بیویوں سے نہ ملو)۔

اور ایک جگہ ارشاد ہے: "فلما قضى زيد منها وطراً زوجناكها لكي لا يكون على المؤمنين حرج في أزواج أدعيائهم إذا قضوا منهن وطراً وكان أمر الله مفعولاً" (۳۳/الاحزاب: ۳۷) (سو جب زید نے اس سے اپنی حاجت پوری کر لی، تو ہم نے اس کو تم سے بیاہ دیا کہ مومنوں کے لئے ان کے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں کے معاملہ میں جبکہ وہ ان سے اپنی حاجت پوری کر لیں، کوئی تنگی باقی نہ رہے، اور اللہ کا فیصلہ شدنی تھا)۔

بلاشبہ ''جنسی تعلیم'' حاصل کرنا ہر پہلو سے مضر ہے، اس لئے کہ وہ شہوت بھڑکنے کا ذریعہ ہے، لہذا وہ مفید علم نہیں ہے، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دعا فرماتے تھے: "أعوذ بك من علم لا ينفع" (صحیح مسلم حدیث نمبر: ۲۷۲۲) (الہی! میں تجھ سے ایسے علم سے پناہ مانگتا ہوں جو نفع بخش نہ ہو)۔

اور یہ بات مخفی نہیں کہ بچے اور بچیوں کو جنسی تعلیم دینا اور انہیں صنفی اعضاء کے وظائف کے بارے میں بتانا عقلی اعتبار سے بھی مضر ہے، اس لئے کہ بلوغ کے وقت سے پہلے بلوغ کے بعد ہونے والی تبدیلیوں اور ان تبدیلیوں کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی ضرورتوں کا ادراک عام طور سے انسان کی بے راہ روی کا سبب بنتا ہے، چنانچہ اب خود یورپ میں جنسی تعلیم کے خلاف آواز اٹھنے لگی ہے۔

اور یہ مسلم حقیقت ہے کہ جس طرح بھوک اور پیاس کا احساس فطری ہے، اور اسے بتانے کے لئے کسی تعلیم کی ضرورت نہیں ہے، اسی طرح حضرت آدم علیہ وعلی نبینا الصلاۃ والسلام کے زمانہ سے مرد اور عورت شادی کے بندھن میں بندھتے آرہے ہیں، اور اپنی جائز فطری جنسی خواہشات کی تسکین کررہے ہیں، انہیں اس کی تکمیل کے طریقے کی تعلیم کی ضرورت کبھی محسوس نہیں ہوئی، اس لئے کہ فطری ضروریات اور تقاضوں کو خود انسان سمجھتا ہے، اس کے لئے مستقل تعلیم کی ضرورت محسوس نہیں کرتا ہے۔

اسلام کے اندر زنا، اغلام بازی اور ہم جنس پرستی حرام ہے اور جو چیز ان ممنوعات تک پہنچنے کا ذریعہ بنے وہ بھی حرام ہے، لہذا ''جنسی تعلیم'' حرام ہے کیونکہ وہ جنسی بے راہ روی کا ذریعہ ہے۔

خلاصہ یہ کہ اسلام فسق وفجور، فحش وفحاشی، بے شرمی کی باتوں اور برائیوں کے اظہار کو بھی پسند نہیں کرتا ہے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے: "لا يحب الله الجهر بالسوء من القول إلا من ظلم" (النساء: ۱۴۸) (اللہ بدزبانی کو پسند نہیں کرتا، مگر یہ کہ کوئی مظلوم ہو)۔

اور اللہ تعالی نے ان لوگوں کو دردناک سزا کی وعید سنائی ہے جو چاہتے ہیں کہ مسلم سماج میں برائی پھیل جائے، چنانچہ ارشاد ہے: "إن الذين يحبون أن تشيع الفاحشة في الذين آمنوا لهم عذاب أليم في الدنيا والآخرة" (النور: ۱۹) (بے شک جو لوگ یہ چاہتے ہیں کہ مسلمانوں میں بے حیائی کا چرچا ہو، ان کے لئے دنیا اور آخرت میں دردناک عذاب ہے)۔

البتہ بچے اور بچیوں کو برائی اور بدکاری سے بچانے کے لئے اسلام اخلاقی تعلیم وتربیت کی طرف توجہ دلاتا ہے، اور مردوں اور عورتوں کے درمیان غیر شرعی تعلق کی قباحت کو اجاگر کرتا ہے، اور عفت و پاکدامنی کی تعلیم دیتا ہے، چنانچہ ارشاد الہی ہے: "وليستعفف الذين لا يجدون نكاحاً حتى يغنيهم الله من فضله" (النور: ۳۳) (اور جو لوگ نکاح کرنے کی مقدرت نہیں پارہے ہیں وہ اپنے کو ضبط میں رکھیں، یہاں تک کہ اللہ ان کو اپنے فضل سے غنی کردے)۔

اور نگاہ نیچی رکھنے کی ہدایت دیتا ہے، چنانچہ فرمان الہی ہے: ''قل للمؤمنين يغضوا من أبصارهم ويحفظوا فروجهم ذلك

أزکی لهم إن الله خبیر بما یصنعون. وقل للمؤمنات یغضضن من أبصارهن ویحفظن فروجهن ولا یبدین زینتهن إلی ما ظهر'' (النور: ۳۰-۳۱) (مومنوں کو ہدایت کرو کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں، اور اپنی شرمگاہوں کی پردہ پوشی کریں، یہ طریقہ ان کے لئے پاکیزہ ہے، بے شک اللہ باخبر ہے ان چیزوں سے جو وہ کرتے ہیں، اور مومنہ عورتوں کو کہہ دیجئے کہ وہ بھی اپنی نگاہیں نیچی رکھیں، اور اپنے اندیشہ کی جگہوں کی حفاظت کریں، اور اپنی زینت کی چیزوں کا اظہار نہ کریں، مگر جو ناگزیر طور پر ظاہر ہو جائے)۔

اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا:

"إن النظر سهم من سهام إبلیس مسموم، من ترکها مخافتي أبدلته إیماناً یجد حلاوته في قلبه" (المعجم الکبیر للطبرانی حدیث نمبر: ۱۰۳۶۲، اور اس کی سند میں کلام ہے) (بدنظری ابلیس کے تیروں میں سے ایک زہر آلود تیر ہے (اللہ تعالی فرماتا ہے) جو اسے میرے خوف سے ترک کرے گا میں اسے ایمانی کیفیت سے بدل دوں گا جس کی مٹھاس وہ اپنے دل میں محسوس کرے گا)۔

اور مرد و عورت کے درمیان خلوت نشینی اور اختلاط مذموم سے منع کرتا ہے، چنانچہ حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: "لا یخلون أحدکم بامرأة، فإن الشیطان ثالثهما" (صحیح ابن حبان، حدیث نمبر: ۲۵۴۷، سنن ترمذی حدیث نمبر: ۲۱۶۵، مسند احمد، حدیث نمبر: ۱۱۴، اور اس کی سند صحیح ہے) (تم میں سے کوئی کسی خاتون سے تنہائی میں نہ ملے، کیونکہ شیطان ان دونوں کے درمیان تیسرا فرد ہوتا ہے)۔

اور جائز اور ناجائز جنسی خواہش کی تسکین کی وضاحت کرتا ہے، چنانچہ ارشاد ہے:

"والذین هم لفروجهم حافظون إلا علی أزواجهم أو ما ملکت أیمانهم فإنهم غیر ملومین فمن ابتغی وراء ذلك فأولئك هم العادون" (المؤمنون: ۵-۷) (اور وہ کامیاب مومن اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں، بجز اپنی بیویوں اور رلونڈیوں کی حد تک، سو اس بارے میں ان کو کوئی ملامت نہیں، البتہ جو ان کے سوا کے خواہش مند ہوئے، تو وہی ہیں جو حد سے تجاوز کرنے والے ہیں)۔

جواب نمبر ج:

اخلاقی بگاڑ، جنسی بے راہ روی اور غیر شرعی تعلق سے بچانے کے لئے اسلام والدین، خاندان اور سماج پر زور دیتا ہے کہ وہ لڑکے اور لڑکیوں کے بالغ ہونے کے بعد ان کی جلد شادی کر دیں، چنانچہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

"وابتلوا الیتامی حتی إذا بلغوا النکاح فإن آنستم منهم رشداً فادفعوا إلیهم أموالهم" (النساء: ۶) (اور ان یتیموں کو جانچتے رہو، یہاں تک کہ جب وہ نکاح کی عمر کو پہنچ جائیں، تو اگر تم ان کے اندر سوجھ بوجھ پاؤ، تو ان کا مال ان کے حوالے کر دو)۔

نیز اللہ تعالی کا فرمان ہے:

"وأنکحوا الأیامی منکم، والصالحین من عبادکم وإمائکم إن یکونوا فقراء یغنهم الله من فضله، والله واسع علیم" (النور: ۳۲) (اور اپنی رانڈوں اور رنڈوں اور ذی صلاحیت غلاموں اور لونڈیوں کے نکاح کرو، اگر وہ تنگ دست ہوں گے تو اللہ ان کو اپنے فضل سے غنی کر دے گا، اور اللہ بڑی سمائی رکھنے والا اور علم والا ہے)۔

اور علامہ آلوسی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''أي: زوجوا من لا زوج له من الأحرار والحرائر ''والصالحین من عبادکم وإمائکم'' علی أن الخطاب للأولیاء والسادات.... والأمر هنا قیل للوجوب وإلیه ذهب أهل الظاهر، وقیل للندب، وإلیه ذهب الجمهور'' (روح المعانی ۹/۳۴۲) (یعنی آزاد مرد اور عورتوں اور ذی صلاحیت غلاموں اور لونڈیوں میں سے بے بیاہوں کی شادی کرا دو، اس بنا پر کہ خطاب ولی اور آقاؤں کو ہے...... اور ''امر کا صیغہ'' اس محل میں کہا گیا ہے کہ وجوب کے لئے ہے اور ظاہریہ کا یہی مسلک ہے، اور کہا گیا ہے کہ ''امر کا صیغہ'' ندب واستحباب کے لئے ہے، اور یہی جمہور کا مسلک ہے)۔

اور قرطبی لکھتے ہیں:

''اختلف العلماء فی ہذا الأمر علی ثلاثة أقوال: فقال علماؤنا یختلف الحکم فی ذلک باختلاف حال المؤمن من خوف العنت، ومن عدم صبرہ، ومن قوته علی الصبر، وزوال خشیة العنت عنه، وإذا خاف الهلاک فی الدین أو الدنیا أو فیهما، فالنکاح حتم، وإن لم یخش شیئاً وکانت الحال مطلقة. فقال الشافعی: النکاح مباح، وقال مالک وأبو حنیفة: هو مستحب'' (تفسیر القرطبی ۱۲-۲۳۹)

(اس امر کے سلسلہ میں اہل علم تین اقوال پر مختلف ہوئے ہیں: چنانچہ ہمارے مالکی علماء کا قول ہے کہ مومن کی حالت بدلنے سے اس بارے میں حکم بدلے گا، یعنی زنا کا اندیشہ ہو اور مومن شادی کے بغیر صبر نہ کرسکے (تو نکاح واجب ہوگا)، اور مومن صبر کی قوت رکھتا ہو، اور اسے زنا کا اندیشہ نہ ہو (تو نکاح مستحب ہوگا)، اور اگر مومن کو دین یا دنیا یا دونوں کے اندر تباہی کا اندیشہ ہو تو نکاح لازم ہوگا اور اگر کسی چیز کا اندیشہ نہ ہو، اور عام حالت ہو، تو امام شافعی کا قول ہے کہ نکاح مباح ہے، اور امام مالک اور ابوحنیفہ کا قول ہے کہ نکاح (ایسی حالت میں) مستحب ہے)۔

اور طبری لکھتے ہیں:

'یقول تعالی ذکرہ: زوجوا أیها المؤمنون من لا زوج له من أحرار رجالکم ونسائکم، ومن أهل الصلاح من عبیدکم ومملیککم،،، وعن ابن عباس: أمر الله سبحانه بالنکاح، ورغبهم فیه، وأمرهم أن یزوجوا أحرارهم وعبیدهم، ووعدهم فی ذلک الغنی'' (تفسیر الطبری ۱۹/ ۱۶۵-۱۶۶) (اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، اے مومنو! اپنے مرد اور خواتین اور ذی صلاحیت غلاموں اور لونڈیوں میں سے ان کا نکاح کرا دو جو بے بیوی یا شوہر ہوں اور حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا کہ اللہ سبحانہ نے نکاح کا حکم دیا اور اس کی رغبت دلائی، اور اہل ایمان کو حکم دیا کہ اپنے آزاد اور غلاموں کا نکاح کرا دیں، اور اس سلسلہ میں ان سے مالداری کا وعدہ کیا)۔

اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھرپور جنسی خواہش رکھنے والے جوانوں کو جلد شادی کرنے کی ہدایت دی، جیسا کہ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"یا معشر الشباب من استطاع منکم الباءة فلیتزوج، فإنه أغض للبصر وأحصن للفرج، ومن لم یستطع فعلیه بالصوم، فإنه له وجاء" (صحیح البخاری، حدیث نمبر: ۵۰۶۵، ۵۰۶۶، صحیح مسلم ۱۴۰۰) (اے گروہ جوانان! تم میں سے جسے نان ونفقہ اور جنسی خواہش پوری کرنے کی قوت ہو، وہ شادی کرلے، کیونکہ اس سے نگاہ زیادہ نیچی رہتی ہے، اور شرمگاہ کی زیادہ حفاظت ہوتی ہے، اور جسے قدرت نہ ہو، وہ مسلسل روزہ رکھے کہ وہ اس کی شہوت کو توڑ دے گا)۔

چنانچہ کتاب وسنت کی نصوص سے واضح ہے کہ لڑکے اور لڑکیاں جب بالغ ہوگئے تو وہ نکاح کی عمر کو پہنچ گئے، لہٰذا ان کی شادی جلد کرا دینی چاہئے، جیسا کہ طبری نے فرمان الٰہی: ''جب وہ نکاح کی عمر کو پہنچ جائیں'' کی تفسیر میں لکھا ہے کہ "فإنه یعنی إذا بلغوا الحلم" (جامع البیان ۷/ ۵۷۴-۵۷۵) (اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ بالغ ہو جائیں)۔

خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ولی کی ذمہ داریوں میں سے ایک ذمہ داری یہ قرار دی ہے کہ بالغ ہونے کے بعد وہ اپنی ولایت میں آنے والے بچوں اور بچیوں کا نکاح کردیں، جیسا کہ حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "من بلی من هذہ البنات شیئاً، فأحسن إلیهن، کن له ستراً من النار" (صحیح البخاری، حدیث نمبر: ۵۹۹۵، صحیح مسلم، حدیث نمبر: ۲۶۲۹) (جوان لڑکیوں میں سے کسی لڑکی کے ذریعہ آزمایا جائے، اور وہ ان کے ساتھ بہتر سلوک کرے، تو یہ لڑکیاں جہنم کی آگ سے اس کے لئے ڈھال بن جائیں گی)۔

بلاشبہ اس حدیث میں وارد لفظ ''احسان'' ایک جامع لفظ ہے، جس میں تعلیم وتربیت، شفقت ومحبت اور شادی و بیاہ سب داخل ہیں، چنانچہ ایک روایت میں اس کی صراحت بھی ہے جو حضرت ابوسعید خدریؓ سے مروی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "من عال ثلاث بنات، فأدبهن وزوجهن، وأحسن إلیهن، فله الجنة" (سنن ابی داؤد، حدیث نمبر: ۵۱۴۷، الادب المفرد حدیث نمبر: ۷۹، مسند احمد، حدیث نمبر: ۱۱۹۲۴، اور یہ حدیث صحیح لغیرہ ہے) (جو تین بیٹیوں کی پرورش کرے اور ان کو ادب سکھائے اور ان کا نکاح کردے، اور ان کے ساتھ بہتر سلوک کرے، تو اس کے لئے جنت ہے)۔

اس سے پتہ چلا کہ اسلام کی نگاہ میں پسندیدہ امر ہے کہ لڑکے اور لڑکیوں کا نکاح بالغ ہونے کے بعد کیا جائے، اور بالغ ہونے کے بعد ان کے

نکاح میں جلدی کی جائے، خود قرآن کریم پر غور کرنے سے بھی یہی پتہ چلتا ہے، چنانچہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے: "فانکحوا ما طاب لکم من النساء، مثنی وثلاث ورباع. فإن خفتم ألا تعدلوا فواحدة أو ما ملکت أیمانکم. ذلک أدنی ألا تعولوا" (النساء: ۳) (تو عورتوں میں سے جو تمہیں پسند آئے، ان سے دو دو، تین تین، چار چار تک نکاح کرلو، اور اگر ڈر ہو کہ ان کے درمیان عدل نہ کرسکو گے تو ایک ہی پر بس کرو، یا پھر کوئی لونڈی جو تمہاری ملک میں ہو، یہ طریقہ اس بات کے زیادہ قریب ہے کہ تم انصاف سے نہ ہٹو)۔

اس آیت میں وارد لفظ ''نساء'' ''امرأۃ'' کی جمع ہے، اور اس کا اطلاق بالغہ خاتون پر ہوتا ہے، جیسے ''رجل'' کا اطلاق بالغ مرد پر ہوتا ہے اور احادیث شریفہ سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے، چنانچہ حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ نے نبی کریم ﷺ سے عرض کیا:

"تزوجت امرأة من الأنصار" (صحیح البخاری حدیث نمبر: ۲۰۴۹، صحیح مسلم، حدیث نمبر: ۱۴۲۷) (میں نے ایک انصاریہ بالغہ خاتون سے نکاح کیا)۔

واضح رہے کہ جمہور اہل علم کے نزدیک کمسنی کی شادی صحیح ہے، اور یہی راجح ہے، اس لئے کہ اللہ تعالی نے بے شادی شدہ مرد اور خاتون خواہ بالغ ہوں یا نابالغ ان کا نکاح کرانے کا حکم دیا ہے، چنانچہ ارشاد ہے: "وأنکحوا الأیامی منکم" (النور: ۳۲) (تم میں سے جو مجرد ہوں، ان کے نکاح کردو)۔

امام طبری اس کی تفسیر میں رقمطراز ہیں:

"والأیم یوصف به الذکر والأنثی، یقال: رجل أیم، وامرأة أیم وأیمة، إذا لم یکن لها زوج" (جامع البیان ۱۹/۱۶۵) (''ایم'' مذکر اور مونث دونوں کی صفت کے طور پر مستعمل ہے، کہا جاتا ہے: ''رجل أیم'' (بے شادی شدہ مرد) اور ''امرأۃ أیم'' (بے شادی شدہ عورت)۔

اور ابومنصور محمد ہروی (م: ۳۷۰ھ) لکھتے ہیں:

"والأیم: البکر والثیب" (تہذیب اللغۃ ۱۵/۴۴۶، ط: ۱، دار الاحیاء ۲۰۰۱ء) (''ایم'' کا اطلاق: کنوارے مرد اور عورت اور شوہر اور بیوی دیدہ اور خاتون پر بھی ہوتا ہے)۔

نیز اللہ تعالی نے کمسن شادی شدہ خاتون کی عدت بیان کی ہے، چنانچہ ارشاد ہے: "واللائی یئسن من المحیض من نسائکم إن ارتبتم، فعدتهن ثلاثة أشهر، واللائی لم یحضن" (الطلاق: ۴) (اور تمہاری عورتوں میں جو حیض سے مایوس ہوچکی ہوں، اگر ان کے باب میں شک ہو تو ان کی عدت تین مہینے ہے، اور اسی طرح ان کی بھی جن کو حیض نہ آتا ہو)۔

اس آیت میں اس خاتون کی عدت جس کو کمسنی کی وجہ سے حیض نہ آیا ہو، تین ماہ رکھی گئی ہے، اور یہ عیاں ہے کہ عدت کی ضرورت شادی اور جدائی کے بعد ہی پڑتی ہے۔ اور خود نبی کریم ﷺ کی حضرت عائشہ سے شادی ان کی کمسنی کی حالت میں ہوئی، چنانچہ فرماتی ہیں:

"تزوجني النبي ﷺ وأنا بنت ست سنین، وبنی بي وأنا بنت تسع سنین" (صحیح البخاری حدیث نمبر: ۳۸۹۴، صحیح مسلم ۱۴۲۲) (نبی کریم ﷺ نے مجھ سے نکاح فرمایا جبکہ میری عمر چھ سال تھی، اور مجھ سے خلوت میں ملے جبکہ میری عمر نو سال تھی)۔

لہذا جمہور فقہاء کمسن کی مصلحت کے پیش نظر ولی کو ان کے عقد کا اختیار دیتے ہیں، تاکہ ہمسر جوڑا فوت نہ ہو، لیکن مالکیہ اور حنابلہ کے نزدیک صرف باپ یا اس کا وصی یا حاکم ہی کمسن کی شادی کراسکتا ہے، کیونکہ ان کے اندر بھرپور شفقت ہوتی ہے، اس لئے وہ کمسن بچے اور بچیوں کی مصلحت میں کوئی کوتاہی نہیں کریں گے۔ جبکہ شافعیہ کے نزدیک صرف باپ دادا ہی کمسن بچے اور بچیوں کا نکاح کرسکتے ہیں (ابن رشد، بدایۃ المجتہد ۳/۳۵، شافعی، الام ۵/۱۸۲، ابن قدامہ حنبلی، المغنی ۷/۴۱-۴۹)۔

لیکن حنفیہ کے نزدیک باپ دادا کے ساتھ وراثت کے اندر عصبات کی ترتیب کے مطابق تمام دیگر اولیاء کو بھی کمسن بچے اور بچیوں کے نکاح کا اختیار ہے، اس لئے کہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے: "وإن خفتم ألا تقسطوا في الیتامی" (۴/النساء: ۳) (اور اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ تم یتیموں کے معاملہ میں انصاف نہ کرسکو گے)۔

یعنی یتیموں کے نکاح کے سلسلہ میں تم انصاف نہ کرسکو گے، بلکہ ان پر ظلم کرو گے، تو دیگر عورتوں سے نکاح کرلو، اس سے پتہ چلا کہ یہ آیت اولیاء

کو یتیموں کا نکاح کرانے کا حکم دیتی ہے، چنانچہ امام جصاص رازی حضرت عائشہؓ کا قول نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ھی الیتیمة تکون فی حجر ولیھا، فیرغب فی مالھا وجمالھا، ویرید أن ینکحھا بأدنی من صداقھا، فنھوا أن ینکحوھن إلا أن یقسطوا لھن، وأمروا أن ینکحوا سواھن من النساء" (احکام القرآن ۲-۳۴۱)۔

(وہ یتیم بچی ہے جو اپنے ولی کی حفاظت میں ہوتی ہے، اور وہ اس کے مال و جمال میں راغب ہوتا ہے اور اس سے اس کے مناسب مہر سے کمتر مہر میں نکاح کرنا چاہتا ہے، تو ان اولیاء کو نکاح سے منع کیا گیا، مگر یہ کہ وہ ان کے معاملہ میں انصاف کریں، اور ان کو حکم دیا گیا ہے کہ ان کے سوا دیگر خواتین سے نکاح کرلیں)۔

البتہ ان کے نزدیک باپ دادا اور دیگر اولیاء کے درمیان کچھ فرق ہے، چنانچہ باپ دادا کا کیا ہوا کمسنی کا نکاح لازم ہے، مگر یہ کہ وہ لڑکی اس وجہ سے اس نکاح کو ناپسند کرے کہ باپ دادا نے اس کا نکاح کسی لالچ میں آکر یا لاپرواہی سے کام لے کر یا بدتدبیری کے ساتھ کردیا ہے، یا ولی اعلانیہ فاسق ہے، تو اس کو قاضی کے ذریعہ حق تفریق حاصل ہوگا۔

جبکہ دوسرے اولیاء کا کرایا ہوا نکاح تو درست ہے، لیکن اگر لڑکی اس نکاح پر مطمئن نہ ہو تو بوقت بلوغ اس کو نکاح فسخ کرانے کا حق ہوگا، چنانچہ عام فقہاء احناف نے اس بات کی صراحت کی ہے جیسا کہ مرغینانیؒ لکھتے ہیں:

"یجوز نکاح الصغیر والصغیرة إذا زوجھما الولی بکراً کانت الصغیرة أو ثیباً، والولی ھو العصبة، فإن زوجھما الأب والجد فلا خیار لھما بعد بلوغھما، وإن زوجھما غیر الأب والجد، فلکل واحد منھما الخیار، إذا بلغ، إن شاء أقام علی النکاح وإن شاء فسخ .... ویشترط فیه القضاء" (الہدایہ مع العنایۃ کتاب النکاح ۳/ ۲۷۴-۲۷۸، نیز دیکھئے: الدر المختار مع رد المحتار، کتاب النکاح، باب الولی ۳/ ۶۵-۷۰، الاختیار لتعلیل المختار ۳/ ۹۴، بدائع الصنائع ۲/ ۳۱۵)۔

(کمسن بچہ اور بچی کا نکاح جائز ہے جبکہ ولی ان دونوں کا نکاح کردے، خواہ کمسن بچی کنواری ہو یا شوہر دیدہ، اور ولی عصبہ ہے .... سو اگر ان دونوں کا نکاح باپ یا دادا کردے، تو بلوغ کے بعد ان دونوں کو خیار نہیں ملے گا، اور اگر ان دونوں کا نکاح باپ یا دادا کے سوا کوئی ولی کردے تو دونوں میں سے ہر ایک کو اختیار ملے گا، جبکہ وہ بالغ ہوجائیں، اگر چاہے تو نکاح پر قائم رہے، اور اگر چاہے تو ختم کردے، اور فسخ کرانے کے سلسلہ میں قاضی کا فیصلہ شرط ہے)۔

اور "الدر المختار" میں ہے:

"لم یعرف منھما سوء الاختیار مجانة وفسقاً، وإن عرف لا یصح النکاح اتفاقاً، وکذا لو کان سکران، فزوجھا من فاسق، أو شریر، أو فقیر، أو ذی حرفة دنیة، لظھور سوء اختیاره، فلا تعارضه شفقته المظنونة" (الدر المختار مع رد المحتار ۳/ ۶۷) (باپ دادا کا کیا ہوا نکاح اس وقت لازم ہے جبکہ بے حیائی اور فسق کی وجہ سے دونوں کی بدتدبیری معروف نہ ہو (سو) اگر بدتدبیری معروف ہو تو بالاتفاق نکاح صحیح نہیں، اور ایسے ہی اگر نشہ میں ہو اور فاسق یا شریر یا محتاج یا گھٹیا پیشہ والے سے نکاح کردے، تو اس کی بدتدبیری کے ظاہر ہونے کے سبب سے (نکاح صحیح نہیں ہے) اور جس شفقت کا گمان ہے وہ اس بدتدبیری کی معارض نہیں ہوگی)۔

فقہاء کرام کی ان تصریحات کی قدر کے باوجود ہمیں یہ کہنے میں کوئی حرج نہیں ہے کہ قرآن وحدیث کے عمیق مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ والد کے لئے بچہ اور بچی کی مصلحت کے پیش نظر کمسنی کی حالت میں نکاح کرنے کی گنجائش تو ہے، لیکن یہ پسندیدہ نہیں ہے، اور حق یہ ہے کہ اسلام میں نکاح کی صحیح عمر بلوغ کے بعد ہے، خواہ بلوغ جس عمر میں ہوجائے، اور بلوغ کے بعد جلدی کرنی چاہئے، جیسا کہ حضرت ابوسعید خدری اور ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"من ولد له ولد فلیحسن اسمه وأدبه، فإذا بلغ فلیزوجه، فإن بلغ ولم یزوج فأصاب إثماً فإنما إثمه علی أبیه" (شعب الایمان للبیہقی حدیث نمبر: ۸۲۹۹، اور اس کی سند میں کچھ کلام ہے) (جسے بچے ہو تو اس کا اچھا نام رکھے اور اس کی اچھی تربیت کرے، پھر جب بالغ ہوجائے تو اس کی شادی

کردے، سوا گر وہ بالغ ہوجائے، اور وہ اس کی شادی نہ کرے اور وہ گناہ کا مرتکب ہوجائے، تو اس کا گناہ اس کے باپ پر ہوگا)۔

اور یہ واضح ہے کہ باپ گنہگار اپنی ذمہ داری نہیں نبھانے کی وجہ سے ہے، کیونکہ اس کی ذمہ داری تھی کہ بالغ ہونے کے فوراً بعد نکاح کا انتظام کرے۔

جواب نمبر: د: (۱):

بچہ مزدوری کے بارے میں اسلام کا موقف:

اسلامی نقطۂ نظر سے بچہ مزدوری حرام ہے، اس کے دلائل درج ذیل ہیں:

۱۔ انسانی زندگی کے مختلف مراحل میں سے بچپن کا مرحلہ انتہائی اہم ہے، کیونکہ فرد کی شخصیت کی تشکیل کا آغاز اسی مرحلہ سے ہوجاتا ہے، اور اسی مرحلہ میں وہ اپنی خوابیدہ صلاحیت کو اجاگر کرکے مستقبل کے کردار کا اہل بنتا ہے، چنانچہ قرآن کریم نے اس مرحلہ میں بچہ کی صحیح تعلیم وتربیت کو لازم قرار دیا ہے، تاکہ وہ جہنم کی آگ سے بچ جائے، جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے: "یا أیها الذین آمنوا قوا أنفسکم وأهلیکم ناراً وقودها الناس والحجارة" (التحریم: ۶) (اے ایمان والو! اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو اس آگ سے بچاؤ، جس کے ایندھن آدمی اور پتھر ہوں گے، اور اس کی تفسیر میں امام قرطبی رقمطراز ہیں:

''اور بعض اہل علم کا قول ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''اپنے آپ کو بچاؤ''، تو اس خطاب میں اولاد شامل ہوگئی، اس لئے کہ اولاد اس کا جزو ہیں.... لہٰذا اولاد کو حلال وحرام سکھائے گا، اور انہیں معصیت اور گناہوں سے بچائے گا، اور دیگر احکام سکھائے گا، اور قشیری نے بیان کیا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی، تو حضرت عمرؓ نے پوچھا اے اللہ کے رسول، ہم اپنے آپ کو بچاتے ہیں، سو اپنے اہل وعیال کو کس طرح بچائیں، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا: ''تم ان کو ان امور سے روکو، جن سے اللہ تعالیٰ نے تم کو روکا ہے، اور ان باتوں کا ان کو حکم دو، جن کا اللہ نے حکم دیا ہے ......اور کیا ہراس کا قول ہے کہ: ہم پر لازم ہے کہ اپنی اولاد اور گھر والوں کو دین اور نیکی کی تعلیم دیں، اور عمدہ اطوار واخلاق کی تعلیم دیں، جن سے بے نیازی نہیں برتی جاسکتی ہے'' (قرطبی، الجامع لاحکام القرآن ۱۸/ ۱۹۵-۱۹۶)۔

اس سے معلوم ہوا کہ بچپن کے مرحلہ میں باپ کی اصل ذمہ داری ہے کہ اولاد کو ضروری دینی تعلیم دے، صحیح اسلامی نہج پر اس کی تربیت کرے، اور باعزت زندگی گزارنے کا اہل بنائے، چنانچہ تعلیم وتربیت کے اصل مرحلہ میں باپ یا گارجین اسے مزدور بنادے، تو وہ مستقبل میں باعزت زندگی گزارنے کے لائق ہی کہاں رہے گا؟

۲۔ گارجین کی ذمہ داری ہے کہ بچے اور بچیوں کو ایسی تعلیم وتربیت سے آراستہ کریں کہ وہ مستقبل میں سماج کے بہتر فرد، نیک اور باصلاحیت ممبر بن سکیں، باپ یا کوئی ولی اگر اس کی ذمہ داری میں کوتاہی برتتا ہے تو وہ امانت میں خیانت کرتا ہے، اور امانت میں خیانت کرنا حرام ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"یا أیها الذین آمنوا لا تخونوا الله والرسول وتخونوا أماناتکم وأنتم تعلمون" (الانفال: ۲۷) (اے ایمان والو! اللہ ورسول سے بے وفائی اور اپنی امانتوں میں خیانت جانتے بوجھتے نہ کرو)۔

اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: "إن الله یأمرکم أن تؤدوا الأمانات إلی أهلها" (النساء: ۵۸) (اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے حق داروں کو ادا کرو)۔

اور اس کی تفسیر میں امام قرطبی رقمطراز ہیں: "فالآیة شاملة بنظمها لکل أمانة، وهی أعداد کثیرة" (تفسیر القرطبی ۵/ ۲۵۷) (لہٰذا آیت اپنے نظم ولفظ کے ساتھ ہر امانت کو شامل ہے، اور اس کی بہت سی قسمیں ہیں)۔

اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "أد الأمانة إلی من ائتمنك، ولا تخن من خانك" (سنن ترمذی حدیث نمبر: ۱۲۶۴، اور اس کی سند حسن درجہ کی ہے) (امانت اس کے حوالہ کرو جس نے تجھے امانت دی ہے، اور جو تیرے ساتھ خیانت کرے اس کے ساتھ خیانت نہ کرو)۔

اور اس میں شک نہیں ہے کہ اولاد والدین کے پاس اللہ تعالیٰ کی امانت ہیں، اور اس امانت میں خیانت اسی طرح حرام ہے جس طرح دیگر امانتوں میں خیانت حرام ہے، اور بلاشبہ اولاد کی صحیح تعلیم وتربیت کی جگہ ان کے معصوم بچپن کو برباد کرنا اللہ تعالیٰ کی امانت میں خیانت ہے۔

۳۔ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "الرجل راع علی أهل بيته وهو مسؤول عن رعيته والمرأة راعية على أهل بيت زوجها وولده وهي مسؤولة عنهم" (صحیح البخاری حدیث نمبر: ۲۸۰۳، صحیح مسلم ۱۸۲۹) (مرد اپنے گھر والوں کا نگراں ہے اور وہ اپنے ماتحتوں کے بارے میں جوابدہ ہے، اور عورت اپنے شوہر کے گھر والوں اور اس کی اولاد کی نگراں ہے، اور اس سے اس کے بارے میں پوچھا جائے گا)۔

اس حدیث سے پتہ چلا کہ گارجین کی ذمہ داری ہے کہ بچہ کی صحیح تعلیم وتربیت کریں اور اولاد کے معصوم بچپن کو ضائع نہ کریں، اور ان کو مزدوری میں لگا کر جسمانی، عقلی، اور نفسیاتی وجذباتی اذیت میں مبتلا نہ کریں، چنانچہ خطابی کے حوالے سے ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں:

"ورعاية الرجل أهله سياسته لأمرهم وإيصاليهم حقوقهم، ورعاية المرأة تدبير أمر البيت والأولاد والخدم، والنصيحة للزوج في كل ذلك" (فتح الباری ۱۳؍ ۱۱۳، بیروت، دار المعرفہ ۱۳۷۹ھ) (اور مرد کی اپنے گھر والوں کی نگرانی ان کے معاملات کا انتظام کرنا اور ان کے حقوق پہنچانا ہے، اور عورت کی نگہبانی گھر، اولاد اور خدام کے معاملات کا انتظام کرنا ہے، اور ان تمام امور میں شوہر کی خیر خواہی کرنا ہے)۔

۴۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "إن من حق الولد على الوالد أن يعلمه الكتابة وأن يحسن اسمه وأن يزوجه إذا بلغ" (ابن نجار، بحوالہ "ضعیف الجامع الصغیر وزیادتہ" حدیث نمبر: ۲۰۰۵، اور اس کی سند میں کلام ہے) (اپنے باپ پر بچہ کا حق یہ ہے کہ اسے لکھائی سکھائے، اور اس کا اچھا نام رکھے، اور وہ جب بالغ ہو جائے تو اس کی شادی کر دے)۔

اور حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "حق الولد على الوالد أن يحسن اسمه ويحسن من مرضعه ويحسن أدبه" (شعب الایمان للبیہقی حدیث نمبر: ۸۳۰۰، اور اس کی سند میں کچھ کلام ہے) (اپنے باپ پر بچہ کا یہ حق ہے کہ اس کا اچھا نام رکھے، اس کے لئے بہتر ماں کا انتخاب کرے، اور اس کی اچھی تربیت کرے)۔

اور حضرت ابورافعؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "حق الولد على الوالد أن يعلمه الكتابة والسباحة والرمي وأن يورثه طيبا" (السنن الکبریٰ للبیہقی حدیث نمبر: ۱۹۵۲۶، شعب الایمان للبیہقی حدیث نمبر: ۸۲۹۸، اور اس کی سند میں کلام ہے) (باپ پر بچہ کا حق یہ ہے کہ اسے لکھائی، تیراکی اور تیر اندازی سکھائے، اور اسے پاکیزہ مال کا وارث بنائے)۔

ان احادیث شریفہ سے پتہ چلا کہ باپ کی ذمہ داری ہے کہ اولاد کو زیور تعلیم وتربیت سے آراستہ کرے، لہٰذا ان کو تعلیم دینے کے بجائے مزدور بنانا درست نہیں ہے۔

۵۔ عقلی اعتبار سے بھی بچہ مزدوری میں بڑی قباحتیں ہیں، چنانچہ اس سے بچے کی صحت متاثر ہو جاتی ہے، اس کی جسمانی اور دماغی نشو ونما صحیح طور پر نہیں ہو پاتی ہے، پر مشقت کام کی وجہ سے ان کی قوت سماعت اور بصارت پر برا اثر پڑتا ہے، تعلیم سے دور ہونے کی وجہ سے بچہ سوچنے سمجھنے، اختراع اور ایجاد کی قوت سے محروم ہو جاتا ہے، لکھنے پڑھنے کی خوابیدہ صلاحیت کم ہونے لگتی ہے، اپنے خاندان سے کٹنے کی وجہ سے اس کے اندر سنگدلی اور تلخی پیدا ہو جاتی ہے، اور سماج سے دور ہونے کی وجہ سے صحیح اور غلط میں تمیز کرنے کی صلاحیت سے وہ محروم ہو جاتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ اسلامی شریعت میں بچہ مزدوری حرام ہے، اور اس سماجی لعنت کو ختم کرنے کے لئے اسلام حکومت اور سماج پر زور دیتا ہے کہ مساوات اور سماجی انصاف کے ذریعہ فقر وافلاس میں کمی لانے کی کوشش کی جائے، خاندانوں کی ذہن سازی کی جائے، غریب بچوں کی تعلیم وتربیت پر خصوصی توجہ دی جائے، مدارس اور اسکولز کے نظام میں سدھار پیدا کیا جائے، اور اساتذہ و معلمین کے طرز میں تبدیلی لائی جائے، تاکہ بچوں کے اندر تعلیم کی رغبت پیدا ہو۔

(۲): (الف):

والدین یا اولیاء نابالغ بچے اور بچیوں سے اپنے گھر کا کام اس حد تک لے سکتے ہیں، جو عرف میں ان کی تربیت کا حصہ سمجھے جاتے ہوں، اور اس کام کی وجہ سے ان کو کوئی شدید مضرت یا مشقت لاحق نہ ہوتی ہو، اور اس بات کی صراحت عام طور سے فقہاء نے کی ہے، چنانچہ علامہ شامی ''جامع الفصولین'' کے حوالہ سے لکھتے ہیں:

"وللأب أو الجد أو الوصی استعماله بلا عوض بطریق التهذیب والریاضة" (ردالمحتار ۶؍۴۴۰) (اور باپ یا دادا یا وصی کو اختیار ہے کہ تربیت اور شائستہ بنانے کے طور پر بچہ سے مفت کام لے)۔

اور ضابطہ ہے کہ جس چیز کی تحدید و تعیین کتاب وسنت میں وارد نہ ہو، اس کے سلسلہ میں عرف معیار ہوتا ہے، لہٰذا جو کام عرف میں تربیت کا حصہ ہو، اسے کرانے میں کوئی حرج نہیں ہے، البتہ یہ ضروری ہے کہ کام لیتے وقت ان کے ساتھ نرمی اور شفقت کا رویہ اختیار کیا جائے، چنانچہ حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "إن الله رفیق یحب الرفق، ویعطی علی الرفق ما لا یعطی علی العنف" (صحیح مسلم حدیث نمبر: ۲۵۹۳) (یقیناً اللہ تعالیٰ مہربان ہے، نرمی کو پسند کرتا ہے، اور نرمی پر جو نوازتا ہے، وہ سختی پر نہیں نوازتا ہے)۔

(ب): والدین یا اولیاء کے لئے جائز نہیں ہے کہ اپنی معاشی ضروریات پوری کرنے یا بہتر بنانے کے لئے بچوں سے مزدوری کرائیں، دلائل درج ذیل ہیں:

۱۔ بچہ کے کھانے پینے اور رہائش کا انتظام بچہ کے باپ، اور اس کے نہ ہونے کی صورت میں دیگر وارثین پر ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "وعلی المولود له رزقهن و کسوتهن بالمعروف. لا تکلف نفس إلا وسعها. لا تضار والدة بولدها ولا مولود له بولده وعلی الوارث مثل ذلك" (البقرہ: ۲۳۳) (اور بچے والے کے ذمہ بچوں کی ماؤں کا دستور کے مطابق کھانا اور کپڑا ہے، کسی پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہ ڈالا جائے، نہ کسی ماں کو اس کے بچے کے سبب سے نقصان پہنچایا جائے، اور نہ کسی باپ کو اس کے بچہ کے سبب سے، اور اسی طرح کی ذمہ داری وارث پر بھی ہے)۔

اور اس کی تفسیر میں امام جصاص رازی رقمطراز ہیں:

''کذلك حکمه فی سائر ما یلزمه من نفقة الأولاد الصغار والکبار الزمنی، یختص و بإیجابه علیه دون مشارکة غیره فیه لدلالة الآیة علیه .... وقال زید بن ثابت: النفقة علی الرجال والنساء علی قدر مواریثهم، وهو قول أصحابنا'' (احکام القرآن ۱؍۴۸۹۔۴۹۳) (ایسے ہی باپ کا حکم دیگر تمام واجبات کے سلسلہ میں ہے جیسے نابالغ بچے اور بالغ اپاہج و معذورین بچے کے نفقہ کا وجوب خاص اسی پر ہے، اس سلسلہ میں دوسرا اس کا شریک نہ ہوگا اس لئے کہ آیت اسی بات پر دلالت کرتی ہے......اور باپ نہ ہونے کی صورت میں زید کا قول ہے کہ نفقہ مردوں اور خواتین پر ان کی میراث کے بقدر ہوگا، اور یہی ہمارے علماء احناف کا قول ہے)۔

نیز لکھتے ہیں: "ومن حیث وجب علی الأب. أی نفقة الطفل. وهو ذو رحم محرم. وجب علی من هو بهذه الصفة. الأقرب فالأقرب لهذه العلة" (احکام القرآن ۱؍۴۹۳) (چونکہ باپ پر بچہ کا نفقہ واجب ہے، جبکہ وہ ذو رحم محرم ہے، تو جو بھی اس حیثیت کا ہوگا اس پر نفقہ اسی علت کی وجہ سے واجب ہوگا، ترتیب وار قریب تر پر پہلے واجب ہوگا پھر جو اس کے بعد قریب تر ہوگا اس پر واجب ہوگا)۔

اور امام کاسانی لکھتے ہیں: "ولا یشارك الجد أحد فی نفقة ولد ولده عند عدم ولده؛ لأنه یقوم مقام ولده عند عدمه" (بدائع الصنائع ۴؍۳۳) (اور باپ نہ ہونے کی صورت میں دادا کے ساتھ پوتوں کے نفقہ میں کوئی شریک نہ ہوگا اس لئے کہ بیٹا کی عدم موجودگی میں دادا اس کا قائم مقام ہوتا ہے)۔

یعنی جس طرح باپ تنہا اپنی نابالغ اولاد کے نفقہ کا ذمہ دار ہوتا ہے، اسی طرح دادا بھی تنہا ان کے نفقہ کا ذمہ دار ہوگا۔

۲۔ دلیل دوم: باپ محتاج ہو، لیکن کمانے پر قادر ہو، پھر بھی نابالغ کا نفقہ اس پر واجب ہوگا، اور اس کے لئے ضروری ہوگا کہ کما کر ان پر خرچ

کرے، چنانچہ علامہ کاسانی لکھتے ہیں:

"وإن كان الأب معسراً بعد أن كان قادراً على الكسب؛ لأن الإنفاق عليهم عند حاجتهم وعجزهم عن الكسب إحياؤهم، وإحياؤهم إحياء نفسه لقيام الجزئية والبعضية، وإحياء نفسه واجب" (بدائع الصنائع ۴/۳۵) (خواہ باپ محتاج ہو جبکہ کمانے پر قادر ہو، تو نابالغ بچوں، اپاہج محتاج بالغ بچوں اور محتاج بچیوں کا نفقہ اس پر واجب ہے، اس لئے کہ ان کے محتاج اور کمانے سے عاجز ہونے کے وقت ان پر خرچ کرنا ان کو زندہ کرنا ہے، اور ان کو زندہ کرنا خود اپنی ذات کو زندہ کرنا ہے، اس لئے کہ جزئیت قائم ہے (یعنی بیٹا باپ کا جز اور حصہ ہوتا ہے) اور اپنی ذات کو زندہ برقرار رکھنا واجب ہے)۔

۳۔ ہر ولی پر نابالغ ذی رحم محرم بچہ کا نفقہ واجب ہے، اسی طرح ذی رحم محرم بچی کا خواہ بالغ اور تندرست ہو۔

''درمختار'' میں ہے:

''اور ہر نابالغ محرم رشتہ دار کا نفقہ واجب ہے، اسی طرح رشتہ دار محرم خاتون کا بغیر تفصیل کے، خواہ خاتون بالغ اور صحتمند ہو، یا مرد بالغ ہو، لیکن اپاہج پن یا کم عقلی یا فالج گرنے جیسے مرض کی وجہ سے کمانے سے عاجز ہو یا اناڑی پن کی وجہ سے اچھی طرح نہ کما سکتا ہو، یا شریف واعلی خاندان سے ہونے کی وجہ سے، یا محتاج طالب علم ہو کہ اس کے لئے صدقہ حلال ہو، خواہ اس کے پاس گھر اور خادم موجود ہو، اور نفقہ کا وجوب میراث کے بقدر ہوگا، اور اسی وجہ سے نفقہ دینے پر مجبور کیا جائے گا'' (الدر المختار ۳/ ۶۲۷-۶۲۹)۔

البتہ بالغہ خاتون عملاً کمار ہی ہو تو اس کا نفقہ واجب نہ ہوگا، جیسا کہ ''ردالمحتار'' میں ہے:

''لیکن خاتون اگر عملاً کمار ہی ہو جیسے دایہ اور غسل دلانے والی ہو، تو اس کا نفقہ واجب نہ ہوگا، اور اگر ان اعذار کے باوجود کمائے اور نفقہ دیئے جانے سے بے نیاز ہو جائے، تو اس کا نفقہ واجب نہیں ہوگا، ورنہ کمانے کا پابند نہیں کیا جائے گا، اس لئے کہ یہ اعذار عام طور سے کمانے سے روکتے ہیں، لہذا کمانے کا پابند نہیں بنایا جائے گا'' (ردالمحتار ۳/ ۶۲۷-۶۲۸)۔

عام طور سے فقہاء نے محرم رشتہ دار ولی پر نفقہ واجب ہونے کے لئے کمانے پر قادر نہ ہونے کی شرط لگائی ہے، جیسا کہ کاسانی لکھتے ہیں:

"والثاني: عجزه عن الكسب ......حتى لو كان صحيحاً مكتسباً لا يقضى له بالنفقة على غيره" (البدائع ۴/۳۵) (اور دوسری شرط: کمانے سے اس کا عاجز ہونا ہے، یہاں تک کہ اگر تندرست اور کمانے پر قادر ہو تو دوسرے شخص پر اس کے نفقہ کا فیصلہ نہیں کیا جائے گا)۔

لیکن میرے نزدیک اس کا محل ضروری دینی اور عصری تعلیم کے بعد کمانے پر قدرت ہے۔

(ج): ضروری دینی تعلیم اور عصری تعلیم اس حد تک دلانے کے بعد کہ وہ مستقبل میں استحصال (Exploitation) کا شکار نہ ہو، اسے کسی پیشہ ورانہ کام سکھانے کے لئے کام سے لگا سکتے ہیں، چنانچہ علامہ شامی رقمطراز ہیں:

"فله دفعها لامرأة تعلمها حرفة كتطريز وخياطة مثلاً" (ردالمحتار ۳/ ۶۱۲) (سو باپ کو حق ہے کہ بچی کو ایسی خاتون کے حوالہ کرے جو اسے کوئی پیشہ مثال کے طور پر کشیدہ کاری اور سلائی سکھادے)۔

اور جب بچی کو پیشہ ورانہ کام سکھانے کی گنجائش ہے، تو بچے کو بدرجہ اولی ہوگی۔ اور خطیب شربینی شافعی لکھتے ہیں:

''اگر لڑکا ماں کو اختیار کرے، تو رات میں اس کے پاس رہے گا، اور دن میں باپ کے پاس، جو اسے اس کے مناسب حال، دین ودنیا کی تعلیم دے گا، اور ادب سے آراستہ کرے گا، اور مکتب (وہ جگہ جہاں بچے تعلیم حاصل کرتے ہیں) اور پیشہ ور کے حوالہ کرے گا، مکتب سے وہ تحریر اور پیشہ ور سے اپنے حسب حال پیشہ کا علم حاصل کرے گا'' (مغنی المحتاج ۵/ ۲۰۰)۔

(۳): بچہ مزدوری اس وقت تک ختم نہیں ہو سکتی ہے جب تک کہ سماج اور حکومت اپنی ذمہ داری محسوس نہ کریں، اور غریبوں کی کفالت میں سرگرمی نہ دکھائیں، چنانچہ اسلامی حکومت کے اندر ایسی حالت میں ایسے بدحال لوگوں کی مدد بیت المال کرتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

"وتعاونوا على البر والتقوى" (المائدہ: ۲) (نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کرو)۔

اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"أنا أولى المؤمنين من أنفسهم، فمن مات وعليه دين، ولم يترك وفاء، فعلينا قضاؤه، ومن ترك مالا فلورثته" (صحیح البخاری حدیث نمبر: ۲۲۹۸، ۲۳۹۸، ۶۷۳۱، صحیح مسلم ۱۶۱۹) (میں اہل ایمان سے ان کی جانوں سے زیادہ قریب ہوں، سو جو مر جائے، اور اس کے ذمہ دین ہو، اور ادائیگی کا مال نہ چھوڑا ہو، تو ہمارے ذمہ اسے ادا کرنا ہے، اور جو مال چھوڑ اجائے، تو وہ مال اس کے ورثہ کا ہے)۔

اور اس کی شرح میں حافظ ابن حجرؒ رقمطراز ہیں:

"وهل كان ذلك من خصائصه، أو يجب على ولاة الأمر بعده، والراجح الاستمرار، لكن وجوب الوفاء إنما هو من مال المصالح" (فتح الباری ۱۲/ ۱۵) (اور کیا یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت تھی یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کے حکمرانوں پر بھی واجب ہے؟ راجح یہی ہے کہ یہ بعد کے حکام پر بھی واجب ہے، لیکن ادائیگی کا وجوب عام لوگوں کے لئے مخصوص کردہ مال سے ہوگا)۔

اس سے پتہ چلا کہ سماج اور حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ بدحالوں اور غریبوں کی سماجی کفالت کریں، اسی لئے علامہ قرطبیؒ نے اللہ تعالیٰ کے ارشاد: ''نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کرو'' کی تفسیر میں لکھا ہے کہ اس میں تمام مسلمانوں سے خطاب کیا گیا ہے کہ ان کے درمیان نیکی اور تقویٰ کے امور میں باہمی مدد واجب ہے جس کی مختلف شکلیں ہیں:

"فواجب على العالم أن يعين الناس بعلمه فيعلمهم، ويعينهم الغني بماله" (الجامع لاحکام القرآن ۶/ ۴۷) (چنانچہ عالم پر واجب ہے کہ وہ اپنے علم کے ذریعہ لوگوں کی مدد کرے سو ان کو علم سکھائے اور مالدار اپنے مال کے ذریعہ لوگوں کی مدد کرے)۔

لیکن اس گئے گذرے دور میں جبکہ ہر ایک کو صرف اپنی اور اپنے اہل وعیال کی فکر ہے، اور محرم رشتہ داروں تک کا خیال نہ رہا، تو ایسی مجبوری اور ناگفتہ بہ حالت میں ایسے غریب اور بدحال اور کمانے سے معذور والد کے لئے گنجائش ہے کہ وہ اپنے نابالغ بچوں کو مزدوری پر لگا کر اپنی روزی حاصل کریں، چنانچہ فقہاء کے مندرجہ ذیل عبارتوں کا مصداق میرے نزدیک ایسی ہی حالت ہے، جیسے ''ہندیہ'' میں ہے:

"وفي النوازل سئل عن رجل له أجير غير مدرك، هل له أن يؤدبه إذا رأى منه بطالة، قال: لا، إلا أن يكون أبوه قد أذن له في ذلك" (عالمگیری، کتاب الکراہیہ، الباب الثانی والثلاثون فی المتفرقات ۴/ ۵۲۸) (''النوازل'' میں ہے کہ ایک شخص کے بارے میں پوچھا گیا، جس کے پاس نابالغ مزدور ہے، کیا وہ اس کی کام چوری دیکھ کر اسے سزا دے سکتا ہے؟ تو جواب دیا: نہیں، مگر یہ کہ اس کے باپ نے اس کی اجازت دی ہو)۔

اور جیسے ''الدر المختار ورد المحتار'' میں ہے:

''اور جب بیٹے کمانے کی حد کو پہنچ جائیں، یعنی بالغ مرد ہونے سے پہلے، کیونکہ بالغ ہونے کے بعد باپ ان کو کام پر مجبور نہیں کرسکتا ہے، تو باپ ان کو کام کے حوالہ کرے گا تا کہ وہ کمائیں، یا ان کو مزدوری پر لگائے گا، اور ان کی اجرت سے ان پر خرچ کرے گا، برخلاف لڑکیوں کے، اور اگر باپ فضول خرچ ہو تو بیٹے کی آمدنی قابل اعتماد شخص کے حوالہ کی جائے گی، جیسا کہ یہی حال دیگر املاک کا ہے'' (الدر المختار مع رد المحتار ۳/ ۵۶۹)۔

اور جیسے ابن نجیمؒ لکھتے ہیں: ''اور اگر باپ مالدار ہو، اور نابالغ بچہ محتاج ہو، تو باپ پر نفقہ واجب ہے، یہاں تک کہ لڑکا کمانے کی حد کو پہنچ جائے، خواہ بالغ نہ ہو، تو جب یہ حالت ہو، تو باپ کو حق ہے کہ اسے مزدوری پر لگائے، اور اس پر اس کی اجرت میں سے خرچ کرے، اور لڑکی میں اس کو یہ اختیار نہیں ہے'' (البحر الرائق ۴/ ۲۱۹)۔

اور جیسے علامہ شامی تحریر فرماتے ہیں: ''نابالغ بچہ کا نفقہ واجب ہے اگر وہ کمائی کی حد کو نہ پہنچے، سو اگر وہ کمائی کی حد کو پہنچ جائے تو باپ کو حق ہے کہ اسے مزدوری پر لگائے، یا اسے پیشہ کے سیکھنے کے سلسلہ میں حوالہ کرے، تا کہ وہ کمائے، اور اس پر اس کی کمائی سے خرچ کرے، اگر وہ لڑکا ہے، برخلاف لڑکی کے.... خیر رملی کا قول ہے کہ اگر لڑکی سلائی اور سوت کاتنے جیسے چیز کی وجہ سے بے نیاز ہو جائے، تو واجب ہے کہ اس کا نفقہ اس کی کمائی میں ہو، جیسا کہ یہ ظاہر ہے.... (کیونکہ) ممنوع اس کو خدمت وغیرہ کے لئے مزدوری پر لگانا ہے، جس میں اسے مزدوری پر رکھنے والے کے حوالہ

کرنے کی ضرورت ہے، فقہاء کے اس قول کی دلیل سے کہ مزدوری پر لینے والا اس سے تنہائی میں ملے گا، اور یہ شریعت میں جائز نہیں، اور بنا بریں باپ کو حق ہے کہ بچی کو ایسی خاتون کے حوالہ کرے جو اسے ہنر مثال کے طور پر کشیدہ کاری اور سلائی سکھادے" (رد المحتار ۳/ ۶۱۲)۔

البتہ اگر بچہ ضروری دینی تعلیم اور باعزت زندگی گزارنے کے لئے مطلوب عصری علم حاصل کرے، اور باپ محتاج ہو، گو کمانے پر قادر ہو، تو بچہ کو باپ کی مدد کرنی چاہئے، اس لئے کہ باپ کو محنت و مشقت پر مجبور کرنا مناسب نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اف تک کہنے سے منع کیا ہے، جیسا کہ ارشاد ہے: "فلا تقل لهما أف ولا تنهرهما" (اسراء: ۲۳) (تو نہ ان کو اف کہو اور نہ ان کو جھڑکو)۔

اور یہ واضح ہے کہ ان کو محنت و مشقت کے حوالہ کرنے میں زیادہ اذیت اور تکلیف ہے، لہٰذا بیٹا ضروری دینی اور عصری تعلیم حاصل کرنے کے بعد کمانے پر قادر ہے تو اس پر لازم ہے کہ کما کر باپ پر خرچ کرے، جیسا کہ ابن نجیم رقمطراز ہیں:

"فلو كان كل منهما كسوبا يجب أن يكتسب الابن وينفق على الأب. فالمعتبر في إيجاب نفقة الوالدين مجرد الفقر. قيل: هو ظاهر الرواية" (البحر الرائق، کتاب النکاح، باب النفقہ ۴/ ۲۲۴، نیز دیکھئے: تبیین الحقائق ۳/ ۶۳، درر الحکام ۱/ ۴۱۹، الدر المختار مع رد المحتار ۳/ ۶۲۳) (سو اگر باپ بیٹا دونوں میں سے ہر ایک کمانے پر قادر ہو تو بیٹے پر کمانا اور باپ پر خرچ کرنا واجب ہے، چنانچہ والدین کے نفقہ کے وجوب کے سلسلہ میں محض محتاجی کا اعتبار ہے، کہا گیا ہے کہ یہی ظاہر الروایہ ہے)۔

اور محقق ابن الہمام لکھتے ہیں: "مالداری کا اندازہ نصاب زکوۃ کے ساتھ ہے.... جبکہ لڑکا کمانے والا نہ ہو، تو اس بات کا اعتبار ہوگا کہ اس کے پاس نصاب کے بقدر زائد مال ہو، تا کہ اس پر نفقہ واجب ہو...... اور اگر کمانے والا ہو تو امام محمد کے قول کا اعتبار ہے، یعنی مالداری اس مال کے ساتھ مقدر ہوگی جو اس کی اپنی ذات اور اہل وعیال کے روزانہ کے خرچ سے زائد ہو، اس لئے کہ بندوں کے حق میں قدرت کا اعتبار ہے نہ کہ نصاب کا، اور فتوی دینے کے سلسلہ میں اسی پر اعتماد کرنا چاہئے" (فتح القدیر ۴/ ۴۲۳)۔

یہاں تک کہ اگر ماں باپ دونوں محتاج ہوں، اور باپ کو بیوی کی ضرورت نہ ہو، پھر بھی دونوں کا نفقہ لڑکے پر واجب ہے، علامہ شامی لکھتے ہیں:

"فالظاهر وجوب نفقة الأم عليه، ولو لم يكن الأب محتاجاً إليها لقولهم: لا يشارك الولد في نفقة أبويه أحد" (رد المحتار ۳/ ۶۱۶)

(سو بہ ظاہر ماں کا نفقہ بھی لڑکے پر واجب ہوگا، خواہ باپ کو اس کی ضرورت نہ ہو، اس لئے کہ فقہاء کہتے ہیں کہ اپنے والدین کے نفقہ کے سلسلہ میں اولاد کے ساتھ کوئی دوسرا شریک نہ ہوگا)۔

(۵): تمام جرائم مثلاً: قتل، غارت گری، چوری اور زنا کی سزا جاری کرنے کے لئے بلوغ شرط ہے، اس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے، اس لئے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "رفع القلم عن ثلاثة: عن الصبي حتى يبلغ، وعن النائم حتى يستيقظ، وعن المجنون حتى يفيق" (سنن ابی داؤد، حدیث نمبر: ۴۳۹۹، اور اس کی سند صحیح ہے) (قلم تین اشخاص سے اٹھالیا گیا ہے: بچہ سے یہاں تک کہ بالغ ہو جائے، اور سوتے سے یہاں تک کہ بیدار ہو جائے، اور دیوانہ سے یہاں تک کہ اس کی دیوانگی دور ہو جائے)۔

اور کاسانی رقمطراز ہیں: "الصبي والمجنون إذا وطئ امرأة أجنبية لا حد عليه؛ لأن فعلهما لا يوصف بالحرمة، فلا يكون الوطء منهما زنا" (بدائع الصنائع، کتاب الحدود ۷/ ۳۴) (بچہ یا دیوانہ اگر کسی اجنبی عورت سے وطی کرے، تو اس پر حد جاری نہیں ہوگی، اس لئے کہ ان کا فعل حرمت سے متصف نہیں ہوتا ہے، لہٰذا ان کی جانب سے ہونے والی وطی زنا نہیں)۔

اور "درمختار" میں ہے: "بشرط كون القاتل مكلفاً، لما تقرر أنه ليس لصبي ومجنون عمد" (الدر المختار ۶/ ۵۳۲) (قصاص قاتل کے عاقل بالغ ہونے کی شرط کے ساتھ جاری ہوگا، اس لئے کہ یہ بات ثابت ہے کہ بچہ اور دیوانہ سے قتل عمد کا تحقق نہیں ہوتا ہے)۔

اور شیرازی شافعی لکھتے ہیں: "ولا يجب. أي القطع. على صبي ومجنون" (المہذب، کتاب الحدود، باب حد السرقہ ۳/ ۳۵۴) (بچہ اور دیوانہ کا ہاتھ کاٹنا واجب نہیں)۔

دور حاضر میں نابالغوں میں پھیلتے ہوئے جرائم کے رجحان سے حکومتوں کا پریشان ہونا قدرتی بات ہے، کیونکہ موجودہ تمام حکومتیں ایک طرف

جرائم کا ماحول بناتی ہیں، برائی، فحاشی، بے حیائی اور عریانیت کی نشر واشاعت اور اسے عام کرنے کی کھلی چھوٹ دیتی ہیں، اور دوسری طرف مغرب کی اندھی تقلید میں نیکیوں، بھلائیوں اور اچھائیوں کے خلاف محاذ بناتی ہیں۔

اس کے برعکس اسلام تمام لوگوں اور خاص کر کے بچوں کے لئے برائی، ظلم، نفرت اور سنگدلی کے خلاف ماحول بناتا ہے، قتل، غارت گری، چوری، زنا اور اغوا جیسے جرائم سے لوگوں کے دلوں میں نفرت پیدا کرتا ہے، اور ان تمام احتیاطی انتظامات کے باوجود اگر کسی سے جرم سرزد ہو تو وہ سزا جاری کرنے میں پس وپیش نہیں کرتا ہے۔

چنانچہ بچوں کو جرائم سے دور رکھنے کے لئے اسلام کی درج ذیل تعلیمات ہیں:

۱۔ اسلام کی ہدایت ہے کہ نابالغوں کی صحیح تعلیم وتربیت کی جائے، تاکہ ان کے اندر جرائم کا رجحان پیدا نہ ہو، جیسا کہ حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: "أکرموا أولادکم وأحسنوا أدبھم" (سنن ابن ماجہ حدیث نمبر: ۳۶۷۱، اور اس کی سند میں کچھ کلام ہے) (اپنی اولاد کی عزت کرو، اور ان کی بہتر تربیت کرو)۔

۲۔ اسلام نابالغ لڑکے اور لڑکیوں کے اندر آخرت کا تصور پیدا کرتا ہے، ان کے اندر حساب وکتاب دینے کا ذہن بناتا ہے، ان میں ہر قول وعمل سے پہلے اللہ تعالی کا استحضار پیدا کرتا ہے، اور شرک سمیت تمام جرائم سے نفرت دلاتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے: "وإذ قال لقمان لابنہ وھو یعظہ یا بنی لا تشرك باللہ إن الشرك لظلم عظیم" (لقمان: ۱۳) (اور یاد کرو جبکہ لقمان نے اپنے بیٹے سے اس کو نصیحت کرتے ہوئے کہا کہ اے میرے بیٹے! اللہ کا شریک نہ ٹھہرائیو، بے شک شرک ایک بہت بڑا ظلم ہے)۔

نیز فرمایا: "واتبع سبیل من أناب إلی ثم إلی مرجعکم فأنبئکم بما کنتم تعملون" (لقمان: ۱۵) (اور پیروی ان کے طریقہ کی کیجیو، جو میری طرف متوجہ ہیں پھر میری ہی طرف تمہارا لوٹنا ہے، سو میں جو کچھ تم کرتے رہے ہو اس سے تم کو آگاہ کروں گا)۔

۳۔ اسلام بچے اور بچیوں کے اندر یہ ذہن بناتا ہے کہ اللہ تعالی سے کوئی چیز مخفی نہیں، جیسا کہ ارشاد ہے: "یا بنی إنھا إن تك مثقال حبۃ من خردل فتکن فی صخرۃ أو فی السموات أو فی الأرض یأت بھا اللہ، إن اللہ لطیف خبیر" (لقمان: ۱۶) (اے میرے بیٹے! کوئی عمل اگر رائی کے دانے کے برابر بھی ہوگا تو خواہ وہ کسی گھاٹی میں یا آسمانوں یا زمین میں ہو، اللہ اس کو حاضر کردے گا، بے شک اللہ نہایت ہی باریک بیں اور باخبر ہے)۔

۴۔ اسلام ان کو خود نیک بننے اور دوسرے کو نیک بنانے کی طرف متوجہ کرتا ہے جیسا کہ ارشاد ہے: "یا بنی أقم الصلاۃ وأمر بالمعروف وانہ عن المنکر واصبر علی ما أصابك إن ذلك من عزم الأمور" (لقمان: ۱۷) (اے میرے بیٹے! نماز کا اہتمام رکھو، نیکی کا حکم دو، اور برائی سے روکو، اور جو مصیبت تمہیں پہنچے اس پر صبر کرو، بے شک یہ باتیں عزیمت کے کاموں میں سے ہیں)۔

۵۔ نبی کریم ﷺ نے خود اپنے عملی نمونہ کے ذریعہ گارجین کو توجہ دلائی ہے کہ وہ نابالغ بچے اور بچیوں کی بھلائی میں دلچسپی اور برائی اور جرائم سے رکنے کی رغبت کے لئے ذہن سازی کرتے رہیں، چنانچہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے:

"کنت خلف النبی ﷺ یوماً فقال: یا غلام! إنی أعلمك کلمات: احفظ اللہ یحفظك، احفظ اللہ تجدہ تجاھك، إذا سألت فاسأل اللہ، وإذا استعنت فاستعن باللہ، واعلم أن الأمۃ لو اجتمعت علی أن ینفعوك بشئی لم ینفعوك إلا بشئی، قد کتبہ اللہ لك، وإن اجتمعوا علی أن یضروك بشئی، لم یضروك إلا بشئی قد کتبہ اللہ علیك، رفعت الأقلام وجفت الصحف" (مسند احمد حدیث نمبر: ۲۶۶۹، مسند ابی یعلی حدیث نمبر: ۲۵۵۶، سنن ترمذی حدیث نمبر: ۲۵۱۶، اور اس کی سند صحیح ہے) (میں ایک دن نبی کریم ﷺ کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا کہ آپ نے فرمایا: اے لڑکے! میں تجھے کچھ باتیں سکھاتا ہوں (تم ان پر مضبوطی سے عمل پیرا ہو جاؤ): اللہ کو پیش نظر رکھو، وہ تمہاری حفاظت فرمائے گا، اللہ کو پیش نگاہ رکھو، تم اسے اپنے سامنے پاؤ گے، اگر مانگو تو اللہ ہی سے مانگو، اور اگر مدد طلب کرو تو اللہ ہی سے مدد لو، اور جان رکھو کہ اگر تمام لوگ متحد ہو کر تجھے کوئی نفع پہنچانا چاہے، تو وہ تجھے اس چیز کے علاوہ نفع نہیں پہنچا سکتے، جسے اللہ نے تمہارے حق میں مقدر کر رکھا ہے، اور اگر سب لوگ مل کر تجھے کوئی نقصان پہنچانا چاہیں تو اس چیز کے علاوہ وہ تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکتے جسے اللہ نے تمہارے حق میں

لکھ رکھا ہے، قلم بند کردیے گئے اور صحیفے خشک ہو چکے)۔

اور سندی ''احفظ اللہ'' (اللہ کو پیش نظر رکھو) کی شرح میں لکھتے ہیں:

"أی أمرہ بامتثال الأوامر واجتناب الزواجر" (حاشیۃ مسند احمد ۴/۴۱۱) (یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کے احکامات کی تعمیل اور منہیات سے اجتناب کا حکم فرمایا) یعنی اللہ کو پیش نظر رکھنے کا مطلب ہے کہ اس کے احکام بجالائے جائیں اور اس کی منع کردہ چیزوں سے دور رہا جائے)۔

(و): تربیت واصلاح کے مقصد سے بچوں کو مخصوص جیلوں میں رکھنے کی گنجائش ہے، بشرطیکہ وہ محفوظ اور پرامن ہوں اور ان کے کھانے پینے کا مناسب بندوبست ہو، اور ان کی صحت پر مضر اثرات مرتب نہ ہوتے ہوں، اور جیل میں بند نابالغ قیدیوں کو ہلکی پھلکی سزا دی جاسکتی ہے، جس کا مقصد اصلاح ہو، چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "مروا أولادکم بالصلاۃ وھم أبناء سبع سنین، واضربوھم علیھا وھم أبناء عشر" (سنن ابی داؤد حدیث نمبر: ۴۹۵، اور اس کی سند حسن درجہ کی ہے) (اپنی اولاد کو نماز کا حکم دو جبکہ وہ سات سال کے ہوں، اور ترک نماز پر ان کو مارو، جبکہ وہ دس سال کے ہوں)۔

اور فقہاء نے بھی اس بات کی صراحت کی ہے کہ بچوں کو تعزیراً سزا دی جاسکتی ہے، چنانچہ علامہ مرغینانی لکھتے ہیں: "ولھذا یعزر الصبی" (الہدایہ کتاب الحدود، فصل فی کیفیۃ الحد وإقامتہ ۲/ ۳۴۲) (اور حق العبد ہونے کی وجہ سے بچہ کو تادیباً سزا دی جاسکتی ہے)۔

اور علامہ کاسانی رقمطراز ہیں:

''بہرحال تعزیر کے وجوب کی شرط تو وہ صرف عقل ہے، تو ہر عاقل جس نے اسے جرم کا ارتکاب کیا جس کی شریعت میں متعین سزا نہیں ہے، تو اسے تعزیراً سزا دی جائے گی، خواہ آزاد ہو یا غلام، مرد ہو یا عورت، مسلمان ہو یا کافر، بالغ ہو یا بچہ، جبکہ وہ عاقل ہو، اس لئے کہ یہ لوگ سزا کی اہلیت رکھتے ہیں، سوائے عقلمند بچہ کے، کیونکہ اسے بطور تادیب اور اصلاح سزا دی جائے گی، نہ کہ سزا کے طور پر، اس لئے کہ اس کے اندر اصلاح کی اہلیت ہے...... اور سزا کے طور پر اس کی تعزیر نہیں کی جائے گی، اس لئے کہ سزا جرم کا تقاضا کرتی ہے، اور بچہ کے فعل کو جرم سے متصف نہیں کیا جاسکتا ہے، برخلاف دیوانہ اور اس بچہ کے جو ناسمجھ ہو، کیونکہ ان کے اندر نہ سزا کی اہلیت ہے اور نہ ہی تادیب کی'' (بدائع الصنائع، کتاب الحدود، فصل فی شروط وجوب التعزیر ۷/ ۶۳-۶۴)۔

اور ابن نجیم حنفی تحریر فرماتے ہیں: "ویقام التعزیر علیہ تأدیباً" (الاشباہ والنظائر ص: ۲۶۵) (اور بچہ پر بطور تادیب واصلاح تعزیر قائم کی جاتی ہے)۔

اور ایک جگہ لکھتے ہیں: "فضرب التأدیب مقید بوصف السلامۃ لکونہ مباحاً" (الاشباہ والنظائر ص: ۲۴۹) (چنانچہ تادیب کی مار سلامتی کی صفت کے ساتھ مقید ہے، اس لئے کہ وہ مباح ہے)۔

اور علامہ ابن فرحون مالکی (م: ۷۹۹ھ) لکھتے ہیں:

''قال ابن مزین: قلت لأصبغ: ''یؤدب الصبیان فی تعدیھم وشتمھم وقذفھم، وجراحاتھم العمد وقتلھم. قال: نعم، یؤدبون إذا کانوا قد عقلوا أو راھقوا'' (تبصرۃ الحکام ۲/ ۲۴۲، ط: ۱، مکتبۃ الکلیات الأزہریہ، ۱۴۰۶ھ) (ابن مزین کہتے ہیں کہ میں نے اصبغ سے پوچھا: بچوں کو ان کے ظلم وزیادتی، گالی وگلوج، تہمت لگانے، قصداً زخمی کرنے اور قتل کرنے کی صورت میں سزا دی جائے گی، تو انہوں نے جواب دیا، ہاں، ان کو سزا دی جائے گی، جبکہ وہ سمجھدار ہو گئے ہوں یا قریب البلوغ ہوں)۔

اور علامہ قرافی مالکی (م: ۶۸۹ھ) تحریر فرماتے ہیں:

''الرابع من الفروق أن التعزیر تأدیب یتبع المفاسد، وقد لا یصحبھا العصیان فی کثیر من الصور، کتأدیب الصبیان والبھائم والمجانین استصلاحاً لھم مع عدم المعصیۃ'' (الفروق ۴/ ۱۸۰، بیروت، عالم الکتب) (حد اور تعزیر میں چوتھا فرق یہ ہے کہ تعزیر ایسی سزا ہے جو مفاسد کے ساتھ چلتی ہے، جبکہ بہت سی صورتوں میں ان کے اندر معصیت نہیں ہوتی ہے، جیسے بچے، چوپائے اور دیوانوں

کو ان کی اصلاح کی خاطر معصیت نہ ہونے کے باوجود تعزیراً سزا دی جائے گی)۔

اور علامہ زکریا انصاری شافعی (م:۹۲۶ھ) لکھتے ہیں: "ویعزر به أي بالقذف صبي ومجنون میزا للزجر والتأدیب" (اسنی المطالب، کتاب الحدود ۴/۱۳۶) (اور اس کی یعنی تہمت لگانے کی وجہ سے بچہ اور دیوانہ کو تعزیراً سزا دی جائے گی، جبکہ وہ سمجھ بوجھ رکھتے ہوں، زجر وتوبیخ اور اصلاح کی غرض سے)۔

اور سیوطی شافعی لکھتے ہیں: "الصبي والمجنون یعزران، إذا فعلا ما یعزر علیه البالغ، وإن لم یکن فعلهما معصیة" (الاشباہ للسیوطی ص: ۴۹۰) (بچہ اور دیوانہ کو تعزیراً سزا دی جائے گی جبکہ وہ ایسی چیز کے مرتکب ہوں جس پر بالغ کو سزا دی جاتی ہے، اگرچہ ان کا فعل معصیت نہیں)۔

اور مرداوی حنبلی (م:۸۸۵ھ) تحریر فرماتے ہیں:

''وما أوجب حداً علی مکلف عزر به الممیز کالقذف، قال في الواضح: من شرع في عشر: صلح تأدیبه في تعزیر علی طهارة وصلاة، فکذا مثله زناً، وهو معنی کلام القاضي، وذکر ما نقله الشالنجي في الغلمان یتمردون: لا بأس بضربهم'' (الانصاف، کتاب الحدود ۱۰/۲۴۲) (اور جو چیز عاقل وبالغ پر حد کو واجب کرے، اس کی وجہ سے سمجھدار بچہ کو تعزیراً سزا دی جائے گی، جیسے تہمت لگانا، ''الواضح'' میں لکھا ہے کہ جو دسویں سال میں داخل ہو جائے، تو طہارت اور نماز کی بنا پر بہ طور تعزیر سزا کی صلاحیت رکھتا ہے، تو یہی حکم زنا کا ہوگا، اور ''قاضی'' کے کلام کا یہی مفہوم ہے، اور ''شالنجی'' نے جو کلام نقل کیا ہے اسے ذکر کیا ہے کہ سرکش بچوں کو مارنے میں کوئی حرج نہیں ہے)۔

اور جس طرح اللہ تعالی نے اصلاح کی خاطر شوہروں کو ہلکی پھلکی مار کی اجازت دی ہے، جیسا کہ ارشاد ہے: "واضربوهن فإن أطعنکم فلا تبغوا علیهن سبیلا، إن الله کان علیاً کبیراً" (النساء: ۳۴) (اور ان کو سزا دو، سو اگر وہ تمہاری اطاعت کریں، تو ان کے خلاف راہ نہ ڈھونڈو، بے شک اللہ بہت بلند اور بہت بڑا ہے)، اور اس جسمانی سزا کی حد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ''غیر مبرح: سخت اور بڑی مار نہ ہو'' مقرر کی ہے، یعنی سزا ایسی نہ ہو کہ وہ کوئی پائیدار اثر چھوڑ جائے، چنانچہ حضرت جابرؓ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع سے فرمایا: "واتقوا الله في النساء فإنهم عندکم عوان، ولکم علیهن أن لا یوطئن فرشکم أحداً تکرهونه، فإن فعلن ذلك، فاضربوهن ضرباً غیر مبرح" (صحیح مسلم حدیث نمبر: ۱۲۱۸) (اور خواتین کے بارے میں اللہ سے ڈرو، کیونکہ وہ تمہارے پاس مقید ہیں، اور ان پر تمہارا حق یہ ہے کہ تمہارے بستروں پر کسی ایسے شخص کو نہ آنے دے جسے تم ناپسند کرتے ہو، سو اگر وہ ایسا کریں، تو انہیں ایسی مار مارو جو دردناک نہ ہو)۔

اس پر قیاس کرتے ہوئے ہم کہتے ہیں کہ نابالغ قیدیوں سے پر مشقت کام لینا اور ان کے ساتھ سخت مار پیٹ کرنا ناجائز ہے، ان کو صرف اتنی سزا دی جاسکتی ہے جس کا کوئی پائیدار اثر نہ رہ جائے اور ان کی اصلاح وتربیت ہو جائے۔

اور غلطی نہ سدھارنے پر مزید سزا کی دھمکی دی جاسکتی ہے، ان پر تیز نگاہ ڈالی جاسکتی ہے اور کسی وقت کھانے سے ان کو محروم کیا جاسکتا ہے۔

اور ان سے صرف ایسے کام لیے جاسکتے ہیں جن کا اثر ان کی ذہنی، دماغی، نفسیاتی وجذباتی اور جسمانی صحت پر نہ پڑے، اور ان کا تعلق ان کی تربیت سے ہو، جیسے لڑکی سے کھانا پکانے، کشیدہ کاری وبیل بوٹے بنانے اور سلائی کڑھائی وغیرہ، اور لڑکے سے پودے وغیرہ لگانے، صنعت وحرفت سکھانے کے کام اور کاشت کاری وغیرہ کی تربیت جو رہا ہونے کے بعد باعزت زندگی گزارنے کی اہلیت ان کے اندر پیدا کرے۔

اور جیل کے اندر ان کو اتنی مدت رکھا جائے جتنی مدت میں ان کی اصلاح ہو جائے، اور اصلاح ہو جانے کے بعد انہیں فوراً رہا کر دیا جائے، چنانچہ امام ابو یوسفؒ لکھتے ہیں:

''چنانچہ آپ اپنے تمام حکام کو روزانہ قیدیوں کے معاملات میں غور وفکر کرنے کا حکم دیں، سو جس کے ذمہ سزا ہو، اسے سزا دے کر چھوڑ دیا جائے، اور جس پر کوئی معاملہ نہ بنتا ہو، اس کو رہا کر دیا جائے، اور ان کو حکم دیجئے کہ سزا میں حد سے تجاوز نہ کریں، اور سزا کے ساتھ ناجائز حد میں نہ داخل ہو جائیں، کیونکہ مجھے اطلاع ملی ہے کہ یہ حکام تہمت اور الزام اور جرم کی بنا پر ایک شخص کو تین سو یا دو سو یا کم وبیش کوڑے لگاتے ہیں، اور یہ حلال اور مباح نہیں، اور مومن کی پیٹھ محفوظ ہے مگر ایسے حق کی وجہ سے جو بدکاری یا تہمت یا نشہ یا ایسے

معاملہ کے مرتکب ہونے کے سبب جس میں حد واجب نہ ہو، تعزیر کی وجہ سے واجب ہو" (الخراج ص: ۱۶۴-۱۶۵، المکتبۃ الازہریہ للتراث)۔

تادیب وتعزیر میں فرق:

بغرض اصلاح جو معمولی سزا دی جاتی ہے اسے تادیب کہتے ہیں، جبکہ تعزیر وہ سزا ہے جو شرعاً متعین نہیں ہے، اور جسے قاضی جرم کی نوعیت اور مرتکب جرم کی حالت کے اعتبار سے طے کرتا ہے۔

بعض فقہاء کا خیال ہے کہ تعزیر اور تادیب میں فرق ہے، چنانچہ تعزیر قاضی کی طرف سے ہوتی ہے، جبکہ تادیب، استاذ، والد اور شوہر وغیرہ کی طرف سے ہوتی ہے، جیسا کہ علامہ عمرانی شافعی (م: ۵۸۷ھ) رقمطراز ہیں:

''التعزير اسم يختص بالضرب الذی يضر به الإمام أو خليفته للتأديب فی غير الحدود، فأما ضرب الرجل زوجته، وضرب المعلم للصبی، فلا يسمی تعزيراً، وإنما يسمی تأديباً'' (البیان، کتاب الحدود، باب التعزیر ۱۲/۵۳۲) (تادیب واصلاح کی خاطر جو مار حدود کے علاوہ میں بادشاہ یا اس کا نائب لگاتا ہے، وہ تعزیر کے نام سے موسوم ہے، رہا شوہر کا بیوی کو اور استاذ کا طالب علم کو مارنا، تو اسے تعزیر کا نہیں بلکہ تادیب کا نام دیا جائے گا)۔

اگر اس فرق کو تسلیم بھی کریں، تو بھی بچہ کی تعزیر میں اتنے زور سے مارنے کی اجازت نہیں ہے کہ اس کا اثر باقی رہ جائے۔

شریعت اسلامی میں نابالغ قیدیوں کی اصلاح کی تدابیر درج ذیل ہیں:

۱۔ جیل کے ذمہ داران انتہائی شفقت ومحبت سے ان کو جرائم سے دور رہنے کی نصیحت کریں، چنانچہ کتاب وسنت میں بچوں کو پرشفقت اسلوب میں نصیحت کی گئی ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"ووصى بها إبراهيم بنيه ويعقوب يا بنی إن الله اصطفى لكم الدين فلا تموتن إلا وأنتم مسلمون" (البقرہ: ۱۳۲) (اور ابراہیم نے اسی ملت کی وصیت اپنے بیٹوں کو کی، اور اس کی وصیت یعقوب نے اپنے بیٹوں کو کی، اے میرے بیٹو! اللہ نے تمہارے لیے دین اسلام کو منتخب فرمایا، تو تم نہ مرنا مگر اسلام کی حالت پر)۔

اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے سر پر اپنا دست مبارک پھیرا اور دعا دیتے ہوئے فرمایا: "يرحمك الله فإنك غليم معلم" (صحیح ابن حبان حدیث نمبر: ۶۵۰۴، مسند احمد، ۳۵۹۸، اور اس کی سند حسن درجہ کی ہے) (اللہ تجھ پر رحم فرمائے، تو سکھایا ہوا لڑکا ہے)۔

۲۔ نابالغ قیدیوں کو وقتاً فوقتاً صالح مربیوں کے ذریعہ نصیحت کرائی جائے، تاکہ بچے ان کے کردار اور نیک سیرتی سے متاثر ہوں، اور ان کے قول وعمل کی جامعیت سے سبق لیں، جس طرح حضرت لقمانؑ نے اپنے بچہ کو نصیحت کی، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"ولا تصعر خدك للناس ولا تمش فی الأرض مرحاً إن الله لا يحب كل مختال فخور" (لقمان: ۱۸) (اور لوگوں سے بے رخی نہ کر، اور زمین میں اکڑ کر نہ چل، اللہ کسی اکڑنے والے اور فخر کرنے والے کو پسند نہیں کرتا)۔

اور حضرت ہودؑ نے اپنی قوم کی اصلاح کی کوشش کی:

"إذ قال لهم أخوهم هود ألا تتقون إنی لكم رسول أمين فاتقوا الله وأطيعون" (الشعراء: ۱۲۴-۱۲۶) (جبکہ ان کے بھائی ہود نے ان کو آگاہ کیا کہ کیا تم لوگ ڈرتے نہیں، میں تمہارے لیے ایک رسول امین ہوں، تو اللہ سے ڈرو اور میری بات مانو)۔

اور حضرت ابوامامہؓ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک نوجوان آیا، اور اس نے زنا کی اجازت چاہی، سو لوگوں کو اس کی جرأت پر بڑا اچنبھا ہوا، لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے سمجھایا کہ کیا تم اپنی ماں، بیٹی، بہن، پھوپھی اور خالہ کے ساتھ ایسا کرنا پسند کروگے، تو اس نے نفی میں جواب دیا، تب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے سمجھایا کہ لوگ بھی اپنی رشتہ دار خواتین کے لئے اسے پسند نہیں کرتے، پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے سینہ پر ہاتھ رکھ کر اس کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعا کی: "اللهم كفر ذنبه، وطهر قلبه وحصن فرجه" (المعجم الکبیر للطبرانی حدیث نمبر: ۷۶۷۹، مسند احمد، حدیث نمبر: ۲۲۲۱۱،

اور اس کی سند صحیح ہے) (اے اللہ اس کے گناہ ختم کردے، اور اس کے دل پاک کردے، اور اس کی شرمگاہ کو محفوظ کردے)۔

۳۔ نابالغ قیدیوں کے سامنے نیک لوگوں کے نمونے پیش کئے جائیں، کیونکہ اسلاف کے عملی نمونے بہت ہی موثر رول ادا کرتے ہیں، اور زندگی کے رخ کو موڑ دیتے ہیں، اور انسان کو باکردار بننے کی طرف متوجہ کرتے ہیں، اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

"لقد كان لكم في رسول الله أسوة حسنة لمن كان يرجوا الله واليوم الآخر" (الاحزاب: ۲۱) (اور تمہارے لیے اللہ کے رسول کی زندگی میں بہترین نمونہ ہے، ان کے لئے جو اللہ کی ملاقات اور روز آخرت کی توقع رکھتے ہیں)۔

اور ایک جگہ ارشاد ہے:

"لقد كان لكم فيهم أسوة حسنة لمن كان يرجوا الله واليوم الآخر" (الممتحنہ: ۶) (بے شک تمہارے لئے ان لوگوں کے اندر ابراہیم اور ان کے ساتھیوں کے اندر بہترین نمونہ ہے، ان کے واسطے جو اللہ اور آخرت کے متوقع ہیں)۔

اور فرمایا: "أولئك الذين هدى الله فبهداهم اقتده" (الانعام: ۹۰) (یہی لوگ ہیں جن کو اللہ نے ہدایت بخشی، تو تم بھی ان ہی کے طریقہ کی پیروی کرو)۔

اور نبی کریم ﷺ نے پچھلی قوم کے تین افراد کا نمونہ صحابہ کرامؓ کے سامنے رکھا، جن کے غار کا منہ چٹان سے بند ہوگیا تھا، اور انہوں نے اپنے نیک عمل کے ذریعہ اللہ تعالی سے دعا کی، اور چٹان غار کے منہ سے ہٹ گئی (صحیح البخاری حدیث نمبر: ۲۲۷۲)۔

۴۔ اچھے قصے اور واقعات نابالغ قیدیوں کو سنائے جائیں، تاکہ وہ نیک کردار کے حامل افراد کی مانند بننے کی کوشش کریں، چنانچہ صحیح اور اچھے واقعات کا بچوں پر گہرا اثر پڑتا ہے، اسی لئے قرآن نے بکثرت صالحین اور ثابت قدم لوگوں کے واقعات ذکر کئے ہیں، جیسا کہ ارشاد ہے:

"نحن نقص عليك نبأهم بالحق إنهم فتية آمنوا بربهم وزدناهم هدى وربطنا على قلوبهم إذ قاموا فقالوا: ربنا رب السموات والأرض لن ندعو من دونه إلها لقد قلنا إذاً شططا" (الکہف: ۱۳-۱۴) (ہم تمہیں ان کی سرگزشت ٹھیک ٹھیک سناتے ہیں، یہ کچھ نوجوان تھے جو اپنے رب پر ایمان لائے، اور ہم نے ان کی ہدایت میں مزید افزونی عطا فرمائی، اور ہم نے ان کے دلوں کو مضبوط کیا، جبکہ وہ اٹھے اور کہا کہ ہمارا رب وہی ہے جو آسمانوں اور زمینوں کا رب ہے، ہم اس کے سوا کسی اور معبود کو ہرگز نہیں پکاریں گے، اگر ہم نے ایسا کیا تو ہم بیحق سے نہایت ہی ہٹی ہوئی بات کہیں گے)۔

اور نبی کریم ﷺ نے صحابہ کرامؓ کو بنو اسرائیل کے تین کردار کے واقعات سنائے کہ گنجے اور برص والے نے ٹھیک ہوکر ناشکری کی، اور پہلی حالت پر لوٹا دیئے گئے، اور اندھے نے ٹھیک ہوکر اللہ تعالی کی شکرگزاری کی اور نوازا گیا (صحیح البخاری حدیث نمبر: ۳۴۶۴، صحیح مسلم حدیث نمبر: ۲۹۶۴)۔

۵۔ نابالغ قیدیوں کے اندر آخرت کا تصور گہرا کیا جائے، کیونکہ اللہ تعالی کے سامنے حساب وکتاب کے لئے روز آخرت میں کھڑے ہونے کا تصور انسان کے قدم کو صحیح سمت دیتا ہے، جیسا کہ ارشاد ہے: "يخافون يوما تتقلب فيه القلوب والأبصار" (النور: ۳۷) (وہ ایک ایسے دن کی آمد سے اندیشناک رہتے ہیں، جس میں دل اور آنکھیں سب مضطرب ہوں گے)۔

اور رسول کریم ﷺ فرمایا کرتے تھے: "اللهم لا عيش إلا عيش الآخرة" (صحیح البخاری حدیث نمبر: ۲۹۶۱) (الہی! زندگی تو آخرت کی زندگی ہے)۔

چنانچہ جب آخرت کا تصور مضبوط ہوگا، اور اللہ تعالی کے سامنے حساب وکتاب کے لئے کھڑے ہونے کا احساس جاگے گا تو جرائم سے نابالغ قیدی قدرتی طور پر خود بخود دور ہوتے جائیں گے۔

(ز): بے سہارا بچوں کو جن کے ماں باپ کا علم نہ ہو، فقہاء "لقیط" سے تعبیر کرتے ہیں، "مبسوط" میں اس کی اس طرح تعریف کی گئی ہے: "اسم لحي مولود طرحه أهله خوفاً من العيلة أو فراراً من تهمة الريبة، مضيعه آثم ومحرزه غانم" (المبسوط، کتاب اللقیط ۲۰۹/۱۰) (لقیط: اس نومولود بچہ کا نام ہے، جسے اس کے گھر والوں نے غربت کے خوف سے یا زنا کی تہمت سے بچنے کے لئے پھینک دیا ہو، اس کو ضائع کرنے والا گنہگار اور اسے

پناہ دینے والا ثواب حاصل کرنے والا ہے)۔

ایسے بچے کو اٹھانا واجب کفائی ہے، اور سڑک حادثات کی وجہ سے بے سہارا ہونے والے بچوں کا بھی یہی حکم ہے، اور اگر کسی نے ایسے بچہ کو نہیں اٹھایا تو وہ تمام لوگ گنہگار ہوں گے، جو اس سلسلہ میں علم رکھتے تھے، اس کے دلائل درج ذیل ہیں:

۱۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "ومن أحیاها فکأنما أحیا الناس جمیعاً" (المائدہ: ۳۲) (اور جس نے اس کو بچایا تو گویا سارے انسانوں کو بچایا)، اس آیت سے پتہ چلا کہ نفس انسانی کو بچانا اور اس سے ہلاکت کو دور کرنا واجب ہے، چنانچہ بیضاوی رقمطراز ہیں:

"أی ومن تسبب لبقاء حیاتها بعفو أو منع عن القتل، أو استنقاذ من بعض أسباب الهلکة، فکأنما فعل ذلك بالناس جمیعاً" (تفسیر البیضاوی ۲/ ۱۲۴) (یعنی جو معافی یا قتل سے روک کر یا ہلاکت کے بعض اسباب سے بچا کر حیات انسانی کی بقا کا سبب بنا، تو گویا اس نے تمام انسانوں کے ساتھ یہ معاملہ کیا)۔

۲۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "کلا بل لا تکرمون الیتیم" (الفجر: ۱۷) (بلکہ تم یتیموں کی قدر نہیں کرتے)، اور ایک جگہ ارشاد ہے: "فأما الیتیم فلا تقهر" (الضحیٰ: ۹) (تو جو یتیم ہے اس کو مت دبائیو)، نیز فرمایا: "فذلك الذی یدع الیتیم" (الماعون: ۲) (وہی ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے)۔

ان آیات سے پتہ چلا کہ یتیم بچہ کی نگہداشت اور تربیت واجب ہے، اور بے سہارا بچہ جس کے باپ ماں معلوم نہ ہوں وہ بھی یتیم ہی کے درجہ میں ہے اور اس کی نگہداشت بھی واجب ہے، اور ان کو ضائع کرنا اسلامی اخوت اور انسانی رشتہ کے منافی ہے، نیز ایسا کرنا کفار ومشرکین کا وطیرہ ہے۔

اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "لیس منا من لم یرحم صغیرنا ولم یوقر کبیرنا" (سنن ترمذی حدیث نمبر: ۱۹۱۹، اور اس کی سند صحیح ہے) (ہم میں سے نہیں جو ہمارے چھوٹے پر رحم نہ کھائے، اور ہمارے بڑے کا احترام نہ کرے)۔

اس حدیث سے پتہ چلا کہ چھوٹے پر ترس کھانا ایمان کا تقاضا ہے، لہٰذا بے سہارا بچہ کی نگہداشت واجب ہے کیونکہ اس میں اس [illegible]ت کا اظہار ہے، اور اسے ضائع ہونے دینے میں سنگدلی کا اعلان ہے۔

۳۔ بے سہارا بچہ کو یوں ہی چھوڑ دینا ناحق انسانی جان کا قتل ہے، اور ناحق انسانی جان کو قتل کرنا حرام ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "ولا تقتلوا النفس التی حرم اللہ إلا بالحق" (الانعام: ۱۵۱) (اور اس جان کو ناحق قتل نہ کرو، جسے اللہ نے حرام ٹھہرایا ہے)، چنانچہ ابن حزم ظاہری لکھتے ہیں:

''إن وجد صغیر منبوذ ففرض علی من بحضرته أن یقوم به ولا بد، لقول اللہ تعالی: ''وتعاونوا علی البر والتقوی ولا تعاونوا علی الإثم والعدوان'' (المائدہ: ۲)، ولقول اللہ تعالی: ''ومن أحیاها فکأنما أحیا الناس جمیعاً'' (المائدہ: ۳۲)، ولا إثم أعظم من إثم من أضاع نسمة مولودة علی الإسلام، صغیرة لا ذنب لها، حتی تموت جوعاً وبرداً، أو تأکله الکلاب، هو قاتل نفس عمداً بلا شك، وقد صح عن رسول اللہ ﷺ: ''من لا یرحم الناس لا یرحمه اللہ'' (المحلی، کتاب اللقیط ۷/ ۱۳۲، بیروت، دار الفکر، اور حدیث کے لئے دیکھئے: صحیح البخاری حدیث نمبر: ۶۰۱۳، صحیح مسلم حدیث نمبر: ۲۳۱۹)

(اگر چھوٹا، راستہ میں پڑا ہوا بچہ پایا گیا، تو جو اس کے پاس موجود ہے اس پر فرض ہے کہ لازماً اس کے معاملہ کو سنبھالے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ''تم نیکی اور تقویٰ میں تعاون کرو، اور گناہ اور ظلم وتعدی میں تعاون نہ کرو''، اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''اور جس نے اس کو بچایا تو گویا اس نے سب لوگوں کو بچایا'' اور اس شخص کے گناہ سے بڑھ کر کسی کا گناہ نہیں جو اسلام پر مولود چھوٹے بے قصور بچہ کو ضائع کردے، یہاں تک کہ وہ بھوک اور ٹھنڈک سے مرجائے، یا کتے اسے کھالیں، بلاشبہ وہ قصداً نفس انسانی کو قتل کرنے والا ہے، اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح حدیث میں ہے: ''جو لوگوں پر رحم نہیں کرے گا، اللہ تعالیٰ اس پر رحم نہیں کرے گا)۔

۴۔ عقلی دلیل یہ ہے کہ بے سہارا بچہ ہلاکت کے دہانہ پر کھڑا ہوا ہے، اور ہلاکت کے اسباب دور کرکے زندہ انسان کو بچانا فرض ہے۔

۵۔ ابن حزم کے علاوہ بھی دیگر فقہاء نے اس بات کی صراحت کی ہے کہ بے سہارا بچہ کے ضائع ہونے کا گمان غالب ہو تو اسے اٹھانا واجب ہے، چنانچہ ''عالمگیری'' میں ہے:

"والالتقاط مندوب إليه، وإن غلب على ظنه ضياعه كأن وجده في الماء، أو بين يدي سبع، فواجب" (ہندیہ، کتاب اللقیط ۲/۲۸۵) (اور بچہ کو اٹھانا مستحب ہے، اور اگر اس کے ضائع ہونے کا اسے گمان غالب ہو، جیسے اسے پانی میں پایا، یا درندہ کے سامنے پایا، تو اٹھانا واجب ہے)۔

اور یہ مخفی نہیں ہے کہ ہر وہ صورت جس میں بچہ کے ضائع ہونے کا گمان غالب ہو، اس کا بھی یہی حکم ہے، جیسے سخت ٹھنڈک سے اس کی ہلاکت کا گمان غالب ہو، تو ایسی صورت میں بھی بچہ کو اٹھانا واجب ہوگا۔ بے سہارا بچوں کی پرورش، ان کی تعلیم وتربیت اور ان کے لئے خاندانی ماحول فراہم کرنے کی ذمہ داری اصلاً حکومت کی ہے، چنانچہ علامہ سرخسیؒ لکھتے ہیں:

''اور ایک دوسری حدیث میں ہے کہ حضرت علیؓ نے راستہ سے اٹھائے ہوئے بچہ کے لئے نفقہ مقرر کیا، اور یہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ راستہ سے اٹھائے ہوئے بچہ کا نفقہ بیت المال (اسلامی سرکاری خزانہ) میں ہے، اس لئے کہ وہ کمانے سے عاجز ہے اور نفقہ کا محتاج ہے، اور اگر اس پر بچہ کو اٹھانے والے نے خرچ کیا، تو وہ اپنے خرچ میں رضا کار ہوگا (سو) بچہ کے بڑے ہونے کے بعد اسے وصول نہیں کرسکتا ہے، اس لئے کہ شرعاً وہ اپنے اس عمل پر مجبور نہیں ہے، اور رضا کار وہ ہے جو شرعی طور پر کسی چیز کو وجود میں لانے پر مجبور نہ ہو (بلکہ) مختار ہو...... اور ایسا اس وجہ سے ہے کہ بچہ کو اٹھانے کی وجہ سے اسے اس قدر حق حاصل ہوتا ہے جس سے اٹھایا ہوا بچہ استفادہ کرے اور وہ حق حفاظت اور تربیت ہے، اور اس کے ذمہ میں کوئی چیز لازم کرنے کا اختیار اس کے لئے ثابت نہیں، اس لئے کہ یہ اس کے لئے مفید نہیں'' (المبسوط ۱۰/۲۱۰)۔

اور ابن قدامہ مقدسی حنبلی لکھتے ہیں:

''اگر راہ سے اٹھائے ہوئے بچہ کے ساتھ کوئی مال نہ پایا گیا، تو عام اہل علم کے قول میں اٹھانے والے پر اس پر خرچ کرنا لازم نہیں، ابن منذر کا قول ہے کہ اہل علم میں سے جس کا قول ہمیں یاد ہے، ان سب کا اس پر اتفاق ہے کہ راہ سے اٹھائے ہوئے بچہ کا نفقہ اٹھانے والے پر واجب نہیں ...... کیونکہ اٹھانا اسے ہلاکت سے بچانا اور رضا کارانہ طور سے اس کی حفاظت کرنا ہے، لہذا یہ نفقہ کو واجب نہیں کرے گا...... اور اس کا نفقہ بیت المال میں واجب ہے، کیونکہ ابو جمیلہ کی حدیث میں حضرت عمرؓ کا قول ہے کہ جاؤ وہ آزاد ہے، اور اس کا ولاء (شراکت خاندان) تیرے لئے ہے، اور ہمارے ذمہ اس کا نفقہ ہے (شرح مشکل الآثار للطحاوی ۷/۳۱۵، حدیث نمبر: ۲۸۷۰، ط: موسسۃ الرسالۃ)، اور ایک روایت میں ہے کہ ہمارے ذمہ بیت المال (اسلامی سرکاری خزانہ) سے اس کا نفقہ ہے، اور اس لئے کہ بیت المال اس کا وارث ہے، اور اس کا مال بیت المال میں جائے گا، لہذا اس کا نفقہ بیت المال پر ہے...... سو اگر بیت المال سے اس پر خرچ کرنا دشوار ہو جائے، اس میں مال نہ ہونے کی وجہ سے، یا ایسی جگہ میں ہونے کی وجہ سے جہاں حاکم نہ ہو، یا حاکم کچھ نہ دے، تو مسلمانوں میں سے جسے اس کا حال معلوم ہو، اس پر خرچ کرنا لازم ہے، اس لئے کہ اللہ تعالی کا فرمان ہے: ''اور نیکی اور تقوی کے کام میں ایک دوسرے کی مدد کرو''، اور اس لئے کہ اس پر خرچ نہ کرنے میں اس کی ہلاکت ہے، اور ہلاکت سے اسے بچانا واجب ہے، جیسے ڈوبنے سے اسے بچانا واجب ہے۔

اور یہ خرچ کرنا فرض کفایہ ہے، اور جو رضا کارانہ طور سے اس پر خرچ کرے، تو اسے کچھ نہیں ملے گا، خواہ یہ خرچ کرنے والا خود اٹھانے والا ہو یا کوئی دوسرا شخص، اور اگر کوئی رضا کارانہ طور سے اس پر خرچ نہ کرے، اور بچہ کو اٹھانے والے یا دوسرے شخص نے بچہ کے مالدار ہونے کے وقت واپس وصول کرنے کی نیت سے خرچ کیا، اور ایسا حاکم کے حکم سے کیا ہو، تو راہ سے اٹھائے ہوئے بچہ کو واپس کرنا لازم ہوگا، جبکہ نفقہ دستور کے مطابق اعتدال کے ساتھ ہو، اور یہی ثوری، حنفیہ اور شافعی کا قول ہے'' (الشرح الکبیر علی متن المقنع ۶/۳۷۵، بیروت، دار الکتاب العربی)۔

اور امام مرغینانی لکھتے ہیں: "ويسلمه في صناعة، لأنه من باب تثقيفه وحفظ حاله" (الہدایہ، کتاب اللقیط، ۲/۴۱۶) (اور راہ سے اٹھائے ہوئے بچہ کو صنعت وحرفت سیکھنے کے لئے حوالہ کرے گا، اس لئے کہ یہ اسے ہنر مند بنانے اور اس کے حال کی حفاظت کے باب سے ہے)۔

اور شیخی زادہ حنفی لکھتے ہیں: "وتسليمه في حرفة، نظر له؛ لأنه من باب تثقيفه، وله تعليمه حيث شاء" (مجمع الانہر، کتاب اللقیط ۱/۷۰۴، دار الاحیاء) (اور ہنر سیکھنے کے لیے اسے حوالہ کرنے میں اس کی رعایت ہے، اس لئے کہ یہ اسے ہنر مند بنانے کے باب سے ہے، اور اسے حق ہے کہ جہاں چاہے اسے تعلیم دلائے)۔

ان فقہی نقول واقتباسات سے واضح ہے کہ بے سہارا بچوں کی پرورش، ان کی تعلیم وتربیت اور ان کے لئے خاندانی ماحول یعنی باپ کی شفقت، ماں کی ممتا کا بدل بقدر امکان فراہم کرنے کی ذمہ داری اصلاً حکومت کی ہے، اگر وہ اس معاملہ میں کوتاہی کرتی ہے تو گنہگار ہے، اور ایسی صورت میں یہ ذمہ داری سماج کی طرف منتقل ہوجائے گی، چنانچہ اگر اس کے درمیان کوئی بے سہارا بچہ ضائع ہوگیا، تو پورا سماج مجرم اور گنہگار ہے، خاص طور سے اس بے سہارا بچہ کے بارے میں علم رکھنے والے مسلمان گنہگار ہوں گے، کیونکہ ان کا دین ومذہب نیکی اور تقویٰ میں تعاون کا حکم دیتا ہے اور برائی اور ظلم وزیادتی، عصبیت اور علاقائیت میں تعاون سے منع کرتا ہے۔

جواب نمبر: ح:

لے پالک بنانے کے لئے اپنا بچہ کسی کو حوالہ کرکے اس سے بے تعلق ہوجانا اسلامی شریعت میں حرام ہے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''وما جعل أدعياءكم أبناءكم ذلكم قولكم بأفواهكم والله يقول الحق وهو يهدي السبيل، ادعوهم لآبائهم هو أقسط عند الله، فإن لم تعلموا آباءهم، فإخوانكم في الدين ومواليكم، وليس عليكم جناح فيما أخطأتم به، ولكن ما تعمدت قلوبكم وكان الله غفوراً رحيماً'' (الاحزاب: ۴-۵) (اور نہ تمہارے منہ بولے بیٹوں کو تمہارے بیٹے بنایا، یہ سب تمہارے اپنے منہ کی باتیں ہیں، اور اللہ حق کہتا ہے، اور وہ صحیح راہ کی طرف رہنمائی کرتا ہے، منہ بولے بیٹوں کو ان کے باپوں کی نسبت کے ساتھ پکارو، یہی اللہ کے نزدیک قرین عدل ہے، اور اگر تم کو ان کے باپوں کا پتہ نہ ہو تو وہ تمہارے دینی بھائی اور تمہارے شریک قبیلہ کی حیثیت رکھتے ہیں، اس باب میں تم سے جو غلطی ہوئی، اس پر تم سے کوئی مواخذہ نہیں، البتہ تمہارے دلوں نے جس بات کا عزم کرلیا اس پر مواخذہ ہے، اور اللہ بخشنے والا اور مہربان ہے)۔

ان آیات سے واضح ہے کہ اسلام لے پالک بنانے کو حرام قرار دیتا ہے، اور اس کی وجہ ظاہر ہے کہ اس میں حقائق کی تبدیلی ہے، کیونکہ اس کے اندر نسب کو بدلنا ہے، ورثہ کے حقوق ضائع کرنا یا کم کرنا ہے، اور اجنبی شخص سے اختلاط رکھنے اور ان سے تنہائی میں ملنے کو مستلزم ہے، اور یہ بات پوشیدہ نہیں کہ اجنبی کے ساتھ اختلاط رکھنے کا انجام بہت ہی برا اور بھیانک ہوتا ہے، اس لئے کہ خونی رشتہ کی بنیاد پر جو تقدس اور قلبی طہارت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، وہ محض مصنوعی طریقہ سے رشتہ قائم کرنے سے نہیں ہوسکتا ہے۔

(۱) اور اگر لے پالک بنانے کے لئے بچہ حوالہ کرنے کی وجہ سے ہدیہ مل رہا ہو تو یہ حرام ہے، اور ''سحت'' (مال حرام) کے حکم میں داخل ہے اور حرام کی مذمت کی ہے، جیسا کہ ارشاد ہے:

"وترى كثيراً منهم يسارعون في الإثم والعدوان وأكلهم السحت لبئس ما كانوا يعملون" (المائدہ: ۶۲) (تم ان میں سے اکثر کو دیکھو گے کہ وہ حق تلفی، زیادتی اور حرام خوری کی راہ میں گرم رو ہیں، کیا ہی برا ہے جو کچھ یہ کررہے ہیں)، اور بیضاوی اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"وأكلهم السحت أي الحرام، خصه بالذكر للمبالغة" (تفسیر البیضاوی ۲/ ۱۳۴) (اور حرام خوری میں گرم رو ہیں، مبالغہ کے طور پر اس کا ذکر خاص طور سے کیا ہے)۔

اور ایک جگہ لکھتے ہیں: "أي الحرام كالرشا من سحته إذا استأصله، لأنه مسحوت البركة" (انوار التنزیل واسرار التاویل ۲/ ۱۲۷) (یعنی حرام جیسے رشوت خوری میں گرم رو ہیں، ''سحت'' کا لفظ ''سحتہ'' سے ماخوذ ہے، جس کے معنی ہیں، بیخ کنی کرنا اور جڑ سے اکھاڑ دینا، اور حرام کو ''سحت'' اس لئے کہتے ہیں کہ وہ برکت سے خالی ہوتا ہے)۔

نیز یہ آزاد کو بیچ کر اس کے ثمن کو کھانے کے درجہ میں ہے، اور حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''ثلاثة أنا خصمهم يوم القيامة، ومن كنت خصمه خصمته، رجل أعطى بي ثم غدر، ورجل باع حراً فأكل ثمنه، ورجل استأجر أجيراً فاستوفى منه ولم يوفه أجره'' (صحیح البخاری، حدیث نمبر: ۲۲۲۷، ۲۲۷۰، سنن ابن ماجہ حدیث نمبر:

۲۴۴۲) (تین اشخاص کا فریق قیامت کے دن میں بنوں گا، اور جس کا مقابل میں بنوں گا اس پر میں غالب آجاؤں گا، ایک وہ شخص جو میرے نام پر عہد دے کر عہد شکنی کرے، اور دوسرا وہ شخص جو آزاد کو بیچ کر اس کا دام کھا جائے، اور تیسرا وہ شخص جو مزدور سے مکمل کام لے اور اسے پوری اجرت نہ دے)۔

(۲) البتہ اگر بچہ کو پرورش کے لئے حوالہ کرے، اور لینے والا پرورش کی نیت سے لے، اور بچہ کو اس کے ماں باپ کی طرف ہی منسوب کرے، تو اس میں بڑا اجر وثواب ہے، اس لئے کہ بچہ کی پرورش نیکی کا کام ہے جس میں لینے والا تعاون دے رہا ہے، اور اللہ تعالی کا ارشاد ہے: "وتعاونوا علی البر والتقوی" (المائدہ: ۲) (اور نیکی اور تقوی کے کام میں ایک دوسرے کی مدد کرو)۔

اور یہ محتاج کے ساتھ حسن سلوک ہے، اور اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

"وأحسن كما أحسن الله إليك" (القصص: ۷۷) (اور جس طرح اللہ تعالی نے تمہارے ساتھ احسان کیا ہے، اسی طرح تم بھی دوسروں کے ساتھ احسان کرو)

پھر اگر وہ اس صورت میں اعانت کے طور پر ہدیہ دیتا ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں، اور اس کے والدین کے لئے اس کا استعمال درست ہے، اس لئے کہ یہ ایک محتاج کی امداد ہے۔

اور اللہ تعالی کا ارشاد ہے: "وآتی المال علی حبه ذوی القربی والیتامی والمساکین وابن السبیل والسائلین وفی الرقاب" (البقرہ: ۱۷۷) (اور (نیکی یہ ہے کہ) اپنے مال، اس کی محبت کے باوجود قرابت مندوں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں، سائلوں اور گردنیں چھڑانے پر خرچ کریں)۔

اور علامہ سرخسی لکھتے ہیں: "فقد كان الأنبياء والرسل صلوات الله وسلامه عليهم يقبلون الهدية" (المبسوط ۱/۱۴۰) (چنانچہ انبیاء اور رسل ہدیہ قبول فرماتے تھے)۔

(۳) حد درجہ بڑھتے ہوئے افلاس اور پرورش کی استطاعت نہ رکھنے کی وجہ سے کسی کو اپنا بچہ حوالہ کر کے اس سے بے تعلق ہونے کے واقعات کی روک تھام کے لئے شریعت اسلامی میں درج ذیل تعلیمات ہیں:

۱۔ حکومت کی ذمہ داری ہے کہ سماجی انصاف قائم کرے اور وسائل کی منصفانہ تقسیم کرے، تاکہ کوئی فرد بھوکا نہ رہ سکے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے: "إن الله يأمر بالعدل والإحسان" (النحل: ۹۰) (بے شک اللہ عدل واحسان کا حکم دیتا ہے)۔

۲۔ حکومت کی ذمہ داری ہے کہ اس کی رعایا میں سے کوئی اگر حد درجہ افلاس کا شکار ہو، تو اس کی مدد کرے، اس لئے کہ وہ سماج کی نمائندہ ہے، لہذا سماج کی نیابت میں اس پر واجب ہے کہ محتاجوں کی مدد کرے، چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "الإمام راع ومسئول عن رعيته" (صحیح البخاری حدیث نمبر: ۸۹۳) (سربراہ حکومت نگہبان ہے اور اپنی رعایا کے سلسلہ میں جواب دہ ہے)۔

اور اس کی شرح میں ابن حجر لکھتے ہیں: ''فرعاية الإمام الأعظم حياطة الشريعة بإقامة الحدود، والعدل في الحكم'' (سو سربراہ حکومت کی نگہبانی یہ ہے کہ حدود قائم کر کے شریعت کی حفاظت کرے اور حکمرانی میں انصاف سے کام لے)، اور انصاف کے ساتھ حکمرانی اسی وقت ہوگی جبکہ محتاج کی مدد کی جائے۔

اور حضرت مقداد کندیؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "أنا أولى بكل مؤمن من نفسه، فمن ترك دينا أو ضيعة فإلي، ومن ترك مالا فلورثته، وأنا مولى من لا مولى له" (سنن ابی داؤد حدیث نمبر: ۲۹۰۰، اور اس کی سند صحیح ہے) (میں ہر مومن سے اس کی جان سے زیادہ قریب ہوں، سو جو قرض یا محتاج بال بچے چھوڑ جائے، تو اس کی ذمہ داری میرے سر ہے، اور جو مال چھوڑ جائے تو اس کے ورثہ کے لئے ہے، اور میں اس کا سرپرست ہوں، جس کا کوئی سرپرست نہیں)، اور اس کی شرح میں علامہ عظیم آبادی ''فتح الودود'' کے حوالہ سے لکھتے ہیں:

"معنى الأولوية هنا النصرة والتولية، أي: أتولى أمورهم بعد وفاتهم وأنصرهم فوق ما كان منهم لو عاشوا" (عون المعبود ۸/۷۷) (اس جگہ زیادہ قریب ہونے کا مفہوم مدد کرنا اور ذمہ داری سنبھالنا ہے، یعنی ان کے مرنے کے بعد میں ان کے معاملات سنبھالوں گا، اور اگر وہ زندہ

ہوتے اور جو کرتے اس سے بڑھ کر میں ان کے بال بچوں کی مدد کروں گا)۔

بے وارث کا ترکہ بیت المال (اسلامی سرکاری خزانہ) میں جاتا ہے، لہذا اس کے محتاج ہونے کی صورت میں بیت المال اس کی مدد کا ذمہ دار ہے، اس لئے کہ فقہی قاعدہ ہے: "الغرم بالغنم" (فتح القدیر ۴۲۱/۴، ابن امیر حاج "التقریر والتحبیر" ۲/۲۰۲، بیروت، العلمیہ ۱۴۰۳ھ) (ذمہ داری نفع کے ساتھ مربوط ہے)۔

۳۔ اگر حکومت ظالمانہ ہو، یا ایسی حکومت ہو جو اپنی ذمہ داری ادا نہ کر رہی ہو، تو اس مفلس کا علم رکھنے والے سماج کی ذمہ داری ہے کہ اس کی مدد کرے، چنانچہ قرطبی لکھتے ہیں: "والتعاون علی البر والتقوی یکون بوجوہ: فواجب علی العالم أن یعین الناس بعلمہ فیعلمھم، ویعینھم الغنی بمالہ" (تفسیر القرطبی ۶/۴۷) (اور نیکی اور تقوی کے کام پر باہمی مدد مختلف شکلوں سے ہوگی، چنانچہ عالم پر واجب ہے کہ اپنے علم کے ذریعہ لوگوں کی مدد کرے اور انہیں تعلیم دے، اور مالدار پر واجب ہے کہ اپنے مال کے ذریعہ لوگوں کی مدد کرے)۔

نیز اس پہلو سے بھی سماج کو غور کرنا چاہئے کہ انتہائی شدید مفلس ماں باپ کا بچہ حکماً یتیم کے درجہ میں ہے، اور یتیم کی نگہداشت کا حکم قرآن مجید نے بار بار دیا ہے، چنانچہ ارشاد ہے: "فأما الیتیم فلا تقھر" (الضحیٰ: ۹) (سو یتیم کو مت دباؤ)۔ اور ارشاد ہے: "کلا بل لا تکرمون الیتیم" (الفجر: ۱۷) (بلکہ تم یتیم سے عزت کا سلوک نہیں کرتے)۔

اور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: "أنا وکافل الیتیم فی الجنۃ ھکذا، وأشار بالسبابۃ والوسطی، وفرج بینھما شیئاً" (صحیح البخاری حدیث نمبر: ۵۳۰۴، صحیح مسلم حدیث نمبر: ۲۹۸۳) ("میں اور یتیم کی پرورش کرنے والا اتنے قریب جنت میں ہوں گے" اور انگشت شہادت اور درمیانی انگلی سے اشارہ فرمایا، اور ان کے درمیان کچھ کشادگی پیدا کی)۔

اور حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: "خیر بیت فی المسلمین، بیت فیہ یتیم یحسن إلیہ، وشر بیت فی المسلمین، بیت فیہ یتیم یساء إلیہ" (سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر: ۳۶۷۹، اور اس کی سند میں کچھ کلام ہے) (مسلمانوں کے اندر سب سے بہتر گھر وہ گھر ہے جس میں یتیم ہو اور اس کے ساتھ بہتر سلوک کیا جاتا ہو، اور مسلمانوں کے اندر بدترین گھر وہ گھر ہے جس میں یتیم ہو، اور اس کے ساتھ برا سلوک کیا جاتا ہو)۔

نیز ارشاد ہے: "الساعی علی الأرملۃ والمسکین کالمجاھد فی سبیل اللہ، أو القائم اللیل الصائم النھار" (صحیح البخاری حدیث نمبر: ۵۳۵۳، صحیح مسلم، حدیث نمبر: ۲۹۸۲) (بیوہ اور مسکین کی خدمت کرنے والا، اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے شخص یا شب بھر عبادت کرنے اور دن میں روزہ رکھنے والے زاہد کی مانند ہے)۔

اور حضرت عبد اللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: "إن أحب البیوت إلی اللہ بیت فیہ یتیم یکرم" (المعجم الکبیر للطبرانی حدیث نمبر: ۱۳۴۳۴، اور اس کی سند میں کلام ہے) (اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں سب سے پسندیدہ گھر وہ گھر ہے جس میں یتیم کی عزت کی جاتی ہو)۔

لہذا مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ ہر علاقہ میں رفاہی تنظیم قائم کریں، تاکہ کوئی بیوہ، یتیم، بے سہارا اور محتاج بھوکا نہ رہے۔

۴۔ اگر محتاج کمانے پر قادر ہے تو کما کر بچوں کی پرورش کرے، چنانچہ امام محمد لکھتے ہیں:

"وإن کان المحتاج بحیث یقدر علی التکسب، فعلیہ أن یکتسب، ولا یحل لہ أن یسأل" (الکسب ص: ۹۰) (اور اگر محتاج اس حیثیت میں ہو کہ کمانے پر قادر ہو، تو اس کی ذمہ داری ہے کہ کمائے، اور اس کے لئے بھیک مانگنا حلال نہیں)۔

۵۔ اگر محتاج کمانے پر قادر نہ ہو، اور سماج اپنی ذمہ داری ادا نہ کرے، تو بھیک مانگ کر اپنے بچوں کی پرورش کرے، لیکن لے پالک بنانے کے لئے نہ دے، چنانچہ امام محمدؒ لکھتے ہیں: "فأما إذا کان عاجزا عن الکسب، ولکنہ قادر علی أن یخرج، فیطوف علی الأبواب، ویسأل، فإنہ یفترض علیہ ذلک، حتی إذا لم یفعل ذلک حتی ھلک کان آثماً عند أھل الفقہ رحمھم اللہ تعالی" (الکسب، ص: ۹۱) (سو اگر کمانے سے عاجز ہو، لیکن گھر سے باہر نکل کر دروازوں کا چکر لگا کر مانگنے پر قادر ہو، تو اس پر ایسا کرنا فرض ہے، یہاں تک کہ اگر ایسا نہ

کرے حتی کہ ہلاک ہو جائے، تو ایسا کرنے والا شخص فقہاء رحمہم اللہ کے نزدیک گنہگار ہے)۔

جواب نمبر ط: ...... معذور بچہ کے سلسلہ میں اسلامی ہدایات درج ذیل ہیں:

۱۔ الف: ...... بچہ خواہ معذور ہو، اس کی پیدائش پر خوش ہونا چاہئے، اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہئے، اور معذور بچہ کی تربیت بھی فرض ہے، اور یہ تربیت اس طرح

ہو کہ بچہ اسلام اور اللہ تعالیٰ کی حکمت کو سمجھے اور حتی الامکان دینی احکام کی بجا آوری کا پابند بنے، مرض اور صحت کے فلسفہ کو سمجھے، مصائب اور آفات پر صبر کرنا سیکھے، اور معذوری میں بھی حتی الوسع عمدہ اخلاق سے آراستہ ہو، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "قوا أنفسكم وأهليكم ناراً" (التحریم: ٦) (اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو آگ سے بچاؤ)۔

۲۔ ب: معذور بچہ کو اپنی مادی اغراض اور اپنے دنیوی منافع کے لئے اپنی شفقت ومحبت سے محروم کر دینا بھی امانت میں خیانت ہے، اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"یا أیها الذین آمنوا لا تخونوا الله والرسول وتخونوا أماناتكم وأنتم تعلمون" (الانفال: ۲۷) (اے ایمان والو، اللہ ورسول سے بے وفائی اور اپنی امانتوں میں خیانت جانتے بوجھتے نہ کرو)۔

اور حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے: ''قبل رسول اللهﷺ الحسن بن علي، وعنده الأقرع بن حابس التميمي جالساً، فقال الأقرع: إن لي عشرة من الولد، ما قبّلت منهم أحداً، فنظر إليه رسول اللهﷺ، ثم قال: ''من لا يرحم لا يرحم'' (صحیح البخاری حدیث نمبر: ۵۹۹۷) (نبی کریم ﷺ نے حضرت حسن بن علیؓ کا بوسہ لیا، اور آپ ﷺ کے پاس اقرع بن حابس تمیمی بیٹھے ہوئے تھے، سو اقرع نے کہا کہ میرے پاس دس اولاد ہے، میں نے ان میں سے کسی کا بوسہ نہیں لیا، تو اس بات پر رسول کریم ﷺ نے ان کی طرف دیکھا، پھر فرمایا: ''جو رحم نہیں کرتا، اس پر رحم نہیں کیا جاتا)۔

اس حدیث سے پتہ چلا کہ کسی بچہ کو مہربانی، رحمت اور شفقت سے محروم کر دینا درست نہیں، خواہ وہ معذور ہی کیوں نہ ہو۔

۳۔ ماں باپ کو سمجھنا چاہئے کہ معذور بچہ انکی بخشش کا ذریعہ ہے، لہذا ان کی خدمت اور ان کے حقوق ادا کرنے میں کوتاہی نہیں ہونی چاہئے، جیسا کہ حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: "ما من مصيبة تصيب المسلم إلا كفر الله بها عنه حتى الشوكة يشاكها" (صحیح البخاری حدیث نمبر: ۵۶۴۰، صحیح مسلم حدیث نمبر: ۲۵۷۲) (مسلمان کو کوئی مصیبت نہیں پہنچتی مگر اللہ تعالیٰ اس کے ذریعہ سے اس کے گناہ مٹا دیتا ہے یہاں تک کہ کانٹا جو اسے چبھتا ہے وہ بھی اس کے گناہ کا کفارہ ہو جاتا ہے)۔

اور حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: "من يرد الله به خيراً يصب منه" (صحیح البخاری حدیث نمبر: ۵۶۴۵) (اللہ تعالیٰ جس کے ساتھ بھلائی کا قصد کرتا ہے اسے مصیبت میں مبتلا کرتا ہے)۔

۴۔ معذور بچہ کی دیکھ ریکھ، نگہداشت اور پرورش پر خصوصی توجہ دی جائے، چنانچہ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا:

"من وسع على مكروب كربة في الدنيا، وسع الله عليه كربة في الآخرة" (صحیح ابن حبان حدیث نمبر: ۵۳۴، مسند احمد حدیث نمبر: ۱۰۷۷۱، اور اس کی سند صحیح ہے) (جو دنیا میں مصیبت زدہ کی پریشانی دور کرے گا، تو اللہ تعالیٰ آخرت میں اس کی بے چینی دور فرمائے گا)۔

۵۔ بچہ خواہ معذور ہو، ماں باپ کی شفقت ومحبت اور پیار کا اسی طرح مستحق ہے جس طرح صحت مند بچے، چنانچہ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: "من لا یرحم لا یرحم" (صحیح البخاری حدیث نمبر: ۵۹۹۷) (جو رحم نہیں کرے گا اس پر رحم نہیں کیا جائے گا)۔

۶۔ صحتمند بچے کی طرح معذور بچہ کے ساتھ بھی محبت اور الفت کا برتاؤ ہونا چاہئے، چنانچہ حضرت اسامہ بن زیدؓ سے مروی ہے:

"كان رسول الله ﷺ يأخذني فيقعدني على فخذه، ويقعد الحسن بن علي على فخذه الآخر، ثم يضمنا، ثم يقول: اللهم ارحمهما، فإني أرحمهما" (صحیح البخاری حدیث نمبر: ۶۰۰۳، مسند احمد حدیث نمبر: ۲۱۷۸۷) (رسول کریم ﷺ مجھے لیتے اور اپنی ران مبارک پر مجھے بیٹھاتے اور حضرت حسن بن علیؓ کو دوسرے زانوئے مبارک پر بٹھاتے، پھر ہمیں سینہ سے لگاتے اور دعا کرتے، الٰہی! ان دونوں پر رحم فرما کیوں کہ میں دونوں پر رحم کھاتا ہوں)۔

۷۔ معذور بچہ صبر کا موقع فراہم کرنے والا ہے، لہذا اس کی قدر ہونی چاہئے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"وبشر الصابرين الذين إذا أصابتهم مصيبة، قالوا إنا لله وإنا إليه راجعون" (البقرہ: ۱۵۵-۱۵۶) (اور ان ثابت قدموں کو خوش خبری سنادو، جن کا حال یہ ہے کہ جب ان کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ بے شک ہم اللہ ہی کے لئے ہیں اور ہم اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں)۔

لہذا ماں باپ کو معذور بچہ کی خدمت پر صبر کرنا چاہئے، اور یہ ذہن میں رکھنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کی تخلیق حکمت سے خالی نہیں۔

(ج):...... دنیوی معاملات کا دارومدار غلبۂ ظن پر ہے، لہذا جس حد تک کسی مرض سے معذور بچہ کا شفایاب ہونا بار بار کے تجربہ سے ثابت ہو، تو اس حد تک اس کا علاج کرانا واجب ہے، اگر چہ اصل علاج مستحب ہے، چنانچہ ابن تیمیہ رقمطراز ہیں:

"وأما التداوي فليس بواجب عند جماهير الأئمة" (الفتاوی الکبری ۳/۷) (علاج ومعالجہ جمہور ائمہ کے نزدیک واجب نہیں ہے)۔

لیکن اگر بار بار کے تجربہ سے مخصوص دوا کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے مخصوص مرض سے شفایابی کا ماہر طبیب کو گمان غالب ہو، تو ایسی حالت میں علاج واجب ہے، اس لئے کہ نفس انسانی کی حفاظت مقاصد شریعت میں سے ہے، اور خود نبی کریم ﷺ نے علاج کروایا ہے اور دوسروں کو علاج کرانے کا حکم دیا ہے، چنانچہ ابن حزم لکھتے ہیں:

"وأمره عليه السلام بالتداوي نهي عن تركه" (المحلی ۶/۹۶) (اور سرکار دو عالم ﷺ کا علاج کرانے کا حکم دینا، علاج چھوڑنے سے منع کرنا ہے)۔

لہذا معذور بچہ کی شفایابی کا گمان غالب ہو تو اس حد تک علاج کرانا واجب ہے۔

☆☆☆

اسلام میں بچوں کے حقوق اور ان سے متعلق احکام

مولانا مفتی راشد حسین ندوی [1]

الف: حضانت کے مختصر احکام:

حضانت کا معنی: حضانت کے لغوی معنی بچہ کی تربیت کرنے کے ہیں، "تربیۃ الولد" (شامی ۲/ ۶۸۷)، قاموس میں ہے: "حضن الصبي حضناً وحضانة: جعله في حضنه أو رباه" (حضن الصبي حضنا وحضانۃ کے معنی ہیں: بچہ کو گود میں لینا، یا اس کی پرورش کرنا)۔

شرعی معنی: علامہ شامی فرماتے ہیں: "أما الشرعي، فهو تربية الولد لمن له حق الحضانة كما أفاده القهستاني" (شامی ۲/ ۶۸۷) (حضانت کی شرعی تعریف یہ ہے کہ جس کو حق حضانت ہے، اس کا بچہ کی تربیت کرنا)۔

سید سابق نے اس کی تعریف یوں کی ہے:

"وعرفها الفقهاء بأنها عبارة عن القيام الخ" (فقہ السنہ ۲/ ۲۸۱) (فقہاء نے اس کی تعریف یہ کی ہے کہ اس سے مراد نابالغ لڑکے لڑکی یا اس کم عقل کی حفاظت کا کام انجام دینا ہے جو نہ تمیز کرسکتا ہو نہ اپنا کام خود سے انجام دے سکتا ہو، نیز اس کے مفادات کی خبر گیری کرنا اور اس کو تکلیف اور ضرر پہنچانے والی چیزوں سے بچانا اور جسمانی، نفسیاتی اور عقلی اعتبار سے تربیت کرنا، تاکہ وہ زندگی کے تقاضوں سے نبرد آزما ہو سکے اور اس کی ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھا سکے)۔

حضانت کا حقدار کون ہے:

اگر میاں بیوی کے درمیان رشتہ ازدواج قائم ہے، اور دونوں میاں بیوی کی حیثیت سے رہ رہے ہیں، تو بچہ ان دونوں کے ساتھ رہے گا، اور دونوں کی شفقتوں سے لطف اندوز ہوگا، لیکن اگر دونوں کے درمیان تفریق ہوجائے، اور بچہ کو دونوں کے ساتھ رکھنا ناممکن ہوجائے تو ابتداء میں بچہ کی پرورش کا حق ماں کو دیا گیا ہے، اس لئے کہ ماں کے اندر اللہ تعالیٰ نے فطری طور سے بچہ کی پرورش کا خاص جذبہ پیدا کردیا ہے، جس سے اس کا باپ یقیناً خالی ہوتا ہے، چنانچہ رات کو بچہ کے جگنے پر ماں خوشی خوشی جگ جاتی ہے، اس کے گیلے کپڑے بدلتی ہے، اس کو دودھ پلاتی ہے، یہ کام مرد کے لئے اتنا آسان نہیں ہے، چنانچہ حدیث شریف میں وارد ہوا ہے:

"عن عبدالله عمرو: أن امرأة قالت: يا رسول الله! إن ابني هذا، كان بطني له وعاء، وحجري له حواء، وثدي له سقاء، وزعم أبوه أنه ينزعه مني، فقال: أنت أحق به ما لم تنكحي" (ابوداؤد کتاب الطلاق باب من احق بالولد (۲۲۷۶) مسند احمد)۔

(حضرت عبداللہ بن عمر سے مروی ہے: ایک خاتون نے کہا: اے اللہ کے رسول! میرے اس بیٹے کے لئے میرا پیٹ ظرف تھا، میری گود اس کی جائے پناہ تھی، میرے پستان اس کے لئے مشکیزہ تھے، اور اس کے باپ کا عزم ہے کہ وہ اسے مجھ سے چھین لے گا؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: جب تک تم نکاح نہ کرلو اس کی زیادہ حقدار ہو)۔

حضرت ابوبکر ﷺ کا فیصلہ بھی اس مسئلہ کو صاف صاف بیان کررہا ہے:

"عن يحيى بن سعيد قال: سمعت القاسم بن محمد يقول: كانت عند عمر بن الخطاب امرأة من الأنصار، فولدت له عاصم بن عمر، ثم إن عمر فارقها، فجاء عمر قباء، فوجد ابنه عاصماً يلعب بفناء المسجد، فأخذ يعضده بين يديه على الدابة، فأدركته جدة الغلام، فنازعته إياه، حتى أتيا أبابكر الصديق، فقال عمر:

---

[1] مدرسہ ضیاء العلوم تکیہ کلاں، رائے بریلی یوپی۔

ابني، وقالت المرأة ابني، فقال أبوبكر خل بينها وبينه، فما راجعه عمر الكلام'' (موطا كتاب النكاح، باب إذا فارق الرجل امرأته وبينهما ولد صغير الخ (۴-۱۲۸)، وفي بعض الروايات أنه قال له: ''الأم أعطف وألطف وأرحم وأحنى وأخير وأرأف، وهي أحق بولدها ما لم تتزوج'' (فقه السنہ ۲-۴۸۳)۔

(یحییٰ بن سعید کہتے ہیں، میں نے قاسم بن محمد کو فرماتے ہوئے سنا: حضرت عمر کی زوجیت میں ایک انصاری خاتون تھیں، ان سے حضرت عاصم ابن عمر کی ولادت ہوئی، پھر حضرت عمر نے ان کو چھوڑ دیا، تو حضرت عمر قباء آئے، اور اپنے بیٹے عاصم کو مسجد کے صحن میں کھیلتے ہوئے پایا تو حضرت عمر نے جانور پر اپنے سامنے بیٹھا کر ان کا بازو پکڑ لیا، تو بچہ کی نانی نے ان کو جالیا، اور بچہ پر نزاع کیا، یہاں تک کہ دونوں حضرت ابوبکرؓ کے پاس آئے، حضرت عمرؓ نے کہا: یہ میرا بیٹا ہے، عورت نے کہا: یہ میرا بیٹا ہے، تو حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا: اے عمر عورت اور بچہ کے درمیان راستہ چھوڑ دو، تو حضرت عمرؓ نے ان سے دوبارہ گفتگو نہیں کی، بعض روایات میں ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے ان سے کہا: ماں زیادہ شفیق، مہربان مشفق، بہتر اور مروت کرنے والی ہوتی ہے، اور جب تک شادی نہ کرلے وہی اپنے بیٹے کی زیادہ حقدار ہے)۔

ماں کی غیر موجودگی میں پرورش کا حقدار کون ہوگا؟

اگر ماں کا انتقال ہو گیا ہو، یا وہ تربیت کی اہلیت نہ رکھتی ہو، یا اس نے بچہ کے غیر محرم سے نکاح کرلیا ہو تو پرورش کا حق الاول فالاول کے اعتبار سے مندرجہ ذیل عورتوں کو ہوگا: (۱) نانی، (۲) دادی، (۳) بہنیں، (۴) خالہ، (۵) پھوپھی، (۶) چھٹی صورت یہ ہے کہ ان میں سے کوئی عورت نہ ہو، اس صورت میں یہ حق مرد عصبات کو عصبات کی ترتیب کے مطابق ملے گا:

''فإن لم تكن له أم، فأم الأب أولى من الأخوات'' (ہدایہ مع الفتح ۴/۱۸۵-۱۸۷)۔

''فإن لم تكن'' أي لم تكن له أم تستحق الحضانة بأن كانت غير أهل للحضانة، أو متزوجة بغير محرم أو ماتت فأم الأم أولى الخ'' (فتح القدیر ۴/۱۸۵)۔

لیکن ان عورتوں کا استحقاق صرف حضانت سے متعلق ہوگا، بچہ کا نفقہ کلی طور پر باپ کے اوپر ہوگا، "والنفقة على الأب" (ہدایہ ۴/۱۸۵)۔

ان عورتوں کو یہ حق ایک خاص مدت تک ہوگا، پھر بچہ باپ کی پرورش میں آجائے گا، اس کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے:

بچہ باپ کی پرورش میں کب آئے گا؟

زیر پرورش اگر لڑکا ہو تو پرورش کرنے والی عورت کو (خواہ ماں ہو یا کوئی دوسری عورت) اس وقت تک پرورش کا حق رہے گا، جب تک بچہ عورتوں سے مستغنی ہو کر خود سے کھانے پینے اور استنجاء کرنے پر قادر نہ ہو جائے، اس کا اندازہ سات سال کی عمر سے لگایا گیا ہے اور فتوی اسی پر ہے، معلوم ہوا کہ سات سال مکمل ہونے پر بچہ باپ کے حوالہ کر دیا جائے، "والحاضنة أما أو غيرها أحق به أي بالغلام حتى يستغني عن النساء، وقدر بسبع، وبه يفتي" (الدر المختار علی ہامش رد المختار ۲/۶۹۵)۔

اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے صاحب ہدایہ فرماتے ہیں: "ووجهه أنه إذا استغنى يحتاج إلى التأدب والتخلق بآداب الرجال وأخلاقهم والأب أقدر على التأديب والتثقيف" (ہدایہ مع الفتح ۴/۱۸۷) (اس کی وجہ یہ ہے کہ بچہ جب عورتوں سے مستغنی ہو جاتا ہے تو اس کو مردوں کے آداب اور اخلاق سے آراستہ ہونے کی حاجت ہوتی ہے، اور باپ کو ادب و تہذیب سکھانے کی طاقت زیادہ ہوتی ہے)۔

جہاں تک لڑکی کا تعلق ہے تو ظاہر الروایہ کے مطابق ماں اور دادی کو اس کی تربیت کا حق اس کے بلوغ تک رہتا ہے، دوسری عورتوں کو اس کے حد شہوت تک پہنچنے تک رہتا ہے، اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے صاحب ہدایہ فرماتے ہیں:

''ماں اور دادی لڑکی کی زیادہ حقدار ہوں گی، یہاں تک کہ اسے حیض آجائے، اس لئے کہ استغناء کے بعد اسے عورتوں کے آداب جاننے کی ضرورت ہے، اور عورت اس پر زیادہ قدرت رکھتی ہے، اور بلوغ کے بعد اسے حفاظت اور بچانے کی ضرورت ہے اور باپ اس پر زیادہ قوی اور زیادہ واقف ہے...... اور ماں اور دادی کے علاوہ دوسری عورتیں لڑکی کی زیادہ حقدار ہیں، یہاں تک کہ وہ حد شہوت تک پہنچ جائے...... اس لئے کہ وہ اس سے کام لینے کی قدرت نہیں رکھتی

...... برخلاف ماں اور جدہ کے اس لئے کہ شرعاً وہ کام لینے پر قدرت رکھتی ہیں'' (ہدایہ ۴/ ۱۸۸)۔

ماں اور جدہ کے علاوہ کے لئے حق تربیت کی مدت ۹ سال کی متعین کی گئی ہے، اور امام محمد سے ایک روایت یہ ہے کہ ماں اور جدہ کے لئے بھی یہی مدت متعین کی جائے گی، کئی حضرات نے اسی روایت پر فتویٰ بھی دیا ہے ''وغیرهما أحق بها حتى تشتهى وقدر بسبع وبه يفتي... وعن محمد أن الحكم في الأم والجدة كذلك، وبه يفتى لكثرة الفساد (وبه يفتى) قال في البحر بعد نقل تصحيحه: والحاصل أن الفتوى على خلاف ظاهر الرواية'' (شامی ۲/ ۶۹۵-۶۹۶)

حق حضانت سے محرومی کب ہوگی؟

حق حضانت میں بچہ کے مفاد کا پورا خیال رکھا جاتا ہے، اوپر کی تفصیل سے واضح ہے کہ جب تک ماں کے پاس رکھنے میں اس کا مفاد زیادہ تھا، اسے اس کے پاس رکھنے کا حکم ہوا، پھر جب یہ دیکھا گیا کہ اس کا مفاد باپ کے پاس رکھنے میں ہے، تو اس کو باپ کے پاس کر دیا گیا ہے، اسی لئے فقہاء فرماتے ہیں کہ اگر کسی کے پاس رکھنے میں بچہ کے مفادات پر ضرب لگتی ہو تو بچہ اس کے پاس نہیں رکھا جائے گا، اسی لئے حضانت کی شرائط کا ذکر کرتے ہوئے فقہاء فرماتے ہیں:

"قال الرملي: ويشترط في الحاضنة أن تكون حرة بالغة سوى الشرط الأخير" (شامی ۲/ ۶۸۷) (رملی کہتے ہیں: پرورش کرنے والی کے لئے شرط یہ ہے کہ وہ آزاد عاقل بالغ قابل اعتماد اور قادر ہو، نیز وہ اجنبی شوہر سے خالی ہو، یہی شرائط آخری شرط کو چھوڑ کر مرد پرورش کرنے والے میں بھی ہیں)۔

انہیں مفادات کا خیال رکھتے ہوئے فقہاء فرماتے ہیں کہ مندرجہ ذیل ۶ صورتوں میں بچہ کو حقدار کے پاس سے ہٹا کر اس کے بعد والے کے حوالہ کر دیا جائے گا:

۱۔ جب وہ مرتد ہو جائے، اس لئے کہ ارتداد کے سبب اسے قید کر دیا جائے گا، لہٰذا اس کے لئے بچہ کی نگہداشت ممکن نہیں ہوگی، "إلا أن تكون مرتدة فحتى تسلم لأنها تحبس أي وتضرب فلا تتفرغ للحضانة" (شامی ۲/ ۶۸۸)۔

۲۔ کسی ایسی برائی میں مبتلا ہو جس میں مشغولیت کے سبب بچہ کی دیکھ بھال کما حقہ نہ ہو سکے، مثلاً: زنا، گانا بجانا، چوری وغیرہ جیسے افعال میں غرق ہو، اصل چیز کیونکہ بچہ کی تربیت میں خلل ہے، لہٰذا اسی میں وہ صورت بھی داخل ہے جب عبادات جیسی اچھائیوں میں استغراق کے سبب بچہ کی دیکھ بھال میں کوتاہی ہوتی ہو، "أو فاجرة فجوراً يضيع الولد به كزنا وغنا وسرقة ونياحة ...... وفي القنية: الأم أحق بالولد ولو سيئة السيرة معروفة بالفجور ما لم يعقل ذلك، أو غير مأمونة بأن تخرج كل وقت وتترك الولد ضائعاً" (الدر المختار علی ہامش الرد ۲/ ۶۸۸)۔ "وعلى هذا لو كانت صالحة كثيرة الصلاة قد استولى عليها محبة الله تعالى وخوفه حتى شغلها عن الولد ولزم ضياعه انتزع منه ولم رده" (شامی ۲/ ۶۸۸)۔

۳۔ ایسی لاپرواہ ہو کہ بچہ کے مفادات میں غفلت دکھاتی ہو، مثلاً ہر وقت گھر سے باہر رہتی ہو، مثلاً ہر وقت گھر سے باہر رہتی ہو، اور بچہ کو بے سہارا چھوڑ دیتی ہو، "أو غير مأمونة. ذكره في المجتبى بأن تخرج كل وقت، وتترك الولد ضائعاً" (شامی ۲/ ۶۸۸)۔

۴۔ باندی، ام ولد یا اس جیسی دوسرے کے ماتحت رہنے والی عورت ہو جس کے لئے بچہ کی دیکھ بھال ممکن نہ ہو، "أو تكون أمة أو أم ولد الخ" (ایضاً)۔

۵۔ جب وہ کسی ایسے شخص سے شادی کرلے جو بچہ کا محرم نہ ہو، "أو متزوجة بغير محرم الصغير" (شامی ۲/ ۶۸۹)۔

۶۔ جب وہ حضانت کی اجرت طلب کر رہی ہو، بچہ کا باپ تنگدست ہو جبکہ بعد کا حقدار مفت دیکھ بھال کرنے پر تیار ہو (ایضاً ہدایہ مع الفتح ۴/ ۱۸۴)۔

یہ شرائط صرف ماں یا اس کے بعد پرورش کا حق رکھنے والی عورتوں کے لئے مخصوص نہیں ہیں، اگر یہ خرابیاں باپ یا دوسرے مرد حقداروں میں ہوں تو بچہ ان کے بھی حوالہ نہیں کیا جائے گا، اور بعد میں خرابیاں پائی جائیں تو ان سے لے لیا جائے گا، چنانچہ اوپر عبارت گزر چکی ہے، "قال الرملي ويشترط في الحاضنة (الی) وكذا في الحاضن الذكر سوى الشرط الأخير" (شامی ۲/ ۶۸۷) (رملی کہتے ہیں: حاضنہ میں مندرجہ ذیل شرائط ہیں، (آگے ان شرائط کا ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں (: یہی شرائط مرد مربی کے لئے بھی ہیں سوائے آخری شرط (یعنی بچہ کے نامحرم سے شادی نہ کی ہو) کے)

اور علامہ ابن الہمام فرماتے ہیں:

"ولو كان في المحارم من الأخوة والأعمام من لا يؤمن على صبي وصبية بفسقه، ليس له حق في الإمساك" (ہدایہ و فتح القدیر ۴/ ۱۸۷)

(اگر بھائیوں اور چچاؤں جیسے محارم میں کوئی ایسا ہو جس کے فسق کے سبب بچہ کے سلسلہ میں اعتماد نہ کیا جاسکتا ہو تو اسے روکنے کا کوئی حق نہیں ہوگا)۔

سوال (ب) (۱) بچوں کے حق تعلیم و تربیت کے بارے میں اسلام کی ہدایات:

اسلام میں علم کی جس قدر اہمیت و فضیلت بیان کی گئی ہے، شاید کسی اور مذہب میں اس کا تصور بھی مشکل ہے، قرآن کی ابتداء ہی لفظ "اقرء" سے کی گئی ہے، او رپھر تاکیداً اس کی تکرار بھی کی گئی (سورہ علق: ۱-۵)، قرآن پاک میں یہ بھی صراحت سے آیا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی ملائکہ پر فوقیت علمی تفوق کی بنیاد پر ثابت کی گئی (سورہ بقرہ: ۳۰-۳۳)، اس کے علاوہ بھی قرآن و حدیث میں جگہ جگہ علم کی فضیلت ثابت کی گئی ہے۔

پھر حدیث میں اس کی بھی صراحت کی گئی کہ ضروری اور لابدی علوم کا حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے: "وعن أنس قال: قال رسول اللہ ﷺ: طلب العلم فريضة على كل مسلم" (ابن ماجہ، باب فضل العلماء والحث علی طلب العلم) (نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے)۔

ملا علی قاری فرماتے ہیں کہ اس حدیث کی سند اگرچہ ضعیف ہے، لیکن کثرت طرق کے سبب یہ حدیث ثابت ہے (مرقاۃ ۱/۲۳۵)۔

پھر علماء کا اختلاف ہے کہ اس حدیث میں جس علم کو فرض قرار دیا گیا ہے، اس سے کونسا علم مراد ہے؟ امام غزالی فرماتے ہیں:

"اس علم کے بارے میں لوگوں کا اختلاف ہے جو ہر مسلمان پر فرض ہے، اس کے بارے میں بیس سے زیادہ گروہ ہوگئے ہیں، تفصیل نقل کر کے ہم بحث لمبی نہیں کرتے، لیکن خلاصہ کلام یہ ہے کہ ہر فریق نے وجوب کو اسی علم پر محمول کیا ہے جس میں وہ مشغول ہے (احیاء علوم الدین ۱/۲۵)۔

ملا علی قاری فرماتے ہیں: "شراح کہتے ہیں: علم سے مراد وہ ہے جس کے سیکھے بغیر بندہ کو کوئی چارہ نہ ہو، جیسے خالق کی معرفت، اس کی وحدانیت کا علم، اس کے رسول کی نبوت اور نماز کی کیفیت کا علم، اس لئے کہ ان سب کا سیکھنا فرض عین ہے، رہا اجتہاد اور افتاء کے مرتبہ تک پہنچنا تو یہ فرض کفایہ ہے (مرقاۃ ۱/۲۳۴، نیز دیکھئے: ہندیہ ۵/۳۷۷، شامی ۱/۳۱، مظاہر حق ۱/۹۶، ۹۷)۔

ان دلائل سے معلوم ہوا کہ بقدر ضرورت علم دین کا حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے، اسی سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بقدر ضرورت بچوں کو علم دین سکھانا بھی اس کے والدین اور سرپرستوں کی ذمہ داری ہے، اس لئے کہ اگر نوعمری ہی سے بچوں کی تعلیم و تربیت نہیں کی گئی اور اس میں کوتاہی برتی گئی تو بچہ کے لئے بعد میں اس کا حصول انتہائی دشوار ہوگا، اور وہ راہ ہدایت سے بھٹک جائے گا، جس کی ذمہ داری ماں باپ پر ہوگی، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"يا أيها الذين آمنوا قوا أنفسكم وأهليكم ناراً" (تحریم: ۶) (اے ایمان والو! بچاؤ اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو (جہنم کی) اس آگ سے جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے)۔

ظاہر ہے کہ جہنم کی آگ سے گھر والوں کا بچانا اسی وقت ممکن ہے جب ان کو بنیادی شرعی علوم سے واقف کرادے، علامہ آلوسی فرماتے ہیں:

"اپنے آپ کو جہنم کی آگ سے بچانا گناہوں کو چھوڑ کر اور طاعات کو اختیار کر کے ہوگا، اور گھر والوں کو بچانا نصیحت اور تادیب کے ذریعہ ان کو اس پر آمادہ کر کے ہوسکتا ہے، روایت ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضرت عمر نے فرمایا: اے اللہ کے رسول! ہم اپنے کو بچاتے ہیں تو گھر والوں کو کیسے بچائیں، آنحضرت ﷺ نے فرمایا: جس سے اللہ نے تم کو روکا ہے اس سے ان کو روکو اور جس کا حکم دیا ہے اس کا حکم دو، اس کے ذریعہ ان کی جہنم سے حفاظت ہوگی، ابن منذر اور صحیح قرار دے کر حاکم نیز ایک جماعت نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے اس آیت کے بارے میں فرمایا: "اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو خیر سکھاؤ اور ان کی تادیب کرو، اور ایک قول یہ ہے کہ اہل سے مراد بیوی، بچے، غلام اور باندی ہیں، اس آیت سے یہ استدلال کیا گیا ہے کہ آدمی پر ضروری فرائض کا سیکھنا اور ان سب گھر والوں کو سکھانا واجب ہے (روح المعانی ۲۸/۱۵۶)۔

اسی طرح صحیح حدیث میں آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے:

"عن عبد الله بن عمر قال: سمعت رسول الله ﷺ يقول: كلكم راع، وكلكم مسئول عن رعيته، الإمام راع ومسئول عن رعيته، والرجل راع في أهله وهو مسئول عن رعيته ......" (بخاری کتاب الجمعہ باب الجمعۃ فی القری والمدن (۸۹۳)، مسلم کتاب الامارۃ باب فضیلۃ الامام العادل (۴۷۲۴)

(حضرت عبد اللہ بن عمرؓ سے مروی ہے، فرماتے ہیں، میں نے نبی کریم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا: تم میں سے ہر ایک نگہبان ہے اور اس سے اس کے زیر نگرانی رہنے والوں سے متعلق سوال کیا جائے گا، اور آدمی اپنے گھر والوں کا نگراں ہے، اور اس سے اس کے زیر نگرانی رہنے والوں سے متعلق سوال کیا جائے گا)۔

اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بچوں کی تربیت کا حکم دیتے ہوئے فرمایا:

عن عمرو بن شعیب عن أبیه عن جده قال: قال رسول اللہ ﷺ: "مروا أولادکم بالصلاۃ وهم أبناء سبع سنین، واضربوهم علیها وهم أبناء عشر سنین، وفرقوا بینهم فی المضاجع" (ابوداؤد کتاب الصلاۃ باب متی یؤمر الغلام بالصلاۃ (۴۹۵) (حضرت عمرو بن شعیب اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم اپنی اولاد کو نماز کا حکم دو جب کہ وہ سات سال کے ہوجائیں، اور اس کے لئے ان کو مارو جب وہ دس سال کے ہوجائیں اور ان کے بستر الگ الگ کردو)۔

مندرجہ بالا نصوص سے معلوم ہوا کہ بچوں کو دین کی بنیادی تعلیم دینا ماں باپ پر ضروری ہے، اس لئے کہ اس کے بغیر ان کی ہلاکت یقینی ہے اور بچوں کو ہلاکت سے بچانے کی ذمہ داری ماں باپ پر ہے، اسی حکم میں وہ دنیاوی علوم بھی آگئے جن کے بغیر بچوں کے لئے باعزت زندگی گزارنا ممکن نہیں ہے، ہندیہ میں ہے:

"علم کا حاصل کرنا فرض ہے شرائع کے بقدر، نیز جس کی حاجت کسی ضروری کام کے لئے ہو جیسے وضو نماز اور دوسرے شرعی احکام، نیز اپنے امور و معاش کے لئے، جو اس کے علاوہ علوم ہیں وہ فرض نہیں ہیں، اگر سیکھے تو افضل ہوگا اور اگر نہ سیکھے تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہے" (ہندیہ ۵/۳۷۷)۔

۴۔ جنسی تعلیم کا مسئلہ:

جنسی تعلیم کی بعض صورتیں ایسی ہیں جن کا تعلق بنیادی دینی تعلیم سے ہے اور جس کا حاصل کرنا فرض عین ہے، مثلاً لڑکے کا یہ جاننا کہ احتلام سے غسل فرض ہوجاتا ہے، اور لڑکی کا یہ جاننا کہ حیض کیا ہے اور حیض کے زمانہ میں کیا جائز ہے اور کیا نہیں، وغیرہ وغیرہ۔

ظاہر بات ہے کہ اس طرح کی معلومات کا تعلق بنیادی دینی تعلیم سے ہے، اس کو حاصل نہ کیا جائے تو نماز روزہ جیسی بنیادی عبادت میں خرابی پیدا ہوجائے گی، البتہ اس طرح کے علوم سکھاتے وقت بہت احتیاط اور سنجیدگی کی ضرورت ہے، اور انہیں بچوں کو یہ امور سکھانے چاہئے کہ جو بالغ ہو چکے ہوں یا جن کے اندر ان چیزوں کو سمجھنے کی صلاحیت ہو چکی ہو۔

اس طرح کی ضروری معلومات ہمارے مدارس کے طلبہ کو تفسیر، حدیث اور فقہ کے نصاب کے تحت حاصل ہوجاتی ہیں، عصری مدارس بھی یہ معلومات انہیں عناوین کے تحت فراہم کردیں تو بہت مفید ثابت ہو، جب اس طرح کی ضروری معلومات اس انداز میں ضمنی طور پر فراہم کی جاسکتی ہیں تو الگ سے جنسیات کے لئے کتاب اور پیریڈ مقرر کرنے کی کیا ضرورت ہے، اس سے تو نفسیاتی طور سے بچوں کے معصوم ذہنوں پر برا اثر پڑ سکتا ہے، میں سمجھتا ہوں کہ اس کا نقصان اتنا واضح اور بدیہی ہے کہ اس کے لئے کسی دلیل کی بھی ضرورت نہیں ہے۔

جہاں تک جنسی تعلیم کی فراہمی اور اس کے حق کے نام سے فحاشی اور بے حیائی سکھانے کا تعلق ہے تو اسلام فحاشی اور بے حیائی کا دشمن ہے، لہذا کسی بھی عنوان سے وہ کتنا خوشنما ہی کیوں نہ ہو، بے حیائی اور فحاشی کی اجازت اسلام میں نہیں ہوسکتی، واللہ اعلم۔

سوال (ج) شادی کی عمر:

اسلام نے شادی کی کوئی عمر مقرر نہیں کی ہے، البتہ ماں باپ اگر مناسب سمجھیں تو بچوں کی شادی کم عمری میں بھی کر سکتے ہیں، اس کے کئی دلائل موجود ہیں، مثلاً صحیح روایات سے ثابت ہے کہ حضرت عائشہؓ کا جب نکاح کیا گیا تو وہ صرف چھ سال کی تھیں (بخاری کتاب النکاح باب انکاح الرجل ولدہ الصغار، مسلم نکاح باب جواز تزویج الاب البکر الصغیرۃ)۔

ایک دوسری روایت میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے امامہ بنت حمزہ کا نکاح ان کی نوعمری میں کرایا تھا (فقہ السنہ ۲/۲۶۷)۔

کئی آیات سے بھی اس کے جواز کا اشارہ ملتا ہے، مثلاً عدت طلاق بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ جن عورتوں کا حیض بند ہوگیا ہو یا جن کو ابھی حیض نہ آیا ہو ان کی عدت تین مہینے ہوگی، "واللائی یئسن من المحیض من نسائکم إن ارتبتم فعدتهن ثلاثة أشهر واللائی لم یحضن" (طلاق: ۴)، معلوم ہوا کہ حیض آنے سے پہلے یعنی بلوغ سے پہلے نکاح کرایا جاسکتا ہے۔

انہیں دلائل کی وجہ سے علماء کا اجماع ہے کہ باپ کے لئے اپنی نابالغ اولاد کی شادی کرنا جائز ہے (الاجماع لابن المنذر ص: ۳۹، بچوں کے احکام و مسائل، ص: ۳۸۸)۔

البتہ یہ جاننا ضروری ہے کہ خاص مصالح کے تحت اس کی اجازت ضرور ہے لیکن نہ تو اس کی ترغیب دی گئی ہے نہ اس کو پسندیدہ قرار دیا گیا ہے، نہ ہی یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کا عام معمول تھا، صرف چند جزئی واقعات ملتے ہیں، لہذا یہ کہا جاسکتا ہے کہ اسلام میں پسندیدہ یہی ہے کہ شادی بالغ ہونے کے بعد کی جائے، علامہ نووی فرماتے ہیں:

''جان لو کہ امام شافعی اور ان کے اصحاب فرماتے ہیں: مستحب یہ ہے کہ باپ دادا باکرہ کا نکاح نہ کریں یہاں تک کہ وہ بالغ ہوجائے اور اس سے اجازت لے لیں، تاکہ اس کی ناپسندیدگی کے باوجود اسے شوہر کی قید میں نہ ڈال دیں، .... رہی وہ صورت جب کوئی ایسی ظاہری مصلحت ہو، تاخیر سے جس کے فوت ہوجانے کا اندیشہ ہو جیسے حضرت عائشہؓ کی حدیث میں ہے، تو اس شوہر کا حاصل کرنا مستحب ہوگا، اس لئے کہ باپ کو اپنی اولاد کی مصلحت کا حکم ہے، لہذا اسے نہیں چھوڑے گا'' (شرح مسلم کتاب النکاح)۔

یہ بات اگرچہ علامہ نووی نے شوافع کے حوالہ سے لکھی ہے، لیکن احناف اور دوسرے علماء کے اصول بھی اس کی تائید کرتے ہیں، اور بظاہر یہ بات متفق علیہ ہے۔

پھر جب اولاد بالغ ہوجائے تو اس کی شادی میں ممکنہ عجلت سے کام لینا چاہئے، تاکہ اس کو گناہ سے بچایا جاسکے، آج کل اس سلسلہ میں جو غیر معمولی تاخیر کی جاتی ہے، شرعاً یہ صحیح نہیں ہے، اور اگر اولاد کو اس تاخیر کی وجہ سے جسمانی، نفسیاتی یا روحانی نقصان پہنچے گا تو اس کا وبال رکاوٹ ڈالنے والے پر بھی ہوگا، اس لئے کہ احادیث میں بلوغ کے بعد جلد شادی کرادینے پر زور دیا گیا ہے، چند احادیث ملاحظہ ہوں:

عن أبي سعيد وابن عباس قالا: قال رسول الله ﷺ: "من ولد له ولد فليحسن اسمه وأدبه، فإذا بلغ فيلزوجه، فإن بلغ ولم يزوجه فأصاب إثماً فإنما إثمه على أبيه" (بیہقی شعب الایمان ۶/ ۴۰۰ (۸۶۶۶)۔

(حضرت ابوسعید اور ابن عباسؓ سے مروی ہے، فرماتے ہیں: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس کی کوئی اولاد پیدا ہو تو اس کا اچھا نام رکھے، اسے ادب سکھائے، پھر جب بالغ ہوجائے تو اس کی شادی کردے، اور اگر وہ بالغ ہوگیا اور اس نے اس کی شادی نہیں کرائی اور وہ گناہ میں مبتلا ہوگیا تو اس کا گناہ باپ پر پڑے گا)۔

''حضرت عمر بن خطابؓ اور انس بن مالکؓ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: توریت میں لکھا ہوا ہے: جس کی بیٹی بارہ سال کی ہوجائے اور وہ اس کی شادی نہ کرے اور وہ گناہ میں مبتلا ہوجائے تو اس کا گناہ باپ پر ہوگا'' (حوالہ سابق ۶/ ۴۰۲ (۸۶۶۹۰)۔

عن علي أن النبي ﷺ قال: "ثلاث لا تؤخرها: الصلاة إذا أتت، والجنازة إذا حضرت، والأيم إذا وجدت لها كفوا" (ترمذی کتاب الصلاۃ، باب ماجاء فی الوقت الاول من الفضل (۱۷۱)۔

(حضرت علیؓ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تین چیزوں میں تاخیر نہ کرو، نماز جب اس کا وقت آجائے، جنازہ جب وہ تیار ہوجائے، اور بے شادی کی عورت جب اس کا جوڑ مل جائے)۔

سوال (د) (ا) بچہ مزدوری کے بارے میں اسلام کا موقف:

بچوں سے متعلق احکام میں اسلام نے اس کے مفادات کا خیال رکھا ہے، اور چونکہ عقل کامل نہ ہونے کے سبب تصرفات سے نقصان اٹھا سکتا ہے اس لئے اس کو تمام تصرفات سے روک دیا گیا، یہاں تک کہ اسی ڈر سے اس کا مال بھی اس کے حوالہ نہیں کیا گیا، اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

"ولا تؤتوا السفهاء أموالكم التي جعل الله لكم قياماً وارزقوهم فيها واكسبوهم وقولوا لهم قولا معروفا. وابتلوا اليتامى حتى إذا بلغوا النكاح فإن آنستم منهم رشداً فادفعوا إليهم أموالهم" (سورہ نساء: ۵-۶) (اور ناسمجھوں کو اپنے وہ مال حوالہ مت کرو جن کو اللہ نے تمہارے لئے (زندگی) کا سرمایہ بنایا ہے، اور ان کو اس میں سے کھلاتے اور پہناتے رہو اور ان سے بھلائی کی بات کہتے رہو، اور یتیموں کی دیکھ بھال رکھو یہاں تک کہ وہ نکاح کی عمر کو پہنچ جائیں، پھر اگر تم ان میں عمر کی پختگی محسوس کرلو تو ان کے مال ان کے حوالہ کردو)۔

اور حدیث شریف میں ہے: "رفع القلم عن ثلاثة: عن النائم حتى يستيقظ، وعن الصبي حتى يبلغ، وعن المعتوه حتى يعقل" (ترمذی کتاب الحدود، باب ماجاء فیمن لا یجب علیہ الحد (۱۴۲۳) ابوداؤد کتاب الحدود باب فی المجنون یسرق أو یصیب حداً (۴۳۹۸)۔

(تین افراد سے قلم رکھا لیا گیا ہے، سوتے شخص سے یہاں تک کہ وہ بیدار ہو جائے، بچہ سے یہاں تک کہ وہ بالغ ہو جائے، اور مجنون سے یہاں تک کہ اسے عقل آجائے)۔

پھر مزدوری کے لئے اپنے کو پیش کرنا بھی ایک تصرف ہے، لہذا ناسمجھ بچہ کو اس سے روک دیا گیا ہے، البتہ اگر وہ سمجھدار ہے، بیع وشراء اور مزدوری وغیرہ کی حقیقت سے واقف ہے تو ولی کی اجازت سے مزدوری کر سکتا ہے، "وإذا أذن ولي الصبي في التجارة فهو في البيع والشراء كالعبد المأذون إذا كان يعقل البيع والشراء حتى ينفذ تصرفه، وقال الشافعي لا ينفذ" (ہدایہ مع تکملۃ فتح القدیر ۸/۲۳۹)۔

بچہ اگر سمجھ دار ہے اور ولی کی اجازت سے مزدوری کرتا ہے تو جائز ہے، اجازت لئے بغیر اپنے کو اجارہ پر لگاتا ہے تو اس کی اجازت پر موقوف ہے، اگر اجازت کے بغیر مزدوری کرڈالی تو کام مکمل کرنے کے بعد اس کو پوری اجرت ملے گی، اجازت ملی ہو یا نہ ملی ہو، اس لئے کہ ممانعت صرف اس وجہ سے تھی کہ ابھی وہ نوعمر ہے، کام کرنے سے اس کو نقصان ہو سکتا ہے، اور اجارہ کے ذریعہ اس کا استحصال کیا جا سکتا ہے، لیکن جب وہ کام مکمل کر چکا تو اس کا مفاد اب اسی میں ہے کہ اس کو اجرت کا مستحق قرار دیا جائے، ورنہ اس کی محنت رائیگاں جائے گی اور اس کو اس سے ضرر ہوگا، علامہ کاسانی فرماتے ہیں:

"وأما الذي يرجع إلى العاقد فالعقل وهو أن يكون العاقد عاقلا حتى لا تنعقد الإجارة من المجنون والصبي الذي لا يعقل كما لا ينعقد البيع منهما، وأما البلوغ فليس من شرائط الانعقاد ولا من شرائط النفاذ عندنا حتى أن الصبي العاقل لو آجر ماله أو نفسه، فإن كان مأذوناً ينفذ، وإن كان محجوراً يقف على إجازة الولي عندنا خلافا للشافعي .... ولو آجر الصبي المحجور نفسه وعمل وسلم من العمل يستحق الأجر له. أما استحقاق الأجر فلأن عدم النفاذ كان نظراً له، والنظر بعد الفراغ من العمل سليما في النفاذ فيستحق الأجرة ولا يهدر سعيه فيتضرر به" (بدائع الصنائع ۴/۱۸)۔

(۲) اولیاء کا بچوں سے گھریلو کام لینا:

گھر کے کام کاج بچوں سے اس خیال سے لینا جائز ہے کہ وہ کوئی ہنر سیکھ لیں، بچوں کو تہذیب وادب سکھانا ان کے اولیاء کی ذمہ داری ہے، لہذا اس خیال سے ان کو کام پر لگایا جا سکتا ہے، علامہ کاسانی فرماتے ہیں:

"اسی طرح باپ، وصی، قاضی، نیز اس کے معتمد کی طرف سے مزدوری پر لگانا شریعت کی طرف سے نائب ہونے کے سبب نافذ ہوگا، تو باپ کو حق ہے کہ اپنے نابالغ بیٹے کو کسی کام میں لگادے، اس لئے کہ نابالغ پر اس کی ولایت اسی طرح ہے جیسے اپنے اوپر ہے، اس لئے کہ اس کو اس پر اسی طرح شفقت ہے جیسے اپنے نفس پر ہے، اور وہ اپنے آپ کو مزدوری پر لگا سکتا ہے تو بیٹے کو بھی لگا سکتا ہے، نیز دو وجوہات سے اس میں نابالغ کا فائدہ ہے.......... دوسری وجہ یہ ہے کہ صنعتوں میں اس کو کام کرنے کے لئے بھیجنا اس کو سنوارنے، ادب سکھانے اور مشق کرانے کے باب سے ہے، اور اس میں بچہ کا فائدہ ہے، تو باپ اس کا حق رکھتا ہے، اسی طرح باپ کا وصی، اس لئے کہ وہ باپ کا پسندیدہ شخص ہے، اور دادا، اس لئے کہ باپ کی غیر موجودگی میں وہ اس کا قائم مقام ہوتا ہے، اور دادا کا وصی، اس لئے کہ وہ اس کا پسندیدہ ہے، اور قاضی، اس لئے کہ اس کو نگراں بنایا گیا ہے اور اس کا معتمد، اس لئے کہ وہ اس کا پسندیدہ ہے، اور باپ، نیز اس کے وصی، دادا، نیز اس کے وصی کے علاوہ دوسرے ذی رحم محرم رشتہ داروں کے لئے اس کو مزدوری پر لگانا جائز نہیں ہے، جب مذکورہ لوگوں میں سے کوئی موجود ہو، اس لئے کہ ان کے علاوہ لوگوں کو بچہ پر ولایت حاصل نہیں ہے...... الا یہ کہ وہ اس کی پرورش میں ہو، تو فقہاء کے نزدیک اس کے لئے اس کو مزدوری پر لگانا جائز ہوگا، اس لئے کہ جب وہ اس کی پرورش میں ہو تو اس کو ایک طرح کی ولایت حاصل ہوتی ہے، اس لئے کہ وہ اس کی پرورش کرتا ہے اور اس کو ادب سکھاتا ہے، اور صنعتوں میں اس کو لگانا بھی ایک طرح سے ادب سکھلانا ہے، لہذا باعتبار تادیب وہ اس کا مالک ہوگا الخ" (بدائع ۴/۲۲، ہندیہ ۴/۴۱۱)۔

ان عبارات میں ادب سکھلانے کی نیت سے مزدوری پر لگانے کی اجازت دی گئی ہے تو ادب سکھانے کے مقصد سے ہلکے پھلکے گھریلو کاموں میں بدرجہ اولی انہیں لگانے کی اجازت ہوگی، خاص طور سے اس صراحت کے بعد "لأن ولايته على الصغير كولايته على نفسه"۔

باپ اس معنی میں مالی حالت بہتر بنانے کے لئے کبھی ان کو اس طرح کے کاموں پر لگا سکتا ہے کہ ان کی کمائی خود ان کے اوپر صرف کرے، گھر کی دوسری

ضروریات میں ان کی کمائی لگانا درست نہیں ہے، اگر ان کے ذاتی مصارف سے مال بچ جائے تو بچوں کے دوسرے ذاتی مال کی طرح اس کو بھی ان کے لئے محفوظ رکھا جائے گا، اور بالغ ہونے کے بعد ان کے حوالہ کردیا جائے گا، اگر باپ اس سلسلہ میں کوئی کوتاہی کرے تو قاضی یہ مال محفوظ کرادے گا، لیکن یہ تمام تفصیلات لڑکوں کے متعلق ہے، لڑکیوں کو کاموں پر لگانا باپ کے لئے درست نہیں ہے، البتہ ماں اور دادی تادیب کے لئے ان سے کام کراسکتی ہیں (تفصیلی عبارت کے لئے دیکھئے: ہندیہ ۱/ ۵۶۲، ۵۶۳، شامی ۲/ ۶۷۸، بدائع ۳/ ۴۵۹، ہدایہ مع الفتح ۴/ ۱۸۸)۔

(۴) نابالغ بچوں کو مزدوری پر لگانا:

اوپر کی تفصیلات سے واضح ہوگیا کہ نابالغ بچوں کو باپ خاص اسباب کے تحت مزدوری پر لگا سکتا ہے، لیکن عام حالات میں اس کی کمائی اپنے اوپر صرف کرنا جائز نہیں ہے، بلکہ اس کی کمائی خود اس پر صرف کی جائے اور جو کچھ بچے اس کو محفوظ رکھا جائے۔

لیکن اگر باپ کمائی پر قادر نہیں ہے، خواہ وہ لاچار ہو یا کسی بیماری میں مبتلا ہو جبکہ نابالغ بچہ کی کمائی کے لائق ہوگیا ہے اور کمائی کر رہا ہے، تو باپ کا خرچ اس نابالغ کے ذمہ ہوگا، اور اس صورت میں باپ بقدر ضرورت خرچ لے سکتا ہے:

''وتجب على موسر ولو صغيراً...... وفي الخلاصة: المختار أن الكسوب يدخل أبويه في نفقته، النفقة لأصوله الفقراء الخ (ولو صغيراً) لأنه كالكبير فيما يجب في ماله من حق عبد فيطالب به وليه كما يطالب بنفقة زوجته'' (شامی ۲/ ۶۷۵)۔

سوال (۵) جب شرعی اعتبار سے نابالغ بچہ کسی جرم کا ارتکاب کرے:

شریعت نے سنگین جرائم قتل، زنا، چوری وغیرہ کے سدباب کے لئے سخت سزائیں مقرر کی ہیں، لیکن ان سزاؤں کے نفاذ کے لئے ایک اہم شرط یہ ہے کہ ارتکاب کرنے والا مکلف یعنی عاقل و بالغ ہو، یہ شرط سب سزاؤں کے ساتھ لگی ہوئی ہے، ملاحظہ ہو مختلف حدود کے متعلق بیان کی جانے والی شرائط:

''والزنا الموجب للحد وطئ مكلف، خرج الصبي والمعتوه'' (الدر المختار ۳/ ۱۵۴-۱۵۵)۔

''حد سرقة أخذ مكلف .... وأخرج الصبي والمجنون، لأن القطع عقوبة. وهما ليسا من أهلها، لكنهما يضمنان المال'' (شامی ۳/ ۲۱۱)۔

''ودخل فيه نحو الزنا والقتل في حق الصبي والمجنون، فإنه محجور عليهما بالنسبة لحكمه وهو الحد والقصاص'' (شامی ۵/ ۹۹)۔

''وفي الأشباه: الصبي المحجور مواخذ بأفعاله، متضمن ما أتلفه من المال للحال، وإذا قتل فالدية على عاقلته'' (الدر المختار ۵/ ۱۰۱ کتاب الحجر)۔

ہندیہ میں ہے: ''ولا توجب هذه المعاني الثلاثة الحجر في الأفعال، حتى إن ابن يوم لو انقلب على قارورة إنسان فكسرها، وجب عليه الضمان في الحال. وإذا كان ذلك الفعل يتعلق به حكم يندرئ بالشبهات كالحدود والقصاص، فيجعل عدم القصد في ذلك شبهة في حق الصبي والمجنون، حتى لا يجب عليهما الحد بالزنا والسرقة وشرب الخمر وقطع الطريق والقصاص بالقتل، هكذا في العيني شرح الهداية'' (ہندیہ ۵/ ۵۴-۵۵)۔

ہندیہ ہی میں ہے: ''إذا زنى صبي أو مجنون بامرأة عاقلة وهي مطاوعة فلا حد على الصبي والمجنون بلا خلاف .... وإذا زنى بصبية فلا حد عليهما وعليه المهر الخ'' (ہندیہ ۲/ ۱۵۰)۔

ان عبارتوں کا حاصل یہ ہے کہ شریعت نے زنا، چوری، قتل وغیرہ جیسے جرائم کی جو سزائیں مقرر کی ہیں بچوں کو وہ سزائیں نہیں دی جاسکتیں، اس لئے کہ وہ مکلف نہیں ہیں، اور غیر مکلف سے قلم رکھا گیا ہے جیسا کہ پیچھے حدیث ذکر کی گئی، البتہ کسی کا مال ضائع کریں تو اس کا ضمان لازم ہوگا، چوری کریں تو مال کا ضمان دینا ہوگا، قتل کریں تو عاقلہ پر دیت ہوگی، زنا کریں تو مہر دینی ہوگی۔

پھر حکومت اور قاضی کو اختیار ہے، اگر بچہ کو جرم سے باز رکھنے کے لئے اتنی ہی سزا کافی محسوس ہو رہی ہو تو اسی پر اکتفا کی جاسکتی ہے، لیکن اگر محسوس ہو کہ صرف اتنی سزا سے جرائم کا سد باب نہیں ہو سکتا تو بطور تعزیر کچھ مزید سزا دی جاسکتی ہے، بشرطیکہ بچہ سمجھ رکھتا ہو، علامہ کاسانی فرماتے ہیں:

''تعزیر کے وجوب کی شرط صرف عقل کا ہونا ہے، تو ہر ایسے عاقل کی تعزیر کی جائے گی جس نے ایسی جنایت کا ارتکاب کرلیا ہو جس کی کوئی مقرر کردہ حد نہیں ہے خواہ وہ...... بالغ ہو یا بچہ بشرطیکہ عاقل ہو...... سوائے عاقل بچہ کے کہ اس کی تعزیر تادیباً ہوگی، نہ کہ سزا کے طور پر، اس لئے کہ وہ اہل تادیب میں سے ہے، کیا آپ نے اس روایت کو نہیں دیکھا جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اپنے بچوں کو نماز کا حکم دو جب وہ سات سال کے ہو جائیں اور ان کو اس کے لئے مارو جب وہ دس سال کے ہو جائیں، اور یہ تادیب اور تہذیب کے طور پر ہے، نہ کہ بطور سزا، اس لئے کہ سزا جنایت پر ہوتی ہے، اور بچہ کے فعل کو جنایت سے متصف نہیں کیا جاسکتا، برخلاف مجنون اور ناسمجھ بچہ کے اس لئے کہ وہ دونوں نہ اہل عقوبت میں سے ہیں نہ اہل تادیب میں سے'' (بدائع ۵/ ۵۳۴)۔

اور یہ تعزیر کن کن طریقوں سے دی جاسکتی ہے، اس کی تفصیل ہندیہ میں اس طرح کی گئی ہے:

''التعزیر قد یکون بالحبس، وقد یکون بالصفع وتحریك الأذن، وقد یکون بالکلام العنیف، وقد یکون بالضرب وقد یکون بنظر القاضي إلیه بنظر عبوس کذا في النهایة'' (ہندیہ ۲/ ۱۶۷) (تعزیر کبھی قید کرکے ہوگی، کبھی طمانچہ لگا کر اور کان اینٹھ کر اور کبھی سخت سست کہہ کر اور کبھی مار کر اور کبھی قاضی کے ٹیڑھی نگاہ دیکھ کر)۔

خلاصہ یہ ہے کہ بچے بھی جب جرم میں مبتلا ہوں تو ان کو صرف بچہ کہہ کر چھوڑا نہیں جائے گا، بلکہ جرم کے مطابق ان کو مناسب سزا دی جائے گی تا کہ صالح معاشرہ تشکیل پاسکے اور بچوں کی مناسب تادیب بھی ہو سکے، واللہ اعلم۔

سوال (و): بچوں کی جیل کے احکام:

ہم اوپر تفصیل سے بتا چکے ہیں کہ بچوں کو اصلاح اور تعزیر کے طور پر جیل میں بھی رکھا جاسکتا ہے، لیکن بچوں کو جیل میں رکھنے کا مقصد ان کی تادیب اور اصلاح ہے، لہذا تادیب کے ہر ممکن طریقہ کو اختیار کیا جاسکتا ہے جس میں ہلکی پھلکی مار پیٹ گوشمالی اور ڈانٹ ڈپٹ شامل ہے، بدائع کی عبارت میں تفصیل آچکی ہے کہ بچہ کی تعزیر تادیباً ہوتی ہے، اس کے لئے انہوں نے اس حدیث کا حوالہ دیا ہے جس میں نماز نہ پڑھنے پر بچوں کو مار لگانے کی اجازت ہے، لیکن ساتھ ہی اس میں صراحت بھی ہے کہ یہ تادیب کے طور پر ہے، سزا کے طور پر نہیں ہے، اس لئے کہ سزا جرم پر دی جاتی ہے، اور بچوں کے فعل کو جرم نہیں کہا جاسکتا۔

جہاں تک سخت مار پیٹ اور استحصال کا تعلق ہے تو بڑوں کے ساتھ اس کی اجازت نہیں ہے، تو بھلا بچوں کے ساتھ اس کی اجازت کیسے ہو سکتی ہے، ہندیہ میں ہے: ''لا ینبغي للقاضي أن یضرب محبوساً في دین ولا غیره ولا یصفد ولا یقید ولا یغل ولا یمد ولا یجرد ولا یقیمه في الشمس'' (ہندیہ ۳/ ۴۱۴)۔

(قاضی کو یہ نہیں چاہئے کہ قرض وغیرہ کی وجہ سے قید کئے ہوئے شخص کو مارے، نہ ہی اسے ہتھکڑی لگائے، نہ بیڑی ڈالے، نہ طوق ڈالے، نہ کھینچے، نہ برہنہ کرے، نہ اسے دھوپ میں کھڑا کرے)۔

سوال (ز) بے سہارا بچوں کی کفالت:

جب بچہ کے ماں باپ دونوں موجود نہ ہوں تو اسلام نے ان کی خبر گیری کا عظیم الشان نظام بنایا ہے، یہ نظام اتنا مکمل ہے کہ اتنی ترقی کے باوجود دنیا کی قومیں اس کی مثال نہیں پیش کرسکتیں، چنانچہ والدین کی عدم موجودگی میں بچوں کی خبر گیری اور ان کے مفادات کا خیال رکھنے کی ذمہ داری ترتیب وار اس طرح مقرر کی گئی ہے:

۱۔ اگر بچہ کے اصول موجود ہوں تو اس کے ذمہ دار وہی ہوں گے، پھر دو برابر درجہ کے اصول موجود ہوں جیسے دادا اور نانا، تو بچہ کی ذمہ داری دادا کے ذمہ ہوگی، اس لئے کہ دادا بچہ کی میراث کا حقدار ہے جبکہ نانا نہیں ہے، "فإن تساووا في القرب فالمفهوم من کلامهم ترجیح الوارث، ففي جد لأم وجد لأب، تجب علی الجد للأب فقط اعتبار اً للإرث" (شامی ۲/ ۷۳۸)۔

۲۔ اگر بچہ کے اصول جیسے دادا اور نانا کے ساتھ حواشی جیسے بچہ کا چچا اور بھائی موجود ہوں، تو اگر فریقین میں سے کوئی فریق غیر وارث ہو تو نفقہ اصول پر ہوگا، چنانچہ

دادا اور بھائی ہوں تو نفقہ دادا پر ہوگا، اور نانا اور چچا ہوں تو نانا پر ہوگا، اور اگر دونوں فریق وارث ہوں تو نفقہ دونوں پر ارث کے بقدر ہوگا (شامی ۲/۷۳۸)۔

۳۔ صرف حواشی موجود ہوں جیسے چچا اور بھائی وغیرہ تو نفقہ وراثت کے بقدر انہیں پر ہوگا بشرطیکہ وہ ذی رحم محرم ہوں، غیر ذی رحم محرم پر نفقہ واجب نہیں ہوگا، "الحواشي فقط والمعتبر فيه الإرث بعد كونه ذا رحم محرم" (ایضا)۔

اوپر بیان کردہ تفصیلات کے مطابق نفقہ اس وقت واجب ہوگا جب کہ یہ سب رشتہ دار مالدار اور شرعی اعتبار سے غنی ہوں، لیکن اگر ان میں کوئی غریب اور تنگدست ہو تو اس وقت اس میں یہ کریں گے کہ اگر یہ دوسروں کو محروم کر رہا ہو تو اس کو میت قرار دیں گے، اور اس کو میت قرار دینے کے بعد جو لوگ بچہ کے وارث بنتے ہوں ان پر ارث کے بقدر بچہ کا نفقہ مقرر کر دیا جائے گا۔

اور اگر یہ دوسروں کو محروم نہیں کرتا تو اس کو زندہ شمار کرنے سے دوسرے وارثوں کو جس تناسب سے حصہ ملتا ہو اسی تناسب سے ان پر بچہ کا نفقہ ہوگا، "ثم هذا كله إن كان جميع الموجودين موسرين، فإن كان فيهم معسر، فتارة ينزل المعسر منزلة الميت وتجب النفقة على غيره، وتارة ينزل منزلة الحي، وتجب على من بعد بقدر حصصهم من الإرث" (شامی ۲/۷۳۸، احسن الفتاوی ۵/۴۷۱)۔

۴۔ اگر مذکورہ رشتہ داروں میں سے کوئی بھی نہ ہو، یا سب مسکین ہوں تو سرکاری بیت المال سے نفقہ دیا جائے گا، اس میں بھی گنجائش نہ ہو تو عامۃ المسلمین پر فرض ہے" (احسن الفتاوی ۵/۴۷۲)۔

اس لئے کہ نفقہ میراث کے بقدر ہوتا ہے اور کوئی وارث موجود نہ ہو تو میراث بیت المال میں جمع کی جاتی ہے، لہذا اس کا خرچ بھی ورثاء کی غیر موجودگی میں بیت المال پر ہونا چاہئے (الشریفیہ شرح السراجیہ ۱۱)۔

''والرابع (مما يوضع في بيت المال) اللقطات .... وما أخذ من تركة الميت الذي مات ولم يترك وارثا .... وهذا النوع يصرف إلى نفقة المرضى وأدويتهم وهم فقراء .... وإلى نفقة من هو عاجز عن الكسب وليس له من تجب عليه نفقته'' (ہندیہ ۱/۱۹۱)۔

(بیت المال میں رکھی جانے والی چوتھی چیز لقطات ..... نیز اس میت کا ترکہ جو مر جائے اور کوئی وارث نہ چھوڑے ...... اور اس قسم کے مال کو مریضوں کے خرچ اور ان کی دواؤں پر صرف کیا جائے گا بحالیکہ وہ تنگ دست ہوں ...... نیز اس شخص کے نفقہ پر جو کمانے سے عاجز ہو اور کوئی ایسا شخص موجود نہ ہو جس پر اس کا نفقہ واجب ہوتا ہے)۔

رہا عامۃ المسلمین پر اس کا فرض ہونا تو بچہ کا سلامت رکھنا ایک فرض کفایہ ہے، لہذا جس طرح کسی لاوارث کی تجہیز و تکفین کی ذمہ داری سب پر ہوتی ہے، اسی طرح بدرجہ اولی بچہ کے نفقہ کی ذمہ داری بھی سب پر ہوگی، "وإن لم يكن من تجب عليه نفقته فكفنه في بيت المال، فإن لم يكن فعلى المسلمين تكفينه، فإن عجزوا سألوا الناس كذا في الزاهدي" (ہندیہ ۱/۱۶۱)۔

سوال (ح) بچہ کو کسی کے حوالہ کر دینا:

بچہ کی صحیح تربیت کرنا باپ کی ذمہ داری ہے، جیسا کہ ایک خاص عمر تک دیکھ بھال کرنا ماں کی ذمہ داری ہے، دونوں پر اپنے فریضہ کو انجام دینا ضروری ہے، اگر انجام دیں تو ان کو اس پر مجبور کیا جائے گا:

''فإن أكل وشرب واستنجى وحده دفع إليه ولو جبراً (قوله ولو جبراً) أي إن لم يأخذه بعد الاستغناء أجبر عليه كما في الملتقى. وفي الفتح: ويجبر الأب على أخذ الولد بعد استغناءه عن الأم لأن نفقته عليه، وصيانته عليه بالإجماع'' (شامی ۲/۶۹۵)۔

(پھر جب وہ کھانے پینے لگے اور خود سے استنجاء کرنے لگے تو اسے باپ کے حوالہ کر دیا جائے گا، خواہ جبر کرنا پڑے (مصنف کا قول خواہ جبر کرنا پڑے) یعنی اگر باپ بچہ کے بے نیاز ہونے کے بعد اس کو نہ لے تو اس کو مجبور کیا جائے گا جیسا کہ ملتقی میں ہے، اور الفتح میں ہے: ماں سے مستغنی ہونے کے بعد باپ کو بچہ لینے پر مجبور کیا جائے گا، اس لئے کہ اس کا نفقہ باپ پر ہے اور بالا جماع اس کی حفاظت باپ کے ذمہ ہے)۔

ان عبارات سے صاف معلوم ہوا کہ باپ بچہ کو دوسرے کے حوالہ کر کے اس سے لاتعلق نہیں ہوسکتا۔

جہاں تک ہدیہ قبول کرنے کا تعلق ہے، تو یہ بھی قطعاً ناجائز اور حرام ہے، اس لئے کہ نام کچھ بھی رکھ لیا جائے یہ آزاد بچہ کا فروخت کرنا ہے اور آزاد انسان کی بیع باطل ہے، "والعبرة فی العقود للمعانی لا للألفاظ"۔

خرید وفروخت روکنے کا طریقہ:

سوال میں وضاحت ہے کہ اس غیر انسانی فعل کی وجہ ماں باپ کی غریبی اور افلاس ہے، لہذا اس کا شرعی حل یہ ہے کہ ماں باپ مفلس ہوں تو ان کو شرعاً غیر موجود مان کر بچوں کی ذمہ داری ان کے بعد والے رشتہ داروں پر ڈال دی جائے، اور کوئی موجود نہ ہو تو اس کی ذمہ داری حکومت یا عامۃ المسلمین پر ڈال دی جائے، چنانچہ شامی کی عبارت پیچھے گزر چکی ہے، "فلو کان فیھم معسر فتارۃ ینزل المعسر منزلة المیت" (شامی ۲/۸۳۸) تفصیل کے لئے دیکھئے: سوال (ز)۔

علامہ حصکفی فرماتے ہیں: "ما لم یکن۔ الأب۔ معسرا فیلحق بالمیت، فتجب علی غیرہ بلا رجوع علیه" (الدر المختار ۲/۷۳۱) (جب تک کہ باپ تنگ حال نہ ہو، اس لئے کہ وہ تنگ حال ہو تو میت کے حکم میں ہوجاتا ہے اور بچہ کا نفقہ دوسرے پر ہوجاتا ہے جس کا اس سے رجوع بھی نہیں کیا جائے گا)۔

سوال (ط) بچہ کو دماغی اسپتال میں داخل کرنے کا حکم:

بچہ کا علاج معالجہ والد پر لازم ہے، لہذا باپ ضرورت کے مطابق اس کا علاج کرائے گا، آج کے عرف میں کبھی علاج کی ضرورت سے اسپتال میں ایڈمٹ کرانا پڑتا ہے، لہذا ضرورت پڑنے پر ایڈمٹ بھی کرسکتا ہے:

"وتجب النفقة بأنواعها علی الحر لطفله یعم الأنثی والجمع (قوله بأنواعها) من الطعام والکسوة والسکنی، ولم أر من ذکر هنا أجرة الطبیب وثمن الأدویة، وإنما ذکروا عدم الوجوب للزوجة، نعم صرحوا بأن الأب إذا کان مریضاً أو به زمانة یحتاج إلی الخدمة فعلی ابنه خادمه، وکذلك الابن" (شامی ۲-۷۲۸)۔

(اپنی تمام انواع سمیت آزاد پر اس کے بچہ کا نفقہ واجب ہے، بچہ میں اناث اور جمع بھی آگئے (تمام انواع سمیت) جیسے کھانا، کپڑے، رہائش، میں نے نہیں دیکھا کہ یہاں کسی نے ڈاکٹر کی فیس اور دواؤں کی قیمت کا ذکر کیا ہو، البتہ فقہاء نے بیوی کے لئے اس کے عدم وجوب کا ذکر کیا ہے، ہاں فقہاء نے صراحت کی ہے کہ باپ جب بیمار ہو یا لاچار ہو اور اسے خدمت کی ضرورت ہو تو بیٹے پر اس کے لئے خادم مہیا کرنا واجب ہوگا اور یہی معاملہ بیٹے کے لئے بھی ہوگا)۔

ہمارا استدلال اس بات سے ہے کہ باپ پر ہمہ وقت خود نگہداشت کرنا واجب نہیں ہے، خادم سے بھی یہ کام لے سکتا ہے، تو اسپتال کے تجربہ کار اسٹاف سے اس کی نگہداشت کرانا بدرجہ اولی درست ہوگا، بس شرط یہی ہے کہ بچہ کو واقعی اس کی ضرورت ہو صرف فرار حاصل کرنا مقصود نہ ہو۔

اس کی دوسری دلیل یہ ہے کہ پرورش کے دوران دودھ پلانے کے لئے بچہ کو دایہ کے حوالہ کرنے کا عربوں میں عام رواج تھا، خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بنوسعد میں حضرت حلیمہ کے ساتھ بھیجا گیا، فقہاء کی عبارتوں سے بھی اس کا جواز معلوم ہوتا ہے: "کان لها أن تحمل الولد إلی منزلها فترضعه" (ہندیہ ۱/۵۶۱) (.....مرضعہ کو اجازت ہوگی کہ بچہ کو اپنے گھر لے جائے اور دودھ پلائے)۔

البتہ اگر بلا ضرورت باپ بچہ کو اسپتال میں داخل کرائے تو جائز نہیں ہوگا، اس لئے کہ بلوغ تک بچہ کو اپنے پاس رکھنے کا حکم ہے، بلوغ کے بعد اگر بچہ پر اطمینان ہو تو اس کو آزاد چھوڑا جاسکتا ہے، ورنہ نہیں، لڑکی ثیبہ ہو تو اس کا حکم بھی لڑکے کی طرح ہے، باکرہ ہو تو اسے اپنے پاس ہی رکھنے کا حکم ہے:

"ویمسکه هؤلاء إن کان غلاماً حتی یدرك الخ" (ہندیہ ۱/۵۴۲)۔

"والجاریة وغیر مأمونة علی نفسها لا یخلی سبیلها ویضمها إلی نفسه وإن کانت مامونة علی نفسها فلا حق له فیها ویخلی سبیلها وتنزل حیث أحبت وإن کانت البالغة بکرا فللأولیاء حق الضم" (ہندیہ ۱/۵۴۲)۔

☆☆☆

اسلام میں بچوں کے حقوق اور ذمہ داریاں

مفتی حافظ سید صادق محی الدین فہیم [1]

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فطری طور پر بچوں سے محبت کے جذبات انسانی فطرت میں ودیعت کئے ہیں، یہی وجہ ہے کہ بچوں کی چاہت اور تڑپ ہر ایک کو ہوتی ہے، انسان تو انسان دیگر مخلوقات میں بھی یہ جذبہ فطرتا کارفرما ہے، اولاد اللہ تعالیٰ کا ایک بیش بہا انعام وتحفہ ہے، بچے ماں باپ اور خاندان کے ہاتھوں میں ایک امانت ہیں، اس لئے اسلام نے ان کے حقوق کا بڑا تحفظ کیا ہے، اس حق میں پہلا حق تو یہ ہے کہ ان کی جان کی حفاظت کی جائے اور ان کی عمدہ نشو ونما اور پرورش کے اسباب مہیا کئے جائیں۔ دوسرا حق والدین پر جو اولاد کا اسلام نے لازم کیا ہے وہ رضاعت وحضانت کا ہے، ماؤں پر دیانۃً واجب ہے کہ وہ اپنے بچوں کو دودھ پلائیں، اس رضاعت کے حق کی مدت متعین ہے جو دو سال ہے، اس دوران بچے کے والد کا یہ فریضہ ہے کہ وہ بچے اور اس کی ماں کی عمدہ انداز میں کفالت کرے اور خوش دلی کے ساتھ دستور وعرف کے مطابق ان کی ضروریات کی تکمیل کرے، خاص حالات میں بچے کو اس کی ماں کے بجائے کسی اور عورت سے دودھ پلوایا جاسکتا ہے، رضاعت کی مدت میں اس فرض کی ادائیگی اسلئے ضروری ہے تاکہ بچے کی عمدہ نشو ونما ہو۔

حضانت: حضن سے مشتق ہے، باعتبار لغت اس کے معنی پہلو، دونوں بازو اور ان کے درمیانی حصے اور سینے کے آتے ہیں (لسان العرب، برحاشیۃ الموسوعۃ الفقہیہ ۱۷/۲۹۹)، شریعت کی اصطلاح میں حضانت کہتے ہیں بچے کے حق پرورش کو (کشاف القناع ۵/۴۹۵، برحاشیۃ الموسوعۃ الفقہیۃ)، اور یہ واجب ہے، اور یہ حق اسلام نے ماں باپ کے علاوہ محرم رشتہ داروں پر رکھا ہے، اور درجہ بدرجہ جن پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے، اس کی تفصیل بیان کی ہے، اس تفصیل ووضاحت سے مقصود یہ ہے کہ اس حق میں کسی طرح کی کوئی کوتاہی نہ ہو بلکہ یہ حق پوری دیانت کے ساتھ بہتر اور اچھے انداز میں ادا ہو، کیونکہ اس حق کو اچھی طرح سے ادا نہ کیا جائے تو بچے کے ضائع ہوجانے کا شدید خطرہ ہے، ماں باپ جب ایک ہوں یعنی ان کے درمیان کوئی نزاع کی وجہ سے طلاق یا خلع کی نوبت نہ آگئی ہو تو ظاہر ہے، ماں باپ دونوں مل کر اپنی اپنی ذمہ داری نبھاتے ہوئے اور اپنا حق ادا کرتے ہوئے بچوں کی پرورش کریں گے لیکن جب دونوں کا رشتہ ازدواج باقی نہ رہے تو از خود یہ سوال سامنے آتا ہے کہ بچہ یا بچی اگر شیر خوار ہو یا زمانہ شیر خوارگی کی بعد کی عمر ہو تو ایسی صورت میں ان بچوں کے حقوق کی ذمہ داری کن کے سپرد ہوگی؟ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے سورۃ البقرہ میں اس کی صراحت فرمادی کہ: "مائیں اپنی اولاد کو کامل دو سال تک دودھ پلائیں اور یہ مدت ان کیلئے ہے جو اس مدت رضاعت کو پوری کرنا چاہتے ہیں، مولود لہ یعنی والد پر ان کے ماں کے کھانے اور کپڑے کی دستور کے مطابق ذمہ داری رکھی گئی ہے، کسی نفس کو اس کی وسعت سے بڑھ کر تکلیف نہیں دی جاتی، بچے کی وجہ سے نہ کسی ماں کو ضرر پہنچایا جائے اور نہ اس کے والد کو اور وارث پر بھی اسی طرح کی ذمہ داری ہے، اگر وہ دونوں آپسی رضامندی ومشورہ سے دودھ چھڑانا طے کرلیں تو ان دونوں پر کوئی حرج نہیں ہے، اور اگر تم دودھ پلانا چاہو کسی غیر عورت سے تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں بشرطیکہ اس کا طے شدہ معاوضہ عرف ودستور کے مطابق عمدہ انداز میں اس کو ادا کردو، اللہ سے ڈرو اور جان رکھو جو کچھ تم کررہے ہو اس کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ دیکھنے والا ہے" (البقرۃ/ ۲۳۳)۔

اس آیت پاک میں رضاعت وحضانت سے متعلق خصوصی احکام دئے گئے ہیں، اس آیت سے پہلے اور بعد والی آیات میں چونکہ طلاق کے احکام کا بیان ہے، عام طور پر طلاق کی وجہ بچوں کی پرورش اور دودھ پلانے کے معاملات میں اختلاف پیدا ہوجاتا ہے، اور بسا اوقات یہ نزاع دراز ہوجاتا ہے، اسلئے اس آیت پاک میں اُس کا ایک اچھا حل پیش کیا گیا ہے، فطری طور پر دودھ پلانے کی ذمہ داری ماں کی بنتی ہے، اس لئے فرمایا گیا ہے کہ مائیں خود اپنے بچوں کو رضاعت کی کامل مدت تک دودھ پلائیں، الّا یہ کہ کوئی شدید عذر ہو، رشتہ ازدواج برقرار رہے تو عام طور پر اس حق کی ادائیگی میں کوئی مانع نہیں ہوتا، لیکن اگر رشتہ ازدواج منقطع ہوجائے تو بسا اوقات انتقام کے جذبات پرورش پاتے ہیں اور ماں نفس کے زیر اثر فیصلہ کی بناء پر

---

[1] سابق مفتی جامعہ نظامیہ حیدر آباد۔

دودھ پلانے سے انکار کرسکتی ہے، اس لئے اس آیت پاک میں صراحت کردی گئی کہ دیانۃً ماں پر یہ ذمہ داری بطور وجوب کے ہے، اس حق کی ادائیگی سے بلا کسی عذر کے انکار گناہ ہے، نکاح باقی رہنے کی صورت میں تو مدت رضاعت میں دودھ پلانا ماں پر دیانۃً لازم ہے، شوہر سے کسی طرح کا کوئی معاوضہ واجرت کی طلب بھی نا جائز ہے، اور یہ حکم نکاح میں باقی رہنے والی ماں کا بھی ہے اور اس مطلقہ ماں کا بھی جو طلاق کی عدت میں ہو، چونکہ ان دونوں صورتوں میں ان عورتوں کے بنیادی مصارف کی ذمہ داری بچے کے والد پر ہے، اور اگر طلاق کی عدت تکمیل پا چکی ہو تو اب اس عورت کو دودھ پلانے کی صورت میں اس کا معاوضہ طلب کرنے کی اجازت ہے، اس آیت پاک میں دودھ پلانے کی مدت دو سال بیان کی گئی ہے، اس پر اکثر ائمہ و فقہاء کا اتفاق ہے، امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے ہاں مدت رضاعت ڈھائی سال ہے، ان کا استدلال اس آیت پاک "وحمله وفصله ثلثون شهرا" (الاحقاف:۱۵) سے ہے، اس لئے اگر کسی خاتون نے دو سال کے بعد ڈھائی سال کی مدت تک دودھ پلایا تو احکام رضاعت ثابت ہونگے، ایسا بعض فقہاء کا خیال ہے، لیکن حرمت رضاعت کے احکام کے ثبوت میں فقہاء احناف نے جمہور ائمہ کے قول پر فتویٰ دیا ہے یعنی دو سال کے بعد دودھ پلایا جائے تو حرمت رضاعت کے احکام ثابت نہیں ہونگے، اس اختلاف کی بناء اگر کوئی دو سال کے بعد اور ڈھائی سال کے اندر دودھ پلائے تو نکاح کے باب میں احتیاط برتی جائے، یعنی رشتہ مناکحت قائم کرنے سے احتراز کیا جائے، البتہ اس مدت یعنی ڈھائی سال کے بعد بچے کو دودھ پلائے تو نا جائز ہے، جمہور فقہاء نے اسی آیت سے مدت حمل چھ مہینے اور مدت رضاعت دو سال ثابت کی ہے، کیونکہ ان تیس مہینوں میں حمل کی مدت چھ ماہ اور دودھ پلانے کی مدت چوبیس ماہ ہے، صدر بالا آیت میں حولین کاملین مذکور ہے، سورۃ لقمان آیت نمبر ۱۴ میں وفصله في عامين فرمایا گیا ہے، جس سے مدت رضاعت دو سال ہونے کی تائید ہوتی ہے، سیدنا علی کرم اللہ وجہہ ورضی اللہ عنہ سے بھی یہی بات ثابت ہے۔

الف: اولاد سے محبت کے جذبات صرف انسانوں تک ہی محدود نہیں بلکہ یہ جذبات واحساسات دیگر تمام حیوانات میں بھی اللہ سبحانہ نے ودیعت فرمائے ہیں، یہاں تک کہ وحشی جانور بھی اپنے بچوں پر مہربان رہتے ہیں اور شفقت کا برتاؤ کرتے ہیں، بریں بناء اسلام میں حق حضانت کی بڑی اہمیت ہے، اسی لئے تفصیلاً اس کے احکام بیان ہوئے ہیں۔

ماں باپ کے حق حضانت کی مدت: اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ماں باپ کے دلوں میں اپنی اولاد سے محبت کا بے پناہ جذبہ ودیعت کردیا ہے، ہر دو چاہتے ہیں کہ اپنے بچوں پر اپنی محبت نچھاور کریں، اور محبت وشفقت سے پال پوس کر ان کو بڑا کریں لیکن اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ باپ کے مقابلہ میں ماں کا سینہ محبت سے زیادہ معمور بنایا گیا ہے، اس لئے کمسنی کے زمانے میں ماں کو بچے کی پرورش کا حق دیا گیا ہے، کیونکہ یہ ایسا زمانہ ہے جس میں ان معصوم بچوں کیلئے محبت سے بھرپور شخصیت کی ضرورت ہوتی ہے اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ماں کو اس کا پیکر بنایا ہے اسلئے اولاد میں اگر لڑکا ہو تو اختلاف اقوال کی بنیاد پر نو سال اور سات سال کی عمر تک ہے، لیکن مفتیٰ بہ قول پر سات سال تک، لڑکی ہو تو جوان ہونے تک ماں کے زیر پرورش رہے گی، بعضوں نے نو سال حد مقرر کی ہے (الفقہ علی المذاہب الاربعۃ ۵/۶۰۶، ۱۱۳)۔

(والحاضنة) أما كان أو غيرها (أحق به) أي بالغلام حتى يستغني عن النساء و قدر بسبع وبه يفتى لأنه الغالب (والأم والجدة) لأم أو لأب (أحق بها) بالصغيرة (حتى تحيض) أي تبلغ في ظاهر الرواية (الدر المختار، کتاب النکاح، باب الحضانۃ ۱۳/ ۵۳ راجع المکتبۃ الشاملۃ)، لڑکا جب سات سال کا ہو جائے اور لڑکی سن بلوغ کو پہنچ جائے تو ماں کا حق حضانت ختم ہو جائے گا اور یہ حق ان بچوں کے والد کو مل جائے گا، اسی طرح والد نہ ہوں تو دادا کو یہ حق دیا گیا ہے، (قوله: ولا خيار للولد عندنا) أي إذا بلغ السن الذي ينزع من الأم يأخذه الأب" (الدر المختار کتاب النکاح باب الحضانۃ ۳۱/۶۰)، اس منزل میں لڑکا اور لڑکی کی پرورش کی ذمہ داری اسلام نے باپ کو اس لئے دی ہے کہ وہ ان کی اچھے ڈھنگ سے تعلیم وتربیت کرسکے، چونکہ اس عمر میں بچوں کو تعلیم سے آراستہ کرنے اور تربیت سے نکھارنے کی سخت ضرورت ہوتی ہے، عمر کا یہ زمانہ سیکھنے اور پڑھنے کیلئے بڑی اہمیت رکھتا ہے، یہ سنہرا دور اگر گزر جائے تو بچے جیسی تعلیم وتربیت کے ساتھ تیار ہونا چاہئے تیار نہیں ہوسکتے، اب اس زمانے میں ماں کے محبت بھرے پیار کے بجائے باپ کی مشفقانہ سرپرستی کی ضرورت ہوتی ہے، جس میں بوقت ضرورت تادیب کرنے کی صلاحیت رکھی گئی ہے، قدرت نے باپ میں مرد ہونے کی حیثیت سے ایک رعب ودبدبہ رکھا ہے، جس کی وجہ سے بچے بآسانی تربیت قبول کرتے ہیں، باپ کی زندگی پاکیزہ اور اسلامی تعلیمات سے مزین ہو تو اس کے مزید اور اچھے اثرات بچوں پر مرتب ہوتے ہیں اور اس باپ کی دینداری کی وجہ بچے علم واخلاق میں اور نکھرتے سنورتے ہیں، الغرض اپنے بچوں کی پرورش کرنے کے اولین حقدار، شریعت کے مقررہ مدت تک دئے گئے حق کی بناء پر ماں باپ ہیں جیسا کہ صراحت صدر سے ثابت ہے،

تاہم اس مدت میں جس کو شریعت نے ماں باپ کے لئے تسلیم کیا ہے اس میں ان بچوں کی تعلیمی، تربیتی، جسمانی ونفسیاتی پہلو سے ماں باپ کی وجہ سے کسی ضرر کا اندیشہ ہو تو پھر ان سے ان کا یہ حق ساقط ہو جائے گا، ماں یا باپ کے فسق وفجور میں مبتلا ہونے یا ان کے اسلام سے برگشتہ ہو جانے کی وجہ بچوں کے بھی فسق وفجور میں مبتلا ہو جانے، یا ان کے مرتد ہو جانے کا خطرہ ہو، چونکہ حضانت کے لئے اسلام، بلوغ وعقل اور فاسق وفاجر نہ ہونے کی شرط ہے، اس لئے ماں یا باپ مرتد ہوں یا جنون میں مبتلا ہوں یا ایسے امراض جیسے برص وغیرہ اور اس جیسے امراض جن کا متعدی ہونا ثابت ہو یا جس سے لوگ نفرت کرتے ہوں اور جن امراض سے محضون یعنی زیر پرورش بچوں کے اس جیسے امراض سے دوچار ہونے کا خطرہ ہو یا ایسے فسق وفجور جیسے کھلم کھلا شراب نوشی، چوری، زنا اور اسلام کے حرام کردہ لہو ولعب میں مبتلا ہوں یا اس قدر بے دین اور اللہ سے بے خوف ہوں کہ نفس کے زیر اثر رہ کر بچوں پر حد درجہ ظلم ڈھاتے ہوں کہ جس کی وجہ سے بچوں کے جسمانی یا نفسیاتی امراض میں مبتلا ہو جانے کا خطرہ ہو تو ان جیسی ساری صورتوں میں ماں باپ سے ان کا یہ حق لے لیا جائے گا "تثبت للأم النسبية (ولو كتابية أو مجوسية) (بعد الفرقة إلا أن تكون مرتدة) فحتى تسلم لأنها تحبس (أو فاجرة) فجورا يضيع الولد به كزنا وغنا وسرقة ونياحة كما في البحر والنهر" (ردالمحتار باب الحضانة ۱۳/۲۰)۔

"الشروط العامة للحضانة.... البلوغ والعقل، فلا تثبت الحضانة لطفل ولا لمجنون أومعتوه لأن هؤلاء عاجزون عن إدارة أمورهم وفي حاجة لمن يحضنهم فلا توكّل إليهم حضانة غيرهم وهذا باتفاق في الجملة .... الأمانة في الدين فلا حضانة لفاسق لأن الفاسق لا يؤتمن، والمراد الفسق الذي يضيع المحضون به كا لاشتهار با لشرب و السرقة والزنى واللهو المحرم، إلا يكون للحاضن مرض معد أو منفر يتعدى ضرره إلى المحضون كالجذام والبرص وشبه ذلك ما يتعدى ضرره إلى المحضون" (كشاف القناع ۵-۴۹۹، بحوالة الموسوعة الفقهية ۱۷-۳۰۶) (الفقه على المذاهب الاربعة ۵-۱۱۳۵)۔

اس تناظر میں اگر ماں باپ ارتداد کے راستے پر چل پڑے ہوں یا اور کوئی ایسی مادی یا روحانی تقاضوں کی تکمیل میں ماں باپ کوتاہی کا شکار ہو گئے ہوں کہ جس کی وجہ اولاد کی جان وصحت کو یا ان کے دین یا ایمان کو کوئی خطرہ لاحق ہو گیا ہو تو اب وہ اسلام کے دیئے ہوئے اس حق حضانت کے مستحق نہیں رہیں گے۔

ب: (ا) حق پرورش کا مقصود یہی ہے کہ مادی اعتبار سے بچوں کی بہتر وصحیح نگہداشت ہو، ان کے کھانے کپڑے رہائش ودیگر بنیادی ضروریات جو اُن کے لئے ضروری ہیں ماں باپ اس کا انتظام کریں، بیماری کی صورت میں علاج ومعالجہ کی ذمہ داری نبھائیں اور یہ سارے امور پیار ومحبت، شفقت و مہربانی، رافت ورحمت کے ماحول میں انجام پائیں، اور روحانی اعتبار سے دین حق پر قائم رہنے کے اسباب مہیا ہوں، ماں باپ ایسی اسلامی اقدار پر مبنی پاکیزہ زندگی گزاریں اور اپنے بچوں کیلئے دیندارانہ فضا بنائیں کہ جس میں پرورش پا کر بچے اسلامی احکام کے مطابق زندگی گزارنے کے اہل بنیں، متقیانہ وپرہیزگارانہ زندگی کو اپنا نصب العین بنائیں۔

اسلام کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ ایک انسان اپنے رب کی معرفت حاصل کر کے مطمئن نہ ہو جائے بلکہ آگے بڑھ کر اپنے اہل وعیال کی اخروی کامیابی کی فکر کرتے ہوئے ان کے سینوں کو بھی معرفت رب سے معمور کرنے کی سعی کرے، ارشاد باری ہے اے ایمان والو! تم اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو اس آگ سے بچاؤ جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے، جس پر سخت دل مضبوط فرشتے مقرر ہیں، جو اللہ تعالیٰ کے دیئے گئے حکم کی تعمیل کرتے ہیں اور اسکی نافرمانی نہیں کرتے (التحریم:۶)، اس آیت پاک میں ایمان والوں کو ان کے ایک اہم فریضہ کی طرف متوجہ کیا گیا ہے اور ان کو ان کی بنیادی ذمہ داری یاد دلائی گئی ہے کہ وہ نہ صرف اپنی اصلاح کریں اور اپنی شخصیت کو مومنانہ اعلیٰ کردار کا حامل بنائیں اور اس کیلئے نہ صرف اپنی ذات کو اسلامی تعلیم وتربیت سے آراستہ کریں، بلکہ اپنی اولاد کو بھی اسی ایمانی واصلاحی رنگ میں رنگ دیں، تاکہ سب کی آخرت کامیاب ہو اور اپنے رب کی رضا حاصل ہو جانے کی وجہ سے دوزخ کا ایندھن بننے سے بچا جا سکے، بچوں کی تعلیم وتربیت کے سلسلہ میں حضرت سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ جب بچہ سات سال کی عمر کو پہنچ جائے تو اُسے نماز پڑھنے کی تلقین کریں اور جب وہ دس سال کی عمر کو پہونچ جائے اور پھر وہ نماز پڑھنے میں تساہل برتے تو اس کی تادیب کے لئے سرزنش کریں: "مروا صبيانكم بالصلاة إذا بلغوا سبعا واضربوهم عليها إذا بلغوا عشرا" (سنن ابی داؤد ر ۴۹۴، باب متی یؤمر الغلام بالصلاۃ)۔

اللہ کے نبی سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد پاک ہے: "ما نحل والد ولداً من نحل أفضل من أدب حسن" (سنن ترمذی کتاب البر، باب ماجاء فی أدب الولد، رقم الحدیث ۱۸۷۵) (والد کی طرف سے اولاد کے لئے اچھی تعلیم وتربیت سے بہتر وافضل کوئی اور تحفہ نہیں)۔ حضرت سیدنا معاذؓ کو حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دس باتوں کی وصیت فرمائی، اُن میں سے تین وصیتیں اولاد سے متعلق ہیں، اُن تین نصیحتوں میں سے ایک نصیحت یہ ہے: "وأنفق على عيالك من طولك" (اپنے اہل وعیال پر اپنی بساط کے مطابق خرچ کرو)، دوسری نصیحت: "ولا ترفع عنهم عصاك أدباً" (ادب سکھانے کے لئے اُن سے لکڑی اٹھا کر مت رکھو، یعنی تعلیم وتربیت ادب واخلاق سکھانے کی طرف سے غفلت نہ برتو)، تیسری نصیحت: "وأخفهم فی الله" (یعنی اللہ کے احکام کے بارے انکوڈراتے رہو) (مسند احمد بن حنبل ۵/ ۲۳۸ رقم الحدیث ۲۲۱۲۸)۔

حدیث پاک میں ارشاد ہے: "طلب العلم فريضة على كل مسلم" (بیہقی شعب الایمان، مشکاۃ المصابیح ۱/ ۳۴، کتاب العلم) (علم حاصل کرنا ہر ایک مسلمان پر فرض ہے)۔

حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "تعلموا العلم وعلموه الناس" (خود بھی علم سیکھو اور لوگوں کو بھی سکھلاؤ) (سنن الدارمی، باب الاقتداء بالعلماء، رقم الحدیث ۲۲۱)، اس لئے والدین پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ خود بھی علم سیکھیں اور اپنی اولاد کو بھی علم سکھائیں۔

(۲) بچوں اور بچیوں کو کس قدر دینی تعلیم دی جائے، اور عصری تعلیم کس حد تک انکو دلائی جائے یہ ایک اہم سوال ہے، ظاہر ہے اللہ سبحانہ کی معرفت اور اخروی کامیابی کا راستہ دکھانے والا جو علم ہے وہ مقصود اصلی ہے، سورۃ العلق کی ابتدائی آیت میں ارشاد ہے: ''پڑھیے اپنے رب کے نام سے جو سب کا پیدا کرنے والا ہے''، ارشاد باری ہے: ''اللہ سبحانہ سے تو اللہ کے بندوں میں وہی ڈرتے ہیں جو صاحب علم ہیں'' (الفاطر/ ۲۸)۔

ان آیات سے یہ بات واضح ہے کہ وہ علم مقصود اولین ہے جو اپنے رب کی معرفت میں مدومعاون ہو، اور جس سے اللہ سبحانہ کا خوف اور تقویٰ پیدا ہو۔

رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد پاک سے بھی اس کی وضاحت ہوتی ہے: "العلم ثلاثة وما كان سوا ذلك فهو فضل: آية محكمة أو سنة قائمة أو فريضة عادلة" (ابوداؤد، کتاب الفرائض، باب ماجاء فی تعلیم الفرائض) (علم تین ہیں یعنی ایسے احکام جن کا حکم منصوصات سے ثابت شدہ ہو، وہ منسوخ نہ ہوں اور معمول بہ ہوں یا وہ ایسی سنن ہوں جو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہوں یا ایسے فرائض اور واجبات ہوں جس کو اسلام نے لازم کئے ہیں اس کے علاوہ جو ہیں وہ زائد ہیں)۔

زندگی گزارنے کے سارے احکام وہدایات کے ساتھ موت کے بعد کے مسائل جیسے میراث وغیرہ یہ سب کے سب عدل پر قائم ہیں، آیت محکمہ، سنت قائمہ، فریضہ عادلہ، انکا اصل علم ہونا اس حدیث سے ثابت ہے، بعض شارحین نے ان کے علاوہ دوسرے علوم کو علم ہی نہیں مانا، اور بعضوں نے کتاب وسنت کے بنیادی احکام کے علم کو سب کے لئے ضروری سمجھا اور اس کے علاوہ کے علم کو علم دین وشریعت کے زمرہ میں نہیں شمار کیا بلکہ ان کو سماج ومعاشرہ کی ضروریات سے متعلق رکھا ہے، یعنی ان زائد علوم کی تحصیل پر دین کا کوئی دارومدار نہیں پھر ان زائد علوم میں انہیں علوم کی تحصیل مباح ہے جن سے انسانی سماج کی ضرورتیں وابستہ ہیں، اس لئے وہ علوم جو انسانی اخلاق وکردار پر ضرب لگاتی ہیں اور ان کو لہو ولعب میں مشغول کرتی ہیں اور انسان کا رشتہ اللہ سے کمزور کرتی اور فکر آخرت سے ان کو محروم کرتی ہیں ان کی تحصیل مذموم وممنوع ہے، حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نفع بخش علم کی دعاء مانگی ہے: "اللهم إني أسألك علماً نافعاً" (مشکاۃ المصابیح، باب جامع الدعا ۲/ ۶۲ رقم الحدیث ۲۴۹۸)، اور ان علوم سے پناہ چاہی ہے جو غیر نفع بخش ہیں: "اللهم إني أعوذبك من علم لا ينفع" (باب الاستعاذہ ۲/ ۵۴ رقم الحدیث ۲۴۶۴)

کتاب وسنت کا وہ علم جو دینی واُخروی علم کہلاتا ہے اُس کے سراسر خیر ہونے اور نفع بخش ہونے میں تو کوئی کلام ہی نہیں، لیکن وہ علوم جو انسانوں کیلئے نافع ہوں اور جس سے انسانوں کی خدمت ہوتی ہو، اور ان کی بنیادی، سماجی ضروریات کی تکمیل ہوتی ہو، وہ بھی مستحسن اور محمود ہیں، چنانچہ علوم طب، کاشت کاری، سلائی، کڑھائی، علوم ریاضی، وغیرہ سماجی ضروریات سے متعلق ہونے کی وجہ سے فرض کفایہ مانے گئے ہیں (مرقاۃ المفاتیح، ۱/ ۲۹۹)، زبانوں کے اختلاف کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنی نشانی فرمایا ہے (الروم/ ۲۲)، مختلف زبانوں جیسے عربی، فارسی، ترکی، انگریزی، ہندی، تلنگی، سنسکرت، پشتو، سندھی، بلوچی وغیرہ کا سیکھنا یہ بھی مباح علوم میں شامل ہے بشرطیکہ ان کے سیکھنے کا مقصود خود نفع اٹھانا اور دوسروں کو نفع پہنچانا ہو، پھر ہر زبان کے

مختلف اسالیب، لب ولہجہ جو اس کے بولنے والے کو انفرادی شناخت بخشتے ہیں، ظاہر ہے ان مختلف زبانوں کے ماہرین اور ان کے مختلف اسالیب سے واقفین امت میں اگر ہونگے تبھی تو پیغام اسلام ان تک پہنچایا جاسکے گا، حضرت نبی پاک ﷺ سے پہلے جو انبیاء کرام گزرے ہیں اور جو آسمانی صحائف وکتب ان پر نازل ہوئے، وہ عبرانی وسریانی زبانوں میں نازل ہوئے ہیں، اس سے خود مختلف زبانوں کے سیکھنے کی اہمیت واضح ہے۔

وہ علوم جو موجودہ دور میں عصری علوم کی قبیل سے ہیں ان کے بارے میں محققین کی رائے ہے کہ علوم فلکیات (Astronomy)، ارضیات (Geology)، علم الماء (Hydrogens)، علم طب (Medical)، علم طبعیات (Physics)، علم البحر (Oceanology)، علم قانون (Law)، علم النفس (Psychology)، علم الاعضاء (Anatomy)، علم الجنین (Embryology)، علم نباتات (Botany)، علم الاخلاق (Manners)، علم الحیوانات (Zoology) وغیرہ جیسے علوم سے متعلق خود قرآن مجید میں کہیں اشارات اور کہیں تصریحات ملتی ہیں، اس سے ثابت ہے کہ علوم اسلامیہ کی تحصیل کے ساتھ دیگر مباح علوم بھی سیکھے اور سکھائے جائیں تاکہ اخروی کامیابی کے ساتھ دنیا کی کامیابی بھی امت مسلمہ کو حاصل ہو۔

دین کی دعوت کو دوسروں تک پہنچانے کیلئے بھی ضروری ہے کہ علوم عصریہ میں نہ صرف یہ کہ مسلمان کمال حاصل کریں بلکہ اس دوڑ میں بھی وہ دوسروں سے آگے رہیں تاکہ اس سے خود انکو اور خلق خدا کو نفع پہنچے، علوم عصریہ میں درک، معاشی احوال کے استحکام اور احوال زمانہ سے باخبری کی وجہ ان کی بات مؤثر ہو سکے، خاص طور پر وہ سائنسی تحقیقات جو فطرت کے پوشیدہ راز سے پردے اٹھاتی ہیں اور جس سے ایک انسان نظام فطرت کے خالق کو جانے بغیر نہیں رہ سکتا، اس طرح کے علوم سے جہاں بہت سے مادی فوائد حاصل ہوتے ہیں وہیں رب کائنات کی معرفت سے ایک انسان کا سینہ سرشار ہوتا ہے اور اس کی وجہ معرفت رب سے محروم انسانوں کو معرفت الٰہی تک پہنچانے کا راستہ فراہم ہوسکتا ہے اور دنیا کے بعد کی حقیقی وابدی اُخروی زندگی کی حقیقتوں کو سمجھنے اور سمجھانے میں مدد ملتی ہے، اس لئے ایسے والدین جو صاحب حیثیت ہوں اور جن کو اللہ سبحانہ نے بہت کچھ مال ودولت دے رکھا ہو، وہ اپنی اولاد کو حسب صلاحیت اسلامی وعصری علوم میں دسترس حاصل کرنے والا بنائیں یا پھر بنیادی دینی تعلیم کے ساتھ، اعلیٰ سے اعلیٰ عصری علوم کی تعلیم دلوائیں تاکہ ان سے خاندان کے ساتھ خلق خدا کو مادی وروحانی ہر دو طرح کا نفع پہنچے، اب رہے وہ والدین جو مالی اعتبار سے متوسط ہیں یا غریب ہیں تو وہ اپنی اپنی حیثیت کے مطابق اپنے بچوں کی بنیادی دینی تعلیم کے ساتھ اور دیگر علوم وفنون کی تعلیم کی فکر کریں۔

جہاں تک لازمی وضروری تعلیم کا سوال ہے وہ بنیادی اسلامی تعلیم وتربیت ہے، اس سے بچوں اور بچیوں ہر دو کو روشناس کرائیں اور حسب مقدرت جائز حدود میں رہتے ہوئے جائز طور سے کمانے اور جائز ومباح ضرورتوں میں خرچ کرتے ہوئے زندگی گزارنے کا اہل بنائیں، یہ تو مالدار، متوسط اور غریب ہر درجہ کے والدین پر لازم ہے۔

(۳) اگر حکومت کسی خاص سطح تک تعلیم کو بچوں اور بچیوں کے لئے لازم قرار دے تو مسلمانوں پر اُس کی پابندی شرعاً لازم نہیں رہے گی، ہاں اگر حکومت کی مقررہ سطح تک تعلیم دلانے میں بچوں کی روحانی یا مادی منفعت ہو اور ان کی شخصیت کی تعمیر میں اس سے نکھار آتا ہو اور یہ تعلیم اسلام کے بنیادی مقاصد سے متصادم نہ ہو تو مسلمانوں کو چاہئے کہ ضرور ایسی سہولتوں سے استفادہ کریں، بشرطیکہ حکومت ان تعلیمی اخراجات کی کفالت کرے، اس سلسلہ میں والدین پر اگر کوئی مالی بوجھ عائد ہوتا ہو اور والدین اس کے متحمل نہ ہوں، تو اس پابندی سے احتراز کیا جاسکتا ہے۔

(۴) جنس کی تعلیم، بچوں کا حق ہے یا نہیں، کیا اس کی تعلیم بھی ضروری ہے، جیسا کہ موجودہ سماج کے بعض گوشوں سے ایسی آوازیں سنائی دے رہی ہیں۔ ظاہر ہے اسلام ایک پاکیزہ اور فطری مذہب ہے، اسلامی تہذیب، اس کی روایات فطری اقدار پر مشتمل ہیں، انسان اشرف المخلوقات ہے دیگر مخلوقات کے بالمقابل انسانوں کو عقل وفہم دی ہے، الٰہی نظام کی پابندی کا انکو مکلف بنایا گیا ہے اور ان کو تمدن بخشا گیا ہے۔ ظاہر ہے جب بچے سن بلوغ کو پہنچتے ہیں تو ان کے اندر وہ خوابیدہ طاقتیں فطرتاً بیدار ہوتی ہیں جو قدرت نے مذکورہ مقصد کیلئے ودیعت فرمائی ہیں، دین ومذہب سے اگر ان کا رشتہ جڑا رہے تو وہ اس خواہش کی تکمیل کے لئے غلط راستہ اختیار نہیں کرسکیں گے، اور ان کی وہ فطری طلب وخواہش انہیں جائز راستے سے اس کی تکمیل کی راہ دکھائے گی۔

قبل از وقت بچوں کو جنسی تعلیم سے آگہی بخشی جائے تو اس کے مضر اثرات خود ان کی شخصیت پر کیا مرتب ہوں گے اور سماج معاشرہ کو کیا نتائج بھگتنے پڑیں گے، اسکا اندازہ مغربی تہذیب کے دلدادہ وہ افراد نہیں کرسکتے جو مذہب بیزار اور اعلیٰ انسانی اخلاق واقدار سے عاری ہیں، جنسی

جذبات انسانی شخصیت کا حصہ ضرور ہیں لیکن بجائے خود اصلاً مقصود زندگی نہیں بلکہ فطرت نے ایک اعلیٰ ترین مقصد کے لئے وہ قُویٰ ودیعت کئے ہیں، اس لئے حسب ضرورت و مصلحت و برموقع تو اس سے واقف کروایا جاسکتا ہے لیکن اس کو قبل از وقت نصاب تعلیم میں شامل کرنے اور بچوں کو اسکی تعلیم دینے سے خطرہ اس بات کا ہے کہ شرم وحیاء کے تقاضے رخصت ہوں گے، اس سے انسانی اخلاق پر جو ضرب پڑے گی اور جو پاکیزہ اقدار مجروح ہوں گے اس سے سماج کی پاکیزگی برقرار نہیں رہ سکے گی، جنسی تفصیلات سے آگہی فطرت کا ایک راز ہے اور یہ راز عمر کے خاص حصہ میں فطرت کی طرف سے الہامی طور پر خود بخود کھلتا ہے، یہی کافی ہے، ورنہ اس راز کے قبل از وقت افشاء ہوجانے سے تہذیب وتمدن کی اعلیٰ قدریں باقی نہ رہ سکیں گی، حیاء کی چادر تارتار ہوجائے گی، انسانی فطرت کی پاکیزگی حیاء کے تقاضوں کو باقی رکھنے ہی سے ممکن ہے، چونکہ حیاء ایک انسان کی پوری شخصیت کی حفاظت کرتی ہے، سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے "الحياء شعبة من الإيمان" (مصنف ابن ابی شیبہ باب ذکر الحیاء وما جاء فیہ ۸/ ۳۴۴ رقم الحدیث ۲۵۸۵۰) (حیاء ایمان کے شعبوں میں ایک اہم شعبہ ہے) اور فرمایا: "إذا لم تستحي فاصنع ما شئت" (السنن الکبریٰ للبیہقی باب بیان مکارم الاخلاق ومعالیہا ۱۰/ ۱۹۲ رقم الحدیث ۲۱۳۰۷) (جب حیاء ہی ختم ہوجائے تو پھر جو چاہے کرے)۔

سات سال کے آغاز سے بلوغ سے پہلے تک کا زمانہ ایک سنہرا زمانہ ہے، اس زمانے میں بنیادی دینی عقائد واحکام کی تعلیم دینے، عبادات کے اہتمام کے ساتھ انسانی اعلیٰ صفات سے انکو مزین کرنے اور اخلاقی اقدار سے انکو سنوارنے، سماجی اور معاشرتی احوال سے انکو واقف کرانے کے لئے سوز وگداز، دردمندی وجگر سوزی سے انکی نشونما کرنے کی ضرورت ہے۔

البتہ مراہق یعنی قریب البلوغ بچوں اور بچیوں کو جب وہ جسمانی تغیرات وتبدیلیوں سے گزرتے ہیں اس سے انکو واقف کرانا چاہیے تاکہ وہ نفسیاتی الجھن کا شکار نہ ہوں اور یہ کام ان لڑکوں کے قریبی احباب کر سکتے ہیں اور لڑکیوں کی مائیں اور وہ سہیلیاں انجام دے سکتی ہیں جو بلوغ کے مراحل سے آگے قدم بڑھا چکی ہیں، اس مادی دنیا میں ایک انسان اللہ کی دی ہوئی نعمت عقل سے انسانوں کو درپیش ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے کوئی مشین بناتا ہے یا کسی مصنع میں کئی انسان اللہ کی دی ہوئی عقل کو استعمال کرکے ضرورت کی بہت سی اشیاء تیار کرتے ہیں، کمپنی ان کے استعمال کی ضروری تفصیلات بھی ان اشیاء کے خریداروں کے حوالے کرتی ہے تاکہ خریدار اُسکا صحیح استعمال کرسکیں، اگر ان ہدایات کے برعکس انکا استعمال ہو تو اس سے صحیح طور پر استفادہ تو رہا ایک طرف، بسا اوقات نقصان وضرر بھی ممکن ہوسکتا ہے۔

اس لئے ماں باپ کی ذمہ داری ہے کہ وہ عمر کے اس خاص حصہ میں ان بچوں کی دینی خطوط پر تربیت کریں، اسلامی احکام کی رو سے جائز وناجائز، حلال وحرام کے درمیان فرق وامتیاز کرنا سکھائیں، خوف خدا وخوف آخرت انکے دلوں میں بٹھائیں، اللہ سبحانہ ہر آن اپنے بندوں کو دیکھ رہا ہے، کا استحضار رکھنے اور اپنے اعمال کی آخرت میں جواب دہی کے تصور کو ہمیشہ تازہ رکھنے کی فکر کو دلنشین کرائیں تاکہ وہ اپنی اس جنسی صلاحیت کو غلط رخ پر نہ لے جاسکیں، اور اپنی جوانی کو بے داغ رکھ سکیں۔

اس طرح بچوں کی پاکیزہ تربیت کرنے کی عمدہ ہدایات کے ساتھ اسلام نے فطری خواہشات کو دبایا نہیں بلکہ جائز راہ سے اسکی تکمیل کے لئے نکاح کا قانون بنایا ہے، ماں باپ کا فرض ہے کہ بلوغ کے بعد ان بچے، بچیوں کے نکاح کا جلد از جلد انتظام کریں، اسلام نے نہ تو رہبانیت کو پسند کیا ہے، نہ ہی آزادانہ جنسی روش کی کوئی حمایت کی ہے بلکہ ان دونوں کے درمیان افراط وتفریط سے بچتے ہوئے اعتدال کی راہ بنائی ہے۔

ج: نکاح کے باب میں جو احکام اسلام نے دئے ہیں وہ بہت واضح ہیں، اولاد کا ایک حق یہ بھی ہے کہ والدین ان کے نکاح کا انتظام کریں، بلوغ کے بعد بچوں کے نکاح کا انتظام نہ کیا جائے اور ان سے کوئی گناہ سرزد ہو تو والدین بھی اس گناہ میں شریک قرار پاتے ہیں، حدیث پاک میں ارشاد ہے: "من ولد له ولد فليحسن اسمه وأدبه، فإذا بلغ فليزوجه، فإن بلغ ولم يزوجه، فأصاب إثما، فإنما إثمه على أبيه" (شعب الایمان للبیہقی باب حقوق الاولاد والاھلین ۱۱/ ۱۳۷ رقم الحدیث ۸۲۹۹)، اس حدیث کو گوکہ بعض شارحین نے ضعیف قرار دیا ہے، تاہم اس حدیث کی تائید دوسری حدیث سے ہوتی ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ جس کی بیٹی بارہ سال کی ہوجائے اور اس نے اس کا نکاح نہیں کیا اور اس لڑکی سے گناہ کا ارتکاب ہوجائے تو اس کا گناہ باپ کو بھی پہنچے گا "عن أنس ابن مالك رضي الله عنهما قال سمعت رسول الله ﷺ يقول: في التوراة مكتوب: من بلغت ابنته اثنتي عشرة سنة ولم يزوجها فأصابت إثما فإثم ذلك عليه" (شعب الایمان ۱۱/ ۱۳۹۔ رقم الحدیث ۸۳۰۳)۔

لڑکی یا لڑکا جب جوان ہو جاتے ہیں تو وہ اپنی اس ضرورت کا احساس ضرور کر لیتے ہیں، لیکن حیا کی وجہ سے اظہار نہیں کر سکتے، اس لئے والدین کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس حقیقت کا ادراک کریں اور جلد سے جلد ان کے نکاح کا بندوبست کریں۔ لڑکا جوان ہو تو وہ از خود اپنا نکاح آپ کر سکتا ہے لیکن اگر لڑکی جوان ہو تو وہ از خود اپنا نکاح آپ کر سکتی ہے یا نہیں اس بارے میں فقہاء کا اختلاف ہے، فقہاء احناف تو اس بات کے قائل ہیں کہ بالغہ لڑکی بھی اپنا نکاح اپنی مرضی سے کرنے کی مجاز ہے، لیکن اس کی فطری حیا اس میں مانع رہتی ہے، اس لئے بکثرت اولیاء ہی کے ذریعہ لڑکیوں کے نکاح انجام پاتے ہیں، البتہ ائمہ شوافع اس کی اجازت نہیں دیتے بلکہ ان کی رائے یہ ہے کہ ولی ان کا نکاح کرے، انعقاد نکاح کی صحت کے لئے یہ ضروری ہے، کیونکہ حدیث پاک میں وارد ہے: "لا نکاح إلا بولی وشاهدی عدل" (المعجم الکبیر للطبرانی ۱۸/ ۱۴۲ رقم الحدیث ۲۹۹، المکتبۃ الشاملۃ)۔

جہاں تک صغرسنی میں نکاح کرنے کی بات ہے تو اسلام نے اس کی بھی رہبری فرمائی ہے، قرآن پاک میں اللہ تعالی نے ان لڑکیوں کی عدت طلاق تین ماہ بتلائی ہے جو اب تک حائضہ نہیں ہو سکی ہیں، ظاہر ہے عدت کا سوال تو طلاق ہی سے پیدا ہوتا ہے اور نکاح صحیح کے بغیر طلاق کا کوئی شرعی تصور نہیں، اس ارشاد سے خود نابالغہ لڑکیوں کے نکاح کا جواز ثابت ہو رہا ہے "واللائی یئسن من المحیض من نسائکم إن ارتبتم فعدتهن ثلثة أشهر واللائی لم یحضن (الطلاق ۴)

مشہور فقیہ علامہ ابن ہمام رحمہ اللہ نے اس آیت پاک سے ثابت کیا ہے کہ جب قرآن نے لم یحضن سے نابالغہ لڑکی کے عدت گزارنے کا حکم بیان فرمایا ہے اس سے خود نابالغین کے نکاح کا جواز ثابت ہوتا ہے: "یجوز تزویج الصغیر والصغیرۃ إذا زوجهما الولی لقوله تعالی: "واللائی لم یحضن" فأثبت العدۃ للصغیرۃ وهی فرع تصور نکاحها شرعاً" (فتح القدیر ۳/ ۲۷۴)۔

حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے اپنے کمسن لڑکے کا نکاح حضرت مصعب رضی اللہ عنہ کی کمسن لڑکی سے کر دیا تھا (مصنف ابن عبدالرزاق رقم الحدیث ۱۰۳۵۸)، حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے لڑکے کا نکاح ان کی بھتیجی سے کمسنی ہی میں ہوا تھا (السنن الکبری ۷/ ۱۳۸۱)، کمسن اولاد کا نکاح اگر باپ یا دادا نے کر دیا ہے تو یہ نکاح شرعاً معتبر مانا جائے گا "إذا أنکح الصغار أباؤهم جاز نکاحهم" (مصنف ابن عبدالرزاق ۱۰۳۵۵)۔

ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا مبارک نکاح سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جب ہوا تو ان کی عمر چھ سال تھی، رخصتی کے وقت ان کی عمر نو سال تھی (بخاری و مسلم)۔

بزمانہ کمسنی و نابالغی نکاح کے جواز پر حضرات صحابہ کرام و تابعین عظام و شارحین امت رضی اللہ عنہم سب کا اتفاق ہے، کتاب و سنت و اجماع امت سے اس امر کے جواز کے باوجود نابالغ لڑکا یا لڑکی اپنا نکاح کر لینے کے خود مجاز نہیں، کوئی باشعور بچہ جو سن بلوغ کو نہ پہنچا ہو اور وہ اپنا نکاح آپ کر لے تو شوافع و مالکیہ کے ہاں اس کا نکاح منعقد نہیں ہوگا، البتہ امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ ایسے نکاح کو ولی کی اجازت پر موقوف مانتے ہیں، یعنی ولی اجازت دے تو نکاح منعقد ہو جائے گا ورنہ نہیں، نکاح کے بعد ولی کی اجازت سے پہلے اگر وہ بالغ ہو جائے تو اب اس کے بلوغ کی وجہ سے نکاح نافذ نہیں ہوگا، البتہ بلوغ کے بعد چونکہ اس کو خود ولایت حاصل ہو جاتی ہے، اس لئے اب اس کی اجازت سے بزمانہ نابالغی کیا گیا یہ نکاح جائز ہو جائے گا (بدائع الصنائع، الجزء الثالث ۲/ ۴۹۱)۔

بچپن کے زمانے میں کئے جانے والے نکاح میں بعض وقت بڑے مفاسد دیکھے گئے ہیں، اس لئے اس نکاح کے رواج کو فروغ نہیں دیا جانا چاہئے، بدلتے ہوئے حالات میں آگے چل کر زندگی میں کہیں بھی کوئی خرابی آسکتی ہے، اس طرح کے نکاح کے شرعی جواز کے باوجود نکاح کو زمانہ بلوغ تک مؤخر کیا جانا ہی بہتر معلوم ہوتا ہے، لیکن اس جائز کو ناجائز نہیں کہا جا سکتا اور نہ ہی اس کے خلاف کوئی قانون بنایا جا سکتا ہے۔

نکاح ایک فطری ضرورت ہے جس کو اپنے وقت پر انجام پا جانا چاہئے، اس سلسلے میں بڑی کوتاہی برتی جا رہی ہے، موجودہ دور ترقی نے کئی اقتصادی اور تعلیمی مسائل کو شادی کی راہ میں رکاوٹ کا ذریعہ بنا رکھا ہے، حالانکہ ایسا نہیں ہے، اللہ سبحانہ وتعالی کا ارشاد ہے: "وأنکحوا الأیامی منکم والصالحین من عبادکم وإمائکم إن یکونوا فقراء یغنهم الله من فضله والله واسع علیم" (النور ۳۲) (تم میں سے جو مرد و عورت بے نکاح ہیں ان کے نکاح کا انتظام کر دو اور اپنے نیک اور صالح غلاموں اور باندیوں کا بھی، اگر وہ تنگدست بھی ہوں تو اللہ سبحانہ انہیں اپنے فضل سے غنی کر دے گا اور اللہ تعالی کشادگی پیدا کرنے والا اور جاننے والا ہے)۔

اس آیت پاک نے اس مسئلہ کو آسان بنادیا ہے، اللہ سبحانہ کا خود وعدہ ہے کہ بے نکاح افراد اللہ کی رضا کے لئے ازدواجی بندھن کو قبول کرلیں تو ان کے اقتصادی مسائل کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ خود حل فرمادے گا، موجودہ دور میں تہذیب مغرب نے بھی دنیا کو ایسے نظائر دئے ہیں جس سے بیک وقت دو کام جاری رکھے جانے کا ثبوت ملتا ہے، بہت سے مغربی نوجوان اور بہت سے وہ مشرقی نوجوان جو امریکہ پہنچ کر تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں، ہر دو تعلیم کے ساتھ ساتھ اپنے ضروری مصارف کی تکمیل کے لئے کسب معاش سے بھی منسلک ہوتے ہیں اور کئی ایک ایسے نوجوان جو مغربی تہذیب کے پروردہ یا دلدادہ ہیں وہ اپنی تعلیم جاری رکھتے ہوئے نوجوان لڑکیوں سے تعلقاتِ عشق ومحبت استوار کرلیتے ہیں اور ان سے ناجائز جنسی تعلقات بھی قائم کر لیتے ہیں، ٹھنڈے دل سے اس پر غور کیا جائے تو تہذیب نو نے محنت وکسب اختیار کرتے ہوئے سلسلہ تعلیم کو برقرار رکھنے اور ناجائز جنسی تعلق کے ساتھ تعلیم جاری رہنے کا عملی ثبوت پیش کردیا ہے، ظاہر ہے اپنے ضروری مصارف کی تکمیل کے لئے محنت وکسب کرتے ہوئے تعلیم جاری رکھی جاسکتی ہے اور اسلام کے جائز طریقہ نکاح کو اختیار کرکے تعلیمی سفر جاری رکھا جاسکتا ہے، اس میں کوئی امر مانع نہیں ہے جب کہ پہلا غیر اسلامی ناجائز طریقہ معاشرہ کو اخلاقی گراوٹ وجنسی انارکی کی طرف لے جارہا ہے اور دوسرا اسلامی طریقہ تعلیم جاری رکھتے ہوئے نکاح کرکے تسکین حاصل کرنے کا ہے جو انسانی زندگی اور اس کی باطنی طہارت کے ساتھ معاشرہ کی پاکیزگی پردال ہے، اقتصادی مسائل کے سلسلہ میں خاندان کے بزرگ اور والدین بھی بچوں کی ابتدائی ازدواجی زندگی کے ایام میں اخلاقی طور پر مالی کفالت کرکے ان کے حصول علم کی راہ کو آسان کرسکتے ہیں، چونکہ اسلام کا نظام اللہ کی رضا کے لئے باہمی تعاون کا نظام ہے، مالدار والدین کو چاہئے کہ وہ اس منزل میں اپنے بچوں کی مالی اعانت کرکے ازدواجی زندگی گزارنے میں ان کی مدد کرتے ہوئے تعلیم حاصل کرنے کی راہ کو ان کے لئے آسان بنائیں، اس طرح تعلیم کی تحصیل آسان ہوگی، جب بچے خود کمانے کے قابل ہوجائیں تو وہ اپنے مصارف کا بار خود اٹھانے کے قابل ہوجائیں گے، اولاد کو بھی چاہئے کہ والدین جب ضعیف ہوجائیں اور محنت اور کسب کے قابل نہ رہیں اور ان کے ہاں مال بھی نہ ہو تو پھر وہ پوری بشاشت قلبی کے ساتھ اپنے والدین پر دل کھول کر حسب مقدرت خرچ کریں۔

موجودہ دور کے اخلاقی انحطاط کے سبب ہونے والے جنسی جرائم ومعاشرہ کی اخلاقی گراوٹ کے سیلاب بلا کے منہ پر بند باندھنے کے لئے اسلام کے جائز طریقہ نکاح کو بڑے پیمانہ پر فروغ دینے کی ضرورت ہے، اس کا بہتر اور احسن طریقہ یہی ہے کہ بلوغ کے بعد بچے بچیوں کے نکاح میں ہرگز تاخیر نہ کی جائے اور نہ ہی اعلیٰ تعلیم کی تحصیل یا اقتصادی مسائل کو اس راہ میں رکاوٹ بنایا جائے۔

ناجائز جنسی تعلقات کے فروغ میں بروقت نکاح کے نہ ہونے اور مخلوط تعلیم نے بھی بڑا غضب ڈھایا ہے، اس لئے اسلامی مملکت کے ذمہ داروں کا فرض ہے کہ وہ مغربی تہذیب کے اس مخلوط تعلیمی کلچر کو جڑ پیڑ سے اکھیڑ پھینکیں، اسلامی احکامات کی پاسداری، حیاوحجاب کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے چلنے والا نظام تعلیم جاری کریں، غیر اسلامی ممالک میں رہنے والے مسلمانوں کا فریضہ ہے کہ وہ مخلوط تعلیمی اداروں سے اپنا رشتہ ناطہ توڑ لیں، ایمان عزیز ہے تو پھر اسلامی احکامات پر عمل پیرا رہتے ہوئے لڑکے اور لڑکیوں کے لئے علاحدہ علاحدہ تعلیمی ادارے قائم کرکے امکانی بلکہ یقینی مفاسد سے ملت اسلامیہ کی حفاظت کو یقینی بنائیں۔

د: (ا) بچہ مزدوری کو بہت سے ملکوں میں قابل سزا جرم قرار دیا گیا ہے، بچے اللہ سبحانہ تعالیٰ کی نعمت، والدین، خاندان اور سماج کے ہاتھوں میں امانت ہیں، انکی حیثیت مملوک کی نہیں ہے، نہ تو وہ خرید وفروخت کی چیز ہیں، قرآن پاک میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے انکو اس عارضی وفانی دنیا میں زندگی گزارنے والوں کے لئے عارضی حیثیت ہی سے کیوں نہ ہو زینت قرار دیا ہے، اور کہیں اللہ نے اولاد کو فتنہ اور آزمائش سے تعبیر فرمایا ہے، یعنی انکے ذریعہ سے انسان کا امتحان ہوتا ہے، خود اسکی اپنی ذات کے بارے میں بھی اور اولاد کے بارے میں بھی کہ اس نے کس حد تک حقوق کی ادائیگی میں سنجیدگی کا مظاہرہ کیا ہے۔

گلشنِ حیات کی تروتازگی اور اس میں سکون وراحت کے اسباب میں سے ایک سبب بچے بھی ہیں، بچوں کی پیدائش سے لیکر ان کے سن بلوغ کو پہنچنے تک اسلام نے ان بچوں کی عمدہ پرورش اور ان کی بہتر نشوونما میں ان کی بنیادی ضروریات کے ساتھ تعلیم وتربیت کو بھی شامل کیا ہے۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے نابالغ بچوں کا نفقہ جبکہ ان کا مال نہ ہو اولاً والدین، پھر درجہ بدرجہ دیگر عصبات وغیرہ پر رکھا ہے، اس طرح اسلام نے بچوں کو کسب ومحنت سے بے نیاز رکھا ہے، تاکہ وہ کسی ذہنی دباؤ کے بغیر سکون وآرام سے محبت وشفقت کے ماحول میں پروان چڑھیں، والدین یا پھر افرادِ

خاندان حسبِ موقع ان کی عمدہ تعلیم وتربیت کا نظم کریں، ان کی شخصیت کی ایسی تعمیر کریں کہ جس سے وہ سماج کے ایک اچھے فرد ثابت ہوں، مستقبل میں ان کے ایک اچھے، دیندار وخداترس انسان اور ایک ماہرِ علم وفن بن کرابھرنے میں ان کے بچپن کی زندگی کو بنیادی حیثیت حاصل ہے، کسی عمارت کی تعمیر میں جس طرح بنیاد کی اہمیت ہے اسی طرح بچوں کی کمسنی کا زمانہ ان کی بہتر نشونما کے لئے ان کو علم واخلاق سے آراستہ کرتے ہوئے ان کی شخصیت کی تعمیر کرنے کا ہے، بچوں کو معاشی مسائل سے دور رکھنے کا بنیادی مقصد یہی ہیکہ انکی زندگی کے یہ قیمتی لمحات ایک اہم اور بنیادی کاز میں لگیں اور وہ تعلیم وتربیت سے مرصع اور عمدہ اخلاق کا پیکر بنیں اور ملک کے ایک اچھے شہری اور ملت کے ایک اچھے خدمتگار ثابت ہوں، اسی لئے اسلام نے بچوں کی تعلیم وتربیت پر خصوصی توجہ دی ہے، سات سال کی عمر میں نماز کی ترغیب اور دس سال کی عمر میں ترکِ نماز کی صورت میں تادیب کے جواحکام ہیں وہ دراصل اسی مقصد کیلئے ہیں، "مروا صبيانكم بالصلاة إذا بلغوا سبعا واضربوهم عليها إذا بلغوا عشرا" (سنن ابی داؤدر ۴۹۴، باب متی یؤمر الغلام بالصلاة)، غزوۂ بدر میں جو قیدی بن کر آئے تھے انکی رہائی کیلئے مالی فدیہ کے بجائے دس بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھانے کو فدیہ بنانا بھی اسی مقصد کی اہمیت کو ظاہر کرتا ہے۔

نابالغ بچوں کے والدین اگر حیات ہوں تو انکی تعلیم وتربیت اور انکے بنیادی مصارفِ زندگی کی ذمہ داری اسلام نے والد پر رکھی ہے، لیکن جو بچے اپنے والد کے سایہ عاطفت سے محروم ہوں اور یتیمی کی زندگی گزار رہے ہوں انکی کفالت کی ذمہ داری درجہ بدرجہ عصبات پر رکھی گئی ہے، وہ بھی اگر اس کے اہل نہ ہوں تو اسلامی مملکت کے بیت المال پر یہ ذمہ داری ڈالی گئی ہے، غیر اسلامی ممالک میں یہ ذمہ داری معاشرہ کے اغنیاء پر عائد کی گئی ہے، قرآن پاک میں یتامیٰ کے بڑے حقوق بتائے گئے ہیں اور اس سے متعلق تفصیلی احکام دئے گئے ہیں اور ان کے ساتھ حسنِ سلوک کرنے کی بڑی تاکید اور اس پر بڑی بڑی بشارتیں احادیثِ پاک میں وارد ہیں، جنت میں وہ حضرت نبی پاک سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ کی قربت ومعیت کے مستحق ہوں گے (صحیح البخاری، کتاب الطلاق ۴۸۹۲)، اسلام نے کمزوروں کی بڑی رعایت رکھی ہے ان میں بچوں کو بڑی اہمیت دی گئی ہے، کمسن بچوں کی دیکھ بھال اور انکی عمدہ کفالت کے احکام بیان کر کے انکو معاشی جھمیلوں میں پڑنے سے محفوظ رکھا ہے، بچوں کے نازک کاندھوں پر کسبِ معاش کا بوجھ لادا جائے تو ان کے تابناک اور محفوظ مستقبل کی ضمانت نہیں دی جاسکتی، موجودہ دور اخلاقی اقدار کے انحطاط کا دور ہے، خدا بے خوفی وآخرت فراموشی نے جہاں جرائم کو فروغ دیا ہے، وہیں معصوم ونھنے ننھے بچے بھی اسکی زد سے محفوظ نہیں رہ سکے ہیں، ساری دنیا میں بچوں کی ناقدری اور ان پر بیجا مظالم کی وجہ ایک تشویش کی لہر پیدا ہوگئی ہے، سنجیدگی سے اس مسئلہ کے حل کیلئے کئی ایک نشستیں اکثر ممالک کے اربابِ حل وعقد نے رکھیں اور اس کیلئے منصوبہ بندی کی گئی، چنانچہ اقوام متحدہ نے مورخہ ۱۴ دسمبر ۱۹۵۸ء اس سلسلے میں ایک قرارداد منظور کی اور ہر سال ۲۰ نومبر کو یوم اطفال منانے کا اعلان کیا، دیگر اور ممالک نے بھی مختلف تواریخ میں یوم اطفال منانے کی منظوری دی، ۱۴ نومبر کو ہندوستان میں بھی یوم اطفال منایا جاتا ہے لیکن یہ ایک رسمی چیز بن کر رہ گئی، بچوں پر ہونے والے مظالم کا چونکہ اس سے کوئی مداوا ممکن نہیں تھا، اس لئے دنیا بھر میں بچوں پر ہونے والے مظالم کا خاتمہ ممکن نہیں ہو سکا ہے، ساری دنیا میں عموماً اور بالخصوص ہندوستان میں بچوں کی صورتحال بڑی ابتر ہے۔

کمسن بچوں کو کسبِ معاش کی بھٹی میں جھونکنا گویا ان کے مستقبل کو داؤ پر لگانا ہے، کمسن بچوں کے نازک کاندھوں پر کسبِ معاش کا بوجھ لادنا کئی ایک جسمانی وروحانی نقصانات کا پیش خیمہ ثابت ہوسکتا ہے، اس میں بچوں کے ذاتی نقصان کے ساتھ ساتھ خاندان اور ملک وقوم کا نقصان بھی ممکن ہے، قدیم وجدید ہر دور میں اکثر علماء وماہرینِ نفسیات اس بات پر متفق رہے ہیں کہ کمسن بچوں کو معاشی تگ ودو میں مشغول نہ کیا جائے، کیونکہ یہ ان کی عمدہ نشونما میں خلل انداز ہوگی، تعلیم وتربیت دینے اور عمدہ اخلاق وآداب کا ان کو خوگر بنانے میں معاشی مشغولیت بڑی رکاوٹ ثابت ہوگی، تعلیم وتربیت سے دوری، کھیل کود سے محرومی ان بچوں کی فطری آزادی کے زمانے میں ان کی عمدہ نشونما میں سدراہ بنے گی۔

معاشی مشغولیت میں اگر مشینوں سے سابقہ ہو تو اس کے مضر اثرات دوہرے ہوسکتے ہیں، مشینوں کی آواز اور اسکی گڑگڑاہٹ دل ودماغ کو متاثر کرنے کے ساتھ ساعت وبصارت پر بھی اثر انداز ہوسکتی ہے، الغرض بچپن کا زمانہ ان بچوں کی سخت حفاظت، دیکھ بھال اور ان کی عمدہ تعلیم وتربیت کا نظم کرتے ہوئے ان کی نگہداشت رکھنے کا ہے، اس سلسلہ میں بعض فقہا جیسے ولوالجی نے اپنے فتاویٰ میں اور ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری میں صراحت کی ہے کہ بچوں کا جسم، ان کی عقل اور ان کی نفسیات کام میں مشغولیت کی اہلیت نہیں رکھتے، کام کاج میں ان کو مشغول کرنا گویا ان کو تکلیف مالا یطاق سے دو چار کرنا ہے (الولوالجی: عبدالرشید (ت ۵۴۰ھ، ۱۱۴۵م) الفتاوی الولوالجیة، تحقیق مقداد بن موسی، بیروت، دارالکتب العلمیة، ط ۱، ۲۰۰۳م- ۱۴۲۴ھ- ۳/۳۸۱- ابن حجر العسقلانی: أحمد بن علی (ت ۸۵۲ھ، ۱۴۴۸م)، (فتح الباری بشرح صحیح البخاری، رقمہا محمد فؤاد عبدالباقی، بیروت، دارالمعرفة ۵/۳۹۶)۔

یہی وہ عوامل ہیں جو اس بات کی رہبری کرتے ہیں کہ شریعت نے بچوں پر کام کاج کی ذمہ داری نہیں ڈالی ہے، اللہ تعالیٰ کسی نفس کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتے "لا یکلف اللہ نفساً إلا وسعها" (البقرۃ/۲۸۶) اور حدیث پاک میں وارد ہے: "رفع القلم عن ثلاث: عن المجنون حتیٰ یفیق، وعن الصبی حتی یبلغ، وعن النائم حتیٰ یستیقظ" (سنن ابی داود کتاب الحدود، رقم الحدیث ۴۳۹۸)، جہاں تک کمسن بچوں کی تربیت و پرورش کا سوال ہے اسکے ذمہ دار سب سے پہلے والد، وہ اگر نہ ہوں تو عصبات قریبہ، یہ بھی نہ ہوں تو سماج کے مالدار اصحاب اسکے ذمہ دار بنائے گئے ہیں کہ وہ غریب خاندانوں کی اور غریب خاندان کے غریب بچوں کی کفالت کریں، حکومتیں بھی اسکی ذمہ دار ہیں کہ رعایا کی بنیادی ضرورتوں کی تکمیل میں وہ نمایاں رول ادا کریں اور اپنے بجٹ میں رقم کا ایک معتد بہ حصہ اس مقصد کے لئے مختص کریں، اسلامی مملکت میں بیت المال اسی ذمہ داری کو پورا کرتے ہیں۔

حدیث پاک میں وارد ہے: "کلکم راع وکلکم مسؤول عن رعیته، فالإمام راع وهو مسؤول، والمرأة راعية فی بیت زوجها وهی مسؤولة، والعبد راع علی مال سیده وهو مسؤول، فکلکم راع وکلکم مسؤول" (صحیح البخاری، کتاب النکاح، باب "قوا أنفسکم وأهلیکم نارا"، رقم الحدیث ۵۱۸۸)، اس حدیث پاک کی روشنی میں اس معاشرہ کا ہر فرد مسؤول ہے، اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنا ہر ایک پر واجب ہے، ماں باپ اپنی اولاد کی اور خاندان کے افراد اپنے خاندان کے غریب بچوں کی تعلیم و تربیت کی فکر کریں اور ان کی تعلیمی و بنیادی ضرورتوں کی رعایت رکھیں، ان سے اگر ذمہ داری پوری نہ ہو سکے تو سماج کے اغنیاء یا پھر حکومتیں اس فرض کی طرف توجہ کریں، اس احساس ذمہ داری میں ہر کوئی سنجیدہ ہو تو پھر کمسن بچوں کے کسب معاش میں مشغول ہونے کے واقعات میں کمی آسکتی ہے اور معاشرہ میں کمسن بچے جو اس وقت اپنی غربت کی وجہ سے کھیل کود، پڑھنے لکھنے سے محروم اور کسب معاش کے بوجھ تلے دب کر ذہنی الجھن کا شکار ہیں، اس کا بڑی حد تک تدارک ہو سکتا ہے، علماء معاصرین میں محمد المبارک وعبد اللطیف بن سعید الغامدی بچوں پر کام کاج کا بوجھ ڈالنے اور ان کو کسب معاش میں مشغول کرنے کے سخت مخالف ہیں، انہوں نے سورۃ البقرۃ کی آیت نمبر ۲۸۶ (لا یکلف اللہ نفساً إلا وسعها) سے استدلال کرتے ہوئے لکھا ہے: دلت الآیة علی عدم تکلیف الإنسان ما لا یستطیع، وتکلیف الصغار بالعمل تکلیفاً بما لا یستطیعون، فاجسادهم ضعیفة لا تقوی علی القیام بالأعمال الشاقة" (حقوق الانسان للغامدی ۲۳/۷)۔

احادیث پاک سے بھی انہوں نے استدلال کیا ہے: "عن ابن عمر رضی اللہ عنهما قال: عرضت علی رسول اللہ ﷺ فی جیش وأنا ابن أربع عشرة فلم یقبلنی" (محمد بن عیسی الترمذی، ت ۲۹۷ھ، ۸۹۲م، الجامع الصحیح، کتاب الجهاد، باب ما جاء فی حد بلوغ الرجل ومتی یفرض له، قال الترمذی: حسن صحیح)، یہ حدیث پاک بچوں کو فوج میں بھرتی کرنے سے منع کر رہی ہے، اسی لئے رسول پاک ﷺ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو انکی کمسنی و عدم بلوغ کی وجہ سے جہاد میں شرکت کی اجازت نہیں دی جبکہ جہاد بھی ایک عمل ہے، ظاہر ہے کام کاج کی جتنی انواع ہونگی وہ سب کی سب بچوں کے حق میں ممنوع ہوں گی، اس میں بچوں کی جسمانی کمزوری، عقلی ونفسیاتی پہلوؤں کو مدنظر رکھا گیا ہے۔

کسب معاش کی مشغولیت بسا اوقات بچوں کو غلط راہ پر ڈال سکتی ہے اور بچے فطری خلقت سے انحراف کی طرف قدم آگے بڑھا سکتے ہیں (دیکھئے: "تفصیل کے لئے" نظام الاسلام۔ الاقتصاد، مبادئ وقواعد عامة لمحمد المبارک" (بیروت، دار الفکر، ط ۳، ۱۹۸۱م، ص ۶۰ و ۶۱۔ حقوق الانسان فی الاسلام للغامدی، الریاض، مکتبة الملک فهد الوطنیة، ط ۱، ۲۰۰۰، ۲/۲۶۳، ۲۳/۷)۔

بچوں کو معاشی مشغولیت میں مصروف کرنے کے واقعات، سابقہ ادوار میں بھی رہے ہیں اور موجودہ ترقی یافتہ دور میں تو اسکی شرح میں مزید اضافہ ہو گیا ہے، بعض قدیم شارحین بھی بچوں کو کام کاج پر لگانے، کاروبار وتجارت میں مشغول کرنے کے مؤید ہیں، لیکن انہوں نے یہ شرط رکھی ہے کہ بچے عاقل ہوں اور ممیز ہوں، مقصود یہ ہے کہ جو بچے خرید و فروخت کے معاملات میں نفع ونقصان کے درمیان تمیز کر سکتے ہوں ان کو بوقت ضرورت کام کاج میں مشغول کیا جا سکتا ہے، طفل ممیز کو بیع وشراء کی اجازت دی گئی ہے، البتہ بحیثیت اجیر اس کا معاملہ ولی کی اجازت پر موقوف رہے گا، حنفیہ، مالکیہ، حنابلہ، ظاہریہ، اباضیہ، جعفریہ سب کا اس پر اتفاق ہے، اس رائے سے اتفاق رکھنے والے علماء نے ان آیات سے استدلال کیا ہے: "وابتلوا الیتامیٰ حتیٰ إذا بلغوا النکاح فإن آنستم منهم رشداً فادفعوا إلیهم أموالهم" (النساء/۶) (یتامیٰ کو ان کے بالغ ہونے تک سدھاتے اور آزماتے رہو اور جب ان میں رشد یعنی سمجھداری، حسن تدبیر دیکھو تو ان کا مال انکے حوالے کردو)، یعنی اس آیت پاک میں یہ ہدایت یتامیٰ کے اولیاء کو دی ہے کہ وہ یتیم اور ممیز بچوں سے چھوٹے موٹے مالی معاملات کروائیں تا کہ ان کو آزمایا جا سکے (الانصاف فی معرفة الراجح من الخلاف للمرداوی ۳۶/۶)۔

فقہاء کا ماننا ہے کہ سابقہ اور موجودہ دور کے احوال میں زمین و آسمان کا فرق ہے، سابقہ و موجودہ دور کے بچوں میں بھی عقل و تمیز کے اعتبار سے بڑی تبدیلی دیکھی جا رہی ہے، بسا اوقات بعض اعمال کی ادائیگی میں بچے بڑوں سے پار نظر آرہے ہیں، معاشی و سماجی ہر سطح پر بچوں کو آگے لانے کی ضرورت محسوس کی جارہی ہے، بچوں سے اگر معاملات کروائے جائیں تو ان کو دوسروں سے تجربہ حاصل ہوتا ہے اور آپسی تعلقات اور میل جول کی وجہ انسانیت کا احترام اور ان سے محبت انکے دل میں رسوخ پا سکتی ہے، کام کاج کا سیکھنا یا کسی حرفت سے انکا وابستہ ہونا ان کے اندر مال کمانے کی اہلیت پیدا کرسکتا ہے اور کام کرتے ہوئے مسؤولیت کا شعور و احساس ان کے اندر اجاگر ہوسکتا ہے، اس لئے اہلیت کے لئے عقل و تمیز کافی ہیں، صغیر کو بھی تصرف کی اجازت ملنی چاہئے۔ موجودہ زمانے کی مصلحت اسی بات کی متقاضی ہے، جواز کی رائے رکھنے والے معاصر علماء میں عبدالفتاح ادریس، عثمان حسن ملا، صالح العلی حسن احمد و اسماعیل البدوی مشہور و معروف ہیں، (تفصیلی بحث کے لئے دیکھیں: عمالۃ الأطفال من وجہۃ نظر اسلامیۃ لأدریس عبدالفتاح، الطفولۃ فی الاسلام مکانتہا وأسس تربیۃ الطفل لعثمان حسن ملا، ۲۳ / ۷، عناصر الانتاجی لصالح العلی، ۲۱۰، نظریۃ الأجور فی الفقہ الاسلامی، دمشق لحسن احمد، ۲۳ عناصر الأنتاج فی الاقتصاد الاسلامی والاقتصاد الوضعی‘ دراسۃ مقارنۃ‘ لاسماعیل ابراہیم البدوی دیکھے جائیں)۔

اور وہ علماء جو تصرف صغیر کے قائل نہیں ہیں وہ تو یہی رائے رکھتے ہیں کہ کمسن و نابالغ اگر کوئی تصرف کرے تو وہ منعقد نہیں ہوگا، خواہ وہ ممیز ہو کہ غیر ممیز، ان کا استدلال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے "ولا تؤتوا السفهاء أموالكم" سے سفیہ یعنی کم عقل کو اپنا مال حوالے کرنے سے منع کیا ہے، اور صدر بالا سورۂ نساء کی آیت ۶ سے استدلال کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے مالی تصرف کو بلوغ اور رشد کے ساتھ مربوط کیا ہے، بطور آزمائش اور ان کی تربیت ہی کی غرض سے کیوں نہ ہو مال ان کے حوالے کرنا یا معاملات میں تصرف کی اجازت دینا غیر درست ہے (مغنی المحتاج الی الفاظ المنہاج، بیروت، دار الفکر، ۲ / ۷)، تصرف صغیر کو جائز رکھنے والے علماء کے اس آیت "وأحل الله البيع وحرم الربو" (البقرۃ / ۲۷۵) سے کئے گئے استدلال کا جواب دیتے ہوئے عدم تصرف کے قائل علماء نے کہا ہے کہ نصوص شرعیہ کے مخاطب مکلف ہیں جو عاقل و بالغ اور راشد ہوتے ہیں، اس لئے اس آیت کے حکم کو عام مان کر صغیر و کبیر سب کے لئے اس حکم کو یکساں ماننا غیر درست ہے، گو کہ اسکا اسکے قائلین نے جواب دیا ہے کہ عقود بیع و اجارہ میں تصرف صغیر کی ممانعت بذات خود مقصود نہیں ہے بلکہ اس کو نقصان سے بچانے کی غرض سے ہے، چونکہ اس کی صغر سنی و تجربہ کی کمی سے نقصان کا احتمال ممکن ہے لیکن اگر وہ صاحب سمجھ اور تمیز کی صلاحیت رکھتا ہو تو اسکے تصرفات کو درست مانا جاسکتا ہے، اس تناظر میں اگر زمانہ نابالغی میں بچوں کو کام کاج میں لگانا ضروری ہو تو بصورت مجبوری، بوقت ضرورت و بقدر ضرورت درج ذیل امور کی رعایت رکھتے ہوئے اس کی اجازت پر غور کیا جاسکتا ہے:

۱۔ بچوں سے جو کام لیا جائے وہ شرعاً جائز ہو۔

۲۔ بچے سمجھ بوجھ رکھنے والے ہوں۔

۳۔ بچوں کے اولیاء یا ان کے وصی کی اجازت کے ساتھ ہو۔

۴۔ بچوں سے جو کام لیا جائے اس میں بچوں کی ظاہری مصلحت پیش نظر ہو۔

۵۔ بچوں سے لئے جانے والے کام کی نوعیت، اسکی مدت اور اجرت کا تعین ہو۔

۶۔ ایسا کوئی کام ان سے نہ لیا جائے جس سے انکی تعلیم متاثر ہوتی ہو۔

۷۔ اس قدر انکو کام میں مشغول نہ کردیا جائے کہ وہ کھیل کود کے لئے وقت نہ پاسکیں۔

۸۔ کام کی نوعیت اس انداز کی ہو کہ جس کو وہ سہار سکیں یعنی ایسا کام نہ ہو کہ جس کی وجہ ان کے جسم، عقل و نفس متاثر ہوں یا پھر ان پر منفی اثرات مرتب ہوں۔

(۲) والدین یا اولیاء نابالغ بچوں اور بچیوں سے حسب موقع و حسب ضرورت گھریلو کام کاج میں مدد لے سکتے ہیں، ظاہر ہے ان سے کام لیتے ہوئے درج بالا امور کو ضرور نظر میں رکھنا چاہئے، کام کاج کی ادائیگی میں اگر ان سے کوئی کوتاہی ہو یا وہ اس کام کی تعمیل نہ کرسکیں تو ان کی سرزنش نہ کریں بلکہ چشم پوشی سے کام لیں کہ اسی میں مصلحت ہے، ماہرین نفسیات نے بچوں کی ذہنی کیفیت کو عکس لینے والے کیمرہ سے تعبیر کیا ہے، جو برتاؤ بڑوں کی طرف

سے ان کے ساتھ کیا جاتا ہے وہ ان کے دل و دماغ پر مرتسم ہوجاتا ہے، ظاہر ہے بڑوں کا برتاؤ اچھا ہوتو اچھے اثرات اور برا ہوتو اس کے برے اثرات ان کے دل و دماغ پر نقش ہوجاتے ہیں، زندگی تمام وہ اس کو بھول نہیں پاتے، بچوں کی مثبت یا منفی شخصیت کی تعمیر میں اس کا بڑا رول ہے، اس لئے ماں باپ کی بڑی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی دیندارانہ وخدا ترسانہ زندگی سے اچھے نقوش چھوڑیں۔

حضرت نبی پاک سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ جو انبیاء و مرسلین کے امام ہیں اور جہاں ساری مخلوقات میں اعلیٰ وارفع فضائل و کمالات کے حامل ہیں وہیں انسانی فطرت کے بڑے نباض اور ماہر ہیں، موجودہ دور کے ماہرین نفسیات نے بچوں کی نفسیات پر تحقیق کے بعد جو رائے دی ہے، آج سے چودہ سو سال پہلے آپ ﷺ نے عملی طور پر انسانیت کو بچوں کے ساتھ عمدہ برتاؤ کر کے انکے نفسیات کو مجروح ہونے سے بچانے کی تعلیم دی ہے، چنانچہ حضرت سیدنا انس رضی اللہ عنہ کمسن تھے اور آپ ﷺ کی خدمت میں رہتے ہوئے تعلیم و تربیت پا رہے تھے، ان کا کہنا ہے کہ ''میں دس سال تک آپ ﷺ کی خدمت اقدس میں رہا، آپ ﷺ نے کبھی مجھے 'اُف' تک نہیں فرمایا، آپ ﷺ نے اگر مجھے کسی کام کے کرنے کی ہدایت دی اور وہ میں نہیں کر پایا تو آپ ﷺ نے یہ نہیں فرمایا کہ تم نے یہ کام کیوں نہیں کیا، اور کبھی آپ ﷺ نے کسی کام سے منع کیا ہو اور میں نے اسے کر لیا تو آپ ﷺ نے یہ نہیں فرمایا کہ یہ کام تم نے کیوں کیا'' (سنن الدارمی باب ما اکرم اللہ نبیہ ۱/۱۱۴۔ رقم الحدیث ۶۷)۔ ماں باپ ہوں یا اولیاء بچوں سے گھریلو ضروری کام کاج لیتے ہوئے اس امر کو ضرور ملحوظ رکھیں۔

جہاں تک اپنے بچوں کو مزدوری پر لگانے کا سوال ہے وہ اگر اچھے مقاصد کے تحت ہو تو ان کو کام پر لگایا جاسکتا ہے، اور بچوں کو کام پر لگانے کی دو وجوہات ہوسکتی ہیں: ایک تو یہ کہ بچے ذہنی اعتبار سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی صلاحیت نہ رکھتے ہوں یا یہ کہ ماں باپ مالی اعتبار سے انکو اعلیٰ تعلیم دلانے کے موقف میں نہ ہوں تو بچوں کو انکی صلاحیت کے مطابق کسی پیشہ یا ہنر سے جوڑا جاسکتا ہے تا کہ وہ اس ہنر یا پیشہ میں مہارت حاصل کرسکیں، دوسری وجہ ماں باپ کی غربت و تنگدستی ہے، ظاہر ہے معاشی بنیادی ضروریات کی تکمیل والد کی آمدنی سے نہ ہو پا رہی ہو تو اس کی پا بجائی کے لئے بصورت مجبوری غریب والدین اپنے بچوں کو مزدوری پر لگاتے ہیں، لیکن ان صورتوں میں انکی بنیادی اسلامی و دینی تعلیم و تربیت سے غفلت نہیں برتی جانی چاہئے۔

(۳) اس لئے ماں باپ انتہائی غریب اور معاشی بدحالی کا شکار ہوں اور ایسے مجبور ہوں کہ وہ کمانے کے لائق نہ ہوں اور حکومت بھی ان کا تکفل نہ کرتی ہو، ان جیسے ناگزیر حالات میں بچوں کو مزدوری پر لگایا جاسکتا ہے، یہ ایک اضطراری صورت ہے، لیکن بچوں کو کام پر لگاتے ہوئے ضرور اس بات کا احساس رکھنا چاہئے کہ وہ کام ایسے ہوں جس سے فی الوقت معاشی ضروریات پوری ہونے کے ساتھ اس سے بچوں کو ایسا فائدہ ہو جس سے وہ مستقبل میں اس کام کو اپنے لئے جائز روزگار حاصل کرنے کا ذریعہ بنا سکیں، ایسا ہرگز نہ ہو کہ موجودہ بنیادی معاشی ضروریات تو پوری ہوں لیکن بچوں کو اس کام کی وجہ سے مستقبل میں کوئی فائدہ پہنچنا ممکن نہ ہو۔

۵: قبل از بلوغ لڑکوں یا لڑکیوں سے جرائم سرزد ہوں تو ان سے متعلق شرعی حکم کی تفصیل درج ذیل ہے:

شریعت مطہرہ کی رو سے بالغ افراد احکام کے مکلف ہیں، نابالغ مجنون وغیرہ احکام شرع کے مکلف نہیں، لڑکے و لڑکیوں میں بلوغ کی علامات پائے جانے پر وہ بالغ متصور ہوتے ہیں اور ان پر احکام شرع جاری ہوتے ہیں۔ فطری طور پر بلوغ کی جو علامات ہیں وہ ظاہر نہ ہوں تو پھر کس عمر میں ان کو بالغ سمجھا جائے اور ان پر احکام شرع جاری کئے جائیں؟ اس باب میں فقہا کے درمیان اختلاف ہے، ایک قول یہ ہے کہ لڑکے اگر ۱۸ سال کے ہوجائیں تو وہ بالغ سمجھے جائیں گے، لڑکیاں جب ۱۷ سال کی ہوجائیں تو وہ بالغ مانی جائیں گی، اس کو امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ (بدائع الصنائع ۷/۱۷۲) اور فقہاء مالکیہ نے اختیار کیا ہے (مواہب الجلیل ۵/۵۷)، ان کا استدلال ان آیات پاک "ولا تقربوا مال الیتیم إلا بالتی هی أحسن حتی یبلغ أشده"، اور "وابتلوا الیتامی حتیٰ إذا بلغوا النکاح فإن آنستم منهم رشدًا فادفعوا إلیهم أموالهم ولا تأکلوها إسرافا وبدارا أن یکبروا" سے ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے پہلی آیت میں ''أشده'' سے مراد وہ لڑکا ہے جس کی عمر ۱۸ سال ہوجائے، دوسری آیت پاک میں "إذا بلغوا النکاح" سے مراد علامات بلوغ کا ظہور ہے، ان علامتوں کا ظہور نہ ہو تو پھر ۱۸ سال کی عمر ہوجانے پر بلوغ کے احکام جاری ہوں گے۔

اس بارے میں دوسری رائے یہ ہے کہ علامات بلوغ ظاہر نہ ہوں تو پھر ۱۵ سال کے ہونے پر وہ بالغ سمجھے جائیں گے، صغیر و صغیرہ ہر دو کا یہی حکم

ہے، شافعیہ، حنابلہ اور ائمہ احناف میں امام ابو یوسف رحمہم اللہ اس کے قائل ہیں، اور یہی رائے سفیان الثوری، ابن المبارک و اسحاق رحمہم اللہ کی ہے (الأشباہ والنظائر، المغنی والشرح الکبیر، بدائع الصنائع، شرائع الاسلام، تحفۃ الأحوذی دیکھے جاسکتے ہیں)۔

امام شافعی رحمہ اللہ مذکورہ دوسری آیت سے استدلال کرتے ہیں اور کہتے ہیں: یتامیٰ پر حجر یعنی صغرسنی، جنون یا کم عقلی وغیرہ کی بنیاد پر تصرفات مالیہ سے روکنے کی حد، بلوغ اور رشد ہے، لڑکا اور لڑکی جب ۱۵ سال کے ہوجاتے ہیں تو ان پر بالغ ہونے کے احکام ثابت ہوجاتے ہیں، ایک اور حدیث پاک کو بھی وہ استدلال میں پیش کرتے ہیں جو حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، وہ کہتے ہیں کہ غزوہ احد کے موقع پر جب ان کی عمر ۱۴ سال کی تھی تو ان کو شرکت کی اجازت نہیں دی گئی، اور جب غزوہ خندق کے موقع پر مجھے پیش کیا گیا جبکہ میں ۱۵ سال کا تھا تو مجھے غزوہ خندق میں شرکت کی اجازت مل گئی (الترمذی، کتاب الجہاد باب ماجاء فی حد بلوغ الرجل ومتی یفرض لہ، رقم: ۱۷۱۰)۔

امام نافع بیان کرتے ہیں کہ یہ حدیث پاک عمر بن عبدالعزیز کے سامنے بیان کی گئی جبکہ وہ خلیفہ تھے تو انہوں نے بالغ و نابالغ کے درمیان فرق کے لئے اس حدیث پاک کو دلیل بنایا اور سارے کار پردازان حکومت کو لکھ بھیجا کہ جب کوئی ۱۵ سال کا ہوجائے تو اس پر احکامات بلوغ جاری کئے جائیں (صحیح مسلم، داراحیاء التراث العربی، بیروت ۴/ ۲۰۵)۔

اس سے ثابت ہے کہ بلوغ کی ادنیٰ حد ۱۵ سال کی عمر کی تکمیل ہے، یہ بھی کہ ثبوت بلوغ کے لئے دراصل عقل کا پایا جانا ہی مؤثر ہے، علامات بلوغ کا ظہور بھی کمال عقل کی دلیل کے طور پر مانا گیا ہے۔

تیسری رائے یہ ہے کہ علامات بلوغ لڑکے و لڑکیوں میں ظاہر نہ ہوں تو ۱۷ سال کی عمر پوری ہونے پر بالغین کے احکام جاری ہونگے اور یہ ابن حزم الظاہری کی رائے ہے (المحلی ۱/ ۸۸)، اکثر علماء و فقہاء نے دوسری رائے کو ترجیح دی ہے، یعنی لڑکا ہو یا لڑکی ۱۵ سال کی عمر کو پہنچ جائیں تو ان کے بلوغ کا حکم لگے گا، ائمہ احناف میں صاحبین رحمہم اللہ کے ساتھ امام صاحب رحمہ اللہ سے بھی ایک رائے یہی ثابت ہے اور امام شافعی رحمہ اللہ سے بھی یہی قول منقول ہے (العنایۃ شرح الہدایۃ، فصل فی حد البلوغ ۱۳/ ۲۲۸، مسند الامام الشافعی ۶/ ۲۵)۔

نابالغ لڑکے یا لڑکی سے کسی جرم کا صدور ہو تو بالاتفاق ان پر حدود شرعیہ جاری نہیں کئے جائیں گے، کتاب و سنت، اجماع اور معقول سے یہ ثابت ہے کہ صغیر یا صغیرہ سے کوئی جرم سرزد ہو تو ان پر حدود شرعیہ کا نفاذ نہیں ہوگا، قرآن پاک کی ان آیات "لایکلف اللہ نفساً إلا وسعھا"، اور "لا تکلف نفس إلا وسعھا" سے ثابت ہے کہ صغیر (نابالغ) سے جو امور سرزد ہوں جن کا وہ مکلف نہیں ہے تو وہ اس بارے میں قابل باز پرس نہیں ہے، کیونکہ کسی نفس کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دی جائے گی، نبی پاک سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان "رفع القلم عن ثلاثۃ: عن النائم حتیٰ یستیقظ، وعن الصبی حتیٰ یحتلم، وعن المجنون حتیٰ یفیق" سے بھی یہ ثابت ہے کہ نابالغین وغیرہ مرفوع القلم ہیں یعنی وہ اپنے اعمال پر قابل مؤاخذہ نہیں اور جنایات میں بھی وہ مسؤول نہیں ہوں گے، اور یہ بات قرین انصاف بھی ہے کہ کسی کو اس بات کی تکلیف نہ دی جائے جس کا وہ اہل نہ ہو۔

فقہاء شریعت اسلامیہ کا اس بات پر اتفاق ہے کہ حدود سے متعلق جرائم کا اطلاق مکلف یعنی عاقل، بالغ اور اختیار رکھنے والے پر ہوگا، اور جو مکلف نہ ہو اس پر عدم اہلیت کی بناء جنایات کے صدور پر حدود شرعیہ کا اجراء نہیں ہوگا (التشریع الجنائی لعبدالقادر عودہ ۱/ ۳۹۳)۔

قاتل اگر نابالغ ہو تو قصاص میں اس نابالغ قاتل کو قتل نہیں کیا جائے گا، البتہ نابالغ کے افراد خاندان پر دیت کا وجوب ہوگا "منھا کون القاتل عاقلاً بالغاً إذ لا یجب القود علی المجنون والصبی أصلاً" (فتح القدیر لابن الھمام، کتاب الجنایات ۲۳/ ۱۵۹ راجع المکتبۃ الشاملۃ)۔

اس کے برعکس کوئی عاقل و بالغ فرد کسی نابالغ کو قتل کردے تو اس بالغ قاتل کو قصاص میں قتل کیا جائیگا چونکہ عاقل و بالغ احکام شرع کا مکلف ہے "ویقتل الکبیر بالصغیر" (فتاویٰ ہندیہ، الباب الثامن فیمن یقتل قصاصاً ومن لایقتل ۶/ ۳)۔

الغرض قصاص کے احکام تو مکلف یعنی عاقل و بالغ پر جاری ہونگے، غیر مکلف یعنی نابالغ و غیر عاقل پر نہیں، البتہ نابالغ سے کسی کا قتل ثابت ہو جائے خواہ وہ عمداً یعنی جانے بوجھے ہو یا قتل غیر عمد (قتل خطاء) یعنی انجانے میں قتل ہوگیا ہو ہر دو صورت میں اس نابالغ پر دیت کا لزوم ہوگا جبکہ وہ مالدار ہو، اگر وہ مالدار نہ ہو تو پھر دیت اسکے اولیاء اور خاندان والوں پر ہوگی اور اس نابالغ پر کفارۂ قتل بھی واجب نہیں ہوگا (الفتاوی الہندیۃ، الباب التاسع فی الامر بالجنایۃ ۶/ ۳۰) جبکہ عاقل و بالغ قتل عمد کا مرتکب ہو تو قصاص جاری ہوگا اور قتل غیر عمد میں قصاص کا حکم نہیں لگے گا بلکہ دیت واجب ہوگی قتل خطاء میں دیت

کے ساتھ بالغ قاتل پر کفارۂ قتل بھی واجب ہوگا، کفارہ قتل یہ ہے: ایک غلام آزاد کیا جائے یا پھر دو ماہ کے پے درپے روزے رکھے جائیں۔

نابالغ اگر کسی دوسرے نابالغ کو کسی انسان کے قتل کرنے کا حکم دے اور وہ اس کی بات مان کر اس کو قتل بھی کردے تو سوال یہ ہے کہ اس قتل کا ذمہ دار کس کو تسلیم کیا جائے گا؟ فقہا کی رائے یہ ہے کہ قتل کرنے والا نابالغ ہی قتل کا ذمہ دار گردانا جائے گا، قتل کا حکم دینے والا ذمہ دار نہیں ہوگا، اس لئے قتل کرنے والے کے افراد خاندان پر ہی دیت واجب ہوگی، حکم دینے والے نابالغ کے افراد خاندان پر دیت کا وجوب نہیں ہوگا، اس لئے حکم دینے والے نابالغ کے عاقلہ سے اس رقم کی وصولی بھی نہیں کی جاسکے گی (حوالہ سابق)۔

البتہ کوئی مکلف فرد نابالغ کو کسی انسان کے قتل کا حکم کرے اور نابالغ اس کی تعمیل میں قتل کردے تو اس صورت میں بھی حکم کرنے والے بالغ فرد کو نہیں بلکہ نابالغ قاتل ہی کو ذمہ دار قرار دیا جائے گا، اور دیت اس نابالغ قاتل کے اہل خاندان پر ہوگی لیکن نابالغ قاتل کے اولیاء اس دیت کی رقم قتل کا حکم دینے والے عاقل و بالغ فرد سے وصول کریں گے (حوالہ سابق)۔

الغرض اسلام میں انسانی جان کی بڑی اہمیت ہے، اسی لئے نابالغ سے اگر قتل کا صدور ہو تو اس سے قصاص تو نہیں لیا جائے گا لیکن دیت (خوں بہا) کا اس پر وجوب رہے گا، نابالغ کی ناسمجھی کی وجہ سے کوئی زخمی ہوجائے یا کسی کی آنکھ ضائع ہوجائے تو شریعت نے جس چیز کو واجب کیا ہے وہ اِرش یعنی مالی معاوضہ ہے، اس مالی معاوضہ کا وجوب اس نابالغ بچے کے مال میں ہوگا، بچے کے ہاں اگر کوئی مال نہ ہو تو اس کے ہاں مال آنے تک مہلت دی جائے گی، اولیاء پر اس کی ذمہ داری نہیں ڈالی گئی (فتاویٰ بزازیہ علی ہامش الہندیہ ۳۸۶/۶)۔

حد کا نفاذ کمال اہلیت یعنی مکلف ہونے پر ہی ہوگا، تاہم صغیر پر عدم حد کے بارے میں اتفاق کے ساتھ بعضوں نے حسب ضرورت تعزیری سزا دینے کی حمایت کی ہے اور اسکے درجات بیان کئے ہیں، دوسری مرتبہ چوری کا ارتکاب ہو تو اس کی تادیب کی جائے، تیسری مرتبہ میں اس کے ناخنوں کو اس قدر رگڑا جائے کہ خون آنے لگے، چوتھی مرتبہ کی چوری پر اس کی انگلی کے پور کاٹ دئے جائیں، پانچویں مرتبہ کی چوی پر مکلف کی طرح قطع ید کی رائے دی ہے (الروضۃ البہیۃ ۳۷۵/۲)۔

کسی نابالغ سے زنا کا ارتکاب ہوجائے تو ائمہ اربعہ کی بالاتفاق رائے یہ ہے کہ اصطلاح شریعت کے مطابق نفاذ حدود کی حیثیت سے اس کو زنا نہیں کہا جائے گا، کیونکہ اس کا عدم بلوغ نفاذ حد میں مانع ہے: "حتی إن وطأ المجنون والصبی العاقل لایکون زنا لأن فعلھما لا یوصف بالحرمۃ کذا فی محیط السرخسی" (فتاویٰ ہندیہ، الباب الثانی فی الزنا، مکتبۃ الشاملۃ ۱۴۳/۲)، اگر نابالغ شادی شدہ ہو تب بھی اسے محصن نہیں سمجھا گیا اور اس بات پر تمام فقہا کا اتفاق ہے، ہر دو صنف یعنی لڑکا و لڑکی دونوں کا حکم ایک ہی ہے (رد المحتار ۳۳/۶)۔

نابالغ کے متعلق زنا کے بارے میں تین صورتیں متصور ہوسکتی ہیں:

پہلی صورت "اشتراك الصغیر بالصغیرۃ فی الزنا" یعنی نابالغ کا نابالغہ لڑکی کے ساتھ جنسی فعل کا ارتکاب، ظاہر ہے صراحت بالا کے مطابق ہر دو پر زنا کا حکم نہیں لگے گا اور نہ ان پر حد جاری ہوگی۔

دوسری صورت "اشتراك الصغیر بالبالغۃ فی الزنا" یعنی صغیر کا بالغہ کے ساتھ زنا کا ارتکاب، اس بارے میں فقہاء کی دو رائے ہیں: پہلی رائے یہ ہے کہ اس بالغہ پر بھی حد جاری نہیں ہوگی، یہ رائے حنفیہ (شرح فتح القدیر ۱۵۶/۴) و مالکیہ (شرح الزرقانی ۷۸/۸) کی ہے، انہوں نے دلیل میں یہ حدیث "ادرؤا الحدود بالشبہات" (تحفۃ الاحوذی ۶۸۹/۴) پیش کی ہے، اس لئے صغیر نے اگر کسی بالغہ عورت سے جنسی تعلق قائم کرلیا ہے اگرچہ کہ اس بالغہ عورت کی رضامندی شامل ہو، تب بھی اس بالغہ عورت سے حد ساقط ہوجائے گی (سبل السلام ۱۵/۴)، کیونکہ اس صورت میں جرم کامل طور پر ثابت نہیں، اس لئے کامل سزا بھی جاری نہیں ہوگی (بدائع الصنائع ۲۳/۱۵، المکتبۃ الشاملۃ)، دوسری رائے یہ ہے کہ صغیر کے لئے تعزیر ہوگی اور بالغہ عورت پر حد قائم کی جائے گی، فقہاء احناف میں اس دوسری رائے کے قائل ابو یوسف و زفر رحمہم اللہ ہیں اور شافعیہ بھی یہی رائے رکھتے ہیں (روضۃ الطالبین ۴۱۰/۸)، حنابلہ کے ہاں اس صورت میں لڑکا اگر سترہ سال کا ہو تو اس پر حد جاری ہوگی ورنہ نہیں، اور یہی رائے ظاہریہ، امامیہ اور زیدیہ کی ہے۔

تیسری صورت اشتراک الکبیر مع الصغیرۃ فی الزنا یعنی بالغ مرد کا نابالغہ کے ساتھ زنا کا ارتکاب، اس صورت میں بھی فقہاء کی دو رائے ہیں: پہلی رائے یہ ہے کہ صغیرہ اگر مشتہاۃ ہو تو بالغ مرد پر بالاتفاق حد ثابت ہے اور نابالغہ پر حد نہیں "ولا خلاف فی أن العاقل البالغ إذا زنی بصبیۃ أو مجنونۃ أنہ یجب

علیہ الحد ولا حد علیہا" (بدائع الصنائع المکتبۃ الشاملۃ ۱۵ / ۲۳)۔ دوسری رائے یہ ہے کہ مذکورہ صورت میں صغیرہ اگر مشتہاۃ نہ ہوتو بالغ پر حد جاری کرنے کے بارے میں فقہاء کا اختلاف ہے، ایک رائے یہ ہے کہ بالغ پر حد قائم کی جائے گی، نابالغہ پر نہیں، البتہ اس کی تادیب کی جائے گی، احناف کی یہی رائے ہے (شرح فتح القدیر)، مالکیہ، شافعیہ، حنابلہ سے بھی ایک روایت اسی طرح ثابت ہے اور امام اوزاعی بھی یہی رائے رکھتے ہیں، نابالغہ پر عدم حد کی دلیل "رفع القلم" والی حدیث سے لائی ہے اور دوسری رائے یہ ہے کہ بالغ مرد اگر کسی غیر مشتہاۃ سے زنا کرے تو بالغ مرد پر بھی حد جاری نہیں ہوگی، کیونکہ غیر مشتہاۃ جماع اور اس کے مبادیات کے قابل نہیں، اس لئے اس پر زنا کا اطلاق نہیں ہوگا، "لأن الصغیرۃ التی لا تصلح للجماع. لا تصلح للدواعیہ لأنہا غیر مشتہاۃ" (العنایۃ شرح الہدایۃ ۵ / ۳۶۹)، مالکیہ سے بھی ایک دوسری روایت اسی طرح کی ہے (شرح الزرقانی ۸ / ۷۶)۔

اس لئے بعضوں نے اس رائے کو ترجیح دی ہے کہ زانی اگر بالغ ہوتو اس پر حد جاری کی جائے، موطوءہ مشتہاۃ ہو کہ غیر مشتہاۃ، کیونکہ سزاؤں کی مشروعیت ثابت شدہ زنا پر ثابت ہے جبکہ وہ مکلف سے سرزد ہو، اس میں معاشرہ میں رہنے والے انسانوں کی عزت وآبرو کا تحفظ ہے خواہ وہ بالغ ہوں کہ نابالغ، بالغین پر تو حد جاری کی جائے، نابالغ کی تادیب کی جائے، ایک فریق بالغ اور دوسرا فریق نابالغ ہو اور شبہات کی بنیاد پر بالغ سے بھی حد کو ساقط کردیا جائے تو یہ نابالغین کے ساتھ زنا کے واقعات کے وقوع پر حوصلہ افزائی کا باعث بنے گا، جبکہ زنا کا جرم بالغ کے ساتھ بالغ کا ہوتو اتنا ضرر و نقصان کا اندیشہ نہیں جتنا کہ ایک بالغ کا نابالغ کے ساتھ اس جرم کی وجہ سے ممکن ہے، جسمانی، نفسیاتی اور اخلاقی اعتبار سے ایک نابالغ پر کیا اثرات مرتب ہوسکتے ہیں اس کا احساس ضروری ہے، بچوں سے اگر جرم زنا سرزد ہو خواہ وہ آپسی رضامندی سے ہو یا جبر سے، ہر دو صورت میں بچوں پر حد تو جاری نہیں ہوگی لیکن رضامندی سے ہونے والے زنا کی صورت میں خوب تادیب کی ضرورت ہے، البتہ ان بچوں کی دینی نہج سے تعلیم وتربیت کے ساتھ خاص طور پر اس طرح کے جرائم کی قباحت وشناعت ان کے ذہن نشین کروائی جائے، اس کے باوجود کسی نابالغ یا نابالغہ سے بار بار اس جرم کا ارتکاب ثابت ہوتو قاضیٔ اسلام اس جرم کی مناسبت سے تعزیری سزا جاری کرسکتا ہے، جہاں تک زنا بالجبر کا تعلق ہے وہ تو معصوم بچوں پر بے نہایت ظلم ہے، بچے معصوم ہوتے ہیں اور ان معصوم بچوں کے ساتھ اس طرح کا جرم ان کی معصومیت کا پردہ چاک کرنے کے ساتھ ان کو جسمانی ونفسیاتی عوارض میں جھونکنے کے مترادف ہے، اس کے جو مضر اثرات ہیں بالغ کا بالغ کے ساتھ زنا کا جرم کرنے سے کہیں زیادہ خطرناک اور شرمناک ہیں، زنا بالجبر کے شکار بچوں کے ساتھ حکومت وسماج کے ذمہ داروں کی ذمہ داری ہے کہ وہ ان کو خصوصی تحفظ فراہم کریں اور ان پر ہونے والے اس ظلم کے مضر اثرات کے تدارک کا خصوصی اہتمام کریں اور اس بات کی تفہیم کریں کہ معاشرہ کے کچھ درندہ انسان اس طرح کے ہوسکتے ہیں، سارے انسان ایسے درندہ صفت نہیں ہوسکتے تاکہ ان کے معصوم ذہن پر نفسیاتی اعتبار سے ان جیسے درندہ انسانوں پر قیاس کرکے معاشرہ میں رہنے والے سارے انسانوں کی تصویر جو اُن کے دل ودماغ میں بن سکتی ہے اس کا تدارک ہوسکے، اور معصوم بچوں کو اچھی صحبت اختیار کرنے کی اور سماج کے برے انسانوں سے دور رہنے کی تلقین کی جائے، کمسن بچوں کو مراہق لڑکوں اور بالغ انسانوں کے ساتھ تنہائی اختیار کرنے کا موقع نہ دیں، تعلیم کے لئے معلمین کے پاس بچوں کو پڑھاتے ہوئے بھی مطمئن نہ رہیں بلکہ ان پر بھی نظر رکھیں کیونکہ اس گوشہ سے بھی بعض مرتبہ بڑے دل آزارانہ وغیر انسانی حرکات کے صدور کا اظہار ہوا ہے، معلم بھی ایک انسان ہے وہ بھی شیطان ونفسِ امارۃ کے نرغہ میں پھنس سکتا ہے، تنہائی کا موقع کسی شیطانی فعل کے لئے اس کو آمادہ کرسکتا ہے اس لئے حدیث پاک میں کسی نوجوان مرد کو کسی نوجوان عورت کے ساتھ خلوت وتنہائی سے منع کیا گیا ہے کیونکہ وہاں تیسرا شیطان موجود ہوتا ہے "لا یخلون رجل بامرأۃ فإن ثالثہما الشیطان" (السنن الکبری للنسائی ۵ / ۳۸۷)۔

موجودہ دور اخلاقی اعتبار سے بڑے انحطاط کا شکار ہے، دین ومذہب سے دوری، خوف خدا وخوف آخرت سے غفلت کی وجہ سے اس وقت سماج اور معاشرہ میں جرائم کا وقوع بہت بڑھ گیا ہے، بالغ افراد کے ساتھ ساتھ نابالغ بچے بھی جرائم کے مرتکب ہیں، اور یہ مسئلہ اس وقت عالمگیر صورت اختیار کرگیا ہے، حکومتوں کے لئے بھی یہ ایک بہت بڑا چیلنج ہے، اس پر قابو پانے کے لئے اسلام نے جو ہدایات دی ہیں وہ سرمۂ بصیرت بنالینے کے قابل ہیں۔ بچے اللہ کی امانت ہیں ان کی تعلیم وتربیت اور ان کے حقوق کی رعایت اور ان کے ساتھ شفقت ومحبت کا برتاؤ، اچھے برے کی تمیز، حق و باطل میں فرق کرنے کی صلاحیت پیدا کرنے، حلال وحرام کے احکام، جائز وناجائز کی تعلیم، بڑوں کا احترام، چھوٹوں کے ساتھ شفقت، مصائب و مشکلات کی صورت میں رجوع الی اللہ ہونے اور خوف خدا اور خوف آخرت کے ساتھ بارگاہ ایزدی میں اپنے کئے ہوئے اعمال کی مسؤولیت کے استحضار کی تلقین، صبر وبرداشت، تحمل وبردباری، سنجیدگی ومتانت، عفو ودرگذر، چشم پوشی وغیرہ جیسے عالی صفات سے ان کو مزین کرنے سے معاشرے میں

وقوع پذیر جرائم کا دائمی سد باب ممکن ہوسکتا ہے کیونکہ یہی بچے کل بڑے ہونگے اور جرائم اور برائیوں سے پاک ماحول میں ان کی تربیت ہوگی تو وہ بچپن میں بھی جرائم سے محفوظ رہیں گے اور بڑے ہوکر بھی نہ صرف جرائم سے نفرت کریں گے بلکہ معاشرہ کو بھی جرائم سے پاک وصاف رکھنے میں نمایاں رول ادا کریں گے، اس لئے حکومتوں کی ذمہ داری ہے اور حکومتوں کے ساتھ سماج کے اچھے شہری بھی اس بات کے ذمہ دار ہیں کہ وہ صدر بالا امور کو بچوں کی تعلیم وتربیت میں شامل کرکے دیر پا اچھے نتائج کی امید رکھیں، بچوں میں پیدا ہونے والے جرائم کا علاج تو وقتی طور پر حسب حال تربیت اور حسب ضرورت تعزیری سزاؤں کے ذریعہ ان بچوں کی تادیب کرکے اس پر قابو پایا جاسکتا ہے، دیر پا حل کیلئے تو اسلامی احکامات واخلاقی تعلیمات کی طرف رجوع ہوئے بغیر ممکن نہیں ہے، اس لئے صدر بالا اسلامی ہدایات پر عمل آوری کو یقینی بنایا جانا ضروری ہے، عصری درسگاہوں میں بھی بچوں کو ان ہدایات عالیہ سے روشناس کرانا ضروری ہے، بچے خواہ کسی مذہب کے ماننے والے کیوں نہوں کیونکہ یہ مسئلہ کسی ایک مذہب کے ماننے والوں کا نہیں بلکہ معاشرہ میں رہنے والے سارے انسانوں کا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ جب تک ہمارے گھرانے انسانی اعلیٰ اخلاق کے پاسدار تھے اور مدارس میں نصابی تعلیم کے ساتھ اخلاق وانسانیت پر مبنی اعلیٰ اقدار کی تعلیم نصاب میں شامل تھی، معاشرہ میں جرائم کی شرح نہ ہونے کے برابر تھی اور معاشرہ جرائم سے بڑی حد تک پاک وصاف تھا، اور جب سے ہمارے گھرانوں سے اعلیٰ اخلاق رخصت ہوگئے ہیں بچوں کی اخلاقی تعلیم وتربیت سے بے توجہی ہوگئی ہے اور اخلاقی تعلیم کو جب سے نصاب تعلیم سے خارج کردیا گیا ہے اس کے بعد سے یہ برے دن دیکھنے کومل رہے ہیں۔

و: مجرمانہ ذہن رکھنے والے بچوں کی سرزنش اور اصلاح کے لئے بچوں کی جیلیں جو قائم ہیں اور ان جیلوں میں بچوں سے پر مشقت کام لئے جاتے ہیں یا سخت مار پیٹ کی جاتی ہے تو اس سلسلہ میں بھی اسلام کی ہدایات واضح ہیں، اسلامی نقطہ نظر یہ ہے کہ جرم کی وجہ سے اس کی انسانی حیثیت ختم نہیں ہوجاتی، اس لئے جو انسانی حقوق ہیں ان سے تو ان کو محروم نہیں کیا جاسکتا، البتہ ثبوت جرم پر حسب دستور سزادی جاسکتی ہے، لیکن دستور وقانون سے روگردانی کرتے ہوئے یا انسانی حقوق سے محروم کرتے ہوئے جو سزادی جائے گی اسلام اس کی حمایت نہیں کرتا، جیسا کہ آج کل قیدیوں کا طبقہ بھی ظلم وستم کا شکار ہے۔ ذرائع ابلاغ کے ذریعہ جو روح فرسا خبریں انسانوں تک پہنچ رہی ہیں وہ دل دہلا دینے والی اور ان پر ہونے والے مظالم کا اندازہ قائم کرنے کیلئے کے لئے کافی ہیں، جب عاقل وبالغ اور مکلف قیدیوں کے لئے حقوق متعین ہیں اور جرم کی مناسبت سے سزاؤں کے اجراء کو روا سمجھا گیا ہے اور ان کے جرم سے زائد ان کو ایذاء پہنچانے والے غیر انسانی سلوک سے منع کیا گیا ہے تو پھر ظاہر ہے نابالغ لڑکے ولڑکیوں سے جرائم کا صدور ہو تو ان کے ساتھ اور زیادہ انسانی سلوک کو ملحوظ خاطر رکھنا بے نہایت ضروری ہے، بچوں سے جرائم کے صدور کی صورت میں صراحت صدر کے مطابق حدود شرعیہ تو ان پر جاری نہیں ہوں گے، البتہ جواب ''ہ'' میں ذکر کردہ صراحتوں کو ملحوظ رکھنا چاہئے، اسی سے جرائم پر قابو پایا جاسکتا ہے، دائمی ودیر پا نتائج کے لئے اسلامی ہدایات کے مطابق بچوں بلکہ بڑوں کی بھی تعلیم وتربیت ہو، اور وقتی طور پر اس مسئلہ کے حل کے لئے حسب جرم بچوں کو تعزیری سزائیں دی جاکر جرائم کے سدباب کی راہ اپنائی جائے۔ تربیت کی بڑی اہمیت ہے، اس تناظر میں جرم کی مناسبت سے ایسے کام لئے جاسکتے ہیں جو ان کے لئے قابل برداشت ہوں، نا قابل برداشت حد تک ان پر مشقت ڈالی جائے تو یہ انصاف وقانون کے مغائر ہونے کے ساتھ انسانیت کے بھی منافی ہوگا ایسی مار پیٹ کی بھی اسلام اجازت نہیں دیتا جس سے وہ جسمانی یا نفسیاتی عوارض کا شکار ہوجائیں، ایسے تحقیر آمیز سلوک سے کوئی فائدہ تو حاصل نہیں ہوسکتا، البتہ الٹے یہ ہوسکتا ہے کہ اس سے ان بچوں میں نفرت کے جذبات پرورش پائیں اور جرائم سے دوری اختیار کرنے کے بجائے اور مزید جرائم کے لئے ان کا ذہن تیار ہوجائے، اس لئے ایسی سزاؤں کے نفاذ کی حمایت نہیں کی جاسکتی جس سے نابالغ بچوں کی منفی شخصیت تیار ہو، اس کے برعکس ایسا سلوک روا رکھنے کی ضرورت ہے جس سے ان کے اندر ایک مثبت رجحان پیدا ہو۔

موجودہ حالات کے تناظر میں بچوں کی جیلوں میں ان کو کیسی سزائیں دی جائیں، کیسا دل آزارانہ سلوک کیا جائے، اور کیسی ان کے ساتھ نفرت وتحقیر برتی جائے، ذمہ داران جیل کا اس پر غور وخوض سے کہیں زیادہ ان کی تربیت پر خصوصی توجہ کو ضروری سمجھا جائے اور مجرم بچوں سے نفرت وتحقیر کا برتاؤ کرنے کے بجائے ان سے محبت وشفقت کا رویہ اختیار کیا جائے، اور ان کو یہ احساس دلایا جائے کہ جرم ناپسندیدہ ہے، مجرم ناپسندیدہ نہیں۔ اس طرز عمل کی وجہ سے انشاء اللہ وہ بچے جرائم سے نفرت کرنے اور ان سے دوری اختیار کرنے کے لئے اپنے آپ کو آمادہ کرلیں گے، اس خصوص میں ان کی عمدہ تربیت کرنے کے لئے روزانہ دروس رکھے جائیں، دین ومذہب اور انسانیت کی بنیاد پر پاکیزہ اصول کی پاسداری کرنے اور خدا ترسانہ مزاج وطبیعت بنانے میں ان کو اس سے بڑی مدد ملے گی۔

ز: وہ بچے جو بے سہارا ہو جاتے ہیں اس کے کئی اسباب میں سے چند اسباب یہ ہو سکتے ہیں کہ وہ اپنے ماں باپ سے بچھڑ جائیں، یا وہ بچے جو ولادت کے بعد کسی وجہ سے پھینک دئے جاتے ہیں یا اور کوئی وجہ بھی ہو سکتی ہے جس کی وجہ سے وہ ماں باپ کی شفقت ومحبت کے سائے سے محروم ہو جاتے ہیں، ان جیسے بچوں کی گذر بسر اوران کی ضروریات زندگی کی کفالت، تعلیم وتربیت وغیرہ جیسے بہت سے مسائل سامنے آتے ہیں، ظاہر ہے ان بچوں کو ایسے ہی بے یار ومددگار چھوڑا نہیں جاسکتا لیکن سوال یہ ہے کہ ان کے ان مسائل کا حل کیسے ہو؟ اور اس کے ذمہ دار کون قرار پائیں گے؟

ایسے بچے جن کو پیدائش کے بعد پھینک دیا گیا ہو اس کو شریعت کی اصطلاح میں ''لقیط'' کہتے ہیں، بسا اوقات تنگ دستی وغربت یا تہمت زنا سے بچنے کے لئے چھوٹے بچوں کو پھینک دیا جاتا ہے۔ ان بچوں سے متعلق اسلام نے خصوصی احکامات دیئے ہیں، جس کسی کو ایسا بچہ ملے وہ اسکی حفاظت کا ذمہ دار ہے، کسی ایسی بڑی شاہراہ پر ایسا بچہ نظر آجائے جہاں سے کئی افراد گزرتے ہوں اور بہت سے افراد کی نظر اس پر پڑ سکتی ہو اور کسی نہ کسی کے اس بچے کو اٹھا لینے کا یقین ہو تو ایسے بچے کا اٹھانا اور اس کی نگہداشت وپرورش کرنا فرض کفایہ ہے، یعنی یہ نہ اٹھانے کا گنہگار نہیں ہوگا، لیکن اگر کسی ایسی جگہ پر پڑا ہو جہاں سے عام طور پر لوگوں کا گزرنا زیادہ نہیں ہوتا ایسے بچے کو اس جگہ سے نہ اٹھایا جائے تو اس کی ہلاکت کا یقین ہو تو پھر اس کو اٹھانا اور اس کی حفاظت وپرورش کرنا فرض عین ہو جائے گا "التقاطه فرض كفاية إن غلب على ظنه هلا كه لو لم يرفعه، ولو لم يعلم به غيره ففرض عين" (الدر المختار علی ہامش رد المحتار ۲۶۹/۴ کتاب اللقیط المکتبۃ الشاملۃ)۔

مقصود یہ ہے کہ اس بچے کی جان ضائع ہونے سے بچ جائے، ایسے بچے کو اٹھانا فرض کفایہ ہو یا فرض عین جب بچہ کو کسی نے اٹھالیا ہے تو اب اس کی پرورش اور اس کی نگہداشت اس پر لازم ہو جاتی ہے، اٹھانے والے کو اٹھا لینے کے بعد دوبارہ اس کو اسی جگہ واپس ڈال دینا یا کہیں اور چھوڑ دینا شرعاً منع ہے، "و ينبغي أن يحرم طرحه بعد التقاطه لأنه وجب عليه بالتقاطه حفظه فلا يملك رده إلى ما كان عليه" (البحر الرائق، کتاب اللقیط ۷۰/۴۱)۔

اب ایک اہم سوال یہ رہ جاتا ہے کہ جس بچہ کو اٹھایا گیا ہے اس کو کس دین ومذہب سے منسوب کیا جائے؟ آیا مسلمان سمجھا جائے یا غیر مسلم؟

فقہاء کرام نے اس سلسلہ میں واضح رہبری کی ہے اسکی روشنی میں اس مسئلہ کو بآسانی حل کیا جاسکتا ہے، ملنے والا بچہ مسلم آبادی میں پایا گیا ہو اور اس بچے کا اٹھانے والا بھی مسلم ہو تو اس بچے کو بھی مسلمان مانا جائے گا، خواہ وہ مسلم ملک ہو یا غیر مسلم (فتح القدیر، کتاب اللقیط ۳۵۴/۱۳)، اس لئے غیر اسلامی ممالک کی مسلم بستیوں میں وہ بچہ ملے اور اٹھانے والا بھی مسلمان ہو تو اس پر ضرور عمل ہو۔ اٹھانے والا اگر غیر مسلم ہو اور آبادی مسلمانوں کی ہو تب بھی یہی حکم ہوگا جو اوپر مذکور ہوا ہے "ولو وجده ذمي في مصر من أمصار المسلمين وفي قرية من قراهم يكون مسلما" (بدائع الصنائع ۲۹۱/۵)۔

او پر ذکر کردہ دونوں صورتوں کے برعکس اگر بچے کا اٹھانے والا بھی غیر مسلم ہو اور وہ غیر مسلم آبادی میں یا غیر مسلموں کے مذہبی مقامات یا اس کے قرب میں پایا گیا ہو تو اسے غیر مسلم سمجھا جائے گا، بعض فقہاء نے اس میں مسلم وغیر مسلم کے درمیان فرق کیا ہے یعنی اگر بچہ مسلم ملک میں پایا جائے خواہ وہ کسی جگہ ملے، دار (اسلامی ملک) کا اعتبار کرتے ہوئے اس کو مسلمان مانا جائے گا "كان اللقيط الموجود في دار الإسلام مسلماً تبعاً للدار" (شرح الزیادات ۲۱۰۱/۶)، اسلام چونکہ دین فطرت ہے اسلئے لقیط کے بارے میں واجد یعنی پانے والے اور دار یعنی اسلامی ملک میں یا غیر اسلامی ملک کی مسلم بستی میں پائے جانے کا اعتبار راجح ہے، اس لئے ملنے والا بچہ دار الکفر (غیر اسلامی ملک) میں پایا جائے تو وہاں آبادی کا اعتبار مانا گیا ہے۔ اگر وہ غیر مسلم آبادی میں ملے اور اٹھانے والا بھی غیر مسلم ہو تو اس بچے پر کافر ہونے کا حکم مانا جائے گا، لیکن اگر مسلم آبادی میں وہ بچہ ملے اور وہ بچے کو اٹھانے والا بھی مسلمان ہو تو اس کے مسلم ہونے کا حکم لگے گا (بدائع الصنائع ۶۷/۴۱، المکتبۃ الشاملۃ)۔

کسی ایسے بچے کے بارے میں مسلم وغیر مسلم میں تنازع ہو، دونوں بھی اس کے اٹھانے کے دعویدار ہوں اور وہ دونوں اس کی پرورش و پرداخت، نگرانی وحفاظت کرنا چاہتے ہوں اور یہ معاملہ حاکم عدالت کی پیشی میں پہنچ گیا ہو تو حاکم کو چاہئے کہ اس حق کو مسلم کے لئے تسلیم کرے اور یہ فیصلہ دے، کیونکہ ہر پیدا ہونے والا بچہ فطرت یعنی اسلام پر پیدا ہوتا ہے، اس کا خاندان اور ماحول اس کو باطل کی طرف لے جانے کا سبب بنتا ہے "كل مولود يولد على الفطرة فأبواه يهودانه و ينصرانه ويمجسانه" (المعجم الکبیر للطبرانی ۲۸۳/۱ رقم الحدیث ۸۲۸)، اس لئے اس کو مسلم مانا جائے اور مسلم ہی کے سپرد کیا جائے، یہی بات قرین انصاف ہے اور اس میں اس بچے کی دین ودنیا کی بھلائی ہے (الدر المختار مع رد المحتار ۴۲۵/۶)۔

ایسا بچہ جس کے بارے میں دعویدار دو مسلم یا دو غیر مسلم ہوں اور وہ دونوں مسلم یا دونوں غیر مسلم اس کی پرورش وپرداخت کرنے کے متمنی ہوں تو

قاضی کو چاہئے کہ لقیط کے لئے جس میں فائدہ محسوس ہو اس کے حق میں فیصلہ دے، وجوہ ترجیح میں دین و دیانت، تقویٰ و پرہیز گاری یا مادی اعتبار سے خوشحالی و تونگری کو پیش نظر رکھ کر لقیط کے حق میں جو صورت بہتر ہو سکتی ہو اس کو اختیار کرے اور اس کا فیصلہ دے۔

لقیط یعنی جس بچے کو اٹھایا گیا ہے اس کی پرورش اور اس کی بنیادی ضروریات کی کفالت تو اس کے اٹھانے والے کا حق ہے، اس کو عمدہ انداز سے نبھائے اور اس کے ساتھ رحمت و مہربانی، شفقت و محبت کا برتاؤ رکھے لیکن اس کے باوجود اس کو یہ حق نہیں دیا گیا ہے کہ اس کی نسبت اپنی طرف کرے اور اس کو اپنا بیٹا اور اپنے آپ کو اس کا والد بتائے۔ عام طور پر موجودہ دور میں لاولد جوڑوں کا دوسروں کے بچوں کو لے کر یا ایسے مراکز سے جہاں ایسے لاوارث بچے دستیاب ہوں قانونی کارروائی کر کے حاصل کرنے کا رواج عام ہے، ان سے اکثر یہ غلطی سرزد ہوتی ہے کہ اس بچے کو اپنی طرف منسوب کر لیتے ہیں اور ان کا ماں باپ ہونا ظاہر کرتے ہیں، اس کی اجازت گو کہ غیر مسلم ممالک کے قانون میں درست قرار دی جاتی ہے لیکن اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا۔ اُن کے والدین کا نام معلوم ہو تو انصاف کی بات یہی ہے کہ اُن کے والدین ہی کی طرف ان کو منسوب کیا جائے، اور اگر ان کا اتہ پتہ نہ چل سکے تو ان کو اپنا دینی بھائی یا دوست مانا جائے "ادعوهم لآبائهم هو أقسط عند الله، فإن لم تعلموا آباءهم فإخوانكم في الدين ومواليكم" (الاحزاب/۵)، بعض احادیث میں اس غلط انتساب پر بڑی سخت وعید وارد ہے، لقیط سے متعلق یہ وہ احکام ہیں جن پر عمل اسلامی ممالک میں تو آسان ہے لیکن غیر اسلامی یا جمہوری طرز کے ممالک میں ان پر عمل آوری بظاہر ممکن نہیں، اگر ملکی قانون و دستور کی روشنی میں مذکورہ صدر وضاحتوں کے ساتھ عمل کرنے میں آسانی ہو تو اسی پر عمل کیا جائے، غیر اسلامی ممالک کے مسلم باشندگان کے لئے اگر حکومت سے اس طرح کے مسائل میں تعاون حاصل نہ ہو تو اپنے طور پر ان جیسے بچوں کی حفاظت و صیانت کا عمدہ اور بھرپور نظم کریں تا کہ اس مسئلہ پر قابو پایا جا سکے۔

ظاہر ہے ایسے بچے حکومت اور قوم کے ہاتھوں ایک امانت ہیں، ان کے صاحب شعور ہونے تک ان کی مالی کفالت کریں اور ان کی تعلیم و تربیت کا نظم رکھیں، ملک پر حکومت کرنے والوں کی بڑی بھاری ذمہ داری ہے کہ رعایا کی حفاظت و نگہداشت اور مالی وسائل سے محروم افراد کے لئے زندگی گذارنے کے ذرائع مہیا کریں، اس لئے ایسے بچوں کے لئے ادارے قائم کئے جائیں جہاں ان کو ہر طرح کا تحفظ ملے اور ماں باپ سے بچھڑ جانے کی بڑی حد تک تلافی ہو سکے، حکومتیں اگر اس ذمہ داری کے نبھانے سے پہلو تہی کریں تو سماج کے دردمند اصحاب ثروت کو آگے آنا چاہئے اور ایک ایسا منصوبہ تیار کرنا چاہئے جس سے اس طرح کے بچوں کو سہارا مل سکے اور ان کے لئے ایک ایسا ماحول فراہم کرنا چاہیے جو اُن کے لئے خاندانی ماحول کی جگہ لے سکے۔

قدیم سے یتیم خانوں کا نظام رہا ہے، اب بھی شہروں میں کہیں کہیں یتیم خانے موجود ہیں لیکن وہ پہلے کی طرح کارکرد نہیں ہیں ان کو کارکرد بنانے کی ضرورت ہے، جہاں یتامیٰ اور بے سہارا بچوں کی دیکھ بھال و نگہداشت کے ساتھ ان کی تعلیم و تربیت اور ان کی بنیادی ضروریات کی کفالت کا انتظام ہو اور ان اداروں پر ایسے افراد کو سربراہ مقرر کیا جائے جو دین و تقویٰ، دیانت و امانت کے پیکر ہوں اور جن کے دل انسانی درد سے معمور ہوں۔

موجودہ دور میں دینی مدارس، خاص طور پر جمہوری ممالک میں چلنے والے یہ ادارے اس ضرورت کو بڑی حد تک پوری کر رہے ہیں۔

البتہ وہ بچے جو نومولود ہوں یا اتنے کمسن ہوں کہ وہ اپنی ضروریات آپ خود پوری نہ کر سکتے ہوں تو ان کی پرورش کی ذمہ داری ان کو اٹھانے والے نبھائیں یا ان کی پرورش کے لئے ایسے مراکز قائم کریں جہاں صحیح معنی میں ان کی نگرانی و دیکھ بھال ہو سکے، مغربی تہذیب نے "بے بی سنٹرس" کی بنیاد ڈالی ہے، عورتوں و مردوں کے درمیان مساوات کا خوش کن نعرہ، غیر اسلامی و غیر فطری نظام زندگی کی پسندیدگی نے اس طرح کے مراکز قائم کرنے پر ان کو آمادہ کیا ہے، ماں باپ اپنے چھوٹے بچوں کو ایسے مراکز کے حوالے کر سکتے ہیں یا نہیں؟ اور اگر کر سکتے ہیں تو فقہاء کے درمیان کچھ شرائط کے ساتھ اختلافی نوعیت کی آراء کتب فقہ میں ملتی ہیں، اس بحث کے قطع نظر ان بچوں کے لئے جو بے سہارا ہونے کے ساتھ نومولود ہوں یا سات سال سے کم عمر کے ہوں ان کے لئے ایسے مراکز قائم کئے جائیں اور ان بے بی سنٹرس کو انسانی بنیادوں پر دیندارانہ ماحول میں چلانے کا انتظام کیا جائے تا کہ انسانیت کی اس سے ایک بہت بڑی خدمت ہو اور اللہ کے ہاں باز پرس سے ہم بچ جائیں۔

ح: رزق وروزی کی ذمہ داری اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے ہاتھ میں رکھی ہے، اس لئے افلاس وتنگدستی کی وجہ بچوں کو قتل کر دینے سے منع کیا گیا ہے، ارشاد باری ہے: "ولا تقتلوا أولادكم خشية إملاق نحن نرزقهم وإياكم إن قتلهم كان خطأ كبيراً" (بنی اسرائیل/۳۱)۔

اور ایک جگہ ارشاد ہے: "ولا تقتلوا أولادكم من إملاق نحن نرزقكم وإياهم." (الانعام/۱۵۱)۔

حدیث پاک میں وارد ہے کہ "شرک کے بعد سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ ایک انسان اپنی اولاد کو اس خوف سے قتل کردے کہ وہ ہمارے ساتھ روزی میں شریک ہوگا" (صحیح البخاری، تفسیر سورۃ البقرۃ)۔

رزق وروزی کا معاملہ اللہ کے ہاتھ میں ہے وہ بہتر جانتے ہیں کہ کس کی روزی کشادہ کی جائے یا کس کی روزی میں تنگی کی جائے، ظاہر ہے اولاد ایک امتحان ہے اور بہت بڑی نعمت بھی ہے جیسے اللہ نے ہم کو جسمانی وذہنی صلاحیتوں سے نوازا ہے اسی نے بچوں کو بھی وہی صلاحیتیں بخشی ہیں، بہت ممکن ہے وہ آگے چل کر اپنے لئے اور اپنے ماں باپ وخاندان کے لئے رزق وروزی میں فراوانی کا ذریعہ بن جائیں، یہ بھی ممکن ہے ان کی روزی بھی کشادہ نہ ہو، بہر صورت افلاس کی غرض سے اپنے بچوں کو کسی اور کے حوالے کردینا شرعاً پسندیدہ نہیں۔ غربت وتنگدستی ہو یا خوشحالی، بساط بھر کوشش کرکے جائز روزی حاصل کرنا اور اپنی حیثیت کے مطابق بچوں پر خرچ کرنا اللہ کو پسند ہے، اس لئے خود ان کی پرورش کرنا چاہئے کیونکہ دنیا میں اور کوئی صحیح معنٰی میں ماں باپ کی جگہ نہیں لے سکتا، وہ جو اپنے بچوں کو کسی کے حوالے کرتے ہیں وہ خود ناپسندیدہ ہے، چہ جائے کہ بچوں کو کسی کے حوالے کرکے ان سے کوئی مالی ہدیہ قبول کیا جائے، ظاہر ہے یہ اور زیادہ مذموم ہے، انسانی بچے مال تجارت نہیں ہیں کہ ان کو خریدا یا بیچا جائے، ہدیہ کے عنوان ہی سے اس کو اگر جائز کردیا جائے تو بچوں کی خرید وفروخت کا ایک ناجائز دروازہ کھل جائے گا اور یہ بھی ایک بازار میں بیچی وخریدی جانے والی چیز ہوکر رہ جائیں گے، جبکہ بچوں کی خرید وفروخت کا دروازہ کھل چکا ہے فرق یہ ہے کہ ان کو ماں باپ فروخت نہیں کررہے ہیں لیکن انسان دشمن کتنے ہی ایک ریاکٹ اس وقت اس جرم میں ملوث ہیں۔ جو بچے گم ہوجاتے ہیں ان میں سے بہت سے اس کربناک راستے سے گذارے جاتے ہیں، یہ خود ایک بہت بڑا المیہ ہے، اسکا تدارک ہونا چاہئے، اس لئے غربت وافلاس کی بنیاد پر ماں باپ اگر یہ کام کرنا چاہیں تو ان کو اس کی اجازت نہیں دی جانی چاہئے۔

بعض تنگدست وغریب ماں باپ کے حوالے سے اپنی غربت کی وجہ اپنے بچوں کو ایک بار سمجھتے ہوئے کہیں کہیں فروخت کرنے کے واقعات بھی اخبارات کی زینت بنتے ہیں جو بہت مذموم ہے۔

اغوا شدہ اور فروخت شدہ بچے بلا شبہ آزاد ہیں، جاہلیت کے طریقہ سے جنہوں نے بھی اس کو حاصل کیا ہے اولاً وہ اس کے مجاز نہیں، ثانیاً اس کی وجہ سے وہ غلام نہیں ہوجاتے، ایسے بچے اگرچہ کہ غیر مسلم ممالک ہی کے کیوں نہ ہوں وہ حُرابن حُر ہیں ان کا کوئی مالک نہیں بن سکتا۔

ایسے واقعات کی روک تھام کے لئے سخت قوانین مدون کرنے کی ضرورت ہے تاکہ ایسے مجرمین کو کیفر کردار تک پہنچایا جاسکے، ماں باپ اگر یہ کام کرتے ہوں تب بھی اس کی شناعت کم نہیں ہوسکتی اس لئے ان کو بھی اس حرکت سے باز رکھا جانا ضروری ہے، البتہ ایسے غریب ماں باپ کو اس کی قباحت سے واقف کروایا جائے، بوقت ضرورت تادیب کیلئے ان کو سزا بھی دی جاسکتی ہے، سماج کے ذمہ داروں اور کار پردازان حکومت کا بھی فرض ہے کہ ان غریب ماں باپ اور ان کے غریب بچوں کی بنیادی ضروریات کی تکمیل کا سامان کریں، اس طرح سماج میں ان جیسے واقعات کے وقوع پر روک لگ سکتی ہے اور بڑی حد تک اس مسئلہ پر قابو پایا جاسکتا ہے۔

ط: انسان کی صحیح وسلامت خلقت اللہ کی نعمت ہے، ایک انسان کا صحیح وسلامت پیدا ہوجانا اور اللہ کی بخشی ہوئی ساری جسمانی نعمتوں کے ساتھ وجود کا پاجانا یہ اللہ کی بخشش وعطا کے بغیر کہاں ممکن ہے، جسمانی کوئی نقص خلقی طور پر باقی رہ جائے تو دنیا کی کونسی طاقت ہے جو اس کمی کی تلافی کرسکے، بچے جہاں خلقی طور پر صحیح الاعضاء پیدا ہوتے ہیں وہیں کچھ بچے خلقی اعضاء میں کمی کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں اور یہ کمی کبھی ذہنی طور پر بھی ہوتی ہے اور کبھی جسمانی طور پر بھی، ایسے بچے ماں باپ کے لئے ایک مسئلہ بنتے ہیں اور ان کی پرورش وپرداخت میں ماں باپ کو بڑے امتحان سے گذرنا پڑتا ہے، لیکن یہ بھی چونکہ اللہ کی مرضی ومشیت ہی سے ہوتا ہے اس لئے ماں باپ اللہ کی رضا پر راضی رہتے ہوئے ان کی دیکھ بھال کرتے ہیں اور ان کی ساری بنیادی ضرورتوں کو پوری کرتے ہیں، بسا اوقات یہ مرحلہ دشوار کن ہوجاتا ہے تو ایسے بچوں کو ماں باپ کسی دماغی دواخانوں میں یا ایسے بچوں کی نگہداشت کرنے والے اداروں میں رکھوادیتے ہیں، ایسے بچوں کو علاج کی غرض سے یا ان کی نگہداشت کی غرض سے ان کو وہاں داخل کرواتے ہیں تو شرعاً کوئی حرج نہیں، ماں باپ ان کے علاج ومعالجہ کے اپنی حیثیت کے مطابق پابند ہیں، ان کی حیات زندگی کی سلامتی کی حد تک اطباء کے مشورہ سے

دوا دارو کی جانی چاہئے، چونکہ ایسے بچے ماں باپ کا امتحان ہوتے ہیں جس قدر وہ ان کے ساتھ ہمدردانہ سلوک رکھتے ہوئے ان پر اپنی محبت نچھاور کریں گے اللہ کے ہاں اس کی بڑی قدر و قیمت ہوگی، راضی برضا رہ کر ایسے بچوں کی پرورش و پرداخت سے اللہ کے ہاں مراتب قرب میں اضافہ ہوگا۔ حضرت نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے جب اللہ سبحانہ وتعالیٰ اپنے کسی بندے کے لئے کوئی ایسا مقام و مرتبہ دینا چاہتے ہیں، جس کو بندہ اپنے عمل کے ذریعہ سے اس تک نہیں پہنچ سکتا تو حق سبحانہ وتعالیٰ اس کو جسمانی یا مالی یا اولاد کی طرف سے آزمائش میں اتار کر اس کو صبر کی توفیق بخش دیتے ہیں یہاں تک کہ اس کو اس مرتبہ پر فائز کردیتے ہیں جو اس کو دینا چاہتے ہیں (المعجم الکبیر للطبرانی ۲۲/ ۱۸ ۳ رقم الحدیث ۸۰۱)۔

اسلام نے مریضوں کے بڑے حقوق بیان کئے ہیں، صحتمند اولیاء واقرباء کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ مریضوں اور خلقی اعتبار سے معذوروں کی بنیادی ضروریات کا ہر طرح لحاظ رکھیں۔ صحت وتندرستی جن کو نصیب ہے اس کا شکرانہ ایک یہ بھی ہے کہ وہ معذور افراد اور خاص طور پر معذور بچوں کی ہر طرح سے مدد کریں، ان کے ساتھ نرمی ومحبت سے پیش آئیں، ان کے ساتھ کھیل کود میں شریک ہو کر ان کا دل بہلائیں۔

حدیث پاک میں وارد ہے: "الخلق عيال الله وأحب عباد الله إلى الله أنفعهم لعياله" (فصل فی نصیحۃ الولاۃ و وعظہم ۶/ ۴۳) (ساری مخلوق ایک طرح سے اللہ سبحانہ کا کنبہ وقبیلہ ہے، اللہ کو وہ بندے زیادہ محبوب ہیں جو اللہ کی مخلوق کے ساتھ محبت رکھیں اور ان کے ساتھ عمدہ سلوک کریں)۔

بعض علماء معاصرین نے کتاب وسنت کے آثار کی روشنی میں معاقین یعنی معذور و مجبور بچوں کی دیکھ بھال وخدمت کو بہت بڑے اجر وثواب کا موجب گردانا ہے، جس طرح مریضوں کی عیادت کرتے ہوئے ان کے لئے دعا کرنا اور ان سے اپنے لئے دعا کی خواہش کرنا جیسے اجر وثواب کا موجب ہے، اس سے کہیں زیادہ معاقین یعنی معذوروں اور ایسے بچوں کی عیادت وخدمت بے نہایت اجر وثواب کا موجب ہے اور یہ عمل اپنے گناہوں کے لئے کفارہ کا ذریعہ ہے، کیونکہ مریض کی دعا ملائکہ کی دعا جیسی ہوتی ہے "إذا دخلت على مريض فمره أن يدعو لك فان دعاءه كدعاء الملائكة" (سنن ابن ماجۃ، باب ما جاء فی عیادۃ المریض ۱/ ۴۶۳ رقم الحدیث ۱۴۴۱)۔

مغربی ممالک اور ان کی تہذیب کے جہاں بہت سے نقصانات ہیں وہیں وہ بعض خوبیوں کے مالک بھی ہیں، وہ مسلمان تو نہیں ہیں لیکن اسلام کی بہت سی خوبیوں کو انہوں نے اپنالیا ہے، انہیں میں سے ایک بیماروں کی خدمت اور خاص طور پر ذہنی وجسمانی اعتبار سے معذور افراد اور بچوں کے ساتھ خیر خواہی کا جذبہ رکھتے ہوئے ان کو سہولت پہنچانے کی غرض سے زر کثیر خرچ کر کے ایسے ادارے قائم کئے ہیں جہاں ان کی نگہداشت کی جاتی ہے اور ان کی ساری بنیادی ضرورتوں کو پورا کرنے کے ساتھ طبی اعتبار سے کیسے ان کو سہولت بخشی جاسکتی ہے اور کیسے ان کو کھیل کود کے وسائل فراہم کر کے ان کو خوش کیا جاسکتا ہے، اس طرح اور وہ سارے ذرائع جو ان کو راحت پہنچا سکتے ہیں ایسے اداروں میں ان کو اختیار کیا جاتا ہے، اور ان کی خدمت کرنے والی نرسس کو خصوصی تربیت دی جاتی ہے تا کہ وہ خوشدلی کے ساتھ انسانی بنیادوں پر ان معذوروں کی دیکھ بھال کریں۔

دنیا کے اور معاملات میں جو کہ گمراہی کا باعث بنتے ہیں مغرب کی اندھی تقلید میں آنکھ بند کر کے اس کو قبول کیا جاتا ہے اور اس کو اپنے تہذیب کا حصہ بنالیا جاتا ہے، اور ان کے ہاں انسانی خدمت کی بنیاد پر ہونے والے کاموں کو اپنایا نہیں جاتا جبکہ حدیث پاک میں وارد ہے "الحكمة ضالة المؤمن فحيث وجدها أحق بها" یعنی حکمت، علم اور ہر طرح کے خیر کے اور انسانیت کو نفع پہنچانے والے سارے کام ایمان والوں کا گمشدہ خزانہ ہے، جہاں بھی وہ مل جائے ایمان والے اس کے زیادہ حقدار ہیں۔

اس تناظر میں جہاں جہاں غیر اسلامی ممالک ہی میں کیوں نہ ہو مسلمان رہتے ہیں اور جہاں جہاں وہ حکمران ہیں ان کا فرض ہے کہ وہ انسانی بنیادوں پر ایسے مراکز قائم کریں، اللہ کی رضا وخوشنودی کے لئے اس کو عمدہ انداز میں چلائیں اور مغرب سے کہیں زیادہ اپنے قائم کردہ ایسے اداروں کو مفید و نفع بخش بنائیں، بڑی خوشی کی بات ہے اور یہ بات قابل تقلید بھی ہے کہ سعودی فرمانروا خادم الحرمین الشریفین نے ایسے معذور و صحتمند، مجبور بچوں کی خصوصی نگہداشت اور ان کی عمدہ تعلیم وتربیت کی غرض سے ایک ادارے کا قیام عمل میں لایا ہے جس کا نام "كلية الملكة رانية للطفولة في الجامعة الهاشمية" رکھا ہے اور جہاں مغربی اداروں سے کہیں زیادہ سہولتوں کا اہتمام ہے، ان کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اور ممالک اسلامیہ اور دیگر مسلمانوں کو آگے آنا چاہئے اور انسانیت کی خدمت کا عملی نمونہ چھوڑنا چاہئے۔

☆☆☆

بچوں کے حقوق، فقہ اسلامی کی روشنی میں

مفتی محمد عثمان بستوی[1]

الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام على سيد الأنبياء والمرسلين ومن تبعهم بإحسان إلى يوم الدين، أما بعد!

انسان چونکہ اشرف المخلوقات ہے اور ساری کائنات اسی کے لئے سجائی وبسائی گئی ہے اور اس کا قیام اور اس کی رونق وآبادی اسی وقت تک انسان جب تک اپنے مولی کی مرضی کے مطابق اپنی زندگی گزارتا رہے اور جس وقت انسان اس دنیا کو شر وفساد سے بھر دے گا اس وقت اس دنیا کے وجود کو بھی ختم کردیا جائے گا، دنیا کو باقی رکھنے کے لئے انسان کا درست ہونا لازم ٹھہرا، اور انسان کو درست رکھنے کے لئے اللہ تعالی سے اپنے رسولوں اور اپنی کتابوں کو بھیجنے کا دستور قائم کیا، اللہ کے ان پیغمبروں اور اس کی کتابوں نے انسانوں کو خود اپنی زندگی صحیح ودرست رکھنے کی ہدایت دی، اسی طرح سے اپنے بچوں کو بھی فکر کرنے کی ہدایت دی، اور بچوں کی تعلیم وتربیت کے لئے اصول وضوابط وضع کئے، بچے کی پیدائش کے بعد سب سے پہلے اذان واقامت کے الفاظ سنوانے کا حکم دیا گیا، اور جب بولنے لگے تو سب سے پہلے قرآن کی تعلیم کا حکم دیا گیا تاکہ بچہ اول وہلہ میں اپنے رب کے نام پاک سے آشنا ہو، اسی طرح اولیاء اور تربیت کرنے والوں کو بچوں کے ہر قسم کے دینی ودنیاوی ضرر سے محفوظ رکھنے کا حکم دیا گیا جس کے لئے نظام حضانت وضع کیا گیا، پھر بچوں کی تعلیم وتربیت کا مکلف کیا گیا، یہ سب احکامات انسانوں کی فلاح وبہبود کے لئے دیئے گئے۔

بچوں کی پرورش کے سلسلہ میں اسلامی ہدایات:

(ا) پہلے مرحلہ میں بچوں کی پرورش ان عورتوں سے کروانے کی ہدایت دی گئی ہے جو رشتہ میں سب سے قریب ترین ہوں، کیونکہ پرورش کے معاملہ میں شریعت مطہرہ نے عورتوں کی فطری نرمی اور شفقت اور چھوٹے بچوں کی تربیت کے سلسلہ میں ان کی طبعی صلاحیت اور ان کے جذبات کی رعایت کرتے ہوئے عورتوں کو اولیت دی ہے: "الأصل فيها النساء لأنهن أشفق وأرفق وأهدى إلى تربية الصغار" (بدائع ۳/۴۵۶)، چنانچہ حضرات فقہاء کا اس پر اتفاق ہے کہ حق پرورش میں ماں سب سے پہلے مقدم ہے، پھر اس کے بعد جو رشتہ کے اعتبار سے سب سے قریب تر ہو، چنانچہ ماں کے بعد نانی، پرنانی وغیرہ، نانی وغیرہ نہ ہوں تو دادی، پردادی وغیرہ، دادی وغیرہ نہ ہوں تو بہن، بہن کے بعد خالہ، خالہ کے بعد پھوپھیاں، تفصیل مندرجہ ذیل ہے:

''إن امرأة قالت يا رسول الله ﷺ إن ابني هذا كان بطني له وعاء وحجري له حواء وثديي له سقاء ويزعم أبوه أنه ينزعه مني فقال رسول الله ﷺ أنت أحق به ما لم تنكحي'' (احمد)، ''قضى أبو بكر ﷺ بعاصم بن عمر ﷺ لأمه .... وقال إن ريحها وفراشها خير له حتى يشب أو تتزوج'' (بیہقی)، ''وقال النبی ﷺ (فی قصة جعفر وعلی لبنت حمزة): ''الخالة والدة'' (احمد، بدائع الصنائع ۴۵۷/۳-۴۵۸)۔

فقہاء فرماتے ہیں: ''تثبت للأم، ثم بعد الأم أم الأم وإن علت، ثم أم الأب وإن علت ثم الأخت، ثم الخالات، ثم العمات'' (تنویر الابصار مع در المختار ۲۵۴/۵-۲۶۳)۔

اگر کسی بچہ کی پرورش کے لئے کوئی مستحق پرورش خاتون موجود نہ ہو تو پرورش کا حق ان مردوں کو حاصل ہوگا جو عصبہ ہوں، اور ان میں جو وارث ہونے کے اعتبار سے مقدم ہوگا وہی پرورش کے حق میں بھی مقدم ہوگا، چنانچہ مستحق پرورش مردوں کی ترتیب درج ذیل ہے:

والد، پھر دادا، پردادا، وغیرہ، پھر بھائی، پھر بھتیجہ، پھر چچا، چچازاد بھائی اپنے چچازاد بھائی کی پرورش کا حق رکھتا ہے، لیکن چچازاد بہن کی پرورش کا نہیں، البتہ

---

[1] ریاض العلوم گورینی، جونپور۔

اگر چچازاد بہن بہت چھوٹی ہو، غیر مشتہات ہو تو اس سے پرورش کرائی جاسکتی ہے۔

''ثم العصبات بترتیب الإرث إن لم یکن للصغیر أحد من محارمه النساء فیقدم الأب، ثم الجد، ثم الأخ، ثم بنوه، ثم العم، ثم بنوه، سوی فاسق ومعتوه وابن عم لمشتهاة وهو غیر مامون، ثم إذا لم یکن عصبة فلذوی الأرحام'' (درمختار ۵-۲۶۳-۲۶۴)۔

(۲) بچوں کو ہر قسم کے دینی، جسمانی، اخلاقی ضرر سے محفوظ رکھنے کے لئے پرورش کرنے والوں کو کچھ شرائط کا پابند بنایا گیا ہے، جس میں کچھ شرطیں وہ ہیں جس کے پابند مرد و عورت دونوں ہیں، کچھ شرطیں ایسی ہیں جو پرورش کرنے والی عورتوں کے ساتھ خاص ہیں، اور کچھ شرطیں ایسی ہیں جو پرورش کرنے والے مردوں کے ساتھ خاص ہیں، جس کی تفصیل درج ذیل ہے:

وہ شرائط جو پرورش کرنے والے مرد و عورت کے درمیان مشترک ہیں:

مشترکہ شرائط کل پانچ ہیں (۱) بالغ ہونا، (۲) عاقل ہونا، (۳) پرورش پر قدرت رکھنا، (۴) پرورش کرنے والے کی اخلاقی کمزوریوں سے بچے کے محفوظ رہنے کا اطمینان ہونا، (۵) شافعیہ اور حنابلہ کے یہاں اسلام کا ہونا۔ البتہ حنفیہ غیر مسلمہ سے پرورش کی اجازت دیتے ہیں بشرطیکہ بچہ اس کے دین سے متاثر ہونے کی اہلیت نہ رکھتا ہو، لہذا اگر پرورش کرنے والے کی دینی و اخلاقی برائی سے بچہ کے متاثر ہونے کا خطرہ ہو تو حق پرورش نہ ہوگا (المعتصر من الفقه الاسلامی ۷/۲۶-۲۷)۔

وہ شرائط جو عورتوں کے ساتھ مخصوص ہیں:

(۱) پرورش کرنے والی عورت بچے کے اجنبی سے نکاح نہ کرے، (۲) پرورش کرنے والی عورت بچے کی ذی رحم محرم ہو، (۳) باپ کی تنگدستی کی صورت میں مفت پرورش کرنے سے انکار نہ کیا ہو، (۴) بچے کو لے کر کسی ایسے گھر میں قیام پذیر نہ ہو جس میں بچے سے نفرت و بغض رکھا جاتا ہو (المعتصر من الفقه الاسلامی ۷/۲۸-۲۹)۔

وہ شرائط جو مردوں کے ساتھ خاص ہیں:

(۱) پرورش پانے والا بچہ اگر لڑکی ہے اور وہ حد شہوت کو پہنچ گئی ہے تو پرورش کرنے والے کا محرم ہونا ضروری ہے، (۲) پرورش کرنے والے مرد یعنی باپ، دادا وغیرہ کے پاس ایسی عورت موجود ہو جو پرورش پانے والے بچہ کی پرورش کر سکے (المعتصر من الفقه الاسلامی ۷/۲۹-۳۰)۔

مسقط حضانت کے اسباب:

یعنی وہ اسباب جن کی وجہ سے پرورش کا استحقاق رکھنے والی عورت یا مرد کا استحقاق ساقط ہو جاتا ہے:

(۱) بچہ کے غیر ذی رحم محرم سے نکاح کر لے، (۲) بچہ کی پرورش پر اجرت طلب کرے، جبکہ بچہ کے ذی رحم محارم میں سے کوئی دوسری عورت بلا اجرت پرورش پر راضی ہو، (۳) کسب وغیرہ کی وجہ سے بکثرت باہر نکلتی ہو جس سے بچہ کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہو، (۴) ایسے فسق و فجور میں مبتلا ہو کہ اس سے بچہ کے ضیاع کا خطرہ ہو، (۵) اگر فاسقہ کے پاس بچہ کے ضیاع کا خطرہ نہ ہو تو اس کے پاس اتنی عمر تک چھوڑا جائے گا جس میں برے اخلاق سے متاثر ہونے کا اندیشہ نہ ہو، (۶) کافرہ کے پاس اتنی مدت تک چھوڑا جائے گا جس میں اس کے دین سے متاثر ہونے کا خطرہ نہ ہو، (۷) مرتدہ یعنی خدانخواستہ کوئی مسلمان عورت شیعہ، قادیانی وغیرہ ہو جائے تو اگر وہ جیل میں ہے تو حق پرورش ساقط ہو جائے گا، ورنہ اتنی عمر تک حق باقی رہے گا جس میں اس کے دین سے متاثر ہونے کا خطرہ نہ ہو، (۸) جب بچہ کی عمر سات سال اور بچی کی عمر نو سال ہو جائے تو عورتوں کا حق پرورش ساقط ہو جائے گا، اسی طرح سے جب بچہ بالغ ہو جائے تو مردوں کا حق پرورش ختم ہو جائے گا، البتہ اگر بچہ ناقص العقل، یا مجنون وغیرہ ہے تو ایسی صورت میں بلوغ سے مردوں کا حق حضانت ساقط نہ ہوگا، (۹) لڑکی کا حق پرورش، مردوں کو حاصل ہونے کے لئے مرد کا امین اور قابل اعتماد ہونا لازم ہے، لہذا اگر پرورش کرنے والے بھائی، چچا وغیرہ پر اگر ان کے فسق و خیانت کی وجہ سے اطمینان نہ ہو تو ان کا حق پرورش ختم ہو جائے گا، (۱۰) میکہ اور مقام عقد کے علاوہ بچہ کو اتنی دور لے جانے سے بھی حق پرورش ساقط ہو جائے گا کہ بچہ کا والد بچہ کو دیکھ کر اسی دن واپس نہ ہو سکے، (۱۱) پرورش کرنے والے مرد یا عورت کا کسی ایسے جسمانی مرض میں مبتلا ہونا بھی حق پرورش ختم ہونے کا سبب ہے جس سے پرورش پانے والے

بچہ کے متاثر ہونے کا خطرہ ہو، (۱۲) شہر میں رہنے والے بچہ کو دیہات میں منتقل کرنے سے بھی حق پرورش ختم ہو جائے گا، جبکہ وہ دیہات مقام عقد نکاح اور میکہ نہ ہو یعنی کسی ایسی جگہ منتقل کرنے سے حق پرورش ساقط ہو جائے گا جس جگہ بچہ کے جسمانی واخلاقی فساد وبگاڑ کا خطرہ ہو (ماخوذ از: احسن الفتاوی ۵/۴۵۷-۴۶۰، الفقہ الاسلامی ۷/۷۳۰، البدائع ۳/۴۵۹-۴۶۲ وغیرہا من الکتب الفقہیہ)۔

''ذهب الحنفية إلى أن حضانة النساء على الذكر تظل حتى يستغني عن رعاية النساء له فيأكل وحده ويشرب وحده ويلبس وحده وقدر ذلك بسبع سنين وبه يفتي، وتظل الحضانة على الأنثى قائمة حتى تبلغ بالحيض. إذا كانت الحاضنة الأم أو الجدة أما غير الأم والجدة فإنهن أحق بالصغيرة حتى تشتهي وقدر بتسع سنين وبه يفتي وعن محمد أن الحكم في الأم والجدة كالحكم في غيرهما فتنتهي حضانة النساء مطلقاً على الصغيرة عند بلوغها حد الاشتهاء الذي قدر بتسع سنين، والفتوى على رواية محمد لكثرة الفساد'' (الموسوعة الفقهيه ۵-۲۱۴، شامی ۵-۲۶۸)۔

حاصل یہ کہ پرورش سے مقصود بچہ کی حضانت دینی اور اخلاقی تربیت ہوتی ہے، لہذا جن صورتوں میں بچہ کے ضیاع، دینی واخلاقی فساد کا خطرہ ہو ان صورتوں میں حق پرورش ساقط ہو جائے گا، بچہ کے ضیاع کا سبب خواہ دنیوی انہماک ہو یا دینی انہماک وہ مسقط حضانت ہے، اسی طرح دینی فساد خواہ عملی ہو یا اعتقادی ہر دو مسقط حضانت ہے، اور جب بچہ اپنے مربی کے پاس محفوظ نہ رہے تو ایسی صورت میں کسی بھی صالح شخص سے بچہ کی پرورش کروائی جاسکتی ہے، جس میں بچہ کی ذہنی جسمانی، اخلاقی حفاظت اتم درجہ میں ہو سکے، چنانچہ احسن الفتاوی میں ہے: لہذا اہل صلاح جس شخص کو اصلح سمجھیں اس کی تحویل میں لڑکی دیدیں (احسن الفتاوی ۵/۴۵۸)۔

اسلام میں بچوں کی تعلیم وتربیت کے بارے میں بنیادی ہدایات:

بچوں کے اولیاء اور ذمہ داران کو یہ ہدایت دی گئی ہے کہ بچہ کو اپنے پاس امانت خیال کرتے ہوئے اس کو ایسے علوم وفنون سے آراستہ ومزین کیا جائے جس سے اس کے معاد ومعاش دونوں صحیح اور درست ہو جائیں، اور بچوں کو ان تمام خرابیوں اور برائیوں سے دور رہنے کی فکر کرنا اور کوشش کرنا اسی طرح سے واجب کیا گیا ہے جس طرح سے خود اپنے کو برائیوں سے دور رہنے کا پابند کیا گیا ہے، ایک روایت میں ہے کہ جب "یا أیها الذین آمنوا قوا أنفسکم وأهلیکم" والی آیت نازل ہوئی تو حضرت عمرؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے آپ کو جہنم سے بچانے کی فکر تو سمجھ میں آ گئی مگر ہم اہل وعیال کو کس طرح جہنم سے بچائیں، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس کا طریقہ یہ ہے کہ اللہ تعالی نے تم کو جن کاموں سے منع فرمایا ہے ان کاموں سے ان سب کو منع کرو جن کاموں کے کرنے کا تم کو حکم دیا ہے تم اہل وعیال کو بھی ان کاموں کا حکم دو، تو یہ عمل ان کو جہنم کی آگ سے بچا سکے گا۔

حضرات فقہاء نے فرمایا کہ اس آیت سے ثابت ہوا کہ ہر شخص پر فرض ہے کہ اپنی بیوی اور اولاد کو فرائض شرعیہ اور حلال وحرام کے احکام کی تعلیم دے اور اس پر عمل کرانے کی کوشش کرے، ایک حدیث میں ہے کہ اللہ تعالی اس شخص پر اپنی رحمت نازل کرے جو کہتا ہے کہ اے میری بیوی بچوں تمہاری نماز، تمہارا روزہ، تمہاری زکوۃ، تمہارا مسکین، تمہارے پڑوسی امید ہے کہ اللہ تعالی ان سب کو اس کے ساتھ جنت میں جمع فرمائیں گے، تمہاری نماز، تمہارا روزہ وغیرہ فرمانے کا مطلب یہ ہے کہ ان چیزوں کا خیال رکھو اس میں غفلت نہ ہونے پائے، بعض بزرگوں نے فرمایا: قیامت کے دن سب سے زیادہ عذاب میں وہ شخص ہوگا جس کے اہل وعیال دین سے جاہل وغافل ہوں (معارف القرآن ۸/۳۰۵)۔

اور ابن امیر الحاج نے اپنی مشہور کتاب المدخل میں باب تربیت الاولاد کے ضمن میں فرمایا:

''بچہ اپنے والدین کے پاس امانت ہوتا ہے اور اس کا قلب ہر قسم کے نقش ونگار سے خالی قیمتی سادی موتی کی طرح پاک وصاف ہوتا ہے، جس کی طرف اس کو مائل کیا جائے اس کو قبول کرنے والا ہوتا ہے، لہذا اگر اس کو خیر کا عادی بنایا جائے اور اسکی تعلیم دی جائے تو اسی پر اس کی نشو ونما ہوگی، اور وہ دنیا وآخرت کے اعتبار سے نیک بخت ہو جائے گا۔ اس کے والدین، اساتذہ وغیرہ سب اس کے ثواب میں شریک ہوں گے، اور اگر اس کو برائی کا عادی بنا دیا گیا، اس کی تربیت نہ کرکے بیکار چھوڑ دیا گیا تو بدبخت اور ہلاک ہو جائے گا، اور اس کے اولیاء بھی گناہ میں شریک ہوں گے، اولیاء کی ذمہ داری، دنیوی آگ کی طرح نار جہنم سے بھی حفاظت کرنے کی ہے، لہذا اس کو اچھے اخلاق کی تعلیم دی جائے برے ساتھیوں سے دور رکھا جائے، اسباب عیش وزینت کا عادی نہ بنایا جائے'' (المدخل لابن الحاج ۴/۳۱۱)۔

بچوں کو دینی تعلیم دینا:

ہر انسان کے ذمہ اتنا علم دین حاصل کرنا جس کے ذریعہ وہ اپنی زندگی اسلام کے مطابق گزار سکے فرض عین ہے، اور پورے علم دین کو حاصل کرنا فرض کفایہ (انعام الباری ۲/۲۹)، اسی طرح سے اپنے زیر تربیت بچوں کو اتنا علم دین سکھلانا جس کے ذریعہ وہ اپنی زندگی اسلام کے مطابق گزار سکیں فرض وواجب ہے، اور اس سے زائد علوم دینیہ کی تعلیم فرض عین تو نہیں لیکن فرض کفایہ ہوگی، چنانچہ علامہ نووی نے اس سلسلہ میں یہ صراحت کی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے :

''والدین اور تمام سرپرستوں کے ذمہ بچوں کو ان امور کی تعلیم دینا واجب ہے جس سے ان کے اعتقاد اور عبادت، نماز، روزہ وغیرہ صحیح و درست ہو جائیں، اسی طرح ان کو محرمات مثلاً بدکاری، چوری، غیبت، جھوٹ وغیرہ کی شناعت سے بھی واقف کرانا لازم ہے، اس کی دلیل آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ پاک ارشاد ہے: "مروا أولادکم بالصلاۃ الخ" (الفواکہ الدوانی ۲/۱۶۴، المجموع ۱/۵۰)۔

اسی طرح سے احکام القرآن للجصاص اور الجامع لأحکام القرآن میں بھی اپنے آل و اولاد کو دینی تعلیم دینے کی وجوب کی صراحت ہے۔

''تحت قوله تعالی: ''قوا أنفسكم وأهليكم ناراً'' قال الحسن تعلمهم وتأمرهم وتنهاهم. قال أبوبكر هذا يدل على أن علينا تعليم أولادنا وأهلينا الدين والخير وما لا يستغنى عنه من الآداب'' (احکام القرآن للجصاص ۳/۶۲۴، الجامع لاحکام القرآن ۱۸/۱۹۵) (اللہ تعالی کے پاک ارشاد "قوا أنفسكم الآیہ کے تحت امام ابوبکر نے فرمایا کہ ہمارے ذمہ اپنے اہل وعیال کو دین اور بھلائی کی تعلیم دینا واجب ہے)۔

بقدر ضرورت دنیوی تعلیم:

اتنی دنیوی تعلیم جس کی ضرورت عام لوگوں کو پیش آتی ہے جس کے بغیر چارہ کار نہیں تو اس کا بھی سیکھنا سکھانا ضروری ہے، مفتی محمد تقی صاحب عثمانی فرماتے ہیں: بعض دنیاوی علوم بھی فرض کفایہ ہیں مثلاً کھانا پکانے کا علم، علاج ومعالجہ کا علم، کپڑا سینے کا علم، اسی طریقے سے بہت سے علوم جن کے اوپر انسان کی دنیاوی زندگی موقوف ہے وہ فرض کفایہ ہے، لہذا اگر کوئی شخص انسانیت کی خدمت کی نیت سے ان علوم کو حاصل کرے تو وہ بھی باعث اجر وثواب ہے (انعام الباری ۲/۳۰)، لہذا بچے کو دنیاوی علوم جو خود اس کے لئے مفید ہوں اور دوسرے لوگوں کے کام آئیں سکھلانا باعث اجر وثواب بہر حال ہے، چنانچہ الموسوعۃ الفقہیہ میں ہے:

''وينبغي أن يعلمه أيضاً من أمور الدنيا مايحتاج إليه من السباحة والرمي وغير ذلك مما ينفعه في كل زمان بحسبه، قال عمر رضي الله عنه علموا أولادكم السباحة والرماية ومروهم فليثبوا على الخيل وثباً'' (الموسوعة الفقهيه ۱۳-۱۲)۔

حاصل یہ کہ بچوں کو جن دنیاوی امور کی زمانے کے لحاظ سے ضرورت اور حاجت محسوس ہو اس کی تعلیم دینا چاہئے لیکن مخرب اخلاق اور مفسد دین علوم جن کی آج کے زمانہ میں بڑی کثرت اور بہتات ہے ان کا سیکھنا سکھلانا حرام وناجائز ہے، مثلاً گانا بجانا اور مصوری کے علوم وغیرہ۔

بچے کو اچھے روزگار کا شوق دلانا، مربی پر اہم ترین ذمہ داری یہ ہے کہ بچے کو آزاد و خود مختار کام پر ابھارا جائے، خواہ یہ صنعت وحرفت سے متعلق ہو یا زراعت وکاشتکاری سے یا تجارت وکاروبار سے، انبیاء علیہم الصلاۃ والسلام بھی آزاد اور اپنے پسندیدہ خود مختار کام کیا کرتے تھے، اور بعض ہنر وصناعت میں مہارت حاصل کرتے تھے، اور اس طرح ان مقدس ہستیوں نے امتوں اور قوموں کے لئے آزاد ہنر اور کسب حلال میں ایک شاندار نمونہ چھوڑا ہے، چنانچہ حضرت نوح نے کشتی بنانا سیکھا اور اللہ تعالی نے انہیں کشتی بنانے کا حکم دیا جیسا کہ سورہ ہود میں ہے: "واصنع الفلك بأعيننا..."۔

خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "إن أفضل الكسب كسب الرجل من يده" (امام احمد)، یعنی انسان کی بہترین کمائی اس کے اپنے ہاتھ کی کمائی ہے، نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "وإن الله يحب العبد المحترف" (ترمذی) یعنی اللہ تعالی ایسے بندے کو پسند فرماتے ہیں جو پیشہ حرفت والا ہو مزید برآں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "كسب الحلال فريضة بعد الفريضة" (طبرانی، بیہقی)، یعنی دوسرے فرائض کی طرح حلال کمانا بھی ایک فرض ہے (تربیت اولاد ۱۵۵)

حضرت عمرؓ ہی وہ بزرگ ہیں جنہوں نے غرباء وفقراء کو اس بات سے روکا کہ وہ وہ کام کاج چھوڑ کر لوگوں کے صدقات وخیرات پر تکیہ کر کے بیٹھ جائیں، چنانچہ فرمایا: اے غرباء وفقراء کی جماعت! اچھائیوں میں ایک دوسرے سے سبقت لے جاؤ اور مسلمانوں پر بوجھ نہ بنو، اور یہ کام ابتدائی عمر میں ہی ہو سکتا ہے، لہذا مربی کو چاہئے کہ بچے کو نوعمری میں ہی بعض صنعت وحرفت سکھائے تا کہ وہ اپنی زندگی کے لئے کمائی کر سکے، اور اپنے دست وبازو کی محنت اور پیشانی کے پسینہ

سے روزی کما سکے۔ ابن سینا نے بچے کو صنعت وحرفت سے متعلق امور کی تعلیم اور محنت ومشقت کے کام کاج سکھانے کے بارے میں فرمایا ہے: "بچہ جب قرآن کریم پڑھ کر فارغ ہو اور لغت کے بنیادی اصول یاد کرلے تو پھر یہ دیکھنا چاہئے کہ وہ کیا کیا کام کاج کر سکتا ہے اس کے مطابق اس کی رہنمائی کرنا چاہئے، چنانچہ اگر وہ کتابت پسند کرتا ہو تو لغت کی تعلیم کے ساتھ ساتھ رسائل، تقاریر اور لوگوں کی بات چیت وگفتگو وغیرہ بھی پڑھانا چاہئے اور حساب کی مشق کرانا چاہئے اور اس کو عدالتوں میں لے جائیں اور اس کی خوشخطی کا خیال رکھنا چاہئے اور اگر کوئی اور کام کرنا ہو تو اس کو اس نوعیت کے کام میں مشق کرانا چاہئے (تربیت الاولاد ۵۵۲-۵۵۳)۔

بچوں کی تعلیم کے سلسلہ میں ملکی قوانین:

اگر حکومت بچے اور بچیوں کی تعلیم کے لئے کوئی قانون لازم کرتی ہے تو اگر اس قانون کی پابندی کی صورت میں کوئی حکم شرعی پامال ہوتا ہے، تو ایسی صورت میں "لا طاعة لمخلوق في معصية الخالق" کے ضابطہ سے قانون کی پابندی شرعاً لازم نہ ہوگی، لیکن اگر حکومتی قانون پر عمل کرنے سے کوئی حکم شرعی فوت نہ ہوتا ہو تو جہاں ممکن ہو مصالح کی رعایت کرتے ہوئے ملکی قوانین کی اتباع کرنی چاہئے۔

"أما لأن طاعة الإمام فيما ليس بمعصية واجب، لأن كل من يسكن دولة فإنه يلتزم قولاً أو عملاً بأن يتبع قوانينها وحينئذ يجب عليه اتباع أحكامها مادامت تلك القوانين لا تجبرها على معصية دينية" (معارف القرآن ۶/ ۶۲۳، احکام القرآن للتھانوی ۵/ ۴۳)۔

بچوں کو جنسی تعلیم دینا:

بچوں کی عمر کے مناسب جو تعلیم مفید وضروری ہوں اس عمر میں وہ تعلیم دی جائے اور عمر کے جس حصے میں جو تعلیم فساد وبگاڑ کا سبب بن سکتی ہو اس سے احتراز کرنا واجب وضروری ہے، لہذا بچے جب قریب البلوغ ہو جائیں تو وہ مسائل واحکام جو جنس سے متعلق ہیں ان احکام کا سیکھنا مفید اور لازم وضروری ہیں، اور عمر کے ایسے حصے میں جب ان مسائل کی تعلیم جو جنسی مسائل سے متعلق ہیں مفید ہونے کے بجائے مضر ہونے کا خطرہ ہو تو اس عمر میں اس کی تعلیم سے احتراز ضروری ہے، لیکن جنس سے متعلق آج کل کے مروج امور جو شہوانی وحیوانی خیالات کو برانگیختہ کرنے اور جذبات کو بے قابو کرنے کا سبب وذریعہ ہوتے ہیں ان کا سکھلانا کسی بھی حال میں جائز نہیں، بلکہ ان سے دور ہی رکھنا لازم وضروری ہے، مثلاً آرٹ اور مصوری کے علوم وغیرہ۔ تربیت الاولاد میں ہے کہ بہت سے مربی حضرات یہ دریافت کرتے ہیں کہ کیا مربی کے لئے جائز ہے کہ بچے سے صاف صاف وہ تمام مسائل بیان کردے جو اسے بالغ ہونے سے پہلے اور بالغ ہونے کے وقت پیش آتے ہیں، تو شرعی دلائل سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مربی اپنے بیٹے بیٹی کو ایسے امور بتلا سکتا ہے جن کا تعلق جنس اور شہوت سے ہو، بلکہ بعض دفعہ ان کا بتلانا واجب ہو جاتا ہے جبکہ کوئی شرعی حکم اس پر مرتب ہوتا ہے، چنانچہ بہت سی آیتوں میں جنسی اتصال وملاپ کا تذکرہ ملتا ہے اور یہ بھی مذکور ہے کہ انسان نطفہ سے پیدا ہوا ہے، اس کے علاوہ زنا وغیرہ کا بھی ذکر ملتا ہے، نیز بعض آیتیں نہایت وضاحت کے ساتھ یہ بتلا رہی ہیں کہ انسان کو اپنی شرمگاہ کی حفاظت کس سے کرنا چاہئے اور کس سے نہیں، اور یہ کہ رمضان میں ہمبستری کی جاسکتی ہے یا نہیں؟ اور حالت حیض میں عورتوں سے دوری اختیار کرنا چاہئے تو یہ سب چیزیں جنس اور خواہش نفس ہی سے متعلق ہیں، پس اگر بچہ سن شعور کو پہنچ جائے اور اس کا استاذ ومربی ان حقائق کو اس کے سامنے بیان نہ کرے تو وہ ان آیات کو کیسے سمجھے گا، اس کے علاوہ یہ قرآن کریم کی دعوت تدبر کے بھی خلاف ہے، اللہ تعالی ارشاد فرماتے ہیں: "كتاب أنزلناه إليك مبارك ليدبروا آياته وليتذكر أولو الألباب" (سورہ ص)، بلکہ قرآن کریم ایسے لوگوں پر نکیر کرتا ہے جو قرآن کریم پڑھ کر ان آیتوں پر غور نہیں کرتے، چنانچہ اللہ تعالی ارشاد فرماتے ہیں: "أفلا يتدبرون القرآن أم على قلوب أقفالها" (محمد)، اس سے ہم کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ جیسے قرآن کریم دیگر علوم ومعارف پر مشتمل ہے اسی طرح ضرورت کے مطابق جنسی مسائل پر بھی مشتمل ہے، لہذا ان مسائل کو بھی سمجھنا ضروری ہے۔

لیکن عمر کے ہر حصے سے متعلق احکام کی تعلیم اسی کی مناسبت سے دیجئے، لہذا یہ قطعاً نامعقول بات ہے کہ آپ دس سال کی عمر کے بچے کو جنسی ملاپ کے اصول بتلائیں، لڑکی کو یہ جنسی مسائل سکھانے کا کام ماں کو انجام دینا چاہئے لیکن اگر کسی لڑکی کی ماں موجود نہ ہو تو اس کی جگہ کوئی اور عورت یہ کام انجام دیدے تو بہتر ہے۔

یہ بات بھی خوب اچھی طرح سمجھ لیں کہ جذبات کے اس بے قابو سیلاب اور بے راہ روی کے اس تباہ کن منجدھار سے پورے عالم کو آج دین اسلام کا نظریہ جنس ہی بچا سکتا ہے، کاش کہ مسلمان اس فلسفہ کو سمجھتے اور اپنی متاع گم شدہ دوبارہ حاصل کرتے (تربیت الاولاد ۳۹۸-۴۰۰)۔

بچوں کا نکاح اور اس سے متعلق اسلامی تعلیمات:

اس سلسلہ میں چند احادیث کریمہ نقل کی جاتی ہیں:

(۱) ''عن حاتم بن إسماعيل قال: سمعت عبد الله بن هرمز قال: قال رسول اللهﷺ إذا جاءكم من ترضون دينه وخلقه فانكحوه، إلا تفعلوا تكن فتنة في الأرض وفساد عريض'' (احکام القرآن ۱-۴۸۵)۔

(۲) ''ذكر البيهقي من حديث مسلم بن إبراهيم قال رسول اللهﷺ: من ولد له ولد فليحسن اسمه وأدبه فإذا بلغ ولم يزوجه فأصاب إثماً فإنما إثمه على أبيه'' (بیہقی ۶-۴۰۱)۔

(۳) ''ثلاثا لا تؤخرها: الصلاة إذا دخل وقتها، الجنازة إذا حضرت، والأيم إذا وجدت لها كفواً'' (ترمذی کتاب الصلاۃ)۔

مذکورہ بالا احادیث کریمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی معقول وجہ اور عذر نہ ہو تو شریعت مقدسہ کی نگاہ میں بلوغ کے بعد نکاح میں تعجیل مطلوب ومقصود ہے، اور بلوغ کے بعد جلد از جلد نکاح کردینا عفت وطہارت اور معاشرہ کی پاکیزگی کا سبب وذریعہ ہے، البتہ اگر نکاح میں تاخیر کی کوئی معقول وجہ ہو اور نکاح کے فی الفور وجوب کے اسباب (دواعی معصیت) نہ ہوں تو تاخیر کرنا جائز ہے، مثلاً بچے کا اعلیٰ تعلیم میں مشغول ہونا اور معصیت میں ابتلاء کا خطرہ نہ ہونا، اس وقت نکاح میں تاخیر کرنا جائز ہے، لیکن اگر معصیت میں ابتلاء کا خطرہ اور ظن غالب ہو تو پھر نکاح میں تاخیر کی گنجائش نہیں، فی الفور نکاح کرنا واجب ہے، کیونکہ اعلیٰ تعلیم کا حصول زیادہ سے زیادہ فرض کفایہ ہوگا، اور معصیت سے بچنا بہرحال فرض عین ہے، اور فرض عین کا فرض کفایہ پر مقدم ہونا ظاہر ہے۔

''ويكون واجباً عند التوقان فإن تيقن الزنا إلا به فرض هذا إن ملك المهر والنفقة وإلا فلا إثم بتركه (قوله عند التوقان) والمراد شدة الاشتياق أي بحيث يخاف الوقوع في الزنا لو لم يتزوج، قلت كذا فيما يظهر لو كان يمكنه منع نفسه عن النظر المحرم أو عن الاستمناء بالكف فيجب التزوج وإن لم يخف الوقوع في الزنا، (قوله فإن تيقن الزنا الخ) أي بأن كان لا يمكنه الاحتراز عن الزنا إلا به ....'' (شامی ۴-۶۳-۶۵ ملخصا)۔

حاصل یہ کہ اگر معصیت میں ابتلا کا ظن غالب یا یقین ہو تو شادی کو موخر کرنا کسی حال میں جائز نہیں فی الفور نکاح کردینا واجب ولازم ہے، البتہ اگر معصیت میں ابتلاء کا خطرہ نہ ہو تو اگر تاخیر کی کوئی وجہ معقول ہو تو نکاح کو موخر کرنے میں کوئی کراہت نہیں، اور بلا وجہ نکاح کو موخر کرنا کراہت سے خالی نہیں۔

کمسنی (قبل البلوغ) کے نکاح کا حکم:

شریعت مقدسہ قبل البلوغ نکاح میں بہت سے مفاسد کی وجہ سے اس کی تائید وہمت افزائی تو نہیں کرتی ہے لیکن بہت سے مصالح کے پیش نظر اولیاء کو اپنے زیر تربیت بچوں کے نکاح کی نابالغی کی حالت میں اجازت دیتی ہے اور قبل البلوغ نکاح کے جو مفاسد ہیں اس کا سد باب خیار بلوغ وغیرہ سے کرتی ہے، لہٰذا کم سنی میں اگر نکاح کرنے کی کوئی معقول وجہ موجود نہ ہو تو بہت سے مفاسد کی بنا پر ایسا کرنا شرعاً ناپسندیدہ اور حماقت وجہالت پر مبنی عمل ہوگا، البتہ اگر کوئی معقول وجہ موجود ہو تو شریعت کی دی ہوئی رخصت کے مطابق کم سنی کی نکاح میں کوئی حرج نہیں، خود حضرت عائشہ صدیقہؓ کا نکاح نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے چھ سات سال کی عمر میں ہوا تھا، اسی طرح حضرت سلمہؓ کا نکاح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حمزہؓ کی صاحبزادی سے کردیا تھا جبکہ دونوں چھوٹے بچے تھے۔

''فزوجه رسول اللهﷺ بنت حمزة وهما صبيان صغيران فلم يجتمعا حتى ماتا'' (احکام القرآن ۲-۶۲)۔

حضرت تھانویؒ نے اصلاح انقلاب امت میں نابالغی کی حالت میں نکاح کرنے سے بہت سختی کے ساتھ منع کیا ہے، اور تفصیل سے اس کے مفاسد پر کلام کیا ہے (اصلاح انقلاب امت ۲/۴۳)۔

نابالغی کی حالت میں نکاح پر تفصیلی کلام حضرت مفتی محمد تقی صاحب عثمانی کی کتاب ہمارے عائلی مسائل صفحہ ۱۵۷-۱۸۹ پر موجود ہے، وہ فرماتے ہیں: یہ صحیح ہے کہ کم عمری میں شادی کرلینے کی اسلام نے کہیں ہمت افزائی نہیں کی ہے کیونکہ بعض اوقات اس طرح کی شادیوں سے بہت سے مفاسد کھڑے ہوجاتے ہیں۔

بچہ مزدوری کے سلسلہ میں اسلامی تعلیمات اور اس کا موقف:

شریعت اسلامیہ نے بچوں کی پرورش اور ان کے نان ونفقہ اور تعلیمی ضروریات وغیرہ کی فراہمی کو ان کے اولیاء اور ذمہ داروں پر لازم کیا ہے، اور بچوں کو کمانے ومزدوری کرنے وغیرہ سے تعلیمی ودیگر اعلیٰ مقاصد کے لئے بالکل فارغ کردیا ہے، لہٰذا بلاکسی ضرورت کے بچوں کو تعلیمی وتربیتی مشاغل سے ہٹا کر کام کاج ومزدوری میں لگانا اصول شریعت کے بالکل خلاف ہے، یہاں تک کہ بعض فقہاء نے والد کو اس کی اجازت ہی نہیں دی کہ وہ بچوں کو مزدوری وغیرہ پر لگائیں، کیونکہ والد وغیرہ کے ذمہ خود اپنی اور بچوں کی ضروریات کے لئے کمانا فرض ہے۔

''جاز إجارته لأمه فقط'' (درمختار ۹-۵۵۹)۔

''الكسب قد يكون فرضاً وهو الكسب بقدر كفاية لنفسه وعياله وقضاء ديونه ونفقته'' (هنديه ۵-۳۴۸)۔

بچوں کے کمانے کے سلسلہ میں اسلامی تعلیم وہ ہے جس کو منتقا شرح موطا وغیرہ میں بیان کیا گیا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے:

اسلام نے بچوں کو کمانے کی ذمہ داری سے فارغ رکھنے کو مستحب قرار دیا ہے، اور اس سلسلہ میں حضرت امام مالکؒ نے حضرت عثمان غنیؓ کا ایک اثر نقل کیا ہے کہ غیر ہنرمند باندیوں کو کمانے پر مجبور نہ کرو، ورنہ وہ اپنی آبرو کے ذریعہ کمائی کرے گی، اسی طرح بچوں پر بھی کمانے کا بوجھ نہ ڈالو ورنہ وہ چوری کریں گے، جب اللہ تعالیٰ نے ان کو معاف رکھا ہے تو تم بھی معاف ہی رکھو (دیکھئے: الموسوعۃ الفقہیہ ۳۴/۲۴۲)۔

بچوں سے والدین اور اولیاء کا گھر کے کام کاج لینا:

بچوں کی تربیت اور ان کی عادت ڈالنے کے لئے بچوں کی صلاحیت کے مطابق اس حد تک گھر کے کام کاج لینا جس سے ان کی صحت اور تعلیم وغیرہ پر کوئی فرق نہ آئے تو اولیاء اور ذمہ دار کا ایسا کرنا جائز ہی نہیں بلکہ بہتر ہے۔

''فإن بلغه حد الكسب للأب أن يؤجره أو يدفعه في حرفة ليكتسب وينفق عليه من كسبه لو كان ذكراً'' (شامی ۵-۳۲۷)۔

''إجارة الصغير جائزة كإجارة الأم الصغير لأن فيها صونا عن الفساد بكونه مشغولاً بعمله'' (شامی ۹-۵۶۰)۔

مذکورہ بالا تفصیل سے یہ واضح ہوگیا کہ بچوں سے گھر کے کام کاج لینے میں شرعاً کوئی حرج نہیں بشرطیکہ ان کی حیثیت سے زائد ان پر بوجھ نہ ڈالا جائے اور دیگر اعلیٰ مقاصد میں خلل واقع نہ ہو (تفصیل کے لئے دیکھئے: تربیت الاولاد ۱۵۶-۱۵۷)۔

صنعت وحرفت کی تعلیم:

بچوں کو ان کی صلاحیت اور ان کے رجحان کے مطابق تعلیم کے ساتھ ساتھ کوئی ہنر اور صنعت وغیرہ کا طریقہ بھی سکھلاتا رہے، حضرات علماء نے اس کی تاکید کی ہے کہ بچوں کو تعلیم کے ساتھ ساتھ کوئی ہنر بھی سکھلاتا رہے۔

''دفع غلامه أو ابنه لحائك مدة كذا ليعلمه النسج وشرط عليه كل شهر كذا جاز'' (شامی ۹-۵۸)۔

''فإن بلغه كان للأب أن يوجره أو يدفعه في حرفة ليكتسب وينفق عليه من كسبه .... أي الممنوع إيجارها للخدمة ونحوها مما فيه تسليمها للمستاجر بدليل قولهم: لأن المستاجر يخلو بها وذا لا يجوز في الشرع وعليه فله دفعها لامرأة تعلمها حرفة كتطريز وخياطة مثلاً'' (شامی ۵-۳۲۷، شامی ۹-۵۶۰)۔

تربیت الاولاد میں ہے کہ وہ بچے جو تعلیم میں فوقیت لے جاتے ہیں (یعنی جوذہین اور محنتی ہوں) اگر وہ تعلیم کو آخری منزل تک پہنچانا چاہتے ہوں تو ان کو تعلیم ہی میں مصروف رکھنا چاہئے، بشرطیکہ چھٹیوں کے موقع پر اپنے ذوق وپسند کے کام کاج اور صنعت وحرفت سیکھتے رہیں، کیونکہ انہیں نہیں معلوم کہ آئندہ کیا کیا حوادثات وپریشانیاں پیش آنے والی ہیں، مربی کے لئے ضروری ہے کہ وہ سمجھے کہ بچہ کس پیشے کی طرف مائل ہے اور کیا کام اس کے مناسب ہے اور زندگی کے کن آرزوؤں اور مقاصد کا خواہاں ہے، کیونکہ اس میں کوئی شک نہیں کہ بچے ذکاوت وطاقت کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں، لہٰذا سمجھدار

مربی وہ ہے جو بچے کو اس کی جگہ رکھے جو اس کے مزاج کے موافق ہو (تربیت الاولاد ر ۵۵۶)۔

معاشی ضرورت پوری کرنے کے لئے یا بہتر کرنے کے لئے بچوں سے مزدوری کروانا:

معاشی ضرورت پوری کرنے کے لئے والدین کو حق ہے کہ بچہ اگر مزدوری کے لائق ہو گیا ہے تو اس کو مزدوری پر لگائیں، البتہ معاشی ضرورت کو بہتر بنانے کے لئے بچوں کو مزدوری پر لگانا اسلامی تعلیمات کے منافی ہے، حاصل یہ کہ جب بچہ مزدوری کے لائق ہو جائے تو اس کی عمر کے مناسب کاموں کے لئے ضرورت کے وقت مزدوری پر لگانے کی اجازت ہے، اور بلا ضرورت شدیدہ بچوں کو مزدوری پر لگا کر ان کو تعلیمی مقاصد سے دور رکھنا اسلامی تعلیمات کے خلاف ہونے کی وجہ سے بہت ہی ناپسندیدہ ہے، جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے۔

''ليس لأحد أن يستخدم الصغير بدون عوض ما عدا للأب والجد والوصي وهؤلاء استخدامه على سبيل التهذيب والرياضة...... وللأب أن يعير الصغير للتعليم من أستاذ أو تعلم حرفة أو صناعة وليس له أن يعيره لغير ذلك كما أنه ليس لأب الصغير أن يعير ماله'' (درر الحكام شرح مجلة الاحكام لعلي حيدر ا، ۳-۵۹۰)۔

معاشی بدحالی کی صورت میں بچہ مزدوری:

معاشی بدحالی کی صورت میں جب انسان اپنی پوری کوشش کے باوجود اپنے اور اپنے زیر کفالت بچوں کے لازمی اخراجات کے بقدر کمائی نہ کر سکے اور بچوں سے مزدوری کرانے کے علاوہ لازمی ضروریات کی تکمیل کی کوئی صورت نہ رہ جائے تو بچہ کی عمر وصحت کے موافق مجبوراً کسی کام میں لگا کر مزدوری کرانے کی شرعاً اجازت ہے، لیکن اس صورت میں بھی صنعت وحرفت کے کام میں لگانا جس سے دونوں مقصد حاصل ہو بقدر ممکن ضروری ہے تاکہ بچے کا مستقبل ہر طرح سے برباد نہ ہو۔

دین اسلام میں بچوں کو سزا دینے کے اصول وضوابط:

اصل یہ ہے کہ بچے کے ساتھ نرمی وپیار کا برتاؤ کیا جائے، چنانچہ امام بخاریؒ اپنی کتاب ''الادب المفرد'' میں روایت کرتے ہیں کہ نرمی اختیار کرو اور سختی وفحش گوئی سے بچو، اور آجریؒ روایت کرتے ہیں کہ سکھاؤ لیکن سختی نہ کرو۔

خطا کار بچے کو سزا دینے میں اس کی طبیعت کی رعایت کی جائے، بچے ذکاوت وسمجھداری میں ایک دوسرے سے بہت مختلف ہوتے ہیں، لہذا البعض کو اصلاح وتنبیہ کے لئے ان کی طرف ترچھی نگاہوں دیکھنا بھی کافی ہوتا ہے جبکہ دوسرا بچہ سزا میں سختی اور ڈانٹ ڈپٹ کا محتاج ہوتا ہے، اور کبھی مربی کو اصلاح ونصیحت ڈانٹ ڈپٹ میں ناکامی کے بعد ڈنڈے کے استعمال کی ضرورت پڑتی ہے، غرض مربی کو سزا دینے میں نہایت حکمت سے کام لینا چاہئے اور ایسی سزائیں دینا چاہئے جو اس کی ذکاوت اور مزاج کے موافق ہو۔

سزا دینے میں تدریج سے کام لینا چاہئے، یعنی مربی پہلے معمولی سزا دے اور سخت سزا بالکل آخری مرحلہ میں اختیار کرنا چاہئے جس کا مطلب یہ ہے کہ اصلاح کرنے اور سزا دینے کے چند مراتب ومراحل ہیں جنھیں مربی کو مار پیٹ سے پہلے اختیار کرنا چاہئے۔

بچوں کو سزا دینے کے شرائط:

(۱) مربی کو مار پیٹ کی طرف اس وقت متوجہ نہیں ہونا چاہئے جب تک وہ تنبیہ اور ڈانٹ ڈپٹ کے تمام وسائل بروئے کار نہ لے آئے۔

(۲) مربی کو چاہئے کہ سخت غصہ کی حالت میں بچے کو ہرگز نہ مارے جس سے بچے کو جسمانی نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو۔

(۳) نیز مربی کو چاہئے کہ بچے کو ایسی جگہ پر نہ مارے جہاں مارنے سے ایذا ونقصان کا خوف ہو، جیسے چہرہ، سر، سینہ اور پیٹ وغیرہ، چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: چہرے پر مت مارو (ابوداؤد)۔

(۴) سزا کے ابتدائی مراحل میں زیادہ سخت اور تکلیف دہ مار نہ ہو بلکہ ہلکی پھلکی معمولی چھڑی سے ہاتھ پاؤں وغیرہ پر مارنا چاہئے، اور اگر بچہ چھوٹا ہو تو دو تین تھپڑوں سے زیادہ نہیں مارنا چاہئے۔

(۵) جب تک بچہ دس سال کی عمر کو نہ پہنچ جائے اس حدیث کی بنا پر جو پہلے گذر چکی ہے کہ اپنے بچوں کو نماز کا حکم دو جبکہ وہ سات سال کے ہو جائیں اور نماز نہ پڑھنے پر ان کو مارو جب کہ وہ دس سال کے ہو جائیں۔

(۶) غلطی کا صدور بچے سے پہلی مرتبہ ہوا ہو تو اسے اس جرم سے توبہ کا موقع دینا چاہئے اور اس کا عذر قبول کرنا چاہئے۔

(۷) مربی بچہ کو خود مارے یہ ذمہ داری اس کے کسی بھائی یا ساتھی کے سپرد نہ کرے تا کہ باہم لڑائی جھگڑا نہ ہو۔

(۸) بچہ جب بلوغ کی عمر کو پہنچ جائے اور مربی یہ محسوس کرے کہ تنبیہ وزجر کے لئے دس چھڑیاں مارنا کافی نہیں تو وہ اس پر اضافہ بھی کرسکتا ہے، اور تکلیف دہ مار بھی لگا سکتا ہے اور بار بار بھی مار سکتا ہے، یہاں تک کہ وہ محسوس کرے کہ بچہ صحیح راستہ پر آ گیا ہے، اور اب بالکل سیدھے راستہ پر ٹھیک ٹھاک چل رہا ہے (تربیت الاولاد ۴۴۰-۴۴۲)۔

نابالغ بچوں کی سزائیں:

نابالغ بچوں سے جو جرائم سرزد ہوتے ہیں ان جرائم کی شرعی سزائیں بچوں پر نافذ نہ ہوں گی خواہ بچے ممیز ہوں یا غیر ممیز، اور اسی طرح سے بلوغ کے بعد بھی نابالغی کے جرائم کی سزا نہیں دی جائے گی، لیکن بچوں کی تربیت واصلاح کے لئے جرائم کے لحاظ سے خود بچوں کو صحت اور عمر کا خیال کرتے ہوئے تعزیری سزائیں دینا شرعاً جائز ہے۔ حضرات فقہاء نے اس کی تصریح فرمائی ہے کہ نابالغ مجرم کی تعزیر جائز ہے، لیکن شرعی سزا دینا جائز نہیں، اس لئے کہ وہ مکلف نہیں ہے، لیکن اگر بچہ اتنا چھوٹا ہو کہ جو سمجھ نہ رکھتا ہو اس کو تعزیری سزا دینا بھی جائز نہیں، البتہ بچے کے ممیز وسمجھدار ہونے کے بعد جرائم، عمر، صحت وغیرہ کو خیال کر کے مناسب سزا دینا جائز ہے، اسی طرح اگر بچے سے کسی کا کوئی مالی نقصان ہو جائے تو اس کی بھرپائی بچے کے مال سے کی جائے گی۔

''لقد قسم الفقهاء مراحل الصغر إلى قسمين رئيسين: الأول الصغير غير المميز وهذا لا يطبق عليه الحدود والقصاص، ولكن يؤدب على ما ارتكب بما يتناسب بما صغر سنه بالتوبيخ والضرب غير المتلف وأما إذا ارتكب الصغير فعلا من شأنه إتلاف مال الغير وجب عليه ضمان ما أتلفه من ماله وكذا لو قتل إنساناً خطأ وجبت الدية في ماله، وهذا هو البدأ العام الذي يحدد علاقة الصغار بالعقوبات'' (الموسوعہ ۲۷-۳۳)۔

بچوں کے جرائم پر سخت سزائیں دینا:

بچوں کی تربیت کے لئے ان کو سزا دینے سے متعلق آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی جو پاکیزہ تعلیمات ہیں ان میں غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بچوں کی سزاؤں میں جرم، عمر، صحت ہر ایک کا لحاظ کرنا ضروری ہے، نہ تو بہت سخت سزائیں دینا جائز ہے اور نہ ہی ناقابل تحمل کام لینا، یا ان کی مار پیٹ شرعاً کسی چیز کی اجازت نہیں، البتہ قید وبند کی سزا نابالغ کو بھی دینا مصلحت کے مطابق جائز ہے، حاصل یہ کہ بچوں کو سزا دینے میں ان کی تربیت پیش نظر رہے بس۔

بے سہارا بچوں کے سلسلہ میں اسلامی تعلیمات:

بے سہارا بچے جن کے والدین اعزاء واقارب میں سے کسی کا پتہ نہ ہو یا پتہ تو ہو لیکن وہ اس دنیا میں موجود نہ ہوں یا موجود ہوں لیکن اپنی بے حسی وسنگدلی کی وجہ سے ان سے قطع تعلق کر چکے ہوں تو ایسے بے سہارا بچوں کے سلسلہ میں اسلامی تعلیمات بڑی روشن ہیں، ان پر یتیم ولقیط وغیرہ سے متعلق روایات واحکام صادق آئیں گے، لقیط کی تعریف شریعت میں ہر اس بچے پر صادق آتی ہے جس کو تنگدستی یا تہمت وغیرہ کی وجہ سے اس کے گھر والوں نے پھینک دیا ہو، ایسے لاوارث بچوں کا حکم شریعت میں یہ ہے کہ اگر اس کی جان کا بچنا کسی معین شخص کے حاصل کرنے پر موقوف ہو تو اس معین شخص کا اس کو حاصل کر کے پرورش کرنا فرض عین ہے، لیکن اگر کسی معین شخص پر اس کی جان کی حفاظت موقوف نہ ہو تو فرض کفایہ ہے، اور اگر جان کے ضائع ہونے کا اندیشہ نہ ہو تو اس کو حاصل کر کے پرورش کرنا بڑی فضیلت وثواب کا کام ہے، اس سلسلہ میں نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور فقہاء کے کلام اس کے بعد ملاحظہ فرمائیں:

(۱) یتیم کی کفالت کرنے والے کے سلسلہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میں اور یتیم کی کفالت کرنے والا جنت میں دونوں اس طرح ساتھ ہوں گے جیسے کہ شہادت اور بیچ کی انگلی: ''أنا وكافل اليتيم في الجنة هكذا، وقال بأصبعيه السبابة والوسطى'' (بخاری شریف، کتاب الادب)۔

(۲) ایک روایت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص کسی مسلم یتیم بچے کو قبضہ میں لے کر اس کے کھانے پینے کا نظم کرے تو اسے اللہ تعالی جنت میں

ضرور داخل کرے گا: "من ضم يتيماً بين أبوين مسلمين إلى طعامه وشرابه حتى يغنيه الله وجبت له الجنة" (مجمع الزوائد ۸/۱۶۱)۔

(۳) حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اللہ کی نظر میں سب سے اچھا گھر وہ ہے جس گھر میں کوئی یتیم باعزت طریقے پر رہتا ہو۔

(۴) حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ مسلمانوں کا سب سے اچھا گھرانہ وہ ہے جس میں یتیم کے ساتھ حسن سلوک کیا جاتا ہو، اور سب سے بدترین گھرانہ وہ ہے جس میں یتیم کے ساتھ برا سلوک کیا جاتا ہو: "خير بيت في المسلمين بيت فيه يتيم يحسن إليه وشر بيت في المسلمين بيت فيه يتيم يساء إليه" (ابن ماجہ)۔

مذکورہ بالا فضائل یتیم بچوں کی پرورش اور ان کی دیکھ بھال سے متعلق ہیں اور یتیم اس بچے کو کہا جاتا ہے جس کے والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا ہو گرچہ والد کے علاوہ دادا، چچا، نانا، ماموں جیسے قرابت دار غمگسار لوگ موجود ہوتے ہیں تو جب صرف والد کو کھونے والے بچے کے ساتھ حسن سلوک کرنے کے یہ فضائل ہیں تو اس بچے کے ساتھ جس کا اس دنیا میں کوئی سہارا موجود نہ ہو حسن سلوک کے یہ فضائل بدرجہ اولیٰ حاصل ہوں گے، "اللقيط إذا حرص الإسلام على مصلحة من فقد واحداً من أبويه فإنه يحرص أيضاً على اللقيط الذي يستقبل الحياة في ظروف أصعب تقطعت به الأسباب وها هو ذا يستقبل الحيوة وحده" (اولادنا ۳۲۲)۔

لاوارث بچوں کے سلسلہ میں حکومت کی ذمہ داری:

لاوارث بچوں کے سلسلہ میں شریعت اسلامیہ کی تعلیم کے مطابق لاوارث بچوں کے اخراجات حکومتی خزانے سے پورے کئے جائیں گے، حکومت ہی اصل میں ایسے بچوں کی ذمہ دار اور دیکھ ریکھ کروانے کی پابند ہے، لہٰذا جہاں اسلامی حکومت اور اس کے تحت بیت المال قائم ہو وہاں لقیط کا نفقہ بیت المال کے ذمہ ہوگا، چنانچہ حضرت عمرؓ کا معمول مبارک یہی تھا کہ بیت المال سے ایسے لوگوں کا نفقہ ادا فرماتے تھے: "أن عمر رضي الله عنه كان إذا أتي باللقيط فرض له مائة درهم وفرض له رزقاً يأخذه وليه كل شهر، وكان يوصي بهم خيراً، ويجعل إرضاعهم ونفقتهم في بيت المال" (الطبقات الکبریٰ: ۲۲۴)۔

چنانچہ تربیت الاولاد میں ہے: اسی طرح حکومت کا یہ بھی فریضہ ہے کہ وہ لاوارث بے سہارا بچوں کی کفالت کرے، اگر کوئی لاوارث بچہ مل جائے تو اس کی دیکھ بھال کرے، جیسا کہ حضرت عمرؓ نے کیا تھا (تربیت الاولاد ۲۴۷)۔

لاوارث بچے کے سلسلہ میں سماجی ذمہ داریاں:

حکومت چونکہ عوام وسماج کی نمائندہ ہوتی ہے تو اگر وہ اپنے فرائض کو ادا کرے تو بہتر ہے، ورنہ لاوارث بچوں کی دیکھ بھال اور اس کی تربیت اور اس کے اخراجات عامۃ الناس کے ذمہ لازم ہوگی، البتہ پرورش کے لئے بچے کو جس نے پہلے حاصل کیا ہے اس کو رکھنے کا وہی زیادہ حقدار ہے۔

"ومعنى ذلك تحول المجتمع ليصير أباً لهذا للقيط فيملأ بذلك الفراغ الناشي عن فقد والديه ....ومايترتب على ذلك من إعداده إعداداً يفيد المجتمع الذي جعل منه عضواً نافعاً، فاللقيط هو مجهولو النسب، يعيشون في رعاية الإسلام وذمته وهم إخوان المسلمين" (اولادنا: ۳۲۳)۔

لاوارث بچوں سے متعلق چند احکام:

جس بچے کا کوئی وارث نہ ہو اور اس کے اولیاء ذمہ داروں نے بچے کو کسی جگہ ڈال دیا ہو تو اس سے متعلق مندرجہ ذیل احکام ہیں:

(۱) اگر بچے کی ہلاکت کا اندیشہ ہو تو ایسی صورت میں اولیاء اور ذمہ دار قتل کے گنہگار ہوں گے۔ "ويأثم طارحه وتاركه إن هلك وينسحب عليه قوله تعالى: "ولا تقتلوا أولادكم خشية إملاق" (الفقہ الحنفی فی ثوبہ الجدید ۲/۲۷۶)۔

(۲) اگر لاوارث بچہ کی جان بچنا کسی متعین شخص کے اٹھانے پر موقوف ہو کہ اگر وہ نہ اٹھائے تو بچہ کی جان جانے کا ظن غالب ہو تو ایسی صورت میں بچہ کا اٹھانا فرض عین ہے: "وإذا كان المكان خالياً لا يوجد فيه غيره فيكون التقاطه فرض عين، ومثله في الحكم رؤية أعمى على وشك الوقوع في البير" (الفقہ الحنفی فی ثوبہ الجدید ۲/۲۷۶)۔

(۳) اور اگر لاوارث بچہ جس کی ہلاکت کا اندیشہ ہو اس کے اٹھانے والے بہت سے حضرات موجود ہوں تو ان سب کے ذمہ اس کا اٹھانا فرض کفایہ ہے، اگر کوئی ایک اٹھا کر اس کی حفاظت کرے گا تو سب گناہ سے بچ جائیں گے، ورنہ اس کی ہلاکت کی صورت میں سب گناہ گار ہوں گے (الفقہ الحنفی فی ثوبہ الجدید ۲۷۶)۔

(۴) ایسے بچے کے اخراجات حکومتی خزانے سے پورا کرنا ضروری ہے، اگر حکومت اپنے فریضے سے لاپرواہی برتے تو عامۃ الناس کے اوپر اس کے ضروری اخراجات کی فراہمی لازم ہے: "ونفقة اللقيط على ولي الأمر ففي الحديث الشريف عن أبي هريرة أن النبي ﷺ قال: أنا أولى بالمؤمنين من أنفسهم" (الفقہ الحنفی فی ثوبہ الجدید ۲۷۷)۔

(۵) ایسا لاوارث بچہ کسی کا غلام نہیں بلکہ آزاد ہوگا (الفقہ الحنفی فی ثوبہ الجدید ۲۷۷)۔

(۶) کسی کو بھی پرورش کرنے والے سے زبردستی لینے کا کوئی حق نہیں، البتہ اگر بچہ کو منتقل کرنے میں اس کا دینی نفع ہو اور اس کے پاس باقی رکھنے میں اس کا دینی ضرر ہو تو پھر ایسی صورت میں منتقل کر دیا جائے گا: "وليس لأحد أن يأخذه قهراً لأن سبق حق الحفظ لو اجده لسبق يده وينبغي أن ينزع منه إن لم يكن أهلاً لحفظه" (الفقہ الحنفی ر۲۷۷)۔

(۷) بچے کے والد کا علم اگر کسی دلیل سے نہ ہو تو اس بچے کو کسی کا بیٹا قرار دینا شرعاً حرام و ناجائز ہے: ولا يجوز للملتقط أن ينسبه إلى نفسه لقوله تعالى "ادعوهم لآبائهم وهو أقسط عند الله" (الفقہ الحنفی ر۲۷۷)۔

اپنا بچہ کسی دوسرے کے حوالہ کرنا:

بچے کی جان اور اس کے نسب کی حفاظت اور اس کو ہر قسم کے دینی و دنیاوی ضرر سے محفوظ رکھنا یہ والدین کا فریضہ ہے، اور والدین کے لئے کوئی ایسی صورت اختیار کرنا شرعاً حرام و ناجائز ہے، جس سے بچے کی جان اور اس کا نسب خطرے میں پڑ جائے، اسی طرح سے ہر ایسی صورت بھی شرعاً حرام و ناجائز ہے جس میں بچے کے دینی یا دنیوی ضرر کا ظن غالب ہو، لہٰذا اپنا بچہ کسی دوسرے کے حوالہ کر کے اس سے اس طرح سے بے تعلق ہو جانا کہ بچہ کسی دوسرے کی طرف منسوب ہونے لگے تو یہ بچے کے قتل کے مترادف ہونے کی وجہ سے شرعاً حرام و ناجائز ہے، اسی طرح اپنا بچہ کسی دوسرے کے حوالہ کرنے میں اس کا دینی ضرر واضح ہو اگر چہ نسب وغیرہ محفوظ رہے اور دنیوی نفع بھی ہو تو بھی بچے کو کسی دوسرے کے سپرد کرنا جائز نہیں۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''ادعوهم لآبائهم وهو أقسط عند الله فإن لم تعلموا آباءهم فإخوانكم في الدين ومواليكم وليس عليكم جناح فيما أخطأتم به ولكن ما تعمدت قلوبكم وكان الله غفوراً رحيماً'' (سورہ احزاب: ۵)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''من ادعى إلى غير أبيه وهو يعلم أنه غير أبيه فالجنة عليه حرام'' (متفق علیہ)۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''لا ترغبوا عن آبائكم فمن رغب عن أبيه فهو كفر'' (متفق علیہ، تفصیل کے لئے دیکھئے: رد المحتار ۵/۵۸ ص)۔

البتہ اگر بچہ کو دوسرے کے حوالہ کرنے کی صورت میں اس کے نسب کا کوئی خطرہ نہ ہو اور نہ ہی اس کا کوئی دینی ضرر ہو بلکہ دینی و دنیوی ہر اعتبار سے بچے کا نفع ہو تو ایسی صورت میں بچہ کو دوسرے کے سپرد کرنا شرعاً جائز ہے، کیونکہ پرورش میں اصل مقصود بچے کو ہر قسم کے دینی و دنیوی ضرر سے محفوظ رکھنا اور اس کے ہر طرح کے نفع کا خیال رکھنا ہے۔ اسی وجہ سے جن صورتوں میں بچے کے دینی و دنیوی اخلاقی ضرر کا پہنچنا یقینی ہو جائے ان صورتوں میں پرورش کرنے والوں کا حق پرورش ساقط ہو جاتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ حق پرورش اسقاطات کی قبیل سے ہے بشرطیکہ اس میں بچے کا کوئی ضرر نہ ہو۔

خلاصہ یہ ہے کہ بچہ دوسرے کے حوالہ کرنے میں اگر اس کا دینی دنیاوی نفع ہو اور کوئی ضرر نہ ہو تو بچہ کو دوسرے کے حوالہ کرنا شرعاً جائز ہے۔

بچہ حاصل کرنے والوں کی طرف سے ملنے والا ہدیہ:

بچہ دے کر اس کا عوض وصول کرنا شرعاً حرام و ناجائز ہے، اگر اس کو بچہ کا عوض مانا جائے تو یہ بیع باطل ہونے کی وجہ سے ثمن لینا حرام ہوگا اور اگر اس حق پرورش منتقل کرنے کا عوض مانا جائے تو یہ حق مجرد کا عوض ہے جس کا لینا شرعاً باطل ہے، لہٰذا بچے کے بدلہ میں حاصل کیا جانے والا عوض کسی بھی صورت میں جائز نہیں۔

''بطل بيع ما ليس بمال كالدم والميتة والحر .... لأنه معصية فيجب رفعها'' (شامی ۷-۲۳۵-۲۹۱)۔

البتہ بچہ کو اس کی دینی ودنیاوی نفع کو ملحوظ رکھ کر دوسرے کو سپرد کرنے کی صورت میں بچے کے والدین وپرورش کرنے والوں کے درمیان اگر ان سے تعلق قائم ہوجاتا ہے اور وہ "تہادوا تحابوا" کے تقاضے سے بلا کسی جبر واکراہ سے اپنی رضا وخوشی سے بچے کے والدین کو کچھ ہدیہ وہبہ کریں تو ہدیہ وہبہ شرعاً جائز ہے، اس کی ممانعت کی کوئی وجہ نہیں (الفقہ الحنفی فی ثوبہ الجدید ۲/ ۳۹۴)۔

افلاس کی وجہ سے ضائع ہونے والے بچوں کے تحفظ کا طریقہ:

جب بچوں کو فروخت کرنے کا سبب معلوم ومتعین ہے تو اس کا سد باب اس کے ازالہ سے ہی ہوگا اور جب سبب کا افلاس ہونا ظاہر ہے تو ایسے واقعات کی روک تھام افلاس کو دور کرنے سے ہوگی، جس کے لئے اسلام نے اولاً حکومت کو پابند کیا کہ ایسے بچوں کے وظیفے جاری کئے جائیں، اور دوسرے لوگوں کو افلاس کو دور کرنے کے لئے صدقہ وغیرہ پر ترغیب دے کر افلاس کے خاتمے کی کوشش کی گئی، چنانچہ امام طبرانی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالی نے مالدار مسلمانوں کے مال میں اتنی مقدار کا نکالنا فرض کیا جو ان کے فقراء کو کافی ہو، اور فقراء بھوک اور بے لباسی کا شکار مالداروں کی کوتاہی کی وجہ سے ہوتے ہیں، سن لو اللہ تعالی ان کا سخت حساب لے گا اور ان کو دردناک عذاب دے گا (تربیت الاولاد ۱/ ۲۵۱)۔

افلاس کے سد باب کا اسلامی تصور:

(۱) وظیفے کا دستور:

اسلام نے خاندان والوں کو بچہ پیدا ہونے پر وظیفہ دینے کا نظام رائج کیا ہے، چنانچہ مسلمانوں کے یہاں جو بچہ بھی پیدا ہوگا خواہ وہ بچہ حاکم کا بیٹا ہو یا ملازم کا، مزدور کا ہو یا بازاری کا سب کو وظیفہ دیا جائے گا، چنانچہ ابو عبیدہ اپنی ''کتاب الاموال'' میں روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ ہر پیدا ہونے والے بچہ کے لئے وظیفہ مقرر کرتے تھے جو اس کے باپ کی طرح اسے بھی ملتا تھا، جس کی مقدار سو درہم تھی، اور بچہ جیسے جیسے بڑھتا جاتا اس طرح اس کا وظیفہ بھی بڑھتا جاتا، حضرت عمرؓ کے بعد حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ نے بھی اور دیگر خلفاء نے بھی اس پر عمل کیا۔

''قال: وكان ديوان حمير على حدة وكان يفرض لأمراء الجيوش والقرى في العطاء ما بين تسعة آلاف وثمانية آلاف وسبعة آلاف على قدر ما يصلحهم من الطعام وما يقومون به من الأمور، قال: وكان للمنفوس إذا طرحته أمه مائة درهم فإذا ترعرع بلغ به مائتين فإذا بلغ زاده'' (كتاب الخراج لابي يوسف-۴۶، دار المعرفه للطباعه والنشر بيروت لبنان)۔

(۲) اسلام نے اس مسلمان کو مسلمان شمار نہیں کیا جو خود پیٹ بھر کر رات گزارے اور اس کا پڑوسی بھوکا ہو اور اس کو اس کی خبر بھی ہو، چنانچہ بزار وطبرانی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: وہ شخص مجھ پر ایمان نہیں لایا جو پیٹ بھر کر رات گذارے اور اس کا پڑوسی اس کے پڑوس میں بھوکا پڑا ہو اور اس کو معلوم بھی ہو (مشکوۃ شریف ۲/ ۴۲۴، حدیث: ۴۹۸۵)۔

(۳) اس کے برخلاف اسلام نے اس کی حاجت روائی، امداد اور اس کے خوش کرنے کو بہترین نیکی اور بڑا اونچا عمل قرار دیا ہے، چنانچہ امام طبرانی اپنی کتاب ''معجم اوسط'' میں حضرت عمرؓ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''أفضل الأعمال إدخال السرور على المومن كستر عورته أو أشبعت جوعته أو قضيت له حاجة'' (اعمال میں افضل ترین عمل مومن کو خوش کرنا ہے خواہ اس کی ستر پوشی کردو یا اس کی بھوک کا مداوا پیٹ بھرا کر کردو یا اس کی حاجت پوری کردو)۔

(۴) تنگی اور سختی کے وقت اسلام نے بھوکوں اور فاقہ مستوں کی امداد کو اہم فریضہ قرار دیا ہے، چنانچہ امام بخاریؒ حضرت عبدالرحمن بن ابی بکر الصدیقؓ سے روایت کرتے ہیں کہ اصحاب صفہ فقیر وغریب لوگ تھے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس کے پاس دو آدمیوں کا کھانا ہو وہ تیسرے کو اپنے ساتھ لے جائے اور جس کے پاس چار کا کھانا ہو وہ اپنے ساتھ پانچویں یا چھٹے آدمی کو لے جائے۔

(۵) اور امام مسلم حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس شخص کے پاس ضرورت سے زائد سواری ہو تو اسے چاہئے کہ اسے اس شخص کو دیدے جس کے پاس سواری نہیں ہے اور جس کے پاس فالتو توشہ اور کھانے کا سامان ہو تو اسے چاہئے کہ وہ اسے اس شخص کو دیدے جس

کے پاس کچھ کھانے کو نہیں، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف مال کی اقسام کا تذکرہ کیا (تربیت الاولاد ۱/۲۵۱، ۲۵۲)۔

معذور بچوں کی نگہداشت:

معذور بچے صحت مند بچوں کے مقابل میں اپنے والدین واعزہ واقارب کی شفقت ومحبت کے زیادہ محتاج ومستحق ہوتے ہیں، کیونکہ ان کا بچپنہ تو شفقت ومحبت کا متقاضی ہے ہی جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "لیس منا من لم یرحم صغیرنا ولم یوقر کبیرنا ویأمر بالمعروف وینهی عن المنکر" (مشکوۃ شریف: ۴۲۳، حدیث: ۴۹۶۴)۔

اسی طرح سے اس کا معذور ہونا بھی شفقت ومحبت کا متقاضی ہے جیسا کہ اس سلسلہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''إن المسلم إذا أعاد أخاه المسلم لم یزل فی خرقة الجنة حتی یرجع'' (مسلم باب عیادۃ المریض)۔

''ما من مسلم یعود مسلماً غدوة إلا صلی علیه سبعون ألف ملك حتی یمسی وإن عاده عشیة إلا صلی علیه سبعون ألف ملك حتی یصبح وكان له خریف فی الجنة'' (ترمذی کتاب الجنائز)۔

اور کمزور و مصیبت زدہ افراد کا تعاون اخلاق کریمانہ میں سے ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق میں شمار کیا گیا۔

''تحمل الكل وتكسب المعدوم وتقری الضیف وتعین علی نوائب الحق الخ'' (مسلم ۱/۸۸)، وجوہات مذکورہ سے معلوم ہوا کہ معذور بچہ صحت مند بچوں کے مقابل میں زیادہ قابل ترس و ترحم ہے، لہذا بغیر کسی سخت مجبوری کے بچے کو دوسری جگہ منتقل کرنا اور ان کی پرورش سے اپنی جان چھڑانا یہ شرعی ذمہ داریوں سے فرار ہی کہلائے گا، معذور بچوں کے ساتھ کیا سلوک ہونا چاہئے اس کی تفصیل "تربیت اولاد کے اسلامی نظام" میں موجود ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ بچے میں اگر کوئی جسمانی نقص یا عیب ظاہر ہو مثلاً پاگل پن، لنگڑا ہونا، اندھا ہونا وغیرہ تو ماں باپ بھائی بہن رشتہ دار دوست احباب سب کے سب اس کے ساتھ محبت والفت کا معاملہ کریں تا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان پر عمل ہو سکے۔

معذور بچوں کا علاج ومعالجہ:

بچے انسان کا جزو ہوتے ہیں اسی وجہ سے اپنی جان کی طرح سے ان کی جان کی بھی حفاظت شرعاً واجب ولازم قرار دی گئی ہے، تو جس طرح سے خود کو زندہ رکھنا اور معرض ہلاکت کے اسباب سے دور رکھنا واجب ہے، اسی طرح سے اپنی اولاد کو بھی ہلاکت کی جگہوں سے بچانا واجب ہوگا، اس سے معلوم ہوا کہ جو حکم خود اپنا ہوتا ہے وہی حکم اپنے بچوں کا بھی ہوتا ہے، تو جس طرح اپنا علاج ومعالجہ سنت ہے، واجب نہیں، اسی طرح سے اپنے چھوٹے بچوں کا بھی علاج ومعالجہ واجب تو نہیں لیکن سنت ضرور ہوگا، حضرات فقہاء نے علاج ومعالجہ کو اسباب ظنیہ میں سے شمار فرما کر اس کے وجوب کی نفی کی ہے، البتہ اس کی سنیت کو ثابت کیا ہے، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود علاج کیا ہے اور علاج کروانے کا حکم بھی دیا ہے۔

''عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ عن النبي صلی اللہ علیہ وسلم ما أنزل الله داء إلا أنزل الله شفاء'' (بخاری کتاب الطب)، ''لأن الولد جزء منه وإحياءهم واجب كإحياء نفسه'' (الفقہ الاسلامی ۷/۷۷۵)۔

''عن أبي الدرداء رضی اللہ عنہ قال: قال رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم: إن الله أنزل الداء والدواء وجعل لكل داء دواء فتداووا ولا تداووا بالحرام'' (ابوداؤد کتاب الطب)۔

لہذا اپنی استطاعت کے بقدر اپنے معذور بچوں کے علاج ومعالجہ کی فکر کرنا سنت اور باعث ثواب ہے، اور کوئی بھی انسان اپنی استطاعت سے زیادہ مکلف نہیں، فقط واللہ اعلم۔

☆☆☆

بچوں کے حقوق واحکام...... شرعی نقطۂ نظر

مفتی شاہد علی قاسمی [1]

اسلام نے بچوں کے تعلق سے واضح احکام دیئے ہیں، غور کیا جائے کہ جب بچہ مادر رحم ہی میں ہوتا ہے، تو اس کی حفاظت اور نگہ داشت کی تعلیم دی گئی، بلاوجہ اسقاط کی سخت ممانعت کی گئی، اور جب بچہ دنیا میں آنکھیں کھولتا ہے تو سب سے اہم مسئلہ اس کی غذا کا سامنے آتا ہے، کیوں کہ اس عمر میں بچہ ہر طرح کی غذا استعمال نہیں کرسکتا، اسے دودھ چاہئے، ڈبے کے دودھ کے بجائے عورت کا دودھ مفید ہوتا ہے، اور اپنی ماں کا دودھ ملے تو یہ سب سے بہتر ہوتا ہے، اس لئے اللہ تعالی نے بچہ کی ماں کو صاف ہدایت دی کہ وہ بچہ کو دو سال دودھ پلائے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

"والوالدات یرضعن أولادھن حولین کاملین لمن أراد أن یتم الرضاعة" (البقرہ: ۲۳۳) (مائیں اپنے بچوں کو مکمل دو سال دودھ پلائیں، یہ حکم اس کے لئے ہے جو دودھ پلانے کی مدت پورا کرنا چاہے)۔

غذائی ضرورت کے علاوہ اسے گود لینا، پیار دینا، بول و براز کی صفائی کرنا، دیکھ بھال کرنا اور اس طرح کے مختلف کام ہیں، جن کو انجام دینے کی اولین ذمہ داری اس کی ماں پر رکھی گئی، علامہ کاسانی فرماتے ہیں:

''الأصل فیھا النساء، لأنھن أشفق وأرفق وأھدی إلی تربیة الصغار'' (بدائع الصنائع ۳-۴۵۶، ط: مکتبہ زکریا دیوبند)۔

حضانت کیا ہے؟

الف: بچوں کی مصلحتوں کی نگرانی، موذی اور مضر چیزوں سے حفاظت اور جسمانی، نفسیاتی اور عقلی تربیت کہ وہ مقتضیات زندگی کی تکمیل کرسکیں، اور اپنے فرائض ادا کرنے کے اہل ہوجائیں، اسے شریعت کی اصطلاح میں ''حضانت'' کہا جاتا ہے (الاحکام الفقہیہ فی المذاہب الاسلامیہ الاربعۃ للشیخ محمد عساف ۲/۴۳۵)۔

اس سے معلوم ہوا کہ بچہ کی جسمانی نشوونما اور اس کے لئے متوازن غذا کی فراہمی، پیار ومحبت والا سلوک، اخلاقی قدروں کو پامال کرنے والے امور سے اجتناب، تعلیمی وتربیتی پہلو کا خیال ''حضانت'' کے بنیادی عناصر ہیں، اس لئے شریعت نے بچہ کی پرورش کا حق جنہیں دیا ہے اگر ان میں مذکورہ تمام یا بعض امور کا فقدان ہو تو ان کا حق پرورش ساقط ہوجاتا ہے۔

پرورش کے حق دار لوگ:

بچہ کی پرورش کی سب سے زیادہ حق دار ماں ہے، جس نے نو مہینہ پیٹ میں رکھا، پھر ولادت کی تکلیف اٹھائی، اور پھر منجانب اللہ اس کے دل میں بچہ کی محبت کوٹ کوٹ رکھ دی گئی، ظاہر ہے ایسی ذات کے علاوہ اور کون بچہ کی پرورش کی حق دار ہوسکتی ہے؟ اگر ماں کا انتقال ہوجائے، یا وہ حق پرورش کے معیار پر پورا نہ اترتی ہو یا شرعاً دوسری رکاوٹ ہو تو حق پرورش نانی کی طرف منتقل ہوجاتا ہے، اس کے بعد دادی پھر پردادی، اس کے بعد بہن، بہن کے بعد خالہ، خالہ کے بعد پھوپھیوں کا درجہ ہے۔ بہن، خالہ اور پھوپھی میں یہ تفصیل بھی ہے کہ ماں باپ دونوں کی شرکت سے جو رشتہ ہو وہ مقدم ہے، اس کے بعد ماں شریک اور اس کے بعد باپ شریک کا درجہ ہے (ہدایہ ۲/۴۳۴، ۵، ۴۳۴، باب حضانۃ الولد)۔

اگر خواتین میں کوئی مستحق نہ ہو تو پھر حق پرورش ان مردوں کی طرف لوٹے گا جو عصبہ رشتہ دار ہوں، اور ان رشتہ داروں میں جو وارث ہونے کے اعتبار سے مقدم ہوگا، وہی حق پرورش کا بھی ذمہ دار ہوگا، چنانچہ فقہاء نے مردوں میں حق پرورش کی ترتیب یوں لکھی ہے: باپ، دادا، پردادا (اوپر تک) اس کے بعد حقیقی بھائی، پھر باپ شریک بھائی، پھر بھتیجہ، اس کے بعد باپ شریک بھائی کا لڑکا، پھر باپ شریک چچا، اس کے بعد چچازاد بھائی، پھر باپ شریک چچا کا لڑکا، بشرطیکہ

---

[1] مفتی شاہد علی قاسمی۔

جس کی پرورش کی جارہی ہو وہ لڑکا ہو لڑکی نہ ہو، ان کے بعد باپ کے چچا، اور دادا کے چچا وغیرہ کا حق ہے (بدائع الصنائع ۴ر۴۳)۔

پرورش کے حق دار کو حق پرورش اس شرط کے ساتھ ہے کہ وہ حق پرورش کی ادائیگی پر قادر ہو، اگر قادر نہ ہو بایں طور کہ اس کے پاس ''ضیاع ولد'' کا غالب گمان ہو تو اس کا حق پرورش ختم ہوجائے گا، اور اس کے بعد والے کی طرف منتقل ہوجائے گا، علامہ شامی فرماتے ہیں:

''والحاصل أن الحاضنة إن كانت فاسقة فسقاً يلزم منه ضياع الولد عندها سقط حقها، وإلا فهي أحق به إلى أن يعقل فينزع منها'' (رد المحتار ۵۔ ۵۴۲، باب الحضانة)۔

البتہ یہ بات قابل غور ہے کہ ''ضیاع ولد'' سے کیا مراد ہے؟ اس کی بعض صورتیں تو واضح ہیں، جیسے پرورش کرنے والی بچہ کو مناسب وقت نہ دیتی ہو، اس لئے بچہ کو مناسب وقت پر نہ تو غذا ملتی ہو، اور نہ اس کی دیکھ ریکھ ہو پاتی ہو، اس کے نتیجہ میں بچہ بیمار رہتا ہو، اس طرح کی بعض اور دوسری صورتیں ہیں جو ''ضیاع ولد'' کی باعث ہیں، ''ضیاع ولد'' کی وہ صورتیں جہاں اشتباہ ہو کہ یہ صورت ''ضیاع ولد'' میں داخل ہیں یا نہیں؛ تو اس سلسلہ میں نصوص وعبارات فقہیہ کے علاوہ عرف اور موجودہ حالات کو بھی فیصلہ کن مانا جائے گا۔

اگر کسی خاندان میں پڑھنے لکھنے کا رجحان بہت زیادہ ہو، اور سب تعلیم یافتہ ہوں، ظاہر ہے ایسے ماحول میں کوئی مناسب تعلیم حاصل نہ کرسکے، تو یہ اس خاندان کے ماحول کے مطابق عیب سمجھا جائے گا، لہٰذا اگر بچہ کی ماں اس اعتبار سے لاپرواہی برتتی ہو، اور تعلیم دلانے کی طرف متوجہ نہ ہو تو یہ اس خاندان کے اعتبار سے ''ضیاع ولد'' کے دائرہ میں آجائے گا۔

ایسی صورت میں اس کا حق پرورش ختم ہوجائے گا، اور بچہ اسے حوالہ کیا جائے گا جو حق پرورش رکھنے والوں میں بچہ کی تعلیم کی رعایت رکھ سکے، اسی طرح جس حق پرورش رکھنے والے کے پاس بچہ کے اخلاق بگڑ جانے کا اندیشہ ہو، یا تو بے دینی کا ماحول ہو، یا کوئی اور وجہ ہو تو بھی یہ ''ضیاع ولد'' کے دائرہ میں آئے گا، اور اس کا حق پرورش دوسرے کی طرف منتقل ہوجائے گا، یا بچہ کو اس انداز سے رکھا جاتا ہو کہ وہ نفسیاتی مریض ہوجائے، جیسے اس گھر میں مار پیٹ کا ماحول ہو، اور بچہ کے نفسیاتی طور پر دہشت زدہ ہوجانے کا خوف ہو تو یہ بھی ''ضیاع ولد'' کے دائرہ میں آئے گا، اور اس کا حق پرورش دوسرے کی طرف منتقل ہوجائے گا۔

خلاصہ یہ کہ بچہ کی مضرت کے وہ تمام پہلو جس کی فقہاء نے صراحت کی ہے، اور مضرت کے وہ پہلو جو عرف وعادات ناس اور سماجی نقطہ نظر سے مضرت کے دائرہ میں آتے ہوں وہ سب ''ضیاع ولد'' کے دائرہ میں ہیں، اور اس کی بنیاد پر اس کا حق پرورش دوسرے کی طرف منتقل ہوجائے گا۔

ان سب کے علاوہ حق پرورش حاصل ہونے کی چند شرائط ہیں، اگر ان شرطوں میں سے کوئی ایک شرط بھی نہ پائی جائے تو اس کا حق حضانت ساقط ہوجائے گا۔

وہ شرطیں درج ذیل ہیں:

۱۔ عاقل وبالغ ہو، نابالغ اور عقل وہوش کے اعتبار سے غیر متوازن (معتوہ) اور مجنون وغیرہ کو حق پرورش حاصل نہ ہوگا۔

۲۔ پرورش کرنے والی عورت بچہ کی ذو رحم محرم رشتہ دار ہو۔

۳۔ عورت نے بعد میں کسی ایسے مرد سے نکاح نہ کیا ہو جو اس بچہ کا محرم نہ ہو۔

۴۔ پرورش کا حق دار مرد زیر حضانت مشتہاۃ بچی کا محرم ہو۔

۵۔ مرد وعورت جس کو حق پرورش حاصل ہو وہ امین اور قابل اعتماد ہوں۔

۶۔ عورت کا ایسا مشغلہ نہ ہو جس سے بچہ کا ضیاع لازم آتا ہو۔

۷۔ عورت مرتد نہ ہوگئی ہو۔

بعض فقہاء نے یہ بھی شرط لگائی ہے کہ حاضن یا حاضنہ فاسق نہ ہو، لیکن حافظ ابن قیم کا خیال ہے کہ فسق جتنا عام ہے اس کے تحت اس قسم کی شرط لگانا بچوں کے حق میں مفید نہ ہوگا، اس لئے کہ اکثر اوقات فاسق وفاجر ماں باپ بھی اپنے بچوں کے لئے فسق وفجور کی راہ کو پسند نہیں کرتے (فقہ السنہ ۲ر۳۴۲)، حقیقت یہ ہے کہ ابن قیم کی رائے عین قرین قیاس ہے، جیسا کہ علامہ ابن نجیم مصریؒ فرماتے ہیں:

''الأم أحق بالصغيرة وإن كانت سيئة السيرة معروفة بالفجور ما لم تعقل ذلك'' (البحر الرائق ۴-۲۸۲)۔

امام ابوحنیفہؒ کا یہ بھی قول ہے کہ جب تک بچوں میں دین کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا نہ ہو جائے کافرہ ماں کو بھی بچہ پر حق پرورش حاصل ہے (ہدایہ ۲؍۴۳۷)۔

بچوں کے حق تعلیم وتربیت کی بابت بنیادی ہدایات:

ب(۱): رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "لأن يؤدب الرجل ولده خير من أن يتصدق بصاع" (ترمذی، باب ماجاء فی أدب الولد، ابواب البر والصلۃ)۔

"ما نحل والد ولداً أفضل من أدب حسن" (ترمذی، باب ماجاء فی أدب الولد)۔

"كفى بالمرء إثماً أن يضيع من يقوت" (ابوداؤد، باب ماجاء فی صلۃ الرحم)۔

"أدبوا أولادكم على ثلاث خصال: حب نبيكم وحب آل بيته وتلاوة القرآن" (تنویر شرح الجامع الصغیر، حرف الہمزۃ مع الہاء)۔

ان احادیث سے واضح ہے کہ بچوں کی تعلیمی واخلاقی تربیت باپ کے فرائض میں داخل ہے، اوراس میں کوتاہی عنداللہ قابل مواخذہ ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"يا أيها الذين آمنوا قوا أنفسكم وأهليكم ناراً" (التحریم:۶)۔

اس آیت کے ذیل میں علامہ آلوسی فرماتے ہیں: "واستدل بها على أنه يجب على الرجل تعلم ما يجب من الفرائض وتعليمه لهؤلاء" (روح المعانی ۱۵؍۲۳۲)۔

نیز اس آیت کے ذیل میں مفتی محمد شفیع صاحبؒ فرماتے ہیں: حضرات فقہاء نے فرمایا کہ اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ ہر شخص پر فرض ہے کہ اپنی بیوی اور اولاد کو فرائض شرعیہ اور حلال وحرام کے احکام کی تعلیم دے، اور اس پر عمل کرانے کے لئے کوشش کرے (معارف القرآن ۸؍۵۰۲)۔

ان تفصیلات کی روشنی میں یہ بات واضح ہے کہ بچوں کو جاہل رکھنا اور دین کی بنیادی باتوں سے ناآشنا رکھنا مجرمانہ غفلت ہے، جو قابل مواخذہ ہے۔

دینی تعلیم اور عصری تعلیم کس حد تک ضروری ہے؟

ب(۲): جو فرائض وواجبات انفرادی طور پر ہر شخص پر عائد ہوتے ہیں، ان کا جاننا ضروری ہے، سیکھنے کی عمر بچپن سے شروع ہو جاتی ہے، اس لئے بلوغ سے پہلے ہی تعلیمی سلسلوں کا آغاز ضروری ہے، علامہ نووی نے اس سلسلہ میں امام شافعی اور ان کے اصحاب کا چشم کشا قول نقل کیا ہے، فرماتے ہیں:

''قال الشافعي وأصحابه رحمهم الله تعالى: على الآباء والأمهات تعليم أولادهم الصغار ما يستعين عليه بعد البلوغ، فيعلمه الولي الطهارة والصلاة والصوم ونحوها، ويعرفه تحريم الزنا واللواط والسرقة وشرب المسكر والكذب والغيبة وشبهها، وقيل: هذا التعليم مستحب، والصحيح وجوبه وهو ظاهر نصه'' (المجموع شرح المہذب ۱-۶۴)

اصل علم وہ ہے جس سے اللہ کی معرفت حاصل ہو، جیسا کہ آیت کریمہ: ''إنما يخشى الله من عباده العلماء'' (فاطر: ۲۸) کے اشارۃ النص سے بھی معلوم ہوتا ہے، علوم عصریہ دوسرے درجہ کا علم ہیں، جو وسیلہ اور ذریعہ کی حیثیت رکھتے ہیں، کیوں کہ علوم عصریہ سے دنیوی زندگی کو فائدہ پہنچتا ہے، اور دینی علوم سے آخرت کی اصل زندگی سنورتی ہے، ''چہ نسبت خاک را با عالم پاک'' مقولہ کے مطابق علوم دینیہ اور علوم عصریہ میں کوئی مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔

دنیا میں زندگی گزارنے کے لئے انسان مختلف چیزوں کا محتاج ہوتا ہے، ان چیزوں کو وجود میں لانے کے لئے علم کی ضرورت پیش آتی ہے، اس لئے ضروری اور انسانی سماج کو کام آنے والے مفید علوم کو حاصل کرنا ''فرض کفایہ'' کے دائرہ میں آئے گا، جیسا کہ علامہ شامی نے اس کی صراحت کی ہے۔

''وأما فرض الكفاية من العلم فهو كل علم لا يستغنى عنه في قوام أمور الدنيا كالطب والحساب'' (رد المحتار ۱-۱۲۶)

اس عبارت میں اشارہ موجود ہے کہ ہر ہر بچہ کے لئے علوم عصریہ لازم نہیں ہے، تاہم تمام بچوں کا اس سے الگ تھلگ رہنا بھی ناروا ہے، فی زمانہ مختلف اعتبارات سے علوم عصریہ خصوصاً سائنس وٹکنالوجی کی کافی اہمیت ہے، آج جو ملک اس میدان میں آگے ہے اس کا مقام بلند ہے، دوسرے ملکوں کی جبین نیاز اس کے سامنے خم ہے، اس لئے فی زمانہ اس کی طرف خصوصی توجہ کی ضرورت ہے، تاہم کسی بھی بچہ پر علی التعیین عصری تعلیم کے حصول کو لازم قرار نہیں دیا جاسکتا، البتہ یہ بات ضرور کہی جاسکتی ہے کہ باعزت زندگی گزارنے اور زندگی کی گاڑی آگے چلانے کے لئے جس حد تک عصری تعلیم کی ضرورت پیش آسکتی ہو اسے ضرور حاصل

کیا جائے، اور سماجی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے جس حد تک عصری تعلیم سے واقفیت ضروری ہے اس حد تک علم حاصل کرنا سماج میں رہنے والے لوگوں پر اجتماعی طور پر ضروری ہے، جسے فقہ کی زبان میں ''فرض کفایہ'' کہا جاتا ہے۔

ایک خاص سطح کی تعلیم کا لزوم:

ب (۳): حکومت جس سطح تک تعلیم لازم کرنے کی بات کہہ رہی ہے، وہ عصری تعلیم ہے، ہندوستان جیسے ملک میں جہاں مسلمانوں کو مختلف چیلنجس کا سامنا ہے حکومت کی بات مان لینا زہر ہلاہل سے کم نہیں، کیونکہ قانون کو ماننے کے نتیجہ میں دینی مدارس کی کارکردگی متاثر ہوگی، مسلم بچے مدرسوں سے کم جڑیں گے، دینی مدارس جو حفاظت اسلام کے لئے قلعوں کے مانند ہیں، اپنی افادیت کھودیں گے، اور آہستہ آہستہ سینکڑوں مدارس کے بند ہوجانے کا اندیشہ رہے گا، اور اس پس منظر میں ہندوستانی مسلمانوں کا دین وایمان خطرہ میں پڑ جائے گا، اس لئے اگر حکومت اس طرح کا کوئی قانون بناتی ہے تو اس کی مخالفت ناگزیر ہوگی، اور اس کے خلاف آواز اٹھانا پوری ملت کی ذمہ داری ہوگی۔

بچوں کے لئے جنس کی تعلیم کا نظم:

ب (۴): جنس کی تعلیم دراصل برائی کو محفوظ طریقہ پر رائج کرنے کی کوشش ہے، اسلام آیا ہے برائی کو مٹانے کے لئے، نہ کہ برائی کو پھیلانے کے لئے، بلوغ سے پہلے جنس کی تعلیم بچوں کو وقت سے پہلے ہی بالغ بنادینے کی ایک کوشش ہے، جس سے بچنا ضروری ہے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

''ولا تقربوا الزنا، إنه كان فاحشة وساء سبيلا'' (الاسراء: ۳۱)۔

اللہ تعالی نے صرف زنا ہی سے منع نہیں کیا، بلکہ زنا کے قریب جانے سے بھی منع کیا، اسی لئے شریعت نے دواعی زنا کو بھی حرام قرار دیا، تاہم ایک مضبوط سبب کے دائرہ میں ضرور ہے، اس لئے راقم الحروف کے نزدیک نابالغی میں جنس کی تعلیم کی اجازت نہیں ہوگی۔

اس سلسلہ میں اسلام کی ہدایت یہ ہے کہ بچوں کو جنس کی تعلیم کی بجائے اخلاقی تعلیمات سے بہرہ ور کیا جائے، علمی تربیت کے ساتھ ساتھ اخلاقی تربیت بھی کی جائے، دانش گاہوں میں ہر ایسی تربیت اور ہر ایسی تعلیم سے بچا جائے جو بچوں میں بگاڑ وفساد اور فواحش ومنکرات کو پھیلانے کا سبب بنیں۔

شادی کی عمر اور سرپرستوں کی ذمہ داریاں:

ج: جب بچہ یا بچی بالغ ہوجائے تو باپ کی ذمہ داری ہے کہ اس کی شادی کرادے، اگر باپ یا باپ نہ ہو تو دوسرے ولی اقرب نے اس سلسلہ میں کوتاہی کی، اور لڑکا یا لڑکی نے برائی کا ارتکاب کرلیا تو اس گناہ میں لڑکا یا لڑکی کے علاوہ اس کا باپ اور سرپرست بھی شامل ہوگا، جیسا کہ حدیث ذیل سے معلوم ہوتا ہے:

''عن ابن سعد وابن عباس قال: قال رسول الله ﷺ: من ولد له ولد فليحسن اسمه وأدبه، فإذا بلغ فليزوجه فإن بلغ ولم يزوجه، فأصاب إثما، فإنما إثمه على أبيه'' (مشکوۃ، باب الولی فی النکاح کتاب النکاح)۔

لہذا اس مسئلہ کی بابت اسلامی ہدایات واضح ہیں، کہ شادی کرانا باپ پر عائد ہونے والی ذمہ داریوں میں ایک اہم ذمہ داری ہے، اور اس سلسلہ میں کوتاہی اور غفلت قابل گرفت ہے۔

شادی کی عمر کیا ہے؟ اس سلسلہ میں قرآن مجید کے اشارۃ النص سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی عمر زمانہ بلوغ ہے، اللہ تعالی نے فرمایا: ''إذا بلغوا النكاح'' (النساء: ۶)۔

اللہ تعالی نے بلوغ کی عمر کو نکاح کی عمر سے تعبیر کیا ہے، گویا نکاح کا اصل وقت یہی ہے، اور حدیث بالا میں تو واضح ہدایت موجود ہے کہ جب لڑکا بالغ ہوجائے تو شادی کرادو، گویا شادی کی اصل عمر یہی ہے۔ تاہم اس کا یہ بھی مطلب نہیں کہ بلوغ سے پہلے شادی جائز نہیں ہے، اسلام نے عمر کی تحدید نہیں کی ہے، عمر کے کسی بھی مرحلہ میں شادی کی جائے تو شادی صحیح ہوجاتی ہے، رسول اللہ ﷺ نے حضرت عائشہؓ سے نکاح کیا تو اس وقت حضرت عائشہؓ کی عمر چھ سال تھی، اسی طرح شادی کی آخری عمر کیا ہوگی؟ اس کی بھی کوئی تحدید نہیں ہے، نکاح صغیر کی بابت علامہ نووی فرماتے ہیں:

''قال النووي: أجمع المسلمون على جواز تزويج الأب بنته البكر الصغيرة لهذا الحديث'' (مرقاۃ المفاتیح ۶-۲۰۶)۔

جب نکاح کی عمر کی اسلام میں تحدید نہیں تو اس میں تحدید کی کوشش کرنا مداخلت فی الدین سمجھا جائے گا، اور کوئی تحدید کر بھی دے تو یہ ناقابل قبول ہوگا، عقلی

اعتبار سے بھی دیکھا جائے تو اس کی تحدید نہ ہونا ہی مصلحت کے عین مطابق ہے۔

دوسری حقیقت یہ بھی ہے کہ شریعت کی نگاہ میں بالغ ہونے کے بعد جتنا جلد ہوسکے نکاح کردینا چاہئے، بلوغ سے پہلے بلا کسی مصلحت شادی کرنا پسندیدہ بات نہیں ہے، اور بالغ ہونے کے بعد بلا معقول وجہ تاخیر کرنا بھی ناپسندیدہ ہے۔ معاشی موقف بلند ہونے تک شادی میں تاخیر کرنا غیر معقول وجہ ہے، اگر لڑکا نان ونفقہ اور سکنی پر قادر ہے تو یہ نکاح پر قدرت کے لئے کافی ہے، مزید معاشی استحکام کا انتظار اور اس کے لئے کافی تاخیر انتہائی ناپسندیدہ بات ہے، جس کے بہت زیادہ مفاسد سامنے آتے ہیں۔

بچہ مزدوری:

و (ا): رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "لا تكلفوا الصغير الكسب، فإنه إذا لم يجد سرق" (موطا امام مالک، باب الامر بالرفق بالمملوک) (بچہ پر کمائی کرنے کی مشقت نہ ڈالو، اس لئے کہ اگر وہ کبھی کمائی نہ کرسکے تو چوری کرے گا)۔

حدیث میں کمائی سے جوڑنے کی ممانعت تربیتی نقطۂ نظر سے ہے، جیسا کہ حدیث کا آخری ٹکڑا خود اس کی وضاحت کررہا ہے، البتہ اس میں یہ اشارہ ضرور موجود ہے کہ بچوں کو کمائی میں لگانا پسندیدہ نہیں ہے، دوسری طرف بچوں کی تعلیم وتربیت کی بابت تاکیدی احادیث بھی متعدد ہیں، چند صفحات قبل عنوان: "بچوں کے حق تعلیم وتربیت کی بابت بنیادی ہدایات" میں ان احادیث کو ملاحظہ کیا جاسکتا ہے، ان احادیث کا تقاضا ہے کہ باپ کی اہم ترین ذمہ داریوں میں ایک بچہ کو تعلیم یافتہ با اخلاق انسان بنانا ہے، اگر معقول عذر کے بغیر بچوں کو مزدوری میں لگا دیا گیا اور وہ دین واخلاق سے نابلد رہا تو اس کا گناہ اس کے باپ اور سرپرست پر ہوگا، جیسا کہ یہ حکم آیت کریمہ: "يا أيها الذين آمنوا قوا أنفسكم وأهليكم نارا" (التحریم:۶) سے مستفاد ہوتا ہے، چنانچہ علامہ آلوسیؒ نے اس آیت کے ذیل میں فرمایا:

"واستدل بها على أنه يجب على الرجل تعلم ما يجب من الفرائض وتعليمه لهؤلاء" (روح المعانی ۱۵/۲۳۲)۔

"ہولاء" کے لفظ میں بچے بھی شامل ہیں، گویا ان بچوں کو ضروری علوم دینیہ سے آراستہ کرنا واجب ہے، ورنہ ان کے سرپرست گناہ گار ہوں گے، اس سے یہ بات ثابت ہوئی کہ بلا وجہ بچوں کو مزدوری میں لگانا انتہائی نامناسب بات ہے۔

مسئلہ کا دوسرا رخ یہ ہے کہ کیا شرعی نقطۂ نظر سے بچہ کو مزدوری پر لگانا جائز ہے یا نہیں؟ اس سلسلہ میں چند صورتیں ہوسکتی ہیں:

۱۔ مزدوری پر لگانے سے بچہ تعلیم وتربیت سے نابلد رہ جائے، اور اسے مزدوری پر لگانے کے لئے معقول عذر نہ ہو تو پھر مزدوری پر لگانا درست نہیں ہوگا، البتہ اس کا درجہ حرمت کا نہیں ہوگا، کراہت کے دائرہ میں آئے گا، اوپر مذکور دلائل سے یہی حکم سامنے آتا ہے۔

۲۔ بچہ سے اس طرح مزدوری کرائی جائے کہ اس کی تعلیم وتربیت کے لئے وقت نکالا جاتا ہو، اور دونوں کام اوقات تقسیم کرکے کرائے جاتے ہوں، تو اگر ایسا معاشی مجبوری کے تحت کیا جائے، تو پھر یہ صورت بلا کراہت جائز ہوگی، اور اگر کسی مجبوری کے بغیر باپ محض معاشی بہتری کے لئے کرائے تو یہ صورت جائز تو ہوگی، لیکن ناپسندیدہ غیر مستحسن سمجھی جائے گی۔

۳۔ اگر گھریلو حالات ایسے ہوں کہ بچوں کو مزدوری پر لگائے بغیر چارہ کار نہ ہو تو یہ مجبوری کی صورت ہے، اور مجبوری کے احکام معمول کے حالات سے مختلف ہوتے ہیں، مجبوری کی وجہ سے اس کی اجازت ہوگی، فقہاء کی عبارتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بچہ کو مزدوری پر لگانا جائز ہے، ہندیہ کی عبارت ہے:

"والأب والجد أبو الأب أو وصيهما إذا آجر الصغير في عمل من الأعمال التي يقدر عليه الصغير جاز" (ہندیہ ۴/۳۳۶)

علامہ کاسانی فرماتے ہیں: "فللأب أن يواجر ابنه الصغير في عمل من الأعمال" (بدائع الصنائع ۴/۲۱)۔

فقہاء کی عبارات غالباً ایسی مزدوری کی بابت ہیں جو وقتی ہو، ایسی مزدوری نہیں جو پورے وقت کو محیط ہو، اور اس کو تعلیم وتربیت کا موقع ہی نہ ملے۔

۴۔ بچہ کو ایسے کام سے لگایا جائے جو حرفت وپیشہ سے متعلق ہو، اور اس کام سے بچہ کو کوئی ہنر آجائے تو اس کی اجازت ہوگی، البتہ اس کا خیال ضروری ہے کہ اس کی تعلیم وتربیت کا بھی خیال رکھا جائے، علامہ کاسانی فرماتے ہیں:

''إن إيجاره فی الصنائع من باب التهذيب والتأديب والرياضة وفيه نظر للصبی، فيملكه الأب (بدائع الصنائع ۴ر۲۱)، واستعماله فی الصنائع نوع من التأديب فيملكه من حيث أنه تأديب'' (حوالہ سابق)۔

خلاصہ یہ کہ بلا معقول عذر بچہ کو مزدوری پر لگانا ناپسندیدہ ہے، اور کراہت کے دائرہ میں ہے، اور معقول عذر کے ساتھ جائز ہے، اور جن صورتوں میں کراہت ہے اگر بچہ مزدوری کر ہی لے تو اجرت حلال رہے گی۔

اولیاء اولاد بچوں سے کس حد تک گھریلو کام لے سکتے ہیں؟

د(۲): اس سلسلہ میں اصولی بات وہی ہے جو اوپر گذری کہ تعلیم وتربیت میں خلل کے بغیر بچوں سے ایسا کام کرواسکتے ہیں جو ان کی طاقت وقدرت میں ہو، لیکن اگر کام اس طرح لیا جائے کہ تعلیم وتربیت کے لئے وقت نہ مل سکے، یا طاقت سے زیادہ کام لیا جائے تو یہ درست نہیں اور یہ صورت کراہت کے دائرہ میں آئے گی، تفصیلی بات اس سے پہلے آچکی۔

بچوں کو پیشہ ورانہ کام سکھانا:

ما قبل میں علامہ کاسانی کی تحریر گزر چکی ہے کہ بچوں کو پیشہ ورانہ کام سکھا سکتے ہیں، کیونکہ یہ بھی تربیت کا ایک حصہ ہے، کہ اس پیشہ سے جڑ کر بچہ آئندہ اپنی معاش بہتر کر سکتا ہے، لیکن تعلیم وتربیت سے نابلد رکھنا درست نہیں ہے، تعلیم وتربیت کے لئے وقت کی تنظیم ضروری ہے، ورنہ اولیاء بچہ اس کے ذمہ دار سمجھے جائیں گے، اور عند اللہ قابل مواخذہ ہوں گے۔

معاشی بدحالی اور بچوں کو مزدوری پر لگانا:

د(۳): اگر والدین معاشی بدحالی کے شکار ہوں، اور دو وقت کا کھانا میسر نہ ہو، یا بنیادی ضروریات زندگی پوری نہ ہوتی ہوں اور وہ کمائی پر بھی قادر نہ ہوں تو ان کا نفقہ ان کے اصول وفروع اور ذورحم محرم رشتہ داروں پر واجب ہوگا، کس پر کب واجب ہوگا؟ اس کی تفصیلات کتب فقہ میں مذکور ہیں، اسی طرح بچہ کا نفقہ اس کے باپ، دادا، ماں اور اس کے محرم رشتہ داروں پر واجب ہوتا ہے، اس کی تفصیلات بھی یہاں ترک کی جاتی ہیں، سر دست اہم مسئلہ یہ ہے کہ اگر ایسے بچے اور اس کے مجبور والدین کی کفالت کے لئے نہ تو ان کے محرم رشتہ دار تیار ہوں اور نہ کسی رفاہی اور خیراتی ادارہ سے ایسا کچھ نظم ہو تو کیا بچوں کو کمائی کرنے میں مشغول کیا جاسکتا ہے؟

اگر واقعی یہ صورت ہو تو ایسی مجبوری کی حالت میں اسلام نے بچہ کو کسب معاش سے نہیں روکا ہے، علامہ کاسانی فرماتے ہیں: "فللأب أن يواجر ابنه الصغير فی عمل من الأعمال" (بدائع الصنائع ۴ر۲۱)۔

اسی طرح والدین بچوں کو سخت مجبوری کے بغیر بھی ایسے کاموں میں لگا سکتے ہیں جس کا تعلق کسی ہنر اور فن سے ہو، جیسے ویلڈنگ، سلائی، مختلف مشینوں کی مرمت وغیرہ، کہ عام طور پر بچوں کو یومیہ، یا ہفتہ واری یا ماہانہ کچھ دیا بھی جاتا ہے، اور بچے کام بھی سیکھ لیتے ہیں، اس طرح یہ صورت بچوں کے مستقبل کو برباد کرنے میں داخل نہیں ہوگی۔ بلکہ مجبور ماں باپ کا بچوں کو ایسے کام سے جوڑنا اور انہیں ہنر مند بنانا تادیب وتربیت کا ایک حصہ ہے، علامہ کاسانی فرماتے ہیں:

''واستعماله فی الصنائع نوع من التأديب فيملكه من حيث أنه تأديب'' (بدائع الصنائع ۴ر۲۱)۔

جو والدین مجبور نہ ہوں، اور وہ بچوں کو اچھی تعلیم دلا سکتے ہوں، پھر بھی جہالت، دین سے دوری، علم کی اہمیت سے ناواقفیت اور معاشی موقف کو مزید مستحکم کرنے کے لئے بچوں کو ایسے کام پر لگائیں جو کسی ہنر اور فن سے متعلق نہ ہو تو یہ صورت دانستہ بچوں کو ضائع کرنے اور ان کے مستقبل کو خراب کرنے میں داخل ہے، اس لئے یہ صورت جائز نہ ہوگی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "الرجل راع علی أهله وهو مسئول عن رعيته" (بخاری: حدیث نمبر: ۸۹۳)۔

بچوں کی تعلیم وتربیت میں لاپرواہی اور انہیں بلا مجبوری جاہل رکھنا بچوں کے تئیں عائد ہونے والی ذمہ داریوں سے راہ فرار اختیار کرنے کے مترادف ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "يا أيها الذين آمنوا قوا أنفسكم وأهليكم نارا" (التحریم: ۶)۔

''اہل'' میں بیوی کے ساتھ بچے بھی داخل ہیں، اگر بچوں کی تربیت کی فکر نہ کی گئی ہو، اور باپ نے بلا مجبوری مزدوری میں لگا کر بچہ کو دین سے دور رکھا تو اس

آیت کی رو سے ایسا باپ مجرم ہے۔

نابالغ لڑکے اور لڑکیوں کو جرائم کے ارتکاب پر سزائیں:

۵۔ اسلام میں جتنی حدود ہیں، جیسے زنا کی سزا، چوری کی سزا، وغیرہ، ان تمام میں نفاذ حدود کے لئے بالغ ہونے کی شرط لگائی گئی ہے، غارت گری سے متعلق نفاذ سزا کی شرائط ذکر کرتے ہوئے علامہ کاسانی فرماتے ہیں:

''منها أن يكون بالغاً فإن كان صبياً .... فلاحد عليه'' (بدائع الصنائع ۹۔ ۳۶۱)۔

چوری سے متعلق علامہ کاسانی ہی فرماتے ہیں:

''أما ما يرجع إلى السرقة فأهلية وجوب القطع، وهي العقل والبلوغ'' (بدائع الصنائع ۹۔ ۲۸۳)۔

زنا کی سزا نافذ ہونے کی شرائط بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''الصبي أو المجنون إذا وطئي امرأة أجنبية لا حد عليه'' (بدائع الصنائع ۹۔ ۱۸۳۔ ۱۸۴)۔

علامہ کاسانی ہی کا بیان قتل پر قصاص جاری ہونے کی شرائط کے بارے میں ہے:

''أما الذي يرجع إلى القاتل فخمسة: أحدها أن يكون عاقلاً، والثاني: أن يكون بالغاً'' (بدائع الصنائع ۱۰۔ ۲۳۶، كتاب الجنايات)۔

غرضیکہ قتل پر قصاص کا معاملہ ہو، چوری، زنا بالجبر، زنا بالرضا، ڈاکہ زنی وغیرہ پر حدود کے نفاذ کی بات ہو تو ان سب صورتوں میں بالغ ہونا ضروری ہے، کیونکہ نابالغ جب تک بالغ نہ ہو جائے، وہ اصولی طور پر احکام شریعت کا مکلف نہیں بنتا ہے، ہاں اگر نابالغ نے ایسا جرم کیا جو مال سے متعلق ہو جیسے کسی کا مال غصب کر لیا، چوری کر لیا، کسی کا مال ضائع کر دیا، وغیرہ، تو ان صورتوں میں نابالغ سے بعینہ وہ مال وصول کیا جائے گا اور موجود نہ ہو اور وہ مال مثلی ہو تو اس کا مثل اور مثلی نہ ہو تو اس کی قیمت وصول کی جائے گی، اگر بچہ چوری کرلے تو اس پر تبصرہ کرتے ہوئے علامہ شامی فرماتے ہیں:

''لأن القطع عقوبة، وهما (الصبي والمجنون) ليسا من أهلها، لكنهما يضمنان المال'' (رد المحتار ۶۔ ۱۳۷، كتاب السرقه)۔

نابالغ لڑکے اور لڑکیوں پر گو کہ حدود (مقررہ سزائیں) نافذ نہیں کی جائیں گی، تاہم تعزیر و تادیب کا دروازہ کھلا ہوا ہے، نابالغ کی تعزیر جائز ہے، علامہ حصکفی فرماتے ہیں:

''الصغر لا يمنع وجوب التعزير فيجري بين الصبيان'' (الدر المختار على هامش الرد ۴۔ ۱۲۰)۔

البتہ علامہ حصکفی کا رجحان یہ بھی ہے کہ اگر بچہ کا جرم حق اللہ سے متعلق ہو تو تعزیر کی اجازت نہیں ہوگی، چنانچہ مذکورہ عبارت کے بعد فرماتے ہیں:

''ولو كان حق الله تعالى بأن زنى أو سرق منع الصغر منه''۔

تاہم متعدد فقہاء نے نابالغ کی تعزیر کی اجازت دی ہے، جیسا کہ علامہ شامی نے علامہ سرخسی کا قول نقل کرتے ہوئے فرمایا:

''إن الصغر لا يمنع وجوب التعزير'' (رد المحتار ۴۔ ۱۲۰)۔

اسی طرح علامہ حصکفی نے نابالغ کو محبوس اور قید میں ڈالنے کی بابت کہا:

''ويحبس في دين على الطفل والد ووصي، وللتأديب بعض يصور''۔

اس کے تحت علامہ شامی وضاحتی نوٹ تحریر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''وحبس الصبي للتأديب بعض المشائخ تصوروا'' (دیکھئے: الدر المختار ورد المحتار ۸۔ ۱۲۴ فصل فی الحبس)۔

بہرحال! قید میں ڈالنے کی سزا ہو یا کوڑے مارنے کی سزا یا کچھ اور، نابالغ کی تادیب کے لئے اس کی اجازت ہوگی، البتہ تادیب کرتے ہوئے قتل کردینے، یا اس جرم پر بالغ شخص کو جو سزا دی جاتی ہو اتنی سزا نابالغ کو نہیں دی جاسکتی۔

جہاں تک مسئلہ ہے نابالغوں کے ارتکاب جرائم اور اس کے بڑھتے ہوئے رجحان کا کہ کس طرح اس پر قابو پایا جاسکتا ہے، اسلام کا امتیازی وصف ہے کہ اس نے نہ صرف یہ کہ جرائم کے ارتکاب پر سخت سزائیں مقرر کی، بلکہ ان اسباب کو اختیار کرنے کا حکم دیا جن کی پابندی سے جرائم کے ارتکاب کا خاتمہ یا کم از کم اس میں کافی حد تک کمی واقع ہوجاتی ہے، چنانچہ اگر شراب نوشی پر کوڑے کی سزا ہے تو اس سے پہلے اس کے اسباب پر روک لگائی گئی، شراب بنانے کی کوئی فیکٹری مسلمان نہیں بناسکتا، کوئی مسلمان دکانوں میں شراب نہیں رکھ سکتا، کوئی مسلمان اسے خرید نہیں سکتا، پھر ان اسباب سے پہلے اسلام نے مسلمان کے دلوں اور ان کی سوچ وفکر کی طرف خصوصی توجہ دی، شرب خمر پر آخرت کی بربادی اور اللہ کے سخت ناراض ہونے کی وعید سنائی گئی، عبادت کے عدم قبول کی دھمکی دی گئی، مسلمان جو اللہ کے حکم کا پابند ہوتا ہے، وہ یقینا اس طرح کی دھمکیوں اور اللہ کی ناراضگیوں سے بچنے کے لئے خلوت میں بھی ارتکاب جرم سے پہلے ہزار بار سوچتا ہے، اور حتی الامکان بچنے کی کوشش کرتا ہے، اسی طرح زنا، ڈاکہ زنی، قتل وغیرہ میں بھی اسلام نے اولاً دلوں کے اصلاح کی کوشش کی، پھر اسباب جرم پر روک لگایا، پھر خدانخواستہ جرم کا ارتکاب ہو ہی جائے تو سخت اور عبرت ناک سزا مقرر کی، تاکہ جرم کے رسیا لوگ بھی سخت سزا کے تصور سے کانپ اٹھیں، اور ارتکاب جرم سے پہلے بھی ہزار بار سوچنے پر مجبور ہوں۔

ان تفصیلات کی روشنی میں جرائم کے سدباب کے لئے درج ذیل صورتیں اختیار کی جاسکتی ہیں:

۱۔ بچوں کی اخلاقی تربیت، اس کے لئے اسکولوں میں اخلاقیات پر مبنی کتابوں کو نصاب میں شامل کرنا۔

۲۔ جرائم کے اسباب قریبہ پر پابندی لگانا، جیسے شراب کی فیکٹری اور فواحش کے اڈے کو بند کرنا، اسی طرح ان اسباب پر روک لگانا جو عام طور پر جرم کے پنپنے اور اس کے وجود میں آنے کا سبب بنتے ہیں، جیسے لڑکیوں کا تنہا ایسے لباس میں نکلنا جو مردوں کے لئے پرکشش ہو، لڑکے اور لڑکیوں کے مخلوط رہنے کے کم سے کم مواقع پیدا کرنا، جیسے لڑکوں کے لئے علاحدہ تعلیم کا کیمپس اور لڑکیوں کے لئے الگ کیمپس، اجتماعات میں بھی اس کی تدبیر اختیار کرنا وغیرہ۔

۳۔ نابالغوں کو جنس کی تعلیم نہ دی جائے۔

۴۔ انٹرنیٹ کے ایسے سائٹ پر روک لگانا جس میں فواحش ومغلظات بھرے ہوئے ہیں، اس کے علاوہ دوسرے اسباب جو اخلاقی انارکی پیدا کرتے ہیں ان سب پر روک لگانا۔

۵۔ تمام اسباب روکنے کے باوجود کوئی بچہ جرم کا ارتکاب کرے تو اس کی سخت تنبیہ وتادیب کی جائے، البتہ یہ تادیب بچہ کی قوت برداشت کے دائرہ میں ہو، اسی طرح جیل کی سزا اتنی مدت کے لئے ہو جو اس مجرم نابالغ کے لئے موثر ہوسکے۔

نابالغوں پر سزائیں نافذ کرنے کی کیفیت اور حد:

و: ظاہر ہے کہ بچوں کو کسی بھی جرم کی وہ سزائیں نہیں دی جاسکتیں جو سزائیں اسی جرم پر بالغ کو دی جاتی ہیں، کیونکہ وہ ابھی تک احکام شرعیہ کا مکلف نہیں ہوئے ہیں، جب کہ تمام حدود کے نفاذ کے لئے مکلف ہونا ضروری ہے، البتہ تعزیر کی جائے گی، اور یہ تعزیر تادیب کے طور پر ہوگی، نہ کہ عقوبت کے طور پر، اور تادیب میں اصول یہ ہے کہ اس کی کیفیت معتاد طریقہ پر ہو، اور کیفیت معتاد سے مراد یہ ہے کہ ہڈی توڑی نہ جائے، ذہنی ٹارچر نہ کیا جائے، ایسی سزا نہ دی جائے جو موت کا سبب بن جائے، یا نفسیاتی مریض بن جائے، جیسا کہ حدیث شریف میں بیوی کی تادیب کرتے ہوئے ضرب مبرح کی ممانعت کی گئی ہے، اور ضرب غیر مبرح کی اجازت دی گئی ہے، اسی طرح باپ اولاد کی اور استاذ اپنے شاگردوں کی تادیب کرتے ہوئے سرزنش کرتا ہے، اسی طرح جیل میں قید نابالغوں کو تادیب کرتے ہوئے مناسب سرزنش کرسکتا ہے، لہٰذا جیل میں محبوس بچوں کو سخت مارنا اور ان سے پرمشقت کام کرانا ان بچوں پر ظلم ہے۔

جہاں تک ان بچوں کی اصلاح کی تدابیر کی بات ہے تو بنیادی طور پر ان کی اصلاح کی وہی صورت ہوگی جو صورت ماں باپ اپنے بچوں کے تئیں اختیار کرتے ہیں، یعنی جس طرح ماں باپ بچوں کی غلطی پر سرزنش کرتے ہیں، اسی طرح ان بچوں کی سرزنش کی جائے، جس طرح ماں باپ شفقت کا برتاؤ کرتے ہیں، اسی طرح وقفہ وقفہ سے جیل میں محبوس بچوں کے ساتھ شفقت کا معاملہ کیا جائے، نیز ان بچوں کی اصلاح کا اہم ذریعہ جیل ہی میں بچوں کے تعلیمی انتظام کا

ہے، یعنی حکومت ان کے لئے تعلیم کا نظم کرکے اور اس میں اخلاقیات پر مبنی کتابوں کو شامل نصاب کرکے بچوں کی سوچ وفکر میں تبدیلی لانے کی کوشش کرے۔

بے سہارا بچوں کی تعلیم وتربیت کی ذمہ داری:

ز: والدین کے بچھڑ جانے یا گذر جانے یا ولادت کے بعد ماں باپ کی طرف سے پھینک دیئے جانے یا کسی اور سبب سے بچے بے سہارا ہوجائیں تو اولاً بچے کے قریبی رشتہ داروں کو تلاش کرنا چاہئے، تاکہ نفقہ ودیگر ضروریات کی بابت انہیں پابند کیا جائے جیسا کہ اسلام نے رشتہ داروں پر اس طرح کی پابندیاں عائد کی ہیں، تاہم اگر اس بچہ کا کوئی رشتہ دار نہ ملے، یا ملے لیکن ذمہ داری اٹھانے کے لئے تیار نہ ہو تو اولاً حکومت وقت کی ذمہ داری ہے کہ ایسے باشندگان وطن کے لئے کھانے پینے، علاج ومعالجہ، تعلیم وتربیت ودیگر ضروریات کا نظم کرے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''فالسلطان ولی من لا ولی له'' (ترمذی شریف: حدیث نمبر: ۱۱۰۲)۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "أنا ولی من لا ولی له" (سنن النسائی الکبری، حدیث نمبر: ۶۳۵۴)۔

اس لئے ایسے بچوں کی نگہداشت اور ان کی تمام ضروریات غذائی وتعلیمی ودیگر حکومت وقت پر عائد ہوں گی، اگر حکومت لاپرواہی برتے، یا سرے سے اس کا کوئی نظم نہ رکھے تو یہ حکومت کی نااہلی ہے، اگر معاملہ ایسا ہی ہو، منجانب حکومت اس کا نظم نہ ہو تو بچہ جہاں ہو وہاں کے لوگوں کی اجتماعی ذمہ داری ہے کہ وہ اس کی پرورش و پرداخت کا خیال رکھیں، تاہم یہ قانوناً واجب نہیں، بلکہ یہ اخلاقی فریضہ ہے، اس لئے اگر لوگ اس کی پرورش و پرداخت کرنے سے انکار کردیں تو کم از کم کچھ لوگ ایسے ضرور تیار ہوں جو قرض کے طور پر ایسے بچوں پر خرچ کریں، اور جب آئندہ حکومت سے، یا بچوں کے اولیاء جو مستقبل میں مل جائیں سے، یا کسی رفاہی ادارہ سے اخراجات مل جائیں تو یہ لوگ اپنی لگائی ہوئی رقم وصول کرلیں، اس سلسلہ میں علامہ ابن قدامہ مقدسی فرماتے ہیں:

''إن اللقیط إذا لم یوجد معه شیئ لم یلزم الملتقط بالإنفاق علیه فی قول عامة أهل العلم .... تجب نفقته فی بیت المال بقول عمر رضی اللہ عنہ فی حدیث أبی جمیلة: اذهب فهو حر، ولك ولاؤه، وعلینا نفقة .... فإن تعذر الإنفاق علیه من بیت المال لکونه لا مال فیه، أو کان فی مکان لا إمام فیه، أو لم یعط شیئاً فعلی من علم حاله من المسلمین الإنفاق علیه .... ولأن فی ترك الإنفاق علیه هلاکه، وحفظه عن ذلك واجب'' (المغنی ۸-۳۵۵)۔

نیز علامہ نووی فرماتے ہیں: "وجب علی الإمام أن ینظم جماعة یکون هو أحد أفرادها تتولی الإنفاق علیه علی سبیل الإقراض، حتی إذا ظهر له مال أو ولی شرعی موسر أو استطاع الکسب أمکن رد ما أنفق علیه" (المجموع شرح المہذب ۱۶/۱۵۵)۔

ح: اس وقت دنیا میں کوئی غلام نہیں ہے، تمام انسان مرد وعورت، بچہ، جوان اور بوڑھا سب آزاد ہیں، اور آزاد شخص کی خرید وفروخت حرام ہے، اور بیع باطل ہے، علامہ حصکفی فرماتے ہیں:

''بطل بیع ما لیس بمال .... کالدم .... والمیتة .... والحر'' (الدر المختار مع الرد-۷-۲۳۵)۔

جو حکم بیع کا ہے وہی ہبہ کا بھی ہے یعنی ہبہ کیا جائے تو یہ بھی باطل ہے، علامہ کاسانی فرماتے ہیں:

''فلا تجوز هبة ما لیس بمال أصلاً کالحر والدم'' (بدائع الصنائع ۵-۱۶۹)۔

لہذا حد درجہ افلاس ہو، حد درجہ مجبوری ہو اس کے باوجود کوئی باپ اپنے بچہ کو کسی اور کے ہاتھ فروخت نہیں کرسکتا، اور نہ ہبہ کرکے اسے مالک بنا سکتا ہے۔

اگر فروخت اور ہبہ کئے بغیر دوسرے کو حوالہ کردے، اور وہ شخص غیر انسانی اور غیر اسلامی حرکت کئے بغیر بچہ کی پرورش و پرداخت کرے جس طرح لے پالک اور منہ بولا بیٹا کا معاملہ ہوتا ہے، تو اس میں کوئی حرج معلوم نہیں ہوتا ہے، جیسا کہ حضرت زید بن حارثہؓ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تحویل میں لیا، اور لے پالک کی طرح معاملہ کیا، ظاہر ہے کہ اس صورت میں متبنی بچہ تمام انسانی حقوق رکھتا ہے، اور پرورش کرنے والا نہ تو اس کا مالک ہوتا ہے، اور نہ اس بچہ کا حقیقی باپ کہلاتا ہے، بچہ کے والدین وہی کہلاتے ہیں جو حقیقی ماں باپ ہیں، اسی لئے بچہ جب پرورش کرنے والے کے گھر جوان ہوجاتا ہے تو پردہ وغیرہ کے احکام بھی جاری ہوجاتے ہیں، اس لئے بچہ کو ایسے شخص کے حوالہ کیا جاسکتا ہے جو بچہ کے ساتھ ویسا ہی معاملہ کرے جو لے پالک کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

اگر بچہ کو ایسے شخص کے حوالہ کیا جائے جس کے بارے میں یقین ہو کہ وہ بچہ کے ساتھ غیر انسانی یا غیر شرعی حرکت کرے گا، جیسے یہ یقین ہو کہ بچہ لینے والا

اسے کہیں اور بیچ دے گا، یا غلام جیسا معاملہ کرے گا، یا جنسی استحصال کرے گا یا اسے بندھوا مزدور بنائے گا، یا گداگری کے لئے استعمال کرے گا، یا اس طرح کا کوئی اور غیر انسانی وغیر اسلامی عمل کرے گا تو ایسے شخص کے حوالہ کسی بچہ کو کرنا ناجائز اور حرام ہوگا، جیسا کہ فقہاء نے غلام کے بارے میں لکھا ہے کہ اگر مالک غلام اپنے غلام کو کسی ایسے شخص کے ہاتھ بیچے جو لواطت کی بری عادت میں مبتلا ہو تو ایسے شخص کے ہاتھ بے ریش غلام کو بیچنا جائز نہ ہوگا (الدر المختار علی ہامش الرد ۹/۵۶۰۔۵۶۱ کتاب الحظر والاباحۃ)۔

اگر مذکورہ باتوں کا یقین نہ ہو، لیکن ظن غالب ہو، یعنی دوسرے قرائن سے اندازہ ہو کہ بچہ کے ساتھ مذکورہ غیر انسانی وغیر اسلامی عمل کیا جائے گا تو بھی بچہ کو ایسے شخص کے حوالہ کرنا جائز نہ ہوگا، کیونکہ طہارت، نماز اور روزہ وغیرہ کے متعدد مسائل میں غالب ظن پر حکم لگایا جاتا ہے، گویا شریعت نے ظن غالب کو بھی یقین کے قائم مقام مانا ہے، اس لئے بچہ ایسے ہی شخص کے حوالہ کیا جاسکتا ہے، جہاں لے پالک جیسا برتاؤ کیا جائے۔

اگر بچہ ایسے شخص کے حوالہ کیا جائے جسے مذکورہ بالا تفصیل کے مطابق بچہ دینا جائز ہے، تو اس سے ہدیہ لینا اور ہدیہ کی رقم سے اپنے مزید بچہ کی پرورش کرنا درست ہے یا نہیں؟ اگر یہ معاملہ مشروط ہو تو ہدایہ لینا جائز نہیں ہے، کیونکہ مشروط صورت میں ہدیہ بچہ کا عوض سمجھا جائے گا، اور بچہ کا عوض لینا ناجائز ہے، جیسا کہ آزاد شخص کی بیع کی ممانعت وحرمت ہے، اگر ہدیہ کی بات مشروط نہ ہو، لیکن اس کا عرف ہو تو بھی ہدیہ لینا ناجائز ہے، جیسا کہ مشہور قاعدہ ہے، ''المعروف عرفاً کالمشروط شرعاً'' (الاشباہ والنظائر/ ۲۷۸)۔

اگر ہدیہ لینا نہ تو معاہدہ کے مطابق ہو، اور نہ اس کا عرف ہو اور بچہ لینے والا بچہ دینے والے کو بطور تعاون اپنی خوشی ومرضی سے ہدیہ دے تو اس کی اجازت ہوگی، کیونکہ ہدیہ کی حقیقت یہی ہے کہ کوئی دوسرے کو بلاعوض کوئی چیز دے، اور مالک بنا دے، علامہ تمرتاشی غزی حنفی لکھتے ہیں:

''ھی تملیک العین مجانا'' (تنویر الابصار مع الدر والرد کتاب الھبہ)۔

بچوں کو دوسرے کے حوالہ کرنے کی روک تھام:

اس مسئلہ کا بنیادی رشتہ معاش سے ہے، کوئی بھی باپ مجبوری کے بغیر اپنا بچہ دوسرے کے حوالہ نہیں کرتا ہے، معاشی مجبوری کے نتیجہ میں ایک باپ کا بچہ کو دوسرے کے حوالہ کرنا ایک لمحہ فکریہ ہے، اس سلسلہ میں اسلام کی ہدایت واضح ہے، اسلام نے اہل ثروت اور اہل وسعت کو حکم دیا کہ ایسے مجبور وقلاش لوگوں کا مالی تعاون کریں، غور کیا جائے کہ جب مکہ سے صحابہ ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تو وہ خالی ہاتھ تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے انصاری صحابہ پر مہاجرین صحابہ کو تقسیم کردیا، ان کے درمیان مواخات کا رشتہ قائم فرمادیا، اس میں سبق ہے کہ سماج کے اصحاب وسعت مفلوک الحال لوگوں کا ضرور خیال رکھیں، اسی طرح اسلام نے زکوۃ کو رکن اسلام قرار دے کر غرباء ومساکین کے تعاون کی بہترین صورت پیش کی، اس پس منظر میں امت مسلمہ کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی زکوۃ دینے میں ایسے علاقہ کے لوگوں کا ضرور خیال رکھیں جہاں کے مسلمان انتہائی پستی میں ہیں، جیسا کہ آفات وحادثات میں مسلمان متحرک ہو کر آفت زدہ مسلمانوں کی مدد کرتے ہیں، اسی طرح مسلمان پسماندہ علاقہ کے لوگوں کی زکوۃ سے خصوصی مدد کریں، مذکورہ دو صورتوں کے علاوہ تیسری صورت یہ ہے کہ اب تقریباً ہر ملک میں کچھ نہ کچھ رفاہی ادارے کام کر رہے ہیں، جہاں چھوٹے بچوں سے لے کر بوڑھوں تک کے لئے کفالت کا انتظام ہے، ایسے مفلوک الحال باپ کی ایسے اداروں تک رہبری کی جائے، بشرطیکہ اس ادارہ میں غیر اسلامی تربیت نہ ہوتی ہو، اس کے علاوہ بھی موقع ومحل کے اعتبار سے بعض اور صورتیں بھی سامنے آسکتی ہیں۔

معذور بچوں کو ہسپتال میں رکھنا:

ط: اگر بچہ جسمانی یا ذہنی ودماغی اعتبار سے معذور ہو، پیدائشی معذور ہو یا پیدائش کے بعد معذور ہو گیا ہو تو اس کا علاج کرانا لازم ہے یا نہیں؟ فقہاء کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ علاج کرانا واجب نہیں ہے، بلکہ بہتر وافضل ہے، جیسا کہ تحریر ذیل سے بھی معلوم ہوتا ہے:

''صام ولم یأکل حتی مات ومن امتنع من التداوی حتی مات لم یأثم'' (الاختیار لتعلیل المختار ۴/ ۱۶۳، لمجد الدین ابی الفضل الحنفی)

لیکن حقیقت یہ ہے کہ بنیادی طور پر بیماری کی نوعیت تین ہوسکتی ہے:

الف: اس بیماری کا علاج دستیاب ہو، اور علاج سے شفاء یقینی یا ظن غالب کے درجہ میں ہو، جیسے ہاتھ ٹوٹنے پر اس کا علاج، پھر اس سے فائدہ تقریباً یقینی ہوتا ہے، عام طور پر موسم کے بدلنے سے نزلہ زکام اور کبھی موسمی بخار آتا ہے، ایسی بیماری کا علاج کافی آسان ہے، اور اس کی دواؤں سے فائدہ یقینی نہ بھی ہو تو کم از کم ظن

غالب کے درجہ میں ضرور ہوتا ہے، ایسی صورت میں علاج کرنا لازم وواجب ہوگا، اور علاج سے غفلت برتنے والا مجرم سمجھا جائے گا۔

ب: ایسی بیماری لاحق ہو جس کا علاج سے ختم ہونا امر موہوم ہو یا اس کے قریب قریب ہو، جیسے کینسر آخری اسٹیج میں ہو، اور چند ڈاکٹروں نے اب دواؤں کے غیر موثر ہونے کی شہادت دے دی ہو، ایسی صورت میں علاج نہ کرانے کی اجازت ہوگی۔

ج: تیسری صورت یہ ہے کہ اس بیماری کا علاج دستیاب ہو، فائدہ یقینی یا ظن غالب کے طور پر نہ ہو، بلکہ دونوں پہلو برابر ہو، یعنی مریض علاج کی صورت میں تندرست بھی ہوسکتا ہے، اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ دوا بالکل اثر نہ کرے، ایسی ہی صورتوں کے بارے میں فقہاء نے علاج کو مستحسن اور صرف بہتر قرار دیا ہے، الاختیار نامی کتاب کی مذکورہ بالا عبارت کا منشا بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔

پس ایسے معذور بچوں کی بیماری اور اس کے لئے دستیاب علاج کی بابت غور کیا جائے کہ علاج کس درجہ موثر ہوگا؟ اسی اعتبار سے بچوں کے اولیاء پر علاج کی ذمہ داری لازم ہوگی، یعنی بعض صورتوں میں علاج کرانا لازم ہوگا، بعض صورتوں میں مستحسن اور مستحب ہوگا اور بعض صورتوں میں محض جائز ہوگا جیسا کہ سطور بالا میں اس کی تین صورتیں بیان کی گئی ہیں۔

رہا یہ مسئلہ کہ کیا مصروف ماں باپ ایسے معذور بچوں کو ہسپتال میں داخل کر سکتے ہیں؟ اگر یہ کام بغرض علاج ہو تو اس کے جواز میں کوئی شبہ نہیں ہے، اور اگر محض نگہداشت اور اپنا دامن بچانے کے لئے ہو تو کیا اس کی اجازت ہوگی؟ راقم الحروف کے نزدیک اس کا جواب مبتلی بہ کے حالات پر موقوف ہے، اگر معذور بچہ کے والدین مصروف ہوں، اور ملازمت کی مجبوری میں بچہ کی صحیح دیکھ ریکھ نہ کر سکتے ہوں، تو پھر بچہ کو ہاسپٹل کے حوالہ کر دینا درست ہوگا، کہ یہ دو شر میں سے اخف کا ارتکاب کرنا سمجھا جائے گا، جیسا کہ مشہور فقہی قاعدہ ہے: "الضرر الأشد يزال بالضرر الأخف" (الاشباہ والنظائر ر ۲۵۸) اور اگر ایسی مجبوری نہ ہو تو بچہ کو ہاسپٹل کے حوالہ کرنا جائز نہ ہوگا، کیونکہ بچہ کا حق ماں باپ پر ہے کہ وہ اس کی دیکھ ریکھ کریں، اور یہ حق شریعت نے دیا ہے، جیسا کہ بعض فقہاء نے صراحت کی ہے کہ حق پرورش بچہ کا حق ہے، فقیہ ابواللیث، ہندوانی، ابن ابی لیلی، ابوثور وغیرہ اسی کے قائل ہیں، علامہ ابن ہمام فرماتے ہیں:

"وهو قول ابن أبي ليلى وأبي ثور تجبر، واختاره أبو الليث والهندواني من مشائخنا، لأن ذلك حق الولد" (فتح القدیر ۴،۳۲۱)

واضح ہو کہ پہلی صورت جس میں بچہ کو ہاسپٹل کے حوالہ کرنا جائز ہے، اس میں بھی وقفہ وقفہ سے ماں باپ کا بچہ سے ملنا ضروری ہے۔

☆☆☆

اسلام میں بچوں کے حقوق اور ان سے متعلق اصول واحکام

مولانا محمد منصف بدایونی[1]

(الف) اسلام میں بچوں کے حق پرورش کے سلسلے میں بنیادی ہدایات یہ ہیں کہ بچہ ماں کی پرورش میں رہے، اگر ماں نہ ہو تو نانی کو حق ہے کہ وہ پرورش کرے، اگر نانی بھی نہ ہو تو دادی پرورش کرے، پھر بہن کو حق پرورش حاصل ہے، پھر خالہ پھر پھوپھی وغیرہ اور اگر مذکورہ عورتیں نہ ہو تو حق پرورش باپ کو حاصل ہوگا پھر دادا کو پھر چچا کو عصبات کی ترتیب سے۔

''ثم إذا لم يكن عصبة فلذوی الأرحام'' (له العصبات) أی إن لم يكن للصغير أحد من محارمه النساء (شامی ۵-۲۶۴)

(ثم العصبات بترتيبهم) يعنى إن لم يكن للصغير أحد من محارمه من النساء واختصم فيه الرجال فأولاهم به أقربهم تعصيباً'' (البحر ۴-۲۸۶)

پھر جس شخص کو حق پرورش حاصل ہے اگر بچہ کو اسے دینے میں آئندہ چل کر خرابی کا اندیشہ ہو تو اس صورت میں ایسے شخص کو سپرد کیا جائے گا جہاں ہر طرح کا اطمینان ہو، "والحاصل أن الحاضنة إن كانت فاسقة فسقاً يلزم منه ضياع الولد عندها سقط حقها" (الشامی ۵/ ۲۵۴)۔

(۱) حق پرورش کی مدت:

حق پرورش لڑکے میں صرف سات سال تک رہتا ہے، جب لڑکا سات سال سے زیادہ کا ہو جائے تو باپ بچے کو لے سکتا ہے اور اگر لڑکی ہے تو اس کی پرورش کا حق نو سال تک رہتا ہے، اگر نو سال سے زیادہ عمر کی ہو جائے تو باپ اسے لے سکتا ہے (تفصیل کے لئے دیکھئے: فتاوی شامی ۵/ ۲۶۸)۔

عمر کے جس مرحلے میں ماں باپ کو پرورش کا اولین حقدار سمجھا گیا ہے اگر بچوں کو ان کے حوالے کرنے میں تربیتی، جسمانی، یا نفسانی پہلو سے مضرت کا اندیشہ ہو تو ماں باپ کو حق پرورش سے محروم کیا جا سکتا ہے۔

(۲) حق حضانت سے محرومی کی صورتیں:

(۱) ماں مرتدہ ہو جائے، (۲) فاحشہ یا مغنیہ ہو جائے، (۳) چوری کرنے والی ہو، (۴) نوحہ کرنے والی ہو، (۵) یا بچہ سے لاپرواہ ہو جائے کہ گھر سے ہر وقت نکلتی رہتی ہو مثلاً وہ غاسلہ ہو، قابلہ ہو اور بچہ کو یونہی گھر پر بغیر کسی نگہداشت کے چھوڑ جاتی ہو، (۶) بچہ کی ماں کسی ایسے شخص سے نکاح کرے جو بچہ کا محرم نہ ہو، (۷) والد کے تنگ دست ہونے کے وقت بغیر اجرت کے حضانت کے لئے تیار نہ ہو۔

مذکورہ صورتوں میں ماں کو حق پرورش سے محروم کر دیا جائے گا، کیونکہ اس بچہ کا تربیتی پہلو سے نقصان ہے کہ ماں کے پاس رہنے سے بچہ کے اندر بھی یہ بری عادتیں پیدا ہو جائیں گی اور اگر ماں نے دوسرا نکاح بچہ کے غیر محرم سے کر لیا تو وہ عورت اپنے شوہر کی خدمت میں رہے گی اور بچہ پر توجہ کم ہوگی اور شوہر بھی زیادہ شفقت سے پیش نہیں آئے گا جس سے اس کے جسمانی پہلو سے مضرت کا اندیشہ ہے، اور اگر کوئی عورت نہ ملے جو بچہ کی پرورش کر سکے تو حق حضانت باپ کو حاصل ہوگا۔

''وتثبت للأم النسبية والكتابية أو بعد الفرقة إلا أن تكون مرتدة أو فاجرة فجوراً يضيع الولد به كزنا وغناء وسرقة ونياحة، أو غير مأمونة ذكره المجتبى بأن تخرج كل وقت وتترك الولد ضائعاً .... أو متزوجة بغير

---

[1] مفتی واستاذ حدیث جامعہ اسلامیہ عربیہ، جامع مسجد امروہہ۔

محرم الصغير أو أبت أن تربيه مجاناً'' (درمختار مع الشامی ۵۔ ۲۵۳ مکتبہ زکریا دیوبند)۔

اسی طرح والد میں اگر مذکورہ عیوب پیدا ہوجائیں تو وہ بھی حق حضانت سے محروم ہوجائے گا، البتہ اگر کسی اجنبیہ عورت سے شادی کرلے تو حق حضانت ساقط نہیں ہوگا (دیکھئے: فتاوی ہندیہ ۱/ ۵۹۲، البحر الرائق ۴/ ۲۸۵)۔

مشتہاۃ بچی جس کے ماں باپ نہ ہوں تو اس کے چچازاد بھائیوں کو تو حق حضانت حاصل ہی نہیں ہے، اگر اس کے بھائیوں اور چچاؤں پر بھروسہ نہ ہو تو قاضی یا ذمہ دار حضرات اس کو ایک امانت دار، عادل اور ثقہ عورت کے حوالے کریں گے جو بالغ ہونے تک اس کی نگہداشت کرے گی۔

''حتى لو كانت الإخوة والأعمام غير مأمونين على نفسها أو مالها لا تسلم إليهما وينظر القاضي امرأة ثقة عدلة أمينة فيسلمها إليها إلى أن تبلغ'' (شامی ۵/ ۲۶۴)۔

''ثم العصبات بترتيب الإرث فيقدم الأب ثم الجد ثم الأخ الشقيق .... سوى فاسق ومعتوه وابن عم لمشتهاة وهو غير مأمون'' (شامی ۵/ ۲۶۳)۔

بچہ کس کے حوالے کیا جائے؟

جب ماں یا باپ کا حق حضانت ساقط ہوجائے تو اس کے بعد والے ولی کے حوالے کیا جائے گا اور درجہ میں سب اولیاء برابر ہوں تو بچہ اس ولی کے حوالے کیا جائے جو متقی اور پرہیزگار ہو یا پھر وہ عمر رسیدہ ہو "وإذا اجتمعوا فالأورع ثم الأسن" (شامی ۵/ ۲۶۴)۔

(ب) (۱) اسلام میں بچوں کے حق تعلیم وتربیت کے بارے میں بنیادی ہدایات یہ ہیں کہ جب پیدا ہو تو اس کو نہلا کر داہنے کان میں اذان دے اور بائیں کان میں اقامت کہی جائے:

''ہرگاہ طفل پیدا شود ناس بریدہ غسل دادہ پارچہ پوشانند واز پارچہ زرد احتراز نمایند ومسنون است کہ بگوش راست اذان وبگوش چپ اقامت مثل اذان واقامت نماز گویند (مالابد منہ/ ۱۷۵)۔

کلمہ شہادت اور آیات توحید اس کو سکھائیں، نماز سکھائیں تا کہ سات برس کا ہونے تک نماز سیکھ لے اور جب سات برس کا ہوجائے تو نماز کی تاکید کریں اور دس برس کا ہوجائے تو نماز نہ پڑھنے پر تنبیہ کریں:

"قال رسول اللہ ﷺ: مروا أولادكم بالصلاة وهم أبناء سبع سنين واضربوهم عليها وهم أبناء عشر سنين" (مشکوۃ/ ۵۸)، رہن سہن میں تمیز سکھائیں بڑوں کا ادب، چھوٹوں پر شفقت کی تلقین کریں، کھانے پینے کپڑے وغیرہ جملہ امور میں طریقہ سنت پر چلائیں، حسن، بخل، حرص، تکبر، دھوکا، فریب، جھوٹ، غیبت، بہتان وغیرہ اخلاق رزیلہ سے بچائیں، ایثار، سخاوت، تواضع، متانت، صبر وتحمل، توکل وغیرہ کا عادی بنائیں، علم دین سکھائیں، اکل حلال کا انتظام کریں، غرض ہر شعبہ زندگی درست کرنے کی فکر وکوشش کریں (فتاوی محمودیہ ۲۹/ ۹۸ مکتبہ محمودیہ میرٹھ)۔

''العلم ثلاثة: آية محكمة أو سنة قائمة أو فريضة عادلة وما سوى فهو فضل'' (مشکوۃ/ ۳۵)۔

"وقال مجاهد: قوا أنفسكم وأهليكم بتقوى الله وأدبوهم" (بخاری شریف ۲/ ۷۳۰) (اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو خدا کے خوف اور تقوی کی تلقین کرو اور انہیں ادب واخلاق سکھاؤ)۔

(۲) علم دین ایک مسلمان کے لئے ریڑھ کی ہڈی کی طرح ہے، بغیر علم دین کے آدمی کا مشیت خداوندی کے مطابق زندگی گزارنا مشکل ہے، سب سے پہلے جو آیت نازل ہوئی اس کا تعلق علم ہی سے ہے، "اقرأ باسم ربك الذي خلق" (علق: ۱)، اللہ کے رسول ﷺ نے علم دین کے حصول پر بہت زور دیا ہے اور اپنے علم دین کا سیکھنا جس سے وہ بآسانی احکام خداوندی کو بجالا سکے فرض قرار دیا ہے: "طلب العلم فريضة على كل مسلم" (ابن ماجہ/ ۲۰)، لہذا مسلمانوں کو چاہئے کہ اپنے بچوں کو ضروریات دین سے واقف کرائیں اور تعلیمات اسلامیہ سے بہرہ ور کرائیں، جن بچوں میں علوم دینیہ کی رغبت ہو انہیں دینی اداروں میں داخل کرنا چاہئے، علماء کرام اور اسلام نے علوم دنیویہ کو شجر ممنوعہ قرار نہیں دیا، بلکہ قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے اور اس کی توصیف فرمائی ہے، لیکن دنیویہ علوم فرض اور واجب کے دائرہ میں نہیں آتے بلکہ ان کی حیثیت فضیلت اور تطوع کی ہے۔

"العلم ثلاثة: آية محكمة ..." (مشکوۃ ۱/۳۵)، اس حدیث کے ذیل میں ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں اور جو علوم ان کے علاوہ ہیں جیسے علم عروض، علم طب، انجینئرنگ اور علم نجوم تو ان کی حیثیت فضیلت اور تطوع کی ہوگی (مرقاۃ ۱/۴۵۶)۔

فتاوی ہندیہ میں ہے کہ علم کا طلب کرنا فرض ہے اور جس علم کی ایک آدمی کو ضرورت پڑتی ہے اس کا سیکھنا فرض ہے، جیسے وضوء، نماز کے احکام، بنیادی شرائع احکام کا علم، رہا معاش کا علم اور اس کے چیزوں کا علم تو وہ فرض نہیں ہے۔ (ہندیہ ۵/۲۷۷ اتحاد)۔

خلاصہ یہ ہے کہ علم دین جو ایک مسلمان کے لئے ضروری ہے، اس کے حصول کے بعد دنیوی علوم حاصل کرنا ممنوع نہیں ہے بلکہ اس کی بھی اجازت ہے، لیکن شریعت کے دائرہ میں رہتے ہوئے اور اس کے احکام کی پابندی کرتے ہوئے، چونکہ یہ دور سائنس اور ٹکنالوجی کا ہے تو ایک مسلمان کے لئے جدید تعلیم کا حصول بھی ضروری ہوگا، تاکہ مسلمان زندگی کے میدان میں پیچھے نہ رہے اور احساس کمتری کا شکار نہ ہوں اور اس کے معاش کا مسئلہ بھی حل ہوجائے، البتہ لڑکیوں کو اتنے علوم عصریہ سکھلانا کہ حساب وغیرہ سے واقف ہوجائیں کافی ہے، کیونکہ ان کے ذمہ نہ ملازمت کا حصول ہے اور نہ معاش کا مسئلہ ہے، "وعلى المولود له رزقهن و كسوتهن بالمعروف" (سورہ بقرہ: ۲۳۳)۔

(۳) حکومت کی طرف سے لازم کی گئی تعلیم، ضروری دینی تعلیم میں رکاوٹ نہ بنے تو مسلمان اسے حاصل کر سکتے ہیں۔

اگر حکومت کسی سطح تک تعلیم کو بچوں اور بچیوں کے لئے لازم قرار دے دے تو دیکھا جائے گا کہ یہ اسلامی تعلیمات سیکھنے میں رکاوٹ تو نہیں بن رہا ہے اگر اس کے التزام سے بچے علوم دینیہ سے محروم ہو سکتے ہیں تو اس کا التزام مسلمانوں کے ضروری نہیں ورنہ دین کی بنیادی ضروریات سے متعلق علم حاصل کرنے کے بعد کسی بھی تعلیم خواہ عصری علوم ہی کیوں نہ ہو حاصل کرنے کی اجازت ہے، بلکہ اکثر علوم ایسے ہیں کہ آدمی نیک نیت کے ساتھ ان کے ذریعہ اللہ کی خوشنودی حاصل کرسکتا ہے۔ اور اس کے تابع ہوکر دنیاوی منافع بھی حاصل ہوجائیں گے، البتہ لڑکیوں کے لئے اتنا سیکھنا جائز ہے کہ وہ حساب وکتاب جان لیں فقط۔

دنیاوی علم حاصل کرنے کی شرطیں:

اسلامی شریعت میں جدید اعلی تعلیم کا حصول چند شرطوں کے ساتھ مباح ہے: (۱) کسی حرام کا ارتکاب لازم نہ آئے، (۲) وہ علوم کسی ایسے امر سے متعلق نہ ہوں جن کی شریعت میں ممانعت آئی ہے جیسے سحر، تصویر سازی، رقص وسرور، میوزک سانگ (گانا بجانا)، (۳) وہ معرفت خداوندی میں معین ومددگار ہوں اس میں رکاوٹ نہ ہوں جیسا کہ سورہ علق کی ابتدائی آیتوں کا مفہوم ہے، (۴) وہ علوم عصری خشیت خداوندی اور تقوی میں معین ومددگار ہو، ارشاد ربانی ہے: "إنما يخشى الله من عباده العلماء" (سورہ فاطر: ۲۸) (اللہ تعالی سے اس کے بندوں میں سے وہ ڈرتے ہیں جو صاحب علم ہیں)۔

حضرت عبداللہ بن مبارک کا قول ہے: "لا يقع موقع الكسب على العيال شئى ولا الجهاد فى سبيل الله" (مقدمہ کتاب الزہد)۔

بعض علوم عصریہ کا حصول بھی فرض کفایہ ہے:

ایک دور ایسا گزرا ہے کہ مسلمان علوم عصریہ میں بھی دنیا کی امامت کر رہے تھے اور ان علوم وفنون میں اپنا لوہا منوایا تھا جب علم وہنر کا نام لیا جاتا ہے تو ہم فخریہ کہتے ہیں کہ ان میں ہمیں اولیت حاصل ہے، بغداد، قرطبہ، غرناطہ اور قاہرہ علوم وفنون کے مرکز رہے ہیں، اہل یورپ ان کی درسگاہوں میں تعلیم پاتے تھے، پوپ سادس وثانی نے اپنی تعلیم قرطبہ کی اسلامی درسگاہ میں پائی (مسلمانوں کے عروج وزاول کے اسباب ۷۲-۷۳)۔

آج عرب ممالک کو خاصا مالدار سمجھا جاتا ہے اور یہ مالداری پیٹرول کے سبب ہے، لیکن کتنے افسوس کا مقام ہے کہ نہ تو ان کے پاس یہ صلاحیت ہے کہ وہ نئے چشموں کو تلاش کرسکیں اور نہ یہ اہلیت ہے کہ نکلتے ہوئے پیٹرول کی صفائی کا کارخانہ قائم کرسکیں، افغانستان وغیرہ کئی ممالک میں ایسے بیش قیمت معدنیات ہیں جن سے ان کی تقدیر بدل سکتی ہے۔

ہمارے پاس نفری قوت مال ودولت اور معدنیات کی کمی نہیں ہے، اگر کمی ہے تو تکنیکی صلاحیتوں کی ہے، اگر یہ کمی نہ ہوتی تو آج مسلمان اور خصوصاً عرب نت نئے ہتھیاروں، جدید ترین اسلحوں اور تکنیکی صلاحیتوں سے لیس ہوتے تو اسرائیل جیسی معمولی ریاست ان کو آنکھ دکھانے کی ہمت

کرسکتی تھی؟ حالانکہ قرآن میں مسلمانوں کو صاف صاف حکم دیا گیا ہے: "وأعدوا لهم ما استطعتم من قوة ومن رباط الخيل ترهبون به عدو الله وعدو كم لا تعلمونهم والله يعلمهم" (سورہ انفال) (اور جس قدر تم سے ہوسکے طاقت (ہتھیاروں) سے اور پلے ہوئے گھوڑوں سے سامان درست رکھوں کہ اس کے ذریعہ سے تم اپنا رعب جمائے رکھو ان پر جو اللہ کے اور تمہارے دشمن ہیں، تم ان کو نہیں جانتے اللہ تعالی ان کو جانتا ہے)۔

لہذا مسلمانوں میں ایک ایسی جماعت ہونی چاہئے جو ان علوم عصریہ میں مہارت حاصل کرے جن سے یہ ضرورت پوری ہوسکے، اسی طرح وہ علوم عصریہ جن کا تعلق اصلاح معاش، کسب حلال اور اصلاح بدن سے ہے مثلاً تجارت وعلم طب تو ان کا سیکھنا اور ان میں مہارت حاصل کرنا فرض کفایہ ہے (شامی ۱/ ۱۲۲ زکریا، مطلب فی فرض الکفایہ)۔

(۴) جنسی تعلیم شریعت کی نظر میں:

علی الاطلاق ممنوع نہیں ہے بلکہ ضرورت کے وقت اس کی بھی تعلیم دی جاسکتی ہے اور دی گئی ہے، چنانچہ جب حضرت عمرؓ کے زمانے میں اکسال سے غسل واجب ہونے اور نہ ہونے میں اختلاف ہوگیا تو حضرت عمرؓ نے ایک صحابیؓ کو حضرت عائشہؓ کے پاس بھیجا، تاکہ معلوم کریں کہ اس بارے میں حکم کیا ہے تو حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ غسل واجب ہے۔

"عن عائشة رضى الله عنها قالت: إذا جاوز الختان الختان وجب الغسل فعلته أنا ورسول الله ﷺ فاغتسلنا" (ترمذی ۱/ ۳۰)۔

اس سے معلوم ہوا کہ ضرورت کے وقت اس طرح کے مسئلہ کے بارے میں معلوم کرنا اور بتلانا ممنوع نہیں ہے، ایک دوسری حدیث میں بھی اس طرح کا مسئلہ مذکور ہے:

"عن أبي هريرة عن النبي ﷺ قال: إذا قعد بين شعبها الأربع وألزق الختان بالختان فقد وجب الغسل" (ابوداؤد ۱/ ۲۸)۔

اللہ تعالی نے انسان کی فطرت ایسی بنائی ہے کہ بچہ یا بچی جیسے جیسے بڑے ہوتے ہیں انہیں جنسی ضروریات کا علم خود بخود ہوجاتا ہے، لیکن بعض باتیں ایسی بھی ہیں کہ ان کا علم نہیں ہو پاتا تو اس کے بارے میں اسلام کی ہدایت یہ ہے کہ ان باتوں کو عورتیں قریبی رشتہ دار یا متقی پرہیزگار عورتوں سے معلوم کریں اگر ان کو معلوم ہوں، یا اپنے شوہروں سے معلوم کریں اگر وہ جانتے ہوں، ورنہ اپنے شوہروں کے ذریعہ علماء کرام سے معلوم کرالیں اور اگر یہ بھی نہ ہوسکے تو پردہ کا اہتمام کرتے ہوئے علماء کرام سے رجوع کریں۔

لیکن موجودہ دور میں جو جنسی تعلیم کا طریقہ ہے یعنی پرائمری اور مڈل اسکول کے سطح کے طلبہ اور طالبات کو جنسی تعلیم دینا اور انہیں صنفی اعضاء کے وظائف کے بارے میں بتلانا یہ دراصل مغربی ایجنڈہ ہے، یہ نہ صرف اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے بلکہ خود ہماری ملکی روایات اور مشرقی اقدار کے بھی خلاف ہے، غیر قانونی تعلیمات کو محفوظ طریقہ پر انجام دینا یہ تو گناہ اور برائی کی دعوت ہے جو اسلامی نقطہ نظر سے قطعاً جائز نہیں ہے، نیز یہ سماج کے لئے اخلاق اور صحت دونوں ہی اعتبار سے تباہ کن ہے۔

(۵) بچوں اور بچیوں کے نکاح کے سلسلہ میں شریعت کی طرف سے عمر کی کوئی قید نہیں ہے، والدین بچوں کا نکاح نابالغی میں بھی کرسکتے ہیں اور بالغ ہونے کے بعد بھی، البتہ شریعت نے نکاح کے کچھ درجات متعین کئے ہیں، بعض حالات میں نکاح کو فرض قرار دیا ہے، یہ اس وقت ہے جب کہ شادی کے بغیر گناہ میں مبتلا ہونے کا یقین ہو، اگر گناہ میں مبتلا ہو یا ظن کے درجے میں ہو تو اس وقت واجب ہے، بشرطیکہ مہر اور نان ونفقہ پر قادر ہو، اگر یقین ہو کہ نکاح کے بعد ظلم وناانصافی میں مبتلا ہوجائے گا، حقوق زوجیت ادا نہ کرسکے گا تو نکاح کرنا حرام اور اگر ظلم وناانصافی میں مبتلا ہوجائے گا، حقوق زوجیت ادا نہ کرسکے گا تو نکاح کرنا حرام ہے اور اگر ظلم وناانصافی کا گمان ہو تو مکروہ تحریمی ہے اور حالت اعتدال میں، سنت مؤکدہ ہے اگر ان درجات کا لحاظ کیا جائے تو آدمی افراط وتفریط سے بچ سکتا ہے۔

"وللولی نکاح الصغیر والصغیرۃ جبراً ولو ثیباً لزم النکاح" (درمختار مع انسانی ۱/ ۱۹۲)۔

"وأما صفته فهو أنه في حالة الاعتدال سنة مؤكدة وحالة التوقان واجب وحالة خوف الجور مكروه" (ہندیہ ۱/۲۳۲ اتحاد)

نکاح کے سلسلہ میں ایک حق یہ ہے کہ بالغ لڑکوں اور لڑکیوں کی رائے معلوم کر لی جائے، جوان کی رضامندی کو نظر انداز کرتے ہیں تو یہ بھی درست نہیں ہے، کیونکہ اگر لڑکی لڑکے کے مزاج کے مطابق نہیں ہے تو طلاق کی نوبت آجاتی ہے اور کبھی لڑکی خلع لینے پر مجبور ہو جاتی ہے، بہر حال رضامندی کے بغیر رشتہ ازدواج میں باندھنا گناہ ہے، ہاں اگر وہ ماں باپ کے اختیار کردہ رشتہ پر رضامندی ظاہر کرتے ہوں تو اجازت کی ضرورت نہیں۔

"لا يجوز نكاح أحد على بالغة صحيحة العقل من أب أو سلطان بغير إذنها بكراً كانت أو ثيباً فإن فعل ذلك فالنكاح موقوف على إجازتها فإن أجازته جاز وإن رده بطل" (ہندیہ ۱-۲۵۳ اتحاد)۔

آج کل اعلیٰ تعلیم کے شوق نے والدین کو اس فریضہ سے غافل کر رکھا ہے، لڑکوں اور لڑکیوں کی عمر کالج اور یونیورسٹی کے چکر میں ڈھل جاتی ہے اور تیس پینتیس برس تک پہنچ جاتی ہے، کتنے ہی خاندان اس سیلاب میں ڈوب چکے ہیں اور کتنے ہی لڑکے لڑکیاں غلط راستہ پر چل پڑے ہیں، حدیث میں اس کی ممانعت آئی ہے کہ لڑکی جوان ہو جائے اور بلا کسی عذر کے یونہی بغیر شادی کے رہے، اب اگر خدانخواستہ اس سے کوئی گناہ سرزد ہو جائے تو اس کا وبال والدین پر ہوگا۔

"اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس کے یہاں بچہ پیدا ہو تو اس کا اچھا نام رکھنا چاہئے اور اس کو ادب سکھلانا چاہئے پھر جب وہ بالغ ہو جائے تو چاہئے کہ والدین اس کا نکاح کر دیں، اگر اس کا نکاح نہیں کیا اور وہ گناہ میں مبتلا ہو گیا تو اس کا گناہ اس کے باپ پر ہوگا" (مشکوۃ ۲/۲۷)۔

لہذا شریعت کا حکم یہ ہے کہ جب لڑکا اور لڑکی بالغ ہو جائیں تو فوراً ان کا نکاح کر دیا جائے تا کہ افراط وتفریط سے محفوظ ہو سکیں۔

(و)(۱): بچوں کے مزدوری کے سلسلہ میں اسلام کا موقف:

یہ ہے کہ بچوں کو اس سے بچایا جائے اور اس کے بجائے ان کی تعلیم وتربیت کا انتظام کیا جائے کیونکہ تعلیم دلوانا والدین کی ذمہ داری ہے، "بخاری شریف" میں ہے:

"كلكم راع وكلكم مسئول عن رعيته"۔

(۲) والدین بچوں کے نگہبان بھی ہیں، لہذا ان کی صحیح تربیت کریں، مزدوری میں لگنے سے وہ حصول علم سے یکسر محروم ہو جائیں گے حالانکہ ضروریات دین کا سیکھنا فرض ہے، "طلب العلم فريضة على كل مسلم" (ابن ماجہ/۲۰)۔ علم معاشرہ کو ایک خوشگوار اور تابناک مستقبل کی طرف لے جاتا ہے اور غلط رسم ورواج کے خلاف ایٹمی ہتھیار ثابت ہوتا ہے۔

(۳) والدین اولاد سے اس حد تک کام لے سکتے ہیں جس میں ان کا کسی قسم کا نقصان نہ ہو، بلکہ وہ ان کے لئے مفید ہو مثلاً بچوں سے کہا جائے کہ وہ اپنا کام خود کریں، حدیث میں آتا ہے کہ حضرت انسؓ نے کم عمری میں آپ کی خدمت کی ہے، لیکن آپ نے کبھی ایسا کام نہیں لیا جو مشقت بھرا ہو، اگر غلطی ہو گئی تو ڈانٹا بھی نہیں۔

اپنی ملازمت بڑھانے کے لئے بچوں سے مزدوری کرانا ان کے مستقبل کو پامال کرنا ہے، اور سنہرے تعلیمی مواقع سے محروم کرنا ہے، لہذا معیشت میں اضافہ کے لئے مزدوری کرانا جائز نہیں۔

(۴) البتہ مجبوری کے وقت بچوں سے مزدوری کرائی جا سکتی ہے، بشرطیکہ ان کے حقوق واجبہ ضائع نہ ہوں، یعنی ان کی تعلیمی رعایت کے ساتھ اور ان کی جسمانی نشوونما کی رعایت کے ساتھ مزدوری کرائی جا سکتی ہے اور ان کو اتنا ہنر والے کام بھی سکھا دیا جائے جس سے وہ ضرورت کے وقت چار پیسے حاصل کر سکیں اور اپنا گزارہ کر سکیں (بہشتی زیور ۴/۴۳ بحوالہ محمودیہ)۔

(ہ) شریعت میں جرائم کا ارتکاب کرنے پر حدود مقرر ہیں، اور تعزیری سزائیں بھی مقرر ہیں، اگر نابالغ لڑکوں اور لڑکیوں سے جرائم سرزد ہوں، مثلاً قتل وغارت گری، چوری زنا بالجبر، زنا بالرضا، وغیرہ تو ان پر حد تو نہیں ہے، البتہ ان پر تعزیری سزائیں عائد کی جائیں گی تاکہ وہ جرائم کا ارتکاب کرنے سے باز آجائیں. "إن الحد لا يجب على الصبي والتعزير يشرع عليه" (تاتارخانیہ ۶ / ۳۹۸)۔

''واتفق الأئمة المذاهب على أنه لا يجب الحد على الصبي والمجنون.... لقوله عليه السلام: رفع القلم عن ثلاث: عن الصبي حتي يكبر وعن النائم حتي يستيقظ وعن المجنون حتي يفيق'' (الفقہ الاسلامی ۵ / ۷۷۴)، البتہ قتل کی صورت میں دیت واجب ہوگی، اگر اس کے پاس مال ہو تو اس کے مال سے واجب ہوگی اور اگر اس کے پاس مال نہ ہو تو عاقلہ پر دیت واجب ہوگی، اور قتل خطا کی صورت میں کفارہ واجب نہیں۔

''ولا قصاص فيما بين الصبيان وعمد الصبي وخطأه سواء عندنا حتى تجب الدية في الحالين فيكون ذلك في ماله في فصل العمد ولا كفارة عليه في الخطأ عندنا'' (ہندیہ ۶-۴)۔

اور یہ تعزیری سزا ارتکاب جرم کے بقدر ہوگی اور یہ قاضی کی رائے پر موقوف ہوگا کہ وہ جرم اور مجرم کے احوال میں غور وفکر کرکے سزا تجویز کرے خواہ قتل ہی کیوں نہ ہو۔

''أما الحنفية فقالوا: إن التعزير إذا كان حقاً شخصيا للإنسان فهو واجب لا عفوفيه لأن حقوق العباد ليس للقاضي إسقاطها وإن كان حقا لله تعالى فهو مفوض إلى رأى الإمام إن ظهر له المصلحة فيه أقامه وإن ظهر عدم المصلحة أو علم انزجار الجاني بدونه يتركه أي أن العفو فيه للإمام'' (الفقہ الاسلامی ۶-۱۹۶)۔

بچوں کے جرائم کے انسداد کے لئے شریعت نے ہدایت دی ہے کہ والدین اپنے بچوں کی نگہداشت کریں، ان کو اخلاق حسنہ اور دین سکھائیں اور ان کی صحیح تربیت کریں، ارشاد باری تعالی ہے: "يأيها الذين آمنوا قوا أنفسكم وأهليكم ناراً وقودها الناس والحجارة"، اس آیت میں اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو دوزخ کی آگ سے بچانے کا حکم ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ لوگ خود بھی ایسے گناہ سے بچیں جو ان کو جہنم تک لے جانے والے ہوں اور اپنے گھر والوں کو بھی ایسے کاموں سے بچائیں، اس سے معلوم ہوا کہ بچوں کی تربیت اور نگہداشت پر پوری توجہ دینی چاہئے، صالح زندگی گزارنے کی ترغیب بھی دیتے رہیں، نیز عقائد میں پختگی پیدا کرنے کی تعلیمات دی جائے، موجودہ زمانے میں بچوں کی نگہداشت اور زیادہ ضروری ہے، اس لئے کہ اس زمانے میں بچوں کو بگاڑنے والے بہت سے سامان چپہ چپہ میں موجود ہیں، ٹیلی ویژن، ریڈیو، وی سی آر، انٹرنیٹ وغیرہ، جب بچہ قدرے ہوشیار ہوجاتا ہے اور والدین اور بڑوں کو ٹی وی دیکھتے ہوئے دیکھتا ہے تو وہ بھی ٹی وی دیکھنے لگتا ہے، والدین خود تو کیا بچتے اپنی اولاد کو بھی اس فحش کے مناظر دیکھنے سے نہیں روکتے، طرح طرح کے فحاشیت پر مبنی مناظر ٹی وی پر نشر ہوتے ہیں، اور بچے اس کو دیکھتے ہیں، رفتہ رفتہ اس کی وجہ سے وہ اپنے آپ کو ان فلم اسٹاروں کے مانند بنانے کی خواہش ان کے دل میں پیدا ہوجاتی ہے، پھر وہ جرائم کا ارتکاب کرتے ہیں، ضرورت اس بات کی ہے کہ بچوں کو گھر کے اندر بھی اور گھر کے باہر بھی انتہائی احتیاط کے ساتھ نگرانی کی جائے اور ان کی نفسیات کو ذہن میں رکھ کر ان کی اصلاح وتربیت کے لئے مثبت تدابیر اختیار کی جائیں (اولاد کی پرورش میں مشکلات اور ان کا حل ۲۱۹)۔

(و): انسانوں کو جرائم سے روکنے اور مجرموں کو زجر وتوبیخ کے لئے ضرورتاً قید وبند کی اجازت ہر قانون وشریعت میں دی گئی ہے، اصلاح کی ضرورت کے پیش نظر نصوص میں بھی اس کی اجازت دی گئی ہے، ارشاد ربانی ہے: "إنما جزاء الذين يحاربون الله ورسوله ويسعون في الأرض فساداً أو يقتلوا أو يصلبوا أو تقطع أيديهم وأرجلهم من خلاف أو ينفوا من الأرض" (یہی سزا ہے ان لوگوں کو جو لڑتے ہیں اللہ سے اور اس کے رسول سے اور دوڑتے ہیں ملک میں فساد کرنے کو کہ ان کو قتل کیا جائے یا سولی چڑھائے جاویں یا کاٹے جاویں ان کے ہاتھ اور پاؤں مخالف جانب سے یا دور کردیئے جائیں اس جگہ سے) (معارف القرآن ۳ / ۱۱۴، ادارۃ المعارف کراچی)۔

مجرم کو قید میں ڈالنا بھی ان کا زمین سے نکالنا ہے، امام اعظم ابوحنیفہؒ کی یہی رائے ہے (معارف القرآن ۳ / ۱۲۲)۔

لیکن قید میں ڈالے جانے کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ وہ اب ہر ناروا سلوک کا مستحق ہوگیا اور دیگر حقوق انسانی کے قابل نہیں رہا، بلکہ وہ تمام

انسانوں کی طرح اپنے مذہبی حقوق نیز جسمانی حقوق، اسی طرح سماجی حقوق یا اخلاقی حقوق کا برابر طور پر مستحق رہتا ہے، خلاصہ یہ ہے کہ جرم کتنا ہی سنگین ہو قیدیوں کے انسانی حقوق برقرار رہیں گے، لہذا مجرمانہ ذہن رکھنے والے بچوں کی سرزنش اور اصلاح کے لئے جیلوں میں ان سے پر مشقت کام لینا صحیح نہیں ہے، بلکہ ان کو ایسی سزا دی جائے کہ جس سے ان کو ذہنی اور جسمانی نقصان نہ ہو اور یہ قاضی کی رائے پر موقوف ہوگا جیسی مصلحت سمجھے ویسی ہی سزا دے، البتہ اگر بچہ کی عمر ۱۰ سال سے کم ہو تو اس صورت میں اس پر تعزیر عقوبت بھی جاری نہیں کی جائے گی، البتہ وہ تعزیر تادیبی کا مستحق ہوگا، "فيعزر كل عاقل ذكراً أو أنثى مسلماً أو كافراً بالغاً أو صبياً عاقلاً لأن هؤلاء غير الصبي من أهل العقوبة أما الصبي فيعزر تاديباً لا عقوبة" (الفقہ الاسلامی ۶/ ۱۹۲)۔

"أما الحنفية فقالوا إن التعزير إذا كان حقا لله تعالى فهو مفوض إلى رأى الإمام إن ظهر له المصلحة فيه أقامه وإن ظهر عدم المصلحة أو علم انزجاراً الجانى بدونه يتركه أى أن العفو فيه للإمام" (الفقہ الاسلامی ۶/ ۱۹۶)۔

قاضی حسب ذیل امور میں سے کسی کے ذریعہ بھی سزا دے سکتا ہے (الفقہ الاسلامی ۶/ ۱۹۳)۔

"تعزیر بقدر جنایت ہوتی ہے اور جانی (جنایت کرنے والے) کے احوال کے مطابق ہوتی ہے، حاکم کے اجتہاد سے یا تو سخت کلامی سے یا قید سے یا پٹائی سے یا اعراض کرنے اور توجہ ہٹانے سے یا اس کو مجلس سے اٹھانے اور بھگانے اور اس کو ظالم نالائق جیسے الفاظ کہہ کر بے عزت کر کے اور اس کا چہرہ کالا کرنے اور اس کے گناہ کا اعلان کرانے اور پٹائی کے ساتھ اس کو گھمانے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے اور اس کو کھانے، پینے، وضو کرنے اور نماز پڑھنے سے نہیں روکا جائے گا اور تعزیر میں داڑھی کاٹنا یا کوئی عضو کاٹنا اور زخمی کرنا حرام ہے اور اس کو سخت سزا تعزیراً دی جاسکتی ہے اور مناسب ہے اس کو لوگوں میں مشہور کر دینا" (الفقہ الاسلامی ۶، ۱۹۳)

اسی طرح نابالغوں اور بالغوں کو الگ الگ قید خانہ میں رکھا جائے گا، ورنہ اور مفاسد پیدا ہوں گے اور ان کی اصلاح کے لئے یہ تدابیر اختیار کی جائیں گی کہ ان کے قید کے زمانہ میں تعلیم وتربیت کا انتظام کیا جائے اور ان کو کوئی ہنر بھی سکھا دیا جائے، اس سے ان کی بہتر اصلاح ہو سکے گی اور مابعد قید وہ بہتر طور پر شہری بن کر زندگی گزار سکیں گے۔

(ز) جو بچے والدین سے بچھڑ جانے یا ولادت کے بعد ماں باپ کی طرف سے پھینک دیئے جانے یا کسی اور سبب سے بے سہارا ہو جاتے ہیں اسلام میں ان کے تعلیم وتربیت کے بارے میں یہ ہدایات ہیں کہ اگر کہیں بچہ پڑا ہوا ملے تو اس کو اٹھا لینا مستحب ہے، اس لئے کہ اٹھا لینے میں اس کو زندگی بخشنا ہے اور یہ افضل اعمال میں سے ہے، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

"ومن أحياها فكأنما أحيا الناس جميعاً" (سورہ مائدہ: ۳۲)، حدیث میں ہے: "أن رجلاً أتى سيدنا علياً رضى الله عنه بلقيط فقال هو حر ولأن أكون وليت من أمره مثل الذى وليت أنت كان أحب إلى من كذا وكذا، عد جملة من أعمال الخير فقد رغب فى الالتقاط وبالغ فى الترغيب فيه حيث فضله على جملة من أعمال الخير على المبالغة فى الندب إليه" (بدائع ۵/ ۲۹۱)۔

لقیط کے ہلاک ہونے کا اندیشہ ہو تو فرض کفایہ ہے، اور اگر نہ اٹھانے میں اس کے ہلاک ہونے کا غالب گمان ہو تو اٹھانا فرض کفایہ ہے، جیسے اگر کوئی شخص کسی اندھے کو دیکھے کہ وہ کنویں میں گر جائے گا تو اس کو کنویں میں گرنے سے بچانا فرض ہوگا (البحر الرائق ۵/ ۳۴۱)۔

لقیط آزاد کے حکم میں ہوگا:

اور وہ آزاد ہوگا اور آزادی کے تمام احکام اس پر نافذ ہوں گے، اس لئے تمام اولاد آدم میں اصل آزادی ہے، "وهو حر لأن الأصل فى بنى آدم هو الحرية فيترتب عليه أحكام الأحرار" (البحر ۵/ ۳۴۱)۔

لقیط پر خرچ کرنا حکومت کی ذمہ داری ہے، اور اس کا نفقہ بیت المال سے جاری ہوگا، اس لئے کہ وہ کمانے سے عاجز ہے، نہ اس کے پاس مال ہے، نہ کوئی رشتہ دار ہے تو اپاہج کے مشابہ ہے، "ونفقته من بيت المال وهو المروى عن عمر وعلى رضى الله عنهما ولأنه مسلم عاجز عن

الکسب ولا مال له ولا قرابة فأشبه المقعد الذی لا مال له ولا قرابة" (البحر ۵/ ۲۴۲)، اور اگر اٹھانے والا خود خرچ کر رہا ہے قاضی کی اجازت کے بغیر تو اس کی جانب سے تبرع مانا جائے گا اور اگر قاضی کی اجازت سے خرچ کر رہا ہے تو بالغ ہونے کے بعد بچے کے مال سے طلب کر سکتا ہے (البحر ۵/ ۲۴۲)۔

لقیط کی حفاظت کا حق اٹھانے والے کو ہے:

اور اگر کوئی اس کو لینا چاہتا ہے تو ملتقط کی اجازت کے بغیر نہیں لے سکتا ہے کیونکہ حفاظت کا حق اسی کے لئے ثابت ہوا ہے، "ولا یأخذ منه أحد أی لا یأخذ اللقیط من الملتقط أحد بغیر رضاہ لأنه ثبت حق الحفظ له لسبق یدہ" (البحر ۵/ ۲۴۲)، اور خاندانی ماحول فراہم کرنے کے لئے اس کو اس کے ساتھ کر دیا جائے گا جو اس کی پرورش کر رہا ہے۔

اگر کوئی دعویدار آ گیا تو لقیط اس کے حوالے کر دیا جائے گا، البتہ اگر کوئی دعوی کرے گا تو اس کے دعوی کو قبول کر لیا جائے گا، کیونکہ اس میں اس کے نسب کی حفاظت ہو جائے گی اور اس کے تعلیم و تربیت کا بھی انتظام اچھی طرح سے ہو جائے گا اور ہلاکت سے بھی بچ جائے گا۔

لقیط اگر مسلم آبادی کے علاقے میں ملے تو وہ مسلمان ہوگا، اگر لقیط کا مدعی مسلمان ہے تو وہ بھی مسلمان سمجھا جائے گا، اور اگر ذمی ہے تو اس کا نسب ذمی سے ثابت ہوگا، البتہ وہ مسلمان رہے گا اگر ذمیوں میں نہ پایا گیا ہو، کیونکہ اس میں بچہ کا نفع ہے اور ذمی قرار دینے میں اس کا ضرر ہے، اور اگر ذمی نے بینہ سے ثابت کر دیا ہے کہ وہ اسی کا بچہ ہے تو وہ اسی ذمی کے دین پر رہے گا۔

"وههنا فی التصدیق وإثبات النسب نظر من الجانبین جانب اللقیط بشرف النسب والتربیة والصیانة من أسباب الهلاك وغیر ذلك، وجانب المدعی بولد یستعین به علی مصالحه الدینیة والدنیویة، حتی لو ادعی شیئین یتصور انفصال أحدهما عن الآخر فی الجملة وهو نسب الولد وکونه کافراً ویمکن تصدیقه لکونه نفعاً للقیط وهو کونه ابنا له ولا یمکن تصدیقه فی الآخر لکونه ضررا به وهو کونه کافراً" (بدائع ۵/ ۲۹۳ زکریا)۔

(ح): اگر کوئی اپنا بچہ کسی کو بغرض حضانت دے دے، تو یہ درست ہے، شریعت میں اس کی اجازت ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کو بطور پرورش کے لے لیا تھا، حضرت ابو طالب کی تنگی کو دیکھتے ہوئے، اسی طرح اگر کوئی کسی کو اپنا متبنی بنانا چاہے تو یہ بھی درست ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید بن حارثہؓ کو اپنی متبنی بنایا تھا، لیکن یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ متبنی کے وہی احکام ہوں گے جو پردہ کے سلسلہ میں ایک اجنبی کے ہوتے ہیں، متبنی حقیقی بیٹا نہیں ہو جاتا، لہذا بالغ ہونے کے بعد اس سے پردہ کرنا ضروری ہے، نہ وہ میراث کا مستحق ہوتا ہے اور نہ اس سے نکاح حرام ہوتا ہے اور اس کو اپنی طرف منسوب کرنا بھی صحیح نہیں ہے، "وما جعل أدعیاء کم أبناء کم، ادعوهم لآبائهم" (سورہ احزاب) (اللہ تعالی نے تمہارے متبنی کو تمہارا بیٹا نہیں بنا دیا، بلاؤ تم ان کو ان کے باپوں کی طرف نسبت کر کے)۔

اولا بچوں کی پرورش اور نان ونفقہ باپ کے ذمہ ہے "ولطفله الصغیر یعنی تجب النفقة والکسوة علیه لأولاده الصغار الفقراء لقوله تعالی: وعلی المولود له رزقهن وکسوتهن بالمعروف، والمولود له هو الأب فأوجب علیه رزق النساء لأجل الأولاد فلأن تجب علیه نفقة الأولاد بالطریق الأولی" (تبیین ۳/ ۳۲۵)، ہاں اگر والدین اتنے تنگ دست ہوں کہ پرورش کرنے میں دشواری ہو، ان کی پرورش پر قادر نہ ہو تو شریعت کا حکم یہ ہے کہ اگر اس کے رشتہ دار مالدار ہوں وہ پرورش کریں، جیسے چچا، دادا، دادی وغیرہ، "وعلی هذا لو کان للمعسر أولاد صغار ولم یقدر علی إنفاقهم تجب نفقتهم علی من تجب علیه لولا الأب کالأم والأخ والعم له یرجع به إذا أیسر" (شامی زکریا ۵/ ۳۰۹)۔

لیکن افلاس کی وجہ سے اور پرورش کی استطاعت نہ رکھنے کی وجہ سے اولاد کو دوسرے کے سپرد کر دینا اور اس سے بے تعلق ہو جانا اور اس کے بدلے میں ہدیہ قبول کرنا جائز نہیں ہے، کیونکہ یہ گویا اولاد کو بیچنا ہے ہدیہ کی صورت میں، کیونکہ کوئی چیز ہدیہ دے کر اس کا بدلا لیا جائے تو صورتاً ہدیہ ہے لیکن بیع کے درجہ میں ہے، کیونکہ فقہاء نے صراحت کی ہے لفظ ہبہ سے بھی بیع منعقد ہو جاتی ہے اور یہ ہدیہ لینا درحقیقت قیمت لینا شمار کیا جائے گا، کیونکہ قاعدہ ہے: "المعروف کالمشروط"۔

(ط): اگر بچے ذہنی طور پر معذور پیدا ہوں، یا پیدا ہوتے ہی معذور ہو جائیں تو ان کی پرورش اور نگرانی والدین کے ذمہ ہے، البتہ اگر ان کو علاج کے لئے کسی ہسپتال میں داخل کر دیا جائے تو یہ درست ہے، لیکن یہ بغرض علاج ہو فرار اختیار کرنے کے لئے نہ ہو، کیونکہ اپنی پرورش کی ذمہ داری سے فرار اختیار کرنا اور بچوں سے بالکل بے تعلق ہو جانا یہ بچوں پر شفقت کے خلاف ہے، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے بچوں پر شفقت نہ کرنے پر وعید ارشاد فرمائی ہے: "من لم یرحم صغیرنا فلیس منا..." (جو چھوٹوں پر رحم و شفقت نہ کرے وہ ہم میں سے نہیں ہے)۔

حدیث شریف میں علاج کرانے کی وضاحت وارد ہے، "عن أبي هريرة قال قال رسول الله ﷺ ما أنزل الله داءً إلا أنزل به شفاءً" (مشکاۃ ۳۸۷) (اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: نہیں نازل کی اللہ نے کوئی بیماری مگر یہ کہ اس سے شفا کو بھی نازل کیا ہے)۔

اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ دوا کرانا جائز ہے لیکن والدین کی ذمہ داری ہے کہ ایسے ہسپتال میں علاج کے لئے داخل کرائیں جہاں سے روزانہ یا وقفہ وقفہ سے ان کی دیکھ ریکھ کر سکے اگر ملازمت پیشہ ہو ورنہ وہیں قیام کریں اور اپنے بچوں کو شفقت سے محروم کر کے راہ فرار اختیار نہ کریں، الغرض ایسے معذور بچوں کا خرچہ اور نگرانی والدین کے ذمہ ہے والدین خصوصاً باپ کا اس سے اعراض اور پہلوتہی کرنا جائز نہیں ہے۔

"إذا كان الولد عند الحاضنة فلأبيه حق رؤيته بأن يخرج الصغير إلى مكان يمكن الأب أن يراه فيه كل يوم" (الفقہ الاسلامی ۶۹۹/۷) (جب بچہ پرورش کرنے والی عورت کے پاس ہو اس کے باپ کو اس بچہ کو دیکھنے کا حق ہے، وہ عورت بچہ کو کسی ایسی جگہ نکال دیا کرے جہاں سے دیکھنا ممکن ہو روزانہ)۔

فتاوی تاتارخانیہ میں ہے:

"ایک شخص کے چھوٹے چھوٹے بچے ہوں، نہ باپ کے پاس مال ہو اور نہ بچوں کے پاس، تو کیا پھر بھی باپ پر بچوں کا خرچہ لازم ہے؟ اگر والد کسب پر (محنت و مزدوری پر) قادر ہو تو اس پر خرچ لازم ہے، وہ محنت و مزدوری کرے گا اور بچوں پر خرچ کرے گا اپنی وسعت و طاقت کے بقدر اور اگر وہ کمانے اور بچوں پر خرچہ کرنے سے انکار کرے تو حکومت کی جانب سے اس پر جبر کیا جائے گا، پھر بھی نہ کمائے تو قید کر دیا جائے گا، (یہاں تک کہ کمانے اور خرچ برداشت کرنے پر راضی ہو جائے)، دیگر دیون میں قید نہیں کیا جائے گا اور اگر والد اپاہج وغیرہ ہونے کے سبب کمانے پر قادر نہ ہو تو لوگوں سے سوال کرے اور اولاد پر خرچ کرے" (التاتارخانیہ ۴۱۶/۵)۔

☆☆☆

بچوں کے حقوق، شریعت اور حقیقت کی روشنی میں

مولانا رحمت اللہ ندوی [1]

اولاد کے حقوق:

والدین کی تمناؤں کا مرکز، ان کی آہ نیم شب و نالۂ سحر کا گداز، انکے تن بدن کا ایک جزء، ان کی مادی و روحانی توانائیوں کا راز، اولاد ہے، اولاد ہی والدین کے بڑھاپے کا سہارا اور صدقۂ جاریہ بنتی ہے، لہذا والدین پر اولاد کے یہ حقوق عائد ہوتے ہیں:

(۱) اولاد کی طلب اور حصول حلال اور مسنون طریقہ سے ہو، یعنی بغیر نکاح یا غیر اللہ سے سوال کر کے نہ ہو۔ (۲) اولاد کی پیدائش کو خواہ لڑکا ہو یا لڑکی، اللہ کی نعمت اور امانت سمجھے۔ (۳) اچھا اور پسندیدہ نام رکھے۔ (۴) ممکن ہو تو عقیقہ کرے۔ (۵) ختنہ کرے۔ (۶) صفائی ستھرائی کا خیال رکھے۔ (۷) دو سال کے بعد دودھ چھڑائے۔ (۸) ماحول کو بہتر اور ساز گار بنائے۔ (۹) گھر میں لہو ولعب کے ایسے اسباب اور سامان مہیا نہ کرے جو بے حیائی کا سبب اور بد اخلاقی کا ذریعہ بنیں۔ (۱۰) کھلانے پلانے اور راحت و آرام پہنچانے کے ساتھ نیک لوگوں اور بزرگوں، اسلام کے شہبازوں کے قصے اور کہانیاں سنائے، اور ایسی لوریاں دے جو توحید اور حقیقت پر مبنی ہوں۔ (۱۱) قرآنی آیات، دعائیں اور اذکار وغیرہ سکھائے۔ (۱۲) اسلام کے آداب اور طریقے، بڑوں کے ادب و تعظیم کے اطوار بتائے۔ (۱۳) جب پڑھنے کے لائق ہو جائے تو دینی تعلیم و تربیت کے لئے کسی ایسے ادارہ کا انتخاب کرے جو بہتر اور مناسب ہو۔ (۱۴) جب باشعور (دس سال کا ہو جائے) تو بستر الگ کر دے۔ (۱۵) سات سال کی عمر میں نماز کی تاکید کرے اور پابندی کروائے، دس سال کا ہو جانے پر اگر نماز چھوڑے تو سزا دے۔ (۱۶) زمانہ کی ایسی بری صحبت اور عادتوں سے بچائے جو مفسد اخلاق ہوں، اگر ماں باپ کی بری عادتوں سے بگڑنے کا اندیشہ اور متاثر ہونے کا امکان ہو تو وہ اس سے تائب ہو کر انہیں ترک کر دیں۔ (۱۷) اولاد کو بے کاری سے بچائیں اور باعزت وحلال کسب معاش کا طریقہ سکھائیں۔ (۱۸) بلوغ پر کسی دیندار گھرانے میں باکردار و دیندار لڑکی سے یا لڑکی ہو تو لڑکے سے نکاح کرے۔ (۱۹) نکاح کے بعد بھی اس کی خیر خواہی سے منہ نہ موڑے اور اس پر شفقت و محبت کی نگاہ رکھے۔ (۲۰) عام حالات میں اولاد (لڑکے اور لڑکی) کے درمیان داد و دہش اور عطیات و بخشش میں مساوات اور انصاف ملحوظ رکھے۔ خصوصی حالات اس سے مستثنی ہیں (اسلامی حقوق وواجبات ر ۲۴۔۲۹)۔

اسی طرح شفقت و کشادہ دلی کے ساتھ پرورش، حلال اور طیب روزی سے پرورش، کھیلنے اور خوش رہنے کے کافی مواقع فراہم کرنا، بالغ ہونے پر شادی میں جلدی کرنا بھی اولاد کے حقوق میں ہیں (مزید تفصیلات "فن تعلیم و تربیت" ر ۱۵۵۔۱۵۶ میں دیکھیں)۔

والدین کے ذمہ اولاد کا سب سے بڑا حق ان کی صحیح تعلیم و تربیت ہے، اور تربیت کہتے ہیں ان کے اندر دین و اخلاق کو پروان چڑھانا اور فروغ دینا، اولاد رحمت بھی ہے اور زحمت بھی بن سکتی ہے، اولاد جمعی کا سبب بھی ہے اور فتنہ بھی برپا کر سکتی ہے، اولاد شجر بار آور بھی ہے اور خار دار بھی ثابت ہو سکتی ہے، اس لئے اولاد کی طرف سے غفلت برتنا اور اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنا برابر ہے، ان کے حقوق میں غفلت و کوتاہی پر روز قیامت باز پرس ہوگی۔

اگر ہم اولاد کے حقوق امانت و دیانت کے ساتھ ادا کریں گے تو قوی امید ہے کہ اولاد فرماں بردار، صالح اور حق شناس ہوگی، دنیا میں والدین کی آنکھوں کی ٹھنڈک اور دل کی راحت اور آخرت کے لئے دعاؤں کا ذریعہ اور ثواب کا ذخیرہ بنے گی۔

اس کے علاوہ ولادت سے بلوغ تک دیگر اور حقوق بھی ہیں اور ان کی تفصیلات، اور ان سے متعلق مستقل احکام و مسائل ہیں (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: تربیۃ الاولاد فی الاسلام للشیخ عبداللہ ناصح علوان، تحفۃ المودود باحکام المولود، علامہ ابن قیم، نیز بچوں کے احکام و مسائل مولانا فیصل احمد ندوی)۔

---

[1] دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ۔

لیکن نہ سب کا احاطہ مقصود ہے اور نہ ہی وہ ہمارے موضوع کے تحت ہیں، اس لئے بچوں کی پرورش، تعلیم وتربیت، نکاح، مزدوری اور تعزیر وسزا نیز لاوارث بچوں کی پرورش اور انکی تعلیم وتربیت میں حکومت وسماج کی ذمہ داریاں، جو والدین ناداری کی وجہ سے اپنے بچوں کو معاضہ لے کر ان سے لاتعلق ہوجاتے ہیں اور پرورش کے لئے دوسروں کے حوالہ کردیتے ہیں، ان کے مسائل اور ذہنی وجسمانی طور پر معذور بچوں کی پرورش اور ان کی مسلسل نگہداشت وعلاج کے سلسلہ میں اسلامی تعلیمات وغیرہ پر ہی سوالنامہ کی روشنی میں اکتفا کیا جائے گا۔

حق حضانت (پرورش کا حق):

''فقہ کی اصطلاح میں نابالغ لڑکے یا نابالغ لڑکی، یا کم عقل بالغ لڑکے اور لڑکی جن میں تمیز کی صلاحیت نہ ہو، کی پرورش، انکی مصلحتوں کی نگرانی، موذی اور مضر چیزوں سے حفاظت اور ایسی جسمانی، نفسیاتی اور عقلی تربیت کہ وہ مقتضیات زندگی کی تکمیل کرسکے اور اپنے فرائض ادا کرنے کا اہل ہوجائے ''حضانت'' ہے (قاموس الفقہ ۳/ ۲۶۲)۔

اس بات پر فقہاء کا اتفاق ہے کہ حق پرورش میں ماں سب سے پہلے اور مقدم ہے، اس کے بعد پھر جو رشتہ کے اعتبار سے زیادہ قریب ہو.... اگر خواتین میں کوئی مستحق نہ ہو تو پھر حق پرورش ان مردوں کی طرف لوٹے گا جو عصبہ رشتہ دار ہوں اور ان رشتہ داروں میں جو وارث ہونے کے اعتبار سے مقدم ہوگا وہی حق پرورش کا بھی ذمہ دار ہوگا...... اگر ایک ہی درجہ کے ایک سے زیادہ مستحق پرورش موجود ہوں اور وہ سب پرورش کے خواہاں ہوں تو امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک ورع وتقوی اور اس کے بعد کبرسنی کی بنا پر ترجیح دی جائے گی، جبکہ حنابلہ کے نزدیک قرعہ اندازی سے کام لیا جائے گا لڑکی کے عصبہ رشتہ داروں میں اگر کوئی محرم موجود نہ ہو تو یہ ذمہ داری قاضی کی طرف منتقل ہوجائے گی کہ وہ جسے مناسب سمجھے اس کے حوالہ کردے۔

ماں، دادی اور نانی کو اس وقت تک لڑکوں کا حق پرورش حاصل ہوگا جب تک کہ خود ان میں کھانے پینے، استنجا کرنے اور کپڑے پہننے وغیرہ کی صلاحیت پیدا نہ ہوجائے، اور سات سال مفتی بہ قول ہے، اس کے بعد باپ کے حوالہ کردیئے جائیں گے، لڑکیاں ہوں تو بالغ ہونے کے بعد باپ کے حوالہ کردی جائیں گی۔

حق پرورش صرف ماں کا حق نہیں، بلکہ بچہ کا بھی حق ہے، لہذا اگر عورت اس شرط پر خلع کرے کہ وہ حق پرورش سے دست بردار ہوجائے گی تو خلع درست ہوجائے گا، لیکن یہ شرط باطل ہوجائے گی، اور عورت کا حق پرورش باقی رہے گا، ہاں اگر عورت خود بچہ کی پرورش نہ کرنا چاہے اور بچہ کی بقا کا انحصار ماں پر نہ ہوں تو ماں کو پرورش پر مجبور نہیں کیا جائے گا (قاموس الفقہ ۳/ ۲۶۶۔ ۲۶۷، بدائع الصنائع ۴/ ۴۰ کتاب الحضانہ، احسن الفتاوی ۵/ ۴۵۹)۔

حضانت کے شرائط:

اس مسئلہ پر اجماع ہے کہ میاں بیوی کی جدائی کے وقت بچہ ہے تو اس کی ماں کو پرورش کا حق ہے جب تک کہ دوسرا نکاح نہ کرے، اس کی وجہ ظاہر ہے کہ ماں، بچے کے حق میں سب سے زیادہ مشفق ہوتی ہے اور تربیتی معاملات میں مرد سے زیادہ واقف ہوتی ہے، اس میں برداشت کا مادہ زیادہ رہتا ہے، اور اس کے لئے زیادہ وقت بھی دے سکتی ہے، لیکن حضانت کے لئے مندرجہ ذیل شرائط ہیں:

۱۔ عقل: کسی پاگل یا کم عقل کو حضانت کا حق نہیں، اس لئے کہ ایسا شخص ذمہ داری نہیں نبھا سکتا۔

۲۔ بلوغ: کسی نابالغ کو یہ حق نہیں، کیونکہ وہ شرعاً خود کسی کی پرورش میں ہوتا ہے۔

۳۔ نگہداشت: پرورش کی صلاحیت اور اس پر قدرت، لہذا نابینا، شدید مرض یا بڑھاپے کی وجہ سے معذور کو حضانت کا حق نہیں، سفر پر رہنے کی وجہ سے دشواری پیش آرہی ہو تو اس کو بھی حق نہیں۔

۴۔ اخلاق وعادات کا اچھا ہونا: فاسق وفاجر کو حق نہیں، کیونکہ اس سے بچہ کے بگڑنے اور بددین ہونے کا خطرہ ہے۔

علامہ ابن قیمؒ نے اس شرط کو تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے، ان کا کہنا ہے کہ یہ شرط ماننے کی صورت میں نظام عالم کے درہم برہم ہوجانے اور ملت کے مصیبت میں پڑجانے کا اندیشہ ہے۔

علامہ ابن عابدین شامیؒ نے بیچ کی راہ اس طرح نکالی ہے کہ ایسا فسق نہ ہو جس سے بچے کے بگڑنے کا خطرہ ہو، اگر عورت فسق وفجور میں مبتلا ہے اور بچہ اتنا باشعور ہے کہ اس طرح کی باتوں کا احساس رکھتا ہے تو دین واخلاق کی حفاظت کی خاطر بچہ اس عورت سے لے لیا جائے گا۔

۵۔ مسلمان ہونا: کسی کافر رشتہ دار کو مسلمان بچے کی حضانت کا حق حاصل نہیں، لیکن احناف نے اس شرط سے اختلاف کیا ہے، کیونکہ حضانت میں بچے کو کھلانا پلانا اور اس کی دیکھ بھال کرنا مقصود ہے اور یہ کام کافر عورت بھی کر سکتی ہے، البتہ احناف کے یہاں بھی یہ شرط ہے کہ وہ مرتد نہ ہو۔

۶۔ حضانت کا حق رکھنے والی عورت کی شادی کسی ایسے شخص سے نہ ہوئی ہو جو بچے کے لئے اجنبی ہو، اس لئے کہ اس سے بچہ کا حق ادا نہ ہونے کا خطرہ موجود رہتا ہے، اگر اس کی شادی بچے کے کسی قریبی رشتہ دار سے ہوئی ہے مثلاً بچے کے چچا کے ساتھ، تو اس صورت میں حضانت کا حق اس کے لئے باقی رہے گا (تحفۃ المودود باحکام المولود)۔

حق حضانت کے سقوط کی صورتیں:

مندرجہ ذیل صورتوں میں حق حضانت ساقط ہو جائے گا:

☆ بچہ کے غیر ذی رحم محرم سے نکاح کر لینا۔

☆ پرورش پر اجرت طلب کرنا جبکہ بچہ کے ذی رحم محارم میں سے کوئی عورت بلا اجرت پرورش پر راضی ہو۔

☆ کسب وغیرہ کی وجہ سے بکثرت باہر نکلنا جس سے بچہ کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہو۔

☆ فسق و فجور میں مبتلا ہونا کہ بچہ کے ضیاع کا خطرہ ہو، اگر خطرہ نہ ہو تو اتنی عمر تک فاسقہ عورت کے پاس چھوڑا جائے گا جس میں برے اخلاق سے متاثر ہونے کا اندیشہ نہ ہو۔

☆ کافرہ کے پاس بھی چھوڑنے کا یہی حکم ہے۔

☆ مرتدہ سے بچہ واپس لے لیا جائے گا، اور دوبارہ اسلام قبول کرنے کے لئے قید میں رکھا جائے گا اور پٹائی بھی کی جائے گی، یہاں تک کہ دوبارہ اسلام قبول کر لے، اگر اسلام قبول کر لے تو بچہ اس کے سپرد کر دیا جائے گا (احسن الفتاوی ۵/ ۴۵۹۔ ۴۶۰)۔

حق حضانت رکھنے والی عورتوں کی ترتیب:

اس پر تو اجماع ہے کہ سب سے زیادہ حضانت کا حق ماں کو ہے، اگر اس کا انتقال ہو جائے یا حضانت کی مذکورہ شرائط میں سے کسی شرط کے نہ پائے جانے کی وجہ سے اس کا حق باقی نہ رہے تو حضانت کا حق رکھنے والی عورتوں کی ترتیب اور تفصیل میں یہاں کچھ اختلاف ہے جو حسب ذیل ہے:

فقہ حنفی: ......ماں، نانی، دادی، مختلف بہنیں (حقیقی، اخیافی (ماں شریک)، علاتی (باپ شریک)، اسی طرح مختلف خالائیں، بھانجی، بھتیجی، مختلف پھوپھیاں، وراثت کی ترتیب کے مطابق عصبہ۔

فقہ شافعی میں ترتیب یہی ہے، اس فرق کے ساتھ کہ علاتی بہن، علاتی خالہ، علاتی پھوپھی اخیافی پر مقدم ہے۔

فقہ مالکی: ......ماں، نانی، مختلف خالائیں (اوپر کی طرح)، دادی، مختلف بہنیں، پھوپھی، بھانجی، موصی لہ (جس کو وصیت کی جائے) پھر عصبہ وراثت کی ترتیب کے مطابق۔

فقہ حنبلی: ......ماں، نانی، اور اس کے بعد اس کی مائیں، باپ، دادی، اس کے بعد اس کی مائیں، دادا، پھر اس کی مائیں، مختلف بہنیں، مختلف خالائیں، مختلف پھوپھیاں، پھر اسی ترتیب پر ماں کی خالائیں، پھر باپ کی خالائیں، پھر باپ کی پھوپھیاں، اسی ترتیب پر بھانجیاں اور بھتیجیاں، چچازاد بہن، پھوپھی زاد بہن اسی تفصیل کے مطابق۔ وراثت کی ترتیب کے مطابق عصبہ (بچوں کے احکام ومسائل ر ۲۳۰، نیز بدائع وشامی)۔

حق حضانت رکھنے والے مردوں کی ترتیب:

مذکورہ بالا تفصیل کے مطابق اگر کوئی عورت، بچے کی حضانت کے لئے نہ ملے تو پھر جیسا کہ گزرا وراثت میں جو بطور عصبہ کے وارث ہوتے ہیں، ان کو اسی

ترتیب سے حضانت کا حق ہوگا:

باپ، دادا (آگے اوپر تک)، بھائی، بھائی کی اولاد (نیچے تک)، چچا، چچا کی اولاد، لیکن کوئی بچی جو اس عمر کو پہنچ چکی ہو کہ اس سے شہوت پیدا ہو سکتی ہے تو ایسی بچی کسی نامحرم وارث کے حوالہ نہیں کی جائے گی، یہ متفقہ مسئلہ ہے، ہاں! چھوٹی بچی کا حق حضانت اس کو حاصل ہوگا۔

(مسئلہ) اگر حضانت کا حق کسی شرط کے نہ پائے جانے کی وجہ سے ختم ہو جائے، پھر وہ رکاوٹ دور ہو جائے تو حضانت کا حق واپس ملے گا۔

تعلیم وتربیت:...... اسلام بچہ کی تربیت کا جو تصور رکھتا ہے وہ نہایت جامع، وسیع اور ہمہ گیر و عالمگیر ہے، وہ چاہتا ہے دینی، اخلاقی، جسمانی، عقلی وذہنی، معاشرتی، حسی، جذباتی وجبلی، نفسیاتی اور جنسی ہر طرح بچہ کی ایسی مکمل تربیت کی جائے کہ مکمل طور پر اس کی شخصیت کی تعمیر ہو سکے اور وہ ایک آئیڈیل بن سکے (تربیۃ الاولاد فی الاسلام للشیخ عبداللہ ناصح علوان ر الاولاد وتربیتہم فی ضوء الاسلام للشیخ محمد بن مقبل ر ۶۹۔ ۱۳۳، حلال وحرام مولانا خالد سیف اللہ رحمانی ر ۴۵۸۔ ۴۶۵، بچوں کی تربیت، مولانا سراج الدین ندوی ر ۱۰۷۔ ۱۳۳)۔

دینی تربیت:...... تربیت کے مختلف شعبوں میں سب سے اہم دینی اور اسلامی تربیت ہے، جس میں مبادیات دین کی تعلیم، عبادات کی ترغیب، حلال وحرام کی تفہیم، قرآن مجید کا پڑھنا وغیرہ داخل ہے، دینی تربیت میں ابتداء کلمہ طیبہ سے ہو، بچہ کے اندر نبی کی محبت، اطاعت کا جذبہ، آل بیت کی محبت اور قرآن مجید کی تلاوت سے شغف پیدا کیا جائے، صحابہ کرام، سیرت نبوی اور اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوات کی بھی تعلیم اپنے بچوں کو دیں۔

اخلاقی تربیت:...... اخلاقی تربیت، دینی تربیت کا ایک حصہ ہے، اسلام میں فطری طور پر اس کو بڑی اہمیت دی گئی ہے، حدیث شریف میں ہے کہ "کسی شخص نے اپنی اولاد کو اچھے اخلاق وآداب سے بہتر عطیہ نہیں دیا، اور یہ کہ "اپنی اولاد کو تہذیب وشائستگی سکھاؤ"۔

ایک روایت میں ہے کہ جب بچہ نو سال کا ہو جائے تو اس کا بستر علاحدہ کر دیا جائے، تیرہ سال میں نماز، روزہ کے لئے سرزنش کی جائے، سولہ سال کی عمر میں اس کی شادی کر دی جائے، پھر اس کا ہاتھ پکڑے اور کہے میں نے تجھے اخلاق سکھا دیئے، تعلیم دے دی اور تمہارا نکاح کر دیا، اب میں اللہ کی پناہ چاہتا ہوں اس سے کہ تو دنیا میں میرے لئے فتنہ کا یا آخرت میں عذاب کا باعث بنے (مسند ابن حبان عن انسؓ)۔

اسی اخلاقی تربیت کے پیش نظر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے والدین کو کسی ایسی حرکت سے منع فرمایا ہے، جو بچہ کے معصوم اور سادہ ذہن پر اپنا غلط نقش چھوڑ جائے، چنانچہ ارشاد ہوا کہ جو شخص بچہ کو کہے یہ لے لو، پھر اسے نہ دے تو یہ بھی جھوٹ ہے۔

اخلاق وکردار نسل انسانی کا سب سے قیمتی اثاثہ ہے، اگر کوئی قوم اخلاق سے محروم ہو جائے تو دنیا کی کوئی طاقت اسے تعمیر وترقی سے ہمکنار نہیں کر سکتی، اس کے برخلاف بااصول وباکردار قوم کو کوئی طاقت زیر نہیں کر سکتی۔

اخلاق وکردار سے مزین کرنے کا سب سے سنہرا دور بچپن کا دور ہے، اس عمر میں جسمانی نشوونما کے ساتھ کردار بھی نشوونما پاتا ہے، ابتداء ہی سے بچے کی نشوونما کے مختلف پہلوؤں کے ساتھ ساتھ اس کی اخلاقی تربیت پر بھی توجہ دینا چاہئے، (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: بچوں کی تربیت از مولانا سراج الدین ندوی ر ۱۱۴۔ ۱۱۸)۔

جسمانی تربیت:

عقل وفہم، اخلاق وشائستگی اور فکر وعقیدہ کی درستگی اور اعتدال کے لئے سب سے بنیادی اور مادی ضرورت انسان کی جسمانی صحت اور اعتدال ہے، اسلام نے اس گوشہ کو بھی تشنہ نہیں رکھا، بلکہ اس سلسلہ میں واضح ہدایات دی ہیں، اسی لئے بیمار آدمی کو تندرست آدمی پر زیادہ آمد ورفت کرنے سے منع کیا گیا ہے، ہر مرض کو قابل علاج قرار دیا اور علاج کی ترغیب دی، نشانہ بازی، گھوڑ سواری، اور تیرا کی کو ذکر الٰہی کے حکم میں رکھا ہے، اور عیش کوشی سے پرہیز، جفاکشی اور تیراندازی کا حکم دیا گیا ہے۔

یہ ہدایات مسلمانوں کے ہر طبقہ کے لئے ہیں اور صلاحیت واستعداد کے لحاظ سے بچے اور جوان اس کے زیادہ مخاطب ہیں، کیونکہ ان کے اندر جسمانی ریاضت، چستی اور پھرتی پیدا کرنے کی زیادہ صلاحیت ہے (حلال وحرام مولانا خالد سیف اللہ رحمانی ر ۴۶۲۔ ۴۶۳)۔

جنس کی تعلیم اور اس کی تربیت:

جنسی خواہش ہر انسان میں ودیعت کی گئی ہے اور یہ بہت طاقتور جبلت ہے، اگر انسان یا معاشرہ اس بے پناہ قوت کو قابو میں نہ رکھ سکے تو وہ بہیمیت (حیوانیت) بلکہ دیوانگی کے درجے تک پہنچ جاتا ہے، اگر انسان کو صحیح جنسی شعور حاصل ہو جائے تو معاشرہ جنت نشان بن جاتا ہے، ہر بچہ میں تجسس کا فطری جذبہ موجود رہتا ہے، وہ ہر چیز کی حقیقت معلوم کرنے کی کوشش میں رہتا ہے؟ کیسے ہے؟ کس لئے ہے؟ تلاش و جستجو کا یہی جذبہ جنسی امور میں بھی کارفرما ہوتا ہے۔

بچوں کی جنسی تجسس کو کچلنا یا اس سلسلہ میں غلط رہنمائی دینا نہایت غیر حکیمانہ عمل ہے، جس کے برے نتائج کسی نہ کسی شکل میں ضرور سامنے آتے ہیں، اس لئے بچے کو اپنے ذہن میں جنس سے متعلق پیدا ہونے والے سوالات کا اطمینان بخش جواب چاہئے، بچے جب جنسی مسائل سے متعلق کچھ پوچھتے ہیں تو ہمارے گھرانوں اور اسکولوں میں عموماً چار طریقے اختیار کئے جاتے ہیں:

۱۔ بچے کو ڈانٹ ڈپٹ کر یا سزا دے کر بالکل خاموش کر دیا جاتا ہے، یہ ایک جاہلانہ رویہ ہے، جس کے بڑے خطرناک نتائج نکل سکتے ہیں، آپ خود سوچئے کہ جس چیز کے بارے میں آپ کو معلومات حاصل کرنے کا اشتیاق ہو اور آپ کو جھڑک دیا جائے تو آپ کا اشتیاق ختم نہیں ہوگا بلکہ اور بڑھ جائے گا۔

۲۔ دوسرا طریقہ یہ اختیار کیا جاتا ہے کہ بچے کو غلط سا جواب دے کر خاموش کر دیا جاتا ہے، اس انداز سے سوچنے والے حضرات یہ سمجھتے ہیں کہ فی الوقت تو بچے کو کسی نہ کسی طرح خاموش کر دیا جائے، بڑا ہو کر وہ سب کچھ خود ہی جان جائے گا، مگر یہ طریقہ بھی پہلے طریقہ سے کم خطرناک نہیں ہے، کیونکہ اس سے تو بظاہر بچہ مطمئن ہو جائے گا، لیکن کل جب آپ کا جھوٹ کھلے گا تو وہ ہمیشہ کے لئے آپ سے اعتماد کھو دے گا اور دوسرے ذرائع سے معلومات فراہم کرے گا اور یہ جنسی ذخیرہ علم اس کی آئندہ زندگی میں، بہت مہلک ثابت ہو سکتا ہے۔

۳۔ تیسرا طریقہ یہ اپنایا جاتا ہے کہ بلا تکلف تمام باتیں من وعن پوری تفصیل کے ساتھ بچے کو صاف صاف بتا دی جائیں، یہ مغربی انداز فکر ہے اور مغرب زدہ لوگ اس نقطہ نظر کے بڑے حامی و وکیل ہیں، ان کی دلیل یہ ہے کہ جب بچے کو سب کچھ بتا دیا جائے گا تو اس کا تجسس ختم ہو جائے گا اور مزید جانکاری کا اشتیاق باقی نہیں رہے گا، مگر یہ دلیل حقیقت کے منافی ہے، جب آپ بچے کو سب کچھ بتا دیں گے تو اس کا اشتیاق و تجسس ختم نہیں ہوگا بلکہ وہ مزید بھڑک جائے گا اور وہ آپ کی باتوں کو پرکھنے کے لئے عملی تجربے کی طرف بڑھے گا، جس کی خطرناکی کا آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں، اسی کا نتیجہ ہے کہ مغرب زدہ گھرانوں کے بچوں میں فحاشی و آوارگی زیادہ پائی جاتی ہے اولاً تو وہاں حیاء و عصمت کا کوئی تصور نہیں، پھر ٹی وی، سینما اور رقص و سرور کے مخرب اخلاق پروگرام ان کی آوارگی میں مزید اضافہ کرتے ہیں، والدین کی آزاد خیالی اور جنسی بے حجابی آگ پر تیل کا کام کرتی ہے، خلاصہ کلام یہ ہے کہ جنسی امور سے متعلق تسلی و اطمینان کے نام پر بچے کو تمام تفصیلات بتا کر ہم اس کی جنسی دلچسپی کو حد اعتدال سے بڑھا دیتے ہیں۔

۴۔ مذکورہ بالا تینوں طریقوں کے بجائے بہترین طریقہ یہ ہے کہ جنسی مسائل کے سلسلہ میں اعتدال اور میانہ روی اختیار کی جائے، جنسی سوال کرنے پر بچے کو ڈانٹنے ڈپٹنے یا غلط سلط جواب بتانے یا بلا تکلف پوری تفصیل بتانے کے بجائے بچے کو ذہنی سطح کے مطابق آسان زبان میں اس کے سوال کا مختصر جواب دیا جائے، مثلاً بچہ اگر یہ سوال کرے منی کہاں سے آ گئی؟ تو اسے اس طرح سمجھایا جائے کہ اللہ میاں نے ہر چیز پیدا کی ہے، اس نے منی کو بھی پیدا کیا ہے، تم نے دیکھا ہوگا کہ مرغی انڈا دیتی ہے، بکری بچہ دیتا ہے، اسی طرح عورت بچے کو جنتی ہے اور یہ سب اللہ میاں کے حکم سے ہوتا ہے۔

جنسی معلومات کی مقدار:

بچے کو کس حد تک جنسی معلومات فراہم کی جائیں؟ اس کا انحصار بچے کی عمر، صلاحیت اور جنسیات سے متعلق اس کے تجسس کی شدت پر ہے، اگر عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ سلیقہ مندی و ترتیب سے بچے کو جنسی معلومات فراہم ہوتی رہیں تو دور بلوغ اور اس کے بعد بچہ کوئی خاص دقت محسوس نہیں کرتا، ورنہ عمر کے ہیجان خیز حصے میں اس کی بے راہ روی کا سخت اندیشہ ہوتا ہے۔

اسلام نے جنسیات سے متعلق جو ہدایات و تعلیمات دی ہیں، ان کو پیش نظر رکھا جائے، بچوں سے ان پر عمل کرایا جائے تاکہ ان میں جنسی ہیجان پیدا نہ ہو سکے، فحش اور گندے لٹریچر بچوں کو بالکل نہ پڑھنے دیئے جائیں، پاکیزہ اور تعمیری کتابیں، رسائل اور اخبارات گھر پر منگائے جائیں تاکہ بچوں کا تعلق انہیں سے رہے، بچوں کے لئے دلچسپ مشاغل فراہم کئے جائیں، ان کے شب و روز کے مشاغل پر گہری نگاہ رکھی جائے، واہیات اور لغو باتوں اور فراغت و عدم فرصت

کا موقع نہ دیا جائے۔

آج ہمارے معاشرے میں جنسی ہیجان کا سب سے بڑا سبب موبائل اور انٹرنیٹ ہے، بچوں کو ان سے دور رکھا جائے، نگاہ ونظر کے آداب سکھائے جائیں، انہیں بتایا جائے کہ غیر محرم عورتوں کو دیکھنا گناہ ہے۔

جب بچے آٹھ دس سال کے ہو جائیں تو ان کے بستر الگ الگ کر دیئے جائیں، ایک ہی بستر پر کئی کئی بچوں کو سلانا (خصوصاً سردیوں کے موسم میں ایک لحاف کے اندر) جنسی تحریک کا سبب بن سکتا ہے۔

جنسی اختلاط بھی جنسی انارکی کا ایک بڑا سبب ہے، قریب البلوغ بچوں کو باہمی میل ملاپ سے دور رکھا جائے، ایک ہی خاندان یا پڑوس کے لڑکے لڑکیوں کا میل ملاپ تعلیم یا ہوم ورک کے نام پر ملاقاتوں کا سلسلہ نہایت خطرناک ہے، والدین اس پر گہری نظر رکھیں اور حکمت عملی سے انہیں ایک دوسرے کے قریب نہ رہنے دیں۔

مخلوط تعلیم بھی جنسی بے راہ روی کا ایک بڑا سبب ہے، کاش! ہمارے ماہرین تعلیم اس طرف توجہ دیں اور دونوں جنسوں کی اعلی تعلیم کے لئے الگ الگ کالجز اور یونیورسٹیاں کھولی جائیں، بہرحال والدین اپنے بچوں کو مخلوط تعلیمی اداروں سے دور رکھیں۔

بچوں کو شروع ہی سے ساتر لباس کی عادت ڈالنی چاہئے، چست اور باریک لباس سے ان کی طبیعت میں نفرت پیدا کرنا چاہئے، شریفانہ لباس کی خوبیاں بیان کر کے انہیں اس کا عادی بنانا چاہئے، فیشن زدگی کے سیلاب کی رو سے انہیں بہنے سے روکنا چاہئے۔

بے پردگی، جدت اور فیشن کے نام پر مغرب نے بے حیائی کی جو سوغات ہمیں دی ہے، اسے حقارت سے ٹھکرا دیجئے، اپنی اخلاقی تعلیمات پر فخر کیجئے، احساس کمتری کے خول سے نکلئے، مغرب کی اندھی تقلید کے بجائے اسلامی تعلیمات پر شرح صدر کے ساتھ عمل کیجئے، بچوں کو کورانہ تقلید اور مغرب کی فیشن پرستی کے نقصانات سے آگاہ کرتے رہیے۔

اگر آپ نے صبر وتحمل اور دور اندیشی سے بچوں کی تربیت کا اہتمام کیا تو یقیناً وہ آپ کی آنکھوں کی ٹھنڈک، روح کی تسکین، اور دل کا سرور بن کر ابھریں گے اور اگر ایسا نہ کر سکے تو پھر بڑے ہو کر نا قابل علاج دردسر بن جائیں گے (بچوں کی تربیت ۱۳۳-۱۴۲ ملخصاً، نیز حلال وحرام ۲۹۷ بعنوان "جنسی بے راہ روی کا سدباب")۔

دینی اور عصری تعلیم:

ہم مسلمانوں کا دینی تجربہ اہل مغرب سے مختلف ہے، ہم جس دین کے پیروکار ہیں، وہ علم تحقیق اور جستجو کا راستہ نہیں روکتا بلکہ اس کی راہ اپنانے کو لازم قرار دیتا ہے، علم کا مصدر اللہ کی ذات ہے، اللہ تعالی نے ان حقائق کا علم وحی کے ذریعہ انسان تک پہنچا دیا، جن کی تحصیل حواس وقیاس سے ممکن نہیں، اسی طرح بے یقینی کے گرداب سے نکال کر اور تشکیک کی حالت میں معلق رہنے کی اذیت سے بچا کر ہمیں ایمان کی مضبوط بنیاد دے دی ہے، وحی کے ذریعہ حاصل ہونے والا علم ان کمزوریوں کو دور کرتا ہے جو ہمارے حسی اور قیاسی ذرائع حصول علم میں موجود ہیں، وحی کے ذریعہ حاصل ہونے والے بنیادی علم سے ہم خدا، انسان اور کائنات کی حقیقت دریافت کر کے ان کے باہمی رشتہ کا سراغ لگا سکتے ہیں اور انسان وکائنات کی غایت تخلیق کا علم حاصل کر سکتے ہیں (اسلامی نظام کے خدوخال ۱۹-۲۰ ملخصاً)

مقدار تعلیم:

علم کی کوئی مقدار اور انتہا نہیں، حدیث شریف میں ہے: "منهومان لا يشبعان: منهوم في العلم لا يشبع منه ومنهوم في الدنيا لا يشبع منها" (رواہ البیہقی فی شعب الایمان) (دو حریص کبھی سیر نہیں ہوتے، علم کا حریص اور دنیا کا حریص)۔

حضرت عیسی علیہ السلام سے پوچھا گیا کہ علم کب تک حاصل کرنا چاہئے؟ فرمایا: گود سے لے کر گور تک، البتہ زندگی گزارنے کے لئے جن بنیادی علوم کی روزمرہ ضرورت پڑتی یا پڑ سکتی ہے، ان کا سیکھنا ضروری ہے، خواہ وہ امور یا ضروریات دین سے متعلق ہوں یا دنیا سے تعلق رکھتے ہوں۔

جبری تعلیم:

اسلام میں تعلیم کو جو اہمیت حاصل ہے، اس کا اندازہ لگانے کے لئے یہی کافی ہے کہ اسلام ایک خاص حد میں "جبری تعلیم" کا حامی ہے، اس لئے اس نے

تعلیم حاصل کرنے کو مسلمانوں کا مذہبی فریضہ قرار دیا ہے، "طلب العلم فریضة علی کل مسلم" اور جو فرائض ہوں ان میں جبر سے کام لینا ہے، پھر چھوٹے بچوں کی تعلیم کو اسلام نے خصوصی اہمیت دی ہے، دینی تعلیم کے علاوہ ایسی ضروری دنیوی اور عصری تعلیم دلانا بھی والدین کا فریضہ ہے جو اولاد کی زندگی یا ان کی معیشت کے لئے ناگزیر ہو (حلال وحرام ۱۶۱/۴-۴۶۲ ملخصا)۔

حکومت بلا کسی خاص مذہب، دین اور عقیدہ کو مسلط کئے، اپنے ہر شہری اور باشندہ کے لئے اجباری تعلیم دلا سکتی ہے، کیونکہ ابتدائی تعلیم وتربیت سے ہر شہری کو آراستہ کرنا، بالغان کی تعلیم وتربیت کا بندوبست کرنا، بلا لحاظ مذہب وملت، رنگ ونسل ہر ایک کو اس کی صلاحیت کے مطابق تعلیم حاصل کرنے کے مواقع فراہم کرنا، نادار طلبہ کی تعلیم کے لئے وظائف ومراعات کا نظم کرنا، ذہنی یا جسمانی حیثیت سے معذور بچوں کے لئے ان کے مناسب حال تعلیم وتربیت کا انتظام کرنا، اور اس سلسلہ میں سہولیات فراہم کرنا، حکومت اور مملکت کے واجبات وفرائض میں شامل ہے (فن تعلیم وتربیت ۲۷/۲۸ ملاحظہ کریں، نیز "اسلامی تربیت ۱۵۹/۱۶۱)۔

اگر حکومت بچوں اور بچیوں کی تعلیم کسی سطح تک لازم قرار دے اور کوئی بات ایمان وعقیدہ یا اخلاقیات کے منافی یا بے راہ روی وانحراف کا باعث نہ ہو تو شرعاً اس کی پابندی مسلمانوں پر لازم ہوگی۔

کمسنی کا نکاح:

نکاح معاشرتی زندگی کا سب سے اہم مسئلہ ہے اور اسلام چونکہ دین فطرت ہے اس لئے اس نے زندگی کے تمام مسائل کا فطری حل پیش کیا ہے، انہیں مسائل میں ایک مسئلہ بچوں کے نکاح کی اجازت کا بھی ہے، کیونکہ بسا اوقات خاندان، نابالغ بچوں اور بالخصوص نابالغ بچیوں کی مصلحت کا تقاضا بچپن میں شادی کردینا ہوتا ہے، اور یہ طریقہ قدیم سے چلا آرہا ہے، اسلامی نقطہ نظر سے اس کو سمجھنے کی ضرورت ہے، اسلام میں کمسنی اور نابالغی کے نکاح کو زیادہ بہتر قرار نہیں دیا گیا ہے، بلکہ اس کی گنجائش رکھی گئی ہے اور اجازت دی گئی ہے، ابن شبرمہ اور ابن اصم کے علاوہ تمام محدثین اور فقہاء نکاح نابالغان کے جواز کے قائل ہیں، قرآن کریم کی متعدد آیات سے اس اجازت کا پتہ چلتا ہے (مثلاً سورہ طلاق کی آیت: ۴، سورہ نور آیت: ۳۲، سورہ نساء: ۱۲۷)۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہؓ سے چھوٹی عمر (چھ سال) میں نکاح کیا، اور اپنی چچازاد بہن امامہ بنت حمزہ کا نکاح حضرت ابوسلمہ کے لڑکے عمر سے کیا، اس وقت دونوں چھوٹے تھے، اسی طرح متعدد صحابہ سے بھی یہی بات ثابت ہے۔

واضح رہے کہ اسلام میں صرف اس کی اجازت ہے کوئی ترغیب نہیں دی گئی ہے، بلکہ بہتر اور پسندیدہ یہی ہے کہ بچوں کی شادی بلوغ کے بعد کی جائے۔

نابالغی کی حالت میں نکاح کی اجازت کی دو بنیادی مصلحتیں ہیں:

۱۔ بعض اوقات اخلاقی بگاڑ کا اندیشہ ہوتا ہے، نکاح کی وجہ سے ایک جائز راہ کھل جاتی ہے، اور یہ بات اسے ناجائز رخ پر جانے سے بچاتی ہے، اگر ایسے حالات سامنے ہوں اور ۱۸ رسال تک نکاح کو روکے رکھا جائے تو اس سے بہت سے اخلاقی مفاسد پیدا ہوسکتے ہیں اور یہ اخلاقی بگاڑ بیک وقت صحت جسمانی کے لئے بھی مضر ہے اور ساتھ ہی ساتھ سماج کے دوسرے لوگ بھی اس سے متاثر ہوتے ہیں۔

۲۔ دوسری اہم مصلحت یہ ہے کہ بعض دفعہ باپ لب گور ہوتا ہے، ظاہری حالات کے تحت اندیشہ ہے کہ اس کے بچوں کو یتیمی کا داغ لگنے والا ہے اور اس کی موت کے بعد خاندان میں ایسے ذمہ دار اور دیانت دار لوگ نہیں ہیں جن سے امید رکھی جائے کہ وہ مناسب رشتہ تلاش کرکے اس کے بے سہارا بچوں کو شادی کردیں (حقائق اور غلط فہمیاں ۱۶۰-۱۶۵ ملخصا، بچوں کے احکام ومسائل ۳۸۹، اولادنا فی ضوء التربیۃ الاسلامیہ ۱۷/۲۲، اسلام کا قانون نکاح ۱۴۷/۱۴۸، الموسوعۃ الفقہیہ ۳۱/۷۲-۳۲)

علامات بلوغ:

بلوغ کی ایک علامت تو مرد وعورت کے درمیان مشترک ہے، وہ ہے بیداری یا نیند کی حالت میں انزال منی، کچھ علامتیں مثلاً حیض آنا اور حاملہ ہونا عورتوں کے ساتھ مخصوص ہیں، اگر یہ علامات عام عادت کے لحاظ سے بروقت ظاہر نہ ہوں تو امام ابوحنیفہ کے نزدیک لڑکے کے لئے ۱۸ ر اور لڑکی کے لئے ۱۷ رسال کی عمر کا اعتبار ہے، جبکہ ائمہ ثلاثہ بشمول قاضی ابویوسف اور امام محمد کے نزدیک لڑکی اور لڑکا دونوں کے لئے بلوغ کی عمر ۱۵ رسال ہے اور اسی پر فتوی ہے (قاموس الفقہ ۳۲۷/۲، مزید تفصیل ودلائل کے لئے "بچوں کے احکام ومسائل ۴۰۹-۴۱۱ ملاحظہ کریں)۔

بچہ مزدوری:

بچہ مزدوری موجودہ حالات میں بڑی اہمیت اختیار کر گیا ہے، اس سلسلہ میں اسلامی نقطہ نظر یہ ہے کہ نابالغ بچوں کو کسب معاش پر مجبور نہیں کیا جاسکتا، لہذا اگر باپ کمانے پر قادر ہو تو کما کر بچوں کا نفقہ ادا کرے گا اور اگر کمانے پر قادر نہ ہو تو قرض لے کر نفقہ ادا کرے گا، تا کہ بچے زیور علم سے آراستہ ہوسکیں۔ عالمگیری میں ہے: "اگر تنگ دست شخص کا نابالغ لڑکا ہو اور وہ شخص کمانے پر قادر ہو تو اس پر واجب ہے کہ کسب معاش کرے اور بچوں کی ضروریات پوری کرے، اگر وہ کمانے اور بچوں کی ضروریات پوری کرنے سے انکار کرے تو اسے اس پر مجبور کیا جائے گا، یا قید کرلیا جائے گا اور اگر کمانے پر قادر نہ ہو تو قاضی اس کا نفقہ متعین کردے گا اور ماں کو حکم دے گا کہ وہ شوہر کے نام پر قرض لیتی رہے اور بعد میں مرد سے اسے وصول کرلے (قاموس الفقہ ۱/۵۴۰ بحوالہ عالمگیری ۱/۵۶۱)۔

اسی طرح بالغ ہونے کے بعد بھی جب تک لڑکے طلب علم میں مشغول رہیں اور کسب معاش سے عاجز ہوں، ان کا نفقہ باپ کے ذمہ رہے گا، اور ان کی ذمہ داری ہوگی کہ ان کا نفقہ ادا کرتے رہیں۔

معلوم ہوا اسلام بنیادی طور پر اس کے خلاف ہے کہ بچوں کو تعلیم و تربیت کے بجائے مزدوری پر لگا یا جائے اور اس طرح اس کے مستقبل کو ضائع کر کے رکھ دیا جائے، البتہ مجبوری کی صورتیں اس سے مستثنیٰ ہیں (قاموس الفقہ ۵/۴۶)۔

ہدایہ میں ہے: "ونفقة الأولاد الصغار على الأب، لا يشاركه فيها أحد" (ہدایہ ثانی ۴۴۴ کتاب النفقات) (چھوٹے بچوں کا نفقہ تنہا باپ کے ذمہ ہے، اس میں کوئی شریک نہیں ہے)۔

چھوٹے بچوں اور بچیوں سے کام لینے اور خدمت کرانے کا حق صرف ماں، دادی اور نانی کو ہے، دیگر عورتوں مثلاً بہنیں، خالائیں اور پھوپھیاں وغیرہ کو یہ حق حاصل نہیں، کیونکہ مقصود (تعلیم) حاصل نہیں ہوگا، جیسا کہ ہدایہ اور اس کے حاشیہ سے معلوم ہوتا ہے (ہدایہ ۲/۴۳۵ باب حضانة الولد ومن أحق به)۔

ناچیز کے نزدیک بچوں سے ان کی حیثیت اور قدرت سے بالاتر کام لینا، یا مسلسل کام لینا، جس سے تعلیم و تربیت کا مقصد فوت یا متاثر ہو جائے، درست نہیں، لیکن اگر ان کی تعلیم و تربیت میں خلل پیدا کئے بغیر ہلکا پھلکا کام جو ان کی عمر اور معیار کے مطابق اور جسمانی و ذہنی نشوونما میں معاون ہو، یا وہ تعلیم و تربیت کا جز ہو تو اس میں کوئی مضائقہ اور حرج نہیں۔

اسی طرح جب بچہ باشعور ہو جائے یا تعلیم کا کوئی مرحلہ مکمل کرلے اور آگے تعلیم جاری رکھنا نہ چاہے یا والدین اور سرپرست پڑھانا نہ چاہیں یا خواہش کے باوجود مالی وسائل مہیا نہ ہوں تو کام سکھانا اور ہنرمند بنانا، والدین کی ذمہ داری اور بچہ کا حق ہے تا کہ وہ شریفانہ اور حلال ذریعہ معاش اختیار کرے، باعزت زندگی گزار سکے، خاندان، والدین اور حکومت پر بوجھ اور بار نہ بنے، خلاصہ کلام یہ کہ عمر کے ایک خاص مرحلہ میں ہنر سکھانا اور کام پر لگانا والدین کی ذمہ داری ہے اور بچوں سے کام لینے کی عدم اجازت کا دارومدار تعلیم و تربیت میں نقص آنے یا خلل پیدا ہونے پر ہے۔

بچوں کو سزائیں:

اسلام نے جرائم پر قدغن لگانے کے لئے دو طرح کی سزائیں مشروع کی ہیں، حدود و قصاص اور تعزیرات، حدود کو شریعت نے حق اللہ کے طور پر مقرر کیا ہے، جرم ثابت ہو جانے کے بعد حاکم یا امیر کو ساقط کرنے یا نافذ نہ کرنے کا اختیار نہیں رہتا، جبکہ تعزیرات میں شریعت نے کوئی سزا متعین نہیں کی ہے بلکہ سزا کو جرم اور مجرم کے لحاظ سے سزا دینے والے کی صوابدید پر چھوڑ دیا ہے، وہ جو سزا مناسب اور کارگر تصور کرے دے، یہ سزا زجر و توبیخ، ضرب و تادیب، قید و بند، ضبطی وقرقی وغیرہ میں سے کوئی بھی ہوسکتی ہے، پھر فرد کی عمر، تعلیم، مقام و مرتبہ کے اعتبار سے الگ الگ ہوسکتی ہے (تربیۃ الاولاد فی الاسلام)۔

بچہ کو ترک صلاۃ اور طہارت پر یا فرائض وغیرہ کی تعلیم کے لئے ولی پر اس کی تادیب کے وجوب پر اتفاق ہے، سات سال کی عمر میں زبانی تادیب اور دس سال کی عمر میں ضرب سے تادیب ہوگی، اگر اصلاح کے لئے ضرب ناگزیر ہو۔

ولایت تادیب کا حق امام یا اس کے نائب، مخصوص ولی خواہ باپ ہو یا دادا یا کوئی وصی یا قاضی کی طرف سے مقرر کردہ نگراں ہو، کو ہے، استاذ ولی کی اجازت سے تادیب کرسکتا ہے، اسی طرح شوہر بیوی کی تادیب ان چیزوں میں کرسکتا ہے جن کا تعلق حقوق زوجیت سے ہو۔

بچہ کے ولی (باپ یا دادا یا کوئی وصی یا قاضی کا مقرر کردہ شخص) کی تادیب ضرب (مار پیٹ) وعید (ڈرانا دھمکانا) تعنیف (سرزنش کرنا) کے ذریعہ ہوگی۔

طریقہ تادیب اشخاص کے لحاظ سے مختلف ہوگا، چنانچہ بچہ کو ادا فرض کا حکم اور منکرات سے نہی پر تادیب زبانی، پھر وعید پھر تعنیف پھر ضرب کے ذریعہ ہوگی۔

اتلاف کے ارادہ سے تادیب کی ممانعت پر فقہاء کا اتفاق ہے (الموسوعۃ الفقہیہ ۱۰/۱۹۔۲۵ مادہ تادیب)۔

تادیب یا تعزیر کی مقدار میں اختلاف ہے، اگر معتاد تادیب پر ہلاک ہو جائے تو امام شافعی کے علاوہ ائمہ ثلاثہ کے نزدیک ضمان نہیں ہے، کیونکہ امام حد اور تعزیر کا مامور اور پابند ہے (ایضاً ۲۵، نیز موسوعہ ۱۲/ ۲۵۴۔۲۸۶ پر تعزیر کا مفصل بیان دیکھیں)۔

فقہاء کرام نے صغر کے مراحل کو دو بنیادی حصوں میں تقسیم کیا ہے:

۱۔ صغیر غیر ممیز، اس پر کوئی بدنی عقوبت سرے سے نافذ نہ ہوگی، کیونکہ وہ غیر مکلف ہے۔

۲۔ صغیر ممیز، اس پر حدود و قصاص کا نفاذ نہیں ہوگا، لیکن اس کے عمر کے لحاظ سے مناسب تادیب ہوگی، جیسے توبیخ، ضرب غیر متلف۔

اگر صغیر کسی کا مال تلف کر دے تو ضمان واجب ہوگا، اسی طرح اگر قتل خطا کا ارتکاب کرے تو اس کے مال میں دیت واجب ہوگی، یہ وہ عام اصول ہے جس کا تعلق صغیر کے عقوبات سے ہے (الموسوعۃ الفقہیہ ۲۷/ ۳۳ مادہ صغیر، مزید تفصیل کے لئے مادہ جنایت، دیت، قصاص دیکھیں)۔

نابالغ بدکار کی سزا:

امام مالکؒ فرماتے ہیں: اگر کوئی عورت کسی نابالغ لڑکے کے ساتھ بدکاری کرے، لڑکا اس عمر میں ہو کہ جماع کر سکتا ہو، لیکن احتلام نہ ہوا ہو تو اس عورت پر زنا کی حد جاری نہ ہوگی، کیونکہ ان کے نزدیک یہ زنا نہیں ہے، لیکن نفس فعل چونکہ حرام ہے لہذا موجب تعزیر ہے۔

مغنی میں ہے کہ نابالغ لڑکی اگر قابل وطی ہے تو اس پر حد زنا کا اجراء ہوگا، لیکن اگر اس کے قابل نہیں ہے لیکن اس سے کوئی وطی کرتا ہے تو کہا گیا ہے کہ یہ فعل موجب حد ہے، کیونکہ یہ فعل ایک انسان کی شرمگاہ میں ہوا ہے، لہذا یہ ایسا ہی ہے کہ جیسا کہ بالغ عورت کی شرمگاہ میں ہو، ایک قول اس کے برخلاف ہے، ایک قول یہ بھی ہے کہ اگر لڑکی ۹ رسال سے کم عمر کی ہو تو اس میں حد نہیں ہے، کیونکہ ایسی لڑکی کی طرف میلان ہی نہیں ہوتا، اور لڑکا دس سال سے کم ہو تو اس کے ساتھ کسی عورت کی بدکاری کرنے سے اس پر حد نہ ہوگی۔

صاحب مغنی نے ان اقوال پر نقد کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اگر وطی ممکن ہو تو صحیح بات یہ ہے کہ طرفین میں سے جو مکلف ہے، اس پر حد واجب ہوگی اور اس میں عمر کی تحدید درست نہیں (اسلام میں جرم وسزا ۱/ ۲۶۱۔۲۶۲ ڈاکٹر عبد العزیز عامر (اردو ترجمہ)، التشریع الجنائی الاسلامی ۲/ ۳۵۶۔۳۵۷)۔

نابالغ راہزن کی سزا:

"اگر راہزنوں میں کوئی نابالغ ہو تو صاحبین کے نزدیک کسی پر حد کا اجراء نہ ہوگا، لیکن امام ابو یوسف کہتے ہیں کہ اگر راہزنی کا ارتکاب عملاً نابالغ نے کیا ہو تو کسی پر بھی حد نہ ہوگی، لیکن اگر جرم کا ارتکاب کسی اور نے کیا ہو تو بالغوں پر حد کا اجراء ہوگا" (الکاسانی ۷/ ۹۱)۔

"اگر ان میں کوئی ایک نابالغ ہو تو باقی سے حد ساقط ہو جائے گی، یہ امام ابو حنیفہ اور زفر کی رائے ہے، امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ اگر مال صرف نابالغ نے لیا ہو تو کسی پر حد نہیں ہے اور اگر بالغوں نے بھی لیا ہو تو ان پر حد کا اجراء ہوگا اور نابالغ کو حد کی سزا نہ ہوگی، کیونکہ جب متبوع سے ساقط ہو جائے تو تابع سے بدرجہ اولی ساقط ہوگی (الجوہرۃ النیرہ ۲/ ۱۶۷۔۳، اسلام میں جرم وسزا ۱/ ۳۴۲ کا حاشیہ)۔

بچوں کو قید کرنا:

حبس وقید کی سزا بچوں کو دی جا سکتی ہے، لیکن ان کا قید خانہ بالغوں سے الگ ہو، اور ان سے کوئی پر مشقت کام نہ لیا جائے، عام حالات میں بچوں کو قتل نہیں کیا جائے گا، البتہ اگر وہ اتنا سیانا (ہوشیار) ہو کہ حکومت اسلامی کے خلاف سازش اور تدبیر کرتا یا شریک رہتا ہو تو قتل بھی کیا جا سکتا ہے (نئے مسائل اور اسلامک فقہ اکیڈمی کے فیصلے، "قیدیوں کے حقوق" ۱۱۷۔۱۲۱)۔

ضرب کی سزا:

جسمانی سرزنش کے سلسلہ میں ان باتوں کا خیال رکھنا چاہئے کہ اس کا استعمال آخری طریق کار کے طور پر اس وقت کرنا چاہئے جب فہمائش، پند و موعظت

4B

اور ڈانٹ ڈپٹ وغیرہ سے کام نہ چل سکے، بعض مربی والدین اور اساتذہ حد سے گزر جاتے ہیں، اور تادیب کو تعذیب بنا دیتے ہیں جو نفسیاتی اعتبار سے نہایت نقصان دہ اور مضر ہے۔

ابوداؤد اور حاکم کی روایت کے الفاظ میں: "... واضربوهم عليها وهم أبناء عشر سنين" (......جب دس سال کے بچے ہوجائیں تو ان کو نماز چھوڑنے پر مارو)، سورہ نساء میں ناشزہ (نافرمان) عورتوں کو موعظت، بستر سے علاحدگی والی تدبیر کے موثر نہ ہونے پر آخری تدبیر "واضربوہن" کا حکم ہے، معلوم ہوا کہ ضرب کی سزا بھی اسلام نے قائم رکھی ہے لیکن یہ آخری مرحلہ ہے۔

عقوبت ضرب کی شرطیں:

واضح رہے کہ عقوبت ضرب کے لئے حسب ذیل شرطوں کا لحاظ ضروری ہے:

۱۔ ضرب، آخری طریقۂ تادیب ہے، لہذا اس سے قبل والے تمام تادیبی وسائل جب ختم ہوجائیں تبھی اس کو اختیار کیا جائے۔

۲۔ شدید غضب اور غصہ کی حالت میں نہ مارا جائے، مبادا لڑکے کو ضرر لاحق ہوجائے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وصیت "لا تغضب" پر عمل کیا جائے۔

۳۔ تکلیف دہ اور نازک مقامات پر مارنے سے اجتناب کیا جائے، جیسے سر، چہرہ، سینہ، پیٹ اور شرمگاہ۔ حدیث: "لا تضرب الوجه" اور "...ارموها واتقوا الوجه..." اور "لا ضرر ولا ضرار" دلیل ہے۔

۴۔ بچہ کو دس سال سے قبل نہ مارا جائے اور مقصد اصلاح ہو۔

۵۔ معلم یا مربی خود ضرب لگائے، دوسرے لڑکے کو حکم نہ دے اور ذریعہ نہ بنائے، ورنہ کینہ پیدا ہوگا۔

۶۔ ضرب کسی معصیت پر ہو جس کا وہ مرتکب ہے۔

۷۔ آلہ ضرب ہلکا اور چھوٹا ہو، تاکہ بچہ کو بڑے نقصانات لاحق نہ ہوں۔

۸۔ ضرب کا استعمال زیادہ اور سنگدلی کے ساتھ نہ ہو، ورنہ بچہ کی نفسیات پر منفی اثر پڑے گا۔

۹۔ بلوغ سے قبل ایک سے تین ضرب اور قریب البلوغ کو ضرورت پر دس تک ہو، اس سے تجاوز نہ کرے۔ "لا يجلد أحد فوق عشر أسواط إلا في حد من حدود الله"۔ سن بلوغ کو پہنچنے کے بعد اضافہ بھی کرسکتا ہے۔

۱۰۔ پہلی بار کی غلطی اور چوک پر توبہ تلافی اور معذرت کا موقع دیا جائے اور عہد و پیمان لیا جائے (تربیۃ الاولاد فی الاسلام، اسالیب التربیۃ الاسلامیہ فی تربیۃ الطفل /۶۶۔۶۷، اسلامی تربیت / ۲۲۲۔۲۲۵، الاولاد و تربیتہم فی ضوء الاسلام / ۱۶۰۔۱۶۱)۔

جرائم کی روک تھام میں اصلاحی تدابیر:

جرائم کی روک تھام اور بچوں میں مجرمانہ رجحان کے سدباب کے لئے مندرجہ ذیل اصلاحی تدابیر اختیار کرنے کی ضرورت ہے:

۱۔ والدین بچوں کی تربیت اسلامی نہج اور دینی اصول تربیت کی روشنی میں کریں، تربیت میں کسی کوتاہی یا کسی قسم کی غفلت نہ برتیں، بلکہ اپنی ذمہ داری کو پوری طرح محسوس کرکے نبھانے کی کوشش ہو۔

۲۔ خاندان اپنا وظیفہ تربیت ادا کرے، ماحول سازگار بنائے، اخلاق وفضائل اور صالح ماحول فراہم کرے تاکہ بچہ اسی بہتر ماحول میں نشو ونما پائے اور پروان چڑھے۔

۳۔ سماج کا جو کردار بچوں کی تربیت میں ہے وہ اسے ادا کرے تاکہ والدین اور خاندان کی کوششیں رائیگاں نہ جائیں، سماج اور ماحول ہی میں مختلف عمر کے بچے پرورش پاتے ہیں، لہذا تربیت میں اس کا کردار فعال اور سرگرم ہونا چاہئے۔

۴۔ حکومت بچوں کے لئے تعلیم وتربیت، اور اخلاقیات کی تعلیم کا ماحول بنائے، اچھے تربیتی ادارے قائم کرے، سماج کی ان خرابیوں کا ازالہ کرے جو بگاڑ پیدا کرتے ہیں، بچوں پر منفی اثرات ڈالتے اور ان کا ذہن ودماغ مجرمانہ اور کردار جابرانہ وبدبختانہ بناتے ہیں، اگر بچوں کے اولیاء وسرپرستان، ان کا خاندان، سماج اور

حکومت بچوں کی تربیت میں اپنا اپنا کردار ادا کریں اور اپنی ذمہ داریوں کو نبھائیں تو پھر اچھا ماحول پیدا ہونے اور جرائم کی شرح گھٹنے اور مٹنے کے سوا فروغ پانے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

متی یبلغ البنیان یوما تمامه　　　إذا کنت تبنیه و غیرک یهدم

(عمارت کی تعمیر کسی دن بھی مکمل نہیں ہوسکتی جبکہ تم تعمیر کرو اور دوسرا مسمار کرے) (اسلامی سماج کی ذمہ داریاں کے لئے ''الاولاد وتربیتہم فی ضوء الاسلام ۵۹-۶۳ ملاحظہ کریں، نیز فن تعلیم وتربیت ۲۶)۔

لاوارث بچوں کی پرورش اور ان کی تعلیم وتربیت:

اسلام نے اپنی زندہ جاوید شریعت اور پاکیزہ تعلیمات کے ذریعہ اوصیاء اور یتیم سے قرابت کا تعلق رکھنے والے حضرات کو حکم دیا ہے کہ وہ اس کے ساتھ حسن سلوک کریں، اس کی کفالت، رہنمائی ونگرانی کریں، اس کی تعلیم وتربیت پر توجہ دیں تاکہ وہ اخلاقی خوبیوں اور نفسیاتی فضائل سے آراستہ ہو کر مکمل لطف ومہربانی اور شفقت واخلاص کے زیر سایہ پروان چڑھے، اس سلسلہ میں کئی آیات اور احادیث ہیں، (مثلاً سورہ بقرہ: ۲۲۰، نساء: ۹، ضحیٰ: ۹، ماعون: ۱-۲)۔

حضرت قتادہؒ کا قول ہے: ''کن للیتیم کالأب الرحیم'' (یتیم کے لئے شفیق باپ بن جاؤ)، ایک صاحب نے رسول اللہ ﷺ سے اپنی سنگ دلی کی شکایت کی تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''إن أردت أن یلین، فامسح رأس الیتیم و أطعم المسکین'' (التفسیر المنیر ۳۰/۲۸۹ سورۃ الضحیٰ) (اگر چاہتے ہو کہ دل میں نرمی پیدا ہو تو یتیم کے سر پر دست شفقت پھیرو، اور مسکین کو کھانا کھلاؤ)۔

متعدد احادیث میں اس کی ترغیب دی گئی ہے، مثلاً:

۱۔ ''من وضع یده علی رأس الیتیم رحمة، کتب الله له بکل شعرة مرت علیه یده حسنة'' (احمد وابن حبان) (جو شخص کسی یتیم کے سر پر شفقت کا ہاتھ پھیرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کے ہاتھ کے نیچے ہر بال کے بدلہ ایک نیکی لکھ دے گا)۔

۲۔ ''من قبض یتیماً بین المسلمین إلی طعامه وشرابه حتی یغنیه الله تعالی، أوجب الله تعالی له الجنة البتة، إلا أن یعمل ذنباً لا یغفر له'' (ترمذی) (جو شخص مسلمانوں کے مابین کسی یتیم کو اپنے کھانے اور پینے میں شریک کرے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس کو بے نیاز کردے، تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت کو لازمی طور پر واجب کردے گا الا یہ کہ وہ کوئی ایسا گناہ کرے جس کی معافی نہیں)۔

۳۔ ''أنا وکافل الیتیم فی الجنة کهاتین، وأشار باصبعیه السبابة والوسطی'' (ترمذی) (میں اور یتیم کی کفالت کرنے والا جنت میں اس طرح ہوں گے (یہ فرماکر) آپ نے اپنی دونوں انگلیوں انگشت شہادت اور بیچ والی سے اشارہ فرمایا)۔

ان کے علاوہ الٰہی اوامر اور نبوی توجیہات ہیں جو یتیم کی نگہبانی اور کفالت کا فائدہ دیتی ہیں، فقر ومحتاجگی کی حالت اور مادی بے سروسامانی کے عالم میں حکومت پر اس کی دیکھ ریکھ، کفالت اور خرچ لازم ہے، تاکہ وہ انتشار، ضیاع اور بے کاری وتعطلی سے محفوظ رہے (تربیۃ الاولاد فی الاسلام ۱/۱۳۶-۱۳۸، ۳۳۵-۳۳۶)۔

یتیم کی نگرانی وکفالت کی اصل ذمہ داری تو ذوی الارحام اور اقرباء پر ہے، اگر یہ ان کو اپنی اولاد کی طرح محبت وشفقت دیں اور ملاطفت کا خصوصی معاملہ کریں تو وہ نفسیاتی اور اخلاقی احوال کے لحاظ سے اچھے ہوں گے۔

اعزہ واقارب میں اوصیاء نہ ہونے کی صورت میں مسلم حکومت پر ان کی سرپرستی اور معاملہ کی درستگی اور تعلیم وتربیت کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے، ایک صاحب حضرت عمرؓ کے پاس ایک لاوارث بچہ لے کر آئے، حضرت عمرؓ نے فرمایا: ''نفقته علینا وهو حر'' (اس کا خرچ ہمارے ذمہ ہے اور وہ آزاد ہے)۔

اسلام کا یہ طرز عمل اور حسن سلوک ہر لاوارث اور یتیم بچہ کے لئے ہے، ضرورت ہے کہ اس کو سماج کے ہم وطن اور نیک لوگوں کے سامنے پیش کیا جائے، تاکہ وہ اپنی ذمہ داریاں انجام دینے کے لئے اٹھ کھڑے ہوں، کیونکہ بچہ کے نفسیاتی انحراف کا ایک بڑا محرک فقر وفاقہ اور محرومی کا احساس ہے، جو اس کے اندر نفسیاتی پیچیدگی اور احساس کمتری پیدا کرتا ہے، اسی وجہ سے فقر کو قریب بہ کفر بتایا گیا ہے، ''کاد الفقر أن یکون کفراً''، اور حضور اکرم ﷺ نے اپنی دعاؤں میں اس سے پناہ مانگی ہے: ''اللهم إنی أعوذبك من الکفر والفقر'' (ایضاً ۳۳۵-۳۳۷)۔

سماج میں بڑھتی بے روزگاری کا اسلامی حل:

اسلام نے بے روزگاری کی جملہ اقسام کا حل پیش کیا ہے، خواہ وہ کسی مضطر و مجبور کی بے روزگاری ہو یا کسی کاہل وکسل مند کی۔

مضطر ایسا پریشان شخص جو کام کرنا چاہتا ہے اور اس کی قدرت بھی رکھتا ہے، لیکن کام کے مواقع نہیں ملتے، اس کو دو چیزوں سے پورا کیا جاسکتا ہے، (۱) حکومت پر کفالت واجب ہے کہ اسے کام کے مواقع فراہم کرے، (۲) سماج پر اس کا تعاون ضروری ہے جب تک کہ اسے کام نہ ملے۔

کسل مند، جو کام کرسکتا ہے لیکن کرنا نہیں چاہتا، حکومت ایسے شخص پر نگاہ رکھے، فہمائش اور نصیحت کرے، اور خیر و منفعت سمجھائے، پھر بھی کام نہ کرے تو قوت کا استعمال کرے اور کام تھوپ دے، حضرت عمرؓ کو کچھ ایسے ہی متوکلین ملے جو ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے تھے، حضرت عمرؓ نے فرمایا: تم جھوٹے ہو، متوکل وہ ہے جو زمین میں بیج ڈال دے، پھر اللہ پر بھروسہ کرے، اور فرمایا: تم میں سے کوئی روزی تلاش کرنے سے ہرگز نہ بیٹھا رہے کہ یہ دعا کرے، "اللھم ارزقنی" حالانکہ اسے معلوم ہے کہ اللہ تعالی سونے اور چاندی کی بارش نہیں کرتا۔

معلوم ہوا کہ اسلام میں زکوۃ حاجت براری اور کام کرنے کے لئے دی جاتی ہے، نہ اس کے لئے کہ زکوۃ کاہلی کا محرک اور توکل کا سبب بن جائے۔

اگر عاجزی و بے بسی یا بوڑھاپا اور سن رسیدگی یا بیماری وغیرہ بے روزگاری کا سبب ہو تو حکومت پر ان حضرات کے حق کی رعایت اور بہتر و باعزت زندگی گزارنے کے راستے کی ضمانت اور سچی کفالت کا طریقہ مہیا کرنا ضروری ہے، خواہ وہ مسلم ہو یا غیر مسلم۔

حضرت عمرؓ نے ایک یہودی بوڑھے کو بھیک مانگتے دیکھا تو بیت المال سے وظیفہ مقرر کردیا، اسی طرح ایک عیسائی کوڑھی کا تکفل بیت المال سے کیا تا کہ اس کا علاج ہو سکے اور وہ باعزت جی سکے (تفصیل کے لئے "تربیۃ الاولاد فی الاسلام ۱ر ۳۴۰ دیکھیں، نیز کتاب الخراج للقاضی ابو یوسف)۔

والدین کا بچہ سے لاتعلق ہونا:

افلاس وغربت اور پرورش پر عدم قدرت واستطاعت کی وجہ سے اپنا بچہ دوسرے کے حوالہ کرکے اس سے لاتعلق ہوجانے کی گنجائش نہیں ہے، کیونکہ اولاً تو یہ انسانیت کے خلاف ہے، ثانیاً والدین کی شفقت اور سرپرستی جس کی ضرورت بچہ کو رہتی ہے اور یہ اس کا حق ہے، اس کے مغائر ہے، پھر زندگی میں، بچہ پر بڑے ہوکر خصوصاً جب والدین بڑھاپے کی عمر کو پہنچ جائیں، اس وقت والدین کی خدمت اور اطاعت، اعانت ونصرت لڑکے پر لازم ہے، لاتعلق ہونے کی صورت میں ہر ایک دوسرے کے حقوق کی ادائیگی اور اپنے حقوق کی حصولیابی سے محروم ہوجائے گا، پھر اگر اس کی اجازت دے دی جائے تو نتائج بڑے سنگین ہوں گے، نہ والدین، والدین رہ جائیں اور نہ بچہ، بچہ رہ جائے گا، نہ اعتماد قائم رہے گا، اور نہ اعتبار، نفع اندوزی اور منفعت ومفاد پرستی کا مزاج بن جائے گا، ایک قابل ذکر پہلو یہ بھی ہے کہ مرنے کے بعد وراثت اور دیگر احکام کا نفاذ نہ ہو پائے گا، لہذا اس کی اجازت کسی صورت اور کسی حالت میں بھی نہیں دی جاسکتی، اگر اسلامی نظام تکافل کو پیش نظر رکھ کر اسے قابل عمل بنایا جائے تو اس کی ضرورت پیش ہی نہیں آئے گی، کیا افراد اور سماج کو گھن لگ گیا ہے کہ کوئی اپنا تعاون پیش کرنے اور ضرورت مند کی ضرورت پوری کرنے پر آمادہ ہی نہیں؟ اگر ایسا ہے تو پھر وہ انسانی سماج نہیں بلکہ جنگل کا راج ہے، جہاں خونخوار درندے اور جانور منہ پھاڑے ایک دوسرے کو نگل جانے کے لئے تیار بلکہ بے تاب ہیں، یا وہ جونک کی طرح ہے جو انسانی خون چوس کر اسے بے جان بنا دیتی ہے، حیرت ہے کہ یہ دنیا کس رخ پر جا رہی ہے، اور حساس و دردمند حضرات، یا حکومتیں اور اس کے ارباب کہاں خواب غفلت میں مست ہیں، اور انہیں صرف اپنی فکر، اپنا نفع اور مادی لذت ومنفعت ہی عزیز ہے۔

اصلاحی تدابیر:

ایسے افسوسناک واقعات کی روک تھام اور شرمناک رجحان پر قدغن لگانے کے لئے ضرورت ہے کہ ہم، ہمارا سماج، ہماری حکومت، سب مل کر اصلاحی تدبیریں اختیار کریں، انسان میں اس کی سوئی ہوئی انسانیت بیدار کی جائے، اس کے ضمیر کو جھنجھوڑا جائے، اس کے خفتہ جذبات کو بھڑکایا جائے، بچہ کی تربیت شروع ہی سے اسلامی اصولوں کے مطابق کی جائے تاکہ اس کا ذہن، دماغ اور سوچ وفکر اسلامی، انسانی، مثبت، تعمیری ہو، وہ تخریبی ذہن اور مجرمانہ کردار سے دور رہے، اخلاق، فضائل، غمخواری وغمگساری، اخوت ومحبت، انسانیت وشرافت، باہم اتحاد والفت، اعانت ونصرت کا درس دیا جائے، ان چیزوں کی خوبیاں اور فوائد بیان کئے جائیں، آخرت کی فکر، خدا کا خوف اور نیکی پر اجر وثواب، دنیا میں بھی اچھے صلہ وجزاء کا سبق دیا جائے اور رجحان پیدا کیا جائے، یہ بتایا جائے کہ وقتی اور عارضی فائدہ کو سامنے رکھنا، ہر چیز میں اپنا دنیوی مفاد پیش نظر رکھنا، ایثار وترجیح سے کام نہ لینا، جانوروں کی صفت ہے، سماج منکرات کی روک تھام کرے، نیکیوں کو

رواج اور جگہ دے، حکومت قانون بنائے اور اس پر عمل کو یقینی بنائے، اصلاح کے لئے فکر مند ہو کر اس کے مراحل پر عمل کرے، مجرم ذہن رکھنے والے افراد کو عبرت ناک سزا دے، تو امید قوی ہے کہ ایسے واقعات پیش نہ آئیں گے۔

معذور بچوں کی پرورش اور ان کا علاج:

ذہنی یا جسمانی طور پر معذور بچوں کی پرورش اور حتی الامکان ان کا علاج ضروری ہے، فرار اختیار کرنا یا فراغ حاصل کرنا درست نہیں، لیکن چونکہ گھر میں نگہداشت کی سہولت نہیں ہوتی، لہذا اسپتال میں بغرض نگہداشت اور مناسب علاج کے رکھا جائے گا، لیکن ان کے پاس والدین میں سے کوئی نہ کوئی رہے تاکہ اولاد اور والدین کا رشتہ کم یا ختم نہ ہونے پائے، اور بچہ بھی ان کی شفقت سے محروم نہ رہے، اگر ہسپتال میں رکھ کر علاج کا خرچ ناقابل برداشت ہو اور شفایابی کے روشن امکانات نہ ہوں یا ماہر اطباء نے مایوسی ظاہر کردی ہو تو علاج واجب نہیں، البتہ بالکل علاج بند کردینا بھی مناسب نہیں، "لعل اللہ یحدث بعد ذلک أمراً"۔

علاج کے سلسلہ میں اسلامک فقہ اکیڈمی جدہ کے فیصلے تحریر کئے جاتے ہیں:

☆علاج کے سلسلہ میں اصل حکم یہ ہے کہ وہ جائز ہے، کیونکہ قرآن کریم اور قولی و عملی سنت میں اس کی مشروعیت بیان ہوئی ہے، نیز شریعت کے مقاصد کلیہ میں سے ایک مقصد یعنی حفاظت جان اس سے وابستہ ہے، لیکن اشخاص واحوال کے فرق سے علاج کے احکام میں فرق ہوتا ہے۔ چنانچہ:

☆اگر علاج نہ کرنے سے مریض کی جان جانے کا اندیشہ ہو یا کسی عضو کے ضائع ہونے یا اس کے معذور ہو جانے کا اندیشہ ہو یا متعدی امراض کی صورت میں دوسروں تک مرض منتقل ہونے کا ڈر ہو تو ایسے شخص پر علاج واجب ہے۔

☆اگر علاج نہ کرنے سے جسمانی کمزوری پیدا ہونے کا اندیشہ ہو لیکن اوپر پہلی حالت میں بیان کردہ کوئی صورت پیش نہ آتی ہو تو ایسے مریض پر علاج کرانا مستحب ہے۔

☆اگر مذکورہ بالا دونوں حالتیں نہ ہوں تو پھر علاج کا درجہ اباحت کا ہے۔

مایوس کن حالت میں علاج:

الف: اسلامی عقیدہ کے مطابق مرض اور شفاء اللہ رب العزت کے ہاتھ میں ہے، دوا علاج صرف اسباب ہیں، جنہیں اللہ نے اس کائنات میں رکھا ہے، اللہ کی رحمت سے مایوسی جائز نہیں، اللہ کے اذن سے شفاء کی امید باقی رہنی چاہئے۔

ڈاکٹروں اور مریض کے متعلقین کا فرض ہے کہ مریض کی ہمت مضبوط بنائے رکھیں، شفاء یا عدم شفاء کی توقع سے قطع نظر کرتے ہوئے مریض کی نگہداشت اور اس کی جسمانی ونفسیاتی تکلیف میں تخفیف کے لئے مستقل کوشاں رہیں۔

ب: مریض کی جس حالت کو علاج سے مایوسی تصور کیا جاتا ہے، وہ دراصل محض ڈاکٹروں کے اندازے ہوتے ہیں، اور ہر دور و علاقہ میں طب کے موجودہ امکانات اور مریض کے حالات کے پیش نظر ہوتا ہے (فقہ اکیڈمی جدہ کے شرعی فیصلے ر ۲۱۱-۲۱۲ قرارداد: ۶۷/۵/۷)۔

ولی علی النفس پر صغیر کا علاج، ڈاکٹری اور ختنہ ضروری ہے، کیونکہ یہ بچہ کی صحت سے متعلق لازمی امور ہیں، اگر چھوٹے بچے کی زندگی بچانے کے لئے آپریشن کی سخت اور فوری ضرورت ہو اور ولی علی النفس موجود نہ ہو تو ولی علی المال یا کسی بھی عام مسلم کے لئے اجازت دینے کا اختیار ہوگا، کیونکہ آدمی کو بچانا ہر مسلمان پر واجب ہے (موسوعہ فقہیہ ۲۷ر ۲۳)۔

معذور بچوں کے علاج ومعالجہ کا ترک اسی صورت میں کیا جائے گا جبکہ مریض کی املاک سے اس علاج کا جاری رکھنا ممکن نہ ہو، نہ ورثہ ان اخراجات کو برداشت کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں اور نہ علاج کو جاری رکھنے کے لئے کوئی اور ذریعہ میسر ہو (اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کے فیصلے ر ۲۱۹)۔

شریعت اسلامی میں انسانی جان کی بڑی اہمیت ہے، اور حتی المقدور اس کی حفاظت خود اس شخص کا اور دوسروں کا فریضہ ہے، لہذا متعلقین کا علاج اور تیمارداری کی زحمت سے نجات پانے کے لئے تدبیر کرنا یا قدرت کے باوجود علاج ترک کرنا جائز اور درست نہیں ہے (ایضاً ملخصاً)۔

بچوں کے حقوق کے لئے تعلیم وتربیت کا نظام اور سد جرائم کی تدبیریں

مفتی تنظیم عالم قاسمی [1]

بنیادی طور پر انسانی زندگی کے تین درجات ہیں: ایک بچپن کا جس کا سلسلہ بلوغ تک باقی رہتا ہے اور جس میں انسان دوسروں کا محتاج رہتا ہے، دوسرے شباب کا جو بلوغ کے بعد شروع ہوتا ہے اور عام طور پر چالیس پینتالیس سال پر ختم ہوجاتا ہے، تیسرے بڑھاپے کا جس کا آغاز جوانی کے بعد ہوتا ہے اور موت تک رفیق سفر رہتا ہے، ان تینوں درجات میں بلوغ سے قبل کا جو مرحلہ ہے اس میں چوں کہ انسان مکلف نہیں ہوتا اس لئے فرائض وواجبات کے احکام اس سے وابستہ نہیں ہیں تاہم دیگر نوعیتوں کے مسائل واحکام اس سے مربوط ہیں جن میں سے بعض کا تعلق خود بچوں سے ہے جیسے وراثت، جنایت، نسب، نکاح وطلاق، بوقت موت ان کی تدفین اور غسل وطہارت، دودھ پیتے بچوں کے پیشاب، ان کے لعاب اور قے کی طہارت وعدم طہارت، باشعور اور ہوشمند بچوں کی نماز، زکوۃ، روزہ، حج، ان کی امامت، شہادت، وکالت ان کے معاملات اور دیگر مسائل اور بعض کا تعلق بچوں کے والدین، ان کے اولیاء اور سرپرستوں سے ہے جیسے بچوں کی حضانت، ان کی صحیح پرورش وپرداخت، ان کی تعلیم وتربیت، اچھے نام کا انتخاب، ختنہ، عقیقہ، ان کے مال کی خرید وفروخت، ان کی دینی ذہنی وجسمانی نشوونما کی دیکھ بھال وغیرہ متعدد ایسے احکام ہیں جن کے مخاطب بچوں کے اولیاء اور سرپرست ہیں۔

بچوں کے مسائل خواہ خود ان کی ذات سے مربوط ہوں یا ان کے والدین اور اولیاء سے، ان تمام کو کتاب وسنت میں اصولی طور پر بیان کردیا گیا ہے جن کی تشریح وتفصیل حضرات فقہاء اور محدثین نے بعد میں درج کیا اور مسائل کی درجہ بندی کرتے ہوئے امت کی مکمل رہنمائی فرمائی، یہی وجہ ہے کہ کتب فقہ میں جہاں جوانوں اور بوڑھوں کے احکام سے متعلق جزئیات وتفصیلات موجود ہیں وہیں بچوں اور نابالغوں کے احکام بھی شرح وبسط کے ساتھ پائے جاتے ہیں اور فقہ کی ہر کتاب میں ان کے مسائل پر مستقل ابواب بندی کی گئی ہے بلکہ بعض لوگوں نے بچوں کے احکام پر مشتمل کتاب ہی تصنیف کردی ہے، جن میں علامہ محمد بن محمود استروشنی (متوفی: ۶۳۲ھ) کی کتاب "جامع أحکام الصغار"، علامہ ابن قیم جوزی (متوفی ۷۵۱ھ) کی کتاب "تحفۃ المودود بأحکام المولود" اور ڈاکٹر عبداللہ ناصح علوان (متوفی: ۱۴۰۸ھ) کی تصنیف "تربیۃ الأولاد فی الإسلام" بطور خاص قابل ذکر ہے۔

آج کے بدلتے ہوئے حالات نے جہاں زندگی کے دوسرے شعبوں میں نئے مسائل پیدا کئے ہیں، بلوغ سے قبل کی زندگی سے متعلق بھی بہت سے ایسے مسائل رونما ہوئے ہیں جو حل طلب ہیں، اسلامک فقہ اکیڈمی لائق صد تحسین ہے کہ دیگر مسائل کے ساتھ بچوں سے متعلق ان جدید مسائل کو بھی موضوع بحث بنایا اور اس موضوع پر اجتماعی غور وخوض کے لئے اہل علم اور ارباب افتاء کو دعوت دی، خاص طور سے بچوں کے حقوق کا مسئلہ بہت اہم اور قابل توجہ ہے، اس لئے عالمی سطح پر ان کے حقوق کے تحفظ پر کافی زور دیا جارہا ہے اور ان کے لئے قوانین اور اصول وضابطے وضع کئے جارہے ہیں، کیوں کہ بچے ہی مستقبل کے معمار ہوتے ہیں، اگر ان کے مفادات کا تحفظ کیا جائے اور ان کی ذہنی، فکری اور جسمانی پرورش ونگرانی صحیح خطوط پر کی جائے تو موجودہ معاشرہ اور سماج صحیح سمت کی طرف اپنا رخ پھیر سکتا ہے۔

(الف) حق حضانت اور اس سے محرومی کے اسباب:

بچوں کے حقوق میں سے "حضانت" ایک اہم حق ہے، یہ لفظ حضن سے مشتق ہے جس کے معنی پہلو، سینہ اور دونوں بازو کے درمیانی حصہ کے ہیں اور شریعت میں ایسی پرورش وپرداخت کو حضانت کہا جاتا ہے جس میں بچے کے مفاد ومصالح کی مکمل حفاظت کی گئی ہو، اسلام کی نظر میں اسے ایک حق کے طور پر تسلیم کیا گیا ہے جو بالترتیب بچے کے قریبی رشتہ داروں سے وابستہ ہوتا ہے، اس حق کے تسلیم کرنے کا سبب بچوں کا صغر اور احتیاج ہے، بچے اس قابل نہیں ہوتے کہ اپنی ضرورت خود پوری کرسکیں، اپنے مفادات کا تحفظ اور مقتضیات زندگی کی تکمیل کرسکیں، شروع میں انہیں کھانے پینے اٹھنے بیٹھنے چلنے پھرنے اور بولنے کی

---

[1] استاذ حدیث دار العلوم سبیل السلام حیدرآباد۔

بھی طاقت نہیں ہوتی، ان کی مثال زمین سے نکلتے ہوئے نرم و نازک پودے کی ہے جس کی نگہداشت از حد ضروری ہے، ورنہ اس کے ضائع ہوجانے کا قوی امکان ہوتا ہے، اسی طرح بچوں کی جسمانی طبعی اور فکری ضروریات کی اگر تکمیل نہ کی جائے تو یہ بھی ضائع ہو جائیں گے، اس لئے ان کی حفاظت اور پرورش و پرداخت کی ذمہ داری بچے کے والدین اور ان کے اولیاء پر ڈال دی گئی ہے تاکہ وہ ان کی نازک طبیعت اور مزاج کی رعایت کرتے ہوئے اس طرح دیکھ بھال کریں کہ بعد میں خود ان میں اپنی کفالت کی اہلیت پیدا ہوجائیں اور وہ ایک کامل انسان بن کر اپنی زندگی گزار سکیں۔

ایک شخص اپنے شروع بچپن میں سب سے زیادہ محتاج ہوتا ہے، انسانی زندگی کا یہ مرحلہ ایسا ہوتا ہے جب وہ کسی چیز کی صلاحیت نہیں رکھتا، اس لئے اس موقع پر ان کو محبت وشفقت اور نرم روی کی شدید ضرورت ہوتی ہے اور یہ وصف ماں کی ذات میں بدرجۂ اتم موجود ہوتا ہے، اسی بنیاد پر شریعت نے سب سے پہلے حضانت اور پرورش کا حق ماں کو دیا ہے، ایک ماں کو فطری طور پر اپنے بچے سے جو پیار ہوتا ہے وہ کسی دوسرے کو نہیں ہوسکتا، وہ اپنی اولاد کی پرورش و پرداخت کی خاطر اپنی راحت اور اپنی جان تک قربان کردیتی ہے، یہ جذبہ دوسروں میں نہیں پایا جاتا، شریعت نے ان کی ممتا اور طبعی صلاحیت ومیلان کی رعایت کرتے ہوئے ان کو دیگر عورتوں پر ترجیح دی۔ ماں نہ ہو تو نانی اور نانی بھی نہ ہو تو اس کی اوپر اسی جہت کی کوئی بھی عورت ہو تو اس کو حق حضانت حاصل ہوگا۔ ماں کی جہت میں کوئی عورت نہ ہو تو دادی کو اسی ترتیب کے ساتھ حاصل ہوگا، دادی کے بعد بہن اور بہن کے بعد خالہ اور پھر پھوپھیوں کا درجہ ہے، اگر خواتین میں کوئی مستحق نہ ہو تو مردوں میں وہ لوگ مستحق ہوں گے جو بچے کے قریبی عصبہ رشتہ دار ہوں، ان میں وہی ترتیب ہوگی جو وراثت کے جاری ہونے میں ہوتا ہے، لہذا پہلے باپ، دادا، پردادا، اوپر تک پھر بھائی بھتیجہ وغیرہ، اگر یہ نہ ہوں تو چچا، چچازاد بھائی، ان کے بعد باپ کے چچا اور دادا کے چچا وغیرہ کو حق ہے، پھر ان تمام رشتہ داروں میں قوت قرابت کا اعتبار ہے، پہلے حقیقی پھر علاتی اور اخیافی مستحق ہوں گے جیسا کہ تقسیم میراث میں ترتیب ہے۔

ایک بچہ صغرسنی میں ماں کی ممتا اور اس کی شفقت ومحبت کا محتاج ہوتا ہے اور اس مرحلے میں ماں ہی صحیح طور پر اس کی پرورش کرسکتی ہے، اس لئے لڑکوں کو سات سال کی عمر تک اور لڑکیوں کی بلوغ تک پرورش کی ذمہ داری ماں کو اور اس کے نہ ہونے پر یکے بعد دیگرے دیگر عورتوں کو سونپی گئی ہے، اس عمر کے بعد تعلیم و تربیت تہذیب وثقافت اور آداب واخلاق کے ساتھ شادی بیاہ کی ضرورت پیش آتی ہے اور یہ فریضہ باپ بہتر طور پر انجام دے سکتا ہے، اسی لئے ہوش وحواس سنبھالنے کے بعد ماں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ اب بچے کو باپ کے حوالے کردیں تاکہ عمر کے حساب سے تعلیم وتربیت اور اخلاقیات کا انتظام ہوسکے گویا حق حضانت کے سلسلے میں شریعت کی بنیادی ہدایات یہ ہیں کہ صغرسنی میں یعنی ہوش وحواس سنبھالنے سے پہلے ماں اور اس کے بعد باپ حضانت کا مستحق ہے، شریعت نے ایک بچے کی ضرورت اور اس کی نزاکتوں کا خیال کرتے ہوئے یہ تقسیم کیا ہے، اب بنیادی طور پر ماں کی ذمہ داری ہے کہ بچپن میں ہر ممکن بچے کی صحت، اس کی صحیح اصولوں پر پرورش و پرداخت اور اس کی ابتدائی تربیت کا انتظام کرے، اس پر اپنی محبت وشفقت نچھاور کرے اور جہاں تک ہوسکے بچے کو آرام وراحت پہنچانے کی فکر رکھے، اس ذمہ داری کے نبھانے میں اگر ماں سستی اور کوتاہی کا مظاہرہ کرے جس سے محسوس ہو کہ اس کے دل میں بچے سے کوئی خاص دلچسپی نہیں یا اس سے بچے کے جسم وصحت اور ذہن ودماغ پر غلط اثر مرتب ہوسکتا ہے ایسے وقت ماں کا حق حضانت ختم ہوجائے گا اور ترتیب مذکور کے مطابق دوسرے کی طرف یہ حق منتقل ہوگا۔

حضرات فقہاء نے ماں کے حق حضانت ختم ہونے کے جو اسباب بیان کئے ہیں وہ درج ذیل ہیں:

۱۔ ماں نے طلاق یا شوہر کی وفات کے بعد بچے کے غیر محرم سے شادی کرلی ہو یا بچے کے محرم سے ہی کی ہو مگر وہ بچے سے بغض رکھتا ہو، اس حالت میں ماں اپنے بچے کی صحیح طرح پرورش کرسکتی ہے اور نہ اسے اپنی محبت دے سکتی ہے، اس لئے حق حضانت کی مصلحت ختم ہوجانے کے سبب اس کا حق ساقط ہوجائے گا۔

۲۔ ماں کسی اچھے یا برے کام میں اس قدر مصروف ہوجائے کہ بچے کے لئے وقت نکالنا دشوار ہو جیسے ماں دایہ یا غسالہ ہو یا مزدوری اور کام کاج کے لئے کثرت سے باہر جانا ہوتا ہو یا وہ زانیہ اور گیت گانے والی ہو یا چوری کرنے اور نوحہ خوانی کا غلط پیشہ اس نے اختیار کیا ہو، ان تمام صورتوں میں حق حضانت ختم ہوجائے گا۔

۳۔ ماں بینائی سے محروم ہو یا سخت بیمار اور پریشان حال ہو یا کافی عمر دراز ہونے کی وجہ سے ضعیف ہو ان صورتوں میں پرورش کی قدرت باقی نہیں رہتی، لہذا اس طرح کی تمام صورتوں میں حق حضانت سے ماں محروم رہے گی۔

۴۔ ماں اگر بددین، کتابیہ کافرہ فاسقہ یا غلط عادتوں کی حامل ہو تو بچہ جب ہوش سنبھال لے اور اس کی فکر پر غلط چھاپ پڑنے کا اندیشہ ہونے لگے تو ماں کا حق ساقط ہوجائے گا۔

۵۔ ماں کو اگر جنون یا جذام یا برص وغیرہ متعدی مرض لاحق ہوجائے تو اس سے بھی ماں کا استحقاق ختم ہوجائے گا اس لئے کہ بچہ ان کے حوالے کرنے میں اس کے ضیاع اور شدید نقصان کا اندیشہ ہے۔

أحق الناس بحضانة الصغير حال قيام النكاح و بعد الفرقة الأم (خانیہ علی ہامش الہندیہ ۱/۴۲۳)

کتب فقہیہ کی عبارتوں میں غور کرنے سے بنیادی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ ماں کے لئے حضانت کا اولین حق تسلیم کئے جانے کی وجہ اس کی شفقت ومحبت اور اس میں پائی جانے والی فطری تڑپ ہے اور شروع عمر میں بچے کو اسی کی ضرورت بھی ہوتی ہے اور شریعت کا مقصد اس کی جسمانی وذہنی اچھی پرورش و پرداخت ہے، لیکن اگر ماں کو حوالہ کرنے میں بچے کی صحیح پرورش نہ ہوسکتی ہو یا اس کو جسمانی ذہنی عقلی یا نفسیاتی طور پر شدید نقصان کا اندیشہ ہو تو ماں کو حق حضانت دیئے جانے کی جو علت ہے وہ ختم ہوگئی، اس لئے اس کا حق بھی ختم ہوجائے گا اور ماں یا اس کے بعد یکے بعد دیگرے دیگر عورتیں اس کے سبب حق حضانت سے محروم کردی جائیں گی، البتہ سات سال کی عمر تک پڑھنے یا تربیت پانے کی کوئی خاص عمر نہیں ہوتی ہے۔ بچہ اس عمر میں نہ پڑھ سکے یا تربیت نہ پاسکے تو اس کی وجہ سے اس کا مستقبل تاریک نہیں ہوگا، یہ کمی بعد میں پوری کی جاسکتی ہے اور ماں کو حق حضانت دینے میں اس کی تعلیم وتربیت پیش نظر بھی نہیں، اس لئے ماں اگر اپنی دیگر ذمہ داریاں مکمل طور پر نبھارہی ہیں اور تعلیم وتربیت کی طرف توجہ نہیں دیتی ہے تو اس کے سبب اس کا حق ساقط نہیں ہوگا (تفصیل کے لئے دیکھئے: ردالمحتار ۳/۵۵۵، ۵۵۷، الفقہ الاسلامی وادلتہ ۷/۷۳۱)۔

سات سال کے بعد لڑکوں کا اور لڑکیوں کا بلوغ کے بعد حق حضانت باپ کی طرف منتقل ہوجاتا ہے، اس لئے کہ اب یہ عمر کا ایسا مرحلہ ہے جب دیگر چیزوں کے ساتھ اس کی تعلیم وتربیت پر خاص توجہ دیا جانا ضروری ہے، اس مرحلے میں اگر اس کی صحیح تربیت نہ کی گئی یا اس کی صحیح تعلیم کا انتظام نہ کیا گیا تو بعد میں یہ کمی پوری نہیں کی جاسکتی، چنانچہ ماں کے مقابلے میں باپ پر ایک گونہ ذمہ داری کا اضافہ ہوگیا اور وہ ہے بچے کی صحیح پرورش و پرداخت یعنی اس کی جسمانی عقلی ذہنی نفسیاتی حفاظت کے ساتھ ساتھ اس کی حسب استطاعت بہترین تعلیم وتربیت کا انتظام، اگر باپ ان فرائض سے راہ فرار اختیار کرتا ہے تو اسے بھی حق حضانت سے محروم کردیا جائے گا، مگر اس شرط کے ساتھ کہ بچے کی ضروری تعلیم وتربیت سے بھی اس کی عدم دلچسپی بالکل واضح ہو اور اس کے علاوہ دوسرا ولی یا قریبی رشتہ دار موجود ہو جو بچے کی تعلیم وتربیت کا انتظام کرسکے جیسے بچے کی ماں اگر باحیات ہے اور وہ بچے کی تعلیم وتربیت سے مکمل دلچسپی رکھتی ہے اور اسے اس پر قدرت بھی حاصل ہے تو یہ حق باپ کے بجائے ماں کی طرف ہی لوٹ جائے گا تاکہ بچے کا بھلا ہوسکے جیسے چھوٹے بچے کی شادی کا حق ولی اقرب کو ہے لیکن ولی اقرب اگر اتنا دور ہے کہ اس کی رائے سے استفادہ نہیں کیا جاسکتا تو خود بخود ولی ابعد کی طرف یہ حق منتقل ہوجاتا ہے، اس لئے کہ جس بنیاد پر یہ حق دیا گیا تھا وہ وجہ باقی نہیں رہی، دور حاضر کے مشہور فقیہ علامہ وہبہ زحیلی کی مذکورہ عبارت سے یہی معلوم ہوتا ہے جو انہوں نے شامی (۲/۸۸۰) کے حوالے سے لکھا ہے، خلاصہ یہ کہ اگر باپ کے پاس بچہ رکھنے میں بچے کو جسمانی ذہنی نفسیاتی تعلیمی وتربیتی نقصان ہونے کا اندیشہ قوی اور ظن غالب ہو تو ماں کی طرح ان کا بھی حق ساقط ہوجائے گا۔

ب۔ بچوں کے لئے دینی وعصری تعلیم کا انتظام:

بچہ نرم ونازک پودے کی طرح ہے جیسی اس کی تربیت کی جائے گی ویسے ہی بعد میں اس کا مزاج بنے گا، اگر صغر سنی میں اس کو توحید و رسالت، جنت وجہنم، آخرت اور دیگر عقائد کا پختہ درس دے دیا جائے اور دینی سانچے میں اس کو ڈھال دیا جائے تو بعد میں الحاد و دہریت کی مسموم ہوا اسے متاثر نہیں کرسکے گی، اس لئے والدین اور بالخصوص باپ یا اس کے دیگر اولیاء کی ذمہ داری ہے کہ جیسے ہی بچہ جسمانی اور عقلی اعتبار سے تعلیم وتعلم کے لائق ہوجائے اسے قرآن کریم کی تعلیم دے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرنا سکھائے، انبیائے کرام صحابۂ عظام اور بزرگوں کی سیرت سے واقف کرائے، نماز، روزہ، زکوۃ، ذکر واذکار، وضو، غسل اور آداب واخلاق کی تعلیم دے اور اتنی حد تک دینی تعلیم سے آراستہ کردے جس سے بنیادی طور پر اس میں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی پہچان پیدا ہوسکے اور فرائض وواجبات پر عمل کرنے میں کوئی دشواری پیدا نہ ہو، احادیث میں اپنی اولاد کو دینی تعلیم سے آراستہ کرنے کی بطور خاص تاکید کی گئی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "أدبوا أولادكم وأحسنوا أدبهم" (ابن ماجہ ۳۶۷۱)۔ (اپنے بچوں کو ادب سکھاؤ اور ان کی اچھی تربیت کرو)۔

''علموا أولادكم و أهليكم الخير وأدبوهم'' (مصنف عبدالرزاق)۔ (اپنے بچوں کو اور گھر والوں کو خیر کی تعلیم دو اور ان کو ادب سکھاؤ)۔

''أدبوا أولادكم على ثلث خصال: حب نبيكم و حب آل بيته و تلاوة القرآن فإن حملة القرآن في ظل عرش الله يوم لا ظل إلا ظله'' (طبرانی)۔

(اپنے بچوں کو تین باتیں سکھاؤ: اپنے نبی ﷺ سے محبت، ان کے اہل بیت سے محبت اور قرآن پاک کی تلاوت، اس لئے کہ قرآن کے حاملین اس دن اللہ کے عرش کے سائے میں ہوں گے جس دن اس عرش کے سایہ کے علاوہ کوئی سایہ نہ ہوگا)۔

ان ہی احادیث کی بنیاد پر فقہاء اور اہل نظر نے ولی پر بچوں کی تعلیم وتربیت کو لازم قرار دیا ہے:

''یجب علی الولی تأدیب الصغار بالآداب الشرعیة التی تغرس فی نفس الطفل الأخلاق الکریمة والسلوك القویم'' (الموسوعة الفقهیة ۲۲/۲۷)

تعلیم وتربیت کے وجوب میں لڑکا اور لڑکی کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے، ضروری حد تک دونوں کو دینی تعلیم سے واقف کرانا جس سے دونوں اپنے اپنے مسائل سے واقف ہوسکیں ضروری ہے، آج دینی تعلیم وتربیت سے کنارہ کشی اختیار کرنے کے سبب بچے بگڑ رہے ہیں، ان میں خوف خدا ہے، نہ خوف آخرت، نہ بڑوں کا ادب اور نہ اخلاق وکردار، وہ مجرمانہ زندگی میں حد سے آگے بڑھتے ہوئے ہیں اور اس میں خود ان کے ماں باپ کا بنیادی رول ہے جنہوں نے دینی تعلیم وتربیت کے فرائض ادا نہیں کئے اور احکام شریعت کی تفہیم میں پہلوتہی سے کام لیا، آج سارے مسلمان اپنے بچوں کو عصری تعلیم سے آراستہ کرنے کی فکر میں ہیں، اسکولس کالجس اور اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم کے لئے ہر جتن کرتے ہیں، حالانکہ عصری تعلیم ولا نامحض مباح کا درجہ رکھتا ہے، دور حاضر کے تقاضوں کی تکمیل کے لئے عصری تعلیم دی جاسکتی ہے، مگر وہ فرض یا وجوب کے درجے میں نہیں ہے جب کہ دینی تعلیم وتربیت سے آراستہ کرنا اور اس کا مناسب انتظام کرنا ماں باپ پر فرض ہے۔

اگر حکومت کسی سطح تک کی تعلیم کو بچوں اور بچیوں کے لئے لازم قرار دے تو حکومت کی پالیسی مسلمانوں کے لئے بھی لازم ہوگی، اس لئے کہ تعلیم فی نفسہ بہتر چیز ہے خواہ وہ عصری ہی کیوں نہ ہو، اس سے سوچ وفکر میں بالیدگی پیدا ہوتی ہے اور بہتر طور پر جینے کا ڈھنگ آتا ہے، حکومت کو اس بات کا اختیار ہے کہ وہ مصالح عامہ، عدل وانصاف اور ضرر وضرار سے بچانے کے لئے قوانین وضع کرے، شرعاً مسلمانوں پر ان قوانین کی پابندی لازم ہوگی بشرطیکہ وہ قوانین شریعت کے خلاف نہ ہوں، مشہور محقق ڈاکٹر یوسف قرضاوی لکھتے ہیں:

''إن الذین یخالفون القانون الذی یحفظ الحقوق و یقر العدل ویقیم میزانه هٰؤلاء یعتبرون شرعا مخالفین للدین نفسه لأن الدین یأمر بطاعة مثل هٰذه القوانین التنظیمیة ما دامت بالمعروف وفی غیر معصیة''

(فتاویٰ معاصرہ ۱/۵۹۷)۔

البتہ حکومت سے مطالبہ کیا جائے کہ بالغ اور باہوش لڑکیوں کے تعلیمی ادارے علحدہ قائم کئے جائیں، اس لئے کہ اسلامی احکام کے مطابق لڑکا اور لڑکی جب اس عمر کو پہنچ جائیں کہ ان کے اندر نفسانی خواہشات پیدا ہونے لگیں تو اب ان دونوں کا ایک ساتھ رہنا اٹھنا بیٹھنا حرام ہے، کیوں کہ اس صورت میں فتنہ اور برائی کا اندیشہ ہے، شریعت نے سد باب کے طور پر باہوش لڑکیوں سے دور رہنے کا حکم دیا ہے، مخلوط تعلیم میں چوں کہ نشستیں ایک ساتھ ہوتی ہیں، ایک دوسرے کے قریب ہونے کے مواقع کثرت سے پیش آتے ہیں، قوی امکان ہے کہ دونوں اخلاقیات کی حدوں کو پار کرکے برائی اور بے حیائی میں مبتلا ہو جائیں اور آج کے دور میں مخلوط تعلیم گاہوں میں انسانیت سوز اس طرح کے واقعات پیش آتے رہتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ طریقہ تعلیم نہایت غلط ہے، اس لئے مسلمان اجتماعی طور پر حکومت سے مطالبہ کریں کہ وہ عورتوں کے لئے علاحدہ اسکولس کالجس اور دیگر ادارے قائم کرے، اگر حکومت مسلم عورتوں کو مخلوط تعلیم گاہوں میں پڑھنے پر مجبور کرے تو اس کی مخالفت کی جائے گی اور اس قانون پر عمل نہیں کیا جائے گا، مشہور حدیث ''لا طاعة لمخلوق فی معصیة الخالق'' سے یہی مفہوم نکلتا ہے۔

عمر کے حساب سے بچوں کے جذبات مختلف ہوتے ہیں، ان کی عمر اور جذبات کے اعتبار سے ان کو تعلیم دی جانی چاہئے، لہٰذا بلوغ سے قبل صغرسنی میں جب کہ ان کے اندر نفسانی خواہشات پیدا نہیں ہوتی ہیں اور طبیعت میں جنس کا ابھار نہیں ہوتا اس مرحلے میں بچوں کو جنسی تعلیم نہیں دینی چاہئے، اس سے ان کا ذہن آلودہ ہوگا اور تعلیم کے بجائے جنسیات کی طرف دل ودماغ منتقل ہوگا جو ان کے لئے بڑا نقصان دہ ہے، ہاں البتہ اگر بچہ بلوغ کی عمر کو پہنچ جائے یا کم از کم مراہق ہو جائے تو ضروری حد تک جنس کی تعلیم دینے میں کوئی حرج نہیں ہے، بلکہ بسا اوقات بتانا استاذ یا والدین پر واجب ہو جاتا ہے جیسے قرآن کی بہت سی آیات میں جماع، صحبت اور اتصال وملاپ کا تذکرہ ہے، اس میں انسان کے نطفے سے پیدا ہونے کا اور زنا وغیرہ کا تذکرہ ہے، شرمگاہوں کی حفاظت کا تذکرہ ہے، حیض ونفاس کا تذکرہ ہے، ان آیات کے افہام وتفہیم کے وقت جنس اور خواہشات کی تعلیم دینی ہی ہوگی، ورنہ مسائل سمجھائے نہیں جاسکتے، قرآن سے زیادہ احادیث میں جنسیات کی تشریح ہے اور وہ اس لئے بھی کہ مردوں عورتوں کے ملاپ سے ہی دنیا کا تصور ہے اور اس ملاپ سے بہت سارے احکام وابستہ ہیں تو اسلام جو ایک کامل

مذہب ہے اس میں اسے کیسے نظر انداز کیا جا سکتا تھا ورنہ اس کی تعلیم ادھوری رہ جائے گی جو بڑا نقص ہے، مدارس عربیہ میں عمر کے جس مرحلے میں جنس کی بحث آتی ہے بچے باشعور ہو جاتے ہیں، ان کو ضروری حد تک جنس کی تعلیم دینے میں کوئی حرج نہیں لیکن اسکولس میں نیچے کے کلاس میں ہی کمسن بچے اور بچیوں کو اس طرح کی تعلیم شروع کر دی جاتی ہے جس سے اخلاقیات پر بہت برا اثر مرتب ہوتا ہے، خاص طور پر اس لئے بھی کہ وہاں بچے اور بچیاں دونوں ایک ساتھ رہتے ہیں، اس طرح کے مخلوط ماحول میں قطعا جنس کی تعلیم مناسب نہیں اور پھر وہاں ضرورت اور عمر کا بھی لحاظ بھی نہیں رکھا جاتا، بچے جیسے جیسے بڑے ہوں اور جیسی ضرورت ہو ان کو اخلاقیات کے حدود میں رہتے ہوئے جنس کی تعلیم دی جا سکتی ہے اور اگر کسی مسئلہ کو سمجھنا اسی پر موقوف ہے تو پھر ان کا یہ حق ہوگا کہ وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا جائے ورنہ یہ بخل اور حق تلفی شمار ہوگا۔

ج۔ بچے اور بچیوں کا نکاح اور شرعی ہدایات:

نکاح ایک طبعی ضرورت ہے، فطری طور پر انسان میں اس کی طرف دل کا میلان ہونا ہے اور یہ سب اللہ کی جانب سے ہے، مگر یہ ضرورت بلوغ کے بعد پیش آتی ہے، اس لئے نکاح کا بہترین وقت بلوغ کے بعد ہے جب کہ نفسانی خواہشات میں ابھار اور جنسی تسکین کی دل میں امنگ پیدا ہوتا ہے، تاہم بلوغ سے قبل بھی شادی کرانے میں کوئی حرج نہیں، خاص طور پر جب کہ صغرسنی میں نکاح کرانے میں بچے اور بچیوں کی منفعت ہو، مثال کے طور پر کسی پاکیزہ اور نیک خاندان میں کوئی بچی ہے اور اندیشہ ہے کہ بلوغ کی عمر کا انتظار کرنے سے بچی ہاتھ سے چلی جائے گی، اس کا نکاح دوسری جگہ ہو جانے کا امکان ہے، لہذا اپنے نابالغ بچے کا رشتہ اس مصلحت اور حکمت کی بنیاد پر کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، شریعت نے اولیاء کو اسی حکمت کے تحت ولایت اجبار کا حق دیا ہے حالانکہ بچہ نکاح کا مفہوم سمجھنے پر بھی قادر نہیں، ولی اس کی طرف سے ایجاب و قبول کرتا ہے، اس کے باوجود شریعت نے اسے درست قرار دیا ہے تاکہ کفاءت کا تحفظ ہو سکے، اس لئے کہ ہر دور میں کفو دستیاب نہیں ہوتا، احادیث و روایات سے بھی بچپن کی شادی کی تائید ہوتی ہے، چنانچہ حضرت عائشہؓ سے رسول اکرم ﷺ نے چھ سال کی عمر میں نکاح کیا تھا (صحیح بخاری: ۵۱۳۳)، حضرت قدامہ بن مظعون کی شادی حضرت زبیرؓ کی صاحبزادی سے ان کی پیدائش کے دن ہوئی تھی (مرقاۃ المفاتیح ۲۰۶/۶)، حضرت عبداللہ ابن عمرؓ نے اپنے لڑکے کی شادی اپنی بھتیجی سے بچپن میں ہی کرادی تھی (السنن الکبری حدیث نمبر: ۱۳۸۱۷)، حضرت عروہ ابن زبیرؓ کا اپنے کم سن لڑکے کی شادی حضرت مصعبؓ کی کم سن لڑکی سے کرانے کا واقعہ بھی کتابوں میں موجود ہے (مصنف بن عبدالرزاق ۱۰۳۵۸)۔

اس طرح کے آثار و واقعات کی وجہ سے محدثین نے اپنی کتابوں میں ولد صغار کے نکاح کرانے پر مستقل باب ہی قائم کیا ہے، خود قرآن کریم نے نابالغہ کی عدت گذارنے کا طریقہ "واللائی لم یحضن" (سورہ نساء: ۴) میں مہینے کے ذریعے بیان کیا ہے جس سے صاف طور پر بلوغ سے قبل شادی کے جائز ہونے کا ثبوت ملتا ہے، اسی لئے مشہور شارح حدیث علامہ نوویؒ نے اس مسئلہ پر اجماع نقل کیا ہے کہ بچپن میں شادی کرانا جائز ہے:

"أجمع المسلمون علی جواز تزویج الأب بنته البکر الصغیرۃ" (مرقاۃ المفاتیح ۲۰۶/۶) (باپ کا اپنی بیٹی کا نکاح بچپن میں کرادینے کے جواز پر مسلمانوں کا اجماع ہے)

بچپن میں نکاح کے جواز پر اجماع ہے اور اس میں کسی کا اختلاف بھی منقول نہیں، جہاں تک مسئلہ استحباب اور بہتری کا ہے، ظاہر ہے کہ بلوغ کے بعد نکاح کرانے میں مقصد کی تکمیل کے ساتھ ساتھ طبی اعتبار سے بھی بہتر ہے، صغرسنی میں نکاح سے ضرر لاحق ہو سکتا ہے اور ضرر سے بچانا ولی کی ذمہ داری ہے، بعض مصالح کی بنیاد پر نکاح کا جواز عدم استحباب کی منافی نہیں، بالکل کم سنی میں شادی بیاہ کا رواج بہتر نہیں ہے، اسے ختم کرنا چاہئے اور یہ طریقہ بھی صحیح نہیں ہے کہ بلوغ کے بعد لمبی عمر تک بچے یا بچیوں کو نکاح کے لئے انتظار کرایا جائے جیسا کہ بعض علاقوں میں مختلف مقاصد کے لئے ایسا کیا جاتا ہے، کہیں تعلیم تکمیل کے انتظار میں، کہیں ملازمت لگنے اور کہیں گھر کی تعمیر کے انتظار میں، کہیں بہنوں کی شادی کے انتظار میں اور کہیں والدین بچے یا بچیوں کی تعلیم پر خرچ ہونے والی رقم واپس ہونے کے انتظار میں ایسا کیا جاتا ہے اور اس کے بہت مضر اثرات معاشرے پر مرتب ہوتے ہیں، بے حیائی اور برائی کا چشمہ ابل پڑتا ہے، اسی لئے رسول اکرم ﷺ نے جوان ہونے کے ساتھ ہی نکاح کے بندھن سے بندھ جانے کا حکم دیا ہے۔

"یا معشرا لشباب من استطاع منکم الباءۃ فلیتزوج فإنه أغض للبصر وأحصن للفرج" (صحیح بخاری)۔

بالغ ہونے کے ساتھ ہی نکاح کر دینے سے بچے کے جذبات پاک رہتے ہیں اور ان کی توجہ فعل حرام کی طرف نہیں جاتی، ماں باپ پر بچے کا حق جیسے ان کے اچھے نام کا انتخاب، عقیقہ، تعلیم و تربیت اور بہتر جسمانی نشوونما کی تدبیر ہے ویسے ہی بلوغ کے بعد جتنا جلد ہو سکے نکاح کرا دینا بھی ایک اہم حق ہے، بشرطیکہ مہر اور نان و نفقہ پر قدرت حاصل ہو اور لڑکی کا جسم صحت اور وطی کا متحمل ہو اور رشتہ بھی شرعی نقطہ نظر سے مناسب ہو، اگر لڑکے یا لڑکی کا جسم شادی کے لائق نہیں یا

مناسب رشتہ میسر نہ ہوتو کچھ دنوں تک انتظار کیا جاسکتا ہے مگر غلط مقاصد کے لئے نکاح کی تاخیر درست نہیں، اس سے فساد عریض کا اندیشہ ہے جس کا سد باب ہر مسلمان کا فریضہ ہے۔

د۔ بچہ مزدوری اور شرعی نقطہ نظر:

شریعت نے انسان کو ان ہی چیزوں کا مکلف بنایا ہے جن کی اس میں طاقت اور وسعت ہے، بچہ چوں کہ محتاج، کمزور اور نااہل ہوتا ہے اس لئے اس کے نان نفقہ، علاج ومعالجہ اور دیگر تمام ضروریات کی تکمیل کا ذمہ دار باپ کو قرار دیا گیا ہے، باپ پر واجب ہے کہ بقدر استطاعت بچے کی جسمانی وذہنی نشوونما، اس کی صحت وتندرستی، نشاط اور چستی پیدا کرنے کے جو بھی اسباب ہوں انہیں اختیار کرے، اسے صحیح غذا، قابل رہائش مکان اور قابل استعمال لباس مہیا کرے، یہ وجوب اس وقت تک ہے جب تک وہ ازخود کمانے کے لائق نہیں ہوجاتا ہے: "فعليه نفقتهم إلى أن يبلغ الذكر حد الكسب وإن لم يبلغ الحلم" (فتح القدیر ۴/۲۱۶)

اولاد سے ہمدردی کا تقاضہ یہ ہے کہ بچپن میں ان کو دنیا کمانے کے لئے استعمال نہ کیا جائے، یہ عمر تعلیم وتربیت کے لئے بہتر وقت ہوتا ہے، اس وقت بچے کا ذہن صاف ستھرا، حافظہ قوی اور تعلیم میں خوب نشاط ہوتا ہے، اسی جانب معلم اول رسول اکرم ﷺ نے اشارہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

"العلم في الصغر كالنقش في الحجر" (بیہقی)۔

(بچپن میں علم حاصل کرنا ایسا ہے جیسے کہ پتھر پر نقش کردینا)۔

اس لئے ذریعہ معاش اگر تنگ اور محدود بھی ہو پھر بھی سرپرستوں کو چاہئے کہ بچوں کو پڑھنے لکھنے، اعلی تعلیم حاصل کرنے اور اخلاق وآداب سیکھنے کے لئے وقف کردیں اور کوئی ایسا کام ان سے ہرگز نہ کرائیں جس سے ان کے قوی جسمانی وذہنی متاثر ہوتے ہوں، لہذا بچوں کو گداگری کے لئے استعمال کرنا، ان کو چوری، زناکاری وغیرہ بری عاتوں میں ملوث کرنا حرام اور جرم عظیم ہے جس کی جتنی بھی مذمت کی جائے کم ہے، ہاں البتہ گھر کے چھوٹے موٹے کام اور معمولی خدمت ان کی وسعت کے اعتبار سے لی جاسکتی ہے جیسے باپ کا اپنے بیٹے سے جسمانی خدمت، بازار سے سودا سلف لانے کی خدمت، خرید وفروخت اور دوسری خارجی وگھریلو خدمات، حضرت عمرو بن شعیبؒ سے روایت ہے کہ ایک عورت رسول اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا یا رسول اللہ! میرا شوہر مجھ سے میرا بیٹا چھین لینا چاہتا ہے حالانکہ وہ میرے لئے پینے کے پانی کا انتظام کرتا ہے اور مختلف انداز سے مجھے نفع دیتا ہے، آپ ﷺ نے اس بچے کو اختیار دیا جس کے ساتھ چاہے رہے، اس بچے نے اپنی ماں کے ساتھ رہنے کو پسند کیا وہ لے کر چلی گئی (مشکوۃ صفحہ ۲۹۳)۔

اس عورت نے اپنے بچے سے مختلف طرح کی خدمات لینے کا ذکر کیا مگر رسول اکرم ﷺ نے کوئی نکیر نہیں فرمائی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ معروف طریقے پر بچوں سے اس طرح کے نجی اور گھریلو کام کرانے میں کوئی حرج نہیں ہے، مگر ایسا کام جس کی ان میں طاقت نہ ہو جائز نہیں، یہ سراسر ظلم اور بے رحمی ہے، رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: "للمملوك طعامه وكسوته ولا يكلف من العمل إلا ما يطيق" (صحیح مسلم)۔

(غلام کے لئے کھانا اور کپڑا ہے اور اس کو ایسے کام کا مکلف نہ بنایا جائے جس کی اس میں طاقت نہ ہو)۔

اندازہ کیجئے کہ غلام جس کے رقبہ اور وجود پر مکمل قدرت اور ملکیت حاصل ہے، بحیثیت انسان اس کے ساتھ بھی محبت وہمدردی کی تعلیم دی گئی ہے اور طاقت سے زیادہ بوجھ لادنے اور بھاری کام لینے سے منع کیا گیا ہے تو پھر اولاد کا کیا حکم ہوگا، ظاہر ہے کہ بچے اپنے ماں باپ کی شفقت وہمدردی اور محبت کے بے حد محتاج ہوتے ہیں، ان کے مشفقانہ برتاؤ سے ان کو حوصلے ملتے ہیں اور ان کا مستقبل تابناک ہوتا ہے، اس لئے ایک باپ اور ولی کو چاہئے کہ بلا ضرورت شدیدہ محض اپنے آسائش اور راحت کے اسباب جمع کرنے، معیار زندگی کو بہتر بنانے اور دولت وجائداد جمع کرنے کی غرض سے بچے سے مزدوری نہ کرائے اور نہ کسی کاروبار میں مصروف کرے، اس سے اس کی تعلیمی زندگی متاثر ہوگی، حالانکہ ایک باپ کی طرف سے بیٹے کے لئے سب سے بہترین تحفہ بہتر تعلیم وتربیت ہے: "ما نحل والد ولده من نحل أفضل من أدب حسن" (ترمذی)۔

ہاں اگر کوئی شخص لاچار ومجبور ہے، نان نفقے کا انتظام نہیں ہوسکتا، نہایت کسمپرسی میں زندگی گھری ہوئی ہے جیسے کسی کا اپاہج ہونا، نہایت ضعیف وکمزور ہونا کہ مزدوری بھی نہیں کرسکتا یا بیمار ہونا وغیرہ اور وہاں کوئی شخص معاش کا انتظام بھی نہیں کرسکتا ہے تو اس کے لئے بدرجہ مجبوری اپنے بچوں سے مزدوری کرانے کی گنجائش ہے، لیکن اس کے لئے بھی بہتر ہے کہ بچوں کو پارٹ ٹائم کام کرائے اور باقی اوقات حصول تعلیم کی تاکید کرے اور ایسے امور میں انہیں مصروف رکھے جن

سے یہ بچے ذہنی اخلاقی ذہنی وجسمانی طور پر پروان چڑھ سکیں، آج کل اس طرح کے مواقع بہت موجود ہیں کہ خالی اوقات اگر تھوڑی بہت محنت کرلی جائے تو اتنا معاش حاصل کیا جاسکتا ہے جس سے پورے گھر والے زندگی گزار سکتے ہیں، چنانچہ اسکولس اور کالجس کے بہت سے طلبہ آج اپنی فیس اور دیگر اخراجات کا اسی طرح خود سے انتظام کرلیتے ہیں اور وہ گھر والوں پر بوجھ نہیں بنتے، تاہم اگر جزوی مزدوری وکسب معاش سے ماں باپ کے نفقے کا انتظام نہیں ہوسکتا تو مکمل طور پر ہوشمند بچوں کو کام پر لگایا جاسکتا ہے جس کی ان میں طاقت واستطاعت موجود ہو لیکن یہاں بھی ضروری ہوگا کہ ان کو اتنا موقع فراہم کیا جائے جس میں کسی کے پاس جاکر ضروری تعلیم حاصل کرسکیں، مشہور فقیہ علامہ کاسانی لکھتے ہیں:

''للأب أن یؤاجر ابنه الصغیر من عمل من الأعمال'' (بدائع الصنائع ۴-۲۲)۔

(والد کے لئے گنجائش ہے کہ وہ اپنے نابالغ لڑکے کو کسی کام پر ملازم رکھوائے)۔

لیکن چھوٹے اور نابالغ بچوں سے مزدوری وملازمت کرانے کا حق صرف باپ یا دادا ہی کو ہے دیگر اولیاء کو یہ حق حاصل نہیں، کیوں کہ باپ اور دادا میں شفقت مکمل طور پر پائی جاتی ہے، وہ اپنے بچے کو بدرجہ مجبوری ہی اس کام پر لگا سکتا ہے، دیگر اولیاء میں یہ وصف نہیں پایا جاتا ہے، اس لئے امکان ہے کہ بلا ضرورت بچے کو اس کام پر لگائے یہی وجہ ہے کہ شریعت نے بہت سے احکام میں باپ دادا اور دیگر اولیاء میں فرق بیان کیا ہے جیسے نابالغ بچوں کے مال میں تصرف کا حق صرف باپ اور دادا کو دیا گیا ہے دیگر اولیاء کو نہیں یا ولایت اجبار بطور الزام صرف باپ دادا کے لئے ثابت ہے دیگر اولیاء کو یہ حق حاصل نہیں، اسی لئے فتاوی ہندیہ میں بچوں سے مزدوری کرانے کے سلسلے میں صرف باپ اور دادا کا ہی تذکرہ کیا گیا ہے:

''والأب والجد أبو الأب أو وصیها إذا آجر الصغیر فی عمل من الأعمال التی یقدر علیها الصغیر جاز'' (فتاوی هندیه: ۴۲۶۳)۔ (باپ، حقیقی دادا یا ان کا وصی جب بچے کو ایسے کام پر اجرت پر لگائے جس کی اس میں طاقت ہو درست ہے)۔

اسلام غالب بن کر طلوع ہوا ہے یہ اپنے متبعین کو اعلی ذہن اور اعلی دماغ رکھنے کی تعلیم دیتا ہے، مختلف علوم وفنون میں مہارت پیدا کرنے کے ذریعہ ساری اقوام میں امتیاز اور تفوق حاصل کرنے کی تعلیم شریعت نے مسلمانوں کو دی ہے، یہ ہرگز پسند نہیں کہ دوسری قومیں سائنس اور ٹیکنالوجی میں ترقی کرکے دنیا پر حکومت کریں اور مسلمان عیش وعشرت میں مبتلا رہیں اور نتیجتاً وہ دوسرے کے محکوم بن جائیں، اس لئے اسلام مسلمانوں کو دینی علوم وفنون کے ساتھ عصری ٹکنالوجیوں میں مہارت پیدا کرنے کی ترغیب دیتا ہے، پھر یہ مذہب بچوں کو مزدوری کرنے اور کمتر درجے کے ہنر اور پیشے اختیار کرنے کی کس طرح تعلیم دے سکتا ہے، تاہم اگر بچوں کو پڑھانے اور اعلی تعلیم دینے کی کوشش کی جائے اور وہ کوشش کامیاب نہ ہوسکے یا تعلیم کے لئے ماحول سازگار نہ ہو تو بچوں کو پیشہ ورانہ کام سکھانے کے لئے کام سے لگایا جاسکتا ہے۔

۵- نابالغ پر سزا کا نفاذ:

اسلام کی نظر میں ایک شخص بالغ ہونے سے پہلے مکلف نہیں ہوتا، نماز، روزہ، زکوۃ اور دیگر عبادات اس سے وابستہ نہیں ہیں، اسی طرح اگر وہ کوئی مجرمانہ حرکت کرتا ہے تو اس کے عمل اور فعل کا اعتبار نہیں کیا گیا ہے، لیکن اگر بالغ ہونے سے قبل بچوں کو اسی طرح آزاد چھوڑ دیا جاتا تو ان کے حوصلے بلند ہوتے اور سزا کے خوف نہ ہونے کی وجہ سے جرائم میں بے تحاشہ اضافہ ہوتا اور اس سے معاشرے کا نظام متاثر ہوتا، اس لئے شریعت نے بچوں کے لئے اعتدال کی راہ اختیار کی ہے، ان پر بڑوں کی طرح حدود وقصاص نافذ نہیں کئے گئے، کیوں کہ حدود وقصاص وہیں نافذ ہوتے ہیں جہاں جرائم کی قباحت وشناعت معلوم ہو اور پھر اپنے شعور سے اسے انجام دیا جائے اور یہ عموماً بلوغ کے بعد ہوتا ہے، اس سے پہلے ایک شخص میں پختہ شعوری نہیں پائی جاتی گویا جرائم تو پائے گئے لیکن ان کے پیچھے شعور کارفرما نہیں جس کی وجہ سے انجام اور نتیجے پر انسان کی نظر رہتی ہے اور اس میں ڈر اور خوف پایا جاتا ہے اور اگر ایک شخص پختہ شعور ہے اور پھر وہ جرم کا ارتکاب کرتا ہے تو اس کی جسارت کی وجہ سے یقیناً وہ سزا کا مستحق ہے، تمام فقہاء کا اتفاق ہے کہ بچوں پر بلوغ سے قبل حدود وقصاص نافذ نہیں کئے جائیں گے، اس لئے کہ حدود وقصاص کے نفاذ کے لئے جہاں عاقل کا ہونا شرط ہے وہیں بالغ ہونا بھی ضروری ہے، علامہ ابن ہمام قصاص کی شرائط لکھتے ہوئے فرماتے ہیں:

''منها کون القاتل عاقلا بالغا إذ لا یجب القود علی الصبی أصلا'' (فتح القدیر ۹-۱۳۸)۔

(قصاص کی شرائط میں قاتل کا عاقل وبالغ ہونا ہے، چنانچہ نابالغ پر قصاص بالکلیہ واجب نہیں)۔

بچہ اگر کسی کو قتل کردے تو مقتول کا خون رائگاں نہیں جائے گا، بلکہ دیت واجب ہوگی، اگر بچے کے پاس مال ہو تو اسی کے مال سے دیت واجب ہوگی، ورنہ اس کے سرپرستوں کے ذمہ ادائیگی واجب ہوگی معلوم ہوا کہ بچوں سے صرف قصاص ساقط ہوگا دیت ساقط نہیں ہوگی، ہاں البتہ حدود بالکلیہ نافذ نہیں ہوں گے۔

بلوغ سے قبل بنیادی طور پر بچوں کو دو مرحلے پیش آتے ہیں: ایک بے شعوری کا جس کو صبی غیر ممیز کہا جاتا ہے اور دوسرا شعور کا جس کو صبی ممیز کہا جاتا ہے، چھ سات سال کی عمر تک عام طور پر بچوں کو کوئی شعور نہیں رہتا قتل، چوری، زنا تہمت وغیرہ جرائم سے بالکل واقف نہیں رہتے، اس لئے ان کی توبیخ اور سرزنش بھی نہیں کی جاسکتی، ایسے بچوں کو اصلاح نفس اور تربیت کے لئے جیل یا قید خانے میں نہیں ڈالا جاسکتا ہے، ان بچوں کے والدین اور سرپرستوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ ان کی بہتر انداز میں تربیت کریں اور افہام و تفہیم کے ذریعہ جرائم کی قباحت و نفرت ان کے دل میں پیدا کریں۔ صاحب بدائع الصنائع لکھتے ہیں: "بخلاف المجنون والصبی الذی لا یعقل لأنهما لیسا من أهل العقوبة ولا من أهل التأدیب" (بدائع الصنائع ۷ر ۶۳)۔

البتہ صبی ممیز کہ جس میں شعور پیدا ہوجاتا ہے اگرچہ حدود و قصاص ان پر نافذ نہیں ہوں گے مگر جرائم کے سدباب کے لئے عمر کے حساب سے ان کی تعزیر کی جاسکتی ہے، اگر جرم ہلکے درجہ کا ہے تو سخت کلامی، ڈانٹ ڈپٹ یا ہلکی مار پیٹ سے تنبیہ کردی جائے اور جرم سخت، سنگین ہو تو قید خانے میں ڈال دینا چاہئے، تاکہ عام لوگ ان کی شرارتوں سے محفوظ رہیں اور جیل میں ان کے نفس کی اصلاح ہوسکے، رسول اکرم ﷺ نے بچوں کو نماز، نہ پڑھنے پر بغرض اصلاح ہلکی مار کی ہدایت دی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ باشعور بچوں کی بغرض تادیب تعزیر کی جاسکتی ہے (بدائع الصنائع ۷ر ۶۳)۔

علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں: "ولا یحبس الصبی إلا بطریق التادیب لئلا یتجاسر إلی مثله إذا باشر شیئا من أسباب التعدی قصدا فلو خطأ فلا" (شامی ۸ر ۱۲۳)۔

صاحب تاتارخانیہ لکھتے ہیں: "ثم قد یکون التعزیر بالحبس وقد یکون بالصفع وتحریك الأذن وقد یکون بالکلام العنیف وقد یکون بالضرب" (تاتارخانیہ ۵ر ۲۳)۔

ان تمام عبارتوں کا ماحصل یہ ہے کہ صبی ممیز کو جرم اور عمر کے حساب سے حدود و قصاص کے نفاذ کے علاوہ دوسری سزائیں دی جاسکتی ہیں: ڈانٹ ڈپٹ، اظہار غضب، سخت کلامی، ہلکی مار پیٹ اور قید و بند کی صعوبتیں، تادیب و اصلاح نفس کی غرض سے یہ تمام صورتیں درست ہیں، تاہم سزا کی کوئی ایسی صورت اختیار نہ کی جائے جس سے ظلم محسوس ہو، لہذا بچے کو اگر قید خانے میں ڈالا جائے تو صرف اتنے دنوں تک کے لئے جس سے اس کی تادیب ہوجائے، کیوں کہ یہی مقصود ہے، اگر کوئی بچہ فطرتا ہی شریر ہو اور کوئی حکمت عملی اس کے حق میں کارگر نہ ہو، یہاں تک کہ قید خانہ سے چھوٹنے کے بعد پھر ان ہی جرائم میں سرگرم ہوجاتا ہو تو اس کے حق میں بہتر ہے کہ اس کے بلوغ تک قید خانہ میں ڈال دیا جائے، پھر بعد میں چھوڑنے کے بعد دوبارہ ان جرائم کا ارتکاب کرے تو بڑوں کی طرح حدود و قصاص کا نفاذ عمل میں آئے گا۔

آج کل ہندوستان یا دوسرے ممالک میں بچوں کے جرائم سے لوگ اس لئے بھی پریشان ہیں کہ ان ممالک میں ۱۸ سال سے کم عمر والے کو بچہ ہی تصور کیا جاتا ہے، حالانکہ حقیقتا وہ بالغ اور پختہ نفس ہوتا ہے، ۱۸ سال میں بالغ ہونے کا قانون بہت سے لوگوں کو سزا کے نفاذ سے تحفظ فراہم کرتا ہے، نتیجتاً ان کے حوصلے جرائم کے باب میں بلند ہوجاتے ہیں اور فساد عام ہوتا ہے، اسلام میں ایسا نہیں ہے بلکہ ہر وہ شخص جس کو بلوغ کے آثار ظاہر ہوں یا پندرہ سال کی عمر کو پہنچ جائے، خواہ لڑکا ہو یا لڑکی وہ بالغ تصور کیا جائے گا اور وہ اسلامی قوانین کا مکلف ہوگا، جرائم پیش آنے کی صورت میں حدود و قصاص کے اصول اس پر جاری ہوں گے (شامی ۹ر ۱۸۶)، سمینار کو حکومت وقت سے سفارش کرنی چاہئے کہ بلوغ کی موجودہ عمر کو گھٹا کر پندرہ سال کرے تاکہ بچوں کے ذریعے پیش آنے والے جرائم پر روک لگائی جاسکے۔

و۔ جیلوں میں بچوں سے بامشقت کام:

بچوں کو قید کرنے کا مقصد اصلاح اور تادیب و تربیت ہے، بڑوں کی طرح ان کو سزا دینا مقصد نہیں ہے، اس لئے جیل اور قید خانے میں ان کے ساتھ وہ معاملہ نہیں کیا جائے گا جو بڑوں کے ساتھ کیا جاتا ہے، علامہ شامیؒ لکھتے ہیں: "وفی المحیط للقاضی حبس الصبی الفاجر تادیبا لا عقوبا لئلا یماطل حقوق العباد فإن الصبی یؤدب لینزجر عن الأفعال الذمیمة" (شامی ۴ر ۳۸۵)۔

لہذا بچوں کو کسی ایسے کام کا مکلف نہ بنایا جائے جس میں اذیت اور سزا کا پہلو ہو، بلکہ قید کرنے والے حکام پر لازم ہے کہ بچوں کی جسمانی و ذہنی نشوونما کے لئے تدابیر اختیار کی جائیں، صحت بخش غذا، صاف شفاف پانی، کھلی آب و ہوا، موسم کے لحاظ سے کپڑے، بہتر علاج و معالجہ کا انتظام کیا جائے، ورزش و تفریح اور

کھیل کود کی سہولتیں فراہم کی جائیں، ان کی ذہنی تربیت کے لئے دینی واخلاقی پروگرامس منعقد کئے جائیں، ان کی تعلیم کے لئے اچھے تعلیمی ادارے قائم کئے جائیں، الغرض بچوں کی شخصیت میں نکھار پیدا کرنے اور اعلیٰ کردار کا حامل انسان بنانے کے لئے جو بھی طریقے ہو سکتے ہیں انہیں اختیار کرنا حکومت پر واجب ہے، تعلیم وتربیت اور تہذیب وتزکیہ کے ساتھ ساتھ ان کی جسمانی نشوونما پر خاص نظر رکھی جائے، ان سے کوئی ایسا کام لینا درست نہیں جس سے ان کی صحت متاثر ہوتی ہو اور نہ ان کے ساتھ کوئی ایسا برتاؤ درست ہے جو ان کی عقل ودماغ اور جسمانی نشوونما کے حق میں غیر مفید اور مضر ہو، لہٰذا تنگ وتاریک کوٹھریوں میں انہیں مقید کرنا درست نہیں، علامہ ابن ہمام فرماتے ہیں:

''ولا یجوز الحبس فی مکان یمنع فیه المحبوس الطعام والشراب أو فی مکان حار أو تحت الشمس أو فی مکان بارد أو فی بیت تتوسد نوافذه و فیه دخان'' (فتح القدیر ۲۶۰/۷)۔

علامہ ابن تیمیہ لکھتے ہیں: "الحبس الشرعی لیس هو السجن فی مکان ضیق إنما هو تعویق الشئی ومنعه من التصرف بنفسه" (فتاویٰ ابن تیمیہ ۳۹۸/۵)

ان عبارتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ قیدیوں کو تنگ جگہوں میں رکھنا، کھانے پینے سے روکنا، نہایت گرم یا ٹھنڈی جگہ رکھنا، دھوپ میں کھڑا کر دینا، دھواں والے گھر میں محبوس کرنا اور اس طرح کی دوسری غیر انسانی حرکتیں کرنا عام قیدیوں کے ساتھ بھی درست نہیں، بچوں کے ساتھ بدرجہ اولیٰ جائز نہیں ہوگا، بچوں کی اصلاح کی غرض سے ان سے ایسا کام لیا جاسکتا ہے جن میں مشقت نہ ہو، تعب وتھکن کا احساس ہی ان کی تربیت واصلاح کے لئے کافی ہے۔

بنیادی طور پر بچوں کو جیل میں رکھنے کا مقصد ان کی سرزنش اور ذہن سازی ہے نہ کہ عقوبت اور تعذیب نفس، اس لئے:

الف: مقید بچوں کے ساتھ ایسا معاملہ کیا جائے جس سے ان کی عزت نفس میں اضافہ ہو اور وہ معاشرہ میں باوقار زندگی گزار سکیں۔

ب: بچوں کو سزائے موت، عمر قید یا کسی طرح کی جسمانی سزا نہیں دی جائے گی۔

ج: مقید بچوں کو بالغ قیدیوں سے الگ رکھا جائے۔

د: ملزم بچوں کو جلد از جلد عدالتی کارروائی کے لئے پیش کیا جائے۔

س: ضرورت اور جرائم کے بقدر ہی محبوس رکھا جائے۔

ف: کتاب کاپی قلم اور دوسرے آلات علم مہیا کئے جائیں۔

ق: مخرب اخلاق اور فحش لٹریچر سے انہیں دور رکھا جائے۔

بہر حال قید خانوں میں بچوں کے لئے ایسا انتظام ہو جس سے ان کی جسمانی، ذہنی، اخلاقی اور دینی اعتبار سے نشوونما ہو سکے اور وہ قید خانے میں بھی رہ کر اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکیں۔

ز۔ لاوارث بچے کا شرعی حکم:

ایسا بچہ جس کا کوئی وارث نہ ہو جیسے کوئی عورت زنا کی تہمت کے خوف یا والدین اپنی غربت ومحتاجگی کے سبب بچے کو کہیں پھینک دے یا کسی حادثے میں ماں باپ ختم ہو جائیں یا کسی اور وجہ سے بچہ لاوارث ہو جائے، اس کا کوئی ولی یا قریبی رشتہ دار نہ ہو تو سارے مسلمانوں کا اجتماعی فریضہ ہے کہ اس بچے کی پرورش وپرداخت اور تعلیم وتربیت کا انتظام کریں، اگر کچھ لوگوں نے بھی مل کر یہ ذمہ داری اٹھالی تو دیگر حضرات سے فریضہ ساقط ہو جائے گا ورنہ سارے لوگ گنہگار ہوں گے، کسی لاوارث بچے کو پالنا اس کی دیکھ بھال کرنا اور اس کی ضرورت کی تکمیل کرنا بہت اونچا عمل ہے، ایک بچے کو زندہ رکھنے کی کوشش ساری انسانیت کو زندہ رکھنے کی کوشش کی طرح ہے، "ومن أحیاها فکأنما أحیا الناس جمیعا" (المائدہ: ۳۲)۔

مشہور فقیہ عصر ڈاکٹر وہبہ زحیلی لکھتے ہیں: ''الالتقاط عند الحنفیة مندوب إلیه وهو من أفضل الأعمال؛ لأنه یترتب علیه إحیاء النفس، ویکون فرض کفایة إن غلب علی الظن هلاك الولد لو لم یأخذه، کأن وجد فی مغارة ونحوها من المهالك. لحصول المقصود بالبعض وهو صیانته'' (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۷۶۴/۵، ہندیہ ۲۶۴/۲)۔

فقہی عبارتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ عام حالات میں جب کہ لاوارث بچے کے ضیاع کا اندیشہ نہ ہو تو اس کو لینا اور ہم پیالہ بنانا مستحب ہے اور اگر ضیاع کا اندیشہ ہو، تاہم دوسرے کی نظر بھی اس بچے پر ہو تو فرض کفایہ اور نہ اٹھانے کی صورت میں ضیاع یقینی ہو تو فرض عین ہوگا، یعنی دیکھنے والے پر فرض ہے کہ اسے اپنی جگہ سے اٹھالے اور بقدر استطاعت اس کی پرورش کا انتظام کرے، بنیادی طور پر ایسے لاوارث بچے کی کفالت حکومت کی ذمہ داری ہے، حضرت ابوجمیلہ کی حدیث میں حضرت عمر فاروقؓ نے فرمایا تھا: "اذهب وعلينا نفقته" (صحیح بخاری: ۲۶۶۱) (اس کو لے جاؤ اور اسکا نفقہ ہمارے ذمہ ہے)۔ یہ اس وقت ہے جب کہ لاوارث بچے کے پاس کوئی مال نہ ہو، اگر اس کے پاس مال ہو تو اسی کے مال میں سے خرچ کیا جائے گا، نان نفقہ، علاج ومعالجہ اور دوسری ضروریات کی کفالت حکومت کرے گی، لیکن پانے والا شخص اپنے گھر میں رکھے گا تاکہ اس کو علیحدگی کا احساس نہ ہو اور اسے خاندانی ماحول فراہم ہو سکے، دیگر بچوں کے ساتھ کھیلنے کودنے اور رہنے سہنے سے جسمانی فکری وذہنی نشوونما بہتر ہوگی اور لاوارث ہونے کے ضرر سے محفوظ رہے گا، اسلام نے شفقت ومحبت کی تعلیم دی ہے اور بے سہارا کو سہارا دینے والوں کی بڑی حوصلہ افزائی کی ہے، رسول اکرم ﷺ نے ایک موقع پر ارشاد فرمایا: أنا وكافل اليتيم له ولغيره في الجنة هكذا وأشار بالسبابة والوسطى" (میں اور کسی یتیم کی کفالت کرنے والا جنت میں اس طرح قریب قریب رہوں گا جس طرح شہادت اور اس کے ساتھ کی انگلیاں)۔

یتیم صرف اپنے باپ کے سائے سے محروم رہتا ہے، اس کی ماں یا دیگر رشتہ دار موجود رہتے ہیں پھر بھی ان کی پرورش اور کفالت کرنے کی اس قدر تاکید ہے تو لاوارث بچہ جس کا کوئی سہارا نہیں اس کی دیکھ ریکھ اور پرورش و پرداخت کی کس قدر فضیلت ہوگی اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا، حدیث مذکور میں اپنے رشتہ دار یتیموں کے ساتھ ساتھ غیر کے یتیموں کی بھی پرورش پر ابھارا گیا ہے، مقصد ہے کہ دنیا میں کوئی بھی بچہ بے سہارا یتیم اور لاوارث ہو، مسلمانوں کو اس کے ساتھ شفقت ومحبت نرمی اور حسن سلوک کا معاملہ کرنا چاہئے، جس طرح ایک انسان اپنی اولاد کو محبت کی نظروں سے دیکھتا ہے، ان کی تمام ضروریات کی تکمیل کرتا ہے، ٹھیک اسی طرح ان کے ساتھ بھی وہی معاملہ کیا جانا چاہئے، اس سے وہ بے سہارا بچہ ضائع ہونے سے محفوظ رہے گا، جو اللہ کی نظر میں بڑا کار خیر اور موجب اجر و ثواب ہے، ارشاد باری ہے: "تعاونوا على البر والتقوى ولا تعاونوا على الإثم والعدوان" (المائدہ: ۲)۔

اگر لاوارث بچے کے پاس کوئی مال نہ ہو اور نہ بیت المال میں اتنی گنجائش ہو کہ اس طرح کے بچوں کی پرورش کی جا سکے یا یہ واقعہ ایسے ممالک میں ہو جو غیر اسلامی ہیں جہاں بیت المال کا نظام نہیں ہوتا جیسے ہندوستان وغیرہ تو ان جگہوں میں دیکھا جائے گا کہ حکومت کے پاس اس طرح کے بچوں کی پرورش کا کوئی نظم ہے یا نہیں، اگر نظم ہے تو بچے کو اسی ادارے کو حوالے کر دینا بہتر ہے بشرطیکہ اس پر مکمل اطمینان ہو جیسے ہندوستان میں بے بی سنٹر کے نام سے حکومت کی نگرانی میں ایسے ادارے قائم ہیں جہاں بچوں کی صحیح پرورش و پرداخت پر خصوصی نظر رکھی جاتی ہے، اگر حکومت کی جانب سے کوئی ایسا انتظام نہ ہو، البتہ رفاہی اداروں کی جانب سے نجی طور پر لاوارث بچوں کی دیکھ بھال کے لئے نظم ہو تو وہاں سے بھی استفادہ کیا جا سکتا ہے اور اگر اس طرح کی کوئی شکل نہ ہو تو بچے کو اٹھانے والا خود ذمہ دار ہوگا، اپنی اولاد کی طرح اس کی بھی کفالت کرے گا اور اس کے تمام اخراجات اس کے ذمے واجب ہوں گے بشرطیکہ اس کی گنجائش ہو اور اگر وہ خود محتاج ہو تو سماج کے تمام مسلمانوں پر اس کی ذمہ داری عائد ہوگی۔

"يقوم المسلمون بكفايته نفقة لا قرضا لأنه محتاج عاجز وإن قام بها بعضهم اندفع الحرج عن الباقين... لأن في ترك الإنفاق عليه هلاكه وحفظه عن ذلك واجب كإنقاذه من الغرق" (الموسوعة الفقهية ۳۵/۳۲۲)۔

جس نے سب سے پہلے بچے کو دیکھا یا اٹھایا ہے اس کا اولین حق ہے کہ وہ بقدر وسعت اس کی پرورش و پرداخت اور تعلیم وتربیت کا انتظام کرے اور اس کے حق میں اپنے اندر جذبہ خیر پیدا کرے، اگر اس کے پاس بچے کو چھوڑے جانے میں بچے کے جسمانی وذہنی ودینی نقصان کا اندیشہ ہو محتاجگی یا فسق وفجور کے سبب تو اس سے بچہ لے کر کسی ایسے شخص کو دے دیا جائے گا جو اس کا بہتر انتظام کر سکے "والظاهر أن النزع فيه واجب كما لو كان الملتقط فاسقا يخشى عليه منه الفجور باللقيط فينزع منه قبيل حد الاشتهاء" (شامی ۴/۲۷۰)۔

ح۔ بچے کی خرید وفروخت:

بچے کی خرید وفروخت کی جتنی صورتیں آج رائج ہیں وہ سب حرام اور گناہ عظیم کے باعث ہیں، یہاں تک کہ اگر کوئی شخص اپنی رضامندی سے خود اپنی ہی اولاد کو فروخت کرتا ہے تو یہ بھی حرام اور ناجائز ہے، اس لئے کہ یہ آزاد کی بیع ہے جو متفقہ طور پر ممنوع ہے، حدیث قدسی ہے، اللہ تعالی فرماتے ہیں: "ثلاثة أنا خصمهم يوم القيامة رجل أعطى بي ثم غدر، ورجل باع حرا فأكل ثمنه، ورجل استأجر أجيرا فاستوفى منه ولم يعطه أجره" (صحیح بخاری: ۲۲۲۷)

(میں قیامت کے دن تین لوگوں کو اپنا فریق بناؤں گا: ایک وہ شخص جس نے میرے ساتھ دھوکہ کا معاملہ کیا، دوسرا وہ شخص جس نے آزاد آدمی کو بیچا اور اس کی کمائی سے اپنے پیٹ کی آگ بجھایا اور تیسرا وہ جس نے کام پر کسی آدمی کو رکھا اور جب اس نے اس کا کام پورا کر دیا تو اس نے اس کی پوری اجرت نہیں دی)۔

شریعت نے اپنا بیٹا یا بیٹی بطور ہدیہ دوسرے کو دینے کی اجازت دی ہے جس پر فقہی کتابوں میں تبنی اور متبنی کے لفظ سے بحث کی گئی ہے، ظاہر ہے کہ دوسرے کی اولاد کو اپنی اولاد بنا کر رکھنے کی اجازت ہے تو دوسرے کو اپنی اولاد کا دینا اور ہدیہ کرنا بھی درست ہوگا، چوں کہ ایک مسئلہ دوسرے سے جڑا ہوا ہے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید بن حارثہؓ کو اپنا بیٹا بنالیا تھا، قرآن نے زمانہ جاہلیت کے مطابق بیٹے کی نسبت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کرنے سے منع کیا لیکن متبنی بنانے سے منع نہیں فرمایا اور اس پر سب کا اتفاق ہے۔

''وأمر من تبنى أحدا لا ينسبه إلى نفسه وإنما ينسبه إلى أبيه إن كان له أب معروف'' (الموسوعة الفقهية ۱۰-۱۲۱)۔

البتہ لینے والے پر واجب ہوگا کہ نہ تو عرف میں اس بچے کو اپنی طرف منسوب کرے اور نہ راشن کارڈ یا دیگر کاغذات میں اس کو اپنے بیٹے سے تعبیر کرے اور دینے والے کی بھی ذمہ داری ہے کہ ان تمام چیزوں پر کڑی نظر رکھے، اولاد کسی کو ہدیہ دے کر بے تعلق ہو جانا درست نہیں ہے، اس لئے کہ بچے کی پرورش و پرداخت، تعلیم وتربیت اور اصلاح نفس بنیادی طور پر باپ کی ذمہ داری ہے، لہٰذا یہ درست نہیں ہوگا کہ بچہ دے کر اپنے آپ کو لاتعلق کر لے، ہدیہ کے طور پر بچہ دے دینے سے والدین کا ذمہ ساقط نہیں ہوگا، دوسرے کو دینے کے بعد بھی ان پر واجب ہوگا کہ وہ ہبہ کردہ بچے پر مشفقانہ نظر رکھیں، اگر لینے والا شخص اس کو غلط مقاصد کے لئے استعمال کر رہا ہے یا اس کی تعلیم وتربیت کا انتظام نہیں کرتا یا فسق وفجور میں مبتلا ہو سکتا ہے تو ان تمام صورتوں میں والد بچے کو فوراً اپنے قبضے میں لے لے، جسمانی دینی یا ذہنی نقصان کے ساتھ کسی کو ہدیہ بھی درست نہ ہوگا۔ پھر کسی کو بچہ حوالہ کرنے کی وجہ صرف غربت اور افلاس ہی نہیں ہے بلکہ اس کی دوسری وجہیں بھی ہو سکتی ہیں، جیسے خاندان میں کوئی شخص اگر بچہ سے محروم ہے تو تعاون کے طور پر اسے اپنا بچہ حوالے کیا جا سکتا ہے، اسی طرح والدین جس علاقے میں ہوں وہاں تعلیم وتربیت کا بہتر انتظام نہ ہو یا وہاں کی فضا بچے کی جسمانی نشوونما کے لئے بہتر نہیں ہے تو تعلیم وتربیت اور اچھی نشوونما کی غرض سے دوسرے علاقے میں موجود خاندان کے افراد کو دیا جا سکتا ہے، اسی طرح غربت وافلاس کی وجہ سے کوئی شخص پرورش پر قادر نہ ہو اور دوسرا شخص بچہ لینے پر آمادہ ہو تو اسے بھی دینے میں کوئی حرج نہیں ہے، بشرطیکہ لینے والے کی نیت فاسد نہ ہو جیسے گداگری، مزدوری یا گھر کی صفائی ستھرائی اور کام کاج کے لئے لینا، اگر کسی بھی طرح معلوم ہو جائے کہ لینے والے کی نیت صحیح نہیں ہے تو اس کو بچہ حوالہ کرنا درست نہ ہوگا، بچہ ہدیہ دیتے ہوئے کسی عوض کا طے کرنا درست نہیں ہے، اس لئے کہ یہ ہبہ بالشرط ہے جو حکماً بیع ہے اور بچے کی بیع حرام ہے اور اگر عوض کی شرط نہ بھی لگائی جائے پھر بھی ہدیہ کے طور پر جو رقم دی جائے گی وہ بھی میرے خیال میں درست نہیں ہونی چاہئے، کیوں کہ حقیقتاً یہ اس کا عوض ہی ہے جس کو ہدیہ کا نام دے دیا گیا ہے، نام بدل دینے سے حقیقت نہیں بدل جاتی ہے، اگر بچہ لینے والا بچے کے والد کی غربت وافلاس پر رحم کھا کر ہدیہ دے رہا ہے تو سوال یہ ہے کہ یہ غربت تو بچہ لینے سے پہلے بھی تھی، اس وقت کیوں نہیں دیا، بچہ لیتے وقت اچانک یہ محبت اور جذبہ خیر کیوں جاگ اٹھا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دراصل اسی بچہ کا عوض ہے جس کو ہدیہ کے نام سے دیا جا رہا ہے، ہاں البتہ بچہ لیتے وقت ہدیہ نہ دیا جائے، کچھ دن گذر جانے کے بعد از خود بچہ لینے والا بچے کے والدین کی غربت پر ترس کھا کر ہدیہ دے تو اس کی گنجائش معلوم ہوتی ہے۔

بچے کی پرورش وپرداخت کے لئے شریعت نے اولا لوگوں کو کسب معاش کی تاکید کی ہے، سست انسان اللہ کی نظر میں پسندیدہ نہیں ہے، وہ جو اپنی کمائی سے خود کھاتا ہے اور دوسروں کی پرورش بھی کرتا ہے، اس کے لئے بڑے اجر وثواب کا وعدہ کیا گیا ہے اور اگر کوئی شخص نہایت درجے کا مفلس ہو اور اس میں کمانے کی بھی طاقت نہ ہو یا اس کی کمائی زیر تربیت افراد کے نفقے کے لئے کافی نہ ہو تو زکوۃ وصدقات کے مال سے اخراجات پورے کئے جا سکتے ہیں، حکومت اسلامیہ کو چاہئے کہ وہ ایسے معذور ومحتاج افراد کے لئے بیت المال سے وظائف جاری کرے یا کم از کم زکوۃ کے نظام کو متحرک ومستحکم بنائے، اگر مسلم معاشرے میں صرف زکوۃ کا نظام بہتر ہو جائے تو ایک انسان کو بھی بھوکا سونے کی نوبت نہیں آئے گی، اس کے علاوہ جو رفاہی ادارے ہیں ان کو فوراً متحرک ہونا چاہئے اور ایسے افراد پر نظر رکھتے ہوئے ان کی مدد کی صورت نکالنی چاہئے، اگر کوئی ایسا ادارہ نہ ہو تو اہل ثروت مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ غربت ومحتاج افراد تعاون کرتے ہوئے ہمدردی کا ثبوت دیں، اس طرح باہمی تعاون سے نہ تو بچہ بیچنے کی نوبت آئے گی اور نہ ہی اس طرح کے گھناؤنے واقعات رونما ہوں گے۔

ط۔ معذور بچوں کا حکم:

بچوں کا نفقہ، علاج ومعالجہ اور ان کی مکمل نگہداشت باپ کی ذمہ داری ہے، باپ خواہ مالدار ہو یا غریب حسب استطاعت بچوں کے تمام اخراجات باپ کے ذمہ لازم ہے، اگر بچہ بیمار ہو جائے تو اس کا علاج باپ پر واجب ہے، باپ کے لئے یہ جائز نہیں کہ اپنی اولاد کو بیماری میں مبتلا چھوڑ کر وہ اپنے کام میں مگن

رہے، طاقت کے باوجود اس کے علاج کی کوشش کرے اور نہ اس کی نگرانی اور دیکھ ریکھ کی طرف توجہ دے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: كفى بالمرء إثما أن يضيع من يقوت" (ابوداؤد)۔

(انسان کے گنہگار ہونے کے لئے اتنی سی بات کافی ہے کہ وہ ان لوگوں کو ضائع کر دے جن کے نان ونفقہ کی ذمہ داری اس پر عائد ہوتی ہے)۔

ضائع کرنا خواہ نان ونفقہ نہ دینے کی وجہ سے ہو یا بیمار پڑنے کے بعد علاج نہ کرنے کی وجہ سے یا کسی اور سبب سے، اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ بچہ کی جسمانی یا ذہنی معذوری کی وجہ سے اپنی توجہ کو ان سے ہٹالینا یا خاطر خواہ محبت نہ کرنا جائز نہیں، یہ سراسر بچے کے ساتھ ظلم اور ناانصافی ہے، شریعت نے ماں باپ کو ہر حال میں مکلف بنایا ہے کہ وہ اپنی اولاد کے ساتھ مشفقانہ برتاؤ کریں، انس ومحبت میں کوئی کمی نہ ہونے دیں، اس محبت اور انس کا تقاضا ہے کہ بچہ اگر اپاہج یا معذور ہو تو جہاں تک ہو سکے اس کا علاج کرائے، قدرت کے باوجود علاج ترک کرنا ہرگز جائز نہیں، علاج ومعالجہ کی کوئی حد متعین نہیں کی جاسکتی، بلکہ اس کا تعلق قدرت اور استطاعت سے ہے اور قدرت ہر ایک کی الگ الگ ہوتی ہے، اس میں مالی قدرت بھی داخل ہے اور دوڑ دھوپ کی بھی، باپ کے پاس مال ہی نہ ہو یا مال ہو لیکن وہ خود ضعف کا شکار ہو یا خود مریض اور اپاہج ہو اور کوئی ایسا شخص نہیں جو اس کا تعاون کرے، ظاہر ہے کہ ایسے وقت اپاہج اور معذور بچے کا علاج وہ نہیں کر سکتا، اس صورت میں وہ ماخوذ نہیں ہوگا، ملازمت یا دیگر مصروفیات کی وجہ سے وقت کا نہ ملنا عذر میں داخل نہیں ہے، عام طور پر باپ کسب معاش کرتا ہے اور عورتیں گھر میں رہتی ہیں، باپ کی غیر موجودگی میں ماں اس کی نگرانی کرے اور جب باپ ڈیوٹی سے واپس آئے تو نگرانی اور دیکھ بھال میں ماں کا ہاتھ بٹائے، وہ بچہ باپ کی شفقت اور ماں کی مامتا دونوں کا محتاج ہے اور دونوں کے اشتراک سے بچے کو راحت مل سکتی ہے، ماں باپ کی خدمت کی نوعیت الگ الگ ہے جیسے ماں کے ذمہ ہے اس کو کھلانا پلانا، موافق غذا تیار کرنا، بضرورت تیل وغیرہ مالش کرنا، کپڑے صاف کرنا، نہلانا دھلانا وغیرہ اور باپ کی ذمہ داری ہے علاج کے لئے مختلف ڈاکٹروں کے پاس لے جانا، دوا فراہم کرنا، موافق غذا وغیرہ مہیا کرنا، تاہم اگر ماں باپ دونوں ملازم ہوں یا گھر سے اچھی نگہداشت کسی ہاسپٹل میں ہوسکتی ہو تو اس میں بغرض علاج وراحت شریک کیا جاسکتا ہے، جیسے بہت سے شہروں میں ایسے ہاسپٹل کھل گئے ہیں جو خصوصی طور پر معذور واپاہج بچوں کے لئے ہی ہیں، بچوں کی راحت رسانی کے لئے وہاں مکمل انتظام ہوتا ہے، بعض ادارے حکومت کی جانب سے مفت خدمت پر مامور ہیں اور بعض میں فیس لی جاتی ہے دونوں جگہ حسب صوابدید شریک کرنا درست ہوگا، مشہور فقہی قواعد "الأمور بمقاصدها، الضرورات تبيح المحظورات، الأمر إذا ضاق اتسع" وغیرہ سے اس کی تائید ہوتی ہے، مگر ماں باپ پر یہ لازم ہوگا کہ فرصت ملنے کے ساتھ ہی وہ بچے سے ملاقات اور حالات معلوم کرنے کے لئے ہاسپٹل جاتے رہیں اور اپنے بچے پر مشفقانہ نظر رکھیں، ایسا برتاؤ ہرگز نہ ہو جس سے اس کی لاتعلقی، بے توجہی اور بوجھ کا احساس ہو ورنہ یہ اپنے بچے سے فرار متصور ہوگا جو جائز نہیں۔

واضح رہے کہ بچے کا جسمانی یا ذہنی معذور ہونا اللہ کی طرف سے ایک آزمائش ہوتی ہے جس پر صبر کرنے میں بے پناہ اجر وثواب کا وعدہ کیا گیا ہے، اس لئے ماں باپ کے حق میں ایسا بچہ زحمت ہی نہیں بلکہ رحمت کا پہلو بھی رکھتا ہے، اس پہلو پر ماں باپ کی نظر رہے تو مصیبت بہت آسان ہوجاتی ہے، ایک روایت میں ہے کہ کسی بندۂ مؤمن کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسا بلند مقام طے ہوجاتا ہے جس کو وہ اپنے عمل سے نہیں پاسکتا تو اللہ تعالیٰ اس کو جسمانی یا مالی تکلیف یا اولاد کی طرف سے کسی صدمہ اور پریشانی میں مبتلا کر دیتا ہے، پھر اس کو صبر کی توفیق دے دیتا ہے، یہاں تک کہ ان مصائب وتکالیف اور ان پر صبر کرنے کی وجہ سے اس کو اس بلند مقام پر پہنچا دیتا ہے جو اس کے لیے پہلے سے طے ہو چکا تھا (مسند احمد وابوداؤد)۔

اس مضمون پر مشتمل متعدد احادیث وارد ہوئی ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ بیماری، دکھ اور مصیبت انسان کے لیے صرف زحمت ہی نہیں بلکہ رحمت بھی ہے، ظاہری طور پر اگرچہ یہ چیزیں پریشان کن ہوتی ہیں مگر درحقیقت ان کے ذریعہ کسی خیر اور بھلائی کا فیصلہ کیا جاتا ہے، جہاں تک انسان کی نظر نہیں پہنچتی اور وہ جزع فزع میں مشغول ہوجاتا ہے، حالانکہ شریعت نے تاکید کی ہے کہ بندوں کو چاہیے کہ مصیبت کے وقت صبر وتحمل سے کام لیں، بیماری اور دوسری تکلیفوں اور مصیبتوں کو خدائی تنبیہ سمجھتے ہوئے اپنی اصلاح کی فکر اور کوشش میں لگ جائیں، اگر کوئی گناہ یا نافرمانی سرزد ہوئی ہو تو فوراً اس سے توبہ واستغفار کرنا چاہیے۔

بہر حال ماں باپ اپنے معذور اور اپاہج بچے کو اپنے لئے بوجھ نہ سمجھیں اور انہیں ترچھی نظروں سے نہ دیکھیں بلکہ محبت وشفقت اور ہمدردی کا مظاہرہ کریں، خدمت اور علاج میں حتی الامکان کسی طرح کی کوتاہی سے کام نہ لیں، گھر میں رہتے ہوئے اس کی بہتر خدمت اور علاج ہوسکتا ہے تو گھر میں رکھنا چاہئے اور اگر کسی بھی وجہ سے ہاسپٹل میں رکھنا اس کے حق میں بہتر ہو تو رکھا جاسکتا ہے، تاہم والدین کے لئے لاتعلق ہوجانا جائز نہیں، یہ سراسر بے رحمی اور ظالمانہ رویہ ہے جس کی قرآن وحدیث میں سخت مذمت آئی ہے۔

☆☆☆

بچوں کے حقوق..... قرآن وسنت کی روشنی میں

مولانا حافظ کلیم اللہ عمری مدنی[1]

جواب: الف: شریعت میں حضانت کا اولین حق ماں کو ہے، بچے سن شعور (۷ سال) کو پہنچنے تک (بلاتفریق لڑکے اور لڑکیاں) ماں کے پاس رہیں گے اور پرورش پائیں گے، البتہ طلاق یا خلع کی صورت میں انہیں سن شعور کو پہنچنے پر اختیار دیا جائے گا کہ وہ ماں باپ میں سے جس کے پاس چاہیں رہیں، انہیں مجبور نہیں کیا جاسکتا، البتہ عورت اگر دوسری شادی کرلے تو حق حضانت ختم ہوجائے گا اور شوہر کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ ان بچوں کو اپنے پاس رکھ لے (أنت أحق به مالم تنكحى زوجا) (رواہ ابوداؤد: ۲۲۷۶، انظر: فتاوی للامام النووی ۱ر۲۱۵) (مطلقہ کو حق حضانت حاصل ہوگا بشرطیکہ وہ دوسری شادی نہ کرلے)۔

بالفرض بچوں کی ماں کا انتقال ہوجائے یا وہ غلط راہ پر چلنا شروع کردے، بچوں کی پرورش سے انکار کردے یا اس کے حوالہ کرنے میں دینی، تعلیمی، جسمانی، تربیتی پہلو سے نقصان کا اندیشہ ہو تو ایسی صورت میں حق حضانت نانی، پرنانی اور اوپر تک یا بچہ کی بہن یا خالہ کے لئے ہوگا، اسی طرح اسلام میں نادار اور مفلس بچوں کی پرورش وکفالت کا نظام بیت المال سے ہوتا تھا، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ۱۸ھ میں لاوارث اور گمنام بچوں کے لئے دودھ پلانے اور دیگر مصارف کا انتظام بیت المال سے کیا، چنانچہ ان کے مصارف کے لئے اولا ۱۰۰ درہم سالانہ مقرر فرمایا، پھر سال بہ سال ترقی ہوتی جاتی تھی اور اس طرح یتیموں کی پرورش اور اگر ان کی جائیداد ہوتی تو اس کی حفاظت کا نہایت اہتمام کرتے تھے اور اکثر اس کو تجارت کے ذریعہ ترقی دیتے تھے (الفاروق، مولانا شبلی نعمانی ر۱۹۷)۔

ان بچوں کے سارے اخراجات باپ کے ذمہ ہوں گے..... اس کی مقدار باپ کی اپنی حیثیت کے مطابق ہوگی..... لڑکوں کا نفقہ بلوغ تک باپ کے ذمہ واجب ہے لیکن بچی کا نفقہ اس کی شادی تک باپ کے ذمہ واجب الاداء ہوگا۔

اگر بچہ کو اس کے حوالہ کرنے میں تعلیمی، تربیتی، جسمانی یا نفسیاتی پہلو سے بچہ کے لئے مضرت کا اندیشہ ہو تو اسلامی بیت المال یا رفاہی اداروں کے ذریعہ ان بچوں کی کفالت وتعلیم وتربیت کا انتظام کرنا ہوگا، تا کہ یہ بچے ضائع نہ ہوں، مثال کے طور پر باپ شرابی، کبابی ہو، بچوں اور بچیوں کا محافظ نہ ہو، یا بچیوں کی ناموس کے ساتھ کھلواڑ کررہا ہو، بچوں کو بلاضرورت مارتا ہو، یا جسمانی یا روحانی اذیت دیتا ہو یا دین کے خطرے میں پڑ جانے کا اندیشہ ہو، کسی نصرانی وغیرہ کے حوالہ کرنے پر مصر ہو یا بچوں کو فروخت کرنے کی کوشش کررہا ہو، یا بچوں کی ماں بھی اخلاقی، دینی اعتبار سے گراوٹ کا شکار ہو، یا بدچلن ہو یا قادیانیت یا لامذہبیت وغیرہ کا شکار ہو تو ایسی صورت حال میں بچوں کے مفاد کی خاطر، تحفظ شریعت کو مقدم رکھتے ہوئے والدین کو حق حضانت سے محروم کیا جاسکتا ہے اور ان بچوں کی کفالت وتربیت اسلامی بیت المال یا اسلامی تحریکات وجمعیات کی سرپرستی میں ہوگی، مذکورہ صورت میں والدین سے پرورش کا حق ساقط ہوجائے گا، تحفظ شریعت کو ہر حال میں ترجیح حاصل ہوگی۔

بچوں کے حق تعلیم وتربیت کے بارے میں بنیادی ہدایات:

جواب: ب: ۱۔ اسلام کی نظر میں تعلیم وتعلم کو بڑی اہمیت ہے، بلکہ یہ کہنا بجا ہوگا کہ یہ ایک ایسا دین ہے جس سیکھنے اور سکھانے کو لازم اور فرض قرار دیا ہے، تعلیم کی اہمیت کے لئے اتنا کافی ہے کہ قرآن کریم کی پہلی آیتیں جو نازل ہوئیں ہیں، وہ علم سے متعلق ہی ہیں۔

مذہب اسلام کی خصوصیات میں سے سب سے اہم خصوصیت تعلیم اور تعلم ہے، پہلی وحی کا آغاز بھی پڑھنے پڑھانے سے ہی متعلق ہے، ارشاد باری تعالی ہے: "اقرأ باسم ربك الذى خلق خلق الإنسان من علق إقرأ وربك الأكرم الذى علم بالقلم، علم الإنسان مالم يعلم" (سورہ علق) (پڑھ اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا، جس نے انسان کو خون کے لوتھڑے سے پیدا کیا، تو پڑھتا رہ تیرا رب بڑے کرم والا ہے جس نے انسان کو وہ سکھایا جسے وہ نہیں جانتا تھا)۔

---

[1] استاذ ومفتی جامعہ دار السلام، عمر آباد۔

ارشاد نبوی ﷺ ہے: "طلب العلم فريضة على كل مسلم" (سنن ابن ماجہ: ۲۲۴) (علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان پر (خواہ مرد ہو یا عورت) فرض ہے)

یہ بات تاریخی طور پر ثابت ہے کہ مسلمانوں کے بچے جو مساجد و مدارس کی طرف حصول علم کے لئے رخ کرتے تو وہ مال و دولت صرف نہیں کرتے تھے، بلکہ بعض زمانوں میں حکومت کے خرچ پر وہ علم حاصل کرتے تھے اور علماء سلف تعلیم کے میدان میں لوگوں کو اجرت و معاوضہ لینے سے منع بھی کرتے تھے..... اس طرح علم عہد نبوت سے ہی ترقی کے منازل طے کرتا رہا۔

اسلامی نقطہ نظر سے بچہ میں شعور پیدا ہوتو اسی وقت سے ایمان کی بنیادی باتیں اور ارکان اسلام سمجھانے کا حکم دیا گیا ہے، جیسا کہ حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: افتتحوا على صبيانكم أول كلمة بلا إله إلا الله" (جامع الاحادیث للسیوطی ۳۹۱۰) (اپنے بچوں کو سب سے پہلے کلمہ لا الہ الا اللہ سکھاؤ)۔

بلکہ پیدا ہونے والے بچہ کے کان میں اذان دینا مسنون ہے، تاکہ سب سے پہلے اس کے کان میں حق و توحید کی آواز پہنچے اور یہ بھی ارشاد ہوا کہ جب بچہ سات سال کا ہو جائے تو نماز کا حکم دو، اور نماز نہ پڑھنے پر ان کو مارو جب وہ دس سال کے ہو جائیں تو ان کے بستر بھی الگ کر دو (سنن ابوداؤد: ۴۹۵، حسن صحیح)۔

حضرت علیؓ نبی کریم ﷺ سے نقل فرماتے ہیں کہ اپنے بچوں کو تین باتیں سکھاؤ: اپنے نبی سے محبت، آل بیت سے محبت اور قرآن کریم کی تلاوت، اس لئے کہ قرآن کریم کے حاملین اللہ تعالیٰ کے عرش کے سائے میں انبیاء کرام اور نیک لوگوں کے ساتھ ہوں گے، جس دن اس کے سایہ کے علاوہ کوئی سایہ نہ ہوگا (الجامع الصغیر للسیوطی ۱/ ۵۲، ضعفہ الالبانی فی السلسلۃ الضعیفۃ: ۲۱۶۱)۔

بچوں اور بچیوں کو کس قدر دینی وعصری تعلیم دینا ضروری ہے؟

جواب: ب، ۲۔ اسلام کا نقطہ نظر علم کے تعلق سے یہ ہے کہ افضل علم علوم شریعت ہیں جن کا حاصل کرنا اولین فریضہ ہے، جیسے توحید اور اس کی تین قسمیں..... ارکان ایمان و اسلام کی اجمالی تعلیم، تلاوت قرآن کریم، نماز اور اس کے آداب و احکام وغیرہ کا بنیادی علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے، نیز یہ علم بھی سکھانا ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں کے سارے تصرفات سے واقف ہے، وہ علیم و خبیر ہے، اس کے پاس کوئی چیز مخفی نہیں، ذرہ ذرہ کا علم رکھتا ہے، یہ سب دین کی بنیادی باتیں ہیں جن کا سیکھنا ہر مسلمان پر واجب ہے، قیامت برحق ہے، حساب و کتاب، جنت و جہنم برحق ہے، بروز قیامت ایمان و عمل صالح کی بنیاد پر ہی کامیابی حاصل ہوگی، ورنہ نافرمانوں کے حق میں عذاب الٰہی بہت سخت ہوگا..... نماز کی پابندی، اس کے شروط و آداب وغیرہ سے واقفیت بھی ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے۔

اسی طرح ہر وہ علم جو کائنات اور انسانیت کے لئے مفید ہو اس علم کا حاصل کرنا بھی مشروع ہے لیکن فرق مراتب کے ساتھ، علوم شریعت پہلے نمبر پر ہیں اور عصری علوم جن سے اسلام اور انسانیت کا فائدہ مقصود ہو دوسرے نمبر پر، دور حاضر میں عصری علوم کی ضرورت و افادیت کا انکار نہیں کیا جا سکتا، اعلیٰ تعلیم کا حصول فرض کفایہ ہے، وسائل و ذرائع مہیا ہوں تو ضرور تعلیم حاصل کی جائے ورنہ نہیں۔

چوتھی صدی تک عصری اور دینی علوم کی تفریق نہیں تھی، ایک ہی مدرسہ (بغداد) سے امام غزالیؒ و ابن حزمؒ اور بوعلی سیناؒ وغیرہم فارغ ہوتے تھے، نیز اس امت کی امتیازی شان یہ ہے کہ وہ لوگوں کو نفع پہنچانے کے لئے برپا کی گئی ہے اور امت کی تاریخ یہی بتاتی ہے کہ وہ ہمیشہ دوسروں کے لئے نفع بخش ثابت ہوئی اور ان کا ہاتھ ہمیشہ اوپر ہی رہا، دنیا والوں نے مسلم قوم کی خدمات و ایجادات سے فائدہ اٹھایا۔

حکومت کی طرف سے بچوں اور بچیوں کے لئے لازمی تعلیم اور مسلمانوں کے لئے اس کی پابندی:

جواب: ۳۔ موجودہ دور تعلیم و تعلم کا دور ہے، ناخواندگی و جہالت کو دور کرنے کے لئے حکومتی سطح سے جو کوششیں ہو رہی ہیں وہ مستحسن ہیں، مثال کے طور پر آج کے دور میں ۱۲ ویں تک کی عصری تعلیم، اسکول کی تعلیم لازمی ہے دنیا کے ہر میدان میں اتنا علم تو فی الوقت ضروری ہے، لہٰذا احالات و زمانے کے مطابق مفاد عامہ کی خاطر جو وسائل و ذرائع خود حکومتوں کی طرف سے میسر ہیں، اس سے فائدہ اٹھانا ضروری ہے، خاص کر ہندوستان کے اکثر علاقوں میں مفت تعلیم کا نظم، تعلیم بالغاں کا انتظام، کتابوں اور وسائل و اسباب کی فراہمی کے ساتھ علم کے دروازے کھلے ہیں، ان سے ضرور فائدہ اٹھایا جائے۔ اور حکومت کی طرف سے لازمی تعلیم کا قانون قابل عمل ہے، اس کی پابندی بھی مسلمانوں کے لئے ہر حال میں لازم ہے، اس سے پوری طرح مستفید ہونا لازم ہے، آج کے دور میں کم سے کم بارہویں تک کی تعلیم بچوں اور بچیوں کے حق میں ضروری ہے۔

جنس کی تعلیم اور اسلامی ہدایات:

جواب: ۴۔ اسلام کی نظر میں مربی کو یہ حق ہے کہ وہ اپنی اولاد کو ایسی باتیں ضرور بتائے جن کا تعلق بلوغت کے بعد کی ہے جیسا کہ علامات بلوغت، احتلام اور اس کے آداب واحکام، جنابت اور اس سے متعلق احکام شریعت، غسل جنابت اور طریقہ وغیرہ جن کا ہر مسلم مرد وعورت کو سیکھنا لازم ہے، قرآن کریم میں بے شمار آیات میں انسان کی تخلیق اور اس کے مراحل کا تذکرہ ہے، زنا اور اس کی حرمت کا اعلان ہے، شرمگاہ کی حفاظت کو ایمان والوں کی پہچان بتایا ہے، محرمات ابدیہ اور غیر ابدیہ کا تذکرہ، حیض اور احکام حیض، نفاس اور اس کے احکام وغیرہ کے تفصیل شریعت میں موجود ہیں، تاکہ بچے سن شعور کو پہنچنے کے بعد ان حقائق سے واقف ہوں تاکہ عملی زندگی میں بچوں کا فائدہ ہو...... یہاں دو باتیں قابل توجہ ہیں:

۱۔ عمر کے ہر حصے سے متعلق احکام کی تعلیم اسی کی مناسبت سے دی جائے اور مربی ہم جنس ہو...... لڑکوں کے مسائل اساتذہ حل کریں اور لڑکیوں کے مسائل استانیاں بتائیں۔

۲۔ بچیوں کو جنسی مسائل سکھانے کا کام ماں، خالہ یا کوئی معلمہ ومربیہ انجام دے سکتی ہے، اگر یہ صورت ممکن نہ ہو تو ماں کی بجائے کوئی اور عورت ہی انجام دے، اس طرح کے مسائل اختلاط مرد وزن کے ساتھ ہرگز نہ ہو، ڈر ہے کہ مصالح کے مقابلہ میں مفاسد کا غلبہ زیادہ ہوگا۔

نکاح کے بارے میں بچے اور بچیوں کے حقوق:

جواب: ج۔ ارشاد ربانی ہے: "وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ" (الروم ۲۱:) (اللہ کی نشانیوں میں سے ہے کہ تمہاری ہی جنس سے بیویاں پیدا کیں تاکہ تم ان سے آرام پاؤ، اس نے تمہارے درمیان محبت اور ہمدردی قائم کردی، یقیناً غور وفکر کرنیوالوں کے لئے بہت سی نشانیاں ہیں)، مطلب یہ ہے کہ اگر مرد اور عورت کی جنس ایک دوسرے سے مختلف ہوتی تو ان سے وہ سکون کبھی حاصل نہ ہوتا جو ایک ہی جنس ہونے کی وجہ سے حاصل ہوتا ہے۔

یہ نکاح زوجین کے مابین ایک معاہدہ ہے جس میں ایک طرف سے کفالت اور پرورش کی ذمہ داری ہے تو دوسری طرف سے اطاعت وفرمانبرداری اور یہ نکاح درحقیقت ایک دائمی معاہدہ ہے۔

کم سنی میں نکاح:

قال اللہ تعالیٰ: "وَالّٰٓئِیْ يَئِسْنَ مِنَ الْمَحِيْضِ مِنْ نِّسَآئِكُمْ اِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ ثَلٰثَةُ اَشْهُرٍ وَّالّٰٓئِیْ لَمْ يَحِضْنَ" (سورہ طلاق: ۴) (تمہاری (مطلقہ) عورتیں جو حیض سے ناامید ہوچکی ہوں اگر تم کو (ان کی عدت کے بارے میں) شبہ ہو تو ان کی عدت تین مہینے ہے اور جن کو ابھی حیض نہیں آیا ہے (ان کی عدت بھی یہی ہے))۔

مذکورہ آیت سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ نابالغہ کا نکاح جائز ہے، ورنہ اس کی طلاق اور عدت کا بیان ہی نہ ہوتا، نیز حدیث شریف میں صحیح ترین روایتوں کی روشنی میں یہ ثابت ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عائشہؓ کا نکاح کم سنی میں ہی کیا تھا، اس وقت ان کی عمر چھ سال تھی، اور نو سال کی عمر میں ان کی رخصتی عمل میں آئی (بخاری، مناقب الانصار، باب تزویج النبی عائشۃ، مسلم، باب تزویج الاب البکر الصغیرۃ، انظر التمہید ۱۹/۹۸)، شیخ ابن عثیمینؒ نے فرمایا کہ جس بچی کی عمر نو سال ہو اس کی رضامندی نکاح کے لئے مشروط ہے، یہی رائے شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کی بھی ہے۔

اس بات پر علماء کا اتفاق رہا ہے کہ لڑکے یا لڑکی کے بلوغ سے قبل ان کا باپ مصلحت راجحہ کے تحت دونوں میں سے کسی کو بھی نکاح پر مجبور کرسکتا ہے، مثال کے طور پر موزوں رشتہ کے چھوٹ جانے کا اندیشہ، ولی کی شدید علالت، معاشی مجبوری یا جذبہ خیر خواہی وغیرہ کے تحت ولی کو یہ حق ہے کہ وہ نابالغ بچوں اور بچیوں کا نکاح کرادے۔

امام مالکؒ اور امام شافعیؒ اور بعض دوسرے فقہاء کرام کے نزدیک بلوغت کے بعد اس نکاح کو ختم کرنے کا لڑکی کو حق حاصل نہ ہوگا، اور امام ابوحنیفہؒ کی رائے یہ ہے کہ نابالغ لڑکی اور لڑکے کا نکاح باپ دادا کردے تو بلوغ کے بعد انہیں اختیار نہ ہوگا، اس لئے کہ ان کی سوجھ بوجھ شفقت ومحبت شک وشبہ سے بالاتر ہے، البتہ عصبات میں سے کوئی نکاح کردے تو ایسی صورت میں بلوغت کے بعد ان بچوں کو اس نکاح کے باقی رکھنے یا نہ رکھنے کا اختیار باقی رہے گا۔

نکاح کے تعلق سے بچوں اور بچیوں کی رضامندی جاننا آج کے دور میں ضروری ہے، ان کی مرضی کے بغیر شادی کرنا یا انہیں مجبور کرنا صحیح نہیں ہے، خصوصاً ایسے نکاح (خنساءؓ جو ثیبہ تھی) کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے رد فرمایا جس میں شادی کرنے والے کی رغبت نہیں تھی (سنن ابی داؤد: ۲۱۰۱ صحیح)، نیز باکرہ سے بھی اجازت کے ساتھ ہی نکاح کی کاروائی کو آگے بڑھانا چاہیے...... ورنہ تجربات شاہد ہیں کہ ایسے نکاح جو بچیوں کی مرضی جانے بغیر کی گئی شادی خانہ آبادی بربادی کے دہانہ پر ہی ٹھہری ہے، اللہ حفاظت فرمائے۔

بالغ لڑکوں اور لڑکیوں کی شادی میں غیر معمولی تاخیر شرعاً غیر مناسب ہے، اسلامی تعلیم تو یہ ہے: إذا أتاكم من ترضون دينه وخلقه فزوجوه إلا تفعلوا تكن فتنة في الأرض وفساد عريض" (الجامع الصغیر ۱/۵۷) (ایسا شخص جس کی دینداری اور اخلاق سے تم راضی ہو، اس کا پیغام نکاح آئے تو فوراً اس کا پیغام قبول کرلو، اگر تم ایسا نہیں کروگے تو زمین میں فتنہ برپا ہوگا اور بڑا فساد قائم ہوگا)۔

مذکورہ حدیث میں مناسب پیغام کے ساتھ نکاح کی تیاری کرنے کا حکم ملتا ہے اور یہ تنبیہ بھی ہے کہ تاخیر کی وجہ سے امت میں فتنوں کے دروازے کھلنے کا شدید اندیشہ بھی ہے، غیر معمولی تاخیر کی وجہ سے بدکاری اور فحاشی عام ہوتے ہوئے دور حاضر میں ہم دیکھ بھی رہے ہیں۔

بچہ مزدوری کے بارے میں اسلام کا موقف:

جواب: ۱۰۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ فَاِنْ اَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا وَاِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْٓا اَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِذَا سَلَّمْتُمْ مَّآ اٰتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ'' (البقرۃ: ۲۳۳) (اور مائیں اپنے بچوں کو پورے دو سال دودھ پلائیں یہ (حکم) اُس شخص کیلئے ہے جو پوری مدت تک دودھ پلوانا چاہے اور دودھ پلانے والی ماؤں کا کھانا اور کپڑا دستور کے مطابق باپ کے ذمے ہوگا، کسی شخص کو اُس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دی جاتی (تو یاد رکھو کہ) نہ تو ماں کو اُس کے بچے کے سبب نقصان پہنچایا جائے اور نہ باپ کو اُس کی اولاد کی وجہ سے نقصان پہنچایا جائے، اور اسی طرح (نان نفقہ) بچے کے وارث کے ذمے ہے اور اگر دونوں (یعنی ماں باپ) آپس کی رضامندی اور صلاح سے بچے کا دودھ چھڑانا چاہیں تو اُن پر کچھ گناہ نہیں، اور اگر تم اپنی اولاد کو دودھ پلوانا چاہو تو تم پر کچھ گناہ نہیں بشرطیکہ تم دونوں پلانے والیوں کو دستور کے مطابق اُن کا حق جو تم نے دینا طے کیا تھا دیدو اور اللہ سے ڈرتے رہو اور جان رکھو کہ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اُس کو دیکھ رہا ہے)۔

مذکورہ آیت کی روشنی میں بچوں کی کفالت بلوغت تک باپ پر واجب ہے، بچے قابل رحم ہوتے ہیں ان کی تربیت وتعلیم اور کفالت گھر کے سرپرستوں پر حسب استطاعت واجب ہے، یہاں تک کہ طلاق وخلع کی صورت میں بھی لڑکوں کی کفالت بلوغت اور لڑکیوں کی کفالت شادی تک باپ کے ذمہ واجب الاداء ہے، جب سے بچہ ماں کے کوکھ میں داخل ہوتا ہے، اسی وقت سے اس کی مکمل رعایت اسلام میں ہے، اگر ماں کسی سبب سے دودھ پلانے پر راضی نہ ہو تو کسی اور عورت سے اجرت پر دودھ پلوانے کا تذکرہ بھی مذکورہ آیت میں وارد ہے، باپ پر بچہ کی کفالت یا نان ونفقہ واجب ہے، البتہ باپ کی کوئی خاص مجبوری ہو یا کوئی مرض ہو یا فقر وفاقہ کا شکار ہو، یا اس کی وفات ہوجائے تو ایسی صورت میں باپ کے بعد دادا، بھائی، چچا وغیرہ عصبات کی فہرست کے مطابق حسب مراتب ددھیال کے لوگ حق کفالت کے ذمہ دار ہوں گے، البتہ حق حضانت میں ماں کے بعد نانی، خالہ وغیرہ کو اولویت حاصل ہے۔

یعنی اسلام بچوں پر شروع سے ہی نہایت مہربان ہے، اس کی ساری ذمہ داریاں بچوں کے والد یا سرپرست کے ذمہ واجب قرار دیتا ہے، بلوغت سے قبل کمانے کی کوئی ذمہ داری بچوں پر نہیں ڈالتا ہے، ابتداء اسلام میں نادار اور مفلس بچوں کی پرورش وکفالت کا نظام بیت المال سے ہوتا تھا، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ۱۸ھ میں لاوارث اور گمنام بچوں کے لئے دودھ پلانے اور دیگر مصارف کا انتظام بیت المال سے کیا تھا، چنانچہ ان کے مصارف کے لئے اولاً ۱۰۰ درہم سالانہ مقرر فرمایا، پھر سال بہ سال ترقی ہوتی جاتی تھی اور اس طرح یتیموں کی پرورش اور اگر ان کی جائیداد ہوتی تو اس کی حفاظت کا نہایت اہتمام کرتے تھے اور اکثر اس کو تجارت کے ذریعہ ترقی دیتے تھے۔ (الفاروق: ۱۹۷)۔

اسلامی تعلیمات میں کم عمری میں کسی بھی قسم کی محنت ومزدوری کی ممانعت کی گئی ہے، جہاد جو اسلام کا ایک اہم رکن ہے، اس کے بارے میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ طریقہ تھا کہ وہ بچوں کو اس میں شرکت کی اجازت نہیں دیتے تھے، جب جہاد میں شرکت کی اجازت نہیں دی جاتی تو بچہ مزدوری کی اجازت کیسے ہوگی،

لہذا بچوں کا نان نفقہ کا انتظام والدین پر ہے، اگر والدین یہ فرض سرانجام نہیں دے سکتے تو یہ حکومت اور ریاست کی ذمہ داری ہے کہ وہ ان بچوں کو وظیفہ مقرر کرے اور تعلیم وتربیت کا معقول بندوبست کرے، نیز حضرت عمرؓ کے عہد میں تمام بچوں کے لئے بیت المال سے وظیفہ مقرر کیا گیا تھا جو ان کے والدین کو ادا کیا جاتا تھا، یتیم اور لاوارث بچوں کے لئے وظیفے کے علاوہ تعلیم وتربیت اور نگہداشت کے لئے الگ انتظام تھا۔

نابالغ بچے اور بچیوں سے گھر کا کام لینے، اپنی معاشی ضروریات پورا کرنے کے لئے مزدوری کرانے یا کوئی پیشہ ورانہ کام سکھانے کے لئے کام پر لگانے کا حکم:

جواب: د، ۲۔ والدین یا سرپرست نابالغ بچوں اور بچیوں سے اپنے گھر کے کام کاج (جو ان کی قدرت وبس میں ہو) لینے میں شرعا کوئی قباحت تو نہیں ہے، البتہ نابالغ بچوں کی کفالت یا نان ونفقہ باپ اور سرپرستوں کے ذمہ ہی واجب ہے، معاشی ضروریات بہتر بنانے کے لئے بچوں کو مزدوری پر لگانا درست تو نہیں ہے، جیسا کہ حکومت ہند کی جانب سے بھی سخت قوانین نافذ کئے جاتے ہیں کہ ۱۴ سال تک کے بچوں کو کام پر لگانا قانونا جرم ہے، بلوغت سے قبل بچوں کو کسی پیشہ ورانہ کام سکھانے کے لئے لگانا درست نہیں ہے، بچوں کو اس مرحلہ میں تعلیم دلانا ضروری ہے، جب کہ حکومتیں مختلف اسکیم کے تحت بچوں کی تعلیم کو آسان کر رہی ہیں، ناخواندگی کو ختم کرنے کی پوری کوششیں کی جارہی ہیں، لہذا ایسی صورت میں ان اسکیموں سے فائدہ اٹھانا ضروری ہے۔

انتہائی غربت اور معاشی بدحالی کی صورت میں نابالغ بچوں کو مزدوری پر لگانا:

جواب: د، ۳۔ ایسی صورت حال میں اسلامی اخوت کے تحت مسلم برادری پر واجب ہے کہ ان ناداروں اور مفلسوں کی مدد کرے، تکافل اجتماعی کی شکل میں ان کی مدد کی جائے، یعنی رفاہی اور دینی جذبے کی تحت ان غریب بچوں کی کفالت کی جائے، ان کی تعلیم کا انتظام کیا جائے، سچی بات تو یہ ہے کہ ایک صالح معاشرہ انسان کے لیے بہت بڑی نعمت ہے، انسان کے چین وسکون اور آرام وراحت میں معاشرے کا بہت اہم رول ہوتا ہے، صالح معاشرے کے ذریعہ انسان کی بہت ساری ضرورتیں پوری ہوسکتی ہیں، اس کی زندہ مثال نبی کریم ﷺ کے دور کا اور خلفاء راشدین کا مدنی معاشرہ ہے، جہاں دین کی خاطر سب کچھ قربان کرکے آئے ہوئے، مہاجرین کا دل وجان سے استقبال کیا گیا، رسول اللہ ﷺ جب مہاجرین وانصار کے درمیان بھائی چارگی کرائی تو انصار نے مہاجرین کے ساتھ اپنے حقیقی بھائی کی طرح برتاؤ کیا، ان کی ضرورتوں کا پورا پورا خیال رکھا، ان کی اجنبیت کو دور کیا اور ایسی ایثار وقربانی اور لطف وکرم کی مثالیں قائم کردیں جن کی نظیر تلاش کرنا ممکن نہیں ہے۔

نبی کریم ﷺ کا تربیت یافتہ معاشرہ ایک مثالی اسلامی معاشرہ تھا، جس میں افراد کی تربیت اس طرح کی گئی تھی کہ وہ اپنے سے زیادہ دوسروں کے لیے جینے والے بن گئے، دور جاہلیت کی ساری بری خصلتوں، منفی عادتوں اور ظاہری وباطنی عیوب ونقائص سے انہیں اس حد تک پاک کیا گیا تھا کہ وہ پوری دنیا میں سب سے ممتاز اور سب کے لیے مثال بن گئے، نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "مومن معاشرہ ایک عمارت کی مانند ہے، آپ ﷺ نے اپنی انگلیوں کے درمیان دیگر انگلیوں کو داخل کر کے ارشاد فرمایا: عمارت کا ہر حصہ دوسرے حصے کو مضبوطی کے ساتھ تھامے رکھتا ہے" (بخاری: ۴۸۱)۔

البتہ بعض خاص حالات میں کوئی مدد کرنے والا نہ ہو، اسلامی بیت المال، صاحب خیر کا تعاون، حکومتی تعاون وغیرہ میسر نہ ہو تو معاشی مجبوری کی وجہ سے بچہ کو کسی مناسب کام پر لگانے میں کوئی حرج نہیں ہے، بشرطیکہ وہ کام ان کی طاقت سے باہر نہ ہو۔

نابالغ بچے اور جرم وسزا:

جواب: ہ۔ اسلامی شریعت کے اصول کے مطابق قصاص کے قانون میں کسی نابالغ بچہ یا مجنون یا کھوسٹ بوڑھے شخص سے قصاص نہیں لیا جائے گا، ان کے عمد کو بھی خطا پر ہی محمول کیا جائے گا، اس کی علت یہ ہے کہ وہ غیر مکلف ہیں، غیر مکلف پر حدود وقصاص نافذ نہیں کیا جاسکتا، ارشاد نبوی ﷺ ہے یعنی تین افراد سے شرعی تکالیف اٹھالی گئی ہیں: بچہ یہاں تک کہ بالغ ہوجائے، سونے والا جاگ جائے، اور مجنون فاقد العقل افاقہ تک پہنچے (سنن ابی داؤد: ۴۴۰۳ صحیح)، البتہ ایسے مجرموں کی سزا حاکم وقت یا عدالت شرعی کی صواب دید کے مطابق تعزیرات یا آداب سکھانے کے لئے مناسب سزائیں دی جاسکتی ہیں۔

امام حمویؒ نے فرمایا: "الولد یحبس تأدیبا لا عقوبة" (نابالغ بچہ کو قید میں رکھنا ادب سکھانے کی غرض سے ہوگا نہ کہ سزا دینے کے لئے)، نیز بدائع الصنائع میں ہے: "حبس الأولاد والتلامیذ لیس علی وجه العقوبة لهم لأنهم لیسوا أهلا للتکلیف وإنما هو علی وجه التهذیب والاستصلاح لهم" (بدائع الصنائع ۷/۶۴، نہایۃ المحتاج ۸/۲۱، المبسوط ۲۰/۹۱) (طلبہ اور نابالغ بچوں کو قید میں رکھنا بطور سزا نہیں ہے، اس لئے کہ وہ سزا کے لائق

نہیں ہیں، بلکہ یہ تادیبی کاروائی ہے)۔

اسلامی آداب میں سے پہلا ادب یہ ہے کہ بچوں کے ساتھ نرمی اور پیار کا طریقہ اپنایا جائے، محبت کی جائے، جیسا کہ امام بخاری کی کتاب الأدب المفرد میں یہ روایت موجود ہے کہ نرمی اختیار کرو، اور سختی اور فحش گوئی سے بچو، البتہ خطا کار بچوں کو سزا دینے کے بعض شرائط بھی ہیں، ان کا لحاظ رکھا جائے، اس لئے کہ بعض بچے ذکاوت و سمجھداری میں ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں، بعض بچوں کو ترچھی نگاہوں سے یا غصہ سے کچھ ڈانٹنا بھی کافی ہوجاتا ہے، کبھی سختی کی ضرورت پڑتی ہے، تو ایسی صورت حال میں:

۱۔ مربی کو سزا دینے کے وقت حکم شرعی کو مدنظر رکھنا چاہئے (چہرے پر مت مارو) (سنن ابی داؤد)۔

۲۔ مار پیٹ کی ضرورت اس وقت ہو جب کہ ڈانٹ ڈپٹ کے تمام طریقے بروئے کار لائے گئے ہوں اور وہ بے سود ثابت ہوں۔

۳۔ غصہ کی حالت میں نہ مارا جائے کہ کہیں جسمانی نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو۔

۴۔ ہلکی پھلکی مار معمولی چھڑی سے ماری جائے۔

۵۔ دس سال سے کم عمر بچوں کو جسمانی سزا دینے کی اجازت نہ ہوگی۔

۶۔ غلطی پہلی بار ہوئی ہو تو تنبیہ کی جائے گی اصلاح کے نبوی طریقے اپنائے جائیں۔

۷۔ عدالتوں کے فیصلوں سے قبل تھانوں کی سزا پر روک لگائی جائے، اس لئے کہ بہت سے ملزم مجرم کی طرح مارے پیٹے جاتے ہیں، بسا اوقات تھانے میں تھانیداران ملزموں پر گولی بھی چلاتے ہیں اور ملزم نابالغ عدالت میں لے جانے سے قبل ہی شہید ہوجاتے ہیں۔

البتہ نابالغ بچوں سے (سوال میں مذکور) جرائم سرزد ہوں تو ایسی صورت میں قاضی یا حاکم اپنی صوابدید کے مطابق سزا تجویز کریں گے، اور یہ سزا بلوغت سے قبل ادب سکھانے کے لئے ہوگی، البتہ بلوغت کے بعد سزا کی نوعیت حدود و تعزیرات کے ضمن میں ہوگی، جمہوری حکومتوں (ہندوستان) میں تقریباً اٹھارہ سال سے قبل کے جرائم کی سزا میں رعایتیں کی جاتی ہیں۔

نوٹ۔ جرائم پر قابو پانے کا اسلامی طریقہ یہ ہوگا کہ اخلاقیات کے پہلو پر زور دیا جائے، ترغیبات پر مشتمل طریقوں کی تعلیم عام ہو، سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے درخشاں پہلوؤں کو اجاگر کیا جائے، صحابہ اور تابعین کی زندگی سے سبق آموز پہلوؤں کو ان کے سامنے رکھا جائے، ترغیب وترہیب کے ابواب سے استفادہ ہو۔

نابالغ بچوں کی سرزنش کے لئے جیلیں:

جواب: و۔ جمہوری ممالک کے قوانین الگ ہیں، اسلامی نظام کچھ اور ہیں، پھر بھی ان نابالغ قیدیوں کو اتنی ہی سزا دی جاسکتی ہیں جس کے وہ متحمل ہوں، شریعت کا اصول یہ ہے کہ کسی کو اس کی طاقت سے بڑھکر تکلیف نہ دی جائے، (تکلیف مالا یطاق لا یجوز)، ان قیدیوں کے ساتھ انسانیت کے پہلوں کو مدنظر رکھ کر ان کے ساتھ معاملہ کیا جائے، انتہائی پر مشقت کام نہ لیا جائے، نمازوں کی پابندی کا موقع دیا جائے، صلہ رحمی سے نہ روکا جائے، ان مجرموں کے ساتھ اخلاقی لحاظ سے بہتر سلوک کیا جائے کہ وہ اخلاق حسنہ سے متاثر ہوکر اپنی اصلاح خود کرلیں۔

قابل ذکر بات یہ بھی ہے کہ ان نابالغ مجرموں کے قید خانے بالغ مجرموں کے قید خانے سے جدا ہونا ضروری ہے کیونکہ قوی احتمال ہے کہ بروں کی صحبت سے نابالغ قیدی متاثر ہوں گے،

صحبت صالح ترا صالح کند   صحبت طالح ترا طالح کند

نیز سلف صالحین خصوصاً امرد (بے ریش) نوجوانوں کی صحبت سے منع کرتے تھے، امام مالک بن انسؒ حدیث کی مجلس میں بے ریش جوانوں کو اجازت نہیں دیتے تھے، امام احمدؒ بے ریش نوجوانوں کی صحبت سے روکتے تھے خواہ وہ قریبی رشتہ دار کیوں نہ ہو...... لہذا فتنوں کے سدباب کی خاطر نابالغ بچوں کے لئے الگ قید خانے کا نظم کیا جائے...... تاکہ مختلف قسم کے مفاسد کا روک تھام کیا جائے۔

ان قیدیوں کی عمر اور ان کی جسمانی حالت کے اعتبار سے مناسب سزا تجویز کی جائے، ہلکی پھلکی مار ماری جائے، چہرہ پر نہ مارا جائے، بدترین سزاؤں سے

اجتناب کیا جائے، ان سے کام کی نوعیت بھی وہی ہوگی جس کے وہ متحمل ہوں، بچوں کی ذاتی صلاحیتوں کی بنیاد پر صنعت وحرفت کے میدان میں کام آنے والے ہنر، یا تعلیم کے میدان میں ترقی کی راہیں فراہم کی جائیں، اصلاح کے لئے اچھے خیر خواہ مربی کا انتظام ہو جو دین و دنیا کی صحیح تعلیم و تربیت دے سکے، جو بھی طریقہ نرمی کا ہو اسے اپنایا جائے، سختی سے کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا، ترغیب کے تمام اسالیب نبوی صلی اللہ علیہ وسلم استعمال کئے جائیں، صبح وشام تذکیر وتزکیہ وتربیت کا طریقہ اپنایا جائے، خصوصا مسلم قیدیوں کو قیام اللیل کا پابند بنایا جائے کہ نماز کی بدولت ان کی اصلاح ہو جائے جیسا کہ ارشاد باری تعالی ہے: "اُتْلُ مَآ اُوْحِیَ اِلَیْكَ مِنَ الْكِتٰبِ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ وَاللّٰهُ یَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ" (سورۃ العنکبوت: ۴۵) (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم!) یہ کتاب جو تمہاری طرف وحی کی گئی ہے اس کو پڑھا کرو اور نماز کے پابند رہو کچھ شک نہیں کہ نماز بے حیائی اور بری باتوں سے روکتی ہے اور اللہ کا ذکر بڑا (اچھا کام) ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اسے جانتا ہے)۔

حقیقت میں یہ قید خانے اصلاح خانے ہونے چاہئے، جہاں ایک بگڑے ہوئے انسان کو مکمل انسان بنایا جاسکتا ہے، تنہائی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے مختلف مربیوں کی خدمات حاصل کی جائیں، دلوں کی صفائی کے لئے کارآمد طریقے اپنائے جائیں، حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے گفتار وکردار کے ذریعہ قید خانہ میں لوگوں کے مابین اپنے حسن اخلاق کے ذریعہ اصلاح کا کام کیا، خوابوں کی تعبیر سنانے سے قبل توحید کا پیغام عام کیا، شرک کی شناعت کو خوب کھول کھول کر بیان کیا، نیز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں قید خانے کی حیثیت سے مسجد کا استعمال ہوتا تھا...... نماز کی پابندی ضروریات کا خیال رکھا جاتا تھا...... اخلاق نبوی سے متاثر ہو کر غیر مسلم قیدی اسلام کے آغوش میں پناہ لینے کے لئے تیار ہو جاتے تھے، مسلمانوں کے کریمانہ سلوک سے مشرف بہ اسلام ہوتے تھے...... صحابہ کرامؓ نے خود بھوکے رہ کر اپنے قیدیوں کو کھلایا پلایا تھا، انسان کے کردار سازی میں اخلاق کا بڑا اہم رول ہوتا ہے، اخلاقیات کا باب روشن ہو تو مخالف اسلام بھی اسلام کا شیدائی بن جاتا ہے، آج کے قید خانے صرف اور صرف تعذیب خانے بن گئے ہیں جیسے ابوغریب قید خانہ وغیرہ مجرم قید خانے سے باہر آنے کے بعد مزید سرکش بن کر نکلتا ہے، یا ناکارہ بن کر باہر نکلتا ہے، بسا اوقات ملزم کئی سالوں کے بعد بھی جرم ثابت نہ ہونے کی وجہ سے باعزت بری ہو جاتا ہے اور کسی کام کا نہیں ہوتا، دور حاضر میں ایک طرف اخلاقیات کا فقدان ہے تو دوسری طرف جرائم کی بہتات ہے، جرائم کو بعض لوگوں نے پیشہ کے طور پر اپنایا ہے، اعلی سطح پر یہی ذریعہ معاش بھی ہے، ملکی اور بیرونی سطح پر جرائم کا وسیع جال پھیلا دیا گیا ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ روئے زمین کو ہر قسم کے فسادات سے پاک کیا جائے اور اسے چمنستان بنانے کی بھرپور کوشش کی جائے۔ واللہ المستعان

بے سہارا بچوں کے لئے تعلیم وتربیت کا نظم اور حکومت کی ذمہ داریاں:

جواب: ز- بے سہارا بچوں کی حفاظت، نگہداشت ان کی تعلیم وتربیت حکومت کی اور سماج کی بھی اہم ذمہ داری ہے، یتیم خانوں سے، رفاہی اداروں سے خدمات حاصل کی جائیں، ویلفیر ایسوسی ایشن وغیرہ کے ذریعہ ان بچوں کی تربیت کی جائے، اگر ان کی طرف صحیح توجہ نہ دی جائے تو مسئلہ خطرناک ثابت ہوسکتا ہے۔

حکومت کی ذمہ داریوں میں ان بے سہارا بچوں کی پرورش بھی شامل ہے، حکومت ہر اس بچہ کی کفیل ہے جس کا کوئی کفیل نہ ہو، والی نہ ہو، سرپرستی کی ذمہ داری حکومت وقت پر عائد ہوتی ہے، پورے ملک میں ایسے جال بچھایا جائے کہ کوئی بے سہارا سڑک پر بھیک مانگتے ہوئے نظر نہ آئے، اسی طرح سماج کے اہل خیر کی بھی مسؤلیت ہے کہ وہ رفاہی ادارہ قائم کریں، یتیم خانہ بنوائیں، جہاں قیام وطعام کے ساتھ تعلیم وتربیت کا بھرپور نظم ہو، جیسا کہ بہت سارے اہل خیر حضرات نے اس سلسلہ میں اوقاف چھوڑی ہیں، سرائے بنوائے، مسافر خانہ بنائے، یہ بھی صدقہ جاریہ ہے، اس پر بھی صاحب دولت وثروت کو متوجہ ہونا چاہئے، اور صالح معاشرہ وسماج کی ذمہ داری میں شامل ہے، بعض اہم ادارے اس سلسلہ میں کوشاں ہیں، متحرک بھی ہیں، اس کڑی کی توسیع ہونی چاہئے، تاکہ بے سہارا بچوں کی تعلیم وتربیت صحیح طور سے انجام پائے۔

غربت وافلاس کی حالت میں بچوں کو فروخت کرنا:

جواب: ح- فقر وفاقہ بھی اللہ کی طرف سے ایک آزمائش ہے، مومن کو ہر طرح کے حالات میں صابر وشاکر رہنا چاہئے، خصوصا والدین کی انتہا درجہ کی کوشش تو یہ ہو کہ خود پرورش کریں، کسی کو اپنا بچہ حوالہ نہ کریں، البتہ جب حالات ناگفتہ بہ ہوں، بچہ کی پرورش کی استطاعت بالکل ہی نہ ہو، والدین کا فقر وفاقہ، یا مرض وغیرہ بچوں کی پرورش میں رکاوٹ ہو تو کسی کو لے پالک بنانے کے لئے خواہشمند لوگوں کو اپنے بچوں کو بلا معاوضہ حوالہ کرنا درست ہوگا، ویسے تامل نادو حکومت اور دیگر اداروں کی طرف سے ایسے بچوں کی کفالت وغیرہ کا نظم موجود ہے، مجبوری کی صورتوں میں سے ایک صورت بچہ کو وقتی طور پر حکومتی اداروں کے حوالہ بھی کیا

جاسکتا ہے ..... جب حالات درست ہوں تو والدین بچوں کو اپنی سرپرستی میں دوبارہ لے سکتے ہیں...... پھر بھی ان اداروں پر پوری طرح اطمینان کا اظہار نہیں کیا جاسکتا، ماں سے بہتر گود کسی کا ہو نہیں سکتا، صبر وضبط کے ساتھ ماں باپ قربانی دیں، محنت ومزدوری کریں، اللہ پر بھروسہ رکھیں، تقوی کی زندگی لازم کرلیں، مشکل کشا تو صرف اللہ ہی ہے، اسی سے خیر کی امید رکھیں، یقیناً اللہ مسبب الاسباب ہے راہیں ہموار کرے گا، یقین کی کمی نہ ہو تو ضرور ممکن ہے کہ ان معصوموں کی بدولت اللہ تعالی سب کے لئے روزی کے دروازہ کھول دے گا جس راستہ کا انسان تصور بھی نہیں کرسکتا اسی غیبی راہ سے چھپر پھاڑ کر روزی دینے والا وہ قادر مطلق ہے: "ومن يتق الله يجعل له مخرجاً ويرزقه من حيث لا يحتسب" (سورہ طلاق: ۲، ۳)، لہذا بچوں کو کسی کے حوالہ کرنے کی سوچ نہ آنے دیجائے...... اور نہ ہی کسی سے ان بچوں کا معاوضہ لینا کا تصور ذہن میں آئے، چونکہ یہ بھی ایک طرف بچہ فروخت کرنے کے مترادف ہی تو ہے، جب اللہ نے اولاد دی ہے تو ضرور اس کے رزق کا بھی نظم فرمائے گا...... یہ بھی یاد رہے کہ اللہ نے سچ فرمایا ہے کہ شیطان ہمیشہ فقر وافلاس کا خوف دلاتے رہتا ہے، اس سے متاثر نہیں ہونا چاہیے، چنانچہ ارشاد باری ہے: "اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَأْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَاءِ (البقرۃ: ۲۶۸) (شیطان تمہیں محتاجی اور فقر وفاقہ سے ڈراتا ہے اور وہ تمہیں برائی کا حکم دیتا)

مذکورہ صورت حال میں اسلامی معاشرہ آگے بڑھے، شریعت میں تکافل اجتماعی کی جو شکلیں موجود ہیں، ایک دوسرے کی ہمدردری، خیر خواہی، غم خواری، باہمی تعاون کا جذبہ، صلہ رحمی، صدقہ وخیرات کی اہمیت اجاگر کرنا، ایثار کے سبق کو عام کرنا وغیرہ یہ صورتیں ہیں جو غربت وافلاس کے خاتمہ کے لئے معاون ثابت ہوں گی، ان شاء اللہ۔

ذہنی یا جسمانی طور پر معذور بچوں کے علاج ونگہداشت کا مسئلہ:

جواب: ط۔ معذور بچوں کا وجود یقیناً اللہ کی طرف سے ایک آزمائش ہے، والدین کی ذمہ داری میں ان کا خیال رکھنا، دیکھ بھال کرنا حتی المقدور علاج ومعالجہ کی پوری کوشش کرنا، اللہ کی حکمت ومصلحت سمجھ کر اللہ کے فیصلے سے راضی رہ کر اسی سے اجر وثواب پانے کی امید میں تاحیات پرورش کرنا، والدین کا حق ہے، اس سے راہ فرار اختیار کرنا، کسی ہسپتال یا اداروں کا حوالہ کرنا شرعاً واخلاقاً اور عقلاً درست نہیں ہے۔

اس سلسلہ میں کسی قسم کی ادنی کوتاہی، حیلہ سازی یقیناً جرم عظیم ہوگا، اللہ تعالی کے پاس جواب دینا ہوگا، مومن ہر حال میں اللہ کا صابر وشاکر بندہ بن کر زندگی گذارے، شریعت پر عمل کی صورت میں اللہ تعالی ہر مسئلہ کو آسان بنادے گا، وقتی مسائل زمانہ کی تبدیلی کے ساتھ بدل جائیں گے، اس قسم کے خیال، سوچ اور فکر مادی دور کے پیداوار ہیں، آج اخلاقیات کا فقدان عام ہے، مادی دوڑ میں سبقت لے جانے کی کوشش میں انسان ان معذوروں سے راہ فرار اختیار کرنا چاہتا ہے، معذور بچوں کا حتی المقدور خدمت کرنا، آخری سانس تک ان کا ساتھ دینا والدین سرپرست، قریبی رشتہ داروں، اور ذمہ داروں کی ذمہ داریوں میں شامل ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہمیشہ سرآنکھوں پر رہے، "هل تنصرون وترزقون إلا بضعفائكم" (رواہ البخاری: ۲۷۳۹) (تمہاری مدد اور روزی کا انتظام تمہارے اپنے ضعیفوں، معذورں کی بدولت ہی کی جاتی ہے)، لہذا ان قرآنی آیات واحادیث شریفہ پر یقین کامل ہو تو ضرور اللہ تعالی کی مدد شامل حال ہوگی، ان شاء اللہ۔

وصلى الله على سيدنا محمد وبارك وسلم، والحمد لله رب العالمين۔

☆☆☆

موجودہ حالات میں بچوں کے حقوق اور آداب

مولانا محمد عمران ندوی[1]

الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام على سيد المرسلين وعلى آله وأصحابه أجمعين، أما بعد!

تربیت اولاد کو اسلام نے جو اہمیت دی ہے اس کا اندازہ ان نصوص سے ہوتا ہے جو اس کے متعلق وارد ہیں، کلام پاک میں ارشاد باری تعالی ہے:

"يا أيها الذين آمنوا قوا أنفسكم وأهليكم ناراً" (التحریم:٦) (اے ایمان والو! اپنے آپ کو اور اپنی اولاد کو آگ سے بچاؤ)، اسی طرح دوسری جگہ ارشاد باری تعالی ہے: "وأمر أهلك بالصلاة واصطبر عليها" (طہ:۱۳۲) (اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم دیں اور خود بھی اس کی پابندی کریں)۔

اسی طرح حدیث پاک میں بچے کی تربیت کو والد کی طرف سے دیئے جانے والے عطیات میں سب سے افضل عطیہ قرار دیا گیا ہے، "وعن أيوب بن موسى عن أبيه عن جده عن النبي ﷺ قال: ما نحل والد ولداً من نحل أفضل من أدب حسن" (رواہ الترمذی)۔

(حضرت ایوب بن موسیٰؒ اپنے باپ دادا کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: کسی والد نے کسی بچے کو اچھے ادب سے زیادہ اچھا عطیہ نہیں دیا)۔

علماء کرام نے تو تربیت اولاد کے عنوان سے مستقل باب قائم کرکے اس کے متعلق احادیث کو جمع کیا، ان تمام نصوص سے اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اسلام نے اپنے پیرووں کی توجہ تربیت اولاد کی طرف خاص سے مبذول کرائی ہے، اور بچیوں کی پرورش اور تربیت پر تو آپ نے جنت میں اپنی رفاقت کی بشارت بھی دی ہے، یہاں تک کہ باندی اور غلام کی تربیت کرنے اور تہذیب سکھانے پر دوہرے اجر کی خوشخبری سنائی گئی ہے۔

بچوں کے حق پرورش کے سلسلہ میں اسلام کی بنیادی ہدایات:

۱۔ بچوں کے حق پرورش کے سلسلہ میں اسلام کی بنیادی ہدایات یہ ہیں کہ بچے کی پرورش، تعلیم وتربیت اس طریقہ سے کی جائے کہ وہ ضائع اور برباد نہ ہونے پائیں، لہذا بچے جب تک اپنی ضروریات سے خود فارغ نہ ہونے لگیں اس وقت تک ماں کے پاس رہیں گے، بعض فقہاء کرام نے اس کی مدت سات سال رکھی ہے اور بعض حضرات نے استنجاء وغیرہ سے فراغت کی بات کہی ہے، حق حضانت میں ماں کو حق تقدم حاصل ہے، اس کے بعد ترتیب وار نانی دادی، بہن، خالہ، پھوپھی وغیرہ ہیں، جیسا کہ صاحب ہدایہ لکھتے ہیں:

''والأم والجدة أحق بالغلام حتى يأكل وحده ويشرب وحده ويلبس وحده ويستنجي وحده والخصاف، قدر الاستنجاء لسبع سنين اعتباراً للغالب والأم والجدة أحق بالجارية حتى تحيض'' (ہدایہ ۲/۴۳۵)۔

پھر جب بچہ اپنی ضروریات سے فراغت میں خود کفیل ہوجائے تو اس کو والد کے پاس لایا جائے گا اور والد اس کے تعلیم وتربیت کا انتظام کرے گا اور مردوں والے اوصاف اس کو سکھائے گا اور جب بچہ بالغ ہوجائے گا تو اس کو اختیار ہوگا، چاہے تو والد کے پاس رہے یا چاہے تو والدہ کے پاس اور بچی کے متعلق یہ احکام ہیں کہ وہ بالغ ہونے تک ماں نانی دادی وغیرہ کے پاس رہے گی اور بالغ ہونے کے بعد وہ والد کے پاس لائی جائے گی تاکہ وہ اس کو تحفظ فراہم کرے اور اس کی شادی کرے۔

اسلام میں بچوں کے حق تعلیم وتربیت کے بارے میں بنیادی ہدایات:

۲،الف۔ کلام پاک میں اللہ رب العزت کا پاک ارشاد ہے: "يا أيها الذين آمنوا قوا أنفسكم وأهليكم ناراً" (التحریم:٦) (اے ایمان والو! اپنے آپ کو

[1] مہتمم جامعہ اسلامیہ انوار العلوم، اورنگ آباد۔

اور اپنے اہل وعیال کو آگ سے بچاؤ)، "وأمر أهلك بالصلاة واصطبر عليها" (طٰہٰ: ۱۳۲) (اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم دیں اور خود بھی اس کا اہتمام کریں)، "وكان يأمر أهله بالصلاة والزكوة وكان عند ربه مرضياً" (مریم: ۵۵) (وہ (اسماعیل) اپنے متعلقین کو نماز پڑھنے اور زکوۃ دینے کا حکم کرتے رہتے تھے اور اپنے رب کے نزدیک پسندیدہ تھے)، اسی طرح احادیث میں اولاد کی تعلیم وتربیت پر خصوصی توجہ دی گئی ہے۔

حدیث پاک میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''عن عمرو بن شعيب عن أبيه عن جده قال قال رسول الله ﷺ: مروا أولادكم بالصلاة وهم أبناء سبع واضربوهم عليها وهم أبناء عشر وفرقوا بينهم في المضاجع'' (جامع الاصول ۸۷/۵، رقم الحدیث: ۳۲۴۳) (آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا پاک ارشاد ہے کہ اپنی اولاد کو نماز کا حکم دو جب وہ سات سال کے ہوجائیں اور جب دس سال کے ہوجائیں تو نماز چھوڑنے پر ان کو مارو اور ان کے بستر الگ کردو)۔ ان نصوص سے واضح طور سے دین کے فرائض اور اچھے اخلاق کی تعلیم دینے کی اہمیت معلوم ہوتی ہے اور ساتھ میں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ علم سے مراد کون سی چیزیں ہیں۔

۲، ب۔ ضروری تعلیم کی مقدار یہ ہے کہ قرآن کریم صحیح طریقہ سے پڑھایا جائے، عقائد اسلام کی تعلیم اس طرح دی جائے کہ ہر ہر عقیدہ پر بچوں کو پختہ یقین حاصل ہوجائے، نماز کے پورے مسائل، روزہ، زکوۃ، حج کے پورے پورے مسائل اور جس طریقہ کسب معاش میں اس کو لگانے کا ارادہ ہو اس کے مسائل شرعیہ، ماں باپ، بیوی اور متعلقین کے حقوق کی تعلیم وغیرہ۔

دوسری چیز ادب اور تہذیب سکھائی جائے، ادب اور تہذیب سے مراد موجودہ زمانہ کی بدتمیزیاں نہیں ہیں بلکہ اسلامی تعلیم کے مطابق لوگوں سے ملنا جلنا، بات کرنا، بڑوں کا ادب کرنا، چھوٹوں پر شفقت کرنا، اسلامی لباس پہننا، اسلامی طریقہ پر کھانا پینا، برے اخلاق مثلاً جھوٹ، غیبت، چوری وغیرہ سے بچوں کے دلوں میں نفرت پیدا کرنا وغیرہ۔

عصری تعلیم سے مراد انگریزی تعلیم نہیں ہے، جس میں سینکڑوں روپیہ کا خرچ بیچارے غریب باپ پر لازم ہوجائے، انگریزی تعلیم دلانا اولاد کو جائز مقصد کے لئے تو جائز ہے مگر واجب اور ضروری نہیں، البتہ جو لوگ اپنے لڑکوں کو انگریزی تعلیم زیادہ سے زیادہ دلا رہے ہیں وہ دو باتوں پر ضرور غور کرلیں: ایک یہ کہ انگریزی تعلیم اس طرح دلائیں کہ غیر اسلامی ماحول اور کافرانہ تہذیب وتمدن کا زہریلا اثر بچوں کے دماغ اور اوضاع واطوار کو خراب نہ کردے۔ اگر اس کا خیال نہ رکھا گیا تو اس زہریلے اثر سے بچے جس قدر بداعمالیوں کا ارتکاب کریں گے اس کے ذمہ دار والدین بھی ٹھہریں گے۔

عصری تعلیم سے مراد عام طور سے ریاضی، سائنس، تاریخ، جغرافیہ وغیرہ کے مضامین مراد لیے جاتے ہیں، ان مضامین سے کم سے کم اتنی واقفیت ضروری ہوا کرتی ہے کہ اپنے ضرورت بھر کا حساب کتاب کرلے، مادری زبان کے علاوہ ایک ملکی زبان میں لکھنے پڑھنے پر قدرت رکھتا ہو، اور ان مضامین سے اتنی واقفیت ہو کہ زمانے کو سمجھ سکے، اس لئے کہ فقہاء کرام کا مشہور قول ہے: "من جهل بأهل زمانه فهو جاهل" (رسم المفتی) (جو اپنے زمانہ سے ناواقف ہو وہ جاہل ہے)۔

علماء کرام اور مفتیان کرام کی ذمہ داریوں میں سب سے اہم ذمہ داری لوگوں کی رہنمائی کا ہے اور جو مفتی یا عالم زمانہ کے لوگوں اور ان کے حالات اور معاملات سے واقف نہ ہو تو وہ رہنمائی کا فریضہ کیسے ادا کرے گا۔

عصری اور دینی تعلیم کے متعلق احقر اپنی ایک رائے اہل علم حضرات کے سامنے پیش کرنے کی جسارت کرتا ہے، وہ یہ کہ تعلیم کو عصری اور دینی عنوان سے تقسیم کرنے کے نتائج آج کل بالکل واضح ہوکر سامنے آچکے ہیں، ایک طرف ہمارے بہت سے عصری درسگاہوں کے طلبہ ہیں جن کو اپنے نبی کا نام نہیں معلوم چہ جائیکہ پیدائش اور مقام پیدائش اور مقام ہجرت، دوسری طرف دینی درسگاہوں سے فارغ ہونے والے مفتیان کرام ہیں جن میں اکثر کو ریاضی سے اتنی واقفیت نہیں ہوتی ہے کہ میراث کا مال تقسیم کرسکیں، حالانکہ علم الفرائض کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خاص طور پر اہمیت دی ہے اور اس کو سیکھنے پر آمادہ کیا ہے، اور اس کو آدھا علم بھی کہا گیا ہے۔ دونوں صورتحال بڑی افسوس ناک ہے، عصری طلبہ کو دین کی بنیادی تعلیمات نہایت ضروری ہیں، اسی طرح دینی درسگاہوں کے طلبہ کے لئے عصری علوم سے واقفیت بھی ضروری ہے اور دونوں درسگاہوں کے نصاب اتنے زیادہ ہیں کہ مزید کسی کتاب کی کوئی گنجائش نہیں، لہذا دونوں نصابوں کو تمام لوازمات کے ساتھ ضم کرنا ممکن نہیں ہے، البتہ دونوں کے ماہرین بیٹھ کر یہ طے کردے کہ عصری علوم کے کون سے مضامین بنیادی ہیں اور کون سے زائد، اسی طرح دینی علوم میں کون سے مضامین بنیادی حیثیت کے حامل ہیں اور کون سے زائد، دونوں میں سے کچھ تخفیف کرلی جاتی اور پھر دونوں کو ضم کرکے ایسا نصاب مرتب کردیا جاتا کہ دسویں تک تمام طلبہ ایک ساتھ پڑھتے اور دسویں کے بعد جس طرح کچھ بچے سائنس سے، کچھ کامرس سے، کچھ آرٹس سے پڑھنے کا پہلا فائدہ تو یہ ہوتا ہے کہ

عصری شعبوں میں جانے والے طلبہ بھی دین کی بنیادی معلومات سے ناواقف نہ رہتے اور دینی شعبوں میں لگنے والے طلبہ بھی عصری تعلیم کی بنیادی تعلیم سے نابلد نہ رہ جاتے۔

اور دوسرا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ دونوں طبقوں کے درمیان کمیونیکیشن گیپ (Communication Gap) نہ ہوتا، آج تو اتنا خلا ہو گیا ہے کہ دینی درسگاہ سے فارغ شدہ حضرات کی زبان بڑی مشکل سے عصری تعلیم گاہوں سے فارغ لوگ سمجھ پاتے ہیں، اس طرح یہ دونوں طبقے ایک دوسرے سے دن بدن دور ہوتے چلے جارہے ہیں جو مناسب نہیں ہے۔

حکومت کی طرف سے ایک سطح تک کی تعلیم کو بچوں اور بچیوں کے لئے لازم قرار دینا:

۳۔ اس سوال کا جواب دینے سے پہلے احقر دو چار باتیں عرض کرنا ضروری سمجھتا ہے، سب سے پہلی بات یہ عرض کرنی ہے کہ موجودہ تعلیمی نظام اور نصاب (Sylabus Education System) کس نے بنایا ہے اور کیوں بنایا ہے، کیا یہ تعلیمی نظام ونصاب واقعی بچوں کو زیور تعلیم سے آراستہ کرنے کے لئے بنایا گیا ہے یا کسی اور مقصد کے لئے، آیئے ذرا تاریخ کے اوراق کو پلٹتے ہیں اور صلیبی جنگوں کے زمانے میں چلتے ہیں۔

صلیبی جنگوں کے دوران مغربی دنیا کو یہ تجربہ ہوا کہ مسلمانوں کا شیرازہ خواہ کتنا ہی منتشر ہو اور ان کے باہمی اختلافات ونزاعات کتنے ہی سنگین ہوں، لیکن جب ان کے مشترک دشمن کی طرف سے جنگ مسلط کی جاتی ہے تو وہ متحد ہو جاتے ہیں، ان کی ایمانی غیرت وحمیت بھڑک اٹھتی ہے اور خدا کے راستے میں شہید ہو جانے کا شوق وجذبہ ان کے دلوں میں موجزن ہو جاتا ہے، چنانچہ مغربی دنیا کے رہنماؤں نے اس ایمانی طاقت وقوت کی رگوں کو کاٹنے اور اس کے سرچشموں اور سوتوں کو خشک کرنے کے لئے تعلیم وتربیت کا طریقہ اختیار کیا، ایسے ہی تعلیمی نظام سے بے راہ روی پھیل رہی ہے اور نوجوان سند یافتہ ہونے کے باوجود بے کردار اور غیر مہذب نظر آتے ہیں یعنی ان کے اندر اخلاق کی وہ روشنی نہیں پیدا ہو رہی جس کی ایک تعلیم یافتہ انسان سے توقع کی جانی چاہئے تھی، طلبہ تعلیم گاہوں سے ایسے حیوان بن کر نکلتے ہیں جن کو دوسروں کی کوئی فکر نہیں، لغزش اور گناہوں کے تمام تصور سے عاری جائز اور ناجائز طریقہ سے دولت جمع کرنے کی ہوس، مزاج تعمیر سے کہیں زیادہ تخریبیت، اور تشدد کا گرویدہ، یہ نہ اچھے شہری ہیں اور نہ ہی اچھے انسان، اور یہ سب تعلیم کے نام پر کرنا نہایت آسان معلوم ہوا۔

چنانچہ مغربی دنیا نے اسکولوں، کالجوں اور تعلیمی اداروں کا ایک جال پھیلا دیا، اس کے لئے انہوں نے ایک خاص نصاب تعلیم تیار کیا، جس میں ایسے مضامین شامل کئے گئے جس سے تعلیم حاصل کرنے والے مسلم طلبہ اپنی روشن تاریخ اور شاندار ماضی کی طرف سے بدگمان ہوں اور اس کی طرف ذلت وحقارت آمیز نگاہوں سے دیکھیں۔ اور اسلامی تشخص کے اہم عناصر سے محروم ہو جائیں، اس نظام تعلیم وتربیت کے اثر سے ان کے قلب، نظر اور ذہن ودماغ میں فساد پیدا ہو، ان کی عقلیں مغرب اور مغربی تہذیب ومدنیت کی چمک دمک سے مسحور ومرعوب ہوں، وہ اس کے گرویدہ اور رسیا بن جائیں، اور پھر تعلیم سے فراغت کے بعد مغرب ان کو اپنے سامراجی منصوبوں کی تکمیل کے لئے استعمال کرے یا پھر اپنے ملک اور معاشرہ میں مکمل طور پر ان کو ضم کرلے اور وہ اپنے معاشرہ سے الگ تھلگ ہو جائیں، مغربی دنیا کا تیار کردہ نظام تعلیم وتربیت ایسی کتب پر مشتمل ہے جن میں اسلام اور اسلامی عہد پر حملہ کیا گیا ہے۔

بقول حضرت مولانا علی میاںؒ: ایسا تعلیمی نظام جس کی بنیاد میں دین وشریعت سے بغاوت ہو اس کو شرعاً کیسے لازم کیا جاسکتا ہے، لازم کرنا تو دور کی بات ہے احقر تو پڑھنے اور پڑھانے کا روادار نہیں۔

بچوں کے لئے جنس کی تعلیم:

۴۔ جنسیات کے متعلق اسلام کی بنیادی ہدایات حیا اور عفت ہیں، جنسی عمل ایک فطری تقاضا ہے اور فطرت نے اس کو پورا کرنے کا فطری طریقہ اور فطری محل بھی بنایا ہے۔

اسلامی ہدایات کے مطابق جنسی خواہشات کی تکمیل کا محل صرف بیوی اور باندی ہے، جو ان دو محل سے تجاوز کرے گا وہ اللہ کے مقرر کردہ حدود سے تجاوز کرنے والا شمار ہوگا، اور زانی کہلائے گا جس کے متعلق احکام خداوندی ہے: "ولا تقربوا الزنا إنه كان فاحشة وساء سبيلاً" (بنی اسرائیل: ۳۲) (اور پاس نہ جاؤ زنا کے، وہ ہے بے حیائی اور بری راہ ہے)، اور اس کی سزا شریعت میں رجم یا پھر سو کوڑے متعین ہے، جنسی خواہشات کی تکمیل میں شریعت بے راہ روی کو گوارا نہیں کرتی ہے اور عورت اور مرد دونوں کو نکاح کے بعد ہی کسی طرح کے تعلقات قائم کرنے کی اجازت دیتی ہے، اور دونوں کو ایک دوسرے کا وفادار بن کر رہنے کو

لازم قرار دیتی ہے، اور دونوں کے تعلقات کی نوعیت کو "هن لباس لكم وأنتم لباس لهن" (وہ تمہارے لئے بمنزلہ لباس ہیں اور تم ان کے لئے بمنزلہ لباس ہو) سے واضح کرتی ہے، جس طرح لباس انسان کی ستر پوشی کرتا ہے اسی طرح عورت مرد کے لئے ستر پوش ہے اور مرد عورت کے لئے ستر پوش ہے۔

دوسری چیز جو بنیادی حیثیت کی حامل ہے وہ حیا ہے، اسلام جائز محل میں بھی جنسی خواہشات کی تکمیل میں بے حیائی کو پسند نہیں کرتا ہے اور اس کو خلوت کا فعل قرار دیتا ہے، اور اس میں اتنی سختی کرتا ہے کہ بچوں کے سامنے ان چیزوں کا اظہار بھی معیوب سمجھتا ہے، چہ جائیکہ عوامی جگہوں، سواریوں، سڑکوں اور تعلیمی اداروں میں۔

اگر جنسی تعلیم کے عنوان سے حیا اور عفت کی تعلیم دینی مراد ہو اور جنسی تعلق کا جائز محل اور صحیح مصرف بتانا مقصود ہو تو مبارک ہے یہ قدم اور اگر اس عنوان سے بے حیائی اور بدچلنی کو فروغ دینا ہو اور طلبہ کو جنسی آوارگی پر ابھارنا اور اکسانا ہو اور ان کی تولیدی صلاحیت کو وقت سے پہلے استعمال کرا کے نسل انسانی کی جڑ کاٹنی ہے تو ایسے علم کو علم کہنا لفظ علم کی صرف توہین نہیں بلکہ ظلم عظیم ہے۔

مخلوط تعلیم نے تعلیمی اداروں کا جو حال کر رکھا ہے وہ کسی عقلمند سے مخفی نہیں K.G سے لے کر P.G تک کے طلبہ کا جائزہ لیا جائے تو بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ تعلیم کا معیار کہاں سے کہاں گیا، Co-education کے نام پر بچوں کو کن سرگرمیوں میں لگا دیا گیا ہے، وہ کسی صاحب بصیرت سے مخفی نہیں ہے، ایسے حالات میں اگر جنسی تعلیم کے نام سے ایک Subject (مضمون) کا اور اضافہ کر دیا جائے تو پھر گویا بارود کو آگ لگانا ہوگا، ابھی تک تو ہمارے دانش ور حضرات مخلوط تعلیم کا ہی رونا رو رہے تھے کہ ایک دھماکہ جنسی تعلیم کے عنوان سے کر دیا گیا۔

مرد و زن کے اختلاط نے تعلیمی اداروں کو جہاں لا کر کھڑا کر دیا ہے اور تعلیم کو جس انحطاط سے دوچار کر دیا ہے کہ اب تو ان تعلیمی اداروں کے افادیت پر سوالیہ نشان لگنے شروع ہو گئے ہیں اور تھوڑی موڑی کسر رہ گئی ہے تو اس کو جنسی تعلیم کے عنوان سے پورا کر لیا جائے گا اور تعلیم یافتہ حضرات کی ایسی کھیپ نکلے گی جن کو دیکھ کر حیوان بھی شرمائیں گے۔

نکاح کے بارے میں بچے اور بچیوں کے حقوق کے متعلق اسلامی ہدایات:

۵۔ اولاد کے بالغ ہونے کے بعد ان کی شادی کرنا والدین کی ذمہ داریوں میں سے ایک اہم ذمہ داری ہے، اور شرعی حکم تو یہی ہے کہ اولاد کے بالغ ہوتے ہی اس کا نکاح کر دیا جائے، اور اگر وقت پر نکاح نہیں کیا گیا اور اولاد کوئی برائی کرتی ہے تو اس کا وبال والدین پر ہی آئے گا جیسا کہ احادیث مبارکہ میں آپ ﷺ کا پاک ارشاد وارد ہوا ہے:

* "عن أبي سعيد وابن عباس قالا قال رسول الله ﷺ: من ولد له ولد فليحسن اسمه وأدبه فإذا بلغ فليزوجه فإن بلغ ولم يزوجه فأصاب إثما فإنما إثمه على أبيه" (رواه البيهقي فى شعب الايمان، مشكوة: ۲۷۱)۔

* "وعن عمر بن الخطاب وأنس بن مالك عن رسول الله ﷺ قال فى التوراة مكتوب من بلغت ابنته اثنتى عشرة سنة ولم يزوجها فأصابت إثماً فإثم ذلك عليه" (رواه البيهقى فى شعب الايمان، مشكوة: ۲۷۱) (آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: توراۃ میں لکھا ہے: جس کی بچی بارہ سال کی ہو گئی اور اس نے اس بچی کی شادی نہیں کی اور اس بچی نے کسی قسم کی برائی کا ارتکاب کر لیا تو اس کا گناہ اس کے والد کے سر ہوگا)۔

دوسری بات: بچوں کا رشتہ طے کرتے وقت ان کی رضامندی ضروری ہوگی، ان کی مرضی کے بغیر ان پر اپنی مرضی تھوپنا جائز نہیں ہوگا اور اگر رشتہ تھوپ بھی دیا گیا تو بچوں کو اس کے قبول کرنے نہ کرنے کا اختیار ہوگا، جیسا کہ حدیث پاک میں وارد ہے:

"وعن خنساء بنت حذام أن أباها زوجها وهي ثيب فكرهت ذلك فأتت رسول الله ﷺ فرد نكاحها" رواه البخاري وفي رواية ابن ماجة "نكاح أبيها" (مشکوۃ: ۲۷۰) (حضرت خنساء بنت حذام سے روایت ہے کہ ان کے والد نے ان کی شادی کر دی اور ان کو ناپسند ہوا اور یہ ثیبہ تھیں، تو آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور پوری بات بتائی تو آپ ﷺ نے ان کا نکاح رد کر دیا، یہ تو بخاری کی روایت ہے اور ابن ماجہ کی روایت میں ہے کہ ان کے والد کا کیا ہوا نکاح رد کر دیا)۔

اسی طرح بچوں کو اس بات کا پابند کیا گیا ہے کہ وہ اولیاء کے ذریعہ ہی سے اپنے نکاح کی کارروائی کرائیں تاکہ ان کی طرف بے حیائی منسوب نہ ہو، اس کے متعلق حدیث پاک میں بڑی ڈانٹ آئی ہے:

''عن عائشة أن رسول الله ﷺ قال أيما امرأة نكحت نفسها بغير إذن وليها فنكاحها باطل فنكاحها باطل فنكاحها باطل'' رواه الترمذي (مشکوۃ: ۲۷۱) (آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا جو عورت اپنا نکاح ولی کی اجازت کے بغیر کر لے تو اس کا نکاح باطل ہے، اس کا نکاح باطل ہے، اس کا نکاح باطل ہے)۔

اب اپنی یہ بات کہ بعض برادریوں میں بہت کم عمری میں نکاح کر دیا جاتا ہے تو وہ صرف نکاح ہوتا ہے، رخصتی نہیں ہوتی ہے، رخصتی کی رسم تو بلوغ کے بعد ہی ادا کی جاتی ہے اور اس کا رواج بھی اب کم ہوتا جا رہا ہے، اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کچھ دنوں کے بعد یہ کم عمری کی شادی کی رسم خود بخود ختم ہو جائے گی، اسلامی تعلیمات میں تو کم عمری کی شادی درست ہے اور فقہاء احناف کے یہاں اس کی باقاعدہ ضرورت بیان فرمائی گئی ہے، صاحب ہدایہ رقم طراز ہیں:

''لأن النكاح يتضمن المصالح ولا تتوفر إلا بين المتكافيين عادةً ولا يتفق الكفو كل زمان فأثبتنا الولاية في حالة الصغر إحرازاً للكفو'' (ہدایہ ۳۱۶/۲) (اس لئے کہ نکاح بہت سے مصالح کو متضمن ہوتا ہے اور عام طور سے تمام مصالح مکمل طور سے اسی وقت حاصل ہو سکتے ہیں جب دونوں میں برابری اور ہم آہنگی ہو اور اس طرح کے رشتہ ہر دم دستیاب نہیں رہتے، اسی وجہ سے ہم بچپن کے زمانے میں ولایت ثابت کی ہے)، کم عمری کی شادی نہ تو پہلے بری تھی اور نہ اب بری رسم ہے، بلکہ اس کو لوگوں کے سامنے برا بنا کر پیش کیا گیا ہے، مقاصد کیا ہیں اس کو یہاں بیان کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔

لیکن حالات اور ماحول کو دیکھتے ہوئے احقر کی رائے یہ ہے کہ کم عمری میں شادی کرنے کے جو مضر اثرات بتائے جا رہے ہیں وہ بہت کم ہیں، اس نقصان کے مقابلے جو کم عمری میں شادی نہ کرنے سے واقع ہو رہے ہیں، اس لئے کہ جاہلوں اور تعلیمی اداروں سے دور بچوں کی تو بات کیا کیا جائے، اسکولوں، کالجوں، یونیورسٹیوں کا جو ماحول ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں، طلبہ کی تمام کوششوں اور سرگرمیوں کا محور طالبات ہیں اور یہی حال تقریباً طالبات کا بھی ہے، تعلیم و تعلّم سے کچھ لینا دینا نہیں سوائے چند کے، اور شریعت اسلامی اس قسم کی سرگرمیوں کو جو نامحرم کے ساتھ ہو حرام کہتی ہے، اللہ تعالیٰ کا پاک ارشاد ہے: "ولا متخذي أخدان ومن يكفر بالإيمان فقد حبط عمله وهو في الآخرة من الخاسرين" (المائدہ:۵)۔

اسی طرح ایک چھوٹی سی قباحت گوارا کر کے ایک بہت بڑی برائی سے بچوں کو بچایا جا سکتا ہے۔

اب رہی بات بالغ ہونے کے بعد بھی لڑکوں اور لڑکیوں کی شادی میں غیر معمولی تاخیر کی تو یہ بات بالکل مناسب نہیں ہے، ہاں کبھی تعلیم یا کسی اور بڑے مقصد کے لئے والدین اپنے بچوں کے کیریر کے لئے تھوڑی موڑی تاخیر کر دیتے ہیں تو اس کی گنجائش موجود ہے، اور فقہاء کرام کے ان تصریحات سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے جس میں اس بات کی وضاحت موجود ہے کہ افراد کے اعتبار سے نکاح کے احکام ہوں گے، کسی کے لئے فرض، کسی کے لئے واجب اور کسی کے لئے سنت اور مستحب:

> ''اور نہایہ میں ہے کہ اگر زنا میں ملوث ہونے کا اتنا خطرہ ہے کہ نکاح کے بغیر بچنا ممکن نہیں تو نکاح کرنا فرض ہوگا اور ظلم کے خدشہ کے وقت مکروہ ہوگا، اور رہی بات حالت اعتدال کی تو داؤد ظاہری اور ان کے رفقاء اس بات پر ہیں کہ انفاق اور وطی پر قادر شخص پر فرض عین ہے، "فانكحوا ما طاب لكم من النساء" سے استدلال کرتے ہوئے، ہمارے مشائخ کے درمیان اختلاف ہے، کہا گیا ہے کہ فرض کفایہ ہے اور کہا گیا ہے کہ واجب کفایہ ہے، ایک قول مستحب کا ہے، ایک قول سنت مؤکدہ کا ہے'' (مرقاۃ ۲۳۷/۶)۔

فقہاء نے نکاح کی بابت جہاں علماء کرام کے اختلافات پر بحث کی ہے وہاں نکاح کی ان مختلف شرعی حیثیتوں کو بھی تفصیل کے ساتھ واضح فرمایا ہے اور باعتبار حکم فقہی اس کی آٹھ صورتیں ذکر کی ہیں:

۱۔ حقوق نکاح کی ادائیگی پر قدرت کے ساتھ، اگر شہوت کا غلبہ اس درجہ کا ہے کہ خواہش کو پورا کرنے کے لئے گناہ میں پڑ جانا یقینی ہے تو نکاح فرض ہے۔

۲۔ حقوق نکاح کی ادائیگی پر قدرت کے ساتھ، اگر اس درجہ شہوت کا غلبہ ہے کہ گناہ میں پڑنا یقینی تو نہیں لیکن ظن غالب اس کا ضرور تو نکاح کرنا واجب ہے۔

۳۔ حقوق نکاح کی ادائیگی پر قدرت کے ساتھ اگر غلبہ شہوت نہیں ہے بلکہ اعتدال ہے تو نکاح سنت موکدہ ہے۔

۴۔ حقوق نکاح کی ادائیگی اور ادائیگی سنت اور نکاح سے وابستہ مقاصد کے حصول کی نیت کے ساتھ مستحب ہے، جبکہ شہوت اعتدال کے درجہ میں بھی نہ ہو بلکہ خواہش بہت کم ہو۔

۵۔ حقوق نکاح کی ادائیگی کے ساتھ بغیر کسی نیت کے مباح ہے خواہ شہوت درجہ اعتدال میں ہو یا اس سے کمتر۔

۶۔ حقوق نکاح کی ادائیگی پر عدم قدرت کا یقین ہو تو حرام ہے۔

۷۔ حقوق نکاح کی عدم ادائیگی کا ظن غالب ہو تو مکروہ تحریمی ہے۔

۸۔ حقوق نکاح کی ادائیگی پر قدرت کے ساتھ مال و دولت، حسن، حسب و نسب وغیرہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے نکاح کرنا مکروہ تنزیہی ہے۔

یہ تھیں فقہاء کرام کی تصریحات جن کی روشنی میں احقر اپنی حقیر رائے پیش کرتا ہے، ہر آدمی اپنی اولاد کے رجحانات سے واقف ہوتا ہے، اگر اس کو محسوس ہو کہ شادی میں تاخیر کرنے کی صورت میں میرے بچے برائی میں ملوث ہو جائیں گے تو اس کے لئے ضروری ہوگا کہ ان بچوں کی جلدی شادی کردے اور اگر وہ محسوس کرے کہ اس کے بچے اپنی تعلیم یا اپنے مقصد کے حصول میں سنجیدہ ہیں اور برائی میں ملوث ہونے کا امکان نہیں ہے تو دو چار سال تاخیر کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

بچہ مزدوری:

د۔ حدیث میں ہے: "عن عمرو بن شعیب عن أبیه عن جده أن رجلاً أتی النبی ﷺ فقال: إن لی مالا وإن والدی یحتاج إلی مالی قال أنت ومالك لوالدك إن أولادكم من أطیب كسبكم كلوا من كسب أولادكم" (رواہ ابوداؤد و ابن ماجہ (مشکوۃ: ۲۹۱) (آپ ﷺ کے پاس ایک صاحب آئے اور عرض کیا میرے پاس مال ہے اور میرے والد کو میرے مال کی ضرورت ہے تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: تو اور تیرا مال تیرے باپ کا ہے، یقیناً اولادیں تمہاری بہترین کمائی ہیں، لہذا اپنی اولاد کی کمائی میں سے کھاؤ)۔

اس حدیث پاک سے اتنی بات واضح ہوتی ہے کہ اولاد کی کمائی باپ کے لئے حلال طیب ہے اور اس میں اس کو تصرف کرنے کا اختیار ہے اور اولاد کا اطلاق بڑے چھوٹے سب پر ہوتا ہے۔

اور فقہاء کرام کی عبارتوں سے اس کی وضاحت بھی ہوتی ہے کہ ماں باپ نانی اور دادی کو اپنے چھوٹے بچوں سے خدمت لینا بھی جائز ہے اور مزدوری سے لگانا بھی درست ہے، جیسے کہ صاحب ہدایہ لکھتے ہیں:

"ماں دادی اور نانی کے سوا جو خواتین بچی کی پرورش کریں گی ان کو پرورش کا حق اس وقت تک ہوگا جب تک بچی حد اشتہا کو نہ پہنچ جائے، اور جامع صغیر میں ہے: یہاں تک کہ وہ خود کفیل ہو جائے، اس لئے کہ ماں نانی اور دادی کے علاوہ خواتین اس بچی سے خدمت نہیں کرا سکتی ہیں اور نہ ہی مزدوری پر لگا سکتی ہیں، لہذا بچی کو جو عورتوں کے پاس رکھنے کا مقصود حاصل نہیں ہوگا برخلاف ماں نانی اور دادی کہ ان کو خدمت لینے اور مزدوری پر لگانے کا اختیار ہے شرعاً" (ہدایہ ۲/۴۳۵ باب الحضانۃ)۔

اسی طرح علامہ کاسانی اپنی کتاب بدائع الصنائع میں لکھتے ہیں: "لکن فی تأدیبها استخدامها وولایة الاستخدام غیر ثابتة لغیر الأمهات من الأخوات والخالات والعمات فتسلمها إلی الأب احترازاً عن الوقوع فی المعصیة" (بدائع الصنائع ۴/۵۹/۳) (لیکن بچیوں کو آداب سکھانے میں خدمت لینا لازم آتا ہے لیکن خدمت لینے کا حق ماں کے علاوہ بہنوں، خالاؤں اور پھوپھیوں کو شرعاً حاصل نہیں ہے، لہذا بچی کو باپ کے حوالے کر دیا جائے گا معصیت سے بچنے کے لئے)۔

اسی طرح علامہ ابن الہمام اپنی کتاب فتح القدیر میں لکھتے ہیں:

"ماں، نانی اور دادی کے سوا کوئی خاتون اس بچی سے خدمت لینے پر شرعاً قادر نہیں ہے، اور عورتوں کے کام جیسے روٹی پکانا، کھانا پکانا، سوت کاتنا، کپڑے دھونا وغیرہ ہیں اور یہ سب کام عملاً کرا کے ہی سکھایا جاتا ہے اور عملاً کرانے میں خدمت لینا لازم آتا ہے، اور خدمت لینے کی شرعی حقدار ماں، نانی اور دادی کے سوا کوئی نہیں ہے، اور ان خواتین کو یہ حق ہے کہ اس بچی کو اجرت پر بھی لگا سکتی ہیں" (فتح القدیر ۴/۳۴۴)۔

حدیث پاک اور فقہاء کرام کی عبارتوں سے رہنمائی لیتے ہوئے احقر اس نتیجہ پر پہنچا ہے:

ا۔ بچہ مزدوری کے متعلق اسلام کا موقف جواز کا ہے۔

۲۔ والدین، نانی اور دادی بچیوں سے گھر کا کام اس حد تک لیں گی کہ بچیاں گھریلو کاموں یعنی کھانا پکانا، سلائی، کڑھائی، صاف صفائی میں ماہر ہوجائیں، اور مذکورہ حضرات اپنی معاشی ضروریات پورا کرنے کے لئے ان سے مزدوری کراسکتے ہیں، اسی طرح ان کو کوئی پیشہ ورانہ کام سکھانے کے لئے کام سے لگا سکتے ہیں

۳۔ انتہائی غریب والدین اپنی معاشی بدحالی کی بنا پر بچوں کو مزدوری پر لگا سکتے ہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ شریعت نے والدین کی شفقت پر اعتماد کیا ہے، اور یہ تسلیم کیا ہے کہ والدین اپنی اولاد کے مستقبل کے متعلق زیادہ متفکر اور حد درجہ سنجیدہ ہوتے ہیں اور حکومت کے مقابلے اپنے بچوں کے زیادہ خیر خواہ ہوتے ہیں اور حقیقت بھی یہی ہے، اور شریعت اسلامی نے والدین کو اپنی اولاد کے متعلق پورا اختیار دیا ہے، اور اولاد کو والدین کے پاس ایک امانت کے طور پر دیا ہے اور آخرت کے مواخذہ سے ڈرایا ہے اور بنیادی باتوں کی رہنمائی بھی کردی ہے کہ کتنی چیزیں سکھانا نہایت ضروری ہے، جیسے عقائد اور فرائض کی تعلیم ضروری قرار دی ہے اور باقی معاشیات میں والدین کے لئے آزادی ہے کہ وہ اپنے بچوں سے جو پیشہ چاہیں کرالیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ جس تعلیم کے حرج کے نام پر یہ بچہ مزدوری پر پابندی لگا رہے ہیں وہ تعلیمی نصاب کا ایک ایسا اسکینر (Scanner) ہے کہ جب بچہ اس سے گذر جائے گا تو اس کے اندر جو شرم وحیا اور مذہب کے جراثیم ہیں وہ مرجائیں گے اور بچہ بے حیاء اور لادین بن کر نکلے گا، لہٰذا ان کی کوشش ہے کہ کوئی بچہ اس اسکینر سے بچنے نہ پائے، اسی منصوبے کی تکمیل کے لئے آئے دن مدارس پر کچھ نہ کچھ اعتراض کیا جارہا ہے، اور اب لازمی حق تعلیم قانون پاس ہوا ہے، جس کا واحد نشانہ مدارس اور مکاتب کے طلبہ ہیں۔

نابالغ بچے اور جرائم:

د۔ شرعاً بالغ ہونے سے پہلے اگر بچوں سے جرائم سرزد ہوں تو ان پر سزا جاری نہیں کی جائے گی، بلکہ تعزیراً تھوڑی سزا دی جائے گی، جیسا کہ حدیث پاک میں مذکور ہے:

''وعن عمران بن حصين أن غلام أناس فقراء قطع أذن غلام لأناس أغنياء فأتى أهله النبي ﷺ فقالوا: إنا أناس فقراء، فلم يجعل عليهم شيئاً'' (رواہ ابوداؤد: مشکوۃ ۲/)۔

''لأن عاقلته كانوا فقراء وجناية الصبي على العاقلة لأنها خطأ إذ لم تصدر عن اختيار صحيح ولهذا لا يقص منه في القتل والفقراء لا ينحملون الدية والظاهر أن الجاني كان صبياً حراً'' (مرقاۃ ۶۳/۷)۔

(حضرت عمران بن حصینؓ سے روایت ہے کہ غریب لوگوں کے ایک بچے نے امیر لوگوں کے ایک بچے کا کان کاٹ لیا تو شکایت لے کر اس کے گھر والے آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان لوگوں نے کہا: ہم غریب لوگ ہیں تو آپ ﷺ نے ان پر کچھ بھی لازم نہیں کیا۔ صاحب مرقاۃ کہتے ہیں کہ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ اس بچے کے عاقلہ فقیر تھے اور بچے کی جنایت عاقلہ پر ہوتی ہے، اس لئے کہ وہ خطا ہوتی ہے، کیونکہ وہ صحیح اختیار کے ساتھ صادر نہیں ہوئی، اسی وجہ سے تو قتل میں اس سے قصاص نہیں لیا جاسکتا اور فقراء دین کے متحمل نہیں ہوتے اور ظاہر حال سے یہ بات معلوم ہورہی ہے کہ بچہ نابالغ اور آزاد تھا)۔

حدود پانچ ہیں: چوری کی سزا، زنا کی سزا، تہمت لگانے کی سزا، شراب پینے کی سزا اور نشہ آنے کی سزا، قتل کی سزا، تمام سزاؤں کے وجوب کے لئے عقل اور بلوغ شرط ہے جیسا کہ فقہاء کرام کی تصریحات موجود ہیں۔

علامہ کاسانی فرماتے ہیں: ''قذف کے احصان کے پانچ شرائط ہیں جس میں عقل اور بلوغ بھی ہیں، اس لئے کہ بچے اور مجنون سے زنا متصور ہی نہیں ہے تو ان کا کسی پر زنا کی تہمت لگانا جھوٹ بولنے کی طرح ہے، لہٰذا تعزیر واجب ہوگی نہ کہ حد'' (بدائع)۔

اسی طرح سے علامہ ابن ہمام فرماتے ہیں: ''بچے یا پاگل نے جب کسی عورت سے زنا کیا اور عورت نے ان کی مطاوعت کی تو نہ ان پر حد جاری ہوگی اور نہ اس کے اوپر'' (فتح القدیر ۳۵۸/۵)۔

اسی طرح سے علامہ ابن ہمام بچے کے چوری کے متعلق فرماتے ہیں: ''اور عقل اور بلوغ کا ہونا نہایت ضروری ہے، اس لئے کہ جنایت محقق ہی نہیں ہوتی ان کے بغیر اور ہاتھ کاٹنا جنایت کی سزا ہے'' (فتح القدیر ۵/ ۳۴۰)۔

علامہ کاسانی فرماتے ہیں: ''چھوٹے بچے کو تعزیراً نہیں ماریں گے بلکہ تادیباً ماریں گے'' (البدائع ۵/ ۵۳۴)۔

اسی طرح سے بچے کے قتل کے متعلق علامہ کاسانی فرماتے ہیں: ''اور اگر جن لوگوں نے قتل کیا ہے اس میں بچہ یا پاگل ہے تو عاقلہ پر دیت واجب ہوگی، اگر چہ ہتھیار سے قتل کیا ہو، اس لئے کہ بچہ اور مجنون ان لوگوں میں سے نہیں ہیں جن پر قصاص واجب ہو، لہذا ان کا قتل عمد بھی قتل خطا ہے'' (البدائع ۶/ ۵۶۶)۔

ان نصوص اور فقہاء کی تصریحات کی روشنی میں احقر کی رائے یہ ہے کہ بچوں سے صادر ہونے والے جرائم پر ان کو سزا نہیں دی جائے گی بلکہ نابالغ ہونے کی بنیاد پر ان کو معاف کیا جائے گا۔

رہی بات دور حاضر میں پھیلنے والے جرائم کے رجحان کی تو اس کے لئے اصلاح معاشرہ کی فکر کی جائے اور بڑوں کو ان جرائم سے روکا جائے اور اسلامی سزائیں شرعی طور پر نافذ کی جائیں، اس لئے کہ بڑوں کو جو کرتا دیکھتے ہیں بچے بھی وہی کرتے ہیں، جرائم پر مبنی فلمیں روکی جائیں، پورا معاشرہ بگڑا ہوا ہے، لہذا بچے بھی بگڑ گئے ہیں، معاشرے کو ٹھیک کیا جائے، بچے بھی ٹھیک ہو جائیں گے، معاشرے کو ٹھیک کئے بغیر بچوں کو درست کرنا ممکن نہیں ہے، اور بچوں کی اخلاق کی درستگی کی ذمہ داری اسلام نے والدین پر ڈالی ہے، اگر والدین اپنے بچوں کو اچھے اخلاق سے آراستہ دیکھنا چاہتے ہیں تو ان کو پہلے خود با اخلاق بننا پڑے گا۔

ہاں ایک متبادل کے طور پر اچھے اقامت گاہوں کا قیام کیا جاسکتا ہے، تعلیمی اداروں میں پڑھنے والے بچوں کے لئے (Islamic Hostels) قائم کر کے اچھے اور با اخلاق حضرات کی خدمات حاصل کی جاسکتی ہیں جو ان بچوں کی تربیت اور نگرانی کریں۔

اس لئے کہ اچھی صحبت کا اثر ہوا کرتا ہے، تعلیمی اداروں کے لئے اساتذہ مقرر کرتے وقت صلاحیت کے ساتھ صالحیت بھی دیکھی جائے، کیونکہ اساتذہ جس کردار کے ہوں گے طلبہ بھی اسی طرح کے ہوں گے۔

و۔ بچوں کو جیلوں میں بچوں سے پر مشقت کام لیے جاتے ہیں اور سخت مار پیٹ کی جاتی ہے، ایسی جیلوں میں جو نابالغ ہیں ان کے احکام یہ ہیں کہ ان کو پر مشقت کام اور مار پیٹ سے دور رکھا جائے اور ان کو لکھنے پڑھنے کا موقع فراہم کیا جائے، جو لکھنے پڑھنے میں دلچسپی نہ لیں ان کو کوئی ہنر سکھایا جائے اور اچھا ماحول فراہم کیا جائے، اس لئے کہ فقہاء کرام بچوں کو تعزیراً مارنے سے بھی منع فرماتے ہیں، علامہ کاسانی فرماتے ہیں:

''وأما شرط وجوبه: فالعقل فقط فيعزر كل عاقل ارتكب جناية ليس لها حد مقرر، سواء كان حراً أو عبداً، ذكرا أو أنثى، مسلماً أو كافراً، بالغاً أو صبياً بعد أن يكون عاقلاً لأن هؤلاء من أهل العقوبة إلا الصبي العاقل فإنه يعزز تأديباً لا عقوبة لأنه من أهل التأديب'' (بدائع الصنائع ۵/ ۵۳۴، باب التعزیر)۔

(رہی بات سزا کے وجوب کی تو عقل کافی ہے، لہذا ہر عاقل جس نے کسی ایسی جنایت کا ارتکاب کیا جس کے لئے کوئی حد مقرر نہیں ہے، چاہے وہ آزاد ہو یا غلام ہو، مرد ہو یا عورت ہو، مسلمان ہو یا کافر ہو، بالغ ہو یا نابالغ ہو، اس کی تعزیر کی جائے گی، اس لئے کہ یہ سب سزا کے مستحق ہیں، سوائے عقلمند بچے کہ اس لئے کہ اس کو سزا دیں گے ادب سکھانے کے لئے نہ کہ سزا دینے کے لئے، اس لئے کہ وہ اہل تادیب میں سے ہے)، اور تجربہ بھی ہے کہ عموماً مار پیٹ سے اصلاح نہیں ہوتی ہے، بلکہ بچوں میں ضد پیدا ہو جاتی ہے پھر ان کا ذہن منفی بن جاتا ہے اور پھر ہر چیز کے اندر ان کو منفی پہلو ہی نظر آتا ہے۔

عام طور سے ایسے بچے بہت ذہین ہوتے ہیں، اگر اخلاق و محبت سے ان کو کوئی ہنر سکھایا جائے یا تعلیم دی جائے تو بہت جلد سیکھ لیتے ہیں، یہ بچے تو کسی حادثے کی وجہ سے یا غلط صحبت کی وجہ سے غلط راہوں پر نکل پڑتے ہیں، اگر اچھی صحبت ملتی ہے اور شفقت و محبت ملتی ہے تو یہ بچے اپنی پرانی روش چھوڑ کر سیدھی راہ پر لگ سکتے ہیں۔

لیکن یہ کام صرف سرکار کے بس کا نہیں ہے، اصلاحی کام کرنے والی تنظیمیں آگے بڑھ کر تعاون کرتی ہیں تو اس کے بڑے خوشگوار نتائج برآمد ہوں گے۔

ز۔ وہ بچے جو کسی حادثہ، والدین کے فوت ہو جانے یا ان سے بچھڑ جانے یا ولادت کے بعد ماں باپ کی طرف سے پھینک دیئے جانے کی وجہ سے بے سہارا ہو جاتے ہیں اسلام ایسے بچوں کو اٹھانا، اس کی پرورش کرنا اور کوئی دعویدار ہو تو اس کے حوالے کرنے کی کوشش کرتا ہے، مثلاً صاحب ہدایہ فرماتے ہیں:

"والالتقاط مندوب إليه لما فيه من إحيائه وإن غلب على ظنه ضياعه فواجب" (ہدایہ ۲/۶۱۱)۔

(گرے پڑے بچے کو اٹھانا مندوب ہے، اس لئے کہ اس عمل میں اس کو زندگی بخشنا ہے اور اگر ظن غالب ہو کہ وہ بچہ ضائع ہو جائے گا تو اس کو اٹھانا واجب ہوگا)۔

اگر کوئی شخص دعوی کرتا ہے کہ یہ بچہ میرا ہے تو اسلام اس کے دعوے میں کوئی مزاحمت نہیں کرے گا اور حتی الوسع کسی خاندان سے منسلک کرنے کی کوشش کرے گا، صاحب ہدایہ فرماتے ہیں:

"اگر کسی دعوی کرنے والے نے دعوی کیا کہ یہ میرا لڑکا ہے تو اس کی بات مان لی جائے گی، استحسان کی وجہ یہ ہے کہ یہ اقرار بچے کے حق میں ہے جس سے اس کو فائدہ ہوگا اور اس کی وجہ سے بھی اس سے وہ نسب سے مشرف ہو جائے گا اور نسب ثابت نہ ہونے پر وہ بچہ عار محسوس کرے گا" (ہدایہ ۲/۶۱۲)۔

اور بچہ کا نفقہ بیت المال پر ہوگا، جیسے کہ صاحب ہدایہ فرماتے ہیں: "نفقته في بيت المال هو المروي عن عمر وعلي ولأنه مسلم عاجز عن التكسب ولا مال له ولا قرابة فأشبه المقعد الذي لا مال له" (ہدایہ ۲/۶۱۲) (اور اس بچہ کا نفقہ بیت المال کے ذمہ ہوگا اور یہی مروی ہے حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ سے اور اس لئے بھی کہ وہ مسلم ہے اور کمانے سے عاجز ہے اور اس کے پاس مال بھی نہیں اور نہ کوئی قرابت ہے، لہذا وہ اس اپاہج (معذور) کی طرح ہو گیا جس کے پاس مال نہیں ہے)، پھر بچے کو اٹھانا اور اس پر خرچ کرنا ثواب کا کام بتایا ہے، صاحب ہدایہ فرماتے ہیں:

"اور وہ بچہ اٹھانے والا اس پر خرچ کرنے میں متبرع ہوگا ولایت نہ ہونے کی وجہ سے، الا یہ کہ قاضی اس کو حکم دے تو پھر وہ اس پر قرض ہوگا" (ہدایہ ۲/۶۱۲)۔

حدیث پاک میں ہے: "عن سهل بن سعد ﷺ قال قال رسول الله ﷺ أنا وكافل اليتيم هكذا وأشار بالسبابة والوسطى، وفرج بينهما" (حضرت سہل بن سعدؓ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: میں اور یتیم کی کفالت کرنے والا اس طرح ہوں گے اور آپ شہادت اور درمیانی انگلی سے اشارہ فرمایا اور تھوڑا سا کھلا رکھا دونوں کے درمیان)۔

اس حدیث پاک میں تو یتیم کی کفالت پر صرف جنت کی ہی بشارت نہیں ہے بلکہ آپ کی رفاقت کی بھی بشارت ہے، شریعت اسلامی پہلے تو نسب ثابت کرنے کے لئے کوشش کرتی ہے، پھر خاندان کے حوالہ کرنے کی کوشش کرتی ہے اور آخر میں اس کا نفقہ بیت المال سے جاری کر کے کسی کو اس کا ولی بناتی ہے اور پھر پرورش کرنے والے کو جنت میں آپ کی رفاقت کی بشارت دیتی ہے۔

ح۔ گارجین حد درجہ بڑھے ہوئے افلاس اور پرورش کی استطاعت نہ رکھنے کی وجہ سے کسی کو اپنا بچہ حوالہ کر سکتے ہیں، بسا اوقات تو افلاس بھی نہیں ہوتا ہے اور پرورش کی استطاعت بھی ہوتی ہے لیکن پھر بھی اپنی اولاد رشتہ داروں میں ان کے حوالے کر دیتے ہیں جن کو اولاد نہیں ہوتی، وہ اس کو اپنی اولاد کی طرح پرورش کرتا ہے

خود حضور پاک ﷺ نے حضرت علیؓ کو چچا ابو طالب سے مانگ کر لیا تھا اور حضرت جعفر کو اپنے چچا حضرت عباسؓ کے حوالے کرایا تھا، اسی طرح حضرت زید بن حارثہ کو بھی آپ نے پالا تھا اور اپنی متبنی بنایا تھا، یہاں تک کہ لوگوں نے زید بن محمد کہنا شروع کر دیا تھا جس کی اصلاح قرآن پاک نے فرمائی۔

دوسری بات ہدیہ قبول کرنا بچہ دینے کے عوض تو اس میں بھی بظاہر کوئی قباحت نظر نہیں آرہی ہے، اس لئے کہ اس میں تینوں کا فائدہ ہے، بچے والے کا تھوڑا بوجھ کم ہو جاتا ہے، بنا بچہ والے کو ایک بچہ مل جاتا ہے اور بچہ کو تعلیم و تربیت اور ترقی کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔

بچوں کے ساتھ ہونے والے حادثات کے لئے الگ سے کوئی تحریک چلانے کے بجائے اصلاح معاشرہ کی کوشش کی جائے، اس لئے کہ یہ کوئی جزوی مسئلہ نہیں ہے، بلکہ معاشرہ کے ساتھ جڑا ہوا ہے، افراد کے اندر حد سے بڑھی ہوئی خود غرضی اور نفع خوری ہی یہ سب کاموں کی محرک بنتی ہے، انسان مال کے حصول میں اندھا بن جاتا ہے، اس کے دل میں رحم نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی اور وہ بچوں کے ساتھ اس طرح کے سنگ دلانہ برتاؤ کرتا ہے، وہ چند روپے کے خاطر معصوم بچوں کا اغوا کرتا ہے اور فروخت کر دیتا ہے، اس کے روک تھام کے لئے عمومی اصلاح کی کوشش کرنی ہوگی، بلا تفریق مذہب و ملت سب کو مل کر انسانیت کے فلاح کی کوشش کرنی ہوگی۔

شریعت اسلامی تو اس طرح سے بچوں کے خرید و فروخت ہی حرام اور ناجائز قرار دیتی ہے، اور کسی آزاد کو غلام بنا کر بیچنا بڑے گناہوں میں سے ایک گناہ ہے جیسا کہ احادیث میں آیا ہے۔

ط۔ وہ بچہ جو ذہنی یا جسمانی طور پر معذور پیدا ہوتے ہیں یا بعد میں معذور ہو جاتے ہیں تو بعض اوقات ایسے بچوں کو دماغی ہسپتال میں داخل کر دیا جاتا ہے جس کا مقصد علاج سے زیادہ ان کی نگہداشت ہوتی ہے، ایسے بچوں کے بارے میں اسلامی تعلیمات یہ ہیں کہ ان کا نفقہ تاحیات والدین پر رہے گا اور ظاہر الروایہ کے مطابق صرف باپ پر رہے گا، جیسے کہ صاحب ہدایہ فرماتے ہیں:

''وفي ظاهر الرواية كل النفقة على الأب بقوله تعالى وعلى المولود له رزقهن وكسوتهن وصار كالولد الصغير'' (ہدایہ ۲/۴۴۷)۔

(اور ظاہر الروایہ میں ہے کہ پورا نفقہ والد کے ذمہ ہوگا، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے: مولود لہ پر ان کا کھانا کپڑا ہے، لہٰذا چھوٹے بچے کی مانند ہو گیا)۔

اب رہی بات ہسپتال میں داخل کر دینا، ماں باپ کا اپنی ذمہ داری سے غفلت برتنا یا فرار اختیار کرنا متصور نہیں ہوگا، اس لئے کہ بچہ کی وجہ سے والدہ کو پریشان نہیں کیا جائے گا، جیسا کہ فقہاء کرام کی تصریحات سے وضاحت ہوتی ہے، اگر چہ وہ رضاعت کے متعلق ہے، صاحب ہدایہ فرماتے ہیں:

''اگر چھوٹا بچہ شیر خوار ہو تو ماں پر دودھ پلانا لازم نہیں ہے، اس وجہ سے بھی کہ ہو سکتا ہے کہ وہ دودھ پلانے سے معذور ہو، لہٰذا جبر کرنا درست نہیں، اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اللہ کے اس قول کی تفسیر بھی یہ ہے کہ ''والدہ کو بچے کی وجہ سے نقصان نہیں پہنچایا جائے گا'' والدہ کی ناگواری کے بعد اس کے اوپر رضاعت لازم کرنا یہ تو حکم بیان کیا گیا جبکہ کوئی دودھ پلانے والی موجود ہو، رہی بات اگر کوئی دودھ پلانے والی موجود نہیں ہے تو ماں کو دودھ پلانے پر مجبور کیا جائے گا تا کہ بچے کو ضائع ہونے سے بچایا جائے'' (ہدایہ ۲/۴۴۴)۔

اس عبارت سے بات بالکل واضح ہوتی ہے کہ اگر بچے کو دودھ پلانے والی کی کوئی متبادل ہے تو پھر ماں کو مجبور نہیں کیا جائے گا، اسی طرح اگر معذور بچے کی دیکھ ریکھ کے لئے کوئی متبادل ہے تو پھر ماں کو اس کی پرورش کے لئے مجبور نہیں کیا جائے گا۔

اور آج کل ہسپتالوں کی شکل میں اس کا بہترین متبادل موجود ہے اور اگر والد کو اس کی خدمت اور پرورش کے لئے مجبور کیا جاتا ہے تو وہ معاش کے کمانے کے لائق نہیں رہے گا، جس کی وجہ سے اس معذور بچے کے ساتھ ساتھ دوسرے بچوں اور گھر کے افراد کو کافی پریشانی کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے، لہٰذا اگر بچہ کی نگہداشت کے لئے ہسپتال میں بھرتی کر دیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں ہوگا، اور والدین کا اپنی ذمہ داریوں سے غفلت یا فرار اختیار کرنا متصور نہیں ہوگا۔

اب رہی بات کس حد تک علاج کرنا واجب ہے، صحت یابی کی امید تک علاج کرانا واجب ہوگا، اگر یہ بات معلوم ہو جائے کہ یہ مرض قدرتی اور فطری ہے، علاج سے درست نہیں ہو سکتا پھر علاج کرانا ضروری نہیں ہوگا، ورنہ آج کل کے ڈاکٹروں کی مانیں تو ان کا حال تو یہ ہے کہ مریض کے انتقال کے بعد بھی کئی کئی دن I.C.U میں صرف اس وجہ سے رکھتے ہیں تا کہ ذرا بل لمبا بن جائے، تو ایسے ماحول میں ایسے اخلاق باختہ ڈاکٹروں سے کیا رائے اور مشورہ لیا جائے، اور اس بات کی کیا امید ہے کہ وہ درست مشورہ دیں گے۔

☆☆☆

اسلامی قانون میں بچوں کے حقوق

قاضی محمد کامل قاسمی [1]

حضانت کا معنی بچہ کی پرورش کرنا ہے۔

حضانت کا مقصد شفقت ومہربانی کے ساتھ بچہ کی حفاظت کرنا، اس کی جسمانی نشوونما کا خاص خیال رکھنا، اسے اچھے اخلاق سکھانا برے اخلاق وعادات سے محفوظ رکھنا، اسے زیور تعلیم سے آراستہ کرنا، لڑکے کو اس کی ضروریات سے متعلق ہنر وکمالات سکھانا اور اس کے اندر مردانہ خوبیاں پیدا کرنے کی کوشش کرنا، لڑکی کو عورتوں کے اخلاق وآداب کی تعلیم دینا اور امور خانہ داری میں مہارت وکمال پیدا کرنا وغیرہ ہے۔

اسی لئے بچے حضانت کے لئے کچھ وقت عورتوں کے پاس اور کچھ وقت مردوں کے پاس رکھے جاتے ہیں، ان کی کچھ ذمہ داریاں عورتوں پر ڈالی گئی ہیں کچھ مردوں پر۔

حضانت کی بنیاد شفقت پر ہے اور عورتیں مردوں کے مقابلہ میں زیادہ شفیق ومہربان ہوتی ہیں اور بچوں کی پیدائش کے بعد ان کی پرورش کے لئے زیادہ موزوں ہوتی ہیں، اسی لئے حضانت کے سلسلہ میں ان کو مقدم رکھا گیا ہے۔

شرائط حضانت:

۱۔ حاضنہ بچہ کی ذی رحم محرم ہو، اس لئے کہ حضانت کی بنیاد شفقت پر ہے، اور ذی رحم محرم ہی شفقت کے لئے مختص ہے، پھر ذی رحم محرم میں بھی حاضنہ الاقرب فالاقرب کی بنیاد پر مقدم ہوگی، لہذا ذی رحم محرم عورتوں میں بچہ کی پرورش کی ماں سب سے زیادہ حقدار ہوگی، پھر نانی، پھر دادی، اسی طرح اوپر تک، حقیقی بہن، پھر ماں شریک بہن (اخیافی بہن)، پھر باپ شریک بہن (علاتی بہن)، پھر حقیقی بہن کی بیٹی (بھانجی)، پھر ماں شریک بہن کی بیٹی، پھر باپ شریک بہن کی بیٹی، پھر حقیقی خالہ، پھر ماں شریک خالہ، پھر باپ شریک خالہ، پھر حقیقی بھائی کی بیٹی (بھتیجی) پھر ماں شریک بھائی کی بیٹی، پھر باپ شریک بھائی کی بیٹی، پھر حقیقی پھوپھی، پھر ماں شریک پھوپھی، پھر باپ شریک پھوپھی وغیرہ۔

۲۔ وہ بچہ کے غیر محرم کے نکاح میں نہ ہو۔

۳۔ وہ کسی ایسے عمل میں مشغول نہ ہو کہ اس کی مشغولیت کی وجہ سے بچہ ضائع ہو جائے، جیسے زنا، گانا بجانا اور چوری وغیرہ، یا وہ ایسی نیک پارسا ہو کہ اس پر اللہ تعالی کی محبت اور اس کے خوف کا ایسا غلبہ ہو کہ وہ بچہ سے ایسی غافل ہو جائے کہ جس سے بچہ کا ضائع ہونا لازم آتا ہو، یا وہ عورت کسی امر مباح کی وجہ سے گھر سے باہر جاتی ہو جیسے دائی، میت کو غسل دینے والی ہو وغیرہ، یہی حکم گھر سے باہر جا کر ملازمت کرنے والی خواتین کا بھی ہونا چاہئے۔

۴۔ حاضنہ فاسقہ فاجرہ نہ ہو۔

۵۔ عصبہ ہونا یعنی جن صورتوں میں مردوں کو حق حضانت حاصل ہوتا ہے ان صورتوں میں انہی مردوں کو حق حضانت حاصل ہوگا جو بچہ کے عصبہ ہوں، اور عصبات الاقرب فالاقرب کی بنیاد پر مقدم ہوں گے، سب سے پہلے باپ کو حق حضانت حاصل ہوگا، پھر دادا، پھر پردادا وغیرہ اوپر تک، پھر حقیقی بھائی، پھر باپ شریک بھائی، پھر حقیقی بھائی کا بیٹا، پھر باپ شریک بھائی کا بیٹا، پھر حقیقی چچا، پھر باپ شریک چچا، پھر حقیقی چچا کا بیٹا، پھر باپ شریک چچا کا بیٹا، بچہ اگر لڑکا ہو تو چچا کے بیٹے کے سپرد کیا جائے گا اور اگر لڑکی ہو تو چچا کے بیٹے کے سپرد نہیں کی جائے گی، اس لئے کہ وہ اس بچی کا محرم نہیں ہے، کیونکہ چچا کے بیٹے کے لئے اس لڑکی سے نکاح کرنا جائز ہے۔

---

[1] دار القضاء آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ، جنوبی دہلی۔

۶۔ اگر محضونہ لڑکی ہے اور حاضن مرد ہے تو اس کا حاضن ایسا عصبہ ہو کہ اس پر اس لڑکی کے متعلق بھروسہ کیا جاسکے۔ لہذا اگر حاضن عصبہ کے فسق اور اس کی خیانت کی وجہ سے اس پر بھروسہ نہ کیا جاسکے تو اس عصبہ کو اس محضونہ پر حق حضانت حاصل نہ ہوگا۔ حتی کہ اگر بھائی اور چچا حاضن ہو جن پر اس محضونہ کی جان و مال اور عزت نفس کے متعلق بھروسہ نہیں کیا جاسکتا تو محضونہ ان کے سپرد نہیں کی جائے گی۔

ایسی صورت میں قاضی کسی مسلمان، دیندار اور قابل اعتماد عورت کو تلاش کرے گا، پھر اس لڑکی کو اس عورت کے سپرد کرے گا۔

اس تفصیل سے واضح ہوتا ہے کہ حق حضانت کے حاصل ہونے کا مدار بچہ کے جسمانی، نفسیاتی، اخلاقی، تعلیمی اور تربیتی منافع کے حصول پر رکھا گیا ہے۔ اور جہاں کہیں محضون کا ان میں سے کسی کا نقصان ہو وہاں سے حق حضانت ساقط ہو جاتا ہے۔

(ب۔۱): اسلام میں بچوں کے حق تعلیم و تربیت سے متعلق ہدایات:

مذہب اسلام نے بچہ کی پیدائش کے بعد ماں باپ یا دگر رشتہ داروں کو سب سے پہلی ہدایت یہ دی ہے کہ نومولود کے کانوں میں مسنون طریقہ پر اذان و اقامت کہیں، جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حسنؓ کے دائیں کان میں اذان اور بائیں کان میں اقامت کے الفاظ خود ارشاد فرمائے (مجمع الزوائد)۔

دوسری ہدایت یہ ہے کہ بچہ کے تالو میں کوئی چیز ملے جس کو تحسنیک کہتے ہیں۔

تیسری ہدایت یہ ہے کہ بچہ کا اچھا نام رکھا جائے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"حق الولد على الوالد أن يحسن اسمه ويحسن أدبه" (بیہقی بحوالہ معارف الحدیث ۲۹/۶) (باپ پر بچہ کا یہ حق بھی ہے کہ اس کا اچھا نام رکھے اور اس کو حسن ادب سے آراستہ کرے)۔

چوتھی ہدایت یہ ہے کہ پیدائش کے ساتویں دن بچہ کا عقیقہ کیا جائے اور اس کے سر کے بال منڈوایا جائے۔ چنانچہ حدیث میں ہے:

''عن أبي هريرةؓ يقول كنا في الجاهلية إذا ولد لأحدنا غلام ذبح شاة ولطخ رأسه بدمها فلما جاء الله بالإسلام كنا نذبح شاة ونحلق رأسه ونلطخه بزعفران'' (ابوداؤد، کتاب الضحایا ر ۳۹۳)۔

(حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ زمانہ جاہلیت میں ہم لوگوں کا دستور تھا کہ جب ہم میں سے کسی کے یہاں لڑکا پیدا ہوتا تو وہ بکرا یا بکری ذبح کرتا اور اس کے سر کو اس کے خون سے رنگ دیتا، پھر جب اللہ تعالی نے ہمیں مذہب اسلام عطا کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و ہدایت کے مطابق ہمارا طریقہ یہ ہو گیا کہ ساتویں دن ہم عقیقہ کی بکری یا بکرا ذبح کرتے اور بچہ کا سر صاف کر کے اس کے سر پر زعفران لگا دیتے)۔

پانچویں ہدایت یہ ہے کہ بچہ کا ختنہ کیا جائے، حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پانچ باتوں کو ''خصال فطرت'' میں شمار کیا ہے، ان میں سے ایک ختنہ بھی ہے، کیونکہ ختنہ سے جسم کی نظافت اور صفائی ستھرائی میں مدد ملتی ہے۔

بچوں کی ابتدائی تعلیم:

بچہ جب بولنا شروع کرے تو سب سے پہلے لا إلہ إلا اللہ یعنی اللہ تعالی کی وحدانیت کا کلمہ اس کی زبان سے ادا کرایا جائے، یہ ہدایت سید الکونین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث پاک میں دی جسے حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے روایت کیا ہے:

"قال رسول الله ﷺ: افتتحوا على صبيانكم أول كلمة بلا إله إلا الله ولقنوهم عند الموت لا إله إلا الله" (بیہقی بحوالہ معارف الحدیث ۳۲/۶) (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اپنے بچوں کو زبان کھولنے کے بعد سب سے پہلے کلمہ ''لا إلہ إلا اللہ'' کہلواؤ اور موت کے وقت لا إلہ إلا اللہ کی تلقین کرو)۔

دوسری حدیث میں ہے: "قال رسول الله ﷺ: مروا أولادكم بالصلاة وهم أبناء سبع سنين واضربوهم عليها وهم أبناء عشر وفرقوا بينهم في المضاجع" (مشکوۃ ر ۸۵) (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم اپنے بچوں کو نماز کا حکم دو جبکہ وہ سات سال کی عمر کو پہنچ جائیں اور جب

دس سال کی عمر کے ہوجائیں تو نماز نہ پڑھنے پر ان کو مارا کرو، اور دس سال کی عمر ہوجانے کے بعد ان کے بستر الگ اور جدا کر کے سلاؤ)۔

حدیث شریف میں صرف نماز کے لئے حکم دینے کا ذکر ہے لیکن اس سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ اسے نیکیوں میں لگا دینا چاہئے، نماز سب سے بڑی اور بنیادی نیکی ہے، اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نماز کا حکم کرنے سے قبل نماز کے مسائل اور احکام سے بھی اس کو واقف ہوجانا چاہئے، کیونکہ اگر پہلے سے بچہ نماز اور اس کے مسائل کو جانتا نہیں تو نماز کا حکم دینے کے بعد بھی نماز ادا نہیں کر سکے گا جس سے ثابت ہوا کہ نماز کے احکام کی تعلیم سات سال سے پہلے مکمل ہوجانی چاہئے تاکہ پھر نماز کا حکم کیا جائے۔

حدیث میں دوسری بات یہ فرمائی گئی کہ بچہ کی عمر جب دس سال ہوجائے تو اسے سختی کے ساتھ نماز کا صرف حکم ہی نہیں دیا جائے گا، بلکہ نماز میں سستی کرنے پر ہلکی قسم کی پٹائی بھی کی جائے گی۔

حدیث شریف میں تیسری بات یہ فرمائی گئی کہ دس سال عمر ہوجانے کے بعد بچوں کو الگ بستر میں سلایا جائے، والدین کے بستر میں نہ رکھا جائے۔

حدیث پاک کی اس تیسری بات سے واضح ہوگیا کہ دس سال یا اس سے زائد عمر کی اولاد کو بے حیائی کے مناظر سے دور رکھا جائے تاکہ وہ بگڑے نہیں۔

بچوں میں اچھے اخلاق سے رغبت کیسے آئے؟

بچوں میں اچھے اخلاق سے رغبت پیدا کرنے کے لئے کتاب الآداب کے ابواب سلام، استیذان، مصافحہ، معانقہ، عطاس، تثاؤب، البر والصلۃ، الشفقۃ والرحمۃ علی الخلق، الحب فی اللہ ومن اللہ، الرفق والحیاء وحسن الخلق، کی تعلیم دینی چاہئے (مشکوۃ ر ۳۹۷-۴۳۳، اور معارف الحدیث جلد ۲ اور جلد ۶ کی بھی)۔

شریعت میں اخلاق کی اہمیت:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تعلیم میں ایمان کے بعد جن چیزوں پر بہت زیادہ زور دیا ہے اور انسان کی سعادت کو ان پر موقوف بتلایا ہے ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ آدمی اخلاق حسنہ اختیار کرے اور برے اخلاق سے اپنی حفاظت کرے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے جن مقاصد کا قرآن کریم میں ذکر کیا گیا ہے، ان میں ایک یہ بھی بتایا گیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو انسانوں کا تزکیہ کرنا ہے اور اس تزکیہ میں اخلاق کی اصلاح اور درستی کی خاص اہمیت ہے۔ حدیث کی مختلف کتابوں میں خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ مضمون روایت کیا گیا ہے کہ میں اخلاق کی اصلاح کے لئے مبعوث کیا گیا ہوں یعنی اصلاح اخلاق کا کام میری بعثت کے اہم مقاصد اور میرے پروگرام کے خاص اجزاء میں سے ہے۔

(ب-۲): بچوں اور بچیوں کو اتنی دینی تعلیم دینا ضروری ہے کہ جس سے عقائد کا صحیح علم ہوجائے، نماز، روزہ وغیرہ فرائض کے احکام معلوم ہوجائیں اور جس مشغلہ کو وہ اختیار کرنا چاہیں اس کے مسائل سے واقف ہوجائیں۔

عصری تعلیم روزگار سے جڑی ہوئی ہے اور اس سے روزگار کے مواقع فراہم ہوتے ہیں اور حلال روزگار اختیار کرنا ایک دینی فریضہ ہے، حدیث پاک میں:

"عن عبد اللہ قال قال رسول اللہ ﷺ: طلب کسب الحلال فریضۃ بعد الفریضۃ" (مشکوۃ، باب الکسب وطلب الحلال فصل ثالث ر ۲۴۲)

(حضرت عبد اللہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حلال روزگار کی تلاش وجستجو فرض ہے (نماز، روزہ، وغیرہ) فرائض کے بعد)۔

لہٰذا عصری تعلیم کو حسب ضرورت واستطاعت حاصل کیا جائے، لیکن یہ ضروری ہے کہ اسکول وکالج ایسا ہو کہ اس میں بچوں کے عقائد واخلاق کی درستگی پر بھی خاص توجہ دی جاتی ہو، ان کے عقائد بگڑنے اور اخلاق خراب ہونے کا اندیشہ نہ ہو، اور حدیث میں جس عمر سے بچوں کے بستر کو الگ کرنے کی ہدایت کی گئی ہے اس عمر سے ان کی تعلیم گاہ بھی الگ الگ ہو مخلوط نظام نہ ہو۔

(ب-۳): اگر حکومت کسی سطح تک کی تعلیم کو بچوں اور بچیوں کے لئے لازم قرار دے تو مسلمانوں کے لئے شرعاً اس کی پابندی لازم نہیں ہے۔

(ب۔۴): جنسی تعلیم سے متعلق اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا) نے اپنے سترہویں فقہی سمینار (برہان پور، ایم پی) میں جو تجویز پاس کی تھی وہ بہت موزوں اور مناسب ہے۔

ج: اسلامک فقہ اکیڈمی نے کئی سمیناروں میں نکاح کے مسائل کو موضوع بحث بنایا اور تجاویز پاس کی ہیں، ان میں نکاح کے بارے میں بچے او ربچیوں کے حقوق سے متعلق تجاویز بھی ہیں، ان کا خلاصہ یہ ہے کہ:

اسلام نکاح کو استوار اور پائیدار دیکھنا چاہتا ہے اور ایسی ہدایات دیتا ہے جن پر عمل کرنے سے نکاح اپنے مقاصد کو پورا کرے اور میاں بیوی تاحیات خوش گوار زندگی گزار سکیں۔

لڑکا یا لڑکی جب بالغ ہوجائے تو شریعت نے انہیں اپنی ذات کے بارے میں تصرف اور نکاح کے سلسلہ میں رشتہ کے انتخاب کا حق دیا ہے۔ یہ حریت شخصیہ شریعت اسلامیہ کے امتیازات میں سے ہے، بلکہ آج مغرب ومشرق کی بہت سی قوموں نے عورتوں کو جو حقوق دیئے ہیں وہ انہی اسلامی تعلیمات سے متاثر ہونے کا نتیجہ ہے۔ عاقل وبالغ لڑکا یا لڑکی کو ولی کی مرضی کے بغیر خود اپنا نکاح کرنے کا حق حاصل ہے، البتہ لڑکا اور لڑکی کو چاہئے کہ اپنے اولیاء کے انتخاب کردہ رشتہ کو ترجیح دیں، کیوں کہ اولیاء کی شفقت ومحبت اور ان کے تجربہ کی وجہ سے عموماً یہی امید ہے کہ اولیاء نے ان کے لئے رشتہ کا انتخاب کرتے وقت ان کے مفاد کا پورا پورا لحاظ کیا ہوگا، اور بہتر یہ ہے کہ اولیاء لڑکا اور لڑکی کی رضامندی سے نکاح ہو۔

اولیاء کی جانب سے بالغ لڑکی یا لڑکے کو ان کی خواہش اور رضا کا خیال کئے بغیر کسی رشتہ پر مجبور کرنا قطعاً جائز نہیں، لہذا اولیاء کا اپنی رائے پر اصرار اور اس پر مجبور کرنے کے لئے طرح طرح کی دھمکیاں دینا، اسلام کے دیئے ہوئے حقوق سے محروم کرنے کی ناروا کوشش ہے، جو کسی طرح درست نہیں ہے۔

نکاح کے منعقد ہونے یا نہ ہونے کا تعلق نکاح کے وقت رضامندی کے اظہار سے ہے، لہذا اگر بالغ لڑکے یا لڑکی نے نکاح کے وقت رضامندی کا اظہار کردیا تو نکاح منعقد ہوجائے گا۔

اگر قاضی شرعی اور قضا کا کام کرنے والے اداروں وذمہ داروں کے سامنے یہ بات بتحقیق ثابت ہوجائے کہ اولیاء نے بالغہ لڑکی کے نکاح کے سلسلہ میں جبر وزبردستی سے کام لیا ہے، اور اس کو مجبور کرکے بوقت نکاح ہاں کرالیا ہے، اور لڑکی رشتہ ہوجانے کے بعد اس رشتہ کو باقی وبرقرار رکھنے کے لئے کسی طرح تیار نہیں ہے اور فسخ کا مطالبہ کرتی ہے اور شوہر اسے نہ بطور خود جدا کرتا ہے اور نہ خلع وطلاق پر آمادہ ہے تو قاضی شرعی کو دفع ظلم کی غرض سے فسخ نکاح کا حق حاصل ہوگا۔

عاقلہ بالغہ لڑکی اپنے نکاح میں کفاءت یا مہر کے مطلوبہ معیار کا لحاظ نہ کرے تو اولیاء کو قاضی کے ذریعہ تفریق کا حق حاصل ہوگا۔

جس لڑکی کا نکاح باپ یا دادا نے نابالغی میں کردیا ہو وہ نکاح لازم ہے، الا یہ کہ وہ لڑکی اس وجہ سے اس نکاح کو پسند نہ کرے کہ باپ دادا نے اس کا نکاح کسی لالچ میں آکر یا لاپرواہی سے کام لے کر یا بدتدبیری کے ساتھ کردیا ہے، یا ولی اعلانیہ فاسق ہے تو اس کو قاضی کے ذریعہ حق تفریق حاصل ہے۔

باپ اور دادا کے علاوہ دوسرے اولیاء کا کرایا ہوا نکاح درست ہے، البتہ اگر لڑکی اس نکاح پر مطمئن نہ ہو تو بوقت بلوغ اس نکاح کو فسخ کرانے کا حق حاصل ہوگا۔

کنواری لڑکی کے لئے اس حق (خیار بلوغ) کا استعمال بوقت بلوغ ضروری ہے، بشرطیکہ بلوغ سے پہلے اس کو نکاح کا علم ہو چکا ہو اور حکم شرعی کا بھی علم ہو، بصورت دیگر اس کو یہ اختیار نکاح کا علم ہونے تک یا مسئلہ کا علم ہونے تک باقی رہے گا۔

شوہر دیدہ یعنی ثیبہ لڑکی کو یہ حق (خیار بلوغ) اس وقت تک حاصل رہے گا جب تک کہ اس کی طرف سے رضامندی کا اظہار نہ ہو، خواہ یہ اظہار صراحتاً ہو یا قرائن کے ذریعہ، اسی طرح یہ حق واختیار اس وقت تک رہے گا جب تک کہ اس کو مسئلہ کا یا نکاح کا علم نہ ہو۔

جن عورتوں کو بڑی عمر کی وجہ سے حیض آنا بند ہوگیا اور جن کو کم عمری کی وجہ سے حیض آیا ہی نہیں، اللہ تعالی نے ان کی عدت طلاق تین مہینہ بیان کی ہے، قرآن کریم میں ہے:

"واللائی یئسن من المحیض من نسائکم إن ارتبتم فعدتہن ثلاثة أشہر واللآئی لم یحضن" (سورہ طلاق: ۴) (اور تمہاری عورتوں میں سے جو عورتیں حیض سے ناامید ہوگئیں اگر تم کو شبہ رہ گیا تو ان کی عدت تین مہینے ہے، اور ایسے ہی جن کو حیض نہیں آیا)۔

پہلے نکاح ہوتا ہے طلاق کی نوبت اس کے بعد آتی ہے، تو جس عورت کو طلاق کے وقت تک بھی حیض نہیں آیا تو اس سے پہلے (نکاح کے وقت) اسے حیض آیا ہی نہیں، اس میں پیدائش سے لے کر حیض آنا شروع ہونے سے پہلے تک کا پورا وقت داخل ہے اور قرآن کریم نے کسی وقت کی تحدید وتعیین نہیں کی، اس کا صاف مطلب ہے کہ پیدائش سے لے کر حیض آنا شروع ہونے سے پہلے تک کبھی بھی لڑکی کا نکاح کرنا جائز ہے، اور یہی حکم لڑکے کا ہونا چاہئے۔

امام بخاریؒ نے باب قائم کیا ہے "باب إنکاح الرجل ولدہ الصغار" اور دلیل میں مندرجہ بالا آیت پیش کر کے لکھا ہے کہ اللہ تعالی نے بلوغ سے مطلقہ کی عدت تین مہینے مقرر کی ہے۔

باب میں یہ حدیث پیش کی ہے کہ: حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے نکاح کیا تو وہ چھ سال کی لڑکی تھی، اور ان کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیجا گیا تو وہ نو سال کی لڑکی تھی اور وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس نو سال رہی (بخاری، باب انکاح الرجل ۲/ ۱۱۹۱)۔

علامہ نوویؒ شارح مسلم نے لکھا ہے کہ مسلمانوں کا اس پر اجماع ہے کہ باپ اپنی باکرہ صغیرہ بیٹی کا نکاح کردے، تو وہ جائز ہے، "أجمع المسلمون علی جواز تزویجہ بنتہ البکر الصغیرة لهذا الحديث" (مسلم باب جواز تزویج الاب البکر الصغیرة ۱/ ۴۵۶)۔

قاموس الفقہ میں لکھا ہے کہ "حسب مراتب ودرجات تمام ہی اعزہ میں شفقت ہوتی ہے، اور بعض دفعہ نابالغی میں ایسا موزوں رشتہ ہاتھ آجاتا ہے کہ اس کا کھودینا بچوں کے لئے نقصان سے خالی نہیں، اس لئے دوسرے اولیاء کے لئے بھی اسے نابالغ بچوں کے نکاح کرنے کی گنجائش ہونی چاہئے" (قاموس الفقہ، ولایت ۵/ ۳۳۰)۔

اس تفصیل سے واضح ہوگیا کہ اسلام میں بہت کم عمری میں نکاح کردینا جائز ہے، لیکن یہ بات بھی مدنظر رہنی چاہئے کہ ولایت اور کفاءت کے مسائل کا جو مقصد ہے وہ فوت نہ ہونے پائے۔

(د-۱): اسلام نے بچوں کے بچپن کو ان کی تعلیم وتربیت کے لئے خاص کیا ہے اور انہیں اس زمانہ میں فکر معاش وکسب معاش سے آزاد و بے فکر رکھا ہے، ان کی تعلیم وتربیت اور معاش کی تمام تر ذمہ داری ان کے ماں باپ وغیرہ پر ڈالی ہے، تاکہ ان کی جسمانی اور دماغی نشوونما صحیح طور پر ہوسکے اور ایسا صالح معاشرہ وجود میں آئے جسے اسلام چاہتا ہے، جو اس تعلیم وتربیت کے بغیر ممکن نہیں ہے جسے مذہب اسلام نے مقرر کیا، اس کی کچھ جھلک گذشتہ صفحات میں پیش کی گئی، ان کے معاش یعنی نفقہ کی ذمہ داری سے متعلق تفصیل درج ذیل ہے، اس سے صاف واضح ہے کہ مذہب اسلام بچوں سے مزدوری کرانا نہیں چاہتا ہے۔

بچوں کے نفقہ کی ذمہ داری:

قاموس الفقہ میں ہے: نفقہ واجب ہونے کا دوسرا سبب قرابت ورشتہ داری ہے، پھر قرابت کی بھی مختلف صورتیں ہیں، ان میں سب سے اہم قرابت ولاء ہے، قرابت ولاء سے اولاد اور والدین ہیں، کیونکہ اولاد اور والدین کی حیثیت ایک دوسرے کے لئے ان کے وجود کے ایک حصہ کی ہے۔

فی الجملہ اولاد کا نفقہ باپ پر واجب ہونے کے سلسلہ میں فقہاء امت کا اجماع واتفاق ہے، یہ خود قرآن سے بھی ثابت ہے، اسی لئے بچہ کے دودھ پینے کی اجرت باپ پر واجب قرار دی گئی (طلاق:۶)، بلکہ ان عورتوں کی کفالت بھی باپ کے ذمہ رکھی گئی جو اس کے بچہ کی پرورش کرنے میں مشغول ہوں اور ان کو دودھ پلاتی ہوں (البقرہ: ۲۳۳)، یہ حدیث سے بھی ثابت ہے، حضرت ابوسفیانؓ اخراجات کی ادائیگی میں کسی قدر تنگی سے کام لیا کرتے تھے، ان کی بیوی حضرت ہندہؓ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس تنگی کی شکایت کی، اور دریافت کیا کہ کیا میں شوہر کی اجازت کے بغیر ان کے مال میں سے خرچ کرسکتی ہوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اتنی مقدار لے سکتی ہو جو تمہارے اور تمہارے بچے کے لئے کفایت کرجائے، "خذی مایکفیک وولدک بالمعروف"۔

کن صورتوں میں اولاد کا نفقہ واجب ہوگا اور کب واجب نہیں ہوگا؟

علامہ ابن ہمامؒ نے اس کو بہت بہتر تجزیہ کے ساتھ بیان فرمایا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ بحیثیت مجموعی چار حالتیں ہوسکتی ہیں:

۱۔ باپ مالدار ہو، بچے نابالغ ہوں، تو لڑکوں کے کمانے کے لائق ہونے تک اور لڑکیوں کی شادی تک باپ پر نفقہ کی ذمہ داری ہوگی، اور باپ کو تنہا کفالت کی ذمہ داری اٹھانی پڑے گی، اور اگر بچے خود بھی صاحب استطاعت ہوں اور مال ان کے پاس موجود ہو، تو باپ ان ہی کا مال ان پر خرچ کرسکتا ہے، اور اگر مال ان کی دسترس میں نہ ہو اور قاضی کی اجازت سے باپ (اپنا مال) خرچ کرے یا اس نیت سے خرچ کرے کہ یہ پیسے بچے کی جائیداد سے وصول کرنے ہیں اور اس نیت پر گواہ بھی بنالے تو بعد کو جب بچہ کا مال حاصل ہوجائے وہ اس میں سے اپنا پیسہ وصول کرسکتا ہے، اور اگر قاضی کا فیصلہ بھی نہ ہو اور بعد میں وصول کرنے کی نیت پر گواہ بھی نہ بنایا ہو تو قانوناً وہ اپنے پیسے واپس نہیں لے سکتا، اور دیانۃً اگر پہلے ہی سے واپس لینے کی نیت رہی ہو تو لے سکتا ہے۔

۲۔ دوسری صورت یہ ہے کہ باپ مالدار ہو اور اولاد بالغ ہوں تو اگر بچے خود اپنی کفالت کے لائق اور صاحب معاش ہوں تو ان کی کفالت باپ کے ذمہ نہ ہوگی، اگر بچے محتاج ہوں تو:

الف: نکاح تک لڑکیوں کی نفقہ باپ کے ذمہ ہوگا، اسی طرح شادی شدہ لڑکیاں مطلقہ یا بیوہ ہوجائیں تب بھی باپ ان کے نفقہ کا ذمہ دار ہوگا۔

ب: لڑکے مفلوج، نابینا، فاتر العقل یا معذور ہونے کی وجہ سے کسب معاش کی صلاحیت نہیں رکھتے ہوں، یا ابھی حصول تعلیم میں مشغول ہوں، تو ان کا نفقہ بھی باپ کے ذمہ ہوگا۔

۳۔ تیسری صورت یہ ہے کہ باپ خود محتاج اور نفقہ ادا کرنے کی پوزیشن میں نہ ہو، بچے نابالغ ہوں لیکن مالدار، یا نابالغ ہوں اور مالدار یا خود کسب معاش کے لائق، ان صورتوں میں باپ پر نفقہ کی ذمہ داری نہیں ہوگی۔

۴۔ چوتھی صورت یہ ہے کہ باپ محتاج ہو، بچے بھی نابالغ و محتاج ہوں یا بالغ ہوں لیکن کسب معاش نہیں کرسکتے، تو باپ کو کسب معاش کرنا چاہئے اور نہ کرے تو اسے اس پر مجبور کیا جائے گا، اور اس پر مجبور کرنے کے لئے اسے قید کی سزا بھی دی جاسکتی ہے، پھر اگر باپ کفالت نہ کرسکتا ہو اور دادا یا ماں یا ماموں یا چچا اس کی کفالت کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں تو ان لوگوں پر اس کی کفالت واجب ہوگی اور وہ اس پر مجبور کئے جائیں گے، البتہ جب اس کے والد کے حالات بہتر ہوجائیں تو ان قرابت داروں کو حق ہوگا کہ وہ اپنے کئے ہوئے اخراجات اس کے والد سے وصول کرلیں، دادا اور ماں دونوں خوش معاش ہوں، تو دونوں کو حصہ میراث کی نسبت سے نفقہ بھی ادا کرنا ہوگا، یہ ظاہر مذہب ہے، اور امام ابوحنیفہؒ کے ایک قول کے مطابق تنہا دادا پر نفقہ کی ذمہ داری ہوگی، کیوں کہ دادا باپ کے درجہ میں ہے۔

اگر کفالت کی کوئی صورت نہ ہو؟

اگر باپ غریب ہو، نفقہ ادا کرنے سے عاجز ہو اور کفالت کی کوئی اور راہ نہ ہو تو آخری درجہ میں بعض حضرات کی رائے ہے کہ نفقہ کی ذمہ داری بیت المال پر ہوگی، اور امام خصافؒ کے نزدیک ایسی صورت میں لوگوں سے سوال کرنے اور اس طرح بچوں کی ضرورت پوری کرنے کی تدبیر اختیار کی جائے گی (قاموس الفقہ ۲۱۱/۵ تا ۲۱۳ نفقہ)۔

خلاصہ یہ ہے کہ اسلام نے بچوں کی تعلیم و تربیت اور ان کی ضروریات زندگی کو پورا کرنے کی ذمہ داری باپ و دیگر قرابت دار اور بیت المال وغیرہ پر رکھی ہے، اگر ان میں سے کوئی نہ ہو، یا وہ اس ذمہ داری کو انجام دینے سے عاجز یا غافل ہوں یا والدین انتہائی معاشی بدحالی میں مبتلا ہوں، نہ وہ خود کمانے کے لائق ہوں، نہ حکومت ان کا تکفل کرتی ہے، پیشہ اور نہ کام کو سکھانے کے لئے کام سے لگایا جاسکتا ہے۔

علامہ شامی نے لکھا ہے کہ: "إن لم یبلغ حد الکسب فإن بلغه کان للأب أن یؤجره أو یدفعه فی حرفة لیکتسب" (شامی ۶۷۰/۲، ۶۷۱)۔

البتہ جو ماں باپ اپنی معاشی ضروریات پوری کرسکتے ہوں انہیں اپنی معاشی ضرورت پورا کرنے یا بہتر بنانے کے لئے بچوں سے مزدوری کرانے کی اجازت نہیں ہونی چاہئے، کیونکہ بچوں کی کفالت خود ان کے ذمہ ڈالی گئی ہے۔

و: شریعت نے جن چیزوں کے ارتکاب سے منع کیا ہے ان کے ارتکاب کی وجہ سے نابالغ پر کوئی جسمانی حد واجب نہیں ہوگی، چنانچہ اگر وہ عمداً بھی کسی کو قتل کردے تو قتل خطا ہی سمجھا جائے گا (قاموس الفقہ صبی، ۲۱۷/۴)۔

لہٰذا سوالنامہ میں مذکور جرائم قتل، غارت گری، چوری، زنا بالرضا یا زنا بالجبر وغیرہ اگر نابالغ لڑکوں یا نابالغ لڑکیوں سے سرزد ہو جائیں تو ان پر شرعی سزائیں جاری نہیں کی جائے گی، البتہ ان کے اولیاء ان کو تنبیہ کریں۔

ایمان کے بعد انسان کی زندگی کو سنوارنے اور فلاح کے مقام تک اس کو پہنچانے میں چونکہ سب سے بڑا دخل اللہ تعالی کے خوف وخشیت اور آخرت کی فکر کو ہے، اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت میں ان دو چیزوں کو پیدا کرنے کی خاص کوشش کی ہے، کبھی اس خوف وفکر کے فوائد اور فضائل بیان فرماتے اور کبھی اللہ تعالی کے قہر وجلال اور آخرت کے ان سخت احوال کو یاد دلاتے جن کی یاد سے دلوں میں یہ دونوں کیفیتیں پیدا ہوتی ہیں تا کہ دلوں میں رقت اور گداز کی کیفیت پیدا ہو، دنیا سے دلبستگی کم ہو، اور آخرت کی فکر بڑھے، اور آدمی اللہ تعالی کی رضا اور اخروی فلاح کو اپنی زندگی کا نصب العین بنائے، اس طرح کی حدیثیں کتب حدیث میں ''کتاب الرقاق'' کے عنوان کے تحت درج کی گئی ہیں، ان کو اور غضب، کبر اور ظلم کے ابواب اور برے اخلاق کے دنیوی واخروی نقصانات بچوں کو خوب اچھی طرح سمجھا کر ذہن نشیں کرادیئے جائیں، مشکوۃ میں ۴۳۳ تا ۴۵۹ میں ان امور سے متعلق احادیث درج ہیں اور حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ نے معارف الحدیث جلد ۲ میں کتاب الرقاق وکتاب الاخلاق سے متعلق احادیث کو جمع کردیا ہے اس کو بھی زیر تعلیم رکھا جائے۔ بچوں کی جیل میں بھی ان کی اصلاح کے لئے ان حدیثوں کی تعلیم دی جائے۔

ز: جو بچے بے سہارا ہو جاتے ہیں، خواہ کسی حادثہ میں ان کے والدین کے گذر جانے یا والدین سے بچھڑ جانے نیز ولادت کے بعد یاں باپ کی طرف سے پھینک دیئے جانے کی وجہ سے یا کسی اور سبب سے، ان پر فقہ کی اصطلاح لقیط کا اطلاق ہونا چاہئے۔

لقیط (لاوارث بچہ):

''لقیط'' عربی زبان میں فعیل کے وزن پر ہے اور یہ اسم مفعول ملقوط کے معنی میں ہے: یعنی ایسا بچہ جس کو اٹھالیا گیا ہو، فقہ کی اصطلاح میں ایسے نابالغ بچہ کو کہتے ہیں جو پڑا ہوا ملے، اس کے والدین کا پتہ نہ ہو اور وہ نابالغ ہو گو باشعور ہو، اللقيط هو الصغير الصبي غير البالغ وإن كان مميزاً، چونکہ عام طور پر کوئی شخص اپنے بچہ کو فقر ومحتاجی یا تہمت زنا کی وجہ سے ہی یوں پھینک دیتا ہے اس لئے سرخسی نے اس کی بھی قید لگائی ہے۔

ایسے بچہ کو لے لینا مسلمانوں پر فرض کفایہ ہے، اگر کسی نے نہیں اٹھایا اور اس کی جان چلی گئی تو اس علاقہ کے تمام لوگ گناہ گار ہوں گے، اور اگر کسی نے اٹھالیا تو وہ تو ایک انسان کی زندگی بچانے کی وجہ سے ثواب کا مستحق ہوا اور دوسرے لوگ بھی گناہ سے بچ جائیں گے۔

لقیط کے احکام:

ایسے بچہ کے احکام درج ذیل ہیں:

اسے آزاد تصور کیا جائے گا نہ کہ غلام، کیوں کہ حضرت عمرؓ نے ایک لقیط کے بارے میں اسی طرح کا حکم فرمایا تھا۔

اگر وہ مسلمانوں کے علاقہ میں پایا جائے تو مسلمان تصور کیا جائے گا اور اگر ایسی آبادی میں پایا جائے جو خالص غیر مسلموں کی ہو تو اگر کسی مسلمان نے اس کو اٹھایا اور اپنے زیر پرورش رکھا تب وہ مسلمان تصور کیا جائے گا اور اگر وہ غیر مسلم کے زیر پرورش ہو تو اس کا ہم مذہب متصور ہوگا۔

جس شخص نے اس لقیط کو اٹھایا ہے وہ بمقابلہ دوسروں کے اس کی پرورش کا زیادہ حق دار ہوگا۔

جہاں اسلامی حکومت اور اس کے تحت بیت المال قائم ہو وہاں لقیط کا نفقہ بیت المال کے ذمہ ہوگا، چنانچہ حضرت عمرؓ کا معمول مبارک یہی تھا کہ بیت المال سے ایسے لوگوں کا نفقہ ادا فرماتے تھے۔

اگر اس پر کسی کا خون بہا واجب ہوا اور خون بہا (دیت) کی نوعیت ایسی ہو کہ جس میں اس کے رشتہ دار یا ہم پیشہ شریک تعاون ہوتے ہیں (جن کو فقہ کی اصطلاح میں عاقلہ کہا جاتا ہے) تو بیت المال خون بہا ادا کرنے میں اس کا معین ومددگار رہوگا۔

اگر اس کا نسب کسی سے ثابت نہیں ہوا تو حکومت کو اس پر ولایت حاصل ہوگی، کیوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس کا کوئی ولی نہ ہو اس کا ولی سلطان ہے، "السلطان ولی من لا ولی له"۔

لقیط کا نسب:

اگر لقیط کو اٹھانے والا یا کوئی اور مرد لقیط سے نسب کا دعوی کرے اور اسے اپنا بیٹا قرار دے تو گو اس کے پاس کوئی گواہ و ثبوت نہ ہو لیکن اگر بظاہر اس کی تکذیب کی بھی کوئی وجہ نہ ہو تو اس لقیط کا نسب اس شخص سے ثابت ہو جائے گا، کیونکہ اس میں لقیط کا بھی فائدہ ہے کہ وہ مجہول النسب نہ رہے گا اور شرافت نسب بھی حاصل ہو سکے گی اور خود دعوی کرنے والے کے لئے بھی فائدہ ہے کہ اسے اس سے تقویت حاصل ہوگی اور جس دعوی میں مدعی کا فائدہ ہو اور دوسرے کا نقصان نہ ہو تو اسے بلا ثبوت بھی قبول کیا جاتا ہے۔

اگر کوئی شخص اس سے ثبوت نسب کے سلسلہ میں ثبوت شرعی پیش کر دے تو پھر اس سے نسب ثابت ہوگا اور اگر ایک سے زیادہ اشخاص نے اس سے نسب کا دعوی کیا اور گواہان بھی پیش کر دیئے کہ ترجیح کی کوئی صورت باقی نہ رہے تو پھر دونوں ہی سے اس کا نسب مانا جائے گا، اور نسب کے احکام جاری ہوں گے۔

ہاں یہ تمام تفصیل اس صورت میں ہے جب مرد نے نسب کا دعوی کیا ہو، اگر عورت نسب کی مدعی ہو اور اسے اپنا بیٹا قرار دیتی ہو تو جب تک شوہر یا دایا کے ذریعہ اس کی تصدیق نہ ہو جائے یا وہ گواہان پیش نہ کر دے نسب ثابت نہ ہوگا، کیونکہ عورت کا دعوی نسب صرف اس کی ذات سے متعلق نہیں بلکہ وہ اگر کسی کو اپنا بیٹا قرار دیتی ہے تو گویا وہ اپنے شوہر کو بھی اس کا باپ قرار دیتی ہے۔

اگر کسی بچہ کے بارے میں دو عورتیں ثبوت نسب کی مدعی ہوں اور گواہان پیش کر دیں تو وہ دونوں ہی خواتین اس کے لئے ماں کے حکم میں ہوں گی۔

مسلمان ''کافر لقیط بچہ'' کو بھی اٹھا سکتا ہے (قاموس الفقہ جلد ۴، لقیط)۔

دوا علاج کا شرعی حکم:

دیگر امور کی طرح بچوں کے علاج کے سلسلہ میں بھی ماں باپ ان کے ولی ہیں۔

''الموسوعۃ الفقہیہ میں چھوٹے یا مریض یا اپاہج و معذور بچہ کی خدمت خود کرنا یا کسی اور سے کرانا باپ پر واجب لکھا ہے، اگر بچہ فقیر ہو، عنوان ہے: ''خدمۃ الوالد للولد وعکسہ''۔

''وتجب علیہ الخدمۃ أو الا خدام لولدہ الصغیر أو المریض أو العاجز، إذا کان فقیراً'' (الموسوعۃ الفقہیہ ۱۹-۳۸، ۳۹)۔

حضانت و پرورش کے دوران بچہ کی نفسیاتی کیفیت کا بھی اسلام نے خاص خیال رکھا ہے، اسی لئے اسلام نے یہ شرط لگائی ہے کہ حاضنہ محضون کے غیر محرم کے نکاح میں نہ ہو، کیونکہ سوتیلے باپ کی طرف سے اسے ذلت و حقارت سے دوچار ہونا پڑے گا، کتب فقہ میں یہ صراحت بھی ہے کہ مفتی کو صاحب بصیرت ہونا چاہئے تاکہ وہ مجنون کے لئے زیادہ خیر خواہ کی رعایت رکھ سکے، اگر محضون کا سوتیلا باپ اس کے حق میں زیادہ خیر خواہ ثابت ہو، حاضن کی بیوی اسے حاضنہ کے اجنبی شوہر سے زیادہ ستاتی ہو تو بچہ کو اس حاضنہ سے نہ لیا جائے، اس کی قدرے تفصیل شرائط حضانت کی شرط ۶ کے بعد شامی (۲/۶۴۰) کے حوالہ سے گذر چکی ہے۔

بیمار و معذور دلجوئی، شفقت اور ہمدردی و خیر خواہی کا صحت مند و تندرست سے زیادہ محتاج ہوتا ہے اور ماں باپ کا اس سلسلہ میں کوئی بدل نہیں ہو سکتا، لہذا جو بچے ذہنی یا جسمانی طور پر معذور پیدا ہوتے ہیں یا پیدائش کے بعد معذور ہو جاتے ہیں، ان کی پرورش، خدمت، نگہداشت اور علاج ماں باپ سے جتنا ہو سکے کرنا چاہئے اور ان کو باپ کی شفقت اور ماں کی ممتا سے محروم نہیں کرنا چاہئے، ان کے علاج یا نگہداشت کے لئے ہسپتال میں داخل کرانے کی ضرورت ہو تو داخل کرایا جائے اور ان کی دلجوئی و ہمدردی کے لئے ماں باپ یا قریبی اعزہ میں سے باری باری کسی کو ان کے پاس رہنا چاہئے، محض اپنی ذمہ داری سے فراغ یا فرار حاصل کرنے یا اپنے عیش و آرام کی قربانی دینے سے بچنے کے لئے ایسے بچوں کو دماغی ہسپتال یا کسی دوسرے ہسپتال میں داخل نہیں کرانا چاہئے، ہذا ما عندی واللہ اعلم بالصواب۔

☆☆☆

اسلام میں بچوں کے حقوق اور ان سے متعلق احکام

مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی[1]

بچوں پر ظلم وزیادتی کی کہانی نئے دور کی پیداوار نہیں بلکہ اس کی تاریخ قدیم ہے، اندوہناک صورت حال کا سامنا زمانہ جاہلیت سے ہوتا رہا ہے، اس انمول امانت کو برباد کرنے کا ارتکاب کبھی تو فقر وفاقہ کے خوف سے کیا جاتا اور کبھی انسانیت سوز رسم اور شرم وحیاء کے مارے انجام دی جاتی، قرآن کریم نے دونوں صورتحال کا تذکرہ کیا ہے:

"لا تقتلوا أولادکم خشیة إملاق نحن نرزقهم وإیاکم إن قتلهم کان خطأ کبیراً" (بنی اسرائیل: ۳۱) (اپنی اولاد کو فقر وفاقہ کے خوف سے قتل مت کرو، ہم ان کو بھی اور تم کو بھی کھلاتے ہیں، یقیناً ان کا قتل گناہ کبیرہ ہے)۔

"إذا بشر أحدهم بالأنثی ظل وجهه مسوداً" (نحل: ۵۸) (جب ان میں سے کسی کو لڑکی کی بشارت دی جاتی تو اس کا چہرہ کالا پڑ جاتا)۔

ایک عرصے تک بچوں پر ظلم وجور کا سلسلہ چلتا رہا، اسلام کی روشنی سے انسانیت کو اس لعنت بد سے نجات ملی، ہر ایک کو اس کے مناسب حقوق نواز کر دنیا کو عدل وانصاف اور اعتدال وتوازن کی خوبیوں سے بہرہ ور کر دیا گیا، پھر قلب ونگاہ میں بچوں کے تئیں وہی چاہت اور وہی تڑپ اُمڈ پڑی، جو پہلے انبیاء جیسی بزرگ ہستیوں میں بھی پائی جاتی تھی، نتیجہ یہ ہوا کہ شفقت پدری، مادری ممتا، اور اہل قرابت کی بھرپور محبت سے پر مسرت کلیاں کھلنے لگیں، لیکن رفتہ رفتہ اسلامی احکام سے غفلت، مغرب کے برپا کیے نظام کی پاسداری ایسی بڑھی کہ زمانہ جاہلیت کا وہی نقشہ ابھرنے لگا جس کی بیخ کنی کے لئے کن کن پیرایہ بیان کو اختیار کیا گیا تھا، آج حقوق کا نعرہ بلند کرنے والے ہی بچوں کو گری پڑی چیز کا درجہ دے کر بے بی سینٹر میں تو پہنچا سکے مگر وہ حقوق جو فطرت کا تقاضا تھے اور اپنے پرائے کی وہ پہچان جو انسانوں کا انسان ہونے کے لئے طرۂ امتیاز تھی وہ نواز نہ سکے، ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ دنیا کا چپہ چپہ اس نظر بد کا شکار ہو چکا ہے، مگر یہ کہنا بھی حق بجانب ہوگا کہ ساری دنیا کے نظریات وخیالات میں بڑی تیزی سے تبدیلی آرہی ہے، کچھ بعید نہیں یورپ کا بھیجا ہوا ابلیسی سوغات، مسلم سماج کی ان روحوں کو بھی پامال نہ کردے جو ابھی بہت حد تک پاکیزہ سمجھی جاتی ہیں، قبل اس کے کہ اس پوزیشن سے سابقہ ہو اسلامی ہدایات وتعلیمات کو آشکارا کر دینا ضروری ہے اور فی الوقت ان حقوق کی بازیابی کے لئے جو دبی دبی سی کوشش ہو رہی ہے اس کو رہنما خطوط مہیا کرنا ضروری ہے تاکہ کامیابی کی کچھ منزلیں طے کی جاسکیں، مندرجہ ذیل سطور میں بچوں کے ان ہی پامال حقوق کے تئیں اسلامی ہدایات سے روشناس کرانے کی کوشش کی گئی ہے۔

حق پرورش اور اسلامی ہدایات:

حق پرورش کے سلسلہ میں شریعت نے "شفقت ومصلحت" کو اساس بنایا ہے جس شخص میں شفقت ومحبت فطری طور پر زیادہ ہو بچہ کی پرورش اسی کا حق ہے، حضانت کے مستحقین کو بیان کرتے ہوئے فقہاء نے یہ ترتیب قائم کی ہے:

"أحق الناس بحضانة الصغیر حال قیام النکاح وبعد الفرقة الأم، فإن ماتت الأم أو تزوجت فأم الأم فإن ماتت أو تزوجت فأم الأب، فإن ماتت أو تزوجت فالأخت لأب وأم، فإن ماتت أو تزوجت فالأخت لأم"

(خانیہ علی الہندیہ ۱/ ۴۲۲، فصل فی الحضانہ، ط: احیاء التراث العربی بیروت)۔

(بچے کی پرورش کے لئے ماں، نکاح باقی رہنے کی حالت میں اور تفریق کے بعد زیادہ حقدار ہے، پس اگر ماں کا انتقال ہو جائے یا دوسرا نکاح ہو جائے تو نانی زیادہ حقدار ہے، پس اگر وہ مرجائے یا شادی کرلے تو دادی زیادہ حقدار ہے، پھر اگر وہ مرجائے یا شادی کرلے تو حقیقی بہن زیادہ حق دار ہے، اگر حقیقی بہن

[1] استاذ حدیث مدرسہ حسنیہ کایم کلم، کیرالہ۔

مرجائے یا شادی کرلے تو ماں شریک بہن زیادہ حقدار ہے)۔

اس کے بعد کچھ اختلاف بھی پایا جاتا ہے، بعض نے خالہ کو علاتی بہن پر مقدم رکھا ہے اور بعض نے علاتی بہن کو مقدم کیا ہے، بہنوں کے بعد خالاؤں کو حق حضانت ہے اور سب سے آخر میں پھوپھیاں حق دار ہیں (فتح القدیر ۴/ ۳۳۲، باب الحضانۃ، زکریا)۔

اس تفصیل میں ایک چیز قدر مشترک یہ ہے کہ جن پرورش کرنے والیوں کا تذکرہ کیا گیا ہے وہ سب محارم ہیں، نیز انہی خواتین کو مقدم کیا گیا ہے جن میں مادہ شفقت دوسری کی بنسبت زیادہ ہے، صاحب ہدایہ، اور صاحب فتح القدیر وغیرہ تعلیل و توجیہ کرتے ہوئے بار بار "لأنہا أشفق" اور "لأنہا أوفر شفقۃ" لکھتے ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ "شفقت" سب سے بنیادی عنصر ہے جس کا لحاظ اس حق کو ادا کرنے میں رکھا گیا ہے۔

اگر شفقت والی محرم عورتیں نہیں ہیں تو پھر یہ حق مردوں کو ملتا ہے، مردوں میں ترتیب عصبہ والی اختیار کی گئی ہے، "فإن لم تکن للصبی امرأۃ من أھلہ فاختصم فیہ الرجال فأولاھم أقربھم تعصیباً، لأن الولایۃ للأقرب" (ہدایہ علی فتح القدیر ۴/ ۳۳۳، کتاب الحضانۃ، ط: زکریا دیوبند)۔

(اگر بچے کی پرورش کی خاطر مستحق خاتون نہیں ہے اور مردوں کے مابین اس بابت نزاع ہو تو عصبہ ہونے کے لحاظ سے جو اقرب ہے وہی زیادہ مستحق ہے، اس لئے کہ ولایت اقرب کے لئے ہوتی ہے)۔

یہی وجہ ہے کہ محرم عورتیں خواہ ماں ہو یا اس کے علاوہ دوسری عورتیں جب شریعت میں مقررہ عرصہ تک پرورش کرکے فارغ ہوجاتی ہیں تو اسی ولایت کی بنا پر بلوغ تک یا اگر لڑکی ہے تو شادی تک اپنے پاس رکھنے کا حق ہے۔

اس میں بھی شفقت ہی پنہاں ہے، یہ شفقت کبھی تو محرمیت کی وجہ سے ہوتی ہے اور کبھی ولایت کی وجہ سے، مردوں کے سلسلہ میں صرف اتنا ملحوظ رکھا گیا ہے کہ اگر بچیاں زیر پرورش ہیں تو ان کو کسی غیر محرم کے پاس نہیں رکھا جاسکتا جیسے چچازاد بھائی، یا آزاد کرنے والا آقا وغیرہ، غیر محرم ہونے کی وجہ سے ان کو حق حضانت نہیں ہے، البتہ بچہ ہے تو کوئی حرج نہیں ہے۔

عصبہ نہ ہونے کی صورت میں احناف کے نزدیک ذوی الارحام پرورش کے مستحق ہوتے ہیں:

"فی الفتاوی الصغری: فإن لم یکن عصبۃ فإلی ذوی الأرحام علی الترتیب" (فتح القدیر ۴/ ۳۲۳، باب الحضانۃ، ط: زکریا) (فتاوی صغری میں ہے: اگر عصبہ نہیں ہے تو ترتیب سے ذوی الارحام مستحق ہوں گے)۔

ذوی الارحام سے مراد محرم ذوی الارحام ہیں (شامی ۳/ ۶۹۴ باب الحضانۃ)۔

غالباً شافعیہ کے یہاں بچیوں کی پرورش میں بھی محرم کی شرط نہیں ہے (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۱۰/ ۷۳۰۹)۔

شاید اس مکتب فکر میں مدار استحقاق میراث پر ہے یا محرمیت پر، محرمیت کا تعلق عورتوں سے ہے، ارث کا تعلق مردوں سے، نیز وارث ہونے کے لئے محرم ہونا ضروری نہیں، یہی وجہ ہے کہ ذوی الارحام شافعیہ کے نزدیک پرورش کے مستحق نہیں ہیں، اس لئے کہ ان کا حصہ میراث میں نہیں ہوتا ہے۔

اسی طرح حنفیہ و مالکیہ کے نزدیک پرورش کرنے والی خاتون کا مسلمان ہونا شرط نہیں ہے، کیونکہ ان میں اعتبار شفقت کا ہے اور وہ کافرہ میں بھی اتنی ہی ہوگی جتنی مسلمان ماں میں، لیکن شافعیہ و حنابلہ اسلام کی شرط لگاتے ہیں، اس لئے کہ بغیر اسلام ایک شخص کو دوسرے پر ولایت حاصل نہیں ہوسکتی۔

البتہ پرورش کرنے والے مرد کے لئے حنفیہ بھی مسلمان ہونے کی قید لگاتے ہیں، چونکہ مالکیہ کے نزدیک عورتوں کی عدم موجودگی میں مردوں کو حق ہوتا ہی نہیں ہے، اس لئے ان کے یہاں یہ مسئلہ زیر بحث نہیں ہے (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۱۰/ ۷۳۰۷)۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ حنفیہ کے یہاں حق پرورش کا مدار محرم عورت پھر عصبہ وارث، بعدہ محرم ذوی الارحام پر ہے جبکہ شافعی کے نزدیک محرمیت بعدہ ارث بنیاد ہیں، مالکیہ صرف محرمیت کو مدار بناتے ہیں۔

ضیاع کا خوف نہ ہو:

پرورش کی بابت دوسری اہم ہدایت یہ ہے کہ بچہ، پرورش کرنے والے کے یہاں رہ کر ضائع نہ ہو، اگر ضیاع کا خطرہ ہے تو اس کو حق حضانت سے محروم کرد

جائے گا، اس لئے کہ حضانت ایک امانت ہے، امانت کو ضائع کرنا صحیح نہیں ہے، اس کی مختلف شکلوں کو شامی وغیرہ میں واضح کیا گیا ہے۔

اگر ماں مرتد ہوگئی تو اس کو حق حضانت نہیں ہے، کیونکہ اب اس کو قید کیا جائے گا اس صورت میں وہ بچے کی پرورش کے لئے فارغ نہیں رہ سکتی۔

یا فسق و فجور میں اس طرح منہمک ہے کہ بچہ کے ضیاع کا خوف ہے تب بھی حق حضانت نہیں ہوتا ہے،

''أو فاجرة فجوراً يضيع الولد به، فالمراد به فسق يضيع الولد به .... على هذا لوكانت صالحة كثيرة الصلاة قد استولى عليها محبة الله تعالى وخوفه حتى شغلاها عن الولد ولزم ضياعه انتزع منها'' (شامی ۳-۶۸۸، باب الحضانة، ط: رشيديه پاكستان)۔

(یا یہ کہ ماں فاجرہ ہو کہ بچہ اس کی وجہ سے ضائع ہوجائے، فسق سے یہی مراد ہے کہ بچہ اس سے ضائع ہوجائے، اسی بنیاد پر اگر وہ صالح ہے، بہت نماز پڑھتی ہے، اس پر اللہ کی محبت اور اس کا خوف اتنا غالب ہے کہ بچے سے غافل ہوجاتی ہے اور ضیاع لازم آئے تو اس سے لے لیا جائے گا)۔

اسی طرح پرورش کرنے والی کے لئے شرط ہے کہ غیر مامون نہ ہو، اس لئے کہ اس وقت بھی ضیاع کا اندیشہ ہے، درمختار میں ہے:

''یا غیر مامون ہو بایں طور کہ کل اوقات باہر رہے، اس سے مراد اکثر اوقات ہے، اس لئے کہ مدار اس بات پر ہے کہ بچہ ضائع نہ ہو، بچہ چوں کہ امانت کے حکم میں ہے، امانت کو ضائع کرنے والا امین نہیں ہوتا ہے، نیز گھر سے باہر نکلنا معصیت میں منحصر نہیں ہے کہ سابقہ عبارت کافی ہوجائے: اس لئے کہ کبھی بغیر معصیت کے لئے نکلنا ہوتا ہے جیسا کہ دایہ ہو، میت کو غسل دینے والی ہو، یا حمام میں غسل کی خدمت پر مامور ہو، وغیرہ'' (درمختار علی ردالمحتار ۳/۶۸۸، باب الحضانۃ، رشیدیہ پاکستان)۔

ضرر کا اندیشہ نہ ہو:

اسلام میں جہاں جلب منفعت کی اہمیت ہے اس سے زیادہ دفع مضرت اہم ہے، ہر ایسی صورت جس میں بچے کو ضرر ہو شریعت میں اس کو منع کردیا گیا، خواہ وہ ضرر دینی ہو یا جسمانی، اسی لئے حق پرورش رکھنے والی عورتیں خواہ وہ ماں ہی کیوں نہ ہوں اگر خدانخواستہ مسلمان نہیں ہیں تو اسی وقت تک پرورش کی حقدار ہیں جب تک کہ بچہ میں اس کے دین کو سمجھنے کا شعور نہ ہوا ہو، اور اندیشہ کفر و معصیت نہ ہو، ورنہ اس سے بچہ لے لیا جائے گا۔

"الحاضنة الذمية ولو مجوسية كمسلمة ما لم يعقل ديناً أو إلى أن يخاف الكفر فينزع منها وإن لم يعقل ديناً" (درمختار علی رد المحتار ۳/۶۹۴ باب الحضانۃ) (پرورش کرنے والی ذمی عورت خواہ وہ مجوسیہ ہو مسلم عورت کی طرح ہے جب تک کہ بچہ دین کو نہیں سمجھتا، الا یہ کہ کفر کا خوف ہو تو چاہے دین کو نہ سمجھتا ہو اس سے بچہ لے لیا جائے گا)۔

یہاں دینی ضرر کی وجہ سے حق پرورش ساقط ہوگیا، اسی طرح اگر ان محرم عورتوں میں سے کوئی کسی غیر نسبی اجنبی سے نکاح کرلے تو اب بچہ کو دنیاوی ضرر کا خدشہ ہے کہ مراسم خسروانہ و بزرگانہ کے بجائے معاملہ اجانب برتا جائے گا جس کی بنا پر بچے کو تکلیف ہوگی۔

اسی طرح پرورش کرنے والی ایسے لوگوں کے مابین سکونت رکھتی ہے جو بچہ کا خیر خواہ نہیں بلکہ حسد و بغض رکھنے والے ہیں تو حق حضانت سے محروم کردی جائے گی، درمختار میں ہے:

"ويسقط حقها بنكاح غير محرمه، وكذا بسكناها عند المبغضين له" (درمختار ۳/۶۹۴ باب الحضانہ) (عورت کا حق بچے کے غیر محرم سے نکاح کرنے کی وجہ سے ساقط ہوجاتا ہے، اسی طرح ایسے لوگوں کے پاس سکونت کرنے سے جو بچے سے بغض و عناد رکھنے والے ہوں)۔

علامہ شامی نے اس پر ایک تبصرہ کیا ہے جو نقل کرنے کے قابل ہے:

''مفتی کے لئے مناسب ہے کہ صاحب بصیرت ہوتا کہ بچے کے حق میں جو نافع ہو اس کی رعایت کرے، اس لئے کہ کبھی بچہ کا قریبی رشتہ دار اس سے بغض کرنے والا اور موت کی تمنا کرنے والا ہوتا ہے، اس کا سوتیلا باپ مشفق ہوتا ہے، اس کے اوپر اس کا فراق شاق گزرتا ہے، تو قریبی محرم چاہتا ہے کہ بچہ کو اس سے لے لے اور تکلیف اس کو اور اس کی ماں کو پہنچائے، یا اس کے نفقہ سے کھائے وغیرہ۔

کبھی قریبی رشتہ دار کی بیوی ہوتی ہے جو سوتیلے باپ سے کئی گنا زیادہ ایذا دیتی ہے، اور کبھی اس کی اولاد ہوتی ہے جن کی وجہ سے ساتھ رہتے ہوئے فتنہ کا خوف ہوتا ہے، پس جب مفتی وقاضی کو ان میں سے کچھ معلوم ہو تو ماں سے بچے کا لینا حلال نہیں ہے، اس لئے کہ پرورش کا مدار تو بچہ کے نفع پر ہے" (شامی ۳/ ۶۹۵، باب الحضانۃ، ط: رشیدیہ پاکستان)۔

اس لئے ہر ایسی صورت جس میں شفقت ومحبت ختم ہو جائے، یا بے توجہی کی بنا پر بچہ ضائع ہو جائے یا تکلیف وایذا رسانی کا سامنا ہو تو حق پرورش سے محروم کر دیا جائے گا، اور اس سے نیچے قریبی رشتہ دار کو یہ حق دیا جائے گا، خلاصہ یہ:

(۱) حق پرورش رکھنے والی خاتون کسی غیر نسبی اجنبی سے نکاح کرے تو اس سے یہ حق ساقط ہو جائے گا۔

(۲) ایسا شغل خواہ جائز کام کی بنا پر ہو یا ناجائز امور میں انہماک کی وجہ سے جس کی بنا پر بچہ کے ضیاع کا خوف ہے تو پرورش کا حق ساقط ہو جائے گا۔

(۳) پرورش کرنے والے کے جسم میں کوئی ایسا مرض ہو جو بچہ کو متاثر کرنے کا سبب ہو مثلاً ایڈز جیسے امراض، تو حق پرورش ساقط ہو جائے گا۔

(۴) پرورش کرنے والے کی نیت صاف نہ ہو، مثلاً وہ ضرر پہنچانا چاہتا ہے جس کو قرائن سے معلوم کیا جاسکتا ہے بایں طور کہ اس کی بیوی ہو جو بچہ کے حق میں مخلص نہ ہو، یا اس کی اولاد ہو جن سے معصیت وغیرہ کا خوف ہو یا پھر اس کی نیت میں محض اپنا فائدہ ہو، بچہ کا نفع مقصود نہیں تو بھی حق پرورش ساقط ہو جائے گا۔

(۵) کسی ایسی مصیبت میں مبتلا ہو جس کی وجہ سے پرورش پر قدرت باقی نہ رہے جیسے جنون کے مرض کا شکار ہو گیا، یا پرورش کنندہ خود ہی محتاج حضانت ہے تو کسی نومولود کی پرورش ایسے اشخاص کو نہیں دی جاسکتی۔

(۶) اگر زوجین کے مابین تفریق ہو گئی، اور دونوں آپس میں اجانب ہو چکے ہیں تو ماں کو یہ حق نہیں کہ ایسی جگہ بچہ کی پرورش کرے جہاں تک رسائی باپ کے لئے مشکل ہو، ہاں اپنے وطن میں جہاں اس سے نکاح ہوا ہے وہاں جاسکتی ہے لیکن کسی دوسرے شہر یا آج کے دور میں دوسرے ملک جہاں اس کی شادی بھی ہوئی تھی، ظاہر ہے وہاں تک پہنچنا ایک باپ کے لئے دشوار گزار عمل ہے، اس لئے اس کی اجازت نہیں دی جاسکتی، یہ تو ماں کی بابت ہوا، دوسری خاتون کو بالکل اجازت نہیں ہوگی کہ کوئی اور جگہ پرورش کرے، خلاف ورزی کی صورت میں حق حضانت سے محروم ہو جائے گی (درمختار ۳/ ۶۹۸ باب الحضانہ، رشیدیہ، پاکستان)۔

محور (ب): (۱) اسلام میں بچوں کی تعلیم وتربیت:

قرآن کریم اور احادیث رسول میں بچوں کی تعلیم وتربیت پر بہت زور دیا گیا ہے، قرآن کہتا ہے: "قوا أنفسكم وأهليكم ناراً" (التحریم: ۶) (اپنے اہل وعیال کو جہنم سے بچاؤ)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: "ما فعل والد ولداً من نحل أفضل من أدب حسن" (ترمذی ۲/ ۱۶، ابواب البر والصلۃ، باب ماجاء فی ادب الولد) (کسی والد نے بچہ کو اچھے ادب سے زیادہ بہتر عطیہ نہیں دیا)۔

ایک اور روایت میں ہے: "ما ورّث والد ولداً خيراً من أدب حسن" (طبرانی الاوسط، کمافی مجمع الزوائد ۸/ ۱۰۶، کتاب الادب، باب تادیب الاولاد)۔

اب یہ تمام چیزیں جو ایک انسان کو جہنم سے محفوظ رکھتی ہیں، ان کی تعلیم دینا ایک باپ کی ذمہ داری ہے۔

(۱) اسی لئے سب سے پہلے درستگی عقائد کی تعلیم دی جائے، کیونکہ اس کے بغیر نجات ممکن نہیں، حدیث میں آتا ہے: "افتحوا علی صبیانکم أول کلمۃ لا إلہ إلا اللہ" (کنز العمال ۱۶/ ۴۴۱، حدیث نمبر: ۴۵۳۳۲، عن ابن عباس) (اپنے بچوں کی تعلیم کلمہ لا الہ الا اللہ سے شروع کرو)۔

(۲) ایمان کے بعد اعمال خیر وشر سے باخبر کرنا بھی لازم ہے، اس لئے کہ بدوں اس کے جہنم سے حفاظت مشکل ہے، حدیث میں ہے: "مروا أولادكم بامتثال الأوامر واجتناب النواهي فذلك وقاية لهم ولكم من النار" (ابن جریر بحوالہ تربیۃ الاولاد ۲/ ۲۸۰) (اپنی اولاد کو اوامر پر عمل کرنے اور نواہی سے رکنے کی تعلیم دو، اس میں ان کے لئے اور تمہارے لئے جہنم سے حفاظت ہے)۔

اسی بنیاد پر ایک حد تک جبری علم کو لازم کیا گیا، حدیث میں ہے: "طلب العلم فريضة على كل مسلم" (ابن ماجہ، ص: ۲۰ فضل العلماء)، یہ انہی اعمال کا

علم ہے جن پر نجات وکامیابی کا مدار ہے۔

(۳) اطاعت واتثال کا جذبہ پیدا کرنے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ حب نبی ان کے دلوں میں پیوست کی جائے، حضرت علیؓ سے مرفوعاً مروی ہے: "أدبوا أولادکم علی ثلاث خصال: حب نبیکم، وحب آله بیته، وتلاوة القرآن" (طبرانی بحوالہ تربیۃ الاولاد ۲/۶۸۱، ط: دارالسلام بیروت)، (اپنی اولاد کو تین باتوں کا ادب سکھاؤ: اپنے نبی سے محبت، آل نبی سے محبت اور تلاوت قرآن)۔

امام غزالی کا فرمان ہے: "الصبی أمانة عند والدیه، وقلبه الطاهر جوهرة نفیسة فإن عوّد الخیر وعلّمه نشأ علیه وسعد فی الدنیا والآخرة" (تربیۃ الاولاد ۲/۲۷۹، ط: دارالسلام بیروت) (بچہ والدین کے پاس امانت ہے، اس کا صاف ستھرا قلب قیمتی اور نفیس جوہر ہے، اگر خیر کا عادی بنادیا گیا اور اس کی تعلیم دی گئی تو اسی پر نشاۃ ہوگی اور دنیا وآخرت میں سعادت حاصل ہوگی)۔

(۴) اخلاق وآداب سے آراستہ کرنا بھی ایک والد کا فریضہ ہے، کیوں کہ بچپن کے اثرات دل ودماغ پر زندگی بھر چھائے رہتے ہیں، اگر بچپن میں ہی اخلاق کو پاکیزہ نہیں بنایا گیا تو بعد میں ان کو سنوارنا مشکل ضرور ہوتا ہے۔

لہذا کھانے پینے کے آداب، ملنے جلنے کا سلیقہ، آنے جانے کا ڈھنگ، اٹھنے بیٹھنے کا طریقہ، گفت وشنید کے آداب، ہنسی مذاق کا معیار، مبارکبادی وخوش آمدید کہنے کے آداب، عیادت وتعزیت حتی کہ چھینکنے وجمائی کے آداب تک سکھانا حقوق میں شامل ہے۔

نیز بتادینا کافی نہیں بلکہ عملی طور پر مشق کرانے سے اچھی طرح ذہن نشیں ہوگا، لہذا عملی تربیت بھی ضروری ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات میں جہاں علمی ہدایات ملتی ہیں عملی تربیت کا باب بھی بہت وسیع ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا: "مروا أولادکم بالصلاة وهم أبناء سبع سنین واضربوهم علیها وهم أبناء عشر وفرقوا بینهم فی المضاجع" (ابوداؤد ۱/۷۱، کتاب الصلاۃ، باب: متی یؤمر الغلام بالصلاۃ) (اپنی اولاد کو جب وہ سات سال کے ہوجائیں تو نماز کا حکم کرو، اور دس سال کے ہوجائیں تو نماز کے ترک پر مارو، اور فراش الگ کردو)۔

دس سال میں نماز چھوڑنے کا علم ایک باپ کو اس وقت ہوگا جبکہ وہ اس کے عمل کی نگہداشت رکھے گا، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ماتحت بچوں اور بچیوں کی تربیت اسی انداز میں فرمائی ہے۔

حضرت ابن عباسؓ کا مشہور واقعہ ہے، انہوں نے ایک شب اپنی خالہ حضرت میمونہ کے گھر گزاری ہے تاکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شب بیداری کی کیفیت کا مشاہدہ کرسکیں، اور جس طرح نبی کو کرتے دیکھیں اپنی زندگی کو اسی کے مطابق ڈھالیں، اس رات حضور نے جو اعمال کیے ان کا تفصیلی تذکرہ کرتے ہوئے ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نماز کے لئے کھڑے ہوئے تو میں آپ کی بائیں جانب کھڑا ہوگیا، تو حضور نے ان کی گوشمالی بھی کی اور سر پکڑ کر دائیں جانب کردیا (بخاری ۱/۱۱۸، کتاب الصلاۃ، باب وضوء الصبیان)۔

حضرت عمر بن ابی سلمہ جو کہ آپ کے ربیب ہیں، ان کو حضور نے جب دیکھا کہ کھانا بے ترتیبی سے کھا رہے ہیں تو تنبیہ فرمائی: "أدن بنی، فسم الله وکل بیمینك وکل مما یلیك" (ابوداؤد ۲/۵۳۰ کتاب الاطعمہ، باب الاکل بالیمین) (بیٹے قریب ہوجاؤ، بسم اللہ پڑھو، داہنے ہاتھ سے اور اپنے سامنے سے کھاؤ)۔

اسی طرح ایک بچی نے بغیر بسم اللہ کھانا کھانا شروع کردیا تو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا (ابوداؤد ۲/۵۲۹ کتاب الاطعمہ، باب التسمیہ علی الطعام)۔

اس طرح کے بہت سے واقعات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں تربیت کے باب میں ملتے ہیں جن سے ہم اس ذمہ داری کی اہمیت کو محسوس کرسکتے ہیں۔

(۲) بچوں کے لئے عصری تعلیم:

اسلام میں جس بنیادی تعلیم کو ضروری قرار دیا گیا ہے اس کا تعلق علم دین سے ہے جس سے مذہب پر چلنا آسان ہوجائے، اور آخرت کی منزل سہل ہوجائے، عصری تعلیم کی افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا، اس کے جواز بلکہ اس کے حصول کی جدوجہد کو نکارہ نہیں بن سکتا، نہ اسلام نے کبھی مخالفت کی ہے اور نہ ہی اسلام کے منشور میں داخل ہے، لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ یہ کسب معاش کا ذریعہ ہے، معاشی مقصد کے لئے حصول بڑی اچھی بات ہے مگر بچپن کا زمانہ جو اصل میں دل ودماغ کو سنوارنے کا اور ایک بڑے مقصد کے لئے ہموار کرنے کا زمانہ ہوتا ہے، اس وقت کا سکھایا ہوا پوری زندگی کے لئے نقش کالحجر

ثابت ہوتا ہے، لہذا زمانہ طفولت کی عمر گراں مایہ کو حقیقی علم میں لگانا ضروری ہے، اس سے بے بہرہ رکھ کر معاشی تگ ودو کے لئے تیار کرنا بالکل نامناسب رویہ بلکہ ایمان واسلام کے لئے مہلک ومضر بھی ہے، اس لئے ناقص رائے میں ماں باپ کی ذمہ داری کی بجائے بالغ ہونے کے بعد خود اس کی اپنی ذمہ داری پر چھوڑنا ہی زیادہ مناسب ہوگا۔

گارجین باپ پر تعلیم کی بابت یہ فریضہ عائد ہوتا ہے کہ بچپن ختم ہوتے ہی ایک بچہ پر کیا واجبات عائد ہوتے ہیں، مثلاً نماز کی فرضیت، طہارت کی فرضیت، غسل کا وجوب، روزے کی فرضیت اس بابت اتنی تعلیم بچپن میں ہونا ضروری ہے کہ بالغ ہونے پر وہ خود کفیل ہو، کسی کی شدید حاجت باقی نہ رہے۔

(۳) حکومت کی طرف سے جبری قانون:

زندگی گزارنے کے لئے جن امور کی ضرورت ہوتی ہے، ان کی افادیت اپنی جگہ مگر بنیادی ضرورت کے بقدر شرعی علوم کے حصول کے بعد بلکہ یوں کہا جائے تو بجا ہوگا کہ ایک طبقہ کم از کم اعلی علوم کے حصول میں مشغول رہ سکیں جو کہ فرض کفایہ کے درجے میں ہیں۔

اگر حکومت کی طرف سے عصری تعلیم پر مجبور کیا جاتا ہے تو چوں کہ "فرض عین" علم حاصل کیا جا چکا ہے، اور فرض کفایہ کے حصول میں ایک گروہ مشغول ہے اب باقی لوگوں کے لئے حصول وعدم حصول دونوں ہی مباح ہیں، ادھر قانون نے جن امور کو حاصل کرنے کے لئے مجبور کیا ہے وہ معصیت نہیں ہے، لہذا ایسے وقت وہ عصری علم لازم وضروری ہو جائے گا، لیکن عملاً یہ ممکن نظر نہیں آتا کہ حکومت کی جبری تعلیم کو لازم کیا جائے تو دین کی بنیادی تعلیم جو فرض عین ہے، اور نہائی تعلیم جو کہ فرض کفایہ ہے حاصل کرنے والے افراد بھی ملیں گے، اس لئے ایسے قانون کو ماننے سے شریعت کے حکم کی خلاف ورزی ہوتی ہے، لہذا اس قانون کو ماننا بھی لازم نہیں۔

(۴) جنسی تعلیم:

جنسی آگاہی سیکھنے سکھانے پر موقوف نہیں؛ بلکہ دوسرے طبعی امور کی طرح انسان کی فطرت میں ودیعت کر دیا گیا ہے، اس منزل پر پہنچ کر خود ہی ادراک ہو جاتا ہے، لہذا صنفی امور کو آشکارا کرنا بالخصوص بچوں اور بچیوں کو اس سے آشنا کرنا، نہ یہ کہ اسلام کے خلاف ہے، بلکہ اخلاقی اقدار کے لئے سم قاتل ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم تو یہ ہے کہ جب بچے اور بچیاں دس سال کے ہو جائیں تو بستر الگ کر دو، کیوں کہ اب صنفی شدبد ہونے والی ہے، آج دنیا اخلاقی قدروں کی جس گراوٹ کو بھگت رہی ہے ایسے ہی امور کی دین ہے، حیاء سوزی کا ایسا ننگا ناچ کھیلا گیا کہ انسان وجانور کا فرق تک اٹھتا جا رہا ہے، حیا کا بیش بہا پاکیزہ خزانہ تقریباً نذر آتش ہو چکا ہے، خاکستر میں دبی چنگاری پر پانی ڈالنے کے مترادف ہوگا کہ جنسی تعلیم کی حوصلہ افزائی کی جائے۔

محور (ج): بچپن کی شادی اور اسلامی ہدایات:

اسلام میں جس طرح بڑوں کی شادی جائز ہے، اسی طرح بچوں کی شادی بھی جائز ہے، لیکن بچے ایجاب وقبول نہیں کر سکتے، اس لئے اس کی طرف سے ولی ایجاب وقبول کرے گا، اولیاء اگر باپ دادا ہیں تب تو ولایت اجبار حاصل ہوگی، یعنی خواہ نابالغ راضی ہو یا نہ ہو ہر صورت میں نکاح منعقد ہو جائے گا حتی کہ بالغ ہونے کے بعد بھی اس کو فسخ نہیں کیا جا سکتا ہے۔

"وللولی إنكاح الصغير والصغيرة جبراً ولو ثيباً، ولزم النكاح ولو بغبن فاحش أو زوجها بغير كفؤ إن كان الولی أباً أو جداً" (درمختار علی ردالمحتار ۲/ ۳۳۰ کتاب النکاح، رشیدیہ پاکستان) (ولی کو صغیر وصغیرہ کا خواہ ثیبہ ہی ہو جبراً نکاح کرانا جائز ہے، نکاح لازم ہوگا، اگرچہ غبن فاحش کے ساتھ نکاح کیا ہو یا غیر کفو میں ہوا ہو اگر ولی باپ یا دادا ہے)۔

صرف شرط اتنی ہے کہ ولی مجبر "سوء اختیار" میں مشہور ومعروف نہ ہو۔

البتہ باپ دادا کے علاوہ کسی دوسرے نے نکاح کرایا ہے تو نکاح صحیح ہوگا بشرطیکہ غیر کفو میں نہ ہو اور غبن فاحش کے ساتھ نہ ہو، مگر لازم نہیں ہوگا بلکہ بلوغ کے بعد خیار فسخ حاصل ہوگا (درمختار علی ردالمحتار ۲/ ۳۳۱ کتاب النکاح، رشیدیہ پاکستان)۔

امام شافعیؒ کے نزدیک صغیرہ اگر باکرہ ہے تب تو ولی کو نکاح کرنے کی اجازت ہے بلکہ ولایت اجبار ہے، لیکن وہ ثیبہ ہے تو اس کی رضا سے نکاح ہوگا اور صغیرہ کا اذن معتبر ہے نہیں، اس لئے کوئی بھی نہیں کرا سکتا (الفقہ المنہجی ۲/ ۶۴)۔

حضرت عائشہ صدیقہؓ کا نکاح بھی صغرسنی میں ہوا، بعض علماء نے فرمایا کہ یہ رسول اللہ ﷺ کی خصوصیات میں سے ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ حکم عام ہے، قدامہ بن مظعون نے حضرت زبیر کی لڑکی سے اس دن نکاح کیا جس دن وہ پیدا ہوئی، صحابہ کے علم میں یہ بات تھی مگر کسی نے انکار نہیں کیا، ابن ہمام نے '' واللائی لم یحضن '' سے بھی نکاح صغیر پر استدلال کیا کہ صغیرہ کے لئے عدت کا اثبات اس بات کی دلیل ہے کہ اس سے نکاح ہو سکتا ہے، یہی وجہ ہے کہ علامہ نووی نے اجماع نقل کیا ہے (مرقاۃ ۶/ ۲۶۱ کتاب النکاح، باب الولی فی النکاح واستئذ ان المرأۃ، الفصل الاول)۔

بچپن کی شادی کے بعد جو مفاسد و مضار بیان کئے جاتے ہیں یقینا قابل توجہ ہیں، مگر فقہاء نے ان کو بھی حاصل کیا ہے اور یہ کہ یہ مفاسد وطی کی وجہ سے لازم آتے ہیں، اگر عورت وطی کی متحمل نہیں، یا کسی مضرت یا مفسدہ کا خطرہ ہے تو وطی کرنا جائز نہیں ہے، عالمگیری میں ہے:

'' صغیرہ کے دخول کے وقت کے سلسلہ میں کہا گیا ہے کہ جب تک بالغ نہ ہو دخول نہیں کرے گا، اور کہا گیا ہے کہ جب نو سال کی ہو جائے تو دخول کرے گا، اسی طرح بحر میں ہے، اور اکثر مشائخ فرماتے ہیں، اس سلسلہ میں سال کا اعتبار نہیں، اعتبار طاقت کا ہے، اگر فربہ و سمین ہے، مردوں کی طاقت ہے، اس سے مرض کا خوف نہیں ہے تو شوہر کے لئے جائز ہے کہ دخول کرے چاہے نو سال کی نہ ہو'' (عالمگیری ۱/ ۲۸۷، کتاب النکاح، الباب الرابع فی الاولیاء)۔

اس سے معلوم ہوا کہ اگر مضرت و مفسدہ کا خطرہ ہے تو نکاح کی اجازت ہوگی، وطی کی اجازت نہیں ہوگی، البتہ صحابہ کے دور میں معمول کی شادی جو ہوتی تھی وہ بلوغ کے بعد ہی ہوتی تھی، اس لحاظ سے بعد البلوغ ہی نکاح کرنا بہتر و افضل ہوگا۔

محور (د): (ا) بچہ مزدوری:

بچپن کا زمانہ حصول تعلیم کے لئے نہایت ہی موزوں وقت ہے، اس لئے تعلیم و تربیت کو زمانہ طفولیت میں کافی اہمیت سے دیکھا گیا ہے، رسول اللہ ﷺ کی مجلسوں میں صحابہ کا اپنے بچوں کو لے کر جانا بہت سی روایات میں موجود ہے، امام بخاری نے بھی اپنی صحیح میں ایک باب قائم فرمایا ہے، ''باب متی یصح سماع الصغیر''، اور اس میں محمود بن الربیع اور حضرت ابن عباسؓ کے تحصیل علم کا تذکرہ کیا ہے (بخاری ۱/ ۱۷ کتاب العلم)۔

اس لئے والد کا فرض منصبی ہے کہ اپنی اولاد کی بچپن میں ہی تعلیم و تربیت کریں، اگر والد بے روزگار ہے یا کسب معاش کی صلاحیت نہیں ہے، نیز کوئی دوسرا قریبی رشتہ دار بھی نہیں ہے تو لوگوں سے مانگ کر اپنے بچوں کی پرورش کرے۔

'' الرابع أن یکونوا فقراء وهم صغار أو كبار عاجزون والأب أيضاً عاجز عن الكسب فالخصاف قال: يتكفف الناس وينفق عليهم '' (فتح القدیر ۴/ ۴۱۷ کتاب النفقات، ط: زکریا)۔

(چوتھی صورت یہ کہ آباء فقیر ہیں اور اولاد صغیر السن ہیں یا بڑے ہیں مگر عاجز ہیں، باپ بھی کسب نہیں کر سکتا ہے تو خصاف نے کہا کہ لوگوں کے سامنے دست سوال دراز کرے اور اپنے بچوں پر خرچ کرے)۔

لیکن قریبی رشتہ دار ہے تو پھر نفقہ قریبی رشتہ دار پر آئے گا:

'' ذخیرہ میں ہے: اگر فقیر کی چھوٹی اولاد ہیں اور مالدار دادا ہے، تو دادا کو خرچ کرنے کا حکم دیا جائے گا، پوتے کی حفاظت کے لئے، نیز وہ والد پر دین ہوگا، ایسا ہی قدوری میں ہے، تو باپ کی تنگ حالی کے وقت دادا پر نفقہ واجب نہیں کیا، یہ حسن بن صالح کا قول ہے۔

صحیح یہ ہے کہ فقیر باپ استحقاق نفقہ میں میت کے حکم میں ہے، اور اگر باپ اپاہج ہے تو دادا پر بالاتفاق فیصلہ کیا جائے گا، اس لئے کہ باپ کا نفقہ اس وقت دادا پر ہے، اسی طرح بچوں کا نفقہ بھی'' (شامی ۲/ ۷۳۱ کتاب النفقہ، الکلام علی نفقۃ الاقارب، ط: رشیدیہ پاکستان)۔

اور اگر باپ کسب کر سکتا ہے تو کسب کرے گا اور اس سے بچوں کو کھلائے گا۔

''وإن كان قادراً على الكسب اكتسب، فإن امتنع عن الكسب حبس بخلاف سائر الديون'' (فتح القدیر ۴/ ۴۱۷ کتاب النفقات، ط: زکریا دیوبند) (اور اگر باپ کسب پر قادر ہے تو کسب کرے گا اور اگر کسب سے انکار کرے تو محبوس کر دیا جائے گا دیگر دیون کے برخلاف)۔

اس لئے اسلام کا اصل موقف بچہ مزدوری کے خلاف معلوم ہوتا ہے۔

(۲) نابالغ بچوں سے گھریلو خدمت، مزدوری کروانا، یا کوئی پیشہ سکھانا:

البتہ بچوں سے گھر کا کام بھی لیا جاسکتا ہے، کیوں کہ یہ بھی تربیت کا ایک حصہ ہے، لیکن بچہ کا ہر عضو بھی نازک ہے، اتنا بار نہ ڈالا جائے جس سے اس کو کوئی جسمانی نقصان ہو، یا دل و دماغ متاثر ہو، یہ وقت دل و دماغ کو تعلیم و تربیت کے لئے فارغ کرنے کا ہے، حضور علیہ السلام نے غلاموں کی بابت جو حکم دیا ہے اس کو ہم اس باب میں بھی مشعل راہ بنا سکتے ہیں:

"ولا تكلفوا ما يغلبهم فإن كلفتموهم ما يغلبهم فأعينوهم" (بخاری ۱/۳۴۶ کتاب العتق، باب قول النبی العبید اخوانکم الخ) (اور ان کو ایسے کام کا حکم نہ دو جوان پر غالب آجائے، اگر غالب آنے والے امر کا مکلف کرتے ہو تو تم بھی ان کی اعانت کرو)۔

لیکن تربیت کی غرض سے ایسے کام کے لینے کی اجازت ہوگی جس کا بوجھ وہ برداشت کرسکیں، حتی کہ اگر اولیاء مزدوری بھی کروانا چاہے تو اس کی بھی گنجائش معلوم ہوتی ہے۔

"جب باپ یا جد، اور خانیہ میں ہے دادا۔ کسی کام کے لئے مزدوری کروائے تو جائز ہے، ان کی موجودگی میں دوسرے کے لئے مزدوری کروانا جائز نہیں ہے، اگر ان میں کا کوئی نہ ہو، پس اس کے ذورحم محرم کارجین نے مزدوری کروائی تو تربیت وریاضت کے طریق پر جائز ہے" (تاتارخانیہ ۱۵/۹۰ کتاب الاجارہ، الفصل الحادی عشر، اجارۃ الصبی، ط: زکریا)۔

اگر پیشہ ورانہ کام ہو تو اور بھی بہتر ہے، اس لئے کہ مزدوری کے ساتھ ایک ہنر کی تحصیل بھی ہوگی جو بعد کی زندگی میں اسی کو کام آئے گا، بلکہ ایسے ہنر کے لئے تو بچوں کو بھی لگایا جاسکتا ہے جبکہ عام طور پر بچیوں کو مزدوری پر لگانے سے منع کیا جاتا ہے، مندرجہ ذیل مسئلہ کو نظیر کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے:

"اگر بچہ کمانے کی عمر کو پہنچ گیا تو باپ اس سے مزدوری کرواسکتا ہے، یا کسی پیشہ کے لئے اس کو دے سکتا ہے تاکہ کموائے اور اس کی کمائی سے اس پر خرچ کرے، اگر وہ مذکر ہے برخلاف مونث کے، خیر الدین رملی فرماتے ہیں: اگر لڑکی سلائی یا سوت کاتنے کے ذریعہ مستغنی ہوسکتی ہے تو اس کا نفقہ اس کی کمائی سے واجب ہوگا، جیسا کہ ظاہر ہے، مگر میں نے اپنے فقہاء کے یہاں یہ نہیں پایا، لیکن یہ بات "بخلاف الانثیٰ" کے منافی نہیں ہے، اس لئے کہ ممنوع اس کو مزدوری پر دینا ہے، اس سے یہ لازم نہیں آتا ہے کہ کوئی پیشہ جس کو وہ سیکھے لازم نہ ہو، یعنی خدمت وغیرہ جس میں لڑکی کو مستاجر کے حوالہ کرنا ہے، اجرت پر دینا ممنوع ہے، اس لئے کہ (ممانعت کی) دلیل یہ ہے کہ مستاجر کا اس بچی سے تنہائی ہوسکتی ہے، اور یہ شریعت میں جائز نہیں، پس اس کے لئے جائز ہے کہ کسی ایسی عورت کے حوالہ کرے جو اس کو کوئی پیشہ کڑھائی، سلائی وغیرہ سکھائے" (الدر مع رد المحتار ۳/۶۲۸ کتاب النفقات، مطلب: الصغیر المکتسب نفقتہ فی کسبہ)۔

(۳) نابالغ بچوں کو ضرورت کے وقت کام پر لگانا:

اصل تو یہی ہے کہ غریب و نادار والدین کا نفقہ ان کے قریبی رشتہ دار پر واجب ہے، بچہ کا بچہ ہونا ہی محتاج ہونے کی دلیل ہے، اس لئے بچہ پر ایسی ذمہ داری نہیں ڈالی گئی ہے، اگر قریبی رشتہ دار بھی فقیر و محتاج ہیں یا نفقہ دینے کے لئے تیار نہیں تو حکومت کفیل ہوتی ہے، مگر حکومت بھی اس کی کفالت نہیں کرتی یا خود بھی کسب کی صلاحیت نہیں ہے تو بچوں کو ایسی مزدوری پر لگایا جاسکتا ہے جوان پر گراں بار نہ ہو، اس کی کمائی سے خود اس کا بھی تکفل ہوگا اور نادار ماں باپ کا بھی، تاتارخانیہ میں ہے:

"الأم إذا احتاجت أو الأب كذلك جاز أن يصرف إليهما من هذا الكسب مقدار حاجتهما، وفي الخانية: وإن كان للصغير أم بانت من زوجها واحتاجت إلى النفقة كان لها أن تأكل من كسب ولدها صغيراً كان الولد أو كبيراً" (تاتارخانیہ ۵/۴۱۹ کتاب النفقات، الفصل الثالث: نفقۃ ذوی الارحام) (والدین جب محتاج ہوں تو جائز ہے کہ اس (بچہ) کے کسب سے ان دونوں کو بقدر حاجت دیا جائے، خانیہ میں ہے: اگر صغیر کی ماں اپنے شوہر سے بائنہ ہوئی اور نفقہ کی محتاج ہے تو اس کے لئے جائز ہے کہ اپنے بچہ کے کسب سے کھائے بچہ چھوٹا ہو یا بڑا)۔

محور (ہ): نابالغ کے جرائم:

اسلام نے انسانی معاشرے میں جان و مال، عزت و آبرو اور عقل و خرد کی حفاظت کو بنیادی مقاصد میں شمار کیا ہے، ان میں سے کسی کے متاثر ہونے کا خطرہ

بھی ہوا تو اس کا سد باب کر دیا گیا، اس لئے ایسے جرائم کی اسلام میں سخت سے سخت سزائیں تجویز کی گئیں، لہذا جان کو ضائع کرنے پر قصاص و دیت، عزت و آبرو کو خاک آلود کرنے پر اسی کوڑوں کی شکل میں حد قذف، عقل وخرد میں بگاڑ والے عمل کرنے پر حد شرب، اور مال کی حرمت کو برباد کرنے پر حد سرقہ جیسی سزائیں مقرر ہیں، حدود کا معاملہ تو اتنا سخت ہے کہ شفاعت کو بھی اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کہہ کر ٹھکرا دیا "أتشفع فی حد من حدود الله" لیکن یہ سب اس وقت ہے جبکہ مکلف کی طرف سے صادر ہوں، اگر غیر مکلف ہے جیسے مجنون یا نابالغ تو پھر یہ دونوں صنف، ان سزاؤں کی متحمل نہیں ہیں۔

"خرج بالتكليف الصبي والمجنون لأن القطع عقوبة وهما ليسا من أهلها" (البحر الرائق ۵ر ۸۴، زکریا دیوبند) (بچہ اور مجنون مکلف ہونے سے خارج ہیں، اس لئے کہ قطع ید ایک سزا ہے اور یہ دونوں اہل عقوبت میں سے نہیں ہیں)۔

لہذا بچہ نے اگر قتل کا ارتکاب کیا خواہ وہ قتل عمد ہی کیوں نہ ہو جمہور کے نزدیک اس پر قصاص نہیں ہوتا ہے، بلکہ اس کے عاقلہ پر دیت آتی ہے: "عمد الصبي والمجنون خطأ وفيه الدية على العاقلة" (ہدایہ ۴ر ۵۹۴ کتاب الدیات) (بچہ اور مجنون کا عمد، خطا ہے، اس میں عاقلہ پر دیت ہوگی)۔

یہی حکم حضرت امام شافعی کے نزدیک بھی ہے مگر تھوڑی تفصیل کرتے ہیں: اگر باشعور بچہ ہے تب تو اس کے مال میں ہی دیت واجب ہوگی، لیکن ناسمجھ ہے تب عاقلہ کے مال میں واجب ہے:

''قال الشافعية: الأظهر أن عمد الصبي عمد إذا كان مميزاً وإن لم يكن له تمييز فهو خطأ قطعاً، أي: أنه سواء أكان مميزاً أم غير مميز لا قصاص عليه لعدم تكليفه بالحلال والحرام شرعاً لكن تجب الدية في ماله ولا تتحملها عنه عاقلته إذا كان مميزاً'' (الفقه الاسلامي وادلته ۷۔ ۵۷۱۴ باب الجنايات وعقوباتها)۔

(شافعیہ نے کہا: اظہر یہ ہے کہ بچے کا عمد، عمد ہے، جبکہ ممیز ہو، اگر تمیز نہیں ہے تو یقینا خطاء ہے، یعنی خواہ ممیز ہو یا نہ ہو قصاص اس پر نہیں ہے، اس لئے کہ حلال وحرام کا شرعاً مکلف نہیں ہے، لیکن اس کے مال میں دیت واجب ہوگی، اس کو اس کا عاقلہ برداشت نہیں کرے گا جبکہ ممیز ہو)۔

غارت گری، وڈاکہ زنی جس کو قطع الطریق اور محاربہ کہا جاتا ہے، اسلام میں یہ جرم تو چوری سے بھی زیادہ خطرناک ہے، اس میں دن دہاڑے ڈرایا دھمکایا جاتا ہے، کبھی مال بھی لوٹا جاتا ہے اور کبھی جان بھی لی جاتی ہے، اس لئے اس کی سزا بھی سخت رکھی گئی ہے، حتی کہ قتل اور سولی بھی بعض صورتوں میں دی جائے گی، سورہ مائدہ میں قرآن کریم نے اس سزا کا ذکر کیا ہے، یہ سزا بھی حق اللہ ہے، لہذا کوئی معاف نہیں کرسکتا، لیکن کوئی بچہ ڈاکہ زنوں کے ساتھ ڈاکہ زنی میں شریک ہو تو صرف اس بچہ کی وجہ سے سب کی سزا معاف ہو جاتی ہے، اور حق اللہ سے حق العبد ہو جاتا ہے، اب مرنے والے کے سرپرستوں کو حق ہے کہ معاف کرنے یا قصاص یا دیت پر اکتفا کرے، مگر بچہ ہے تو اس کو قصاصاً قتل نہیں کیا جاسکتا ہے۔

''إن كان من القطاع صبي أو مجنون أو ذو رحم محرم من المقطوع عليه سقط الحد عن الباقين وإذا سقط الحد صار القتل إلى الأولياء فإن شاؤوا قتلوا وإن شاؤوا عفوا'' (ہدایہ ۲ر ۵۵۷ باب قطع الطریق) (اگر ڈاکوؤں میں سے کوئی بچہ ہے یا مجنون ہے یا مقطوع علیہ کا کوئی ذورحم محرم ہے تو حد باقی لوگوں سے ساقط ہو جائے گی، اور جب حد ساقط ہوئی تو اولیاء کو قتل کا اختیار ہے، چاہے تو قتل کرے یا چاہے تو معاف کرے)۔

البتہ جمہور: مالکیہ وشافعیہ وحنابلہ کے نزدیک اگر بچہ دوسرے ڈاکوؤں کے ساتھ ہے تو دوسروں سے حد ساقط نہیں ہوگی، لیکن بچہ سے تو ہر حال میں ساقط ہوگی، اس کے مال میں ضمان واجب ہوگا (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۷ر ۵۴۶۷ باب قطع الطریق)۔

اسی طرح چوری کرنا بھی اسلام میں جرم ہے، جس میں ایک طرف حق اللہ کو پامال کرنا ہے تو دوسری طرف مال کو ضائع کرنا ہے، اس پر بھی اسلام میں سزا مقرر ہے لیکن خواہ چوری ہو یا دوسرے زنا جیسے گھنونے جرائم شریعت میں مقرر سزا مکلف پر ہی جاری کی جائے گی، بچہ مکلف نہیں ہے، اس لئے وہ سزا تو جاری نہیں ہوسکتی۔

لیکن بڑھتے جرائم کی روک تھام بھی ضروری ہے ورنہ دنیا فتنہ وفساد سے لبریز ہو جائے گی، اس لئے سرپرستوں کی ذمہ داری ہے کہ مناسب سرزنش کرے، یہ بچوں کے حق میں بھی بھلا ہے، اس لئے کہ یہی بچے بڑے ہوں گے، اپنی فطرت کی بنا پر پھر جرائم کا ارتکاب کریں گے اور نتیجۃً ان پر سزائیں جاری کی جائیں گی۔

"وإنما يؤدب أي: يجب على من تولى أمور الناس أن يؤدبه لأجل إصلاح حاله" (روضۃ الطالبین ۱۰ر ۵۹۳ طبع بیروت ۱۴۱۲ھ) (حاکم پر واجب

ہے کہ اصلاح حال کی خاطر تادیب کریں)۔

بلکہ مناسب سمجھیں تو جیل بھی بھیجا جا سکتا ہے، صرف اتنا متحقق ہو جائے کہ بچوں کی طرف سے یہ قصداً ہوا ہے، محض غلطی اور ناسمجھی میں انہوں نے نہیں کیا ہے۔

''لا يحبس الصبي إلا بطريق التأديب لئلا يتجاسر إلى مثله إذا باشر شيئاً من أسباب التعدي قصداً فلو خطأ فلا'' (شامی ۴/۳۸۵ کتاب القضاء، مطلب فی حبس الصبی، ط: رشیدیہ پاکستان) (بچہ کو بطور تادیب محبوس کیا جا سکتا ہے تاکہ دوبارہ اس طرح کی حرکت کرنے کی جرأت نہ کرے، جبکہ قصداً اس نے کسی سبب تعدی کا ارتکاب کیا ہو، اگر خطاً ہے تو محبوس نہیں کیا جا سکتا)۔

محور (و): نابالغ بچوں کی جیل:

بچے سخت مار پیٹ کے متحمل نہیں ہیں، شریعت نے تو مار پیٹ کی جتنی سزائیں تھیں وہ سب معاف کر دی ہے، بے جا تشدد اور سخت گیری سے مجرمانہ ذہن اور بھی سخت ہو جاتا ہے اور پھر اس کے اثرات بہت ہی مضر اور نقصان دہ ثابت ہوتے ہیں، وہی بچے جو جیل کی سلاخوں میں مار پیٹ کی مصیبت جھیل کر باہر نکلتے ہیں تو وہاں کی سختیوں کا بدلہ بے قصور انسانوں سے لیتے ہیں، اس لئے ایسی مار پیٹ جو آج جیلوں کا طرہ امتیاز بنا ہوا ہے بڑوں کے لئے مناسب نہیں چہ جائیکہ بچوں کے لئے روا ہو، جہاں تک ہو سکے نرم گفتار سے جرائم کے عواقب و نتائج ذہن نشین کرائے جائیں، ضرورت پڑنے پر ہلکی سرزنش بھی کی جا سکتی ہے جو تادیب تو ہو تعذیب نہ ہو۔

نیز ان سے بامشقت کام بھی نہیں لیا جا سکتا ہے جس سے ان کا جسمانی یا ذہنی ضرر ہو، بطور تادیب ایسے کام لیے جائیں جو ان کی صحت اور عمر و قوی کے مناسب ہو، اس سے زیادہ کا مکلف بنانا ظلم ہوگا، قید خانہ میں رکھنا ہی کم بڑی سزا نہیں ہے کہ مزید اور سزاؤں کا اضافہ کیا جائے، اگر اصلاح کی کوشش اور مناسب سرزنش کے ساتھ اس کی نگرانی کی جائے، تو انشاء اللہ جرائم کا سد باب بھی ہو سکتا ہے، ورنہ بچے جیل سے نکلتے رہیں گے اور داخل ہوتے رہیں گے اور جرائم کی صورت حال روز بگڑتی رہے گی۔

محور (ز): لاوارث بچوں کی بابت اسلامی ہدایات:

وہ بچے جو دانستہ یا نادانستہ اپنے خویش و اقارب سے بچھڑ گئے، خواہ کسی حادثہ میں والدین کے فوت ہونے کی وجہ سے، یا ولادت کے بعد پھینک دیئے جانے کی وجہ سے، بہر حال کسی نہ کسی وجہ سے بے سہارا ہو گئے، اب یا تو ان کا حسب و نسب معلوم ہے، یا معلوم نہیں کہ کون ہے کہاں کا ہے، اگر حسب و نسب معلوم ہے تو اس کی پرورش ایسے لوگوں سے کرائی جائے گی جو کہ ان کے کسی نہ کسی درجے میں رشتہ دار ہوں خواہ وہ دور کے ہی ہوں، کیوں کہ پرورش کا مدار شفقت و محبت پر ہے، کسی اجنبی کے مقابلہ میں رشتہ دار زیادہ بہتر طریقے سے پرورش کر سکتا ہے بشرطیکہ کسی ضرر کا اندیشہ نہ ہو، اور اگر ضرر کا خدشہ ہے تو سماج پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ پرورش کے لئے ایسے آدمی کا انتخاب کرے جو اس بے سہارا بچے کے حق میں خیر خواہ ہو، البتہ نفقہ وغیرہ کی ذمہ داری اگر کوئی رشتہ دار وارث نہیں ہے تو حکومت پر آئے گی، خلافت راشدہ میں خاص طور پر دور فاروقی میں ہر محتاج کا نفقہ بیت المال سے جاری کیا جاتا رہا ہے، اسی لئے لقیط کا مسئلہ بیان کرتے ہوئے فقہاء لکھتے ہیں:

''نفقته في بيت المال هو المروي عن عمر وعلي، ولأنه مسلم عاجز عن التكسب ولا مال له ولا قرابة فأشبه المقعد الذي لا مال له'' (ہدایہ ۲/۶۱۱، کتاب اللقیط) (لقیط کا نفقہ بیت المال میں ہوگا یہی حضرت عمر اور حضرت علی سے مروی ہے، نیز اس لئے کہ مسلمان ہے کسب معاش سے عاجز ہے، نہ اس کے پاس مال ہے نہ قرابت پس اپاہج کے مشابہ ہوا جس کے پاس مال نہ ہو)۔

اگر بے سہارا بچہ کہیں پڑا ہوا ہے، معلوم نہیں اس کا وارث کون ہے، تو اگر ظن غالب ہو کہ اگر اس کو اٹھایا نہیں جائے تو ہلاک ہو جائے گا، نیز وہ عام شاہراہ پر ہے جس پر ہر شخص کی نگاہ پڑ سکتی ہے، تو اٹھانا اور حفاظت کرنا فرض کفایہ ہوگا، لیکن وہ بچہ ایسی جگہ پڑا ہے جہاں کسی کی نظر نہیں پڑ سکتی مثلاً کسی گلی میں پھینکا ہوا ہے، اب اس کو پانے والا نہ اٹھائے تو اس کی ہلاکت یقینی ہوگی تو ایسی صورت میں اس کو اٹھانا فرض عین ہو جائے گا، ورنہ عام حالات میں مندوب و مستحب ہوگا۔

''التقاطه فرض كفاية إن غلب على ظنه هلاكه لو لم يرفعه ولو لم يعلم به غيره ففرض عين وإلا مندوب لما فيه من الشفقة والإحياء'' (درمختار علی رد المحتار ۳/۳۴۴ کتاب اللقیط)۔

جب ایک مرتبہ اس کو اٹھالیا تو اب کو پھینک دینا جائز نہیں ہے:

''وينبغي أن يحرم طرحه بعد التقاطه لأنه وجب عليه بعد التقاطه حفظه فلايملك رده إلى ما كان عليه''
(شامی ۳ / ۳۴۴ کتاب الملقیط)۔

ایسے بچوں کا نان ونفقہ بھی حکومت وقت کے ذمہ ہوگا۔ ایسے لاوارث بچے کو حتی الامکان مسلمان اور آزاد سمجھا جائے گا، لہذا:

(۱) مسلمانوں کی آبادی میں پایا جانے والا بچہ اگر پانے والا بھی مسلمان ہے تب تو وہ مسلمان ہی سمجھا جائے گا۔

(۲) اگر آبادی کفار کی ہے، پانے والا بھی کافر ہے تب تو اس کو غیر مسلم سمجھا جائے گا۔

(۳) مسلمانوں کی آبادی میں کافر نے پایا۔

(۴) کافروں کے مقامات پر مسلمان نے پایا، ان دونوں صورتوں میں دونوں ہی قول ہیں جن لوگوں نے واجد کا اعتبار کیا انہوں تیسری صورت میں کافر کہا اور چوتھی صورت میں مسلمان قرار دیا، اور جنہوں نے آبادی کا لحاظ کیا تو انہوں نے تیسری صورت میں مسلمان قرار دیا اور چوتھی صورت میں کافر گردانا، البتہ دونوں ہی آبادی ملی جلی ہے اور پانے والا مسلمان ہے تو بھی اس کو مسلمان قرار دیا جائے گا (فتاوی تاتارخانیہ ۷ / ۴۰۱، ۴۰۲ کتاب الملقیط)۔

اس کی پرورش ملتقط کے ذمہ ہے، مگر تعلیم وتربیت، شادی بیاہ اور دیگر اخراجات حکومت کی ذمہ داری ہے، کیوں کہ ایسے بچوں کی ولایت حاکم وقت کو ہوتی ہے، ایسے بچوں کی میراث بھی بیت المال میں ہی جمع ہوتی ہے، اگر کوئی جرم سرزد ہو جائے تو اس کی دیت یا مالی ہرجانہ حکومت پر عائد ہوتی ہے اگر حکومت اپنے مفوضہ امور کو انجام نہیں دیتی ہے تو سماج کو چاہئے کہ ایک بچہ کو دین ودنیا کی مضرتوں سے بچانے کے لئے فکر مند ہو، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مشہور حدیث کا مصداق بننے کے لئے کوشاں ہو۔ ''أنا وكافل اليتيم كهاتين في الجنة'' (میں اور یتیم کی پرورش کرنے والا دو انگلیوں کے قرب کی طرح جنت میں ہوں گے)

محور (ح): بچوں کی خرید وفروخت اور گود لینا:

آزاد بچوں کی چوری اور اس کی خرید وفروخت مذہب بیزاری اور اخلاقی قدروں سے محرومی کا خمیازہ ہے، ایک حدیث قدسی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شدید وعید فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا:

''ثلاثة أنا خصمهم يوم القيامة، رجل أعطى بي ثم غدر، ورجل باع حرا فأكل ثمنه، ورجل استأجر أجيراً فاستوفى منه ولم يعطه أجره'' (بخاری ۱ / ۲۹۷ کتاب البیوع، باب اثم من باع حرا) (میں روز قیامت تین شخص کا فریق ہوں گا، ایک وہ شخص جو میرا نام لے کر عہد وپیمان کیا پھر دھوکہ دیا، دوسرا شخص جس نے کسی آزاد کو بیچ دیا پھر اس کی قیمت کو کھایا، تیسرا وہ شخص جو کہ مزدور سے کام مکمل کروا دیا اور مزدوری اس کو نہیں دی)۔

لہذا بچوں کی خرید وفروخت خواہ چوری وڈاکہ زنی کر کے ہو یا بخوشی وبرضا ورغبت اس کی قطعاً اجازت نہیں ہوگی، بچوں کو گود لینے کا رواج زمانہ جاہلیت میں رہا ہے، جس کو گود لیا جاتا تھا اس کو متبنی یعنی لے پالک کہا جاتا تھا، ایسا بچہ مکمل طور پر نسبی بیٹا سمجھا جاتا تھا، اس کی نسبت بھی اسی گود لینے والے کی طرف ہوتی، اس کی بیوی، بہو کے درجے میں ہوتی اور اس سے شادی بیاہ ممنوع سمجھا جاتا تھا، اسلام نے جاہلیت کے اس طرز عمل پر قدغن لگاتے ہوئے ''ادعوهم لآبائهم'' نازل کیا، اور عملی طور پر حضرت زید بن ثابت جو کہ زمانہ جاہلیت میں آپ کے متبنی تھے ان کی زوجہ محترمہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حرم میں داخل کروا اس طرز فکر کی مکمل تردید کردی گئی، اس لئے اسلام میں گود لینے کو کوئی قانونی حیثیت نہیں ہوسکتی۔

البتہ مفلس ونادار والدین سے بوجھ کم کرنے کی نیت سے یا کسی یتیم کی پرورش کی نیت سے اپنی کفالت میں داخل کر اور اس کے ساتھ حسن سلوک کا معاملہ کرنا یہ بہت اچھی بات ہے، خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چچا ابوطالب سے حضرت علیؓ کو کم سنی میں ہی پرورش کے لئے لے لیا تھا، ایسے ہی لوگوں کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مژدہ ہے: ''أنا وكافل اليتيم في الجنة كهاتين'' (میں اور یتیم کی کفالت کرنے والا جنت میں ان دونوں انگلیوں کی طرح قریب ہوں گے)۔

اسی طرح بے اولاد جوڑے اولاد کی خواہش کو پورا کرنے کے لئے کسی بچہ کو گود لیتے ہیں تو شاید حرج نہیں ہوگا، اگر گود لینے والا بطور تحفہ ان کے حقیقی والدین کو دیں تو بھی حرج معلوم نہیں ہوتا، بشرطیکہ کوئی دباؤ نہ ہو۔

محور (ط): ذہنی وجسمانی طور پر معذور بچوں کا علاج ومعالجہ:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''ما أنزل الله داء إلا أنزل له شفاء'' (بخاری ۲/۸۴۸ کتاب الطب) (اللہ نے ہر مرض کے لئے شفا نازل کیا ہے)

یہ الگ بات ہے کہ بعض کو انسان جانتا ہے تو علاج کراتا ہے اور بعض ایسے امراض ہوتے ہیں جنہیں نہ جاننے کی وجہ سے لاعلاج سمجھا جاتا ہے، نسائی شریف کی ایک روایت میں اسی کی طرف اشارہ ہے:

"علمه من علمه، جهله من جهله" (فتح الباری ۱۰/۱۶۷) (جس نے جانا تو اس نے جانا، اور جو ناواقف رہا وہ ناواقف رہا)۔

اس لئے کبھی مرض کو لاعلاج سمجھ کر چھوڑنا بالخصوص وہ مرض جب بچوں کو لاحق ہو مناسب نہیں ہے، اس اعتقاد کے ساتھ کہ یہ ایک سبب ہے، اگر اللہ کا حکم ہوجائے تو بیڑا پار لگ جائے، علاج ومعالجہ کو اختیار کرنے کی ترغیب دی جائے گی، مسلم شریف میں ہے:

"لکل داء دواء فإذا أصيب الدواء الداء برأ بإذن الله تعالى" (فتح الباری ۱۰/۱۶۷) (ہر مرض کی دوا ہے، جب دوا مرض پر پہنچتی ہے تو اللہ کے حکم سے شفایاب ہوتا ہے)۔

لیکن علاج کرانا ایک سبب کے درجہ میں ہے، فقہاء نے اس سبب کو اسباب مظنونہ میں شمار کیا ہے اور سبب مظنون کو اختیار کرنا مباح ہے، زیادہ سے زیادہ بہتر ہوسکتا ہے، واجب نہیں کہا جاسکتا (عالمگیری ۵/۲۵۵ کتاب الکراہیہ، باب التداوی)۔

سبب قطعی جیسے کھانا پینا اور سبب ظنی جیسے علاج ومعالجہ کے مابین فرق بیان کرتے ہوئے عالمگیری میں ہے:

''فرق بين هذا وبينما إذا جاع ولم يأكل مع القدرة حتى مات حيث يأثم والفرق أن الأكل مقدار قوته مشبع يقين فكان تركه إهلاكاً ولا كذلك المعالجة والتداوى'' (عالمگیری ۵/۲۵۵ کتاب الکراہیہ، الباب الثامن من عشر فی التداوی) ((علاج ومعالجہ) اس کے مابین اور اس صورت کے مابین جب انسان بھوکا ہو اور قدرت کے باوجود نہیں کھایا یہاں تک کہ مر گیا تو گنہ گار ہوگا، فرق یہ ہے کہ زندہ رہنے کے بقدر کھانا یقیناً بھوک کو مٹانے والا ہوتا ہے، لہٰذا ترک کرنا جسم وجان کو ہلاک کرنا ہے، علاج ومعالجہ ایسا نہیں ہے)۔

لہٰذا دماغی لحاظ سے معذور بچوں کا علاج کرانا مستحب کے دائرے میں آئے گا، واجب نہیں ہوگا، لیکن خیال یہ بھی ہوتا ہے کہ ضرر سے بچانا اور تکلیف کو دور کرنا اسلام کا بنیادی ضابطہ اخلاق ہے، اگر قابل اعتماد اطباء دوا تجویز کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس دوا میں نفع ہوگا، ماں باپ بھی اس علاج کا تحمل کر سکتے ہیں تو ایسے وقت استاد دوا دارو کرنا جس سے بچہ کو غیر معمولی پریشانی سے افاقہ ہوجائے واجب ہو تو شاید شریعت کے خلاف نہیں ہوگا۔

معذور بچوں کا اسپتال کے ذریعہ نگہداشت کرانا:

بچپن میں جس شفقت و پیار کی ضرورت ہے اور صلہ رحمی کا جو تقاضا ہوتا ہے شاید بڑے ہونے پر اس کی اتنی ضرورت نہیں ہوتی ہے، بچوں سے پیار و محبت کی تاکید حدیث کی کتابوں میں بڑے وقیع الفاظ میں موجود ہے، ایک حدیث میں تو حضرت اقرع بن حابس کو تقبیل صبیان کو عجیب سمجھنے پر بڑے سخت الفاظ دربار رسالت سے ارشاد ہوئے: "أو أملك لك إذا نزع الله من قلبك الرحمة" (بخاری ۲/۸۸۷ کتاب الادب، باب رحمۃ الولد وتقبیلہ الخ) (جب اللہ تعالی نے تمہارے قلب سے رحمت کو چھین لیا تو میں کیا کرسکتا ہوں)۔

لہٰذا صرف نگہداشت کی غرض سے ایسے اسپتالوں کے حوالہ کردینا اور بے بی سینٹروں کے سپرد کرکے اپنے آپ کو حق حضانت سے فارغ سمجھنا کسی بھی طرح مناسب نہیں ہے، یہ اپنی ذمہ داری میں غفلت برتنے اور فرار اختیار کرنے کے مترادف ہوگا۔

☆☆☆

اسلامی شریعت میں بچوں کے حقوق

مولانا محمد احسن عبدالحق ندوی[1]

حق پرورش:

جواب: الف۔ ماں کا دودھ بچے کے لیے بڑی اہمیت رکھتا ہے، بچے کو دودھ پلانا ماں پر بچے کا حق ہے، بچہ صرف باپ کی اولاد نہیں بلکہ ماں کا بھی جگر گوشہ ہوتا ہے، بچے کے لیے کوئی بھی دودھ ماں کے دودھ کا بدل نہیں بن سکتا۔

اللہ تعالیٰ اس دودھ کو خاص بچے کی غذا کی صورت میں بچے ہی کے لیے ماں کی چھاتیوں میں پیدا فرماتا ہے، اللہ نے اس دودھ کو صرف جسمانی غذا ہی نہیں بلکہ روحانی اور اخلاقی غذا بھی بنایا ہے۔

بچے کو ماں سے غیر معمولی انس ومحبت، گہرا طبعی لگاؤ اور انتہائی قلبی وروحانی تعلق جو ہوتا ہے، اس میں بڑا حصہ دودھ کا ہوتا ہے، جو مائیں بچوں کو اپنا دودھ نہیں پلاتیں وہ بچے کے سینے میں اپنے لیے وہ جذبات ہرگز نہیں پاسکتیں جو دودھ پلانے سے ہی پیدا ہوتے ہیں، اگر ایسی ماؤں کو اپنے بچے سے بے تعلقی اور بیگانگی کی شکایت ہے تو وہ خود اس کی ذمہ دار ہیں، چونکہ عمر کے ابتدائی دو سالوں میں اس نے اپنے گرم سینے سے بچہ کو دور رکھا ہے اور بچے کے سینے میں اس نے اپنی محبت، خلوص، روحانی اور قلبی تعلق کی گرمی کو منتقل نہیں کیا تو عمومی طور پر اس کا یہی نتیجہ نکلتا ہے۔

اسلام کے نزدیک ہر بچہ اخلاقی اور قانونی حق لے کر پیدا ہوتا ہے کہ اس کی ضروریات زندگی فراہم کی جائیں اور اسے موت کے منہ میں جانے نہ دیا جائے، بچے کی پرورش اور دیکھ بھال ایک طویل اور تھکا دینے والا عمل ہے، بالعموم لڑکے کی پرورش جس محبت، توجہ اور خوش دلی سے ہوتی ہے لڑکی کی نہیں ہوتی، اسلام نے اس فرق کو ناپسندیدہ قرار دیا، لڑکی کی پرورش کی خاص ترغیب دی اور اسے بہت بڑا کار ثواب بتایا، اللہ کے رسول (ﷺ) نے فرمایا:

''من بلی من هذه البنات شيئاً فأحسن إليهن كن له ستراً من النار'' (بخاری کتاب الادب باب رحمة الولد وتقبیله، مسلم ابواب البر باب فضل الاحسان الی البنات)۔

(اللہ تعالیٰ جس شخص کو ان لڑکیوں کے ذریعہ کچھ بھی آزمائش میں ڈالے اور وہ ان کے ساتھ اچھا سلوک (پرورش، تعلیم وتربیت، محبت کا رویہ) کرے تو وہ اس کے لیے جہنم سے بچاؤ کا ذریعہ ہوں گی)۔

شریعت کی رو سے اولاد کے نان ونفقہ اور پرورش کی ذمہ داری قانوناً باپ پر عائد ہوتی ہے، اولاد میں لڑکے یا لڑکی کی تخصیص نہیں ہے، ان میں دونوں شامل ہیں، ان میں سے کسی کی ذمہ داری سے انکار نہیں کرسکتا ہے، چنانچہ قرآن مجید میں رضاعت کے ذیل میں ذکر ہے:

''وَعَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ'' (البقرہ: ۲۳۳) (اور لڑکے والے یعنی باپ پر ہے کھانا اور کپڑا ان عورتوں کا موافق دستور کے واجب ہے)۔

اس سلسلہ میں فقہاء نے خاصی تفصیلات فراہم کی ہیں، فقہاء احناف نے لکھا ہے کہ لڑکے کے نان ونفقہ کی ذمہ داری اس کے بالغ ہونے تک ہے، اس کے بعد باپ کی ذمہ داری ختم ہوجاتی ہے، الا یہ کہ وہ اپاہج یا معذور ہوں، البتہ لڑکی کے نان ونفقہ کی ذمہ داری اس کے بالغ ہونے کے بعد بھی شادی ہونے تک باقی رہے گی، ایک رائے یہ بھی ہے کہ بلوغ کے بعد یہ ذمہ داری باپ اور ماں کے درمیان تقسیم ہوجائے گی، باپ دو حصے برداشت

[1] دار عرفات، رائے بریلی۔

کرے گا اور ماں ایک حصہ، اسی طرح جو بالغ عورت بھی محتاج ہے اس کا نان ونفقہ اس کے قریبی محرم پر واجب ہوگا، البتہ اگر وہ صاحب حیثیت ہے تو اسی کے مال میں سے اس پر خرچ کیا جائے گا، کسی اور پر اس کی ذمہ داری عائد نہیں ہوگی (ہدایہ ۲/۴۲۶)۔

اسلام میں بچوں کے حق تعلیم وتربیت

(ب۔ ۱) اسلام دین رحمت ہے، نبی کریم (ﷺ) رحمۃ للعالمین ہیں اور قرآن کریم جو آپ (ﷺ) کے توسط سے لوگوں تک پہنچا، کتاب رحمت ہے، ان رحمتوں کا ایک بڑا فیض یہ بھی ہے کہ علم کی قدر و قیمت دوبالا ہوئی۔

آپ (ﷺ) نے نہ صرف تعلیم کی ضرورت واہمیت کا احساس دلایا اور اس کی طرف لوگوں کو راغب کیا، بلکہ مختلف طریقوں سے اس کی اشاعت کا اہتمام فرمایا اور باقاعدہ وسیع پیمانہ پر اس کا نظام قائم کیا، اس کا اثر یہ ہوا کہ ایک ایسا تعلیمی انقلاب آیا کہ جو قوم لکھنا پڑھنا نہیں جانتی تھی وہ علم وفن کی امام بن گئی اور جو لوگ تعلیم سے بے بہرہ تھے وہ معلم ومودب کے فرائض انجام دینے لگے، آپ (ﷺ) کا فرمان ہے: ''علم کا حصول ہر مسلمان پر فرض ہے'' (ابن ماجہ)۔

آپ (ﷺ) نے بڑے موثر انداز میں والدین کو اس جانب راغب کیا، فرمایا: ''والد کی طرف سے اولاد کے لیے بہترین تحفہ یہ ہے کہ وہ انہیں علم وادب سکھائے'' (ترمذی)۔

اس میں شبہ نہیں کہ تعلیم کے باب میں بچوں کی تعلیم بنیادی اہمیت رکھتی ہے، بچپن کا زمانہ ذہنی تربیت، علمی صلاحیت کی نشوونما اور اخلاق وعادات کی تعمیر کا ہوتا ہے، اسی لیے یہ قول بہت مشہور ہے کہ بچپن میں جو کچھ پڑھایا جاتا ہے وہ دل ودماغ میں نقش ہوجاتا ہے، اس بات کے واضح ثبوت موجود ہیں کہ عہد نبوی میں بچوں کی تعلیم وتربیت پر خاص توجہ دی گئی، یہ بات بڑی اہم ہے کہ آپ (ﷺ) کی ہدایت تھی کہ بچہ کی پیدائش کے بعد اس کے کان میں سب سے پہلی جو آواز پڑے وہ اذان کے الفاظ ہوں، عہد نبوی میں مساجد کا جو نظام جاری ہوا اس میں بچوں کی تعلیم کا خاص اہتمام تھا، انہیں سب سے پہلے قرآن کریم پڑھایا جاتا تھا، پڑھنے لکھنے کی مشق کرائی جاتی تھی اور احادیث نبوی اور انبیاء کرام کے قصے بھی سنائے جاتے تھے (عہد نبوی میں نظام تعلیم)۔

امام سیوطیؒ کی کتاب ''جمع الجوامع'' کے حوالہ سے ذکر کیا جاتا ہے کہ بچوں کو نماز پڑھنے کا طریقہ بتایا جاتا تھا اور انہیں نشانہ بازی وتیراکی بھی سکھائی جاتی تھی۔

امام بخاریؒ نے اپنی کتاب صحیح بخاری میں بچوں کو قرآن پڑھانے کا باقاعدہ ایک باب قائم کیا ہے، عہد نبوی میں صحابہ کرامؓ کا قرآن سے اتنا غیر معمولی شغف تھا کہ وہ اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے، حضر وسفر ہر جگہ قرآن پڑھتے اور سناتے رہتے تھے، بہت سے لوگ جن میں بعض اوقات غیر مسلم بچے بھی ہوتے تھے ان سے قرآن سن کر یاد کر لیتے تھے۔

عہد نبوی کی تعلیمی سرگرمیوں کا اہم پہلو عورتوں کی تعلیم پر توجہ اور اس کا اہتمام تھا، آپ (ﷺ) نے طالب علم کی رغبت دلاتے ہوئے ارشاد فرمایا: ''جس شخص کے تین لڑکیاں ہوں، وہ ان کی پرورش کرے، انہیں ادب سکھائے یعنی تعلیم وتربیت دے، پھر ان کا نکاح کردے اور ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کرے اسے جنت نصیب ہوگی'' (ترمذی)۔

انسان کی ترقی علم سے وابستہ ہے، جو فرد یا گروہ علم سے بے بہرہ ہو وہ زندگی کی تگ ودو میں پیچھے رہ جاتا ہے، نہ تو اس کی فکری پرواز بلند ہوتی ہے اور نہ اس کی مادی ترقی ہی کا بہت زیادہ امکان ہے، لیکن اس کے باوجود تاریخ کا ایک طویل دور ایسا گزرا ہے، جس میں عورت کے لیے علم کی اہمیت محسوس نہیں کی گئی، علم کا میدان صرف مرد کو سمجھا جاتا ہے، مردوں میں بھی خاص طبقات علم حاصل کرتے ہیں، عورت علم کی بارگاہ سے بہت دور، جہالت کی زندگی بسر کررہی تھی، اسلام نے علم کے دروازے مرد وعورت دونوں کے لیے کھلے رکھے، اس راہ کی پابندیاں ختم کیں اور ہر طرح کی آسانیاں فراہم کیں۔

اسلام کا خطاب مرد وعورت دونوں سے ہے، اس نے ان میں سے ہر ایک کو عبادت، اخلاق اور احکام شریعت کا پابند بنایا ہے، علم کے بغیر اس کی

پابندی نہیں ہوسکتی، اور جب تک اسے ان کا علم نہ ہو وہ ٹھیک ٹھیک نہ تو اپنی ذمہ داریاں ادا کرسکتی ہے اور نہ اپنے حقوق کی حفاظت ہی اس سے ہوسکتی ہے۔

فقہاء نے لکھا ہے کہ مرد وعورت دونوں ہی کے لیے کم از کم دین کی بنیادی باتوں کا جاننا ضروری ہے، عورت اگر ان سے ناواقف ہو تو شوہر اسے خود بتائے گا یا کوئی ایسا انتظام کرے گا کہ وہ ان کا علم حاصل کرسکے، اگر شوہر اس کا انتظام نہ کرے تو عورت خود سے انہیں سیکھنے کی کوشش کرے گی، یہ اس کا ایک قانونی حق ہے، اس کے لیے وہ گھر سے باہر بھی اخلاقی حدود کی پابندی کے ساتھ جاسکتی ہے، شوہر اس پر پابندی نہیں لگا سکتا۔

بچوں اور بچیوں کے لئے دینی وعصری تعلیم:

(ب۔ ۲) جہاں تک عہد نبوی کے نظام تعلیم کے تحت پڑھائے جانے والے مضامین کا تعلق ہے، بلاشبہ اس میں قرآن وحدیث کو اولیت حاصل تھی، انفرادی واجتماعی تعلیم کے نظام یا تعلیم دینے کے جتنے واقعات اس دور سے متعلق ملتے ہیں ان میں قرآن کی تعلیم کا ذکر جزو لازم کے طور پر ہوتا ہے، اور یہ بات مردوں، عورتوں، بچوں اور غلاموں سب کی تعلیم کے ضمن میں قدر مشترک تھی، مساجد میں تعلیم کا جو نظام جاری ہوا اس میں قرآن کی تعلیم پر خاص توجہ دی جاتی تھی، صحابہ کرامؓ کے مذاکراتی حلقوں میں قرآن کے سمجھنے سمجھانے پر خاص زور دیا جاتا تھا، انفرادی درس گاہوں میں سب سے پہلے قرآن پڑھایا جاتا تھا، ہجرت سے قبل مدینہ میں اور ہجرت کے بعد بیرونی علاقوں میں جو معلمین بھیجے گئے وہ قاری یا مقری یعنی قرآن کے ماہر ہوتے تھے، وہ سب سے پہلے قرآن کی تعلیم دیتے تھے، علم دین کی طلب میں دوسرے علاقوں سے آنے والے وفود کو سب سے پہلے قرآن کی تعلیم دی جاتی تھی، متعدد روایتوں میں عام تعلیم کے ضمن میں قرآن کے ساتھ حدیث کی تعلیم کا بھی ذکر ملتا ہے، وفد عبدالقیس کے لوگوں نے مدینہ میں اپنے قیام کے تجربات بیان کرتے ہوئے ذکر کیا کہ انصار ہمیں قرآن کریم اور سنت رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تعلیم دیتے تھے (مسند احمد)۔

بچوں کی تعلیم کے سلسلہ میں قرآن پڑھانے کے علاوہ ایک اور چیز کا تذکرہ ملتا ہے، وہ ہے لکھنے کی مشق کرانا، مختلف مساجد میں ابتدائی تعلیم کا جو نظام رائج تھا اس کے تحت اس کا خاص اہتمام کیا جاتا تھا (عہد نبوی میں نظام تعلیم)۔

بعض احادیث سے بچوں کو نشانہ بازی اور تیراکی سکھانے کی بھی ترغیب ملتی ہے۔

اس زمانہ کی عام تعلیم میں قرآن مجید، حدیث اور دین کے ضروری احکام کا علم پہنچانے کے علاوہ وقت کی ضرورت اور مستقل افادیت کے نقطۂ نظر سے جس فن کے سکھانے کا سب سے زیادہ اہتمام کیا جاتا تھا وہ کتابت کا فن تھا، یہ بات عام طور پر مشہور ہے کہ بعثت کے وقت مکہ میں ان لوگوں کی تعداد بیس سے بھی کم تھی جو لکھنا جانتے تھے، انفرادی ضرورت کے علاوہ اجتماعی امور کی انجام دہی (معاہدات، خطوط، سرکاری احکام وہدایات لکھوانا اور مختلف چیزوں کا ریکارڈ تیار کرنا وغیرہ) کے لیے ایسے مسلمانوں کی ضرورت بڑھتی جارہی تھی جو لکھنے کے اہل ہوں، دوسرے یہ بات بھی اپنی جگہ مسلم ہے کہ خود علم کے تحفظ اور اس کی اشاعت کا ایک بہت بڑا ذریعہ تحریر ہے، ایک صحابیؓ نے حافظہ کی کمزوری کی وجہ سے سنی یا سیکھی ہوئی باتوں کو یاد نہ رکھ پانے کا شکوہ کیا تو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے انہیں ہدایت دی کہ اپنے دائیں ہاتھ سے مدد لو (ترمذی)۔

نازل شدہ قرآنی آیات اور احادیث نبوی کو تحریری صورت میں محفوظ رکھنے اور قرآنی ہدایت کے مطابق مالی معاملات کو ضبط تحریر میں لانے کے لیے بھی کاتبین کی ضرورت دن بہ دن بڑھتی جارہی تھی، آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نظر میں وقت کی ضرورت کے تحت فن کتابت کی اہمیت وافادیت کا اندازہ اسیران بدر کے واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے، کہ ان میں جو رہائی کے لیے فدیہ کی رقم ادا کرنے سے قاصر تھے ان کا فدیہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے یہ قرار دیا کہ وہ انصار کے دس دس بچوں کو لکھنا سکھادیں، ان قیدیوں سے کتابت سیکھنے والوں میں حضرت زید بن ثابتؓ بھی تھے، جو کاتبین وحی میں سب سے زیادہ مشہور ہوئے۔

جو صحابہ کرامؓ دیگر حضرات کو کتابت سکھانے کی خدمت انجام دیتے تھے ان میں حضرت عبادہ بن صامتؓ، حضرت عبداللہ بن سعید بن العاصؓ، حضرت سعد بن عبادہؓ، حضرت زید بن ثابتؓ اور حضرت ابورافع مولیٰ حضرت عبداللہ بن عمرؓ معروف ہیں، صحابیات میں حضرت شفاء بنت عبداللہ اور حضرت ام درداءؓ اس فن کی ماہر تھیں اور وہ دوسروں کو لکھنا سکھاتی تھیں۔

موجودہ دور میں علوم وفنون کو محفوظ رکھنے اور دوسروں تک منتقل کرنے کے لیے کمپیوٹر، انٹرنیٹ، ای میل کا استعمال عام ہوتا جارہا ہے، وسیع پیمانہ

پر معلومات پہونچانے کے لیے دوسرے ذرائع ابلاغ بھی اختیار کیے جاتے ہیں، علم کی حفاظت واشاعت کے لیے بنیادی طور پر کتابت کی اہمیت وافادیت اپنی جگہ مسلم ہے، لیکن آج کے دور میں اس کے جو متبادل ذرائع رائج ہو گئے ہیں، ضروری اور مفید کاموں کے لیے ان کے استعمال کا طریقہ سیکھنے کی ضرورت واہمیت سے کون انکار کرسکتا ہے۔

تعلیم کے میدان میں نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اسوۂ مبارکہ سے ہمیں یہ سبق بھی ملتا ہے کہ انفرادی واجتماعی ضروریات کی تکمیل کے لیے ہمیں مختلف زبانیں سیکھنی چاہیے، یہ بات مستند روایتوں سے ثابت ہے کہ ضرورت کے تحت آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے صحابہ کو سریانی یا عبرانی زبان سیکھنے کی ترغیب دی، سب سے پہلے حضرت زید بن ثابتؓ کو با قاعدہ اس کی ہدایت فرمائی اور انہوں نے نہایت مختصر عرصہ میں اس زبان کو پڑھنا اور لکھنا سیکھ لیا (ابوداؤد)۔

روایتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ عہد نبوی میں صحابہ کرامؓ ضرورت کے تحت غیر عربی زبانیں سیکھتے تھے اور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) اس کی ترغیب دیتے تھے۔

موجودہ دور میں اسلامی عقائد اور تعلیمات کی تشریح وترجمانی، دینی علوم کا ارتقاء اور اسلام کی اشاعت کے لیے عربی، فارسی، اردو کے علاوہ انگریزی، دوسری یوروپین اور برصغیر کی مختلف علاقائی زبانوں سے واقفیت کی افادیت کافی بڑھ گئی ہے، آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ایک خاص اجتماعی ضرورت کے تحت عبرانی زبان سیکھنے پر زور دیا تو آج کے ماحول میں مختلف ملی ضروریات کی تکمیل کے لیے جدید مروجہ زبانوں میں مہارت حاصل کرنے کے معاملہ میں اس اسوۂ مبارکہ سے روشنی حاصل کرنی چاہیے۔

فن کتابت اور عبرانی زبان کے علاوہ بعض دیگر مفید علوم کے اکتساب کی ترغیب بھی عہد نبوی میں ملتی ہے، ان میں علم انساب، علم میراث، علم نجوم اور تیراندازی شامل ہیں۔

عہد نبوی کی تعلیمی سرگرمیوں کے سلسلہ میں ایک اور اہم بات کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے، وہ یہ کہ کسی فن میں اختصاص حاصل کرنے کی داغ بیل اس عہد مبارک میں پڑ چکی تھی، اس کا ثبوت اس سے فراہم ہوتا ہے کہ صحابہ کرامؓ میں مختلف علوم کے ماہرین دستیاب تھے، اور آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) ان کی نشان دہی فرما کر ان سے استفادہ کرنے کی ہدایت دیتے، مثلاً آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: جسے قرآنی علوم حاصل کرنے ہوں وہ ان چار حضرات سے رجوع کریں، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت ابی بن کعبؓ، حضرت معاذ بن جبلؓ، حضرت سالم مولیٰ ابوحذیفہؓ (بخاری ومسلم)۔

اسی طرح دوسری روایت میں آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا یہ قول نقل کیا گیا کہ: حضرت زید بن ثابتؓ علم میراث، حضرت ابی بن کعبؓ تجوید وقرأت اور معاذ بن جبلؓ حرام وحلال کے احکام کے ماہر ہیں، انساب کے ماہرین میں حضرت ابوبکرؓ کا ذکر ملتا ہے (مسلم)۔

اس میں شبہ نہیں کہ دور جدید میں فنی اختصاص کی طلب کافی بڑھ گئی ہے، اور اس کے حصول کا طریقہ کافی ترقی کر گیا ہے، لیکن اس طریقۂ تعلیم کو جدید دور کی دین کہنا صحیح نہ ہوگا، اس لیے اسلامی تاریخ کے اولین دور میں اس کی نشو ونما کی مثالیں ملتی ہیں، جیسا کہ عہد نبوی کی تعلیمی سرگرمیوں کے واقعات شاہد ہیں، آج ضرورت اس بات کی ہے کہ اس طریقۂ تعلیم کو مزید مستحکم کیا جائے، دور جدید کے مطالبات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ملت میں مختلف علوم وفنون کے ماہرین پیدا ہوں، جو اسلام کی موثر ترجمانی اور ملی فلاح وبہبود کے مختلف کام بحسن خوبی انجام دے سکیں۔

ضرورت کی حد تک دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ عصری تعلیم بھی حاصل کی جائے، عہد نبوی میں اس کی مثالیں ملتی ہیں۔

لازمی تعلیم کا مسئلہ:

(ب۔۳): بلاشبہ جو علم معرفت الٰہی کا ذریعہ ہو اس کی تحصیل افضل ترین اعمال میں سے ہے، اور متعدد حدیثوں میں اس کے حاصل کرنے والوں کو بشارتیں دی گئی ہیں بلکہ احکام دین کا علم (جس میں عقائد بھی ہیں عبادات واعمال بھی اور طریقۂ معاشرت بھی) ہر مسلمان پر فرض ہے، ہر وہ طالب علم جو اپنے اوقات کو اس میں صرف کرے اور استحضار نیت کے ساتھ پوری طرح اس میں مشغول ہو، بڑی بشارتوں کا مستحق ہے، اس کے لیے فرشتوں کا پر بچھانا، سکینت کا نازل ہونا، رحمت الٰہی کا اس کو ڈھانپ لینا؛ یہ وہ وعدے ہیں جو خود احادیث مبارکہ میں وارد ہوئے ہیں۔

مگر اس کی شرطوں میں سے یہ بھی ہے کہ آداب طالب علمی کا پورا خیال ہو اور رضائے الٰہی کے حصول کے لیے تحصیل کی جائے، ورنہ جو بھی دین کا علم دنیا کے نفع کے لیے حاصل کرتا ہے، اس کے بارے میں فرمان نبوی ہے: ''لَمْ يَجِدْ عَرْفَ الْجَنَّةِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ يَعْنِي رِيحَهَا'' (اس کو قیامت کے روز جنت کی خوشبو بھی نصیب نہ ہوگی)، اللہ تعالیٰ صحیح نیت کے ساتھ اور پورے آداب کے ساتھ تحصیل علم کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

اگر حکومت کسی سطح تک کی تعلیم مسلمان کے بچوں اور بچیوں کے لیے لازم قرار دے تو شرعاً مسلمانوں کو اس کی پابندی لازم نہیں ہے۔

بچوں کے لئے جنسی تعلیم:

(ب۔ ۴): اسلام اور مسلمان دشمن طاقت کو یہ بخوبی معلوم ہے کہ امت کے مستقبل کی تعمیر و تہذیب کو روح پرور بنانے میں بچے بچیاں اور ان کے بچپن کا بڑا اثر ہے، کیونکہ کل وہ امت کے قائد بننے اور اس کی زمام سیادت کو سنبھالنے والے ہیں، اسی لیے دشمن طاقتیں امت اسلامیہ کے نونہال بچوں کو اپنا نشانہ بناتے ہیں اور مسلمان کی اولاد کو قرآن کریم اور اس کی تعلیمات و احکامات سے دور کرنے اور اسلامی شعار سے انہیں متنفر کرنے میں بے پناہ محنت کرتے ہیں۔

مسلمانوں کے معاشرہ کی اصلاح کے لیے تعلیم و تربیت کی درستگی ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے، تعلیم اصلاً اپنے عقائد، تصورات، نظام زندگی اور صالح روایات کی نئی نسل کو تلقین کا بہترین ذریعہ ہے، مسلمانوں پر لازم ہے کہ ان کے درمیان سو فیصد بچوں اور بچیوں کی تعلیم کا نظام ہو، ان کے گھروں میں عورتیں تعلیم کی فکر کریں اور ماں کی گود بچوں کی تربیت کا اولین گہوارہ بنے۔

دینی تعلیم کو ہوا پانی اور غذا سے زیادہ اہمیت دینا ہے، ہر بچہ کو قرآن پاک، کچھ عربی زبان، اردو زبان، دینیات اور سیرت النبی پڑھانا لازم ہے، اسکول اور کالج کی تعلیم کے مضر اثرات سے اپنی نسلوں کو محفوظ رکھنے کے لیے مساجد، مکاتب اور مدارس کھولے جائیں تاکہ امت کا کوئی فرد دینی معلومات سے ناواقف نہ رہے۔

عہد نبوی کی تعلیمی سرگرمیوں کے ماحصل سے معلوم ہوتا ہے کہ جنس کی تعلیم کی ضرورت نہیں ہے۔

نکاح کے بارے میں بچوں اور بچیوں کے کیا حقوق ہیں؟

(ج): نکاح اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمت ہے، اولاد کی پیدائش پر نسل کے جاری رہنے کا ایک ذریعہ ہے، اس کے علاوہ بے شمار دینی اور دنیوی منافع حاصل ہوتے ہیں، سب سے بڑھ کر نکاح کی فضیلت کے لیے یہی کافی ہے کہ حضور پاک (ا) نے نکاح کو اپنی سنت فرمایا ہے:

"النکاح من سنتی" (نکاح میری سنت ہے)، ازدواجی تعلق عبادت ہے، اس پر اجر و ثواب ملتا ہے۔

نکاح پر نصف ایمان کی تکمیل کی سند عطا فرمائی گئی ہے، حدیث میں فرمایا گیا ہے:

''جب بندہ نکاح کر لیتا ہے تو وہ اپنا آدھا دین پورا کر لیتا ہے بس باقی آدھے کے بارے میں بھی تقوی کی روش اختیار کرے'' (شعب الایمان: ۵۴۸۶)۔

نکاح کے اصل معنی دو چیزوں کے انضمام اور ملانے کے ہیں (فتح القدیر ۹۸/۳)۔

اسی مناسبت سے لغت میں مرد و عورت کے صنفی تعلق کو بھی ''نکاح'' کہا گیا ہے اور خود عقد نکاح کو بھی، البتہ اس بارے میں اختلاف ہے کہ نکاح کے حقیقی معنی کیا ہیں؟ بعض حضرات کا خیال ہے کہ نکاح، وطی اور عقد نکاح کے درمیان مشترک لفظ ہے، گویا دونوں ہی معنی حقیقی ہیں، بعض حضرات کے نزدیک اصل معنی ''ہم بستری'' کے ہیں، مجازاً عقد کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، زیادہ تر مشائخ حنفیہ اسی طرف رجحان رکھتے ہیں، تیسری رائے اس کے برعکس ہے کہ اصل معنی عقد کے ہیں، مجازاً وطی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے (شامی ۶۲/۴)۔

اگر قرآن و حدیث کی تعبیر پر نگاہ کی جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ دونوں معنوں میں بکثرت استعمال ہوا ہے، اس لیے غالباً یہ بات زیادہ قرین صواب ہے کہ یہ لفظ مشترک ہے اور سیاق کے اعتبار سے اس کے معنی کی تعیین ہوتی ہے۔

قرآن نے جابجا نکاح کی ترغیب دی ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کو انبیاء کی سنت اور ان کا طریقہ قرار دیا ہے۔

''وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلاً مِّنْ قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ أَزْوَاجاً وَذُرِّيَّةً'' (الرعد: ۳۸) (اور بھیج چکے ہیں ہم کتنے رسول تجھ سے پہلے اور ہم نے دی تھیں جوڑے اور اولاد)۔

جو لوگ اپنی معمولی معاشی صلاحیت کی وجہ سے نکاح کرنے میں دقت محسوس کرتے تھے اللہ تعالیٰ نے ان کو بھی نکاح کی ترغیب دی اور حوصلہ دلایا کہ اگر آج یہ بھی محتاج ہیں تو اللہ تعالیٰ کل ان کو غنی بنادے گا۔

''إِنْ يَكُونُوا فُقَرَاءَ يُغْنِهِمُ اللهُ مِنْ فَضْلِهِ وَاللهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ'' (النور: ۳۲)۔

فقہاء نے کتاب وسنت کی ہدایات کو سامنے رکھ کر مختلف حالات میں نکاح کے احکام متعین کیے ہیں، چنانچہ اس شخص پر نکاح کرنا فرض ہوجاتا ہے جو مہر اور نفقہ ادا کرنے پر قادر ہو اور نکاح نہ کرنے کی صورت میں زنا میں ملوث ہوجانے کا یقین ہو، اور اگر زنا میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہو یقین نہ ہو اور نفس میں نکاح کا سخت تقاضہ پاتا ہو تو نکاح کرنا واجب ہے، اور اگر نکاح نہ کرنے کی صورت میں برائی میں مبتلا ہونے کا اندیشہ نہیں اور مالی اور جسمانی اعتبار سے نکاح کرنے پر قادر ہے تو ایسے شخص کے لیے نکاح کر لینا سنت مؤکدہ ہے، اور اگر نکاح کے بعد اندیشہ ہو کہ وہ بیوی پر ظلم کرے گا تو نکاح کرنا مکروہ تحریمی ہے، اور اگر اس کا یقین ہو تو حرام ہے (شامی ۲/۶۶-۶۳)۔

نکاح کے لیے کوئی عمر متعین نہیں ہے، لڑکی کے والدین کو جب مناسب رشتہ مل جائے یا عورت کو جب اس کی ضرورت محسوس ہو فوراً نکاح کر لینا چاہیے۔

آپ (ا) کا ارشاد ہے: ''شادی نہ کرنے پر زمین میں فساد برپا ہونے کا خطرہ ہے'' (ترمذی: ۱۰۸۴)۔

رسول (ا) کا پہلا نکاح حضرت خدیجہؓ سے ۲۵/سال کی عمر میں ہوا، جب کہ حضرت خدیجہؓ کی عمر ۴۰/سال تھی، اور حضرت عائشہؓ جب سات سال کی تھیں اس وقت حضور (ا) نے انھیں اپنی زوجیت میں قبول فرمایا حالانکہ اس وقت حضور پاک (ا) کی عمر ۵۳/سال تھی، اس لیے شادی کے لیے نہ لڑکی کی عمر متعین ہے اور نہ ہی لڑکی کا لڑکے سے چھوٹی ہونا ضروری ہے بلکہ جس طرح کم عمر لڑکی کا نکاح بڑی عمر کے لڑکے کے ساتھ درست ہے، اسی طرح زیادہ عمر کی لڑکی کا نکاح کم عمر لڑکے کے ساتھ بھی کر سکتے ہیں، البتہ بہتر ہے کہ بلوغ کے بعد جب لڑکی لڑکے میں ایک حد تک نکاح کا شعور پیدا ہوجائے اس وقت نکاح کیا جائے۔

ماہر نفسیات کا کہنا ہے کہ شادی انسان کی جسمانی اور نفسیاتی ضرورت ہے، اگر لڑکیوں کی شادی بروقت نہ ہو تو ان کے ہارمونز کے نظام میں بے قاعدگی پیدا ہوجاتی ہے، جس سے وہ مختلف قسم کی نفسانی پیچیدگیوں اور بیماریوں میں مبتلا ہوجاتی ہیں، جن میں ڈپریشن، ہائپرٹینشن، لو بلڈ پریشر تا وحتی کے دماغی امراض تک شامل ہیں، اس بیماری میں انسان انتہائی وہمی ہوجاتا ہے اور یادداشت متاثر ہوتی ہے، جس سے جسم کے افعال اپنا صحیح کام نہیں کرتے، بڑی عمر میں شادی ہونے کا ایک نقصان، بانجھ پن اور زچگی کی پیچیدگیوں کی صورت میں نکل سکتا ہے، نیز بڑی عمر کی غیر شادی شدہ خواتین میں بریسٹ کینسر کے امکانات بھی پائے جاتے ہیں (ندائے ملت: ۲۰۰۲ء)۔

بچہ مزدوری اور اسلام:

(د-۱): اولاد خدا تعالیٰ کا بہت بڑا انعام ہے، اس پر خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اس نے آپ کو اپنے ایک نیک بندے کی پرورش کی توفیق بخشی اور یہ موقع فراہم فرمایا کہ آپ اپنے پیچھے اپنے دین ودنیا کا جانشین چھوڑ جائیں۔

چھوٹے بچے، ماں باپ اور خود اپنی کفالت کے لیے دوڑ دھوپ کو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اللہ کی راہ میں جدوجہد بتایا ہے (طبرانی)۔

انسان اس دنیا میں اللہ کی بندگی کے لیے پیدا کیا گیا ہے، اور یہی اس کا اصل مقصود ہے، البتہ ضرورت زندگی کے لیے کسب معاش کی بھی اجازت دی گئی ہے، کسب معاش میں خدا کی مقدر کی ہوئی حلال اور طیب رزق کی تلاش مقصود ہو اور اس کی رزاقیت پر بھروسہ ہو تو وہ عین عبادت اور کار دین میں مشغول ہونے والوں میں شمار ہوتا ہے۔

شریعت کا مزاج یہ ہے کہ سب سے پہلے بچے کو دینی تعلیم سے واقف کرایا جائے، اس کے بعد اگر کوئی دوسرا کمانے کے لیے نہیں ہے تو پھر اس کو کوئی کام سکھایا جائے یا مزدوری پر لگایا جائے، بچہ کو مزدوری پر رکھنے والوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس کی وسعت کے بقدر ہی اس سے کام لیں، اجرت پر رکھنے والوں کو ضرورت سے زیادہ کام لینے کی شریعت کی رو سے صحیح نہیں ہے۔

بچے اور گھریلو کام:

(د۔ ۲): مزدوروں سے کتنا کام لیا جائے اسلام نے اس کی وضاحت کردی ہے، آپ (ﷺ) نے فرمایا: غلاموں سے کوئی ایسا کام نہ لو جوان کی طاقت اور قدرت سے ماوراء ہو (مؤطا امام مالک)۔

عموماً بعض لوگ کم عمر بچوں سے اتنا ہی کام لینا چاہتے ہیں جتنا جوان اور توانا آدمیوں سے، اسلامی تعلیم کے تحت یہ غلط اور ظالمانہ حرکت ہے، جہاں تک نابالغ بچوں اور بچیوں سے گھر کے کام کاج کا تعلق ہے تو بقدر ضرورت لیا جاسکتا ہے، ایسا پرمشقت کام جس کے وہ اہل نہ ہوں ان سے نہیں لینا چاہیے، معاشی ضروریات کو فراہم کرنے کے لیے پیشہ وارانہ کام سکھا سکتے ہیں، بہتر اور اعلیٰ بنانے کے لئے نہیں، اس لیے کہ اسلام بقدر کفاف کی اجازت دیتا ہے، نہ کہ اصل حصول دنیا کی۔

انتہائی غربت اور معاشی بدحالی کی بنا پر بچوں کو مزدوری پر لگانا:

(د۔ ۳): اسلام میں کسب معاش کو خاص اہمیت دی گئی ہے، اللہ تعالیٰ نے خود ارشاد فرمایا: {وَجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشاً} (نبا:۱۱) (دن کو تلاش معاش کا ذریعہ بنایا) اور زمین کو بھی تلاش معاش کا ذریعہ بنایا، ارشاد خداوندی ہے: {وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ قَلِيلاً مَا تَشْكُرُونَ} (اعراف:۱۰)، اسی طرح کسب معاش کے لیے دوڑ بھاگ کا بھی حکم دیا گیا: {فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلَاةُ فَانتَشِرُوا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوا مِن فَضْلِ اللَّهِ} (جمعہ:۱۰)۔

احادیث بھی کثرت سے کسب معاش کی فضیلت کے سلسلہ میں وارد ہیں، یہاں تک کہ آپ ﷺ نے سچے اور امانت دار تاجر کے سلسلہ میں فرمایا: ''اس کا حشر انبیاء، صدیقین اور شہداء کے ساتھ ہوگا'' (ترمذی کتاب البیوع باب ماجاء فی التجار)۔

اسلام نے قناعت اور توکل کے جاہلانہ اور رہبانی تصور کو رد کردیا، اسی لیے اسلام بھیک منگی کا سخت مخالف ہے، مسلمانوں کے معاشرے کو اس لعنت سے بچانے کے لیے فقہاء اسلام نے بیت المال میں ایسے مجبور اور مفلوک لوگوں کا حق رکھا ہے۔

کسب معاش میں اعتدال ہونا چاہیے تاکہ فرائض وواجبات میں غفلت نہ ہو، حرام اور ممنوع طریقوں کا ارتکاب نہ ہو، قرآن مجید نے ایسے لوگوں کی تعریف کی ہے جن کے لیے تجارت اور کاروبار نماز، زکوۃ اور ذکر الٰہی سے رکاوٹ کا سبب نہ بنے: {رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَلَا بَيْعٌ عَن ذِكْرِ اللَّهِ وَإِقَامِ الصَّلَاةِ وَإِيتَاءِ الزَّكَاةِ يَخَافُونَ يَوْماً تَتَقَلَّبُ فِيهِ الْقُلُوبُ وَالْأَبْصَارُ} (نور:۲۷)۔

ضرورت ومجبوری کے وقت نابالغ بچوں کو مزدوری یا کوئی کام سکھانے پر لگانے کی اجازت ہونی چاہیے۔

نابالغ بچے اور جرائم:

(ہ): معاشرے کے وہ افراد جن کے قلوب معصیت اور ظلم کے تسلسل سے زنگ آلود ہو گئے ہیں، نہ انہیں اپنی عفت وعصمت کی پرواہ ہے اور نہ ہی دوسروں کی آبرو کا لحاظ، یہ معاشرے کے لیے سم قاتل اور ناسور بنے ہوئے ہیں، ان پر قابو پانے کے لیے ایسی سزاؤں اور تنبیہات کا تعین کیا جائے کہ آمادۂ جرم نہ ہونے پائیں، اور اگر اس کی جرأت کریں تو ان کا نفاذ مجرمین کو کیفر کردار تک پہونچا دیں تاکہ دوسروں کے لیے عبرت بن جائیں۔

ظلم جس نوعیت کا ہو سزا اسی کے لحاظ سے ہو، اسلامی تعزیرات کا آخری درجہ سزائے موت ہے اور سب سے کم درجہ یہ ہے کہ قاضی یا حاکم مجرم کی طرف آلود نگاہوں سے دیکھ لے، اس لیے یہ حقیقت ہے کہ اسلامی قوانین کے نفاذ کی وجہ سے ہی وہ معاشرہ وجود میں آتا ہے، جس میں فسق وفجور، شر وفساد، ظلم وناانصافی کا صفایا ہوجاتا ہے، بڑے سے بڑے عادی مجرموں کا حوصلۂ جرم پست بلکہ فنا ہوجاتا ہے۔

جسٹس تنزیل الرحمٰن فرماتے ہیں: ''سزا ایک طرف مجرم کو جرم سے باز رکھنے کا باعث ہوتی ہے تو دوسری جانب غیر مجرم کے حق میں تنبیہ کا سبب ہوتی ہے، جرم کے بار بار اور مزید واقع ہونے سے روک دیتی ہے، چونکہ سزا ایک ایسا فعل ہے جس کو حواس محسوس کرتے ہیں اور آنکھیں دیکھ سکتی ہیں، اس لیے کہ اس کی اثر اندازی فعل میں محسوس ہوتی ہے، یہی سبب ہے کہ معاشرہ کو پاک وصاف رکھنے کے لیے سزا کا اختیار کیا جانا ایک لابدی امر ہے، اور سزا کم از کم جرائم کی تخفیف کا باعث تو ہو ہی جاتی ہے'' (اسلامی جرم وسزا کا فلسفہ: ۶۹)۔

دور حاضر میں جو واقعات روز بروز رونما ہو رہے ہیں، ان واقعات میں سرفہرست نابالغوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے، اس لیے ان نابالغوں سے ان جرائم کو ختم کرنے کے لیے کچھ ایسے قوانین مرتب کئے جائیں، جن سے ان جرائم کا سد باب ہو، اور جرائم کرنے والوں کے لیے عبرت ہو۔

بچوں کی سرزنش اور اصلاح کے لیے جیلیں قائم کرنا:

(و): بچوں کی تادیب اور تعلیم وتربیت والدین پر فرض ہے، اس میں غفلت، کوتاہی، چشم پوشی اور بے جا نرمی، جہاں بچوں کو بگاڑ دیتی ہے اور ان کے مستقبل کو تباہ کر دیتی ہے، وہیں والدین کو بھی مجرم بنا دیتی ہے، بچوں کی تادیب کے لیے اصل تو یہ ہے کہ جہاں تک ہو سکے پوری نرمی اور شفقت کے ساتھ ان کے ساتھ معاملہ کیا جائے، یہاں تک کے بچے کے ذہن میں یہ بات اچھی طرح بیٹھ جائے کہ والدین اس سے جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ اسی کے فائدہ کے لیے ہیں۔

جہاں تک ہو سکے بچوں کو زبانی طور پر نرمی ومحبت سے سمجھانے کی کوشش کی جائے، مارنے اور جسمانی سزا دینے سے بچا جائے، البتہ ضرورت پڑنے پر مارا بھی جا سکتا ہے۔

مغرب کے اخلاق سوز اور انسانیت دشمن بچوں کو مارنا جرم سمجھتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ بچوں کو بالکل نہ مارا جائے، دوسری طرف بعض لوگ بچوں کو اتنا مارتے ہیں کہ جسم پر اس کا نمایاں اثر ظاہر ہو جاتا ہے، کچھ ظالم تو ان کو زخمی کر دیتے ہیں، چمڑی اُدھیڑ دیتے ہیں، ہڈی توڑ ڈالتے ہیں، یہاں تک کے صورت بگاڑ دیتے ہیں، یہ سراسر جرم ہے۔

اسلام نے بیچ کی راہ اختیار کی ہے، وہ اس کے دین فطرت اور دین رحمت ہونے کی کھلی دلیل ہے، مارنا کبھی ضروری ہوتا ہے، مارنے کے موقعوں پر اگر بچہ کو نہ مارا جائے تو بگڑ جائے گا، اس لیے اگر بچے کی عمر کے لحاظ سے مناسب مار ماری جائے تو بچہ سہم جائے گا، اسلام نے اس کے مفصل احکام بیان کئے ہیں، حدود متعین کرتے ہوئے مارنے کی اجازت دی ہے۔

دس سال کی عمر میں مارنا جائز نہیں ہے۔

ایک ساتھ تین مار سے زیادہ نہ مارا جائے (مصنف ابن عبدالرزاق: ۲۹۵/۷)۔

ناگزیر حالات میں جب بچہ بڑا اور بالغ ہونے کے قریب ہو، نہایت بدتمیز اور بدمعاش ہو، تو بچے کے برداشت کے مطابق (ایسی مار جس سے نقصان نہ ہو) دس سے زیادہ مار ماری جا سکتی ہے۔

رہا مسئلہ جیل میں قید نابالغ بچوں کا تو ان سے ان کی وسعت کے بقدر کام لیا جا سکتا ہے، وسعت سے زیادہ کی اجازت نہیں، جہاں تک مار کا تعلق ہے تو ایسی مار نہ ماری جائے جس سے جسم کا کوئی عضو تلف ہو جائے یا سخت چوٹ لگے، البتہ سرزنش کے طور پر مناسب سزا تجویز کی جائے جو مجرم کے لیے عبرت کا باعث ہو۔

بے سہارا بچے اور حکومت وسماج کی ذمہ داریاں:

(ز): جو بچے بے سہارا ہو جاتے ہیں یا کسی حادثہ میں ان کے والدین گذر جاتے ہیں یا بچھڑ جاتے ہیں، ایسی صورت حال میں جو ان کے قریبی رشتہ دار ہیں ان کی ذمہ داری ہے کہ وہ ان کی تعلیم وتربیت کی فکر کریں، رہا مسئلہ ان بچوں کا جو پھینک دئے جاتے ہیں، ان کے لیے حکومت کی، اسی طرح خود سماج کی ذمہ داری ہے کہ کوئی ایسا نظام بنایا جائے جس سے ان کی تعلیم وتربیت کا نظم ہو سکے، رہا مسئلہ خاندانی ماحول کا تو جس علاقہ میں وہ بچھلا ہے وہاں کے رہنے والوں کے خاندان کا اعتبار کر کے ان کے ساتھ ان کو منسوب کیا جائے۔ اور یہ جو پھینکنے والا مسئلہ معاشرے میں درپیش ہے، اس کی

روک تھام کے لیے زنا کی شناعت معاشرے میں عام کی جائے، اور اس طرح کے رونما ہونے والے واقعات سے لوگوں کو آگاہ کیا جائے۔

غربت کی حالت میں اپنا بچہ دوسروں کے حوالہ کرنا:

(ح): نابالغ لڑکے یا نابالغ لڑکی یا کم عقل بالغ لڑکے اور لڑکی جن میں تمیز کی صلاحیت نہ ہو، ان کی پرورش، ان کی مصلحتوں کی نگرانی، موذی اور مضر چیزوں سے حفاظت ایسی جسمانی، نفسیاتی اور عقلی تربیت کہ وہ مقتضیات زندگی کی تکمیل کر سکے اور اپنے فرائض کے ادا کرنے کا اہل ہو جائے، والدین کی پرورش کی ذمہ داری ہے۔

کسی کو اپنا بچہ افلاس کی وجہ سے حوالہ کرنے کی اجازت نہیں ہے، اس لیے کہ رزق کا وعدہ اللہ نے خود لے رکھا ہے، والدین پر بچوں کا یہ حق ہے کہ ان کی پرورش و پرداخت کرے، ماں بچے کو اپنا دودھ پلائے، ماں پر بچے کا یہ حق ہے، قرآن مجید نے اولاد کو ماں کا یہی احسان یاد دلا کر ماں کے ساتھ غیر معمولی حسن سلوک کی تاکید کی ہے۔

معذور بچے اور ان کی تربیت ونگہداشت:

(ط): اولاد خدا کا انعام ہے، اس پر خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اس نے آپ کو اولاد کی پرورش کی توفیق بخشی، اولاد کی پیدائش پر کبھی دل تنگ نہ ہو، معاشی تنگی یا صحت کی خرابی یا کسی اور وجہ سے اولاد کی پیدائش پر کڑھنے یا اس کو اپنے حق میں ایک مصیبت سمجھنے سے پرہیز کرنا چاہیے، اولاد کو کبھی ضائع نہیں کرنا چاہیے، پیدا ہونے سے پہلے یا پیدا ہونے کے بعد، اولاد کو ضائع کرنا بدترین سنگ دلی، بھیانک ظلم، انتہائی بزدلی اور دونوں جہان کی تباہی ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ قَتَلُوْٓا اَوْلَادَهُمْ سَفَهًاۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّحَرَّمُوْا مَا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ افْتِرَاۗءً عَلَى اللّٰهِ قَدْ ضَلُّوْا وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ (انعام: ۱۴۰)

(وہ لوگ انتہائی کھاٹے میں ہیں، جنہوں نے اپنی اولاد کو نا سمجھی میں اپنی حماقت سے موت کے گھاٹ اتار دیا......)۔

دوسری جگہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا (بنی اسرائیل: ۳۱)

(اور اپنی اولاد کو فقر وفاقے کے خوف سے قتل نہ کرو، ہم ان کو بھی رزق دیں گے، اور ہم ہی تمہیں بھی رزق دے رہے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ اولاد کا قتل کرنا بہت بڑا گناہ ہے)۔

اسلام میں اس طرح کی کوئی ایسی مثال نہیں ملتی کہ روزی کمانے کی غرض سے کسی نے اپنے بچے کو کسی دوسرے کے حوالہ کر کے فرار اختیار کر لیا ہو، اسی طرح اگر کسی کے کوئی معذور بچہ ہو تو اس کو علاج کے لیے علاج کی جگہ میں چھوڑ کر چلا آیا ہو، بلکہ یہ ہر دور میں رہا ہے کہ جس کے جس طرح کا بھی بچہ پیدا ہوا چاہے اچھا ہو یا کوئی نقص ہو اس کو پیار ومحبت سے اپنے پاس رکھ کر علاج ومعالجہ کیا، نہ کہ کسی کے حوالہ کیا۔ اسلامی تعلیمات سے پتہ چلتا ہے کہ بچہ چاہے جس طرح کا ہو والدین کو اپنی ممتا سے دور نہیں رکھنا چاہیے، اور اگر علاج ومعالجہ کی ضرورت ہو تو خود ہسپتال میں رکھ کر علاج ومعالجہ کی ذمہ داری سنبھالے، یورپی ممالک کی طرح نہ کرے کہ جب والدین بوڑھے ہو جاتے ہیں تو ان کو دوسری جگہ منتقل کر دیا جاتا ہے، دوسرے لوگ دیکھ ریکھ کرتے ہیں، اولاد سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

☆☆☆

اسلام میں بچوں کے حقوق اور موجودہ قوانین

مفتی محمد جہانگیر حیدر قاسمی

حضانت کا لغوی معنی:

حضن يحضن حضنا وحضانة واحتضن الصبي: بچہ گود میں لینا، پرورش کرنا، سینہ سے لگانا، حضنہ عن کذا: علی حدہ کرنا، دور کرنا (مصباح اللغات/۱۶۱)

حضانت کا شرعی مفہوم:

ان افراد کا بچوں کی تربیت و پرورش کرنا جنہیں حق پرورش حاصل ہے، اصطلاح شرع میں حضانت کہلاتا ہے (ردالمحتار ۵/ ۲۰۳)۔

حضانت (حق پرورش):

بچہ کی کفالت، دیکھ بھال، علاج و معالجہ، تعلیم و تربیت، نفقہ و سکنی دراصل باپ کی ذمہ داری ہے، کیوں کہ بچہ باپ کی جانب منسوب ہوتا ہے اور اللہ تعالی نے "وعلى المولود له" اور "ولا مولود له بولده" سے اسی طرف اشارہ کیا ہے، لیکن بلوغ و شعور سے پہلے بچہ ماں کے لطف و کرم، پیار و محبت، دل و نظر، شفقت و عنایت اور بالخصوص ماں کے دودھ اور گود کا ترجیحی محتاج ہوتا ہے، جو باپ اسے نہیں دے سکتا، اسی لئے شریعت مطہرہ نے بچے کی پرورش کا اولین حقدار ماں کو قرار دیا ہے، کہ بچے کے وجود میں اس کا خون جگر شامل ہے اور اس کی غذا بھی اسی ماں کے سینوں میں بہم رکھی ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک خاتون نے رسول اللہ ﷺ سے شکایت کی کہ یہ میرا بچہ ہے جو میرے پیٹ میں پلا، گود میں پرورش پایا، اور میرے سینے سے دودھ پیتا رہا، اب اس کے والد نے مجھے طلاق دے دی ہے اور وہ مجھ سے یہ بچہ چھیننا چاہتے ہیں، تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ تمہیں اس کی پرورش کا زیادہ حق ہے جب تک تمہارا نکاح کسی اجنبی سے نہیں ہوجاتا (اخرجہ احمد ۲/ ۱۸۲، سنن ابی داؤد ا/ ۳۱۰)۔

ایسے ہی حضرت عمر بن خطابؓ اور ام عاصم کا مقدمہ جب ابوبکر صدیقؓ کی خدمت میں آیا تو آپؓ نے ام عاصم کے حق میں بچہ کی پرورش کا فیصلہ دیا اور یہ کہا کہ ان کے آنچل کی ہوا، سانسوں کی خوشبو اور پیار و محبت اس بچے کے لئے تمہارے مقابلے زیادہ بہتر ہے (رواہ سعید فی سننہ، باب الغلام بین الابوین ایہما احق بہ من کتاب الطلاق ۲/ ۱۰۹-۱۱۰ بحوالہ المغنی ۱۱/ ۴۱۴، بیہقی ۸/ ۵، نصب الرایہ ۳/ ۲۶۶)۔

بچہ ایام طفولیت میں جس شفقت و عنایت، جذباتی تعلق، قلبی رجحان اور رشتہ خون کے رنگ و بو کا محتاج ہوتا ہے، ماں کی گود کے سوا کہیں اور اسے میسر نہیں آسکتا، اسی لئے جذبہ ترحم و شفقت کے اسی فطری بنیاد کو شریعت نے حق پرورش کے لئے معیار قرار دیا ہے اور پرورش کا حق سب سے پہلے ماں کو دیا ہے۔

چنانچہ فقہاء اسلام کا اس بات پر اتفاق ہے کہ میاں بیوی کے بیچ رشتہ ازدواج باقی ہو، طلاق کے بعد عدت کا دورانیہ ہو یا عدت کے بعد کا مرحلہ ہو، اگر ماں بچے کی پرورش کے لئے تیار ہو اور مطلوبہ تمام شرطیں پائی جاتی ہوں تو پرورش کا پہلا حق ماں کا ہے، باپ کے لئے یہ جائز نہیں کہ زبردستی بچے کو ماں سے چھین لے؛ کیوں ایسا کرنا نہ باپ کے حق میں مفید ہے، اور نہ ہی بچے کے حق میں۔

ابن قدامہ حنبلیؒ لکھتے ہیں: ''وجملة أن الزوجين إذا افترقا ولهما ولد طفل أو معتوه فأمه أولى الناس بكفالته إذا كملت الشرائط فيها ذكرا كان أو أنثى وهذا قول يحيى الأنصاري والزهري والثوري ومالك والشافعي وأبي الثور وإسحاق وأصحاب الرأي ولا نعلم أحداً خالفهم'' (المغنی ۱۱/ ۴۱۳)۔

فقہاء نے پرورش کی میعاد لڑکا ہو تو سات سال اور لڑکی ہو تو ۹ رسال یا حیض آنے تک مقرر فرمائی ہے، کیونکہ اب بچے کی تعلیم وتربیت اور شخصیت سازی کے فرائض ماں کے مقابلے باپ عمدہ طریقے پر انجام دینے کی صلاحیت رکھتا ہے، اور بچہ اب ماں کا محتاج بھی نہیں رہا، اگر لڑکی ہو تو جب ۹ رسال کی ہو جائے یا نسوانی عادات واخلاق، گھریلو کام کاج اور تہذیب وتربیت کی ضرورت ہو تو حیض آنے یعنی بلوغ تک انتظار کے بعد باپ اسے اپنی نگرانی میں لے سکتا ہے، کیوں کہ شادی بیاہ کی ذمہ داری باپ پر ہے، اور اس کی عزت وعصمت کے تحفظ اور نگہ داشت پر ماں کے مقابل باپ کو زیادہ قدرت حاصل ہے (فتاوی عالمگیری ا ر ۱۶۵ - ۱۶۶، کتاب الطلاق، باب الحضانۃ، بدائع الصنائع ٣ ر ۴۵۹)۔

ماں اور نانی یا دادی کے سوا کسی اور خاتون رشتہ دار کو حق پرورش حاصل ہو تو لڑکا اور لڑکی دونوں استغناء کی عمر کے بعد باپ کو سپرد کر دیئے جائیں گے، صاحب بدائع اس کی توجیہ بیان کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''وأما غير هؤلاء من ذوات الرحم المحرم من الأخوات والخلات والعمات إذا كان الصغير عندهن فالحكم في الجارية كالحكم في الغلام وهو أنها تترك في أيديهن إلى أن تأكل وحدها وتشرب وحدها وتلبس وحدها ثم تسلم إلى الأب'' (بدائع الصنائع ٣-٤٥٩)۔

حق پرورش کس کو ہے:

لڑکے اور لڑکیوں کی پرورش اور تربیت میں مردوں کے مقابلے عورتوں کا کردار اہم ہوتا ہے، اسی لئے پرورش کا حق مردوں سے پہلے خواتین کو حاصل ہے، اگر یہ خواتین نہ ہوں یا ان میں پرورش کی اہلیت نہ ہو تو پرورش کا حق مردوں کو منتقل ہو جاتا ہے، صاحب بدائع تحریر فرماتے ہیں:

''والأصل فيها النساء لأنهن أشفق وأرفق وأهدى إلى تربية الصغار ثم تصرف إلى الرجال'' (بدائع الصنائع ٢-٤٥٦)۔

خواتین میں پہلا حق ماں کو ہے کیوں کہ وہ ذی رحم محرم بھی ہے اور سب سے اقرب بھی، ماں کی عدم موجودگی یا پرورش سے انکار یا اہلیت کے فقدان کی صورت میں یہ حق نانی، پرنانی اور پھر دادی پردادی کو حاصل ہوگا، اگر یہ بھی زندہ نہ ہوں یا پرورش سے انکار کر دیں یا اہلیت نہ پائی جاتی ہو تو یہ حق مندرجہ ذیل خواتین کے لئے اس ترتیب سے ثابت ہوگا:

عینی بہن، پھر اخیافی بہن، پھر علاتی بہن، پھر عینی بھانجی، پھر اخیاف بھانجی، پھر عینی خالہ پھر اخیافی خالہ، پھر نانا کی ماں، پھر علاتی بھانجی، پھر عینی بھتیجی، پھر اخیافی بھتیجی، پھر علاتی بھتیجی، پھر عینی پھوپھی، پھر اخیافی پھوپھی، پھر علاتی پھوپھی، پھر ماں کی عینی خالہ، پھر ماں کی اخیافی خالہ، پھر ماں کی علاتی خالہ، پھر باپ کی عینی خالہ، پھر باپ کی اخیافی خالہ پھر باپ کی علاتی خالہ پھر ماں کی عینی پھوپھی، پھر ماں کی اخیافی پھوپھی، پھر ماں کی علاتی پھوپھی، پھر باپ کی عینی پھوپھی، پھر باپ کی اخیافی پھوپھی، پھر باپ کی علاتی پھوپھی۔

اگر ان میں سے کوئی بھی نہ ہو یا وہ انکار کر دے یا نااہل ہو تو حق پرورش مردوں کو ہوگا اور عصبات مقدم ہوں گے، میراث کی ترتیب پر انہیں یہ حق حاصل ہوگا۔

پھر یہ حق ذوی الارحام کو منتقل ہوگا، جو محرم بھی ہوں، جیسے نانا، پرنانا اور پر تک پھر اخیافی بھائی پھر اخیافی بھائی کا بیٹا، پھر اخیافی چچا پھر عینی ماموں پھر علاتی ماموں پھر اخیافی ماموں۔

عینی اور علاتی چچا کی بیٹی اور پھوپھی، ماموں، خالہ اور اخیافی چچا کی مذکر یا مونث اولاد کو حق پرورش حاصل نہیں ہے اگر مساوی رتبہ کے ایک سے زائد حق دار ہوں تو وہ مقدم ہوگا جس میں بچے کی پرورش کی لیاقت زیادہ ہو، پھر جو زہد وتقوی میں فائق ہو پھر جو عمر رسیدہ ہو (بدائع الصنائع ٣ ر ٤٥٧، ٤٦٠، الدر المختار مع الرد ۵ ر ۲۱۱، ۲۱۴)

کیا ماں کو پرورش پر مجبور کیا جا سکتا ہے؟

اگر ماں بچہ کی پرورش سے انکار کر دے اور کوئی ذی رحم محرم رشتہ دار خاتون ہو جو پرورش کی ذمہ داریاں نباہ سکتی ہو اور کوئی خاتون دودھ پلانے پر رضامند ہو یا بچہ اوپر کا دودھ پیتا ہو، ماں کا محتاج نہ ہو اور باپ اضافی اخراجات کی سکت رکھتا ہو تو ماں کو بچہ کی پرورش پر مجبور نہیں کیا جا سکتا، لہذا ماں

بچہ کو باپ کے حوالے کرسکتی ہے۔

اگر نانی دادی یا کوئی ذی رحم محرم رشتہ دار نہ ہو یا بچہ کسی غیر عورت کا یا اوپر کا دودھ نہ پیتا ہو یا پیتا ہو مگر شوہر اس کے اخراجات برداشت نہ کرسکتا ہو تو ایسی صورت میں بچہ کو دودھ پلانا اور اس کی پرورش کے فرائض انجام دینا ماں کے لئے ضروری ہوگا اور شرعاً اسے اس کام پر مجبور کیا جائے گا، ماں کے لئے جائز نہ ہوگا کہ وہ بچہ باپ کے حوالہ کردے۔

علامہ کاسانی تحریر فرماتے ہیں: ''ولا تجبر الأم على إرضاعه إلا أن لا يوجد من ترضعه فتجبر عليه وهذا قول عامة العلماء'' (بدائع الصنائع ۳ / ۴۵۵، ۴۵۶)۔

علامہ حصکفی لکھتے ہیں: ''ولا تجبر من لها الحضانة عليها إلا إذا تعينت لها بأن لم يأخذ ثدى غيرها أو لم يكن للأب ولا للصغير مال، به يفتى: خانيه، وسيجئى فى النفقة، وإذا أسقطت الأم حقها صارت كميتة أو متزوجة فتنقل للجدة، ولا تقدر الحاضنة على إبطال حق الصغير فيهما'' (الدر المختار مع رد المحتار ۵ / ۲۰۸)۔

کیا ماں پرورش پر اجرت لے سکتی ہے؟

عورت اگر منکوحہ یا معتدہ رجعیہ یا اصح قول کے مطابق معتدہ بائنہ ہو اور ابھی عدت پوری نہ ہوئی ہو تو دیانۃً بچہ کو دودھ پلانا اور اس کی پرورش کرنا ماں کے ذمہ لازم ہے اور جو کام شرعاً کسی کے ذمہ لازم ہو اس پر اجرت کا مطالبہ کرنا دراصل رشوت ہے، اور رشوت لینا دینا دونوں ناجائز ہے، لہذا ماں کے لئے دودھ پلانے اور بچے کی پرورش پر اجرت کا مطالبہ جائز نہ ہوگا، اس لئے بھی کہ ماں کا نفقہ اس دوران باپ پر حسب حال واجب ہے، مزید دوسرا نفقہ اجرت حضانت کی شکل میں باپ کے ذمہ لازم نہیں کیا جاسکتا۔

صاحب ہدایہ لکھتے ہیں: ''وإن استأجرها وهى زوجته أو معتدته لترضع ولدها لم تجز لأن الإرضاع مستحق عليها ديانة قال الله تعالى: ''والوالدات يرضعن أولادهن'' (ہدایہ اولین ۲ / ۴۲۴۔۴۲۵، بدائع الصنائع، بیان القرآن، معارف القرآن)۔

عدت کے بعد ماں اگر مفت پرورش کے لئے تیار نہ ہو اور وہ پرورش اور دودھ پلانے کا معاوضہ طلب کرے اور باپ مالدار ہو تو باپ پر معاوضہ ادا کرنا ضروری ہوگا، البتہ اگر باپ تنگدست اور مفلوک الحال ہو اور بچہ کی پھوپھی وغیرہ مفت پرورش کے لئے تیار ہو تو ماں کا حق حضانت ساقط ہوجائے گا اور بچہ پھوپھی وغیرہ کے حوالے کیا جائے گا، لیکن ماں کو بچے سے ملاقات کا حق باقی رہے گا، اور اگر ماں دوبارہ مفت پرورش کے لئے آمادہ ہوجائے تو بچہ اس کے حوالے کردیا جائے گا، اللہ تعالی کا فرمان ہے:

''فإن أرضعن لكم فآتوهن أجورهن وأتمروا بينكم بمعروف وإن تعاسرتم فسترضع له أخرى''۔

علامہ حصکفی تحریر فرماتے ہیں: ''وتستحق الحاضنة أجرة الحضانة إذا لم تكن منكوحة ولا معتدة لأبيه''۔

دوران پرورش بچہ کا نفقہ کس پر ہے؟

پرورش کا حق ماں کو حاصل ہو یا کسی اور کو، زمانہ پرورش میں بچہ کا نفقہ باپ پر ہے، البتہ بچہ اگر مالدار ہو اور مال موجود بھی ہو تو اس کے اخراجات اس مال سے پورے کئے جاسکتے ہیں۔

صاحب بدائع الصنائع تحریر فرماتے ہیں: ''ونفقة الولد يختص بها الوالد لا يشاركه فيها الأم'' (بدائع الصنائع ۳ / ۴۵۵)۔

صاحب در مختار لکھتے ہیں: ''وتجب النفقة بأنواعها على الحر لطفله يعم الأنثى والجمع الفقير الحر فإن نفقة المملوك على مالكه والغنى فى ماله الحاضر فلو غائباً فعلى الأب'' (الدر المختار مع رد المحتار ۵ / ۲۶۸)۔

استغناء (خود شعوری) کے بعد بچہ باپ کے حوالے ہوگا:

لڑکا اگر ماں نانی دادی یا کسی اور ذی رحم محرم کی پرورش میں ہو اور اپنی عمر کے سات سال مکمل کرچکا ہو، کھانے، پینے، لباس پہننے، پیشاب پاخانہ

کرنے اور وضوو غسل میں مربیہ کا محتاج نہ رہا ہو تو لڑکا باپ کے حوالہ کیا جائے گا، اگر باپ قبول کرنے سے پہلوتہی کرے اور کوئی شرعی مانع نہ ہو تو اسے قبول کرنے پر مجبور کیا جائے گا، کیوں کہ تعلیم وتربیت کی ذمہ داری باپ پر ہے، آپ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''مروا صبيانكم إذا بلغوا سبعا''۔

اسی طرح لڑکی اگر ماں، نانی، دادی کی پرورش میں ہو تو بلوغ کے بعد یا کسی اور ذی رحم محرم خاتون رشتہ دار کی پرورش میں ہو تو استغناء کی عمر یعنی ۹ رسال کے بعد باپ اپنی تحویل میں لے گا، کیونکہ اب اس کی تحصین وتحفظ کی ذمہ داری باپ کے مضبوط کندھوں پر ہے (الدر المختار مع رد المحتار ۵ر۲۱۶)۔

مضرت کا اندیشہ ہو تو حق پرورش ساقط ہو جائے گا:

بچہ کی جسمانی نشوونما، ذہنی ارتقا، نفسیاتی علو وبہتری اور تعلیمی وتربیتی حصولیابی ایک ایسے ماحول کا محتاج ہوتی ہے جو پرسکون اور فطرت سے ہم آہنگ ہو، اسی لئے شریعت مطہرہ ایسے ذی رحم محارم رشتہ دار، عصبہ اور ذوی الارحام کو پرورش کا حقدار سمجھتی ہے، جو بچہ کو خوش گوار ماحول فراہم کر سکیں اور ان کی گود میں بچہ کے لئے نشوونما کا گہوارہ اور تعلیم وتربیت کا مسکن ثابت ہوں۔

وہ لوگ جو بچے کی صحیح دیکھ بھال نہیں کر سکتے، جسمانی، ذہنی اور تعلیمی وتربیتی نقطہ نگاہ سے ان کی پرورش بچہ کی شخصیت پر منفی اثر ڈالتی ہو، شفقت ومحبت کے بجائے ان کے دلوں میں نفرت وانتقام کی آگ سلگتی ہو اور بچہ کے ضیاع کے امکانات قوی ہو، تو ایسے لوگ حق پرورش سے محروم کر دیئے جائیں گی، خواہ وہ ماں یا باپ ہی کیوں ہوتے ہوں۔

چنانچہ فقہاء نے اس اصول کی صراحت کی ہے کہ پرورش کا مدار جذبہ ترحم وشفقت پر ہے، علامہ کاسانی لکھتے ہیں: ''لأن مبنى الحضانة على الشفقة'' (بدائع الصنائع ۳ر۷۵۴)۔

لہذا جب یہ جذبہ مفقود ہو تو ایسی صورت میں حق پرورش ساقط ہوگا اور ثانوی درجہ کے حق دار کو پرورش کی ذمہ داری سونپی جائے گی اگر قرابت داروں میں کوئی بھی اس لائق نہ ہو تو حاکم وقت یا اصحاب حل وعقد کو اختیار ہوگا کہ جسے تربیت کے لئے مناسب وموزوں سمجھیں بچہ اس کے سپرد کر دیں، وہ اجنبی یا اجنبیہ ہی کیوں نہ ہو (الدر المختار مع رد المحتار ۵ر۹۱۲)۔

علامہ ابن عابدین شامی تحریر فرماتے ہیں: ''قال الرملي: ويشترط في الحضانة أن تكون حرة بالغة عاقلة أمينة قادرة وأن تخلو من زوج أجنبي وكذا في الحاضن الذكر سوى الشرط الأخير، هذا ما يؤخذ من كلامهم'' (رد المحتار ۵ر۲۰۳)۔

مذکورہ بالا تینوں شرطوں کا حاصل یہ ہے کہ بچہ جسمانی، ذہنی، فکری، نفسیاتی، تعلیمی وتربیتی کسی لحاظ سے نقصان کا شکار نہ ہو، لہذا جنہیں حق پرورش حاصل ہے، مگر وہ پرورش کا حق ادا نہیں کر سکتے یا اہلیت ہی نہیں رکھتے تو انہیں حق پرورش سے محروم قرار دیا جائے گا، علامہ کاسانی تحریر فرماتے ہیں: ''وهذه ولاية نظر فلا تثبت مع الضرر'' (بدائع الصنائع ۳ر۴۶۰)۔

کن صورتوں میں مرد یا عورت کو حق پرورش سے محروم کیا جا سکتا ہے؟

ان تمام صورتوں میں کسی مرد یا عورت کو حق پرورش سے محروم کیا جا سکتا ہے جب بچہ کی پرورش، دیکھ بھال اور تعلیم وتربیت کا مطلوبہ عمل پورا نہ ہوتا ہو اور ایسے اسباب پائے جاتے ہوں جو پرورش کے عمل میں رکاوٹ بنتے ہوں یا بچہ کے حق میں پرورش کرنے والے بے توجہی اور لاپرواہی کا مظاہرہ کرتے ہوں یا غیر شرعی اور غیر اخلاقی امور میں ہمیشہ ہنتلا رہتے ہوں، یا متعدی امراض میں مبتلا ہوں وغیرہ، یہ اور اس کے علاوہ امور ہیں جن کو فقہاء نے تفصیل سے ذکر کیا ہے (دیکھئے: الدر المختار ورد المحتار ۵ر ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۰۶، بدائع الصنائع ۳ر۴۶۰ وغیرہ)۔

حق تعلیم وتربیت: بچوں کے حق تعلیم وتربیت سے متعلق بنیادی ہدایات:

زندگی کے بعد اگر کوئی حق عقل وشریعت کی نظر میں اہم اور لائق ترجیح ہے تو وہ حق تعلیم وتربیت ہے، دیگر حقوق کی طرح اسلام میں اس حق پر خصوصی توجہ دی گئی ہے اور اسے بنیادی ولابدی حقوق میں شامل کیا گیا ہے۔

انسان کی تخلیق کا مقصد اللہ کی معرفت اور طاعت و بندگی ہے، تعلیم وتربیت کے بغیر اللہ کا عرفان حاصل ہوسکتا ہے اور نہ ہی طاعت و بندگی کا جذبہ پروان چڑھ سکتا ہے، اسی لئے علم کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے اللہ کا ارشاد عالی ہے: ''إنما یخشی اللہ من عبادہ العلماء''، بچوں کی تعلیم وتربیت اور فکر آخرت کے تئیں سنجیدگی کا اندازہ حضرت لقمانؑ کی اس نصیحت سے بھی ہوتا ہے، جو انہوں نے اپنی اولاد کو کی تھی، یہ نصیحت انبیاء کرام کے مزاج ومذاق کا حقیقی غماز ہے اور سلامتی فکر کا عکاس بھی، "وإذ قال لقمان لابنه وهو يعظه يٰبني لا تشرك بالله إن الشرك لظلم عظيم" (سورہ لقمان: ۱۳)، "يابني أقم الصلاة وأمر بالمعروف وانهى عن المنكر واصبر على ما أصابك إن ذلك من عزم الأمور" (سورہ لقمان: ۱۷)۔

حضرت یعقوبؑ نے اپنی اولاد کو نصیحت فرمائی، قرآن مجید نے اسے یوں نقل کیا ہے: "أم كنتم شهداء إذ حضر يعقوب الموت إذ قال لبنيه ما تعبدون من بعدي قالوا نعبد إلٰهك وإلٰه آبائك إبراهيم وإسماعيل وإسحاق إلٰها واحداً ونحن له مسلمون" (سورہ بقرہ: ۱۳۳)۔

یہ واقعات تربیت اولاد کی اہمیت اور اس کے تئیں ماں باپ کی ذمہ داری اور رول پر اسلامی نظریہ کی ترجمانی کرتے ہیں، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اولاد کو ادب سکھانا ایک صاع (ساڑھے تین کلو غلہ) خیرات کرنے سے بہتر ہے، ایک حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ما نحل والد ولده من نحل أفضل من أدب حسن" (ترمذی شریف)۔ یعنی کسی والد نے اپنی اولاد کو نیک ادب سے بہتر کوئی عطیہ نہیں دیا۔

ایک موقع پر بچوں کو تہذیب وشائستگی سکھانے پر زور دیتے ہوئے فرمایا: "أحسنوا أدبهم" (ابن ماجہ: ۲۶۱)۔

حضرت عمر بن خطابؓ کا مشہور مقولہ ہے: "تفقهوا قبل أن تسودوا" (بخاری ۱/۱۷)۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام میں اصولی طور پر علم حاصل کرنا واجب ہے، اگر یہ کہا جائے کہ اسلام جبری تعلیم کا قائل ہے تو کچھ غلط نہ ہوگا، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر مسلمان پر تحصیل علم کو فرض قرار دیا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: "طلب العلم فريضة على كل مسلم" (ابن ماجہ ۱/۲۰)۔ اور مخصوص حالات میں فرائض کی تکمیل کے لئے جبر کی صورت بھی اختیار کی جاسکتی ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد: "مروا أولادكم بالصلاة وهم أبناء سبع سنين واضربوهم عليها وهم أبناء عشر سنين وفرقوا بينهم في المضاجع" (ابوداؤد ۱/۷۱)، تعلیم وتربیت کے سلسلہ میں رہنما خطوط کا درجہ رکھتا ہے۔

ظاہر ہے کہ دس سال کی عمر میں ترک نماز پر تنبیہ اور مار کی اجازت اور سات سال کی عمر میں نماز کے لئے تاکید کا حکم اسی پس منظر میں صحیح ہوسکتا ہے، جب اس سے قبل بچہ کی تعلیم کا نظم کیا گیا ہو اور بچہ طریقہ نماز، فرائض وواجبات اور سنن کا علم رکھتا ہو، ورنہ اس تاکید وتنبیہ کا کوئی مطلب نہ ہوگا، اسی لئے امام بخاری نے صحیح بخاری، کتاب العلم میں اس بات کو ثابت کیا ہے کہ پانچ سال کی عمر میں بچوں کی تعلیم کا آغاز ہوجانا چاہئے (بخاری، باب الاغتباط فی العلم والحکمۃ ۱/۱۷)۔

بچوں کی تعلیم وتربیت کی اہمیت کے پیش نظر ہی اسلام نے ایسی خواتین سے نکاح کو معیوب کہا ہے جو بداخلاق، بدطینت اور برے اطوار کے لئے جانی جاتی ہوں، اور ایسی عورتوں سے نکاح کو پسند کیا ہے جو دین دار اور خوش اخلاق ہوں۔

اسلام کی بنیادی ہدایتوں میں یہ بھی ہے کہ مباشرت کے وقت یہ دعا پڑھے: "بسم الله اللهم جنبنا الشيطان وجنب الشيطان ما رزقتنا"، تاکہ بچے شیطان کے اثرات سے محفوظ رہیں، پھر جب بچہ کی ولادت ہو تو ایک کان میں اذان، دوسرے میں اقامت کہی جائے، پھر تحنیک وتبریک کا عمل کرایا جائے، اچھا اسلامی نام رکھا جائے اور جب بولنے کی ہمت کرے تو سب سے پہلے کلمہ طیبہ یاد کرایا جائے، اور جب شعور آنے لگے تو دینی تعلیم اور اسلامی تربیت پر خاص توجہ دی جائے تاکہ دنیا میں وہ مثالی انسان کا کردار ادا کرے اور آخرت میں اللہ کے عذاب سے محفوظ رہے۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں: "إن رسول الله ﷺ كان يؤتى بالصبيان فيبرك عليهم ويحنكهم" (مشکاۃ ۲/۳۶۲، باب العقیقہ)۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "من له ولد فليحسن اسمه وأدبه" (مشکاۃ ۲/۲۷۱)۔

اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: "قوا أنفسكم وأهليكم نارا"۔

یہ ہدایتیں اس بات کی غماز ہیں کہ ابتداء تخلیق ہی سے بچہ خصوصی توجہ، دینی واسلامی تربیت اور روحانی اصطلاح کا محتاج ہے تاکہ جب وہ جوانی کی دہلیز پر قدم رکھے تو وہ ایک ایسے انسان کا کردار ادا کرے جو انسانی سماج کا قابل فخر فرد اور ملت کا دمکتا ستارہ ہو، انسانیت کی خدمت اور ملت سے خیر خواہی کو اپنا فرض سمجھتا ہو، ایسے ہی صالح اولاد کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ماں باپ کے لئے صدقہ جاریہ سے تعبیر فرمایا ہے:

''إذا مات الإنسان انقطع عنه عمله إلا من ثلاث: صدقة جارية وعلم ينتفع به وولد صالح يدعو له'' (بخاری شریف ۱/۲۵۶)۔

ماں باپ کی تعلیم وتربیت کا بچہ کی زندگی پر اثر ہوتا ہے اور اس کی دنیا وآخرت بھی اسی ماحول میں بنتی یا بگڑتی ہے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی وضاحت فرمائی ہے۔

''ما من مولود يولد على الفطرة فأبواه يهودانه أو ينصرانه أو يمجسانه'' (مشکوۃ ۲۱)۔

یعنی بچہ میں اسلام قبول کرنے کی استعداد ہوتی ہے، مگر ماں باپ کی تعلیم وتربیت اسے یہودی، نصرانی یا مجوسی بنا دیتی ہے، اسی لئے اسلام میں بچہ کی تعلیم وتربیت اور اصلاح حال کی ذمہ داری ماں باپ پر ہے، اور وہ اس بارے میں جواب دہ بھی ہیں، کل قیامت کے میدان میں ان سے اس بابت سوال بھی ہوگا، "ماذا علمته وماذا أدبته"۔

بچوں کی تعلیم اسلام کی نگاہ میں کس قدر اہمیت کی حامل ہے، اس کا اندازہ اس سے بھی کیا جاسکتا ہے کہ اصولی طور پر بالغ ہونے کے بعد بچہ کا نفقہ باپ پر نہیں ہے، سوائے اس کے کہ وہ معذور ہو، لیکن اگر وہ حصول تعلیم میں مصروف ہو اور باپ مالدار ہو تو اس کا نفقہ اور تعلیمی خرچہ باپ پر ہے، علامہ ابن عابدین شامی تحریر فرماتے ہیں:

''وكذا تجب لولده الكبير العاجز عن الكسب كأنثى مطلقاً وزمن ومن يلحقه العار بالتكسب وطالب علم لا يتفرغ لذلك، كذا في الزيلعي والعيني'' (رد المحتار ۵-۲۷۱)۔

اسی طرح فقہاء نے ایسے بالغ بچوں کو زکوۃ کا مصرف قرار دیا ہے، جو حصول علم میں مصروف ہوں اور ان کے والدین غریب ہوں۔

دینی وعصری علوم کس حد تک ضروری ہے:

دین کے تمام شعبوں سے متعلق بنیادی تعلیمات سے بچوں وبچیوں کو آراستہ کرنا ہر ماں باپ پر واجب ہے، کیونکہ عقائد وعبادات، معاملات واخلاقیات سے متعلقہ علوم کا حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے، یعنی توحید وشرک کی حقیقت، نبوت ووحی کا اسلامی تصور، انبیاء بالخصوص پیغمبر اسلامؐ کے حالات زندگی، طہارت وپاکی، نماز، روزہ، زکوۃ، حج اور قربانی کے بنیادی احکام ومسائل، نکاح، طلاق وتفریق، خرید وفروخت، ملازمت ونوکری، کسب معاش کے حلال وحرام طریقے، شریعت میں حرام کردہ اعمال وافعال اور اشیاء کی تفصیلات، صحابہ وصحابیات کی پاکیزہ زندگیوں سے متعلق بنیادی معلومات، والدین، اولاد، میاں بیوی اور اعزہ واقارب کے حقوق کا جاننا ہر مسلمان پر فرض ہے۔

''قوا أنفسكم وأهليكم ناراً'' کی تفسیر میں علامہ قرطبی تحریر فرماتے ہیں:

''وروى عن علي بن أبي طلحة عن ابن عباس رضي الله عنه: قوا أنفسكم وأمروا أليكم بالذكر والدعاء حتى يقيهم الله بكم وقال علي رضي الله عنه وقتادة رضي الله عنه ومجاهد رضي الله عنه، قوا أنفسكم بأفعالكم وقوا أهليكم بوصيتكم، ابن العربي وهو الصحيح .... وقال بعض العلماء لما قال ''قوا أنفسكم'' دخل فيه الأولاد لأن الولد بعض منه، فيعلمه الحلال والحرام ويجنبه المعاصي والآثام إلى غير ذلك من الأحكام .... وذكر القشيري أن عمر رضي الله عنه قال لما نزلت هذه الآية يا رسول الله نقي أنفسنا فكيف لنا بأهلينا؟ (تنهونهم عما نهاكم الله وتأمرونهم بما أمر الله)، وقال مقاتل: ذلك حق عليه في نفسه وولده وأهله وعبيده وإمائه .... فعلينا تعليم أودلانا وأهلينا الدين والخير وما لا يستغني عنه من الأدب، وهو قوله تعالى'' وأمر أهلك بالصلاة واصطبر عليها، ونحو قوله تعالى للنبي صلى الله عليه وسلم: ''وأنذر عشيرتك الأقربين'' (قرطبی ۱۸-۱۲۷-۱۲۸)

قرآن وحدیث، کلام وعقیدہ اور سیرت وفقہ میں تبحر وبصیرت حاصل کرنا اور نت نئے مسائل اور حوادث وواقعات میں تخریج احکام کے لئے اجتہاد وقیاس کی قابلیت پیدا کرنا چونکہ ہر مسلمان پر فرض نہیں ہے، اس لئے بچوں اور بچیوں کو اس حد تک اعلیٰ تعلیم سے واقف کرانا اولیاء کے ذمہ ضروری نہ ہوگا، لیکن مستحسن اور مطلوب ہے، بلکہ فقہاء نے اسے فرض کفایہ قرار دیا ہے، اس کی تائید قرآن وحدیث سے ہوتی ہے۔

عصری علوم جن کا موضوع عام طور پر انسان اور عالم انسان ہے، اور جن کے مقاصد، انسانی زندگی کی حفاظت اور ضروریات زندگی کی فراہمی ہے، اگر اسلامی ہدایات کی روشنی میں حاصل کئے جائیں اور انسانوں کو نفع پہنچانا مقصود ہو، تو ایسے علوم حاصل کرنا اسلام میں نہ صرف جائز ہے بلکہ محمود ہے؛ کیوں کہ بہت سے وہ علوم ہیں جن سے احکام شریعت کے مقاصد خمسہ میں سے کسی مقصد کی تکمیل ہوتی ہے، مثلاً طب (میڈیکل سائنس)، انسانی جسم کے لئے نفع بخش ہے، انجینئرنگ ضروریات زندگی کی تکمیل کرتی ہے، علم قانون (لاء) عزت وآبرو، مال وزر اور نفس وجان کا محافظ ہے، ادب وصحافت امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا مضبوط وموثر ہتھیار ہے، اور علم معاشیات کا مقصد افراد وسماج کی معاشی ضرورتوں کو پورا کرنا ہے، اس لئے یہ تمام علوم اسلامیہ میں مطلوب ومحبوب ہیں اور شرعی نقطہ نظر سے ان کی حیثیت فرض کفایہ کی ہے۔

نیز ایسے علوم جو انسانی معیشت کو سہارا دے شریعت میں ان کا سیکھنا جائز اور کبھی ضروری ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: "كاد الفقر أن يكون كفراً"۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: "قوا أنفسكم وأهليكم ناراً" بچوں کو دوزخ سے بچانے کے لئے دین کی تعلیم تو ضروری ہے ہی، طریقہ معاش اور اس سے متعلقہ علوم وفنون سے واقفیت بھی ضروری ہے، تاکہ بچے جائز طریقہ پر اپنی معاشی ضروریات کی تکمیل کریں اور ناجائز سرگرمیوں میں ملوث ہوکر اپنی آخرت تباہ نہ کریں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکمت ودانائی کی ہر بات کو مومن کا متاع گم گشتہ قرار دیا ہے، ''الحكمة ضالة المؤمن'' عصری علوم کا تعلق حکمت ودانائی سے ہے، لہٰذا اسلامی اصولوں کا تقاضا ہے کہ عصری علوم سے بچوں کو واقف کرایا جائے، کیونکہ یہ انسانیت کے لئے مفید ہیں اور پیغمبر اسلامؐ نے جہاں مذہبی علوم کو ضروری قرار دیا وہیں علی الاطلاق علم نافع کو بھی اہمیت دی، چنانچہ روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم علم نافع کی دعا کیا کرتے تھے، اور غیر نافع سے پناہ مانگا کرتے تھے۔

اسی طرح قرآن مجید کی مختلف آیتوں میں ایسے حقائق پر روشنی ڈالی گئی ہے جن کا تعلق، فلکیات، طبیعیات، نباتات وحیوانات کے علوم سے ہے، خود انسان کی مرحلہ وار تخلیق اور نفسیات کا تذکرہ بار بار کیا گیا ہے، گذشتہ اقوام کے قصص وواقعات، ان کی آبادی، محل وقوع، صنعت وحرفت، زراعت وغلہ بانی اور مقام عذاب وقہر کا ذکر بھی ہے اور ان میں غور وفکر کی دعوت بھی دی گئی ہے، ظاہر ہے کہ ان عصری علوم کے حصول کے بغیر تحقیق وجستجو اور فکر وتدبر کا حق ادا نہیں کیا جاسکتا، اس لئے اس حد تک ان علوم کو حاصل کرنا کہ کائنات کے اسرار ورموز سے پردہ چاک ہو اسلامی نقطہ نظر سے جائز ومطلوب ہوگا، کسی دور میں علماء اسلام نے اس میدان میں امامت وپیشوائی کا کردار بھی ادا کیا ہے۔

البتہ بچیوں کے لئے لازم ہوگا کہ شرعی حدود کی پوری رعایت کے ساتھ عصری علوم حاصل کریں یعنی دوران تعلیم بے پردگی نہ ہو، غیر محرم مردوں کے ساتھ تنہائی نہ ہو، فتنہ کے مواقع سے بچنے کا اہتمام ہو، ایسا علم نہ ہو جو شرعاً ناجائز ہو جیسے رقص وسرور اور موسیقی کا فن وغیرہ، ایسی تعلیم نہ ہو جو عورت کی فطری صلاحیتوں سے ہم آہنگ نہ ہو اور حصول علم کی اجازت شادی سے پہلے ولی سے اور شادی کے بعد شوہر سے حاصل ہو۔

اگر حکومت کسی سطح تک تعلیم کو لازم قرار دے تو اس کا کیا حکم ہے:

اسلامی نقطہ نظر سے عصری علوم حاصل کرنا بنیادی طور پر فرض کفایہ ہے، لیکن اگر حکومت کسی سطح مثلاً (Secondary) تک بچے اور بچیوں کے تعلیم کو لازم قرار دے اور یہ قانون تعلیمی بہتری اور معاشی اصلاحات کے پس منظر میں وضع کیا گیا ہو تو مسلمانوں کے لئے اسلامی اصولوں کی پاسداری کرتے ہوئے ملکی قانون کا پالن کرنا ضروری ہوگا، کیونکہ اسلام تعلیم سے منع نہیں کرتا، اور انحراف کی وجہ سے مسلمان مسائل کا شکار ہوں گے، پاسپورٹ، بینک اکاؤنٹ اور حکومت کی فلاحی تدبیروں سے استفادہ کرنا اس کے بغیر ممکن نہ ہوگا۔

ہاں مسلم دانشوروں اور ارباب علم وفضل کی ذمہ داری ہوگی کہ وہ مسلم بچیوں کی مستقل، علاحدہ تعلیم گاہ کا انتظام کریں تاکہ اسلامی ہدایات کی روشنی

میں ان کی مطلوبہ تعلیم وتربیت کا فریضہ انجام پائے اور وہ خاندان وسماج کے لئے ممتاز کردار ادا کریں۔

کیا جنس کی تعلیم بھی بچوں کا حق ہے:

انسان کی کچھ ضرورتیں وہ ہوتی ہیں جو فطری ہوتی ہیں، عمر میں اضافے کے ساتھ ان میں بھی ترقی ہوتی رہتی ہے، وقت آنے پر اس کی ادائیگی کا طریقہ انسان خود سیکھ جاتا ہے، کسی تعلیم وتجربہ کا محتاج نہیں ہوتا، جیسے بھینس کا بچہ تیرنا جانتا ہے مگر وہ کسی کا تربیت یافتہ نہیں ہوتا۔

ان ہی میں انسان کی جنسی ضرورت بھی ہے، اللہ تعالی نے مرد وعورت میں کشش رکھی ہے اور جوں جوں انسان بلوغ کے قریب پہنچتا ہے جنسی ضرورت کا تقاضا بڑھتا جاتا ہے، حالاں کہ اس سے پہلے انسانی خیال میں اس ضرورت کا احساس پیدا نہیں ہوتا، اسی لئے اسلام نے حکم دیا ہے کہ جب بالغ ہوجائیں تو ان کا فوری نکاح کردیں اور بلا عذر شرعی تاخیر نہ کی جائے، حضرت علیؓ کی روایت:

''إن رسول اللهﷺقال له يا علي ثلاث لا توخرها: الصلاة إذا حانت، والجنازة إذا حضرت، والأيم إذا وجدت لها كفواً'' (ترمذی شریف ۱/۲۰۶)۔

عہد جدید سے پہلے انسان ہزاروں سال سے اس روئے زمین پر آباد ہے، اور ابو الانسان حضرت آدمؑ سے لے کر آج کے انسانوں تک لاکھوں اور اربوں انسان اس دنیا میں آئے اور انہوں نے بشری تقاضے کی تکمیل کی، لیکن کسی کو تربیت کی ضرورت نہ تھی، فی زمانہ یہ خیال پیدا ہوا کہ بچوں کو جنسی بے راہ روی اور اس کے برے اثرات سے آگاہ کرنے کے لئے جنس کی تعلیم اسکولی سطح پر ضروری ہے، اس سمت میں قدم بھی اٹھائے گئے اور عصری درسگاہوں میں اس نصاب کو شامل بھی کیا گیا۔

یہ فیصلہ فطرت، تاریخ انسانی کے تجربہ اور اسلامی ہدایات کے خلاف تھا، اور تعلیم وتربیت کے مقاصد سے ہم آہنگ بھی نہ تھا، کیوں کہ تعلیم کا مقصد انسانیت کی تعمیر ہے نہ کہ تخریب۔

کم عمر بچے اور بچیوں کو جنس کی تعلیم دینا درحقیقت ان میں خفتہ جذبات اور خوابیدہ خواہشات کو ہوا دینا ہے، انسانی فطرت ہے کہ جب جذبات اور امنگوں کی تکمیل کا جائز راستہ میسر نہ ہو تو ناجائز طریقے اختیار کرنے سے بھی انسان پس وپیش نہیں کرتا، چنانچہ قلیل عرصہ میں تجربہ نے یہ ثابت کردیا کہ انگیٹھیوں کو سلگانے کا انجام کیا ہوتا ہے۔

نابالغ بچے اور بچیوں کا گھر سے راہ فرار اختیار کرنا، اسکول میں ہم جماعت لڑکوں یا اساتذہ کی جانب سے نابالغ بچیوں کی عصمت ریزی کے واقعات، تفریحی مقامات اور سنسان علاقوں میں نوعمر بچے اور بچیوں کا آزادانہ اختلاط اور اخلاق سوز حرکات میں ملوث ہونا، ۲۴ رگھنٹے فون پر شہوانی گفتگو میں مصروف رہنا اور انسانی اخلاق واقدار اور سماجی روایات کا گلا گھونٹنا، انسانی سماج، بالخصوص مسلم معاشرہ کے لئے ایک ایسا ناسور ہے، جو اسی نظریہ کی پیداوار ہے جو اسکول میں جنس کی تعلیم اور مخلوط تعلیم کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔

عقل ودانش کی میزان میں ایسے اقدامات کو درست نہیں ٹھہرایا جاسکتا، اسی لئے اسلام کی نظر میں معصوم بچے اور بچیوں کو جنس کی تعلیم دینا تخریب اخلاق کی سمت تباہ کن اقدام ہے، اور قلیل فائدے کے لئے کثیر نقصان کا سودا کرنے کے مرادف ہے۔

آپ ﷺ نے میاں بیوی کے درمیان جنسی عمل کو نہایت پردہ داری سے انجام دینے کا حکم دیا، اور رسول اللہ ﷺ جب ازواج مطہرات سے قربت فرمایا کرتے تو جسم مبارک پر چادر ڈال لیتے تھے، اور مادر زاد ننگا ہوکر جنسی عمل کرنے سے منع فرمایا۔

لہذا اس بات کی اجازت نہیں دی جاسکتی کہ ناپختہ بچوں اور بچیوں کو پختگی اور جنس کی تفصیلات سے آگاہ کیا جائے کہ اس میں تعمیر سے زیادہ تخریب اور نفع کے مقابلے نقصان زیادہ اور متعدی ہے، بلکہ تخریب ہی تخریب اور نقصان ہی نقصان ہے کیونکہ یہ مختلف سنگین جرائم کی جڑ اور بنیاد ہے۔

اس زاویے سے بھی غور کیا جاسکتا ہے کہ نقشوں اور تصویروں کے ذریعہ جنسی عمل کی تفصیل بیان کرنا درحقیقت خیالی زنا ہے جو آہستہ آہستہ حقیقت میں تبدیل ہوکر بچے اور بچیوں کو اخلاقی برائیوں کا خوگر اور زنا کا سوداگر بنادیتا ہے۔

اسی طرح جنسی ضرورت کا تقاضا بلوغ کی عمر میں شدت اختیار کرتا ہے، بچے اور بچیوں کو فطرتاً اس کی ضرورت نہیں ہوتی، اس لئے یہ ان کے

حقوق میں شامل ہی نہیں ہے کہ اس کا پاس ولحاظ ضروری ہو۔

حق نکاح:

نکاح ایک ایسا معاہدہ ہے جس میں عبادت کی شان ہے، اسی لئے فقہاء نے لکھا ہے کہ نفل عبادت میں مشغول ہونے سے افضل نکاح اور مقاصد نکاح کی تکمیل کے لئے کوشاں رہنا ہے۔

علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں: ''حتی لو قالوا إن الاشتغال به أفضل من التخلی لنوافل العبادات. أی الاشتغال به وما یشتمل علیه من القیام بمصالحه وإعفاف النفس من الحرام وتربیة الولد ونحو ذلك'' (ردالمحتار ۴/۵۱)۔

نسل انسانی کا پھیلاؤ، خاندانی نظام کا تحفظ، معاشرہ کی تشکیل، باہمی محبت وارتباط کا چلن، نفسانی خواہشات کی تکمیل اور اولاد کا حصول، نیز اسلام اور مسلمانوں کی بقاوترقی کی ضمانت ہی نظام نکاح میں ہے، اسی لئے قدیم وجدید تمام مذاہب اور قوموں میں نکاح کی رسم موجود رہی ہے، گویا فطری تقاضہ کی تکمیل کا فطری طریقہ ہے، قرآن مجید نے اسی راز سے پردہ اٹھایا ہے:

''واللہ جعل لکم من أنفسکم أزواجا'' (سورۂ نحل: ۷۲)۔

نکاح کی ترغیب دیتے ہوئے اللہ جل شانہ نے ارشاد فرمایا: ''فانکحوا ما طاب لکم من النساء'' (سورۂ نساء: ۳)۔

لیکن یہ ایک ایسی ضرورت ہے جس کی حاجت بلوغ کے بعد پیش آتی ہے، اسی لئے فقہاء نے اسے عقد سے تعبیر کیا ہے، "عقد یفید ملك المتعة قصداً" (الدر المختار مع ردالمحتار ۴/ ۵۲۔۵۳)۔

کسی بھی عقد (معاملہ) کی صحت کے لئے اہلیت اور اہلیت کے لئے بلوغ شرط ہے۔

نیز نکاح کے تینوں درجات: فرض، واجب وسنت میں نفسانی جذبات کے ساتھ جس چیز کو بنیادی عنصر کا درجہ حاصل ہے وہ ہے عفت و پاکدامنی اور حصول اولاد کا جذبہ، ظاہر ہے کہ یہ جذبات بلوغ کے بعد ہی پیدا ہوتے ہیں، اسی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے ان لوگوں کو نکاح کا حکم دیا جو حق زوجیت ادا کرنے کی اہلیت رکھتے ہوں "من استطاع منکم الباءة فلیتزوج" (بخاری شریف ۲/ ۷۵۸)۔

وہ بچے جو باپ کے زیر پرورش ہوں، رسول اللہ ﷺ نے ان کے حقوق میں اس بات کو بھی اہم قرار دیا کہ باپ ان کے نکاح کردیں جب وہ بالغ ہوجائیں، حدیث کے الفاظ ہیں:

''حق الولد علی الوالد أن یحسن اسمه ویعلمه الکتابة ویزوجه إذا بلغ'' (بحوالہ قرطبی ۱۸/ ۱۲۸)۔

بچوں کی تعلیم وتربیت، پرورش اور ان کے دینی ودنیاوی مصالح کا خیال رکھنا باپ اور اولیاء کے فرائض منصبی میں سے ہے، نکاح دینی ودنیاوی مصالح میں داخل ہے، اس لئے بچوں کا نکاح باپ اور اولیاء کی ذمہ داری ہے، چنانچہ علامہ عینی حدیث رسول ﷺ ''کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیته، والأمیر راع والرجل راع علی أہل بیته والمرأة راعیة علی بیت زوجها وولده فکلکم راع وکلکم مسئول عن رعیته'' کی شرح میں لکھتے ہیں:

''وکلکم راع اسم فاعل من رعی رعایة وهو حفظ الشئی وحسن التعهد له والراعی هو الحافظ المؤتمن الملتزم صلاح ما قام علیه وماهو تحت نظره فکل من کانت تحت نظره شئی فهو مطلوب بالعدل فیه والقیام بمصالحه فی دینه ودنیاه ومتعلقاته'' (حاشیہ بخاری ۲/ ۷۸۳)۔

مذکورہ بالا تفصیلات سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ نکاح بھی بچوں کا حق ہے، باپ دادا یا اولیاء کی ذمہ داری ہے کہ جب بچے بالغ ہوجائیں یا قریب البلوغ ہوں اور نکاح کی ضرورت محسوس ہوتو ان کا مناسب جوڑا دیکھ کر نکاح کردیں اگر وہ شرطیں موجود ہوں جن کو فقہاء نے ضروری قرار دیا ہے، اگر بلوغ کے بعد بچے اپنا نکاح کفو کی رعایت کے ساتھ خود کرلیں تو نکاح صحیح ہوگا اور ولی کی اجازت ضروری نہ ہوگی۔

اگر بچے ابھی بالغ نہیں ہوئے تو ان کے نکاح کا حق ولی کو ہے، ولی اگر باپ یا دادا ہو تو ان کا کیا ہوا نکاح لازم ہوگا اور بلوغ کے بعد بچوں کو خیار نہ ہوگا، باپ دادا کے علاوہ دوسرے درجہ کا کوئی ولی ہو تو ان کا کیا ہوا نکاح درست ہوگا مگر لازم نہ ہوگا، چنانچہ بلوغ کے بعد بچوں کو اختیار حاصل ہوگا۔

صاحب درمختار لکھتے ہیں: ''وهو أى الولى شرط صحة نكاح صغير ومجنون ورقيق لا مكلفة منعقد نكاح حرة مكلفة بلا رضا ولى. والأصل أن كل من تصرف فى ماله تصرف فى نفسه وما لا فلا'' (الدر المختار مع رد المحتار ۴-۱۱۵-۱۱۶)۔

آگے لکھتے ہیں: ''وللولى إنكاح الصغير والصغيرة جبراً ولو ثيباً كمعتوه ومجنون شهراً ولزوم النكاح ولو بغبن فاحش أو زوجها بغير كفء إن كان الولى المزوج بنفسه بغبن أبا أو جدا. وكذا المولى وابن المجنونة لم يعرف منهما سوء الاختيار، مجانة وفسقاً، وإن عرف لا يصح النكاح اتفاقاً'' (الدر المختار مع رد المحتار ۴-۱۲۷-۱۲۸)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عائشہ صدیقہؓ سے نکاح کا پیغام ابوبکر صدیقؓ کو بھیجا جسے ابوبکر صدیقؓ نے قبول فرمالیا اور عائشہؓ کا نکاح آپ سے فرمادیا جبکہ اس وقت عائشہؓ کی عمر مشہور روایت کے مطابق ۶ رسال تھی۔

''عن عائشة أن النبى ﷺ تزوجها وهى بنت ست سنين وأدخلت عليه وهى بنت تسع سنين'' (بخاری ۲/۷۷۱)۔

معلوم ہوا کہ بلوغ سے پہلے بھی بچوں کا نکاح اولیاء کر سکتے ہیں اگر وہ مناسب سمجھیں اور آئندہ کسی بڑے اختلاف یا نزاع کا خطرہ نہ ہو، ورنہ بہتر یہی ہے کہ بچوں کا نکاح اولیاء اس وقت کریں جب وہ بالغ ہو چکے ہوں اور ان کی پسند و ناپسند کو بھی ملحوظ رکھیں، تا کہ آئندہ کی زندگی تلخیوں کی نذر نہ ہوجائے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی چاروں صاحبزادیوں کا نکاح اسی طرز پر فرمایا اور نکاح میں جو دوام واستقرار مطلوب ہے اس کے لئے یہی صورت زیادہ مفید ہے۔

عام طور پر کم عمری کی شادی بڑے ہونے کے بعد اس وقت راس نہیں آتی یا دو خاندانوں کے بیچ اختلاف اور بسا اوقات طلاق کی نوبت آتی ہے، جب باپ دادا یا ولی نے ناعاقبت اندیشی سے کام لیا ہو، کبھی فسق و فجور یا دنیاوی طمع وحرص اس کی وجہ ہوتی ہے، اسی لئے فقہاء نے اس نکاح کو باطل قرار دیا ہے، جس میں باپ دادا یا ولی نکاح کا فسق اور سوء اختیار نمایاں ہو اور وہ اس کے لئے شہرت بھی رکھتا ہو، کیونکہ حق ولایت کی بنیاد شفقت کے جذبہ پر ہے، اور قصداً غلط انتخاب اس جذبہ کو مجروح کرتا ہے، لہذا ایسی صورت میں اس سے حق ولایت سلب ہوجائے گا اور اس کا کیا ہوا نکاح شرعاً کالعدم قرار پائے گا۔

علامہ حصکفی تحریر فرماتے ہیں: ''وإن عرف لا يصح النكاح اتفاقاً وكذا لو كان سكران فزوجها من فاسق أو شرير أو فقير أو ذى حرفة دنية لظهور سوء اختياره فلا تعارضه شفقته المظنونة'' (الدر المختار مع رد المحتار ۴-۱۲۸-۱۲۹)۔

لہذا بہتر یہ ہے کہ کم عمری میں بلا وجہ نکاح سے احتراز کیا جائے اور جب بالغ ہوجائیں تو تاخیر بھی نہ کریں۔

قرآن وحدیث اور دینی ودنیاوی مصلحتوں کا تقاضا اور فقہاء کی تصریحات کا حاصل یہی ہے۔

بچہ مزدوری:

بچوں کے حقوق سے متعلق اسلامی ہدایات نہایت واضح اور تفصیلی ہیں، زمانہ حمل، پیدائش، کفالت و پرورش اور تعلیم وتربیت کے احکام بسط وتفصیل سے فقہی کتابوں میں موجود ہیں، بچوں کو مزدوری پر لگانے اور معاشی ضرورت کی تکمیل کی ذمہ داری ان کے ناتواں کاندھوں پر ڈالنا اسلامی تعلیمات کے مغائر ہے۔

اسلام بنیادی طور پر بچوں کے ساتھ شفقت ورحمت اور خیر خواہی کے جذبہ کی ستائش کرتا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "من لم یرحم صغیرنا ولم یعرف حق کبیرنا فلیس منا" (ابوداؤد شریف ۳/۶۷۶)۔

بچوں کو کسب معاش کا مکلف بنانا دراصل ان کے ساتھ ناانصافی، بے رحمی اور بدخواہی پر مبنی ہے، نیز معاشی، اخلاقی اور فکری اعتبار سے انہیں پسماندہ اور محروم رکھنا ہے، اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کم عمر بچوں کو کسب معاش کے لئے استعمال کرنے سے منع فرمایا، حدیث کے الفاظ ہیں:

''لا تكلفوا الصغير الكسب فإنه إذا لم يجد سرق'' (موطا امام مالك، باب الامر بالرفق بالمملوك: ۳۸۵)۔

صحت، جسمانی نشوونما، ذہنی پرداخت اور فکری بالیدگی بچوں کے بنیادی حقوق ہیں، کم عمری میں مزدوری پر لگانے سے ان کے یہ حقوق متاثر ہوتے ہیں اور مستقبل میں کئی لاعلاج بیماریوں کے پیدا ہونے کا قوی خطرہ بڑھتا ہے، یہ اس درجہ کا ضرر ہے کہ شریعت اسے گوارہ نہیں کرتی، چنانچہ فقہی اصول اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: "لا ضرر ولا ضرار" (موطا امام مالک کتاب الاقضیہ ۳۱۱)۔

اسی طرح ایک موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو کسی کو ضرر پہنچائے اللہ اس کو ضرر سے دو چار کریں گے اور جو کسی کو مشقت میں ڈالے اللہ بھی اس کو مشقت میں مبتلا فرمائیں گے، "من ضار ضار الله به ومن شاق شاق الله عليه" (ترمذی باب ما جاء فی الخیانۃ والغش ۲ / ۱۵)۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام نے بچوں کی تعلیم وتربیت، پرورش وکفالت اور نفقہ وسکنی کی ذمہ داری باپ دادا اور ان کی عدم موجودگی میں حسب مراتب قریبی رشتہ داروں پر رکھی ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ کی روایت ہے: ''إن هنداً قالت: يا رسول الله إن أبا سفيان رجل شحيح وليس يعطيني ويكفيني وولدى إلا ما أخذت منه وهو لا يعلم، فقال: خذى ما يكفيك وولدك بالمعروف'' (اخرجہ البخاری: ۲۲۱۱، مسلم: ۱۷۱۴، ابوداؤد: ۳۵۳۲، نسائی ۸ / ۲۴۶)۔

فقہاء نے یہ تفصیل بیان کی ہے کہ نابالغ لڑکا اگر وہ مالدار نہ ہو تو اس کا نفقہ باپ پر ہے تا آں کہ وہ بالغ ہوجائے اور کسب معاش پر قدرت حاصل کرلے، بلوغ کے بعد بچہ کسی عذر کی وجہ روزی کمانے کی سکت نہ رکھتا ہو تو اس کا نفقہ اب بھی باپ کے ذمہ ہے۔

علامہ حصکفی تحریر فرماتے ہیں: ''وتجب النفقة بأنواعها الثلاثة على الحر لطفله يعم الأنثى والجمع الفقير الحر فإن نفقة المملوك على مالكه والغنى فى ماله الحاضر فلو غائباً فعلى الأب'' (الدر المختار مع رد المحتار ۵-۲۶۸)۔

لڑکی کا نفقہ شادی ہونے تک ہر حال میں باپ کے ذمہ ہے، کیونکہ اس کی نسوانیت کسب معاش سے عجز کی بنیادی اور مستقل وجہ ہے، لہذا بلوغ سے پہلے اور بلوغ کے بعد دونوں صورتوں میں لڑکی کا نفقہ باپ وغیرہ پر واجب ہے، باپ کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ لڑکی کو بلوغ کے بعد ذریعہ معاش اختیار کرنے پر مجبور کرے، ہاں ہنر وحرفت کی تعلیم دلوا سکتا ہے۔

اگر لڑکی گورنمنٹ یا پرائیوٹ نوکری کرتی ہو یا کوئی مہذب پیشہ اپناتی ہو جس سے حاصل آمدنی اس کو کفایت کرتی ہو تو اس کا نفقہ باپ پر واجب نہیں رہے گا۔

ہاں اگر لڑکی اس کی آمدنی سے اس کی کفایت نہ ہوتی ہو تو اسے پورا کرنا باپ کی ذمہ داری ہوگی، علامہ حصکفی لکھتے ہیں:

''وكذا تجب لولده الكبير العاجز عن الكسب كأنثى مطلقاً'' (الدر المختار مع رد المحتار ۵-۲۷۰)، اس کی تشریح میں علامہ شامی لکھتے ہیں:

''أى ولو لم يكن بها زمانة تمنعها عن الكسب فمجرد الأنوثة عجز، إلا إذا كان لها زوج فنفقتها عليه ما دامت زوجة''، آگے لکھتے ہیں: ''وتقدم أنه ليس للأب أن يوجرها فى عمل أو خدمة وأنه لو كان لها كسب لا تجب عليه .... ولو قدر على اكتساب ما لا يكفيه فعلى أبيه تكميل الكفاية'' (رد المحتار ۵ / ۲۷۰-۲۷۱، نیز دیکھئے: ۵ / ۲۶۸)۔

اگر ماں باپ دونوں غریب ونادار ہوں تو باپ پر لازم ہوگا کہ کسب معاش اور روزی کی تلاش میں لگے یا بدرجہ مجبوری گداگری اختیار کرے اور اپنے اہل وعیال کی کفالت کی ذمہ داری پوری کرے۔

علامہ حصکفی تحریر فرماتے ہیں: ''فلو كانا فقيرين فالأب يكتسب ويتكفف وينفق عليهم'' (الدر المختار ۵ / ۶۹)۔

اگر اب بھی ضرورت پوری نہ ہوتی ہو تو قریبی رشتہ داروں کا فرض ہوگا کہ ان کی امداد کریں اور جب فراخی کے ایام آئیں تو وہ باپ سے رجوع کرلیں، اگر یہ صورت بھی ممکن نہ ہو تو حکومت کی اور سماج کے سربرآوردہ لوگوں کی ذمہ داری ہوگی کہ وہ آگے آئیں اور ایسے مفلوک الحال افراد کی دست گیری کریں۔

علامہ حصکفی لکھتے ہیں: "ولو لم يتيسر أنفق عليهم القريب ورجع على الآب إذا أيسر" (الدر المختار مع رد المحتار ۵-۲۶۹)

الغرض اسلام کا نظام کفالت کم عمر بچوں کو تعلیم وتربیت اور ذہنی وجسمانی نشوونما سے دور رکھتے ہوئے حصول معاش کے دشوار ترین راستے پر ڈالنے کی قطعاً اجازت نہیں دیتا، اور نہ ہی حق وانصاف کے پیمانے میں اس نظام کے ہوتے ہوئے اس کی حاجت ہے۔

لہذا ماں باپ کے لئے یہ جائز نہ ہوگا کہ وہ اپنی یا بچے کی معاشی ضرورت کی تکمیل کے لئے یا اسے بہتر بنانے کے لئے نابالغ بچوں کو کام پر لگائیں۔

حضرت عثمان غنیؓ فرماتے ہیں: "ولا تكلفوا الصغير الكسب فإنه إذا لم يجد سرق" (موطا امام مالک ر ۱۸۵)۔

علامہ ابن عابدین فرماتے ہیں: "وتجب لطفله الفقير أي إن لم يبلغ حد الكسب فإن بلغه كان للأب أن يوجره أو يدفعه في حرفة ليكتسب وينفق عليه من كسبه لو كان ذكراً بخلاف الأنثى" (رد المحتار ۵-۲۶۸)۔

البتہ گھر کے وہ کام کاج جو بچوں کے لئے مشقت کا باعث نہ ہوں، ماں باپ بچوں سے لے سکتے ہیں، کیوں کہ یہ کفالت کے منافی نہیں بلکہ تربیت کا ایک حصہ ہے، وہ کام جو مشقت اور دشواری پیدا کرے، ماں باپ، بچوں کو ایسے کام کا مکلف نہیں کر سکتے، رسول اللہ ﷺ نے غلام اور باندیوں کو بھی ایسے پر مشقت کام کا مکلف بنانے سے منع فرمایا اور حضرت عمرؓ تو باقاعدہ مدینہ سے باہر خاص اسی مقصد کے لئے دورہ فرماتے تھے، اور جب کوئی غلام یا باندی کسی مشقت بھرے کام میں مصروف نظر آتا تھا تو آپ اسے سبکدوش فرمادیتے۔

حضرت امام مالکؒ روایت کرتے ہیں: "عن أبي هريرة قال قال رسول الله ﷺ للملوك طعامه وكسوته بالمعروف ولا يكلف من العمل إلا ما يطيق". "مالك أنه بلغه أن عمر بن الخطاب ﷺ كان يذهب إلى العوالي كل سبت فإذا وجد عبداً في عمل لا يطيقه وضع عنه منه" (موطا امام مالك: ۳۸۵)۔

وہ بچے جو بالغ ہیں انہیں کسب معاش پر مامور کیا جاسکتا ہے، کیوں کہ ان کا نفقہ عام حالات میں باپ پر نہیں ہے، تو بدرجہ اولی انہیں ذریعہ معاش کے طور پر کوئی فن یا ہنر سکھانا ماں باپ کے لئے جائز ہوگا، بشرطیکہ وہ فن یا ہنر شرعی نقطۂ نگاہ سے ممنوع یا مذموم نہ ہو۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ "کسب معاش" یعنی معاشی ذمہ داری ایک چیز ہے اور ذریعہ معاش کے حصول کے لئے فن یا ہنر سیکھنا اور شئی ہے، فقہاء کے بیان کے مطابق نابالغ لڑکے کا نفقہ چوں کہ باپ وغیرہ کے ذمہ ہے اس لئے کسب معاش کے لئے بچے کو کام پر لگانا درست نہیں ہے، البتہ بالغ لڑکے کا نفقہ باپ وغیرہ پر نہیں ہے، اس لئے کسب معاش کے لئے بالغ لڑکے کو مجبور کیا جاسکتا ہے اور اس کی کمائی سے ہی اس کا نفقہ ادا کیا جائے گا۔

"فإن بلغه كان للأب أن يوجره أو يدفعه في حرفة ليكتسب وينفق عليه من كسبه لو كان ذكراً بخلاف الأنثى" (رد المحتار ۵-۲۶۸)۔

اگر لڑکی ہو تو چوں کہ بلوغ سے پہلے اور بلوغ کے بعد شادی ہونے تک اس کا نفقہ باپ پر ہے، اس لئے بہر دو حالت اسے کسب روزی کے لئے مجبور نہیں کیا جاسکتا، یہ اور بات ہے کہ بلوغ کے بعد اگر وہ بذات خود کسب معاش کرے تو اس کا نفقہ اس کی حاصل آمدنی سے پورا کیا جائے گا، اور اس صورت میں باپ پر اس کا نفقہ باقی نہیں رہے گا۔

"لو استغنت الأنثى بنحو خياطة وغزل يجب أن تكون نفقتها في كسبها كما هو ظاهر" (رد المحتار ۵-۲۶۸)

لیکن حصول روزگار کے لئے کوئی فن یا ہنر سیکھنے سے متعلق فقہاء کی جو تصریحات ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ نابالغ لڑکے اور لڑکیوں کو تعلیمی وتربیتی مقاصد کے پیش نظر ایسے اعمال سے دور رکھا جانا چاہئے اور تعلیم وتربیت کے بعد جب بچے بلوغ کو پہنچ جائیں تو انہیں کسی ہنر یا فن کی تربیت دینے میں شرعی مضائقہ نہیں ہے، کیونکہ یہ تعلیم وتربیت اور کفالت کے اصول کے خلاف نہیں بلکہ بیشتر شکلوں میں تعلیم کی ہی صورت ہے۔

رہی یہ صورت کہ نابالغ لڑکا جو تعلیم وتربیت میں دلچسپی نہ لیتا ہو اور ماں باپ سمجھا کر تھک ہار گئے ہوں، تو اسے کم عمری میں کسی فن یا ہنر کی تربیت کے لئے لگانا جائز ہوگا تاکہ آئندہ وہ خود کفیل ہو سکے اور کسی اور کا دست نگر یا معاشی قلت کا شکار نہ ہو، اس جواز کی بڑی وجہ یہ ہے کہ فن یا ہنر سکھانا تعلیم کا

حصہ ہے، نہ کہ خدمت وعمل کا، کسب معاش کے نابالغ بچوں کو مزدوری پر لگانے سے فقہاء نے منع فرمایا ہے اس کی بنیاد خدمت وعمل کے نظریہ پر ہے، نہ کہ تعلیم وہنرمندی پر، یہی وجہ ہے کہ لڑکیوں کو بھی بلوغ کے بعد ہنر سیکھنے کی اجازت فقہاء نے دی ہے، حالانکہ خدمت وعمل کے نظریہ سے انہیں کسب معاش پر مجبور کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

علامہ شامی لکھتے ہیں: ''فله دفعها لامرأة تعلمها حرفة كتطريز وخياطة مثلاً'' (رد المحتار ۵-۲۶۸)۔

انتہائی غربت اور معاشی بدحالی کی وجہ سے والدین کا بچوں کا نفقہ برداشت نہیں کرسکتے اور نہ ہی اپنا نفقہ اٹھا سکتے ہیں، اعزہ واقارب نے ہاتھ جھاڑ لیے ہیں، کہیں سے قرض حسنہ ملنے کی امید نہیں ہے، غیرت ہاتھ پھیلانے سے مانع ہے اور حکومت وقت بھی اپنی ذمہ داریوں کے تئیں سنجیدہ نہیں ہے تو ایسے حالات میں نابالغ مگر ہوشیار بچے کو عمر کے لحاظ سے ہلکے پھلکے کام کے لئے مزدوری سے جوڑنا بدرجہ مجبوری جائز ہوگا، ورنہ ایسے ہی حالات میں لوگ حرام راستہ اختیار کرنے پر مجبور ہوتے ہیں، خودکشی جیسے واقعات پیش آتے ہیں، اور تبدیلی مذہب کا سانحہ بھی رونما ہوتا ہے۔

لہذا شدید دینی اور جانی مضرت کے مقابلے میں قدرے کم درجہ کے نقصان کو انگیز کیا جائے گا، فقہ کا مشہور ضابطہ ہے: "إذا تعارض مفسدتان روعي أعظمهما ضرراً بارتكاب أخفهما" (الاشباہ والنظائر ۱۴۵)۔

اس طرح کے حالات پر قابو پانے کے لئے حکومت اور سماجی تنظیموں کو آگے آنا چاہئے تاکہ ایسے معصوم ستارے وقت سے قبل اپنی چمک کھونہ جائیں، اور غربت وافلاس کی وجہ سے لوگ اپنے ایمان کا سودا تک نہ کربیٹھیں، ایسے ہی لوگوں کے متعلق آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا:

"من ترك كلاً فإلي ومن ترك مالاً فلورثته" (یعنی جو کوئی بوجھ چھوڑ کر مرا ہو وہ میرے ذمہ ہے، اور مال چھوڑ کر رخصت ہوا ہو تو یہ اس کے ورثہ کا حق ہے)۔

اسی فرمان رسالت کا نتیجہ واثر تھا کہ خلیفۃ المسلمین سیدنا عمر بن خطابؓ کے زمانہ خلافت میں جب معاشی فراخی ہوئی آپؓ نے ولادت کے ساتھ ہی ہر بچہ کے لئے سرکاری خزانے سے سو درہم وظیفہ مقرر فرمادیا کاش آج کی حکومتیں دولت کی ریل پیل کے باوجود ایسا اقدام کرتیں تو کوئی بھوک سے نہ مرتا۔

جرائم اور سد باب:

جرائم کا انسداد اور معاشرہ کو مجرمانہ سرگرمیوں سے پاک رکھنے کے لئے شریعت مطہرہ نے انتہائی مضبوط ومستحکم نظام بنایا ہے اور جرائم کو دو درجوں میں تقسیم کیا ہے: پہلے درجہ میں وہ جرائم ہیں جو معاشرہ کے لئے انتہائی خطرناک اور حد درجہ نقصان دہ ہیں جیسے قتل، سرقہ، زنا وغیرہ ان کے ثبوت کی صورت میں ان کی سزائیں بھی کافی سنگین اور عبرت ناک ہیں اور شریعت نے انہیں متعین بھی کیا ہے ایسی سزائیں حدود وقصاص کہلاتی ہیں۔

دوسرے درجہ میں وہ جرائم ہیں جو نسبتاً کم سنگین ہیں اور مجرم، جرم کی نوعیت، مقام جرم، حالات اور زمانہ کے فرق سے ان کی سنگینی کم زیادہ ہوسکتی ہے، اسی لئے شریعت اسلامی نے ان کی سزائیں متعین نہیں کی ہے، بلکہ امراء اور قانون نافذ کرنے والے حکام کی صوابدید اور تقاضۂ مصلحت پر چھوڑ دیا ہے، اس طرح کی سزائیں تعزیر کہلاتی ہیں۔

صاحب تاتارخانیہ لکھتے ہیں: "والتعزير مفوض إلى رأي الإمام" (تاتارخانیہ ۳/۱۴۱)۔

بچوں کی تعزیر:

کہتے ہیں کہ چھوٹے بڑوں سے سیکھتے ہیں اور بڑے چھوٹوں پر اثرانداز ہوتے ہیں، معاشرہ میں بے دینی حیا سوز ماحول، اسلامی کلچر سے دوری اور ٹی وی، انٹرنیٹ کے راستہ مغربی تہذیب کی یلغار کے نتیجہ میں اور برائی کے اسباب ومحرکات کی فراوانی اور تربیت کے فقدان کی وجہ سے جرائم کی دنیا میں اب بچے بھی بڑوں کے شانہ بشانہ آگے بڑھ رہے ہیں، جن جرائم کو سن کر بچے کبھی خوف زدہ ہوجایا کرتے تھے آج وہ ان کا محبوب مشغلہ اور روزمرہ کے شوق بن گئے ہیں، ہندوستان اور سارے عالم میں پیش آنے والے سنگین واقعات اس کے پختہ ثبوت ہیں، اسلامی نقطہ نظر سے اگر بچے جرم کا ارتکاب کرتے ہیں، تو ان کی تعزیر کی جاسکتی ہے، مگر حدود وقصاص کا نفاذ ان پر نہیں ہوسکتا ہے۔

صاحب تاتارخانیہ حدود وقصاص اور تعزیر کے مابین فرق بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں: "والثالث أن الحد لا یجب علی الصبی والتعزیر یشرع علیه" (تاتارخانیہ ۵/۱۳۸)۔

یہی وجہ ہے کہ فقہاء نے اس بات کی تصریح فرمائی ہے کہ نماز کے بشمول دیگر عبادات کا حکم سات سال کی عمر میں بچوں کو دیا جائے گا اور دس سال میں ہلکی مار سے تنبیہ بھی کی جائے گی، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: "علموا الصبی الصلاۃ ابن سبع واضربوہ علیها ابن عشر"۔

علامہ ابن عابدین شامی نے "وفرقوا بینهم فی المضاجع" اور مذکورہ بالا حدیث کا مفہوم وسیع ترمعنی میں یہ بیان کیا ہے کہ بچوں کو جمیع مامورات کا حکم دیا جائے گا، اور تمام منہیات سے روکا بھی جائے گا، تاکہ خیر کی عادت پڑے اور شر سے نفرت کے جذبات پروان چڑھے (ردالمحتار ۵/۲)۔

تعزیر کی اصل تادیب ہے، علامہ شامی لکھتے ہیں: "هو لغة التأدیب مطلقاً وشرعاً تأدیب دون حد" (ردالمحتار ۳/ ۱۰۳)، یعنی تعزیر کا مقصود اصلی مجرم کی فتنہ پردازیوں پر قدغن لگانا، مجرم کی اصلاح وتربیت اور عوام الناس کو اس کی شرانگیزیوں سے بچانا ہے۔

لہذا جرم اگر اس قبیل سے ہو کہ اس کی سزا شریعت میں منصوص ومتعین نہ ہو، یا منصوص تو ہو لیکن مطلوبہ ثبوت فراہم نہ ہونے یا کسی خارجی عارض اور مانع کی وجہ سے مجرم پر اس سزا کا نفاذ نہ ہوسکتا ہو، مثلاً مجرم نابالغ ہو تو ایسی صورت میں مجرم کو جرم کے حساب سے تعزیری سزا دی جاسکتی ہے۔

صاحب تاتارخانیہ لکھتے ہیں: ''وینبغی أن ینظر القاضی فی سببه فإن كان من جنس ما یجب به الحد ولم یجب بعارض یبلغ التعزیر أقصی غایاته، وإن كان من جنس ما لا یجب به الحد حتی وجب التعزیر فالتعزیر مفوض إلی رأی الإمام'' (تاتارخانیہ ۵/۱۴۱)۔

تعزیر کا دائرہ:

تعزیر کا دائرہ کافی وسیع ہے، حکام یا حکومتوں کو اس بات کا اختیار ہے کہ جرم کی نوعیت، مجرم کے احوال، گردوپیش کے حالات اور اصلاح حال کی مصلحتوں کا خیال رکھتے ہوئے سزا تجویز کرے۔ اصولی طور پر اس کے لئے کوئی محدود ضابطہ مقرر نہیں ہے۔ زبانی تنبیہ اور زجر وتوبیخ سے قتل تک کی سزا دی جاسکتی ہے (درمختار مع ردالمحتار ۶/۱۰۶)۔

اسی طرح علامہ عبدالرحمن الجزری ''باب التعزیر واسع'' کے تحت لکھتے ہیں: ''وبالجملة فإن التعزیر واسع یمكن للحاكم أن یقضی به علی كل الجرائم التی لم یقع الشارع لها حداً أو كفارة علی أن یضع العقوبة المناسبة لكل بیئة ولكل جریمة من سجن أو ضرب أو نفی أو توبیخ أو غیر ذلك فقد أجاز الإسلام التعزیر بكل أنواعه للحاكم فقط'' (کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ ۵/۳۲۵)۔

قید تعزیر کی ایک صورت:

نفس قید کے جواز پر جمہور اہل علم نے مندرجہ ذیل آیات سے استدلال کیا ہے:

۱۔ ''واللاتی یأتین الفاحشة من نسائكم فاستشهدوا علیهن أربعة منكم فإن شهدوا فأمسكوهن فی البیوت حتی یتوفاهن الموت أو یجعل الله لهن سبیلاً'' (سورہ نساء: ۱۵)۔

امام رازی لکھتے ہیں کہ اس آیت میں اگرچہ زنا کی سزا کی بابت قید کا حکم منسوخ ہے، لیکن زنا کے علاوہ کے بارے میں یہ حکم آج بھی مشروع ہے (احکام القرآن ۲/۲۱۶)۔

امام سرخسی نے بھی حبس کی مشروعیت پر اس آیت سے استدلال کیا ہے (المبسوط للسرخسی ۲/۸۸)۔

۲۔ "أو ينفوا من الأرض" (سورہ مائدہ: ۳۳)۔

علامہ حصکفی اور ابن ہمام نے اس آیت سے حبس کے جواز پر استدلال کرتے ہوئے وضاحت کی ہے کہ نفی اور جلاوطنی بھی حبس کی ایک شکل ہے (فتح القدیر ۵/۴۷۱)۔

احناف کے علاوہ حنابلہ اور مالکیہ میں ابن العربی اور شوافع کی ایک جماعت نے بھی یہاں نفی سے مراد حبس (قید) ہی لیا ہے۔

۳۔ "وخذوهم واحصروهم" (سورہ توبہ: ۵)۔

علامہ کاسانی نے بدائع الصنائع میں اور ابن قدامہ نے المغنی میں اس آیت سے بھی قید کے جواز پر استدلال کیا ہے (دیکھئے: بدائع الصنائع ۷/۱۱۹، المغنی ۸/۲۷۲)۔

اس کے علاوہ فقہاء نے درجہ ذیل احادیث و آثار سے بھی استدلال کیا ہے۔

۱۔ عبداللہ بن عمر کی روایت ہے: "روى عن النبی ﷺ قال: إذا أمسك الرجل الرجل وقتله الآخر فيقتل الذی قتل ويحبس الذی أمسك" (دار قطنی ۳/۱۴۰، بیہقی ۸/۵۰)۔

۲۔ معاویہ بن حیدہ القشیری کی روایت ہے: "إن النبی ﷺ حبس رجلاً فی تہمة" (رواہ ابوداؤد ۴/۴۷، ترمذی ۴/۲۸)۔

مصنف عبدالرزاق میں حضرت علیؓ کا ایک فیصلہ بھی مذکور ہے کہ ایک شخص نے ایک آدمی کو پکڑ رکھا تھا اور دوسرے نے اسے قتل کیا تو حضرت علیؓ نے قاتل کو قتل کا حکم دیا اور پکڑنے والے کو قید کئے جانے کا فرمان جاری کیا، چنانچہ وہ شخص قتل کیا گیا اور دوسرا قید میں ڈالا گیا اور پھر قید میں ہی اس کی وفات ہوئی (مصنف عبدالرزاق ۲/۴۸۰)۔

مروجہ قید خانہ کا تصور:

عہد نبوی اور عہد ابوبکر میں قید خانہ کا مروجہ نظام نہیں تھا بلکہ حضرت عمر کے دور خلافت میں جب اسلامی سلطنت کا دائرہ پھیلا تو انہوں نے ملکی اور سماجی ضرورت کو مدنظر رکھتے ہوئے مکہ میں ایک مکان خریدا اور اسے قید خانہ میں تبدیل کیا (مجموعہ فتاوی ابن تیمیہ ۳۵/۳۹۸)۔

بعد کو حضرت علیؓ پھر حضرت عبداللہ بن زبیرؓ اور پھر مسلم سلاطین نے قید خانے تعمیر کرائے (تبصرة الحکام لابن فرحون ۲/۱۵۰)۔

سزائے قید کا درجہ:

لیکن چونکہ اسلام میں تعزیری سزاؤں کے نفاذ کا مقصد مجرمین کی اصلاح وتربیت ہے اور اصلاح وتربیت میں قید کے علاوہ دیگر سزائیں زیادہ موثر ہیں اس لئے قید کی سزا کو ثانوی حیثیت دی گئی ہے، لہذا تعزیراً قید کرنے کا حق حاکم کو اسی صورت میں ہوگا جب کوئی متبادل ادنی سزا مجرم پر اثر انداز نہ ہوسکتی ہو اور حاکم کے لئے اسے قید کرنا ناگزیر ہوجائے، ''أما فی الشريعة الإسلامية فعقوبة الحبس ليست إلا عقوبة ثانوية لا يعاقب بها إلا على الجرائم البسيطة وهی عقوبة اختيارية للقاضی'' (التشریع الجنائی ۱/۹۰)۔

بچوں کو قید کرنا:

یہی وجہ ہے کہ جرم کا ارتکاب اگر ایسے نابالغ نے کیا ہے جس پر حدود وقصاص جاری نہیں ہوسکتے اور نہ ہی سزا کے طور پر اس کی تعزیر کی جاسکتی ہے تو جرم اگر معمولی درجہ کا ہے جو عام حالات میں موجب تعزیر ہوا کرتا ہے تو ایسے جرم کی پاداش میں نابالغ بچے کو قید نہیں کیا جاسکتا، بلکہ ہلکے درجے کی تادیب اور سرزنش کی جاسکتی ہے، یا برائے اصلاح وتربیت تعزیر کی دوسری صورتیں اختیار کی جاسکتی ہیں جیسا کہ فقہاء نے بعض صورتوں کا ذکر کیا ہے۔

صاحب تاتارخانیہ لکھتے ہیں: "ثم قد يكون التعزير بالحبس وقد يكون بالصنع وتحريك الأذن وقد يكون بالكلام العنيف وقد يكون بالضرب" (تاتارخانیہ ۵/۱۴۰)۔

عام طور پر فقہاء کی یہی رائے ہے، حنفیہ میں امام سرخسی نے اسی کو راجح قرار دیا ہے (دیکھئے المبسوط ۲۰/۹۱)۔

البتہ احناف میں بعض حضرات کا مسلک یہ ہے کہ بچوں کو بھی تعزیراً قید کیا جائے، لیکن سزا کی حیثیت سے نہیں بلکہ تادیب کی غرض سے (رد المحتار ۲۵۷/۴)۔

اور اگر جرم سنگین اور خطرناک ہے تو جمہور فقہاء کے نزدیک اس صورت میں بھی نابالغ مجرم کو قید کرنے کی اجازت نہیں ہے، البتہ تعزیر کی اس سے کم درجہ کی دوسری سزائیں دی جاسکتی ہے، جو مقصد تعزیر میں سب سے زیادہ مؤثر رول ادا کرسکتی ہیں، لیکن فقہاء احناف نے اس دوسری نوع کے جرم میں نابالغ بچوں کو قید کرنے کی اجازت دی ہے، مگر یہ صراحت بھی کی ہے کہ یہ قید سزا کے طور پر نہیں بلکہ تادیب ہوگی۔

علامہ ابن عابدین لکھتے ہیں: ''ولا يحبس الصبی إلا بطريق التأديب لئلا يتجاسر إلى مثله إذا باشر شيئاً من أسباب التعدی قصداً فلو خطأ فلا'' (رد المحتار ۸۔ ۱۲۳)۔

بچوں کے سلسلہ میں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ بچے کی عمر اگر دس سال سے کم ہو جو شریعت کی اصطلاح میں صبی غیر عاقل ہے، اور اس سے کوئی جرم سرزد ہوتا ہے تو بالاتفاق اس عمر کے بچے کو قید و بند کی سزا کوئی طور نہیں دی جاسکتی عقوبۃ نا تادیباً اور خواہ جرم کی نوعیت کچھ بھی ہو۔

صاحب بدائع الصنائع نے وضاحت کی ہے: ''بخلاف المجنون والصبی الذی لا يعقل لأنهما ليسا من أهل العقوبة ولا من أهل التأديب'' (بدائع الصنائع ۷/ ۶۳)۔

بچوں کی جیل:

مذکورہ بالا تفصیلات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ دس سال یا اس سے زیادہ عمر کے بچے جو ابھی بالغ نہیں ہوئے یا ان کی عمر پندرہ سال سے کم ہے تو انہیں تعزیر و تادیب کے طور پر قید یعنی جیل میں رکھا جاسکتا ہے اور یہ بھی مسلم ہے کہ بڑوں کی قید کا مقصد سزا ہے اور بچوں کی قید کا مقصد ان کی تربیت و اصلاح ہے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب بچوں کی جیل علاحدہ رکھی جائے، اور دیگر عادی مجرمین یا ملزمین سے میل جول کی کوئی صورت ممکن نہ ہو، تاکہ آزاد کھلے فطری ماحول میں وہ تربیت پاسکیں اور ان کے اخلاق و کردار، جرائم پیشہ افراد کے تباہ کن اثرات سے محفوظ رہ سکے (رد المحتار ۳۸۵/۴)۔

قیدی بچوں کے حقوق:

۱۴ / دسمبر ۱۹۹۰ء کو جنرل اسمبلی نے نابالغ قیدیوں کے متعلق ایک اہم دستاویز (جو ریاض اصول سے مشہور ہے) کو منظوری دی۔ بنیادی اصولوں کے مقابلے یہ دستاویز زیادہ مفصل ہے، جس میں ۶۶ / اصول مذکور ہیں، اسی طرح بیجنگ قوانین ۳۰ / اصولوں پر مشتمل ہے، یہ دونوں دستاویز مندرجہ ذیل قوانین و ہدایات کی وضاحت کرتے ہیں، جن کا اطلاق نابالغوں پر ہوتا ہے:

۱۔ مقید بچوں کے ساتھ ایسا معاملہ کیا جائے جس سے ان کی عزت نفس میں اضافہ ہو، وہ معاشرہ میں باوقار زندگی گزار سکیں، ان کے مفادات وضروریات کا پورا خیال رکھیں۔

۲۔ امکان نجات کے بغیر بچوں کو سزائے موت، عمر قید یا کسی طرح کی جسمانی سزا نہیں ملنی چاہئے۔

۳۔ مقید بچوں کو بالغ قیدیوں سے الگ رکھا جائے۔

۴۔ ملزم بچوں کو بڑوں سے الگ رکھا جائے اور حتی الامکان جلد از جلد انہیں عدالتی کارروائی کے لئے پیش کیا جائے۔

۵۔ نابالغ بچوں کی پرائیویسی کا احترام ہونا چاہئے اور ان کا محفوظ مکمل ریکارڈ رکھا جائے۔

۶۔ لازمی اسکولی عمر کے بچوں کو تعلیم اور پیشہ ورانہ تربیت کا حق حاصل ہے۔

۷۔ جن اداروں میں نابالغ بچے ہوں وہاں ہتھیار نہیں لے جانا چاہئے۔

۸۔ اصول پسندی کی کارروائیاں ایسی ہوں جن سے بچوں کی عزت نفس میں کوئی فرق نہ آئے اور ان کے اندر احساس انصاف اور حقوق انسانی

کا احترام پیدا ہو۔

۹۔ نابالغوں کی موت، زخمی ہونے، بیماری، چھٹکارا، منتقلی اور داخلے کی اطلاع ان کے والدین کو دی جانی چاہئے (دیکھئے قیدیوں کے حقوق اسلامی تعلیمات کی روشنی میں، ص: ۱۷۳)۔

بیجنگ رولس اور ریاض ہدایات کافی حد تک قیدیوں سے متعلق اسلامی تعلیمات سے موافقت رکھتی ہیں، لیکن اقوام متحدہ کے مقرر کردہ یہ قوانین اور ہدایات لازمی دستاویز کا درجہ نہیں رکھتی ہیں اور نہ ہی حکومتیں دیانت داری کے ساتھ ان پر عمل پیرا ہیں، اس لئے بچہ قیدیوں کو جو بنیادی اور لازمی حقوق اسلام نے دیئے ہیں، ہم انہیں ذیل میں اختصار سے ذکر کرتے ہیں۔

قیدی بچوں سے حسن سلوک:

اسلام ایک ایسا مذہب ہے جس کی بنیاد عدل وانصاف اور احسان پر ہے، اسی لئے اسلام اس بات کا قائل ہے کہ قیدیوں کے ساتھ حسن سلوک کیا جائے اور کوئی ایسا اقدام نہ ہو جس سے قیدیوں کی عزت نفس کو ٹھیس پہنچے یا انہیں ذلت وحقارت کا احساس ہو۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "ولا یجرمنکم شنآن قوم علی أن لا تعدلوا، اعدلوا ھو أقرب للتقوی" (سورہ مائدہ: ۸)۔

جو لوگ اللہ کی محبت میں مسکین یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں ان کی توصیف بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: "ویطعمون الطعام علی حبه مسکیناً ویتیماً وأسیراً" (سورہ انسان: ۸)۔

ایسے ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قیدیوں کے ساتھ اچھے برتاؤ کی تاکید فرمائی اور جب ثمامہ بن اثال گرفتار کر کے لائے گئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "أحسنوا أسارہ" (آداب الحرب فی الاسلام للشیخ محمد الخضر، ص: ۲۸)۔

جنگ بدر میں گرفتار کئے گئے قیدیوں کے بارے میں صحابہ کو ہدایت دی اور فرمایا: "استوصوا بالأساری خیراً" (طبرانی، ص: ۹۷۷)۔

فقہاء کرام نے بھی قیدیوں کے ساتھ حسن سلوک اور بہتر برتاؤ کی ہدایت دی ہے، چنانچہ قاضی امام ابویوسف فرماتے ہیں: ''الأسیر من أساری المشرکین لابد أن یطعم ویحسن إلیه حتی یحکم فیه فکیف برجل مسلم قد أخطأ أو أذنب یترك یموت جوعاً'' (کتاب الخراج، ص: ۱۴۹۔ ۱۵۰)۔

قیدی بچہ ہو تو بالخصوص وہ امتیازی بنیاد پر حسن سلوک اور ہمدردی کا حق دار ہے۔

قیدی بچوں کو مذہبی آزادی:

بچہ قیدی کے لئے جیل میں اپنے مذہب پر عمل کرنا، عبادت بجالانا، مذہبی علوم پڑھنا لکھنا، مذہب کے عنوان پر منعقد اجلاس میں شرکت کرنا، یا مذہبی رہنماؤں سے ملاقات اور بات چیت کرنا جائز ہوگا، حکومت کی ذمہ داری ہوگی کہ وہ قیدیوں کو مذہب کے موافق غذا فراہم کرے، ایسی غذا سے اجتناب کرے جس کی اجازت قیدی کے مذہب میں نہیں ہے۔ حکومت پر اس امر کو یقینی بنانا بھی ضروری ہے کہ مذہبی امور میں کسی قیدی بچے کو کسی عمل پر مجبور نہ کیا جائے، اور نہ ہی مذہبی خطوط پر قیدیوں کے بیچ تفریق برتی جائے، بلکہ تمام مذاہب کے قیدیوں کو اپنے مذہب کے مطابق عمل کا مکمل حق حاصل ہوگا، کیونکہ مذہبی رجحان سے ہی اصلاح حال اور تزکیہ نفس کی راہیں کھلتی ہیں اور انسان کا دل پسیجتا ہے اور حق قبول کرنے کے لئے آمادہ ہوتا ہے۔

ابن کثیر لکھتے ہیں: ''کان یسمح سجناء فی السجون الإسلامیة بإدخال الکتب والأرقام والأوراق للقراءة والکتابة'' (البدایة والنهایة لابن کثیر ۱۴/ ۱۴۰)۔

اور علامہ شامی تحریر فرماتے ہیں: ''ینبغی تمکین المحبوس من الوضوء والصلاة ولا یجوز معاقبته بالمنع منها'' (رد المحتار ۵/ ۳۷۸)۔

قیدی بچوں کی تعلیم وتربیت:

اسلامی تعلیمات کی روشنی میں سزا کا بنیادی مقصد تہذیب نفس، یعنی طبیعت کی پاکیزگی وتطہیر ہے، تعذیب نفس یعنی نفس کو کلفت ومشقت میں ڈالنا ثانوی درجہ کی شئی ہے۔ دوسری طرف تعلیم وتربیت بچوں کا اولین بنیادی حق بھی ہے۔

لہٰذا قیدخانہ (جیل) میں مقید کئے گئے اسکولی عمر کے بچوں کو تعلیم وتربیت کا لازمی حق حاصل ہوگا اور حکومت کا فرض ہوگا کہ مستقل بنیادوں پر اس کا انتظام کرے۔ فی زمانہ مسلم تنظیموں کی بھی ذمہ داری ہوگی کہ جیل میں قید مسلم بچوں کی فلاح وبہبود کے لئے ضروری پروگرامس منعقد کریں تاکہ قید سے خلاصی کے بعد یہ بچے صالح معاشرہ کی تشکیل میں اپنا بھرپور حصہ ادا کریں۔

قیدی بچوں کی جسمانی ضروریات:

قید کی وجہ سے انسان حق آزادی سے محروم ہوجاتا ہے (یہ محرومی اپنے آپ میں کچھ کم نہیں ہے خاص طور پر بچوں کے نظریے سے کہ جن کی عمر کھیل کود، نشوونما اور غنچوں کی طرح چٹکنے کی ہے) لیکن وہ اب بھی انسان ہے اور انسانی ضروریات وتقاضے اس سے وابستہ ہیں۔

لہٰذا حفظان صحت کے لئے بچوں کو ورزش اور کھیل کود کی اجازت ہوگی، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے کمزور ولاغر مسلمان کے مقابلے میں صحت مند وتوانا مسلمان کو بہتر اور اللہ کا محبوب فرمایا، حدیث کے الفاظ ہیں: "المؤمن القوی خیر وأحب إلی اللہ من المؤمن الضعیف" (صحیح مسلم ۸/۲۶۰)۔

قیدی بچوں کے سماجی حقوق:

ایک عام آدمی کو جو سماجی حقوق حاصل ہیں قید کے گئے بچوں کو بھی وہ حقوق حاصل ہوں گے، چنانچہ دوران حراست وہ اپنے والدین، اعزہ واقارب اور دوست واحباب سے ملاقات اور تبادلہ خیال کرسکتے ہیں، فون پر بات چیت کرنے کی بھی سہولت ہوگی، تاکہ ماں باپ کی جانب سے تفہیم ونصیحت کا سلسلہ برقرار رہے اور اخلاقی بیماریوں کو دور کرنے میں مدد ملے۔

فتاوی ہندیہ میں ہے: "ولا یمنع المسجون من دخول أھلہ وجیرانہ" (ہندیہ ۳/۴۱۸)۔

بچوں کو آپس میں میل جول، گفت وشنید اجتماعی کھیل کود اور سیر وتفریح کے مواقع بھی حاصل ہوں گے، علامہ سرخسی فرماتے ہیں: "لا یمنع المحبوس من السلام علی أصدقائہ والحدیث معھم" (المبسوط للسرخسی ۳/۹۰)۔

تفریح طبع اور احوال عالم کی جانکاری کے لئے ریڈیو استعمال کرنے، اخبارات ورسائل پڑھنے کی بھی گنجائش ہوگی بشرطیکہ وہ مخرب اخلاق مضامین اور پروگرام پر مشتمل نہ ہوں (دیکھئے: احکام السجن ر ۴۹۷)۔

قیدی بچوں پر مظالم:

اسلامی شریعت نے یہ واضح کردیا ہے کہ بچوں کو قید میں اس لئے رکھا جاسکتا ہے کہ ان کی ذہن سازی کی جائے اور شخصیت میں نکھار پیدا کیا جائے، تعلیم وتربیت اور تہذیب وتزکیہ کے ذریعہ مثالی کردار کا حامل انسان بنایا جائے، اس لئے نہیں کہ تختہ مشق سمجھا جائے اور جرم سے باز رکھنے کے لئے مختلف قسم کے مظالم آزمائے جائیں اور نت نئی سزاؤں کا تجربہ کیا جائے۔

چنانچہ دوران قید جیل میں بچوں سے ایسا برتاؤ کرنا، جس میں کچھ بھی ظلم یا سزا کی بات ہو، عالمی حقوق انسانی منشور اور اسلامی قوانین کے خلاف ہونے کے سبب ہرگز درست نہیں ہوگا۔

اسلامی ماہرین قانون نے بعض متعارف اور رائج سزاؤں کا ذکر کرکے سختی سے ان کی نفی کی ہے، ذیل میں بعض صورتیں بیان کی جاتی ہیں:

(۱) زیر حراست بچے کو مار پیٹ کرنا، (۲) ننگا کرکے ذلت کا احساس دلانا، (۳) سزا کے ارادے سے دیر تک تیز دھوپ، سخت سردی یا تیز روشنی میں رکھنا، (۴) صعوبت آمیز کام کاج کا مکلف کرنا، (۵) تنگ کال کوٹھری میں رکھنا، (۶) سخت سردی میں برف کی سلوں پر ڈالنا، (۷) خونخوار جانوروں کے ذریعہ خوف زدہ کرنا، (۸) الیکٹرانک شاک لگانا، (۹) جسم کے کسی حصہ کو داغنا، (۱۰) ذہنی ودماغی طور پر ٹارچر کرنا، (۱۱) ہاتھ میں

ہتھکڑی اور بیر میں بیڑی ڈالنا یا جسم کو زنجیر سے جکڑنا، (۱۲) قید تنہائی میں ڈالنا، (۱۳) سب وشتم کرنا، (۱۴) تحقیر آمیز لب ولہجہ میں مخاطب کرنا، (۱۵) بھوکا پیاسا رکھنا وغیرہ۔

اس سلسلہ میں مصادر شریعت اور قانون شریعت سے مندرجہ ذیل شواہد پیش کئے جاسکتے ہیں:

۱۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "لا تعذبوا بعذاب الله" (ابوداؤد، کتاب الحدود، ص: ۵۹۸)۔

۲۔ ''لا ينبغي للقاضي أن يضرب محبوساً في دينه ولا في غيره ولا يصفد ولا يقيد ولا يغل ولا يمد ولا يجرد ولا يقيمه في الشمس'' (فتاوی ہندیہ ۳/۴۱۴)۔

۳۔ ''التمثيل بالجسم وضرب الوجه ونحوه والتعذيب بالنار ونحوها التجويع والتعريض للبرد ونحوه، والتجريد من الملابس، وأمور أخرى تحرم المعاقبة بها'' (الموسوعة الفقهيه ۱۴-۲۲۶، بدائع ۷-۱۲۰)۔

۴۔ ''وليس للطالب أن يقيم الملزوم في الشمس أو على الثلج أو في موضع يضربه'' (معين الحكام، ص: ۱۹۹)۔

۵۔ ''تحرم المعاقبة بالتجريد من الثياب لما في ذلك من كشف العورة'' (الاحكام السلطانيه، ص: ۲۳۹)۔

قیدی بچوں کو جیل میں رکھنے کی مدت:

بچوں کو جیل میں تعزیر عقوبت کے طور پر نہیں بلکہ تعزیر تادیب کے طور پر رکھا جاتا ہے اور چونکہ ادب اور اصلاح حال کی کوئی مدت نہیں ہوتی، اس لئے مجرم اور جرم کی نوعیت کے اعتبار سے حاکم اپنی صوابدید پر قید کی مدت کا فیصلہ کرسکتا ہے۔

علامہ ابن نجیم مصری لکھتے ہیں: ''وتقدير مدة الحبس راجع إلى الحاكم كما لا يخفى'' (البحر الرائق ۵-۴۳)۔

علامہ ابن ہمام فرماتے ہیں: ''والصحيح أن التقدير مفوض إلى رأى القاضي لاختلاف أحوال الأشخاص فيه'' (فتح القدير ۶-۳۷۹)۔

بچہ کب بالغ اور کب مکلف ہوگا:

اتفاق برائے حقوق اطفال کے آرٹیکل نمبر ۱ کی نگاہ میں اٹھارہ سال سے کم عمر کا ہر انسان بچہ ہے، البتہ اس سے پہلے ہی پختگی حاصل کر لینے کی صورت میں پختگی سے جڑے قوانین کا انہیں مکلف بنایا جاسکتا ہے، آزادی سے محروم کردیئے گئے کم سنوں کے تحفظ کے لئے اقوام متحدہ کے ذریعہ بنائے گئے قوانین کے قانون نمبر گیارہ کے مطابق اٹھارہ سال سے کم عمر کا ہر انسان کم سن کے زمرے میں شامل ہے (دیکھئے: قیدیوں کے حقوق اسلامی تعلیمات کی روشنی میں، ص: ۱۴۵)۔

لیکن اسلامی ماہرین قانون کی نظر میں لڑکے ولڑکیاں اسی وقت سے بالغ سمجھے جائیں گے جب ان میں بلوغ کی حقیقی علامات پائی گئی ہیں، جس کی کم سے کم مدت لڑکوں کے لئے ۱۲ رسال اور لڑکیوں کے لئے ۹ رسال ہے، اور اگر علامات کا ظہور نہ ہوسکے تو سن بلوغ کا اعتبار ہوگا اور لڑکے اور لڑکیاں بیک طور پر ۱۵ رسال کی عمر میں قانوناً بالغ سمجھے جائیں گے اور شرعی قانون کے مکلف ہوں گے۔

علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں: ''بلوغ الغلام بالاحتلام والإحبال والإنزال والجارية بالاحتلام والحيض والحبل، فإن لم يوجد فيها فحتى يتم لكل منهما خمس عشرة سنة، به يفتى هذا عندهما وهو رواية عن الإمام وبه قالت الأئمة الثلاثة، وأدنى مدته له اثنتا عشرة سنة ولها تسع سنين هو المختار'' (رد المحتار ۹-۱۸۶)۔

اقوام متحدہ کا مقرر کردہ سن بلوغ راست طور پر اسلامی اصول سے متصادم ہے، تجربہ اور حالات وواقعات اس بات کے متقاضی ہیں کہ فی زمانہ زیادہ سے زیادہ پندرہ سال کی عمر کے بچے کو قانوناً بالغ تسلیم کیا جائے ورنہ اٹھارہ سال کی عمر کا اعتبار وانتظار بے شمار بالغ مجرموں کو سزا سے تحفظ فراہم کرتا ہے، اور مجرم جرم کی سخت سزا سے بچ نکلنے میں کامیاب ہوجاتا ہے، جس کے سبب سماج میں جرائم کا تناسب روز افزوں بڑھتا چلا جاتا ہے۔

☆☆☆

اسلام اور بچے: حقوق و ہدایات

مولانا محمد حذیفہ داحودی[1]

(الف): بچہ اور حق حضانت:

بلاشبہ بچے ایک خدائی نعمت بھی ہیں اور انسانی ضرورت بھی، اللہ تعالیٰ نے ایک طرف بچوں کو انسان کے لئے آنکھوں کا نور اور دل کا سرور بنا کر بچوں کی شفقت ومحبت دلوں میں ڈال دی ہے، تو دوسری طرف بچوں کے حقوق اور ان سے متعلق گارجین کے فرائض کی بھی رہنمائی کرکے بچوں کے تئیں ان کو فکرمند کیا ہے، چنانچہ اس سلسلہ میں دی گئی اسلامی ہدایات اور شرعی تعلیمات میں سے ایک تعلیم وہدایت یہ ہے کہ بچہ کی دینی ذہن سازی کے ساتھ ساتھ اس کی جسمانی پرورش اور ظاہری نشوونما کی بھی فکر کی جائے، اس کی ذمہ داری شریعت مقدسہ نے اصلاً ماں باپ کے سر ڈالی ہے، چنانچہ باپ پر اس سلسلہ کا خرچ لازم کیا ہے اور ماں کو مخصوص عمر تک اپنے پاس بچہ رکھ کر خود بچہ کی پرورش کرنے کا حق دیا ہے، چاہے زوجین کے درمیان نکاح باقی ہو یا دونوں میں کسی وجہ سے تفریق ہوگئی ہو، ماں کو بچہ کی پرورش کا یہ حق اس وقت تک ہے کہ بچہ کو کھانے پینے اور نا پاکی رفع کرنے میں ماں کی ضرورت پڑے اور اس کی مدت لڑکے کے لئے سات سال اور لڑکی کے لئے نو سال ہے، ماں نہ ہونے یا اس کا اہل باقی نہ رہنے کی صورت میں پرورش کا یہ حق سگی نانی، پھر سگی پرنانی، پھر سگی دادی وغیرہ سگے رشتہ داروں (یعنی بچے کے ذی رحم محرم) کو حاصل ہوتا ہے، جس کو فقہاء نے بالتفصیل ذکر کیا ہے، اس عمر تک باپ زبردستی بچہ کو نہیں لے سکتا اور مذکور مدت کے اخراجات کی ادائیگی باپ کے ذمہ ہے، اس کے بعد باپ کا حق ہے، وہ اجباری طور پر لے سکتا ہے، لڑکا بھی باپ کے پاس جانے سے انکار نہیں کرسکتا، بلکہ باپ اگر اس کے لئے تیار نہ ہو تو اس کو مجبور کیا جائے گا۔ "ويجبر الأب على أخذ الولد بعد استغنائه عن الأم لأن نفقته وصيانته عليه بالإجماع...لأنه أقدر على تأديبه وتعليمه" (ردالمحتار ۵/۲۶۸)، اور اس عمر میں بچہ باپ کے حوالہ کرنا اس لئے ضروری ہے، تاکہ باپ اس کی تعلیم وتربیت کا انتظام کرسکے۔ "الغلام إذا استغنى يحتاج إلى التأديب والتخلق بأخلاق الرجال وتحصيل أنواع الفضائل واكتساب أسباب العلوم والأب على ذلك أقوم وأقدر" (البدائع ۳/۴۵۹)، البتہ بالغ ہونے کے بعد لڑکے کو اختیار ہے کہ باپ کے ساتھ رہے یا ماں کے ساتھ یا الگ رہے، عقل وبلوغ سے انسان کی حیثیت مستقل ہوجاتی ہے، اس لئے بالغ ہونے کے بعد خواہ لڑکی ہو یا لڑکا شریعت اسے خود مختار گردانتی ہے اور وہ کسی کے تصرف کا محتاج محض نہیں رہ جاتا۔

واضح رہے کہ شریعت اسلامیہ کے قانون حضانت کا بنیادی مقصد بچوں کے مفاد کا تحفظ ہے، اگرچہ بچے کے ساتھ ساتھ ماں وغیرہ صاحب حق کی بھی رعایت ملحوظ رکھی گئی ہے، علامہ شامی نے اس سلسلہ میں کہ حضانت یہ کس کا حق ہے؟ ماں وغیرہ کا یا بچہ کا؟ فقہاء کے دو نقطۂ نظر ذکر کرکے ان میں تطبیق دی ہے اور یہ وضاحت کرتے ہوئے کہ اس میں دونوں کا لحاظ ہے، لکھا ہے: "وعلله في المحيط بأنها لما أسقطت حقها بقي حق الولد فصارت بمنزلة الميتة والمتزوجة فتكون الجدة أولى. قلت: ويؤخذ من هذا التوفيق بين القولين وذلك أن ما في المحيط يدل على أن لكل من الحاضنة والمحضون حقا في الحضانة" (ردالمحتار ۵/۲۵۹)، کیوں کہ بچہ اپنی اچھی پرورش کے لئے کسی ہمدرد اور شفیق مربی کا محتاج ہوتا ہے، جبکہ ماں یا دوسرے اصحاب حق سے بچوں کا چھین لیا جانا طبعی طور پر ان کے لئے تکلیف کا موجب ہوسکتا ہے، اس لئے شریعت نے بچوں اور بچیوں کی پرورش کا حق ان کے رشتہ داروں کو دیا ہے اور جن رشتہ داروں کو دیا ہے وہ بچوں اور بچیوں کی ساخت، پرداخت، ان کی خیر خواہی اور شفقت ومحبت کے لحاظ سے دیا ہے، "مبنى الحضانة على الشفقة" (البدائع ۳/۴۵۷)، اور بچہ کے مفادات کے متاثر اور ضائع ہونے کی ہر صورت کو ممنوع قرار دیا ہے، مثلاً: لکھا ہے کہ اگر عورت اس شرط پر خلع کرلے کہ وہ اپنے بچہ کو چھوڑ دے گی، نہیں لے گی تو خلع صحیح ہوجائے گا، مگر شرط باطل ہوجائے گی (الدر

[1] مدرسہ شیخ المدارس داحود، گجرات۔

المختار ۵/ ۲۵۸)، بلکہ بچہ کے نقصان اور ضیاع کو صاحب حق کے لئے اس حق سے محرومی کا سبب اور مدار قرار دیا ہے: "المناط هو الضياع ... والحاصل أن الحاضنة إن كانت فاسقة يلزم منه ضياع الولد عندها سقط حقها وإلا فهي أحق به إلى أن يعقل فينزع منها كالكتابية" (ردالمحتار ۵/ ۲۵۴)، چنانچہ ایک طرف حضانت کے استحقاق کے لئے بہت سی شرطیں لگائی ہیں، مثلاً: یہ کہ صاحب حق عاقل ہو، بالغ ہو، مامون اور قابل اعتماد ہو، بچہ کی جسمانی و اخلاقی تربیت کی پوری صلاحیت رکھتا ہو، تو دوسری طرف یہ بات واضح کی ہے کہ اگر کسی حقدارِ حضانت کے پاس بچہ کو رکھنے میں بچہ کی مضرت کا اندیشہ ہو اور اس کے ضیاع کا خطرہ ہو تو اس حقدار کو اس کے حق حضانت سے محروم کر کے مابعد کے حقدار کو یہ ذمہ داری دی جائے گی، مثلاً: اگر (۱): حاضنہ بچہ کے غیر ذی رحم محرم سے نکاح کر لے۔ (۲): کسب وغیرہ کی وجہ سے بکثرت باہر نکلتی ہو، جس سے بچہ کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہو۔ (۳): مرتد ہو جائے۔ (۴): ایسے فسق و فجور میں مبتلا ہو کہ اس سے بچہ کے ضیاع کا خطرہ ہو یا ماں بدکار ہو جس کی بداخلاقی سے بچہ کے متاثر ہونے کا اندیشہ ہو۔ (۵): حاضنہ غیر مسلمہ ہے جس کے پاس چھوڑنے میں اس کے دین سے متاثر ہونے کا خطرہ ہو۔ (۶): بچہ کی جسمانی و اخلاقی تربیت سے عاجز ہو۔ (۷): موذی بیماری میں مبتلا ہو، تو ان تمام صورتوں میں حاضنہ اپنے حق حضانت سے محروم کر دی جائے گی (تفصیل کے لئے دیکھئے: ردالمحتار ۵/ ۲۵۳)۔

روایت میں ہے کہ نبی کریم ﷺ کے سامنے ایک خاتون نے یہ شکایت پیش کی کہ میں اپنے بچہ کی پرورش کر رہی ہوں، مگر میرا پہلا شوہر مجھ سے بچہ چھیننا چاہتا ہے، تو آپ ﷺ نے اس کے جواب میں فرمایا: "أنت أحق منه ما لم تنكحي" (رواہ ابوداود، کتاب الطلاق، باب من احق بالولد، رقم: ۲۲۷۸) (کہ تو اپنے بچہ کی پرورش کی زیادہ حقدار ہے جب تک کہ دوسری شادی نہ کر لے)۔

بعض فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر حاضنہ بہت زیادہ نیک ہو اور اس قدر نماز وعبادت میں مشغول اور محبت و خشیت الٰہی میں مغلوب رہتی ہو کہ بچہ کی تربیت اور نگرانی کا موقع نہ ملتا ہو جس سے بچہ کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہو تو اس صورت میں بچہ اس کے پاس نہیں رکھا جائے گا، اس سے لے لیا جائے گا، علامہ شامی لکھتے ہیں: "قال: وعلى هذا لو كانت صالحة كثيرة الصلوة قد استولى عليها محبة الله تعالى وخوفه حتى شغلاها عن الولد ولزم ضياعه انتزع منها ولم أره" (الرد ۵/ ۲۵۴)۔

(ب، ۱): بچہ اور حق تعلیم و تربیت

بچے ماں باپ کے پاس اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی امانت ہیں، جسکی حفاظت کرنا اور ان کو حرز جان بنا کر ان کی نشو ونما اور تعلیم و تربیت کا اہتمام کرنا یہ والدین کا ایک اہم ترین فریضہ ہے، اگرچہ بچے بلوغ سے پہلے نہ تو احکام شریعت کے مکلف ہیں اور نہ ہی بچوں کی علمی و عملی اعتبار سے دینی تربیت کے لئے اور ان کو علم و عمل سکھانے کے لئے شریعت مطہرہ نے کسی عمر کی تحدید فرمائی ہے، مگر از روئے کتاب و سنت بچے کے والدین اور اولیاء اس بات کے پابند ہیں کہ وہ اپنی اولاد کی بچپن ہی سے دینی و تعلیم و تربیت کی فکر و سعی کریں، بچوں کو تعلیم دیں اور انہیں اسلامی آداب و اخلاق سے مزین کریں، یہ بات بہت ضروری ہے، والدین پر اس کی بڑی ذمہ داری ہے، جس نے اپنی اولاد کو تعلیم سے محروم رکھا اور ان کی دینی تربیت کی طرف توجہ نہیں دی اس نے اپنی اولاد کو دنیا و آخرت کی بہت بڑی خیر سے محروم رکھا، اسی لئے بچوں کے حقوق میں شریعت نے سب سے زیادہ جس بات کی تاکید فرمائی وہ ان کی تعلیم اور تربیت ہے، قرآن کریم میں حق تعالیٰ شانہ ارشاد فرماتے ہیں: "يا أيها الذين آمنوا قوا أنفسكم وأهليكم نارا" (سورة التحريم: ۶) (اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو جہنم کی آگ سے بچاؤ)، یعنی ان کو جہنم کی آگ سے بچانے کا انتظام کرو، ظاہر ہے کہ یہ انتظام ان کی تعلیم اور تربیت ہے، تعلیم کا مطلب ہے: علم سکھنے پر لگانا اور تربیت کا مطلب ہے: عمل کرنے پر لگانا، علم اور عمل کے راستہ سے ہی جہنم سے بچا جا سکتا ہے۔ حضرت مفتی شفیع صاحبؒ فرماتے ہیں: ''اس آیت سے ثابت ہوا کہ ہر شخص پر فرض ہے کہ بیوی اور اولاد کو فرائض شرعیہ اور حلال و حرام کے احکام کی تعلیم دے اور اس پر عمل کرانے کے لئے کوشش کرے'' (معارف القرآن ۸/ ۵۰۳)، نبی کریم ﷺ نے تعلیم کو لازم قرار دیتے ہوئے فرمایا ہے: "طلب العلم فريضة على كل مسلم" (اخرجہ ابن ماجہ عن انس بن مالک، باب فضل العلماء والحث علی طلب العلم، رقم: ۲۲۴) (ہر مسلمان پر علم کی طلب فرض ہے)۔ یہ ارشاد تمام مسلمانوں کے لئے عام ہے، جس میں لڑکے، لڑکیاں، مرد و عورت سبھی داخل ہیں، فقہاء نے لکھا ہے کہ بالغ ہونے کے بعد بچوں کی کفالت باپ پر واجب نہیں ہے، اس کے باوجود اگر بالغ بچہ حصول علم میں لگا ہو تو والد پر اس کا نفقہ واجب ہوگا، فقہاء کی اس تصریح سے بھی اس حق کی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

تعلیم کے ساتھ بچوں کی تربیت بھی ضروری ہے، کیوں کہ تربیت ہی انسان کو انسان بناتی ہے، نبی کریم انے فرمایا ہے: "ما نحل والد ولدا من نحل أفضل من أدب حسن" (رواہ الترمذی: کتاب البر والصلۃ، باب ما جاء فی ادب الولد ۲/۱۶، رقم: 1952) (کوئی شخص اپنی اولاد کو اچھے اخلاق وآداب اور اچھی تربیت سے بہتر عطیہ نہیں دے سکتا)۔

ایک روایت میں ہے: "من ولد له ولد فليحسن اسمه وأدبه فإذا بلغ فليزوجه فإن بلغ ولم يزوجه فأصاب إثما فإنما إثمه على أبيه" (رواه البيهقي في شعب الايمان، باب في حقوق الأولاد والاهلين: ۸۶۶۶) (جس کے یہاں بچہ پیدا ہو تو وہ اس کا اچھا نام رکھے اور اسے ادب سکھائے، پھر جب بالغ ہو جائے تو اس کا نکاح کرادے، بالغ ہو جانے کے باوجود اگر اس کا نکاح نہیں کرایا اور وہ بچہ گناہ میں مبتلا ہو گیا تو اس کا وبال باپ پر بھی ہوگا)۔ تعلیم وتربیت کی طرف آپ کی توجہ خاص کا یہ حال تھا کہ باندیوں تک کو علم وعمل سے آراستہ کرنے کی ترغیب دیتے ہوئے فرمایا: "إذا أدب الرجل أمته فأحسن تأديبها وعلمها فأحسن تعليمها ثم أعتقها فتزوجها كان له أجران" (رواه البخاري، كتاب الانبياء، باب واذكر في الكتاب مريم ... رقم: ۳۲۶۲) (جو اپنی باندی کی بہتر تربیت کرے اور اچھی تعلیم دے پھر اسے آزاد کر کے اس سے نکاح کر لے اس کو دوہرا اجر ملے گا)۔

شریعت نے احکام کا مکلف بالغوں کو کیا ہے، حتی کہ نماز جیسی اہم عبادت بھی بچوں پر فرض نہیں کی ہے، پھر بھی والدین، اولیاء اور سرپرستوں کو از راہ تربیت یہ ذمہ داری دی ہے کہ وہ بچپن ہی سے بچوں کو نماز کا عادی بنائیں، تاکہ بالغ ہونے کے بعد اس اہم فریضہ کی تکمیل میں کوئی پریشانی نہ ہو، بلکہ اس سلسلہ میں حسب ضرورت بچوں کی تنبیہ کی بھی تعلیم دی ہے، ارشاد نبوی ہے: "مروا أولادكم بالصلوة وهم أبناء سبع سنين واضربوهم عليها وهم أبناء عشر سنين وفرقوا بينهم في المضاجع" (رواه ابوداؤد، كتاب الصلوة، باب متى يؤمر الغلام بالصلاة، رقم: ۴۹۵) (بچے جب سات سال کے ہو جائیں تو ان کو نماز کا حکم کرو اور جب دس سال کے ہو جائیں تو نماز نہ پڑھنے پر ان کی سرزنش کرو اور ان کو بستر پر الگ کر دو)۔ فقہاء نے بھی اس کو ذکر کیا ہے اور والدین کو بال بچوں کی مناسب حد میں رہتے ہوئے تادیب اور سرزنش کی بھی اجازت دی ہے۔ بدائع میں ہے: "وينبغي للرجل أن يؤدب ولده على الطهارة والصلوة إذا عقلهما" (۱/۳۵۹)، شامی میں ہے: "هي فرض عين على كل مكلف ... وإن وجب ضرب ابن عشر عليها بيد لا بخشبة لحديث مروا أولادكم بالصلوة وهم أبناء سبع واضربوهم عليها وهم أبناء عشر ....." (شامی ۹/۶۱۶، ۲/۴-۵)، حدیث وفقہ کی ان تصریحات سے بھی بچوں کی تعلیم وتربیت کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔

(ب، ۲): بچوں کے لئے دینی وعصری تعلیم:

بچوں اور بچیوں کو بنیادی دینی تعلیم دینا ضروری ہے، یعنی اتنی تعلیم دینا ضروری ہے جس سے وہ اپنے دین کی بنیادی معلومات سے واقف ہو کر ایک صحیح اسلامی زندگی گذار سکے، نبی کریم انے فرمایا ہے: "طلب العلم فريضة على كل مسلم" (اخرجه ابن ماجه عن انس بن مالك، باب فضل العلماء والحث على طلب العلم، رقم: ۲۲۴) (ہر مسلمان مرد وعورت پر علم ضروری حاصل کرنا فرض ہے)، چنانچہ توحید اور شرک کی حقیقت، نبوت ووحی کا اسلامی تصور، انبیاء بالخصوص پیغمبر اسلام کے ضروری حالات، پاکی و ناپاکی، نماز، روزہ، حج و زکوۃ اور قربانی کے احکام، نکاح وطلاق، خرید وفروخت، ملازمت اور نوکری، کسب معاش کے حلال وحرام طریقے، صحابہ اور صحابیات کی مبارک زندگیوں سے متعلق بنیادی معلومات، والدین، اولاد، میاں بیوی اور اعزہ اقرباء سے متعلق حقوق، شب وروز کئے جانے والے افعال کے بارے میں رسول اللہ کی سنتیں اور مسنون و ماثور اورادو اذکار، ان سب کی تعلیم بچوں اور بچیوں کو دینا ضروری ہے، اس قدر علم حاصل کئے بغیر انسان نہ اپنی دنیا کو بہتر بنا سکتا ہے اور نہ اس کی آخرت سنور سکتی ہے (دیکھئے: رد المحتار ۱/۱۲۵، ۱۲۶، مرقاۃ المفاتیح ۲/۱۳۱)۔

اسلام میں جس بنیادی تعلیم کو ہر ایک کے لئے فرض اور ضروری قرار دیا گیا ہے وہ دین کی تعلیم ہے، جس سے دنیا وآخرت کی کامیابی وابستہ ہے، مگر چوں کہ موجودہ دور میں روزگار کے مواقع اور دیگر بعض ضروریات ومنافع زندگی کو عصری تعلیم کے ساتھ جوڑ دیا گیا ہے، اس لئے اس قدر عصری تعلیم (جو صحیح اور غیر مفسد ماحول میں دی جارہی ہو) بچوں کو دینا بہتر ومفید بلکہ ضروری اور واجب لغیرہ ہے جس کے ذریعہ وہ اپنی معاشی ضروریات بھی پوری کر سکے اور ایک باعزت اور خود دار شہری کی حیثیت سے زندگی بسر کرنا اس کیلئے ممکن ہو۔

حضرت اقدس تھانویؒ فرماتے ہیں: ''اولاد کو ضرور کوئی ایسا ہنر سکھلادو جس سے ضرورت اور مصیبت کے وقت چار پیسے حاصل کر کے اپنا اور اپنے بچوں کا گذارہ کر سکے، لڑکیوں کو اتنا لکھنا سکھادو کہ ضروری خط اور گھر کا حساب و کتاب لکھ سکیں'' (بہشتی زیور: ۵/ ۳۰۷)

حضرت مفتی نظام الدین صاحبؒ لڑکیوں کی تعلیم کے متعلق تحریر فرماتے ہیں: ''پردہ کے ساتھ شرعی حدود میں رہتے ہوئے عالمہ حافظہ مفسرہ محدثہ فقیہہ بننے کی حد تک فرض کفایہ کے درجہ میں تعلیم حاصل کر لینا شرعاً درست ہے، البتہ ضروری درجہ ان کے لئے صرف اتنا ہے کہ جس سے اعتقادات وایمانیات وعبادات (فرض وواجبات) کا علم حاصل ہونے کے ساتھ شرعی معاملات کی صحت وسقم کا بھی تصحیح معاملات کے لئے علم حاصل ہوجائے، نیز گھریلو وخانگی حساب کتاب لکھنے پڑھنے اور سمجھنے اور بچوں کی تربیت و پرورش کا بھی سلیقہ ہوجائے اور بس'' (منتخبات نظام الفتاوی: ۳/ ۴۶۰)

(ب، ۳): لازمی تعلیم:

جس حد تک تعلیم بچوں کے لئے ضروری ہے، جس کے بغیر عملی زندگی میں ضرر لاحق ہونے کا گمان غالب ہے، (جیسے: پرائمری تک) اس حد تک کی تعلیم اگر حکومت لازم قرار دے تو اس کی پابندی مسلمانوں کے لئے لازم ہوگی، اس سے زائد نہیں، کیوں کہ اتنی تعلیم زمانہ کی ضرورت کے لحاظ سے بچوں کے لئے واجب لغیرہ اور بہت سی مضرتوں سے حفاظت کا سامان ہے اور ظاہر ہے کہ واجبات میں اور ضرر سے بچانے کے لئے ضرورت پڑنے پر جبر کیا جاسکتا ہے۔ نیز بادشاہ اور حاکم کو رعیت کے باب میں ہر ایسے تصرف کا حق واختیار ہوتا ہے جس میں رعیت کا واقعی نفع ہو، فقہی ضابطہ ہے: "التصرف علی الرعیة منوط بالمصلحة" (شرح القواعد: ۳۰۹، مجلة الاحکام: ۱/ ۵۱) علامہ احمد زرقاء اس ضابطہ کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "أي إن نفاذ تصرف الراعي علی الرعیة ولزومه علیهم شاءوا أو أبوا معلق أو متوقف علی وجود الثمرة والمنفعة في ضمن تصرفه دینیة کانت أو دنیویة فإن تضمن منفعة ما وجب علیهم تنفیذه وإلا رد" (شرح القواعد: ۳۰۹)، ظاہر ہے کہ مسئلہ زیر بحث میں بھی یہی صورت حال ہے، اس لئے شرعاً اس کی پابندی لازم ہوگی، البتہ خلاف عقل ونقل امور جیسے: مخلوط تعلیم، جنسی تعلیم وغیرہ امور سے اجتناب ضروری ہوگا۔

(ب، ۴): بچوں اور بچیوں کے لئے جنسی تعلیم:

جنسی تعلیم نہ صرف یہ کہ بچوں کا حق نہیں، بلکہ شریعت میں اس کا کوئی جواز اور گنجائش نہیں، بلوغ کے بعد پیدا ہونے والی انسانی ضرورتیں اور بشری تقاضے فطری ہیں، جن کی مستقل تعلیم دینے کی ضرورت نہیں پڑتی، انسان وقت پر خود ہی ان کا ادراک کر لیتا ہے، بلکہ بلوغ کی وجہ سے ہونے والی تبدیلیوں اور ان تبدیلیوں سے پیدا ہونے والی جنسی ضرورتوں کی قبل از وقت تعلیم اور اس کا ادراک بچوں کو بے راہ روی کی طرف لے جائیگا، اس طرح کی تعلیم سے کس قدر مفاسد پیدا ہوں گے اور معاشرہ میں کتنی بے حیائیاں جنم لے گی اس کا اندازہ لگانا کسی معمولی سوجھ بوجھ رکھنے والے کے لئے بھی مشکل نہیں، جس مقدس شریعت کی بنیادی تعلیم میں {وینهی عن الفحشاء والمنکر} (النحل) کا جلی عنوان ہو، وہ کیوں کر تعلیم جنس جیسی جنسی منکرات پھیلنے کی راہوں کو برداشت کر سکتی ہے، اس باب میں اسلام کے مزاج اور احساس کا حال یہ ہے کہ اس نے بچہ بچی دس سال کی عمر کو پہنچ جانے کے وقت ہی کا یہ حکم دیا ہے کہ ان کے بستر علاحدہ کر دیئے جائیں، تا کہ ان کے اندر نفسانی خواہشات پیدا ہونے سے پہلے ہی فتنوں اور برائیوں کے آنے کی اس راہ کا سد باب ہوجائے۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد گذر چکا ہے: "مروا أولادکم بالصلوة وهم أبناء سبع سنین واضربوهم علیها وهم أبناء عشر سنین وفرقوا بینهم في المضاجع" (رواہ ابوداؤد، کتاب الصلوة، باب متی یؤمر الغلام بالصلاة، رقم: ۴۹۵) (بچے جب سات سال کے ہوجائیں تو ان کو نماز کا حکم کرو اور جب دس سال کے ہوجائیں تو نماز نہ پڑھنے پر ان کی سرزنش کرو اور ان کو بستر پر الگ کر دو)۔

فقہاء لکھتے ہیں: ''وإذا بلغ الصبي أو الصبیة عشر سنین یجب التفریق بینهما، بین أخیه وأخته وأمه وأبیه في المضجع لقوله علیه السلام: وفرقوا بینهم في المضاجع وهم أبناء عشر وفي الرد: قوله: (بین أخیه وأخته وأمه وأبیه) ویفرق بین الصبیان في المضاجع إذا بلغوا عشرا ویحول بین ذکور الصبیان والنسوان وبین الصبیان والرجال فإن ذلك داعیة إلی الفتنة ولو بعد حین...'' (الدر المختار ورد المحتار، کتاب الحظر والاباحة ۹- ۵۴۸) غرضیکہ جنسی تعلیم نہ ہی بچوں کا حق ہے اور نہ ہی شریعت میں اس کا کوئی جواز اور گنجائش ہے۔

(ج): بچے اور نکاح:

شریعت نے نکاح کے درست اور جائز ہونے کے لئے عمر کی کوئی تحدید نہیں کی ہے، عمر کے جس مرحلہ میں نکاح کیا جائے نکاح جائز اور درست ہوتا ہے، پس بچوں اور بچیوں کا نکاح کرنا اگر چہ لازمی اور ضروری نہیں ہے، مگر از روئے شرع اسلامی ممنوع بھی نہیں ہے، بلکہ صحیح اور ایک اسلامی حق ہے، قرآن مجید میں نابالغ لڑکیوں کی عدت بتائی گئی ہے: "واللائی لم یحضن" (سورۃ الطلاق:۴) اور ظاہر ہے کہ عدت نکاح کے بعد ہی لازم آتی ہے، معلوم ہوا کہ بچوں کا نکاح درست ہے، علامہ ابن ہمام فرماتے ہیں: "یجوز نکاح الصغیر والصغیرۃ إذا زوجهما الولی لقوله تعالی: "واللائی لم یحضن" (سورۃ الطلاق:۴) فأثبت العدة للصغیرة وهو فرع تصور نکاحها شرعاً" (فتح القدیر، کتاب النکاح باب فی الاولیاء والاکفاء ۳/۲۶۳)، خود نبی کریم ﷺ کا نکاح حضرت عائشہؓ سے اس وقت ہوا تھا جبکہ ان کی عمر چھ سال کی تھی: (رواہ البخاری، رقم: ۴۸۶۳)، فقہاء نے نکاح صغار کے احکام مستقل طور پر بیان کئے ہیں، جس میں اس بات کی بھی وضاحت موجود ہے کہ اولیاء کو اپنے نابالغ بچوں کے نکاح کی ولایت حاصل ہے، بلکہ امت کا اس بات پر اجماع ہے کہ بچپن میں شادی کرانا جائز ہے: "أجمع المسلمون علی جواز تزویج بنته البکر الصغیرة" (نووی شرح مسلم، کتاب النکاح، باب جواز تجویز الأب البکر الصغیرة، رقم: ۱۴۲۲)، اس لئے کم عمری میں بچے کا نکاح کر دینے میں اصلاً کوئی حرج نہیں ہے، اسلام میں بچپن کی شادی کا بھی اعتبار اور اس کی اجازت ہے، شادی کے لئے کوئی متعین عمر نہیں ہے، تاہم شادی کے لئے بہتر اور مناسب زمانہ بلوغ کے بعد کا ہے، امت کا عمومی عمل اسی پر ہے، لہٰذا اگر کوئی شدید ضرورت نہ تو بلوغ کے بعد ہی نکاح کرنا چاہئے، بلکہ شریعت مقدسہ نے بچوں کے حقوق اور ان کے تعلق سے گارجین کے فرائض میں یہ بات بیان کی ہے کہ جیسے ہی بچہ بالخصوص لڑکی نکاح کے قابل یعنی بالغ ہو جائے اس کا نکاح کر دیا جائے، اس میں تاخیر نہ کرنی چاہئے، روایت میں ہے: "حق الولد علی الوالد أن یحسن اسمه ویزوجه إذا أدرك ویعلمه الکتاب" (الجامع الصغیر: ۲/۵۷۰، رقم: ۳۶۳۳) (والدین پر بچے کے حقوق یہ ہیں کہ اس کا اچھا نام رکھے، بالغ ہونے کے بعد اس کی شادی کرے اور اور اس کو قرآن بھی سکھائے)، اگر بلا کسی معقول وجہ اور شرعی عذر کے نکاح کرنے میں تاخیر کی، جس کی وجہ سے اولاد گناہ میں مبتلا ہوئی تو اس کا وبال گارجین کے سر ہوگا، ارشاد نبوی ہے: "من ولد له ولد فلیحسن اسمه وأدبه فإذا بلغ فلیزوجه فإن بلغ ولم یزوجه فأصاب إثما فإنما إثمه علی أبیه" (رواہ البیہقی فی شعب الایمان، باب فی حقوق الاولاد والاہلین: ۸۶۶۶)۔ ایک روایت میں ہے: "من بلغت ابنته اثنتی عشرة سنة فلم یزوجها فأصابت إثما فإثم ذلك علیه" (رواہ البیہقی فی شعب الایمان، باب فی حقوق الاولاد والاہلین: ۸۳۰۲) (جس شخص کی بچی بارہ سال کی ہو جائے اور وہ اس کا نکاح نہ کرائے اور وہ بچی گناہ میں مبتلا ہو جائے تو اس کا وبال باپ پر بھی ہوگا۔

فتاویٰ دارالعلوم میں ہے: ''جوان اولاد کے نکاح میں حتی الوسع جلدی کرنا ضروری ہے، خصوصاً لڑکی کے نکاح میں باوجود موقع مناسب کے دیر کرنا بہت برا ہے اور حدیث مذکور سے معلوم ہوا کہ اگر اس اولاد سے گناہ سرزد ہوا تو وبال اس کے باپ پر ہے'' (۷/۴۳)۔

خلاصہ یہ ہے کہ عدل واعتدال کے امتیازی پہلو کے حامل دین اسلام کی ہدایت یہ ہے کہ بہت کم عمری میں کیا ہوا نکاح اگر چہ درست ہے، مگر بہتر بلکہ ضروری یہ ہے کہ بلوغ کے بعد نکاح کیا جائے، بالغ ہونے کے بعد بلا وجہ لڑکوں اور لڑکیوں کی شادی میں غیر معمولی تاخیر نہ کی جائے، تا کہ اخلاقی بگاڑ سے حفاظت ہو جائے۔

(د،۱): بچے اور مزدوری

شریعت اسلامیہ میں عام حالات میں کم عمر بچوں کو مزدوری پر لگانا مناسب اور قرین صواب نہیں ہے، البتہ مجبوری کی حالت میں اس کی گنجائش ہے، جیسا کہ تفصیل سے آرہا ہے۔

(د،۲): شریعت اسلامیہ میں عام حالات میں کم عمر بچوں سے مزدوری کرانا یا انہیں کوئی پیشہ ورانہ کام سکھانے کے لئے کام میں لگانا مناسب اور قرین صواب نہیں ہے، کیوں:

ایک: تو نابالغ ہونے کی حالت میں کسی بھی شخص کی ضروریات زندگی کا انتظام از روئے شریعت بچوں کے ذمہ نہیں ہے، بلکہ خود بچوں کی کفالت بھی ان

کے سر نہیں، بلکہ باپ کے سر ہے اور اگر وہ نہ ہو تو حسب مراتب رشتہ داروں کے ذمہ ہے۔ "نفقة الأولاد الصغار على الأب لا يشاركه فيها أحد ..." (الهندية ۱/ ۵٦۰)، اسلام نے نہ صرف یہ کہ بچوں کی کفالت بالغوں سے متعلق کی ہے، بلکہ اس سلسلہ میں خاص ترغیبات بھی دی ہے، چنانچہ اولاد پر خرچ کرنے کو صدقہ قرار دیا، یتیم بچہ کی کفالت کرنے پر جنت کی خوشخبری سناتے ہوئے اپنی انگشت شہادت اور درمیانی انگلی کو ملا کر نبی کریم ؐ نے فرمایا: "أنا وكافل اليتيم في الجنة هكذا وأشار بالسبابة والوسطى وفرق بينهما شيئا" (رواه البخاري، كتاب الطلاق، باب اللعان، رقم: ۴۹۹۸)۔

دوسرے: یہ کہ اسلام نے بچوں کے بارے میں جو ہدایات دی ہیں ان میں ایک اہم ہدایت یہ ہے کہ ان کی تعلیم وتربیت کی فکر کی جائے، ظاہر ہے کہ بچوں کو مزدوری پر لگانے سے ان کی تعلیم وتربیت کی ذمہ داری پوری نہیں کی جاسکتی، اس طرح تو وہ علم جیسی نعمت سے محروم رہیں گے اور ان کی جہالت کی وجہ سے ان کی اگلی نسلیں بھی پستی اور انحطاط کا شکار ہوں گی، جبکہ شریعت اسلامیہ نے اس سلسلہ میں بڑی تاکید کی ہے، جیسا کہ اوپر اس کی کچھ تفصیل گزری، ایک روایت میں ہے: "إن من حق الولد على الوالد أن يحسن اسمه وأن يحسن أدبه" (مجمع الزوائد، كتاب الادب، باب الاسماء وماجاء في الاسماء الحسنة، رقم: ۱۲۸۲۹)، بلکہ صاحب شریعت کی نظر میں ضروریات زندگی کی تکمیل کے مقابلہ میں تعلیم وتربیت کا انتظام زیادہ اہم ہے، اسی لئے جنگ بدر کے بعد مسلمان بچوں کی تعلیم کو ان کی معاشی ضرورت سے بھی اہم سمجھتے ہوئے قیدیوں سے مالی فدیہ وصول کرنے کے بجائے آپ نے تعلیمی فدیہ وصول کیا، یہ اس بات کا سبق دینا تھا کہ بچوں کو تعلیم دینا بہر حال ضروری ہے، چاہے اس کے لئے پیٹ کاٹنا پڑے یا فاقے برداشت کرنے پڑے، شریعت نے ہمیں بچوں کے ساتھ خیر خواہی اور حسن سلوک کی تعلیم دی ہے، بچوں کی بڑی خیر خواہی اور حسن سلوک ان کی اچھی تعلیم وتربیت ہے، جس طرح خود کھانا اور بچوں کو بھوکا رکھنا بدسلوکی اور بدخواہی ہے، ٹھیک اسی طرح بچوں کو کسب زر کا ذریعہ بنا کر ان کو اپنے حق تعلیم وتربیت سے محروم رکھنا بھی ان کے ساتھ بدسلوکی اور ان کی بدخواہی ہے، کیوں کہ یہ ہمیشہ کے لئے ان کو معاشی، فکری اور اخلاقی اعتبار سے پسماندہ اور محروم رکھنے کے مترادف ہے، اسی لئے رسول اللہ ؐ نے فرمایا کہ کم عمر بچوں کو کسب معاش کا مکلف نہ کرو، اس سے یہ ہوگا کہ کمانہ پائے گا تو پھر چوری کرے گا:

"لا تكلفوا الصغير الكسب فإنه إذا لم يجد سرق" (رواه مالك في الموطا: كتاب الاستيذان، باب الامر بالرفق للمملوك، رقم: ۱۷۷۱)۔

تیسرے: یہ کہ کم عمر بچوں کو کسب معاش پر لگا دینا قبل از وقت مشقت میں مبتلاء کرنے کی وجہ سے ان کی صحت اور جسمانی نشو ونما کے لئے نقصاندہ ہے، کیوں کہ ان بچوں کی بے شعوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایسے کام ان سے لئے جائیں گے جو ان کی طاقت وقدرت سے باہر ہوں، جبکہ نبی کریم ؐ نے فرمایا ہے کہ غلاموں سے کوئی ایسا کام نہ لو جو ان کی طاقت اور قدرت سے ماوراء ہو (موطا مالک عن یحی بن یحی)، نیز ان کی صحت کا ٹھیک طور سے خیال نہ رکھتے ہوئے ان سے ایسے کام بھی لئے جائیں گے جن میں آلودگی ان پر اثر انداز ہو، اس طرح ان کا معاشی مستقبل تاریک ہو جائے گا اور ان کے لئے پوری زندگی ایسی ہی معمولی مزدوری اور کم آمدنی پر انحصار کرنے کے سوا چارہ نہیں رہے گا، پھر یہ معاشی محرومی ان میں اخلاقی گراوٹ اور تنزلی پیدا کرے گی، ظاہر ہے کہ یہ ان کا اور ان کی نسلوں کا نقصان ہے، رسول اللہ ؐ نے فرمایا ہے کہ اسلام میں ضرر پہنچانے کی کوئی گنجائش نہیں، نہ ابتداءً اور نہ انتہاءً "لا ضرر ولا ضرار" (رواه مالك في الموطا، كتاب الاقضية، باب القضاء في المرفق، رقم: ۱۴۲۹)، نیز ارشاد ہے کہ جو کسی کو ضرر پہنچائے اللہ اس کو ضرر پہنچائے گا، اور جو کسی کو مشقت میں ڈالے اللہ اس کو مشقت میں مبتلا فرمائیں گے۔ "من ضار ضار الله به ومن شاق شاق الله عليه" (رواه الترمذي، كتاب البر والصلة، باب ماجاء في الخيانة والغش، رقم: ۱۹۴۰) اسی لئے نبی کریم ؐ نے بچوں پر کمائی کی ذمہ داری ڈالنے سے منع فرمایا ہے، جیسا کہ گزرا۔

(د، ۳): پہلے گزر چکا ہے کہ عام حالات میں تو کم عمر بچوں کو مزدوری پر لگانا شریعت اسلامیہ میں درست نہیں ہے، مگر جب انتہائی غربت اور معاشی بد حالی ہو، غریب باپ معذور ہو جائے یا ماں بیوہ ہو جائے، نہ خود وہ کمانے کے لائق ہوں، نہ حکومت یا کوئی اور ان کا تکفل کر رہے ہوں اور ان کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہ ہو کہ وہ اپنے کم عمر بچہ کو مزدوری پر لگائے، تو ایسے والدین کا اپنے نابالغ بچوں کو مزدوری پر لگانا درست ہے، اس

صورت میں ماں باپ کو ضرر سے بچانے کے لئے بچوں کے ضرر کو برداشت کرلیا جائے گا، شریعت کا اصول ہے کہ اگر دوخرابیوں میں سے ایک خرابی کے ارتکاب پر مجبور ہوجائے تو کمتر درجہ کی خرابی کو اختیار کرلے، "إذا تعارض مفسدتان روعی أعظمهما ضررا بارتكاب أخفهما" (شرح القواعد الفقهية، المادة: ۲۸)، فقہاء نے باپ کو اس کا حق واختیار دیتے ہوئے لکھا ہے: "فللأب أن يؤاجر ابنه الصغير من عمل من الأعمال..." (البدائع: ۴/۲۱)، نیز فقہاء نے یہ بھی لکھا ہے کہ جب لڑکا کمانے پر قادر ہوجائے تو باپ اس کو کمانے میں لگائے گا اور اس کی آمدنی سے اس کا خرچہ پورا کرے گا۔ ''الذكور من الأولاد إذا بلغوا حد الكسب ولم يبلغوا في أنفسهم يدفعهم الأب إلى عمل ليكسبوا أو يؤاجرهم وينفقوا عليهم من أجرتهم وكسبهم وأما الأناث فليس للأب أن يؤاجرهن في عمل أوخدمة، ثم في الذكور إذا سلمهم في عمل فاكتسبوا يأخذ كسبهم وينفق عليهم من كسبهم وما فضل من نفقتهم يحفظ ذلك عليهم إلى وقت بلوغهم كسائر أملاكهم'' (الهندية: ۱/۵۶۳، الدر والرد: ۵/۲۷۲)۔

بچہ کو مزدوری پر لگانے کا ایک بنیادی سبب یہ ہوتا ہے کہ جاہل اور بے شعور والدین واولیاء روپیوں کی قیمت سمجھتے ہیں یا پھر مال کی خوب حرص وطمع رکھتے ہیں، مگر نیکیاں اور علم وتعلیم ان کے نزدیک بے قیمت اور ناقابل توجہ چیز ہوتی ہے، اس لئے وہ لوگ اپنے بچوں کو تعلیم سے محروم رکھ کر روپیوں کے خاطر ان کو مزدوری پر لگاتے ہیں، ایسے موقع کے لئے اسلامی ہدایت یہ ہے کہ عمومی سطح پر لوگوں کا ذہن بنایا جائے اور خصوصاً والدین کو سمجھایا جائے کہ اگر وہ آج اپنے بچوں کو مزدوری پر نہ لگا کر اور انہیں تعلیم دلاکر تھوڑے سے مال اور روپیوں سے محرومی گوارا کرلیں گے تو کل یہ بچہ تعلیم یافتہ، باعزت اور باشعور بن کر بھی اہل خانہ کی خوش حالی کا ذریعہ بن جائے گا اور ان کی تھوڑی سی قربانی سے ان کی آنے والی نسلوں کا مستقبل سنور جائے گا۔

دوسرا سبب یہ ہوتا ہے کہ ماں باپ انتہائی غریب ہیں، کمانے سے معذور ہیں اور گھر مین کمانے والا کوئی نہیں ہے، اس لئے ان کے لئے اپنے بچوں کو مزدوری پر لگانے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا، اس سلسلہ میں اسلامی ہدایت یہ ہے کہ حکومت یا پھر اجتماعی طور پر سماج ایسے غریب اور بے سہارا گھرانوں کی ضروریات پوری کرنے کی بھی ذمہ داری لے لے اور ان غریبوں کے بچوں کی تعلیم وتربیت کا انتظام کرنے کی بھی ذمہ داری لے لے، تاکہ ملک وملت کی یہ متاع گرانمایہ ضائع نہ ہونے پائے، اسی لئے حضرت عمرؓ کے دور خلافت میں جب کشادگی ہوئی تو ولادت کے ساتھ ہی ہر بچہ کا وظیفہ مقرر کردیا جاتا تھا اور ایسے ہی پریشان حال لوگوں کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا:

"من ترك كلا فإليّ ومن ترك مالا فلورثته" (رواه ابوداود، كتاب الفرائض، باب في ميراث ذوي الارحام، رقم: ۲۹۰۰)

(جو کوئی بوجھ یعنی عورتیں، بچے اور قرضے چھوڑ کر مرا ہو وہ میرے ذمہ ہے، اور جو مال چھوڑ کر گیا ہو تو یہ اس کے ورثہ کا حق ہے)۔

☆☆☆

اسلام میں بچوں کے حقوق

مفتی غلام اللہ کاوی والا[1]

بچوں کی پرورش کے سلسلہ میں اسلام کی بنیادی ہدایات

بچی جب تک بالغ نہ ہوجائے وہاں تک (حق حضانہ) پرورش کا حق والدہ کو ہے، بچہ جب تک سات سال کا نہ ہوجائے وہاں تک (حق حضانہ) پرورش کا حق والدہ کو ہے۔

''فی سنن أبي داؤد عن عبد الله بن عمر أن امرأة قالت، یا رسول الله! إن ابنی ہذا کان بطنی له وعاء، وثدیي له سقاء، وحجری له حواء، وإن أباه طلقنی وأراد أن ینتزعه منی، فقال لها رسول اللہ ﷺ: أنت أحق به ما لم تنكحي'' (حدیث: ۲۲۶۶، ابوداؤد مع بذل المجهود ۸-۳۳۹-۳۴۰)۔

وفی الشرح الكبير ۹-۲۹۸-۲۹۹ للحنابلة إذا افترق الزوجان، ولهما طفل و معتوه فأمه أولی بكفالته، إذا كملت الشرائط فيها ذكرا كان أو أنثى، هذا قول الثوری ومالك والشافعي واسحاق وأصحاب الرأی، ولا نعلم أحداً خالفهم''۔

بچہ اور بچی کی پرورش کا حق بلوغ وحد شہوت تک ماں کو حاصل ہونے پر ائمہ اربعہ کا اتفاق شرح کبیر کی عبارت سے واضح ہے۔

علامہ زیلعی تبیین الحقائق میں تحریر فرماتے ہیں:

''لأن الصغار لما عجزوا عن مصالحهم، جعل الشرع ولایتها إلی غيرهم، لجعل ولاية التصرف فی النفس والمال إلی الآباء لأنهم أقوی رأیا مع الشفقة الكاملة وأوجب النفقة علیهم لكونهم أقدر عليها، وجعل الحضانة إلی الأمهات لأنهن أشفق وأرفق وأصبر علی تحامل المشاق بسبب الولد علی طول الاعصار، وأفرغ للقيام بخدمته، فكان فی تفويض الحضانة إليهن وغيرها من المصالح إلی الآباء زيادة منفعة إلی الصغيرة فكان حسنا. وانظر للصغير فيكون مشروعاً، ولهذا قال أبوبكر لعمر حين فارق امرأته: ريحها ومسها ومسحها وريقها خير له من الشهد عندك ولم ينكر عليه أحد فكان إجماعاً'' (۳-۴۷)۔

علامہ زیلعی کی اس عبارت سے بھی واضح ہے کہ حق حضانہ ماں کو حاصل ہے، اور یہ اجماع صحابہ سے ثابت ہے۔

فتاوی عثمانیہ کے حاشیہ پر ہے: ''ظاہر الروایۃ یہی ہے کہ لڑکی کے بالغ ہونے تک اس کی پرورش کا حق ماں کو حاصل ہے، مگر کئی فقہاء کرام کے نزدیک حد شہوت تک پہنچنے تک ماں کو اس کی پرورش کا حق حاصل ہے، اور حد شہوت کی عمر میں اختلاف ہے، بعض فقہاء نے اس کی عمر ۹ سال بیان کیا ہے، اور اسی پر فتوی دیا ہے (مزید دیکھئے: الدر المختار ۳/ ۵۶۶، ۵۶۷ طبع سعید)۔

ہمارے اکابر نے ظاہر الروایت کے مطابق فتوی دیا ہے چنانچہ مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے امداد المفتین ص: ۲۲۷ میں اور حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن صاحبؒ نے عزیز الفتاوی میں ص: ۵۶۶ اور حضرت ظفر احمد تھانویؒ نے امداد الاحکام ۲/ ۸۷۷ میں اسی کے مطابق فتوی دیتے ہوئے فرمایا ہے کہ لڑکی بالغہ ہونے تک اس کی پرورش کا حق ماں کو حاصل ہے (ماخوذ از فتاوی عثمانی ۲/ ۴۸۱)۔

---

[1] دار الافتاء، دار العلوم عربیہ اسلامیہ بھروچ، گجرات۔

(ب): تعلیمی وتربیتی، جسمانی یا نفسیاتی مضرت کا اندیشہ اور حق پرورش

۱۔ اجنبی سے نکاح کرے گی تو (حق حضانہ) پرورش کا حق ختم ہوجائے گا، اگر ذی رحم محرم سے شادی کرے گی تو (حق حضانہ) پرورش کا حق ساقط نہ ہوگا۔

"أحق الناس بحضانة الصغير حال قيام النكاح أو بعد الفرقة الأم، فإن ماتت أو تزوجت فالأخت لأب وأم، وإنما يبطل حق الحضانة لهؤلاء النسوة بالتزوج، إذا تزوجن بأجنبي، فإن تزوجن بذي رحم محرم من الصغير كالجدة إذا كان زوجها جد الصغير أو الأم إذا تزوجت بعم الصغير لا يبطل حقها كذا في فتاوى قاضي خان"

(الفتاوى العالمگيريه، كتاب الطلاق، الباب السادس عشر في الحضانة ۱-۵۴۱، كذا في مجمع الأنهر، كتاب الطلاق باب الحضانة ۱-۴۸۱، كذا في الدر المختار ۳-۵۶۵)۔

۲۔ بچے، بچی کو جان کا خطرہ ہو، اسی طرح بچے اور بچی کا ماں کے پاس رہنے اور پرورش میں رکھنے سے تعلیم وتربیت میں کمی کا ظن غالب ہو، امن وسکون نہ ہو، ان تمام حالات میں ماں کا حق پرورش (حق حضانہ) ساقط ہوجائے گا: "تربية الولد تثبت للأم إلا أن تكون مرتدة إلى قوله أو غير مأمونة ذكره المجتبى بأن تخرج كل وقت أو تترك الولد ضائعاً" (الدر المختار كتاب الطلاق، باب الحضانه)۔

امداد المفتیین ص: ۶۰۶ پر ہے: "ماں اگر بدچلن ہے تو دادا وغیرہ پرورش کے لئے اس سے علاحدہ کرسکتے ہیں"۔

حق تربیت اولاد کا سات سال تک اور لڑکی کا بالغہ ہونے تک ان کی ماں کو پہنچتا ہے، لیکن اگر ماں کی چال چلن ایسی ہو کہ اس سے بچوں کی پرورش کا خراب ہونا متیقن یا مظنون ہو تو تربیت دادا ہی کرسکتا ہے (جبکہ باپ موجود نہ ہو) (کذا فی الہدایہ والدر المختار باب الولی وباب الحضانۃ)۔

(ب): اسلام میں بچوں کی تعلیم وتربیت کے بارے میں بنیادی ہدایات:

واضح رہے کہ اولاد نعمت خداوندی ہے، اس واسطے نکاح وشادی کے ذریعہ ہر انسان کے سامنے اس نعمت خداوندی کے حصول کی تمنا ہونی چاہئے، چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "فالآن باشروهن وابتغوا ما كتب الله لكم" (بقرہ: ۱۸۷) (سو اب تم اپنی بیویوں سے ملو، اور تمہارے لئے جو کچھ لکھ دیا ہے اس کو طلب کرو)، سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "تزوجوا الودود الولود فإني مكاثر بكم الأمم" (مشکوۃ) (محبت کرنے والی اور کثرت سے جننے والی عورتوں سے نکاح کرو، کیونکہ قیامت کے روز میں تمہاری کثرت سے دوسری امتوں پر فخر کروں گا)۔

اس سے معلوم ہوا کہ اولاد بہت بڑی نعمت ہے اور باعث فخر ہے، ویسے بھی طبعی وفطری طور پر انسان شادی کے بعد اولاد کی خواہش کرتا ہے، اولاد ہونے پر اکثر اظہار مسرت کرتا ہے، اس کے برعکس اولاد نہ ہونے کی صورت میں میاں بیوی دونوں احساس کمتری میں مبتلا ہوجاتے ہیں (اسلام میں اولاد کی تربیت: ۹)۔

نیک صالح اولاد صدقہ جاریہ ہے:

"إذا مات الإنسان انقطع عمله إلا من ثلاثة: إلا من صدقة جارية، أو علم ينتفع به أو ولد صالح يدعو له" (مشكوة)۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نیک اور صالح اولاد چھوڑ کر جانا میت کے لئے صدقہ جاریہ ہے اور آخرت کے لئے ذخیرہ ہے۔

خدا کے واسطے اہل وعیال کو جہنم سے بچالو:

"يا أيها الذين آمنوا قوا أنفسكم وأهليكم ناراً" (سورہ تحریم: ۶)، اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت کریمہ میں تمام ایمان والوں سے خطاب فرمایا اور حکم دیا ہے کہ خود کو بھی اور بیوی بچوں کو بھی دوزخ کی آگ سے بچاؤ، جس کا مطلب یہ ہے کہ خود قرآن اور قرآنی علوم سیکھو، اس پر عمل کرو، پھر اپنی بیوی بچوں کو قرآنی علوم کی تعلیم دو۔

چنانچہ احکام القرآن میں امام ابوبکر جصاصؒ، حضرت حسن بصریؒ سے اس کی تفسیر نقل کرتے ہیں، "قوله قوا أنفسكم ..... الخ. یعنی بیوی بچوں کو دینی تعلیم دینا، اطاعت اور نیک اعمال کا حکم دینا، معاصی اور تمام برے اعمال سے ان کو روکنا مراد ہے، امام ابوبکرؒ اس کے بعد لکھتے ہیں: اس سے معلوم ہوا کہ ہمارے ذمہ لازم ہے کہ ہم اہل وعیال اور بیوی بچوں کو دین کی تعلیم دلائیں اور ان کی اخلاقی تربیت کریں (۳/۴۴۴، اسلام میں اولاد کی تربیت: ۱۱۵)۔

نئی نسل کے ایمان وعقیدے کی فکر کیجئے:

حضرت مولانا علی میاں صاحب ندویؒ فرماتے ہیں کہ "آج ہم مسلمانوں کو سب سے زیادہ اس کی ضرورت ہے کہ اپنی آئندہ نسل کے متعلق یہ اطمینان کرلیں کہ یہ صراط مستقیم پر رہے گی، جس دین کا نام اسلام ہے، "إن الدين عند الله الإسلام"، یعنی اللہ نزدیک "دین" صرف اسلام ہے (خطبات علی میاںؒ ۷/۲۰۹)۔

اولاد کے لئے باپ کا افضل تحفہ:

ایک باپ اپنے اولاد کو سب سے بڑا تحفہ کیا دے سکتا ہے؟ آپ نے ارشاد فرمایا: عن سعيد بن العاص رضي الله عنه أن النبي ﷺ قال: "ما نحل والد ولداً من نحل أفضل من أدب حسن" (ترمذی) (رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: سب سے افضل تحفہ جو کوئی والد اپنی اولاد کو دے وہ حسن ادب کی تعلیم ہے)۔

اولاد کیسی ہوں؟ ان کی صفات کیسی ہوں؟

قرآن کریم اور احادیث میں اولاد پر ماں باپ کے زبردست حقوق بتلائے گئے ہیں، ان تمام آثار سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اولاد کی صفات کیا ہونی چاہئے اور کیا نہیں، اولاد شرک کرنے والی نہ ہوں، اللہ کے علاوہ کسی کی بھی بندگی نہ کریں، وہ ماں باپ کے ساتھ بھلائی اور احسان اور نیکی کا معاملہ کریں، ان کو کسی بھی حالت میں سخت وسست اور اف نہ کہیں، کسی بھی طور وطریقہ سے ان کو نہ جھڑکیں، ان کے ساتھ ادب وہمدردی سے بات کریں، ان کے ساتھ شفقت وانکساری کے ساتھ جھکے رہیں اور ان کے لئے دعائیں کرتے رہیں کہ اے اللہ! تو ان دونوں پر رحم فرما جس طرح انہوں نے مجھ کو بچپن میں پالا پوسا تھا، اور میری پرورش کی تھی، اولاد ماں باپ کی (حرام کاری کے علاوہ) ہر طرح کی اطاعت وفرمانبرداری کریں، ان کا شکریہ ادا کریں، اس میں کسی قسم کی کمی نہ ہونے دیں، ان کو اچھی طرح عزت واحترام کے ساتھ رکھیں، اولاد ماں باپ کے لئے رحمت ہوں، آنکھوں کی ٹھنڈک بنیں، متقی وپرہیزگار بنیں اور آخرت میں جنت میں ساتھ رہیں، اس طرح کی اور بھی صفات کی حامل اولاد ہونے چاہئیں۔

قرآن کریم میں ہے: "وقضى ربك ألا تعبدوا إلا إياه وبالوالدين إحسانا، إما يبلغن عندك الكبر أحدهما أو كلاهما فلا تقل لهما أف ولا تنهرهما وقل لهما قولاً كريماً واخفض لهما جناح الذل من الرحمة وقل رب ارحمهما كما ربياني صغيراً" (سورہ بنی اسرائیل: ۲۳-۲۴)۔

سورہ لقمان میں ہے: "وإذ قال لقمان لابنه وهو يعظه يا بني لا تشرك بالله إن الشرك لظلم عظيم، ووصينا الإنسان بوالديه حملته أمه وهنا على وهن وفصاله في عامين أن اشكر لي ولوالديك إلي المصير" (سورہ لقمان: ۱۳-۱۴)۔

"والذين يقولون ربنا هب لنا من أزواجنا وذرياتنا قرة أعين واجعلنا للمتقين إماماً" (الفرقان: ۷۴)۔

اس کے خلاف اولاد کی صفات ہرگز ہرگز نہ ہوں، اور یہ آواز نہ آئے، "إنه ليس من أهلك" یعنی یہ تیرے اہل میں سے نہیں ہے، بلکہ اس طرح کی آواز آجائے، "قری عینا" آنکھ ٹھنڈی کر اور ہاتھ جوڑ کر پکارے "ربنا توفنا مسلمين وألحقنا بالصالحين"۔

۱۔ بچوں کو شرک وبدعت ومعاصی سے محفوظ رکھنے کی تدابیر اختیار کریں۔

۲۔ اسکول مدرسہ میں جاکر مدرس وماسٹر سے بچے کی اخلاقی وحاضری وغیرہ کی تفتیش کیا کریں، کم سے کم ہفتہ یا ماہ میں ایک مرتبہ۔

۳۔ بچے کے مدرس و اساتذہ پر اسی طرح ٹیچر پر آنکھ بند کر کے بھروسہ نہ کریں۔

۴۔ بچوں نے کہاں وقت گزارا؟ کیسے گزارا جیسے سوالات سے بچے کی حالت سے آگاہ رہا کریں، بچوں سے دور نہ رہیں، غلط صحبت و دوستوں سے بچانے کی تمام تدابیر اختیار کریں۔

۵۔ الیکٹرانک آلات، موبائل، ٹی وی، وغیرہ غلط راستوں پر ڈالنے والے اسباب سے اجتناب اور دور رکھنے کی کامل سعی کریں۔

۶۔ اس وقت دنیوی علوم، تعلیم کی طرف سیل رواں کی طرح بڑھ گئی ہے، اسی تناسب سے دینی علوم کی رغبت گھٹ رہی ہے، عوام تو کیا خواص اور علماء عظام کے بچے بھی دنیوی علوم کے پیچھے بھاگ رہے ہیں، اسکول اور کالج میں پڑھنے کی ہر سو ترغیب دی جارہی ہے، پیسے، کپڑے، یونیفارم دیئے جارہے ہیں، اسکالرشپ وظیفہ دیا جارہا ہے، اسکولوں میں باقاعدہ چھوٹے چھوٹے بچوں کو کھانا دیا جارہا ہے، غرض قسم قسم کی مفت امداد دی جارہی ہے، اور یہ عقل میں آنے والی بات ہے کہ بچوں کو جہاں کھانا ملے گا، کپڑے ملیں گے، پیسے ملیں گے، بچے اس طرف دوڑیں گے، ابھی ایسا ہی ہو رہا ہے، سوال یہ ہے کہ کیا ہمیں بھی یہ طریقہ علم دین کے لئے اختیار کرنا چاہئے، یقیناً جواب ہاں میں آئے گا، اور ہمیں الجواب صحیح کہنا ہوگا۔

حضرت مولانا علی میاں صاحب ندویؒ فرماتے ہیں:

میں یہ نہیں کہتا کہ آپ اپنے بچوں کو جدید علوم نہ سکھائیں، اس کی تعلیم ضرور دیجئے، مگر پہلے ان کے دلوں میں ایمان و یقین کی بنیاد مضبوط و مستحکم کر دیجئے، تاکہ کوئی طوفان ان کے ایمان و یقین کی بنیاد کو ہلا نہ سکے (خطبات علی میاں تکبیر مسلسل: ۳۱۵)۔

خالص دنیوی اسکول کا حال:

خالص دنیوی اسکول کا حال کس پر پوشیدہ ہے؟ سب جانتے ہیں کہ وہاں کا ماحول لادینی ہے، اساتذہ وغیرہ لامذہبی ہیں، کورس میں اسلام دشمن عناصر کے وضع کردہ متعصبانہ مواد کا غلبہ ہے، اس کے مواد کسی سے متصادم ہوں کہ نہ ہوں اسلام سے تو سیدھا ٹکراؤ ہے، بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ بہت سے شرائط بہت سے اسکولوں میں مسلمانوں کو مذہبی ٹھیس پہنچانے کی نیت سے طے کئے گئے ہیں، اور عیسائی مشنریوں نے تو انگریزی اسکولوں کا جو بھونچال اٹھایا ہے وہ تو مسلمانوں کو خس و خاشاک کی طرح اڑا لے گیا ہے، ان میں تربیت پانے والے تو نہ یہ کہ صرف اسلام پر عمل کرنے والے نہیں ہوتے بلکہ وہ ایک طرح سے متنفر ہو جاتے ہیں، اس حقیقت کا اظہار ہے اکبر الہ آبادی کے اس کلام میں

مغرب کی تعلیم سے دل ایشیا کا ہے ملول　　　کر دیا خلقت کو اس نے بے تمیز و بے اصول

ایک دوسری جگہ کہتے ہیں:

ہم کل ایسی کتابیں قابل ضبطی سمجھتے ہیں　　　کہ جن کو پڑھ کر بیٹے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں

مگر نہ معلوم امت کیوں فرنگیوں کی تقلید میں اندھی ہو چکی ہے، خصوصاً سرمایہ دار طبقہ تو ان کا آئیڈیل اور نمونہ بننے میں فخر محسوس کر رہا ہے، اس کا نتیجہ ہے کہ دینی مدارس سے وہاں کے ماحول سے، وہاں کی تعلیم سے نفرت تو نہیں، مگر ان کی ضرورت، افادیت، عظمت سے قلوب یکسر خالی ہیں اور خالص دنیوی اسکولوں اور خصوصاً انگریزی تعلیم گاہوں کا دل و دماغ پر ایسا نشہ چھایا ہوا ہے جس نے ان کی فکر آخرت کو بالکل معدوم کر کے رکھ دیا ہے، نہ اپنی فکر، نہ اپنی اولاد کے تباہ و برباد ہونے کا غم، بچپن ہی سے اپنی اولاد کو اسکول کے حوالہ کر دیتے ہیں، اور اپنی استطاعت سے زیادہ ان پر اپنے مالوں کو خرچ کرتے ہیں، جبکہ اس تعلیم کا مقصد اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ دنیوی ترقی ہو، فانی چیزیں زیادہ سے زیادہ اولاد کی ملکیت میں ہوں، وہ دنیوی اعتبار سے مہذب اور تعلیم یافتہ افراد کے ممبر و برابر بلکہ ان سے ایک قدم آگے چل سکیں (علم و دعوت: ۱۲)۔

بقدر ضرورت ہی دنیوی تعلیم:

بلاشبہ اکابر نے عصری تعلیم کو جائز قرار دیا ہے، اور حالات و وقت کا تقاضا بھی ہے، اگر کوئی شخص دینی تعلیم کے سیکھنے کے ساتھ ساتھ دنیوی تعلیم حاصل کر لے ہم اس کو سراہتے ہیں، یہ اچھی چیز ہے، فرق صرف فوقیت و اولیت کا ہے، مدلل یہ بات ثابت کی جاسکتی ہے کہ فوقیت و اولیت دینی علوم کو ہے، بعض حضرات یہ نظریہ بھی رکھتے ہیں کہ بقدر ضرورت ہی ''دینی تعلیم'' حاصل کی جائے، ہم اکابر کے نظریہ کی عزت کرتے ہیں، صحیح بات یہ ہے کہ

بقدر ضرورت ہی عصری و دنیوی علوم حاصل کئے جائیں، باقی دینی علوم ہی میں زندگی ختم کردی جائے، اور آخرت بچالی جائے۔

(۳) ایمان و عقیدہ مضبوط و مستحکم بنالیں پھر عصری علوم حاصل کئے جائیں، جیسا کہ ماقبل بیان ہو چکا ہے۔

(۴) جنس کی تعلیم سے گریز کریں، یہ باتیں عمر کے ساتھ ساتھ خود سیکھ لی جاتی ہیں۔

(ج) نکاح کا حکم سب کے حق میں یکساں نہیں ہے، جس پر شہوت غالب ہو اور بغیر نکاح کے زنا میں مبتلا ہونے کا مظنہ ہو، اور مہر ونفقہ پر قادر ہو، اس کے ذمہ نکاح کرنا فرض ہے، نکاح نہیں کرے گا تو گنہ گار ہوگا، اتنی بات بلا اختلاف ہے، چنانچہ ملک العلماء نے لکھا ہے: "لا خلاف أن النكاح فرض حال التوقان، حتى أن من تاقت نفسه إلى النساء بحيث لا يمكنه الصبر عنهن، وهو قادر على المهر والنفقة، ولم يتزوج يأثم اه" (بدائع ۲/ ۲۲۸)۔

جس پر ایسا غلبہ شہوت نہ ہو اس کے متعلق متعدد اقوال ہیں:

اصحاب ظواہر: نماز و روزہ کی طرح فرض عین ہے۔

امام شافعی: بیع وشراء کی طرح مباح ہے، احناف میں سے بعض نے مندوب و مستحب کہا ہے، بعض وجوب علی الکفایہ کے قائل ہیں، بعض وجوب علی العین کے ان سب کے دلائل بدائع میں مذکور ہیں۔

راجح یہ ہے کہ اعتدال شہوت کے وقت یعنی ابتلائے معصیت کا مظنہ بھی نہ ہو، بلکہ صبر وضبط پر قدرت ہو، ادائے حق زوجیت پر قدرت ہو، اور ادائے نفقہ و مہر پر بھی قدرت ہو سنت موکدہ ہے، اس میں یہ شرط ہے کہ نکاح کی وجہ سے ترک فرائض و سنن کا خوف نہ ہو، نیز خوف جور نہ ہو، اس حالت اعتدال میں اگر نہیں کرے گا تو ترک سنت موکدہ کے وبال میں ماخوذ ہوگا، اگر حالت اس اعتدال سے گری ہوئی ہو تو اس کے حق میں سنت موکدہ نہیں، بلکہ اس حالت میں اگر ادائے مہر ونفقہ پر قدرت نہ ہو یا جور میں مبتلا ہو جائے یا اس کی وجہ سے فرائض و سنت ترک کرنے کی نوبت آجائے تو گنہ گار ہوگا، ایسے شخص کو نکاح سے بچنا لازم ہوگا، بعض صورتوں میں نکاح کرنا ہوگا، اور بعض صورتوں میں حرام ہوگا۔

علامہ ابن نجیمؒ نے لکھا ہے:

"وصفته فرض، وواجب، وسنة، وحرام ومكروه ومباح" (البحر الرائق کتاب النکاح ۳-۱۴۰)۔

پھر ہر نوع کا محمل بیان کیا ہے، اور مختصر دلائل کی طرف بھی اشارہ کیا ہے (دیکھئے: حوالہ سابق ۳/ ۷۹)۔

حالت اعتدال میں نکاح کو سنت موکدہ قرار دیا گیا ہے، شرائط پائے جانے کے باوجود سنت موکدہ کا ترک کرنا گناہ ہے، اس کی تفصیل کرتے ہوئے لکھا ہے:

"وهو سنة وعند التوقان واجب فالمراد به السنة المؤكدة على الأصح وصرح في المحيط أيضاً بأنها مؤكدة، ومقتضاه الإثم لو لم يتزوج، لأن الصحيح أن لترك السنة المؤكدة مؤثم، كما علم في الصلاة والمراد به حالة القدرة على الوطئي والمهر والنفقة مع عدم الخوف من الزنا والجور، وترك الفرائض والسنن، فلو لم يقدر على واحد من الثلاثة، أو خاف واحداً من الثلاثة، فليس معتدلاً، فلا يكون سنة في حقه كما أفاده في البدائع اه" (البحر الرائق ۳-۱۴۲ کتاب النکاح)۔

فتح القدیر کتاب النکاح ۳/ ۱۸۷، مکتبہ مصطفی البابی الحلبی مصر، المبسوط للسرخسی ۴/ ۲۱۵، عقاریہ کوئٹہ، وغیرہ کتب احناف میں یہی تفصیل مذکور ہے، لہذا سب پر ایک حکم لگا دینا درست نہیں۔

د: بچوں کے بالغ ہونے تک کا نفقہ وسکنی والد پر ہے، اسی طرح باپ موجود نہ ہو تو دیگر اولیاء پر ڈالا گیا ہے، مطلب واضح ہے کہ بچہ بالغ ہونے تک مزدوری وغیرہ کے کاموں پر نہ لگایا جائے، یہ زمانہ اس کے تعلیم و تعلم، لعب، کھیل کود کا ہے، اسی لئے بلوغ تک نان ونفقہ وسکنی کی ذمہ داری والد وغیرہ پر ڈالی گئی ہے، ہاں بعد البلوغ وہ خود کمائی کرے گا، اور خود کفیل ہوگا، بعدہ یہ ذمہ داری دوسرے پر عائد نہ ہوگی۔

گھر کے معمولی کام جو اس کے تحمل سے باہر نہ ہو، یا ایسا کام جس سے جسمانی ودماغی ضعف کا باعث نہ ہو، ایسا کام لیا جاسکتا ہے، تفصیلات تو نظر سے نہیں گزری مگر عقلاً ونقلاً یہ سمجھا جاسکتا ہے۔

(۳) نکاح اسی وقت مباح ہے، جبکہ وہ نان ونفقہ وسکنی پر قادر ہو، اگر قدرت نہ ہو تو اس سے بچنا ضروری ہوجاتا ہے، پھر بھی اگر یہ حالات بعد النکاح پیش آئے ہوں تو عقلاً ونقلاً یہی بات سمجھ میں آتی ہے کہ تحمل سے باہر مزدوری کی کوئی گنجائش نہیں، بہتر یہی ہے کہ ایسے گھروں کی فہرست تیار کی جائے، مسلمان لیڈر امانت دار بیت المال کا انتظام کریں، اور وہاں سے انکی ضروریات پوری کریں۔

(۴) نابالغ سے ہونے والے جرائم پر حدود قائم نہیں کی جاسکتی ہے، ہاں سد باب کے لئے تعزیر ہے، بادشاہ وقت مناسب سزا دیں، تاکہ آئندہ اس قسم کے جرائم نہ کریں۔

فتح القدیر میں ہے: "فالعقل والبلوغ شرط لأهلية العقوبة" (۲۳۱/۵)۔

(و) بچوں کو جرائم سے بچانے کے لئے قرآن نے بتلایا ہے، "قوا أنفسكم وأهليكم نارا"۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: والدین کی جانب سے اولاد کے لئے بہترین تحفہ ان کو ادب وحسن اخلاق کی تعلیم دینا ہے۔

''عن ابن عمر عن النبی ﷺ كلكم راع وكلكم مسئول عن رعيته''۔

جامع صغیر میں حضرت ابوہریرہؓ سے منقول ہے، فرماتے ہیں: ''عن أبي هريرة ﷺ قال: قال رسول الله ﷺ: ''حق الوالد على ولده أن يحسن اسمه ويزوجه إذا أدرك، ويعلمه الكتاب''۔

بچوں کی بچپنہ میں ہی صحیح تعلیم وتربیت کی جائے گی تو اسی فیصد جرائم کا سد باب ہوگا، جب بالغ ہوجائیں تو جلد شادی کردی جائے، حدیث میں ہے: ''تین امور میں تاخیر نہ کی جائے، نماز جب اس کا وقت ہوجائے، جنازہ جب موجود ہو، بالغ ہوتے ہی بچہ کی شادی کردی جائے۔

حضرت ابو اللیث سمرقندیؒ نے لکھا ہے کہ ایک شخص اپنے لڑکے کو لے کر حضرت عمرؓ کے پاس آیا اور کہا کہ یہ میرا لڑکا ہے، میرا کہنا نہیں مانتا، اور ہر کام میں میری نافرمانی کرتا ہے، حضرت عمرؓ نے اس کی ساری بات سن کر لڑکے سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ اے لڑکے! کیا تجھے پتہ نہیں کہ باپ کے حقوق بیٹے پر کیا ہیں؟ پھر آپؓ نے خود لڑکے کو بتایا کہ باپ کے حقوق اولاد پر یہ ہیں، پھر لڑکے نے پوچھا، اولاد کے حقوق بھی باپ پر ہیں؟ حضرت عمرؓ نے جواب دیا کہ اولاد کے حقوق بھی باپ پر ہیں، لڑکے نے پھر پوچھا کہ اولاد کے حقوق باپ پر کون کون سے ہیں؟ حضرت عمرؓ نے جواب دیا سب سے پہلے لڑکے کی ماں اچھی تلاش کرے، نیک ودیندار لڑکی کے ساتھ شادی کرلے، ہر طرح کی بھگوڑی بداخلاق بدچلن کو اپنے گھر میں لاکر کھڑی نہ کردے، دوسرا حق یہ ہے کہ پیدا ہونے کے بعد اچھا نام رکھے، تیسرا حق یہ ہے کہ بچے کو دین اور قرآن کی تعلیم دے، لڑکے نے جواب دیا، میرے باپ نے ان تینوں میں سے میرا ایک بھی حق ادا نہیں کیا ہے، سب سے پہلے جو عورت میری والدہ ہے وہ ایک ان پڑھ اور جاہل عورت تھی جو باندی تھی، جس کو میرے باپ نے چار سو درہم میں خریدا تھا، یعنی وہ ایک نو مسلم عورت ہے جس کو دینی تعلیم اور اسلامی آداب کے بارے میں ذرا برابر معلومات نہیں ہے، ایسی ان پڑھ اور جاہل ماں کی گود میں میرا بچپن گزرا ہے مجھے کچھ بھی دینی تعلیم نہیں دی ہے، میں کیا کروں؟ اور میرا نام بھی اچھا نہیں رکھا، میرا نام ایسا ہے جس کا مطلب ہوتا ہے 'ٹیکس'، تیسرا حق میرے دینی تعلیم کا تھا، جو مجھے قطعاً نہیں دیا، اب آپ جو فیصلہ فرمائیں گے وہ مجھے منظور ہے۔

غور کیجئے! حضرت عمرؓ جیسے عظیم شخص نے فرمایا کہ اے لڑکے کے باپ! تم نے سب سے پہلے لڑکے کے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی اور نافرمانی کی ہے یعنی تم نے اس کے حقوق ادا نہیں کئے، اور مجھے آکر یہ شکایت کرتے ہو کہ لڑکا میری اطاعت نہیں کرتا، یہاں سے کھڑے ہوجاؤ، پہلے نافرمان تم ہی ہو (نزہۃ الناظرین: ۱۷۶)۔

افسوس صد افسوس آج تو فلمی ہیروئن کے نام پر اپنی لڑکیوں کے نام رکھے جاتے ہیں ریڈیو پر آنے والے عشقیہ گانوں کا شوق پیدا کیا جاتا ہے، پھر ایسے بے شرم بے حیا ماں باپ کی گودوں سے ایسی نالائق اولاد پیدا ہوں گی جو اپنے گھروں سے دین ایمان اور قرآن وحدیث کے جنازے نکالیں گی۔

اسلامی فلاسفہ نے لکھا ہے کہ ہندوستان میں ہندو مذہب نوسو سال تک مسلمان کے زیرنگیں رہنے کے باوجود آج بھی زندہ جاوید ہے، کیونکہ ہندو عورتیں اپنے مذہب میں بڑی کٹر رہی ہیں، جس کا تجربہ خود آپ کو بھی ہوا ہوگا۔

مذکورہ بالا تفصیلات سے واضح ہوجاتا ہے کہ والدین بچوں کی تربیت وتعلیم پر نظر رکھیں، اس کے ایمان ویقین کو مضبوط بنائیں، ان میں اسلامی کلچر وتہذیب پیدا کریں، تبلیغی جماعت نے ایک مدت تک بہت عمدہ کام کیا، مگر یہ جماعت بھی بے اثر نظر آرہی ہے، پھر کوئی ایسی تحریک کی ضرورت ہے جو بڑے بوڑھوں میں اولا اسلامی کلچر وتہذیب کی خوبیاں دکھائیں اور مغربی تہذیب سے نفرت پیدا کردیں۔

نابالغ پر حدود نہیں، تعزیر ہے۔

(د): دینی اور اصلاحی جتنے ادارے ہیں محب اسلام اور اسلامی تہذیب وکلچر کو قابل فخر سمجھنے والے منتظمین طے کئے جائیں، دعوت وتبلیغ والوں نے یقینا ایک مدت تک مؤثر کردار ادا کیا، مگر آج کل وہ بھی غیر مؤثر ثابت ہورہی ہے، اسی طرح اداروں اور خانقاہوں میں مخلص افراد کو آگے بڑھایا جائے، اور ان کو بھی موثر بنائیں، مزید دیگر تحریک وتدبیر پر غور فرما کر ان کو بھی بروئے کار لائے کہ عوام وخواص میں اسلامی کلچر وتہذیب قابل قبول بنیں، مغربی تہذیب وکلچر سے متنفر ہوں، اسی (۸۰) فیصد مسلم اسلامی تہذیب وکلچر سے متنفر نظر آتی ہے، بلکہ اسلامی تہذیب ہی سے نابلد ہے اور مغربی تہذیب کو قابل قبول، اس پر عمل پیرا ہوکر فخر کرنے والی نظر آتی ہے، جب بڑے بوڑھوں کا یہ حال ہے تو بچوں میں اسلامی تہذیب کا تصور بہت مشکل نظر آتا ہے، محنت بڑے اور بوڑھوں پر کرنا ہے، ان میں جو باتیں ہوں گی وہی بچے قبول کریں گے، بچے بڑوں کی نقل کرنے والے ہوتے ہیں، جس ماحول میں پرورش ہوگی اسی میں رنگے جائیں گے۔

(ز): آجکل ہر صوبہ میں دارالیتامی، بچوں کا گھر وغیرہ ادارے قائم ہیں، جہاں اچھا انتظام ہو وہاں سپرد کردیں۔

(ح): شروع میں بیان ہوچکا سات سال تک بچے کی پرورش کا حق ماں کو ہے، پھر باپ کو وغیرہ تفصیلات شروع میں ہوچکی ہے، اقرباء، پڑوسی، اہل قریہ وغیرہ توجہ دیں، یہ لوگ نہ کرسکیں تو ادارے ہر قصبہ (صوبہ) میں موجود ہیں وہاں اچھی تعلیم وتربیت کا نظم ہے، انہیں سپرد کردیں۔

(ط): بالا عبارات سے اس کا جواب بھی واضح ہوجائے گا۔

اولاد کو نیک صالح بنانے کی ذمہ داری، ماں باپ پر اولا عائد ہوتی ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے: ''عن ابن عمر رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ ﷺ بروا آباءكم تبركم أبناءكم وعفوا تعف نساءكم'' (طبرانی بحواله مجمع الزوائد كتاب البر والصلة باب ما جاء في البر وحق الوالدين ۸۔۲۵۸)۔

(حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم اپنے والدین کے ساتھ نیکی کرو، تمہاری اولاد تمہارے ساتھ نیکی کرے گی، تم پاک رہو (زنا، وغیرہ سے دور رہو) تمہاری عورتیں پاکباز ہوں گی (زنا وغیرہ سے دور رہیں گی)۔

''عن عطاء بن أبي رباح أن رسول الله ﷺ قال ارحم الله والداً أعان ولده على بره'' (سلسلة الاحاديث الضعيفه ۱۴، حديث نمبر: ۱۹۴۶)۔

(عطاء بن ابی رباح سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ رب العزت اس باپ پر رحم کرے جو اپنی اولاد کو نیک کاموں کے لئے مدد کرتا ہے)۔ فقط والسلام، واللہ سبحانہ اعلم۔

☆☆☆

بچوں کے احکام ومسائل ۔ شرعی نقطہ نظر سے

مفتی لطیف الرحمن فلاحی [1]

الف: حضانت (بچوں کی پرورش، دیکھ بھال) واجب اور ضروری ہے، اس لئے کہ اس کے بغیر بچہ ضائع ہوجائے گا اور اس کو ضیاع سے بچانا لازم اور ضروری ہے، اور شریعت میں حضانت کی اولین حقدار اس کی ماں ہے جبکہ اس کے اندر حضانت کے شرائط پائے جائیں تو اس سے بچہ کو نہیں لیا جاسکتا اور ماں اور بچہ میں جدائی نہیں کی جاسکتی۔

دربار نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں ایک واقعہ پیش آیا کہ ایک عورت نے شکایت کی یا رسول اللہ! میرا بیٹا ہے، میرا پیٹ اس کے لئے برتن، میری چھاتی مشک اور میری گود اس کے لئے پناہ تھی، اب اس کے والد نے مجھے طلاق دیدی اور وہ یہ چاہتے ہیں کہ اس کو مجھ سے چھین بھی لے، سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "أنت أحق به مالم تنزوجي" (ابوداؤد) تجھے اس کو لینے کا زیادہ حق ہے جبکہ تو دوسرا نکاح نہ کرلے)۔

اسی طرح حضرت عمرؓ نے اپنی ایک انصاری بیوی کو طلاق دیدی اور بچہ کو لینا چاہا تو یہ واقعہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خدمت میں پہنچا، آپ نے فیصلہ فرماتے ہوئے یہ ارشاد فرمایا: "...وحجرها وفراشها خير له منك حتى يشب ويختار لنفسه" (نصب الرایہ ۳؍۲۸۸)۔ اس کی ماں کی صحبت اس کی گود اور اس کا بستر تمہارے مقابلہ میں زیادہ بہتر اور مناسب ہے یہاں تک کہ بچہ بڑا ہوجائے اور اس میں کچھ سوجھ بوجھ پیدا ہوجائے (مستفاد مختارات النوازل ۲؍۱۸۷)۔

لہذا یہ عقل، شرعی اور فطری فیصلہ ہے کہ بچہ کی حقدار اس کی ماں ہے جب تک اس کے اندر حضانت کے تمام شرائط پائے جائیں۔

اور اگر ماں باپ یا دونوں میں سے کسی کو بچہ حوالہ کرنے میں بچہ کی تعلیمی، تربیتی نقصان ہو تو پھر حق حضانت ختم ہوجاتا ہے، لہذا حق حضانت کے ختم ہونے کے شرائط کیا ہیں؟ جس کی بنا پر ماں یا باپ یا رشتہ دار اس بچہ کی حفاظت سے دستبردار ہوجاتے ہیں، کتب فقہ میں اس کی تفاصیل موجود ہیں، ان اسباب وشرائط کو ذکر کیا جاتا ہے تفاصیل ملاحظہ:

(۱) عاقل ہو۔ (۲) بالغ ہو۔ (۳) بچے کی نگہداشت اور پرورش کی صلاحیت ہو، اور اس پر قدرت ہو۔

(۴) اخلاق وعادات اچھے ہوں۔ (۵) مسلمان ہو۔

(۶) حضانت کا حق رکھنے والی عورت کی شادی کسی ایسے شخص سے نہ ہوئی ہو جو بچے کے لئے اجنبی ہو، لیکن اگر بچے کا باپ اس عورت کے شوہر کے گھر بچے کے ساتھ رہنے پر راضی ہو تو کوئی حرج نہیں، اس عورت کا حق باقی رہے گا۔

(۷) ارتداد کا ہونا، یعنی کوئی عورت مرتد ہوجائے تو اس کا چھوٹا بچہ اس سے چھین لیا جائے گا۔

(۸) کوئی مسلمان بچہ کسی غیر مسلم کے ہاتھ لگے اور وہ اس کی پرورش پر راضی بھی ہو تب بھی اس بچے کو اس کے پاس نہیں چھوڑا جائے گا اور اگر اسلامی حکومت نہ ہو تو مسلمانوں کے سربرآوردہ لوگوں کو یہ ذمہ داری ہے کہ بچے کو اس غیر مسلم کے ہاتھ سے لے کر اس کے مسلمان ماں باپ تک پہنچائیں (مستفاد بچوں کے احکام ومسائل ۲۲۸-۲۲۹)۔

اسلام میں بچوں کے حق تعلیم وتربیت کے بارے میں بنیادی ہدایات:

ب (۱): حضرت مفتی عبدالرحیم لاجپوریؒ نے بہت تفصیل سے اس بارے میں ایک بہت پر اثر فتوی تحریر فرمایا ہے، ہم اس فتوی کے چند اقتباسات

[1] ممبئی، مہاراشٹر۔

یہاں نقل کرتے ہیں: آپ تحریر فرماتے ہیں کہ اولاد کی تعلیم وتربیت کا مسئلہ بہت اہم ہے، اولاد والدین کے پاس بہت عظیم امانت ہوتی ہے، والدین کو ان کی تعلیم وتربیت کا بہت ہی اہتمام کرنا چاہئے:

اولاد نیک صالح، اطاعت گزار اور فرمانبردار ہو، اس کے لئے مرد پر چند چیزیں لازم ہیں:

(۱) سب سے پہلے مرد پر ضروری ہے کہ دیندار، پاکباز اور شریف عورت سے نکاح کرے۔

(۲) نکاح کے بعد حلال وطیب روزی کا خاص اہتمام کریں۔

(۳) استقرار حمل کے بعد عورت بھی خصوصاً حرام اور مشتبہ روزی سے بچے اور اپنے خیالات نہایت پاکیزہ کرے۔

(۴) اسی طرح زوجین پر لازم ہے کہ بوقت مباشرت دعاؤں کا اہتمام کریں، دعاؤں کی برکت سے بچہ شیطانی اثرات سے محفوظ ہوجاتا ہے۔

(۵) جب انزال کا وقت ہو تو دل میں یہ دعا پڑھے: اللّٰھم لا تجعل للشیطان فیما رزقتنی نصیباً۔

(۶) بچہ کی ولادت کے بعد اسے نہلا دھلا کر سیدھے کان میں اذان اور بائیں کان میں اقامت کہے۔

(۷) اس کے بعد تحنیک اور برکت کی دعا کرائیں۔

(۸) بچہ پیدا ہونے کی خوشی میں شکریہ کے طور پر نیز آفات اور امراض سے حفاظت کے لئے ساتویں دن لڑکے کے لئے دو بکرے اور لڑکی کے لئے ایک بکرا ذبح کیا جائے۔

(۹) بچہ کا سر منڈوا کر بال کے ہم وزن چاندی غریبوں کو صدقہ کردیں۔

(۱۰) بچہ کے سر پر زعفران لگائیں۔

(۱۱) اور اس کا اچھا نام رکھ دیں، آج کل نئے ناموں کے رکھنے کا شوق ہوتا ہے، انبیاء، صحابہ اور نیک بندوں کے نام رکھنے کا اہتمام کریں۔

(۱۲) جب بچہ سمجھدار اور بڑا ہونے لگے اور اس کی زبان کھل جائے تو سب سے پہلے اس کو کلمہ طیبہ سکھائیں، اللہ پاک کا مبارک نام اس کی زبان پر جاری کرائیں۔

(۱۳) پھر انہیں اسلامی آداب سکھلائیں، والدین کی طرف سے اپنی اولاد کو اسلامی آداب سکھلانا سب سے بہتر اور افضل عطیہ ہے۔

(۱۴) اس کے ساتھ ساتھ اپنے گھروں کو بھی اسلامی ماحول میں رنگنے کی کوشش کریں۔

(۱۵) پھر جب سات سال کی ہوجائے تو نماز کا اہتمام کرائیں اور نماز کی تاکید کرنا شروع کردیں اور دس سال کے ہوجانے اور نماز میں کوتاہی کریں تو ان کو سزا دیں اور اب بستر بھی الگ کردیں۔

(۱۶) اب بچپن ہی سے دینی تعلیم پر خاص توجہ دیں، مکاتب قرآنیہ قائم کریں، جہاں قرآن مجید کی تعلیم تجوید کے ساتھ، نیز طہارت نماز وغیرہ کے ضروری مسائل نیز عقائد صحیحہ کی تعلیم کا انتظام ہو۔

(۱۷) اس کے ساتھ ساتھ بچوں کے لئے اچھی صحبت کا اہتمام اور بری صحبت سے اجتناب کی طرف بھی خصوصی توجہ دیں کہ یہ بہت ہی ضروری ہے۔

یہ چند اسلامی آداب ہیں اگر اس کا اہتمام کروالیا گیا تو اپنے گھروں میں اللہ کی رحمتیں، برکتیں نازل ہوں گی اور اولاد صحیح راہ پر قائم رہے گی اور گھر میں طمانیت اور سکون پیدا ہوگا (مستفاد فتاوی رحیمیہ ۳/ ۱۷۴-۱۷۶)۔

دینی وعصری تعلیم کی حد:

ب (۲): بچوں اور بچیوں کے لئے دینی تعلیم اور بقدر ضرورت عصری اور دنیوی تعلیم لازم اور ضروری ہے، حضرت سید مفتی عبدالرحیم لاجپوریؒ بچوں کے لئے عصری تعلیم کی فائدہ کو مدنظر رکھتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

ایسے اسکول قائم کرنا جس میں بقدر ضرورت انگریزی اور دنیوی علوم وفنون سکھلائے جائیں اور صنعت وحرفت کی کلاس قائم کرنا جس سے حلال روزی حاصل کرنے میں مدد مل سکے، بلاشبہ جائز اور کار خیر وموجب اجر وثواب ہے، لیکن تعلیم اور دینی مدارس کی امداد کو مقدم سمجھا جائے (فتاوی رحیمیہ ۱۳۰/۳)۔

اور بچوں کے لئے بقدر ضرورت عصری تعلیم کے حصول کے بعد کالج میں داخلہ کرانے نیز ڈگریوں کے حصول کی بھی گنجائش ہے، مگر چند شرائط کے ساتھ: اولاً بچوں کو قرآن پاک کی صحیح اور باقاعدہ تعلیم، اور عقائد دینیہ کی تصحیح کا اہتمام کیا جائے، بزرگوں کی صحبت کا بھی گاہے بگاہے اہتمام رکھا جائے، اسی طرح دینی کتب کے مطالعہ کی پابندی کروائی جائے اور بچوں کے سرپرست خود بھی سنتوں کا اہتمام کرتے ہوئے بچوں کو بھی سنتوں اور اسلامی آداب کی پابندی کروائیں، ان تمام شرائط کا اگر اہتمام سرپرست کرواسکیں تو مزید تعلیم کے لئے انگریزی کالج میں داخلہ کروانے کی گنجائش ہے، ورنہ کنارہ کشی میں اپنی اولاد کی عافیت ہے، ہرگز داخلہ کی اجازت نہیں ہے۔

اور بچیوں کو بقدر ضرورت دنیوی تعلیم کے حصول کے بعد مزید اونچی تعلیم دلوانے کی غرض سے کالج میں داخل کروانا اور ڈگریاں حاصل کروانے کی اجازت نہیں ہے۔

حضرت مفتی لاجپوریؒ اپنے ایک فتوی میں فرماتے ہیں: بچیاں انگریزی میں نام و پتہ لکھ سکے اتنا سیکھنے میں مضائقہ نہیں، لیکن لڑکیوں کو اسکول اور کالج میں داخل کرکے اونچی تعلیم دلانا اور ڈگریاں حاصل کرنا جائز نہیں ہے کہ اس میں نفع سے نقصان کہیں زیادہ ہے، تجربہ بتلاتا ہے کہ انگلش تعلیم اور کالج کے ماحول سے اسلامی عقائد واخلاق بگڑ جاتے ہیں، آزادی، بے حیائی، بے شرمی بڑھ جاتی ہے۔

حضرت شیخ الہندؒ کا ارشاد ہے کہ اگر انگریزی تعلیم کا یہی اثر ہے جو عموماً دیکھا گیا ہے کہ لوگ نصرانیت کے رنگ میں رنگ جائیں یا حکومت وقت کی پرستش کرنے لگیں تو ایسی تعلیم سے ایک مسلمان کے لئے جاہل رہنا ہی اچھا ہے (فتاوی رحیمیہ ۱۲۴/۳)۔

مرحوم سرسید احمد جو انگلش کے بڑے حامی تھے تجربہ نے یہ کہنے پر مجبور کردیا کہ ''لڑکیوں کے اسکول بھی قائم کئے گئے جن کے ناگوار طرز نے یقین دلایا کہ عورتوں کو بدچلن اور بے پردہ کرنے کے لئے یہ طریقہ نکالا گیا ہے (اسباب بغاوت ہند بحوالہ فتاوی رحیمیہ ۱۲۸/۳)۔

لیکن ان مذکورہ خطرات اور مفاسد سے حفاظت کرتے ہوئے اور لڑکیوں کے سرپرست اپنی لڑکیوں کی پورے شرعی پردے کی رعایت کرتے ہوئے اپنی بچیوں کو میڈیکل سائنس کی تعلیم یا ہومیوپیتھک ڈاکٹر اس غرض سے بناتے ہیں کہ اپنے فن کا استعمال عورتوں کی خدمت کے لئے کریں گی تو گنجائش ہوسکتی ہے، بشرطیکہ تمام احکام کی رعایت اور پابندی کرسکے اور اس کے باوجود بھی یہ مشورہ عمومی طور پر کسی بھی سرپرست کو نہیں دیا جائے گا۔

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم عورتوں کو میڈیکل اور ہوم اکنامکس کی تعلیم دلانے کے سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

> خواتین اگر میڈیکل سائنس یا ہوم اکنامکس کی تعلیم اس غرض سے حاصل کریں کہ ان علوم کو شرعی طریقے پر عورتوں کی خدمت کے لئے استعمال کریں گی تو ان علوم کی تحصیل میں بذاتہ کوئی حرمت وکراہت نہیں، بشرطیکہ ان علوم کی تحصیل میں اور تحصیل کے بعد ان کے استعمال میں پردے اور دیگر احکام شریعت کی پوری رعایت رکھی جائے، اگر کوئی خاتون ان تمام احکام کی رعایت کرتے ہوئے یہ علوم حاصل کریں تو کوئی کراہت نہیں، لیکن چونکہ آج کل ان میں سے بیشتر علوم کی تحصیل میں احکام شریعت کی پابندی عنقا جیسی ہے اس لئے اس کا عام مشورہ نہیں دیا جاسکتا (فتاوی عثمانی ۱۶۳/۱)۔

حضرت مولانا بدر عالم میرٹھی مہاجر مدنی حضرت علامہ انور شاہ کشمیری کے مایہ ناز شاگرد اپنی آخری تصنیف ''جواہر الحکم'' میں ایک حدیث کی شرح فرماتے ہوئے تعلیم وتربیت نسواں کا صحیح مفہوم پیش کرتے ہوئے یوں رقم طراز ہیں: میرے ناقص اندازے کے مطابق متوسط طبقہ کی خواتین کو ہومیوپیتھک ڈاکٹری کی تعلیم دی جانی ضروری ہے، تاکہ اپنے گھر کے بچوں کا معمولی علاج وہ خود کرلیں اور معمولی معمولی بیماریوں میں ڈاکٹروں کی بڑی بڑی فیس اور گراں ادویات کی قیمتوں کا بار اٹھانے سے بچ جائیں (۲۳۲/۳)۔

لازمی تعلیم کا مسئلہ:

ب (۳): اگر سرکار کسی سطح تک تعلیم کو لازم قرار دے تو بقدر ضرورت تو سرکار کی طرف سے تعلیم کی پابندی ضروری ہے، بشرطیکہ سرکار کا نصاب تعلیم اسلام کے بنیادی عقائد کے خلاف نہ ہو، ورنہ ایسے مضامین کی تعلیم دینے کی اور بقدر ضرورت بھی پڑھنے پڑھانے کی گنجائش نہیں ہوگی۔

جنسی تعلیم اور اسلامی ہدایات:

ب (۴): ہرگز نہیں، اتنی کم عمری میں جنسیات کی تعلیم ہی نے مغربی ممالک میں بدکاری کا تناسب بڑھا دیا جس کی وجہ سے بلوغ کے ساتھ ہی حمل اور اسقاط حمل کے واقعات کثرت سے ہو رہے ہیں، بین الاقوامی ماہرین صحت کی رپورٹ ۱۹۹۷ء کے مطابق دنیا میں ہر سال ۱۶ کروڑ تیس لاکھ افراد جنسی امراض میں مبتلا ہو جاتے ہیں، یہ ابتداء عمر ہی سے جنسیات کی تعلیم کی سوغات ہے، وہاں کے اسکولوں میں پرائمری کے مرحلہ سے ہی بچوں اور بچیوں کو یہ تعلیم دی جاتی ہے اور اسکولوں میں باضابطہ مانع حمل اسباب کی سہولت فراہم کی جاتی ہے۔

اس بارے میں اسلام کی ہدایت یہ ہے کہ سب سے پہلے اسلام برائی کو روکنے کا قائل ہے، نہ کہ برائی کو محفوظ طریقہ پر رواج دینے کا، اس لئے جنسیات کی تعلیم سے زیادہ اہم اخلاقیات کی تعلیم ہے، ہونا یہ چاہئے کہ ابتدائی جماعتوں سے لے کر میٹرک تک ایک مضمون اخلاقیات کا شامل نصاب کیا جائے۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ اسلام ایسی تمام باتوں سے منع کرتا ہے جو برائی کی طرف لے جانے والی ہیں، خواہ وہ تعلیم کے نام پر ہوں، اس لئے نابالغوں کو جنسی اعضاء کا وظیفہ سمجھانا، اور جنسی اتصال کا محفوظ طریقہ سمجھانا کسی بھی طرح مناسب نہیں، کہ اس سے مزید برائی کی تحریک پیدا ہوتی ہے، اور یہ علاج کے بجائے بیماری ثابت ہوتی ہے (مستفاد شمع فروزاں ۲ / ۱۱۴)۔

نکاح کے بارے میں بچوں اور بچیوں کے حقوق:

ج: واقعی ہمارے سماج میں اس بارے میں افراط وتفریط پائی جاتی ہے، ملک کے بہت سے علاقوں میں بچپن میں ہی شادی کرانے کا رواج ہے، لیکن اسلام میں صرف اس کی اجازت ضرور ہے ترغیب نہیں (ماں عائشہؓ کا نکاح کم عمری میں ہونا اس کی واضح دلیل ہے)، بلکہ بہتر اور پسندیدہ اسی کو قرار دیا گیا ہے کہ بالغ ہونے کے بعد بچوں کی شادی کریں، امام نووی لکھتے ہیں: مستحب اور پسندیدہ یہ ہے کہ باپ اور دادا کنواری لڑکی کی شادی اس وقت تک نہ کریں جب تک وہ بالغ نہ ہو اور تاکہ ایسا نہ ہو کہ اس کی ناپسندیدگی کے ساتھ اس کی شادی کے جال میں پھنسا دیا جائے (مستفاد بچوں کے احکام ومسائل ۳۸۸-۳۸۹)۔

اور ہمارے سماج میں بعض مرتبہ سرپرست غیر معمولی تاخیر بھی کرتے ہیں، یہ بھی کسی طرح مناسب نہیں، اس بارے میں حضرت حکیم الامت تحریر فرماتے ہیں: بعض ناعاقبت اندیش کنواری لڑکیوں کو بالغ ہو جانے کے بعد بھی کئی سال تک بٹھلائے رکھتے ہیں، اور محض ناموری کے سامان کے انتظار میں ان کی شادی نہیں کرتے، حتی کہ بعض کی عمریں تیس تیس اور چالیس چالیس برس کی پہنچ جاتی ہے، حدیث میں اس پر سخت وعید آئی ہے کہ اگر اس صورت میں عورت سے کوئی لغزش ہوگئی تو وہ گناہ اس کے ولی پر بھی لکھا جاتا ہے (اسلامی شادی / ۱۱۵)۔

اور بچپن اور کم عمری میں نکاح کر دینے کی خرابی واضح کرتے ہوئے آپ تحریر فرماتے ہیں:

آج کل قوی بہت ضعیف ہے، اعضاء میں مکمل پختگی نہیں ہو پاتی کہ شادی کر دیتے ہیں، جس کی وجہ سے کم عمری ہی میں اعضاء ڈھل جاتے ہیں اور ضعیف ہو جاتے ہیں، پچھلے زمانہ میں لوگ بڑے قوی ہوتے تھے، اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ان کی شادی سن نمو کے ختم ہونے کے بعد ہوتی تھی۔

دوسری خرابی یہ ہے کہ کم عمری میں شادی کرنے سے مناکحین (لڑکا لڑکی) کو کچھ تمیز بھی نہیں ہوتی کہ نکاح کیا چیز ہے اور اس کے حقوق کیا ہیں؟ اور جب معلوم ہی نہیں ہوتا تو ایک دوسرے کے حقوق پامال ہونے لگتے ہیں۔

بس اس بارے میں اعتدالی راہ یہ ہے کہ نہ بہت دیر کرے نہ جلدی، بلوغ کے بعد اور درستگی عقل اور اعضاء کی پختگی کے بعد نکاح کرایا جائے، حضرت فاطمہؓ کی عمر شادی کے وقت ساڑھے پندرہ سال اور حضرت علیؓ کی عمر اکیس سال کی تھی (مستفاد اسلامی شادی ۱۲۰، ۱۲۱)۔

بچہ مزدوری کے بارے میں اسلام کا موقف:

د (۱): اس بارے میں رسول اللہ ﷺ نے تلقین فرمائی ہے کہ کم عمر بچوں کو کسب معاش کا مکلف نہ کرو، اس سے یہ ہوگا کہ اگر کمانہ سکیں گے تو چوری کریں گے، ارشاد فرمایا: "لا تکلفوا الصغیر الکسب فإنہ إذا لم یجد سرق" (موطا امام مالک بحوالہ راہ عمل ۳/۶۶)۔

کم عمری میں بچوں کا کسب زر کا ذریعہ بنانا اور تعلیم وتربیت سے محروم رکھنا یہ بڑی بے رحمی اور بدخواہی ہے، کیوں کہ یہ ہمیشہ کے لئے ان کو معاشی، اخلاقی، اور فکری اعتبار سے پسماندہ اور محروم رکھنے کے مترادف ہے۔

نابالغ بچے اور گھریلو کام:

د (۲): ان کی تعلیم کا پورا خیال رکھتے ہوئے اگر بطور تربیت کے گھریلو ہلکا پھلکا کام خصوصاً چھوٹی بچیوں سے لے لیا جائے تو گنجائش ہے، بشرطیکہ ان کی صحت اور نشوونما متاثر نہ ہو۔

اور معاشی ضروریات پورا کرنے یا اسے بہتر بنانے کے لئے مزدوری پر لگانے کی ہرگز اجازت نہیں، اس لئے کہ اس پر اجماع ہے کہ بچوں کا خرچ اور ضروریات کا مہیا کرنا باپ کے ذمہ ہے، مسلم شریف کی روایت ہے کہ ایک شخص نے پیسے لاکر حضور ﷺ کے سامنے رکھ دیئے، آپ ﷺ نے فرمایا: اپنی ذات سے آغاز کرو، اگر بچ جائے تو بیوی بچوں پر خرچ کرو، اگر اس سے بھی بچ جائے تو دوسرے رشتہ داروں پر اور اگر اس سے بھی بچ جائے تو تم جہاں مناسب سمجھو، معلوم ہوا کہ باپ اپنے بچوں کے خرچ اٹھانے کا ذمہ دار ہے۔

اور اگر باپ خود محتاج ہے یا بیمار ہے تو احناف کے نزدیک بچہ کا نفقہ اس کے اصول میں سے جتنا موجود ہے اس پر واجب ہوگا، خواہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ ان کے پاس گنجائش ہو، لہذا مزدور پر لگانے کی اجازت نہ ہوگی (مستفاد بچوں کے احکام ومسائل ۲۴۱، ۲۴۲)۔

نیز انہیں پیشہ ورانہ کام سکھانے میں یہ تفصیل ملحوظ رکھنی ہوگی کہ اولاً ضروری اور فرض عین تعلیم کے حصول سے پہلے اس کی بھی اجازت نہیں، البتہ اس کے حصول کے بعد مزید تعلیم میں محنت نہیں کر پا رہا ہو یا جی چراتا ہو تو پھر اس فن یا ہنر جو اس کے لئے اور اس کی صحت کے قابل ہو اس میں مصروف رکھنا اور سکھانا بہتر ہوگا، تاکہ مستقبل میں اپنی معاشی ضروریات کا خود کفیل بن سکیں۔

بچہ مزدوری اور اسلامی ہدایات:

د (۳): ماں باپ اگر بدحال ہیں اور غربت میں مجبور ہیں تو باپ کے بعد دادا اس کی کفالت اختیار کرے گا اور اگر یہ تینوں مجبور ہیں تو دوسرے رشتہ دار ذمہ دار ہوں گے اور جس کا رشتہ سب سے قریبی ہوگا اس پر اس بچہ کا نفقہ واجب ہوگا اور اگر ایک درجہ کا قریبی رشتہ دار کئی ہوں تو سب کے ذمہ برابر برابر بچے کا نفقہ لازم ہوگا (یعنی پھر بھی مزدوری کی اجازت نہیں ہوگی) (بچوں کے احکام ومسائل، ص: ۲۴۳)۔

اور اگر مذکورہ اولیاء رشتہ دار موجود نہ ہوں یا اس قابل نہ ہوں تو ایسے موقع پر حکومت ذمہ دار ہے کہ وہ ایسے بے سہارا گھرانوں کی اقل ترین ضروریات پوری کرے اور حکومت ایسے غریب گھرانوں کی کفالت کا مناسب انتظام کرے۔

اور آج حکومت بھی اس سے سخت غفلت کا شکار ہے تو جو دوکاندار اور کارخانہ دار کم عمر بچوں کی خدمت سے فائدہ اٹھاتے ہیں تو انہیں بھی چاہئے کہ قوم کے ان نونہالوں کے حقوق محسوس کرے، اول تو ان سے وہی کام لیں اور اتنا ہی لیں جو ان کے قابل برداشت ہو، دوسرے ان سے کام لینے کے ساتھ ساتھ ان کی تعلیم وتربیت کا بھی انتظام کردیں تاکہ ان کا مستقبل سنور سکیں (مستفاد راہ عمل ۳/۶۸)۔

نابالغ بچے اور جرائم:

ہ: اسلام ایک دین فطرت اور دین رحمت ہے، کتب فقہ میں مارنے کے اصول وضوابط اور حدود کی تفصیل یوں ملتی ہے، عام حالات میں تو تین چھڑی سے زیادہ نہ مارا جائے، لیکن اگر بچہ جو تقریباً دس سال کا ہو چکا ہے اور اس نے ایسے جرم کا ارتکاب کیا مثلاً قتل، چوری زنا وغیرہ تو پھر اس بارے میں شرعی تادیب یہ ہے کہ دس چھڑی یا دس کوڑے مارنے کی اجازت ہے، اس سے زیادہ نہیں، حدیث میں ہے: حد کے علاوہ کسی اور غلطی پر دس کوڑے

سے زیادہ نہیں مارنا چاہئے، "لا یجلد فوق عشر جلدات إلا فی حد من حدود الله" (بخاری)۔

لیکن اس سزا دینے کا طریقہ بھی متعین ہے، اور یہ سزا ایسی نہ ہو جو "ضرب مبرح" میں داخل ہو جائے اور اس کی تفصیل جو کتب فقہ میں ملتی ہے وہ یہ ہے:

(۱) چہرہ پر مارنے سے پرہیز کیا جائے، رسول اللہ ﷺ نے جانور کو بھی چہرہ پر مارنے سے منع فرمایا ہے (کنز العمال)۔

(۲) جسم کے نازک حصہ جیسے پیٹ، سینہ، وغیرہ پر نہ مارا جائے۔

(۳) مسلسل ایک ہی مقام پر نہ مارا جائے بلکہ جسم کے مختلف حصوں پر مارا جائے۔

(۴) اس طرح نہ مارے کہ جسم کی ہڈی پھٹ جائے، یا ٹوٹ جائے یا مار کا نشان جسم پر نمایاں ہو جائے۔

(۵) لٹا کر، بیڑی ڈال کر یا کپڑے اتار کر مارنا جائز نہیں، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ اس امت میں لٹا کر بیڑی ڈال کر اور کپڑے اتار کر مارنا نہیں۔

(۶) سر پر اور نازک اعضاء جس سے جان کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے، جیسے شرمگاہ اس پر بھی مارنا جائز نہیں۔

بہت مجبوری میں شرعی سزا دینے کی یہ ترتیب اسلام کی جانب سے ملتی ہے، آج حکومت کی جیلوں کو بھی اسلام کی شرعی سزا کا یہ طریقہ اختیار کرنے کی ضرورت ہے (مستفاد راہ عمل ۵/۲۶۲، ۲۶۳، بچوں کے احکام و مسائل/۳۳۹)۔

بچوں کی جیلیں:

و: آج حکومت کی جیلوں میں مجرم بچوں کے ساتھ سرزنش کا جو ناروا سلوک کیا جا رہا ہے اس کی ہرگز اسلام میں اجازت نہیں، مذکورہ سزا کا طریقہ اختیار کریں، نیز ان مجرمانہ ذہنیت رکھنے والے بچوں کی اصلاح اور تادیب کے لئے حکومت کی ذمہ داری ہے کہ ایسے ماہر نفسیات اور شفیق اساتذہ کا انتخاب کریں اور ایسے مشفق اساتذہ کے اوقات کو ان بچوں کے لئے متعین کریں، پھر یہ اساتذہ، روزانہ کم از کم دو گھنٹہ ان بچوں کو اپنی صحبت میں رکھ کر ان کی تعلیم وتربیت کریں، تو بہت جلد جیل کی فضا ہموار ہو سکتی ہے اور آئندہ ان بچوں کا مستقبل سنور سکتا ہے۔ ارباب حکومت کی یہ ذمہ داری ہے، جس سے حکومت سخت غافل ہے۔

بے سہارا بچے اور ان کی تعلیم وتربیت:

ز: شریعت اسلامی میں ان تمام بچوں کا حکم "یتیم" کا ہوگا، اور حکومت کے ذمہ ضروری ہے کہ مستقل یتیم خانے قائم کریں اور اس طرح کے بچوں کی تعلیم وتربیت کا اہتمام کریں اور ان کی فکر کریں، اسی طرح مسلمان معاشرہ کی بھی ذمہ داری ہے کہ یتیم کے سلسلہ میں حضور ﷺ نے جو تاکیدات اور فضائل ارشاد فرمائے ہیں اسکو پیش نظر رکھیں اور یتیموں کے لئے ہر علاقہ میں، یتیم خانے قائم کر کے ان میں تعلیم وتربیت کا معقول انتظام کریں، نیز بالغ ہونے کے بعد ان کی ازدواجی زندگی کی بھی فکر کریں اور شادی بیاہ کا بھی مناسب انتظام کریں۔

حضرت ابو بکر بن حفص کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمر اس دسترخوان پر کھانا نہیں کھاتے جس پر کوئی بچہ نہ ہوتا (الادب المفرد) (بحوالہ ارشادات نبوی ﷺ کی روشنی میں نظام معاشرت ۱/۱۰)۔

ایک اور حدیث میں حضور ﷺ کا ارشاد ہے: ہم اور یتیم کی پرورش کرنے والے اس طرح دو انگلیوں کے برابر ہوں گے، دکھلا کر فرمایا کہ اس طرح جنت میں ہم ایک دوسرے کے ساتھ ہوں گے (حوالہ بالا)۔

بچوں کی اسمگلنگ:

ح: گارجین کا بچہ کو حوالہ کرنا اور اس سے بے تعلق ہو جانا اور اس پر حوالہ کرنے والے کی جانب سے ہدیہ قبول کرنا، یہ درحقیقت اپنے بچوں کو فروخت کرنے کی ایک جدید شکل ہے اور اس پر ہدیہ قبول کرنا رشوت کے حکم میں ہے، ہرگز شریعت اسلامی میں اس کی اجازت نہیں، حد سے بڑھے ہوئے

افلاس کے باوجود اس طرح کا عمل پوری انسانیت کی توہین ہے، اس طرح رفتہ رفتہ ہر غریب کے بچے "بکری کا مال" بن جائیں گے، جس طرح ماں باپ اپنے کسی عضو کے مالک نہیں اسی طرح یہ ماں باپ اپنے بچوں کے بھی مالک نہیں اور جس طرح قیمتاً کسی کو نہیں دے سکتے، اسی طرح اس کو دے کر اس پر ہدیہ کے طور پر کوئی قیمت بھی قبول نہیں کر سکتے، ہاں اگر کوئی شریف فیملی یونہی بلا معاوضہ کسی غریب بچہ کو اس کے ماں باپ سے مانگ کر "لے پالک" بنالے تو اس کی اجازت ہوگی۔

فتاوی قاضی خاں میں ہے:

"مضطر لم يجد شيئاً وخاف الهلاك فقال له رجل اقطع يدي وكلها أو قال اقطع مني قطعة فكلها لا يسعه أن يفعل ذلك ولا يصح أمره به كما لا يصح للمضطر أن يقطع قطعة من لحم نفسه فيأكل، یعنی کوئی شخص حالت اضطرار میں ہے اور بھوک کی وجہ سے اس کو اپنی جان کی ہلاکت کا اندیشہ ہے اور مردار جانور تک نہیں ہے کہ اس کا گوشت کھا کر اپنی جان بچائے، اس حالت میں کسی شخص نے پیش کش کی کہ تم میرا ہاتھ کاٹ کر کھالو تو اس مضطر کے لئے اس شخص کا ہاتھ کاٹ کر کھانا جائز نہیں اور کسی شخص کو اس طرح پیش کش کرنا بھی صحیح نہیں، اس لئے کہ خود وہ اپنے ہاتھ یا اپنے بدن کے گوشت پوست کا مالک نہیں (فتاوی قاضی خاں ص: ۳۶۵، بحوالہ فتاوی رحیمیہ ۱۰/ ۱۷۰)۔

فتح القدیر میں یہ عبارت اور وضاحت سے آئی ہے: "ولا يجوز بيع شعور الإنسان ولا الانتفاع بها لأن الآدمي مكرم لا متبذل فلا يجوز أن يكون شيئ من أجزائه مهانا ومبتذلاً" (بحوالہ فتاوی محمودیہ ۱۸/ ۳۴۵)۔

اس بارے میں حکومت کی ذمہ داری ہے کہ اس طرح کے ماں باپ کی اولاد کا اپنی طرف سے اتنا وظیفہ مقرر کریں کہ عافیت سے اس طرح کے بچوں کی پرورش ہو سکیں، حضرت عمرؓ کے دور امارت میں جب فراخی آئی تو ولادت کے ساتھ ہی ہر بچہ کا وظیفہ سو درہم مقرر کر دیا جاتا، آج حکومت کے ذمہ داروں کو یہ اسلامی ہدایت اپنانے کی ضرورت ہے جس کی وجہ سے بآسانی اس طرح کے بچوں کی پرورش ہو سکتی ہے، پھر نہ مجبور ماں باپ اپنے بچوں کو فروخت کریں گے اور نہ ہی غریب ماں کوڑے کرکٹ کے پاس اپنے بچہ کو خاموشی کے ساتھ ڈال کر چلی جائے گی، لیکن ہائے افسوس! انکم ٹیکس کی جمع شدہ رقمیں اور اسکا اکثر حصہ ارباب حکومت کے داد عیش میں خرچ ہو جاتا ہے اور حکومت جان بوجھ کر اپنی آنکھیں بند کر لیتی ہے۔

معذور بچوں کی نگہداشت کا مسئلہ:

ط: علاج سنت ہے واجب نہیں، نیز دوا کا اختیار کرنا یہ سبب ہے، اصل شفا اللہ پاک کے ہاتھ میں ہے، بس اپنی قدرت کے بقدر علاج کرا سکتے ہیں، اگر علاج کے گراں ہونے کی وجہ سے ان کی قدرت سے باہر ہو جائے اور علاج کرانا چھوڑ دے تو گنہگار نہیں ہے نیز ان کو مستقل اسپتال میں داخل کر کے ان کی دیکھ ریکھ سے غفلت برتنے کی اجازت نہیں ہوگی، دماغی اسپتال میں داخل کر کے ماں باپ کی ذمہ داری ہوگی اپنی مصروفیتوں کے باوجود مستقل ان کی نگہداشت کریں، البتہ علاج کرانے میں اہمال سے کام لیا گیا تو حرج نہیں، فتاوی عالمگیری میں ہے:

"الاشتغال بالتداوي لا بأس به إذا اعتقد أن الشافي هو الله تعالى وأنه الدواء سبباً، والرجل إذا استطلق بطنه أو رمدت عيناه فلم يعالج حتى أضعفه ذلك ومات منه لا إثم عليه" (۵-۳۵۴-۳۵۵)۔

☆☆☆

اسلام میں بچوں کے حقوق واحکام

مولانا عبداللہ بن حافظ خالد لوناواڑا

حق حضانت:

فقہ کی اصطلاح میں نابالغ لڑکے یا نابالغ لڑکی، یا کم عقل بالغ لڑکے اور لڑکی جن میں تمیز کی صلاحیت نہ ہو، کی پرورش، ان کی مصلحتوں کی نگرانی، موذی اور مضر چیزوں سے حفاظت اور ایسی جسمانی، نفسیاتی اور عقلی تربیت کے وہ مقتضیات زندگی کی تکمیل کر سکے اور اپنے فرائض ادا کرنے کا اہل ہو جائے، ''حضانت'' ہے (قاموس الفقہ ۳/ ۲۶۲)۔

پرورش کے اولین حقدار:

شریعت مطہرہ نے بچہ کی ضروریات اور مفاد کو دیکھتے ہوئے اس کا اولین حقدار عورتوں کو بنایا ہے، اس لئے کہ اللہ تعالی نے عورتوں کے اندر طبعی رفق اور بچوں کی ضروریات کو زیادہ سمجھنے کی صلاحیت رکھی ہے (بدائع ۵/ ۲۲۵۴)۔

عورتوں میں سب سے پہلے پرورش کا حق ماں کی ممتا اور اس کے جذبات مادری کی رعایت کرتے ہوئے ماں کو دیا گیا ہے، ماں کی عدم موجودگی، یا حضانت کی حقدار نہ ہونے کی وجہ سے حق حضانت حسب ذیل ترتیب کے ساتھ بچہ کے ان رشتہ داروں کو حاصل ہوگا:

نانی، دادی، حقیقی بہن، اخیافی بہن، علاتی بہن، حقیقی بھانجی، اخیافی بھانجی، حقیقی خالہ، اخیافی خالہ، علاتی خالہ، علاتی بھانجی، حقیقی بھتیجی، اخیافی بھتیجی، علاتی بھتیجی، حقیقی پھوپھی، علاتی پھوپھی (ردالمحتار ۵/ ۲۶۲، قدوری/ ۴۱۵، ۴۱۶، فتاوی تاتارخانیہ ۴/ ۲۶۳ وغیرہ)۔

اگر مندرجہ بالا خواتین میں سے کوئی خاتون نہ ہو یا حضانت کے اہل نہ ہو تو حق حضانت عصبہ کی طرف منتقل ہوگا۔

علامہ شامی لکھتے ہے: "ثم العصبات بترتیب الإرث" (شامی ۵/ ۲۶۳)۔

اگر ایک درجہ کے دو شخص مستحق حضانت موجود ہو تو جو زیادہ بہتر تربیت کی صلاحیت رکھتا ہو، پھر زیادہ پرہیزگار ہو، پھر زیادہ عمر والے کو ترجیح دی جائے گی (بدائع الصنائع ۵/ ۲۲۵۹، ردالمحتار ۵/ ۲۶۵)۔

حق حضانت کے شرائط:

☆......حق حضانت انہی کو حاصل ہوگا جو عاقل بالغ ہو اور بچہ کی جسمانی اور اخلاقی تربیت کی صلاحیت رکھتا ہو اور قابل اعتماد ہو۔

☆......عورت کے مستحق حضانت ہونے کی شرط یہ ہے کہ وہ کسی ایسے شخص کی منکوحہ نہ ہو جو اس بچہ کے لئے غیر ذی رحم محرم ہو، اس لئے اگر وہ عورت مستحق حضانت بچہ کے چچا یا بھتیجے سے نکاح کرے تو حق حضانت ثابت نہیں ہوگا۔

☆......بچی کے حق میں مردوں کے مستحق حضانت ہونے کے لئے ان کا ذی رحم محرم ہونا شرط ہے، اسی طرح بچہ کے حق میں عورتوں کے مستحق حضانت ہونے کے لئے بھی ان کا ذی رحم محرم ہونا شرط ہے۔

☆......پرورش کرنے والی عورت اگر فاسقہ، بدکار اور فاحشہ ہو جس کی پرورش میں رہ کر بچہ کی تعلیمی، تربیتی، یا نفسیاتی پہلو سے بچہ کے لئے مضرت کا اندیشہ ہو تو اس کا بھی حق حضانت ساقط ہو جائے گا۔

☆......اسی طرح عورت ایسی بیماری میں مبتلا ہو جس سے بچہ کو کسی قسم کی مضرت کا اندیشہ ہو جیسے جنون وغیرہ، اس سے بھی حق حضانت ساقط ہو

جائے گا۔

☆......اگر بچہ کی مطلقہ ماں کسی ایسے دور دراز علاقے میں چلی جائے جہاں باپ کے لئے بچہ سے ملنا وقتاً فوقتاً دشوار ہو تو بھی حق حضانت ساقط ہو جائے گا (ردالمحتار ۵/۲۶۶، ہندیہ ۱/۵۴۱، ۵۴۲، البحر ۴/۲۸۲، ۲۸۳)۔

عورت بچہ کے غیر ذی رحم محرم سے نکاح کرلے، بچہ کی پرورش پر اجرت طلب کرے جبکہ بچہ کے ذی رحم محارم میں سے کوئی دوسری عورت بغیر اجرت پرورش پر راضی ہو، کسب وغیرہ کی وجہ سے بکثرت باہر نکلتی ہو جس سے بچہ کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہو، ایسے فسق وفجور میں مبتلا ہو کہ اس سے بچہ کے ضیاع کا خطرہ ہو (احسن الفتاوی ۵/۴۵۹)۔

اسی طرح فتاوی عبدالحی میں ہے: ماں اگر مرتد ہو جائے یا زنا، غنا، سرقہ، نوحہ اور ماتم وغیرہ کرنے کی وجہ سے فاجرہ ہو جائے یا بچہ کو گھر میں تنہا چھوڑ کر اکثر اوقات باہر رہے یا اس چھوٹی بچی کے غیر محرم کے ساتھ شادی کرلے ان تمام صورتوں میں اس کی تربیت کا حق نہ رہے گا (فتاوی عبدالحی: ۲۴۸)۔

اگر کسی مانع کے پیش آنے کی وجہ سے حق حضانت ساقط ہو جائے اور وہ مانع دور ہو جائے تو پھر حق حضانت لوٹ آئے گا (البحر الرائق ۴/۲۸۵، رد المحتار)۔

حق پرورش کی مدت:

ماں اور دادی، نانی کو اس وقت تک لڑکوں کی پرورش کا حق حاصل ہوگا جب تک خود ان میں کھانے پینے، استنجاء کرنے اور کپڑا پہننے وغیرہ کی صلاحیت پیدا ہو جائے، فقہاء نے اس مدت کا اندازہ سات سال سے کیا ہے، اسی سات سال والے قول پر فتوی ہے، اس کے بعد چونکہ لڑکوں کو تہذیب وثقافت اور آداب واخلاق کی ضرورت ہے اس لئے بچے باپ کے حوالہ کردئے جائیں گے، لڑکیاں ہوں تو بالغ ہونے کے بعد باپ کے حوالہ کردی جائیں گی (فتاوی ہندیہ ۱/۵۴۳، البحر الرائق ۴/۲۸۷، بدائع الصنائع ۵/۲۲۵۷ وغیرہ)۔

مفتی عبدالرحیم صاحب ایک سوال کے جواب میں لکھتے ہیں: صورت مسئولہ میں اگر ماں بچہ کی پرورش کے لئے تیار ہو تو پرورش کا سب سے پہلا حق ماں کا ہے، باپ زبردستی بچہ کو اس کے پاس سے چھین نہیں سکتا، اس کی میعاد فقہاء نے لڑکے کے لئے سات سال اور لڑکی کے لئے نو سال اور زیادہ سے زیادہ حیض آنے تک مقرر کی ہے (فتاوی رحیمیہ ۵/۶۸)۔

تعلیم وتربیت کی ذمہ داری:

اسلام میں تعلیم کی بڑی اہمیت ہے، اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ قرآن کریم میں سب سے پہلے جو آیت نازل ہوئی اس میں تعلیم کا حکم دیا گیا:

"اقرا باسم ربك الذی خلق" (سورۃ العلق)، دوسری جگہ ارشاد ہے: "وقل رب زدنی علماً" (طٰہٰ)۔

حدیث شریف میں بھی تعلیم کی بڑی تاکید کی گئی ہے، بلکہ ہر مسلمان مرد وعورت پر تعلیم کو لازم قرار دیا ہے، چنانچہ نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں: "طلب العلم فریضة علی کل مسلم" (بخاری شریف: ۵۰۳۵) (یعنی علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے)۔

ایک دوسری حدیث میں ہے: "من خرج فی طلب العلم فهو فی سبیل الله حتی یرجع" (ترمذی) (یعنی جو شخص علم کی طلب کے لئے نکلتا ہے وہ اللہ کے راستہ میں ہے یہاں تک کہ وہ لوٹ جائے)۔

اسی طرح کی بہت سی قرآنی آیات اور احادیث نبویہ ہیں جس میں تعلیم کی ترغیب اور تعلیم حاصل کرنے والوں کے فضائل بیان کئے گئے ہیں۔

والدین کی ذمہ داری:

تعلیم کی اسی اہمیت کے پیش نظر اسلام میں ہر باپ کا فریضہ بتایا گیا ہے کہ اپنے بچہ کی اچھی تعلیم وتربیت کا انتظام کرے، چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ایک باپ کا اپنے بچہ کے لئے سب سے بہترین ہدیہ اور تحفہ بہترین تعلیم وتربیت ہے: ما نحل والد ولداً من نحل أفضل من أدب حسن" (ترمذی: ۱۹۵۲)۔

ایک اور حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے لڑکیوں کی اچھی تعلیم وتربیت کرنے والے باپ کے لئے جنت کی بشارت سنائی۔

''ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس کے پاس تین لڑکیاں ہوں اس نے ان کی اچھی تربیت کی، پھر ان کی شادی کرادی اور ان کے ساتھ اچھا معاملہ رکھا، تو ایسے شخص کے لئے جنت کی بشارت ہے'' (سنن ابی داؤد: ۵۱۴۷)۔

مذکورہ بالا روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ شریعت میں کس درجہ تعلیم کی اہمیت دی گئی ہے، اس لئے والدین اور سرپرستوں کے لئے ضروری ہے کہ اپنے بچوں اور ماتحتوں کو اچھی سے اچھی تعلیم دلائیں اور ان کی بہترین تربیت فرمائیں۔

اسلام میں جس بنیادی تعلیم کو ہر ایک کے لئے ضروری قرار دیا ہے وہ دین کا علم ہے جس سے انسان کے لئے مذہب پر چلنا آسان ہوجاتا ہے، اس کے اندر اخلاقی قدریں پروان چڑھتی ہیں، اسی طرح والدین کے لئے ضروری ہے کہ اپنی اولاد کو عصری علوم سے بھی آراستہ کریں، اس لئے کہ شریعت مطہرہ میں اس کی بھی بڑی اہمیت ہے (دیکھئے: احیاء علوم الدین ۱/ ۲۳، ردالمحتار ۱/ ۱۲۶ وغیرہ)۔

اس کی اہمیت اس لئے بھی ہے کہ مسلمانوں کو دنیا میں نیابت اور خلافت کے فرائض انجام دینے ہیں اور خلافت و نیابت کے فریضہ کی ادائیگی اسی وقت ہوسکتی ہے جب دین کے علم کے ساتھ دنیا کا علم بھی حاصل کریں۔

لیکن ان علوم کو حاصل کرتے وقت ضروری ہے کہ کوئی خلاف شرع چیز کا ارتکاب نہ کرنا پڑے جیسے مخلوط تعلیم وغیرہ۔

حضرت مولانا تقی عثمانی صاحب ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں: خواتین اگر میڈیکل، سائنس، حکمت، ہوم اکنامکس کی تعلیم اس غرض سے حاصل کرے کہ ان علوم کو مشروع طریقہ پر عورتوں کی خدمت کے لئے استعمال کریں گی تو ان علوم کی تحصیل میں بذاتہ کوئی حرمت وکراہت نہیں بشرطیکہ ان علوم کی تحصیل میں اور تحصیل کے بعد ان کے استعمال میں پردے اور دیگر احکام شریعت کی پوری رعایت رکھی جائے (فتاوی عثمانی ۱/ ۱۶۳)۔

لازمی تعلیم کا مسئلہ:

اسی طرح اگر حکومت کی طرف سے کسی درجہ تک تعلیم کو لازم قرار دیا جائے اور اس میں غیر شرعی امور کا ارتکاب کرنا نہ پڑتا ہو تو مسلمانوں کو چاہئے کہ اس قانون کو قبول کریں۔

لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ آج تعلیم کا بھگوا کرن کے ذریعہ ہندو تہذیب مسلط کی جارہی ہے، خاص طور سے اس نئی حکومت کے بن نے کے بعد تیزی سے آر ایس ایس اور سنگھ پریوار اپنے عزائم کو پورا کرنے کے لئے اور مسلمان بچوں کو اسلام سے دور کرنے کے لئے تعلیم کے ذریعہ اپنے مقاصد کی تکمیل کررہے ہیں، اس لئے مسلمانوں پر ضروری ہے کہ وہ اسلامک اسکول قائم کریں جو صرف نام کی اسلامک نہ ہو بلکہ اس میں طلبہ کی اسلامی تربیت اور ذہن سازی کی جائے اور اس میں اسلامی معاشرت کو فروغ دیا جائے اور طلبہ کا رہن سہن اسلامی تہذیب اور اسلامی کلچر کا نمائندہ ہو۔

جنسی تعلیم:

شریعت مطہرہ میں جہاں زندگی کے تمام گوشوں میں انسانیت کی رہبری کی گئی ہے وہیں جنسیات کے متعلق بھی رہبری کی ہے، قرآن، حدیث اور فقہ اسلامی میں اس کے تفصیلی احکام بیان کئے گئے ہیں۔

شادی کی عمر:

اسلامی شریعت نے انسانوں کی ضرورت کو دیکھتے ہوئے اور پریشانیوں کا لحاظ کرتے ہوئے شادی کی کوئی عمر متعین نہیں کی ہے، اسی لئے بچپن کی عمر سے لیکر بڑھاپے کی عمر تک شادی کرنے کی اجازت دی۔

کم عمری کی شادی:

اس پر تمام فقہاء کرام کا اتفاق ہے کہ بچوں کے اولیاء وسرپرستان بچپن میں ان کا نکاح کرا دے تو جائز ہے، اس لئے کہ خود اللہ کے رسول ﷺ نے حضرت عائشہؓ سے اس وقت نکاح فرمایا جبکہ حضرت عائشہؓ کی عمر ۶ سال تھی، چنانچہ بخاری شریف میں ہے:

''عن هشام عن أبيه عن عائشةؓ أن النبيﷺ تزوّجها وهي بنت ست سنين وأدخلت عليه وهي بنت تسع و مكثت عنده تسعاً'' (بخاری شریف: ۴۸۴۰)۔

اسی طرح مصنف ابن ابی شیبہ میں حضرت حسنؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ جب باپ نے اپنے نابالغ بچے کی شادی کر دی تو جائز اور درست ہے:

"وإذا زوجه وهو صغير جاز نكاحه" (مصنف ابن ابی شیبہ: ۱۶۰۰۴)۔

اسی طرح قرآن شریف میں ہے: "واللائي يئسن من المحيض من نسائكم إن ارتبتم فعدتهن ثلثة أشهر واللائي لم يحضن" (سورہ نساء: ۱۴) (اور وہ عورتیں جو حیض سے مایوس ہو چکی ہیں ان کی عدت تین مہینے ہے اور اسی طرح ان کی، جنہیں ابھی حیض نہیں آیا)۔

اسی آیت سے استدلال کرتے ہوئے امام بخاریؒ نے چھوٹے بچوں کا نکاح کرانے کا جواز ثابت کرتے ہوئے مستقل باب باندھا ہے (بخاری شریف: حدیث نمبر: ۴۸۴۰)۔

مشہور شارح حدیث علامہ نوویؒ نے اس مسئلہ پر علماء کا اجماع نقل کیا ہے: ''أجمع المسلمون على جواز تزويج الأب بنته البكر الصغيرة'' (مرقات المفاتیح ۶/۲۰۶)۔

علامہ ابوبکر جصاص رازی نے بھی اس پر علماء کا اجماع نقل کیا ہے (احکام القرآن ۲/۶۴)۔

مندرجہ بالا دلائل سے معلوم ہوتا ہے کہ بچوں کا نکاح قبل البلوغ بھی کیا جا سکتا ہے۔

لیکن کم سنی اور نابالغی کے نکاح کے جواز سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اسلام میں اس کو بہتر قرار دیا گیا ہو اور اس کی ہمت افزائی کی گئی ہو، شرعی نقطہ نظر سے بہتر یہی ہے کہ نکاح بلوغ کے بعد کیا جائے، خود قرآن مجید میں اس کی طرف اشارہ ہے: ''یتیموں کو آزماؤ جب وہ نکاح کو پہنچ جائیں اور تم ان سے ہوش مندی محسوس کرو تو ان کا مال ان کے حوالے کر دو'' (سورہ نساء: ۶)۔

اس آیت سے واضح ہوتا ہے کہ بہتر طریقہ یہی ہے کہ بالغ ہونے کے بعد لڑکوں اور لڑکیوں کے نکاح کئے جائیں، اسی طرح اللہ کے رسول ﷺ نے نوجوانوں کو شادی کی ترغیب دیتے ہوئے فرمایا: "يا معشر الشباب! من استطاع منكم الباءة فليتزوّج" (بخاری: ۵۰۶۶)۔

ایک اور حدیث میں اللہ کے رسول ﷺ فرماتے ہیں: "من ولد له ولداً فليحسن اسمه و أدبه فإذا بلغ فليزوجه" (مشکوۃ ۲/۲۷۱) (جس شخص کے یہاں لڑکا پیدا ہو تو چاہئے کہ اس کا اچھا نام رکھے اور اسے ادب سکھائے اور جب بالغ ہو جائے تو اس کا نکاح کر دے)۔

ان احادیث سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ نکاح کا بہتر وقت بلوغ کے بعد ہی ہے۔

خود اللہ کے رسول ﷺ نے اپنی پیاری بیٹی حضرت فاطمہؓ کا نکاح حضرت علیؓ سے پندرہ سال کی عمر میں کیا (استیعاب: ۳۶۲)۔

اور بہت سے صحابۂ کرام اور جمہور سلف کا عمل چلا آ رہا ہے اور طبی اعتبار سے بھی یہی زیادہ بہتر ہے۔

پھر اسلام میں رشتہ کے انتخاب کی جو آزادی عاقدین کو دی گئی ہے وہ بالغ ہونے کے بعد ہی قانوناً اس اختیار کو استعمال کرنے کے اہل ہیں اور

بالغ ہونے کے بعد ہی انسان کے اندر بھلے اور برے کی تمیز پیدا ہوتی ہے۔

اسی لئے مناسب یہی ہے کہ شادی بالغ ہونے کے بعد کی جائے، لیکن موجودہ زمانہ میں کم سنی کے واقعات کم پائے جاتے ہیں، اب لڑکوں لڑکیوں کا رجحان بالغ ہونے بعد کئی سال بعد نکاح کرنے کا ہے، چودہ پندرہ سال کی عمر میں تولڑ کے لڑکیاں میٹرک کرتے ہیں اور اعلی تعلیم کا رجحان روز افزوں ہے اور تعلیم کے درمیان عام طور پر شادی نہیں کی جاتی پھر تعلیم کے بعد حصول روزگار کا مسئلہ ہوتا ہے، اس میں کئی سال نکل جاتے ہیں، اس کے بعد ہی شادی کرنے کی طرف راغب ہوتے ہیں، دوسری طرف ٹی وی کے فروغ، بیہودہ فلموں کی ویڈیو، فحش ویب سائٹس کی کثرت، پورن فلم کی طرف رجحان، اس کے سدباب کے لئے حکومت کی طرف سے چشم پوشی بلکہ ہمت افزائی جس سے نوجوان جنسی بے رہ روی میں مبتلا ہورہے ہیں اور ناجائز اسقاط حمل کی کثرت ہورہی ہے جس سے پورا معاشرہ خراب ہورہا ہے۔

اس لئے ماں باپ کو چاہئے کہ اپنے لڑکوں اور لڑکیوں کے اخلاق وکردار کی حفاظت کے لئے اور جنسی بے رہ روی میں مبتلا ہونے سے بچانے کے لئے بالغ ہونے کے بعد جلد سے جلد نکاح کردینا چاہئے ورنہ والدین سخت گنہگار ہوں گے، حدیث میں ایسے والدین کے لئے سخت وعیدیں آئی ہیں۔

"عن أبي سعيد و ابن عباس قالا: قال رسول الله ﷺ من ولد له ولد فليحسن اسمه و أدبه فإذا بلغ ولم يزوجه فأصاب إثما فإنما إثمه على أبيه" (مشکوۃ ۲۷۱/۲) (اللہ کے رسول ﷺ فرماتے ہیں: جس شخص کے یہاں لڑکا پیدا ہو چاہئے کہ وہ اسکا اچھا نام رکھے اور اسے نیک ادب سکھائے اور پھر جب وہ بالغ ہوجائے تو اس کا نکاح کردے اور وہ بالغ ہوگیا اور اس کا باپ اسکا نکاح نہ کرے اور پھر وہ لڑکا برائی میں مبتلا ہوجائے تو اسکا گناہ باپ پر ہوگا)۔

ایک اور حدیث میں اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا: "عن أبي هريرة ؓ قال قال رسول الله ﷺ: إذا خطب إليكم من ترضون دينه وخلقه فزوجوه إن لا تفعلوه تكن فتنة في الأرض و فساد عريض" (ترمذی ۱۲۸/۱، مشکوۃ ۲۶۷/۲) (حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جب تم کو (تمہاری لڑکی کے لئے) ایسا کوئی شخص پیغام نکاح دے جن کی دینداری اور اخلاق کو تم پسند کرتے ہو تو اس کے ساتھ نکاح کردو، اگر تم ایسا نہ کروگے تو روئے زمین میں بہت فتنہ وفساد پیدا ہوجائے گا)۔

مذکورہ بالا احادیث سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اپنے لڑکوں اور لڑکیوں کے نکاح بالغ ہونے کے بعد جلد از جلد کردینا چاہئے ورنہ روئے زمین میں فتنہ، فساد، بے حیائی، فسق وفجور، بدکاری، اور زناکاری کے دروازے کھل جائیں گے۔

بچہ مزدوری:

اسلام میں بچوں کی بڑی اہمیت ہے، اور ان کی ایک ایک ضرورت کے بارے میں ہدایت کی گئی ہے، ان ہدایات میں دو باتیں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں: ایک ان کی کفالت اور ضرورت زندگی کی تکمیل، دوسرے ان کی تعلیم وتربیت، بچوں کی کفالت کی ذمہ داری والد پر رکھی گئی ہے، چنانچہ قرآن کریم میں ہے: "وعلى المولود له رزقهن و كسوتهن بالمعروف" (سورہ بقرہ)۔

اسی طرح حدیث میں ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے حضرت ہندہ سے فرمایا: خذي ما يكفيك وولدك بالمعروف (بخاری: ۵۳۶۴) (تم اتنی مقدار لے سکتی ہو جو تمہارے اور تمہارے بچہ کے لئے کفالت کرجائے)۔

مذکورہ نصوص سے معلوم ہوتا ہے کہ باپ پر اولاد کا نفقہ واجب ہے، اسی طرح فقہاء امت کا بھی اس بات پر اجماع ہے (المغنی ۱۶۹/۸)۔

بچوں کو کسب معاش کا ذریعہ بنانا اور ان کو تعلیم وتربیت سے محروم رکھنا بڑی بے رحمی اور بدخواہی ہے۔

اسی طرح حدیث شریف میں ہے کہ کم عمر بچوں کو کسب معاش کا مکلف نہ کرو، اس سے یہ ہوگا کہ اگر کمانہ پائیں گے تو چوری کا ارتکاب کریں گے: "لا تكلف الصغير الكسب فإنه إذا لم يجد سرق" (موطا امام مالک: باب الامر بالرفق بالمملوک)۔

ان تمام باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بچوں کو کسب معاش کا ذریعہ بنانا اور ان کو مزدوری کا مکلف بنانا شریعت مطہرہ میں اس کی کوئی گنجائش نہیں

ہے۔

ہاں البتہ والدین انتہائی غربت اور معاشی بدحالی میں ہو، نہ وہ خود کمانے کے لائق ہو اور ان کی کوئی کفالت کرنے والا نہ ہو تو بدرجۂ مجبوری اس کی اجازت دی جاسکتی ہے۔ اس لئے کہ شریعت مطہرہ کا اصول ہے کہ اگر دو خرابیوں میں سے ایک کے ارتکاب پر مجبور ہو جائے تو کمتر درجہ کی برائی کو اختیار کرے: "إذا تعارضت مفسدتان روعي أعظمهما ضرراً بارتكاب أخفهما"، اس لئے کہ ایسے موقع پر اگر رخصت نہ دی جائے تو بڑے خطرات کا اندیشہ ہے، اس لئے کہ سماج اتنا ظالم اور خود غرض ہو چکا ہے کہ ایسے اوقات میں ان کی عزت وآبرو کا سودہ کرنے کے لئے کمربستہ ہو جاتے ہیں، اسی کے پس منظر میں احکام الصغار میں ایک جزئیہ نقل کیا ہے: صبی ورث من أمه مالاً وله أب معسر محتاج فنفقة الأب على الولد الصغير" (احکام الصغار: ۹۴)۔

بچوں کو پیشہ ورانہ کام سکھانے کے لئے ان کو کام پر لگا سکتے ہیں، اس لئے کہ یہ بچہ کے لئے مفید ہے، محیط برہانی میں ہے:

"وكذلك لو أراد الأب أن يواجره في عمل أو خدمة فذلك له لأن فيه منفعة للصغير لأنه يتعلم الكسب" (المحیط البرہانی ۳۴۱/۴)۔

اسی طرح شامی میں ہے: "وعليه فله دفعها لامرأة تعلمها حرفة كتطريز وخياطة مثلاً" (ردالمحتار ۳۳۷/۵)۔

اسی طرح بچوں سے ان کی وسعت کے مطابق گھر کا کام بھی لے سکتے ہیں، بلکہ لینا چاہئے، اس لئے کہ یہ بھی تربیت کی ایک قسم ہے، تاکہ بچوں کو کام کرنے کا سلیقہ سکھایا جائے، اگر ان سے کام نہیں لیا جائے گا تو وہ عیش وعشرت کے عادی ہو جائیں گے اور سست اور کاہل ہو جائیں گے اور حدیث میں اس سے منع کیا گیا ہے، مسند احمد میں معاذؓ ابن جبل سے مرفوعاً روایت ہے: "إياكم والتنعم فإن عباد الله ليسوا بالمتنعمين" (تم ناز ونعمت میں پڑنے سے بچو)

اس قسم کی اور بہت سی احادیث ہیں جن سے عجز وکاہلی وغیرہ کی مذمت ثابت ہوتی ہے، اس لئے والدین کو چاہئے کہ بچوں سے ان کی وسعت کے مطابق کچھ نہ کچھ کام لیتے رہیں۔

بچے اور جرائم:

اس پر تمام علماء کا اتفاق ہے کہ بچوں پر حد جاری جاری نہیں ہوگی (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۲۴/۶، بدایۃ المجتہد ۴۷۰/۲)۔

صاحب فتح القدیر لکھتے ہیں: "قصاص کے شرائط میں سے قاتل کا عاقل وبالغ ہونا ہے، چنانچہ نابالغ پر قصاص بالکلیہ واجب نہیں" (فتح القدیر ۱۳۸/۹)۔

مذکورہ بالا عبارتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بچون پر حد یعنی قصاص، قطع ید وغیرہ جاری نہیں ہوگی، البتہ ایسے معاملات میں شریعت مطہرہ نے حاکم کو تعزیر کا اختیار دیا ہے، اس لئے ایسے بچوں کے متعلق بھی حکومت کو اختیار ہوگا کہ وہ ان کی سخت تعزیر کریں اور تعزیر کی حد حکومت کی صواب دید پر ہوگی۔

بے سہارا بچے اور حکومت وسماج کی ذمہ داریاں:

اسلام ایک ایسا مذہب ہے کہ جس میں کمزوروں، یتیموں، بے سہاراؤں، کا بہت خیال رکھا ہے، اور ان کے ساتھ اچھا معاملہ وبرتاؤ اور اس کے ضروریات زندگی کے پورا کرنے کا بہت اہتمام کیا گیا ہے، چنانچہ قرآن کریم میں ایسے لوگوں کے متعلق بہت اہتمام کیا ہے، اور ان کو ڈانٹنے جھڑکنے سے منع کیا ہے اور ان کے ساتھ ایسے برتاؤ سے روکا ہے جو ان کی عزت وشرافت کے خلاف ہو، ارشاد باری ہے: "فأما اليتيم فلا تقهر" (الضحیٰ: ۹) (اور آپ بھی یتیم پر سختی نہ کیجئے)۔ دوسری جگہ ارشاد ہے: "أرأيت الذي يكذب بالدين فذلك الذي يدع اليتيم" (الماعون: ۱، ۲) (بھلا آپ نے اس شخص کو دیکھا ہے جو روز جزاء کو جھٹلاتا ہے سو وہ شخص ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے)۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ایسے لوگوں کی کفالت پر امت کو ابھارا ہے اور ان کے ساتھ حسن سلوک پر جنت کی بشارت سنائی ہے کہ وہ جنت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہوں گے، حدیث شریف میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"أنا وكافل اليتيم في الجنة هكذا وأشار بالسبابة والوسطى وفرج بينهما" (بخاری) (میں اور یتیم کی کفالت کرنے والا جنت میں اس طرح ہوں گے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی شہادت کی انگلی اور اس کی برابر کی انگلی سے اشارہ فرمایا اور ان دونوں کو کشادہ رکھا)۔

مذکورہ بالا احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کی کفالت کرنا موجب ثواب بلکہ اخلاقی فریضہ ہے، اس لئے مسلم سماج پر ضروری ہے کہ ایسے لوگوں کی کفالت کرے، بلکہ ایک حدیث میں تو ایسے ہی لوگوں یعنی کمزوروں کے ذریعہ ہی رزق کا وعدہ کیا گیا ہے: ''إنکم ترزقون بضعفائکم''، اس لئے مسلم سماج کو چاہئے کہ ان کے ساتھ خصوصی شفقت، توجہ اور دیکھ بھال سے کام لیں اور اپنے عمل سے ان کو یہ محسوس کرادے کہ محبت، معاملات، اور برتاؤ کے لحاظ سے وہ بھی ان کے لئے ان کی اولاد ہی کی طرح ہے۔

اسی طرح حکومت کا بھی فریضہ ہے کہ وہ ایسے لوگوں کی کفالت کرے، چنانچہ حضرت عمرؓ کا معمول مبارک بھی یہی تھا کہ ایسے لوگون کا نفقہ بیت المال سے ادا فرماتے تھے (المغنی ۶/ ۳۵)، اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ میں جو اسلامی مملکت کی داغ بیل ڈالنے والے تھے آپ نے یتیم کے ساتھ کس طرح شفقت و پیار کا برتاؤ فرمایا، چنانچہ حضرت عائشہ سے روایت کرتی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی عید کے موقع پر کسی یتیم کو دیکھا، اس کے ساتھ پیار کا برتاؤ کیا اور اس کو اپنے دولت کدہ پر لائے اور اس سے فرمایا: "أما ترضى أنا أقول لك أباً و تكون عائشة لك أماً" (کیا تم کو یہ بات پسند نہیں ہے کہ میں تمہارا باپ بن جاؤں اور عائشہ تمہاری ماں ہو جائیں)۔

ذہنی و جسمانی طور پر معذور بچوں کی نگہداشت اور علاج:

اللہ تعالی نے ماں باپ کے دلوں میں جو قابل قدر جذبات اور ودیعت رکھے ہیں ان میں سے بچوں پر رحم اور شفقت و محبت، الفت و پیار بھی ہے، اسی وجہ سے وہ بچوں کی دیکھ بھال کی زحمت برداشت کرتے ہیں، ان پر رحمت و شفقت کرتے ہیں اور ان کے معاملات وضروریات کا اہتمام کرتے ہیں، اسی وجہ سے شریعت مطہرہ نے الفت و محبت کے جذبات کو مخلوق کے دلوں میں راسخ کیا ہے، اور سب کو ان اوصاف کو اختیار کرنے کی طرف رغبت دلائی ہے، حدیث شریف میں ہے: "ليس منا من لم يرحم صغيرنا ولم يعرف حق كبيرنا" (ابوداؤد، ترمذی) (وہ شخص ہم میں سے نہیں جو چھوٹوں پر رحم نہ کرے اور بڑوں کے حق کو نہ پہچانے)۔

ایک دوسری حدیث میں ہے: "من لا يرحم لا يرحم" (الادب المفرد للبخاری) (جو اوروں پر رحم نہیں کرتا اس پر بھی رحم نہیں کیا جاتا)۔

انہی جذبات کی بنا پر شریعت مطہرہ نے ماں باپ کو پرورش کرنے کا حکم دیا ہے، یعنی بچہ کی جیسی جیسی ضرورت ہوتی ہے اسی کے مطابق ایسے ہی آدمی کو شریعت نے اس کا مکلف بنایا ہے، چنانچہ حق حضانت میں ایک مدت تک عورتوں کو بچوں کی پرورش کا مکلف بنایا ہے، اس لئے کہ اس وقت بچوں کو عورتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے بعد مردوں کو مکلف بنایا ہے، اور عورتوں میں بھی ماں کو سب سے مقدم طور پر بچہ کی پرورش کا حکم دیا ہے، اور ماں کی عدم موجودگی میں دوسرے ذی رحم محرم رشتہ داروں کو پرورش کا حکم دیا ہے، اس لئے کہ بچوں کی ضروریات اور ان کی شفقت و محبت جو وہ کر سکتے ہیں دوسروں میں یہ چیز نہیں پائی جائے گی، اسی وجہ سے شریعت مطہرہ نے حضانت کو بچہ کا حق قرار دیا ہے، علامہ شامی لکھتے ہیں: "لأن مدار أمر الحضانة على نفع الولد" (ردالمحتار ۵/ ۲۶۶)، اسی وجہ سے بعض صورتوں میں ذی محرم رشتہ داروں کو حضانت پر مجبور کیا جائے گا (ردالمحتار ۵/ ۲۶۷)، اس لئے والدین پر ضروری ہے کہ اپنی اولاد کی خود پرورش کریں اور خاص کر کے معذور اور بیمار بچوں کو ماں باپ کی شفقت و محبت کی اور ضرورت ہوتی ہے، اس لئے یہ جائز نہیں ہوگا کہ ان کو ہسپتال کے حوالہ کردے اور خود اس ذمہ داری سے سبکدوش ہو جائے۔

حدیث شریف میں ہے کہ اللہ تعالی ہر نگہبان سے اس کے ماتحتوں کے بارے میں دریافت فرمائیں گے کہ اس نے ان کی دیکھ بھال کی ہے یا ضائع کردیا ہے (ابن حبان)۔

ہاں البتہ ان کے علاج و معالجہ میں بہت خرچ ہو رہا ہو اور اس خرچ کو بغیر ملازمت کئے پورا نہ کیا جا سکتا ہو جس سے بچہ کا حرج ہو رہا ہو تو اس صورت میں "إذا تعارضت مفسدتان روعي أعظمهما بارتكاب أخفهما" کے قاعدہ کے تحت اس کی گنجائش نکل سکتی ہے (واللہ اعلم بالصواب)

☆☆☆

اسلام میں بچوں کے حقوق اوران کے متعلق فقہی احکام

مفتی محمد شفیق قاسمی[1]

الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام على سيد المرسلين وعلى آله وأصحابه أجمعين۔

امابعد! اللہ جل شانہ کے بے شمار عطیات وانعامات میں سے ایک عظیم الشان عطیہ وانعام اولاد بھی ہے؛ قرآن کریم میں اسے "قرة أعين" (فرقان: ۷۴) یعنی آنکھوں کی ٹھنڈک قرار دیا ہے، اس عطیۂ الہی اور انعام باری کا حق وشکر یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی جانب سے والدین یا سرپرستوں پر بچوں کے جو حقوق اور فرائض عائد ہوتے ہیں انہیں کمال دیانتداری کے ساتھ ادا کیا جائے، آج ان حقوق وفرائض سے غفلت وکوتاہی کے نتیجہ میں بچوں کے بہت سے حقوق سماج میں پامال ہورہے ہیں، جس کے سبب دور حاضر میں بچوں کے حقوق کی حفاظت کے لئے ملکی اور عالمی سطح پر بہت سے قوانین بنائے گئے، اقوام متحدہ نے اپنے ممبر ممالک کے لئے بھی "حقوق اطفال" کے بارے میں قوانین بنائے ہیں، اوراس کے متعلق ہدایات جاری کی ہیں۔

اس پس منظر میں ضروری ہے کہ اسلام میں بچوں کے حقوق اوران کے متعلق فقہی احکام کو واضح کیا جائے۔

یہ حقیقت ہے کہ اسلام نے تمام انسانوں خصوصا سماج کے کمزور طبقات (بچوں، بوڑھوں، عورتوں، مریضوں، معذوروں وغیرہ) کے حقوق کا تحفظ اپنے قانونی وفقہی احکام اوراخلاقی تعلیمات کے ذریعہ جس طول اور اعتدال کے ساتھ کیا ہے اس کی نظیر کسی مذہب اور قانون میں نہیں ملتی، کتاب وسنت میں اس کے متعلق جو ہدایات وتفصیلات ہیں اس سے اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اسلام ہی سب سے پہلے اور سب سے زیادہ ان کے حقوق کی رعایت وحفاظت کا حامی وداعی ہے، حسب ذیل مقالہ میں اختصار کے ساتھ ان میں سے چند حقوق پیش کئے جارہے ہیں، وباللہ التوفیق۔

حضانت کے احکام:

رضاعت کے بعد کامرحلہ حضانت کا ہے، شوہر وبیوی کے فرائض کے سلسلے میں دونوں کا مشترکہ حق بچے کی پرورش کرنا بھی ہے، لہذا دونوں کو ملکر ہی بچہ کی پرورش بھی کرنی چاہئے، لیکن اگر خدانخواستہ دونوں میں تفریق اور طلاق کی نوبت آجائے تو چونکہ چار، پانچ برس کی مدت تک بچہ کا تعلق سب سے زیادہ ماں سے ہوتا ہے، اسی لئے اسکی سب سے زیادہ ذمہ داری ماں پر ہی ہوتی ہے اور شریعت مطہرہ نے عورتوں کے طبعی رفق وشفقت اور چھوٹے بچوں کی طبعی صلاحیت، نیز خود ماں کی ممتا اور اس کے جذبات مادری کی رعایت کرتے ہوئے اس کو اولیت دی ہے، علامہ کاسانیؒ کے الفاظ میں "الأصل فيها النساء لأنهن أشفق وأرفق وأهدى إلى تربية الصغار" (بدائع ۴۵۶/۳)، حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کی عورتوں کی تعریف کرتے ہوئے ارشاد فرمایا "صالح نساء قريش أحناه على ولد في صغره وارعاة على زوج في ذات يده" (صحیحین از مشکوۃ: ۲۶۷) (قریش کی سب سے نیک عورت وہ ہے جو اپنے بچے پر بچپن میں سب سے زیادہ شفیق اوراپنے شوہر کے مال کی بہت ہی محافظ ہو)۔

حق پرورش میں ماں مقدم کب ہے؟

اس بات پر فقہاء کا اتفاق ہے کہ حق پرورش میں ماں سب سے پہلے اور مقدم ہے اور یہ حق پرورش صرف ماں کا ہی نہیں بلکہ بچہ کا بھی حق ہے، لہذا اگر کوئی عورت اس شرط پر خلع کرے کہ وہ حق پرورش سے دست بردار ہوجائیگی تو خلع درست ہوجائے گا لیکن یہ شرط باطل ہوئی اور عورت کا حق پرورش باقی رہے گا (البحر الرائق ۱۸۰/۴)۔

ہاں! اگر عورت خود بچہ کی پرورش کرنا نہیں چاہتی اور بچہ کی بقاء کے لئے ماں کا پرورش کرنا ضروری بھی نہ ہو، مثلا وہ بچہ دوسری عورت کا بھی

[1] استاذ دارالعلوم بروڈا، گجرات۔

دودھ تھام لیتا ہو یا ماں پرورش کرنے کی اہلیت نہ رکھتی ہو، مثلاً (العیاذ باللہ العظیم) وہ مرتدہ یا پاگل یا نابالغ یا باندی یا بہت زیادہ بداخلاق وبدکردار یا پیشہ ور فاسقہ ہو اور اس سے اپنے زیر پرورش بچے کے دین واخلاق کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہو، شامی کی زبانی "فالمراد فسق یضیع الولد به" (شامی ۲/ ۶۳۳ـ الحضانة)۔

ایسی عورت کی نگرانی اور گود میں بچے کو نہیں دیا جاسکتا، مگر اس سلسلہ میں فقہاء احناف نے اس رائے کو زیادہ پسند کیا ہے کہ اگر ماں کا اخلاق وکردار اچھا نہیں ہے جب بھی اس وقت تک بچہ کو ماں کے پاس رکھا جاسکتا جب تک وہ سمجھدار نہ ہو جائے، اور سمجھدار ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ ماں کی حرکات وسکنات کا عملاً اثر نہ لینے لگے، یہی حکم فاجر مرد کا بھی ہے، شرح وقایہ میں ہے "ولا فاسق ماجن" (۲/ ۱۶۹)، یعنی جس طرح فاجرہ عورت کی نگرانی میں بچہ نہیں دیا جاسکتا، اسی طرح غیر ذمہ دار فاسق وفاجر مرد کی نگرانی میں بچہ کو نہیں دیا جاسکتا، اسی طرح اگر ماں مطلقہ ہے اور اس سے کسی ایسے شخص نے نکاح کرلیا جس سے بچے کا کوئی نسبی تعلق نہیں ہے تب بھی اس کا حق پرورش جاتا رہے گا، البتہ اس نے بچے کے قریبی اعزہ ہی میں سے کسی سے نکاح کرلیا جیسے بچہ کے چچا سے تو پھر اس کا حقِ پرورش اپنی جگہ باقی رہے گا، پہلی صورت میں اس لئے اجازت نہیں دی گئی کہ اس کے موجودہ شوہر کو بچے سے کوئی خاص مناسبت نہ ہوگی بلکہ وہ بار محسوس کرے گا اور اس کا اثر ماں کے اوپر یہ پڑے گا کہ وہ بچہ کی دیکھ بھال اچھی طرح نہیں کرسکے گی، اور دوسری صورت میں اس لئے اجازت دی گئی ہے کہ چونکہ اس کا شوہر بھی بچے سے تعلق رکھتا ہے اور یہ تو ماں ہی ہے اس لئے دیکھ بھال سے دونوں کو دلچسپی ہوگی، بعض علماء نے "یضیع الولد" کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "اگر کوئی عورت ایسی ہے جو نماز روزے میں اتنی مشغول رہتی ہے کہ اپنے بچے کی پرورش کا اس کو مطلق خیال نہیں رہتا ہو تو ایسی عورت کی نگرانی میں بھی بچہ کو نہیں دیا جاسکتا ہے" (اسلامی فقہ ۲/ ۱۴۸)۔

پھر حقِ حضانت کے سلسلہ میں جو شرطیں مطلوب ہیں اگر ان میں سے کوئی موجود نہ تھی جسکی وجہ سے حقِ حضانت سے محروم کردیا گیا تھا، لیکن بعد میں یہ رکاوٹ ختم ہوگئی، مثلاً ماں نے کسی اجنبی سے شادی کی، لیکن اب اس سے طلاق واقع ہوچکی ہے وغیرہ تو اس صورت میں اسکا حقِ پرورش لوٹ آئے گا، البتہ ان شرطوں کے نہ پائے جانے کے علاوہ ایک یہ سبب بھی ہے جو حقِ پرورش سے محروم کردیتا ہے، اور وہ ہے پرورش کرنے والے کا طویل سفر کرنا، عورت ایسی معمولی مسافت پر بچے کو لے جاسکتی ہے کہ باپ بچہ کو روزانہ دیکھ کر واپس آسکے، لیکن اتنی دور کا سفر کرے کہ بچہ کا باپ دن کو نکل کر اور بچہ کو دیکھ کر رات کو واپس نہ آسکے تو ماں کا حقِ پرورش ختم ہوجائے گا، دوسری خواتین کا حق پرورش تو اس کے شوہر سے محض منتقل ہوجانے ہی سے ختم ہوجائے گا، خواہ اس کی دوری کچھ بھی ہو (قاموس الفقہ ۳/ ۲۶۵)۔

ماں کے بعد حقِ پرورش:

ماں کے بعد بچہ کی پرورش کا حق اسے دیا جائے گا جو رشتہ کے اعتبار سے زیادہ قریب ہے، چنانچہ ماں کے بعد نانی، چاہے وہ بالائی پشت کی ہو، نانی نہ ہو تو دادی اور دادی میں بھی یہی ترتیب ہے کہ دادی نہ ہو تو پردادی، بہن سے زیادہ مستحق ہے، دادی کے بعد بہن، بہن کے بعد خالہ، خالہ کے بعد پھوپھیوں کا درجہ ہے، بہن، خالہ، پھوپھی، ان سب میں یہ ترتیب بھی ہے کہ ماں باپ دونوں کی شرکت کے ساتھ جو رشتہ ہو وہ مقدم ہے، اس کے بعد ماں شریک اور اس کے بعد باپ شریک کا درجہ ہے (ہدایہ: ۴۳۴)، ان میں سے جس کی پرورش میں بچہ دیا جائے گا وہ انہی شرائط کے ساتھ جن کا ذکر اوپر ہوا، اگر ایک ہی درجہ کے ایک سے زیادہ مستحق پرورش موجود ہو اور وہ سب پرورش کے خواہاں ہوں تو احناف کے یہاں ورع اور تقوی اور اسکے بعد کبر سنی کی بناء پر ترجیح دی جائے گی (بدائع ۴/ ۲۳)۔

اگر خواتین میں کوئی مستحق نہ ہو تو پھر حقِ پرورش ان مردوں کی طرف لوٹے گا جو عصبہ رشتہ دار ہو اور ان رشتے داروں میں جو وارث ہونے کے اعتبار سے مقدم ہوگا وہی حقِ پرورش کا بھی ذمہ دار ہوگا، فقہاء نے مردوں میں حقِ پرورش کی ترتیب اس طرح بیان فرمائی ہے، باپ، دادا، پردادا وغیرہ اس کے بعد سگا بھائی پھر باپ شریک بھائی، پھر بھتیجہ، پھر باپ شریک بھائی کا لڑکا، پھر باپ شریک چچا، پھر چچازاد بھائی، اس کے بعد باپ شریک چچا کا لڑکا، بشرطیکہ جسکی پرورش کی جارہی ہے، وہ لڑکا ہو، لڑکی نہ ہو، ان کے بعد باپ کے چچا اور دادا وغیرہ کا حق ہے (بدائع ۴/ ۲۳)، مردوں کو حق پرورش حاصل ہونے کے لئے ضروری ہے کہ اگر زیر پرورش لڑکی کا مسئلہ ہو تو وہ مرد اسکا محرم ہوتا ہو (بدائع ۴/ ۴۲)، البتہ اگر کوئی دوسرا پرورش کنندہ موجود نہ ہو اور قاضی مناسب سمجھے اور مطمئن ہو تو چچازاد بھائی کے پاس بھی لڑکی کو رکھ سکتا ہے (بدائع: ۳/ ۴۳)، لڑکی کا حق پرورش جس کو دیا جائے ضروری ہے کہ وہ

مرد امین اور قابل اعتماد ہو، یہاں تک کہ بھائی اور چچا ہی کیوں نہ ہو، لیکن اگر فسق وخیانت کی وجہ سے اس پر اطمینان نہ ہو تو اسے حق پرورش حاصل نہ ہوگا (بدائع ۳/۴۳)، مالکیہ کے یہاں یہ بھی شرط ہے کہ اس مرد کے ساتھ کوئی بھی ایسی خاتون ماں، بیوی وغیرہ موجود ہوں جو اس بچہ کی پرورش کر سکیں، تنہا مرد بچہ کی پرورش کا حقدار نہیں (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۷/۷۳۰)۔

حقِ پرورش کی مدت:

ماں، دادی وغیرہ کو اس وقت تک لڑکوں کا حق پرورش حاصل ہوگا جب تک کہ خود ان میں کھانے، پینے، استنجاء کرنے اور کپڑے پہننے وغیرہ کی صلاحیت پیدا ہو جائے، امام ابوبکر خصافؒ نے اس کی مدت کا اندازہ سات آٹھ سال سے کیا ہے، اور اسی سات سال والے قول پر فتوی ہے، اس کے بعد چونکہ لڑکوں کو مزید تہذیب وثقافت اور آداب واخلاق کی ضرورت ہے، اس لئے بچے باپ کے حوالے کردئے جائیں گے، لڑکیاں ہوں تو ایک قول کے مطابق حدِ شہوت کی عمر تک حقِ پرورش ماں کو حاصل ہے، مگر کیوں کہ یہ عمر صحت اور علاقہ کے موسم وحالات کی بناء پر مختلف ہے، اس لئے ظاہری روایت کے مطابق بالغ ہونے تک ہے، بالغ ہونے کے بعد باپ کے حوالہ کردی جائیں گی، ماں، نانی، دادی کے علاوہ پرورش کنندہ خواتین لڑکیوں کو اس عمر تک اپنے پاس رکھے گی، جب تک کہ وہ عمر اشتہاء کو نہ پہنچ جائے (ھدایہ: ۴۳۵)، اس مدت تک پرورش کی نگرانی ماں کے ذمہ ہوگی اور ماں وبچہ دونوں کا خرچ باپ کے ذمہ ہوگا، یعنی کنٹرول اور سپرویژن (بشرطیکہ خلافِ شرع نہ ہو) باپ کا رہے گا اور کسٹڈی (تحویل) ماں کی رہے گی۔

نفقہ واجب ہونے کے اسلامی اصول:

اسلام میں بچوں کے جو حقوق ہیں ان میں باپ کے ذمہ اولاد کا نفقہ وخرچ بھی ہے، شریعت میں ایک شخص پر دوسروں کا نفقہ تین اسباب سے واجب ہوتا ہے: (۱) حبس (۲) ملکیت (۳) قرابت (شامی: ۲/۶۴۴) ''حبس'' کے معنی ہیں روکے رکھنا، یعنی اگر ایک شخص دوسرے شخص کی وجہ سے محبوس ہو، پابندی کی حالت میں ہو اور معاشی سرگرمیاں اختیار نہ کر سکتا ہو تو اس کا نفقہ اس شخص پر واجب ہوگا جس کی وجہ سے وہ حبس اور پابندی کی حالت میں ہے، غلام، قیدی اور ملازمین کی تنخواہ اس لئے واجب ہے کہ وہ ان کے لئے پابند ہے، جن کے قیدی، غلام، ملازم یا مزدور ہے ان کے لئے محبوس ہے، بیوی کا نفقہ بھی شوہر پر اسی جہت سے واجب ہوتا ہے کہ بیوی گھر کی دیکھ بھال، بال بچوں کی پرورش اور امورِ خانہ داری کے لئے گویا محبوس ہوتی ہے، اس لئے شوہر کے ذمہ اسکا نفقہ واجب رکھا گیا ہے، حبس کی وجہ سے جو نفقہ واجب ہوتا ہے اس کے سلسلہ میں اصول یہ ہے کہ محبوس وپابند غریب ہو یا امیر اور اسی طرح وہ جس شخص کے لئے محبوس ہے اسکی معاشی حالت اچھی ہو یا معمولی، بہر حال نفقہ واجب ہوگا، پھر جب ایک عورت اپنے شوہر سے مطلقہ ہو جاتی ہے، تو عدت گزارنے کے بعد وہ اپنے سابقہ شوہر کے لئے محبوس نہیں، دوسرا نکاح کر سکتی ہے، اور شریعت کے دائرہ میں رہتے ہوئے، معاشی سرگرمی بھی اختیار کر سکتی ہے، اس لئے اب حبس کی وجہ سے نفقہ واجب ہونے کی کوئی وجہ نہیں، نیز یہ بات بھی ظاہر ہے کہ طلاق کے بعد اپنے سابق شوہر سے خود اسکی کوئی قرابت بھی باقی نہیں رہی؛ کیوں کہ ازدواجی رشتہ خونی رشتہ کی طرح اٹوٹ نہیں ہے؛ بلکہ ایک ایسا رشتہ ہے جو زبان کے بول ہی سے ختم بھی ہو جاتا ہے، اس لئے طلاق کے بعد میاں بیوی میں کوئی قرابت بھی باقی نہیں رہتی۔

کن صورتوں میں اولاد کا نفقہ واجب ہوگا؟

اب سوال یہ ہے کہ کن صورتوں میں اولاد کا نفقہ باپ پر واجب ہوگا اور کب واجب نہیں ہوگا؟ علامہ ابن ہمامؒ نے اس کو بہت بہتر تجزیہ کے ساتھ بیان فرمایا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ بحیثیت مجموعی باپ کی چار حالتیں ہو سکتی ہیں:

(۱) باپ مالدار ہو، بچے نابالغ ہو اب اگر بچے خود اتنی جائداد کے مالک نہ ہوں جس سے ان کی کفالت ہو سکے تو لڑکوں کے کمانے کے لائق ہونے تک اور لڑکیوں کی شادی ہونے تک نفقہ کی ذمہ داری باپ پر ہوگی، لیکن اگر بچے خود صاحب استطاعت ہو اور ان کے پاس مال موجود ہو تو باپ ان ہی کا مال ان پر خرچ کر سکتا ہے، اس صورت میں باپ پر ان کا خرچ واجب نہیں رہے گا (ہدایہ: ۲/۴۲۵)۔

(۲) دوسری صورت یہ ہے کہ باپ مالدار ہو اور اولاد بالغ ہوں، اب اگر بچے خود اپنی کفالت کے لائق اور صاحب معاش ہو تو ان کی کفالت باپ کے ذمہ نہ ہوگی، لیکن اگر بچے نابینا ومعذور یا مجنون ہونے کی وجہ سے کسبِ معاش کی صلاحیت نہ رکھتے ہوں، یا ابھی حصول تعلیم میں مشغول ہوں، تو

ان کا نفقہ بھی باپ کے ذمہ ہوگا، لیکن اگر وہ معذور نہ ہو تو باپ لڑکوں کو کمانے پر مجبور کرسکتا ہے، البتہ لڑکیوں کو نہیں کرسکتا (ہدایہ: ۲/۴۲۷)، نکاح تک لڑکیوں کا نفقہ باپ کے ذمہ ہوگا، اسی طرح شادی شدہ لڑکیاں مطلقہ یا بیوہ ہوجائیں تب بھی باپ ان کے نفقہ کا ذمہ دار ہوگا۔

(۳) تیسری صورت یہ ہے کہ باپ خود محتاج اور نفقہ ادا کرنے کی پوزیشن میں نہ ہو، بچے نابالغ ہوں؛ لیکن مالدار یا خود کسبِ معاش کے لائق ہوں تو بھی باپ پر نفقہ کی ذمہ داری نہ ہوگی۔

(۴) چوتھی صورت یہ ہے کہ باپ محتاج ہو، بچے بھی نابالغ اور محتاج ہو لیکن کسب۔ حاش نہیں کرسکتے تو باپ کو کسب معاش کرنا چاہئے، اور وہ نہ کرے تو اسے اس پر مجبور کیا جائے گا، اس سلسلہ میں اسے سزائے قید بھی دی جاسکتی ہے، پھر بھی اگر باپ کفالت نہ کرسکتا ہو، اور دادا یا ماں یا ماموں یا چچا اسکی کفالت کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں تو اس پر ان لوگوں کی کفالت واجب ہوگی، اور وہ اس پر مجبور بھی کئے جاسکتے ہیں، البتہ بعد میں جب اس کے والد کے حالات بہتر ہوجائیں تو ان قرابت داروں کو حق ہوگا کہ وہ اپنے کئے ہوئے اخراجات ان سے وصول کرلیں، دادا اور ماں دونوں خوش معاش ہو، تو دونوں کو حصۂ میراث کی نسبت سے نفقہ ادا کرنا ہوگا، یہ ظاہری مذہب ہے اور امام صاحبؒ کا ایک قول یہ ہے کہ تنہاء دادا پر نفقہ کی ذمہ داری ہوگی کیوں کہ دادا باپ کے درجہ میں ہے۔

اگر بچوں کی کفالت کی کوئی صورت نہ ہو تو:

اگر باپ غریب ہو، نفقہ ادا کرنے سے عاجز ہو اور کفالت کی کوئی اور راہ نہ ہو، تو آخری درجہ میں بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ نفقہ کی ذمہ داری بیت المال پر ہوگی، اور امام خصافؒ کے نزدیک ایسی صورت میں لوگوں سے سوال کرنے اور اس طرح بچوں کی ضروریات پوری کرنے کی تدبیر اختیار کی جائے گی (فتح القدیر: ۴/۴۱۰، شامی: ۲/۶۷۱ از قاموس: ۵/۲۱۳)۔

بے سہارا بچوں کی پرورش کا حکم:

اسی پس منظر میں ایک سوال یہ ہے کہ بہت سے بچے بے سہارا ہوجاتے ہیں، کسی حادثہ میں ان کے والدین کے گزر جانے یا بچھڑ جانے یا ولادت کے بعد ماں باپ کی طرف سے پھینک دیئے جائے کی وجہ سے یا کسی اور سبب سے یہ صورت حال پیش آتی ہے، ایسے بچوں کی پرورش کے لئے حکم یہ ہے کہ اگر والدین کا انتقال ہوچکا ہو، یا وہ واقعی معذور ہو تو پھر بچے کی پرورش ان قریبی رشتہ داروں کے ذمہ ہے، جو اس کے وارث ہوسکتے ہیں، اور ہر ایک پر میراث کے اعتبار سے خرچ کی ذمہ داری ہوگی، مثلاً اس کا دادا بھی زندہ ہے اور ماں بھی تو دو حصے کا خرچ دادا کو دینا پڑے گا اور ایک حصہ ماں کو، اسی طرح یکے بعد دیگرے دوسرے ورثہ پر اس کی ذمہ داری ڈالی جائے گی (ہدایہ: ۲/۴۲۷)۔

اور اگر کوئی قریبی رشتہ دار نہ ہو تو خاندان کے لوگ پرورش کریں، ورنہ پھر ایسے بچوں کی پرورش کی ذمہ داری اسلامی حکومت پر ہوگی، پہلے وہ پرورش کے ذمہ داروں کو مجبور کرے گی اور اگر وہ نہ ہو یا ہو مگر کسی وجہ سے معذور ہو تو ایسے بچوں کا خرچہ حکومت برداشت کرے گی (عاجز کے خیال ناقص میں ہمارے دیار میں یتیم خانوں کا قیام بھی نافع تدبیر ہے) (اسلامی فقہ ۲/۱۴۴)۔

دورِ طفولیت کے مزید احکام:

یہ احکام حیاتِ انسانی کے دوسرے دور ''دورِ طفولیت'' سے متعلق ہیں، اس سلسلہ میں مزید احکام کتب فقہ میں مذکور ہیں:

☆ مثلاً دورِ طفولیت تک میں بچوں پر عبادات واجب نہیں ہوتیں۔

☆ اسی طرح عقوبات اور بدنی و مالی سزائیں بھی انکے ذمے نہیں ہوئیں، جیسے قصاص، قتلِ مورث کی وجہ سے وراثت سے محرومی، دیت وغیرہ۔

☆ اسی طرح ایسے مالی اخراجات جن میں عقوبت اور سزا کا پہلو غالب ہو، ان پر واجب نہ ہونگے، جیسے خون بہا کا وہ حصہ جو قریبی رشتہ دار یا ہم پیشہ (عاقلہ) قاتل کی طرف سے ادا کرتے ہیں۔

البتہ وہ اخراجات اور مالی ذمہ داریاں جو معاوضہ کا درجہ رکھتی ہوں یا ٹیکس کے حکم میں ہو ایسے بچے بھی اس سے مستثنیٰ نہ ہوں گے، جیسے عشر،

خراج، محرم رشتہ داروں اور بیوی کا نفقہ وغیرہ، اسی طرح ایسے مالی تاوان جو حقوق العباد سے متعلق ہوں وہ بھی ان پر عائد ہوں گے، مثلاً کسی کی کوئی چیز توڑ دی تو اسکی قیمت اس نابالغ کے مال سے ادا کئے جائیں گے (قاموس: ۲/ ۲۴۴)۔

دورِ تمیز کا بنیادی حکم تعلیم وتربیت ہے:

احکام شرعیہ کے اعتبار سے انسانی زندگی کا تیسرا زمانہ ''دورِ تمیز'' ہے، یہ وہ دور ہے کہ بچہ میں خیر وشر کی تمیز تو کسی حد تک پیدا ہوگئی ہو لیکن ابھی وہ بالغ نہ ہوا ہو، اس دور کا بنیادی حکم تعلیم وتربیت ہے، اسلام میں بچوں کے حق تعلیم وتربیت کے بارے میں کیا ہدایات ہیں؟ بچوں اور بچیوں کو کس قدر تعلیم دینا ضروری ہے اور عصری تعلیم کس حد تک دینا ضروری ہے؟ اگر حکومت کسی سطح تک کی تعلیم کو بچوں اور بچیوں کے لئے لازم قرار دے تو شرعاً کیا اسکی پابندی مسلمانوں کے لئے لازم ہے؟ کیا جنس کی تعلیم بھی بچوں کا حق ہے جیسا کہ آج کل کہا جارہا ہے؟ اس کے سلسلہ میں اسلام کی جو ہدایات ہیں، اسکا خلاصہ پیش کیا جارہا ہے:

اسلام میں بچوں کی تعلیم وتربیت کی اہمیت

صحیح تعلیم وتربیت ہی دراصل انسان کو انسان بناتی ہے اور یہ انسانیت کی شہ رگ اور بنیادی ضرورت ہے، اس لئے قرآن نے اہل ایمان کو خصوصی ہدایت بلکہ حکم دیا ہے: "یأیہا الذین آمنوا قوا أنفسکم وأھلیکم نارا" (تحریم/ ۶)، (اے ایمان والو! تم اپنی ذات اور اہل وعیال کو دوزخ کی آگ سے بچاؤ)، اس چھوٹے سے فقرے میں تعلیم وتربیت کی ذمہ داری کو نہایت جامعیت کے ساتھ بیان کردیا، کیوں کہ یہاں حکم آگ سے بچانے کے لئے دیا گیا ہے، جس سے یہ بات واضح طور پر معلوم ہوتی ہے کہ بنیادی طور پر ایک مسلمان کا اپنے بال بچوں کو ایسی ہی تعلیم وتربیت دینی چاہئے جو ان کو عذاب سے بچاسکے، حدیث پاک میں ایسی تعلیم وتربیت کو بچہ کے لئے بہترین عطیہ قرار دیا ہے: "مانحل والد ولدہ من نحل أفضل من أدب حسن" (ترمذی از مشکوۃ)، بچوں کی تعلیم وتربیت کے بارے میں اسلام نے اسقدر تاکید فرمائی کہ اگر یہ کہا جائے کہ اسلام بچوں کی جبری تعلیم وتربیت کا بھی قائل ہے تو بے جانہ ہوگا، کیوں کہ آپ نے فرمایا "طلب العلم فریضة علی کل مسلم" (ابن ماجہ از مشکوۃ: ۳۴)، اس میں ہر مسلمان کے لئے آپ نے تحصیل علم کو فرض قرار دیا ہے، تو ظاہر ہے کہ فرائض کی ادائیگی میں بوقت ضرورت جبر سے بھی کام لیا جاسکتا ہے، شاید ہی دنیا کے کسی مذہب نے علم کی یہ اہمیت بیان کی ہو، مزید برآں اسلام میں بچوں کی تعلیم کس درجہ اہم ہے؟ اس کا اندازہ اس سے بھی کیا جاسکتا ہے کہ اگرچہ اصولی طور پر بالغ ہونے کے بعد اولاد کی کفالت باپ پر واجب نہیں ہے، سوائے اس کے کہ وہ معذور ہو، لیکن اگر وہ حصولِ علم میں مشغول ہوں اور والدین ان کے اخراجات ادا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں تو پھر ان کا نفقہ بھی واجب ہے، پھر لڑکوں کے مقابلہ میں لڑکیوں کی تعلیم وتربیت دو وجہ سے زیادہ ضروری اور اہمیت کی حامل ہے، ایک تو اس لئے کہ وہ صنفِ نازک اور جنس لطیف ہونے کے سبب قدرے مجبور رہتی ہے، یہی وجہ ہے کہ شریعت نے اس کو بہت سے فرائض وواجبات سے بریٔ الذمہ اور فارغ الذمہ رکھا ہے، دوسرے اس لئے کہ آئندہ زندگی میں بچوں کی تعلیم وتربیت کی پہلی ذمہ داری بھی انہیں پر ہوتی ہے، اور یہ حقیقت ہے کہ فطرت نے ان میں اثر انداز ہونے کی مردوں کے مقابلہ میں غیر معمولی صلاحیت عطاء فرمائی ہے، اس لئے صحیح تعلیم وتربیت کے نتیجہ میں اگر یہ نیک وصالح بن گئی تو اس کا اچھا اثر اولاد پر ضرور مرتب ہوگا، غالباً یہی وجہ ہے کہ لڑکیوں کی تعلیم کی طرف رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی توجہ خاص کا یہ حال تھا کہ آپ نے فرمایا کہ جو اپنی باندی کی بہتر تربیت کرے اور اسے اچھی تعلیم دے پھر اسے آزاد کردے اور اس سے نکاح کرلے تو اسکو دوہرا اجر ملے گا (بخاری)، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس ترغیب نے قرن اول ہی میں خواتین میں بھی ایک تعلیمی انقلاب پیدا کردیا تھا۔

عصری تعلیم اسلامی نقطۂ نظر سے:

اور تعلیم میں دین کی تعلیم تو داخل ہے ہی، اس لئے کہ بقدر ضرورت علم دین حاصل کئے بغیر اپنی دنیا وآخرت کو بہتر نہیں بنایا جاسکتا، لیکن ایسے علم کا حصول بھی ضروری ہے جس کے ذریعہ ہماری اولاد اپنی معاشی ضروریات پوری کرسکے اور ایک باعزت وخوددار شہری کی حیثیت سے زندگی بسر کرسکے، قرآن کریم نے اس کے لئے جو جامع تعبیر اختیار فرمائی کہ "قوا أنفسکم وأھلیکم نارا" (تحریم: ۶)، اس میں بچوں کو دوزخ سے بچاؤ کے لئے دین کی تعلیم تو ضروری ہی ہے، طریقۂ معاش کی تعلیم بھی ضروری ہے، تاکہ وہ جائز طریقہ پر اپنی ضروریات کو پوری کرسکیں اور غیر ساجی طریقے اختیار کرنے پر مجبور نہ ہو، اس لئے اسلام نے کسی خاص علم کی تخصیص فرماکر دوسرے کی مخالفت نہیں کی بلکہ ہر نافع علم کی اسلام نے حوصلہ افزائی کی ہے،

اسلام کی نظر میں جو علم بھی انسان اور انسانیت کے لئے نافع اور کار آمد ہو وہ "علم نافع" ہے جسکی حضور ﷺ نے دعا مانگی ہے، اور جو علم خود انسان اور انسانیت کے لئے نافع ہونے کے بجائے نقصان رساں ہو اور تعمیر کے بجائے تخریب کی طرف لے جاتا ہو وہ علم غیر نافع ہے جس سے حضور نے پناہ چاہی ہے، عصری تعلیم میں ابتدائی تعلیم کے بعد میڈیکل تعلیم ہو، انجینئرنگ کا فن ہو یا تکنیکی تعلیم کے دوسرے شعبے ہوں، یہ سب بھی انسانی خدمت اور انسانیت کی فلاح و بہبود کے ذرائع ہیں اور یقیناً یہ علم نافع کی فہرست میں آتے ہیں، لہذا شرعی اور اسلامی دائرہ میں رہ کر عصری تعلیم کا حصول قابل تعریف ہے، بلکہ دنیوی حد تک مطلوب اور پسندیدہ ہے، تعلیم کی اصل ذمہ داری تو باپ کی ہے، لیکن اگر والدین نادار ہو یا موجود نہ ہو تو بچوں کی تعلیم وتربیت کی ذمہ داری حکومت کی ہے (اسلامی فقہ ۲/ ۱۳۳)۔

تعلیم گاہوں میں جنسی تعلیم:

جہاں تک تعلق ہے جنسی تعلیم کا تو اس سلسلہ میں اسلامی نقطۂ نظر یہ ہے کہ اسکی قطعاً ضرورت واجازت نہیں ہے، اس لئے کہ بالغ ہونے کے بعد انسان سے جو ضروریات اور تقاضے متعلق ہوتے ہیں وہ فطری ہے، اسی لئے عام طور اس سلسلہ میں مستقل تعلیم کی ضرورت نہیں پڑتی بلکہ قبل از وقت بلوغ اور اس کے بعد ہونے والی تبدیلیوں اور ان کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی ضرورتوں کا ادراک عموماً انسان کو بے راہ روی کی طرف لے جاتا ہے؛ اس لئے آج کل جنسی تعلیم کے سلسلہ میں جو بات چلائی جاتی ہے اسلامی بلکہ اخلاقی اعتبار سے وہ درست نہیں، اگر اس کی طرف توجہ نہ دی گئی تو اس کے اخلاقی اثرات نہایت نامناسب ہوں گے۔

اسلام میں بچے کی مزدوری کے احکام:

علاوہ ازیں بچوں کی تعلیم وتربیت سے غفلت برتتے ہوئے، انہیں کم عمری میں مزدوری اور کام پر لگا دینا اسلامی ہدایات وتعلیمات کے خلاف ہے، اسلام نے والدین کے لئے یہ روا نہیں رکھا کہ وہ نابالغ بچوں کو مزدوری پر لگائیں اور اپنی ذمہ داری سے پہلو تہی برتیں (شامی ۵/ ۳۴۷)، موجودہ حالات میں، بچہ مزدوری کا مسئلہ بڑی اہمیت اختیار کر گیا ہے، اس سلسلہ میں اسلامی نقطۂ نظر یہ ہے کہ نابالغ بچوں کو کسب معاش پر مجبور نہیں کیا جا سکتا، لہذا اگر باپ کمانے پر قادر ہو تو کما کر بچوں کا نفقہ ادا کرے گا، اور اگر کمانے پر قادر نہ ہو تو قرض لے کر نفقہ ادا کرے گا، تاکہ بچے زیور علم سے آراستہ ہو سکیں (ہندیہ ۱/ ۵۶۱)، اسی طرح بالغ ہونے کے بعد بھی جب تک بچے طلب علم میں مشغول رہیں اور کسب معاش سے عاجز ہوں، ان کا نفقہ باپ کے ذمہ رہے گا، فقہاء نے گو اس کے ساتھ علوم شرعیہ میں اشتغال کی شرط لگائی ہے، لیکن چونکہ دوسرے نافع علوم بھی انسانیت کے لئے ضروری اور شریعت میں مطلوب وپسندیدہ ہیں، اس لئے ان کا بھی وہی حکم ہوگا (ہندیہ ۱/ ۵۶۳)، اس سے معلوم ہوا کہ اسلام بنیادی طور پر اس کے خلاف ہے کہ بچوں کو تعلیم وتربیت کے بجائے مزدوری میں لگا دیا جائے اور اس طرح مستقبل کو ضائع کر کے رکھ دیا جائے، البتہ مجبوری کی صورتیں اس سے مستثنیٰ ہیں (قاموس الفقہ ۱/ ۵۴۶)۔

دورِ تمیز کے احکام:

اس دور سے متعلق شرعی احکام دو طرح کے ہیں: حقوق اللہ اور حقوق العباد، حقوق اللہ کے وہ احکام جن میں نفع ہی نفع ہو نقصان کا کوئی پہلو نہ ہو، جیسے اللہ پر ایمان لانا، ایسے احکام میں ان کا عمل معتبر ہوگا، اسی طرح حقوق اللہ سے متعلق ایسے احکام جو ضرر محض کا باعث ہو اور جن میں سوائے قباحت کے خیر کا کوئی پہلو نہ ہو، جیسے کفر، ان میں بھی امام صاحبؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک ان کا عمل دنیا و آخرت دونوں اعتبار سے معتبر ہوگا، چنانچہ اسکی مسلمان بیوی (کفر کی وجہ سے) رشتۂ نکاح سے نکل جائے گی اور اس کو کسی مسلمان سے وراثت نہ مل سکے گی، البتہ بلوغ سے قبل یا بلوغ کے بعد ارتداد کی سزاء کے طور پر قتل نہیں کیا جائے گا، اور ایسے احکام کہ جس میں ظاہر کے اعتبار سے نفع ونقصان دونوں کا احتمال ہو، جیسے بدنی عبادات جو باعتبار آخرت کے نافع اور باعتبار دنیا کے بظاہر دشواری کا موجب ہے، ان احکام کا حکم یہ ہے کہ اگر وہ انجام ہو گئی تو درست ہے، لیکن واجب نہیں چنانچہ نفل عبادات شروع کر دے تو شروع کرنے کی وجہ سے وہ عبادات واجب نہ ہوگی، "حقوق العباد" کے وہ احکام جو محض نفع پر مبنی ہوں، ولی کی اجازت کے بغیر ان کو انجام دے سکتا ہے، چنانچہ وہ ہدیہ وصدقہ قبول کر سکتا ہے، نیز اس کا خود کو اجیر رکھنا گو صحیح نہیں لیکن رکھ ہی لے تو اجرت بھی لے سکتا ہے، اور حقوق العباد میں وہ احکام جو محض ضرر ونقصان کا باعث ہیں ان کو نہیں کر سکتا، چاہے ولی کی اجازت ہی کیوں نہ شامل ہو، اور اگر کرنا چاہے تو اسکا تصرف

قابل نفاذ نہ ہوگا، جیسے طلاق، اسی طرح کسی اور کو صدقہ وھبہ وغیرہ، اور وہ معاملات جس میں نفع ونقصان دونوں پہلو ہو، ان میں نابالغ کا تصرف اس وقت نافذ اور درست ہوگا جبکہ ولی کی اجازت ہو یا خود ولی اس کی انجام دہی میں شریک ہو، جیسے نکاح اور خرید وفروخت وغیرہ (قاموس ۲، ۲۴۴)

مجرمانہ ذہن رکھنے والے بچوں کو ان کی سرزنش واصلاح کے لئے قید کیا جاسکتا ہے (قاموس الفقہ ۳/ ۱۷۹)۔

دورِ بلوغ کے احکام:

احکام شرعیہ کی اہلیت کے اعتبار سے حیات انسانی کا چوتھا دور ''بلوغ'' کا ہے، بلوغ کے بعد انسان کی اہلیت درجۂ کمال کو پہنچ جاتی ہے، اور شریعت اسکو تمام حقوق وواجبات کا مکلف قرار دیتی ہے، البتہ کچھ خاص عوارض (ساویہ ومکتسبہ) وموانع ہیں، جو بلوغ کے بعد بھی انسان کی اہلیت کو ختم کردیتے ہیں اور اس کو تکلیف وذمہ داری سے نکال دیتے ہیں جیسے جنون، اکراہ، اغماء (بیہوشی) وغیرہ، اس لئے کہ بلوغ عام حالات میں فہم وشعور، جسمانی نشوونما اور صلاحیت کے ایک منزل تک پہنچ جانے کی علامت ہے، بلوغ کے علامتیں لڑکوں میں انزال، ناف کے نیچے بال کا اُگ آنا وغیرہ ہے، اور لڑکیوں کے لئے حیض، جسم کے مخصوص حصہ میں بال نکل آنا، احتلام اور چھاتیوں کا ابھار ہے، اگر بلوغ کی یہ علامتیں ظاہر نہ ہوتو اب عمر کے اعتبار سے بلوغ کا فیصلہ کیا جائے گا، بلوغ کی کم سے کم عمر احناف کے نزدیک لڑکوں کے لئے ۱۲ رسال ہے اور لڑکیوں کے لئے ۹ رسال ہے، اس سے کم عمر میں اگر بلوغ کا دعویٰ کرے تو معتبر نہ ہوگا، سوائے اس کے کہ ظاہری حالات اور قرائن سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہو، اور زیادہ سے زیادہ بلوغ کی عمر حضرت امام ابوحنیفہ کے نزدیک ۱۸ رسال لڑکوں اور ۱۷ رسال لڑکیوں کے لئے ہے، امام شافعی، امام مالک، امام احمد اور صاحبین کے نزدیک ہر دو کے لئے عمر بلوغ ۱۵ رسال ہے اور اسی پر فتوی ہے (ہندیہ ۲/ ۶۰۲)، بالغ ہونے کے بعد جو احکام متعلق ہوتے ہیں، ان میں والدین کے ذمہ بنیادی حکم یہ ہے کہ ان کے نکاح کی فکر کرے، چنانچہ ایک موقع پر نہایت جامعیت کے ساتھ آپ ﷺ نے بچوں کے ان حقوق کا ذکر فرمایا، جو والدین پر ہیں، ارشاد ہے: ''من ولد له ولد فليحسن اسمه وأدبه فإذا بلغ فليزوجه فإن بلغ ولم يزوجه فأصاب إثما فإنما إثمه على أبيه'' (مشکوۃ: ۲۷۱) (جسکی کوئی اولاد ہوتو وہ اس کا اچھا نام رکھے، اسے اچھی تعلیم وادب سکھائے اور جب وہ بالغ ہوجائے (تو نکاح کردے) اور اس کی شادی نہ کی جس کی وجہ سے وہ گناہ میں مبتلا ہوگی تو اس کی ذمہ داری باپ پر بھی ہوگی)۔ (العیاذ باللہ)

بچوں کے نکاح کے متعلق شرعی نقطۂ نظر:

بچوں کے نکاح کے سلسلہ میں افراط وتفریط پائی جاتی ہے، ایک طرف تو بعض برادریوں میں لڑکوں اور لڑکیوں کی شادی میں غیر معمولی تاخیر کی جاتی ہے، جس سے اخلاقی بگاڑ پیدا ہونا فطری بات ہے، جبکہ بعض برادریوں میں کم عمری میں ہی نکاح کردیئے جاتے ہیں، جو بعد کو پیش آنے والے حالات میں بچوں کے لئے بعض اوقات غیر موزوں ثابت ہوتے ہیں۔

اس سلسلہ میں شریعت کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ بچوں کے بالغ ہونے کے بعد مناسب رشتہ تلاش کرکے فوراً ان کا نکاح کردیا جائے، تاکہ وہ گناہ میں مبتلاء نہ ہو، اور مسلم معاشرہ میں ہمیشہ یہ معمول رہا کہ لڑکے اور لڑکیوں کے بالغ ہونے کے بعد فوراً ان کا نکاح کردیا جاتا، خود قرآن مجید نے بھی اس طرح اشارہ کیا ہے، {وابتلوا اليتمى حتى إذا بلغوا النكاح} (نساء: ۶)، یہاں نکاح کو پہنچنے سے مراد بالغ ہونا ہے، چنانچہ ابوبکر جصاص رازیؒ نے احکام القرآن (۲/ ۶۳) میں اور علامہ جلال الدین سیوطیؒ نے جلالین (۱/ ۷۰) میں یہی فرمایا ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ بہتر طریقہ یہی ہے کہ بچوں کے بالغ ہونے کے فوراً بعد نکاح کئے جائیں، اور بلا کسی معقول عذر کے خواہ مخواہ تاخیر نہ کی جائے، خود رحمت عالم ﷺ نے اپنی صاحبزادیوں کا نکاح عمر بلوغ کو پہنچنے کے بعد فرمایا، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اصل یہی ہے کہ بالغ ہونے کے بعد نکاح ہو، لیکن اس کے ساتھ ساتھ اسلام نے بلوغ سے قبل بھی بچوں کے نکاح کی گنجائش رکھی ہے، اور اسی وجہ سے مختلف صحابہؓ نے کم عمری میں بچوں کے نکاح کئے ہیں، اسلام نے کم عمری میں لڑکے یا لڑکی کے نکاح کی ترغیب تو نہیں دی ہے؛ البتہ اس سے منع بھی نہیں کیا، بلکہ بتقاضۂ مصلحت خیار بلوغ کے ذریعہ اسکی تلافی کی گنجائش رکھ کر اجازت دی ہے، واللہ اعلم بالصواب وعندہ علم الحق والکتاب۔

☆☆☆

اسلام میں بچوں کے حقوق و ذمہ داریاں

مولانا محمد صابر حسین ندوی[1]

شریعت کی اصطلاح میں: جن محرم رشتہ داروں پر بچے کی پرورش و پرداخت کی ذمہ داری ہے اسی ذمہ داری کو حضانت کہتے ہیں، "تربية الاولاد لمن له حق الحضانة" (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۷/۷۱۷)۔

اسلام نے بچہ کی پرورش اور اس کی پرداخت کو ایک حق کے طور پر مانا ہے، کہ پیدائش کے بعد بچہ کے لئے کوئی آدمی اس کی دیکھ بھال کے لئے موجود رہے، لہذا شرعاً اسے واجب بھی کہا گیا ہے: "حكمها: إنه واجبة؛ لأن المحضون يهلك بتركها. فوجب حفظه من الهلاك..." (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۷/۷۱۸)۔

اگر بچہ کو جسمانی یا نفسیاتی یا کسی قسم کی مضرت کا اندیشہ ہو تو یقیناً انہیں حق حضانت سے محروم کر دیا جائے گا، کیونکہ اصل یہاں پر بچہ کی صحیح تربیت، نشوونما ہے جو کہ مفقود ہے، لہذا فقہاء نے یہ نقل کیا ہے کہ جس بچہ کی حفاظت ممکن نہ ہو اور اس کے اخلاق وصحت پر خدشہ ہو ایسے میں اسے حق حضانت سے محروم کر دیا جائے گا، "القدرة على تربية المحضون: وهي الاستطاعة على صون الصغير في خلقه وصحته. فلا حضانة للعاجز لكبر سن أو مرض أو شغل ويعد الأعمى لعدم تحقق المقصود" (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۷/۷۲۷-۷۲۶)۔

شرائط حضانت:

حاضن مسلمان ہو، مرتد نہ ہو، عاقل ہو، بالغ ہو، اخلاق وعادات اچھے ہوں، بچے کی نگہداشت و پرورش کی صلاحیت رکھتا ہو اور اس پر قادر ہو۔

غرض یہ کہ حق حضانت کے سلسلہ میں بچے کی منفعت کو ہمیشہ درپیش رکھا جائے گا۔ ان کے علاوہ بعض وہ ہدایات جنہیں دبستان فقہ کے فقہاء کرام نے ذکر کئے ہیں اور جن کا لحاظ بھی بالخصوص عصر حاضر میں ضروری معلوم ہوتا ہے، مثلاً:

(۱) فقہاء مالکیہ نے حاضن کے لئے یہ شرط لگائی ہے کہ وہ بے وقوف اور اسراف سے کام لینے والا نہ ہو، کیونکہ اگر ایسوں کو حق حضانت دیا جائے گا تو ہوسکتا ہے کہ وہ مالدار بچے کے مال کو ضائع کر دے، "فلا حضانة لسفيه مبذر. لئلا يتلف مال المحضون. أو ينفق عليه منه ما لا يليق" (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۷/۷۲۶)

(۲) فقہاء مالکیہ وحنابلہ نے حاضن کے لئے ضروری قرار دیا ہے کہ وہ مہلک اور تنفر کرنے والے امراض سے دور ہوں جیسے: جذام، کوڑھ وغیرہ (حوالہ سابق)۔

(۳) عورت اگر دنیاوی کاموں میں ایسے مشغول ہو کہ بچے کی حفاظت اور دیکھ ریکھ نہیں کر سکتی تو حضانت سے محروم ہو جائے گی (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۷/۷۲۶)۔

(۴) اسی طرح اگر عورت کسی اجنبی وغیر محرم سے شادی کر لے، تو اس عورت کو بھی حق حضانت سے محروم مانا جائے گا (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۷/۷۲۸)۔

الف: ان شرائط وہدایات کی روشنی میں یہ کہنا مشکل نہیں کہ اگر بچہ کی تعلیم و تربیت اور جسمانی ونفسیاتی مضرت کا خطرہ ہو، نیز اس کے اخلاق وصحت پر خدشہ ہو تو حاضن کو حق حضانت سے محروم کر دیا جائے گا (فقہاء نے بچوں کے سلسلہ میں یہ اصول نقل کیا ہے، "وإقامة مصالح الصغار أقدر. بدائع الصنائع ۴۵۷-۳")، پھر یہ حق سلسلہ بسلسلہ باعتبار فقہ حنفی یعنی ماں، پھر نانی، پھر دادی، پھر حقیقی بہن، پھر اخیافی بہن، پھر علاتی بہن، پھر خالہ، پھر اخیافی خالہ، پھر علاتی خالہ، پھر بھانجی، پھر بھتیجی، پھر حقیقی پھوپھی، پھر اخیافی پھوپھی، پھر علاتی پھوپھی، پھر وراثت کی ترتیب کے مطابق عصبات کو منتقل ہوتا چلا جائے گا (دیکھئے: بدائع الصنائع ۳/۴۵۷-۴۵۸، در المختار مع الرد ۵/۲۶۲)۔

---

[1] استاذ جامعہ معین الدین چشتی، اجمیر، راجستھان۔

ب: اسلام میں بچوں کے حق تعلیم وتربیت کے بارے میں بنیادی ہدایات:

ملت ومذہب میں صرف اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو انسانوں کے ہر طبقہ کو مکمل حقوق ادا کرتا ہے، خواہ وہ بچہ ہی کیوں نہ ہو، جابجا قرآن وحدیث میں ان کے حقوق کو کبھی مجمل تو کبھی مفصل ذکر کیا گیا ہے، ان حقوق میں سب سے اہم اور بنیادی حق بچوں کے لئے جو تسلیم کیا گیا ہے وہ ان کے لئے مناسب تعلیم وتربیت کا انتظام کیا جانا ہے، یہی وجہ ہے کہ گذشتہ برگزیدہ شخصیات نے بھی اس فریضہ کو ہمیشہ ادا کرنے اور اپنی اولاد کے لئے صحیح نہج تیار کرنے کی کوشش کی ہے، اس کا بین ثبوت حضرت لقمانؑ کی اپنی اولاد کو وہ نصیحتیں ہیں جو کہ نہ صرف ان کی اولاد کے لئے بلکہ تمام اولادوں کے ذمہ داروں کے لئے مشعل راہ ہیں، لہذا اللہ نے بھی اس طریقہ کار اور اس معیار تربیت کو اتنا پسند کیا کہ اسے اپنے کلام میں بھی ذکر فرمایا:

"وإذ قال لقمان لابنه وهو يعظه يا بني لا تشرك بالله إن الشرك لظلم عظيم" (لقمان: ۱۳) (اور جبکہ لقمان نے وعظ کہتے ہوئے اپنے بیٹے سے فرمایا کہ میرے پیارے بچے! اللہ کے ساتھ شریک نہ کرنا، بے شک شرک بڑا بھاری ظلم ہے)۔

"يا بني إنها إن تك مثقال حبة من خردل فتكن في صخرة أو في السموات أو في الأرض يأت بها الله إن الله لطيف خبير" (لقمان: ۱۶) (پیارے بیٹے! اگر کوئی چیز رائی کے دانے کے برابر ہو پھر وہ (بھی) خواہ کسی چٹان میں ہو یا آسانوں میں ہو یا زمین میں ہو اسے اللہ تعالی ضرور لائے گا، اللہ تعالی بڑا باریک بیں اور خبردار ہے)۔

"يا بني أقم الصلاة وأمر بالمعروف وانه عن المنكر واصبر على ما أصابك إن ذلك من عزم الأمور" (لقمان: ۱۷) (اے میرے پیارے بچے! تو نماز قائم رکھنا، اچھے کاموں کی نصیحت کرتے رہنا، برے کاموں سے منع کیا کرنا اور جو مصیبت تم پر آجائے صبر کرنا (یقین مان) کہ یہ بڑے تاکیدی کاموں میں سے ہے)۔

"ولا تصعر خدك للناس ولا تمش في الأرض مرحاً إن الله لا يحب كل مختال فخور" (لقمان: ۱۸) (لوگوں کے سامنے اپنے گال نہ پھلا اور زمین پر اترا کر نہ چل، کسی تکبر کرنے والے شیخی خورے کو اللہ پسند نہیں فرماتا)۔

"واقصد في مشيك واغضض من صوتك إن أنكر الأصوات لصوت الحمير" (لقمان: ۱۹) (اپنی رفتار میں میانہ روی اختیار کر، اور اپنی آواز پست کر یقینا آوازوں میں سب سے بدتر آواز گدھوں کی آواز ہے)۔

ان آیتوں کو غور سے پڑھیے اور دیکھئے کہ حضرت لقمانؑ نے اپنے بیٹوں کو دس باتوں کی تلقین کی ہے، یہ دس باتیں تعلیم وتربیت کا ایک جامع اور مکمل کورس ہیں:

۱۔ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو۔ ۲۔ اچھا عمل کرو، اللہ کے یہاں اس کا بہترین صلہ ملے گا۔
۳۔ نماز کا اہتمام کرو۔ ۴۔ بھلائی کا حکم دو۔
۵۔ برائی سے روکو۔ ۶۔ مصیبت میں صبر سے کام لو۔
۷۔ لوگوں سے بے رخی نہ برتو۔ ۸۔ زمین میں اکڑ کر مت چلو۔
۹۔ اپنی چال میں میانہ روی اختیار کرو۔ ۱۰۔ اپنی آواز پست رکھو۔

نیز حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بچوں کے تعلیم وتربیت پر اس قدر زور دیا ہے کہ اسیران بدر کا فدیہ مسلمان بچوں کو تعلیم سے آراستہ کرنا قرار دیا تھا، اور جو مقدمہ اسلام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ملا اس میں اللہ رب العزت نے یہی فرمایا تھا "اقرأ" پڑھو، مگر یاد رکھو جو کچھ بھی پڑھو اور وہ اللہ کے نام سے پڑھو، "اقرأ باسم ربك الذي خلق" (علق: ۱)، اس نہج سے حرف موانحراف کرتے ہوئے بھلے ہی کوئی عظیم سے عظیم ہستی کیوں نہ بن جائے تب بھی اسلام کی نظر میں اس کی ساری تعلیم رائیگاں، اس کا پڑھنا رائیگاں، اس کا پڑھانا، اور اس کی تمام تحقیق رائیگاں متصور ہوگی، الغرض تعلیم وتربیت میں سب سے اہم زیور علم سے مزین کرنا ہے مگر ضروری ہے کہ وہ باسم الٰہی ہو نہ باسم شیطانی۔

بچے اور بچیوں کے لئے دینی تعلیم وعصری تعلیم:

اللہ رب العزت نے جاننے اور نہ جاننے والوں کے متعلق بیان فرمایا ہے کہ نہ جاننے والا اور جاننے والا کبھی برابر نہیں ہو سکتے: "قل هل يستوي الذين يعلمون والذين لا يعلمون" (الزمر:۹)، (نیز حضور ﷺ نے ہر مسلمان پر تعلیم کے حصول کو فرض قرار دیا: "طلب العلم فريضة على كل مسلم" (سنن ابن ماجہ، باب فضل العلماء والحث علی طلب العلم: ۲۲۴، ۱/۱۰/۸۱)۔ تعلیم کی راہوں میں اس کی مسافتوں اور میلوں کو پاٹنے کی ترغیب فرمائی، فرمایا: "اطلب العلم ولو كان بالصين"، اور اس کی راہ میں چلنے والوں کو مبارک بتاتے ہوئے فرمایا: "من سلك طريقاً يلتمس فيه علما سهل الله له طريقاً إلى الجنة" (سنن ابن ماجہ، باب فضل العلماء والحث علی طلب العلم: ۲۲۳، ۱/۱۰/۸۱)۔

ان ارشادات وفرمودات کے پیش نظر حصول علم کی فضیلت واہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، مگر سوال یہ ہے کہ بچے اور بچیوں کا کس قدر تعلیم دینا ضروری ہے؟ اور عصری تعلیم کس حد تک دینا ضروری ہے؟

بچوں کو اتنی تعلیم دینا ضروری ہے جو معرفت الٰہی اور اطاعت خداوندی کے لئے معاون و مددگار ہوں، کیونکہ یقیناً شرک ایک عظیم گناہ اور اس سے بچنا فرض ہے، لہٰذا اتنی تعلیم حاصل کرنا فرض قرار پائے گا جو انسان کو رب حقیقی سے ملادے۔

یہی وجہ ہے فقہاء نے بھی قرآن صرف اتنا سیکھنا اور یاد کرنا جس سے نماز ہو جائے فرض اور سورہ فاتحہ وایک سورہ سیکھنا بلکہ یاد کرنا واجب اور مکمل یاد کرنا فرض کفایہ قرار دیا ہے (البحر الرائق ۱/ ۲۹۲ کتاب الصلاۃ)۔

اب جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ عصری تعلیم دینا کس حد تک ضروری ہے؟ اس میں پہلی بات تو یہ ہے کہ عصری تعلیم اپنے بچوں کو دینا ضروری بلکہ اشد ضروری ہے کہ اسلامی تعلیمات کو خلط ملط کرنے والے مغربی پروپیگنڈے اور بسا اوقات اسلامی تعلیم کے لبادے میں غیر اسلامی تعلیمات کے درمیان وہ تمیز کر سکنے اور اپنے ایمان وعقیدے کو بچا سکنے پر قادر ہو سکے، یہ ضرورت زمانی ہے، جیسا کہ آپ ﷺ نے زید بن ثابتؓ کو عبرانی زبان سیکھنے کا حکم فرمایا تھا (مسند احمد ۵/ ۱۸۶، دیکھئے: سیر الصحابہ: ۳۴۰)، تاکہ ان کی خباثتوں سے حفاظت ہو سکے۔

دوم یہ کہ حالات حاضرہ کی صورت حال کسی سے پوشیدہ نہیں، بارہا اسلام اور اسلامی تعلیمات پر حملے ہوتے رہتے ہیں، حتی کہ اسلام پر حملوں کی منصوبہ بند سازشیں ہوتی رہتی ہیں، ایسے میں امت کی غیور ماؤں اور جلال ایمانی سے سرشار خواتین کو چاہئے کہ اپنے بچوں کو تعلیم کے ساتھ ساتھ وہ معیاری فکر کی بلندی سے پیراستہ کریں، تاکہ اسلام پر ہو رہے جارحانہ حملوں کو نہ صرف روک سکیں؛ بلکہ ان کا دفاع بھی کر سکیں، چنانچہ عصری تعلیم اتنی حاصل کروانا ایک گونا امت کی ماؤں پر واجب قرار دیا جا سکتا ہے؛ کیونکہ اصل بیج اور تخم ریزی کا ہنر انہی کے پاس ہے۔

سوم یہ کہ اسلام نے نہ جاننے والوں کو جاننے والوں سے پوچھنے کا حکم فرمایا: "فاسئلوا أهل الذكر إن كنتم لا تعلمون" (نحل: ۴۳) اور اس میں کوئی قباحت بھی نہیں رکھی، بلکہ بسا اوقات اسے فرض بھی قرار دیا ہے، مگر واقعہ یہ ہے کہ عصر حاضر میں بالخصوص عصری تعلیم کے متعلق اگر کسی سے سوال کیا جائے تو وہ ناگواری بلکہ اکثر عزت نفس پر بار کلمات تک کہنے سے گریز نہیں کرتے، ایسے میں چاہئے کہ مسلمان بچے اور بچیاں عصری علوم اتنا ضرور حاصل کریں کہ اپنی فضیحت ورسوائی نہ ہو، کیونکہ عزت نفس کی حفاظت شریعت اسلامی کا ایک اہم جز ہے۔

حکومت کی طرف سے بچے اور بچیوں کے لئے لازمی تعلیم:

اگر حکومت کسی سطح تک تعلیم لازم کر دے تو کیا شرعاً اس کی پابندی ضروری ہے، چنانچہ اس کا جواب دیئے اور اس میں چھپی رازہائے سربستہ کو سمجھنے سے پہلے ضروری ہے کہ ہم اپنے ملک کے حالات اور اس میں پنپ رہی بھگوا اور اسلام دشمن طاقتیں، زعفران اور زعفرانیت میں لت پت سرخی کا بغور جائزہ لیں، بلکہ اگر ایک طائرانہ نظر بھی ڈالیں تو یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ تعیین کردہ قانون کسی رحم دلی وحب وطنی کا پرتو نہیں، بلکہ ذہنی سطحیت اور ہندو احیائیت کے منصوبوں کا ایک مقدمہ ہے، لہٰذا یہ تو یقینی ہے کہ مسلمانوں پر ایسے قانون کی پابندی شرعاً ضروری نہیں، بلکہ دیانتاً بھی اگر دیکھیں تو اس قانون، بلکہ ایسے لاقانونیت کی پابندی مسلمانوں پر لازم نہیں، بھلا کون ہوگا جو یہ پسند کرے کہ جس عمر میں اسلامی تعلیمات کی تخم ریزی کی جائے، جس عمر میں کلمہ لا إلہ إلا اللہ کا زاویہ کروایا جائے، جس عمر میں غیرت ایمانی کا جذبہ ان میں ودیعت کی جائے، جس عمر میں ایک ایسی بنیاد رکھی جائے جو

اس کے مستقبل کا عظیم معمار بنے، ایسی اہم اور نازک عمر میں ان دہریوں اور دیوی پرستوں کے حوالہ کردیا جائے، یقیناً ایسا کرنے والا غیرت ایمانی سے دور بلکہ کوسوں دور ہوگا۔

بچوں کو جنس کی تعلیم دلانے کا مسئلہ:

آج دنیا ہوا و ہوا پرستی کی باندی اور اتباع خواہشات پر عاجز و بے کس ہوتی جارہی ہے، اپنی چاہ ومنشا کی تکمیل کے لئے کبھی سبز باغ تیار کرتی ہے تو کبھی حدود الٰہی کو توڑنے سے بھی گریز نہیں کرتی، جنسی تعلیم دراصل انہیں فحش اور تخریب پسند فطرت کا ثمرہ ہے، جس کی سرپرستی یا تو "بلیک ہاؤس" یا وہ شیطانی امراء کررہے ہیں جو کہ نسل انسانی کو برباد کرنے کے درپے ہیں۔

یقیناً یہ بات ارباب حل وعقد کے سامنے اظہر من الشمس ہے کہ اگر بچہ چھوٹا ہو اور اسے دودھ کی جگہ کتنی ہی شیریں وقیمتی غذا کیوں نہ کھلادی جائے بدہضمی کا شکار ہوجائے گا، ایسے ہی ایک بچہ جو کہ ابھی شعور کے اس معیار کو نہیں پہنچا کہ اسے خود کا شعور حاصل ہو، بھلا اسے جنسی تعلیم دینا ان کے مستقبل کو ضائع کرنا اور حال کو ملیا میٹ کرنے کے مترادف ہوگا۔

کیونکہ بچپن میں بچوں کا حق جنسی تعلیم نہیں بلکہ وہ تعلیمات ہیں جو آئندہ ان کے لئے شاہراہ حیات ثابت ہوسکیں، جس سے وہ رب حقیقی اور اطاعت خداوندی پر گامزن ہوسکیں، لہذا یہی وجہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بچہ کے سات سال ہونے پر ہی اسے نماز پڑھوانے کا والدین کو پابند بنوایا، "مروا أولادكم بالصلاة وهم أبناء سبع سنين..." (ابوداؤد ۱/ ۳۳۴، من حدیث عبداللہ بن عمرو حسنہ النووی فی ریاض الصالحین)۔

اسی طرح حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سرپرستوں کو پابند بنایا کہ اپنے بچوں کو اوامر ومعروفات کی اتباع پر ابھاریں اور منہیات ومنکرات سے بچنے کی تلقین کرتے رہیں، اور یہی نہیں بلکہ ایسی تعلیمات کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان (والدین، سرپرستوں) کے حق میں جہنم سے خلاصی کا باعث تک قرار دیا ہے، "مروا أولادكم بامتثال الأوامر واجتناب بالنواهي فذلك وقاية لهم من النار" (مجمع الزوائد ۴/ ۲۵۳، کنز العمال ۱۶/ ۲۷۶، حدیث نمبر: ۴۴۴۴۱)۔

ایک جگہ تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بالخصوص والدہ کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ اپنے بچوں کا نام خوب سے خوب تر رکھیں اور ان کی تعلیم وتربیت پر خصوصی توجہ دیں، اور اس میں معاون قرآن کریم کی تعلیم کو اولین درجہ دیں تا کہ علوم قرآنیہ سے اس کا سینہ منور ہو اور امت کے لئے باعث انتفاع بنے، "أن يتنقى أمه ويحسن اسمه ويعلمه القرآن" (مجمع الزوائد ۴/ ۲۵۳، کنز العمال ۱۶/ ۲۷۶، حدیث نمبر: ۴۴۴۴۱)۔

غرض یہ کہ جنسی تعلیم کا جاپ کرنے والی زبانیں مغربیت اور عصبیت انسانی سے تر ہیں، لہذا ایسوں کی صدا پر کان دھرنے کی قطعی ضرورت نہیں، اسلامی ہدایات واضح ہیں جو کہ ہر ایک مومن کے لئے عمل کا متقاضی ہیں۔

ج: نکاح کے بارے میں بچے اور بچیوں کے حقوق:

بچے اور بچیوں کے جو حقوق والدین پر مرتب ہوتے ہیں ان میں ایک اہم حق یہ ہے کہ والدین ان کی شادی کی فکر کریں، اور جلد از جلد عقد نکاح کے مبارک رشتے سے منسلک کردیں، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی حوصلہ افزائی فرمائی ہے اور اس میں شیطان کی فضیحت ورسوائی بتلائی ہے، حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جب کوئی جوان اپنی نئی عمر ہی میں شادی کرلیتا ہے تو شیطان ہائے ہائے کرتا ہوا کہتا ہے کہ اس نے اپنے ایمان ودین کو مجھ سے محفوظ کرلیا، "أيما شاب تزوج فى حداثه سنة عج شيطان ياويله ياويله! عصم منى دينه" (مجمع الزوائد ۴/ ۲۵۳، کنز العمال ۱۶/ ۲۷۶، حدیث نمبر: ۴۴۴۴۱)۔ نیز آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شادی کو ایک مومن کے لئے نصف ایمان قرار دیا ہے (الاجماع لابن منذر: ۳۹)۔

واقعہ یہ ہے کہ نکاح ایک فطری ضرورت ہے اور اسلام دین فطرت ہے، جس نے زندگی کے تمام مسائل کا فطری حل بتایا ہے، ان ہی میں بچوں کے نکاح کا مسئلہ بھی ہے بسا اوقات خاندان میں کم عمر بچوں، بچیوں بالخصوص نابالغ لڑکی کی مصلحت کا تقاضا ہوتا ہے کہ بچپن ہی میں یا کم عمری میں شادی کردی جائے، لہذا فطری تقاضوں کو دیکھتے ہوئے اسلام نے بھی اس کی اجازت مرحمت فرمائی ہے، جس کا ثبوت قرآن کریم کی متعدد آیتوں سے ہمیں ملتا ہے (مثلاً: سورہ طلاق کی آیت: ۴، سورہ نور کی آیت: ۳۲، سورہ نساء کی آیت: ۱۲۷)، اسی لئے علماء کا اس پر اجماع ہے کہ باپ کے لئے اپنی کم عمر

اولاد خواہ وہ نابالغ ہی کیوں نہ ہوں شادی کرنا جائز ہے (الاجماع لابن منذر: ۳۹)، نیز آپ ﷺ نے حضرت عائشہؓ سے نکاح چھوٹی عمر میں کیا (دیکھئے: بخاری: ۵۱۳۳، مسلم: ۱۴۲۲)، اور آپ ﷺ نے اپنی چچازاد بہن امامہ بنت حمزہؓ کا نکاح ابوسلمہ کے لڑکے عمرؓ سے کیا، اس وقت وہ دونوں چھوٹے تھے (الاصابہ ۲/ ۳۷۳)، اسی طرح متعدد صحابہؓ سے ثابت ہے (دیکھئے مصنف عبدالرزاق ۶/ ۶۲ - ۱۶۴)۔

لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اسلام میں اس کی (کم عمری کی شادی) صرف اجازت ہے، کوئی ترغیب یا حوصلہ نہیں دیا گیا ہے، بلکہ بہتر اور پسندیدہ امر اسی کو قرار دیا گیا کہ بالغ ہونے کے بعد ہی بچوں کی شادی کریں، جیسا کہ آپ ﷺ نے حضرت فاطمہؓ کا نکاح حضرت علیؓ سے فرمایا تھا ...... لہذا امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ مستحب اور پسندیدہ یہ ہے کہ باپ اور دادا کنواری لڑکی کی شادی اس وقت تک نہ کریں جب تک کہ وہ بالغ نہ ہوں، اور اس سے اجازت لینی چاہئے تاکہ ایسا نہ ہو کہ ناپسندیدگی کے ساتھ شادی کے جال میں پھنسا دیا جائے (شرح مسلم للنووی ۹/ ۲۱۰، دیکھئے: بچوں کے احکام ومسائل: ۳۸۸)۔

دراصل آج نظام زندگی افراط وتفریط کا شکار ہے، یہی وجہ ہے کہ نکاح وشادی کے معاملے میں بھی بھونڈہ پن پیدا ہو گیا ہے، کہیں اتنی عمر میں شادی کردی جاتی ہے کہ دولہا اور دلہن کو کسی بات کا شعور تک نہیں ہوتا اور کہیں بلکہ اکثر شہری زندگی میں عمر کے ان مرحلوں میں شادی کی جاتی ہے جہاں حقیقتاً انہیں کئی بچوں کا باپ ہونا تھا۔

اسلام ایک متوسط دین اور یہ امت، امت وسط ہے "و کذلك جعلنا کم أمة وسطاً" (بقرہ: ۱۴۳)، اس میں افراط وتفریط کی اجازت نہیں، غرض یہ کہ اسلام نے کم عمری میں نکاح کی صرف اجازت دی ہے، نہ کہ ترغیب، کما مر۔

یہ بات ماہر نفسیات اور تمام اہل شعور سے بھی پوشیدہ نہیں کہ نکاح میں تاخیر سماج ومعاشرے کے اندر اور خود اس انسان کے اندر مختلف برائیوں کا ذریعہ بنتی ہے، چنانچہ حضور ﷺ نے والدین کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ "جب وہ بالغ ہوجائیں تو ان کی شادی کردیں" اور وہ عوارض جن کا حوالہ دے کر شادی کی تاخیر میں سند جواز حاصل کی جاتی ہیں، مثلاً: معیشت، حالات وغیرہ وغیرہ کا دفع بخوبی کیا، بلکہ ان کا حل بھی شادی ہی کو بتلایا ہے، لہذا حضور ﷺ نے فرمایا: اگر شادی کرنے والا عفت وپاکدامنی کی نیت کرتے ہوئے شادی کرے تو اللہ کی مدد اس کے ساتھ شامل حال ہوجاتی ہے، "ثلاثة حق علی الله عزوجل عونهم ... والناکح الذی یرید العفاف..." (سنن نسائی ۳/ ۶۱ باب معونة الله الناکح الذی یرید العفاف)، اسی طرح آپ ﷺ ایک صحابی کی شادی محض ایک لوہے کی انگوٹھی پر فرمادی (سنن نسائی ۳/ ۶۱ باب معونة الله الناکح الذی یرید العفاف)، یہ بھی نہیں کہا کہ کیسے کھلاؤ گے؟ کیا کھلاؤ گے؟ کیا پہناؤ گے؟

یقیناً شادی میں تاخیر انسان کو شہوت رانی وبدبختی کی ظلمت میں پھینک دیتا ہے، جنہیں یقین نہ ہو وہ ذرا ایک نظر مغرب کی سبزوادیوں پر ڈالیں تو ضرور یقین ہوجائے گا کہ آج نوجوان کس طرح اپنی خواہشات کی تکمیل کے لئے شیطانی حربے استعمال کررہے ہیں، اور عقد مبارک سے دور ہوتے جارہے ہیں، یہی وجہ ہے کہ آج مغرب کی پچاس سے ساٹھ فیصد آبادی حرام زادوں کی ہے۔

خدارا! مسلم امت اپنے آپ کو اس لعنت سے بچائیں، معاشیات وماحولیات کا حیلہ تلاش کرکے حضور ﷺ وانبیاء کرام کی مبارک سنت پر عمل پیرا ہونے سے محروم نہ ہوئیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ محرومی بدنصیبی اور جہنمی کا باعث بن جائے، اللہم احفظنا۔

د: بچہ مزدوری کے بارے میں اسلام کا موقف:

مادیت اور معدیت کے اس دور میں انسانوں کا مقصد حیات اپنا پیٹ پالنا اور اپنا کام نکالنا رہ گیا ہے، خواہ اس کے لئے ظلم وجور کا سہارا ہی کیوں نہ لینا پڑے، فرعون وشداد ہی کیوں نہ بننا پڑے، یہی وجہ ہے کہ آج صنف ضعیف کے تمام ترضعف کے باوجود ظلم واستبداد کے شکار ہوئے جارہے ہیں، کبھی ان سے بچہ مزدوری تو بندھوا مزدوری یا استحصال اور مختلف ومتنوع حالات سے دوچار کیا جارہا ہے، جس کے لئے انہیں ماؤں کی ممتا اور باپوں کی شفقت سے دور کیا جارہا ہے۔

جبکہ بچہ مزدوری دستور ہند کی دفعہ "بنیادی حقوق" میں "استحصال سے محفوظ رہنے کے حق" (Rights Against Exploitation) کے زیر عنوان، علاوہ اور باتوں کے چودہ سال سے کم عمر کے بچوں کے لئے فیکٹریوں، کانوں اور اسی طرح مزدوری کی تمام پرخطر صورتوں کو ممنوع قرا

ردیا گیا ہے(p:24,Indias Constitution)، اور حکومت ہند کے ۱۹۵۹ء کے ''حقوق اطفال'' کے اعلامیہ (Declration of the Right of Child 1959) میں تعلیم، صحت، رہائش، ظلم واستحصال سے تحفظ علاحدہ نام اور قومیت، آزادی ووقار کی فضا میں پرورش کو ہر بچہ کا بنیادی حق تسلیم کیا گیا ہے، حتی کہ اقوام متحدہ نے بھی بچہ مزدوری کو ایک قابل سزا جرم قرار دیا ہے۔

بہرحال انسانی عقل وشعور وارتقا کے نہ جانے کتنے مراحل طے کرنے کے بعد آج اس مقام تک پہنچا ہے کہ اسے فلاح اطفال (Child Welfare) کا خیال ہونے لگا ہے، جبکہ اسلامی تعلیمات جو آج سے چودہ سو سال پہلے نازل ہوئیں، جس کا دستور اساسی قرآن کریم فلاح اطفال کے سلسلہ میں فکرمند دکھائی دیتا نظر آتا ہے، شاید یہ دنیا کی پہلی کتاب ہوگی جس نے بچوں کو مستضعف قرار دے کر سب سے پہلے اسے ایک کمزور طبقہ انسانیت کی حیثیت سے ابھارا ہے، "إلا المستضعفين من الرجال والنساء والولدان لا يستطيعون حيلة ولا يهتدون سبيلاً" (نساء: ۹۸)، اور اسے ظلم واستبداد کے آہنی پنجوں سے نجات دلانے کے لئے اپنے ماننے والوں کو جہاد وقتال تک کا حکم دیتا ہے، "وما لكم لا تقاتلون في سبيل الله والمستضعفين من الرجال والنساء والولدان الذين يقولون ربنا أخرجنا من هذه القرية الظالم أهلها، واجعل لنا من لدنك نصيراً" (نساء: ۷۵)، نیز رب العزت نے کسی کو بھی استطاعت سے زیادہ کا مکلف نہیں بنایا ہے، "لا نكلف نفساً إلا وسعها" (انعام: ۱۵۲)، ایسے ہی بچہ مزدوری کے متعلق اسلامی موقف نصف النہار کی طرح ظاہر ہوجاتا ہے کہ ایک صنف ضعیف کو مزدوری کا مکلف نہیں بنایا جاسکتا، کیونکہ یہ ان کی استعداد سے باہر اور ان کے حق میں ظلم ہے اور ظلم اسلام میں حرام ہے (دیکھئے: بچوں کی مزدوری اور اسلام ص: ۱۲۔۱۳)۔

(۲) والدین یا اولیاء کا نابالغ بچے اور بچیوں سے گھریلو کام لینا:

اس کے مختلف طریقے ہوسکتے ہیں، کیونکہ کسی نے بھی سیکھنے سکھانے کا کوئی طریقہ اخیر ایجاد نہیں کیا، کبھی کبھی بچوں میں بیداری وآداب انسانی سکھانے کے لئے اپنی نگرانی میں مستقل رکھا جاتا ہے، اور ان کے ذریعہ وہ کام بھی لیے جاتے ہیں جو کہ تربیت کا حصہ ہوتے ہیں، جیسا کہ حضور ﷺ کے زیر نگرانی بچوں وخادمین کے تذکرے میں ملتا ہے، جس میں نمایاں نام حضرت انسؓ کا ہے، جنہوں نے دس سال تک حضور ﷺ کی خدمت گزاری کی، ان کے علاوہ کم سنی سے حضرت ابن عمرؓ اور حضرت ابن عباسؓ وغیرہ، مستقل خدمت میں شامل رہے، خدمت کا ہی پروانہ تھا کہ حضرت ابن عباسؓ کو ''اللهم علمه تأويل القرآن'' (المستدرک علی الصحیحین ۳/۶۱۸، حدیث نمبر: ۶۲۸۸)، جیسی دعاء کا تحفہ مایہ نصیب ہوا۔

مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان بچے اور بچیوں سے ان کے اولیاء گھر کا کام کس حد تک لے سکتے ہیں؟ حضور ﷺ کے خادمین کی فہرست اور ان سے لئے جانے والے کاموں پر اگر ہم ایک طائرانہ نظر بھی ڈالیں تو ہمیں کوئی ایسا واقعہ نہیں ملتا جہاں آپ ﷺ نے سکت بھر سے زیادہ کسی سے کام لیا ہو، کیونکہ حضور ﷺ خدا کے تابع وفرمانبردار تھے، اور خدا نے اپنا یہ حال بتادیا تھا کہ "لا يكلف الله نفساً إلا وسعها" (بقرہ: ۲۸۶)، ایسے میں بھلا حضور ﷺ وسعت سے بڑھ کر کیسے کام لے سکتے تھے، یہی وجہ ہے کہ حضور ﷺ عموماً اپنے کام خود ہی کیا کرتے تھے، لہذا آپ ﷺ کے گھریلو حالات ومعاملات کو بتلاتے ہوئے حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ آپ گھر میں اپنا کام خود ہی کیا کرتے تھے، مثلاً بکری دوہنا، کپڑے بدلنا وغیرہ (دیکھئے: علم اصول الفقہ ۸/۱۸۷)، غرض یہ کہ بقدر ضرورت واستطاعت بچے اور بچیوں سے کام لیے جاسکتے ہیں، مگر افضلیت کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اپنا کام خود کرے اور کسی کی محتاجی وبے کسی کا دست نگر نہ بنے۔

اپنی معاشی ضرورت پورا کرنے کے لئے یا بہتر بنانے کے لئے بچوں سے مزدوری کرانا:

اسلامی تعلیمات نے ضروریات انسانی کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے:

(۱) ضروریات: جن کے بغیر مقاصد خمسہ (حفظ دین، حفظ نفس، حفظ عقل، حفظ نسل، حفظ مال) کا تحفظ ممکن نہ ہو، وہ ''ضرورت'' ہیں، جیسے: جان بچانے کے لئے کھانے کی اجازت۔

(۲) حاجت: وہ احکام جن پر مقاصد خمسہ موقوف تو نہ ہوں لیکن وہ نہ ہوں تو مشقت پیدا ہوجائے جیسے: آسودہ ہوکر کھانا کہ زندگی اس پر موقوف نہیں، لیکن اگر اس کی اجازت نہ دی جائے تو مشقت ہوگی۔

(۳) تحسین: جن احکام کا مقصد سہولت وآسانی پیدا کرنا ہو، جیسے: انواع واقسام کے لذت بخش کھانوں کی اجازت (دیکھئے: علم اصول الفقہ ۸/۱۸۷)۔

ضرورت کا درجہ سب سے اول ہے، پھر حاجت اور اس کے بعد تحسین کا درجہ ہے۔

ان اصول وقواعد کے پیش نظر اگر ہم مذکورہ سوالات پر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ اگر کسی کو ضرورت (بحیثیت مذکورہ تعریف کے) لاحق ہو تو پھر ان سے کام کاج لینے کی اجازت دی جاسکتی ہے، تاکہ زندگی کی رمق باقی رہے، اور "ولا تلقوا بأيديكم إلى التهلكة" (بقرہ: ۱۹۵) کا ثبات نہ ہونے پائے، مگر ان سے ظلم وجور والے کام نہ لیے جائیں، یعنی وہ کام جن سے ان کی نشوونما وصحت حد درجہ متاثر ہو۔

اور رہی بات ان سے اپنی معاشی ضرورت کو بہتر بنانے کے لئے مزدوری کروانے کی تو یقینا اس کا جواب نفی میں ہی ہوگا، کیونکہ یہ درجہ ضرورت کا نہیں بلکہ تحسین کا ہے اور تحسین کے لئے ایک ایسے کام کی اجازت نہیں دی جاسکتی جو کہ شرعاً درست نہیں ہے (کما سبق)۔

مذکورہ سوال کا تیسرا جزء محل نظر وتحقیق طلب ہے، لیکن اتنی بات تو حتمی ویقینی ہے کہ ان سے ان کے وسعت سے بڑھ کر کام نہیں لیا جاسکتا۔ "لا نكلف نفساً إلا وسعها" (انعام: ۱۵۲)، مگر چونکہ عموماً یہ دیکھا جاتا ہے کہ اللہ رب العزت نے ہر بچے کی صلاحیت واستعداد میں نمایاں فرق ملحوظ رکھا ہے، چنانچہ بہت سے بچے اپنی تمام تر سہولیات وفراہمی کے باوجود تعلیم وتعلم سے محروم رہ جاتے ہیں، جبکہ ایک ایسا بچہ جو پے در پے حوادث وحالات سے دوچار ہو لائق وفائق اور اعلیٰ تعلیم حاصل کرلیتا ہے، اب ایسے میں ان بچوں کا کیا ہو جو کہ تعلیم وتہذیب کی طرف مائل نہیں ہوتے، اس کے متعلق اجمالاً اسلامی تعلیمات جن باتوں کی طرف اشارہ کرتی ہے، وہ یہ ہے کہ ان کی نگہداشت وپرورش میں حتی المقدور بہتر سے بہتر کوشش کرنی چاہئے، انہیں بے یار ومددگار اور زمانے کے ادوار پر منحصر نہ چھوڑنا چاہئے، پھر اگر والدین مناسب سمجھیں تو انہیں کسی ایسے کام کاج میں لگا سکتے ہیں جس میں ان کے بچپنے کی بھی رعایت کی جاتی ہو، ایسا نہ ہو کہ کسی دشوار کن، کان، فیکٹری وغیرہ میں لگادیں، اگر ایسا کیا جائے گا تو ہوسکتا ہے کہ جسمانی طور پر زیادہ مضر اثرات ظاہر نہ ہوں، مگر ذہنی طور پر وہ شرپسند اور سنگ دلی کا شکار ہو جائے گا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل بھی ہمیشہ اسی طرح رہا کہ بچوں کو کبھی بھی اس کے سکت سے زائد کا مکلف نہ بنایا، لہذا صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عمیر بن ابی الوقاص کا واقعہ مشہور ہے کہ جنگ احد کے موقع پر جہاد کے لئے نکلنے کی خواہش رکھتے تھے مگر کم عمری وکم سنی کی وجہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں واپس کردیا (دیکھئے: الموسوعۃ الفقہیہ: القواعد)، کیونکہ جہاد ایک مشقت طلب اور محنت طلب امر ہے جس کا بچے متحمل نہیں۔

معلوم یہ ہوا کہ بچوں سے استطاعت کے بقدر ہی کام لیا جائے گا اور لگایا جائے گا۔

(۴) غربت کی وجہ سے بچوں کو مزدوری پر لگاتے ہیں نہ خود کھانے کے لائق ہوتے ہیں نہ حکومت ان کا تکفل کرتی ہیں، ایسے والدین کا نابالغ بچوں کو مزدوری پر لگانا درست ہے کہ نہیں، اس بابت اسلام کی کیا ہدایات ہیں؟

اسلام آفاقی وابدی مذہب ہے، جو ہر حالات اور ہر مقام پر صحیح رہنمائی کرتا ہے، خواہ انسان حالت استقراری میں ہو یا حالت اضطراری میں، چنانچہ استقراری حالات کو بتاتے ہوئے قرآن کہتا ہے: "حرمت عليكم الميتة" (المائدہ: ۳)، مگر مضطر ومجبور کے لئے کہتا ہے: "فمن اضطر غير باغ ولا عاد فلا إثم عليه" (بقرہ: ۱۷۳)، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی استقراری حالت والے شخص کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا: ''تم میں جو کوئی قوت وطاقت رکھتا ہو تو چاہئے کہ وہ شادی کرے، مگر وہیں پر مضطر کے لئے رخصتاً فرمایا: اگر عوارض لاحق ہوں اور شادی نہ کر پار ہے ہوں تو پھر چاہئے کہ وہ روزے رکھیں'' (الموسوعۃ الفقہیہ: القواعد)۔

نیز قرآن وحدیث کی روشنی میں فقہاء کرام نے مستقل ان اصولوں کو مستنبط کیا ہے جن میں مضطر کے لئے رخصت دی گئی ہے، مثلاً "الضرورات تبيح المحظورات"، اور "المشقة تجلب التيسير"، "ما لا يمكن التحرز منه فهو عفو"، "إذا ضاق الأمر اتسع" وغیرہ (دیکھئے: الموسوعۃ الفقہیہ: القواعد)۔ اسی طرح ضروریات انسانی کے جو طبقات بتلائے گئے (ضرورت، حاجت، تحسین) ہیں، وہ بھی اسی کا پرتو ہیں، مذکورہ سوال کو بھی اسی نظر سے دیکھنا چاہئے۔

فقہاء نے بچوں کی دو قسمیں بیان کی ہیں: ایک وہ جو ابھی کم سنی اور لاشعوری کی حالت میں ہے، ان کے متعلق حکم ظاہر ہے، ایسوں سے نہ کام لیا جاسکتا ہے اور نہ لے سکتے ہیں۔

دوسرے وہ بچے جو ابھی نابالغ ہیں مگر سن شعور کو پہنچ چکے ہیں (دیکھئے: الموسوعۃ الفقہیہ ۲۷ / ۳۳: صغر)۔

لہذا اسلامی تعلیمات وہدایات کو مدنظر رکھتے ہوئے سن شعور کے بچوں کو کام میں لگایا جاسکتا ہے، کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان مشہور ہے: ''مفلسی بسا اوقات کفر کا سبب بن جاتی ہے (ابوداؤد: ۴۹۴۳، باب فی الرحمۃ)، ایسے میں اگر بچے محنت ومزدوری کر کے کچھ اپنے اور والدین کے لئے کما سکیں اور ان کے ایمان کی حفاظت کرسکیں، اس سے بڑھ کر بھلا اور کیا ہوگا، مگر بہر صورت چند اسلامی ہدایات وشرائط کو ملحوظ رکھا جانا ضروری ہے۔

(۱) بچے شفقت ومحبت سے محروم نہ ہو پائیں:

عموماً یہ دیکھا جاتا ہے کہ کام کاج کرنے والے بچے ہمدردی ورحم دلی اور آغوش محبت سے محروم ہوجاتے ہیں، یہ سراسر غلط اور اسلامی اعتبار سے ناروا ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ بچوں خواہ اہل خانہ ہوں یا خارج خانہ ہر ایک ان سے فطری لگاؤ اور جذبات واحساسات کا سا سلوک کرے، کیونکہ ارشاد نبوی ہے: "من لم یرحم صغیرنا ولم یعرف حق کبیرنا فلیس منا" (ابوداؤد: ۴۹۴۳، باب فی الرحمۃ)۔

(۲) بقدر استطاقت کام لیں:

جس کام کے لئے بھی انہیں لگایا جائے اس میں ہمیشہ ان کی قوت وہمت کو درپیش رکھا جائے گا، کیونکہ اللہ ہرگز یہ پسند نہیں کرتا کہ وہ کسی کو بھی اس کی سکت سے بڑھ کر کام لے، "لا یکلف اللہ نفساً إلا وسعہا" (بقرہ: ۲۸۶)، اب ایسے میں اگر بندہ الٰہی قانون الٰہی کی خلاف ورزی کریں تو ایسوں کے لئے لمحہ فکریہ ہے کہ کہیں جہنم ان کا انتظار نہ کررہی ہو۔

(۳) جسمانی اعضاء ونفسیات کی حفاظت:

دراصل بچہ نابالغی کی عمر میں نشوونما اور پروان چڑھنے کے دور میں ہوتا ہے، لہذا ان کے اعضاء نرم وملائم اور ضعیف ہوتے ہیں، ذرا سی لاپرواہی اعضا کے تلف ہونے کا باعث، یا سختی، نفسیاتی مرض کا ذریعہ بن سکتی ہے، جو کہ آئندہ کی زندگی دشوار سے دشوارکن اور اوروں کا دست نگر بنا سکتی ہے، یہی وجہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صنف نازک پر ہاتھ اٹھانے اور مبرح (جس کا اثر بدن پر آجائے) مار مارنے اور وہ مار جو اعضا کو تلف کرنے کا باعث بنے منع فرمایا ہے (دیکھئے: حدیث ہذا: عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: لا یجلد أحدکم امرأتہ جلد العبد ..... رواہ البخاری: ۵۲۰۴، کی تشریح: تنویر الآفاق شرح تہذیب الأخلاق: ۲۹۱-۲۹۰)، لہذا بچوں سے کام لینے میں اس بات کا ضرور خیال رکھا جائے کہ اعضاء ونفس متاثر نہ ہوں۔

(۴) دہریت وملحدیت کے شکنجوں سے بچائیں:

ایسا ہرگز نہ ہو کہ انہیں ایسے ماحول میں کام پر لگایا جائے کہ ان کے عقیدے کا سودا کرنا پڑے، والدین اور سرپرستوں کو ہر ممکن صورت میں اولاد کے عقیدے کی فکر کرنی چاہئے، جیسا کہ انبیاء ورسل کیا کرتے تھے، حضرت یعقوبؑ کے بارے میں آتا ہے کہ تمام زندگی انہوں نے اپنی اولاد پر محنت کی، لیکن پھر بھی جب ان کی موت کا وقت آیا تو اپنی اولاد کو جمع فرما کر پوچھا تھا جس کو قرآن نے بھی ذکر کیا ہے: "ما تعبدون من بعدی" (بقرہ: ۱۳۳)، چنانچہ ان کی فکر کا ہی نتیجہ تھا کہ بچوں نے یہ جواب دیا: "قالوا نعبد إلٰہک وإلٰہ آبائک.... (بقرہ: ۱۳۳)۔

(۵) ان کے تئیں نیت درست رکھیں:

ایسا نہ ہو کہ ان کے ذریعہ اپنا پیٹ بھرنا اور معیشت مضبوط کرنا مقصود ہوجائے، کیونکہ ہوسکتا ہے کہ اگر خیر وصلاح کی نیت پیش نظر ہو تو مستقبل میں ان کے صحیح راہ پر گامزن رہنے اور ایک اچھے انسان بننے میں معاون ومددگار ہوں، کیونکہ "إنما الأعمال بالنیات" (رواہ البخاری)۔

...بچے اور جرائم:

اللہ تعالیٰ بچوں کو سادہ دل وسادہ لوح پیدا کرتا ہے، مگر وقت اور ماحول ان پر ایسے اثرات نقش کردیتے ہیں جو کہ انہیں گناہوں کے دلدل میں ...نے اور اللہ ...ت سے دوری کا باعث بنتے ہیں، چونکہ اسلام قطعاً برائی کو پسند نہیں کرتا اور ہمیشہ اس کی حوصلہ شکنی بلکہ اس کی بیخ کنی کرنے اور اس کا

استیصال کرنے کو ضروری قرار دیتا ہے، مگر اسی کے ساتھ ساتھ ضعیف وناتواں کیلئے بہتوں بار عفوو درگزر کا معاملہ بھی کرتا ہے، لہذا بچوں کے متعلق فرمان نبوی ہے: "رفع القلم عن ثلاث: عن النائم والصبي والمجنون" (سبق تخریجہ)۔

اب سوال یہ ہے کہ وہ جرائم جو عموماً بڑوں سے سرزد ہوتے ہیں اگر بچے اس کا ارتکاب کرلیں تو کیا ان پر بھی سزا جاری کی جائے گی؟ فقہاء کرام نے مجرمین اطفال کی دو قسمیں کی ہیں: پہلی قسم ان بچوں کی ہے جو غیر ممیز اور لاشعوری کے مرحلے میں ہیں، ایسے بچوں سے اگر کوئی جرم سرزد ہو جائے تو بدنی ہوں تو ایسے میں اسے سزا سے معاف رکھا جائے گا۔

دوسری قسم: وہ بچے جو کہ ممیز اور باشعور ہوں، مگران پر بھی بچپنے کی وجہ سے قصاص وحدود جاری نہ کئے جائیں گے، الا یہ کہ انہیں تعزیر یعنی ڈانٹ ڈپٹ اور غیر مبرح ومتلف مار مارا جائے گا، لیکن اگر اس نے کوئی مالی جرم کیا یا کسی انسان کے قتل خطا کا مرتکب ہوا تو اس کے اولیاء کے مال سے اس کی دیت وتاوان دینا پڑے گا (الموسوعۃ الفقہیہ ۲۷ / ۳۳، صغر)۔

فقہاء کے اس نقطہ نظر سے دور حاضر میں نابالغ بچے بچیوں سے سرزد ہورہے جرائم کا حکم صاف ظاہر ہے کہ اگر بچہ ممیز و باشعور ہو تو بغیر حد جاری کئے ہوئے غیر مبرح ومتلف سزا دی جاسکتی ہے، کیونکہ حقیقتاً وہ شریعت واحکام کے مکلف نہیں۔

راقم کا خیال ہے کہ جس طرح فقہاء نے کھوسٹ بوڑھے یا وہ عورت جو جنگ میں ماہر ہو قتل کرنے کی اجازت دی ہے، لہذا ہوسکتا ہے کہ اگر کوئی نابالغ صاحب شعور کسی غلط جرم پر مصر اور اپنی اصلاح سے غافل ہوکر سرکشی کی حد کو پہنچ چکا ہو اور فتنہ عظیم کا باعث ہو، تو مصلحتاً ان پر امام وقت وحاکم حدود بھی جاری کریں، کیونکہ قاعدہ عام ہے "تصرف الإمام على الرعية منوط بالمصلحة" (الموسوعۃ الفقہیہ: (القواعد)، یہ یقیناً تمام بچوں اور والدین وسرپرست کے لئے بھی باعث عبرت اور ملک ومعاشرے کے لئے صلح وآشتی کا ذریعہ بنیں، واللہ اعلم۔

جرائم پر سد باب کے لئے اسلام کی ہدایات:

اسلام میں بلاشبہ حدود وقصاص کے احکام ہیں، مگر یہ بہت اخیر درجہ کی چیزیں ہیں، اس سے پہلے اسلام ایسے تصورات اور ماحولیات کا معاشرے کو پابند بناتا اور تعلیمات دیتا ہے جو ان پر ایسی نوبت آنے ہی نہ دے۔

کہا جاتا ہے کہ احتیاط علاج سے بہتر ہے، لیکن تمام احتیاطی تدابیر کے باوجود اگر کسی کو مرض لاحق ہو جائے تو پھر اسے دوا کے کڑوے گھونٹ کا پلانا بھی ضروری ہو جاتا ہے......، اسلام نے جرائم کے متعلق اس اصول کو پوری طرح پیش نظر رکھا ہے، لہذا اگر کوئی تدابیر کے باوجود جرم میں ملوث ہو جائے تو اس کا مستقل علاج بھی تجویز کرتا ہے۔

شریعت اسلامیہ نے جرائم کے علاج کی تین صورتیں بتائی ہیں:

(۱) پہلی قسم: حدود کا نفاذ ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ مجرم ان جرائم کا ارتکاب اپنے جملہ شرائط کے ساتھ کیا ہو جن کی سزائیں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے متعین کردی ہیں، جن میں نہ کمی کی جاسکتی ہے اور نہ زیادتی، لہذا وہ سزائیں مجرم پر ویسے ہی نافذ کی جائیں گی، ان میں زنا، زنا کا الزام، چوری، شراب نوشی، ارتداد، ڈکیتی اور بغاوت شامل ہیں۔

(۲) دوسری قسم: قصاص ہے، اس کے معنی بدلے کے ہیں، مجرم نے اگر کسی کا قتل کردیا یا اس کو زخم یا چوٹ پہنچائی تو اس کے بقدر اس سے بدلہ لیا جائے گا۔

(۳) تیسری قسم: تعزیرات ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ جن جرائم پر سزائیں مقرر کی گئی ہیں مگر مطلوبہ شرائط پوری نہیں ہورہی ہیں، تو ایسی صورت میں مجرم کی حسب ضرورت تعزیر (مقررہ سزاؤں سے کمتر) کی جائے گی (دیکھئے: جرائم اور اسلام انسدادی تدابیر اور علاج: ۵۷)۔

اگر ان تعلیمات اسلامی پر بخوبی عمل کیا جائے تو انشاء اللہ حکومت مجرمین خواہ جوان ہوں یا بچے کے جرم سے بوجھل اور معاشرہ گرد آلود نہ ہونے پائے گا۔

(و): بچوں کی جیلیں:

شریعت اسلامیہ کے نزدیک مجرم بہرحال سزا کا مستحق ہے، تاکہ جرائم سے معاشرہ پاک ہو، لہذا اگر مجرم نے جملہ شرائط کے ساتھ جرم کیا ہے، تو ان پر مقررہ حد کا نفاذ ہوگا، دوسری صورت میں ان کی تعزیر ضرور کی جائے گی، خواہ وہ نابالغ ہی کیوں نہ ہو، مگر اس کے چند اصول وضوابط ہیں جس کا خیال رکھنا ہے، اولاً یہ کہ حدود وقصاص کی جو شرعی حکمتیں ہیں وہی تعزیرات کے نفاذ میں بھی ہیں، فقہاء نے ان حکمتوں کو مختلف الفاظ میں بیان فرمایا ہے، علامہ زیلعی فرماتے ہیں: ''تعزیر کا مقصد زجر ہے'' (رد المحتار علی الدر ۳/ ۲۴۷)۔

زجر کے معنی مجرم کو اعادہ جرم سے باز رکھنے یا دوسرے کو عبرت دلانے کے ہیں، یہ مقصد جتنی تعزیر سے حاصل ہو جائے اسی قدر تعزیر کی جائے گی، بے جا اور غیر ضروری تعزیر سے شریعت نے منع کیا ہے، مثال کے طور پر مجرم اگر زبانی تنبیہ سے جرم سے باز آجائے، یا معمولی مار پیٹ سے اسے اپنی غلطی کا احساس ہو جائے، یا قید وبند سے اعادہ جرم سے باز رہے تو اس پر مزید سختی کرنا جائز نہیں (البحر الرائق ۵/ ۴۱)۔

تعزیر کی حد:

اسلام نے تعزیر کے متعلق یہ تاکید کی ہے کہ کسی کو بھی اتنی ہی تعزیر کی جائے جتنی حقیقتاً ضرورت ہو، غیر ضروری سختی اور بے جا تشدد اس مقصد کو فوت کردے گا، چنانچہ ایسی تعزیر جس سے مجرم کا کوئی عضو تلف ہو جائے یا اس کی افادیت جاتی رہے یا اس کی جان کو خطرہ لاحق ہو تو یہ جائز نہیں (المغنی ۸/ ۳۱۶)۔

تعزیر کی قسمیں:

تعزیر کی مختلف شکلیں شریعت میں بیان کی گئی ہیں، جن میں جسمانی سزا، مالی سزا، قید وبند، شہر بدری اور جرمانہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں، مگر جہاں تک نابالغ کی تعزیر کی بات ہے تو ان کے لئے زجر وتوبیخ کے بعد قید وبند ہی زیادہ مناسب ہے۔

قید وبند:

فقہی اصطلاح میں اس کا مطلب آدمی کی شخصی آزادی سلب کر لینے کے ہیں، جس سے وہ اپنی مرضی کے مطابق نقل وحرکت سے قاصر رہے۔ "تعويق الشخص ومنعه من التصرف بنفسه" (مجموع فتوی ابن تیمیہ ۳۵/ ۳۹۸، والطرق الحکمیہ لابن قیم: ۱۰۷)۔

فقہاء کا اس امر میں اختلاف بھی ہے کہ آیا قید وبند کی سزا دی جاسکتی ہے، مگر جمہور کا اتفاق ہے کہ قید کے ذریعہ مجرم کی تعزیر کی جاسکتی ہے (المغنی ۸/ ۳۲۵)۔

فقہاء نے اسی کے ساتھ ساتھ ایک اور نقطہ بیان کیا ہے جس سے استدلال کیا جاسکتا ہے کہ قید وبند کے ساتھ ہی ان سے کام بھی لیے جاسکتے ہیں، جو ان کے لئے اصلاح میں معاون ومددگار ہوں، لہذا علامہ ابن نجیمؒ نے یہ لکھا ہے کہ بعض وقت مجرم کو صرف قید کر کے اس کی تعزیر کی جائے گی اور بعض وقت ضرورت اس کے ساتھ دوسری سزاؤں کو بھی نافذ کیا جائے گا، مثلاً اسے کوڑے لگائے جائیں گے اور جرمانہ بھی عائد کیا جاسکتا ہے (البحر الرائق ۵/ ۴۵)۔

قید کی کیفیت:

قید وبند کی کیفیت کے بارے میں فقہاء نے بیان کیا ہے کہ قیدی کو آرام کرنے کے لئے نہ نرم بستر دیا جائے گا اور نہ کسی کو اس کی خدمت کے لئے متعین کیا جائے گا، اس کو جنازہ، جماعت، جمعہ، حج یا کسی مریض کی عیادت کی اجازت بھی نہ ہوگی (بدائع الصنائع ۷/ ۱۷۴)۔

جہاں تک اس سے خدمت لینے کا سوال ہے تو اس بارے میں شریعت میں کوئی ممانعت وارد نہیں ہوئی ہے، لہذا ان سے سزاءً خدمت بھی لی جاسکتی ہے، جیسا کہ فقہاء ثلاثہ اور بعض حنفیہ کا بھی مفتی بہ قول یہی ہے (فتاوی ہندیہ ۳/ ۴۱۸، المغنی ۴/ ۴۹۵، نوٹ: مطول ومفصل تعزیر کی بحث کے لئے دیکھئے: جرائم اور اسلام، انسداد کی تدابیر اور علاج)۔

مگر خدمت لینے میں ان تعلیمات وہدایات کا خیال رکھا جائے گا جو بچوں کے متعلق اسلام نے بتایا ہے، مزید برآں یہ کہ ان کی اصلاح وتربیت کے لئے مناسب تدابیر اختیار کی جائیں گی، مثلاً:

(۱) عمدہ ماحول: قید وبند کے درمیان نابالغوں کے لئے عمدہ ماحول فراہم کرنے کی کوشش کی جائے، تاکہ ان کے اندر جذبہ جرم ختم ہواور اصلاح کی فکر کریں۔

(۲) مذہب پر عمل: یعنی صحیح دین پر کاربند ہونے اور خصائص کو اپنانے ورزائل سے اجتناب کرنے پر آمادہ کیا جائے اور اس کے لئے معاون، دعا واذکار اور تسبیحات کا ورد کرنے کی ترغیب دی جائے۔

(۳) تعلیم کا وقت: اسی طرح پورے دن میں اجتماعی طور پر تعلیم کا نظم کیا جائے اور ان تک صحیح طریقہ حیات اور مقصد حیات کو واضح کرتے ہوئے شکوک وشبہات کا بخوبی جواب دیا جائے، تو انشاء اللہ امید ہے کہ ان تدابیر کے ذریعہ ان کی اصلاح وخیر کا کام بحسن انجام پائے اور قید وبند سزا نہیں بلکہ تعلیم گاہ بن جائے (دیکھئے: حجۃ اللہ البالغہ)۔

(ز): بے سہارا بچوں کی تربیت ونگہداشت:

آج مغربی کلچر اور سرمایہ دارانہ نظام نے یہ فکر عام کردی ہے کہ ہر انسان اپنا مالک خود ہے اور اسے بے مہار نقل وحرکت کرنے کی اجازت ہے، ان کے سرکسی کی ذمہ داری اور کسی کی ہمدردی وپہلوتہی نہیں، لہذا بچوں کی جانب سے بے رغبتی، انہیں پھینک دیئے جانے یا انہیں بے سہارا چھوڑ دیئے جانے کے واقعات اسی فکر کے نتائج ہیں۔

جب کہ اسلام کا قاعدہ کلیہ یہ ہے: "كلكم راع وكلكم مسئول عن رعيته" (صحیح بخاری: ۸۹۳، کتاب الجمعہ، وصحیح مسلم: ۱۸۲۹، کتاب الامارۃ)، یعنی نوع انسانی کا ادنی سے ادنی اور اعلی سے اعلی اپنے آپ میں بعض ذمہ داریوں اور فرائض کا بار اٹھائے ہوئے ہے، جس کی ادائیگی اس پر فرض اور اس سے سبکدوشی نافرمانی الٰہی کے مترادف ہے، یوں تو اولاد ماں باپ کی ذمہ داری اور تعلیم وتربیت پر مسئول ہیں، لیکن خاندان اور سماج نیز حکومت بھی انہیں گردش زمانہ کے تھپیڑوں سے بچانے پر معمور ہیں۔

والدین کا فریضہ:

اسلام نے بچوں کی تربیت وتعلیم کا ایسا نظام قائم کیا کہ کوئی بھی بچہ بھوکا یا ننگا نہ رہ پائے، اس سلسلہ میں سب سے پہلی ذمہ داری والدین پر عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنی کم سن اولاد کا خرچ برداشت کریں، اور یہ صرف ان کی اخلاقی ہی نہیں بلکہ قانونی ذمہ داری بھی ہے، چنانچہ فقہاء نے صراحت کی ہے کہ "ونفقة الأولاد الصغار على الأب لا يشاركه فيها" (ہدایہ ۲/ ۴۲۴)، اور جو بچے والدین کی سرپرستی سے محروم ہوں، یا کسی بھی معذوری کا شکار ہوں تو کفالت کی ذمہ داری اس کے قریبی اعزہ پر عائد ہوگی، چنانچہ آگے ہے: "والنفقة لكل ذي رحم محرم إذا كان صغيراً أو كانت امرأة بالغة فقيرة أو كان ذكراً بالغاً فقيراً زمناً أو أعمى" (ایضا ۲/ ۴۲۶)، اسی طرح اگر کوئی اس ذمہ داری سے دامن بچانا چاہے تو حکومت انہیں ایسا کرنے کے لئے مجبور کرے گی، "يجب على ذلك على مقدار الميراث ويجبر عليه" (ایضا ۲/ ۴۲۷)۔

معاشرے کی ذمہ داری:

لیکن ظاہر بات ہے کہ ہر ایک کو والدین کی سرپرستی ودل لگی حاصل نہیں ہوتی، یا اس کے اعزہ واقرباء ہوں جو اس کی کفالت اور نگہداشت کا حق ادا کرسکیں، کسی بھی سماج میں ایسے بچوں کی بڑی تعداد ہوتی ہے، جو یتیمی ومحرومی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوتے ہیں، قرآن اپنے ماننے والوں کو اس بات کی تاکید کرتا ہے کہ ایسے بے سہارا یتیم اور مسکین بچوں کو ظلم واستحصال کا نشانہ نہ بنایا جائے، بلکہ ان کی خبر گیری کی جائے، اور ان کے جائز مفادات کا تحفظ کیا جائے، "ويسألونك عن اليتامى، قل إصلاح لهم خير وإن تخالطوهم فإخوانكم والله يعلم المفسد من المصلح" (بقرہ: ۲۲۰)، اور یہ تحفظ انہیں اس وقت تک فراہم کیا جاتا رہے جب تک کہ وہ سن رشد کو نہ پہنچ جائیں، یعنی وہ شادی کی عمر کو پہنچ جائیں، اور ان کے اندر معاملات کی سمجھ پیدا ہو جائے، "وابتلوا اليتامى حتى إذا بلغوا النكاح فإن آنستم منهم رشداً فادفعوا إليهم أموالهم" (نساء: ۶)۔

قرآن حکیم نے ۲۸ مقامات پر یتیموں اور مسکینوں کے حقوق ادا کرنے اور ان کی پرورش ونگہداشت کی تلقین کی ہے، اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بے شمار احادیث میں اس کی تلقین فرمائی ہے اور اس کے بہت زیادہ فضائل بیان کئے ہیں، چنانچہ ایک حدیث میں آیا ہے: "أنا و كافل اليتيم فى الجنة هكذا وقال بإصبعه السبابة والوسطى" (صحیح بخاری جلد ۲، کتاب الادب، کتاب الزہد، ابوداؤد، ج ۲، باب من ضم یتیماً، ترمذی ج ۲، ابواب البر والصلۃ)۔

حکومت کی ذمہ داری:

اس کے بعد جو بچے بے سہارا ہو جائیں تو حکومت ذمہ دار ہے کہ ان کی ضروریات زندگی کا سامان کرے، جیسا کہ اسلامی دور حکومت کا عمل تھا، لہذا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خاص طور پر بے سہارا اور امکانی زیاں کا شکار بچوں کے سلسلہ میں سربراہ حکومت کو ان کی کفالت کا ذمہ دار قرار دیا ہے، او راسلامی ریاست کے سربراہ اول کی حیثیت سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان کرایا تھا: "أنا أولى بالمؤمنين من أنفسهم فمن مات وترك مالاً فماله لموالى العصبة ومن ترك كلاً أو ضياعاً فأنا وليه فلأدع له" (صحیح بخاری ج ۲ کتاب الفرائض، مسلم ج ۲ کتاب الفرائض، ابوداؤد ج ۲ کتاب الفرائض)۔

مذکورہ حدیث سے یہ گمان نہ کیا جائے کہ یہ صرف آپ کے ساتھ ہی خاص ہے، بلکہ ابوداؤد کی روایت میں صراحتاً یہ بات ملتی ہے کہ یہ ہر زمانے اور ہمیشہ ہمیش کے لئے ہے، حضرت مقدامؓ کی روایت ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "من ترك كلاً فإلیّ وربما قال إلى الله وإلى رسوله ومن ترك مالاً فلورثته" (ابوداؤد ج ۲ کتاب الفرائض)۔ اس حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ الفاظ "إلى الله وإلى رسوله" صاف طور پر دلالت کرتے ہیں کہ آپ کی ذات گرامی یقیناً ایک وقت کے لئے خاص تھی، لیکن جہاں تک اللہ کی ذات کا سوال ہے تو وہ ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا، اور اسی سے یہ بات بھی ثابت ہوئی کہ اللہ کے نائب کی حیثیت سے امام وقت کی ذمہ داری ہمیشہ ہمیش کے لئے ہے اور جب تک یہ کارخانہ ہست وبود قائم ہے اسے اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآں ہونا پڑے گا،، اسی طرح کی نصوص صریحہ کی روشنی میں علامہ ابن تیمیہؒ نے مسلمانوں کے سربراہوں کی پوزیشن اور ان کے فریضہ منصبی کو ان لفظوں میں واضح کیا ہے، "وهذا ظاهر فى الاعتبار فإن الخلق عباد الله على عباده وكلاء العباد على نفوسهم بمنزلة أحد الشريكين مع الآخر" (السياسة الشرعية في اصلاح الراعي والرعية لابن تيمية: ۱۲۔۱۳)۔

خلافت اسلامی کا عمل:

اسلام کے نقطہ نظر سے خلافت راشدہ کا زمانہ روئے زمین میں مرضیات الٰہی کی جلوہ نمائی اور احکام اسلامی کے عملی ظہور کا زمانہ ہے اور ان کے طرز عمل سے بھی اسلام کے تحفظ اطفال کی اس پالیسی کی تصدیق ہوتی ہے، امام ابو یوسفؒ نے بچوں کے سلسلہ میں خلافت فاروقی میں رائج پالیسی کو اس طرح بیان کیا ہے: ''بچے کے لئے ولادت کے بعد ہی سے سو درہم مقرر تھے جب وہ بڑا ہو جاتا تو اس کا وظیفہ دو سو کر دیتے، جب بالغ ہو جاتا تو اس میں اور اضافہ کر دیتے'' (اسلام کا نظام محاصل اردو ترجمہ کتاب الخراج: ۲۲۲، نوٹ: دیکھئے بچوں کی مزدوری اور اسلام، اور المکتبۃ الشاملہ)۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ صاحب زمام اقتدار وحکومت اپنے اندر کی دبی بلکہ مردہ انسانیت میں روح پھونکیں اور انصاف پروری سے کام لیتے ہوئے اپنی حکومت کے ضعیف طبقات کی طرف دھیان دیں، جو کہ نادار و بے کس اور اپنوں سے ٹھکرائے ہوئے ہیں، تاکہ ان کی کفالت وتربیت علی الاتم ہو سکے اور ملک وملت کے لئے نمایاں کردار ادا کر سکیں۔

(ح): بچوں کی خرید وفروخت:

الف: حق حضانت کے بنیادی شرائط وہدایات کے بیان میں بات آچکی ہے کہ اگر کوئی بچے کی پرورش کی استطاعت نہ رکھتا ہو تو اس سے حق حضانت ساقط ہو جاتا ہے (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۷/۲۶-۷۲۷)، نیز فقہاء نے یہ بھی لکھا ہے کہ اگر کوئی عورت بھلے ہی ماں کیوں نہ ہو، اگر بچے کی پرورش سے انکار کر دے تو اسے حضانت پر مجبور نہیں کیا جائے گا'' ("ولو امتنعت من الحضانة لم يجبر عليها" کشاف القناع ۵/۴۹۶)۔

لہذا بچے کے گارجین ووالدین کو بحالت مجبوری اجازت ہوگی کہ وہ اس بچے کو کسی اور کے حوالہ کر دیں، جو اس کی دیکھ بھال اور صحیح پرداخت پر قادر ہوں، اس سلسلہ میں بہتر ہے کہ بتلائے گئے شرعی مستحق حضانت کا خیال رکھا جائے، کیونکہ یہ اس بچے کے حق میں مفید ہوگا۔

لیکن یہ بات قابل غور ہے کہ کیا کلی طور پر اس بچے سے بے تعلق ہو سکتے ہیں، دراصل ایک بچے کے لئے والدین سے زیادہ کوئی اور ارفق وارحم

نہیں ہوسکتا، اور بچہ بھی کسی اور سے وہ انسیت نہیں رکھتا یا رکھ سکتا ہے جو اپنے والدین سے فطری طور پر ودیعتاً ہوتی ہے، ایسے میں تعلیمات اسلامی کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ والدین کا سرے سے قطع تعلق کرلینا مناسب نہیں، یہی وجہ ہے کہ فقہاء نے حاضن کو اس بات کی اجازت نہیں دی ہے کہ بچے کو کسی ایسی جگہ یا اتنی دور لے کر جائے جہاں اس کے گارجین اسے دیکھ نہ سکتے ہوں (فتاوی ہندیہ ۱/ ۴۸۴، وفتح القدیر ۴/ ۱۹۰ وبعدہا)۔

جہاں تک سوال اس بات کا ہے کہ کیا بچے کی پرورش کی غرض سے پیش کئے جانے والے ہدایا قبول کئے جاسکتے ہیں، اس بارے میں فقہاء اسلام کے مختلف نقطہائے نظر ہیں، جن میں شافعیہ اور حنابلہ کی رائے یہ ہے کہ حاضنہ ہدایا قبول ہی نہیں کرسکتی، بلکہ اس کو اجازت ہے کہ حضانت پر اجرت طلب کرے خواہ پرورش کرنے والی ماں ہی کیوں نہ ہو، کیونکہ ماں پر بچے کی پرورش واجب نہیں ہے...... (مغنی المحتاج ۲/ ۳۳۸۔ ۴۵۲، کشاف القناع ۵/ ۴۹۶،۸)۔

جب کہ حنفیہ نے یہ صراحت کی ہے کہ اگر حاضنہ ماں ہو اور ابھی وہ محضون کے والد کی بیوی، خواہ وہ معتدہ یا رجعیہ ہی کیوں نہ ہو حضانت پر اجرت لینا صحیح نہیں، اس لئے کہ اولاد کی پرورش دیانۃً اس پر واجب ہے، لہذا اگر وہ اجرت لے گی تو رشوت میں شمار کیا جائے گا، لیکن حاضنہ ماں کے علاوہ ہو یا مطلقہ ہو اور اس نے عدت گذار لی ہو تو ایسے میں وہ اجرت لے سکتی ہے...... (شامی ۲/ ۶۳۶۔ ۶۳۸)۔

نیز یہ بات فقہاء حنفیہ کے نزدیک مسلم ہے کہ اگر بچہ صاحب مال ہے تو حضانت کی اجرت اس کے مال سے ادا کی جائے گی، اور اگر نہیں ہے تو اس کے والد کے مال سے یا پھر ان کے مال سے جن پر اس کا نفقہ واجب ہوتا ہے...... (ایضا)۔

فقہاء مالکیہ کا کہنا ہے کہ (یہی امام مالک کا آخری قول بھی ہے) حاضنہ کا حق ہے کہ وہ حضانت پر اجرت لے...... (دیکھئے: الموسوعۃ الفقہیہ ۱۷/ ۳۱۲)۔

فقہاء کی رائیں پڑھنے اور غور کرنے سے ایسا خیال ہوتا ہے کہ اگر حاضنہ محضون کی ماں ہے تو دیانۃً اجرت لینا صحیح نہیں ہے، لیکن اگر بچے کا باپ صاحب متمول ہے تو بہتر ہے کہ کچھ دے دے، نیز ماں کے علاوہ حاضنہ حضانت کی اجرت لے سکتی ہے، اب جب اجرت لینے کی اجازت ہے تو ہدیہ وتحائف بدرجہ اولی قبول کرسکتی ہے۔

ب: اس سے کوئی صاحب نظر انکار نہیں کرسکتا کہ اسلام وہ ضابطہ حیات ہے جو زندگی کے ہر شعبے میں روشنی اور امن وآشتی کا پیغام دیتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ آج بچوں کے ساتھ ہو رہے ناسوز ودردمند حوادث اپنے آپ سے دوری، کیونکہ ''من عرف نفسہ عرف ربہ'' اور خدا پرستی سے مہجوری کی علامات ہیں، خوف خدا مفقود ہونے اور غرض وغایت مقصود ہونے کی نشاندہی ہیں، لہذا اسلام ایسے حالات میں نپٹنے کے لئے سب سے پہلا سبق یہ دیتا ہے کہ انسان اپنی پوری زندگی کا صحیح تصور اور پاکیزہ مقصد متعین کرے اور بے سمتی، وجودی خلفشار، عیش وعشرت کی زندگی کو اپنا عین نہ بنائے، ظاہر ہے کہ اس دوڑ کی کوئی منزل نہیں۔

نیز ایسے واقعات کے روک تھام کے لئے حکومت کا بڑا اہم کردار ہوتا ہے کہ وہ ایسے عملوں کو تیار کرے اور ایسے سخت قانون بنائے اور صرف بنائے ہی نہیں بلکہ نافذ بھی کرے، جو حرمت انسانی کو پامال کرنے اور معصوم نونہالوں کی زندگی دوبھر کرنے کے مرتکب پائے جاتے ہیں، اس سلسلہ میں اسلامی دور حکومت کے امراء بالخصوص خلفاء راشدین کا فعل قابل ذکر ہے، جو کہ اپنی رعایا کی حتی المقدور نگرانی کرتے اور غلطی پر مواخذہ کرتے تھے۔

ایک تیسری صورت یہ ہے کہ ''عوام میں بچے اور ان کے حقوق کے متعلق بیداری مہم چلائی جائے، اولاد کے نعمت خداوندی اور ذریعہ رحمت ہونے کا یقین دلایا جائے تاکہ اس طرح کے جرائم نہ خود کریں اور نہ کسی کو کرنے دیں، اور ایک ایسا معاشرہ وجود میں آئے جو "ولا یحض علی طعام المسکین" (الماعون: ۳) کی مثال نہ بنے، جو "فأما الیتیم فلا تقہر" (الضحی: ۹) کے مرتکب نہ ہوں، اور جو "وأما السائل فلا تنہر" (الضحی: ۱۰) کا خیال رکھیں۔

عصر حاضر میں جب کہ عموماً حکومت سے مسلمان محروم ہیں، چاہئے کہ آخر الذکر طریقہ پر عمل پیراں ہوں تاکہ ملک اور بالخصوص مسلم معاشرہ ایسی نادرست حرکتوں سے باز آجائیں۔

(ط): ذہنی یا جسمانی طور پر معذور بچوں کی تربیت ونگہداشت:

بچوں کو شریعت اسلامی نے جذبہ ترحم وشفقت کی نظر سے دیکھا ہے، یہاں تک کہ ان پر رحم نہ کرنے والوں کو غیر اسلامی روش پر مانا ہے، اس طرح کی حدیثیں بکثرت موجود ہیں، جن پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بغیر کسی بچے کی تعیین اور حال کا لحاظ کئے ہوئے ہر حال میں وہ جذبہ محبت وشفقت کے مستحق ہیں خواہ وہ جسمانی یا ذہنی اعتبار سے کمزور ولاچار ہی کیوں نہ ہو، بلکہ ایسے بچے والدین کی محبت وپرورش کے زیادہ مستحق ہیں، مگر شاید یہ زمانے کی ستم ظریفی ہے کہ جدید ٹکنالوجی وآلات کے دور نے انسانوں کو مشین اور پرزوں کی طرح بنا دیا، محبت وانسیت، ایثار وقربانی تو گویا قصۂ پارینہ ہوتی جارہی ہے، یہی وجہ ہے کہ اگر آج بچہ تندرست نہ ہوتو اسے ذہنی ہسپتالوں میں داخل کردیا جاتا ہے، اور ہر ممکن کوشش کی جاتی ہے کہ اس سے چھٹکارا پاسکیں اور نگہداشت وپرورش کی ذمہ داری سے بری ہوسکیں۔

اس مسئلہ مہمہ میں دو باتیں قابل ذکر ہیں: اولاً تو یہ کہ اللہ نے جب انسانوں کو ذمہ داری سونپی اور بزبان نبی فرمادیا گیا: "کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ" (سبق تخریجہ) تو اس کی ادائیگی کئے بغیر اس سے بے تعلق ہونا صحیح نہیں، ایسا کرنے والا عنداللہ ماخوذ اور واصل جہنم ہوسکتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ "إنما الأعمال بالنیات" (سبق تخریجہ)، اولاد عطیہ خداوندی ہے، ایسے میں اگر اس کے اندر کوئی بیماری یا نقص پیدا ہوتو چونکہ باپ پر نفقہ واجب ہے، لہٰذا اس کا علاج کروانا اس پر ضروری قرار پائے گا، خواہ اسے ذہنی ہسپتال میں داخل ہی کیوں نہ کرنا پڑے، مگر اس تعلق سے یاد رکھنا چاہئے کہ اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے۔

غرض یہ کہ اگر کوئی ہسپتال میں داخلہ کو علاج نہیں بلکہ فراغ وفرار کا ذریعہ بنائے یا سمجھے تو ہوسکتا ہے کہ دنیا میں اپنی حرکت چھپالے مگر قیامت کے روز اپنا دامن نہ بچا پائے گا۔

کس حد تک علاج کروانا ضروری ہے؟

انسانی جان بہت قیمتی ہے، اسے گنوانا یا نقصان پہنچانا حرام ہے، اللہ نے اسی لئے خودکشی کو، بلکہ ان تک پہنچانے والے تمام ذرائع کو بھی حرام قرار دیا ہے، "ولا تلقوا بأیدیکم إلی التہلکۃ" (بقرہ:۱۹۵)، اور آخرت میں ایسوں کی سزا کا ذکر کرتے ہوئے اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا ''جو شخص خودکشی کرے گا اور جس آلہ سے کرے گا، جہنم میں اسی آلہ سے اپنے آپ کو قیامت تک اذیت دیتا رہے گا''۔

حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے امراض کے لئے بزبانِ رسول ﷺ یہ بات فرمادی ہے کہ "لکل داء دواء" یعنی ہر مرض کی شفا اللہ نے رکھی ہے، یہاں تک فرمایا: اللہ کوئی بیماری نازل نہیں کرتا مگر اس کی دوا بھی ضرور نازل کرتا ہے''، اب ایسے میں معذور بچوں کو چھوڑ دینا، اس کا علاج نہ کروانا فعل قبیح، ناجائز اور حرام اور تکریم انسانی کے خلاف ہے، اسلامک فقہ اکیڈمی کی جانب سے ہونے والے سمینار بموضوع "قتل بجذبہ رحم" کے اندر اکثر مقالہ نگار نے یہی بات پیش کی ہے، اور یہ اتفاق کیا ہے کہ حتی المقدور اس کا علاج کروانا سرپرست واولیاء پر فرض اور نہ کروانا ''ولا تلقوا بأیدیکم إلی التہلکۃ'' کے زمرے میں شمار ہوگا۔

☆☆☆

اسلامی شریعت میں بچوں کے حقوق

مفتی محمد الیاس قاسمی

جواب (الف): حق حضانت عمر کی ایک حد میں عورتوں کو اور اس کے بعد مردوں کو حاصل ہوتا ہے، البتہ عورتوں کے طبعی رفق، شفقت اور چھوٹے بچوں کی تربیت کی طبعی صلاحیت کی رعایت کرتے ہوئے اسلام نے عورتوں کو اولیت دی ہے، اس مخصوص حد کے بعد حق حضانت مردوں کو حاصل ہوتا ہے، کیونکہ وہ بچوں کی حفاظت اور ان کے تعلیمی وتربیتی تقاضوں کو پورا کرنے پر زیادہ قادر ہوتے ہیں، فقہ کی کتابوں میں تفصیلات درج ہیں (دیکھئے: بدائع الصنائع ۴/۵۶، ہدایہ علی فتح القدیر ۴/۳۴۴-۳۳۰۳، بدائع ۴/۴۶)۔

بچوں کے مفاد میں مندرجہ ذیل صورتوں میں کسی مرد یا عورت کو حق پرورش سے محروم کیا جاسکتا ہے، کسی عورت یا مرد کے حق پرورش سے محروم ہونے کے بعد اس کے بعد کے قریبی مستحق کو حق پرورش حاصل ہوگا۔

۱۔ مرد (باپ وغیرہ) یا عورت (ماں وغیرہ) مرتد ہوجائیں۔

۲۔ مرد یا عورت ایسے فسق وفجور میں مبتلا ہو جس سے بچے کی تربیت و پرورش بہتر انداز میں نہ ہوسکے۔

۳۔ عورت کسی اجنبی مرد سے نکاح کرلے یا کسی ایسے رشتے دار سے نکاح کرلے جو بچے کے حق میں محرم نہ ہو۔

۴۔ عورت بلا اجرت بچے کی پرورش سے انکار کردے جب کے شوہر کی معاشی حالت اجرت کی متحمل نہ ہو۔

۵۔ مرد یا عورت کی حالت جسمانی یا اخلاقی اعتبار سے اطمینان بخش نہ ہو اور وہ بچی کی پرورش بہتر حالت میں نہ کرسکتے ہوں۔

۶۔ شریعت میں حق حضانت کے جو اصول ہیں، ان میں صرف ماں کے جذبات کی رعایت مقصود نہیں بلکہ زیر پرورش بچے کا مفاد بھی پیش نظر ہے، لہذا اگر پرورش کرنے والے مرد یا عورت کے گھر کا چال چلن، رہن، سہن اور تعلیمی حالت بچے کی پرورش کے لیے مضر و غیر اطمینان بخش ہو تو ایسے مرد یا عورت کو حق پرورش سے محروم کیا جاسکتا ہے (شامی ۵/۲۵۸، ۲۵۳، ۲۵۵)۔

جواب (ب): اسلام میں بچوں کے حق تعلیم وتربیت کے بارے میں درج ذیل بنیادی ہدایات ہیں:

(۱) اولاد کو خدا کا انعام سمجھنا چاہئے، ان کی پیدائش پر خوشی منانا چاہئے، خیر وبرکت کی دعاؤں کے ساتھ ان کا استقبال کرنا چاہئے، اللہ تعالی نے حضرت ابراہیمؑ کو اسحاقؑ اور حضرت زکریاؑ کو حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش کی اطلاع دی تو اسے خوش خبری سے تعبیر فرمایا (سورہ صف: ۱۱۲، مریم: ۷)۔

(۲) لڑکی کی پیدائش پر بھی اس طرح خوشی منانا چاہیے جس طرح لڑکے کی پیدائش پر مناتے ہیں، لڑکی ہو یا لڑکا دونوں اللہ پاک کا عطیہ ہیں کسی کو نہیں معلوم کہ اس کے لئے لڑکے کے مفید ہوں گے یا لڑکیاں؟

(۳) بچوں کا ایک بنیادی حق ان کے زندہ رہنے کا حق ہے، عام طور سے بچوں کی پیدائش کے بعد ان کا قانونی وجود تسلیم کیا جاتا ہے، لیکن اسلام کے نزدیک ماں کے پیٹ میں قرار حمل کے دن ہی سے وہ ایک قابل احترام اور لائق حفاظت انسان ہے، چنانچہ اسلام نے اسقاط حمل کو ناجائز قرار دیا ہے، بچے کی پیدائش کے بعد اسے دودھ پلانا ماں کی اخلاقی ذمہ داری ہے۔

''والوالدات یرضعن أولادهن حولین کاملین لمن أراد أن یتمّ الرضاعة'' (البقرہ: ۲۳۳)۔

''ولا تقتلوا أولادکم خشیة إملاق نحن نرزقهم وإیّاکم إنّ قتلهم کان خطأ کبیرا'' (سورہ بنی اسرائیل: ۳۱)۔

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں بچے لائے جاتے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم تحنیک فرماتے اور ان کے حق میں خیر وبرکت کی دعا کرتے

"عن عائشة رضی اللہ عنہا أن رسول الله ﷺ كان يؤتى بالصبيان فيبرك عليهم ويحنكهم" (مشكوٰة المصابيح ص ۳۶۲، باب العقيقة).

پیدائش کے بعد اذان واقامت کہی جائے، کسی نیک مرد یا عورت سے تحنیک کرائی جائے، بچے کے لیے اچھا سا نام تجویز کیا جائے، ساتویں دن عقیقہ کیا جائے، جب بچہ بولنے لگے تو سب سے پہلے اس کو کلمہ 'لا الٰہ الا اللہ' سکھانا چاہئے، بچوں کے ساتھ ہمیشہ شفقت، محبت اور نرمی کا برتاؤ کرنا چاہئے، چھوٹے بچوں کو گود میں لینا چاہئے، اور ان کے ساتھ خوش طبعی کا معاملہ کرنا چاہئے۔

بچے جب سات سال کے ہو جائیں تو انہیں نماز سکھانا چاہئے، اور نماز کی تلقین کرنا چاہئے، اور وہ دس سال کے ہو جائیں اور نماز میں کوتاہی کریں تو انہیں مناسب سزا دینا چاہئے، دس سال کی عمر میں ان کے بستر الگ کر دینا چاہئے۔

"مروا أولادكم بالصلوٰة وهم أبناء سبع سنين واضربوهم عليها وهم أبناء عشر سنين وفرقوا بينهم في المضاجع" (سنن أبي داؤد كتاب الصلوٰة باب متى يؤمر الغلام بالصلوٰة ص ۷۰).

جواب (۲): بچوں وبچیوں کو ان کی ضرورت کے بقدر تعلیم دینا فرض ہے، ان کو اس قدر دینی تعلیم دینا ضروری ہے کہ ان کے عقائد، اخلاق اور اعمال شرعیہ درست ہو جائیں، وضو و غسل کا طریقہ سکھایا جائے اور نماز وروزوں کی عملی تربیت دی جائے۔

"طلب العلم فريضة على كل مسلم" قال الشراح المراد بالعلم ما لا مندوحة للعبد منه كمعرفة الصانع والعلم بوحدانيته ونبوة رسوله وكيفية الصلوٰة فإن تعلمه فرض عين" (مرقاة المفاتیح ۱/ ۴۳۴، کتاب العلم ط: المکتبۃ الأشرفیہ دیوبند)۔

علم حاصل کرنا ہر مرد اور عورت پر فرض ہے، شارحین کہتے ہیں علم سے مراد وہ علم ہے جس کے سیکھنے کے علاوہ بندے کے لیے کوئی چارہ نہ ہو، جیسے صانع کی معرفت، اس کی واحدانیت، اس کے رسول کی نبوت اور نماز کی کیفیت کا علم اس لیے کہ اس کو سیکھنا فرض عین ہے۔

"جان لو کہ علم حاصل کرنا فرض عین ہے، اور یہ اپنے دین کی حاجت کے بقدر ہے، اور حصول علم فرض کفایہ بھی ہوتا ہے اور یہ اپنی حاجت سے زائد دوسروں کو نفع پہنچانے کے لیے حاصل کیا جانے والا علم ہے اور حصول علم مستحب بھی ہوتا ہے جبکہ فقہ اور علم قلب میں تبحر پیدا کیا جائے" (الدر المختار علی رد المحتار ۱/ ۱۲۶-۱۲۵)۔

امت کے بعض بچوں وبچیوں کو علم تفسیر، حدیث وفقہ کی تعلیم دینا اور علوم شرعیہ میں ان کو ماہر بنانا فرض کفایہ ہے تا کہ وہ امت کی دینی رہنمائی کا فریضہ انجام دے سکیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ "فلولا نفر من كل فرقة طائفة ليتفقهوا في الدين ولينذروا قومهم إذا رجعوا إليهم لعلهم يحذرون" (التوبہ: ۱۲۲)۔

اسلام میں دینی ودنیوی علوم کی کوئی تقسیم نہیں کی گئی ہے، بلکہ علم کی دو ہی قسمیں کی گئی ہیں:

"علم نافع اور علم غیر نافع"، جو علم انسانیت کے لئے مفید اور کارآمد ہو وہ "علم نافع" ہے اور جو علم انسانیت کے لیے نقصان دہ ہے وہ "علم غیر نافع" ہے، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے علم نافع کی دعا مانگی ہے، اور علم غیر نافع سے پناہ طلب کی ہے۔

میڈیکل تعلیم انجینئرنگ، طبعیات، اور حیوانیات یہ سب انسانی خدمت اور انسانیت کی فلاح وبہبود کے ذرائع ہیں اور یقیناً یہ علم نافع کی فہرست میں آتے ہیں اور ان کا حصول اسلام کا مطلوب ومقصود ہے، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنے زمانہ کی جدید تکنیک کی حوصلہ افزائی فرمائی ہے۔

بچوں کو اس قدر عصری تعلیم دینا ضروری ہے جس کے ذریعے وہ اپنی معاشی ضروریات کو پوری کر سکیں اور ایک باعزت اور خود کفیل شہری کی حیثیت سے زندگی بسر کر سکیں، یہ عصری تعلیم خواہ کسی ڈگری کے ذریعے مناسب روزگار حاصل کر کے ہو یا کسی ہنر وپیشہ کی تعلیم کے ذریعے۔

مختلف عصری علوم کے ساتھ مختلف زبانوں مثلاً انگریزی، مراٹھی، ہندی وغیرہ میں بچوں کی ایک تعداد کو ماہر بنانا بھی ضروری ہے تا کہ وہ اشاعت اسلام وتبلیغ دین کا فریضہ انجام دے سکیں۔

بچیوں کے لئے بھی عصری تعلیم ضروری ہے بشرطیکہ وہ درج ذیل شرعی حدود کے اندر ہو:

(۱) یہ تعلیم پردے کے ساتھ ہو، غیر محرم مردوں کے ساتھ خلوت وتنہائی اختیار کرنے سے اجتناب کیا جائے۔

(۲) یہ علم شرعاً ناجائز نہ ہو مثلاً رقص وموسیقی۔

(۳) یہ تعلیم عورتوں کی فطری صلاحیت اور دائرہ کار کے مغائر نہ ہو، مثلاً عورتوں کو ٹریفک پولیس کی تعلیم۔

(۴) اپنے سرپستوں یا شوہر کی اجازت سے تعلیم حاصل کی جائے۔

''ویمنعها من زیارة الأجانب وعیادتهم والولیمة وإن أذن کانا عاصیین'' (الدر المختار علی ردالمحتار ۵۔۲۵۔ ۳۲۴)۔

(شوہر بیوی کو روکے گا، اجنبی مردوں سے ملاقات کرنے سے، ان کی عیادت کرنے اور ولیمہ سے اور اگر وہ اجازت دے گا تو وہ دونوں گنہگار ہوں گے۔)

غزوات اور جنگوں میں خواتین اسلام مجاہدین کی مرہم پٹی کرتی تھیں۔ چنانچہ ربیع بنت معوذؓ سے مروی ہے۔

''عن الربیع بنت معوّذ قالت: کنا مع النبی ﷺ نسقی الماء ونداوی الجرحیٰ ونرد القتلی'' (کتاب الجهاد باب مداواة النساء الجرحیٰ فی الغزو ۶۱۶ ط: کولکاتا)۔

(ربیع بنت معوذ سے روایت ہے فرماتی ہیں ''ہم نبی ﷺ کے ساتھ (غزوہ) میں شریک ہوتی تھیں، مسلمان فوجیوں کو پانی پلاتی تھیں، زخمیوں کی مرہم پٹی کرتی تھی اور جو لوگ شہید ہو جاتے انہیں مدینہ اٹھا کر لاتی تھیں)۔

فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر کوئی خاتون ڈاکٹر میسر ہو تو مرد ڈاکٹر کے لیے عورت کا علاج کرنا جائز نہیں، اسی طرح اگر کسی عورت کے جسم پر زخم ہو جائے تو مرد ڈاکٹر کو چاہئے کہ اگر ممکن ہو تو وہ علاج کا طریقہ کسی خاتون کو سکھادے اور وہ خاتون اس عورت کا علاج کرے، اس سے معلوم ہوا کہ مسلم خاتون کو علم طب کی تعلیم حاصل کرنا چاہئے تاکہ وہ عورتوں کی خدمت کرسکیں (البحر الرائق ۸ر۵۳۹۔ ۵۲ ۳ ط: زکریا)۔

جواب (۳): اسلام میں طلب علم ہر مسلمان پر فرض ہے، اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے:

''طلب العلم فریضة علی کل مسلم'' (مشکوٰۃ المصابیح، ص: ۳۴ کتاب العلم)۔

فقہاء نے لکھا ہے کہ فرائض میں جبر سے کام لیا جاسکتا ہے جیسا کہ دس سال کا بچہ نماز نہ پڑھے تو اسے سزا دے کر نماز پڑھنے پر مجبور کیا جاسکتا ہے، اسی طرح سے بچوں کو حصول علم پر بھی مجبور کیا جاسکتا ہے، گویا اسلام جبری تعلیم کا قائل ہے (الدر المختار علی ردالمحتار ۲ر ۴۵)۔

امام بخاری نے اپنی کتاب صحیح بخاری میں ثابت کیا ہے کہ پانچ سال کی عمر میں بچوں کی تعلیم کا آغاز ہونا چاہئے۔

علامہ عینیؒ لکھتے ہیں: "قد ذکرنا أن المتأخرین قد حدّدوا أقل سن التحمل بخمس سنین" (عمدۃ القاری ۲/۱۰۱ ط: زکریا دیوبند)۔

بلوغت کے بعد بچوں کا نفقہ باپ کے ذمہ واجب نہیں رہتا، لیکن فقہاء لکھتے ہیں کہ اگر بچہ طلبِ علم میں مشغول ہو تو اس کا نفقہ باپ کے ذمہ لازم ہوگا (الدر المختار علی ردالمحتار ۵ر۳۴۱)۔

حکومت کے جائز قوانین کی پابندی ہم پر لازم ہے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ''یاأیها الذین آمنوا أطیعوا الله وأطیعوا الرسول وأولی الأمر منکم'' (النساء:۵۹)۔

علامہ شامی تحریر فرماتے ہیں: ''اس لئے کہ جو کام معصیت نہ ہو اس میں امام کی اطاعت واجب ہے'' (شامی ۶ر۴۱۴)۔

ایک ہندستانی شہری کی حیثیت سے ہم یہ عہد کرتے ہیں کہ ہم ملک کے قوانین کی پابندی کریں گے، لہٰذا ملک کے جائز قوانین پر عمل کرنا ہم پر لازم ہوگا، اللہ تعالی کا ارشاد ہے: "وأوفوا بالعهد إن العهد کان مسئولا" (الاسراء: ۳۴)۔

لہٰذا اگر حکومت کسی سطح تک کی تعلیم بچوں اور بچیوں کے لئے لازم قرار دے تو شرعاً اس کی پابندی مسلمانوں کے لئے درج ذیل شرطوں کے ساتھ لازم ہے:

(۱) لازمی تعلیم مفت ہو۔

(۲) غیر مستطیع طلبہ کو لوازماتِ تعلیم حکومت خود مہیا کرے۔

(۳) قریب البلوغ و بالغ بچیوں کے لئے علٰحدہ تعلیمی ادارے مہیا کیے جائیں۔

(۴) مواد تعلیم اسلام کے خلاف نہ ہو یا اخلاقی بے راہ روی کا باعث نہ بنے۔

(۵) اس تعلیم کی وجہ سے طلبہ وطالبات میں دین سے دوری اور دیگر مفاسد پیدا نہ ہوں۔

جواب (۴): جنس کی تعلیم بچوں کا حق نہیں ہے، کیونکہ اس تعلیم کی وجہ سے بچوں میں بے شرمی و بے حیائی پیدا ہوتی ہے، جبکہ اللہ تعالی نے اس کی مذمت بیان فرمائی ہے:

''إن الذين يحبّون أن تشيع الفاحشة في الذين آمنوا لهم عذاب أليم في الدنيا و الآخرة'' (سورہ النور: ۱۹) (جو لوگ چاہتے ہیں کہ چرچا ہو بدکاری کا ایمان والوں میں، ان کے لئے عذاب ہے دردناک دنیا اور آخرت میں)۔

''لأن الأصل أن سبب الحرام حرام'' (ہدایہ علی فتح القدیر ۱۰/۵۶ کتاب الکراھیۃ) (اس لئے کہ یہ اصول ہے کہ حرام کا سبب حرام ہوتا ہے)

اسلام نے سرپرستوں کو بچوں کو جذبات بھڑکانے اور شہوانی خیالات ابھارنے والی چیزوں سے دور رکھنے کا حکم دیا ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''ولا يبدين زينتهن إلا لبعولتهن أو آبائهن أو آباء بعولتهن أو أبناءهن ....أو الطفل الذين لم يظهروا على عورات النساء ....'' (النور: ۳۱)۔

(اور عورتیں اپنی زینت ظاہر نہ کریں مگر اپنے شوہر پر اور اپنے باپ پر اور اپنے شوہر کے باپ پر اور اپنے بیٹوں پر ....اور ان لڑکوں پر جو ابھی تک عورتوں کی پردہ کی بات سے واقف نہیں ہوئے ہیں....)۔

یعنی وہ بچے جو کم سنی کی وجہ سے عورتوں کے نشیب وفراز اور داخلی حالات سے واقف نہ ہوں، لہٰذا اگر بچہ چھوٹا ہو اور ان چیزوں کو نہ سمجھتا ہو تو اس کے عورتوں کے پاس جانے آنے میں کوئی حرج نہیں، لیکن اگر وہ قریب البلوغ ہو یا وہ ان چیزوں کو سمجھنے بوجھنے لگ گیا ہو تو پھر اس کو عورتوں کے پاس جانے کی اجازت نہیں دی جائے گی، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

''تمہارے بچے جب سات سال کے ہوجائیں تو انہیں نماز کا حکم دو اور جب دس سال کے ہوجائیں تو اس پر مارو اور ان کے بستر علیحدہ کردو'' (سنن ابی داؤد کتاب الصلوۃ باب متی یؤمر الغلام بالصلوۃ ص ۷۰)۔

اسلام نے حکم دیا ہے کہ بچہ جب شعور کی عمر کو پہنچ جائے تو راحت وآرام اور سونے کے اوقات میں اپنے والدین کے کمرے میں بلا اجازت داخل نہ ہو، کیونکہ یہ ایسے اوقات ہیں جن میں اپنے ماں باپ کو غیر مناسب حالات میں دیکھ کر بچے کے جذبات مشتعل ہوسکتے ہیں، جیسا کہ سورہ نور کی آیتوں میں ہے۔

جواب (ج): اسلام میں بلوغ سے قبل کم عمری کی شادی جائز تو ہے لیکن بچے اور بچی کی شادی بلوغ اور عمر میں پختگی آنے کے بعد مطلوب و مستحسن ہے۔

نابالغ بچیوں کا نکاح کرایا جاسکتا ہے، اس کا جواز قرآن مجید کی آیت اور حدیث عائشہ سے مستفاد ہے۔

اسلام نے خاندان، معاشرے اور ناگزیر انسانی مصالح کے تحت کم سنی کی شادی کو جائز رکھا ہے، لیکن اس کے نزدیک بہتر ہے کہ بچے اور بچیوں کی شادی پوری طرح بالغ ہونے کے بعد ہی کی جائے۔

جواب (د): عام حالات میں اسلام میں بچہ مزدوری کی اجازت نہیں، اسلام نے بچے کو کمزور قرار دے کر سب سے پہلے اس کمزور طبقہ کی جانب ہماری توجہ مبذول کرائی ہے، اسے ظلم واستبداد کے آہنی پنجوں سے نجات دلانے کے لیے اپنے ماننے والوں کو جہاد کا حکم دیتا ہے۔

اسلام کے نزدیک بچہ ایک قومی امانت اور قومی سرمایہ ہے، اس کا یہ حق ہے کہ اس کے ساتھ نرمی ومحبت کا سلوک کیا جائے اور اسے ظلم واستحصال کی تمام شکلوں سے بچایا جائے۔

بچوں سے کوئلہ کی کانوں اور دیگر پرخطر مقامات پر سخت محنت ومشقت کے کام لیے جاتے ہیں، جب کہ اسلام کا عام اصول ہے کہ بچوں سے ہی نہیں بلکہ کسی بھی شخص سے اس کی طاقت سے زیادہ کام نہیں لیا جاسکتا، اللہ کا ارشاد ہے

"لا يكلف الله نفسا إلا وسعها" (البقرہ: ۲۸۶) (اللہ تعالیٰ کسی شخص پر بوجھ نہیں ڈالتا مگر جتنا کہ وہ کر سکے)۔

بچہ مزدوری کی وجہ سے بچے کی صحت وتندرستی پر خطرناک اثرات مرتب ہوتے ہیں اور بعض اوقات وہ انتہائی مہلک امراض کا شکار ہوجاتا ہے، یہ نقصان وضرر کی ایک بدترین صورت ہے، اسلام نے نقصان وضرر تمام صورتوں کو ممنوع قرار دیا ہے۔

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"من ضارّ ضار الله به ومن شاق شاق الله عليه" (سنن ترمذی ۲/۲۵ ابواب البر والصلۃ باب ما جاء فی الخیانۃ والغش رقم الحدیث ۱۹۴۰) (جو کوئی کسی کے نقصان پہنچانے کے درپے ہوگا، اللہ اسے نقصان پہنچائے گا اور جو کوئی کسی کو ناحق دشمنی کا نشانہ بنائے گا اللہ اسے اپنی دشمنی کا نشانہ بنائے گا)۔

اسلام نے بچوں کی کفالت اور ان کی پرورش کا ایسا نظام بنایا ہے کہ کوئی بچہ کم عمری میں، بچہ مزدوری کرنے پر مجبور نہ ہو، اسلام نے بچوں کے اخراجات کی ذمہ داری والدین پر عائد کی ہے کہ وہ اپنے کمسن بچوں کا خرچ برداشت کریں۔

فقہاء تحریر فرماتے ہیں:

"نفقة الأولاد الصغار على الأب لا يشاركه فيها أحد كما لا يشاركه في نفقة الزوجة" (ہدایہ علی فتح القدیر ۴/۳۷۱) (کمسن اولاد کا نفقہ باپ پر واجب ہوگا، اس ذمہ داری میں اس کے ساتھ کوئی دوسرا شریک نہ ہوگا، جیسا کہ بیوی کے نفقہ میں اس کا کوئی دوسرا شریک نہیں ہوتا)۔

اگر کسی بچے کے والدین نہ ہوں تو اس کے اخراجات کی ذمہ داری اس کے قریبی رشتے داروں پر ہوگی، یہ ان کی قانونی ذمہ داری ہوگی جس کو لازما انہیں پورا کرنا ہوگا۔

"والنفقة لكل ذي رحم محرم إذا كان صغيرا فقيرا أو كانت امرأة بالغة فقيرة أو كان ذكرا بالغا فقيرا زمنا أعمى.... يجب ذلك على مقدار الميراث و يجبر عليه" (ہدایہ علی فتح القدیر ۴/۳۷۸)۔

(ہر ذی رحم محرم رشتے دار کا نفقہ اس کے قریبی اعزہ پر واجب ہوگا جبکہ وہ کمسن اور نادار ہو یا بالغ محتاج عورت ہو یا بالغ مرد ہو جو محتاج ہو یا اسی طرح سے وہ مرد جو مرض مزمن میں مبتلا ہو یا نابینا ہو..... یہ نفقہ اس کے اوپر میراث کی مقدار کی نسبت سے واجب ہوگا اور اس کے لئے اسے مجبور کیا جائے گا)۔

جواب (۲): والدین اپنے گھریلو کاموں میں نابالغ بچوں سے اس حد تک کام لے سکتے ہیں جس سے ان کی تعلیم متاثر نہ ہو، اسی طرح وہ اپنے بچوں سے شرعی دائرہ میں رہتے ہوئے جسمانی خدمت بھی لے سکتے ہیں۔

فقہاء لکھتے ہیں: "وإن استأجر الرجل ابنه ليخدمه في بيته لم يجز ولا أجر عليه لأن خدمة الأب مستحق على الابن دينا" (مبسوط ۱۶/۵۶ بحوالہ محمود الفتاوی ۳/۸۳)۔ (اور اگر کوئی شخص اپنے بیٹے کو مزدوری پر رکھے تاکہ وہ اس کے گھر میں اس کی خدمت کرے، تو یہ ناجائز ہے اور اس پر اسے مزدوری نہیں ملے گی، اس لئے کہ باپ کی خدمت بیٹے کی دینی ذمہ داری ہے)۔

اس سے معلوم ہوا کہ والدین اپنے نابالغ بچوں سے خدمت لے سکتے ہیں۔

اپنی معاشی ضروریات پورا کرنے یا بہتر بنانے کے لئے والدین بچوں سے مزدوری نہیں کرا سکتے، کیونکہ بچوں کے اخراجات باپ کے ذمہ لازم ہیں، لہٰذا بچوں کو مزدوری پر لگا کر ان کے حقوق پامال کرنا جائز نہیں، اسی طرح بچوں سے مزدوری کرانے سے ان کے عادات واخلاق کے بگڑنے کا اندیشہ ہے، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے کمسن غلام کو مزدوری پر لگانے سے منع فرمایا ہے، لہٰذا عام حالات میں اپنے نابالغ بچوں سے مزدوری کرانا بھی درست نہ ہوگا، آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

"ولا تكلفوا الصغير الكسب فإنه إذا لم يجد سرق" (موطا مالک ص ۳۸۵، کتاب الجامع باب الأمر بالرفق بالمملوک) (کمسن (غلام) کے اوپر کمائی کا بوجھ نہ ڈالو کیونکہ اگر اس کی کمائی نہیں ہوئی تو وہ چوری کرنے لگے گا)

ایسے نابالغ بچے جو قریب البلوغ ہوں والدین انہیں پیشہ وارانہ کام سکھانے کے لئے کام سے لگا سکتے ہیں، البتہ اگر وہ حصول تعلیم میں مشغول ہوں تو انہیں تعلیمی اوقات کے علاوہ دیگر وقت میں انہیں پیشہ وارانہ کام سکھایا جائے۔

چنانچہ فقہاء لکھتے ہیں: ''اور جب لڑکے کمائی کی حد کو پہنچ جائیں تو ان کو کسی کام پر لگائے گا تا کہ وہ کمائیں یا ان کو مزدوری پر رکھے گا اور ان پر ان کی مزدوری میں سے خرچ کرے گا، برخلاف بیٹیوں کے'' (الدر المختار علی رد المحتار ۵ر۲۷۵)۔

اسی طرح لڑکیوں کو سلائی کڑھائی جیسے پیشہ وارانہ کام سکھانے کے لئے لگا سکتے ہیں، البتہ ان سے مزدوری کرانا جائز نہیں۔

''علامہ حصکفی کا قول (برخلاف لڑکیوں کے) پس اس کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ انہیں کسی کام یا خدمت کے لئے اجرت پر رکھے (فتاوی تاتارخانیہ) اس لئے کہ کرائے پر لینے والا اس کے ساتھ خلوت اختیار کرے گا اور شرعا یہ مذموم ہے (ذخیرہ) اس سے یہ بات مستفاد ہوتی ہے کہ وہ لڑکی کو کسی عورت کے حوالے کرے جو اسے کوئی ہنر جیسے کشیدہ کاری یا سلائی سکھائے اس لئے کہ اس میں کوئی برائی نہیں ہے'' (شامی ۵ر۲۷۶، ط: زکریا)۔

جواب (۴): انتہائی غربت اور معاشی بدحالی کی بناء پر والدین کے لئے اپنے بچوں کو مزدوری پر لگانا درست ہے، البتہ درج ذیل شرطوں کی رعایت ضروری ہے:

۱) دیگر رشتے دار ایسے بچوں کی کفالت نہ کریں۔

۲) بچوں کی عمر مزدوری کرنے کی متحمل ہو۔

۳) بچوں کو ایسے کام پر لگایا جائے جس کے کرنے پر وہ قادر ہوں۔

فقہاء کرام تحریر فرماتے ہیں: ''باپ اور دادا یعنی باپ کا باپ یا ان کا وصی جب چھوٹے بچے کو کاموں میں سے کسی ایسے کام کی مزدوری پر لگائیں جس پر وہ چھوٹا بچہ قادر ہو تو یہ جائز ہے اور باپ کے ہوتے ہوئے دادا کو ولایت حاصل نہیں ہوتی'' (فتاوی عالمگیری ۴ر۴۳۶)۔

جواب (۵): شرعا بالغ ہونے سے پہلے اگر لڑکوں یا لڑکیوں سے جرائم سرزد ہوں مثلاً قتل، غارت گری، چوری زنا بالرضا یا زنا بالجبر تو ان پر شرعی حد جاری نہیں کی جائے گی، البتہ ان کی مناسب تعزیر کی جائے گی تا کہ وہ آئندہ اس سے اجتناب کریں۔ مختلف جرائم کے بارے میں فقہاء نے صراحت کے ساتھ تحریر کیا ہے کہ بچوں پر جرم کی حد جاری نہیں کی جائے گی (فتاوی عالمگیری ۲ر۱۵۰، ۲ر۱۵۹، ۶ر۴)۔

جرائم کے ارتکاب کے بعد بچوں کو ان کی جسمانی حالت کی مناسبت سے مناسب سزا دی جائے جو کس جرم کے سلسلہ میں متعینہ حد سے کم ہونا چاہئے، نیز سزا ایسی ہونا چاہئے کہ بچہ اس کا تحمل کر سکے۔

دور حاضر میں نابالغوں میں پھیلتے ہوئے جرائم پر قابو پانے اور ان کا سدّ باب کرنے کے لئے اسلام نے درج ذیل ہدایت دی ہیں:

۱۔ ان بچوں میں خوف خدا بٹھایا جائے اور آخرت کی جوابدہی کا احساس پیدا کیا جائے۔

''وأمّا من خاف مقام ربّه ونهى النفس عن الهوى ه فان الجنة هى المأوى'' (النازعات: ۴۰-۴۱)۔

(اور جو کوئی ڈرا ہو اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے سے اور روکا ہو اس جی کو خواہش سے، سو بہشت ہی ہے اس کا ٹھکانہ)

''ولمن خاف مقام ربّه جنّتٰن'' (الرحمن: ۴۶)۔

(اور جو کوئی اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرا اس کے لیے دو باغ ہیں)۔

۲۔ زنا پر قابو پانے کے لئے ان تمام محرکات کا سد باب کیا جائے جو بچوں کو اس پر آمادہ کرتے ہیں، مثلاً

(الف) پردہ کا نظام قائم کیا جائے اور غیر محرم خواتین کے ساتھ تنہائی سے منع کیا جائے۔

''الخلوة بالأجنبية حرام'' (الدر المختار على رد المحتار، كتاب الكراهية فصل فى النظر والمس)۔

(ب) مخلوط تعلیم بند کی جائے، لڑکیوں کے لئے علاحدہ مدارس اور کالج کھولیں جائیں۔

(ج) شراب پر مکمل طور سے پابندی عائد کردی جائے، کیونکہ شراب ام الخبائث ہے اور اکثر زنا کاری شراب کے نشے میں ہوتی ہے۔

(د) فحش لٹریچر اور فلموں پر پابندی عائد کردی جائے۔

۳۔ حکومت نے بلوغت کی عمر اٹھارہ سال مقرر کی ہے، اس میں ترمیم کرنا چاہئے، کیونکہ شرعاً بچے پندرہ سال کی عمر میں بالغ ہوجاتے ہیں اور جسمانی صحت اچھی ہوتو وہ اس عمر میں مختلف جرائم کا ارتکاب کر سکتے ہیں، لیکن قانونی طور سے اٹھارہ سال سے کم ہونے کی وجہ سے وہ سزا سے بچ جاتے ہیں، جس کے سبب ان میں مزید جرائم کے ارتکاب کا حوصلہ پیدا ہوتا ہے، موجودہ معاشرتی ماحول میں اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ بلوغت کی عمر پندرہ سال کردی جائے تاکہ جرائم سرزد ہونے پر ان کو سزا دی جاسکے اور بچوں میں بڑھتے ہوئے مجرمانہ رجحانات پر قابو پایا جاسکے، حضرت عبداللہ بن عمر بیان فرماتے ہیں کہ ایک جنگ کے موقع پر وہ رسول ﷺ کے سامنے پیش ہوئے تو انہیں اجازت نہیں ملی، اس وقت ان کی عمر چودہ سال تھی، پھر اگلے سال دوسری جنگ کے موقع پر پیش ہوئے تو اجازت مل گئی، اس وقت ان کی عمر پندرہ سال تھی، نافع نے بیان کیا کہ جب میں عمر بن عبدالعزیز کے یہاں ان کی خلافت کے زمانے میں گیا تو میں نے ان سے یہ حدیث بیان کی تو انہوں نے فرمایا کہ چھوٹے اور بڑے کے درمیان بے شک یہی حد فاصل ہے اور انہوں نے اپنے گورنروں کو لکھا کہ جس بچے کی عمر پندرہ سال کی ہو جائے اس کا فوجی وظیفہ بیت المال سے مقرر کردیں (سنن ترمذی ار ۳۰۰ ابواب الجہاد باب ماجاء فی حد بلوغ الرجل ومتی یفرض لہ)۔

سزا کے نفاذ میں سختی کی وجہ سے جرائم کا سد باب ہوتا ہے، للہذا جو جرائم پیشہ بچے شرعاً بالغ ہوچکیں ہوں ان کو سزا دینا چاہیے، حکومت سے مطالبہ کرنا چاہئے کہ وہ حد بلوغت کی عمر میں ترمیم کرے۔

جواب (و): جیلوں میں نابالغ قیدیوں سے پر مشقت کام لینا جائز نہیں، اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

''لا یکلف اللّٰہ نفسا إلّا وسعھا'' (البقرہ: ۲۸۶) (اللہ تعالی کسی شخص پر بوجھ نہیں ڈالتا مگر اس کی طاقت کے بقدر)۔

یہ حکم عام اشخاص کے لئے ہے تو بچوں سے ان کی طاقت سے زیادہ کام لینا بدرجہ اولی ناجائز ہوگا۔

جیل میں نابالغ قیدیوں سے ایسے ہی کام لیے جائیں جسے وہ بآسانی انجام دے سکیں، بچوں کو مزدوری پر لگانے کے متعلق فقہاء نے لکھا ہے کہ بچوں کو ایسے کاموں ہی کی مزدوری پر لگانا جائز ہے جس کو انجام دینے کی وہ قدرت رکھتے ہوں، لہذا جیلوں میں بھی بچوں سے ایسے ہی کام لئے جائیں جو ان کے بس میں ہوں (ہندیہ ۴؍۴۳۶)۔

نابالغ قیدیوں کی جیلوں میں بچوں سے سخت مار پیٹ کرنا قطعاً جائز نہیں، چنانچہ فتاوی عالمگیری ہے:

''الخامس أن لا یضرب الصبیان ضربا مبرحا ولا یجاوز الحد فإنه یحاسب یوم القیامة'' (فتاوی عالمگیری ۵-۳۷۹)

بچوں کی جسمانی حالت کے مطابق ان کو ایسی سزا دی جائے جس کو وہ برداشت کرسکیں، ان کے اصلاح کے لئے انہیں وعظ نصیحت کی جائے، ان کے اندر خوف خدا اور آخرت کی جوابدہی کا احساس پیدا کیا جائے۔

جواب (ز): بے سہارا بچوں کی پرورش، ان کی تعلیم وتربیت اور ان کو خاندانی ماحول فراہم کرنے کے سلسلہ میں اسلام نے سماج ومعاشرہ کو بہت سی ہدایت دی ہیں، قرآن مجید مسلمانوں کو اس بات کی تاکید کرتا ہے کہ ایسے بے سہارا ویتیم بچوں پر ظلم نہ کیا جائے، اور ان کے تحفظ کی کوشش کی جائے:

اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ''ویسئلونك عن الیتمٰی قل إصلاح لھم خیر وإن تخالطوھم فإخوانکم واللّٰہ یعلم المفسد من المصلح'' (البقرہ: ۲۲۰)۔

(اور وہ تم سے پوچھتے ہیں یتیموں کے بارے میں کہہ دو، ان کے ساتھ اصلاح حال کی روش بہتر ہے اور اگر تم انہیں اپنے ساتھ ملالو تو وہ تمہارے بھائی ہیں، اور اللہ جانتا ہے کہ کون اصلاح حال کی روش اپناتا ہے اور کون بگاڑ کا راستہ اختیار کرتا ہے)۔

اللہ کے رسول ﷺ نے بے شمار احادیث میں یتیموں کی کفالت وسرپرستی کی تاکید کی ہے اور اس کے فضائل بیان کیے ہیں:

''قال رسول ﷺ أنا و کافل الیتیم فی الجنة ھکذا وقال بإصبعه السبابة و الوسطی'' (الجامع الصحیح للبخاری ۲/ ۸۸۸ کتاب الأدب باب فضل من یعول یتیما)۔

(اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا ''میں اور یتیم کی کفالت کرنے والا جنت میں اس طرح ہوں گے اور یہ کہہ کر آپ ﷺ نے شہادت اور بیچ کی انگلی کو ملا کر اشارہ کیا)۔

عام طور پر یتیموں کی پرورش کے لیے یتیم خانے قائم کیے گئے ہیں، لیکن اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کی ترغیب دی ہے کہ یتیم کی پرورش اپنے گھر میں کی جائے اور اسے اپنے بچوں کی طرح پالا جائے۔

اسلامی حکومت میں بے سہارا بچوں کے تعلیم و تربیت کے اخراجات بیت المال سے پورے کئے جائیں گے، اگر بیت المال نہ ہو تو ایسے بچوں کے اخراجات کی کفالت عام مسلمانوں کی ذمہ داری ہوگی (دیکھئے: اعلاء السنن ۷ر ۱۴۲)۔

جواب (ح): بچہ کے کارجین حد درجہ بڑھے ہوئے افلاس اور پرورش کی استطاعت نہ رکھنے کی وجہ سے کسی کو اپنا بچہ حوالہ کر کے اس سے بے تعلق نہیں ہوسکتے، کیونکہ یہ اپنی اولاد کو ضائع کرنے کے مترادف ہے، اللہ تعالی نے شدید الفاظ میں اولاد کو ضائع کرنے کی مذمت بیان فرمائی ہے:

''قد خسر الذين قتلوا أولادهم سفها بغير علم'' (الأنعام: ۱۴۱)۔

(وہ لوگ انتہائی گھاٹے میں ہیں جنھوں نے اپنی اولاد کو نا سمجھی میں اپنی حماقت سے موت کے گھاٹ اتار دیا)

ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا: ''لا تقتلوا أولادکم من املاق'' (الأنعام: ۱۵۱) (اپنی اولاد کو مفلسی کی وجہ سے قتل نہ کرو)۔

اپنی اولاد کو دوسرے کے حوالے کر کے اس سے بے تعلق ہو جانا ایک طور سے اولاد کو ضائع کرنا ہی ہے، اولاد کو حاصل کرنے والا مختلف طریقوں سے اس کا استحصال کرسکتا ہے، ماحول کے اثرات قبول کر کے ایسا بچہ اسلام سے دور ہوسکتا ہے یا پھر بددین و ملحد بھی ہوسکتا ہے جبکہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

''یا یها الذین آمنوا قوا انفسکم و أهلیکم نارا'' (التحریم: ۶)۔ (اے ایمان والوں! اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو جہنم کی آگ سے بچاؤ)

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر شخص کو اپنی اولاد کا نگراں قرار دیا ہے اور ہر شخص سے اس کی اولاد کی تعلیم و تربیت کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''سن لو تم میں سے ہر ایک نگراں ہے اور ہر ایک سے اس کی رعیت کے بارے میں سوال کیا جائے گا، پس امام جسے عوام الناس کی سربراہی حاصل ہے وہ نگراں ہے اور اس سے اس کی رعایا کے بارے میں سوال کیا جائے گا اور مرد اپنے گھر والوں پر نگراں ہے اور اس سے اس کی رعیت کے بارے میں سوال کیا جائے گا اور عورت اپنے شوہر کے گھر اور اس کے بچوں پر نگراں ہے اور اس سے ان کی بابت سوال کیا جائے گا'' (صحیح بخاری ۲ / ۱۰۵۷، کتاب الأحکام)۔

فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر بچہ اور باپ دونوں غریب ہوں اور باپ کسی وجہ سے کمائی کر کے بچے کے اخراجات پورے نہ کرسکتا ہو تو اسے چاہئے کہ وہ لوگوں کے سامنے دست سوال دراز کر کے بچوں کا خرچ پورا کرے، لہذا کسی بھی حال میں کسی شخص کے لیے بچوں کو دوسرے کے حوالے کر کے بے تعلق ہونا جائز نہ ہوگا (دیکھئے: الدر المختار ورد المحتار ۵ر ۳۴۳)۔

سوال میں مذکورہ طریقے پر بچوں کو دوسروں کے حوالہ کر کے ہدیہ کی رقم حاصل کرنا قطعا جائز نہیں، کیونکہ یہ ہدیہ نہیں بلکہ دراصل بچوں کی فروخت کے بعد حاصل ہونے والی رقم ہے، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کے خلاف اعلان جنگ فرمایا ہے جو کسی آزاد انسان کو فروخت کرے۔

''حضرت ابو ہریرہؓ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ تین طرح کے لوگ ایسے ہوں گے جن کا میں قیامت کے دن مدعی بنوں گا: ایک وہ شخص جس نے میرے نام پر عہد کیا اور توڑ دیا، وہ شخص جس نے کسی آزاد انسان کو بیچ کر اس کی قیمت کھائی اور وہ شخص جس نے کوئی مزدور اجرت پر رکھا اس سے پوری طرح کام لیا، لیکن اس کی مزدوری نہیں دی'' (صحیح بخاری ر ۴۵۳، کتاب البیوع)۔

فقہاء کرام نے بھی آزاد انسان کی بیع کو باطل قرار دیا ہے، کیونکہ وہ مال متقوم نہیں ہے (تنویر الأبصار علی الدر المختار مع رد المحتار ۷ ر ۲۳۵،۳۶)۔

ایسے واقعات کی روک تھام کے لئے درج ذیل تدابیر اختیار کرنا چاہئے:

(۱) سماج و معاشرے کو ایسے غریب و نادار سرپرستوں کی مدد کرنا چاہئے، ان کی ضرورتوں کو پورا کرنا چاہئے، ان کے بچوں کی کفالت میں ان کا تعاون کرنا چاہئے

(۲) حکومت ایسے نادار والدین کے بچوں کی کفالت کے لئے ان کی مدد کرے اور ان کے لیے مخصوص اسکیم بنائے۔

(۳) حکومت کو ایسے غریب بچوں کی تعلیم و تربیت اور کفالت کے لیے ماہانہ مناسب وظیفہ دینا چاہئے۔

(۴) لڑکیوں کی شادی کے مشکل ومہنگی ہوجانے کی وجہ سے بھی اس طرح کے واقعات رونما ہوتے ہیں، والدین مستقبل کے خطرات ودشواریوں سے بچنے کے لیے اپنے بچے دوسروں کے حوالے کردیتے ہیں، لہٰذا شادی کو آسان بنایا جائے، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

''أعظم النكاح بركة أيسره مؤنة'' (مسند احمد ۶/ ۸۲)۔ (سب سے برکت والا نکاح وہ ہے جس میں مشقت کم سے کم ہو)۔

جواب (ط): اسلام نے کمزوروں، بیماروں اور معذوروں کو عزت کا مقام عطا کیا ہے، اسلام کا عقیدہ ہے کہ انسان صرف رزق کے حصول کا ذریعہ بنتا، ورنہ درحقیقت کمزوروں ومعذوروں کی دعاو برکت سے عام لوگوں کو رزق ملتا ہے، چنانچہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

عن أبي الدرداء قال قال رسول الله ﷺ ''ابغوني في ضعفائكم فإنما ترزقون وتنصرون بضعفائكم'' (سنن ترمذی ۱/ ۲۹۹ أبواب الجهاد)۔

(حضرت ابو درداءؓ سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ''تم مجھے غریب اور کمزور لوگوں میں تلاش کرو، تمھیں تو انہی کی وجہ سے رزق ملتا ہے اور انہی کی وجہ سے تمھاری مدد کی جاتی ہے)۔

اسلام نے جسمانی طور پر معذور بچوں کا نفقہ بلوغت کے بعد بھی ان کے باپ پر واجب قرار دیا ہے، چنانچہ فقہاء لکھتے ہیں:

''وكذا تجب لولده الكبير العاجز عن الكسب كأنثى مطلقا وزمن'' (شامی ۵/ ۳۴۱)۔

(اس طرح بالغ اولاد جو کمائی سے عاجز ہو اس کا نفقہ بھی واجب ہوگا، جیسے بیٹی کا نفقہ مطلقا اور مرض مزمن میں مبتلا اولاد کا نفقہ)۔

علامہ حصکفی کا قول (مزمن) یعنی جسے مرض مزمن ہو اور یہاں پر اس سے مراد ایسا مرض ہے جو اس کے لئے کمائی کرنے سے مانع ہو جیسے اندھا ہونا اور ہاتھ کی خرابی۔

معذور بچوں کے والدین پر ان کی طاقت وقدرت کے بقدر علاج ومعالجہ واجب ہے والدین ہی نہیں بلکہ عام انسانوں کا فریضہ ہے کہ وہ دوسروں کو حتی الوسع موت اور ہلاکت سے بچانے کی کوشش کریں، چنانچہ اگر کوئی شخص نماز میں مشغول ہو اور کسی نابینا کے کنوئیں میں گر جانے کا اندیشہ ہو تو نماز توڑ کر اس نابینا شخص کو کنوئیں میں گرنے سے بچانا واجب ہے۔

لہٰذا اپنی طاقت وقدرت کے بقدر/ معذور بچوں کا علاج ومعالجہ واجب ہے، اگر والدین کی معاشی حالت کمزور ہو اور وہ رفاہی اداروں نیز حکومت کے تعاون سے ان کا علاج کرانے پر قادر ہوں تو ان پر رفاہی اداروں اور حکومت کا تعاون حاصل کرکے معذور بچوں کا علاج کرانا واجب ہوگا، جسمانی وذہنی طور پر معذوروں کو باپ کی شفقت اور ماں کی ممتا سے محروم کرکے ہسپتال میں داخل کردینا جائز نہیں ہے، اسے اپنی ذمہ داری سے راہ فرار اختیار کرنا تصور کیا جائے گا، اسلام نے بیماروں ومعذوروں کے ساتھ محبت وہمدردی کی تعلیم دی ہے، لہٰذا ایسے بچوں کو گھر میں رکھ کر ان کے ساتھ حسن سلوک کرنا چاہئے تاکہ وہ اپنے آپ میں جینے کا حوصلہ پاسکیں، اسلام نے بیمار شخص کو تسلی دینے اور اس کے لئے دعا کرنے کی تعلیم دی ہے اور یہ تبھی ہوسکتا ہے جب معذور بچہ والدین کی نگرانی وتیارداری میں ہو، چنانچہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

جب تم مریض کے پاس جاؤ تو اس سے کہو ''ابھی تمھاری عمر بہت ہے'' یہ بات اللہ کے فیصلے کو رد نہیں کرسکے گی، لیکن اس سے اس کا دل خوش ہو جائے گا'' (سنن ترمذی ابواب الطب ۲/ ۲۹)۔

واللہ اعلم بالصواب وعلمہ اتم واحکم۔

☆☆☆

اسلام میں بچوں کے حقوق وآداب

مفتی محمد یاسر القاسمی[1]　　　　زیر نگرانی: مفتی محمد عبداللہ الفولفوری

اسلام ایک مکمل نظام حیات ہے، اس نے بچوں کو وہی مقام دیا ہے جو مقام دیگر بنی نوع انسانیت کے طبقات کو حاصل ہے، حضرت محمد ﷺ کا بچوں کے تئیں مشفقانہ اور محبت بھرا برتاؤ اسلام کی نظر میں بچوں کے حقوق کی اہمیت کی عکاسی کرتا ہے، یہی وجہ ہے کہ اسلام نے پیدائش سے قبل ہی بچوں کے اہم اور ضروری احکام اور ہدایات سے متعارف کرایا، تاکہ پیدا ہونے سے پہلے ہی جنین کو تحفظ فراہم کیا جائے، اس لئے کہ بچے مستقبل میں قوم کا سرمایہ ہیں، ان کی زندگی میں قوم کی بقاء وصلاح وفلاح مضمر ہے۔

پرورش کا حق: اسلام نے پرورش کو ایک حق کے طور پر تسلیم کیا ہے اور بچہ کی پرورش کے ذمہ داروں کو بالترتیب بیان کیا ہے اور اولین حق دار کی بھی تعیین کی ہے۔

بچہ کی پرورش کا سب سے زیادہ حق دار کون؟ عورتیں بچہ کی پرورش کی سب سے زیادہ حق دار ہیں اور وہی اس کے لئے موزوں بھی ہیں، اس لئے کہ ان کی شفقت اور محبت اور تربیت کی سوجھ بوجھ اور صبر وتحمل مرد کے مقابلہ زیادہ ہے، اور ان کے درمیان ماں کی شفقت ومحبت بے مثل اور بے بدل ہے، دنیا کی نرم سے نرم چیز بھی اس کی نرمی کے سامنے بے معنی ہے، اسی لئے زوجین کے مابین اگر کسی وجہ سے تفریق ہوجائے تب بھی بچہ کی پرورش کی وہ سب سے زیادہ حق دار ہے، چنانچہ فتاوی خانیہ میں ہے: أحق الناس بحضانة الصغیر حال قیام النکاح وبعد الفرقة الأم" (خانیة علی هامش الهندیه ۱/۴۲۲)۔

ماں کے بعد کس کا حق ہے؟ جب ماں کا دوسرا نکاح ہوجائے، یا وہ اپنے حق کو ساقط کردے، یا ماں کا انتقال ہوجائے، یا وہ پرورش کی اہل نہ ہو تو حق پرورش نانی کے ذمہ آجاتا ہے اگرچہ اوپر تک ہو، پھر دادی کے ذمہ اگرچہ اوپر تک ہو، پھر حقیقی کے بہن کے ذمہ، اسی طرح بالترتیب یہ حق محرم رشتہ داروں کی طرف مذکورہ بالا شرائط کے ساتھ منتقل ہوتا رہتا ہے (الدر مع الرد ۵/۲۶۲)۔

ماں کو پرورش کا حق کب تک؟ اسلام نے والدین میں سے ہر ایک بچہ کے ساتھ جذباتی لگاؤ کو احترام دیا ہے، مگر بچہ کے لئے مفید اور مثبت پہلو کو بھی نظر انداز نہیں کیا ہے، اس لئے کہ سن شعور کو پہنچنے کے بعد لڑکے کے لئے انتہائی نگہداشت کی ضرورت پڑتی ہے، اس کی تعلیم وتربیت، پاکدامنی پر خاصی نظر رکھنا ہوتی ہے اور باپ اس پر زیادہ قادر ہے اور زیادہ سوجھ بوجھ والا ہے، اس لئے سات سال کے بعد لڑکا والد کے حوالہ کردیا جائے گا اور لڑکی کو نسوانی آداب، سلائی، کڑھائی اور امور خانہ داری سیکھنا از حد ضروری ہے اور ماں کو اس میں زیادہ مہارت ہے، اس لئے بلوغت تک وہ ماں، دادی یا نانی کے ساتھ رہے گی، اور بلوغت کے بعد لڑکی کو باپ کے حوالہ کردیا جائے گا، اس لئے کہ اب اسے پاکدامن رکھنے کی ضرورت ہے اور باپ اس پر زیادہ قادر اور راہ یاب ہے اور بلوغت کے بعد لڑکا خود مختار ہے، چاہے تو ماں کے ساتھ رہے، یا باپ کے ساتھ، یا تنہا ہی زندگی بسر کرے اور لڑکی کو یہ حق حاصل نہیں ہے، البتہ اگر لڑکا بلوغت کے بعد بھی عقل وشعور سے محروم ہے تو اس کو والد اپنا لے گا۔

اگر بچی کی تربیت ماں اور نانی یا دادی کے علاوہ دیگر محارم کے حوالہ ہے، تو سن شہوت یعنی نو سال کی ہوجانے پر باپ کے سپرد کردی جائے گی، امام محمدؒ سے منقول ہے کہ فساد زمانہ کی وجہ سے ماں اور نانی یا دادی کا بھی یہی حال ہے، زیلعی نے اسی کو مفتی بہ قرار دیا ہے (الہندیہ ۱/۵۴۲، الدر المختار مع الرد ۵/۲۶۷، بدائع الصنائع ۳/۴۵۹، الفقہ الاسلامی وأدلتہ ۱۰/۷۳۰۴)۔

---

[1] ... بیت العلوم سرائے میر۔

اگر مستحق حضانت کے سپرد کرنے میں بچہ کا ضرر ہو: حضانت کا دارومدار بچہ کے لئے نفع بخش پہلو پر ہے، لہذا جو صورتیں بچے کے لئے مضرت رساں ہیں ان میں حق حضانت ساقط ہوجاتا ہے. "لأن مدار الحضانة على نفع الولد" (ردالمحتار علی الدر ۵/ ۲۶۶)، اسی لئے فقہاء احناف نے بھی حضانت کے ثبوت کے لئے چند شرائط کو ذکر کیا ہے، چنانچہ علامہ رملیؒ نے فرمایا: حاضنہ کے لئے یہ شرط ہے کہ وہ آزاد، بالغہ، عاقلہ، امانت دار اور بچہ کی پرورش پر قادر ہو اور اجنبی شوہر سے اس کا نکاح نہ ہوا ہو، آخری شرط پرورش کرنے والی خاتون کے ساتھ خاص ہے، باقی شرائط کا پرورش کرنے والے مرد میں بھی پایا جانا ضروری ہے، نیز پرورش کرنے والے کے لئے علامہ ابن عابدینؒ نے یہ بھی ضروری قرار دیا ہے کہ وہ ذی رحم محرم ہو، مرتدہ نہ ہو اور بچہ کو ایسے شوہر کے گھر میں نہ رکھا ہو جو بچہ سے بغض رکھتا ہے اور اگر لڑکے کا باپ تنگ دست ہے، پرورش کے نفقہ کی ادائیگی پر قادر نہیں ہے، تو اس کی ماں کو چاہئے کہ مفت پرورش کرنے سے انکار نہ کرے، یہ چند شرائط ہیں جن کا پرورش کرنے والے مرد و عورت میں پایا جانا ضروری ہے، ورنہ حق پرورش ساقط ہوکر دیگر ورثہ کی طرف منتقل ہوجائے گا (ردالمحتار علی الدر ۵/ ۲۵۳)۔

فقہاء کی ذکر کردہ شرائط سے پتہ چلتا ہے کہ حضانت کی قدرت، اہلیت، بچہ کی حفاظت اور اس کی منفعت پرورش کا خاص مقصود ہے، لہذا اگر بچہ ماں کی تربیت میں ضائع ہو رہا ہے تو اس کا حق حضانت ساقط ہوجائے گا، خواہ اس کے اسباب کچھ بھی ہوں، لیکن اگر پرورش کرنے والی خاتون متعدی بیماری میں مبتلا ہے، یا باعث نفرت بیماری میں مبتلا ہے، جس کا ضرر بچہ کو پہنچ سکتا ہے، جیسے جذام، برص اور دیگر متعدی امراض تو کیا اس کا حق پرورش ساقط ہوجائے گا؟ مجھے تلاش بسیار کے باوجود فقہ حنفی میں ایسا کوئی جزیہ نہیں ملا، البتہ امام مالکؒ چار اسباب کی وجہ سے حق پرورش کو ساقط کردیتے ہیں، ان میں سے ایک سبب پرورش کرنے والی کا ضرر رساں بیماری مین مبتلا ہونا بھی ہے، جیسے جنون، جذام اور برص، حضرات حنابلہ بھی مالکیہ کے ساتھ ہیں۔

مجھے لگتا ہے کہ اگر کوئی مسلمان عادل، طبیب حاذق یہ تصدیق کردے کہ یہ امراض بچے کے لئے مضر ہیں تو فقہ حنفی میں بھی حق پرورش کو ساقط کرنے والے اسباب میں اس کا شمار ہونا چاہئے: ''ففي الفقه الاسلامي وأدلته: تسقط الحضانة بأربعة أسباب عند المالكية: ومنها ضرر في بدن الحاضن كالجنون والجذام والبرص وافقهم فيه الحنابلة: (۱۰-۷۳۰۹) وفيه أيضاً: إذاثبت أن الولي غير مامون على الصغير والصغيرة ولو أباً يسلمان إلى من يليه في الولاية'' (۱۰-۷۳۱۰، الموسوعة الفقهيه: ۱۷-۳۰۶)۔

حق تعلیم وتربیت:

اسلام نے حصول علم پر بہت زور دیا ہے، "فلولا نفر من كل فرقة منهم طائفة ليتفقهوا في الدين ولينذروا قومهم إذا رجعوا إليهم لعلهم يحذرون" (التوبۃ: ۱۲۲) (کیوں نہیں ہر بڑی جماعت میں سے ایک چھوٹی جماعت نکلتی تاکہ وہ دین کی سمجھ حاصل کرے، تاکہ یہ لوگ جب اپنی قوم کے پاس واپس آئیں تو انہیں ڈرائیں تاکہ وہ ڈر جائیں)، نیز حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "طلب العلم فريضة على كل مسلم" (ابن ماجۃ: ۲۰۱) (حصول علم ہر مسلمان کی ذمہ داری ہے)، خواہ مرد ہو یا عورت، تعلیم کی اہمیت کی بنیاد پر ہر باپ کو ذمہ دار بنایا گیا ہے کہ بچہ کی اچھی تعلیم وتربیت کرے، چنانچہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑے جاذب اور ترغیبی انداز میں ایک باپ کو بچہ کی تعلیم وتربیت کا احساس دلایا کہ ایک باپ کا بچہ کے لئے سب سے بہتر تحفہ یہ ہے کہ اس کی بہترین تعلیم وتربیت کرے "ما نحل والد ولده أفضل من أدب حسن" (جامع الترمذی: ۱۰۲/۲)، بچیوں کی تربیت پر بھی آپ نے ترغیب دیتے ہوئے فرمایا: ''جس کے پاس تین لڑکیاں ہوں، اور اس نے ان کی اچھی تربیت کی، پھر ان کی شادی کرادی اور ان کے ساتھ اچھا سلوک کیا تو ایسے شخص کے لئے جنت کی بشارت ہے'' (سنن ابی داؤد رقم الحدیث: ۵۱۴۷)۔

بچوں کی تعلیم کے حدود:

اللہ تعالی کا ارشاد ہے: "يا أيها الذين آمنوا قوا أنفسكم وأهليكم ناراً" (التحریم: ۶) (اے ایمان والو خود کو اور اپنے گھر والوں کو جہنم کی آگ سے بچاؤ) اس کی تفسیر میں حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو خیر کی تعلیم دو، حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا: تم ان کو تعلیم دو اور انہیں بھلی بات کا حکم دو اور انہیں بری بات سے روکو، امام جصاص رازیؒ فرماتے ہیں: اس سے پتہ چلا کہ اپنی اولاد کو اور اہل خانہ کو دین اور خیر کی بات سکھلانا اور ان آداب کی تعلیم دینا جن سے وہ بے نیاز نہیں ہیں، ہم پر واجب ہے (احکام القرآن للجصاص ۳/ ۶۲۴)۔

لہذا والدین بلکہ تمام اولیاء کی ذمہ داری ہے کہ بچوں کو ان احکام کی تعلیم دیں، جن کے وہ بالغ ہونے کے بعد مکلف ہونے والے ہیں، لہذا بچپن ہی میں ان کو اسلامی عقائد کی تعلیم دینا واجب ہے، تا کہ ان کا عقیدہ درست ہو جائے اور ان عبادات کی تعلیم دینا واجب ہے جو ہر مسلمان پر فرض عین ہیں، جیسے نماز، روزہ، حج، زکوۃ اور اخلاص نیت وغیرہ، اس لئے کہ حضرت نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''سات سال کے بچوں کو نماز کا حکم دو اور دس سال کے ہو جائیں تو نماز کی خاطر مارو اور ان کا بستر الگ کردو'' (جامع الترمذی ار ۹۳)۔

پتہ چلا کہ بچوں کو سات سے پہلے ہی نماز اور دیگر عبادات کی تعلیم دی جائے تا کہ سات سال کے بعد بچے نماز وغیرہ دیگر عبادات ادا کر سکیں اور سات سال کا ہونے پر ان کو نماز کا حکم دیا جائے، تا کہ وہ بچپن ہی سے نماز وغیرہ کے عادی ہو جائیں اور ''شاب نشأ فی عبادۃ اللہ'' کا مصداق بنیں۔

اسی طرح بچوں کو مخرب اخلاق کبائر سے بھی متعارف کرایا جائے اور انہیں کم سنی ہی میں ان جرائم اور معاصی سے متنفر کر دیا جائے تا کہ بچہ بالغ ہوتے ہی شہوانی خیالات اور شیطانی اثرات سے محفوظ رہے، اس لئے اسے زنا، بدکاری، چوری، شراب نوشی، جھوٹ، غیبت، حسد، بغض وعناد، کبر، عجب، ریاء اور چغل خوری وغیرہ کی شناعت وقباحت سے متعارف کرادیا جائے، تا کہ بچہ ظاہری وباطنی امراض سے بالکل محفوظ رہے۔

قاضی ابوبکر بن العربیؒ والدین کو بچے کی بہتر تربیت پر ترغیب دیتے ہوئے تحریر کرتے ہیں: بچہ والدین کے پاس امانت ہے، اس کا پاک قلب ایک عمدہ اور سادہ جوہر ہے، جو ہر طرح کے نقش ونگار سے خالی ہے، ہر نقش کو قبول کرنے کی اس میں صلاحیت ہے، اس کو جس طرح مائل کیا جائے مائل ہو جاتا ہے، لہذا اگر اسے خیر کا عادی بنادیا گیا اور خیر کی تعلیم دی گئی تو خیر کے ساتھ پروان چڑھے گا اور دنیا وآخرت میں سعادت مند ہوگا، تو اس کے والدین، معلمین اور مؤدبین بھی ثواب میں شریک ہو جائیں گے، اور اگر بچہ شر کا عادی بن گیا اور اس سے غفلت برتی گئی تو وہ بدبخت بن جائے گا اور برباد ہو جائے گا اور اس کے ذمہ دار اور ولی کی گردن میں اس کا وبال ہوگا، جب باپ بچہ کو دنیا کی آگ سے محفوظ رکھتا ہے تو اسے آخرت کی آگ سے بدرجہ اولی محفوظ رکھنا چاہئے اور جہنم کی آگ سے بچہ کی حفاظت کا یہ طریقہ ہے کہ اس کی تربیت کرے، اس کو اچھے اخلاق کی ہدایت اور تربیت دے اور برے ساتھیوں سے اس کی حفاظت کرے، ناز ونعمت کا اسے عادی نہ بنائے اور زینت اور اسباب ترفہ کا اس کو عادی نہ بنائے، ورنہ بڑے ہو کر اسی کی طلب میں اس کی عمر ضائع ہو جائے گی اور وہ ہمیشہ کے لئے برباد ہو جائے گا (المدخل لابن الحاج ۴ر۳۱۱، از موسوعہ فقہیہ: ۱۳ر ۱۲ مادہ تعلیم وتعلم)۔

مناسب ہے کہ بچہ کو ایسے دنیاوی امور بھی سکھلائے جائیں جن کی بچہ کو ضرورت ہے، جیسے تیراکی، تیراندازی، گھوڑسواری، رائج الوقت زبانیں اور حسب ضرورت نفع بخش علوم کی تعلیم بھی دی جائے، تا کہ بچہ کی معیشت بھی بہتر ڈھنگ سے گذر سکے، حضرت عمرؓ نے فرمایا: "علموا أولادكم السباحة والرماية ومروهم فليثبوا على الخيل وثباً" (الفروسية لابن القيم: ص: ۶ معزياً عن الموسوعة الفقهية ۱۳ر ۱۲) (اپنے بچوں کو تیراکی اور تیراندازی سکھاؤ اور انہیں حکم دو کہ وہ گھوڑوں پر جست لگائیں)

عصری تعلیم کا حکم:

عصر حاضر میں علوم عصریہ کی اہمیت بہت زیادہ بڑھ گئی ہے، عصری علوم کے ذریعہ کسب معاش کی سہولت کے ساتھ ان کی افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا، سائنسی ایجادات نے سب کو محو حیرت کر دیا ہے، بڑے سے بڑے منصوبے چند ساعتوں میں مکمل ہو جاتے ہیں، انجینیرنگ، میڈیکل اور زبانوں کی مہارت نے بہت ساری مشکلات کو آسان کر دیا ہے، لہذا ایسے علوم کی تعلیم جس کے حصول میں شرعی قباحت نہ پائی جائے اس کے جواز میں کوئی کلام نہیں کیا جاسکتا، بلکہ اس کی افادیت کی بنا پر اس کو فرض کفایہ کا درجہ حاصل ہوگا، چنانچہ علامہ ابن عابدینؒ نے تبیین المحارم سے نقل کیا ہے کہ رہا فرض کفایہ علم تو یہ وہ علم ہے کہ دنیاوی امور کی انجام دہی میں اس سے بے نیازی نہیں ہے، جیسے طب، حساب، صنعت وحرفت کے اصول، کاشتکاری کے ضابطے، جیسے بنکری، سیاست اور حجامت، "وأما فرض الكفاية من العلم فهو كل علم لا يستغنى عنه في قوام أمور الدنيا كالطب والحساب.....إلى أن قال: وأصول الصناعة والفلاحة كالحياكة والسياسة والحجامة" (ردالمحتار علی الدر ۱ر۱۲۶)، تاہم شرعی علوم سے بے نیازی برتنا اور اعراض کر کے دنیاوی علوم کے پیچھے پڑ جانا بالکل نامناسب اور ناروا ہے۔

جبری تعلیم:

مدارس اسلامیہ نے تعلیم وتربیت میں اب تک وہ نمایاں کردار ادا کیا ہے، جس کی نظیر نہیں ملتی، مدارس کے مفت تعلیمی نظام نے برصغیر ہند وپاک

میں دین کے چراغ کو بجھنے نہیں دیا اور باطل کی تمام کوششیں اب تک ناکام رہی ہیں، ایسے میں حکومت کے ذریعہ مفت جبری تعلیم کا شوشہ دینی مدارس پر قدغن لگانے کا ایک حربہ ہے، مسلمان بھی اس ملک کا آزاد شہری ہے اور اسے اپنے اسلامی اصولوں کے ساتھ زندگی گزارنے کا پورا حق ہے، لہذا ایسی کسی تعلیم پر اسے مجبور نہیں کیا جاسکتا، جو اسے دین وایمان سے بے گانہ کردے، حکومت کے ذریعہ جبری تعلیم کا منصوبہ اسلامی تشخص کو مٹانے کی ایک منظم سازش ہے، اس لئے منظم طریقہ سے اس کی مخالفت ضروری ہے، ورنہ ہندوستان سے شعائر اسلامیہ کا مٹ جانا کچھ مستبعد نہیں ہے، البتہ مسلمانوں کے لئے ضروری ہے کہ ایسے ادارے قائم کریں، جہاں دینی تعلیم کے ساتھ عصری علوم بھی پڑھائے جائیں، تاکہ برق رفتار دنیا میں ہماری جدید نسل اپنا کردار نبھا سکے اور باعزت زندگی گزار سکے، مگر یہ بھی ضروری ہے کہ نظام تعلیم اور طریقۂ تعلیم مغرب زدہ نہ ہو بلکہ اسلامی آئین اور مزاج سے ہم آہنگ ہو، ورنہ مسلمانوں کے ذریعہ قائم کردہ ادارے بھی کارآمد انسانوں کے تیار کرنے میں ناکام ثابت ہوں گے، خلاصہ یہ کی قدیم صالح اور جدید نافع علوم کی اسلام میں مکمل آزادی ہے اور اسلام ایسے علوم کا داعی اور علم بردار ہے اور معصیت کے کاموں میں کسی کی اطاعت جائز نہیں ہے، خواہ وہ حکومت وقت ہی کیوں نہ ہو، چنانچہ مسلم شریف کی روایت ہے: "السمع والطاعة على المرء المسلم فی ما أحب و كره إلا أن يؤمر بمعصية فإذا أمر بمعصية فلا سمع ولا طاعة" (مسلم، کتاب الامارۃ رقم: ۱۸۳۹)۔

جنسی تعلیم:

جنسی تعلیم یا سیکس ایجوکیشن اہل یورپ کی ایجاد ہے، جس کا سبب یورپ کا اوپن کلچر اور کھلے پن کی ثقافت ہے، جس میں انسانوں کو شہوتوں کو استعمال کرنے کی مکمل آزادی حاصل ہے، اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ یورپی کلچر میں ایڈز جیسے خطرناک امراض نے جنم لیا اور وبا کی طرح پورے یورپ اور بعض افریقی ممالک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا، امریکہ، انگلینڈ اور یورپ جیسے ترقی یافتہ ممالک میں ہم جنسی کو قانونی حیثیت حاصل ہے، ایسے حالات میں بچوں کو مہلک بیماریوں سے بچانے کے لئے تعلیمی نصابوں میں سیکس ایجوکیشن کو بھی داخل کردیا گیا ہے، تاکہ شہوتوں کی تکمیل میں احتیاطی تدابیر استعمال کی جائیں اور مہلک امراض سے بچا جائے، اگر سیکس ایجوکیشن کا مطلب یہ ہے کہ بچوں کو پریکٹکل کرکے شہوانی مناظر کا مشاہدہ کرایا جائے، یا بچوں کو ایسے غیر فطری غیر انسانی انعال کے کرنے پر مجبور کیا جائے یا حوصلہ افزائی کی جائے فحش تصاویر، بلو فلموں اور ویڈیوز کے ذریعہ شہوت کے تئیں انہیں بیدار کیا جائے، تو اسلام کے پاکیزہ معاشرہ میں ایسے ایجوکیشن اور تعلیم کی کوئی گنجائش نہیں ہے، بلکہ بالکل حرام اور ناجائز ہے۔

اسلام میں جنسی تربیت:

جنسی احساس ایک فطری عمل ہے، جیسے بھوک، پیاس کا احساس فطری ہے، بچہ عمر کے بڑھنے کے ساتھ بہت کچھ سیکھتا رہتا ہے، اس کا یہ سیکھنا قدرتی اور فطری ہے، اس کے ذہن میں نت نئے سوالات ابھرتے رہتے ہیں اور ان سوالات کے حل کے لئے پہلے تو خود ہی کوشش کرتا ہے، پھر اپنے والدین سے دریافت کرتا ہے، اگر والدین سے تسلی نہیں ہوتی تو پھر قابل اعتبار ذرائع سے معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہے، دس سے پندرہ سال کی عمر کا عرصہ بچہ کے لئے انتہائی نازک دور سمجھا گیا ہے، یہ وہ دور ہے جب بچہ کے جنسی احساسات میں حد درجہ اضافہ ہوتا رہتا ہے، اسی لئے حدیث میں حکم دیا گیا ہے کہ جب بچے دس سال کے ہوجائیں تو ان کا بستر الگ کردو تاکہ خدانہ خواستہ وہ جنسی انحراف کا شکار نہ ہوجائیں، "وفرقوا بينهم في المضاجع" (أبوداؤد: رقم: ۴۹۵)۔

اس عمر میں والد کی ذمہ داری ہے کہ اپنے بچوں کو زیادہ تر ساتھ ہی رکھے تاکہ وہ بے راہ روی کا شکار نہ ہوں، چنانچہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "الزموا أولادكم" (اپنے بچوں کے ساتھ رہا کرو)، والدین کی ذمہ داری ہے کہ بچوں کی تربیت کے معاملہ میں وہ حساس ہوں، ان کے سوالات کا بہترین جواب دیں، حیاء کا مطلب یہ نہیں کہ ان کے سوالات کو بالکل نظر انداز کردیا جائے، یا ڈانٹ دیا جائے، یا انہیں غلط جوابات دیے جائیں، بلکہ بہتر ہے کہ انہیں صحیح اور ان کے سادہ دماغ کے مطابق جواب دیا جائے، بچہ جب جنسی سوال کرے تو اس کو حیوانات وغیرہ سے مثال دے کر سمجھایا جاسکتا ہے، قرآن کی آیات میں زنا، فاحشہ، حلم، رفث، ماء دافق، ھن لباس لكم جیسے کلمات کی بچوں کے ذہن کے مطابق سادہ سی تفسیر اور وضاحت کردی جائے، تاکہ بچے ان کی مراد اور احکام سے واقف ہوجائیں، بچوں کو استیذان، غض بصر اور ستر عورت کا پابند بنایا جائے اور ان کے دلوں میں یہ بٹھادیا جائے کہ تمہارے بعض اعضاء تمہارے لئے خاص ہیں، ان کو دیکھنے کی کسی کو اجازت نہیں ہے، اس لئے اپنے ان اعضاء کو کسی کے

سامنے ہرگز ظاہر نہ کرو، بچے جب قریب البلوغ ہوجائیں تو انہیں وجوب غسل، زائد بالوں کی صفائی، اور حیض وغیرہ کے احکام سے بھی باخبر کر دیا جائے، تاکہ بالغ ہونے کے بعد اپنے فرائض کی ادائیگی میں انہیں کسی الجھن کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

نکاح کے بارے میں بچے اور بچیوں کے حقوق:

آج دنیا کے جدید قانون میں بچپن کے نکاح کو قانونی درجہ حاصل نہیں ہے اور بچپن میں شادی کی اجازت نہیں ہے، جب کہ اسلامی شریعت میں نکاح کی صحت کے لئے بلوغ کو شرط قرار نہیں دیا گیا ہے، لہذا قبل البلوغ بھی شریعت اسلامیہ میں نکاح کی اجازت ہے، چنانچہ سورۃ الطلاق میں نابالغہ کی عدت تین حیض بیان کی گئی ہے "واللائی لم یحضن" (الطلاق: ۴)، اور یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ شوہر کے ساتھ خلوت اور تفریق کے بغیر عدت واجب نہیں ہوتی، لہذا اس آیت کریمہ سے مستفاد ہوتا ہے کہ نابالغی کی حالت میں نہ صرف نکاح جائز ہے، بلکہ خلوت بھی جائز ہے (احکام القرآن للجصاص ۲/۶۲)۔

وہبہ زحیلی نے جمہور ائمہ کا مسلک یہی بیان کیا ہے کہ نابالغہ کا نکاح جائز ہے، بلکہ ابن المنذرؒ نے اجماع کا بھی دعوی کیا ہے اور اس کے چند دلائل ہیں: (۱) نابالغہ کی عدت تین ماہ ہے، جیسا کہ "واللائی لم یحضن" (الطلاق: ۴) میں بیان کیا گیا اور عدت نکاح وفرقت کے بعد ہی ہوتی ہے، (۲) اللہ تعالی نے خواتین کے نکاح کا حکم دیتے ہوئے فرمایا: "وأنکحوا الأیامی منکم" (النور: ۳۲) غیر شادی شدہ عورت کے نکاح کا حکم دیا گیا، خواہ نابالغہ ہو یا بالغہ، (۳) حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے نکاح فرمایا جب میری عمر چھ سال تھی اور میرے ساتھ خلوت کیا جب میں نو سال کی ہوئی، نیز حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چچا حضرت حمزہؓ کی بیٹی کا ابن ابی سلمہؓ کے ساتھ عقد فرمایا جب کہ دونوں نابالغ تھے، (۴) صحابہ کے درمیان بھی نابالغی کے نکاح کو بالکل آزادی حاصل تھی، چنانچہ حضرت علیؓ نے اپنی بیٹی ام کلثومؓ کا حضرت عروہ بن زبیرؓ سے عقد فرمایا جب کہ وہ نابالغہ تھیں، حضرت عروہ بن زبیر نے اپنی بھتیجی کا اپنے ایک بھتیجے کے ساتھ عقد فرمایا جب کہ دونوں نابالغ تھے، ایک شخص نے اپنی نابالغہ لڑکی کو عبداللہ بن حسن بن علیؓ کو ہبہ کیا تو حضرت علیؓ نے اس کی اجازت دی اور عبداللہ بن مسعودؓ نے بھی اپنی بیٹی کے نکاح کی اجازت دی (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۹/۱۷۲)۔

بعض حضرات کا یہ نظریہ تھا کہ یہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت تھی، مگر حضرات صحابہ کے ذریعہ کیے گئے یہ عقود صراحتاً دلالت کرتے ہیں کہ نابالغی کے نکاح جائز ہیں۔

تاہم بالغ ہونے کے بعد نکاح کرنا بہتر ہے، نکاح کا پسندیدہ زمانہ بلوغ اور درستی عقل کے بعد کا زمانہ ہے، لہذا بلوغت کے بعد مناسب رشتہ ملنے کے باوجود بلا وجہ تاخیر کرنا مناسب نہیں ہے، ورنہ تاخیر کی صورت میں اولاد سے جو گناہ سرزد ہوگا اس کا وبال سرپرست کو بھی ہوگا، چنانچہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر تمہیں ایسا شخص نکاح کا پیغام دے جس کے دین واخلاق سے تم راضی ہو تو اس کا نکاح کردو، اگر تم نے اس کا نکاح نہیں کیا تو روئے زمین پر فتنہ وفساد عام ہوجائے گا۔ "عن أبي هريرة رضي الله عنه قال قال رسول الله ﷺ إذا خطب إليكم من ترضون دينه وخلقه فزوجوه إلا تفعلوا تكن فتنة في الأرض وفساد عريض" (أخرجه الترمذي رقم: ۱۰۸۴)۔

نیز حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے علی تین چیزوں میں تاخیر نہ کرو، نماز جب اس کا وقت ہوجائے، جنازہ جب وہ تیار ہوجائے اور بے نکاحی لڑکی کا نکاح جب کہ جوڑا مل جائے، "ثلاث لا تؤخر، الصلاة إذا أتت والجنازة إذا حضرت والأيم إذا وجدت لها كفوأ" (أخرجه الترمذي رقم: ۱۰۷۵)۔

حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح کی ترغیب دیتے ہوئے فرمایا: "اے نوجوانوں کی جماعت! تم میں سے جو نکاح کی استطاعت رکھتا ہو اسے نکاح کرلینا چاہیے، اس لئے کہ نکاح نگاہ کو پست کرنے اور شرمگاہ کی حفاظت کا باعث ہے" (صحیح البخاری رقم: ۵۰۶۶، صحیح مسلم رقم: ۳۳۹۸)، آج کل تاخیر نکاح کے مختلف اسباب ہیں، مثلاً جہیز کی بڑھتی لعنت، بارات وغیرہ کی بے ہودہ رسم، لڑکی کے یہاں دعوت کا اہتمام، نام ونمود کی خاطر حیثیت سے زیادہ اسراف، عصری تعلیم کی خاطر نکاح میں تاخیر اور رشتوں کو تلاش کرنے کا غیر شرعی معیار، ضرورت ہے کہ ان اسباب کا سد باب کیا جائے، اور مستقل تحریکوں کے ذریعہ ان اسباب کا صحیح حل نکالا جائے۔

بچہ مزدوری:

بچپن کا زمانہ تعلیم وتربیت کے لحاظ سے بڑا اہم زمانہ ہے، اس لئے والدین اور اولیاء کو چاہئے کہ بچپن میں بچہ کو پڑھنے کے لئے فارغ رکھیں، تاکہ بچہ دینی اور دنیوی علوم میں مہارت حاصل کرے اور بڑا ہو کر بہتر طریقہ سے زندگی گذار سکے، یہ بات مخفی نہیں ہے کہ آج مسلمانوں کا شرح تعلیم بہت کم ہے اور بچپن ہی سے بچوں سے کموانے کا مزاج بنا ہوا ہے، حالانکہ نابالغ اولاد کا نفقہ باپ کے ذمہ فرض ہے اور بلوغت کے بعد بھی اگر بچے زیر تعلیم ہوں تو ان کی کفالت باپ کے ذمہ عائد ہوتی ہے، اس لئے دنیا طلبی کے رجحانات کے چلتے بچوں سے مزدوری کرانا از روئے شرع جواز کے دائرہ میں نہیں آنا چاہئے، اگر والد بقید حیات نہ ہوں تو دیگر اولیاء کی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ بچوں کی تعلیم وتربیت اور نفقات کی فکر کریں، تاہم اسلام نے حالت مجبوری میں نابالغوں کو بھی مزدوری کی اجازت دی ہے، چنانچہ بدائع الصنائع میں ہے:

''والد، اس کے وصی، قاضی اور اس کے امین کی جانب سے بچہ سے مزدوری کرانا درست اور نافذ ہے، اس لئے کہ شریعت کی جانب سے ان کو نیابت حاصل ہے، لہذا باپ کے لئے جائز ہے کہ اپنے نابالغ بیٹے کو کسی بھی کام میں مزدوری پر لگا دے، اس لئے کہ باپ کو نابالغ بچہ پر ایسے ہی ولایت ہے، جیسے اسے اپنی ذات پر ولایت حاصل ہے، اس لئے کہ جس طرح باپ اپنی ذات پر شفیق ہے نابالغ بچہ کی ذات پر بھی شفیق ہے، باپ کو یہ اختیار ہے کہ خود کو اجارہ پر دیدے تو اسی طرح بیٹے کو بھی اجارہ پر دینے کا اسے اختیار حاصل ہے، اس لئے کہ اس میں نابالغ بچہ کے لئے مصلحت دو طرح سے پائی جاتی ہے: (۱) دراصل منافع مال نہیں ہیں، بالخصوص آزاد کے منافع اور اجارہ کے ذریعہ منافع مال بن جاتے ہیں اور غیر مال کو مال بنا دینا از قبیل مصلحت ہے، (۲) نابالغ بیٹے کو صنعت وحرفت میں مشغول کر دینا از قبیل تہذیب وتادیب اور ورزش ہے اور اس میں بچہ کے لئے مصلحت بھی ہے، لہذا باپ اس کا مالک ہے، تاہم دیگر محارم کے لئے بچہ سے مزدوری کرانے کا اختیار نہیں ہے، الا یہ کہ کسی قرابت دار کی پرورش میں ہو تو وہ بچہ سے مزدوری کرا سکتا ہے۔

اگر بچہ مدت اجارہ کے ختم ہونے سے پہلے ہی بالغ ہو گیا تو اس کو یہ اختیار ہوگا کہ چاہے تو اجارہ کو نافذ کردے اور چاہے تو فسخ کردے'' (بدائع الصنائع ۴/۱۷۷، ۱۷۸، المحیط البرہانی ۱۱/۳۰۹، ۳۱۰)۔

تاہم بچہ سے مزدوری کرانے میں اس کی مصلحت کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے۔

غربت کی بناء پر بچوں سے مزدوری کرانا:

جب تک بچہ کمائی کے لائق نہیں، نابالغ ہے، یا بچی ہے خواہ بالغہ ہی کیوں نہ ہو اس کا نفقہ والد پر عائد ہوتا ہے، اسی طرح بچہ بالغ ہو گیا مگر کمانے سے معذور ہے، اپاہج یا طالب علم ہونے کی بناء پر یا شریف زادہ ہے جس سے مزدوری کرانے کے لئے کوئی تیار نہیں تو اس کا نفقہ والد پر ہی عائد ہوتا ہے، اگر باپ محتاج ہے تو کما کر بچوں کو کھلائے اور اگر کمانے کی اس کے اندر استطاعت نہیں ہے تو حسب ترتیب دیگر اولیاء پر نفقہ کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے، اگر دوسرا کوئی ولی نہ ہو تو حکم ہے کہ باپ لوگوں سے بھیک مانگ کر بچوں کو کھلائے، صاحب بحر نے نقل کیا ہے کہ بعض حضرات کا خیال ہے کہ باپ اگر غریب ہے اور کمانے سے عاجز ہے تو اس کے بچوں کا نفقہ بیت المال سے ادا کیا جائے گا، چنانچہ درمختار میں ہے: "فلو كانا فقيرين فالأب يكتسب أو يتكفف وينفق عليهم" (درمع الرد ۵/۳۳۷)

اگر باپ محتاج ہے اور بچے کمانے کے لائق ہو جائیں، خواہ لڑکا نابالغ ہی کیوں نہ ہو تو باپ کو یہ اختیار ہوگا کہ اس سے مزدوری کرائے یا کسی پیشے سے وابستہ کردے، تاکہ اس کی کمائی سے اس پر خرچ کیا جائے، مگر لڑکی کو کسی کے حوالہ کر دینا درست نہیں ہے؛ اس لئے کہ اگر کسی کی خدمت میں لڑکی کو دیا گیا، تو مستاجر لڑکی کے ساتھ خلوت اختیار کرے گا اور از روئے شرع یہ جائز نہیں ہے، البتہ اسے درزی اور سلائی وغیرہ سیکھنے کے لئے اسے کسی خاتون کے حوالہ کیا جا سکتا ہے، چنانچہ رد المحتار میں ہے: ''فإن بلغه (حد الكسب) كان للأب أن يؤجره أو يدفعه في حرفة ليكتسب وينفق عليه من كسبه لو كان ذكراً بخلاف الأنثى'' (رد المحتار علی الدر ۵-۳۳۷، المحیط البرہانی ۴-۲۴۱)۔

بچوں کے جرائم اور ان کے احکام:

اگر بچوں سے زنا کا صدور ہو، یا بقدر نصاب چوری کریں، یا کسی اور جرم کا ارتکاب کریں تو اسلام میں ان پر حدود یعنی شرعی سزائیں جاری نہیں کی جاسکتیں؛ اس لئے کہ شرعی سزاؤں کے نفاذ کے لئے مکلف ہونا شرط ہے، جب کہ نابالغ بچے مکلف نہیں ہوتے، چنانچہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''رفع القلم عن ثلاث، عن النائم حتى يستيقظ وعن الصبي حتى يحتلم وعن المجنون حتى يعقل'' (مسند أحمد بن حنبل، رقم: ۳۸۷۸، ۲۴، ۱۰۰/۶) (تین طرح کے لوگ مرفوع القلم ہیں، سونے والا بیدار ہونے تک، بچہ بالغ ہونے تک، مجنون عقل مند ہونے تک)۔

موسوعہ فقہیہ میں ہے: ''حد مکلف پر ہی واجب ہوتی ہے اور مکلف عاقل بالغ ہوتا ہے؛ اس لئے کہ جب غیر عاقل، نابالغ سے عبادات میں مکلف ہونا ساقط ہو گیا تو معاصی میں بھی اس سے گناہ ساقط ہو جائے گا'' (الموسوعۃ الفقہیہ ۱۴۲/۱۷)۔

بدائع میں ہے: ''بچہ یا مجنون اگر کسی اجنبی عورت سے وطی کرلے تو اس پر کوئی حد نہیں ہے؛ اس لئے کہ ان دونوں کے فعل کو حرمت کے ساتھ متصف نہیں کیا جاسکتا؛ لہٰذا ان دونوں کا وطی کرنا زنا نہیں ہے؛ اس لئے اگر عورت بچہ کی موافقت کرے تو اس پر بھی حد واجب نہیں ہے'' (۴۸۷/۵، البحر الرائق ۵/۵، رد المحتار ۵/۶)۔

چور کا ہاتھ کاٹنے کے سلسلے میں علامہ کاسانیؒ تحریر فرماتے ہیں: ''فأهلية وجوب القطع وهو العقل والبلوغ، فلا يقطع الصبي والمجنون لما روي عن النبي ﷺ أنه قال: رفع القلم عن ثلاث، عن الصبي حتى يحتلم وعن المجنون حتى يفيق وعن النائم حتى يستيقظ'' (بدائع: ۷/۶)۔

البتہ نابالغ یا مجنون سے اگر کسی کا مال تلف ہو جائے تو اس پر ضمان عائد ہوگا، در مختار میں ہے: ''ولکنهما یضمنان المال'' (رد المحتار ۱۳۷/۶)۔

شریعتِ اسلامیہ میں گو بچہ پر کچھ سزائیں متعین نہیں ہیں، مگر یوں ہی چھوڑنے کا حکم بھی نہیں ہے، بلکہ بطور تادیب بچے کے اولیاء اس کی تعزیر کریں گے، چنانچہ ڈاکٹر زحیلی صاحب لکھتے ہیں: ''يشترط العقل فقط لوجوب التعزير بارتكاب جناية ليس لها حد مقرر في الشرع، فيعزر كل عاقل ذكر أو أنثى، مسلماً أو كافراً، بالغاً أو صبياً عاقلاً؛ لأن هؤلاء غير الصبي من أهل العقوبة، أما الصبي فيعزر تأديباً لا عقوبةً'' (الفقہ الاسلامی وأدلتہ ۷۔۵۵۹۹، بدائع الصنائع ۷۔۶۳)۔

بچوں کو جیل میں ڈالنے کا حکم:

مالکیہ اور شوافع کے نزدیک نابالغ بچوں سے جرائم سرزد ہونے کی صورت میں ان کو قید میں نہیں ڈالا جاسکتا، البتہ ان کے ساتھ تادیبی کارروائی کی جائے گی، خواہ مالی معاملہ ہو یا غیر مالی، مگر فقہائے احناف کے نزدیک مالی اور غیر مالی دونوں قسم کے معاملات میں تادیب کی غرض سے بچوں کو قید کیا جاسکتا ہے، نہ کہ سزا کے مقصد سے؛ اس لئے کہ بچے سزا کے مکلف نہیں ہیں، بچوں کو قید کرنے کا مقصد ان کی اصلاح اور تنبیہ ہے، تاکہ وہ جرائم پر جری نہ ہو جائیں:

علامہ ابن عابدینؒ رقم طراز ہیں:

> ''بچے کو صرف تادیب کے طور پر قید کیا جاسکتا ہے، تاکہ اس جیسے کام کی اسے پھر جسارت نہ ہو، بشرطیکہ اسباب تعدی کا اس سے قصداً ارتکاب ہوا ہو، لہٰذا اگر غلطی سے اس سے کسی جرم کا ارتکاب ہوا تو اسے قید نہیں کیا جاسکتا، اسی طرح مبسوط کے کتاب الکفالہ میں ہے، اور محیط میں بیان کیا گیا ہے کہ بغرضِ تادیب (نہ کہ بغرض سزا) بچے کو قید کردے، تاکہ وہ حقوق العباد کی ادائیگی میں ٹال مٹول نہ کرے؛ اس لئے کہ بچے کی سرزنش کی جاتی ہے تاکہ وہ قابل مذمت کاموں سے باز رہے'' (رد المحتار علی الدر ۱۲۳/۸، الہندیہ ۴۱۳/۳، معین الحکام: ۱۷۴)۔

ارتداد کی بنا پر بھی نابالغ لڑکے یا لڑکی کو قید کیا جاسکتا ہے (در مع الرد ۱۰۰/۶) مغنی میں ایسے باغیوں کو بھی قید کرنا بیان کیا گیا ہے جو قتال کے اہل نہ ہوں، تاکہ باغیوں کے دلوں میں شکستگی پیدا ہو (المغنی لابن قدامہ ۱۱۵/۸)۔

الموسوعۃ الفقہیہ میں ہے: ''اکثر نصوص دلالت کرتی ہیں کہ نوعمر بچوں کو ان کے والد یا ولی کے گھر میں قید کیا جائے گا، نیز اسے جیل میں بھی محبوس کرنا جائز ہے، مگر جب یہ اندیشہ ہو جائے کہ جیل کا ماحول بچے کو خراب کر دے گا تو اس کے والد کے پاس اسے قید کرنا واجب ہوگا جیل میں اسے قید نہیں کیا جاسکتا'' (الموسوعۃ الفقہیہ ۱۶ / ۳۱۸)۔

لقیط کے حقوق:

علمائے احناف کے نزدیک لقیط کو اٹھانے کا حکم یہ ہے کہ اگر لقیط کے نہ اٹھانے کی صورت میں اس کی ہلاکت کا اندیشہ ہے تو اس کو اٹھانا فرض کفایہ ہے، اور اگر کسی ایسی جگہ بچہ پڑا ہے کہ اس سے کوئی ایک شخص ہی واقف ہے تو اس کے لئے بچہ کو اٹھالینا فرضِ عین ہے، ورنہ تو مندوب ہے؛ اس لئے کہ لقیط کو اٹھانے میں اس کے ساتھ شفقت کا برتاؤ ہے اور اس کو زندہ رکھنے کی کوشش ہے (درمع الرد ۶ / ۴۲۳)۔

اگر کسی نے لقیط کو اٹھالیا تو اس کو پھینکنا جائز نہیں ہے، چنانچہ ابن عابدینؒ نے لکھا ہے: "وينبغي أن يحرم طرحه بعد التقاطه، لأنه وجب عليه بعد التقاطه حفظه" (ردالمحتار علی الدر ۶ / ۴۲۵)۔

لقیط کا سب سے زیادہ مستحق کون؟

ڈاکٹر وہبہ زحیلی صاحب لکھتے ہیں کہ بچہ کو اٹھانے والا دوسروں کے بالمقابل بچہ کا زیادہ مستحق ہے، اس کو اختیار ہے کہ اس کی تعلیم و تربیت میں خرچ کر کے احسان کرے، یا بچے کا معاملہ حاکم کے پاس لے جائے، تاکہ بیت المال کے صرفہ سے اس کی تربیت کا کسی کو حکم دے؛ اس لئے کہ بیت المال تمام مسلمانوں کی ضروریات کے لئے تیار کیا جاتا ہے، مگر یہ حکم اس وقت ہے جب بچے کے پاس مال نہ ہو، اگر اس کے پاس مال ہو اس طرح کہ اٹھانے والے کو اس کے پاس مال بھی ملا تو بیت المال میں اس بچے کا کوئی حق ثابت نہیں ہے اور علماء کا یہ اجماعی فیصلہ ہے، اور اگر اٹھانے والے نے بچے پر اپنے مال سے ہی خرچ کیا تو اگر قاضی کی اجازت سے خرچ کیا تو بالغ ہونے کے بعد بچے سے رجوع کرنے کا اختیار ہوگا اور اگر قاضی کی اجازت کے بغیر ہی خرچ کیا تو وہ متبرع ہوگا اور بلوغت کے بعد بچے سے رجوع کرنے کا اختیار نہیں ہوگا، اگر نظامِ قضا قائم ہو تو بچے کے جان و مال کا ذمہ دار قاضی ہوگا، یعنی بچے کی حفاظت، تعلیم و تربیت، نکاح اور اس کے مال میں تصرف کا اختیار قاضی کو ہوگا؛ اس لئے کہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: جس کا کوئی ولی نہ ہو تو سلطان اس کا ولی ہے، اٹھانے والے کو بچے کا نکاح کرانے یا مال میں تصرف کا کوئی اختیار نہیں ہے (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۶ / ۴۸۵۲)۔

بدائع میں ہے: "ومنها أن الملتقط أولى بإمساكه من غيره حتى لا يكون لغيره أن يأخذ منه" (بدائع الصنائع ۶ / ۱۹۸)۔

اس عبارت سے واضح ہو گیا کہ بچے کو اٹھانے والے سے کسی کو لینے کا اختیار نہیں ہے، البتہ اگر اٹھانے والا نابالغ ہونے یا مجنون ہونے یا فاسق و فاجر ہونے کی بنا پر بچے کی حفاظت کا اہل نہیں ہے جب کہ بچہ حد شہوت کو پہنچ جائے، یا اٹھانے والا کافر ہے اور بچہ مسلمان ہے تو اٹھانے والے سے لے لیا جائے گا، یا اٹھانے والا بچہ کی تعلیم و تربیت پر توجہ نہیں دیتا تو بھی اس کا حق ساقط ہو جانا چاہئے (ردالمحتار علی الدر ۶ / ۴۲۵)۔

اٹھانے والا اس سے اصلاح حال کی خاطر مزدوری کرا سکتا ہے اور کسی صنعت میں لگا سکتا ہے، مگر اجرت بچے ہی کی خاطر محبوس کی جائے گی اور بچے کی ضروریات میں خرچ کیا جائے گا، اٹھانے والے کو اپنی ذات پر خرچ کرنے کا اختیار نہیں ہوگا (بدائع الصنائع ۶ / ۱۹۹)۔

بچے کی چوری اور اس کی خرید و فروخت:

علماء احناف کے یہاں چوری کے تحقق کے لئے اشیاء مسروقہ کا مال متقوم ہونا شرط ہے؛ لہٰذا بچے کی چوری کو اصطلاح شرع میں چوری نہیں کہا جاسکتا؛ اس لئے کہ بچہ مال نہیں ہے، خواہ صغیر ممیز ہو یا غیر ممیز؛ اس لئے اگر کوئی اس کی چوری کرلے تو اس کا ہاتھ نہیں کاٹا جاسکتا، البتہ اگر بچے کے ساتھ بقدر نصاب مال ہو تو اس کی چوری کرنے والے کا ہاتھ کاٹا جائے گا یا نہیں؟ تو یہ مسئلہ علماء احناف کے درمیان مختلف فیہ ہے، امام ابو حنیفہؒ اور امام محمدؒ بچے کو اصل قرار دیتے ہیں اور مال کو تابع بناتے ہیں؛ اس لئے کہتے ہیں کہ چور کا ہاتھ کاٹا نہیں جائے گا اور حضرت امام ابو یوسفؒ کا مذہب یہ ہے کہ اگر تنہا مال کی چوری کرتا تو ہاتھ کاٹا جاتا تو جب بچے کے ساتھ مال کی چوری کیا ہے جب بھی ہاتھ کاٹا جائے گا، مگر یہ اختلاف اس بچے کے بارے میں

ہے جو کمسن ہے اور بول نہیں سکتا اگر بچہ خود سے چل لیتا ہے اور بول لیتا ہے تو اس کی چوری کرنے والے کا ہاتھ بالا جماع نہیں کاٹا جائے گا، خواہ اس کے ساتھ کتنا بھی مال ہو (الہندیہ ۲/ ۱۷۷، ۱۷۸)۔

تاہم اگر کوئی بچے کی چوری کا عادی ہو گیا ہے تو اس کو سخت سزا دی جائے اور حاکم وقت کو چاہئے کہ اسے اس وقت تک جیل میں رکھے جب تک وہ توبہ نہ کرلے (ردالمحتار علی الدر ۶/ ۱۵۴)۔

خلاصۂ کلام یہ کہ علماء احناف بچے کی چوری کرنے والے کے ہاتھ کاٹنے کے قائل نہیں ہیں، ہر چند کہ صاحب الفقہ علی المذاہب الاربعہ نے صبی غیر ممیز کی چوری کرنے والے کا ہاتھ کاٹے جانے کا قول امام ابو یوسفؒ کی طرف منسوب کیا ہے اور یہی امام مالکؒ کا مذہب بھی ہے، امام مالکؒ کے مسلک کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے جس کو امام دارقطنی نے بروایت حضرت عائشہؓ روایت کیا ہے کہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک ایسے شخص کو لایا گیا جو بچوں کی چوری کرتا تھا پھر دوسری جگہ لے جا کر انہیں فروخت کر دیا کرتا تھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے اس کا ہاتھ کاٹا گیا (دار قطنی ۳/ ۱۴۱)۔

آج کل یہ جرم بڑھتا جا رہا ہے، بچوں کی اسمگلنگ نے تجارتی شکل اختیار کرلی ہے، ان معصوم بچوں کو مختلف مقاصد کے لئے استعمال کیا جارہا ہے، کبھی انہیں فروخت کر دیا جاتا ہے، تو کبھی ان کے اعضاء رئیسہ کی خرید و فروخت ہوتی ہے، تو کبھی جنسی تسکین کے لئے انہیں ہدف بنایا جاتا ہے، ایسی صورت حال میں ایسے درندوں کو تعزیراً قتل کرنے کا حکم دینا چاہئے، چنانچہ درمختار میں ہے:

''امام کو یہ اختیار ہے کہ سیاسۃً چور کو قتل کر دے زمین میں فساد پھیلانے کی وجہ سے، مگر یہ حکم اس وقت ہے جب وہ بار بار چوری کرے، بہر حال ابتداءً قتل کرنا سیاست نہیں ہے'' (درمع الرد ۶/ ۱۶۹)۔

اگر والد غریب اور کمائی سے عاجز ہے جب بھی بچہ کو دوسرے کے ہاتھ فروخت کرنا یا ہبہ کرنا جائز نہیں ہے؛ اس لئے کہ لڑکا مال نہیں ہے اور آزاد کو نہ تو فروخت کرنا جائز ہے نہ ہبہ کرنا؛ اس لئے اگر باپ محتاج یا کمانے سے عاجز ہے تو دیگر اولیاء پر ان کا نفقہ واجب ہے اور اگر اولیاء بھی محتاج ہوں تو باپ بھیک مانگ کر بچوں کا خرچ چلائے گا۔

بے بی سنٹر میں بچے کی پرورش:

مرد و زن کے مساوات کے نعرہ نے خواتین کو گھر کی چہار دیواری سے نکال کر بازاروں کی زینت بنا دیا، مردوں کی طرح خواتین بھی مختلف النوع ملازمتوں سے وابستہ ہو گئیں جس کے نتیجہ میں بچوں کی پرورش کے لئے کرایہ کی گود کا سہارا لینے کی ضرورت پڑی اور اس ضرورت کی تکمیل کے لئے مغربی ممالک میں بے بی سنٹر کا قیام عمل میں آیا، جہاں کرایہ کی عورتیں بچوں کی پرورش کرتی ہیں، پرورش کرنے والی عورتیں مسلم اور غیر مسلم دونوں ہوتی ہیں تو کیا ایسے سنٹر میں ڈال کر بچوں کی پرورش کرانا جائز ہے؟

حضرات علماء احناف اور مالکیہ رحمہم اللہ تعالیٰ کے نزدیک پرورش کرنے والی خاتون کا بچہ کا محرم ہونا شرط ہے، جب کہ حنابلہ اور شوافع اس شرط کو ملحوظ نہیں رکھتے، نیز پرورش کرنے والی خاتون کا مسلمان ہونا علماء احناف کے یہاں شرط نہیں ہے؛ اس لئے جب تک بچہ دین کا شعور حاصل نہ کرلے کافرہ عورت سے بھی اس کی پرورش کرائی جاسکتی ہے، ان دونوں اصولوں سے یہ مستفاد ہوا کہ علماء احناف اور مالکیہ کے یہاں بلا ضرورت شدیدہ بے بی سنٹر میں بچے کی پرورش کرانا جائز نہیں ہے، البتہ اگر بچے کے ساتھ کوئی محرم رشتہ دار ہو تو جائز ہے اور اگر محرم رشتہ دار عورت میسر نہ ہوسکے تو مجبوری کی حالت میں حنابلہ اور شوافع کے مسلک پر عمل کرتے ہوئے بے بی سنٹر میں بچہ کی پرورش کرانا جائز ہے اور اگر بے بی سنٹر میں کافرہ عورت سے بچے کی پرورش کرانا پڑے تو سن شعور کو پہنچنے تک اس سے بچے کی پرورش کرانا جائز ہوگا اور جب یہ اندیشہ ہونے لگے کہ بچہ پرورش کرنے والی خاتون کے مذہب سے مانوس ہو جائے گا تو اس کو سنٹر سے نکال لینا واجب ہوگا (الموسوعۃ الفقہیہ ۱۷/ ۳۰۵)۔

تاہم ماں کی شفقت و محبت سے بڑھ کر کسی کی شفقت و محبت نہیں ہوسکتی؛ اس لئے بہتر تو یہی ہے کہ ماں سے ہی بچے کی پرورش کرائی جائے، البتہ مجبوری کی صورت میں مذکورہ بالا شرائط کا لحاظ کرتے ہوئے بے بی سنٹر میں بھی پرورش کرانا درست اور جائز ہے (واللہ اعلم بالصواب)۔

☆☆☆

اسلام میں بچوں کے حقوق

مفتی آصف پالنپوری [1]

(الف): اسلام میں بچہ کی پرورش اور اس کی دیکھ بھال کو ایک حق کے طور پر مانا گیا ہے کہ پیدائش کے بعد بچہ کے لئے کوئی آدمی اس کی پرورش و پرداخت کے لئے موجود رہے، چنانچہ شریعت نے لمبی فہرست بیان کی ہے، چونکہ اللہ تعالی نے والدین کے دلوں میں بچوں کی محبت وشفقت اور بچوں کے دلوں میں بھی والدین سے تعلق خاطر کا بیش بہا ذخیرہ رکھ دیا ہے، پھر والدین میں بھی ماں کا رتبہ اس سلسلہ میں بہت اونچا ہے اور ماں کے دل کی نرمی کی تو دنیا میں کوئی مثال نہیں ہے، ان ہی فطری خصوصیات کی وجہ سے اسلام نے بچہ کی پرورش کی ذمہ داری اور اس کا حق اولا ماں کو دیا ہے اور ماں کے لئے یہ حق جہاں زوجین کے درمیان نکاح کے باقی رہنے کی صورت میں ہے وہیں اگر میاں بیوی کے درمیان کسی وجہ سے تفریق ہو جائے تب بھی پرورش کا اختیار اور اس کا حق ماں ہی کو ہوگا۔

فتاوی قاضی خاں میں ہے: "أحق الناس بحضانة الصغير حال قيام النكاح وبعد الفرقة الأم" (۱ر ۴۳۳)۔

نیز اسی طرح ایک مرتبہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایک عورت نے شکایت پیش کی کہ میں اپنے بچہ کی پرورش کر رہی ہوں مگر پہلا شوہر مجھ سے چھیننا چاہتا ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو جواب میں فرمایا: "أنت أحق به منه مالم تنكحي" (فتاوی قاضی خاں ۱ر ۴۳۳)۔

ماں نے اگر اولاد کے کسی غیر ذی رحم محرم سے شادی کر لی تو اس کا حق پرورش ساقط ہو جاتا ہے اور فقہاء کرام کے بیان کردہ ترتیب کے مطابق یہ حق ان کی طرف منتقل ہو جاتا ہے (دیکھئے: احسن الفتاوی ۵ر ۵۴۹)۔

الغرض والدین کے دلوں میں اللہ تعالی نے اپنے بچوں سے محبت کا بے پناہ جذبہ رکھ دیا ہے، جس کی بنا پر ان میں سے ہر کوئی اپنے بچوں کی پرورش کرنا چاہتا ہے لیکن اس سلسلہ میں اللہ تعالی نے ماں کی محبت نیز بچہ کے نفع کے خاطر کم سنی میں ماں کو ہی پرورش کا اختیار دیا ہے، کیوں کہ یہ ایسا زمانہ ہوتا ہے جس میں ماں ہی اپنے بچہ کی صحیح طور پر پرورش و تربیت کر سکتی ہے، مگر شریعت نے باپ کو بھی اس خواہش سے محروم نہیں رکھا ہے اور اسے بھی حق دیا ہے، چنانچہ بچہ زیادہ عمر کا ہو جائے تو اب اس کی پرورش کی ذمہ داری باپ کے سر آجاتی ہے، فقہاء کرام نے احادیث و آثار کی روشنی میں مسئلہ مستنبط کیا ہے کہ بچہ کے اندر جب ہوش و حواس پیدا ہو جائے اور اپنی ضروریات کو خود ہی پورا کرنے کی صلاحیت آجائے، عمر کے لحاظ سے بچہ سات سال کا اور بچی نو سال کی ہو جائے یا حیض شروع ہو جائے تو ان کی پرورش کا حق باپ کو ہوتا ہے، کیوں کہ تو اب اس کی تعلیم و تربیت کی ضرورت پڑے گی اور باپ ہی اس کے لئے موزوں ترین آدمی ہے، اسی طرح جب بچی بالغ ہو جائے تو اس کی شادی کا مسئلہ درپیش ہوگا اور باپ ہی اس کو صحیح طور پر انجام دے سکتا ہے (بچے حقوق واحکام ص: ۴۷ – ۳)۔

مندرجہ ذیل وجوہ سے حق حضانت ساقط ہو جاتا ہے:

(۱) بچہ کے غیر ذی رحم محرم سے نکاح کر لیوے۔

(۲) بچہ کی پرورش پر اجرت طلب کرے جبکہ بچہ کے ذی رحم محرم میں سے کوئی دوسری عورت بلا اجرت پرورش پر راضی ہو۔

(۳) کسب کی وجہ سے بکثرت باہر نکلتی ہو جس سے بچہ کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہو۔

(۴) ایسے فسق و فجور میں مبتلا ہو کہ اس سے بچہ کے ضیاع کا خطرہ ہو۔

(۵) اگر فاسقہ کے پاس بچہ کے ضیاع کا خطرہ نہ ہو تو اس کے پاس اتنی عمر تک چھوڑا جائے گا جس میں برے اخلاق سے متاثر ہونے کا اندیشہ نہ ہو۔

(۶) کافرہ کے پاس اتنی عمر تک چھوڑا جائے گا جس سے اس کے دین سے متاثر ہونے کا خطرہ نہ ہو۔

---

[1] جامعہ اسلامیہ قاسمیہ رتن پور، گجرات۔

(۷) مرتدہ یعنی خدانخواستہ کوئی مسلمان عورت شیعہ یا قادیانی ہوجائے یا کوئی دوسرا مذہب اختیار کرلے (دیکھئے: احسن الفتاوی ۵/۴۵۹-۴۶۰، فتاوی رحیمیہ ۸/۴۵۶، فتاوی دار العلوم دیوبند ۸/۱۰ وغیرہ)۔

البتہ اگر ماں کے پاس تربیت اسلام کے مطابق نہیں ہو رہی ہے تو ماں کے پاس سے واپس نہیں لے سکتے ہیں جیسا کہ فتاوی دار العلوم (۱۱/۱۰۹) پر ایک سوال وجواب سے معلوم ہوتا ہے۔

(ب) (۱-۲): اسلام جن فکری عقائد اور عملی احکام کا داعی وطالب ہے، اس کے لئے تعلیم نہایت ہی ضروری عمل اور اہم ہے، اسی وجہ سے قرآن مجید میں عالم اور جاہل کے درمیان واضح لفظوں میں فرق بیان کیا گیا ہے، "قل هل يستوي الذين يعلمون والذين لا يعلمون"۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنی امت کو تعلیم کی دعوت دیتے ہوئے امت کا یہ فریضہ بتایا ہے کہ وہ علم حاصل کریں، "طلب العلم فريضة على كل مسلم"۔

تعلیم کی اسی اہمیت کے پیش نظر اسلام میں ہر باپ کا فریضہ بتایا گیا ہے کہ وہ اپنے بچہ کی اچھی تعلیم وتربیت کا انتظام کرے، چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک باپ کا اپنے بچہ کے لئے سب سے بہترین ہدیہ وتحفہ بہترین تعلیم وتربیت ہے۔ "ما نحل والد ولداً من نحل أفضل من أدب حسن" (سنن ترمذی: ۱۹۵۲)۔ تعلیم کے سلسلہ میں حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسی فرمان کا نتیجہ تھا کہ حضرت ابن عباسؓ جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت صرف دس برس کے تھے فرماتے تھے" کہ ہم نے اس عمر میں پورا قرآن پڑھ لیا تھا، "توفي رسول الله ﷺ وأنا ابن عشر سنين وقد قرأت المحكم" (بخاری شریف: ۵۰۳۵ باب تعلیم الصبیان القرآن)۔

تعلیم کے سلسلہ میں اسلام نے لڑکے اور لڑکی کے درمیان کوئی تفریق نہیں رکھی ہے، بلکہ جس طرح لڑکیوں کے لئے بنیادی تعلیم کو ضروری قرار دیا ہے، اسی طرح لڑکی کے لئے بھی اسے ضروری کہا ہے۔

اسلام میں مرد وعورت کے الگ الگ فرائض ہیں اور اپنے فرائض سے واقفیت کے لئے علم کا ہونا ضروری ہے، اس لئے اسلام میں بلا تفریق کے بنیادی تعلیم ضروری قرار دی گئی ہے، چنانچہ لڑکیوں کی اچھی تعلیم وتربیت اور ان کی شادی کا اچھا انتظام کرنے والے باپ کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنت کی بشارت سنائی ہے۔

"عن أبي سعيد الخدري رضي الله عنه قال قال رسول الله ﷺ: من عال ثلاث بنات فأدبهن وزوجهن وأحسن إليهن فله الجنة" (سنن ابی داؤد: ۵۱۴۷) (حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس کی تین لڑکیاں ہوں اور ان کی اچھی تربیت کی پھر ان کی شادی کرائی اور ان کے ساتھ اچھا معاملہ رکھا تو ایسے شخص کے لئے جنت کی بشارت ہے)۔

بچوں کو عصری اسکولوں میں داخل کرنا:

اسلام میں جس بنیادی تعلیم کو ہر ایک کے لئے ضروری قرار دیا گیا ہے وہ دین کا علم ہے، جس سے انسان کے لئے مذہب پر چلنا آسان ہوجاتا ہے، اور اس کے اندر اخلاقی قدریں پروان چڑھتی ہیں، مگر موجودہ دور میں روزگار کے مواقع کو تعلیم سے جوڑ دیا گیا ہے جس کی وجہ سے عصری تعلیم پر مشتمل نصاب کے مطابق تعلیم دی جاتی ہے، ظاہر ہے کہ یہ عمل خلاف اسلام نہیں اور نہ ہی ان اسکولوں میں بچوں کو داخل کرنا اسلامی نقطہ نظر کے خلاف ہے، کیونکہ اسلام ایک معتدل مذہب ہے نہ اس میں غلو پر مبنی عبادت ہے اور نہ دنیا سے بے تعلقی کی اجازت ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کھلے لفظوں میں ارشاد فرمایا: "إن الرهبانية لم تكتب علينا" (مجمع الزوائد ۴/۳۰۱) (رہبانیت (دنیا سے کنارہ کشی) اسلام میں نہیں رکھی گئی)، نہ ہی دنیا کا پرستار بن جانے کی اجازت ہے کہ آدمی دین سے بیزار ہوجائے۔

الغرض اسکولوں میں بچوں کو داخل کرنا جائز بلکہ بہتر ہے، مگر اس تعلیم کے ساتھ ساتھ اسلام کی بنیادی تعلیمات جس کا حاصل کرنا تمام مرد وعورت پر ضروری ہے، بچوں کو تعلیم بھی دینا ضروری ہے تاکہ بچہ دنیا کے مسائل کے ساتھ ساتھ دینی احکام سے بھی واقف ہو، اور اس کے لئے شریعت پر چلنا آسان ہوجائے لیکن یاد رہے کہ بچے جب تک کم سن ہو، برائی کے خیالات وجذبات ابھی پیدا نہ ہوئے ہوں تو لڑکوں اور لڑکیوں کی مخلوط تعلیم کی اجازت ہے، لیکن بچے جب قریب البلوغ ہو اور صنفی امور کا شعور ان کے اندر جاگ گیا ہو تو اب ان کو مخلوط اسکولوں میں داخل کرنا جائز نہیں ہے، کیوں کہ اس صورت میں ایک اجنبی بچہ کا دوسری قریب البلوغ اجنبی لڑکی اور ایک اجنبی قریب البلوغ لڑکی کا دوسرے اجنبی نفسانی خواہشات کے حامل لڑکے کے ساتھ میل جول پایا جائے گا جو شریعت کی نگاہ میں جائز نہیں ہے، خود زمانہ نبوت میں اس کی مثال ملتی ہے، چنانچہ ایک مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کئی عورتیں حاضر ہوئیں اور انہوں نے شکایت کی کہ مرد حضرات تو آپ کے ارشادات سنتے ہیں مگر ہم لوگ محروم رہ جاتے ہیں، اس لئے آپ ہمارے لئے کوئی وقت مقرر فرمادیں، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لئے ہفتہ میں

چند دن متعین فرمادیئے، جس میں صرف صحابیات حاضر ہوتیں اور آپ انہیں درس دیتے (بخاری شریف: ۱۰۱، باب ہل یجعل للنساء یوم علی حدة فی العلم)، اس حدیث سے اس مسئلہ پر روشنی پڑتی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان حضرات صحابیات کے لئے الگ سے ایک یا دو دن متعین فرمائے جن میں ان کو درس دیتے، مردوں کے ساتھ ان کے لئے درس کا انتظام نہیں فرمایا، نیز چوں کہ شریعت میں قریب البلوغ بچوں کا حکم بھی بہت سے احکام میں بالغوں کا سا ہے، اس لئے جس طرح اس حدیث سے خواتین کے حق میں مخلوط تعلیم کی ممانعت کا اشارہ ملتا ہے، قریب البلوغ اور مشتہی لڑکوں اور لڑکیوں کا بھی یہی حکم ہوگا (بچے حقوق و احکام، ص: ۳۸۶-۳۸۸)۔

پوری تفصیل کا خلاصہ یہ ہے کہ لڑکے اور لڑکیوں کے لئے پہلے مذہبی بنیادی ضروری تعلیم حاصل کرنا ضروری ہے اور عصری تعلیم کے بارے میں اصول یہ ہے کہ اسلامی تمدن اور اسلامی اخلاق وعادات پر مضبوطی سے قائم رہیں تو بے شک ان کے لئے گنجائش ہے کہ وہ جتنی چاہے عصری تعلیم حاصل کریں۔

(۳) اگر حکومت کسی سطح تک کی تعلیم کو بچوں اور بچیوں کے لئے لازم کردیں تو ان کی یہ تجویز مذہب اسلام کے سراسر خلاف ہے اور اس کا خلاف اسلام ہونا ظاہر ہے (امداد الاحکام ۱/ ۲۱۸)، لہذا ایسے قانون پر پابندی کرنا شرعاً لازم نہیں ہوگا۔

(۴) شرعی دلائل سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مربی اپنے بیٹے بیٹی کو ایسے امور بتلاسکتا ہے جن کا تعلق جنس اور شہوت سے ہو بلکہ بعض دفعہ ان کا بتلانا واجب ہوتا ہے جبکہ کوئی شرعی حکم اس پر مرتب ہوتا ہو۔

چنانچہ بہت سی آیتوں میں جنسی اتصال وملاپ کا تذکرہ ملتا ہے، اور یہ بھی مذکورہ ہے کہ انسان نطفہ سے پیدا ہوا ہے اس کے علاوہ زنا وغیرہ کا بھی ذکر ملتا ہے نیز بعض آیتیں وضاحت کے ساتھ یہ بتلارہی ہیں کہ انسان کو اپنی شرمگاہ کی حفاظت کس سے کرنا چاہئے اور کس سے نہیں اور یہ کہ رمضان میں ہمبستری کی جاسکتی ہے یا نہیں؟ اور حالت حیض میں عورت سے دوری اختیار کرنا چاہئے تو یہ چیزیں جنس اور خواہش نفس کے متعلق ہیں، پس اگر بچہ سن شعور کو پہنچ جائیں اور اس کا استاذ ومربی ان حقائق کو اس کے سامنے بیان نہ کریں تو وہ ان آیات کو کیسے سمجھے گا، لہذا ان مسائل کو سمجھنا بھی ضروری ہے۔

لیکن جنس کی تعلیم کی صورت میں دو چیزیں اہم ہیں جن کا لحاظ رکھنا ضروری ہے اور اس کے خلاف کی اجازت نہیں۔

(۱) عمر کے ہر حصہ سے متعلق احکام کی تعلیم اسی کی مناسبت سے دیجئے، لہذا یہ قطعاً نامعقول بات ہے کہ آپ دس سال کے عمر کے بچے کو جنسی ملاپ کے اصول بتائیں۔

(۲) لڑکی کو یہ جنسی مسائل سکھانے کا کام ماں کو انجام دینا چاہئے، لیکن اگر کسی لڑکی کی ماں موجود نہ ہو تو اس کی جگہ کوئی اور عورت یہ کام انجام دے تو بہتر ہے (تربیت اولاد کا اسلامی نظام ۱/ ۴۰۰)۔

(ج) حق تعالیٰ شانہ کا ارشاد ہے: "وابتلوا الیتامی حتی إذا بلغوا النکاح"، یہ آیت صاف مشیر ہے کہ نکاح کا پسندیدہ زمانہ بلوغ کے بعد کا ہے، سیدھا طریقہ یہی ہے کہ بلوغ اور درستی عقل کے بعد نکاح کیا جائے نہ کہ اس سے پہلے اور نہ بالغ ہونے کے بعد کئی کئی سال بٹھلائے رکھیں، محض ناموری کے سامان کے انتظار میں یا مناسب رشتہ نہ ملنے کے فضول عذر میں۔

حضرت فاطمہؓ کی عمر شریف نکاح کے وقت ساڑھے پندرہ سال تھی اور حضرت علیؓ کی عمر شریف اکیس برس تھی۔

بہت تھوڑی عمر میں شادی کرنے کے بہت سے نقصان ہیں بہتر تو یہی ہے کہ لڑکا جب کمانے لگے اور لڑکی جب گھر چلانے کا بوجھ اٹھا سکے اس وقت شادی کی جائے (اسلامی شادی بحوالہ بہشتی زیور، ص: ۳۵۶)۔

"امداد الفتاویٰ" میں ہے، حضرت ابوسعید خدریؓ سے اور حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ دونوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس کی اولاد پیدا ہو اس کو چاہئے کہ اس کا اچھا نام رکھے اور اچھی تعلیم دے، پھر جب وہ بالغ ہوجائے اس کا نکاح کردے، اگر وہ بالغ ہوجائے اور اس کا نکاح نہ کرے پھر وہ کسی گناہ میں مبتلا ہوجائے تو وہ گناہ (سبب کے درجہ میں) باپ پر ہی ہوگا (گو مباشرت کے درجہ میں خود اس پر ہوگا) (۱/ ۲۶۴)۔

(د) (۱-۲) بچپن کا زمانہ چوں کہ تعلیم وتربیت کے لئے موزوں ترین زمانہ ہوتا ہے، اس لئے اسلام نے انسانی عمر کے اس زینہ میں تعلیم وتربیت کو کافی اہمیت دی ہے بلکہ باپ کو فرائض وذمہ داریوں میں سے ایک اسے بھی شمار کیا ہے کہ وہ اپنے بچوں کی صحیح تربیت کریں، چنانچہ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "إن من حق الوالد علی الولد أن یحسن أدبه"، نیز ایک دوسری حدیث میں ہے: "ما نحل والد ولداً من نحل أفضل من

أدب حسن"، اسی طرح اور بھی کئی احادیث ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ اسلام میں بچوں کی صحیح تعلیم وتربیت کی بڑی اہمیت ہے اور اسکے لئے موزوں وقت بچپن کا زمانہ ہے، لہذا اس عمر میں مزدوری میں نہیں لگانا چاہئے اور خاص کر جب کہ باپ خود کسب معاش کی صلاحیت رکھتا ہو یا کسب معاش میں مشغول ہو تو بدرجہ اولی نابالغ اولاد کو مزدوری میں نہیں لگانا چاہئے، کیونکہ اس عمر میں محنت ومزدوری میں لگادینے سے تعلیم وتربیت بھی نہیں ہوتی اور اس سے ان کی ہمت اور جسمانی قوی پر بھی اثر پڑتا ہے، البتہ گھر کے کام کاج حسب استعداد وطاقت لے سکتے ہیں۔

(۳) والدین کمائی سے معذور ہوجائے یا باپ کا انتقال ہوجائے تو اسلام کا اصل نقطہ نظر ہے کہ باپ اگر کمائی سے معذور ہوجائے یا انتقال ہوجائے تو چھوٹی اولاد کی دیکھ بھال خاندان کے قریبی لوگوں کے ذمہ ہے، اگر اسلام کے اس حکم کی تعمیل کی جائے تو ان چھوٹے بچوں کی تعلیم وتربیت کا بھی مسئلہ حل ہوجاتا ہے جن کے باپ بوڑھے یا کمائی سے معذور ہوں۔

لیکن افسوس کہ صورت حال یہ ہے کہ لوگ ان جیسے لوگوں کی مدد کیا کریں گے بلکہ ان کے بقیہ مال وجائداد کو ہڑپ کرجانے اور انہیں بے دخل کرنے کی سازش میں لگے رہتے ہیں، اس صورت حال میں مجبوراً ایسے چھوٹے بچوں کو اپنی تعلیم وتربیت ترک کرکے کسب معاش میں لگ جانا پڑتا ہے اور ایسے حالات میں عقل وخرد کا بھی تقاضا ہے کہ بچہ کو کمائی کی اجازت دی جائے، تاکہ وہ اپنے والدین اور گھر والوں کی پرورش کرسکے، اسی لئے اسلام نے بھی ایسی مجبوری کی حالت میں نابالغوں کو بھی مزدوری کرنے کی اجازت دی ہے، تاکہ گھر والوں کی پرورش ہوسکے، "بدائع" میں ہے:

"فللأب أن يواجر ابنه الصغير من عمل من الأعمال" (۴/ ۲۲)، نیز عالمگیری میں ہے: "والأب والجد أبو الأب أو وصيهما إذا آجر الصغير في عمل من الأعمال التي يقدر عليها الصغير جاز" (۴/ ۴۳۶)۔

(۵) ائمہ اربعہ اس بات پر متفق ہیں کہ معاملہ زنا کسی بچہ سے صادر ہوجائے تو اسے حدود کی اصطلاح میں زنا نہیں کہیں گے، کیونکہ وہ اپنی نابالغی کی وجہ سے حرمت زنا کا مخاطب نہیں، اگرچہ اس نے ایک حرام کام کیا ہے، چنانچہ "عالمگیری" میں ہے: "حتى أن وطأ المجنون والصبي العاقل لا يكون زنا لأن فعلهما لا يوصف بالحرمة كذا في محيط السرخسي" (۲۔ ۱۴۲)، البتہ نابالغوں کے اولیاء اور سرپرستوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ ایسے واقعات میں بچوں کی سرزنش کریں تاکہ وہ مستقبل میں ایسی برائیوں سے بچ سکیں، "وإنما يؤدب أي يجب على من تولى أمور الناس أن يؤدبه لأجل إصلاح حال"۔

لڑکی اگر کنواری ہو اور اس لڑکی کی دعوت پر زنا کا ارتکاب کیا تو لڑکے پر کچھ واجب نہ ہوگا اور اگر اس نے دعوت نہیں دی تھی بلکہ اس نے اسے مجبور کیا اور اس کی وجہ سے اس کا کنوارپن زائل ہوگیا تو لڑکے پر اس کا تاوان واجب ہوگا (بچے حقوق واحکام)۔

اسی طرح اگر نابالغ نے شراب پی لی اور اس سے نشہ میں بھی آجائے تو بھی اس پر حد جاری نہیں کی جائے گی، بدائع میں ہے: "فلا حد على المجنون والصبي الذي لا يعقل"۔

اسی طرح بچہ پر حد قذف بھی جاری نہیں کرسکتے ہیں: "ولا يجب الحد بقذف الصبي" (عالمگیری ۲/ ۱۶۲)۔

بچہ پر چوری کی سزا:

اسلام نے انسانی معاشرہ میں جان، عزت وآبرو، عقل ومال کی حفاظت کو بڑی اہمیت دی ہے، چنانچہ ان چیزوں کی خلاف ورزی یا ایسی چیزوں کا استعمال جن سے ان چیزوں میں بگاڑ کا اندیشہ ہو شریعت نے ان سے منع کیا ہے اور ان کے ارتکاب پر سزا بھی مقرر کی ہے، اسی پس منظر میں چوری کو بھی حرام قرار دیا ہے، اور اس پر سزا بھی مقرر فرمائی ہے، لیکن یہ سزا مکلفین یعنی عاقل وبالغ سے متعلق ہے، چنانچہ اگر نابالغ نے چوری کرلی خواہ چوری میں رقم کی مقدار جتنی ہو اس پر چوری کی سزا جاری نہیں کی جائے گی، البتہ بچے نے جو رقم یا سامان چوری کی ہے اس کی واپسی لازم ہوگی اور اگر وہ سامان یا رقم ضائع ہوگئی تو نابالغ اس کا ضامن ہوگا، "البحر الرائق" میں ہے: "وخرج بالتكليف الصبي والمجنون لأن القطع عقوبة وهما ليسا من أهلها" (۵/ ۸۴)۔

اسی طرح اگر قاتل نابالغ ہو تو قتل کے جرم میں اسے بطور قصاص قتل نہیں کیا جاسکتا بلکہ اس کے خاندان والوں کے ذمہ دیت کا ادا کرنا واجب ہوگا۔ علامہ ابن ہمام فرماتے ہیں: "منها كون القاتل عاقلاً بالغاً إذ لا يجب القود على الصبي أصلاً" (فتح القدیر ۹/ ۱۳۸)۔

نابالغ کے ذریعہ اگر کوئی شخص زخمی ہوجائے مثلاً وہ تیراندازی کررہا تھا، کھیل رہا تھا جس سے کسی کی آنکھ زخمی ہوگئی تو آنکھ کا ضمان (مالی معاوضہ) خود بچے کے

مال میں سے واجب ہوگا اور اس کے سرپرستان کی ذمہ داری ہوگی کہ وہ نابالغ کے مال میں سے آنکھ کا بدلہ ادا کردیں اگر اس کے پاس مال نہ ہو تو آنے تک کا وقفہ دیا جائے گا باپ یا کسی دوسرے اولیاء پر اس دیت کو ادا کرنا واجب نہیں، ''فتاویٰ بزازیہ'' میں ہے: "رمی صبی فأصاب عین إنسان إن کان للإنسان مال یودی الدیة وإن لم یکن له مال فنظرة إلی میسرة قال ولا یواخذ به الأب"۔

الغرض اصل متعینہ سزا نابالغ پر جاری نہیں کی جائے گی، لیکن تعزیر کی گنجائش باقی رہے گی، اور قاضی اپنے صوابدید سے جرم کی زیادہ اور کم شدت اور مجرم کی عادت وخو اور احوال وکیفیات کو سامنے رکھ کر مناسب اور معقول سرزنش کرسکتا ہے اور بغرض تادیب ضرورۃً قید بھی کرسکتا ہے (ماخوذ قاموس الفقہ ۴ر ۱۵۳)۔

(و) تعزیر میں لوگوں کی عمر، حیثیت، منزلت وثقافت کے اعتبار سے فرق پڑتا ہے، چنانچہ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جنہیں معمولی سی نصیحت کافی ہوجاتی ہے، اور بعض کو ڈانٹ ڈپٹ سے کام چل جاتا ہے، اور بعض کو بغیر ڈنڈے کے کام نہیں چلتا اور بعض اس وقت تک قابو میں نہیں آتے جب تک انہیں جیل میں نہ ڈالا جائے، واقعی کسی نے سچ کہا ہے:

العبد یقرع بالعصا والحر تکفیه الإشارة

(غلام کو ڈنڈے سے سزا دی جاتی ہے اور آزاد شریف آدمی کے لئے اشارہ کافی ہوتا ہے)۔

دین اسلام میں بچوں کو سزا دینے کے طریقے:

(۱) اصل یہ ہے کہ بچہ کے ساتھ نرمی اور پیار کا برتاؤ کیا جائے، چنانچہ امام بخاریؒ اپنی کتاب ''الادب المفرد'' میں روایت کرتے ہیں کہ ''نرمی اختیار کرو اور سختی وفحش گوئی سے بچو'' اور آجریؒ روایت کرتے ہیں: ''سکھاؤ لیکن سختی نہ کرو''۔

(۲) خطا کار بچے کو سزا دینے میں اس کی طبیعت کی رعایت کی جائے۔

(۳) سزا دینے میں تدریج سے کام لینا چاہئے، یعنی پہلے معمولی سزا دے، اور سخت سزا بالکل آخری مرحلہ میں اختیار کرنا چاہئے جس کا مطلب یہ ہے کہ اصلاح کرنے اور سزا دینے کے چند مراتب ہیں جنہیں مار پیٹ سے پہلے اختیار کرنا چاہئے۔

بچوں کو سزا دینے کے شرائط:

(۱) مار پیٹ کی طرف اس وقت متوجہ نہ ہونا چاہئے جب تک کہ وہ تنبیہ اور ڈانٹ ڈپٹ کے تمام وسائل بروئے کار نہ لے آئے۔

(۲) سخت غصہ کی حالت میں بچے کو ہرگز نہ مارے جس سے بچے کو جسمانی نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو۔

(۳) بچے کو ایسی جگہ پر نہ مارے جہاں مارنے سے ایذا ونقصان کا خوف ہو جیسے چہرہ، سر، سینہ، پیٹ وغیرہ، چنانچہ حضور ﷺ نے فرمایا: ''چہرہ پر مت مارو''۔

(۴) سزا کے ابتدائی مراحل میں سخت اور تکلیف دہ مار نہ ہونی چاہئے بلکہ ہلکی پھلکی معمولی چھڑی سے ہاتھ پاؤں وغیرہ پر مارنا چاہئے اور اگر بچہ چھوٹا ہو تو دو تین قمچیوں سے زیادہ نہیں مارنا چاہئے۔

(۵) جب تک بچہ دس سال کی عمر کو نہ پہنچ جائے اسے نہیں مارنا چاہئے، اس حدیث کی بنا پر کہ ''اپنے بچوں کو نماز کا حکم دو جب وہ سات سال کے ہوجائیں اور نماز نہ پڑھنے پر ان کو مارو جبکہ وہ دس سال کے ہوجائیں''۔

(۶) غلطی کا صدور بچے سے پہلی مرتبہ ہوا ہے تو اسے جرم سے توبہ کا موقع دینا چاہئے اور اس حرکت پر اس کا عذر قبول کرنا چاہئے (تربیت اولاد کا اسلامی نظام، ص: ۴۴۰)۔

(ز) حضرت نبی کریم ﷺ جس عہد اور جس ماحول میں پیدا ہوئے اس میں سب سے زیادہ مظلوم تین طبقے تھے: یتیم، غلام، خواتین، اس لئے آپ ﷺ نے ان تین طبقوں کے حقوق اور ان کے ساتھ حسن سلوک کی تلقین جس کثرت کے ساتھ فرمائی ہے شاید ہی کسی اور طبقہ کے بارے میں اس قدر تاکید فرمائی ہو، یتیمی کا داغ چونکہ آپ ﷺ نے خود سہا تھا اس لئے یتیموں کی مشکلات اور دشواریوں کا آپ ﷺ کو پوری طرح اندازہ رہا ہوگا، اسی لئے احادیث میں بہت ہی عبرت خیز اور درد انگیز اسلوب میں یتیموں کے حقوق کی نگہداشت پر لوگوں کو متوجہ کیا گیا ہے، اور خود آیات قرآنی میں بھی یتیموں سے

بدسلوکی کی مذمت ایسے دل پذیر اور اثر انگیز انداز پر فرمائی ہے کہ دل تو دل پتھر کی سل بھی پگھل جائے، قرآن کریم نے یتیم کے سلسلہ میں بہت اہتمام کیا ہے اور اس کو ڈانٹنے جھڑکنے سے منع فرمایا ہے، اور اس کے ساتھ ایسے برتاؤ سے روکا ہے جو اس کی عزت وشرافت کے خلاف ہو، ارشاد باری ہے: "فأما اليتيم فلا تقهر"، نیز "أرأيت الذي يكذب بالدين فذلك الذي يدع اليتيم"۔

نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یتیم کا بہت خیال رکھا ہے اور اس کی کفالت پر ابھارا ہے اور اس کی دیکھ بھال کو واجب قرار دیا ہے اور اس کے اولیاء اگر اس کا خیال رکھیں اور اس کے ساتھ حسن سلوک کریں تو ان کو بشارتیں بھی سنائی ہیں، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "عن سهل بن سعد قال قال رسول الله ﷺ: أنا وكافل اليتيم له أو لغيره في الجنة هكذا وأشار بالسبابة والوسطى وفرج بينهما شيئاً" (رواه البخاري)۔

مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی کلمہ والی انگلی اور اس کے برابر کی بیچ والی انگلی اس طرح اٹھا کر ان کے درمیان تھوڑا سا فاصلہ رکھا اور بتلایا کہ جتنا تھوڑا سا فاصلہ اور فرق تم میری ان انگلیوں کے درمیان دیکھتے ہو بس اتنا ہی فاصلہ اور فرق جنت میں میرے اور اس مرد مومن کے مقام میں ہوگا جو اللہ کے لئے اس دنیا میں کسی یتیم کی کفالت اور پرورش کا بوجھ اٹھائے خواہ وہ یتیم اس کا اپنا ہو (جیسے پوتا، بھتیجہ وغیرہ) یا پرایا ہو یعنی جس کے ساتھ رشتہ داری وغیرہ کا کوئی خاص تعلق نہ ہو، نیز "ترمذی" میں ہے:

"عن ابن عباس رضی اللہ عنہ قال قال رسول الله ﷺ: من قبض يتيماً من بين المسلمين إلى طعامه وشرابه أدخله الله الجنة البتة إلا أن يكون قد عمل ذنباً لا يغفر"۔ اس حدیث سے صراحتاً معلوم ہوا کہ یتیم کی کفالت و پرورش پر داخلہ جنت کی قطعی بشارت اس شرط کے ساتھ ہے کہ وہ آدمی ایسے سخت گناہ کا مرتکب نہ ہو جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک ناقابل معافی ہو (جیسے شرک، کفر اور خون ناحق وغیرہ)۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مسلمانوں کے گھرانوں میں بہترین گھرانہ وہ ہے جس میں کوئی یتیم ہو اور اس کے ساتھ حسن سلوک کیا جاتا ہو اور مسلمانوں کے گھروں میں بدترین گھر وہ ہے جس میں کوئی یتیم ہو اور اس کے ساتھ برا سلوک کیا جائے" (معارف الحدیث ۱۰۶/۶)۔

الغرض اسلام ایک ایسا دین ہے جس نے یتیم بچوں کا بہت خیال رکھا ہے اور اس کے ساتھ اچھا معاملہ و برتاؤ اور اس کی ضروریات زندگی کے پورا کرنے کا بہت اہتمام کیا ہے تا کہ معاشرہ میں وہ ایسا فائدہ مند فرد بنے جو اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرے اور اپنے فرائض کو ادا کرے اور دوسروں پر اس کے جو حقوق آتے ہیں اور اس پر دوسروں کے جو حقوق آتے ہیں انہیں اچھے طریقہ اور عمدگی سے ادا کرے۔

اسی لئے یتیم کی دیکھ بھال اور کفالت اس کے رشتہ داروں اور قرابت داروں پر واجب ہے، اس لئے اگر یہ لوگ یتیموں کی نفسیاتی اور اخلاقی حالات درست کرنا چاہتے ہیں تو ان کو چاہئے کہ ان کے ساتھ خصوصی شفقت، توجہ اور دیکھ بھال سے کام لیں اور اپنے عمل سے ان کو یہ محسوس کرادیں کہ محبت، معاملات اور برتاؤ کے لحاظ سے وہ بھی ان کے لئے ان کی اولاد ہی کی طرح ہیں۔

اور اگر رشتہ داروں میں کوئی کفیل موجود نہ ہو تو پھر ان کی دیکھ بھال مسلمانوں کی ذمہ داری ہے اور حکومت کو چاہئے کہ ان کے معاملات نمٹائے اور ان کی تربیت ورہنمائی کرے اور زندگی و معاشرہ میں ان کی شخصیت و مقام کو بلند کرے۔ اسی طرح حکومت کا بھی یہ فرض ہے کہ وہ لاوارث، بے سہارا بچوں کی کفالت کرے اور اگر کوئی لاوارث بچہ مل جائے تو اس کی دیکھ بھال کرے جیسا کہ حضرت عمرؓ کے پاس جب ایک شخص نے ایک لاوارث بچہ لایا تو انہوں نے بھی لاوارث بچے کے ساتھ یہی برتاؤ کیا اور انہوں نے اس سے فرمایا کہ نان ونفقہ ہمارے ذمہ ہے، لیکن یہ بچہ آزاد شمار ہوگا۔

اسلام نے یتیم ولاوارث بچوں کے ساتھ جو یہ بہترین برتاؤ پیش کیا ہے جس کے نتیجہ میں انہیں کسی قسم کا احساس کمتری پیدا نہ ہوگا، اور وہ پراگندہ افکار وخیالات اور برے تصورات کے سمندر میں سرگرداں و پریشان نہ ہوں گے، ورنہ یتیم بچہ اگر اپنے سر پر شفقت کرنے والا ہاتھ اور رحم کرنے والا ولی نہ پائے گا تو وہ بتدریج دین سے انحراف کی طرف بڑھتا رہے گا بلکہ مستقبل میں امت کے شیرازہ کو بکھیرنے اور اس کی عمارت کو ڈھانے اور اس کی وحدت کو پارہ پارہ کرنے میں اور قوم کے افراد میں آوارگی، آزادی اور انتشار پھیلانے کا سبب بنے گا، نیز وہ ہر قسم کی برائی اور بے حیائی اختیار کریں گے اور لوگوں کے امن وسکون کو برباد کریں گے پھر ان کو راہ راست پر لانا نہایت دشوار ہو جائے گا، اس لئے اسلام نے (جو ابدی دین ہے) یتیموں کی کفالت کرنے والوں کو ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنے کا حکم دیا ہے، ہاں اگر یتیم کے رشتہ دار غریب ہوں اور یتیم بچوں کی کفالت سے معذور ہوں تو حکومت کا یہ فرض ہے کہ وہ ان کی کفالت کرے (جیسا کہ اوپر تفصیل سے ذکر ہو چکا) تا کہ وہ آوارگی اور مہمل پھرنے اور خراب ہونے سے محفوظ رہیں (تربیت اولاد کا اسلامی نظام ص: ۱۲۰، ۲۴۴)۔

(ح) کسی بچہ کو گود لینا اگر چہ جائز ہے لیکن حقیقت کے اعتبار سے وہ اس شخص کا بیٹا اور وہ شخص اس کا باپ نہیں بن جاتا، اس بچہ کا حقیقی باپ تو وہی ہے جس کے نطفہ سے وہ پیدا ہوا ہے اور اس بچہ کا نسب بھی حقیقی باپ سے ثابت ہوگا، ''قرآن'' میں ہے: "ادعوهم لآبائهم هو أقسط عند الله الخ" (سورہ احزاب: ۵)، اس آیت کی تفسیر میں حضرت مفتی شفیع صاحبؒ فرماتے ہیں: اس طرح منہ بولا بیٹا تمہارا بیٹا نہیں بن جاتا، یعنی دوسرے بیٹوں کے ساتھ نہ میراث میں شریک ہوگا اور نہ حرمت کے مسائل اس پر عائد ہوں گے کہ بیٹے کی مطلقہ بیوی باپ کے لئے ہمیشہ حرام ہے تو متبنی کی بیوی بھی حرام ہو (معارف القرآن ۷ / ۸۴)۔

الغرض قرآن نے اس خیال کو رد کر دیا کہ گود لینے سے حقیقی بیٹا نہیں ہو جائے، وہ غیر کا ہی بیٹا رہتا ہے، لہذا اس کے احکام وہی ہیں جو اجنبی کے ہیں، چنانچہ گود لی ہوئی لڑکی سے بالغ ہونے کے بعد پردہ واجب ہے، کیونکہ وہ اجنبی ہے، اسی طرح کسی عورت نے کوئی لڑکا گود لیا تو بالغ ہونے کے بعد گود لینے والی پر پردہ کرنا واجب ہے، کیونکہ وہ ماں نہیں ہے، اب ظاہری بات ہے بالکلیہ قطع تعلق ہو جانے کی صورت میں گود لینے والے ان چیزوں پر کیسے پابندی کر سکتے ہیں پابندی کرنا یعنی ان کو اجنبی سمجھ کر پردہ وغیرہ کا خیال رکھنا محال نہیں تو اتنا آسان نہیں بلکہ کرامت سے کم نہیں۔

نیز فقہاء نے اولاد کے نفقہ کے بارے میں صراحت فرمائی ہے کہ باپ محتاج ہو اور بچے بھی نابالغ ومحتاج ہو یا بالغ ہو لیکن کسب معاش نہیں کر سکتے، تو باپ کو کسب معاش کرنا چاہئے اور نہ کرے تو اسے مجبور کیا جائے گا اور اس پر مجبور کرنے کے لئے قید کی سزا بھی دے سکتے ہیں۔

اگر باپ غریب ہو نفقہ ادا کرنے سے عاجز ہو اور کفالت کی اور کوئی راہ نہ ہو تو آخری درجہ میں بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ نفقہ کی ذمہ داری بیت المال پر ہوگی اور امام خصافؒ کے نزدیک ایسی صورت میں لوگوں سے سوال کرنے اور اس طرح بچوں کی ضروریات پوری کرنے کی تدبیر اختیار کی جائے گی (قاموس الفقہ ۵ / ۲۱۲)۔

اس فقہی حکم میں نیز آیت کریمہ کی تفسیر وغیرہ میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ افلاس و پرورش کی استطاعت نہ ہونے کی وجہ سے بچہ دوسرے کے حوالہ کر کے بالکلیہ قطع تعلق نہیں ہو سکتے ہیں، اس لئے کہ یہ زمانہ جاہلیت کی رسم ہے کہ منہ بولے بیٹے کو حقیقی بیٹا سمجھنا، اسلام میں اس کی کوئی اصل نہیں ہے، اسی لے پالک کی رسم کو اور اس غلط تصور کو ختم کرنے کے لئے حضرت زینبؓ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا نکاح کروایا ہے، لہذا والدین اور گارجین کا بچہ سے بالکل بے تعلق ہو جانا نیز اس کے بدلے میں رقم لینا کیونکر درست ہو سکتا ہے؟

(ط) شریعت کا منشا یہ ہے کہ بچوں کی پرورش ماں یا اس کے قریبی رشتہ داروں کے ذریعہ ہو، کیونکہ ان کی پرورش کرنے والی خواتین کے اندر جو انس ومحبت اور بہی خواہی ہوگی، دوسری عورتوں سے اس کی توقع نہیں کی جا سکتی، یہی وجہ ہے کہ بچوں کے بگڑنے کا سب سے بڑا سبب والدین کا بچوں کی تربیت سے کنارہ کش ہونا ہے اور ماں بھی اس امانت کی بڑی ذمہ دار ہے، اس لئے کہ ذمہ داری اور مسئولیت کے سلسلہ میں ماں بھی مسئول اور ذمہ دار ہے، بلکہ ماں کی ذمہ داری زیادہ اہم اور نازک ہے، اس لئے کہ ماں ولادت سے جوان ہونے تک بچے کے ساتھ رہتی ہے، پس اگر ماں باپ اپنا فارغ وقت دوسرے غیر ضروری کام کاج میں ضائع کریں گے تو پھر لازمی طور پر بچوں کی تربیت یتیموں کی طرح ہوگی اور وہ آوارہ بچوں کی طرح گھومیں پھریں گے اور مجرمانہ زندگی میں حد سے زیادہ بڑھ جائیں گے، اس لئے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بچوں کی نگرانی اور تربیت کے سلسلہ میں ایک سے زیادہ مرتبہ حکم دیا اور بہت سی مرتبہ وصیت فرمائی، (۱) "أدبوا أولادکم وأحسنوا أدبهم" (ابن ماجہ شریف)، اپنے بچوں کو ادب سکھاؤ اور ان کی اچھی تربیت کرو، (۲) "علموا أولادکم وأهليكم الخير وأدبوهم" (اپنے بچوں اور گھر والوں کو خیر کی تعلیم دو اور ان کو ادب سکھاؤ)۔

مذکورہ احادیث کی روشنی میں معلوم ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے والدین کو اولاد کی تربیت کی کتنی تاکید فرمائی ہے اب ظاہری بات ہے کہ دوسری جگہ پرورش کرانے کے نتیجہ میں اولاد کی وہ تربیت بظاہر مشکل ہے اور خصوصاً ہسپتال وغیرہ میں تو نہیں ہوگی، لیکن پھر بھی علاج وغیرہ کے لئے ہسپتال میں وقتی طور پر رکھنے کی گنجائش ہو سکتی ہے بشرطیکہ والدین اس بچہ سے بالکل بے تعلق نہ ہو بلکہ مقصود صرف علاج ہو، لہذا پرورش اور اس کو سنبھالنے کے عذر کی وجہ سے بچہ کو مستقل ہسپتال میں رکھ دینا یہ والدین کی کھلی غفلت ہے اور اسلام ان چیزوں کی اجازت قطعاً نہیں دیتا ہے، نیز بڑھاپے اور پیرانہ سالی میں اولاد والدین کی خدمت اسی وقت کر سکتی ہیں جبکہ بچپن کے زمانہ میں اولاد کو ماں کی شفقت وممتا حاصل ہوئی ہو، اگر بچپن میں ماں کی جانب سے جیسی شفقت، ممتا وپیار اولاد کو ملنا چاہئے ایسا پیار وشفقت وممتا نہیں ملے گی تو لازماً بڑھاپے میں اولاد جیسی ماں باپ کی خدمت کرنی چاہئے وہ نہیں کر پائے گی، بلکہ Old Age Home میں روانہ کر دے گی، بریں بنا مستقل رکھنے کی اجازت نہ ہوگی بلکہ والدین کی کھلی غفلت شمار ہوگی، فقط۔ ☆☆☆

باب سوم مختصر تحریریں

اسلام میں بچوں کے حقوق

مولانا قاضی عبدالجلیل قاسمی [1]

الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام على سيد المرسلين وعلى آله وأصحابه أجمعين

الف: حضانت شرعاً واجب ہے، اگر بچہ کی دیکھ بھال نہ کی جائے تو اس کے ضائع ہوجانے کا اندیشہ ہے، اگر پرورش کرنے والی ایک ہی عورت ہو تو پرورش کرنا اس پر واجب عینی ہوگا، اور اگر چند ہوں تو واجب کفائی ہوگا۔

پرورش میں بچہ اور پرورش کنندہ دونوں کی رعایت کی گئی ہے، البتہ بچہ کی رعایت کرنا مقدم ہے، پرورش کرنا، پرورش کرنے والی کا حق ہے، اس کا معنی یہ ہے کہ اگر وہ اپنا حق ساقط کردے تو اس کو پرورش کرنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔

حضانت بچہ کا حق ہے، اس کا معنی یہ ہے کہ اگر بچہ کسی دوسری عورت کو قبول نہ کرے یا کوئی دوسری پرورش کرنے والی موجود نہ ہو یا باپ یا بچہ کا مال نہ ہو تو ماں کو حضانت کے لیے مجبور کیا جائے گا۔

لڑکا اس وقت تک ماں کے پاس رہے گا جب تک خود کھانے پینے اور استنجاء وغیرہ کرنے کے لائق ہوجائے، عام طور پر فقہاء نے سات، آٹھ سال کی عمر بتائی ہے۔

لڑکی بالغہ اور قریب البلوغ ہونے تک ماں کے پاس رہے گی، اس مدت کی حکمت پر بھی فقہاء نے کلام کیا ہے، اس کے بعد بچی باپ کے حوالہ ہوجائے گی۔

عمر کے جس مرحلہ میں ماں کو یا باپ کو حق حضانت حاصل ہے، اگر اس مدت میں بچہ کے ضائع ہوجانے یا اس کو ضرر پہنچنے کا اندیشہ ہوگا تو بچہ اس کے حوالہ نہیں کیا جائے گا، اس لیے کہ حق پرورش میں بچہ کی رعایت مقدم ہے، اسی لیے فقہاء نے حق پرورش کے لیے چند شرطوں کا ذکر کیا ہے، کچھ شرطیں تو وہ ہیں جن کا تعلق مرد و عورت دونوں سے ہے، مثلاً پرورش کرنے والے کا مسلمان ہونا، عاقل بالغ ہونا، عادل ہونا، فاسق کو حق حضانت نہ ہوگا، بچہ کی پرورش اور اس کی ضروریات کو پورا کرنے پر قادر ہونا، اس لیے اگر بڑھاپے یا مرض کی وجہ سے اس کی قدرت نہ ہو تو اس کو حق حضانت نہ ہوگا وغیرہ، مرد کے تعلق سے شرط یہ ہے کہ اگر بچی ہو اور قابل شہوت ہو تو پرورش کرنے والا اس کا محرم ہو، اسی لیے چچازاد بھائی کو حق پرورش نہ ہوگا، الا یہ کہ بچی بہت کم عمر ہو۔

عورت کے تعلق سے شرط یہ ہے کہ اس نے بچہ یا بچی کے غیر محرم سے شادی نہ کی ہو، اگر لڑکا ہو تو پرورش کرنے والی اس کی محرم ہو، پرورش کرنے والی عورت بچہ یا بچی کو اس گھر میں نہ رکھے جس کا مالک بچہ کو ناپسند کرتا ہو، اسی طرح اگر بچہ، بچی دودھ پینے کے محتاج ہو اور پرورش کرنے والی اس کی اہل ہو تو دودھ پلانے سے انکار نہ کرے وغیرہ (تفصیل کے لیے دیکھیے الموسوعۃ الفقہیہ، بدائع الصنائع، حضانت کی بحث)۔

ب۔ا۔ اسلام میں بچوں کی تعلیم و تربیت کو ضروری قرار دیا ہے، اس کی تربیت ایسی ہو کہ اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو پہچان لے، والدین کے حقوق سے واقف ہوجائے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مشہور واقعہ ہے کہ ایک آدمی نے ان کے پاس آکر اپنے بیٹے کی نافرمانی کی شکایت کی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس لڑکے کو بلا کر باپ کی نافرمانی اور اس کے حقوق کی عدم ادائیگی پر اس کو تنبیہ کی تو اس لڑکے نے حضرت سے سوال کیا کہ اے امیر المؤمنین کیا باپ پر بچہ کے کچھ حقوق نہیں ہیں؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کیوں نہیں؟ لڑکے نے پوچھا کہ وہ حقوق کیا ہیں؟ حضرت نے فرمایا بچہ کے لیے اچھی ماں کا انتخاب کرے، اس کا اچھا نام رکھے، اس کو قرآن کی تعلیم دے، بچہ نے کہا کہ میرے والد نے ان میں سے کوئی حق ادا نہیں کیا، نہ اچھی ماں کا انتخاب کیا، نہ اچھا نام رکھا، نہ قرآن کی تعلیم دی تو

[1] قاضی شریعت، امارت شرعیہ پھلواری شریف، پٹنہ۔

حضرت امیر المؤمنین نے اس شخص کو تنبیہ کی۔

(۲) بچوں اور بچیوں کو اتنی دینی تعلیم دینا ضروری ہے، جن سے وہ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہچان سکیں، ان کا ایمان وعقیدہ درست ہوجائے، نماز روزہ وغیرہ عبادات ادا کرنے کے اہل ہوسکیں، اسی طرح عصری تعلیم اتنی دینی ضروری ہے، جن کی ضرورت اس کو جوان ہونے کے بعد زندگی گزارنے کے لیے ضروری ہو۔

(۳) اگر حکومت بچوں اور بچیوں کے لیے تعلیم کو لازم قرار دے تو مسلمانوں کے لیے یہ پابندی لازم ہوگی، خود اسلام میں تعلیم کو لازم قرار دیا گیا ہے، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"طلب العلم فريضة على كل مسلم" (ابن ماجہ ۱/۱۵۱) (ہر مسلمان پر علم کا حاصل کرنا فرض ہے)۔

حدیث کا لفظ مسلم عام ہے، اس میں مرد وعورت دونوں داخل ہیں۔ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیتے ہوئے فرمایا:

"مابال أقوام لايفقهون جيرانهم و لا يعلمونهم و لايعظونهم و لا يأمرونهم و لا ينهونهم و ما بال أقوام لا يتعلمون من جيرانهم و لايتفقهون و لا يتعظون و الله ليعلمن قوم جيرانهم و يفقهونهم و يعظونهم ويأمرونهم وينهونهم وليتعلمن قوم من جيرانهم و يتفقهون ويتعظون أو لأعاجلنهم العقوبة" (مجمع الزوائد ۱/ ۱۹۹ انہوں نے طبرانی کا حوالہ دیا ہے۔ بعض روایات میں في الدنيا کا لفظ بھی آیا ہے)

(لوگوں کو کیا ہوگیا ہے؟ کہ وہ اپنے پڑوسیوں کو نہیں سمجھاتے ہیں، نہ ان کو تعلیم دیتے ہیں، نہ ان کو نصیحت کرتے ہیں، نہ ان کو بھلائی کا حکم دیتے ہیں، نہ ان کو برائی سے روکتے ہیں، لوگوں کو کیا ہوگیا ہے؟ کہ وہ اپنے پڑوسیوں سے علم حاصل نہیں کرتے ہیں، نہ ان سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں، نہ ان سے نصیحت حاصل کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی قسم ہے لوگ اپنے پڑوسیوں کو تعلیم دیں، ان کو سمجھائیں ان کو نصیحت کریں ان کو (بھلائی کا) حکم دیں، ان کو (برائی سے) روکیں، اسی طرح لوگ اپنے پڑوسیوں سے علم حاصل کریں، ان سے سمجھنے کی کوشش کریں، نصیحت حاصل کریں ورنہ میں ان کو بہت جلد سزا دوں گا)۔

اسی طرح ارشاد نبوی ہے: "من سئل عن علم فكتمه ألجمه الله بلجام من نار يوم القيامة" (ابوداؤد ۳/۳۲۱) (اگر کسی شخص سے علم کے بارے میں سوال ہو اور وہ اس کو چھپائے تو اللہ تعالیٰ اس کو قیامت کے دن آگ کی لگام لگائے گا)۔

جب اسلام کی نظر میں علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان مرد وعورت پر فرض ہے، علم کے سیکھنے اور کھانے سے اعراض کرنے والوں کو سزا کی دھمکی دی جائے، علم نافع کے چھپانے والے کو قیامت کے دن آگ کی لگام لگانے کی بات ہو تو کیا اس سے معلوم نہیں ہوتا ہے کہ اسلام ایسا دین ہے کہ اس میں علم سیکھنا اور سکھانا لازم و ضروری ہے۔

البتہ یہ خیال رکھنا ضروری ہے کہ اسلام میں جس علم کے سیکھنے سکھانے کو لازم قرار دیا گیا ہے، اس سے وہ علم نافع مراد ہے جس سے اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل اور اسلام کے احکام پر عمل کرنا آسان ہو، حکومت کی طرف سے صرف لکھنے پڑھنے کو ضروری قرار دیا جاتا ہے، اسلام میں وہ بھی ایک درجہ میں مطلوب ہے، اس لیے کہ جنگ بدر میں جو مشرکین گرفتار ہوئے تھے ان میں پڑھے لکھے قیدیوں کا فدیہ مسلمانوں کو لکھنا پڑھنا سکھانا قرار دیا گیا تھا۔

(۴) جنس کی تعلیم سے کیا مراد ہے؟ واضح طور پر سمجھ میں نہیں آیا، اگر اس سے مراد مردوں اور عورتوں سے متعلق مخصوص احکام ہیں تو فقہ وفتاویٰ کی کتابوں میں نیز قرآن وحدیث میں ان کے متعلق تفصیل کے ساتھ احکام موجود ہیں اور ظاہر ہے کہ بچوں بچیوں کو ان کی تعلیم دی جائے گی، البتہ اس سلسلہ میں دو باتوں کی رعایت ضروری ہوگی، ایک یہ کہ ان کی عمر کے لحاظ سے یہ احکام بتائے جائیں گے، جیسا کہ قرآن کریم میں چھوٹے بچوں کو تین اوقات میں گھر میں داخل ہونے کے لیے اجازت لینے کو ضروری قرار دیا گیا ہے، اور بالغ ہونے کے بعد ہر وقت اجازت لینے کی ضرورت ہے، دوم یہ کہ بچوں کو تعلیم دینے والا مرد ہو اور بچیوں کو تعلیم دینے والی عورت ہو، جیسا کہ حضانت کے تعلق سے اسلام کا حکم ہے، بچہ ماں کے پاس اس وقت تک رکھا جاتا ہے جب تک وہ خود اپنی ضروریات پوری کرنے میں ماں کا محتاج رہتا ہے، مثلاً سات آٹھ سال کی عمر تک اور بچی بلوغ یا قریب البلوغ تک ماں کے پاس رکھی جاتی ہے، تاکہ ماں اس کو بلوغ کے تعلق سے شریعت کے جو احکام ہیں، سکھائے۔

اس لیے بچوں بچیوں کو ایک ساتھ بٹھا کر ان کو مردوں، عورتوں سے متعلق مخصوص احکام بتانا خواہ بتانے والا مرد ہو یا عورت ہرگز مناسب نہ ہوگا۔

ج: بچہ اور بچی جب جوان ہوجائیں ان کے اولیاء کو حکم دیا گیا ہے کہ ان کی شادی کریں، اگر وہ ان کی شادی میں تاخیر کریں گے اور وہ کسی گناہ میں مبتلا ہوجائیں تو اولیاء بھی گناہ گار ہوں گے، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''من ولد له ولد فليحسن اسمه و أدبه فإذا بلغ فليزوجه فإن بلغ ولم يزوجه فأصاب إثما فإنما إثمه على أبيه'' رواه البيهقي في شعب الإيمان (مشکوۃ شریف: ۲۷۱) (حضرت ابوسعید خدری اور ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر کسی شخص کو کوئی بچہ پیدا ہو تو اس کو چاہیے کہ اس کا کوئی اچھا نام رکھے اور اس کی تربیت کرے اور جب وہ بالغ ہوجائے تو اس کی شادی کردے، اگر وہ بالغ ہوجائے اور اس کی شادی نہ کرے پھر وہ کسی گناہ میں مبتلا ہوجائے تو اس کا گناہ اس کے والد پر ہوگا)۔

اس لیے بچہ بچی کے بالغ ہوجانے کے بعد بلا کسی سخت مجبوری کے ان کا نکاح کرنے میں تاخیر ہرگز نہ کرنی چاہیے، اگر بلوغ سے قبل بھی کسی بچی کا جوڑا مناسب مل جائے تو اس کا نکاح بھی کردینا چاہیے، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تین چیزوں میں تاخیر نہ کرنی چاہیے، جب نماز کا وقت آجائے، جب جنازہ آجائے اور جب بے شوہر والی عورت کا جوڑا مل جائے، ''إن رسول الله ﷺ قال: ثلاثة يا علي لا تؤخرهن: الصلاة إذا أتت والجنازة إذا حضرت والأيم إذا وجدت كفوا'' (مسند احمد ۲/۱۹۷) (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے علی تین چیزوں میں تاخیر نہ کرو: جب نماز کا وقت آجائے، جب جنازہ آجائے اور جب بے شوہر والی عورت کا مناسب جوڑا مل جائے)۔

اگر بچپن میں کیا ہوا نکاح غیر موزوں ثابت ہو تو اس کی تلافی کا انتظام اسلام میں موجود ہے، اگر باپ دادا معروف بسوء الاختیار نہ ہوں تو ان کا کیا ہوا نکاح لازم ہوگا، ورنہ بچہ بچی کو اختیار ہوگا کہ وہ اس نکاح کو فسخ کردیں، اس کی تفصیل فقہ و فتاوی کی کتابوں میں موجود ہے۔

د۔الف: نابالغ بچہ بچی کا نفقہ باپ پر واجب ہے، اگر باپ تنگ دست ہو اور کمانے پر بھی قادر نہ ہو تو جائز ہے کہ بچہ کو کسی کام میں لگا دے اور اس کی اجرت اس پر خرچ کرے، البتہ بچی کو خدمت کے لیے کسی غیر محرم کو نہیں دے سکتا ہے، فتاوی قاضی خاں میں ہے: ''صغير بلغ حد الكسب و لم يبلغ مبلغ الرجال كان للأب أن يسلمه في عمل أو يؤاجره لعمل أو خدمة و ينفق عليه من ذلك و إن كان الولد بنتا لا يملك دفعها إلى غير المحرم للخدمة لأن الخلوة مع الأجنبي حرام'' (قاضی خاں علی ہامش الھندیہ ۱/۴۴۷) (بچہ کمانے کے لائق ہوجائے لیکن ابھی بالغ نہ ہوا ہو تو باپ کے لیے جائز ہے کہ اس کو کسی کام میں لگا دے یا کسی کام یا خدمت کے لیے مزدوری پر لگا دے اور اس سے اس پر خرچ کرے اور اگر وہ بچی ہو تو اس کو خدمت کے لیے غیر محرم کے حوالہ نہیں کرسکتا ہے، اس لیے کہ اجنبی کے ساتھ خلوت حرام ہے)۔

اسی طرح کی عبارت الفتاوی الھندیہ میں بھی ہے: ''الذكور من الأولاد إذا بلغوا حد الكسب و لم يبلغوا في أنفسهم يدفعهم الأب إلى عمل ليكسبوا أو يؤاجرهم وينفق عليهم من أجرتهم وكسبهم و أما الإناث فليس للأب أن يؤاجرهن في عمل أو خدمة كذا في الخلاصة'' (ہندیہ ۱/۵۶۲) (اگر بچے کمانے کے لائق ہوجائیں لیکن ابھی بالغ نہ ہوں تو باپ ان کو کسی کام میں لگا دے گا تاکہ کمائیں یا ان کو اجرت پر لگا دے گا اور ان کی اجرت اور کمائی سے ان پر خرچ کرے گا، البتہ بچیوں کے بارے میں باپ کو اختیار نہ ہوگا کہ ان کو کسی کام یا مزدوری میں لگائے)۔

ب: جہاں تک صنعت و حرف سکھانے کا معاملہ ہے تو بچوں کی تربیت میں یہ داخل ہے کہ اگر وہ کند ذہن ہوں، اعلی تعلیم کی صلاحیت ان میں نہ ہو تو ابتدائی تعلیم کے بعد ان کو کوئی ہنر سکھا دیں تاکہ آگے چل کر ان کے لیے معاشی دشواری نہ ہو، اگر ماں باپ غریب ہوں تو اپنے بچوں کی آمدنی سے کھا سکتے ہیں۔

''فإن كان للصغير أم بانت عن زوجها و احتاجت إلى النفقة كان لها أن تأكل من كسب ولدها صغيرا كان الولد أو كبيرا'' (قاضي خان على هامش هنديه ۱/۴۴۷) (اگر بچہ کی ماں ہو جس کو اس کے شوہر نے طلاق بائن دے دی ہو اور وہ محتاج ہو تو وہ اپنے بچہ کی کمائی سے کھا سکتی ہے، خواہ بچہ بالغ ہو یا نابالغ)۔

حدیث میں ہے: ''رجل أتى النبي ﷺ فقال يا رسول الله إن لي مالا و ولدا و إن والدي يجتاح مالي قال أنت ومالك لوالدك، إن أولادكم من أطيب كسبكم فكلوا من كسب أولادكم'' (ابوداؤد ۳/۳۱۲) (ایک آدمی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور عرض کیا اے اللہ کے رسول مرے پاس مال ہے اور اولاد بھی ہیں اور میرے والد میرا سارا مال لینا چاہتے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تو اور تیرا مال تیرے والد کا ہے، بلاشبہ تمہاری اولاد تمہاری بہترین کمائی کا حصہ ہے، لہذا اپنی اولاد کی کمائی میں سے کھاؤ)۔

ایک حدیث میں ہے، حضرت عائشہؓ روایت کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''إن أطيب ما أكل الرجل من كسبه و إن ولد الرجل من كسبه'' (سنن أبي داؤد باب الحث على الكسب ۲/۱۸۵) (آدمی کا سب سے اچھا کھانا وہ ہے جو اس کی کمائی کا ہو اور آدمی کی اولاد اس کی کمائی کا حصہ ہے)۔

ابوداؤد کے حاشیہ میں علامہ سندھی سے منقول ہے: ''و الفقهاء قيدوا ذلك بما إذا احتاج إلى مال الولد تجوز له الأخذ منه على قدر حاجته'' (حاشیہ سنن ابوداؤد ۲/۱۸۵) (اس حدیث میں فقہاء نے یہ قید لگائی ہے کہ والد اپنے بیٹے کے مال کا محتاج ہو تو اپنی حاجت کے بقدر اس کے لیے لینا جائز ہوگا)۔

ھ: اس سوال میں لفظ ''سزا'' کا استعمال کیا گیا ہے، اسلام میں سزا کی دو قسمیں ہیں، ایک حد، دوم تعزیر، حد اس سزا کو کہتے ہیں جس کی تعیین شریعت میں ہو اور وہ اللہ تعالیٰ کا حق بھی ہو، اس کی پانچ قسمیں ہیں، حد سرقہ، حد زنا، حد شرب، حد سکر اور حد قذف۔ تعزیر وہ سزا ہے جس کی مقدار شریعت میں متعین نہ ہو، بلکہ امام اور قاضی کی صواب دید پر موقوف ہو، سزا کی جس مقدار پر مجرم کو زجر ہو اسی مقدار میں سزا دی جائے گی، اس میں مجرم، جرم اور جس کے خلاف جرم کیا ہے، ان تینوں کے لحاظ سے سزا کی مقدار متعین کی جائے گی، اس لیے ہر مجرم کو جرم کے یکساں ہونے کے باوجود یکساں سزا نہیں دی جائے گی۔

جہاں تک حد کا تعلق ہے تو بچہ یا بچی پر حد جاری نہیں کی جاسکتی ہے، اس لیے کہ حد کے جاری کرنے کے لیے مجرم کا مکلف ہونا ضروری ہے، یعنی وہ عاقل بالغ ہو، علامہ کاسانی نے لکھا ہے: ''الصبي والمجنون إذا وطئ امرأة أجنبية لا حد عليه لأن فعلها لا يوصف بالحرمة فلا يكون الوطأ منهما زنا'' (بدائع الصنائع ۵/۴۸۷) (نابالغ بچہ یا مجنون اگر کسی اجنبی عورت سے وطی کرے تو اس پر حد جاری نہیں کی جائے گی، اس لیے کہ ان کے عمل کو حرام نہیں کہا جائے گا، اس لیے ان کی طرف سے پائی جانے والی وطی کو زنا نہیں کہا جاسکے گا)۔

حد سرقہ کے بارے میں چور پر حد جاری کرنے کے شرائط میں لکھا ہے: ''فأهلية وجوب القطع وهو العقل والبلوغ فلا يقطع الصبي والمجنون لما روي عن النبي ﷺ رفع القلم عن ثلاثة : عن الصبي حتى يحتلم وعن المجنون حتى يفيق وعن النائم حتى يستيقظ'' (بدائع الصنائع ۷/۸۶) (قطع ید کے واجب ہونے کے لیے اس کا اہل ہونا ضروری ہے اور اہل ہونے کے لیے عقل و بلوغ لازم ہے، لہذا نابالغ بچہ اور مجنون کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا، اس لیے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ تین آدمی مرفوع القلم ہیں، بچہ جب تک بالغ نہ ہوجائے، مجنون جب تک اس کو افاقہ نہ ہوجائے، سونے والا جب تک بیدار نہ ہوجائے)۔

البتہ بچہ کو تعزیر کی جاسکتی ہے، اور یہ تعزیر بطور تادیب ہوگی، تعزیر کے لیے بالغ ہونا ضروری نہیں ہے، محض عقل کا ہونا کافی ہے، علامہ کاسانی نے تعزیر پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے: ''و أما شرط وجوبه : فالعقل فقط فيعزر كل فاعل ارتكب جناية ليس لها حد مقدر سواء كان حرا أو عبدا ذكرا أو أنثى، مسلما أو كافرا، بالغا أو صبيا بعد أن يكون عاقلا، لأن هؤلاء من أهل العقوبة إلا الصبي العاقل فإنه يعزر تأديبا لا عقوبة لأنه من أهل التأديب'' (بدائع الصنائع : ۵/۵۳۴) (اس کے واجب ہونے کی شرط صرف عقل کا ہونا ہے، لہذا ہر اس عاقل کو جو کسی ایسی جنایت کا ارتکاب کرے جس میں کوئی حد متعین نہیں ہے، تعزیر کی جائے گی خواہ وہ آزاد ہو یا غلام، مرد ہو یا عورت، مسلمان ہو یا کافر، بالغ ہو یا نابالغ، بشرطیکہ صاحب عقل ہو، اس لیے کہ باشعور بچہ کے علاوہ سب لوگ عقوبت کے اہل ہیں، بچہ کو تادیب کے طور پر تعزیر کی جائے گی عقوبت کے طور پر نہیں، اس لیے کہ اس کو تادیب کی جاسکتی ہے)۔

پھر اس کے بعد اس مشہور حدیث کو ذکر کیا ہے، جس میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سات برس کی عمر میں بچہ کو نماز پڑھنے کا حکم دینے اور دس برس کی عمر میں نماز چھوڑنے پر مارنے کا حکم دیا ہے۔

البتہ حکومت نے بلوغ کی جو عمر مقرر کی ہے وہ اسلامی قانون کے مطابق صحیح نہیں ہے، اس کی وجہ سے بہت سے ایسے مجرم جو اسلام کی نظر میں حد کے مستحق ہیں، وہ جرم کے ثابت ہوجانے کے بعد بھی حد سے بچ جاتے ہیں، اس لیے حکومت کی پریشانیاں بڑھ رہی ہیں، اگر اسلامی قانون کی رعایت کی جائے تو جرائم پر بہت حد تک قابو پایا جاسکتا ہے۔

و: مجرمانہ ذہن رکھنے والے بچوں کی تادیب کے لیے پہلے ان کو سمجھایا جائے گا، پھر ان کو سزا کی دھمکی دی جائے گی، پھر سزا دی جائے گی، سزا میں تدریج کا

طریقہ اختیار کیا جائے گا، یعنی پہلے معمولی سزا دی جائے گی، پھر بڑی سزا دی جائے گی، سزا کی مقدار کے بارے میں تادیب کرنے والے کی صوابدید پر بھروسہ کیا جائے، جس بچے کو جس جرم میں جو سزا مناسب سمجھے دے گا، جس سے اس کی اصلاح ہو سکے۔

ز: یتیم اور بے سہارا بچوں کی پرورش کے سلسلہ میں اسلام میں بڑی فضیلت ہے، قرآن وحدیث میں مختلف مقامات پر اس کا تذکرہ ہے، یتیم ہی کے حکم میں وہ بچے داخل ہیں جن کے باپ ماں معلوم نہ ہوں، یعنی جو بچے پھینک دیے گئے ہوں یا کسی حادثہ میں ان کے ماں باپ مر گئے یا بچھڑ گئے ہوں، بلکہ ان کی مجبوریاں زیادہ بڑھی ہوئی ہیں، اس لیے کہ یتیم کے بعض رشتہ دار معلوم ہوتے ہیں، جیسے چچا، ماموں، دادا وغیرہ اور جن کے والدین کا پتہ نہیں ہے، ان کا کوئی رشتہ دار بھی معلوم نہیں ہوتا ہے، قرآن میں ہے: ''فأما الیتیم فلا تقهر'' اس آیت کے بارے میں علماء نے لکھا ہے کہ اس کا مطلب ہے کہ یتیم کو ذلیل نہ کیا جائے، اس کو ڈانٹ ڈپٹ نہ کی جائے بلکہ اس کے ساتھ احسان ونرمی کا معاملہ کیا جائے، اس کے ساتھ ایک شفیق باپ کی طرح برتاؤ کیا جائے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "أنا وكافل اليتيم في الجنة هكذا" (باب بدء الوحی ۶۸/۷) (میں اور یتیم کی کفالت کرنے والا جنت میں اس طرح ہوں گے)، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیچ کی انگلی اور انگوٹھے کے پاس کی انگلی سے اشارہ کیا اور دونوں کے درمیان تھوڑا سا فصل رکھا، یتیم کے پاس اگر مال ہو تو اس کی حفاظت کرنے بلکہ اس میں اضافہ کی کوشش کرنے کا حکم دیا گیا ہے، ناحق یتیم کا مال کھانے سے منع کیا گیا ہے، قرآن کریم میں یتیم کا مال ناحق کھانے کو آگ کے کھانے سے تعبیر کیا گیا ہے، حدیث میں سات ہلاک کرنے والی چیزوں میں سے ایک یتیم کا مال ناحق کھانا بتایا گیا ہے، حدیث میں: اجتنبوا السبع الموبقات (ابوداؤد ۳/۴۷) (سات ہلاک کرنے والی چیزوں سے بچو)، ان میں ایک یتیم کا مال کھانا بھی ہے۔

یتیم کے مال کو بڑھانے کے سلسلہ میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ألا من ولي يتيما له مال فليتجر فيه ولا يتركه حتى تأكله الصدقة" (ترمذی باب زکوۃ مال الیتیم ۳/۳۲) (اگر کسی کی ولایت میں ایسا یتیم ہو جس کے پاس مال ہو تو اس کو اس میں تجارت کرنا چاہیے، اس کو چھوڑ دینا نہیں چاہیے کہ صدقہ اس کو ختم کر دے)۔

ح: کسی بچہ کے گارجین حد درجہ بڑھے ہوئے افلاس کی وجہ سے پرورش کی صلاحیت نہ رکھتے ہوں اگر وہ اپنے کسی بچہ کو کسی ایسے آدمی کے حوالہ کر دیں جو ان کی صحیح پرورش اور ان کی صحیح تعلیم وتربیت کر سکے، خواہ اس کے پاس اولاد ہو یا نہ ہو تو میرے خیال میں کوئی حرج نہیں ہے، اگر اندیشہ ہو کہ وہ اس بچہ کا استحصال کرے گا تو اس کے حوالہ کرنا جائز نہ ہوگا، اور اس کی نگرانی بھی کرنی ہوگی، کہ اس بچہ کی صحیح پرورش اور صحیح تعلیم وتربیت ہو رہی ہے، البتہ اس کو فروخت کرنا جائز نہ ہوگا کہ آزاد کی بیع باطل ہے، لیکن اگر بچہ کو گود لینے والا اپنی خوشی سے بلا شرط بچہ کے گارجین کو کچھ ہبہ کرے تو اس میں کوئی قباحت سمجھ میں نہیں آتی ہے، اگر کسی بچہ کے گارجین نہ ہوں تو اس کا حکم ماقبل کے سوال کے جواب سے واضح ہے۔

ط: جو بچے معذور ہوں ان کے علاج اور نگرانی کے سلسلہ میں ان کے مفاد کو ترجیح دی جائے گی، اگر والدین کے پاس ان کو رکھنا ان کے لیے مفید ہوگا تو والدین کو اپنے پاس رکھنے کا حکم دیا جائے گا، اگر والدین کے پاس گھر میں رکھنا ان کے لیے ضرررساں ہو تو اسپتال میں داخل کرانا ضروری ہوگا، والدین اگر اپنی ذمہ داری سے راہ فرار اختیار کرنے کے لیے بلا سخت ضرورت کے ان کو اسپتال میں داخل کریں گے تو مجرم ہوں گے۔

☆☆☆

اسلام میں بچوں کے حقوق، تعلیم وتربیت کے تناظر میں

مولانا سید قمر الدین محمود قاسمی [1]

اللہ جل شانہ نے اس دنیا میں حضرت آدم علیہ السلام کے ذریعہ سے انسانی وجود عطا فرمایا اور پھر ان کے ذریعہ سے توالد وتناسل کا سلسلہ جاری فرمایا اور اس توالد وتناسل کے ذریعہ دنیا میں جو انسان آئے ان کی ضروریات کا تکفل فرمایا اور انسانوں کی ہدایت، دنیوی واخروی فلاح وکامیابی کے لئے انبیاء کرام کو مبعوث فرمایا، کہ انسان اپنے خالق کو پہچانے اور اپنے حق عبدیت کے وظیفہ کو پوری طرح انجام دے۔

دنیا میں انسان کے وجود کے لئے ظاہری اسباب کے طور پر اس کے ماں اور باپ ہوتے ہیں اور بچوں کی دینی ودنیوی ضروریات کے انتظام کے لئے پہلے مخاطب ماں اور باپ ہوتے ہیں، چنانچہ والدین کے دلوں میں بچوں کی محبت فطری ہوتی ہے اور یہ فطری محبت حق تعالی نے ان کے دلوں میں ڈالی ہے، بچوں کی دیکھ بھال کی زحمت برداشت کرنا، ان پر رحمت وشفقت کرنا اور ان کے معاملات وضروریات کا اہتمام کرنا یہ سب چیزیں نفسیاتی طور پر والدین میں موجود اور ان کے دلوں میں راسخ اور ان کے احساسات وشعور میں داخل ہوتے ہیں، اگر بالفرض یہ نہ ہوتا تو روئے زمین سے انسان کا وجود ختم ہوجاتا، اسی لئے قرآن نے کہیں بچوں کو دنیا کی زینت قرار دیا ہے، فرمایا گیا: "المال والبنون زينة الحياة الدنيا" (سورہ کہف) (مال اور اولاد حیات دنیا کی ایک رونق ہیں)، تو کہیں اللہ جل شانہ نے ایسی بڑی نعمت قرار دیا ہے کہ اس کا شکر کرنا واجب ہے، چنانچہ فرمایا گیا: "وأمددناكم بأموال وبنين وجعلناكم أكثر نفيراً" (سورہ اسراء) (اور مال اور بیٹوں سے ہم تمہاری امداد کریں گے اور ہم تمہاری جماعت بڑھادیں گے)۔

خلاصہ یہ کہ حق تعالی شانہ نے اولاد کو ایک بہت بڑی نعمت قرار دیا ہے اور والدین کو حکم دیا گیا کہ اپنی اولاد کی صحیح تربیت کریں، ان کو دین کی ضروری تعلیم دلائیں اخلاق حسنہ سے ان کو آراستہ کرنے کے لئے جدوجہد کریں۔

بچوں کی پرورش کا پہلا حق ماں کا ہے، اسی لئے لڑکیوں کی دینی تعلیم وتربیت کی زیادہ اہمیت ہے تاکہ وہ جب ماں بنیں تو اپنی اولاد کی بھی صحیح تربیت کرسکیں۔

شریعت نے حضانت کا حق سب سے پہلے ماں کو دیا ہے، فتاوی عالمگیری میں ہے:

''أحق الناس بحضانة الصغير حال قيام النكاح أو بعد الفرقة الأم إلا أن تكون مرتدة أو فاجرة غير مأمونة كذا في الكافي سواء لحقت المرتدة بدار الحرب أم لا فإن تابت فهي أحق به كذا في البحر الرائق وكذا لو كانت سارقة أو مغنية أو نائحة فلا حق لها كذا في النهر الفائق'' (فتاوی عالمگیری: ۵۹۲)۔

اگر ماں کا انتقال ہوجائے یا وہ حضانت کے قابل نہ رہے مثلاً وہ مرتد ہوجائے یا فاسقہ فاجرہ ہو تو اس صورت میں حضانت کا حق نانی کو ملے گا، اور یہ حق حضانت سات سال کی عمر تک اگر لڑکا ہو اور لڑکی ہو تو حد شہوۃ تک پہنچنے تک رہے گا۔ اس کے بعد باپ حضانت کے لئے زیادہ مستحق ہوگا:

''والأم والجدة أحق بالغلام حتى يستغني وقدر بسبع سنين وقال القدوري حتى يأكل وحده ويشرب وحده ويستنجي وحده وقدره أبوبكر الرازي بتسع سنين والفتوى على الأول والأم والجدة أحق بالجارية حتى تحيض وفي (نوادر) هشام عن محمد إذا بلغت حد الشهوة فالأب أحق وهذا صحيح كذا في التبيين'' (فتاوی عالمگیری۔ ۵۹۳)۔

اولاد کی تعلیم وتربیت کے سلسلہ میں ماں اور باپ دونوں پر ذمہ داری عائد کی گئی ہے، بیوی اور اولاد کا نفقہ سکنی وغیرہ باپ کے ذمہ رکھا گیا ہے، اگر ماں اور نانی موجود نہ ہو تو ماں اور نانی کے علاوہ دوسرے رشتہ داروں کو بھی بچہ کی پرورش کا حق دیا گیا ہے، جیسا کہ فقہاء کرام نے کتب فقہ میں باب الحضانۃ قائم کرکے تفصیل

---

[1] ناظم اعلی اصلاح المسلمین، بڑودہ گجرات۔

سے اس پر بحث کی ہے، ماں اگر مرتد ہوجائے یا فاسقہ فاجرہ ہو اور شریعت کے خلاف کام کرتی ہو تو اس صورت میں پرورش کا حق اس سے لے لیا جائے گا اور جن کو شریعت نے پرورش کی ذمہ داری ہے ان کو حق پرورش دیدیا جائے گا۔

اہل وعیال کے نفقہ کی ذمہ داری شریعت نے باپ پر ڈالی ہے، اولاد کے بالغ ہونے تک نفقہ سکنی وغیرہ باپ کے ذمہ رہے گا، اگر لڑکی ہو تو اس کی شادی کرانے تک باپ کی ذمہ داری رہے گی، اور اسی مدت میں اولاد کی صحیح تعلیم وتربیت کی ذمہ داری ماں اور باپ دونوں پر لازم ہے، اہل وعیال پر خرچ کرنے کو بہترین صدقہ فرمایا گیا ہے اور اس پر اجر وثواب میں اضافہ کا وعدہ کیا گیا ہے۔

مسلم شریف میں ہے: "عن أبي هريرة قال قال رسول اللهﷺ دينار أنفقته في سبيل الله ودينار أنفقته في رقبة ودينار تصدقت به على مسكين ودينار أنفقته على أهلك أعظمها أجراً الذي أنفقته على أهلك" (رواہ مسلم، مشکوۃ شریف ۱/۱۷۰) (حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ (ایک) دینار جس کو تم اللہ کے راستہ میں خرچ کرو اور (دوسرا) دینار جس کو تم غلام کے آزاد کرنے میں خرچ کرو اور (تیسرا) دینار جس کو تم کسی مسکین پر خرچ کرو اور (چوتھا) دینار جس کو تم اپنی بیوی بچوں پر خرچ کرو، ان تمام میں سب سے بڑا باعتبار اجر کے وہ دینار ہے جو تم نے اپنی بیوی بچوں پر خرچ کیا ہے)۔

اس کی فضیلت کی وجہ یہ ہے کہ بیوی اور بچوں کا خرچ فرض ہے، کیونکہ ان پر خرچ کرنے کی وجہ سے صدقہ اور صلہ رحمی دونوں کا ثواب ملتا ہے، اس لئے یہ افضل قرار دیا گیا۔

بخاری شریف میں حضرت ابوہریرہؓ اور حکیم بن حزامؓ سے روایت ہے: "عن أبي هريرة وحكيم بن حزام رضي الله عنهما قالا قال رسول اللهﷺ: خير الصدقة ما كان عن ظهر غنىً وابدأ بمن تعول" (مشکوۃ شریف ۱/۱۷۰)۔

(حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت حکیم بن حزامؓ سے مروی ہے، فرماتے ہیں کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بہترین صدقہ وہ ہے جو نفس کے غنی کے ساتھ ہو یعنی دل بڑا رکھ کر خرچ کیا جائے اور تم ابتداء کرو ان لوگوں سے جن کا خرچ تم پر لازم ہے)۔

جس کا خرچ تم پر لازم ہو اور ان سے ابتداء کرنے کا مطلب یہ ہے کہ شوہر پر چونکہ اپنی بیوی بچوں وغیرہ کا خرچ واجب ہے اس لئے سب سے پہلے ان سے شروع کرنے کا حکم دیا گیا۔

بخاری ومسلم شریف میں حضرت ام سلمہؓ سے روایت ہے: "عن أم سلمة ﷺ قالت قلت يا رسول الله ألي أجر إن أنفق على بني أبي سلمة إنما هم بني فقال أنفقي عليهم فلك أجر ما أنفقت عليهم" (متفق علیہ، مشکوۃ شریف ۱/۱۷۰)۔

(حضرت ام سلمہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے پوچھا کہ اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کیا میرے لئے ثواب ہوگا کہ میں ابوسلمہ کی اولاد (بیٹوں) پر خرچ کروں بلاشبہ وہ میرے بھی بیٹے ہیں، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تو ان پر خرچ کر، جو تو ان پر خرچ کرے گی اس کا تیرے لئے اجر ہوگا)۔

"عن سلمان بن عامر قال قال رسول اللهﷺ الصدقة على المسكين صدقة وهي على ذي الرحم ثنتان صدقة وصلة" (رواہ احمد والترمذی والنسائی وابن ماجہ والدارمی، مشکوۃ شریف ۱/۱۷۱)۔

معلوم ہوا کہ اہل وعیال پر خرچ کرنے میں دوہرا ثواب ہے، صدقہ کا اور صلہ رحمی کا۔

مذکورہ بالا تمام احادیث کی روشنی میں یہ بات ثابت ہوئی کہ بیوی اور بچوں پر جو خرچ کیا جاتا ہے اس کا بہت بڑا ثواب ہے۔

۲۔ والدین اور خصوصاً باپ کی ذمہ داری ہے کہ اپنے بچوں کی تعلیم وتربیت کی طرف خصوصی توجہ دیں، طفولیت کا زمانہ تعلیم وتربیت کے لئے بڑی اہمیت کا حامل ہوتا ہے، اس زمانہ میں بچہ کا دل ودماغ بالکل صاف سلیٹ کی طرح ہوتا ہے، بسا اوقات والدین یہ سمجھ کر کہ بچہ کچھ نہیں سمجھتا ایک دوسرے کو اسی دودھ پیتے بچے کے سامنے نامناسب کلمات بولتے ہیں اور گالی گلوج بھی کرتے ہیں، یہ تمام بول بچے کے دل ودماغ میں مرتسم ہوجاتے ہیں، لہذا اس طرح کے کلمات بولنے سے مکمل احتراز کیا جائے۔

امام غزالیؒ نے لکھا ہے کہ بچپن کی تعلیم ایسی ہے جیسے پتھر پر کریدنا یعنی پتھر تو ٹوٹ جائے گا مگر اس پر کریدا ہوا نقش کبھی ختم نہیں ہوگا، اسی طرح بچوں کو اس

کی ماں کی گود سے جو تعلیم دی جائے گی وہ مرور زمانہ سے مضبوط بھی ہوگی، اور اس میں اضافہ بھی ہوگا وہ ختم کبھی نہیں ہوگی، اسی لئے بچہ کا پہلا مدرسہ ماں کی گود ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان بھی ہے:

"اطلبوا العلم من المهد إلى اللحد" (یعنی علم طلب کرو گہوارے سے لے کر قبر تک)۔

آیات قرآنیہ اور احادیث مقدسہ میں تعلیم وتربیت کی اہمیت کی طرف خصوصی توجہ دلائی گئی ہے، ارشاد ہے: "یا أیها الذین آمنوا قوا أنفسكم وأهليكم ناراً"، کہیں فرمایا: "وأمر أهلك بالصلاة واصطبر عليها"، ارشادات نبویہ بھی اس کی اہمیت پر دال ہیں:

"كلكم راع وكلكم مسئول عن رعيته" (تم میں کا ہر شخص اپنی رعیت کا نگراں وذمہ دار ہے، لہذا اس کی رعیت کے بارے میں ہر ایک سے سوال ہوگا)

"عن ابن عباس عن النبي ﷺ أنه قال: افتحوا على صبيانكم أول كلمة بلا إله إلا الله" (رواہ الحاکم، کنز العمال) (حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اپنے بچوں کو سب سے پہلے کلمہ لا الہ الا اللہ سکھاؤ)۔

''اعملوا بطاعة الله واتقوا معاصي الله ومروا أولادكم بامتثال الأوامر واجتناب النواهي فذلك وقاية لهم ولكم من النار'' (ابن جریر وابن المنذر) (اللہ کی فرمانبرداری کا عمل کرو اور اس کی نافرمانی سے بچو اور اپنی اولاد کو نیکیوں کا عمل کرنے اور برائیوں سے بچنے کا حکم کرو (اگر تم ایسا کروگے) تو یہ ان کے لئے اور تمہارے لئے آگ سے بچاؤ کا سامان ہوگا)۔

''إن الله سائل كل راع عما استرعاه حفظ أم ضيع حتى يسأل الرجل عن أهل بيته'' (رواہ ابن حبان) (بے شک اللہ ہر ذمہ دار سے اس کی رعیت کے بارے میں سوال کرے گا کہ ان کی حفاظت کی یا ضائع کردیا، یہاں تک کہ آدمی سے اس کے گھر والوں کے بارے میں سوال کیا جائے گا)۔

"علموا أولادكم وأهليكم الخير وأدبوهم" (رواہ عبد الرزاق) (اپنی اولاد کو اور اپنے گھر والوں کو بھلائی کی تعلیم دو اور ان کو ادب سکھاؤ)۔

ان تمام آیات قرآنی اور احادیث نبویہ سے بچوں کو دین کا علم سکھانے اور ان کو حسن اخلاق کی تعلیم کی اہمیت ظاہر وباہر ہے، لڑکوں اور لڑکیوں کے بالغ ہونے تک یہ فریضہ بہت زیادہ مؤکد ہے۔

رہا دنیوی تعلیم کا معاملہ تو بچوں میں بنیادی عقائد اسلام کی پختگی، توحید وایمان کی مضبوطی اور ارکان اسلام اور ان کی ادائیگی کے طریقوں کا ضروری علم آجانے کے بعد اگر دنیوی تعلیم ان کو دی جائے اور اسکول وکالج تک کی تعلیم دی جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں، بشرطیکہ وہ ایمان واسلام اور اس کے مقتضیات پر مضبوطی سے قائم رہیں۔

لڑکیوں کو بھی ضروری حد تک کہ وہ عصری زبان میں لکھ پڑھ سکیں اتنی عصری تعلیم دلا سکتے ہیں، بشرطیکہ ان کے اندر بھی عقائد کی پختگی، توحید وایمان پر مضبوطی سے قائم رہنا، ارکان اسلام وغیرہ کا ضروری علم آیا چکا ہو۔ لڑکیوں کو کالجوں اور یونیورسٹی میں داخل کرکے اونچی تعلیم دلانا اور ڈگریاں حاصل کرنا جائز نہیں ہے، اس لئے کہ اس میں نفع سے نقصان کہیں زیادہ ہے، "إثمهما أكبر من نفعهما" کے مدنظر، تجربہ شاہد ہے کہ انگلش تعلیم اور کالج یونیورسٹی کے ماحول سے اسلامی عقائد واخلاق وعادات بگڑ جاتے ہیں، آزادی، بے شرمی اور بے حیائی بڑھ جاتی ہے۔

شریعت کا قانون ہے کہ فائدہ حاصل کرنے کے بجائے خرابی سے دور ہٹنا اور برائی سے بچنا ضروری ہے، ''الاشباہ والنظائر میں ہے: ''قاعدة خامسة وهي درأ المفاسد أولى من جلب المصالح فإذا تعارضت مفسدة ومصلحة قدم دفع المفسدة غالباً لأن اعتناء الشرع المنهيات أشد من اعتناءه بالمأمورات'' (۱۱۴)۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں عورتوں کو مسجد میں جاکر جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنے کی اجازت تھی، مگر بعد میں خرابی پیدا ہونے کی وجہ سے حضرت عمر فاروقؓ نے عورتوں کو مسجد میں آنے سے روک دیا اور حضرت عائشہؓ نے مذکورہ فیصلہ کی تاکید کرتے ہوئے فرمایا کہ عورتوں نے جو حالت بنالی ہے اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو ملاحظہ فرمایا ہوتا تو پہلے ہی ان کو مسجد سے روک دیتے اجازت نہ دیتے ''إن عائشة زوج النبي ﷺ قالت لو أدرك رسول الله ﷺ ما حدث النساء لمنعهن المسجد'' (ابوداؤد شریف باب ماجاء فی خروج النساء الی المساجد)۔

مذکورہ قانون کے مطابق جب عورتوں کے لئے مسجد میں جاکر نماز پڑھنا ناجائز ٹھہرا تو ان کو انگریزی پڑھانا اور کالجوں یونیورسٹیوں میں داخل کرکے اعلی

ڈگریاں حاصل کرنا کیوں کرنا جائز ہوسکتا ہے، جب کہ یہاں دین کا ضرر کہیں زیادہ ہے، مطلب یہ ہے کہ ایسی تعلیم دلانا جس سے دین وایمان پر برا اثر پڑتا ہے، جوغیر اسلامی کلچر غیر اسلامی اخلاق وعادات اختیار کرنے کا ذریعہ بنتی ہو ہر ایک کے لئے ناجائز ہے، لڑکی ہو یا لڑکا، البتہ یہ فرق کیا جاسکتا ہے کہ چونکہ لڑکیوں کی فطرت اثر بدکو جلد قبول کر لیتی ہے اور مذہبی لحاظ سے معاشی ذمہ داریاں بھی ان پر نہیں ڈالی گئیں تو ان کو اعلی عصری تعلیم سے باز رکھنا چاہئے، اس کی اجازت نہیں ہے کہ وہ اعلی عصری تعلیم حاصل کریں، کیونکہ دین وایمان کی حفاظت اولین فرض ہے۔

لازمی تعلیم کا مسئلہ:

۳۔ اگر حکومت عصری تعلیم پرائمری درجہ تک لازم قرار دے تو بچوں کو دینی تعلیم کے انتظام کے ساتھ اس کو اختیار کرنے کی اجازت ہے، بایں طور کہ اسکول کی تعلیم کے اوقات کے علاوہ مکتب کی تعلیم کے اوقات متعین کئے جائیں اور بچوں کو ان اوقات میں مکتب یا مدرسہ میں بھیجا جائے تا کہ ان کو قرآن شریف کی تعلیم اور ضروریات دین کی تعلیم دی جاسکے۔ اگر دن کے اوقات میں اسکی گنجائش نہ نکل سکے تو اسکول کا وقت ختم ہونے کے بعد شام کو پانچ بجے سے ساڑھے سات بجے تک مکتب کی تعلیم کا انتظام کیا جائے جیسا کہ یورپ اور امریکہ وغیرہ ممالک میں مکتب کی تعلیم کا یہی سسٹم رائج ہے اور کامیاب ہے۔

جنس کی تعلیم اور ہمارے بچے:

۴۔ اس بارے میں عرض یہ ہے کہ آج کل جنس کی تعلیم کا جو مفہوم ومطلب لیا جارہا ہے کہ بچوں کو میاں بیوی کے جنسی حقیقی ملاپ کے جو طریقے ہیں وہ ان کو بتائے جائیں اور سکھلائے جائیں تو اس طرح کی جنسی تعلیم شرعاً ناجائز ہے اور مہذب معاشرہ بھی اس کی اجازت نہیں دیتا، یہ پرلے درجہ کی بے حیائی اور فحاشی ہے، یہ سب مغربی تہذیب وکلچر کی دین ہے۔

البتہ بعض وہ امور جن کا تعلق جنس اور شہوت سے ہے اور اسپر کوئی حکم شرعی مرتب اور عائد ہوتا ہے تو اس کو بتلانا مربی حضرات کے لئے جائز ہے، جیسے بعض آیات میں جنسی استحصال وملاپ کا تذکرہ ملتا ہے، نیز یہ کہ انسان نطفہ سے پیدا ہوا ہے، زنا وغیرہ کا ذکر ملتا ہے، نیز اپنی شرمگاہ کی حفاظت کس سے کرنا چاہئے کس سے نہیں، رمضان میں ہمبستری کی جاسکتی ہے یا نہیں، حالت حیض میں عورتوں سے دوری اختیار کرنا چاہئے، تو یہ سب چیزیں اور خواہش نفس سے سے متعلق ہیں تو ان کا تذکرہ شرم وحیا کے بقاء کے ساتھ مربی حضرات ان بچوں کے سامنے جو سن شعور کو پہنچ گئے ہوں احکام شرعیہ کو بتانے کے لئے کر سکتے ہیں، لیکن اس میں دو باتیں ملحوظ رہیں:

عمر کے ہر حصہ سے متعلق احکام کی تعلیم اسی کی مناسبت سے دی جائے، دوسری بات یہ ہے کہ لڑکی کو یہ جنسی مسائل سکھانے کا کام ماں کو انجام دینا چاہئے، اگر ماں نہ ہو تو کوئی دوسری عورت یا معلمہ استانی اس کام کو انجام دے۔

نکاح کے بارے میں بچوں اور بچیوں کے حقوق:

ج۔ شریعت کا یہ حکم ہے کہ لڑکے اور لڑکیاں جب بالغ ہوجائیں تو والدین کو چاہئے کہ ان کی شادی کروادیں تا کہ وہ کسی گناہ کے کام میں بتلا نہ ہوں، والدین اگر شادی نہیں کروائیں گے اور لڑکا لڑکی اگر گناہ کے کام میں بتلا ہو گئے تو والد کو اس کا گناہ ہوگا اور اس کی باز پرس ہوگی۔

''عن أبي سعيد الخدري وابن عباس رضي الله عنهما قالا: قال رسول اللهﷺ: من ولد له ولد فليحسن اسمه وأدبه فإذا بلغ فليزوجه فإن بلغ ولم يزوجه فأصاب إثماً فإنما إثمه على أبيه'' (مشکوۃ شریف ۲ / ۲۷۱)۔

(حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس کے یہاں کوئی بچہ پیدا ہو تو سب سے پہلے اس کا اچھا نام رکھو اور اچھے اخلاق وآداب سکھاؤ، بالغ ہوجائے تو اس کی شادی کروادو، اگر بالغ ہوگیا اور اس کی شادی نہ کروائی اور (وہ لڑکا لڑکی) گناہ کے کام میں بتلا ہو گئے تو اس کا گناہ اسکے باپ پر ہوگا)۔

بیہقی میں حضرت انسؓ سے روایت ہے: ''عن أنس ﷺ عن رسول اللهﷺ قال في التوراة مكتوب: من بلغت ابنته اثنتى عشرة سنة ولم يزوجها فأصابت إثماً فإثم ذلك عليه'' (مشكوة المصابيح ۲-۲۷۱)۔

(حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تورات میں لکھا ہوا ہے کہ جس لڑکی کی عمر بارہ سال کی ہوگئی اور اس کے والد نے اس کی شادی نہ کروائی اور اس سے کسی گناہ کا ارتکاب ہوگیا تو اس کا گناہ اس کے باپ پر ہوگا)۔

بچہ مزدوری کے بارے میں اسلام کا موقف:

د: اسلام نے طفولیت کے زمانہ میں اور بلوغ تک پہنچنے کی مدت میں بیوی بچوں کے خرچ کی ذمہ داری باپ کے سر ڈالی ہے، اور اسی مدت میں بچوں کو دینی تعلیم دینے کا مکلف باپ کو خصوصاً قرار دیا ہے، اب ظاہر ہے کہ اگر اس زمانہ میں بچہ کو مزدوری اور کام پر لگایا جائے تو اس کی جسمانی اور دماغی نشو ونما صحیح طور پر نہیں ہوسکے گی، اسی طرح وہ دینی تعلیم وتربیت سے بھی محروم ہوجائے گا، اس لئے اسلام نے بچوں سے مزدوری اور کام پر لگانے کی اجازت نہیں دی ہے، کیوں کہ ان کو اس عمر میں کمانے کا مکلف نہیں بنایا گیا ہے، اگر والدین غربت وتنگدسی میں مبتلا ہوں تب بھی بچوں سے ایسے مزدوری کے کام کرانا درست نہیں ہے، باپ کو چاہئے کہ روزی کے ذرائع تلاش کرے اور اپنے بچوں کی کفالت کرے، حکومت وقت کی بھی یہ ذمہ داری ہے کہ روزی کے اسباب تلاش کر کے یا مہیا کر کے بے روزگار لوگوں کی مدد کرے، مگر آج کل حکومتیں اس سے غفلت برتتی ہیں، والدین یا اولیاء اپنے بچوں سے ان کی تعلیم وتربیت کے اوقات کے علاوہ میں گھر کے چھوٹے موٹے کام لے سکتے ہیں، کام کی عادت ڈالنے کے لئے اور تربیت کی خاطر بازار سے کوئی معمولی سودا سلف لانے یا گھر میں کوئی معمولی کام کرانے کی اجازت ہے۔

نابالغ بچے اور جرائم:

ہ: اسلام نے جرائم کے سد باب کے لئے حدود اور سزائیں مقرر کی ہیں تا کہ اسلامی معاشرہ جرائم سے محفوظ رہے اور ایک دوسرے کے حقوق پر کوئی زد نہ پڑے۔

بڑوں کے لئے جن جرائم پر حدود مقرر کی گئی ہیں اگر وہی جرائم بلوغ سے پہلے بچوں سے سرزد ہوں تو چونکہ بلوغ سے پہلے وہ شرعی احکام کا مکلف نہیں ہے بلوغ سے پہلے اس لئے شرعی طور پر بالغ ہونے سے پہلے ان جرائم کے صدور پر حدود تو جاری نہیں کی جائیں گی، البتہ تعزیرات جاری ہوں گی، لیکن اس میں اس بات کا لحاظ ضروری ہوگا کہ بچہ کی جسمانی ساخت، عمر اور اس کے تحمل کی طاقت کو مدنظر رکھ کر اس کو سزا دی جائے اور جرائم کے دینی ودنیوی نقصانات کو بتا کر اس کی ذہن سازی کی جائے تا کہ آئندہ ان کے ارتکاب سے اس کو بچایا جاسکے۔ شرعی اعتبار سے جب بچہ بالغ ہوجائے تو احکام شرع کا وہ مکلف بن جاتا ہے، لہذا اس کے بعد اس پر حدود والے جرائم کے ارتکاب پر حدود جاری کی جائیں گی، آج کل حکومت کے قانون کے اعتبار سے اٹھارہ سال سے کم عمر والے کو بچہ میں شمار کیا جاتا ہے، یہ صحیح نہیں ہے، لہذا شرعی اعتبار سے بلوغ کا اعتبار ہوگا۔

و: اگر ضرورت محسوس ہو تو بچہ کو بچوں کی جیل میں بھیجا جاسکتا ہے، مگر ان کو سخت مار پیٹ یا ان کی طاقت سے زیادہ کے کام لینے کی اجازت نہیں ہے، بلکہ جیل میں ایسا عملہ ہونا چاہئے جو ان برائیوں کے نقصانات سے ان کو آگاہ کرے اور ان کی ذہنی تربیت کرے۔

ز: جو بچے بے سہارا ہوجاتے ہیں جس کی بہت سی شکلیں ہیں، ایسے بچوں کی تربیت، پرورش اور ان کی دیکھ بھال کے لئے اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ ان بچوں کے جو قریبی رشتہ دار ہیں ان پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ ان بچوں کی نگہداشت کریں، انکی تعلیم وتربیت کی فکر کریں، اگر رشتہ دار اس ذمہ داری کو قبول کرنے سے پہلو تہی کریں یا غفلت برتیں تو ایسی صورت میں حکومت کو یہ ذمہ داری اٹھانی چاہئے یا دوسرے مسلمانوں کو حکم دیا کہ وہ ایسے بچوں کو اپنائیں اور ان کی کفالت کریں، نیز تعلیم وتربیت کی ذمہ داری اٹھائیں، ایسے بچوں کی کفالت پر بڑے اجر وثواب کا وعدہ کیا گیا ہے۔

ح: بچہ کے والدین یا اولیاء حد درجہ مفلس ہوں اور اپنے افلاس وتنگدستی (جو بدرجۂ مجبوری ہو) کی وجہ سے بچہ کی کفالت اور اس کی پرورش نہ کر سکتے ہوں، اور دوسرا رشتہ دار یا اسلامی بھائی اس بچہ کی کفالت خوشی سے اپنے ذمہ لینے کے لئے تیار ہو اور اپنی کفالت میں لینے والا شخص یا خاندان دیندار ہو تو ایسی صورت میں بچہ کی کفالت ونگرانی کے لئے دوسرے کو سپرد کیا جاسکتا ہے، مگر والدین اس سے بے تعلق نہیں ہوسکتے، وقتاً فوقتاً اپنے بچہ کی خبر گیری اور کس طرح اس کی تعلیم وتربیت ہو رہی ہے اسکی خبر گیری ضروری ہوگی، یا کوئی ایسا ادارہ جو بچوں کی تعلیم وتربیت اپنے ادارہ میں رکھ کر کرتا ہو اس ادارہ میں بھی بچہ کو داخل کیا جاسکتا ہے۔

بچہ کی کفالت اپنے ذمہ لینے والے شخص سے اپنے بچہ کو سپرد کرنے کے عوض کوئی معاوضۂ مالی لینا درست نہیں ہے۔

ط: جو معذور بچے ہوتے ہیں اور ان کے علاج اور نگہداشت کی سخت ضرورت ہوتی ہے، والدین کا فرض بنتا ہے کہ وہ ایسے بچوں کی دیکھ بھال کریں اور اسے اللہ تعالی کی طرف سے آزمائش سمجھیں، ایسے بچوں کی جو بھی خدمت کریں اس پر بڑے بڑے اجر وثواب کا وعدہ ہے، اگر ملازمت یا اور کسی مجبوری کے سبب معذور بچہ کی دیکھ بھال نہ کر سکیں تو کسی ملازم کو معاوضہ دے کر اس کے ذریعہ اس کی ضروریات کو پورا کریں اور ساتھ ہی اپنا پیار ومحبت بچہ کو دیتے رہیں، اور اس کی تعلیم وتربیت کی طرف دھیان دیتے رہیں، اگر یہ بھی نہ ہوسکے تو ایک مسلمان کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ کسی مسلم ہسپتال میں داخل کرے جہاں اس کا ایمان سلامت رہے اور داخل کرنے کے بعد اس سے بے تعلق ہوجانا اور اسے چھوڑ دینا جائز نہیں، بلکہ وقتاً فوقتاً اس کی خبر گیری رکھنا اور اس پر شفقت کرتے رہنا ضروری ہے۔ ☆☆☆

اسلامی قانون میں بچوں کے حقوق

مفتی ظہیر احمد قاسمی[1]

حق حضانت:

حضانت شریعت اسلامیہ میں نابالغ لڑکے ولڑکی کی پرورش ان کی مصالح کی رعایت کے ساتھ کرنا، کہ ان کی جسمانی، نفسیاتی اور عقلی تربیت جو ان کی مستقبل کی زندگی گزارنے میں معاون ہو حضانت کہلاتا ہے۔

حق حضانت سب سے پہلے ماں کو ہے، ماں نہ ہو تو پھر نانی، پھر دادی، پھر بہن اس کے بعد خالہ، اور پھر پھوپھی کا حق پرورش ہوتا ہے، اگر عورتوں میں کوئی پرورش کے لائق نہ ہو تو پھر حق پرورش مردوں میں سب سے پہلے باپ پھر دادا پردادا اس کے بعد حقیقی بھائی وغیرہ کو حق حضانت حاصل ہوگا۔

ماں نانی دادی وغیرہ کو حق حضانت لڑکوں کے سن تمیز تک ہے کہ جب تک وہ خود اپنے ہاتھ کھانے پینے، استنجاء کرنے کپڑے پہننے وغیرہ کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔ یہ عمر تقریباً ۷ سال ہے، اس کے بعد باپ کے حوالہ لڑکے کردیئے جائیں گے تاکہ صحیح طریقہ پر ان کی تعلیم وتربیت، آداب واخلاق، تہذیب وثقافت کے زیور سے آراستہ ہوسکیں۔

جب کہ لڑکیاں ماں، نانی دادی وغیرہ کے پاس بلوغ تک رہیں گی، بالغ ہونے کے بعد (۱۵ سال کے بعد) پھر باپ کے حوالہ کردی جائیں گی۔

حق پرورش کی شرائط میں سے عاقل، بالغ ہونا، فاسق نہ ہو، آزاد ہونا، مسلمان ہونا، چنانچہ ماں اگر نعوذ باللہ مرتدہ ہوجائے تو اس کا حق پرورش ختم ہوجائے گا، اسی طرح عورت بچہ کی محرم رشتہ دار ہو یا اس عورت نے ایسے مرد سے نکاح نہ کیا ہو جو اس بچہ کا محرم نہ ہو، ورنہ اس کا حق پرورش ختم ہوجائے گا، اسی طرح لڑکی کے حق میں مرد کا محرم ہونا ضروری ہے، البتہ اگر کوئی اور شخص ہو تو قاضی کی صوابدید پر چچازاد بھائی کو بھی حق پرورش دیا جاسکتا ہے، (ماخوذ قاموس الفقہ ۴/ ۲۶۷-۲۶۲)۔

حضانت میں اصلاً اس کی اخلاقی تربیت ہے، چنانچہ اگر اخلاقی بگاڑ کا اندیشہ ہو تو پھر اس کا حق حضانت ساقط ہوجائے گا حتی کہ اگر ماں مرتدہ ہوجائے یا زانیہ ہو تو اس کا حق ساقط ہوجائے گا (فتاوی دار العلوم ۱۱/ ۱۰۸)۔

اسی طرح اسکے برعکس اگر باپ فاسق ہو اور اس کے پاس رہنے سے اولاد پر غلط اثرات پڑ سکتے ہوں تب بھی یہی حکم ہے کہ باپ کا حق پرورش ساقط ہوجائے گا، غرضیکہ اخلاقی تربیت کو حق حضانت میں بنیادی حیثیت حاصل ہے۔

(ب-۱): اسلام میں صحیح تعلیم وتربیت پر بہت زور دیا گیا ہے، ارشاد باری ہے:

"یأیھا الذین آمنوا قوا أنفسکم وأھلیکم ناراً" (سورہ تحریم:۶) (اے ایمان والو! اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو دوزخ کی آگ سے بچاؤ)۔

امام بخاریؒ اپنی صحیح بخاری میں اس آیت کی تفسیر ان کلمات سے فرماتے ہیں:

"أوصوا أنفسکم وأھلیکم بتقوی اللہ وأدبوھم" (بخاری ۲/ ۷۳۰-۷۳۱) (یعنی تم اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو تقوی اختیار کرنے کی

---

[1] جامع العلوم کانپور، یوپی۔

نصیحت کرو اور ان کو ادب سکھاؤ)۔

ایک حدیث میں ارشاد نبوی ہے: "لأن یؤدب الرجل ولدہ خیر من أن یتصدق" (مسند احمد ۵/۱۰۲، ترمذی ۴/۳۳۷)۔

ترمذی کی ایک روایت میں خیر من أن یتصدق کے بعد بصاع کا لفظ بھی ہے، یعنی اپنی اولاد کو ادب سکھانا ایک صاع صدقہ کرنے سے افضل ہے۔

ایک اور حدیث میں ارشاد نبوی ہے: "أکرموا أولادکم وأحسنوا أدبہم" (ابن ماجہ ۲/۱۲۱۱، ترمذی ۲/۱۶)۔

اس حدیث پاک میں صیغہ امر کے ساتھ ارشاد ہے جس سے بچوں کی صحیح تعلیم وتربیت کے فریضہ کی طرف تاکید معلوم ہوتی ہے، ایک اور دوسری حدیث پاک میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "ما نحل والد ولدہ أفضل من أدب حسن" (مسند احمد ۴/۷۷-۷۸، ترمذی ۲/۱۶) کہ والد کی جانب سے سب سے افضل اور بہتر تحفہ اپنی اولاد کے لئے احسن ادب ہی ہے۔

غرضیکہ والد پر اولاد کو اچھی تعلیم وتربیت دلانا اور اس سے آراستہ کرنا فرض ہے، "کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ" الحدیث۔

(۲) موٹی موٹی اور ضروری تعلیم فرض عین ہے، خواہ دینی ہو یا دنیوی جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "طلب العلم فریضة علی کل مسلم"۔ البتہ دونوں تعلیم (دینی ودنیوی) اختصاص کی حد تک فرض کفایہ ہیں۔

(۳) ۱۴ سال تک حکومت تعلیم کو لازم قرار دے رہی ہے، جو مڈل یا ہائی اسکول تک کی تعلیم ہوگی اگر نصاب میں کوئی مضر اور نقصان دہ مواد نہ ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں، ہم اس مدت میں دونوں ضروری اور بنیادی تعلیم سے بچوں کو آراستہ کر سکتے ہیں۔

(۴) جنس کی ضروری اور بنیادی تعلیم کی اصلاً ضرورت نہیں، بنیادی جنسی تعلیم سے تمام حیوانات تک واقف ہوتے ہیں، البتہ کن حالتوں میں مجامعت کرنی چاہئے اور کن حالتوں میں نہیں، اس کی تعلیم خود اسلام میں موجود ہے۔

ج: بچوں کے اوپر ولایت نکاح بچوں کے مفاد کے پیش نظر شریعت نے رکھا ہے، لیکن اگر اس ولایت سے مفاد کی بجائے فساد اور خرابی پیدا ہوتی ہو تو وہ ولایت ساقط الاعتبار ہوگی جس کا فیصلہ حالات کے پیش نظر قاضی شریعت کرسکتا ہے، بچوں کے مفاد کو ہر حالت میں مقدم رکھا جائے گا۔

لقولہ ﷺ: "إذا خطب إلیکم من ترضون دینہ وخلقہ فزوجوہ إلا تکن فتنة فی الأرض وفساد عریض" (ترمذی ۳/۳۹۴، رقم الحدیث: ۱۰۸۴)

د: بچہ مزدوری اصلاً اسلام میں درست نہیں، کیونکہ یہ زمانہ اس کی تعلیم وتربیت کا ہے، چنانچہ صبی غیر ممیز کا کوئی بھی عقد منعقد نہیں ہوگا، خواہ عقد اجارہ ہو یا عقد بیع وغیرہ، چنانچہ الفقہ الاسلامی وادلتہ میں ہے:

"أن یکون العاقل عاقلاً أی ممیزاً فلا ینعقد بیع المجنون والصبی غیر العاقل، ولا یشترط البلوغ فیصح تصرف الصبی الممیز البالغ من العمر سبع سنوات" (۵/۳۳۱۷)۔

البتہ بوقت ضرورت جب بچہ سات سے زیادہ عمر کا ہو تو پھر اپنے ولی کی اجازت سے وہ عقد اجارہ یا بیع وغیرہ کرسکتا ہے، جیسا کہ فی الفقہ الاسلامی وادلتہ میں ہے:

"التصرفات الدائرة بین الضرر والنفع: کالبیع والشراء والإیجار والاستئجار والزواج والمزارعة والمساقات والشرکات ونحوھا، فھذہ التصرفات تصح من الصبی الممیز ولکنھا تکون موقوفة علی إذن الولی أو إجازتہ ما دام صغیراً أو علی إجازتہ بنفسہ بعد البلوغ لأن الممیز جانباً من الإدراک غیر قلیل" (۵/۳۳۱۸)۔

وہ عقود جو بغیر ولی کی اجازت کے کئے ہیں وہ ولی کی اجازت پر موقوف ہوں گے۔

(۲) جیسا کہ پہلے مذکور ہوا کہ اصلاً اسلام میں بچہ مزدوری درست نہیں، کیونکہ یہ وقت اس کے لئے حصول تعلیم وتربیت کا ہے، متعدد نصوص میں اس کی طرف اشارہ ہے، حتی کہ حصول تعلیم خود عجز عن الکسب کا سبب ہے، یعنی اگر چہ وہ کمائی پر قادر ہو کما سکتا ہو، لیکن اگر وہ تعلیم میں مشغول ہے تو ایسی

صورت میں اس پر کمانا ضروری نہیں، بلکہ اس کا خرچ والد پر ہوگا، جیسا کہ الفقہ الاسلامی وادلتہ میں ہے:

''طلب العلم الذی یشغل عن التکسب فالطالب المتعلم حتی ولو کان قادراً علی العمل والتکسب تجب نفقته علی أبیه لأن طلب العلم فرض کفایة فلو ألزم طلبة العلم التکسب تعطلت مصالح الأمة'' (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۱۰-۷۴۱۴)۔

اور بچہ میں تو دو سبب عجز عن الکسب کے پائے جارہے ہیں: ایک حصول تعلیم اور دوسرا اس کا صغر، لہذا اس سے کمائی کی اجازت اصلاً نہیں ہوگی، اس کے اخراجات اس کے والد پر ہوں گے۔

البتہ اگر اس کے والد قادر نہ ہوں یا گھریلو اخراجات پورے نہ ہوتے ہوں تو اس وقت بچہ سے کمانے کی اجازت ہوسکتی ہے۔

''الصغر أی الصغیر الذی لم یبلغ به صاحبه حد الکسب، فإن بلغ الغلام لا الأنثی حد الکسب کان للأب أن یوجره أو یدفعه إلی حرفة لیکتسب منها وینفق علیه من کسبه، أما الأنثی فلا توجر للخدمة لما فیها من مخاطر الخلوة بها وهو لا یجوز شرعاً لکن یجوز تعلیمها عند امرأة حرفة معینة مناسبة لها کخیاطة أو تطریز أو غزل ونحوها'' (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۱۰-۷۴۱۳)۔

لیکن صرف اس حد تک کہ ان کا خرچ وغیرہ آسانی سے چل سکے، اور اس کی تعلیم کا سلسلہ بھی چلتا رہے، معیار زندگی کو بلند کرنے یا اس کو بہتر بنانے کے لئے بچوں سے کمانے کی شرعاً اجازت نہیں۔

(۳) ایسے والدین جو خود کمانے پر قادر نہیں وہ اپنے بچوں کو مزدوری وغیرہ پر لگا سکتے ہیں، لیکن صرف اس حد تک کہ ان کا ضروری خرچ پورا ہوتا رہے، معیار زندگی کو بلند کرنے یا بہتر بنانے کے لئے اس کی اجازت نہیں۔

والدین کے کمائی پر قادر نہ ہونے کی صورت میں اور بچوں کے کمائی پر قادر ہونے کی صورت میں خرچ شرعاً والدین پر نہیں بلکہ بچوں پر ہی واجب ہوتا ہے۔

''وإذا کان (الولد) مکتسباً وجب علیه الاکتساب فالصغیر المکتسب نفقته فی کسبه لا علی أبیه'' (۱۰-۷۴۱۳، الفقہ الاسلامی وادلتہ)۔

حتی کہ ایسی صورت میں لڑکی کا خرچ بھی باپ سے ساقط ہوجائے گا جبکہ وہ خود جائز اور مناسب کمائی پر قادر ہو۔

''فإن اکتسبت من مهنة شریفة لا تعرضها للفتنة کخیاطة وتعلیم وتطبیب سقطت نفقتها عن الأب'' (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۱۰-۷۴۱۴، وکذا ۱۰-۷۴۱۳)۔

۵: بچہ سے اگر جریمہ قتل وغیرہ کا صدور ہوتا ہے تو اس پر قصاص تو بالاتفاق واجب نہیں ہوگا، بدائع الصنائع میں ہے:

''فإن کان صبیاً أو مجنوناً لا یجب القصاص لأن القصاص عقوبة وهما لیسا من أهل العقوبة لأنهما لا تجب إلا بالجنایة وفعلهما لا یوصف بالجنایة ولهذا لم یجب علیهما الحدود'' (۷، ۲۳۴ طبع ایچ ایم سعید کراچی، تبیین الحقائق ۶، ۹۸ طبع امدادیہ پاکستان)

بدایۃ المجتہد میں ہے: ''اتفقوا علی أن القاتل الذی یقاد عنه یشترط فیه أن یکون عاقلاً بالغاً مختاراً'' (بدایة المجتهد ۲، ۳۳۱، الخرشی ۸، ۳، دار الفکر مصر، المهذب ۲، ۱۷۳، مغنی المحتاج ۴، ۱۵، المغنی ۷، ۶۶۴ مکتبة الریاض)۔

البتہ اس پر دیت مخففہ واجب ہوگی، مغلظہ نہیں، جو بچہ کے عاقلہ پر تین سال موجلہ واجب ہوگی، اخماساً یعنی ۲۰ حقے، ۲۰ جذعہ، ۲۰ بنت مخاض، ۲۰ بنت لبون اور ۲۰ بنی مخاض واجب ہوں گے (المغنی ۷/۷۶۹-۷۷۱، بدایۃ المجتہد ۲/۳۴۳، بدائع الصنائع ۷/۲۵۴، تبیین الحقائق ۲/۱۲۶-۱۲۷، رد المحتار ۵/۳۶۸)۔

اور قاتل بچہ میراث اور وصیت سے بھی ہمارے نزدیک محروم نہیں ہوگا۔

''حتی أن الصبی أو المجنون إذا قتل مورثه لا یحرم من المیراث لأن حرمان المیراث عقوبة وهما لیسا من أهل العقوبة'' (جامع احکام الصغار ۲-۷۴، تبیین الحقائق ۶-۱۳۹)۔

''أو یکون القاتل صبیاً أو مجنوناً فتجوز بلا إجازة لأنهما لیسا أهلاً للعقوبة'' (رد المحتار ۵-۴۲۰)۔

اور اس پر تعزیر یعنی تادیب واجب ہوگی جو حکم اور قاضی کی رائے پر مفوض ہوگی (تبیین الحقائق ۳/۲۰۸، المغنی ۷/۲۴۵-۲۴۶، الدر المختار مع رد المحتار ۳/۱۷۹، بدایۃ المجتہد ۲/۳۳۸)۔

انواع تادیب کی فقہاء نے نو شکلیں ذکر کی ہیں، حاکم اور قاضی جو ان میں سے مناسب سمجھے نافذ کر سکتا ہے۔

(۱) الاعلام، (۲) الاعلام والجر إلی باب القاضی، (۳) والخطاب بالمواجہۃ، (۴) النصح والتوجیہ، (۵) التوبیخ، (۶) التعنیف والتجریح، (۷) الضرب، (۸) اتلاف محل الانحراف، (۹) المصادرۃ (مقالتی جرائم الصبیان فی الشریعۃ الاسلامیہ والقانون الہندی دراسۃ مقارنۃ، ص: ۸۶ تا ۱۰۳، ص: ۱۴۹ تا ۱۵۲)۔

اور اگر بچہ سے جریمہ سرقہ (چوری) کا صدور ہوتا ہے تو اس پر حد کا نفاذ نہیں ہوگا، بلکہ اس پر تادیب مع ضمان مال السرقہ واجب ہوگا (بدائع الصنائع ۶/۶۷، لسان الحکام مع معین الحکام، ص: ۴۰۱، تبصرۃ الحکام ۲/۲۵۱، معین الحکام، ص: ۱۸۵، نہایۃ المحتاج ۷/۴۴۳، المہذب ۲/۲۷۷، بدایۃ المجتہد ۲/۳۷۳، مقالتی جرائم الصبیان فی الشریعۃ الاسلامیہ والقانون الہندی، ص: ۵۴ تا ۵۹)۔

اور اگر بچہ سے جریمہ زنا کا صدور ہوتا ہے تو اس صورت میں بھی اس پر تادیب ہے حد واجب نہیں، البتہ بعض صورتوں میں مہر کا وجوب بھی ہوگا۔

لسان الحکام مع معین الحکام میں ہے: ''الصبی إذا زنی بصبیة لا حد علیه وعلیه المهر فی ماله لأنه مواخذ بأفعاله وإذنهما له لم یصح'' (لسان الحکام مع معین الحکام، ص: ۳۹۹، وکذا فی بدائع ۷-۳۳)۔

تبصرۃ الحکام میں ہے: ''ویجب فیه الصداق إن کانت المرأة مکرهة أو غیر عالمة'' (تبصرة الحکام ۲-۶)۔

لیکن اگر پہلی عورت عاقلہ بالغہ کی طرف سے ہے تو اس پر مہر کا بھی وجوب نہیں۔

نیز لسان الحکام میں ہے: ''العاقلة البالغة وطأت من صبی أو مجنون لا حد علیهما وزاد فی النظم وعلیها العدة ولا مهر لها، ولأن الرضا معتبر فی إسقاط حقها'' (لسان الحکام مع معین الحکام، ص: ۳۹۹، مقالتی جرائم الصبیان فی الشریعة الاسلامیه والقانون الهندی، ص: ۳۸ تا ۴۵)۔

لیکن ہندوستانی قانون میں بچہ اگر ۱۲ سال سے اوپر ہے یا ۷ اور ۱۲ کے درمیان ہے اور اس بچہ نے یہ جرائم سمجھتے بوجھتے ہوئے کئے ہیں تو اس کو بالغ کی طرح ہی سزائیں دی جاسکتی ہیں، لیکن عام طور سے اس کو مدارس اصلاحیہ (Reformentry School) میں رکھا جائے گا (Reformentory School Act 1847 Section 8-13)۔

اسلام میں تادیب کی قسمیں:

بچوں کی تربیت اور ان کی اصلاح کے لئے تادیب کی چند درج ذیل شکلیں اور صورتیں حسب ضرورت اختیار کیا جاسکتی ہیں:

(۱) الاعلام: محض اس کو یہ بتانا کہ مجھ کو تمہارے بارے میں اس طرح کی شکایت ملی ہے، شریف بچوں کے لئے اتنا کہہ دینا ہی کافی ہے، انشاء اللہ وہ اسی سے باز آجائے گا اور اپنی اصلاح کر لے گا، حیث جاء فی بدائع الصنائع، ''فتعزیر إشراف الأشراف بالإعلام المجرد وهو أن یبعث القاضی أمینه إلیه فیقول له بلغنی إنك تفعل کذا وکذا'' (بدائع الصنائع ۳/۲۰۷-۲۰۸، رد المحتار ۳/۱۷۹)۔

(۲) الاعلام والجر الی باب القاضی: اگر اس کو اس سے تنبیہ نہ ہوئی ہو تو پھر اس کو قاضی اپنی عدالت میں طلب کرے اور سختی اور ناگواری کے ساتھ اس کو گھورے (سابقہ حوالہ)۔

(۳) الخطاب بالمواجہۃ: یہ شکل بھی سابق شکل میں داخل ہے اس میں بھی قاضی ناگواری کے ساتھ ہی پیش آئے گا، مگر ابھی کچھ زبان سے نہیں کہے گا (بدائع ۷ / ۶۴)۔

(۴) النصح والتوجیہ: اس صورت میں اب تادیب فعلی سے تادیب قولی کی طرف رجوع کرے گا، جب اس کو بالفعل تنبیہ نہیں ہوئی تو اب بالقول اس کو نصیحت کرے گا۔

(حیث جاء فی بدائع الصنائع: وتعزیز الاشراف بالاعلام والجر الی باب القاضی وبالمواجہۃ ۷ / ۶۴، وکذا جاء فی احکام جرائم الاحداث، ص: ۱۰۱، مغنی المحتاج ۴ / ۱۹۲ - ۱۹۹، تبیین الحقائق ۳ / ۲۰۷ - ۲۰۸، الاحکام السلطانیہ للماوردی، ص: ۲۰۴، السیاسیۃ الشرعیہ، ص: ۹۷، الحسبۃ لابن تیمیہ، ص: ۳۸)۔

(۵) التوبیخ: نصیحت کرنے پر جب باز نہ آئے تو پھر اس کو ڈانٹا ڈپٹا جائے۔

(۶) التعنیف والتجریح: جب ڈانٹنے ڈپٹنے سے کام نہ چلے تو پھر اس کی گوشمالی کی جائے، تاکہ اس کو کچھ جسمانی تکلیف ہو۔

درمختار مع ردالمحتار میں ہے: "وفرك الأذن وبالكلام العنيف وبنظر القاضي إليه بوجه عبوس" (۳ / ۱۷۸)۔

(۷) الضرب: اگر ہلکی پھلکی جسمانی سزا یعنی گوشمالی سے بھی کام نہ چلے تو پھر اس کی ہلکی پھلکی پٹائی بھی کی جاسکتی ہے، جیسا کہ حدیث میں ہے: "مروا أولادكم بسبع واضربوهم عليها بعشر" (سات سال کے ہونے پر نماز کا حکم دو اور دس کے ہونے پر اس کی پٹائی کرو)۔

(۸) اتلاف محل الانحراف: تادیبی انواع میں ایک شکل اس جگہ کا ختم کردینا بھی ہے، جس کی وجہ سے بچے بگڑ رہے ہیں، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد ضرار کو ڈھا دیا تھا، اسی طرح حضرت عمرؓ اور علیؓ نے شراب کے اڈے کو جلا دیا تھا، جس جگہ شراب بیچی جاتی تھی (الحسبہ لابن تیمیہ، ص: ۴۳ - ۴۷، کذا فی السیاسۃ الشرعیہ، ص: ۹۷ - ۹۸)، بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی ثابت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے شراب کے برتنوں کو توڑنے کا حکم دیا تھا۔

طرق حکمیہ میں ہے: "ومثل أمره ﷺ بكسر دنان الخمر وشق ظروفها .... ومثل هدم مسجد الضرار" (الطرق الحکمیہ، ص: ۲۴۶ تا ۲۵۸)۔

(۹) المصادرۃ: انواع تادیب میں سے مصادرۃ بھی ہے یعنی اس کو ضبط کرلینا جس کی وجہ سے بگاڑ پیدا ہو رہا ہے، مثال کے طور پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مانعین زکوۃ سے انکا آدھا مال بیت المال میں جمع کروایا۔ (مزید دیکھئے: تبیین الحقائق ۳ / ۲۰۸، احکام جرائم الاحداث، ص: ۱۶۸، الطرق الحکمیہ، ص: ۲۴۵)۔

☆☆☆

بچوں سے متعلق حقوق

مفتی عبداللہ کاوی والا[1]

بچوں کی تربیت کی ذمہ داری اور اہمیت سے متعلق چند آیات واحادیث درج کرتا ہوں، تاکہ تربیت سے متعلق اسلامی احکام وذمہ داری سمجھ میں آجائے۔

* ''يا أيها الذين آمنوا قوا أنفسكم واهليكم ناراً وقودها الناس والحجارة عليها ملائكة غلاظ شداد لا يعصون الله ما أمرهم ويفعلون ما يؤمرون'' (سورہ تحریم:٦)۔

* ''وأنذر عشيرتك الأقربين'' (سورہ شعراء:۲۱۴)۔

* ''وأمر أهلك بالصلاة واصطبر عليها'' (سورہ طہ:۱۳۲)۔

مذکورہ بالا تینوں آیات کے ذریعہ اولاد کی تعلیم وتربیت کی ذمہ داری ماں باپ پر عائد کی ہے، اور اس کے متعلق انذار کا پہلو اختیار کرنے کا حکم دیا ہے، اور اولاد کے حقوق کی ادائیگی کے لئے صبر کا حکم ملا ہے۔

احادیث مبارکہ اس سلسلہ میں بے شمار ہیں، بخاری شریف میں ہے۔

۱۔ ''كلكم راع وكلكم مسئول عن رعيته ....'' (متفق علیہ، مشکوۃ ۱/۳۲۱)۔

۲۔ ''عن ابن عباس عن النبي ﷺ أنه قال افتحوا على صبيانكم أول كلمة بلا إله إلا الله'' (رواہ الحاکم، کنز العمال ۱۶/۴۵۳۳۲)۔

۳۔ ''علموا أولادكم وأهليكم الخير وأدبوهم'' (رواه عبد الرزاق وسعيد بن منصور في مصنفه)۔

۴۔ ''إن الله سائل كل راع عما استرعاه حفظ أم ضيع حتى يسئل الرجل عن أهل بيته'' (رواه ابن حبان)۔

۵۔ ''عن ابن عمر رضی اللہ عنہ قال قال رسول الله ﷺ زوجوا أبناءكم وبناتكم وحُلوهن الذهب والفضة وأجيدوا لهن الكسوة وأحسنوا إليهن بالحلة ليرغب فيهن'' (مستدرك حاكم، كنز العمال ۱٦-۴۵۴۲۲)۔

٦۔ ''اعملوا بطاعة الله واتقوا معاصي الله ومروا أولادكم بامتثال الأوامر واجتناب النواهي فذلك وقاية لهم ولكم من النار'' (ابن جرير وابن منذر)۔

مذکورہ بالا چھ (٦) احادیث مبارکہ میں اولاد کی تعلیم وتربیت کی ذمہ داری ماں باپ پر عائد فرمائی ہے، جس میں اولاد کو جب وہ بولنے لگے تب کلمہ توحید "لا إله إلا الله" سے شروع کرنے کا حکم فرمایا، اولاد کو دینی تعلیم اور بھلائی وادب کی تعلیم دینے کا حکم فرمایا، اپنی ذمہ داری اور قیامت کے دن اولاد سے متعلق ماں باپ سے باز پرس ہوگی، اس میں تنبیہ فرمائی، تاکہ ماں باپ اولاد کی تعلیم وتربیت اور حقوق سے غفلت نہ برتیں، اولاد کے بالغ ہونے کے بعد بچے اور بچیوں کے نکاح پڑھانے کی ذمہ داری بچوں کی طرف رغبت ہوں، اس لئے سونے، چاندی، بہترین عمدہ کپڑوں سے آراستہ کرنے کا حکم فرمایا، اولاد ایک عظیم نعمت ہے، اس کی حفاظت، تعلیم وتربیت اور ادائے حقوق کے ذریعہ کی یا نہیں کی اور اولاد کو ضائع تو نہیں کیا، اس کی باز پرس سے حدیث میں باخبر فرمایا، ان احادیث سے ماں باپ پر عائد ہونے والے اولاد کے حقوق، تعلیم وتربیت کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے۔

بچوں کے حمل کی صورت رہنے اور دودھ پلانے کی فضیلت اور پیش آنے والے مصائب جھیلنے پر فضائل احادیث مبارکہ [illegible] انداز سے پیش کئے ہیں کہ

---

[1] صدر مفتی دار الافتاء، دار العلوم کنتھاریہ، بھروچ، گجرات۔

مائیں اپنے بچوں کی رضاعت میں فخر کریں، رغبت سے کام لیں، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: عورت اپنی حالت حمل سے لے کر بچہ جننے اور دودھ چھڑانے تک فضیلت وثواب میں ایسی ہے جیسے اسلام کی راہ میں سرحد کی نگہبانی کرنے والا (جس میں ہر وقت وہ مجاہدہ کے لئے تیار رہتا ہے) اور اگر (عورت) اس درمیان مرجائے تو اس کو شہید کے برابر ثواب ملتا ہے (طبرانی عن ابن عمر)۔

دوسری روایت میں ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب عورت بچہ کو دودھ پلاتی ہے تو ہر گھونٹ کے پلانے پر اس کو ایسا اجر ملتا ہے جیسے کسی جاندار کو زندگی دیدی، پھر وہ جب دودھ چھڑاتی ہے تو فرشتہ اس کے کندھے پر (شاباشی سے) ہاتھ مارتا ہے اور کہتا ہے کہ ''پچھلے گناہ سب معاف ہوگئے، اب آگے جو گناہ کا کام ہوگا وہ آئندہ لکھا جائے گا، معافی سے مراد گناہ صغیرہ ہے، یہ بھی کیا تھوڑی بات ہے؟ (بہشتی زیور ۸ / ۴۶۷)۔

اسلام میں اولاد کی کثرت مقصود ہے، اسی وجہ سے آپ ﷺ نے فرمایا: "تزوجوا الودود الولود فإني أباهي بكم الأمم" (مشکوۃ، ابن ماجہ)۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو عورت کنوارے پن کی حالت میں یا حمل میں بچہ جنتے وقت یا نفاس کے ایام میں مرجائے اس کو شہادت کا درجہ ملتا ہے (ترمذی)۔

ایسے ہی آپ ﷺ کا فرمان ہے جو حمل گر جائے وہ بھی اپنی ماں کو گھسیٹ کر جنت میں لے جائے گا جب کہ وہ عورت ثواب سمجھ کر صبر کرے، آپ ﷺ نے فرمایا: جس عورت کے تین بچے مرجائیں اور ثواب سمجھ کر صبر کرے تو جنت میں داخل ہوگی، ایک عورت بولی یارسول اللہ ﷺ جس کے دو ہی بچے مرجائیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: دو کا بھی یہی ثواب ہے، ایک روایت میں ہے کہ ایک صحابیؓ نے ایک بچہ کے مرنے کو پوچھا اس میں بھی بڑا ثواب بتلایا ہے، ایسے ہی بچوں کو دودھ پلانے پر اور رات کو جاگنا پڑے اس عورت کو راہ خدا میں ستر (۷۰) غلاموں کو آزاد کرنے کا ثواب ملتا ہے (کنز العمال)۔

آپ ﷺ نے فرمایا جو عورت بیوہ ہو جائے اور خاندانی بھی ہے، مالدار بھی ہے، لیکن اس نے اپنے بچوں کی خدمت اور پرورش میں لگ کر اپنا رنگ میلا کر دیا، یہاں تک کہ وہ بچے یا تو بڑے ہو کر الگ رہنے لگے یا مرمرا گئے ہوں تو ایسی عورت جنت میں مجھ سے ایسی نزدیک ہوگی جیسے انگشت شہادت اور بیچ کی انگلی ساتھ میں ہے۔

اولاد کی فضیلت واہمیت کے لئے آپ ﷺ کا فرمان "تزوجوا الودود الولود فإني أباهي بكم الأمم" کافی ہے، تاہم اولاد کا ہونا بھی کتنا بڑا فائدہ ہے، زندگی میں بھی وہ سب سے بڑھ کر تعلیم وتربیت یافتہ اور اخلاق حسنہ سے مزین ہو کر ماں باپ، قرابتداروں، پڑوسیوں اور اہل وطن کے لئے خدمت گزار، مددگار اور فرمانبردار اور خیرخواہ ہوتے ہیں، اور مرنے کے بعد ان کے لئے دعائے مغفرت اور ایصال ثواب بھی کرتے ہیں اور بچپن میں انتقال کی صورت میں میدان محشر میں سفارشی ہوتے ہیں، اگر زندہ رہے اور آگے نسل چلی تو دین اسلام کو اپنانے والے، پھیلانے والے، مذہب اسلام کے مجاہد، مبلغ، محدث وفقیہ بن کر احیائے دین کا سبب بنتے ہیں، سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ امت اجابت کی کثرت کا سبب بن کر رسول اللہ ﷺ کے لئے میدان محشر میں باعث فخر ثابت ہوں گے۔

اللہ نے والدین کے دلوں میں ایسی محبت پیدا کر دی کہ والدین ان کی تربیت اور پرورش کرنے پر مجبور ہیں، یہ اللہ کا نظام ہے، اس کا تقاضا یہ ہے کہ اولاد کی بہتر سے بہتر ایمانی، اسلامی، اخلاقی تربیت کی جائے تاکہ ان کی زندگی ان کے حق میں جنت کا نمونہ بنے اور دنیا سے جانے کے بعد جنت کے مستحق بنیں۔

اولاد کے حقوق ترتیب بالترتیب یہ ہیں:

۱۔ ہونے والے بچوں کی ماں دیندار اور اخلاق حسنہ سے مزین پرہیزگار ہوں، اس لئے آپ ﷺ نے فرمایا: ''يا معشر الشباب من استطاع منكم الباءة فليتزوج فإنه أغض للبصر وأحسن للفرج، ومن لم يستطع فعليه بالصوم فإنه له وجاء'' (مشکوۃ)۔

وقال النبي ﷺ: تنكح المرأة لأربع لمالها ولحسبها ولجمالها ولدينها فاظفر بذات الدين تربت يداك'' (ترمذی، بخاری)

دیندار عورت سے نکاح پڑھنے میں ہونے والے بچوں کی تربیت اچھی طرح ہوگی، اور بچوں کے ایمان ودین کی حفاظت ہوگی، اسی لئے اگر بچوں کے ایمان اور دین کے بارے میں بچوں کی ماں کی جانب بے دینی، فسق وفجور اور ایمان واسلام کے لئے ماں کی حضانت میں رہنے میں خطرہ لاحق ہوں تو باپ کو یہ حق رہے گا کہ اپنے بچوں کو ان خطرات سے محفوظ رکھنے کے لئے اس ماں سے دور رکھے، ماں کا حق حضانت اس بڑے خطرہ کی وجہ سے ساقط ہو جائے گا۔

۲۔ "تزوجوا الودود الولود" میں حمل کی حفاظت یہ بڑا ابتدائی بچوں کا حق ہے، اسی لئے زمانہ جاہلیت میں ''موؤدہ'' کے بارے میں اللہ کا فرمان وارد ہوا:

"وإذا الموؤدة سئلت بأي ذنب قتلت"، اور عزل کی ممانعت وارد ہوئی اور اسقاط حمل کو حرام ٹھہرایا اور اسے اور عزل کو وأد صغیر سے تعبیر کیا، اسلام میں اولاد کی کثرت، ان کی دینی ایمانی اسلامی اخلاقی تعلیم وتربیت کے ساتھ مطلوب ہے۔

۳۔ نسل بڑھتی رہے، اس لئے لڑکیوں کو زندہ درگوری کو بہت بڑا گناہ ٹھہرایا اور احادیث میں لڑکیوں کی مکمل تربیت پر اور ان کے انتقال پر ترغیبی باتیں اور فضائل پیش کئے گئے ہیں، نسل کشی کو حرام ٹھہرایا گیا۔

۴۔ حمل کی حفاظت کا حکم فرمایا، اور "حملہ کرہا ووضعتہ کرہا" کہہ کر ماں کی اہمیت اور احسان قرآن کریم میں جتایا گیا، اس حالت کی موت کو شہادت کا درجہ دیا گیا۔

۵۔ بچہ کی پیدائش پر احکام نفاس میں سہولت رکھی گئی۔

۶۔ بچہ کو غسل دے کر داہنے کان میں اذان اور بائیں کان میں اقامت کا حکم دیا گیا، تاکہ دنیا میں آتے ہی بچہ کے کام و دل ودماغ میں اللہ کی کبریائی اور عظمت اور رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی شہادت اور صلاۃ وفلاح کی بنیادی ندا پہنچ جائے۔

۷۔ بچہ کی تحنیک کا حکم تفاؤلا دیا۔

۸۔ مدت حمل اور مدت رضاعت میں ماں کو اچھے صفات اور اچھے کردار کے ساتھ رہنے کا حکم دیا تاکہ اچھے اثرات نومولود پر پڑے۔

۹۔ ساتویں دن بچہ کا اچھا نام رکھ کر عقیقہ کا حکم دیا گیا اور اس کی فضیلت بتائی گئی۔

۱۰۔ جب بچہ بولنا شروع کرے تو سب سے پہلے اپنے خالق اور مالک حقیقی کا نام زبان پر جاری رہے، کلمہ "لا إلہ إلا اللہ محمد رسول اللہ" بولنا سکھایا جائے۔

۱۱۔ بچہ کی رضاعت، طہارت ونظافت اور صحت کا خیال رکھا جائے۔

۱۲۔ قرآن کریم اور دینی ضروری تعلیم دی جائے۔

۱۳۔ سات سال کی عمر ہونے پر نماز کا حکم دیا جائے، عصری ضروری تعلیم دی جائے۔

۱۴۔ اللہ اور رسول پاک کی اطاعت اور اوامر ونواہی کا علم سکھایا جائے۔

۱۵۔ اخلاق حسنہ سے تربیت کے ذریعہ مزید کیا جائے۔

۱۶۔ خوف خدا پیدا کیا جائے، حلال وحرام اور نیکی اور گناہ کے کاموں سے خوب اچھی طرح آگاہ کیا جائے اور ارکان اسلام کی اچھی طرح تعلیم دی جائے۔

۱۷۔ ماں باپ کی اطاعت وخدمت شریعت مطہرہ کی حدود میں رہتے ہوئے کس طرح کی جائے، حلال کمائی میں لگایا جائے۔

۱۸۔ جوان ہونے پر دین دار لڑکی/لڑکا سے نکاح پڑھایا جائے۔

۱۹۔ میاں بیوی کے حقوق کی تعلیم دی جائے۔

۲۰۔ نافرمانی، حق تلفی، ایذا رسانی کے برے ماحول سے دور رکھا جائے اور ایسی بری عادتیں پڑ جانے پر پیار ومحبت اور نرمی کے ساتھ سمجھائیں، پھر بھی اصلاح نہ ہوں تو سزا شریعت کی حد میں رہ کر دی جائے، اور نیک بچوں کی صحبت میں رکھے جائیں، خوب خوب دعائیں اپنی اولاد کے حق میں کیا کریں، کیونکہ ماں باپ کی دعائیں اولاد کے حق میں قبول ہوتی ہیں، بددعا کرنے سے گریز کریں۔

الف۔ بچوں کی حق پرورش (حق حضانت) کے سلسلہ میں اسلام کی بنیادی ہدایات مرد کے دیندار عورت اور ودود الولود کو نکاح میں لانے کی ترغیب کے ساتھ حمل کی حفاظت، عزل واسقاط حمل کی حرمت اور اسے وأد صغیر قرار دینا، اور اس کے سدباب کے لئے سخت وعید اور ترغیب کے لئے "فإني أباهي بكم الأمم" فرمانا، اور حق حضانت کا ختم ہوجانا اگر بچہ کے ایمان ودین کے بارے میں بچہ کی ماں کی جانب سے خطرہ لاحق ہو، بچہ کی عمر کے اعتبار سے نو دس سال تک ماں کو حق حضانت حاصل ہے، اس دوران ماں کے فسق وفجور، مرتدہ بددین ہونے کی وجہ سے بچہ کی بنیادی تعلیم وتربیت میں چاہے تعلیمی، اعتقادی (عقائد) کے اعتبار سے یا تربیتی، جسمانی، نفسیاتی پہلو سے مضرت کا اندیشہ ہو تو حق پرورش ماں سے ختم ہوکر نانی کی طرف منتقل ہوجائے گی، کیونکہ بچہ کے مفاد یعنی ایمان واسلام اور دینداری، تقوی وپرہیزگاری کا دارومدار بنیادی پرورش پر موقوف ہے، کیونکہ ماں کی گود ہی ہر بچہ کے لئے بنیادی تعلیم وتربیت کا مدرسہ ہے، اگر اس میں بچے کے حق

میں کامیابی مل گئی تو بچوں کے لئے مستقبل کی کوئی خاص فکر رہتی نہیں۔

ب۔ بچوں کی ایمان واسلام، عبادات، حقوق، حلال وحرام، اخلاق حسنہ اور اسلام کے پانچوں ارکان کما حقہ تعلیم دینا اور خوب اچھی طرح تربیت کرنا کہ بالغ ہونے کے بعد ایمانی غیرت اور اخلاق حسنہ کے ساتھ تمام ارکان اسلام کے فرائض کے کما حقہ مرتے دم تک قائم ودائم رہے، جو پچھلے صفحات میں بالتفصیل ذکر کئے گئے ہیں۔

۲۔ بچوں اور بچیوں کو دینی تعلیم مکمل طور پر دینا ضروری ہے، حدیث میں "طلب العلم فريضة على كل مسلم" کے پیش نظر، تاکہ زندگی کے ہر موڑ (جوانی، بڑھاپا) تک دین اسلام پر کما حقہ قائم رہے، عصری تعلیم ضرورت کی مقدار سیکھنا ضروری ہے، ضرورت سے زائد سیکھنا بہتر ہے، ضروری نہیں ہے، عصری تعلیم کے لئے عام مسلمانوں کو ضرورت دنیا کے ہر شعبہ میں کچھ نہ کچھ مسلمان تعلیم یافتہ ہونے چاہئے۔

۳۔ اگر حکومت کسی سطح تک کی تعلیم کو لازم کرتی ہے تو اس نصاب کو دیکھا جائے گا، اگر مسلمان بچوں کے لئے ایمانی واسلامی اعتبار سے ضرر رساں ہو تو اس کو چھوڑنا ضروری رہے گا، اور اگر ایسا خطرہ نہ ہو تو اس کی پابندی میں کوئی حرج نہیں، بلکہ اس کی پابندی سے دنیوی ضروریات میں عموماً مسلمانوں کو اس کا عظیم فائدہ ہوگا۔

۴۔ جنسی تعلیم بچوں کا حق نہیں ہے، بے حیائی کو عام کرے گی، حیا جو ایمان کا جزء ہے اس کو ختم کرنے والی ہے، اور زنا کاری بے حیائی کا دروازہ کھولنے والی تعلیم ہے، جنس کی تعلیم کی ضرورت اس لئے بھی نہیں ہے کہ وہ فطری چیز ہے، اس کو سکھانے کی ضرورت نہیں ہے، اپنے بچوں کو اسباب زنا یعنی زنا کے قریب کرنے والی چیزیں، ان سب کی حرمت بتانے کی ضرورت ہے، اسلام پاکیزہ مذہب ہے، مردوں عورتوں کی عفت مقصود ہے، یہ جنس کی تعلیم عفت کو ختم کرنے والی ہے، اس لئے اس تعلیم سے بچوں، بچیوں کو دور رکھا جائے۔

ج۔ بچوں اور بچیوں کے بلوغ کے بعد ماں باپ ان کے حالات سے واقف ہو جائیں کہ اس عمر بلوغ کے بعد بچوں بچیوں کی حالت اس درجہ تک پہنچ چکی ہے کہ نکاح نہ کرانے پر گناہ وزنا کاری میں مبتلی ہونے کا قوی اندیشہ ہے تو بالغ ہوتے ہی جلد نکاح پڑھوا دینا ضروری ہوگا، جیسا کہ البحر الرائق، النہر الفائق وغیرہ کتب فقہ وفتاوی میں ضروری بتایا گیا جب کہ نکاح کے لئے زوجہ کے نان نفقہ، مہر وسکنی پر قادر ہو، اور شہوۃ کا غلبہ اس طرح ہو کہ نکاح نہ پڑھنے میں زنا میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہو، "وعند التوقان واجب .... غير أنه إن كان بحيث لا يمكنه الاحتراز عنه (عن الزنا) إلا به كان فرضاً" (النہر الفائق ا-۱۷۵)۔ اور حالت اعتدال میں سنت ہے: "وهو سنة مؤكدة على الأصح يعني حالة الاعتدال بدليل جعل التوقان مقابلاً وهو القدرة على المهر والنفقة والوطء مع عدم الخوف من الزنا والجور وترك الفرائض والسنن" (النہر الفائق ۲-۱۷۵)۔

لڑکے کے بالغ ہونے کے بعد پختہ شعور پیدا ہونے کے بعد ۱۸ سال سے ۲۰ سال کی عمر ہو جانے پر نکاح پڑھا دینا چاہئے، اس سے کم عمری میں یا زیادہ بڑی عمر ہونے تک تاخیر نہ کی جائے، اس وقت اگر لڑکا لڑکی زنا میں مبتلا ہو جائیں تو تاخیر کرنے والے ماں باپ گنہگار ہوں گے، اسلامی تعلیمات اور شرعی ہدایات یہی ہیں کہ بلا تاخیر جلد از جلد نیک دیندار جوڑا تلاش کر کے نکاح پڑھا دیا جائے۔

د (۱): چونکہ نابالغ اولاد کا نان نفقہ باپ پر ہے جیسا کہ الفقہ الاسلامی میں لکھا ہے: "ودليل وجوب نفقة الولد ما دام صغيراً لم يبلغ على أبيه قوله تعالى وعلى المولود له رزقهن وكسوتهن بالمعروف" (سورہ بقرہ: ۲۳۳) ....اتفق الفقهاء على أن نفقة الأقارب والزوجات تجب بقدر الكفاية من الخبز والأدم والكسوة والسكن على حسب حال المنفق وبقدر العادة أو عوايد البلاد لأنها وجبت للحاجة والحاجة تندفع بالكفاية كنفقة الزوجة وقد قال النبی ﷺ لهند: خذى ما يكفيك وولدك بالمعروف فقدر نفقتها وولدها بالكفاية" (الفقہ الاسلامی ۷-۸۲۴،۸۲۶)۔

بچوں اور بچیوں کا نفقہ باپ پر ہونے کی وجہ سے ان کی تعلیم کے ایام میں بچوں سے مزدوری کروانا ظلم ہے، اس طرح کے مزدوری کے کام سے دور رکھے جائیں، اور دینی دنیوی عصری تعلیمات سے ان کو آراستہ کئے جائیں، یہ ایک بچوں کا باپ کے ذمہ فریضہ ہے، اس سے غفلت برت کر ان سے مزدوری لینا، ان کی زندگی کو برباد کرنا ہے۔

(۲) والدین یا اولیاء نابالغ بچے اور بچیوں سے اپنے گھر کا کام بطور تربیت لے سکتے ہیں، اس میں کوئی حرج نہیں، بشرطیکہ ان کی صحت پر اثر نہ ہو، ان کی جوانی ٹوٹنے نہ پائے اور ان کا مستقبل تاریک نہ ہونے پائے، اور محتاج محض ہو کر نہ رہ جائے، ان تمام امور کے ساتھ ساتھ گھر کے کام کر کے خدمت کا جذبہ برقرار

رہے، کیونکہ بچے امانت ہیں اللہ کی طرف سے، اس سلسلہ میں پوچھ ہوگی جیسا کہ حدیث میں ہے: "ألا کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ"، اور ضروری امور خانہ داری جن کی ان کو ضرورت پڑے گی ایسے کام حتی المقدور ضرور لیے جائیں، مذکورہ بالا قیودات کو مدنظر رکھتے ہوئے معاشی ضروریات پورا کرنے یا بہتر بنانے کے ارادہ سے ان کی طاقت کے مطابق اس طرح مزدوری کرا سکتے ہیں، یہ رزق حلال کمائی کا فریضہ ہے، جس سے آگے چل کر ان کو دولت کی قدردانی ہوگی بشرطیکہ ان کی تعلیم میں کوئی حرج نہ ہو، اسی طرح انہیں مذکورہ بالا امور کا خیال رکھتے ہوئے پیشہ ورانہ کام سکھانے کے لئے کام سے لگا سکتے ہیں، یہ ان کے حق کی ادائیگی کے ساتھ انکے ساتھ خیر خواہی ہے۔

(۳) جب ماں باپ خود انتہائی غربت وفقر وفاقہ اور معاشی بدحالی میں مبتلی ہوں اور زندگی کے گزارہ کے لئے کوئی سبیل نہ ہو اور کسی طرح خود کمانے کے لائق نہ ہوں اور مسلمانوں کی طرف سے بیت المال زکوۃ وغیرہ کے ذریعہ کسی قسم کا تعاون نہ ہوتا ہو اس وقت معذور ہونے کے باوجود کوئی ان کی نصرت نہ کرتا ہو سوال کی اجازت ہے، سوال کر کے اپنی ضروریات پوری کریں اور حتی الامکان بچوں کو مزدوری پر لگانے سے روکیں اور صبر سے کام لیں، ان کو بہترین تعلیم، صنعت وہنر کی تعلیم دے کر ان کو بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش کریں۔

(ہ) شرعاً بالغ ہونے سے پہلے اگر لڑکوں اور لڑکیوں سے جرائم سرزد ہوں، مثلاً قتل، غارت گری، چوری، زنا بالرضا یا زنا بالجبر تو ان کو اس بری عادت سے چھڑانے کے لئے تعزیر کے طور پر سزا ضرور دیجائے، ان کو بروں، فاسق وفاجر کی صحبت سے دور رکھا جائے، اچھے نیک لوگوں کی صحبت میں رکھے جائیں، کچھ مدت کے لئے جیل خانہ میں رکھ کر تربیت کی جاسکتی ہے، ان کو ان کے حال پر بالکل نہ چھوڑ دیا جائے، موجودہ زمانہ میں ان کی دینی، دنیوی تعلیم وتربیت کے بہترین دینی ادارہ بیت الصبیان (بچوں کے گھر) کی صورت میں ہر صوبہ اور ہر ضلع میں قائم کئے گئے، وہاں ان کو داخل کر دیئے جائیں، لڑکیوں کے لئے مدرسۃ البنات قائم کئے گئے، وہاں لڑکیوں کو داخلہ دے دیا جائے تاکہ وہ مذکورہ بالا جرائم سے محفوظ رہ سکیں، یہ ذمہ داریاں بچوں بچیوں کے اولیاء کی ہیں، قوم کے رہبر علمائے کرام بھی بخوبی انجام دے سکتے ہیں۔

(و) ان کو جیلوں میں رکھنے کا مقصد ایسے گندے ماحول سے محفوظ رکھنا ہے، سخت مار پیٹائی کی ضرورت نہیں، ان کے برداشت کے مطابق ان کو روکنے کی غرض سے ہلکی سزا دی جائے، سخت سزا جس کے نشانات بدن پر پڑے منع ہے، ان کی اصلاح کے لئے جیلوں میں تعلیم وتربیت جاری کی جائے۔

(ز) جب حکومت غیر اسلامی ہو جیسا کہ ہمارا ہندوستان تو وہاں مسلم برداران ہی ایسے بچوں کے لئے اپنے طور پر تعلیمی تربیتی ادارے قائم کر کے ان کی مکمل نگہبانی فرمائیں، بیت المال قائم کئے جائیں، ان کے مصارف کا مسلمان ہی انتظام فرمائیں، عام مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ ایسے بچوں کی تعلیم وتربیت کا بہترین نظم فرمائیں، یہی احکام لقیط کے لئے ہیں۔

(ح) اپنے حد درجہ بڑھے ہوئے افلاس کی وجہ سے اور پرورش کی استطاعت نہ رکھنے کی وجہ سے کسی کو اپنا بچہ تعلیم وتربیت وپرورش کے لئے حوالہ کر سکتے ہیں، لیکن بے تعلق نہیں ہو سکتے ہیں، اور بچہ کے عوض ہدیہ نہیں لے سکتے ہیں، یہ صورتاً ہدیہ ہے حقیقۃً قیمت ہے، اس طرح آزاد بچہ اسلامی شریعت میں مال نہیں ہے، اس کی بیع باطل ہے، اس طرح اپنی حاجت پوری کرنا جائز نہیں ہے، اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا ہے، ایسے ناجائز سودوں کی روک تھام کے لئے ان کو سخت سزا دی جائے اور حلال کمائی اور محنت کی ترغیب دی جائے، اگر نہیں رکتے تو جیل خانہ میں ایسے ماں باپ کو رکھا جائے تاکہ ان کی برائی متعدی نہ ہونے پائے۔

(ط) ایسے معذور بچوں کی تعلیم وتربیت کا ادارہ قائم کیا جائے اور عوام مسلمانوں سے چندہ فراہم کر کے ان کی تعلیم وتربیت ونگہبانی کی جائے، یہ بہت بڑی خدمت اور کار ثواب ہے، حتی المقدور علاج کرایا جائے، اگر ماں باپ قادر نہ ہوں یا مجبور ہوں تو ہسپتال میں داخل کر کے معذور کی نگہداشت اور جس طرح ہو سکے فکر کریں، دیکھ بھال کرتے رہیں اپنی ذمہ داری سے غفلت برتنا اور فرار اختیار کرنا بہت بڑا ظلم اور حق تلفی کا گناہ ہوگا، فقط واللہ اعلم بالصواب۔

☆☆☆

بچوں کے حقوق، اسلامی فقہ کی روشنی میں

مفتی صادق پٹیل دیولوی[1]

(۱) بچوں کی حضانت کا حق ماں کو ہے، بچہ سات سال کا ہو جائے تو باپ کو ہے اور لڑکی ماں کے پاس بالغہ ہونے تک رہے گی۔

(۲) اسلام میں بچیوں کو بالغ ہونے سے پہلے پہلے مخلوط دنیوی تعلیم سے فارغ کردے، اس طرح بچوں کو بھی۔

(۳) بالغ ہوتے ہی بچوں کا نکاح کردینا ماں باپ کو ضروری ہے، ورنہ گنہ گار ہوں گے۔

(۵) ماں باپ کی ذمہ داری بچوں کی تعلیم اور تربیت ہے، اس سے مزدوری کی وجہ سے محروم کرنا جائز نہیں ہے، مجبوری کے وقت بچہ مزدوری کرسکتا ہے جائز ہے۔

(۶) تعلیم کا حرج نہ ہو تب تک بچوں سے گھریلوں کام کاج کراسکتے ہیں۔

(۷) بچوں سے جرائم سرزد ہو تو حد نہ لگے گی، والدین سرزنش کرے تاکہ چوری ڈاکہ زنی نہ کرے۔

(۸) بے سہارا بچوں کی نگرانی رشتہ داروں کے ذمہ ہے، اس کو سماج دباؤ ڈال کر کروائے۔

(۹) دوسروں کو پرورش کے لئے مجبوراً دے سکتے ہیں لیکن ماں باپ کا نام بدلنا جائز نہیں ہے۔

(۱۰) بیماری کی وجہ سے بچوں کو دواخانہ میں رکھ کر پرورش سے محروم کرنا جائز نہیں ہے۔

بچوں کی تربیت سے بچے دین اور مقدمہ دین کی فلاح پالیتے ہیں، یہ بچے ملک اور دنیا دونوں کی ترقی اور کامیابی کا ذریعہ تعلیم اور تربیت سے بنتے ہیں، اگر تربیت نہ کی تو دنیا اور آخرت کی ناکامی کا ذریعہ ہے۔

☆☆☆

[1] دارالعلوم حسنیہ مانگرول، جوناگڑھ، گجرات۔

اسلام میں بچوں کے حقوق

مولانا نعیم اختر قاسمی [1]

ذی روح مخلوقات میں انسانی بچہ پیدائش کے بعد انتہائی نرم ونازک، کمزور وناتواں، مجبور ومعذور اور شعور وادراک سے دور ہوتا ہے، ابتدائی چند سالوں تک وہ مکمل دیکھ ریکھ اور نگہداشت کا محتاج ہوتا ہے، شب وروز توجہ کا تقاضا کرنے والی جسمانی نشوونما کے اس مرحلہ میں کسی بھی قسم کی کمی یا کوتاہی بچہ کی زندگی کے لئے نقصان دہ ہوسکتی ہے۔

پرورش کا حق:

یوں تو بچہ ہر ایک کی آنکھوں کا تارا اور سب کا دلارا ہوتا ہے لیکن اس کی مکمل پرورش اور نشوونما کے لئے طبعاً جن جذبات واحساسات، شفقت ومحبت، دلسوزی ودلجمعی اور ایثار وقربانی کی ضرورت ہوتی ہے وہ مرد کی بنسبت عورت کے اندر زیادہ پائی جاتی ہے، نیز معاشی ذمہ داریوں سے آزاد رہنے کی بنا پر وہ گھر میں رہ کر بچہ کی ہمہ وقت دیکھ بھال کے لئے اپنے کو زیادہ سے زیادہ فارغ کرسکتی ہے، مزید یہ کہ ابتداءً بچہ کی غذائی ضرورت بھی ایک عورت ہی پوری کرسکتی ہے، انہیں وجوہات اور عورتوں کی انہیں فطری صلاحیتوں کی بنا پر شریعت نے عورتوں کو بچوں کی پرورش کا اولین حقدار تسلیم کیا ہے، علامہ کاسانی کے الفاظ میں:

''الأصل فيها النساء لأنهن أشفق وأرفق وأهدى إلى تربية الصغار'' (بدائع الصنائع ۲-۴۵۶)۔

حتی کہ عورت اگر غیر مسلم ہو تو بھی پرورش کی وہی حقدار ہوگی، کیونکہ دین کے مختلف ہونے سے ممتا اور شفقت متاثر نہیں ہوتی، البتہ بچے کے اندر جب دین سمجھنے کا شعور پیدا ہوجائے (جس کی تعیین سات سال سے کی گئی ہے) (الدر المختار علی رد المحتار ۵/۲۶۵)، یا اس سے پہلے ہی اس بات کا اندیشہ ہو کہ کفر وشرک سے بچہ مانوس ہونے لگے گا تو غیر مسلم عورت کی پرورش سے بچہ کو دور کردیا جائے گا، ہدایہ میں ہے:

''والذمية أحق بولدها المسلم ما لم يعقل الأديان أو يخاف أن يألف الكفر'' (ہدایہ ۲/۴۳۶)۔

مدت حضانت:

عورتوں کا حق حضانت بچہ (نر) ہونے کی صورت میں اس وقت تک باقی رہتا ہے جب تک وہ بچہ جسمانی اعتبار سے خود کفیل نہ ہوجائے، یعنی خود سے کھانے، پینے اور استنجاء وغیرہ کرنے لگے جس کی تحدید فقہاء نے حدیث "مروا صبيانكم إذا بلغوا سبعاً" کی روشنی میں سات سال سے کی ہے، وبہ یفتی (رد المحتار ۵/۲۶۷)، تو پرورش کا حق علی ترتیب العصبات مردوں کی طرف منتقل ہوجاتا ہے، کیونکہ اب اسے علم وہنر، تہذیب وسلیقہ اور آداب واخلاق سے مزین ہونے کی ضرورت ہے اور یہ ذمہ داری ایک مرد زیادہ بہتر طریقہ سے انجام دے سکتا ہے (بدائع ۳/۴۵۹)۔

اور بچی (مادہ) ہونے کی صورت میں اس مرحلہ کے بعد بھی عورتوں کا حق حضانت باقی رہتا ہے، کیونکہ شعور وادراک پیدا ہونے کے بعد اس بات کی ضرورت ہے کہ وہ بچی عورتوں کے آداب واخلاق اور نسوانی طور وطریقے کو اپنائے اور امور خانہ داری میں سوجھ بوجھ اور مہارت پیدا کرے اور ایک ہی کی تربیت اور پرورش میں مذکورہ امور زیادہ بہتر طریقے سے انجام پاسکتے ہیں (حوالہ سابق)۔

پھر پرورش کرنے والی عورت اگر ماں، نانی یا دادی ہو تو بچی کے بالغ ہونے کے بعد اور اگر ان کے علاوہ کوئی اور ہو تو حد اشتہاء تک پہنچنے کے بعد (جس کی تحدید نو سال سے کی گئی ہے) (الدر المختار علی رد المحتار ۵/۲۶۸)، ان کا حق حضانت ختم ہوجاتا ہے، بلکہ امام محمدؒ تو بچی کے حد اشتہاء تک پہنچنے پر

[1] مدرسہ عربیہ مصباح العلوم کوپاگنج، مئو یوپی۔

مطلقاً عورتوں کے حق پرورش کے ختم ہونے کے قائل ہیں اور کثرت فساد کی وجہ سے یہی قول مفتی بہ بھی ہے (حوالہ سابق)۔

بہرحال جب وہ بچی بالغ یا حد اشتہاء کو پہنچ جائے تو چونکہ اب اس کی عفت وعصمت کا مسئلہ درپیش ہوتا ہے اور ہر قسم کے شرور وفتن سے اس کی حفاظت مقصود ہوتی ہے اور یہ فریضہ عورت کے مقابلہ میں مرد کہیں بہتر انجام دے سکتا ہے، اس لئے حق حضانت مرد کی طرف منتقل ہوجائے گا (بدائع ۴۵۹/۳)۔

ولایت ضم:

بلوغ کے بعد انسان چونکہ شرعاً مکلف اور خود مختار ہوجاتا ہے، اس لئے اب اس پر کسی کو حق حضانت حاصل نہیں ہوتا، البتہ باپ دادا اور دیگر عصبات کو ولایت ضم حاصل ہوتی ہے (شامی ۲۷۰/۵)، جس کا حاصل یہ ہے کہ اگر لڑکا بالغ ہوجائے اور اس کی اخلاقی حالت قابل اطمینان نہ ہو تو اسے آزاد نہیں چھوڑا جائے گا، مبادا کوئی ایسی حرکت کرگزرے جس کا خمیازہ اولیاء کو بھگتنا پڑے، اس لئے باپ دادا وغیرہ اسے اپنی تربیت میں رکھیں گے، اور اگر لڑکی بالغ ہوجائے تو باکرہ ہونے کی صورت میں مطلقاً اور ثیبہ ہو تو اس کی طرف سے عدم اطمینان کی صورت میں باپ دادا اسے اپنی پرورش میں رکھیں گے (بدائع ۴۵۹/۳)، دیگر عصبات بھی بشرط اطمینان اپنی تربیت میں رکھ سکتے ہیں (شامی ۲۷۰/۵)۔

بعض قابل لحاظ شرطیں:

جن صورتوں میں عورتوں کو حق حضانت حاصل ہوتا ہے ان میں ایک اہم شرط یہ ہے کہ وہ کسی ایسے مرد سے شادی نہ کرے جو اس بچے کا ذی رحم محرم نہ ہو (ہدایہ ۴۳۵/۲)، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خاتون کو جواب دیتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا: "أنت أحق بالولد ما لم تنكحي" (ابوداؤد کتاب الطلاق)، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس اجنبی مرد کے گھر میں بچے کو مطلوبہ پیار ومحبت ملنے کے بجائے اس اجنبی کی ناپسندیدہ نگاہوں کا بچہ مرکز بنے گا جو یقیناً بچہ کے حق میں نقصان دہ ہے، "ولأن زوج الأم إذا كان أجنبياً يعطيه نزراً وينظر إليه شزراً فلا نظر" (ہدایہ ۴۳۵/۲)۔

دوم یہ کہ وہ کسی ایسے کام یا پیشے سے وابستہ نہ ہو جس کی وجہ سے اسے بکثرت گھر سے باہر جانا پڑتا ہو اور نتیجے میں بچے کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہو مثلاً وہ دایہ یا غسل دینے والی ہو (ردالمحتار ۲۵۴/۵)۔

سوم یہ کہ وہ ایسی بدکار نہ ہو کہ جس کی وجہ سے بچے کا اسی کی راہ پر چل پڑنا غیر متوقع نہ ہو، ورنہ شعور کی عمر تک پہنچنے کے بعد اس کا حق حضانت ساقط ہوجائے گا (حوالہ سابق)۔

بچی کی تربیت کا حق اگر مرد کو حاصل ہو تو اس کی ایک خاص شرط یہ ہے کہ وہ اس کا محرم رشتہ دار ہو، نیز وہ امین اور قابل اعتماد بھی ہو، اگر چچازاد کے علاوہ کوئی اور موجود نہ ہو تو قاضی کی صوابدید پر اس کی پرورش میں بھی دی جاسکتی ہے، اگر فسق وخیانت کی وجہ سے مرد قابل اطمینان نہ ہو تو اسے بچی پر حق حضانت حاصل نہ ہوگا، خواہ وہ اس کا بھائی یا چچا ہی کیوں نہ ہو (بدائع ۴۶۰/۳)۔

حق حضانت کے متعلق شریعت کے یہ بنیادی اصول تھے جن میں بچہ کی خیرخواہی اور شفقت کو اساسی حیثیت حاصل ہے اور سارے فقہی مسائل اس کے گرد دائر ہیں، اسی لئے علامہ کاسانی فرماتے ہیں: "لأن مبنى الحضانة على الشفقة" (بدائع ۴۵۷/۳)۔

لہٰذا پرورش کرنے والا جن صورتوں میں بچہ پر دینی، جسمانی اور اخلاقی شفقت کے تقاضے کو پورا کرنے کا اہل ہوگا اسے پرورش کا حق حاصل ہوگا، بصورت دیگر اس کا حق حضانت ساقط ہوجائے گا، واللہ اعلم۔

بچے اور تعلیمی حق:

ایک حدیث میں ارشاد ہے: "طلب العلم فريضة على كل مسلم" (مشکوۃ بحوالہ ابن ماجہ ۳۴/۱)، یعنی علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے، یہ حدیث حق تعلیم کے سلسلہ میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے، اس میں علم اگرچہ مطلق فرمایا گیا جس میں دینی، دنیوی، فنی، عصری اور جزئی وکلی ہر قسم کے علوم وفنون داخل ہیں، لیکن چونکہ ہر شخص کے لئے نہ تو جملہ علوم وفنون کا حاصل کرنا ممکن ہے اور نہ ہر ایک کے اندر اس کی صلاحیت ہے کہ اس پر ہر قسم کے علوم کو حاصل کرنا فرض قرار دیا جائے، اس لئے علماء کی رائے ہے کہ اس سے مراد دینی علوم کا اتنا حصہ ہے جس کی وجہ سے ایک مسلمان اپنا عقیدہ

درست کرسکے، خدا اور رسول کی معرفت اور ان کی مرضیات کا اسے علم ہوسکے اور مکلف ہونے کی حیثیت سے دینی فرائض انجام دے سکے۔ ''قال البیضاوی: المراد من العلم ما لا مندوحة للعبد عن تعلمه کمعرفة الصانع والعلم بوحدانیته ونبوة رسوله وکیفیة الصلاة فإن تعلمه فرض عین'' (التعلیق الصبیح ۱۔۱۵۱)۔

ظاہر ہے کہ اتنی مقدار علم حاصل کرنا ہر مسلمان کے لئے ممکن ہے، لہذا یہ فرض عین ہے اور سرپرستوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے ماتحت بچوں کی اتنی مقدار دینی تعلیم کا یقینی بندوبست کریں، اس کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جس میں سرپرستوں کو فرمایا گیا کہ وہ سات سال کا ہونے پر انہیں نماز کا حکم دیں ("مروا أولادکم بالصلاة بسبع واضربوا علیها لعشر وفرقوا بینهم فی المضاجع"، ترمذی حدیث: ۴۰۷، ابوداؤد حدیث: ۴۹۴)۔

نیز ایک دوسری روایت میں حسن ادب کو باپ کی طرف سے بچہ کو دیا جانے والا سب سے بہتر عطیہ قرار دیا گیا ہے (ترمذی ۲؍۱۶، ابواب البر والصلہ)۔

حضرت لقمان کے اپنے بیٹے کو کی جانے والی نصیحتیں بھی اس سلسلہ میں رہنمائی کرتی ہیں۔

البتہ دینی علوم میں مہارت وبصیرت حاصل کرنا اور شرعی احکام کی حکمتوں اور مصلحتوں کو معلوم کرکے دینی مسائل میں عوام کی رہنمائی کے لئے خود کو تیار کرنا یہ فرض کفایہ ہے جس کے لئے امت کے بقدر کفایت افراد کا تیار ہوجانا کافی ہے جو ان کے لئے دنیا وآخرت میں عزوشرف اور کامیابی وکامرانی کا سبب ہوگا۔

اسی طرح دیگر مفید علوم وفنون کا حاصل کرنا بھی "وأعدوا لهم ما استطعتم" (سورہ انفال: ۶۰) اور "خلق لکم فی الأرض جمیعاً" (سورہ بقرہ: ۲۹) اور "سنریهم آیاتنا فی الآفاق" (سورہ فصلت: ۵۳) وغیرہ آیات قرآنی کی روشنی میں فرض کفایہ ہے۔

فرض کفایہ سے تعلق رکھنے والے علوم وفنون کے اندر چونکہ غیر معمولی تنوع ہے اور ان کے حصول کے ذرائع، مدت تعلیم، اور اخراجات وغیرہ کے اعتبار سے بھی خاصا فرق ہے، اسی طرح خطہ وعلاقہ، سماج ومعاشرہ، مذاق ومزاج، ذاتی حالات اور لیاقت وصلاحیت کا بھی پورا پورا دخل ہوتا ہے، اس لئے اس کے حصول کا حکم طالب علم کے حالات پر منحصر ہوگا، البتہ اس میں کوتاہی کا ذمہ دار پورا معاشرہ ہوگا، تاہم سرپرستوں کو چاہئے کہ وہ اپنے بچوں کو بقدر ضرورت دینی تعلیم دلانے کے ساتھ ساتھ ان کے لئے مزید اتنی تعلیم کا انتظام کردیں کہ وہ بچہ اپنے معاشرہ اور ماحول میں ایک باغیرت زندگی گزارنے کا اہل بن سکے، اس سلسلہ میں اگر حکومت ایک سطح تک تعلیم کو بچوں اور بچیوں کے لئے لازم قرار دے تو چونکہ مباح چیز میں حکومت کے حکم کی تعمیل شرعاً لازم ہوتی ہے اس لئے اس کی پابندی مسلمانوں کے لئے بھی لازم ہوگی، اگر نصاب میں بعض غیر شرعی امور ہوں تو ان کی اصلاح کی حتی الامکان کوشش کی جائے۔

شادی کا حق:

بچے اور بچیوں کی مناسب رشتہ میں شادی کرانا اولیاء کا اخلاقی فریضہ ہے، جس کی تائید بہت ساری احادیث سے ہوتی ہے، البتہ بعض باتیں قابل توجہ ہیں:

نابالغ بچے اور بچی کی مناسب رشتہ میں شادی کرانے کا اختیار اگرچہ اولیاء کو حاصل ہے مگر اس بات کا اطمینان نہیں ہوتا کہ جس رشتہ کو اولیاء ان کی کم عمری کی حالت میں دونوں کے حق میں مناسب سمجھ رہے ہیں وہ بالغ ہونے کے بعد بھی ان کے مناسب ہی رہیں، کیونکہ بالغ ہونے کے بعد عقل وفہم اور شعور وادراک بیدار ہوتا ہے اور انسان کی اصل خوبی وخامی، مزاج وعادات اور طور طریقے واضح ہوتے ہیں اور پسند وناپسند کے معیار سامنے آتے ہیں، اگرچہ خیار بلوغ کی صورت میں ان کے سامنے اس نکاح کو فسخ کرانے کا اختیار باقی رہتا ہے، تاہم اولاً تو باپ دادا کے ذریعہ کئے ہوئے نکاح میں یہ اختیار حاصل نہیں ہوتا، دوم جن صورتوں میں انہیں خیار بلوغ حاصل ہوتا ہے ان میں بعض شرائط ایسی ہیں جن کی وجہ سے اس اختیار سے فائدہ اٹھانے سے پہلے ہی وہ ہاتھ سے نکل جاتا ہے، سوم یہ کہ اس نکاح کو فسخ کرانے کے لئے قضا قاضی کی ضرورت پڑتی ہے، چہارم یہ کہ اگر اولیاء کی رعایت میں وہ راضی بھی ہوجائیں تو بھی یہ اجازت بعض اوقات بطیب خاطر نہیں ہوتی، لہذا راقم الحروف کی رائے میں عام حالات میں نابالغی اور کم

سنی میں شادی کرانے سے اولیاء کو احتیاط کرنا چاہئے، واللہ اعلم۔

بچی اگر بالغ ہوجائے اور اس کا رشد وادراک بیدار ہوجائے تو اس کی مناسب رشتہ میں شادی کرنے میں دیر نہیں کرنی چاہئے، ایک حدیث میں حضرت علیؓ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین چیزوں میں تاخیر کرنے سے منع فرمایا ہے، جن میں سے ایک عورت کا مناسب رشتہ (کفو) ملنا بھی ہے، "والأيم إذا وجدت لها كفواً" (متفق علیہ)۔

البتہ شادی کے بعد چونکہ شوہر پر بیوی بچوں کا نفقہ (رہائش، خوراک، پوشاک) وغیرہ کی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں اس لئے اسے نفقہ کی ادائیگی کے لائق بنانے تک بچہ کے نکاح میں تاخیر کی جاسکتی ہے، کیونکہ نکاح کا مقصد محض قضاء شہوت ہی نہیں ہے، ورنہ غیر مستطیع شخص کے لئے روزہ رکھنے کا حدیث میں حکم کیوں دیا جاتا؟ ("ومن لم يستطع فعليه بالصوم فإنه له وجاء")۔

اس سلسلہ میں حضرت امام ابوحنیفہؒ کی اس نصیحت کو پیش نظر رکھا جاسکتا ہے، جو انہوں نے اپنے شاگرد رشید حضرت امام ابو یوسفؒ کو کی تھی:

"ولا تتزوج إلا بعد أن تعلم أنك تقدر على القيام بجميع حوائجها واطلب العلم أولاً ثم أجمع المال من الحلال ثم تزوج" (الاشباه والنظائر الفن السابع حکایات ومراسلات وصیة الامام الاعظم لابی یوسف: ۳۶۹) (اس وقت تک نکاح نہ کرنا جب تک تجھے یقین نہ ہوجائے کہ تم عورت کی تمام ضرورتوں کو پورا کرسکتے ہو، پہلے علم حاصل کرو، پھر حلال مال کماؤ پھر نکاح کرو)۔

بچہ مزدوری سے متعلق مسائل:

اسلامی قانون نفقہ کے تحت نابالغ بچے اور بچیوں کے نفقہ کا اصلاً باپ ذمہ دار ہے، لیکن اگر بچہ جسمانی اعتبار سے محنت ومزدوری کے لائق ہوگیا ہو تو اگر باپ چاہے تو اس کی ذہنی وجسمانی صلاحیت کے لحاظ سے اس سے کوئی معاشی خدمت لے سکتا ہے، یا مناسب سمجھے تو مزدوری پر بھی لگا سکتا ہے، اسی طرح بچی کو بھی اس کے مناسب کام مثلاً سلائی کڑھائی وغیرہ پر مامور کیا جاسکتا ہے، البتہ بعض شرعی ومعاشرتی قباحتوں کی بنا پر بچی کو کہیں مزدوری پر نہیں لگا سکتا (رد المحتار ۵/ ۳۴۳ باب النفقہ)

بظاہر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس اجازت کی مصلحت اولاد کی معاشی تربیت ہے تاکہ بچوں کے اندر ان کی صنف کے اعتبار سے معاشی ہنر پیدا ہو اور دوسروں پر بھروسہ کرنے کے بجائے ان کے اندر بھی معاشی ضرورت کا احساس پیدا ہو، ظاہر ہے کہ بچوں کے تعلق سے اس جذبہ کے خیر ہونے سے بھلا کس کو انکار ہوسکتا ہے اور اس کے جواز میں کیا تردد ہوسکتا ہے خصوصاً اس صورت میں جبکہ والدین معاشی طور پر انتہائی کمزور اور بدحال ہوں اور ان کے اندر خود کمانے کی صلاحیت نہ ہو۔

خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا بچپن میں بکریاں چرانا اور تجارتی سفر کرنا اس کی واضح مثالیں موجود ہیں۔

لیکن بعض مفاسد کے سدباب کے تحت اگر کوئی حکومت مطلقاً نابالغ بچوں سے پیشہ ومزدوری کرانے کو قانوناً جرم قرار دے تو دفع مضرت کے پیش نظر مستطیع اولیاء کے لئے اس سے بچنا ہی بہتر ہے، البتہ تربیت کے پیش نظر ان کی صلاحیت کے لحاظ سے گھریلو کام اتنی مقدار میں بہرحال لے سکتے ہیں جس کی وجہ سے اس کا بچپن متاثر نہ ہو۔

بچے، جرائم اور سزائیں:

شریعت میں مختلف قسم کے جرائم کی الگ الگ تین قسم کی سزائیں مقرر کی گئی ہیں: (۱) حدود، (۲) کفارات، (۳) تعزیرات۔

ان میں حدود وکفارات کے جاری ہونے کے لئے بلوغ شرط ہے جبکہ تعزیر کے لئے محض عقل کافی ہے، علامہ کاسانی فرماتے ہیں:

"وأما شرط وجوبه فالعقل فقط فيعزر كل عاقل ارتكب جناية ليس لها حد مقدر سواء كان حراً أو عبداً، ذكراً أو أنثى، مسلماً أو كافراً، بالغاً أو صبياً بعد أن يكون عاقلاً" (بدائع ۵- ۵۲۴ باب التعزیر) (تعزیر واجب ہونے کی شرط صرف عقل ہے، چنانچہ اگر کوئی عاقل ایسے جرم کا ارتکاب کرے جس پر حد مقرر نہ ہو تو اس کی تعزیر کی جائے گی، خواہ وہ آزاد ہو یا غلام، مرد ہو یا عورت، مسلم ہو یا کافر، بالغ ہو یا نابالغ بشرطیکہ وہ عاقل ہو)۔

لہذا شرعی طور سے نابالغ کسی بچہ سے کوئی ایسا جرم صادر ہوجائے جس کی سزا میں حد جاری ہوتی ہو تو نابالغ ہونے کی وجہ سے اس پر وہ حد تو جاری نہ ہوگی، البتہ تادیباً اس کی تعزیر کی جاسکتی ہے اور کسی کی جانی یا مالی نقصان پہنچانے کی صورت میں اس پر مالی تاوان بھی عائد ہوگا، ہدایہ میں ہے: "وعمد الصبي والمجنون خطأ وفيه الدية على العاقلة" (ہدایہ، کتاب الدیات)۔

علامہ کاسانی فرماتے ہیں: ''وأما التصرفات الفعلية وهي الغصوب والاتلافات فهذه العوارض وهي الصبا والجنون والرق لا توجب الحجر فيها حتى لو أتلف الصبي والمجنون شيئاً فضمانه في مالهما'' (بدائع ۶/۱۷۶، کتاب الحجر) (فعلی تصرفات مثلاً غصوب واتلافات، تو ان عوارض یعنی عدم بلوغ، جنون اور غلامی میں ''حجر'' کام نہیں کرے گا، چنانچہ اگر کوئی بچہ یا مجنون کسی کا کوئی مال تلف کردے تو اس کا ضمان ان کے مال سے ادا کیا جائے گا)۔

خلاصہ یہ کہ وہ جرائم جن پر مالی ضمان عائد ہوتا ہے تو ان میں نابالغ کا حکم بالغ کا سا ہے اور مالی ضمان بہرحال لازم آئے گا جس کے ذمہ دار وہ خود اور ان کے اولیاء ہوں گے، البتہ جسمانی سزاؤں میں ان پر حد جاری نہ کرکے ان کی تعزیر کی جائے گی، جس کا مقصد سزا دینا نہیں بلکہ اس کی تادیب واصلاح ہے۔

"فإنه يعزر تأديباً لا عقوبة لأنه من أهل التأديب" (بدائع ۵/۳۴، باب التعزیر)، چنانچہ اگر تعزیراً بچے کو جیل میں رکھا جائے تو اس کے ساتھ ایسا سلوک نہ کیا جائے کہ اسے محسوس ہو کہ اسے سزا دی جارہی ہے، بلکہ اس کے ساتھ خیرخواہانہ برتاؤ کیا جائے، اسے اخلاقی تعلیم سے روشناس کیا جائے اور اس سے اس کی حیثیت کا لحاظ کرتے ہوئے اسی نوعیت کا کام لیا جائے جس سے اس کی اصلاح وتربیت کا پہلو نمایاں ہو۔

بے سہارا بچوں کا مسئلہ:

اسلام میں انسانی جان کو جو اہمیت دی گئی ہے وہ اس آیت کریمہ سے ظاہر ہوتی ہے جس میں ایک انسانی جان کے تلف کرنے کو پوری انسانیت کو تلف کرنے اور ایک جان کے بچانے کو پوری انسانیت کو بچانے سے تعبیر کیا گیا ہے، اور قرآن وحدیث میں جابجا نادار ویتیم اور قوم کے بے کس وبے سہارا بچوں کی کفالت وپرورش کی اہمیت اور فضیلت بیان کی گئی ہے اور ان کے حقوق کی نگہداشت پر لوگوں کو متوجہ کیا گیا ہے، اور انہیں بے سہارا چھوڑنے یا ان کے ساتھ بدسلوکی اور ظلم وزیادتی کی صورت میں بڑی سخت وعید بھی بیان کی گئی ہے، لہذا کسی بھی معذور اور بے سہارا بچے کو سہارا دینا اور تعلیم وتربیت سے آراستہ کرکے اسے سماج کا ایک مفید انسان بنانا یہ صرف حکومت ہی کی نہیں بلکہ پورے معاشرہ کی ذمہ داری ہے، ذہنی اور جسمانی اعتبار سے معذور بچے تو رحم وکرم اور توجہ وعنایت کے اور زیادہ محتاج ہوتے ہیں، والدین یا رشتہ داروں کی ان کے تعلق سے کسی بھی قسم کی بے رخی اور بے توجہی خدا کے حضور لائق گرفت ہے، انہیں محض کسی ہسپتال یا ادارہ میں داخل کرکے ان سے غفلت برتنا یا فقر وغربت کی صورت میں اپنا بچہ کسی کے حوالہ کرکے ہمیشہ کے لئے اس سے بے تعلق ہوجانا کسی طور پر مناسب نہیں، مختلف قسم کے افراد پر مشتمل انسانی معاشرہ تو ایک ایسی عمارت ہے جس کے حصہ آپس میں ایک دوسرے کو مضبوطی دیتے اور تھامے رہتے ہیں۔

☆☆☆

اسلام میں بچوں کی تعلیم وتربیت

مولانا مبارک حسین ندوی[1]

اسلام کی جامعیت:

مذہب اسلام نے معاشرہ کے ہر فرد کے لئے رہنما اصول بیان کئے ہیں، اور یہ اصول قرآن وحدیث کی شکل میں موجود ہیں، قرآن میں بنیادی باتیں ذکر کی گئی ہیں اور حدیث شریف میں ان کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں، اس نے بچپن سے لے کر بڑھاپے تک کے حالات، بلکہ موت اور اس کے بعد کی تفصیلات ذکر کی ہیں، بچوں کے مسائل اور ان کے جملہ حقوق کا تذکرہ کیا ہے۔

بچے معاشرہ کی سب سے بڑی ضرورت:

بچے معاشرہ کی سب سے بڑی ضرورت، قوم کے مستقبل اور حیات انسانی کے مہکتے پھول ہیں، اگر بچے نہ ہو تو زندگی اجیرن ہوجاتی ہے، جب بچے اس قدر قیمتی ہیں تو اسلام میں ان کی حفاظت اور تربیت کے زریں ضابطے بیان کئے ہیں، اللہ رب العزت نے بچوں کے سلسلہ میں والدین کو اس بات کا مکلف کیا ہے کہ وہ ان کی تربیت میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھیں، ولادت سے لے کر بڑی عمر تک ہر ہر لمحہ میں ان کی رہنمائی والدین کے مذہبی فرائض میں داخل ہے۔

بچوں کے حقوق (عمر کے مختلف مراحل میں):

اولاد کے بنیادی بقاء کے بعد اس کے نمایاں حقوق میں جہاں ایک طرف رضاعت وحضانت (پرورش) ہے وہیں دوسری طرف تعلیم وتربیت ہے، بچوں کے حقوق کی ابتداء ماں کے پیٹ ہی سے شروع ہوجاتی ہے، حمل کے دوران صحیح اور جائز غذا کا استعمال، حمل والی عورت کے اچھے معمولات اور اسلامی تعلیمات کا اثر بھی بچے پر مرتب ہوتا ہے، شریعت نے نوزائیدہ بچے کی حفاظت کے لئے باضابطہ احکامات دیئے ہیں، جنین سے چھیڑ چھاڑ کو جرم قرار دیا ہے، یہ جنین جب بچہ کی شکل میں پیدا ہوتا ہے تو سب سے پہلی آواز اس کی کان میں اذان اور اقامت کی شکل میں جاتی ہے، اور یہ سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے، حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے کہ جب حسن بن علیؓ پیدا ہوئے تو نبی کریمؐ نے ان کے داہنے کان میں اذان دی اور بائیں کان میں اقامت کہی، علامہ ابن قیمؒ اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں ''انسان کے کان میں سب سے پہلی آواز ایسے کلمات کی پڑنی چاہئے جو اللہ کی عظمت وکبریائی پر مشتمل ہو، جیسا کہ مرتے وقت کلمۂ توحید کی تلقین کی جاتی ہے'' (تحفۃ المودود بأحکام المولود)۔

پیدا ہونے والے بچے کی تحنیک کرانا بھی سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں داخل ہے۔

اس کے بعد اسلام نے بچوں کے سلسلہ میں یہ حقوق والدین پر لازم کئے ہیں کہ ساتویں دن ان کا اچھا نام رکھا جائے، اللہ تعالیٰ کے صفاتی ناموں سے جوڑ کر اگر نام رکھا جائے تو ان کی معنویت میں اضافہ ہوتا ہے، ورنہ صحابہ اور صحابیات کے ناموں پر نام رکھنا بھی برکت کے حصول کا ذریعہ ہے، بچہ کا ختنہ کرنا بھی اس کے بنیادی حقوق میں سے ہے، اور حضرت ابراہیمؑ کی ملت حنیفی کا جز ہے، علامہ سید سلیمان ندویؒ نے سیرۃ النبی میں بچوں کے ابتدائی حق کا تذکرہ اس طرح کیا ہے:

''اولاد کے جینے کا حق تسلیم کرانے کے بعد پہلا فرض ہے کہ اس کی نشوونما اور دودھ پلانے کے حق کو تسلیم کیا جائے، اور جب تک وہ خود سے کھانے پینے کے قابل نہ ہوجائے، اس کی خبر گیری کی جائے، اور اس کے بعد اس کی نابالغی کے زمانہ تک اس کی نگرانی اور اس کے خرچ کی

[1] ناظم مدرسہ نور العلوم مدھولیا، نول پراسی نیپال۔

کفالت کی جائے، چنانچہ اسلام میں ان دونوں باتوں کا بوجھ والدین پر اور خاص طور پر جہاں تک مصارف کا تعلق ہے تنہا باپ پر رکھا ہے'' (سیرۃ النبی ۶/ ۱۵۳، ۱۵۴ جدید ایڈیشن)۔

اس کے بعد یہ مرحلہ آتا ہے کہ بچہ کی تعلیم وتربیت پر توجہ کی جائے، اللہ کے نام اس کو یاد کرائے جائیں، قرآنی دعائیں اور سورتیں یاد کرائی جائیں، انبیاء کرام کے قصے سنائے جائیں، صحابہ اور صحابیات سے اس کو مانوس کیا جائے، حدیث شریف میں آیا ہے کہ جب بچے سات سال کے ہوجائیں تو ان کو نماز کا حکم دو، اور جب دس سال کے ہوجائیں تو ان کو تنبیہ کرو (ابوداؤد)۔

اس طرح والدین پر ضروری ہے کہ بچوں کو غلط صحبت سے بچائیں، کیونکہ صحبت کا اثر ایسا ہوتا ہے جس کو زائل کرنا بعد میں ناممکن ہوتا ہے، شیخ عبداللہ صالح علوان نے اپنی کتاب "تربية الأولاد في الإسلام" میں لکھا ہے کہ والدین کی متنوع ذمہ داریاں ہیں، جن میں ایمانی تربیت بھی ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ بچے کو ایمان کی ابتدائی باتیں بتائی جائیں، عمر کے ارتقاء کے ساتھ حلال وحرام کی تلقین کی جائے، اور اتنے شرعی علم کی تحصیل کا مکلف بنایا جائے، جو بااصول زندگی گذارنے میں معاون ہوں۔

(۲) اخلاقی تربیت: اس میں اخلاقی باتوں کی تعلیم وقتاً فوقتاً ضروری ہے، ترمذی کی حدیث میں ہے کہ کوئی باپ اپنے بیٹے کو عمدہ اور بہترین ادب سے زیادہ اچھا ہدیہ نہیں دے سکتا، غلط باتوں، جھوٹ، چوری اور دیگر معاشرتی امراض سے دور رکھنا بھی ہے۔

(۳) جسمانی تربیت: بچے کی جسمانی تربیت میں اس کی صحت کی فکر کرنا، مرض میں مناسب علاج کرانا ہے۔

(۴) نفسیاتی تربیت۔

(۵) معاشرتی تربیت وغیرہ خاص اہمیت کے حامل ہیں۔

ان اصول کو اگر پیش نظر رکھا جائے تو بچے والدین کا لحاظ رکھتے ہیں، ان کا خیال رکھتے ہیں، اور ان کی خدمت میں دن ورات ایک کردیتے ہیں، لیکن اگر یہ اصول نہیں برتے گئے تو وہی حال ہوگا جس کا تذکرہ ایک حدیث میں آیا ہے کہ ایک صاحب نے اپنے لڑکے کی شکایت امیر المؤمنین حضرت عمرؓ سے کی، تو انہوں نے لڑکے کو بلایا اور پوچھا کہ کیوں تم ان کا کہنا نہیں مانتے ہو، اس نے کہا: اے امیر المؤمنین! میرے باپ نے میرے ساتھ کئی ظلم کئے ہیں: باندی سے شادی کی، میرا نام گبریلا رکھا، میری تعلیم پر ذرہ برابر بھی توجہ نہیں دی۔

سیرۃ النبی میں ہے: ''ظاہری اور جسمانی نشوونما کے بعد اولاد کی باطنی وروحانی تربیت کا درجہ ہے، قرآن پاک نے ایک مختصر سے مختصر فقرہ میں جو صرف چار لفظوں سے مرکب ہے، اس حق کو ایسے جامع طریقہ سے ادا کردیا ہے کہ اس کی تفصیل وتشریح میں دفتر کے دفتر لکھے جاسکتے ہیں: فرمایا: "يأيها الذين آمنوا قوا أنفسكم وأهليكم نارا" (تحریم:۶) (اے ایمان والو! تم اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو آگ سے بچاؤ)، اپنے اہل وعیال کو آگ سے بچانا خاندان کا فرض ہے، یہ آگ جہنم کی آگ ہے، مگر اس سے مقصود ان تمام برائیوں، خرابیوں اور بدباکیوں سے ان کی حفاظت ہے، جو بالآخر انسان کو دوزخ کی آگ کا مستحق بنادیتی ہے، اس طرح گھر کے سردار پر اولاد کی اخلاقی تربیت، دینی تعلیم اور نگہداشت کا فرض عائد کیا ہے'' (۶/ ۱۵۴)۔

یہ تھا ایک مختصر جائزہ بچوں کے حقوق کے سلسلے میں، ورنہ ظاہر ہے کہ تہذیب جدید نے بچوں کے لاتعداد مسائل کھڑے کردئے ہیں، اس طرح کی تربیت کی ذمہ داری سرپرستوں پر دوچند ہوجاتی ہے۔

سوالات کے جوابات:

الف: بچوں کے حق پرورش کے سلسلہ میں اسلام کی ہدایات بہت واضح ہیں، بچوں کی دیکھ بھال ضروری ہے، کیونکہ اس کے بغیر بچہ ضائع ہوجائے گا، پرورش کی سب سے زیادہ حقدار ماں ہے، جب اس کے شرائط پائے جائیں تو اس سے چھیننے کا کسی کو حق نہیں، اگر میاں بیوی میں جدائی ہوجاتی ہے، تب بھی بچے کی پرورش کا حق ماں ہی کو ہوگا، مسند احمد کی روایت ہے سے یہی معلوم ہوتا ہے، امام ابن قیمؒ نے زاد المعاد میں حضانت (پرورش) کی متعدد شرطیں لکھی ہیں: (۱) عاقل ہو (۲) بالغ ہو (۳) بچہ کی پرورش کی صلاحیت ہو (۴) اخلاق وعادات بہتر ہوں (۵) مسلمان ہونا ضروری ہے

(زاد المعاد ۴/ ۵۶۱)۔

بدائع الصنائع میں پرورش کا حق رکھنے والی عورتوں کا ترتیب اس طرح ہے: (۱) ماں (۲) نانی (۳) دادی (۴) حقیقی بہن (۵) ماں شریک بہن (۶) باپ شریک بہن (۷) حقیقی خالہ (۸) اخیافی خالہ (۹) علاتی بہن (۱۰) بھانجی (۱۱) بھتیجی (۱۲) حقیقی پھوپھی وغیرہ (جلد ۳/ص ۴۵۷)۔

اگر عورتوں میں کوئی حضانت کے لئے نہ ملے تو پھر حسب ذیل ترتیب سے پرورش کا حق حاصل ہوگا۔

باپ، دادا، بھائی، بھائی کی اولاد، چچا، چچا کی اولاد (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۷/ ۷۳۰)۔

پرورش کی اجرت باپ کے ذمہ ہے، فقہاء نے لکھا ہے کہ پرورش کی مدت ولادت سے لیکر سن شعور تک ہے، بچہ کا نفقہ، اس کے کھانے، کپڑے کا خرچ باپ ہی کے ذمہ ہے، اس کی دلیل وہ حدیث ہے جس میں حضرت ہند بنت عتبہ نے رسول اللہؐ سے اپنے شوہر ابوسفیان کی شکایت کی کہ وہ بخل سے کام لیتے ہیں، اور مجھے اتنا نہیں دیتے جو مجھے اور میرے بچوں کو کافی ہوجائے، اس پر آپؐ نے فرمایا: ''جو تمہیں اور تمہارے بچوں کو کافی ہوجائے قاعدہ کے مطابق اتنا لے لو'' (بخاری: ۵۳۶۴)۔

ب: ۱۔ اسلام میں بچوں کے حق تعلیم وتربیت کے وضاحت قرآن وحدیث میں بہت تفصیل سے آئی ہے، آیت قرآنی "یآیھا الذین آمنوا قوا أنفسکم وأھلیکم نارا" (سورۂ تحریم) (اے ایمان والو! اپنے آپ کو اور اپنی اولاد کو اور اپنے اہل وعیال کو جہنم کی آگ سے بچاؤ)، بخاری شریف کی روایت میں ہے کہ تم میں سے ہر شخص ذمہ دار ہے، اور اس سے اس کی رعایا کے بارے میں پوچھا جائے گا، آدمی اپنے گھر کا ذمہ دار ہے اور اس سے ان کے بارے میں پوچھا جائے گا، عورت اپنے شوہر کے گھر اور اس کے بچوں کی ذمہ دار ہے اس سے ان کے بارے میں پوچھا جائے گا (بخاری شریف: ۸۹۳)۔

حضرت علیؓ فرماتے ہیں: بچوں کو تعلیم دو اور ان کو ادب سکھاؤ (شعب الایمان ۱۱/ ۱۲۷)، ایک مسلمان خاندان کے افراد کا حق ہے کہ بچوں کو شروع سے ہی اسلامی تعلیمات سے واقف کرائیں، صحابہ کرامؓ اور صحابیات کے واقعات سنائیں، اس سے بچوں پر اچھا اثر پڑے گا، بچوں کو لوریاں دینا، بنیادی تعلیمات سے واقف کرانا، عقائد کی تعلیم دینا، قرآن سکھانا، حفظ قرآن کا عادی بنانا، دعائیں یاد کرانا، اسلامی آداب واخلاق کی تعلیم دینا (مثلاً سلام کرنا، گھر میں داخل ہونے کا ادب سکھانا، کھانے پینے کا ادب سکھانا، شرم وحیاء، بڑوں کا ادب، سچائی، امانت داری، حرام کاموں سے دور رہنا وغیرہ) یہ باتیں بچے کے لئے ضروری ہے، جب وہ سات سال کا ہوجائے تو نماز کا حکم دینا، اور دس سال کا ہوجائے تو اس کو تنبیہ کرنا ضروری ہے، اسی طرح سنتوں اور دیگر فرائض کی ادائیگی کی بھی تعلیم دینا بچوں کا بنیادی حق ہے۔

۲۔ اسلام میں بچوں اور بچیوں کو دینی تعلیم اتنی مقدار میں دینا ضروری ہے، جس سے انہیں حلال وحرام، جائز وناجائز، صحیح وغلط کا علم ہوجائے، حدیث شریف میں آیا ہے: ''طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم ومسلمۃ'' (یعنی علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان مرد وعورت پر ضروری ہے)، اس حدیث سے پتا چلا کہ علم دین کی وہ مقدار ہر ایک کے پاس ہونی چاہئے، جس سے وہ اپنی زندگی شریعت کی روشنی میں گزار سکے، اور آخرت کے عذاب سے بچ سکے، امام غزالیؒ نے احیاء علوم الدین میں لکھا ہے کہ علم کی دو قسمیں ہیں: فرض کفایہ اور فرض عین۔ فرض عین وہ علم ہے جو عقائد اور حلال وحرام سے عبارت ہے، اتنا علم ہر ایک کے پاس ہونا ضروری ہے، اور فرض کفایہ وہ علم ہے جس کو چند لوگ حاصل کرلیں تو معاشرہ کی ضرورت پوری ہوجائے جیسے زراعت، صنعت وحرفت وغیرہ (فضل العلم وآدابہ)۔

عصری تعلیم اتنی مقدار میں دینی ضروری ہے جس سے دنیاوی ضرورتیں بآسانی پوری ہوجائیں، یعنی اگر سرکاری دفاتر میں کام کی ضرورت پیش آئے تو اس وقت مجبوری نہ ہو، جہاں تک تخصص اور اسپیشلائزیشن کی بات ہے تو یہ بھی معاشرہ کا ایک حصہ ہے، کچھ افراد اس کو حاصل کریں گے، اس وقت صحیح معاشرہ کی تشکیل ہوگی "فلولا نفر من کل فرقۃ منھم طائفۃ لیتفقھوا فی الدین ولینذروا قومھم إذا رجعوا إلیھم لعلھم یحذرون" (التوبہ: ۱۲۲)۔

۳۔ ہندوستان ایک جمہوری ملک ہے، اس میں تمام مذاہب کے ماننے والوں کو اپنے اپنے لحاظ سے عبادت اور تعلیم کی آزادی ہے، اس لحاظ سے اگر کوئی حکومت کسی نظریہ کے تحت ایک خاص سطح کی تعلیم کو بچوں اور بچیوں کے لئے لازم کرتی ہے تو دستور ہند کی روشنی میں ہمیں اس کا حل ڈھونڈھنا

چاہئے، کیونکہ جب دستور ہمیں تعلیم اور عبادت کی آزادی دیتا ہے تو پھر کسی نظریہ کو کیسے کسی معاشرہ پر تھوپا جاسکتا ہے۔

۴۔اسلام ایک پاکیزہ دین ہے، اس نے حیاء وشرم کو ایمان کا جز قرار دیا ہے، بنیادی تعلیمات کی فہرست سوال نمبر ۲ کے ذیل میں آچکی ہے، اس لئے جنس کی تعلیم بچوں کا حق کسی طرح سے بھی نہیں ہے، یہ نظریہ مغربی نظام تعلیم سے نکل کر آیا ہے، اس لئے اس کو مسترد کرنا ہر مسلمان کا مذہبی فریضہ ہے، شادی اور نکاح کے بعد جو عائلی مسائل زوجین سے متعلق ہیں مثلاً نکاح، طلاق، خلع، نفقہ، سکنیٰ وغیرہ کا جاننا ضروری ہے۔

ج۔نکاح ایک معاشرتی ضرورت ہے، اس ضرورت سے معاشرہ صاف ستھرا رہتا ہے، اولیاء کو نابالغ اولاد کی شادی کرنا جائز ہے، لیکن بہتر یہ ہے کہ بالغ ہونے کے بعد بچوں کی شادی کریں، باپ، دادا اور اسی طرح دوسرے رشتہ دار جن کو ولایت کا حق ہے وہ بچوں اور بچیوں کے نکاح کے ولی ہوسکتے ہیں (ہدایہ ۲/ ۳۴۴)۔

د:۱۔ بچوں کی عمر ذہن سازی اور تربیت کی ہوتی ہے، اس عمر میں اگر مزدوری یا دوسرے کاموں میں مشغول کردیا جائے گا تو اصل تربیت کا وقت فوت ہوجائے گا، جس کا ان کو پوری زندگی احساس رہے گا، اس لئے بچوں کو نوعمری میں صحیح تعلیم دینا اور بہتر تربیت کا انتظام کرنا ضروری ہے۔

صورت مذکورہ میں اگر اضطراری حالت ہے تو بچہ مزدوری کرسکتا ہے، اسلام نے اضطرار کی صورت میں بہت سی ناجائز چیزوں کو جائز قرار دیا ہے، اس لئے اس کی گنجائش نکلتی ہے۔

۲۔ والدین بچوں کے سرپرست ہیں، جس طرح سے بچوں کے حقوق ماں، باپ پر ہیں، اسی طرح سے بچوں پر بھی ماں، باپ کے حقوق ہیں، دونوں کا ایک دوسرے کے حقوق کا لحاظ رکھنا ضروری ہے، بچے جتنے کام کی وسعت رکھتے ہیں، اسی قدر اس کو مکلف کیا جاسکتا ہے، لیکن ان کے بنیادی عمل تربیت کو چھوڑ کر پیشہ وارانہ کام پر لگانا یہ ان کے ساتھ ظلم کرنا ہے، لہٰذا اس سلسلہ میں احتیاط ضروری ہے "لا یکلف اللہ نفسا إلا وسعها"، علامہ ابن عابدین کی بھی صراحت ردالمحتار میں موجود ہے۔

ہ۔حدود کو نابالغ بچوں پر نہیں جاری کیا جائے گا، بلکہ ان کو تعزیری سزا دی جائے گی، امام ابویوسفؒ کتاب الخراج میں لکھتے ہیں: "ولا يقام الحد على غلام لم يبلغ الحلم، فإن شك فيه فلا يقام حد، حتى يبلغ خمس عشرة سنة" (کتاب الخراج: ۱۷۵)۔

و۔ نابالغ مجرم بچوں کو جیل میں رکھنا شرعاً درست ہے، ان کو وسعت سے زیادہ سزا نہیں دی جائے گی، اور ان سے ان کی طاقت کے مطابق کام لئے جاسکتے ہیں، پندونصائح اور اسلامی تعلیمات سے واقف کراکر ان کی اصلاح کی جاسکتی ہے، امام ابویوسف فرماتے ہیں: "وبعضهم قال: الحبس للصبي بطريق التأديب من لا يتجاسر على مثله، ولكن هذا انما يكون فيما يباشر من أسباب التعدي قصداً، وأما ما وقع خطأً منه فلا" (المبسوط ۲/۱۰۸)۔

ز۔ بے سہارا بچوں کی پرورش کی تربیت کے سلسلہ میں حکومت کا لازمی فریضہ ہے کہ وہ سرکاری فنڈ سے ان کی نگہداشت کا اہتمام کرے، اور عامة المسلمین کی ذمہ داری ہے کہ ایک کمیونٹی قائم کرکے غور کریں، علامہ ابن عابدین نے رد المحتار میں اس موضوع پر بڑی تفصیلی بحث کی ہے (ردالمحتار ۲/ ۷۴۰)۔

ح۔ پرورش کی استطاعت نہ رکھنے والے اپنے بچوں کو قریب ترین رشتہ داروں کے حوالہ کرسکتے ہیں، علامہ ابن عابدین فرماتے ہیں: "إذا لم يكن للأب مال، والجد أو الأم أو الخال أو العم موسر يجبر على نفقة الصغير و كذا يجبر الأبعد إذا غاب الأقرب (ردالمحتار ۵/۳۴۸)۔

ط۔معذور بچوں کا عذر اگر ایسا ہے کہ گھر میں ان کی وجہ سے ہمیشہ انتشار کی کیفیت رہتی ہے، اور علاج بھی سود مند نہیں تو ان کو بحالت اضطرار اسپتال میں یا ان جیسے بچوں کی مخصوص جگہ میں رکھنا مناسب ہے، اسلامی تعلیمات میں بچوں کی تربیت کی خاص اہمیت ہے، اگر فرار اختیار کرنے کے لئے یا اپنی مفوضہ ذمہ داری سے کنارہ کشی کے لئے ماں باپ یہ عمل کرتے ہیں کہ بغیر علاج کئے ہوئے اور تربیت پر توجہ نہ دے کر اسپتالوں کے حوالہ کرتے ہیں تو یہ ناجائز عمل شمار ہوگا، کیونکہ یہ "كلكم راع و كلكم مسئول عن رعيته" کے بالکل خلاف ہے۔

☆☆☆

بچوں کے حقوق...... اسلامی تعلیم وتربیت کے تناظر میں

مفتی محمد اخلاق حسین قاسمی [1]

(۱) پرورش کا حق رشتہ دار عورتوں اور مردوں کے لیے ثابت ہے، لوگوں میں سب سے زیادہ پرورش کی حقدار ماں ہوگی خواہ وہ باپ کے نکاح میں ہو یا مطلقہ ہو جب تک بچہ کے غیر محرم شادی نہ کرے اگر ماں نہ ہو تو اس کے بعد نانی اس کے بعد پرنانی اسی طریقہ سے اوپر تک، اس ترتیب کے ساتھ جو فقہ کی کتابوں میں مذکور ہے۔

اگر مذکورہ عورتیں بچہ کی پرورش کے لئے نہ ہوں جو مستحق حضانت ہیں تو حضانت عصبہ رجال کی طرف علی حسب الترتیب منتقل ہو جائے گی اگر اوپر مذکورہ لوگوں میں سے کوئی نہ ہو تو حکومت کی ذمہ داری ہوگی کہ وہ اس بچہ کی پرورش کا انتظام کرے، اگر حکومت کوتاہی برتتی ہو تو عامۃ المسلمین پر اس بچہ کی حفاظت لازم وضروری ہوگی (تفصیل کے لئے دیکھئے: کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ ۴/ ۵۲۰/ ۵۲۱)۔

(۲) عمر کے جس مرحلہ میں ماں یا باپ کو پرورش کا اولین حقدار تسلیم کیا گیا ہے، اگر بچہ کو ان کے حوالہ کرنے میں تعلیمی، تربیتی، جسمانی یا نفسیاتی پہلو سے مضرت کا اندیشہ ہو تو حق پرورش کے سلسلہ میں حکم یہ ہے کہ اگر بچہ کا ضائع ہونا لازم آئے تو ان لوگوں کا حق پرورش ساقط ہو جائے گا، کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ میں بڑی تفصیل کے ساتھ ان صورتوں کو بیان کیا ہے جس کے نہ پائے جانے کی صورت میں صاحب حق اپنے حق پرورش سے محروم ہو جائے گا (۴/ ۵۶۲)۔

(۳) اسلام میں بچوں کے حق تعلیم وتربیت کے سلسلہ میں بنیادی ہدایات یہ ہے کہ بچہ سات سال کے بعد باپ کے پاس رہے گا، تاکہ وہ مردوں کے اخلاق وآداب کو سیکھ سکے، اسی طرح بچی ماں کے پاس شعور کے بعد بھی بلوغ تک رہے گی تاکہ وہ عورتوں کے آداب کو سیکھ سکے مثلاً کپڑا دھونا، بنائی، سلائی اور امور خانہ داری کو سیکھ سکے اور یہ بچی عورت کے پاس ہی رہ کر سیکھ سکتی ہے (تفصیل کے لئے دیکھئے: کتاب المبسوط ۵/ ۱۹۵، تفسیر مظہری ۹/ ۳۴۴، تفسیر طبری وغیرہ)۔

(۴) بچوں اور بچیوں کو دینی تعلیم اتنی مقدار میں دینا فرض عین ہے جس سے فرائض وواجبات کی ادائیگی پر قادر ہو جائیں اور عصری تعلیم اس قدر جس سے ان کے معاش کا مسئلہ حل ہو سکے (رد المحتار علی الدر المختار ۲/ ۲۸/ ۷۲۹)۔

(۵) حکومت کی طرف سے تعلیم لازمی ہو اور نصاب لازمی نہ ہو تو دینی تعلیم میں فرائض کی حد تک لزوم کو تسلیم کیا جا سکتا ہے، اس لیے کہ اس میں شریعت میں بھی لزوم ہے، البتہ اگر دوسری تعلیم ہو اور وہ معاش سے متعلق ہو تو اس پر عمل کرنے کی گنجائش ہے جیسا کہ فقہاء کے یہاں بچوں کو صنعت وحرفت سکھانے کا تذکرہ ملتا ہے، البتہ لزوم تسلیم نہیں کیا جائے گا، اور اس پر عمل کرنا مسلمانوں کے لیے بحیثیت شریعت لازم نہ ہوگا، البتہ ملکی قانون کی حیثیت سے لازم ہوگا جب کہ وہ تعلیم کفر وشرک کی نہ ہو اور اس کا اخلاقیات پر اثر نہ پڑتا ہو۔

(۶) بچوں کا حق اگر وہ لڑکا ہے تو مردوں کے اخلاق وعادات سیکھنا ہے اور بچی ہے تو گھریلو کام کاج، سلائی بنائی، امور خانہ داری وغیرہ ہے، بچہ بالغ ہونے کے بعد خود بخود اپنی مخصوص صنفی اور جنسی کیفیات کو محسوس کرنے لگتا ہے، اسی طرح لڑکی ہے تو وہ بھی محسوس کرتی ہے، یہ ایسی چیز نہیں ہے جس کی تعلیم دی جائے (کتاب المبسوط ۵/ ۱۹۵ باب حکم الولد عند افتراق الزوجین)۔

اسلامک فقہ اکیڈمی کی طرف سے شائع شدہ کتاب ''نئے مسائل اور اسلامک فقہ اکیڈمی کے فیصلے'' کے صفحہ ۱۱۵/ ۱۱۶ پر اس سلسلہ میں بڑی

---

[1] مفتی دار الافتاء مدرسہ اسلامیہ قرآنیہ فیض العلوم، یمنا نگر، ہریانہ۔

شرح وبسط کے ساتھ کلام کیا ہے جس میں اس کو بچوں کا حق تسلیم نہیں کیا گیا ہے۔

(۷) بچہ اور بچی جب بالغ ہو جائیں تو ماں باپ پر یہ لازم ہے کہ ان دونوں کی شادی کر دیں، البتہ اگر رشتہ برابری کا مل جائے تو باپ اور دادا کو یہ اختیار ہے کہ وہ بچی کا رشتہ کر دے لیکن رخصتی بلوغ کے بعد کرے، پھر والدین کی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ بچوں کے نشونما کا خیال کر کے ان کی شادی بلوغ کے بعد فوراً کر دیں، اس لیے کہ شادی میں تاخیر کی گئی اور وہ گناہ میں مبتلاء ہو گئے تو اس کا گناہ باپ کو ہوگا۔

(۸) جب بچہ کمانے کے قابل ہو جائے تو اس کو اجرت پر دیا جائے گا یا کوئی صنعت وکاریگری سکھائی جائے گی (الدر المختار مع رد المحتار ۲/۶۷۹، باب الحضانۃ)۔

مذکورہ بالا عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ اسلام میں بچہ اگر حد کسب کو پہنچ جائے اور وہ سات آٹھ سال ہے تو اس کو مزدوری پر لگایا جائے گا اور کاریگری سکھائی جائے گی اور پھر اس کی کمائی سے اس کی ذات پر خرچ کیا جائے گا، البتہ اگر بچہ تحصیل علم میں لگا ہوا ہو تو اس کے بالغ ہونے کے بعد بھی اس کا نفقہ اس کے باپ پر ہوگا اور وہ مزدوری پر نہیں لگایا جائے گا: "إلا إذا كان طالب علم مستقيم. فإن نفقته تجب على أبيه ولو كبيرا وليس له منعه من طلب العلم" (کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ ۴/۵۱۲)، البتہ بچوں سے ایسے کام نہیں لیے جا سکتے ہیں جو ان کے جسمانی اور دماغی نشو ونما پر اثر انداز ہوں یا وہ اس کی وجہ سے مہلک بیماری میں مبتلاء ہو جائیں، اسی طرح سے وہ کام ان کے تحمل سے باہر ہو، اس لیے کہ کاریگری سکھانا یا مزدوری پر لگانا اس کو کامیاب بنانے اور خود کفیل بنانے کے لیے ہے اور ان صورتوں میں بچہ کا ضائع ہونا لازم ہوگا جسکی وجہ سے ماں کا حق حضانت بھی ساقط ہو جاتا، اس لیے ایسے کاموں میں لگانا جائز نہیں ہوگا۔

(۹) والدین اور اولیاء نابالغ بچوں سے ایسا کام لیں جو بچہ کی تعلیم وتربیت سے متعلق ہو یا لڑکی سے امور خانہ داری سے متعلق ہو تو ان کے تحمل تک درست ہے، اگر کوئی کام ان کے بس سے باہر ہو یا اس میں ان کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہو تو وہ کام لینا جائز نہیں ہوگا۔

(۱۰) اپنی معاشی ضروریات پورا کرنے یا بہتر بنانے کے لیے ان سے مزدوری کروا سکتے ہیں اور پیشہ وارانہ کام سکھانے کے لیے کام پر لگا سکتے ہیں، جبکہ بچہ طلب علم میں مشغول نہ ہو اور وہ کام اس کے بس میں ہو اور اس میں اس کے ضیاع کا اندیشہ نہ ہو جیسا کہ شامی میں ہے: "وأطلق فيمن تجب عليه النفقة فشمل الصغير الغني والصغيرة الغنية فيؤمر الوصي بدفع نفقة قريبهما المحرم بشرطه كذا في أنفع الوسائل بحر" (ردالمحتار علی الدر المختار ۲/۶۷۰)۔

والدین کا اپنی غربت اور معاشی بدحالی کی بنا پر بچوں کو مزدوری پر لگانا جائز ہوگا اور اس وقت تو بدرجہ اولی جائز ہوگا جبکہ وہ خود کمانے کے لائق نہ ہوں اور حکومت بھی ان کا تکفل نہ کرتی ہو "صرحو بأن الأب إذا كان مريضا أو به زمانة يحتاج إلى الخدمة فعلى ابنه خادمه" (شامی جلد ۲/۶۲۸)، جب خادم کا مہیا کرنا بچہ پر لازم ہے تو وہ خود باپ کے لیے کمانے پر کیوں نہیں لگایا جائے گا۔

(۱۱) نابالغ بچہ یا بچی سے قتل، غارت گری، چوری، زنا بالرضا یا زنا بالجبر جیسے جرائم صادر ہوں تو ان پر حد تو جاری نہیں کی جائے گی، البتہ اگر نابالغ قاتل ہے تو اس کو سیاسۃ امام قتل کروا سکتا ہے (ردالمحتار ۳/۱۹۶ مطلب یکون التعزیر بالقتل، باب التعزیر)، اسی طرح شامی میں ص/۲۰۴ ہے "وشرع في حق الصبيان" یعنی تعزیر بچوں کے حق میں مشروع ہے۔

جب بچہ پر تعزیر کی جا سکتی ہے تو ان کو قید کیا جا سکتا ہے، ان کو قید خانہ میں سزائیں بھی دی جا سکتی ہیں، ایسی سزا جس سے ان کے اور ان کے اعضاء کا تلف نہ لازم آئے اور ان سے کام بھی لیا جا سکتا ہے اور کوئی ہنر اور کاریگری سکھائی جائے تو بہتر ہے، ان کے اصلاح کی تدبیر ان کو تعلیم دینا ہے، ان کے تعلیم کا نظم ہو، اخلاقیات کا درس دیا جائے اور جرم کی قباحت اور اس کا نقصان بتایا جائے، اچھے لوگوں کی سیرت وسوانح کے پڑھانے کا نظم ہو۔

(۱۲) یتیم بچوں کی پرورش کا تو اسلام میں ایک مضبوط نظام ہے جو کتب فقہ میں مصرح ہے کہ ایسے بچوں کا خرچہ دادا اٹھائے گا اگر وہ مالدار ہو یا چچا یا بھائی ہو تو ان دونوں میں سے کوئی ایک اٹھائے گا، اسی طریقہ سے نسبی رشتہ دار پر اقرب فالاقرب کے قاعدہ کے مطابق خرچ کرنا اور تعلیم وتربیت کا انتظام کرنا ضروری ہوگا، اگر کوئی بھی نہ ہو تو بیت المال پر ہوگا اور اگر بیت المال کا نظام نہ ہو جیسے ہمارے ہندوستان میں تو عام

مسلمانوں کی ذمہ داری ہوگی کہ ایسے بچہ کی حفاظت کریں جیسا کہ کتاب الفقہ میں ہے: "فإن لم یکن لهم جد موسر، وكان لهم عم أو أخ موسر وجبت النفقة على واحد منهما، وإلا وجب على الأقرب فالقرب وعلى كل حال .... فإن لم يستطع وجبت نفقتهم في بيت المال. كي لا يضيعوا" (كتاب الفقه على المذاهب الاربعه ۴، ۵۱۲، ۵۱۳، باب النفقة، نفقة الاولاد)۔ البتہ اگر کوئی بچہ ماں باپ سے بچھڑ جائے یا ولادت کے بعد پھینک دیا جائے یا کوئی اور صورت حال پیش آئے اور اس بچہ کے رشتہ داروں کا پتہ چل جائے تو جزئیت کے اعتبار سے اس کے عصبات پر اس کا خرچہ لازم وضروری ہوگا، اگر معلوم نہ ہوسکے جیسا کہ ظاہر ہے تو پھر اس کا خرچ حکومت کے بیت المال پر ہوگا اور حکومت کی یہ ذمہ داری ہوگی کہ وہ اس کی حفاظت کا انتظام وانصرام کرائے اور اگر حکومت وقت لاپرواہی برتے تو عامۃ المسلمین پر اس کے جان کی حفاظت واجب ہوگی۔

(۱۳) حد درجہ بڑھے ہوئے افلاس اور پرورش کی استطاعت کے نہ رکھنے کی صورت میں ماں باپ کا اپنے بچہ کو کسی دوسرے کے حوالہ کر کے بے تعلق ہونا شرعا درست نہیں ہے، اس لیے کہ بچہ کا خرچہ باپ پر ہے، اگر وہ استطاعت نہیں رکھتا ہے تو دادا پر ہے، اسی طرح اور رشتہ داروں پر، اگر کوئی نہ ہو تو بیت المال پر، اگر بیت المال نہ ہو تو عامۃ المسلمین پر ہے، اگر کسی کو بچہ دے دے تو اس کی طرف سے پیش کیا جانے والا ہدیہ اس کے لیے جائز نہ ہوگا، اس لیے کہ انسان کی خرید فروخت جائز نہیں ہے اور یہ (ثمن) قیمت بنام ہدیہ ہے جیسا کہ "بدائع" میں ہے

"والآدمي بجميع أجزائه محترم مكرم وليس من الكرامة والاحترام ابتذاله بالبيع والشراء (البدائع والصنائع ۵-۱۴۵)۔

اسی طرح ہدایہ میں ہے:

"إذا كان أحد العوضين أو كلاهما محرما فالبيع فاسد وكذا إذا كان غير مملوك كالحر" (ہدایہ ۳/ ۵۳)۔

ایسے ماں باپ کو قید کر دیا جائے گا اور اگر ان کے لیے استطاعت کا مسئلہ ہو تو اسلام میں بیت المال اور اس کے نہ ہونے کی صورت میں عامۃ المسلمین کی طرف سے دیا جانے والا صدقہ اور زکاۃ سے ان کی مدد کی جائے گی اور ہدایت کی جائے گی کہ وہ اپنی حرکت سے رک جائے، بہر حال اس کے لیے اسلامی تنظیموں کو کوشش کرنی ہوگی کہ لوگ اس عمل کو برا سمجھیں اور اپنی ذمہ داری سے فرار اختیار نہ کریں۔

(۱۴) ذہنی یا جسمانی طور پر معذور پیدا ہونے والے بچے یا معذور ہونے والے بچہ کے سلسلہ میں اسلامی ہدایات یہ ہیں کہ ماں باپ پر ان کا علاج بقدر استطاعت واجب ہے اور علاج ونگہداشت کے لیے ہسپتال میں رکھنا جائز ہوگا، البتہ ماں باپ پر ان بچوں سے ملنا لازمی ہوگا

"وفي الشرع حفظ الصغير، والعاجز، والمجنون والمعتوه، مما يضره بقدر المستطاع" (كتاب الفقه على المذاهب الاربعه ۴-۵۲۰)۔

☆☆☆

اسلام میں بچوں کے حقوق اوران سے متعلق احکام

قاضی محمد ریاض ارمان قاسمی [1]

اسلام میں بچوں کے حق پرورش کے سلسلہ میں ہدایت یہ ہے کہ ماں پر بچہ کی پرورش کرنا دیانۃ واجب ہے، قضاءً واجب نہیں ہے، اگر ماں نہ ہوتو نانی اوپر تک پھر دادی، اسی طرح ماں کی جہت کی عورتیں پھر باپ اس کے بعد عصبات مستحق پرورش ہوں گے، اگر کوئی نہ ہوتو معاملہ قاضی کے سپرد ہوگا اور خرچ بیت المال پر ہوگا، اگر باپ زندہ ہوتو پرورش کا خرچ اس پر ہوگا، ورنہ نفقہ کی ترتیب پر دوسرے رشتہ دار پر ہوگا، اگر مذکورہ لوگوں کے سپرد کرنے میں بچہ کا ضائع ہونے کا خطرہ ہو یا اس کے دین کا خطرہ ہوتو صاحب حق کا حق حضانت ساقط ہوجائے گا اور ماں یا دوسری عورتیں جب بچہ کے اجنبی سے شادی کرلیں، اسی طرح وہ مرد جو بچی کے محرم نہ ہوں جیسے چچازاد بھائی تو وہ بھی بچی کی حضانت سے محروم ہوں گے۔

اسلام میں بچوں کی تعلیم وتربیت کے لیے بنیادی ہدایت یہ ہے کہ ان کو فرائض دین کی تعلیم اور حرفت وصنعت سکھائی جائے گی، بچوں اور بچیوں کو فرائض کی تعلیم دینا فرض، سنت کی تعلیم دینا سنت، مستحب کی تعلیم مستحب اور مباح کی تعلیم دینا مباح ہے اور عصری تعلیم معاش کے حصول کی حد تک لازم ہے، ورنہ مباح ہے، اگر کوئی صحیح علم حاصل کرے تو بالغ ہونے کے بعد بھی اس کا خرچہ باپ پر ہے اور وہ اس کو حصول علم سے منع نہیں کرسکتا ہے۔

اگر حکومت کسی حد تک کی تعلیم کو لازم قرار دے تو مسلمانوں کے لیے حکومتی قانون کے اعتبار سے لازم ہوگا، اسلامی قانون کے اعتبار سے لازم نہیں ہوگا۔

جنس کی تعلیم بچوں کا حق نہیں ہے، اس لیے اس سے ان میں بے حیائی اور بری عادتیں جڑ پکڑیں گی۔

اسلام میں نابالغ بچوں اور بچیوں کی شادی باپ دادا کو کرنے کا اختیار ہے، بعد بلوغ کے بھی ان کی شادی جلدی کرنے کا حکم ہے تاخیر کرنے کی اسلام میں حوصلہ افزائی نہیں کی گئی ہے، بلکہ بعض حالات میں بعد بلوغ شادی فرض، واجب اور سنت اور مباح کے درجہ کو پہنچ جاتی ہے۔

بچوں سے مزدوری کرانے میں کوئی حرج نہیں ہے جبکہ ان کے نشوونما میں خرابی اور ہلاکت کا اندیشہ نہ ہو، والدین بچوں سے ان کی عمر کا لحاظ کر کے ان سے گھر کا کام انکی مقدور کے مطابق لے سکتے ہیں اور معاشی ضرورت کے لیے ان سے مزدوری کراسکتے ہیں، اسی طرح ان کو پیشہ وارانہ کام بھی سکھا سکتے ہیں جو ماں باپ خود کما نہیں سکتے ہیں تو وہ بچوں کو اجرت پر دے سکتے ہیں، ان تمام صورتوں میں اس بات کا خیال رہے کہ ماں باپ بچہ کے ذریعہ کمائی گئی رقم کے مالک نہیں ہوں گے اور ان کو اپنی ضرورت پر بغیر ضرورت شدیدہ خرچ کرنے کے مجاز بھی نہیں ہوں گے، اس لیے کہ وہ بچہ کا مال ہے، اس میں تصرف کی اجازت نہیں ہے، ہاں اس میں سے اسی کے اوپر خرچ کرسکتے ہیں، اپنے لیے کہیں اور سے انتظام کریں، البتہ غریب ہیں یا کسب سے عاجز ہیں تو خرچ کرسکتے ہیں۔

نابالغ قیدی کو سزائیں دی جاسکتی ہیں ان سے تعزیرا کام لیا جاسکتا ہے اور ان کی اصلاح کے لیے انہیں اخلاقیات کا درس دینا چاہئے۔

بے سہارا بچہ باپ کے مرنے بچھڑ جانے یا پھینک دئے جانے کے بعد اگر باپ ہوتو وہ ورنہ ورثہ یا حکومت ورنہ تو عام مسلمان اس کی دیکھ ریکھ، تعلیم وتربیت کے ذمہ دار ہوں گے، غیربی کی وجہ سے اپنا بچہ کسی دوسرے کو نہیں دے سکتے ہیں، اس لیے کہ وہ بچہ کے مالک نہیں ہیں بلکہ وہ ان کے پاس امانت ہے، اسی طرح اس کے نام کا دیا ہوا ہدیہ استعمال نہیں کرسکتے ہیں، اس لیے کہ انسان کی خرید فروخت اور ہدیہ جائز نہیں ہے، کیونکہ ہدیہ تو مال کا ہے اور یہ مال نہیں ہے۔

مفلوج بچہ کا علاج باپ بقدر استطاعت کرے گا، البتہ اس کو نگہداشت کے لیے ہسپتال میں رکھ سکتا ہے جبکہ وہ اس کو چھوڑ کر بالکل لاپرواہ نہ ہوجائے۔

☆☆☆

---

[1] قاضی شریعت دارالقضاء، مدرسہ اسلامیہ قرآنیہ فیض العلوم، ہریانہ۔

بچوں کے حقوق اور اسلامی تعلیمات

مولانا عبدالتواب اناوی[1]

الف:۱۔ ماں کو حق پرورش میں پہلا درجہ حاصل ہے اس کے بعد ضابطہ کے مطابق دوسری عورتوں کو۔

۲۔ حق پرورش کے حصول کے لئے ضابطہ کی ہر عورت کے لئے مذکورہ صفات سے متصف ہونا ضروری ہے:

(۱) آزاد ہونا، (۲) عاقل ہونا، (۳) مسلمان یا اہل کتاب ہونا، (۴) صحت مند ہونا، (۵) غیر ذی رحم محرم کے نکاح سے خالی ہونا، (۶) بالغہ ہونا، (۷) امینہ ہونا، (۸) گھر میں رہنے والی ہونا، (۹) متقیہ ہونا، (۱۰) بینا ہونا، (۱۱) حقوق پرورش سے واقف ہونا۔

۳۔ حق پرورش کے ضابطہ میں آنے والی عورت اگر مذکورہ صفات میں سے کسی صفت کی اہل نہیں ہے تو اسے چھوڑ کر دوسری ضابطہ کی عورت جس میں تمام صفات موجود ہوں حق حضانت دیا جائے گا۔

۴۔ اگر مدت حضانت کے بعد باپ یا عصبات کی جانب سے یا مدت حضانت سے قبل حاضنہ کی طرف سے غیر ذمہ دارانہ باتیں اور چیزیں محسوس ہوں تو بچہ کو ان سے لے کر دوسرے کو دے دیا جائے گا خواہ وہ نقصان بچہ کو پہنچ رہا ہو یا از روئے قرائین پہنچنے کا اندیشہ ہو۔

ب: بچہ کو بالغ ہونے سے قبل عائد ہونے والی تمام دینی ضرورتوں کا علم حاصل کرنا فرض عین ہے۔

(۲) بچوں اور بچیوں کو دین کی اتنی تعلیم ضروری ہے جس سے وہ حرام وحلال اور روزمرہ کی زندگی میں پیش آمدہ مسائل میں فرائض وواجبات اور حرام ومکروہات کو جان لیں، عصری تعلیم بھی اسی حد تک ضروری ہے جس سے معاشرہ میں جینے رہنے اور کام کرنے کا حق مل جائے۔

(۳) اگر حکومت کسی حد تک بچوں اور بچیوں کو تعلیم کا پابند کرے اور وہ تعلیم وطرز تعلیم مغائر احکام اسلام نہ ہو اور معاشرہ کا کچھ حرج بھی نہ ہوتا ہو تو اس کی پابندی میں کوئی حرج نہیں، ورنہ اجازت نہیں۔

(۴) جنسی تعلیم حرام ہے، اسلام اس کی کسی بھی طرح اجازت نہیں دیتا، اسے بچوں کا حق کہنا غلط ہے۔

ج: نکاح ہر عمر میں جائز ہے، البتہ بالغ ہونے سے قبل نکاح میں رخصتی بعد از بلوغ ہونی چاہئے اور نکاح بعد البلوغ میں غفلت نہیں برتنی چاہئے، بلکہ بہت جلدی کرنی چاہئے۔

(۱) بچہ مزدوری اسلام میں جائز نہیں ہے۔

(۲) تعلیم سے فارغ اوقات میں تربیت کے عنوان سے بچہ سے گھر کے وہ کام لئے جاسکتے ہیں جس سے بچہ کا تعلیمی، جسمانی اور نفسیاتی نقصان نہ ہو۔

(۳) نادار اور فقیر حضرات کے بچوں کی تعلیم وتربیت حکومت، یا پھر مسلم معاشرہ کے ذمہ ہے اور فقراء کا نفقہ بھی۔

ہ: نابالغ بچوں پر حدود جاری نہ ہوں گی، ان کا تاوان ان کے باپ سے لیا جائے گا، ان کے لئے سزا ہونی چاہئے۔

و: جیلوں میں قید بچوں کو مارنا، پرمشقت کام لینا، نامناسب سزا دینا جائز نہیں، ان سے تعلیم سے فارغ اوقات میں تربیتی عنوان سے صرف اتنا کام لیا

---

[1] جامعہ اسلامیہ، بانگر مئو، اناؤ۔

جاسکتا ہے جس میں ان کا جسمانی، تعلیمی اور تربیتی نقصان نہ ہو۔

ز: بے سہارا بچوں پر لقیط کا حکم جاری ہوگا، ان کا نفقہ سلطان یا عامۃ المسلمین پر ہے، معاشرہ پر ضروری ہے کہ انکی تعلیمی ضرورتوں اور بعدہ عائلی ضرورتوں کو پورا کرنے کی مکمل سعی کریں۔

ح: بچوں کی خرید ہو یا فروخت قتل نفس کے حکم میں ہے، اسلام اسے حرام قرار دیتا ہے، نہ خوش حالی میں ہی اس کی اجازت ہے اور نہ تنگ دستی او رحالت فقر میں، بہر صورت حرام ہے۔

ط: معذور بچوں کی پرورش عام بچوں کی طرح ان کے والدین پر واجب اور ضروری ہے، البتہ اگر کسی اسپتال و ادارے میں ان کے علاج اور نگرانی کا باضابطہ نظام ہو اور بہت ہی صاف ستھرا حدود و قیود کے ساتھ معاملات طے کئے جائیں اور جملہ اخراجات کا صرفہ والد کے ذمہ رکھا جائے اور ساتھ ہی تحدید وقت بھی ہو تو اسے درست ہونا چاہئے، اسے پرورش کی ذمہ داری سے فرار نہیں کہا جانا چاہئے، واللہ تعالی اعلم بالصواب والیہ المرجع والمآب۔

☆☆☆

اسلامی قانون میں بچوں کے حقوق

مفتی عارف کنجروی[1]

بچے کا حق حضانت:

اسلام نے بچوں کی پرورش کو بڑی اہمیت کی نظر سے دیکھا ہے اور اسکو ایک مستقل حق کے طور پر مانا ہے اور باقاعدہ ایک فہرست بیان فرمائی کہ کون کون بچے کی پرورش کے حقدار ہیں، اور اس میں بھی بچے اور حقداروں کی رعایت کرتے ہوئے مدت بھی متعین فرمادی، اولاً اسلام اس حق کو ماں کے سپرد کرتا ہے، اس لئے کہ ماں میں بچوں کی محبت وشفقت بنسبت باپ کے زیادہ ہوتی ہے، اور ماں کی نرمی بھی بے نظیر ہے، اور اس عمر میں بچہ انہی محبتوں اور شفقتوں کے قابل ہوتا ہے، لیکن جب بچہ سات سال کی عمر کو پہنچتا ہے تو اسلام اس حق کو باپ کی طرف پھیر دیتا ہے، اس لئے کہ بچہ کو اس عمر میں جس تعلیم وتربیت کی ضرورت پڑتی ہے اس کے لئے موزوں شخص باپ ہی ہے، اسی طرح بچی جب بالغ ہوجائے تو باپ ہی کے ذمہ پرورش ہے، اور چونکہ شادی کا معاملہ بھی درپیش ہوتا ہے جس کو باپ ہی صحیح طریقہ سے انجام دے سکتا ہے۔

اگر ماں کا انتقال ہوجائے یا وہ مطلقہ ہوجائے اور دوسری شادی کرلے تو حق حضانت نانی کے ذمہ ہوتا ہے، اس کے بعد دادی، علامہ کاسانی نے لکھا ہے کہ اسی طرح بالترتیب بچے کے جتنے بھی محرم رشتہ دار ہوں اگر وہ مسلمان وآزاد ہوں تو ایک کی غیر موجودگی میں دوسرے قریبی محرم رشتہ دار کے ذمہ بچہ کی پرورش ہے (بچے حقوق واحکام ۳۷۰/۴۰)۔

شریعت نے یہ ترتیب بچے کی صحیح تربیت اور اسکے مفاد کے لئے کی ہے، لیکن اگر اس ترتیب میں بچے کا نقصان ہو تو یہ حق دوسروں کی طرف منتقل ہوجاتا ہے جیسے ماں مطلقہ ہوگئی اور دوسرا شوہر بچے کے لئے بالکل اجنبی ہو یعنی بچے کے ساتھ اس کا کوئی قریبی رشتہ نہ ہو تو اس کا کوئی حق نہ ہوگا۔ اس شرط کی اصل وہ روایت ہے جو عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ سے مروی ہے کہ ایک عورت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا یارسول اللہ میں اس بیٹے کو پیٹ میں لئے پھری، گود میں اٹھا رکھا، اپنی چھاتی سے دودھ پلایا اب اس کا باپ مجھ سے چھیننا چاہتا ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "أنت أحق به منه مالم تنكحي" (بدائع اردو ۱۱۴/۴)۔ اور اس میں حکمت یہ ہے کہ اگر بچے کو اس نئے باپ کے حوالہ کردیا جائے تو وہ بچہ کے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی کرے گا اور بچے کے ضرر کا بھی قوی اندیشہ ہے اور یہ بات محرم شوہر کے وہاں پیش نہ آئے گی۔

دوسری چیز جس سے ماں حق حضانت سے محروم ہوتی ہے ماں کا مرتد ہونا ہے کہ مرتدہ کو قید کرلیا جاتا ہے اور بچہ کے قیدی بننے میں ضرر ہے، اسی طرح ماں کے باندی اور ام ولد ہونے کی صورت میں بھی حق حضانت سے محروم کردی جاتی ہے (بدائع الصنائع)۔

بچے کی تعلیم وتربیت:

شریعت میں تعلیم کی بڑی اہمیت ہے، اس لئے کہ اسلام مکلف سے جن فکری عقائد وعملی اخلاق کا مطالبہ کرتا ہے وہ بغیر تعلیم کے پورا نہیں کیا جاسکتا، نیز قرآن وحدیث میں بھی جابجا حصول علم اور علم کی فضیلت کو بیان کیا گیا ہے، قرآن مجید میں ہے: "هل يستوى الذين يعلمون والذين لا يعلمون" (سورہ زمر: ۹)۔ اور تعلیم کے سلسلہ میں اسلام نے لڑکا اور لڑکی کے درمیان کوئی تفریق نہیں رکھی، فرمان نبوی صلی اللہ علیہ وسلم: "طلب العلم فريضة على كل مسلم" (ابن ماجہ)، یہ ارشاد عام ہے جس میں لڑکا لڑکی تمام داخل ہیں، نیز اسلام میں مرد وعورت کے علاحدہ علاحدہ فرائض ہیں اور ہر ایک کو اپنے فریضے کو جاننا ضروری ہے۔

لہذا اہمیت تعلیم کے پیش نظر اسلام نے ہر باپ پر یہ فریضہ عائد کیا ہے کہ وہ اپنے بچوں کی اچھی تعلیم وتربیت کا انتظام کریں، چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

[1] جامعہ قاسمیہ کھروڈ انکلیشور، بھروچ، گجرات۔

کہ ایک باپ کا اپنے بچے کے لئے سب سے بہترین ہدیہ بہترین تعلیم وتربیت ہے۔

''ما نحل والد ولداً من نحل أفضل من أدب حسن'' (سنن ترمذی، حدیث نمبر: ۱۹۵۲)۔

اور لڑکیوں کی اچھی تعلیم وتربیت اور ان کی شادی کا اچھا انتظام کرنے والے باپ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جنت کی بشارت سنائی (بچے حقوق واحکام، ص: ۱۴۰)۔

لہذا ان کو اتنی تعلیم دینا تو ضروری ہے کہ ان کا دین پر چلنا آسان ہوجائے اور ان میں اسلامی اخلاقیات ومعاملات ومعاشرت کی سوجھ بوجھ آجائے، اور رہا مسئلہ عصری تعلیم کا تو چونکہ فی زمانا روزگاری اور معاش کے حصول کا ظاہری سبب عصری تعلیم ہے اور اس کا ایک خاص نصاب ہے اور ظاہر ہے کہ یہ عمل اسلامی نقطہ نظر سے خلاف شرع بھی نہیں، الا یہ کہ اس نصاب میں خلاف شرع کچھ ایسی باتیں شامل کی گئی ہوں یا اس کے پڑھانے والوں کی طرف سے کوئی بچوں کی تربیت خلاف شرع ہوئی ہو، جیسے آجکل RSS اور سنگھ پریوار نیز عیسائی مشنری کی اسکولوں میں ہورہا ہے کہ وہ مسلمانوں کے بچوں کی تربیت بھی اپنے نقطہ نظر سے کرتے ہیں، لہذا ایسے اسکولوں میں بچوں کو داخل نہ کیا جائے، اسی طرح اگر بچے اس عمر کو پہنچ جائے کہ ان کے اندر خواہشات پیدا ہونے لگے تو لڑکے اور لڑکی کا اختلاط ممنوع وحرام ہے، حتی کہ شریعت نے تو قریب البلوغ کے بستر کو بھی علاحدہ کرنے کا حکم دیا ہے، لہذا مخلوط تعلیم کے اسکولوں میں ان بچوں کو جو قریب البلوغ ہوا ور صنفی امور کا شعور ان میں بیدار ہوگیا ہو داخل کرنا جائز نہیں، ورنہ آپس میں میل جول پایا جائے گا جو شریعت کی نگاہ میں بہت بڑا جرم ہے (بچے حقوق واحکام، ص: ۳۸۶)۔

ہاں اگر حکومت کسی سطح تک کی تعلیم کو لازم قرار دے تو ان کے قوانین کی رعایت کی جائے، اگر حکم خداوندی پامال نہ ہو ورنہ "لا طاعة لمخلوق فی معصية الخالق"، اصول شرع مسلم ہے۔

آج کل جو شور ہے کہ جنسی تعلیم بھی بچوں کا حق ہے، یہ بالکل غلط ہے، اس لئے کہ اللہ تعالی فرماتے ہیں کہ "قال ربنا الذی أعطی کل شئی خلقه ثم هدی" (طه: ۵۰)، اب جو چیز خود بخود حاصل ہوجاتی ہو اور طبعی امور میں سے ہو ایسی چیزوں کے پیچھے لگانا تحصیل حاصل اور حیوانیت کا بھڑکانا ہے۔

اور آج کل جو شادی کی عمر میں افراط وتفریط پائی جاتی ہے تو والدین کو یہ ہدایت کی جائے کہ وہ اس میں سمجھ وعقلمندی سے کام لے اور خاص کر زیادہ تاخیر نہ کرے، ورنہ بچوں کے گناہ کا وبال بھی ان پر ہوگا۔ فرمان نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: "من ولد له ولد فليحسن اسمه وأدبه فإذا بلغ فليزوجه فإن بلغ ولم يزوجه فأصاب إثماً فإنما إثمه على أبيه" (مشکوۃ، ص: ۲۷۱)۔

اور رہا مسئلہ کہ کس عمر میں شادی کرائی جائے تو اس کی کوئی قید نہیں ہے، قبل البلوغ وبعد البلوغ شادی کے آثار صحابہ کرام سے ملتے ہیں۔

کبھی گردش ایام سے یہ صورت حال بھی پیش آتی ہے کہ باپ کمانے سے عاجز ہوجاتا ہے یا اس کا انتقال ہی ہوجاتا ہے اور قریبی رشتہ دار بھی ایسے ہوتے ہیں کہ باپ کی جائیداد کی طرف توجہ نہ دی گئی تو ہڑپ کرجائیں گے خاصۃً فی زمانا تو اس صورت میں اسلام بچے کو مزدوری کی اجازت دیتا ہے تاکہ وہ گھر والوں کی پرورش کرسکے، لہذا فقہاء نے لکھا ہے:

''فللأب أن يؤاجر ابنه الصغير من عمل من الأعمال'' (بدائع ۴/ ۲۲، بچے حقوق واحکام، ص: ۲۹۹)۔

کبھی بچہ ایسی حرکت کربیٹھتا ہے جو قابل مواخذہ ہوتی ہے تو کیا بچے کو اس حرکت پر سزا دی جائے یا نہیں؟ تو فقہاء نے یہ تقسیم فرمائی ہیں کہ اگر وہ غیر ممیز ہے تو بدنی عقوبات میں سے کوئی بھی لاگو نہ ہوگی، اس لئے کہ اس سے اس کے بارے میں حساب وکتاب ہی نہ ہوگا، اگر وہ ممیز ہے تو تادیباً سزا دی جائے، چاہے ڈانٹ ڈپٹ ہو یا قدرے زدوکوب، اس طور پر کہ اتلاف نہ ہونے پائے، ہاں اگر بچہ مال کو ضائع کرتا ہے تو مال کا ضمان اس پر ضرور عائد کیا جائے گا (الموسوعۃ الفقہیہ ۲۷/ ۳۳)۔

بچے کے جرم پر جو تفصیل ہوئی اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بچے کو سزا دینے کے باب میں شریعت نے نرم پہلو اختیار کیا ہے، لہذا اب بچوں کو ان کے جرم پر قید خانہ میں بند کئے رکھنا اور ان سے بار برداری کا کام لینا، ان پر ظلم وزیادتی ہوگی، مناسب تو یہ تھا کہ بچوں کو روک کر زیور تعلیم سے آراستہ کرلیا جائے تاکہ کچھ اچھے برے کی تمیز ہو، اور شنیع کاموں سے باز آجائے، ورنہ بسا اوقات یہ سزائیں بچوں کو اور دلیر بنادیتی ہیں اور بڑے بڑے جرائم کی طرف لے جاتی ہیں۔

کبھی ایسا بھی سننے میں آتا ہے کہ والدین افلاس کے خوف سے یا زانیہ عفت کو بچانے کے لئے نومولود کو راستہ یا کوڑے دان میں ڈال دیتے ہیں، تو ایسا بچہ

کسی کو مل جائے تو اسلام اس کو اس کی پرورش کی تعلیم دیتا ہے، لیکن اس کی چند صورتیں ہیں، "التقاطه فرض كفاية إن غلب على ظنه هلا که لو لم يرفعه ولو لم يعلم به غيره ففرض عين"۔

(۱) اگر بچہ ایسی جگہ ہے کہ اس کے علاوہ کوئی نہیں دیکھتا اور نہ اٹھانے کی صورت میں ہلاک ہو جائے گا تو اٹھانا فرض عین ہے۔

(۲) اور اگر عام شاہراہ پر پھینکا ہوا ہے اور بہت سے لوگوں کی اس پر نظر پڑتی ہے اور نہ اٹھانے کی صورت میں اس کی ہلاکت کا اندیشہ ہے تو اٹھانا فرض کفایہ ہے۔

(۳) لیکن اگر امید ہو کہ اس کو کوئی اٹھا ہی لے گا تو پھر اٹھا کر پرورش کرنا مستحب ہے۔

الحاصل اگر اٹھا لیا تو پرورش کا ذمہ دار وہ خود ہے، دوبارہ پھینکنا اور چھوڑنا جائز نہیں ہے، کیونکہ یہ نفس انسانی کو جان کر ہلاک کرنے کے مترادف ہے۔

''وينبغي أن يحرم طرحه بعد التقاطه لأنه وجب عليه بالتقاطه حفظه فلايملك رده إلى ما كان عليه''۔ ''وليه السلطان حتى أن الملتقط إذا زوجه امرأة لم يجزه'' (ہندیہ ۲/ ۲۸۵، البحر الرائق)۔

اس دوسری عبارت سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ ملتقط صرف پرورش کا ذمہ دار ہے، نہ کہ دیگر کاموں کا، لہذا اصل ذمہ دار تو حاکم وقت ہی ہوتا ہے۔

کبھی والدین، بچہ کے پیدا ہونے سے افلاس کا خطرہ محسوس کرتے ہیں، یہ جہالت اور معرفت خداوندی کے نہ ہونے کی وجہ سے ہوتا ہے، لہذا یہ ہمیشہ یاد رکھنا چاہئے کہ رزق کی ذمہ داری اللہ کے ذمہ ہے، سورہ اسراء میں ہے: ''نحن نرزقهم وإياكم''۔ ترتیب آیت سے اس طرف اشارہ ہوتا ہے کہ پہلے رزق کے مستحق تو یہ ضعیف بچے ہیں اور انہی کی خاطر تمہیں رزق دیا جاتا ہے، لہذا والدین کا افلاس کے خوف سے اپنے بچوں کے بارے میں ایسا فیصلہ کرنا کہ جس سے اس کی جان، یا اس کی تعلیم و تربیت کا حرج و نقصان ہو اسلام اس کی اجازت تو درکنار مذمت کرتا ہے، مفتی شفیع صاحبؒ نے معارف القرآن میں "لا تقتلوا أولادكم من إملاق" کے تحت لکھا ہے جو لوگ اپنی اولاد کے اعمال، اخلاق کے درست کرنے کی طرف توجہ نہیں دیتے اور ان کو آزاد چھوڑ دیتے ہیں وہ بھی ایک حیثیت سے قتل اولاد کے مجرم ہیں۔

آج کل مذہب بیزاری اور اخلاقی گراوٹ کے سبب انسان اس قدر جری ہو گیا کہ انسان انسان کو فروخت کرنے لگا، اور وہ بھی اس جان کو جو بالکل ضعیف ہے، اور ان کا وجود ہی قابل ترحم ہے، ان کو اٹھا کر ایسے لوگوں کے ہاتھوں بیچا جاتا ہے جو ان کی گداگری کرواتے ہیں، کوئی تو جنسی استحصال کرتا ہے تو کوئی درندہ صفت ان کے اعضاء کو بھی جدا جدا کر کے فروخت کر دیتا ہے، ایسے لوگوں کی حدیث میں وعید آئی ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: "ثلاثة أنا خصمهم يوم القيامة رجل أعطى ثم غدر، ورجل باع حراً وأكل ثمنه، ورجل استأجر أجيراً فاستوفى منه ولم يعطه أجره" (بخاری)۔

ایسے جرائم کو بند کرنے کے لئے اسلام نے مختلف سزائیں مقرر کی ہیں، فقہاء کے مختلف اقوال کو دیکھتے ہی یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ایسے لوگوں کو یا تو بطور تعزیر کے سزا موت دینی چاہئے یا کم از کم امام مالکؒ کی رائے اور امام ابو یوسفؒ کے ایک قول کے مطابق چوری کی سزا جاری کی جائے، تاکہ ایسے لوگ اپنی حیوانیت سے باز آجائیں۔

بعض اوقات بچے میں پیدائشی کچھ نقص رہ جاتا ہے جس میں حکمت خداوندی کارفرما ہوتی ہے، جہاں ہماری ناقص عقل نارساں ہے، اب انکی پرورش اور علاج و معالجہ کرنا والدین کے ذمہ حتی الوسع ضروری ہے، البتہ وسعت سے زیادہ کے وہ مکلف نہیں ہیں، "لا يكلف الله نفساً إلا وسعها"۔

فی زمانہ ایسے بچوں کی پرورش کے لئے حکومت نے بعض جگہ بے بی سینٹر کھولے ہیں جس میں بچے کو رکھنے کے لئے چند چیزوں کا لحاظ رکھنا عند الاحناف ضروری ہے، وہ یہ کہ شدید ضرورت ہو، پرورش کرنے والی محرم رشتہ دار ہو، اور عند الشوافع محرم کی قید نہیں ہے تو عند الضرورت عدول عن المذہب کی اجازت ہوگی جبکہ محرم نہ ہو، غیر مسلم سے بھی ضرورت کی وجہ سے پرورش کرائی جا سکتی ہے جبکہ فتنہ اور تبدیلی مذہب کا خطرہ نہ ہو، ورنہ اس سے بچنا واجب ہے، لہذا قبل از شعور بچے کو وہاں سے نکال لے، واللہ تعالیٰ اعلم۔

☆☆☆

اسلام میں بچوں کے حقوق

مولانا حبیب بن یوسف قاسمی [1]

الف: اللہ تعالیٰ شانہ اپنے کلام پاک میں فرماتے ہیں:

''والوالدات یرضعن أولادهن حولین کاملین لمن أراد أن یتم الرضاعة وعلی المولود له رزقهن وکسوتهن بالمعروف ....'' (سورہ بقرہ: ۲۳۳)۔

(اور مائیں اپنے بچوں کو دو سال کامل دودھ پلایا کریں، یہ مدت اس کے لئے ہے جو کوئی شیر خوارگی کی تکمیل کرنا چاہے اور جس کا بچہ ہے اس کے ذمہ ہے ان کا کھانا اور کپڑا قاعدہ کے موافق الخ)۔

اصطلاح شرع میں بچہ کی پرورش کو حضانت کہتے ہیں۔

حضانت واجب ہے، اس لئے کہ بچہ کی پرورش صحیح طور پر نہ کی جائے تو بچہ کے ضائع ہوجانے کا اندیشہ ہے، حضانت میں بچہ، پرورش کرنے والی اور بچہ کے باپ، تینوں ہی کا حق متعلق ہوتا ہے، اگر تینوں کے حق میں کبھی تعارض ہوتو بچہ کے حق کو ترجیح دی جائے گی، "فینبغی للمفتی أن یکون ذا بصیرة لیراعی الأصلح للولد.... لأن مدار أمر الحضانة علی نفع الولد" (ردالمحتار ۵ـ۲۶۶)۔

اورحق حضانت حسب ذیل ترتیب کے ساتھ بچہ کے ان رشتہ داروں کو حاصل ہوگا:

ماں، نانی، دادی، حقیقی بہن، اخیافی بہن، علاتی بہن، حقیقی بھانجی، اخیافی بھانجی، حقیقی خالہ، اخیافی خالہ، علاتی خالہ، علاتی بھانجی، حقیقی بھتیجی، اخیافی بھتیجی، علاتی بھتیجی، حقیقی پھوپھی، اخیافی پھوپھی، علاتی پھوپھی (ردالمحتار ۵/ ۲۵۳-۳۲۵-۲۶۳)۔

اگر مندرجہ بالا خواتین میں سے کوئی خاتون نہ ہو، یا حضانت کی اہل نہ ہو تو حق حضانت حسب ترتیب ذیل ان عصبہ کی طرف منتقل ہوگا جو بدچلن اور بے عقل نہ ہوں، اولاً اصول پر بھائی اور ان کی اولاد، پھر چچا اور ان کی اولاد، لیکن لڑکی کسی غیر محرم مرد کو پرورش کے لئے نہیں دی جاسکتی، جیسے چچازاد بھائی، اگر عصبہ میں سے بھی کوئی نہ ہو یا حضانت کا اہل نہ ہو تو ذوی الارحام جیسے اخیافی بھائی، پھر اس کی اولاد، پھر اخیافی چچا، پھر حقیقی ماموں، پھر اخیافی ماموں کو حق حضانت حاصل ہوگا (درمختار مع الرد ۵/ ۲۶۳-۲۶۵)۔

اگر ایک درجہ کے دو شخص مستحق حضانت موجود ہوں تو جو زیادہ بہتر تربیت کی صلاحیت رکھتا ہو، پھر زیادہ پرہیزگار پھر زیادہ عمر والے کو ترجیح دی جائے گی، "فإن تساووا فأصلحهم ثم أورعهم ثم أکبرهم" (درمختار ۵/ ۲۶۵)۔

حق حضانت انہیں کو حاصل ہوگا جو عاقل بالغ ہوں اور بچہ کی جسمانی اور اخلاقی تربیت کی صلاحیت رکھتی ہوں اور قابل اعتماد ہوں۔

عورت کے مستحق حضانت ہونے کی شرط یہ ہے کہ وہ کسی ایسے شخص کی منکوحہ نہ ہو جو اس بچہ کے لئے غیر ذی رحم محرم ہو، اس لئے اگر وہ عورت مستحق حضانت بچہ کے چچا یا بھتیجے سے نکاح کرے تو حق حضانت ساقط نہیں ہوگا، باپ کے افلاس کی شکل میں مذکورہ بالا ترتیب کو ملحوظ رکھتے ہوئے مستحقین حضانت میں اس کا حق مقدم ہوگا جو بلا معاوضہ اس فریضہ کو انجام دے سکے (ردالمحتار ۵/ ۲۵۳، ۲۵۷)۔

بچی کے حق میں مردوں کے مستحق حضانت ہونے کے لئے ان کا ذی رحم محرم ہونا شرط ہے (شامی ۵/ ۲۶۴)۔

[1] ناظم مدرسہ انوار محمدی، ممبئی۔

بچے کے حق میں عورتوں کے مستحق حضانت ہونے کے لئے بھی ان کا ذی رحم محرم ہونا شرط ہے (درمختار مع ردالمحتار ۵/۲۶۵)۔

اگر بچہ کی ماں جو مطلقہ ہے، کسی ایسے دور دراز علاقہ کو چلی جائے جہاں باپ کے لئے وقتاً فوقتاً بچہ سے ملنا دشوار ہو تو اس کا حق حضانت ساقط ہو جائے گا (درمختار ۵/۲۷۲)۔

پرورش کرنے والی عورت اگر ٹی بی، جنون، جذام، برص جیسے امراض میں مبتلا ہو تو حق حضانت ساقط ہو جائے گا (شامی ۵/۲۶۷)۔

پرورش کرنے والی عورت فاسقہ، بدکار اور فاحشہ ہو جس کی پرورش میں رہ کر بچہ کی صحیح تربیت نہیں ہو سکتی تو اس کا بھی حق حضانت ساقط ہو جائے گا۔

پرورش کرنے والی عورت اگر کسی ایسے شخص سے شادی کرے جو بچہ کا ذی رحم محرم نہ ہو تو بھی حق حضانت ساقط ہو جائے گا۔

اگر کسی مانع کے پیش آجانے سے حق حضانت ساقط ہو جائے اور وہ مانع دور ہو جائے تو پھر حق حضانت لوٹ آئے گا (درمختار مع الرد ۵/۲۶۶، ۲۶۷)۔

اگر زوجین کے مابین خلع ہو جائے اور خلع میں یہ شرط لگا دی جائے کہ ماں کو حق پرورش نہیں ہوگا تو بچہ کے مفاد کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ شرط باطل تسلیم کی جائے گی اور ماں کو حق حضانت حاصل رہے گا (درمختار ۵/۲۵۸، ۲۵۹)۔

اگر بچہ کے پاس مال ہو تو اس کی پرورش کی اجرت اسی کے مال سے ادا کی جائے گی ورنہ جن پر اس بچہ کا نفقہ واجب ہے ان ہی پر یہ اجرت بھی واجب ہوگی (درمختار ۵/۲۶۲)۔

وہ مطلقہ عورت جو عدت کے گذرنے کے بعد اپنے بچہ کو دودھ پلا رہی ہو اور پرورش بھی کر رہی ہو اسے بچہ کے باپ سے اجرت رضاعت اور اجرت حضانت بھی ملے گی، اور مدت رضاعت گذر جانے کے بعد صرف اجرت حضانت کی مستحق ہوگی (درمختار مع الرد ۵/۲۵۹، ۲۶۰)۔

اگر بچہ اور اس کا باپ دونوں مفلس ہوں اور کوئی دوسرا معاوضہ کے بغیر پرورش کے لئے تیار نہ ہو تو بچہ کی ماں کو مجبور کیا جائے گا کہ وہ اس کی پرورش اپنے ذمہ لے اور حضانت کی اجرت باپ پر قرض رہے گی، جو باپ کو استطاعت ہونے پر ادا کرنا ہوگا، اور اگر بچہ کا باپ خوشحال ہے یا بچہ کے پاس خود مال ہے تو عند الطلب بچہ کی ماں کو حضانت کا معاوضہ ملے گا بشرطیکہ ماں بچہ کے باپ کی زوجیت یا عدت میں نہ ہو اور زوجیت یا عدت میں رہتے ہوئے ماں کو بچہ کی پرورش بلا معاوضہ کرنا ہوگی (درمختار ۵/۲۵۹، ۲۶۰)۔

ماں کے علاوہ اگر کوئی عورت ذی رحم محرم بلا اجرت پرورش کے لئے آمادہ ہو اور بچہ کے پاس مال نہ ہو اور اس کے والد مالدار ہوں تو اس صورت میں ماں ہی کو حضانت کے لئے ترجیح دی جائے گی، خواہ اجرت ہی دینی پڑے، اگر باپ اور بچہ دونوں غیر مستطیع ہوں اور ماں بلا اجرت حضانت کے لئے تیار نہ ہو تو جو ذی رحم محرم خاتون بلا اجرت، حضانت کے لئے آمادہ ہو بچہ اس کے حوالہ کر دیا جائے گا (شامی ۵/۲۶۲)۔

بچہ اگر مالدار ہو تو بچہ اور اس کی پرورش کرنے والی کی رہائش کے اخراجات بچہ کے مال سے ادا کئے جائیں گے، اور اگر بچہ مالدار نہ ہو تو اخراجات کی ادائیگی کی ذمہ داری اس پر ہوگی جس کے ذمہ بچہ کا نفقہ ہے (درمختار ۵/۲۶۱، ۲۶۲)۔

حاضنہ (پرورش کرنے والی) کی پرورش میں بچہ سات سال تک رہے گا، اور بچی اگر ماں، دادی یا نانی کی پرورش میں ہے تو بالغ ہونے تک ورنہ نو سال تک پرورش میں رہے گی، اس کے بعد ولی عصبہ محرم اقرب کو مجبور کیا جائے گا کہ اپنے پاس رکھے اور تربیت کرے (درمختار مع ردالمحتار ۵/۲۶۷، ۲۶۸)۔

ب:۱۔ پہلا حق: اولاد کا سب سے پہلا حق یہ ہے کہ آدمی ان کے لئے اچھی ماں کا انتخاب کرے اور عورت پر لازم ہے کہ وہ ایسے شخص سے نکاح کرے جو اس کے بچوں کا اچھا باپ ثابت ہو سکے۔

دوسرا حق یہ ہے کہ بچوں کے اچھے اور بامعنی نام رکھے جائیں۔

تیسرا حق یہ ہے کہ بچوں کے ساتھ محبت وشفقت، پیار اور ایثار کا سلوک کیا جائے۔

چوتھا حق یہ ہے کہ بچہ کی پرورش حلال روزی سے کی جائے، بلکہ ضروری ہے کہ اسے دودھ پلانے والی عورت بھی حلال کھانے والی ہوخواہ وہ ماں ہوں یا رضاعی ماں، جولوگ اپنے بچوں کو حرام روزی کھلاتے ہیں ان کے بچوں میں اس کے اثرات ظاہر ہوکر رہتے ہیں اور جو مائیں حلال پر اکتفا کرنے والی ہوتی ہیں ان کی گود میں پلنے والے بچوں میں ان کی ماؤں کا زہد وتقوی ضرور رنگ دکھاتا ہے۔

پانچواں حق یہ ہے کہ اولاد کی صحیح نہج پر تربیت کی جائے جن والدین کی غفلت یا غلط تربیت کے نتیجہ میں بے راہ روی کا شکار ہوجاتے ہیں ان کو جان لینا چاہئے کہ وہ اپنے بچوں کی جسمانی پرورش کررہے ہیں، لیکن رُوحانی طور پر وہ ان کوقتل کررہے ہیں۔

اسی لئے جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ما نحل والد ولداً أفضل من أدب حسن" (ترمذی) (کسی باپ نے اپنے بیٹے کو اچھے ادب سے بہتر عطیہ اور ہدیہ نہیں دیا)۔

اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "علموا أولادكم وأهليكم الخير وأدبوهم" (مصنف عبدالرزاق) (اپنی اولاد اور گھر والوں کو خیر سکھاؤ اور انہیں باادب بناؤ)۔

نیز اولاد کی تربیت کے لئے سب سے زیادہ ضروری امر یہ ہے کہ والدین اپنے کردار کو اسلامی سانچے میں ڈھالیں اور اپنی اولاد کے سامنے اچھے انسان بن کر رہیں، کیونکہ بچہ سب سے پہلے جن دوشخصیتوں سے متاثر ہوتا ہے، وہ اس کے والدین ہیں، بچہ انکی نقالی کرتا ہے۔

(۲) تعلیم دوحصوں میں تقسیم ہے، ایک دین کی تعلیم ہے، دوسرے دنیا کی، قرآن وحدیث میں دونوں کا الگ الگ درجہ قائم کیا گیا ہے، ایک کو ضروری قرار دیا ہے، دوسرے کو پسندیدہ۔ ضروری علم دین کا علم ہے، دین کے علاوہ دوسرے علوم پسندیدہ ہیں مگر کچھ دنیوی علوم حرام بھی ہیں، یہ وہ علوم ہیں جونقصان رساں ہیں، جیسے جادو سیکھنا، ستاروں کا علم سیکھنا، کہانت سیکھنا، گانا بجانا سیکھنا، یہ سب علوم حرام ہیں، باقی دنیا کے جتنے علوم ہیں ان کو دوسرے نمبر پر رکھا ہے، حدیث شریف میں ہے: "طلب العلم فريضة على كل مسلم" (علم دین کا حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے)۔

علماء نے کہا ہے کہ یہ حکم مردوں اور عورتوں کے لئے یکساں ہے، صرف مردوں کے لئے خاص نہیں ہے اور اس حدیث میں علم سے مراد دین کا علم ہے، دنیا کا علم مراد نہیں ہے۔

حدیث شریف میں ہے: "العلم ثلاثة: آية محكمة، أو سنة قائمة أو فريضة عادلة، وما سوى ذلك فضل" (مشکوۃ شریف، ص: ۳۵) (ضروری علم تین ہیں: قرآن کریم کا علم، احادیث شریفہ کا علم اور احکام یعنی فقہ کا علم، ان کے علاوہ جوعلوم ہیں وہ سب پسندیدہ ہیں، فضیلت کے حامل ہیں)۔

نحو وصرف کا علم، ادب وانشاء کی معرفت، منطق وفلسفہ کی مہارت، تاریخ وجغرافیہ کی مزاولت، سائنس وٹیکنالوجی سیکھنا اور طب وڈاکٹری میں مہارت پیدا کرنا ان کا درجہ دوسرا ہے، تو دین کی تعلیم ضرورت ہے اور دنیا کی تعلیم مفید ہے (عصری تعلیم: ضرورت، اندیشے، تدبیریں مفتی سعید پالنپوری)۔

آپ بڑے شوق سے اپنی اولاد کو ڈاکٹر بنایئے، پروفیسر بنایئے، پائلٹ بنایئے لیکن سب سے پہلے اسے ایک اچھا انسان اور مثالی مسلمان بنایئے (ندائے منبر ومحراب)۔

دینی علم بقدر ضرورت حاصل کرنا تو سب پر فرض ہے اور دنیاوی علوم کسب معاش کے لئے ہیں اور کسب معاش عورتوں کے ذمہ نہیں بلکہ مردوں کے ذمہ ہے، ان کی تعلیم اتنی کافی ہے کہ دینی رسائل پڑھ سکیں اور لکھ سکیں، باقی سب زائد ہے (آپ کے مسائل اور ان کا حل ۸/ ۲۱۶)۔

(۳) شرعاً اس کی پابندی کرنا تو لازم نہیں ہوگا، البتہ دفع مضرت اور بہت سے مواقع پر حکومت کی طرف سے عائد کردہ قوانین کے تحت اپنے نجی حقوق کی وصولیابی کی غرض سے اس سطح تک تعلیم اپنے بچوں کو دلوائی جاسکتی ہے، لیکن خیال رہے کہ حکومت کے حکم کی پاسداری میں کہیں رضاء الٰہی کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹ جائے۔

''لا طاعة لمخلوق في معصية الخالق'' (قواعد الفقہ/ ۱۰۶) (اللہ کو ناراض کرکے بندوں کو راضی نہیں کرنا)۔

(۴) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تو عورتیں بھی ازدواجی زندگی سے متعلق باتیں خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کرلیا کرتی تھیں، جس سے معلوم ہوا کہ ان مسائل کا پوچھنا یا بیان کرنا کوئی ناجائز یا شرم کی بات نہیں ہے، آج کل کے شادی شدہ جوڑے اور غیر شادی شدہ نوجوان لڑکے لڑکیاں، جنسی مسائل سے بالکل ناواقف ہیں (جدید جنسیات وزیبائش کے شرعی احکام)، لیکن آج جس انداز سے جنس کی تعلیم کا مطالبہ کیا جارہا ہے وہ بالکل جائز نہیں، شریعت میں دس سال کی عمر ہونے پر بچوں کے بستر الگ کرنے کا حکم دیا گیا ہے، تو اس سے یہ بھی معلوم ہوسکتا ہے کہ بچے بچیاں زیادہ سے زیادہ دس گیارہ سال کی عمر تک ایک ساتھ پڑھ سکتے ہیں، اس کے بعد مخلوط تعلیم نہیں ہونی چاہئے، پھر اس طرح فحش اور عریاں چیزوں کی تعلیم لڑکوں اور لڑکیوں کو ایک ساتھ کہاں روا رکھا جاسکتا ہے۔

''الإیمان بضع وسبعون شعبة أفضلها لا إله إلا الله وأدناها إماطة الأذى عن الطريق والحياء شعبة من الإیمان'' (بخاری ومسلم)۔

ج: ''عن ابن عباس رضی اللہ عنہ قال: قال رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم: من ولد له ولد فليحسن اسمه وأدبه فإذا بلغ فليزوجه فإن بلغ ولم يزوجه فأصاب إثماً فإنما إثمه على أبيه'' (مشکوۃ شریف)۔

(حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس کی اولاد پیدا ہو اس کو چاہئے کہ اس کا اچھا نام رکھے اور اچھی تعلیم دے پھر جب وہ بالغ ہوجائے تو اس کا نکاح کردے، اگر وہ بالغ ہوجائے اور اس کا نکاح نہ کرے پھر وہ کسی گناہ میں مبتلا ہوجائے تو اس کا گناہ (سبب کے درجہ میں) صرف باپ پر ہی ہوگا) (گو مباشرت کے درجہ میں خود اس پر ہوگا)۔

اور ایک دوسری حدیث ہے: حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اے علی تین چیزوں میں تاخیر نہ کرو، ایک نماز جب اس کا وقت آجائے، دوسرے جنازے میں جب وہ تیار ہوجائے، تیسرے بے نکاح لڑکی اور لڑکے کی شادی میں جب کہ جوڑا مل جائے'' (ترمذی)۔

ان جیسی روایات کی وجہ سے فقہاء کرام نے یہ مسئلہ بیان کیا ہے کہ شادی کے لئے کوئی عمر مقرر نہیں ہر عمر میں نکاح جائز ہے، مگر بہتر یہ ہے کہ بلوغ کے بعد مناسب رشتہ ملنے پر جلدی نکاح کردیا جائے تاکہ نوجوان نسل کے جذبات کا بہاؤ غلط رخ کی طرف نہ ہوجائے (ماخوذ از فتاوی عثمانی ۲/۳۰۸، آپ کے مسائل اور ان کا حل ۵/۳۲)۔

د:۱۔ جناب نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کی روشنی میں ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ بچہ کو صحیح تعلیم وتربیت سے آراستہ کرنا والدین کے اولین فرائض میں سے ہے، بخلاف اس کے کہ بچہ کو تعلیم دنیوی ودینی سے محروم کرکے محنت مزدوری، صنعت وحرفت سے وابستہ کردینا نہ صرف اللہ اور جناب نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام سے یکسر سرمو انحراف کے مترادف نظر آتا ہے بلکہ اس چھوٹے سے ننھے سے بچہ کے ساتھ سراسر ظلم واستبداد کا گھناؤنا پن بھی ہے، فقہ کا مشہور اصول ہے: "وضع الشئی فی غیر محله فهو ظلم" (کسی بھی چیز کو اس کی جگہ سے اٹھا کر دوسری جگہ رکھ دینا ظلم کہلاتا ہے)۔

ظاہر ہے کہ بچہ کو تعلیم سے دور رکھ کر محنت کش کام میں لگا دینا اس سے بڑھ کر اور کیا ظلم ہوگا، نیز اولاد باپ ہو یا ماں اس کے پاس ایک خوبصورت اور قیمتی امانت ہے، اس امانت میں خیانت کرنے والوں کو روکا جائے اور اس کا حق ادا کیا جائے اور اس کا حق یہ ہے کہ چند ٹکڑوں کے خاطر یا افلاس کے ڈر سے بچہ کو صحیح تعلیم سے محروم نہ کیا جائے، یہ ہے شریعت کا نقطہ نظر۔

۲۔ حدیث پاک میں جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "هم إخوانكم وخولكم جعلهم الله تحت أيديكم فمن كان أخوه تحت يده فليطعمه مما يأكل ويلبسه مما يلبس ولا تكلفوهم ما يغلبهم فإن كلفتموهم فاعينوهم" (متفق علیه) (وہ تمہارے بھائی ہیں جن کو خدا نے تمہارے ماتحت رکھا ہے، لہذا خدا نے جس کے ماتحت اس کے بھائی کو کیا ہو اس کو چاہئے کہ اس کو وہی کھلائے جو خود کھائے، جو خود پہنے وہی اس کو پہنائے، اس کو ایسے کام کی تکلیف نہ دے جو اس کے لئے دشوار ہو اور اگر ایسے کام کی ذمہ داری سونپ ہی دے تو پھر اس کی مدد کرے)۔

تو اس حدیث پاک میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں یہ تعلیم دی کہ غلاموں سے کوئی ایسا کام نہ لو جوان کی طاقت اور قدرت سے ماوراء ہو، تو اس سے سمجھا جاسکتا ہے کہ جب آپ نے غلاموں اور خادموں کے ساتھ یہ سلوک کرنے کا حکم دیا ہے تو پھر والدین یا اولیاء اپنے بچوں کو کس حد تک کاموں کا مکلف کرسکتے ہیں۔

عموماً بعض لوگ کم عمر بچوں سے اتنا ہی کام لینا چاہتے ہیں جتنا جوان اور توانا آدمیوں سے، اسلامی تعلیم کے تحت یہ غلط اور ظالمانہ حرکت ہے جس کا بالکل جواز نہیں، معاشی ضرورتیں پورا کرنے یا بہتر بنانے کے لئے تو بچوں سے مزدوری نہ کروائی جائے، البتہ تعلیم کے علاوہ فارغ اوقات میں صرف کوئی ہنر سکھانے کی نیت سے کسی جگہ روزانہ تھوڑی دیر بھیج دیا جائے جبکہ بچہ اس کی سکت بھی رکھتا ہو تو کوئی مضائقہ نہیں ہونا چاہئے۔

۳۔ فن فقہ کا اصول ہے "الضرورات تبيح المحظورات" (ضرورت کے وقت ممنوعات بھی جائز ہوجاتی ہیں) تو اگر سوالنامہ میں ذکر کردہ صورت پیش آئے تو اس اصول کے تحت بچوں کو مزدوری پر لگانا درست ہوسکتا ہے، کیونکہ اس وقت سب سے اہم چیز جان کی حفاظت ہے جس کا متکفل بظاہر کوئی نظر نہیں آرہا ہے، سوائے اس کے کہ وہ خود محنت کرکے اپنا پیٹ بھرے۔

ہ: سب سے اول تو یہ بات عرض ہے کہ شرعی حدود کے سلسلہ میں اصول یہ ہے کہ دار الاسلام ہی میں اس کو نافذ کیا جائے گا اور امام المسلمین یا اس کا نائب ہی حدود قائم کرسکتا ہے۔

''وركنه إقامة الإمام أو نائبه في الإقامة'' (الفتاوی الهندیه ۲۲-۱۴۵)۔

''وزاد بعض المتاخرين أن الحد مختص بالإمام'' (شامی ۶/۱۰۳)، اور اس کی مصلحت یہ ہے کہ اسلام نے جہاں بعض برائیوں پر سزائیں سخت رکھی ہے وہیں اس بات کا بھی اہتمام کیا ہے کہ ماحول کو برائیوں کے محرکات سے صاف ستھرا رکھا جائے، جیسے شراب کو نہ صرف حرام قرار دیا، بلکہ اس کی خرید و فروخت کو بھی منع کردیا، اس کی صنعت کو بھی روا نہیں رکھا تاکہ شراب کا حصول دشوار سے دشوار تر ہوجائے، اب جہاں اسلامی نظام قائم نہ ہو اور برائی کے محرکات پر کسی طرح کی کوئی پابندی نہ ہو، وہاں بھی ایسی سخت سزائیں دی جائیں تو یہ بات یقیناً قرینہ انصاف نہیں ہوگی، لہذا ہندوستان میں یہ حدود نافذ نہیں کئے جاسکتے (کذا فی کتاب الفتاوی ۶/۵۵)۔

علاوہ ازیں نابالغ بچے اور بچیاں شریعت کے احکام کے مکلف ہی نہیں ہیں، تو پھر انہیں کیوں کر سزا دی جائیں گی، ''المكلف هو المسلم العاقل البالغ وكذا المسلمة العاقلة البالغة'' (قواعد الفقه: ۵۰۳) اور شامی میں ہے:

''إن التكليف شرط لكون الفعل زنا، لأن فعل الصبي والمجنون ليس بزنا أصلاً'' (رد المحتار ۶-۲۲)، نیز دوسری جگہ ہے: ''الحد عقوبة مقدرة وجبت حقاً لله تعالى زجراً فلا تعزير ولا قصاص حد والزنا وطء مكلف خرج الصبي'' (درمختار ۶-۳-۵)۔

رہی بات ان جرائم پر سد باب کی تو بچوں کے دل صاف ہوتے ہیں، ذرا سی محنت سے پورا دلنشیں گلستاں تیار ہوسکتا ہے، لہذا قرآن پاک کے احکام اور جناب نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کی روشنی میں ان چیزوں کی قباحت اور انجام بد سے روشناس کرایا جائے، اگر بچوں کی اس طرح ذہن سازی کی گئی اور انہیں بات سمجھ میں آگئی تو پھر جیل، سزا اور پابندیوں کی سد سکندری کھڑی کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی، خود بخود ان کی زندگی کی گاڑی پٹری پر گامزن رہے گی، ورنہ تو والی اللہ المشتکی۔

و: اس کا جواب سابق جواب میں گذر چکا ہے۔

ز: بچوں کی تعلیم و تربیت کی اولین ذمہ داری تو خود ان کے والدین کی ہے، لیکن جملہ صورتوں کے فقدان کی شکل میں مشترکہ طور پر حکومت اور سماجی کارکنان کا فرض ہے کہ وہ ایسے بچوں کی کفالت کریں اور ان کی پرورش سے لے کر تعلیم و تربیت تک کی تمام ذمہ داریاں بخوبی انجام دے کر بہر صورت ایک اچھا نظام قانون اور تعلیم فراہم کریں اور اس امر خیر کے خاطر مستقل ایک عملہ تشکیل دیں جو مختلف ریاستوں میں ان کا سروے کر کے اس طرح کے نادار بچوں کی فہرست تیار کر کے حکومت کی اعلیٰ کمان کے سپرد کرے اور اس پر سنجیدگی سے غور و خوض کرنے کے بعد بلا کسی امتیاز و تفریق کوئی مناسب ادارہ ہر جگہ قائم کیا جائے، ورنہ بصورت دیگر مستقبل کے یہ ستارے ضائع ہو کر ایسی تاریکیوں میں گم ہوجائیں گے کہ پھر کوئی مداوی کارگر ثابت نہیں ہوگا۔

ح: ایک طرف جہاں قرآن پاک میں یہ کہا گیا ہے: "ولا تقتلوا أولادكم خشية إملاق" (بنی اسرائیل)، وہاں دوسری جگہ یہ بھی ارشاد فرمایا: "ومن

یتوکل علی الله فهو حسبه" (الطلاق)، ان دونوں آیتوں کا حاصل یہ ہے کہ اس آب وگل میں نہ کوئی باپ کسی اولاد کو پالتا ہے اور نہ کوئی آقا اور مالک اپنے غلام اور خادم کی ضرورت پوری کرتا ہے، اس پورے جہاں کا نظام صرف اور صرف اس رزاق عالم کے قبضہ قدرت میں ہے جس کے خزانہ میں کسی چیز کی کمی نہیں ہے، تو کیا افلاس اور کیا ناداری کا خوف، ہر بچہ مادر رحم ہی سے اپنا رزق لکھوا کر آتا ہے، لوگوں کو تو صرف دنیا میں کسی نہ کسی شکل میں ذریعہ بنایا جاتا ہے، تو اگر کسی بندہ کو یہ خوف دامن گیر ہو تو بے سود ہے اور توکل علی اللہ کے سراسر خلاف ہے جو ایک مومن کی امتیازی صفت ہے، "وعلى الله فليتوكل المؤمنون" (آل عمران)، نیز ماں باپ کا یہ عمل کہ وہ اپنا بچہ کسی دوسرے شخص کے حوالہ کر دیں، اس طرح تو شفقت پدر و مادر سے بچہ یکسر محروم ہو جائے گا جس کی بھرپائی پوری دنیا مل کر بھی نہیں کر سکتی۔

رہا یہ سوال کہ بچہ حاصل کرنے والے کی طرف سے ہدیہ قبول کرنا؟ تو اس کا جواب، واللہ اعلم بالصواب وعلمہ أتم، یہ ہو سکتا ہے کہ جب شق اول ہی درست نہیں تو اس پر جس کی بنیاد رکھی جائے گی وہ کیسے درست ہو سکتی ہے، فقہ کا مشہور اصول ہے، "المبنی علی الفاسد فاسد" (قواعد الفقه: ۱۱۷)۔

ایسے واقعات کی روک تھام اسی صورت میں ہو سکتی ہے کہ جبکہ ہر ماں باپ مال مفت کی عادت تج کے محنت اور جفاکشی کر کے اپنی اور اپنے اہل وعیال کی ضرورتیں پوری کرنے کی ٹھان لیں، ایک نہیں سیکڑوں واقعات ایسے ملیں گے کہ باپ کے نہ ہونے کی صورت میں ماں نے دن رات ایک کر کے حلال روزی سے نہ صرف اپنے بچوں کی بنیادی ضرورتیں پوری کیں بلکہ ان کو پڑھا لکھا کر دنیا کا مشہور عالم دین بنا دیا اور ملک کی ان گنی چنی ہستیوں کی صف میں لا کر کھڑا کر دیا جن کا طوطی چہار دانگ عالم میں بولتا ہے، جناب نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "کسی نے اس سے بہتر کبھی کھانا نہیں کھایا کہ آدمی اپنے ہاتھ کی محنت کا کھائے، بے شک اللہ کے نبی داؤدؑ اپنے ہاتھ سے کام کر کے کھاتے تھے" (بخاری)۔

ط: حدیث پاک میں جناب محمد عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علاج کروانے کا حکم دیا ہے، "عن أسامة ابن شريك قال قالوا يا رسول الله أفنتداوى قال: نعم يا عباد الله! تداووا، فإن الله لم يضع داء إلا وضع له شفاء" (احمد، ترمذی، ابوداؤد، بحوالہ مشکوۃ ر ۳۸۸)۔

کیوں کہ انسان کی جان خود امانت خداوندی ہے، لہذا حتی المقدور والدین ایسے معذور بچوں کا علاج کروانے کے ذمہ دار ہوں گے اور ضرورت ہو تو اس طرح کے جو مختلف ٹرسٹ قائم ہیں ان سے امداد بھی طلب کی جا سکتی ہے اور ایسی جگہیں جہاں ایسے معذوروں کی خصوصی نگہداشت کی جاتی ہے، وہاں کچھ وقت تک چھوڑ دینا بچہ کو ماں باپ کے پیار سے محروم کرنا نہیں ہے بلکہ یہ تو بچہ کی جان کی حفاظت کی خاطر شفقت ومحبت کا عین مقتضی ہے۔

☆☆☆

ملت

عالم اسلام کے اکابر علمائے کرام کے جدید فقہی مسائل پر مقالہ جات اور مناقشات کا مجموعہ نئی ترتیب کے ساتھ

سلسلہ
جدید فقہی مباحث

اسلام میں معذوروں اور بوڑھوں کے حقوق

اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا) کے پچیسویں فقہی سمینار منعقدہ مورخہ ۲۵۔۲۷/ ربیع الآخر ۱۴۳۷ھ مطابق ۵۔۷/ فروری ۲۰۱۶ء کو جامعہ عربیہ اسلامیہ دار الحدیث بدر پور ضلع کریم گنج، آسام میں پیش کئے گئے علمی، فقہی اور تحقیقی مقالات ومناقشات کا مجموعہ

تحقیقاتِ اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا

زیر سرپرستی
حضرت مولانا مجاہد الاسلام قاسمی
حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی دامت برکاتہم

دار الاشاعت
اردو بازار ۰ ایم اے جناح روڈ ۰ کراچی پاکستان

پیش لفظ

انسان پر اس کی زندگی میں دو مرحلے ایسے آتے ہیں، جب وہ سب سے زیادہ رحم، نگہہ داشت اور حسن سلوک کا محتاج ہوتا ہے، ایک پیدا ہونے کے بعد اپنے بچپن میں، دوسرے: بوڑھا ہونے کے بعد جب عمر طبعی کے اعتبار سے وہ قبر کی منزل کے قریب پہونچ جاتا ہے؛ اسی لئے شریعت نے بچوں اور بوڑھوں کے حقوق پر زیادہ توجہ دلائی گئی ہے، بوڑھوں ہی کے زمرہ میں معذورین بھی ہیں؛ کیوں کہ وہ بھی بوڑھوں ہی کی طرح اور بعض اوقات ان سے بڑھ کر دوسروں کی خدمت کے محتاج ہوتے ہیں، اور اسی لئے ان دونوں گروہوں کے لئے احکام شریعت میں خصوصی رعایتیں رکھی گئی ہیں۔

لیکن عمر کے ان دونوں مرحلوں میں ایک نمایاں فرق ہوتا ہے، بچہ پورے خاندان کی توجہ کا مرکز ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ نے والدین اور دادا، دادی، نانا، نانی میں محبت وشفقت کے جو غیر معمولی جذبات رکھے ہیں، اس کے تحت اسے سبھوں کی چاہت حاصل ہوتی ہے؛ لیکن بوڑھوں اور معذوروں کو یہ توجہ حاصل نہیں ہو پاتی، اور بدقسمتی سے موجودہ دور میں یہ بے توجہی بڑھتی ہی جارہی ہے؛ کیوں کہ دنیا پر مغربی تہذیب کا بول بالا ہے، اور اس تہذیب کی بنیاد خود غرضی پر ہے، جس شخص سے مستقبل میں کوئی غرض وابستہ نہ ہو اسے بوجھ تصور کیا جاتا ہے؛ اسی لئے بوڑھے ماں باپ اور خاندان کے معذور افراد تکلیف دہ بے توجہی کا شکار ہیں۔

موجودہ حالات میں ان گروہوں سے متعلق بہت سے فقہی مسائل بھی قابل غور ہیں؛ چنانچہ اس اہم مسئلہ کی طرف لوگوں کو متوجہ کرنے اور ان سے متعلق قابل غور شرعی مسائل کا حل دریافت کرنے کی غرض سے اکیڈمی کے پچیسویں فقہی سیمینار کا ایک موضوع ''بوڑھوں اور معذوروں کے حقوق'' بھی متعین کیا گیا۔

بحمد اللہ موضوع سے متعلق تفصیلی اور تحقیقی مقالات آئے، چشم کشا مناقشات ہوئے، اور اہم فیصلے کئے گئے، یہ مجموعہ ان ہی مقالات، تجاویز اور مناقشات پر مشتمل ہے، جس کو محب عزیز مولانا احمد نادر القاسمی (رفیق شعبۂ علمی) نے بہتر ترتیب کے ساتھ جمع کیا ہے، امید ہے کہ اکیڈمی کے دوسرے مجلات کی طرح اسے بھی قبول عام وتام حاصل ہوگا۔

واللہ ھو المستعان۔

(مولانا) خالد سیف اللہ رحمانی
(جنرل سکریٹری اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا)
۹ ر ربیع الاول ۱۴۳۸ھ / ۹ ر دسمبر ۲۰۱۶ء

☆☆☆

باب اول تمہیدی امور

سوالنامہ:

معذوروں اور بوڑھوں کے حقوق

انسان عام طور پر اپنی زندگی میں تین مرحلوں سے گزرتا ہے۔ وہ اس حال میں پیدا ہوتا ہے کہ اسکی آنکھیں بند ہوتی ہیں، زبان قوت گویائی سے محروم ہوتی ہے، پاؤں میں چلنے کی طاقت نہیں ہوتی اور عقل وشعور کے اعتبار سے بھی وہ ایک ناقص وجود ہوتا ہے؛ پھر قدرت کے ہاتھوں آہستہ آہستہ اسکی نشوونما ہوتی ہے اور جب وہ بڑھتے بڑھتے جوانی کی منزل میں داخل ہوتا ہے تو اسکی ساری صلاحیتیں اور قوتیں اوج کمال پر ہوتی ہیں، اس کی طبیعت میں مہم جوئی کا جذبہ ہوتا ہے یہاں تک کہ بعض اوقات دشوار راستوں پر چلنے اور خطرات کے طوفانوں سے کھیلنے میں اسے لطف آنے لگتا ہے، پھر اللہ کی طرف سے اسکی تمام قوتوں اور صلاحیتوں میں انحطاط شروع ہوتا ہے۔ جس شخص کو کل دوڑنے بھاگنے اور کود پھاند کرنے میں لطف آتا تھا اب وہ دو قدم چلنے میں بھی کسی انسان یا لاٹھی کا محتاج ہو جاتا ہے گویا ایک طرح سے پھر اسکا بچپن لوٹ آتا ہے اور اس کی انتہاء اپنی کیفیت کے اعتبار سے اسکی ابتداء کی ہم پایہ نظر آتی ہے۔

لیکن فرق یہ ہے کہ ماں باپ کے دل میں بچہ کی اتنی اتھاہ محبت ہوتی ہے کہ وہ بچوں کی خوشی کے لئے اپنی ہر خوشی کو قربان کر دیتا ہے، اس کو اس تکلیف میں بھی راحت محسوس ہوتی ہے جو اس کے بچہ کو کسی تکلیف سے بچا لے لیکن وہی والدین جب خود بوڑھاپے کی منزل میں پہنچتے ہیں تو انہیں اپنے بچوں سے وہ پیار نہیں مل پاتا ہے جو انہوں نے اپنے بچوں کو انکے بچپن میں دیا تھا بلکہ اگر بچوں میں اللہ کا خوف نہ ہو تو والدین ایک بوجھ محسوس ہونے لگتے ہیں اسی لئے قرآن مجید نے یہ نصیحت کی کہ جب والدین میں سے کوئی بوڑھاپے کو پہنچ جائے تو انہیں اُف بھی نہ کہو اور نہ انکو جھڑکو، بلکہ ان سے نرم گفتگو کیا کرو (بنی اسرائیل: ۲۴)۔

یہ تو ان بوڑھوں کا حکم ہے جو گھروں کے اندر موجود ہوتے ہیں، لیکن سماج کے بوڑھے لوگوں کے ساتھ جو بے اعتنائی برتی جاتی ہے وہ بھی کچھ کم نہیں ہوتی۔ ان کے ساتھ ایسا سلوک روا رکھا جاتا ہے کہ گویا وہ زائد از ضرورت کوئی شے ہو؛ اسی لئے آپ ﷺ نے بوڑھوں کی توقیر کا حکم دیتے ہوئے فرمایا کہ جو نوجوان کسی بوڑھے شخص کا اسکی عمر کی وجہ سے احترام کرے تو جب وہ بوڑھاپے کو پہنچے گا تو اللہ تعالیٰ اس کے چھوٹوں میں اس کے احترام کا جذبہ پیدا فرمائیں گے۔

تاہم یہ ایک حقیقت ہے کہ آج سماج میں شاید یہ سب سے مظلوم طبقہ ہے، انکے حقوق کی طرف سے سب سے زیادہ بے توجہی برتی جاتی ہے اور انکے لئے کوئی آواز اٹھانے والا بھی نہیں۔ اس پس منظر میں بوڑھے اور سن رسیدہ لوگوں کے حقوق کے سلسلہ میں چند اہم سوالات ہیں، جن پر غور کرنے کی ضرورت ہے:

۱۔ اگر کوئی شخص بوڑھاپے کی عمر کو پہنچ گیا لیکن اتنا کمزور نہیں ہے کہ کسب معاش نہ کر سکے کسی قدر مشقت کی ساتھ بھی وہ کما کر خود اپنی ضرورت پوری کر سکتا ہے تو کیا ایسے شخص کو اسکی اولاد یا اعزاء واقارب جن کے ذمہ اسکا نفقہ واجب ہے، کسب معاش پر مجبور کر سکتے ہیں؟

۲۔ سن رسیدہ حضرات کا نفقہ وعلاج کن صورتوں میں دوسروں پر واجب ہوگا؟

۳۔ بوڑھے والدین یا خاندان کے وہ بڑے جن کا نفقہ انکے چھوٹوں پر محتاجی کی صورت میں واجب ہے، اگر وہ محتاج نہ ہوں خود صاحب ثروت

ہوں تب بھی وہ اپنی اولاد سے یا ان لوگوں سے جن پر بحالت حاجت نفقہ واجب ہوتا ہے زیادہ سہولت کے لئے یا دوسرے لوگوں پر خرچ کرنے کے لئے یا کچھ رقم محفوظ کرنے کے لئے زائد رقم کا مطالبہ کرسکتے ہیں؟

۴۔ ایک اہم مسئلہ والدین اور بزرگوں کی جسمانی خدمت، خاص کر جب انسان چلنے پھرنے اٹھنے بیٹھنے اور کسی ضرورت کو پوری کرنے میں سہارے کا محتاج ہوجائے، ایسی صورتحال میں اگر بیٹا زیادہ پیسہ کمانے کی غرض سے دوسرے شہر، دوسری ریاست یا دوسرے ملک میں چلا جائے تو بوڑھوں کی دشواریاں بہت بڑھ جاتی ہیں ان حالات میں:

الف:......کیا زیادہ آمدنی کے لئے لڑکوں کا اپنے ماں باپ کو چھوڑ کر دوسری جگہ جانا جائز ہے؟

ب:......اگر بہو ساس سسر کے ساتھ رہنا نہ چاہتی ہو یا اسکی ساس کو خدمت کی ضرورت ہو لیکن کوئی خدمت گار موجود نہ ہو اور بیٹیوں کو انکے شوہروں کی طرف سے میکے میں رہنے کی اجازت نہ ہو تو اس صورت میں بہو کی کیا ذمہ داری ہے؟ اور کیا اسے اسکے ساس سسر کے ساتھ رہنے پر مجبور کیا جاسکتا ہے؟

ج:۰ ماں باپ کی خدمت صرف بیٹوں پر واجب ہے یا بیٹیوں پر بھی، بعض اوقات بیٹیاں اپنے والدین کی مجبوری اور بے بسی کو دیکھتے ہوئے اپنے والدین کی خدمت کرنا چاہتی ہیں لیکن ان کے شوہران کو اس کی اجازت نہیں دیتے۔ کیا ان کے شوہر کو اس کا حق حاصل ہے؟

۵۔ انسان کو جس طرح جوانی میں بیوی کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح وہ بوڑھاپے میں بھی بیوی کا محتاج ہوتا ہے تاکہ اس عمر کے سرد و گرم کو سہنا اس کے لئے آسان ہوجائے؛ ہندوستان کے معاشرہ میں عام طور پر بیٹے اور بیٹیاں اپنی والدہ کے فوت ہونے کے بعد والد کے دوسرے نکاح میں رکاوٹ بنتے ہیں، کیا انکا یہ رکاوٹ بننا درست ہے؟ اور اگر خود والد میں اپنی بیوی کی کفالت کی استطاعت نہ ہو تو اس سلسلہ میں کیا اولاد پر بھی اس نسبت سے کچھ ذمہ داری عائد ہوتی ہے؟

۶۔ بعض اوقات اولاد والد کی زندگی میں ہی جائداد کا مطالبہ شروع کردیتے ہیں اور اسے اپنا حق سمجھتے ہیں؛ کیا اولاد کے لئے ایسے مطالبہ کی گنجائش ہے؟ خاص کر ایسی صورت میں جب کہ والدین کی معاشی حالت بہتر اور اولاد محتاج ہوں؟

۷۔ مغربی ملکوں میں عمر دراز لوگوں کے لئے ہاسٹل بنادیئے گئے ہیں اب ہندوستان میں بھی جگہ جگہ ایسے ہاسٹل بن رہے ہیں جن میں نوجوان اپنے بزرگوں کو داخل کردیتے ہیں؛ اس میں ایک پہلو یہ ہے کہ ان عمر دراز حضرات کو ایک جگہ اپنی ضرورت کی چیزیں مہیا ہوجاتی ہیں اور اپنے ہم عمر لوگ مل جاتے ہیں۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ وہ اپنے رشتہ داروں کی محبت سے محروم ہوجاتے ہیں، عمر کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ انسان چاہتا ہے کہ اس کے بال بچے اس کے قریب رہیں، اولاد اور اولاد کی اولاد کو دیکھ کر اسکی آنکھیں ٹھنڈی ہوں، ایسے ہاسٹلوں میں اس کی یہ خواہش ایک حسرت بن جاتی ہے تو ایسے ہاسٹلوں کے بارے میں شرعی نقطہ نظر کیا ہے؟ کیا کوئی شخص اپنے بزرگوں کو ایسے ہاسٹلوں میں قیام پر مجبور کرسکتا ہے؟

۸۔ بوڑھاپے کی عمر میں اگر انسان کا ہاتھ خالی ہو تو اسکی بے سہارگی اور بڑھ جاتی ہے اور اگر اسکی اولاد یا قریبی رشتہ دار موجود نہ ہوں تب تو انسان اپنے آپ کو اس دنیا میں تنہا محسوس کرنے لگتا ہے؛ کیا ایسے لوگوں کی اجتماعی کفالت کے لئے خصوصی طور پر زکوۃ کی رقم استعمال کی جاسکتی ہے؟

۹۔ عمر دراز لوگوں کے لئے حکومتوں نے مختلف چیزوں میں بعض خصوصی رعایتیں رکھی ہیں جیسے ٹرین وغیرہ میں کرایہ میں تخفیف، حکومت کی طرف سے امدادی وظیفہ، ٹیکس میں رعایت وغیرہ؛ جو لوگ ان رعایتوں کے لئے مطلوب مقررہ حدِ عمر کو نہ پہنچے ہوں کیا انکے لئے ایسی رعایتوں سے فائدہ اٹھانا جائز ہوگا؟

☆☆☆

تجاویز:

اسلام میں بوڑھوں اور کمزوروں کے حقوق

اسلام ایک دین فطرت ہے جو اخلاق وآداب اور معاملات کی ایسی تعلیم دیتا ہے جو انسان کو انسانیت کی تکمیل تک پہنچا دیتی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مقصد ہی مکارم اخلاق کی تعلیم ہے، اسلام کے عطا کیے ہوئے مکارم اخلاق کا ایک اہم عنصر معذورین اور سن رسیدہ لوگوں کی قدر ومنزلت اور ان کے حقوق کی ادائیگی ہے۔ اسلام اپنے ماننے والوں کو اس بات کا پابند بناتا ہے کہ معذوروں اور عمر رسیدہ لوگوں کی عزت اور ان کی ہر طرح کی ضرورتوں کا مکمل خیال رکھا جائے۔

اس تناظر میں اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کا یہ تاریخی سمینار اسلامی اور اخلاقی نقطۂ نظر کو واضح کرتے ہوئے درج ذیل تجاویز منظور کرتا ہے:

(۱) اگر انسان کے پاس مال ہو تو اصولی طور پر اس کا نفقہ خود اس کے اپنے مال میں واجب ہے، البتہ بیوی کا نفقہ ہر حال میں شوہر پر واجب ہے۔

(۲) اگر والدین تنگ دست ہوں تو اولاد کے ذمہ ان کا نفقہ واجب ہے، اولاد کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے والدین کو کسب معاش پر مجبور کریں، اگرچہ والدین کسب پر قادر ہوں۔

(۳) دوسرے قریبی رشتہ داروں کا نفقہ وعلاج اس وقت واجب ہوگا جبکہ تنگ دست ہونے کے ساتھ کسب سے بھی عاجز ہوں۔

(۴) والدین اگر خود کفیل ہوں تو اولاد پر ان کا نفقہ واجب نہیں، لیکن اولاد کو چاہئے کہ اخلاقی طور پر والدین کی ہر جائز خواہش کو پورا کریں۔

(۵) والدین کی خدمت اولاد کا فریضہ بھی ہے اور ان کے لئے دنیا وآخرت کی سعادت کا باعث بھی، ضرورت سے زائد معاش اور بلند معیار زندگی حاصل کرنے کے لئے خدمت کے محتاج والدین کو چھوڑ کر دوسرے شہر، دوسری ریاست یا دوسرے ممالک میں جانا اس وقت جائز ہوگا جبکہ والدین کے خدمت گار موجود ہوں اور والدین اس پر راضی بھی ہوں۔

(۶) ساس اور سسر کی خدمت بہو پر شرعاً واجب نہیں ہے، لیکن شریعت کے دائرہ میں رہتے ہوئے خدمت کرنا اس کی اخلاقی ذمہ داری ہے۔

(۷) ماں باپ کی خدمت بیٹا اور بیٹی دونوں پر واجب ہے۔

(۸) اگر والدین بالکل مجبور ہوں یا ایسی بیماریوں میں مبتلا ہوں کہ بیٹی کی خدمت کے محتاج ہوں اور بیٹی کے علاوہ کوئی خدمت گار نہ ہو تو ایسی صورت میں بیٹی کو والدین کی خدمت کرنی چاہئے، شوہر کو چاہئے کہ اس کی اجازت دے۔

(۹) اولاد کا اپنے والد کو نکاح ثانی سے روکنا جائز نہیں ہے اور اگر باپ اپنی اس بیوی کے اخراجات کی ادائیگی پر قادر نہ ہو تو اس کی زوجہ ثانیہ (سوتیلی ماں) کا نفقہ بھی اس کی غنی اولاد پر واجب ہے۔

(۱۰) والدین کی زندگی میں تقسیم جائیداد کا مطالبہ کرنا اولاد کا حق نہیں، والدین خود اپنی مرضی سے تقسیم کر کے مالکانہ تصرف دیدیں تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

(۱۱) الف: اپنے بزرگ رشتہ داروں کو اپنے ساتھ رکھ کر خدمت کرنا یا بوقت ضرورت دوسرے خدمت گار کے ذریعہ ان کی خدمت کرانا شرعی فریضہ ہے، اس لئے اولڈ ایج ہوم اسلام کے مزاج سے ہم آہنگ نہیں، البتہ بے سہارا لوگوں کے لئے ایسا اولڈ ایج ہوسٹل جن میں شرعی تقاضے پورے ہوتے ہوں، بنانے کی اور وہاں رکھنے کی شرعاً گنجائش ہے۔

ب: جو لوگ خود یا خدمت گار کے ذریعہ اپنے والدین کی خدمت کر سکتے ہیں، ان کے لئے بوڑھے والدین کو ان کی اجازت ومرضی کے بغیر ایسے ہاسٹل میں رکھنا جائز نہیں، البتہ اگر ضرورت کے تحت اور والدین کی اجازت ومرضی سے ان کو ہاسٹل میں رکھا جائے تب بھی اولاد پر واجب ہے کہ وہ مسلسل ان کی خبر گیری کرے، اور ان سے ملاقات کرتا رہے۔

(۱۲) حکومت عمر رسیدہ لوگوں کو رعایتیں فراہم کرنے کے لئے جو عمر مقرر کرتی ہے، اس عمر کو پہنچنے سے پہلے ان مراعات سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں ہے۔☆

تلخیص مقالات:

معذوروں اور بوڑھوں کے حقوق

مفتی محمد سراج الدین قاسمی[1]

اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا) کے پچیسویں فقہی سمینار میں جن چار اہم موضوعات پر بحث وتحقیق اور مناقشہ ہونا ہے ان میں ایک موضوع ''معذوروں اور بوڑھوں کے حقوق'' سے متعلق ہے، جس کے تحت ۹ رسوالات قائم کئے گئے تھے، اور اہل علم وتحقیق سے گزارش کی گئی تھی کہ وہ ان سوالات کا مفصل جواب قرآن و سنت، آثار صحابہ اور اجتہادات فقہاء کی روشنی میں تحریر فرمائیں۔

چنانچہ اکیڈمی کو تلخیص کے اختتام تک ۳۶ اہل علم واصحاب افتاء کے مقالات موصول ہوئے، جن کی تلخیص پیش خدمت ہے۔ فاضل مقالہ نگاران کے اسماء گرامی حسب ذیل ہیں:

ڈاکٹر مولانا شاہجہاں ندوی، مولانا حافظ کلیم اللہ عمری، مفتی راشد حسین ندوی، مفتی محبوب فروغ احمد قاسمی، مولانا محمد حذیفہ بن محمود ٹیلر داحودی، مولانا قمر الدین محمود قاسمی، مفتی رحمت اللہ ندوی، قاضی محمد ریاض ارمان قاسمی، مولانا محمد صبیح اختر قاسمی، مولانا عبدالتواب اناوی، مفتی عبدالرزاق قاسمی، مولانا سید انور سلیم، مولانا سعید الرحمن قاسمی، مفتی محمد ارشاد پالنپوری، مولانا عبداللہ خالد لوناواڑہ، مولانا حفیظ الرحمن اعظمی مدنی، مولانا حیدر علی قاسمی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا ضیاء الدین ملک قاسمی، مولانا محمد احسن عبدالحق ندوی، قاضی محمد کامل قاسمی، مفتی ظہیر احمد، مفتی شاہد علی قاسمی، مفتی عبدالمنان صاحب، مولانا فیضان احمد قاسمی، قاضی عبدالجلیل قاسمی، مولانا محمد قمر الزماں ندوی، مفتی محمد الیاس قاسمی، مولانا محمد آزاد بیگ قاسمی، مفتی نذیر احمد شافعی، مولانا ندیم انصاری، مولوی انوار الحق ہلال قاسمی، مولانا خورشید انور اعظمی، مفتی امانت علی قاسمی، مفتی محمد عثمان بستوی، مفتی جمیل احمد نذیری۔

اس موضوع کا پہلا سوال یہ ہے:

۱۔ اگر کوئی شخص بوڑھاپے کی عمر کو پہنچ گیا لیکن اتنا کمزور نہیں ہے کہ کسب معاش نہ کر سکے، کسی قدر مشقت کے ساتھ سہی وہ کما کر خود اپنی ضرورت پوری کر سکتا ہے، تو کیا ایسے شخص کو اسکی اولاد یا اعزہ واقارب جن کے ذمہ اسکا نفقہ واجب ہے، کسب معاش پر مجبور کر سکتے ہیں؟

اس سوال میں دو شق ہیں، پہلی شق کا خلاصہ یہ ہے کہ سن رسیدہ شخص کما کر خود اپنی ضرورت پوری کر سکتا ہے تو کیا اس کی اولاد اس کو کمانے پر مجبور کر سکتی ہے۔ دوسری شق کا خلاصہ یہ ہے کہ سن رسیدہ شخص کی اولاد نہ ہو، اس کے اعزہ واقارب ہوں تو کیا اعزہ واقارب اس شخص کو کمانے پر مجبور کر سکتے ہیں؟

پہلی شق: ...... سن رسیدہ شخص کما کر خود اپنی ضرورت پوری کر سکتا ہے، تو کیا اس کی اولاد اس کو کمانے پر مجبور کر سکتی ہے؟

اس مسئلہ سے متعلق ائمہ حنفیہ کے درمیان اختلاف ہے، صاحب محیط برہانی لکھتے ہیں:

''ذکر شمس الأئمة الحلوانی فی أدب القاضی للخصاف: أنه لا یجبر الابن علی نفقة الأب إذا کان الأب قادرًا علی الکسب فاعتبره بذی الرحم المحرم ... وذکر شمس الأئمة السرخسی: أن الأب إذا کان کسوبًا، والابن أیضًا کسوب یجبر الابن علی الکسب والنفقة علی الأب'' (المحیط البرہانی ۴/ ۱۶۰، فتاوی تاتارخانیہ ۵/ ۴۲۵)
(مفتی خورشید انور اعظمی، مفتی شبیر احمد قاسمی)۔

[1] شعبہ علمی، اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا)۔

لیکن تمام مقالہ نگاران کا اتفاق ہے کہ باپ تنگدست ہو تو اولاد پر نفقہ واجب ہوگا، باپ کمانے پر قادر ہو یا نہ ہو، باپ کو کمانے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا ہے۔

بعض مقالہ نگاران نے سن رسیدہ اشخاص کے نفقہ کے وجوب کی شرطیں بھی لکھی ہیں، پہلے ان شرطوں پر ایک نظر ڈال لی جائے:

بوڑھوں کے نفقہ کے وجوب کی بنیادی شرطیں:

۱۔ سن رسیدہ حضرات فقیر ہوں، ان کے پاس زندگی کی ضروریات پوری کرنے کے لئے مال واسباب نہ ہوں، گرچہ وہ کمانے پر قدرت رکھتے ہوں، پھر بھی ان کو کمانے پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔

صاحب ''در مختار'' لکھتے ہیں:

''وتجب علی موسر یسار الفطرة النفقة لأصوله الفقراء ولو قادرين على الكسب، جزم به فی الهداية، فالمعتبر فی إيجاب نفقة الوالدين مجرد الفقر، قيل: هو ظاهر الرواية'' (رد المحتار ۲/ ۶۳۶، کتاب النفقات) (مفتی عبدالرزاق، مولانا حفیظ الرحمن اعظمی، مولانا محبوب فروغ احمد)۔

۲۔ اولاد غنی ہوں، یا کمانے پر قادر ہوں، اور اس کی کمائی اس کے بیوی بچوں کے نفقہ سے بچ بھی جاتی ہو۔

علامہ زیلعی فرماتے ہیں:

''أن الأب إذا كان عاجزًا والابن فقير كسوب ينفق على الأب فضل كسبه'' (تبیین الحقائق ۳/ ۶۴) (مفتی عبدالرزاق)۔

البتہ اگر اولاد غنی نہ ہو، یا کمانے پر قادر نہ ہو تو پھر اس سے بوڑھے والدین کا نفقہ ساقط ہو جائے گا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''ابدأ بنفسك فتصدق عليها، فإن فضل شئی فلأهلك، فإن فضل عن أهلك شئی فلذی قرابتك'' (صحیح مسلم حدیث: ۹۹۷)۔

مقالہ مقاران حضرات نے والدین کے نفقہ کے وجوب کے سلسلہ میں ان آیات قرآنی واحادیث سے استدلال کیا ہے جن میں والدین کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا گیا ہے، اور بدسلوکی پر عتاب کا ذکر ہے، اس کے علاوہ فقہاء کی عبارتیں پیش کی ہیں:

ذیل میں فاضل مقالہ نگاران کے دلائل وآراء ذکر کئے جاتے ہیں:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

''إن أطيب ما يأكل الرجل من كسبه وإن ولده من كسبه، كلوا من كسب أولادكم إذا رجعتم إليه بالمعروف'' (سنن نسائی کتاب البیوع ۲/ ۲۱۰، حدیث: ۴۴۵۰) (مولانا حفیظ الرحمن مدنی، مفتی عبدالرزاق، مفتی شبیر وغیرہم)۔

محتاج والدین کا نفقہ اولاد پر واجب ہوگا، اس پر تمام دبستان فقہ کا اتفاق ہے۔

علامہ ابن المنذر لکھتے ہیں: ''أجمع أهل العلم على أن نفقة الوالدين الفقيرين الذين لا كسب لهما ولا مال واجبة فی مال الولد'' (الموسوعة الفقهيه ۴/ ۴۳) (مفتی عبدالرزاق، قاضی عبدالجلیل صاحبان)۔

فقہاء کی درج ذیل عبارتوں سے فاضل مقالہ نگاروں نے استدلال کیا ہے، صاحب ہدایہ لکھتے ہیں:

۱۔ ''وعلى الرجل أن ينفق على أبويه وأجداده وجداته إذا كانوا فقراء وإن خالفوه فی دينه، أما الأبوان فلقوله تعالى: وصاحبهما فی الدنيا معروفًا، نزلت الآية فی الأبوين الكافرين وليس من المعروف أن يعيش فی نعم الله، ويتركهما يموتان جوعًا، وأما الأجداد والجدات فلأنهما من الآباء والأمهات .... وشرط الفقر، لأنه لو كان ذا مال فإيجاب نفقته فی ماله أولى من إيجابها فی مال غيره، ولايمنع ذلك باختلاف الدين لما تلونا'' (ہدایہ مع الفتح ۴/ ۲۲۰، ۲۲۱)

(مفتی راشد حسین ندوی، مولانا حفیظ الرحمن، مفتی جمیل احمد نذیری)۔

علامہ ابن الہمام اس کی تشریح میں فرماتے ہیں:

"وقوله:إذا كانوا فقراء بإطلاقه قول السرخسی حيث قال:إذا كان الأب قادرًا على الكسب يجبر الابن على نفقته بخلاف قول الحلوانی (إلی) فالمعتبر فی إيجاب نفقة الوالدين مجرد الفقر، قيل هو ظاهر الرواية، لأن معنى الأذى فی إيكاله إلى الكدر والتعب أكثر منه فی التافيف المحرم بقوله تعالى:"ولا تقل لهما أف ولا تنهرهما" (فتح القدیر ۴/ ۲۲۰) (مفتی راشد حسین، مولانا حفیظ الرحمن اعظمی)۔

علامہ ابن الہمام نے حاکم کی الکافی سے نقل کیا ہے۔

۲۔ "ولا يجبر المؤسر على نفقة أحد من قرابته إذا كان رجلًا صحيحًا، وإن كان لا يقدر على الكسب إلا فی الوالد خاصة، أو فی الجد أبی الأب إذا مات الولد، فإنی أجبر الولد على نفقته وإن كان صحيحًا" (فتح القدیر ۴/ ۲۲۵) (مفتی راشد حسین)۔

امام ابواللیث سمرقندی تحریر فرماتے ہیں:

۳۔ "ونفقة الأبوين على الابن الموسر والبنت الموسرة بالسوية فی ظاهر الرواية وهو الأصح، ولا يشترط العجز فيهما بخلاف نفقة ذی رحم محرم منه، فإن العجز فيه شرط فی الذكور دون الإناث، وتجب نفقة ذی الأرحام المعسرين على المؤسرين، وعن محمد مقدر بما يفضل عن نفقة نفسه وعياله شهرًا" (فتاوی النوازل للسمرقندی ص: ۲۲۷، طبع دار الایمان سہارنپور) (مولانا حفیظ الرحمن مدنی)۔

علامہ کاسانی فرماتے ہیں:

۴۔ "يقضی بنفقة الأب وإن كان قادرًا على الكسب بعد إن كان معسرًا على ولده الموسر وكذا نفقة الجد على ولد ولده إذا كان موسرًا" (البدائع ۳/ ۴۴۷) (مولانا محمد حذیفہ)۔

علامہ ابن نجیم فرماتے ہیں:

۵۔ "فلو كان كل منهما كسوبا يجب أن يكتسب الابن وينفق على الأب، فالمعتبر فی إيجاب نفقة الوالدين مجرد الفقر، قيل: هو ظاهر الرواية" (البحر الرائق ۴/ ۲۲۴) (مولانا شاہجہاں ندوی)۔

فتاوی ہندیہ کے مؤلفین نے لکھا ہے:

۶۔ "ونفقة الوالد على الابن الموسر واجبة قدر الأب على الكسب أم لا. والفقراء أنواع:فقير لا مال له غير أنه قادر على الكسب فالمختار أنه يدخل الأب والأم فی نفقته كعياله، والثانی فقير لا مال له عاجز عن الكسب، فلا يجب عليه نفقة غيره خلاف الزوجة، والثالث فقير كسوب يفضل شئی من كسبه عن قوته فإنه يجبر على نفقة البنت الكبيرة والأبوين والأجداد" (فتاوی ہندیہ ۱/ ۵۶۴-۵۶۶) (مولانا حفیظ الرحمن مدنی، مولانا خورشید انور اعظمی)۔

علامہ ابن قیم لکھتے ہیں:

۷۔ "ليس من بر الوالدين أن يدع الرجل أباه يكنس الكنف، ويكاری على الحمر، ويوقد فی أتون الحمام ويحمل للناس على رأسه ما يتقوت بأجرته، وهو فی غاية الغنى واليسار وسعة ذات اليد، وليس من بر أمه أن يدعها تخدم الناس، وتغسل ثيابهم، وتستقی لهم الماء ونحو ذلك ولا يصونها بما ينفقه عليها، ويقول:الأبوان مكتسبان صحيحان وليسا بمزمنين ولا أعميين، فيالله العجب أين شرط الله ورسوله فی بر الوالدين وصلة الرحم أن يكون أحدهم زمنا أو أعمى، وليست صلة الرحم ولا بر الوالدين موقوفة على ذلك

شرعًا ولا لغة ولا عرفًا، وباللّٰہ التوفیق'' (زاد المعاد ۴/۱۶۷) (مولانا خورشید انور اعظمی)۔

دیگر دبستان فقہ:

دیگر دبستان فقہ میں والدین کا نفقہ اولاد پر اسی طرح سن رسیدہ افراد کا نفقہ اعزہ واقارب پر کب واجب ہوگا، اس کی وضاحت موسوعہ فقہیہ کے حوالہ سے پیش خدمت ہے: ''الموسوعۃ الفقہیہ'' میں ہے:

۸۔ ''أن یکون الأصل فقیرًا أو عاجزا عن الکسب فلا یجب علی الفرع نفقة أصله إن کان أصله غنیا أو قادرًا علی الکسب لأنهما تجب علی سبیل المواساة والبر، والقادر علی الکسب کالموسر مستغن عن المواساة وبهذا قال المالکیة والحنابلة والشافعیة فی قول۔ وقال الحنفیة والشافعیة فی الأظهر کما قال النووی وهو قول بعض المالکیة، إن کان الأصل فقیرًا قادرا علی الکسب تجب نفقته علی فرعه کذلك، لأن اللّٰہ تعالی قد أمر بالإحسان إلی الوالدین، وفی إلزام الآباء التکسب مع غناء الأبناء ترك للإحسان إلیهم وإیذاء لهم وهو لا یجوز'' (الموسوعۃ الفقہیہ ۴۱/۷۵) (مولانا خورشید انور اعظمی)۔

دبستان شافعی:

مسلک شافعی کی ترجمانی کرتے ہوئے علامہ غمراوی فرماتے ہیں:

۱۔ ''وتجب لفقیر غیر مکتسب إن کان زمنا وکذا العاجز بمرض أو عمی أو صغیرًا أو مجنونا والابن قدر علی الکسب ولم یکتسب فأقوال: أحسنها تجب مطلقًا للأصل والفرع أو لا تجب مطلقًا والثالث تجب لأصل لا فرع، قلت: الثالث أظهر'' (السراج الوہاج: ۴۷۳) (مفتی نذیر احمد یونس شافعی)۔

ڈاکٹر محمد مطرجی فرماتے ہیں:

۲۔ ''وإن کان من الأصول وجبت علی الأظهر نفقته، لأن اللّٰہ تعالی أمر بمصاحبتهم فی الدنیا بالمعروف ولیس من المعروف أن یکلفوا الاکتساب مع کبر السن ولحرمة الوالدین'' (المجموع ۱۹/ ۴۰۳) (مفتی نذیر احمد یونس شافعی)۔

علامہ نووی لکھتے ہیں:

۳۔ ''وإن کان من الأصل وجبت علی الأظهر. لأن اللّٰہ تعالی أمر بمصاحبتهم بالمعروف. ولیس من المعروف تکلیفهم الکسب مع کبر السن'' (روضۃ الطالبین ۸/ ۴۸، کتاب النفقۃ) (مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی)۔

دبستان حنبلی:

علامہ مرداوی فرماتے ہیں:

۱۔ ''الصحیح من المذهب وجوب نفقة أبویه وإن علوا، وأولاده وإن سفلوا بالمعروف، إذا فضل عن نفسه وامرأته'' (الانصاف ۹/ ۳۹۲) (مفتی عبد الرزاق)۔

دوسری شق یہ ہے کہ اگر کوئی شخص بوڑھاپے کی عمر کو پہنچ گیا ہو اور وہ کسی قدر مشقت کے ساتھ کسب معاش کر سکتا ہو تو کیا اس کے اعزہ واقارب اس کو کسب معاش پر مجبور کر سکتے ہیں؟

اس سوال کے جواب میں فاضل مقالہ نگاروں نے لکھا ہے کہ والدین اگر فقیر ہوں تو ان کا نفقہ بہر حال اولاد پر واجب ہوگا، لیکن اگر والدین کے علاوہ دیگر اعزہ واقارب کسب معاش کی قدرت رکھتے ہوں، تو ایسی صورت میں اعزہ واقارب کی صرف اخلاقی ذمہ داری ہے کہ ان عمر رسیدہ افراد کی خدمت کریں اور ان کے قیام وطعام کی پوری سہولت فراہم کریں، لیکن اگر اعزہ واقارب چاہیں تو ایسے عمر رسیدہ افراد کو کسب معاش پر مجبور کر سکتے ہیں۔

قاضی عبدالجلیل صاحب لکھتے ہیں:

کسی رشتہ دار کا نفقہ دوسرے رشتہ دار پر واجب ہونے کے لئے ذی رحم محرم ہونے کے ساتھ اس کا فقیر اور حاجت مند ہونا ضروری ہے، لیکن والدین کا نفقہ اولاد پر واجب ہونے کے لئے ان کا فقیر ہونا کافی ہے، حاجت مند ہونا ضروری نہیں ہے، اس لئے والدین اگر فقیر ہوں اور کمانے پر قادر ہوں تو بھی ان کا نفقہ اولاد پر واجب ہوگا، ان کو کمانے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا ہے۔

مفتی راشد حسین صاحب لکھتے ہیں:

باپ دادا اور وہ خواتین جن کا نفقہ ان پر واجب ہوتا ہے اگر محتاج ہیں، تو ان کا نفقہ اس پر واجب ہوگا، خواہ وہ کمائی پر قادر ہی کیوں نہ ہوں، اور ان کو کمائی پر مجبور نہیں کیا جاسکتا ہے، بقیہ دوسرے مردوں کا نفقہ اسی وقت واجب ہوگا جب وہ محتاج ہونے کے ساتھ ساتھ معذور ہوں، اور کمائی پر قادر نہ ہوں، ہاں اگر تندرست ہوں تو ان کا نفقہ واجب نہیں ہوگا، ان کو کمائی پر مجبور کیا جاسکتا ہے۔ (نیز دیکھئے مقالہ: مولانا حفیظ الرحمن مدنی)۔

مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی ذرا تفصیل کرتے ہوئے لکھتے ہیں: نفقہ واجب ہونے کے تین اسباب ہیں: زوجیت، ملکیت، قرابت۔

قرابت کی بنا پر جو نفقہ واجب ہوتا ہے، اس کے مصداق میں اختلاف پایا جاتا ہے، شافعیہ تو اصول وفروع کے لئے نفقہ واجب کرتے، جبکہ مالکیہ کے نزدیک صرف والدین اور بیٹے وبیٹیوں کا نفقہ واجب ہے، دادا، دادی کا نفقہ واجب نہیں ہے۔

حنفیہ کے نزدیک ہر وہ شخص جس سے محرمیت وقرابت ہو، اس کا اپنے اپنے احوال کے مطابق نفقہ واجب ہے، البتہ اصول وفروع کا نفقہ جزئیت کی وجہ سے واجب ہے، لہذا اصول کمانے پر قادر ہوں یا نہ ہوں بہر صورت ان کا نفقہ واجب ہوگا۔

فاضل مقالہ نگاروں نے درج ذیل عبارتوں سے استدلال کیا ہے:

۱۔ ''والنفقة لكل ذی رحم محرم إذا كان صغيرا فقيرًا أو كانت المرأة بالغة فقيرة، أو كان ذكرا فقيرًا زمنًا أو أعمى (أی) ويجب ذلك على مقدار الميراث ويجبر عليه'' (ہدایہ ۴/ ۲۲۴) (مفتی راشد حسین، مولانا خورشید انور اعظمی)۔

۲۔ علامہ کاسانی لکھتے ہیں: ''أحدها إعساره ... والثانی: عجزه عن الكسب ... حتى لو كان صحيحا مكتسبا لايقضى له بالنفقة على غيره'' (بدائع الصنائع ۴/ ۳۵) (مفتی شاہجہاں ندوی)۔

۳۔ ''ونفقة الأبوين على الابن الموسر ... ولا يشترط العجز فيهما بخلاف نفقة ذی رحم محرم منه، فإن العجز فيه شرط فی الذكور دون الإناث'' (فتاوی النوازل للسمرقندی ص: ۲۲۷ دار الایمان سہارنپور) (مولانا حفیظ الرحمن مدنی)۔

سوال نمبر (۲): سن رسیدہ حضرات کا نفقہ وعلاج کن صورتوں میں دوسروں پر واجب ہوگا؟

اس سوال میں دو شقیں ہیں: پہلی شق نفقہ کے سلسلہ میں ہے، اور دوسری شق علاج کے سلسلہ میں ہے، پہلی شق کے جواب میں تقریباً تمام مقالہ نگاروں کا اتفاق ہے کہ سن رسیدہ افراد اگر فقیر ہوں اور کمانے پر قدرت نہ رکھتے ہوں، تو ان کا نفقہ اولاد پر واجب ہوگا، اگر اولاد نہ ہوں تو دیگر رشتہ داروں پر نفقہ واجب ہوگا۔

دوسری شق یہ ہے کہ علاج کن صورتوں میں دوسروں پر واجب ہوگا، اس شق کا حکم اس بحث پر موقوف ہے کہ نفقہ میں علاج داخل ہے یا نہیں؟ اس سلسلہ میں حنفیہ، مالکیہ اور حنابلہ کی رائے یہ ہے کہ نفقہ میں علاج داخل نہیں ہے، البتہ شافعیہ کی رائے یہ ہے کہ اصول کے علاج کا خرچ فروع پر واجب ہوگا، اور وہ نفقہ میں داخل ہوگا، البتہ دیگر رشتہ داروں مثلاً بھائی بہنوں کے علاج کا خرچ نفقہ میں داخل نہیں ہوگا۔

پہلی شق کے جواب میں مقالہ نگاروں نے اکثر وہی عبارتیں ذکر کی ہیں، جو سوال نمبر ا کے تحت ذکر کی گئی ہیں، اس لئے تکرار سے بچتے ہوئے ان سب کا اعادہ نہیں کیا گیا ہے، البتہ چند عبارتیں ذکر کی جاتی ہیں:

مفتی راشد حسین صاحب نے سن رسیدہ افراد کے نفقہ کے وجوب کی شرطیں ذکر کی ہیں، موصوف لکھتے ہیں:

سن رسیدہ اشخاص کا نفقہ عزیز واقارب پر اس وقت واجب ہے، جبکہ وہ محتاج ہو، کمانے پر قادر نہ ہو اور اس کے اعزہ خوشحال ہوں، پھر وہ شخص قاضی

کے سامنے مرافعہ کرے تو قاضی کے فیصلہ کے بعد عزیز واقارب پر اس شخص کا نفقہ واجب ہوگا۔

علامہ کاسانی لکھتے ہیں: ''الثالث: أن الطلب والخصومة بين يدى القاضى فى أحد نوعى النفقة وہى نفقة غير الولاد فلا تجب بدونه'' (بدائع الصنائع ۳/ ۴۴۷)۔

اور عزیز واقارب کے خوشحال ہونے کی تفصیل یہ ہے:

''اليسار مقدر بالنصاب فيما روى عن أبي يوسف وعليه الفتوى، والنصاب نصاب حرمان الصدقة، هكذا فى الهداية'' (ہندیہ ۱/ ۵۶۴) (مفتی راشد حسین ندوی)۔

مفتی شبیر احمد صاحب لکھتے ہیں: عمر رسیدہ ہوکر کسب معاش پر قادر نہ ہو اور ضرورت مند ہو یا عمر رسیدہ تو ہو مگر معذور ہو اور محتاج ہو تو ایسی صورت میں عزیز واقارب پر ان کا خرچ واجب ہوگا۔

فاضل مقالہ نگاروں نے درج ذیل عبارتیں پیش کی ہیں:

علامہ کاسانی لکھتے ہیں:

۱۔ ''والثانى عجزه عن الكسب بأن كان به زمانة أو قعد أو فلج أو عمى أو جنون أو كان مقطوع اليدين أو أشلهما أو مقطوع الرجلين أو مفقود العينين أوغير ذلك من العوارض التى تمنع الإنسان من الاكتساب'' (بدائع الصنائع ۴/ ۳۵) (مولانا خورشید انور اعظمی)۔

ڈاکٹر وہبہ زحیلی لکھتے ہیں:

۲۔ ''وتجب نفقة الأقارب من الحواشى وذوى الأرحام لقوله تعالى: ''وآت ذا القربى حقه''، ''وبالوالدين إحسانا''، وقول النبى ﷺ: يد المعطى العليا ابدأ بمن تعول أمك وأباك وأختك وأخاك ثم أدناك'' (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۱۰/ ۲۵) (مولانا حفیظ الرحمن اعظمی)۔

مفتی ظہیر احمد صاحب نے ڈاکٹر وہبہ زحیلی کی درج ذیل عبارت پیش کی ہے:

۳۔ ''أن يكون الملزم بالنفقة موسرا مالكا نفقة فاضلة عن نفسه إما من ماله وإما من كسبه فيلزم القادر على التكسب أن يعمل للإنفاق على قريبه الفقير ويستثنى الأب فنفقة أولاده واجبة عليه، ولو كان معسرا وكذلك الزوج فنفقة زوجته واجبة عليه، ولو كان معسرا'' (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۱۰/ ۷۲۵۳)۔

شافعیہ کا مسلک:

شافعیہ کے نزدیک اولاد پر وجوب نفقہ کے لئے والد اور ولد میں بنیادی طور پر تین شرائط کا پایا جانا ضروری ہے۔

علامہ ماوردی لکھتے ہیں:

''أما الشروط المعتبرة فى الوالد فثلاثة: أحدها الحرية، والشرط الثانى الفقر، فإن كان غنيا بمال أو مكتسبا ببدنه لم تجب نفقته على ولده، لأنها مواساة تجب مع الحاجة وتسقط مع القدرة على الكفاية، والشرط الثالث أن يكون عاجزًا عن الاكتساب، وأما الشروط المعتبرة فى الولد لوجوب النفقة عليه فثلاثة شروط: أحدها الحرية، والشرط الثانى أن يكون قادرا عليها بمال أو كسب بدن ليصير بالقدرة عليها من أهل المواساة بها، والشرط الثالث: أن يجد الولد فاضلة عن قوته وقوت زوجته فى يومه وليلته فإن لم تفضل سقطت'' (الحاوی الکبیر ۱۱/ ۴۸۸) (مولانا عمر بن یوسف کوکنی)۔

سوال کی دوسری شق علاج سے متعلق ہے کہ نفقہ میں علاج داخل ہے یا نہیں، اس سلسلہ میں اکثر مقالہ نگاروں کی رائے یہ ہے کہ اگرچہ کتب فقہیہ میں علاج

کو نفقہ میں داخل نہیں کیا گیا ہے، لیکن اب علاج بھی نفقہ میں داخل ہوگا، البتہ قاضی ارمان صاحب کی تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ نفقہ میں علاج داخل نہیں ہے۔

مفتی تقی عثمانی صاحب بیوی کے علاج ومعالجہ سے متعلق ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

ایک مرتبہ اس مسئلہ پر دوسرے فقہاء کی کتابوں کی بھی مراجعت کا اتفاق ہوا اور یہ عجیب بات نظر آئی کہ سب کے یہاں صورت حال یکساں ہی ہے، یعنی علاج کے خرچہ کو نفقہ کا حصہ قرار نہیں دیا گیا، لیکن تلاش کے باوجود کتاب وسنت کی کوئی ایسی نص بھی نہیں ملی جس میں یہ صراحت ہو کہ علاج کا خرچہ شوہر پر واجب نہیں، اس لئے احقر کو کچھ یہ خیال ہوتا ہے کہ قرآن کریم میں نفقہ کے ساتھ "بالمعروف" کی قید لگائی گئی ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ نفقہ کا تعین عرف پر مبنی ہے، پچھلے دور میں چونکہ علاج کا خرچہ زیادہ لمبا چوڑا نہیں ہوتا تھا، اس لئے شاید عرف یہ تھا کہ وہ نفقہ میں شامل نہیں، اور بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے دور میں عرفاً علاج نفقہ کا حصہ ہے (فتاوی عثمانی ۲/۴۹۱) (مفتی راشد حسین ندوی)۔

علامہ ابن تیمیہ فرماتے ہیں:

"وأما التداوى فليس بواجب عند جماهير الأئمة، وإنما أوجبه طائفة قليلة كما قاله بعض أصحاب الشافعي وأحمد" (الفتاوی الکبری ۳/۷) (مفتی محمد شاہجہاں ندوی)۔

ذیل میں علاج کے سلسلہ میں ائمہ کے مسالک اور فقہاء کی عبارتیں ذکر کی جاتی ہیں:

حنفیہ کا مسلک:

قاضی ارمان قاسمی تقریرات رافعی کے حوالہ سے لکھتے ہیں:

جب انسان پر اپنا علاج کرانا واجب نہیں ہے، تو دوسرے کے علاج کا خرچہ اس پر کیسے واجب کیا جاسکتا ہے؟

"(قوله: ولم أر من ذكر بنا أجرة الطبيب) عدم الوجوب ظاهر فإن المريض لا تجب عليه مداواة نفسه مع غناه فبالأولى أن لا تجب على غيره وقد عللوا وجوب النفقة عليه بأنه جزوه فصار كنفسه" (تقريرات رافعی ۱/ ۲۵۴)۔

مالکیہ کا مسلک:

"قال مالك: ولا تستحق الدواء للمرض وقاله؛ لأنه ليس من مصالحه، ولا أجرة الحجامة، وعليه أجرة القابلة، لأنه سبب الحمل عند أصبغ مطلقًا، ووافقه محمد إن كانت المنفعة للولد، أو لها فعليها أولهما فعليهما، قال أبو الوليد: والأظهر قول أصبغ" (الذخیرہ، کتاب النکاح، النفقہ) (محمد ریاض ارمان قاسمی)۔

حنابلہ کا مسلک:

"ولا يجب عليه شراء الأدوية ولا أجرة الطبيب؛ لأنه يراد لإصلاح الجسم، فلا يلزمه كما لا يلزم المستاجر بناء ما يقع من الدار وحفظ أصولها، وكذلك أجرة الحجام والفاصد" (المغنی لابن قدامه ۹/ ۲۳۶، فصل فی النفقه) (محمد رياض ارمان قاسمی)۔

شوافع کا مسلک:

امام شافعی کے یہاں بیوی کے علاج کا خرچ شوہر پر ہے، اور والد کی بیماری کا خرچ بھی اس کے لڑکے پر ہے۔

علامہ شمس الدین رملی تحریر فرماتے ہیں:

"(ودواء مرض وأجرة طبيب وحاجم) وفاصد وخاتن؛ لأنها لحفظ الأصل (ولها طعام أيام المرض وأدمها) وكسوتها وآلة تنظيفها وتصرفه للدواء أو غيره لأنها محبوسة له" (نہایۃ المحتاج ۷/ ۱۹۵) (قاضی محمد ریاض ارمان)۔

مسلک شافعی کی ترجمانی کرتے ہوئے مفتی نذیر احمد شریوردھن لکھتے ہیں:

"يشترط لوجوب نفقة الأصول على الفروع توافر الشروط التالية: أولًا أن يكون الفرع موسرا بما يزيد عن الضروري من نفقته ونفقة زوجته يومه وليلته، فلو كان الذى عنده من النفقة لايكفى لأكثر من حاجته وحاجة زوجته مدة يوم وليلة، لم يكلف الإنفاق على أبيه وأمه، لأن نفقة الفقير لاتجب على فقير مثله ... وثانيا أن يكون الأصل فقيرا، والمراد بالفقر هنا أن لايكتسب ما يسد حاجته الضرورية سواء قادرا على الكسب أم لا، ثالثًا: أن لاتكون الأم مكفيه بنفقة زوجها فعلا أو حكما، ومعنى هٰذا الشرط: أن نفقة الأم إنما تجب على ولدها فى حالتين، الحالة الأولى أن يكون الوالد عاجزا عن الإنفاق عليها. الحالة الثانية: أن يكون والده متوفى، وهى خلية عن الزوج" (الفقه المنهجى على مذهب الامام الشافعى ۲/ ۱۶۸)۔

والد کی بیماری کا خرچ بھی شوافع کے نزدیک اس کی اولاد پر ہے۔

"(لزمه) أى الفرع الحر أو البعض ذكرًا كان أو أنثى (نفقة) أى مؤنة حتى نحو دواء وأجرة طبيب (الوالد) المعصوم الحر وقنه المحتاج له" (نہایۃ المحتاج ۷/ ۱۹۵، کتاب النفقات) (محمد ریاض ارمان قاسمی)۔

شافعیہ کے نزدیک جن سن رسیدہ حضرات کا نفقہ اس کی اولاد پر لازم ہے، اگر وہ حضرات علاج کے محتاج ہوں تو ان کا علاج بھی اولاد پر لازم ہوگا۔

شیخ الاسلام زکریا انصاری لکھتے ہیں:

"ويجب أيضًا الأدم والكسوة ومؤنة الخادم إن احتاج إليه وأجرة الطبيب وثمن الأدوية فالمعتبر الكفاية وهى غير مقدرة، لأنها تجب على المواساة لدفع الحاجة، فيعتبر حاله فى السن والرغبة والزهادة" (الغرر البہیہ ۸/ ۵۷۳) (مفتی عمر بن یوسف کوکنی)۔

مولانا عمر بن یوسف کوکنی لکھتے ہیں:

شوافع کے نزدیک صرف جزئیت کی وجہ سے نفقہ واجب ہوتا ہے، یعنی صرف اصول کا نفقہ فروع پر واجب ہوگا، یا فروع کا نفقہ اصول پر واجب ہوگا، علامہ نووی لکھتے ہیں:

"أحدها إنما تجب النفقة بقرابة البعضية فتجب للولد على الوالد وبالعكس ... ولا يلحق بالأصول والفروع سائر الأقارب كالأخ والأخت والعم والخال والعمة والخالة وغيرهم" (روضۃ الطالبین ۹/ ۸۴)۔

علاج ومعالجہ کا خرچ دوسروں پر کن صورتوں میں واجب ہوگا؟ اس کا جواب مفتی راشد حسین صاحب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

ایک صورت تو یہ ہے کہ وجوب نفقہ کی شرائط پائی جا رہی ہوں، تو دوسرے نفقات کی طرح علاج ومعالجہ کا خرچ بھی لازم ہوگا۔

اور دوسری صورت یہ ہے کہ منفق علیہ محتاج تو نہ ہو، البتہ جس مرض کا وہ شکار ہے، اس کے علاج کے مصارف کا متحمل نہیں ہے، تو اس صورت میں بھی علاج کے مصارف کو برداشت کرنا عزیز واقارب کی ذمہ داری ہوگی۔

علاج ومعالجہ کے سلسلہ میں مقالہ نگاروں نے عام طور پر انہیں عبارتوں کو پیش کیا ہے، جو نفقہ سے متعلق ہے کہ کن صورتوں میں نفقہ واجب ہوگا اور وجوب کے شرائط کیا ہوں گے، اس لئے ان کا اعادہ نہیں کیا گیا ہے۔

سوال نمبر (۳): بوڑھے والدین یا خاندان کے وہ بڑے جن کا نفقہ انکے چھوٹوں پر محتاجی کی صورت میں واجب ہوتا ہے اگر وہ محتاج نہ ہوں خود صاحب ثروت ہوں تب بھی وہ اپنی اولاد سے یا ان لوگوں سے جن پر بحالت حاجت نفقہ واجب ہوتا ہے، زیادہ سہولت کے لئے یا دوسرے لوگوں پر خرچ کرنے کے لئے یا کچھ رقم محفوظ کرنے کے لئے زائد رقم کا مطالبہ کر سکتے ہیں؟

تمام مقالہ نگاروں کی آراء سے واضح ہوتا ہے کہ اگر بوڑھے والدین یا خاندان کے دیگر بڑے افراد زائد رقم کا مطالبہ کریں تو اولاد پر یا چھوٹوں پر ان کا پورا کرنا لازم نہیں ہے، البتہ والدین زائد رقم کا مطالبہ کر سکتے ہیں یا نہیں، تو اس صورت میں بعض مقالہ نگاروں کی رائے یہ ہے کہ زائد رقم کا مطالبہ کر سکتے ہیں اور اولاد

کے لئے سعادت مندی کی بات یہ ہے کہ وہ ان کے مطالبہ کو پورا کریں، تاکہ والدین کبیدہ خاطر نہ ہوں، جبکہ بعض مقالہ نگاروں نے لکھا ہے کہ وہ اس کا مطالبہ نہیں کرسکتے ہیں۔

ذیل میں مقالہ نگاران کی آراء مع دلائل ذکر کی جاتی ہیں:

پہلی رائے یہ ہے کہ زائد رقم کا مطالبہ کرسکتے ہیں، اور اولاد کو جس حد تک پورا کرنے کی گنجائش ہو، مطالبہ پورا کرنا چاہئے، تاکہ وہ کبیدہ خاطر نہ ہوں (مفتی جمیل احمد نذیری، مفتی سعید الرحمن قاسمی بستی، قاضی ریاض ارمان قاسمی، مفتی عبدالمنان آسام وغیرہم)۔

مفتی جمیل احمد نذیری صاحب نے درج ذیل آیات پیش کی ہیں:

۱۔ "وبالوالدین إحسانا" (سورہ اسراء: ۲۳)۔

۲۔ "واخفض لهما جناح الذل من الرحمة" (سورہ اسراء: ۲۴)۔

۳۔ "وصاحبهما في الدنيا معروفا" (سورہ لقمان: ۱۵)۔

جبکہ بعض مقالہ نگار نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے:

''رضا الرب في رضى الوالد وسخط الرب في سخط الوالد'' (مشکوۃ، ص: ۴۱۹) (دیکھئے مقالہ مفتی سعید الرحمن قاسمی بستی)۔

قاضی ریاض ارمان قاسمی نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے: "أنت ومالك لأبيك"

علامہ کاسانی لکھتے ہیں: ''أضاف مال الابن إلى الأب بلام التمليك، وظاهره يقتضي أن يكون للأب في مال ابنه حقيقة الملك، فإن لم تثبت الحقيقة فلا أقل من أن يثبت له حق التمليك عند الحاجة'' (بدائع الصنائع ۳/۴۳۹)۔

دیگر مقالہ نگاروں نے لکھا ہے کہ بیوی کے علاوہ دوسرے اقرباء کا نفقہ اس وقت واجب ہوتا ہے جبکہ وہ محتاج اور ضرورت مند ہوں، بوڑھے والدین یا خاندان کے بڑے اگر صاحب ثروت ہوں تو ان کا نفقہ دوسروں پر واجب نہیں ہوگا، اگر وہ لوگوں پر خرچ کرنے کے لئے یا رقم محفوظ کرنے کے لئے زائد رقم کا مطالبہ کرنا چاہیں تو نہیں کرسکتے۔

ہاں اگر والدین زائد رقم کا مطالبہ کریں اور اولاد حسن سلوک کے طور پر دیدیں تو ان کے ساتھ سعادتمندی کی بات ہے (مفتی راشد حسین ندوی، مولانا خورشید انور اعظمی، مولانا شاہجہاں ندوی، مولانا حفیظ الرحمن مدنی، مولانا عمر بن یوسف کوکنی، مفتی نذیر احمد، مفتی ابوبکر قاسمی، مولانا محمد حذیفہ، مفتی حیدر علی قاسمی، مولانا عبداللہ خالد، مولانا قمر الدین محمود قاسمی، مفتی افتخار احمد مفتاحی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، قاضی عبدالجلیل قاسمی، مفتی شاہد علی قاسمی وغیرہم)۔

اس رائے کے قائلین نے ان احادیث اور فقہی عبارتوں سے استدلال کیا ہے جو احتیاج کی صورت میں وجوب نفقہ کے سلسلہ میں ہیں۔

چند احادیث وفقہی عبارتیں ملاحظہ ہوں:

مفتی سعید صاحب نے درج ذیل احادیث سے استدلال کیا ہے:

۱۔ ''عن قيس بن حازم جاء رجل إلى أبي بكر الصديق فقال: إن أبي يريد أن يأخذ مالي كله لحاجة فقال لأبيه: إنما لك من ماله ما يكفيك، فقال: يا خليفة رسول الله ﷺ أليس؟ قال رسول الله ﷺ: أنت ومالك لأبيك. فقال: نعم، وإنما يعني بذلك النفقة'' (اعلاء السنن ۱۱/۲۰۱)۔

۲۔ ''عن عائشة مرفوعا: إن أولادكم هبة الله تعالى لكم يهب لمن يشاء إناثا ويهب لمن يشاء الذكور فهم وأموالهم إذا احتجتم إليها'' (السنن الکبری ۷/۷۸۹) (مولانا افتخار احمد مفتاحی)۔

فاضل مقالہ نگاروں نے درج ذیل عبارتوں سے استدلال کیا ہے:

۱۔ ''وعلى الرجل أن ينفق على أبويه وأجداده وجداته إذا كانوا فقراء ... وشرط الفقر لأنه لو كان ذا مال فإيجاب

نفقته فی ماله أولی من إیجابها فی مال غیره'' (ہدایہ مع فتح القدیر ۴/۴۲۱) (مفتی راشد حسین ندوی، مولانا خورشید انور اعظمی، مولانا شاہجہاں ندوی، مولانا حفیظ الرحمن مدنی، مولانا عمر بن یوسف کوکنی، مفتی نذیر احمد، مفتی ابوبکر قاسمی، مولانا محمد حذیفہ، مفتی حیدر علی قاسمی، مولانا عبداللہ خالد، مولانا قمر الدین محمود قاسمی)۔

۲۔ ''والنفقة لكل ذی رحم إذا كان صغيرًا فقيرًا'' (حوالہ بالا) (مفتی راشد حسین ندوی)۔

صاحب تاتارخانیہ نے لکھا ہے:

۳۔ ''فإن كان للأب مسكن أو دابة فالمذهب عندنا أنه يفرض النفقة على الابن، إلا أن يكون فی المسكن فضل نحو أن يكفيه أن يسكن فی ناحية منه، فحينئذ يؤمر الأب ببيع الفضل والإنفاق على نفسه، فإذا آل الأمر إلى الناحية التی يسكنها الأب يفرض نفقته حينئذ على الأب، وكذلك إذا كانت للأب دابة نفسية يؤمر أن يبيع ويشتری الأوكس وينفق الفضل على نفسه، فإذا آل الأمر إلى الأوكس يفرض النفقة على الابن ويستوی فی هذا الوالدون والمولودون وسائر المحارم وهو الصحيح من المذهب'' (فتاوی تاتارخانیہ ۵/۴۲۹) (مفتی شبیر احمد قاسمی)۔

۴۔ علامہ شامی محتاجگی کی شرط کے ساتھ مقید کرنے کی وجہ پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں: لاتجب نفقة الموسر إلا الزوجة (ردالمحتار ۵/ ۳۵۵) (مولانا افتخار مدنی)۔

علامہ شامی لکھتے ہیں:

۵۔ ''إن النفقة لاتجب بغير المحتاج وہؤلاء غير محتاجين؛ لأنه يمكن الاكتفاء بالأدنی'' (منحۃ الخالق علی البحر الرائق ۴/۲۲۹) (مفتی شاہد علی)۔

مفتی سعید الرحمن لکھتے ہیں کہ اگر وہ چھوٹے خود غربت کے شکار ہوں تو ان کا نفقہ والدین پر واجب ہوگا، چہ جائیکہ وہ مطالبہ کریں۔

مفتی سعید الرحمن صاحب نے اس عبارت سے استدلال کیا ہے:

''ولو قدر على اكتساب ما لايكفيه فعلى أبيه تكميل الكفاية، حاصله أن السلف قالوا بوجوب نفقته على الأب'' (ردالمحتار ۴/۶۱۴)۔

مولانا محبوب فروغ نے درج ذیل عبارت سے استدلال کیا ہے:

''فإن طلب الأب النفقة من ولده فقال الولد: ہو غنی، وقال الأب: أنا فقير، قال فی المنتقی: روی بشر عن أبی يوسف أنه يسأل عن حال الأب فإن أخبر أنه فقير تجعل عليه النفقة وإن قالوا: لا ندری، لايجعل على الابن النفقة ما لم يقم الأب بينة أنه فقير'' (تاتارخانیہ ۵/۴۳۰) (مولانا محبوب فروغ)۔

مولانا حافظ کلیم اللہ عمری نے مفتی محمود صاحبؒ کے فتاوی سے ایک اقتباس نقل کیا ہے:

اگر دونوں لڑکوں میں مالدار اور غریب ہونے کے اعتبار سے زیادہ فرق ہے، تو والد کے نفقہ میں بھی فرق ہوگا، یعنی حسب حیثیت واجب ہوگا، جب زید خود بھی صاحب عیال ہے اور اس میں اتنی گنجائش نہیں ہے کہ والد صاحب کو دس روپیہ ماہانہ دے، اور والد کا گزر اس کے روپے پر موقوف بھی نہیں جبکہ وہ خود صاحب حیثیت ہے اور اپنا خرچ خود برداشت کرسکتا ہے، تو پھر زید کے ذمہ دس روپیہ دینا واجب نہیں، بلکہ اپنی استطاعت کے موافق والد کی خدمت کرتا رہے، اس میں کوتاہی نہ کرے، اگر والد استطاعت سے زیادہ طلب کرے تو اس کے نہ دینے سے زید پر مواخذہ نہیں (فتاوی محمودیہ ۱۳/۴۶۴)۔

شوافع کی بھی رائے یہ ہے کہ مزید رقم کا مطالبہ نہیں کرسکتے ہیں، بلکہ شوافع کی ایک رائے تو یہ ہے کہ اگر باپ کمانے پر قادر ہو تو پھر اولاد پر اس کا نفقہ واجب ہی نہیں ہوگا۔

۱۔ ''والثانی لاتجب نفقته على الولد لأنه قادر على الاكتساب فأشبه المكتسب'' (البیان فی مذہب الشافعی ۱۱/۲۵۲) (مفتی شاہد علی

قاسمی)۔

فقہ شافعی کی ترجمانی کرتے ہوئے علامہ خطیب شربینی فرماتے ہیں:

۲۔ ''ولا تجب النفقة لمالك كفايته ولو زمنا أوصغيرا أو مجنونا لاستغنائه عنها ولا لمكتسبها بأن يقدر على كسب كفايته من كسب حلال يليق به لانتفاء حاجته إلى غيره، وإن كان يكسب دون كفايته استحق القدر المعجوز عنه خاصة'' (مغنی المحتاج ۳/۵۴۶) (مولانا عمر بن یوسف کوکنی)۔

۳۔ علامہ نووی لکھتے ہیں: ''نفقة القريب لاتتقدر بل هي قدر الكفاية ....لأنها تجب لتزجية الوقت ودفع حاجته الناجزة فتعتبر الحاجة وقدرها، حتى لو استغنى في بعض الأيام بضيافة وغيرها لم يجب'' (روضۃ الطالبین ۶/۴۹۱) (مفتی نذیر احمد شریوردھنی)۔

سوال نمبر ۴: ایک اہم مسئلہ والدین اور بزرگوں کی جسمانی خدمت، خاص کر جب انسان چلنے پھرنے اٹھنے بیٹھنے اور کسی ضرورت کو پوری کرنے میں سہارے کا محتاج ہو جائے، ایسی صورتحال میں اگر بیٹا زیادہ پیسہ کمانے کی غرض سے دوسرے شہر، دوسری ریاست یا دوسرے ملک میں چلا جائے تو بوڑھوں کی دشواریاں بہت بڑھ جاتی ہیں ان حالات میں:

الف: کیا زیادہ آمدنی کے لئے لڑکوں کا اپنے ماں باپ کو چھوڑ کر دوسری جگہ جانا جائز ہے؟

اکثر مقالہ نگاروں کی رائے یہ ہے کہ اس صورت میں جبکہ والدین خدمت کے محتاج ہوں اور اس بیٹے کے علاوہ کوئی خدمت کرنے والا نہ ہو تو اس صورت میں بیٹے پر باپ کی خدمت واجب ہے، اور ان کو چھوڑ کر اجازت کے بغیر جائز نہیں ہے، بعض مقالہ نگاروں نے یہ تفصیل بھی ذکر کی ہے کہ زیادہ آمدنی کے لئے باہر جانا ناگزیر ہو تو اس پر ضروری ہے کہ والدین کی خدمت کے لئے کسی کو رکھ کر جائے، اور گاہے بگاہے خبر وخیریت لیتا رہے۔ (فاضل مقالہ نگاروں کے نام حسب ذیل ہیں: مفتی راشد حسین، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا حیدر علی، قاضی عبدالجلیل قاسمی، مفتی شبیر احمد، مولانا شاہجہاں ندوی، مولانا محبوب فروغ، مولانا حفیظ الرحمن، مولانا افتخار احمد مفتاحی، مولانا قمر الدین محمود قاسمی وغیرہم)۔

اس مسئلہ میں چونکہ دلائل تقریباً مشترک ہیں اور مختلف کتابوں سے عبارتیں نقل کی گئی ہیں، اس لئے مکررات سے بچتے ہوئے چند عبارتیں پیش کی جاتی ہیں:

مولانا خورشید انور اعظمی لکھتے ہیں:

اگر والدین بیٹے کی خدمت سے مستغنی ہوں تو ان کی اجازت کے بغیر تجارت یا حج کا سفر کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، البتہ اگر راستہ خوفناک ہو تو ان کی اجازت کی ضرورت ہوگی۔

علامہ شامی لکھتے ہیں:

''فلو في سفر تجارة أو حج لا بأس به بلا إذن الأبوين إن استغنيا عن خدمته إذ ليس فيه إبطال حقهما إلا إذا كان الطريق مخوفا كالبحر فلا يخرج إلا بإذنهما وإن استغنيا عن خدمته'' (رد المحتار ۹/ ۵۸۴)۔

مفتی راشد حسین لکھتے ہیں:

اگر ماں باپ کی خدمت کا مکمل انتظام کر دیا جائے اور یہ خطرہ نہ ہو کہ ان کی غیر موجودگی میں ان کو پریشانی لاحق ہوگی تو شرعاً اس کی اجازت ہوگی، لیکن خلاف اولی ہے۔ البتہ اگر بیٹا کے جانے کی وجہ سے والدین کو ذہنی تکلیف ہو یا جسمانی تکلیف ہو یا مشقت ہو تو شرعاً وہ گنہگار ہوگا۔

مقالہ نگاروں نے لکھا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب جہاد پر ماں باپ کی خدمت کو ترجیح دی اور جہاد جو کہ فرض کفایہ ہے، سے منع فرمادیا تو زائد آمدنی کی غرض سے کرنا جبکہ ماں باپ کے ضیاع کا خدشہ ہو، کیونکر جائز ہوسکتا ہے؟

مقالہ نگاروں نے درج ذیل حدیث سے استدلال کیا ہے:

''عن عبداللہ بن عمر وقال: قال رجل للنبی ﷺ: أجاهد؟ قال: لك أبوان؟ قال: نعم، قال: ففيهما جاهد''
(بخاری مع عمدۃ القاری ۲۲/ ۸۳)۔

اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے علامہ عینی فرماتے ہیں:

''فيفهم فيه أنه لايجاهد إلا إذا أذنا له بالجهاد فيجاهد فيكون جهاده موقوفًا على إذنهما'' (عمدۃ القاری ۲۲/ ۸۳)
(مولانا حیدر علی قاسمی)۔

فاضل مقالہ نگاروں نے درج ذیل عبارتوں سے استدلال کیا ہے:

۱۔ ''لايحل سفر فيه خطر إلا بإذنهما ومالا خطر فيه يحل بلا إذن، ومنه السفر في طلب العلم (قوله: ومالا خطر) كالسفر للتجارة والحج والعمرة يحل بلا إذن إلا إن خيف عليهما الضيعة'' (شامی ۳/ ۲۴۱، کتاب الجہاد) (مفتی راشد حسین ندوی، قاضی عبدالجلیل قاسمی، مولانا محبوب فروغ وغیرہم)۔

۲۔ ''قال محمد في السير الكبير: إذا أراد الرجل أن يسافر إلى غير الجهاد لتجارة أو حج أو عمرة وكره ذلك أبواه فإن كان يخاف الضيعة عليهما بأن كانا معسرين ونفقتهما عليه وماله لايفي بالزاد والراحلة ونفقتهما، فإنه لايخرج بغير إذنهما، سواء كان سفرا يخاف على الولد الهلاك فيه ... أولا يخاف على الولد الهلاك فيه، وكذا الجواب فيما إذا خرج للنفقة إلى بلدة أخرى إن كان لايخاف عليه الهلاك بسبب هذا الخروج كان بمنزلة السفر للتجارة، وإن كان يخاف عليه الهلاك كان بمنزلة الجهاد'' (ہندیہ ۵/ ۴۲۲) (مفتی شبیر احمد قاسمی)۔

فاضل مقالہ نگاروں نے استشہاد میں اصحاب افتاء کے فتاوی بھی نقل کئے ہیں جو ذیل میں پیش کی جاتی ہیں:

۱۔ مفتی رشید احمد صاحب لکھتے ہیں:

درج ذیل صورتوں میں والدین کی اجازت کے بغیر سفر کرنا یا دور رہنا جائز نہیں:

۱۔ والدین جسمانی خدمت کے محتاج ہوں اور کوئی خدمت کرنے والا نہیں ہے۔

۲۔ سفر ایسا پر خطر ہے کہ ہلاکت کا ظن غالب ہے۔

۳۔ لڑکا امرد ہے، اس کے فتنہ میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہے (احسن الفتاوی ۵/ ۲۶۱) (مولانا حفیظ الرحمن اعظمی)۔

۲۔ مفتی رشید احمد صاحب دوسری جگہ لکھتے ہیں:

اگر سفر کی وجہ سے والدین یا بیوی بچوں کے ضیاع کا خوف ہو، یعنی وہ خود غنی نہ ہوں، یا ان کی حفاظت کرنے والا کوئی نہ ہو تو اس صورت میں سفر نہ کرے۔ (احسن الفتاوی ۸/ ۱۷۸) (مولانا حفیظ الرحمن اعظمی)۔

مفتی رشید صاحب نے ایک جگہ لکھا ہے کہ اگر والدین مستغنی ہوں تو ان کی اجازت کے بغیر بھی سفر جائز ہے۔

حضرت مفتی صاحب کی عبارت ملاحظہ ہو:

بصورت استغناء والدین بلا اجازت سفر جائز ہے جبکہ راستہ پر خطر نہ ہو (احسن الفتاوی ۸/ ۱۷۹) (مفتی عبدالمنان، قاضی ریاض ارمان قاسمی وغیرہم)۔

صاحب قاموس الفقہ لکھتے ہیں:

جائز دنیوی مقاصد کے لئے سفر کرنا درست ہے... البتہ اگر ماں باپ کے لئے خدمت کی متبادل صورت موجود ہو، تو نہ ان کا اصرار درست ہے کہ ان کے لڑکے دینی اسفار نہ کریں اور نہ اولاد کے لئے ان کے اصرار کو قبول کرنے کی گنجائش ہے (قاموس الفقہ ۴/ ۱۵۵) (مولانا حیدر علی قاسمی)۔

چند شافعی علماء واصحاب افتاء نے کتب شوافع کی عبارتیں نقل کی ہیں، جو ذیل میں پیش کی جاتی ہیں:

مولانا عمر بن یوسف کوکنی لکھتے ہیں:

والدین کی اجازت کے بغیر درج ذیل شرائط کے ساتھ جانے کی اجازت ہے:

۱۔ ''ویشترط لخروجه ولو للفرض رشده وأن لایکون أمرد جمیلا، إلا إن کان معه نحو محرم یأمن به علی نفسه، ولو لزمته نفقة الأصل احتاج لإذنه أو أنابه من یمونه من مال حاضر'' (شرح المنهج علی هامش الجمل ۷/ ۲۰۴)۔

علامہ خطیب شربینی لکھتے ہیں:

۲۔ ''ویحرم علی رجل جهاد بسفر وغیره إلا بإذن أبویه إن کانا مسلمین، لأن الجهاد فرض کفایة وبرهما فرض عین'' (مغنی المحتاج ۴/ ۲۵۱) (مولانا عمر بن یوسف کوکنی)۔

۳۔ ''وسکت المصنف عن حکم السفر المباح کالتجارة وحکمه إن کان قصیرًا فلا منع به بحال، وإن کان طویلا فإن غلب الخوف فکالجهاد والإجاز علی الصحیح بلا استیذان'' (مغنی المحتاج ۴/ ۲۵۱) (مولانا عمر بن یوسف کوکنی)۔

۴۔ علامہ ابن حجر فرماتے ہیں: ''ویحرم علیه أیضًا بلا إذن سفر مع الخوف وإن قصر مطلقًا وطویل ولو مع الأمن إلا لعذر'' (تحفة المحتاج ۱۲/ ۴۲)۔

مولانا عمر بن یوسف کوکنی لکھتے ہیں:

سفر مباح اگر قصیر ہو تو علامہ خطیب مطلقا اس کے جواز کے قائل معلوم ہوتے ہیں، چاہے امن کی حالت ہو یا خوف کی، جبکہ علامہ ابن حجر کے کلام سے مترشح ہوتا ہے کہ خوف کی حالت میں قصیر سفر مباح بھی حرام ہے، یہی رائے امام رملی کے کلام سے بھی ظاہر ہوتی ہے۔

ب: اگر بہو ساس سسر کے ساتھ رہنا نہ چاہتی ہو یا اسکی ساس کو خدمت کی ضرورت ہو لیکن کوئی خدمت گار موجود نہ ہو اور بیٹیوں کو انکے شوہروں کی طرف سے میکے میں رہنے کی اجازت نہ ہو تو اس صورت میں بہو کی کیا ذمہ داری ہے؟ اور کیا اسے اسکے ساس سسر کے ساتھ رہنے پر مجبور کیا جاسکتا ہے؟

اس سوال کے جواب میں فاضل مقالہ نگاروں کی رائے یہ ہے کہ اصولی طور پر بہو کے ذمہ ساس کی خدمت لازم نہیں ہے، البتہ حسن معاشرت کا تقاضا ہے کہ بہو شوہر کے ساتھ اس کی ماں کی خدمت بھی کرے، البتہ بعض مقالہ نگاروں کی رائے یہ ہے کہ ایسی صورت میں جبکہ ساس محتاج خدمت ہو اور کوئی خدمت گزار نہ ہو، بہو کے اوپر دیانۃً واجب ہے کہ وہ ساس کی بھی خدمت کرے۔

اب ذیل میں فاضل مقالہ نگاروں کے آراء و دلائل ذکر کئے جاتے ہیں:

فاضل مقالہ نگاروں نے لکھا ہے کہ:

اگر والدین کی خدمت کے لئے ان کی اپنی اولاد موجود ہے یا کوئی دوسری بہو موجود ہو تو اس پر خدمت کرنا نہ قضاءً واجب ہے نہ دیانۃً، البتہ چونکہ اس کے شوہر پر ان کی خدمت واجب ہے، لہذا اس طرح کے حالات میں بیوی کو اپنے شوہر کا تعاون کرنا چاہئے اور سسر کی خدمت کرنی چاہئے (مولانا محبوب فروغ، مولانا قمر الدین محمود)۔

مولانا ابوسفیان مفتاحی کی رائے یہ ہے کہ بہو کی اخلاقی ذمہ داری ہوگی کہ وہ ساس کی خدمت کرے، لیکن بہو کو اس پر مجبور نہیں کیا جاسکتا ہے۔

قاضی عبدالجلیل صاحب لکھتے ہیں:

جب شوہر کی خدمت کرنا عورت پر واجب نہیں ہے اور شوہر کی ماں کے ساتھ رہنے پر اس کو مجبور نہیں کیا جاسکتا ہے تو ساس سسر کی خدمت کرنا اس پر کیسے واجب ہوسکتا ہے؟

مفتی شبیر احمد صاحب نے یہ اضافہ کیا ہے کہ صرف غیر جسمانی خدمت کھانا وغیرہ پکا کر کھلانا بہو کا اخلاقی فریضہ ہے (مولانا عمر بن یوسف کوکنی)۔

جبکہ مولانا شاہجہاں ندوی لکھتے ہیں:

ناگزیر حالت میں بہو کو ساس سسر کے ساتھ رہنے پر مجبور کرنے کی گنجائش ہے۔

''وإن كان الوالد لايقدر على عمل أو كان زمنًا وللابن عيال كان على الابن أن يضم الأب إلى عياله وينفق على الكل'' (البحر الرائق ۴/۳۴۹)۔

مفتی راشد حسین صاحب کی تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ ایسی صورت میں جبکہ خدمت کرنے والی کوئی دوسری عورت موجود نہ ہوتو بہو پر ساس کی خدمت دیانۃً واجب ہے۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب ایک استفتاء کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں: اگر ساس سسر کی خدمت کے لئے کوئی اور موجود نہ ہو تو اگرچہ قضاءً اس صورت میں بھی بہو پر ان کی خدمت واجب نہیں ہے، لیکن دیانۃً واجب ہے (کتاب الفتاوی ۴/۴۹) (مفتی راشد حسین ندوی)۔

ارباب افتاء کے فتاوے:

۱۔ مفتی عزیز الرحمن صاحب ایک استفتاء کے جواب میں لکھتے ہیں:

مقدم شوہر کی خدمت ہے، ساس کے ساتھ بھی معاملہ ایسا رکھئے جیسا کہ چھوٹوں کو بڑوں کے ساتھ رکھنا چاہئے، مگر یہ نہیں کہ جو کچھ ساس کہے وہ اس کو ماننا ضروری ہو اگرچہ اس میں عورت کی حق تلفی ہو، ایسی اطاعت لازم نہیں ہے، نیز ایک سوال یہ تھا کہ چونکہ بیٹے پر والدین کی اطاعت فرض ہے اور بیوی پر خاوند کی، تو کیا بہو پر ساس کی اطاعت فرض ہوگی؟

اس کے جواب میں حضرت مفتی صاحب لکھتے ہیں:

خدمت کرے، لیکن اپنے حقوق کا مطالبہ کرسکتی ہے اور شوہر کے پاس رہنے کو وہ کہہ سکتی ہے، اس میں وہ حق پر ہے، اور اس میں اس پر ساس کی اطاعت لازم نہیں (فتاوی دار العلوم ۶/۵۲۶) (قاضی ریاض ارمان قاسمی)۔

۲۔ حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب تحریر فرماتے ہیں:

زید کے والد کا ادب واحترام اور معمولی عرفی خدمت جس میں زوجہ پر کوئی مشقت اور تکلیف نہ ہو کرنی بہتر ہے، اس سے زیادہ زوجہ کے ذمہ لازم نہیں۔ (کفایت المفتی ۵/۲۲۳) (مولانا حیدر علی)۔

۳۔ مفتی محمود الحسن صاحب ایک سوال کے جواب میں لکھتے ہیں:

شرعاً ہندہ کے ذمہ شوہر کی ماں کی خدمت واجب نہیں ہے لیکن اخلاقی طور پر اس کا خیال کرنا چاہئے کہ وہ اس کے شوہر کی ماں ہے، تو اپنی ماں کی طرح اس کو بھی راحت پہنچانے کا خیال رکھے اور شوہر کی اطاعت کرے، "وحقه على أن تعطيه في كل مباح يأمرها به" (فتاوی محمودیہ)۔

۴۔ مولانا یوسف لدھیانوی لکھتے ہیں:

بیوی اگر اپنی خوشی سے شوہر کے والدین کی خدمت کرتی ہے تو یہ بہت اچھی بات ہے اور بیوی کے لئے اخلاقی چیز ہے، اور سعادت کی بات ہے۔ اگر بیوی شوہر کے والدین سے الگ رہنا چاہے تو شوہر شرعی قانون کی رو سے بیوی کو اپنے والدین کی خدمت پر مجبور نہیں کرسکتا (آپ کے مسائل اور ان کا حل) (مولانا حیدر علی، مفتی عبد المنان، مولانا خورشید احمد وغیرہم)۔

دوسری شق یہ ہے کہ کیا بہو کو ساس کے ساتھ رہنے پر مجبور کیا جاسکتا ہے، اس شق سے متعلق فاضل مقالہ نگاروں نے لکھا ہے کہ بہو کو ساس وسسر کے ساتھ رہنے پر مجبور کرنا درست نہیں، بلکہ بیوی ساس سسر کے ساتھ مشترکہ فیملی میں ایک ساتھ نہ رہنا چاہے تو شوہر کی ذمہ داری ہے کہ بیوی کے لئے الگ رہائش کا انتظام کرے (مولانا حیدر علی، مولانا خورشید انور اعظمی، مولانا حفیظ الرحمن اعظمی، مفتی شبیر احمد قاسمی وغیرہم)۔

البتہ مفتی راشد حسین ندوی لکھتے ہیں:

رہائش کے لئے الگ سے انتظام کرنے کا وجوب اور عدم وجوب حالات وعرف پر مبنی ہے، لہذا جن صورتوں میں بہو پر ساس کی خدمت متعین ہوجائے

ان میں اس کا الگ گھر کا مطالبہ کرنا صحیح نہیں ہوگا، اس لئے کہ واجب کو پورا کرنے کے لئے جو چیز ضروری ہو وہ بھی واجب ہو جاتی ہے، اور جب ساس کی خدمت کرنا واجب ہو گیا ہے اور یہ واجب الگ گھر میں رہ کر نہیں کر سکتی تو اس پر اسی گھر میں رہنا ضروری ہوگا اور اسے ساس کے ساتھ ہی رہنے پر مجبور کیا جا سکتا ہے، الا یہ کہ بالکل متصل علاحدہ گھر مل جائے جس میں رہنے سے فریضہ پورا کرنے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔

فاضل مقالہ نگاروں نے درج ذیل فقہی عبارتوں سے استدلال کیا ہے:

"ہدایہ" میں ہے:

۱۔ "وعلى الزوج أن يسكنها في دار مفردة ليس فيها أحد من أهله، إلا أن تختار ذلك، لأن السكنى من كفايتها، فتجب لها كالنفقة وقدأوجبه الله مقرونا بالنفقة، وإذا وجب حقا لها ليس له أن يشرك غيرها فيه، لأنها تتضرر به فانها لاتأمن على متاعها ويمنعها ذلك من المعاشرة مع زوجها ومن الاستمتاع إلا أن تختار؛ لأنها رضيت بانتقاص حقها" (ہدایہ ۲/۴۴۱) (مولانا حفیظ الرحمن اعظمی، مولانا افتخار احمد مفتاحی)۔

علامہ شامی لکھتے ہیں:

۲۔ "ولو أراد أن يسكنها مع ضرتها أو مع أحمائها كأمه وأخته وبنته فأبت فعليه أن يسكنها في منزل منفرد، لأن إباءها دليل الأذى والضرر، ولأنه محتاج إلى جماعها ومعاشرتها في أي وقت يتفق لايمكن ذلك مع ثالث (وقوله) ذكر الخصاف أن لها أن تقول: لا أسكن مع والديك وأقربائك في الدار فأفرد لي دارًا" (شامی ۵/ ۳۲۱-۳۲۲) (مفتی شبیر احمد)۔

۳۔ فتاوی ہندیہ میں ہے: "تجب السكنى لها عليه في بيت خال عن أهله وأهلها، إلا أن تختار ذلك، كذا في العيني" (ہندیہ ۱/ ۵۵۶) (مولانا خورشید انور)۔

حضرت تھانوی فرماتے ہیں:

بعض آدمی اس کو بڑی سعادت سمجھتے ہیں کہ بیوی کو اپنی ماں کا محکوم و مغلوب بنا کر رکھیں اور اس کی بدولت بیویوں پر بڑے بڑے ظلم ہوتے ہیں، سو سمجھ لینا چاہئے کہ بیوی پر فرض نہیں ہے کہ ساس کی خدمت کیا کرے، تم سعادت مند ہو، خود خدمت کیا کرو (اصلاح انقلاب ۲/۱۸۸) (مولانا حفیظ الرحمن اعظمی)۔

مولانا عمر بن یوسف مسلک شافعی کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ بیوی کی رہائش کا انتظام کرنا شوہر پر واجب ہے، لہذا بیوی کسی بھی وجہ سے ساس سسر کے ساتھ رہنا نہ چاہتی ہو تو اسے ان کے ساتھ رہنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا ہے۔ شیخ زکریا انصاری لکھتے ہیں:

"ويجب لها مسكن يليق بها عادة من دار أو حجرة أو غيره كالمعتدة بل أولى وإن لم يملكه" (شرح المنہج ۴/۲۰۴)۔

ج: ماں باپ کی خدمت صرف بیٹوں پر واجب ہے یا بیٹیوں پر بھی، بعض اوقات بیٹیاں اپنے والدین کی مجبوری اور بے بسی کو دیکھتے ہوئے اپنے والدین کی خدمت کرنا چاہتی ہیں، لیکن ان کے شوہران کو اس کی اجازت نہیں دیتے۔ کیا ان کے شوہر کو اس کا حق حاصل ہے؟

اس سوال کے جواب میں فاضل مقالہ نگاروں نے لکھا ہے کہ ماں باپ کی خدمت بیٹا اور بیٹی دونوں پر واجب ہے، البتہ شادی کے بعد بیٹی سے شوہر کے حقوق متعلق ہو جاتے ہیں، ایسی صورت میں بیٹی کو کوشش کرنی چاہئے کہ شوہر سے اجازت لے کر والدین کی خدمت کرے، لیکن اگر شوہر والدین کی خدمت سے منع کرے تو اس وقت بیٹی کیا کرے گی؟

فاضل مقالہ نگاروں کی رائے یہ ہے کہ ایسی صورت میں شوہر کی اطاعت نہیں کرے گی، اور ہفتہ میں ایک مرتبہ میکے جا کر والدین کی خدمت کرے گی۔ جبکہ بعض مقالہ نگاروں کی رائے یہ ہے کہ اس صورت میں بھی شوہر کی اطاعت اس پر ضروری ہے، بعض فاضل مقالہ نگاروں نے یہ بھی لکھا ہے کہ اگر بیٹی کی شادی دور دراز علاقے میں ہوگئی تو اس کے آمد و رفت کا مسئلہ ہے، اس لئے بیٹی پر والدین کی خدمت واجب نہیں ہوگی۔

قاضی عبدالجلیل قاسمی لکھتے ہیں:

والدین کی خدمت کے لئے شوہر کو اجازت نہ دینے کا حق حاصل ہے یا نہیں، اس سلسلہ میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے، شافعیہ وحنابلہ کی رائے ہے کہ شوہر کی اجازت کے بغیر وہ اپنے میکہ نہیں جائے گی، امام ابو یوسف سے روایت ہے کہ اگر والدین اپنی بیٹی کے پاس آسکتے ہوں تو ان سے ملنے کے لئے بیٹی کو شوہر کی اجازت کے بغیر نہیں جانا چاہئے اور اگر وہ نہ آسکتے ہوں تو وہ جاسکتی ہے۔

مولانا حیدر علی اور مفتی راشد حسین صاحبان لکھتے ہیں:

بیٹیوں کے نکاح کے بعد ان کے ساتھ ان کے شوہروں کے حقوق متعلق ہوجاتے ہیں، اس لئے شوہر کی مرضی کے بغیر کوئی کام کرنا درست نہیں ہے۔

لیکن اگر والدین بالکل مجبور ہوں اور ایسی بیماریوں میں مبتلا ہوں کہ بیٹی کی خدمت کے محتاج ہوں اور کوئی نہ ہو تو ایسی صورت میں بیٹی والدین کی خدمت کرسکتی ہے، شوہر کی اجازت ضروری نہیں، اور اگر شوہر منع کرے تو اس کی اطاعت ضروری نہیں (مولانا حیدر علی، مفتی راشد حسین ندوی)۔

مفتی شبیر احمد صاحب لکھتے ہیں:

۱۔ ماں باپ کی خدمت دو طرح کی ہے:

(۱)۔ نان ونفقہ کی خدمت، (۲) جسمانی خدمت۔

نان ونفقہ کی خدمت: چونکہ بیٹیاں کمانے پر قادر نہیں ہوتی ہیں، لہذا ان پر نان ونفقہ کی خدمت واجب نہیں ہے۔

اور جہاں تک جسمانی خدمت کا تعلق ہے تو اگر دور دراز علاقے میں لڑکی کی شادی ہوگئی اور اس کا شوہر اس کو میکہ نہ آنے دیتا ہو تو اس پر ماں باپ کی جسمانی خدمت واجب نہیں ہوگی، ہاں اگر شوہر اس کی اجازت دیں یا وہ میکہ سے قریب ہی رہتی ہو تو اس کے اوپر لازم ہے کہ وہ ماں باپ کی خدمت کرے۔

مولانا خورشید احمد اعظمی لکھتے ہیں:

والدین کی خدمت کرنا بیٹا بیٹی دونوں پر واجب ہے، لہذا بیٹی کو چاہئے کہ موقع بہ موقع اپنے شوہر سے اجازت لے کر اپنے والد کی خدمت کرے، اور اگر شوہر اجازت نہ دے تو پھر ہفتہ میں ایک بار والدین کو دیکھنے کے لئے جاسکتی ہے، اور شوہر بیوی کو ہفتہ میں ایک بار جانے سے روک نہیں سکتا۔

مولانا محبوب فروغ لکھتے ہیں:

شوہر کی اطاعت فرض ہے، اسی طرح ماں کی خدمت بھی فرض ہے، ایسی صوت میں ماں باپ کی خدمت کا حق مقدم ہوگا، جہاں تک استمتاع کا تعلق ہے تو وہ شوہر کے مطالبہ پر اس پر واجب ہوگا۔

علامہ شامی لکھتے ہیں:

''وكذا فيما لو أرادت حج الفرض بمحرم أو كان أبوها زمنا مثلًا يحتاج إلى خدمتها، ولو كان كافرًا أو كانت لها نازلة ولم يسأل لها الزوج عنها من عالم فتخرج بلا إذنه في ذلك كله'' (رد المحتار ۲/ ۳۹۰)۔

قاضی ریاض ارمان لکھتے ہیں:

شوہر کو روکنے کا حق نہیں ہے، ہاں جب تک وہ اپنے ماں باپ کے یہاں رہے گی شوہر پر اس کا نفقہ لازم نہیں ہوگا۔

فاضل مقالہ نگاروں نے درج ذیل عبارتوں سے استدلال کیا ہے:

خانیہ میں ہے:

۱۔ ''امرأة لها أب زمن ليس له من يقوم عليها زوجها يمنعها عن الخروج إليه وتعاهده كان لها أن تعصي زوجها وتطيع الوالد مؤمنا كان الوالد أو كافرًا، لأن القيام بتعاهد الوالد فرض عليها فيتقدم على حق الزوج''
(خانیہ ۱/ ۴۴۳) (مولانا حیدر علی، قاضی عبدالجلیل قاسمی، قاضی ریاض ارمان قاسمی)۔

صاحب درمختار لکھتے ہیں:

۲۔ ''ولو أبوها زمنًا مثلًا فاحتاج فعليها تعاهده وإن كان كافرًا وإن أبى الزوج'' (درمختار ۲/ ۶۶۴)۔

مفتی شبیر صاحب اس عبارت پر تعلیق کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس عبارت سے مراد یہ ہے کہ وقتاً فوقتاً ماں باپ کی عیادت کے لئے جانے سے روکنے کا حق شوہر کو نہیں ہے، لیکن مستقل رہ کر روکنے کا حق شوہر کو ہے۔

علامہ شامی لکھتے ہیں:

۳۔ ''ولا يمنعها من الخروج إلى الوالدين في كل جمعة إن لم يقدرا على إتيانها على ما اختاره في الاختيار، ولو أبوها زمنا مثلًا فاحتاجها فعليها تعاهده، ولو كافرًا وإن أبى الزوج، وفي الشامية: فعليها تعاهده: أي بقدر احتياجه إليها، وهذا إذا لم يكن له من يقوم عليه'' (شامی ۵/ ۳۲۴) (مفتی محمد شبیر، مولانا خورشید انور اعظمی، مولانا شاہجہاں ندوی، مولانا افتخار احمد مفتاحی)۔

علامہ ابن ہمام لکھتے ہیں:

۴۔ ''عن أبي يوسف في النوادر تقييد خروجها بأن لا يقدر على إتيانها فإن كانا يقدران على إتيانها لا تذهب وهو حسن، والحق الأخذ بقول أبي يوسف إذا كان الأبوان بالصفة التي ذكرت ... ولو كان أبوها زمنا مثلا وهو محتاج إلى خدمتها والزوج يمنعها من تعاهده فعليها أن تعصيه كان الأب مسلما أو كافرًا'' (فتح القدير ۴/ ۳۹۸) (قاضی عبدالجلیل، قاضی ریاض ارمان صاحبان)۔

۵۔ ''والذي ينبغي تحريره أن يكون له منعها عن كل عمل يؤدي إلى تنقيص حقه أو ضرره أو إلى خروجها من بيته'' (ردالمحتار ۵/ ۳۲۵) (مولانا حفیظ الرحمن اعظمی)۔

مولانا خورشید انور اعظمی نے مفتی رشید صاحب کے درج ذیل فتوی سے بھی استدلال کیا ہے۔

مفتی رشید صاحب لکھتے ہیں:

اگر باپ محتاج خدمت ہو مثلاً اپاہج ہو اور اس کی خدمت کرنے والا کوئی نہ ہو تو اس کی خدمت، کے لئے روزانہ جاسکتی ہے، یہی حکم ماں کے محتاج خدمت ہونے کا ہے (آپ کے مسائل اور ان کا حل ۵/ ۱۲۰)۔

اسلامک فقہ اکیڈمی کی تجاویز:

اگر ماں کو ایسی خدمت کی ضرورت ہو جس کو کوئی عورت ہی انجام دے سکتی ہے، اور بہو کے علاوہ کوئی دوسری قریبی عورت خدمت کرنے والی نہ ہو، نیز ماں مجبور ہو، خود سے وہ کام انجام دینے کے لائق نہ ہو تو ایسی صورت میں بہو پر ساس کی خدمت واجب ہوگی (فقہ اکیڈمی کے فیصلے ۶/ ۱۲۵) (مفتی راشد حسین ندوی، مولانا حافظ کلیم اللہ عمری صاحبان)۔

بعض مقالہ نگاروں کی رائے یہ ہے کہ والدین کی خدمت شادی شدہ لڑکیوں پر واجب نہیں ہے، چنانچہ:

مولانا قمر الدین محمود صاحب لکھتے ہیں: ماں باپ کی خدمت صرف بیٹوں پر واجب ہے، بیٹیوں پر واجب نہیں، ہاں شوہر کی اجازت سے نہیں روک سکتے ہیں، البتہ خدمت سے روک سکتے ہیں۔

مولانا ابوسفیان مفتاحی لکھتے ہیں: شوہر کو یہ حق حاصل ہے کہ بیوی کو اس کے اپنے ماں باپ کی خدمت سے روک دے، البتہ ایسا کرنا بہتر نہیں۔

سوال نمبر (۵): انسان کو جس طرح جوانی میں بیوی کی ضرورت ہوتی ہے، اسی طرح وہ بوڑھاپے میں بھی بیوی کا محتاج ہوتا ہے تاکہ اس عمر کے سرد و گرم کو سہنا اس کے لئے آسان ہوجائے؛ ہندوستان کے معاشرہ میں عام طور پر بیٹے اور بیٹیاں اپنی والدہ کے فوت ہونے کے بعد والد کے دوسرے نکاح میں رکاوٹ بنتے ہیں، کیا ان کا یہ رکاوٹ بننا درست ہے؟ اور اگر خود والد میں اپنی بیوی کی کفالت کی استطاعت نہ ہو تو اس سلسلہ میں کیا اولاد پر بھی اس

نسبت سے کچھ ذمہ داری عائد ہوتی ہے؟

اس سوال کے جواب میں تمام مقالہ نگاروں نے لکھا ہے کہ بچوں کے لئے والدین کی شادی میں رکاوٹ ڈالنا جائز نہیں ہے، بلکہ اگر والد شادی کرلے اور وہ تنگ دست ہوتو والد کے ساتھ ان کی بیوی کا نفقہ بھی بچوں پر واجب ہوگا اور تمام دبستان فقہ کا اس پر اتفاق ہے۔

اس مسئلہ سے متعلق فاضل مقالہ نگاروں نے جو عبارتیں ذکر کی ہیں وہ تقریباً مشترک ہیں، اس لئے چند عبارتیں پیش خدمت ہیں:

مولانا افتخار احمد مفتاحی نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے: لیس شئی خیر امرأة من زوج أو قبر (غنیۃ الطالبین ۱/۳۲)۔

مولانا خورشید انور اعظمی لکھتے ہیں: بوڑھاپے میں ایک شریک حیات کی ضرورت مزید بڑھ جاتی ہے، اس لئے صحابہ کرام زندگی کے آخری مرحلے میں بھی نکاح کا اہتمام فرماتے تھے، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں:

''لو لم یبق من أجلی إلا عشرة أیام، وأعلم أنی أموت فی آخرہا یومًا ولی طول النکاح فیهن لتزوجت مخافة الفتنة'' (المغنی لابن قدامہ ۹/۳۴۱) (مولانا خورشید انور اعظمی، مولانا ابوسفیان مفتاحی صاحبانؒ)۔

حضرت شداد بن اوس نے اپنے گھر والوں سے کہا:

''زوجونی فإن النبی ﷺ أوصانی أن لا ألقی اللہ أعزب'' (احکام القرآن للجصاص ۳/۳۲۰) (مولانا خورشید انور اعظمی)۔

فقہاء کرام نے اس بات کی صراحت کی ہے کہ محتاج باپ کی شادی کرانا بھی اولاد کی ذمہ داری ہے اور ان دونوں کا نفقہ بھی ان پر لازم ہے۔

علامہ شامی لکھتے ہیں:

۱۔ ''فالظاهر وجوب نفقة الأم علیه، ولو لم یکن الأب محتاجًا إلیها، لقولهم: لایشارك الولد فی نفقة أبویه أحد'' (ردالمحتار ۳/۶۱۶) (مولانا شاہجہاں ندوی)۔

ہندیہ میں ہے:

۲۔ ''إلا أن یکون بالأب علة لایقدر علی خدمة نفسه ویحتاج إلی خادم یقوم بشأنه ویخدمه، فحینئذ یجبر الابن علی نفقة خادم الأب منکوحة کانت أو أمة (وقوله) وإن احتاج الأب إلی زوجة والابن موسر وجب علیه أن یزوجه أو یشتری له جاریة، وإن کان للابن زوجتان أو أکثر لم یلزم الابن إلا نفقة واحدة ویدفعها إلی الأب وهو یوزعها علیهن'' (فتاویٰ ہندیہ ۱/۶۱۱) (مفتی شبیر احمد قاسمی، قاضی عبدالجلیل قاسمی، مولانا حیدر علی قاسمی وغیرہم)۔

فتاویٰ تاتارخانیہ میں ہے:

۳۔ ''إلا أن تکون بالأب علة لایقدر علی خدمة نفسه فیحتاج إلی خادم بشأنه وخدمته فحینئذ یجبر الابن علی نفقة خادم الأب منکوحة کانت أو أمة وذکر بشام فی نوادره عن أبی یوسف أنه یفرض نفقة خادم الأب علی ابنه'' (فتاویٰ تاتارخانیہ ۵/۴۲۶) (مفتی سعید الرحمن قاسمی بستی)۔

صاحب ''الجوہرۃ النیرۃ'' لکھتے ہیں:

۴۔ ''وإن احتاج الأب إلی زوجة والابن موسر وجب علیه أن یزوجه أو یشتری له جاریة ویلزمه نفقتها وکسوتها، کما یجب نفقة الأب وکسوته'' (الجوہرۃ النیرۃ ۲/۱۸۴) (مفتی شاہد علی قاسمی)۔

علامہ ابن نجیم لکھتے ہیں:

۵۔ ''وکما یجب علی الابن الموسر نفقة والده الفقیر تجب علیه نفقة خادم الأب امرأة کانت الخادم أو جاریة إذا کان الأب محتاجا إلی من یخدمه، وفی الخلاصة: یجبر الابن علی نفقة زوجة أبیه وفی نفقات الحلوانی: قال فیه

روایتان فی روایة کما قلنا، وفی روایة: إنما تجب نفقة زوجة الأب إذا کان الأب مریضًا أو به زمانة یحتاج إلی الخدمة، أما إذا کان صحیحا فلا" (البحر الرائق ۴/۲۰۶) (مفتی سعید الرحمن قاسمی بستی)۔

سوتیلی ماں کا نفقہ:

فاضل مقالہ نگاروں نے لکھا ہے کہ اگر باپ صاحب استطاعت نہیں ہے تو سوتیلی ماں کا نفقہ بیٹے پر واجب ہوگا۔

علامہ شامی لکھتے ہیں: "وعلیه نفقة زوجة أبیه، أی فی روایة وفی أخری: إن کان الأب مریضًا أو به زمانة یحتاج للخدمة، قال فی المحیط فعلی ہذا لا فرق بین الأب والابن إذا کان ب ھذه المثابة یجبر الأب علی نفقة خادمه، قال فی البحر: وظاہر الذخیرة أن المذهب عدم وجوب نفقة امرأة الأب أو جاریته أو أم ولده حیث لم یکن بالأب علة وأن الوجوب مطلقًا عن روایة أبی یوسف۔ وفی حاشیة الرملی: والذی تحرز من المذهب أنه لا فرق بین الأب والابن فی نفقة الخادم وأنه إذا احتاج أحدهما لخادم وجبت نفقته کما وجبت نفقة المخدوم فکان من جملة نفقته وإذا لم یحتج إلیه فلا تجب" (ردالمحتار ۲/۷۳۱) (مولانا محبوب فروغ، مفتی شبیر احمد قاسمی، مفتی راشد حسین ندوی، قاضی محمد ارمان قاسمی)۔

ائمہ ثلاثہ کا مسلک:

فقہ مالکی:

فقہ مالکی کا جزئیہ ہے:

"وکذا یجب علی الولد اعفاف أبیه بزوجة أو أکثر وإن لم تعفه الواحدة والقول فی ذلك للأب، ویجب علیه الإنفاق علی من یعفه من الزوجات ولو تعددت" (کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ ۴/۵۹۲) (مفتی سعید الرحمن قاسمی بستی، قاضی محمد ریاض ارمان قاسمی)۔

فقہ شافعی:

شوافع کے یہاں اس صورت میں دونوں طرح کے اقوال ہیں، تاہم راجح قول کے مطابق شوافع کے یہاں بھی بوڑھے باپ کی شادی کرانا اولاد کی ذمہ داری ہے۔

"والقول الثانی: نص علیه فی الدعوی والبینات وهو اختیار جمهور أصحابنا أن إعفافه واجب کنفقته، لعموم قوله تعالی: "وصاحبهما فی الدنیا معروفا" وإنکاحه من المعروف" (الحاوی الکبیر ۹/۱۸۴) (مفتی شاہد علی قاسمی)۔

شیخ زکریا انصاری لکھتے ہیں:

"إعفاف الأب الحر ولو کافرًا واجب علی ابنه؛ لأنه من وجوه حاجاته المهمة فیجب علی ابنه القادر علیه کنفقته، ولئلا یعرضه للزنا وذلك لا یلیق بحرمة الأبوة ولیس من المصاحبة بالمعروف المامور بها" (أسنی المطالب ۴/۶۰۷) (مفتی نذیر احمد حسینی)۔

علامہ نووی تحریر فرماتے ہیں:

"یلزم الولد إعفاف الأب والأجداد علی المشهور بأن یعطیه مهر إمرة أو یقول: انکح وأعطیك المهر... ثم علیه مؤنتهما" (منہاج الطالبین ۳/۲۵۸) (مولانا عمر بن یوسف کوکنی، مفتی نذیر احمد حسینی)۔

علامہ رملی فرماتے ہیں:

"یلزمه أی الفرع الحر أو المبعض ذکرًا کان أو أنثی أی مؤنة حتی نحو دواء وأجرة طبیب (الوالد) المعصوم الحر وقنه المحتاج له وزوجته إن إعفافه أو المبعض بالنسبة لبعضه الحر لا المکاتب" (نہایۃ المحتاج ۷/۲۱۸) (قاضی محمد ارمان

قاسمی)۔

مفتی نذیر احمد حسینی لکھتے ہیں:

باپ تنگدست ہو اور اولاد مالدار ہو تو اسی کے ذمہ باپ کی شادی کرانا ہے اور سوتیلی ماں کا نفقہ بھی بچوں کے ذمہ ہے۔

امام نووی لکھتے ہیں:

''ومن وجبت علیه نفقته بالقرابة وجبت نفقته علی قدر الکفایة، لأنها تجب للحاجة فقدرت بالکفایة، وإن احتاج إلی من یخدمه وجبت نفقة خادمه وإن کانت له زوجة وجبت نفقة زوجته؛ لأن ذلك من تمام الکفایة'' (المجموع ۱۹/۴۰۶) (مفتی نذیر احمد حسینی)۔

فقہ حنبلی:

علامہ ابن قدامہ لکھتے ہیں:

''وإذا وجب علیه إعفاف أبیه فهو مخیر إن شاء زوجه حرة وإن شاء ملکه أمة أو دفع إلیه ما یتزوج به حرة أو یشتری به أمة، ولیس للأب التخییر علیه إلا أن الأب إذا عین امرأة وعین الابن أخری وصداقهما واحد قدم تعیین الأب، لأن النکاح له والمؤنة واحدة فقدم قوله'' (المغنی لابن قدامہ ۹/۲۶۴) (قاضی محمد ریاض ارمان قاسمی)۔

علامہ جزیری لکھتے ہیں:

''فعلی الولد أن ینفق علی أبیه المعسر وعلی زوجة أبیه'' (کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ ۴/۵۹۲) (مفتی سعید الرحمن قاسمی بستی)۔

سوال نمبر (۶): بعض اوقات اولاد والد کی زندگی میں ہی جائداد کا مطالبہ شروع کر دیتے ہیں اور اسے اپنا حق سمجھتے ہیں؛ کیا اولاد کے لئے ایسے مطالبہ کی گنجائش ہے؟ خاص کر ایسی صورت میں جب کہ والدین کی معاشی حالت بہتر اور اولاد محتاج ہوں؟

تقریباً تمام فاضل نگاروں کی رائے ہے کہ والدین اپنے مال کے خود مالک ہیں، اس میں وہ اپنے حسب منشا تصرف کرنے کے مجاز ہیں، اولاد کے لئے درست نہیں ہے کہ وہ والدین سے جائیداد کی تقسیم کا مطالبہ کریں، ہاں اگر اولاد نابالغ ہیں یا معذور ہوں تو ان کا نفقہ والد پر واجب ہوگا، البتہ بعض مقالہ نگاروں نے اس شق کا اضافہ کیا ہے کہ والدین اگر چاہیں تو بطور ہبہ اولاد کو جائیداد کا مالک بنا سکتے ہیں، اور بعض فاضل مقالہ نگاروں نے لکھا ہے کہ اگر والدین کو یہ اندیشہ ہو کہ وفات کے بعد تقسیم ترکہ میں اولاد کے درمیان منازعت ہوگی تو بہتر ہے کہ اپنی زندگی ہی میں جائیداد وارثین کے درمیان تقسیم کر دیں۔

ذیل میں فاضل مقالہ نگاروں کی آراء اور دلائل ذیل میں پیش کی جاتی ہیں:

فاضل مقالہ نگاروں کی رائے یہ ہے کہ والد کی زندگی میں اولاد کے لئے جائیداد کا مطالبہ کرنا درست نہیں ہے، البتہ اگر اولاد محتاج ہو یا نابالغ ہو اور والدین کی معاشی حالت اچھی ہو تو اولاد کا نفقہ والدین پر واجب ہوگا (مولانا حیدر علی قاسمی، مفتی عبد المنان، مفتی راشد حسین، مفتی شبیر احمد، قاضی عبد الجلیل قاسمی، مولانا خورشید انور اعظمی، مولانا شاہجہاں، مولانا افتخار احمد مفتاحی، مولانا قمر الدین محمود قاسمی، مولانا حافظ کلیم اللہ عمری، مفتی نذیر احمد حسین، مفتی شاہد علی قاسمی، مفتی جمیل احمد نذیری وغیرہم)۔

مقالہ نگاروں نے لکھا ہے کہ والد جب تک زندہ ہیں وہ اپنی جائیداد کے مالک ہیں، اولاد کا جائیداد کی تقسیم کا مطالبہ کرنا گویا دوسرے کے مال کو ناحق کھانا ہے، جس سے اللہ تعالیٰ نے منع کیا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "یاأیها الذین آمنوا لاتأکلوا أموالکم بینکم بالباطل" (سورہ نساء: ۲۹) (مولانا حیدر علی قاسمی، مولانا شاہجہاں ندوی)۔

نیز کتب احادیث میں بھی طیب خاطر کے بغیر دوسرے کے مال کھانے کو حرام قرار دیا گیا ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

حدیث: ''ألا لاتظلموا لایحل مال امرئ إلا بطیب نفس منه'' (مشکوۃ ۱/۲۵۵) (مولانا حیدر علی قاسمی، مفتی شبیر احمد قاسمی، مولانا شاہجہاں ندوی)۔

فاضل مقالہ نگاروں نے درج ذیل فقہی عبارتیں بھی پیش کی ہیں:

علامہ ابن نجیم تحریر فرماتے ہیں:

۱۔ ''لا يجوز لأحد من المسلمين أخذ مال أحد بغير سبب شرعي'' (الاشباہ والنظائر/۲۷۶) (مولانا حیدر علی)۔

علامہ شامی لکھتے ہیں:

۲۔ ''لا يجوز لأحد من المسلمين أخذ مال أحد بغير سبب شرعي'' (ردالمحتار ۴/۶۱) (مولانا حیدر علی قاسمی)۔

مفتی راشد حسین ندوی لکھتے ہیں:

مورث جو کچھ چھوڑ جائے وہ ترکہ ہے، اس لئے بچوں کا باپ کے مال میں ان کی زندگی میں کوئی حق نہیں ہے۔

شامی میں ہے: والمراد من التركة ما تركه الميت (شامی ۶/۵۳۵)۔

وارثین مورث کے ترکہ کے کب مالک ہوتے ہیں، اس سلسلہ میں مفتی شبیر احمد صاحب نے درج ذیل عبارتیں پیش کی ہیں:

۱۔ ''وأما بيان الوقت الذي يجري فيه الإرث فنقول هذا فصل اختلف المشائخ فيه، قال مشائخ العراق: الإرث يثبت في آخر جزء من أجزاء حياة المورث، وقال مشائخ بلخ: الإرث يثبت بعد موت المورث'' (البحر الرائق ۸/ ۴۸۸) (مفتی شبیر احمد قاسمی)۔

تاتارخانیہ میں ہے:

۲۔ ''الفصل الرابع في بيان الوقت الذي يجري فيه الإرث، هذا فصل اختلف المشائخ رحمهم الله، قال مشائخ العراق: الإرث يجري في آخر جزء من أجزاء حياة المورث، وقال مشائخ بلخ: الإرث يجري بعد موت المورث'' (فتاویٰ تاتارخانیہ ۲۰/۲۱۵) (مفتی شبیر احمد قاسمی)۔

قاضی محمد ریاض ارمان قاسمی نے وراثت پانے کے شرائط بھی تحریر کی ہیں:

موصوف لکھتے ہیں: وراثت پانے کے لئے تین شرطیں ہیں:

''وأركانه ثلاثة: ''وارث ومورث وموروث، وشروطه ثلاثة: موت مورث حقيقة أو حكمًا كمفقود أو تقديرًا كجنين فيه غرة، ووجود وارثه عند موته حيا حقيقة أو تقديرًا كالحمل والعلم بجهة إرثه وأسبابه وموانعه'' (ردالمحتار ۵/ ۶۶۲) (قاضی محمد ریاض ارمان قاسمی)۔

ارباب افتاء کے فتاوے:

۱۔ حضرت مفتی عبدالرحیم صاحب ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں:

آپ مالک ہیں، جن بچوں کو الگ ہونا ہو وہ الگ ہو سکتے ہیں، ان کو آپ سے زبردستی مطالبہ کا حق نہیں ہے (فتاویٰ رحیمیہ ۶/۱۵۰)۔

۲۔ مفتی محمود صاحب لکھتے ہیں:

جب تک باپ زندہ ہے تب تک کسی کو زبردستی لینے کا حق نہیں ہے (فتاویٰ محمودیہ ۱۴/۴۴۱) (مفتی عبدالمنان)۔

۳۔ فتاویٰ محمودیہ میں دوسری جگہ ہے: باپ کو ناگوار گزرے تو اجازت نہیں (فتاویٰ محمودیہ ۲۶/۲۹) (مفتی حیدر علی قاسمی)۔

بعض فاضل مقالہ نگاروں نے لکھا ہے:

اگر اولاد محتاج ہو اور کمانے کے قابل نہ ہو تو اس کا نفقہ اس کے والد پر ہے، اور درج ذیل عبارتیں پیش کی ہیں:

۱۔ ''تجب لولده الكبير العاجز عن الكسب'' (الدر المختار ۲/۲۳۰) (مولانا محمد ریاض ارمان قاسمی)۔

۲۔ ''وإن كانوا ذكورًا بالغين لم يجبر الأب على الإنفاق عليهم لقدرتهم على الكسب إلا من كان منهم زمنا أو أعمى أو مقعدا .... فحينئذ تجب النفقة على الوالد لعجز المنفق عليه عن الكسب وهذا إذا لم يكن للولد مال'' (المبسوط ۵/ ۲۲۲) (مولانا سعید الرحمن قاسمی بستی)۔

دوسری رائے یہ ہے کہ اگر والدین کی وفات کے بعد وارثوں میں منازعت کا اندیشہ ہو تو اولاد کو والد سے جائیداد کے مطالبہ کی گنجائش ہے، اور والد اپنا اور بیوی کا حصہ الگ کر کے جائیداد تقسیم کر سکتا ہے، اور اس صورت میں لڑکے اور لڑکیوں کے درمیان برابری کرنا مستحب ہے۔ (دیکھئے مقالہ مولانا سعید الرحمن قاسمی بستوی، مولانا ابوسفیان مفتاحی)۔

متعدد مقالہ نگاروں نے ہبہ کی تعریف اور اس کے شرائط بھی نقل کئے ہیں، نیز اولاد کو ہبہ کرنے میں برابری ضروری ہے یا نہیں، اس سلسلہ میں ائمہ کے اختلافات وغیرہ، چونکہ اکیڈمی ہبہ کے موضوع پر سمینار منعقد کر چکی ہے اور تجاویز بھی منظور کر چکی ہے، اس لئے ان بحثوں کو حذف کر دیا گیا ہے۔

سوال نمبر (۷): مغربی ملکوں میں عمر دراز لوگوں کے لئے ہاسٹل بنا دیئے گئے ہیں، اب ہندوستان میں بھی جگہ جگہ ایسے ہاسٹل بن رہے ہیں جن میں نوجوان اپنے بزرگوں کو داخل کر دیتے ہیں؛ اس میں ایک پہلو یہ ہے کہ ان عمر دراز حضرات کو ایک جگہ اپنی ضرورت کی چیزیں مہیا ہو جاتی ہیں اور اپنے ہم عمر لوگ مل جاتے ہیں۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ وہ اپنے رشتہ داروں کی محبت سے محروم ہو جاتے ہیں، عمر کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ انسان چاہتا ہے کہ اس کے بال بچے اس کے قریب رہیں، اولاد اور اولاد کی اولاد کو دیکھ کر اس کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں، ایسے ہاسٹلوں میں اس کی یہ خواہش ایک حسرت بن جاتی ہے تو ایسے ہاسٹلوں کے بارے میں شرعی نقطۂ نظر کیا ہے؟ کیا کوئی شخص اپنے بزرگوں کو ایسے ہاسٹلوں میں قیام پر مجبور کر سکتا ہے؟

اس سوال کے جواب میں اکثر مقالہ نگاروں نے لکھا ہے کہ والدین یا ایسے سن رسیدہ افراد کو ان ہاسٹلوں میں رہنے کے لئے مجبور کرنا جائز نہیں ہے، بعض مقالہ نگاروں نے یہ تفصیل کی ہے کہ اگر وہ رہنا چاہیں، تو ان کو داخل کیا جا سکتا ہے، جبکہ بعض مقالہ نگاروں نے لکھا ہے کہ ایسے سن رسیدہ افراد جن کے عزیز و اقارب نہ ہوں، ان کے لئے ایسے ہاسٹلوں کا قیام ایک مستحسن قدم ہے۔

فاضل مقالہ نگاروں کے آراء و دلائل پیش خدمت ہیں:

درج ذیل مقالہ نگاروں نے لکھا ہے کہ والدین کو ایسے ہاسٹلوں میں رہنے پر مجبور کرنا جائز نہیں ہے (مفتی جمیل احمد نذیری، مولانا عمر بن یوسف کوکنی، مولانا قمر الدین محمود قاسمی، مولانا افتخار احمد مفتاحی، قاضی محمد ریاض ارمان قاسمی، مولانا حافظ کلیم اللہ عمری، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مفتی شبیر احمد قاسمی، مولانا حیدر علی قاسمی)۔

مفتی عبد المنان صاحب لکھتے ہیں: والدین کو ان ہاسٹلوں میں رکھنا جائز نہیں اور اگر وہ خود جانا چاہیں تو اولاد کو روکنے کا حق ہے۔

فاضل مقالہ نگاروں نے ان آیات واحادیث سے استدلال کیا ہے، جن میں والدین کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا گیا ہے، یا والدین کی خدمت اور ان کی رضا کو دخول جنت کا سبب قرار دیا گیا ہے، مثلاً اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''وقضى ربك ألا تعبدوا إلا إياه وبالوالدين إحسانا إما يبلغن عندك الكبر أحدهما أو كلاهما فلا تقل لهما أف ولا تنهرهما وقل لهما قولًا كريمًا، واخفض لهما جناح الذل من الرحمة وقل رب ارحمهما كما ربياني صغيرا'' (سورہ اسراء: ۲۴-۲۳) (مولانا خورشید انور اعظمی، مولانا عمر بن یوسف کوکنی، قاضی محمد ریاض ارمان قاسمی، مولانا حافظ کلیم اللہ عمری وغیرہم)۔

علامہ جصاص رازی اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

''وقال هشام ابن عروة عن أبيه ''واخفض لهما جناح الذل من الرحمة'' قال: لا تمنعهما شيئًا يريدانه'' (احکام القرآن للجصاص ۵/ ۲۰)۔

امام قرطبی اس آیت کی تفسیر میں تحریر فرماتے ہیں:

''إما يبلغن عندك الكبر أحدهما أو كلاهما'' خص حالة الكبر، لأنها الحالة التي يحتاجون فيها إلى بره لتغير الحال عليهما بالضعف والكبر، فألزم في هذه الحالة من مراعاة أحوالهما أكثر مما ألزمه من قبل، لأنهما في هذه الحالة

قد صارا كلا عليه فيحتاجان أن يلي منهما في الكبر ما كان يحتاج في صغره أن يليا منه فلذلك خص هذه الحالة بالذكر'' (الجامع لاحکام القرآن للقرطبی ۱۰/۱۵۸) (مفتی شبیر احمد قاسمی)۔

فاضل مقالہ نگاروں نے درج ذیل احادیث سے بھی استدلال کیا ہے۔

۱۔ ''ما أكرم شاب شيخًا بسنه إلا قيض الله له من يكرمه عند سنه'' (ترمذی: ۲۰۲۳) (مولانا عبداللہ خالد)۔

۲۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''رغم أنفه رغم أنفه، رغم أنفه، قيل: من يا رسول الله؟ قال: من أدرك والديه عند الكبر أحدهما أو كلاهما ثم لم يدخل الجنة'' (مسلم)۔

اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے علامہ نووی فرماتے ہیں:

''وقال النووي: معناه أن برهما عند كبرهما وضعفهما بالخدمة والنفقة وغير ذلك سبب لدخول الجنة فمن قصر في ذلك فاته دخول الجنة'' (مرقاة ۷/ ۳۰۸۰) (مولانا خورشید انور اعظمی)۔

مولانا قمر الدین محمود قاسمی نے لکھا ہے کہ:

ایسے ہاسٹلوں میں قیام کے اندر بہت ساری قباحتیں ہیں، جن میں سے ایک یہ ہے کہ ہاسٹل میں مسلم اور غیر مسلم عمر دراز لوگوں کا اجتماع ہوگا، جن میں غیر مسلموں کی اکثریت ہوگی، اور ان کے ساتھ رہنے کی صورت میں ان کے عقائد کفریہ، اور طرز معاشرت سے متاثر ہو سکتے ہیں جو ان کے لئے اخروی اعتبار سے نقصان دہ ہے نیز رشتہ داروں سے تنہائیت ان کے لئے باعث اذیت بھی ہے۔

جبکہ بعض فاضل مقالہ نگاروں نے چند شرطوں کے ساتھ ایسے ہاسٹلوں کے قیام کو جائز قرار دیا ہے۔

مفتی شاہد علی قاسمی لکھتے ہیں:

بعض مرتبہ ایسی مجبوریاں پیش آسکتی ہیں جن میں عمر دراز حضرات کا بیت المعمرین میں رہنا ہی عافیت کا باعث ہوتا ہے، موصوف نے اس سلسلہ میں مختلف صورتیں اور ان کے احکام نقل کئے ہیں:

۱۔ اولاد گھر میں موجود ہو، بوڑھے ماں باپ کی خدمت کرنے میں دقت نہ ہو، گھر میں رہنے کی خواہش ہو، ایسی صورت میں اولاد پر خدمت واجب ہے، بیت المعمرین کے حوالہ کرنا جائز نہیں ہے۔

۲۔ اولاد گھر میں موجود نہ ہو، باپ کی خواہش گھر میں رہنے کی ہو تو اگر اولاد مستطیع ہو تو بوڑھے باپ کے لئے خادم کا نظم کرنا واجب ہے، ہاسٹل کے حوالہ کرنا جائز نہیں۔

۳۔ اگر اولاد معاشی مجبوری کی وجہ سے ماں باپ سے دور ہو اور تنگ دستی کی بنیاد پر خادم نہیں رکھ سکتا ہو تو ایسی صورت میں ہاسٹل میں منتقل کرنا قبیح نہیں ہے (ملخص از فتاوی الشبکۃ الاسلامیہ ۱۳/ ۴۳)۔

مولانا خورشید انور اعظمی لکھتے ہیں:

ایسے ہاسٹل کے قیام میں بظاہر کوئی شرعی قباحت نہیں ہے بلکہ اگر اس میں بوڑھوں کے ذہن ومزاج، ان کی نفسیات اور جملہ ضروریات زندگی کا خیال رکھا گیا ہو تو یہ بہتر اقدام ہے، البتہ بچوں کی ذمہ داری بنتی ہے کہ موقع بموقع پہنچ کر ان کی خبر گیری کرتا رہے۔ لیکن اگر کوئی بوڑھا شخص وہاں رہنے پر آمادہ نہیں ہے تو ایسے میں ہاسٹل میں رہنے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا۔

قاضی عبدالجلیل قاسمی لکھتے ہیں:

عمر دراز لوگوں کی مرضی کے بغیر ان کو ہاسٹلوں میں داخل کرنا جائز نہیں ہے، البتہ اگر وہ رضامند ہوں اور ان کے ضروریات کی کفالت کی جائے تو کوئی حرج نہیں ہے (مولانا راشد حسین ندوی)۔

مولانا شاہجہاں ندوی لکھتے ہیں:

ایسے عمر دراز حضرات جن کے قریبی رشتہ دار واعزہ موجود نہ ہوں، ان کے لئے ہاسٹل بنانا تا کہ ہم عمر لوگوں کے ساتھ زندگی گزار سکیں، مستحسن ہے۔ البتہ جن کے اولاد یا قریبی رشتہ دار موجود ہوں، ان کو اس طرح کے ہاسٹلوں میں قیام پر مجبور کرنا درست نہیں۔

قاضی محمد ریاض ارمان قاسمی نے انٹرنیشنل اسلامک فقہ اکیڈمی جدہ کی درج ذیل تجاویز نقل کی ہیں:

''آدم کی اولاد کی حیثیت سے اسلام نے ہر انسان کے لیے عزت وتکریم کا جو اصول طے کیا ہے، اس کی رو سے اسلام نے انسان کی زندگی کے تمام مراحل کو اہمیت دی ہے اور اس سلسلہ میں آیات اور احادیث اسلام کی بنیاد ہیں، جیسے "لقد کرمنا بنی آدم" (سورہ اسراء: ۷۰) اور "وقضی ربك ألا تعبدوا إلا إياه وبالوالدين إحسانا" (سورہ اسراء: ۲۳) اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہے: "ما أكرم شباب شيخا لسنه إلا قيض الله لهم من يكرمه عند سنه" (جب بھی کوئی نوجوان کسی بوڑھے کا اکرام اس کی درازی عمر کی وجہ سے کرتا ہے تو اللہ تعالی اس کے لئے ایسے لوگ تیار کر دیتا ہے جو خود اس کے بوڑھاپے کے وقت اس کی عزت واکرام کریں گے) (ترمذی شریف) اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول ہے: "ليس منا من لم يرحم صغيرنا ويعرف شرف كبيرنا" (وہ ہمارے طریقہ پر نہیں ہے جس نے ہمارے چھوٹے پر رحم نہیں کیا اور ہمارے بڑے کے مقام عزت کو نہیں پہچانا) (ترمذی واحمد)۔

اس کی روشنی میں اکیڈمی یہ فیصلہ کرتی ہے کہ:

(۱) بوڑھوں کو جسمانی، روحانی اور اجتماعی صحت کی حفاظت کرنے والی چیزوں سے واقف کرایا جائے، انہیں مسلسل وہ دینی احکام بتائے جائیں جن کی ان کو اپنی عبادات، معاملات اور دوسرے احوال میں ضرورت پیش آتی ہے، اور اپنے رب سے تعلق اور اس کی بخشش ومغفرت کے ساتھ حسن ظن کو مضبوط بنایا جائے۔

(۲) ان کو سوسائٹی کا ایک حصہ بنانے اور ان کے تمام انسانی حقوق کا پاس ولحاظ رکھنے پر زور دیا جائے۔

(۳) ان کے خاندان ہی ان کے لئے بنیادی جگہ ہوں تا کہ وہ عائلی زندگی کا لطف اٹھا سکیں، ان کے بیٹے اور پوتے ان کے ساتھ حسن سلوک کریں، وہ اپنے اقرباء واحباب اور پڑوسیوں کے حسن سلوک سے لطف اندوز ہوں، اگر ان کے اپنے خاندان نہ ہوں تو مناسب ہے کہ ان کے لئے اولڈ ہاؤسز میں گھریلو ماحول فراہم کیا جائے۔

(۴) سوسائٹی کو بوڑھوں کے مقام ومرتبہ اور ان کے حقوق سے تعلیم وتربیت کے کورسز اور ٹی وی پروگراموں کے ذریعہ آگاہ کیا جائے، ساتھ ہی والدین کے ساتھ حسن سلوک پر زور دیا جائے۔

(۵) ان بوڑھوں کی خبر گیری کے لئے سنٹر بنائے جائیں جن کا کوئی خاندان نہ ہو یا جن کے گھرانے ان کی خبر گیری نہ کر سکتے ہوں (انٹرنیشنل اسلامک فقہ اکیڈمی جدہ کے شرعی فیصلے، ص: ۳۴۳)۔

سوال نمبر (۸): بوڑھاپے کی عمر میں اگر انسان کا ہاتھ خالی ہو تو اسکی بے سہارگی اور بڑھ جاتی ہے اور اگر اسکی اولاد یا قریبی رشتہ دار موجود نہ ہوں تب تو انسان اپنے آپ کو اس دنیا میں تنہا محسوس کرنے لگتا ہے؛ کیا ایسے لوگوں کی اجتماعی کفالت کے لئے خصوصی طور پر زکوۃ کی رقم استعمال کی جاسکتی ہے؟

اس سوال کے جواب میں فاضل مقالہ نگاروں نے لکھا ہے کہ اگر سن رسیدہ افراد فقیر ومحتاج ہوں تو وہ زکاۃ کے مصارف میں ہیں اور ان کو زکاۃ کی رقم دی جاسکتی ہے، بعض مقالہ نگاروں کی رائے یہ ہے کہ اجتماعی کفالت اس طرح کی جائے کہ تملیک کی صورت پیدا ہو جائے تو یہ تعاون علی البر کی ایک شکل ہوگی، جبکہ مفتی سعید الرحمن بستوی نے لکھا ہے کہ ایسے ہاسٹل کا قیام جہاں اجتماعی کفالت ہو درست ہے اور ان سن رسیدہ افراد کی حیثیت مدارس کے طلبہ کی ہوگی اور ایسے ہاسٹلوں کے ذمہ دار کی حیثیت مہتممین کی ہوگی۔

اس خلاصہ کے بعد فاضل مقالہ نگاروں کے آراء ودلائل پیش کئے جاتے ہیں:

اگر بوڑھا آدمی غریب، محتاج اور بے سہارا ہو اور اس کی اولاد یا کوئی قریبی رشتہ دار موجود نہ ہو جو اس کی دیکھ ریکھ کر سکے، تو اس کی اجتماعی کفالت درست ہے، بشرطیکہ اداء زکاۃ میں تملیک کی رعایت ہو رہی ہو (مولانا خورشید انور اعظمی، مولانا افتخار احمد مفتاحی، مولانا حافظ کلیم اللہ عمری، مولانا حفیظ الرحمن مدنی، مولانا شاہجہاں

ندوی، قاضی عبدالجلیل قاسمی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مفتی ابوبکر قاسمی، مفتی جمیل احمد نذیری، مولانا عمر بن یوسف کوکنی، مولانا قمر الدین محمود قاسمی، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مفتی راشد حسین ندوی، قاضی محمد کامل قاسمی، مفتی صبیح اختر قاسمی وغیرہم)۔

مفتی سعید الرحمن قاسمی بستوی لکھتے ہیں:

بوڑھے حضرات بے سہارا اور محتاج ہوں، اولاد یا قریبی رشتہ دار نہ ہوں تو ان کا اجتماعی کفالت کے لئے خصوصی طور پر زکاۃ کی رقم استعمال کی جاسکتی ہے جس طرح غریب طلبۂ مدارس عربیہ کے لئے استعمال کی جاتی ہے، ان اداروں کے ذمہ داروں کی بھی وہی حیثیت ہونی چاہئے، جو مدارس کے مہتمین کی ہوتی ہے۔

مفتی شبیر احمد قاسمی نے اس سوال کا محمل متعین کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اگر ضعیف اور کمزور لوگوں کو ایک جگہ ہاسٹل میں جمع کر کے ان کی اجتماعی کفالت کے لئے زکاۃ اکٹھا کرنے کی بابت یہ سوال ہے تو شریعت اس کی اجازت ہی نہیں دیتی کہ رشتہ داروں سے الگ کر کے ان کو کسی ہاسٹل میں داخل کر دیا جائے، بلکہ ان کے رشتہ داروں کی ذمہ داری ہے کہ ان کی کفالت کرے، یا زکاۃ کی رقم ان کو دے کر باضابطہ ان کو مالک بنا دیا جائے۔

فاضل مقالہ نگاروں نے درج ذیل آیات اور کتب فقہ کی عبارتوں سے استدلال کیا ہے:

مولانا خورشید انور اعظمی نے لکھا ہے: یہ نیک کام میں تعاون ہے، جس کا قرآن میں حکم دیا گیا ہے: "وتعاونوا علی البر والتقوی" (سورہ مائدہ: ۲)۔

علامہ قرطبی اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

''وهو أمر لجميع الخلق بالتعاون على البر والتقوى أي ليعين بعضكم بعضًا'' (تفسیر قرطبی ۶/۴۶)۔

فاضل مقالہ نگاروں نے درج ذیل آیت قرآنی سے استدلال کیا ہے:

"إنما الصدقات للفقراء والمساكين والعاملين عليها والمؤلفة قلوبهم وفي الرقاب والغارمين وفي سبيل الله وابن السبيل" (سورہ توبہ: ۶۰) (مولانا قمر الدین محمود قاسمی، مولانا افتخار احمد مفتاحی، مولانا شاہجہاں ندوی، مفتی راشد حسین ندوی، مولانا قمر الزماں ندوی، مفتی امانت علی قاسمی، مفتی ظہیر احمد قاسمی)۔

مقالہ نگاروں نے زکوۃ کی ادائیگی کے شرائط بھی کتب فقہ سے نقل کئے ہیں، چند عبارتیں درج ذیل ہیں:

علامہ حصکفی لکھتے ہیں:

۱۔ ''ويشترط أن يكون الصرف (تمليكا) لا إباحة''۔

علامہ شامی اس پر تعلیق فرماتے ہیں:

''قوله تمليكا: فلا يكفي فيها الإطعام إلا بطريق التمليك ولو أطعمه عنده ناويا الزكاة لا تكفي'' (الدر المختار مع رد المحتار ۲/ ۳۴۴) (مولانا خورشید انور اعظمی، مفتی امانت علی قاسمی، مفتی محمد الیاس)۔

صاحب تاتارخانیہ لکھتے ہیں:

۲۔ ''إن الحيلة أن يتصدق على الفقير ثم يأمره بفعل هذه الأشياء، والحيلة من أراد ذلك أن يتصدق ينوي الزكاة على فقير، ثم يأمر بعد ذلك بالصرف إلى هذه الوجوه، فيكون لصاحب المال ثواب الصدقة، ولذلك الفقير ثواب هذه الصرف'' (فتاوی تاتارخانیہ ۳/ ۲۰۸) (مولانا عبد اللہ خالد)۔

۳۔ ''واعلم أن التمليك شرط، قال تعالى: وآتوا الزكاة، والإيتاء: الإعطاء، والإعطاء التمليك فلا بد فيها من قبض الفقير أو نائبه، لأن التمليك لا يتم بدون القبض'' (الاختیار لتعلیل المختار ۱/ ۱۲۱) (مفتی شبیر احمد قاسمی)۔

امام نووی فرماتے ہیں:

۴۔ ''إذا دعى أنه لا كسب له فإن كان ظاهره عدم الكسب كشيخ هرم أو شاب ضعيف ونحوهما قبل قوله بغير يمين

بلا خلاف، لأن الأصل والظاهر عدم الكسب'' (المجموع ۶/ ۱۸۲) (مفتی نذیر احمد حسینی)۔

ڈاکٹر وہبہ زحیلی زکاۃ کی تملیک اور اس کے مصارف کے سلسلہ میں جمہور فقہاء کا موقف واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

۶۔ ''اتفق جماهير فقهاء المذاهب على أنه لا يجوز صرف الزكاة إلى غير من ذكر الله تعالى من بناء المساجد والجسور والقناطر والسقايات وكرى الأنهار وإصلاح الطرقات وتكفين الموتى وقضاء الدين والتوسعة على الأضياف وبناء الأسوار ونحو ذلك من القرب التي لم يذكرها الله تعالى مما لا تمليك فيه'' (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۲/ ۸۷۵) (مولانا خورشید انور اعظمی، مفتی راشد حسین ندوی)۔

مولانا خورشید انور اعظمی نے مفتی محمد شفیع صاحب کا یہ اقتباس نقل کیا ہے:

جمہور فقہاء اس پر متفق ہیں کہ زکاۃ کے معینہ آٹھ مصارف میں سے کسی مستحق کو مال زکوۃ پر مالکانہ قبضہ دیدیا جائے، بغیر مالکانہ قبضہ دیئے اگر کوئی مال ان ہی لوگوں کے فائدے کے لئے خرچ کردیا تو زکوۃ ادا نہیں ہوگی، اسی وجہ سے ائمہ اربعہ اور جمہور فقہاء امت اس پر متفق ہیں کہ زکوۃ کی رقم کو مساجد یا مدارس یا شفاخانے یا یتیم خانے کی تعمیر میں یا ان کی دوسری ضروریات میں صرف کرنا جائز نہیں ہے (معارف القرآن ۴/ ۲۰۹)۔

سوال نمبر (۹): عمر دراز لوگوں کے لئے حکومتوں نے مختلف چیزوں میں بعض خصوصی رعایتیں رکھی ہیں، جیسے ٹرین وغیرہ میں کرایہ میں تخفیف، حکومت کی طرف سے امدادی وظیفہ، ٹیکس میں رعایت وغیرہ؛ جو لوگ ان رعایتوں کے لئے مطلوب مقررہ حد عمر کو نہ پہنچے ہوں، کیا ان کے لئے ایسی رعایتوں سے فائدہ اٹھانا جائز ہوگا؟

اس سوال کے جواب میں تقریباً تمام مقالہ نگاروں کی رائے یہ ہے کہ حکومتوں کی طرف سے مقررہ عمر کو پہنچنے کے بعد جو رعایتیں اور سہولتیں ملتی ہیں، ان سے مقررہ عمر کے حامل اشخاص کا فائدہ اٹھانا جائز ہے اور جو لوگ اس مطلوبہ عمر کو نہ پہنچے ہوں، ان کے لئے اس سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں ہے۔

مفتی شبیر احمد صاحب نے ایک شق یہ بڑھایا ہے کہ اگر کسی کی عمر قمری سن کے لحاظ سے پوری ہوگئی ہو، لیکن شمسی لحاظ سے پوری نہ ہوئی ہو تو وہ بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں، اس خلاصہ کے بعد فاضل مقالہ نگاروں کی آراء و دلائل ذکر کی جاتی ہیں:

فاضل مقالہ نگاروں نے لکھا ہے کہ

عمر دراز لوگوں کے لئے حکومت کی طرف سے خصوصی رعایتیں جیسے ٹرین کرایہ میں تخفیف، حکومت کی طرف سے وظیفہ اور ٹیکس میں رعایت وغیرہ اگر عمر دراز حضرات ان خصوصی رعایتوں کے مستحق ہیں اور اس رعایت کے لئے مطلوبہ شرائط کو پورا کرتے ہیں تو ان کے لئے یہ رعایت حاصل کرنا جائز ہے، لیکن اگر کوئی شخص اس خصوصی رعایت کے لئے مطلوبہ شرائط کو پورا نہ کرتا ہو تو اس کے لئے جھوٹ بول کر یہ رعایت حاصل کرنا جائز نہیں ہے اور یہ غش، خداع اور سرقہ میں شامل ہے۔

(مفتی امانت علی قاسمی، قاضی محمد ریاض ارمان قاسمی، قاضی محمد کامل قاسمی، مولانا علاء الدین، مفتی عبد المنان، مفتی راشد حسین ندوی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، قاضی عبد الجلیل قاسمی، مولانا شاہجہاں ندوی، مولانا محبوب فروغ احمد، مولانا حفیظ الرحمن مدنی، مولانا حافظ کلیم اللہ عمری، مولانا محمد انیس ندوی، مولانا افتخار احمد مفتاحی، مولانا قمر الدین محمود قاسمی، مفتی شاہد علی قاسمی، مفتی جمیل احمد نذیری، مفتی محمد الیاس قاسمی وغیرہم)۔

مفتی شبیر احمد قاسمی صاحب نے لکھا ہے کہ خصوصی رعایتوں کے لئے مطلوبہ حد کے بارے میں سرکاری قانون میں علی الاطلاق اس کی تحدید ہے، شمسی یا قمری کی کوئی قید نہیں ہے، لیکن غیر اسلامی سرکاری قوانین میں شمسی سن مراد لئے جاتے ہیں، جبکہ اسلامی سرکاری قوانین میں قمری سن مراد لئے جاتے ہیں، اگر کوئی شخص قمری حساب سے مطلوبہ عمر کو پہنچ گیا ہو، لیکن شمسی اعتبار سے نہ پہنچا ہو، تو اس کے لئے اس سے فائدہ اٹھانے کی گنجائش ہے اور جن امور میں رعایت حاصل کرنے کا مدار آئی ڈی دیکھنے پر ہے ان میں آئی ڈی میں درج کردہ تاریخوں کا اعتبار ہوگا۔

مولانا عمر بن یوسف کوکنی لکھتے ہیں:

یہ رعایتیں حکومت کی طرف سے تبرع اور عطیہ ہے اور حکومت مطلوب مقررہ حد عمر کو پہنچنے والے افراد کو دینا چاہتی ہے، نہ کہ ان کے علاوہ کسی اور کو۔

موصوف نے درج ذیل عبارت سے استدلال کیا ہے:

علامہ ابن حجر مالکی لکھتے ہیں:

''ومن أعطى لوصف يظن به كفقر أو صلاح أو نسب بأن توفرت القرائن إنه إنما أعطى بهذا القصد أو صرح له المعطى بذلك وهو باطنا بخلافه حرم عليه الأخذ مطلقًا، ويجرى ذلك فى الهدية على الأوجه. ومثلها سائر عقود التبرع فيما يظهر كهبة ووصية ووقف ونذر'' (تحفة المحتاج ۸/ ۷۵۲)۔

فاضل مقالہ نگاروں نے درج ذیل احادیث سے استدلال کیا ہے:

۱۔ ''من حمل علينا السلاح فليس منا ومن غشنا فليس منا'' (صحیح مسلم ۱/ ۷۰) (قاضی محمد ریاض ارمان قاسمی، مولانا محمد شاہجہاں ندوی، مولانا حفیظ الرحمن مدنی، مولانا حافظ کلیم اللہ عمری، مفتی عبداللہ خالد، مفتی خورشید انور اعظمی وغیرہم)۔

صاحب تحفۃ الاحوذی اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''وهو يدل على تحريم الغش وهو مجمع عليه'' (تحفۃ الاحوذی ۱/ ۲۴۵) (مفتی نذیر احمد حسینی)۔

۲۔ ''لا يؤمن العبد الإيمان كله حتى يترك الكذب فى المزاح والمراء وإن كان صادقًا'' (مسند احمد) (مولانا افتخار احمد مفتاحی)۔

۳۔ ''كبرت خيانة أن تحدث أخاك حديثا هو لك به مصدق وأنت به كاذب'' (سنن ابی داؤد ۴/ ۲۴۹، حدیث: ۴۹۷۱) (مفتی امانت علی قاسمی)۔

۴۔ ''يطوى المؤمن على الخلائق كلها غير الخيانة والكذب'' (مصنف ابن ابی شیبہ حدیث: ۲۵۶۸) (مفتی امانت علی قاسمی)۔

مولانا محمد حذیفہ نے درج ذیل قاعدہ فقہیہ سے استدلال کیا ہے:

امور مباحہ میں حکومت کے قانون کی پابندی لازم ہے اور اس کی خلاف ورزی گناہ ہے۔

''التصرف على الرعية منوط بالمصلحة''۔

علامہ احمد زرقاء اس کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''أى إن نفاذ تصرف الراعى على الرعية ولزومه عليهم شاءوا أو أبوا معلق أو متوقف على وجود الثمرة والمنفعة فى ضمن تصرفه دينية كانت أو دنيوية، فإن تضمن منفعة ما وجب عليهم تنفيذه وإلا رد'' (شرح القواعد: ۳۰۹)۔

☆☆☆

عرض مسئلہ:

اسلام میں معذوروں اور بوڑھوں کے حقوق
(سوال نمبر ۱، ۲، ۳)

مفتی ظہیر احمد[1]

نحمدالله ونصلی علی رسوله الکریم

محترم حضرات اساتذہ کرام، علماء ومشائخ عظام دامت برکاتہم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

احقر کے ذمہ ''اسلام میں معذوروں اور بوڑھوں کے حقوق'' سے متعلق پہلے تین سوالات کا عرض ہے، ان تینوں سوالات سے متعلق مجھے کل ۷ ۳ مقالات موصول ہوئے، مجموعی طور پر تینوں سوالات میں مقالہ نگار حضرات کا کوئی خاص اختلاف نہیں، سوائے علاج کے سلسلہ میں چند آراء ہیں، جن کو میں ذکر کروں گا، پہلے متفق علیہ نکات کی طرف نشاندہی کرتا ہوں جو پانچ ہیں، پھر چھٹا نکتہ علاج کے سلسلہ میں ہے جس میں اختلاف ہے۔

۱- اصولی طور پر انسان کا نفقہ خود اس کے اپنے مال میں واجب ہے، اگر اس کے پاس مال ہے، سوائے بیوی کے نفقہ کے، پھر اگر اس کے پاس مال نہیں ہے اور وہ کمانے پر قادر ہے تو اس کو اپنی کمائی سے کھانا چاہئے۔

اسلام نے خودداری اور اپنی کمائی پر انحصار کرنے کی تاکید کی ہے، بلاضرورت سوال کرنے اور دوسروں سے مانگنے کی مذمت اور حوصلہ شکنی کی ہے، متعدد احادیث اس پر شاہد ہیں۔

الف- ایک صحابی نے امداد طلب کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا کہ تمہارے پاس کیا ہے؟ انہوں نے کہا کہ میرے پاس ایک ٹاٹ کا کپڑا اور پیالہ ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں کو دو درہم میں نیلام فرما کر ایک درہم گھر کے خرچ کے لئے اور دوسرے سے کلہاڑی خرید کر لانے کی ہدایت فرمائی، یہ ایک مشہور حدیث ہے پورا واقعہ ذکر کرنے کی ضرورت نہیں (سنن ابوداؤد حدیث نمبر: ۱۶۴۳)۔

ب- حضرت قبیصہؓ مقروض ہو گئے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ سوال کرنا صرف تین اشخاص کے لئے درست ہے ۱- مقروض جس سے اس کا قرض ادا نہ کیا جاتا ہو، ۲- جس پر ناگہانی مصیبت آپڑی ہو، ۳- جو شخص فقر و فاقہ میں مبتلا ہو (صحیح مسلم حدیث ۲۴۵۱)۔

غرضیکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مال اور اپنی کمائی سے ہی کھانے کی تعلیم مرحمت فرمائی ہے، چنانچہ بخاری کی ایک روایت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''ما أكل أحد طعاما قط من أن يأكل من عمل يديه، وإن نبي الله داؤد عليه السلام كان يأكل من عمل يديه'' (رواه البخاري، مرقاة ۲/ ۲۸۶) (کہ کبھی بھی کسی نے کوئی اس کھانے سے بہتر نہیں کھایا جو اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کی کمائی سے کھایا ہو اور حضرت داؤد علیہ الصلاۃ والسلام اپنے دونوں ہاتھوں کے عمل کی کمائی سے کھاتے تھے)۔

اس میں دونوں ہاتھوں کا تذکرہ اس لئے ہے کہ عموماً کمائی اور کسب میں دونوں ہاتھوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک دوسری روایت میں ہے:

---

[1] المعہد للدراسات العالیۃ الاسلامیہ، کانپور۔

''إن أطيب ما أكلتم من كسبكم، وإن أولادكم من كسبكم فكلوه هنيئا مريئا'' (نيل الأوطار/ ۱۱۱۲، ترمذی حديث: ۱۳۵۸)

ایک اور روایت میں اس طرح آتا ہے:

''إن أطيب ما أكل الرجل من كسبه، وإن ولده من كسبه'' (نسائی ۱/ ۱۸۶، حدیث نمبر: ۴۴۵۷)۔

ایک اور روایت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''إن رجلا جاء إلى النبی ﷺ فقال: إن لی مالا، وإن والدی يحتاج إلى مالی، قال: أنت ومالك لوالدك، إن أولادكم من أطيب كسبكم كلوا من كسب أولادكم'' (رواہ البخاری، مرقاۃ ۳/ ۸۲۶)۔

۲- اس بات پر بھی تمام مقالہ نگار حضرات متفق ہیں کہ تمام فقہاء کے نزدیک والدین کا نفقہ ان کے محتاج (فقیر) اور کسب پر قادر نہ ہونے کی صورت میں اولاد پر واجب ہے، البتہ اگر والدین کمائی پر قادر ہوں تو حنابلہ، مالکیہ اور شمس الائمہ الحلوانی کے نزدیک اولاد پر نفقہ واجب نہ ہوگا، بلکہ والدین کو اپنے کسب کردہ سرمایہ پر گزارہ کرنا ہوگا، تاہم حنفیہ اور شافعیہ کے نزدیک والدین کو ان کے کمائی پر قادر ہونے کے باوجود کمائی اور کسب کرنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا، ان کا نفقہ اولاد پر واجب ہوگا، خواہ وہ اولاد مالدار ہو یا کسب پر قادر ہو۔

''وقوله: إذا كانوا فقراء يوافق باطلاقه قول السرخسی حيث قال: إذا كان الأب قادرا على الكسب يجبر الابن على نفقته، بخلاف قول الحلوانی (إلى) فالمعتبر فی إيجاب نفقة الوالدين مجرد الفقر، قيل: هو ظاهر الرواية؛ لأن معنى الأذى فی إيكاله إلى الكد والتعب أكثر عنه فی التافيف المحرم بقوله تعالى: '' ولا تقل لهما أف'' (الفتاوی الهندية: ۱/ ۵۶۴، فتح القدير ۴/ ۲۲۰، الفقه الاسلامی وأدلته ۱۰/ ۷۳۵۸، الهداية مع الفتح ۴/ ۲۲۴، ردالمحتار ۵/ ۳۵۵، زكريا ديوبند، الموسوعة الفقهيه ۴۱/ ۷۵، الفتاوی التاتارخانيه ۵/ ۴۲۵۴۲۶)۔

۳- والدین کے علاوہ دیگر اور بزرگوں کا نفقہ ان کے اعزہ واقارب پر اس وقت واجب ہوگا، جبکہ ان میں فقر کے ساتھ ساتھ عجز بھی پایا جاتا ہو، اگر والدین کے علاوہ بزرگ حضرات کسب معاش پر قادر ہیں ان کا نفقہ ان کے اعزہ پر واجب نہ ہوگا، بلکہ ان کو کسب پر مجبور کیا جاسکتا ہے۔

''قال العلامة الكاسانی فی كتابه بدائع الصنائع: أحدها إعساره، والثانی عجزه عن الكسب، حتى لوكان صحيحا مكتسبا لايقضى له بالنفقة على غيره، وإن كان معسرا'' (بدائع الصنائع ۴/ ۳۵) ''وكذا جاء فی الهداية: النفقة لكل ذی رحم محرم إذا كان صغيرا فقيرا أوكانت امرأة بالغة فقيرة أو كان ذكرا بالغا فقيرا زمنا أو أعمى ويجب ذلك على مقدار الميراث ويجبر عليه'' (بدايه مع الفتح ۴/ ۲۲۴، شرح الوقايه ۲/ ۱۸۴، الفقه الاسلامی وأدلته ۱۰/ ۷۳۵۳)

۴- والدین اگر محتاج (فقیر) ہونے کے ساتھ ساتھ عاجز من الکسب ہوں تو پھر اولاد کے فقیر ہونے کے باوجود عاجز من الکسب والدین کا نفقہ ان کی فقیر اولاد پر بھی واجب ہوگا، بشرطیکہ اولاد قادر علی الکسب ہو، عاجز نہ ہو، خواہ اپنی فاضل کمائی ان پر خرچ کرکے یا ان کو اپنے اہل وعیال کے ساتھ رکھ کر ان کا خیال رکھا جائے۔

''حيث جاء فی ردالمحتار: والحاصل أنه يشترط فی نفقة الأصول اليسار على الخلاف المار فی تفسيره، إلا إذا كان الأصل زمنا لا كسب له فلا يشترط سوى قدرة الولد على الكسب، فإن كان لكسبه فضل أجبر على إنفاق الفاضل'' (ردالمحتار ۵/ ۳۵۲، زکریا دیوبند)۔

''وأيضا لايجب على الابن الفقير نفقة والده الفقير حكما، إلا أن كان والده زمنا لايقدر على العمل وللابن عيال، فعليه أن يضمه إلى عياله وينفق على الكل'' (ردالمحتار ۱/ ۳۵۲)۔

۵- تیسرا سوال کہ بوڑھے والدین یا خاندان کے وہ بڑے جن کا نفقہ انکے چھوٹوں پر محتاجی کی صورت میں واجب ہے اگر وہ محتاج نہ ہوں خود صاحب ثروت

ہوں تب بھی وہ اپنی اولاد سے یا ان لوگوں سے جن پر بحالت حاجت نفقہ واجب ہوتا ہے زیادہ سہولت کے لئے یا دوسرے لوگوں پر خرچ کرنے کے لئے یا کچھ رقم محفوظ کرنے کے لئے زائد رقم کا مطالبہ کرسکتے ہیں؟

اس کے جواب میں تقریباً تمام مقالہ نگار حضرات متفق ہیں، اختلاف صرف جزوی اور تعبیراتی معلوم ہوتا ہے، کہ صاحب ثروت والدین کے مطالبہ کو پورا کرنا واجب تو نہیں ہے، مگر اولاد کو اپنے والدین کی ہر ضرورت اور جائز خواہش کا احترام کرتے ہوئے ان کے مزید رقم کے مطالبہ کو پورا کرنے میں اپنی سعادت مندی سمجھنی چاہئے، جس طرح انہوں نے صغر سنی میں ہماری ہر ضرورت اور خواہش کا خیال رکھا، چنانچہ ارشاد باری ہے: "رب ارحمهما كما ربياني صغيرا"۔ چنانچہ چند مقالہ نگار حضرات کی رائے ہے کہ "اگر اولاد صاحب مال ہو تو والدین سے زائد رقم کا مطالبہ کرسکتے ہیں (مفتی ضیاء الدین، مفتی شاہد علی، مفتی محمد ارشاد صاحب پالنپوری)۔

اگر اولاد کو ضرر نہ ہو تو لے سکتے ہیں، لیکن امر تبرع ہے (مفتی عبدالرزاق، مفتی ریاض ارمان قاسمی)۔

زائد رقم کا مطالبہ امر مباح ہے (مفتی سعید الرحمن)۔

خوشی سے دیں تو لے سکتے ہیں، مجھے کتاب وسنت میں کوئی اشارہ نہیں ملا ہے (مولانا ابوسفیان مفتاحی)۔

دنیاوی ودینی ضرورت کے واسطے زائد رقم کا مطالبہ کرسکتے ہیں (مولانا محمد آزاد بیگ قاسمی، مفتی عبدالمنان)۔

جس حد تک اولاد پورا کرسکے پورا کرنا چاہئے (مفتی جمیل احمد نذیری)۔

زائد رقم کا مطالبہ والدین کے لئے مناسب نہیں (مولانا خورشید انور اعظمی)۔

زائد رقم کا مطالبہ درست معلوم نہیں ہوتا (مولانا قمر الزماں ندوی)۔

زائد رقم کا مطالبہ جائز نہیں (مفتی محمد الیاس، مولانا صبیح اختر، مفتی نذیر احمد، قاضی عبدالجلیل قاسمی، مولانا فیضان احمد، مفتی محمد شاہجہاں ندوی)۔

اگر اولاد کو ان کے مطالبہ کو پورے کرنے میں مشقت نہ ہو تو ان کے مطالبے پورے کرنا واجب ہے (مفتی محمد عثمان گورینی)۔

دلائل:

"ولأبويه وأجداده وجداته لو فقراء كنز الدقائق... وشرط الفقر، لأنه لو كان ذا مال فإيجاب النفقة في ماله أولى من إيجابها في مال غيره" (البحر الرائق زکریا ۴/ ۳۴۸)، "ايضا جاء في نفس الكتاب: فالمعتبر في إيجاب نفقة الوالدين مجرد الفقر، وجاء في بدائع الصنائع: إذا كان مستغنيا بماله كان إيجاب النفقة في ماله أولى من إيجابها في مال غيره" (بدائع الصنائع ۴/ ۳۴ بیروت، وكذا جاء في التاتار خانیہ ۵/ ۲۹۴۳۰ رقم ۸۳۴۸)۔

۶- علاج کے سلسلہ میں مقالہ نگار حضرات میں اختلاف ہے اور اس میں چار آراء ہیں:

پہلی رائے:

اکثر مقالہ نگار حضرات نے نفقہ کی طرح علاج کو بھی واجب قرار دیا ہے، علاج کو نفقہ کا ہی حصہ قرار دیا ہے، اس رائے کے قائلین حسب ذیل ہیں: ڈاکٹر مفتی محمد شاہجہاں ندوی، مولانا راشد حسین ندوی، مفتی عبدالرزاق امروہہ، مفتی شاہد علی قاسمی، مفتی عبدالمنان قاسمی (آسام)، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مفتی قمر الزماں ندوی، مفتی آزاد بیگ قاسمی، مولانا انوار الحق ہلالی، مولانا محمد احسن عبدالحق ندوی، قاضی محمد ریاض ارمان قاسمی۔

ان میں سے اکثر حضرات نے نفقہ کے ضمن میں شامل کیا ہے اور نفقہ ہی کے دلائل پر اکتفاء کیا ہے، جبکہ چند حضرات نے علاج کے سلسلہ میں تفصیل سے گفتگو کی ہے اور مدلل انداز میں اپنی بات رکھی ہے۔

ڈاکٹر مفتی محمد شاہجہاں ندوی صاحب نے "سنن ابی داؤد" کی حدیث سے استدلال کیا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"تداووا فإن الله عزوجل لم يضع داء إلا وضع له دواء غير داء واحد: الهرم" (ابوداؤد حدیث: ۳۸۵۵)

(یعنی علاج کراؤ کیونکہ اللہ عز وجل نے کوئی ایسی بیماری نہیں رکھی ہے جس کی دواء پیدا نہ کی ہو، سوائے ایک بیماری یعنی بڑھاپے کے)۔

اور اس پر ابن حزم کا قول ذکر کیا ہے، علامہ ابن حزم فرماتے ہیں: ''أمره عليه السلام بالتداوي نهي عن تركه'' (ابن حزم المحلی ۶/ ۹۶)
(یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا علاج کرانے کا حکم دینا علاج ترک کرنے سے منع کرتا ہے) (مفتی شاہجہاں ندوی)۔

راشد حسین ندوی: آج کے دور میں نفقہ میں علاج بھی شامل ہے، ورنہ بڑی مشقت ہوگی، اور موصوف نے مفتی تقی عثمانی صاحب کے فتوی سے استدلال کیا ہے ''کہ قرآن کریم میں نفقہ کے ساتھ ''بالمعروف'' کی قید لگائی گئی ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ نفقہ کا تعین عرف پر مبنی ہے...... کہ ہمارے دور میں عرفاً علاج نفقہ کا حصہ ہے'' (فتاوی عثمانی ۲/ ۴۹۱)۔

اسی طرح مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب کی کتاب الفتاوی (۶/ ۳۳۶-۳۳۷) میں درج ایک فتوی سے استدلال کیا ہے۔

دوسری رائے: قاضی محمد ریاض ارمان صاحب کی ہے: ان کی آراء میں اضطراب معلوم ہوتا ہے، تداوی مسنون و مستحب ہے، فرض واجب نہیں، ''تقریرات رافعی'' میں صراحت ہے کہ انسان کے اوپر اپنا علاج کرانا واجب نہیں تو دوسرے کے علاج کا خرچہ کیسے واجب ہوگا؟

''فإن المريض لا تجب عليه مداواة نفسه مع غناه فبالأولى أن لا تجب على غيره''

اس مہنگائی کے دور میں اگر دوسرے پر علاج کو واجب کر دیا جائے تو موسر کو حرج میں مبتلا کرنا ہے (تقریرات رافعی ۱/ ۲۵۴)

لیکن آگے چل کر تحریر فرماتے ہیں کہ کم از کم بوڑھے والدین کے علاج کا خرچہ لازم ہونا چاہئے۔

تیسری رائے مولانا حیدر علی قاسمی صاحب کی ہے کہ بیوی کا علاج کرانا واجب نہیں، بلکہ احسان ہے، انہوں نے استدلال عالمگیری کی عبارت سے کیا ہے:

''ولا يجب الدواء للمرض ولا أجرة الطبيب ولا الفصد ولا الحجامة'' (الهندية: ۱/ ۵۴۹)

اسی طرح فتاوی محمودیہ (۲/ ۱۴۰) اور دین کی باتیں (ص ۲۷۷) سے استدلال کیا ہے، البتہ والدین اگر محتاج ہوں تو اس کا علاج کرانا واجب ہے، "وبالوالدين إحساناً" (سورہ اسراء: ۲۳) کو مستدل بنایا ہے، اسی طرح دیگر بزرگوں کا علاج جب واجب ہوگا، جبکہ وہ محتاج ہونے کے ساتھ ساتھ کسب معاش پر قادر نہ ہوں۔

چوتھی رائے: قاضی محمد کامل قاسمی صاحب کی ہے کہ اگر مرض شدید وخطرناک و مہلک ہو اور تداوی پر قدرت واستطاعت میسر ہو تو حسب حیثیت علاج کرانا واجب ہے، استدلال (نظام الفتاوی جدید ۱/ ۳۵۱۰) اور قاضی مجاھد الاسلامؒ کی تحریر (بحث ونظر شمارہ ۲/ ۴۲-۴۹) سے کیا ہے۔

اس مسئلہ میں ہمارے اکثر مقالہ نگار حضرات کی رائے اور معاصر فقہاء اور اکابر علماء کرام کی رائے (جیسے حضرت مفتی تقی عثمانی، مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، اور شیخ وہبہ زحیلیؒ) یہ ہے کہ موجودہ دور میں علاج کو بھی نفقہ میں شامل ہونا چاہئے، جیسا کہ نفقہ کی تعریف بھی اس کی طرف مشیر ہے۔

مگر یہاں یہ بات قابل غور ہونی چاہئے کہ اکثر قدیم فقہاء نے بیوی کے علاج کی ذمہ داری شوہر پر کیوں نہیں ڈالی؟ جبکہ والدین اور اولاد کے علاج کے سلسلہ میں فقہاء کی عبارات ملتی ہیں، اور ان کے علاج کی ذمہ داری ان کے ان قریب رشتہ داروں پر ڈالی ہے جن پر ان کا نفقہ واجب ہے، جیسا کہ شیخ وہبہ زحیلیؒ اولاد کے علاج کے سلسلہ میں اجماع نقل کرتے ہیں کہ باپ پر اولاد کی دوا کا خرچ واجب ہے۔

''حيث قال: ومثل وجوب نفقة الدواء اللازم للولد على الوالد بالإجماع'' (الفقه الاسلامي وأدلته ۱۰/ ۷۳۸۱، کوئٹہ)۔

شوافع میں ''صاحب نهاية المحتاج إلى شرح المنهاج'' تحریر فرماتے ہیں:

''يلزمه أي الفرع الحر أو البعض ذكرا كان أو انثى (نفقة) أي مؤنة حتى نحو دواء وأجرة طبيب (الوالد) المعصوم العروضة المحتاج له'' (نهاية المحتاج/ ۲۱۸، كتاب النفقة فصل في مؤن الاقارب) (مقالہ ریاض ارمان)۔

حالانکہ انہوں نے بیوی کے علاج کا خرچ بھی شوہر پر رکھا ہے۔

''ودواء مرض وأجرة طبيب وحاجم وفاصد وخائف؛ لأنها لحفظ الأصل ولها أيام المرض وأدمها وكسوتها وآلة تنظيفها وتصرفه للدواء أو غيره؛ لأنها محبوسة له'' (نهاية المحتاج/ ۱۹۵، كتاب النفقة فصل في مؤن الاقارب)۔

علامہ شامی فرماتے ہیں: ''ولم أر من ذكرهنا أجرة الطبيب وثمن الأدوية، وإنما ذكروا عدم الوجوب للزوجة'' (ردالمحتار ۵/ ۳۳۶ زکریا دیوبند)۔

ایسا کیوں:

ہمارے معاصر اکابر علماء تحریر فرماتے ہیں کہ اس دور میں علاج نفقہ میں داخل ہوگیا ہے، مگر علاج تو والدین کے نفقہ میں پہلے بھی شامل تھا جیسا کہ قدیم فقہاء کی عبارات سے مفہوم ہوتا ہے۔

اس لئے اس کا اصل جواب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان حضرات کا نفقہ فقر و عجز سے ہے، اس لئے ان کے نفقہ میں علاج بھی شامل ہے، جبکہ بیوی کا نفقہ شوہر پر فقر و عجز کی وجہ سے نہیں، بلکہ اس کا نفقہ حق احتباس کی وجہ سے ہے، اس لئے اس کے نفقہ میں علاج شامل نہیں، علامہ وہبہ زحیلی تحریر فرماتے ہیں: اگر بیوی میں فقر پایا جائے گا تب بھی اس کے علاج کا خرچ اس کے اقارب پر ہوگا نہ کہ شوہر پر۔

''قرر فقهاء المذاهب الأربعة أن الزوج لا يجب عليه أجور التداوي للمرأة المريضة من أجرة طبيب وحاجم وفاصد وثمن دواء، وإنما تكون النفقة في مالها إن كان لها مال، وإن لم يكن لها مال وجبت النفقة على من تلزمه نفقتها، لأن التداوي لحفظ أصل الجسم فلا يجب على مستحق المنفعة كعمارة الدار المستاجرة تجب على المالك لا على المستاجر، وكما لا تجب الفاكهة لغير أدم'' (الفقہ الاسلامی وأدلتہ ۱۰/ ۷۳۸۰، طبع کوئٹہ پاکستان)۔

اس میں شیخ وہبہ زحیلیؒ نے علت بیان فرمائی ہے کہ بیوی کے نفقہ میں دوا و علاج کیوں داخل نہیں، کیونکہ دوا و علاج اصل جسم کی حفاظت کے لئے ہے، لہذا اصل جسم کی حفاظت کی ذمہ داری اس شخص پر نہیں ڈالی جاسکتی جو مستفید منفعت ہے، جیسا کہ دار مستاجرۃ کی عمارت کی حفاظت اصل مالک کے اوپر ہے مستاجر پر نہیں، اسی وجہ سے بیوی کے علاج و دواء کی ذمہ داری بجائے شوہر کے پہلے اس کے اصل مال میں ہوگی پھر ان قریبی رشتہ داروں پر واجب ہوگی جن پر احتیاج و عجز کی صورت میں نفقہ واجب ہوتا ہے، کیونکہ دراصل علاج نفقہ سے ہٹ کر ہے، اسی وجہ سے فقہاء احناف کے یہاں تو مالدار انسان پر بھی خود کا علاج کرانا واجب نہیں تو دوسرے کے علاج کا خرچ کیسے واجب ہوگا، جیسا کہ تقریرات رافعی میں ہے:

''قوله: ولم أر ذكرهنا أجرة الطبيب عدم الوجوب ظاهر، فإن المريض لا تجب عليه مداواة نفسه مع غناه فبالأولى أن لا تجب على غيره'' (تقریرات رافعی ۱/ ۲۵۴) (مولانا محمد ارمان قاسمی)۔

اپنا علاج کرانے کا حکم مختلف اوقات میں مختلف ہے کبھی مباح تو کبھی مسنون تو کبھی واجب اور یہ حفظ نفس کے لئے ہے، ٹھیک اسی طرح دوسرے عزیز و اقارب کے علاج کرانے کا حکم بھی مختلف اوقات میں مختلف ہوگا، بیوی کے علاج کا خرچ پہلے خود اس کے مال سے ادا کیا جائے گا، پھر اس کے بعد اس کے قریبی رشتہ داروں پر اس کے خرچ کی ذمہ داری ڈالی جائے گی۔

دیگر اقارب میں والد کے علاج کرانے کا حکم تاکیدی ہوگا، چونکہ اللہ تعالی نے خصوصی طور پر ان کے ساتھ تاکیدی حسن سلوک کا حکم فرمایا ہے:

"وبالوالدين إحسانا" (سورہ اسراء: ۲۳)

اور ان کو ادنی درجہ کی تکلیف بھی نہ پہنچانے کا حکم ہے:

"ولا تقل لهما أف" (سورہ اسراء: ۲۳)۔

☆☆☆

عرض مسئلہ:

معذوروں اور بوڑھوں کے حقوق
(سوال نمبر ۴/ تا ٦)

مولانا خورشید انور اعظمی[1]

اسلامک فقہ اکیڈمی کی جانب سے راقم الحروف کو "معذوروں اور بوڑھوں کے حقوق" کے سوال نمبر ۴ رتا ٦ ر سے متعلق عرض مسئلہ پیش کرنے کی ذمہ داری دی گئی ہے، اس موضوع پر کل ۴۲ رمقالات موصول ہوئے، مقالہ نگار حضرات کے اسماء گرامی یہ ہیں:

ڈاکٹر شاہجہاں ندوی، مولانا کلیم اللہ عمری، مفتی راشد حسین ندوی، مفتی محبوب فروغ احمد قاسمی، مولانا محمد حذیفہ داحودی، مولانا قمر الدین محمود قاسمی، مفتی رحمت اللہ ندوی، قاضی محمد ریاض ارمان قاسمی، مولانا محمد صبیح اختر قاسمی، مولانا عبدالتواب اناوی، مفتی عبدالرزاق قاسمی، مولانا سید سلیم انور، مولانا سعید الرحمن قاسمی، مولانا محمد ارشاد پالنپوری، مولانا عبداللہ خالد لوناواڑہ، مولانا حفیظ الرحمن اعظمی مدنی، مولانا حیدر علی قاسمی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا ضیاء الدین قاسمی، مولانا احسن عبدالحق ندوی، قاضی محمد کامل قاسمی، مفتی ظہیر احمد کانپور، مفتی شاہد علی قاسمی، مفتی عبدالمنان صاحب، مولانا فیضان احمد قاسمی، قاضی عبدالجلیل قاسمی، مولانا محمد قمر الزماں ندوی، مفتی محمد الیاس قاسمی، مولانا محمد آزاد بیگ قاسمی، مفتی نذیر احمد شافعی، مولانا ندیم انصاری، مولوی انوار الحق ہلال قاسمی، مفتی امانت علی قاسمی، مفتی محمد عثمان بستوی، مفتی جمیل احمد نذیری، مفتی شبیر احمد قاسمی، مولانا عمر بن یوسف کوکنی، مولانا محمد انیس ندوی، محمد شمیم قاسمی، مولانا افتخار احمد مفتاحی، مفتی محمد ابوبکر قاسمی، راقم الحروف خورشید انور اعظمی۔

سوال نمبر ۴- اس سوال میں تین شق ہیں۔

الف: کیا زیادہ آمدنی کے لئے لڑکوں کا اپنے بوڑھے ماں باپ کو چھوڑ کر دوسری جگہ جانا جائز ہے؟

اس سوال کے جواب میں بیشتر مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ اگر والدین خدمت کے محتاج ہوں یا سفر پُر خطر ہو تو زیادہ آمدنی کے لئے والدین کی اجازت سے دوسری جگہ جا سکتے ہیں، بغیر اجازت کے جانا جائز نہیں ہے، ان کے دلائل حسب ذیل ہیں:

(۱) "عن عبدالله ابن عمر رضی الله عنهما قال: قال رجل للنبی صلی الله علیه وسلم: أجاهد؟ قال لك أبوان؟ قال: نعم، قال: ففیهما فجاهد" (صحیح البخاری ۲/ ۸۸۳)

اس حدیث کو بطور دلیل مولانا سعید الرحمن قاسمی، مولانا کلیم اللہ عمری، مفتی محبوب فروغ احمد قاسمی اور مولانا حیدر علی قاسمی نے ذکر کیا ہے، مولانا قمر الزماں ندوی کی بھی یہی رائے ہے، اور ڈاکٹر شاہجہاں ندوی نے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت نقل کی ہے کہ ایک شخص یمن سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ہجرت کر کے آیا، آپ نے اس سے پوچھا:

"هل لك أحد بالیمن؟ فقال: أبوای، قال: أذنا لك؟ قال: لا، قال: إرجع إلیهما فاستاذنهما، فإن أذنا لك فجاهد، وإلا فبرهما" (سنن ابوداود: حدیث نمبر ۲۵۳۰)

(۲) "لایحل سفر فیه خطر کالجهاد وسفر البحر إلا باذنهما ومالا خطر فیه کالسفر للتجارة والحج والعمرة یحل بلا

[1] صدر مدرس مدرسہ مظہر العلوم، بنارس۔

إذن إلا أن خيف عليهما الضيعة'' (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۲۴۱)
اس کے ناقلین ہیں: قاضی عبدالجلیل قاسمی، مفتی شبیر احمد قاسمی، مفتی محبوب فروغ احمد قاسمی۔

(۳) '' فلو في سفر تجارة أو حج لا بأس به بلا إذن الأبوين إن استغنيا عن خدمته، إذ ليس فيه إبطال حقهما، إلا إذا كان الطريق مخوفا كالبحر، فلا يخرج بلا إذنهما، وإن استغنيا عن خدمته'' (رد المحتار: ۵/ ۲۶۱) (مفتی رحمت اللہ ندوی، قاضی محمد ریاض ارمان قاسمی، مفتی عبدالمنان)۔

(۴) ''قال محمد رحمه الله تعالى في (السير الكبير): إذا أراد الرجل أن يسافر إلى غير الجهاد لتجارة أو حج أو عمرة وكره ذلك أبواه، فإن كان يخاف الضيعة عليهما بأن كانا معسرين ونفقتهما عليه وماله لايفي بالزاد والراحلة ونفقتهما، فإنه لايخرج بغير إذنهما'' (فتاوی ہندیہ ۵/ ۳۶۵)
(عبدالتواب اناوی، انیس احمد ندوی، مولانا عبداللہ خالد لوناواڑہ، مولانا حفیظ الرحمن اعظمی، مفتی محمد الیاس قاسمی)، مفتی محمد ارشاد پالنپوری نے یہ صراحت کی ہے کہ اگر ایک ہی لڑکا ہو تو جانے کی اجازت نہیں ہوگی اور اگر کئی لڑکے ہوں تو ان میں سے ایک اجازت سے جاسکتا ہے، اور یہی بات قمر الدین قاسمی نے بھی لکھی ہے۔

(۵) ''كل سفر أراد الرجل أن يسافر غير الجهاد لتجارة أو لحج أو لعمرة فكره ذلك أبواه هل له أن يخرج بغير إذنهما؟ فهذا على وجهين: إما أن كان لايخاف عليهما الضيعة بأن كانا موسرين لم تكن نفقتهما عليه أو كان يخاف عليهما الضيعة بأن كانا معسرين وكانت نفقتهما عليه، إن كان الأب مستغنيا عن خدمته، لابأس أن يخرج وإن لم يكن مستغنيا لايسع له أن يخرج'' (التاتارخانیہ ۱۸/ ۴۳-۲۴۲) (عبداللہ خالد لوناواڑہ، مفتی محمد عثمان، مفتی شبیر احمد قاسمی)۔

مولانا ابوسفیان مفتاحی نے بدرجۂ مجبوری، والدین کی اجازت سے سفر کا قول کیا ہے، مگر موبائل سے حال معلوم کرتے رہنے کی تاکید کی ہے، مولانا صبیح اختر قاسمی نے بھی والدین کی اجازت کے بغیر سفر کو ناجائز قرار دیا ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ اگر والدین کی خدمت اور دیکھ ریکھ کا معقول انتظام کردے تو جاسکتا ہے، مفتی جمیل احمد نذیری نے دلیل میں "ان اشکرلی ولوالديك" (لقمان: ۱۴) اور "وصاحبهما في الدنيا معروفا" (لقمان: ۱۵) سے، اور مفتی نذیر احمد شافعی نے ''کتاب الام'' کی عبارت ''إذا زمن الأب والأم ولم يكن لهما مال ينفقان منه على أنفسهما أنفق عليهما الولد؛ لأنهما جمعا الحاجة والزمانة التي لايتحرفان معهما والتي مثل حال الصغر أو أكثر ومن نفقتهم الخدمة كما وصفت'' (الام ۶/ ۲۲۶) سے استدلال کیا ہے، مفتی محمد راشد حسین ندوی نے لکھا ہے کہ والدین کی خدمت کا مکمل انتظام کر کے جاسکتا ہے مگر خلاف اولی ہے، اور دلیل میں '' لايحل سفر فيه خطر إلا بإذنهما وما لا خطر فيه يحل بلا إذن ومنه السفر في طلب العلم (قوله وما لا خطر) كالسفر للتجارة والحج والعمرة يحل بلا إذن إلا أن خيف عليهما الضيعة'' (شامی ۲/ ۲۴۱) کو نقل کیا ہے، مولانا عمر یوسف کا بھی یہی قول ہے انھوں نے دلیل میں یہ عبارت نقل کی ہے: ''ويشترط لخروجه ولو للفرض رشده، وأن لايكون أمرد جميل إلا أن كان معه نحو محرم يأمن به على نفسه، ولو لزمته نفقة الأصل احتاج لإذنه أو أنابه من يمونه من مال حاضر'' (تحفۃ المحتاج ۴/ ۳۳،۴۴)۔
مولانا شاہد علی قاسمی نے لکھا ہے کہ اگر لڑکا والدین کی نگرانی کا مناسب انتظام کردے اور انکی دیکھ بھال کے لئے گاہے گاہے آجایا کرے تو گنجائش معلوم ہوتی ہے، جیسا کہ فقہی قاعدہ ہے:

'' إذا تعارض مفسدتان روعي أعظمهما ضررا بارتكاب أخفهما'' (الاشباہ والنظائر، ص ۲۶۱)۔

بقیہ مقالہ نگار کا خیال ہے کہ محتاج خدمت والدین کو چھوڑ کر دوسری جگہ جانا جائز نہیں ہے، دلیل میں:

(۱) حدیث نبوی: ''جاء رجل إلى رسول الله ﷺ فاستأذنه في الجهاد فقال: أحي والداك؟ قال: نعم، قال: ففيهما فجاهد'' کو پیش کیا ہے (مفتی ظہیر قاسمی، قاضی محمد کامل قاسمی، مولانا ندیم احمد مولانا محمد آزاد بیگ قاسمی اور امانت علی قاسمی)۔

(۲) واقعۂ حضرت اویس قرنی، اس کا ذکر کیا ہے مولانا محمد احسن عبدالحق اور مفتی ظہیر قاسمی نے، آخر الذکر نے لکھا ہے کہ حضرت اویس قرنی نے شرف صحابیت کو نظر انداز کر کے والدین کی خدمت کو ترجیح دی، مولانا افتخار احمد نے کہا زیادہ آمدنی کے لئے والدین کے حقوق کو قربان کرتے ہوئے دوسری جگہ جانا درست نہیں ہے۔

(۳) ''إذا أراد الابن أن يخرج إلى الحج وأبوه كاره لذلك إذا كان الأب مستغنيا عن خدمته فلا بأس به، وإن كان محتاجا يكره كذا الأمر'' (حاشیہ طحطاوی ۱/ ۴۷۹)

اس کا ذکر کرتے ہوئے مفتی امانت علی قاسمی نے لکھا ہے: والد کی خدمت کو ترک کر کے سفر پر جانا جائز نہیں۔

(۴) ''وصاحبهما في الدنيا معروفا'' (سورہ لقمان: ۱۵) اس سے استدلال کرتے ہوئے مفتی ابوبکر قاسمی نے کہا: زیادہ آمدنی کے لئے محتاج خدمت والدین کو چھوڑ کر دوسری جگہ جانا شرعاً جائز نہیں ہے۔

(۵) ''ووصينا الإنسان بوالديه حسنا'' (عنکبوت: ۸) اور ''أن اشكر لي ولوالديك'' (لقمان: ۱۴) سے استدلال کرتے ہوئے مولانا فیضان احمد قاسمی نے کہا: اگر آمدنی اس درجہ ہے کہ والدین کے پاس رہ کر گذر بسر ہوسکتا ہے تو پیسہ کمانے کی غرض سے سفر کرنا والدین کے حقوق کی پامالی کے ساتھ ان کو ایذا پہنچانے کا باعث ہے۔

مفتی عبدالرزاق نے کہا: ناجائز تو ہے لیکن اگر اپنے شہر میں کوئی کاروبار نہ مل رہا ہو تو سفر کرسکتا ہے، مولانا سید انور سلیم نے کہا: جب وطن میں گنجائش رزق مل رہی ہو تو پھر باہر جانے کی ضرورت نہیں، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: خوش نصیب ہے وہ شخص جسے وطن میں رزق مل جائے، مولانا محمد حذیفہ داحودی نے بھی ناجائز لکھا ہے لیکن ان کی پیش کردہ دلیل سے ظاہر ہوتا ہے کہ اجازت سے سفر کرسکتا ہے۔

نصوص احادیث اور فقہاء کی عبارات کے دیکھنے سے یہی بات راجح معلوم ہوتی ہے کہ اگر باپ محتاج خدمت ہو تو لڑکے کا زیادہ آمدنی کے لئے دوسری جگہ کا سفر کرنا والدین کی اجازت پر موقوف ہے، اگر ان کی جانب سے اجازت ہوتی ہے تو جائز ہے ورنہ نہیں، مگر بہتر ہوگا کہ ضرورت مند بوڑھے والدین کی خدمت کو زیادہ آمدنی پر ترجیح دے اور اگر محتاج خدمت نہ ہوں تو اجازت کے بغیر بھی جاسکتے ہیں، بشرطیکہ راستہ پرامن اور جگہ اطمینان بخش ہو، جیسا کہ البحر الرائق کی اس عبارت سے واضح ہے:

''وأما سفر التجارة والحج فلا بأس بأن يخرج بغير إذن والديه، لأنه ليس فيه خوف هلاكه حتى لو كان السفر في البحر لايخرج بغير إذنهما، ثم إنما يخرج بغير إذنهما للتجارة إذا كانا مستغنيين عن خدمته أما إذا كانا محتاجين فلا، كذا في التجنيس'' (البحر الرائق ۵/ ۷۸)۔

ب: اگر بہو ساس سسر کے ساتھ رہنا نہ چاہتی ہو یا اس کی ساس کو خدمت کی ضرورت ہو، لیکن کوئی خدمت گار موجود نہ ہو اور بیٹیوں کو ان کے شوہر کی طرف سے میکے میں رہنے کی اجازت نہ ہو تو اس صورت میں بہو کی کیا ذمہ داری ہے؟ اور کیا اسے اس کے ساس سسر کے ساتھ رہنے پر مجبور کیا جاسکتا ہے؟

اس سوال کی دو شقیں ہیں:

۱- ساس سسر کی خدمت کا مسئلہ۔ ۲- ان کے ساتھ رہنے پر مجبور کئے جانے کا مسئلہ۔

پہلی شق کے جواب میں مفتی محمد عثمان بستوی، مفتی ابوبکر قاسمی کا خیال ہے کہ بہو پر ساس سسر کی خدمت واجب ہے، مفتی ابوبکر قاسمی نے کہا: بہو مثل بیٹی کے ساس کے ساتھ رہ کر خدمت کرے اور شوہر اس کو سمجھاتا رہے کہ

''ما أكرم شاب شيخا من أجل سنه إلا قيض الله له من يكرمه عند سنه'' (مشکوۃ الآثار ۱۵۱)

مفتی عثمان بستوی نے کہا ہے کہ میاں بیوی کے درمیان معاہدہ عرفیہ ہے، جس کی پابندی واجب ہے، اسی طرح اطاعت شوہر بھی واجب ہے، لہذا اگر

والدین لاچار و مجبور ہوں اور خدمت کے ہر ہر قدم پر محتاج ہوں اور بیٹا کے علاوہ ان کا کوئی خدمتگار موجود نہ ہو اور بیٹے کو معاشی مسائل اور مشغولیات کی بنا پر خود خدمت کی فرصت نہ ہو اور معاشی قلت کی بنا پر یا کسی دوسری وجہ سے والدین کی خدمت کی کوئی صورت نہ ہو تو اس صورت میں شوہر بیوی کو اپنی والدہ کی خدمت اور اس کی دیکھ ریکھ اور ان کے ساتھ رہنے پر مجبور کر سکتا ہے، مولانا رحمت اللہ ندوی کا بھی یہی خیال ہے، البتہ عام حالات میں بہو کو ساس سسر کی خدمت اور ان کے ساتھ رہنے پر مجبور نہ کئے جانے کی بات کہی ہے۔

مفتی محمد الیاس قاسمی کے نزدیک بھی اگر کوئی خادم نہ ہو تو بہو پر ساس کی خدمت واجب ہے، اس لئے کہ جس معاشرہ میں قرآن نازل ہوا ہے وہاں کا عرف یہی تھا کہ عورتیں شوہر سے متعلق اس کے گھر کے کام کو انجام دیا کرتی تھیں، اللہ تعالی کا ارشاد ہے: "ولهن مثل الذي عليهن بالمعروف" (البقرہ: ۲۲۸) مولانا انیس ندوی اور مولانا افتخار احمد مفتاحی نے بھی بوقت ضرورت خدمت کو واجب قرار دیا ہے۔ مولانا کلیم اللہ عمری کا خیال ہے کہ خدمت بہو کی واجبات میں نہیں ہے، اطاعت شوہر کے ضمن میں شامل ہے، المرأة راعية على بيت زوجها وولده (صحیح بخاری ۱۱۶۳) البتہ اگر بیٹیوں کو شوہر کی جانب سے اجازت نہ ہو تو بہو کو مجبور کیا جا سکتا ہے۔

جبکہ بقیہ مقالہ نگار حضرات کا خیال ہے کہ اصولی طور پر بیوی پر ساس سسر کی خدمت واجب نہیں ہے، البتہ اسے اخلاقی طور پر کرنا چاہئے، اس سلسلے میں ڈاکٹر شاہجہاں ندوی نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد: ''ألا استوصوا بالنساء خيرا فإنهن عوان عندكم ليس تملكون منهن شيئا غير ذلك'' (سنن ترمذی ۱۱۶۳) سے استدلال کیا ہے، مفتی راشد حسین ندوی نے ''قالوا: إن هذه الأعمال واجبة عليها ديانة، وإن كان لايجبرها القاضي'' (ہندیہ ۱/ ۵۴۶) سے اور مفتی محبوب فروغ احمد قاسمی نے فتح القدیر کی عبارت: ''وكذا غسل الثياب والطبخ والخبز وكنس البيت واجب عليها ديانة لايجبرها القاضي عليه إذا امتنعت'' (فتح القدیر ۴/ ۳۷۲) سے، مولانا قمر الدین محمود قاسمی اور مولانا حفظ الرحمن اعظمی نے درمختار کی عبارت: ''وحقه عليها أن تطيعه في كل مباح يأمرها به'' (الدر ۴/ ۳۶۶) سے، اور مولانا حیدر علی قاسمی نے فتاوی تاتارخانیہ کی عبارت: '' ليس عليها أن تعمل شيئا لزوجها قضائا من الخبز والطبخ وكنس البيت وغير ذلك'' (خانیہ ۱/ ۴۴۳) سے استدلال کیا ہے۔

مفتی نذیر احمد شافعی، قاضی عبدالجلیل قاسمی نے کہا کہ جب عورت پر شوہر ہی کی خدمت واجب نہیں ہے تو اس کے والدین کی خدمت کیسے واجب ہو سکتی ہے، اول الذکر نے ''البیان'' کی عبارت: ''ولاتجب على الزوجة الخدمة للزوج في الخبز والطبخ والغزل وغير ذلك؛ لأن المعقود عليه هو الاستمتاع دون هذه الأشياء'' (۹/ ۴۶۳) سے اور ثانی الذکر نے فتاوی تاتارخانیہ کی عبارت: ''ليس عليها أن تعمل شيئا لزوجها قضائا من الخبز والطبخ وكنس البيت وغير ذلك'' (خانیہ ۱/ ۴۴۳) سے استدلال کیا ہے، اور اگر خدمت کی ضرورت ہو تو مولانا سعید الرحمن قاسمی، مفتی ظہیر احمد، مولانا فیضان احمد قاسمی، مفتی شبیر احمد قاسمی نے اس بات کی صراحت کی ہے کہ اگر ساس سسر محتاج خدمت ہوں تو یہ بیٹے کی ذمہ داری ہے کہ خود خدمت کرے یا خادم کا انتظام کرے، ڈاکٹر شاہجہاں ندوی نے کہا کہ اگر خود نہ کر سکے اور خادم کا بھی نظم نہ کر سکے تو بہو پر وجوب خدمت کی گنجائش نکل سکتی ہے،'' إن كان الوالد لايقدر على عمل أو كان زمنا وللابن عيال كان على الابن أن يضم الأب إلى عيا له وينفق على الكل'' (البحر ۴/ ۳۴۹) جب کہ تمام مقالہ نگار حضرات نے اس بات کی وضاحت بھی ہے کہ بیوی کو چاہئے کہ شوہر کی اطاعت میں گھر کی فضا کو خوشگوار رکھنے کے لئے ساس سسر کی خدمت کو اپنا فرض سمجھے، النہر الفائق میں ہے:

''أن يعاشر كل منهما صاحبهما بالمعروف، بأن يعمل مع صاحبه كما يحب أن يعمل مع نفسه (۲/ ۲۹۷)۔

دوسری شق کے جواب میں مفتی محمد عثمان بستوی اور مفتی ابوبکر قاسمی نے کہا کہ شوہر بیوی کو اپنے ماں باپ کے ساتھ رہنے پر مجبور کر سکتا ہے۔

بقیہ مقالہ نگار حضرات نے کہا کہ اسے ماں باپ کے ساتھ رہنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا ہے بلکہ اسے علیحدہ مکان کے مطالبہ کا حق حاصل ہے۔

آپ حضرات نے ہدایہ کی عبارت:

''على الزوج أن يسكنها في دار مفردة ليس فيها أحد من أهله إلا أن تختار ذلك، ولو أسكنها في بيت من الدار مفردا وله غلق كفاها؛ لأن المقصود قد حصل'' (۲/ ۴۴۱) ردالمختار کی عبارت: ''ولو أراد أن يسكنها مع ضرتها أو مع أحمائها كأمه وأخته و بنته فأبت، فعليه أن يسكنها في منزل مفرد'' (رد ۵/ ۳۲۰) المحیط البرہانی کی عبارت: ''إن كان في

الدار بيوت فأعطاها بيتا تغلق وتفتحلم يكن لها أن تطالبه بمنزل آخر'' (۳/ ۱۷۲) جیسی فقہا کی عبارتوں سے استدلال کیا ہے، راقم الحروف کا رجحان بھی اسی بات کی جانب ہے کہ اصولی طور پر بہو پر ساس سسر کی خدمت واجب نہیں ہے، اور نہ اسے خدمت پر یا ان کے ساتھ رہنے مجبور کیا جاسکتا، اسی پر مفتی عزیز الرحمن عثمانی (فتاوی دارالعلوم ۱۶/ ۵۲۷)، حضرت تھانوی (بہشتی زیور ۵/ ۳۰۵)، مفتی کفایت اللہ (۵/ ۲۳۰)، مولانا محمد یوسف لدھیانوی (آپ کے مسائل اور ان کا حل ۵/ ۱۲۰) اور مفتی عبدالرحیم لاجپوری (فتاوی رحیمیہ ۸/ ۴۵۷) کا فتوی ہے، البتہ بہو کو چاہئے کہ بمقتضائے اطاعت شوہر، اخلاقا و دیانۃ ان کی خدمت کرے۔

ج: ماں باپ کی خدمت صرف بیٹوں پر واجب ہے یا بیٹیوں پر بھی، بعض اوقات بیٹیاں اپنے والدین کی مجبوری اور بے بسی کو دیکھتے ہوئے اپنے والدین کی خدمت کرنا چاہتی ہیں، لیکن ان کے شوہران کو اس کی اجازت نہیں دیتے۔ کیا ان کے شوہر کو اس کا حق حاصل ہے؟

اس سوال کے جواب میں مولانا قمر الدین محمود قاسمی کا خیال ہے کہ ماں باپ کی خدمت صرف بیٹوں اور غیر شادی شدہ بیٹیوں پر واجب ہے، مفتی رحمت اللہ ندوی کی رائے ہے کہ بیٹی پر شادی سے پہلے خدمت واجب ہے اور شادی کے بعد حسب سہولت مستحب، مفتی شبیر احمد قاسمی کا خیال ہے کہ نان نفقہ کی خدمت صرف بیٹوں پر واجب ہے، بیٹیوں پر نہیں اس وجہ سے کہ بیٹیاں کمانے پر قادر نہیں ہوتی ہیں، البتہ محتاج خدمت والدین کی جسمانی خدمت دونوں پر واجب ہے، شادی شدہ لڑکیوں کو باجازت شوہر خدمت کرنی چاہئے۔

بقیہ حضرات کے نزدیک دونوں پر خدمت واجب ہے، آپ حضرات کے مستدلات یہ ہیں:

اللہ تعالی کے ارشاد: "ووصينا الإنسان" (سورہ عنکبوت: ۸) میں انسان مرد و زن دونوں شامل ہیں۔

تاتار خانیہ میں ہے: ''فان كان الاولاد ذكورا واناثا موسرين فنفقة الأبوين عليهم بالسوية فى أظهر الروايتين، وفى الخانية: عليه الفتوى'' (تاتار خانیہ ۵/ ۴۲۵)۔

ہدایہ میں ہے: ''وهى على الذكور والإناث بالسوية فى ظاهر الرواية، وهو الصحيح؛ لأن المعنى يشملهما'' (ہدایہ ۲/ ۴۳۶)۔

ہندیہ میں ہے: ''وإذا اختلطت الذكور والإناث فنفقة الأبوين عليهما على السوية فى ظاهر الرواية، وبه أخذ الفقيه أبو الليث، وبه يفتى، كذا فى الوجيز للكردرى'' (ہندیہ ۱/ ۵۶۸)۔

''الاختیار لتعلیل المختار'' میں ہے:

''وهو على الذكور والإناث على السواء فى رواية، وهو المختار لاستوائهما فى العلة والخطاب'' (۴/ ۱۱)۔

مذکورہ عبارات فقہاء سے معلوم ہوتا ہے کہ صحیح اور مختار بات یہی ہے کہ ماں باپ کی خدمت بیٹوں بیٹیوں دونوں پر واجب ہے، رہا یہ مسئلہ کہ کیا شوہر کو یہ حق حاصل ہے کہ بیوی کو اس کے ماں باپ کی خدمت کی اجازت نہ دے، اس سلسلے میں بیشتر مقالہ نگار حضرات کا خیال یہ ہے کہ بیوی کو اپنے بے سہارا، محتاج خدمت والدین کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہ ہونے کی صورت میں خدمت سے شوہر کا روکنا درست نہیں ہے، اور منع کرنے پر بیوی اس کی خلاف ورزی کر سکتی ہے، اس کی دلیلیں حسب ذیل ہیں:

(۱) ''لا يمنعها من الخروج إلى الوالدين فى كل جمعة مرة وعليه الفتوى'' (فتاوی عالمگیریہ ۱/ ۵۵۷)۔
اس کی روشنی میں شاہجہاں ندوی نے لکھا ہے کہ شوہر کو روکنا نہیں چاہئے تاکہ تال میل بنا رہے۔

(۲) ''وكذا فيما لو أرادت حج الفرض بمحرم، أو كان أبوها زمنًا مثلايحتاج إلى خدمتها، ولو كان كافرًا أو كانت لها نازلة ولم يسئل لها الزوج عنها من عالم فتخرج بلا إذ نه فى ذلك كله'' (ردالمحتار ۲/ ۳۹۰)۔
مولانا سعید الرحمن قاسمی اور مولانا محبوب فروغ نے لکھا ہے والدین کے محتاج ہونے کی صورت میں ان کا حق مقدم ہوگا شوہر کو روکنا نہیں چاہئے۔

(۳) ''لا يمنعها عن الخروج إلى الوالدين فى كل جمعة إن لم يقدروا على إتيانها على ما اختاره فى الاختيار ولو أبوها زمنا

مثلا فاحتاجها فعليها تعاهده ولوكافرا، وإن أبي الزوج (الدر المختار) وفي الشامية: فعليها تعاهده:أي بقدر احتياجه إليها، وهذا إذا لم يكن من يقوم عليه'' (شامی ۵/ ۳۲۴) (مفتی راشد حسین، مولانا حذیفہ داحودی، قاضی محمد ریاض ارمان، مولانا صبیح اختر، انور سلیم، مولانا محمد کامل، قمر الزماں ندوی، محمد الیاس قاسمی، مولانا آزاد بیگ، مفتی عبد المنان، مولانا افتخار احمد)۔

(۴) '' امرأة لها أب زمن ليس له من يقوم عليه وزوجها يمنعها عن الخروج إليه وتعاهده كان له أن تعصى زوجها وتطيع الوالد، مؤمنا كان الوالد أو كافرا، لأن القيام بتعاهد الوالد فرض عليها فيقدم على حق الزوج'' (فتاوی خانیہ ۱/ ۴۴۳) (مولانا محمد انیس ندوی، قاضی ریاض ارمان، مولانا حیدر علی)۔

(۵) ''امرأة لها أب زمن ليس له من يقوم عليه غير البنت ويمنعها الزوج من تعاهده جاز له أن تعصى زوجها وتطيع أباها، مؤمنا كان أو كافرا، لأن القيام عليه فرض عليها في هذه الحالة، وحق الزوج لايظهر في الفرائض'' (المحیط البرہانی ۴/ ۲۳۶) (مولانا عبداللہ خالد، مولانا شاہ علی)۔

(۶) ''ولو كان أبوها زمنا مثلا وهو محتاج إلى خدمتها، والزوج يمنعها من تعاهده فعليها أن تغضبه مسلما كان الأب أو كافرا'' (فتح القدیر ۴/ ۳۵۹) (قاضی ریاض ارمان، قاضی عبد الجلیل)۔

(۷) '' قالوا ولو كان أبوها زمنا وليس له من يقوم عليه مؤمنا كان أو كافرا، فإن عليها أن تعصى الزوج في المنع'' (البحر الرائق ۴/ ۳۸۵) (مولانا عبد التواب اناوی)۔

(۸) ''يستحب للزوج أن لايمنعها من ذلك ربما أدى إلى العداوة بينهما'' (البیان ۹/ ۴۵۶) (مفتی محمد نذیر شافعی)۔

(۹) '' إذا كان أبو الزوجة مريضا مرضا طويلا فاحتاجها ولم يكن لديه من يقوم بشانه، فعليها الذهاب إليه وتعاهده بقدر احتياجه، ولوكان غير مسلم وإن أبي الزوج'' (الاحکام الشرعیہ فی الاحوال الشخصیہ ۱/ ۴۷۶) (مولانا عمر بن یوسف)۔

مفتی شبیر احمد قاسمی کی پیش کردہ عبارتوں سے یہ واضح ہوتا ہے کہ وقتاً فوقتاً والدین کی عیادت سے نہیں روک سکتا، لیکن والدین کے یہاں مستقل رہ کر خدمت سے روکنے کا حق شوہر کو ہے، مذکورہ دلائل میں سے کچھ کا ذکر کرنے کے بعد انھوں نے لکھا ہے کہ فقہاء کی عبارتوں سے مراد یہی ہے۔

دوسری رائے یہ ہے کہ بیوی کو اپنے والدین کی خدمت سے روکنے کا حق شوہر کو ہے، اس کی اجازت کے بغیر نہیں جائیگی، دلائل حسب ذیل ہیں:

۱۔ شوہر کا حق والد کے حق سے مقدم ہے

'' قال أحمد: امرأة لها زوج وأم مريضة، طاعة زوجها أوجب عليها من أمها إلا أن يأذن لها'' (المغنی) (مفتی عبد الرزاق قاسمی، مولانا ابوسفیان مفتاحی)۔

۲۔ ''والذي ينبغي تحريره أن يكون له منعها من كل عمل يؤدي إلى تنقيص حقه أو ضرر أو إلى خروجها من بيته'' (رد المحتار ۵/ ۳۴۵) (مولانا حفیظ الرحمن اعظمی)۔

مولانا ندیم انصاری، مفتی ظہیر احمد، مولانا امانت علی قاسمی کا بھی یہی خیال ہے۔

مولانا محمد عثمان بستوی نے شامی کی عبارت سے استدلال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جب دوسرے افراد خدمت کے لئے موجود ہوں تو خدمت فرض کفایہ ہوگی، اور اس صورت میں شوہر کا حق مقدم ہوگا، اسے روکنے کا حق ہوگا، اور جب کوئی خدمتگار موجود نہ ہو تو خدمت فرض عین ہوگی اور والدین کا حق مقدم ہوگا۔ احقر کو بھی یہی رائے معتدل اور درست معلوم ہوتی ہے، اس وجہ سے کہ فقہاء نے جہاں بھی عورت کو شوہر کی نافرمانی کی بات کہی ہے یہ اس صورت میں ہے جبکہ والدین کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہ ہو۔

سوال نمبر ۵- انسان کو جس طرح جوانی میں بیوی کی ضرورت ہوتی ہے، اسی طرح بڑھاپے میں بھی بیوی کا محتاج ہوتا ہے، تا کہ اس عمر کے سرد و گرم کو سہنا اس کے لئے آسان ہو جائے؛ ہندوستان کے معاشرہ میں عام طور پر بیٹے اور بیٹیاں اپنی والدہ کے فوت ہونے کے بعد والد کے دوسرے نکاح میں رکاوٹ بنتے ہیں کیا ان کا یہ رکاوٹ بننا درست ہے؟ اور اگر خود والد میں اپنی بیوی کی کفالت کی استطاعت نہ ہو تو اس سلسلہ میں اولاد پر بھی اس نسبت سے کچھ ذمہ داری عائد ہوتی ہے؟

تمام مقالہ نگار حضرات کا اتفاق ہے کہ بیٹے بیٹیوں کا اپنی والدہ کی وفات کے بعد والد کے نکاح ثانی میں رکاوٹ بننا شرعاً درست نہیں ہے۔

ڈاکٹر شاہجہاں ندوی نے کہا کہ دوسری شادی کرنا باپ کا حق ہے، کسی کو اس کے حق سے روکنا ظلم ہے، "والله لا يحب الظالمين" (آل عمران: ۵۷)

کلیم اللہ عمری نے کہا کہ عہد سلف میں باپ کے نکاح ثانی کی بیشمار مثالیں ہیں، مگر اولاد نے کوئی رکاوٹ نہیں پیدا کی۔

مفتی راشد حسین ندوی اور مولانا قمر الزماں ندوی نے "فانكحوا ما طاب لكم من النساء" (النساء: ۳) سے استدلال کیا ہے۔

مفتی محبوب فروغ احمد قاسمی نے کہا کہ شافعیہ اور حنابلہ کے یہاں تو شادی کا انتظام بھی اولاد کے ذمہ ہے، مولانا قمر الدین محمود قاسمی نے کہا کہ ضرورتاً اور بغیر ضرورت کے بھی یہ شرعی حق ہے، مفتی صبیح اختر قاسمی کے خیال میں رکاوٹ ڈالنا والد کے ساتھ حسن سلوک کے بجائے بد سلوکی ہے۔

مفتی ارشاد احمد نے (البحر الرائق ۳/۱۸۶) کی عبارت: أربع من الحرائر کی روشنی میں کہا کہ چار شادی کی اجازت ہے، مفتی حیدر علی قاسمی نے کہا کہ یہ غیر مسلم کا طریقہ ہے، اور "وبالوالدين إحسانا" (سورہ اسراء: ۲۳) اور "وصاحبهما في الدنيا معروفا" (سورہ لقمان: ۱۵) کے خلاف ہے۔

مفتی محمد الیاس قاسمی اس سلسلے میں وأنكحوا الأيامى منكم (النور: ۳۳) اور "إذا تزوج العبد فقد استكمل نصف الدين" (حدیث) سے استدلال کیا ہے۔ بیشتر حضرات نے یہ بھی کہا ہے کہ اگر والد کو نکاح ثانی کی ضرورت ہو تو اولاد کو چاہئے کہ ان کے نکاح کا انتظام کرے، آپ حضرات نے "وإن احتاج الأب إلى زوجة والابن موسر وجب عليه أن يزوجه أو يشترى له جارية" (ہندیہ ۱/۵۶۵) جیسی عبارتوں سے استدلال کیا ہے۔

اسی طرح باپ کی عورت کے نفقہ کے مسئلے میں بھی تمام حضرات اس بات پر متفق ہیں کہ اگر باپ کو بیوی کی کفالت کی استطاعت نہ ہو تو اولاد پر باپ کی بیوی کا نفقہ واجب ہوگا، دلائل حسب ذیل ہیں:

(۱) "فالظاهر وجوب نفقة الأم عليه، ولم يكن الأب محتاجا إليها لقولهم: لايشارك الولد في نفقة أبويه" (رد المحتار ۲/۶۱۶)۔

(۲) "وعليه نفقة زوجة أبيه وأم ولده بل وتزويجه وتسريه" (الدر المختار ۲/ ۲۲۳،۷۳۱)۔

(۳) "(وعليه نفقة زوجة أبيه) أى فى رواية وفى أخرى إن كان الأب مريضا أو به زمانة يحتاج للخدمة. قال فى البحر: وظاهر الذخيرة أن المذهب عدم وجوب نفقة امراة الأب أو جاريته أو أم ولده حيث لم يكن بالأب علة، وأن الوجوب مطلقا عن رواية ابى يوسف" (شامی ۵/ ۳۴۴)۔

(۴) "وإن احتاج الأب إلى زوجة والابن موسر وجب عليه أن يزوجه أو يشترى له جارية" (ہندیہ ۱/ ۵۶۵)۔

(۵) "وكل من لزمه إعفافه لزمته نفقة زوجته لأنه لايتمكن من الإعفاف إلا بذلك" (المغنی ۸/ ۱۷۳)۔

(۶) "وعلى الابن الموسر نفقة زوجة أبيه وعليه تزويجه ولو زوجات فعليه نفقة واحدة يسلمها لأبيه" (الفقه على المذاهب الاربعة: ۴/ ۵۸۹)۔

(۷) "وعلى الولد فى رأى الجمهور نفقة زوجة الأب وإعفافه بزوجة واحدة وكذا عند المالكية والحنابلة من زوجة إن لم يحصل الإعفاف بواحدة؛ لأنه معنى يحتاج إليه ويلحقه الضرر بفقده فوجب كالنفقة" (الفقه الاسلامى وادلته ۱۰/ ۱۳۵)۔

(۸) "من وجبت عليه نفقته بالقرابة وجبت نفقته على قدر الكفاية؛ لأنها تجب للحاجة فقدرت بالكفاية، وإن

احتاج إلى من يخدمه وجبت نفقة خادمه، وإن كانت له زوجة وجبت نفقة زوجته لأن ذلك من تمام الكفاية'' (المجموع۱۹۶/۴۰۶)۔

فقہاء کی ان عبارتوں سے واضح ہوتا ہے کہ اگر والد نفقہ زوجہ پر قادر نہ ہو تو ان کی بیوی کا نفقہ اولاد پر واجب ہوگا۔ راقم الحروف کا بھی (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۱۰/ ۱۴۵، فتح القدیر ۴/ ۲۲۳، اور تبیین الحقائق ۳/ ۶۴ سے استدلال کرتے ہوئے) یہی خیال ہے۔

سوال نمبر ۶۔ بعض اوقات اولاد والد کی زندگی میں ہی جائداد کا مطالبہ شروع کردیتے ہیں اور اسے اپنا حق سمجھتے ہیں؛ کیا اولاد کے لئے ایسے مطالبہ کی گنجائش ہے؟ خاص کر ایسی صورت میں جب کہ والدین کی معاشی حالت بہتر اور اولاد محتاج ہوں؟

اس سوال کے جواب میں مولانا سعید الرحمن قاسمی کا خیال ہے کہ اگر والد کی وفات کے بعد ورثہ میں منازعت اور شریعت کی پامالی کا اندیشہ قوی ہو تو مطالبہ کی گنجائش ہے ورنہ نہیں، ان کے علاوہ تمام مقالہ نگار حضرات کا خیال ہے کہ والد تاحیات اپنی جائداد کے مالک ہوتے ہیں، اس میں کسی کا حق نہیں ہوتا، وہ اپنے اختیار سے اس میں تصرف کرنے کے مجاز ہوتے ہیں، اگر کسی کو کچھ دیتے ہیں تو اس کی حیثیت ہبہ وعطیہ کی ہوتی ہے، اولاد کا حق والد کے انتقال کے بعد ان کے ترکہ میں ہوتا ہے، اس لئے اولاد کا والد کی زندگی میں اپنا حق سمجھتے ہوئے ان کی جائداد کا مطالبہ کرنا درست نہیں ہے، آپ حضرات کے مستدلات حسب ذیل ہیں:

"للرجال نصيب مما ترك الوالدان والأقربون" (النساء: ۷) (نذیر احمد شافعی)۔

''والمراد من التركة ماتركه الميت'' (حاشیہ شریفیہ: ۳) (مفتی راشد حسین ندوی)۔

''ولكل واحدمنهم ان يتصرف في ملكه كيف ماشاء'' (شرح المجلۃ ۱/ ۶۴۳) (مولانا آزاد بیگ قاسمی)۔

''لكونهم ورثة لايستحق الا بعد المورث'' (ردالمحتار ۶/ ۶۸۸) (شاہد علی)۔

''شروطه ثلاثة: موت مورث حقيقة أو حكما كمفقود أو تقديرا كجنين فيه غرة ووجود وارثه عند موته حيا حقيقة أو تقديرا كالحمل والعلم بجهة ارثه'' (شامی ۱۰/ ۴۹) (مفتی محمد الیاس قاسمی)۔

''لا يجوز لأحد من المسلمين أخذ مال أحد بغير سبب شرعي'' (ردالمحتار ۴/ ۶۱)۔

بعض مقالہ نگار حضرات نے اسی کے ساتھ یہ بھی کہا ہے کہ لڑکا بطور ہبہ مطالبہ کرسکتا ہے، تعاون کی درخواست کرسکتا ہے، اور اگر کمانے پر قادر نہ ہو تو نفقے کا مطالبہ کرسکتا ہے، الدر المختار میں ہے:

''إن طلب الهبة مزاحا لا جدا فوهبه جدا وسلم صحت الهبة، لأن الواهب غير مازح وقد قبل الموهوب له قبولا صحيحا'' (الدرالمختار ۴/ ۵۶۸)۔

اولاد کے محتاج ہونے کی صورت میں تقریباً سبھی حضرات نے یہ کہا ہے کہ آسودہ حال والد کو چاہئے کہ ان کو اخلاقی طور پر دیدے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''خير الصدقة ماكان عن ظهر غني وابدا بمن تعول'' (صحیح البخاری ۳/ ۲۹۴) (مفتی ظہیر احمد)۔

''أن تذر ورثتك أغنياء خير من أن تذرهم عالة يتكففف الناس'' (مشکوۃ ۲/ ۲۶۵) (ایضا)۔

اور بعض مقالہ نگار حضرات نے اس بات کی بھی صراحت کی ہے کہ اگر مستقبل میں اولاد کے درمیان نزاع کا اندیشہ ہو تو والد اپنی حیات ہی میں عادلانہ تقسیم کردے تو جائز ہی نہیں بہتر ہوگا۔

عرض مسئلہ:

معذوروں اور بوڑھوں کے حقوق
(سوال نمبر ۷-۹)

مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی [۱]

حضرات علماء کرام ومفتیان عظام: معذوروں اور بوڑھوں کے حقوق کے سوال ۷ تا ۹ کا عرض تیار کرنے کی ذمہ داری اس ناچیز سے متعلق کی گئی ہے، اکیڈمی کی جانب سے کل ۷۳ مقالات موصول ہوئے بعض تفصیلی اور بعض مختصر، مقالہ نگاروں کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

مولانا خورشید انور اعظمی، مفتی محمد الیاس قاسمی، مفتی محمد عثمان بستوی، قاضی عبدالجلیل قاسمی، مفتی شبیر احمد قاسمی، مفتی رحمت اللہ ندوی، ڈاکٹر مولانا محمد شاہجہاں ندوی، قاضی محمد ریاض ارمان قاسمی، مفتی راشد حسین ندوی، مولانا عبدالتواب اناوی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مفتی شاہد علی قاسمی، مولانا محمد آزاد بیگ قاسمی، مفتی جمیل احمد نذیری، مولانا حافظ کلیم اللہ عمری، مولانا محمد حذیفہ داحودی، مولانا قمر الدین محمود قاسمی، مولانا محمد صبیح اختر قاسمی، مفتی عبدالرزاق قاسمی، مولانا سید انور سلیم، مولانا سعید الرحمن قاسمی، مفتی محمد ارشاد پالنپوری، مولانا عبداللہ خالد لوناواڑہ، مولانا حفیظ الرحمن مدنی اعظمی، مولانا حیدر علی قاسمی، مولانا ضیاء الدین ملک قاسمی، مولانا محمد احسن عبدالحق ندوی، قاضی محمد کامل قاسمی، مفتی ظہیر احمد کانپوری، مفتی عبدالمنان قاسمی (آسام)، مولانا فیضان احمد قاسمی، مولانا محمد قمر الزماں ندوی، مفتی نذیر احمد شافعی (شری وردھن)، مولانا ندیم احمد انصاری، مفتی امانت علی قاسمی، مولانا انور الحق قاسمی اور راقم الحروف محبوب فروغ احمد قاسمی۔

سوال نمبر: ۷- مغربی ملکوں میں عمر دراز لوگوں کے لئے ہاسٹل بنا دیئے گئے ہیں اب ہندوستان میں بھی جگہ جگہ ایسے ہاسٹل بن رہے ہیں جن میں نوجوان اپنے بزرگوں کو داخل کر دیتے ہیں؛ اس میں ایک پہلو یہ ہے کہ ان عمر دراز حضرات کو ایک جگہ اپنی ضرورت کی چیزیں مہیا ہو جاتی ہیں اور اپنے ہم عمر لوگ مل جاتے ہیں۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ وہ اپنے رشتہ داروں کی محبت سے محروم ہو جاتے ہیں، عمر کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ انسان چاہتا ہے کہ اس کے بال بچے اس کے قریب رہیں، اولاد اور اولاد کی اولاد کو دیکھ کر اسکی آنکھیں ٹھنڈی ہوں، ایسے ہاسٹلوں میں اس کی یہ خواہش ایک حسرت بن جاتی ہے، تو ایسے ہاسٹلوں کے بارے میں شرعی نقطہ نظر کیا ہے؟ کیا کوئی شخص اپنے بزرگوں کو ایسے ہاسٹلوں میں قیام پر مجبور کر سکتا ہے؟

اس سوال کا جواب دیتے ہوئے مقالہ نگاروں نے چار پہلوؤں پر بحث کی ہے:

الف- ایسے اولڈ ایج ہاسٹل کا قیام جائز ہے یا نہیں؟

ب- کیا بوڑھوں اور سن رسیدہ حضرات کو "اولڈ ایج ہاؤس" میں رہائش پر مجبور کیا جا سکتا ہے جس میں ہر قسم کی راحت وآرام فراہم ہو؟

ج- اگر سن رسیدہ لوگ خود ہی برضا ورغبت اولڈ ایج ہاؤس میں رہائش اختیار کرنا چاہیں تو کیا حکم ہے؟

د- بے سہارا اور لاچار لوگوں کے لئے ایسے ہاسٹلوں میں قیام کیسا رہے گا؟

ترتیب وار ہر ایک حکم اور مقالہ نگاروں کی آراء مندرجہ ذیل سطور میں درج کی جاتی ہیں:

الف- اولڈ ایج ہاؤس کا قیام:

---

[۱] استاذ حدیث مدرسہ حسنیہ کایم کلم، کیرالا۔

اولڈ ایج ہاؤس کے قیام کی بابت شرعی نقطہ نظر کیا ہے؟ بیشتر مقالہ نگاروں نے اس سے تعرض ہی نہیں کیا ہے، صرف ۱۶ حضرات کے مقالے میں اس پر روشنی ڈالی گئی ہے، غالباً جن حضرات نے اس کو محل اعتبار نہیں سمجھا ان کے پیش نظر یہ ہو کہ حقیقت میں اس کا حکم تعاون وتسبب پر مبنی ہے، اگر بوڑھوں کے لئے ایسے ہوسٹلوں میں رہائش کا مسئلہ حل ہو جاتا ہے تو ایسے ہوسٹلوں کو قائم کرنے کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔

جن حضرات نے اس پہلو پر کلام کیا ہے ان کے نقاط نظر بھی مختلف ہیں:

عدم جواز کی رائے:

۱- پہلا نقطہ نظر یہ ہے کہ اس قسم کے ہوسٹلوں کا قیام جائز نہیں ہے، بعض حضرات نے نامناسب بھی کہا ہے، اس نظریہ کے قائلین مندرجہ ذیل حضرات ہیں: مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا محمد حذیفہ داحودی، مولانا فیضان احمد قاسمی، مولانا حیدر علی قاسمی، مولانا حفیظ الرحمن اعظمی، مولانا انور الحق قاسمی، مفتی محمد الیاس قاسمی۔

ان تمام حضرات کے خیال میں یہ مغربی تہذیب کی تقلید، غیروں کے ساتھ تشبہ، نیز ایذا رسانی کا سبب ہے، اور یہ ساری چیزیں شریعت اسلامیہ میں ممنوع و ناجائز ہیں۔

مولانا محمد حذیفہ داحودی لکھتے ہیں: عمر دراز لوگوں کو داخل کرنے کے لئے مغربی ملکوں اور ہندوستان میں بنائے جانے والے ہاسٹلوں کا قیام شریعت اسلامیہ کی تعلیمات سے میل نہیں کھاتا۔

مولانا فیضان احمد قاسمی رقم طراز ہیں: اولڈ ہومز کا مقصد سراسر مغربی ہے، یہ اسلامی تعلیمات و روایات کے خلاف ہے، مولانا حیدر علی قاسمی چند وجوہات: اتباع ہوی کا لزوم، مشابہت بالغیر، ایذاء رسانی وحق تلفی ذکر کر کے لکھتے ہیں: ان چیزوں کے پیش نظر ایسے ہاسٹل کا قیام شرعاً ناجائز ہے۔

مولانا ابوسفیان مفتاحی تشبہ بالغیر والی حدیث لکھ کر لکھتے ہیں: حدیث سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کو ایسے ہاسٹل بنانا جائز نہیں کہ وہ مسلمانوں میں نہیں، بلکہ عند اللہ غیروں میں شمار ہوں گے، لہذا ایسے ہاسٹل- اللہ کی پناہ- اسلام کی ضد میں ایک سازش ہے، مولانا حفیظ الرحمن مدنی والدین واولاد کے مابین دوری کا ذریعہ ہونے کی وجہ کر فرماتے ہیں: اس قسم کا ہاسٹل بنانا شرعی اعتبار سے بہتر نہیں معلوم ہوتا ہے۔

جواز کی رائے:

اس کے برخلاف دوسرا نقطہ نظر یہ ہے کہ ایسے ہوسٹل بنانے کی حوصلہ افزائی کی جائے گی یا کم از کم جواز کے دائرے میں رکھا جائے گا، کیونکہ بہت سے لاچار ومجبور حضرات ایسے ہیں جن کا کوئی پرسان حال نہیں، بلکہ کبھی اولاد اور اہل قرابت ہونے کے باوجود خبر گیری کرنے والا کوئی نہیں ہوتا، ایسے وقت میں یہ معاشرتی و سماجی ضرورت بن جاتا ہے، اس لئے ہوسٹل بنانے میں حرج نہیں ہوگا، اس قسم کے خیال کے حاملین مندرجہ ذیل حضرات ہیں:

مولانا خورشید انور اعظمی، مولانا محمد عثمان بستوی، مفتی عبد الرزاق قاسمی، مولانا رحمت اللہ ندوی، حافظ کلیم اللہ عمری، مولانا عبد اللہ خالد لونا واڑہ، مفتی نذیر احمد شافعی، ڈاکٹر محمد شاہجہاں ندوی، مفتی امانت علی قاسمی۔

ان میں سے بعض حضرات نے اس عمل کو مستحسن قرار دیا ہے، جبکہ بعض نے صرف جواز کے دائرے میں رکھا ہے۔

مولانا خورشید انور اعظمی لکھتے ہیں: ایسے ہاسٹل کے قیام میں بظاہر کوئی شرعی قباحت نہیں ہے، بلکہ اگر اس میں بوڑھوں کے ذہن ومزاج، ان کی نفسیات اور جملہ ضروریات زندگی کا لحاظ رکھا گیا ہو تو یہ بہتر اقدام ہے۔

مولانا محمد عثمان بستوی نے لکھا ہے: عمر دراز افراد کے لئے ہاسٹل کا قیام شرعاً فی نفسہ ایک مستحسن قدم ہے، اس کی وجہ بتاتے ہیں کہ ایسے حضرات کی خبر گیری حقیقت میں بیت المال اور اسلامی حکومت کی ذمہ داری ہے جس پر عمل اس وقت متروک ہو گیا ہے، لہذا اس کے علاوہ کوئی صورت نہیں ہے کہ اجتماعی طریقے سے ان کی کفالت کی جائے، یہ شریعت کی نگاہ میں پسندیدہ عمل ہے۔

مفتی عبد الرزاق صاحب نے بھی کچھ ایسا ہی لکھا ہے، لیکن وہ مستحسن کے بجائے جائز ودرست فرماتے ہیں۔

مولانا رحمت اللہ ندوی لکھتے ہیں: البتہ اگر اولاد بوڑھوں اور معذوروں کے حقوق ادا نہ کر رہی ہو اور اہل قرابت اپنی ذمہ داری محسوس کر رہے ہوں اور نہ سماج

کا کوئی فرد آگے بڑھ رہا ہو جس کی وجہ سے وہ لاوارث بن گئے ہوں اور کسم پرسی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوں تو ایسی صورت میں ان کے لئے اس غرض سے ہاسٹل قائم کرنا اور اس میں ان کی ضروریات وسہولیات مہیا کرنا، تاکہ وہ اپنی زندگی کے بقیہ ایام باعزت طور پر گزار سکیں اور در بدر کی ٹھوکر کھانے سے محفوظ رہیں، ایک مناسب کام معلوم ہوتا ہے، خواہ یہ اقامتی ادارے، حکومت کی طرف سے قائم کئے جائیں یا رفاہی یا سماجی تنظیموں کی طرف سے۔

مفتی نذیر احمد لاچار ومجبور حضرات کے لئے ہوسٹل کا قیام سماجی ومعاشرتی ضرورت قرار دیتے ہیں۔

ڈاکٹر محمد شاہجہاں ندوی لکھتے ہیں: یہ مستحسن قدم ہے کہ یہ نیکی پر تعاون کی ایک شکل ہے، اس لئے کہ قرطبی کے بیان کے مطابق تعاون کی الگ الگ شکلیں ہوتی ہیں۔

مجوزین کی رائے بہت حد تک قرین صواب معلوم ہوتی ہے، اس لئے کہ ضرورت وحاجت کے وقت بہت سے احکام تبدیل ہوجاتے ہیں، اسی طرح بہت سی چیزیں مغربی تہذیب کی پیداوار ہونے کے باوجود اگر شریعت سے متصادم نہ ہوں اور عام ہوجائیں حتی کہ اصل شئی کا تصور محو ہوجائے، یا ضرورت وحاجت داعی ہوجائے تو شریعت اغماض سے کام لیتی ہے، نیز بعض اوقات اپنے گھر میں اولڈ ہاسٹلوں کے مقابلہ میں زیادہ تکلیف وگھٹن کی حالت ہوتی ہے، اس لئے یہ کہنا کہ اس قسم کے ہاسٹل ایذاء رسانی کا ذریعہ ہیں علی الاطلاق صحیح نہیں معلوم ہوتا ہے، البتہ اس بات کا لحاظ رکھنا تو لابدی ہے کہ اس کے انتظامات میں کسی محظور کا ارتکاب لازم نہ آیا کرے، اس کو حلال کرنے کی مجال کسی میں نہیں ہوگی۔

۲- کیا کوئی شخص اپنے بزرگوں کو ایسے ہوسٹل میں قیام پر مجبور کرسکتا ہے؟

تمام مقالہ نگار متفق ہیں کہ مجبور نہیں کیا جاسکتا ہے، اس لئے کہ یہ

(الف) "وصاحبهما في الدنيا معروفا" (سورہ لقمان: ۱۵) کے خلاف ہے (مفتی جمیل احمد نذیری، مولانا ندیم احمد انصاری)۔

ب- والدین کے لئے حسن سلوک کی تاکید آئی ہے، حسن سلوک میں یہ ہے کہ ان کی تمام ضرورتوں کا خیال رکھا جائے، اور ان کی ہر خوشی کی قدر کی جائے، ان کے لئے ہر راحت کا انتظام کیا جائے اور ان کی مرضی کے بغیر ان کو ہاسٹل میں ٹھہرانا ان کو اذیت اور تکلیف میں مبتلا کرنا ہے (مفتی امانت علی قاسمی، مولانا محمد عثمان بستوی، مولانا سعید الرحمن قاسمی)۔

ج- ڈاکٹر محمد شاہجہاں ندوی نے قرآن کریم کی آیت: "وبالوالدين إحسانا إما يبلغن عندك الكبر أحدهما أو كلاهما" (سورہ اسراء: ۲۳) سے استدلال کیا ہے، کہ عندک کا لفظ دلالت کررہا ہے کہ سن رسیدہ والد اولاد کے پاس رہیں گے، نیز خدمت واجب ہے، اف کہنے تک کی ممانعت ہے، سب دلالت کرتے ہیں کہ اولڈ ہوسٹلوں کے حوالہ کرنا جائز نہیں، حافظ کلیم اللہ عمری نے بھی کچھ ایسا ہی کہا ہے۔

د- یہ حقوق الوالدین ہے (مفتی نذیر احمد شافعی، مفتی عبدالرزاق امروہوی، مولانا ندیم احمد انصاری)۔

ھ- ''قال هشام بن عروة عن أبيه: ''واخفض لهما جناح الذل من الرحمة''، قال: لا تمنعهما شيئا يريدانه'' (احکام القرآن للجصاص ۵ / ۲۰) (مولانا خورشید انور اعظمی وغیرہ)۔

و- علامہ آلوسی نے "وصاحبهما في الدنيا معروفا" (سورہ لقمان: ۱۵) کی تفسیر میں جملہ ضروریات، بھرپور خدمت، اور تمام حقوق کی ادائیگی کا ذکر کیا ہے، یہ اسی وقت ممکن ہے، جبکہ ساتھ ہو۔

مولانا سید انور سلیم لکھتے ہیں: ظاہر ہے کہ اولاد جب اپنے بزرگ کو ہاسٹل میں داخل کریں گے تو اس میں بھی اخراجات ہوں گے وہ انہیں اخراجات کو اپنے گھر میں خرچ کریں تو بات برابر ہے، ''ردالمحتار'' کی عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ خادم کا خرچ اولاد کے ذمہ ہے۔

ز- مولانا قمر الزماں ندوی آیت کریمہ "إما يبلغن عندك الكبر أحدهما أو كلاهما" (سورہ اسراء: ۲۳) لکھ کر فرماتے ہیں: میری رائے میں اس آیت میں عبارت النص، دلالۃ النص، اشارۃ النص اور اقتضاء النص سب کچھ یہی بتارہا ہے کہ والدین کا بڑھاپا اولاد کے پاس گزرنا چاہئے، انہوں نے کتاب ''دو مہینہ امریکہ میں'' اور رسالہ ''افکار ملی'' وغیرہ سے بعض بزرگوں کے مضامین کے تراشے بھی تحریر کیے ہے، جن سے اس کے نقصانات اور برے نتائج واضح ہوتے ہیں۔

ح- مولانا محمد الیاس قاسمی صاحب آیت کریمہ: "أسکنوهن من حیث سکنتم من وجدکم" (سورۂ طلاق: ۶) سے استدلال کرتے ہوئے لکھتے ہیں: یہ حکم بیویوں کے لئے ہے تو والدین کے لئے اپنی حیثیت کے مطابق اپنی رہائش کی طرح رہائش کا انتظام کرنا بدرجہ اولی لازم ہوگا اور انہیں اپنے گھروں سے دور کر کے ہاسٹلوں میں قیام پر مجبور کرنا قطعاً جائز نہیں ہوگا۔

ط- "النهایة فی شرح الهدایه" میں ہے: "ليس من المعروف أن يعيش الرجل في نعم الله ويتركهما أي: الأبوين يموتان جوعا، والمعروف هو المحاسنة بالخلق الجميل، والحلم والاحتمال والبر والصلة وبما يقتضيه الكرم والمعروف" (مولانا محمد آزاد بیگ قاسمی)۔

ی- درحقیقت اس طرح کا تصور جذبہ خدمت کے فقدان اور ان کو رحمت خداوندی تصور کرنے کے بجائے بوجھ سمجھنے کی وجہ سے پیدا ہوا ہے اور ظاہر ہے کہ اسلام میں اس کی گنجائش نہیں (مولانا محمد حذیفہ داحودی)۔

چند مقالہ نگاروں نے کچھ تفصیل بھی کی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ممانعت اس وقت ہے، جبکہ ورثہ میں خود یا خدمت گاروں کے ذریعہ ان کی ضروریات کے تکفل کی استطاعت ہو، نیز ان بوڑھوں کو اپنی اولاد کے پاس اولڈ ہاؤس کے مقابلہ میں زیادہ تکلیف نہ ہو۔ چنانچہ مولانا محمد عثمان بستوی لکھتے ہیں: وہ عمر دراز حضرات جن کے ورثہ موجود ہوں اور خوشحال ہوں تو ایسے عمر دراز حضرات کو دوسروں کے حوالہ کرنا انتہائی بے مروتی اور قساوت قلبی کی دلیل ہے۔

مولانا عبدالتواب اناوی نے دفعہ وار کر کے لکھا ہے:

الف- اگر والدین کو ہاسٹل کے مقابلہ میں گھر میں تکلیف زیادہ ہو رہی ہو اور ہاسٹل میں رکھ کر بھی اولاد ان کی تیمارداری اپنا فرض سمجھتی رہے گی تو اس صورت میں جائز ہوگا کہ اپنے بزرگوں کو ایسے ہاسٹلوں میں داخل کر کے ممکن حد تک انہیں راحت پہنچانے کی سعی کریں۔

ب- اگر کسی وجہ سے وہاں رہنے والے حضرات گھٹن محسوس کریں تو جائز نہیں، مثلاً وہاں آنا جانا قرابت داروں کا ممنوع ہو، یا قرابت دار نہ جاتے آتے ہوں، تو ممنوع ہوگا۔

مفتی راشد حسین ندوی لکھتے ہیں: یا گھر کی صورت حال ایسی ہے کہ یہاں ان کی خدمت کا پورا انتظام نہیں ہو سکتا، جبکہ اولڈ ایج ہوم میں ایسا ہو سکتا ہے تو اس طرح کی صورت حال میں ان کو وہاں داخل کرنے کی اجازت ہوگی۔

مفتی ظہیر کانپوری کی رائے ہے: تاہم ناگزیر حالات میں اولاد کا والد کے پاس مستقل رہنا مشکل و متعذر ہو تو انتہائی مجبوری کی حالت میں ان کو اولڈ ہاؤس میں رکھا جا سکتا ہے۔

مفتی شاہد حیدرآباد نے بھی دفعہ وار کر کے لکھا ہے:

الف- اولاد گھر میں موجود ہو، بوڑھے ماں باپ کی خدمت کرنے میں دقت نہ ہو، گھر میں رہنے کی خواہش ہو تو ایسی صورت میں اولاد پر خدمت واجب ہے، بوڑھے کو بیت المعمرین کے حوالہ کرنا جائز نہیں ہے۔

ب- اولاد گھر میں موجود نہ ہو باپ کی خواہش گھر میں رہنے کی ہو تو اگر اولاد مستطیع ہوں تو بوڑھے باپ کے لئے اس پر خادم کا نظم واجب ہے، ہاسٹل کے حوالہ کرنا جائز نہیں۔

ج- اگر گھر میں بوڑھے باپ کے ساتھ نامناسب برتاؤ ہوتا ہو اس کی وجہ سے وہ ہاسٹل منتقل ہونا چاہتا ہو تو بچوں پر لازم ہے کہ ماحول تبدیل کریں، خوشگوار فضا بنائیں۔

د- اگر اولاد معاشی مجبوری یا کسی اور مناسب مجبوری سے ماں باپ سے دور ہو اور تنگ دستی کی بنیاد پر خادم نہیں رکھ سکتا ہو یا اولاد ہی نہ ہو اور دوسرے رشتہ دار صحیح خدمت نہیں کر پا رہے ہوں تو پھر ان کا ہاسٹل منتقل ہونا قبیح نہیں۔

خلاصہ یہ ہوا کہ قدرت ہونے کے باوجود ہاسٹل کے حوالہ کرنا جائز نہیں، ہاں استطاعت نہیں ہے تو اور بات ہے، "بدائع الصنائع" میں بھی اشارہ موجود ہے:

"وترك الإنفاق من ذي الرحم المحرم مع قدرته وحاجة المنفق عليه تفضي إلى قطع الرحم، فيحرم الترك،

وإذا حرم الترك وجب الفعل ضرورة''۔

راقم بھی اس تفصیل کو بہتر سمجھتا ہے، یعنی جب تک نبھ سکے نبھانے کی حتی المقدور کوشش کی جائے، چند عرصے کی تو بات ہے، ہاں حالات ہی ناگفتہ بہ ہوجائیں، مل جل کر رہنے میں مفاسد وضرر زیادہ ہو، نیز ہاسٹل کی رہائش میں عافیت ہو، شرعا دین وایمان بھی سلامت رہ سکے تو پھر ایسے ہوسٹلوں میں منتقل کردینے میں حرج نہیں ہے کہ جلب المنافع سے دفع المفاسد اولی ہوتا ہے۔

اگر عمر رسیدہ حضرات بخوشی اولڈ ایج ہاسٹل منتقل ہونا چاہیں:

۱۹ر مقالہ نگاروں نے اس پہلو کو بھی تشنہ باقی نہیں رکھا، جبکہ ۱۸ر حضرات کی تحریریں راقم کے خیال میں ساکت ہیں، جن حضرات نے اس کو موضوع بحث بنایا ہے ان میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔

۱- پہلی رائے ان حضرات کی ہے جنہوں نے برضا ورغبت بھی اولڈ ایج ہاؤس میں منتقل ہونے کو ناجائز قرار دیا ہے، بعض حضرات کی تحریر سے صراحۃ یہ بات معلوم ہورہی ہے، اور بعض حضرات کی تحریر اس بابت واضح نہیں، مگر جن دلائل ووجوہات کا سہارا لیا ہے ان کا تقاضا ہے کہ حرام ہی ہو، جن حضرات نے اس کو صراحۃ یا اشارۃ ناجائز قرار دیا ہے ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

مفتی عبدالرزاق قاسمی، مولانا قمر الدین محمود قاسمی، مولانا ضیاء الدین ملک قاسمی، مفتی عبدالمنان، مولانا محمد قمر الزماں ندوی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا حیدر علی قاسمی، مفتی محمد عثمان بستوی، مفتی شبیر احمد قاسمی۔

ان حضرات کے پیش نظر تہذیب فرنگ کی بے جا چاپلوسی، فریضہ خدمت سے فرار، قطع رحمی وایذاء رسانی کا ذریعہ اور غیر اقوام کی مشابہت اختیار کرنا ہے۔

مفتی شبیر احمد قاسمی نے بلا کسی تفصیل لکھا ہے: ہاسٹل میں داخل کردینا ان کے حق میں جیل خانہ کردینے کے مرادف ہے اور شرعا صلہ رحمی کے خلاف قطع رحمی کا ایک دروازہ کھول دینا ہے۔

مولانا محمد عثمان بستوی لکھتے ہیں: قدرت واستطاعت ہوتے ہوئے والدین کو اولڈ ہاؤس کے حوالہ کرنا کسی حال میں جائز نہیں، والدین کی خدمت دینی فریضہ ہے اور ان کی معمولی سے معمولی تکلیف کا سبب بننا شرعا حرام وناجائز ہے۔

مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا حیدر علی قاسمی نے اولڈ ہوسٹل کو تشبہ بالغیر قرار دیا ہے، اس لئے اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ کسی بھی صورت میں سن رسیدہ حضرات کو داخل کرنا جائز نہیں۔

مفتی عبدالمنان قاسمی (آسام) نے لکھا ہے: اگر وہ خود جانا چاہے تو اولاد کو روکنے کا حق ہوگا، لیکن کوئی دلیل ذکر نہیں کی۔

مولانا ضیاء الدین قاسمی ندوی اس کو ایک مہمل عمل قرار دیتے ہیں، لکھتے ہیں: ہاں ماں باپ بطیب خاطر اپنی مرضی سے ایسی جگہوں پر رہنا پسند کریں تو جواز کی صورت بن سکتی ہے، مگر یہ ایک مہمل تصور ہے، کیونکہ حقائق وواقعات اس کی تردید کرتے ہیں، یورپ میں جب آزاد خیال ماں باپ پسند نہیں کرتے جبراً گوارہ کرتے ہیں تو ہمارے مشرقی اسلامی معاشرے میں ان کی رضامندی اور معاشرتی زندگی کے مروجہ رہن سہن سے اس کی نفی ہوتی ہے۔

گویا کہ مولانا اس بات کو ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں کہ کوئی شخص ایسے ہوسٹلوں میں رہنا اپنی مرضی سے پسند کرے گا، لیکن مسئلہ کا تعلق اسی صورت سے ہے، جبکہ رضا ورغبت بلا کسی دباؤ کے موجود ہوں۔

مولانا قمر الدین محمود قاسمی نے بوڑھوں کے لئے بنائے گئے ہوسٹلوں کی قباحتوں کا ذکر کیا ہے، خاص طور پر مسلم وغیر مسلم کے اختلاط سے عقائد واخلاق پر جو اثرات بد مرتب ہوں گے وہ ظاہری اعتبار سے حاصل ہونے والے کچھ فوائد کے مقابلہ یقینا قابل توجہ ہیں، لہذا ظاہری فوائد کو حاصل کرنے کے لئے ان کو اخروی نقصانات کا شکار نہیں بنایا جائے گا۔

۲- اس بابت دوسرا نقطہ نظر یہ ہے کہ اگر برضا ورغبت سن رسیدہ حضرات ایسے ہوسٹلوں کی رہائش کو قبول کریں، نیز اخروی نقصانات سے حفاظت کا ظن غالب ہو تو اولڈ ایج ہاؤس میں منتقل کردینے میں حرج نہیں ہے۔

اس نقطہ نظر کے حاملین مندرجہ ذیل حضرات ہیں:

مفتی راشد حسین ندوی، مفتی شاہد علی قاسمی، مفتی امانت علی قاسمی، مولانا خورشید انور اعظمی، مولانا سید انور سلیم، قاضی عبدالجلیل قاسمی، مولانا محمد صبیح اختر قاسمی، مولانا عبدالتواب اناوی، مولانا رحمت اللہ ندوی، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی۔

یہ تمام حضرات اس بات پر تقریباً متفق ہیں کہ اولاد و قریبی رشتہ داران سن رسیدہ حضرات کو اولڈ ایج ہاؤس میں داخل کر کے اپنی ذمہ داری سے پھر بھی کلیۃ سبکدوش نہیں ہو سکتے ہیں، بلکہ وقتاً فوقتاً آنا جانا رکھنا ہوگا، اور حتی الامکان ہر ایسے اقدام سے احتراز لازم ہوگا جس سے ان کو تکلیف ہوتی ہو۔

مفتی راشد حسین ندوی لکھتے ہیں: اس لئے کہ وجوب ان کی رضا حاصل کرنے اور کما حقہ ان کی خدمت انجام دینے کا ہے جس کی صورتوں میں اختلاف ہو سکتا ہے۔

مفتی شاہد علی قاسمی لکھتے ہیں: اگر اولاد خدمت کے لئے تیار ہو یا خادم رکھنے پر آمادہ ہو، اور عمر دراز حضرات اپنی خوشی و مرضی سے ہاسٹل کی بہتر سہولتوں کی وجہ سے ہاسٹل کا رخ کریں تو اولاد گنہگار نہ ہوگی، نیز اگر بوڑھے حضرات اپنی مرضی سے ہاسٹل منتقل ہو گئے ہوں یا کسی اور مشکل کی وجہ سے انہیں مجبوراً ہاسٹل کا رخ کرنا پڑا ہو، ایسی صورت میں اولاد کا گاہ بگاہ ان سے ملاقات کرنا اور ان کی خبر گیری کرنا لازم ہے، یہی بات مولانا خورشید انور اعظمی نے بھی لکھی ہے، مولانا سید انور سلیم لکھتے ہیں: ایسی صورت میں یہی سمجھا جائے گا کہ وہ اولاد گویا خدمت سے سبکدوش کرنا چاہتے ہیں، لیکن اولاد کا فریضہ ہے کہ اس حالت میں بھی اپنے والدین کی ہاسٹل میں جا کر خبر گیری کرتے رہیں۔

مولانا رحمت اللہ ندوی اس وقت اجازت دیتے ہیں، جبکہ گھر سے زیادہ ہوسٹل میں آرام و سہولت ہو، نیز ہاسٹل اندرون شہر ہو، اور آمد و رفت ہوتی رہے، اسی طرح رضا و رغبت کسی دباؤ کی بنا پر نہ ہو۔

راقم کا رجحان بھی یہی ہے، اس لئے کہ ممانعت کی اصل وجہ خدمت کا فقدان اور جبر و اکراہ ہے، جب رضا و رغبت موجود ہے اور خدمت بھی بھرپور ہو رہی ہے، اس لئے کہ خدمت سے مقصود آرام و راحت ہے جس کا انتظام ہوسٹل میں اچھے طریقے سے ہے، پھر ورثہ تو خدمت کے اخراجات بھی برداشت کر رہے ہیں تو بالواسطہ وہی خدمت کر رہے ہیں، اگر فرض کر لیں کہ ان کی طرف سے خدمت نہیں ہو پا رہی ہے تو بھی رضا کی صورت میں سمجھا جائے گا کہ مخدومین نے خدمت کو معاف کر دیا ہے، البتہ اس کی وجہ سے اگر ذہنی و فکری کجروی پیدا ہو جو دین و ایمان کو برباد کر دے تو ایسے وقت میں یقیناً خواہ کتنا بھی راضی ہو، ہوسٹل کے حوالہ نہیں کیا جائے گا۔

۴- لاچار و بے سہارا لوگوں کے لئے ہوسٹل میں رہائش:

امت میں ایسے لاچار و مجبور و بے سہارا لوگ بھی ہیں جو در در کی ٹھوکریں کھا رہے ہیں، نہ کوئی پرسان حال ہے، نہ ٹھکانہ، ایسے بے سہارا لوگوں کے لئے اس قسم کے ہوسٹل میں قیام مناسب ہے یا نہیں اس پہلو پر بھی ۹ حضرات نے کلام کیا ہے، باقی مقالہ نگاروں نے سکوت کیا ہے، غالباً اس سے تعرض نہ کرنے والے بیشتر وہ حضرات ہیں جنہوں نے ہوسٹل کے قیام کی اجازت ہی نہیں دی، یا قیام کی بحث کو چھیڑا ہی نہیں، صرف تین حضرات: مولانا خورشید انور اعظمی، مولانا عبداللہ خالد لونا واڑہ اور مفتی امانت علی قاسمی نے ہر چند کہ قیام ہوسٹل کو جائز ٹھہرایا تھا، مگر لاچار و مجبور حضرات کے حکم سے تعرض نہیں کیا ہے، جن حضرات نے اس پر کلام کیا ہے ان تمام نے اس کو جائز یا مستحسن قرار دیا ہے، ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

مولانا رحمت اللہ ندوی، مولانا محمد کامل قاسمی، مولانا محمد عثمان بستوی، مفتی عبدالرزاق امروہوی، مولانا محمد قمر الزماں ندوی، مفتی شاہد علی قاسمی، مولانا عبدالتواب اناوی، مفتی نذیر احمد شافعی، مفتی محمد ریاض ارمان قاسمی۔

اکثر حضرات نے دلائل سے تعرض نہیں کیا ہے، البتہ تحریروں سے یہ بات آشکارا ہو رہی ہے کہ در بدر کی ٹھوکریں کھانے والے لاچار و بے سہارا حضرات کی کفالت حقیقت میں حکومت اور بصورت دیگر سماج کی اجتماعی ذمہ داری ہے، یہ ذمہ داری ایسے ہوسٹلوں میں داخل کر کے بحسن و خوبی انجام پا سکتی ہے۔

مولانا محمد عثمان بستوی لکھتے ہیں: اسلام نے ایسے مجبور لاوارث افراد کی خبر گیری بیت المال اور اسلامی حکومت کے ذمہ رکھی ہے، لیکن جب اسلامی دستور اور اس کے طریقے پر عمل نہیں کیا جاتا ہے تو ایسے لاچار و مجبور افراد کی دیکھ ریکھ کے لئے اس کے علاوہ کوئی اور صورت نہیں رہ جاتی کہ ان کا نظم اجتماعی طریقے پر

کیا جائے۔

مولانا محمد قمر الزماں ندوی بھی اسی طرح کی باتیں کہتے ہوئے لکھتے ہیں: بلکہ احقر کی رائے میں تو حکومت کے لئے ایسا انتظام کرنا واجب اور ضروری ہے، کیونکہ "السلطان ولی من لا ولی له" (حدیث) اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ایسے بے سہارا اور معذور سن رسیدہ افراد کی پوری کفالت کی ذمہ داری حکومت کی ہوتی ہے۔

قاضی محمد ریاض ارمان نے اس بابت انٹرنیشنل فقہ اکیڈمی جدہ کا فیصلہ نقل کیا ہے، فیصلہ کی ترجمانی ان الفاظ میں ہے: ان کے خاندان ہی ان کے لئے بنیادی جگہ ہوں، تاکہ وہ عائلی زندگی کا لطف اٹھا سکیں، ان کے بیٹے اور پوتے ان کے ساتھ حسن سلوک کریں وہ اپنے اقرباء واحباب اور پڑوسیوں کے حسن سلوک سے لطف اندوز ہوں، اگر ان کے اپنے خاندان نہ ہوں تو مناسب ہے کہ ان کے لئے اولڈ ہاؤسز میں گھریلو ماحول فراہم کیا جائے۔

سوال نمبر: ۸- بوڑھاپے کی عمر میں اگر انسان کا ہاتھ خالی ہو تو اسکی بے سہارگی اور بڑھ جاتی ہے اور اگر اسکی اولاد یا قریبی رشتہ دار موجود نہ ہوں تب تو انسان اپنے آپ کو اس دنیا میں تنہا محسوس کرنے لگتا ہے؛ کیا ایسے لوگوں کی اجتماعی کفالت کے لئے خصوصی طور پر زکوۃ کی رقم استعمال کی جاسکتی ہے؟

اس سوال کا جواب مولانا ضیاء الدین قاسمی ندوی کے مقالہ میں احقر کو نہیں مل سکا، اسی طرح مولانا ابوسفیان مفتاحی کے مقالہ کا آخری صفحہ ناچیز تک نہیں پہنچ سکا، آخری حصہ میں سوال ۸، ۹ کے جوابات تھے، اسی طرح سید انور سلیم صاحب سوال میں مذکور سن رسیدہ حضرات کو زکاۃ دینے کے قائل ہیں، مگر اجتماعی کفالت کا کیا معنی فرماتے ہیں: یہ سمجھ میں نہیں آیا۔

باقی ۳۴ مقالہ نگاروں نے اس سوال کا جواب دیا ہے، مفتی شبیر احمد قاسمی کے علاوہ تمام حضرات زکاۃ کے شرعی اصول خاص طور پر تملیک کی صفت کو برپا کر کے اجتماعی کفالت کے جواز کے قائل ہیں، لیکن مفتی شبیر احمد قاسمی صاحب لکھتے ہیں: اگر قریبی رشتہ دار موجود نہیں ہیں تو دور کے رشتہ داروں کی ذمہ داری ہے کہ ان کی ضرورت پوری کریں، نیز اس میں یہ بات بھی ہے کہ دور کے رشتہ دار اپنی زکاۃ کی رقم سے بھی ان کی ضرورت پوری کرسکتے ہیں، لہذا اجتماعی کفالت کے واسطے زکاۃ اکٹھا کرنے کی ضرورت نہیں، بلکہ زکاۃ کا پیسہ ان کمزوروں کے ہاتھ میں دے کر براہ راست مالک بنا دیا جائے، وہ اپنے حساب سے اپنی ضرورت پوری کرلیا کریں، پھر مفتی صاحب نے کتب فقہیہ سے ان عبارات کو نقل کیا ہے جن سے ادائے زکاۃ کے لئے تملیک کی شرط ضروری معلوم ہوتی ہے، گویا کہ اجتماعی کفالت کے عدم جواز میں اصلاً شرط تملیک کا فقدان ہی مؤثر ہے، لیکن اجتماعی کفالت میں تملیک کو برپا کرلیا جائے، بایں طور کہ اجتماعی طور پر زکاۃ وصول کی جائے، اس سے کھانا پکا کر، کپڑے سلوا کر، علاج کے لئے دوا خرید کر ان مستحقین کو مالک بنا دیا جائے، یا شرعی ضابطے کے مطابق حیلہ تملیک کرلیا جائے تو تملیک کی شرط بھی پوری ہوجائے گی اور اجتماعی کفالت بھی ہوجائے گی، جیسا کہ مدارس کے خدا ترس منتظمین تملیک یا حیلہ تملیک اختیار کرتے ہیں تو شاید مفتی صاحب کو بھی اعتراض نہ ہوگا۔

ادائے زکاۃ کے لئے تملیک کی شرط کلیدی ہے اور ائمہ اربعہ کے یہاں متفق علیہ ہے، غالباً اس کی شہرت کی بنا پر دس مقالہ نگاروں نے اس کو ذکر نہیں کیا ہے، بقیہ حضرات نے خاص طور پر اس پر زور دیا ہے، البتہ چند مقالہ نگار اس بات کے قائل ہیں کہ فنڈ کے منتظم کو زکاۃ دے دینا تملیک کے لئے کافی ہے، مزید تملیک کی ضرورت نہیں ہے، اس کے قائلین میں ہیں: مولانا سعید الرحمن قاسمی، مفتی امانت علی قاسمی، مولانا محمد عثمان بستوی۔

مولانا محمد عثمان بستوی لکھتے ہیں: جب کسی انجمن اور کمیٹی کی طرف سے زکاۃ کی اصولی مصارف میں خرچ کرنے کے لئے ہوگی تو زکاۃ اس کمیٹی کے قبضے میں پہنچنے سے ادا ہوجائے گی۔

اس کے باوجود مولانا موصوف مصرف میں تملیک کو ضروری قرار دیتے ہیں، جیسا کہ انہوں نے ادائے زکاۃ کے لئے تین شرطوں میں شرط ۲ میں بیان کیا ہے۔

مفتی امانت علی لکھتے ہیں: محتاج اور ضرورت مند بوڑھوں کی طرف سے کوئی ادارہ بحیثیت وکیل زکاۃ وصول کرسکتا ہے اور ان کی ضرورتوں پر خرچ کیا جاسکتا ہے، زیادہ بہتر ہے کہ ان کو زکاۃ کا مالک بنا دیا جائے۔

مولانا سعید الرحمن قاسمی ادارہ کو زکاۃ دہندگان اور بوڑھے دونوں کا وکیل مانتے ہیں، لہذا زکاۃ وصول کرتے ہی زکاۃ ادا ہوجائے گی، البتہ بوڑھوں پر خرچ کرنا ان کی ذمہ داری ہوگی۔

ان تین حضرات کے علاوہ ۲۰ حضرات نے خصوصی تملیک یا شرعی حیلہ تملیک کی شرط لگائی ہے، اس پر ان تمام نصوص سے استدلال کیا ہے جو تملیک کو ضروری قرار دیتی ہیں، اس بابت مولانا خورشید انور اعظمی نے "معارف القرآن عثمانی" سے ایک پیراگراف نقل کیا ہے، جس میں جمہور فقہاء کا مسلک بیان کیا گیا ہے کہ مستحقین کا مالکانہ قبضہ ضروری ہے تب ہی زکاۃ کی ادائیگی ہو پائے گی۔

بہر حال یہ بات کہ منتظم کا قبضہ زکاۃ دہندگان کا قبضہ ہے یا مستحقین کا؟ اکیڈمی اس مسئلہ سے فارغ ہو چکی ہے، لیکن محتاط طریقہ یہ ہے کہ خصوصی تملیک کو اختیار کیا جائے، یہ کچھ مشکل نہیں، اور اختلاف سے خروج بھی ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اگر زکاۃ دہندگان میں سے کسی کا ایسا رشتہ دار اس ہاسٹل میں ہے جس کو وہ زکاۃ نہیں دے سکتا تو اس کی زکاۃ اس فرد پر خرچ نہیں کی جائے گی۔

سوال نمبر: ۹-عمر دراز لوگوں کے لئے حکومتوں نے مختلف چیزوں میں بعض خصوصی رعایتیں رکھی ہیں جیسے ٹرین وغیرہ میں کرایہ میں تخفیف، حکومت کی طرف سے امدادی وظیفہ، ٹیکس میں رعایت وغیرہ؛ جو لوگ ان رعایتوں کے لئے مطلوب مقررہ حد عمر کو نہ پہنچے ہوں کیا انکے لئے ایسی رعایتوں سے فائدہ اٹھانا جائز ہوگا؟

دو مقالہ نگار کے علاوہ تمام حضرات کی تحریروں میں اس کا جواب موجود ہے۔

۳۳ رمقالہ نگاروں نے حکومت کی جانب سے مقررہ عمر میں ہی ان مراعات سے استفادہ کو جائز کہا ہے، مطلوب مقررہ حد عمر کو پہنچنے سے پہلے ان مراعات کو حاصل کرنا حرام ہے۔

مولانا سید انور سلیم، مولانا محمد کامل قاسمی، مولانا محمد احسن عبدالحق ندوی، مفتی عبدالمنان، مفتی جمیل احمد نذیری، مولانا سعید الرحمن قاسمی کے علاوہ تمام حضرات نے بالتفصیل دلائل و وجوہات رقم قرطاس کیا ہے، جس کا خلاصہ مندرجہ ذیل ہے:

الف-یہ خداع ودھوکہ ہے، کیونکہ ہر شہری حکومت کے اس قانون پر چلنے کا پابند ہے جو شریعت حقہ سے متصادم نہ ہو، گویا ہر شہری کا حکومت سے حکماً معاہدہ ہے کہ وہ حکومتی قانون پر چلے گا اور اس کی خلاف ورزی نہیں کرے گا، اس لئے حکومت کو دھوکہ دے کر سہولتیں حاصل کرنا جائز نہیں (مفتی محمد شاہد قاسمی، مولانا محمد قمر الدین محمود)۔

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ملعون من ضار مومنا أو مكر به" (ترمذی ۲/۸۵) (مقالہ: مولانا محمد الیاس قاسمی)۔

"من غشنا فليس منا" (مسلم شریف ۱/۷۰) (مقالہ مولانا عبداللہ خالد لوناواڑہ، مولانا حفیظ الرحمن اعظمی وغیرہ)۔

مسلم کی قید اتفاقی ہے، کسی کو بھی دھوکہ دینا جائز نہیں، خواہ فرد ہو یا گروہ، حکومت ہو یا پبلک (ڈاکٹر محمد شاہجہاں ندوی)۔

ب-یہ کذب وجھوٹ ہے، قرآن کریم میں ہے: "واجتنبوا قول الزور"۔

حدیث میں آیا ہے: "ألا أنبئكم بأكبر الكبائر، قال: قول الزور أو شهادة الزور"

اسی طرح آیا ہے: "المتشبع بما لم يعط كلابس ثوبي زور" (اکثر مقالہ نگار حضرات)۔

ج-تذلیل نفس ہے، اس لئے کہ قانونی طور پر جرم ہونے کی وجہ سے عزت وآبرو کا بھی خطرہ ہوگا، جس سے حفاظت واجب ہے، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "لا ينبغي للمؤمن أن يذل نفسه، قالوا: وكيف يذل نفسه، قال: يتعرض من البلاء لما لا يطيق" (ترمذی) (مولانا خورشید انور اعظمی، مولانا محمد الیاس قاسمی)۔

غیر اسلامی حکومت کے ضابطہ کی خلاف ورزی اس لئے ممنوع ہے کہ اپنے آپ کو قانونی سزاؤں کے لئے پیش کرنا لازم آتا ہے، جس میں تذلیل ہے:

"ولكونه عرضا للنفس لعقوبات قانونية إذا كانت الحكومة غير إسلامية" (تکملہ فتح الملہم ۱/۵۹۰)
(مولانا رحمت اللہ ندوی، مولانا خورشید انور اعظمی)۔

د-یہ سرقہ بھی ہے، اس لئے کہ کسی دوسرے کی چیز اس کی مرضی کے بغیر استعمال کرنا چوری ہی میں داخل ہے (مولانا محمد قمر الزماں ندوی)، کرایہ میں تخفیف یہ

اجارہ کے باب سے ہے اور بغیر مقررہ حد عمر کو پہنچے ہوئے فائدہ اٹھانا کرایہ کی چوری ہے (مولانا حفیظ الرحمن مدنی)۔

ھ- نیز قانون شکنی وحق تلفی ہے، پھر اس صورت میں یہ بھی ممکن ہے کہ بعض ضرورت مند اپنے حق سے محروم رہ جائیں، اس لئے اجازت نہیں دی جاسکتی (مولانا ندیم احمد انصاری)۔

حکومت کے جو قوانین شریعت سے متصادم نہ ہوں ان پر عمل کرنا بہ حیثیت ایک معاہد کے ہماری شرعی اور قانونی ذمہ داری ہے (مفتی راشد حسین ندوی، مولانا قمر الدین محمود وغیرہ)۔

البتہ حکومت نے جو عمر مقرر کی ہے اس کا حساب قمری اعتبار سے ہوگا یا شمسی حساب سے، ظاہر ہے حکومت کے یہاں قمری حساب کا اعتبار سرے سے ہی نہیں، لیکن مفتی شبیر احمد قاسمی صاحب کا رجحان ہے کہ اگر کوئی قمری حساب سے مقررہ حد کو پہنچ گیا ہو تو اس کے لئے مراعات حاصل کرنے میں حرج نہیں، خواہ شمسی حساب سے اس کی عمر نہ ہوئی ہو، البتہ بہتر یہی ہے کہ شمسی حساب سے ہی ان مراعات کو حاصل کرے، مفتی صاحب فرماتے ہیں: اس کو اسلامی نقطہ نظر سے خائن و دھوکہ باز نہیں سمجھا جائے گا، کیونکہ سرکاری قانون میں علی الاطلاق تحدید ہوتی ہے۔

مگر ناچیز کو لگتا ہے کہ یہ بھی خیانت اور دھوکہ ہے، اس لئے کہ جس ملک میں سرکاری قانون شمسی حساب سے بنتا ہے وہاں شمسی ہی مراد ہوتا ہے اور اس کی پاسداری کا حکما معاہدہ ہے، اس کی خلاف ورزی دھوکہ وخیانت ہی ہوگی۔

بہر حال بیشتر مقالہ نگاروں کی رائے میں مقررہ حد عمر سے پہلے مراعات حاصل کرنا جائز نہیں، لیکن مولانا عبدالتواب انادی اور مفتی ظہیر احمد کانپوری فرماتے ہیں کہ ان مراعات کا مقصود معذورین وضعفاء کی مدد کرنا ہے، لہذا "الأمور بمقاصدها" (الاشباہ لابن نجیم) تحت اگر کوئی مستحق اس معنی میں ہو جائے، خواہ عمر کی معیاد ابھی مکمل نہ ہوئی ہو تب بھی مراعات حاصل کرنے میں حرج نہیں ہے، بشرطیکہ عزت وآبرو محفوظ رہے۔

لیکن یہ بات سمجھ سے بالاتر ہے کہ جس کی عمر مقررہ حد کو نہ پہنچی ہو وہ مستحق کیسے ہوگا؟ حکومت نے تو مستحق ایسے شخص کو گردانا ہے جن کی عمر کی مقررہ معیاد مکمل ہو، ضعف وعذر کا لحاظ نہیں، ضعف وعذر کی وجہ سے جو مستحق ہے حکومت نے اس کے لئے الگ فنڈ رکھا ہے۔

ٹیکس کے سلسلہ میں مولانا محمد عثمان بستوی کا خیال ہے کہ اگر اپنی عزت وآبرو کو محفوظ رکھتے ہوئے تخفیف ممکن ہو تو غیر مستحق کے لئے بھی اس رعایت کے حاصل کرنے میں کوئی شرعا حرج نہیں، کیونکہ حقیقت میں یہ رعایت نہیں، بلکہ اپنے مال کی حفاظت ہے جو کہ بجائے خود ایک فرض ہے۔

☆☆☆

باب دوم تفصیلی مقالات

معذوروں اور بوڑھوں کے حقوق کا تحقیقی جائزہ

مفتی شبیر احمد قاسمی[1]

سوال (۱) والدین کسب معاش پر قادر والدین کا نفقہ اولاد پر لازم ہے یا نہیں؟

اگر والدین اور عمر رسیدہ کمزور شخص کسب معاش پر قادر نہ ہوں اور وہ ضرورت مند ہوں، تو ان کے چھوٹوں پر ان کا نفقہ لازم اور واجب ہوتا ہے، اگر حقیقی اولادیں ہیں تو ان پر واجب ہوتا ہے۔ اور اگر حقیقی اولادیں نہیں ہیں، تو قریبی اعزہ پر ان کا نفقہ لازم ہوتا ہے، جیسا کہ بھائی بھتیجے وغیرہ۔

اور اگر عمر رسیدہ کمزور شخص کسی قدر کسب معاش پر قادر ہو اور ضرورت مند ہو اور اس کی اولاد خوش حال ہو اور کمانے پر اچھی طرح قادر ہو، تو ایسی حالت میں امام شمس الائمہ سرخسی اور امام شمس الائمہ حلوائیؒ کے درمیان اختلاف ہے، امام شمس الائمہ سرخسیؒ فرماتے ہیں کہ باپ کے کسب معاش پر قادر ہونے کے باوجود بیٹے کو باپ کا خرچہ دینے پر مجبور کیا جائے گا اور بیٹے پر لازم ہے کہ باپ کو آرام کا موقع دے اور اس کا سارا خرچ بیٹا ادا کرے اور اس کے برخلاف شمس الائمہ حلوائیؒ فرماتے ہیں کہ باپ اگر کسب معاش پر قادر ہو تو بیٹے کو باپ کا نفقہ ادا کرنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا؛ بلکہ بیٹے کو اختیار دیا جائے گا کہ چاہے تو باپ کو آرام کا موقع دے دے اور سارا خرچ بیٹا اپنے ذمہ لے لے اور چاہے تو خرچ ادا نہ کرے اور باپ اپنی کمائی کی محنت سے گذارا کرے۔ اور شمس الائمہ حلوائیؒ کی رائے کے مطابق یہ بات سامنے آتی ہے کہ بیٹا باپ کو کسب معاش پر مجبور کر سکتا ہے؛ لیکن حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ باپ اگر کسی قدر کسب معاش پر قادر ہو تو باپ کو کسب معاش پر مجبور نہیں کیا جائے گا؛ بلکہ اولاد اپنی کمائی کے ذریعہ سے باپ کا خرچ ادا کرے اور باپ کو آرام کا موقع دے، تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شمس الائمہ سرخسیؒ کی بات زیادہ راجح ہے اور وہی مفتی بہ قول معلوم ہوتا ہے اور یہی ظاہر الروایت بھی ہے۔

اس سلسلے میں پہلے حدیث شریف ملاحظہ فرمائیے:

''عن عائشة رضي الله عنها قالت: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: إن أولادكم هبة الله لكم {يَهَبُ لِمَنْ يَشَآءُ إِنَاثًا وَيَهَبُ لِمَنْ يَشَآءُ الذُّكُوْرَ} [الشورى: ۴۹] فهم وأموالهم لكم إذا احتجتم إليها '' (السنن الكبرى للبيهقي، دار الحديث القاهرة ۸/ ۱۱۵، رقم: ۱۵۷۴۵)۔

''عن عائشة رضي الله عنها قالت: قال رسول الله صلى لله عليه وسلم: إن أطيب ما أكلتم من كسبكم، وإن أولادكم من كسبكم '' (ترمذي شريف ۱/ ۲۵۲، رقم: ۱۳۵۸)۔

''عن عائشة رضي الله عنها قالت: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: إن أطيب ما أكل الرجل من كسبه، وإن ولده من كسبه '' (نسائي شريف ۲/ ۱۸۶، رقم: ۴۴۵۷)۔

اس کو ''تاتارخانیہ'' میں اس طرح کے الفاظ میں نقل کیا گیا ہے، ملاحظہ فرمائیے:

''ثم يفرض على الابن نفقة الأب إذا كان الأب محتاجا والابن موسرا، سواء كان الأب قادرا على الكسب

---

[1] جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مرادآباد۔

أو لم يكن، وذكر شمس الأئمة السرخسي في شرح أدب القاضي للخصاف: أن الأب إذا كان كسوبا والابن أيضا كسوبا يجبر الابن على الكسب في نفقة الأب، وذكر شمس الأئمة الحلواني في شرح أدب القاضي للخصاف: أنه لايجبر الابن على نفقة الأب إذا كان الأب قادراً على الكسب، واعتبره بذي الرحم المحرم، فإنه لايستحق النفقة في كسب قريبه ولا على قريبه المؤسر إذا كان هو كسوبا، وفي الفتاوى الخلاصة: وفي الأصل إذا كان الأب والابن معسرين لاتجب على أحدهما نفقة الآخر'' (الفتاوى التاتارخانية ۵/ ۴۲۵، ۴۲۶، رقم: ۸۳۶۷)۔

اس کو''مجمع الانہر'' میں ان الفاظ سے نقل کیا گیا ہے، ملاحظہ فرمائیے:

''تجب على الموسر نفقة أبويه وأجداده وجداته ... سواء كانوا قادرين على الكسب أو لا، قيل: هو ظاهر الرواية، وقال الحلواني: الابن الكاسب لايجبر على نفقة الأب الكاسب؛ لأنه كان غنيا باعتبار الكسب، فلا ضرورة في إيجاب النفقة على الغير، وفي الفتح: يجبر الموسر على نفقة أحد من قرابته إذا كان رجلا صحيحا، وإن كان لايقدر على الكسب إلا في الوالد خاصة'' (مجمع الأنهر ۲/ ۱۹۵، ۱۹۶)۔

اس کو''بنایہ شرح ہدایہ'' میں کافی واضح الفاظ سے نقل کیا گیا ہے، ملاحظہ فرمائیے:

''واستدل شمس الأئمة السرخسي في شرح الكافي بقوله تعالى: ''فلا تقل لهما أف'' [الإسراء: ۲۳] وقال: نهى عن التأفيف يعني الأذى، ومنع الأذى في منع النفقة على حاجتها أكثر، ولهذا يلزمه نفقتهما وإن كانا قادرين على الكسب؛ لأن معنى الأذى في الكد والتعب أكثر منه في التأفيف، وقال عليه السلام: إن أطيب ما أكل الرجل من كسبه، وإن ولده من كسبه، فكلوا من كسب أولادكم'' (البناية ۵/ ۷۰۰)۔

سوال (۲) عمر رسیدہ لوگوں کا نفقہ وعلاج دوسروں پر کب واجب ہوگا؟

کمزوروں کا خرچ ان کی اولاد پر یا ان کے چھوٹوں پر یا ان کے قریبی اعزہ پر دو صورتوں میں واجب ہوتا ہے:

(۱) عمر رسیدہ ہو کر کسب معاش پر قادر نہ ہوں اور ضرورت مند ہوں۔

(۲) عمر رسیدہ ہونے کی کوئی قید نہیں ہے، مگر معذور ہوں، مثلاً لنگڑے ہوں، اپاہج ہوں یا کسی اور طریقے سے ایسی بیماری کا شکار ہوں جس کی وجہ سے کسب معاش پر قادر نہ ہوں، تو ایسی صورت میں عزیز واقارب پر ان کا خرچ اور ان کا علاج واجب اور لازم ہوتا ہے، اگر ان کا علاج ومعالجہ اور خرچ واخراجات عزیز واقارب ادا نہیں کریں گے، تو گنہگار ہوں گے۔

اس کو''بنایہ شرح ہدایہ'' میں ان الفاظ کے ساتھ نقل فرمایا ہے، ملاحظہ فرمائیے:

''وعلى الرجل أن ينفق على أبويه وأجداده وجداته إذا كانوا فقراء، وإن خالفوه في دينه، (هداية)

وتحته في البناية: وفي المبسوط: على الرجل الموسر نفقة أبيه وأمه وأب الأب وإن علا، وأم الأب وإن علت، وأم الأم وإن علت، وشرط الشافعي في ذلك أن يكون الأب زمنا ولم يوافقه أحد، وفي التنبيه: ويجب على الأولاد ذكورهم وإناثهم نفقة الوالدين، وإن علوا بشرط الفقر والزمانة'' (البناية، أشرفيه ۵/ ۶۹۹)۔

اس کو شامی میں بہت مختصر الفاظ میں نقل کیا گیا ہے؛ لیکن مفہوم واضح ہے، ملاحظہ فرمائیے:

''فالمعتبر في إيجاب نفقة الوالدين مجرد الفقر قيل: وهو ظاهر الرواية'' (شامي، زكريا ۵/ ۳۵۵، كراچی ۳/ ۶۲۲)۔

سوال (۳) صاحب ثروت والدین کا خرچہ اولاد پر نہیں:

بوڑھے والدین یا خاندان کے وہ بڑے لوگ جن کا نفقہ چھوٹوں پر ضرورت اور محتاجی کی حالت میں واجب ہوتا ہے، اگر وہ لوگ محتاج اور

ضرورت مند نہ ہوں؛ بلکہ خود صاحب ثروت اور سرمایہ دار ہوں، تو وہ لوگ دوسروں پر خرچ کرنے کے لئے یا کچھ رقم پس انداز کر کے محفوظ کرنے کے لئے اپنی اولاد یا چھوٹوں سے زائد رقم کے مطالبہ کے مجاز نہ ہوں گے؛ اس لئے کہ یہ مطالبہ ان کی ضرورت سے خارج ہے اور بے ضرورت مطالبہ ہے، ہاں البتہ اولاد اپنے والدین کو خوش کرنے کے لئے ضرورت نہ ہونے کے باوجود اپنے طور پر والدین کو ماہانہ یا سالانہ کچھ دیتی رہے اور والدین اس رقم کو کہیں بھی اپنے اختیار سے خرچ کریں، تو یہ اولاد کی خوش نصیبی ہے، مگر اولاد کو اس پر مجبور نہیں کیا جائے گا اور یہ بات یاد رکھنا چاہئے کہ عمر رسیدہ لوگ صاحب ثروت نہ ہوں، مگر کسب معاش پر قادر ہوں تو ظاہر روایت کے مطابق اولاد پر ان کا خرچ لازم ہوتا ہے، مگر صاحب ثروت ہونے کی صورت میں لازم نہیں ہوتا، جیسا کہ ذیل کی جزئیات سے واضح ہوتا ہے:

اس کو ''فتاوی قاضی خان'' میں ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا گیا ہے، ملاحظہ فرمائیے:

''وملك الدار لايمنع النفقة إلا أن يكون فيها فضل مال بأن كان يكفيه أن يسكن في ناحية ويبيع الناحية الأخرى، وكذا الخادم والدابة إذا كانت نفيسة يمكنه أن يبيعها ويشتري بثمنها خسيسة، وينفق الفضل على نفسه، فحينئذ لاتجب له النفقة'' (خانية على الهندية ۱/ ۴۴۸، فتاوى قاضي خان جديد ۱/ ۲۶۸)۔

اس کو ''البحر الرائق'' میں ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا گیا ہے، ملاحظہ فرمائیے:

''ولأبويه وأجداده وجداته لو فقراء'' (كنز الدقائق) ''... وشرط الفقر؛ لأنه لو كان ذا مال فإيجاب النفقة في ماله أولى من إيجابها في مال غيره'' (البحر الرائق، كوئٹه ۴/ ۲۰۵، زكريا ۴/ ۳۴۸)۔

اور اس کو صاحب ''تاتارخانیہ، محیط برہانی اور ہندیہ نے ان الفاظ کے ساتھ نقل فرمایا ہے، ملاحظہ فرمائیے:

''فإن كان للأب مسكن أو دابة فالمذهب عندنا أنه يفرض النفقة على الابن، إلا أن يكون في المسكن فضل نحو أن يكفيه أن يسكن في ناحية منه، فحينئذ يؤمر الأب ببيع الفضل والإنفاق على نفسه، فإذا آل الأمر إلى الناحية التي يسكنها الأب يفرض نفقته حيئنذ على الأب، وكذلك إذا كانت للأب دابة نفيسة يؤمر أن يبيع ويشتري الأوكس وينفق الفضل على نفسه، فإذا آل الأمر إلى الأوكس يفرض النفقة على الابن ويستوى في هذا الوالدون والمولودون وسائر المحارم وهو الصحيح من المذهب'' (الفتاوى التاتارخانية ۵/ ۴۲۹، ۴۳۰، رقم: ۸۳۴۸، والمحيط البرهاني ۴/ ۳۵۴، رقم: ۴۵۵۷، ہندية قديم ۱/ ۵۶۷، جديد ۲۱۳)۔

سوال (۴) کسب معاش کے لئے بوڑھے والدین کو چھوڑ کر دوسری جگہ چلا جانا:

ضعیف، کمزور والدین جو جسمانی خدمت کے محتاج ہوں، چلنے پھرنے، اٹھنے بیٹھنے اور کسی ضرورت کو پوری کرنے میں دوسروں کے سہارے کے محتاج ہو جائیں، تو ایسی صورت میں بیٹوں کا ایسے ضعیف والدین کو بے یار و مددگار چھوڑ کر ان کی اجازت کے بغیر دور دراز علاقوں میں کمانے کے لئے چلا جانا جائز نہیں ہے، ہاں البتہ اگر ماں باپ نے بخوشی اجازت دے دی ہے یا ماں باپ کی خدمت کے لئے خادم کا انتظام کر دیا ہو، جس کی وجہ سے ماں باپ کو جسمانی خدمت حاصل کرنے میں کوئی پریشانی نہیں ہوتی تو دوسری جگہ جا کر کسب معاش کی گنجائش ہے؛ لیکن اگر خادم کا باضابطہ انتظام نہیں کیا ہے اور ماں باپ کی طرف سے ان کو چھوڑ کر جانے کی اجازت نہیں ہے، تو سفر حج، سفر عمرہ اور سفر تبلیغ کے لئے چلا جانا اولاد کے لئے جائز نہیں ہے؛ بلکہ ماں باپ کی خدمت ان سب پر مقدم ہے، جیسا کہ ذیل کی جزئیات سے واضح ہوتا ہے۔

اس کو ''ہندیہ'' میں بہت واضح الفاظ میں نقل فرمایا ہے، ملاحظہ فرمائیے:

''وقال محمد رحمه الله تعالى في السير الكبير: إذا أراد الرجل أن يسافر إلى غير الجهاد لتجارة أو حج أو عمرة وكره ذلك أبواه، فإن كان يخاف الضيعة عليهما بأن كانا معسرين ونفقتهما عليه، وماله لايفي بالزاد والراحلة ونفقتهما، فإنه لايخرج بغير إذنهما، سواء كان سفرا يخاف على الولد الهلاك فيه ... أولا يخاف على الولد الهلاك فيه،

وکذا الجواب فیما إذا خرج للنفقة إلی بلدة أخری إن کان لایخاف علیه الهلاك بسبب هذا الخروج کان بمنزلة السفر للتجارة، وإن کان یخاف علیه الهلاك کان بمنزلة الجهاد'' (ہندیہ قدیم ۵/ ۳۶۵، جدید ۵/۴۲۲)۔

اس کو''تاتارخانیہ''اور''محیط برہانی''میں ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا گیا ہے، ملاحظہ فرمائیے:

''وکل سفر أراد الرجل أن یسافر غیر الجهاد لتجارة أو لحج أو لعمرة فکره ذلك أبواه، هل له أن یخرج بغیر إذنهما؟ فهذا علی وجهین:إما إن کان لایخاف علیهما الضیعة بأن کانا موسرین ولم تکن نفقتهما علیه، أو کان یخاف علیهما الضیعة بأن کانا معسرین وکانت نفقتهما علیه، وفي الذخیرة:وماله لایفي بالزاد والراحلة ونفقتهما ... فإن کان یخاف الضیعة علیهما، فإنه لایخرج بغیر إذنهما سواء کان السفر سفرا یخاف علی الولد الهلاك فیه أو لایخاف'' (الفتاوی التاتارخانیة ۱۸/ ۲۴۲، رقم: ۲۸۶۷، المحیط البرهاني ۸/ ۱۱۰، رقم: ۹۷۰۷)۔

اس کو''شامی''میں کچھ مختصر الفاظ سے نقل فرمایا ہے، ملاحظہ فرمائیے:

''لا یحل سفر فیه خطر إلا بإذنهما، وما لا خطر فیه یحل بلا إذن (درمختار) وفي الشامیة: کالسفر للتجارة والحج والعمرة یحل بلا إذن إلا أن خیف علیهما الضیعة'' (شامي زکریا ۶/ ۲۰۳، کراچی ۴/ ۱۲۵)۔

سوال (۵) کیا عورت پر ساس، خسر کی خدمت لازم ہے؟

عورت پر اپنے ساس، خسر کی خدمت شرعی طور پر لازم نہیں ہے، اگر شوہر کے ماں باپ خدمت کے محتاج ہوں تو شوہر کی ذمہ داری ہے کہ اپنے ماں باپ کی خدمت کے لئے خادم کا انتظام کرے، اس کی بیوی اس کام کے لئے نہیں ہے، ہاں البتہ بیوی کا اخلاقی فریضہ ہے کہ ساس خسر کی غیر جسمانی خدمت کرے، مثلاً پکوان وغیرہ پکا کر کے کھلائے؛لیکن اگر بیوی یہ نہیں چاہتی ہے تو اس پر کسی قسم کا جبر ودباؤ جائز نہیں ہے، نیز اگر بیوی ساس خسر کے ساتھ مشترکہ فیملی میں ایک ساتھ نہ رہنا چاہے تو شوہر کی ذمہ داری ہے کہ بیوی کے لئے الگ رہائش کا انتظام کرے، اسی طرح ساس بہو کے درمیان عدم موافقت کی صورت میں شوہر کے لئے حکمت عملی یہی ہے کہ ان کے درمیان کشیدگی کا سلسلہ طول نہ پکڑنے پائے، اس لئے الگ انتظام کرلے۔

اس کو علامہ شامیؒ نے اس طرح کے الفاظ سے نقل فرمایا ہے، ملاحظہ فرمائیے:

''ولو أراد أن یسکنها مع ضرتها أو مع أحمائها کأمه وأخته وبنته فأبت، فعلیه أن یسکنها في منزل منفرد؛ لأن إباءها دلیل الأذی والضرر، ولأنه محتاج إلی جماعها ومعاشرتها في أي وقت یتفق لایمکن ذلك مع ثالث (وقوله) ذکر الخصاف أن لها أن تقول:لا أسکن مع والدیك وأقربائك في الدار فأفرد لي دارا'' (شامي، زکریا ۵/ ۳۲۲،۳۲۱، کراچی ۳/ ۶۰۱)۔

اس کو''الموسوعة الفقهیة''میں ان الفاظ سے نقل کیا گیا ہے، ملاحظہ فرمائیے:

''فالجمع بین الأبوین والزوجة في مسکن واحد لایجوز (وکذا غیرهما من الأقارب) ولذلك یکون للزوجة الامتناع عن السکنی مع واحد منهما؛ لأن الانفراد بمسکن تأمن فیه علی نفسها ومالها وحقها، ولیس لأحد جبرها علی ذلك، وهذا مذهب جمهور الفقهاء من الحنفیة والشافعیة والحنابلة'' (الموسوعة الفقهیة ۲۵/ ۱۰۹)۔

اس کو''البحر الرائق''میں ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا گیا ہے، ملاحظہ فرمائیے:

''والسکنی في بیت خال عن أهله وأهلها ... أي تجب السکنی في بیت أي الإسکان للزوجة علی زوجها؛ لأن السکنی من کفایتها فتجب لها کالنفقة ... وإذا وجبت حقا لها لیس له أن یشرك غیرها فیه؛ لأنها تتضرر به، فإنها لاتأمن علی متاعها ویمنعها ذلك من المعاشرة مع زوجها، ومن الاستمتاع إلا أن تختار؛ لأنها رضیت بانتقاص

حقها'' (البحر الرائق کوئٹہ ۴/ ۱۹۳،۱۹۴، زکریا ۴/ ۳۲۸)۔

سوال (۶،ج) کیا ماں باپ کی خدمت بیٹوں کی طرح بیٹیوں پر بھی واجب ہے؟

ماں باپ کی خدمت دو طرح کی ہیں:

(۱) ان کے نان ونفقہ کی خدمت:...... یہ صرف بیٹوں پر واجب ہے، بیٹیوں پر نہیں؛ اس لئے کہ بیٹیاں کمانے پر قادر نہیں ہوتی ہیں؛ لہٰذا بیٹوں پر ہی محتاج ماں باپ کا نان ونفقہ لازم ہوگا۔

(۲) جسمانی خدمت:...... ماں باپ جب جسمانی خدمت کے محتاج ہوجائیں، چلنے پھرنے، اٹھنے بیٹھنے میں دوسروں کے سہارے کے محتاج بن جائیں تو ایسے ماں باپ کی جسمانی خدمت بیٹے اور بیٹیوں پر برابر طریقے سے لازم ہوجاتی ہے؛ البتہ دونوں میں فرق یہ ہے کہ بیٹے کے لئے ماں باپ کی خدمت کرنے میں کوئی رکاوٹ نہیں، جبکہ بیٹیاں اگر شادی شدہ ہیں، تو ان کے لئے ماں باپ کی جسمانی خدمت کرنے کے لئے ماں باپ کے یہاں قیام کرنا مشکل پڑ جاتا ہے؛ اس لئے کہ اگر دور دراز علاقے میں لڑکی کی شادی ہوگئی ہے تو شوہر اور اس کے بچوں کو چھوڑ کر ماں باپ کے یہاں آکر ان کی خدمت کرنا اس کے لئے دشوار ہے، ہاں البتہ اگر شوہر نے اپنی مرضی سے بیوی کو ماں باپ کے یہاں ان کی خدمت کے لئے چھوڑ دیا ہے تو بیٹی پر والدین کی خدمت کرنا لازم ہے۔ اور اگر شوہر نے ماں باپ کے یہاں نہیں چھوڑا ہے اور بیٹی ماں باپ کی خدمت کے لئے ماں باپ کے یہاں رہنا چاہے اور شوہر نہ چاہے تو ایسی صورت میں شریعت بیٹی کو اس بات پر مجبور نہیں کرتی کہ اپنا گھر بگاڑیں۔ اور اگر بیٹی کی شادی اسی مقام پر ہوئی ہے جہاں ماں باپ رہتے ہوں، تو موقع لے لے کر ماں باپ کی خدمت کرنا اور دیکھ بھال کرنا اس پر لازم ہے، نیز ماں باپ کی خدمت کے لئے اگر غیر شادی شدہ لڑکیاں موجود ہیں یا لڑکے موجود ہیں تو شادی شدہ لڑکیوں پر ماں باپ کی خدمت کسی طرح لازم اور واجب نہیں ہے۔ اور جن فقہی عبارات میں اس بات کا ذکر ہے کہ شوہر کو یہ حق نہیں ہے کہ کمزور اور معذور والدین کے یہاں جانے سے بیوی کو روکے تو ان سے مراد یہ ہے کہ وقتاً فوقتاً ماں باپ کی عیادت کے لئے جانے سے شوہر کو روکنے کا حق نہیں؛ لیکن ماں باپ کے یہاں مستقل رہ کر کے خدمت کے لئے جانے سے شوہر کو روکنے کا حق ہے، جیسا کہ حسب ذیل جزئیات سے واضح ہوتا ہے۔ اس کو صاحب ''خلاصۃ الفتاوی'' نے ان الفاظ میں نقل فرمایا ہے، ملاحظہ فرمائیے:

''امرأة لها أب زمن وليس له من يقوم عليه غير البنت ويمنعها الزوج من تعاهده جاز لها أن تعصى زوجها وتطيع أباها، سواء كان الأب مسلما أو كافرا'' (خلاصة الفتاوى ۲/ ۵۳)۔

اور اس کو علامہ شامیؒ نے ان الفاظ کے ساتھ نقل فرمایا ہے، ملاحظہ فرمائیے:

''ولا يمنعها من الخروج إلى الوالدين في كل جمعة إن لم يقدرا على إتيانها على ما اختاره في الاختيار ولو أبوها زمنا مثلا فاحتاجها فعليها تعاهده ولو كافرا، وإن أبى الزوج (الدرالمختار) وفي الشامية: فعليها تعاهده: أي بقدر احتياجه إليها، وهذا إذا لم يكن له من يقوم عليه'' (شامي، زكريا ۵/ ۳۲۴، كراچی ۳/ ۶۰۲،۶۰۳)۔

اور اس کو ''فتاوی قاضی خان'' میں ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا گیا ہے، ملاحظہ فرمائیے:

''امرأة لها أب زمن ليس له من يقوم عليه، وزوجها يمنعها عن الخروج إليه وتعاهده كان لها أن تعصى زوجها وتطيع الوالد مؤمنا كان الوالد أو كافرا؛ لأن القيام بتعاهد الوالد فرض عليها، فيقدم على حق الزوج'' (خانية على الهندية ۱/ ۴۴۳، خانية جديد ۱/ ۲۶۴)۔

اور اس کو ''الموسوعۃ الفقہیۃ'' میں ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا گیا ہے، ملاحظہ فرمائیے:

''فقال الحنفية: ليس له منعها من عيادة والد زمن ليس له من يقوم عليه، ولا يجب عليها طاعة زوجها إن منعها من ذلك، سواء كان الوالد مسلما أو كافرا؛ لأن القيام بخدمته فرض عليها في مثل هذه الحالة، فيقدم على حق الزوج'' (الموسوعة الفقهية ۲۴/ ۵۸)۔

سوال (۷) نکاح ثانی کرنے پر اولاد کو رکاوٹ بننے کا حق نہیں؟

اگر بڑھاپے کی حالت میں بیوی کا انتقال ہو جائے تو آدمی بے سہارا جیسا ہو جاتا ہے اور اس کو ایسا لگتا ہے کہ وہ بے یار و مددگار ہے، ایسے حالات میں جب وہ نکاح ثانی کرنا چاہے تو لڑکے اور لڑکیاں ساری اولادیں اور خاندان کے دوسرے لوگ بھی ہندوستان کے غیر شرعی معاشرہ کی وجہ سے رکاوٹ بن جاتے ہیں جو شریعت کے مطلوبہ مقصد کے خلاف ہے؛ لہٰذا جب باپ دوسری شادی کرنا چاہے تو اولاد میں سے کسی کے لئے بھی رکاوٹ بننا جائز نہیں ہے؛ بلکہ باپ اگر نکاح ثانی کرنا چاہے تو شریعت کا مطلوبہ مقصد یہ ہے کہ اولاد خود باپ کے نکاح ثانی کا انتظام کرے۔ اور اگر باپ نے نکاح ثانی کر لیا ہے اور خرچ واخراجات پر قادر نہیں ہے، تو اولاد پر لازم ہے کہ باپ کے خرچ کے ساتھ ساتھ باپ کی زوجۂ ثانیہ کا نان ونفقہ بھی ادا کرے، جیسا کہ ذیل کی جزئیات سے واضح ہوتا ہے۔

اس کو "ہندیہ" میں ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا گیا ہے، ملاحظہ فرمائیے:

"إلا أن يكون بالأب علة لايقدر على خدمة نفسه ويحتاج إلى خادم يقوم بشأنه ويخدمه، فحينئذ يجبر الابن على نفقة خادم الأب منكوحة كانت أو أمة (وقوله) وإن احتاج الأب إلى زوجة والابن موسر وجب عليه أن يزوجه أو يشتري له جارية" (ہندية قديم ۱/ ۵۶۵، جديد ۱/ ۶۱۱، والفتاوى التاتارخانية ۵/ ۴۲۷، رقم: ۸۳۷۱)۔

اس کو "فقہ اسلامی" میں اور واضح الفاظ میں نقل فرمایا ہے، ملاحظہ فرمائیے:

"يرى جمهور الفقهاء وفي رواية عند الحنفية: أن الوالد يلزمه تزويج أو إعفاف أبيه المعسر ولو كان كافرا معصوما ... فالزواج معا تدعو الحاجة إليه ويتضرر الأب بفقده، فلزم ابنه تزويجه كالنفقة، والرواية الراجحة عند الحنفية عدم وجوب إعفاف الأب؛ لأنه من الكماليات" (الفقه الاسلامي وأدلته ۷/ ۸۳۳)۔

اس کو شامی میں اس طرح کے الفاظ میں نقل کیا گیا ہے، ملاحظہ فرمائیے:

"وعليه نفقة زوجة أبيه وأم ولده، بل وتزويجه أو تسريه (الدرالمختار) وفي الشامية: أي في رواية وفي أخرى: إن كان الأب مريضا أو به زماناة يحتاج للخدمة ... قال في البحر: وظاهر الذخيرة أن المذهب عدم وجوب نفقة امرأة الأب أو جاريته أو أم ولده حيث لم يكن بالأب علة، وأن الوجوب مطلقا عن رواية أبي يوسف، وفي حاشية الرملي: والذي تحرر من المذهب أنه لا فرق بين الأب والابن في نفقة الخادم وأنه إذا احتاج أحدهما لخادم وجبت نفقته كما وجبت نفقة المخدوم، فكان من جملة نفقته، وإذا لم يحتج إليه فلا تجب" (شامي، زكريا ۵/ ۳۴۴، كراچی ۳/ ۶۱۶)۔

اور اس کو صاحب خانیہ نے ان الفاظ کے ساتھ نقل فرمایا ہے، ملاحظہ فرمائیے:

"يجب عليه نفقة خادم الأب امرأة كانت الخادم أو جارية إذا كان الأب محتاجا إلى من يخدمه" (خانية على الهندية ۱/ ۴۴۸، خانية جديد ۱/ ۲۶۸)۔

سوال (۸) کیا اولاد کو باپ کی زندگی میں اپنے حق کے مطالبہ کا حق ہے؟

اگر اولاد باپ کی عیال اور باپ کی فیملی میں رہتی ہے تو والدین کی معاشی حالت بہتر ہونے کی صورت میں اولاد کے محتاج اور فقیر ہونے کی بات ثابت نہیں ہوتی؛ اس لئے کہ اولاد کی ساری ضروریات باپ کی عیال اور فیملی میں رہ کر پوری ہو جاتی ہیں، ہاں البتہ اگر اولاد باپ کی فیملی سے الگ رہتی ہو، تو معاشی کمزوری اور محتاج ہونے کی بات ثابت ہوتی ہے، ایسے حالات میں جب اولاد محتاج ہو اور والدین کی معاشی حالت بہتر ہو تو اولاد کے لئے ماں باپ سے ان کی زندگی ہی میں جائیداد کا مطالبہ کرنا اور ماں باپ پر دباؤ ڈالنا جائز نہیں ہے، ہاں البتہ ماں باپ کے سامنے اولاد اپنی ضرورت رکھ سکتی ہے اور پھر ماں باپ اپنے طور پر اپنے اختیار سے کچھ دے دیں تو وہ ان کے رحم وکرم پر موقوف ہے، مگر ان پر دباؤ ڈال کر کے یا جبر وتشدد کے ساتھ ان سے مطالبہ کرنے کا اولاد کو کوئی حق نہیں ہے، اسی طرح دادالٰہی اور موروثی جائیداد میں سے اولاد کا اپنے والدین سے حق کا مطالبہ کرنا جائز نہیں

ہے؛ اس لئے کہ جب تک ماں باپ زندہ ہیں وہی شرعی طور پر مالک ہیں، ان کی زندگی میں اولاد کا کوئی حق ان کی جائیداد سے متعلق نہیں ہوتا ہے، جیسا کہ درج ذیل جزئیات سے واضح ہوتا ہے۔ اس کو ''البحر الرائق'' میں ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا گیا ہے، ملاحظہ فرمائیے:

''وأما بيان الوقت الذي يجرى فيه الإرث فنقول هذافصل اختلف المشايخ فيه، قال مشايخ العراق: الإرث يثبت في آخر جزء من أجزاء حياة المورث، وقال مشايخ بلخ: الإرث يثبت بعد موت المورث'' (البحر الرائق کوئٹہ ۸/ ۴۸۸، زکریا ۹/ ۳۶۴)۔

اس کو صاحب تاتارخانیہ نے ان الفاظ میں نقل فرمایا ہے، ملاحظہ فرمائیے:

''الفصل الرابع في بيان الوقت الذي يجرى فيه الإرث، هذافصل اختلف المشايخ رحمهم الله، قال مشايخ العراق: الإرث يجرى في آخر جزء من أجزاء حياة المورث، وقال مشايخ بلخ: الإرث يجرى بعد موت المورث'' (الفتاوى التاتارخانية ۲۰/ ۲۱۵، رقم: ۳۳۰۷۸)۔

اس سلسلے میں ''شعب الایمان'' کی حدیث شریف ملاحظہ ہو:

''عن أبي حرة الرقاشي عن عمه أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: لايحل مال امرئ مسلم إلا بطيب نفس منه'' (شعب الایمان للبیهقي ۴/ ۳۸۷، رقم الحديث: ۵۴۹۲)۔

سوال (۹) عمر رسیدہ لوگوں کو ہاسپٹل میں داخل کر دینا

جب انسان عمر رسیدہ ہو کر کمزور ہو جاتا ہے، تو وہ اپنے چھوٹوں کی خدمت کا زیادہ محتاج ہو جاتا ہے اور اپنی اولاد اور قریبی اعزہ کی ہمدردی اور صلہ رحمی کا زیادہ مستحق بھی ہو جاتا ہے، ایسے حالات میں ان کو قریبی رشتہ داروں اور اعزہ سے الگ کر کے ہاسپٹلوں میں داخل کر دینا ان کے حق میں جیل خانہ میں داخل کر دینے کے مرادف ہے، اور شرعاً صلہ رحمی کے خلاف قطع رحمی کا ایک دروازہ کھول دینا ہے؛ لہٰذا شریعت صلہ رحمی، غم خواری اور رواداری سے محروم کر کے ایسے ہاسپٹلوں میں داخلہ کی ہرگز اجازت نہیں دیتی، قرآن وحدیث کی رو سے یہ عمل جواز کے دائرے میں داخل نہیں ہوسکتا، ذیل کی عبارات میں شریعت کا حکم ملاحظہ فرمائیے:

''قوله تعالى: ''إما يبلغن عندك الكبر أحدهما أو كلاهما'' خص حالة الكبر؛ لأنها الحالة التي يحتاجان فيها إلى بره لتغير الحال عليهما بالضعف والكبر، فألزم في هذه الحالة من مراعاة أحوالهما أكثر مما ألزمه من قبل؛ لأنهما في هذه الحالة قد صارا كلا عليه فيحتاجان أن يلي منهما في الكبر ما كان يحتاج في صغره أن يليا منه، فلذلك خص هذه الحالة بالذكر'' (الجامع لأحكام القرآن للقرطبي ۱۰/ ۱۵۸)۔

اور ''ترمذی شریف'' کی روایت ملاحظہ فرمائیے:

''فقال عبدالرحمن: سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: قال الله تبارك وتعالى: أنا الله وأنا الرحمن خلقت الرحم وشققت لها من اسمي، فمن وصلها وصلته ومن قطعها بتته'' (جامع الترمذي ۲/ ۱۲/ رقم: ۱۹۰۷)۔

اور بخاری شریف کی روایت ملاحظہ فرمائیے:

''عن أبي هريرة رضي الله عنه عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: الرحم شجنة من الرحمن، فقال الله من وصلك وصلته، ومن قطعك قطعته'' (صحيح البخاري ۲/ ۸۸۵۸۸۶، رقم: ۵۷۵۳۵۷۵۵)۔

اور ترمذی شریف کی دوسری روایت ملاحظہ فرمائیے:

''عن جبير بن مطعم رضي الله عنه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لايدخل الجنة قاطع، قال ابن أبي عمر قال سفيان: يعني قاطع رحم'' (جامع الترمذي ۲/ ۱۳، رقم: ۱۹۰۹)۔

اور بدائع الصنائع کی عبارت ملاحظہ ہو:

''وترك الإنفاق من ذي الرحم المحرم مع قدرته وحاجة المنفق عليه تفضي إلى قطع الرحم، فيحرم الترك وإذا حرم الترك وجب الفعل ضرورة'' (بدائع الصنائع، زکریا دیوبند ۳/ ۴۴۲)۔

سوال (۱۰) اجتماعی کفالت کے لئے زکوۃ جمع کرنا:

ضعیف کمزور لوگوں اور بوڑھے لوگوں کو ایک جگہ ایک ہاسٹل میں جمع کرکے پھر ان کی اجتماعی کفالت کے لئے زکوۃ اکٹھا کرنے کی بات سوال نامہ میں ذکر کی گئی ہے، تو اس سلسلے میں گزارش یہ ہے کہ شریعت اس کی اجازت ہی نہیں دیتی ہے کہ ان کو قریب یا دور کے رشتہ داروں سے الگ کرکے کسی ہاسٹل میں داخل کردیا جائے، اگر قریبی رشتہ دار موجود نہیں ہیں تو دور کے رشتہ داروں کی ذمہ داری ہے کہ ان کی ضرورت پوری کریں، نیز اس میں یہ بات بھی ہے کہ دور کے رشتہ دار اپنی زکوۃ کی رقم سے بھی ان کی ضرورت پوری کرسکتے ہیں؛ لہٰذا اجتماعی کفالت کے واسطے زکوۃ اکٹھا کرنے کی ضرورت نہیں؛ بلکہ زکوۃ کا پیسہ ان کمزوروں کے ہاتھ میں دے کرکے براہ راست مالک بنادیا جائے وہ اپنے حساب سے اپنی ضرورت پوری کرلیا کریں گے، جیسا کہ حسب ذیل جزئیات سے واضح ہوتا ہے۔

اس کو ''الاختیار لتعلیل المختار'' میں ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا گیا ہے، ملاحظہ فرمائیے:

''واعلم أن التمليك شرط، قال تعالى: وآتوا الزكوة، والإيتاء: الإعطاء، والإعطاء التمليك. فلابد فيها من قبض الفقير أو نائبه؛ لأن التمليك لايتم بدون القبض'' (الاختيار التعليل المختار ۱/ ۱۲۱، الشاملة بحواله كتاب النوازل ۷/ ۴۰)۔

اس کو ''بدائع الصنائع'' میں ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا گیا ہے، ملاحظہ فرمائیے:

''أما ركن الزكاة، فركن الزكاة: هو إخراج جزء من النصاب إلى الله تعالى، وتسليم ذلك إليه يقطع المالك يده عنه بتمليكه من الفقير وتسليمه إليه أو إلى يد من هو نائب عنه، وهو المصدق، والملك للفقير يثبت من الله تعالى، وصاحب المال نائب عن الله تعالى في التمليك والتسليم إلى الفقير'' (بدائع الصنائع، زکریا دیوبند ۲/ ۱۴۲)۔

سوال (۱۰) عمر رسیدہ لوگوں کے لئے سرکاری مراعات سے فائدہ اٹھانا:

حکومت کی طرف سے عمر رسیدہ لوگوں کے لئے جو سہولیات اور خصوصی رعایتیں رکھی گئی ہیں، ان رعایتوں سے فائدہ اٹھانا ان ہی لوگوں کے لئے جائز ہے جن کی عمر مطلوبہ حد کو پہنچ گئی ہو، اب مطلوبہ حد کے بارے میں سرکاری قانون میں علی الاطلاق اس کی تحدید ہے، شمسی یا قمری کی کوئی قید نہیں ہے؛ لیکن غیر اسلامی سرکاری قانون میں شمسی اور انگریزی سن ہی مراد لیتے ہیں اور اسلامی قوانین میں قمری سن مراد ہوتا ہے، جیسے سعودی عرب وغیرہ میں ہے؛ اس لئے اگر کوئی مسلمان قمری حساب سے ساٹھ سال کی عمر کو پہنچ گیا ہے اور شمسی حساب سے کچھ کم ہے اور وہ اس رعایت سے فائدہ اٹھاتا ہے، تو اسلامی نقطہ نظر سے اسے خائن اور دھوکہ باز نہیں کہا جائے گا؛ اس لئے کہ اس کی عمر اسلامی سن کے اعتبار سے ساٹھ سال پوری ہوگئی ہے، ہاں البتہ احتیاطاً شمسی سال کے حساب سے ساٹھ سال پورے ہونے کے بعد ان رعایتوں سے فائدہ اٹھائے تو زیادہ بہتر ہے، نیز جن امور میں رعایت حاصل کرنے کا مدار آئی ڈی دیکھنے پر ہے، ان امور میں آئی ڈی میں درج کردہ تاریخوں کے اعتبار سے رعایت حاصل کرنا ضروری ہے، اور آج سے دس پندرہ سال پہلے تک لوگوں کے پاس آئی ڈی نہیں تھی اور نہ ہی آئی ڈی مانگی جاتی تھی، جس نے اپنی عمر اندازے سے ساٹھ سال سمجھا ہے اور لکھ دیا ہے اور وہ ان رعایتوں سے فائدہ اٹھاتا رہا ہے اور دس پندرہ سال کے بعد سے جو آئی ڈی بنتی چلی آئی ہے ان میں عمر رسیدہ لوگوں کی عمریں عام طور پر اندازے سے لکھی گئی ہیں، قطعی اور حتمی نہیں ہیں؛ لہٰذا آج کے زمانے میں جتنے لوگ ساٹھ سال تک پہنچ چکے ہیں، ان میں سے ساٹھ ستر فیصد افراد وہ ہیں جن کی تاریخ پیدائش متعین طور پر درج کردہ نہیں ہے؛ اس لئے ایسے لوگ اندازے سے اپنی عمریں ساٹھ سال بتاکر ان رعایتوں سے فائدہ حاصل کریں یا قمری حساب سے فائدہ حاصل کریں، تو جائز اور درست ہوگا؛ اس لئے کہ ان کا مقصد حکومت کو دھوکہ دینا نہیں ہے؛ بلکہ عمر رسیدہ ہونے کی وجہ سے ان رعایتوں سے فائدہ اٹھانا مقصد ہے۔

تمام اسلامی اور دینی ممالک میں سارا نظام اسلامی سال اور اسلامی مہینوں سے چلتا ہے، اور مسلمان اپنی تاریخیں اسلامی سال کے حساب سے

محفوظ رکھتے ہیں، اس سلسلے میں فتح الباری مطبع دار الریان ۷/۱۵ ۳، مطبع اشرفیہ ۷/۱ ۴ ۳، عمدۃ القاری نسخہ قدیم ۱۷/ ۶۶، الروض الانف ۴/ ۲۵۶، میں پوری تفصیل موجود ہے۔

نیز قرآن مقدس کے اندر اسلامی تاریخ اور اسلامی مہینے ہی کو معتبر قرار دیا گیا ہے، آیت شریفہ ملاحظہ فرمائیے:

"يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْأَهِلَّةِ قُلْ هِيَ مَوَاقِيتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ" [البقرۃ: ۱۸۹]۔

اور ''روح المعانی'' میں بہت واضح الفاظ میں اسلامی تاریخ کے اعتبار کرنے کو واضح فرمایا ہے، ملاحظہ فرمائیے:

''وهي أن يكون معالم للناس يوقتون بها أمورهم الدنيوية، ويعملون أوقات زروعهم ومتاجرهم ومعالم للعبادات المؤقتة يعرف بها أوقتها كالصيام والإفطار، وخصوصا الحج، فإن الوقت مراعى فيه أداء وقضاء''

(روح المعاني، المكتبة التجارية مصطفى أحمد الباز ۲/ ۱۰۷)۔

اور جامع احکام القرآن للقرطبی میں ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا گیا ہے:

''قوله تعالى: {قُلْ هِيَ مَوَاقِيتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ} تبيين لوجه الحكمة في زيادة القمر ونقصانه، وهو زوال الإشكال في الآجال، والمعاملات، والأيمان، والحج، والعدد، والصوم، والفطر، ومدة الحمل، والإجارات والأكرية إلى ذلك من مصالح العباد'' (الجامع لأحكام القرآن للقرطبي ۲/ ۲۲۸، بيروت لبنان ۲/ ۲۲۸)۔

ان جزئیات سے معلوم ہوا کہ ایک مسلمان اسلامی سال اور اسلامی مہینہ ہی کا زیادہ پابند ہوتا ہے؛ اس لئے اگر کسی مسلمان نے اسلامی سال کے پیش نظر سرکاری مراعات سے فائدہ اٹھالیا ہے، تو اس کے لئے جائز اور درست ہو جائے گا، اس کو ناجائز نہیں کہا جا سکتا؛ اس لئے کہ ملک بھر میں رہنے والے مسلمانوں کے سربراہان اور ذمہ داران قمری سال ہی کا اعتبار کرتے ہیں۔

يَا رَبِّ صَلِّ وَسَلِّمْ دَائِمًا أَبَدًا ★ عَلَى حَبِيبِكَ خَيْرِ الْخَلْقِ كُلِّهِمِ

اَللّٰهُ أَكْبَرُ كَبِيرًا وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ كَثِيرًا وَسُبْحَانَ اللّٰهِ بُكْرَةً وَأَصِيلًا۔ الحديث

(المعجم الكبير ۲/ ۱۳۵، برقم: ۱۵۷۰)۔

معذوروں اور صاحب ثروت والدین کا نفقہ اور ان کے حقوق

مولانا خورشید انور اعظمی[1]

قرآن واحادیث میں ماں باپ کی اہمیت وعظمت اور ضعف وپیری کے زمانہ میں ان کی خدمت پر کافی زور دیا گیا ہے، اور اولاد کو تاکید کی گئی ہے کہ اس سلسلہ میں کسی طرح کی کوئی کوتاہی نہ برتیں، بلکہ ان سے متعلق جملہ حقوق کی ادائیگی کو اپنے لئے سعادت وبرکت کا ذریعہ سمجھیں، اسی لئے فقہاء کرام نے کتب فقہ میں والدین کے حقوق کی تفصیل پورے اہتمام سے بیان کی ہے، کتاب وسنت میں بیان کردہ انہیں اصول وضوابط کی روشنی میں مندرجہ ذیل تفصیلات سپرد قرطاس کیا جارہا ہے:

(۱) بوڑھے غریب باپ کو کسب معاش پر مجبور کرنے کا مسئلہ:

اگر باپ غریب اور تنگ دست ہے اور ضعف وپیری کے سبب اس کے لئے کسب معاش آسان نہیں ہے، بس اپنے گذر اوقات کے لئے مشقت کے ساتھ ہی کمانے کی استطاعت رکھتا ہے، تو ایسی صورت میں اس کا نفقہ اولاد کے ذمہ واجب ہوگا یا بوڑھے باپ کو کسب معاش پر مجبور کیا جائے گا؟ اس سلسلہ میں فقہاء کرام کی دو رائیں ہیں، شمس الائمہ حلوانی کا خیال ہے کہ اگر باپ کسب معاش پر قادر ہے تو اولاد کو والد کے نفقہ کی ادائیگی پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔

''ذكر شمس الأئمة الحلواني رحمه الله في أدب القاضي للخصاف أنه لا يجبر الابن على نفقة الأب، إذا كان الأب قادرًا على الكسب، فاعتبره بذي الرحم المحرم'' (المحيط البرهاني ۴/ ۱۶۰)۔

(شمس الائمہ حلوانی خصاف کی ادب القاضی میں ذکر کیا ہے کہ اگر باپ کمانے پر قادر ہو تو بیٹے کو باپ کے نفقہ پر مجبور نہیں کیا جائے گا، انہوں نے باپ کو ذی رحم محرم پر قیاس کیا ہے)۔

جبکہ علامہ سرخسی کا خیال ہے کہ مذکورہ صورت حال میں اگر اولاد مالدار یا کمانے پر قادر ہے اور والد بھی کمانے کی طاقت رکھتا ہے، تب بھی اولاد کو والد کے نفقے پر مجبور کیا جائے گا۔

''ذكر شمس الأئمة السرخسي رحمه الله في شرح أدب القاضي للخصاف: أن الأب إذا كان كسوبا والابن أيضا كسوب يجبر الابن على الكسب والنفقة على الأب'' (المحيط البرهاني ۴/ ۱۶۰)۔

(شمس الائمہ سرخسی نے خصاف کی ادب القاضی کی شرح میں ذکر کیا ہے کہ اگر باپ اور بیٹا دونوں کمانے والے ہوں تو بیٹے کو مجبور کیا جائے گا کہ وہ کمائے اور باپ کا نفقہ برداشت کرے)۔

علامہ سرخسی اپنی شہرہ آفاق تصنیف ''المبسوط'' میں اس کی علت پر روشنی ڈالتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''ويجبر الرجل المؤسر على نفقة أبيه وأمه إذا كانا محتاجين لقوله تعالى ''فلا تقل لهما أف'' (الاسراء: ۲۳)، نهى عن التافيف لمعنى الأذى، ومعنى الأذى في منع النفقة عند حاجتهما أكثر، ولهذا يلزمه نفقتهما، وإن كانا قادرين على الكسب؛ لأن معنى الأذى في الكد والتعب أكثر منه في التافيف وقال ﷺ: إن أطيب ما يأكل الرجل من كسبه، وإن ولده لمن كسبه، فكلوا مما كسب أولادكم'' (المبسوط ۵/ ۲۲۲)۔

---

[1] صدر مدرس جامعہ مظہر العلوم

(مالدار آدمی کے والدین اگر ضرورت مند ہوں تو اسے ان کے نفقہ پر مجبور کیا جائے گا، اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "فلا تقل لهما أف" اف کرنے کی ممانعت اذیت کی بنیاد پر ہے، اور انکی ضرورت کے وقت نفقہ نہ دینے میں اس سے کہیں زیادہ اذیت ہے، اسی وجہ سے فقہاء بیٹے پر والدین کا نفقہ واجب قرار دیتے ہیں، اگر چہ وہ کمانے پر قادر ہوں، اس لئے کہ محنت ومشقت میں اف کہنے سے بہت زیادہ تکلیف ہے، اور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: آدمی کا سب سے بہتر کھانا اس کی کمائی سے ہے، اور اس کا لڑکا اس کی کمائی سے ہے، لہٰذا تم اپنی اولاد کی کمائی سے کھاؤ، والدین کے حقوق سے متعلق جملہ تفصیلات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ سرخسی کا خیال راجح اور مختار ہے، جیسا کہ البحر الرائق میں خلاصہ کے حوالے سے اس کے مختار ہونے کا رجحان معلوم ہوتا ہے۔

"وفي الخلاصة المختار: في الفقير الكسوب أن يدخل الأبوين في النفقة وقيّد بفقرهم فقط؛ لأنه لو كان فقيرًا وله قدرة على الكسب، فإن الابن يجبر على نفقته، وهو قول السرخسي" (البحر الرائق ۴/ ۲۲۴)۔

(اور خلاصہ میں ہے کہ کمانے والے فقیر آدمی کے بارے میں مختار قول یہ ہے کہ وہ والدین کو نفقے میں شامل کرے، ماتن نے والدین کے لئے صرف فقر کی قید لگائی ہے، اس وجہ سے کہ اگر باپ فقیر ہو اور اسے کمانے پر قدرت ہو تو لڑکے کو اس کے نفقے پر مجبور کیا جائے گا، سرخسی کا یہی قول ہے)۔

اسی طرح علامہ بابرتی نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف، عنایہ شرح ہدایہ میں علامہ سرخسی کے موقف کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اگر والد کے استحقاق نفقہ کے لئے بھی کمانے پر عدم قدرت کی شرط لگادی جائے، تو پھر نفقہ کے تعلق سے باپ بیٹے کے درمیان فرق ہی کیا رہ جائے گا، اس لئے کہ بالغ اولاد بھی کسب معاش پر عدم قدرت کے سبب مستحق نفقہ ہو جاتی ہے، جب کہ والدین کو بہر حال بیٹے کے بالمقابل زیادہ اہمیت وفضیلت حاصل ہے، اس لئے اگر باپ محتاج ہے تو اس کا نفقہ بیٹے پر واجب ہوگا، خواہ باپ کمانے پر قادر ہو یا نہ ہو، تحریر فرماتے ہیں:

"فلو شرط ہاہنا عجز الوالد عن الكسب لاستحقاق نفقته على ولده، كما شرط في حق الابن لوقعت المساواة مع قيام دليل المفاضلة" (عنایہ شرح الهدایہ ۴/ ۴۱۶)۔

(اگر یہاں بھی بیٹے پر باپ کے نفقہ کے استحقاق کے لئے باپ کے کمانے پر عدم قدرت کی شرط لگادی جائے، جیسا کہ یہ شرط بیٹے کے حق میں ہے، تو دونوں برابر ہو جائیں گے، جبکہ باپ کی بیٹے پر فضیلت کی دلیل موجود ہے)۔

نیز یہ قول اس لئے بھی راجح معلوم ہوتا ہے کہ اولاد پر باپ کے احسانات بے شمار اور حقوق متنوع ہیں، جس کی بنا پر شریعت میں اولاد کو باپ کی بہترین کمائی بتایا گیا ہے، باپ کی خدمت ومعاونت کو ان پر لازم قرار دیا گیا ہے، اور اس بات کی تاکید کی گئی ہے کہ وہ ان کا ہر ممکن لحاظ کریں، اس صورت حال میں یہ کیسے مناسب ہوگا کہ باپ کو کسب معاش پر مجبور کیا جائے جبکہ اولاد اس کی بنیادی ضروریات کو پورا کرنے کی پوزیشن میں ہے، کیا یہ زیب دے گا کہ بیٹا آرام کے ساتھ زندگی بسر کرے اور باپ کسب معاش کے لئے در در کی ٹھوکریں کھائے، پھر اس حیثیت سے بھی یہ قول راجح ہے کہ فقہاء نے اولاد پر والدین کے نفقے کے وجوب کی بنیاد ان کا فقر واحتیاج قرار دیا ہے نہ کہ کمانے پر عدم قدرت، جیسا کہ (ردالمحتار ۵/ ۳۵۵، البحر الرائق ۴/ ۲۲۴، فتح القدیر ۴/ ۲۲۱)، وغیرہ میں اس کی صراحت موجود ہے، لہٰذا اگر والدین فقیر ومحتاج ہوں تو اولاد پر ان کا نفقہ واجب ہوگا، اس سے قطع نظر کہ وہ کسب معاش پر قدرت رکھتے ہیں یا نہیں، یہی وجہ ہے کہ کتب فقہ میں یہ بات بصراحت مذکور ہے کہ اگر والدین غریب ومحتاج ہوں تو مالدار بیٹے کو ان کے نفقہ پر مجبور کیا جائے گا، "فتاوی ہندیہ" میں ہے:

"ويجبر الولد الموسر على نفقة الأبوين المعسرين مسلمين كانا، أو ذميين قدرا على الكسب، أو لم يقدرا" (فتاوی ہندیہ ۱/ ۵۶۴)۔

(مالدار بیٹے کو غریب ماں باپ کے نفقے پر مجبور کیا جائے گا، وہ مسلمان ہوں یا ذمی، کمانے پر قدرت ہو یا نہ ہو)۔

المحیط البرہانی میں ہے:

"يفرض على الابن نفقة الأب إذا كان محتاجًا والابن موسرا سواء كان الأب قادرا على الكسب أو لم يكن" (المحيط البرهاني ۴/ ۱۶۰)۔

(باپ اگر محتاج ہو اور بیٹا مالدار، تو بیٹے پر باپ کا نفقہ فرض ہے، خواہ باپ کمانے پر قادر ہو یا نہ ہو)۔

ہدایہ میں ہے:

''القادر علی الکسب غني بکسبه بخلاف الأبوین؛ لأنه یلحقهما تعب الکسب والولد مأمور بدفع الضرر عنهما فتجب نفقتهما مع قدرتهما علی الکسب'' (ہدایہ ۲/ ۲۹۳)۔

(کمانے پر قدرت رکھنے والا اپنی کمائی کے سبب مالدار ہے، بخلاف والدین کے، اس لئے کہ انہیں کمانے میں مشقت لاحق ہوگی اور لڑکا ان سے دفع ضرر کا مامور ہے، لہذا کمائی پر قدرت کے باوجود ان کا نفقہ واجب ہوگا)۔

الموسوعۃ الفقہیہ میں ہے:

''وقال الحنفیة والشافعیة في الأظهر، کما قال النووي وهو قول بعض المالکیة: إن کان الأصل فقیرًا قادرًا علی الکسب تجب نفقته علی فرعه کذلك، لأن الله تعالی قد أمر بالإحسان إلی الوالدین، وفي إلزام الآباء التکسب مع غنی الأبناء ترك للإحسان إلیهم وإیذاء لهم، وهو لا یجوز'' (الموسوعة الفقهیه ۴۱/ ۷۵)۔

(حنفیہ نے اور بقول نووی، شافعیہ نے قول اظہر میں کہا ہے اور یہی بعض مالکیہ کا بھی قول ہے کہ اگر اصل فقیر ہو، اور کمانے پر قادر ہو تو اس کا نفقہ اس کی فرع پر واجب ہوگا، اس لئے کہ اللہ تعالی نے والدین کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا ہے، اور لڑکوں کے مالدار ہونے کے باوجود باپ کو کمائی کو لازم قرار دینا، ان کے ساتھ حسن سلوک کو ترک کرنا اور انہیں اذیت دینا ہے، جو جائز نہیں ہے)۔

علامہ ابن قیم اس مسئلے میں کافی حساس نظر آتے ہیں، انہوں نے زاد المعاد میں اس مسئلے پر سیر حاصل گفتگو کی ہے، اور آخر میں بہت ہی پرزور انداز میں اس بات کی وضاحت کی ہے کہ والدین کے ساتھ یہ کہاں کا حسن سلوک ہے کہ بیٹا خوشحال زندگی بسر کرے اور ماں باپ اپنے گذر اوقات کے لئے دوسروں کے دست نگر بنے رہیں، لکھتے ہیں:

''لیس من بر الوالدین أن یدع الرجل أباه یکنس الکنف، ویکاري علی الحمر، ویوقد في أتون الحمام، ویحمل للناس علی رأسه ما یتقوت بأجرته، وهو في غایة الغنی والیسار وسعة ذات الید، ولیس من بر أمه أن یدعها تخدم الناس، وتغسل ثیابهم، وتسقي لهم الماء، ونحو ذلك، ولا یصونها بما ینفقه علیها، ویقول: الأبوان مکتسبان صحیحان ولیسا بزمنین ولا أعمیین، فیا لله العجب: أین شرط الله ورسوله في بر الوالدین وصلة الرحم أن یکون أحدهم زمنا أو أعمی، ولیست صلة الرحم ولا بر الوالدین موقوفة علی ذلك شرعًا ولا لغة ولا عرفا، وبالله التوفیق'' (زاد المعاد ۴/ ۱۶۷)۔

(یہ والدین کے ساتھ حسن سلوک نہیں ہے کہ آدمی اپنے باپ کو کسی کا بیت الخلاء صاف کرنے، گدھوں سے کرایہ داری کرنے، حمام کی بھٹی میں آگ جھونکنے، اور اپنے سر پر دوسروں کا سامان ڈھونے دے، جس کی اجرت سے وہ اپنی روٹی روزی کا نظم کرے، جبکہ بیٹا کافی مالدار اور خوشحال ہے، اور یہ ماں کے ساتھ حسن سلوک نہیں ہے کہ اسے لوگوں کی خدمت کرنے، ان کا کپڑا دھونے، ان کے لئے پانی لانے جیسے کاموں کو کرنے دے، اور کہے کہ والدین صحت مند ہیں کماتے ہیں، اپاہج اور نابینا نہیں ہیں، یہ کس قدر عجب بات ہے، اللہ و رسول نے والدین کے ساتھ حسن سلوک اور صلہ رحمی کے سلسلہ میں کہاں یہ شرط لگائی ہے کہ وہ اپاہج اور نابینا ہوں، والدین کے ساتھ حسن سلوک اور صلہ رحمی، اس پر موقوف نہیں ہے، نہ شرعا نہ لغتا نہ عرفا، وباللہ التوفیق)۔

حاصل یہ کہ اگر والدین محتاج وضرورت مند ہیں تو ان کا نفقہ بیٹے پر واجب ہوگا، خواہ وہ کمانے کی طاقت رکھتے ہوں یا نہ رکھتے ہوں۔

(۲) سن رسیدہ حضرات کے نفقہ وعلاج کا مسئلہ:

والدین کے علاوہ دوسرے سن رسیدہ حضرات کا نفقہ وعلاج دوسروں پر اس وقت واجب ہوتا ہے، جب وہ اپنی جسمانی معذوری کے سبب کمانے پر قدرت نہ رکھتے ہوں، اور بذات خود اپنی کفالت کے اہل نہ ہوں، ایسے حالات سے دوچار افراد کے نفقے کی ذمہ داری ان حضرات پر ہوگی، جن سے ان کے نفقے کی ادائیگی از روئے شریعت اسلامیہ متعلق ہے، جیسا کہ علامہ کاسانی نے ''بدائع الصنائع'' میں وجوب نفقہ کی شرطوں کے ذیل میں اس بات کی وضاحت فرمائی ہے۔

''والثاني عجزه عن الکسب بأن کان به زمانة أو قعد أو فلج أو عمی أو جنون أو کان مقطوع الیدین أو

أشلهما أو مقطوع الرجلين أو مفقوء العينين أو غير ذلك من المن الله عوارض التي تمنع الإنسان من الاكتساب'' (بدائع الصنائع ۴/ ۳۵)۔

(دوسری شرط کمانے سے عاجزی ہے، اس طرح پر کہ وہ اپاہج یا چلنے پھرنے سے معذور، یا مفلوج، یا اندھا، یا مجنون ہو، یا اس کے دونوں ہاتھ کٹے ہوئے ہوں، یا شل ہوں، یا دونوں پیر کٹے ہوئے، یا دونوں آنکھیں پھوٹ گئی ہوں، یا ان کے علاوہ ایسے عوارض ہوں جن کے سبب وہ کمانے پر قادر نہ ہو)۔

ہدایہ میں ہے:

''والنفقة لكل ذي رحم محرم إذا كان صغيرًا فقيرًا أو كانت امرأة بالغة فقيرة أو كان ذكرا بالغًا فقيرًا زمنًا أو أعمى، لأن الصلة في القرابة القريبة واجبة دون البعيدة والفاصل أن يكون ذا رحم محرم وقد قال الله تعالى: (وعلى الوارث مثل ذلك)'' (بدایہ ۲/ ۲۹۳)۔

(ہر ذی رحم محرم کا نفقہ اس وقت ہے جب کہ وہ چھوٹا ہو اور فقیر ہو، یا بالغ فقیر عورت ہو یا بالغ فقیر مرد ہو اپاہج یا اندھا ہو، اس وجہ سے کہ صلہ قریبی قرابت میں واجب ہے، دور میں نہیں دونوں میں فرق کرنے والی چیز یہ ہے کہ وہ ذی رحم محرم ہو، اللہ تعالیٰ نے فرمایا وعلی الوارث مثل ذلک)۔

دوسرے رشتہ داروں کے نفقہ کے لئے اس درجہ محتاجگی ضروری ہے کہ وہ از خود کما کر اپنے گذر بسر کا سامان مہیا کرنے پر قادر نہ ہوں، ہدایہ میں ہے:

''لابد من الحاجة والصغر والأنوثة والزمانة والعمى أمارة الحاجة لتحقق العجز فإن القادر على الكسب غني بكسبه بخلاف الأبوين'' (بدایہ ۲/ ۲۹۳)۔

(اس سلسلہ میں احتیاج ضروری ہے، کم عمر ہونا، مونث ہونا، اپاہج ہونا، اور اندھا ہونا احتیاج کی علامت ہے، اس لئے کہ کمانے پر قدرت نہیں ہے، کیونکہ جو شخص کمانے پر قادر ہوتا ہے وہ اپنی کمائی کے سبب مالدار ہوتا ہے، برخلاف والدین کے)۔

کمانے پر قادر ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ جسمانی اعتبار سے صحت مند ہوں، اس لئے کہ صحت مند آدمی کمانے اور اپنے معاش کا نظم کرنے کی پوزیشن میں ہوتا ہے، علامہ ابن ہمام نے (غنی بکسبہ) کا مطلب واضح کرتے ہوئے لکھا ہے:

''وقدرته على الكسب تتحق بصحة الدين بعد كونه بالغًا'' (فتح القدیر ۴/ ۲۲۴)

(بالغ ہونے کے بعد کمانے پر قدرت، جسمانی صحت سے ہوا کرتی ہے)۔

حاصل یہ کہ سن رسیدہ شخص اس درجہ مجبور و بے بس ہو کہ خود اپنی کفالت نہ کر سکتا ہو تو اس کا نفقہ دوسروں پر واجب ہوگا۔

(۳) صاحب ثروت والدین کے نفقہ کا مسئلہ:

اگر والدین صاحب ثروت ہوں اور خوشحال زندگی گزار رہے ہوں تو ان کا نفقہ اولاد پر واجب نہیں ہوگا، اس لئے کہ والدین کے نفقہ کے وجوب کے لئے فقر کی شرط ہے، اور یہی ظاہر روایت ہے، جیسا کہ کتب فقہ کی تصریحات سے واضح ہے، لہذا والدین کے مالدار ہونے کی صورت میں انہیں دوسروں کے تعاون ضرورت نہیں ہوگی، اس لئے بہتر ہوگا کہ ان کا نفقہ دوسروں پر واجب نہ کیا جائے، علامہ مرغینانی والدین کے استحقاق نفقہ کے لئے فقر کی شرط لگائے جانے کی وجہ بتاتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''وشرط الفقر؛ لأنه لو كان ذا مال، فإيجاب نفقته في ماله أولى من إيجابها في مال غيره'' (بدایہ ۲/ ۲۹۱)۔

(فقر کی شرط اس لئے لگائی گئی ہے کہ اگر باپ مالدار ہو تو اس کا نفقہ دوسرے کے مال میں واجب کئے جانے کے بالمقابل اس کے مال میں واجب کیا جانا زیادہ بہتر ہے)۔

علامہ کاسانی اس مسئلے کی توضیح کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''لا تجب لموسر على غيره نفقة في قرابة الولاد وغيرها من الرحم المحرم؛ لأن وجوبها معلول بحاجة المنفق عليه، فلا تجب لغير المحتاج'' (بدائع الصنائع ۴/ ۳۴)۔

(ولادت اور ذی رحم محرم والی رشتہ داری میں کسی مالدار کا نفقہ دوسرے پر واجب نہیں ہوتا ہے، اس وجہ سے کہ نفقے کا وجوب منفق علیہ کی حاجت کی بنا پر ہے، لہذا غیر محتاج کے لئے واجب نہیں ہوگا)۔

اگر والدین، محتاج تعاون نہیں ہیں، بلکہ خود ہی صاحب ثروت ہیں، مگر اپنی ذاتی مصلحت کی بنا پر، اپنے بیٹوں سے زائد رقم کا مطالبہ کرتے ہیں، تو عام حالات میں یہ بہتر نہیں ہے، جیسا کہ مذکورہ جزئیات سے واضح ہوتا ہے، البتہ اگر بیٹے کی مالی حالت اجازت دیتی ہو کہ ان کا اضافی تعاون کر سکے تو اسے باپ کے گونا گوں احسانات کے سبب جائز حدود میں رہتے ہوئے ضرور کرنا چاہئے، اس لئے کہ بیٹے کے مال میں باپ کی شبہ ملک ہے، جیسا کہ ملا علی قاری ''أنت ومالک لأبیک'' کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''في الحديث دليل على وجوب نفقة الوالد على ولده، وأنه لو سرق شيئًا من ماله أو ألمّ بأمته فلاحد عليه لشبهة الملك'' (مرقاۃ المفاتیح ۶/۲۱۹۶)۔

(اس حدیث میں اس بات کی دلیل ہے کہ والد کا نفقہ اس کی اولاد پر واجب ہے، اور اگر باپ، بیٹے کے مال سے چوری کرے یا اس کی باندی سے ہم بستر ہو جائے تو شبہ ملک کے سبب اس پر حد جاری نہیں ہوگی)۔

معلوم ہوا کہ صاحب ثروت والدین کے لئے مناسب نہیں ہے کہ عام حالات میں بیٹوں سے اپنی دیگر ضرورتوں کے لئے زائد رقم کا مطالبہ کریں، البتہ اگر بیٹا اپنے حالات و مصلحت کو مدنظر رکھتے ہوئے، ان کے مطالبہ کو پورا کردے، تو اس کے لئے بہتر ہوگا۔

(۴) والدین کی خدمت کا مسئلہ:

انسان کا جسم جب ضعف پیری کے سبب، پورے طور پر لاغر و کمزور ہو جاتا ہے، تو اسے ہر قدم پر ایک سہارے کی ضرورت ہوتی ہے، اس صورت میں اس کی خدمت کے تعلق سے بیٹے کی ذمہ داری، بہت زیادہ ہو جاتی ہے، اور ہر فیصلے سے پہلے اس اہم پہلو پر نہایت سنجیدگی سے غور کرنا لازم ہو جاتا ہے، چنانچہ اگر بیٹا زیادہ پیسہ کمانے کی غرض سے دوسرے شہر، ریاست یا ملک چلا جاتا ہے تو بعض دفعہ باپ کی خدمت کا مسئلہ بہت اہم اور پیچیدہ ہو جاتا ہے، آج کے ماحول میں ماں باپ کی جسمانی خدمت کے تعلق سے یہ اور اس طرح کے چند مسائل از حد غور طلب ہیں:

(الف) اگر بیٹا، ماں باپ کو چھوڑ کر زیادہ آمدنی کے لئے کسی دوسری جگہ جاتا ہے، تو دیکھا جائے گا کہ اگر باپ محتاج خدمت ہے تو اس کی اجازت کے بغیر باہر کا سفر نہیں کر سکتا، اور اگر محتاج خدمت نہیں ہے، تو اس کی اجازت کے بغیر بھی سفر تجارت کر سکتا ہے، البحر الرائق میں ہے:

اگر بیٹا حج کے لئے جانا چاہے اور باپ نہ چاہتا ہو تو علماء نے کہا: اگر باپ، بیٹے کی خدمت سے بے نیاز ہو تو کوئی حرج نہیں ہے، ورنہ حج کے لئے جانے کی گنجائش نہیں ہے،،، اس وجہ سے کہ والدین کے حق کی حفاظت فرض عین ہے۔

اسی طرح اسلام میں جہاد کی بہت اہمیت ہے، مگر والدین کی خدمت گزاری کا درجہ اس سے بھی بڑھا ہوا ہے، کہ ان کی اجازت کے بغیر جہاد بھی جائز نہیں، ایک مرتبہ ایک صحابی نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر شرکت جہاد کی اجازت چاہی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمہارے والدین ہیں، کہا جی ہاں، آپ نے فرمایا تو پھر انہی کی خدمت کا فریضہ جہاد ادا کر (صحیح بخاری ۴/۵۹)۔

علامہ بدرالدین عینی نے جہاد میں نکلنے کے لئے والدین کی اجازت سے متعلق فقہاء کرام کے نقطہ نظر پر روشنی ڈالتے ہوئے تحریر فرمایا ہے:

''قال أكثر أهل العلم: منهم الأوزاعي والثوري ومالك والشافعي وأحمد: إنه لايخرج إلى الغزو إلا بإذن والديه ما لم تقع ضرورة وقوة العدو، فإذا كان كذلك تعين الفرض على الجميع وزال الاختيار ووجب الجهاد على الكل، فلا حاجة إلى الإذن من والد وسيد، وقال ابن حزم في (مراتب الإجماع): إن كان أبواه يضيعان بخروجه ففرضه ساقط عنه إجماعًا وإلا فالجمهور يوقفه على الاستيذان'' (عمدۃ القاری ۷/۴۰)۔

(اکثر اہل علم، مثلاً اوزاعی، ثوری، ملک، شافعی اور احمد نے کہا: جب تک ضرورت اور دشمن کی قوت نہ ہو تو آدمی جہاد کے لئے اپنے والدین کی اجازت کے بغیر نہ نکلے، اور جب ایسا ہو جائے تو تمام لوگوں پر جہاد فرض ہو جائے گا اور اختیار ختم ہو جائے گا، اور ہر ایک پر جہاد لازم ہو جائے گا، پھر تو باپ کی اجازت کی

ضرورت ہوگی اور نہ مالک کی، ابن حزم نے ”مراتب الاجماع“ میں کہا ہے کہ اگر والدین اس کے نکلنے سے ضائع ہوجائیں تو اس سے فرض جہاد بالاجماع ساقط ہوجائے گا، ورنہ تو جمہور کا نقطہ نظر یہ ہے کہ وہ والدین کی اجازت پر موقوف ہوگا)۔

علامہ ابن حجر عسقلانی مذکورہ بالا حدیث کی شرح کے ذیل میں تحریر فرماتے ہیں:

”واستدل به على تحريم السفر بغير إذن، لأن الجهاد منع مع فضيلته فالسفر المباح أولى“ (فتح الباری ۶/۱۴۰)۔

(اس حدیث سے، بغیر اجازت کے سفر کی حرمت پر استدلال کیا گیا ہے، اس وجہ سے کہ جب جہاد سے اس کی فضیلت کے باوصف منع کردیا گیا تو مباح سفر تو بدرجہ اولی ممنوع ہوگا)۔

مفتی محمد شفیع صاحب عثمانی نے معارف القرآن میں اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے:

”اس روایت سے معلوم ہوا کہ جب کوئی چیز فرض عین یا واجب علی العین نہ ہو، کفایہ کے درجہ میں ہو تو اولاد کے لئے وہ کام بغیر ماں باپ کے جائز نہیں، اس میں مکمل علم دین حاصل کرنا اور تبلیغ دین کے لیے سفر کرنے کا حکم بھی شامل ہے کہ بقدر فرض علم دین جس کو حاصل ہو وہ عالم بننے کے لیے سفر کرے، یا لوگوں کو تبلیغ ودعوت کے لئے سفر کرے تو بغیر اجازت والدین جائز نہیں“ (معارف القرآن ۵/۴۶۵)۔

علامہ ابن حزم اندلسی لکھتے ہیں:

”وإن كان الأب والأم محتاجين إلى خدمة الابن أو الابنة، الناكح أو غير الناكح۔ لم يجز للابن ولا للابنة الرحيل، ولا تضييع الأبوين أصلا، وحقهما أوجب من حق الزوج والزوجة۔ فإن لم يكن بالأب والأم ضرورة إلى ذلك فللزوج إرحال امرأته حيث شاء مما لا ضرر عليهما فيه“ (المحلی بالآثار ۱۰/۱۵۸)۔

(اگر ماں باپ، بیٹے یا بیٹی۔ شادی شدہ ہوں یا غیر شادی شدہ۔ کی خدمت کے محتاج ہوں تو بیٹے یا بیٹی کے لئے کہیں جانا اور والدین کو ضائع کرنا جائز نہیں ہے، ان کا حق بیوی اور شوہر کے حق سے کہیں زیادہ واجب ہے، اور اگر ماں باپ کو اس کی ضرورت نہ ہو تو شوہر اپنی بیوی کو جہاں چاہے لے جاسکتا ہے، جس میں والدین کا کوئی ضرر نہ ہو)۔

مذکورہ بالا تفصیلات سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ زیادہ آمدنی کے لئے لڑکوں کو اپنے ماں باپ کو چھوڑ کر ان کی اجازت سے دوسری جگہ جانا جائز ہے، اگر وہ محتاج خدمت ہوں، اور اگر محتاج خدمت نہ ہوں تو اجازت کے بغیر بھی جاسکتے ہیں، بشرطیکہ راستہ پر امن اور جگہ اطمینان بخش ہو۔

(ب) اسی طرح بیوی کا اپنی ساس کے ساتھ رہنے نہ رہنے اور اس کی خدمت کا مسئلہ بھی بہت اہم ہے بیوی اگر اپنے شوہر کے لحاظ میں اس کے والدین کی خدمت کرے تو بہت اچھی بات ہے، کہ اس سے فطری طور پر شوہر کو خوشی ہوگی، اور بیوی کی قدر و منزلت اس کی نگاہ میں بڑھ جائے گی، اور عام حالات میں اس سے گھر کے اندر کا ماحول بھی خوشگوار رہے گا، لیکن یہ سب بیوی کی طرف سے تبرع ہی ہوگا، شوہر اس کے لئے بیوی کو مجبور نہیں کرسکتا۔

فتح الباری میں ہے:

”وحكى ابن بطال أن بعض الشيوخ قال: لا نعلم في شئى من الآثار أن النبي ﷺ قضى على فاطمة بالخدمة الباطنة وإنما جرى الأمر بينهم على ما تعارفوه من حسن العشرة وجميل الأخلاق وأما أن تجبر المرأة على شئى من الخدمة فلا أصل له، بل الإجماع منعقد على أن على الزوج مؤنة الزوجة كلها“ (فتح الباری ۹/۵۰۷)۔

(ابن بطال نے بیان کیا ہے کہ بعض شیوخ نے کہا: ہم کسی بھی حدیث میں نہیں جانتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے حضرت فاطمہؓ پر اندرون خانہ کی خدمت کو لازم کیا ہو، بلکہ سارے امور، حسن معاشرت وعمدگی اخلاق کے متعارف طریقے پر انجام پاتے تھے، پس اگر عورت کو کسی خدمت پر مجبور کیا جائے تو اس کی کوئی اصل نہیں ہے، بلکہ اس بات پر اجماع ہے کہ عورت کی تمام تر ذمہ داری شوہر پر ہے)۔

حضرت مفتی عزیز الرحمن صاحب مفتی اعظم دارالعلوم دیوبند نے بھی ایک سوال کے جواب میں تحریر فرمایا ہے:

سوال: کیا خاوند بیوی کو ساس کی خدمت کے لئے مجبور کرسکتا ہے؟

جواب: مجبور نہیں کرسکتا (فتاوی دار العلوم ۱۶/ ۵۲۷)۔

اسی طرح مولانا محمد یوسف صاحب لدھیانوی نے اس مسئلے کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے:

''بیوی اگر اپنی خوشی سے شوہر کے والدین کی خدمت کرتی ہے تو یہ بہت اچھی بات ہے اور بیوی کے لئے موجب سعادت، لیکن یہ اخلاقی چیز ہے، قانونی نہیں، اگر بیوی شوہر کے والدین سے الگ رہنا چاہے تو شوہر شرعی قانون کی رو سے بیوی کو اپنے والدین کی خدمت پر مجبور نہیں کرسکتا'' (آپ کے مسائل اور ان کا حل ۵/ ۱۲۰)۔

ڈاکٹر حسام الدین بن موسی عفانہ اپنی تالیف لطیف ''فتاوی یسئلونک'' میں اسی طرح کے ایک سوال کے جواب میں رقم طراز ہیں:

''يقول السائل: إن زوجته ترفض خدمة والده فهل يحق له أن يجبرها على ذلك؟

الجواب: لا يجب على الزوجة أن تخدم والد زوجها والشرع لا يلزمها بذلك ولا يجوز للزوج أن يجبر زوجته على خدمة والده أو أى أحد من أقاربه والأمر متروك للزوجة، فإن خدمت والد زوجها فبها ونعمت، وإن لم تفعل فلا حرج عليها، وإن كان الأفضل والأولى فى حق هذه الزوجة أن تخدم والد زوجها من باب بر الزوج وطاعته إن أمرها بذلك وتكون تلك الخدمة تبرعًا منها وتفضلًا وإحسانا، ولكن الأمر ليس واجبا عليها''
(فتاوى يسئلونك/ دكتور حسام الدين بن موسى عفافه ۲/ ۴۱۸)۔

(سائل کہتا ہے: اس کی بیوی اس کے والد کے خدمت سے انکار کرتی ہے تو کیا وہ اس پر مجبور کرسکتا ہے؟

جواب: بیوی پر اپنے شوہر کی خدمت کرنا واجب نہیں ہے، شریعت اس کو عورت پر لازم قرار نہیں دیتی، اور شوہر کے لئے جائز نہیں ہے کہ اپنی بیوی کو اپنے والد کی یا اپنے کسی قریب کی خدمت پر مجبور کرے، اگر بیوی اپنے شوہر کے والد کی خدمت کرتی ہے تو بہت اچھی بات ہے، اور اگر نہیں کرتی ہے تو اس کے لئے کوئی حرج نہیں ہے، اگر چہ بیوی کے حق میں بہتر یہ ہے کہ اگر شوہر اس سے باپ کی خدمت کے لئے کہتا ہے تو وہ شوہر کی اطاعت وفرمانبرداری میں اس کے والد کی خدمت کرے، یہ خدمت، اس کی طرف سے تبرع اور احسان ہوگی، نہ کہ اس پر واجب)۔

مذکورہ تفصیلات سے واضح ہوتا ہے کہ بہو کو ساس سسر کی خدمت کے لئے مجبور نہیں کیا جاسکتا، اگر اپنی مرضی سے خدمت کرتی ہے تو بہتر ہے، اور اس اپنے شوہر کے مزاج ومنشا کا لحاظ کرتے ہوئے کرنا بھی چاہئے لیکن یہ اس کی جانب سے تبرع ہے، اسی طرح بہو کو ساس سسر کے ساتھ رہنے پر بھی مجبور نہیں کیا جاسکتا، اس لئے کہ شوہر کے ذمہ بیوی کے لئے علاحدہ مکان کا نظم کرنا واجب ہے، فتاوی ہندیہ میں ہے:

''تجب السكنى لها عليه فى بيت خال عن أهله وأهلها، إلا أن تختار ذلك، كذا فى العينى شرح الكنز'' (ہندیہ ۱/ ۵۵۶)
(عورت کی رہائش، شوہر پر ایسے گھر میں واجب ہے جو دونوں کے اہل خانہ سے خالی ہو، الا یہ کہ وہ اسے پسند کرتی ہو)۔

ملتقی الابحر میں ہے:

''وعلى الزوج أن يسكنها فى بيت خال عن أهله وأهلها'' (ملتقی الابحر ۱/ ۱۸۷)۔
(شوہر پر واجب ہے کہ عورت کو ایسے گھر میں ٹھہرائے، جو میاں بیوی دونوں کے اہل خانہ سے خالی ہو)۔

حاصل یہ کہ عورت کو ساس سسر کی خدمت کے لئے مجبور نہیں کیا جاسکتا اور نہ ان کے ساتھ رہنے پر، البتہ اگر اپنی مرضی سے خدمت کرے اور ان کے ساتھ رہے تو بہتر ہے، یہ اس کی جانب سے تبرع ہوگا، بلکہ اس سلسلہ میں ہر جگہ کے عرف وعادت کے اعتبار سے حدود شرع میں رہتے ہوئے، خانگی نظام بنایا جائے اور بہتر ہوگا۔

(ج) ماں باپ کی خدمت بیٹوں اور بیٹیوں دونوں پر واجب ہے، اس لئے کہ قرآن کریم میں والدین کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دونوں کے لئے عام ہے، اسی لئے ماں باپ کا نفقہ دونوں پر یکساں طور پر واجب ہے، ہدایہ میں ہے:

''وهى على الذكور والإناث بالسوية فى ظاهر الرواية، وهو الصحيح؛ لأن المعنى يشملها'' (ہدایہ ۲/ ۲۹۳)۔

(نفقہ ظاہر روایت میں مذکر، مؤنث دونوں پر یکساں طور پر واجب ہے، اور یہی صحیح ہے، اس وجہ سے کہ باپ کے استحقاق نفقہ کی بنیاد دونوں کو شامل ہے)۔

"فتاوی ہندیہ" میں ہے:

"وإذا اختلطت الذكور والإناث فنفقة الأبوين عليهما على السوية فى ظاهر الرواية، وبه أخذ الفقيه أبو الليث، وبه يفتي كذا فى الوجيز للكردي" (فتاوی ہندیہ ۱/ ۵۶۸)۔

(اگر اولاد مذکر و مؤنث دونوں ہوں تو والدین کا نفقہ، ظاہر روایت کے مطابق دونوں پر یکساں ہوگا، فقیہ ابو اللیث نے اسی کو اختیار کیا ہے اور اسی پر فتوی ہے، کردری کی وجیز میں اسی طرح مذکور ہے)۔

الاختیار لتعلیل المختار میں ہے: "وهو على الذكور والإناث على السواء فى رواية، وهو المختار لاستوائهما فى العلة والخطاب" (الاختيار لتعليل المختار ۴/ ۱۱)۔

(نفقہ ایک روایت میں مذکر و مؤنث دونوں پر یکساں ہے، اور یہی مختار ہے اس وجہ سے کہ دونوں علت و خطاب میں برابر ہیں)۔

مذکورہ تفصیل سے معلوم ہوا کہ ماں باپ کی خدمت صرف بیٹے ہی پر واجب نہیں ہے، بلکہ بیٹیوں پر بھی واجب ہے، اور بیٹی کو چاہئے کہ موقع بہ موقع اپنے شوہر سے اجازت لے کر اپنے والد کی خدمت کرے، لیکن اگر شوہر اس کی اجازت نہ دے تو وہ ہفتہ میں ایک بار اپنے والدین کو دیکھنے کے لئے جاسکتی ہے، اس لئے کہ شوہر بیوی کو ہفتہ میں ایک بار جانے سے نہیں روک سکتا، علامہ ابن نجیم نے البحر الرائق میں تحریر فرمایا ہے:

"قالوا الصحيح أنه لايمنعها من الخروج إلى الوالدين ولايمنعها من الدخول عليها فى كل جمعة" (البحر الرائق ۴/ ۲۱۲)

(علماء نے کہا ہے کہ شوہر، اپنی بیوی کو والدین کے پاس ہفتے میں ایک بار جانے سے اور والدین کو اس کے پاس آنے سے نہیں روک سکتا)۔

ملتقی الابحر میں ہے:

"والصحيح أنه لايمنعها من الخروج إلى الوالدين ولا من دخولهما عليها فى الجمعة مرة" (ملتقى الابحر ۱/ ۱۸۷)۔

(صحیح یہ ہے کہ شوہر، عورت کو ہفتے میں ایک بار والدین کے پاس جانے اور ان کو اس کے یہاں آنے سے نہیں روک سکتا)۔

علامہ عینی نے اس کو مفتی بہ قرار دیا ہے:

(وقيل: لا يمنعها من الخروج إلى الوالدين) ش: لاحتمال أنهما لايأتيان إليها، فإذا منعها زوجها عن الخروج إليها، توهم فيها العقوق الذى هو من الكبائر، م: (ولا يمنعها من الدخول عليها) ش: أى ولا يمنع الزوج والديها من الدخول عليها، م: (فى كل جمعة) ش: وعليه الفتوى (البنايه شرح الهداية: ۵/ ۶۸۲)۔

(کہا گیا ہے کہ شوہر، بیوی کو والدین کے پاس جانے سے نہیں روک سکتا) اس احتمال پر کہ والدین اس کے پاس نہیں آسکیں گے، اب اگر شوہر، بیوی کو ان کے پاس جانے سے منع کرتا ہے تو اس میں والدین کی نافرمانی کا وہم ہوگا جو گناہ کبیرہ ہے، (اور نہ والدین کو اس کے پاس ہر ہفتہ آنے سے منع کرسکتا ہے) اور اسی پر فتوی ہے)۔

"اور اگر باپ، محتاج خدمت ہو، مثلاً اپاہج ہو، اور اس کی خدمت کرنے والا کوئی نہ ہو تو اس کی خدمت کے لئے روزانہ جاسکتی ہے، یہی حکم ماں کے محتاج خدمت ہونے کا ہے" (آپ کے مسائل اور ان کا حل ۵/ ۱۲۰)۔

فتح القدیر میں ہے:

"لو كان أبوها زمنا مثلاً وهو محتاج إلى خدمتها والزوج يمنعها من تعاهده، فعليها أن تعصيه مسلما كان الأب أو كافرًا" (فتح القدير ۴/ ۲۰۸)۔

(اگر عورت کا باپ مثلاً اپاہج ہو، اور اسے بیٹی کی خدمت کی ضرورت ہو، اور شوہر اس کی دیکھ بھال کرنے سے بیوی کو منع کرتا ہو تو اعورت اس کی بات نہ مانے باپ، مسلم ہو یا کافر)۔

فتاوی قاضی خاں میں ہے:

''امرأة لها أب زمن ليس له من يقوم عليه وزوجها يمنعها عن الخروج إليه وتعاهده كان لها أن تعصى زوجها وتطيع الوالد مومنا كان الأب أو كافرًا؛ لأن القيام بتعاهد الوالد فرض عليها، فيقدم على حق الزوج'' (فتاوی قاضی خاں علی ہامش الہندیہ ۱/ ۴۴۲)۔

(ایک عورت کا باپ اگر اپاہج ہو اور کوئی اس کی دیکھ ریکھ کرنے والا نہ ہو، اور شوہر اس کے پاس جانے اور اس کی دیکھ بھال کرنے اس کو منع کرتا ہو تو اسے چاہئے کہ اپنے شوہر کی بات نہ مانے اور والد کی اطاعت کرے، باپ مومن ہوں یا کافر، اس لئے کہ والد کی دیکھ بھال اس پر فرض ہے، لہذا اسے شوہر کے حق پر مقدم رکھا جائے گا)۔

(۵) بوڑھاپے میں نکاح کا مسئلہ:

نکاح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور انسانی زندگی کی اہم ضرورت ہے، شریعت نے اس کی اہمیت پر کافی زور دیا ہے، اور اس کے فوائد ومصالح پر مختلف انداز سے روشنی ڈالی ہے، اس میں عمر کی کوئی قید نہیں ہے، بلکہ زندگی کے ہر مرحلے میں حسب ضرورت ومصلحت اس کی اجازت ہے، بلکہ بوڑھاپے کی عمر میں ایک شریک حیات کی ضرورت اور بڑھ جاتی ہے کہ انسان کے لئے اس زمانے کی تنہائی، بے کاری اور کسمپرسی کے احساس کو کم کرنے یا دور کرنے کا اس سے بہتر کوئی اور ذریعہ نہیں ہوسکتا، اسی لئے صحابہ کرام زندگی کے آخری مرحلے میں بھی نکاح کا اہتمام کرتے تھے، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا قول ہے:

''لو لم يبق من أجلي إلا عشرة أيام، واعلم أني أموت في آخرها يومًا، ولي طول النكاح فيهن لتزوجت مخافة الفتنة'' (المغنی لابن قدامہ ۹/ ۳۴۱)۔

(اگر میری زندگی کے صرف دس دن باقی ہوں اور مجھے معلوم ہو کہ اس کے آخری دن میں میرا انتقال ہوجائے گا اور عورتوں سے نکاح کی طاقت ہو تو فتنے کے خوف سے میں ضرور شادی کروں گا)۔

حضرت شداد بن اوسؓ نے اپنے گھر والوں سے کہا:

''زوجوني فإن النبي ﷺ أوصاني أن لا ألقى الله أعزب'' (احکام القرآن للجصاص ۲/ ۳۲۰)۔

(تم لوگ میری شادی کردو اس وجہ سے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے وصیت کی ہے کہ میں اللہ سے غیر شادی شدہ نہ ملاقات کروں)۔

''قال احمد في رواية المروزي: ليس العزبة من الإسلام في شئي، وقال: من دعاك إلى غير التزويج فقد دعاك إلى غير الإسلام، ولو تزوج بشر كان قد تم أمره'' (المغنی ۹/ ۳۴۱)۔

(امام احمد نے مروزی کی روایت میں کہا: اسلام میں تجرد کی زندگی کی کوئی حیثیت نہیں ہے، مزید کہا: جس نے تمہیں مجرد رہنے کی دعوت دی، تو اس نے اسلام کے ماسوا کی دعوت دی، اور اگر کسی نے شادی کرلی تو اس کا کام مکمل ہوگیا)۔

اس صورت حال میں اگر کوئی شخص اپنی بیوی کے انتقال کے بعد کسی دوسری عورت سے شادی کرنا چاہے تو درست ہے، اور اگر بیٹا بیٹی اس سلسلہ میں رکاوٹ بنتے ہیں تو درست نہیں ہے، جیسا کہ مندرجہ ذیل آیت کریمہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے:

"وإذا طلقتم النساء فبلغن أجلهن فلا تعضلوهن أن ينكحن أزواجهن إذا تراضوا بينهم بالمعروف" (البقرۃ: ۲۳۲)۔

(اور جب تم میں ایسے لوگ پائے جاویں کہ وہ اپنی بیبیوں کو طلاق دیدیں پھر وہ عورتیں اپنی میعاد بھی پوری کرچکیں تو تم ان کو اس امر سے مت روکو کہ اپنے شوہروں سے نکاح کرلیں جبکہ باہم سب رضامند ہوجائیں قاعدے کے موافق)۔

حضرت تھانوی نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا:

''بعضے جگہ تو خود شوہر ہی طلاق دینے کے بعد جب وہ کہیں دوسری جگہ نکاح کرنا چاہتی تو اپنی ذلت سمجھ کر نکاح نہ کرنے دیتا اور بعضے جگہ عورت کے اور عزیز قریب اپنی کسی دنیوی غرض سے اس کو نکاح نہ کرنے دیتے اور ایک جگہ ایسا ہوا کہ وہ عورت اور اس کا شوہر پھر نکاح کرنے پر رضامند ہوگئے تھے، مگر اس

عورت کے بھائی نے غصہ میں آکر روکا تھا اس آیت میں سب صورتیں داخل ہیں اور ہر صورت میں روکنے کو منع فرمایا ہے" (بیان القرآن ۱/ ۱۳۶)۔

علامہ زمخشری اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

"والوجه أن يكون خطاباً للناس، أى لايوجد فيما بينكم عضل، لأنه إذا وجد بينهم وهم راضون كانوا فى حكم العاضلين" (تفسیر کشاف ۱/ ۲۷۸)۔

(مقصد یہ ہے کہ یہ خطاب تمام لوگوں سے ہے، یعنی تمہارے درمیان نکاح سے رکاوٹ نہیں ہونا چاہئے، اس لئے کہ اگر لوگوں کی رضامندی کے باوجود انہیں نہیں سے روکا گیا تو یہ لوگ نکاح سے روکنے والوں کے حکم میں ہوجائیں گے)۔

بلکہ اگر باپ کو بیوی کی ضرورت اور بیٹا خوشحال ہو تو اس پر لازم ہے کہ وہ باپ کی شادی کرائے، فتاوی ہندیہ میں ہے:

"إن احتاج الأب إلى زوجة والابن موسر وجب عليه أن يزوجه" (فتاوى ہنديہ ۱/ ۵۶۵)۔

(اگر باپ کی بیوی کی حاجت ہے اور بیٹا خوشحال ہے تو اس پر واجب ہے کہ اس کی شادی کرادے)۔

اور اگر والد میں اپنی بیوی کی کفالت کی استطاعت نہ ہو تو جمہور فقہاء کی رائے یہ ہے کہ باپ کا نفقہ بیٹے پر ہوگا۔

ڈاکٹر وہبہ زحیلی الفقہ الاسلامی وادلتہ میں لکھتے ہیں:

"وعلى الولد فى رأى الجمهور نفقة زوجة الأب وإعفافه بالتزويج بزوجة واحدة، وكذا عند المالكية والحنابلة بأكثر من زوجة إن لم يحصل الإعفاف بواحدة؛ لأنه معنى يحتاج إليه، ويلحقه الضرر بفقده، فوجب كالنفقة" (الفقه الاسلامى وادلته۱۰/ ۱۴۵)۔

(جمہور کی رائے میں بیٹے پر باپ کی بیوی کا نفقہ اور باپ کو ایک عورت سے شادی کرکے پاک دامن بنانا واجب ہے، اسی طرح مالکیہ اور حنابلہ کے نزدیک اگر ایک سے پاکدامنی نہ ہو پا رہی ہو تو ایک سے زیادہ سے شادی کرانا واجب ہے، اس وجہ سے کہ یہ ضروری چیز ہے، اور اس کے نہ ہونے سے ضرر ہوتا ہے، لہذا یہ نفقہ کی طرح واجب ہوگا)۔

فتح القدیر میں ہے:

"وفى الفتاوى: يجبر الابن على نفقة زوجة أبيه ولا يجبر الأب على نفقة زوجة ابنه" (فتح القدير۴/ ۴۲۳)۔

(فتاوی میں ہے کہ بیٹے کو اس کے باپ کی بیوی کے نفقہ پر مجبور کیا جائے گا، اور باپ کو اس کے بیٹے کی بیوی کے نفقے پر مجبور نہیں کیا جائے گا)۔

تبیین الحقائق میں ہے:

"وفيه أن الابن يجبر على نفقة امرأة أبيه ذكره هشام عن أبى يوسف" (تبيين الحقائق ۳/ ۶۴)۔

(محیط میں ہے کہ بیٹے کو اپنے باپ کی عورت کے نفقے پر مجبور کیا جائے گا، ہشام نے امام ابو یوسف سے روایت کی ہے)۔

فقہاء کی تصریحات کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر والد میں اپنی بیوی کی کفالت کی استطاعت نہ ہو تو بیٹا اس کی کفالت کا نظم کرے۔

(۶) والد کی حیات میں مطالبہ جائیداد کا مسئلہ:

بعض دفعہ لڑکے والد کی زندگی میں ہی جائیداد کا مطالبہ کرتے ہیں اور اسے اپنا حق سمجھتے ہیں، یہ صحیح نہیں ہے، اس لئے کہ یہ جائیداد والد کی مملوک ہے، وہ اپنی ملکیت میں جس طرح تصرف کرنا چاہے، اسے مکمل اختیار ہے۔

مجلۃ الاحکام العدلیہ میں ہے: "كل يتصرف فى ملكه كيف ما شاء" (مجلة الاحكام العدليه ۱/ ۲۳۰)۔

(ہر شخص اپنی ملکیت میں جیسے چاہے تصرف کرسکتا ہے)۔

یہی وجہ ہے کہ والد اپنی حیات میں اپنی اولاد کو اپنی جائیداد سے جو کچھ دیتا ہے، وہ ہبہ اور عطیہ ہوتا ہے، اگر وہ برضا و رغبت دیتا ہے تو درست ہے، اور اگر جبر

واکراہ سے دیتا ہے تو وہ ہبہ صحیح نہیں ہوگا مجلۃ الاحکام العدلیہ میں بصراحت موجود ہے:

(المادۃ ۸۶۰) ''یلزم فی الھبۃ رضاء الواھب فلاتصح الھبۃ التی وقعت بالجبر والإکراہ'' (مجلۃ الأحکام العدلیہ ۱/ ۱۷۵)

(ہبہ میں ہبہ کرنے والے کی رضا لازم ہے، جو ہبہ جبر واکراہ سے ہو، وہ صحیح نہیں ہے)۔

مذکورہ جزئیات سے واضح ہوتا ہے کہ بیٹا اپنے والد سے اس کی زندگی میں اپنا حق سمجھ کر اس کی جائیداد کا مطالبہ نہیں کرسکتا۔

(۷) بوڑھوں کے ہاسٹل کا مسئلہ:

آج کے مصروف دور میں لوگوں کے لئے گھر کے ضعیف العمر، سن رسیدہ اور بڑے بوڑھوں کی خدمت، ان کا علاج ومعالجہ اور ان کی روزمرہ کی بنیادی ضروریات کا خیال رکھنا بہت بڑا مسئلہ بن گیا ہے، اور آدمی اپنی گوناگوں مصروفیات کے سبب ان کی جانب جتنی توجہ دینی چاہئے نہیں دے پاتا، مغربی ممالک نے اس مسئلے کے حل کے لئے ہاسٹل بنایا ہے، تاکہ بوڑھے لوگ ہم عمر لوگوں کے بیچ اپنی زندگی کے بقیہ لمحات بآسانی گذار سکیں، ایسے ہاسٹل کے قیام میں بظاہر کوئی شرعی قباحت نہیں ہے، بلکہ اگر اس میں بوڑھوں کے ذہن ومزاج، انکی نفسیات اور جملہ ضروریات زندگی کا لحاظ رکھا گیا ہو تو یہ بہتر اقدام ہے، البتہ اگر کسی نے اپنے حالات کے تحت اپنے بوڑھے باپ کو اس کی مرضی سے اس طرح کے ہاسٹل میں داخل کردیا ہے تو اس کی ذمہ داری بنتی ہے کہ موقع بموقع وہاں پہنچ کر ان کی خبر گیری کرتا رہے، تاکہ انہیں یہ احساس نہ ستائے کہ اس وسیع وعریض دنیا میں اب کوئی ان کا پرساں حال نہیں رہا۔

لیکن اگر کوئی بوڑھا شخص وہاں رہنے پر آمادہ نہیں ہے، بلکہ اپنے اہل خانہ کے ساتھ ہی زندگی بسر کرنا چاہتا ہے تو اس کے متعلقین اسے ہاسٹل میں رہنے پر مجبور نہیں کرسکتے، اس لئے کہ اللہ تعالی نے والدین کے ساتھ حسن سلوک کرنے کی بے حد تاکید فرمائی ہے، بالخصوص جبکہ وہ بوڑھاپے کی عمر میں پہنچ جائیں، ارشاد خداوندی ہے:

"وقضی ربك ألا تعبدوا إلا إیاہ وبالوالدین إحسانا إما یبلغن عندك الکبر أحدھما أو کلاھما فلا تقل لھما أف ولا تنھرھما وقل لھما قولا کریمًا واخفض لھما جناح الذل من الرحمۃ وقل رب ارحمھما کما ربیانی صغیرا" (اسراء: ۲۳-۲۴)۔

(تیرے رب نے حکم کردیا ہے کہ بجز اس (معبود برحق) کے کسی کی عبادت مت کر، اور تم ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کیا کرو، تیرے پاس ان میں سے ایک یا دونوں بڑھاپے کو پہنچ جاویں، سوان کو کبھی ہوں مت کہنا اور نہ ان کو جھڑکنا، اور ان سے خوب ادب سے بات کرنا اور جھکا دے ان کے آگے کندھے عاجزی کرکر نیازمندی سے اور کہہ اے رب! ان پر رحم کر جیسا پالا انہوں نے مجھ کو چھوٹا سا)۔

والدین کے ساتھ اس تاکیدی حکم سے واضح ہوتا ہے کہ ان کی ہر ممکن خدمت کی جائے، ان کی منشا کا بھرپور لحاظ کیا جائے، جس طرح وہ زندگی بسر کرنا چاہیں، ان کی خواہش کا احترام کیا جائے، اس سلسلہ میں پیش آمدہ دشواریوں کو خندہ پیشانی سے برداشت کیا جائے، بلکہ خدمت کے اس موقع کو غنیمت جانا جائے، اور اسے اپنے لئے سعادت وبرکت کا ذریعہ سمجھا جائے، علامہ جصاص رازی، والدین کے ساتھ حسن سلوک پر گفتگو کرتے ہوئے ''واخفض لھما جناح الذل'' کی توضیح میں ذکر فرمایا ہے کہ ہشام ابن عروہ نے اپنے والد کے واسطے سے اس آیت کا مطلب یہی بتایا ہے کہ والدین کی خواہش پوری کرنی چاہئے:

''وقال ھشام ابن عروۃ عن أبیہ: ''واخفض لھما جناح الذل من الرحمۃ'' قال لاتمنعھا شیئًا یریدانہ'' (احکام القرآن للجصاص ۵/ ۲۰)۔

(ہشام بن عروہ نے اپنے والد سے روایت کرتے ہوئے کہا: "واخفض لھما جناح الذل" کا مطلب یہ ہے کہ تم انہیں جس چیز کی خواہش ہے اس سے مت روکو)۔

اسی طرح ہشام نے حسن بصری سے روایت کرتے ہوئے کہا کہ والدین کے ساتھ حسن سلوک یہ ہے کہ ان کے اخراجات برداشت کئے جائیں، اور ان کی جائز باتوں کو مانا جائے۔

''أنہ سئل ما بر الوالدین قال أن تبذل لھما ما ملکت وأطعمھما فیما أمراك ما لم یکن معصیۃ'' (احکام القرآن للجصاص ۵/ ۲۰)۔

(آپ سے دریافت کیا گیا کہ والدین کے ساتھ حسن سلوک کیا ہے، آپ نے کہا: جو کچھ آپ کے پاس ہے ان پر خرچ کریں، اور ان کے حکم کی اطاعت کریں اگر اس میں معصیت نہ ہو)۔

اسی طرح اللہ تعالی نے ان کے ساتھ دنیا میں بہتر سے بہتر برتاؤ کرنے کا حکم دیا ہے، ارشاد فرمایا:

"وإن جاهداك على أن تشرك بي ما ليس لك به علم فلا تطعهما وصاحبهما في الدنيا معروفا واتبع سبيل من أناب إلي ثم إلي مرجعكم فأنبئكم بما كنتم تعملون" (لقمان: ۱۵)۔

علامہ آلوسی نے اس آیت کریمہ کی تفسیر میں اس بات کی وضاحت فرمائی ہے کہ اولاد کے فرائض میں سے ہے کہ والدین کی جملہ ضروریات کا لحاظ رکھے، ان کی بھرپور خدمت کرے، ان کے تمام حقوق کی ادائیگی کرے، اور ان کی خدمت کو اپنے لئے سعادت سمجھے نیز اس بات کا خاص خیال رکھے کہ انہیں کسی طرح کی تکلیف نہ پہنچنے پائے، تحریر فرماتے ہیں:

''وصاحبهما في الدنيا معروفا أي صحابا معروفا يرتضيه الشرع ويقتضيه الكرم والمروءة كإطعامهما وإكسائهما وعدم جفائهما وانتهارهما وعيادتهما إذا مرضا ومواراتهما إذا ماتا، وذكر في الدنيا لتهوين أمر الصحبة والإشارة إلى أنها في أيام قلائل وشيكة الانقضاء فلا يضر تحمل مشقتها لقلة أيامها وسرعة انصرامها'' (روح المعانی ۱۱/۸۶)۔

("وصاحبهما في الدنيا معروفا"، کا مطلب یہ ہے کہ والدین کے ساتھ دنیا میں ایسے ڈھنگ سے رہو کہ شریعت اسے پسند کرے، اور بخشش و مروت اس کا تقاضا کرے، مثلاً انہیں کھانا کھلاؤ، کپڑے پہناؤ، ان کے ساتھ بدسلوکی نہ کرو، نہ انہیں ڈانٹو، اگر مریض ہوں تو ان کی عیادت کرو، اور انتقال کر جائیں تو انہیں دفن کرو، پھر یہ سب دنیا میں کرنے کو کہا گیا، تاکہ ان کے ساتھ رہنے کا معاملے کو ہلکا سمجھا جائے، نیز یہ بتانے کے لئے کہ اس تعلق سے یہ مختصر ایام ہی جو جلد ہی گزر جائیں گے، لہذا اس کی مشقت کا تحمل، قلت ایام اور جلد گزر جانے کے سبب مضر نہیں ہوگا)۔

ظاہر ہے کہ ان کی خدمت کا کامل حق اسی وقت ادا ہو پائے گا، جبکہ وہ اہل خانہ کے درمیان زندگی بسر کریں، اگر انہیں بوڑھوں کے کسی ہاسٹل میں ڈال دیا جائے گا، تو انکی خدمت کا موقع ہی فراہم نہیں ہو پائے گا، کہ بیٹا باپ کو بوڑھاپے کی عمر میں پانے کے باوجود جنت کا حقدار بن سکے، اس لئے اپنے بزرگوں کو ایسے ہاسٹلوں میں قیام پر مجبور کرنا درست نہیں ہوگا، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''رغم أنفه، رغم أنفه، رغم أنفه''، قيل: من يا رسول الله؟ قال: ''من أدرك والديه عند الكبر، أحدهما أو كلاهما ثم لم يدخل الجنة'' (رواه مسلم)۔

(وہ شخص ذلیل ہو، وہ شخص ذلیل ہو، وہ شخص ذلیل ہو، دریافت کیا گیا کون یا رسول اللہ! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے اپنے والدین کو، ایک کو یا دونوں کو بوڑھاپے میں پایا اور جنت میں داخل نہ ہو سکا)۔

''وقال النووي: معناه أن برهما عند كبرهما وضعفهما بالخدمة والنفقة وغير ذلك سبب لدخول الجنة، فمن قصر في ذلك فاته دخول الجنة'' (مرقاۃ ۷/ ۳۰۸۰)۔

(امام نووی نے فرمایا: اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ والدین کے ضعف پیری اور کبر سنی کے وقت، خدمت و نفقہ وغیرہ کے ذریعہ حسن سلوک کرنا، دخول جنت کا سبب ہے، لہذا جس نے اس سلسلہ میں کوتاہی برتی، وہ جنت حاصل کرنے میں ناکام رہا)۔

(۸) زکوۃ کی رقم سے بوڑھوں کی اجتماعی کفالت کا مسئلہ:

اگر بوڑھا آدمی، غریب، محتاج اور بے سہارا ہو، اور اس کی اولاد یا کوئی قریبی رشتہ دار موجود نہ ہو، جو اس کی دیکھ ریکھ کر سکے تو اس کی اجتماعی کفالت درست ہے، بلکہ اسلامی، اخلاقی، اور معاشرتی فریضہ ہے کہ اس کی نگہداشت کا مناسب بندوبست کیا جائے، یہ نیک کام میں تعاون ہے، جس کا اللہ تعالی نے حکم دیا ہے۔

"وتعاونوا على البر والتقوى" (المائدۃ: ۲)۔

علامہ قرطبی نے اس کی تفسیر کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے:

"وهو أمر لجميع الخلق بالتعاون على البر والتقوى، أي ليعن بعضكم بعضا" (تفسير قرطبی ۴۶/۶).

(یہ تمام مخلوق کو حکم ہے کہ نیک اور اچھے کاموں میں تعاون کریں، یعنی ایک دوسرے کی مدد کریں)۔

اسی لئے اسلامی نظام حکومت میں اس طرح کے بے سہارا افراد کا نفقہ بیت المال پر ہوتا ہے، تا کہ صحیح طور پر ان کی کفالت ہو سکے، الموسوعہ میں ہے:

"لا خلاف بين الفقهاء في أن نفقة العاجز الذي لا عائل له ولا قدرة له على الكسب ولا يملك مالا، تجب في بيت المال، لأنه معد للصرف على ذوي الحاجات والمعدومين ومن هم في مثل حاله ممن لا قدرة لهم على كسب كفايتهم ولا عائل لهم تجب عليه نفقتهم" (الموسوعة الفقهية ۱۰۰/۴۱)۔

(فقہاء کے درمیان اس سلسلہ میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ ایسا عاجز جس کی کوئی اولاد نہیں ہے، نہ اسے کمانے پر قدرت ہے، اور نہ اس کے پاس مال ہی ہے، تو اس کا نفقہ بیت المال پر واجب ہے، اس لئے کہ وہ اسی لئے بنایا گیا ہے کہ اس سے ضرورت مندوں، محتاجوں اور اس طرح کے لوگوں پر خرچ کیا جائے جنہیں بقدر گذارہ کمانے پر قدرت نہ ہو اور نہ ان کی اولاد ہی ہو جس پر ان کا نفقہ واجب ہوتا ہے)۔

اور جہاں اسلامی نظام حکومت نہیں ہے وہاں کے حساس و ذمہ دار افراد کا فرض بنتا ہے کہ ایسے لوگوں کی کفالت کا نظام بنائے، باقی رہا ایسے بے سہارا افراد کے لئے زکوۃ کی رقم کے استعمال کا مسئلہ تو اس کے لئے لازم ہے کہ اس میں زکوۃ کے تعلق سے جملہ اصول وضوابط اور اس کی ادائیگی کی تمام شرطوں کا لحاظ کیا گیا ہو، وہ مستحق زکوۃ ہوں اور انہیں پورے طور پر زکوۃ کی رقم کا مالک بنا دیا گیا ہو، تو ان پر زکوۃ کی رقم کا استعمال کرنا جائز ہوگا، اس لئے کہ ادائیگی زکوۃ کے لئے تملیک شرط ہے، درمختار میں ہے:

"ويشترط أن يكون الصرف (تمليكا) لا إباحة" (الدر المختار مع رد المحتار ۳۴۳/۲)۔

(اس سلسلہ میں شرط یہ کہ ادائیگی زکوۃ بطور تملیک ہو نہ کہ بطور اباحت)۔

علامہ شامی اس کی وضاحت کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

"(قوله: تمليكا) فلا يكفي فيها الإطعام إلا بطريق التمليك ولو أطعمه عنده ناويا الزكوة لا تكفي" (رد المحتار ۳۴۳/۲)

(زکوۃ میں صرف بطور تملیک کھلانا کافی ہوتا ہے، اور اگر کسی نے اپنے پاس زکوۃ کی نیت سے کسی کو کھلایا تو کافی نہیں ہوگا)۔

علامہ کاسانی نے واضح کیا ہے کہ زکوۃ فقیر کا حق ہے اور اسی کو اس سے فائدہ اٹھانے کا حق ہے، اس لئے اس کو زکوۃ کی رقم کا مالک بنانا ہی حقیقت زکوۃ ہے، بدائع الصنائع میں ہے تحریر فرماتے ہیں:

"أما الحقيقة، فإن الزكوة تمليك المال من الفقير، والمنتفع بها هو الفقير فكانت حق الفقير" (بدائع الصنائع ۵/۲)

(زکوۃ کی حقیقت یہ ہے کہ فقیر کو مال کا مالک بنا دیا جائے، چوں کہ اس سے فقیر ہی نفع اٹھاتا ہے، لہذا یہ فقیر ہی کا حق ہوگا)۔

ڈاکٹر وہبہ زحیلی الفقہ الاسلامی وادلتہ میں زکوۃ کی تملیک اور اس کے مصارف کے سلسلہ میں جمہور فقہاء کا موقف واضح کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

"اتفق جماهير فقهاء المذاهب على أنه لا يجوز صرف الزكوة إلى غير من ذكر الله تعالى من بناء المساجد والجسور والقناطر والسقايات وكري الأنهار وإصلاح الطرقات وتكفين الموتى وقضاء الدين والتوسعة على الأضياف وبناء الأسوار وإعداد وسائل الجهاد كصناعة السفن الحربية وشراء السلاح ونحو ذلك من القرب التي لم يذكرها الله تعالى مما لا تمليك فيه" (الفقه الاسلامي وادلته ۸۷۵/۲)۔

(جمہور فقہاء مذاہب کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اللہ تعالی کے ذکر کردہ مصارف کے علاوہ کو زکوۃ دینا جائز نہیں ہے، مثلاً مساجد، پل اور حوض کی تعمیر، نہروں کی کھدائی، راستوں کی درستگی، مردوں کی تکفین، قرض کی ادائیگی، مہمانوں کی ضیافت، فصیل کی تعمیر، وسائل جہاد کی تیاری جیسے جنگی کشتیوں کا بنانا اور اسلحہ کا خریدنا

وغیرہ جیسے نیک اعمال، جن کا اللہ تعالیٰ نے ذکر نہیں فرمایا ہے، جن میں تملیک نہیں ہے)۔

حاصل یہ کہ ایسے بوڑھے شخص کی اجتماعی کفالت، جو بے سہارا ہو اور اس کی کوئی اولاد یا قریبی رشتہ دار نہ ہوں تو درست ہی نہیں، بلکہ نہایت مستحسن امر ہے، البتہ اس پر زکوۃ کی رقم کا استعمال، اس صورت میں درست ہوگا، جبکہ وہ زکوۃ کا مصرف ہو اور رقم کے استعمال میں ادائیگی زکوۃ کی شرطوں کا پورا لحاظ کیا گیا ہو۔

مفتی محمد شفیع صاحب عثمانی مسئلہ تملیک پر بہت عمدہ گفتگو کی ہے، جس سے زیر بحث مسئلہ پورے طور پر واضح ہو جاتا ہے، کہ اجتماعی کفالت میں بھی ادائیگی زکوۃ کے لئے تملیک شرط ہے، تحریر فرماتے ہیں:

''جمہور فقہاء اس پر متفق ہیں کہ زکوۃ کے معینہ آٹھ مصارف میں بھی زکوۃ کی ادائیگی کے لئے یہ شرط ہے کہ ان مصارف میں سے کسی مستحق کو مال زکوۃ پر مالکانہ قبضہ دیدیا جائے، بغیر مالکانہ قبضہ دیئے اگر کوئی مال انہی لوگوں کے فائدے کے لئے خرچ کر دیا تو زکوۃ ادا نہیں ہوگی، اسی وجہ سے ائمہ اربعہ اور جمہور فقہاء امت اس پر متفق ہیں کہ رقم زکوۃ کو مساجد یا مدارس یا شفاخانے، یا یتیم خانے کی تعمیر میں یا ان کی دوسری ضروریات میں صرف کرنا جائز نہیں، اگرچہ ان تمام چیزوں سے فائدہ ان فقراء اور دوسرے حضرات کو پہنچتا ہے جو مصرف زکوۃ ہیں، مگر ان کا مالکانہ قبضہ ان چیزوں پر نہ ہونے کے سبب زکوۃ ادا نہیں ہوتی'' (معارف القرآن ۲۰۹/۴)۔

(۹) مقررہ حد عمر کو پہنچے بغیر حکومت کی رعایتوں سے فائدہ اٹھانے کا مسئلہ:

اگر کسی حکومت نے اپنے ملک کے عمر دراز لوگوں کے لئے کچھ خصوصی رعایتیں رکھی ہیں مثلاً ٹرین وغیرہ کے کرایہ میں تخفیف، ٹیکس میں رعایت، کوئی امدادی وظیفہ وغیرہ، اور ان رعایتوں کے حصول کے لئے عمر کی ایک حد مقرر کی ہے، تو ان رعایتوں سے فائدہ اٹھانا تو جائز نہ ہوگا، اس لئے کہ یہ جھوٹ ہے، جو حرام ہے، علامہ ابن عابدین شامی نے ''ردالمحتار'' میں اس بات کی وضاحت فرمائی ہے کہ جو کام سچ بول کر ہو سکتا ہے اس میں جھوٹ بولنا حرام ہے، تحریر فرماتے ہیں:

''كل مقصود يمكن التوصل إليه بالصدق والكذب جميعًا فالكذب فيه حرام'' (رد المحتار ۶۱۲/۹)۔

(جس مقصد تک صدق و کذب دونوں کے ذریعہ پہنچا جا سکتا ہے اس میں جھوٹ بولنا حرام ہے)۔

اسی طرح اس میں فریب دہی ہے جس سے شریعت میں منع کیا گیا ہے:

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''من غش فليس منا'' (سنن ترمذی ۲۴۵/۱)۔

(جس نے دھوکہ دیا وہ ہم میں سے نہیں ہے)۔

شریعت میں دھوکہ دینے کی حرمت کا دائرہ محدود نہیں ہے، بلکہ زندگی کے جملہ امور میں دھوکہ دینے سے سختی سے منع کیا گیا ہے، الموسوعۃ الفقہیہ میں ہے:

''اتفق الفقهاء على أن الغش حرام سواء أكان بالقول أم بالفعل، وسواء أكان بكتمان العيب في المعقود عليه أو الثمن أم بالكذب والخديعة، وسواء أكان في المعاملات أم في غيرها من المشورة والنصيحة'' (الموسوعة الفقهية ۲۱۹/۳۱)۔

(فقہاء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ دھوکہ دینا حرام ہے، خواہ قول سے ہو یا فعل سے، سامان کے عیب یا اس کی قیمت کو چھپا کر ہو یا کذب بیانی اور فریب دہی سے، معاملات میں ہو یا مشورہ و نصیحت میں)۔

علامہ نووی نے مسئلہ کذب پر سیر حاصل گفتگو کرتے ہوئے واضح فرمایا ہے کہ کسی کے حق کو نہ دینے اور جو اپنا حق نہیں ہے اس کو لینے کے لئے فریب سے کام لینا حرام ہے، اور اس پر اہل اسلام کا اجماع ہے، جس سے واضح ہوتا ہے کہ اپنی مصلحت کے تحت خلاف واقعہ عمر کا ظاہر کرنا شریعت میں جائز نہیں ہے، تحریر فرماتے ہیں:

''أما المخادعة في منع ما عليه أو عليها أو أخذ ما ليس له أو لها فهو حرام بإجماع المسلمين'' (شرح النووی علی مسلم ۱۵۸/۱۶)۔

(باقی رہا اپنے اوپر واجب کسی کے حق کو روکنے میں یا جو اپنا نہیں ہے اس کے لینے میں دھوکہ دہی کام لینا تو مسلمانوں کا اس بات پر اجماع ہے کہ وہ حرام ہے)۔

نیز اس میں خیانت بھی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''كبرت خيانة أن تحدث أخاك حديثا وهو لك به مصدق وأنت له به كاذب'' (ابوداؤد)۔
(یہ ایک بہت بڑی خیانت ہے کہ تم اپنے بھائی سے ایک جھوٹی بات کہو درآنحالیکہ وہ تم کو سچا سمجھتا ہو)۔

اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خلاف واقعہ بات کہنے سے بھی منع فرمایا ہے، چنانچہ ایک دفعہ ایک عورت نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر پوچھا کہ یا رسول اللہ! میری ایک پڑوسن (سوکن) ہے، کیا اگر میں یہ ظاہر کروں کہ مجھے شوہر نے یہ دیا یہ دیا، جبکہ ایسا نہ ہو صرف اس کو جلانا مدنظر ہو تو کیا یہ گناہ ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''المتشبع بما لم يعط كلابس ثوبي زور'' (سنن ابوداؤد ۴/ ۲۹۹)
(جتنا نہیں دیا گیا اتنے کا دکھاوا کرنے والا جھوٹ کے دو جامے پہننے والے کی طرح ہے)۔

نیز آدمی قانون کی خلاف ورزی کر کے اپنی عزت کو داؤ پر لگاتا ہے کہ اگر وہ قانون کی زد میں آگیا تو اسے تھوڑے سے پیسے کے بچانے میں ذلت ورسوائی کا سامنا کرنا پڑسکتا ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے کو ذلیل کرنے سے منع فرمایا ہے:

''عن حذيفة قال: قال رسول الله ﷺ: لاينبغي للمؤمن أن يذل نفسه، قالوا: وكيف يذل نفسه؟ قال: يتعرض من البلاء لما لايطيق'' (ترمذی ۲/ ۵۱)۔

(حضرت حذیفہؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مومن کے لئے مناسب نہیں ہے کہ اپنے کو ذلیل کرے، صحابہ نے کہا: وہ اپنے کو کیسے ذلیل کرے گا، آپ نے فرمایا: وہ ایسی آزمائش کا خواہاں ہو جو اس کے بس میں نہ ہو)۔

اسلام میں قانون کی خلاف ورزی کرنے کی ممانعت ہے، چنانچہ مفتی تقی عثمانی نے ''تکملۃ فتح الملہم'' میں غیر ملکی نوٹوں کے مبادلہ بالتفاضل پر گفتگو کرتے ہوئے اس بات کی وضاحت کی ہے کہ اگر کوئی کام شرعاً درست ہو لیکن اس کے کرنے میں ملکی قانون کی خلاف ورزی لازم آرہی ہو تو اس سے منع کیا جائے گا، تحریر فرماتے ہیں:

''ولكن يمنع من ذلك لكونه مخالفة لأولي الأمر، إذا كانت الحكومة إسلامية، ولكونه عرضا للنفس لعقوبات قانونية إذا كانت الحكومة غير إسلامية'' (تکملة فتح الملهم ۱/ ۵۹۰)۔
(لیکن اس سے منع کیا جائے گا، اس لئے کہ اگر اسلامی حکومت ہے تو اولوالامر کی مخالفت ہے اور اگر غیر اسلامی ہے تو اپنے کو قانونی سزا کے حوالے کرنا ہے)۔

مذکورہ تفصیلات سے یہ بات پورے طور پر واضح ہوتی ہے کہ عمر دراز لوگوں کے لئے حکومت کی طرف سے عطا کردہ رعایتوں سے فائدہ اٹھانا اسی وقت جائز ہوگا جبکہ وہ شخص حکومتی قانون کی مقررہ حد عمر کو پہنچ چکا ہو۔

بوڑھوں اور معذوروں کے حقوق ۔ شریعت اسلامیہ کی روشنی میں

مولانا راشد حسین ندوی[1]

اسلام میں معاشرتی مسائل کی اہمیت:

اسلام ایک مکمل اور ہمہ گیر دین ہے، اس میں زندگی کے تمام شعبوں کے بارے میں مکمل ہدایات موجود ہیں، چنانچہ اسلام میں کھانے، پینے، رہنے سہنے، ملنے جلنے اور ایک دوسرے سے تعلق رکھنے سے متعلق بھی ٹھیک اسی طرح پوری وضاحت اور صراحت کے ساتھ رہنمائی کی گئی ہے جس طرح توحید شرک اور عقائد وعبادات وغیرہ سے متعلق کی گئی ہے، اور ظاہر بات ہے جس دین نے جانوروں پر رحم کرنے کا حکم دیا، ان کو ناحق ستانے اور بلا وجہ تکلیف دینے سے منع کیا، بھلا وہ معاشرتی اور سماجی مسائل کو کیسے نظر انداز کرسکتا ہے، جبکہ معاشرتی مسائل کو سلجھائے بغیر صالح معاشرہ کی تشکیل ممکن نہیں، اور صالح معاشرہ کا قیام اسلام کے بنیادی مقاصد میں سے ہے، چنانچہ معاشرہ کے ہر فرد کے حقوق اور فرائض کھول کھول کر بیان کئے گئے، اور کسی پہلو کو بھی تشنہ نہیں چھوڑا گیا، اولاد پر والدین کے حقوق وفرائض، والدین پر اولاد کے حقوق وفرائض، چھوٹوں پر بڑوں کے حقوق وفرائض، بڑوں پر چھوٹوں کے حقوق وفرائض، زوجین میں سے ہر ایک پر دوسرے کے حقوق اور فرائض نیز پڑوسی پر پڑوسی کے حقوق وفرائض کی پوری تفصیلات جزئیات سمیت کتاب وسنت اور فقہ اسلامی میں مل جاتی ہے، اس مختصر تحریر میں ہم بوڑھوں اور معذوروں کے چند حقوق کا ذکر کرنا چاہتے ہیں، جن پر شریعت نے بہت تاکید کے ساتھ زور دیا ہے اور ہمارا معاشرہ ان سے غفلت برت رہا ہے۔

سوال (۱) عمر رسیدہ افراد کو کمانے پر مجبور کرنا:

شریعت اسلامیہ میں ماں باپ نیز دوسرے خاندانی بزرگوں اور کمزوروں کے حقوق کو بہت اہمیت سے بیان کیا گیا ہے، قرآن مجید میں ارشاد ہے:

"واعبدوا الله ولا تشركوا به شيئاً وبالوالدين إحساناً وبذى القربى واليتامى والمساكين والجار ذى القربى والجار الجنب والصاحب بالجنب وابن السبيل وما ملكت أيمانكم" (سورہ نساء: ۳۶)

(اور اللہ کی بندگی کرتے رہو، اور اس کے ساتھ کچھ بھی شریک مت کرو، اور والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرتے رہو، اور قرابت داروں، یتیموں، مسکینوں، رشتہ دار پڑوسی اور اجنبی پڑوسی، ساتھ بیٹھنے والے، مسافر اور غلاموں کے ساتھ (بھی حسن سلوک کرو)۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:

"وقضى ربك ألا تعبدوا إلا إياه وبالوالدين إحساناً، إما يبلغن عندك الكبر أحدهما أو كلاهما فلا تقل لهما أف ولا تنهرهما وقل لهما قولاً كريماً، واخفض لهما جناح الذل من الرحمة وقل رب ارحمهما كما ربياني صغيراً" (سورہ بنی اسرائیل: ۲۳، ۲۴)

(اور آپ کے رب کا یہ فیصلہ ہے کہ تم سب صرف اسی کی بندگی کرو، اور والدین کے ساتھ حسن سلوک (کرو) اگر تمہارے پاس دونوں میں سے کوئی ایک یا دونوں بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو ان سے اف مت کرنا، اور نہ ہی ان کو جھڑکنا، اور ان دونوں سے عزت کے ساتھ بات کرنا، اور ان دونوں کے سامنے سراپا رحمت بن کر جھکے رہنا اور دعا کرتے رہنا کہ اے میرے رب ان دونوں پر رحم فرما جیسے انہوں نے بچپن میں ہمیں پالا)۔

ایک اور جگہ ارشاد ہے: "ووصينا الإنسان بوالديه ....الآية" (سورہ لقمان: ۱۴، ۱۵)

(اور ہم نے انسان کو اس کے والدین کے بارے میں حسن سلوک کی تاکید کی (آگے فرمایا) کہ میرا حق پہچانو اور اپنے ماں باپ کا حق پہچانو، لوٹ کر میرے ہی پاس آنا ہے، اور اگر وہ تمہیں اس پر مجبور کریں کہ تم میرے ساتھ شرک کرو جس کا تمہیں کوئی علم نہیں تو ان کی بات مت ماننا اور دنیا میں ان کے ساتھ اچھا

---

[1] مدرسہ ضیاء العلوم میدانپور تکیہ کلاں، رائے بریلی یوپی۔

برتاؤ کئے جانا)۔

انہیں آیات اور دوسرے دلائل سے استدلال کر کے فقہاء نے تصریح کی ہے کہ والدین اور اجداد وغیرہ کا نفقہ اس کے صاحب حیثیت بیٹوں اور پوتوں وغیرہ پر واجب ہے، علامہ مرغینانی فرماتے ہیں:

''وعلى الرجل أن ينفق على أبويه وأجداده وجداته إذا كانوا فقراء وإن خالفوه في دينه. أما الأبوان فلقوله تعالى: وصاحبهما في الدنيا معروفا. نزلت الآية في الأبوين الكافرين. وليس من المعروف أن يعيش في نعم الله تعالى، ويتركهما يموتان جوعا. وأما الأجداد والجدات فلأنهما من الآباء والأمهات (أي) وشرط الفقر لأنه لو كان ذا مال فإيجاب نفقته في ماله أولى من إيجابها في مال غيره. ولايمنع ذلك باختلاف الدين لما تلونا (ہدایہ مع الفتح ۴/ ۲۲۰، ۲۲۱ وکذا في البدائع ۴/ ۴۲۹، والشامی ۲/ ۴۳۶، والہندیہ ۱/ ۵۶۴)۔

(آدمی پر لازم ہے کہ اپنے والدین اجداد اور جدات پر خرچ کرے بشرطیکہ وہ محتاج ہوں اگر چہ دین میں اس کے مخالف ہوں، رہے والدین تو اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: دنیا میں ان دونوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرتے رہو، اور اچھے برتاؤ میں یہ نہیں ہے کہ وہ خود اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں زندگی گزارے، اور ان دونوں کو بھوکوں مرتے ہوئے چھوڑ دے، رہے اجداد اور جدات تو اس لئے کہ وہ آباء اور امہات میں سے ہیں، (آگے ہے) اور فقر کی شرط اس لئے ہے کہ اگر وہ مالدار ہو تو دوسرے کے مال میں نفقہ واجب کرنے کے مقابلہ میں اس کے مال میں واجب کرنا اولیٰ ہوگا، اور دین کا اختلاف نفقہ کے وجوب سے مانع نہیں ہوگا، اس دلیل سے جس کی ہم نے تلاوت کی ہے)۔

اور دوسرے اقارب کے نفقات کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''والنفقة لكل ذي رحم محرم إذا كان صغيرًا فقيرًا أو كانت المرأة بالغة فقيرة، أو كان ذكرًا فقيرًا زمنًا أو أعمى (أي) ويجب ذلك على مقدار الميراث ويجبر عليه'' (ہدایہ مع الفتح ۴/ ۲۲۴ نیز دیکھئے بدائع الصنائع ۴/ ۴۴۰، ۴۴۱، شامی ۲/ ۴۷۰، ۴۷۱)

(اور ہر ذی رحم محرم کا نفقہ اس صورت میں واجب ہوگا جب کہ وہ نابالغ اور محتاج ہو، یا بالغ اور محتاج عورت ہو، یا بالغ اور فقیر لنج یا نابینا مرد ہو (پھر فرمایا) یہ نفقہ بقدر میراث واجب ہوگا، اور اسے اس پر مجبور کیا جائے گا)۔

رہا یہ سوال کہ اگر بوڑھا شخص کسی قدر مشقت سے کمائی کر سکتا ہے، تو کیا اس کی اولاد وغیرہ بجائے نفقہ دینے کے یہ کہہ سکتی ہے کہ چونکہ آپ کمانے پر قادر ہیں، لہٰذا اپنا خرچ کما کر حاصل کیجئے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ مفتی بہ قول کے مطابق والد دادا، اسی طرح ماں دادی نانی اور وہ تمام عورتیں جن کا اس پر نفقہ واجب ہے اگر محتاج ہیں تو ان کا اس پر نفقہ واجب ہوگا اور ان کو کمائی پر مجبور نہیں کیا جا سکتا ہے، خواہ وہ کمائی پر قادر ہی کیوں نہ ہوں، بقیہ دوسرے مرد اگر کمائی پر قادر ہوں تو ان کا نفقہ واجب نہیں ہوگا، ان سے کہا جا سکتا ہے کہ کمائی کر کے اپنا خرچ پورا کریں، علامہ ابن الہمام فرماتے ہیں:

''وقوله: إذا كانوا فقراء يوافق بإطلاقه قوله السرخسي حيث قال: إذا كان الأب قادرًا على الكسب يجبر الابن على نفقته بخلاف قول الحلواني (إلى) فالمعتبر في إيجاب نفقة الوالدين مجرد الفقر قيل هو ظاهر الرواية. لأن معنى الأذى في إيكاله إلى الكدر والتعب أكثر منه في التافيف المحرم بقوله تعالى: ولا تقل لهما أف'' (فتح القدیر ۴/ ۲۲۰، شامی ۲/ ۴۳۶، ہندیہ ۱/ ۵۶۴)

(اور صاحب ہدایہ کا قول: ''بشرطیکہ وہ محتاج ہوں'' مطلق ہونے کے سبب سرخسی کے قول کی موافقت کر رہا ہے، اس لئے کہ انہوں نے فرمایا: جب باپ کمانے پر قادر ہو تو بیٹے کو اس کے نفقہ پر مجبور کیا جائے گا، برخلاف حلوانی کے قول کے (آگے ہے) لہٰذا والدین کے نفقہ کے وجوب میں صرف فقر معتبر ہے، کہا جاتا ہے کہ یہی ظاہر الروایہ ہے، اس لئے کہ باپ کو محنت و مشقت میں ڈالنے کی تکلیف اف کہنے کے مقابلہ میں زیادہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے قول ''ان دونوں کو اف نہ کہو'' کی وجہ سے حرام ہے)۔

اور صاحب ہدایہ فرماتے ہیں:

''ثم لا بد من الحاجة، والصغر والأنوثة والزمانة والعمى إمارة الحاجة لتحقق العجز. فإن القادر على

الكسب غني بكسبه، بخلاف الأبوين لأنه يلحقه تعب الكسب، والولد مامور بدفع الضرر عنهما فتجب نفقتهما مع قدرتهما على الكسب (بدایہ مع الفتح ۴/ ۲۲۴، بدائع ۳/ ۴۴۰، ۴۴۱، شامی ۲/ ۶۷۰، ۶۷۱)

(پھر (وجوب نفقہ کے لئے) حاجت مند ہونا ضروری ہے، اور نابالغ ہونا، عورت ہونا، لنج ہونا اور نابینا ہونا محتاجی کی علامت ہے، اس لئے کہ عاجزی متحقق ہوگئی ہے، اور جو کمائی پر قادر ہو وہ کمائی کے سبب مالدار ہے، برخلاف والدین کے اس لئے کہ اسے کمائی کی مشقت ہوگی، اور اولاد کو والدین سے ضرر دور کرنے کا حکم ہے، لہٰذا ان دونوں کا نفقہ ان کے کمائی پر قادر ہونے کے باوجود واجب ہوگا)۔

اور صاحب فتح القدیر حاکم کی کافی سے نقل کرتے ہیں:

''ولا يجبر الموسر على نفقة أحد من قرابته إذا كان رجلا صحيحا وإن كان لا يقدر على الكسب إلا في الوالد خاصة أو في الجد أبي الأب إذا مات الولد، فأني أجبر الولد على نفقته وإن كان صحيحا (فتح القدیر ۴/ ۲۲۵)

(اور خوشحال شخص کو اپنے کسی قرابت دار پر اس وقت خرچ کرنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا جب وہ تندرست مرد ہو اگرچہ کمائی پر قادر نہ ہو، سوائے خصوصی طور پر والد کے یا دادا یعنی باپ کے باپ کے جبکہ اس کا بیٹا فوت ہوگیا ہو، چنانچہ میں اولاد کو اس کے نفقہ پر مجبور کروں گا اگرچہ وہ تندرست ہو)۔

خلاصہ کلام یہ کہ باپ دادا اور وہ خواتین جن کا نفقہ انسان پر واجب ہوتا ہے اگر محتاج ہیں تو ان کا نفقہ اس پر واجب ہوگا خواہ وہ کمائی پر قادر ہی کیوں نہ ہوں اور ان کو کمائی پر مجبور نہیں کیا جاسکتا، بقیہ دوسرے مردوں کا نفقہ اسی وقت واجب ہوگا جب وہ محتاج ہونے کے ساتھ ساتھ معذور ہوں اور کمائی پر قادر نہ ہوں، ورنہ تندرست ہوں تو ان کا نفقہ واجب نہیں ہوگا، ان کو اس پر مجبور کیا جاسکتا ہے کہ کما کر اپنا خرچ پورا کریں، واللہ اعلم۔

سوال (۲) سن رسیدہ افراد کے علاج کا خرچ:

اوپر تفصیل آچکی ہے کہ والدین دادا اور جن خواتین کا نفقہ انسان پر واجب ہوتا ہے، ان سب کا نفقہ واجب ہونے کی شرط یہ ہے کہ یہ سب محتاج ہوں اور جس پر خرچ واجب کرنا ہے وہ خوشحال ہو، ان کے علاوہ دوسرے اقارب کے لئے یہ بھی شرط ہے کہ کسی معذوری کے سبب کمائی پر قادر نہ ہوں، اس کے دلائل بھی اوپر ذکر کئے جاچکے ہیں، البتہ جن کے درمیان ولاد کا تعلق نہ ہو ان کے نفقہ کے وجوب کے لئے ایک مزید شرط قاضی کے پاس مرافعہ کرنا بھی ہے، چنانچہ اصول وفروع کے علاوہ بقیہ اقارب کا نفقہ حکم قاضی کے بغیر واجب نہیں ہوتا، علامہ کاسانی اس تیسری شرط کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''والثالث: إن الطلب والخصومة بين يدي القاضي في أحد نوعي النفقة وهي نفقة غير الأولاد فلا تجب بدونه (بدائع ۳/ ۴۴۷)

(تیسری شرط یہ ہے کہ نفقہ کی دو انواع میں سے ایک یعنی غیر ولاد کے نفقہ میں قاضی کے پاس مطالبہ اور خصومت کی جائے، یہ نفقہ اس کے بغیر واجب نہیں ہوگا)۔

اور جس پر نفقہ مقرر کرنا ہے اس کی خوشحالی کی تفصیل بیان کرتے ہوئے ہندیہ میں فرماتے ہیں:

''اليسار مقدر بالنصاب فيما روى عند أبي يوسف رحمه الله وعليه الفتوى، والنصاب نصاب حرمان الصدقة، هكذا في الهداية'' (ہندیہ ۱/ ۵۶۴)

(خوشحالی کی تقدیر امام ابو یوسف سے مروی روایت میں نصاب سے کی گئی ہے اور اسی پر فتوی ہے، اور نصاب سے صدقہ سے محرومی کا نصاب مراد ہے)۔

مطلب یہ ہے کہ اگر اتنا مال ہے جس کی وجہ سے اس پر قربانی اور صدقۂ فطر واجب ہے اور زکوۃ وغیرہ لینا ناجائز ہے تو وہ شرعاً خوشحال قرار دیا جائے گا، اور اس پر نفقات واجب ہوجائیں گے، خواہ اس پر زکوۃ واجب نہ ہو۔

جہاں تک علاج ومعالجہ کا تعلق ہے تو پہلے زمانہ میں اس کا وہ انداز نہیں تھا جو آج ہو چکا ہے، نہ تو آج کی طرح اسپتال ہوتے تھے نہ غیر معمولی خرچ آتا تھا، اس لئے علاج ومعالجہ کے مصارف کا ذکر نہ کتاب وسنت میں ملتا ہے نہ فقہی کتابوں میں، ہاں فقہی کتابوں میں یہ ذکر ملتا ہے کہ انسان پر جن افراد کا نان نفقہ واجب ہے ان کو اتنا دینا لازم ہے جس سے ان کا کام چل جائے، علامہ کاسانی فرماتے ہیں:

''وأما بيان مقدار الواجب من هذه النفقة، فنفقة الأقارب مقدرة بالكفاية بلا خلاف، لأنها تجب للحاجة

فتقدر بقدر الحاجة (إلى) لأن وجوبها للكفاية، والكفاية تتعلق ب هذه الأشياء، فإن كان للمنفق عليه خادم يحتاج إلى خدمة تفرض له أيضًا، لأن ذلك من جملة الكفاية'' (بدائع ۴/ ۴۵۱)

(جہاں تک اس نفقہ کی مقدار واجب کا تعلق ہے تو اقارب کا نفقہ بغیر کسی اختلاف کے کفایت سے مقدر ہے، اس لئے کہ وہ حاجت کے لئے واجب ہوتا ہے، لہٰذا بقدر حاجت مقدر ہوگا (آگے ہے) اس لئے کہ نفقہ کا وجوب کفایت کے لئے ہے اور کفایت ان چیزوں سے ہی متعلق ہے، چنانچہ اگر منفق علیہ کے پاس کوئی خادم ہو جس کی خدمت کی اسے حاجت ہو تو اس کے لئے بھی مقرر کیا جائے گا، اس لئے کہ یہ بھی منجملہ کفایت کے ہے)۔

ظاہر ہے کہ آج کے دور میں اگر کھانے پینے اور رہنے سہنے کا خرچ دیا جائے اور علاج کا خرچ نہ دیا جائے تو اس کو شدید مشقت لاحق ہوگی، عرف میں نفقہ میں علاج کا خرچ بھی داخل ہو چکا ہے، مولانا تقی عثمانی صاحب بیوی کے علاج معالجہ سے متعلق ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

''ایک مرتبہ اس مسئلہ پر دوسرے فقہاء کی کتابوں کی بھی مراجعت کا اتفاق ہوا، اور یہ عجیب بات نظر آئی کہ سب کے یہاں صورت حال یکساں ہی ہے، یعنی علاج کے خرچہ کو نفقہ کا حصہ قرار نہیں دیا گیا، لیکن تلاش کے باوجود کتاب وسنت کی کوئی ایسی نص بھی نہیں ملی جس میں یہ صراحت ہو کہ علاج کا خرچ شوہر پر واجب نہیں، اس لئے کہ احقر کو کچھ یہ خیال ہوتا ہے کہ قرآن کریم میں نفقہ کے ساتھ بالمعروف کی قید لگائی گئی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ نفقہ کا تعین عرف پر مبنی ہے، پچھلے دور میں چونکہ علاج کا خرچہ زیادہ لمبا چوڑا نہیں ہوتا تھا، اس لئے شاید عرف یہ تھا کہ وہ نفقہ میں شامل نہیں، اور بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے دور میں عرفاً علاج نفقہ کا حصہ ہے'' (فتاوی عثمانی ۲/ ۴۹۱)۔

رہا یہ سوال کہ علاج معالجہ کا خرچ دوسروں پر کن صورتوں میں واجب ہوگا تو اس کی ایک صورت تو وہی ہے کہ وجوب نفقہ کی شرائط پائی جا رہی ہوں تو دوسرے نفقات کی طرح علاج معالجہ کا خرچ بھی لازم ہو جائے گا، وجوب نفقہ کی شرائط ابھی ابھی ذکر کی جا چکی ہیں۔

اور علاج معالجہ والے مسئلہ میں وہ شکل بھی آجائے گی جب منفق علیہ شرعاً محتاج تو نہ ہو لیکن بیماری ایسی ہے کہ بغیر اولاد واحفاد اور اقارب کی مدد کے اس کے مصارف برداشت نہیں کر سکتا اور یہ لوگ مدد کرنے پر قادر ہوں، تو اگرچہ شرعی اعتبار سے وہ محتاج نہیں ہے، لیکن بیماری کے مصارف کو دیکھتے ہوئے محتاج ہے، لہٰذا اس صورت میں بھی بقدر ضرورت مریض کے مصارف پورے کرنا اولاد واقارب کی ذمہ داری ہوگی، اس کا اشارہ مندرجہ بالا نصوص اور فقہی عبارات میں موجود ہے، واللہ اعلم۔

سوال (۳) منفق علیہ کی احتیاج شرط ہے:

انسان کا نان نفقہ اصلاً خود اسی کے اوپر ہوتا ہے، اس کے پاس مال نہ ہو تبھی دوسروں پر ہوتا ہے، اس کے لئے فقہاء نے حد بندی کرتے ہوئے صراحۃً لکھا ہے کہ دوسروں پر نفقہ فقر واحتیاج کی شکل ہی میں لازم ہوتا ہے، ہدایہ میں ہے:

''وعلى الرجل أن ينفق على أبويه وأجداده وجداته إذا كانوا فقراء (إلى) وشرط الفقر لأنه لو كان ذا مال فإيجاب نفقته في ماله أولى من إيجابها في مال غيره'' (ہدایہ مع الفتح ۴/ ۴۲۱)

(آدمی پر لازم ہے کہ وہ اپنے والدین، اجداد اور جدات پر خرچ کرے بشرطیکہ وہ محتاج ہوں (آگے ہے) اور فقر کی شرط اس لئے ہے کہ اگر وہ مالدار ہو تو دوسرے کے مال میں اس کا نفقہ واجب کرنے کے مقابلہ میں اسی کے مال میں اس کا واجب کرنا اولیٰ ہوگا)۔

دوسری جگہ ہے:

''والنفقة لكل ذي رحم إذا كان صغيرًا فقيرًا... الخ'' (ایضاً ۴/ ۴۲۴)

(اور ہر ذی رحم محرم کا نفقہ اس صورت میں لازم ہوگا جب کہ وہ نابالغ اور محتاج ہوں الخ)۔

ان تمام عبارات سے واضح ہو گیا کہ والدین وغیرہ کا نفقہ واجب اسی وقت ہوتا ہے جب وہ محتاج ہوں، اگر محتاج نہیں ہیں تو وجوب نہیں ہے، اگر اس طرح کی حالت میں مطالبہ کریں تو اس کا پورا کرنا اولاد وغیرہ پر لازم نہیں ہے، البتہ حسن سلوک کے طور پر دیدیں تو یہ ان کی سعادت مندی ہوگی، آخرت میں ثواب کا ذریعہ بنے گا، اور ہو سکتا ہے کہ اس سعادت مندی کا صلہ ان کو دنیا ہی میں اپنی معذوری کے زمانہ میں اپنی اولاد کی سعادت مندی سے ملے، واللہ اعلم۔

سوال (۴) الف: ماں باپ کو چھوڑ کر دوسری جگہ جانا:

قرآن مجید میں ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا گیا ہے، نیز ماں باپ نے اپنی اولاد کو پالنے کے لئے جو بے پناہ قربانیاں دی ہیں، اس پر ان کا احسان مند ہونے اور شکر بجالانے کا حکم دیا گیا ہے، شکر گزار ہونے کا مطلب صرف یہ نہیں ہے کہ زبانی شکریہ ادا کر لیا جائے، بلکہ اس کا مطلب یہی ہے کہ دل، زبان اور اعضاء وجوارح سے ان کی قربانیوں کا حتی الامکان بدلہ دینے کی کوشش کی جائے۔

أفادتكم النصحاء مني ثلاثة...... يدي ولساني والضمير المحجبا

اور جس طرح انہوں نے اس کی سخت احتیاج کی حالت میں اس کا خیال رکھا، یہ بھی ان کی احتیاج اور ضعیفی کے وقت ان کا خیال رکھے، اور لاچاری کی حالت میں ان کا سہارا بنے، اور ضرورت ہو تو ان کی بدنی خدمت بھی انجام دے، حکم دیا گیا کہ ان سے سخت بات بھی نہ کی جائے اور اف بھی نہ کہا جائے تاکہ ان کی دل آزاری نہ ہو، اسی سے صاف ہو جاتا ہے کہ جس طرح ان سے سخت بات کہنا جائز نہیں، اسی طرح ان کے ساتھ کوئی ایسا فعل کرنا بھی جائز نہیں ہوگا جس سے ان کو جسمانی یا روحانی وذہنی تکلیف پہنچے، حد یہ ہے کہ حدیث شریف میں ایسے شخص کو جہاد جیسے عمل سے بھی روک دیا گیا جس کے ماں باپ کو اس کی ضرورت ہو:

"عن معاوية بن جاهمة إن جاهمة جاء إلى النبي ﷺ فقال يارسول الله! أردت أن أغزو، وقد جئت أستشيرك، فقال: هل لك من أم؟ قال نعم قال: فالزمها، فإن الجنة عند رجلها" (النسائی کتاب الجهاد باب الرخصة فی التخلف لمن له والدة (۳۱۰۶)، ومسند احمد ۳/ ۴۳۰ (۱۵۶۲۳) واللفظ کما هو مذکور فی المشکاة باب البر والصلة الفصل الثالث ص: ۴۲۱)۔

(حضرت معاویہ ابن جاہمہ سے مروی ہے کہ حضرت جاہمہ نبی کریم ﷺ کے پاس آئے اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول! میرا ارادہ غزوہ کرنے کا ہے اور میں آپ سے مشورہ کے لئے حاضر ہوا ہوں تو آپ ﷺ نے فرمایا: کیا تمہاری ماں ہیں، عرض کیا: جی ہیں! فرمایا: تو انہیں کے ساتھ رہو اس لئے کہ جنت ان کے قدموں کے پاس ہے)۔

بعض روایات میں ماں باپ دونوں کا ذکر آیا ہے (ابوداؤد کتاب الجهاد باب فی الرجل یغزو وأبواه کارهان (۲۵۲۸) (۲۵۲۹) (۲۵۳۰))۔

اسی لئے فقہاء نے صراحت فرمائی ہے کہ ماں باپ کی اجازت کے بغیر جہاد میں شرکت کرنا جائز نہیں ہے الا یہ کہ نفیر عام ہو جائے، اگر ایک اجازت دیدے، اور دوسرا اجازت نہ دے تب بھی جانا جائز نہیں ہے، اگر کسی کے ماں باپ نہ ہوں لیکن دادا یا نانی موجود ہوں تب بھی ان کی اجازت کے بغیر جانا جائز نہیں ہے،

"وإذا أراد الرجل أن يخرج للجهاد وله أب أو أم فلا ينبغي له أن يخرج إلا بإذنه إلا من النفير العام، وإن كان له أبوان، وأذن له أحدهما في الخروج، ولم يأذن له الآخر فليس له أن يخرج لحق الآخر، فإذا أكره الوالدان أو أحدهما الخروج لايباح له الخروج، سواء كان يخاف عليهما الضيقة بأن كانا معسرين وكانت نفقتهما عليه أو لايخاف عليهما الضيقة ....وإن كان له أبوان ميتين وله أبو الأب وأم الأم لايخرج إلا بإذنهما الخ" (ہندیہ ۲/ ۱۸۹، کتاب السیر، شامی ۳/ ۲۴۱ کتاب الجهاد)۔

جہاں تک زیادہ آمدنی کے لئے ماں باپ کو چھوڑ کر دوسری جگہ جانے کا تعلق ہے، تو اگر ماں باپ کی خدمت کا مکمل انتظام کر دیا جائے، اور یہ خطرہ نہ ہو کہ ان کی غیر موجودگی میں ان کو پریشانی یا خطرات کا سامنا کرنا پڑے گا تو شرعاً اس کی اجازت ہوگی، لیکن ایسا کرنا خلاف اولی ہوگا، اس لئے کہ ان کی آسائش کا ظاہری طور پر کتنا بھی اہتمام کر لیا جائے لیکن اس کے دور رہنے سے انہیں ذہنی تکلیف ہوگی جو کہ ایک بدیہی حقیقت ہے، اور ظاہر ہے، قرآن نے ان کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا ہے اور یہ عمل حسن سلوک کے منافی ہوگا، الا یہ کہ کئی بھائی ہوں اور پورا یقین ہو کہ ایک دو بھائی دور بھی چلے جائیں تو رہ جانے والے بھائی ماں باپ کو کوئی تکلیف نہیں ہونے دیں گے اور ان کا پورا خیال رکھیں گے تو اس صورت میں گنجائش ہوگی۔

اور اگر ان کا ایک ہی بیٹا ہے جس کے چلے جانے سے ماں باپ پر خطرات ہیں کہ انہیں مشقت ہوگی، یا ان کی دیکھ بھال کا مکمل انتظام کئے بغیر چلا جاتا ہے تو شرعاً وہ گنہگار ہوگا، اس لئے کہ اس طرح کے حالات میں اس کے لئے تجارتی سفر جائز نہیں ہے، فقہاء نے اس کی صراحت کی ہے:

"لايحل سفر فيه خطر إلا بإذنهما، وما لا خطر فيه يحل بلا إذن، ومنه السفر في طلب العلم (قوله وما لا خطر)

کالسفر للتجارة والحج والعمرة یحل بلا إذن إلا أن خیف علیهما الضیقة'' (سرخسی)

(والدین کی اجازت کے بغیر ایسا سفر نا جائز ہے جس میں خطرہ ہو، اور جس میں خطرہ نہ ہو وہ سفر بلا اجازت بھی جائز ہے، اسی میں سے طلب علم کے لئے سفر بھی ہے (مصنف کا قول: جس میں خطرہ نہ ہو) جیسے تجارت حج اور عمرہ کے لئے سفر کرنا بلا اجازت جائز ہے الا یہ کہ والدین کے ضیاع کا اندیشہ ہو) (شامی ۳/۲۴۱ کتاب الجہاد، نیز دیکھئے ہندیہ کتاب السیر ۲/۱۸۹، وکتاب الحظر والاباحۃ باب ۲۶، ج ۵/۳۶۵، فتاوی عثمانی ۱/۲۷۴)۔

(ب) بہو کے لئے ساس سسر کی خدمت کا حکم:

والدین کی خدمت کرنا اصلاً اس کی اولاد پر واجب ہے، بہو پر واجب نہیں ہے، لیکن شریعت کے بہت سے احکام قضاءً واجب نہیں ہوتے دیانۃً واجب ہوتے ہیں، جیسے عورت کے لئے کھانے پکانے اور گھریلو کام کاج کرنے کو قضاءً واجب نہیں قرار دیا جاسکتا لیکن زمانہ نبوت سے لے کر آج تک اس طرح کے کام کاج عورتیں کرتی رہی ہیں، اور باہمی الفت ومحبت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ جب شوہر باہری کام کاج میں لگا ہوا ہے تو بیوی گھریلو امور کو سنبھالے، اسی لئے فقہاء نے ان اعمال کے انجام دینے کو دیانۃً عورت پر واجب قرار دیا ہے:

''وإن قالت لا أطبخ (إلی) قالوا: إن هذه الأعمال واجبة علیها دیانة وإن کان لا یجبرها القاضی کذا فی البحر الرائق'' (ہندیہ ۱/۵۴۸)۔

اسی طرح کا معاملہ ساس سسر کی خدمت کا بھی ہے، اگر ان کی خدمت کے لئے ان کی اپنی اولاد موجود ہے، یا کوئی دوسری بہو موجود ہے تو اس پر خدمت کرنا نہ قضاءً واجب ہے نہ دیانۃً، البتہ چونکہ اس کے شوہر پر ان کی خدمت واجب ہے، لہذا اس طرح کے حالات میں بھی شوہر کے تعاون کے طور پر اس کو ان کی خدمت بجالانا چاہئے، اس لئے کہ شوہر بیوی بچوں کی آسائش ہی کے لئے کاموں میں مشغول ہے، جس کی وجہ سے ان کی خدمت کے لئے وقت نہیں نکال پاتا تو اخلاق ودیانت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اس فریضہ کی ادائیگی میں شوہر کی مدد کرے۔

اور اگر ساس سسر کی خدمت کے لئے کوئی اور موجود نہ ہو، تو اگر چہ قضاءً اس صورت میں بھی بہو پر ان کی خدمت واجب نہیں ہے لیکن دیانۃً واجب ہے (کتاب الفتاوی ۴/۴۰۹)۔

اس مسئلہ پر فقہ اکیڈمی نے مندرجہ ذیل تجویز منظور کی ہے:

''اگر ماں کو ایسی خدمت کی ضرورت ہو جس کو کوئی عورت ہی انجام دے سکتی ہے، اور بہو کے علاوہ کوئی دوسری قریبی عورت خدمت کرنے والی نہ ہو، نیز ماں مجبور ہو، خود سے وہ کام انجام دینے کے لائق نہ ہو تو ایسی صورت میں بہو پر ساس کی خدمت واجب ہوگی'' (فقہ اکیڈمی کے فیصلے مشترکہ خاندانی نظام تجویز ۶/۱۲۵)۔

یہ تو بہو کی ذمہ داریوں کی بات ہے، جہاں تک اس کو ساتھ رہنے پر مجبور کرنے کا تعلق ہے تو اس سلسلہ میں کچھ تفصیل ہے: سکنی کا حکم دیتے ہوئے اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

''أسکنوهن من حیث سکنتم من وجدکم ولا تضاروهن لتضیقوا علیهن'' (سورۂ طلاق: ۶)

(ان کو اپنی حیثیت کے مطابق وہیں رکھو جہاں تم رہتے ہو اور ان کو تنگ کرنے کے لئے ان کو ستاؤ مت)۔

اور اس کی تفصیل اور وضاحت کرتے ہوئے علماء فرماتے ہیں کہ بیوی کو الگ گھر کا مطالبہ کرنے کا حق ہے، لیکن اگر بڑے گھر میں اس کو ایک کمرہ دیدیا جائے جس میں دوسروں کی آمد ورفت نہ ہو، اور جو ہر طرح کی ضروریات پوری کرتا ہو (مثلاً کیچن اور لیٹرن کا نظم ہو حسب حیثیت علاحدہ یا مشترکہ) اور محفوظ ہو جس پر بیوی کا تالا لگایا جاسکتا ہو تو کافی ہوگا۔

دوسرا قول یہ ہے کہ یہ تفصیلات متوسط لوگوں کے لئے ہیں، لہذا اصحاب ثروت کے لئے الگ سے گھر مہیا کرانا ضروری ہوگا، علامہ شامی نے اس پر تفصیلی بحث کی ہے اور اس کو عرف کے تابع قرار دیا ہے۔

صاحب ہدایہ فرماتے ہیں: ''وعلی الزوج أن یسکنها فی دار مفردة لیس فیها أحد من أهله إلا أن تختار ذلك .... ولو أسکنها فی بیت من الدار مفرد وله غلق کفاها لأن المقصود قد حصل'' (ہدایہ ۲/۴۴۴)

(اور شوہر پر لازم ہے کہ بیوی کو ایسے علاحدہ کمرہ میں رکھے جس میں شوہر کے گھر والوں میں سے کوئی نہ ہو الا یہ کہ بیوی خود اس کو ترجیح دے.... اور اگر اس کو گھر کے الگ کمرے میں نہیں رکھے جس کا تالا ہو تو کافی ہوگا، اس لئے کہ مقصود پورا ہو گیا ہے)۔

اور شامی میں ہے: "(قوله ونقل عن الملتقط)...... وإن أسكن الأم في بيت داره، والمرأة في بيت آخر فليس لها غير ذلك ... ومفهومه: إن من كانت من ذوات الإعسار يكفيها بيت ولو مع أحمائها وضرتها الخ.... وهٰذا موافق لما قدمنا عن الملتقط من قوله اعتبارًا بالسكنى بالمعروف، إذ لا شك أن المعروف يختلف باختلاف الزمان والمكان" (شامی ۲/ ۷۲۰، ۷۲۱)۔

(اور اگر ماں کو اپنے گھر کے ایک کمرے میں ٹھہرائے اور بیوی کو الگ کمرے میں تو بیوی کو اس کے علاوہ کا حق نہیں ہوگا.... اس کا مفہوم مخالف یہ ہے کہ اگر بیوی تنگدست عورتوں میں سے ہو تو اس کے لئے ایک کمرہ کافی ہوگا، خواہ وہ سسرالی اقارب اور سوکن کے ساتھ ہی کیوں نہ ہو.... یہ روایت اس قول کے مطابق ہے جس کو ہم نے ملتقط کے حوالے سے پہلے بیان کیا ہے کہ رہائش میں وہ عرف کو معتبر ماننے کے قائل ہیں، اس لئے کہ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ عرف زمان ومکان کے مختلف ہونے سے بدل جاتا ہے)۔

معلوم ہوا کہ رہائش کے الگ انتظام کرنے کا وجوب اور عدم وجوب دونوں حالات اور عرف پر مبنی ہے، لہٰذا جن صورتوں میں بہو پر ساس کی خدمت متعین ہو جائے ان میں اس کا الگ گھر کا مطالبہ کرنا صحیح نہیں ہوگا، اس لئے کہ واجب کو پورا کرنے کے لئے جو چیز ضروری ہو وہ بھی واجب ہو جاتی ہے، اور جب ساس کی خدمت کرنا واجب ہو گیا ہے اور یہ واجب الگ گھر میں رہ کر پورا نہیں کر سکتی تو اس پر اس گھر میں رہنا ضروری ہوگا اور جب تک اس پر ساس سسر کی خدمت متعین رہتی ہے اس دوران وہ الگ گھر کا مطالبہ نہیں کر سکتی، اور اسے ساس سسر کے ساتھ ہی رہنے پر مجبور کیا جا سکتا ہے، الا یہ کہ بالکل متصل علاحدہ گھر مل جائے، جس میں رہنے سے فریضہ پورا کرنے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو، واللہ اعلم۔

(ج) بیٹیوں پر والدین کی خدمت واجب ہے:

والدین کا نفقہ تمام صاحب نصاب اولاد پر برابر برابر ہوتا ہے، اس میں زیادہ اور کم مالدار یا بیٹے اور بیٹی میں فرق نہیں ہوتا ہے، اسی طرح والدین کی خبر گیری اور خدمت سب پر واجب ہوتی ہے:

"وهي على الذكور والإناث بالسوية في ظاهر الرواية وهو الصحيح" (ہدایہ مع الفتح ۴/ ۲۲۳)

(اور نفقہ ظاہر الروایہ کے مطابق بیٹوں اور بیٹیوں پر برابر برابر ہوتا ہے اور یہی روایت صحیح ہے) (نیز دیکھئے: شامی ۲/ ۷۳۶، ہندیہ ۱/ ۵۶۴، فتح القدیر ۴/ ۲۲۳)

عام طور سے والدین اپنے بیٹوں کے ساتھ رہتے ہیں، اور ان کی خبر گیری اور خدمت کا فریضہ وہی انجام دیتے ہیں، بیٹیاں اپنے شوہروں کے گھر میں ماں باپ سے دور رہتی ہیں، اس طرح والدین کی خدمت کا فریضہ ادا ہو جاتا ہے، ہمارے یہاں کا عام عرف یہی ہے اور باہمی رضامندی سے جب تک خوش اسلوبی سے اصل مقصد پورا ہوتا رہے شرعاً اس میں کوئی قباحت بھی نہیں ہے، لیکن اگر بیٹے موجود ہی نہ ہوں، یا موجود تو ہوں لیکن والدین کی خدمت کا فریضہ انجام دینے کے لائق نہ ہوں یا لائق ہونے کے باوجود اس میں کوتاہی برتتے ہوں تو بیٹیوں پر والدین کی خدمت متعین ہو جائے گی، اس صورت میں ان پر لازم ہوگا کہ بقدر ضرورت ان کی خدمت انجام دیں، اگر شوہر اس کی اجازت دیدے، یا باہمی سمجھوتہ سے اس کا کوئی نظام بنا لیا جائے تو زیادہ اچھا ہوگا، لیکن اگر شوہر اس کی اجازت اس طرح کے حالات میں بھی نہیں دے رہا ہے جبکہ والدین کو اس کی حاجت ہے، تو بیٹی اپنے شوہر کی اجازت کے بغیر بھی ان کی خدمت کے لئے جا سکتی ہے، یہ الگ بات ہے کہ اس صورت میں جب تک وہ والدین کے گھر رہے گی اس کا نفقہ شوہر پر واجب نہیں ہوگا:

"ولا يمنعها من الخروج إلى الوالدين في كل جمعة إن لم يقدرا على إتيانها على ما اختاره في الاختيار، ولو أبوها زمنا مثلًا، فاحتاجها فعليها تعاهده ولو كافرا، وإن أبى الزوج فتح (قوله زمنا) أي مريضا مرضا طويلا (قوله فعليها تعاهده) أي بقدر احتياجه إليها. وهٰذا إذا لم يكن له من يقوم عليه كما قيده في الخانية (قوله وإن أبى الزوج) لرجحان حق الوالد، وهل لها النفقة الظاهر لا، وإن كانت خارجة من بيته بحق كما لو خرجت لفرض الحج" (شامی ۲/ ۷۲۲، ہندیہ ۱/ ۵۵۷)

(اور بیوی کو ہر جمعہ کے دن والدین کے پاس جانے سے نہیں روکے گا، اگر وہ اس کے پاس آنے پر قدرت نہ رکھتے ہوں، جیسا کہ الاختیار میں اختیار کیا ہے، اور اگر اس کے والد مثال کے طور پر لنج ہوں، اور اس کو اس لڑکی کی ضرورت محسوس ہو، تو اس پر والد کی دیکھ بھال کرنا لازم ہے اگر چہ وہ کافر ہو اور اگر چہ شوہر انکار کردے (مصنف کا قول لنج ہو) یعنی لمبے عرصہ سے مریض ہو (مصنف کا قول: تو اس پر دیکھ بھال کرنا لازم ہے) یعنی جیسے کی والد کو اپنی اس بیٹی کی ضرورت ہو اس کے بقدر، اور یہ اس وقت ہے جب والد کا دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہ ہو، جیسا کہ خانیہ میں قید لگائی ہے (مصنف کا قول: اگر چہ شوہر انکار کرے) اس لئے کہ والد کے حق کو ترجیح حاصل ہے، اور کیا اس کو نفقہ ملے گا، بظاہر نہیں ملے گا اگر چہ وہ اپنے گھر سے صحیح طور پر نکلی ہے، جیسا کہ وہ فرض حج کے لئے نکلتی تو ہوتا)۔

فقہ اکیڈمی کی تجویز میں ہے: والدین کی خدمت وکفالت لڑکوں کے ساتھ لڑکیوں پر بھی حسب استطاعت واجب ہے (فقہ اکیڈمی کے فیصلے، ص: ۱۲۵)۔

البتہ شوہر کی اجازت کے بغیر والدین کی خدمت کا فریضہ انجام دینے میں لڑکیوں کو بہت ہوشمندی اور احتیاط کی ضرورت ہے، جہاں تک ممکن ہو شوہروں کو حکم شرعی سے آگاہ کرکے، باپ کی معذوریوں کو بیان کرکے اس کے دل میں نرمی پیدا کی جائے، اور پھر اجازت لے کر ہی شوہر کے گھر سے نکلا جائے، اور والدین کی خدمت کی جائے، پوری کوشش ہونی چاہئے کہ اس مسئلہ کی وجہ سے شوہر سے ناچاقی نہ ہونے پائے، تاکہ والدین کی خدمت کے ساتھ ساتھ اس کا گھریلو سکون بھی سلامت رہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ جب والدین کی خبر گیری کرنے والا بیٹی کے علاوہ کوئی نہ ہو تو ان کی خدمت اور خبر گیری اس پر واجب ہو جاتی ہے، اور اس صورت میں شوہر کے لئے شرعاً اس کو منع کرنے کا حق نہیں ہے، واللہ اعلم۔

سوال (۵) بوڑھاپے میں شادی:

شریعت نے شادی کی اجازت دی ہے، اور اس کے لئے جوان یا بوڑھے میں کوئی تفریق نہیں کی ہے،

"فانکحوا ما طاب لکم من النساء" (سورہ نساء: ۳) (جو عورتیں تمہیں پسند آئیں ان میں دو اور تین اور چار تک سے نکاح کر سکتے ہو)۔

لہذا معمر ہونے کے باوجود اگر کوئی شخص شادی کی ضرورت محسوس کرتا ہے، تو اس میں کسی کے لئے بھی رکاوٹ ڈالنا شرعاً غلط ہے، فقہاء نے تو یہاں تک فرمایا ہے کہ اگر باپ کو شادی کی ضرورت ہو تو اولاد کو خود اس کی شادی کرادینی چاہئے، تو بھلا رکاوٹ بننے کی گنجائش کہاں ہو سکتی ہے:

"وعليه نفقة زوجة أبيه وأم ولده بل وتزويجه وتسريه" (الدر المختار ۲/ ۷۳۱، ۷۳۲)

(اس پر اپنے باپ کی بیوی اور اس کی ام ولد کا نفقہ بلکہ اس کی شادی کرنا اور اس کے لئے باندی مہیا کرنا لازم ہے)۔

جہاں تک اولاد پر باپ کی بیوی کے نفقہ کی ذمہ داری کا تعلق ہے، تو اگر باپ کی بیوی اس کی ماں ہو، تب تو اس کا نفقہ بحیثیت ماں کے واجب ہے ہی، لیکن اگر ماں نہ ہو تو اس کا نفقہ ایک روایت کے مطابق اس وقت واجب ہوگا جب باپ مریض یا لنج ہو، اور دوسری روایت کے مطابق خواہ کوئی ایسی بات ہو یا نہ ہو، اگر باپ کے نفقہ کے وجوب کی شرائط پائی جا رہی ہیں تو اس کی بیوی کا نفقہ بھی اولاد پر واجب ہوگا:

"وعليه نفقة زوجة أبيه وأم ولده بل وتزويجه وتسريه ولو له زوجات فعليه نفقة واحدة يدفعها للأب ليوزعها عليهن"

(اس پر اپنے باپ کی بیوی اور اس کی ام ولد کا نفقہ بلکہ اس کی شادی کرانا اور اس کو باندی مہیا کرانا لازم ہوگا، اور اگر باپ کی کئی بیویاں ہوں تو اس پر صرف ایک بیوی کا نفقہ واجب ہوگا جسے وہ باپ کو دیدے گا تاکہ وہ ان سب پر تقسیم کردے (الدر المختار ۲/ ۷۳۱، ۷۳۲)۔

علامہ شامی اس پر تعلیق کرتے ہوئے فرماتے ہیں: (قوله وعليه نفقة زوجة أبيه) (مصنف کا قول ہے کہ اس پر باپ کی بیوی کا نفقہ لازم ہوگا) یعنی ایک روایت میں، اور دوسری روایت میں ہے کہ اگر باپ بیمار ہو یا معذور ہو اور اسے خدمت کی حاجت ہو (تب ایسا ہوگا) (پھر فرماتے ہیں) بحر میں ہے: ذخیرہ کی روایت کے ظاہر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مذہب مختار باپ کی بیوی باندی اور ام ولد کے نفقہ کا اس صورت میں عدم وجوب ہے جب باپ کو کوئی عذر نہ ہو الخ (پھر فرماتے ہیں) جب دونوں میں سے کسی کو خادم کی ضرورت ہو تو اس کا نفقہ اسی طرح واجب ہوگا جس طرح مخدوم (یعنی ماں باپ) کا واجب ہے اور جب خادم کی ضرورت نہ ہو تو واجب نہیں ہوگا) (شامی ۲/ ۷۳۱)۔

ان روایات سے یہ بات تو طے ہوگئی کہ اگر والد کو اپنی خدمت کے لئے بیوی کی ضرورت ہے تب تو بالاتفاق باپ کے ساتھ اس کی بیوی کا نفقہ بھی اولاد پر

لازم ہوگا، اس لئے کہ والد کی خدمت اولاد کے فرائض میں سے ہے، لہٰذا اس حالت میں باپ کی بیوی کا نفقہ خود باپ کے نفقہ میں سے ہوگا، اور اگر اس کو خدمت کی حاجت نہیں ہے، تو ایک روایت کے مطابق اس صورت میں بھی بیوی کا نفقہ واجب ہوگا، علامہ حصکفی نے بظاہر اسی روایت کو راجح قرار دیا ہے، دوسری روایت کے مطابق اس صورت میں بیوی کا نفقہ اولاد پر نہیں ہوگا، علامہ شامی نے اسی کو راجح قرار دیا ہے، قول فیصل یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر بیٹے کے حالات اچھے ہوں اور باپ کے اتنے خراب ہوں کہ اگر بیٹے نے اس کا نفقہ نہیں دیا تو اکتساب پر مجبور ہونا پڑے گا تو اس صورت میں پہلی روایت کو ترجیح دے کر باپ کی بیوی کا نفقہ بھی بیٹے پر لازم قرار دیا جائے، اس لئے کہ باپ کو جہاں تک ممکن ہو کمائی کی مشقت سے بچانا بیٹے کے فرائض میں شامل ہے، اور اگر بیٹے کے مالی حالات ابتر ہوں اور باپ اپنے فقر کے باوجود اتنی استطاعت رکھتا ہو کہ اپنی بیوی کا خرچ کمائی کی مشقت اٹھائے بغیر برداشت کرسکتا ہے تو اس صورت میں دوسری روایت کو ترجیح دے کر عدم وجوب کو راجح قرار دیا جائے، واللہ اعلم۔

سوال (۶) والد کی زندگی میں جائیداد کا مطالبہ:

محتاج اولاد جب تک نابالغ ہے اس کا نفقہ باپ پر واجب ہے، چاہے لڑکا ہو یا لڑکی، اسی طرح اگر بالغ ہونے کے بعد کمائی پر قادر نہ ہو تب بھی اس کا نفقہ باپ پر واجب ہوگا، کمائی پر قادر نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اسے معذوری ہو، یا طلب علم میں مشغول ہو، یہ تفصیل لڑکے کے لئے ہے، جہاں تک لڑکی کا تعلق ہے تو شادی ہونے تک اس کا نفقہ باپ پر ہوتا ہے خواہ اسے عذر ہو یا نہ ہو (شامی ۲/ ۷۲۹، ۷۳۰)۔

اور اگر بالغ ہونے کے بعد لڑکے کو اس طرح کا کوئی عذر ہو تو باپ پر اس کا نفقہ واجب نہیں ہوتا، یہ الگ بات ہے کہ اللہ نے والدین میں اولاد کی بے پناہ محبت رکھی ہے، اس لئے اگر بیٹا پریشان حال ہے اور باپ خوش حال ہے تو وجوب نہ ہونے کے باوجود وہ خود ہی اس کی ضروریات کا خیال رکھے گا اور اسے اپنی شفقتوں کے گھنیرے سائے میں رکھے گا، اکثر دیکھا جاتا ہے کہ باپ بیٹے کی بھرپور مدد کرتا ہے، اور اس کو اپنے پیروں پر کھڑا کرنے کے لئے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتا۔

لیکن جہاں تک باپ سے جائیداد تقسیم کرنے کا مطالبہ کرنے اور باپ کی جائیداد میں اپنا حق سمجھنے کا تعلق ہے، تو شرعاً اس کی کوئی بنیاد موجود نہیں ہے، جب تک باپ زندہ ہے اس کی پوری جائیداد اور مال صرف اسی کا ہے، اس لئے وہ جس طرح چاہے تصرف کرے، اولاد کو کوئی حق نہیں کہ اس کی روک ٹوک کریں یا اس سے جائیداد تقسیم کرنے کا مطالبہ کریں، ہاں باپ اپنی مرضی سے تقسیم کردے تو وہ ایک الگ مسئلہ ہے، اس لئے کہ اولاد کو باپ کا ترکہ اور اس کی میراث تقسیم کرنے کا حق ہوتا ہے اور ترکہ کی تقسیم کے مطالبہ کا بھی حق ہوتا ہے، لیکن جب تک باپ زندہ ہے اس کی ملکیت ترکہ یا میراث کیسے کہی جاسکتی ہے؟ آیت میراث اور آیت کلالہ میں بار بار "ما ترک" کے الفاظ آئے ہیں، جس کا مطلب ہی یہ ہے کہ باپ کے انتقال کے بعد جو کچھ اس نے چھوڑا ہے وہ ترکہ ہے، سراجی اور اس کی شرح شریفیہ نیز دوسری کتب فقہ میں اس کی صراحت موجود ہے: "والمراد من التركة ما تركه الميت" (شامی ۶/ ۵۳۵، حاشیہ شریفیہ ص: ۳، نیز دیکھئے: فتاویٰ رحیمیہ ۳/ ۲۰۰) (ترکہ سے مراد وہ مال ہے جس کو میت چھوڑ جائے)۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ باپ کی زندگی میں اولاد کے لئے جائیداد کے مطالبہ کا کوئی حق نہیں ہے، باپ اپنی مرضی سے ان کی محتاجی کے پیش نظر کچھ دیدے تو یہ اس کی پدرانہ شفقت ہے نہ کہ شرعی حق کی ادائیگی، واللہ اعلم۔

سوال نمبر (۷) عمر رسیدہ افراد کو اولڈ ایج ہوم میں داخل کرنا:

قرآن مجید میں والدین کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا گیا ہے، ان کا شکر گزار ہونے اور انہیں اف تک نہ کہنے کا مطالبہ کیا گیا ہے، اس سلسلہ میں قرآن کی آیات اور احادیث پیچھے گزر چکی ہیں، یہاں چند مزید احادیث نقل کی جاتی ہیں:

"عن أبي أمامة: أن رجلا قال: يا رسول الله! ماحق الوالدين على ولدهما؟ قال هما جنتك ونارك" (ابن ماجه مشکوٰۃ باب البر والصلة الفصل الثالث، ص: ۴۲۱)

(حضرت ابوامامہؓ سے مروی ہے کہ ایک شخص نے پوچھا: اے اللہ کے رسول! والدین کا اپنی اولاد پر کیا حق ہے؟ فرمایا: وہ دونوں تمہاری جنت اور جہنم ہیں)۔

"عن عبدالله بن عمرو قال: قال رسول اللهﷺ: رضى الرب فى رضى الوالد، وسخط الرب فى سخط الوالد" (ترمذی مشکوٰۃ ۴۱۹)

(حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے، فرماتے ہیں: آنحضور ﷺ نے فرمایا: پروردگار کی خوشنودی باپ کی خوشنودی میں ہے اور پروردگار کی ناراضگی باپ کی ناراضگی میں ہے)۔

"عن ابن عباس أن رسول الله ﷺ قال: ما من ولد بار ينتظر إلى والديه نظرة رحمة إلا كتب اله بكل نظرة حجة مبرورة، قالوا وإن نظر كل يوم مائة مرة قال نعم! الله أكبر وأطيب" (بیہقی فی شعب الایمان مشکوۃ ۴۲۱)

(حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ آنحضور ﷺ نے فرمایا: جو اولاد بھی اپنے والدین پر ایک بارنگاہ رحمت ڈالتی ہے تو اللہ تعالیٰ ہر نگاہ کے بدلہ میں حج مقبول لکھ دیتا ہے، لوگوں نے پوچھا: خواہ وہ ہر دن سو مرتبہ نگاہ ڈالے؟ فرمایا: ہاں، اللہ بہت بڑا اور پاک ہے)۔

ان نصوص کا تقاضا یہ ہے کہ والدین اور دوسرے بڑوں کو گھر ہی میں رکھ کر ان کی خدمت بجالائے، تاکہ بچوں میں ان کا دل بہلا رہے، اور ان کی آنکھیں ہر وقت اپنی اولاد سے ٹھنڈی رہیں، اولڈ ایج ہوم میں ان کے آرام کا خواہ کتنا بھی انتظام کردیا جائے، ان کا دل خوش نہیں رہ سکتا، اور ان کی رضا حاصل نہیں ہوسکتی جس کے فضائل اوپر بیان کئے گئے ہیں، نہ ہی ان پر محبت کی نگاہ ڈالنے کا ثواب حاصل ہوسکتا ہے، نہ ہی قرآن وحدیث میں جس حسن سلوک کا حکم دیا گیا ہے اس کی ٹھیک ٹھیک ادائیگی ہوسکتی ہے، جس شریعت میں ان کی کسی بات سے اکتاہٹ کے اظہار سے روکا گیا ہے تاکہ ان کی دل شکنی نہ ہو، وہ ان کو اس طرح گھر بدر کرنے کی اجازت کیسے دے سکتی ہے؟

لیکن اگر والدین کو خود اولڈ ایج ہوم میں زیادہ راحت محسوس ہوتی ہو، اور وہ اپنی مرضی سے وہاں جانا چاہتے ہوں، یا گھر کی صورت حال ایسی ہے کہ یہاں ان کی خدمت کا پورا انتظام نہیں ہوسکتا، جبکہ اولڈ ایج ہوم میں ایسا ہوسکتا ہے تو اس طرح کی صورت حال میں ان کو وہاں داخل کرنے کی اجازت ہوگی، اس لئے کہ اصل وجوب ان کی رضا حاصل کرنے اور کما حقہ ان کی خدمت انجام دینے کا ہے، جس کی صورتوں میں اختلاف ہوسکتا ہے، لیکن داخل کرنے کے بعد اس کی سعادت مندی اس میں ہوگی کہ ان سے مسلسل ملاقات کرتا رہے، رابطہ کرتا رہے اور ان کی ضروریات کا خیال رکھتا رہے اور جیسے ہی ممکن ہو ان کو پھر گھر لے آئے، ایسا نہ ہو کہ ان کو اولڈ ایج ہوم کی انتظامیہ کے رحم وکرم پر چھوڑ کر اپنی دنیا میں مگن ہوجائے اور ان سے لاتعلق ہوکر منھ پھیر لے، اگر ایسا کیا تو ان کو تکلیف ہوگی جس سے یہ گنہگار ہوگا اور بجائے فرماں بردار اور سعادت مند کے نافرمان اور بدبخت شمار ہوگا، واللہ اعلم۔

سوال نمبر (۸) معمر افراد کی اجتماعی کفالت کے لئے زکوۃ کا استعمال:

زکوۃ کے مصارف خود قرآن مجید میں تفصیل سے بتادیئے گئے ہیں:

"إنما الصدقات للفقراء والمساكين الآية" (سورہ توبہ: ۶۰) (زکوۃ تو حق ہے مفلسوں کا اور محتاجوں کا)۔

ان مصارف کے علاوہ کہیں بھی زکوۃ کا صرف کرنا درست نہیں ہے، اور چونکہ ادائیگی زکوۃ کا حکم دیتے ہوئے "آتوا الزکوۃ" کہا گیا ہے، اور لفظ ایتاء استعمال کیا گیا ہے، لہذا زکوۃ میں تملیک شرط ہے، اس لئے کہ ایتاء کا لفظ اس بات کا متقاضی ہے کہ دینے والے کے ساتھ وہ شخص بھی پایا جارہا ہو جس کو زکوۃ دی جارہی ہے، چنانچہ فقہاء نے اس کی صراحت کی ہے، اور ان جہات میں زکوۃ صرف کرنے سے منع کردیا ہے جہاں تملیک نہیں پائی جاتی، اگر چہ وہ نیکی ہی کے کام ہوں، اور اس سے محتاجوں کو فائدہ ہو:

"ولا يجوز أن يبنى بالزكوة المسجد وكذا القناطر والسقايات وإصلاح الطرقات وكرى الأنهار والحج والجهاد وكل ما لا تمليك فيه ولا يجوز أن يكفن بها ميت ولا يقضى بها دين الميت كذا فى التبيين" (ہندیہ ۱/ ۱۸۸)

(اور یہ جائز نہیں ہے کہ زکوۃ سے مسجد، اسی طرح پلوں، سبیلوں راستوں کی اصلاح، نہر کی کھدائی اور حج وجہاد کے کام کئے جائیں اور کوئی بھی ایسا کام جس میں تملیک نہ ہو اور جائز نہیں ہے کہ اس سے میت کو کفن دلایا جائے، نہ ہی اس سے میت کا دین ادا کیا جائے)۔

لہذا جس طرح دوسرے محتاجوں اور ضرورت مندوں کو زکوۃ دی جاسکتی ہے، اسی طرح ادائیگی زکوۃ کی شرائط (مثلاً محتاجی، اصل یا فرع نہ ہونا، زوجیت کا تعلق نہ ہونا، مسلمان ہونا وغیرہ) پائے جانے پر بوڑھے افراد کو بھی دی جاسکتی ہے، زکوۃ اکٹھا کرکے ان کی اس طرح اجتماعی کفالت بھی کی جاسکتی ہے کہ زکوۃ کی رقم سے کھانا تیار کراکے ان کو دیدیا جائے، یا کپڑے تیار کرکے ان کے حوالہ کردیئے جائیں یا دوائیں مہیا کرادی جائیں، یا دوسری ضروریات کی چیزیں مہیا کراکے ان کے سپرد کردی جائیں، لیکن یہ درست نہیں ہوگا کہ زکوۃ کی رقم سے کوئی عمارت سرائے کے انداز میں بنوادی جائے تاکہ معمر افراد اس میں رہا کریں، یا زکوۃ کی رقم ان

پر اس انداز میں صرف کی جائے جس میں تملیک نہ پائی جاتی ہو، اس لئے کہ اوپر کی عبارت میں اس سے صراحتاً منع کیا گیا ہے، اور وجہ یہ ہے کہ زکوۃ میں تملیک شرط ہے اور اس میں یہ شرط مفقود ہوگی، واللہ اعلم۔

سوال نمبر (۹) معمر افراد کے لئے مخصوص سہولیات سے دوسروں کو فائدہ اٹھانا:

حکومت نے معمر افراد کے لئے بہت سی سہولیات رکھی ہیں، اور ان سہولیات سے فائدہ اٹھانے کے لئے خاص عمر تک پہنچنے کی قید لگادی ہے، اگر کوئی اس حد عمر تک نہیں پہنچا ہے تو اس کے لئے ان سہولیات سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں ہے، اس کی تین وجوہات ہیں:

۱۔ اپنی عمر غلط بتانا ایک جھوٹ ہے، اور جھوٹ بولنا حرام ہے، کتاب وسنت میں جھوٹ کی حرمت کے بے شمار دلائل ہیں، اور یہ ان محرمات میں سے ہے جو دوسرے مذاہب میں بھی جائز نہیں ہیں۔

۲۔ اگر اس کا جھوٹ پکڑا جائے تو اس کو سزا اور بے عزتی کا سامنا کرنا پڑے گا، لہذا جان بوجھ کر اپنے آپ کو مصیبت میں ڈالنا جائز نہیں ہے، شریعت میں بے شمار ایسی چیزیں ہیں جو سد ذریعہ کے طور پر منع ہیں۔

۳۔ حکومت کے جو قوانین شریعت سے متصادم نہ ہوں ان پر عمل کرنا بہ حیثیت ایک معاہد کے ہماری شرعی اور قانونی ذمہ داری ہے، اور یہ شرائط بھی اسی دائرہ میں آتی ہیں، لہذا اس حیثیت سے بھی ایسا کرنا درست نہیں ہے، واللہ اعلم۔

معذوروں اور سن رسیدہ اشخاص کے شرعی حقوق

ڈاکٹر مفتی محمد شاہجہاں ندوی[1]

تمہید:

بیماروں، معذوروں اور بوڑھوں کے حقوق کی رعایت پر اسلام نے بڑا زور دیا ہے تا کہ سماجی اور اجتماعی کفالت حاصل ہو، اور ایسے لوگوں کو دنیا میں تنہائی کا احساس نہ ہو، چنانچہ احادیث پاک میں بیمار افراد کو نہ بھولنے کی بڑی تاکید کی گئی ہے، جیسا کہ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''من عاد مريضا، أو زار أخاله في الله، ناداه مناد أن طبت وطاب ممشاك، وتبوأت من الجنة منزلا''

(سنن ابن ماجہ حدیث نمبر: ۱۴۴۳، بیہقی، شعب الایمان حدیث نمبر: ۹۰۲۶، ۹۰۲۷، اور اس کی سند حسن درجہ کی ہے)

(جو کسی بیمار کی مزاج پرسی کرے، یا اپنے دینی بھائی کی زیارت کرے، تو آسمانی فرشتہ اسے آواز دیتا ہے کہ تم اچھے رہے اور تمہارا چلنا خوشگوار رہا، اور جنت میں تم نے اپنے لیے مکان بنالیا)۔

معذوروں کے حقوق، ان کی خواہشات اور جذبات کا خاص خیال رکھنے کی بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تاکید کی ہے، چنانچہ عمرو بن الجموح سخت لنگڑے تھے، اور ان کے چاروں بیٹوں کی رائے تھی کہ وہ جنگ احد میں شریک نہ ہوں، لیکن ان کی خواہش تھی کہ وہ اپنے لنگڑے پن کے ساتھ جنت میں چلیں، لہذا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے تو ان کے سامنے شرعی حکم بیان فرمایا کہ آپ معذور ہیں، اس لئے آپ پر جہاد فرض نہیں، لیکن ان کی خواہش کے احترام میں ان کے بیٹوں سے سفارش کی:

''ما عليكم ألا تمنعوه، لعل الله يرزقه شهادة''

(تم پر کوئی مضائقہ نہیں کہ تم انہیں جنگ میں شریک ہونے سے باز نہ رکھو، شاید اللہ تعالی ان کو شہادت نصیب فرمادے)۔

چنانچہ وہ جنگ میں شریک ہوئے اور شہادت کا درجہ حاصل کیا، تب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے بارے میں فرمایا کہ اللہ کے کچھ بندے ایسے ہوتے ہیں جو اگر اللہ کی قسم کھالیں تو اللہ ان کو سچا کردے، عمرو بن الجموح بھی ان ہی افراد میں سے ہیں، میں نے ان کو اپنے لنگڑے پن کے ساتھ جنت میں ٹہلتے ہوئے دیکھا) (صحیح ابن حبان، حدیث نمبر: ۷۰۲۴، راوی حدیث: جابر بن عبداللہ)۔

اسی طرح سن رسیدہ افراد، خواہ باپ دادا ہوں، یا چچا، ماموں ہوں یا پھوپھا، سگے بھائی ہوں یا چچازاد بھائی اسلام نے ان کے احترام اور ان کے ساتھ حسن سلوک پر آمادہ کیا ہے، جیسا کہ حضرت ابوموسی اشعریؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''إن من إجلال الله: إكرام ذي الشيبة المسلم'' (سنن ابی داؤد، حدیث نمبر: ۴۸۴۳، بخاری، الادب المفرد حدیث نمبر: ۳۵۷، اور یہ حسن درجہ کی حدیث ہے) (مسلمان بوڑھے شخص کا احترام اللہ تعالی کی تعظیم کا حصہ ہے)۔

اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ مسواک کر رہا ہوں، اور دو اشخاص اسے لینا چاہتے ہیں، میں نے ان میں سے چھوٹے کو مسواک بڑھادی، تو فرشتے کی طرف سے مجھ سے کہا گیا: ''كبر، فدفعته إلى الأكبر'' (صحیح مسلم حدیث نمبر: ۲۲۷۱، بخاری بہ طور تعلیق حدیث نمبر: ۲۴۶) (بڑے کو دیجئے سو میں نے عمر رسیدہ شخص کو مسواک دی)۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس امر پر بھی توجہ دلائی کہ جو صحت اور جوانی کی حالت میں سن رسیدہ افراد کے حقوق کی رعایت کرے گا، اللہ تعالی اس کے لئے اس کے بڑھاپے کے وقت اس کے حقوق کی رعایت کرنے والے افراد فراہم کرے گا، چنانچہ حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ رسول

---

[1] عمید کلیۃ القرآن، جامعہ اسلامیہ، شانتاپورم، مالاپرم، کیرالہ۔

کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''ما أكرم شاب شيخا لسنه إلا قيض الله له من يكرمه عند سنه''
(ترمذی حدیث نمبر: ۲۰۲۲، بیہقی، شعب الایمان حدیث نمبر: ۱۰۹۹۳، اور یہ حسن درجہ کی حدیث ہے) (عمر درازی کی بنا پر کوئی جوان کسی بوڑھے کا اکرام نہیں کرے گا، مگر اللہ تعالی اس کے لئے اس کے بڑھاپے کے وقت ایسے افراد مامور کردے گا جو اس کا اکرام کریں گے)۔

اور یحییٰ بن سعید مدنیؒ کہتے ہیں کہ ہمیں سلف سے یہ بات پہنچی کہ

''من أهان ذا شيبة لم يمت حتى يبعث الله عليه من يهين شيبته إذا شاب'' (ابن ابی الدنیا، العمر والشیب ص/ ۵۳، اثر نمبر: ۱۵) (جو کسی بوڑھے کی توہین کرے گا، تو اسے اس وقت تک موت نہیں آئے گی، یہاں تک کہ اللہ تعالی اس کے پاس ایسے شخص کو مامور کردے تو بوڑھا ہونے کے وقت اس کے بڑھاپے کی تذلیل کرے)۔

اس تفصیل سے یہ بات پوری طرح واضح ہے کہ سماج کے معذور اور بوڑھے افراد کے حقوق کی طرف خصوصی توجہ سب سے پہلے اسلام نے دلائی ہے۔

اس مختصر تمہید کے بعد سوالات کے جوابات درج ہیں:

سوال نمبر (۱):

الف: باپ اگر بڑھاپے کی عمر کو پہنچ جائے، لیکن اتنا کمزور نہیں کہ کسب معاش نہ کرسکے تو اولاد کے لئے مناسب نہیں کہ باپ کو محنت ومشقت پر مجبور کرے، کیونکہ اللہ تعالی نے ان کو اف تک کہنے سے منع کیا ہے، جیسا کہ ارشاد ہے: "فلا تقل لهما أف ولا تنهرهما" (الاسراء: ۲۳) (تو نہ ان کو اف کہو اور نہ ان کو جھڑکو)۔

اور یہ واضح ہے کہ ان سے محنت ومشقت کرانے میں ان کے لئے زیادہ اذیت اور تکلیف ہے، لہذا اولاد بوڑھے والد کو کسب معاش پر مجبور نہیں کرسکتی ہے، جیسا کہ ابن نجیم رقمطراز ہیں:

''فلو كان كل منهما كسوبا يجب أن يكتسب الابن وينفق على الأب، فالمعتبر في إيجاب نفقة الوالدين مجرد الفقر، قيل: هو ظاهر الرواية'' (ابن نجیم، البحر الرائق، کتاب النکاح، باب النفقۃ ۴/ ۲۲۴، نیز دیکھئے: زیلعی، تبیین الحقائق ۳/ ۶۳ علی حیدر، درر الحکام ۱/ ۴۱۹، حصکفی، الدر المختار مع رد المحتار ۳/ ۶۲۳) (سو اگر باپ بیٹا دونوں میں سے ہر ایک کمانے پر قادر ہو تو بیٹے پر کمانا اور باپ پر خرچ کرنا واجب ہے، چنانچہ والدین کے نفقہ کے وجوب کے سلسلہ میں محض محتاجی کا اعتبار ہے، کہا گیا ہے کہ یہی ظاہر الروایہ ہے)۔

ب: دیگر اعزاء واقارب کے ذمہ کسی شخص کا نفقہ اس وقت واجب ہے، جبکہ وہ (۱) محتاج ہوں، (۲) اور کسب معاش پر قدرت نہ رکھتا ہو۔

علامہ کاسانی لکھتے ہیں: ''أحدها إعساره۔ والثاني: عجزه عن الكسب۔ حتى لو كان صحيحًا مكتسبًا لا يقضى له بالنفقة على غيره، وإن كان معسرًا'' (کاسانی، بدائع الصنائع ۴/ ۳۵) (ان میں سے پہلی شرط: جس کا نفقہ دیا جائے اس کی محتاجی ہے اور دوسری شرط: کمانے سے اس کا عاجز ہونا ہے۔ یہاں تک کہ اگر تندرست اور کمانے پر قادر ہو تو دوسرے شخص پر اس کے نفقہ کا فیصلہ نہیں کیا جائے گا، اگرچہ وہ محتاج ہو)۔

سوال نمبر (۲):

سن رسیدہ حضرات کا نفقہ وعلاج دوسروں پر درج ذیل صورتوں میں واجب ہے:

۱۔ باپ دادا کا نفقہ ان کی محتاجی کی صورت میں واجب ہے، کاسانی لکھتے ہیں:

''فإنه يقضى بنفقة الأب، وإن كان قادرا على الكسب بعد أن كان معسرا على ولده الموسر، وكذا نفقة الجد على ولد ولده إذا كان موسرًا'' (کاسانی، بدائع الصنائع ۴/ ۳۵) (سو باپ کے نفقہ کا فیصلہ اس کے مالدار بچہ کے ذمہ کیا جائے گا، خواہ وہ کمانے پر قادر ہو جبکہ وہ محتاج ہو، اور ایسے ہی دادا کے نفقہ کا فیصلہ اس کے مالدار پوتے کے ذمہ کیا جائے گا)۔

۲۔ ذو رحم محرم اعزہ واقارب کا نفقہ اس وقت واجب ہے جب کہ وہ محتاج اور کمانے پر قادر نہ ہوں۔

۳۔ باپ محتاج ہو اور ایسے مرض میں مبتلا ہو جس سے شفایابی اللہ تعالی کے حکم سے بار بار کے تجربہ سے ثابت ہو تو ایسی حالت میں اولاد پر سن رسیدہ والد یا دادا

وغیرہ کا علاج کرانا واجب ہے، کیونکہ دنیوی معاملات کا دارومدار غلبہ ظن پر ہے، اور نفس انسانی کی حفاظت مقاصد شریعت میں سے ہے، اور خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے علاج کروایا ہے اور دوسروں کو علاج کرانے کا حکم دیا ہے، جیسا کہ اسامہ بن شریکؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بدوؤں نے پوچھا کہ کیا ہم علاج کرائیں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا:

''تداووا فإن الله عزوجل لم يضع داءً إلا وضع له دواءً، غير داء واحد: الهرم'' (سنن ابی داؤد حدیث نمبر: ۳۸۵۵، اور اس حدیث کی سند صحیح ہے)۔

(علاج کراؤ کیونکہ اللہ عزوجل نے کوئی ایسی بیماری نہیں رکھی جس کی دوا پیدا نہ کی گئی ہو، سوائے ایک بیماری یعنی بوڑھاپے کے)۔

اور ابن حزمؒ لکھتے ہیں: ''وأمره ﷺ بالتداوي نهي عن تركه'' (ابن حزم، المحلی ۶/۹۶)

(اور سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کا علاج کرانے کا حکم دینا، علاج ترک کرنے سے منع کرنا ہے)۔

۴۔ سن رسیدہ اعزہ واقارب محتاج ہوں، اور ایسے مرض میں مبتلا ہوں جس کے ساتھ کسب معاش کی قدرت نہ ہو، اور وہ مرض ایسا ہو جس سے شفایاب ہونا بار بار کے تجربہ سے ثابت ہو تو اس حد تک ان کا علاج کرانا ان کے رشتہ داروں پر واجب ہے۔

خلاصہ یہ کہ محتاج سن رسیدہ رشتہ دار کی شفایابی کا گمان غالب ہو تو اس حد تک علاج کرانا واجب ہے، اگرچہ اصلاً علاج کرانا واجب نہیں ہے، جیسا کہ ابن تیمیہ لکھتے ہیں، اگرچہ اصلاً علاج کرانا واجب نہیں ہے، جیسا کہ ابن تیمیہ لکھتے ہیں: ''وأما التداوي فليس بواجب عند جماهير الأئمة، وإنما أوجبه طائفة قليلة، كما قاله بعض أصحاب الشافعي وأحمد'' (ابن تیمیہ، الفتاوی الکبری ۳/۷)

(بہرحال علاج ومعالجہ کرانا تو جمہور ائمہ کے نزدیک واجب نہیں ہے، بس ایک قلیل گروہ نے اسے واجب قرار دیا ہے، جیسا کہ یہی امام شافعی اور احمد کے بعض متبعین کا قول ہے)۔ لیکن چونکہ دنیوی معاملات کا دارومدار غلبہ ظن پر ہے، اور مخصوص دوا کے ذریعہ اللہ تعالی کے حکم سے شفایابی بار بار کے تجربہ سے ثابت ہے، لہذا جس مرض سے شفایابی کا گمان غالب ہو اس سے علاج کرانا واجب ہے۔

سوال نمبر (۳):

صاحب ثروت سن رسیدہ یا خاندان کے وہ بڑے جن کا نفقہ ان کے چھوٹوں پر محتاجی کی صورت میں واجب ہے، وہ اپنی اولاد سے یا ان لوگوں سے جن پر بہ حالت حاجت نفقہ واجب ہوتا ہے، زیادہ سہولت کی خاطر یا دوسرے لوگوں پر خرچ کرنے کے لئے یا کچھ رقم محفوظ کرنے کے لئے زائد رقم کا مطالبہ نہیں کر سکتے ہیں، کاسانیؒ لکھتے ہیں:

''إذا كان مستغنيا بماله كان إيجاب النفقة في ماله أولى من إيجابها في مال غيره'' (کاسانی، بدائع الصنائع ۴/۳۴ بیروت، دار الکتاب العربي، ۱۹۸۲ء) (جب وہ شخص جس کا نفقہ واجب ہوتا ہے، اپنے مال کی وجہ سے بے نیاز ہو، تو اس کے مال میں نفقہ واجب قرار دینا دوسرے کے مال میں نفقہ واجب قرار دینے سے ارجح ہے)۔

سوال نمبر (۴):

(الف): ماں باپ کی اجازت سے زیادہ آمدنی کے لئے لڑکوں کا اپنے ماں باپ کو چھوڑ کر دوسری جگہ جانا جائز ہے، چنانچہ حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص یمن سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ہجرت کر کے آیا، سو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے پوچھا:

''هل لك أحد باليمن؟ فقال: أبوايد، قال: أذنا لك؟ قال: لا، قال: ارجع إليهما فاستأذنهما، فإن أذنا لك فجاهد، وإلا فبرهما'' (سنن ابی داؤد، حدیث نمبر: ۲۵۳۰، اور یہ صحیح درجہ کی حدیث ہے)

(یمن کے اندر تمہارا کوئی ہے، تو اس نے جواب دیا: میرے ماں باپ زندہ ہیں، تب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت کیا کہ ان دونوں نے کیا اجازت دی؟ تو اس شخص نے جواب دیا نہیں، اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ان کے پاس لوٹ جاؤ، اور ان سے اجازت طلب کرو، سو اگر وہ تجھے اجازت دے دیں تو جہاد میں حصہ لو، ورنہ ان کے ساتھ حسن سلوک کرو)۔

چونکہ ماں باپ کی خدمت اوران کے ساتھ حسن سلوک فرض عین ہے، اور جہاد عمومی حالات میں فرض کفایہ ہے، لہذا والدین کی اجازت شرکت کے لئے ضروری ہے، البتہ اگر جہاد فرض عین ہو جائے، تو عمومی مصلحت کو خصوصی مصلحت پر ترجیح دی جائے گی، اور اس وقت اجازت کی ضرورت نہ ہوگی۔

امام بغوی لکھتے ہیں:

هذا في جهاد التطوع لايخرج إلا بإذن الأبوين إذا كانا مسلمين، فإن كان الجهاد فرضا متعينًا، فلا حاجة إلى إذنهما، وإن منعاه، عصاهما وخرج. وكذلك لايخرج إلى شئي من التطوعات كالحج والعمرة، والزيارة ولايصوم التطوع إذا كره الوالدان المسلمان، أو أحدهما، إلا بإذنهما، وما كان فرضا فلا يحتاج فيه إلى إذنهما'' (بغوی، شرح السنه ۱۰/ ۳۷۸، بیروت، المکتب الاسلامی، ۱۴۰۳ھ)

(یہ حکم نفلی جہاد کی صورت میں ہے کہ ماں باپ کی اجازت کے بغیر نہ نکلے جبکہ مسلمان ہوں، سو اگر جہاد فرض عین ہو جائے، تو ان کی اجازت کی ضرورت نہیں، اور اگر وہ اسے منع کریں تو ان کی نافرمانی کرتے ہوئے نکل جائے، اور ایسے ہی نفلی امور جیسے نفلی حج، عمرہ اور زیارت کے لئے ان کی اجازت کے بغیر نہ نکلے، اور نفلی روزہ نہ رکھے، اگر مسلمان ماں باپ یا ان میں سے کوئی ایک ناپسند کرے، البتہ فرض عین میں ان کی اجازت کی ضرورت نہیں ہے)۔

(ب): اصولی اعتبار سے بہو پر ساس سسر کی خدمت واجب نہیں ہے، عمرو بن الاحوص جشمیؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع سے ارشاد فرمایا:

''ألا واستوصوا بالنساء خيرًا، فإنما هن عوان عندكم ليس تملكون منهن شيئًا غير ذلك'' (سنن ترمذی، حدیث نمبر: ۱۱۶۳)

(خوب سن لو، میں تمہیں عورتوں کے ساتھ بھلائی کی نصیحت کرتا ہوں، تم اس نصیحت کو قبول کر لو، اس لئے کہ وہ خواتین تمہارے پاس محبوس و مقید رہتی ہیں، اس کے علاوہ شرعاً ان پر تمہارا کوئی اختیار نہیں)۔

البتہ اگر ماں کو اپنی ضروریات کے لئے تعاون کی ضرورت ہو، اور وہ تعاون ایسا ہو جس کو بیٹا خود انجام نہ دے سکتا ہو، اور بہو اس خدمت کو بجا لانے پر راضی نہ ہو تو بیٹے کو چاہئے کہ وہ ان کے لئے خادم یا خادمہ فراہم کرے، البحر میں ہے:

''وأشار بقوله: ولأبويه، إلى أن جميع ما وجب للمرأة، يجب للأب والأم على الولد من طعام وشراب وكسوة وسكنى حتى الخادم، قال في الخانية: وكما يجب على الابن الموسر نفقة والده الفقير، تجب عليه نفقة خادم الأب، امرأة كانت الخادم أو جارية، إذا كان الأب محتاجًا إلى من يخدمه'' (البحر الرائق ۴/ ۲۵۰)

(اور مصنف نے اپنے قول: ''اور والدین کے لئے'' سے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ تمام وہ چیزیں جو بیوی کے لئے واجب ہیں، وہ سب اولاد پر والدین کے لئے بھی واجب ہیں، جیسے کھانے پینے کی چیز، لباس اور رہائش، یہاں تک کہ خادم بھی، خانیہ میں ذکر کیا ہے کہ جس طرح مالدار بیٹے پر محتاج والد کا نفقہ واجب ہے، اسی طرح اس پر باپ کے خادم کا نفقہ بھی واجب ہے، خادم (آزاد) عورت ہو یا باندی، جبکہ باپ کو ایسے آدمی کی ضرورت ہو جو اس کی خدمت کرے)۔

اور شیخ محمد شربینی خطیب شافعی تحریر کرتے ہیں: ''ويجب له مؤونة خادم إن احتاجه'' (مغنی المحتاج ۳/ ۴۴۹)

(اور رشتہ دار جس کو نفقہ دیا جائے، اس کے خادم کا نفقہ بھی واجب ہے، اگر اسے اس کی ضرورت ہو)، اور اگر بیٹے کی مالی حیثیت ایسی نہ ہو کہ خادم فراہم کر سکے، اور نہ ہی وہ خدمت یہ خود انجام دے سکتا ہو، تو ایسی حالت میں بیوی کی سعادت مندی ہے کہ وہ اپنے شوہر کے والدین کی خدمت خوش دلی سے اپنی سعادت اور باعث اجر سمجھ کر انجام دے، اور ساس سسر کو بھی چاہئے کہ بہو کی خدمت کی قدر کریں اور اس کا بدلہ دینے کی کوشش کریں۔

اور ایسی ناگزیر حالت میں بہو کو ساس سسر کے ساتھ رہنے پر مجبور کرنے کی گنجائش ہے، البحر میں ہے:

''وإن كان الوالد لايقدر على عمل، أو كان زمنا، وللابن عيال كان على الابن أن يضم الأب إلى عياله، وينفق على الكل'' (البحر الرائق ۴/ ۳۴۹)

(اور اگر والد کام کی قدرت نہ رکھتا ہو، یا اپاہج ہو، اور محتاج بیٹے کا کنبہ ہو تو (محتاج) بیٹے پر لازم ہے کہ باپ کو اپنے کنبہ میں شامل کرے، اور سب پر خرچ کرے)۔

(ج): والدین کی خدمت بیٹا اور بیٹی دونوں پر واجب ہے، ارشاد الٰہی ہے:

ووصینا الإنسان بوالدیه (لقمان:۱۴) (اور ہم نے انسان کو اپنے والدین کا حق پہچاننے کی خود تاکید کی ہے)۔

اور یہ واضح ہے کہ انسان میں مرد وعورت دونوں شامل ہیں۔ اور شوہر کو چاہئے کہ اپنی بیوی کو اس کے ماں باپ کی زیارت اور خدمت سے نہ روکے، ہندیہ میں ہے:

''لا یمنعها من الخروج إلی الوالدین فی کل جمعة مرة، وعلیه الفتوی'' (عالمگیری ۱/ ۵۵۷، بیروت، دار الفکر، ۱۴۱۱ھ)

(بیوی کو ہر جمعہ ایک بار والدین کے پاس جانے سے نہ روکے، اور اسی پر فتوی ہے)۔

دراصل فقہاء کرام نے میکہ بار بار جانے سے روکنے کا حق شوہر کو اس لئے دیا ہے تا کہ شوہر کو ضرر لاحق نہ ہو، اور بہ کثرت زیارت اور اختلاط کے نتیجہ میں فتنہ وفساد نہ پیدا ہو، لیکن بیوی کے والدین کو خدمت کی سخت حاجت ہو، اور شوہر کا اس سے کوئی خاص ضرر نہ ہو، تو انسانیت اور حسن اخلاق کے تقاضے میں شوہر کو اجازت دے دینی چاہئے۔

اس سلسلہ میں میاں بیوی باہمی مشورہ سے اچھا تال میل بنا سکتے ہیں، تا کہ کسی کی حق تلفی نہ ہو۔

سوال نمبر (۵) اولاد کا اپنے والدین میں سے کسی کے نکاح میں رکاوٹ بننا:

بیٹے اور بیٹیوں کا اپنی والدہ کے فوت ہونے کے بعد والد کے دوسرے نکاح میں رکاوٹ بننا درست نہیں ہے، اس لئے کہ دوسری شادی کرنا باپ کا حق ہے اور کسی کو اس کے حق سے روکنا سراسر ظلم ہے، اور ظلم حرام ہے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے: "واللہ لا یحب الظالمین" (آل عمران: ۵۷) (اور اللہ ظالموں کو دوست نہیں رکھتا) اور ایک جگہ ارشاد ہے: "أن لعنة الله علی الظالمین" (الاعراف: ۴۴) (کہ اللہ کی لعنت ہو ظالموں پر) اور نیز ارشاد ہے: "ألا لعنة الله علی الظالمین" (ہود: ۱۸) (خبردار کہ اللہ کی لعنت ہے ظالموں پر)۔

اور حدیث قدسی میں وارد ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالی فرماتا ہے:

''یا عبادی إنی حرمت الظلم علی نفسی وجعلته بینکم محرما، فلا تظالموا'' (صحیح مسلم حدیث نمبر: ۲۵۷۷)

(اے میرے بندو، میں نے اپنی ذات پر ظلم کو حرام ٹھہرایا ہے اور اسے تمہارے درمیان بھی حرام قرار دیا ہے، لہذا آپس میں ظلم نہ کرو)۔

اور ایک انسان اپنی عفت و پاکدامنی کی حاجت اور اپنی ضروریات کو خود سمجھ سکتا ہے، اور اسلام میں ہر عمر میں نکاح مباح ہے، چنانچہ حضرت علقمہ کہتے ہیں کہ میں حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کے ساتھ منی میں چل رہا تھا کہ اسی دوران حضرت عثمانؓ نے ان سے ملاقات کی، اور وہ ان کے ساتھ بات کرنے لگے، پھر حضرت عثمانؓ نے ان سے کہا، اے ابو عبد الرحمن:

ألا نزوجك جارية شابة لعلها تذكرك بعض ما مضى من زمانك، قال: فقال عبدالله: لئن قلت: ذاك، لقد قال لنا رسول الله ﷺ: يا معشر الشباب من استطاع منكم الباءة فليتزوج، فإنه أغض للبصر، وأحصن للفرج، ومن لم يستطع فعليه بالصوم، وإنه له وجاء'' (صحیح مسلم حدیث نمبر: ۱۴۰۰)

(کیا ہم آپ کی شادی نوجوان دوشیزہ سے نہ کرا دیں، شاید وہ آپ کو گزشتہ زمانہ کی کچھ یاد دلا دے، علقمہ کہتے ہیں عبد اللہ بن مسعودؓ نے فرمایا: آپ نے جو بات فرمائی ہے (اس سے بہتر بات) رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہم سے فرمائی ہے: ''اے گروہ جوانان! تم میں سے جسے نان ونفقہ پر قدرت ہو، وہ شادی کر لے، کیونکہ اس سے نگاہ پست رہتی ہے اور شرمگاہ کی حفاظت ہوتی ہے، اور جسے قدرت نہ ہو تو وہ مسلسل روزہ رکھے کہ اس سے اس کی شہوت ٹوٹے گی)۔

اور اس حدیث میں ''جوان'' کی قید محض اتفاقی ہے، جس کے اندر بھی جنسی شہوت ہو اسے نکاح کرنا چاہئے۔

نیز فقہاء کرام نے اس بات کی صراحت کی ہے کہ محتاج باپ کی شادی کرانا بھی اولاد کی ذمہ داری ہے، اور ان دونوں کا نفقہ بھی ان پر لازم ہے۔

علامہ شامیؒ لکھتے ہیں: ''فالظاهر وجوب نفقة الأم عليه، ولو لم يكن الأب محتاجا إليها، لقولهم: لا يشارك الولد فی نفقة أبويه أحد'' (ابن عابدین، رد المحتار ۲/ ۶۷۶)

(سو بہ ظاہر ماں کا نفقہ بھی اولاد پر واجب ہوگا، خواہ باپ کو بیوی کی ضرورت نہ ہو، اس لئے کہ فقہاء کہتے ہیں کہ والدین کے نفقہ میں کوئی اولاد کے ساتھ شریک نہ ہوگا)۔

سوال نمبر (۶) والد کی زندگی میں جائیداد کے بٹوارے کا مطالبہ:

۱۔ والد کی زندگی میں جائیداد کا مطالبہ کرنا درست نہیں، خواہ اولاد محتاج ہوں، کیونکہ میراث بہ طور نیابت ورثاء کی طرف مورث کے انتقال کے بعد منتقل ہوتی ہے۔

ہندیہ میں ہے: ''والإرث فی اللغة: البقاء، وفی الشرع: انتقال مال الغیر إلی الغیر علی سبیل الخلافة، (و) الترکة تتعلق بها حقوق أربعة: جهاز المیت ودفنه والدین والوصیه والمیراث۔ ... ثم یقسم الباقی بین الورثة علی سهام المیراث'' (عالمگیری ۶/ ۴۴۷)

(''ارث'' لغت میں باقی رہنے کو کہتے ہیں، اور شریعت کی اصطلاح میں: مرنے والے مورث کی نیابت کے طور پر دوسرے کے مال کا دیگر اشخاص کی طرف منتقل ہونے کا نام میراث ہے، (اور) ترکہ سے چار حقوق متعلق ہوتے ہیں: (۱) میت کی تجہیز و تکفین اور تدفین، (۲) دین کی ادائیگی، (۳) وصیت کی تنفیذ اور (۴) میراث۔..... پھر تجہیز و تکفین اور دین کی ادائیگی اور باقی ماندہ ترکہ سے تہائی کی وصیت کی تنفیذ کے بعد باقی مال ورثہ کے درمیان میراث کے حصے کے مطابق تقسیم ہوگا)۔ اس سے معلوم ہوا کہ اولاد کا حق والد کے مرنے کے بعد ہی بنتا ہے، تو پھر حق بننے سے پہلے اس کا مطالبہ کیوں کر درست ہوگا؟

۲۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "یوصیکم اللہ فی أولادکم للذکر مثل حظ الانثیین، فإن کن نساء فوق اثنتین فلهن ثلثا ما ترک" (النساء: ۱۱)

(اللہ تمہاری اولاد کے باب میں تمہیں ہدایت دیتا ہے کہ لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر ہے، اگر لڑکیاں دو سے زائد ہیں تو ان کے لئے ترکہ کا دو تہائی ہے)۔

اس آیت سے پتہ چلا کہ مورث کی وفات کے بعد ورثاء کا حق بنتا ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ باپ کے چھوڑے ہوئے مال میں سے لڑکیوں کو دو تہائی ملے گا، اگر وہ دو یا دو سے زائد ہیں۔

۳۔ ورثاء کے حصے کی تفصیل کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"ومن یعص اللہ ورسوله ویتعد حدوده یدخله نارًا خالدًا فیها وله عذاب مهین" (النساء: ۱۴)

(اور جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کریں گے، اور اس کے مقرر کردہ حدود سے تجاوز کریں گے، ان کو ایسی آگ میں داخل کرے گا جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور ان کے لئے ذلیل کرنے والا عذاب ہے)۔

یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ ورثاء کا اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ حدود سے تجاوز کرنا معصیت ہے، لہذا حق بننے سے پہلے ہی والد کی زندگی میں جائیداد کا مطالبہ شروع کر دینا حدود اللہ سے تجاوز کرنا ہے۔

۴۔ مورث جب تک زندہ ہے وہ اپنے مال کا مالک ہے، لہذا کسی سے جبرًا اس کے مال کا مطالبہ درست نہیں ہے، چنانچہ حضرت حنیفہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''إنه لایحل مال امرئ مسلم إلا بطیب نفس منه'' (مسند احمد حدیث نمبر: ۲۰۶۹۵، اور یہ حسن درجہ کی حدیث ہے)
(کسی مسلمان شخص کا مال اس کی خوشنودی کے بغیر حلال نہیں ہے)۔

سوال نمبر (۷):

(الف): ایسے بے سہارا عمر دراز لوگوں کے لئے ہاسٹل بنانا جن کے قریبی رشتہ دار موجود نہیں ہیں تا کہ وہ اپنے ہم عمر لوگوں کے ساتھ مل جل کر خوشی خوشی اپنی زندگی گزار سکیں، مستحسن قدم ہے، کہ یہ نیکی پر تعاون کی ایک شکل ہے، اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"وتعاونوا علی البر والتقوی" (المائدہ: ۲) (تم نیکی اور تقوی میں تعاون کرو)۔

اور قرطبی لکھتے ہیں: ''والتعاون علی البر والتقوی یکون بوجوه، فواجب علی العالم أن یعین الناس بعلمه

فیعلمهم، ویعینهم الغنی بماله'' (قرطبی، الجامع لاحکام القرآن ۶/۴۷، ریاض، دار عالم الکتب، ۱۴۲۳ھ)

(اور نیکی اور تقوی پر تعاون مختلف شکلوں سے ہوتا ہے، لہذا عالم پر واجب ہے کہ اپنے علم کے ذریعہ لوگوں کی مدد کرے، سوان کو علم سکھائے، اور مالدار اپنے مال کے ذریعہ سے لوگوں کی مدد کرے)۔

(ب): ایسے عمر دراز لوگ جن کے قریبی رشتہ دار موجود ہیں، خاص طور سے جن کی اولاد یا اولاد کی اولاد موجود ہوں ایسے لوگوں کو سن رسیدہ افراد کے باشاؤں میں قیام پر مجبور کرنا درست نہیں ہے، اس کے دلائل درج ذیل ہیں:

۱۔ اللہ تعالی کا ارشاد ہے: "وبالوالدین إحسانا إما یبلغن عندك الكبر أحدهما أو كلاهما، فلا تقل لهما أف ولا تنهرهما وقل لهما قولا كريما" (الاسراء: ۲۳) اور ماں باپ کے ساتھ نہیت اچھا سلوک کرو، اگر وہ تیرے سامنے بڑھاپے کو پہنچ جائیں ان میں سے، ایک یا دونوں تو نہ ان کو اف کہو، اور نہ ان کو جھڑکو اور ان سے شریفانہ بات کہو)۔

اس آیت میں "عندک" (تیرے پاس) کا لفظ صاف دلالت کرتا ہے کہ بزرگ اور سن رسیدہ والد اولاد کے پاس رہیں گے۔

۲۔ ان آیت میں اف کہنے کی ممانعت ہے، اور اولاد اور اولاد کی اولاد کو دیکھ کر آنکھیں ٹھنڈی ہوں، بزرگوں کی اس خواہش کو حسرت میں تبدیل کر دینے میں زیادہ تکلیف ہے۔

۳۔ حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''لا یجزی ولد والده إلا أن یجده مملوكا فیشتریه فیعتقه'' (صحیح مسلم، حدیث نمبر: ۱۵۱۰)

(کوئی اولاد اپنے والد کے حق کا بدلہ نہیں دے سکتی مگر یہ کہ اسے مملوک غلام پائے، تو اسے خرید کر آزاد کر دے)۔

کیا والدین کے احسان کا بدلہ یہی ہے کہ ان کو اپنی خدمت سے دور کر دے؟

۴۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے ایک شخص کو اپنی ماں کو اپنی پشت پر لے کر طواف کرتے ہوئے دیکھا، جس نے اس سے پوچھا، اے ابن عمر! آپ کی کیا رائے ہے؟ میں نے ان کے حق کا بدلہ دے دیا؟ سو حضرت ابن عمرؓ نے ایک ہی سانس میں دومرتبہ فرمایا: نہیں، نہیں) (مسند بزار، حدیث نمبر: ۴۳۸۰، الادب المفرد حدیث نمبر: ۱۱، اور یہ اثر صحیح درجہ کی ہے)۔

۵۔ فقہاء کرام نے بھی اس بات کی صراحت کی ہے کہ ماں باپ کی خدمت سے فرار اختیار کرنا درست نہیں ہے، برہان الدین مازہ حنفی تحریر کرتے ہیں:

''خدمة الأب واجبة على الابن'' (محمود مازہ، المحیط البرہانی ۸/۴۰، بیروت، دار الاحیاء) (باپ کی خدمت بیٹے پر واجب ہے)۔

اور امام سرخسی حنفی تحریر کرتے ہیں: ''خدمتها أوجب عليه، فإنها أحوج إلى ذلك وأشفق عليه'' (سرخسی، المبسوط ۱۶/۱۰۷، بیروت، دار الفکر ۱۴۲۱ھ) (ماں کی خدمت بیٹے پر زیادہ واجب ہے، اس لئے کہ اسے اس کی زیادہ ضرورت ہے، اور وہ اس کے حق میں زیادہ مہربان ہے)۔

سوال نمبر (۸) ضعیف لوگوں کی زکوۃ کی مد سے کفالت:

بے سہارا عمر دراز لوگوں کی اجتماعی کفالت کے لئے خصوصی طور پر زکوۃ کی رقم استعمال کی جاسکتی ہے، کیونکہ ایسے حضرات فقراء اور مساکین میں داخل ہیں۔

اور اللہ تعالی کا ارشاد ہے: "إنما الصدقات للفقراء والمساكين والعاملين عليها والمؤلفة قلوبهم وفي الرقاب والغارمين وفي سبيل الله وابن السبيل فريضة من الله، والله عليم حكيم" (التوبہ: ۶۰)

(صدقات تو بس محتاجوں، مسکینوں، محصلین، صدقات اور تالیف قلب کے سزاواروں کے لئے ہیں، اور اس لئے کہ یہ گردنوں کے چھڑانے تاوان زدوں کے سنبھالنے، اللہ کی راہ اور مسافروں کی امداد میں خرچ کئے جائیں، یہ اللہ کا مقرر کردہ فریضہ ہے، اور اللہ علم والا اور حکمت والا ہے)۔

اور حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''والذی نفس محمد بیده، إن على الأرض من مؤمن إلا أنا أولى الناس به، فأيكم ترك دينا أو ضياعًا، فأنا

مولاہ، وأیکم ترك مالا، فإلی العصبة من کان'' (صحیح مسلم حدیث نمبر: ۱۶۱۹)

(اس ذات کی قسم جس کے دست قدرت میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی جان ہے، میں روئے زمین پر بسنے والے ہر مومن سے لوگوں سے زیادہ قریب ہوں، سو جو شخص قرض یا بے سہارا اولاد چھوڑ کر مر جائے، تو میں اس کا ذمہ دار ہوں، اور جو مال چھوڑ کر مر جائے تو وہ اس کے قریبی رشتہ دار کا ہے)۔

اس حدیث سے پتہ چلا کہ بے سہارا افراد کی سماجی کفالت بیت المال میں جمع زکوۃ کی رقم سے ہوگی۔

سوال نمبر (۹) مطلوبہ کی حد سے قبل حکومت کی رعایت سے فائدہ اٹھانا:

جو لوگ حکومت کی رعایتوں کے لئے مطلوب مقررہ حد عمر کو نہ پہنچے ہوں، ان کے لئے ایسی رعایتوں سے فائدہ اٹھانا ناجائز ہے کہ یہ دھوکہ دہی میں داخل ہے، جو مومن کی شان نہیں ہے، چنانچہ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''من غشنا فلیس منا'' (صحیح مسلم حدیث نمبر: ۱۰۱) (جو ہمیں دھوکہ دے وہ ہم میں سے نہیں)۔

اور اس میں مسلم کی قید اتفاقی ہے، کسی کو بھی دھوکہ دینا جائز نہیں ہے، خواہ فرد ہو یا گروہ، حکومت ہو یا پبلک، نیز اس میں جھوٹ بول کر رعایت حاصل کرنا ہے، اور جھوٹ بولنا حرام ہے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے: "فاجتنبوا الرجس من الأوثان واجتنبوا قول الزور" (الحج: ۳۰) (تو بتوں کی گندگی سے اجتناب رکھو، اور جھوٹ بات سے بچو)۔

اور حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''ألا أنبئکم بأکبر الکبائر؟ قال: قول الزور، أو شهادة الزور'' (صحیح البخاری حدیث نمبر: ۵۹۷۷، صحیح مسلم ۸۸)

(کیا میں تمہیں بڑے گناہوں میں بھی سنگین گناہ کی خبر نہ دوں؟ فرمایا: وہ سنگین گناہ جھوٹ بولنا یا جھوٹی گواہی دینا ہے)۔

لہذا جھوٹ بول کر رعایت حاصل کرنا درست نہیں ہے۔

خلاصہ بحث:

۱- اولاد بوڑھے باپ کو کسب معاش پر مجبور نہیں کر سکتی ہے۔

۲- ذو رحم محرم رشتہ دار پر نفقہ اس وقت واجب ہوتا ہے جبکہ نفقہ طلب کرنے والا شخص محتاج اور کسب معاش سے عاجز ہو۔

۳- جس مرض سے شفایابی بار بار کے تجربہ سے ثابت ہو، اس مرض کا علاج کروانا ان اشخاص پر واجب ہے جن پر محتاجی کی وجہ سے سن رسیدہ حضرات کا نفقہ واجب ہے۔

۴- بوڑھے والدین یا خاندان کے بڑے صاحب ثروت ہونے کی حالت میں زیادہ سہولت وغیرہ کی خاطر زائد رقم کا مطالبہ نہیں کر سکتے ہیں۔

۵- ماں باپ کی اجازت سے لڑکے زیادہ آمدنی کے لئے دوسری جگہ جا سکتے ہیں۔

۶- اصولی اعتبار سے بہو پر ساس سسر کی خدمت واجب نہیں ہے، لیکن ناگزیر حالت میں اسے ساس سسر کے ساتھ رہنے پر مجبور کرنے کی گنجائش ہے۔

۷- ماں باپ کی خدمت بیٹے اور بیٹیوں دونوں پر واجب ہے، اگر شوہر کو کوئی خاص ضرر نہ ہو تو اسے اپنی بیوی کو والدین کی خدمت کی اجازت دے دینی چاہئے

۸- والد کے دوسرے نکاح میں رکاوٹ بننا جائز نہیں ہے۔

۹- والد کی زندگی میں جائیداد کا مطالبہ کرنا درست نہیں ہے۔

۱۰- والدین کو ہاسٹل میں رکھنا ناجائز ہے۔

۱۱- بے سہارا بوڑھے افراد کی اجتماعی کفالت زکوۃ سے کی جا سکتی ہے۔

۱۲- جھوٹ بول کر رعایت حاصل کرنا ناجائز ہے۔

سماج کے مجبور افراد اور بوڑھوں کا نظام کفالت

مولانا محمد مصطفی عبدالقدوس ندوی [1]

اسلام نے معاشرہ کی تشکیل اور اس کا نظام کچھ ایسا بنایا ہے کہ معاشرہ کے کمزور اور مجبور افراد کی کفالت کا نظم خود بخود ہو جاتا ہے، اگر اسلام کے نظام کفالت پر عمل ہو تو سماج میں ایک بھی بھیکاری نظر نہیں آئے گا اور نہ ہی اولڈ ہاسٹل کی ضرورت پیش آئے گی، بہر حال معاشرہ کے کمزور اور مجبور افراد مختلف نوع کے ہیں، اور وہ یہ ہیں: بچے، بچی، بوڑھے، بوڑھی، بذات خود عورت کی ذات نسوانیت گو وہ جوان و بالغ ہو، اپاہج، فالج زدہ، اندھا، دونوں ہاتھ پیر کٹے، یا صرف دونوں ہاتھ یا پیر کٹے، مجنون، دماغ سے معذور اور محتاج ماں باپ، ہمیں آئندہ سطور میں انہیں سے متعلق نظام کفالت پر گفتگو کرنی ہے:

قرابت ولاد کی بنا پر وجود میں آنے والا نظام کفالت اور اس کے اصول وشرائط:

قرابت ولاد سے مراد اولاد اور والدین کے درمیان قائم ہونے والا رشتہ جزئیت وبعضیت ہے، اور اسی کی بنیاد پر کفالت کا ایک نظام وجود پذیر ہوتا ہے، جس کے کچھ اصول اور شرطیں ہیں جو اس طرح ہیں:

۱۔ ''الأصل أن نفقة الإنسان فی مال نفسه صغیرا کان أو کبیرا'' (ہدایہ مع الفتح ۴/ ۳۷۴، مختارات النوازل ۲/ ۲۰۲)

یعنی اصول یہ ہے کہ انسان کا نفقہ خود اس کے مال میں واجب ہوتا ہے، خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا، اس لئے کہ انسان کی جان خود اس کے پاس امانت ہے، جس کی حفاظت اس پر لازم ہے، کیونکہ قرآن نے انسان کو ہلاکت نفس اور قتل جاں سے منع فرمایا (بقرہ: ۱۹۵)۔

پس اگر باپ خوشحال مالدار ہو کہ ماں اور اپنی ضروریات کی کفالت کی صلاحیت رکھتا ہو تو ماں باپ کی کفالت اولاد پر واجب نہیں ہوگی، اسی طرح اگر اولاد خواہ لڑکا ہو یا لڑکی، نابالغ ہو یا بالغ اگر وہ مالدار ہیں تو انکا نفقہ باپ پر واجب نہیں ہوگا۔

۲۔ ''الأصل فی نفقة الوالدین والمولودین أنه یعتبر القرب بعد الجزئیة دون المیراث'' (ہدایہ وفتح القدیر ۴/ ۳۷۴، درمختار ورد المحتار ۵/ ۲۸۱)

یعنی اولاد اور والدین کے درمیان نفقہ واجب ہونے کی اساس جزئیت ہے، یعنی اولاد ماں باپ کے جزو حصہ ہیں، اس کے بعد محرم رشتہ داروں میں سب سے زیادہ قریب اولاد والدین سے، اور والدین اولاد سے ہیں، اسی جزئیت کی بنیاد پر عائد ہونے والے حقوق وفرائض کو قرآن نے یوں بیان کیا:

"وعلی المولود له رزقهن وکسوتهن بالمعروف" (بقرہ: ۲۳۳)

(اور دودھ پیتے بچے کے باپ پر ان عورتوں کا معروف طریقہ کے مطابق کھانا اور کپڑا واجب ہے)۔

اور جس طرح باپ پر اپنی جان کی حفاظت وصیانت اور اس کے اسباب کا انتظام کرنا واجب ہے، اسی طرح اپنے جزء، یعنی اولاد کی احیاء اور اس کی جان کی حفاظت ونگہداشت اور اس کے ذرائع کا انتظام کرنا لازم ہے، اسی طرح اس کے برعکس معاملہ ہے، نیز ماں باپ سے تعلق جوڑنا فرض ہے اور قطع تعلق بالاجماع حرام ہے، ''الولد جزء الوالد وإحیاء نفسه واجب، کذا إحیاء جزئه، واعتبار هذا المعنی یوجب النفقة من الجانبین، ولأن هذه القرابة مفترضة الوصل محرمة القطع بالإجماع'' (بدائع ۵/ ۱۴۰)، اور ترک نفقہ قطع تعلق ہے۔

۳۔ احتیاج وتنگدستی، یعنی اولاد اور والدین کے درمیان وجوب نفقہ احتیاج کے ساتھ معلول ہے، کیونکہ انسان جب خود مالدار ہو تو اس کا نفقہ خود اس پر اس کے

---

[1] استاذ جامعۃ الصالحات، گڑیہ اے پی۔

مال میں واجب ہوتا ہے، جیسا کہ ابھی اوپر ذکر آیا، اور اس کا نفقہ دوسرے پر واجب قرار دینے سے بے نیاز ہوجاتا ہے۔

''لأن وجوبها معلول بحاجة المنفق عليه، فلا تجب لغير المحتاج'' (بدائع ۵/۱۴۹)

''أما الولد فنفقته للحاجة، وبغناه اندفعت حاجته، فلا تجب على غيره'' (فتح القدير ۴/۳۷۲)۔

لہٰذا غیر محتاج کا نفقہ دوسرے پر واجب نہیں ہوگا۔

اب جہاں تک احتیاج کی حد کی بات کہ جس کی بنا پر والدین کا نفقہ اولاد پر اور اولاد کا نفقہ باپ پر واجب ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ والدین میں خود اپنی ضروریات مکمل کرنے کی صلاحیت نہ ہو، اور مرد اولاد میں اپنی ضروریات مکمل کرنے کی صلاحیت نہ ہونے کے ساتھ ساتھ وہ کمانے کے لائق بھی نہ ہو، البتہ لڑکی میں کمانے کی عدم صلاحیت وقدرت کی شرط نہیں ہے، صرف احتیاج کافی ہے (بدائع ۵/ ۱۵۴، مختارات النوازل ۲/ ۲۰۳، درمختار ورد المحتار ۵/ ۲۶۰)۔

۴۔ والدین کا نفقہ اولاد پر واجب ہونے کے لئے ان کا محتاج ہونا کافی ہے، کمانے سے قاصر ہونا شرط نہیں ہے، جبکہ مرد اولاد کا نفقہ والد پر واجب ہونے کے لئے احتیاج کے ساتھ کسب معاش کی صلاحیت سے محروم ہونا بھی شرط ہے (ہدایہ وفتح القدیر ۴/ ۲۷۹، درمختار ورد المحتار ۵/ ۲۶۰، رد المحتار ۵/ ۲۸۰)۔

۵۔ اولاد اور والدین کے درمیان وجوب کے لئے اتحاد دین شرط نہیں ہے، جیسا کہ لزوم نفقہ کے لئے قضا قاضی کی بھی شرط نہیں ہے، کیونکہ وجوب نفقہ کا بنیادی سبب جزئیت ہے، اور اختلاف دین کے ساتھ بھی جزئیت پائی جاتی ہے، اسی لئے قرآن نے والدین کے کافر ہونے کے باوجود ان کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا ہے (لقمان: ۱۵)، اور سب سے بڑا حسن سلوک ان کی کفالت کرنا ہے، اور ترک کفالت بالفاظ دیگر ان کو ایذا پہنچانا ہے (بدائع ۵/ ۱۳۹، ۱۵۵، ۱۵۶، ہدایہ وفتح القدیر ۴/ ۳۸۲)، اور قرآن نے اس سے منع کیا ہے (اسراء: ۲۳)۔

۶۔ بچیاں خواہ نابالغ ہوں یا بالغ، البتہ محتاج ہوں، شیر خوار بچے، نابالغ بچے جو ابھی کسب معاش کے لائق نہ ہوئے ہوں، اور بالغ معذور بچوں کا نفقہ باپ پر مطلق واجب ہوتا ہے، یعنی باپ خواہ مالدار ہو، یا غریب، کمانے کی طاقت رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو، کسب معاش کی صلاحیت رکھنے کی صورت میں کما کر کھلائے گا، اور صلاحیت نہ رکھنے کی صورت میں ایک قول کے مطابق بھیک مانگ کر کفالت کرے گا جبکہ دادا فوت ہو چکا ہو، یا موجود ہو، لیکن کسب معاش سے عاجز ہو اور خوش حال بھی نہ ہو (بدائع ۵/ ۱۵۳، رد المحتار ۵/ ۲۶۹، فتح القدیر ۴/ ۳۷۲)۔

۷۔ والدین کا نفقہ بیٹے پر واجب ہونے کے لئے بیٹے کا مالدار ہونا ضروری نہیں ہے؛ بلکہ کسب معاش کی صلاحیت رکھنا کافی ہے (درمختار مع الرد ۵/ ۲۷۹)۔

۸۔ باپ اور بیٹے دونوں مالدار نہ ہوں البتہ دونوں کسب معاش کی صلاحیت کے حامل ہیں تو بیٹا کما کر باپ کو کھلائے گا (حوالہ سابق ۵/ ۲۸۱)۔

(۹) باپ کے کسب معاش سے عاجز اور فوت ہو جانے کی صورت میں دادا باپ کے قائم مقام ہوگا (دیکھئے بدائع ۵/ ۱۴۶، فتح القدیر ۴/ ۳۷۲)۔

محتاج ماں باپ کی کفالت:

ماں باپ کا نفقہ اولاد پر دو وجہوں سے واجب ہوتا ہے، اول: جزئیت، دوم: قرابت، نفقہ کے وجوب کا سبب میراث نہیں ہے (درمختار ورد المحتار ۵/ ۲۸۱)۔

بدائع (۵/ ۱۴۰) میں ہے: ''والولد جزء الوالد وإحياء نفسه واجب كذا إحياء جزئه. واعتبار هذا المعنى يوجب النفقة من الجانبين، ولأن هذه القرابة مفترضة الوصل محرمة القطع بالإجماع، والإنفاق من باب الصلة فكان واجبًا وتركه مع القدرة للمنفق وتحقق حاجة المنفق عليه يؤدي إلى القطع فكان حرامًا''۔

قرآن وحدیث میں ماں باپ کی خدمت اور ان کے ساتھ حسن سلوک کرنے کا حکم دیا گیا ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "وبالوالدين إحسانا" (اسراء: ۲۳) (اور والدین کے ساتھ حسن سلوک کرو)، اور والدین کی کفالت حسن سلوک میں داخل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سورہ لقمان میں فرمایا: "أن اشكر لي ولوالديك" (لقمان: ۱۴) (تو میری اور اپنے ماں باپ کی شکر گزاری کیا کر)۔ معلوم ہوا کہ والدین کا شکریہ مکافات ہے، یعنی ماں باپ جو اس کی تربیت ونگہداشت کا فریضہ انجام دیا، سرد گرم، موسموں میں اس کی حفاظت اور اس پر شفقت کا سایہ فگن رکھا، اب جبکہ وہ کمزور اور بوڑھے ہو چکے ہیں، اور اپنی ضروریات پوری کرنے کی صلاحیت کھو چکے ہیں، پس ایسے وقت میں ان کی خدمت کرنا اور ان کے اخراجات کو پورے کرنا شکریہ کے زمرہ میں آئے گا، نیز اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: "وصاحبهما في الدنيا معروفًا" (لقمان: ۱۵) (اور دنیا میں ان کے ساتھ شرافت سے بسر کئے جانا)، قرآن کا یہ حکم کافر والدین کے ساتھ ہے تو مسلمان

والدین کے ساتھ حسن سلوک کرنے کا حکم بدرجہ اولی ہوگا۔ ایک جگہ اللہ تعالی کا ارشاد یوں ہے: "فلا تقل لهما أف ولا تنهرهما" (اسراء: ۲۳) (تو ان کو اف تک نہ کہو اور نہ ان کو جھڑکو)۔ اور کمانے سے عاجز اور ضرورت کے وقت ان پر خرچ نہ کرنا اور ان کی کفالت کا حق ادا نہ کرنا ان کو ایذا پہنچانا ہے، پس معلوم ہوا کہ آیت کریمہ میں ماں باپ کو گالی گلوج اور مار پیٹ کی ممانعت وحرمت آیت کی دلالت سے ثابت ہے، اسی طرح ان پر ترک نفقہ کی ممانعت بھی از راہ دلالت ثابت ہے

''فكان النهي عن التأفيف نهيا عن ترك الإنفاق دلالة، كما كان نهيا عن الشتم والضرب دلالة'' (بدائع ۵/ ۱۳۹)

حدیث شریف میں ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کرنے کا حکم تو ہے ہی، مزید آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سب سے پاکیزہ کھانا وہ ہے جو آدمی کی اپنی کمائی کا ہو اور تمہاری اولاد بھی تمہاری کمائی ہے (ترمذی، احکام، باب أن الوالد أخذ من مال ولده، حدیث: ۱۳۵۸، امام ترمذی کا بیان ہے، یہ حدیث حسن صحیح ہے)۔

ایک روایت میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی سے فرمایا: "تم اور تمہارا مال تمہارے والد کا ہے" (ابوداؤد، بیوع، باب الرجل یأکل من مال ولده، حدیث: ۳۵۳۰)۔

مذکورہ بالا آیات واحادیث کی روشنی میں فقہاء احناف نے لکھا ہے کہ جب ماں باپ محتاج ہوں اپنی ضروریات پوری کرنے کی خود صلاحیت نہ رکھتے ہوں، باپ کسب معاش کی صلاحیت رکھنے کے باوجود کما تا نہ ہو تو ان کو کمانے پر مجبور نہیں کیا جائے گا، اور اولاد پر ماں باپ کا نفقہ واجب ہوگا۔ باپ کو کمانے پر اس لئے مجبور نہیں کیا جائے گا کہ قرآن نے کہا: ماں باپ کو اف تک نہ کہو (اسراء: ۲۳)، یعنی اللہ تعالی نے ماں باپ کو اذیت پہنچانے سے روکا ہے، اور باپ کو کمانے کا حکم دینا ان کو اذیت پہنچانا ہے؛ بلکہ زبان سے گالی گلوج اور کسی بات پر اف کہنے کے مقابل کسب معاش کا مکلف بنانا زیادہ اذیت رسانی کا باعث ہے (ہدایہ مع الفتح ۴/ ۳۷۵، بدائع ۵/ ۱۳۹، ۱۵۱، رد المحتار ۵/ ۲۶۰)۔ اور عقلی نقطہ نظر سے بھی بیٹے پر ماں باپ کی کفالت واجب معلوم ہوتی ہے؛ کیونکہ ان دونوں نے اسے وجود بخشا، جب وہ کمزور تھا حتی کہ چلنے پھرنے کے لائق نہیں تھا اس وقت اس کی پرورش کی، اور اسے بڑی محنت اور بڑا خرچ کر کے جوان کیا، اس لئے اس کے بدلہ آج جبکہ ماں باپ کمزور ومحتاج ہیں تو بیٹے ان کی پوری کفالت کا فریضہ انجام دے، اسی کو فقہی قاعدہ کے قالب میں "الغرم بالغنم" کہا جاتا ہے۔

ماں باپ محتاج ہونے کے ساتھ کمانے سے عاجز:

اسی طرح جب ماں باپ محتاج ہونے کے ساتھ مجبور بھی ہوں اس طور پر کہ کسب معاش کی صلاحیت نہ رکھتے ہوں، ماں عورت ہونے کی وجہ سے پہلے ہی سے کسب معاش سے عاجز ہے اور باپ مثلاً اپاہج پہلے سے ہو یا اب ہوگیا ہو، یا پیدائشی اندھا ہو، یا پہلے بینا تھا اور اب نابینا ہوگیا، یا کسی حادثہ کے شکار ہونے کی وجہ سے کمانے سے معذور ہوگیا، تو ایسی صورت میں بدرجہ اولی اولاد پر ان کا نفقہ لازم ہوگا (سابق حوالہ جات، نیز دیکھئے: رد المحتار ۵/ ۲۷۹)۔

اور بات بھی معقول ہے کہ جب ماں باپ کھانے پینے کے محتاج ہوں تو اولاد ان کو کھلائیں اور پلائیں، اور جب وہ پیرہن کے حاجتمند ہوں تو ان کو کپڑے زیب تن کرائیں، یہ معروف اور حسن سلوک، جس کا قرآن نے اولاد کو حکم دیا ہے، نہیں ہے کہ خود اولاد اللہ تعالی کی نعمت میں مگن رہے، کھانے پینے، لباس و پوشاک اور زندگی کے آسائش وآرائش میں شاداں وفرحاں رہیں، اور ماں باپ کو بھوکے مرنے کے لئے چھوڑ دیں، وہ نان شبینہ کے لئے ترسیں، اور بے لباس در در مارے پھریں اور اولاد خود ٹھاٹ باٹ کی زندگی گزاریں (مختارات النوازل از صاحب ہدایہ ۲/ ۲۰۴، فتح القدیر ۴/ ۳۷۵)۔

صرف ماں ہوں:

ماں باپ دونوں باحیات ہوں تو ماں کا نفقہ باپ پر واجب ہوتا ہے، ہاں اگر باپ محتاج ہو اور کسب معاش کی صلاحیت نہ رکھتا ہو، یا کسب معاش کی طاقت رکھنے کے باوجود کما تا نہ ہو تو ماں باپ دونوں کا نفقہ اولاد پر لازم ہوگا، جیسا کہ اوپر بیان آچکا ہے، لیکن باپ بقید حیات نہ ہو، صرف ماں زندہ ہو، مالدار نہ ہو بلکہ محتاج ہو تو اولاد پر اس کا نفقہ لازم ہوگا؛ کیونکہ ماں اپاہج باپ کے درجہ میں ہے؛ اس لئے کہ نفس عورت عجز سے عبارت ہے کہ وہ فطرۃً کمانے کی صلاحیت نہیں رکھتی (رد المحتار ۵/ ۲۷۹، ۲۸۰)۔

کیا وجوب نفقہ کے لئے بیٹے کا مالدار ہونا ضروری ہے؟

ماں باپ محتاج ہوں، باپ کسب معاش کی صلاحیت رکھتا ہو، لیکن نہ کما تا ہو، یا احتیاج کے ساتھ کمانے کی صلاحیت سے محروم ہو، اور بیٹا مالدار نہ ہو، اس کے پاس جمع شدہ مال اتنے نہ ہوں کہ اس سے خود، ماں باپ اور اپنے اہل وعیال کو کھلا سکے، تاہم کسب معاش کی صلاحیت رکھتا ہے، تو اس پر ماں باپ کا نفقہ

واجب ہوگا، جتنا بھی کمائے گا اس میں اپنے اہل وعیال کے ساتھ ماں باپ کو شریک کرے گا، یہی مختار قول ہے۔

''المختار أن الکسوب یدخل أبویه في نفقته'' (درمختار مع الرد ۵/ ۲۷۹)

اس کی تائید ان آیات واحادیث سے ہوتی ہے، جن میں والدین کے ساتھ حسن سلوک کرنے کی تاکید آئی ہے، اور وہ حدیث (ابوداؤد، حدیث: ۳۵۳۰، ۳۵۲۸، ترمذی حدیث: ۱۳۵۸، ابن ماجہ، حدیث: ۲۲۹۰) جس میں اولاد کو انسان کی کمائی قرار دیا گیا۔

اگر بیٹا محتاج ہو، اس کے پاس مال نہ ہو اور کسب معاش سے بھی عاجز ہو تو اس پر اس کی ذات کے علاوہ کسی اور کا نفقہ واجب نہیں ہوگا، اور اگر کسب معاش سے عاجز تو نہ ہو، لیکن اسکی کمائی خود اس کے لئے ناکافی ہو، یا خود اس کے لئے کافی ہو، لیکن مزید نہ بچ پاتی ہو تو اس کو دوسرے کے نفقہ کی ادائیگی کے لئے مجبور نہیں کیا جائے گا، اور اگر کسب معاش کی صلاحیت رکھتا ہو اور اس کی کمائی خود اس کے لئے کافی ہو کر مزید بچتی ہو تو اس کو ماں باپ کے نفقہ کی ادائیگی پر مجبور کیا جائے گا (ردالمحتار ۵/ ۲۸۰، بدائع الصنائع ۵/ ۱۵۴)۔ یعنی اہل وعیال کے نفقہ کے ساتھ ماں باپ کو بھی شریک کرے گا، اور اگر بیٹا غیر شادی شدہ ہے اور کسب معاش کی طاقت رکھتا ہو تو مذکورہ بالا تفصیلات کے ساتھ ماں باپ کے نفقہ کی ادائیگی پر مجبور کیا جائے گا۔

اگر بیٹا تنگدست ہو، مالی پوزیشن زیادہ اچھی نہ ہو اس کے ماں باپ دونوں باحیات ہوں، تو تنگی کے ساتھ اسی میں ماں باپ کی کفالت کرے، لیکن صورت حال ایسی ہو کہ دونوں میں سے کسی ایک ہی کی کفالت ممکن ہو، تو ماں کی کفالت کرے گا اور باپ کو چھوڑ دے گا؛ کیونکہ فقہی نظر سے ماں کا حق مقدم ہے، اس لئے کہ باپ کے مقابلہ میں ماں کا مقام بلند ہے؟ اسی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سائل کے سوال پر کہ ہمارے حسن سلوک کا سب سے زیادہ حقدار کون ہے؟ ماں کا تین مرتبہ نام لیا اور اور باپ کا چوتھی بار میں نام لیا (بخاری، ادب باب من أحق الناس بحسن الصحبة، حدیث: ۵۹۷۱)۔

اور بظاہر ماں کے لئے کسب معاش دشوار ہے؛ جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے کہ عورت اپنی ذات نسوانیت کے اعتبار سے کمانے کے لائق نہیں ہے۔

''لأن مجرد الأنوثة عجز'' (رد المحتار ۵/ ۲۶۰، ۲۷۹)۔

حاصل بحث یہ ہوا کہ والدین کے وجوب نفقہ کے لئے بیٹے کا مالدار ہونا ضروری نہیں ہے، بلکہ صرف کسب معاش کی صلاحیت کا مالک ہونا کافی ہے، نیز واضح رہے کہ والدین کا نفقہ جس میں کھانا، پینا، لباس وپوشاک اور رہائش شامل ہیں، بقدر کفایت واجب ہوتا ہے (ہدایہ مع الفتح ۴/ ۳۸۵، بدائع ۵/ ۱۲۳، ردالمحتار ۵/ ۲۸۰)۔

والدین کی کفالت لڑکیوں پر بھی:

یقیناً ماں باپ کی کفالت کی ذمہ داری اولاد پر عقلاً وشرعاً ہر اعتبار سے واجب ہے، جیسا کہ اوپر بیان آچکا ہے، یہاں ایک اہم سوال یہ ہے کہ کیا ماں باپ کی کفالت بیٹوں کے ساتھ لڑکیوں پر بھی لازم ہے؟ فقہاء نے لکھا ہے کہ اولاد کے لفظ میں لڑکیاں بھی شامل ہیں، اور ظاہر روایت کے مطابق مرد اور عورت اولاد پر مساوی نفقہ واجب ہوگا، میراث کے مطابق متفاوت نفقہ واجب نہیں ہوگا، صاحب ہدایہ نے کہا: یہی صحیح قول ہے، شارح ہدایہ محقق علامہ ابن ہمام صاحب ہدایہ کے قول کی تائید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ نفقہ کا تعلق ولاد (والدین اولاد کے درمیان پیدائش کا رشتہ) سے ہے کہ، اور اس رشتہ میں لڑکا اور لڑکی دونوں برابر ہیں، بخلاف غیر ولاد قرابت دار کے، کہ ان کے درمیان نفقہ کی بنیاد الغرم بالغنم کے تحت میراث ہے، اسی وجہ سے قرابت ولاد میں وجوب نفقہ کے لئے اختلاف دین حارج نہیں ہے (ہدایہ وفتح القدیر ۴/ ۳۷۸)۔

تاہم لڑکیوں پر ماں باپ کا نفقہ اسی وقت واجب ہوگا جبکہ وہ اتنی خوشحال ہوں کہ اپنی بنیادی ضروریات زندگی میں خرچ کے بعد اتنا مال اس کے پاس بچتے ہوں کہ وہ ماں باپ کی کفالت کر سکیں، یا جس حد تک نفقہ برداشت کر سکتی ہوں اتنا بھی واجب ہوگا، اگر ان کے پاس مال نہیں ہے تو ان پر ماں باپ کا نفقہ واجب نہیں ہوگا، گو کسب معاش کی صلاحیت رکھتی ہوں، اس کے باوجود ماں باپ کے نفقہ کی ادائیگی کے لئے کسب کی مکلف نہیں بنائی جائیں گی، حتی کہ کوئی لڑکی خود اپنے نفقہ کے لئے بھی کمانے کی مکلف نہیں کی جائے گی کہ باپ اس کو کمانے کا حکم کرے، انکار کرنے پر مجبور کرے کہ وہ کسب معاش اختیار کرے، اور باپ اس کی کمائی سے اسی کی ضرورت پوری کرے، ''ولیس له أن یؤاجرهن في عمل ولا خدمة وإن کان لهن قدرة'' (فتح القدیر ۴/ ۳۷۱، نیز دیکھئے: ردالمحتار ۵/ ۲۷۱)، اس لئے کہ وہ اپنی ذات نسوانیت کے اعتبار سے شرعاً کسب معاش سے عاجز ہے (ردالمحتار ۵/ ۲۶۰، ۲۷۹)۔ اسی وجہ سے شریعت اسلامیہ نے اس کی کفالت کو پیدائش سے لے کر موت تک دوسروں کے کندھوں پر ڈالا، جس کی تفصیل آگے آرہی ہے، نیز کمانے کی غرض سے گھر سے باہر نکلنے میں قدم قدم پر فتنہ

منہ کھولے بیٹھا ہے، جیسا کہ حالات مشاہد ہیں۔

تنہا اولاد - نفقہ کی ذمہ دار:

ماں باپ کے نفقہ کی ذمہ دار تنہا اولاد ہیں، ان کے ساتھ اس میں کوئی اور شریک و سہیم نہیں، اور نہ ہی کوئی معین و مددگار، کیونکہ جزئیت کے اعتبار سے اولاد ماں باپ سے زیادہ قریب ہیں، اور حدیث کی رو سے والدین کا حق اولاد کے مال وجان دونوں میں ہے (ہدایہ وفتح القدیر ۴/ ۳۷۷)، پس جب ایک بیٹا خوشحال یا کم سے کم کسب معاش کی صلاحیت کا مالک یا ایک مالدار بیٹی ہو تو ماں باپ کا نفقہ تنہا اسی پر واجب ہوگا، اگر صرف دو بیٹے ہوں، تو دونوں پر برابر نفقہ واجب ہوگا، اسی طرح اگر ایک بیٹا اور ایک مالدار بیٹی ہو تو بھی دونوں پر برابر نفقہ واجب ہوگا؛ اس لئے کہ نفقہ واجب ہونے کے سبب ولاد میں دونوں برابر ہیں (بدائع الصنائع ۵/ ۱۴۵)، پس اگر ایک سے زیادہ ہوں، خواہ صرف لڑکے ہوں یا لڑکیاں یا دونوں ملے جلے ہوں تو سب پر نفقہ برابر تقسیم ہوجائے گا۔

نفقہ میں والدین کے مقابلہ میں اولاد کو ترجیح:

اگر کسی شخص کے اولاد کے ساتھ والدین بھی ہو، اس کی مالی پوزیشن ایسی ہو کہ دونوں میں سے کسی ایک کے نفقہ ادا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو، ایسی صورت میں کوشش تو یہی ہونی چاہئے کہ دونوں کو نفقہ میں شریک کرے اور جہاں تک ممکن ہو دونوں کی کفالت کی سعی کرے؛ کیونکہ قرآن وحدیث کے رو سے انسان پر دونوں کا نفقہ واجب ہے، تاہم ایسا ممکن نہ ہو تو اولاد کا نفقہ مقدم ہے؛ اس لئے کہ بچے کسب معاش کے لائق نہیں ہیں (درمختار ۲/ ۶۷۳)۔

دادا دادی کی کفالت کا نظام:

اسلام نے معاشرہ کے بوڑھے بوڑھی کی کفالت کا نظام اس طرح بنایا کہ اگر اس کے اپنے حقیقی بیٹے محتاج ہوں، اور خود بھی محتاج ہوں اور پوتے خوشحال ہوں تو پوتوں پر دادا اور دادی دونوں کا نفقہ واجب ہوگا؛ اس لئے کہ اللہ تعالی کا ارشاد "وصاحبهما في الدنيا معروفا" (لقمان: ۱۵)

(اور دنیا میں ان کے ساتھ شرافت سے بسر کئے جانا) میں "ہما" ضمیر کا مرجع "ابوین" ہے اور لفظ "ابوین" کے تحت دادا دادی اور اس سے اوپر کے اصول آتے ہیں، اور چونکہ دادا دادی اور اس سے اوپر کے اصول پوتوں کے دنیا میں آنے کے سبب بنے ہیں، اسی وجہ سے باپ کے فوت ہوجانے کی صورت میں دادا باپ کے قائم مقام ہوتا ہے کہ دادا محتاج ہو اور پوتا خوشحال تو پوتے پر دادا اور دادی کا نفقہ واجب ہوگا، اور دادا کو کمانے کا مکلف نہیں بنایا جائے گا، اور نہ ہی کسب معاش کا اسے حکم دیا جائے گا (بدائع ۵/ ۱۵۱، مختارات النوازل از صاحب ہدایہ ۲/ ۲۰۴، ہدایہ وفتح القدیر ۴/ ۳۷۵۔ ۳۷۶)۔

کیا بوڑھے شخص کو کمانے پر مجبور کیا جاسکتا ؟

سوال (۱): ما گر کوئی بوڑھاپے کی عمر کو پہنچ گیا لیکن اتنا کمزور نہیں ہے کہ کسب معاش نہ کرسکے کسی قدر مشقت کی ساتھ سہی وہ کما کر خود اپنی ضرورت پوری کرسکتا ہے، تو کیا ایسے شخص کو اس کی اولاد یا اعزاء واقارب جن کے ذمہ اس کا نفقہ واجب ہے، کسب معاش پر مجبور کرسکتے ہیں؟

جواب: بوڑھے والدین بھی ہوسکتے ہیں، اور دوسرے رشتہ دار، اگر بوڑھے والدین ہیں، تو ان کا نفقہ اولاد پر واجب ہونے کے لئے ان کا ضرورتمند ہونا کافی ہے کمانے سے عاجز ہونا شرط نہیں ہے، لہذا کمانے صلاحیت رکھنے والے محتاج بوڑھے باپ کو کمانے پر مجبور نہیں کیا جائے گا (ہدایہ وفتح القدیر ۴/ ۳۷۹، درمختار وردالمحتار ۵/ ۲۶۰، ردالمحتار ۵/ ۲۸۰)؛ اس لئے کہ اللہ تعالی نے ماں باپ کو اف تک کہنے سے روکا ہے (اسراء: ۲۳)، یعنی اللہ تعالی نے اولاد کو ماں باپ کو اذیت پہنچانے سے روکا ہے، اور ظاہر ہے کہ باپ کو کمانے پر مجبور کرنا ان کو اذیت پہنچانا ہے، بلکہ زبان سے گالی گلوج اور کسی بات پر اف کہنے کے مقابل کسب معاش پر مجبور کرنا زیادہ اذیت رسانی کا باعث ہے (ہدایہ مع الفتح ۴/ ۳۷۵، بدائع ۵/ ۱۳۹، ۱۵۱، ردالمحتار ۵/ ۲۶۰)۔

عقلی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو بیٹے پر ماں باپ کی کفالت واجب معلوم ہوتی ہے؛ کیونکہ ان دونوں نے اسے وجود بخشا، جب وہ کمزور تھا حتی کہ چلنے پھرنے کے لائق نہیں تھا اس وقت اس کی پرورش کی، اسے بڑی محنت اور بڑا خرچ کرکے جوان کیا، اس لئے اس کے بدلہ آج جبکہ ماں باپ کمزور محتاج ہیں، بیٹے ان کی پوری کفالت کا فریضہ انجام دے، اسی کو انسانیت کی زبان میں مکافات اور قواعد فقہیہ کی رو سے ایک فقہی قاعدہ "الغرم بالغنم" کہا جاتا ہے۔

اگر بوڑھا دادا ہو، اس کے حقیقی بیٹے محتاج ہوں، اور وہ خود بھی محتاج ہو، اور پوتے خوشحال ہوں تو پوتوں پر دادا اور دادی کا نفقہ واجب ہوگا، کیونکہ قرآن نے سورہ لقمان (آیت: ۱۵) میں ابوین کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا ہے، اور ابوین میں دادا اور دادی دونوں شامل ہیں، اس لئے کہ پوتوں کے دنیا میں آنے کا سبب

بالواسطہ دادا اور دادی بنتے ہیں، باپ بوڑھے کی طرح پوتا بوڑھے دادا کو بھی کسب معاش پر مجبور نہیں کرے گا گو کہ وہ کسب معاش کی طاقت رکھتے ہوں (بدائع ۵/ ۱۵۱، مختارات النوازل از صاحب ہدایہ ۲/ ۲۰۴، ہدایہ وفتح القدیر ۴/ ۷۵-۳۷۶)۔

اگر باپ ودادا کے علاوہ دوسرے محتاج رشتہ دار بوڑھے ہوں جو قدر مشقت کے ساتھ کسب معاش کے ذریعہ اپنی ضرورت پوری کرسکتے ہیں، ان کے اپنے بیٹے اور پوتے بھی نہ ہوں، جس کی وجہ سے خاندان کے جن دوسرے افراد پر ان کا نفقہ واجب ہوتا ہے، قانونی طور پر ان کو کسب معاش پر مجبور کرسکتے ہیں؛ کیونکہ بیوی، ماں باپ اجداد اور اپنی نسبی اولاد کو چھوڑ کر دوسرے افراد خاندان کا نفقہ اس صورت میں واجب ہوتا ہے، جبکہ وہ ضرورت مند ہونے کے ساتھ کسب معاش کی صلاحیت سے بھی محروم ہوں (عنایہ مع الفتح ۴/ ۳۷۶)۔

سن رسیدہ حضرات کا نفقہ وعلاج:

سوال (۲): سن رسیدہ حضرات کا نفقہ وعلاج کن صورتوں میں دوسروں پر واجب ہوگا؟

جواب: اصولی طور پر انسان کا نان ونفقہ اور علاج خود اس پر اس کے ذاتی مال میں واجب ہوتا ہے (ہدایہ مع الفتح ۴/ ۳۷۸، درمختار وردالمحتار ۵/ ۲۸۱)

اس کے پاس اپنا مال نہ ہو اور وہ ضرورت مند ہو، تو بیوی، نابالغ مرد اولاد، بالغ مجبور اولاد، شادی سے پہلے تک عورت اولاد، ماں باپ دادا اور دادی اور اوپر کے اصول کا نان ونفقہ اور علاج ومعالجہ کے اخراجات دوسروں پر واجب ہوتے ہیں، جیسا کہ تفصیل سے بات پیچھے آچکی ہے۔

دوسرے سن رسیدہ افراد کا نفقہ وعلاج دوسروں پر اس وقت واجب ہوتا ہے، جبکہ ان کے پاس گذر اوقات اور علاج کے پیسے نہ ہوں، ان کا کوئی ذریعہ معاش نہ ہو، وہ مجبور ہوں اور کمانے پر قدرت نہ ہو (عنایہ مع الفتح ۴/ ۳۷۶)۔

جن صورتوں میں کسی کا دوسرے پر نفقہ واجب ہوتا ہے تو اس کے ساتھ اس کا علاج بقدر وسعت بھی لازم ہوتا ہے؛ کیونکہ وجوب نفقہ کا سبب اس کی جان کی حفاظت وبقاء ہے، اور یہی مقصد علاج کا بھی ہے۔

سوال (۳) غیر محتاج کا اپنے چھوٹوں سے اضافی رقم کا مطالبہ:

جواب: غیر محتاج صاحب ثروت بوڑھے والدین یا خاندان کے وہ بڑے جن کا نفقہ ان کے چھوٹوں پر محتاجگی کی صورت میں واجب ہوتا ہے، کے لئے اپنی اولاد سے یا ان لوگوں سے جن پر بحالت حاجت نفقہ واجب ہوتا ہے، زیادہ سہولت کے لئے یا دوسرے لوگوں پر خرچ کرنے کے لئے یا کچھ رقم محفوظ کرنے کے لئے زائد رقم مطالبہ کرنے کا قانونی طور پر حق نہیں ہے؛ کیونکہ ایسی صورت میں ان بزرگ حضرات کا نفقہ دوسروں پر واجب نہیں ہے، ویسے بھی مانگنا نہیں چاہئے؛ اس لئے کہ جس شخص کے پاس کھانے پینے کی اشیاء اور کپڑے جیسی ضروریات کے لئے سامان موجود ہو گو وہ مالک نصاب نہیں، ایسے آدمی کو دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلانے سے پرہیز کرنا چاہئے، اس لئے کہ بلاضرورت اور مزید زندگی کی سہولیات کے لئے دوسروں کے ساتھ ہاتھ پھیلانے والوں کے حق میں احادیث میں وعید وارد ہوئی ہیں؛ چنانچہ حضرت حبشی بن جنادہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سوال کرنا مالدار اور توانا وتندرست آدمی کے لئے جائز نہیں ہے، البتہ ایسے آدمی کے لئے سوال کرنا جائز ہے جس کو ناداری وافلاس نے زمین پر گرا دیا ہو یا جس پر قرض یا کسی تاوان وغیرہ کا کوئی بھاری بوجھ پڑ گیا ہو، اور آدمی (محتاجی کی وجہ سے نہیں بلکہ) اپنے مال میں اضافہ کے لئے لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلائے اور سوال کرے تو قیامت کے دن اس کا یہ سوال اس کے چہرے پر ایک زخم کی شکل میں نمایاں ہوگا، اور جہنم کا گرم جلتا ہوا پتھر ہوگا جس کو وہ وہاں کھائے گا، پس اس کے بعد جس کا جی چاہے سوال کم کرے اور جس کا جی چاہے زیادہ کرے (ترمذی، زکوۃ، باب من لاتحل لہ الصدقۃ، حدیث: ۶۵۳)۔

نیز حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو کوئی (حاجت سے مجبور ہو کر نہیں بلکہ) زیادہ مال حاصل کرنے کے لئے لوگوں سے مانگتا ہے تو وہ درحقیقت اپنے لئے جہنم کا انگارہ مانگتا ہے (یعنی جو کچھ اس طرح سوال کرکے وہ حاصل کرے گا وہ آخرت میں اس کے لئے دوزخ کا انگارہ بن جائے گا)، اب خواہ اس میں کمی کرے یا زیادتی کرے" (مسلم، زکوۃ، باب کراھۃ المسألۃ للناس، حدیث: ۲۳۹۹)۔

ہاں، البتہ اولاد اور ان چھوٹوں-جن پر ان کے خاندان کے بڑے لوگوں کا نفقہ محتاجی کی صورت میں ان پر واجب ہے-کو چاہئے اپنے بوڑھے والدین اور خاندان کے بڑے لوگوں کے ساتھ حسن سلوک کرے اور بے مانگے کچھ نہ کچھ رقم اور استعمال کی اشیاء دیتے رہا کریں اور ان کی آسائش وآرام کا خیال رکھیں؛

کیونکہ قرآن وحدیث میں والدین کے ساتھ اور اپنے خاندان کے بڑے لوگوں کے ساتھ حسن سلوک کرنے کا حکم دیا ہے اور ان کو اذیت پہنچانے سے روکا ہے، جیسا کہ تفصیل سے پیچھے ذکر کیا جاچکا ہے۔

سوال (۴) محتاج خدمت ماں باپ کو چھوڑ کر زیادہ آمدنی کے لئے دوسری جگہ جانا:

الف: کیا زیادہ آمدنی کے لئے لڑکوں کا اپنے ماں باپ کو چھوڑ کر دوسری جگہ جانا جائز ہے؟

جواب: اللہ تعالی نے مختلف آیات میں مختلف انداز واسلوب میں ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کرنے کی بڑی تاکید فرمائی ہے (بقرہ: ۸۳، نساء: ۳۶، انعام: ۱۵۱، اسراء: ۲۳-۲۴، لقمان: ۱۳-۱۵، عنکبوت: ۸)، سب سے زیادہ خاص بات یہ ہے کہ اللہ تعالی نے ان کے ساتھ حسن سلوک کا حکم اپنی توحید وعبادت کے ساتھ ساتھ کچھ اس طرح دیا ہے کہ انسانوں کے اعمال میں خدا کی عبادت کے بعد ماں باپ کی خدمت اور راحت رسانی کا درجہ ہے، چنانچہ ارشاد فرمایا:

"وقضی ربك ألا تعبدوا إلا إياه وبالوالدين إحسانا" (بنی اسرائیل: ۲۳)

(اور تمہارے رب نے قطعی فیصلہ کردیا کہ صرف اسی کی عبادت کرو اور ماں باپ کے ساتھ اچھے سے اچھا برتاؤ کرو)۔

رسول اللہ ﷺ نے مختلف احادیث میں ان ہی آیات کی تشریح وتوضیح فرماتے ہوئے کہیں ماں باپ کو اولاد کی جنت اور دوزخ بتایا ہے (ابن ماجہ، ادب، باب برالوالدین، حدیث: ۳۶۶۲)، اور اللہ کی رضا وخوشنودی کو والدین کی رضامندی سے وابستہ کیا ہے (ترمذی باب الفضل فی رضا الوالدین، حدیث: ۱۸۹۹)۔

کہیں بوڑھے ماں باپ کی خدمت میں کوتاہی کرنے والے کو بدبخت اور محروم قرار دیا (مسلم، باب رغم من أدرك أبويه، حدیث: ۶۵۱۰، ۶۵۱۱)،

بعض حالات میں ماں باپ کی خدمت کو جہاد جیسی مقدس عبادت پر مقدم فرمایا (مسلم، باب برالوالدین، حدیث: ۶۵۰۴، ۶۵۰۷)،

کہیں تو ماں کے قدموں تلے جنت کا مژدہ سنایا (نسائی، جہاد حدیث: ۳۱۰۶)، اور باپ کو جنت کا دروازہ ہونے کی خوشخبری سنائی (ترمذی، باب الفضل فی رضا الوالدین، حدیث: ۱۹۰۰)، یعنی ماں کی خدمت سے جنت ملے گی اور باپ کی خدمت سے جنت کا دروازہ کھلے گا، آنحضرت ﷺ نے ایک جگہ ماں کی خدمت کو بڑے سے بڑے گناہ کی معافی کا ذریعہ بتایا (ترمذی، باب فی برالخالہ، حدیث: ۱۹۰۴) تو دوسری جگہ والدین کی نافرمانی اور ایذا رسانی کو عظیم ترین گناہ قرار دیا (بخاری، باب فی شہادۃ الزور، حدیث: ۲۶۵۳)۔

ظاہر ہے کہ اس حد تک ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک اور ان کو ایذا نہ پہنچانے کی تاکید سے معلوم ہوتا ہے کہ ماں باپ جب جسمانی خدمت کے محتاج ہوجائیں تو اولاد پر ان کی جسمانی خدمت کرنا فرض ہے، اگر کسی وجہ سے از خود خدمت کرنے سے قاصر ہو تو دوسرے کو پیسے دے کر خدمت کرانا اس پر لازم ہے، ملک العلماء علامہ کاسانی نے لکھا ہے کہ باپ خدمت کا محتاج ہو تو بیٹے کو خدمت کرنے کا حکم دیا جائے گا، چاہے وہ از خود خدمت کرے یا کسی کو اجرت دے کر خدمت کروائے (بدائع الصنائع ۵/۱۴۵)۔

پس مذکورہ بالا شرعی نصوص اور فقہاء کی تصریح کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ اگر ایک سے زائد بیٹے ہوں، یا ایک ہی بیٹا ہے اور وہ باہر پردیس میں کماتا کھاتا ہے، تو ایسی صورت میں بیٹوں پر لازم ہے کہ ماں باپ کی خدمت کے لئے کوئی نظم کرکے باہر کمانے کے لئے جائے، خواہ یہ انتظام رضاکارانہ ہوجائے یا اجرت دے کر۔

جب ماں باپ جسمانی خدمت کے محتاج ہوں تو لڑکوں کے لئے ماں باپ کو چھوڑ کر دوسری جگہ جانا جائز نہیں، اور زیادہ آمدنی کے لئے جانا بدرجہ اولی درست نہیں ہوگا، ایسی حالت میں لڑکوں کے لئے ماں باپ کو چھوڑ کر دوسری جگہ جانا انسانی اخلاق سے بھی گری ہوئی بات ہے، اور اللہ کے نظام مکافات کے بھی خلاف ہے، کیونکہ ماں باپ نے بچوں کی پرورش کی جبکہ وہ بچے ناتواں اور سہارے کے محتاج تھے، آج جبکہ ماں باپ خدمت اور سہارے کے محتاج ہیں، تو بچوں کو چاہئے آج جبکہ وہ جوان اور توانا ہیں، کہ وہ اپنے بوڑھے ضعیف محتاج خدمت ماں باپ کا سہارا بنیں، اگر وہ ایسا کریں گے تو کل جبکہ یہ بوڑھے ہوجائیں گے تو اللہ تعالی ان کی خدمت کے لئے انتظام فرمائے گا، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کسی نوجوان نے کسی سن رسیدہ شخص کا اکرام کیا تو جب وہ سن رسیدہ کی عمر کو پہنچے گا اللہ اس کے لئے ایسے شخص کا نظم کردے گا جو اس کا اکرام کرے گا (ترمذی، بروصلہ، باب فی اجلال الکبیر، حدیث: ۲۰۲۲)۔

اللہ تعالی نے نظام مکافات کے تحت بندے کو اپنے رب اور والدین کا شکریہ ادا کرنے کا حکم دیا، ارشاد ہوا:

"ووصينا الإنسان بوالديه حملته أمه وهنا وعلى وهن وفصاله في عامين أن اشكر لي ولوالديك إلى المصير" (لقمان: ۱۴)۔

(اور ہم انسان کو اس کے ماں باپ کے متعلق تاکید کی ہے، اس کی ماں نے ضعف پر ضعف اٹھا کر اس کو پیٹ میں رکھا اور دو برس میں اس کا دودھ چھوٹتا ہے کہ تو میری اور اپنے ماں باپ کی شکر گزاری کیا کر، میری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے)۔

ب: کیا بیوی کو ساس سسر کے ساتھ رہنے پر مجبور کیا جاسکتا ہے؟

جواب: اس سوال میں کئی مسائل دریافت کئے گئے ہیں، جن کے احکام درج ذیل بیان کئے جاتے ہیں:

بیوی کے لئے علاحدہ راحت گاہ کا انتظام:

شوہر پر بیوی کے بنیادی حقوق میں سے ایک یہ ہے کہ شوہر اس کے لئے رہائش گاہ کا انتظام کرے، کیونکہ اللہ تعالی نے ارشاد فرمایا: "أسكنوهن" (طلاق: ۶) اور اس پر پوری امت کا اجماع ہے (بدائع ۵/ ۱۰۵)۔ اب شوہر کی ذمہ داری ہے کہ بیوی کے لئے محفوظ علاحدہ راحت گاہ کا انتظام کرے، جہاں گھر کے لوگ بے محابہ داخل نہ ہوں اور بیوی کے لئے ہمہ وقت شوہر سے استمتاع کا موقع فراہم رہے، اس لئے کہ جس طرح شوہر کو بیوی سے استمتاع کا حق ہمہ وقت ہے، اسی طرح عورت کا بھی حق ہے، لہذا کوئی مرد بیوی کو دیگر افراد خاندان کے ساتھ رہائش اختیار کرنے پر مجبور نہیں کرسکتا؛ کیونکہ ایسا کرنے میں بیوی کو ایذا پہنچانا اور اس کے حق استمتاع کو تلف کرنا لازم آئے گا، اور قرآن نے اس سے شوہر کو روکا ہے، ارشاد ہے: "لا تضاروهن" (طلاق: ۶) (ان کو رہائش گاہ) میں تکلیف نہ پہنچاؤ)، کہ خاندان کے لوگ بلا روک ٹھوک اندر آتے جاتے ہوں (بدائع ۵/ ۱۰۴-۱۲۲)۔ نیز اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

"فلا تمسكوهن ضرارا لتعتدوا، ومن يفعل ذلك فقد ظلم نفسه" (بقرہ: ۲۳۱)

(محض ان کو نقصان پہنچانے کے ارادہ سے کہ تم زیادتی کرتے رہو، ان کو نہ روکو، جو ایسا کرتا ہے تو وہ اپنے آپ ہی پر ظلم کرتا ہے)۔

مذکورہ بالا تصریحات وتوضیح سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر بہو ساس سسر کے ساتھ رہنا نہ چاہتی ہو تو اسے ان کے ساتھ رہنے پر جبر کرنا درست نہیں ہوگا، بلکہ شوہر پر لازم ہوگا کہ اس کے لئے علاحدہ گھر بنائے، یا کرایہ پر مکان لے کر دونوں ساتھ رہے، یا اس کے پاس کئی کمرے ہوں، تو ایک کمرہ اس کے لئے خاص کردے، اور ماں باپ دوسرے کمرے میں رہیں، اگر ایک ہی گھر ہو، اس میں ایک سے زائد روم نہ ہو، تو کم از کم دبیز کپڑے سے گھیر کر روم نما سپریٹ بنالیا جائے، جس میں ساس سسر نہ جائیں، تاکہ بہو کا حق ادا ہوسکے۔

ساس محتاج خدمت ہو:

اگر ساس کو خدمت کی ضرورت ہے اور بہو کے علاوہ کوئی اور خدمت گار نہیں ہے، بیٹیاں ہیں، لیکن ان کے شوہروں کی طرف سے میکے آنے کی اجازت نہیں ہے، معلوم ہونا چاہئے کہ شریعت اسلامیہ کے احکام کے دو درجے ہیں: ایک اخلاقی واحسانی، دوسرے فقہی وقانونی کچھ احکام ایسے ہیں جن کو بروئے کار لانا دیانۃً واجب ہے، یعنی ان کی تعمیل کرنا واجب ہے، نہ کرنا موجب گناہ ہے، البتہ انسان کو ان کاموں کو کرنے پر قانونا مجبور نہیں کیا جاسکتا، اس طرح کے احکام کو اخلاقی واحسانی احکام کہتے ہیں، اور بہت سے احکام وہ ہیں جن کا کرنا قانونا واجب ہے، اگر انسان نہ کرے تو جہاں وہ گنہ گار ہوگا وہیں قانونا بھی اسے اس کام کے کرنے پر مجبور کیا جائے گا، اس طرح کے احکام کو قضائی احکام بھی کہتے ہیں۔

ساس سسر کی خدمت بہو پر اس وقت دیانۃً واجب ہوگی، جبکہ کوئی اور خدمت کرنے والا میسر نہ ہو، اگر کوئی دوسرا خدمت کرنے والا میسر ہو، تب بھی بہو کو چاہئے کہ اپنی ساس سسر کی خدمت سے دامن نہ کھینچے، کیونکہ یہ اس کا اپنے شوہر کے ساتھ تعاون ہے، اس لئے کہ اصل میں والدین کی خدمت اس کے شوہر پر واجب ہے، اور شوہر اپنی بیوی اور اس کے بچوں کی ضروریات کے لئے مشغول ہے، تو اخلاق ودیانت کا تقاضا ہے کہ وہ اس فریضہ کی ادائیگی میں شوہر کی مدد کرے (دیکھئے: کتاب الفتاوی ۴/ ۴۱۰)۔

بہو کو ساس سسر کے ساتھ رہنے پر مجبور کیا جانا:

جہاں تک بہو کو ساس سسر کے ساتھ رہنے پر مجبور کئے جانے کی بات ہے تو اس میں تھوڑی تفصیل ہے، اور وہ یہ ہے کہ اگر گھر میں صرف سسر ہو ساس نہ ہو، خواہ ساس فوت ہوچکی ہو یا اپنی بیٹی یا بہن کے پاس باہر ملک یا اندرون ہندوستان کسی اور شہر میں جا بیٹھی ہو، اور شوہر پردیس میں ہو، ایسی صورت میں بہو کو

سسر کے ساتھ رہنے پر مجبور کیا جانا دور کی بات رہی، ساتھ رہنا شرعاً صحیح نہیں ہوگا؛ اس لئے کہ فتنہ میں مبتلا ہونے کا غالب گمان ہے، اور احکام کے باب میں غالب گمان یقین کے قائم مقام ہوتا ہے۔

اور اگر شوہر ساتھ میں ہو تب بھی سسر کے ساتھ رہنے پر قانونا مجبور نہیں کی جاسکتی، تاہم سسر خدمت کے محتاج ہوں، اس کی خدمت کے لئے کوئی اور نہ ہو، تو دیانۃً بہو پر خدمت واجب ہے، اور خدمت کے وقت شوہر موجود ہو تو بہتر ہوگا، اور شوہر کی غیر موجودگی میں احتیاط کے ساتھ خدمت کرے، اگر بالفرض فتنہ میں پڑنے کا غالب گمان ہو تو لازماً شوہر کی موجودگی میں خدمت کرے اور اس کی غیر موجودگی میں سسر کے قریب نہ جائے، روم سے باہر کا کام کردے۔

اگر ساس سسر دونوں ہوں اور دونوں کی خدمت کی ضرورت ہو اور بہو کے علاوہ کوئی اور خدمت گار نہ ہو تو دیانۃً بہو پر خدمت واجب ہوگی، جیسا کہ اوپر مذکور ہوا، قانونا خدمت پر مجبور نہیں کیا جاسکتا اور نہ دونوں کے ساتھ رہنے پر مجبور کیا جاسکتا؛ کیونکہ قرآن نے شوہر کو اپنے ساتھ رکھنے کا حکم دیا، نہ کہ اس کے ماں باپ کے ساتھ، ارشاد ہوا: "أسکنوھن من حیث سکنتم" (طلاق:۶) (انکو اپنی حیثیت کے موافق رہنے کا مکان دو)۔

ماں باپ کی خدمت بیٹیوں پر بھی واجب:

ج: ماں باپ کی خدمت صرف بیٹوں پر واجب ہے یا بیٹیوں پر بھی، بعض اوقات بیٹیاں اپنے والدین کی مجبوری اور بے بسی کو دیکھتے ہوئے اپنے والدین کی خدمت کرنا چاہتی ہیں، لیکن ان کے شوہران کو اس کی اجازت نہیں دیتے، کیا ان کے شوہر کو اس کا حق ہے؟

جواب: لڑکوں کی طرح لڑکیوں پر بھی ماں باپ کی کفالت اور ان کی خدمت واجب ہے؛ کیونکہ ماں باپ نے دونوں کو پیدا کئے، اسی وجہ سے اللہ تعالی نے بلا تخصص اولاد کو والدین کے ساتھ حسن سلوک کرنے کا حکم دیا، "وقضی ربك ألا تعبدوا إلا إیاہ وبالوالدین إحسانا" (بنی اسرائیل: ۲۳) (اور تمہارے رب نے قطعی فیصلہ کردیا کہ صرف اسی کی عبادت کرو اور ماں باپ کے ساتھ اچھے سے اچھا برتاؤ کرو)، اور ایک جگہ انسان کا لفظ استعمال کرکے بیٹے اور بیٹیاں دونوں سے خطاب کیا: "ووصینا الإنسان بوالدیه حملته أمه وھنا علی وھن وفصاله فی عامین أن اشکر لی ولوالدیك إلی المصیر" (لقمان: ۱۴)

(اور ہم نے انسان کو اس کے ماں باپ کے متعلق تاکید کی ہے، اس کی ماں نے ضعف پر ضعف اٹھا کر اس کو پیٹ میں رکھا اور دو برس میں اس کا دودھ چھوٹتا ہے کہ تو میری اور اپنے ماں باپ کی شکر گزاری کیا کر، میری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے)۔

اس آیت پاک میں نظام مکافات کے تحت دونوں سے والدین کے ساتھ حسن سلوک کرنے کا حکم دیا ہے اور احادیث میں بھی بہ کثرت جن میں سے بعض پیچھے نقل کی جاچکی ہیں، اچھا سے اچھا برتاؤ کرنے کے لئے کہا ہے۔ نیز اللہ تعالی نے صیغہ مذکر لاکر بیٹے کے تابع کرکے بیٹی کو بھی حکم دیا کہ ماں باپ کے ساتھ نرم رویہ اور نرم گفتگو کے ساتھ ساتھ ان کے حق میں دعا بھی کرتے رہنا:

"إما یبلغن عندك الکبر أحدھما أو کلاھما فلا تقل لھما أف ولا تنھرھما وقل لھما قولا کریما. واخفض لھما جناح الذل من الرحمة وقل رب ارحمھما کما ربیانی صغیرا" (بنی اسرائیل: ۲۴)۔

(اگر تمہارے سامنے ان دونوں میں سے ایک یا دونوں بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو ان کو اف تک نہ کہو اور نہ ان کو جھڑکو، ان کے ساتھ خوب ادب سے بات کرو، ان کے سامنے نیاز مندی سے عاجزی کے ساتھ جھکے رہو اور دعا کرتے رہو، اے میرے رب! جیسے ان دونوں نے بچپن میں میری پرورش کی تھی آپ ان دونوں پر اسی طرح رحم فرمایئے)۔

کیا والدین کی خدمت سے روکنے کا حق شوہر کو حاصل ہے؟

والدین مجبور و بے بس ہوں، خدمت کئے جانے کے محتاج ہوں، بیٹیاں ہیں، لیکن شادی شدہ ہیں، وہ والد کی حالت مجبوری و مرض کو دیکھتے ہوئے خدمت کرنا چاہتی ہیں جو کہ شرعاً ان پر واجب ہے، ایسی صورت حال میں شوہر کے لئے بیوی کو اس کے اپنے والدین کی خدمت سے روکنا اور میکے جانے نہ دینا جائز نہیں ہے، بلکہ شوہر کو روکنے کا حق شرعاً حاصل نہیں ہے، اگر وہ روکتا ہے تو ایسے موقع پر بیوی کے لئے شوہر کی نافرمانی جائز ہے، اس لئے کہ ان امور میں شوہر کی اطاعت و فرمانبرداری عورت پر لازم ہے جن سے اللہ اور اس کے رسول راضی ہوں، اور ان امور میں شوہر کی بات اس کے لئے نہ ماننا ہے جن سے اللہ اور اس کے رسول ناراض ہوتے ہوں، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "لا طاعة لمخلوق فی معصیة اللہ" (مسند احمد عن علی ۱/ ۱۶۱، حدیث: ۱۰۹۴) (جہاں اللہ کی نافرمانی ہو

وہاں کسی مخلوق کی اطاعت درست نہیں)۔

ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جب کوئی معصیت (نافرمانی) کا حکم دے، تو اس کی سمع وطاعت نہیں کی جائے گی" (بخاری، جہاد، باب السمع والطاعة للامام، حدیث: ۲۹۵۵، ابن ماجہ، جہاد: باب لا طاعة فی معصیة اللہ، حدیث: ۲۸۶۴)۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر ماں باپ کفر وشرک پر تم کو مجبور کریں تو ان کی بات مت مانو (لقمان: ۱۵)۔

متاخرین فقہاء شوافع کا بیان ہے کہ شوہر کے لئے مکروہ ہے کہ وہ بیوی کو اپنے باپ کی عیادت سے روکے،

"یکره منعها من عیادة أبیها إذا أثقل" (المجموع ۱۵/ ۵۶۷)۔

اسی طرح متاخرین حنابلہ نے کہا کہ شوہر کے لئے مناسب نہیں ہے کہ وہ اپنی بیوی کو اس کے اپنے والدین کی عیادت سے روکے،

"لاینبغی للزوج منعها من عیادة والدیها وزیارتهما" (المغنی ۷/ ۲۰)۔

مالکیہ کے یہاں شوہر کے لئے روا نہیں ہے کہ وہ اپنی بیوی کو اس کے میکے جانے سے روکے، جبکہ راستہ مامون ہو۔

"الخروج لدار أبیها وأخیها إن كانت مأمونة" (التاج والاکلیل ۴/ ۱۸۵)۔

اس سلسلہ میں حنفیہ کا مذہب یہ ہے کہ اگر ماں باپ بیٹی کی زیارت کے لئے اس کے پاس جانے پر قادر نہ ہو اس طور پر کہ باپ اپاہج ہو کہ وہ بیٹی کی خدمت کا محتاج ہو ایسی صورت میں اگر شوہر اس کو باپ کی خدمت کے لئے جانے سے روکتا ہے تو اس پر لازم ہے کہ شوہر کی بات نہ مانے اور باپ کی خدمت کے لئے جائے اور خدمت کرے۔

"كان أبوها زمنا مثلا وهو محتاج إلى خدمتها والزوج يمنعها من تعاهده أن تعصيه مسلما كان الأب أو كافرا" (فتح القدیر ۳۳۵۳)۔

والدہ کی فوت ہونے کے بعد والد کے دوسرے نکاح میں رکاوٹ نہ بننا:

سوال (۵): انسان کو جس طرح جوانی میں بیوی کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح وہ بوڑھاپے میں بھی بیوی کا محتاج ہوتا ہے تاکہ اس عمر کے سرد وگرم کو سہنا اس کے لئے آسان ہو جائے؛ ہندوستان کے معاشرہ میں عام طور پر بیٹے اور بیٹیاں اپنی والدہ کے فوت ہونے کے بعد والد کے دوسرے نکاح میں رکاوٹ بنتے ہیں کیا ان کا یہ رکاوٹ بننا درست ہے؟ اور اگر خود والد میں اپنی بیوی کی کفالت کی استطاعت نہ ہو تو اس سلسلہ میں کیا اولاد پر بھی اس نسبت سے کچھ ذمہ داری عائد ہوتی ہے؟

جواب: قرآن وحدیث میں والدین کے ساتھ حسن سلوک کی بڑی تاکید آئی ہے، زمانہ وحالات کے اعتبار سے حسن سلوک کی نوعیتیں مختلف ہوں گی، لہذا اگر والد کا انتقال ہو جائے اور ماں شادی کرنے کی قابل ہو تو ان کی شادی کرا دینا ان کے ساتھ سب سے بڑا حسن سلوک ہے، اسی طرح اگر ماں مطلقہ ہو، اور شادی کی قابل ہے تو ان کے ساتھ حسن سلوک کا تقاضا یہی ہے کہ ان کی مناسب جگہ شادی کرادی جائے، اسی طرح اگر والدہ کا انتقال ہو گیا اور والد عمر کے لحاظ سے شادی کے لائق ہے یا خدمت کے محتاج ہیں تو عمر کے اعتبار سے مناسب عورت سے شادی کرادی جائے، اس لئے کہ ایک تو ان کے ساتھ حسن سلوک کا تقاضا یہی ہے، نیز جس طرح ان کی جان کو بچانے کے لئے اولاد پر نفقہ واجب ہوتا ہے، اسی طرح نفسانی غذا کا نظم بھی اولاد پر واجب ہوگا، تاکہ ان کو برائی میں مبتلا ہونے سے بچایا جاسکے، شرعی حکم تو یہ ہے، پس بیٹے اور بیٹیوں کے لئے والدہ کے فوت ہونے کے بعد والد کے دوسرے نکاح میں رکاوٹ بننا درست نہیں ہوگا۔

باپ کی بیوی کا نفقہ:

خود والد میں اپنی بیوی کی کفالت کی استطاعت نہ ہو تو اولاد پر اس کے نفقہ کی ذمہ داری عائد ہوگی، علامہ شامی کا بیان ہے:

"نفقة زوجته على ابنه" (رد المحتار ۵/ ۲۸۰) (اس کی بیوی کا نفقہ اس کے بیٹے پر ہے)۔

والد کی زندگی میں جائیداد کی تقسیم کا مطالبہ:

سوال (۶): بعض اوقات اولاد والد کی زندگی میں ہی جائداد کا مطالبہ شروع کردیتے ہیں اور اس سے اپنا حق سمجھتے ہیں؛ کیا اولاد کے لئے ایسے مطالبہ کی گنجائش ہے؟ خاص کر ایسی صورت میں جب کہ والدین کی معاشی حالت بہتر اور اولاد محتاج ہوں؟

جواب: اصولی طور پر ہر عاقل وبالغ مسلمان کو اپنے اوپر اور اپنے مال ودولت پر ولایت حاصل ہوتی ہے، اور اپنے مال وجائیداد میں بغیر کسی دباؤ کے آزادانہ تصرف کرنے کا حق ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"للرجال نصیب مما اکتسبوا وللنساء نصیب مما اکتسبن" (نساء: ۳۲)

(مردوں نے جو عمل کئے ہیں، وہاں کا حصہ ہے اور عورتوں نے جو عمل کئے وہ ان کا حصہ ہے)۔

اسی طرح عاقل بالغ کمانے کی صلاحیت رکھنے والے بیٹے کا نفقہ باپ پر لازم نہیں ہوتا ہے، جیسا کہ پیچھے گذر چکا ہے۔

"أما الكبار فعلى الظاهر. كما سيأتي وإن لم يكونوا عاجزين لا نفقة لهم" (فتح القدير [illegible])۔

پس اولاد کے لئے باپ سے ان کی زندگی میں جائیداد کی تقسیم کا مطالبہ کرنا درست نہیں ہوگا، گو اولاد محتاج ہوں، یہ قانونی بات ہوئی، البتہ اخلاقی اور پدرانہ محبت کا تقاضا یہ ہے کہ محتاج اولاد کو جائیداد تقسیم کرکے نہ دے کر یوں ہی اس کو عاریت کے طور پر استفادہ کے لئے دے، اور تحریر میں یہ بات لے آئے کہ یہ بطور عاریت ہے نہ کہ تملیک، اگر میرا انتقال ہوجائے گا تو یہ جائیداد میراث میں تقسیم ہوگی۔

سوال (۷) عمر دراز لوگوں کے لئے ہاسٹل:

جواب: اس طرح کے ہاسٹلوں کے بنانے میں کوئی شرعی قباحت نہیں ہے، کیونکہ بعض اوقات ایسے معذور ومجبور افراد اور بوڑھے لوگ ہوتے ہیں جن کے آگے پیچھے دیکھنے والا کوئی نہیں ہوتا ہے، بالفاظ دیگر لاوارث ایسے لوگوں کے لئے رہائش وکفالت کی انتظام ہوجائے گا۔ اسی طرح دور حاضر میں جن بوڑھے ماں باپ کو نالائق اولاد گھر سے باہر کردیں اور وہ آسمان کے نیچے سڑکوں پر آجائیں تو ان کے لئے اس طرح کے ہاسٹل ایک نعمت سے کم نہیں، اور وہ ادھر ادھر مارے پھرنے کے بجائے وہاں گذر اوقات کرلے سکتے ہیں، اور زندگی کے بقیہ لمحات کیسے بھی گذر جائیں گے، جیسا کہ ایک مثل مشہور ہے: "ڈوبتے ہوئے کو تنکا کا سہارا"۔

ہاسٹل میں بوڑھے لوگوں کو ڈالنا:

جن مجبور لوگوں کا اوپر ذکر ہوا ان لوگوں کو ہاسٹل میں ڈالنے اور قیام کرانے میں کوئی مضائقہ نہیں، البتہ ایسے مجبور اور بوڑھے لوگ جن کے افراد خاندان موجود ہیں جیسے بیٹے یا حقیقی بھائی، وغیرہ ان لوگوں پر درجہ بدرجہ اپنے بوڑھے قرابتداروں اور اپاہج کی کفالت لازم ہے جیسا کہ پیچھے تفصیل سے بیان آچکا ہے، اس لئے کہ کوئی شخص اپنے بزرگوں کو ایسے ہاسٹلوں میں قیام پر مجبور نہیں کرسکتا۔

نیز اصل یہ ہے کہ سن رسیدہ لوگ اپنے خاندان کے درمیان اپنے گھر میں رہیں جہاں انہوں نے نشوونما پایا اور زندگی کا بڑا حصہ گذارا، اب جبکہ بوڑھے ہوچکے ہیں، ان کو اس ماحول سے نکالا جائے گا تو ان پر بڑا گراں گذرے گا اور جو ایک سال میں مرنے والا ہوگا وہ ایک ہی مہینہ میں مرجائے گا، اور ان کو ایسی عمر میں اپنے رشتہ داروں کے درمیان رہنے دینے میں ان کی عزت وتعظیم ہے، اور ان کو اپنے خاندان سے پیار ومحبت ملے گی، اپنے ارد گرد اولاد کی اولاد کو دیکھ کر خوش ہوں گے، ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں گی، دل بہلے گا، طبیعت شادماں اور باغ باغ ہوگی۔

نیز اس عمر میں انسان کی طبیعت زیادہ خراب ہوتی ہے اور صحت رو بہ زوال ہوتی ہے، خدمت ومدد کی بار بار ضرورت پڑتی ہے، اپنی اولاد اور قرابت دار عام طور پر خدمت سے اکتاتے نہیں ہیں، اور نہ ہی جی چراتے ہیں، بلکہ خدمت کو اپنی سعادت تصور کرتے ہیں، اور قرآن وحدیث میں بھی بوڑھے ماں باپ یا خاندان کے بزرگ کی خدمت پر بڑا اجر وثواب کا وعدہ کیا گیا ہے، اس کے برخلاف ہاسٹل کے خدمت پر مامور ملازم شوق وذوق سے خدمت نہیں کرتے ہیں، اور جیسی نگہداشت ہونی چاہئے ویسی نہیں ہوپاتی ہے۔

اور نیز حدیث وقرآن میں بوڑھے ماں باپ اور دادا دادی کی خدمت اور انکے ساتھ حسن سلوک کی جو تاکید آئی ہے اور ترک حسن سلوک اور خدمت پر وعید

وارد ہوئی ہے، سے مستفاد ہوتا ہے کہ بوڑھے ماں باپ اور دادا دادی کی خدمت اوران کے ساتھ حسن سلوک کرنا فرض ہے، لہذا اپنے بزرگوں کو ہاسٹلوں میں قیام پر مجبور کرنا حرام اور گناہ کبیرہ ہوگا۔

اگر کسی وجہ سے قرابتدار پر اپنے بزرگ کی خدمت دشوار ہو تو ان کے لئے ضروری ہوگا کہ خادم یا خادمہ مقرر کردے جو ان کی خدمت ونگہداشت پورے طور پر کرے۔

سوال (۸) اجتماعی کفالت میں زکوۃ کی رقم کا استعمال:

جواب: انسان کو بذات خود شریف النفس، خوددار اور غیرت مند ہونا چاہئے دوسروں کے سامنے دست سوال پھیلانے سے گریز کرنا چاہئے، جب تک اپنے بازو میں طاقت ہو، اس پر اعتماد و بھروسہ کرنا چاہئے، اپنے علم وہنر سے استفادہ کرتے ہوئے دوسروں پر تکیہ کرنے کے بجائے خود کما کر زندگی بسر کرنے کا عادی بننا چاہئے، اس لئے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے کسب ید کو پاکیزہ ترین خوراک فرمایا اور اس کی طرف لوگوں کو راغب فرمایا، اور بلا ضرورت دست سوال پھیلانے پر وعید سنایا (بخاری، باب الاستعفاف عن المسألۃ، حدیث: ۱۴۶۹، ۱۴۷۰، باب من سأل الناس تکثرا، حدیث: ۱۴۷۴، ۱۴۸۰)۔

جو لوگ عمر ڈھلنے کے بعد کام کرنے کو معیوب سمجھتے ہیں اور ترک عمل شرف وعزت تصور کرتے ہیں وہ خود فریبی اور بڑی غلطی میں پڑے ہوئے ہیں، حقیقت میں معاملہ اس کے برعکس ہے؛ کیونکہ عمل ایک ورزش ہے جس سے صحت وتندرستی برقرار رہتی ہے، اور دل بہلتا ہے اور مصروفیت کی بنا پر بہت سے گناہوں سے اپنا پن محفوظ رہتا ہے، دماغی قوی تروتازہ اور چالو رہتا ہے، اور غور وفکر کی صلاحیت کمزور نہیں پڑتی۔

جہاں تک دریافت کردہ صورت کے جیسے لوگوں کے لئے اجتماعی کفالت کے لئے زکوۃ کی رقم استعمال کرنے کی بات ہے تو اس کی گنجائش ہوگی؛ کیونکہ وہ محتاج مصرف زکوۃ ہیں۔

سوال (۹) جو لوگ مطلوب مقررہ حد عمر کو نہ پہنچے ہوں کیا ان کے لئے سرکاری رعایتوں سے فائدہ اٹھانا جائز ہے:

جواب: ظاہر ہے کہ ایسی رعایتوں سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں ہوگا؛ کیونکہ یہ دھوکہ دینا ہوگا، اور حدیث شریف میں دھوکہ دینے کی ممانعت آئی ہے، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو دوسرے کو دھوکہ دے وہ ہم میں سے نہیں (ترمذی، بیوع، باب فی کراھیۃ الغش، حدیث: ۱۳۱۵)۔

والدین کے حقوق اور آداب واحکام

مولانا رحمت اللہ ندوی[1]

بوڑھوں کے حقوق:

اسلام نے حضرت آدم کی اولاد کی حیثیت سے ہر انسان کے لئے عزت وتکریم کا جو اصول طے کیا ہے اس کی رو سے اس نے انسان کی زندگی کے تمام مراحل کو اہمیت دی ہے، اور اس سلسلہ میں آیات واحادیث اسلام کی بنیاد ہیں:

"ولقد کرمنا بنی آدم... وفضلناهم علی کثیر ممن خلقنا تفضیلاً" (بنی اسرائیل: ۷۰).

"وقضی ربك ألا تعبدوا إلا إیاه وبالوالدین إحساناً" (بنی اسرائیل: ۲۳).

''ما أکرم شباب شیخا لسنه إلا قیض الله لهم من یکرمه عند سنه'' (ترمذی).

(جب بھی کوئی نوجوان کسی بوڑھے کا اکرام اس کی درازی عمر کی وجہ سے کرتا ہے تو اللہ تعالی اس کے لئے ایسے لوگ تیار کر دیتا ہے جو خود اس کے بوڑھاپے کے وقت اس کی عزت واکرام کریں گے)۔

''لیس منا من لم یرحم صغیرنا ویعرف شرف کبیرنا'' (ترمذی واحمد)۔

(جو ہمارے چھوٹوں پر رحم نہ کرے اور بڑے و بوڑھوں کا احترام نہ پہچانے تو وہ ہم میں سے نہیں)۔

انٹرنیشنل اسلامک فقہ اکیڈمی جدہ نے ''بچوں اور بوڑھوں کے حقوق'' کے موضوع پر منعقد ہونے والے سمینار میں بوڑھوں سے متعلق جو فیصلے کئے ہیں، ان میں سے چند تجاویز تحری اور نقل کرنا موضوع کی مناسبت سے بہتر معلوم ہوتا ہے:

۲۔ ان کو (بوڑھوں) سوسائٹی کا ایک حصہ بنانے اور ان کے تمام انسانی حقوق کا پاس ولحاظ رکھنے پر زور دیا جائے۔

۳۔ ان کے خاندان ہی ان کے لئے بنیادی جگہ ہوں تاکہ وہ عائلی زندگی کا لطف اٹھا سکیں، ان کے بیٹے اور پوتے ان کے ساتھ حسن سلوک کریں، وہ اپنے اقرباء واحباب اور پڑوسیوں کے حسن سلوک سے لطف اندوز ہوں، اگر ان کے اپنے خاندان نہ ہوں تو مناسب ہے کہ ان کے لئے اولڈ ہاؤسز میں گھریلو ماحول فراہم کیا جائے۔

۴۔ سوسائٹی کو بوڑھوں کے تمام ومرتبہ اور ان کے حقوق سے تعلیم وتربیت کے کورسز اور ٹی وی پروگراموں کے ذریعہ آگاہ کیا جائے، ساتھ ہی والدین کے ساتھ حسن سلوک پر زور دیا جائے۔

۵۔ ان بوڑھوں کی خبر گیری کے لئے سنٹر بنائے جائیں جن کا کوئی خاندان نہ ہو یا جن کے گھرانے ان کی خبر گیری نہ کر سکتے ہوں۔

۷۔ ٹرانسپورٹ کے ذرائع میں اور عام مقامات اور ٹیکسی اسٹینڈ وغیرہ میں بوڑھوں کا لحاظ رکھتے ہوئے ان کی مخصوص سیٹیں بنائی جائیں (جدہ فقہ اکیڈمی کے شرعی فیصلے، بارہواں سمینار، قرارداد ۱۱۳، (۷/۱۲) ص/۳۳۹، ۳۴۰)۔

والدین سے متعلق ضروری احکام وآداب:

والدین سے متعلق کچھ ضروری احکام وآداب تحریر کئے جاتے ہیں:

---

[1] دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ۔

۱۔ والدین غریب اور خدمت کے محتاج ہوں اور کوئی دوسرا خدمت گار نہ ہو یا وہ اولاد کی دینی مصلحت کے پیش نظر سفر کرنے سے منع کریں تو ان کی اطاعت واجب ہے، ان کی اجازت کے بغیر فرض کفایہ علم، تبلیغ دین اور جہاد جبکہ فرض عین نہ ہو، کے لئے نکلنا درست نہیں۔

۲۔ اگر والدین خدمت کے محتاج ہوں مگر خود کفیل ہیں تو فرض عین علم دین حاصل کرنے کے لئے بلا اجازت سفر کرنا جائز ہے، والدین کو چاہئے کہ وہ کسی کو اجرت پر رکھ کر خدمت لیں، البتہ فرض کفایہ علم اور تبلیغ کے لئے بغیر اجازت سفر کرنا جائز نہیں۔

۳۔ اگر والدین طاقت وقوت رکھتے ہوں، خدمت کے محتاج نہ ہوں تو خواہ وہ خود کفیل ہوں یا غریب، فرض عین اور کفایہ دونوں درجوں کے علم دین کے لئے اجازت کی ضرورت نہیں، کیونکہ اس صورت میں والدین کا نفقہ (خرچ) اولاد کے ذمہ واجب نہیں۔

۴۔ والدین کا نفقہ حیثیت رکھنے والی اولاد پر اس وقت واجب ہوتا ہے، جب والدین غریب ہوں اور بڑھاپے یا بیماری کی وجہ سے کمانے کے قابل نہ ہوں۔

۵۔ باپ کے مالدار یا کمانے کی طاقت رکھنے کی صورت میں ماں کا خرچ اولاد پر واجب نہیں، بلکہ باپ پر واجب ہے، کیوں کہ بیوی کا نفقہ شوہر پر واجب ہوتا ہے۔

۶۔ واضح رہے کہ جن صورتوں میں اجازت ضروری نہیں، افضل اور بہتر ہے کہ والدین سے اجازت لے، تاکہ ان کی رضامندی اور دعا سے خیر وبرکت پیدا ہو۔

۷۔ جن صورتوں میں باپ کا خرچ اولاد پر واجب ہے اور سفر کرنے کی وجہ سے باپ کو خرچ نہ دے سکتا ہو تو باپ کو منع کرنے کا حق ہے، اسی طرح اگر بچہ کی آبرو پر حرف آسکتا ہے، مثلاً وہ امرد ہے اور باہر جانے میں تہمت کا اندیشہ ہے تو باپ سفر کرنے سے منع کرسکتا ہے، اور لڑکی کو بدرجہ اولی روک سکتا ہے۔
لیکن اگر سفر میں بچہ کا قطعاً کچھ ضرر نہ ہو، محض رہنمائی سے باپ کے امر ونہی کا تعلق ہو تو عدم تعمیل نافرمانی نہیں، البتہ حکم کی مخالفت نہ کرنا بہر حال بہتر ہے (تحفۃ الالمعی ۵ / ۲۴۰، ۲۴۱ ملخصا)۔

اگر شوہر اور والد کے حکم میں تضاد ہو اور ان میں سے کسی ایک کے حکم کی ہی تعمیل کی جاسکتی ہو تو شوہر کا حق مقدم ہے، اگر شوہر اپنی بات پر بضد ہو تو اس کی بات کو ترجیح دی جائے اور والدین سے معذرت کرلی جائے، جو لڑکیاں شوہر کے مقابلے میں والدین کے حکم کو فوقیت دیتی ہیں وہ اپنے گھر کبھی سکون سے آباد نہیں ہوسکتیں (آپ کے مسائل اور ان کا حل ۷ / ۲۳۲ تلخیصا)۔

بیوی کی بات مان کر والدین سے ترک تعلق جائز نہیں اور شرعاً بیوی کی اس بات کا کوئی اعتبار نہیں، وہ عورت بھی گنہگار ہوگی (ایضا/ ۲۲۵)۔

بلا اجازت سفر کا حکم:

اگر سفر کی وجہ سے والدین یا بیوی بچوں کے ضیاع کا خوف ہو، یعنی وہ خود غنی نہ ہوں ان کی حفاظت کرنے والا کوئی نہ ہو تو اس صورت میں سفر نہ کرے، اور اگر اپنے شہر میں روزگار کا کوئی انتظام نہ ہوسکتا ہو تو ان کے لئے نفقہ اور حفاظت کا معقول انتظام کرکے سفر کرسکتے ہیں، البتہ سفر ایسا پر خطر ہے کہ ہلاکت کا ظن غالب ہے تو بہر صورت والدین کی اجازت کے بغیر سفر کرنا جائز نہیں۔

''فلو فی سفر تجارة أو حج لا بأس به بلا إذن الأبوين إن استغنيا عن خدمته'' (رد المحتار ۵/ ۲۶۱)۔
بوقت استغناء والدین کی اجازت کے بغیر بھی سفر کرنا جائز ہے، بشرطیکہ راستہ پر خطر نہ ہو، استغناء کا مطلب یہ ہے کہ وہ بیٹے کی جسمانی خدمت یا مالی تعاون کے محتاج نہ ہوں، طبعی صدمہ تو بہر حال ہوتا ہی ہے (احسن الفتاوی ۸ / ۱۷۸۔ ۱۸۰)۔

دور حاضر میں کسی جگہ تدریس کے لئے والدین کی رضامندی ضروری نہیں، بلکہ اگر والدین خدمت کے محتاج نہیں اور مدرس ان کی تمنا پوری کرنے میں اپنا نقصان سمجھتا ہے، تو اس امر میں والدین کی اطاعت جائز نہیں۔

درج ذیل صورتوں میں والدین کی اجازت کے بغیر سفر کرنا یا دور رہنا جائز نہیں۔

۱۔ والدین جسمانی خدمت کے محتاج ہوں اور کوئی خدمت کرنے والا نہیں ہے۔

۲۔ سفر ایسا پر خطر ہے کہ ہلاکت کا ظن غالب ہے۔

۳۔ لڑکا امرد ہے، اس کے فتنہ میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہے (احسن الفتاوی ۸ / ۱۸۱۔ ۱۸۲)۔

بہو کی طرف سے علاحدہ رہائش کا مطالبہ:

حکیم الامت حضرت تھانویؒ نے تحریر فرمایا ہے:

''نفقہ ہی کا ایک جزء بی بی کو رہنے کے لئے گھر دینا ہے، اس کے متعلق ایک عام غلطی میں اکثر مرد مبتلا ہیں کہ جداگانہ گھر دینا اپنے ذمہ واجب نہیں سمجھتے، بس اپنے عزیزوں میں عورت کو لا ڈالتے ہیں، سو اس میں حکم یہ ہے کہ اگر شامل رہنے پر عورت بخوشی راضی ہو تب تو خیر، ورنہ اگر وہ سب سے جدا رہنا چاہے تو مرد پر اس کا انتظام واجب ہے، حتی کہ اگر مرد کو قرائن قویہ سے معلوم ہو جائے کہ وہ جدا رہنا چاہتی ہے، مگر زبان سے اس کی درخواست نہ کر سکے تب بھی مرد کو شامل رکھنا جائز نہیں، البتہ اتنی گنجائش ہے کہ اگر پورا گھر نہ دے سکے تو بڑے گھر میں ایک کوٹھری یا کمرہ ایسا دینا کہ اس کی ضروریات کو کافی ہو سکے اور اس میں اپنا مال و اسباب مقفل کر کے رکھ سکے، اور آزادی کے ساتھ اپنے میاں کے ساتھ تنہائی میں اٹھ بیٹھ سکے، بات چیت کر سکے، یہ واجب کے ادا کرنے کے لئے کافی ہوگا۔

اس سے آگے کی تحریر کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر اعزہ اس پر ناخوش ہوں تب بھی مصلحت یہی ہے کہ علاحدہ ہی رکھے، اس میں ہزاروں مفاسد کا انسداد ہے، خصوصاً چولہا تو ضرور ہی علاحدہ ہونا چاہئے، کیونکہ زیادہ تر آگ اس چولہے ہی سے بھڑکتی ہے۔

فقہاء نے یہاں تک فرمادیا ہے کہ مرد کی بیوی کی اولاد ہو تو ان کے ساتھ رہنے پر دوسری بیوی کو مجبور نہیں کر سکتا، آج کل کے واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسری اولاد کے ساتھ رہنے میں، عزیزوں کے ساتھ رہنے کے مقابل میں مفاسد زیادہ ہیں (اصلاح انقلاب امت ۲ / ۱۸۷۔ ۱۸۸)۔

حضرت مولانا مفتی رشید احمد لدھیانویؒ نے لکھا ہے:

''اگر بیوی مالدار ہو تو اسے الگ مکان دینا واجب ہے، متوسط درجہ کی ہو تو اسی مکان میں ایک مستقل کمرہ کے علاوہ باورچی خانہ، غسل خانہ اور بیت الخلاء بھی مستقل ہونا ضروری ہے، مسکین ہو تو صرف ایک کمرہ کافی ہے، باورچی خانہ، غسل خانہ اور بیت الخلاء مشترک ہوں تو مضائقہ نہیں (احسن الفتاوی ۵ / ۷۶ ۴، محمود الفتاوی ۳ / ۱۰۶ تا ۱۰۸، آپ کے مسائل اور ان کا حل ۷ / ۲۴۶)۔

ڈاکٹر رشید عبد اللہ الفرحان لکھتے ہیں:

''شوہر کے لئے جائز نہیں ہے کہ اپنی بیوی کو اس کی رضا کے بغیر اس کے غیر محرم رشتہ دار کے ساتھ بسائے، کیونکہ اس میں عورت کے لئے ضرر اور اس پر تنگی برتنا ہے، نیز اس میں اس کی حق تلفی بھی ہے، اگر بیوی کو لے کر غیر محرم رشتہ دار کے ساتھ رہنے کے علاوہ مرد کے لئے کوئی چارہ نہ ہو اور عورت اس پر راضی ہو تو عورت کا الگ اور غیر مشترک گھر میں رہنے کا حق ساقط ہو جائے گا، اور اگر راضی نہ ہو تو اللہ تعالی کی حدود زیادہ اہمیت کے حامل اور لائق عمل ہیں اور شرعی محرمات سے بچنا زیادہ اہم ہے، باری تعالی کا ارشاد ہے: "تلك حدود الله فلا تقربوها" (بقرہ: ۱۸۷، زوجین کے درمیان اسلام کا نظام معاشرت / ۱۲۲)۔

''مجموعہ قوانین اسلامی'' میں ہے:

''شوہر پر اپنی صلاحیت کے مطابق بیوی کی رہائش کے لئے ایسی علاحدہ جگہ دینا ضروری ہے، جو عورت کے لئے مناسب حال اور رہن سہن کی بنیادی ضرورتوں پر مشتمل ہو (مجموعہ قوانین اسلامی از مسلم پرسنل لا بورڈ / ۱۳۹ دفعہ ۱۸۹)۔

ساس، سسر کی خدمت ـ شرعی نقطہ نظر سے:

حضرت تھانویؒ نے اپنے رسالہ ''حقوق اسلام'' میں لکھا ہے:

''قرآن مجید میں حق تعالی نے نسب کے ساتھ علاقہ مصاہرہ کو بھی ذکر فرمایا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ ساس، سسر اور سالے و بہنوئی اور داماد اور بہو اور ربیب یعنی بیوی کی پہلی اولاد کا بھی حق کسی قدر ہوتا ہے، اس لئے ان تعلقات میں بھی رعایت احسان و اخلاق کے کسی قدر خصوصیت کے ساتھ رکھنا چاہئے'' (اصلاحی نصاب / ۴۳۶)۔

نامور فقیہ مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ فرماتے ہیں:

''ایک بات اور سمجھ لیجئے جس میں بڑی کوتاہی ہوتی ہے، وہ یہ کہ جب عورت کے ذمہ شوہر اور اس کی اولاد کا کھانا پکانا واجب نہیں، تو شوہر کے جو ماں باپ اور بہن بھائی ہیں ان کے لئے کھانا پکانا اور ان کی خدمت کرنا بطریقہ اولی واجب نہیں۔

ہمارے یہاں یہ دستور چل پڑا ہے کہ جب بیٹے کی شادی ہوئی تو اس بیٹے کے ماں باپ یہ سمجھتے ہیں کہ بہو پر بیٹے کا حق بعد میں ہے اور ہمارا حق پہلے ہے، لہذا یہ بہو ہماری خدمت ضرور کرے، چاہے بیٹے کی خدمت کرے یا نہ کرے، اور پھر اس کے نتیجہ میں ساس، بہو، بھاوج اور نندوں کے جھگڑے کھڑے ہوجاتے ہیں اور جھگڑوں کے نتیجہ میں جو کچھ ہورہا ہے، وہ آپ کے سامنے ہے۔

خوب سمجھ لیجئے! اگر والدین کو خدمت کی ضرورت ہے تو لڑکے کے ذمہ واجب ہے کہ وہ خود ان کی خدمت کرے، البتہ اس لڑکے کی بیوی کی سعادت مندی ہے کہ وہ اپنے شوہر کے والدین کی خدمت بھی خوشی دلی سے اپنی سعادت اور باعث اجر سمجھ کر انجام دے، لیکن لڑکے کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اپنی بیوی کو اپنے والدین کی خدمت کرنے پر مجبور کرے جب کہ وہ خوش دلی سے ان کی خدمت پر راضی نہ ہو، اور نہ والدین کے لئے جائز ہے کہ وہ اپنی بہو کو اس بات پر مجبور کریں کہ وہ ہماری خدمت کرے، اگر بہو اپنی سعادت سمجھ کر ساس کی خدمت کرتی ہے تو اجر کی مستحق ہوگی اور گھر کی فضا بھی خوشگوار رہے گی، لیکن ساس، سسر اور شوہر کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ وہ جو خدمت بھی کردے رہی ہے، اس کا حسن سلوک اور حسن اخلاق ہے، اس کے ذمہ فرض و واجب نہیں، حقوق کے حدود نہ سمجھنے کی وجہ سے طرح طرح کے مسائل پیدا ہوتے ہیں اور اس کے نتیجہ میں گھر کے گھر برباد ہورہے ہیں، لہذا حقوق کی جو حدیں قرآن وحدیث میں بیان کردی گئی ہیں، ہر ایک کو ان پر قائم رہنا چاہئے (اصلاحی خطبات ۲/ ۴۱-۴۲)۔

حضرت تھانویؒ تحریر فرماتے ہیں:

''بعضے آدمی اس کو بڑی سعادت مندی سمجھتے ہیں کہ بی بی کو اپنی ماں کا محکوم و مغلوب بنا کر رکھیں، اور اس کی بدولت بیبیوں پر بڑے بڑے ظلم ہوتے ہیں، سو سمجھ لینا چاہئے کہ بی بی پر فرض نہیں کہ ساس کی خدمت کیا کرے، تم سعادت مند ہو تو خود خدمت کرو، خدمت کے لئے نوکر لاؤ'' (اصلاح انقلاب امت ۲/ ۱۸۸، محمود الفتاوی ۳/ ۱۰۵، ۱۰۶)۔

اسلامی فقہ اکیڈمی انڈیا نے ''مشترکہ وجداگانہ خاندانی نظام'' کے عنوان سے جو تجاویز پیش کی ہے، اس کا ایک حصہ یہاں نقل کیا جاتا ہے:

''اگر ماں کو ایسی خدمت کی ضرورت ہو جس کو کوئی عورت ہی انجام دے سکتی ہے اور بہو کے علاوہ کوئی دوسری قریبی عورت خدمت کرنے والی نہ ہو، نیز ماں مجبور ہو، خود سے وہ کام انجام دینے کے لائق نہ ہو تو ایسی صورت میں بہو پر ساس کی خدمت واجب ہوگی'' (نئے مسائل اور اسلامک فقہ اکیڈمی کے فیصلے/ ۳۵، ۳۱، دفعہ ۶)

باپ کی زندگی میں جائیداد کا مطالبہ:

والدین اپنی زندگی میں اولاد کو جو کچھ دیتے ہیں اس کی حیثیت ہبہ اور بخشش کی ہے، اور اس کے لئے حکم شرعی یہ ہے کہ اس میں تمام اولاد کے ساتھ برابر سلوک کیا جائے، کسی کو بلا وجہ شرعی کم زیادہ نہ دیا جائے، البتہ نیکی وصلاح، یا خدمت واطاعت یا معذوری وضرورت کے پیش نظر کسی کے ساتھ خصوصی معاملہ کیا جاسکتا ہے (محمود الفتاوی ۳/ ۱۱۱-۱۱۲ ملخصا)۔

لڑکا جب بالغ ہوگیا تو اس کا نفقہ باپ پر نہیں، الا یہ کہ وہ اپاہج ہونے کی وجہ سے کمانے پر قادر نہ ہو اور اس کے پاس بقدر کفاف مال نہ ہو، اور اس کا باپ صاحب حیثیت ہو، تو باپ پر ہوگا، واجب نہ ہونے کی صورت میں ملکی قانون کا سہارا لے کر بذریعہ کورٹ نفقہ حاصل کرنا جائز نہیں اور اس کا کھانا بھی جائز نہیں (ایضا ۵/ ۳۴۳ ملخصا)۔

باپ پر لازم ہے کہ بخشش کے معاملہ میں اپنی اولاد کے ساتھ مساویانہ سلوک کرے، تا کہ سب بچے اپنے باپ کے ساتھ نیک سلوک کرسکیں، بخشش (ہبہ) کے معاملہ میں اپنی اولاد کو بلا ضرورت اور بغیر کسی وجہ جواز کے ایک دوسرے پر ترجیح دینا حرام ہے، کیونکہ اس سے اشتعال پیدا ہوتا ہے، اور آپس میں بغض وعداوت کی آگ بھڑک اٹھتی ہے، حدیث شریف میں تین بار تاکید سے فرمایا گیا ہے،

''اعدلوا بين أبنائكم'' (احمد، نسائی، ابوداؤد، اسلام میں حلال وحرام از ڈاکٹر یوسف القرضاوی/ ۳۰۲)۔

امام احمدؒ کے یہاں کسی سبب مثلاً لڑکے کی معذوری یا حاجتمندی کی وجہ سے ترجیح دینا جائز ہے (ایضا: ۱۰۴)۔

باپ اپنی زندگی میں اپنی جائیداد کا مکمل اور باختیار مالک ہے، بلوغ کے بعد لڑکوں کا نفقہ اس کے ذمہ نہیں ہے، لڑکوں کو کسب معاش کی فکر اور اس کے لئے جائز ذرائع تلاش کر کے خود اپنی کفالت کرنی چاہئے اور باپ کے سہارے نہ رہنا چاہئے اور وہ اپنی جائیداد نہ دے تو بچوں کو مطالبہ کا کوئی حق شرعاً نہیں پہنچتا، البتہ اگر لڑکے پریشان حال اور بے روزگار ہوں اور باپ خوشحال ہو تو اسے چاہئے کہ گزر اوقات کے لئے اور بعد میں پیدا ہونے والے مسائل اور اختلاف سے بچنے کے لئے زندگی میں مکمل یا بقدر ضرورت کی تقسیم برابری کے ساتھ کر دے اور کچھ اپنی ملکیت میں بھی رکھے۔

آج کل جائیداد کی تقسیم اور مطالبہ، دونوں میں زیادتی ہو رہی ہے لڑکے صحت منداور طاقت ور ہونے اور کمائی پر قدرت رکھنے کے باوجود باپ کی جائیداد پر تکیہ کئے ہوئے ہیں، اور آوارہ بنے پھرتے ہیں، نہ کسی کام پر لگے ہیں اور نہ روزگار اختیار کرتے ہیں، بلکہ کمائی اور محنت سے جی چراتے ہیں۔

دوسری طرف والدین بھی بسا اوقات ان کی بے بسی اور مجبوری کو نہیں سمجھتے اور ان کا کوئی تعاون نہیں کرتے ہیں، یا لڑکوں کے مابین جائیداد کی غلط تقسیم سے نفرت پیدا کر دیتے ہیں۔

لڑکوں کو چاہئے کہ وہ روزی کمائی خواہ زراعت، تجارت، صنعت اور ملازمت میں سے کوئی ذریعہ ہو، بس شرط یہ ہے کہ ذریعہ حرام نہ ہو اور نہ اس سے حرام کی معاونت ہوتی ہو اور نہ ہی وہ حرام میں ملوث ہو، ہر جائز پیشہ اختیار کیا جا سکتا ہے، کسی پیشہ کو حقیر اور کمتر یا معیوب خیال کرنا درست نہیں۔

مسلمان کے لئے جائز نہیں کہ وہ عبادت کے لئے یکسوئی یا اللہ پر توکل کے نام سے طلب رزق سے بے پرواہ ہو جائے، کیونکہ آسمان سے سونے چاندی کی بارش ہونے والی نہیں۔

اسی طرح یہ بھی جائز کہ وہ صدقات کے بھروسہ پر بیٹھ جائے، جبکہ اسے ایسے ذرائع میسر ہوں جن کو اختیار کر کے وہ اپنے معاش کو دوڑ دھوپ کر سکتا ہے، نیز اپنے زیر کفالت افراد کی ضرورتیں پوری کر سکتا ہے، حدیث شریف میں ہے:

''لا تحل الصدقة لغني ولا لذي مرة سوي'' (ترمذی)

(صدقہ کسی غنی کے لئے جائز نہیں ہے اور نہ کسی ایسے شخص کے لئے جو توانا اور تندرست ہو)۔

اسی لئے بلا ضرورت گداگری حرام ہے، کیونکہ وہ انسان کو حیا باختہ بنا دیتی ہے، اور انسانیت وشرافت کو مجروح کر دیتی ہے (اسلام میں حلال وحرام/ ۱۶۸ تا ۱۷۰، دیکھیں، مزید تفصیل: کتب احادیث میں ملاحظہ کریں)۔

جب لڑکے کا باپ کی زندگی میں اس کی جائیداد میں حق نہیں، تو پھر جائیداد کا مطالبہ بھی گداگری، اور مفت خوری یا صدقہ کے زمرہ میں آئے گا، لہذا عام حالات میں تو جائیداد کا مطالبہ نہیں کیا جا سکتا، بعض خصوصی حالات میں اس کی اجازت اور گنجائش نکل سکتی ہے، یہ بھی واضح رہے کہ قانون کے علاوہ کچھ امور انسانیت اور اخلاقیات سے متعلق ہوتے ہیں، اگر چہ شرعی طور پر لڑکے کو مطالبہ کا حق تو نہیں، لیکن جب باپ خوشحال اور لڑکا پریشان حال ہو تو باپ کو اخلاقی اور انسانی فریضہ کے طور پر اس کا وہ حق دے دے جس کا استحقاق اس کو باپ کے مرنے کے بعد میراث اور ترکہ میں ہوگا۔

واضح رہے کہ دنیا کمانے میں اس قدر منہمک ہو جانا کہ حقوق اللہ وحقوق العباد میں خلل واقع ہونے لگے اور جسمانی ودماغی صحت پر برا اثر پڑنے لگے، جائز نہیں

"يأيها الذين آمنوا لا تلهكم أموالكم ولا أولادكم عن ذكر الله... الخاسرون" (سورہ منافقون: ۹)۔

صحابہ کرامؓ کے بارے میں آیا ہے، "رجال لا تلهيهم تجارة ولا بيع عن ذكر الله" (نور: ۳۷)۔

حدیث شریف میں حق تلفی سے منع فرماتے ہوئے فرمایا:

''إن لنفسك عليك حقا، فأعط كل ذي حق حقه'' (رواہ البخاری، احسن الفتاوی ۸/ ۹۳ ملاحظہ ہو)۔

والدین کا نفقہ:

قرابت کی وجہ سے جن لوگوں کا نفقہ واجب ہوتا ہے، ان میں والدین کا نفقہ واجب ہونے پر بھی فی الجملہ فقہاء کا اجماع واتفاق ہے، کیونکہ والدین کے ساتھ حسن سلوک کا اللہ تعالی نے حکم فرمایا ہے، "وبالوالدين إحسانا" (اسراء: ۲۳)۔

• والدین کا نفقہ اس وقت واجب ہوتا ہے، جب ان میں خود اپنی ضروریات مکمل کرنے کی صلاحیت نہ ہو، باپ اگر محتاج ہو اور کسب معاش کی صلاحیت رکھتا

ہو، لیکن نہ کماتا ہو، جب بھی اس کا نفقہ بیٹے کے ذمہ واجب ہے، وہ اپنے باپ کمانے پر مجبور نہیں کرسکتا، یہ حنفیہ کی رائے ہے، حنابلہ وغیرہ کے نزدیک بشمول والدین اقارب کا نفقہ اسی وقت واجب ہوتا ہے کہ وہ کمانے کی صلاحیت بھی نہ رکھتا ہو۔

نواب صدیق حسن خاں مرحوم نے قاضی ثناء اللہ پانی پتی کے رسالہ "حقیقۃ الاسلام" کے حوالے سے لکھا ہے:

"نفقہ مادر و پدر و اجداد و جدات مفلس کا، گو قدرت کمائی کی رکھتے ہوں، فرزند آزاد، عاقل، بالغ پر کہ قدرت کسب رکھتا ہو، واجب ہے، اگرچہ کافر و اہل ذمہ کیوں نہ ہوں (اسعاد العباد بحقوق الوالدین والاولاد/ ۵۳)۔

اگر کسی شخص کے ماں باپ دونوں ہوں اور اس کی معاشی پوزیشن اچھی نہ ہو تو اول تو تنگی کے ساتھ ہی اسی میں دونوں کی کفالت کرنی چاہئے، لیکن اگر ایسا ممکن نہ ہو تو نفقہ کے اعتبار سے ماں کا حق مقدم ہے، کیونکہ بظاہر ماں کے لئے کسب دشوار ہے، لیکن بعض فقہاء نے مطلقاً باپ کو ماں پر مقدم رکھا ہے، کیونکہ باپ ہی نے بچپن میں اس کی کفالت کا فریضہ سرانجام دیا ہے، حدیث میں ہے:

"أنت و مالك لأبيك" (رواه ابن ماجه بسند صحيح، اعلاء السنن ۱۱/ ۲۸۵، حديث: ۳۴۲۶)۔

باپ کا نکاح:

اگر باپ نکاح کی حاجت رکھتا ہو اور خود اس موقف میں نہ ہو تو شوافع اور حنابلہ کے نزدیک بیٹے پر باپ کی شادی کا انتظام واجب ہوگا اور اس کے مہر کی ذمہ داری بھی اس کے بیٹے پر ہوگی، حنفیہ کے یہاں وجوب اور عدم وجوب دونوں قول ہیں، علامہ ابن قدامہؒ نے ماں کے نکاح کا ذمہ دار بھی اولاد کو قرار دیا ہے (تفصیل کے لئے شرح مہذب، المغنی اور در مختار ملاحظہ ہو)۔

سوتیلی ماں کا نفقہ:

باپ کی بیوی (سوتیلی ماں) کا نفقہ ادا کرنے کی صلاحیت اگر باپ میں نہ ہو تو احناف کے علاوہ دیگر ائمہ ثلاثہ کے نزدیک اس کا نفقہ بیٹے پر واجب ہوگا، کیونکہ یہ بھی باپ کی ضروریات میں داخل ہے (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۷/ ۷۷۷)۔

علامہ حصکفی کی ترجیح کے مطابق حنفیہ کا بھی ایک قول یہی ہے، جبکہ دوسرا قول یہ ہے کہ اگر باپ مریض یا معذور ہونے کی وجہ سے محتاج خدمت ہو تب اس کی بیوی کا نفقہ بیٹے کے ذمہ ہے، کیونکہ وہ گویا باپ کی خادمہ ہے۔

بقول مولانا خالد سیف اللہ رحمانی دام مجدہ جمہور کا مسلک قرآن و حدیث کے مزاج سے قریب تر ہے، کیونکہ والدین کے ساتھ حسن سلوک اور معروف کا رویہ اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے، اور ظاہر ہے کہ یہ حسن سلوک نہیں ہوسکتا کہ اس کی بیوی کو نفقہ سے محروم رکھا جائے، بلکہ فقہاء نے ان جزئیات سے اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اگر والدین اپنی طبعی ضرورت اور خدمت کے لئے نکاح کے ضرورت مند ہوں تو اولاد کو اس کی رعایت کرنی چاہئے۔

خادم کا نظم:

جہاں والدین کی خوراک و پوشاک وغیرہ کی ضروریات کا پورا کرنا واجب ہے، وہیں اگر وہ خادم کے محتاج ہوں تو خادم کا نظم کرنا اور اس کے اخراجات کو برداشت کرنا بھی اولاد کے فرائض میں داخل ہے (قاموس الفقہ ۵/ ۲۱۴-۲۱۶)۔

مجموعہ قوانین اسلامی میں والدین کے نفقہ کے بارے میں ہے:

"اولاد پر اپنے حاجت مند آباء و اجداد کا نفقہ دینا واجب ہے، خواہ وہ اس کے ہم مذہب نہ ہوں" (دفعہ ۱۶۱)۔

اس دفعہ کی شرح میں ہے کہ شرع اسلام نے آباء و اجداد کے نفقہ کی ذمہ داری میں محتاجی کی شرط اس لئے لگائی ہے کہ اگر وہ مالدار ہیں تو ان کے نفقہ کا وجوب دوسرے مال میں قائم ہونے کی نسبت اپنے مال میں قائم ہونا اولی ہے (مجموعہ قوانین اسلامی ۳/ ۱۹۱۵، دفعہ: ۱۶۱)۔

مجموعہ قوانین اسلامی میں ہے:

"محتاج ماں باپ کا نفقہ اولاد پر بہر حال لازم ہے چاہے اولاد خوشحال ہوں یا تنگدست" (مجموعہ قوانین اسلامی، دفعہ: ۱۹۹)۔

حدیث شریف میں ہے: "إن أطيب ما يأكل الرجل من كسبه وإن ولده من كسبه. فكلوا من كسب أولادكم إذا احتجتم إليه بالمعروف" (بدائع ۴/ ۴۴۰)۔

بلاشبہ سب سے زیادہ پاکیزہ روزی انسان کی خود اپنی کمائی ہے، اور اس کا لڑکا بھی اس کی کمائی ہے، لہذا تم اپنی اولاد کی کمائی بوقت محتاجی معروف طریقہ سے کھاؤ)۔

نفقہ کی مقدار:

نفقہ کی مقدار شرعاً مقرر نہیں، لہذا نفقہ کی مقدار زمان ومکان کا لحاظ کرتے ہوئے باہمی مصالحت یا جماعت کے مشورہ سے بقدر کفایت طے کی جائے گی، اور وہی مقدار، مقدار نفقہ ہوگی (اہم مسائل جن میں ابتلاء عام ہے ۴/ ۱۴۱)۔

والدین کا نفقہ جس میں کھانا پینا، رہائش جیسی مسائل ہیں، بقدر کفایت واجب ہے (بدائع ۳/ ۵۴، ۴، قاموس الفقہ ۵/ ۲۱۴)۔

مجموعہ قوانین اسلامی کے مطابق نفقہ نرخوں کے بموجب مقرر کیا جائے گا۔

نفقہ کا ذمہ دار کون؟

والدین وغیرہ کا نفقہ ادا کرنے میں اولاد کے ساتھ کوئی اور شریک نہیں ہوگا، یعنی اولاد کو تنہا اپنے مال سے باپ کی کفالت کرنی ہوگی، والدین اور دادا دادی وغیرہ کا نفقہ لڑکوں اور لڑکیوں دونوں پر واجب ہوتا ہے، اگر تنہا ایک لڑکا یا ایک لڑکی ہو تو پورا نفقہ اسی کے ذمہ ہوگا، اگر ایک سے زیادہ ہوں تو سب پر تقسیم ہو جائے گا، سب مل کر ادا کریں گے، پھر اس میں لڑکوں اور لڑکیوں کی ذمہ داری قول صحیح کے مطابق مساوی ہوگی، شوافع، حنابلہ اور امام ابوحنیفہؒ کے ایک قول (جو حسن بن زیاد سے منقول ہے) کے مطابق حصہ میراث کے تناسب سے لڑکوں کی ذمہ داری بمقابلہ لڑکیوں کے دوگنا ہوگی (ہدایہ ۲/ ......، قاموس الفقہ ۵/ ۲۱۵، مادہ نفقہ)۔ ظاہر الروایہ میں ہے کہ محتاج والدین کے واسطے نفقہ کا استحقاق ان کے لڑکے اور لڑکیوں دونوں پر برابر ہے، اور فتوی اسی پر ہے (مجموعہ قوانین اسلامی ۳/ ۹۱۶، ۹۱۷)۔

مجموعہ قوانین اسلامی میں ہے:

-اگر کئی اولاد ہوں تو ہر ایک پر والدین کا نفقہ برابر واجب ہوگا۔

-محتاج باپ کی اگر ایک سے زائد بیویاں ہوں تو اولاد پر ایک سوتیلی ماں کا نفقہ واجب ہوگا (مجموعہ قوانین اسلامی از مسلم پرسنل لا بورڈ دفعہ ۲۰۰/ ۲۰۱)۔

بعض اسلامی ممالک میں قوانین نفقہ:

بعض ممالک اسلامیہ میں رائج قوانین نفقہ کی تلخیص پیش کی جارہی ہے تاکہ درست فیصلہ تک پہنچنے میں سہولت ہو۔

عراق:

۱۔ صاحب استطاعت لڑکے پر، خواہ بالغ ہوں، یا نابالغ، اپنے نادار والدین کا نفقہ واجب ہے، خواہ وہ (والدین) کسب معاش پر قادر ہوں، تا آنکہ یہ ظاہر نہ ہو کہ باپ کاہلی اختیار کرنے پر تلا ہوا ہے (دفعہ ۶۱)۔

۲۔ ہر نادار کسب معاش سے عاجز شخص کا نفقہ اس کے ایسے صاحب استطاعت رشتہ داروں پر ہے جو اس کے وارث ہوں، بقدر حصہ ترکہ واجب ہوگا (دفعہ ۶۲)

شام:

☆ خوش حال اولاد پر خواہ مرد ہو یا عورت الخ (مثل بالا ۱) تیونس کے قانون میں والدین کے ساتھ دادا، دادی کا اضافہ ہے (مثل ۲) (مجموعہ قوانین اسلامی ۳/ ۹۱۷، دفعہ ۴۴، ۱۵۸، ۱۵۹، ملاحظہ ہو)۔

تیونس:

اگر اولاد ایک سے زائد ہو تو خوش حال سے نفقہ دلایا جائے گا، نہ کہ انفرادی طور پر ہر ایک سے اور نہ ہی ورثہ کی بنیاد پر (مجموعہ قوانین اسلام ۳/ ۹۲۲، دفعہ ۴۵)۔

اہل قرابت کے حقوق:

والدین کے ساتھ حسن سلوک کے بعد اسی پر قرابت داروں کے ساتھ بہتر سلوک اور صلہ رحمی کو عطف کیا ہے، گویا یہ کہا جارہا ہے کہ اے مکلف انسان! قرابت دار، مسکین، مسافر جس کے پاس وطن تک جانے کا ذریعہ نہیں ان سب کا حق ادا کرو۔

ایک حدیث میں ہے: ''أمك وأباك، ثم أدناك أدناك'' ثم الأقرب فالأقرب''
(پہلے والدین کا حق ادا کرو، پھر قریب سے قریب تر کا)

بخاری اور مسلم میں ہے: ''من أحب أن يبسط له في رزقه، وينسأ له في أثره، فليصل رحمه''
(جو شخص پسند کرے کہ اس کی روزی کشادہ اور عمر دراز کردی جائے، اسے صلہ رحمی کرنی چاہئے)۔

احناف کے یہاں محرم اقارب کے لئے جیسے بہن، بھائی، والدین ہیں، حکم وجوب کے لئے ہے، جمہور کے نزدیک صرف اصول وفروع کا نفقہ واجب ہے، دیگر اقارب کا نہیں، حنابلہ کے یہاں تمام اقارب کا حتی کہ حاشیہ برداروں کا بھی واجب ہے (التفسیر المنیر ۱۵ / ۵۷-۵۸)۔

اعزہ واقارب کا شریعت میں ایک درجہ اور ایک حق ہے، حق قرابت کی اہمیت بتانے کے لئے بکثرت آیات (مثلاً: اسراء، ۲۶، بقرہ: ۸۳، نساء: ۸۵) اور احادیث (جن میں سے چند اوپر ذکر کی گئیں) وارد ہوئی ہیں۔

لیکن دنیا میں کتنے ایسے لوگ ہیں جن کے نزدیک نہ رشتہ دار کوئی چیز ہے، نہ رشتہ کا کوئی کام، نہ ہدیہ وتحفہ، نہ اخلاق ومروت، نہ خاطر مدارات، میل محبت کون کہے؟ مہینوں اور سالوں گزر جاتے ہیں، ملاقات کی نوبت نہیں آتی، اگر ملے بھی تو حسن سلوک کیا، سیدھے منہ بات کرنا بھی گوارا نہیں۔

عام رشتہ داروں کے حقوق میں کم از کم حسن معاشرت اور عمدہ سلوک ہے، اگر وہ حاجتمند ہوں تو ان کی مالی امداد بھی اپنی وسعت کے مطابق ہے، امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک جو رشتہ دار ذی رحم محرم ہو، اگر وہ عورت یا بچہ ہے جن کے پاس اپنے گزارہ کا سامان نہیں اور کمانے پر قدرت نہیں، اسی طرح جو رشتہ دار ذی رحم محرم اپاہج یا اندھا ہو، اور اس کی ملک میں اتنا مال نہیں، جس سے اس کا گزارہ ہو سکے، تو ان کے جن رشتہ داروں میں اتنی وسعت ہے کہ وہ ان کی مدد کر سکتے ہیں، ان پر ان سب کا نفقہ فرض ہے، اگر ایک ہی درجہ کے کئی رشتہ دار صاحب وسعت ہوں تو ان سب پر تقسیم کرکے ان کا گذارہ نفقہ دیا جائے گا (معارف القرآن ۵ / ۴۵۸ سورہ اسراء: ۲۶)۔

واضح رہے کہ والدین کے ساتھ حسن سلوک میں ان کے قرابت داروں اور دوستوں کے ساتھ بالخصوص ان کی وفات کے بعد حسن سلوک بھی شامل ہے (بخاری)

حضرت خدیجہؓ کے انتقال کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ان کی سہیلیوں کو تحفہ بھیجنا اسی قبیل سے تھا، خوش حال اور کمانے پر قدرت رکھنے والے شخص پر اس کے صرف قرابت دار فقراء میں سے صرف ان کا نفقہ واجب ہوتا ہے جن کا فی الجملہ یہ وارث ہوتا ہے (زوجین کے درمیان اسلام کا نظام معاشرت / ۲۱۸)۔

حضرت تھانویؒ نے اہل قرابت کے حسب ذیل حقوق تحریر فرمائے ہیں:

۱۔ اپنے محارم اگر محتاج ہوں اور کھانے کمانے کی قدرت نہ رکھتے ہوں تو بقدر کفایت ان کے نان ونفقہ کی خبر گیری مثل اولاد کے واجب ہے، اور محارم کا نان ونفقہ اس طرح تو واجب نہیں لیکن کچھ خدمت کرنا ضروری ہے۔

۲۔ گاہ گاہ ان سے ملتا رہے۔

۳۔ ان سے قطع قرابت نہ کرے، بلکہ اگر کسی قدر ان سے ایذا بھی پہنچے تو صبر افضل ہے۔

۴۔ اگر کوئی قریب محرم اس کی ملک میں آجاوے تو وہ فوراً آزاد ہو جاتا ہے (حقوق اسلام / ۶)۔

''مجموعہ قوانین اسلام'' میں ہے: مسلمان رشتہ داروں پر واجب ہے کہ اپنے حاجت مند رشتہ داروں کو جن سے میراث کا باہمی تعلق ہو، حسب قاعدہ وراثت نفقہ دیں (مجموعہ قوانین اسلام ۳ / ۹۱۶-۹۱۷)۔

دلیل "وعلى الوارث مثل ذلك"، نیز قدوری وہدایہ کی عبارتیں ہیں۔

مجموعہ قوانین اسلامی میں ہے:

۱۔ اقارب سے مراد ذی رحم محرم ہیں، یعنی وہ نسبی رشتہ دار جن میں باہم نکاح دوامی طور پر حرام ہے (دفعہ ۱۹۰)۔

۲۔ اصول وفروع کو چھوڑ کر دیگر اقارب کا نفقہ اس شخص پر واجب ہوگا جس کی آمدنی اتنی ہو جو اس کے ذاتی اور اس کے زیر کفالت افراد کے اخراجات سے زائد ہو (دفعہ ۱۹۳)۔

۳۔ اصول وفروع کو چھوڑ کر اس قریبی رشتہ دار کا نفقہ واجب ہوگا جس کے پاس نہ مال ہو اور نہ کمانے کے لائق ہو (دفعہ ۱۹۴)۔

۴۔ اصول وفروع کو چھوڑ کر دیگر محتاج ذی رحم محرم رشتہ داروں کا نفقہ ان کے خوشحال ذی رحم محرم رشتہ داروں پر بقدر حصہ وراثت واجب ہوگا (دفعہ ۲۰۳، مجموعہ قوانین اسلامی/ ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۴۳، قاموس الفقہ ۵/ ۲۱۵، مادہ: نفقہ)۔

اجتماعی کفالت کے لئے زکوۃ کا استعمال:

اسلام میں اس بات کو پسند کیا گیا کہ مسلمان کی زکوۃ اجتماعی طور جمع ہو اور مستحقین میں تقسیم ہو، خود قرآن مجید میں اس کی طرف اشارہ موجود ہے (توبہ: ۱۳۰) اسی پر عہد صحابہ اور بعد کے زمانوں میں بھی عمل رہا (اسلام کا نظام عشر وزکوۃ/ ۲۱۴)۔

ایسے ممالک کے بارے میں جہاں باگ اقتدار مسلمانوں کے ہاتھ میں نہ ہو، فقہاء نے لکھا ہے کہ وہاں بھی مسلمان خود کو اجتماعیت اور تنظیم کے اسلامی مزاج سے مستثنیٰ نہ سمجھیں اور باہمی اتفاق سے کسی کو امیر منتخب کرلیں۔

اسلام کی تمام تعلیمات اور شریعت کی تمام ہدایات سراپا رحمت ہیں، زکوۃ اور بیت المال کا یہ اجتماعی نظام مسلمانوں کے سماج کے لئے ایک نعمت عظمی اور کتنی ہی مادی، اخلاقی اور روحانی فوائد کا حامل تھا (ایضاً تفصیل کے لئے از ۲۱۳ تا ۲۳۶ دیکھیں)۔

بلاشبہ زکوۃ، صدقات، اور عشر اسلام کے معاشی نظام کی اصل ہیں، اور ان کے اثرات انسانی زندگی پر محیط ہیں۔

اسلام نے خود کفالتی نظام دیا ہے اور بلا ضرورت سوال کرنے اور ضرورت کی صورت میں حاکم وقت اور اپنے سرپرست کے سوا تمام لوگوں سے سوال کرنے کو ممنوع قرار دیا ہے، اور اس کی سخت مذمت کی گئی ہے۔

اسلام میں ایک طرف کام اور عمل کی ہمت افزائی کی گئی ہے، اور دوسری طرف مفت خوری اور بھیک منگی کی مذمت کی گئی ہے، تاہم ہر شہری کا اپنی ذمہ داریوں کے احساس اور اپنی کفالت کے لئے پوری فکر وجدوجہد کے باوجود معاشرے میں کچھ ایسے لوگ ضرور باقی رہ جاتے ہیں، جو معاشی جدوجہد نہیں کرسکتے، جیسے بالکل بے سہارا بیوہ، چھوٹے نادار یتیم بچے، مزمن امراض میں مبتلا مفلس مریض، نہایت، ضعیف مرد اور عورتیں، اچانک ہاتھ پاؤں سے معذور ہوجانے والے لوگ۔ اسلام ان کو سڑکوں پر بھیک مانگنے اور فٹ پاتھوں پر مرجانے کے لئے ہرگز نہیں چھوڑتا ہے، بلکہ ان کے لئے دو انتظامات کرتا ہے۔

ایک قرابت داری اور صلہ رحمی کا انتظام، اور دوسرا سرکاری وظیفے کا اجراء (اسلام کا نظام کفالت، ۳۱۔ ۳۸ ملاحظہ کریں)۔

اگر کسی ضرورت مند کے اہل قرابت اس کی ضرورت کا تکفل نہیں کرتے اور نہ حکومت اپنی ذمہ داری محسوس کرتی ہے تو ایسے لوگوں کی اجتماعی کفالت کے لئے زکوۃ کا استعمال ہوسکتا ہے بشرطیکہ وہ واقعی مستحق ہوں، کیونکہ زکوۃ کے مصارف ہشتگانہ میں فقراء ومساکین مصرف میں اولین توجہ کے حق دار ہیں، اور زکوۃ کا اصل مقصود ہی فقر واحتیاج کو دور کرنا اور ضرورت مند کی ضروریات کی تکمیل کرنا ہے، گو شریعت میں فقر واحتیاج زکوۃ کے مصارف کا اصل معیار ہے (قاموس الفقہ ۴/ ۷۸، ۷۹، مادہ زکوۃ)۔

اس پر قریب قریب فقہاء کا اتفاق ہے کہ محتاج علماء، علوم دینیہ کے طلبہ، صوفیہ زہاد اور دینی کام کرنے والوں کی زکوۃ سے مدد کرنا زیادہ باعث ثواب ہے (قاموس الفقہ ۴/ ۸۷، جدید فقہی مسائل ۱/ ۲۰۱)۔

جو فلاحی ادارے زکوۃ جمع کرتے ہیں وہ زکوۃ کی رقم کے مالک نہیں ہوتے، بلکہ زکوۃ دہندگان کے وکیل اور نمائندے ہوتے ہیں، اگر وہ صحیح مصرف پر خرچ کریں گے تو زکوۃ دہندگان کی زکوۃ ادا ہوگی ورنہ نہیں۔

اس لئے جب تک کسی فلاحی ادارے کے بارے میں یہ اطمینان نہ ہو کہ وہ زکوۃ کی رقم شریعت کے اصولوں کے مطابق ٹھیک مصرف میں خرچ کرتا ہے، اس وقت تک اس کو زکوۃ نہ دی جائے (آپ کے مسائل اور ان کا حل ۳/۴۰۶)۔

زکوۃ کی وصولی میں مہتمم یا اسکا نائب (سفیر و محصل) طلبہ کا وکیل ہے، مہتمم یا اس کے نائب (سفیر و محصل) کو دے دینے سے زکوۃ ادا ہو جائے گی، مہتمم مدرسہ کا فرض ہے کہ زکوۃ کی رقم حسب احکام شرع طلبہ پر صرف کرے (نئے مسائل اور فقہ اکیڈمی کے فیصلے: ۶۴ بعنوان مدرسہ کے سفراء و محصلین اور مہتمم کی حیثیت)۔

سرکاری سہولت سے بغیر استحقاق استفادہ:

سن رسیدہ حضرات کو حکومت مختلف چیزوں میں خصوصی مراعات دیتی ہے، مثلاً ٹرین وغیرہ کے کرایہ میں تخفیف، امدادی وظیفہ، ٹیکس میں رعایت وغیرہ، ان مراعات اور خصوصی اسکیموں کے لئے عمر کی جو حد مقرر ہے اس مطلوب مقرر حد عمر کو جو حضرات نہ پہونچے ہوں، ان کے لئے اس سے استفادہ ناجائز ہے اور اس میں کئی مفاسد اور قباحتیں جمع ہیں:

۱۔ حکومت کے قانون کی خلاف ورزی اور ضابطہ شکنی۔

جبکہ حکومت اسلامیہ کے قوانین کی پابندی اس حیثیت سے ضروری ہے کہ وہ اطاعت اولی الامر ہے، اور غیر اسلامی حکومت کے ضابطہ کی خلاف ورزی اس لئے ممنوع ہے کہ اپنے آپ کو قانونی سزاؤں کے لئے پیش کرنا لازم آتا ہے، جس میں تذلیل ہے۔

''ولكونه عرضا للنفس لعقوبات قانونية إذا كانت الحكومة غير إسلامية'' (تكملة فتح الملهم ۱/ ۵۹۰، محمود الفتاوی ۴/ ۷۷۳)۔

۲۔ مال حق ناحق کھانا۔

قرآن میں ہے: "ولا تأكلوا أموالكم بينكم بالباطل وتدلوا بها إلى الحكام لتأكلوا أموال الناس" (بقرة: ۱۸۸)، "إن الذين يأكلون أموال اليتامى ظلمًا إنما يأكلون في بطونهم نارًا وسيصلون سعيرًا" (نساء: ۱۰)۔

۳۔ دھوکہ وفریب۔

حدیث میں ہے: ''من غش فليس منا'' (مسلم ۱/ ۷۰، باب قول النبی ﷺ من غشنا، ترمذی ۱/ ۲۴۵، ابواب البیوع، باب ما جاء فی کراہیۃ الغش)۔

۴۔ رشوت دینا: ''الراشي والمرتشي كلاهما في النار'' (حديث)۔

۵۔ ذلت نفس۔

لا ينبغي المؤمن أن يذل نفسه، الخ (تحفة الالمعی ۵/ ۶۳۱، رواه الترمذی، ابواب الفتن)۔

۶۔ معاہدہ کی خلاف ورزی جو قانون شکنی کی صورت میں ہے۔

"يا أيها الذين آمنوا أوفوا بالعقود" (مائدہ: ۱)، "وأوفوا بالعهد إن العهد كان مسئولا" (اسراء: ۳۴)۔

معلوم ہوا کہ سرکاری سہولیات سے کسی غیر مستحق کا فائدہ اٹھانا حرام ہے، کیونکہ دھوکہ بازی کے ساتھ اپنے کو مستحق امداد ثابت کیا جاتا ہے، اور بسا اوقات فریب اور دھوکہ بازی کو درست ظاہر کرنے کے لئے رشوت کا بھی ارتکاب کیا جاتا ہے جو حرام ہے۔

بوڑھوں کا ہاسٹل اور اس کا شرعی حکم:

موجودہ ترقی یافتہ دور اور مغربی طرز حیات کے موج تند جولاں نے آج معاشرتی نشیمن کو تہہ و بالا اور خاندانی نظام کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیا ہے، مغربی تمدن کا علمی اور نفسیاتی جائزہ لینے والے اس پر متفق ہیں کہ اس کی بنیاد خود غرضی، مفاد پرستی اور مشترکہ مادی منفعت پر ہے، ساری مغربی دنیا کا پورا معاشرہ ایک تجارتی کمپنی کے اصولوں پر عامل اور گامزن ہے، وہاں انسان صرف ایک مشین یا محض تاجر بن کر رہ گیا ہے، عائلی نظام درہم برہم، زندگی بے کیف و بے سکون، نہ مسرت ہے نہ

لذت وحلاوت، البتہ اس کو پرکیف و پرمسرت بنانے کے لئے عارضی اور وقتی تدبیریں اپنائی اور طرح طرح کے غیر انسانی طریقے اختیار کئے جاتے ہیں، انسان جانور اور درندہ ہوگیا ہے، نہ اخلاص ہے اور نہ محبت، نہ ایک دوسرے سے بلاضرورت کوئی ربط اور تعلق، اس کی آنکھ نرگس کی ہے، جس میں کوئی نمی نہیں، دل کے بجائے سنگ ہے جو پسیجتا نہیں۔

آگے کے چند اقتباسات سے وہاں کی مہذب قوم، ترقی یافتہ معاشرہ، اور وہاں رہنے والے لوگوں کی انسانیت نوازی، اور اپنے والدین کے لئے جذبۂ ہمدردی کا اندازہ لگائیں۔

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ اپنے سفرنامہ "دو مہینے امریکہ میں" وہاں کے خاندانی حالات اور والدین اور اولاد کے باہمی تعلقات کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں:

"یہاں والدین، اولاد کے صرف جوان ہونے تک اپنے کو ان کی پرورش کا ایک حد تک ذمہ دار سمجھتے ہیں اور درمیان میں ان بچوں کے ذہن میں یہ خیال پیدا کرتے ہیں کہ آدمی کو خود اپنی کمائی سے اپنے مصارف پورے کرنا چاہئے، ان کی تعطیلات میں ان کو وقتی طور پر ملازمت کرلینے یا کوئی آمدنی والا کام کرنے کا شوق دلاتے ہیں اور جیسے ہی ان کی عمر کمانے کی ہوجاتی ہے ان کو خود اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کے لئے چھوڑ دیتے ہیں۔

اولاد بھی بڑی ہوکر اس رویہ کا جواب اپنے خود غرضانہ رویہ سے دیتی ہے کہ ہر شخص اپنی کمائی سے فائدہ اٹھائے، نہ کما سکتا ہو تو حکومت اس کی ذمہ داری لے یا پھر اس کی قسمت ہے، بھگتے، کوئی ایک دوسرے کا ذمہ دار کیسے ہوسکتا ہے، جبکہ ہر شخص کی کمائی اس کی ضرورت اور مصارف کے مطابق ہے، اسی سے ریٹائرڈ ہونے کے بعد لوگوں کی حالت عجیب ہوتی ہے۔...... اعزہ سے ملاقات، اہل تعلق کی مزاج پرسی اور ہمدردی سے وہ بالکل محروم رہتا ہے، اپنا وقت خود ہی گزارنا پڑتا ہے۔

بوڑھوں کی دل بستگی کے لئے اگر بیوی کے لئے شوہر اور شوہر کے لئے بیوی نہیں ہے تو کوئی دلبستگی کرنے والا نہیں، بہت کسی نے کیا تو اتوار کے روز چند منٹ آکر مل گیا اور اپنے ساتھ کچھ پھول یا گلدستے اظہار تعلق کے لئے ہدیۃً لیتا آیا" (دو مہینے امریکہ میں، ۲۵۶، ۲۵۷ مزید تفصیل کتاب میں دیکھیں، سماج کی تعلیم وتربیت/ ۵۱۔۵۳)۔

آگے بوڑھوں کے ہوسٹل کے عنوان سے لکھتے ہیں:

"اس صورت حال کا مداوا حکومتیں یہ کرنے لگی ہیں کہ بڑھاپے کی فیس کے اندوختہ سے بوڑھوں کے لئے اقامت خانہ مہیا کرتی ہیں، جو لوگ اپنی تنہائی کی زندگی سے پریشان ہوں، ان اقامت گاہوں میں داخل ہوسکتے ہیں وہاں ان کے ہم عمر اور ہم مذاق ہوتے ہیں، اور ان کی انسانی ضروریات کا پورا انتظام ہوتا ہے، بوڑھوں کے ان ہوسٹلوں میں سب کچھ ہوتا ہے، لیکن اعزہ و اولاد کا قریبی ربط نہیں ہوتا، جو بوڑھے لوگ اعزہ یا اولاد کے تعلق کی حس زیادہ رکھتے ہیں، ان میں سے بعض کے بہت افسوس ناک واقعات سننے میں آئے ہیں" (دو مہینے امریکہ میں/ ۲۵۸۔۲۵۹)۔

مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ العالی نے جو منظر پیش کیا ہے، اس کو بھی دل پر جبر کر کے پڑھتے چلیں:

"خاندانی تعلقات کا نظام درہم برہم ہے اور رشتہ داروں کے ساتھ تو محبت والفت کے تقاضے نایاب ہوتے جارہے ہیں، امریکی معاشرے میں بڑھاپا موت سے بدتر عذاب ہے، بوڑھوں کے لئے الگ مرکز قائم ہیں، جہاں ان کے کھانے پینے کا انتظام تو ہوتا ہے، لیکن وہ اس محبت کو ترستے ہیں جو صرف خون کے رشتے کی خاصیت ہے، بڑے بڑے مالدار لوگوں کے ماں باپ ان مراکز میں بے چارگی کے ساتھ موت کا انتظار کرتے ہیں اور ان کی اولاد مہینوں، بلکہ بعض اوقات سالوں ان سے ملنے نہیں آتی اور جو بوڑھے گھر پر رہ جائیں، انہیں کوئی بات کرنے والا نہیں ملتا، ایسے بوڑھوں کی طرف سے باقاعدہ اشتہارات شائع ہوتے ہیں کہ "ہم سے فلاں پتے پر مل کر گھنٹہ بھر بات کرلیجئے" اور اس ہمدردی کا بسا اوقات معاوضہ بھی پیش کیا جاتا ہے، تنہائی سے اکتائے ہوئے بوڑھے بعض اوقات بے مقصد لوگوں کو فون کرتے ہیں، تاکہ کچھ دیر کسی سے بات کرسکیں" (جہان دیدہ/ ۹۴ مزید دیکھیں مغرب سے صاف صاف باتیں/ ۶۶۔۶۷)۔

مولانا ابوالکلام قاسمی شمسی کی یہ چند سطریں بھی پڑھ لیں، جو انہوں نے اپنے سفرنامہ "تین ہفتہ امریکہ میں" وہاں کی کمزوریوں کے عنوان سے لکھا ہے:

"صرف اپنے لئے جینا اور اپنے لئے مرنا وہاں کی زندگی ہے، ماں باپ بوڑھے ہوجائیں تو بوڑھوں کے ہاسٹل میں ان کو رکھ دیا گیا، وہاں ان کی زندگی گذر رہی ہے، یہ ہے وہاں کی زندگی یہ وہیں کی عام حالت ہے، مسلمان کے سلسلہ میں معلوم ہوا کہ ان کی اخلاقی حالت میں زیادہ فساد نہیں آیا ہے" (تین ہفتہ امریکہ میں/

۸۳)۔

اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کے بیسویں سمینار کے ایک موضوع ''مشترکہ و جداگانہ خاندانی نظام'' کی آخری تجویز یوں ہے:

''سماج کے معمر اور سن رسیدہ افراد انسانی سماج کے لئے بیش قیمت سرمایہ ہیں، ان کی راحت رسانی اور خدمت انسانی سماج کی ذمہ داری ہے، خصوصاً اولاد اور افراد خاندان کی ذمہ داری ہے کہ بوڑھوں کی خدمت کریں، ان کی عزت وتکریم کریں، اور انہیں اپنے ساتھ محبت و الفت کے ساتھ رکھیں اور ان کی خدمت کو اپنے لئے سعادت سمجھیں'' (نئے مسائل اور اسلامک فقہ اکیڈمی کے فیصلے/ ۱۲۶ / دفعہ ۸)۔

مذکورہ بالا اقتباسات سے معلوم ہوا کہ ''بوڑھوں کے ہاسٹل'' مغربی نظام زندگی کا عطیہ اور خالص غیر اسلامی اور مادی فکر کا نتیجہ ہے، بلکہ غیر فطری اور غیر انسانی نظام اور طریقہ ہے، جو اسلام کے عطا کردہ لازوال معاشرتی نظام کے بالکل مغائر ہے، لہٰذا اس طرز زندگی کو عام حالات میں اختیار کرنا یا بوڑھوں کو بار سمجھ کر ان کو ہوسٹلوں کے حوالہ کر دینا اور وہاں قیام پر مجبور کرنا، نہ شرعاً جائز ہے اور نہ عقلاً اس کی کوئی گنجائش ہے۔

البتہ اگر اولاد بوڑھوں اور معذوروں کے حقوق ادا نہ کر رہی ہو، اور نہ ان کے اہل قرابت اپنی ذمہ داری محسوس کر رہے ہوں اور نہ سماج کا کوئی فرد آگے بڑھ رہا ہے جس کی وجہ سے وہ لاوارث بن گئے ہوں اور کسمپرسی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوں تو ایسی صورت میں ان کے لئے اس غرض سے ہاسٹل قائم کرنا اور اس میں ان کی ضروریات و سہولیات مہیا کرنا، تاکہ وہ اپنی زندگی کے بقیہ ایام باعزت طور پر گزار سکیں، اور در بدر کی ٹھوکر کھانے سے محفوظ رہیں، ایک مناسب کام معلوم ہوتا ہے، خواہ یہ اقامتی ادارے حکومت کی طرف سے قائم کئے جائیں، یا رفاہی اور سماجی تنظیموں کی طرف سے۔

لیکن یہ واضح رہے کہ یہ مسئلہ کا مستقل حل نہیں ہے اصل طریقہ وہی ہے جو اسلام نے پیش کیا ہے کہ ان کو گھر میں رکھ کر ان کی خدمت کی جائے، لہٰذا بوڑھوں کے تعلق سے سماج کے ہر فرد میں یہ احساس پیدا کیا جائے کہ بوڑھے لوگ انسانی سماج کا عضو معطل یا اس کے لئے بار گراں یا زمین کا بوجھ نہیں ہیں، بلکہ وہ بیش قیمت سرمایہ ہیں، اور ہر اعتبار سے انسانی تکریم کے مستحق ہیں، ان کی خدمت اپنی سعادت سمجھ کر کی جائے۔

نوجوان نسل میں یہ شعور بیدار کیا جائے کہ عمر ڈھلنے اور شباب رخصت ہونے کے بعد ان کو بھی اسی تلخ حقیقت اور دشوار مرحلہ سے گزرنا ہے، اس لئے وہ اپنے بوڑھوں، اور بزرگوں کی خدمت، اطاعت کریں، اور ان کے ساتھ ہمدردی، محبت و تعلق کا ایسا نمونہ پیش کریں جس کا خوشگوار نقش قائم ہو اور آنے والی نسل ذہنی و فکری طور پر اپنے والدین اور بوڑھوں کی خدمت کے لئے آمادہ رہے۔

معذورین اور معمر افراد کے شرعی حقوق

مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی [1]

ا۔ کسب معاش پر جبر اور اولاد و اقارب کا رویہ:

نفقہ کن لوگوں پر واجب ہے؟ اس سلسلہ میں شریعت نے کچھ درجات متعین کئے ہیں اس کی توضیح سے مسئلہ کو حل کیا جا سکتا ہے، نفقہ واجب ہونے کے تین اسباب ہیں، زوجیت، ملکیت، قرابت۔

(۱) بیوی کا نفقہ ہر صورت میں واجب ہے، خواہ وہ کتابیہ ہی کیوں نہ ہو، بشرطیکہ نکاح صحیح ہو اور بلا کسی عذر شوہر کے گھر سے باہر نہ ہو، نیز اس سے وطی کی جا سکتی ہو یا کسی بھی قسم کا ازدواجی نفع حاصل کیا جا سکتا ہو، شوہر کا مالدار ہونا بھی شرط نہیں ہے، کیونکہ یہ نفقہ حق مقصود میں محبوس ہونے کی وجہ سے ہے اور ہر صورت میں ہے، اس بابت امت کا اجماع بھی ہے اور اس میں اختلاف کی گنجائش ہو بھی تو کیوں ہو، قرآن کریم نے خود اس کی تصریح کردی ہے ''سورہ طلاق'' میں ہے:

"لينفق ذو سعة من سعته. ومن قدر عليه رزقه فلينفق مما آتاه الله لا يكلف الله نفسًا إلا ما آتاها" (طلاق: ۷)۔

(صاحب گنجائش کو چاہئے کہ اپنی گنجائش کے مطابق نفقہ ادا کرے اور جس کے پاس رزق میں تنگی ہے تو جتنا اللہ نے دیا ہے اسی میں سے خرچ کرے، اللہ تعالی ہر کسی کو اسی کا مکلف کرتے ہیں جتنا عطا کیا ہے)۔

''سورہ بقرہ'' میں ہے: "على المولود له رزقهن وكسوتهن بالمعروف" (بقرہ: ۲۳۳)

(والد پر اس کی والدہ کا عرف کے مطابق کھانا، پینا، اور کپڑا دینا ہے)۔

مختلف احادیث میں بھی اس پر بہت ہی واضح انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے، اہل علم سے وہ نصوص مخفی نہیں ہیں۔

(۲) ملکیت کی بنا پر غلاموں کا نفقہ، نیز انسان کی ملک میں موجود مویشیوں کا نفقہ واجب ہوتا ہے، اسی طرح جو شخص بھی کسی جاندار کے نفع و فائدہ کا مستحق ہے اسی پر اس کا نفقہ واجب ہے۔

''وتجب النفقة على من له المنفعة مالكًا كان أولا. مثاله: أوصى بعبد الرجل وخدمته لآخر فالنفقة على من له الخدمة'' (فتح القدير ۴/ ۳۸۷، كتاب النفقات، ط: زکریا دیوبند)۔

(جس کے لئے منفعت ہو اسی پر نفقہ واجب ہے خواہ مالک ہو یا نہ ہو، مثال کے طور پر کسی نے ایک شخص کے لئے غلام کی وصیت کی اور دوسرے کے لئے اس کی خدمت کی تو نفقہ اس شخص پر واجب ہے جس کے لئے خدمت ہے)۔

فقہاء نے تو جمادات، یعنی زمین، مکانات، وباغات جو انسان کے زیر ملک ہوں ان پر بھی بحث کی ہے کہ ان کو ضیاع سے بچانا بھی ضروری ہے، اگر غفلت برتی گئی تو کراہت ہوگی، یہ الگ بات ہے کہ یہ حکم قانونی طور پر واجب نہیں ہے۔

(۳) قرابت کی بنا پر جو نفقہ واجب ہوتا ہے اس کے مصداق میں اختلاف پایا جاتا ہے، شافعیہ تو اصول و فروع، سلسلہ وار اوپر و نیچے تک کا نفقہ واجب کرتے ہیں، یعنی والدین کے ماسوا دادا دادی، نانا نانی، پوتا پوتی، نواسہ نواسی کا بھی نفقہ واجب ہے۔

---

[1] مدرسہ حسنیہ کایم کلم کیرالہ۔

مالکیہ کے یہاں اس سلسلہ میں تنگی ہے صرف والدین اور بیٹے وبیٹیوں کا نفقہ واجب ہے، دادا دادی کا واجب نہیں (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۱۰/ ۷۴۲۱، ط: دارالفکر المعاصر)۔

البتہ حنفیہ کے نزدیک ہر وہ شخص جس سے محرمیت وقرابت ہو اس کا اپنے اپنے احوال کے مطابق نفقہ واجب ہوتا ہے، اصول وفروع اور دیگر اقرباء کے مابین وجوب نفقہ کے علت میں فرق ہے، اصول وفروع کا نفقہ جزئیت کی بنا پر واجب ہے، جبکہ دوسرے رشتہ داروں کا نفقہ، صلہ رحمی کی وجہ سے واجب ہے، اسی بنا پر خاص طور پر اصول کا نفقہ اس وقت بھی باقی رہتا ہے جبکہ فقیر ہوں، خواہ مال کمانے کی صلاحیت ہو یا نہ ہو، بہر صورت واجب ہے، یہ حنفیہ وشافعیہ کا قول ظاہر ہے، لیکن مالکیہ وحنابلہ اس بابت اختلاف کرتے ہیں ان حضرات کے نقطہ نظر میں یہ نفقہ بھی از قبیل مواسات ہے، لہذا اگر کسب کی صلاحیت ہے، خواہ وہ اصول ہی میں سے کیوں نہ ہو نفقہ واجب نہیں ہوگا۔

''أن يكون الأصل فقيرًا أو عاجزا عن الكسب، فلا يجب على الفرع نفقة أصله إن كان أصله غنيًا أو قادرًا على الكسب، لأنها تجب على سبيل المواساة والبر، والقادر على الكسب كالموسر مستغن عن المواساة، وبهذا قال المالكية والحنابلة والشافعيه في قول۔ وقال الحنفية والشافعية في الأظهر، كما قال النووي وهو قول بعض المالكية: إن كان الأصل فقيرًا قادرا على الكسب تجب نفقته على فرعه كذلك، لأن الله تعالى قد أمر بالإحسان إلى الوالدين، وفي إلزام الآباء التكسب مع غناء الأبناء ترك الإحسان إليهم وإيذاء لهم، وهو لايجوز'' (الموسوعة الفقہیہ ۴۱/ ۷۵، مادہ: نفقہ، ط: کویت)۔

(شرط یہ ہے کہ اصل فقیر ہو یا عاجز عن الکسب ہو پس اولاد پر اصل کا نفقہ واجب نہیں ہے اگر اصل غنی یا کمانے کی قدرت رکھنے والا ہو، اس لئے کہ یہ مواساۃ اور حسن سلوک کے طور پر واجب ہے، قادر علی الکسب مالدار کی طرح مواساۃ سے بے نیاز ہے، یہی مالکیہ وحنابلہ کی رائے ہے، شافعیہ کا ایک قول ہے۔ حنفیہ اور شافعیہ اظہر قول کے مطابق جیسا کہ نووی نے کہا اور بعض مالکیہ کا قول ہے، اگر اصل فقیر ہو قادر علی الکسب ہو تو اس کا نفقہ اس کی اولاد پر واجب ہے، اس لئے کہ اللہ تعالی نے والدین کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا ہے، آباء کو اولاد کے مالدار ہونے کے باوجود کمانے کا پابند بنانا ان کے ساتھ احسان کو ترک کرنا ہے اور ان کو ایذا پہنچانا ہے جو کہ جائز نہیں ہے)۔

والدین کے نفقہ کے وجوب پر ائمہ کا اتفاق ہے، مالکیہ وحنابلہ کے نزدیک حاجت کے وقت واجب ہے، یعنی جب ان کے پاس نہ تو مال ہو اور نہ مال کمانے کی صلاحیت، لیکن شافعیہ وحنفیہ کے نزدیک فقیر ہونا وجوب نفقہ کے لئے کافی ہے، مال کمانے کی صلاحیت کا فقدان ضروری نہیں ہے، صحیح مسلک اس سلسلہ میں یہی ہے اسی وجہ سے حنفی دواوین فقہ میں اس طرح کی تصریح ملتی ہے۔

''يجبر الولد الموسر على نفقة الأبوين المعسرين مسلمين كانا أو ذميين، قدرا على الكسب أم لم يقدرا'' (ہندیہ: ۱/ ۵۶۴ كتاب النفقات، الفصل الخامس في نفقة ذوي الارحام، احياء التراث العربي)۔

(مالدار اولاد کو فقیر ماں وباپ کو نفقہ دینے پر مجبور کیا جائے گا دونوں مسلمان ہوں یا ذمی، کسب پر قادر ہوں یا نہ ہوں)۔

شامی میں ہے: ''النفقة لأصوله الفقراء قيده به، لأنه لاتجب نفقة الموسر إلا الزوجة؛ ولو قادرين على الكسب جزم به في الهدايه، فالمعتبر في إيجاب نفقة الوالدين مجرد الفقر، قيل: وهو ظاهر الرواية'' (رد المحتار ۲/ ۶۷۲، کتاب النفقات، ط: رشیدیہ پاکستان)۔

(اپنے فقیر آباء وامہات کے لئے نفقہ واجب ہے، فقر کے ساتھ اس کو مقید کیا ہے، اس لئے کہ مالدار ہونے کی صورت میں صرف بیوی کا نفقہ واجب ہوتا ہے، اگر چہ اصول قادر علی الکسب ہی کیوں نہ ہوں، ہدایہ میں اسی پر جزم ہے، پس والدین کا نفقہ واجب ہونے میں صرف فقر کا اعتبار ہے، یہی ظاہر الروایہ ہے)۔

البتہ دوسرے محرم رشتہ دار کا نفقہ اس وقت واجب ہوگا، جبکہ فقر کے ساتھ محتاجی بھی ہو، محتاجی کی تین شکلیں ہوسکتی ہیں:

الف: صغرسنی، اس عمر میں مال کمانے کی صلاحیت ہی نہیں ہوتی ہے۔

ب: انوثت: مؤنث ہونا بھی محتاجی کی علامت ہے اس لئے کہ خلقی بناوٹ کے ساتھ خارجی اتنے فتنے ہیں کہ کسب معاش اس صنف کے لائق نہیں ہے۔

ج: بالغ و مذکر ہونے کے باوجود کسی عارضہ وحادثہ کی وجہ سے کسب کی صلاحیت کا مفقود ہو جانا، مثلاً اپاہج یا اندھا وغیرہ ہو گیا۔

محتاجی قید کے ساتھ اعزہ واقارب پر بقدر ارث نفقہ واجب ہوتا ہے:

’’تجب لکل ذی رحم محرم صغیرا وأنثی مطلقًا. قید للأنثی أی: سواء کانت بالغة أو صغیرة، صحیحة أو زمنة.... والمراد بالصحیحة، القادرة علی الکسب. لکن لو کانت مکتسبة بالفعل کالقابلة والمغسلة لانفقة لها‘‘ (رد المحتار مع الدر المختار ۲/ ۴۰، کتاب النفقات رشیدیہ پاکستان)۔

(ہر ذی رحم محرم کا نفقہ واجب ہے، صغیر ہو یا مطلق مؤنث (مطلق ہونا) مونث کی قید ہے، یعنی خواہ بالغہ ہو یا صغیرہ، تندرست ہو یا اپاہج، تندرست سے مراد ہے کہ کسب پر قادر ہو، البتہ بالفعل کسب کرنے والی ہو، جیسا کہ دایہ، غسل دینے والی ہے تو اس کا نفقہ واجب نہیں ہوگا)۔

چونکہ ذی رحم محرم کا نفقہ صلہ رحمی کے طور پر اور بقدر میراث واجب ہوتا ہے، لہذا صفت ارث کا فقدان ہو یا صلہ رحمی کی حاجت نہ ہو تو نفقہ بھی ساقط ہو جاتا ہے، اسی وجہ سے کافر رشتہ دار کا نفقہ واجب نہیں ہے،

’’ولا تجب نفقتهم مع اختلاف الدین لبطلان أهلیة الإرث. ولابد من اعتباره ولا تجب علی الفقیر، لأنها تجب صلة وهو یستحقها علی غیره، فکیف تستحق علیه بخلاف نفقة الزوجة وولده الصغیر‘‘ (ہدایہ علی فتح القدیر ۴/ ۲۸۲ کتاب النفقات، ط: زکریا دیوبند)۔

(اہل قرابت کا نفقہ اختلاف دین کے ساتھ واجب نہیں، اہلیت ارث نہ ہونے کی وجہ سے کیونکہ اس کا اعتبار ضروری ہے، نیز فقیر پر واجب نہیں ہے، اس لئے کہ اس قسم کا نفقہ بطور صلہ رحمی واجب ہوا ہے، فقیر شخص تو دوسرے سے اس صلہ رحمی کا محتاج ہے تو اس کا استحقاق اس پر کیسے ہوگا، برخلاف زوجہ اور ولد صغیر کے)۔

اوپر کی تفصیل سے چند باتیں معلوم ہوئیں:

(۱) فقیر والدین کا نفقہ اولاد پر واجب ہے، کسب سے عاجز ہونا ضروری نہیں ہے، نیز اس کا وجوب ائمہ کے مابین متفق علیہ ہے۔

(۲) اولاد اور والدین کے مابین اختلاف دین سے اثر نہیں پڑتا۔

(۳) دوسرے اعزہ واقارب کا نفقہ مالکیہ وشافعیہ کے یہاں واجب نہیں، صرف احناف وحنابلہ کا مسلک ہے۔

(۴) احناف کے نزدیک اس وقت نفقہ واجب ہوگا، جبکہ دونوں کے مابین قرابت محرمیت کا رشتہ ہو۔

(۵) دوسرے اعزہ واقارب کا نفقہ بقدر ارث واجب ہوتا ہے، اس لئے اختلاف دین کی وجہ سے نفقہ ساقط ہو جائے گا، کیونکہ اختلاف دین موانع ارث میں سے ہے۔

(۶) اعزہ واقرباء کا نفقہ صلہ رحمی کے جذبہ سے واجب ہے، اگر منفق خود صلہ رحمی کا محتاج ہو، یعنی فقیر ہو تو وجوب نہیں ہوگا۔

(۷) رشتہ داروں کا نفقہ احتیاج کے وقت واجب ہے، صغرسنی، انوثت نیز بلوغ کے ساتھ کسی ایسے عارضہ کا لاحق ہونا جو کسب معاش سے عاجز کردے محتاجی پر دلیل ہوں گے۔

(۸) محتاجی کا مدار کسب سے عاجز ہونے پر ہے، بظاہر جو بھی صورت کسب کے لئے مانع ہو وہ محتاجی کی علامت ہوگی، لہذا بہت زیادہ کمزور ولاغر ہونا، یا کبر سنی ودرازی عمر کی اس منزل پر پہنچ جانا کہ کسب معاش مشکل ہو اس میں داخل ہوگا۔

اس تفصیل کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ اگر والدین کے پاس مال نہیں ہے، خواہ کسب کی صلاحیت ہو ان کا نفقہ اولاد پر ہوگا، والدین کو کسب پر

مجبور نہیں کیا جاسکتا، وہ اپنا حوصلہ پورا کرنے کے لئے کسب میں لگے ہوں تو الگ بات ہے۔ ''تاتارخانیہ'' میں ہے:

''ذكر شمس الأئمة السرخسي في شرح أدب القاضي للجصاص أن الأب إذا كان كسوبا والابن أيضا كسوب يجبر الابن على الكسب في نفقة الأب'' (تاتارخانیہ ۵/۴۲۶، نفقہ ذوی الارحام، ط: زکریا دیوبند)۔

(علامہ سرخسی نے ادب القاضی کی شرح میں ذکر کیا ہے: باپ کسب پر قادر ہو، بیٹا بھی کسب پر قادر ہو تو بیٹا کو باپ کے نفقہ کے لئے کسب پر مجبور کیا جائے گا)۔

دبستان شافعی کی معتبر ترین متن میں بھی اس کی تصریح موجود ہے:

''وإن كان من الأصول وجبت على الأظهر، لأن الله تعالى أمر بمصاحبتهم بالمعروف، وليس من المعروف تكليفهم الكسب مع كبر السن'' (روضة الطالبين ۸/۴۸، كتاب النفقه، الباب الرابع في نفقة الأقارب)۔

(اگر اصول میں سے ہے تو قول اظہر کے مطابق نفقہ واجب ہے، اس لئے کہ اللہ تعالی نے ان کے ساتھ معروف کا معاملہ کرنے کا حکم دیا ہے، یہ معروف نہیں ہوگا کہ بڑھاپے کے ساتھ ان کو کسب معاش کا مکلف کیا جائے)۔

لیکن دوسرے اعزہ واقارب پر اسی وقت واجب ہوگا جبکہ واقعتا کسب سے عجز ہو، اگر ایسا سن رسیدہ کسب کرسکتا ہو، خواہ تھوڑی مشقت سے ہی، نیز ایسی مشقت کا برداشت کرنا ایسی عمر میں عرفاً کوئی معیوب بھی نہیں ہو تو خود ہی کسب کا مکلف رہے گا، لیکن سوسائٹی میں ایسی عمر کو کسب کی عمر نہیں سمجھا جاتا تو کسب کا مکلف نہیں ہوگا اور اس کے نفقہ اس کے خویش واقارب پر ہوگا، شامی کی عبارت میں ہے:

''لو كان الذكر بالغًا عاجزًا عن الكسب بنحو زمانة كعمى وعته، وفلج، زاد في الملتقى والمختار: أو لايحسن الكسب لخرقه أو لكونه من ذوي البيوتات، أي، من أهل الشرف، وعبارة الفتح: وكذا إذا كان من أبناء الكرام لايجد من يستأجره، وعبارة الزيلعي: أو يكون من أعيال الناس يلحقه العار بالتكسب، واعترضه الرحمتي بأن كسب الحلال فريضة، وبأن عليًا سيد العرب كان يؤجر نفسه لليهود كل ولو ينزعه من البئر بتمرة والصديق بعد أن بويع بالخلافة حمل أثوابًا وقصد السوق، قلت: لا يخفى أن ذلك لم يكن عارًا في زمن الصحابة، بل بعد ونه فخرًا بخلاف من بعدهم، ألا ترى أن الخليفة، بل من دونه في زماننا لو فعل كذلك لسقط من أعين رعيته فضلًا عن أعدائه'' (الدر المختار مع رد المحتار ۲/۶۷۰، كتاب النفقات، ط: رشیدیہ پاکستان)۔

(اگر مذکر بالغ ہو، کسب سے کسی عارضہ کی وجہ سے عاجز ہو مثلاً اندھا پن، خفت عقل، فالج زدہ ہونا، ملتقی مختار میں ہے، یا کسب اچھی طرح سے نہیں کرسکتا ہے کہ اس کو آتا نہیں ہے، یا شرفاء میں ان کا شمار ہے، اسی طرح شرفاء کی اولاد میں سے ہے کوئی ایسا شخص نہیں ہے جو اس کو اجیر رکھے، زیلعی کی عبارت ہے: یا ایسے ہم لوگوں میں سے ہے کہ کسب معاش کی وجہ سے عار ہوتا ہو۔ رحمتی نے اس پر اعتراض کیا کہ حلال روزی کا کسب تو فرض ہے، نیز حضرت علی سید العرب ہونے کے باوجود خود کو یہودی کا اجیر بنا کر کنواں سے ہر ڈول کے نکالنے پر ایک تمر لے رہے ہیں، صدیق اکبر خلیفہ ہونے کے بعد کپڑوں کو اٹھاتے ہیں اور بازار کا قصد کرتے ہیں، میں کہتا ہوں کہ یہ مخفی نہیں ہے کہ دور صحابہ میں یہ عار نہیں تھا بلکہ اس کو فخر سمجھا جاتا تھا بعد کے زمانہ میں ایسا نہیں رہا دیکھتے نہیں کہ خلیفہ کیا اس سے کم درجہ کا شخص ہمارے زمانے میں اگر ایسا کرے تو دشمن کی نگاہ میں تو کجا اپنی رعایا کی آنکھوں میں ہیچ ہوجائے گا)۔

آج کی صورت حال بھی ٹھیک یوں ہی ہے، لہٰذا جہاں درازی عمر میں کام کرنے کو عار سمجھا جاتا ہو، ناچیز کی رائے میں اس عمر میں اس کو کسب پر مجبور نہیں کیا جاسکتا ہے، لیکن جہاں کا ماحول ہی ہو کہ بوڑھے سے بوڑھا انسان کام کرنے کو اپنا اعزاز تصور کررہا ہو بہر حال وہاں دوسرے رشتہ داروں پر اس کے نفقہ کا بار گراں نہیں ڈالا جائے گا۔

۲۔ سن رسیدہ حضرات کا نفقہ کس صورت میں واجب ہے:

اوپر کی تفصیل سے اس سوال وجواب کی تصویر واضح ہوچکی ہے، اگر سن رسیدہ حضرات کے پاس مال موجود ہے تو اس کا نفقہ خود اسی کے مال سے

واجب ہے، مال نہیں ہے، لیکن کسب کی قدرت ہے تو اولاد پر ان حضرات کا نفقہ واجب ہوگا، لیکن قریبی رشتہ دار پر ان کا نفقہ واجب نہیں ہو سکے گا، ہاں کسب کی صلاحیت بھی باقی نہیں ہے یا اس عمر کے افراد کے لئے کسب معاش عار کا باعث ہوتا ہے تب ہی ان کا نفقہ قریبی رشتہ دار پر واجب ہو سکے گا۔

۳۔ زیادہ سہولت کے لئے رقم کا مطالبہ نفقہ کے تحت نہیں آتا ہے:

بنیادی امر یہ ہے کہ ''نفقہ'' کا مصداق ومعیار کیا ہے، فقہاء کرام نے اس موضوع کو بھی منقح کیا ہے۔

''نفقہ'' نفوق سے مشتق ہے جس کے معنی ہلاک ہونے کے ہیں کہا جاتا ہے ''نفقت الدابة نفوقا'' جانور ہلاک ہو گیا۔

یا پھر ''نفاق'' بفتح النون سے ماخوذ ہے اس کا معنی رائج ہونے یا کسی بھی سودے کا چلن ہونے کے ہیں (فتح القدیر ۴/ ۳۴۰، باب النفقہ، ط: زکریا دیوبند)۔

عرفاً نفقہ کا اطلاق صرف طعام پر ہوتا ہے، مگر شرعاً کھانا، کپڑا اور رہائش کو کہا جاتا ہے۔

''النفقة هي لغة ما ينفق به الإنسان على عياله، وشرعًا هي: الطعام والكسوة والسكنى. وعرفًا: هي الطعام'' (درمختار ۲/ ۲۹۹، باب النفقہ ط: رشیدیہ پاکستان)۔

(نفقہ لغت میں بولا جاتا ہے اس مال کو جس کو انسان اپنے عیال پر خرچ کرتا ہے، اور شرعاً: طعام کسوۃ اور سکنی کو کہا جاتا ہے، اور عرفاً طعام کا نام ہے)۔

نیز اس کی مقدار کتنی ہونی چاہئے، مختلف جزئیات ومسائل کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ''قدر کفایت'' ہونی چاہئے، یہ ہر شخص کے لحاظ سے الگ الگ بھی ہو سکتی ہے، بلکہ زمان ومکان کے اختلاف سے بھی اس کی مقدار ومعیار متاثر ہو سکتی ہے، جامعین موسوعہ نے لکھا ہے:

''اتفق الفقهاء على أن الواجب في نفقة الأقارب قدر الكفاية من الخبز والأدم والكسوة والسكنى والرضاع إن كان رضيعًا، لأنها وجبت للحاجة فتقدر بما تندفع به الحاجة'' (الموسوعة الفقهية ۴۱/ ۸۱، مادہ: نفقہ)۔

(فقہاء کا اس پر اتفاق ہے کہ اقارب کے نفقہ میں روٹی، سالن، کپڑا، رہائش، اگر وہ دودھ پیتا بچہ ہے تو رضاعت کی وہ مقدار جو کافی ہو جائے وجب ہے، اس لئے کہ یہ حاجت کی وجہ سے واجب ہے، لہذا جو مقدار حاجت کو رفع کردے وہی مقدم ہوگی)۔

اس لئے اگر سن رسیدہ حضرات قدر کفایت سے زیادہ کا مطالبہ کرتے ہیں تو قانونی طور پر واجب نہیں کیا جا سکتا، یہ اور بات ہے کہ اولاد کو چاہئے کہ ان کو کچھ زائد دیا کریں تاکہ جوانی کے زمانے میں جو دوسروں کو دینے کی عادت رہی ہے وہ متاثر نہ ہو ورنہ ان کا دل کڑھے گا، اور رواں رواں بلکے گا تو اچھا نہیں ہوگا، فقہی ذخیرے کی ایک عبارت سے استناد کیا جا سکتا ہے کہ زیادہ رقم کا مطالبہ کرنے کا حق ان حضرات کو نہیں ہے۔

''فإن طلب الأب النفقة من ولده فقال الولد: هو غني، وقال الأب: أنا فقير، قال في المنتقى: روى بشر عن أبي يوسف أنه يسأل عن حال الأب، فإن أخبر أنه فقير تجعل عليه النفقة، وإن قالوا: لا ندري لا يجعل على الابن النفقة ما لم يقم الأب بينة أنه فقير'' (تاتارخانیہ ۵/ ۴۳۰، نفقۃ ذوی الارحام، ط: زکریا دیوبند)۔

(اگر باپ نے اپنی اولاد سے نفقہ کا مطالبہ کیا، اولاد نے کہا کہ وہ مالدار ہے باپ نے کہا: میں فقیر ہوں، منتقی میں ہے: بشر نے ابویوسف سے روایت کی ہے کہ باپ کے احوال سے متعلق سوال کیا جائے گا اگر معلوم ہو کہ فقیر ہے تو بیٹا پر نفقہ واجب کیا جائے گا اور اگر لوگ کہیں: معلوم نہیں تو بیٹا پر نفقہ واجب نہیں کرے گا، جب تک باپ اپنے فقیر ہونے پر بینہ قائم نہ کرے)۔

جب اصل نفقہ کا یہ حال ہے تو حاجت سے زائد نفقہ تو بہر حال اس پر واجبی حقوق میں سے نہیں ہوگا)۔

(۴، الف): زائد آمدنی کے لئے دوسرے شہر کا سفر کرنا:

زائد آمدنی کا حصول زیادہ سے زیادہ مباح کے دائرہ میں آئے گا، مگر محتاج والدین کی رضا کا حصول طاعت ہے اور اس کا درجہ فرض عین کا ہے،

ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''رضی الرب فی رضا الوالد وسخط الرب فی سخط الوالد'' (ترمذی ۲/ ۱۲ ابو البر والصلۃ)

(رب کی خوشنودی والد کی خوشنودی میں، اور رب کی ناراضگی والد کی ناراضگی میں پنہاں ہے)۔

والدین کی اطاعت ورضا کا کتنا لحاظ رکھا گیا ہے، ہجرت وجہاد جیسی اہم عبادت پر بھی اس کو مقدم رکھا گیا ہے، متعدد احادیث میں مختلف واقعات مذکور ہیں کہ صحابی نے جہاد کی اجازت طلب کی، مگر والدین کی وجہ سے اجازت نہیں ملی، ہجرت کر کے آئے، مگر ان کو وطن واپس کر دیا گیا۔

(ابوداؤد ۱/ ۳۴۲ کتاب الجہاد باب فی الرجل یغزو وأبواہ کارھان)۔

فقہاء نے تصریح کی ہے کہ ایک فرض کفایہ ہے، دوسرا فرض عین ہے، لہذا فرض عین کو چھوڑ کر فرض کفایہ میں مشغول ہونا دانش مندی نہیں ہوگی، یہ صورت اس وقت اور بھی سنگین ہو جاتی ہے، جبکہ والدین کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہو۔

''لا یحل سفر فیہ خطر کالجہاد وسفر البحر، إلا بإذنہما، وما لا خطر فیہ کالسفر للتجارۃ والحج والعمرۃ یحل بلا إذن، إلا أن خیف علیہما الضیعۃ'' (الدر المختار مع رد المحتار ۳/ ۲۴۱ کتاب الجہاد، ط: رشیدیہ پاکستان)۔

(جس سفر میں اندیشہ ہو مثلاً جہاد، بحری سفر، اس میں بغیر ان کے اذن جائز نہیں ہے اور جس میں اندیشہ نہیں ہے، جیسے تجارت، حج وعمرہ کے لئے سفر تو بغیر اجازت بھی جائز ہے، مگر یہ کہ ان کے ضیاع کا خطرہ ہو)۔

اگر والدین کی طرف سے انکار ہو جائے تب تو بغیر اس کو منائے اجازت نہیں ہوگی، جیسا کہ حدیثوں سے واضح ہوتا ہے، نیز درازی عمر ایک ایسا مرحلہ ہے کہ ہر لحظہ ضیاع کا خوف ہے بالخصوص، جبکہ اس کا کوئی خدمت گار نہ ہو، اس لئے ماں و باپ کو مذکورہ پوزیشن میں چھوڑ کر زائد آمدنی کی تلاش میں بغیر ان کی رضا جانا جائز نہیں ہوگا۔

ب: بہو کی ذمہ داری:

اصل تو یہ ہے کہ بہو پر اپنے سسرالی رشتہ دار، خواہ ساس وسسر ہی کیوں نہ ہوں ان کی خدمت کرنا واجب نہیں ہے، بلکہ خود اس پر اپنے لیے چولہا پھونکنے کی ذمہ داری نہیں ہے، بلکہ شوہر پر لازم ہے کہ اس کو نفقہ تیار کر کے یا دوسرے سے پکوا کر دے، لیکن شوہر پر اتنا ہی قانونی طور پر واجب ہے جو نفقہ کے زمرے میں آتا ہے، اسی لئے اس طرح کی تصریحات بھی ملتی ہیں کہ گیہوں کی روٹی دے کر کہہ دے کہ یہی تمہارا نفقہ ہے سالن دینا ضروری نہیں، البتہ جو کی روٹی کے ساتھ سالن ضروری ہوگا۔

''قال الشیخ شمس الأئمۃ السرخسی: إذا امتنعت المرأۃ من الطبخ والخبز وأعمال البیت کان للزوج أن یمنع من الإدام أیضا ویعطیہا خبز البر ما یمکن أکلہا وحدہ، ویقول: ہو طعام، ولیس علی سوی الطعام، وکذلک إذا طلب الفواکہ کان للزوج أن یمنع عن بعض الفواکہ، وإن أعطاہا خبزًا لشعیر لا بد من الإدام، ولکن لا یجبر علی ذلک فی الحکم، ومتی أقامت الأعمال فی البیت والزوج یؤدی ہذہ الأشیاء فتؤمر بذلک دیانۃ لا جبرًا وحکمًا''

(تاتارخانیہ ۵/ ۳۷۲، کتاب النفقات نفقۃ المرأۃ علی الزوج، ط: زکریا دیوبند)۔

(شمس الائمہ سرخسی کہتے ہیں: عورت طعام تیار کرنے، روٹی پکانے اور گھر کے کام وکاج سے منع کرے تو شوہر کے لئے جائز ہے کہ سالن دینے سے منع کر دے، اور گیہوں کی روٹی دے جس کو بغیر سالن کھانا ممکن ہوتا ہے، اور کہہ دے یہی 'طعام' ہے، نیز میرے اوپر طعام کے ماسوا واجب نہیں ہے، اسی طرح زوجہ اگر فواکہ کا مطالبہ کرے تو کچھ فواکہ نہ دے، البتہ اگر جو کی روٹی دے گا تو سالن ضروری ہوگا، مگر (گھریلو کام کاج پر) حکماً جبر نہیں کیا جائے گا، جب عورت گھر کے ان امور کو ادا کرے تو شوہر بھی یہ چیزیں دے گا، عورت کو اس کا حکم دیانتاً ہوگا جبرًا وقضاءً نہیں ہوگا)۔

امور خانہ داری اس پر قضاءً واجب نہیں کیا جا سکتا، لیکن دیانۃً بہر حال اس پر واجب ہے۔

''وکذا غسل الثیاب والطبخ والخبز ووکنس البیت واجب علیہا دیانۃ ولا یجبرہا القاضی علیہ إذا امتنعت، لأن المستحق علیہا بالنکاح تسلیم نفسہا للاستمتاع'' (فتح القدیر ۴/ ۳۷۲، باب النفقات، فصل نفقۃ الاولاد الصغار، ط:

زکریا دیوبند)۔

(اسی طرح کپڑے کی دھلائی، کھانا پکانا، روٹی بنانا، گھر میں جھاڑو دینا اس پر دیانۃً واجب ہے اگر وہ انکار کردے تو قاضی اس پر جبر نہیں کرے گا اس لئے کہ اس پر نکاح کی وجہ سے واجب صرف استمتاع کے لئے اپنے آپ کو حوالہ کرنا ہے)۔

یہی وجہ ہے کہ سیدہ فاطمہؓ وسیدنا علیؓ کے مابین تقسیم کار تھی، باہر کا کام حضرت علیؓ دیکھتے تھے، اندرون خانہ کی ذمہ داری حضرت فاطمہؓ سنبھالتی تھیں، یہ سب دیانت کے باب سے متعلق ہے بدون اس کے معاشرہ میں توازن بھی برقرار نہیں رہ سکتا۔

بعینہ اسی طرح ساس سسر کی خدمت اصلاً تو شوہر پر واجب ہے، لیکن تقسیم کار کے تحت وہ باہر کا انتظام کر رہا ہے، اندرون خانہ کی دیکھ بھال بہو جس خوش اسلوبی سے کرسکتی ہے وہ دوسرا نہیں کرسکتا اگر شوہر اپنے والدین کی خدمت کے لئے کسی خادم کو مقرر نہیں کر پاتا ہے تو بہو کی اخلاقی ذمہ داری ہے کہ ان کی خدمت کو اپنے لئے سعادت دارین سمجھے اور پورے جذبہ کے ساتھ ان کے ساتھ حسن سلوک کا رویہ رکھے اس لئے ہوسکتا ہے کہ اس کو بھی ان حالات کا سامنا ہو تو اس کی بہو کا بھی رویہ اس کے ساتھ خیر خواہانہ ہوگا ان شاء اللہ، هل جزاء الإحسان إلا الإحسان، اچھائی کا بدلہ اچھائی ہی ہے، خواہ ایک گھر میں گزارہ نہ ہوسکے تو الگ رہے، لیکن جس وقت بھی خدمت کی حاجت ہو اس کو بجالائے۔

(ج): والدین کی خدمت صرف بیٹوں پر ہے یا بیٹیوں پر بھی:

''خدمت'' بھی نفقہ کا جزء ہے، اگر والدین کو خدمت کی ضرورت ہو تو خادم فراہم کرنا یا ان کی خدمت خود بجالانا ضروری ہے، والدین کے نفقہ کی بنیاد اس کی حاجت برآری پر ہے، لہٰذا خدمت بھی اس کا حصہ ہوگی، شامی لکھتے ہیں:

''كل من وجبت عليه نفقة غيره يجب عليه المأكل والملبس والرضاع إن كان رضيعًا، لأن وجوبها للكفاية والكفاية تتعلق بـ هذه الأشياء، وإن كان له خادم يحتاج إلى خدمته يفرض له أيضًا، لأن ذلك من جملة الكفاية واحتياجه إلى خدمته، بأن يكون به علة، كما قدمناه في الأب'' (رد المحتار ۲/ ۶۴۱ کتاب النفقات، ط: رشیدیہ پاکستان)۔

(جس پر بھی دوسرے کا نفقہ واجب ہے اس پر طعام، پوشاک اور اگر بچہ دودھ پیتا ہے تو دودھ پلانا واجب ہے اس لئے کہ نفقہ کا وجوب کفایت کے لئے ہے اور کفایت کا تعلق ان اشیاء سے ہے، اگر خدمت کے لئے خادم کی حاجت ہے تو خادم کا نفقہ بھی فرض ہے اس لئے کہ یہ من جملہ کفایت میں سے ہے، خدمت کی حاجت کا مطلب ہے کہ اس کا کوئی بیماری ہو جیسا کہ باپ کے نفقہ میں بیان کیا ہے)۔

حنفیہ کے نزدیک خاص طور پر والدین کا نفقہ مذکر ومؤنث ہر دو اولاد پر مساویانہ طور پر واجب ہے، لہٰذا خدمت بھی مساویانہ واجب ہوگی۔

''فإن كان الأولاد ذكورًا وإناثًا موسرين فنفقة الأبوين عليهم بالسوية في أظهر الروايتين، وفي الخانية: وعليه الفتوى'' (تاتارخانیہ ۵/ ۴۳۵ نفقۃ ذوی الارحام ط: زکریا دیوبند)۔

(اگر اولاد مذکر ومؤنث ہر دو مالدار ہوں تو والدین کا نفقہ ان پر برابر ہوگا، یہی اظہر روایت ہے، خانیہ میں ہے: اسی پر فتوی ہے)۔

لیکن نفقہ کے وجوب کے لئے جیسا کہ سابق میں تفصیل سے گزرا کہ شوہر کے ماسوا جس پر بھی واجب ہے، اس کا صاحب استطاعت یعنی مالدار ہونا ضروری ہے، اگر خود فقیر ہے تو اس پر دوسرے کا نفقہ واجب نہیں ہوگا، دنیاوی ضروریات: طعام، پوشاک ومکان کی بابت تو غنی ہونے کا مفہوم بالکل واضح ہے، اسی طرح خدمت کے لئے خادم کا نفقہ اسی وقت واجب ہوگا جبکہ وہ صاحب مال ہو، مگر خادم نہیں ہے خود ہی خدمت کرنا چاہتا ہے، تو ایسے موقع پر کہا جائے گا کہ اس کی خدمت سے کوئی شئی مانع نہ ہو، جس طرح خاندانی شرافت ووجاہت اور معاشرتی وقار بعض اوقات قادر علی الکسب کو بھی عاجز عن الکسب بنادیتا ہے، اسی طرح لڑکیوں کی جب شادی ہوگئی تو ان پر اپنے اپنے شوہروں کی اطاعت فرض ہوگئی اب بغیر ان کی رضا واذن ماں وباپ کے گھر آنا چاہیں تو نہیں آسکتیں، البتہ ملاقات مقصود ہو تو ہفتہ میں ایک مرتبہ ملاقات کروانے کی ذمہ داری شوہر پر ہوتی ہے، خواہ وہ جس طرح سے بھی ہو، لہٰذا جہاں تک ہوسکے ان کی مرضی کا لحاظ رکھے، لیکن بعض اوقات والدین زیادہ ہی خدمت کے محتاج ہوتے ہیں، چونکہ ان کی خدمت بھی بیٹیوں پر ضروری ہے، دو فرض جمع ہوگئے دونوں میں بظاہر توافق ناممکن ہو تو ماں وباپ کی خدمت کا حق مقدم ہوگا جہاں تک استمتاع کا

تعلق ہے وہ شوہر کے مطالبہ پر اس پر واجب ہوگا، بعض عبارات اس پر دلالت بھی کرتی ہے:

''وكذا فيما لو أرادت حج الفرض بمحرم أو كان أبوها زمنًا مثلًا يحتاج إلى خدمتها ولو كان كافرًا أو كانت لها نازلة، ولم يسأل لها الزوج عنها من عالم، فتخرج بلا إذنه في ذلك كله'' (رد المحتار ۲/ ۲۹۰ كتاب النكاح، ط: رشيديه پاکستان)۔

(اسی طرح اگر محرم کے ساتھ حج فرض کا ارادہ ہو یا اس کے والد مثلاً اپاہج ہوں کہ ان کی خدمت کی ضرورت ہے خواہ کافر ہی کیوں نہ ہو، یا کوئی مسئلہ درپیش ہو اور شوہر اس کے بارے میں کسی مفتی سے پوچھتا نہیں ہے تو ان تمام صورتوں میں بغیر اس کے اذن نکل سکتی ہے)۔

ہر چند کہ بعض بزرگوں نے اجازت کو ضروری بھی قرار دیا ہے، مگر اس سے اتنی بات تو سمجھی جاسکتی ہے کہ بیٹی پر مجبوری کی حالت میں خدمت مستحق وضروری ہے، خواہ اس کے لئے اجازت کے ساتھ جائے یا بلا اذن شوہر کو چاہئے کہ ایسے موقع پر منع نہ کرے، جس طرح اپنے والدین کی خدمت اپنی بیوی سے کرواتا ہے اور یہ اس کی اخلاقی ذمہ داری بھی سمجھا جاتا ہے تو کیا اس بیوی کو اپنے والدین کا یہ حق نہیں ہوگا کہ ان کی خدمت یا تو بذات خود یا صاحب استطاعت ہو تو دوسرے سے کروائے۔

(۵، الف) اولاد کا اپنے والد کے نکاح ثانی میں رکاوٹ ڈالنا:

بیوی کی ضرورت تو زندگی کی آخری سانس تک ہے، بعض اوقات جسمانی خدمت کی حاجت ہوتی ہے جو بیوی سے بہتر انداز میں دوسرا انجام نہیں دے سکتا، بعض اوقات جنسی تعلق کے لئے بیوی کی ضرورت ہوتی ہے، ظاہر ہے دونوں ہی اہم ہیں، اگر خدمت کی حاجت ہے تو خادم کی انتظام اولاد کا فریضہ ہے، اگر جنسی تعلق کی حاجت ہے تو نکاح ثانی میں حارج بننا اور والد کے لئے زنا کا باب کھولنا صحیح نہیں ہے، ان دونوں وجوہ کا تقاضا ہے کہ اولاد کو، اپنے والد کے نکاح ثانی میں رکاوٹ نہیں بننا چاہئے، شافعیہ وحنابلہ کے نزدیک تو اس شادی کا انتظام بھی اولاد کے ذمہ ہے، یعنی مہر وغیرہ کی ادائیگی بھی واجب ہے (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۱۰ / ۷۶۰۳، کتاب النفقہ)۔

حنفیہ کے اس سلسلہ میں دو قول ہیں ایک وجوب کا اور دوسرا عدم وجوب کا:

''وعليه نفقة زوجة أبيه وأم ولده، بل وتزويجه أو تسريه، ذكره في الشرنبلالية أيضًا عن الجوهرة، وهو مخالف لما مر في باب نكاح الرقيق'' (الدر المختار مع رد المحتار ۲/ ۶۷۲، كتاب النفقات، رشيديه)۔

(اس پر باپ کی زوجہ اور ام ولد کا نفقہ ہے، بلکہ شادی کرانا اور جاریہ کا انتظام کرنا بھی، شرنبلالی میں جوہرہ سے اس کو نقل کیا ہے، نکاح الرقیق کے باب میں جو گزرا ہے وہ اس کے خلاف ہے)۔

یہ تو شادی کے انتظام کی بابت ہے، مگر باپ خود شادی کرنا چاہتا ہے، بچوں سے اس سلسلہ میں کوئی مطالبہ بھی نہیں کرتا تو ایسے وقت میں رکاوٹ ڈالنے کی کیوں کر گنجائش ہوگی۔

(ب): سوتیلی ماں کا نفقہ:

اگر باپ صاحب استطاعت نہیں ہے تو سوتیلی ماں کا نفقہ بیٹے پر واجب ہوگا:

''وعليه نفقة زوجة أبيه، أي: في رواية وفي أخرى: إن كان الأب مريضًا أو به زمانة، يحتاج للخدمة، قال في المحيط: فعلى هذا لا فرق بين الأب والابن إذا كان ب هذه المثابة يجبر الأب على نفقة خادمه، قال في البحر: وظاهر الذخيرة أن المذهب عدم وجوب نفقة امرأة الأب أو جاريته أو أم ولده حيث لم يكن بالأب علة، وأن الوجوب مطلقًا عن رواية أبي يوسف، وفي حاشية الرملي: والذي تحرر من المذهب أنه لا فرق بين الأب والابن في نفقة الخادم، وأنه إذا احتاج أحدهما لخادم وجبت نفقته، كما وجبت نفقة المخدوم، فكان من جملة نفقته، وإذا لم يحتج إليه، فلا تجب عليه'' (رد المحتار ۲/ ۶۷۱ كتاب النفقات رشيديه پاکستان)۔

(اس پر سوتیلی ماں کا نفقہ واجب ہے یہ ایک روایت ہے، دوسری روایت میں ہے: اگر والد مریض ہے یا اس میں اپاہج پن ہے کہ خدمت کا محتاج ہے، محیط میں ہے کہ اس بنیاد پر والد اور بیٹے میں فرق نہیں، جب بیٹا اسی صورت حال سے دو چار ہو تو باپ کو اس کے خادم کے نفقہ پر مجبور کیا جائے گا، جبکہ کوئی بیماری نہ ہو، مطلقاً وجوب کا قول امام ابو یوسف کی روایت سے ہے، ''حاشیہ رملی'' میں ہے: مذہب یہ ہے کہ باپ و بیٹے میں خادم کے نفقہ کی بابت فرق نہیں ہے اور یہ کہ ان دونوں میں سے کوئی خادم کا محتاج ہو تو جس طرح مخدوم کا نفقہ واجب ہوگا، اس خادم کا بھی نفقہ واجب ہوگا کیونکہ یہ بھی من جملہ مخدوم کے نفقہ میں سے ہے اور اگر ضرورت نہیں تو واجب نہیں ہے)۔

اس سے معلوم ہوا اگر باپ اپنی بیوی کا بوجھ نہیں برداشت کر سکتا جبکہ باپ کو فی الجملہ بیوی کی ضرورت بھی ہے تو اس کا نفقہ اس کی اولاد پر آئے گا۔

(۶) والد کی زندگی میں جائیداد کی تقسیم کا مطالبہ:

والد کے مال واسباب میں فقیر ومحتاج بیٹے کا نفقہ تو واجب ہے اس سے زائد کا حق نہیں ہے، میراث کی تقسیم اور اس کا استحقاق والد کے انتقال کے بعد ہے، اسلئے اولاد کا والد کی زندگی میں جائیداد کی تقسیم کا مطالبہ کرنا صحیح نہیں ہے، والد کو چاہئے کہ مفلوک الحال اولاد کی مدد کرے، بطور ہبہ کچھ مال دے کر مالکانہ قبضہ دلادے تاکہ وہ اپنی حالت کو درست کر سکے، اور اگر چاہے تو مساویانہ طریقہ پر تقسیم کر کے ان کے حوالہ کر دے یہ سب والد کی جانب سے از قبیل تبرعات ہیں، اولاد کو اس قسم کے مطالبہ کا حق نہیں ہے۔

(۷) سن رسیدہ حضرات کے لئے ہاسٹل کا قیام:

سن رسیدہ حضرات خود کفیل ہیں تب تو اس کی حاجت ہی نہیں ہے، لیکن معمر اشخاص مفلوک الحال ہیں اور پوزیشن ایسی ہے کہ ان کا نفقہ دوسروں پر واجب ہے، آج کی مصروف ومتحرک دنیا میں خویش واقارب تو کجا خود اپنی اولاد کو بھی مال خرچ کرنا آسان ہوتا ہے مگر ان کی جسمانی خدمت یا ان کے پاس بیٹھ کر روحانی تسکین کا موقع نکالنا مشکل لگتا ہے، ہندوستان کی عمومی فضاء تو اب تک اس قدر مسموم نہیں ہوئی ہے، مگر مغربی ملکوں میں وہ سب کچھ ہو رہا ہے، خوشگوار ماحول، گھریلو راحت، اور پرسکون معاشرت اسی میں مضمر ہے کہ ان بوڑھوں کو اس ہاسٹل تک پہنچا دیا جائے جہاں ان کے لئے ہر طرح کی دلداری کا سامان موجود ہے، قرابت داری ورشتہ داری والی محبت سے محروم ہونے کے ماسوا اور کوئی خامی نہیں ہے، اس لئے ایسے حالات میں بہت سے فائدوں کے لئے ایک فائدہ کو قربان کر کے ایسے ہاسٹلوں میں رہنے کا انتظام کیا جائے اور نفقہ وخدمت کی اجرت وغیرہ ان کے رشتہ داروں پر حسب مراتب واجب ہو تو گنجائش ہے۔

جہاں تک ان بوڑھوں کو اس پر مجبور کرنے کی بات ہے، یہ اخلاق اور بزرگانہ احترام کے خلاف معلوم ہوتا ہے، ایسے بزرگوں کو اپنے لئے نعمت باور کرنا چاہئے، ضعیفوں اور ناداروں کے سبب تو اللہ کی رحمت جوش میں آتی ہے اور دوسروں کو بھی اس سے وافر حصہ ملتا ہے حدیث میں ہے:

''هل تنصرون إلا بضعفائكم'' (بخاری ۱/ ۴۰۵، كتاب الجهاد، باب من استعان بالضعفاء والصالحين في الحرب)

(تمہاری نصرت کی جارہی ہے اور رزق دیا جارہا ہے صرف ضعیف لوگوں کی بدولت)۔

''بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب''......''تماشہ اہل کرم دیکھتے ہیں''

ایسے سن رسیدہ حضرات کو معتد بہ ضرر کے اندیشہ کے بغیر ان اولڈ ہوموں کے حوالہ کر دینا مناسب نہیں ہے، جب تک نبھ سکے نبھانے کی حتی المقدور کوشش کی جائے، چند عرصے کی تو بات ہے، آپ حیات پی کر تو آئے نہیں ہیں، آخر یہ ٹمٹماتے چراغ کب تک جلتے رہیں گے، گنتی کے چند سانس باقی ہیں اور وہ بھی وبال جان بن رہے ہیں؟ ہاں حالات ہی ناگفتہ بہ ہو جائیں، مل جل کر رہنے میں مفاسد وضرر زیادہ ہوں اور ہاسٹلوں کی زندگی میں عافیت ہو تو بات دوسری ہے۔

(۸) بوڑھے لوگوں کی بمد زکوۃ اجتماعی کفالت:

زکوۃ کا مال فقراء ومساکین کا ہی حق ہے، ان تک پہنچانا ہر صاحب ثروت کی ذمہ داری ہے، اگر بوڑھے لوگ خود کفیل نہیں اور شریعت کی نگاہ میں

ان کو مستحقین کے زمرے میں رکھا جاسکتا ہے تو زکوۃ کے شرعی اصول خاص طور پر تملیک کی صفت کو برپا کرتے ہوئے ان کی کفالت زکوۃ کی رقم سے کی جاسکتی ہے، تملیک کی شرط کو پورا کرنے کے لئے معتبر حیلہ بھی کہا جاسکتا ہے۔

''یصرف المزکی إلی کلهم أو بعضهم ولو واحدًا من أی صنف کان، وبشرط أن یکون الصرف تملیکا لا إباحة'' (الدر المختار ۲/ ۶۸، کتاب الزکوۃ باب المصرف رشیدیه پاکستان)۔

(مزکی تمام مستحقین یا ان میں سے بعض خواہ ایک ہی ہو اس کے کسی بھی صنف سے اس کو دے، شرط یہ ہے کہ یہ دینا تملیک کے طور پر ہو نہ کہ اباحت کے طور پر)۔

بلکہ اولاد اور خویش واقارب مالدار ہوں مگر بوڑھوں کا یہ طبقہ غریب ہو پھر بھی ان پر زکاۃ کی رقم تملیک کر کے خرچ کی جاسکتی ہے۔

''ولا إلی غني ولا إلی مملوکه غیر المکاتب والمأذون المدیون بمحیط فیجوز. ولا إلی طفله بخلاف ولده الکبیر و أبیه وامرأته الفقراء وطفل الغنیة. فیجوز لانتفاء المانع'' (درمختار ۲/ ۷۲، کتاب الزکوة، باب المصرف، رشیدیه پاکستان)۔

(زکوۃ کسی مالدار کو، مالدار کے غلام کو دینا جائز نہیں ہے، مکاتب اور ایسا ماذون غلام جس پر دین محیط ہو اس کو دینا جائز ہے، نیز مالدار کو نابالغ اولاد کو دینا جائز نہیں ہے، برخلاف اس کے بالغ اولاد، باپ، اور بیوی (بشرطیکہ) یہ حضرات فقراء ہوں، اور مالدار عورت کا بچہ ان سب کو زکوۃ دینا جائز ہے، مانع کے نہ ہونے کی وجہ سے۔

(۹) سن رسیدہ حضرات اور ملنے والی رعایتیں:

حکومت کی طرف سے مخصوص عمر والوں کے لئے مخصوص رعایتیں ہیں، ان رعایتوں کا استحقاق اسی وقت ہوگا، جبکہ واقعتاً وہ اس عمر میں قدم رکھ چکا ہو، قبل ازیں یا بعد ازیں ایسی رعایتوں کو لینے کے لئے جھوٹا سرٹیفکٹ، وجھوٹی شہادت یا جھوٹا دعوی شریعت کی نگاہ میں سنگین جرم ہوگا، اس میں جھوٹ کے ساتھ دھوکہ دہی، اور دوسروں کی حق تلفی بھی ہے، اس لئے یہ کسی طرح روا نہیں ہے۔

......☆......

والدین اور خاندان کے بزرگ حضرات کے حقوق

مولانا محمد مصطفی قاسمی آواپوری[1]

سن رسیدہ لوگوں کو کسب معاش پر مجبور کرنا:

الجواب الأول: قرآن مجید، تفسیر کتب، کتب حدیث، کتب فقہ کے غائرانہ مطالعہ و کتب بینی سے معلوم ہوتا ہے کہ اولاد یا اعزہ واقارب کے لئے ہرگز جائز نہیں ہے کہ ان بوڑھوں کو کسب معاش پر مجبور کریں، ان کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد گرامی کو لائحہ عمل بنانا چاہئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بوڑھوں کی توقیر و تکریم کا حکم دیتے ہوئے ارشاد فرمایا: جو نوجوان کسی بوڑھے شخص کا اس کی عمر کی وجہ سے احترام کرے گا، تو جب وہ بوڑھاپے کی عمر کو پہنچے گا تو اللہ تعالی اس کے لئے بھی چھوٹے بچوں میں اس کے اکرام واحترام کا جذبہ پیدا فرمادے گا تاکہ اس کی خدمت کرتا رہے۔

عن أنس بن مالك قال: قال رسول الله ﷺ: ما أكرم شاب شيخًا لسنه إلا قيض الله له من يكرمه عند سنه'' (ترمذی ۲/ ۲۲، ابواب البر والصلة، باب ما جاء في اجلال الكبير، مختار اینڈ کمپنی دیوبند ۱۹۸۵ء)۔

انسانی زندگی میں والدین کا کردار بہت اہم ہوتا ہے، اس لئے اگر اولاد اپنی پوری زندگی کا سارا قیمتی سرمایہ اور اثاثہ ان کے حقوق کی ادائی میں صرف کردے تو بھی ان کے احسان کا بدلہ ادا نہیں کیا جاسکتا، ان کی جائز خواہشات کی تکمیل ہو اور ان کی خوشی اور خوش نودی کو اپنے حق میں ایک بڑی سعادت و نیک بختی سمجھے۔ اپنی بساط کے مطابق ان کی ضروریات اور ان کے آرام و راحت میں اپنی ہر چیز کو قربان کرے، جب وہ بوڑھاپے کی عمر کو پہنچ جائیں اس کے باوجود کسب معاش کے لئے تگ و دو کریں تو اس وقت اولاد کو چاہئے کہ والد ماجد کو ادب کے دائرے میں رہتے ہوئے کسب معاش کرنے سے روک دے، کہ اب آپ کی عمر اس قابل نہیں ہے کہ مرتے دم تک کسب معاش کرتے رہئے، اب آپ اطمینان و سکون کے ساتھ گھر پر آرام و راحت کی زندگی بسر کیجئے، اب ہم کسب معاش کے لئے تگ و دو کریں گے اور آپ کو آرام و سکون کے ساتھ کھلاؤں گا، کسی چیز کی بھی کمی کا احساس نہ ہونے دوں گا، آپ اب بالکل بےفکر رہئے اور خوب مزے کی زندگی بسر کیجئے اور شریعت مطہرہ کے جملہ اوامر ونواہی پر عمل پیرا رہئے، یعنی اوامر کی تعمیل کیجئے اور نواہی سے اجتناب کیجئے (سورہ بقرہ: ۸۳، سورہ نساء: ۳۶، سورہ انعام: ۱۵۱، سورہ بنی اسرائیل: ۲۳، سورہ عنکبوت: ۸، سورہ لقمان: ۱۴، سورہ احقاف: ۱۵، اردو میں والدین کے حقوق کی تفصیلات دیکھئے راہ اعتدال، ص: ۷۲ تا ۸۱، عمرآباد جلد ۱۲، شمارہ: ۲، جون)۔

ارشاد ربانی ہے: "قل تعالوا أتل ما حرم ربكم عليكم ألا تشركوا به شيئًا وبالوالدين إحسانا" (سورہ انعام: ۱۵۱)

(تو کہہ تم آؤ میں سنادوں جو حرام کیا ہے تم پر تمہارے رب نے کہ شریک نہ کرو اس کے ساتھ کسی چیز کو، اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو)۔

سب سے پہلا گناہ عظیم شرک ہے، دوسرا گناہ والدین سے بدسلوکی ہے۔ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع اس کی تشریح میں یوں رقمطراز کرتے ہیں: اس کے بعد دوسری چیز یہ ارشاد فرمائی، "وبالوالدين إحسانا" (سورہ اسراء: ۲۳) یعنی والدین کے ساتھ احسان کا معاملہ اور اچھا برتاؤ کرو، مقصد تو اس جگہ یہ ہے کہ والدین کی نافرمانی نہ کرو، ان کو ایذا نہ پہنچاؤ، مگر حکیمانہ انداز سے بیان اس طرح کیا گیا کہ والدین کے ساتھ احسان کا معاملہ کرو، اس میں اس طرف اشارہ کرنا ہے کہ والدین کے حق میں صرف اتنا ہی کافی نہیں کہ ان کی نافرمانی نہ کرو اور ایذاء نہ پہنچاؤ، بلکہ حسن سلوک اور نیاز مندانہ برتاؤ کے ذریعہ ان کو راضی رکھنا اور خوش کرنا فرض ہے، جس کا بیان دوسری جگہ قرآن کریم میں اس طرح آیا ہے: واخفض لهما جناح الذل (سورہ بنی اسرائیل: ۲۴) (یعنی ان کے سامنے اپنے بازو نیازمندانہ طور پر پست کرو)۔ اس آیت میں والدین کو ایذاء پہنچانے اور تکلیف دینے کو شرک کے بعد دوسرے نمبر کا جرم قرار دیا ہے، جیسا کہ دوسری آیت میں ان کی اطاعت اور راحت رسانی کو اللہ تعالی نے اپنی عبادت کے ساتھ ملا کر ارشاد فرمایا ہے: وقضى ربك ألا تعبدوا إلا إياه وبالوالدين إحسانا (سورہ بنی اسرائیل: ۲۳)

[1] خادم مدرسہ اسلامیہ شکرپور، پوسٹ دوا یا بھرواڑہ ضلع دربھنگہ، بہار۔

(یعنی آپ کے رب نے یہ فیصلہ کردیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو، اور والدین کے ساتھ احسان کا معاملہ کرو)۔

صحیحین میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت ہے کہ انہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ سب سے افضل اور بہتر عمل کونسا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نماز کو اس کے وقت "مستحب" میں پڑھنا، فرماتے ہیں کہ میں نے پھر سوال کیا کہ اس کے بعد کونسا عمل افضل ہے؟ تو فرمایا: "والدین کے ساتھ اچھا سلوک"، پھر پوچھا کہ اس کے بعد کونسا عمل افضل ہے؟ فرمایا: "اللہ کے راستہ میں جہاد" (بخاری ۲/۸۸۲)۔

صحیح مسلم میں یہ روایت حضرت ابوہریرہؓ سے مذکور ہے کہ ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین مرتبہ فرمایا: "رغم أنفه، ثم رغم أنفه ثم رغم أنفه" یعنی ذلیل ہوگیا، ذلیل ہوگیا، ذلیل ہوگیا، صحابہ کرام نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کون ذلیل ہوگیا؟ فرمایا وہ شخص جس نے اپنے ماں باپ کو یا ان میں سے ایک کو بڑھاپے کے زمانہ میں پایا اور پھر وہ جنت میں داخل نہ ہوا (مسلم ۲/۳۱۴، کتاب البر والصلة والادب، باب فضل طلبة أصدقاء الأب والأم ونحوهما)۔

مطلب یہ ہے کہ بڑھاپے کے زمانہ میں والدین کی خدمت سے جنت کا ملنا یقینی ہے، بڑا محروم وذلیل ہے وہ شخص جس نے اتنی سستی جنت کو ہاتھ سے کھودیا، سستی اس لئے کہ والدین جو اولاد پر طبعی طور سے خود ہی مہربان ہوتے ہیں وہ ذرا سی خدمت سے بہت خوش ہوجاتے ہیں، ان کا خوش رکھنا کسی بڑے عمل کا محتاج نہیں، اور بڑھاپے کی قید اس لئے کہ جس وقت والدین تندرست اور قوی ہیں، اور اپنی ضروریات خود پوری کرتے ہیں، بلکہ اولاد کی بھی مالی اور جانی امداد کردیتے ہیں اس وقت تو نہ خدمت کے وہ محتاج ہیں نہ اس خدمت کا کوئی خاص وزن ہے، قابل قدر خدمت اس وقت ہی ہوسکتی ہے، جبکہ وہ بڑھاپے کی وجہ سے محتاج ہوں (معارف القرآن ۳/۴۸۲-۴۸۳)۔

سن رسیدہ حضرات کا نفقہ وعلاج مجبوری کی حالت میں ان کے رشتہ داروں پر فرض ہے:

الجواب الثانی: قرآن وحدیث میں صلہ رحمی یعنی رشتہ داروں کے حقوق کی ادائیگی اور ان کے ساتھ حسن سلوک کی ازحد تاکید کی گئی ہے، اور اس کے بے حد فضائل وفوائد بیان کئے گئے ہیں، اور قطع رحمی، یعنی رشتہ داروں کے حقوق ادا نہ کرنے اور ان کے ساتھ بدسلوکی کرنے پر سخت وعیدیں بیان کی گئی ہیں؛ اس لئے دیگر اہل حقوق سے زیادہ رشتہ داروں کے حقوق ادا کرنے کا خیال رکھنا چاہئے، رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک کرنا ایسا مبارک عمل ہے کہ اس کی برکت سے اللہ تعالی رزق میں وسعت، مال میں کثرت اور عمر میں برکت اور اضافہ فرماتے ہیں، ارشاد باری ہے: "وآت ذا القربى حقه والمسكين وابن السبيل ولا تبذر تبذيرا" (سورہ بنی اسرائیل:۲۶) (اور دے قرابت والے کو اس کا حق اور محتاج کو اور مسافر کو اور مت اڑا بے جا)۔

"عن أنس قال: قال رسول الله ﷺ: من أحب أن يبسط له في رزقه وينسأ له في أثره فليصل رحمه" (مشکوۃ ۲/۴۱۹)

(حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص یہ چاہتا ہے کہ اس کے رزق میں وسعت وزیادتی ہو اور دنیا میں اس کا اثر تادیر رہے، اس کی عمر دراز ہو اور اس کے کاموں میں برکت ہو، تو اس کو چاہئے کہ اپنے رشتہ کو جوڑے، رشتہ داروں کے حقوق ادا کرے اور ان کے ساتھ حسن سلوک کرے)۔

"عن أبي هريرة قال: قال رسول الله ﷺ: تعلموا من أنسابكم ما تصلون به أرحامكم فإن صلة الرحم محبة في الأهل مثراة في المال منسأة في الأثر" (مشکوۃ ۲/۴۲۰)

(حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تم اپنے نسبوں کو خوب اچھی طرح سیکھ لو تا کہ اس کی وجہ سے تم اپنے رشتوں کو جوڑسکو، اس لئے کہ صلہ رحمی خاندان میں محبت، مال میں کثرت اور عمر میں اضافہ کا سبب ہے)۔

اس کے برعکس قطع رحمی یعنی رشتہ داروں کے حقوق ادا نہ کرنا، اور ان کے ساتھ بدسلوکی کرنا ایسا منحوس ومذموم عمل ہے کہ اس کی وجہ سے پورا معاشرہ رحمت خداوندی سے محروم ہوجاتا ہے، اللہ تعالی ہمیں ایسی حرکت شنیعہ سے محفوظ فرمائے، آمین۔

"عن عبدالله بن ابي اوفى قال: سمعت رسول الله ﷺ يقول: لا تنزل الرحمة على قوم فيهم قاطع رحم" (مشکوۃ ۲/۴۲۰)

(حضرت عبداللہ بن ابی اوفیؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اس قوم پر اللہ تعالی کی رحمت نازل نہیں ہوتی جس میں کوئی قطع رحمی کرنے والا ہو)۔

عام رشتہ داروں کے حقوق کا اہتمام:

حضرت مولانا مفتی محمد شفیعؒ یوں رقمطراز ہیں:

''پچھلی آیتوں میں والدین کے حقوق اور ان کے ادب واحترام کی تعلیم تھی اس آیت میں عام رشتہ داروں کے حقوق کا بیان ہے کہ ہر رشتہ کا حق ادا کیا جائے جو کم سے کم ان کے ساتھ حسن معاشرت اور عمدہ سلوک ہے اور اگر حاجت مند ہوں تو ان کی مالی امداد بھی اپنی وسعت کے مطابق اسی میں داخل ہے، اس آیت سے اتنی بات تو ثابت ہوگئی کہ ہر شخص پر اس کے عام رشتہ دار عزیزوں کا بھی حق ہے، وہ کیا اور کتنا ہے اس کی تفصیل مذکور نہیں مگر عام صلہ رحمی اور حسن معاشرت کا اس میں داخل ہونا واضح ہے، امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک اسی فرمان کے تحت جو رشتہ دار ذی رحم محرم ہو اگر وہ عورت یا بچہ ہے جن کے پاس اپنے گذارہ کا سامان نہیں اور کمانے پر قدرت نہیں اسی طرح جو رشتہ دار ذی رحم محرم اپاہج یا اندھا ہو اس کی ملک میں اتنا مال نہیں جس سے اس کا گذارہ ہو سکے تو ان کے جن رشتہ داروں میں اتنی وسعت ہے کہ وہ ان کی مدد کر سکتے ہیں، ان پر ان سب کا نفقہ فرض ہے، اگر ایک ہی درجہ کے کئی رشتہ دار صاحب وسعت ہوں تو ان سب پر تقسیم کر کے ان کا گذارہ نفقہ دیا جائے گا۔

سورہ بقرہ کی آیت "وعلی الوارث مثل ذلك" سے بھی یہ حکم ثابت ہے، اس آیت میں اہل قرابت اور مسکین ومسافر کو مالی مدد دینے اور صلہ رحمی کرنے کو ان کا حق فرما کر اس طرف اشارہ کر دیا کہ دینے والے کو ان پر احسان جتانے کا کوئی موقع نہیں، کیوں کہ ان کا حق اس کے ذمہ فرض ہے دینے والا اپنا فرض ادا کر رہا ہے، کسی پر احسان نہیں کر رہا ہے (معارف القرآن ۵ / ۴۶۹ تا ۴۷۰، رشتہ داروں کے حقوق کے لئے دیکھئے راہ اعتدال ص: ۱۱۶ تا ۱۲۵، عمرآباد جون ۲۰۱۵ء جلد ۱۲، شمارہ: ۲، مضمون نگار مولانا صادق محی الدین عمری ندوی، واقعی مولانا نے مضمون نگاری کا کما حقہ حق ادا کیا ہے، اللہ تعالیٰ ان کے علم وعمل میں مزید اضافہ فرمائے، آمین)۔

اس سے یہ بات روز روشن کی طرح الم نشرح ہوگئی کہ مفلس زدہ، بے مقدور، بے مائیگی، بے سروسامان، سن رسیدہ حضرات کا نفقہ وعلاج ان کے رشتہ داروں پر فرض ہوگا اور ہر رشتہ دار کو اس معاملے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا چاہئے کیونکہ شرعاً ان معذوروں کا حق ان پر ثابت ہو گیا ہے، اس سے راہ فرار اختیار کرنا کوئی دانش مندی کی بات نہ ہوگی، ثواب سمجھ کر اور اپنا حق سمجھ کر اپنے حاجت مند رشتہ داروں کی خدمت کیجئے، واللہ اعلم بالصواب۔

اپنی سہولت وصرف کے لئے زائد رقم کا مطالبہ:

الجواب الثالث: مولانا عبدالمالک سیفی عمری یوں رقمطراز کرتے ہیں: ماہرین طب کے مطابق معذور ہر وہ شخص ہے جو مستقل طور پر زندگی کی سرگرمیوں میں کسی ذہنی یا جسمانی کمزوری کی بنا پر اپنا رول ادا نہ کرتا ہو، یہ معذور پیدائشی بھی ہوتی ہے یا کسی بیماری یا حادثے کے سبب ہو سکتی ہے۔

معذور افراد معاشرہ کا وہ حصہ ہیں جو عام افراد کی بہ نسبت زیادہ توجہ کے مستحق ہیں، کوئی بھی معاشرہ ان معذورین کو نظر انداز کر کے اور ان کے حقوق سے چشم پوشی کر کے مہذب نہیں ہو سکتا، اسی لئے ہر ملک میں ایک ایسا ادارہ قائم ہے، جو ان معذور افراد سے ہمدردی جتاتا ہے اور ان کے حقوق کی نگرانی کرتا ہے، ہر جگہ ان افراد کے لئے الگ سے سہولیات فراہم ہیں، بسوں، ریل گاڑیوں اور عام جگہوں پر ان کے بیٹھنے کے لئے جگہ مختص کر دی جاتی ہے۔ تعلیم وملازمت میں انہیں خصوصی رعایت دیتے ہوئے کوٹہ مقرر کیا جاتا ہے، اگر یہ ذریعہ معاش کے لئے کوشاں ہوں تو بینک سے انہیں خصوصی رعایت کا لون دیا جاتا ہے۔

اسلام نے بھی اس طبقے کا خاص خیال رکھا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل قدیم معاشرہ میں ذہنی وجسمانی طور پر معذور انسانوں کے ساتھ جانوروں سے بھی بدتر سلوک کیا جاتا تھا۔ انسانی معاشرہ میں ان کو کوئی حق حاصل نہ تھا، زمانہ قدیم میں یورپی معاشرہ میں کوئی بچہ معذور پیدا ہوتا تو اس کے ماں باپ اس معصوم کو قتل کر ڈالتے تھے تاکہ وہ ان پر بوجھ نہ بنے۔

افلاطون (۴۲۷ ق م۔ ۳۴۷ ق م) جیسے دانشور کا کہنا تھا کہ ذہنی وجسمانی طور پر معذور مرد وزن معاشرہ پر بوجھ ہیں اور یہ عام جنتا کے لئے نقصان دہ ہیں۔ مغربی معاشرہ بھی اس سے پاک نہیں تھا، وہ بھی معذورین کو اچھوت سمجھتا تھا، ہربرٹ اسپنسر برطانوی (۱۹۳۰ ق م۔ ۱۸۲۰ ق م) نے اپنی حکومت پر دباؤ ڈالا کہ ان معذوروں پر خرچ کی جانے والی رقم دوسرے کاموں میں خرچ کی جائے، کیوں کہ وہ کوئی کام نہیں کر سکتے (راہ اعتدال ص: ۱۷۳ تا ۱۷۴، عمرآباد جون ۲۰۱۵ء، جلد ۱۲، شمارہ ۲)۔

اسلام نے کسب معاش کا بار معذوروں پر نہیں ڈالا، انہیں اس الجھن سے آزاد کر دیا ہے، قرآن مجید اور احادیث مبارکہ میں کمزوروں کے ساتھ حسن سلوک

اوران پر انفاق اور خرچ کی تعلیم دی گئی ہے، معذور اور اپاہج افراد کا نفقہ، خاندان کے متمول افراد پر واجب ہے، "غیر اقوام و مذاہب کی خبر گیری اور مدد اسی طرح کی جاتی تھی جیسی کہ اسلام اور مسلمانوں کی ہوتی تھی۔ قحط کے زمانہ میں مسلمانوں سے غیر مذہب والوں کو کھانا کھلایا جاتا تھا۔ فاروق اعظمؓ سے داروغہ بیت المال کو حکم دے دیا تھا۔ "إنما الصدقات للفقراء والمساكين" (سورۃ التوبۃ: ۶۰) میں مسلمان و عیسائی و یہودی اور سب اقوام کے فقیر اور مساکین لوگ شامل ہیں۔ جابیہ کے قریب جو عیسائی جذامی لوگ آباد تھے ان کا حصہ بھی عشر میں سے مقرر کر دیا۔

غیر مذہب کے فقیروں اور محتاجوں کو بھی معافی اور جاگیریں عطا ہوئی تھیں، ایک اندھے بڈھے یہودی کو ایک دن آپ نے سرراہ بھیک مانگتے دیکھ لیا، اسے پاس بلا کے اس کا حال دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ جزیہ کے لئے مانگنے کی نوبت آ پہنچی ہے۔ آپ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا، گھر لے آئے اور بہت کچھ دیا، پھر بیت المال کے داروغہ کو لکھا کہ اس بڈھے کو اور اس جیسے جتنے ہوں انہیں جزیہ سے معاف کر دو اور وظیفہ دیا کرو۔ بنی تغلب نے ولید بن عقبہ کے باعث اطاعت قبول کر لی مگر ولید نے ان پر اس لئے سختی کرنا شروع کی کہ وہ جلدی سے مسلمان ہو جائیں، جناب فاروق اعظمؓ کو یہ بات معلوم ہوئی تو ناراض ہوئے اور ولید کو لکھا کہ خبردار انہیں دق نہ کرو ان کے حال پر چھوڑ دو، مگر جب دیکھا کہ ولید کو ان سے ضد ہو گئی ہے تو انہیں موقوف کر دیا اور صرف جزیہ لینے پر اکتفا کی، جب بنی تغلب نے کہا کہ جزیہ دینے میں ہماری ہتک ہے ہم عشر دیں گے تو فاروق اعظمؓ نے یہی قبول کر لیا۔

الغرض غیر مذاہب اور غیر اقوام کے ساتھ جس فیاضی اور انصاف سے عمر فاروق اعظمؓ نے برتاؤ کیا اور جو خاص حقوق اور رعایتیں مسلمانوں سے بھی بڑھ کر غیروں کو عطا کیں ان سے آج کل کی بڑے بڑے دعوے کرنے والی اور بڑھ بڑھ کے نکتہ چینیاں کرنے والی قومیں مدتوں سبق لیں گی جب کچھ سلیقہ آئے گا (شمس التواریخ ۳/ ۱۰۸۷ تا ۱۰۸۸، مولانا محمد سعادت اللہ، رقیہ لامع النور آگرہ، شعبان، اکتوبر ۱۹۰۶ء۔ ۱۳۲۴ھ)۔

بوڑھے والدین یا خاندان کے وہ بڑے جن کا نفقہ ان کے چھوٹوں پر محتاجی کی صورت میں واجب ہے اگر وہ محتاج نہ ہوں، خود صاحب ثروت ہوں تب بھی وہ اپنی اولاد سے یا ان لوگوں سے جن پر بہ حالت حاجت نفقہ واجب ہوتا ہے زیادہ سہولت کے لئے یا دوسرے لوگوں پر خرچ کرنے کے لئے یا کچھ رقم محفوظ کرنے کے لئے زائد رقم کا مطالبہ کر سکتے ہیں، جس طرح اپنی جائز ضروریات زندگی کی تکمیل کے لئے نفقہ کا طلب کرنا شرعاً جائز ہے، ان کے انتقال کے بعد جو کچھ بچے گا پھر وہ مال و اسباب اولاد ہی کے تصرف میں کام آئے گا، اس لئے اولاد کو خوب بشاشت و مسرت کے ساتھ والدین کی ہر جائز خواہشات کی تکمیل کی تعمیل اور بجا آوری کرنی چاہئے اس میں تذبذب و تردد کرنے کی ضرورت نہیں ہے، مذہب اسلام میں والدین اور خصوصاً ماں کی خدمت و اطاعت و رضامندی کو دین و دنیا کی راحت، جنت کی ضمانت اور جہنم سے نجات کا بہترین ذریعہ بتایا ہے۔

بوڑھے والدین اور بزرگوں کی خدمت:

الجواب الرابع: عصر حاضر کا ایک اہم مسئلہ والدین اور بزرگوں کی جسمانی خدمت، خاص کر جب انسان چلنے پھرنے اٹھنے بیٹھنے کھانے پینے اور دیگر کسی ضرورت کو پوری کرنے میں سہارے کا محتاج ہو جائے، ایسی صورت میں اگر بیٹا زیادہ پیسہ کمانے کی غرض سے دوسرے شہر، دوسری ریاست یا دوسرے ملک ہی چلا جائے تو بوڑھوں کی دشواریاں بہت زیادہ بڑھ جاتی ہیں تو ان حالات میں لڑکوں کا والدین کو چھوڑ کر زیادہ سے زیادہ دولت حاصل کرنے کی نیت سے سفر کرنا شرعی نقطہ نظر سے حرام ہے، والدین کی خدمت حج و جہاد جیسے فریضہ پر بھی مقدم ہے۔ ہر لڑکے کو اپنے والدین کے ساتھ رہ کر ان کی خدمت کرنا ایک اہم فریضہ میں داخل ہے، اس سے اگر کوئی ناخلف، ناہنجار پہلوتہی کرے گا تو دین و دنیا میں وہ ذلیل و خوار ہوگا، مارا مارا پھرے گا، کہیں کوئی ٹھکانا نہیں ملے گا۔ یاد رکھیے والدین کی نافرمانی کرنا گناہ کبیرہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس بات کو بہ طور امتنان کے اپنی کتاب میں ذکر کیا ہے، ارشاد باری ہے:

"زين للناس حب الشهوات من النساء والبنين والقناطير المقنطرة من الذهب والفضة والخيل المسومة والأنعام والحرث ذلك متاع الحياة الدنيا والله عنده حسن المآب" (سورۂ آل عمران: ۱۴) (خوش نما معلوم ہوتی ہے اکثر لوگوں کو محبت مرغوب چیزوں کی مثلاً عورتیں ہوئیں بیٹے ہوئے لگے ہوئے ڈھیر ہوئے سونے اور چاندی کے نمبر یعنی نشان لگے ہوئے ہو گھوڑے ہوئے یا دوسرے مواشی ہوئے اور زراعت ہوئی، لیکن یہ سب استعمال کی چیزیں ہیں دنیوی زندگانی کی اور انجام کار کی خوبی تو اللہ تعالیٰ ہی کے پاس ہے)۔

اس تمہید کے بعد سوال میں مذکور شقوں کا جواب ملاحظہ ہو:

الف: زیادہ آمدنی، ریال و ڈالر حاصل کرنے کی غرض سے لڑکوں کا اپنے ماں باپ کو چھوڑ کر دوسری جگہ جانا اس حالت میں کہ ان کے والدین ان کی خدمت

ودیدار کے محتاج ہوں شرعاً حرام ہے، اسلامی شریعت کے سراسر خلاف ہے، ان لڑکوں کو سوچنا چاہئے کہ ہمارے والدین نے بچپن کے زمانہ میں ہماری پرورش کے لئے کتنی صعوبت ومشقت برداشت کی اور آج ہم ان کے ساتھ جانوروں جیسا سلوک کرتے ہیں، ہر لڑکوں کو ایسی حرکت شنیعہ سے اجتناب کرنی چاہئے، ماں باپ کے ساتھ نافرمانی ایک زہریلا سلسلہ ہے، اگر تم اپنے ماں باپ کے ساتھ فرماں برداری کروگے تو تمہاری اولاد بھی تمہارے ساتھ رواداری کا معاملہ کرے گی۔ اور اگر تم اپنے ماں باپ کے ساتھ نافرمانی کروگے تو تمہاری اولاد بھی تمہاری نافرمانی کرے گی، بلکہ ایک قدم آگے بڑھ کر نافرمانی کرے گی۔

''عن ابن عمر قال رسول الله ﷺ: بروا آباءكم يبر أبناءكم وعفوا تعف نساءكم'' (رواه الطبراني في الاوسط، معارف الحديث ۶/ ۵۹، الفرقان بک ڈپو ۳۱، نیا گاؤں مغربی لکھنؤ، طباعت جولائی ۲۰۱۳ء)۔

(حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تم اپنے ماں باپ کی خدمت وفرماں برداری کرو، تمہاری اولاد تمہاری فرماں بردار اور خدمت گزار ہوگی، اور تم پاک دامنی کے ساتھ رہو تمہاری عورتیں پاک دامن رہیں گی)۔

ب: بہو کی اطاعت کا مطلب واضح ہے، یعنی اپنے شوہر کا ہر طرح کا حکم بجالانا، ارشاد نبوی ہے: شوہر جب اپنی بیوی کو اپنی ضرورت کے لئے بلائے تو وہ فوراً حاضر ہوجائے، چاہے وہ تنور پر روٹی ہی کیوں نہ پکار ہی ہو (بخاری ۲/ ۷۸۲، مسلم ۱/ ۴۶۴، ترمذی ۱/ ۱۳۸)۔

معلوم ہوا کہ عورت ہر حال میں خاوند کی اطاعت کی ذمہ دار ہے اور اس کا حکم بجالانے کے لئے ہمہ وقت کمر بستہ رہنا چاہئے، اسی اطاعت میں خدمت کا وسیع مفہوم بھی نکلتا ہے۔ مثلاً کھانا پکانا، کپڑے دھونا، سینا پرونا، گھر کی صفائی، بچوں کی دیکھ بھال، دیگر افراد خانہ کی ضروری خدمات اور ذمہ داریاں ادا کرنا بھی دینی خدمت متصور ہوگا، ان ذمہ داریوں کی کوئی حد اور عمر متعین نہیں ہے، تادم حیات اس کی خدمات کا سلسلہ چلتا رہے گا، یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالی اس کے آرام کی ضرورت کا خیال کرتے ہوئے، نیز اس کی فطری کمزوریوں کو ملحوظ خاطر رکھ کر اپنے خالص حقوق کی ادائیگی میں کمی کررکھی ہے، مثلاً حالت حیض میں روزہ، نماز، حج وغیرہ عبادات سے بری الذمہ رکھا ہے۔ یعنی حقوق اللہ کے ساتھ حقوق العباد کا بوجھ بھی کم رکھا ہے، تاکہ وہ اپنی ذمہ داریاں بہ خوبی ادا کرسکے۔ ان ذمہ داریوں کی ادائیگی میں احسان کا پہلو بھی ابھرتا ہے، اگر وہ ان ذمہ داریوں کو کما حقہ ادا کرے تو احسان کے درجہ تک پہنچتی ہے اور یہی مرتبہ بہو کو کامل عزت اور نیک نام بناتا ہے۔ یہ اطاعت، خدمت اور احسان ایک ایسا مرتب لائحہ عمل ہے، جو بہو کی عزت واحترام میں کئی گنا اضافہ کرتا ہے۔ حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے: عورت اپنے خاوند کے گھر والوں اور اس کی اولاد کی نگران ہے اور اس سے ان کے بارے میں باز پرس ہوگی (بخاری ۱/ ۳۲۴، بخاری ۲/ ۷۸۳۔ ۱۰۵۷، ترمذی ۱/ ۲۰۳، ابوداؤد ۲/ ۴۰۹)۔

اہل خانہ کا مفہوم بہت وسیع ہے، کیونکہ اہل خانہ میں وہ تمام افراد شامل ہیں، جو کوئی اس کی نگرانی میں آئے، مثلاً خاوند کی کم سن بہنیں، بھائی، مطلقہ، بیوہ، بہن، کمزور اور بوڑھے ماں باپ، نوکر چاکر نیز مہمان وغیرہ۔ اس سلسلہ میں منفی پہلو پر بھی بہو کی نظر رہنی چاہئے کہ خاوند کے قریبی اور دور کے رشتہ داروں کو کوئی تکلیف نہ دے۔ اپنے خاوند کو برتر ثابت کرنے کی کوشش نہ کرے، خواہ مخواہ عیب تلاش نہ کرے، قریبی رشتہ داروں پر خاوند کے احسانات کو حقیر نہ جانے، سسرالی رشتہ داروں سے قطع تعلق نہ کرے، بلکہ صلہ رحمی اور خوش گوار ماحول بنانے کی کوشش کرے۔

بہو کے ساتھ حسن سلوک:

سسرال والوں کو چاہئے کہ بہو کو اپنی بیٹی کا درجہ دیں، اس کا مکمل احترام کریں، اب وہ ایک نیا خاندان بنانے والی ہے، اس کے ماحول کو سازگار بنایا جائے، تاکہ وہ آئندہ نسل کی اچھی تربیت اور پرورش کرسکے اور جتنا کچھ اسے پیار اور خوشی ملے گی، وہ بھی اتنا ہی خوشی دوسروں تک پہنچائے گی، اگر اس کے کردار اور عادات میں کوئی کمی اور خامی نظر آئے تو پیار اور حکمت سے دور کریں، خواہ مخواہ عیب تلاش کرنا، الزام لگانا، برے نام سے پکارنا، گالی گلوج سے کام لینا، کسی غلطی پر زیادہ سرزنش کرنا، غیبت کرنا، یہ وہ بری باتیں ہیں، جن سے اپنا ہی گھر تباہ وبرباد ہوگا اور گھر کا سکون ختم ہوجائے گا (اس کی پوری تفصیلات کے لئے دیکھئے: راہ اعتدال ص: ۱۳۰ تا ۱۳۳ عمر آباد، جون ۲۰۱۵ء جلد ۱۲، شمارہ ۲)۔

بہو کو چاہئے کہ وہ اپنے شوہر کے گھر کو اصلی گھر جانے، اس کی زندگی کی تکمیل اب اسی گھر اور گھر کے افراد کے ساتھ بہ خوشی بسر ہونی ہے۔ اپنے شوہر کے والدین، بھائی، بہن اور دیگر افراد خانہ کو اپنے حقیقی والدین، بھائی بہن کا درجہ دے کر بھرپور اطاعت اور خدمت کرے، امانت میں خیانت نہ کرے، گھر کی مکمل حفاظت کرے، تمام جائز امور میں جی جان سے محنت کرے، شوہر کا حکم سرآنکھوں پر رکھے۔ (۱) اگر بہو ساس سسر کے ساتھ نہ رہنا چاہتی ہو، (۲) ساس کو خدمت کی ضرورت ہو لیکن خدمت گار موجود نہ ہو، (۳) بیٹیوں کو ان کے شوہروں کی طرف سے میکے میں رہنے کی اجازت نہ ہو، تو ان تینوں صورتوں میں بہو پر

واجب ہے کہ وہ اپنے انا کو بحر الکاہل میں غرقاب کر کے اپنی ساس کو اپنی حقیقی والدہ سمجھ کر ان کے ساتھ رہے اور خوب دل وجان سے اور اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان سمجھ کر ساس کی خدمت کو تاکیدی حکم سمجھے، اور ایسی حالت میں بہو کو ساس سسر کے ساتھ رہنے پر شرعاً، عقلاً، دیانۃً، قضاءً مجبور کیا جا سکتا ہے، اس میں کوئی کلام نہیں، ساس سسر مثل والدین کے ہیں اور بہو مثل بیٹی کے مانند ہے۔ ارشاد باری ہے:

"وصاحبهما في الدنيا معروفاً" (سورہ لقمان: ۱۵) (دنیا میں والدین کے ساتھ حسن سلوک کا برتاؤ کرتے ہوئے ساتھ رہو)۔

قرآن وحدیث کی روشنی میں یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ دادھیالی، نانھیالی، سسرالی، رشتے داروں کی قدر کریں، اکرام واحترام میں کوئی کوتاہی نہ کریں، سسرالی رشتے کی مضبوطی کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اسے احسان کی ریشمی ڈور میں مضبوط باندھ لیا جائے اور یہ ڈور کبھی نہ ٹوٹنے پائے، بہو کو ساس سسر کے ساتھ رہتے ہوئے خوب دل وجان سے فرصت ومسرت کے ساتھ خوب ان کی خدمت کرے، اور ان سے دعا لیتی رہے، ان کی خدمت واطاعت گزاری کو مصیبت اور بوجھ نہ سمجھے، بلکہ اس خدمت گذاری کو عین عبادت سمجھ کر انعام دہی میں مشغول رہے۔

ج: ماں باپ کی خدمت بیٹوں اور بیٹیوں دونوں پر واجب ہے۔

(۱) پہلی شق بعض اوقات بیٹیاں اپنے والدین کی مجبوری اور بے بسی کو دیکھتے ہوئے اپنے والدین کی خدمت کرنا چاہتی ہیں اور ان کے نیک صالح شوہر بھی ان کو اس کی اجازت دیتے ہیں کہ اپنے والدین کی خدمت کرلو اور یہ دیندار نیک صالح داماد ہونے کی علامت ہے۔ کوئی بندہ اس وقت تک سچا مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اپنے بھائی کے لئے وہی پسند نہ کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے۔

"عن معاذ بن جبل أنه سأل النبي ﷺ عن أفضل الإيمان قال: أن تحب لله وتبغض لله وتعمل لسانك في ذكر الله، قال: وماذا يا رسول الله! قال وأن تحب للناس ما تحب لنفسك" (مشکوۃ ۱/۱۶، کتاب الایمان، الفصل الثالث)۔

یہ حدیث واضح ہدایت دیتی ہے کہ داماد بھی اپنے نئے معاشرتی نظام کا ایک خیرخواہ فرد ہے، اسے لازمی طور پر اپنی ذمہ داری کا علم ہونا چاہئے، ان کے حقوق وفرائض کی نگہداشت کیسے کی جائے، یہ سب اس نئے دولہا کی ذمہ داریاں ہوں گی۔ کتب حدیث میں ہے ہر آدمی اپنے اہل وعیال کے متعلق مسئول ہے (بخاری ۱/۳۲۴، بخاری ۲/۷۸۳۔۱۰۵۷، ترمذی ۱/۲۰۳، ابوداؤد ۲/۴۰۹)۔ گویا مرد کی ذمہ داریوں میں سے ایک اہم ذمہ داری یہ بھی ہے کہ وہ اپنی بیوی کے اقرباء کے حقوق بہ خوبی ادا کرے، کیوں کہ نکاح کے بعد مرد کے لئے بیوی کے اقرباء اس کے بھی اہل قرابت بن جاتے ہیں، نیز جب نسل انسانی اور خونی رشتے شروع ہو جائیں، یعنی صاحب اولاد بن جائے تو اسے چاہئے کہ بچوں کو ان سے مربوط رکھنے کے لئے ان کے حقوق ادا کرے، کیوں کہ بچوں کا نانھیال سے رحم کا تعلق ہے، ذوی الارحام وہ رشتے ہیں جن سے قطع تعلق پر سخت وعید آئی ہے (بخاری ۲/۸۸۵ تا ۸۸۶، مسلم ۲/۳۱۵)۔

(۲) دوسری شق یہ ہے کہ بیٹیاں اپنے والدین کی مجبوری اور بے بسی کو دیکھتے ہوئے اپنے والدین کی خدمت کرنا چاہتی ہیں، لیکن ان کے شوہر ان کو اس کی اجازت نہیں دیتے ہیں اس لئے وہ مجبور وبے بس ہے، وہ اپنے شوہر کی اطاعت کرے گی، اس کے مال ومتاع کی حفاظت کرے گی، اور اس کے بال بچوں کی تربیت اور شوہر کی غیر موجودگی میں اپنی شرمگاہ کی حفاظت کرے گی اور اس کے بستر پر کسی اجنبی کو قریب آنے نہ دے گی، ان کے شوہر کو اس کا حق حاصل ہے کہ اپنی بیوی کو میکے میں رہنے کی اجازت نہ دے، اور والدین کی خدمت کرنے کی اجازت نہ دے۔

حضرت مولانا عبدالحی فرنگی محلی لکھنوی سوال ۸۱۰ کا جواب دیتے ہوئے رقمطراز کرتے ہیں:

جواب: شوہر کی اطاعت مقدم ہے، اور جو عورت شوہر کی نافرمانی کرنے میں جری ہو تو شوہر اولا کی زبانی فہمائش کرے اور اگر یہ موثر نہ ہو تو ترک کلام اور ترک مجامعت کردے تا کہ اس کو تنبیہ ہو جائے، اور اگر یہ نسخہ بھی کارآمد نہ ہو تو پھر ضرورت کے مطابق مارنا بھی جائز ہے (فتاوی مولانا عبدالحی اردو، ص: ۵۱۲ تا ۵۱۳، مکتبہ تھانوی دیوبند، اشاعت اول ۱۹۸۹ء)۔

اولاد کا اپنے بوڑھے والد کو شادی سے روکنا:

الجواب الخامس: انسان کو جس طرح جوانی میں بیوی کی ضرورت ہوتی ہے، اسی طرح وہ بوڑھاپے میں بھی بیوی کا محتاج ہوتا ہے تا کہ اس عمر کے سرد وگرم کو سہنا اس کے لئے آسان ہو جائے، ہندوستان کے معاشرہ میں عام طور پر بیٹے اور بیٹیاں اپنی والدہ کے فوت ہونے کے بعد والد کے دوسرے نکاح میں رکاوٹ

بنتے ہیں، ان کا یہ رکاوٹ بننا شرعاً حرام ہے، بلکہ ان کا اسلام کے مسائل میں مداخلت کرنے اور تمسخر واستخفاف کرنے کے مترادف ہے، غیر اسلامی طریقے کو پسند کرنا سوء خاتمہ کا خطرہ ہے، العیاذ باللہ۔ لہذا بیٹوں اور بیٹیوں پر واجب ہے کہ اپنے والد محترم کی دوسری شادی کرا دے، تا کہ ان کے والد کو خوشی ومسرت اور سکون قلب حاصل ہو۔ اور ان لوگوں کو بھی دین ودنیا کی فلاح ونجاح نصیب ہوگی اور دنیا میں سرخرو کہلائیں گے اور ہر طرف ان کی نیکی وبھلائی کا تذکرہ ہوگا، اور اگر خود والد میں اپنی بیوی کی کفالت کی استطاعت نہ ہو تو اس سلسلہ میں اولاد پر واجب ہے کہ والد کی طرح اپنی سوتیلی ماں کے نان ونفقہ کا بھی بوجھ اٹھائے اور خوب بشاشت ومسرت کا مظاہرہ کرتے ہوئے والد ووالدہ کی خدمت گزاری کرتا رہے، کیونکہ جب والد نے حسب ضرورت ومصلحت نکاح ثانی کر لیا ہے تو اولاد پر سوتیلی ماں کی عزت کرنا واجب ہے، اس کے علاوہ ان دونوں کے ساتھ حسن سلوک کرنا، صلہ رحمی کرنا اور ان کے رشتوں کے احترام کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

"وعلی الوارث مثل ذلک" (سورہ بقرہ: ۲۳۳) (اور مثل طریق مذکور کے اس کے ذمہ ہے جو وارث ہو)۔

دوسری جگہ ارشاد ہے: "ومن آیاتہ أن خلق لکم من أنفسکم أزواجا لتسکنوا إلیہا وجعل بینکم مودۃ ورحمۃ إن في ذلک لآیات لقوم یتفکرون" (سورہ روم: ۲۱) (اور اس کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ تم کو تمہارے واسطے تمہاری جنس کی بیبیاں بنائیں، تا کہ تم کو ان کے پاس آرام ملے، اور تم میاں بیوی میں محبت اور ہمدردی پیدا کی، اس میں ان لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں جو فکر سے کام لیتے ہیں)۔

لہذا مذکورہ نعمتوں، فائدوں کے حصول کی خاطر بوڑھاپے کی بیماری اور مشقت ووحشت کا بہترین علاج یہی ہے کہ ان کا کوئی بہترین لائق ومناسب جوڑا تلاش کر کے اس کی شادی کر دی جائے، بیٹوں اور بیٹیوں پر واجب ہے کہ بوڑھے والد کی بھلائی اور خوش نودی کو مدنظر رکھتے ہوئے ان کی شادی جلد از جلد کرا دیں شرعاً یہ محمود عمل ہے، والد کے ساتھ یہ طریقہ اختیار کرنا بہت ہی موزوں ہے۔ آرام وسکون پہنچانے کا ذریعہ ووسیلہ ہے۔ اس سلسلہ میں انبیاء علیہم السلام، صحابہ کرام، تابعین، تبع تابعین علیہم الرحمہ کا اسوہ حسنہ ہمارے لئے نمونہ عمل ہے اور مزید فیہ ہمارے اکابر واسلاف بھی کثرت ازدواج کو بے حسن پسند کرتے تھے، لیکن ہندوستان کے معاشرہ میں اس کو برا سمجھا جاتا ہے، لہذا ہمارا بھی حال کافروں، فاسقوں اور فاجروں جیسا ہو گیا ہے، اس لئے عصر حاضر میں ہمارا مزاج فاسد ہو گیا ہے اور برا حال بھی ہو گیا ہے کہ ہم اس سے نفرت کرتے ہیں، کیونکہ جب والد کی شادی کر دیں گے تو اولاد ہونے کا قوی اندیشہ ہے۔ پھر ہماری جائیداد اور کھیت وغیرہ کے اندر حصہ دار بن جائیں گے، اس لئے ہندوستان میں اولاد اپنے والد کو دوسری شادی کرنے سے روک ٹوک کرتے رہتے ہیں، تا کہ وہ شادی کرنے کے ارادے کو ہمیشہ کے لئے دفن کر دیں، تا کہ ہماری جائیداد مزید منقسم ہونے سے بچ جائے، یہ خاص ہندوانہ رسم ورواج ہے اور اسلامی قانون کے سراسر خلاف ہے اس لئے اس رواج کو بحر الکاہل میں غرقاب کر دیا جائے (سورہ احقاف: ۱۵)۔

والدین کی زندگی میں ہی جائیداد کی تقسیم کا مطالبہ:

الجواب السادس: بعض اوقات اولاد والد کی زندگی میں ہی جائیداد کا مطالبہ شروع کر دیتے ہیں اور سے اپنا حق سمجھتے ہیں، والدین کی معاشی حالت بہتر ہو یا خراب ہو دونوں حالتوں میں اولاد کے لئے والدین سے جائیداد کا مطالبہ کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے، والدین نے تربیت و پرورش اور تعلیم اور شادی وبیاہ کے فرائض انجام دے کر اپنا فرض منصبی ادا کر چکے اب اولاد کے ذمہ ہے کہ خود اپنی کفالت ومعیشت کی تکمیل کے لئے تگ ودو کرے، محنت ومزدوری کرے اور اپنے اور اپنے بچوں کی ذمہ داری کا احساس ہر دم ہر آن رکھے، اپنے والدین کے مال واسباب پر تکیے کرنا چھوڑ دے، اللہ تعالی نے اپنی زمین بہت ہی وسیع، طویل و عریض بنائی ہے جہاں چاہو جاؤ اور فکر معاش میں جستجو کرتے رہو جو یندہ یابندہ کا مصداق بنو، دودھ پیتے بچوں کی روش چھوڑ کر، چرندوں، پرندوں کی طرح اپنی روزی وخوراک کی حصولیابی کے لئے انتھک سعی بلیغ کرتے رہو، ابھی سے والدین کے مال واسباب پر ہاتھ صاف کرنے کی کوشش مت کرو، ورنہ آخری عمر میں کف افسوس ملتے رہو گے، پھر اس وقت کا پچھتانا اور افسوس کرنا بے سود ہوگا، ابھی طاقتور، مضبوط ہو، خوب محنت ومشقت کر کے مال واسباب حاصل کرو تا کہ آخری عمر میں اس سے بھرپور استفادہ حاصل کر سکو اور خود کھاؤ اور اہل وعیال کو کھلاؤ، اور غریبوں، محتاجوں کو صدقہ خیرات کرو، دین ودنیا کی بھلائی حاصل کرو۔ وراثت کا حکم والدین کے انتقال کے بعد جاری وساری ہوگا، اس سے قبل نہیں ارشاد باری ہے: "یوصیکم اللہ في أولادکم للذکر مثل حظ الأنثیین فإن کن نساء فوق اثنتین فلہن ثلثا ما ترک... الخ" (سورہ نساء: ۱۱) (اللہ تعالی تم کو حکم دیتا ہے، تمہاری اولاد کے باب میں لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے حصے کے برابر، اور اگر صرف لڑکیاں ہی ہوں، گو دو سے زیادہ ہوں تو ان لڑکیوں کو دو تہائی ملے گا اس مال کا جو کہ مورث چھوڑ مرا ہے، اور اگر ایک ہی لڑکی ہو تو اس کو نصف ملے گا، اور ماں باپ کے لئے یعنی دونوں میں سے ہر ایک کے لئے میت کے ترکہ میں سے چھٹا چھٹا حصہ ہے، اگر میت کے کچھ اولاد ہو، اور اگر اس میت کے کچھ اولاد نہ ہو اور اس کے

ماں باپ ہی اس کے وارث ہوں تو اس کی ماں کا ایک تہائی ہے، اور اگر میت کے ایک سے زیادہ بھائی بہن ہوں تو اس کی ماں کو چھٹا حصہ ملے گا، وصیت نکالنے کے بعد کہ میت اس کی وصیت کر جاوے، یا دین کے بعد، تمہارے اصول وفروع جو ہیں تم پورے طور پر یہ نہیں جان سکتے کہ ان میں کون سا شخص تم کو نفع پہنچانے میں نزدیک آئے، یہ حکم من جانب اللہ مقرر کر دیا گیا ہے، بالیقین اللہ تعالیٰ بڑے علم اور حکمت والے ہیں)۔

اولاد محتاج وضرورت مند ہوں:

خاص کر ایسی صورت میں جب کہ والدین کی معاشی صورت حال ماشاء اللہ خوب بہتر ہو اور اولاد محتاج وضرورت مند ہوں، واقعی اولاد کی صورت حال ناگفتہ بہ، نامساعد، ناسازگار ہو، تو ایسی صورت حال میں والدین اپنی اولاد پر ترس کھاتے ہوئے ان کے نان ونفقہ کا انتظام وانصرام کر دیں تاکہ وہ نان شبینہ کا محتاج نہ رہیں، دوسروں کے سامنے اپنا ہاتھ پھیلائے نہ پھیریں، ورنہ اس بات کا زیادہ خطرہ رہے گا کہ وہ گداگری وگدائی کا پیشہ اختیار کر لے جو اہل خاندان پر کلنک کا ٹیکا لگ جائے، اس لئے اس رسوائی سے بچنے اور اولاد پر صلہ رحمی کرنے کے ارادے سے اپنی زندگی ہی میں اپنی ہر اولاد کو اپنی خوشی سے اپنا مال واسباب اور جائیداد دے کر سبھوں کو اپنے اپنے حصے کا مالک بنا دیا تو یہ تقسیم بھی شرعاً جائز ودرست ہے، کیونکہ ہر لڑکی اور لڑکوں کو برابر برابر حصہ دیا ہے۔

بوڑھوں کو اولڈ ایج ہاؤس میں رکھنا:

الجواب السابع: مغربی ملکوں میں عمر دراز لوگوں کے لئے ہاسٹل بنا دیئے گئے ہیں اب ہندوستان میں بھی جگہ جگہ ایسے ہاسٹل بن رہے ہیں جن میں نوجوان اپنے بزرگوں کو داخل کر دیتے ہیں، اس میں ایک پہلو یہ ہے کہ عمر دراز حضرات کو ایک جگہ اپنی ضروریات کی چیزیں مہیا ہو جاتی ہیں اور اپنے ہم عمر لوگ مل جاتے ہیں، اگرچہ بالفعل ان لوگوں کو کوئی الجھن وپریشانی لاحق نہ ہوں، لیکن درحقیقت ان بزرگوں کو ان کی اولاد نے جہنم میں داخل کر دیا ہے اس کا پھل ان شاء اللہ دنیا ہی میں جلد از جلد مل جائے گا۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ وہ اپنے رشتہ داروں کی محبت سے محروم ہو جاتے ہیں، عمر کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ انسان چاہتا ہے کہ اس کے بال بچے اس کے قریب رہیں، اولاد اور اولاد کی اولاد کو دیکھ کر اس کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں، ایسے ہاسٹلوں میں اس کی یہ خواہش ایک حسرت بن جاتی ہے۔ ان ہاسٹلوں کو شداد کی جنت کا نمونہ بھی بنا دیا جائے تب بھی اپنے گھر کا بدل نہیں بن سکتا ہے۔ ایسے ہوسٹلوں کا بنانا، اس کی تعمیر میں تعاون کرنا، مشورہ دینا شرعی نقطۂ نظر سے قطعاً حرام ہے۔ کوئی شخص جو ذرہ برابر بھی اپنے دل میں ایمان کی چنگاری رکھتا ہو گا وہ ہرگز اپنے بزرگوں کو ایسے ہاسٹلوں میں قیام پر مجبور نہیں کر سکتا ہے، چونکہ یہ منحوس وملعون عمل ہے جو قابل مذمت ونفرت ہے۔ سراسر یہ غیر انسانی، خلاف فطرت، خلاف شرع فعل ہے۔ یہود ونصاریٰ کی تہذیب وتمدن ہے، اس کی شدید مخالفت کی جائے، کیونکہ درحقیقت یہ قطع رحمی کا ایک ہولناک محل ہے، اور قطع رحمی کا سب سے بڑا خطرناک وسیلہ اور ذریعہ ہے جو مذہب اسلام میں اس کی کوئی گنجائش نہیں، بلکہ قطعاً حرام فعل ہے (سورہ بقرہ: ۸۳، سورہ نساء: ۳۶، سورہ انعام: ۱۵۱، سورہ بنی اسرائیل: ۲۳ تا ۲۴، بخاری ۲/ ۸۸۵، کتاب الادب باب من وصل وصلہ اللہ، مسلم ۲/ ۳۱۵ کتاب البر والصلۃ والادب، باب صلۃ الرحم وتحریم قطعیتہا)۔

معذور بوڑھوں کی کفالت زکوۃ کی رقم سے کرنے کی شرعاً اجازت ہے:

الجواب الثامن: بوڑھاپے کی عمر میں اگر انسان کا ہاتھ خالی ہو، وہ کسب معاش سے معذور ہو، بالخصوص ایسا بوڑھا ہو جو لاولد ہو اور اس کے قریبی رشتہ دار بھی کوئی موجود نہ ہوں تو ایسے بوڑھوں کی بے سہارگی اور بڑھ جاتی ہے، بالآخر وہ انسان اپنے آپ کو اس دنیا میں تن تنہا محسوس کرنے لگتا ہے، ایسے معذور ومجبور بوڑھوں کی انفرادی یا اجتماعی کفالت کے لئے خصوصی طور پر زکوۃ کی رقم کا بھی استعمال کرنا شرعاً درست وجائز ہے۔ قرآن مجید میں زکوۃ کے مصارف میں سب سے پہلے فقراء ومساکین کو ذکر کیا ہے۔ ارشاد باری ہے:

(۱) "إنما الصدقات للفقراء والمساكين والعاملين عليها والمؤلفة قلوبهم وفي الرقاب والغارمين وفي سبيل الله وابن السبيل فريضة من الله، والله عليم حكيم" (سورۃ توبہ: ۶۰)۔

(صدقات تو صرف حق ہے غریبوں کا اور محتاجوں کا اور جو کارکن ان صدقات پر متعین ہیں اور جن کی دل جوئی کرنا منظور ہے اور غلاموں کی گردن چھڑانے میں اور قرض داروں کے قرضہ میں اور جہاد میں اور مسافروں میں، یہ حکم اللہ کی طرف سے مقرر ہے اور اللہ تعالیٰ بڑے علم والے بڑی حکمت والے ہیں)۔

اس آیت میں آٹھ اوصاف کے حاملین کا تذکرہ کیا گیا ہے جو زکوۃ کی رقم کے مستحقین میں شامل ہیں، ان میں بلا تذبذب وتردد کے ایسے بوڑھے بھی شامل

ہیں، اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں جہنم میں جانے کا ایک سبب فقراء ومساکین پر اپنا مال نہ خرچ کرنا اوران کو کھانا نہ کھلانا بھی بتایا ہے، ارشاد باری ہے:

(۲) "فی جنات یتساءلون، عن المجرمین، ما سلککم فی سقر، قالوا لم نک من المصلین، ولم نک نطعم المسکین، وکنا نخوض مع الخائضین" (سورہ مدثر: ۴۰-۴۵)

(اور مجرموں کا حال پوچھتے ہوں گے (یعنی مومنین کفار سے پوچھیں گے) کہ تم کو دوزخ میں کس بات نے داخل کیا وہ کہیں گے ہم نہ تو نماز پڑھا کرتے تھے اور نہ غریب کو (جس کا حق واجب تھا) کھانا کھلایا کرتے تھے اور مشغلہ میں رہنے والوں کے ساتھ ہم بھی (اس) مشغلہ میں رہا کرتے تھے)۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ فاقہ وتنگ دستی کے موقع پر بھوکوں کو کھانا کھلانا، رشتہ دار یتیم کی مدد کرنا، ضرورت مند خاک نشیں مسکینوں اور حاجت مندوں کی خدمت کرنا اوران کا تعاون کرنا بھی بتلایا ہے، ارشاد باری ہے:

(۳) "فلا اقتحم العقبة وما أدراك ما العقبة فك رقبة أو إطعام في يوم ذي مسغبة يتيمًا ذا مقربة أو مسكينًا ذا متربة" (سورہ بلد: ۱۱-۱۶)

(سو وہ شخص (دین) کی گھاٹی میں سے ہوکر نہ نکلا اور آپ کو معلوم ہے کہ گھاٹی (سے) کیا (مراد) ہے، وہ کسی کی گردن کا غلامی سے چھڑا دینا ہے، کھانا کھلانا فاقہ کے دن میں کسی رشتہ دار یتیم یا کسی خاک نشیں محتاج کو یعنی ان احکام الٰہیہ کو بجالانا چاہئے تھا)۔

ایسا ہی اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں نیک بندوں کے اوصاف حمیدہ کا ذکر کیا ہے کہ وہ اپنا مال اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی حاصل کرنے کے لئے مسکینوں، یتیموں اور قیدیوں کو کھانا کھلانے میں خرچ کرتے ہیں، ارشاد باری ہے:

(۴) "ويطعمون الطعام على حبه مسكينا ويتيما وأسيرا، إنما نطعمكم لوجه الله لا نريد منكم جزاء ولا شكورًا" (سورہ دہر: ۸-۹)۔

(اور وہ لوگ محض خدا کی محبت سے غریب اور یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں ہم تم کو محض خدا کی رضامندی کے لئے کھانا کھلاتے ہیں نہ ہم تم سے اس کا فعلی بدلہ چاہیں اور نہ اس کا قولی شکریہ چاہیں)۔

(۵) ''عن أنس وعن عبدالله قالا قال رسول اللهﷺ: الخلق عيال الله فأحب الخلق إلى الله من أحسن إلى عياله'' (مشکوۃ ۲/ ۴۲۵)۔

(حضرت انسؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ساری مخلوق اللہ تعالیٰ کی عیال (گویا اس کا کنبہ) ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ محبوب اپنی مخلوق میں وہ آدمی ہے جو اللہ تعالیٰ کی عیال (یعنی اس کی مخلوق) کے ساتھ احسان اور اچھا سلوک کرے)۔

بغیر استحقاق کے سرکاری رعایتوں سے فائدہ اٹھانا:

الجواب التاسع: عمر دراز لوگوں کے لئے حکومتوں نے مختلف چیزوں میں بعض خصوصی رعایتیں رکھی ہیں، جیسے ٹرین وغیرہ میں کرایہ میں تخفیف، حکومت کی طرف سے امدادی وظیفہ، ٹیکس میں رعایت وغیرہ بلاشبہ اسی رعایتوں سے ان لوگوں کا فائدہ اٹھانا شرعاً جائز ودرست ہے، اس میں کسی قسم کا شک وشبہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے، کیوں کہ حکومت خود رعایت دے رہی ہے عوام زبردستی رعایت نہیں لے رہی ہے، اگر عوام حکومت کی اجازت کے بغیر کسی چیز کو اپنے استعمال میں لائے یا رعایتی فائدہ اٹھائے تو شرعاً یہ ناجائز وحرام ہے۔ اس سے اجتناب واحتراز کرنے کی ہمیں ضرورت ہے۔ عمر دراز لوگوں میں چاہے وہ مالدار ہوں یا غریب ومحتاج ہوں، دونوں کو فائدہ اٹھانا جائز ہے، وظیفہ کے جواز کے لئے حضرت عمرؓ کا عمل کافی ہے، آپ خواص وعوام کو وظائف دیتے تھے۔

جو لوگ ان رعایتوں کے لئے مطلوب مقررہ حد عمر کو نہ پہنچے ہوں تو ان لوگوں کے لئے ایسی رعایتوں سے فائدہ اٹھانا جائز نہ ہوگا۔ اور جو لوگ حکومت کو دھوکہ دے کر رعایتوں سے فائدہ اٹھائے گا تو وہ شرعاً، عقلاً، دیانۃً، قضاءً، سب سے بڑا مجرم شمار ہوگا، معمولی رعایت کے لئے اپنی عاقبت خراب نہیں کرنی چاہئے۔ اور ایسے مجرموں کو سزا دینے کا حکومت کو مکمل اختیار ہوگا، کیوں کہ حکومت کی حقوق تلفی کرکے ملک کو نقصان پہنچایا ہے، مزید فیہ نبی کریم ﷺ نے اپنی امت کو کسی کے ساتھ دھوکہ دہی جیسے جرم کے ارتکاب کرنے کی ممانعت کی ہے۔ جھوٹ، دھوکہ دہی، حقوق تلفی کا انجام بہت ہی برا ہوتا ہے، مسلمانوں کو اس سے بھی بالکلیہ اجتناب کرنا چاہئے۔

معذوروں کے حقوق اور اجتماعی کفالت کے لئے زکوۃ کا استعمال

مولانا عمر بن یوسف کوکنی[1]

(۱) بوڑھے شخص کو کسب معاش پر مجبور کرنا:

والدین، اولاد کے حق میں اللہ کی بڑی نعمت ہے، اس لئے اس نعمت کی قدردانی کی شریعت مطہرہ نے سخت تاکید فرمائی، قدر نعمت کا تقاضہ ہے کہ اولاد اپنے والدین کی جملہ حاجتوں کی تکمیل کا ذمہ لیں۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: "ووصینا الانسان بوالدیہ إحسانا" (سورہ عنکبوت: ۸)۔

اور قولاً وفعلاً ان کی ایذاء رسانی سے مکمل احتراز کریں۔ جیسا کہ فرمان الٰہی ہے: "فلا تقل لهما أف ولا تنهرهما" (سورہ اسراء: ۲۳) حتی کہ اختلاف دین کے باوجود ان کے ساتھ حسن سلوک کو ضروری قرار دیا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: "وصاحبهما فی الدنیا معروفا" (سورہ لقمان: ۱۵)

نیز اولاد والدین کی بہترین کمائی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

إن أطیب ما اكتسبتم من كسبكم، وإن اولادكم من كسبكم (سنن ترمذی، باب ما جاء فی أن الولد یأخذ من مال ولده: ۱۳۵۱)

والدین کے ساتھ حسن سلوک دلالت کرتا ہے کہ والدین کا نفقہ اولاد پر لازم ہے، چنانچہ علامہ ابن الرفعہؒ بیان کرتے ہیں:

''یجب علی الأولاد نفقة الوالدین أی بكسر الدال وإن علوا. ذكورا كانوا أو إناثا أی إذا كانوا أحرارا'' (كفایة النبیه شرح التنبیه ۱۵/۲۳۶. ط: عباس احمد الباز مكة المكرمه)۔

لہذا کسی کے والدین اس حالت کو پہنچیں کہ کسب معاش سے عاجز تو نہیں ہیں، بلکہ اپنے لائق پیشہ اختیار کر کے خود کما کر اپنی ضرورتیں پوری کر سکتے ہیں تو ایسے حضرات پر لازم ہے کہ وہ خود ہی اپنی حاجات کو مکمل کرنے کی فکر کریں اور ترک کسب کر کے دوسروں پر بوجھ نہ بنیں، چنانچہ ایک حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

''كفى بالمرء إثما أن يضيع من يقوت'' (سنن أبی داود: كتاب الزكوة باب فی صدة الرحم: ۱۶۹۲)۔

نیز کسب معاش پر قادر ہونا مال پر قدرت رکھنے کی طرح ہے، جیسا کہ علامہ خطیب شربینیؒ تحریر فرماتے ہیں:

''ویلزم كسوبا إذا لم یكن له مال كسبها فی الأصح إذا وجد مباحا یلیق به ... ولأن القدرة بالكسب كالقدرة علی المال'' (مغنی المحتاج ۳/ ۵۳۵ ط: عباس احمد الباز مكة المكرمه)۔

کمائی پر قادر شخص کے پاس اگر مال نہ ہو تو اصح وجہ کے مطابق نفقہ کو کمانا (حاصل کرنا) اس پر لازم ہے، جبکہ اپنے لائق مباح ذریعہ معاش پائے...... اس لئے کہ کمائی کے ذریعہ قدرت، مال پر قادر ہونے کی طرح ہے۔

البتہ کمائی پر قدرت کے باوجود والدین کمائی نہ کریں تو اولاد ان کو کمائی پر مجبور نہیں کرسکتیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ اولاد کو والدین کے ساتھ حسن معاشرت کا حکم دیتے ہیں۔ "وصاحبهما فی الدنیا معروفا" (سورہ لقمان: ۱۵) اور بوڑھاپے کی عمر میں والدین کو کمائی پر مجبور کرنا حسن معاشرت کے خلاف ہے، نیز والدین نے جوانی اور تندرستی کی حالت میں اولاد کی راحت وترقی کیلئے اپنی جان ومال کو قربان کر کے بڑا احسان کیا ہے، اب ان کے بوڑھاپے کی عمر کو پہنچنے کے بعد حاجتوں کا بوجھ ان کے سر ڈالنا اور کسب معاش کے لئے انہیں مجبور کرنا احسان فراموشی اور پیرانہ سالی میں اولاد کے

[1] جامعہ حسینیہ عربیہ شریوردھن، رائے گڈھ، مہاراشٹر۔

سہارے کے خوابوں کو چکنا چور کرنے کے مرادف ہے۔

چنانچہ علامہ نوویؒ کا کلام ملاحظہ ہو:

''ومن لا مال له ولا هو مكتسب ... لكنه كان لا يكتسب مع القدرة على الكسب. فإن كان من الفروع لم تجب نفقته على المذهب سواء فيه الابن والبنت، وإن كان من الأصول وجبت على الأظهر. لأن الله تعالى أمر بمصاحبتهم، وليس من المعروف تكليفهم الكسب مع كبر السن... وهذه طريقة الجمهور'' (روضة الطالبين ۹/ ۸۵-۸۳ ط: المکتب الاسلامی بیروت، نیز دیکھئے: الحاوی الکبیر ۱۱/ ۴۸۸، العزیز شرح الوجیز ۱۰/ ۶۸، نهاية المطلب ودراية المذهب ۱۵/ ۵۲۲، كفاية النبيه شرح التنبيه ۱۵/ ۲۴۰، تحفة المحتاج مع الحواشی ۱۰/ ۳۴۶)۔

... لیکن جو شخص کمائی پر قدرت کے باوجود نہ کماتا ہو وہ اگر اولاد میں سے ہے، تو اس کا نفقہ اصول پر واجب نہیں، چاہے وہ بیٹا ہو یا بیٹی، اور نہ کمانے والا اگر اصول میں سے ہے تو راجح قول کے مطابق اس کا نفقہ فروع پر واجب ہوگا، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے والدین کے ساتھ حسن معاشرت کا حکم دیا ہے اور بوڑھاپے کے باوجود ان کو کمائی پر مجبور کرنا اچھی بات نہیں، یہی جمہور اور حضرات شوافع کا نقطہ نظر ہے۔

(۲) سن رسیدہ حضرات کا نفقہ کب واجب ہوگا؟

اولاد پر وجوب نفقہ کے لئے والد اور ولد میں بنیادی تین شرائط کا پایا جانا ضروری ہے، جسے علامہ ماوردیؒ نے عمدگی کے ساتھ یوں بیان فرمایا ہے:

''أما الشروط المعتبرة في الوالد فثلاثة، أحدها الحرية... والشرط الثاني الفقر. فإن كان غنيا بمال أو مكتسبا ببدنه لم تجب نفقته على ولده؛ لأنها مواساة تجب مع الحاجة وتسقط مع القدرة على الكفاية. والشرط الثالث أن يكون عاجزا عن الاكتساب۔'' وأما الشروط المعتبرة في الولد لوجوب النفقة عليه فثلاثة شروط. أحدها الحرية... والشرط الثاني أن يكون قادرا عليها بمال أو كسب بدن ليصير بالقدرة عليها من أهل المواساة بها. والشرط الثالث أن يجدها الولد فاضلة عن قوته وقوت زوجته في يومه وليلته. فإن لم تفضل سقطت ... (الحاوی الکبیر ۱۱/ ۴۸۸، ط: دلت ع بیروت، نیز دیکھئے: كفاية النبيه ۱۵/ ۲۴۰)۔

(وجوب کے لئے والد میں تین شرائط معتبر ہیں (۱) آزاد ہو (۲) والد فقیر ہو، اگر وہ مال یا جسمانی کمائی کی بناء پر مالدار ہو تو اس کا نفقہ اولاد پر واجب نہیں، اس لئے کہ یہ غمخواری وہمدردی ہے، حاجت کی صورت میں واجب ہوگا، بقدر کفاف مال پر قادر ہونے کی صورت میں واجب نہیں ہوگا (۳) والد کمانے سے عاجز ہو۔ اولاد میں تین شرائط پائے جانے چاہیے (۱) آزاد ہو (۲) نفقہ ادا کرنے پر قادر ہو مال کے ذریعہ یا بدنی کمائی کے ذریعہ تاکہ نفقہ پر قدرت کی بناء پر غمخواری کرنے والوں (اہل مواساۃ) میں شمار ہو (۳) اولاد کے پاس اپنی اور بیوی کی ایک دن ورات کی ضرورت سے زائد مال ہو، اگر مال زائد نہ ہو تو اس سے نفقہ ساقط ہوگا۔ اولاد پر وجوب نفقہ کی ایک شرط ہے ''اپنی اور اپنے اہل (بیوی) کی ایک دن ورات کی حاجت سے زائد ہونا)۔

یہاں حاجت سے فقط کھانا پینا مراد نہیں بلکہ ہر وہ چیز جس سے انسان مستغنی نہیں ہوسکتا جیسے ضرورت کا مکان، پوشاک، بستر، وغیرہ جیسا کہ علامہ ابن حجر مکی تحریر فرماتے ہیں:

''يعني عن حاجته من كل ما لا غنى لمثله كمسكن وملبس وفرش وماء وضوئه وعن حاجة حليلته من نحو زوجته وخادمها وأم ولدها وإن تعدد كل منهن كما هو ظاهر'' (فتح الجواد بشرح الارشاد ۲/ ۲۶۱، ط: دلت ع بیروت، نیز دیکھئے: مغنی المحتاج ۳۰/ ۵۴۵)۔

حاجت میں ہر وہ چیز داخل ہے جن سے انسان مستغنی نہ ہوسکتا ہو، جیسے مکان، کپڑا، بستر اور وضو کا پانی، اسی طرح بیوی اور اس کے خادم وغیرہ کی حاجت بھی اسمیں داخل ہے، اگرچہ متعدد ہوں)۔

دلیل:......سن رسیدہ حضرات کا نفقہ از راہ ''مواساۃ'' واجب ہوتا ہے، اس لئے کہ ''مواساۃ'' کا تحقق ضرورت سے زائد مال میں ہوگا، اپنی حاجت اصلیہ کے مال میں ''مواساۃ'' کا مکلف نہیں کیا جاسکتا، چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حاصل شدہ مال کے مصارف میں یوں ہی ترتیب بیان فرمائی:

''ابدأ بنفسك فتصدق عليها، فإن فضل شئی فلأهلك، فإن فضل عن أهلك فلذی قرابتك'' (صحیح مسلم: کتاب الزکوٰۃ، باب الابتداء فی النفقة بالنفس: ۹۹۷)۔

جن سن رسیدہ حضرات کا نفقہ اپنی اولاد پر لازم ہوتا ہے، اگر وہ حضرات علاج کے محتاج ہوں تو ان کا علاج بھی ان ہی اولاد پر لازم ہوگا، کیونکہ علاج بھی حاجت میں داخل ہے اور ''مواساۃ'' حاجت روائی کا تقاضہ کرتی ہے، اس پر روشنی ڈالتے ہوئے شیخ الاسلام زکریا انصاریؒ یوں رقمطراز ہیں:

''ويجب أيضا الادم والكسوة ومؤنة الخادم إن احتاج إليه وأجرة الطبيب وثمن الأدوية، فالمعتبر الكفاية وهی غير مقدرة؛ لأنها تجب علی المواساة لدفع الحاجة فيعتبر حاله فی السن والرغبة والزهادة'' (الغرر البهية: ۸/ ۵۰۳ ط: عباس احمد الباز مكة المكرمة)۔

(اور سالن اور پوشاک اسی طرح اگر خادم کی ضرورت ہے تو خادم کا خرچ اور ڈاکٹر (طبیب) کی اجرت اور دوائیوں کا ثمن بھی واجب ہوگا، الغرض ضروریات کو پورا کرنا مطلوب ہے اور وہ متعین نہیں، اس لئے کہ نفقہ از راہ مواساۃ واجب ہوتا ہے تو اس میں ہر ایک کی عمر اور اس کی حاجت وعدم حاجت کا اعتبار کیا جائے گا)۔

تنبیہ:......حضرات شوافع کے نزدیک قرابت بعضیت کی وجہ سے نفقہ کا وجوب ہوتا ہے، وہ صرف ولد کا نفقہ والد پر لازم ہوگا یا اس کے برعکس، یعنی صرف اصول کا نفقہ فروع پر یا فروع کا نفقہ اصول پر لازم ہوگا، اصول وفروع کے ساتھ دیگر رشتہ داروں کو لاحق نہیں کیا جائے گا جیسے بھائی، بہن، چچا، ماموں، پھوپھی اور خالہ وغیرہ، جیسا کہ وجوب نفقہ کے شرائط بیان کرتے ہوئے علامہ نووی کا کلام ملاحظہ ہو:

''أحدها إنما تجب النفقة بقرابة البعضية، فتجب للولد علی الوالد وبالعكس ... ولا يلحق بالأصول والفروع سائر الأقارب كالأخ والأخت والعم والخال والعمة والخالة وغيرهم'' (روضة الطالبين: ۹/ ۸۳/ ۸۳)۔

نفقہ بعضیت کی قرابت کی وجہ سے واجب ہوتا ہے اسی بناء اولاد کا نفقہ والد پر اور والد کا نفقہ اولاد پر لازم ہوگا اور وجوب نفقہ کے سلسلہ میں اصول وفروع کے ساتھ دیگر رشتہ داروں مثلاً بھائی، بہن، چچا، ماموں، پھوپھی اور خالہ وغیرہ کو لاحق نہیں کیا جائے گا (دیگر رشتہ داروں کا نفقہ واجب نہیں)۔

(۳) زیادہ سہولت کے لئے مزید رقم کا مطالبہ:

بوڑھے والدین یا خاندانوں کے وہ بڑے جن کا نفقہ ان کے چھوٹوں پر محتاجی کی صورت میں واجب ہے، اگر وہ محتاج نہ ہوں، تو زیادہ سہولت کے لئے یا دوسروں پر خرچ کرنے کے لئے یا کچھ رقم محفوظ کرنے کیلئے نفقہ کی حیثیت سے زائد رقم کا مطالبہ نہیں کر سکتے، اس لئے کہ رشتہ داروں کے نفقہ کا وجوب ''مواساۃ'' کی بناء پر ہے، جب خود صاحب ثروت ہیں یا بقدر کفاف کے مالک ہیں تو وہ ''مواساۃ'' کے مستحق نہیں، چنانچہ علامہ خطیب شربینیؒ کا واضح کلام ملاحظہ ہو:

''(ولا تجب) النفقة (لمالك كفايته) ولو زمنا أو صغيرًا أو مجنونا لاستغنائه عنها ولا لمكتسبها، بأن يقدر علی كسب كفايته من كسب حلال يليق به لانتفاء حاجته إلی غيره، وإن كان يكسب دون كفايته استحق القدر المعجوز عنه خاصة'' (مغنی المحتاج: ۳/ ۵۴۶، نیز دیکھئے: العزيز شرح الوجيز: ۱۰/ ۶۴، الحاوی الكبير: ۱۱/ ۳۸۸)۔

اپنی کفایت کے بقدر مال کا جو شخص مالک ہو اس کا نفقہ واجب نہیں ہوگا چاہے وہ اپاہج ہو یا نابالغ یا پاگل، اس کے نفقہ سے مستغنی ہونے کی وجہ سے، اسی طرح جو اپنے لائق حلال کمائی کے ذریعہ اپنے نفقہ کو حاصل کر سکتا ہو تو اس کا نفقہ بھی واجب نہیں ہوگا، اس لئے کہ یہ دوسرے کا محتاج نہیں ہے اور جو بقدر کفاف مال نہ کما پا رہا ہو تو جتنی مقدار سے عاجز ہے اسی کے بقدر نفقہ واجب ہوگا۔

(۴) الف: زیادہ آمدنی کے لئے لڑکوں کا والدین کو چھوڑ کر دوسری جگہ جانا:

قرآن وحدیث کی نصوص صریحہ سے اطاعت والدین ثابت ہے، اس لئے امور طاعت اور امور مباحہ میں والدین کی اطاعت ضروری ہے جب تک کسی معصیت کا حکم نہ دیں، حتی کہ بعض اہل علم کا کہنا ہے کہ والدین کسی امر مباح کا حکم دیں تو اولاد کے حق میں مندوب ہوتا ہے، اور کسی امر مندوب کا حکم دینا اس کی تاکید اور اہمیت کو بڑھاتا ہے (دیکھئے: الجامع لاحکام القرآن للقرطبی ۱۰/۱۵۶، ط: دکن بیروت)۔

والدین کے ساتھ حسن سلوک کا تقاضہ ہے کہ جہاد جیسے عمل کے لئے بھی والدین کی اجازت کے بغیر نہ نکلیں، والدین کی اجازت کے بغیر نکلنا حرام ہے، چنانچہ علامہ خطیبؒ کا بیان ہے:

''ويحرم على رجل جهاد بسفر وغيره إلا باذن أبويه إن كانا مسلمين، لأن الجهاد فرض كفاية وبرهما فرض عين'' (مغنی المحتاج: ۴/ ۲۵۱، نیز دیکھئے: تحفۃ المحتاج مع الحواشی: ۱۲/ ۴۲)۔

اور مرد پر اپنے والدین کی اجازت کے بغیر جہاد کیلئے نکلنا حرام ہے، جبکہ وہ مسلمان ہوں، چاہے سفر کی اجازت ہو یا نہ ہو، اس لئے کہ جہاد فرض کفایہ ہے اور والدین کی اطاعت فرض عین ہے۔

دلیل:......''عن عبدالله بن عمرو قال: جاء رجل إلى النبي ﷺ يستأذنه في الجهاد فقال: أحي والداك! قال: نعم. قال: ففيهما فجاهد'' (صحيح البخاري: كتاب الجهاد والسير، باب الجهاد باذن الابوين: ۳۰۰۴)۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص نبی کریم ﷺ کے پاس جہاد کی اجازت طلب کرنے کیلئے آئے تو آپ ﷺ نے پوچھا کہ کیا آپ کے والدین حیات ہیں؟ تو جواب دیا جی ہاں! تو آپ ﷺ نے فرمایا ان ہی میں جہاد کیجئے۔

علامہ ابن منذرؒ فرماتے ہیں: اس حدیث میں والدین کی اجازت کے بغیر جہاد کے لئے نکلنے کی ممانعت پر دلالت ہے (الجامع لاحکام القرآن: ۱۰/ ۱۵۷)۔

☆ جہاد کے علاوہ تجارت وغیرہ جیسے مباح سفر کے سلسلہ میں علامہ خطیب کا واضح کلام ملاحظہ ہو:

''تنبيه: وسكت المصنف عن حكم السفر المباح كالتجارة وحكمه إن كان قصيرا فلا منع به بحال، وإن كان طويلا فإن غلب الخوف فكالجهاد، وإلا جاز على الصحيح بلا استيذان'' (مغنی المحتاج ۴/ ۲۵۱، نیز دیکھئے: العزيز شرح الوجيز ۱۱/ ۳۶۱)۔

ماتنؒ نے سفر مباح مثلاً تجارت کے سفر کے حکم کو بیان نہیں کیا اور اس کا حکم یہ ہے کہ اگر سفر قصیر ہو تو کسی صورت میں اس کی ممانعت نہیں، اور اگر طویل ہو اور اس میں خوف غالب ہو جیسے جہاد تو اس کی اجازت نہیں اور اگر خوف غالب نہ ہو تو صحیح قول کے مطابق بغیر اجازت سفر جائز ہے۔

اس سلسلہ میں علامہ ابن حجر مکیؒ یوں بیان فرماتے ہیں:

''ويحرم عليه أيضا بلا إذن سفر مع الخوف وإن قصر مطلقا وطويل ولو مع الأمن إلا لعذر'' (تحفة المحتاج مع الحواشي: ۱۲/ ۴۲، ط: عباس احمد الباز مكة المكرمة)۔

اور مکلف پر خوف کی حالت میں بغیر اجازت سفر حرام ہے چاہے قصیر ہو اور طویل سفر امن کی حالت میں بھی منع ہے البتہ اگر کوئی شرعی عذر ہو تو جائز ہے۔

لطیف فرق:......سفر مباح اگر قصیر ہو تو علامہ خطیبؒ مطلقاً اسکے جواز کے قائل معلوم ہوتے ہیں چاہے امن کی حالت ہو یا خوف کی، جبکہ علامہ ابن حجرؒ کے کلام سے مترشح ہوتا ہے کہ خوف کی حالت میں قصیر سفر مباح بھی حرام ہے یہی رائے امام رملیؒ کے کلام سے بھی ظاہر ہوتی ہے۔ جیسا کہ علامہ شروانیؒ نے یہ توضیح کرتے ہوئے نقل فرمایا ہے:

''قوله (ويحرم عليه) أي على المكلف. اهـ ع ش قوله (وإن قصر الخ) وفاقا للنهاية وخلافا للمغني عبارته...''

(حاشیۃ الشروانی علی تحفۃ المحتاج ۱۲/ ۴۲)۔

صورت مسئولہ کے مطابق زیادہ آمدنی کے لئے اپنے ماں باپ کو چھوڑ کر دوسری جگہ جانا ہو تو ان سے اجازت حاصل کرنا بہتر ہے، اور والدین کو بھی چاہیے کہ ایسے موقع پر اجازت سے انکار نہ کرے، کیونکہ کسب معاش وغیرہ کے لئے اجازت نہ دینا بسا اوقات معاشی تنگی اور مشقت کا باعث ہوتا ہے جیسا کہ علامہ رافعی تحریر فرماتے ہیں:

والأظهر أنه لا منع لهما؛ لأنه بالامتناع عن ذلك قد ينقطع عن معاشه ويضطرب عليه أمره (الشرح الكبير ۱۱/ ۳۶۲)

(اور مشہور قول یہ ہے کہ والدین کو اجازت سے انکار کرنے کا حق نہیں، اس لئے کہ یہ انکار بسا اوقات معاش کے منقطع ہونے اور پریشانی کا باعث ہوتا ہے)

البتہ والدین کی اجازت کے بغیر بھی دوسری جگہ جانا جائز ہے جیسا کہ گذشتہ ''عبارت مغنی'' سے واضح ہوا، نیز علامہ شروانیؒ ''العذر'' کی وضاحت کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''ومنه السفر لبيع أو شراء مالا يتيسر بيعه أو شراءه في بلده أو يتيسر لكن يتوقع زيادة في ثمنه في البلد الذي يسافر إليه'' (حاشیۃ الشروانی علی تحفۃ المحتاج ۱۲/ ۴۳)۔

(عذر کی صورت یہ ہے کہ اپنے شہر میں خرید و فروخت آسان نہ ہو یا آسان ہو، لیکن دوسرے شہر میں زیادہ ثمن کی امید ہو (تو طویل سفر بھی بلا اجازت جائز ہے))۔

لیکن اجازت کے بغیر دوسری جگہ جانے میں چند شرائط ملحوظ رکھنے چاہئیے۔

(۱) جانے والا لڑکا اپنے معاملات اور میدان میں کام کرنے کے اعتبار سے ''رشید'' (سوج بوجھ رکھنے والا) ہو، کہ جس سے زیادہ آمدنی یا تجارت میں زیادہ نفع حاصل ہونے کی امید ہو۔

(۲) یہ امرد جمیل نہ ہو جس سے کسی فتنہ میں واقع ہونے کا اندیشہ ہو۔ ہاں! اگر کسی کے ساتھ کوئی محرم ہو جس سے اپنی ذات پر امن حاصل ہو تو اس کے ساتھ جا سکتا ہے۔

(۳) اگر اس پر والدین کا نفقہ لازم ہوتا ہو تو والدین کی جگہ میں کسی کو نائب بنائے جو اسکے موجودہ مال میں سے نفقۂ والدین اور دیگر ضروریات کو پورا کر سکے۔ (اس کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہیکہ اگر والدین کے خدمت کے محتاج ہوں تو ان کی خدمت کیلئے کسی کو مقرر کرے تو زیادہ بہتر ہے۔)

چنانچہ علامہ ابن حجر ھیتمی مکیؒ کا کلام ملاحظہ ہو:

''ويشترط لخروجه ولو للفرض رشده وأن لايكون أمرد جميلا إلا أن كان معه نحو محرم يأمن به على نفسه. ولو لزمته نفقة الأصل احتاج لاذنه أو أنابه من يمونه من مال حاضر'' (تحفۃ المحتاج مع الحواشی ۲/ ۴۲/ ۴۳)۔

(اولاد میں سے کسی کے سفر کیلئے بلا اجازت نکلنے کے جواز کی شرط یہ ہے کہ وہ رشید ہو، اور امرد جمیل نہ ہو، الا یہ کہ کوئی محرم ساتھ ہو جس سے امن حاصل ہو سکتا ہے، اور اگر اصل کا نفقہ اس پر لازم ہے تو اصل کی اجازت ضروری ہے یا کسی کو نائب بنائے جو موجودہ مال میں سے اس پر خرچ کرے)۔

حاصل کلام:...... اداء حقوق والدین کی تاکید کی وجہ سے بہتر یہ ہے کہ کسب معاش کے لئے ایسا طریقہ اختیار کرے جس سے رزق حلال بھی حاصل ہو اور خدمت والدین کی سعادت بھی نصیب ہو، کہ ایسی نیک بختی ہے کہ اس کے فوت ہونے کے بعد سوائے حسرت اور افسوس کے کچھ حاصل نہیں۔ ...... تاہم زیادہ آمدنی کے لئے شرائط مذکورہ کی رعایت کرتے ہوئے دوسرہ جگہ جانا بھی جائز ہے۔

(۴) ب: بہو کو ساس کے ساتھ رہنے پر مجبور کرنا:

بیوی کی رہائش کا انتظام کرنا شوہر پر حق واجب ہے اور ایسی جگہ انتظام کرے جو اس کے مناسب اور لائق ہو یعنی اس مقام پر رہائش سے عورت

کو ضرر لاحق نہ ہوتا ہو، لہذا بیوی کسی بھی وجہ سے ساس سسرے کے ساتھ رہنا نہ چاہتی ہو تو اسے ان کے ساتھ رہنے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا، جیسا کہ دو سوکنوں کو ایک ساتھ رکھنے میں جھگڑے کا اندیشہ ہو یا دونوں ایک ساتھ رہنا نہ چاہتی ہوں تو دونوں کے لئے مناسب حال مستقل رہائش کا انتظام کرنا ضروری ہے، چنانچہ شیخ زکریا انصاریؒ کا بیان ہے:

''(و) یجب لها (مسکن یلیق بها) عادة من دار او حجرة أو غیره کالمعتدة بل أولی. وإن لم یملکه'' (شرح المنہج علی ھامش حاشیۃ الجمل ۷/ ۳۰۴، ط عباس احمد الباز مکۃ المکرمہ)۔

(اور بیوی کے لئے اس کے لائق عرف کے مطابق مسکن (رہائش) لازم ہے چاہے گھر میں ہو یا کسی کمرہ میں جیسا کہ معتدہ کیلئے لازم ہوتا ہے، بلکہ بیوی کیلئے بدرجۂ اولی لازم ہے، اگرچہ شوہر مسکن کا مالک نہ ہو)۔

مزید علامہ اہدلؒ فرماتے ہیں:

''یجب علی الزوج إسکان زوجته فی محل لائق بها یسار أو إعسار أو توسطا یتعین أن یکون بحیث یخلوا بها الزوج فیه. فإن أسکنها فی محل یبیت معها فیه غیرها کأمة مثلا لم یکف فی الإسکان'' (عمدۃ المفتی والمستفتی ۲/ ۲۸۴، ط دار المنہاج، نیز دیکھئے: تحفۃ المحتاج ۹/ ۴۸۳)۔

(شوہر پر واجب ہے کہ اپنی بیوی کو مناسب مکان میں اپنی حیثیت کے مطابق رہائش دے، مکان ایسا ہو کہ اسمیں وہ بیوی کے ساتھ خلوت کر سکے، اگر اس کو ایسی جگہ ٹھرائے کہ اس کے ساتھ کوئی دوسرا بھی اسمیں رات گزارے مثلا اس کی باندی تو یہ جگہ حق سکنی کی ادائیگی کے لئے کافی نہیں ہوگی)۔

تنبیہ: موجودہ ماحول میں بے پردگی، بے حیائی اور مردوں وعورتوں میں بے تکلفیاں عام ہوئی ہیں، شر پسند عناصر اور جن کے دلوں میں مرض ہوتا ہے وہ زیادہ تر ان ہی عورتوں کو اپنی ہوس اور جذبات کی آگ ٹھنڈی کرنے کے لئے نشانہ بناتے ہیں جو اپنے گھروں میں تنہا رہتی ہیں۔ اور عورتیں بھی تنہائی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے از خود یا کسانے اور ورغلانے پر شہوت پرستوں کی ہوس رانی میں مدد اور معاون بن جاتی ہیں، ایسے موقع پر اپنی آبرو وعفت کی حفاظت کرنا بڑا مشکل ترامر ہے، اس لئے بیوی کو مستقل مکان میں رہائش دینے کی صورت میں ایسی جگہ اختیار کرنی چاہیئے جہاں اسے خود بھی اپنی عفت و پاکدامنی کی فکر لاحق ہو اور دوسرے قریبی رشتہ دار بھی اس پر نظر نگاہ رکھ سکیں... لہذا بیوی کے حق سکنی کو ادا کرنے میں کسی بھی گناہ کے کام کا شک وشبہ پیدا کرنے والی راہوں اور گوشوں کو بند کرنا شوہر کی ذمہ داری ہے۔

علامہ رملی شافعیؒ کے کلام سے اس پر روشنی حاصل کی جاسکتی ہے:

''وله إغلاق الباب علیها عند خوف لحوق ضرر له فی فتحه ... فله السد بل یجب علیه کما افتی به الوالد اخذا من افتاء ابن عبد السلام بوجوبه فی طاقات تری الاجانب منها، وعلم منها تعمد رؤیتهم'' (نہایۃ المحتاج ۵/ ۲۰۵، ط: عباس احمد الباز مکۃ المکرمۃ، نیز دیکھئے: حاشیۃ الجمل ۷/ ۳۰۴)۔

(اگر دروازے کو کھلا رکھنے میں فتنہ کا اندیشہ ہو تو بیوی کے مکان کے دروازے کو بند کرنے کا شوہر کو حق حاصل ہے...... بلکہ دروازہ بند کرنا شوہر پر واجب ہے، جیسا کہ والدؒ نے اس پر فتوی دیا علامہ ابن عبد السلام کے فتوی سے اخذ کرتے ہوئے، کہ جن طاقچوں سے عمداً اجنبیوں کو دیکھنے کا یقین ہو ان کو بند کرنا واجب ہے)۔

☆ جہاں تک بہو کی خدمت کا تعلق ہے اس بارے میں یہ ذہن نشین رہے کہ امور خانہ داری مثلا پکانا، جھاڑو لگانا، دھونا وغیرہ یہ کام بیوی پر لازم نہیں، بلکہ ان کا انتظام کرنا شوہر کی ذمہ داری ہے، چاہے خود ہی یہ کام انجام دے یا کسی خادم کے ذریعہ کروائے، اس کی توضیح میں علامہ اہدلؒ رقمطراز ہیں:

''وأما الطبخ والکنس والغسل ونحوها فلا شئی منها علی المرأة مخدومة کانت فی أهلها أو لم تکن ولا علی خادمتها إلا أن تبرعة، بل هو علی الزوج. إن شاء فعله بنفسه، وإن شاء بغیره'' (عمدۃ المفتی والمستفتی ۲/ ۲۲۶، نیز

دیکھئے: الغرر البھیة ۸/ ۵۵۷)۔

(بہر حال پکانا، جھاڑو دینا اور دھونا وغیرہ بیوی پر کچھ بھی لازم نہیں چاہے وہ میکہ میں مخدومہ رہی ہو یا نہ رہی ہو اور نہ بیوی کی خادمہ پر یہ لازم ہے، البتہ تبرعا یہ کام انجام دے سکتی ہیں، بلکہ یہ کام شوہر پر لازم ہے چاہے وہ خود انجام دے یا کسی کے ذریعہ کروائے)۔

فقہائے کرام کی ان تصریحات سے بیوی پر خدمت شوہر کے عدم وجوب پر دلالت ہوتی ہے، تو ساس سسرے کی خدمت کا لازم نہ ہونا ظاہر ہے... لیکن با اخلاق اور صالح خاتون کی علامت یہ ہے کہ وہ اپنے شوہر کی اطاعت کو اپنے لئے سعادت سمجھتی ہے اور شوہر کو راضی رکھنے اور اسکا دل جیتنے کو اپنی بڑی کامیابی تصور کرتی ہے۔ اس لئے اگر شوہر اپنے والدین کی خدمت کا تقاضہ کرتا ہو اور وہ خاتون خانہ کے سامنے خدمت کے اشد محتاج نظر آرہے ہوں تو اس خاتون کے بلندیٔ اخلاق کا تقاضہ یہ ہے کہ اس امر خاوند کی اطاعت میں بھی اپنے دارین کی کامیابی کا یقین رکھے، اور ایک بے سہارا کو سہارا دینے میں بھرپور تعاون کرے (حوالہ سابق)۔

چنانچہ صحابیات کی زندگی میں اس جذبۂ اطاعت اور شوق ثواب آخرت کے بہترین نمونے موجود ہیں۔

حضرت فاطمۃ الزہراءؓ خود ہی امور خانہ داری نہایت ہی شوق سے انجام دیتی تھیں (دیکھئے: سنن ابی داود، کتاب الخراج والفئی والامارۃ، باب فی بیان مواضع قسم الخمس وسہم ذی القربی ۲۹۸۸)۔

اسی طرح حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ اپنے خاوند زبیر بن عوامؓ کی خدمت کے سلسلہ میں اپنی مثال آپ ہیں (دیکھئے: صحیح مسلم، کتاب السلام، باب جواز ارداف المرأۃ الاجنبیة ۲۱۸۲)۔

(۴) ج: بیویوں کو اپنے والدین کی خدمت کی شوہروں کا اجازت نہ دینا:

والدین کے ساتھ احسان کا خطاب صرف مردوں کے ساتھ خاص نہیں بلکہ عورتیں بھی اسمیں داخل ہیں، لہذا بیٹوں کی طرح بیٹیاں بھی خدمت والدین کی مخاطب ہیں، انھیں بھی والدین کی خدمت پر وہ بشارتیں اور اجر حاصل ہوگا جو مردوں کو حاصل ہوتا ہے، اور یہ عام بات ہے کہ بیٹوں کو خدمت میں کوئی مانع اور رکاوٹ نہیں ہوتی جبکہ یہ آزادی اور خودمختاری شادی شدہ بیٹیوں کو حاصل نہیں، کیونکہ وہ شوہروں کے تابع ہونے کی وجہ سے ان کے مکلف ہوتی ہیں۔

فقہاء کرام کی تصریحات سے دلالت ہوتی ہے کہ عورت کی رہائش جس گھر میں متعین ہوئی ہے اس مقررہ مکان سے شوہر کی اجازت کے بغیر اس کا نکلنا جائز نہیں اور بغیر اجازت کے نکلنا ''نشوز'' (نافرمانی) میں داخل ہوگا جس کی بناء پر وہ شرعی نفقہ سے محروم ہوگی، علامہ رملیؒ کا بیان ہے:

''والخروج من بيته أي من محل مرضي بإقامتها به ولو بيتها أو بيت أبيها كما هو ظاهر ولو لعيادة. وإن كان غائبا بتفصيله الآتي بلا اذن منه ولا ظن مرضاة عصيان ونشوز. إذ له حق الحبس في مقابلة المؤن'' (نھایة المحتاج ۵/ ۳۰۹، نیز دیکھئے: حاشیة الجمل ۷/ ۳۱۷)۔

(بیوی کے جس جگہ میں رہنے پر شوہر راضی ہو اس جگہ سے بیوی کا شوہر کی اجازت کے بغیر نکلنا چاہے عیادت کیلئے ہو چاہے شوہر غائب ہو، نہ شوہر کی طرف سے صریح اجازت ہو اور نہ اجازت کا گمان ہو (دلالۃ اذن) تو اس طرح بیوی کا نکلنا نافرمانی اور نشوز ہے، اس لئے کہ شوہر نفقہ کے عوض بیوی کو روکنے کا حق حاصل ہے)۔

چونکہ شوہر کو نفقہ کی وجہ سے بیوی پر حق حبس حاصل ہے اس لئے بیوی کو گھر سے نکلنے سے منع کرنے کا حق اسے حاصل ہے حتی کہ بعض عبارات فقہیہ سے والدین کی زیارت وعیادت کے لئے نکلنے سے بھی حق منع مترشح ہوتا ہے، چنانچہ علامہ رملیؒ تحریر فرماتے ہیں:

''ولو خرجت لا على وجه النشوز ... وظاهره أن محل ذلك ما لم يمنعها من الخروج قبل سفره أو يرسل لها بالمنع'' (نھایة المحتاج ۵/ ۳۱۱)۔

(اگر بیوی بغیر نافرمانی کے کسی عذر شرعی کی بناء پر نکلے تو شوہر کے غائب ہونے کی صورت میں اجازت کے بغیر نکلنا جائز ہوگا، جبکہ شوہر نے اپنے

سفر سے پہلے اسے نکلنے سے منع نہ کیا ہو یا ممانعت کا پیغام نہ بھیجا ہو)۔

البتہ یہاں یہ امر ذہن نشین رہنا چاہیے کہ والدین کی خدمت وزیارت بیٹوں کی طرح بیٹیوں کے لئے باعث سعادت ہے اور وہ بھی اخلاص ومحبت کے ساتھ خدمت والدین کا جذبۂ صادق رکھتی ہیں، نیز عرف عام میں شوہر کی غیر موجودگی میں اس مقصد کے خاطر گھر سے نکلنے کو نشوز اور معصیت شمار نہیں کیا جاتا، اور اس سے شرعی واجب نفقہ بھی ساقط نہیں ہوتا، اس لئے شوہروں کے لئے مناسب نہیں کہ وہ بیویوں کو اپنے والدین کی خدمت وزیارت سے منع کریں، بلکہ خوشدلی کے ساتھ اپنے اعلیٰ اخلاق اور وسیع ظرف کا ثبوت فراہم کریں۔ چنانچہ علامہ خطیب ''متن منہاج الطالبین'' کی شرح کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''ولوخرجت في غيبته لا على وجه النشوز. بل لزيارة لأقاربها أو جيرانها ونحوها كعيادتهم وتعزيتهم لم تسقط نفقتها إذ لايعد ذلك نشوزا عرفا'' (مغنی المحتاج ۳ / ۵۳۳)۔

(اگر بیوی نشوز کے بغیر شوہر کی عدم موجودگی میں نکلے یعنی اپنے رشتہ دار یا پڑوسیوں کی زیارت کے لئے یا ان کی عیادت وتعزیت وغیرہ کیلئے تو اس کا نفقہ ساقط نہیں ہوگا، اس لئے کہ ایسے نکلنے کو عرفاً نشوز شمار نہیں کیا جاتا)۔

نیز علامہ خطیبؒ کے آئندہ کلام سے مزید توضیح ہورہی ہے:

''والأوجه ما قال الدميري من أن المراد خروجها إلى بيت أبيها أو أقاربها أو جيرانها لزيارة أو عيادة أو تعزية. ولهذا تبعته في حل المتن. ونقل الزركشي عن الحموي شارح التعجيز: أنه ليس لها الخروج لموت أبيها ولاشهود جنازته وأقره. والظاهر خلافه أخذا مما مر'' (حوالہ سابق، نیز دیکھئے: حاشية الجمل ۷ / ۳۱۷. عمدة المفتي والمستفتي ۳ / ۱۵۹)۔

اور قرین قیاس قول وہ ہے جسے علامہ دمیری نے بیان کیا کہ بیوی کے نکلنے سے مراد اس کا اپنے والد یا رشتہ داروں یا پڑوسیوں کے گھر کی طرف عیادت یا زیارت کیلئے نکلنا ہے، اس لئے حل متن میں اس معنی کا میں نے لحاظ کیا۔ علامہ زرکشیؒ نے علامہ حمویؒ سے نقل کیا کہ بیوی کو اپنے والد کی موت پر یا ان کے جنازہ میں حاضری کے لئے نکلنے کا حق نہیں اور زرکشی نے اس قول کو ثابت کیا، حالانکہ ظاہر اس کے برخلاف ہے، کیونکہ ایسے نکلنے کو عرفاً نشوز نہیں کہا جاتا۔

حاصل کلام:...... بیوی کے والدین بیمار ہوں یا بوڑھاپے کی وجہ سے خدمت کے محتاج ہوں اور ان کی خدمت کے لئے کوئی نہ ہوتو والدین کے خدمت کیلئے جانے سے روکنا تقاضہ ایمان واخلاق کے صریح خلاف ہے، بلکہ شوہر ان کو جانے کی اجازت دیں، اس لئے کہ ہر شخص اپنی استطاعت کے بقدر والدین کے ساتھ حسن سلوک وبھلائی کا مکلف ہے، تائید کیلئے مندرجہ ذیل کلام ملاحظہ ہو:

''إذا كان أبو الزوجة مريضا مرضا طويلا فاحتاجها ولم يكن لديه من يقوم بشأنه فعليها الذهاب إليه وتعاهده بقدر احتياجه ولو كان غير مسلم. وإن أبى الزوج ذلك'' (الاحكام الشرعيه في الاحوال الشخصيه ۱ / ۴۶۷ مادة ۲۱۶)

(جب بیوی کا باپ طویل عرصہ سے بیماری میں مبتلا ہو اور خدمت کے لئے اپنی بیٹی کا محتاج ہو، کیونکہ اس کے پاس اس کی خدمت کرنے والا کوئی نہیں ہے تو بیٹی بقدر ضرورت اپنے باپ کی خدمت ودیکھ بھال کیلئے جاسکتی ہے اگرچہ باپ غیر مسلم ہو اور شوہر جانے سے منع کرے)۔

(۵) اولاد کا والد کے دوسرے نکاح میں رکاوٹ بننا:

بوڑھاپے میں والد اپنی عفت اور سہارے کے لئے کسی خاتون سے نکاح کرنا چاہتے ہیں تو والد کے دوسرے نکاح میں اولاد کا رکاوٹ بننا درست نہیں، بلکہ والدین نکاح کا مہر ادا کرنے یا بیوی کی کفالت کی استطاعت نہ ہوتو اولاد پر ضروری ہے کہ والد کا نکاح کرائے اور والد کے ساتھ والد کی بیوی کی بھی کفالت کرتے رہے، علامہ نووی تحریر فرماتے ہیں:

يلزم الولد إعفاف الأب والأجداد على المشهور بأن يعطيه مهر حرة أو يقول أنكح وأعطيك المهر... ثم عليه مؤنتهما (منهاج الطالبين على هامش مغني المحتاج ۳ / ۲۵۸)۔

(مشہور قول کے مطابق بیٹے پر اپنے اصول (باپ دادا) کو پاکدامن رکھنے کی فکر کرنا لازم ہے، لہذا اولاد کسی آزاد سے نکاح کا مہر انھیں دے یا

کہے کہ آپ نکاح کیجئے میں آپ کو مہر دونگا پھر دونوں کا خرچ بیٹے پر ہی ہوگا)۔

نیز ایک اور مقام پر آپ ہی کا کلام ملاحظہ ہو:

''إن الابن يلزمه إعفاف أبيه على المشهور وأنه إذا عفه بزوجة أو ملكه جارية لزمه نفقتها ومؤنتها حيث تلزمه نفقة الأب'' (روضة الطالبين ۹/ ۸۶، نیز دیکھئے: نهاية المطلب ودراية المذهب ۱۵/ ۵۲۳، العزيز ۱۰/ ۰۷، الحاوی الكبير ۱۱/ ۴۸۹)۔

(بیٹے پر اپنے باپ کو پاکدامن رکھنا لازم ہے، لہذا باپ کی عفت کے لئے اسے بیوی یا باندی دے تو بیٹے پر باپ کے نفقہ ساتھ بیوی یا باندی کا نفقہ بھی واجب ہوگا)۔

(۶) اولاد کا والدین کی زندگی میں ہی جائیداد کا مطالبہ کرنا:

انسان اپنی زندگی میں جو کچھ کماتا ہے وہ اسکی خالص ملکیت ہے اور مالک اپنی ملکیت میں تصرف کا مکمل حق رکھتا ہے، اور دوسرا کوئی مالک کی خوشدلی اور رضامندی کے بغیر اس کے مال میں تصرف کا حق نہیں رکھتا، لہذا والد کے کمائے ہوئے مال میں جب تک والد زندہ ہیں وہی مالک وخودمختار رہیں گے وہ اپنی خوشی وخودمختاری سے اولاد کو کچھ یا سب ھبہ کر کے مالک بنائے تو ان کی مرضی... ورنہ والد کے مال وجائیداد میں ان کی زندگی ہی میں کسی بھی اعتبار سے اولاد کو مطالبہ کرنے کی گنجائش نہیں، والد کی وفات کے بعد ان کی جائیداد میں بحیثیت وارث اور اولاد کا حق ثابت ہوتا ہے، چنانچہ ''باب وصیت'' میں والد کی حیثیت ملکیت پر روشنی ڈالتے ہوئے علامہ خطیب شربینیؒ بیان کرتے ہیں:

''وتصح ... لوارث في الأظهر إن أجاز باقي الورثة ولا عبرة بردهم ولا إجازتهم الوصية في حياة الموصي، إذ لا استحقاق لهم ولا للموصى له قبل موته'' (مغنى المحتاج ۳/ ۵۳)۔

(اور وارث کیلئے وصیت درست ہے جبکہ باقی ورثہ اجازت دیں اور ورثہ کے وصیت کی اجازت دینے یا اس سے انکار کرنے کا موصی کی زندگی میں کوئی اعتبار نہیں، کیونکہ ورثہ کو موصی کی وفات سے پہلے اس کے مال میں کسی قسم کا کوئی حق نہیں)۔

اسی باب میں ''رجوع عن الوصية'' میں کلام ہے:

''له أي الموصي الرجوع عن الوصية أي عن التبرع المتعلق بالموت بالإجماع كما حكاه الأستاذ أبومنصور، ولأنه عطية لم يزل عنها ملك معطيها فاشبهت الهبة'' (مغنى المحتاج ۳/ ۸۶)۔

(موصی کیلئے وصیت سے رجوع کرنا جائز ہے۔...... اس لئے کہ ایسا عطیہ ہے کہ اس سے دینے والے (مالک) کی ملکیت زائل نہیں ہوتا، جیسا کہ ھبہ میں ہے)۔

(۷) عمر دراز لوگوں کو ہاسٹلوں میں قیام پر مجبور کرنا:

اولاد پر والدین کے بڑے احسانات ہیں جن کی شکرگزاری اور ان کے ساتھ اطاعت واحسان کا طریقہ اختیار کرنے کی شریعت میں بڑی تاکید واہمیت وارد ہوئی ہے، اس حقیقت کو سمجھنے کے لئے ''سورۂ اسراء'' آیت (۲۳) ''وقضى ربك ألا تعبدوا إلا إياه وبالوالدين إحسانا الخ'' (سورہ اسراء: ۲۳) بہت ہی جامع وبلیغ ہے، نیز والدین اپنی اولاد کو بوڑھاپے کا سہارا، تنہائیوں کا مونس وغمخوار اور امیدوں کا مرجع سمجھتے ہیں، لہذا اولاد بچپن میں اپنی تربیت ونشونما کیلئے والدین کی محتاج ہوتی ہیں اسی طرح والدین بھی خصوصا بوڑھاپے کی عمر میں اپنی اولاد کی توجہات اور ان کی خدمت وسہارے کے محتاج ہوتے ہیں، ایسے وقت میں والدین کے دست وبازو بننا اور تن من دھن سے خدمت کر کے ان کی آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچانا سعادت عظمی، رضائے الہی اور بارگاہ ایزدی میں تقرب خاص کا باعث ہے Old age home... (ہاسٹلوں) میں اپنے سن رسیدہ بزرگوں کو ایسی جگہ رکھنے میں خوشی محسوس کرتی ہیں۔ کیا ان کے ساتھ ان کی اولاد کی طرف سے ایسے سلوک کو وہ گوارہ کریں گے اور وہ ایسے ہاسٹلوں میں رہنے کیلئے راضی وخوش ہونگے......؟ جب اولاد کو اپنے ساتھ ایسا سلوک پسند نہیں ہے تو انہیں رحمت دوعالم ﷺ کے فرمان کی روشنی میں اپنے فیصلہ پر غور کرنا چاہئے:

''فمن أحب أن يزحزح عن النار ويدخل الجنة فلتأته منيته وهو يؤمن بالله واليوم الآخر وليأت إلى الناس

الذی یحب أن یؤتی إلیہ'' (صحیح مسلم: باب وجوب الوفاء ببیعة الخلفاء الاول فالاول: ۱۸۴۴)۔

(جو شخص پسند کرتا ہو کہ اسے جہنم سے بچالیا جائے اور جنت میں داخل کیا جائے تو اللہ اور یوم آخر پر ایمان کی حالت میں اسے موت آنی چاہئے، اور لوگوں کے ساتھ ایسا سلوک کرے جس سلوک کو اپنے ساتھ کئے جانے کو پسند کرتا ہو)۔

اس حدیث کے تحت شارح مسلم امام نوویؒ بیان کرتے ہیں:

''یہ فرمان نبی کریم ﷺ کے جوامع الکلم میں سے ہے اور انوکھی حکمت ہے اور قاعدہ مہمہ کی حیثیت رکھتا ہے جس پر خصوصی توجہ مفید ہے وہ یہ کہ انسان دوسروں کے ساتھ ایسا برتاؤ وسلوک اختیار کرے جسے دوسروں کی طرف سے اپنے ساتھ کئے جانے کو پسند کرتا ہے'' (المنہاج شرح صحیح مسلم: ۱۲/۱۹۶، ط: دک ع بیروت)۔

مذکورہ وضاحت کی روشنی میں یہ امر واضح ہوتا ہے کہ اولاد پر اپنے والدین اور بزرگوں کی خدمت کو سعادت سمجھنا اور خوشدلی کے ساتھ اسے انجام دینا ضروری ہے، لہٰذا اولاد اپنے والدین کو ایسے ہاسٹلوں میں قیام پر مجبور نہیں کرسکتیں...... بلکہ یہ مجبور کرنا بڑی محرومی اور دارین کے خسران عظیم کا باعث ہے۔

☆ ایسے ہاسٹلوں کے قائم کرنے میں دنیوی واخروی مضرات پائے جاتے ہیں، اس لئے عام حالات میں ان کا قیام شرعاً درست نہیں...... البتہ بسا اوقات انسان کو کچھ ایسے عوارض لاحق ہوتے ہیں، کسب معاش اور گھریلو زندگی کے اعتبار سے توشوق خدمت کے باوجود خدمت کرنا ممکن نہیں ہوتا، بلکہ ایسے ہاسٹلوں میں داخل کرکے جسمانی ومادی خدمت کا موقع حاصل کرسکتا ہے، تو ایسی صورت میں والدین ہاسٹل میں رہنے پر راضی ہوں اور اولاد کے دل میں والدین کی تحقیر اور بوجھ کا شائبہ نہ ہو تو نہایت معذرت وندامت کے احساس اور ہر اعتبار سے ان کی دیکھ ریکھ اور خبر گیری کے جذبہ کے ساتھ ہاسٹل میں داخل کرنے کی گنجائش معلوم ہوتی ہے، اس لئے ایسی مجبوریوں کی تکمیل کیلئے ایسے ہاسٹلوں کا قیام ناپسندیدہ نہیں سمجھا جائے گا۔

(دیکھئے: (فتاوی الشبکة الاسلامیہ: حکم وضع الابن اباہ فی دار المسنین)، (مقالات موقع الالوکة، عقوق اخر زمن اٰھات واحزان)، (مکافاة الحاصرین لابائھم)۔ مأخوذ من المکتبة الشاملة) واللہ اعلم بالصواب

(۸) بے سہارا بوڑھوں کی اجتماعی کفالت کے لئے زکوۃ کی رقم استعمال کرنا:

جو لوگ بوڑھاپے کی عمر کو پہنچ گئے ہوں اور ان کی کفالت کے لئے اولاد یا ایسے رشتہ دار نہ ہوں جن پر شرعاً ان کا نفقہ واجب ہوتا ہے تو ایسے بے سہارا لوگوں کی کفالت اسلامی بیت المال پر عائد ہوتی ہے، جیسا کہ شیخ سلیمان جملؒ کا بیان ہے:

''وفی الروض وشرحہ فصل: لاتجب نفقة القریب ولو حرا علی رقیق ولو مکاتبا؛ لأنہ لیس أھلا للمواساة، بل نفقة الحر فی بیت المال، إلا أن یکون فی أصولہ أو فروعہ من تلزمہ نفقتہ'' (حاشیة الجمل ۷/۳۲۱)۔

(روض اور شرح الروض میں یہ فصل ہے، بلکہ آزاد کا نفقہ بیت المال میں واجب ہوگا، الا یہ کہ اس کے اصول یا فروع میں ایسا شخص ہو جس پر اسکا نفقہ لازم ہوتا ہو)۔

اسی طرح ڈکتور وھبہ زحیلی اس کی وضاحت میں تحریر فرماتے ہیں:

''إذا لم یکن للقریب المعسر أحد من الأقارب الموسرین کانت نفقتہ فی بیت المال ''خزینة الدولة'' ولا یطالب بتکفف الناس؛ لأن من وظائف بیت المال فی الإسلام أن یحتمل حاجة المحتاجین وینفق علیھم بقدر حاجاتھم'' (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۱۰/۴۳۷۰)۔

(جب کسی تنگ دست کا مالدار رشتہ داروں میں سے کوئی نہ ہو تو اس کا نفقہ بیت المال میں ہوگا، اور لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلانے (مانگنے) کا مکلف نہیں کیا جائیگا، اس لئے اسلامی بیت المال کی ذمہ داری ہے کہ محتاجوں کی حاجت روائی کرے اور انؐ پر ان کی ضرورتوں کے بقدر خرچ کرے)۔

ایسے ضرورتمندوں کی حاجت روائی کی ذمہ داری بیت المال پر عائد کرنا اس وقت ممکن ہے جبکہ ''بیت المال'' ہو اور اس کا نظام بھی درست ہو ......لیکن اگر بیت المال کا نظام ہی نہ ہو جیسا کہ خصوصا ہمارے ملک میں صورت حال ہے تو یقینا مذکورہ وضاحت پر عمل کرنا ممکن نہیں......ایسی صورت حال میں ایسے حضرات کے شخصی احوال پر غور کیا جائے تو وہ ''مصارف زکوۃ'' کے ''فقراء'' یا ''مساکین'' میں سے کسی ایک میں شامل ہو کر شرعا مستحق زکوۃ شمار ہو سکتے ہیں۔ لہذا جب ایسے لوگوں کے پاس خود ذاتی مال نہ ہو اور کوئی پرسان حال بھی نہ ہو تو مستحق زکوۃ مان کر ان کی اجتماعی کفالت کے لئے رقم زکوۃ استعمال کرنے میں حرج معلوم نہیں ہوتا، چنانچہ ''شارح المقدمہ الحضرمیۃ'' کا بیان ہے:

''الفقراء: جمع فقير وهو من لانفقة له واجبة ولا مال ولا كسب حلال يقع جميعها او مجموعها موقعا من كفايته مطعما وملبسا ومسكنا وغيرها مما لا بد منه على ما يليق به وبمونه ...والمساكن ...وهو من له ما يسد مسدا من حاجته بملك أو منفق أو كسب حلال على ما مر. ولا يكفيه الكفاية اللائقة بحاله مما مر'' (بشرى الكريم شرح المقدمة الحضرمية ۲۵/ ۵۲۴)۔

(۹) مطلوب مقررہ حد عمر کو نہ پہنچے ہوئے لوگوں کا حکومت کی خصوصی رعایتوں سے فائدہ اٹھانا:

جن لوگوں کے لئے جن شرائط کے ساتھ حکومت نے خصوصی رعایتیں رکھی ہیں، مطلوبہ شرائط جن لوگوں میں پائی جائیں وہی لوگ ان رعایتوں کے مستحق ہونگے اور ان کے لئے ان رعایتوں سے فائدہ اٹھانا جائز ہے.... البتہ جن لوگوں میں وہ شرائط موجود نہ ہوں مثلا جو لوگ مطلوب مقررہ حد عمر کو نہ پہنچے ہوں تو انھیں ان رعایتوں سے فائدہ اٹھانا شرعا جائز نہیں، کیونکہ یہ رعایتیں حکومت کی طرف سے تبرع اور عطیہ ہے، اور حکومت مطلوب مقررہ حد عمر کو پہنچنے والے افراد ہی کو دینا چاہتی ہے نہ کہ ان کے علاوہ کو..... چنانچہ علامہ ابن حجر مکی ''صدقہ تطوع'' میں اس کے مشابہ صورت پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں:

''ومن أعطى لوصف يظن به كفقر أو صلاح أو نسب بأن توفرت القرائن أنه إنما أعطى بهذا القصد أو صرح له المعطى بذلك وهو باطنا بخلافه حرم عليه الأخذ مطلقا ويجرى ذلك فى الهدية أيضا على الأوجه ومثلها سائر عقود التبرع فيما يظهر كهبة ووصية ووقف ونذر'' (تحفة المحتاج مع الحواشى ۸/ ۴۵۲)۔

(جو شخص کسی کو کسی خاص وصف کا گمان کرتے ہوئے کچھ دے مثلا محتاج یا نیکی یا نسب، اور قرائن اسی پر دال ہیں کہ دینے والا اسی قصد سے دے رہا ہے، یا دینے والا اس مقصد خاص کی صراحت کرے اور جس کو دیا جارہا ہے اس میں وہ مطلوب وصف خاص نہ پایا جارہا ہو تو اس شخص کو عطیہ لینا مطلقا حرام ہے، اور یہ ضابطہ ہدیہ اور اس کے مانند دیگر عقود تبرع یعنی ھبہ، وصیت، وقف اور نذر وغیرہ میں بھی جاری ہوگا)۔

نیز مقررہ حد عمر کو پہنچنے سے پہلے ہی کوئی مقررہ حد عمر کا سرٹیفکٹ بنائے اور اس کے ذریعہ رعایتیں حاصل کرے تو یہ صریح جھوٹ اور دھوکہ ہے اور جھوٹی شہادت کے مثل ہے جس کا حرام ہونا یقینی اور بالکل ظاہر ہے، لہذا اس طریقہ پر بھی وہ رعایتیں حاصل کرنا درست نہیں، کیونکہ جس چیز کا لینا حرام ہوتا ہے حرام طریقہ پر لینے والا شرعا اس کا حقیقی مالک نہیں بن سکتا، جب مالک نہیں بن سکتا تو اس سے فائدہ حاصل کرنا بھی جائز نہ ہوگا، چنانچہ علامہ ابن حجر مکی کا کلام ملاحظہ ہو:

''وحيث حرم الأخذ لم يملك ما أخذه؛ لأن مالكه لم يرض ببذله له'' (تحفة المحتاج مع الحواشى ۸/ ۴۵۳)۔

(اور جہاں لینا حرام ہوتا ہے وہاں وہ لینے والا اس چیز کا مالک نہیں ہوسکتا، اس لئے کہ اس چیز کا حقیقی مالک اس لینے والے کو اس چیز کے دینے پر راضی نہیں ہے)۔

☆☆☆

سن رسیدہ حضرات کا نفقہ وحقوق- شریعت کی روشنی میں

مولانا محمد قمر الزماں ندوی[1]

کسب معاش پر ادھیڑ والدین کو مجبور کرنا:

۱۔ اگر کوئی شخص بوڑھا نہ ہو لیکن بڑھاپے کی عمر کے قریب ہو گیا ہو اور اس کے کسی قدر مشقت کے بعد ہی کمانے کی صلاحیت ہو تو شریعت کی روشنی میں ایسے شخص کو اس کی اولاد یا اعزہ وا قارب جن کے ذمہ اس کا نفقہ واجب ہے، کسب معاش پر مجبور نہیں کر سکتے، صاحب درمختار لکھتے ہیں:

''ایسے لوگوں کی کفالت اولاد پر شرعاً واجب ہے، اگر ماں باپ کا معاملہ ہو تو گو ان کے اندر کمانے اور کسب معاش کرنے کی صلاحیت ہو پھر بھی ان کو اس پر مجبور نہیں کیا جا سکتا، بلکہ بال بچوں پر ان کی ضروریات کی تکمیل ضروری ہے دوسرے اقارب کا حکم ذرا مختلف ہے، اگر کوئی شخص بڑھاپے کی وجہ سے کسب معاش کی طاقت نہیں رکھتا اور لا ولد ہو تو قریب ترین رشتہ دار پر اس کی ضروریات پوری کرنا واجب ہے (درمختار د/ ۵۵۔ ۳۵۲)۔

ہاں اگر وہ اپنی اولاد کا ہاتھ خود اپنی مرضی سے بٹاتے ہیں اور اولاد کی طرف سے کسی طرح کا جبر واکراہ پائے بغیر ان کا تجارت، زراعت، صنعت وحرفت یا کسی اور پیشے میں ساتھ دیتے ہیں تو اس میں کوئی حرج اور مضائقہ نہیں، لیکن یہاں بھی اولاد کا فرض ہے کہ وہ ان کو ضرورت سے زیادہ مشقت برداشت کرنے نہ دیں بلکہ وہ ان کو منع کریں کہ بس حسب سہولت ہی آپ کاروبار، تجارت اور بزنس میں ہاتھ بٹائیں، یہ اولاد کی اخلاقی ذمہ داری ہے، کیونکہ اسلام نے مجبور اور بے بس افراد خصوصاً والدین پر کسی طرح کا معاشی بار نہیں رکھا اور کسب معاش کی الجھنوں اور جھمیلوں سے انہیں آزاد رکھا ہے، وہ تمام قرآنی آیات اور احادیث مبارکہ جن میں کمزوروں، بے سہاروں کے ساتھ حسن سلوک اور ان پر انفاق کی تلقین کی گئی ہے، اور ایسے لوگوں کا نفقہ ان کے ساتھ شامل کیا گیا ہے اور ان کے ذمہ رکھا گیا ہے، کتب فقہ میں نفقہ اقارب کے عنوان سے پوری تفصیلات بکھری پڑی ہیں، اور فقہاء عظام نے اس موضوع پر بڑی شرح وبسط کے ساتھ بحث کی ہے۔

حضرت قاضی شریعت مولانا مجاہد الاسلام صاحب قاسمیؒ کی ایک بصیرت افروز تحریر کا ایک حصہ نفقہ کی حکمت، مشروعیت، مصلحت اور ضرورت پر ملاحظہ کیجئے۔

اسلام کے قانونی نظام اور اس کی تعلیمات کا جائزہ لیا جائے تو مجموعی طور پر یہ تصور ابھرتا ہے کہ اسلام اس انفرادیت کو پسند نہیں کرتا جس میں فرد اپنے ذاتی مفادات کے لئے زندہ رہتا ہے، بلکہ اسلام ایسی اجتماعی زندگی پیدا کرنا چاہتا ہے جس میں ہر فرد پر دوسرے فرد کے تئیں کچھ فرائض اور حقوق عائد ہوتے ہوں، اور معاشرہ کا کوئی فرد بے سہارا اور لا وارث نہ رہے، بلکہ ہر ضرورت مند اور معاشرہ کا ہر وہ شخص جو خود اپنی کفالت کا اہل نہیں اور نہ اپنی روزی کما سکتا ہے اس کی ذمہ داری سماج کے کسی دوسرے فرد پر عائد کی گئی ہے، اور اگر شریعت کے قائم کردہ معیار کے مطابق کوئی شخص ایسا موجود نہیں ہو جس پر یہ ذمہ داری عائد کی جا سکتی ہو تو پھر ریاست (بیت المال) پر یہ ذمہ داری عائد ہوگی کہ اسلامی نقطہ نظر سے قائم فلاحی ریاست میں کوئی شخص بھوک سے نہیں مر سکتا اور نہ کسی کو بے سہارا اور لا وارث چھوڑا جا سکتا ہے (مباحث فقہیہ: ۲۰۰ از قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ)۔

اولاد پر والدین کا نفقہ قرآن وحدیث کی روشنی میں:

ذیل میں چند آیات قرآنی اور احادیث نبویہ پیش خدمت ہے جن پر غور وفکر کرنے سے والدین اور دیگر اہل قرابت کے حقوق کی اہمیت واشگاف ہوتی

---

[1] استاذ مدرسہ نور الاسلام کنڈہ پرتاب گڈھ یوپی، جنرل سکریٹری مولانا علاء الدین ایجوکیشنل سوسائٹی جھارکھنڈ۔

ہے۔

۱۔ "وقضی ربك ألا تعبدوا إلا إياه وبالوالدين إحسانا" (الاسراء: ۲۳)
(اور تیرے پروردگار کا یہ فیصلہ ہے کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو اور والدین کے ساتھ حسن سلوک کرو)۔

۲۔ "ووصينا الإنسان بوالديه إحسانا" (عنکبوت: ۸) (اور ہم نے انسان کو اس کے والدین کے ساتھ حسن سلوک کی وصیت کی)۔

۳۔ "وصاحبهما في الدنيا معروفا" (لقمان: ۱۵) (اور والدین کے ساتھ دنیا میں اچھا سلوک کرو)۔

حضرت جابر بن عبداللہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک شخص اپنے والد کے ساتھ حاضر ہوا اور عرض کیا:

يارسول الله! إن لي مالا وإن لي أبا وله مال وإن أبي يريد أن يأخذ مالي، فقال رسول الله ﷺ: أنت ومالك لأبيك (ابوداؤد كتاب البيوع باب في المؤجل يأكل من مال ولده، ۳۵۳۰، ابن ماجه كتاب التجارات باب ما للرجل من مال ولده: ۲۲۹۲، مسند احمد ۲/ ۲۱۴)۔

(یا رسول اللہ! میرے پاس مال ہے اور میرے والد کے پاس بھی مال ہے، پھر بھی میرے والد میرا مال لینا چاہتے ہیں، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم اور تمہارا مال تمہارے باپ کا ہے)۔

بعض روایات میں اولاد کو انسان کی کمائی قرار دیا گیا ہے:

''إن أطيب ما يأكل الرجل من كسبه وإن ولده من كسبه، فكلوا من كسب أولادكم إذا احتجتم إليه بالمعروف'' (ابوداؤد ۳/ ۸۰۱، حمص، ابن ماجه ۲/ ۷۶۹، ط: الحلبي)۔

(سب سے پاکیزہ رزق وہ ہے جو انسان اپنے ہاتھ کی کمائی سے کھائے اور اولاد بھی انسان کی کمائی ہے، پس ضرورت کے وقت اپنی اولاد کی کمائی کھاؤ معروف طریقہ پر)

والدین کے لئے اولاد کی ذمہ داریاں:

فقہاء نے پوری تفصیل کے ساتھ والدین کے لئے اولاد کی ذمہ داریوں کو واضح کیا ہے:

☆ اگر والدین ضرورت مند ہوں اور ان کے پاس مال نہ ہو تو اولاد پر ان کی کفالت واجب ہے، والدین کمانے پر قادر ہوں یا نہ ہوں اگر وہ نہیں کمارہے ہیں تو ان کو کمانے پر مجبور نہیں کیا جائے گا، بلکہ ان کو خرچ مہیا کرنا اولاد کی ذمہ داری ہے، بشرطیکہ اولاد صاحب استطاعت ہو یا کمانے پر قادر ہو اور کمائی میں اس کے اپنے اور بیوی بچوں کے اخراجات کے علاوہ گنجائش ہو (تبیین الحقائق ۳/ ۶۴، شامی ۲/ ۶۷۸)۔

☆ اگر ماں باپ کے پاس نابالغ یا معذور اولاد ہو جن کے اخراجات کا بوجھ بھی انہی کے سر ہو تو ماں باپ کے ساتھ ان کی چھوٹی اولاد کے اخراجات بھی حسب گنجائش کمانے والی اولاد پر واجب ہوگی (بدائع الصنائع کتاب النفقه سبب وجوب هذه النفقه ۳/ ۴۴۳، فتاوی ہندیہ نفقہ ذوی الارحام: ۱/ ۵۶۵ ط دیوبند)۔

☆ فقہاء نے یہ بھی لکھا ہے کہ اگر باپ کو نکاح کی ضرورت ہو اور بیٹے کے پاس اتنی استطاعت ہو تو باپ کی شادی کرانا بھی اس کی ذمہ داری ہے (فتاوی ہندیہ نفقہ ذوی الارحام ۱/ ۵۶۵ ط دیوبند)۔

☆ اگر اولاد باوجود استطاعت وسہولت کے والدین کے اخراجات سے انکار یا ٹال مٹول کرے تو والدین کو حق ہوگا کہ وہ ان کو بتائے بغیر اپنے خرچ کے بقدر مال لے لے، اگر وہاں قاضی ہو تو قاضی کے پاس اپنا معاملہ لے جائے (فتاوی ہندیہ نفقہ ذوی الارحام ۱/ ۵۶۷ ط دیوبند)۔

☆ یہی حکم جمہور فقہاء کے نزدیک اولاد کی اولاد کے لئے بھی ہے، یعنی اگر اپنی اولاد مر چکی ہو یا خود بہت محتاج اور معذور ہو تو احکام کی یہ تفصیلات اولاد کی اولاد پر بھی عائد ہوں گی اور یہ سلسلہ نیچے تک چلتا رہے گا (العنایہ علی الہدایہ ۴/ ۴۱۰، مغنی المحتاج ۳/ ۴۴۶)۔

☆ اسی طرح فقہاء نے یہ بھی واضح کیا ہے کہ والدین کی خدمت وکفالت کی ذمہ داری اولاد ذکور واناث دونوں پر برابر عائد ہوتی ہے، اگر اولاد میں کوئی زیادہ خوشحال ہے اور کوئی کم تب بھی واجبات کی ادائیگی میں فرق نہیں کیا جائے گا، شمس الائمہ سرخسی نے بعض مشائخ کا قول نقل کیا ہے کہ اولاد میں تھوڑے بہت فرق کا اعتبار نہیں ہے، لیکن بہت زیادہ فرق ہو تو فرق کا لحاظ رکھا جائے گا (فتاوی ہندیہ نفقۃ ذوی الارحام ۱/ ۵۶۴، ۵۶۵، ط: دیوبند)۔

سوال نمبر ۲: سن رسیدہ حضرات کا نفقہ وعلاج:

سن رسیدہ حضرات کا نفقہ وعلاج کن صورتوں میں واجب ہے، اس سوال کا جواب عرض کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ نفقہ کی تعریف، حکمت ومصلحت اور نفقہ کے شرائط وجوب نیز وجوب نفقہ کے اسباب پر قدر اختصار کے ساتھ روشنی ڈال دی جائے۔

نفقہ کی لغوی تعریف:

نفقہ یا تو ''نفوق'' سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہلاک ہونے کے ہیں، اس لئے جانور کے ہلاک ہونے کو ''نفقت الدابة نفوقًا'' کہتے ہیں، یا نَفاق (ن پر زبر) سے مشتق ہے، نفاق کے معنی مروج ہونے کے ہیں، اسی لئے جس سودے کا چلن ہوجائے اس کے لئے ''نفقت السلعة'' کی تعبیر استعمال ہوتی ہے۔ نفقہ کے اصطلاحی مفہوم کی اس کے لغوی معنی سے مطابقت اور قربت یہ ہے کہ انفاق میں مال ہلاک اور خرچ ہوجاتا ہے، اور حالات مناسب طور پر جاری رہتے ہیں، ''فإن بهاهلاک المال ورواج الحال''۔ علامہ شامیؒ نے زمخشری سے ایک اچھا نکتہ نقل کیا ہے کہ عربی زبان میں ہر وہ لفظ جس کا ابتدائی حرف (ف کلمہ) ''ن'' اور درمیانی حرف (عین کلمہ) ''ف'' ہو تو اس میں نکلنے اور جانے کے معنی پائے جاتے ہیں (قاموس الفقہ ۵/ ۲۰۳)۔

نفقہ کی اصطلاحی تعریف:

فقہاء نے نفقہ کی تعریف مختلف الفاظ میں کی ہے، بحوالہ فتح القدیر علامہ شامی نے ان الفاظ میں تعریف کی ہے:

''وفی الشرع: الإدرار علی شئی بما فیه بقاءه'' (یعنی کسی بھی چیز پر وہ کچھ خرچ کرنا جو اس کی بقا کے لئے ضروری ہو)۔

جبکہ بعض فقہاء نے کہا کہ نفقہ کھانا، کپڑا اور مکان جیسی وہ چیزیں ہیں جن پر کسی شئی کی بقا موقوف ہو۔

امام محمدؒ سے ان کے شاگرد ہشام نے نفقہ کے بارے میں پوچھا تو امام محمدؒ نے جواب دیا کہ نفقہ طعام، کسوہ اور سکنی ہے۔

(مباحث فقہیہ: ۲۰۴، از قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ)۔

وجوب نفقہ کے اسباب:

ایک شخص پر دوسرے شخص کا نفقہ، اور اس کی ضروریات کی کفالت، کب اور کیوں واجب ہوگی؟ اس سلسلہ میں فقہاء کا کہنا ہے کہ وجوب نفقہ کے اسباب تین ہیں، زوجیت، ملک اور قرابت (درمختار، المغنی)، یعنی رشتۂ زوجیت کی وجہ سے بیوی کا نفقہ اس کے شوہر پر، والدین کا نفقہ اولاد پر اور ایک رشتہ دار کا نفقہ دوسرے رشتہ دار پر واجب ہے، البتہ کون سا رشتہ اس باب میں معتبر ہے اور کون سا نہیں اس میں تفصیل ہے، جس کو یہاں ذکر کرنے کی چنداں ضرورت نہیں، کیونکہ وہ ایک مستقل باب ہے۔

زوجیت کی بنیاد پر نفقہ اور ملکیت کی بنا پر نفقہ اس پر بحث کی یہاں کوئی ضرورت نہیں ہے، کیوں کہ میرے سوالنامہ سے متعلق نہیں ہے۔ ہم صرف والدین اور اہل قرابت کے نفقہ کے وجوب سے اس موضوع پر بحث کریں گے۔

والدین اور اہل قرابت کے نفقہ کا وجوب:

قرآن کریم میں والدین کے ساتھ حسن سلوک، ان کی نگہداشت، رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک پر اتنا زور دیا گیا ہے اور حدیث رسول ﷺ میں اس پر اتنی تاکید کی گئی ہے جسے سامنے رکھنے کے بعد اس میں کوئی شک نہیں رہتا کہ والدین کا نفقہ اولاد پر اور اولاد کا نفقہ والدین پر، نیز محتاج قرابت داروں کا نفقہ، دوسرے خوشحال رشتہ داروں پر واجب ہے بعض ان آیات اور احادیث کا تذکرہ ماقبل کے سوال کے جواب میں آچکا

ہے، اس لئے اس کو دہرانے کی ضرورت نہیں۔

علامہ ابن قدامہ نے المغنی میں لکھا ہے تفصیل کی وجہ سے صرف ترجمہ پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

ابن المنذر نے نقل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ایسے والدین جو محتاج ہوں اور ان کے لئے کوئی ذریعہ آمدنی نہ ہو، اور نہ مال تو ان کا نفقہ اولاد کے مال میں واجب ہے، اور تمام وہ اہل علم جن کے اقوال محفوظ ہیں، اس پر متفق ہیں کہ آدمی پر ان کے نابالغ بچوں کا نفقہ واجب ہے جن کے پاس ذاتی مال نہ ہو (المغنی لابن قدامہ ۷ / ۵۸۳)۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی والدین اور سن رسیدہ حضرات کے نفقہ کے حوالہ سے لکھتے ہیں:

''قرابت کی وجہ سے جن لوگوں کا نفقہ واجب ہوتا ہے، ان میں والدین کا نفقہ واجب ہونے پر فی الجملہ فقہاء کا اجماع واتفاق ہے، کیونکہ اللہ تعالی نے والدین کے ساتھ حسن سلوک کا حکم فرمایا ہے، وبالوالدین إحسانا (الاسراء: ۲۳) اور والدین کی کفالت حسن سلوک میں داخل ہے۔ اسی طرح حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا سب سے پاکیزہ کھانا وہ ہے جو آدمی کی اپنی کمائی کا ہو اور تمہاری اولاد بھی تمہاری کمائی ہے۔ والدین کا نفقہ اس وقت واجب ہوتا ہے جب ان میں خود اپنی ضروریات مکمل کرنے کی صلاحیت نہ ہو، باپ اگر محتاج ہو اور کسب معاش کی صلاحیت رکھتا ہو لیکن نہ کماتا ہو جب بھی اس کا نفقہ بیٹے کے ذمہ واجب ہے، وہ اپنے باپ کو کمانے پر مجبور نہیں کرسکتا، یہ حنفیہ کی رائے ہے، حنابلہ وغیرہ کے نزدیک بشمول والدین اقارب کا نفقہ اسی وقت واجب ہوتا ہے کہ وہ کمانے کی صلاحیت بھی نہ رکھتا ہو (قاموس الفقہ ۵ / ۲۱۴)۔

نفقہ میں اصول کفایت کی رعایت:

والدین یا سن رسیدہ حضرات کا نفقہ جس میں کھانا پینا رہائش بھی شامل ہیں اور جس کی ادائیگی کے دو طریقے ہو سکتے ہیں۔

ایک طریقہ تمکین اور دوسرا تملیک، ان دونوں صورتوں میں جس کو اختیار کرلیا جائے نفقہ کی ادائیگی ہو جائے گی، لیکن بیوی اور والدین میں عموماً تمکین کی صورت پائی جاتی ہے اور یہی زیادہ بہتر ہے اور شریعت کی روح سے قریب بھی، بعض اوقات دوسرے رشتہ دار کو بھی ساتھ رکھنا پڑتا ہے اور ان کی ضروریات کی کفالت کرنی پڑتی ہے یہ صورت بھی تمکین اور اباحت کی ہے جو جائز ہے۔

والدین قریبی رشتہ داروں اور سن رسیدہ افراد کا نفقہ جس پر واجب ہوگا بقدر کفایت واجب ہوگا۔

مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ نفقہ میں اصول کفایت کی رعایت کے حوالے سے لکھتے ہیں:

یہ یاد رکھنا چاہئے کہ ایک کا نفقہ دوسرے پر واجب کیا جانا دراصل اس اجتماعی ضرورت (Social Need) کی تکمیل اور اس سماجی مسئلہ کا حل ہے جو وسائل معاش سے کسی فرد کی محرومی، یا اہل خاندان اور سماج کے کسی طبقہ کی خدمت میں مشغولیت کی وجہ سے اپنے لئے تلاش معاش کے مواقع مفقود ہونے کے باعث پیدا ہوتا ہے، ورنہ اصل یہ ہے کہ سماج کے ہر فرد کو اپنی ذمہ داری خود اٹھانی چاہئے، لیکن جب سماجی اور اجتماعی ضرورت کے پیش نظر بعض خاص حالات میں ایک شخص کی کفالت دوسرے شخص پر عائد کی جارہی ہے، تو ضروری ہے کہ اس کی رعایت کی جائے کہ یہ ذمہ داری ''ضرورت'' کی حد تک محدود ہے۔ لہذا اس پر سبھی فقہاء کا اتفاق ہے کہ نفقہ بیوی کا ہو، یا رشتہ داروں کا وہ بقدر کفایت واجب ہوگا، اور قدر کفایت سے مراد ہے ہر شہر، ملک، زمانہ اور معیار رہائش کے عرف کو سامنے رکھ کر اوسط معیار کا نفقہ جس میں نہ فضول خرچی ہو اور نہ بے جا تنگی جس میں ہر دو جانب کے حالات کی رعایت کی گئی ہو (مباحث فقہیہ/ ۲۰۸)۔

ان تفصیلات کے بعد ہم اصل مسئلہ کی طرف لوٹتے ہیں کہ سن رسیدہ حضرات کا نفقہ کسی پر اس وقت واجب ہوگا جب ان میں خود اپنی ضروریات پوری کرنے کی صلاحیت نہ ہو، باپ اگر محتاج ہو اور کسب معاش کی صلاحیت رکھتا ہو، لیکن کماتا نہ ہو جب بھی اس کا نفقہ بیٹے کے ذمہ واجب ہے وہ اپنے باپ کو کمانے پر مجبور نہیں کرسکتا، یہ حنفیہ کی رائے ہے، حنابلہ وغیرہ کے یہاں بشمول والدین اقارب کا نفقہ اس وقت واجب ہوتا ہے کہ ان کے اندر کمانے وغیرہ کی صلاحیت بالکل نہ ہو (المغنی ۸ / ۱۶۹)۔

سن رسیدہ حضرات کا نفقہ وعلاج ائمہ اربعہ کے یہاں:

بحیثیت مجموعی قرابت کی بنا پر نفقہ واجب ہونے کے سلسلہ میں ائمہ اربعہ کے یہاں اختلاف ہے، سب سے وسعت حنابلہ کے یہاں، پھر حنفیہ کے یہاں پھر شوافع کے یہاں اور آخری درجہ مالکیہ کا ہے، جس کی تفصیل کچھ اس طرح ہے کہ مالکیہ کے یہاں نفقہ صرف والدین بیٹے اور بیٹیوں کا واجب ہے، دادا، دادی، نانا، نانی یا پوتے نواسے وغیرہ کا واجب نہیں، شوافع کے نزدیک علاوہ والدین کے جو آبائی سلسلہ دادا، دادی، نانا، نانی اور اولاد ہی کے اولاد کے ذیلی سلسلہ پوتے نواسے وغیرہ کا نفقہ بھی واجب نہیں۔ حنفیہ کے نزدیک ان رشتہ داروں کے علاوہ بعض حالات میں دوسرے محرم رشتہ داروں کا نفقہ بھی واجب ہوا کرتا ہے۔ غیر محرم رشتہ داروں کا نفقہ واجب نہیں ہوتا، حنابلہ نے محرم ہونے کی بھی شرط نہیں رکھی بلکہ غیر محرم رشتہ داروں جیسے چچازاد بھائی وغیرہ کا نفقہ بھی بوقت ضرورت واجب قرار دیتے ہیں۔

والدین میں کن کا نفقہ مقدم ہے:

اگر کسی شخص کے ماں باپ دونوں ہوں اور اس کی معاشی پوزیشن اچھی نہ ہو تو اول تنگی کے ساتھ ہی اس میں دونوں کی کفالت کرنی چاہئے لیکن اگر ویسا ممکن نہ ہو تو نفقہ کے اعتبار سے ماں کا حق مقدم ہے، کیونکہ بظاہر ماں کے لئے کسب معاش دشوار ہے (درمختار ۲ / ۶۷۳)، اور اس کی تائید اس روایت سے بھی ہوتی ہے جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ ہمارے حسن سلوک کا سب سے زیادہ مستحق کون ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے جواب میں تین دفعہ ماں کا حق ماں کا اور چوتھی دفعہ باپ کا نام لیا، لیکن اگر باپ کسب معاش سے معذور ہو اور ماں کسب معاش کی صلاحیت رکھتی ہو تو باپ کا حق مقدم ہوگا، کیونکہ باپ ہی نے بچپن میں اس کی کفالت کا فریضہ سرانجام دیا ہے، اسی لئے بعض فقہاء نے مطلقاً باپ کو ماں پر مقدم رکھا ہے۔

قال بعضهم الأب أحق (رد المحتار ۲/ ۶۷۳، بحواله قاموس الفقه ۵/ ۲۱۴)۔

خلاصہ یہ کہ اگر والدین ضرورت مند ہوں یا وہ رشتہ دار جن کا نفقہ مجبوری کی صورت میں کسی پر واجب ہوجاتا ہے تو ان کی کفالت واجب ہے، والدین کمانے پر قادر ہوں یا نہ ہوں اگر وہ نہیں کما رہے ہیں تو ان کو کمانے پر مجبور نہیں کیا جائے گا، بلکہ ان کو خرچ مہیا کرنا اولاد کی ذمہ داری ہے، بشرطیکہ اولاد صاحب استطاعت ہو یا کمانے پر قادر ہو، اور کمائی میں اس کے اپنے اور بیوی بچوں کے اخراجات کے علاوہ گنجائش ہو (تبیین الحقائق ۳/ ۶۴، شامی ۲/ ۶۷۸)۔

سوال نمبر ۳: صاحب ثروت والدین کا اولاد سے رقم کا مطالبہ:

ایسے بوڑھے والدین یا خاندان کے وہ بزرگ اور سرپرست جن کا نفقہ ان کے خوردوں پر محتاجی اور مجبوری کی صورت میں واجب ہے۔ اگر ایسے افراد محتاج نہ ہوں بلکہ ان کے پاس دولت اور مال واسباب کی کمی نہ ہو تو وہ اپنی اولاد سے یا ان لوگوں سے جن پر بحالت حاجت نفقہ واجب ہوتا ہے، صرف محض زیادہ آسانی اور سہولت کے لئے، لوگوں پر خرچ کرنے کے لئے یا ضرورت کے لئے کچھ رقم مستقبل کے لئے محفوظ کرنے کے لئے زائد رقم کا مطالبہ کرنا احقر کی رائے میں شریعت کے مزاج کو دیکھتے ہوئے درست معلوم نہیں ہوتا۔ ایسے افراد کے اندر صبر اور قناعت ہونی چاہئے، دنیا کی حرص اور محض وقتی سہولت کے لئے اس طرح اپنی اولاد اور ماتحتوں سے زائد رقم کا مطالبہ اور اس پر مجبور کرنا کسی طرح بہتر نہیں ہے۔

البتہ اس نیت سے کہ وہ زائد رقم اکٹھا کر کے ان کو دیں تاکہ وہ اس رقم کو رفاہی، ملی اور دینی کاموں میں صرف کریں گے یا یتیموں اور بیواؤں ومحتاجوں کی کفالت کریں گے یا اقامت دین اور اشاعت دین کے کاموں میں صرف کریں گے تو پھر ایسی صورت میں وہ ترغیبی انداز اختیار کرتے ہوئے اس زائد رقم کا مطالبہ کرسکتے ہیں، لیکن یہ مطالبہ قانونی درجہ میں نہیں ہوگا بلکہ محض "تعاونوا علی البر والتقوی" (سورہ مائدہ: ۲) پر عمل کرنے کے لئے ہوگا، انسان رفاہی اور ملی کاموں کے لئے جب لوگوں سے رقم اکٹھا کرسکتا ہے تو ذوی القربی اور اپنے ماتحتوں سے اس طرح کا مطالبہ کرنے میں کیا حرج ہے۔

لیکن محض دنیاوی مفاد اور عیش وعشرت کے لئے زائد رقم کا مطالبہ مزاج شریعت کے خلاف ہے اور غیرت وخودداری بھی اس کی اجازت نہیں دیتی جن صورتوں میں کسی کا کسی پر نفقہ واجب ہوتا ہے وہاں بھی اصول کفایت کی رعایت ضروری ہے، جیسا کہ گذشتہ صفحات میں اس پر روشنی ڈالی

جا چکی ہے۔

سوال نمبر ۴: والدین اور بزرگوں کی جسمانی خدمت:

الف: کیا زیادہ آمدنی کے لئے لڑکوں کا اپنے والدین کو چھوڑ کر دوسری جگہ جانا جائز ہے؟

ب: کیا بہو کو مجبوری کی صورت میں ساس کی خدمت پر اور ان کے ساتھ رہنے پر مجبور کیا جاسکتا ہے؟ کیا ساس کی خدمت بہو کی ذمہ داری ہے؟

ج: والدین کی خدمت صرف بیٹوں پر ضروری ہے یا بیٹیوں پر بھی؟

ان تمام سوالات کے جوابات شریعت کی روشنی میں نمبر وار درج کئے جاتے ہیں:

الف: زیادہ آمدنی کے لئے اولاد کا دور دراز سفر کرنا:

اگر بیٹا مجبور و بے بس اور جسمانی خدمت کے محتاج والدین کو چھوڑ کر محض زیادہ پیسہ کمانے اور معیار زندگی کو بلند کرنے کے شوق میں دور دراز کا سفر کرتا ہے، جبکہ ایسا کرنے سے والدین کی دشواریاں بڑھ جاتی ہیں تو ایسی صورت میں والدین اور بزرگوں کو چھوڑ کر دور دراز علاقوں کا یا دوسرے ملکوں کا سفر کرنا از روئے شریعت جائز نہیں ہوگا، کیونکہ یہ چیز مزاج شریعت کے خلاف ہے۔

والدین ساری زندگی بچوں کی خدمت کرتے ہیں اور کفالت بھی اور بڑھاپے میں انہیں خدمت و کفالت کی ضرورت ہوتی ہے، ایسے وقت میں شریعت اسلامیہ والدین کی خدمت و کفالت کی ذمہ داری اولاد پر عائد کرتی ہے۔

قرآن مجید کے بعض ان آیات اور احادیث کا تذکرہ تمہید میں آچکا ہے جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ والدین کی خدمت اولاد کی ذمہ داری ہے۔

البتہ اگر اولاد کے لئے وطن اور علاقہ میں کسب معاش اور روزی روٹی کے حصول کی کوئی صورت نہ ہو اور گاؤں اور گھر میں بیٹھے رہنے سے خود کا معاشی مسئلہ اور والدین کی کفالت کا مسئلہ حل نہ ہو رہا ہو تو ایسی صورت میں والدین کی مرضی اور اجازت سے اس کا دور دراز کسب معاش کے لئے مجبوری کی صورت میں سفر کرنا جائز ہوگا، اور اس کی بہتر شکل یہ ہوگی کہ اگر وہ کئی بھائی ہیں تو ترتیب اس طرح بنالے کہ کوئی گھر پر ضرور رہے اور اس کے لئے باری اور ترتیب بنالے اور اگر خلیجی ملکوں میں ہے تو کفیل سے صورت مسئلہ بتا کر اپنی چھٹی اس موقع پر حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ اور آکر والدین کی خدمت کرے اور اگر وہ اکیلا ہے اور تنہا ہے تو اپنی اولاد کو اور شریک حیات کو خدمت کی ترغیب دے اور اس کا مزاج بنائے کہ وہ ان کی غیر موجودگی میں ان کے والدین کی خدمت کریں۔ یا پھر ماں کے لئے خادمہ اور والد کے لئے خادم کا انتظام کرے فقہاء نے کتب فقہ میں اس کی صراحت کی ہے۔

ایک حدیث سے استدلال:

ایک صحابیؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جہاد کی اجازت چاہی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا، تمہارے والدین ہیں؟ اس نے جواب دیا: ہاں، ارشاد ہوا، انہیں میں جہاد کرو (صحیح بخاری ۱/ ۸۸۳)۔

یعنی والدین کی خدمت کرو، اس لئے فقہاء نے لکھا ہے کہ ماں باپ کی اجازت سے ہی جہاد کے لئے جاسکتا ہے، گویا جہاد جیسی عبادت پر ماں باپ کی خدمت مقدم ہے۔

اصح الکتب بعد کتاب اللہ بخاری شریف جس کے بارے میں کہا جاتا ہے، فقہ البخاری فی تراجمہ" امام بخاریؒ نے اس حدیث کے لئے جو باب باندھا ہے اس پر غور کرنے سے بھی اس مسئلہ کی وضاحت ہوجاتی ہے، وہ عنوان ہے "باب لا یجاھد إلا باذن الأبوین"۔

لیکن یہاں یہ بات یاد رہے اس حدیث اور اس قسم کی تمام احادیث کے بارے میں یہی کہا جائے گا کہ ان کا تعلق اس صورت سے ہے جب ماں باپ خدمت کے سخت محتاج ہوں اور کوئی دوسرا ان کی خبر گیری کرنے والا نہ ہو اور اس وجہ سے وہ اجازت بھی نہ دیں تو پھر بلاشبہ ان کی خدمت اور

خبر گیری ہجرت اور جہاد سے مقدم ہے۔ اس حدیث سے یہ نتیجہ نکالنا قطعاً غلط ہوگا جس کسی کے والدین حیات سے ہوں وہ جہاد اور دین کی خدمت کے لئے بھی گھر سے باہر نہ نکلے، اور صرف وہی لوگ جہاد میں اور دین کی خدمت میں لگیں جن کے ماں باپ نہ ہوں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جو صحابہ جہاد کرتے تھے، ان میں بڑی تعداد ان ہی کی ہوتی تھی جن کے ماں باپ زندہ ہوتے تھے (مستفاد معارف القرآن ۶ / ۴۸۲)۔

الغرض والدین اگر خدمت کے محتاج ہوں اور خدمت کرنے والا کوئی اور محرم نہ ہو تو ایسی صورت میں کسب معاش کے دور دراز کا سفر کرنا جائز نہ ہوگا، اور یہی حکم جماعت اور چلہ وغیرہ میں نکلنے کا ہوگا، اس بارے میں بھی عموماً کوتاہی ہورہی کہ والدین خدمت کے محتاج ہوں اور اولاد جماعت میں ہوں۔

ب: کیا سسر اور خوش دامن کی خدمت بہو پر واجب ہے؟

بہو کو سسر اور خوش دامن کے ساتھ رہنے پر مجبور کرنا از روئے شریعت درست نہیں ہے، اگر بیوی علاحدہ رہنا چاہتی ہے اور مشترکہ خاندان میں ساس اور سسر کے ساتھ رہنے پر آمادہ نہ ہو تو شوہر پر واجب ہے کہ بیوی کو علاحدہ مکان میں ٹھہرائے جہاں اس کے گھر والوں میں سے کوئی نہ ہو مگر یہ کہ عورت ساتھ رہنے کو خود ہی تیار ہو، مالکیہ کے نزدیک اس کی اجازت ہے کہ عورت شوہر کے رشتہ داروں کے ساتھ ایک گھر میں رہنے سے انکار کرسکتی ہے، اس سلسلہ میں فقہاء کے یہاں بہت سی اور تفصیلات ہیں کہ کن صورتوں میں عورت علاحدہ رہنے کا مطالبہ کرسکتی ہے اور کب نہیں طوالت کے خوف سے ان تمام اقتباسات کو حذف کیا جارہا ہے۔

جہاں تک بہو کے لئے ساس اور سسر کی خدمت کا مسئلہ ہے تو اس کی تفصیلات کچھ اس طرح ہیں:

والدین کی خدمت وکفالت کی مکمل ذمہ داری اولاد کے سر ہے خواہ وہ اولاد ذکور ہوں یا اناث بہو کے اوپر "المعروف کالمشروط" کے اصول پر محض اخلاقی طور پر یہ ذمہ داری آتی ہے، اگر وہ کسی وجہ سے انکار کردے تو اس کو قانوناً مجبور نہیں کیا جاسکتا۔

مولانا مفتی تقی عثمانی لکھتے ہیں:

ایک بات اور سمجھ لینی چاہئے کہ جس میں بڑی کوتاہی ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ جب عورت کے ذمہ شوہر اور اس کی اولاد کا کھانا پکانا واجب نہیں ہے تو شوہر کے جو ماں باپ اور بھائی بہن ہیں انکی خدمت کرنا بطریق اولی واجب نہیں ہوگا، اگر والدین کو خدمت کی ضرورت ہے اور کفالت کی تو اس کی ذمہ دار لڑکا ہے، البتہ اس کے لڑکے کی بیوی کی سعادت مندی ہے کہ وہ اپنے شوہر کے والدین کی خدمت کرے اور خوش دلی سے تو یہ سعادت مندی ہوگی، اور باعث اجر سمجھ کر انجام دے، اور لڑکے کو بھی یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اپنی بیوی کو اپنے والدین کی خدمت پر مجبور کرے، اور یہ خدمت انجام دے رہی ہے تو اس کا حسن سلوک اور حسن اخلاق ہے، اور اس کی یہ خدمت اس کے ذمہ فرض نہیں ہے، لہذا ان کو چاہئے کہ وہ اپنی بیوی کی قدر کرے، اور اس کا بدلہ دینے کی کوشش کرے (اصلاحی خطبات / محمود الفتاوی)۔

حضرت مولانا عبدالرحیم صاحب لاجپوریؒ اس طرح کے ایک سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

''شوہر کی والدہ اور اس کے بھائی بہن کے لئے کھانے کا انتظام کرنا عورت پر شرعاً لازم وضروری نہیں ہے، البتہ اگر عورت اپنی ساس کی ضعیفی اور کمزوری کی وجہ سے ان کی خدمت کرے اور ان کے لئے کھانا پکائے تو یہ اس کے لئے سعادت مندی ہوگی اور یہ خدمت انشاء اللہ! اس کے لئے باعث اجر وثواب ہوگی (فتاوی رحیمیہ ۸ / ۴۵۷)۔

مذکورہ اقتباسات کی روشنی میں یہ صاف ہوگیا کہ قانونی طور پر بیوی اپنے شوہر کے والدین اور اعزہ واقارب کی خدمت کی مکلف نہیں ہے۔

قانونی طور سے جس شخص کی وہ بیوی ہے وہ بھی اسے اپنی خدمت کے لئے مجبور نہیں کرسکتا، فقہاء کرام نے اس ذیل میں ایک دلچسپ جزئیہ لکھا ہے:

''ولو جاء الزوج بطعام يحتاج إلى الطبخ والخبز فأبت المرأة الطبخ والخبز. يعنى بأن تطبخ وتخبز لما روى أن رسول الله ﷺ قسم الأعمال بين على وفاطمة فجعل أعمال الخارج على على وأعمال الداخل على فاطمة، ولكنها لاتجبر

علی ذلك إن أبت، ویؤمر الزوج أن یأتی لها بطعام مهیأ'' (بدائع الصنائع کتاب النفقہ ۴/ ۴۳۰ شامی کتاب الطلاق ۵/ ۲۲۱)۔

(اگر شوہر ایسا کھانا لے کر آئے جس کو پکانے یا روٹی بنانے کی ضرورت ہو اور عورت پکانے سے انکار کرے جیسا کہ روایت میں آتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے گھر کے کام کو حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ کے درمیان تقسیم کر دیا تھا، حضرت علیؓ کے ذمہ باہر کا کام اور حضرت فاطمہؓ کے ذمہ اندر کا کام مقرر فرما دیا تھا، لیکن اگر عورت انکار کر دے تو اس کو مجبور نہیں کیا جا سکتا اور شوہر سے کہا جائے گا کہ وہ بیوی کے لئے بنا بنایا اور تیار شدہ کھانا لے کر آئے)۔

ظاہر ہے کہ جب بیوی کو شوہر کے کھانا بنانے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا تو پھر شوہر کے والدین کی خدمت کے لئے اس کو مجبور کیسے کیا جا سکتا ہے؟ یہ سارا معاملہ اخلاقی بنیادوں پر ہے، جیسے حضور ﷺ نے حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ کے درمیان اخلاقی بنیادوں پر کاموں کی تقسیم فرما دی تھی، اسی بنا پر ''المعروف کالمشروط'' کے اصول پر ساس سسر کی خدمت و دیکھ بھال کا بار بہو پر ڈالا جا سکتا ہے، اور اس سے کہا جا سکتا ہے کہ جس طرح تمہارا شوہر تمہارے ماں باپ کا خیال رکھتا ہے تم کو بھی اس کے ماں باپ کا خیال رکھنا چاہئے، بہت سے کام جو قانون کے بل پر نہیں ہو سکتے، اخلاقی قوت کے ذریعہ ہو جاتے ہیں، خصوصاً گھریلو اخلاقیات جو عرف میں رائج ہیں، ان کی نزاکت کا لحاظ تو ہر ایک کو رکھنا چاہئے، آخر ایک نہ ایک دن ہر ایک کو اس دور اور مرحلے سے گزرنا ہے۔

علامہ حصکفی نے میاں بیوی کے مسائل کے ذیل میں کثرت مہر کو جہیز سے جوڑتے ہوئے لکھا ہے۔

''وعلیه فلو زفت به إلیه لایحرم علیه الانتفاء به، وفی عرفنا یلتزمون کثرة المعسر لکثرة الجهاز وقلته لقلته، ولا شك أن المعروف کالمشروط، فینبغی العمل بما مر، کذا فی النهر'' (درمختار علی رد المحتار کتاب الطلاق ۵/ ۲۲۸)۔

(عورت جو سامان جہیز لے کر آتی ہے اس سے شوہر کا استفادہ کرنا جائز ہے، اس لئے کہ ہمارے عرف میں جن عورتوں کا مہر زیادہ ہوتا ہے وہ زیادہ سامان جہیز لے کر آتی ہیں اور کوئی شبہ نہیں کہ معروف مشروط کے طرح ہوتا ہے اس لئے اس پر عمل ہونا چاہئے)۔

خاکسار کی رائے میں ساس اور سسر کی خدمت بہو پر اس وقت دیانۃً واجب ہونی چاہئے جب کوئی اور خدمت کرنے والا میسر نہ ہو، اور واقعی وہ خدمت کے محتاج ہوں، کیونکہ اس کے شوہر پر والدین کی خدمت واجب ہے، اور اس کا شوہر اس کے اور اس کے بچوں کی ضروریات کی تکمیل میں مشغول ہے، اس لئے وہ اپنے والدین کی خدمت کرنے سے قاصر ہے، حالانکہ جب والدین خدمت کے محتاج ہوں تو اولاد پر ان کی خدمت واجب ہے، خواہ وہ خود خدمت کرے یا کسی اور کے ذریعہ خدمت کرائے گویا اجرت دے کر ہو۔

علامہ علاء الدین ابوبکر کاسانی لکھتے ہیں:

''ولا تجب علی الابن نفقة منکوحة أبیه؛ لأنها أجنبیة عنه، إلا أن یکون الأب محتاجا إلی من یخدمه، فحینئذ یجب علیه نفقة امرأته، لأنه یؤمر بخدمة الأب بنفسه أو بالأجیر'' (بدائع الصنائع ۴/ ۴۴۳)۔

(بیٹا پر سوتیلی ماں کا نفقہ واجب نہیں ہے، اس لئے کہ وہ اس کے حق میں اجنبی عورت ہے، ہاں جبکہ باپ خدمت کا محتاج ہو اور وہ ان کی خدمت میں مشغول ہو تو اس وقت اس سوتیلی ماں کا نفقہ اس پر واجب ہے، کیونکہ بیٹا کو باپ کی خدمت کرنے کا حکم ہے، چاہے وہ بذات خود خدمت کرے یا کسی کو خادم رکھ کر خدمت کرے)۔

میں اپنے اس موقف کی تائید کے لئے فقیہ عصر حضرت الاستاذ مولانا خالد سیف اللہ رحمانی مدظلہ العالی کا ایک فتویٰ نقل کرنا مناسب خیال کرتا ہوں تا کہ احقر کے موقف کی مزید تائید ہو جائے۔

ایک استفتاء کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

''شوہر کے والدین کی خدمت عورت پر اس وقت دیانۃً واجب ہوگی جب کوئی اور خدمت کرنے والا میسر نہ ہو، اگر کوئی دوسرا خدمت کرنے والا میسر ہو، تب عورت کو چاہئے کہ اپنے ساس سسر کی خدمت سے دامن نہ کھینچے، کہ یہ اس کا اپنے شوہر کے ساتھ تعاون ہے، کیونکہ اصل میں والدین کی خدمت اس کے شوہر پر واجب ہے، اور شوہر اپنی بیوی اور اس کے بچوں کی ضروریات کے لئے مشغول ہے، تو اخلاق و دیانت کا تقاضا ہے کہ وہ اس فریضہ کی ادائیگی میں شوہر کی مدد کرے'' (کتاب الفتاوی ۴/ ۴۰۹۔ ۴۱۰)۔

(ج): ماں باپ کی خدمت کن پر واجب ہے؟

والدین کی خدمت نیز ان کی کفالت کی ذمہ داری ازروئے شریعت اولاد ذکور واناث دونوں پر برابر عائد ہوتی ہے۔

علامہ شامی نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ اگر والدین چلنے پھرنے سے معذور ہو جائیں اور ان کی خدمت اور دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہ ہو اور ایک بیٹی ہے جو شادی شدہ ہے اور اپنی سسرال میں رہتی ہے تو اس شادی شدہ بیٹی کی ذمہ داری ہے کہ وہ باپ کے گھر آکر ان کی خدمت کرے اور دیکھ بھال کا فریضہ انجام دے، اگر شوہر اس کے لئے راضی نہ ہو تب بھی والدین کو اس بے بسی کی حالت میں تنہا نہ چھوڑے، ایسے موقع پر ماں باپ کا حق مقدم ہے، زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ شوہر اس کا نفقہ بند کردے گا مگر نفقہ کی لالچ میں والدین کی خدمت نہ چھوڑے۔

''ولو أبوها ... زمنًا مثلًا فاحتاجها، فعليها تعاهده ولو كافرًا. وإن أبى الزوج فتح (فتح القدير/ درمختار) أي مريضا مرضًا طويلًا ... وهٰذا إذا لم يكن من يقوم عليه ... لأن ذلك من المصاحبة بالمعروف بها ... لرجحان حق الوالد وهل لها النفقة الظاهر لا. وإن كانت خرجت من بيته بحق كما لو خرجت لفرض الحج'' (رد المحتار باب الطلاق ۵/ ۲۵۷/ ۲۵۸)۔

اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ والدین کی خدمت کی ذمہ داری (لڑکی اور لڑکے) دونوں پر ہے، علامہ ابن حزم نے ''المحلی'' میں لکھا ہے کہ والدین کی خدمت کی ذمہ داری شوہر کے حق سے مقدم ہے۔

الغرض والدین بوڑھے، معذور و بیمار ہوں تو ان کی خدمت و نگہداشت علاج ومعالجہ کے اخراجات و دیگر ضروریات وحاجات کی ذمہ داری اولاد پر ہے اور یہ ذمہ داری لڑکے اور لڑکی دونوں پر واجب وضروری ہے۔

قرآن وحدیث میں جہاں جہاں والدین کی خدمت، ان کے ساتھ حسن سلوک، ان کی ضروریات کی کفالت اور ان کے نفقہ کا تذکرہ کیا گیا ہے وہاں ولد اور اولاد کا لفظ آیا ہے اور عربی زبان میں لفظ ولد لڑکی اور لڑکے دونوں کے لئے بولا جاتا ہے۔

لیکن لڑکی عموماً شادی کے بعد سسرال چلی جاتی ہے اور اکثر میکے اور سسرال میں فاصلہ اور دوری رہتی ہے، اس کے لئے والدین کی خدمت دشوار ہوتی ہے، لڑکے کے لئے اس طرح کی پریشانی نہیں ہوتی ہے، اس لئے اگر لڑکی والدین سے دور ہوں اور ان کے لئے روزانہ خدمت ممکن ہی نہ ہو تو ایسی صورت میں والدین کی خدمت کی ذمہ داری لڑکوں پر آجائے گی اور لڑکیاں جب اپنے والدین کے یہاں آئیں گی تو وہ ان کی خدمت کریں گی۔

مولانا تقی عثمانی مدظلہ العالی تحریر فرماتے ہیں:

''لڑکیاں جب تک گھر میں رہتی ہیں تو ان پر بھی والدین کی خدمت ونگہداشت واجب ہیں لیکن وہ اپنی شادی کر کے سسرال چلی جاتی ہیں تو بیٹوں پر خدمت واجب ہو جاتا ہے'' (محمود الفتاوی)۔

لیکن بعض خدمتیں ایسی ہوتی ہیں جسے صرف عورت ہی انجام دے سکتی ہے، تو اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ لڑکا اس سے کس طرح عہدہ برآ ہو سکتا ہے، کیا وہ اس خدمت کے لئے اپنی بیوی کو مامور کر سکتا ہے؟ یعنی بہو کی ذمہ داری اس سلسلہ میں کیا ہے؟ جبکہ بیٹی اپنے سسرال میں ہے۔ صورت مسئلہ میں بیٹے کی ذمہ داری ہے کہ والدہ کے لئے اور والد کے لئے خود خدمت انجام دیں، یا ان کے لئے خادمہ اور خادم کا انتظام کریں، یا اخلاقی طور پر اپنی بیوی کو اس کے لئے آمادہ کریں اور اس کو عند اللہ اس کا اجر کیا ہوگا سمجھائیں نیز رشتہ صہریت کی حقیقت واہمیت سے آگاہ کریں۔

الغرض والدین کی کفالت وخدمت بیٹے اور بیٹیوں سب پر ہے۔

''يجب على الولد الموسر كبيرًا كان أو صغيرًا ذكرا وأنثى نفقة والديه وأجداده وجداته الفقراء ... ولا يشارك الولد الموسر أحد في نفقة أصوله المحتاجين'' (مجموعة قدوری باشا دفعہ ۴۰۸)۔

یہاں یہ بات بھی یاد رہے کہ اولاد کو ماں باپ کی خدمت آخری حد تک کرنی چاہئے، چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے ایک شخص کو اپنی ماں کو اپنی پشت پر لے کر طواف کرتے ہوئے دیکھا، تو اس شخص نے پوچھا، اے ابن عمر! آپ کی کیا رائے ہے، میں نے ان کے حق کا بدلہ دے دیا، تو حضرت

ابن عمرؓ نے ایک ہی سانس میں دو مرتبہ نہیں فرمایا (الادب المفرد، حدیث نمبر: ۱۱)۔

شوہر کا بیوی کو والدین کی خدمت سے روکنا کیسا ہے؟

اگر والدین کی خدمت کرنے والا گھر میں موجود ہو یعنی دیگر نرینہ اولاد نیز کنواری بہنیں گھر میں موجود ہیں تو ایسی صورت میں شوہر کا بیوی کو والدین کی خدمت سے روکنا از روئے فتوی مباح قرار دیا جاسکتا ہے، لیکن از روئے تقوی، شرافت اور اخلاق یہ عمل کسی طرح پسندیدہ قرار نہیں دیا جاسکتا۔ شوہر کو چاہئے کہ وقفے وقفے سے بیوی کو والدین کی خدمت کی اجازت دیا کرے بلکہ وہ اپنی شریک حیات کو وہاں کچھ دن ٹھہرنے دے تا کہ وہ (بیوی) اپنے والدین کی خدمت کر سکے، یہ مسئلہ تو اس وقت ہے جبکہ شوہر کی اقامت اور رہائش اپنی بیوی کے میکے سے دور ہو اگر شہر اور محلہ ایک ہے اور لڑکی روزانہ اپنے شوہر کی تمام ضروریات اور خدمات سے فارغ ہو کر اپنے والدین کی خدمت کے لئے تھوڑی دیر آنا چاہتی ہیں تو اس صورت میں شوہر کو روکنے اور منع کرنے کا حق نہ ہوگا۔ اور خدمت سے روکنا اور منع کرنا معصیت اور گناہ کا سبب ہوگا، کیونکہ شوہر کا یہ عمل اخلاق وانسانیت عقل وشریعت اور تہذیب ومروت کے خلاف ہے، قرآن کریم اور احادیث نبویہ میں جو اخلاقی اور انسانی تعلیم دی گئی ہے اس کے خلاف ہے۔

علامہ ابن حزم کے اس اقتباس سے ہمارے اس موقف اور رائے کی زبردست تائید ہوتی ہے جہاں وہ لکھتے ہیں کہ والدین کی خدمت شوہر کے حق سے مقدم ہے۔

اور علامہ شامی فرماتے ہیں: ''ولا يمنعها من الخروج إلى الوالدين في كل جمعة إن لم يقدرا على إتيانها على ما اختاره في الاختيار ولو الدها زمنا مثله فاختاره بها فعليها تعاهد ولو كافرا وإن أبى الزوج'' (وقوله فعليها تعاهده) أي بقدر احتياجه إليها، وهذا إن لم يكن له من يقوم عليه (الدر المختار ۵/ ۲۲۴، رد المحتار ۵/ ۲۲۴)۔

علامہ شامی دوسری جگہ تحریر فرماتے ہیں کہ اگر والدین چلنے پھرنے سے معذور ہوں، اور ان کی خدمت کرنے والا اور دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہ ہو، اور ایک بیٹی ہے جو شادی شدہ ہے اور اپنی سسرال میں رہتی ہے تو اس شادی شدہ بیٹی کی ذمہ داری ہے کہ وہ باپ کے گھر آ کر ان کی خدمت اور دیکھ بھال کا فریضہ ادا کرے، اگر شوہر اس کے لئے راضی نہ ہو تب بھی والدین کو اس بے بسی کی حالت میں تنہا نہ چھوڑے، ایسے موقع پر ماں باپ کا حق مقدم ہے، زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ شوہر اس کا نفقہ بند کر دے گا، مگر نفقہ کی لالچ میں والدین کی خدمت نہ چھوڑے:

ولو أبوها ... زمنًا فاحتاجها ... الخ (رد المحتار كتاب الطلاق ۵/ ۲۵۷)۔

خلاصہ یہ ہے اگر والدین خدمت کے محتاج ہوں اور ان کا کوئی دوسرا خدمت کرنے والا نہ ہو تو ایسی صورت میں شوہر کا بیوی کو والدین کی خدمت سے روکنا اور منع کرنا از روئے شریعت جائز نہیں ہے، فقہاء کرام نے یہ صراحت کی ہے کہ شادی شدہ لڑکی پر ایسے والدین کی خدمت واجب ہے، وہ ہفتہ میں ایک مرتبہ کم از کم جا کر ان کی خدمت کرے گی، شوہر اس کو منع نہیں کر سکتا ہے، اگر وہ منع کرے تو بھی جا سکتی ہے۔

سوال نمبر (۵): والد کے عقد ثانی میں اولاد کی رکاوٹ اور حکم شریعت:

یہ حقیقت ہے کہ اس ملک میں رہتے ہوئے ہم نے برادران وطن سے زندگی کے دوسرے شعبوں میں اور سماجی رسوم وروایات میں ہندو معاشرت کا اثر قبول کیا ہے، ان سماجی اور معاشرتی رسوم وروایات میں عقد ثانی، یعنی دوسری شادی کو معیوب سمجھا ہے برصغیر میں انسان اگر اپنی پہلی بیوی کے انتقال کے بعد دوسری شادی کرنا چاہتا ہے تو سماج اور معاشرہ کے ڈر سے پہلے تو وہ اس کی ہمت ہی نہیں جٹا پاتا اگر سماج اور معاشرہ کے خوف بے جا سے اگر وہ اپنے کو نکال بھی لیتا ہے تو دوسری شادی میں اولاد رکاوٹ بنتے ہیں بلکہ جان سے مارنے کی دھمکی دیتے ہیں، راقم السطور نے گاؤں اور اطراف میں کتنے ایسے ادھیڑ کو دیکھا کہ وہ بیوی کے انتقال کے بعد دوسری شادی کرنا چاہتے ہیں مگر اولاد کی مخالفت اور دھمکی کی وجہ سے وہ شادی نہیں کر سکے اور یاس وحسرت اور ناامیدی لے کر پیوند خاک ہو گئے اور یہ کہہ کر دنیا سے رخصت ہوئے کہ ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پر دم نکلے،
بہت نکلے میرے ارماں پھر بھی کم نکلے۔

یہ حقیقت ہے کہ بیوی کی ضرورت انسان کو جس طرح جوانی میں رہتی ہے اس سے کم ضرورت بڑھاپے میں نہیں رہتی ہے بلکہ خدمت کے حوالے سے اس زمانہ میں اور عمر کے اس مرحلے میں کچھ زیادہ ہی انسان بیوی کا محتاج ہوتا ہے، تا کہ اس عمر کے سرد وگرم کو سہنا اور تنہائی اور بڑھاپے کے غم کو

سہنا اس کے لئے آسان ہوجائے۔

لیکن ہندوستانی معاشرہ میں عام طور پر بیٹے اور بیٹیاں اپنی والدہ کے فوت ہونے کے بعد والد کے دوسرے نکاح میں رکاوٹ بنتے ہیں، از روئے شرع اولاد کا والد کے عقد ثانی میں رکاوٹ بننا درست نہیں ہے یہ عام حالت کی بات ہے اور نارمل صورت کا مسئلہ ہے، لیکن اگر والد کو یہ خطرہ ہے کہ اگر وہ دوسری شادی نہیں کریں گے تو گناہ بدنظری اور برائی میں ملوث ہوجائیں گے تو ایسی صورت میں ان کے لئے دوسری شادی کرنا ضروری ہوگا اور اس صورت میں اولاد کا والد کی دوسری شادی میں رکاوٹ بننا حرام ہوگا اور اگر نکاح نہ ہونے کی صورت میں والد سے کوئی گناہ جس کا کہ اوپر تذکرہ کیا گیا سرزد ہوجائے تو بچے بھی گنہگار ہوں گے۔

والد کے نکاح ثانی میں اولاد رکاوٹ کیوں بنتے ہیں؟

یہ تو مسئلہ کا ایک رخ اور سکہ کا ایک پہلو ہے، مسئلہ کا دوسرا رخ اور سکہ کا دوسرا پہلو بھی انتہائی تلخ ہے، وہ یہ ہے کہ ہندوستانی معاشرہ میں عموماً جو حضرات اپنی بیوی کے انتقال کے بعد دوسری شادی کرتے ہیں وہ سابقہ (مرحومہ) بیوی کی اولاد کے ساتھ عدل وانصاف نہیں کرتے پوری توجہ، میلان اور جھکاؤ نئی بیوی اور پھر ان سے ہونے والی اولاد کی طرف ہوجاتا ہے، بلکہ دوسری بیوی سے محبت اور وفاداری میں اتنے دیوانے ہوجاتے ہیں کہ پہلی اولاد کو وراثت سے محروم کرنے، منقولہ وغیر منقولہ جائیداد کو اس نئی بیوی اور اس سے جو اولاد ہے اس کے نام منتقل کرنے کے لئے ہر طرح کا داؤ پیچ کرتے ہیں اور اس کے لئے کوئی کسر باقی نہیں رکھتے، پھر نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ گھر کا سکون غارت ہوجاتی ہے، بیٹے اور باپ میں جنگ اور محاذ آرائی قائم ہوجاتی ہے، اور مسئلہ عدالت میں پہنچتا ہے اور پھر برسوں مقدمہ چلتا ہے۔ عرب میں دوسری تیسری اور چوتھی شادی کا رواج عام ہے۔ لڑکے خود اپنے والد کی شادی اور ولیمہ کا انتظام کرتے ہیں ایسا اس لئے ہے کہ وہ والد عدل سے کام لیتے ہیں کسی کا حق مارنا اور کسی ایک طرف جھک جانا عرب میں یہ بیماری اور وبا نہیں ہے، اس لئے وہاں نکاح ثانی میں کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوتا، وراثت کی تقسیم غیر منصفانہ نہیں ہوتی والد اپنے جائیداد میں خرد برد نہیں کرتے کسی ایک کے نام جائیداد کی منتقلی کا وہاں تصور بھی نہیں ہے۔

لہذا مسئلہ تو یہی ہے کہ اولاد کا اپنے والد کے نکاح ثانی میں رکاوٹ بننا شرع کی روشنی میں درست نہیں، خاص طور پر جبکہ اس کے اندر مالی، جسمانی طاقت اور صلاحیت موجود ہو اور اپنی آنے والی نئی بیوی کے نفقہ ادا کرنے کی صلاحیت واستطاعت اس کے اندر ہو، کیونکہ قرآن مجید نے انسان کے جنسی آسودگی اور جائز اور برمحل خواہشات کو پوری کرنے کے لئے جو تعبیر استعمال کیا ہے، "فانکحوا ما طاب لکم من النساء مثنی وثلث وربع...الخ" (سورہ نساء: ۳)۔

اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اولاد کا والد کے جائز جنسی آسودگی اور خواہشات کی تکمیل میں رکاوٹ بننا کسی طرح درست نہیں ہے، جب تک والد کی طرف سے کھلم کھلا کوئی ایسی چیز سامنے نہ آئے جس سے پہلی بیوی کی اولاد کے ساتھ غیر عادلانہ اور غیر منصفانہ سلوک کا یقینی خطرہ نہ ہو۔

لیکن دوسری طرف اولاد کو بھی اپنے رویے میں تبدیلی لانی ہوگی، اسلام نے بیویوں کے ساتھ جو عادلانہ اور منصفانہ سلوک، رویہ اور تقسیم کا حکم دیا ہے، نیز اولاد کے ساتھ چاہے ایک بیوی سے ہوں یا الگ الگ بیویوں سے ان کے ساتھ جس طرح سلوک کا حکم دیا ہے اس کو اپنانا ہوگا، اپنے مزاج میں تبدیلی لانی ہوگی، اور عرب کلچر اور ماڈل کو اس سلسلہ میں اپنا نمونہ بنانا ہوگا۔

کیا اولاد پر والد کے منکوحہ (سوتیلی ماں) کا نفقہ ہے؟

فقہاء کرام نے صراحت کی ہے کہ عام حالت میں والد کی منکوحہ کے اخراجات بیٹے پر واجب نہیں ہیں، اس لئے کہ وہ اس کے لئے اجنبیہ ہے، اس کا نفقہ اس کے شوہر پر واجب ہے۔ لیکن اگر باپ کو دوسری شادی کی ضرورت ہو اس طور پر کہ اس کی خدمت کرنے والا اور کوئی نہ ہو اور لڑکا بھی اپنی مشغولیت ومصروفیت کی وجہ سے وقت نہ نکال پاتا ہو تو بیٹے پر باپ کی منکوحہ کے اخراجات پورے کرنے کی ذمہ داری ہوگی، اس لئے کہ بیٹے کی ذمہ داری ہے کہ والد کی خدمت خود کرے یا کسی کو اجرت دے کر کرائے۔

علامہ کاسانی تحریر فرماتے ہیں:

''ولا تجب على الابن نفقة منكوحة أبيه، لأنها أجنبية عنه. إلا أن يكون الأب محتاجا إلى من يخدمه، فحينئذ يجب عليه نفقة امرأته، لأنه يومر بخدمة الأب بنفسه أو بالأجير'' (بدائع الصنائع ۴/۳۲)۔

والد کی منکوحہ کے اخراجات بیٹے پر واجب نہیں ہیں اس لئے کہ وہ اجنبیہ ہے، البتہ والد کو خادم کی ضرورت ہو تو ایسی صورت میں بیٹے پر والد کی منکوحہ کے اخراجات لازم ہوں گے، اس لئے کہ اس کو حکم دیا گیا ہے، والد کی خدمت کرنے کا وہ خود اس خدمت کو انجام دے یا نوکر اور خادم کے ذریعہ انجام دے۔

علامہ داماد آفندی نقل کرتے ہیں:

''وفي الجوهرة: إن احتاج الأب إلى زوجة والابن موسر وجب عليه أن يزوجه أو يشتري له جارية ويلزمه نفقتهما وكسوتهما'' (مجمع الانہر ۱/۵۰۱)۔

(جوہرہ میں ہے کہ اگر والد کو (خدمت کے لئے) بیوی کی ضرورت ہو اور بیٹا خوشحال ہو تو اس پر ضروری ہے کہ وہ والد کی شادی کرائے یا اس کے لئے باندی خریدے اور ان دونوں کے اخراجات اور لباس وغیرہ اس کے ذمہ لازم ہوں گے)۔

خلاصہ کلام یہ کہ اگر ماں کے مرنے کے بعد باپ نے دوسری شادی کرلی ہو اور باپ کی خدمت کے لئے سوتیلی ماں کا باپ کے پاس رہنا ضروری ہو اور اس کے خرچ کا کوئی انتظام نہ ہو تو صاحب استطاعت اولاد پر باپ کے سوتیلی ماں کا خرچ بھی واجب ہوگا، البتہ اگر باپ سوتیلی ماں کے بغیر بھی خود اپنے سارے کام اور امور انجام دے سکتا ہو تو اس صورت میں اولاد پر سوتیلی ماں کا خرچہ واجب نہ ہوگا، دے تو باعث فضیلت اور ثواب ہے، ورنہ مجبور نہیں کیا جاسکتا۔

لیکن احقر کی رائے میں سوتیلی ماں کا نفقہ بھی اولاد پر واجب ہونا چاہئے، اگر باپ محتاج اور ضرورت مند ہو، مجموعہ قوانین اسلامی میں بھی اسی کو اختیار کیا گیا ہے (دفعہ ۲۰۱) محتاج باپ کی ایک سے زائد بیویاں ہوں تو اولاد پر سوتیلی ماں کا نفقہ واجب ہوگا۔

''وعليه نفقة زوجة أبيه... بل وتزويجه... ولو له زوجات فعليه نفقة واحدة يدفعها للأب ليوزعها عليهن قوله (وعليه نفقة زوجة أبيه) اى فى رواية۔ وفى أخرى: إن كان الأب مريضًا أو به زمانة يحتاج للخدمة'' (الدر المختار مع رد المحتار ۲/۹۲۷)۔

حضرت الاستاذ مولانا خالد سیف اللہ رحمانی تحریر فرماتے ہیں:

''دوسرا مسئلہ باپ کی بیوی یعنی سوتیلی ماں کے نفقہ کے متعلق ہے، اگر باپ میں نفقہ ادا کرنے کی صلاحیت نہیں تو مالکیہ، شوافع اور حنابلہ کے نزدیک بیٹے پر اس کا نفقہ بھی واجب ہوگا، کیونکہ یہ بھی باپ کی ضروریات میں داخل ہے۔ حنفیہ کا بھی ایک قول یہی ہے جس کو علامہ حصکفی نے ترجیح دیا ہے، دوسرا قول یہ ہے کہ اگر باپ مریض یا معذور ہونے کی وجہ سے محتاج خدمت ہو تب اس کی بیوی کا نفقہ بیٹے کے ذمہ ہے، کیونکہ وہ گویا باپ کی خادمہ ہے، بہر حال جمہور کا مسلک قرآن وحدیث کے مزاج سے قریب تر ہے، کیونکہ والدین کے ساتھ حسن سلوک اور معروف رویہ اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے، اور ظاہر ہے کہ یہ حسن سلوک نہیں ہوسکتا کہ اس کی بیوی کو نفقہ سے محروم رکھا جائے، بلکہ فقہاء نے ان جزئیات سے اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے، کہ اگر والدین اپنی طبعی ضرورت اور خدمت کے لئے نکاح کی ضرورت مند ہوں تو اولاد کو اس کی رعایت کرنی چاہئے'' (قاموس الفقہ د/۲۱۵)۔

آگے مزید تحریر فرماتے ہیں:

''اگر باپ نکاح کی حاجت رکھتا ہو اور خود اس موقف میں نہ ہو تو کیا اس کا نکاح کرنا بھی اولاد کی ذمہ داری ہوگی؟ شوافع اور حنابلہ کے نزدیک بیٹے پر باپ کی شادی کا انتظام واجب ہوگا، اور اس کی ذمہ داری بھی اس کے بیٹے پر ہوگی، حنفیہ کے یہاں دو قول ہے: ایک واجب ہونے کا دوسرا واجب نہ ہونے کا، اسی طرح علامہ ابن قدامہؒ نے ماں کے نکاح کے بارے میں بھی لکھا ہے کہ وہ بھی اولاد کے ذمہ ہوگا'' (قاموس الفقہ د/۲۱۵)۔

سوال نمبر (۶): والد کی زندگی میں اولاد کا جائیداد کا مطالبہ:

مذہب اسلام نے مال ودولت کی تقسیم کا جو سسٹم اور نظام قائم کیا ہے، اس کا ایک اہم اور مرکزی حصہ ''میراث'' ہے، اسلام نے افراط وتفریط

سے پاک وراثت اور میراث کا نظام قائم کیا اور دولت کی تقسیم کا منصفانہ قانون بنایا تا کہ دولت ایک شخص کے ہاتھ میں نہ رہ جائے بلکہ والدین اولاد اور زوجین کو تو میراث میں لازمی طور پر حصہ دار بنایا اور ان کے علاوہ بعض دیگر رشتہ داروں کو بھی بعض مواقع پر میراث میں شریک رکھا اور اس کے لئے ایک جامع نظام بنایا، نیز یہ بھی بتادیا کہ وراثت کی تقسیم کب ہوگی اور وارثین کب مستحق میراث ہوں گے۔

سوال نمبر (۶) میں جو سوال کیا گیا ہے اس کا جواب شریعت کی رو سے یہ ہے کہ باپ کی زندگی میں اولاد کو میراث طلب کرنے کا حق نہیں ہے، مورث کے انتقال کے بعد ہی ترکہ کی شرعی تقسیم ہے، جو بھی شرعاً وارث ہوگا شریعت کے قانون کے مطابق مورث کے انتقال کے بعد اسے اس کا حق ملے گا وہ مالدار ہو یا غریب تقسیم وراثت اپنی مرضی کی چیز نہیں ہے کہ جسے چاہیں دے دیں اور جسے چاہیں نہ دیں، اولاد اگر والد کی زندگی میں ہی جائیداد کا مطالبہ شروع کردیں اور اس کو اپنا حق تصور کریں تو یہ شرعاً درست نہیں ہے، اولاد کا اس طرح وراثت کا مطالبہ کرنا ازروئے شرع درست نہیں ہے: ہاں اگر والدین کی معاشی حالت بہتر ہو اور اولاد محتاج ہوں تو اس صورت میں کھانے کے لئے وقتی طور پر کچھ زمین کا مطالبہ کرنا اور اس میں کاشت کرکے اپنے اخراجات پورا کرنا ازروئے شرع درست ہوگا، لیکن اس کا حکم وراثت کا نہیں ہوگا۔

عقل اور شعور کا فیصلہ بھی یہی ہوگا، یہ کیونکر بہتر ہوگا کہ والدین عیش و مستی سے زندگی گزاریں اور ان کے پاس اسباب وسائل کی کثرت اور بہتات ہو اور ان ہی کی صلبی اولاد ان کی نگاہوں کے سامنے دربدر کی ٹھوکر کھائے اور وہ نان شبینہ کا محتاج رہے، لہذا والدین کی اخلاقی ذمہ داری ہوگی کہ وہ اپنی دولت اور مال کو اپنی اولاد پر بھی خرچ کریں اور جائیداد کا کچھ حصہ وقتی طور پر استعمال کے لئے دے دیں، میراث اور ترکہ کی تقسیم تو مورث کے مرنے کے بعد ہی ہوتی ہے۔

مورث کی اخلاقی ذمہ داری:

مورث اپنی زندگی میں اپنے مال میں خود مختار ہوتا ہے، وہ جو چاہیں کرسکتے ہیں، اولاد مانع نہیں ہوسکتی ہے، لیکن وارثوں کو بلاوجہ محروم کرنا، یا نقصان پہنچانے کی غرض سے فروخت کرنے اور خیرات کرنے کی شرعاً اجازت نہیں ہے۔

حضرت سعد بن ابی وقاصؓ بیمار ہوئے تو آنحضرت ﷺ عیادت کے لئے تشریف لائے، حضرت سعدؓ نے عرض کیا کہ میرے پاس بہت مال ہے اور بیٹی کے سوا کوئی وارث نہیں ہے، میں چاہتا ہوں کہ اپنے سب مال کو اللہ کے راستہ میں صرف کرنے کی وصیت کرجاؤں، آنحضرت ﷺ نے فرمایا نہیں، میں نے عرض کیا کیا دو تہائی مال کی وصیت کروں؟ فرمایا نہیں، میں نے عرض کیا نصف مال کی، فرمایا نہیں، تب میں نے کہا: تہائی مال کی؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: خیر تہائی مال کی کرسکتے ہو اور یہ بھی زیادہ ہے، تمہارا اپنے وارثوں کو آسودہ چھوڑنا اس سے بہتر ہے کہ تم ان کو محتاج چھوڑ جاؤ اور وہ لوگوں کے آگے ہاتھ پھیلاتے پھریں (مشکوۃ)۔

اس حدیث سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مورث کی وارثوں کے حق میں کیا ذمہ داری بنتی ہے، دونوں کا باہم کتنا تال میل ہونا چاہئے، والد کو اپنی اولاد کی ہر ممکن مدد کرنی چاہئے اگر وہ خوش حال ہوں اور اولاد فقر وفاقہ کی زندگی گزارنے پر مجبور ہوں، بہرحال یہاں قانون کی بالادستی تو قائم ہی رہے گی، اولاد مورث کی زندگی میں میراث کا مطالبہ نہیں کرسکتا۔ لیکن اخلاقیات کے حدود یہاں کیا ہوں گے اور کیا ہونے چاہئے اس پر ضرور نظر رہے۔

کیا مورث اپنی زندگی میں جائیداد یا ترکہ وارث کو ہبہ کرسکتا ہے؟

زندگی میں مورث کا ورثہ کے درمیان جائیداد تقسیم وراثت کے طور پر یہ درست نہیں ہے، قرآن وحدیث میں وراثت کا جو مفہوم بیان کیا گیا ہے اور اس کی تقسیم کا جو شرعی وقت بتایا گیا ہے، وہ مورث کی وفات اور موت کے بعد کا وقت ہے۔

مال ودولت اور جائیداد کا زندگی میں تقسیم کردینا اور موت کے بعد مستحقین کے درمیان اشیاء کا تقسیم کیا جانا فقہی اعتبار سے دو الگ الگ چیزیں ہیں پہلی چیز ''ہبہ'' کہلاتی ہے، جو خود اس شخص کی جانب سے تقسیم ہے اور دوسری صورت ''وراثت'' ہے، جس میں من جانب اللہ تقسیم عمل میں آتی ہے، ہبہ میں وہ قانونی لحاظ سے مختار ہے کہ جسے جتنا اور جس قدر چاہے دیدے، لیکن اگر ورثاء کو زندگی میں تقسیم کردینا چاہتا ہو تو اصول یہ ہے کہ لڑکے اور لڑکیوں کو برابر تقسیم کردے، اگر کمی بیشی کرے گا تو عنداللہ بازپرس ہوگی، اور اگر تقسیم کے بغیر موت واقع ہوگئی تو اب متروکہ جائیداد موروثی اعتبار سے تقسیم ہوگی۔

یہاں یہ مسئلہ بھی ذہن میں رہے کہ اگر اس نے (مورث نے) جائیداد اپنی زندگی میں اس لحاظ سے تقسیم کی جو موت کے بعد ''موروثی'' حصوں کے اعتبار سے ہوسکتی تھی، تو یہ تقسیم نافذ تو ہوجائے گی، لیکن بہتر طریقہ کے خلاف ہوگا، واللہ اعلم بالصواب (مستفاد کتاب الفتاوی ۴/۲۰۱۱-۲۱۲)۔

سوال نمبر (۷) اولڈ ہوم میں بوڑھے والدین کو رکھنے کا شرعی حکم:

مذہب اسلام دین فطرت ہے، اس نے ہر فرد کو اور ہر طبقہ کو اس کا حق دیا اور اس کے حقوق کی بھرپور رعایت کی اور ان کے فرائض و اختیارات کی حد بندی کردی ہے، اسلام نے سماج کے کمزور، پس ماندہ اور مظلوم اشخاص کو بطور خاص اپنے سایہ عاطفت میں جگہ دی ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ انسان جب کبرسنی اور بڑھاپے کی عمر کو پہنچتا ہے تو اس کے قویٰ مضمحل ہوجاتے ہیں، قوت فکر و عمل کمزور پڑ جاتی ہے، جذبات سرد پڑ جاتے ہیں، وہ دوسروں کے رحم و کرم، حسن و سلوک اور توجہات و عنایات کا مستحق ہوتا ہے، اسلام نے اس کی کمزوری اور ضعف و اضمحلال کا خیال کرتے ہوئے اس کے ساتھ ادب و احترام سے پیش آنے اور اچھے برتاؤ کا حکم دیا ہے۔ قرآن کریم میں بوڑھے والدین کے ساتھ حسن سلوک اور ان کی حق شناسی کا حکم دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے: "إما يبلغن عندك الكبر أحدهما أو كلاهما فلا تقل لهما أف ولا تنهرهما وقل لهما قولا كريما" (الاسراء: ۲۳) (اگر پہنچ جائیں تمہارے سامنے بڑھاپے کو ان میں سے ایک یا دونوں نہ کہوان کو ہوں، اور نہ جھڑک ان کو اور کہہ ان سے بات ادب کی اور جھکا دے ان کے آگے کندھے عاجزی کر کے، نیازمندی سے اور کہہ اے رب ان پر رحم کر جیسا پالا انہوں نے مجھ کو جب چھوٹا سا تھا)۔

علامہ شبیر احمد عثمانی نے مذکورہ آیت کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا ہے:

''بڑھاپے میں خدمت کی احتیاج زیادہ ہوتی ہے، جس سے بعض اوقات اہل و عیال بھی اکتانے لگتے ہیں، زیادہ پیرانہ سالی میں ہوش و حواس بھی ٹھکانے نہیں رہتے، بڑی سعادت مند اولاد کا کام ہے کہ اس وقت بوڑھے والدین کی خدمت گزاری و فرمانبرداری سے جی نہ ہارے، قرآن نے تنبیہ کی جھڑکنا اور ڈانٹنا تو کجا ان کے مقابلے میں زبان سے ''ہوں'' بھی نہ کرو بلکہ بات کرتے وقت پورے ادب و تعظیم کو ملحوظ رکھو'' (تفسیر عثمانی سورہ اسراء)۔

جناب نبی کریم ﷺ نے مختلف اسلوب و پیرائے میں نوجوانوں کو بوڑھے بزرگ اور والدین کا اس کے بڑھاپے کی وجہ سے ادب و احترام کرنے کا اور ان کی قدر و منزلت ملحوظ رکھنے کا حکم دیا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: ''جو جوان کسی بوڑھے بزرگ کا اس کے بڑھاپے کی وجہ سے قدر کرے گا، تو اللہ تعالی اس جوان کے بوڑھے ہونے کے وقت ایسے بندے مقرر کردے گا جو اس وقت اس کا ادب و احترام کریں گے'' (ترمذی)۔

حضرت انسؓ کی اس حدیث سے معلوم ہوا کہ بڑوں کا ادب و احترام اور ان کی خدمت وہ نیکی ہے جس کا صلہ اللہ تعالی دنیا میں بھی عطا فرماتا ہے اور اصل جزاء و ثواب کی جگہ تو آخرت ہی ہے۔

جناب نبی کریم ﷺ نے حضرات صحابہؓ کو اس بات کا پابند بنایا تھا کہ وہ لوگوں کے مراتب کا خیال رکھیں اور جس کا جو رتبہ اور درجہ ہو اسی لحاظ سے اس کے ساتھ برتاؤ کیا جائے۔

اسلامی معاشرہ میں بوڑھوں اور خاص کر بوڑھے والدین کے مقام و مرتبہ سے متعلق ان اسلامی تعلیمات و ہدایات اور نبی کریم ﷺ کے واضح ارشادات کے بعد کیا اس کی ذرا بھی گنجائش نکلتی ہے کہ محض اس فائدے کے لئے کہ والدین کو ایک جگہ اپنی ضرورت کی چیزیں مہیا ہوجاتی ہیں اور اپنے ہم عمر لوگ مل جاتے ہیں ان کو اولڈ ایج ہوم میں قیام کرنا پر مجبور کردیا جائے اور ان کو اس عمر میں جس میں کہ انسان چاہتا ہے کہ اس کے بال بچے اس کے قریب رہیں اور اولاد اور اولاد کی اولاد دیکھ کر آنکھیں ٹھنڈی کریں ان ہاسٹلوں کے حوالے کردیا جائے اور ان کی یہ خواہش ایک حسرت بن کر رہ جائے۔

احقر کی رائے میں سوائے بعض شدید حالات اور مجبوری کے اس کی قطعاً گنجائش نہیں ہے، یہ سراسر اسلامی تعلیمات کے منافی چیز ہے۔

حکومت کا بے سہارا معذوروں کے لئے ہاسٹل قائم کرنا:

لیکن ایسے بوڑھے اور بے سہارا معذور افراد جن کی خدمت اور کفالت کے لئے ان کے ورثہ میں سے کوئی نہ ہو یا ہو لیکن وہ خود معذور و اپاہج ہو تو ایسی صورت میں حکومت کا بے سہارا اور بوڑھوں اور معذوروں کے لئے ہاسٹل قائم کرنا جہاں ان کی سہولت کے لئے ساری چیزیں موجود ہوں اور ان کے ہم عمر افراد موجود ہوں نہایت مستحسن قدم ہوگا بلکہ احقر کی رائے میں تو حکومت کے لئے ایسا انتظام کرنا واجب اور ضروری ہے کیونکہ ''السلطان

ولی لمن لا ولی له'' (حدیث نبوی)، اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ایسے بے سہارا اور معذور اور سن دراز افراد کی پوری کفالت کی ذمہ داری حکومت کی ہوتی ہے، اور خلفاء راشدین کے زمانے میں اس پر عمل ہوتا رہا اور بعد کے زمانے میں بھی خلفاء نے اس ذمہ داری کو انجام دیا، حضرت عمرؓ نے باقاعدہ اس کا نظام بنایا تفصیل کے لئے ''الفاروق'' کا مطالعہ کرنا بہتر ہوگا۔

الغرض والدین کی خدمت، ان کی کفالت، ان کے ساتھ محبت والفت یہ شریعت اسلامی کے اہم ترین واجبات میں سے ہے اور بڑھاپے میں اس کی ضرورت اور زیادہ ہے، عمر کے اس مرحلہ میں اولاد کو خدمت و کفالت کا زیادہ مکلف بنایا گیا ہے، تہذیب فرنگ کی طرح اسلام کا یہ فتوی نہیں کہ لڑکا جب عاقل اور بالغ وصاحب اختیار ہوجائے تو بیوی کو ساتھ لے کر اپنا الگ گھر بار کر لے اور بوڑھے ماں باپ سے تعلق اگر رکھے بھی تو محض دور کا اور ضابطہ کا۔

سوال نمبر (۸) بے سہارا لوگوں کی زکوۃ کے ذریعہ اجتماعی کفالت:

زکوۃ اور زکوۃ کی ادائیگی کا بنیادی اور مرکزی مقصد غریبوں اور محتاجوں کی حاجت روائی ہے اور ان کی ضرورتوں کی کفالت ہے، اگر سماج میں ایسے محتاج سن رسیدہ، بوڑھے، اور عمر دراز لوگ ہوں جن کی کفالت کرنے والا کوئی بھی نہ ہو یا ان کی اولاد خود فاقہ کی شکار ہو اور نان شبینہ کا محتاج ہو تو ایسی صورت میں ایسے سن رسیدہ اور بوڑھے افراد کی اجتماعی کفالت کے لئے خصوصی طور پر زکوۃ کی رقم استعمال کی جاسکتی ہے، قرآن مجید مصارف زکوۃ کی تفصیل بیان کرتے ہوئے کہتا ہے۔ ''إنما الصداقت للفقراء۔ الخ'' (سورہ توبہ: ۶۰)۔

نیز اگر نادار اور محتاج بوڑھوں کی رہائش کے لئے کوئی ہاسٹل تعمیر ہو اور وہاں ایسے محتاجوں کی کفالت لی جاتی ہو تو وہاں بھی ان کی کفالت کے لئے زکوۃ کی رقم دے سکتے ہیں، لیکن اس رقم کو صرف ان ہی محتاجوں پر خرچ کیا جائے گا، اس مد سے ہاسٹل کی تعمیر وہاں کے ملازمین کی تنخواہیں، کرایہ کا مکان، تعمیر اور فرنیچر وغیرہ مصارف پر خرچ کرنا جائز نہ ہوگا، اس سے زکوۃ کی ادائیگی نہیں ہوگی۔

نیز اگر یہ حضرات اتنے محتاج ہیں کہ اپنی کوئی بھی ضرورت خود پوری نہیں کر پاتے تو ایسے حضرات کے اوپر خرچ کرنے کے لئے ان اداروں اور وہاں کے منیجروں کو زکوۃ کی رقم دینا درست ہوگا، ورنہ اصل مسئلہ ہے کہ تملیک ہو کھانے پینے کی چیزیں براہ راست خود ان کے حوالے کی جائیں جیسا کہ ''إنما الصدقات للفقراء'' کا لام صاف بتا رہا ہے کہ یہاں لام تملیک کے لئے ہے۔

سوال نمبر (۹) سرکاری رعایتوں سے غیر مستحقین کا استفادہ کرنا:

حکومت نے عمر دراز اور معذور لوگوں کے لئے مختلف چیزوں میں جو خصوصی رعایتیں رکھی ہیں جیسے ٹرین، ہوائی جہاز وغیرہ میں کرایہ میں تخفیف، حکومت کی طرف سے امدادی وظیفہ، ٹیکس وغیرہ میں رعایت، کمزور اور معذور افراد کے لئے خاص پنشن اور بھی بعض اسکیمیں تو ان خصوصی رعایتوں اور وظیفوں سے صرف وہی افراد مستفید ہوسکتے ہیں جو ان رعایتوں اور وظیفوں کے لئے مطلوب مقررہ حد عمر کو پہنچ گئے ہوں اور جو ان مقررہ حدوں تک نہ پہنچے ہوں ان لوگوں کے لئے ان رعایتوں سے فائدہ اٹھانا از روئے شرع جائز نہیں ہے، یہ حکومت کے ساتھ دھوکہ اور فراڈ ہے، شریعت میں اس کی گنجائش قطعاً نہیں ہے، ان رعایتوں سے حاصل آمدنی ناجائز ہے اور ان رعایتی ٹکٹوں پر سفر کرنا بھی درست نہیں ہے، وہ اس وعید میں داخل اور شامل ہوں گے: ''من غش فلیس منا'' (حدیث نبوی) جس نے دھوکہ اور فریب کا کام کیا اس کا ہماری شریعت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

ایسا کرنا چوری کرنے کے مترادف ہے، چوری کی قانونی تعریف خواہ کچھ ہو لیکن گناہ وثواب کے نقطہ نظر سے کسی دوسرے کی چیز اس کی مرضی کے بغیر استعمال کرنا چوری ہی میں داخل ہے اور اس حساب سے صرف فرد ہی کا مال نہیں بلکہ مسلمان حکومت کے غیر مسلم باشندے کا، یا غیر مسلم حکومت کے مسلم باشندے کا وہاں کی حکومت کی طرف اور حکومت کی اشیاء کا حکومت کے قانون اور ضابطے کے خلاف استعمال کرنا بھی چوری ہے۔

حدیث میں ہے: ''حرمة مال المسلم کحرمة دمه'' (مسلم)

اگر چہ حدیث میں ''مسلمان'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے لیکن دوسری احادیث کی روشنی میں حکومت بھی شامل ہے۔

☆☆☆

والدین اور عزیز واقارب کے مالی حقوق

مولانا محمد آزاد بیگ قاسمی بہرائچی[1]

۱۔ اگر کوئی شخص بوڑھاپے کی عمر کو پہنچ گیا ہے اور کسب پر قادر ہے تو بھی اولاد پر نفقہ واجب ہے، اس کو کسب پر مجبور نہیں کیا جاسکتا ہے جیسا کہ حضرات فقہاء کرام کی تصریحات سے ہمیں رہنمائی ملتی ہیں۔

''ویجبر الولد الموسر علی نفقة الأبوین المعسرین مسلمین کانا أو ذمیین قدرا علی الکسب أو لم یقدرا... الخ کذا فی العتابیة'' (عالمگیری ۱/ ۵۶۴)

(کہ مالدار لڑکے پر تنگدست والدین کے نفقہ کے بارے میں جبر کیا جائے گا مسلمان ہوں یا ذمی ہوں کسب پر قادر ہوں یا قادر نہ ہوں)۔

''وذکر شمس الأئمة السرخسی فی شرح أدب القاضی للخصاف أن الأب إذا کان کسوبا والابن أیضا کسوبا یجبر الابن علی الکسب فی نفقة الأب''

(شمس الائمہ سرخسی نے ذکر کیا ہے کہ جب باپ اور بیٹا دونوں کسب معاش کی طاقت رکھتے ہوں تو بیٹے کو مجبور کیا جائے گا، باپ کے نفقہ کے بارے میں جبکہ شمس الائمہ حلوانی نے فرمایا کہ جب باپ اور بیٹا دونوں کسب معاش پر قادر ہوں تو بیٹے کو باپ کے نفقہ کے بارے میں مجبور نہیں کیا جائے گا)۔

''وذکر شمس الأئمة الحلوانی فی شرح أدب القاضی للخصاف:أنه لایجبر الابن علی نفقة الأب إذا کان الأب قادرًا علی الکسب، واعتبره بذی الرحم المحرم. فإنه لایستحق النفقة فی کسب قریبه، ولا علی قریبه الموسر إذا کان هو کسوبًا''

شمس الائمہ حلوانی نے اس صورت کو ذی رحم محرم پر قیاس کرلیا ہے کہ جب قریبی شخص ذی رحم محرم کسب پر قادر ہو تو دوسرے قریبی شخص پر اس کا نفقہ لازم نہیں (تاتارخانیہ جدید ۵/ ۴۲۶، ۸۳۶۷)۔

علامہ حلوانی نے کسب معاش پر قادر ہونے کی وجہ سے باپ کو غنی مان کر بیٹے پر نفقہ لازم نہیں کیا ہے، جیسا کہ انہوں نے ذی رحم محرم پر قیاس کرتے ہوئے فرمایا کہ جس طرح قریبی شخص اگر کسب معاش پر قادر ہوں تو اس کا نفقہ اس کے دوسرے ذی رحم محرم پر لازم نہیں ہوگا، کیونکہ قادر علی الکسب کو غنی شمار کیا گیا ہے، لیکن صاحب ہدایہ نے ذی رحم محرم اور والدین کے درمیان فرق فرمایا ہے کہ

''ثم لا بد (فی وجوب النفقة) من الحاجة والصغر والأنوثة والزمانة والعمی أمارة الحاجة لتحقق العجز فإن القادر علی الکسب غني بکسبه بخلاف الأبوین؛ لأنه یلحقهما تعب الکسب والولد مامور بدفع الضرر عنهما، فتجب نفقتهما مع قدرتهما علی الکسب'' (الهدایة: ۲/ ۴۳۹)

(کہ قادر علی الکسب اپنے کسب کی بنا پر غنی ہے، لہذا اس کا نفقہ دوسرے پر واجب نہیں ہوگا، برخلاف والدین کے اس لئے کہ والدین کو کسب کی صورت میں کسب کی مشقت لاحق ہوگی جس سے ان کو ضرر پہنچے گا اور اولاد کو والدین سے ضرر و تکلیف دور کرنے کا حکم دیا گیا ہے کہ ان کو ایذا نہ پہنچے، لہذا والدین کے کسب معاش پر قادر ہونے کے باوجود نفقہ اولاد پر واجب رہے گا)۔

صاحب ''ہدایہ'' کی اس توضیح سے شمس الائمہ سرخسی کے قول کی تائید ہوتی ہے، صاحب فتح القدیر علامہ کمال بن الہمام فرماتے ہیں کہ ہدایہ میں ''إذا کانوا فقراء''، جو مطلق ہے، یعنی کسب معاش پر قادر ہونے یا قادر نہ ہونے کی کوئی تفصیل نہیں ہے یہ قول اپنے اطلاق کی وجہ سے شمس الائمہ سرخسی کے قول

[1] خادم التدریس والافتاء معراج العلوم، چیتا کیمپ، ممبئی۔

کے موافق ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ باپ کسب معاش پر قادر ہے پھر بھی بیٹے پر باپ کا نفقہ لازم ہے برخلاف علامہ حلوانی کے قول کے کہ اگر باپ کسب معاش پر قادر ہے تو بیٹے کو باپ کے نفقہ پر مجبور نہیں کیا جائے گا، اس لئے کہ کسب کے اعتبار سے باپ غنی شمار ہوگا، لہٰذا اس صورت میں دوسرے پر نفقہ واجب کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

''وقوله إذا كانوا فقراء يوافق بإطلاقه قول السرخسي حيث قال إذا كان الأب قادرًا على الكسب يجبر الابن على نفقته بخلافه قول الحلواني أنه لايجبر إذا كان الأب كسوبا؛ لأنه كان غنيا باعتبار الكسب قال ضرورة على الغير'' (فتح القدير ۴/ ۲۲۰ کوئٹہ پاکستان)

آگے اور آپ مزید فرماتے ہیں کہ باپ کے خلاف بیٹا اگر کسب معاش پر قادر ہو تو اس پر کسب واجب ہے باپ کے ذمہ اس کا نفقہ نہیں ہے، یعنی اگر باپ اور بیٹا دونوں کسب معاش پر قادر ہوں تو بیٹے پر واجب ہے کہ کسب کر کے اور باپ پر خرچ کرے نہ کہ باپ کسب کرے۔

''وإذا كان الابن قادرًا على الكسب لاتجب نفقته على الأب فلو كان كل منهما كسوبا يجب أن يكتسب''۔

آپ نے بہت اہم بات یہ نقل فرمائی ہے کہ باپ کے نفقہ کے واجب ہونے میں محض فقر کا لحاظ کیا گیا ہے اور اس کو ظاہر الروایت کے مطابق بتایا گیا ہے۔

''قوله الفقر سواء كانوا قادرين على الكسب أو لا قيل هٰذا ظاهر الرواية'' (مجمع الانہر ۲/ ۱۹۶)

یعنی بیٹے پر نفقہ واجب ہونے کے لئے محض باپ کا فقیر و محتاج ہونا کافی ہے کسب پر قدرت رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو۔

''فالمعتبر في إيجاب نفقة الوالدين مجرد الفقر، قيل: هو ظاهر الرواية'' (فتح القدير ۴/ ۲۲۱)۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کریم میں اللہ تعالی نے والدین کو کلمہ ایذا اف کہنے سے بھی منع فرمایا ہے اور ایذا رسانی میں اف کہنے سے بھی کم کوئی درجہ ہوتا تو یقیناً وہ بھی ذکر کیا جاتا۔

''وروى من حديث على ابن أبي طالب قال: قال رسول الله ﷺ: لو علم الله من العقوق شيئًا أراد من أف لذكره'' (قرطبی ۱۰/ ۱۵۹)

باپ کو کسب پر مجبور کرنے میں جو تکلیف اور مشقت لاحق ہوگی وہ اف کہنے کی ایذا سے بدرجہا بڑھا ہوا ہے تو جب اف کہنا حرام ہے باپ کو کسب معاش پر مجبور کرنا بدرجہ اولی حرام و ممنوع ہوگا۔

''لأن معنى الأذى في إيكاله إلى الكد والتعب أكثر منه في التأفيف المحرم بقوله تعالى: ولا تقل لهما أف'' (فتح القدير ۴/ ۲۲۱)

ٹھیک یہی بات علامہ عینی ''النہایہ شرح الہدایہ'' میں فرماتے ہیں، علامہ شمس الائمہ السرخسی نے ''شرح الکافی'' میں اللہ تعالی کے ارشاد ''فلا تقل لهما أف'' (سورہ اسراء: ۲۳) سے استدلال کیا ہے کہ اللہ تعالی نے اف کہنے سے، یعنی تکلیف دینے سے منع کیا ہے، اور والدین کے محتاجگی کے وقت نفقہ نہ دینے میں اذیت اف کہنے سے زیادہ ہے، لہٰذا لڑکے کو والدین کا نفقہ لازم ہے چاہے والدین کسب معاش پر قادر کیوں نہ ہو، اس لئے کہ کسب معاش کی محنت و مشقت کی تکلیف اف کہنے کی تکلیف وایذا سے بڑھ کر ہے حالانکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ سب سے پاکیزہ اور طیب چیز جس کو آدمی کھائے وہ اپنا کسب معاش ہے اور لڑکا اس کی کمائی ہے، تو اپنے والد کی کمائی میں سے کھاؤ۔

''قال العلامة العيني: واستدلال شمس الأئمة السرخسي في شرح الكافي بقوله تعالى: فلا تقل لهما أف (اسراء: ۲۳)، وقال نهى عن التافيف يعني الأذى ومنع الأذى في منع النفقة عند حاجتهما أكثر، ولهٰذا يلزمه نفقتهما، وإن كانا قادرين على الكسب؛ لأن معنى الأذى في الكد والتعب أكثر منه في التافيف وقال ﷺ: إن أطيب ما أكل الرجل من كسبه، وإن ولده من كسبه فكلوا من كسب أولادكم'' (النہایہ شرح الہدایہ ۵/ ۵۴۱)

صاحب عنایہ نے شمس الائمہ سرخسی کے قول کو ترجیح دیتے ہوئے فرمایا کہ والد اور ولد کے درمیان میں فرق ہے، اس لئے کہ بالغ لڑکا اگر کسب معاش پر قادر ہو تو باپ پر اس کا نفقہ واجب نہیں، لیکن باپ کے بارے میں ایسا نہیں ہے، اگر وہ کسب معاش سے عاجز ہے تو لڑکے پر نفقہ واجب ہے، اور اگر قادر علی الکسب ہوگا تو نفقہ واجب نہیں ہوگا، اگر کسب معاش سے عاجز ہونے کی شرط لگادی جائے تو لڑکے پر اس کے نفقہ کے وجوب کے لئے جیسا کہ لڑکے کے متعلق یہی ہے تو پھر لڑکا اور والد میں مساوات واقع ہو جائے گی، حالانکہ والد کی اولاد پر فضیلت قائم اور ثابت ہے۔

''وشمس الأئمة السرخسي يحتاج إلى الفرق بين نفقة الولد والوالد. فإن الولد البالغ إذا كان قادرا على الكسب لاتجب على الأب نفقته وفرق بينهما بفضيلة الولد (إلى قوله) فلو شرط هٰهنا عجز الوالد عن الكسب لاستحقاق نفقته على ولده. كما شرط في حق الابن لوقعت المساواة مع قيام دليل المفاضلة'' (العناية على هامش فتح القدير ۴/۲۲۱)

ان عبارات کا خلاصہ یہ ہوا کہ محتاج بوڑھا باپ اگرچہ کسب معاش پر قدرت رکھتا پھر مالدار بیٹے پر اس کا نفقہ واجب ہوگا بیٹا اس کو کسب معاش پر مجبور نہیں کرسکتا ہے، کیونکہ ایسا کرنا ایذا پہنچانا ہے اور ایذا پہنچانا بنص قطعی حرام ہے۔

۲۔ سن رسیدہ اشخاص کا نفقہ وعلاج ودیگر ضروریات زندگی اولاد پر اور اس کی عدم موجودگی میں دیگر لوگوں پر اس وقت واجب ہوگا جبکہ یہ محتاج وتنگدست وضرورت مند ہوں ان کے پاس کوئی وسعت نہ ہو۔

''ويجبر الولد الموسر على نفقة أبيه وأمه إذا كانا محتاجين هٰكذا ذكر الإمام خواهرزاده، وشمس الأئمة السرخسي والخصاف في كتابه اعتبر القدرة على الإنفاق ولم يعتبر اليسار''

شمس الائمہ سرخسی اور خصاف نے مالداری کی بھی شرط نہیں لگائی کہ لڑکا صرف انفاق پر قادر ہو تو اس پر علاج ونفقہ لازم ہوگا (فتاوی تاتارخانیہ ۵/۴۲۴)۔

فتاوی ہندیہ میں ہے: ''قال: ويجبر الولد الموسر على نفقة الأبوين المعسرين مسلمين كانا أو ذميين قدرا على الكسب أو لم يقدرا... الخ. كذا في العتابية'' (فتاوی ہندیہ ۱/۵۶۴ في نفقة ذوي الارحام)۔

ہدایہ میں ہے: ''وعلى الرجل أن ينفق على أبويه وأجداده وجداته إذا كانوا فقراء''

کہ آدمی پر لازم ہے کہ وہ اپنے والدین اجداد اور جدات پر خرچ کرے جبکہ وہ محتاج ہوں (الہدایہ ۲/۴۴۸)۔

فقہاء کرام کی تصریحات سے ثابت ہوا کہ والدین یا اس کے اجداد وجدات اسی طریقہ سے اس کے محارم میں سے کوئی معذور ہوں بیمار ہوں کسی بھی طریقہ کا ضرورت مند ہو تو اس کا علاج معالجہ اس کی خدمت حسن سلوک اور مروت سے پیش آنا اس کی خاطر مدارات کرنا اس کی اولاد اور اس کی عدم موجودگی میں دیگر قریبی رشتہ داروں پر ازروئے شرع لازم ہے، کیونکہ اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا ہے:

''وصاحبهما في الدنيا معروفا'' (سورہ لقمان: ۱۵) کہ ان کے ساتھ دنیا میں دستور کے موافق برتاؤ کرو۔

یہ آیت کریمہ کا فرماں باپ کے بارے میں نازل ہوئی ہے، اب مسلمان والدین کی خدمت اور ان کے ساتھ حسن سلوک کس قدر بڑھ جاتی ہے اس آیت کریمہ سے ظاہر ہے، صاحب ہدایہ نے وضاحت فرمائی ہے کہ معروف یہ نہیں کہ آدمی خود عیش وعشرت کے مزے اڑائے اور والدین کو بھوکوں مرتا چھوڑ دے۔

''وليس من المعروف أن يعيش في نعم الله تعالى ويتركهما يموتان جوعا'' (الہدایہ ۲/۴۴۸)

پھر معروف کیا ہے صاحب نہایہ علامہ عینی فرماتے ہیں: والدین کے ساتھ حسن اخلاق سے پیش آنا بردباری کرنا قوت برداشت وتحمل کا مظاہرہ کرنا، حسن سلوک اور صلہ رحمی کرنا اور مروت وانسانیت کے تقاضے ہیں اس کو اپنانا۔

''والمعروف هو المحاسنة بالخلق الجميل والحلم والاحتمال والبر والصلوة وبما يقتضيه الكرم والمروة'' (النهاية في شرح الهداية: ۵/۵۴۱)۔

خلاصہ یہ کہ ضرورت مند معذور اشخاص جو خود اپنے علاج معالجہ پر قادر نہ ہوں تنگدستی کا شکار ہوں ان کو بے یارومددگار نہ چھوڑا جائے، ان کی ہر اعتبار سے خبر گیری اور مروت وانسانیت صلہ رحمی کا ان کے ساتھ برتاؤ وسلوک کیا جائے، ایسی صورت میں اولاد یا دیگر رشتہ داروں پر واجب ہے کہ ان کے نفقہ وعلاج کا بار اٹھائیں۔

۳۔ انسان کی جس طرح دنیاوی ضروریات ہوتی ہیں جس کے بغیر چارہ کار نہیں ہوتا ایسے ہی اخروی ضروریات بھی ہیں آخرت کے لئے ذخیرہ کرنا، راہ خدا میں خرچ کر کے صلہ رحمی کر کے عزیز واقارب پر خرچ کر کے ثواب کمانا یہ بھی اہم دینی ضرورت ہے جس طرح بوڑھے والدین یا دیگر معذور قریبی رشتہ داروں کی دنیاوی ضرورت کی کفالت کی ذمہ اولاد پر یا دیگران کے قریبی لوگوں پر ہوتی ہے، اسی طرح ان کی دینی ضرورت بھی پوری کرنا ان کے ذمہ ہے، لہذا سوالنامہ میں مذکور خرچ کے مختلف طریقے بھی قابل لحاظ ہیں ان کی وجہ سے بوڑھے والدین اور معذوروں کو پہنچتا ہے کہ اپنے صاحب حیثیت ہونے کے باوجود اپنے اولاد یا اپنے ان لوگوں سے جن پر ان کا نفقہ واجب ہے زائد رقم کا مطالبہ کریں جیسا کہ حدیث شریف سے ہمیں رہنمائی ملتی ہے، امام قرطبی نے اپنی تفسیر میں نقل کیا ہے۔

''قد روينا بالأسناد المتصل عن جابر بن عبدالله قال: جاء رجل إلى النبي ﷺ فقال: يا رسول الله إن أبي أخذ مالي فقال النبي ﷺ للرجل: فأتني بأبيك فنزل جبرئيل عليه السلام على النبي ﷺ فقال: إن الله عزوجل يقرئك السلام ويقول لك: إذا جاءك الشيخ فاسأله عن شئى قال في نفسه ما سمعته أذناه. فلما جاء الشيخ قال له النبي ﷺ: ما بال ابنك يشكوك أتريد أن تأخذ ماله؟ فقال سله يا رسول الله! هل أنفقه إلا على إحدى عماته أو خالاته أو على نفسي فقال له رسول الله ﷺ إيه عنا من هذا أخبرني عن شئى قلته في نفسك ما سمعته أذناك فقال الشيخ: والله يا رسول الله ما زال الله يزيد نابك يقينا لقد قلت في نفسي شيئا ما سمعته أذناي، قال: وأنا أسمع، قال: قلت: غذوتك مولودًا ومنتك يافعًا تعل بما اجني عليك وتنهل، فاوليتني حق الجوار، ولم تكن على بمال دون مالك تبخل، قال: فحينئذ أخذ النبي ﷺ: بتلابيب ابنه، وقال: أنت ومالك لأبيك'' (الجامع لاحکام القرآن للقرطبی ۱۰/ ۱۶۰، ۱۶۱)

(امام قرطبی نے اپنے اسناد متصل کے ساتھ حضرت جابر بن عبداللہؓ سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص رسول کریم ﷺ کی خدمت میں اور شکایت کی کہ میرے باپ نے میرا مال لے لیا ہے آپ ﷺ نے فرمایا کہ اپنے والد کو بلا کر لاؤ، اسی وقت جبرئیل امین تشریف لائے اور رسول اللہ ﷺ سے کہا کہ آپ کے پروردگار آپ کو سلام کہتے ہیں اور جب اس کا باپ آجائے تو آپ اس سے پوچھیں کہ وہ کلمات کیا ہیں جو اس نے دل میں کہے ہیں خود اس کے کانوں نے بھی ان کو نہیں سنا جب یہ شخص اپنے والد کو لے کر پہنچا تو آپ ﷺ نے والد سے کہا کہ کیا بات ہے آپ کا بیٹا آپ کی شکایت کرتا ہے، کیا آپ چاہتے ہیں کہ اس کا مال چھین لیں؟ والد نے عرض کیا کہ آپ اسی سے سوال فرمائیں کہ میں اسکی پھوپھی، خالہ یا اپنے نفس کے سوا کہاں خرچ کرتا ہوں، رسول ﷺ نے فرمایا (ایہ) جس کا مطلب یہ تھا کہ بس اب حقیقت معلوم ہوگئی اور کچھ کہنے کی ضرورت نہیں، اس کے بعد اس کے والد سے دریافت کیا کہ وہ کلمات کیا ہیں جس کو ابھی تک خود تمہارے کانوں نے بھی نہیں سنا ہے، اس شخص نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ ہمیں ہر معاملہ میں اللہ تعالی ہمارا ایمان اور یقین بڑھا دیتے ہیں (جو بات کسی نے نہیں سنا آپ کو اس کی اطلاع ہوگئی جو ایک معجزہ ہے)، پھر اس نے عرض کیا کہ یہ ایک حقیقت ہے کہ میں نے چند اشعار دل میں کہے ہیں جن کو میرے کانوں نے بھی نہیں سنا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا وہ ہمیں سناؤ اس نے اس وقت یہ اشعار ذیل سنائے (جس کا پہلا شعر یہ ہے) ''غذوتک مولودا ومنتک یافعا تعل بما اجنی علیک وتنهل''، میں نے تجھے بچپن میں غذا دی اور جوان ہونے کے بعد بھی تمہاری ذمہ داری اٹھائی تمہارا سب کھانا پینا میری ہی کمائی سے تھا، (اور اس کا آخری شعر یہ ہے) ''فأوليتني حق الجوار ولم تكن... على بمال دون مالك تبخل''، تو کم از کم مجھے پروسی کا حق دے دیا ہوتا اور خود میرے ہی مال میں سے میرے حق میں بخل سے کام نہ لیا ہوتا۔ رسول اللہ ﷺ نے یہ اشعار سننے کے بعد بیٹے کا گریبان پکڑ لیا اور فرمایا: أنت ومالک لأبیک، یعنی جا تو بھی اور تیرا مال بھی تیرے باپ کا ہے) (مستفاد معارف القرآن ۵/ ۴۶۸)۔

اس واقعہ سے صاف ظاہر ہے کہ آپ ﷺ سے شکایت کرنے والا شخص مذکور نے بیٹے کے مال میں سے اپنے اور قریبی رشتہ داروں پر خرچ کرنے کے لئے لیا تھا، لیکن بیٹے کی شکایت پر بجائے آپ ﷺ کے منع فرمانے کے ایک عظیم ضابطہ فرمایا کہ جاؤ تو اور تیرا مال سب تیرے باپ کا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ باپ اپنی ضرورت کے علاوہ دیگر ضروریات کے لئے مثلاً دوسرے رشتہ داروں پر خرچ کرنے کے لئے یا آئندہ کے لئے متوقع ضروریات کے لئے بیٹے سے نفقہ کا مطالبہ کر سکتا ہے، اس کے قریب قریب ابوداؤد شریف کی روایت ہے، جو حضرت عمرو بن شعیبؓ کے طریقہ سے مروی ہے کہ ایک شخص نے آکر حضور ﷺ کی خدمت میں عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ بلاشبہ میرے پاس مال ہے اور میرے اولاد ہیں اور میرے والد کو میرے مال کی ضرورت ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم اور تمہارا مال تمہارے والد کا ہے، یقیناً تمہاری اولاد بہترین کمائی ہے تو تم اپنی اولاد کی کمائی میں سے کھاؤ۔

''عن عمرو بن شعيب عن أبيه عن جده أن رجلا أتى النبي ﷺ فقال: يا رسول الله! إن لي مالا وولدا وإن والدي يحتاج مالي، قال: أنت ومالك لوالدك إن أولادكم من أطيب كسبكم فكلوا من كسب أولادكم'' (سنن ابی داؤد ۲/ ۴۹۸، ۳۵۳۰ كتاب البيوع باب الرجل يأكل من مال ولده، كنز العمال ۱۶/ ۴۶۳، ۴۵۴۵۱)، ''عن جابر بن عبدالله قال: يا رسول الله! إن لي مالا وولدًا وإن أبي يريد أن يحتاج مالي فقال أنت ومالك لأبيك''۔

حضرت جابر بن عبداللہؓ سے منقول ہے کہ ایک شخص نے کہا اے اللہ کے رسول! میرے پاس مال ہے اور میرے اولاد ہیں اور میرے والد میرا مال چھیننا چاہتے ہیں تو آپ ﷺ نے فرمایا تو اور تیرا مال تمہارے باپ کا ہے (ابن ماجہ، ۱۶۵)، اس حدیث شریف سے ثابت ہوتا ہے کہ والد کا نفقہ اس کے

اولاد پر واجب ہے۔

"فی الحدیث دلیل علی وجوب نفقة الوالد علی ولده" (مرقاۃ ۶/ ۵۲۱ کذا فی البدائع ۴/ ۴۳۹)۔

ان دونوں روایتوں سے واضح ہوا کہ والد کو ضرورت کے وقت بیٹے کے مال میں سے لینے کا حق ہے، اب ضرورتیں مختلف ہیں، اپنے عزیز و اقارب کو مختلف مواقع پر دینا یہ بھی ضرورت ہے اور آئندہ کے لئے متوقع ضرورت کے لئے کچھ محفوظ کر لینا بھی ایک ضرورت ہے لہذا بوڑھے والدین یا دیگر معذوروں کو زیادہ سہولت کے لئے اپنے اعزہ و اقارب پر خرچ کرنے کے لئے یا پس انداز کرنے کے لئے زائد رقم کا مطالبہ کر سکتے ہیں۔

۴۔ اللہ تعالیٰ نے اولاد و احفاد کی پیدائش کو لوگوں کے لئے بطور نعمت شمار کیا ہے، ارشاد خداوندی ہے:

"والله جعل لكم من أنفسكم أزواجًا وجعل لكم من أزواجكم بنين وحفدة ورزقكم من الطيبات" (سورہ نحل: ۷۲)

(اور اللہ نے پیدا کیا تمہارے واسطے تمہاری ہی قسم کی عورتیں اور دیئے تم کو تمہاری عورتوں سے بیٹے اور پوتے اور کھانے کو دیا تم کو ستھری چیزیں) (ترجمہ شیخ الہند سورہ نحل: ۷۲)، اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بیوی، بیٹے اور پوتے کا تذکرہ بطور نعمت کیا ہے آیت کریمہ میں لفظ حفدہ کے اصلی معنی مددگار و خدمت گار کے ہیں، اولاد کے لئے یہ لفظ استعمال کرنے میں اس طرف اشارہ ہے کہ اولاد کو اپنے ماں باپ کا خادم ہونا چاہئے (معارف القرآن ۵/ ۳۷۸)۔

تفسیر قرطبی میں ہے: "قال الحفدة الخدم والأعوان فی رأی فی قولهم إن الحفدة الخدم والأعوان فقد خرجت خدمة الولد والزوجة من القرآن بابدع بیان قاله ابن العربی"۔

امام قرطبی نے ابن العربی کے حوالہ سے فرمایا کہ حفدہ کے معنی اعوان و انصار و خدمتگار و مددگار کے ہوتے ہیں، لہذا اس کے اولاد کا خدمتگار ہونا قرآن کریم کے بیان سے انوکھے طریقے پر ثابت ہوتا ہے (تفسیر قرطبی ۱۰/ ۹۵)، اسی طریقے سے ارشاد خداوندی ہے: "وبنين شهودا" (اور دیا میں نے بیٹے مجلس میں بیٹھنے والے) (ترجمہ شیخ الہند سورہ مدثر ۱۳) اللہ تعالیٰ نے پاس رہنے والے بیٹوں کو موضع نعمت میں شمار کیا ہے، حضرت مفتی محمد شفیع فرماتے ہیں: اس سے معلوم ہوا کہ جب اولاد کا پیدا ہونا اور اس کا باقی رہنا اللہ تعالیٰ کے انعامات ہیں، اسی طرح اولاد کا اپنے پاس حاضر و موجود ہونا بھی ایک بڑا انعام ہے جو والدین کے لئے آنکھوں کی ٹھنڈک اور قلب کے سکون کا سب سے بڑا ذریعہ ہے، ان کی حاضری سے اپنی خدمت کاروبار میں امداد کا فائدہ مزید برآں، صرف سونے چاندی کے سکوں، بلکہ ان سکوں کے اقرار ناموں (نوٹوں) کا نام عیش و آرام رکھ لیا ہے جس کے لئے والدین بڑے فخر سے اولاد کو دوسرے ملکوں میں پھینک دیتے ہیں اور اس پر خوش ہوتے ہیں کہ اگرچہ سالہا سال بلکہ عمر بھر اولاد کی صورت بھی نہ دیکھیں، مگر ان کی بڑی تنخواہ اور آمدنی کی خبر ان کے کانوں تک پہنچتی ہے اور یہ اس خبر کے ذریعہ اپنی برادری میں اپنی برتری ثابت کرتے رہتے ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ آرام و راحت کے مفہوم سے بھی بے خبر ہو گئے اور اللہ تعالیٰ کو بھلانے کا یہی نتیجہ ہونا چاہئے کہ وہ خود اپنے آپ کو یعنی اپنے اصلی آرام و راحت کو بھی بھول جائے، جیسا کہ قرآن کریم نے فرمایا: "نسوا الله فأنساهم أنفسهم" (سورہ حشر: ۱۹، معارف القرآن ۸/ ۶۱۴، ۶۱۵)، قرآن کریم کی مذکورہ آیت کریمہ سے اس طرف اشارہ ملتا ہے کہ اولاد اپنے والدین کی نگاہوں کے سامنے ہوں یا پاس میں ہوں تو یہ دوسری بڑی نعمت ہے، تا کہ والدین کی ہر طرح کی خدمت میں کام آسکیں، لہذا اگر ماں باپ معذور اور بوڑھے اور خدمت کے محتاج ہیں اور کوئی ان کی خبر گیری کرنے والا نہیں ہے تو ایسی صورت میں زیادہ کمائی کی خاطر والدین سے دور رہنا درست نہیں معلوم ہوتا ہے، کیونکہ ایسے وقت میں ان کی یہ دوری ان کے لئے باعث تکلیف وایذا ہے اور قرآن کریم میں اف کہہ کر ایذا پہنچانے سے منع ہے جو ایذا پہنچانے میں سب سے معمولی و کمتر درجہ ہے تو اس ایذا سے بچانا بھی لازم اور ضروری ہوگا، جیسا کہ آیت کریمہ "فلا تقل لهما أف" (سورہ اسراء: ۲۳) کے بارے میں علامہ آلوسی فرماتے ہیں:

قال العلامة الآلوسي والنهي عن ذلك يدل المنع فی سائر الإيذاء (روح المعانی ۱۵/ ۵۵ سورہ بنی اسرائیل)۔

ایک سوال کے جواب میں حضرت مفتی محمود گنگوہی فرماتے ہیں اور اگر والدین آپ کی خدمت واطاعت کے محتاج ہیں اور ان کے گذارے کی کوئی صورت نہیں ہے اور آپ ہی ان کی خدمت پوری کر سکتے ہیں تو آپ کو اس کی اجازت نہیں کہ ان سے ترک تعلق کر کے کہیں چلے جائیں اور درس نظامی کی تکمیل کریں، بلکہ ان کی خدمت کرتے رہیں اور فارغ وقت میں دینی علم حاصل کر سکتے ہیں اگر وہ آپ کی خدمت کے محتاج نہیں تو اس کا حکم دوسرا ہے پھر ایسی روش اختیار نہ کی جائے جس سے والدین کی حق تلفی ہو (فتاوی محمودیہ جدید ۱۹۰/ ۳۰)

"واعلم أن تعلم العلم يكون فرض عين وهو بقدر ما يحتاج بدينه، وفرض كفاية وهو ما زاد عليه لنفع غيره"

جب علم کے بارے میں یہ حکم ہے تو زیادہ مال حاصل کرنے کی غرض سے والدین کو بے یارومددگار خدمت کا محتاج ہونے کی حالت میں چھوڑ کر جانا کیسے روا ہو سکتا ہے، اس طریقہ سے جہاد جیسی عظیم عبادت ہو جانا والدین کی خدمت کے محتاج ہونے کے وقت ممنوع ہے، وجہ یہ ہے کہ والدین کی اطاعت فرض عین ہے۔

''لأن إطاعتهما فرض عين (درمختار) أي والجهاد لم يتعين فكان مراعاة فرض العين أولى كما في التجنيس وأخفى منه في الكراهة الخروج بلا إذنهما (إلى قوله) وقال عليه الصلاة والسلام للعباس بن مرداس لما أراد الجهاد: الزم أملك فإن الجنة تحت رجل أملك (درمختار) قوله وقال عليه السلام الخ. وقيل: آخر على تقديم الوالدين. وقدمنا الحديث المتفق عليه وفيه تقديم برهما على الجهاد وفي صحيح البخاري في الرجل الذي يستأذن النبي ﷺ الجهاد. قال: أحي والداك؟ قال: نعم. قال ففيهما فجاهد'' (زکریا ۶/ ۲۰۳ کتاب الجهاد) مطلب طاعة الوالدين فرض عين۔

خلاصہ یہ کہ آپ سے جہاد میں جانے کی اجازت چاہنے پر آپ نے سائل کو والدین کی خدمت کرنے کا حکم دیا، جس سے واضح ہے کہ خدمت اور ضرورت کے وقت والدین کے پاس رہ کر ان کی دیکھ ریکھ کی جائے اور ساتھ اپنے دیگر امور انجام دیئے جائیں، والدین کو چھوڑ کر زیادہ مال کے حصول کے ارادہ سے دور دراز بطور خاص غیر ملکی اسفار نہ کئے جائیں، الآداب الشرعیۃ میں ہے:

''وقال الشيخ تقي الدين بعد قول أبي بكر: هذا يقتضي قوله أن يبرا في جميع المباحات فما أمره ائتمر وما فيهما. انتهى وهذا فيما منفعة لهما، ولما ضرر عليه فيه ظاهر مثل ترك اسفر وترك المبيت عنهما ناحية'' (الآداب الشرعیہ ۱/ ۴۶۳ المقدس)

یعنی والدین کی تمام مباح امور میں اطاعت کی جائے جس کام کو کہیں اس کو بجالایا جائے اور جس سے منع کریں اس سے رکا جائے جیسے کہ سفر کا ترک کرنا وغیرہ، مذکورہ تصریحات سے واضح ہوا کہ زیادہ آمدنی کی خاطر والدین کو چھوڑ کر دوسری جگہ جانا جبکہ وہ خدمت کے محتاج ہوں جائز نہیں۔

حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں کہ قرآن مجید میں حق تعالیٰ نے نسب کے ساتھ علاقہ مصاہرہ (سسرالی رشتہ) کو ذکر فرمایا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ ساس اور سسر کا بھی کسی قدر حق ہوتا ہے، اس لئے ان تعلقات میں بھی احسان اور اخلاق کی رعایت کسی قدر خصوصیت کے ساتھ رکھنا چاہئے (حقوق الاسلام: ۱۵ تحفۃ الزوجین/ ۵۷)۔

ب: ایک قانونی فرض ہے اور اخلاقی فرض ہے، میاں بیوی کا معاملہ اگر قانونی فرض تک محدود رکھا جائے تو نہ مرد عورت سے کوئی خدمت لے سکتا ہے نہ عورت علاج معالجہ کے لئے شوہر سے کہہ سکتی ہے اور اخلاقی فرض کا جہاں تک تعلق ہے، آج کل شریف گھرانوں میں اسکا چلن ہے، اور یہ بالکل صحیح ہے۔

''وليس عليها أن تعمل بيدها شيئًا لزوجها قضاء من الخبز والطبخ وكنس البيت وغيرذلك'' (الخانیہ علی الهندیة ۱/ ۴۴۲) ''ويجب عليه ما يقطع به الضان ولا يجب الدواء للمرض ولا أجرة الطبيب ولا الفصد ولا الحجامة'' (كذا في السراج الوهاج هندية: ۱/ ۵۴۹)۔

''قالوا: إن هذه الأعمال واجبة عليها ديانة، وإن كان لما يجبرها القاضي. كذا في البحر الرائق'' (ہندیہ ۱/ ۵۴۸)۔

ساس اور سسر کی خدمت اگر بہو نہیں کرتی ہے تو اسے مجبور نہیں کیا جاسکتا ہے اور اگر بہ خوشی یہ خدمت انجام دے تو یہ اس کی سعادت ہے (مستفاد آپ کے مسائل اور ان کا حل ۶/ ۳۴۳)۔

حضرت مفتی محمود حسن گنگوہی فرماتے ہیں: شرعا ہندہ کے ذمہ شوہر کی ماں کی خدمت واجب نہیں، اخلاقی طور پر عورت کو اس کا خیال کرنا چاہئے کہ وہ اس کے شوہر کی ماں ہے تو اپنی ماں کی طرح اس کو بھی راحت پہنچانے کا خیال رکھے اور شوہر کی اطاعت کرے، آخر ہندہ کو ضرورت پیش آتی ہے تو شوہر کی ماں اس کی خدمت کرتی ہے (فتاوی محمودیہ جدید ۱۸/ ۶۱۶)۔

آپ مزید فرماتے ہیں: جو امور شرعا مباح ہوں اور عورت ان پر قادر ہوں، یعنی بلانا قابل برداشت مشقت کے کر سکتی ہو تو وہ شوہر کے امر کی وجہ سے واجب ہو جاتے ہیں ہاں معصیت میں شوہر کی اطاعت ناجائز ہے (فتاوی محمودیہ جدید: ۱۸/ ۶۰۶)

''وحق الزوج... وحقه عليها أن تعطيه في كل مباح يأمرها به (درمختار) ظاهر أنه عنه إلا به منه يكون واجبًا عليها كأمر السلطان الرعية'' (شامی زکریا ۴/ ۲۸۸ باب القسم)۔

فقہاء کرام کی تصریحات سے واضح ہوتا ہے کہ عورت پر شوہر کی ہر مباح امور میں اطاعت واجب ہے جس طرح بادشاہ اور سلطان کی اطاعت رعایا پر واجب ہے، اور ظاہر ہے شوہر کے والدین کی خدمت سے شوہر کو راحت ہوگی اور ساس سسر کی خدمت بھی مباحات میں سے ہے، لہذا اگر شوہر عورت کو کہے تو اس کو شوہر کی اطاعت کرنا لازم ہوگا، حضرت تھانوی نے گھروں میں فساد نہ ہونے کی طرف اشارہ فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے: جب تک سسر اور ساس زندہ ہیں ان کی خدمت کو ان کی تابعداری کو فرض جانو اور اس میں اپنی عزت سمجھو اور ساس و نندوں سے الگ ہو کر رہنے کی ہرگز فکر نہ کرو کہ ساس نندوں سے بگاڑ ہو جانے کی یہی جڑ ہے خود سوچو کہ ماں باپ نے اس کو پالا پوسا اور اب بوڑھاپے میں اس آسرے پر اس کی شادی بیاہ کیا کہ ہم کو تو آرام ملے اور جب بہو آئی تو گھر آتے ہی یہ فکر کرنے لگی کہ میاں آج ہی سے ماں باپ کو چھوڑ دیں، جب ماں کو معلوم ہوتا ہے کہ میرے بیٹے کو ہم سے چھوڑاتی ہے تو فساد پھیلتا ہے (بہشتی زیور ۴/ تحفۂ زوجین: ۷۵)، لیکن یہ سب اخلاقی تعلیم ہے ورنہ شرعاً عورت کو حق حاصل ہے کہ اپنی ساس سسر سے علاحدہ رہنے کا مطالبہ کرے اور شوہر پر اس مطالبہ کا پورا کرنا لازم ہے (تحفۂ زوجین/ ۷۵)۔

''وتجب السكنى لها عليه في بيت خالٍ عن أهله وأهلها ألا أن تختار لذلك. كذا في العيني شرح الكنز'' (ہندیہ ۱/ ۵۵۶)

حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب فرماتے ہیں: زید کے والدین کا ادب و احترام اور معمولی عرفی خدمت جس میں زوجہ پر کوئی مشقت اور تکلیف نہ ہو تو کرنی بہتر ہے اس سے زیادہ زوجہ کے ذمہ لازم نہیں (کفایت المفتی ۵ / ۲۴۳)۔

خلاصہ ان سطور کا یہ ہوا کہ عورت پر ساس سسر کی خدمت اخلاقی چیز ہے قانونی نہیں اگر عورت خدمت کرتی ہے تو اس کے لئے موجب سعادت ہے ورنہ جبر نہیں کیا جا سکتا ویسے شوہر کو خوش کرنے کے لئے اس کی امر مباح میں اطاعت کرنا چاہئے، جبکہ ساس سسر کو شدید خدمت کی ضرورت ہو۔

شریعت نے عورتوں کو صلہ رحمی اپنانے اور قرابت داری کا خیال کرنے کے لئے جہاں دیگر رشتہ داروں سے ملاقات کے لئے سال بھر میں ایک مرتبہ کی اجازت دی ہے، وہیں والدین سے ملاقات اور خیر خیریت کے لئے ہفتہ میں ایک مرتبہ کی اجازت دی ہے، اور شوہر کو روکنے سے منع کیا ہے۔

''ولا يمنعها من الخروج إلى الوالدين في كل جمعة إن لم يقدر على إتيانها على ما اختاره في الاختيار ولو أبوها زمنًا فاحتاجها فعليها تعاهده ولو كافرًا، وإن أبي الزوج فتح ويمنعها من الدخول عليها في كل جمعة وفي غيرها من المحارم في كل سنة لها الخروج ولهم الدخول (درمختار)، قوله: فعليها تعاهده أي بقدر احتياجه إليها. وهذا إذا لم يكن له من يقوم عليه، كما قيده في الخانية''۔

یعنی باپ اگر معذور ہو تو ملاقات اور ان کی دیکھ ریکھ کے لئے اگر کوئی دیکھ بھال کرنے والا نہیں ہے تو لڑکی کو اجازت ہے، شوہر پر لازم ہے کہ اس کی اجازت دے (شامی زکریا ۵ / ۳۲۴ باب النفقہ)، ''وقيل: لا يمنعها من الخروج إلى الوالدين في كل جمعة مرة. وعليه الفتوى، كذا في غاية السروجي'' (ہندیہ ۱/ ۵۵۷، كذا في البحر الرائق ۴/ ۱۹۵)۔

فتاوی قاضی خاں میں ہے:

''امرأة لها أب زمن ليس له من يقوم عليه وزوجها يمنع عن الخروج إليه وتعاهده كان لها أن تعصي زوجها وتطيع الوالد مؤمنا كان الوالد أو كافرًا لأن القيام بتعاهد الوالد فرض عليها فيتقدم على حق الزوج'' (قاضیخاں ۱/ ۴۴۳)

کہ اگر عورت کا کوئی معذور باپ ہو اور اس کی کوئی دیکھ ریکھ کرنے والا نہ ہو اور شوہر اس کے پاس جانے اور اس کی دیکھ ریکھ سے منع کرتا ہو تو اس کے لئے اس معاملہ میں شوہر کا حکم ماننا لازم نہیں ہے، بلکہ والد کی دیکھ بھال کرے اس لئے کہ والد کی خدمت دیکھ ریکھ اسی طریقہ سے جن چند اسباب کی بنا پر شوہر کی اجازت کے بغیر عورت کو گھر سے نکلنے کی اجازت ہے اس میں یہ بھی ہے۔

''قالوا: ليس للمرأة أن تخرج بغير إذن الزوج، إلا بأسباب معدودة (إلى قوله) ومنها الخروج إلى زيارة الوالدين وتعزيتهما وعيادتهما وزيادة المحارم'' (قاضی خان علی الہندیہ ۱/ ۴۴۳)۔

کہ عورت والدین کی زیارت اور انکی تعزیت اور مزاج پرسی کرنے اور دیگر محارم سے ملاقات کے لئے جا سکتی ہے، فقہاء کرام کی مذکورہ تصریحات سے ثابت ہوتا ہے کہ عورت کو اپنے ماں باپ کی دیکھ ریکھ اور ملاقات کے لئے جانے کی اجازت ہے، شوہر پر لازم ہے کہ وہ اس کو نہ روکے۔

حضرات فقہاء کرام نے لڑکے اور لڑکیوں پر تنگ دست والدین کا نفقہ واجب کیا ہے اور یہ نفقہ برابر سرابر لڑکا اور لڑکی دونوں پر لازم ہے۔

''ویجبر الولد الموسر علی نفقة أبیه وأمه إذا کانا محتاجین هکذا ذکر الإمام خواهر زاده (إلی قوله) فإن کان الأولاد ذکورًا أو إناثًا موسرین فنفقة الأبوین علیهم بالسویة فی أظهر الروایتین''

کہ جب اولاد میں مذکر و مونث ہوں یعنی لڑکے اور لڑکیاں ہوں تو والدین کا نفقہ ان پر برابر سرابر واجب ہے (فتاوی تاتارخانیہ ۵/ ۴۲۴)۔

''والضمیر فی قوله ولأبویه یعود إلی الإنسان المفهوم فأفاد بإطلاقه أنه لا فرق بین الذکر والأنثی. وفی الهدایة وهی علی الذکور والإناث بالسویة فی ظاهر الروایة هو الصحیح، لأن المعنی یشملها. وفی الخلاصة وبه یفتی. وفی فتح القدیر، وهو الحق لتعلق الوجوب بالأولاد وهو یشملها بالتسویة الخ'' (البحر الرائق ۴/ ۲۰۶)۔

فتاوی ہندیہ میں ہے: ''وإذا اختلطت الذکور والإناث فنفقة الأبوین علیهما علی السویة فی ظاهر الروایة وبه أخذ الفقیه أبو اللیث وبه یفتی کذا فی الوجیز للکردی'' (عالمگیری ۱/ ۵۶۴)

کہ جب لڑکے اور لڑکیاں مخلوط ہوں تو والدین کا نفقہ دونوں پر برابر برابر واجب ہے ظاہر روایت کے مطابق، شامی میں ہے:

قوله بالتسویة بین الابن والبنت هو ظاهر الروایة، وهو الصحیح بدایه، وبه یفتی، خلاصة وهو الحق فتح'' (شامی زکریا ۵/ ۳۵۵ باب النفقه)۔

جس طرح والدین کو مالی خدمت کی ضرورت ہوتی ہے شریعت نے تنگدستی کی حالت میں ان پر واجب کررکھا ہے، اسی طریقہ سے والدین کو جسمانی و بدنی خدمت کی ضرورت ہوتی ہے، لہذا جب والدین معذور اور محتاج خدمت ہوں تو بیٹوں اور بیٹیوں دونوں پر ان کی خدمت واجب ہوگی، اس لئے کہ جزئیت وقرابت میں دونوں برابر ہیں، اور جس طرح والدین کی زیارت وملاقات سے شوہر کو روکنے کا حق نہ ہوگا، اسی طرح خدمت کے محتاج والدین کو ان کی خدمت کرنے کے لئے شوہر کو روکنے کا حق نہ ہوگا، جیسا کہ قاضی خاں کے جزئیہ سے روشنی ملتی ہے۔

''امرأة لها أب زمن لیس له من یقوم علیه وزوجها یمنعها عن الخروج إلیه وتعاهده کان لها أن تعصی زوجها وتطیع الوالد مؤمنا کان الوالد أو کافرًا، لأن القیام لتعاهد الوالد فرض علیها. فیقدم علی حق الزوج. فتاوی قاضی خان'' (علی الفتاوی الهندیه ۱/ ۴۴۳)۔

اور ''البحر الرائق'' میں ہے:

''ولو کان أبوها زمنا مثلًا وهو یحتاج إلی خدمتها والزوج یمنعها من تعاهده فعلیها أن تعصیه مسلما کان الأب أو کافرًا'' (کذا فی فتح القدیر البحر الرائق ۴/ ۱۹۵، فتح القدیر ۴/ ۲۰۸)۔

خلاصہ یہ کہ ماں باپ کی خدمت جس طرح بیٹوں پر واجب ہے، اسی طرح بیٹیوں پر واجب ہے اگر خدمت کے لئے محتاج والدین ہوں تو شوہروں کو ان کو روکنے کا حق نہ ہوگا جس طرح ان کی زیارت وملاقات اور ان سے گفتگو سے روکنے کا شوہر کو حق نہیں ہے۔

والدین کو نکاح ثانی سے روکنے کا حق نہیں ہے۔

ارشاد خداوندی ہے: "وأنکحوا الأیامی منکم الآیة" (سورہ نور: ۳۲) (اور تم میں سے جو بے نکاح ہوں تو ان کا نکاح کردو)

ایامی ایم کی جمع ہے جس کے معنی ہے بے نکاح شخص عورت ہو یا مرد۔

'(الأیامی) جمع أیم وهی من لیس لها زوج بکرًا کانت ثیبا ومن لیس له زوجة'' (جلالین/ ۲۹۸)

یعنی اس آیت کریمہ میں ہے کہ جو بے نکاح ہوں خواہ مرد ہوں یا عورت اور خواہ ابھی نکاح نہ ہوا ہو یا بیوی کی وفات یا طلاق سے ایسا تجرد ہو گیا ہو اور حقوق زوجیت کرنے کے لائق ہوں تو ہدایت ہے کہ ان کا نکاح کر دیا کرو (فتاوی رحیمیہ ۴/ ۳۳۷)

جن عورتوں کو طلاق دیدی گئی ہو عدت کے بعد اگر وہ اپنا نکاح کرنا چاہیں تو اللہ کا حکم یہ ہے کہ تم ان کو نکاح کرنے سے مت روکو، قرآن کریم میں ہے:

وإذا طلقتم النساء فبلغن أجلهن فلا تعضلوهن أن ينكحن أزواجهن إذا تراضوا بينهم بالمعروف" (سورہ بقرہ: ۲۳۲)

(اور جب تم میں سے ایسے لوگ پائے جائیں کہ وہ اپنی بیویوں کو طلاق دیدیں پھر وہ عورتیں اپنی میعاد (عدت) پوری کر چکیں، اور عورت پوری کر کے کسی سے نکاح کرنا چاہیں خواہ پہلے ہی شوہر سے یا کسی دوسری جگہ) توتم ان کو اس امر سے مت روکو کہ وہ اپنے (تجویز کردہ شوہروں سے خواہ اول ہو) یا ثانی) نکاح کرلیں جب کہ باہم سب رضامند ہوجائیں قاعدہ کے موافق) (سورہ بقرہ: ۲۳۲)۔

جس طرح مطلقہ عورت کسی جگہ نکاح کرنا چاہے تو روکنا نہ چاہئے اسی طرح مرد نکاح کرنا چاہے تو اس کو بھی روکنا نہ چاہئے چونکہ نکاح بہت سی چھوٹی بڑی خرابیوں سے بچنے کا ذریعہ ہے، اس سے دین وایمان کی حفاظت ہوتی ہے، حدیث میں ہے:

''عن أنس قال: قال رسول اللهﷺ: إذا تزوج العبد فقد استكمل نصف الدين فليتق الله في الباق'' (مشکوۃ/ ۲۶۸)

(حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب بندہ نے نکاح کرلیا تو اس نے نصف دین کی تکمیل کا انتظام کرلیا اب اس کو چاہئے کہ باقی نصف میں اللہ کا تقوی اختیار کرے) تو اس کے بھی حفاظت ہوجائے گی جو شخص بے نکاح ہو اس کے لئے آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے: ''مسکین مسکین مسکین من لیس لہ امرأۃ'' (مسکین ہے مسکین ہے مسکین ہے وہ شخص جس کی عورت نہیں ہے)۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ بغیر نکاح کے عبادات کامل نہیں ہوتیں، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا ارشاد ہے کہ اگر مجھے یہ معلوم ہوجائے کہ میری زندگی کے صرف تین دن باقی ہیں اور میری بیوی نہ ہو تو میں اس کو پسند کروں گا کہ نکاح کرلوں کہ اللہ پاک سے ملاقات شادی شدہ ہوکر کروں، حضرت معاذؓ کی دو بیویوں کا طاعون میں انتقال ہوچکا اور خود بھی اس مرض میں مبتلا تھے پھر بھی فرمایا کہ میرا نکاح کرو میں اس کو پسند نہیں کرتا کہ اللہ پاک سے غیر متاہل ہوکر ملوں (از فضائل نکاح/ ۱۶۔ ۱۷، تالیف حضرت باندویؒ، مستفاد فتاوی رحیمیہ جدید ۴/ ۳۳۷، ۳۳۹)، قرآنی آیت حدیث نبوی اور آثار صحابہ سے ثابت ہوا کہ نکاح ثانی کرنا نہ صرف جائز، بلکہ مستحسن ہے، لہذا والدہ کے فوت ہونے کے بعد والد کی شادی میں اولاد کا روکاٹ بننا گناہ کا کام ہے، گویا شریعت کے ایک حکم سے ناراضگی ہے اور شریعت کے حکم سے روگردانی ہے جس سے توبہ واستغفار لازم ہے اور جب والد کے لئے نکاح ثانی کرنا جائز ودرست ہے، اور اپنی وشرعی ضرورت کے ساتھ دنیوی ضرورت بھی ہے، لہذا اگر والد اپنی بیوی کی کفالت کی صلاحیت نہ رکھتے ہوں تو جس طرح والدہ کا نفقہ اولاد پر واجب ہے، اسی طرح والد کے خادم کا نفقہ واجب ہوگا، اب یہ خادم خواہ ان کی اہلیہ ہوں یا اور کوئی لہذا اس اعتبار سے والد کی بیوی یعنی سوتیلی والدہ کا نفقہ اولاد پر واجب ہوگا فتاوی قاضیخاں ہے:

''وكما يجب على الابن الموسر نفقة والده الفقير يجب عليه نفقة خادم الأب امرأة كانت الخادم أو جارية إذا كان الأب محتاجا إلى من يخدمه'' (فتاوی قاضیخاں علی هامش الهنديه ۱/ ۴۴۸)۔

یعنی جیسا کہ مالدار بیٹے پر اس کے محتاج باپ کا نفقہ واجب ہے، اسی طرح باپ کے خادم کا نفقہ واجب ہے اب یہ خادم خواہ بیوی ہو یا باندی ہو جبکہ باپ کو خادم کی ضرورت ہے (قاضیخاں علی الہندیہ ۱/ ۴۴۸ کذافی النہر الفائق ۲/)۔

۷۔ انسان کو اپنوں سے دور کرنا خصوصاً ایسی صورت میں جبکہ وہ خدمت کا شدید محتاج ہوچکا ہو اور کسی ہاسٹل میں لے جاکر مقید کرنا یہ کسی سزا دینے اور جیل خانہ سے کم نہیں، اس میں ان کو نہایت اذیت پہنچانا ہے، اللہ تعالی نے اولاد اور احفاد کو خدمت گار بنایا ہے ارشاد خداوندی ہے:

"وجعل لكم من أزواجكم بنين وحفدة" (سورہ نحل: ۷۲) (اور دیئے تم کو تمہاری عورتوں سے بیٹے اور پوتے)

اس آیت میں لفظ حفدہ سے اسی طرف اشارہ ہے کہ اولاد کو اپنے ماں باپ کا خادم ہونا چاہئے کیونکہ حفدہ کے اصل معنی مددگار اور خدمت گار کے ہیں (مستفاد معارف القرآن ۵/ ۳۷۸)، جیسا کہ تفسیر قرطبی میں ہے:

''إن الحفدة الخدم والأعوان فقد خرجت خدمة الولد والزوجة من القرآن بأبدع بيان قاله ابن العربي'' (الجامع لاحكام القرآن للقرطبی ۱۰/ ۹۵)۔

جب اللہ تعالی نے اولاد کو والد کے لئے خدمت گار بنایا ہے تو اس کا تقاضا یہ ہرگز نہیں ہے کہ ان کو اپنے سے دور رکھ کر کسی اور تنظیم وسنستھا کے ذریعہ ان کی خدمت کرائی جائے جبکہ اولاد کا پاس رہنا اللہ تعالی نے موضع نعمت میں شمار کیا ہے، وبنين شهودا (سورہ مدثر) اولاد سے اور عورتوں سے دور کرنا نعمت سے محروم کر کے اذیت پہنچانا ہے، حالانکہ اللہ تعالی نے ادنی تکلیف واذیت رسانی سے منع کیا ہے ارشاد خداوندی ہے: ولا تقل لهما أف الخ (سورہ اسراء: ۲۳) کہ ان کو

کبھی ہاں سے ہوں بھی مت کہنا (خلاصہ تفسیر معارف القرآن ۵ / ۴۶۲) بروایت حضرت علیؓ رسول کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ ایذا رسانی میں اف کہنے سے بھی کم کوئی درجہ ہوتا تو یقیناً وہ بھی ذکر کیا جاتا۔

حاصل یہ ہے کہ جس چیز سے ماں باپ کو کم سے کم بھی اذیت پہنچے وہ بھی ممنوع ہے (معارف القرآن ۵/ ۴۶۶) اور ظاہر ہے کہ معذورین کے ہاسٹل میں والد کو داخل کرنے میں بدرجہا اذیت ہے، اس لئے ہاسٹلوں میں قیام پر مجبور کرنا شرعاً ممنوع وحرام ہوگا نیز اللہ تعالیٰ نے والدین کے ساتھ معروف کا حکم دیا ہے اور معروف یہ نہیں ہے کہ بیٹے عیش وعشرت کے مزے اڑائیں اور بوڑھا باپ اپنے عزیز واقارب سے دور قید تنہائی کی صعوبت جھیلے اور کڑھ کڑھ کر مرے، معروف ان کے ساتھ یہی ہے کہ ان سے حسن اخلاق سے پیش آئے اور حسن سلوک کا مظاہرہ ہے اپنے گھر پر اپنی نگاہ کے سامنے رکھ کر ان کی جملہ ضروریات کا تکفل کرے، ارشاد خداوندی ہے: "وصاحبهما في الدنيا معروفا" (سورۂ لقمان: ۱۵)

"وليس من المعروف أن يعيش الرجل في نعم الله ويتركهما أي الأبوين يموتان جوعًا والمعروف هو المحاسنة بالخلق الجميل والحلم ولاحتمال والبر والصلة وبما يقتضيه الكرم والمعروف (النهاية في شرح الهداية ۵/ ۵۲۱)۔

خلاصہ یہ کہ معذورین کے ہاسٹل میں والد بزرگوار کو قیام مجبور کرنے میں ان کے ساتھ ناز یبا سلوک کرنا ان کو اذیت پہنچانا ہے، لہذا ان کو وہاں قیام پر مجبور نہیں کیا جا سکتا ہے شرعاً گناہ اور حرام ہے۔

۸۔ جبکہ ایسے معذور اور بوڑھے لوگ جن کی خبر گیری کرنے والے کوئی بھی رشتہ دار نہ ہو اور وہ خود مستحق زکوۃ ہوں اور وہ کسی نصاب کے مالک نہ ہوں تو ان پر تملیکاً خرچ کرنے کے لئے زکوۃ کی رقم استعمال کی جا سکتی ہے۔

"مصرف الزكوة هو فقير وهو من له أدنى شئي أي دون نصاب" (درمختار زكريا ۳/ ۲۸۳)

"وهو من أدنى شئي وهو ما دون النصاب الخ كذا في فتح القدير" (عالمگیری ۱/ ۱۸۷ الباب السابع في المصارف)

"هو أي المصرف الفقير وهو من له شئي دون النصاب فيجوز الدفع له. ولو كان صحيحًا مكتسبا كما في العناية" (مجمع الانہر ۱/ ۲۲۵ باب البيان احكام المصارف)

اور اجتماعی کفالت کے لئے کسی انجمن، تنظیم یا ادارہ قائم کیا جا سکتا ہے۔ حضرت مفتی عزیز الرحمن صاحب عثمانی فرماتے ہیں سوال ایسی انجمن قائم کرنا جس میں مال زکوۃ مساکین پر صرف ہوتا ہو جائز ہے یا نہیں جواب درست ہے (فتاویٰ دار العلوم دیوبند ۶/ ۳۳۸، مستفاد فتاویٰ نظامیہ ۱/ ۱۰۹)۔

حضرت مفتی محمد یوسف لدھیانوی شہید فرماتے ہیں جن اداروں اور تنظیموں کے بارے میں پورا اطمینان ہو کہ وہ زکوۃ کی رقم کو ٹھیک طریقے سے صحیح مصرف میں خرچ کرتے ہیں تو ان کو زکوۃ دی جائے ورنہ نہیں، دوسری جگہ فرماتے ہیں: اگر یہ ادارے محتاج اور مستحق افراد کو اس رقم کا مالک بنا دیتے ہیں تو زکوۃ ادا ہوگئی (آپ کے مسائل اور ان کا حل جدید ۵/ ۱۷۷، ۱۷۰)۔

خلاصہ یہ ہے کہ ایسے مستحق معذوروں کی اجتماعی کفالت زکوۃ کی رقم تملیکاً کا استعمال کے لئے لی جا سکتی ہے۔

۹۔ سرکاری یا غیر سرکاری اداروں کی طرف عمر دراز لوگوں کو ان کی درازی عمر کی بنا پر جو مراعات دی جاتی ہے وہ خاص اس عمر کے لوگوں کا حق ہوتا ہے کم عمر یا غیر مستحق لوگوں کو ان مراعات کے حصول کے لئے جھوٹ اور دھوکہ یا رشوت وغیرہ کا سہارا لینا ہو اور اس غیر شرعی طریقہ سے مال کا حصول یا رعایت کا فائدہ اٹھانا ہوگا جو سراسر گناہ ہے، ارشاد خداوندی ہے: "ولا تأكلوا أموالكم بينكم بالباطل" (البقرۃ: ۱۸۸)

"وفي أحكام القرآن للجصاص (۱/ ۲۵) وأكل المال بالباطل على وجهين: أحدهما أخذه على وجه الظلم والسرقة والخيانة والغصب وما جراه مجراه قوله بالباطل أي بالحرام بالربا والقمار والغصب السرقة والخيانة ونحوه" (تفسیر بغوی ۲/ ۵۰ بحوالہ آپ کے مسائل اور ان کا حل جدید ۷/ ۳۱۶) اس طرح کی مراعات اور رقومات کا لینا اور اس کا استعمال کرنا حرام ہے جائز نہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ عمر درازوں کے لئے جو مراعات حکومتوں کی طرف سے جاری ہیں جو لوگ رعایت کے استحقاق کی شرط پورا نہ کرتے ہوں اور کسی غلط طریقے سے اس کے حصول کی کوشش کرتے ہوں تو ایسے غیر شرعی طریقہ سے ایسے مراعات کا حصول ناجائز ہے، گناہ کا کام ہے۔

والدین اور معذوروں کے حقوق کی بابت شرعی ہدایات

مولانا حیدر علی قاسمی [1]

ا۔ یوں تو دنیا کے ہر دھرم اور ہر مذہب میں والدین، اعزہ و اقارب، بزرگوں کی اطاعت، ان کے ساتھ حسن سلوک، خیر خواہی اور ان کی ضروریات کی تکمیل کی تعلیم دی گئی ہے، لیکن مذہب اسلام میں ان کے لئے مخصوص اور امتیازی حقوق طے کرنے کے ساتھ ساتھ ان کو غیر معمولی مقام و مرتبہ سے بھی سرفراز کیا گیا ہے، حتی کہ خدا کے حقوق کے ساتھ والدین کے حقوق بیان کئے گئے ہیں، دنیا اور آخرت کی کامرانی و کامیابی کی بنیاد والدین کی اطاعت اور ان کی فرمانبرداری پر رکھی گئی ہے، ان کی خبر گیری، نفقہ اور ان کی ضروریات کا پورا پورا لحاظ کیا گیا ہے۔

یہ بھی واضح ہے کہ ہر آدمی کا الگ الگ مقام ہوتا ہے، ہر ایک کے ساتھ مقام و مرتبہ کے لحاظ سے معاملہ کرنا ضروری ہے، بصورت دیگر قدم قدم پر دشواریاں پیش آسکتی ہیں، اسی طرح والدین کا حکم دوسرے اعزہ و اقارب سے ذرا مختلف ہے، اس لئے پہلے والدین کا حکم بیان کیا جائے گا، اس کے بعد دوسرے اعزاء و اقارب کا حکم بیان کیا جائے گا۔

والدین کا حکم:

والدین اگر بوڑھاپے کی عمر کو پہنچ جائیں، اتنے کمزور نہ ہوں کہ کسب معاش نہ کر سکیں، کسی قدر مشقت کے ساتھ سہی وہ کما کر خود اپنی ضروریات کی تکمیل کر سکتے ہیں، تو بھی ان کا نفقہ ان کی اولاد پر واجب ہے، جبکہ وہ محتاج ہوں اور اولاد مالدار ہوں، اولاد کے لئے ان کو کسب معاش پر مجبور کرنا جائز نہیں ہے، جیسا کہ ارشاد باری تعالی ہے: "وبالوالدين إحسانا" (سورہ بنی اسرائیل: ۲۳) (حسن سلوک میں کفالت بھی داخل ہے)۔

دوسری جگہ ارشاد ربانی ہے: "وصاحبهما في الدنيا معروفا" (سورہ لقمان: ۱۵)، یعنی دنیا کے حوائج و معاملات میں (جیسے ان کے ضروری اخراجات اور خدمت وغیرہ) ان کے ساتھ خوبی کے ساتھ بسر کرنا۔

ارشاد نبوی ہے: ''إن أطيب ما أكل الرجل من كسبه وإن ولده من كسبه'' (ابوداؤد ۲/ ۴۹۸)
(بے شک پاکیزہ کھانا جو آدمی کھاتا ہے وہ اپنی کمائی کا ہے اور اس کی اولاد اس کی اپنی کمائی میں سے ہے)۔

ملا علی قاری رقمطراز ہیں: ''وفي الحديث دليل على وجوب نفقة الوالد على ولده'' (مرقات ۶/ ۲۲۸)
(حدیث میں اس بات پر دلیل ہے کہ والد کا نفقہ اولاد پر واجب ہے)۔

صاحب فتح القدیر تحریر فرماتے ہیں: ''إذا كان الأب قادرا على الكسب... يجبر الابن على نفقته ... فالمعتبر في إيجاب نفقة الوالدين مجرد الفقر'' (فتح القدیر ۱/ ۳۷۵)۔
(جب والد کسب معاش پر قادر ہو تو بیٹے کو والد کے نفقہ پر مجبور کیا جائے گا، پس والدین کے نفقہ واجب کرنے میں صرف فقر و فاقہ کا اعتبار ہے)۔

ہندیہ میں مذکور ہے: ''ويجبر الولد الموسر على نفقة الأبوين المعسرين مسلمين كانا أو ذميين قدرا على الكسب أو لم يقدرا'' (ہندیہ ۱/ ۵۶۴) (اور مالدار اولاد کو تنگدست (محتاج) والدین -خواہ مسلمان ہوں یا ذمی ہوں- کے نفقہ پر مجبور کیا جائے گا، والدین کمانے پر قادر ہوں یا نہ ہوں)۔

---

[1] جامعۃ اسلامیہ جلالیہ ہوجائی، نوگاؤں، آسام۔

دوسرے اعزہ واقارب کا حکم:

اگر والدین کے علاوہ دوسرے اعزہ واقارب ہوں، جو بوڑھاپے کی عمر کو پہنچ جائیں، اتنے کمزور نہ ہوں کہ کسب معاش نہ کرسکیں، کسی قدر مشقت کے ساتھ سہی وہ کما کر خود اپنی ضرورت پوری کرسکیں، تو اپنے اعزہ واقارب کا نفقہ دوسرے پر واجب نہیں ہے، بلکہ خود کما کر اپنی ضروریات پوری کریں گے، اگر یہ لوگ نہ کمائیں تو دوسرے اعزہ واقارب (جن کے ذمہ ان کا نفقہ ان کی محتاجی کی صورت میں واجب ہے) ان کو کمانے اور کسب معاش پر مجبور کرسکتے ہیں، چنانچہ صاحب "شرح وقایہ" رقمطراز ہیں:

"والحاصل أنه لاتجب نفقة ذی رحم محرم علی الموسر إلا عند حاجته إلیها. وهی إنما یکون بالفقر والصغر والأنوثة والزمانة والعمی. فإن هٰذه إمارات العجز. فلاتجب نفقة الذکر القادر علی الکسب" (شرح وقایہ ۲/۱۸۴)

(حاصل یہ ہے کہ ذی رحم محرم کا نفقہ مالدار پر اسی وقت واجب ہے جبکہ وہ نفقہ کا محتاج ہو، اور یہ فقر وفاقہ، کمسنی، مؤنث، اپاہج اور نابینا کی بنیاد پر ہوتا ہے، اس لئے کہ یہ عجز کی علامات ہیں، لہٰذا کسب معاش پر قدرت رکھنے والا مذکر کا نفقہ واجب نہیں ہے)۔

صاحب ہدایہ تحریر فرماتے ہیں: "والنفقة لکل ذی رحم محرم إذا کان صغیرًا فقیرًا أو کانت امرأة بالغة فقیرة أو کان ذکرًا بالغًا فقیرًا زمنًا أو أعمی. فإن القادر علی الکسب غني بکسبه (ہدایہ مع فتح القدیر ۴/ ۳۸۰)

(اور ہر ذی رحم محرم کا نفقہ جبکہ چھوٹا محتاج ہو یا بڑی بالغہ ضرورت مند ہو، یا تو بالغ محتاج اپاہج لڑکا ہو یا نابینا ہو، اس لئے کہ کمانے پر قادر کمانے کے اعتبار سے مالدار ہے)۔

۲۔ اسلام کامل ومکمل مذہب ہے، اس میں کسی چیز کی کمی نہیں ہے، انسانی مزاج سے ہم آہنگ ہے، اس مذہب میں تمام ضروریات اور حالات کا لحاظ کیا گیا ہے، یہاں تک کہ سن رسیدہ حضرات کے نفقہ وعلاج کے احکام بھی بیان کئے گئے ہیں، سن رسیدہ حضرات میں بیوی، والدین، اور دوسرے اعزہ واقارب کا حکم الگ الگ ہے، اس لئے الگ الگ بیان کیا جارہا ہے۔

بیوی کا نفقہ وعلاج:

سن رسیدہ حضرات میں سے اگر بیوی کا معاملہ ہو تو ان کا نفقہ شوہر کے ذمہ ہے جبکہ وہ ناشزہ نہ ہو، چنانچہ ارشاد خداوندی ہے: "علی الموسع قدرہ وعلی المقتر قدرہ متاعًا بالمعروف" (بقرہ: ۲۳۶)، دوسری جگہ ارشاد ربانی ہے: "لینفق ذو سعة من سعته" (طلاق: ۷)۔

اور صاحب ہدایہ رقمطراز ہیں: "النفقة واجبة للزوجة علی زوجها مسلمة کانت أو کافرة إذا سلمت نفسها إلی منزله فنفقتها وکسوتها وسکناها (ہدایہ مع فتح القدیر ۴/ ۳۴۰)

(شوہر پر بیوی کا نفقہ واجب ہے خواہ بیوی مسلمان ہو یا کافرہ جب اپنے آپ کو شوہر کے گھر کے حوالہ کردے تو شوہر پر اس کا نفقہ، کسوہ، اور سکنی واجب ہے)۔

رہی بات بیوی کے علاج کی تو یہ شرعًا واجب نہیں ہے، اگر شوہر علاج کا انتظام نہ کرے تو شوہر کو مجبور نہیں کیا جاسکتا، جیسا کہ فتاوی عالمگیری میں مذکور ہے: "ولا یجب الدواء للمرض ولا أجرة الطبیب ولا الفصد ولا الحجامة" (فتاوی عالمگیری ۱/ ۵۴۹) (بیماری کے لئے دواء، ڈاکٹر، فصد اور حجامت کی اجرت واجب نہیں ہے)۔

صاحب "فتاوی محمودیہ" رقمطراز ہیں: بیماری کی وجہ سے جو کچھ دوا وغیرہ میں خرچ ہوا ہے وہ زوج کے ذمہ واجب نہیں (فتاوی محمودیہ ۲۰/ ۱۴۰)۔

حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ تحریر فرماتے ہیں:

"بیماری کی حالت میں فقط روٹی کپڑے کا خرچ ملے گا، دوا، علاج، حکیم، ڈاکٹر کا خرچ مرد کے ذمہ واجب نہیں (دین کی باتیں/ ۲۷۷)۔

واضح رہے اس پرفتن دور میں الفت ومحبت کی زندگی گزارنے کے لئے اور ازدواجی زندگی کو خوشگوار بنانے کے لئے زوج کے لئے بہتر ہے کہ وہ دوا، حکیم اور ڈاکٹر وغیرہ کا انتظام بھی کرے، تاکہ بیوی ہموم وافکار اور مصائب ومشکلات سے دوچار نہ ہو، سکون کے ساتھ زندگی گزار کر شوہر کی خدمت اور ان کے حقوق کی رعایت کرسکے، جیسا کہ صاحب "فتاوی محمودیہ" تحریر فرماتے ہیں: اگر زوج وہ خرچ دیدے تو اس کا احسان ہے (فتاوی محمودیہ ۲۰/ ۱۴۰)۔

اور تھانویؒ رقمطراز ہیں: اپنے پاس سے خرچ کرے اگر مرد دیدے تو اس کا احسان ہے (دین کی باتیں/۲۷۷)۔

والدین واجداد کا نفقہ وعلاج:

سن رسیدہ حضرات میں سے اگر والدین واجداد کا معاملہ ہو، تو ان حضرات کا نفقہ وعلاج اولاد پر اسی صورت میں واجب ہوگا، جبکہ یہ حضرات محتاج ہوں، اور نفقہ وعلاج کے ضرورت مند ہوں، اگر چہ کسب معاش کی صلاحیت رکھتے ہوں، چنانچہ ارشاد ربانی ہے: "وبالوالدین إحسانا" (سورہ اسراء: ۲۳) اسی طرح وہ آیات واحادیث جن میں والدین کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا گیا ہے، حسن سلوک کی مختلف شکلیں ہیں، ان میں سے ایک شکل ہے جان ومال سے والدین کی خدمت کرنا۔

حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب زید مجدہم اپنی کتاب "تحفۃ الالمعی" میں تحریر فرماتے ہیں: والدین کے ساتھ نیک سلوک کی شکلیں یہ ہیں:

(۱) ان کی زندگی میں جان ومال سے ان کی خدمت کرنا اور ہمیشہ ان کو خوش رکھنا (تحفۃ الالمعی ۵/۲۳۶)۔

قاضی ثناء اللہ پانی پتی "وصاحبهما في الدنيا معروفاً" (سورہ لقمان: ۱۵) کی تفسیر میں رقمطراز ہیں: اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ ماں باپ خواہ کافر ہوں، لیکن اگر صاحب احتیاج ہیں تو ان کی مالی مدد کرنا اور قرابتداری کو نہ توڑنا واجب ہے (تفسیر مظہری ۹/۱۷۲)۔

صاحب ہدایہ فرماتے ہیں: "وعلى الرجل أن ينفق على أبويه وأجداده وجداته إذا كانوا فقراء" (ہدایہ مع فتح القدیر ۴/۳۸۰) (اور مرد پر ضروری ہے کہ وہ اپنے والدین، اجداد اور جدات پر خرچ کرے جبکہ وہ محتاج ہوں)۔

والدین کے علاوہ دیگر اعزہ واقارب کا نفقہ وعلاج:

سن رسیدہ حضرات میں سے اگر بیوی، والدین، اجداد وجدات کے علاوہ دیگر اعزہ واقارب کا معاملہ ہو تو ان کا نفقہ دوسروں پر اسی وقت واجب ہوگا جبکہ وہ محتاج اور ضرورت مند ہوں، کمانے کھانے اور کسب معاش کی صلاحیت بھی نہ رکھتے ہوں، اپنی ضروریات کی تکمیل سے عاجز ہوں، اور جن پر ان کا نفقہ وعلاج واجب ہے وہ خود موسر ہو یعنی کوئی بھی مال اس کے پاس نصاب کے بقدر ہو جو کسی شخص پر زکوۃ حرام ہونے اور صدقۃ الفطر واجب ہونے کا نصاب ہے، یہ امام ابو یوسف کا قول ہے، اور بعض مشائخ نے اسی کو ترجیح دی ہے، امام محمدؒ کے نزدیک جس کے پاس اپنے ماں، باپ، بال بچوں کے ایک ماہ کے نفقہ سے زائد مال موجود ہو وہ موسر ہے (فتح القدیر ۴/ ۲۳-۴۲۲)۔

واضح رہے کہ اگر یہ اعزہ واقارب محتاج ہوں لیکن کمانے پر قادر ہوں اور کسب معاش کی صلاحیت رکھتے ہوں تو ان کا نفقہ وعلاج دوسروں پر واجب نہیں ہوگا بلکہ خود کما کر اپنی ضروریات کی تکمیل کریں گے۔

چنانچہ حاشیہ شرح وقایہ میں مذکور ہے: "والحاصل أنه لا تجب نفقة ذي رحم محرم على الموسر إلا عند حاجته إليها وهي إنما يكون بالفقر والصغر والأنوثة والزمانة والعمى، فإن هذه إمارات العجز. فلا تجب نفقة الذكر القادر على الكسب" (حاشیہ شرح وقایہ ۲/ ۱۸۴)۔

(حاصل یہ ہے کہ ذی رحم محرم کا نفقہ دولت مند پر واجب نہیں مگر جبکہ وہ نفقہ کے محتاج ہوں اور یہ فقر وفاقہ، کمسنی، انوثت، اپاہج اور نابینا کی بنیاد پر ہے، اس لئے کہ یہ عجز کی علامات ہیں، تو کمانے پر قدرت رکھنے والا مرد کا نفقہ واجب نہیں ہے)۔

اور صاحب ہدایہ رقم طراز ہیں: "والنفقة لكل ذي رحم محرم إذا كان صغيرًا فقيرًا أو كانت امرأة بالغة فقيرة أو كان ذكرًا بالغًا فقيرًا أو أعمى، فإن القادر على الكسب غني بكسبه" (ہدایہ مع الفتح ۴/ ۴۲۸) (اور ہر ذی رحم محرم کا نفقہ جبکہ یہ چھوٹا حاجتمند ہو یا بالغہ محتاج عورت ہو یا بالغ محتاج اپاہج مذکر ہو یا نابینا ہو، اس لئے کہ کمانے پر قدرت رکھنے والا کمائی کی وجہ سے مالدار ہے)۔

حکیم الامت حضرت تھانویؒ رقمطراز ہیں:

اپنے سگے اگر محتاج ہوں اور کھانے کمانے کی قدرت نہ رکھتے ہوں، تو گنجائش کے موافق ان کے ضروری خرچ کی خبر گیری رکھے (بہشتی زیور ۵/۲۸۶)۔

۳- دنیا میں رہنے کے لئے نفقہ کی ضرورت ہے، شریعت اسلامیہ نے اس کا بھی لحاظ کیا ہے، جو لوگ نفقہ اور ضروریات کی تکمیل سے عاجز ہیں، دوسرے لوگ

حسب استطاعت ان کے نفقہ کے ذمہ دار ہیں، تاکہ عاجز اور معذور لوگ بھی اپنی ضروریات کی تکمیل کر سکے، اور دنیاوی ہموم وافکار سے نجات پا کر مقصد اصلی یعنی حصول رضائے الٰہی میں مشغول ہوسکے۔

یہ نفقہ بقدر ضرورت ہی واجب ہے، چنانچہ علامہ کاسانی تحریر فرماتے ہیں:

''وأما بیان مقدار الواجب من هذه النفقة فنفقة الأقارب مقدره بالکفایة بلا خلاف، لأنها تجب للحاجة فتقدر بقدر الحاجة'' (بدائع الصنائع ۳/ ۴۵۱) (بہر حال نفقہ کے وجوب کی مقدار کا بیان تو اقارب کا نفقہ کفایت کے ساتھ مقدر ہے بغیر اختلاف کے، اس لئے کہ یہ حاجت کی وجہ سے واجب ہے، لہٰذا بقدر حاجت ہی مقدر ہے)۔

فقہی قاعدہ ہے: ''الضرورات تقدر بقدرها'' (قواعد الفقہ/ ۸۹)۔

صاحب ''قاموس الفقہ'' تحریر فرماتے ہیں: والدین کا نفقہ جس میں کھانا، پینا، رہائش بھی شامل ہیں بقدر کفایت واجب ہوتا ہے (قاموس الفقہ ۵/ ۲۱۴)۔

لہٰذا بوڑھے والدین یا وہ لوگ جن کا نفقہ محتاجی کی صورت میں ان کے چھوٹوں پر واجب ہے، اگر وہ محتاج نہ ہوں، بلکہ صاحب ثروت ہوں تو زیادہ سہولت کے لئے یا دوسرے لوگوں پر خرچ کرنے کے لئے یا کچھ رقم محفوظ کرنے کے لئے زائد رقم کا مطالبہ نہیں کر سکتے، اگر مطالبہ کرے تو یہ مطالبہ قابل توجہ نہیں ہے۔

البتہ اگر چھوٹے لوگ جن پر واجب ہوتا ہے اپنی خوشی اور رضامندی سے کچھ دیدے تو یہ احسان ہے۔

۴۔ الف: دینی اور دنیاوی ضروریات کی تکمیل کے لئے اسفار کی ضرورت پڑتی ہے، رسول اللہ ﷺ نے جہاد اور دعوت دین کے لئے سفر فرمایا ہے، صحابہ کرام، تابعین عظام اور فقہاء ومحدثین سے بھی اسفار منقول ہیں، سلف صالحین نے تجارت، کسب معاش، اقرباء سے ملاقات اور بیماروں کی عیادت کے لئے بھی سفر کیا ہے، شریعت مطہرہ نے اسفار کی رعایت کرتے ہوئے بہت سارے احکام میں تخفیف کی ہے، جیسا کہ نماز اور روزہ۔

البتہ سفر کی وجہ سے کسی کو تکلیف دینا، کسی کو پریشان کرنا، اور کسی کے حق کو ضائع کرنا جائز نہیں ہے، چنانچہ اگر ماں باپ خدمت کے محتاج ہوں اور بیٹے کے علاوہ دوسرا کوئی خدمت کرنے والا موجود نہ ہو تو والدین کی خدمت کرنا ضروری ہے اور ان کی اجازت کے بغیر سفر جہاد بھی (جبکہ فرض عین نہ ہو) جائز نہیں ہے۔

ارشاد نبوی ہے: ''عن عبد الله بن عمرو قال: قال رجل للنبی ﷺ: أجاهد، قال: لك أبوان؟ قال: نعم، ففیهما جاهد'' (بخاری مع عمدة القاری ۲۲/ ۸۳) (حضرت عبداللہ بن عمرو سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ ایک آدمی نے نبی ﷺ سے کہا کہ کیا میں جہاد میں جا سکتا ہوں، تو حضور ﷺ نے پوچھا: کیا تمہارے والدین ہیں، انہوں نے کہا: جی ہاں، تو حضور ﷺ نے فرمایا ان دونوں میں جہاد کرو)۔

مذکورہ حدیث کی تشریح کرتے ہوئے علامہ عینی رقمطراز ہیں:

''فیهم فیه أنه لا یجاهد إلا إذا أذنا له بالجهاد فیجاهد فیکون جهاده موقوفًا علی إذنهما'' (عمدة القاری ۲۲/ ۸۳)

اس سے معلوم ہو رہا ہے کہ جہاد کرنا جائز نہیں ہے، مگر جبکہ والدین جہاد کی اجازت دیدیں تو جہاد کیا جا سکتا ہے، لہٰذا جہاد کرنا والدین کی اجازت پر موقوف ہے۔

صاحب درمختار تحریر فرماتے ہیں: والدین یا ان میں سے کوئی ایک مریض ہو اور اپنے بچہ کی مدد کا محتاج ہو، کوئی دوسرا تیماردار نہ ہو تو ایسے شخص کا حج یا جہاد کے سفر پر نکلنا جائز نہیں (رد المحتار ۳/ ۲۲۰ بحوالہ قاموس الفقہ/ ۵۵)۔

البتہ اگر سفر کی وجہ سے کسی کو تکلیف نہ ہو، اور ماں باپ کی خدمت کے لئے دوسرا خبر گیری کرنے والا اور دیکھ بھال کرنے والا موجود ہو تو زیادہ آمدنی کے لئے والدین کو چھوڑ کر دوسری جگہ کا سفر کرنا جائز ہے۔ چنانچہ صاحب ''قاموس الفقہ'' تحریر فرماتے ہیں: تاہم دینی اور جائز دنیوی مقاصد کے لئے سفر کرنا درست ہے، البتہ اگر ماں باپ کے لئے خدمت کی متبادل صورت موجود ہو تو نہ ان کا اصرار درست ہے کہ ان کے لڑکے دینی اسفار نہ کریں اور نہ اولاد کے لئے ان کے اصرار کو قبول کرنے کی گنجائش ہے (قاموس الفقہ ۴/ ۱۵۵)۔

۴۔ ب: اسلام سے پہلے عورتوں کی کوئی قدر وقیمت نہیں تھی، ہر طرف سے ظلم وستم ہوتا تھا، عورتیں مجبور وبے کس تھیں، لیکن اسلام نے ان کو وہ مرتبہ اور مقام دیا جس کی کوئی نظیر نہیں ہے، ان کے حقوق کا پورا پورا لحاظ کیا، صنف نازک کے اعتبار سے کسب معاش کی ذمہ داری ان پر نہیں ہے، ان کی راحت آرام، سکون وشانتی اور ان کے ساتھ ہمدردی وخیر خواہی کی وجہ سے کوئی مشکل کام ان کے ذمہ نہیں ہے، چنانچہ فتاوی خانیہ میں مذکور ہے:

''وليس عليها أن تعمل شيئًا لزوجها قضاء من الخبز والطبخ وكنس البيت وغير ذلك'' (خانیہ ۱/ ۴۴۳)
(اور عورت پر قضاءً ضروری نہیں ہے کہ شوہر کے لئے روٹی بنانے، کھانا پکانے اور گھر جھاڑو دینے کا کام کرے)۔

اسی طرح ایک سوال کے جواب میں حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب تحریر فرماتے ہیں: زید کے والدین کا ادب واحترام اور معمولی عرفی خدمت جس میں زوجہ پر کوئی مشقت اور تکلیف نہ ہو کرنی بہتر ہے، اس سے زیادہ زوجہ کے ذمہ لازم نہیں ہے (کفایۃ المفتی د/ ۲۴۳)۔

حضرت مولانا یوسف صاحب لدھیانوی تحریر فرماتے ہیں: اگر بیوی شوہر کے والدین سے الگ رہنا چاہے تو شوہر شرعی قانون کی رو سے بیوی کو اپنے والدین کی خدمت پر مجبور نہیں کرسکتا (آپ کے مسائل اور ان کا حل ۶/ ۳۴۲)۔

صاحب ''تحفہ دولہا'' تحریر فرماتے ہیں: ''عورت کے ذمہ شوہر اور اس کی اولاد کا کھانا پکانا واجب نہیں تو شوہر کے جو ماں باپ اور بھائی بہن ہیں ان کے لئے کھانا پکانا اور ان کی خدمت کرنا بطریق اولی واجب نہیں (تحفہ دولہا/ ۲۴۲)۔

مذکورہ عبارت کی بنا پر اگر بہو ساس، سسر کے ساتھ رہنا نہ چاہے تو بہو کو ساس، سسر کے ساتھ رہنے پر مجبور کرنا درست نہیں ہے، اگر چہ اس کی ساس، سسر کو خدمت کی ضرورت ہو اور بیٹیوں کو ان کے شوہروں کی طرف سے میکہ میں رہنے کی اجازت نہ ہو۔

البتہ ہموم وافکار، شرور وفتن اور ہر قسم کی برائیوں سے بچ کر امن وسکون، الفت ومحبت، اور عزت وراحت کی زندگی گزارنے کے لئے بہو کے لئے مناسب ہے کہ وہ ساس، سسر کو اپنے والدین کی طرح سمجھ کر ان کی خدمت کرے، ان کے ساتھ تعظیم وتکریم اور خیر خواہی کا معاملہ کرے، جیسا کہ حضرت تھانوی تحریر فرماتے ہیں: سسرالی رشتہ کو قرآن میں خدا تعالی نے سب میں ذکر فرمایا، اس سے معلوم ہوا کہ ساس اور سسر اور سالے اور بہنوئی، داماد اور بہو اور بیوی کی پہلی اولاد اور اسی طرح میاں کی پہلی اولاد کا بھی کسی قدر حق ہوتا ہے، اس لئے ان علاقوں میں بھی رعایت احسان واخلاق کی اوروں سے زیادہ رکھنا چاہئے (بہشتی زیور ۵/ ۲۸۶)۔

۴۔ ج: انسان کو وجود حقیقۃً اللہ تعالی نے عطا فرمایا ہے، مگر والدین سبب ظاہری ہیں، اس لئے قرآن کریم کی متعدد آیات میں والدین کے حقوق کو اللہ کے حقوق کے ساتھ ملا کر بیان کئے گئے ہیں، اور احادیث شریفہ میں بھی بہت اہمیت کے ساتھ ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کرنے اور بدسلوکی سے بچنے کا ذکر آیا ہے۔

جن آیات کریمہ اور احادیث شریفہ میں والدین کے ساتھ حسن سلوک، خیر خواہی اور تعظیم وتکریم اور فرمانبرداری کا حکم ہے وہ عام ہے، بیٹا ہو یا بیٹی ہو، کسی کی تخصیص نہیں ہے۔ نیز والدین کے لئے جو مشقتیں بیٹے کی وجہ سے اٹھانی پڑتی ہیں وہ بیٹی کی وجہ سے بھی اٹھانی پڑتی ہیں۔ لہذا جس طرح بیٹوں پر خدمت واجب ہے، اسی طرح بیٹیوں پر بھی خدمت واجب ہے۔

لیکن بیٹیوں کے نکاح کے بعد ان کے ساتھ ان کے شوہروں کے حقوق متعلق ہو جاتے ہیں، اس لئے شوہروں کے حقوق کی رعایت کرنا اور ان کی اطاعت وفرمانبرداری کرنا بہت ضروری ہے، ان کی مرضی کے بغیر کوئی کام کرنا عورتوں کے لئے درست نہیں ہے۔

البتہ اگر والدین بالکل مجبور ہوں اور ایسی بیماری میں مبتلا ہوں کہ بیٹی کے محتاج ہوں بیٹی کے علاوہ کوئی خدمت کرنے والا، خبر گیری کرنے والا اور دیکھ بھال کرنے والا نہ ہو، تو ایسی صورت میں شوہر کے لئے اپنی بیوی کو والدین کی خدمت سے روکنے کا حق نہیں ہے، اور اگر منع کرے تو بیوی کے لئے اس کی اطاعت ضروری نہیں، بلکہ شوہر کی اجازت کے بغیر والدین کی خدمت کے لئے جاسکتی ہے، چنانچہ خانیہ میں مذکور ہے:

''امرأة لها أب زمن ليس له من يقوم عليها زوجها يمنعها عن الخروج إليه وتعاهده كان لها أن تعطي زوجها وتطيع الوالد مومنا كان الولد أو كافرًا؛ لأن القيام بتعاهد الوالد فرض عليها فيتقدم على حق الزوج'' (خانیہ ۱/ ۴۴۳)
(کسی عورت کا باپ اپاہج ہو اس کی خبر گیری کرنے والا نہ ہو، اس کا شوہر اس کو باپ کے پاس جانے اور خبر گیری سے منع کرے، تو عورت کے لئے شوہر کی بات نہ مان کر اپنے والد کی اطاعت کرنا جائز ہے، باپ مومن ہو یا کافر، اس لئے کہ والد کی خبر گیری کرنا عورت پر فرض ہے تو یہ شوہر کے حق پر مقدم ہے۔

اسی طرح صاحب ''درمختار'' رقمطراز ہیں:

''ولو أبوها زمنًا مثلًا فاحتاج فعليها يعاهده وإن كان كافرًا، وإن أبى الزوج'' (درمختار ۲/ ۶۶۴)

(اگر عورت کا باپ مثلاً اپاہج ہو اور بیٹی کی خدمت کا محتاج ہو تو عورت پر اس کی دیکھ بھال واجب ہے گو وہ کافر ہو اور شوہر اس کی اجازت نہ دیتا ہو)۔

۵۔ اسلامی تعلیمات میں ظلم وستم، تنگی وحرج، مشقت وتکلیف اور ایذا رسانی سے بچنے اور بچانے کا پیغام سنایا گیا ہے، سکون وراحت، ہمدردی وخیر خواہی اور ایثار کا سبق پڑھایا گیا ہے۔

امن وسکون اور عافیت کی زندگی گزارنے کے لئے بہت سارے اسباب کی ضرورت پڑتی ہے، ان میں سے ایک اہم سبب اور ذریعہ نکاح ہے، نکاح کے بہت سارے مقاصد اور منافع ہیں، جن کی وجہ سے لوگ جوان سے آخری سانس تک نکاح کے محتاج ہوتے ہیں۔ جب انسان بوڑھاپے کی عمر کو پہنچتا ہے تو اس عمر کے سرد وگرم کو سہنے اور جسمانی وروحانی سکون حاصل کرنے کے لئے بیوی کا محتاج ہوتا ہے۔

ایسی حالت میں باپ کی بیوی کے فوت ہونے کے بعد دوسری شادی کے لئے رکاوٹ بننا باپ کے ساتھ ایذا رسانی اور ظلم وستم کے مترادف ہے، جو شریعت اسلامیہ میں ناجائز اور ممنوع ہے۔

نیز یہ ارشاد ربانی: "وبالوالدین إحسانا" (سورہ اسراء: ۲۳) اور "صاحبهما في الدنيا معروفا" (سورہ لقمان: ۱۵) کے خلاف ہے۔

نیز اگر والد میں اپنی بیوی کی کفالت کی استطاعت نہ ہو اور باپ نکاح کا محتاج ہو، تو مالدار اولاد پر ضروری ہے کہ والد کے نکاح کا انتظام کرے، چنانچہ فتاوی ہندیہ میں ہے: "وإن احتاج الأب إلى زوجة والابن موسر وجب عليه أن يزوجه أو يشتري له جارية" (ہندیہ ۱/ ۵۶۵)

(اگر والد بیوی کا محتاج ہو اور لڑکا مالدار ہو تو اس پر ضروری ہے کہ والد کے نکاح کا انتظام کرے یا والد کے لئے باندی خریدے)۔

۶۔ شریعت اسلامیہ میں عدل وانصاف، امن وامان کی تعلیم دی گئی ہے، ہر ایک کے ساتھ خیر خواہی اور بھلائی کرنے کا سبق سکھایا گیا ہے، کسی پر ظلم کرنا، کسی کو تکلیف دینا، اور ناحق کسی کا مال استعمال کرنا جائز نہیں ہے، ارشاد ربانی ہے: "يأيها الذين آمنوا لا تأكلوا أموالكم بينكم بالباطل" (سورہ نساء: ۲۹)۔

مذکورہ آیت کی تفسیر میں مفتی شفیع صاحب رقمطراز ہیں: اس ارشاد خداوندی کے الفاظ عام ہیں کہ باطل اور ناجائز طریقہ سے کسی کا مال نہ کھاؤ، اس میں کسی کا مال غصب کر لینا بھی داخل ہے، چوری، اور ڈاکہ بھی، جن میں دوسرے پر ظلم کر کے جبراً مال چھین لیا جاتا ہے، اور سود، قمار، رشوت اور تمام بیوع فاسدہ اور معاملات فاسدہ بھی جواز روئے شرع جائز نہیں ہے، اگرچہ فریقین کی رضامندی بھی متحقق ہو، جھوٹ بول کر یا جھوٹی قسم کھا کر کوئی مال حاصل کر لینا یا ایسی کمائی جس کو شریعت اسلامیہ نے ممنوع قرار دیا ہے، اگرچہ اپنی جان کی محنت ہی سے حاصل کی گئی ہو وہ سب حرام اور باطل ہیں، اور قرآن کے الفاظ میں اگرچہ صراحۃً کھانے کی ممانعت مذکور ہے، لیکن مراد اس جگہ صرف کھانا ہی نہیں، بلکہ مطلقاً استعمال کرنا ہے (معارف القرآن: ۱/ ۳۶۰)۔

ارشاد نبوی ہے: "ألا لا تظلموا ألا لا يحل مال امرئ إلا بطيب نفس منه" (مشکوۃ ۱/ ۲۵۵)

(خبردار کسی پر ظلم نہ کرو، جان لو کہ کسی کا مال اس کی رضامندی کے بغیر حلال نہیں ہے)۔

صاحب الاشباہ والنظائر تحریر فرماتے ہیں: "لا يجوز لأحد أن يتصرف في ملك غيره بلا إذنه (الاشباہ والنظائر/ ۲۷۶)

(کسی کے لئے دوسرے کی ملکیت میں مالک کی اجازت کے بغیر تصرف کرنا جائز نہیں ہے)۔

صاحب "رد المحتار" رقمطراز ہیں: "لا يجوز لأحد من المسلمين أخذ مال أحد بغير سبب شرعي" (رد المحتار ۴/ ۶۱)

(کسی مسلمان کے لئے کسی سبب شرعی کے بغیر کسی کا مال لینا جائز نہیں ہے)۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ انسان اپنی زندگی میں مال کا مالک خود ہوتا ہے، اس کے مال کے ساتھ وہ جو چاہے کر سکتا ہے، کسی کے لئے روکنے ٹوکنے کی گنجائش نہیں ہے، البتہ موت کے بعد ورثاء کے حقوق اس مال سے متعلق ہوجاتے ہیں، زندگی میں والد اگر اپنے اختیار سے اولاد کو کچھ دیدے تو یہ ہبہ ہے، اگر والد نہ دے تو اولاد کے لئے مطالبہ کی گنجائش نہیں ہے، اسی قسم کے ایک سوال کے جواب میں صاحب "فتاوی محمودیہ" تحریر فرماتے ہیں: باپ کو ناگوار گذرے تو اجازت نہیں (فتاوی محمودیہ ۲۶/ ۲۹)۔

مذکورہ چیزوں کی بنا پر والد کی زندگی میں اولاد کے لئے جائیداد کا مطالبہ کرنا اور اسے اپنا حق سمجھنا درست نہیں ہے، اگرچہ والدین کی معاشی حالت بہتر ہو اور اولاد محتاج ہوں۔

البتہ والدین کی معاشی حالت بہتر ہونے اور اولاد محتاج ہونے کی صورت میں اولاد کا نفقہ والدین کے ذمہ ہے۔

۷۔ حقیقت یہ ہے کہ بوڑھاپے کا زمانہ انسان کی زندگی میں سب سے زیادہ قابل رحم اور لائق ترس ہوتا ہے، اعضاء جواب دینے لگتے ہیں، عقل کام کرنا چھوڑ دیتی ہے، ہوش وحواس، احساسات اور جذبات میں فتور آجاتا ہے، مایوسی چھا جاتی ہے، ایسی حالت میں ان کے ساتھ حسن سلوک، ادب واحترام اور تعظیم وتوقیر معاملہ بہت ضروری ہے، ارشاد نبوی میں بھی اس کی تاکید کی گئی ہے، چنانچہ ارشاد ہے:

"لیس منا من لم یرحم صغیرنا ولم یوقر کبیرنا" (ترمذی ۲/ ۱۴)۔

دوسری جگہ ارشاد نبوی ہے: "ما أکرم شاب شیخا لسنه إلا قیض الله له من یکرمه عند سنه" (ترمذی شریف ۲/ ۲۲)۔

ایسے لوگوں کی شرعاً کفالت بھی واجب ہے، اگر ماں باپ کا معاملہ ہے تو ان میں کمانے اور کسب معاش کرنے کی صلاحیت ہونے کے باوجود ان کو کسب معاش پر مجبور نہیں کیا جاسکتا، بلکہ بال بچوں پر ان کی ضروریات کی تکمیل واجب ہے، دوسرے اقارب کا حکم ذرا مختلف ہے، اگر کوئی شخص بوڑھاپے کی وجہ سے کسب معاش کی طاقت نہ رکھے اور وہ لاولد ہو تو قریب ترین رشتہ دار پر اسکی ضروریات پوری کرنی واجب ہے، اور اگر وہ خود اس کی صلاحیت رکھے تو دوسروں پر اس کی ذمہ داری نہیں۔

ان حضرات کی رعایت کرتے ہوئے بہت سارے احکام میں تخفیف پیدا کی گئی ہے، جیسا کہ نماز میں قیام پر قدرت نہ ہونے کی صورت میں بیٹھ کر نماز ادا کرنے کی گنجائش، روزہ پر قدرت نہ ہونے کی صورت میں فدیہ کا جواز، فریضہ حج کا معاف ہو جانا وغیرہ۔

بوڑھے اور معذور لوگوں کو ایسے ہاسٹلوں میں رکھنے سے اتباع ہوی لازم آتا ہے، حالانکہ قرآن حکیم سے یہ ممنوع ہے، ارشاد ربانی ہے:

"ولا تتبع الهوی فیضلك عن سبیل الله" (سورہ ص: ۲۶)۔

نیز غیروں کے ساتھ مشابہت اختیار کرنا لازم آتا ہے حالانکہ حدیث میں ہے:

"من تشبه بقوم فهو منهم" (ابوداؤد شریف، حدیث نمبر: ۴۰۳۱ بحوالہ کتاب الفتاوی ۱/ ۳۰۸)۔

مذکورہ چیزوں کے ساتھ ساتھ یہ ایذارسانی اور حق تلفی کے مترادف ہے، جبکہ یہ جائز نہیں ہے ان چیزوں کے پیش نظر ایسے ہاسٹل کا قیام شرعاً جائز نہیں ہے، یہ شریعت اسلامیہ کے خلاف ہے اور اپنے بزرگوں کو ایسے ہاسٹلوں میں قیام پر مجبور کرنا جائز نہیں ہے۔

۸۔ زکوۃ اسلام کے بنیادی ارکان میں سے ایک اہم رکن ہے، یہ امیروں اور مالداروں سے لی جاتی ہے، غرباء وفقراء پر تقسیم کی جاتی ہے، اس کے اغراض ومقاصد میں سے ایک اہم غرض اور مقصد فقراء، غرباء اور ضرورت مندوں کی ضرورت کی تکمیل ہے، بے سہارا اور بے کس لوگوں کے لئے تعاون ہے۔

اس کی ادائیگی کے لئے تملیک ضروری ہے، یعنی بغیر کسی عوض کے کسی کو کلی طور پر مالک بنا دینا تا کہ وہ اپنے مال میں اپنی رضا ورغبت سے حسب ضرورت تصرف کر سکے، جیسا کہ صاحب "درمختار" رقمطراز ہیں: "یشترط أن یکون الصرف تملیکا لا إباحة" (درمختار ۲/ ۸۵) (شرط یہ ہے کہ کسی کو دینا تملیک کے طور پر ہو نہ کہ اباحت کے طور پر)۔

علامہ ابن ہمام فرماتے ہیں: "قوله: لانعدام التملیك وهو الرکن، فإن الله تعالی سماها صدقة وحقیقة الصدقة تملیك المال من الفقیر" (فتح القدیر ۲/ ۲۰۸) (ماتن کا قول تملیک نہ ہونے کی وجہ سے اور یہ رکن ہے، اس لئے کہ اللہ تعالی نے اس کا نام صدقہ کر کے رکھا اور حقیقت صدقہ فقیر کو مال کا مالک بنا دینا ہے)۔

صاحب شرح وقایہ رقمطراز ہیں: "لأنه لا بد أن یملك أحد المستحقین" (شرح وقایہ ۱/ ۲۲۸)

(اس لئے کہ مستحقین میں سے کسی ایک کو مالک بنا دینا ضروری ہے)۔

صاحب "قاموس الفقہ" تحریر فرماتے ہیں: زکوۃ کی رقم سے غلہ خرید کر فقراء کے حوالہ کر دیا جائے یا کھانا بنا کر ان کے درمیان تقسیم کر کے مالک بنا دیا جائے تو یہ بھی کافی ہے (قاموس الفقہ ۴/ ۸۸)۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ جب آدمی بوڑھاپے کی عمر کو پہنچ جاتا ہے، اس کے ہاتھ خالی ہونے سے بے سہارگی اور پریشانی بہت بڑھ جاتی ہے، اور اگر اس کی اولاد

یا قریبی کوئی رشتہ دار موجود نہ ہو تو وہ اس دنیا میں اپنے آپ کو تنہا محسوس کرنے لگتا ہے، جس کی وجہ سے مشقتوں اور تکالیف سے دوچار ہو جاتا ہے۔

ایسی صورت میں اگر اجتماعی کفالت کرنے کے لئے تملیک کی صورت اختیار کی جائے، ہر ایک کو زکوۃ کی رقوم یا سامان کا مالک بنادیا جائے تو زکوۃ کی رقم استعمال کی جاسکتی ہے۔

اور اگر تملیک کی صورت اختیار نہ کی جائے اور ہر ایک کو مالک نہ بنایا جائے تو اجتماعی کفالت کے لئے خصوصی طور پر زکوۃ کا استعمال جائز نہیں ہے، اور کرنے سے زکوۃ بھی ادا نہ ہوگی۔

۹۔ اسلام معتدل اور معتبر مذہب ہے، تمام احکام وحقوق کا جامع ہے، کسی پر ظلم وستم کا تصور اس مذہب میں نہیں ہے، یہاں تک کہ بوڑھوں اور معذوروں کے لئے مناسب احکام نافذ کئے گئے ہیں، اور ان کے لئے خصوصی حقوق طے کئے گئے ہیں۔

حکومتیں بھی عمر دراز لوگوں کے لئے بہت ساری چیزوں میں بعض خصوصی رعایتیں رکھی ہیں، جیسے ٹرین وغیرہ کے کرایہ میں تخفیف، حکومت کی طرف سے امدادی وظیفہ، ٹیکس میں رعایت وغیرہ۔

جو لوگ ان رعایتوں کے لئے مطلوب مقررہ حد عمر کو نہ پہنچے ہوں، ان کے لئے ایسی رعایتوں اور سہولیات سے فائدہ اٹھانے کی صورت میں درج ذیل خرابیاں لازم آتی ہیں۔

(۱) کسی کا مال باطل اور ناحق کے ساتھ کھانا اور استعمال کرنا، جبکہ یہ ناجائز ہے، جیسا کہ اللہ تعالی فرماتے ہیں:

"ولا تأكلوا أموالكم بينكم بالباطل" (سورہ بقرہ: ۱۸۸)۔

اس آیت کی تفسیر میں مفتی شفیع صاحب تحریر فرماتے ہیں: اس ارشاد خداوندی کے الفاظ عام ہیں کہ باطل اور ناجائز طریقہ سے کسی کا مال نہ کھاؤ، اس میں کسی کا مال غصب کر لینا بھی داخل ہے، چوری اور ڈاکہ بھی، جن میں دوسرے پر ظلم کر کے جبراً مال چھین لیا جاتا ہے، اور سود، قمار، رشوت اور تمام بیوع فاسدہ اور معاملات فاسدہ بھی جو از روئے شرع جائز نہیں، اگر چہ فریقین کی رضامندی بھی متحقق ہو، جھوٹ بول کر یا جھوٹی قسم کھا کر کوئی مال حاصل کر لینا یا ایسی کمائی جس کو شریعت اسلام نے ممنوع قرار دیا ہے اگر چہ اپنی جان کی محنت ہی سے حاصل کی گئی ہو، وہ سب حرام اور باطل ہیں، اور قرآن کے الفاظ میں اگر چہ صراحتاً کھانے کی ممانعت مذکور ہے، لیکن مراد اس جگہ صرف کھانا ہی نہیں بلکہ مطلقاً استعمال کرنا ہے (معارف القرآن ۱/ ۴۶۰)۔

(۲) اس سے جھوٹ بولنا، خیانت کرنا، اور دھوکہ دینا لازم آتا ہے، حالانکہ جھوٹ بولنا، خیانت کرنا اور دھوکہ دینا شریعت اسلامیہ میں جائز نہیں ہے، جیسا کہ حدیث شریف میں ہے: "المسلم أخو المسلم لا يخونه ولا يكذبه ولا يخذله" (ترمذی ۲/ ۱۴)۔

(۳) ظلم کرنا اور دوسرے کا مال مالک کی رضامندی کے بغیر استعمال کرنا لازم آتا ہے جبکہ یہ منع ہے، چنانچہ ارشاد نبوی ہے:

"ألا لا تظلموا ألا لا يحل مال امرأ إلا بطيب نفس منه" (مشکوۃ شریف: ۱/ ۲۵۵)

(جان لو کسی پر ظلم نہ کرو، جان لو کسی کا مال اس کی مرضی کے بغیر حلال نہیں ہے)۔ اسی طرح صاحب الاشباہ والنظائر قمطراز ہیں:

لا يجوز لأحد أن يتصرف في ملك غيره بلا إذنه أو وكالة منه (الاشباہ والنظائر/ ۲۷۶)

(کسی کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ دوسرے کی ملکیت میں مالک کی اجازت یا وکالت کے بغیر تصرف کرے)۔

اسی طرح حضرت مولانا یوسف صاحب تحریر فرماتے ہیں:

اسی طرح بعض لوگ ان کارڈ کے ذریعہ ریل میں رعایتی ٹکٹ استعمال کرتے ہیں یہ بھی گناہ ہے، جو اس قسم کی حرکت کا ارتکاب کر چکے ہیں، ان کو چاہئے کہ اس کے بدلہ صدقہ دیدیں تاکہ بددیانتی کا گناہ معاف ہو (آپ کے مسائل اور ان کا حل ۷/ ۲۸۶)۔

مذکورہ وجوہات اور خرابیوں کی بنا پر جو لوگ ان رعایتوں کے لئے مطلوب مقررہ حد عمر کو نہ پہنچے ہوں، ان کے لئے ایسی رعایتوں سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں ہے۔

☆☆☆

خاندان کے معذوروں اور والدین کے حقوق۔ شریعت کی روشنی میں

مفتی محمد الیاس قاسمی[1]

اسلام ایک ایسے نظام عدل کا نقیب ہے جس میں انسانیت کے تمام طبقات پر ہونے والے مظالم کا سد باب ہو سکتا ہے۔ وہ ایک ایسا فلاحی سماج کا قیام چاہتا ہے جس میں تمام انسانوں کے درد و آلام کا مداوا ہو۔ دور حاضر میں مختلف سماجی طبقات مظالم کے سبب سسک رہے ہیں۔ اسلام نے سماج کے تمام طبقات کے حقوق کو صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ان حقوق کی ادائیگی و عملی نفاذ سے انسانیت کو دونوں جہانوں میں حقیقی امن و سکون میسر آ سکتا ہے۔ اسلام میں معذوروں، بوڑھوں، یتیموں و بیواؤں کو عزت کا مقام حاصل ہے۔ اس دین رحمت کی نگاہ میں معذور، بوڑھے اور کمزور طبقات خدائے پاک کی نصرت اور خیرات و برکات کے نزول کا باعث ہوتے ہیں۔

جواب (۱): والدین یا دیگر اعزہ و اقارب کا نفقہ فقر و محتاجگی کی بنا پر واجب ہوتا ہے، لہذا اگر کوئی شخص بڑھاپے کی عمر کو پہنچ گیا لیکن اتنا کمزور نہیں ہے کہ کسب معاش نہ کر سکے تو ایسے شخص کو اس کی اولاد یا اعزہ و اقارب جن کے ذمہ اس کا نفقہ واجب ہے کسب معاش پر مجبور نہیں کر سکتے، چنانچہ علامہ ابن ہمام رقمطراز ہیں:

''وقوله: إذا كانوا فقراء يوافق بإطلاق قول السرخسي حيث قال: إذا كان الأب قادرًا على الكسب يجبر الابن على نفقته بخلاف قول الحلواني: إنه لا يجبر إذا كان الأب كسوبا؛ لأنه كان غنيا باعتبار الكسب فلا ضرورة في إيجاب النفقة على الغير، وإذا كان الابن قادر على الكسب لاتجب نفقته على الأب فلو كان كل منهما كسوبا يجب أن يكتسب الابن وينفق على الأب، فالمعتبر في إيجاب نفقة الوالدين مجرد الفقر، قيل: هو ظاهر الرواية، لأن معنى الأذى في إيكاله إلى الكد والتعب أكثر منه في التأفيف المحرم لقوله تعالى: فلا تقل لهما أف'' (الاسراء: ۲۳، فتح القدير ۴/۳۷۵)۔

(صاحب ہدایہ کا قول ''جب کہ وہ محتاج ہوں'' علی الاطلاق علامہ سرخسی کے موافق ہے، چنانچہ آپ فرماتے ہیں: ''جب باپ کسب معاش پر قادر ہو تو بیٹا اس کے اخراجات پورے کرنے پر مجبور کیا جائے گا''۔ یہ علامہ حلوانیؒ کے اس قول کے برخلاف ہے کہ اگر باپ کمانے پر قادر ہو تو بھی بیٹے کو اس کے اخراجات پورے کرنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔ اس لئے کہ کسب معاش پر قدرت کے اعتبار سے وہ مالدار ہے، لہذا دوسرے پر نفقہ واجب کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ جب بیٹا کمانے پر قادر ہو تو اس کا نفقہ باپ پر واجب نہیں ہوتا اور اگر ان دونوں میں سے ہر ایک کسب معاش پر قادر ہوں تو واجب ہوگا کہ بیٹا کمائے اور باپ پر خرچ کرے، پس والدین کا نفقہ واجب ہونے میں صرف فقر و محتاجگی کا اعتبار ہے، کہا گیا ہے کہ یہی ظاہر الروایہ ہے، کیونکہ باپ کو محنت و مشقت کے حوالہ کرنا اسے اف کہنے سے زیادہ تکلیف کا باعث ہے۔ جو اللہ تعالیٰ کے ارشاد ''پس ان دونوں کو اف نہ کہو'' (الاسراء: ۲۳) کی بنا پر حرام قرار دیا گیا ہے)۔

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں دو بھائی تھے۔ ایک بھائی ہنر مند ہونے کی وجہ سے روزی کماتا تھا اور دوسرا بھائی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتا رہتا تھا۔ پہلے بھائی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے دوسرے بھائی کی شکایت کی (کہ وہ کوئی دھندا نہیں کرتا) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''شاید اس کی وجہ سے تمہیں رزق ملتا ہو''۔

''كان أخوان على عهد رسول الله ﷺ فكان أحدهما يأتي النبي ﷺ والآخر يحترف فشكا المحترف أخاه النبي ﷺ فقال: لعلك ترزق به'' (جامع الترمذي رقم الحديث: ۲۳۴۵، ابواب الزهد باب في التوكل على الله)۔

مذکورہ بالا حدیث میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے کسب معاش نہ کرنے والے بھائی کو محنت و مزدوری پر مجبور کرنے کا حکم نہیں فرمایا حالانکہ وہ تندرست تھا

---

[1] مدرسہ بیت العلوم پونہ۔

لہذا محتاج باپ کو بدرجہ اولی کسب معاش پر مجبور نہیں کیا جائے گا، اگر چہ وہ کسب معاش پر قادر ہو۔

فتاوی عالمگیری میں ہے: ''ویجبر الولد الموسر علی نفقة الأبوین المعسرین مسلمین کانا أو ذمیین قدرا علی الکسب أو لم یقدرا'' (عالمگیری ۱/ ۵۶۴) (مالدار لڑکے کو تنگدست والدین کے نفقہ پر مجبور کیا جائے گا خواہ وہ دونوں مسلمان ہوں یا ذمی ہوں کسب معاش پر قادر ہوں یا قادر نہ ہوں)۔

جواب (۲): سن رسیدہ حضرات کا نفقہ وعلاج درج ذیل صورتوں میں دوسروں پر واجب ہوگا۔

ا۔ سن رسیدہ حضرات تنگدست ومحتاج ہوں جبکہ ان کی اولاد یا دیگر اعزہ واقارب مالدار وصاحب استطاعت ہوں، صاحب ہدایہ علامہ مرغینانی رقمطراز ہیں:

''وعلی الرجل أن ینفق علی أبویه وأجداده وجداته إذا کانوا فقراء وإن خالفوه فی دینه أما الأبوان فلقوله تعالی: ''وصاحبهما فی الدنیا معروفًا'' (لنزلت الآیة فی الأبوین الکافرین ولیس من المعروف أن یعیش فی نعم الله تعالی ویترکهما یموتان جوعا'' (ہدایہ علی فتح القدیر ۴/ ۳۷۵)۔

(اور مرد پر واجب ہے کہ وہ اپنے والدین، اجداد اور جدات پر خرچ کرے، جبکہ وہ محتاج ہوں اگر چہ وہ دوسرے مذہب کے ماننے والے ہوں۔ رہے والدین تو یہ اللہ تعالی کے ارشاد ''اور دنیا میں ان دونوں کے ساتھ اچھی طرح بسر کرنا'' کی بنا پر ہے۔ یہ آیت کافر والدین کے بارے میں نازل ہوئی ہے اور یہ بھلا طریقہ نہیں ہے کہ وہ خود تو اللہ تعالی کی نعمتوں میں عیش کرے اور والدین کو بھوک سے مرتا ہوا چھوڑ دے)۔

علامہ ابن نجیم مصری اس سلسلہ میں تحریر فرماتے ہیں:

''وشرط الفقر لأنه لو کان ذا مال فإیجاب النفقة فی ماله أولی من إیجابها فی مال غیره'' (البحر الرائق ۴/ ۳۴۸)

(اور نفقہ کے وجوب میں محتاجگی کی شرط ہے اس لئے کہ اگر انسان صاحب مال ہو تو اس کا نفقہ اس کے اپنے مال میں واجب قرار دینا دوسرے کے مال میں واجب قرار دینے سے زیادہ بہتر ہے)، فتاوی تاتارخانیہ میں ہے:

''ثم یفرض علی الابن نفقة الأب إذا کان الأب محتاجًا والابن موسرا سواء کان الأب قادرا علی الکسب أو لم یکن'' (فتاوی تاتارخانیہ ۳/ ۲۸۱)

(پھر بیٹے پر باپ کا نفقہ اس وقت واجب ہوگا، جبکہ باپ محتاج ہو اور بیٹا خوشحال ہو، خواہ باپ کسب معاش پر قادر ہو یا نہ ہو)۔

(ب) سن رسیدہ حضرات جسمانی طور سے معذور ہوں تو بھی ان کا نفقہ ان کی اولاد یا دیگر اعزہ پر واجب ہوتا ہے، اگر چہ ان کی اولاد یا دیگر اعزہ صاحب استطاعت نہ ہوں بشرطیکہ معذور حضرات بذات خود مالدار نہ ہوں۔ چنانچہ فتاوی قاضی خاں میں ہے:

''إن کان الولد زمنًا أو لایقدر علی عمل وللابن عیال کان علی الابن أن یضم الأب إلی عیاله وینفق علی الکل'' (فتاوی قاضیخاں علی الهندیہ ۱/ ۴۴۶)۔

(اگر باپ اپاہج ہو یا کام کرنے پر قادر نہ ہو اور بیٹا صاحب اولاد ہو تو بیٹے پر واجب ہے کہ باپ کو اپنی اولاد کے ساتھ رکھے اور سب کے اخراجات اجتماعی طور پر پورے کرے)۔

علامہ ابن نجیم مصری تحریر فرماتے ہیں:

''ولا یجبر الابن علی نفقة أبویه المعسرین إذا کان معسرًا إلا إذا کان بهما زمانة أو بهما فقر فقط فإنهما یدخلان مع الابن ویأکلان معه ولا یفرض لهما نفقة علاحدة'' (البحر الرائق ۴/ ۳۴۹)۔

(بیٹا صاحب استطاعت نہ ہو تو اسے اس کے تنگدست والدین کے نفقہ پر مجبور نہ کیا جائے گا، مگر جب کہ ان دونوں کو اپاہج پن لاحق ہو یا وہ دونوں صرف محتاج ہوں تو وہ دونوں بیٹے کے ساتھ داخل ہو جائیں گے اور اس کے ساتھ میں رہ کر کھائیں گے اور ان دونوں کے لئے علاحدہ طور سے نفقہ واجب نہ ہوگا)۔

جواب (۳): بوڑھے والدین یا خاندان کے وہ بڑے جن کا نفقہ ان کے چھوٹوں پر محتاجی کی صورت میں واجب ہے، اگر وہ محتاج نہ ہوں خود صاحب ثروت ہوں

تو وہ سماج و معاشرہ کے دستور کے موافق اور اپنے بیٹوں یا دیگر اعزہ واقارب کی معاشی حالت کے مطابق ان سے جیب خرچ کا مطالبہ کرسکتے ہیں، لیکن زیادہ سہولت کے لئے یا دوسرے لوگوں پر خرچ کرنے کے لئے یا کچھ رقم محفوظ کرنے کے لئے زائد رقم کا مطالبہ نہیں کرسکتے۔ حضرت عمرو بن شعیب سے روایت ہے کہ ایک شخص اپنے والد کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم میرے پاس مال ہے اور میری اولاد بھی ہے اور میرے والد چاہتے ہیں کہ میرا مال لے لیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تو اور تیرا مال سب تیرے والد کا ہے''۔

عن عمرو بن شعيب عن أبيه عن جده أن رجلا أتى النبي ﷺ فقال: يا رسول الله! إن لي مالا وولدا وإن والدي يحتاج مالي، قال: أنت ومالك لوالدك'' (سنن ابی داؤد کتاب البیوع باب الرجل یأكل من مال ولده/ ۴۹۸)۔

ایک حدیث میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: ''سب سے پاکیزہ کھانا وہ ہے جو انسان اپنی کمائی میں سے کھائے اور انسان کی اولاد اس کی کمائی ہے)۔

''قال رسول الله ﷺ: إن من أطيب ما أكل الرجل من كسبه وولده من كسبه'' (سنن ابی داؤد کتاب البیوع باب الرجل یأكل من مال ولده/ ۴۹۸)۔

مندرجہ بالا دونوں احادیث سے معلوم ہوا کہ انسان انسانی دستور کے موافق اور اپنی اولاد یا دیگر اقارب کی معاشی حالت کے مطابق جیب خرچ کا مطالبہ کرسکتا ہے۔ زیادہ سہولت کے لئے یا دوسرے لوگوں پر خرچ کرنے کے لئے یا کچھ رقم محفوظ کرنے کے لئے زائد رقم کا مطالبہ جائز نہیں، چنانچہ حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

''كل أحد أحق بماله من والده وولده والناس أجمعين'' (دارقطنی حدیث نمبر: ۴۵۶۸، سنن کبری للبیہقی، حدیث نمبر: ۱۶۱۷۰)
(ہر شخص اپنے مال کا اپنے والد، اپنے لڑکے اور تمام لوگوں سے سب سے زیادہ حقدار ہے)۔

''قال رسول الله ﷺ: ألا لا يحل مال امرئ إلا بطيب نفس منه'' (مشکوۃ المصابیح/ ۲۵۵، باب الغصب والعارية)
(اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: سنو! کسی انسان کا مال اس کی رضامندی کے بغیر حلال نہیں)۔

جواب (۴، الف): اگر والدین معاشی طور سے تنگ دست ہوں ان کا نفقہ بیٹوں پر واجب ہو یا ان کو لڑکوں کی جسمانی خدمت کی ضرورت ہو اور اس بات کا اندیشہ ہو کہ لڑکوں کے ماں باپ کو چھوڑ کر چلے جانے کی صورت میں وہ ضائع ہو جائیں گے تو والدین کی اجازت کے بغیر لڑکوں کا ماں باپ کو چھوڑ کر جانا جائز نہیں۔ اگر والدین معاشی طور سے خوشحال ہوں، ان کا نفقہ لڑکوں پر واجب نہ ہو والدین لڑکوں کی جسمانی خدمت کے محتاج نہ ہوں اور سفر ایسا پر خطر نہ ہو جس میں ہلاکت کا اندیشہ ہو تو وہ والدین کی اجازت کے بغیر بھی زیادہ آمدنی کے لئے ماں باپ کو چھوڑ کر جاسکتے ہیں۔

جاہمہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ! میں نے جہاد پر جانے کا ارادہ کیا ہے اور آپ سے مشورہ لینے آیا ہوں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمہاری ماں ہیں؟ انہوں نے جواب دیا: ''ہاں! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ماں کی خدمت اختیار کرو اس لئے جنت ماں کے قدموں تلے ہے۔

''إن جاهمة جاء إلى النبي ﷺ فقال: يا رسول الله أردت أن أغزو وقد جئت أستشيرك فقال: هل لك من أم؟ قال: نعم، قال: فألزمها فإن الجنة عند رجلها'' (مشکوۃ المصابیح/ ۴۲۱، باب البر والصلة، الفصل الثالث)۔

فقہاء لکھتے ہیں: ''إذا أراد الرجل أن يسافر إلى غير الجهاد لتجارة أو حج أو عمرة وكره ذلك أبواه. فإن كان يخاف الضيعة عليهما بأن كانا معسرين ونفقتهما عليه وماله لا يفي بالزاد والراحلة ونفقتهما. فإنه لا يخرج بغير إذنهما ... وإن كان لا يخاف الضيعة عليهما بأن كانا موسرين ولم تكن نفقتهما عليه إن كان سفرا لا يخاف على الولد الهلاك فيه كان له أن يخرج بغير إذنهما.... وكذا الجواب فيما إذا خرج للنفقة إلى بلدة أخرى'' (عالمگیری ۵/ ۳۶۵)

(جب آدمی جہاد کے علاوہ تجارت، حج یا عمرہ کے لئے سفر کرنے کا ارادہ کرے اور اس کے والدین اس کو ناپسند کریں، پس اگر ان کے ضیاع کا اندیشہ ہو اس طور سے کہ وہ دونوں تنگدست ہوں اور ان دونوں کا نفقہ اس پر واجب ہو اور اس کے پاس اتنا مال نہ ہو جو زاد راہ، سواری اور نفقہ کے لئے کافی ہو تو وہ ان کی اجازت کے بغیر نہیں نکلے گا۔ اور اگر ان کے ضیاع کا اندیشہ نہ ہو، اس طور سے کہ وہ دونوں مال دار ہوں اور ان کا نفقہ اس پر واجب نہ ہو تو اگر سفر ایسا ہو کہ اس میں لڑکے کی ہلاکت کا اندیشہ نہ ہو تو اسے ان کی اجازت کے بغیر نکلنے کا اختیار ہوگا اور یہی جواب اس صورت میں بھی ہوگا جب کہ وہ دوسرے شہر میں آمدنی کے لئے جائے)۔

علامہ شامیؒ تحریر فرماتے ہیں: ''ولو أذن الأبوان لا يلتفت إلى غيرهما هذا في سفر الجهاد. فلو في سفر تجارة أو حج لا بأس به بلا إذن الأبوين إن استغنيا عن خدمته إذ ليس فيه إبطال حقهما إلا إذا كان الطريق مخوفاً كالبحر فلا يخرج إلا بإذنهما وإن استغنيا عن خدمته'' (شامی ۹/ ۵۸۵ زکریا)۔

(اگر والدین اجازت دیدیں تو ان کے علاوہ دیگر لوگوں کی طرف توجہ نہیں کی جائے گی، یہ سفر جہاد کا حکم ہے پس اگر تجارت یا حج کا سفر ہو تو والدین کی اجازت کے بغیر سفر کرنے میں کوئی حرج نہیں، جبکہ وہ اس کی خدمت سے بے نیاز ہوں، اس لئے کہ اس صورت میں ان کے حق کا ابطال لازم نہیں آتا البتہ اگر راستہ سمندر کی طرح پرخطر ہو تو والدین کی اجازت کے بغیر نہیں نکلے گا اگرچہ وہ اس کی خدمت سے بے نیاز ہوں)۔

جواب (۴، ب): عام حالات میں بیوی کو بنیادی طور پر اپنے لئے علاحدہ کمرہ کے مطالبہ کا حق ہے جس میں وہ تالا لگا سکے اور اپنے سامان کی حفاظت کر سکے اور جب چاہے تخلیہ کر سکے۔ اگر ایک وسیع مکان میں ایک سے زائد کمرے ہوں اور ایک کمرہ بیوی کے لئے مخصوص کردیا جائے اور دوسرا کمرہ ساس سسر کی رہائش کے لئے طے کردیا جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں اور بیوی کو علاحدہ سے رہائش کے مطالبہ کا حق نہیں ہوگا، البتہ اگر یہ ثابت ہوجائے کہ ساس سسر بیوی کو ایذا پہنچاتے ہیں تو اس صورت میں بیوی کو علاحدہ مکان کے مطالبہ کا حق ہوگا اور اسے ساس سسر کے ساتھ رہنے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا۔

''ولو أراد الزوج أن يسكنها في منزل مع ضرتها أو مع أحمائها كأم الزوج وأخته وبنته من غيرها وأقاربه فأبت ذلك، عليه أن يسكنها في منزل مفرد لأنهن ربما يؤذينها ويضررن بها في المساكنة وإباها دليل الأذى والضرر ولأنه يحتاج إلى أن يجامعها ويعاشرها في أي وقت يتفق ولا يمكنه ذلك إذا كان معهما ثالث حتى لو كان في الدار بيوت ففرغ لها بيتا وجعل لبيتها غلقا على حدة قالوا: إنما ليس لها أن تطالبه ببيت آخر'' (بدائع الصنائع کتاب النفقہ ۳/ ۴۲۸-۴۲۹)۔

(اگر شوہر اپنی بیوی کو اس کی سوکن، دیوروں، شوہر کی ماں، بہن، لڑکی یا دیگر رشتہ داروں کے ساتھ رکھنا چاہے اور عورت اس کے لئے آمادہ نہ ہو تو شوہر پر لازم ہے کہ اس کو جداگانہ مکان میں رہائش دے، اس لئے کہ ایک ساتھ رہنے پر ایک دوسرے کو تکلیف ہوسکتی ہے، چنانچہ عورت کا انکار اس کی علامت ہے، نیز عورت کو اپنے شوہر کے ساتھ کسی بھی وقت تنہائی کی ضرورت ہے اور تیسرے کی موجودگی میں یہ ممکن نہیں، البتہ ایک بڑے گھر میں کئی کمرے ہوں اور شوہر ان میں سے ایک کمرہ اپنی بیوی کے لئے خاص کردے اور اس کے لئے تالا چابی الگ کردے تو فقہاء نے کہا ہے کہ پھر اسے مزید کسی مکان کے مطالبہ کا حق نہیں رہ جائے گا)۔

اگر ساس کو بہو کی خدمت کی ضرورت ہو، لیکن کوئی خدمتگار موجود نہ ہو اور بیٹیوں کو ان کے شوہروں کی طرف سے میکے میں رہنے کی اجازت نہ ہو تو اس صورت میں ساس کی خدمت کرنا بہو پر واجب ہوگا۔ اس لئے کہ جس معاشرہ میں قرآن نازل ہوا ہے وہاں کا عرف یہی تھا کہ عورتیں شوہر سے متعلق اس کے گھر کے کام کو انجام دیا کرتی تھیں، اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

"ولھن مثل الذی علیھن بالمعروف" (البقرہ: ۲۲۸) (اور عورتوں کے بھی ویسے ہی حق ہیں جیسے ان پر مردوں کے ہیں دستور کے موافق)۔

عام طور پر معروف طریقہ یہی ہے کہ بیوی شوہر سے متعلق چیزوں کی دیکھ ریکھ کرتی ہے، چنانچہ حضرت جابرؓ صرف اس مقصد سے ایک شوہر دیدہ عورت سے نکاح کرتے ہیں کہ وہ ان کی کم عمر بہنوں کی دیکھ بھال کرے گی۔

''عن جابر بن عبد الله قال: تزوجت امرأة فأتيت النبي ﷺ فقال: أتزوجت يا جابر! فقلت: نعم. قال: بكرا أو ثيبًا. فقلت: لا بل ثيبا. فقال: هلا جارية تلاعبها وتلاعبك. فقلت: يا رسول الله! إن عبد الله مات وترك سبع بنات أو تسعا فجئت بمن يقوم عليهن فدعا لي'' (الجامع الترمذی ابواب النکاح باب ما جاء فی تزویج الأبکار رقم الحدیث: ۱۱۰۰)۔

(حضرت جابر بن عبداللہؓ سے روایت ہے کہتے ہیں: میں نے ایک عورت سے شادی کی تو آپ ﷺ نے فرمایا اے جابر! کیا تم نے شادی کرلی؟ تو میں نے عرض کیا ہاں! آپ نے فرمایا کنواری سے شادی کی یا شوہر دیدہ سے؟ تو میں نے کہا: نہیں بلکہ شوہر دیدہ عورت سے شادی کی، تو آپ ﷺ نے فرمایا: تم نے کیوں نہ کنواری سے شادی کی کہ تو اس سے کھیلتا اور وہ تجھ سے کھیلتی تو میں نے کہا: اے اللہ کے رسول ﷺ عبداللہ کا انتقال ہوگیا ہے اور انہوں نے سات یا نو لڑکیاں چھوڑی ہیں پس میں ایسی عورت کو لایا ہوں جو ان کی دیکھ بھال کرسکے تو آپ ﷺ نے میرے لئے دعا فرمائی)۔

حضرت فاطمہؓ کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ گھریلو کاموں کو انجام دیا کرتی تھیں یہاں تک کہ جب کام کا بوجھ بہت بڑھ گیا تو اللہ کے رسول ﷺ سے ایک غلام عطا کرنے کی درخواست فرمائی، لیکن اس موقع پر اللہ کے رسول ﷺ نے حضرت علیؓ سے یہ نہیں فرمایا کہ یہ سارے کام تمہارے ذمہ ہیں، فاطمہ پر ان سارے کاموں کی مشقت کا بوجھ ڈالنا درست نہیں۔

''روی أن رسول اللهﷺ قسم الأعمال بين علي وفاطمة فجعل أعمال الخارج على علي وأعمال الداخل على فاطمة'' (بدائع الصنائع ۳/ ۴۳۰)۔

(اللہ کے رسول ﷺ سے مروی ہے کہ آپ نے حضرت علیؓ اور فاطمہؓ کے درمیان کاموں کی تقسیم فرمادی تھی پس آپ نے باہر کے کاموں کی ذمہ داری علیؓ پر ڈالی تھی اور گھر کے اندر کا کام فاطمہؓ کے ذمہ سپرد کئے تھے)۔

فقہاء لکھتے ہیں کہ اخلاقی طور پر شوہر کے گھر کے کام عورت پر واجب ہیں، قانونی طور پر واجب نہیں۔

''قالوا: إن هٰذه الأعمال واجبة عليها ديانة ولا يجبرها القاضي'' (فتاوی عالمگیری ۱/ ۵۴۸)۔

(فقہاء احناف نے کہا ہے کہ گھر کے کام کاج اور شوہر کی خدمت عورت پر دیانۃً واجب ہے، اگر چہ قاضی اسے اس پر مجبور نہیں کرے گا)۔

ابوثور کہتے ہیں کہ عورت کی ذمہ داری ہے کہ وہ ہر چیز میں اپنے شوہر کی خدمت کرے۔

''عليها أن تخدم زوجها في كل شيء'' (زاد المعاد ۵/ ۱۸۷)۔

علامہ ابن قدامہ حنبلی تحریر کرتے ہیں کہ عرف کے مطابق شوہر کی خدمت کرنا بہتر ہے۔

''ولكن الأولى لها فعل ما جرت العادة بقيامها به لأنه العادة ولا تصلح الحال إلا به ولا تنتظم المعيشة بدونه'' (المغنی ۷/ ۲۱)۔

(لیکن اس کام کو انجام دینا بہتر ہے جس کو انجام دینا عرف میں جاری ہو، اس لئے کہ ایسا عرف ہے اور عرف پر عمل کے بغیر حالت ٹھیک نہیں ہوسکتی اور اس کے بغیر معیشت درست نہیں ہوسکتی)۔

تمام جائز امور میں شوہر کی اطاعت واجب ہے، لہذا اگر ساس کی خدمت کے لئے کوئی خادمہ میسر نہ ہو اور شوہر بیوی کو اس کی خدمت کا حکم دے تو بیوی پر شوہر کی اطاعت واجب ہوگی، چنانچہ فقہاء لکھتے ہیں:

''وحقه عليها أن تطيعه في كل مباح يأمرها به.... ظاهره أنه عند الأمر به منه يكون واجبًا عليها كأمر السلطان الرعية به'' (الدر المختار ورد المحتار ۴/ ۲۸۸ ط زکریا)۔

مرقاۃ شرح مشکوۃ میں ہے:

لأنها (أي المرأة) كانت مأمورة إلى طاعة زوجها في غير معصية (مرقاة المفاتيح ۳/ ۴۶۳ باب عشرة النساء وما لكل واحد من الحقوق)

(اس لئے کہ گناہ کو چھوڑ کر باقی امور میں عورت کو اپنے شوہر کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے)۔

لہذا شوہر کے حکم سے بیوی پر ساس سسر کی خدمت واجب ہوگی البتہ معاملہ حد اعتدال میں ہونا چاہئے ایسا نہ ہو کہ بیوی کو چوبیس گھنٹے کی نوکرانی بنالیا جائے اور اس سلسلہ میں اس پر ظلم وزیادتی کی جائے۔

جواب (۴، ج): والدین کی خدمت بیٹے اور بیٹیوں دونوں پر واجب ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''ووصينا الإنسان بوالديه إحسانا'' (عنکبوت: ۸) (اور ہم نے انسان کو اپنے والدین سے حسن سلوک کی تاکید کی ہے)۔

یہ واضح ہے کہ انسان میں مرد اور عورت دونوں شامل ہیں۔

فتاوی عالمگیری میں ہے:

''ويجبر الولد الموسر على نفقة الأبوين المعسرين'' (عالمگیری ۱/ ۵۶۴) (اور مالدار اولاد کو محتاج والدین کے نفقہ پر مجبور کیا جائے گا)۔

یہ بات ظاہر ہے کہ "ولد" کا اطلاق مذکر اور مؤنث دونوں اولاد پر ہوتا ہے۔

فقہاء نے بھی والدین کی خدمت کی تاکید کی ہے، چنانچہ شمس الائمہ سرخسی تحریر فرماتے ہیں:

"وإن استأجر الرجل ابنه ليخدمه في بيته لم يجز ولا أجر عليه؛ لأن خدمة الأب مستحقة على الابن دينا وهو مطالب به عرفًا فلا يأخذ علية أجرًا ويعدّ من العقوق أن يأخذ الأجر على خدمة أبيه والعقوق حرام، وكذلك إن استأجرته الأم؛ لأن خدمتها أوجب عليه، فإنها أحوج إلى ذلك وأشفق عليه" (المبسوط ۱۶/ ۱۰۷، ط: دار الفکر بیروت)۔

(اور اگر کسی شخص نے اپنے بیٹے کو مزدوری پر لیا تاکہ وہ اس کے گھر میں اس کی خدمت کرے تو یہ جائز نہیں اور اس کے ذمہ اجرت نہیں اس لئے کہ باپ کی خدمت بیٹے پر دینی اعتبار سے لازم ہے اس سے عرف میں اس کا مطالبہ ہے، لہذا وہ اس سے اجرت نہیں لے گا، یہ بات والدین کی نافرمانی میں شمار کی جاتی ہے کہ اولاد اپنے باپ کی خدمت پر اجرت لے اور نافرمانی حرام ہے۔ اور ایسے ہی اگر اس کی ماں مزدوری پر رکھے کیونکہ ماں کی خدمت اس پر زیادہ واجب ہے اس لئے کہ اسے اس کی زیادہ ضرورت ہے اور اس کے حق میں زیادہ مہربان ہے)۔

اگر والدین کی خدمت کرنے والا بیٹیوں کے علاوہ کوئی نہ ہو اور ان کے شوہران کو اس کی اجازت نہ دیں تو بھی بیٹیوں کو والدین کی خدمت کرنا چاہئے، اس صورت میں شوہر کو بھی اپنی بیوی کو روکنے کا حق حاصل نہیں، چنانچہ فقہاء لکھتے ہیں کہ اگر والدین چلنے پھرنے سے معذور ہو جائیں اور ان کی خدمت کرنے والا کوئی نہ ہو اور ایک بیٹی ہو جو شادی شدہ ہو اور سسرال میں رہتی ہو تو اس شادی شدہ بیٹی کی ذمہ داری ہے کہ وہ باپ کے گھر آ کر ان کی خدمت اور دیکھ بھال کا فریضہ انجام دے۔ اگر شوہر اس کے لئے راضی نہ ہو تب بھی والدین کو اس بے بسی کی حالت میں تنہا نہ چھوڑے، ایسے موقع پر والدین کا حق مقدم ہے۔

"ولو أبوها .... زمنا مثلا فاحتاجها فعليها تعاهده ولو كافرًا، وإن أبي الزوج .... أي مريضا مرضًا طويلًا .... وهذا إذا لم يكن من يقوم عليه.... لأن ذلك من المصاحبة بالمعروف المأمور بها .... لرجحان حق الوالد" (الدر المختار ورد المحتار، کتاب الطلاق ۵/ ۳۲۴ ط زکریا)۔

صورت مسئولہ میں شوہر کی اطاعت کرتے ہوئے والدین کی ترک خدمت جائز نہ ہوگی، کیونکہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"لا طاعة لمخلوق في معصية الخالق" (مشکوۃ المصابیح/ ۳۲۱، کتاب الامارہ) (خالق کی نافرمانی میں مخلوق کی اطاعت جائز نہیں)۔

جواب (۵): اسلام ایک صالح معاشرہ کی تشکیل چاہتا ہے، اس لئے اس نے نکاح کی ترغیب دی ہے اور تجرد کی ممانعت فرمائی ہے۔ نکاح کے باعث معاشرے میں عفت و پاکدامنی کا ماحول تیار ہوتا ہے، جبکہ تجرد کے باعث بہت سی معاشرتی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"وأنكحوا الأيامى منكم والصالحين من عبادكم وإمائكم" (سورۂ نور: ۳۲)

(تم میں سے جو مرد و عورتیں بے نکاح ہیں ان کا نکاح کر دو اور تمہارے غلاموں اور لونڈیوں میں سے جو نیک بخت ہوں ان کا بھی)۔

حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب بندہ نے نکاح کر لیا تو اس نے نصف دین کی تکمیل کا انتظام کر لیا، اب اس کو چاہئے کہ باقی نصف میں اللہ کا تقویٰ اختیار کرے۔

"عن أنس قال قال رسول الله ﷺ إذا تزوج العبد فقد استكمل نصف الدين فليتق الله في النصف الباقي" (مشکوۃ المصابیح/ ۲۶۸ کتاب النکاح)۔

ایک حدیث میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کو مسکین قرار دیا ہے جس کی بیوی نہ ہو۔

"مسكين مسكين مسكين ليس له امرأة" (غنیۃ الطالبین/ ۹۱)۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "دنیا ساری کی ساری ایک تھوڑے سے فائدہ کی چیز ہے اور نیک بخت عورت دنیا کی عمدہ فائدہ مند چیزوں میں سے ہے"۔

لہذا بیٹے بیٹیوں کے لئے اپنے والدین کے دوسرے نکاح میں رکاوٹ بننا قطعاً جائز نہیں، اگر والد کی خدمت یا ضرورت کے لئے بیوی درکار ہو لیکن خود والد میں بیوی کی کفالت کی استطاعت نہ ہو تو اولاد پر اپنے باپ کا نکاح کرانا اور سوتیلی ماں کے اخراجات پورا کرنا واجب ہے۔ چنانچہ علامہ حصکفی رقمطراز ہیں:

''وعليه نفقة زوجة أبيه وأم ولده بل تزويجه أو تسرّيه'' (الدر المختار على رد المحتار ۵/ ۳۴۴)۔

علامہ کاسانی رقمطراز ہیں:

''ولا تجب على الابن نفقة منكوحة أبيه، لأنها أجنبية عنه، إلا أن يكون الأب محتاجًا إلى من يخدمه، فحينئذ يجب عليه نفقة امرأته؛ لأنه يؤمر بخدمة الأب بنفسه أو بالأجير'' (بدائع الصنائع ۳/ ۴۴۳)۔

(اور بیٹے پر اپنے باپ کی منکوحہ عورت کا نفقہ واجب نہیں ہے، مگر یہ کہ باپ خادم کا محتاج ہو تو اس صورت میں اس پر اپنے باپ کی بیوی کا نفقہ واجب ہوگا، اس لئے کہ اسے خود کے ذریعہ یا مزدور کے ذریعہ باپ کی خدمت کا حکم دیا جائے گا)۔

فقہاء لکھتے ہیں: ''إن احتاج الأب إلى زوجة والابن موسر وجب عليه أن يزوجه أو يشترى له جارية ويلزمه نفقتهما وكسوتهما'' (الجوہرة النيرہ ۲/ ۱۳۹) (اگر باپ کی بیوی کی حاجت ہو درانحالیکہ بیٹا مالدار ہو تو اس پر واجب ہے کہ وہ باپ کی شادی کرائے یا اس کے لئے ایک باندی خریدے اور اس پر ان دونوں کا نان ونفقہ اور لباس لازم ہوگا)۔

فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر باپ محتاج ہو تو مالدار بیٹے پر اس کے نابالغ بھائی بہنوں کا نفقہ بھی واجب ہوگا۔

''محتاج له أولاد صغار محاويج وله ابن كبير موسر أجبر على نفقة أبيه وعلى نفقتهم أيضًا؛ لأن الأب كالميت لفقره ولو مات فنفقتهم عليه كذاهنا'' (فتاوی تاتارخانیہ ۳/ ۲۸۰)۔

(ایک محتاج شخص ہے جس کے محتاج نابالغ بچے ہیں اور اس کا ایک مالدار بالغ بیٹا بھی ہو تو اسے اپنے باپ اور ان بچوں کے اخراجات کی ادائیگی پر مجبور کیا جائے گا، اس لئے کہ باپ اپنے فقر کی وجہ سے مردہ شخص کی طرح ہے۔ اگر باپ کا انتقال ہو گیا تو ان بچوں کا نفقہ اس پر واجب ہوتا اسی طرح کا معاملہ یہاں بھی ہوگا)۔

جواب (۶): والد کی زندگی میں وہ اپنے مال کے مالک ومختار ہیں۔ وہ اپنے مال میں جو تصرف چاہیں کر سکتے ہیں تفسیر بیضاوی میں ہے:

''المالك هو المتصرف فى الأعيان المملوكة كيف شاء'' (تفسیر بیضاوی ۱/ ۷، سورہ فاتحہ تحت قوله تعالى مالك يوم الدين: ط دلہی) (مالک وہ ہے جو مملوک چیزوں میں حسب منشا تصرف کر سکے)۔

فقہاء نے لکھا ہے کہ مالک کی اجازت کے بغیر اس کی ملکیت میں تصرف کرنا جائز نہیں)۔

''لا يجوز التصرف فى مال غيره بلا إذنه ولا ولايته'' (الدر المختار على رد المحتار ۹/ ۲۹۱، زکریا)

(دوسرے کے مال میں اس کی اجازت اور ولایت کے بغیر تصرف جائز نہیں)۔

''لا يجوز لأحد أن يتصرف فى ملك غيره بلا إذنه أو وكالة منه أو ولاية عليه وإن فعل كان ضامنًا (شرح المجله لرستم باز ۱/ ۶۱، رقم الماده: ۹۶) (کسی کے لئے جائز نہیں کہ دوسرے کی ملکیت میں اس کی اجازت یا اس کی طرف سے وکالت یا اس پر ولایت کے بغیر تصرف کرے اور اگر تصرف کرے گا تو وہ ضامن ہوگا)۔

فقہاء کرام نے لکھا ہے کہ حق وراثت کے استحقاق کے لئے تین شرطیں ہیں: ان میں سے ایک اہم شرط مورث کی موت واقع ہونا ہے، خواہ موت حقیقی، حکمی ہو یا تقدیری۔ لہذا والد کی زندگی میں میراث وجائیداد کا مطالبہ جائز نہیں۔ علامہ شامی لکھتے ہیں:

''وشروطه ثلاثة: موت مورث حقيقة أو حكمًا كمفقود أو تقديرًا كجنين فيه غرة ووجود وارثه عند موته حيا حقيقة أو تقديرًا كالحمل والعلم بجهة إرثه'' (شامی ۱۰/ ۴۹۱ ط: زکریا)۔

(وراثت پانے کے لئے تین شرطیں ہیں: مورث کی موت ہونا حقیقی طور سے یا حکمی طور سے جیسے مفقود یا تقدیری طور سے جیسے اس جنین کی موت جس میں غرہ واجب ہو اور وارث کا مورث کی موت کے وقت زندہ موجود ہونا حقیقی طور سے زندہ ہو یا تقدیری طور سے جیسے حمل اور وراثت کی جہت کا علم ہونا)۔

اگر والدین کی معاشی حالت بہتر ہو اور اولاد محتاج ہو تو والدین کے لئے بہتر ہوگا کہ اپنی کچھ جائیداد اپنی اولاد میں تقسیم کردیں، چونکہ زندگی میں اولاد کو کچھ عطا کرنا بحکم ہبہ ہے اور اولاد کے بیچ میں عدل وانصاف کی تعلیم دی گئی ہے، لہٰذا اپنا مال تمام اولاد لڑکوں اور لڑکیوں دونوں کو برابر برابر دینا چاہئے۔

"فاتقوا الله واعدلوا بين أولادكم" (مشكوة المصابيح / ۲۶۱) (اللہ سے ڈرو اور اپنی اولاد کے درمیان (ہبہ وغیرہ میں) برابری کرو)۔

"يعطي البنت كالابن عند الثاني، وعليه الفتوى، أي على قول أبي يوسف من أن التنصيف بين الذكر والأنثى أفضل من التثليث الذي هو قول محمد" (الدر المختار ورد المحتار ۸/ ۵۰۲، ۵۰۱)۔

(امام ابویوسف کے نزدیک بیٹی کو بیٹے کی طرح دیا جائے گا اور اسی پر فتوی ہے یعنی امام ابویوسف کے قول پر کہ لڑکا اور لڑکی کو نصف نصف دینا افضل ہے، تثلیث (لڑکے کو دو تہائی اور لڑکی کو ایک تہائی) سے جو کہ امام محمد کا قول ہے)۔

جواب (۷): اسلام میں والدین اور بزرگوں کا مقام بہت بلند ہے، مثالی اسلامی معاشرہ میں عمر دراز و بزرگ حضرات عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں اور یہ سماج پر بوجھ نہیں ہوتے، اولاد اور اولاد کی اولاد کی قربت سے محروم کرکے عمر دراز حضرات کو ہاسٹلوں میں قیام پر مجبور کرنا اسلامی تعلیمات کے مغائر اور شریعت اسلامی کی روح سے متصادم ہے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

"إما يبلغن عندك الكبر أحدهما أو كلاهما فلا تقل لهما أف ولا تنهرهما وقل لهما قولًا كريمًا" (بنی اسرائیل: ۲۳)

(جب ماں باپ یا ان میں سے ایک بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو اف نہ کہو اور نہ جھڑکی دو بلکہ ان سے نرم گفتگو کرو)۔

لہٰذا عمر دراز والدین اور دیگر رشتہ داروں کو ہاسٹلوں میں قیام پر مجبور کرنا شرعاً قطعاً جائز نہیں، ملا علی قاری رقمطراز ہیں:

"وبالوالدين إحسانا الخ فإنه دل على الاجتناب عن جميع الأقوال المحرمة، والإتيان بجميع كرائم الأقوال والأفعال من التواضع والخدمة والإنفاق عليهما، ثم الدعاء لهما في العاقبة" (مرقاة المفاتيح ۴/ ۶۶۴ باب البر والصلة)۔

(اللہ تعالی کا ارشاد اور والدین کے ساتھ حسن سلوک کرو، تمام حرام اقوال سے اجتناب کرنے اور تمام عمدہ اقوال وافعال یعنی تواضع، خدمت اور ان پر خرچ کرنے پھر آخرت کے سلسلہ میں ان کے لئے دعا کرنے پر دلالت کرتا ہے)۔

ایک صحابیؓ نے رسول اللہ ﷺ سے جہاد کی اجازت چاہی، آپ ﷺ نے دریافت فرمایا: تمہارے والدین زندہ ہیں؟ انہوں نے جواب دیا، ہاں! آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "انہیں میں جہاد کرو"۔

"جاء رجل إلى النبي ﷺ فاستأذنه في الجهاد فقال أحي والداك؟ قال نعم، قال: ففيهما فجاهد" (صحيح البخاري ۱/ ۴۲۱ كتاب الجهاد باب الجهاد بإذن الأبوين)۔

فقہاء نے لکھا ہے کہ والدین کی اجازت کے بغیر جہاد کے لئے نکلنا جائز نہیں، اس لئے کہ والدین کے حقوق کی رعایت فرض عین ہے، جبکہ جہاد فرض کفایہ ہے چنانچہ علامہ شامی رقمطراز ہیں:

"وفي بعض الروايات: لا يخرج إلى الجهاد إلا بإذنهما، ولو أذن أحدهما فقط لا ينبغي له الخروج؛ لأن مراعاة حقهما فرض عين والجهاد فرض كفاية" (شامی ۹/ ۵۲۴) (بعض روایات میں ہے کہ انسان والدین کی اجازت کے بغیر جہاد کے لئے نہیں نکل سکتا اور اگر ان میں سے کوئی ایک ہی اجازت دے تو اسے نہیں نکلنا چاہئے، اس لئے کہ والدین کے حقوق کی رعایت فرض عین ہے، جبکہ جہاد فرض کفایہ ہے)۔

جب والدین کے حقوق کی ادائیگی میں رکاوٹ کی وجہ سے جہاد جیسی مقدس عبادت کے لئے خروج ناجائز ہے تو والدین کی خدمت اور ان کی دیکھ بھال سے پہلو تہی کرکے انہیں ہاسٹلوں میں قیام پر مجبور کرنا شرعاً کس طرح جائز ہوسکتا ہے؟ اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

"أسكنوهن من حيث سكنتم من وجدكم" (الطلاق: ۶) (ان کو اسی جگہ رکھو جہاں تم رہتے ہو اپنی وسعت کے موافق)۔

اللہ تعالی نے یہ حکم بیویوں کے لئے دیا ہے کہ اپنی حیثیت کے مطابق جہاں تم رہائش اختیار کرتے ہو وہیں ان کے لئے بھی رہائش کا انتظام کرو، یہ حکم بیویوں کے لئے ہے، تو والدین کے لئے اپنی حیثیت کے مطابق اپنی رہائش کی طرح رہائش کا انتظام کرنا بدرجہ اولی لازمی ہوگا اور انہیں اپنے گھروں سے دور کرکے ہاسٹلوں میں قیام پر مجبور کرنا قطعاً جائز نہ ہوگا۔

جواب (۸): اگر یہ عمر دراز حضرات زکوۃ کے مستحق ہوں تو ان پر زکوۃ کی رقم صرف کی جاسکتی ہے، اس رقم سے ان کے خورد ونوش، علاج ومعالجہ اور وظیفے کے اخراجات کو پورا کیا جاسکتا ہے۔

ان کو زکوۃ دینے کا طریقہ یہ ہے کہ زکوۃ کی رقم اور اس سے خریدی گئی اشیاء ان حضرات کو بطور تملیک دی جائے یا پھر پہلے ہی سے حیلہ تملیک کرلیا جائے، تاکہ سہولت کے مطابق رقم زکوۃ سے تیار کی گئی اشیاء ان کو مناسب اور باعزت طریقے پر دی جاسکے۔

''وأخرج التمليك الإباحة فلا تكفي فيها الإطعام فلو أطعم يتيمًا ناويًا به الزكوة لاتجزيه إلا إذا دفع إليه المطعوم.... وخرج بالمال المنفعة فلو أسكن فقيرًا داره سنة ناويا الزكوة لايجزيه'' (حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح، ص: ۷۱۴، ط: دار الكتاب ديوبند)۔

(اور تملیک کی قید سے اباحت کو خارج کردیا پس اس میں اباحت کافی نہ ہوگی پس اگر کسی یتیم کو زکوۃ کی نیت سے کھانا کھلادے تو کافی نہ ہوگا، مگر جبکہ کھائی جانے والی چیز کو یتیم کے حوالے کردے.... مال کی قید سے منفعت خارج ہوگئی پس اگر زکوۃ کی نیت کرتے ہوئے کسی فقیر کو اپنے گھر میں ایک سال تک سکونت کا موقع دے دے تو کافی نہ ہوگا)۔

جواب (۹): عمر دراز لوگوں کے لئے حکومتوں نے مختلف چیزوں میں جو بعض خصوصی رعایتیں دے رکھی ہیں، جیسے ٹرین وغیرہ میں کرایہ میں تخفیف، حکومت کی طرف سے امدادی وظیفہ، ٹیکس میں رعایت وغیرہ، ان رعایتوں سے ایسے لوگوں کا فائدہ اٹھانا قطعاً جائز نہیں جو ان رعایتوں کے لئے مطلوب مقررہ حد عمر کو نہ پہنچے ہوں، اس میں درج ذیل شرعی قباحتیں پائی جاتی ہیں:

الف: أكل مال بالباطل: ناجائز طریقے پر کم کرائے میں سفر کرنا یا حکومت سے امدادی وظیفہ حاصل کرنا اکل مال بالباطل میں داخل ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "يا أيها الذين آمنوا لاتأكلوا أموالكم بينكم بالباطل إلا أن تكون تجارة عن تراض منكم" (سورہ نساء: ۲۹) (اے ایمان والو! آپس کے مال ناجائز طریقہ سے مت کھاؤ مگر یہ کہ تمہاری آپس کی رضامندی سے خرید وفروخت ہو)۔

علامہ جصاص رازی تحریر فرماتے ہیں: ''لا تأكلوا أموالكم بينكم بالباطل'' نهى لكل أحد عن أكل مال نفسه ومال غيره بالباطل وأكل مال نفسه بالباطل إنفاقه في معاصي الله وأكل مال الغير بالباطل .... قال ابن عباس والحسن: أن يأكل بغير عوض'' (احکام القرآن ۲/ ۲۱۶)۔

(آپس کے مال ناجائز طریقے سے مت کھاؤ، اللہ تعالیٰ نے ہر ایک کو اپنا مال اور غیر کا مال ناجائز طریقے پر کھانے سے منع فرمادیا۔ خود کا مال ناجائز طریقے پر کھانا اس کو اللہ کی نافرمانیوں میں خرچ کرنا ہے، اور غیر کا مال ناجائز طریقے پر کھانا.... ابن عباس اور حسن کہتے ہیں کہ یہ بغیر کسی عوض کے دوسرے کا مال کھانا ہے)۔

ب: انتظامیہ کے ساتھ خداع وخیانت: اس طرح سے اپنی عمر کم ظاہر کرکے حکومتی سہولیات حاصل کرنا دھوکہ دہی وخیانت میں داخل ہے، حضرت ابوبکر صدیقؓ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا: وہ شخص ملعون ہے جو کسی مومن کو تکلیف پہنچائے یا اسے دھوکہ دے۔

''عن أبي بكر الصديق قال: قال رسول الله ﷺ: ملعون من ضارّ مؤمنا أو مكر به'' (جامع الترمذی ۲/ ۱۵، ابواب البر والصله، ما جاء في الخيانة والغش)۔

ج: قانونی طور پر جرم ہونے کی وجہ سے عزت وآبرو کا بھی خطرہ ہوگا جس سے حفاظت واجب ہے۔ حضرت حذیفہؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا: "مومن کو اپنے آپ کو ذلیل نہیں کرنا چاہئے، صحابہ نے عرض کیا: "مومن اپنے آپ کو کیسے ذلیل کرسکتا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: "اپنے آپ کو ایسی مصیبت میں مبتلا کرے جس کی وہ طاقت نہ رکھتا ہو"۔

''عن حذيفة قال: قال رسول الله ﷺ: لاينبغي للمؤمن أن يذل نفسه قالوا: وكيف يذل نفسه؟ قال: يتعرض من البلاء لما لايطيق'' (جامع الترمذی ابواب الفتن، باب لايتعرض من البلاء لما لايطيق رقم الحديث نمبر: ۲۲۵۴)۔

قاعدہ فقہیہ ہے: ''درء المفاسد أولى من جلب المصالح'' (الاشباه والنظائر/ ۱۴۷، ط: مکتبہ اشرفیہ دیوبند) (دفع مفاسد اولی ہے تحصیل مصالح سے)۔

قرآن وحدیث کی روشنی میں والدین ومعذورین کے حقوق

مولانا افتخار احمد مدنی مفتاحی [1]

سوال نمبر ۱: اگر کوئی شخص بوڑھاپے کی عمر کو پہنچ گیا لیکن اتنا کمزور نہیں ہے کہ کسب معاش نہ کر سکے کسی قدر مشقت کے ساتھ سہی وہ کما کر خود اپنی ضرورت پوری کر سکتا ہے تو کیا ایسے شخص کو اس کی اولاد یا اعزہ واقارب جن کے ذمہ اس کا نفقہ واجب ہے، کسب معاش پر مجبور کر سکتے ہیں؟

جواب ۱: قرآنی آیات میں حسن سلوک کی تاکید والدین سے لے کر غلاموں، باندیوں اور معاشرہ کے ہر طبقہ کے ساتھ کی گئی ہے اللہ پاک کا ارشاد ہے:

"واعبدوا الله ولا تشركوا به شيئًا وبالوالدين إحسانا وبذى القربى واليتامى والمساكين والجار ذى القربى والجار الجنب والصاحب بالجنب وابن السبيل وما ملكت أيمانكم إن الله لا يحب من كان مختالا فخورًا" (سورہ نساء: ۳۶)

(اور تم اللہ کی عبادت اختیار کرو اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک مت کرو اور والدین کے ساتھ اچھا معاملہ کرو اہل قرابت کے ساتھ بھی اور یتیموں کے ساتھ بھی اور غریب غرباء کے ساتھ بھی اور پاس والے پڑوسی کے ساتھ بھی اور ہم مجلس کے ساتھ بھی اور راہ گیر کے ساتھ بھی اور ان کے ساتھ بھی جو تمہارے مالکانہ قبضہ میں ہیں بے شک اللہ تعالی ایسے شخصوں سے محبت نہیں رکھتے ہیں جو اپنے کو بڑا سمجھتے ہوں)۔

بالخصوص والدین کے ساتھ حسن سلوک کے بارے میں تو کتاب وسنت میں اتنی واضح تعلیمات موجود ہیں کہ شاید دنیا کے کسی صحیفۂ اخلاق اور تعلیمات میں نہ ہوں والدین کے طرز عمل اور ان کی کسی بات پر ان کو جواب دینا تو در کنار انہیں زبان سے اف تک کہنے سے منع کیا گیا ہے۔ ارشاد خداوندی ہے:

"وقضى ربك أن لا تعبدوا إلا إياه وبالوالدين إحسانا إما يبلغن عندك الكبر أحدهما أو كلاهما فلا تقل لهما أف ولا تنهرهما وقل لهما قولا كريمًا" (سورہ اسراء: ۲۳۔۲۴)

(اور تیرے رب نے حکم دیا ہے کہ بجز اس کے کسی کی عبادت مت کرو اور تم ماں، باپ کے ساتھ حسن سلوک کیا کرو اگر تیرے پاس ان میں سے ایک یا دونوں بڑھاپے کو پہنچ جاویں سو ان کو کبھی اف (ہوں) مت کہنا اور نہ ان کو جھڑکنا اور ان سے خوب ادب سے بات کرنا۔

مذکورہ بالا آیت کے ذیل میں صاحب معارف القرآن (ادریسی) رقمطراز ہیں کہ اس آیت میں اللہ تعالی نے اپنی توحید اور عبادت کے بعد والدین کے ساتھ احسان کا حکم دیا ان دونوں حکموں میں مناسبت یہ ہے کہ اللہ تعالی انسان کے وجود کا سبب حقیقی ہے اس لئے اول اس کا حکم دیا اور والدین انسان کے وجود کا سبب مجازی اور ظاہری ہیں اس لئے والدین کے ساتھ احسان کا حکم بعد میں دیا نیز والدین کی شفقت رحمت خداوندی کا ایک نمونہ ہے، والدین کی شفقت ہر وقت موجزن رہتی ہے کہ ہر طرح کی بھلائی اولاد کو پہنچا دیں اور ہر طرح کی برائی کو اولاد سے دور رکھیں اور والدین سے جس خیر اور بھلائی کا اولاد کو پہنچانا ممکن ہوتا ہے وہ اس سے دریغ نہیں کرتے اور سوائے جذبۂ شفقت ومحبت اور کوئی ان کی غرض نہیں ہوتی اس وجہ سے انعام اور احسان میں خدا کے بعد والدین کا درجہ ہے پھر چونکہ حق تعالی علیم وخبیر ہے وہ خوب جانتا ہے کہ والدین بڑھاپے کے وقت اولاد پر گراں ہو جاتے ہیں، لہذا بطور اہتمام حکم دیتے ہیں کہ اگر ان میں سے ایک یا دونوں تیرے سامنے اور تیرے پاس بڑھاپے کو پہنچ جائیں اور ضعف اور عجز سے ان کی وہ حالت ہو جائے جو بچپن میں تیری تھی اور ایسی حالت میں کوئی ایسی بات ظاہر ہو جو طبعاً تم کو ناگوار ہو تو ایسی حالت میں بھی ان کے ادب واحترام کو ملحوظ رکھنا اور ان کے سامنے اف اور چوں نہ کرنا (معارف القرآن ادریسی ۴/ ۴۷۰)۔

مذکورہ بالا آیت کے پس منظر میں صاحب رد المحتار بھی (جلد ۵ ص ۵۴۵ پر) رقمطراز ہیں کہ "ومن كان صحيحًا غير عاجز عن الكسب

[1] استاذ جامعہ مفتاح العلوم مئو۔

لاتجب له النفقة على غيره وإن كان معسرا إلا الأب خاصة والجد عند عدمه؛ لأن الشرع نهى الولد عن إلحاق أدنى الأذى بالوالدين وهو التأفيف ومعنى الأذى فى إلزام الأب الكسب مع غنى الولد أكثر فكان أولى بالنهى''

کہ جو شخص صحیح سالم ہو کمانے سے عاجز نہ ہو تو اس کا نفقہ دوسرے پر واجب نہیں ہوگا اگر چہ وہ تنگ دست ہو مگر باپ اس سے مستثنیٰ ہیں اور باپ کی عدم موجودگی میں دادا اس لئے کہ شریعت نے والدین کو معمولی درجہ کی تکلیف پہنچانے سے بھی لڑکے کو ولا تقل لهما أف سے منع کر رکھا ہے، بایں وجہ اگر بیٹا مالدار ہے اور باپ کو نفقہ نہ دے کر کمانے پر مجبور کرے تو اس میں ''اف'' کہنے سے بھی زیادہ اذیت ہوگی اس لئے اس کی ممانعت تو بدرجہ اولیٰ ہوگی۔

امام سرخسی لکھتے ہیں کہ ''إذا كان الأب قادرا على الكسب يجبر الابن على نفقته بخلاف قول الحلوانى إنه لايجبر إذا كان الأب كسوبا؛ لأنه كان غنيا باعتبار الكسب فلا ضرورة فى إيجب النفقة على الغير وإذا كان الابن قادرا على الكسب لاتجب نفقته على الأب فلو كان كل منهما كسوبا يجب أن يكتسب الابن وينفق على الأب. فالمعتبر فى إيجاب نفقة الوالدين مجرد الفقر قيل هو ظاهر الرواية؛ لأن معنى الأذى فى إيكاله إلى الكد والتعب أكثر منه فى التأفيف المحرم بقوله تعالى: فلا تقل لهما أف'' (فتح القدير مع الكفايه كتاب الطلاق باب النفقة/ ۳۴۵)۔

جب باپ کمانے پر قادر ہو تو بیٹے کو ان کے نفقہ پر مجبور کیا جائے گا بخلاف حلوانی کے قول کے کہ ان کے نزدیک باپ جب کمانے پر قادر ہو تو بیٹے کو ان کے نفقہ پر مجبور نہیں کیا جائے گا، اس لئے کہ باپ کے کمانے پر قدرت کی وجہ سے انہیں غنی سمجھا جائے گا پس دوسرے پر نفقہ واجب کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے اور جب بیٹا کمانے پر قادر ہو تو اس کا نفقہ باپ پر واجب نہیں ہوگا، پس اگر دونوں کمانے کی طاقت رکھتے ہوں تو ضروری ہے کہ بیٹا کمائے اور باپ پر خرچ کرے پس معتبر والدین کے نفقہ کے واجب ہونے میں محض فقر ہے کہا گیا کہ امام سرخسی کا قول ظاہر الروایۃ کے مطابق ہے، اس لئے کہ تکلیف کا معنی محنت ومشقت کرانے میں ''اف'' کہنے سے زیادہ ہے جبکہ ''اف'' کہنا حرام ہے، اللہ تعالیٰ کے قول ولا تقل لهما أف کی وجہ سے۔

مذکورہ بالا قرآنی آیات اور فقہاء کی تصریحات سے یہ واضح ہوا کہ ماں، باپ کو ''اف'' کہنے سے بھی منع کر دیا کہ انہیں تکلیف نہ ہو اور ظاہر ہے کہ ''اف'' کہنے پر جتنی تکلیف ہوگی اس سے زیادہ اس وقت ہوگی، جبکہ بڑھاپے کی عمر کو پہنچنے کے بعد اس کی اولاد اپنے والدین (جن کے ذمہ ان کا نفقہ واجب ہے) کو کسب معاش پر مجبور کریں گے اس سے یہ بات واضح ہوئی کہ اولاد کو چاہئے کہ والدین جب بوڑھاپے کو پہنچ جائیں اور کسی قدر مشقت کے ساتھ کسب معاش پر قدرت بھی رکھتے ہوں تو انہیں کسب معاش پر مجبور نہ کریں، ''ويجب ذلك على مقدار الميراث ويجبر عليه؛ لأن التنصيص على الوارث تنبيه على اعتبار المقدار'' (ہدایہ باب النفقہ) (نفقہ میراث کی مقدار پر واجب ہوگا اور ان کو نفقہ دینے پر مجبور کیا جائے گا اس واسطے کہ وارث کی تصریح کرنا تنبیہ ہے مقدار میراث کے معتبر ہونے پر)۔

مولانا محمد یوسف صاحب لدھیانوی نے وضاحت کی ہے کہ اگر والدین یا دوسرے رشتہ دار غنی ہوں تو ان کی مالی کفالت آپ کے ذمہ نہیں اور اگر وہ نادار ہوں تو ان کی کفالت کا بار حصہ رسدی ان لوگوں پر آتا ہے جو ان کے مرنے کے بعد وارث ہوں۔

(۴) سن رسیدہ کا تعلق بیوی کا اصول وفروع کو چھوڑ کر اگر دوسرے قرابت دار کے طور پر ہو تو نفقہ واجب ہونے کے لئے دونوں کا ہم مذہب ہونا ضروری ہے۔

''ولا تجب نفقتهم مع اختلاف الدين لبطلان أهلية الإرث ولابد من اعتباره'' (ہدایہ باب النفقة)

ذی رحم محرم کا نفقہ دینی اختلاف کی صورت میں واجب نہیں ہوگا، کیونکہ وارث ہونے کی لیاقت باطل ہے، حالانکہ اس کا اعتبار ضروری ہے۔

''والوجوب فى غيرها من الرحم المحرم تحق الوراثة ولا وراثة عند اختلاف الدين فلا نفقة'' (بدائع الصنائع ۴/ ۳۶)

(دوسرے قرابت داروں کا نفقہ حق وراثت کی وجہ سے واجب ہوتا ہے اور دین کے مختلف ہونے کی شکل میں وراثت کا استحقاق نہیں ہوتا، اس لئے نفقہ واجب نہیں ہوگا مثلاً اگر کسی کا بھائی غیر مسلم ہو تو اس کا نفقہ اس پر واجب نہیں ہوگا)۔

مذکورہ بالا عبارت میں واضح کیا گیا کہ مذہب کا ایک ہونا ضروری ہے، اسی طرح ان کے نفقہ کے وجوب میں یہ بھی ضروری ہے کہ دونوں ایک ہی ملک کے شہری ہوں اسی وجہ سے اگر ایک ذمی بکسبہ بخلاف الابوین (ہدایہ کتاب الطلاق/ ۴۴۷) اور کمانے کی وسعت کا تعلق وتحقق بلوغت کے بعد صحت بدن کا ہونا ہے یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی بالغ ہے، لیکن وہ لنجا ہے تو اس کو محتاج کے زمرہ میں رکھ کر اس کے اقرباء پر نفقہ واجب کیا جاتا ہے۔

خلاصہ کلام یہ نکلا کہ والدین کسی قدر مشقت کے ساتھ سہی وہ کما کر خود اپنی ضرورت پوری کر سکتے ہیں تو بھی ان کا نفقہ اولاد پر واجب ہوگا اور انہیں کسب معاش پر مجبور نہیں کیا جا سکتا بخلاف دیگر رشتہ داروں کے کہ اگر ان میں کمانے کی طاقت ہو تو وہ کما کر اپنی ضرورت پوری کریں گے، اس لئے کہ ان کا نفقہ دوسروں پر احتیاج کی وجہ سے واجب ہوتا ہے اور یہاں احتیاج نہیں ہے۔

۲۔ سن رسیدہ حضرات کا نفقہ وعلاج کن صورتوں میں دوسروں پر واجب ہوگا۔

جواب: سن رسیدہ حضرات کی مختلف حیثیتیں ہیں۔

(۱) سن رسیدہ حضرات اگر ماں، باپ، دادا، دادی کی قبیل سے ہوں تو ان کا نفقہ اولاد پر بقدر کفایت واجب ہوگا، اس شرط کے ساتھ کہ اولاد نفقہ برداشت کرنے کی وسعت رکھتے ہوں اور یہ لوگ ضرورت مند ہوں لیکن باپ یا خاندان کے ضعیف لوگ اگر صاحب ثروت ہوں تو ان کا نفقہ دوسروں پر واجب نہیں ہوگا۔

''وعلى الرجل أن ينفق على أبويه وأجداده وجداته إذا كانوا فقراء وإن خالفوه في دينه'' (ہدایہ کتاب الطلاق باب النفقہ ۲/ ۴۴۵) (آدمی پر واجب ہے کہ اپنے والدین، اجداد اور جدات کو نفقہ دے جبکہ وہ محتاج ہوں اگرچہ دین میں وہ اس کے مخالف ہوں)۔

(۲) سن رسیدہ حضرات اگر ذی رحم محرم ہوں تو ان کا نفقہ میراث کے تناسب سے واجب ہوتا ہے بشرطیکہ احتیاج ہو، مثلاً آپ کا کوئی عزیز نادار ہے تو یہ دیکھنا ہوگا کہ اگر اس کا انتقال ہو جائے تو اس کی وراثت کا کتنا حصہ آپ کو ملے گا بس اس کے مصارف کا اتنا حصہ ہی آپ کے ذمے ہے۔ اس سلسلہ میں عرض ہے کہ عام رشتہ داروں کے ساتھ حسن معاشرت اور بہتر سلوک کے سلسلہ میں قرآن میں مختلف مقامات پر زور دیا گیا، سورہ بنی اسرائیل آیت ۲۶، ۲۷ میں حکم دیا گیا، "وآت ذا القربى حقه" (سورہ اسراء: ۲۶) (اور قرابت دار کو اس کا حق (مال وغیر مال) دیتے رہنا) مندرجہ ذیل آیت کے ذیل میں صاحب معارف القرآن مولانا مفتی شفیع صاحب رقمطراز ہیں کہ اس آیت میں عام رشتہ داروں کے حقوق کا بیان ہے کہ ہر رشتہ دار کا حق ادا کیا جائے جو کم سے کم ان کے ساتھ حسن معاشرت اور عمدہ سلوک ہے اگر وہ حاجتمند ہوں تو ان کی مالی امداد بھی اپنی وسعت کے مطابق اس میں داخل ہے، اس آیت سے اتنی بات تو ثابت ہوگئی کہ ہر شخص پر اس کے عام رشتہ داروں، عزیزوں کا بھی حق ہے۔

امام اعظم ابوحنیفہ کے نزدیک اسی فرمان کے تحت جو رشتہ دار ذی رحم محرم ہو اگر وہ عورت یا بچہ جن کے پاس اپنے گزارہ کا سامان نہیں اور کمانے پر بھی قدرت نہیں اسی طرح جو رشتہ دار ذی رحم اپاہج یا اندھا ہو اور اس کی ملک میں اتنا مال نہیں جس سے اس کا گزارہ ہو سکے تو ان کی جن رشتہ داروں میں اتنی وسعت ہے کہ وہ ان کی مدد کر سکتے ہیں ان پر ان سب کا نفقہ فرض ہے اگر ایک ہی درجہ کے کئی رشتہ دار صاحب وسعت ہو تو ان سب پر تقسیم کر کے ان کا گزارہ نفقہ دیا جائے گا سورہ بقرہ کی آیت "وعلى الوارث مثل ذلك" (سورہ بقرہ: ۲۳۳) سے بھی یہ حکم ثابت ہے (معارف القرآن ۵/ ۴۵۷)۔

حنفیہ کے نزدیک ہر ذی رحم محرم کا نفقہ واجب ہوتا ہے بشرطیکہ وہ محتاج ہوں اور جس کے ذمہ نفقہ واجب قرار دیا جائے، وہ صاحب گنجائش ہو اگر اگر کوئی صحیح، سالم ہو اور کمانے سے عاجز نہ ہو تو ان کا نفقہ دوسرے پر واجب نہیں ہوگا، سوائے باپ کے نیز یہ بات بھی واضح ہو کہ جو آدمی کمانے کی وسعت رکھتا ہے وہ اس قدرت کی بنا پر غنی متصور ہوگا، جیسا کہ صاحب ہدایہ نے وضاحت کی ہے،

''ثم لابد من الحاجة والصغر والأنوثة والزمانة والعمى أمارة الحاجة لتحقق العجز، فإن القادر على الكسب غني''

دار الاسلام میں ہو اور دوسرا حربی دار الکفر میں تو ایک کا دوسرے پر نفقہ واجب نہیں ہوتا۔

علامہ کاسانی نے اس کی وضاحت کی ہے: ''اتحاد الدار في غير قرابة الولادة من الرحم المحرم، فلا تجرى النفقة بين الذمي الذي في دار الإسلام وبين الحربي، في دار الحرب لاختلاف الدارين'' (بدائع الصنائع ۴/ ۴۳۹)۔

الجواب: ۳۔ بیوی کے علاوہ دوسرے اقرباء کا نفقہ اسی وقت واجب ہوتا ہے جب کہ وہ محتاج اور ضرورت مند ہوں، بوڑھے والدین یا خاندان کے بڑے اگر صاحب ثروت ہوں تو ان کا نفقہ دوسروں پر واجب نہیں ہوگا، اس لئے اگر وہ لوگوں پر خرچ کرنے کے لئے یا کچھ رقم محفوظ رکھنے کے لئے زائد رقم کا مطالبہ کرنا چاہیں تو نہیں کر سکتے، ہاں محتاجگی کی حالت میں جن پر نفقہ واجب ہوتا ہو ان کو چاہئے کہ ان کو خوش رکھنے کے لئے خدمت کرتا رہے اور محبت وادب سے پیش آتا رہے اور ان کی خواہشات کے مطابق کچھ مالی مدد کرتا رہے بشرطیکہ دینے والے کے پاس بھی فراوانی ہو، حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''إذا كان أحدكم فقيرًا فليبدأ بنفسه فإن فضل فعلى عياله فإن كان فضل فعلى قرابته'' (مغنی لابن قدامہ ۸/ ۱۸۵)
(جب تم میں کا کوئی ضرورت مند ہو تو شروعات اپنے سے کرے، اپنی ضروریات سے اگر کچھ مال و دولت بچ جائے تو اپنے اہل وعیال پر خرچ کرے اور اگر اس سے بھی بچ جائے تو قرابت داروں پر خرچ کرے)۔

صاحب رد المحتار نے لکھا ہے کہ محتاجگی کی شرط کے ساتھ اس لئے مقید کیا کہ ''لا تجب نفقة الموسر إلا الزوجة'' (رد المحتار ۵/ ۳۵۵)
(مالدار کا نفقہ سوائے بیوی کے کسی کا واجب نہیں ہوتا)۔

جہاں تک حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''إن أطيب ما أكل الرجل من كسبه وولده من كسبه فكلوا من أموالهم'' (ابوداؤد)
(بلاشبہ سب سے پاکیزہ چیز وہ ہے جو انسان اپنی کمائی سے کھائے اور اس کی اولاد اس کی کمائی سے ہی ہے، لہذا تم ان کے اموال کھاؤ)۔

نیز عمرو بن شعیب عن أبیہ جدہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''أنت ومالك لأبيك'' (تم اور تمہارا مال دونوں تمہارے والد کے لئے ہے) جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ والد اپنی اولاد کے مال سے جب چاہے اور جتنا چاہے لے سکتا ہے تو اہل علم نے اس کی وضاحت کی ہے کہ اس کی مراد یہ نہیں ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب والد کو کسی چیز کی ضرورت ہو اور وہ چیز بچے کے پاس زائد ہو یا اس کا اس کے بغیر گزارہ ہو سکتا ہو تو والد اس سے وہ چیز لے کر اپنی ضرورت پوری کر سکتا ہے، اس کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے کہ

''إن أولادكم هبة الله لكم فهم وأموالهم لكم إذا احتجتم إليه''
(بلاشبہ تمہاری اولاد تمہارے لئے اللہ کا عطیہ ہے پس وہ اور ان کے اموال تمہارے لئے ہیں جبکہ تم اس کے محتاج ہو)۔

الجواب: ۴ (الف): اسلام کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ جس طرح والدین نے بچپن میں اپنے بچوں کو پالا پوسا اور اس کے لئے ہر قسم کی صعوبتوں کو خندہ پیشانی سے برداشت کیا، اسی طرح اولاد کو بھی چاہئے کہ ماں باپ خاص کر جب بوڑھاپے کی منزل کو پہنچ رہے ہوں تو ان کا سہارا بنیں، ان کی خدمت کریں ان کی آنکھوں کا تارا بن کر ان کے پاس موجود رہیں، کیونکہ حدیث میں اس شخص کو بدنصیب کہا گیا ہے جو والدین ماں، باپ یا دونوں میں سے کسی ایک کو بڑھاپے کی عمر میں پائیں اور ان کی خدمت نہ کریں اسی طرح حدیث میں موجود ہے، ''البركة مع أكابركم'' (الجامع الصغیر) (بڑے اور بزرگوں کے ساتھ رہنے میں برکت ہے)۔

مقصود یہ ہے کہ بڑھاپے میں والدین کو اپنے ساتھ رکھنے کی بھرپور کوشش کریں اور آخری حد تک خدمت کرتے رہیں، حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے ایک شخص کو دیکھا کہ اپنی ماں کو اپنی پشت پر لے کر طواف کر رہا ہے تو اس شخص نے ابن عمرؓ کو جب دیکھ لیا تو پوچھا اے ابن عمرؓ آپ کی کیا رائے ہے میں نے ان کے حق کا بدلہ ادا کر دیا تو ابن عمرؓ نے ایک ہی سانس میں دو مرتبہ کہا نہیں، نہیں (مسند بزار، حدیث ۴۳۸۰) لیکن ایک دوسرا رخ یہ بھی ہے کہ بڑھاپے میں ماں، باپ کمانے کی قدرت نہیں رکھتے اور اگر کسی قدر مشقت اٹھا کر کام کر سکتے ہوں تو بھی اولاد کو اس بات کا مکلف بنایا ہے کہ ماں، باپ کا نفقہ بقدر ضرورت برداشت کریں اور موجودہ ہوش ربا گرانی کے دور میں گھریلو ضروریات کی تکمیل کرنا اور مکانات اور دیگر اخراجات کے نظم کے لئے خاطر خواہ پیسوں کا حاصل کرنا ایک اہم مسئلہ بن چکا ہے، خاص کر ان مقامات پر جہاں کوئی معیشت اور صنعت نہیں ایسے حالات میں رزق کے حصول کے لئے ان اسباب و ذرائع کو تلاش کرنا ناگزیر ہوگا جس سے ہماری ضرورت پوری ہو سکے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: ''طلب كسب الحلال فريضة بعد الفريضة'' (مشکوۃ شریف: ۲۴۲)۔

جس سے معلوم ہوا کہ رزق کا حاصل کرنا بھی از حد ضروری ہے اور حصول رزق کے لئے کسی جگہ، مقام کی تخصیص نہیں کی گئی بلکہ حکم دیا گیا ''فانتشروا في الأرض وابتغوا من فضل الله'' کہ زمین کے کسی بھی حصہ میں جہاں رزق مل سکتا ہو، حاصل کرنے کی کوشش کی جائے اور اللہ کے فضل کو تلاش کیا جائے اور یہ بات بھی کسی سے مخفی نہیں کہ رزق کی تنگی انسان کو ناگفتہ بہ منزل تک پہنچا دیتی ہے اور فقہاء نے اس بات کی صراحت کی ہے کہ جن سفروں میں خطرات درپیش نہ ہوں اور سفر کی ضرورت بھی ہو تو بلا اجازت بھی سفر کیا جا سکتا ہے، اس لئے اگر اپنی بستی اپنے شہر، اپنے ملک میں روپیہ، پیسہ خاطر خواہ مقدار میں کمانے کی کوئی صورت نہ ہو تو ماں، باپ کو چھوڑ کر دوسری جگہ جانا کوئی قباحت نہیں رکھتا بشرطیکہ ماں باپ کی ضروریات پر نظر رکھے ہوئے ہو۔ موجودہ دور میں سفر کی سہولیات اور ماں باپ کے حالات کو معلوم کرنا سہل تر ہو چکا ہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ اگر ماں، باپ کے ساتھ رہتے ہوئے ضروریات زندگی کے بقدر روپیہ، پیسہ کما سکتے ہوں تو زیادہ آمدنی کے لئے والدین کے حقوق کو قربان

کرتے ہوئے دوسری جگہ جانا درست نہیں ہے۔

(ب) اسلام میں انسانوں کی خدمت اور کمزور، معذوروں کے ساتھ حسن سلوک کی جتنی تاکید کی گئی ہے شاید ہی وہ کسی مذہب میں ہو اور اس حسن سلوک میں مرد وعورت میں کوئی امتیاز نہیں ہے، مسلمان مرد کی طرح مسلمان عورت بھی ان تعلیمات وہدایات کی مخاطب ہے شوہر کے ماں، باپ اگر بوڑھے اور خدمت کے محتاج ہوں تو کسی شریف اور مسلمان عورت سے جس کا دل خوف خدا سے لبریز ہو اس کی توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ خدمت سے پہلوتہی کرے گو ماں، باپ کی خدمت اصلاً تو اولاد پر واجب ہی ہے ارشاد خداوندی ہے: "ووصینا الإنسان بوالدیه" (سورہ لقمان: ۱۴) (اور ہم نے انسان کو اپنے والدین کا حق پہچاننے کی خود تاکید کی ہے)، اگر اولاد خود خدمت نہ کر سکتے ہوں تو اس بات کے مکلف ہیں کہ والدین کی خدمت کے لئے خادم رکھیں اور اس خادم کا بھی نفقہ برداشت کریں۔

عبداللہ بن محمود بن مودود موصلی حنفی تحریر فرماتے ہیں کہ "ویجب علی الابن نفقة خادم الأب إذا احتاج إليه، لأن خدمة الأب مستحقة علی الابن، فکذا النفقة من یخدمه" (اور بیٹے پر باپ کے خادم کا نفقہ واجب ہے، جبکہ اسے اس کی ضرورت ہو، کیونکہ باپ کی خدمت بیٹے پر لازم ہے تو ایسے ہی اس کا نفقہ بھی لازم ہوگا جو اس کی خدمت کرے)۔

شامی میں وضاحت کی گئی ہے کہ اگر والدین چلنے پھرنے سے معذور ہو جائیں اور ان کی خدمت اور دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہ ہو، ایک بیٹی ہے جو شادی شدہ ہے اور اپنی سسرال میں رہتی ہے تو اس شادی شدہ بیٹی کی ذمہ داری ہے کہ وہ باپ کے گھر آکر ان کی خدمت اور دیکھ بھال کا فریضہ ادا کرے، اگر شوہر اس کے لئے راضی نہ ہو تب بھی والدین کو اس بے بسی کی حالت میں تنہا نہ چھوڑے، ایسے موقع پر ماں، باپ کا حق مقدم ہے، "ولو أبوها زمنا مثلاً فاحتاجها الخ" (رد المحتار ۵/۲۵۷)۔ رہ گیا مسئلہ بہو کا تو قانونی طور پر وہ شوہر کے والدین کی خدمت کے لئے جوابدہ نہیں ہے، لیکن پھر بھی بہو کو چاہئے کہ اپنی ساس اور سسر کو اپنے والدین کے درجہ میں رکھے کہ یہ دیانت کا تقاضا یہی ہے کہ ان کی خدمت کرے اگر ماں کو اپنی ضروریات کے لئے تعاون کی ضرورت ہو اور وہ ایسا تعاون ہو جس کو بیٹا انجام نہ دے سکتا ہو تو بہو پر بدرجہ مجبوری اس خدمت کا بجالانا ضروری ہونا چاہئے جہاں تک معاملہ ساس سسر کے ساتھ رہنے پر مجبور کرنے کا ہے تو اس سلسلہ میں عرض ہے کہ قرآن نے شوہروں کو مخاطب کرتے ہوئے "أسکنوهن من حیث سکنتم" (سورہ طلاق: ۶) کا حکم دیا یعنی عورتوں کو ایسی جگہ رکھو جہاں خود رہتے ہو اور ان کو ضرر نہ پہنچنے دو۔

صاحب ہدایہ رقمطراز ہیں: "وعلی الزوج أن یسکنها في دار مفردة لیس فیها أحد من أهله إلا أن تختار ذلك، لأن السکنی من کفایتها فیجب لها کالنفقة وقد أوجبه الله تعالی مقرونا بالنفقة وإذا وجب حقا لها لیس له أن یشرك غیرها فیه؛ لأنها تتضرر به" (کتاب النفقة)

(شوہر پر واجب ہے کہ عورت کو علاحدہ گھر میں رکھے جس میں شوہر کے اہل میں سے کوئی نہ ہو جب تک عورت خود اس کو پسند کرے، کیونکہ عورت کی کفایات میں سے سکونت بھی ہے تو نفقہ کی طرح وہ بھی واجب ہوگا اور اللہ تعالی نے نفقہ کے ساتھ ملا کر اس کو بھی واجب کیا ہے اور جب عورت کے واسطے (سکونت) حق واجبی ہے تو مرد کے لئے جائز نہیں ہے کہ اس کے حق میں غیر کو شریک کرے کیونکہ عورت کو اس سے ضرر ہوتا ہے، مذکورہ بالا عبارت سے واضح ہوتا ہے کہ حتی الامکان ایسی شکل اختیار کی جائے کہ عورت مضرت میں مبتلا نہ ہو، اس لئے اگر ساس، سسر کے ساتھ رہنے میں عورت کو کسی قسم کی تکلیف اور مشقت کا سامنا نہیں ہوگا تو وہ خوشی بخوشی ان کے ساتھ رہنا گوارہ کرے گی، شوہر کو مجبور کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی اور اگر تکلیف اور مشقت کا غلبہ ظن ہو تو ان کے ساتھ رہنے پر مجبور نہ کیا جائے، علاوہ ازیں عورت کو خود چاہئے کہ ساس، سسر جو خدمت کے مستحق ہیں ان کو باپ، ماں کے درجہ میں رکھتے ہوئے ان کے ساتھ رہ کر ان کی خدمت میں مشغول رہے عنداللہ اجر وثواب کی مستحق ہوگی۔

(ج) ماں، باپ کی خدمت صرف بیٹوں پر واجب ہے یا بیٹیوں پر بھی، اس سلسلہ میں سب سے پہلے میں رجوع کرتا ہوں سورہ لقمان کی آیت ۱۴ کی طرف جس میں ارشاد خداوندی ہے: "ووصینا الإنسان بوالدیه" (سورہ لقمان: ۱۴) (اور ہم نے انسان کو اپنے والدین کا حق پہنچانے کی خود تاکید کی ہے)، اور یہ بات واضح ہے کہ انسان مرد اور عورت دونوں کو شامل ہے، اس سے معلوم ہوا کہ والدین کی خدمت بیٹے اور بیٹی دونوں پر واجب ہے۔

فقہاء کی عبارتوں سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح والدین کی خدمت اور کفالت بیٹوں پر واجب ہے، اسی طرح بیٹیوں پر بھی واجب ہے۔

"وهي علی الذکور والإناث بالسویة في ظاهر الروایة وهو الصحیح" (ہدایہ کتاب الطلاق)

(ماں، باپ کا نفقہ بیٹے اور بیٹیوں پر برابر واجب ہے یہی ظاہر روایت ہے اور صحیح قول ہے) حتی کہ اگر باپ محتاج ہو اور اس کی ایک لڑکی اور ایک لڑکا مالدار ہوں تو ان دونوں پر باپ کا نفقہ نصف، نصف واجب ہوگا، اس لئے کہ وجوب نفقہ کا سبب یعنی ولادت دونوں کو یکساں شامل ہے۔ شمس الائمہ سرخسی کی رائے ہے کہ باپ کا نفقہ بھی لڑکے اور لڑکی پر اثلاثا واجب ہوگا یعنی دو تہائی لڑکے پر اور ایک تہائی لڑکی پر، لیکن یہ قول صحیح نہیں ہے اور جو حکم نفقہ کا ہے وہی حکم والدین کی خدمت کا ہے، الغرض والدین کی خدمت بیٹے اور بیٹی دونوں پر واجب ہے جہاں تک معاملہ والدین کی خدمت سے شوہر کے روکنے کا ہے تو اس سلسلہ میں عرض ہے کہ چونکہ والدین کی خدمت بیٹے اور بیٹی دونوں پر واجب ہے اسی پس منظر میں علامہ شامی نے وضاحت کی ہے کہ اگر والدین معذور ہوں، چلنے پھرنے کی طاقت نہ رکھتے ہوں اور ان کی خدمت اور دیکھ بھال کرنے والا اور کوئی نہ ہو سوائے ایک بیٹی کے اور وہ بھی شادی شدہ ہے اپنے شوہر کے ساتھ بود و باش اختیار کئے ہوئے ہے تو اس شادی شدہ لڑکی کی ذمہ داری ہے کہ وہ باپ کے گھر آ کر ان کی خدمت کا فریضہ ادا کرے اور اگر شوہر اس کے لئے راضی نہ ہو تب بھی والدین کو اس بے بسی میں بے سہارا نہ چھوڑے، ایسے موقع پر والدین کا حق مقدم ہے جہاں تک معاملہ نفقہ کا ہے تو شوہر نفقہ روک سکتا ہے،

''ولا يمنعها عن الخروج إلى الوالدين في كل جمعة إن لم يقدروا على أتيانها على ما اختاره في الاختيار، ولو أبوها زمنا مثلاً فاحتاجها فعليها تعاهده ولو كافرا وإن أبي الزوج فتح (در مختار) أي مريضا مرضا طويلا وهذا إذا لم يكن من يقوم عليه، لأن ذلك من المصاحبة بالمعروف المامور بها لرجحان حق الوالد، وهل لها النفقة الظاهر لا، وإن كانت خارجة من بيته بحق كما لو خرجت لفرض الحج'' (رد المحتار ۵/ ۲۵-۲۲۴)۔

فقہاء کی عبارتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر ماں، باپ مجبور ہوں اور اپنی بیٹی کے پاس جانے کی قدرت نہ رکھتے ہوں، مزید خدمت کے محتاج ہوں تو شوہر چاہے اجازت دے یا نہ دے، وہ اپنے والدین کی خدمت میں حاضر ہوگی شوہر ان کے روکنے کا مجاز نہیں ہے، صاحب بحر الرائق نے لکھا ہے کہ

''فعلى الصحيح المفتى به تخرج للوالدين في كل جمعة بإذنه وبغير إذنه''

والدین کے پاس ہر جمعہ کو حاضر ہوگی چاہے شوہر کی طرف سے اجازت ہو یا نہ ہو، الغرض اگر والدین خدمت کے سخت مستحق ہوں اور خدمت کے لئے اپنی بیٹی کی ضرورت محسوس کرتے ہوں تو شوہر کو چاہئے کہ اپنی بیوی کو اس کے والدین کے پاس برائے خدمت جانے کی اجازت دیں روکنے کی کوشش نہ کریں، کیونکہ والدین کا حق بایں صورت شوہر پر مقدم ہے کہ شوہر کو روکنے کا حق نہیں ہے۔

۵۔ قرآن واحادیث میں نکاح کے متعلق غور کرنے سے نکاح کے مختلف مقاصد معلوم ہوتے ہیں، سورہ روم کی آیت نمبر ۲۱:

"ومن آياته أن خلق لكم من أنفسكم أزواجا لتسكنوا إليها وجعل بينكم مودة ورحمة إن في ذلك لآيات لقوم يتفكرون"

(اور اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ اس نے تمہارے واسطے تمہاری ہی جنس کی بیبیاں بنائیں، تاکہ تم کو ان کے پاس آرام ملے اور تم میاں بیوی میں محبت اور ہمدردی پیدا کی اس میں ان لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں جو فکر سے کام لیتے ہیں)، سے معلوم ہوتا ہے کہ نکاح کا اہم مقصد طمانینت قلب ہے، اور سکون قلب ہے، ایک انسان باہر کی دنیا میں تگ و دو کرتا رہتا ہے اور حصول رزق کے لئے جدوجہد کرتے کرتے جسم پسینہ سے شرابور ہو جاتا ہے بدن میں تھکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے، خلاف طبع باتوں سے بھی دوچار ہوتا ہے، لیکن جب وہ اندرون خانہ قدم رکھتا ہے تو بیوی کی مسکراہٹ، در مودت ومحبت کی ایک بولی اس کی تھکاوٹ کو دور کر دیتی ہے اور مرد وعورت دونوں ایک دوسرے کو مضرت رساں چیزوں سے دور رکھنے کی تمنائیں دل میں لئے رہتے ہیں، دکھ، درد میں ایک دوسرے کا مداوا بنتے ہیں، اسی لئے قرآن میں مرد وعورت کو ایک دوسرے کے لئے لباس سے تعبیر کیا گیا ارشاد خداوندی ہے، "هن لباس لكم وأنتم لباس لهن" (سورہ بقرہ: ۱۸۷) (عورتیں تمہارے لئے بمنزلہ لباس ہیں اور تم ان کے حق میں بمنزلہ لباس ہو)، جس طرح لباس سے انسانوں کو راحت و آرام اور سکون میسر ہوتا ہے، بہت سی مضرتوں سے حفاظت ہے اور گرمی سے بچاؤ حاصل ہوتا ہے اسی طرح زوجین بھی ایک دوسرے کے لئے راحت وسکون کے متلاشی ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کے دکھ، درد کو اپنا دکھ درد سمجھتے ہیں۔

دوسرا مقصد عفت وعصمت کی حفاظت ہے، فرمان نبوی ہے:

''يا معشر الشباب من استطاع منكم الباءة فليتزوج، فإنه أغض للبصر وأحصن للفرج'' (مشکوۃ

کہ صاحب استطاعت کو نکاح کرنا ہے، کیونکہ یہ نگاہ کو پست رکھنے اور عفت وپاکدامنی کا باعث ہے۔

تیسرا مقصد توالد وتناسل ہے، ارشاد نبوی ہے: ''تزوجوا الودود الولود، فإني مكاثر بكم الأمم'' کہ جس میں توالد کی صلاحیت زیادہ ہو اسی سے شادی کرو کیونکہ میں امت کی کثرت پر فخر کروں گا۔

قدرت کے باوجود نکاح نہ کرنے پر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے سخت تنبیہ فرمائی ہے، عکاف بن وداعہؓ سے اللہ کے رسول سے پوچھا: ''ألک زوجة'' کیا تمہارے پاس بیوی ہے تو انہوں نے جواب میں ''لا'' کہا یعنی نہیں، تو آپ نے ان سے وسعت وقدرت کے بارے میں سوال کیا تو انہوں نے ''نعم'' یعنی مثبت جواب دیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''فأنت إذا من إخوان الشياطين'' کہ تب تو تم شیطان کے بھائی ہو۔ اس شخص کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسکین کہا ہے جو غیر شادی شدہ ہو ارشاد ہے: مسكين مسكين مسكين ليس له امرأة (غنیۃ الطالبین/۹۱) مسکین ہے، مسکین ہے، مسکین ہے وہ شخص جس کی عورت نہیں ہے۔ اسی طرح جو عورت غیر شادی شدہ ہو اس کو بھی مسکین کہا گیا:

''مسكينة مسكينة امرأة ليس لها زوج. قيل: يا رسول الله! إن كانت غنية من المال قال: وإن كانت غنية من المال''

یعنی مسکینہ ہے مسکینہ ہے وہ عورت جس کا شوہر نہ ہو پوچھا گیا اگر وہ مالدار ہو تب بھی وہ مسکینہ ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تب بھی وہ مسکینہ ہے۔

اور بڑھاپے میں بیوی کی ضرورت اس لئے شدید ہو جاتی ہے کہ بڑھاپا خود ایک مرض ہے، مزید مختلف قسم کے امراض آ گھیرتے ہیں اٹھنا، بیٹھنا، پیشاب، پاخانہ کے لئے آنا جانا اور کرنا مشکل تر ہو جاتا ہے اور یہ ایسی ضروریات ہیں جس سے کسی انسان کو مفر نہیں اور بیوی کے علاوہ کوئی دوسرا اس خدمت کو چاہے بیٹے ہوں یا بیٹیاں انجام نہیں دے سکتا، اور شریعت نے مطلقہ عورت جب اس نے عدت پوری کر لی ہو اور کسی مرد سے شادی کرنا چاہے تو حکم دیا کہ اس کو شادی سے نہ روکو۔

"وإذا طلقتم النساء فبلغن أجلهن فلا تعضلوهن أن ينكحن أزواجهن" (سورہ بقرہ: ۲۳۲) تو اسی طرح اگر وہ مرد جس کے پاس بیوی نہ ہو اور وہ شادی کرنا چاہے تو اولاد کو رکاوٹ بننا درست نہیں، لیکن مرد اگر اپنے بوڑھاپے میں حالات پر مطمئن ہے اور گھر کے نظم ونسق کو مدنظر رکھتے ہوئے شادی نہ کرنا چاہے تو اس پر انہیں بھی اکسانا مناسب نہیں، جہاں تک والد کے بیوی کی کفالت کی استطاعت نہ ہونے کی صورت میں اولاد کی ذمہ داری کا معاملہ ہے تو اس سلسلہ میں عرض ہے کہ قرآنی آیات میں باپ کے ساتھ حسن سلوک اور احسان کا حکم دیا گیا ہے جس کا تقاضا یہ ہے کہ باپ پر کوئی ایسا بوجھ نہ ہو جس کی وجہ سے وہ مشقت میں مبتلا ہوں اور یہ ظاہر ہے کہ ضرورت اور تنہائی کی وحشت دور کرنے کے لئے باپ سے شادی کیا اور باپ پر بیوی کا نفقہ واجب ہوتا ہے اور باپ کفالت کی وسعت نہیں رکھتا تو اگر اولاد پر اس نفقہ کی ذمہ داری عائد نہیں کی جائے گی تو باپ مصیبت میں گرفتار ہوں گے، اس لئے اولاد کو اس کی رعایت کرنی چاہئے، فقہاء کی عبارتوں سے بھی یہی مستفاد ہوتا ہے اور ائمہ ثلاثہ اور ایک قول کے مطابق ابوحنیفہ بھی اسی کے قائل ہیں۔

۲۔ والد اپنے جائیداد کے مکمل مالک ہیں ان کی زندگی میں طلب وراثت کا کسی کو حق نہیں ہے، وراثت کا تعلق بعد الموت ہوتا ہے لیکن والد کو بھی یہ حق نہیں کہ اولاد کو حق وراثت سے محروم کرے اور ان کو نقصان پہنچانے کے لئے اپنی جائیداد کو فروخت کر دیں یا دوسرے کو خیرات کر دیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے والد کو نصیحت فرمائی ہے کہ جب دنیا سے جائیں تو بہتر ہے کہ اولاد کو خوشحال اور آسودہ چھوڑ کر جائیں، مشکوۃ شریف میں روایت موجود ہے کہ

''عن سعد بن وقاص قال: مرضت عام الفتح مرضا اشفيت على الموت فأتاني رسول الله ﷺ يعود لي فقلت: يارسول الله! إن لي مالا كثيرًا وليس يرثني إلا بنتي أفأوصي بمالي كله قال: لا... إنك أن تذور ورثتك أغنياء خير من أن تذرهم عالة يتكففون الناس وإنك لن تنفق نفقة تبتغي وجه الله إلا أجرت لها حتى اللقمة ترفعها إلى في امرأتك'' (متفق علیہ)

(حضرت سعد بن وقاصؓ بیمار ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم عیادت کے لئے تشریف لائے، حضرت سعد بن وقاصؓ نے عرض کیا کہ میرے پاس مال بہت ہے اور بیٹی کے سوا کوئی وارث نہیں ہے، میں چاہتا ہوں کہ اپنے سب مال کو (اللہ کے راستے میں صرف کرنے کی) وصیت کر جاؤں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نہیں، میں عرض کیا دو تہائی مال کی وصیت کروں؟ فرمایا نہیں، میں نے عرض کیا نصف مال کی، فرمایا نہیں، تب میں نے کہا کہ تہائی مال کی؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خیر تہائی مال کی کر سکتے ہو اور یہ بھی زیادہ ہے تمہارا اپنے وارثوں کو آسودہ چھوڑنا اس سے بہتر ہے کہ تم ان کو محتاج چھوڑ جاؤ اور وہ لوگوں کے آگے ہاتھ پھیلاتے پھریں، اور اس بات پر یقین رکھو جو بھی تم اللہ کی خوشنودی کے واسطے خرچ کرو گے اس پر اللہ کی طرف سے اجر دیا جائے گا، حتی کہ اگر بیوی کے منہ میں لقمہ بھی ڈالو گے تو اس پر بھی ثواب ملے گا)۔

وارثوں کو محروم کرنا شریعت کی نظر میں مستحسن نہیں ہے۔

''عن أنس قال: قال رسول اللہ ﷺ: من قطع میراث وارثه قطع الله میراثه من الجنة یوم القیامة'' (مشکوۃ شریف)

(حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص اپنے وارث کو میراث سے محروم کرے گا اللہ اس کو جنت سے محروم کردے گا)۔

اولاد کو باپ کی زندگی ہی میں اگر مطالبہ کا حق دیدیا جائے گا تو خدشہ اس بات کا ہے کہ باپ نے اگر اپنی جائیداد اولاد اور دیگر وارث ہونے والوں کے درمیان تقسیم کردیا اور باپ کسی مرض یا مصیبت میں مبتلا ہوگیا جس میں کثیر سرمایہ کی ضرورت ہو تو باپ کو دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلانا پڑسکتا ہے، جس میں ضرر لاحق ہوگا، اس لئے اولاد کو باپ کی زندگی میں مطالبہ کا حق حاصل نہیں ہوگا، لیکن باپ کو چاہئے کہ اولاد اگر معاشی اعتبار سے پریشان ہیں اور یہ صاحب وسعت ہو تو زندگی ہی میں کچھ زمین جائیداد، مال و دولت کو اپنے مستقبل کے لئے بچاکر ان کے مابین تقسیم کردے۔

۷۔ اولڈ ہومز، درحقیقت ایسے ہاسٹل ہوتے ہیں جہاں بوڑھوں کو زندگی کے آخری ایام گذارنا ہوتے ہیں، ان ہاسٹلوں میں ان کے دوا، علاج، خوردونوش کا نظم اس کے منتظمین کے ذریعہ کیا جاتا ہے اور اس انتظام وانصرام پر جو اخراجات آتے ہیں وہ ان کی اولاد سے وصول کئے جاتے ہیں، حتی کہ جب کوئی بوڑھا مرجاتا ہے تو ان کی اولاد و اقرباء کو مطلع کردیا جاتا ہے، اگر وہ تجہیز وتکفین میں شریک ہوجاتے ہیں تو فبہا ورنہ اسے دفن کردیا جاتا ہے اور اس پر آنے والے اخراجات کو لواحقین سے وصول کرلیا جاتا ہے، اس کا ایک پہلو تو بظاہر مستحسن دکھائی دیتا ہے کہ بوڑھاپے کی منزل میں کوئی انسان جب پہنچتا ہے تو اسے مختلف قسم کے امراض اپنی چپیٹ میں لے لیتے ہیں جس سے راحت کے لئے ہر وقت ڈاکٹروں کے پاس لے جاکر یا ڈاکٹروں کو بلاکر صلاح ومشورہ کرنا اور دوا کا نظم کرنا ناگزیر ہوجاتا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ معاملہ بھی پریشان کن ہے اور جب اولڈ ہوم میں داخل کردیا جاتا ہے تو وہاں ہر قسم کے انتظامات ہونے کی وجہ سے آسانی ہوتی ہے، لیکن دوسرا پہلو تکلیف دہ ہوتا ہے کہ وہ بوڑھے والدین جنہوں نے اپنے بچوں کو پالا پوسا اور اس کے لئے ہر قسم کی صعوبتوں کو برداشت کیا اس کا تقاضا تھا کہ یہ بچے بھی بوڑھاپے میں ان کا سہارا بنتے اور ان کی آنکھوں کا تارا بن کر ان کے پاس ہمہ وقت ہمہ تن حاضر رہتے اور حتی الوسع ان کی ہر پہلو سے خدمت کرے، کیونکہ ماں باپ کی خدمت صرف مال و دولت ہی سے کرنے کا حکم شریعت میں نہیں ہے بلکہ جسمانی خدمت کے بھی مکلف ہیں، قرآن کی آیت فآت ذا القربی حقه کے تحت حضرت حسنؓ سے فرمایا کہ ذوی القربی کا حق اس شخص کے لئے جس کو مالی وسعت حاصل ہے یہ ہے کہ مال سے ان کی امداد کرے اور جس کو یہ وسعت حاصل نہ ہو اس کے لئے جسمانی خدمت اور زبانی ہمدردی ہے علاوہ ازیں جامع صغیر کی روایت ''البرکة مع أکابرکم'' (بڑے اور بزرگوں کے ساتھ برکت ہے) کا مقصود بھی یہی ہے کہ بڑھاپے میں اولاد کو ان کے ساتھ رہنا اور ان کی خدمت کرنا ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اولڈ ہوم جیسے ہاسٹل شریعت کی نگاہ میں مستحسن نہیں ہے اور بزرگوں کو ایسے ہاسٹلوں میں قیام پذیر کرنے پر مجبور کرنے میں ان کو دلی تکلیف ہونا ناگزیر ہے، اس لئے ان کو مجبور نہیں کیا جاسکتا، حدیث میں اس شخص کو بدبخت قرار دیا گیا ہے جو والدین یا ان میں سے کسی ایک کو بڑھاپے کی عمر میں پائے اور ان کی خدمت نہ کرے۔

۸۔ جن پانچ چیزوں پر اسلام کی بنیاد رکھی گئی ہے ان میں سے ایک زکوۃ بھی ہے زکوۃ کی اہمیت کے پیش نظر اس کے مصارف کی تعیین انسانوں کے سپرد نہ کرکے از خود اللہ رب العزت نے متعین فرمادیا ہے جو آٹھ ہیں ان کے سوا کسی مصرف میں خرچ کرنا درست نہیں ہے۔ زیادہ بن الحارث الصدائیؓ سے روایت ہے کہ ایک آدمی رسول اللہ ﷺ کے پاس آکر صدقات کا سوال کرنے لگا آپ ﷺ نے اس سے فرمایا:

''إن الله لم یرض في الصدقات بحکم نبي ولا غیره حتی جزأها ثمانیة أجزاء فإن کنت من أهل تلك الأجزاء أعطیتك'' (ابوداؤد)

کہ اللہ تعالی راضی نہیں ہیں صدقات کے بارے میں کسی نبی اور غیر نبی کے فیصلہ پر یہاں تک کہ ان کے مصارف کو آٹھ حصوں میں بانٹ رکھا ہے پس اگر تم ان مصارف میں داخل ہوگے تو میں تمہیں دیدوں گا، ارشاد خداوندی ہے:

''إنما الصدقات للفقراء والمساکین والعاملین علیها والمؤلفة قلوبهم وفي الرقاب والغارمین وفي سبیل الله وابن السبیل فریضة من الله والله علیم حکیم'' (سورہ توبہ: ۶۰)

(صدقات وخیرات یعنی زکوۃ صرف فقیروں اور مسکینوں کا حق ہے اور ان لوگوں کا حق ہے جو ان کے وصول کرنے پر تعینات ہیں اور ان لوگوں کے لئے جن

کی تالیف قلب کی جائے اور غلاموں کی گردن چھڑانے میں اور مقروض اور اللہ کے راستہ (جہاد کرنے والے) اور مسافروں کے لئے یہ اللہ کی طرف سے فریضہ ہے اور اللہ بڑا علم والا ہے اور بڑی حکمت والا ہے)۔

ان آٹھ مصارف میں اولیت فقراء اور مساکین کو حاصل ہے، یہی وجہ ہے کہ قرآن میں اکثر و بیشتر مقامات پر زکوۃ کا مصرف فقراء کو قرار دیا گیا ہے، مثلاً:

"إن تبدوا الصدقات فنعما هي، وإن تخفوها وتؤتوها الفقراء فهو خير لكم" (سورۂ بقرہ: ۲۷۱)

(اگر ظاہر کر دو تم صدقات کو پس اچھا ہے وہ اگر چھپاؤ تم اس کو اور دو فقیروں کو پس وہ بہتر ہے واسطے تمہارے)

"للفقراء المهاجرين الذين أخرجوا من ديارهم" (سورۂ الحشر: ۸)

(یہ مال واسطے فقیروں وطن چھوڑنے والوں کے ہیں جو نکالے گئے گھروں اپنے سے)۔

''للفقراء الذين أحصروا في سبيل الله'' (سورہ بقرہ: ۲۷۳) (خیرات واسطے ان فقیروں کے جو بند کئے گئے ہیں بیچ راہ اللہ کے)۔

اور کہیں کہیں مسکین کا ذکر فرمایا:

"فكفارته إطعام عشرة مساكين من أوسط ما تطعمون أهليكم أو كسوتهم" (سورۂ مائدہ: ۸۹)

پس کفارہ اس کا کھلا دینا دس فقیروں کا درمیان سے اس چیز کے کہ کھلاتے ہو تم لوگوں اپنوں کو یا پہنانا ان کا۔

"ويطعمون الطعام على حبه مسكينا ويتيما وأسيرا" (سورۃ الدہر: ۸) اور کھلاتے ہیں کھانا او پر محبت اس کی کہ فقیروں کو اور یتیموں کو اور قیدیوں کو۔

قرآن میں جن آٹھ مصارف کا تذکرہ آیا ہے ان سب کی بنیاد فقر اور محتاجگی پر ہے، بایں وجہ اللہ کے رسول نے جب حضرت معاذؓ کو یمن بھیجا تو ہدایت فرمائی کہ

''إن الله افترض عليهم صدقة تؤخذ من أغنيائهم وترد على فقرائهم''

اللہ تعالی نے مسلمانوں پر یہ فرض کیا ہے کہ ان کے مالداروں سے زکوۃ لی جائے اور فقراء میں تقسیم کر دی جائے۔

اسی وجہ سے امام ابوحنیفہؒ اور جمہور ائمہ کے نزدیک مصارف زکوۃ میں فقر اور احتیاج شرط ہے، بغیر فقر کے کسی کو زکوۃ دینا جائز نہیں، نیز فقہاء نے اس بات کو واضح کر رکھا ہے کہ تمام مصارف زکوۃ میں تملیک شرط ہے، یعنی جس کو زکوۃ دی جائے اس کو مکمل مالک بنا دیا جائے کہ وہ اس میں جو بھی تصرف کرنا چاہے کر سکے، زکوۃ کے مصارف پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اصل مقصد ضرورت مندوں کی ضرورت کو پورا کرنا ہے، اس ضرورت کے پیش نظر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم مختلف لوگوں کو مختلف علاقوں میں زکوۃ کی وصولیابی کے لئے روانہ کرتے تھے اور جو مال زکوۃ وصول ہوتا اسے حاجتمندوں میں تقسیم کراتے کیونکہ یہ ذمہ داری اللہ رب العزت نے آپ کے کاندھوں پر رکھی تھی، فرمان خداوندی:

"خذ من أموالهم صدقة تطهرهم وتزكيهم بها وصل عليهم إن صلوتك سكن لهم" (سورۂ توبہ: ۱۰۳)

(ان کے مالوں سے زکوۃ وصول کیجئے کہ یہ ان کو پاک کرے گی اور ان کا تزکیہ ہوگا نیز ان کے لئے دعا فرمایئے کہ آپ کی دعا ان کے لئے سامان سکون ہے)۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ذمہ داری مختلف صحابہ کرام کو سپرد کر رکھی تھی، یہی وجہ تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دار فانی سے دار بقا کوچ کرنے کے بعد عہد صحابہ میں بھی اس پر عمل ہوتا رہا، لیکن موجودہ دور میں جہاں زمام حکومت مسلمانوں کے ہاتھوں میں نہیں ہے جیسے ہندوستان ان جگہوں پر مسلمانوں کو چاہئے کہ کسی ایک کو باہم ملکر امیر مقرر کرلیں اور انہیں کی زیر امارت وصولی اور تقسیم زکوۃ کی ذمہ داری انجام اور جہاں امارت شرعیہ کا قیام نہ ہو وہاں بھی کوئی انجمن، فلاحی تنظیم بنا کر اس کام کو انجام دینے کی ضرورت ہے، مذکورہ بالا باتوں کے پس منظر میں صورت مسئولہ میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ بوڑھاپے کی عمر میں اگر انسان کا ہاتھ خالی ہو اور بے سہارا ہو اور اس کی اولاد یا قریبی رشتہ دار موجود نہ ہوں تو ایسے ضرورت مندوں کی اجتماعی کفالت کے لئے خصوصی طور پر زکوۃ کی رقم استعمال کرنا مستحسن اقدام ہوگا۔

۹۔ مذہب اسلام میں سچ گوئی، راست بازی، امانت داری کو کلیدی حیثیت حاصل ہے ان پر سخت سے سخت تاکیدات موجود ہیں اور جعل سازی، کذب بیانی، خیانت سے سختی سے منع کیا گیا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "عليكم بالصدق فإن الصدق يهدي إلى البر والبر يهدي إلى الجنة" تم سچ بولنے کو اپنے اوپر لازم کرلو کیونکہ سچائی نیکی کی راہ دکھلاتی ہے اور نیکی جنت میں پہنچا دیتی ہے۔ "وإياكم والكذب فإن الكذب يهدي الفجور والفجور يهدي

إلى النار" اورتم جھوٹ بولنے سے ہمیشہ بچتے رہو کیونکہ جھوٹ گناہ کی طرف لے جاتا ہے اور گناہ دوزخ کے راستہ پر چلاتا ہے (بخاری ومسلم)

اللہ رب العزت کا فرمان ہے: "إن الله لا يهدي من هو كاذب كفار" (سورہ زمر: ۳) بلاشبہ اللہ جھوٹے اور احسان فراموش کو راہ نہیں دکھلاتا۔

بخاری ومسلم میں حدیث ہے: "آية المنافق ثلاث إذا حدث كذب وإذا وعد أخلف وإذا عاهد غدر"، منافق کی تین علامتیں ہیں:

(۱) جب بات کرے تو جھوٹ بولے (۲) جب وعدہ کرے تو خلاف کرے (۳) جب عہد واقرار کرے تو عہد شکنی کرے۔

ہنسی، مذاق میں بھی جھوٹ بولنے سے منع کیا گیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "لا يؤمن العبد الإيمان كله حتى يترك الكذب المزاحة والمزاح، وإن كان صادقًا" (احمد) کوئی بندہ پورا مومن ہو ہی نہیں سکتا یہاں تک کہ ہنسی، مذاق اور سچ میں چھوڑ دے اگر چہ وہ فی نفسہ سچا ہو۔

تجارت کے موقع پر بھی جھوٹی قسمیں کھا کر سامان بیچنے والے پر سخت وعید آئی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین دفعہ فرمایا: تین آدمی ہیں جن کی طرف خدا قیامت کے دن نہ دیکھے گا نہ ان کو پاک کرے گا اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے، صحابی کہتے ہیں میں نے کہا یہ لوگ جونا کام ہوئے اور ٹوٹے میں پڑے وہ کون ہیں یا رسول اللہ! فرمایا جو اپنا لباس ٹخنوں کے نیچے تک لٹکاتا ہے اور جو احسان جتاتا ہے اور جو جھوٹی قسمیں کھا کر اپنا مال بیچتا ہے (مسلم، ابوداؤد، ترمذی)۔

امانت داری وہ وصف ہے جسے ہم انسانوں نے اپنے کندھوں پر اٹھا رکھا ہے۔

"إنا عرضنا الأمانة على السموات والأرض والجبال فأبين أن يحملنها وأشفقن منها وحملها الإنسان إنه كان ظلومًا جهولا" (احزاب: ۷۲)

(ہم نے امانت کو آسمانوں، اور زمین اور پہاڑوں پر پیش کیا تو ان سبھوں نے اس کے اٹھانے سے انکار کر دیا اور اس سے ڈر گئے مگر انسان نے اس کو اٹھالیا یقیناً وہ بڑا ظالم اور ناداں تھا)

امانت داری کا دائرہ بہت وسیع ہے، خلاصہ یہ ہے کہ دین ودنیا کے حقوق کو پوری ایمانداری سے ادا کرنے کو امانت داری کہتے ہیں۔ قوانین کی پابندی اور راست گوئی بھی امانت میں داخل ہے۔ مذکورہ بالا احادیث وآیات کی روشنی میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ عمر دراز لوگوں کے لئے حکومتوں کی طرف سے جو مراعات مقررہ حد عمر کو پہنچنے والوں کو دی جاتی ہیں تو امانت داری کا تقاضا یہی ہے کہ جو لوگ اس مقررہ عمر تک پہنچ چکے ہوں وہی اس سے فائدہ اٹھائیں اور جو اس حد تک نہ پہنچے ہوں ان کے لئے ان رعایتوں سے فائدہ اٹھانا درست نہیں، کیونکہ اس میں شرمندگی کا بھی امکان ہے، لیکن اس صورت مسئلہ کا دوسرا رخ یہ بھی ہے کہ حکومتی سطح پر مختلف قسم کے آئی کارڈ بنائے جاتے ہیں، جیسے الیکشن کے آئی کارڈ، یا انکم ٹیکس یا راشن کارڈ وغیرہ وغیرہ ان کارڈوں پر جو عمر درج ہو جاتی ہے اس کا ردوبدل کروانا بھی دشواریوں سے خالی نہیں ہوتا اور سرکاران کارڈوں میں درج عمر پر مراعات دیتی ہے اور اس میں کسی قسم کی ذلت کا امکان بھی نہیں ہوتا، علاوہ ازیں سال، دو سال کی کمی زیادتی تو عموم بلوی کی حیثیت اختیار کر چکی ہے اس لئے ان کارڈوں میں درج عمر کے مطابق مراعات حاصل کرنا قضاء درست معلوم ہوتا ہے۔

والدین کے حقوق اور معمر افراد کے لئے ہاسٹل کی تعمیر

مولانا عبدالتواب اناوی[1]

(۱) ''وفی مختارات النوازل: وعلی الرجل أن ینفق علی أبویه وأجداده وجداته إذا کانوا فقراء، وکان الأب لم یکن کسوبا وإن کان کسوبا فیه اختلاف'' (مختارات النوازل، باب النفقات ۲/ ۲۰۴)۔

''وفی الهندیه: فإن کان الأب کسوبا هل یجبر الابن علی الکسب والنفقة؟ اختلفوا فیه، قیل: یجبر، وقیل: لا یجبر'' (فتاوی ہندیه، باب النفقات فصل فی نفقة ذوی الارحام ۱/ ۵۶۵)۔

مذکورہ بالا عبارت پر نظر کرتے ہوئے مفہوم ہوتا ہے کہ اس صورت حال کی چار شکلیں بنتی ہیں:

(۱) اولاد اور ابوین دونوں موسر (۲) اولاد اور ابوین دونوں معسر (۳) اولاد موسر ابوین معسر (۴) اولاد معسر ابوین موسر۔

الف (۱) جب والدین اور اولاد دونوں خوشحال ہوں اور ہر ایک کی گذر بسر ٹھیک طرح ہو رہی ہو تو ہر ایک اپنے اپنے نفقہ کا ذمہ دار ہوگا، کسی ایک کا نفقہ دوسرے پر واجب نہیں کیا جائے گا۔

ب (۲) اگر دونوں تنگ دست ہیں، فقیر ہیں تو تین صورتیں ہوں گی:

(۱) دونوں کسوب ہوں گے، (۲) دونوں غیر کسوب ہوں گے، (۳) ایک کسوب اور ایک غیر کسوب ہوگا۔

(۱) جب تنگ دست اولاد اور ابوین دونوں کسوب ہوں تو ظاہر ہے کسی کا کسب کم ہوگا کسی کا زیادہ اور یہی صورت اخراجات کی بھی ہوگی، ممکن ہے کسی کی آمد کم اور اخراجات کثیر اور دوسرے کی آمد ٹھیک اور خرچ کم مگر فاضل عن الصرف سے دوسرے کے اخراجات کا بھی تکفل نہیں ہو سکتا تو اس صورت میں دونوں کو اپنی آمدنی ملا کر ایک ساتھ معاشرت کا حکم دیا جائے گا، اور دونوں کو اپنی اپنی آمد میں اضافہ کی فہمائش کی جائے گی۔

(۲) جب اولاد اور والدین دونوں تنگ دست اور غیر کسوب ہیں تو اس صورت میں بھی کسی کا نفقہ کسی پر واجب نہیں ہوگا، بلکہ دونوں کا نفقہ دوسرے اقارب پر جو خوشحال ہوں الاقرب فالاقرب کے ضابطے پر ہوگا۔

(۳) فقیر باپ اور بیٹے میں سے ایک کسوب اور دوسرا غیر کسوب ہے تو اس صورت کی بھی چار شکلیں ہوں گی:

(۱) کسب، دونوں کے اخراجات کے لئے کافی ہے، (۲) کسب صاحب کسب کے پورے اور دوسرے کے بعض اخراجات کے لئے کافی ہے، (۳) کسب صرف صاحب کسب ہی کے لئے کافی ہے، (۴) کسب صاحب کسب کی صرف چند ہی ضروریات پوری کر سکتی ہے۔

(۱) اس صورت میں دونوں کو ایک ساتھ رہ کر زندگی گزارنے کا حکم دیا جائے گا اور دیگر اعزاء سے ان کی مالی امداد کی فہمائش کی جائے گی وقتاً فوقتاً۔

(۲) دونوں کو ایک ساتھ رہنے کا حکم ہوگا اور اخراجات کی کمی کی حد تک قریبی عزیزوں پر ان کے نفقہ کو واجب کیا جائے گا۔

(۳) صاحب کسب کو تنہا اپنے اخراجات پورا کرنے کا حکم دیا جائے گا، اور دوسرے کا نفقہ اقرباء پر واجب ہوگا۔

---

[1] جامعہ اسلامیہ بانگر مئو، ضلع اناؤ، یوپی۔

(۴) کسب سے زائد نفقہ کی ذمہ داری اہل قرابت پر ڈالی جائے گی۔

ج (۳) اولاد موسر اور ابوین معسر۔

اس صورت کی تین شکلیں بنتی ہیں:

(۱) اولاد موسر کسوب، والدین معسر کسوب (۲) اولاد موسر غیر کسوب، والدین معسر غیر کسوب، (۳) اولاد موسر غیر کسوب، والدین معسر کسوب۔

(۱) اگر والدین کسب کو برا نہیں سمجھتے اور انہیں کوئی دشواری بھی نہیں ہوتی اور از خود اپنی ضروریات پوری کر لیتے ہیں تو ایسی صورت میں اولاد کو ان کے نفقہ پر مجبور نہیں کیا جائے گا، بلکہ والدین کو اپنے ہاتھ پیر چلاتے رہنے کی تاکید و تلقین کی جائے گی، البتہ اولاد کو ان کی نصرت و مدد کی فہمائش کی جائے گی۔

(۲) اس صورت میں دیکھا جائے گا کہ اولاد کے پاس اپنے اخراجات سے زائد ہے یا نہیں اگر ہے تو زائد کو والدین پر صرف کرنے کا حکم دیا جائے گا اور اگر زائد نہیں ہے تو اسے والدین کو اپنے عیال کے ساتھ شامل کرنے کی فہمائش کی جائے گی۔

(۳) اس صورت میں ایک دوسرے پر نفقات واجب نہیں ہوں گے، مگر والدین کو اپنی آمدنی بڑھانے اور اولاد کو ان کی ممکنہ مدد کرنے کا مشورہ دیا جائے گا۔

د (۴) اولاد معسر اور ابوین موسر۔

اس صورت کی بھی تین شکلیں بنتی ہیں:

(۱) اولاد معسر کسوب، والدین موسر کسوب، (۲) اولاد معسر غیر کسوب، والدین موسر غیر کسوب، (۳) اولاد معسر غیر کسوب، والدین موسر کسوب۔

والدین خوشحال برسر روزگار اور اولاد تنگ حال، مگر روزگار سے جڑی ہوئی ہے اگر اس کا روزگار اس کی ضروریات کے لئے کافی ہے تو بہت خوب اور اگر نہیں تو دیکھا جائے گا کہ اس کی آمدنی سے اس کے اخراجات کتنے زائد ہیں اگر کچھ ہی کم ہیں، بلکہ تقریباً پورے ہی سمجھے تو اسے صبر کی تلقین کے ساتھ اسے اپنی ذرائع آمد کے بڑھانے کے لئے کہا جائے گا، اور اگر زیادہ کم ہوں تو اس کمی کو پورا کرنے کی ذمہ داری جملہ اقارب پر مثل ارث الاقرب فالاقرب کے ضابطہ پر ہوگی، البتہ خوشحال والدین اگر اپنے بیٹے کے ساتھ ایثار کرتے ہوئے انہیں اپنے ساتھ رکھیں اور ان کے اخراجات برداشت کریں تو یہ ان کے لئے باعث اجر بھی ہے اور انہیں اپنے عیال کی طرف نظر کرتے ہوئے، ایسا ہی کرنا چاہئے یہی محبت اور پیار کا تقاضا ہے اور اسی کو صلہ رحمی بھی کہتے ہیں۔

"والموسر في هذا الباب من يملك مالا فاضلا عن نفقة عياله ويبلغ الفاضل مقدار تجب فيه الزكوة" (خانيه على هامش الهنديه ۱/ ۴۴۰)۔

وجوب نفقات علی غیرہ کے عنوان سے فقہاء کرام نے یہ ضابطہ متعین فرمایا ہے کہ جس شخص کے پاس مالی اعتبار سے اتنی وسعت ہے کہ وہ اپنے اور اپنے عیال کے اخراجات پوری کرنے کے بعد بھی اپنے پاس اتنی مقدار میں مال رکھتا ہے جتنے پر زکوۃ واجب ہوتی ہے تو ایسا شخص شرعاً موسر یعنی امیر و خوشحال ہے اور اگر کسی کی اتنی مالی حیثیت نہ ہو تو وہ شرعاً معسر یعنی تنگ دست و فقیر ہے، اسے زکوۃ بھی دی جاسکتی ہے۔

موسر یعنی خوشحال شخص اپنے اور اپنے عیال کے نفقہ کا بہر حال خود ذمہ دار ہے نہ اس کے نفقات دوسروں کی طرف وجوباً منتقل ہوں گے اور نہ ہی وہ شخص اپنی موجودہ مالی حیثیت پر زکوۃ ہی کا مستحق ہوسکتا ہے۔

پھر شریعت نے جس شخص کو معسر یعنی فقیر کہا ہے وہ بھی ایک حال پر نہیں ہے کسی کا کسب فاضل عن الاخراجات ہے مگر وجوب زکوۃ تک نہیں پہنچتا، کسی کا اس سے کم بچتا ہے اور کچھ ایسے بھی ہیں جن کی آمد خرچ برابر ہے اور بعض کی آمد خرچ سے بھی کم ہے۔

بہر حال وہ فقیر جو اپنی اور اپنے عیال کی حوائج اصلیہ پورا کرنے میں محتاج ہو خواہ کلی طور پر یا جزدی طور پر ان کا نفقہ اس حد تک دوسروں پر واجب ہے جس سے وہ اپنی مع اہل و عیال بلا تکلف ضروریات اصلیہ پوری کر سکیں۔

سوالنامہ میں صورت مسئولہ سے متعلق لکھا ہے کہ اس کی اولاد یا اس کے اعزہ و اقارب پر اس کا نفقہ واجب ہے، جس سے وہ اپنی حوائج اصلیہ پورا کر سکتا ہو، ہاں ہاتھ پیر مار کر کسی طرح گذر بسر کرے تو اور بات ہے۔ اور اسی سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ اس کی اولاد اور اعزہ موسر یعنی مالدار ہیں اور فقیر باپ کا نفقہ

مالدار اولاد پر بہر حال واجب ہوتی ہے۔

اس سے صورت مسئولہ میں اولاد یا دوسرے اعزہ واقارب اپنے باپ کو یا اس شخص کو جس کا نفقہ اس کے اوپر واجب ہو چکا ہو اسے کسب معاش پر مجبور نہیں کر سکتے، البتہ انہیں توجہ دلا سکتے ہیں، ترغیب دے سکتے ہیں حصول معاش کے حوالے سے ان کی نصرت ومدد کی جا سکتی ہے، کسب خود کے فضائل وبرکات بتا کر انہیں اس کی طرف راغب اور تیار کیا جا سکتا ہے، مگر اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہو کر انہیں حصول معاش کے لئے مجبور کرنا کسی طرح درست نہیں معلوم ہوتا، اور اس لئے بھی کہ آج مسائل سے اکثر ناواقف معاشرہ جو کچھ کم وبیش اپنے بزرگوں کی کسی طرح خدمت کر رہا ہے وہ اسے بھی چھوڑ دے گا اور انہیں مجبور کر دے گا کہ وہ اپنا دست نہ چاہتے ہوئے بھی غیروں کے سامنے دراز کریں یا پھر گرتے پڑتے کسب معاش کی گھاٹیاں عبور کریں۔

''وفی الهداية: ثم لا بد من الحاجة، والصغر، والأنوثة، والزمانة والعمى، امارة الحاجة لتحقق العجز عن الكسب، فإن القادر على الكسب غني بدفع الضرر عنهما فتجب نفقتهما مع قدرتهما على الكسب'' (ہدایہ، فتح القدیر کتاب الطلاق باب النفقات ۴/ ۳۸۰)۔

''وفی فتح القدير: ولا يجبر الموسر على نفقة أحد من قرابته إذا كان رجلًا صحيحًا وإن كان لايقدر على الكسب إلا فی الولد خاصة، أو فی الجد أبي الأب إذا مات الولد فإنی أجبر الولد على نفقته وإن كان صحيحًا'' (فتح القدیر، کتاب الطلاق باب النفقات ۴/ ۳۸۰)۔

مذکورہ عبارات سے پتہ چلتا ہے کہ سن رسیدہ مفقود النفقہ حضرات کی تین قسمیں ہو سکتی ہیں: (۱) ابوین، (۲) محارم، (۳) غیر محارم۔

(۱) جن صورتوں میں کسی کا نفقہ دوسرے پر واجب ہوتا ہے ان تمام صورتوں میں والدین کا نفقہ انکی مذکر اولاد پر واجب ہوتا ہے اگر وہ موجود ہوں۔

(۲) محارم کا نفقہ وارثوں پر "وعلى الوارث مثل ذلك" (سورہ بقرہ: ۲۳۳) کے ضابطہ پر واجب ہوتا ہے اگر وارثین خرچ برداشت کرنے کی پوزیشن میں ہوں۔

(۳) غیر محارم کے نفقات کسی پر واجب نہیں ہوتے البتہ استحساناً اگر کوئی کسی مجبور اور معذور شخص کی مدد کرے تو یہ اس کے حق میں بہتر ہے۔

انفقوا فی سبیل اللہ کی راہ سے غرباء اور مساکین کی نصرت اور اپنی اپنی مالی حیثیت کے مطابق مدد کرتے رہنا چاہئے، انہیں فراموش اور نظر انداز نہ کیا جائے۔

سن رسیدہ حضرات کا نفقہ وعلاج کن صورتوں میں دوسروں پر واجب ہے؟

(۱) سن رسیدہ حضرات کسی اکتسابی کام کی صلاحیت نہ رکھتے ہوں۔

(۲) کچھ نہ کچھ کام کی طاقت ہو مگر وہ ناکافی ہو یا وسائل نہ ہونے کی صورت میں وہ نہ ہونے کے مرادف ہو۔

(۳) ان کی کوئی مذکر اولاد نہ ہو، یا اگر ہو تو وہ ان کی کفالت کے لائق نہ ہو۔

(۴) ان کے پاس اتنا جمع مال بھی نہ ہو جن سے وہ اپنی ضروریات اور حاجات بلا کسی کے تعاون کے پورے کر سکیں۔

(۵) سرکاری خزانے سے بھی ان کو امداد کا کوئی سہارا نہ ہو۔

(۶) مسلمانوں یا دیگر قوموں کے ملی رفاہی ادارے بھی ان کی طرف توجہ نہ کر رہے ہوں۔

(۷) سرکاری نظام میں ایسے حضرات کے لئے کوئی علاحدہ نظم ونسق نہ ہو۔

اس طرح کی صورتوں میں سن رسیدہ حضرات کی کفالت دوسرے حضرات کے ذمہ واجب ہو جاتی ہے جسے پورا کرنا بہر حال ضروری ہوگا۔

اولاً: یہ نفقہ اگر ان کی مذکر اولاد اس قابل ہے کہ وہ ادا کر سکے تو اس پر واجب ہوگا، یعنی والدین کے جملہ اخراجات مذکر بالغ موسر اولاد پر واجب ہوں گے۔

ثانیاً: "وعلى الوارث مثل ذلك" (سورہ بقرہ: ۲۳۳) کے قبیل سے قریب کے محارم رشتہ داروں پر ایسے لوگوں کا نفقہ واجب ہوگا خواہ نفقہ وعلاج مقدار میں کم ہو یا زیادہ۔

ثالثاً: اگر مذکر اولاد نہ ہو یا ہو مگر اخراجات برداشت کرنے کے لائق نہ ہو اور اس کے محارم رشتہ دار بھی نہ ہوں یا ہوں مگر سب کے سب خود فقیر اور محتاج ہوں تو ایسی

صورت میں پھر "وعلی الوارث مثل ذلك" (سورہ بقرہ: ۲۳۳) کے ضابطہ پر محارم بعید پر نظر کی جائے گی اور ان سب پر ان کے جملہ اخراجات کو ان کے حصۂ میراث کے مطابق ان پر نفقہ وعلاج واجب قرار دیا جائے گا، لیکن یہ اسی صورت میں ہوگا جب محارم قریب موجود نہ ہوں، ورنہ محارم بعید یا غیر محارم مثلاً دوست احباب وغیرہ پر اخراجات نفقہ وعلاج واجب قرار نہ پائیں گے، البتہ استحساناً بلا کسی قید وبند اور تعیین تعداد کے ان پر بھی اخراجات کی ذمہ داری ڈالی جائے گی اور وہ اسے بطیب خاطر جو خرچ کرے، اس سے سوا انہیں مزید اخراجات کا پابند نہیں کیا جائے گا، کیونکہ استحسان کا یہی مطلب ہوتا ہے۔

''وفی مختارات النوازل: فالولد الكبير مامور بدفع الضرر عن الوالدين إلا أن الأب يستحق النفقة على ابنه لمجر الحاجة وغيره لايستحق إلا بالحاجة والعجز عن الكسب'' (مختارات النوازل، كتاب الطلاق باب النفقات ۲/ ۲۰۴)۔

''وفی الهندية: ولا يجبره على أن يعطى شيئًا علاحدة'' (فتاوى ہندیه، باب النفقات، فصل فی نفقة ذوی الارحام ۱/ ۵۶۵، وفتاوى شاميه مطلب صاحب الفتح كتاب الطلاق ۵/ ۲۷۹، بحر الرائق، كتاب الطلاق، باب النفقة ۴/ ۲۴۹)۔

مذکورہ عبارت سے مستفاد ہوتا ہے کہ والدین اگر محتاج ہوں تو اولاد پر اور اولاد کے نہ ہونے پر دوسرے اقارب پر دفع ضرر کی حد تک نفقہ واجب ہے اور حقدار کو اپنا حق وصول کرنے کا شرعاً پورا حق ہے، لیکن اگر محتاج نہ ہو تو کیا پھر بھی وہ اپنی اولاد یا اہل قرابت سے کچھ وصول کر سکتا ہے جبکہ بروقت اسے زائد عن النفقۃ کی ضرورت بھی نہ ہو؟

اس صورت میں دو باتیں مفہوم ہوتی ہیں:

(۱) والدین اپنی اولاد کے سوا کسی اور سے بحالت محتاجی بقدر حاجت ہی نفقہ کا مستحق ہو سکتا ہے اس سے زائد کا نہیں، جیسا کہ عبارت بالا وغیرہ "لا يستحق إلا بالحاجة والعجز عن الكسب" سے مفہوم ہے۔

(۲) البتہ اگر باپ یا ماں کے پاس اپنے گذر بسر کی حد تک تو نفقہ ہے مگر آنے والے مہمانوں کی ضیافت، معروف طریق پر بیٹی داماد نیز قریبی عزیز کے تحائف وغیرہ کے اخراجات کی حد تک نہیں ہے تو فقہاء کی اس عبارت "فالولد الكبير مأمور بدفع الضرر عن الوالدين إلا أن الأب يستحق النفقة على ابنه لمجرد الحاجة" سے مفہوم ہوتا ہے کہ والدین جملہ ضروریات کے لئے اپنی اولاد سے مطالبہ کا حق رکھتے ہیں مگر شرط یہ ہے کہ اولاد بھی اس پوزیشن میں ہو کہ وہ ان کے ہر مطالبہ کو بلا تنگ حالی کے پورا کر سکتے ہوں، ورنہ بصورت دیگر یعنی جب اولاد خود ہی تنگ دست ہو تو نادار والدین کے صرف نفقۂ واجبہ کی ذمہ داری ہوگی، جیسا کہ مذکورہ بالا عبارات سے مفہوم ہوتا ہے، اور وہ بھی اس طرح کہ اپنے عیال کے ساتھ والدین کو نفقہ میں شریک کرے گا علاحدہ سے انہیں کچھ نہیں دیا جائے گا، خواہ انہیں ان اخراجات کی ضرورت ہوتی ہو یا نہ ہوتی ہو، رہی بات رقم محفوظ کرنے کی تو صورت اولی میں اگر اولاد اس اضافی مطالبہ کو بخوشی منظور کر لے تو کچھ حرج نہیں مگر صورت ثانیہ میں اس مطالبہ کی گنجائش معلوم نہیں ہوتی اسے جائز نہ ہونا چاہئے۔

(۴) الف: ''وقال محمد فی السير الكبير: إذا أراد الرجل أن يسافر إلى غير الجهاد للتجارة أو حج أو عمرة وكره ذلك أبواه فإن كان يخاف الضيعة عليهما بأن كان معسرين ونفقتهما عليه وماله لايبقى بالزاد والراحلة ونفقتهما، فإنه لايخرج بغير إذنهما، سواء كان سفر يخاف على الولد الهلاك فيه كركوب السفينة فى البحر أو دخول البادية ماشيًا فى البرد أو الحر الشديد، أو لايخاف على الولد الهلاك فيه، وإن كان لايخاف الضيعة عليهما بأن كانا موسرين ولم تكن نفقتهما عليه إن كان سفرًا لايخاف على الولد الهلاك فيه، كان له أن يخرج بغير إذنهما، وإن كان سفر يخاف على الولد الهلاك فيه لايخرج إلا بإذنهما، كذا فى الذخيرة، وكذا الجواب فيما إذا خرج للنفقة إلى بلدة أخرى'' (فتاوى ہندیه، كتاب الحظر والاباحة باب فى الرجل يخرج إلى سفر ويمنع ابواه ۵/ ۳۶۵ ياسر نديم اينڈ کمپنی ديوبند)۔

''وفی الدر المختار: وبالغ له أبوان أو إحداهما لأن طاعتهما فرض عين وفيه لايحل سفر فيه خطر إلا بإذنهما وما لا خطر فيه يحل بلا إذن، ومنه السفر فى طلب العلم'' (درمختار)۔

''وفی الشامية (قوله: فى خطر) كالجهاد وسفر البحر وما لا خطر كالسفر للتجارة والحج والعمرة يحل بلا إذن

إلا إن خيف عليهما الضيعة'' (رد المحتار على الدر المختار، كتاب الجهاد، مطلب طاعة الوالدين فرض عين ۶/ ۱۵۴-۱۵۵)۔

مذکورہ عبارت سے یہ بات مفہوم ہوتی ہے کہ والدین اگر تنگ دست اور ضعیف بیمار قریب المرگ نہ ہو، بلکہ اپنی ضروریات پوری کر لینے کی ان میں طاقت بھی ہو اور سرمایہ بھی اور لڑکے کو حالت سفر میں بظاہر جان کے خطرہ کا اندیشہ نہ ہو تو ایسا سفر خواہ تجارت کی غرض سے ہو، یا حج وعمرہ کی غرض سے یا تحصیل علم اور تبلیغ کے لئے ہو یا کسی طرح کی ملازمت کے لئے ہو تو والدین کی اجازت اور بلا اجازت دونوں طرح جائز ہے، لیکن بہر صورت اجازت لینا بہتر ہوگا۔

اور اگر والدین بیمار ہوں چند دن کے مہمان نظر آتے ہوں یا ان کے پاس نفقہ نہ ہو اور اولاد کے پاس بھی زاد سفر سے زیادہ نہ ہو کہ اپنے نادار والدین کو اخراجات کے لئے دے، یا سفر میں اولاد کو خطرات سے گذرنا ہو جو بسا اوقات ہلاکت کا سبب بن جایا کرتے ہیں تو ان تینوں صورتوں میں والدین کی اجازت کے بغیر اولاد کو سفر میں نکلنا جائز نہیں خواہ سفر بغرض تجارت ہو یا بغرض عبادت یا برائے طلب علم ہو یا بغرض تبلیغ دین۔

معلوم یہ ہوا کہ آمدنی کی زیادتی کی غرض سے والدین کو چھوڑ کر جانے میں مذکورہ بالا ہدایات کا لحاظ ضروری ہوگا، یعنی والدین اور اولاد دونوں میں سے کسی کے ضیاع کا خطرہ نہ ہو والدین موسر ہوں ضعیف اور ناتواں نہ ہوں تو ایسی صورت میں ان کی اجازت اور بلا اجازت دونوں طرح دوسری جگہ جانا جائز اور درست معلوم ہوتا ہے، البتہ بصورت دیگر دوسری جگہ بزیادتی آمد کی خاطر جانا جائز تو ہوگا مگر ابوین کی اجازت پر موقوف ہوگا، اگر اجازت دی تو جائز ورنہ ناجائز ہوگا۔

ب: قوله تعالى: ''وعاشروهن بالمعروف'' (سورہ نساء: ۱۹)۔

وفى ابن كثير: وعاشروهن بالمعروف، أى طيبوا أقوالكم لهن وحسنوا أفعالكم وهيئاتكم بحسب قدرتكم، كما تحب ذلك منهما، فافعل أنت بهما مثله، كما قال تعالى: ولهن مثل الذى عليهن بالمعروف''۔

اچھی معاشرت کے لئے اسلام نے ایک دوسرے پر حقوق عائد کئے ہیں اگر ان حقوق کی پاسداری کی جائے تو معاشرہ میں کسی طرح کی برائی جنم نہیں لے سکتی، نکاح کے بعد ایک عورت اپنے شوہر کے لئے اور ایک مرد اپنی بیوی کے لئے کیا نہیں کر سکتے ہیں۔ قرآن وحدیث میں مثالیں موجود ہیں۔

صورت مسئولہ میں چونکہ شوہر کے سفر میں بیوی کی اجازت بظاہر یا در پردہ موجود ہے اور وہ اس زائد آمدنی سے خوش بھی ہے، شوہر کی طرف سے اسے گھر بھی حاصل ہے، اس میں نہ رہ کر کسی اور جگہ رہنے کی شوہر کی طرف سے اجازت بھی نہیں ہے تو ظاہر ہے کہ اسے اپنے گھر میں رہنے کے لئے کہنے کو مجبور کرنا نہیں کہا جائے گا، ہاں بات صرف اتنی ہے کہ شوہر کے والدین کی خدمت بیوی کے ذمہ یہاں ہوگی یا نہیں، تو اس صورت میں چونکہ بیوی شوہر کے والدین خواہ وہ بیمار ہی سہی ان سے محافظت بہت اکیلے پن سے دوری وغیرہ، بہت سے مسائل میں فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے شوہر کے والدین کے ساتھ رہ کر ان کی خدمت بھی کرے تو یہ اس کے لئے بہر حال بہتر اور خوش آئند ہوگا، اور حکما برائے استحسان اس پر ضروری بھی ہوگا، کیونکہ اس کے بغیر معاشرت کے اندر سوا فساد کے کچھ اور نہیں ہو سکتا، اس لئے کہ یہ احکام ان احکام کی قبیل سے ہیں جو زمان ومکان کے تابع ہوتے ہیں اور آج کا معاشرہ اس بات کو بالکل برداشت نہیں کر سکتا کہ اس کی غیر موجودگی میں اس کی بیوی خود تو کھا پکا کر سو جائے اور اس کے والدین بوڑھے بھوکے رہیں ان کو دوا پانی بھی میسر نہ ہو، لیکن ساتھ ہی یہ بھی امر قابل لحاظ ہے کہ اس خدمت کو ضروری قرار دے کر بیوی کو اپنے والدین کے حق میں نوکرانی تصور کر لینا بھی انتہائی غلط اور قبیح سوچ ہے، اس سے احتراز کیا جائے اور درمیانی صورت اختیار کی جائے، ساس سسر اپنی بہو کو اپنی بیٹی سے زائد یا کم از کم بیٹی کے برابر کا سب تک درجہ نہیں دیں گے تو بہو بھی انہیں اپنا باپ اور ماں کس طرح مان کر ان کی خدمت کے لئے بہر صورت اپنے آپ کو ہمیشہ تیار رکھے، بصورت دیگر حالات شاہد ہیں کہ بیوی شوہر کے ابوین کی خدمت میں اپنے اور اپنی آرام کو بھول جاتی ہیں، لیکن اگر شوہر کے والدین کی طرف سے اسے پیار نہ ملے تو صورت برعکس ہو جاتی ہے پھر نہ ہی وہ ان کی خدمت اپنے اوپر ضروری سمجھتی ہے اور نہ ان کے ساتھ رہنے پر آمادہ ہی ہوتی ہے، ایسی ہی صورتوں میں فقہاء نے لکھا ہے کہ شوہر پر فرض ہے کہ وہ اپنے والدین اور دیگر رشتہ داروں سے علاحدہ بیوی کے لئے انتظام کرے، اس صورت میں بیوی کو والدین کے ساتھ رہنے پر مجبور کرنا اور ساتھ ہی ان کی خدمت دوا دارو وغیرہ کے لئے بیوی کو مجبور کرنا درست معلوم نہیں ہوتا۔

ج- ''وفى الهندية: وقيل: لا يمنعها من الخروج إلى الوالدين فى كل جمعة مرة وعليه الفتوى، وفى مجموع النوازل: فإن كانت قابلة أو غسالة أو كان لها حق على آخر أو لآخر عليها حق تخرج بالإذن وبغير الإذن والحج على هذا'' (ہندیہ، کتاب الطلاق باب النفقات، فصل فى السكنى ۱/ ۵۵۷، دیوبند)۔

''وفى التاتارخانية: فإن كان الأولاد ذكورًا وإناثًا موسرين فنفقة الأبوين عليهم بالسوية فى أظهر

الروایتین وعلیه الفتوی'' (التاتارخانیه علی ہامش الهندیه ۵/ ۴۳۵)۔

''وفی البحر الرائق: قالوا: ولو كان أبوها زمنا وليس له من يقوم عليه مومنا كان أو كافرًا فإن عليها أن تعصی الزوج فی المنع'' (بحر الرائق فی شرح کنز الدقائق، نکاح ۴/ ۳۸۵)۔

مذکورہ عبارات سے مفہوم ہوتا ہے کہ جس طرح والدین کا نفقہ اور خدمت مذکر اولاد کے ذمہ ہوتی ہے، اسی طرح مونث اولاد کے ذمہ بھی ہوتی ہے، بلا کسی فرق کے اور اسی طرح اگر عورت اپنے والدین کی عیادت، تیمارداری، خدمت کے لئے اپنے میکہ جانا چاہتی ہے، تو اسے شوہر سے اجازت لینے کی بھی ضرورت نہیں اگر چہ اسے اجازت لے کر ہی جانا چاہئے، لیکن اگر شوہر اسے دریں صورت میکہ جانے سے روکے تو اس عورت کے لئے جائز ہے کہ وہ اپنے شوہر کے اس حکم کو نہ مانے، یعنی اگر شوہر کے حقوق کی ادائیگی کے ساتھ کوئی عورت اپنے ماں باپ کی خدمت کرنا چاہے تو اس کے شوہر کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اسے نہ جانے پر مجبور کریں۔

''وفی الهندية: وإن احتاج الأب إلى زوجة والابن موسر وجب عليه أن يزوجه أو يشتري له جارية'' (فتاوی هندیه، باب النفقات، فصل فی نفقة ذوی الارحام ۱/ ۵۶۵)۔

''وفی الدر المختار: قال: وعليه نفقة زوجة أبيه وأم ولده، بل وتزويجه أو تسريه، ولو له زوجات فعليه نفقة واحدة يدفع للأب ليوزعها عليهن'' (درمختار، شامی ۵/ ۲۴۳)۔

''وفی الشامية: والذی تحرر من المذهب أنه لا فرق بين الأب والابن فی نفقة الخادم، وأنه إذا احتاج أحدهما لخادم وجبت نفقته كما وجبت نفقة المخدوم فكان من جملة نفقته، وإذا لم يحتج فلا تجب فاعلم ذلك واغتنمه، فإنه كثير الوقوع'' (رد المحتار علی الدر المختار کتاب الطلاق باب فی نفقة زوجة الأب ۵/ ۲۴۳)۔

اسلامی معاشرت ہمیشہ یہی رہی ہے کہ کوئی مرد یا کوئی عورت بے نکاحی نہ رہے، تفرد کی زندگی اسلام کسی کے حق میں گوارا نہیں کرتا خواہ مرد ہو یا عورت، عورت بیوہ ہو یا مطلقہ ہو فوراً بعد ختم عدت کسی مرد سے اس کا نکاح کر دیا جائے، اسی طرح کسی مرد کی بیوی کا انتقال ہو جائے یا وہ اپنی بیوی کو طلاق دیدے تو فوراً کسی دوسری عورت سے اس کا نکاح کر دیا جائے، کیونکہ ہر انسان کی ضرورتیں دو طرح کی ہیں: ایک جنسی ضرورت ایک خارجی ضرورت، پہلی ضرورت بصورت ازواج ہی پوری ہو سکتی ہے، اسی لئے ہر دو کو نکاح کے بندھن میں ہمیشہ جڑا رہنا ضروری ہے، پھر خارجی ضرورت کی بھی دو قسمیں ہیں ضرورت عام ضرورت خاص، اس میں پہلی ضرورت تو کسی نہ کسی درجہ میں پوری ہو سکتی ہیں مگر جو خاص ضرورتیں ہیں وہ صحیح طور پر شوہر بیوی یا بیوی شوہر ہی کے ذریعہ درست طریق پر پوری ہو سکتی ہیں ان کے علاوہ سے نہیں۔

مذکورہ عبارات سے مفہوم ہوتا ہے کہ جو بچے یا بچیاں والدین میں سے کسی کے حق میں ضرورت کے وقت نکاح کرنے میں رکاوٹ بنیں تو ان کا یہ فعل ناجائز ہوگا، کیونکہ نکاح بھی ہر انسان کی ایک فطری ضرورت ہے اور ضرورت کے وقت میں اس کا پورا کرنا ضروری ہوتا ہے تا کہ انسان گناہ سے دور رہے۔

اور اگر کسی انسان کو نکاح کی ضرورت تو ہے مگر اس کے پاس بیوی کا خرچ برداشت کرنے کی طاقت نہیں ہے، لیکن اس کی اولاد کے پاس وسعت ہے وہ باپ اور باپ کی آنے والی بیوی کے اخراجات برداشت کر سکتی ہے تو اولاد پر واجب ہے کہ اپنے باپ کے نکاح کی فکر کرے اور پھر ان کے اخراجات کی ذمہ داری لے، البتہ اگر والد صاحب اس پوزیشن میں ہوں کہ ان کو اب حقیقۃً نکاح کی ضرورت باقی نہ رہے تو اس صورت میں اولاد پر باپ کا نکاح کرنا واجب نہیں ہوگا، اور یہی صورت ماں کے حق میں بھی ہونا چاہئے، یعنی اگر کسی کے والد صاحب کا انتقال ہو گیا ہو اور والدہ حیات ہوں اور وہ صاحب فراش نہ ہوں تو بچوں کو چاہئے کہ ان کے نکاح کا انتظام کریں اور اگر واقعۃً ماں کو ضرورت نہ ہو تو پھر نکاح کی ذمہ داری بچوں پر نہ ہوگی۔

''وفی الهداية قال: وتجب نفقة الابنة البالغة والابن الزمن البالغ على أبويهما أثلاثًا، على الأب الثلثان وعلى الأم الثلث، لأن الميراث لهما على هذا المقدار، وقال: هذا الذی ذكره الخصاف والحسن وفی ظاهر الرواية، كل النفقة على الأب، لقوله تعالى: ''وعلى المولود له رزقهن وكسوتهن'' وصار كالولد الصغير (بنایه شرح ہدایه کتاب الطلاق باب النفقة ۵/ ۵۰۷ دیوبند)۔

عموماً والدین اپنی پوری جائداد اپنے قبضہ تصرف میں رکھتے ہیں اور اولاد کو اپنے ساتھ رہنے پر مجبور کرتے ہیں خواہ اولاد نابالغ ہو یا بالغ اور بعد از نکاح بھی اپنے ساتھ رہنے پر مجبور کرتے ہیں اور حد یہ کہ اولاد جو کمائے خواہ والد صاحب کے ساتھ یا علاحدہ، وہ سب والد صاحب کا ہوتا ہے بیٹے مجبور محض اپنے اور بیوی کے ذاتی خرچ کے لئے یا تو قرض کسی سے لیں یا اپنی ہی کمائی سے کچھ چوری کریں اپنے والدین کی نظروں سے، مجبور ہو کر اولاد علاحدگی کا مطالبہ کرتی ہے اس کے مطالبہ کو پورا اس طرح کیا جاتا ہے کہ گھر کے کسی ایک طرف صرف اسے رہنے کے لئے کہہ دیا جاتا ہے اور بقیہ اس کے تمام اخراجات نیز خود اس کی کمائی جو والدین کے پاس ہے وغیرہ سب سے صرف نظر کرلیا جاتا ہے، ایسی صورت میں اولاد باپ کی جائیداد میں اپنا حق جتلا کراسے وصول کرنے کا مطالبہ کرتی ہے۔

مذکورہ عبارات سے مستفاد ہوتا ہے کہ تنگ دستی کی صورت میں جبکہ والدین خوش حال ہوں بالغ اولاد کا نفقہ والدین پر واجب ہوتا ہے اگر والدین صاحب ثروت اور معاشی اعتبار سے مضبوط رہیں اور ان کی بعض اولاد بالغ جوان سے الگ رہ کر زندگی گزار رہی ہے نادار ہے اور ذرائع کسب سے معذور ہے تو ایسے شخص کے لئے والدین سے اپنے اخراجات کی حد تک نفقات وصول کرنے کا شرعاً وجوبی حق حاصل ہے، یعنی والدین پر واجب ہے کہ ایسی اولاد کے نفقات کا ذمہ اپنے اوپر لیں، لیکن اولاد کو والدین سے ان کی زندگی میں جائیداد کے مطالبہ کا حق بالکل نہیں ہے جب تک وہ حیات سے ہیں ان کا ہے بعدہ علی حصص المیراث وارثین کا ہوگا، کسی وارث کو مورث کی حیات میں موروثہ پر کچھ حق حاصل نہیں ہوتا،

قولہ تعالی: "وقضى ربك ألا تعبدوا إلا إياه وبالوالدين إحسانا إما يبلغن عندك الكبر أحدهما أو كلاهما فلا تقل لهما أف ولا تنهرهما وقل لهما قولًا كريما. واخفض لهما جناح الذل من الرحمة وقل رب ارحمهما كما ربياني صغيرا (بنی اسرائیل: ۲۳/۲۴).

"وقال: أن اشكر لي ولوالديك" (لقمان: ۱۴).

"وقال: وصاحبهما في الدنيا معروفا" (لقمان: ۱۵).

"وقال: ووصينا الإنسان بوالديه حسنا" (عنکبوت: ۸).

"وقال النبی ﷺ: أن من الكبائر عقوق الوالدين" (بخاری ۷۷-۵۹۷۶)۔

مذکورہ آیات قرآنیہ اور احادیث صحیحہ تقاضا کرتی ہیں اس بات کا کہ بہر صورت والدین کے ساتھ حسن سلوک روا رکھا جائے کسی بھی حال میں انہیں کسی طرح اولاد کی طرف سے کوئی تکلیف نہ پہنچے بشرطیکہ والدین اپنی اولاد کو معصیت پر مجبور نہ کریں، کیونکہ معصیت میں ان کی اطاعت جائز نہیں۔

عمر رسیدہ اشخاص کے لئے جو ہاسٹل تیار کئے جاتے ہیں ان کا شرح خرچ ان بزرگوں کے ذمہ دار (خواہ اولاد کی شکل میں ہو یا غیر اولاد) پر ہوگا۔

اولین درجہ کی بات تو یہی ہے کہ اولاد اپنی مصروفیات کو ادھر ادھر کر کے اپنے والدین کی خدمت کرے، ان کو خوش کرے ان کی ضروریات کو پورا کرے ان کے سامنے رہ کر ان کی آنکھوں کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرے۔

اور اگر یہ صورت مشکل ہو اور والدین کو ہاسٹل کے مقابلہ گھر میں تکلیف زیادہ ہو رہی ہو اور ہاسٹل میں رکھ کر بھی اولاد ان کی تیمارداری اپنا فرض سمجھتی رہے گی اور مستقبل میں وقت نکال کر ان کی زیارت اور بذات خود خدمت کرتی رہے تو اس صورت میں اولاد کے لئے جائز ہوگا کہ وہ اپنے بزرگوں کو ایسے ہاسٹلوں میں داخل کر کے ممکن حد تک اپنی راحت پہنچانے کی سعی کریں۔

لیکن اگر یہ صورت نہ ہو بلکہ وہاں کے اخراجات حکومت کے ذمہ ہوں، یا کسی ادارہ کے تحت ان ہاسٹلوں کا نظام ہو، بزرگوں کے ذمہ داروں سے ان کے اخراجات کی رقم وصول نہ کی جاتی ہو، داخلہ کے بعد معذوروں کے قریب و دور کے اعزہ و احباب کا وہاں آنا جانا نہ ہو یا ادارہ کی طرف سے عام ملاقاتوں پر پابندی ہو جس کی وجہ سے وہ معذور بزرگ وہاں گھٹ گھٹ کر جیئے تو ایسی صورت میں معذور بزرگوں کو اس طرح کے ہاسٹلوں میں داخل کرنا جائز نہ ہوگا۔

خاندان اور معاشرہ میں کچھ ایسے گھرانے بھی نظر آتے ہیں جن کا کوئی پرسان حال نہیں ہوتا نہ ان کے اخراجات ہی پورے ہوتے نظر آتے ہیں اور نہ ان کا علاج و معالجہ ہی صحیح طور پر ہو پاتا ہے، نہ ان پر ان اقارب کی نظر ہوتی ہے جن پر ان بیچاروں کا نفقہ واجب ہے اور نہ ان کے علاوہ دیگر رشتہ داروں کی بڑی خستہ حالی اور بیچارگی میں زندگی گزارتے ہیں۔

اگر کوئی تنظیم، کوئی ادارہ، کوئی صاحب ثروت شخص، معاشرہ میں اس طرح سے زندگی بسر کرنے والے بزرگوں کو اپنی ذمہ داری اور اپنے خرچ پر ایسے ہاسٹلوں میں داخل کرا کر انہیں روزانہ کی مصیبتوں سے نجات دلانے کی کوشش کرے تو یقیناً یہ اس کا بہت بڑا عمل ہو سکتا ہے۔

معذور اور ضعیف العمر اشخاص کے حقوق

قاضی محمد ریاض ارمان قاسمی[1]

تندرست بوڑھے کا اپنے ماتحت کو معاش کے حصول پر مجبور کرنا:

اگر کوئی شخص بوڑھا ہوجائے اور وہ مالدار نہ ہو، بلکہ تنگدست ہو۔ ''قوله الفقراء) قيد به؛ لأنه لا تجب نفقة الموسر إلا الزوجة''(شامی باب النفقة) اور وہ قدر مشقت کے ساتھ خود کما کر کھا سکتا ہے، لیکن قدرت کے باوجود اس کو کمانے پر اس کی اولاد مجبور نہیں کرسکتی ہے اس کا نفقہ اس کے لڑکے (بیٹے) پر واجب ہوگا۔

''النفقة لأصوله، ولو أب أمه ذخيره (الفقراء) ولو قادرين على الكسب تحته في الشامية: ولو قادرين على الكسب جزم به في الهداية. فالمعتبر في إيجاب نفقة الوالدين مجرد الفقر. قيل: وهو ظاهر الرواية فتح. ثم أيده بكلام الحاكم الشهيد، وقال: وهذا جواب الرواية'' (شامی ۳۶/۲، مطلب فی نفقة الاصول)۔

اسی طرح ''کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ'' میں ہے کہ تنگدست باپ کا نفقہ بیٹے پر ہے اور باپ پر کمانا لازم نہیں ہے اور اس میں یہ بھی تفصیل ہے کہ اگر بیٹا ماں باپ میں سے صرف ایک کا خرچہ برداشت کرسکتا ہو تو ماں کو حق تقدم حاصل ہوگا اسی طرح اگر بوڑھے کے پاس بیٹا اور بیٹی دونوں ہوں اور وہ مالدار ہوں تو باپ کا نفقہ بیٹا اور بیٹی دونوں کے درمیان تقسیم ہوگا اسی طرح کئی ایک بیٹا ہو تو بھی بوڑھے کا نفقہ ان سب کے درمیان تقسیم ہوگا البتہ اگر کوئی بیٹا بے انتہاء مالدار ہو تو، اس کے ذمہ زیادہ مقدار میں قسط کا باندھنا درست ہے۔

''الحنفية قالوا: نفقة الآباء واجبة على ابنائهم وإن علوا، فعلى الولد الإنفاق على أبيه، وجده لأبيه، وجده لأمه أيضا، بشرط الإعسار. ولا يلزم الأب بالتكسب، كما يلزم الابن. ومثل الأب الأم، فإذا كان يقدر على إحضاره قوت أحدهما قدمت الأم على الأب، فإذا ادعى الابن أن أباه موسر كان عليه أن يثبت بالبينة، فإن لم تكن له بينة فالقول للأب، فإذا كان للأب ابن و بنت موسرين قسمت نفقته بينهما بالسوية، على المعتمد، وكذا إذا كان له ابنان فإنما تقسم بالسوية بينهما، ولو كان أحدهما أكثر غنى من الآخر، نعم إذا كان التفاوت بينهما كثيرا، فإنه ينبغي أن يخص الغني بقسط اوفر من الانفاق على والده، وعلى الابن الموسر نفقة زوجة أبيه، وعليه تزويجه، ولو له زوجات، فعليه نفقة واحدة فقط يسلمها لأبيه'' (کتاب الفقه علی المذاهب الاربعة ۵۱۵/۴، النفقة علی الاباء والاقارب)۔

اگر کوئی کمانے پر قادر ہو اور معسر ہو تو اعسار کی صورت میں نفقہ بیٹے پر واجب ہوگا اور اس کو کمانے پر مجبور نہیں کیا جائے گا، لیکن اگر اس کا نفقہ بیٹے کے علاوہ پر اعسار کی وجہ سے واجب ہو اور وہ کمانے پر قادر ہو تو اس کو کمانے پر مجبور کیا جائے گا اور بیٹے کے علاوہ پر کمانے کی صلاحیت کی صورت میں نفقہ واجب نہیں ہوگا۔

''وإنما كان كذلك؛ لأن المنفق عليه إذا كان قادرا على الكسب كان مستغنيا بكسبه، فكان غناه بكسبه كغناه بماله. فلا تجب نفقته على غيره إلا الولد؛ لأن الشرع نهى الولد عن إلحاق أدنى الأذى بالوالدين وهو التافيف'' (بدائع الصنائع ۴۴۷/۳)۔

اس سلسلہ میں ائمہ ثلاثہ کا مسلک بھی یہی ہے کہ والد کے اعسار کی صورت میں نفقہ بیٹے پر ہوگا، البتہ اگر کمانے کی صلاحیت ہو تو امام مالکؒ کے یہاں والد کو کمانے پر مجبور کیا جائے گا اور امام شافعیؒ کا مسلک حنفیہ کی طرح ہے اور امام احمد ابن حنبل کے یہاں اس کی صراحت نہیں ہے کہ کمانے پر مجبور کیا جائے گا یا نہیں۔

---

[1] قاضی شریعت دارالقضاء ہریانہ، مدرسہ اسلامیہ قرآنی فیض العلوم خانقاہ بوڑیہ، یمنا نگر، ہریانہ۔

امام مالکؒ کا مسلک:

امام مالکؒ کے یہاں ماں باپ اگر کسب پر قادر ہوں تو ان کو کسب پر مجبور کیا جائے گا۔

''الثالث أن لايكون عاجزين عن الكسب، اما إذا كانا قادرين على الكسب فإن نفقتهما لاتجب على الولد، وأجبرا على الكسب'' (كتاب الفقه على المذاهب الاربعه ۴/۵۱۷)۔

امام شافعیؒ کا مسلک:

۔امام شافعیؒ کے یہاں ماں باپ کو کسب پر مجبور نہیں کیا جائے گا اگر وہ کسب پر قادر ہوں تو بھی نفقہ بیٹے پر ہی اعسار کی صورت میں لازم ہوگا۔

''ولا يشترط أن يكون الولدان عاجزين عن الكسب، كما لايشترط الاسلام. فلو كانا كافرين والولد مسلم، أو العكس فإن النفقة تلزمه'' (كتاب الفقه ۴/۵۱۸)۔

امام احمد ابن حنبلؒ کا مسلک:

امام احمد ابن حنبلؒ سے اس سلسلہ میں کچھ مروی نہیں ہے کہ والدین کو کمانے پر مجبور کیا جائے گا یا نہیں صرف ان کے یہاں یہ شرط ہے کہ ماں باپ مالدار نہ ہوں اور ان کے پاس کمائی نہ ہو تو نفقہ اولاد پر واجب ہے۔

''فحكى ابن المنذر قال: أجمع أهل العلم على أن نفقة الوالدين الفقيرين اللذين لا كسب لهما ولا مال واجبة في مال الولد'' (المغنی لابن قدامہ ۹/ ۲۵۷، باب يجبر الرجل على نفقة والديه وولده الذكور والاناث)۔

خلاصہ یہ کہ حنفیہ اور شافعیہ کے یہاں معسر ماں باپ کا نفقہ اولاد پر ہے اگر وہ کمانے کی قدرت رکھتے ہوں تو بھی ان کو حصول نفقہ پر مجبور نہیں کیا جائے گا اور اولاد پر نفقہ واجب ہوگا اس کی وجہ فقہاء نے یہ لکھی ہے کہ کسب معاش کی صورت میں بوڑھے ماں باپ کو تعب و پریشانی لاحق ہوگی اور اولاد کو اللہ تعالیٰ نے اس بات پر مامور کیا ہے کہ وہ ان دونوں سے ضرر کو دور کریں تو دفع ضرر کی وجہ سے ماں باپ کو کمانے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا ہے۔

''فإن القادر على الكسب غني بكسبه بخلاف الأبوين؛ لأنه يلحقهما تعب الكسب و الولد مامور بدفع الضرر عنهما فتجب نفقتهما مع قدرتهما على الكسب'' (ہدایہ ۲/ ۴۴۷، باب النفقة)۔

اسی طرح بدائع میں ہے کہ شریعت نے والدین کو ادنیٰ قسم کی تکلیف دینے سے بھی منع کیا ہے اور وہ 'اف' کہنا ہے 'ولا تقل لهما اف' اور لڑکہ کے مالدار ہونے کی صورت میں باپ کو کمانے کا مکلف بنانے میں تکلیف دینا لازم آئے گا تو یہ عمل نہی میں بدرجہ اولی شامل ہوگی۔

''لأن الشرع نهى الولد عن الحاق أدنى الأذى بالوالدين وهو التافيف بقوله عز وجل: ولا تقل لهما أف ''ومعنى الاذى في إلزام الأب الكسب مع غنى الولد أكثر فكان أولى بالنهي'' (بدائع الصنائع ۳/ ۴۴۷ باب النفقہ)۔

سن رسیدہ کے نفقہ اور علاج کا وجوب دوسروں پر کن صورتوں میں:

سن رسیدہ حضرات کا نفقہ دوسروں پر جب واجب ہوگا، جبکہ وہ مالدار نہ ہوں اور عدم مالداری کا اعتبار اس صورت میں ہوگا کہ ان کے لیے صدقہ حلال ہو اور ان پر زکوٰۃ واجب نہ ہو، اور کمانے پر قادر نہ ہوں جیسے جنون، اندھا پن، مقطوع الیدین ہونا یا دونوں ہاتھوں کا شل ہونا یا اپاہج، فالج کا اثر ہونا یا ایسے عوارض میں مبتلا ہونا جو انسان کو کمانے سے روک دے، ہاں ماں باپ اگر کمانے پر قادر بھی ہوں تو ان کو اولاد کمانے پر مجبور نہیں کرسکتی ہے، البتہ دوسرے اقارب پر جب وہ کمانے پر قادر ہوں تو نفقہ واجب نہیں ہوگا اور والدین اور جن کا تعلق ولادت کا ہو ان کے علاوہ کے نفقہ کے لیے قضاء قاضی ضروری ہے بغیر قضاء قاضی نفقہ واجب نہ ہوگا۔

''وأما شرائط وجوب هذه النفقة فأنواع: بعضها يرجع إلى المنفق عليه خاصة۔ أحدها إعساره فلا تجب لمؤسر على غيره نفقة في قرابة الولاد وغيرها من الرحم المحرم، لأن وجوبها معلول بحاجة المنفق عليه. فلا تجب لغير المحتاج؛ ولانه إذاكان غنيا لايكون هو بإيجاب النفقة له على غيره أولى من الإيجاب لغيره عليه فيقع التعارض

فیمتنع الوجوب، بل إذا کان مستغنیا بماله کان النفقة فی ماله أولی من إیجابها فی مال غیره. الثانی: عجز عن الکسب بأن کان به زمانة أو قعد أو فلج أو عمی أو جنون أو کان مقطوع الیدین او أشلهما أو مقطوع الرجلین أو مفقوء العینین أو غیر ذلك من العوارض التی تمنع الإنسان من الاکتساب حتی لو کان صحیحا مکتسبا لا یقضی له بالنفقة علی غیره. وإن کان معسرا إلا للأب خاصة والجد عند عدمه. فإنه یقضی بنفقة الأب وإن کان قادرا علی الکسب بعد إن کان معسرا علی ولده الموسر.... والثالث: إن الطلب والخصومة بین یدی القاضی فی أحد نوعی النفقة وهی نفقة غیر الولاد. فلا تجب بدونه؛ لأنها لا تجب بدون قضاء القاضی. والقضاء لا بد له من الطلب والخصومة'' (بدائع الصنائع ۴/ ۴۴۶تا ۴۴۷)

اسی طرح لڑکا پر باپ کا نفقہ جب واجب ہوگا جبکہ وہ بھی مالدار ہو اور اگر فقیر ہو اور اس کے پاس بھی اہل وعیال ہوں اور باپ کمانے پر قادر ہو تو باپ کے لیے نفقہ کا فیصلہ نہیں کیا جائے گا ہاں اگر باپ کمانے سے عاجز ہو تو باپ کو بھی بیٹے کے اہل وعیال میں شامل کردیا جائے گا۔

''فإن کان الولد فقیرا وعنده عیال، وله أب قادر علی الکسب. فإنه لا یحکم علی الولد بنفقته. أما إذا کان الأب عاجزا، فإنه یحکم علیه بضمه إلی عیاله لیأکل معهم. فإنه لا یرهقه فی هذه الحالة'' (کتاب الفقه علی المذاهب الاربعه ۴/ ۵۱۶ باب النفقة علی الاباء والاقارب)۔

سن رسیدہ کمانے پر قادر ہو اور اس کے پاس اولاد نہ ہو تو ذی رحم محرم پر جن سے ولادت کا رشتہ نہ ہو تو ان پر بھی اس کا نفقہ جب واجب ہوگا جبکہ وہ موسر (مالدار) ہوں ورنہ سن رسیدہ کا نفقہ ان پر واجب نہ ہوگا اس لیے کہ نفقہ کا وجوب بطور صلہ رحمی کے ہے اور صلہ رحمی کا ثبوت غربت کے ساتھ نہیں ہوتا ہے۔

''وأما الذی یرجع إلی المنفق خاصة فیساره فی قرابة غیر الولاد من الرحم المحرم. فلا یجب علی غیر الموسر فی هذه القرابة نفقة وإن کان قادرا علی الکسب؛ لأن وجوب هذه النفقة من طریق الصلة. والصلات تجب علی الأغنیاء لا علی الفقراء'' (بدائع الصنائع ۴/ ۴۴۷)

رہی بات علاج کے سلسلہ میں تو فقہاء کی عبارتوں میں صریح جزئیہ نظر سے نہیں گذرا اور علامہ شامی نے بھی اس کی صراحت کی ہے کہ باپ پر بیٹے کا ہر قسم کا نفقہ واجب ہے، لیکن ڈاکٹر کی اجرت اور دوائی کی قیمت کی صراحت میں نے نہیں دیکھی ہاں بیوی کے لیے دوائی اور اجرت طبیب کے عدم وجوب کی صراحت کی ہے۔

''تجب النفقة بانواعها علی الحر (لطفله) یعم الأنثی (قوله بانواعها) من الطعام والکسوة والسکنی ولم أر من ذکر هنا أجرة الطبیب وثمن الأدویة. وإنما ذکر وعدم الوجوب للزوجة. نعم صرحوا بأن الأب إذا کان مریضا أو به زمانة یحتاج إلی الخدمة فعلی ابنه خادمه، وکذلك الابن'' (ردالمحتار ۲/ ۶۲۸، کتاب النفقة)

البتہ اس کا تذکرہ ملتا ہے کہ باپ کو اگر خادم کی ضرورت ہو تو بیٹے پر خادم کا نفقہ دینا لازم ہے یعنی اس کی اجرت موسر بیٹے کے ذمہ ہوگی۔

''إن کان الأب مریضا أو به زمانة یحتاج للخدمة قال فی المحیط: فعلی هذا لا فرق بین الأب والابن فإن الابن إذا کان بهذه المثابة یجبر الأب علی نفقة خادمه. وفی حاشیة الرملی: والذی تحرر من المذهب أنه لا فرق بین الأب والابن فی نفقة الخادم. وإذ إذا احتاج أحدهما لخادم وجبت نفقته کما وجبت نفقة المخدوم فکان من جملة نفقته، واذا لم یحتج إلیه، فلا تجب علیه. فا[illegible] ذلك واغتنمه. فإنه کثیر الوقوع'' (رد المحتار ۲/ ۶۳۱، مطلب فی نفقة زوجة الاب)

اسی طرح بدائع الصنائع میں ہے: ''وأما بیان مقدار الواجب من هذه النفقة فنفقة الاقارب مقدرة بالکفایة بلا خلاف. لأنها تجب للحاجة. فتتقدر بقدر الحاجة وکل من وجبت علیه نفقة غیره یجب علیه له المأکل والمشرب والملبس والسکنی والرضاع إن کان رضیعا. لأن وجوبها للکفایة والکفایة تتعلق بهذه الأشیاء. فإن کان للمنفق علیه خادم یحتاج إلی خدمته تفرض له أیضا؛ لأن ذلك من جملة الکفایة'' (بدائع الصنائع ۴/ ۴۵۱)

فتح القدیر میں محیط کے حوالہ سے لکھا ہے: ''قال فی المحیط: فعلی هذا لا فرق بین الأب والابن فإن الابن إذا کان بهذه المثابة یجبر الأب علی نفقة خادمه'' (فتح القدیر ۴/ ۴۲۸، فصل وعلی الرجل أن ینفق علی ابویه)

''ہندیہ'' میں ہے: ''وإن كان للرجل المعسر زوجة ليست ام ابنه الكبير لم يجبر الابن على أن ينفق على امرأة أبيه، وكذلك أم ولده وأمته لايجبر الابن على نفقة هؤلاء إلا أن يكون علة لايقدر على خدمة نفسه ويحتاج إلى خادم يقوم بشأنه ويخدمه، فحينئذ يجبر الابن على نفقة خادم الاب منكوحة كانت أو أمة كذا فى المحيط'' (ہندیہ ۱/ ۵۶۵، الفصل الخامس فى نفقة ذوى الارحام)۔

ان تمام عبارتوں سے یہ بات واضح ہے کہ اگر باپ کو بیماری ہو تو مالدار پر اس کے نفقہ میں خادم بھی داخل ہے، جیسا کہ علامہ کاسانیؒ نے صراحت کی ہے کہ نفقہ سے کفایت والا نفقہ مراد ہے اور خادم کفایت والے نفقہ میں داخل ہے۔

ابھی یہ بات شامی کے حوالے سے گذری ہے کہ ڈاکٹر کی اجرت اور دوائی کے خرچہ کی صراحت نہیں ہے اور بیوی کے لیے بھی شوہر پر ڈاکٹر کی اجرت اور دوائی کا خرچہ لازم نہیں ہے'' (كمالا يلزمه مداواتها) أى إتيانه لها بدواء المرض ولا أجرة الطبيب ولا الفصد ولا الحجامة هنديه عن السراج والظاهر أن منها ما تستعمله النفساء مما يزيل الكلف ونحوه. وأما أجرة القابلة فسيأتى فى الكلام عليها'' (ردالمحتار على الدر المختار ۲/ ۷۰۲، كتاب النفقة)۔

اسی طرح آگے چل کر علامہ شامی لکھتے ہیں کہ شوہر پر قہوہ لازم نہیں ہے اور نہ دوا لازم ہے

(تنبيه) ''قد علم مما ذكر أنه لايلزمه لها القهوة والدخان وإن تضررت بتركها؛ لأن ذلك إن كان من قبيل الدواء أو من قبيل التفكه فكل من الدواء والتفكه لايلزمه كما علمت'' (ردالمحتار على الدر المختار ۲/ ۷۰۵ كتاب النفقة)۔

آگے چل کر اجرت قابلہ کی وضاحت فرماتے ہیں جس کا وعدہ مصنف نے بیوی کی دوائی اور اجرت طبیب کو بیان کرتے ہو کیا تھا۔

''فيه أجرة القابلة على من استاجرها من زوجة وزوج ولو جاءت بلا استيجار قيل:عليه، وقيل:عليها (قوله قيل عليه) عبارة البحر عن الخلاصة فلقائل أن يقول عليه؛ لأنه مونة الجماع ولقائل أن يقول عليها كأجرة الطبيب، وكذا غيره ومقتضاه أنه قياس ذووجهين لم يجزم أحد من المشايخ بأحدهما خلاف ما يفهمه كلام الشارح ويظهر لى ترجيح الأول؛ لأن نفع القابلة معظمه يعود إلى الولد فيكون على أبيه تامل'' (ردالمحتار على الدر المختار ۲/ ۷۰۴/ ۷۰۵كتاب النفقة)۔

ہندیہ میں ہے:''ويجب عليه ما يقطع به الصنان ولايجب الدواء للمرض ولا أجرة الطبيب ولا الفصد ولا الحجامة، كذا فى السراج الوهاج۔ وأجرة القابلة عليها إن استاجرها ولو استاجرها الزوج فعليه وإن حضرت بلا إجار فلقائل أن يقول على الزوج؛ لأنه مونة الوطء ويجوز أن يقال عليها كأجرة الطبيب، كذا فى الوجيز للكردرى'' (ہندیہ ۱/ ۵۴۹ باب النفقه)

ان تمام عبارتوں سے اتنی بات کا پتہ لگتا ہے کہ بیوی کی دوائی کا خرچہ شوہر پر نہیں ہے، البتہ شامی کی ترجیح کے مطابق زچگی کے وقت دایہ کا خرچہ شوہر پر ہے اس لیے کہ اس کا نفع بچہ کی طرف لوٹے گا۔

اب ہم اصل بحث کی طرف آتے ہیں کہ فقہاء حنفیہ کے یہاں بیوی، باپ و بیٹا اور جن کا نفقہ آدمی پر واجب ہوتا ہے ان کے علاج کی ذمہ داری اور علاج کے خرچہ کے وجوب کی صراحت نہیں ہے البتہ فقہاء شافعیہ کے یہاں اس کی صراحت ملتی ہے جیسا کہ مذکور ہوا

''(يلزمه) أى الفرع الحر أو المبعض ذكرا كان أو انثى (نفقة) أى مؤنة حتى نحو دواء وأجرة طبيب (الوالد) المعصوم الحر وقنه المحتاج له'' (نهاية المحتاج الى شرح المنهاج ۷/ ۲۱۸ كتاب النفقة، فصل فى مون الاقارب)۔

شوافع کے مسلک کی صراحت کے مطابق بیوی اور والد اور بچوں کے علاج کا خرچہ لازم ہوگا اور بہتر معلوم ہوتا ہے کہ کم سے کم بوڑھے والد کے علاج کا خرچہ لازم ہونا چاہئے کیوں کہ بچوں سے محبت اور وفور شفقت کی وجہ سے عدم لزوم کے باوجود انسان علاج کراتا ہے اور ہر ممکن کوشش ہوتی ہے کہ بچہ کی جان محفوظ رہے رہی بات بیوی کی تو وہ باشعور ہوتی ہے اور وہ اپنے علاج میں شوہر کی محتاج نہیں ہوتی ہے خود بھی اپنے علاج کا انتظام کرسکتی ہے لیکن بوڑھے والدین کا علاج بچند وجوہ

لازم ہونا چاہئے پہلی وجہ یہ کہ اولاد پر نفقہ لازم ہے اور والد کی دوسری شادی لازم ہے اسی طرح سے بیماری کی صورت میں خادم لازم ہے تو علاج بھی لازم ہونا چاہئے کہ اخلاقی اقدار کے گھٹنے کی وجہ سے بوڑھے لوگوں کی طرف توجہ کم رہتی ہے اور وہ شئی لایعنی سمجھ لیے جاتے ہیں تیسری وجہ یہ ہے کہ نفقہ انسان کو زندہ رکھتا ہے اور علاج بوڑھے بیمار کو حصول نفقہ پر قادر کرتا ہے اب خادم نفقہ میں ہے جو سہارا ہے تو علاج جو انسان کو اصلی حالت پر کھڑا کرنے والا ہے اور بعد صحت عاجز حصول معاش پر قادر ہوسکتا ہے تو علاج ان لوگوں پر واجب ہوگا جو مالدار ہوں اور ان پر نفقہ بھی واجب ہو۔

نفقہ کا وجوب اولاد پر اس بنیاد پر ہے کہ اللہ تعالی نے بیٹے کو ماں باپ کے ساتھ احسان، حسن معاملہ، شکر، دنیا میں ان کے ساتھ معروف اور بھلائی کا حکم دیا ہے، ان کو ایذاء سے بچانے کا حکم ہے خواہ "اف" کہنے کے ذریعہ ہی کیوں نہ ہو کہ اس کی اجازت نہیں ہے کہ آدمی اپنے ماں باپ کو اف کہے تو بیماری کی تکلیف ایذاء کی اعلی صورت ہے، اس لیے ان کو ایذاء سے بچانے کے لیے اولاد پر ماں باپ کا علاج کرانا واجب ہوگا ہاں دوسرے اقارب اگر مالدار ہوں تو بوڑھے شخص کا علاج کرانا ان پر واجب ہوگا ورنہ نہیں (بدائع الصنائع ۳/۴۳۹)۔

والدین کا مالداری کے باوجود اپنی اولاد سے زائد رقم کا مطالبہ:

والدین اپنی مالدار اولاد سے اپنی ضرورت سے زائد رقم کا مطالبہ اپنی زیادہ سہولت کے لیے یا لوگوں پر خرچ کرنے کے لیے یا محفوظ کرنے کے لیے کر سکتے ہیں اس سلسلہ میں ایک مشہور حدیث ہے جس کو حضرت جابرؓ نے نقل کیا ہے کہ ایک شخص رسول کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور شکایت کی کہ میرے باپ نے میرا مال لے لیا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ اپنے والد کو بلا کر لاؤ اسی وقت جبرئیل امین تشریف لائے اور رسول اللہ ﷺ سے کہا کہ جب اس کا باپ آجائے تو آپ اس سے پوچھیں کہ وہ کلمات کیا ہیں جو اس نے اپنے دل میں کہے ہیں خود اس کے کانوں نے بھی ان کو نہیں سنا جب یہ شخص اپنے والد کو لے کر پہونچا تو آپ ﷺ نے والد سے کہا کہ کیا بات ہے آپ کا بیٹا آپ کی شکایت کرتا ہے کیا آپ چاہتے ہیں کہ اس کا مال چھین لیں والد نے عرض کیا کہ آپ اسی سے سوال فرمائیں کہ میں اس کی پھوپھی خالہ یا اپنے نفس کے سوا کہاں خرچ کرتا ہوں رسول ﷺ نے فرمایا "ایہ" جس کا مطلب یہ تھا کہ بس حقیقت معلوم ہوگئی اب اور کچھ کہنے اور سننے کی ضرورت نہیں۔ اس کے بعد رسول ﷺ نے حضرت جبرئیل کے کہنے کے مطابق اس سے پوچھا کہ تم اپنے دل میں کیا شوچتے آرہے تھے تو اس نے کچھ اشعار سنائے رسول ﷺ نے یہ اشعار سننے کے بعد بیٹے کا گریبان پکڑ لیا اور فرمایا "أنت ومالک لأبیک" یعنی جا تو بھی اور تیرا مال بھی سب باپ کا ہے (معارف القرآن ۵/۴۶۷ تا ۴۶۸)۔

اسی طرح علامہ کاسانی اس سلسلہ میں اسی حدیث اور دوسری حدیث کو نقل کیا ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ بیٹے کا مال باپ کے لیے ہے۔

"وروی عن جابر بن عبدالله رضی الله عنه أن رجلا جاء إلى رسول الله ﷺ ومعه أبوه فقال: یا رسول الله إن لی مالا وإن لی أبا وله مال وإن أبی یرید أن یأخذ مالی، فقال رسول الله ﷺ: أنت ومالك لأبیك، أضاف مال الابن إلى الأب بلام التملیك، وظاهره یقتضی أن یکون للأب فی مال ابنه حقیقة الملك، فإن لم تثبت الحقیقة فلا أقل من أن یثبت له حق التملیك عند الحاجة، وروی عن النبی ﷺ أنه قال: إن أطیب ما یأكل الرجل من كسبه وإن ولده من كسبه فكلوا من كسب أولادكم إذا احتجتم إلیه بالمعروف والحدیث حجة بأوله وآخره فظاهر، لأنه ﷺ أطلق للأب الأكل من كسب ولده إذا احتاج إلیه مطلقا عن شرط الإذن والعوض فوجب القول به"

(بدائع الصنائع ۳/ ۴۳۹ تا ۴۴۰)

، اس حدیث شریف کے اس جملہ "وإن لی أبا وله مال وإن أبی یرید أن یأخذ مالی" اسی طرح معارف القرآن کی صراحت کہ میں اس کی پھوپھی اور خالہ اور اپنی ذات کے علاوہ کہاں خرچ کرتا ہوں" تو آپ ﷺ نے والد سے کہا کہ کیا بات ہے آپ کا بیٹا آپ کی شکایت کرتا ہے کیا آپ چاہتے ہیں کہ اس کا مال چھین لیں والد نے عرض کیا کہ آپ اسی سے سوال فرمائیں کہ میں اس کی پھوپھی خالہ یا اپنے نفس کے سوا کہاں خرچ کرتا ہوں" سے پتا لگتا ہے کہ ماں باپ مالدار بیٹے سے زائد رقم کا مطالبہ کر سکتے ہیں۔

یہ بات پیش نظر رہے کہ بیٹے کا مال ماں باپ کے لیے اس حدیث کی وجہ سے مباح نہیں ہوگا کہ بغیر پوچھے جیسے چاہیں جب چاہیں استعمال کریں، بلکہ بیٹے کی اجازت لینی ہوگی ہاں ضرورت کے وقت نہ دے تو چپکے سے لینے کی اجازت ہے۔

''وقال:(أنت ومالك لوالدك) على معنى أنه أراد إذا احتاج إلى مالك أخذ منه قدر الحاجة، كما يأخذ من مال نفسه. فأما أن يكون أراد به إباحة ماله حيث يحتاجه ويأتي عليه لا على هذا الوجه فلا أعلم أحدا ذهب إليه من الفقهاء قاله السيوطي في مرقاة الصعود، وكذا في فتح الودود'' (حاشیہ ابوداؤد ص۴۹۸ باب الرجل یاکل من مال ولدہ، کتاب البیوع)۔

زیادہ پیسہ کمانے کی خاطر باہر جانا:

حصول معاش کی فقہاء نے چند قسمیں کی ہیں فرض، مستحب، مباح اور مکروہ، انسان کے اوپر کسب معاش بقدر کفایت اپنے لیے، اپنے اہل وعیال، ادائیگی دین اور ان لوگوں کے نفقہ کے لیے جن کے نفقہ کی ادائیگی اس پر واجب ہے فرض ہے اگر فرض مقدار کے حصول کے بعد نفقہ کے حصول کو ترک کردے تو اس کی گنجائش ہے اور اگر ذخیرہ کرنے کے لیے کوشش کرے تو بھی اس کی گنجائش ہے، جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اہل وعیال کے لیے ایک سال کا نفقہ اکٹھا کیا تھا، اسی طرح مفلس ماں باپ کے لیے بھی نفقہ کا جمع کرنا درست ہے، دوسری صورت مستحب کی ہے کہ بقدر کفایت سے زیادہ حاصل کرے، تاکہ فقیروں اور قریبی رشتہ داروں پر خرچ کرے اور یہ صورت افضل ہے نفلی عبادت میں مشغول ہونے سے، اور تیسری صورت مباح ہے صرف زیادتی مقصود ہو اور تجمل وخوبصورتی کے لیے بھی مال کا حصول مذموم نہیں ہے بلکہ مباح ہے، اور چوتھی صورت مکروہ ہے جبکہ نیت تفاخر اور تکاثر ہو

''فرض وهو الكسب بقدر الكفاية لنفسه و عياله وقضاء ديونه ونفقة من يجب عليه نفقته، فإن ترك الاكتساب بعد ذلك وسعه، وإن اكتسب ما يدخر لنفسه وعياله فهو في سعة فقد صح أن النبي ﷺ ادخر قوت عياله سنة، كذا في خزانة المفتيين، وكذا إن كان له أبوان معسران يفترض عليه الكسب بقدر كفايتها، كذا في الخلاصة، ومستحب وهو الزيادة على ذلك ليواسي به فقيرا أو يجازي به قريبا، فإنه أفضل من التخلي لنفل العبادة ومباح، وهو الزيادة للزيادة والتجمل، ومكروه وهو الجمع للتفاخر والتكاثر، وإن كان من الحل، كذا في خزانة المفتيين'' (ہندیہ ۵/ ۳۴۸ تا ۳۴۹، باب الخامس عشر في الكسب، كتاب الكراهية)۔

اسی طرح قرطبی نے ایک واقعہ نقل کیا ہے جس کو ''صاحب معارف القرآن'' نے نقل کیا ہے کہ ''جب تک جہاد فرض عین نہ ہوجائے فرض کفایہ کے درجے میں رہے اس وقت تک کسی لڑکے کے لیے بغیر ان کی اجازت کے جہاد میں شریک ہوجانا جائز نہیں صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں شریک جہاد ہونے کی اجازت لینے کے لیے حاضر ہوا آپ نے اس سے دریافت کیا کہ، کیا تمہارے والدین زندہ ہیں اس نے عرض کیا کہ ہاں زندہ ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''ففيهما فجاهد'' یعنی بس تو اب تم ماں باپ کی خدمت میں رہ کر جہاد کرو مطلب یہ ہے کہ ان کی خدمت ہی میں تمہیں جہاد کا ثواب مل جائے گا دوسری روایت میں اس کے ساتھ یہ بھی مذکور ہے کہ اس شخص نے یہ بیان کیا کہ میں اپنے ماں باپ کو روتا ہوا چھوڑ کر آیا ہوں اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جاؤ ان کو ہنساؤ جیسا کہ ان کو رلایا ہے، یعنی ان سے جا کر کہہ دو کہ میں آپ کی مرضی کے خلاف جہاد میں نہیں جاؤں گا (معارف القرآن ۵/ ۴۶۵)۔

اگر مقامی علاقہ میں بقدر کفایت معاش کا انتظام نہ ہو اور ماں باپ اور اہل وعیال کے ضیاع کا خوف نہ ہو اور خود اپنی جان کو خطرہ نہ ہو تو پھر ماں باپ کی اجازت کے بغیر باہر جا کر روزی حاصل کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، اس لیے کہ بقدر کفایت روزی کا حصول فرض ہے ہاں زیادہ آمدنی کا تجمل کے لیے حصول مباح ہے اور ابھی حدیث شریف نقل کی گئی ہے کہ جہاد کی اجازت مانگنے پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے روک دیا اور ماں باپ کی خدمت کا حکم دیا اسی طرح شامی میں ہے کہ حج پر جانے کی صورت میں ماں باپ ناپسند سمجھیں تو اگر وہ بے نیاز ہوں اور دوسرا کوئی خدمت کرنے والا ہو تو ٹھیک ہے ورنہ حج کے لیے نکلنا درست نہیں۔

''وفي الخانية: ولو أراد الخروج إلى الحج وكرها ذلك قالوا: إن استغنى الأب عن خدمته فلا بأس وإلا فلا يسعه الخروج، وإن احتاجه إلى النفقة ولا يقدر أن يخلف لهما نفقة كاملة أو أمكنه إلا أن الغالب على الطريق الخوف، فلا يخرج ولو الغالب السلامة يخرج'' (رد المحتار ۵/ ۲۶۱ بحوالہ احسن الفتاوی ۱/ ۳۹۹، کتاب العلم والعلماء)

ان تمام عبارتوں سے پتا چلتا ہے کہ زیادہ آمدنی کے لیے اگر ماں باپ کی کوئی خدمت کرنے والا نہ ہو تو باہر جانا درست نہیں ہے ہاں ماں باپ بے نیاز ہوں اور باہر جانے کی اجازت دے دیں تو کوئی حرج نہیں ہے۔

احسن الفتاویٰ میں ہے:

سوال: والدین اور بیوی کی اجازت کے بغیر روزگار کے لئے کسی دور شہر کا سفر کرنا کیسا ہے؟ جبکہ اس شہر میں روزگار نہ ملتا ہو؟

الجواب: اگر سفر کی وجہ سے والدین یا بیوی بچوں کے ضیاع کا خوف ہو یعنی وہ خود غنی نہ ہوں یا ان کی حفاظت کرنے والا کوئی نہ ہو تو اس صورت میں سفر نہ کرے اور اگر اپنے شہر میں روزگار کا کوئی انتظام نہ ہوسکتا ہو تو ان کے لیے نفقہ اور حفاظت کا معقول انتظام کر کے سفر کر سکتے ہیں، البتہ اگر سفر ایسا پر خطر ہے کہ ہلاکت کا ظن غالب ہے تو بہر صورت والدین کی اجازت کے بغیر سفر کرنا جائز نہیں۔

اسی طرح دوسرے سوال کے جواب میں لکھتے ہیں۔

سوال: ایک شخص کی والدہ انتہائی ضعیف ہے، ان کی خدمت بہترین طریقہ سے ہورہی ہے، ان کے صاحبزادے کی ان کو کوئی ضرورت نہیں، صاحبزادہ ایک دو سال کے سفر کے لئے جانا چاہتا ہے، والدہ اجازت تو دے رہی ہے مگر آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ اسے صاحبزادے کے فراق کا کافی صدمہ ہوگا، ایسی صورت میں سفر پر جانے سے صاحبزادہ گناہ گار تو نہیں ہوگا؟

الجواب: اگر کسی دنیوی یا دینی حاجت کے لئے سفر کر رہا ہے تو جائز ہے، بلکہ بوقت استغناء والدین ان کی اجازت کے بغیر بھی سفر کرنا جائز ہے، بشرطیکہ راستہ پر خطر نہ ہو، استغناء کا مطلب یہ ہے کہ وہ بیٹے کی جسمانی خدمت یا مالی تعاون کے محتاج نہ ہوں طبعی صدمہ تو بہر حال ہوتا ہی ہے۔

”وفی الخانية: ولو أراد الخروج إلى الحج وكرها ذلك قالوا: إن استغنى الأب عن خدمته فلا بأس وإلا فلا يسعه الخروج وإن احتاجه إلى النفقة ولا يقدر أن يخلف لهما نفقة كاملة أو أمكنه إلا أن الغالب على الطريق الخوف فلا يخرج ولو الغالب السلامة يخرج (إلى أن قال): ولو أذن الأبوان لايلتفت إلى غيرهما هذا في سفر الجهاد، فلو في فسر تجارة أو حج لا بأس به بلا إذن الأبوين إن استغنيا عن خدمته، إذ ليس فيه إبطال حقهما، إلا إذا كان الطريق مخوفا كالبحر، فلا يخرج بلا إذنهما وإن استغنيا عن خدمته“ (رد المحتار ۵/ ۲۶۱)۔

بہو کو ساس سسر کے ساتھ رہنے پر مجبور کرنا:

اولاد پر ماں باپ کی ہر طرح کی خدمت واجب ہے ارشاد ربانی ہے۔ ”وقضى ربك أن لا تعبدوا إلا إياه وبالوالدين إحسانا إما يبلغن عندك الكبر أحدهما أو كلاهما فلا تقل لهما أف ولا تنهرهما وقل لهما قولا كريما“ (سورہ بنی اسرائیل: ۲۳-۲۲)، اسی طرح ”ووصينا الإنسان بوالديه إحسانا“ (سورہ احقاف: ۱۵)، نیز ”أن اشكر لي ولوالديك“ (سورۃ لقمان: ۱۴) اور ”وصاحبهما في الدنيا معروفا“ (سورۃ لقمان: ۱۵)۔

اسی طرح حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں ہے ”وعن أبي هريرة رضي الله عنه قال: قال رسول الله ﷺ: رغم أنفه، ثم رغم أنفه، ثم رغم أنفه، قيل من يارسول الله ؟ قال: من أدرك والديه عنده الكبر أحدهما أو كليهما ثم لم يدخل الجنة“ (الصحيح لمسلم ۲/ ۳۱۴، كتاب البر والصلة والادب، باب فضل صلة اصدقاء الاب ونحوهما)

دوسری حدیث میں ہے ”وعن أبي هريره رضي الله عنه قال: قال رسول الله ﷺ: لايجزى ولد والده إلا أن يجده مملوكا، فيشتريه فيعتقه“ (سنن ابی داود ص ۶۹۹، کتاب الادب، باب فی بر الوالدین)۔

فتاویٰ دار العلوم میں ایک سوال کے جواب میں لکھتے ہیں ”اولاد کے ذمے والدین کی اطاعت و فرماں برداری اور ہر قسم کی خدمت و خبر گیری ہے، اور والدین کے ذمے اولاد کا نفقہ اور تعلیم و تربیت کا انتظام اور ہر قسم کی خیر خواہی ہے جس کی تفصیل معلوم و معروف ہے (فتاویٰ دار العلوم ۱۶/ ۵۲۶/ ۵۲۷)۔

ان عبارتوں سے یہ واضح ہے کہ بہو کو ساس کے ساتھ انسانی ہمدردی کرنی چاہئے اور ساس سسر کے ساتھ ایسا معاملہ جیسا کہ اپنے بڑوں کے ساتھ کرتے ہیں کرنا چاہئے اور ان کی خدمت کرنی چاہئے، لیکن بہو پر ساس سسر کی خدمت نہ تو واجب ہے اور نہ ہی ان کے ساتھ رہنا واجب ہے اور نہ اس کو ان کے ساتھ رہنے پر مجبور کی جاسکتا ہے۔

ماں باپ کی خدمت کس پر واجب ہے:

ماں باپ کی خدمت بیٹا بیٹی دونوں پر واجب ہے۔

سوال: حقوق والدین لڑکے و دختر دونوں کے ذمے برابر ہیں یا کم وبیش؟

جواب: دونوں کے ذمے برابر ہیں "لعموم النصوص الواردة فی هذا الباب" (فتاوی دار العلوم جلد ۱۶ / ۵۰۱)۔

شوہر کو اپنی بیوی کو اس کے ماں باپ کی خدمت سے روکنے کا حق نہیں:

ماں باپ مرض دائمی یا مہلک بیماری میں مبتلا ہوں اور ان کی کوئی خدمت کرنے والا نہ ہو اور وہ بیٹی کی خدمت کے محتاج ہوں تو بیٹی پر ماں باپ کی خدمت واجب ہے اور شوہر کو روکنے کا حق نہیں ہے ہاں جب تک وہ اپنے ماں باپ کے یہاں رہے گی شوہر پر اس کا نفقہ لازم نہیں ہوگا۔

"ولو أبوه زمنا مثلا أی مریضا مرضا طویلا فاحتاجها فعلیها تعاهده أی بقدر احتیاجه إلیها، وهذا إذا لم یکن له من یقوم علیه کما قیده فی الخانیة ولو کافرا؛ لأن ذلك من المصاحبة بالمعروف المأمور بها، وإن أبی الزوج لرجحان حق الوالد وهل لها النفقة لا ظاهر لا، وإن کانت خارجة من بیته بحق کما لو خرجت لفرض الحج" (ردالمحتار ۲/ ۶۷۱/ ۶۷۲)، فتاوی خانیہ میں ہے "امرأة لها أب زمن لیس له من یقوم علیه وزوجها یمنعها عن الخروج وتعاهده کان لها أن تعصی زوجها وتطیع الوالد مومنا کان الوالد أو کافرا؛ لأن القیام بتعاهد الوالد فرض علیها فیقدم علی حق الزوج" (فتاوی خانیه علی هامش الهندیه ۱/ ۴۴۳، کتاب النفقه، باب فی حقوق الزوجیة)۔

فتح القدیر میں ہے "ولو کان أبوها زمنا مثلا وهو محتاج إلی خدمتها والزوج یمنعها من تعاهده فعلیها أن تغضبه مسلما کان الأب أو کافرا" (فتح القدیر ۴/ ۳۵۹)۔

والد کی دوسری شادی میں اولاد کا رکاوٹ بننا:

والد کی دوسری شادی میں بیٹے اور بیٹیوں کا رکاوٹ بننا قطعا درست نہیں ہے بلکہ اگر والد کو خادم کی ضرورت ہو اور وہ شادی کرنا چاہے یا اسی طرح اس کو گناہ میں مبتلا ہونے کا خطرہ ہو تو اولاد پر والد کی شادی کرنا ضروری ہے اور اگر والد معسر و تنگدست ہو تو اولاد پر اپنے والد کی بیوی کا خرچہ برداشت کرنا بھی واجب ہوگا اس سلسلہ میں ائمہ اربعہ کا اتفاق ہے کہ والد کے پاکدامنی کے لیے ان کی شادی کرانا اور ان کے اعسار کی صورت میں ان کی بیوی کا نفقہ بھی ان پر لازم ہوگا شامی میں ہے۔

"مطلب فی نفقة زوجة الأب وأم ولده بل و تزیجه أو تسریه ولو له زوجات فعلیه نفقة واحدة یدفعها للأب لیوزعها علیهن" (الدر المختار علی رد المحتار ۲/ ۶۷۱/ ۶۷۲، مطلب فی نفقة زوجة الاب)۔

اولاد کا والد کی زندگی میں جائداد کا مطالبہ:

اگر اولاد محتاج ہو اور کمانے کے قابل نہ ہو تو اس کا نفقہ اس کے والد پر ہے۔

"تجب لولده الکبیر العاجز عن الکسب" (الدر المختار ۲/ ۶۷۰)

لیکن اگر کمانے کے قابل ہو تو اس کا نفقہ والد پر نہیں ہے تو ان کے لیے درست نہیں ہے کہ وہ اپنے والد سے ان کی زندگی میں جائیداد کا بطور وراثت کے مطالبہ کریں اس لیے کہ وراثت کے پانے کے لیے تین شرطیں ہیں۔

(۱) مورث کی موت حقیقی یا حکمی کا یقین یا ظن غالب ہونا۔

(۲) مورث کی موت کے وقت وارثوں کی زندگی حقیقی یا تقدیری کا یقین یا ظن غالب ہونا۔

(۳) ارث کی جہت کا علم، یعنی اس بات کا علم کہ کون کس بنیاد پر وارث ہو رہا ہے۔

"وأرکانه ثلاثة: وارث ومورث وموروث وشروطه ثلاثة: موت مورث حقیقة أو حکما کمفقود أو تقدیرا

كجنين فيه غرة ووجود وارثه عند موته حيا حقيقة أو تقديرا كالحمل والعلم بجهة إرثه وأسبابه وموانعه ستأتي'' (رد المحتار على الدر المختار، اوائل كتاب الفرائض ۵/ ۶۶۲)۔

ابھی چونکہ باپ زندہ ہے اس لیے وہی اپنے مال کا مالک ہوگا اس لیے بطور وراثت کے مطالبہ درست نہ ہوگا۔

البتہ اگر بطور ہبہ کے مطالبہ کرے اور والد ہبہ کردے تو اس کی گنجائش معلوم ہوتی ہے کہ محتاج اولاد اپنے مالدار والد سے جائیداد کی تقسیم کا مطالبہ کرے۔ لیکن یہ مطالبہ کرنا ان کا حق نہیں ہے، بلکہ جیسے کوئی آدمی کسی اجنبی آدمی سے بطور ضرورت کوئی چیز مانگ لے ایسے ہی ہے اور والد کو اختیار ہے کہ اپنی چیز ہبہ کرے یا نہ کرے اور اگر والد نے ہبہ کردیا اور قبضہ بھی دلا دیا تو بیٹا اس کا مالک ہوجائے گا۔

''ونص عبارته الذي في الخلاصة أنه طلب الهبة مزاحا لا جدا فوهبه جدا وسلم صحت الهبة؛ لأن الواهب غير مازح وقد قبل الموهوب له قبولا صحيحا وما نقله المصنف عن الخلاصة مستدلا به على ما في متنه لا يفيد فإنه نحو ما في الخلاصة وعبارتها لو قال هبي هذا الشئي على وجه المزاح فقالت وهبت إليك وسلم جاز. وكذا ما في القهستاني لا يفيده و نصه و يدخل فيه ما يكون على وجه المزاح، فلو قال وهبت لي كذا فقال وهبت وقال الآخر: قبلت وسلم إليه جاز'' (الدر المختار على رد المحتار ۴/ ۵۶۸ كتاب الهبه)۔

بوڑھوں کے لیے ہاسٹل بنانا اور ان کو اس میں رکھنا:

ایسے بوڑھے جن کے پاس اولاد یا اقرباء میں ایسے لوگ ہیں جن پر ان کا نفقہ واجب ہے تو ان پر ان کی خدمت بھی واجب ہے۔

"وإذا قضى ربك ألا تعبدوا إلا إياه وبالوالدين إحسانا" (سورہ بنی اسرائیل: ۲۳)۔

اور بلاوجہ کے ان کے لیے جائز نہیں کہ وہ ان کو اولڈ ہاؤس میں ان کی مرضی کے خلاف رہنے پر مجبور کریں اور ان کو وہاں ڈال دیں۔

ہاں وہ لوگ جن کے پاس کوئی نہیں ہے تو پھر ان کو ایسی جگہوں پر ان کی حفاظت کی غرض سے ڈالا جاسکتا ہے اور بے سہارا لوگوں کے لیے ایسے ہاسٹلوں کی حوصلہ افزائی کی جاسکتی ہے اس سلسلہ میں انٹرنیشنل فقہ اکیڈمی جدہ کے شرعی فیصلہ ''بوڑھوں کے حقوق'' کی تجاویز کو ذکر کرنا یہاں مناسب ہوگا۔

''آدم کی اولاد کی حیثیت سے اسلام نے ہر انسان کے لیے عزت وتکریم کا جو اصول طے کیا ہے اس کی رو سے اسلام نے انسان کی زندگی کے تمام مراحل کو اہمیت دی ہے اور اس سلسلہ میں آیات اور احادیث اسلام کی بنیاد ہیں، جیسے "لقد كرمنا بني آدم" (سورہ اسراء: ۷۰) اور "وقضى ربك ألا تعبدوا إلا إياه وبالوالدين إحسانا" (سورہ اسراء: ۲۳) اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہے ''ما أكرم شباب شيخا لسنه إلا قيض الله لهم من يكرمه عند سنه'' (جب بھی کوئی نوجوان کسی بوڑھے کا اکرام اس کی درازی عمر کی وجہ سے کرتا ہے تو اللہ تعالی اس کے لئے ایسے لوگ تیار کردیتا ہے جو خود اس کے بوڑھاپے کے وقت اس کی عزت واکرام کریں گے) (ترمذی شریف) اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول ہے ''ليس منا من لم يرحم صغيرنا ويعرف شرف كبيرنا'' (وہ ہمارے طریقہ پر نہیں ہے جس نے ہمارے چھوٹے پر رحم نہیں کیا اور ہمارے بڑے کے مقام عزت کو نہیں پہچانا (ترمذی واحمد)۔

اس کی روشنی میں اکیڈمی یہ فیصلہ کرتی ہے کہ:

(۱) بوڑھوں کو جسمانی، روحانی اور اجتماعی صحت کی حفاظت کرنے والی چیزوں سے واقف کرایا جائے، انہیں مسلسل وہ دینی احکام بتائے جائیں جن کی ان کو اپنی عبادات، معاملات اور دوسرے احوال میں ضرورت پیش آتی ہے، اور اپنے رب سے تعلق اور اس کی بخشش ومغفرت کے ساتھ حسن ظن کو مضبوط بنایا جائے۔

(۲) ان کو سوسائٹی کا ایک حصہ بنانے اور ان کے تمام انسانی حقوق کا پاس ولحاظ رکھنے پر زور دیا جائے۔

(۳) ان کے خاندان ہی ان کے لئے بنیادی جگہ ہوں تا کہ وہ عائلی زندگی کا لطف اٹھا سکیں، ان کے بیٹے اور پوتے ان کے ساتھ حسن سلوک کریں، وہ اپنے اقرباء واحباب اور پڑوسیوں کے حسن سلوک سے لطف اندوز ہوں، اگر ان کے اپنے خاندان نہ ہوں تو مناسب ہے کہ ان کے لئے اولڈ ہاؤسز میں گھریلو ماحول فراہم کیا جائے۔

(۴) سوسائٹی کو بوڑھوں کے مقام و مرتبہ اور ان کے حقوق سے تعلیم و تربیت کے کورسز اور ٹی وی پروگراموں کے ذریعہ آگاہ کیا جائے، ساتھ ہی والدین کے ساتھ حسن سلوک پر زور دیا جائے۔

(۵) ان بوڑھوں کی خبر گیری کے لئے سنٹر بنائے جائیں جن کا کوئی خاندان نہ ہو یا جن کے گھرانے ان کی خبر گیری نہ کر سکتے ہوں۔

(۶) طبی کالجوں اور صحت کے مراکز میں بوڑھاپے کے مرض کی تعلیم کا اہتمام کیا جائے، اور کچھ ڈاکٹروں کو بوڑھوں کے امراض کی تحقیق اور علاج کے لئے تربیت دی جائے اور اسپتالوں میں بڑھاپے کے امراض کے خاص شعبے قائم کئے جائیں۔

(۷) ٹرانسپورٹ کے ذرائع میں اور عام مقامات اور ٹیکسی اسٹینڈ وغیرہ میں بوڑھوں کا لحاظ رکھتے ہوئے ان کی مخصوص سیٹیں بنائی جائیں (انٹرنیشنل فقہ اکیڈمی جدہ کے شرعی فیصلے ص/ ۳۴۲/ ۳۴۳)۔

بے سہارا بوڑھے لوگوں کی اجتماعی کفالت میں زکوۃ کی رقم صرف کرنا:

زکوۃ کے مصارف آٹھ ہیں جن کی تعیین خود اللہ رب العزت نے فرمادی ہے۔ "إنما الصدقات للفقراء والمسكين والعملين عليها والمولفة قلوبهم وفي الرقاب والغرمين وفي سبيل الله وابن السبيل فريضة من الله والله عليم حكيم" (سورہ توبہ: ۶۰)

اس آیت سے پتہ چلا کہ ایسے بوڑھے جو بے سہارا ہوں اور صاحب نصاب نہ ہوں اور ان کی اولاد نہ ہو یا ایسے اقرباء نہ ہوں جن پر ان کا نفقہ واجب ہے تو وہ مسکین اور فقراء کے درجہ میں ہوں گے اور ان پر زکوۃ کی رقم خرچ کی جاسکتی ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ وہ مسلمان ہوں، اس لیے کہ کافر پر زکوۃ کی رقم خرچ نہیں کی جاسکتی ہے "فقیر اور مسکین کے دونوں مصرفوں میں یہ بات قدر مشترک ہے کہ جس کو مال زکوۃ دیا جائے وہ مسلمان ہو اور حاجات اصلیہ سے زائد بقدر نصاب مال کا مالک نہ ہو۔

اگر چہ عام صدقات غیر مسلموں کو بھی دے جاسکتے ہیں، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "تصدقوا على أهل الأديان كلها" یعنی ہر مذہب والے پر صدقہ کرو، لیکن صدقہ زکوۃ کے بارے میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ کو یمن بھیجنے کے وقت یہ ہدایت فرمائی تھی کہ مال زکوۃ صرف مسلمانوں کے اغنیاء سے لیا جائے، اور انہی کے فقراء پر صرف کیا جائے، اس لئے مال زکوۃ کو صرف مسلم فقراء و مساکین ہی پر صرف کیا جاسکتا ہے (معارف القرآن ۴/ ۳۹۶)۔

مذکورہ لوگوں پر اجتماعی طور پر زکوۃ کی رقم خرچ کرنا تو اس کی مثال ہندوستان میں موجودہ مدارس اسلامیہ ہیں کہ جس طرح ان میں جن شرائط کی رعایت کے ساتھ زکوۃ کا استعمال جائز ہے اسی طرح ایسے لوگوں پر جائز ہوگا مثلاً کپڑہ اور کھانے اور دوائیاں پر یہ رقم خرچ کر کے ان کو ان کی ضرورت کی چیزوں کا مالک بنا کر ان رقم کو خرچ کیا جاسکتا ہے اسی طرح ان کی رہائش کے مکان وغیرہ کی تعمیر کسی غریب کے ذریعہ تملیک کرا کر ان پر اجتماعی طور پر خرچ کر سکتے ہیں بغیر تملیک اور بغیر ان کو مالک بنائے ان پر زکوۃ کی رقم خرچ نہیں کر سکتے ہیں "جمہور فقہاء، اس پر متفق ہیں کہ زکوۃ کے معینہ آٹھ مصارف میں بھی زکوۃ کی ادائیگی کے لئے یہ شرط ہے کہ ان مصارف میں سے کسی مستحق کو مال زکوۃ پر مالکانہ قبضہ دیدیا جائے، بغیر مالکانہ قبضہ دئے اگر کوئی مال انہی لوگوں کے فائدے کے لئے خرچ کر دیا گیا تو زکوۃ ادا نہیں ہوگی، اسی وجہ سے ائمہ اربعہ اور جمہور فقہاء امت اس پر متفق ہیں کہ رقم زکوۃ کو مساجد یا مدارس یا شفا خانے، یتیم خانے کی تعمیر میں یا ان کی دوسری ضروریات میں صرف کرنا جائز نہیں، اگر چہ ان تمام چیزوں سے فائدہ ان فقراء اور دوسرے حضرات کو پہونچتا ہے جو مصرف زکوۃ ہیں، مگر ان کا مالکانہ قبضہ ان چیزوں پر نہ ہونے کے سبب زکوۃ اس سے ادا نہیں ہوتی۔

البتہ یتیم خانوں میں اگر یتیموں کا کھانا کپڑا وغیرہ مالکانہ حیثیت سے دیا جاتا ہے تو صرف اس خرچ کی حد تک رقم زکوۃ صرف ہوسکتی ہے، اسی طرح شفا خانوں میں حاجت مند غرباء کو مالکانہ حیثیت سے دیدی جائے اس کی قیمت رقم زکوۃ میں محسوب ہوسکتی ہے (معارف القرآن ۴/ ۴۰۹)۔

فتاوی محمودیہ میں ہے "غریب مسکین، بیوہ اور گزارہ الاونس والے معذوروں کے لئے زکوۃ۔

سوال: کیا زکوۃ کی رقم میں سے مستحق غریبوں، مسکینوں، بیواؤں اور ان لوگوں کو جو اپاہج یا ضعیف ہونے کی وجہ سے روزی کمانے سے معذور ہوں عمر بھر کی پنشن کے طور پر گزارہ الاونس دیا جاسکتا ہے؟

الجواب (۲۷) دیا جاسکتا ہے جب تک وہ مصرف رہیں (فتاوی محمودیہ ۹/ ۳۴۹ اور ۳۶۴)۔

ایک اور سوال کے جواب میں ہے، زکوۃ سے طبی امداد

سوال: دریافت طلب امر یہ ہے کہ زکوۃ کا مصرف اس طبی امدادی فنڈ میں لگایا جاسکتا ہے یا نہیں؟

اس کا اشتہار یہ ہے "طبی امدادی فنڈ" ہمارے شہر بھٹکل کی آبادی روز بروز بڑھتی جارہی ہے اور بیماریوں کی بھی کثرت ہورہی ہے، ڈاکٹروں کی تعداد بھی بہت بڑھ گئی ہے اور میونسپلٹی کی طرف سے کوئی انتظام نہیں ہے، بعض مسلمان ڈاکٹر غریب اور مزدوروں پر رحم کھا کر یا تو ادھار دوا دے دیتے ہیں یا ان پر مہربانی کرتے ہیں، مگر ہمارے شہر میں کوئی ایسا انتظام نہیں ہے جہاں پر غریب عوام بیماری میں دوا دارو کے لئے کچھ اعانت طلب کرسکیں، بعض ایسے مریضوں کو بھی دیکھا گیا ہے جن کو ڈاکٹری مشورے کے مطابق بھٹکل سے باہر جا کر علاج کرنا چاہئے، مگر بغیر خرچ اور دوسرے انتظامات نہ ہونے کی وجہ سے گھٹتے رہتے ہیں۔

ان عبارتوں سے پتہ لگتا ہے کہ ایسے لوگوں پر زکوۃ کی رقم اجتماعی طور پر تملیکا خرچ کی جاسکتی ہے۔

سن رسیدہ افراد کے سرکاری خصوصی رعایت کا غیر سن رسیدہ کے لیے استعمال:

عمر دراز لوگوں کے لئے حکومت کی طرف سے خصوصی رعایت جیسے ٹرین کے کرایہ میں تخفیف، حکومت کی طرف سے امدادی وظیفہ، ٹیکس میں رعایت وغیرہ کا ان لوگوں کے لیے استعمال ناجائز ہے جو اس مقررہ عمر کو نہ پہنچے ہوں، اس لیے کہ کسی کا مال اس کی مرضی کے خلاف کھانا اور لینا درست نہیں جیسا کہ قرآن شریف میں ارشاد ربانی ہے "ولا تأكلوا أموالكم بينكم بالباطل" (سورۃ البقرۃ/۱۸۸) ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

''عن أبي حرة الرقاشي عن عمه رضي الله تعالى قال: قال رسول الله ﷺ: ألا لا تظلموا ألا لا يحل مال امرئ إلا بطيب نفس منه'' (مشكوة المصابيح كتاب البيوع باب الغصب والعارية)

دوسری حدیث شریف میں ہے: '' عن أبي هريرة رضي الله تعالى عنه أن رسول الله ﷺ قال: من حمل علينا السلاح فليس منا ومن غشنا فليس منا'' (الصحيح لمسلم كتاب الايمان باب قول النبي ﷺ من غشنا ۱/ ۷۰)۔

فتاوی محمودیہ میں ہے:

سوال: ایک مدرسہ میں چند مدرسین درس نظامی کی تعلیم پر مامور ہیں اور اس کی انہیں تنخواہ ملتی ہے اور ۳۰۰ روپیہ ماہانہ گرانی الاؤنس بھی ملتا ہے ان اخراجات کی آمدنی کے لئے کوئی مستقل ذریعہ نہیں ہے، بلکہ اہتمام کی طرف سے مختلف ذرائع اختیار کئے جاتے ہیں، ان ہی میں سے ذریعہ کے طور پر بعض دیگر ادارتی مصلحتوں کی بناء پر سرکار سے الحاق کرلیا گیا ہے مگر سرکاری نصاب کی تعلیم نہیں ہوتی، صرف دفتری خانہ پری کے ذریعہ تعلیم دکھلادی جاتی ہے، سرکار مختلف ناموں سے امداد دیتی رہتی ہے: لائبریری کے نام سے، کبھی تنخواہوں کے نام سے اور دیگر تعلیمی اخراجات کے نام سے، اور مہتمم ان رقوم کو ادارتی مصلحتوں میں خرچ کرتا رہتا ہے اور مدرسین کو ان دفتری خانہ پری سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

اب گورنمنٹ نے ۳۰۰ روپیہ ماہانہ گرانی الاؤنس دیا ہے۔

سوال: یہ ہے کہ اس طریقہ سے گورنمنٹ سے رقم لینا اور اپنی حسب صوابدید ادارہ پر خرچ کرنا شرعا درست ہے یا نہیں؟

الجواب: اگر الحاق کی شرائط موجود نہیں، غلط بیانی کر کے شرائط الحاق موجود ظاہر کر کے الحاق کیا گیا ہے اور اس کے تقاضوں کو پورا نہیں کیا جاتا، صرف دفتری خانہ پری کر کے بتلادیا جاتا ہے کہ تقاضوں کو پورا کردیا گیا اور اس طور پر امداد حاصل کی جاتی ہے تو یہ زور وخداع ہے، اس کا لینا دانشمندی کے بھی خلاف ہے۔ پھر اس کی تقسیم کا سوال بے محل ہے، کیا مدرسین حضرات ایسی رقم لینے کے لئے آمادہ ہوجائیں گے امید تو یہ ہے کہ اگر ان کو دی جائے تب بھی وہ قبول نہیں کریں گے، ان کی دیانت اس کی اجازت نہیں دے گی بلکہ اس کو برداشت نہیں کریں گے (فتاوی محمودیہ ۱۵/ ۵۹۱ تا ۵۹۲)۔

اسلام میں سن رسیدہ لوگوں کے حقوق واحکام

مولانا عبداللہ خالد لوناواڑہ ؒ

جواب:

اسلام ایک مکمل نظام حیات ہے۔اس میں ہر ایک کے حقوق کا خیال رکھا گیا ہے۔اور کسی کو بے یارو مددگار نہیں چھوڑا۔ ہر ایک کے لئے ایسے اسباب، ذرائع مہیا کر دیئے ہیں کہ آسانی کے ساتھ اللہ کی زمین پر رہ کر اپنی زندگی کے ایام گزار سکے۔اسی لئے اس نے سماج کے مختلف طبقات کے حقوق اور واجبات متعین کئے ہیں۔منجملہ ان کے سن رسیدہ اور بوڑھے لوگوں کے حقوق کے متعلق ان کے ماتحتوں اور سماج کے فرائض کی بھی رہنمائی کی ہے۔

بوڑھاپے کی نفسیات کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ اس عمر میں انسان چاہتا ہے کہ اس کے چھوٹے اس کے ساتھ عزت واحترام کا معاملہ کریں۔اس کو سماج میں بہتر مقام دیا جائے۔اسلام نے اسکا بھی پاس ولحاظ کیا ہے۔

حدیث شریف میں ہے:

ایک سن رسیدہ شخص اللہ کے رسول ﷺ کی ملاقات کے لئے حاضر ہوئے۔لوگوں نے جگہ دینے میں دیر کی تو آپ ﷺ نے تنبیہ کی اور فرمایا جو شخص چھوٹوں پر شفقت نہ کرے اور بڑوں کی توقیر نہ کرے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ ''لیس منا من لم یرحم صغیرنا ولم یؤقر کبیرنا'' (ترمذی: ۱۹۲۴)۔

ایک دوسری حدیث میں ہے کہ جو نوجوان کسی بوڑھے شخص کی اسکی عمر کی رعایت کرتے ہوئے تعظیم کریگا تو جب وہ نوجوان اس عمر کو پہونچے گا تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے بھی ویسا ہی تعظیم کرنے والا مہیا کردے گا۔

''ما أكرم شاب شيخا بسنه إلا قيض الله له من يكرمه عند سنه'' (ترمذی: ۲۰۲۲)۔

اسی طرح اسلام نے رہنمائی فرمائی ہے کہ جب کئی لوگ ہو اور ان کو اپنی بات پیش کرنی ہو تو بڑے کو گفتگو اور نمائندگی کا موقع دینا چاہئے۔

''كبر الكبر'' (مسلم ۲/۵۵)۔

اسی طرح دو اشخاص علم وقراءت، وراع وتقوی کے اعتبار سے بڑھا ہو تو جوان میں عمر دراز ہو اس کو امامت کا حق حاصل ہوگا۔

''وليؤمكما أكبركما'' (متفق عليه)۔

اسی طرح فقہاء نے لکھا ہے کہ چھوٹوں کو بڑوں کو سلام کرنے میں سبقت کرنی چاہئے (ہندیہ ۵/ ۳۲۵)۔

اسی طرح ان کی جسمانی ضروریات کا لحاظ کرتے ہوئے ان کے چھوٹوں کو اس بات کا مکلف بنایا ہے کہ ان کی ضروریات کی تکمیل اور ان کی کفالت کریں۔ان میں سب سے اہم والدین ہیں۔ایسے وقت میں شریعت اسلامیہ نے والدین کی خدمت اور کفالت کی ذمہ داری اولاد پر عائد کی ہے۔

قرآن کریم میں ہے: "وقضى ربك ألا تعبدوا إلا إياه وبالوالدين إحسانا" (الاسراء: ۲۳)

(تیرے پروردگار کا یہ فیصلہ ہے کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو اور والدین کے ساتھ حسن سلوک کرو)

"وصاحبهما في الدنيا معروفا" (لقمان: ۱۵) (اور والدین کے ساتھ دنیا میں اچھا سلوک کرو)

حدیث میں ہے حضرت جابر ابن عبداللہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک شخص اپنے والد کے ساتھ حاضر ہوا اور عرض کیا:

''يا رسول الله! أن لي مالا و أن لي أبا وله مال و أن أبي يريد أن يأخذ مالي فقال رسول الله ﷺ: أنت

ؒ خادم التدریس دار العلوم مدرسہ عربیہ تعلیم المسلمین، لوناواڑہ، گجرات۔

و مالك لأبيك'' (أبوداؤد: ۳۵۳۰)۔

(یارسول اللہ! میرے پاس مال ہے اور میرے والد کے پاس بھی مال ہے پھر بھی میرے والد میرا مال لینا چاہتے ہیں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم اور تمہارا مال تمہارے باپ کا ہے)

ایک دوسری حدیث میں ہے: ''عن طارق المحاربي قال قدمنا المدينة فإذا رسول الله ﷺ قائم على منبر يخطب الناس وهو يقول: يد المعطى العليا وابدأ بمن تعول أمك وأباك وأختك وأخاك ثم أدناك أدناك'' (نسائی شریف: ۲۵۳۳)۔

ایک اور حدیث میں اللہ کے رسول ﷺ فرماتے ہیں: إن أطيب ما يأكل الرجل من كسبه وإن ولده من كسبه فكلوا من كسب أولادكم إذا احتجتم إليه بالمعروف'' (ابوداؤد: ۳۰۶۱)۔

(سب سے پاکیزہ رزق وہ ہے جو انسان اپنی ہاتھ کی کمائی سے کھائے اور اولاد بھی انسان کی کمائی ہے پس ضرورت کے وقت اپنی اولاد کی کمائی کھاؤ معروف طریقہ پر)۔

ان آیات واحادیث کی بناء پر فقہاء کرام کا اس بات پر اتفاق ہے کہ والدین کا نفقہ اولاد پر واجب ہے۔

چنانچہ ابن قدامہؒ لکھتے ہیں: ''أما الإجماع فحكى ابن المنذر قال: أجمع أهل العلم على أن نفقة الوالدين الفقيرين الذين لا كسب لهما و لا مال واجبة في ما ل الولد'' (المغنی ۵۸۳/۷)۔

اسی طرح علامہ وہبہ زحیلیؒ لکھتے ہیں: ''تجب نفقة الوالدين وإن علو عند الجمهور'' (الفقہ الاسلامی و ادلتہ ۸۳۰/۷)۔

اسی طرح ''الموسوعۃ الفقھیۃ'' میں ہے:

''اتفق الفقهاء على وجوب نفقة الأبوين المباشرين على الولد'' (۴۱/۷۳)۔

کن شرطوں کے ساتھ والدین کا نفقہ واجب ہوگا؟

اگر والدین ضرورت مند ہوں اور ان کے پاس مال نہ ہو تو اولاد پر ان کی کفالت واجب ہے۔ چاہے والدین کمانے پر قادر ہو یا نہ ہو۔

چنانچہ محیط برہانی میں ہے: ''ثم يفرض على الابن نفقة الاب، اذا كان الأب محتاجا سواء كان الأب قادرا على الكسب أو لم يكن'' (المحیط البرہانی ۳۵۰/۴)۔

اسی طرح ''ہندیہ'' میں ہے: ''ويجبر الولد الموسر على نفقة الوالدين المعسرين مسلمين كانا أو ذميين قدرا على الكسب أو لم يقدرا'' (الفتاوی الہندیہ ۵۶۴/۱)۔

اسی طرح ''الجوہرۃ النیرۃ'' میں ہے: ''وعلى الرجل أن ينفق على أبويه و أجداده و جداته إذا كانوا فقراء وإن خالفوا في دينه و يعتبر فيهم الفقر'' (الجوہرۃ النیر ۱۵۵/۲)۔

اسی طرح علامہ وہبہ زحیلیؒ لکھتے ہیں:

''فتجب لهما النفقة في رأى الحنفية والشافعية مع القدرة على الكسب؛ لأن الفرع مأمور بمعاشرة أصله بالمعروف، و ليس منها تكليف الكسب مع كبر السن'' (الفقہ الاسلامی و ادلتہ ۷۷۳/۷)۔

☆ جن شرطوں کیساتھ انسان پر والدین کا نفقہ واجب ہے، انہی شرطوں کے ساتھ اس کے دادا دادی نانا نانی یعنی اسکے اصول کا نفقہ بھی اس پر واجب ہے اس لئے کہ فقہاء کرام نے والدین کے ساتھ ہی اصول کے نفقہ کا ذکر کیا ہے۔

صاحب ہدایہ لکھتے ہیں: ''أما الأجداد والجدات فلأنهم من الآباء و الأمهات و لهذا يقوم الجد مقام الأب عند عدمه ولأنهم سببوا لإحيائه فاستوجبوا عليه الإحياء بمنزلة الأبوين'' (الہدایۃ: ۴۳۶)۔

اسی طرح ''تاتارخانیہ'' میں ہے: ''الجد بمنزلة الأب في حق استحقاق النفقة عليه إذا كان الأب ميتا أو كان حيا

فقیرا... ویعتبر فی حق الجد لاستحقاق النفقة الفقر لا غیرعلی ما هو ظاهر الروایة کما فی حق الأب. والجد من قبل الأم کالجد من قبل الأب'' (الفتاوی التاتارخانیة ۵/۴۳۱)۔

☆ اصول کے علاوہ دوسرے ذی رحم محرم رشتے داروں کا نفقہ بھی انسان پر کچھ شرطوں کے ساتھ واجب ہے۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: "وعلی الوارث مثل ذٰلك" (البقرة: ۲۳۳)۔

ایک دوسری جگہ پر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: "وآت ذالقربی حقه" (بنی اسرائیل: ۲۵)۔

اسی طرح ایک حدیث میں اللہ کے رسول ﷺ فرماتے ہیں:

''ید المعطی العلیا، وابدأ بمن تعول، أمك وأباك وأختك وأخاك ثم أدناك أدناك'' (نسائی شریف: ۲۵۳۲)۔

ایک دوسری حدیث میں ہے:

''وقال رجل: یا رسول الله! من أبر؟ قال: أمك و أباك: وأختك وأخاك. ومولاك الذی یلی ذلك حق واجب. ورحم موصولة'' (ابوداؤد: ۵۱۴۰)۔

ان آیات واحادیث کی بنا پر فقہاء کرام کے نزدیک ذی محرم رشتے داروں کا نفقہ بھی کچھ شرطوں کے ساتھ واجب ہوگا۔

(۱) نفقہ دینے والے کے پاس مال ہو۔ (۲) ذی رحم محرم کے پاس نفقہ کی مقدار مال نہ ہو، کیوں کہ ان کے پاس نفقہ کی مقدار مال ہو تو دوسرے پر ان کا نفقہ واجب نہ ہوگا۔ (۳) آدمی کی ایسی مجبوری ہو کہ خود کام کر کے نفقہ حاصل کرنے پر قادر نہ ہو، یا عورت ہو لیکن فقیرہ ہو اس سے قریب کا کوئی آدمی اس کی کفالت کرنے والا نہ ہو اور اگر اس کو نفقہ نہ دیا جائے تو ضائع ہو جائے گی کیوں کہ باہر جا کر کام کرنا اس کے بس کی بات نہیں۔

علامہ وہبہ زحیلی فرماتے ہیں: ''ویشترط لوجوب نفقة هؤلاء الأقرباء فی رأی حنفیة ما یلی: (۱) أن یکون القریب ذا رحم محرم فقیرا عاجزا عن الکسب۔ (۲) اتحاد الدین مع القریب المنفق۔ (۳) أن یکون المنفق موسرا''

اسی طرح علامہ کاسانیؒ لکھتے ہیں:

''أحدها: إعساره فلا تجب لموسره علی غیره نفقة فی قریب الولاد وغیرها من الرحم المحرم

والثانی: عجزه عن الکسب بأن کان به زمانة... أو غیر ذالك من العوارض التی تمنع الانسان من الاکتساب حتی لو کان صحیحا مکتسبا لا یقضی له بالنفقة علی غیره'' (بدائع الصنائع ۳/۳۴۶)۔

اسی طرح ہدایہ میں ہے: ''والنفقة لکل ذی رحم محرم... أو کانت امرأة بالغة فقیرة أو کان ذکرا بالغا فقیرا زمنا أو أعمی'' (ہدایہ اولین: ۴۴۶)۔

''تاتارخانیہ'' میں ہے: ''ولا یقضی بنفقة أحد من ذوی الأرحام إذا کان غنیا. أما الکبار الأصحاء فلا یقضی لهم بنفقتهم علی غیرهم وإن کانوا فقراء، وتجب النفقة الاناث إن کانت من ذوی الأرحام وإن کن صحیحات البدن إذا کان بهن حاجة إلی النفقة'' (الفتاوی تاتارخانیة ۵/۴۳۲)۔

☆ وہ معذورین اور سن رسیدہ حضرات جن کا کوئی رشتے دار نہیں ہے ان کا نفقہ فقہاء کرام کی تصریح کے مطابق بیت المال اور حکومت کی ذمہ داری میں ہوگا۔

''الموسوعة الفقهیة'' میں ہے: ''لا خلاف بین الفقهاء فی أن نفقة العاجز الذی لا عائل له و لا قدرة له علی الکسب ولا یملك مالا تجب فی بیت المال'' (الموسوعة الفقهیة ۴۱/۹۹)۔

اسلامی حکومت کے نہ ہونے اور بیت المال کے نظام کے نہ ہونے کی وجہ سے ان لوگوں کا نفقہ عام مسلمانوں پر ہوگا۔

خلاصۂ بحث:

(۱) والدین اور اجداد کا نفقہ اسی وقت واجب ہوتا ہے جب کہ وہ محتاج اور ضرورت مند ہو لیکن اگر وہ صاحب ثروت ہو تو ان کا نفقہ واجب نہیں ہوگا۔ ان کے لئے زیادہ سہولت کے لئے یا دوسرے لوگوں پر خرچ کرنے کے لئے یا رقم محفوظ کرنے کے لئے اپنے ماتحتوں سے مطالبہ کرنا درست نہیں ہوگا۔

(۲) والدین اگر محتاج ہو تو کمانے پر قدرت ہونے کے باوجود ان کو کمانے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا۔

(۳) والدین اور اجداد کے علاوہ دوسرے اقرباء کا نفقہ اسی صورت میں واجب ہوگا جب وہ خود کمانے پر قادر نہ ہوں اگر وہ خود کمانے پر قدرت رکھتے ہوں تو ان کا نفقہ کسی پر عائد نہ ہوگا۔

(۴) عمر دراز اور سن رسیدہ لوگوں کو ہاسٹیل میں رکھ کر اپنی ذمہ داری سے فرار ہونا جائز نہیں ہے ایسے لوگوں کو ایسی ہاسٹیلوں میں داخل کرانا جائز نہ ہوگا ان کی ذمہ داری ان کی اولاد اور اولاد نہ ہونے کی صورت میں دوسرے ذی رحم رشتہ داروں پر ہوگی اس لئے عام حالت میں ان ہاسٹلوں کے قیام کی اجازت نہ ہوگی۔

(۵) ہاں البتہ ان لوگوں کے لئے ایسے ہاسٹیل قائم کئے جاسکتے ہیں جن کی کوئی اولاد یا ذی رحم رشتہ دار نہ ہو اور ان کی کوئی کفالت کرنے والا نہ ہو۔

سوال۔ ۴: (الف): کیا زیادہ آمدنی کے لئے لڑکوں کا اپنے ماں باپ کو چھوڑ کر دوسری جگہ جانا جائز ہے؟

والدین کی خدمت اولاد پر واجب ہے اور خاص طور پر جبکہ وہ خدمت کے محتاج ہو۔ اللہ کے رسول ﷺ نے والدین کی اجازت کے بغیر جہاد میں جانے سے منع فرمایا ہے۔ حضرت عبداللہ ابن عمرو ابن عاص کی روایت ہے فرماتے ہیں:

''قال رجل للنبی ﷺ: أجاهد؟ قال لك أبوان؟ قال: نعم. قال: ففيهما فجاهد'' (بخاری ۲۹۱۲، ۸۸۳، ۲)۔

اسی طرح اللہ کے رسول ﷺ فرماتے ہیں:

جس شخص نے والدین یا ان میں سے کسی ایک کو بوڑھاپے میں پایا اور وہ جنت میں داخل نہ ہوسکا تو وہ بڑا محروم ہے۔

''عن أبي هريرة، عن النبي ﷺ، قال: رغم أنف، ثم رغم أنف، ثم رغم أنف۔ قيل: من يا رسول الله؟ قال: من أدرك أبويه عند الكبر، أحدهما أو كليهما فلم يدخل الجنة'' (مسلم: ۲۵۵۱)۔

اسی لئے فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ انسان کے لئے والدین کی اجازت کے بغیر جہاد میں نکلنا جائز نہ ہوگا۔

''ولا يخرج الرجل إلى الجهاد وله أب أو أم إلا بإذنه إلا في النفير العام'' (التاتارخانیہ ۱۸/ ۲۴۰)۔

جہاد کے علاوہ دوسرے سفروں کے لئے فقہاء کرام نے یہ وضاحت کی ہے کہ اگر والدین اسکی خدمت کے محتاج ہو تو اس کے لئے والدین کی اجازت کے بغیر سفر کرنا جائز نہیں ہوگا۔ لیکن اگر والدین اسکی خدمت کے محتاج نہ ہو تو اس کے لئے ان کی اجازت کے بغیر بھی سفر کرنا جائز ہوگا۔

''تاتارخانیہ'' میں ہے:

''كل سفرٍ إن أراد الرجل أن يسافر غير الجهاد لتجارة أو لحج أو لعمرة. فكره ذلك أبواه هل له أن يخرج بغير اذنهما؟ فهذا على وجهين: أما إن كان لايخاف عليهما الضيعة بأن كانا موسرين لم تكن نفقتهما عليه(۲) أو كان أن يخاف عليهما الضيعة بأن كانا معسرين وكانت نفقتهما عليه... إن كان الأب مستغنيا عن خدمته لا بأس أن يخرج، وإن لم يكن مستغنيا لايسع له أن يخرج'' (التاتارخانية ۱۸/۳۳۳۲)۔

اسی طرح ''فتاوی ہندیہ'' میں ہے: ''إذا أراد الرجل أن يسافر إلى غير الجهاد لتجارة أوحج أوعمرة وكره ذلك أبواه. فإن كان يخاف الضيعة عليهما بأن كانا معسرين و نفقتهما عليه وماله لايفي للزاد و الراحلة ونفقتهما فإنه لايخرج بغير إذنهما'' (الفتاوی الهنديه ۵/۳۶۵)۔

اسی طرح استاذ محترم فقیہ العصر حضرت مولانا خالد سیف اللہ صاحب دامت برکاتہم ضعیف والدین کو چھوڑ کر خلیج کا سفر کرنے کے سوال کے جواب میں فرماتے ہیں:

والدین کی خدمت بال بچوں پر واجب ہے، خاص کر جب وہ ضعیف اور خدمت کے محتاج ہوں تو ان کی ذمہ دایاں بڑھ جاتی ہے اس لئے الف کو چاہئے کہ وہ ہندوستان میں رہ کر معاش حاصل کرے اور اپنے والدین کے خدمت کے غنیمت موقع کو ہاتھ سے جانے نہ دے، رسول اللہ ﷺ نے تو سفر جہاد سے بھی ایسے شخص کو منع فرمادیا، جس کے والدین اسکی خدمت کے محتاج تھے، فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر لڑکا کوئی ایسا عمل کرے جس اس کے والدین کو کوئی دینی اور دنیوی نقصان نہ ہو لیکن انہیں لڑکے کا یہ عمل پسند نہ تب بھی والدین سے اجازت حاصل کرنا ضروری ہے۔ اسی طرح فقہاء نے اس کی بھی صراحت کی ہے کہ اولاد کے لئے والدین کی اجازت کے بغیر ایسا سفر کرنا درست نہیں ہے، جو اس کے لئے ناگزیر نہ ہو...... پھر یہ بھی ذہن میں رکھئے کہ والدین کی دعا [illegible] سے بھی زیادہ قیمتی ہے، جو اولاد کے لئے دنیا وآخرت دونوں کی فلاح کا ذریعہ ہے (کتاب الفتاوی ۹/۳۴۶)۔

اسی طرح صاحب ''احسن الفتاوی'' فرماتے ہیں:

اگر سفر کی وجہ سے والدین یا بیوی بچوں کے ضیاع کا خوف ہو، یعنی وہ خود غنی نہ ہو یا ان کی حفاظت کرنے والا کوئی نہ ہو تو اس صورت میں سفر نہ کرے (احسن الفتاوی: ۸/۱۷۸)۔

(ب) کیا بیوی کو ساس سسر کے ساتھ رہنے پر مجبور کیا جاسکتا ہے؟

بہو پر قانونی طور پر شوہر اور اس کے والدین کی خدمت واجب نہیں ہے اس لئے شوہر اس کو اپنی خدمت اور ساس سسر کی خدمت پر مجبور نہیں کرسکتا ہے۔ فقہاء کرام نے اس کے ذیل میں ایک جزئیہ نقل کیا ہے:

''ولو جاء الزوج بطعام يحتاج إلى الطبخ والخبز فأبت المرأة. يعني بأن تطبخ وتخبز... ولكنها لاتجبر على ذلك إن أبت، و يأمر الزوج أن يأتي لها بطعام مهيأ'' (رد المحتار ۵/ ۲۲۱)۔

علامہ کاسانی رقم طراز ہیں: ''ولو أراد الزوج أن يسكنها مع ضعتها أو مع أحمائها كأم زوجه وأخته وبنته من غيرها وأقاربه فأبت ذلك. عليه أن يسكنها في منزل مفرد'' (بدائع الصنائع ۳/ ۴۲۸)۔

لیکن بہو پر اس وقت ساس سسر کی خدمت کرنا دیانۃً واجب ہوگا جب کوئی اور خدمت کرنے والا میسر نہ ہو اور وہ واقعی خدمت کے محتاج ہو، کیونکہ اس کے شوہر پر ماں باپ کی خدمت واجب ہے۔ اور اس کا شوہر اسکی اور اسکے بچوں کی ضروریات کی تکمیل میں مشغول ہے۔ اس لئے وہ اپنے والدین کی خدمت کرنے سے قاصر ہے۔ حالانکہ جب والدین خدمت کے محتاج ہو تو اولاد پر ان کی خدمت واجب ہے خواہ وہ خدمت کرے یا کسی اور کے ذریعہ خدمت کرائے گا واجرت دے کر ہو۔ جیسا کہ علامہ کاسانیؒ کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے:

''إلا أن يكون الأب محتاجا إلى من يخدمه، فحينئذ يجب عليه نفقة امرأته؛ لأنه يؤمر بخدمة الأب بنفسه أو بالأجير'' (بدائع الصنائع ۴۴۳/ ۳)۔

استاذ محترم فقیہ العصر حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں:

شوہر کے والدین کی خدمت اس وقت دیانۃً واجب ہوگی جب کوئی اور خدمت کرنے والا میسر نہ ہو، اگر کوئی دوسرا خدمت کرنے والا میسر ہو تب بھی عورت کو چاہئے کہ اپنے ساس سسر کی خدمت سے دامن نہ کھینچے، کہ یہ اس کا اپنے شوہر کے ساتھ تعاون ہے، کیونکہ اصل میں والدین کی خدمت اس کے شوہر پر واجب ہے، اور شوہر اپنی بیوی اور اس کے بچوں کی ضروریات کے لئے مشغول ہے، تو اخلاق ودیانت کا تقاضا ہے کہ وہ اس فریضہ کی ادائگی میں شوہر کی مدد کرے (کتاب الفتاوی ۴/ ۴۱۰)۔

اسی طرح حضرت مفتی محمود الحسن گنگوہیؒ فرماتے ہیں:

شرعاً ہندہ کے ذمہ شوہر کی ماں کی خدمت واجب نہیں، لیکن اخلاقی طور پر اس کا خیال کرنا چاہئے کہ وہ اس کے شوہر کی ماں ہے تو اپنی ماں کی طرح اس کو بھی راحت پہونچانے کا خیال رکھے، اور شوہر کی اطاعت کرے، البتہ شوہر کو بھی چاہئے کہ اپنی بیوی کے ساتھ نرمی اور شفقت کا معاملہ کرے اس کو سمجھائے کہ میں تمہاری ماں کا احترام کرتا ہوں اور ان کو اپنی ماں کی طرح سمجھتا ہوں، تم بھی میری ماں کو اپنی ماں کی طرح سمجھو۔ نیز بیوی پر اسکی طاقت سے زیادہ بوجھ نہ ڈالے (فتاوی محمودیہ ۱۸/ ۶۱۶)۔

(ج) ماں باپ کی خدمت صرف بیٹوں پر واجب ہے یا بیٹیوں پر بھی؟

عام حالت میں بیوی کے لئے شوہر کی اطاعت واجب ہے اور اس کی اجازت کے بغیر گھر سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں ہوگی۔ اور شوہر بیوی کو اپنے والدین کی زیارت وملاقات کے لئے ہفتہ میں ایک مرتبہ جانے سے منع نہ کرے اور دوسرے رشتہ داروں کے لئے سال میں ایک مرتبہ جانے سے نہ روکے۔

درمختار میں ہے: ''لا یمنعها من الخروج إلی الوالدین فی کل جمعة إن لم یقدر علی إتیانها ولا یمنعها من الدخول علیها فی کل جمعة. وفی غیرها من المحارم فی کل سنة'' (در مختار ۲/ ۶۰۳)۔

☆ لیکن اگر بیوی کے والدین اس کی خدمت کے محتاج ہو اور اس کے علاوہ کوئی خدمت کرنے والا نہ ہو تو شوہر کے لئے جائز نہیں ہوگا کہ وہ بیوی کو ان کی خدمت سے روکے۔ اور بیوی کے لئے اپنے شوہر کی اطاعت کرنا لازم نہ ہوگا۔

چنانچہ محیط برہانی میں ہے: ''امرأة لها أب زمن لیس له من یقوم علیه غیر البنت. و یمنعها الزوج من تعاهده. جاز لها أن تعصی زوجها. وتطیع أباها مؤمنا کان أو کافرا؛ لأن القیام علیه فرض علیها فی هذه الحالة. وحق الزوج لایشتهر فی الفرائض'' (المحیط البرهانی ۴/ ۲۳۶)۔

علامہ ابن نجیم مصریؒ فرماتے ہیں: ''ولو کان أبوها زمنًا مثلًا وهو یحتاج. والزوج یمنعها من تعاهده فعلیها أن تعصیه مسلمًا کان الأب أو کافرًا'' (البحر الرائق ۴/ ۲۳۱)۔

استاذ محترم فقیہ العصر حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں:

اسلام میں نکاح کی وجہ سے والدین اور اولاد کے حقوق ایک دوسرے پر ختم نہیں ہوجاتے یہ حکم بیٹوں کے لئے بھی ہے اور بیٹیوں کے لئے بھی، جب آپ کے والد خدمت کے محتاج ہے اور کوئی خدمت کرنے والا نہیں ہے تو آپ پر ان کی خدمت کرنا واجب ہے اور آپ کے شوہر کا اس سے روکنا زیادتی ہے، فقہاء نے لکھا ہے کہ ماں باپ کے حقوق میاں بیوی کے حقوق پر مقدم ہیں اس لئے باپ چاہے غیر مسلم کیوں نہ ہو اور چاہے جائز بات میں ان کی اطاعت کرنے میں شوہر کی خلاف ورزی کیوں نہ ہو، باپ کی اطاعت کی جائیگی (کتاب الفتاوی ۹/ ۳۴۹)۔

سوال: والد کے دوسرے نکاح میں رکاوٹ بننا درست ہے؟

جواب: والد کی خدمت اور انکی ضروریات کو پورا کرنا اولاد کا شرعی اور اخلاقی فریضہ ہے۔ اور مرد کی جو خدمت ہوتی ہے ان میں تو بعض بیوی ہی انجام دے سکتی ہے، اس لئے اگر باپ ضرورت محسوس کرتا ہو تو اسکا نکاح کرانا بھی اس کی خدمت کا ایک حصہ ہے۔ اس لئے بچوں کو ماں کے انتقال کے بعد باپ کی ضروریات کا لحاظ کرتے ہوئے باپ کے نکاح کرنے میں معاون ہونا چاہئے اور نکاح میں رکاوٹ بننا والد کی نافرمانی اور ان کی خدمت سے منہ موڑنا ہے۔ اس کے متعلق احادیث میں سخت وعیدیں آئی ہیں۔ جہاں تک باپ کی بیوی کے نفقہ کی بات ہے تو عام حالات میں جب باپ کے اندر نفقہ ادا کرنے کی صلاحیت نہ ہو تو مالکیہ شوافع اور حنابلہ کے نزدیک بیٹے پر اسکا نفقہ واجب ہوگا اور احناف کا بھی ایک قول یہی ہے۔

علامہ وہبہ زحیلی لکھتے ہیں: ''یلزم الابن أیضًا نفقة زوجة أبیه فی رأی الحنابلة والشافعیة و المالکیة. وفی روية عند الحنفیة. فکل من لزمه إعفافه لزمته نفقته زوجته'' (الفقه الاسلامی و ادلته ۷/ ۷۷۷)۔

لیکن اگر باپ مریض اور معذور ہونے کی وجہ سے خدمت کا محتاج ہو تو اسکی بیوی کا نفقہ بیٹے کے ذمہ احناف کے نزدیک بھی واجب ہوگا۔

چنانچہ محیط برہانی میں ہے: ''إلا أن تکون بالأب علة. لایقدر علی خدمة نفسه. فیحتاج إلی خادم یقوم بشأنه وبخدمته. فحینئذٍ یجبر الابن علی نفقه خادم الأب منکوحةً کانت أو أمةً؛ لأن الأب لایستغنی عنها. فصار ذلك من فروض حاجة الأب. فصار کنفقة الأب'' (المحیط البرہانی ۴/ ۳۵۱)۔

اسی طرح ''تاتارخانیہ'' میں ہے: ''وإن کان للرجل المعسر زوجة ولیست أم ابنه الکبیر لم یجبر الابن علی أن ینفق علی امرأة أبیه إلا أن تکون بالأب علة لایقدر علی خدمة نفسه.. فحینئذ یجبر الابن علی نفقة خادم الأب

منکوحة كانت أو أمة'' (الفتاوى التاتارخانية٥/٣٢٧)۔

اسی طرح علامہ شامی رقم طراز ہیں: ''وعليه زوجة أبيه أی فی رواية، وفی رواية أخری إن كان الأب مريضًا أو به زمانة يحتاج للخدمة'' (رد المحتار٥/ ٣٤٣)۔

سوال: عمر رسیدہ کی اجتماعی کفالت کے لئے خصوصی طور پر زکوۃ کی رقم کا استعمال:

جواب: زکوۃ فقراء و مساکین کا حق ہے اس لئے اگر یہ حضرات زکوۃ کے مستحق ہیں تو اس میں زکوۃ کی رقم لگا سکتے ہیں لیکن اگر یہ زکوۃ کے مستحق نہیں ہیں تو عام حالت میں زکوۃ کی رقم استعمال کرنا جائز نہ ہوگا۔

اللہ تعالی فرماتے ہیں: ''إنما الصدقات للفقراء والمساكين....'' (التوبة: ٦٠)۔

اسی طرح ''مجمع الانہر'' میں ہے:

''هو أی مصرف الزكوة الفقير و هو من له شیء دون نصاب، فيجوز الدفع له'' (مجمع الانہر ١/ ٢٢٠)۔

اسی طرح شامی میں ہے: ''مصرف الزكوة هو فقير وهو من له أدنى شئى أى دون نصابٍ'' (در مختار مع الشامی ٣/ ٢٨٣ زکریا)۔

اسی طرح ''تاتارخانیہ'' میں ہے: ''الصدقة لا يحل إلا للفقير من كل وجهٍ أو من وجهٍ كابن السبيل'' (التاتارخانیہ ٢/ ٢٠٣)۔

اس کے لئے نفلی صدقات اور امدادی عطیات پر اکتفا کیا جائے، لیکن اگر حد درجہ مجبوری ہو اور زکوۃ کے علاوہ کوئی چارہ کار نہ ہو تو کسی غریب فقیر کو زکوۃ کی رقم دے کر واقعتًا مالک بنا دیا جائے اور اس کو ترغیب دی جائے کہ وہ اس جگہ پر خرچ کرے اس طرح کا حیلہ کیا جا سکتا ہے۔

حدیث میں ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: ''لا تحل الصدقة لغنى إلا فی سبيل الله، أو ابن السبيل، أو جار فقير يتصدق عليه فيهدى لك أو يدعوك'' (ابوداؤد: ١٦٣٧)۔

''درمختار'' میں ہے: ''قدمنا أن الحيلة أن يتصدق على الفقير، ثم يأمره بفعل هذه الأشياء'' (الدر المختار ٣/ ٢٩٣)۔

اسی طرح ''تاتارخانیہ'' میں ہے: ''إن الحيلة أن يتصدق على الفقير ثم يأمره بفعل هذه الأشياء و الحيلة من أراد ذلك أن يتصدق ينوى الزكوة على فقيرٍ، ثم يأمر بعد ذلك بالصرف إلى هذه الوجوه فيكون لصاحب المال ثواب الصدقة ولذلك الفقير ثواب هذه الصرف'' (الفتاوى التاتارخانية ٢/ ٢٠٨ زکریا)۔

سوال: حکومت کی طرف سے دی جانے والی رعایت عمر نہ ہونے کے باوجود فائدہ اٹھانا:

جواب: حکومتوں کی طرف سے جو رعایتیں دی جاتی ہیں اس کے لئے جو قانون مقرر ہوتے ہیں یعنی مخصوص عمر وغیرہ اگر کوئی شخص ان مقررہ قانون کی حد میں نہ آتا ہو اس کے لئے ایسی رعایتوں سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں ہوگا اس لئے کہ یہ ایک قسم کا دھوکہ اور جھوٹ ہے، شریعت مطہرہ میں اس سے منع کیا گیا ہے۔

حدیث میں ہے: ''عن أبي هريرة أن رسول الله ﷺ قال: من حمل علينا السلاح. فليس منا. ومن غشنا فليس منا'' (مسلم ١/ ٧٠، کتاب الایمان)۔

اسی طرح درمختار میں ہے: ''لا يجوز أن يتصرف فی ملك غيره بلا إذنه، لا ولايته'' (ردالمحتار ٦/ ٢٠٠، کتاب الغصب، سعید)۔

اسی طرح ''قواعد الفقہ'' میں ہے: ''لا يجوز لأحد أن يأخذ مال أحد بلا سبب شرعی'' (قواعد الفقہ: ١١٠)۔

حضرت مفتی عزیز الرحمان صاحب ایک سوال کے جواب میں رقم طراز ہیں:

جبکہ قانون یہ ہے کہ بارہ برس تک کہ عمر والے لڑکے کو نصف ٹکٹ دیا جاتا ہے اور بارہ برس سے زیادہ عمر والے کو پورا ٹکٹ لینا چاہئے تو جس لڑکے کی عمر ۱۴، ۱۵ برس کی ہو تو اس کو پورا ٹکٹ لینا چاہئے اور صاف کہہ دینا چاہئے کہ ۱۴، ۱۵ برس کی عمر ہے۔ اور ٹکٹ ماسٹر اگرچہ دریافت نہ کرے اور وہ نصف ٹکٹ بھی قد و قامت کو دیکھ کر دینے پر راضی ہو تب بھی پورا ہی ٹکٹ لینا چاہئے (فتاوی دار العلوم دیوبند ۱۵/ ۳۴۶)۔

اسی طرح حضرت مفتی محمود الحسن گنگوہیؒ بھی اسی طرح کے ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں: یہ طریقہ دھوکہ اور خیانت ہے (فتاوی محمودیہ ۱۷/ ۱۲۸)

فقہ اسلامی میں معذوروں اور ضعیفوں کے حقوق

مولانا سعید الرحمن قاسمی *

اسلامک فقہ اکیڈمی کے مقرر کردہ سوالوں کے جوابات واحکامات مندرجہ ذیل صفحات میں سلسلہ وار قلم بند کئے جاتے ہیں:

(۱) اگر کوئی شخص بڑھاپے کی عمر کو پہنچ گیا، لیکن کسی قدر محنت ومشقت برداشت کرتے ہوئے وہ خود کما کر اپنی ضرورت پوری کر سکتا ہے، اور وہ کسب معاش نہیں کرتا ہے تو اس کی اولاد، اعزہ واقارب ان کو کسب معاش کے لئے مجبور نہیں کر سکتے، کیونکہ مجبور کرنے سے ان کو ایذا اور تکلیف ہوگی جو قرآنی آیت "ولا تقل لهما أف ولا تنهرهما" (سورہ اسراء: ۲۳) کی نہی کے بالکل خلاف ہے، چنانچہ صاحب بدائع الصنائع نے اس آیت کے تحت لکھا ہے:

"ومعنى الأذى في إلزام الأب الكسب مع غنى الولد أكثر. فكان أولى بالنهي. ولم يوجد ذلك في الابن" (بدائع الصنائع ...)

نیز امام سرخسی نے "مبسوط" میں رقم کیا ہے:

"ويجبر الرجل الموسر على نفقة أبيه وأمه إذا كانا محتاجين لقوله: "ولا تقل لهما أف" نهي عن التافيف لمعنى الأذى. ومعنى الأذى في منع النفقة عند حاجتهما أكثر، ولهذا يلزمه نفقتهما وإن كانا قادرين على الكسب" (المبسوط، ۲۲۲)

سورہ عنکبوت میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے، "ووصينا الإنسان بوالديه حسنا. وإن جاهداك لتشرك بي ما ليس لك به علم فلا تطعهما" (سورہ عنکبوت: ۸) اور ہم نے انسان کو اپنے ماں باپ کے ساتھ نیک سلوک کرنے کا حکم دیا ہے، (اور اس کے ساتھ یہ بھی کہہ دیا ہے کہ اگر وہ دونوں تجھ پر اس بات کا زور ڈالیں کہ تو ایسی چیز کو میرا شریک ٹھہرائے جسکے معبود ہونے کی اور کوئی صحیح دلیل تیرے پاس نہیں ہے، تو ان کا کہنا نہ ماننا۔

اس آیت کریمہ سے معلوم ہوتا ہے والدین اگر شرک یا معصیت کا حکم کریں تو ان کی اطاعت نہ کی جائے، بقیہ اس کے علاوہ تمام امور میں یہاں تک کہ مشتبہ امور میں بھی ان کی اطاعت کا حکم ہے، اور اطاعت فرض بھی ہے۔

"قال الإمام الغزالي: أكثر العلماء على أن طاعة الوالدين واجبة في الشبهات. ولم تجب في الحرام المحض: لأن ترك الشبهة ورع ورضى الوالدين حتم" (روح البيان ۵/ ۱۴۹)۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کے قول کا حاصل ہے کہ جب والدین کی رضامندی وخوشنودی واجب ہے تو ظاہر ہے ہر وہ شی جو ناراضگی کا سبب ہو وہ بھی ناراضگی اور ناخوشی ہے اور کسب معاش پر ان کو مجبور کرنا یقینا ناراضگی ہے جو سراسر ناجائز ہونا چاہئے، لہٰذا معلوم ہوا کہ کسب معاش پر ان کو مجبور نہیں کیا جا سکتا ہے۔

نیز تعظیم وتوقیر کا تقاضا ہے کہ بوڑھوں کو کسب معاش پر مجبور نہ کیا جائے، کیوں کہ تعظیم کے خلاف ہے، اور حدیث شریف میں آیا ہے۔

"ليس منا من لم يرحم صغيرنا ولم يوقر كبيرنا" "ما أكرم شاب شيخا من أجل سنه إلا قيض الله له عند سنه من يكرمه" (مشكوة شريف / ۴۲۳)۔

ان دونوں حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ تعظیم وتوقیر ان بوڑھوں اور معذوروں کا حق ہے، ہاں اگر باپ محتاج ہو، بچے بھی نابالغ ہوں، یا بالغ ہوں لیکن کسب معاش نہیں کر سکتے تو باپ کو کسب معاش کرنا چاہئے اور نہ کرے تو اسے اس پر مجبور کیا جائے گا اور اس پر مجبور کرنے کے لئے قید کی سزا بھی دی جا سکتی ہے (قاموس الفقہ ۵/ ۲۱۲)۔

* دار العلوم الاسلامیہ بستی۔

صاحب بدائع نے کہا ہے کہ اگر منفق علیہ (سن رسیدہ حضرات) خود کسب پر قادر ہوں تو وہ اپنے کسب کی وجہ سے مستغنی ہیں، لہٰذا ان کا غنا کسب کی وجہ سے ایسا ہی غنا اور مالداری ہے، جیسا کہ مال کی وجہ سے، لہٰذا ان کا نفقہ لڑکے کے علاوہ دوسروں پر واجب نہ ہوگا، اس لئے کہ شریعت نے لڑکے کو ادنیٰ قسم کی تکالیف دینے سے منع کیا ہے، اور وہ تافیف ہے، (بدائع الصنائع ۳/۴۴۸)۔

مذکورہ نصوص اور عبارتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اولاد ان کو کسب معاش پر مجبور نہیں کرسکتی۔

(۲) سن رسیدہ حضرات کا نفقہ وعلاج دوسروں پر مندرجہ ذیل صورتوں میں واجب ہے اگر سن رسیدہ حضرات صاحب ثروت نہ ہوں، دوسروں کے نفقہ وعلاج کے محتاج ہوں، تو دوسروں پر ان کا نفقہ وعلاج واجب ہوجاتا ہے، بشرطیکہ وہ دوسرے حضرات بھی صاحب ثروت ہوں اور ان کے ذمہ نفقہ وعلاج حصۂ میراث کے تناسب سے ہی واجب ہوگا۔

''الإجماع على أنه يجب على الولد المعسر نفقة أبويه المعسرين الذين لا كسب لهما ولا مال'' (موسوعة الاجماع فی الفقہ الاسلامی ۳/ ۱۱۸۱)

''ويجب ذلك على مقدار الميراث ويجبر عليه؛ لأن التنصيص على الوارث تنبيه على اعتبار المقدار'' (الهداية كتاب الطلاق باب النفقة ۲/ ۴۴۷)۔

مختصر القدوری کی عبارت سے شہادت ملتی ہے کہ فقر واحتیاج کی صورت میں سن رسیدہ حضرات کا نفقہ وعلاج دوسروں پر واجب ہے۔

''وعلى الرجل أن ينفق على أبويه وأجداده وجداته إذا كانوا فقراء، وإن خالفوه في دينه'' (مختصر القدوری. كتاب النفقات / ۱۹۲)۔

اگر سن رسیدہ حضرات محتاج نہیں ہیں، بلکہ صاحب ثروت ہیں تو دوسروں پر ان کا نفقہ وعلاج واجب نہیں ہے، اور اگر سن رسیدہ حضرات بھی محتاج ہیں اور ان کی اولاد بھی محتاج ہیں تو ان پر نفقہ وعلاج واجب نہیں ہے، البتہ جہاں تک ہوسکے ان کے نفقہ وعلاج کی ہر ممکن کوشش کرے۔

''ولأبويه وأجداده لو فقراء أي تجب النفقة لهؤلاء، وأطلق في الابن ولم يقيد مع أنه مقيد به. لما في شرح الطحاوي، ولا تجب الابن على نفقة المعسرين إذ كان معسرًا'' (البحر الرائق ۴/ ۲۰۵)۔

''وعبارة الخلاصة هكذا، وفي الاقضية: الفقر أنواع ثلثة فقير لا مال له وهو قادر على الكسب والمختار أنه يدخل الأبوين من نفقته، الثاني فقير لا مال له وهو عاجز عن الكسب، فلا تجب عليه نفقة غيره، الثالث أن يفضل كسبه عن قوته فإنه يجبر على نفقة البنت الكبيرة والأبوين والأجداد. وفي الرحم المرحم كالعم يشترط النصاب قلت: وهذا مبني على رواية الخصاف من عدم اشتراط اليسار في نفقة الأصول، بل قدرة الكسب كافية والمعتمد خلافه'' (ردالمحتار علی الدرالمختار دار الفکر مطلب فی نفقة الاصول ۳/ ۶۲۲)۔

(۳) بوڑھے والدین یا خاندان کے وہ بڑے جن کا نفقہ ان کے چھوٹوں پر محتاجی کی صورت میں واجب ہے اگر وہ محتاج نہ ہوں خود صاحب ثروت ہوں تب بھی وہ اپنی اولاد سے یا ان لوگوں سے جن پر بحالت احتیاج نفقہ واجب ہے، زیادہ سہولت کے لئے، دوسروں پر خرچ کرنے کے لئے یا کچھ رقم محفوظ کرنے کے لئے زائد رقم کا مطالبہ کرسکتے ہیں کیوں کہ زائد رقم کا مطالبہ امر مباح ہے اور اس مطالبہ کو پورا کرنے میں والدین کی خوشی ہے۔

''رضى الرب في رضى الوالد وسخط الرب في سخط الوالد'' (مشکوۃ شریف: ۴۱۹)۔

نیز اس مطالبہ میں خالق کائنات کی معصیت بھی نہیں ہے ''لاطاعة لمخلوق في معصية الخالق'' بلکہ مطالبہ پورا کرنے میں خالق کی رضامندی ہے، لیکن اگر اولاد اور وہ چھوٹے جن پر محتاجی کی صورت میں نفقہ واجب ہوتا ہے غربت وافلاس کے شکار ہیں تو یہ والدین اور بوڑھے ان سے رقم زائد کا مطالبہ نہیں کرسکتے بلکہ کچھ صورتوں میں ان پر ان کی کفالت کرنا اور ان کا نفقہ برداشت واجب ہوجاتا ہے، مثلاً لڑکے مفلوج، نابینا، فاتر العقل یا معذور ہونے کی وجہ سے کسب معاش کی صلاحیت نہ رکھتے ہوں یا ابھی حصول تعلیم میں مشغول ہوں یا کمائی تو کرتے ہوں مگر ان کی اولاد کے لئے ناکافی ہو۔

''وكذا تجب لولده الكبير العاجز عن الكسب كانثى مطلقًا وزمن ومن يلحقه العار بالتكسب وطالب علم

لایتفرغ لذالك كذافي الزيلعي والعيني'' (درمختار ۴/ ۶۱۴) ''ولو قدر على اكتساب مالا يكفيه فعلى أبيه تكميل الكفاية حاصله أن السلف قالوا بوجوب نفقه على الأب'' (الردالمحتار على الدرالمختار ۴/ ۶۱۴)۔

بوڑھوں اور والدین کیلئے احتیاج نہ ہونے کی صورت میں شفقت ومحبت کا تقاضہ یہ ہے کہ اولاد سے زائد رقم کا مطالبہ نہ کریں، جیسا کہ قیس بن حازم کی روایت سے ہم کو رہنمائی ملتی ہے، ''کہ ایک شخص حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں حاضر ہو کر کہنے لگا کہ کسی ضرورت میں میرے والد میرا سارا مال لینا چاہتے ہیں تو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اس کے والد سے کہا: ''إنما لک من ماله مايكفيک ''تمہارے لئے بیٹے کے مال میں سے بقدر کفایت ہی ہے تو باپ نے کہا! اے خلیفہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: کیا اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں فرمایا: ''أنت ومالک لأبیک'' (حدیث) تو اس پر حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ارشاد فرمایا: ہاں! حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے، لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس (جملہ وارده) سے نفقہ مراد لیتے تھے۔

''عن قيس بن أبي حازم جاء رجل إلى أبي بكر الصديق فقال: إن أبي يريد أن يأخذ مالي كله لحاجة فقال: لأبيه: إنما لك من ماله مايكفيك فقال يا خليفة رسول الله! أليس قال رسول الله ﷺ: أنت ومالك لأبيك؟ فقال: نعم، وإنما يعني بذلك النفقة'' رواه الطبراني في الاوسط والبيهقي'' (اعلاء السنن كتاب الطلاق ۱۱/ ۳۰۱)۔

'' عن عائشة موفوعًا: أن أولادكم هبة الله تعالىٰ لكم يهب لمن يشاء إناثا ويهب لمن يشاء الذكور فهم وأموالهم إذا احتجتم إليها، رواه الحاكم في المسند'' (السنن الكبرىٰ للامام ابي بكر احمد من الحسين بن على البيهقي ۷/ كتاب النفقات باب النفقة الابوين ص: ۴۸۹)۔

وقال بشر: أرئ الأب يأخذ من مال ابنه إذاكان يحتاج مايكفيه والأم أيضا تأخد بقدر ما يحتاج (شعب الايمان ۷/ ۱۸۷)۔

''عن عمر بن شعيب عن أبيه عن وجده أن رجلا أتى النبي صلى الله عليه وسلم: فقال: إن لي مالا وإن والدي يحتاج إلى مالي، فقال: أنت ومالك لوالدك إن أولادكم من أطيب كسبكم، كلوا من كسب أولادكم'' (مشكوة شريف، ص: ۲۹۰)۔

(۴) الف: والدین اور بزرگوں کی جسمانی خدمت ایسی حالت میں جبکہ وہ چلنے پھرنے اٹھنے بیٹھنے اور انسانی ضرورت پوری کرنے سے قاصر ہوں بیٹے کے لئے زیادہ پیسہ کمانے کی غرض سے دوسرے شہر، دوسری ریاست اور دوسرے ملک، ماں باپ کو بوڑھاپے کی دشواریوں میں چھوڑ کر چلا جانا نامناسب معلوم ہوتا ہے، جبکہ ان کے دیکھ بھال کا کوئی مناسب بندوبست نہ ہو کیونکہ خالق حقیقی کے حقِ عبادت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حق تعظیم وتکریم کے بعد دین وشریعت میں حقوق والدین کو ہی اہمیت وبرتری کے ساتھ بیان کیا گیا ہے چناں چہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

"ووصينا الإنسان بوالديه حملته أمه وهنا على وهن وفصاله في عامين أن اشكرلي ولوالديك إلى المصير وإن جاهداك على أن تشرك بي ماليس لك به علم فلا تطعهما وصاحبهما في الدنيا معروفا، واتبع سبيل من أناب إلى ثم إلى مرجعكم فأنبئكم بما كنتم تعملون" (سورہ لقمان: ۱۴/ ۱۵)۔

اور ہم نے انسانوں کو اس کے ماں باپ کے متعلق تاکید کی ہے، اس کی ماں نے ضعف پر ضعف اٹھا کر اس کو پیٹ میں رکھا اور دو برس میں اس کا دودھ چھوڑایا ہے کہ تو میری اور اپنے ماں باپ کی شکر گذاری کیا کرو اور میری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے، اگر تجھ پر وہ دونوں بھی اس بات کا زور ڈالیں کہ تو میرے ساتھ ایسی چیز کو شریک ٹھہرائے جس کے شریک ہونے کی تیرے پاس کوئی دلیل نہ ہو تو ان کا کہنا نہ ماننا اور دنیا (کے حوائج ومعاملات) میں ان کے ساتھ خوبی کے ساتھ بسر کرنا اور اس شخص کی راہ پر چلنا جو میری طرف رجوع ہو پھر تم سب کو میرے پاس آنا ہے، آیت کریمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ والدین کی شکر گذاری اور اطاعت فرض ہے۔

"وصاحبهما في الدنيا معروفا" (سورہ لقمان: ۱۵) دین کے خلاف ان کا کہنا نہ مانو مگر دنیا کے کاموں میں مثلاً ان کی جسمانی خدمت یا مالی اخراجات وغیرہ میں کمی نہ ہونے دو کیونکہ خوشنودیٔ والدین حیات مستعار کا مقصود ومطلوب ہے۔

حدیث شریف میں والدین کی اجازت کے بغیر جہاد میں جانے کی گنجائش نہیں ہے تو زیادہ کمائی کے پیش نظر جبکہ والدین اپنے جسمانی خدمت کے

حاجتمند ہوں کیونکر گنجائش ہوسکتی ہے۔

''باب لایجاهد إلا بإذن الوالدين۔ عن عبدالله ابن عمرو قال: قال رجل للنبی صلى الله عليه وسلم: أجاهد قال ألك أبوان قال نعم: قال ففيهما فجاهد'' (صحیح البخاری کتاب الادب ۲/ ۸۸۳)۔

قال ذوالنون: ثلاثة من اعلام البر، بر الوالدين، بحسن الطاعة لهما ولين الجناح، وبذل المال'' (شعب الایمان ۷/ ۱۸۷)۔

''عن أبي هريرة عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: لا يجزى الولد والده إلا أن يجده مملوكًا فيشتريه فيعتقه'' (شعب الایمان ۷/ ۱۸۲) ''عن أبي عمر قال: قال رسول اللهﷺ: نوملك على السرير برًا بوالديك تضحكهما ويضحكانك أفضل من جهادك بالسيف في سبيل الله'' (شعب الایمان ۷/ ۱۷۹)۔

عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر ہجرت کے لئے بیعت کرنے لگا جبکہ اس نے اپنے والدین کو روتا ہوا چھوڑا تھا تو آپ نے یہ منظر دیکھ کر فرمایا: ارجع إليهما فاضحكهما كما أبكيتهما ''تم اپنے والدین کے پاس لوٹ جاؤ ان کو ہنساؤ اور خوش کرو جیسا کہ تم نے ان کو رلایا ہے (الجامع لاحکام القرآن: ج ۹۔ ۱۰/ص ۱۵۷)۔

''فلا تقل لهما أف'' وقال مجاهد معناه إذا رأيت منهما في حال الشيخ الغائط والبول الذي رياه منك في الصغر فلا تقذرهما، وتقول أف والآية أعم من هذا'' (الجامع لاحکام القرآن ۹۔۱۰/ ۱۵۸)۔

قرآنی آیات، احادیث وآثار اس بات پر شاہد عدل ہیں کہ معذوروں، اور بوڑھوں اور والدین کی حتی المقدور مالی وجسمانی خدمات بہ نفس نفیس کی جائے اور ایسے موقع پر باہر کا سفر نہ کیا جائے، لیکن اگر باہر جائے بغیر ان کے نفقہ وعلاج اور خدمت کا بہتر بندوبست نہ ہوسکتا ہو تو والدین اور بوڑھوں کی اجازت کے ساتھ جانا چاہئے، تا کہ ان کی رضامندی اور دعائیں ساتھ رہیں۔

(۴) ب: بہو ساس سسر کے ساتھ رہنا نہ چاہتی ہو یا اس کی ساس کو خدمت کی ضرورت ہو لیکن کوئی خدمت گار نہ موجود ہو اور بیٹیوں کو ان کے شوہروں کی طرف سے میکے میں رہنے کی اجازت نہ ہو تو اس صورت میں بہو کی ذمہ داری ہے کہ ساس کے پاس رہ کر ان کی خدمت بجالائے اور اس خدمت کو اپنی سعادت تصور کرے؛ کیونکہ شوہر کے ساتھ نکاح ہوجانے کے بعد شوہر کا والد اس کے والد اور شوہر کی ماں اس کی ماں کے درجہ میں ہوگئی تو جس طرح سے بیٹی اپنے ماں باپ کی خدمت کرتی ہے، اسی طرح اسکو اپنے ساس سسر کی خدمت کرنا چاہئے، یہی سعادت مندی اور نیک بختی کی بات ہے، اور صلہ رحمی کا تقاضا بھی یہی ہے، کہ بہو ساس سسر کے ساتھ حسن سلوک کا معاملہ کرے اور شوہر کے حق میں قطع رحمی کا سبب نہ بنے، کیوں کہ حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ 'عورتوں کا وہ فتنہ جس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ڈرایا ہے یہ کہ وہ عورتیں اپنے شوہروں کے لئے قطع رحم کا سبب بنتی ہیں اور ان کو معمولی رذیل پیشوں کا محتاج کرتی ہیں (آپ کے مسائل اور ان کا حل ۶/ ۳۰۷)۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مہاجرین وانصار کی ایک جماعت کے ساتھ تشریف فرما تھے، کہ ایک اونٹ آیا اور اس نے آپ کا سجدہ کیا، صحابہ نے عرض کیا! اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم جانور، چوپائے، اور درخت آپ کا سجدہ کرتے ہیں، جبکہ ہم تو آپ کے سجدہ کرنے کے زیادہ حق دار ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''اعبدوا ربكم وأكرموا أخاكم ولو كنت آمر أحدًا أن يسجد لأحد لأمرت المرأة أن تسجد لزوجها ولو أمرها أن تنقل من جبل أصفر إلى جبل أسود ومن جبل أسود إلى جبل أبيض كان ينبغي لها أن تفعله'' (مشكوة شریف باب عشرة النساء الفصل الثالث: / ۲۸۳)۔

روایت مذکورہ سے یہ سبق ملتا ہے کہ شوہر اگر لغو اور عبث فعل کا حکم دے تب بھی عورت کو اس کا حکم بجالانا چاہئے چہ جائے کہ وہ والدین کے ساتھ حسن سلوک اور خدمت کی فہمائش کرے؛ کیونکہ شوہر کے والدین جب بوڑھاپے کی عمر کو پہنچ جاتے ہیں تو خدمت کے محتاج ہوجاتے ہیں اور شوہر کبھی کسب معاش کی وجہ سے خدمت نہیں کرپاتا تو اس وقت اگر عورت چاہے تو خدمت کرکے شوہر کا منظور نظر بن سکتی ہے، اور سعادت دنیوی واخروی کی تحصیل میں اپنے کو وقف کرسکتی ہے۔

جیسا کہ حدیث شریف میں بہترین عورت کے بارے میں استفسار کیا گیا تو آپ نے فرمایا: ''التی تسرہ إذا نظر'' (جب شوہر کی نگاہ محبت عورت پر پڑے تو وہ خوش ہو جائے) ظاہر ہے کہ جب شوہر کے والدین بہو کی خدمت، حسن سلوک اور رواداری سے خوش رہیں گے تو شوہر نامدار کے لئے بیوی کی یہ ادا مزید خوشی کا باعث ہوگی، لہٰذا روایت بالا سے معلوم ہوتا ہے کہ عورت کو دیانۃً شوہر کے والدین کی خدمت بجالانی چاہئے، لیکن اگر بہو ساس سسر کے ساتھ رہنا نہ چاہتی ہو اور ان کی خدمت ناپسند کرتی ہو تو اسے ساس سسر کے ساتھ رہنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا (فتاویٰ دارالعلوم دیوبند ج ۷ ص ۵۲)۔

بیوی کو علیحدہ جگہ میں رکھنا خواہ مکان کا کوئی حصہ ہو جس میں اس کے سوا دوسرے کا عمل دخل نہ ہو شوہر کے ذمہ شرعاً واجب ہے، والدین کی خوشی کے لئے بیوی کی حق تلفی جائز نہیں ہے۔ ''لا طاعة لمخلوق فی معصیة الخالق'' (مشکوۃ ۲/ ۳۲۱ کتاب الامارۃ)۔

قیامت کے دن آدمی سے اس کے متعلق حقوق کے بارے میں مطالبہ ہوگا۔

''عن نافع عن ابن عمر عن النبی صلی اللہ علیه وسلم قال: کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیته والأمیر راع والرجل راع علی أهل بیته والمرأة راعیة علی بیت زوجها وولده فکلکم راع وکلکم مسئول عن رعیته'' (صحیح البخاری، باب المرأة راعیة فی زوجها ۲/ ۷۸۳)۔

''فعلیه نفقتها وکسوتها وسکناها'' (ہدایہ ۲/ ۴۳۷ باب النفقہ)۔

''أما السکنی فحقها فی بیت علی جدة تامن علی متاعها ولا تستحی من غیرها من معاشرة الزوج. فإن کان للرجل والدة أو أخت أو ولد من غیرها فی منزلها فقالت: صیرنی فی منزلی علی حدة کان لها'' (فتاویٰ عالمگیری ۱/ ۳۲۸)۔

''ولو أراد الزوج أن یسکنها مع ضرتها أو مع أحمائها کأم الزوج وأخته وبنته من غیرها وأقاربه فأبت ذلك علیه أن یسکنها فی منزل مفرد؛ لأن هن ربما یوذینها ویضرون بها فی المساکنة وإباؤها دلیل الأذی والضرر'' (بدائع الصنائع ۳/ ۴۲۸)۔

احادیث اور فقہی جزئیات سے معلوم ہوتا ہے کہ عورت کو ساس سسر کے ساتھ رہنے اور خدمت پر مجبور نہیں کیا جا سکتا، شوہر خود خدمت کرے یا خادم کے ذریعہ اپنے والدین کی خدمت کرائے۔

(۴) ج: ماں باپ کی خدمت بیٹوں اور بیٹیوں دونوں پر برابر سرابر واجب ہے؛ کیوں کہ نصوص میں عموم ہے، نص قرآنی ''ووصینا الانسان بوالدیه حسنا'' (سورہ عنکبوت: ۸) میں لفظ ''الإنسان'' مذکر و مونث دونوں کو شامل ہے۔

''عن أبی هریرة رضی اللہ تعالیٰ عنه قال: قال رسول اللہ ﷺ: رغم انفه ثم رغم انفه ثم رغم انفه قیل من یا رسول اللہ! قال: من أدرك والدیه عنده الکبر أحدهما أو کلیهما ثم لم یدخل الجنة'' (الصحیح المسلم ۲/ ۳۱۴)۔

''عن أبی هریرة عن النبی صلی اللہ علیه وسلم قال: لایجزی الولد والده إلا أن یجده مملوکا فیشتریه فیعتقه'' (شعب الایمان للبیہقی ۷/ ۱۸۲)۔

مذکورہ بالا احادیث میں عموم کی طرف اشارہ واضحہ ہے؛ کیوں کہ لفظ ''من'' اور ''الولد'' دونوں مذکر و مونث کو شامل ہے نیز فتاویٰ کی روشنی میں بھی ماں باپ کی خدمت بیٹوں اور بیٹیوں پر مساوی ہے، جیسا کہ صاحب فتاویٰ تاتارخانیہ رقم طراز ہیں:

''فإن کان الأولاد ذکورًا وإناثا موسرین نفقة الأبوین علیهم بالسویة فی أظهر الروایتین، وروی الحسن عن أبی حنیفة: أن النفقة بین الذکور والإناث أثلاثا علی قیاس المیراث واعتبره بنفقة ذوی الأرحام فی الروایة الأخریٰ والأول هو الأصح (الفتاویٰ التاتارخانیه ۵/ ۴۲۵)

نیز ہدایہ میں ہے: ''وهی علی الذکور والإناث بالسویة فی ظاهر الروایة'' (ہدایہ ۲/ ۴۴۹)۔

''فإذا کان للأب ابن وبنت موسرین قسمت نفقته بینهما بالسویة علی المعتمد'' (کتاب الفقه علی المذاهب الاربعة، مبحث النفقة علی الاباء والاقارب ۴/ ۵۸۸)۔

بعض اوقات والدین کی ضعیفی، مجبوری اور بے بسی کے پیش نظر بیٹیاں اپنے والدین کی خدمت کرنا چاہتی ہیں؛ لیکن ان کے شوہران کو اس کی اجازت نہیں دیتے تو اس سلسلہ میں عام حالات میں شوہر کو نرم پہلو اختیار کرنا چاہئے اور عورت کو والدین کی خدمت کا موقع دینا چاہئے، لیکن اگر شوہر اپنی بیوی کو خدمت والدین سے روکتا اور منع کرتا ہے تو اس کی تین صورتیں ہیں:

(۱) اگر بیٹی والدین کی مالی خدمت کرنا چاہتی ہے تو شوہر کو منع کرنے کا کوئی حق نہیں ہے؛ کیونکہ عورت اپنے ذاتی مال کے خرچ کی خود ذمہ دار ہے وہ جہاں چاہئے خرچ کرسکتی ہے۔

(۲) اگر بیٹی والدین کی جسمانی خدمت کرنا چاہتی ہے اور قیام بھی والدین کے ساتھ کرنا چاہتی ہے اور والدین کی خدمت کرنے والے اور لوگ بھی موجود ہیں تو حقوقِ زوجیت میں حارج ہونے کی وجہ سے شوہر کو منع کرنے کا حق حاصل ہے، جیسا کہ فقہ کے اس جزئیہ سے ارشاد ملتا ہے۔

''ولیس للزوج أن یمنعها من السفر والخروج من منزله وزیارة أهلها حتی یوفیها المهر کله أی المعجل؛ لأن حق الحبس لاستیفاء المستحق ولیس له حق الاستیفاء قبل الایفاء'' (ہدایہ: ص۳۵۵ کتاب النکاح)۔

''وله أن یمنع والدیها وولدها من غیره وأهلها من الدخول علیها؛ لأن المنزل ملکه فله حق المنع من دخول ملکه'' (ہدایہ ۲/ ۴۴۵)۔

(۳) اگر بیٹی کے والدین شدید بیمار ہوں، خدمت کے حاجتمند ہوں کوئی تیاردار موجود نہ ہو تو شوہر کی ممانعت کے باوجود عورت کے لئے والدین کی تیارداری کے لئے جانا اور ان کی خدمت انجام دینا جائز ہے، ایسی صورت حال میں شوہر کو روکنے کا اختیار نہیں ہے۔ جیسا کہ فقہ کی مندرجہ ذیل عبارت سے واضح ہے۔

''وکذا فیما لو أرادت حج الفرض بمحرم ولو أبوها زمنا مثلا فاحتاج فعلیها تعاهده، ولو کافرًا. أوکانت لها نازلة ولم یسال لها الزوج عنها من عالم فتخرج بلا إذنه فی ذلك کله، کما بسطه فی نفقات الفتح'' (الرد المختار علی الرد المحتار ۲/ ۱۴۵-۱۴۶)۔

(۵) یقیناً انسان جوانی میں بیوی کی احتیاج کے ساتھ ساتھ بوڑھاپے میں بھی اس کا ضرورت مند ہوتا ہے، تاکہ اس عمر کے سرد وگرم کو سہنے میں آسانی ہو، ہندوستانی معاشرہ میں بیٹے بیٹیاں والدہ کے انتقال کے بعد والد کو نکاح کرنے سے روکتے ہیں اور اس کے لئے بڑی شدت اختیار کرتے ہیں، اولاد کا یہ فعل انتہائی نازیبا ہے اور ان کو نکاح سے روکنا ناجائز ہے، کیونکہ والد کو نکاح کی ممانعت باعث ایذا ہے اور والد کو ایذا و تکلیف رسانی ناجائز وحرام ہے؛ کیونکہ نص قرآنی ہے "ولا تقل لهما اف" (سورہ اسراء: ۲۳) اگر والدین اپنی طبعی ضرورت وخدمت کے لئے نکاح کے ضرورت مند ہوں تو اولاد کو اس سلسلہ میں رعایت کرنی چاہئے، نیز باپ میں اگر نفقہ ادا کرنے کی استطاعت نہیں ہے تو مالکیہ شوافع، اور حنابلہ کے نزدیک بیٹے پر باپ کی زوجہ کا نفقہ واجب ہوگا؛ کیونکہ یہ بھی باپ کی ضروریات میں داخل ہے، نیز حنفیہ کا بھی ایک قول یہی ہے جسکو علامہ حصکفی رحمۃ اللہ علیہ نے ترجیح دیا ہے، جبکہ دوسرا قول یہ ہے کہ اگر باپ مریض یا معذور ہونے کی وجہ سے محتاج خدمت ہے تو اس کی بیوی کا نفقہ بیٹے کے ذمہ ہے؛ کیونکہ وہ گویا باپ کی خادمہ ہے، بہر حال جمہور کا مسلک قرآن وحدیث کے مزاج سے قریب تر ہے، اسلئے کہ والدین کے ساتھ حسن سلوک اور معروف رویہ کا حکم ہے اور ظاہر بات ہے کہ حسن سلوک یہ نہیں ہے کہ بیٹا اپنی سوتیلی ماں کو نفقہ سے محروم رکھے (قاموس الفقہ ۵/ ۲۱۵)۔

''وکما یجب علی الابن الموسر نفقة والده الفقیر تجب علیه نفقة خادم الأب امرأة کانت الخادم أوجاریة إذاکان الأب محتاجا إلی من یخدمه، وفی الخلاصة: یجبر الابن علی نفقة زوجة أبیه، وفی نفقات الحلوانی: قال: فیه روایتان، فی روایة کما قلنا: وفی روایة: إنما تجب نفقة زوجة الأب إذا کان الأب مریضا أو به زمانة یحتاج إلی الخدمة، أما إذا کان صحیحًا فلا'' (البحر الرائق ۴/ ۲۰۶) (رد المحتار علی الدر المختار ۳/ ۶۲۶)۔

''إلا أن تکون بالأب علة لایقدر علی خدمة نفسه فیحتاج إلی خادم یقوم بشأنه وخدمته. فحینئذٍ یجبر الابن علی نفقة خادم الأب منکوحة کانت أو أمة، وذکر هشام فی نوادره عن أبی یوسف أنه یفرض نفقة خادم الأب علی ابنه'' (الفتاویٰ التاتار خانیہ ۵/ ۴۲۶)۔

فقہاء کرام اور اساطین امت کی تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر تنگ دست باپ کو نکاح کی ضرورت ہو تو خوش حال بیٹے کے ذمہ واجب ہے کہ اس کے نکاح اور اس کی زوجہ کے نفقہ کا بندوبست کرے، جیسا کہ مختلف دبستانِ فقہ کا اشارہ ہے؛ چناں چہ فقہ حنفی کا جزئیہ ہے۔

''وعلى الابن الموسر نفقة زوجة أبيه وعليه تزويجه ولو له زوجات فعليه نفقة واحدةٍ يسلمها لأبيه'' (كتاب الفقه على المذاهب الاربعة ۴/ ۵۸۹)۔

فقہ مالکی کا جزئیہ ہے: ''وكذا يجب على الولد إعفاف أبيه بزوجة أو أكثر لم تعفه الواحدة والقول في ذلك للأب. ويجب عليه الإنفاق على من يعفه من الزوجات ولو تعددت'' (كتاب الفقه على المذاهب الاربعة ۴/ ۵۹۲)۔

فقہ شافعی کا جزئیہ بھی ملاحظہ ہو:

''ويجب على الولد إعفاف أبيه بتزوجه والإنفاق على زوجته'' (كتاب الفقه على المذاهب الاربعة ۴/ ۵۹۲)۔

فقہ حنبلی کا جزئیہ ہے:

''فعلى الولد أن ينفق على أبيه المعسر وعلى زوجة أبيه (كتاب الفقه على المذاهب الاربعة ۴/ ۵۹۲)۔

(۶) بعض اوقات اولاد والد کی زندگی میں ہی جائیداد کا مطالبہ شروع کر دیتے ہیں اور اسے اپنا حق گردانتے ہیں تو اس سلسلہ میں قرآن وحدیث اور فقہاء کرام کی عبارتوں سے یہی اشارہ ملتا ہے کہ اگر والدین کی وفات کے بعد وارثوں میں منازعت اور شریعت کی پامالی کا اندیشہ قوی ہو تو اولاد کو مطالبہ کی گنجائش ہے اور والد کے لئے بھی مناسب ہے کہ زمانہ کے احوال وکوائف کے پیش نظر جائیداد واموال ان کے درمیان تقسیم کر دے، لیکن اگر ایسا اندیشہ قوی نہیں ہے تو اولاد کو زبردستی مطالبہ کا کوئی حق نہیں ہے، اسلئے کہ فقہاء کرام نے بیان کیا ہے کہ اگر والد اپنی زندگی میں جائیداد وغیرہ تقسیم کرے تو یہ ہبہ ہوگا اور ہبہ میں موہوب لہ کے لئے واہب سے مطالبہ کی گنجائش نہیں ہے، اس لئے اولاد زبردستی مطالبہ نہیں کر سکتے، ہاں اگر اولاد کی معاشی حالت ابتر ہے، افلاس میں مبتلا ہے اور کسب معاش سے عاجز ہے، جیسا کہ غیر شادی شدہ کبیرہ بیٹیاں، معذور لڑکا، اندھا لڑکا، دونوں ہاتھوں کا کٹا ہوا لڑکا، اور وہ طالب علم جو علم کی تحصیل میں مشغولیت کی وجہ سے فارغ نہ ہو، ان کی کفالت کی ذمہ داری باپ پر عائد ہوتی ہے، جیسا کہ فقہی جزئیات سے اشارہ واضح ہے۔

''فأما إذا كان كبيرًا وهو ذكر فقير عاجز عن الكسب فقد ذكر في كتاب النكاح أن نفقته أيضا على الأب خاصة'' (بدائع الصنائع ۴/ ۴۴۴)۔

''وإن كانوا ذكورًا بالغين لم يجبر الأب على الإنفاق عليهم لقدرتهم على الكسب إلا من كان منهم زمنا أو أعمى أو مقعدًا أو أشل اليد لاينتفع بهما أو مفلوجًا أو معتوها فحينئذٍ تجب النفقة على الوالد لعجز المنفق عليه عن الكسب. وهذا إذا لم يكن للولد مال'' (المبسوط للسرخسی ۵/ ۲۲۲)۔

(۷) شریعت کے مذاق ومزاج سے معلوم ہوتا ہے کہ والدین اور بوڑھوں کو اولڈ ہوم اور ہاسٹلوں میں داخل کرنا نامناسب ہے؛ کیوں کہ والدین کے ساتھ ان کی اولاد جس طرح حسن سلوک خاطر ومدارات کا معاملہ کرتی ہے، یا کرے گی اس طرح وہاں کے ملازمین اور خادم نہیں کر سکتے؛ کیونکہ وہ تو تنخواہوں پر مقرر ملازمین ہیں، جن کو آخرت کے ثواب وعقاب سے کوئی سروکار نہیں، نیز والدین اور بوڑھے حضرات کے ساتھ حسن سلوک یہ نہیں ہے کہ ان کو گھر سے باہر دوسری جگہ منتقل کر دیا جائے؛ جبکہ وہ اپنے بال بچوں میں رہنا پسند کرتے ہیں اور بیٹوں، بیٹیوں، پوتوں، پوتیوں اور نواسوں، نواسیوں کو دیکھ کر راحت اور قلبی ٹھنڈک محسوس کرتے ہیں، بوڑھاپے میں والدین اپنی اولاد دیکھ کر مریض مرض میں اپنے تیماردار دیکھ کر سکون وطمانینت حاصل کرتے ہیں۔

والدین نے سن صغری میں ہماری بے پناہ خدمات کیں ہیں، جس کے تذکرہ کے لئے مطول کتاب کی ضرورت ہے، تو جس طرح انھوں نے ہماری پرورش وخدمت کے لئے ہم کو کسی ہاسٹل یا کسی ادارہ کے حوالہ کر کے ہماری پرورش وپرداخت کو نامعقول گردانا؛ بلکہ انھوں نے ہماری خدمت وپرورش کو اپنے لئے باعث فخر سمجھا، ایسے ہی بوڑھاپے میں والدین کا حق یہ ہے کہ بذات خود حتی المقدور ان کی مالی وجسمانی خدمت انجام دے، یہی سعادت اور فخر کی بات ہے اور اس خدمت کے دوران ان کی طرف سے پیش آمدہ ناگواریوں کو ناگوار نہ سمجھے، بلکہ اپنی طرف سے ان کو ادنیٰ تکلیف نہ پہنچنے دے کیوں کہ وہ جنت بھی ہیں اور جہنم بھی ہیں۔

''عن أبي أمامة رضي الله عنه أن رجلا قال: يا رسول الله! ماحق الوالدين على ولدهما؟ قال: هما جنتك ونارك'' (مشکوۃ: ص۴۲۱/ باب البر والصلۃ)۔

نصوص سے معلوم ہوتا ہے، کہ مذکورہ بالا ہاسٹلوں میں والدین کو قیام پر مجبور نہیں کیا جاسکتا ہے؛ کیونکہ مجبور کرنے میں ایذا رسانی ہے جو نا جائز ہے۔

(۸) موجودہ دور میں بوڑھے حضرات اگر بے سہارا، لاچار اور محتاج ہوں، اولاد یا قریبی رشتہ دار موجود نہ ہوں تو ایسے حالات میں ان کی اجتماعی کفالت کے لئے خصوصی طور پر زکوۃ کی رقم استعمال کی جاسکتی ہے جس طرح غریب طلبہ مدارس عربیہ کے لئے استعمال کی جاتی ہے اور ان کی کفالت کے ذمہ داروں کی وہی حیثیت ہونی چاہئے جو مدارس عربیہ کے مہتممین کی ہوا کرتی ہے اور مہتممین کی حیثیت عاملین زکوۃ کی سی ہے، جیسا کہ صاحب فتاویٰ حقانیہ نے (ج ۴/ ص۷۶) پر ایک فتویٰ میں ذکر کیا ہے کہ ''موجودہ دور میں مدارس کے مہتممین کی حیثیت عاملین زکوۃ کی ہے، البتہ مہتممین کیلئے لازم ہے کہ وہ زکوۃ اپنے ذاتی مصارف میں خرچ نہ کریں بلکہ طلبہ علوم دینیہ پر خرچ کریں، اسی طرح بوڑھے حضرات کی کفالت کے ذمہ داروں پر لازم ہے کہ وہ زکوۃ اپنے ذاتی مصارف میں خرچ نہ کریں، بلکہ ان بوڑھوں کی ضرورتوں میں خرچ کریں۔

''لما قال العلامة ابن همام هذه جهات الزكوة فلما لك أن يدفع إلى كل واحد منهم. وله أن تقتصر على صنف واحد'' (فتح القدير ۲/ ۲۰۵ کتاب الزکوۃ)۔

بعض فقہاء اور مفتیان کرام کی رائے یہ ہے کہ جو فلاحی ادارے زکوۃ کی رقم جمع کرتے ہیں وہ زکوۃ کی رقم کے مالک نہیں ہوتے، بلکہ وہ زکوۃ دہندگان کے وکیل اور نمائندے ہوتے ہیں جب تک ان کے پاس زکوۃ کا پیسہ جمع رہے گا، وہ بدستور زکوۃ دہندگان کی ملک ہوگا اگر صحیح مصرف میں خرچ کریں گے تو زکوٰۃ ادا ہوگی ورنہ نہیں (آپ کے مسائل اور ان کا حل ۵/ ۱۷۸)۔

''فلو دفع الزكوة إلى رجل وامرأة أن يدفع إلى الفقير فدفع ولم ينو عند الدفع جاز'' (عالمگیری ۱/ ۱۷۱)۔

میری نظر میں جو حضرات بوڑھوں کی کفالت کے لئے اقامتی ادارہ (دارالشیوخ) قائم کریں گے، وہ بھی ایک فلاحی ادارہ ہوگا اور اُن کے نظماء اور ذمہ داران زکوٰۃ دہندگان اور بوڑھوں دونوں کے وکیل ہوں گے کہ زکوۃ وصول کرتے ہی زکوٰۃ ادا ہو جائے گی، البتہ بوڑھوں پر خرچ کرنا ان کی ذمہ داری ہوگی، جیسا کہ بعض اکابر دیوبند کا مدارس کے سلسلہ میں یہی فتویٰ ہے۔

(۹) عمر دراز لوگوں کو جو خصوصی مراعات حکومتیں دیتیں ہیں وہ عمر کی حد کے ساتھ ساتھ مختص ہوا کرتی ہیں؛ لہٰذا جن کی عمریں اس حد تک پہنچ چکی ہیں یا اس سے عبور کر چکی ہیں ان کے لئے ان مراعات (مثلاً ٹرین وغیرہ کے کرایہ میں تخفیف، حکومت کی طرف سے امدادی وظیفہ، ٹیکس میں رعایت وغیرہ) کا حاصل کرنا جائز ہے، لیکن جو لوگ ان مقررہ حد عمر کو نہیں پہنچے ہیں ان کا جعلی سرٹیفکٹ کے ذریعہ ان مراعات کا حاصل کرنا روا نہیں ہے، جیسا کہ شریعت مطہرہ نے زکوٰۃ لینے کا اختیار انہیں غرباء و مساکین کو دیا ہے جو صاحب نصاب نہ ہوں ان کو زکوٰۃ لینے کا اختیار صاحب نصاب نہ ہونے کی قید کے ساتھ مختص ہے اگر یہ قید مفقود ہوگی تو زکوٰۃ لینے کا اختیار بھی مفقود ہوگا اسی طرح مقررہ حد عمر کی ہوگی تو مراعات کا حصول جائز ہوگا ورنہ نہیں۔

معذورین اور والدین کی خدمت اور ان کے حقوق

مولانا ندیم احمد انصاری[1]

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے والدین کے حق کو اپنے حق کے ساتھ جوڑ کر متعدد مقامات پر قرآن کریم میں بیان کیا ہے اور رسول اللہ ﷺ نے بے شمار احادیث میں ان کے حقوق ادا کرنے کی تاکید اور فضیلت بیان کی ہے۔ اس اہم موضوع پر بہت سی کتابیں بھی مختلف زبانوں میں وجود میں آچکی ہیں اور راقم الحروف کا بھی مستقل رسالہ لبِ طبع ہے۔ والدین اور اولاد کے حقوق وغیرہ پر جو احادیث مروی ہیں، یا جو روایات ان سے حسنِ سلوک پر وارد ہوئی ہیں، ہم یہاں ان کو بعینہٖ بیان کرنا موقع ومحل کے خلاف سمجھتے ہیں، اس لیے کہ یہاں چند جدید مسائل پر فقہی گفتگو کرنا اصل مقصد ہے، جس کے پیشِ نظر ہم بلاتمہید سوالات کے جوابات کی جانب پیش رفت کرتے ہیں۔

(۱) کسب معاش پر مجبور کرنا:

اس سوال کا جواب ملاحظہ کرنے سے پہلے یہ ذہن نشین کرلیں کہ سورۂ لقمان میں والدین کا حق بیان کرتے ہوئے ارشادِ ربانی ہے کہ اگر بالفرض کسی کے ماں باپ کافر ومشرک ہوں اور اولاد کو بھی کفر وشرک کے لیے مجبور کریں تو اولاد کو چاہیے کہ ان کے کہنے سے کفر وشرک تو نہ کرے لیکن دنیا میں ان کے ساتھ اچھا سلوک اور ان کی خدمت کرتی رہے، چنانچہ ارشاد ہے:

"وَاِنْ جَاهَدَاكَ عَلٰٓى اَنْ تُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوْفًا" (لقمان: ۱۵).

یعنی دین میں تو تم ان کا کہنا نہ مانو مگر دنیا کے کاموں میں مثلاً ان کی جسمانی خدمت یا مالی اخراجات وغیرہ، اس میں کمی نہ ہونے دو......الخ (معارف القرآن ۷ / ۳۷، کتب خانہ نعیمیہ دیوبند)۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''إِنَّ أَطْيَبَ مَا أَكَلَ الرَّجُلُ مِنْ كَسْبِهِ وَإِنَّ وَلَدَهُ مِنْ كَسْبِهِ''۔

بلاشبہ سب سے پاکیزہ چیز وہ ہے جو انسان اپنی کمائی سے کھائے اور اس کی اولاد بھی اس کی کمائی سے ہی ہے، لہٰذا تم ان کے مال میں سے کھاؤ۔

(ابوداؤد: ۳۵۲۸، ۳۵۲۹، ترمذی: ۱۳۵۸، نسائی: ۴۴۴۹، ابن ماجہ: ۲۲۹۰)۔

ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے ایک صحابیؓ کو ارشاد فرمایا:

''أنت و مالك لأبيك'' (حديث)۔ تم اور تمہارا مال (دونوں) تمہارے والد کے ہیں (ابوداؤد: ۳۵۳۰)۔

اسی بنا پر فقہاء نے لکھا ہے:

''ويجبر الولد الموسر على نفقة الأبوين المعسرين، مسلمين كانا أو ذمين، قدرا على الكسب أو لم يقدرا''۔

مال دار بیٹے کو اپنے محتاج والدین کو نفقہ دینے کے لیے مجبور کیا جائے گا، خواہ دونوں مسلمان ہوں یا ذمی ہوں، خواہ دونوں کمائی کرنے پر قادر ہوں یا قادر نہ ہوں (ہندیہ: ۱ / ۵۶۴)۔

حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ رقم طراز ہیں:

---

[1] ڈائریکٹر الفلاح اسلامک فاؤنڈیشن، ممبئی، انڈیا۔

بیوی کے نفقے کے سوا اور اہلِ قرابت کا نفقہ مرد کے ذمّے اس وقت واجب ہوتا ہے، جبکہ وہ اس قدر مال کا مالک ہو جس سے صدقۂ فطر (واجب) ہوتا ہے اور والدین بھی اس حکم میں داخل ہیں...... معلوم ہوا جب تک مالِ مذکور مرد کے پاس نہ ہو والدین کا نفقہ (ضروری خرچ) واجب نہ ہوگا۔ اس تقریر سے یہ غرض نہیں کہ انسان والدین سے بے رُخی اور ان کے ادائے حقوق میں کوتاہی اور ان کی احسان فراموشی کرے کہ یہ تو بہت بری بات ہے، بلکہ غرض اس تمام تقریر سے یہ ہے کہ مبالغہ رفع کر دیا جاوے، وہ حقوق بھی بیان ہو جاویں جو واجب ہیں اور وہ بھی جو غیر ضروری اور مستحب یا مباح ہیں۔ والدین ربِ مجازی ہیں، ان کا لحاظ اور بڑی اطاعت کرنی چاہیے...... صورتِ مذکورہ میں مستحبِ مؤکدہ ہے کہ اگر کوئی خاص مجبوری نہ ہو تو باوجود اس قدر مال نہ ہونے کے بھی ان کی خدمت کرے، اگرچہ خود کو تکلیف ہو (ازلۃ الرین عن حقوق الوالدین:۳۹، دار الکتاب دیوبند)۔

اس تفصیل کے پیشِ نظر یہی کہا جاسکتا ہے کہ اگر کوئی شخص بڑھاپے کی عمر کو پہنچ گیا، لیکن اتنا کمزور نہیں ہے کہ کسبِ معاش نہ کر سکے، کسی قدر مشقت کے ساتھ ہی سہی، وہ کما کر خود اپنی ضرورت پوری کر سکتا ہے تو اس کے لیے تگ و دو کرنا اور کسی پر بوجھ نہ بننا ہی مناسب ہے، لیکن ایسے شخص کو اس کی اولاد وغیرہ کسبِ معاش پر مجبور کریں تو یہ ان کے لیے بڑی حرماں نصیبی اور غیر درست بات ہے۔

حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب کا بھی یہی خیال ہے، تحریر فرماتے ہیں:

باپ اگر محتاج ہو اور کسبِ معاش کی صلاحیت رکھتا ہو، لیکن نہ کماتا ہو، جب بھی اس کا نفقہ بیٹے کے ذمّے واجب ہے، وہ اپنے باپ کو کام کرنے پر مجبور نہیں کر سکتا (قاموس الفقہ:۵/ ۲۱۴، کتب خانہ نعیمیہ، دیوبند)۔

(۲) دوسرا سوال یہ ہے کہ سن رسیدہ حضرات کا نفقہ وعلاج کن صورتوں میں دوسروں پر واجب ہوگا؟

اس سوال کے جواب سے قبل بھی یہ یاد رکھنے کی ضرورت ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"وَقَضَىٰ رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا" (الاسراء:۲۳)۔

احادیثِ مبارکہ میں آیا ہے:

"إذا كان أحدكم فقيرًا فليبدأ بنفسه، فإن فضل فعلى عياله. فإن كان فضل فعلى قرابته" (حدیث نبوی)

(تم میں سے جب کوئی فقیر ہو تو (خرچ کرنے میں) اپنے نفس سے ابتدا کرے، اس کے بعد جو مال بچے اسے اپنے اہل وعیال پر خرچ کرے اور اس کے بعد جو مال بچے اسے اپنے اقربا پر خرچ کرے) (نسائی:۴۶۵۳)۔

اسی لیے فقہاء نے لکھا ہے:

"وعلى الرجل أن ينفق على أبويه وأجداده وجداته إذا كانوا فقراء. وإن خالفوه في دينه"۔

(آدمی پر واجب ہے کہ وہ اپنے والدین پر خرچ کرے اور اپنے اجداد و جدات پر خرچ کرے، جب کہ وہ حضرات غریب ہوں، اگرچہ دین میں اس کے مخالف ہی کیوں نہ ہوں) (الہدایہ ۲/ ۴۴۵)۔

'قاموس الفقہ' میں ہے:

قرابت کی وجہ سے جن لوگوں کا نفقہ واجب ہوتا ہے، ان میں والدین کا نفقہ واجب ہونے پر بھی فی الجملہ فقہاء کا اجماع واتفاق ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کا حکم فرمایا ہے اور والدین کی کفالت حسنِ سلوک میں داخل ہے (لیکن) والدین کا نفقہ اس وقت واجب ہوتا ہے جب ان میں خود اپنی ضروریات مکمل کرنے کی صلاحیت نہ ہو۔ باپ اگر محتاج ہو اور کسبِ معاش کی صلاحیت رکھتا ہو، لیکن نہ کماتا ہو، جب بھی اس کا نفقہ بیٹے کے ذمّے واجب ہے، وہ اپنے باپ کو کمانے پر مجبور نہیں کر سکتا۔ یہ حنفیہ کی رائے ہے، حنابلہ وغیرہ کے نزدیک بشمول والدین، اقارب کا نفقہ اسی وقت واجب ہوتا ہے کہ وہ کمانے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو۔ والدین کا نفقہ جس میں کھانا، پینا، رہائش سبھی شامل ہیں (۵/ ۲۱۲ ملخصاً بترمیم)۔

اس اقتباس سے واضح طور پر معلوم ہو گیا کہ کن صورتوں میں سن رسیدہ حضرات کا نفقہ وعلاج دوسروں پر واجب ہوتا ہے۔ یہ بھی خیال رہے کہ نفقے کے ان احکام میں جو کہ والدین سے متعلق ہیں، دادا، دادی اور نانا، نانی بھی شامل ہیں، اگر وہ محتاج ہوں تو پوتے، پوتیاں اور نواسے، نواسیاں ان کا نفقہ ادا کریں گے (بدائع

الفتح ۴/۴۱۵، بحوالہ قاموس الفقہ ۵/۲۱۵)۔

(۳) جن کی کفالت واجب ہے، ان کی طرف سے زائد رقم کا مطالبہ:

اس سوال کے جواب سے قبل یہ یاد رہے کہ نفقے کے وجوب کے شرائط میں سے چوں کہ مندرجۂ ذیل امور بھی داخل ہیں:

(۱) والدین فقیر یا تنگ دست ہوں، ان کے پاس خود کوئی مال یا ایسا کوئی ذریعہ نہ ہو جس کے باعث وہ دوسروں کے (اُن پر) خرچ کرنے سے مستغنی ہو سکیں۔

(۲) جس پر نفقہ واجب ہو رہا ہے، اس کے پاس اپنے نفس وغیرہ کے خرچ سے زائد مال ہو۔

جیسا کہ ’المغنی‘ میں ہے:

’’ویشترط لوجوب الانفاق ثلاث شروط: أحدھما؛ أن یکونوا فقراء، لا مال لھم... الثانی؛ أن یکون لمن تجب علیه النفقة ما ینفق علیھم فاضلًا... الثالث؛ أن یکون المنفق وارثًا‘‘ (دار عالم الکتب، ریاض)۔

اس لیے بوڑھے والدین یا خاندان کے وہ بڑے جن کا نفقہ ان کے چھوٹوں پر محتاجی کی صورت میں واجب ہے، اگر وہ محتاج نہ ہوں، خود صاحب ثروت ہوں تب بھی ان کا اپنی اولاد سے یا ان لوگوں سے جن پر بحالت حاجت نفقہ واجب ہوتا ہے، زیادہ سہولت کے لیے یا دوسرے لوگوں پر خرچ کرنے کے لیے یا کچھ رقم محفوظ کرنے کے لیے زائد رقم کا مطالبہ کرنا مناسب معلوم نہیں ہوتا، انھیں اس سے احتراز کرنا چاہیے۔

حضرت مفتی محمود حسن گنگوہی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

اصل یہ ہے کہ ہر شخص اپنا خرچہ خود برداشت کرے، بعض اسباب کے ماتحت شریعت نے خاص صورتوں میں دوسروں پر نفقہ لازم کیا ہے، بیٹا اگر مال دار، صاحب وسعت ہو اور باپ حاجت مند، غریب ہو تو باپ کا نفقہ بیٹے پر واجب ہے (فتاویٰ محمودیہ جدید محقق ۱۳/۴۴۸، جامعہ فاروقیہ کراچی)۔

پھر بھی اولاد کا ازخود ان کی جائز خواہشات کا ممکن خیال رکھنا اور انھیں ہدیے تحائف سے نوازنا نیکی قرار پائے گا۔

جیسا کہ والدین سے حسن سلوک کی بات کہا گیا ہے۔

’’برھما بکل ما تصل الیه یداہ، و تتسع له طاقته من أنواع البر والاحسان، کإطعام وکسوتھما، وعلاج مریضھما، ودفع الأذی عنھما، و تقدیم النفس فداءً لھما‘‘ (بر الوالدین: ۹، مکتبة الملك، ریاض)۔

(۴) والدین کی خدمت کے محتاج ہونے کے باوجود دوسرے شہروں میں کسب معاش کے لئے جانا:

الف: کیا زیادہ آمدنی کے لیے لڑکوں کا اپنے ماں باپ کو چھوڑ کر دوسری جگہ جانا جائز ہے؟

ظاہر ہے کہ اس کا جواب نفی میں ہی ہوگا، اس لیے کہ والدین کی خدمت بڑی عظیم نعمت ہے، جس کا کوئی نعم البدل نہیں۔ قرآن واحادیثِ مبارکہ میں والدین کی خدمت کی بڑی تاکید آئی ہے، بطور نمونہ محض دو حدیثیں پیش کی جاتی ہیں:

☆ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اس کی ناک خاک آلود ہو، اس کی ناک خاک آلود ہو، اس کی ناک خاک آلود ہو! کسی نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! وہ کون ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس نے ماں باپ دونوں یا ان میں سے کسی ایک کو بڑھاپے کی حالت میں پایا پھر (ان کی خدمت کرکے) جنت میں داخل نہ ہوا (مسلم: ۱۵۵۲)۔

یہی نہیں، بلکہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے والدین کی خدمت کو نفلی جہاد سے بھی افضل قرار دیا ہے، ملاحظہ ہو:

☆ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جہاد میں شریک ہونے کی اجازت لینے کے لیے حاضر ہوا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے پوچھا: کیا تمہارے والدین زندہ ہیں؟ اس نے عرض کیا: ہاں اے اللہ کے رسول۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ’’ففیھما فجاھد‘‘ بس تم والدین کی خدمت کر کے جہاد کا ثواب حاصل کرو (بخاری: ۲۷۸۲)۔

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب عثمانی اس روایت کو ذکر کر کے فرماتے ہیں:

اس روایت سے معلوم ہوا کہ جب کوئی چیز فرضِ عین یا واجب علی العین نہ ہو کفایہ کے درجے میں ہو تو اولاد کے لیے وہ کام بغیر ماں باپ کی اجازت کے جائز نہیں، اس میں تکمیل علمِ دین حاصل کرنا اور تبلیغِ دین کے لیے سفر کرنے کا حکم بھی شامل ہے کہ بقدرِ فرض علمِ دین جس کو حاصل ہو وہ عالم بننے کے لیے سفر کرے یا لوگوں کو تبلیغ کی دعوت کے لیے سفر کرے تو بغیر اجازتِ والدین کے جائز نہیں (معارف القرآن: ۵/ ۶۵،۴۶۴، کتب خانہ نعیمیہ، دیوبند)۔

ان روایات اور مفتی صاحب کے اس اقتباس کے بعد دیکھیں کہ جب جہاد جیسے فرضِ کفایہ اور مبارک عمل میں جانے سے والدین کی خدمت مانع ہے تو قدرے زیادہ مال کمانے کے لیے جو کہ زیادہ سے زیادہ مباح ہوگا، انھیں اس طرح چھوڑ کر جانا کیسے درست قرار دیا جاسکتا ہے، جب کہ اس فانی دنیا میں ہر وقت چل چلاؤ کا عمل جاری ہے، خدا جانے اس کے لوٹنے پر اسے والدین کی زیارت بھی نصیب ہوگی یا نہیں۔ دراصل یہاں مسئلہ یہ ہے کہ انسان اپنے لیے ایک ایسی چیز از خود تجویز کر لیتا ہے، جس کے متعلق اس کے علم میں مستقبل کے متعلق کوئی یقینی بات نہیں ہوتی، علمِ الٰہی میں جو کچھ طے ہو چکا ہے اس کے بارے میں وہ بتہ نہیں جانتا اسی لیے عموماً یہ سوچ کر کہ دور جا کر زیادہ کما کر لاؤں گا تو والدین کی خدمت بھی بہتر طریقے سے کر پاؤں گا، وہاں جانے کی ٹھان تو لیتا ہے حالانکہ اس کے بھی امکانات ہیں کہ اس کا یوں باہر جانا خود اس کے حق میں، اس کے والدین کے حق میں بہتر نہ ہو۔ اس لیے اگر ضروریات کا انتظام والدین کی خدمت کرتے ہوئے ان کے ساتھ رہ کر ہی ہو جاتا ہو تو خدمت کے محتاج والدین کو یوں چھوڑ کر جانا درست قرار نہیں دیا جاسکتا۔

پھر باری تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی پیشِ نظر رہے:

"وَعَسَىٰ أَن تَكْرَهُوا شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۖ وَعَسَىٰ أَن تُحِبُّوا شَيْئًا وَهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۗ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ" (البقرہ: ۲۱۶)

(اور شاید کہ ناپسند ہو تمھیں ایک چیز اور وہ بہتر ہو تمہارے حق میں اور شاید کہ تم کو بہتر لگے ایک چیز اور وہ بری ہو تمہارے حق میں)۔

ب: ساس، سسر کے حق میں بہو کی ذمہ داری:

دراصل والدین کی خدمت اصلاً تو بیٹے کی ذمہ داری ہے اور خود شوہر کو راضی رکھنا اور اس کے نیک کاموں میں معاون و مددگار بننا بیوی کی ذمہ داری، اس لیے ایسی صورت میں بہو کو چاہیے کہ وہ ساس سسر کے ساتھ رہے، الگ رہنے پر اصرار نہ کرے، جب کہ اس کی ساس کو خدمت کی ضرورت بھی ہے اور کوئی خدمت گار موجود نہیں۔

رہا یہ سوال کہ کیا اسے اس کے ساس سسر کے ساتھ رہنے پر مجبور کیا جاسکتا ہے؟

اس کا فقہی و قانونی جواب تو یہی ہے کہ مرد کے ذمے واجب ہے کہ عورت کو ایک مکان علاحدہ رہنے کے لیے دے کہ اس مکان میں شوہر کے ماں باپ، بھائی بہن وغیرہ نہ رہتے ہوں، بلکہ وہ پورا بیوی کے قبضے میں ہو اور مکان سے مراد ایک کمرہ یا کوٹھا ہے، جس کو عربی میں 'بیت' کہتے ہیں، لہٰذا اگر صحن وغیرہ مشترک ہو جس کو شوہر کے دوسرے عزیز بھی استعمال کرتے ہوں اور بیوی بھی، تو اس کو مطالبے کا حق نہیں کہ میرا صحن بھی مستقل ہونا چاہیے، اس میں بھی کسی کی شرکت نہ ہو۔ یہ اس وقت ہے جب کہ شوہر اور بیوی دونوں زیادہ مالدار نہ ہوں، بلکہ متوسط درجے کے ہوں، اگر مالدار ہوں اور شوہر میں اس قدر استطاعت ہو کہ کوئی مستقل گھر علاحدہ بیوی کو دے سکتا ہو، خواہ خرید کر، خواہ کرایے پر، خواہ عاریت پر، جس کا صحن وغیرہ بھی علاحدہ ہو جس کو عربی میں 'دار' کہتے ہیں تو عورت کو اس مطالبے کا حق حاصل ہے۔

"تجب السكنى لها عليه في بيت خال عن أهله و أهلا بقدر حلهما كطعام و كسوة و بيت منفرد من دار له غلق. فإن كانت فيها بيوت وأعطى لها بيتًا يغلق و يفتح لم يكن أن تطلب بيتًا آخر. إذا لم يكن ثمة أحد من أحماء الزوج يؤذيها... وذكر الخصاف: أن لها أن تقول: لا أسكن مع والديك و أقربائك في الدار فأفرد لي دارًا. قال صاحب الملتقط: هذه الرواية محمولة على المؤسرة الشريفة. أما ذكرنا قبله أن إفراد بيت في الدار كاف. إنما هو في المرأة الوسط اعتبارًا بالسكنى المعروف" (رد المحتار علی الدر ۳/ ۵۹۹، ۶۰۱، البحر الرائق ۴/ ۳۲۸ بحوالہ فتاوی محمودیہ جدید ۱۳/ ۴۴۸، جامعہ فاروقیہ، کراچی)۔

یعنی جس قدر انسان میں طاقت ہے، اسی کے مطابق اس پر خرچ اور بیوی کے مطالبات پورا کرنا بھی لازم ہوگا۔

"وهذا القول يؤخذ من هذه الآية لا يقتضي اعتبار حال الزوجة و تقتضي أن يكون على الموسر للفقيرة نفقة.

الیسار لقوله تعالیٰ: (لینفق ذو سعة من سعته) ویقتضی أن یکون علی الفقیر بقدر طاقته ولا یکون شیء فی ذمته، وإن کانت زوجة موسرة لقوله تعالیٰ: (لایکلف الله نفسا الا ما آتاها) فإنه تعلیل لعدم وجوب الزیادة'' (تفسیرِ مظہری ۹/ ۳۲۳)۔

یہ تو ہوا قانونی و فقہی جواب، لیکن بعض باتیں دیانت واخلاق سے بھی متعلق ہوتی ہیں یعنی یہ تو درست ہے کہ شرعاً اور قانوناً بہو پر ساس کی خدمت لازمی نہیں ہے، لیکن اخلاقی طور پر اگر وہ اپنی ساس کی خدمت کرے تو اس کے لیے بہتر اور باعثِ اجر ہوگا۔ اگر میاں بیوی ایک دوسرے کے والدین کا ادب واحترام کریں گے تو یہ ان دونوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے محبت وعزت کا سبب بنے گا۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کا یہ ارشاد بھی پیشِ نظر رہے، فرماتے ہیں:

اگر شوہر کوئی جائز کام کسی اپنے قرابت دار یا کسی غیر عورت سے کروائے بغیر کسی مجبوری تو اس کا کرنا عورت کے ذمے ضروری نہیں، مثلاً کسی کے لیے روٹی پکوائے یا کپڑا سلوائے یا کوئی ایسا ہی کام کرائے، اگر کسی مجبوری سے کرائے تو چونکہ اُس کام کو نہ کرنے میں خاوند کو تکلیف ہوگی، اس لیے ضروری ہے کہ کردے۔

(ازالۃ الرین عن حقوق الوالدین: ۴۹، دار الکتاب دیوبند)۔

حضرت موصوف ہی ایک مقام پر ایک اصولی بات یوں تحریر فرماتے ہیں:

قرآن مجید میں حق تعالیٰ نے نسب کے ساتھ علاقۂ مصاہرت کا بھی ذکر فرمایا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ ساس اور سسر اور سالے، بہنوئی اور داماد اور بہو اور ربیب یعنی بیوی کی پہلی اولاد کا بھی کسی قدر حق ہوتا ہے، اس لیے ان تعلقات میں بھی رعایت احسان واخلاق کی کسی قدر خصوصیت کے ساتھ رکھنا چاہیے۔

(حقوق العباد: ۱۰۰، ادارۂ اسلامیات، لاہور)۔

ج: والدین کی خدمت کس پر واجب ہے:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَی النِّسَاۗءِ" (مرد حاکم ہیں عورتوں پر) (النساء: ۳۴)۔

اس آیت میں قوام کا ترجمہ عموماً حاکم کیا گیا ہے، یعنی مرد عورتوں پر حاکم ہیں، مراد یہ ہے کہ ہر اجتماعی نظام کے لیے عقلاً اور عرفاً یہ ضروری ہوتا ہے کہ اس کا کوئی سربراہ یا امیر اور حاکم ہوتا ہے کہ اختلاف کے وقت اس کے فیصلے سے کام چل سکے، جس طرح ملک وسلطنت اور ریاست کے لیے اس کی ضرورت سب کے نزدیک مسلّم ہے، اسی طرح قبائلی نظام میں بھی اس کی ضرورت ہمیشہ محسوس کی گئی اور کسی ایک شخص کو قبیلے کا سردار اور حاکم مانا گیا ہے۔ اسی طرح اس عائلی نظام میں جس کو خانہ داری کہا جاتا ہے، اس میں بھی ایک امیر اور سربراہ کی ضرورت ہے، عورتوں اور بچوں کے مقابلے میں اس کام کے لیے حق تعالیٰ نے مردوں کو منتخب فرمایا کہ ان کی علمی اور عملی قوتیں بہ نسبت عورتوں، بچوں کے زیادہ ہیں اور یہ ایسا بدیہی معاملہ ہے کہ کوئی سمجھ دار عورت یا مرد اس کا انکار نہیں کرسکتا (معارف القرآن ۲/ ۳۹۶)۔

آج کی دنیا میں جہاں مرد وعورت کی مساوات کا ہر طرف شور ہے، ایسے میں لوگ اعتراف کرتے ہوئے شرم محسوس کرتے ہیں کہ شریعت نے مرد کو حاکم بنایا ہے اور عورت کو محکوم بنایا ہے، جب کہ صحیح بات یہ ہے کہ مرد وعورت زندگی کی گاڑی کے دو پہیے ہیں، جن میں ہر دو کی اپنی اہمیت ہے۔ نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جب بھی دو آدمی کوئی سفر کررہے ہوں۔ خواہ وہ سفر مختصر ہی کیوں نہ ہو، انھیں چاہیے کہ اپنے میں سے ایک کو امیر بنالیں، اس لیے کہ اس کے بغیر ایک بد نظمی پیدا ہوجائے گی (ابوداؤد: ۲۶۰۸)، لہٰذا جب ایک چھوٹے سے سفر میں امیر بنانے کی تاکید کی گئی ہے تو زندگی کا ایک طویل و پُر خار سفر جو ایک ساتھ گزارنا ہے اس میں یہ تاکید اور زیادہ ہوگی۔

پھر اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ" (اور قرار پکڑو اپنے گھروں میں) (الاحزاب: ۳۳)۔

اس آیت کے ذیل میں تفسیر 'معارف القرآن' میں ہے:

خلاصہ یہ ہے کہ آیت کے مفہوم سے باشاراتِ قرآن اور بعملِ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور باجماعِ صحابہؓ مواقعِ ضرورت مستثنیٰ ہیں، جن میں عبادات حج وعمرہ بھی داخل ہیں اور ضروریاتِ طبعیہ، والدین اور اپنے محارم کی زیارت، عیادت وغیرہ بھی۔ اسی طرح اگر کسی کے نفقے اور ضروریاتِ زندگی کا کوئی اور سامان نہ ہو تو پردے

کے ساتھ محنت مزدوری کے لیے نکلنا بھی الخ (۷/ ۱۳۴-۱۳۵)۔

ان نصوص کے پیش نظر فقہاء نے یہ قانون لکھا ہے کہ اگر شوہر عورت سے یہ کہہ دے کہ تم گھر سے باہر نہیں جاسکتیں اور اپنے عزیز واقارب سے ملنے نہیں جا سکتیں حتی کہ اس کے والدین سے ملنے کے لیے جانے سے منع کردے تو عورت کے لیے ان سے ملاقات کے لیے گھر سے باہر جانا جائز نہیں، البتہ اگر والدین اپنی بیٹی سے ملنے کے لیے اس کے گھر آجائیں تو اب شوہر ان والدین کو ملاقات کرنے سے روک نہیں سکتا، لیکن فقہاء نے اس کی حد مقرر کردی ہے کہ اس کے والدین ہفتے میں ایک مرتبہ آئیں اور ملاقات کر کے چلے جائیں یہ اس عورت کا حق ہے شوہر اس سے روک نہیں سکتا، لیکن اجازت کے بغیر عورت کے لیے جانا جائز نہیں ہے (اصلاحی خطبات ۲/ ۵۳)۔

''فتاویٰ عالمگیری'' میں ہے:

''وقيل: لا يمنعها من الخروج إلى والوالدين في كل جمعة مرة، وعليه الفتوىٰ''۔

بعض علماء نے فرمایا کہ ہر جمعہ کو بیوی کو ایک مرتبہ اپنے والدین کی زیارت کے لیے جانے سے نہیں روک سکتا اور اسی پر فتویٰ ہے (۱/ ۵۷۹، دار الکتب العلمیہ، بیروت)۔

معلوم ہوا سوال میں شوہر کے جس حق کے متعلق سوال کیا گیا ہے، وہ اسے بعض حدود کی رعایت کے ساتھ حاصل تو ہے، جس کا ذکر مذکورہ بالا سطور میں کیا گیا، لیکن ساتھ ہی اسے یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ خود وہ اگر بیوی کے والدین کی خدمت کا ایسی صورت میں خیال نہیں رکھے گا، تو بیوی سے یہ امید رکھنا کہ وہ اپنے ساس سسر، یعنی شوہر کے والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرے گی عبث ہوگا، اس لیے کہ یہ دنیا تو صدائے بازگشت کی طرح ہے، جیسی کہے ویسی سنے، ہاں بیوی کے لیے لازم ہے کہ شوہر کی بات ماننے اور جس رخصت کا اوپر ذکر کیا گیا، اس کے علاوہ والدین کی خدمت کے لیے بھی نہ جائے۔

(۵) والد کے نکاح ثانی میں رکاوٹ بننا:

اس سوال کے دو جزو ہیں:

☆ ہندوستانی معاشرے میں جس طرح والدہ کے انتقال پر عموماً اولاد اپنے والد کے نکاح ثانی میں رکاوٹ بنتے ہیں، کیا ان کا یہ رکاوٹ بننا درست ہے؟

دوسرا یہ کہ اگر خود والد میں اپنی بیوی کی کفالت کی استطاعت نہ ہو تو اس سلسلے میں کیا اولاد پر بھی اس نسبت سے کچھ ذمہ داری عائد ہوتی ہے؟

بات یہ ہے کہ آج معاشرے میں نکاح کو صرف نفسانی خواہشات کی تکمیل کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے، اسی لیے معمر حضرات کے نکاح ثانی پر خصوصیت سے فقرے کسے جاتے ہیں، مذاق بنائی جاتی ہے وغیرہ وغیرہ۔ جب کہ نکاح کے مختلف ومتعدد مقاصد وفوائد ہیں اور من جملہ ان کے ایک یہ بھی ہے، جس کا سوال میں تذکرہ کیا گیا ہے، یعنی بڑھاپے میں ایک دوسرے کا معاون ومددگار بننا، نیز نکاح کے مختلف اعلیٰ ترین مقاصد کے تحت اسلام نے نکاح ثانی کو معیوب نہیں سمجھا اور بلاکسی خاص عمر وغیرہ کی تعیین کے اس کی اجازت دی ہے، اس لیے اولاد کا والد کے نکاح ثانی میں رکاوٹ بننا درست نہیں اور یہ محض معاشرے کا اثر ہے، بلکہ اگر والد نکاح کی ضرورت محسوس کرتا ہو تو اسے نکاح ثانی کر لینا چاہیے۔

'اغلاط العوام' میں مرقوم ہے:

بعضے لوگ باوجود ضرورت کے اور باوجود وسعت کے نکاح نہیں کرتے، بعضے تو اول ہی سے نہیں کرتے اور بعضے ایک بیوی کے مرنے یا طلاق دینے کے بعد پھر نکاح نہیں کرتے۔ سو خوب جان رکھو کہ

۱) جب ضرورت یعنی نفس میں تقاضا ہو اور وسعت بھی ہو، گو صرف اس قدر ہو کہ روز کے روز کماؤ ×ں گا اور کھلاؤ ×ں گا تو نکاح کرنا اس صورت میں واجب ہے اور اس کے ترک سے گنہ گار ہوگا۔

۲) اگر وسعت کے ساتھ بہت زیادہ تقاضا ہے کہ بدون نکاح کیے ہوئے فعلِ حرام میں مبتلا ہو جانے کا اندیشہ ہے تو نکاح کرنا فرض ہوگا، فعلِ حرام میں نظر حرام اور جلق بازی بھی شامل ہے۔

۳) اگر ضرورت کا درجہ نہیں، لیکن ادائے حق پر قدرت ہے، تب بھی نکاح کرنا سنت ہے۔

۴) اگر بیوی کے حقوق ادا نہ کر سکنے کا اندیشہ ہے، خواہ حقِ نفس، خواہ حقِ مال، تو ایسے شخص کے لیے البتہ نکاح کرنا ممنوع ہے۔

۵) اگر ضرورت ہو اور وسعت نہ ہو تو اس میں اقوال مختلف ہیں، احقر قولِ وجوب کو راجح سمجھتا ہے اور وسعت کا تدارک محنت مزدوری یا قرض سے کر لے جس کے ادا کی نیت مصمم رکھے اور ادا کی کوشش بھی کرے اور اگر اس پر بھی ادا نہ کر سکا تو امید ہے کہ حق تعالیٰ اس کے مخاصم کو راضی فرما دیں گے (ص: ۶۵۱-۶۱۷ بتغیر)۔

معلوم ہوا اسلام میں نکاحِ ثانی کی بالکل اجازت ہے، البتہ اس کا فایدہ اٹھاتے ہوئے ایسا کوئی کام نہ کرے کہ لوگوں کو بلاوجہ منہ کھولنے کا موقع ملے، جیسا کہ بعض لوگ اپنی بیٹی کی عمر کی لڑکی سے نکاح کر لیتے ہیں، ظاہر ہے اس میں جوان اولاد کو بھی عجب شرمندگی ہوتی ہے اور دوسرے بھی نکاحِ ثانی کو معیوب گردانتے ہیں۔ ایسی لڑکیاں عموماً غریب ماں باپ کی ہوتی ہیں، اس لیے اس ظلم کو برداشت کرتی ہیں۔

حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

بعض لوگ ساٹھ ساٹھ برس کے بوڑھوں سے تیرہ تیرہ برس کی لڑکیوں کو بیاہ دیتے ہیں، یہ کھلا ظلم ہے (اغلاط العوام: ۱۵۷، شمس پبلیشرز، دیوبند)۔

رہا یہ سوال کہ اگر خود والد میں اپنی بیوی کی کفالت کی استطاعت نہ ہو تو اس سلسلے میں کیا اولاد پر بھی اس نسبت سے کچھ ذمہ داری عائد ہوتی ہے؟

علامہ ابن قدامہ نے اس موضوع پر 'المغنی' میں: ''ویلزم الرجل إعفاف أبیه، إذا احتاج إلی النكاح'' کے الفاظ سے مستقل فصل قائم کی ہے، نیز حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب نے اس مسئلے پر اچھی گفتگو کی ہے، موصوف لکھتے ہیں:

اگر باپ نکاح (ثانی) کی حاجت رکھتا ہو اور خود اس موقف میں نہ ہو تو شوافع اور حنابلہ کے نزدیک بیٹے پر باپ کی شادی کا انتظام واجب ہوگا اور اس کے مہر کی ذمہ داری بھی اس کے بیٹے پر ہوگی۔ حنفیہ کے یہاں دو قول ہیں؛ ایک واجب ہونے کا، دوسرا واجب نہ ہونے کا۔ اسی طرح علامہ ابن قدامہ رحمہ اللہ نے ماں کے نکاح کے بارے میں بھی لکھا ہے کہ وہ بھی اولاد کے ذمے ہوگا۔

اسی سے ایک دوسرا مسئلہ باپ کی بیوی یعنی سوتیلی ماں کے نفقے کے متعلق ہے' اگر باپ میں نفقہ ادا کرنے کی صلاحیت نہ ہو تو مالکیہ، شوافع اور حنابلہ کے نزدیک بیٹے پر اس کا نفقہ بھی واجب ہوگا کیوں کہ یہ بھی باپ کی ضروریات میں داخل ہے۔

حنفیہ کا بھی ایک قول یہی ہے جس کو علامہ حصکفی رحمہ اللہ نے ترجیح دی ہے، دوسرا قول یہ ہے کہ اگر باپ مریض یا معذور ہونے کی وجہ سے محتاجِ خدمت ہو تب اس کی بیوی کا نفقہ بیٹے کے ذمے ہے کیوں کہ وہ گویا کہ باپ کی خادمہ ہے۔

بہر حال جمہور کا مسلک قرآن وحدیث کے مزاج سے قریب تر ہے کیوں کہ والدین کے ساتھ حسنِ سلوک اور معروف رویہ اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ حسنِ سلوک نہیں ہو سکتا کہ اس کی بیوی کو نفقے سے محروم رکھا جائے، بلکہ فقہاء نے ان جزئیات سے اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اگر والدین اپنی طبعی ضرورت اور خدمت کے لیے نکاح کے ضرورت مند ہوں تو اولاد کو اس کی رعایت کرنی چاہیے (قاموس الفقہ ۵ / ۳۱۵-۳۱۴، کتب خانہ نعیمیہ، دیوبند وانظر فتاویٰ محمودی جدید محقق ۱۳ / ۴۵۲، جامعہ فاروقیہ کراچی)۔

(۶) اولاد کی طرف سے والد کی زندگی میں جائیداد کی تقسیم کا مطالبہ:

جواب تو اس صریح سوال کا یہ ہے کہ اولاد کو اس کا حق نہیں پہنچتا کہ وہ والد کی زندگی ہی میں جائداد کا مطالبہ کریں، اس لیے کہ والد کی جو جائداد اس کی موت کے بعد اولاد کے لیے میراث بنتی ہے، اگر کوئی والد زندگی ہی میں اولاد کو اس کا مالک بنا دے تو اسے ہبہ وعطیہ ہی کہہ سکتے ہیں، جس کے والد کو مجبور نہیں کیا جا سکتا۔

قال المصري: ''وأما بيان الوقت الذي يجري فيه الإرث: هذا فصل اختلف فيه... المشايخ بلخ: الإرث يثبت بعد الموت المورث'' (البحر الرائق ۹/ ۳۶۴، دار الكتب العلمية، بيروت)۔

لیکن کوئی شخص اپنی اولاد میں اپنی جائداد زندگی رہتے تقسیم کرنا ہی چاہے تو چوں کہ اس کی حیثیت عطیہ وہبہ کی ہوگی، اس لیے بعض علماء نے لکھا ہے کہ مستحب یہ ہے کہ لڑکا لڑکی سب میں مساویانہ تقسیم کرے البتہ بعض کے نزدیک ایک لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر رکھے تو بھی مضایقہ درست ہے لیکن اس کی

نیت اضرار کی نہ ہو۔

"فتاویٰ عالمگیری" میں ہے:

"ولو وهب رجل شيئا لأولاده في الصحة وأراد تفضيل على البعض في ذلك، لا رواية في الأصل عن أصحابنا۔ وروى عن أبي حنيفة: أنه لا بأس به اذا كان التفضيل لزيادة فضل في الدين، وإن كانوا سواء يكره۔ وروى المعلى عن أبي يوسف: أنه لا بأس به اذا لم يقصد به الاضرار" (هنديه ۴/۳۹۱)۔

البتہ سوال میں والدین و اولاد کی جس صورت حال کا ذکر ہے، اس میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ والد اولاد کے ساتھ ایثار کا معاملہ کرے تا کہ اولاد کی بھی مشکل آسان ہو، لیکن اس کے لیے اسے مجبور نہیں کیا جا سکتا، ویسے اگر اولاد بھی ماں باپ کے حقوق ادا کرنے میں چاک و چوبند ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ والد خود ہی ان کی محبت میں ایسا کرنے کے لیے مجبور ہو جائے، اس طرح کا تنازع تو عموماً وہاں پیش آتا ہے جہاں اولاد خود تو والدین کے حقوق ادا نہیں کرتی، لیکن اپنے خود ساختہ حصے کا مطالبہ کرتی ہے، یہ والدین کو ایذا پہنچانا ہے، جس سے توبہ کرنی چاہیے۔

(۷) عمر رسیدہ لوگوں کے لئے ہولڈا یج ہوم تعمیر کرنا:

☆ ایک پہلو یہ ہے کہ ان عمر دراز حضرات کو ایک جگہ اپنی ضرورت کی چیزیں مہیا ہو جاتی ہیں اور اپنے ہم عمر لوگ مل جاتے ہیں۔

☆ دوسرا پہلو یہ ہے کہ وہ اپنے رشتے داروں کی محبت سے محروم ہو جاتے ہیں۔

عمر کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ انسان چاہتا ہے کہ اس کے بال بچے اس کے قریب رہیں، اولاد اور اولاد کی اولاد کو دیکھ کر اس کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں، ایسے ہاسٹلوں میں اس کی یہ خواہش ایک حسرت بن کر رہ جاتی ہے تو ایسے ہاسٹلوں کے بارے میں شرعی نقطۂ نظر کیا ہے؟ کیا کوئی شخص اپنے بزرگوں کو ایسے ہاسٹلوں میں قیام پر مجبور کر سکتا ہے؟

سوال میں جن دو پہلو پر توجہ دلائی گئی ہے، ان پر غور کے باوجود ہمیں اس قبیح ترین فعل کا کوئی جواز سمجھ میں آتا، اگر بہت کھینچ تان کی جائے تو بھی: إثمهما أكبر من نفعهما" (سورہ بقرہ: ۲۱۹) والی مثال صادق آتی ہے، اس لیے کہ والدین کی خدمت کا حکم قرآن کریم میں موجود ہے اور اس کے فضائل سے کتب احادیث مملو ہیں۔ یہ سب مغربی ممالک کے زہریلے جراثیم ہیں، جس نے انسان کو حواس باختہ کر دیا ہے، اس کے دل و دماغ پر مادیت کے پردے ڈال دیے ہیں اور اس کے احساسات کو مردہ کر دیا ہے۔ خود کو اگر اپنے والدین کی جگہ رکھ کر ایک مرتبہ ٹھنڈے دماغ سے سوچا جائے تو جس بات کو اول پہلو کے تحت ذکر کیا ہے، اس کے جواز کی بھی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آسکتی، دراصل یہ نتیجہ ہے اپنی عاقبت سے غافل ہونے کا، اللہ تعالیٰ ہم سب کو صحیح سمجھ نصیب فرمائے۔ آمین

اس میں ہماری نظر میں دو بڑے گناہ شامل ہیں:

(۱) ایک والدین کی نافرمانی۔ (۲) دوسرے قطع تعلق۔

اور یہ دونوں ہی گناہ سخت حرام ہیں، جن سے بچنا نہایت ضروری ہے، اس لیے کہ والدین سے حسن سلوک اسلام کی اساسی تعلیم میں سے۔ ارشاد ربانی ہے:

"وَقَضَىٰ رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا ۚ إِمَّا يَبْلُغَنَّ عِندَكَ الْكِبَرَ أَحَدُهُمَا أَوْ كِلَاهُمَا فَلَا تَقُل لَّهُمَا أُفٍّ وَلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُل لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيمًا، وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُل رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِي صَغِيرًا" (سورہ اسراء: ۲۳-۲۴)

اور آپ کے رب نے حکم فرما دیا ہے کہ تم اللہ کے سوا کسی کی عبادت مت کرو اور والدین کے ساتھ حسن سلوک کرو، اگر تمہارے سامنے ان دونوں میں سے کوئی ایک یا دونوں بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو انھیں اُف بھی نہ کہنا اور انھیں جھڑکنا مت اور ان کے ساتھ بڑے ادب سے بات کرنا اور ان دونوں کے لیے نرمی، عجز و انکساری کے بازو جھکائے رکھنا اور (اللہ تعالیٰ سے) عرض کرتے رہنا اے میرے رب! ان دونوں پر رحم فرما، اسی طرح جیسے انھوں نے بچپن میں مجھ پر رحم کیا۔

یوں تو والدین کی خدمت و اطاعت اور تعظیم و تکریم عمر کے ہر مرحلے میں واجب و ضروری ہے لیکن بڑھاپے کا ذکر خصوصیت سے اس لیے مذکور ہوا کہ وہ اس مرحلے پر پہنچ کر اولاد کی خدمت کے محتاج ہو جاتے ہیں، اس لیے رب حقیقی نے رب مجازی کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید کا اس قدر اہتمام فرمایا۔

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ نے بجا فرمایا ہے:

والدین کی خدمت واطاعت والدین ہونے کی حیثیت سے کسی زمانے اور کسی عمر کے ساتھ مقید نہیں، ہر حال میں والدین کے ساتھ اچھا سلوک واجب ہے، لیکن واجبات وفرائض کی ادائیگی میں جو حالات عادۃً رکاوٹ بنا کرتے ہیں، ان حالات میں قرآنِ کریم کا عام اسلوب یہ ہے کہ احکام پر عمل کو آسان کرنے کے لیے مختلف پہلوؤں سے ذہنوں کی تربیت کرتا ہے اور ایسے حالات میں تعمیلِ احکام کی پابندی کی مزید تاکید بھی۔

والدین کے بڑھاپے کا زمانہ جب کہ وہ اولاد کی خدمت کے محتاج ہو جائیں، ان کی زندگی اولاد کے رحم وکرم پر رہ جائے، اس وقت اگر اولاد کی طرف سے ذرا سی بے رخی بھی محسوس ہو تو وہ ان کے دل کا زخم بن جاتی ہے، دوسری طرف بڑھاپے کے عوارض طبعی طور پر انسان کو چڑچڑا بنا دیتے ہیں، تیسرے بڑھاپے کے آخری دور میں جب عقل وفہم بھی جواب دینے لگتے ہیں تو ان کے خواہشات ومطالبات کچھ ایسے بھی ہو جاتے ہیں جن کا پورا کرنا اولاد کے لیے مشکل ہوتا ہے۔ قرآنِ کریم نے ان حالات میں والدین کی دل جوئی اور راحت رسانی کے احکام دینے کے ساتھ انسان کو اس کا زمانۂ طفولیت یاد دلایا کہ کسی وقت تم بھی اپنے والدین کے اس سے زیادہ محتاج تھے، جس قدر آج وہ تمہارے محتاج ہیں تو جس طرح انھوں نے اپنی راحت وخواہشات کو اُس وقت تم پر قربان کیا اور تمہاری بے عقلی کی باتوں کو پیار کے ساتھ برداشت کیا، اب جبکہ ان پر محتاجی کا یہ وقت آیا تو عقل وشرافت کا تقاضا ہے کہ ان کے اس سابق احسان کا بدلہ ادا کرو۔ آیت میں کما ربیانی صغیرًا سے اسی طرف اشارہ کیا گیا ہے (معارف القرآن ۵/ ۴۶۶، کتب خانہ نعیمیہ، دیوبند)۔

اس لیے ان ہاسٹلوں میں رہنے کے لیے اپنے والدین وبزرگوں کو مجبور کرنا تو کجا، اس کی فہمائش کرنا یا ان کے سامنے اس کا اشارہ کرنا بھی ان کو اذیت دینا ہوگا، جو کہ حرام ہے۔

(۸) اجتماعی کفالت کے لئے خصوصی طور پر زکوۃ کی رقم کا استعمال:

اول درجہ تو یہی ہے کہ ایسے حضرات کے عزیز واقارب ان کی کفالت کا انتظام کریں، جیسا کہ بدائع الصنائع میں ہے:

خاندان کے کچھ مفلس رشتے دار، اپاہج ولاچار ہوں یا معذور ومفلوج ہوں یا مجنون واندھے پن کا شکار ہوں، دست وپا بریدہ یا شل زدہ ہوں تو ان کا نفقہ معہود ترتیبِ فقہی کے اعتبار سے خاندان کے دیگر صحیح الاعضاء متمول رشتے داروں پر واجب ہوتا ہے (بدائع الصنائع: ۴/ ۴۴۶)۔

البتہ اگر عزیز واقارب کو اس کی توفیق نہ ہو تو ان کی علاحدہ اجتماعی کفالت کا نظم کیا جانا ضروری ہے، جس میں اگر جن لوگوں کی اجتماعی کفالت کی جا رہی ہے، وہ تمام مستحقین زکوٰۃ کی فہرست میں شامل ہوں تو نہ صرف یہ کہ ایسا کرنا جائز ودرست ہے بلکہ بہتر واحسن ہے، جس کے لیے وہی طریقہ اختیار کیا جا سکتا ہے جو کہ عموماً مدارس میں اختیار کیا جاتا ہے اور ضرورت مند طلبہ کی کفالت کی جاتی ہے۔ اس لیے کہ یہ حضرات معذور ہیں اور اسلام نے معذورین پر کسی قسم کا معاشی بوجھ نہیں رکھا، کتاب وسنت میں اس کے واضح اشارے موجود ہیں۔

علامہ شبلی نعمانیؒ کی کتاب سے ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

زکوٰۃ کا سب سے اہم مصرف یہ ہے کہ اس سے لنگڑے، لولے، اندھے، بوڑھے، کوڑھی، مفلوج اور دوسرے معذور لوگوں کی امداد کی جائے، نادار، یتیموں، بیواؤں اور ان لوگوں کی خبر گیری کی جائے جو اپنی کوشش اور جدوجہد کے باوجود روزی کا سامان نہیں کر پاتے، یہ زکوٰۃ کا وہ مصرف ہے جو تقریباً ہر قوم میں اور ہر مذہب میں ضروری خیال کیا گیا ہے اور ان مستحقین کی قابلِ افسوس حالت' جو کسی مزید تشریح کی محتاج نہیں، لیکن اسلام نے ان کے علاوہ زکوٰۃ کے چند اور ایسے مصارف مقرر کیے ہیں، جن کی اہمیت کو خاص طور سے صرف اسلام ہی نے محسوس کیا ہے (سیرۃ النبی ۵/ ۷، ۱۲، مکتبہ مدنیہ، لاہور)۔

سید قطب شہید رحمہ اللہ نے دورِ فاروقی کا ایک واقعہ نقل کیا ہے:

حضرت عمرؓ نے ایک بوڑھے نابینا کو ایک دروازے پر بھیک مانگتے دیکھا، دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ یہودی ہے۔ آپؓ نے اس سے پوچھا: تمھیں کس چیز نے اس حالت تک پہنچایا؟ اس نے جواب دیا: جزیہ، ضرورت اور بڑھاپے نے۔ حضرت عمرؓ اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے گھر لے گئے اور اتنا کچھ دیا جو اس وقت کی ضروریات کے لیے کافی تھا، پھر آپؓ نے بیت المال کے خزانچی کو کہلا بھیجا کہ اس شخص اور اس جیسے دوسرے اشخاص کی طرف توجہ کرو، خدا کی قسم! یہ انصاف کی بات نہیں کہ ہم اس کی جوانی کی کمائی کھائیں اور بڑھاپے میں اسے دھتکار دیں اور آپؓ نے اس فرد اور اس جیسے دوسرے افراد کو جزیے سے بری قرار

دے دیا (العدالۃ الاجتماعیۃ فی الاسلام اردو: ۳۔۸۷)۔

علامہ شبلی نعمانیؒ تحریر فرماتے ہیں:

(حضرت عمرؓ کے زمانہ خلافت میں) عام حکم تھا اور اس کی ہمیشہ تعمیل ہوتی تھی کہ ملک کے جس قدر اپاہج، از کاررفتہ، مفلوج وغیرہ ہوں سب کی تنخواہیں بیت المال سے مقرر کردی جائیں، لاکھوں سے متجاوز آدمی فوجی دفتر میں داخل تھے جن کو گھر بیٹھے خوراک ملتی تھی، بلا تخصیص مذہب حکم تھا کہ بیت المال سے ان کے روزینے مقرر کردیے جائیں (الفاروق ۲ / ۱۹۷-۱۹۶)۔

دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:

یہ جو قاعدہ تھا کہ جو مسلمان اپاہج اور ضعیف ہوجاتا تھا اور محنت ومزدوری سے معاش نہیں پیدا کرسکتا تھا، بیت المال سے اس کا وظیفہ مقرر ہوجاتا تھا، اسی قسم کی، بلکہ اس سے زیادہ فیاضانہ رعایت ذمیوں کے ساتھ بھی تھی (الفاروق ۲ / ۱۵۷)۔

(۹) حکومت کی طرف سے امدادی وظیفہ، ٹیکس میں رعایت وغیرہ سے مطلوب عمر کی حد سے کم میں فائدہ اٹھانا:

سوال کے مطابق جو چیز ان حضرات کے لیے نہیں ہے، اس کو حاصل کرنے کے لیے انہیں کچھ نہ کچھ ایسا کرنا پڑے گا جو دھوکے کے زمرے میں آئے گا، مطلب یہ کہ وہ قبل از وقت ان سہولیات کو حاصل کرنے کے لیے غلط کاغذات وغیرہ بنوائیں گے یا اسی طرح اور کچھ اور کام انجام دیں گے، جب کہ اسلام میں کسی کو بھی دھوکہ دینا حرام ہے، پھر اس صورت میں یہ بھی ممکن ہے کہ بعض ضرورت مند اپنے حق سے محروم رہ جائیں، اس لیے اس کی اجازت نہیں دی جاسکتی کہ جو لوگ ان رعایتوں کے لیے مطلوب حدِ عمر کو نہ پہنچے ہوں اور وہ ان سے فائدہ اٹھائیں، انہیں حکومت کے اس طرح کے قانون کی خلاف ورزی سے روکا جائے گا۔

جیسا کہ شامی میں ہے: ''إن طاعة الإمام في غير معصية واجبة'' (۴ / ۳۴۴)۔

پھر یہ قانون عوام الناس کی خیر وفلاح ہی کے لیے ہے، جس کی خلاف ورزی میں بعض دینی واخلاقی مفاسد بھی ہیں، حکیم الامت حضرت تھانویؒ کا یہ قیمتی ملفوظ بھی پیش نظر رہے، موصوف ریلوے کی حق تلفی کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں:

عوام الناس کا تو فتویٰ ہی ہے کہ سرکار کا مال جس طرح بھی ملے لے لیا جائے، سب روا ہے، چناں چہ ریل میں بے احتیاطیوں کا مشاہدہ ہوتا ہے، اس طرف توجہ ہی نہیں کہ تعداد سے زیادہ اسباب ریل میں لے جانا چاہیے یا نہیں؟ بعض لوگ کہہ دیتے ہیں کہ کفار کا قانون ماننا ضروری تھوڑا ہی ہے، مگر خوب سمجھ لیجیے کہ یہ قانون ملکی نہیں ہے جو یہ عذر کیا جائے بلکہ یہ قانونِ اجارت کے متعلق ہے، اگر من حیث السلطنت اس کا ماننا ضروری نہ بھی ہوتو من حیث الاستجار تو ماننا ضروری ہے۔ شرائط اجارہ میں سلطنت اور غیر سلطنت برابر ہیں، جن شروط پر اجارہ قرار پائے، ان کا پورا کرنا واجب ہوتا ہے تو ان کا قانون بحیثیت اجارہ تو واجب الامتثال ہے، جب انھوں نے قانون مقرر کردیا ہے کہ پندرہ سیر سے زیادہ کسی کو اسباب بلا کرایہ لے جانے کی اجازت نہیں تو اگر تھوڑا بھی اس سے زیادہ ہوگا تو بوجہ اس کے غیر کی حق تلفی ہونے کے اس کا لے جانا ہرگز جائز نہ ہوگا، لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ کفار کا مال ہے، چاہے جس طرح تصرف کرو، یہ ان کی غلطی ہے۔ بعض لوگوں نے اس کی یہ وجہ گھڑی ہے کہ بہت سے حقوق ہمارے گورنمنٹ کے ذمے رہ گئے ہیں، ہمیں جائز ہے کہ ہم خفیہ طور سے وصول کرلیں، اول تو اس میں یہ بات ہے کہ ساری ریلیں گورنمنٹ کی نہیں ہیں، بہت سی ریلیں کمپنی کی ہیں، دوسرے اگر ساری ریلیں گورنمنٹ کی ہوں تو کیا ہر شخص کا حق گورنمنٹ کے ذمے رہ گیا ہے اور پھر جن کے حقوق گورنمنٹ کے ذمے ہوں بھی تو کیا اس کا حساب ان کے پاس ہے کہ کتنے حق ان کے گورنمنٹ کے ذمے ہیں اور کتنے گورنمنٹ کے ان کے ذمے ہیں۔ یہ سب نفس کی تاویلیں ہیں، بلکہ اگر ثابت بھی ہوجاوے کہ ان کا حق گورنمنٹ کے ذمے رہ گیا ہے، تب بھی حفاظتِ نفس کا مقتضیٰ یہی ہے کہ ایسا نہ کیا جاوے۔ راز اس کا یہ ہے کہ نفس کو جیسی عادت ڈالی جاتی ہے، ویسی ہی پڑ جاتی ہے، اگر اس کی عادت ڈالی گئی تو اس کا خوگر ہوجائے گا اور آئندہ حد سے تجاوز کرے گا، جہاں قطعاً جائز نہ ہوگا وہاں بھی اس عادت پر کاربند ہوگا، نفس کو تو ذرا سا بہانہ چاہیے (حقوق العباد: ۶۵-۷۵، ادارہ اسلامیات، لاہور)۔

☆☆☆

باب سوم مختصر تحریریں

والدین کے حقوق اور عمر رسیدہ اشخاص کے لئے ہاسٹل کی تعمیر

قاضی عبدالجلیل قاسمی[1]

۱- اس سوال میں والدین اور دوسرے رشتہ داروں کو ایک ہی صف میں ذکر کیا گیا ہے، اس کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آئی، کسی رشتہ دار کا نفقہ دوسرے رشتہ دار پر واجب ہونے کے لئے ذی رحم محرم ہونے کے ساتھ اس کا فقیر اور حاجت مند ہونا ضروری ہے، لیکن والدین کا نفقہ اولاد پر واجب ہونے کے لیے ان کا فقیر ہونا کافی ہے، حاجت مند ہونا ضروری نہیں ہے، اس لیے والدین اگر فقیر ہوں اور کمانے پر قادر بھی ہوں تو بھی ان کا نفقہ اولاد پر واجب ہوگا۔ ان کو کمانے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا ہے، لیکن دوسرے ذی رحم محرم رشتہ دار کا نفقہ اس وقت واجب ہوگا جب فقیر ہونے کے ساتھ حاجت مند بھی ہوں یعنی کمانے پر قادر نہ ہوں، اگر کمانے پر قادر ہوں گے تو ان کا نفقہ دوسرے رشتہ دار پر واجب نہ ہوگا۔

''النفقة لكل ذي رحم محرم إذا كان صغيرا فقيرا أو كان امرأة بالغة فقيرة أو كان ذكرا بالغا فقيرا زمنا أو أعمى؛ لأن الصلة في القرابة القريبة واجبة دون البعيدة و الفاصل أن يكون ذا رحم محرم ... ثم لابد من الحاجة و الصغر و الأنوثة و الزمانة و العمي أمارة الحاجة لتحقيق العجز. فإن القادر على الكسب غني بكسبه بخلاف الأبوين؛ لأنه يلحقهما تعب الكسب والولد مأمور بدفع الضرر عنهما. فتجب نفقتهما مع قدرتهما على الكسب'' (الهدایہ ۲/ ۴۴۶-۴۴۷)۔

(ذی رحم محرم کا نفقہ اس وقت واجب ہوگا جبکہ وہ نابالغ اور فقیر ہو یا بالغہ فقیرہ عورت ہو یا مرد بالغ فقیر اپاہج یا نابینا ہو، اس لیے کہ قریبی رشتہ دار کے ساتھ صلہ رحمی کرنا واجب ہے ذی رحم محرم قریبی رشتہ دار ہے...... پھر حاجت کا ہونا بھی ضروری ہے، نابالغ ہونا، عورت ہونا، اپاہج ہونا اور نابینا ہونا حاجت مند ہونے کی علامت ہے، اس لیے کہ وہ عاجز ہے، کیونکہ کمانے پر قادر شخص اپنی کمائی کی وجہ سے حاجت مند نہیں ہے، البتہ والدین اس سے مستثنی ہیں، اس لیے کہ کمانے میں ان کو مشقت ہوگی اور اولاد کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ ان دونوں سے ضرر کو دور رکھے، اس لیے کمانے پر ان کے قادر ہونے کے باوجود ان کا نفقہ اولاد پر واجب ہوگا) (یعنی ان کو کمانے پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔)

اگر والدین فقیر ہوں، کمانے پر قادر نہ ہوں تو تمام فقہاء کے نزدیک ان کا نفقہ اولاد پر واجب ہوگا، علامہ ابن المنذر نے اس پر اجماع نقل کیا ہے۔

''و قد حكى ابن المنذر الإجماع في هذا فقال: و أجمعوا على أن نفقة الوالدين الذين لا كسب لهما و لا مال واجبة في مال الولد'' (الموسوعة الفقهية ۴/ ۷۴)۔

(علامہ ابن المنذر نے اس پر اجماع نقل کیا ہے وہ فرماتے ہیں: اس پر فقہاء کا اتفاق ہے کہ جو والدین فقیر ہوں اور کمانے پر قادر نہ ہوں ان کا نفقہ اولاد کے مال میں واجب ہوگا)۔

البتہ جو والدین فقیر ہوں، لیکن کمانے پر قادر ہوں، ان کا نفقہ اولاد پر واجب ہوگا یا نہیں اس میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے، حنفیہ کے نزدیک

[1] قاضی شریعت، مرکزی دارالقضاء امارت شرعیہ، پھلواری شریف پٹنہ۔

واجب ہے، جیسا کہ ہدایہ سے اوپر نقل کیا گیا، شافعیہ کا اظہر قول اور بعض مالکیہ کی رائے بھی یہی ہے۔

''وقال الحنفية والشافعية الأظهر كما قال النووي و هو قول بعض المالكية: إن كان الأصل فقيرا قادرا على الكسب تجب نفقته على فرعه كذلك، لأن الله تعالى قد أمر بالإحسان إلى الوالدين في إلزام الآباء الكسب مع غنى الأبناء ترك للإحسان إليهم و إيذاء لهم و هو لايجوز'' (الموسوعة الفقهية ۴/۷۵)۔

(حنفیہ اور نووی کے کہنے کے مطابق شافعیہ کا اظہر قول اور بعض مالکیہ کا قول ہے: اگر اصل فقیر ہو اور کمانے پر قادر ہو تو بھی اس کا نفقہ اس کی اولاد پر واجب ہوگا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے والدین کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا ہے، اور اولاد کے غنی ہونے کے باوجود والدین کو کمانے کا حکم دینا ان کے ساتھ حسن سلوک نہ کرنا اور ایذا پہنچانا ہے اور یہ جائز نہیں ہے)۔

۲- اس سوال کا جواب پہلے سوال کے جواب سے واضح ہے۔

۳- والدین کا نفقہ اولاد پر واجب ہونے کے لیے والدین کا فقیر ہونا ضروری ہے، اور دوسرے رشتہ داروں کا نفقہ اس وقت واجب ہوگا جب وہ فقیر ہونے کے ساتھ کمانے سے عاجز بھی ہوں، اس لیے اگر والدین یا دوسرے بوڑھے رشتہ دار فقیر نہیں ہیں تو ان کا نفقہ اولاد پر یا دوسرے رشتہ داروں پر واجب نہ ہوگا، اور جب نفقہ واجب نہ ہوگا تو مطالبہ کرنے کا حق بھی نہ ہوگا۔

''يجب على الرجل أن ينفق على أبويه و أجداده و جداته إذا كانوا فقراء . . . و شرط الفقر؛ لأنه لو كان ذا مال فإيجاب نفقته في ماله أولى من إيجابها في مال غيره'' (ہدایہ ۲/۴۴۵-۴۴۶)۔

(آدمی پر واجب ہے کہ اگر اس کے آباء و اجداد فقیر ہوں تو ان پر خرچ کرے، فقیر ہونے کی شرط اس لیے ہے کہ اگر وہ مالدار ہوں تو ان کا نفقہ خود ان کے مال میں واجب کرنا دوسرے کے مال میں واجب کرنے سے بہتر ہے)۔

۴- (الف) اگر والدین چلنے پھرنے، اٹھنے، بیٹھنے اور ضروریات کو پوری کرنے میں سہارے کے محتاج ہوں اور بیٹے کے سفر میں جانے کی صورت میں ان کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہو تو ان کی اجازت کے بغیر سفر کرنا درست نہ ہوگا، صاحب درمختار نے لکھا ہے کہ جس سفر میں خطرہ ہو اس میں والدین کی اجازت کے بغیر سفر کرنا جائز نہ ہوگا اور جس سفر میں خطرہ نہ ہو ان کی اجازت کے بغیر سفر کرسکتا ہے، علامہ شامی نے بے خطرہ والے سفر کی مثال میں حج و عمرہ اور تجارت کے سفر کو شمار کیا ہے اور سرخسی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ اگر والدین کے ضائع ہوجانے کا اندیشہ ہو تو بلا اجازت سفر کرنا جائز نہ ہوگا۔

''وما لا خطر فيه كالسفر للتجارة والحج والعمرة يحل بلا إذن إلا أن خيف عليهما الضيعة'' (رد المحتار ۶/ ۴۰۲)

(جس میں خطرہ نہ ہو، جیسے تجارت، حج اور عمرہ کے لیے سفر کرنا، بلا اجازت جائز ہوگا، البتہ اگر ان کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہو تو جائز نہ ہوگا)۔

(ب) بیوی پر واجب نہیں ہے کہ وہ شوہر کے گھر میں جھاڑو دے یا اس کے لیے کھانا پکائے۔

''ليس على المرأة خدمة زوجها من العجن و الخبز و الطبخ و نحو ذلك؛ لأن المعقود عليه من جهتها هو الاستمتاع فلا يلزمها ما سواه هذا ما ذهب إليه الجمهور'' (الموسوعة الفقهية ۴۴/ ۵۹)۔

(بیوی پر شوہر کی خدمت کرنا یعنی آٹا گوندھنا، روٹی بنانا اور کھانا پکانا وغیرہ واجب نہیں ہے، اس لیے کہ عورت کی طرف سے جس چیز پر عقد کیا گیا ہے وہ اس کی طرف سے استمتاع پر قدرت دینا ہے، لہٰذا اس کے علاوہ کوئی دوسری چیز اس پر واجب نہ ہوگی، یہ جمہور کا مذہب ہے)۔

''فتاوی قاضی خان'' میں ہے:

''وليس عليها أن تعمل بيدها شيئا لزوجها قضاء من الخبز و الطبخ و كنس البيت وغير ذلك'' (الخانية على هامش الهندية: ۴۴۳)۔

(عورت پر قضاءً واجب نہیں ہے کہ اپنے شوہر کے لیے روٹی بنائے، کھانا پکائے یا گھر میں جھاڑو دے وغیرہ)۔

اسی طرح اگر بیوی شوہر کے کسی رشتہ دار کے ساتھ ایک گھر میں رہنے پر راضی نہ ہو تو شوہر پر واجب ہے کہ اس کے لیے الگ مکان کا انتظام کرے ہدایہ

میں ہے:

"وعلى الزوج أن يسكنها في دار مفردة ليس فيها أحد من أهله إلا أن تختار ذلك" (فتح القدير ۴/۳۹۷)۔

(شوہر پر واجب ہے کہ بیوی کو ایسے تنہا مکان میں رکھے جس میں خود اس کا کوئی رشتہ دار نہ ہو الا یہ کہ عورت اس پر راضی ہو)۔

جب شوہر کی خدمت کرنا عورت پر واجب نہیں ہے اور جب شوہر کی ماں کے ساتھ رہنے پر اس کو مجبور نہیں کیا جاسکتا ہے تو ساس سسر کی خدمت کرنا اس پر کیسے واجب ہوسکتا ہے؟

(ج) ماں باپ کا نفقہ بیٹا بیٹی دونوں پر برابر واجب ہے، ہدایہ میں ہے:

"لا يشارك الولد في نفقة أبويه أحد؛ لأن لهما تأويلا في مال الولد بالنص ولا تأويل لهما في مال غيره؛ ولأنه أقرب الناس إليهما فكان أولى باستحقاق نفقتهما عليه و هي على الذكور والإناث بالسوية في ظاهر الرواية. وهو الصحيح؛ لأن المعنى يشملهما" (هدايه ۲/۴۴۶)۔

(والدین کے نفقہ کے وجوب میں اولاد کے ساتھ کوئی شریک نہ ہوگا، اس لیے کہ اولاد کے مال کے بارے میں تو ان کے حق کی صراحت نص (حدیث) میں ہے، دوسرے کے مال کے بارے میں یہ صراحت نہیں ہے، دوسری وجہ یہ ہے کہ لوگوں میں سب سے قریبی رشتہ دار اولاد ہی ہیں، اس لیے ان ہی پر ان کا نفقہ واجب کرنا زیادہ بہتر ہے اور ظاہر روایت کے مطابق لڑکا لڑکی دونوں برابر ہیں، یہی صحیح ہے، اس لیے کہ اولاد ہونے میں دونوں برابر ہیں)۔

پھر علامہ ابن الہمام نے "فتح القدیر" اور علامہ بابرتی نے "عنایہ" میں اس عبارت کی پوری وضاحت کی ہے۔

"ہدایہ" کی یہ عبارت "الموسوعۃ الفقہیۃ" (۴۱/۷۶) میں بھی ہے،

"ہندیہ" میں ہے: "إذا اختلط الذكور والإناث فنفقة الأبوين عليهما على السوية في ظاهر الرواية. و به أخذ الفقيه أبو الليث، و به يفتى" (هنديه، الفصل الخامس في نفقة ذوي الأرحام: ۵۶۴)۔

اور جب نفقہ بیٹا بیٹی دونوں پر واجب ہے تو خدمت تو بدرجہ اولی دونوں پر واجب ہونا چاہیے، البتہ والدین کی خدمت کے لیے شوہر کو اجازت نہ دینے کا حق ہے یا نہیں؟ اس سلسلہ میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے، شافعیہ وحنابلہ کی رائے ہے کہ شوہر کی اجازت کے بغیر وہ اپنے میکہ نہیں جائے گی، اس سلسلہ میں ہدایہ کی عبارت کی وضاحت کرتے ہوئے علامہ ابن الہمام نے تفصیلی گفتگو کی ہے، اس میں انہوں نے لکھا ہے کہ امام ابو یوسف سے مروی ہے کہ اگر والدین اپنی بیٹی کے پاس آسکتے ہوں تو ان سے ملنے کے لیے بیٹی کو شوہر کی اجازت کے بغیر نہیں جانا چاہیے اور اگر وہ نہ آسکتے ہیں تو وہ جاسکتی ہے، پھر لکھا ہے کہ اگر وہ اپاہج ہوں، بیٹی کی خدمت کے محتاج ہوں تو ان کی خدمت کرنا بیٹی پر واجب ہوگا اور شوہر کے منع کرنے کے باوجود وہ جاسکتی ہے۔

"عن أبي يوسف في النوادر تقييد خروجها بأن لا يقدرا على إتيانها فإن كانا يقدران على إتيانها لا تذهب و هو حسن ... و الحق الأخذ بقول أبي يوسف إذا كان الأبوان بالصفة التي ذكرت... و لو كان أبو ها زمنا مثلا وهو محتاج إلى خدمتها و الزوج يمنعها من تعاهده، فعليها أن تعصيه مسلما كان الأب أو كافرا" (فتح القدير ۴/۳۹۸)

(نوادر میں امام ابو یوسف سے منقول ہے کہ والدین کے پاس جانے میں بیٹی کے لیے یہ قید ہے کہ وہ دونوں اس کے پاس آنے پر قادر نہ ہوں، اگر وہ دونوں اس کے پاس آنے پر قادر ہوں تو وہ نہیں جائے گی، یہی بہتر ہے...... امام ابو یوسف کے قول کو اختیار کرنا بہتر ہے، جبکہ والدین میں مذکورہ صفت موجود ہو ...... اور اگر اس کا باپ اپاہج وغیرہ ہو اور اس کی خدمت کا محتاج ہو اور شوہر اس کو اس کی دیکھ ریکھ سے منع کرے تو اس پر واجب ہوگا کہ شوہر کی نافرمانی کرے خواہ باپ مسلمان ہو یا کافر)۔

"فتاوی خانیہ" میں ہے: "امرأة لها اب زمن ليس له من يقوم عليه و زوجها يمنعها من الخروج إليه و تعاهده كان لها أن تعصي زوجها و تطيع الوالد مؤمنا كان الوالد أو كافر؛ لأن القيام بتعاهد الوالد فرض عليها، فيقدم على حق الزوج" (الخانية على هامش هنديه: ۴۴۳)۔

(اگر کسی عورت کا اپاہج باپ ہو کوئی اس کی خدمت کرنے والا موجود نہ ہو اور اس کا شوہر اس کو اس کے پاس جانے اور اس کی دیکھ ریکھ سے منع کرتا ہو تو اس کو

حق ہے کہ اپنے شوہر کی نافرمانی کرے اور والد کی اطاعت کرے خواہ وہ مومن ہو یا کافر، اس لیے کہ والد کی خدمت کرنا اس پر فرض ہے، لہذا شوہر کے حق پر مقدم ہوگا)۔

''الموسوعہ'' میں ہے: ''فقال الحنفية ليس له منعها من عيادة والد زمن ليس له من يقوم عليه و لا يجب عليها طاعة زوجها إن منعها من ذلك سواء كان الوالد مسلما أو كافرا؛ لأن القيام بخدمته فرض عليها في مثل هذه الحالة. فيقدم على الزوج. وقال الشافعية و الحنابلة: ليس الخروج لعيادة أبيها المريض. إلا باذن الزوج و له منعها من ذلك'' (الموسوعة الفقهية ۴۱/۵۸)۔

(حنفیہ نے کہا: شوہر کو حق نہیں ہے کہ اپنی بیوی کو اپنے اپاہج والد کی عیادت سے، جبکہ اس کی خدمت کرنے والا کوئی نہ ہو منع کرے اگر وہ اس کو اس سے منع کرے تو اس پر اپنے شوہر کی اطاعت واجب نہ ہوگی، خواہ باپ مسلمان ہو یا کافر ہو، اس لیے کہ اس جیسی حالت میں اس کی خدمت انجام دینا اس پر فرض ہوگا لہذا شوہر پر مقدم ہوگا۔ شافعیہ وحنابلہ نے کہا: شوہر کی اجازت کے بغیر اس کو اپنے مریض والد کی عیادت کے لیے نکلنا جائز نہیں ہے۔ شوہر کو اس سے روکنے کا حق ہے)۔

۵- بیٹوں اور بیٹیوں کے لیے اپنی والدہ کے انتقال کے بعد اپنے والد کے دوسرے نکاح میں رکاوٹ بننا جائز نہیں ہے اور والد فقیر ہو اور خدمت کا محتاج ہو تو بیوی اور خادم کا نفقہ بھی اولاد پر واجب ہوگا، بلکہ جن لوگوں کا نفقہ والد پر واجب ہو ان کا بھی نفقہ اولاد پر واجب ہوگا، جیسے اس کے نابالغ بچے یا کنواری بچیاں وغیرہ، الخانیہ میں ہے:

''وكما يجب على الابن الموسر نفقة والده الفقير يجب عليه نفقة خادم الأب امرأة كانت الخادم أو جارية إذا كان الأب محتاجا إلى من بخدمة ... فإن كان الأب زمنا يجبر الإبن على نفقة امرأة نفسه و ولده الصغير و ابنته الكبيرة وعلى نفقة الأب أيضا'' (الخانية على هامش هنديه: ۴۴۸)۔

(جس طرح خوش حال بیٹے پر اس کے فقیر والد کا نفقہ واجب ہے اسی طرح اس پر باپ کے خادم کا نفقہ بھی واجب ہوگا، خواہ خادم مرد ہو یا عورت بشرطیکہ باپ اس کی خدمت کا محتاج ہو..... اگر باپ اپاہج ہو تو بیٹے کو مجبور کیا جائے گا کہ وہ اس کی بیوی، نابالغ بچے، نابالغہ بیٹی اور والد کا نفقہ بھی ادا کرے)۔

''و إن احتاج الأب إلى زوجة و الابن موسر وجب عليه أن يزوجه أو يشتري له جارية. و إن كان للأب زوجتان أو أكثر لم يلزم الإبن إلا نفقة واحدة و يدفعها إلى الأب وهو يوزعها عليهن'' (هنديه: ۵۶۵)۔

(اگر باپ کو بیوی کی ضرورت ہو اور بیٹا خوش حال ہو تو اس پر واجب ہوگا، اس کا نکاح کردے یا اس کے لیے ایک باندی خرید دے، اگر باپ کی دو یا زیادہ بیویاں ہوں تو بیٹے پر صرف ایک بیوی کا نفقہ واجب ہوگا۔ وہ نفقہ باپ کے حوالہ کردے گا اور وہ اس کو ان کے درمیان تقسیم کرے گا)۔

''إن احتاج المنفق عليه إلى خادم فعلى المنفق إخدامه؛ لأن ذلك من تمام كفايته'' (الموسوعة الفقهية ۴۱/۸۱)۔

(جس کا خرچ واجب ہے اگر وہ خادم کا ضرورت مند ہو تو خرچ کرنے والے پر اس کو خادم مہیا کرنا واجب ہوگا، اس لیے کہ یہ اس کی ضرورت میں داخل ہے)۔

۶- والد کی زندگی میں اولاد کا ان سے جائداد کا مطالبہ کرنا ناحق ہے، البتہ اگر اولاد فقیر ہوں ان کے پاس مال نہ ہو اور کمانے سے بھی مجبور ہوں، جیسا کہ فقہ وفتاوی کی کتابوں میں تفصیل مذکور ہے، اور باپ مالدار ہو تو ان کا نفقہ باپ پر واجب ہوگا، وہ ادا نہ کرے تو اس کا مطالبہ کیا جاسکتا ہے۔

۷- اپنی ذمہ داریوں سے راہ فرار اختیار کرتے ہوئے عمر دراز بزرگوں کو ان کی مرضی کے بغیر ان کے لیے بنائے گئے ہوٹلوں میں داخل کرنا جائز نہ ہوگا، البتہ اگر ان کی رضامندی ہو اور ان کی ساری ضروریات کی کفالت کی جائے تو اس سے کوئی حرج معلوم نہیں ہوتا ہے۔

۸- بوڑھے فقیر لوگوں کی اجتماعی کفالت کا انتظام مال زکوۃ سے کرنے میں کوئی حرج محسوس نہیں ہوتا ہے۔ بشرطیکہ ان کی ضروریات اس طرح پوری کی جائیں کہ ان میں تملیک پائی جائے، اگر تملیک کے بغیر ان کی کفالت کی جائے گی تو زکوۃ ادا نہ ہوگی، تفصیل فقہ وفتاوی کی تقریبا تمام کتابوں میں موجود ہے۔

۹- عمر دراز لوگوں کے لیے حکومت کی طرف جو رعایت ملتی ہے، اس رعایت کے لیے مطلوب عمر کو پہنچے بغیر کذب بیانی کے ذریعہ اس رعایت سے فائدہ اٹھانا جائز نہ ہوگا۔ وھو ظاھر

والدین اور معذورین سے متعلق مسائل

مولانا ابوسفیان مفتاحی[1]

۱۔ کوئی شخص بوڑھاپے کی عمر کو پہنچ گیا، لیکن اتنا کمزور نہیں ہے کہ کسب معاش کسی قدر مشقت کے ساتھ ہی وہ کما کر خود اپنی ضروریات پوری کر سکتا ہے تو ایسے شخص کو اس کی اولاد یا اعزہ واقارب جن کے ذمہ اس کا نفقہ واجب ہے اس کو کسب معاش پر مجبور نہیں کر سکتے، اس کو کچھ مشقت کے ساتھ ہی کسب معاش کرنا چاہئے، اولاد وغیرہ کا محتاج نہیں بننا چاہئے، کیونکہ جب تک وہ کسب معاش کر سکتا ہے وہ اس میں مشغول رہے یہی افضل اور سنت انبیاء علیہم السلام ہے، چنانچہ صحیح بخاری کی حدیث ہے۔

''عن المقداد بن معدی کرب قال: قال رسول اللہ ﷺ: ما أکل أحد طعامًا قط خیرا من أن یأکل من عمل یدیہ، وإن نبی اللہ داؤد علیہ السلام کان یأکل من عمل یدیہ'' (رواہ البخاری)۔

یعنی کوئی کھانا نہیں کھایا کبھی بھی جو بہتر ہو اس سے کہ وہ کھائے اپنے دونوں ہاتھوں کے عمل سے کہ وہی افضل ہے یا پاکیزہ ہے، دونوں ہاتھ اس لئے فرمایا کہ اکثر عمل میں دونوں ہاتھوں کا استعمال ہوتا ہے، اور اللہ کے نبی حضرت داؤد علیہ وعلی نبینا الصلاۃ والسلام اپنے دونوں ہاتھوں کے عمل سے کھاتے تھے ان کے خصوصی تذکرہ کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالی نے ان کو تعلیم دیا تھا کہ اللہ تعالی نے فرمایا:

"وعلمناہ صنعۃ لبوس لکم" (سورہ انبیاء: ۸۰) اور ہم نے تمہارے واسطے ان کو زرہ بنانے کا طریقہ سکھایا۔

علامہ مظہر فرماتے ہیں کہ حدیث میں حلال کمائی پر ابھارنا ہے کیونکہ یہ بہت فوائد کو شامل ہے:

(۱) نفع پہنچانا کمائی کرنے والے کو مزدوری کے لینے سے اگر وہ عمل دوسرے کے لئے ہے اور زیادتی کے حاصل ہونے سے اصل پونجی پر اگر عمل تجارت ہو، یعنی اگر وہ تاجر ہو تو تجارت سے مقصود اپنا اصل مال بڑھانا ہے۔

(۲) نفع پہنچانا لوگوں کو ان کے اسباب کے مہیا کرنے سے، مثلاً ان کپڑوں کی تجارت اور ان کے لئے سلائی کرنا اور ان کے مثل جو حاصل ہوتا ہے (کوشش سے جیسے فتوں کا لگانا اور خوراکوں اور پھلوں کی کھیتی کرنا و پیداوار کرنا)۔

(۳) کمانے والا اس میں مشغول ہو کہ بیکاری اور لہو ولعب سے محفوظ رہے گا۔

(۴) اس کی وجہ سے کسر نفس (انکساری) کا مزاج بنا جس کی وجہ سے کم ہوگی نفس کی سرکشی واسکا اترانا۔

(۵) دعا سوال و مانگنے کی ذلت اور دوسروں کی محتاجی سے محفوظ رہے گا۔

اور کمانے والے کی شرط یہ ہے کہ کمائی سے روزی و رزق ملنے کا عقیدہ نہ رکھے، بلکہ اسے محض سبب رزق سمجھے، بلکہ رزق کا عقیدہ رکھے کہ رزق اس اللہ سے ملتا ہے جو کریم ہے، رزق دینے والا ہے، مضبوط طاقت والا ہے، پھر حدیث میں تاکید ہے کہ کمائی کرنا حضرات انبیاء علیہم الصلاۃ والسلام کی سنتوں میں سے ہے، کیونکہ اللہ کے نبی داؤد علیہ وعلی نبینا الصلاۃ والسلام زرہ بناتے تھے اس کو بیچتے تھے اپنی روزی روٹی کے لئے (مرقاۃ ۳/۲۸۶)۔

ایک دوسری حدیث ملاحظہ کیجئے جس کو ابوداؤد وابن ماجہ نے روایت کیا ہے:

''عن عمرو بن شعیب عن أبیہ عن جدہ أن رجلا أتی النبی ﷺ فقال: إن لی مالا وإن والدی یحتاج إلی مالی قال:

[1] جامعہ مفتاح العلوم مئو۔

أنت ومالك لوالدك إن أولادكم من أطيب كسبكم كلوا من كسب أولادكم'' (رواہ ابوداؤد وابن ماجہ)

(حضرت عمرو بن شعیب عن أبیہ عن جدہ اپنے دادا حضرت عمرو بن العاصؓ سے روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص نبی ﷺ کی خدمت میں آیا پھر کہا کہ میرے پاس بہت مال ہے اور میرے والد میرے مال کے محتاج ہیں تو نبی ﷺ نے فرمایا کہ تم اور تمہارا مال تمہارے والد کے لئے ہے، بے شک تمہاری اولاد تمہاری پاکیزہ کمائی ہے تم اپنی اولاد کی کمائی سے کھاؤ) یعنی تمہاری اولاد تمہاری حلال وافضل کمائی ہے تو جو تمہاری اولاد کمائی کرے وہ حلال ہے تمہارے لئے اور حدیث کی دلیل ہے کہ والد کا خرچہ اس کی اولاد پر واجب ہے، واللہ اعلم (مرقاۃ ۳/۵۲۶)۔

پس صاف معلوم ہوا کہ والد محترم جو بوڑھاپے کے باوجود کسب معاش کرسکتا ہے اس کو کسب معاش پر مجبور نہیں کیا جاسکتا وہ از خود کسب معاش کرے تو کرنے دیا جائے۔

پس اگر کہا جائے کہ والدین محترمین کو غنی شمار نہیں کیا جانا کسب معاش پر قادر ہونے کے باوجود؟ تو صاحب ہدایہؒ نے اس کا جواب یوں دیا کہ والدین محترمین کو کسب معاش کی تھکن اور مشکل لاحق ہوگی اور اولاد کو حکم ہے ان سے ضرر و تکلیف کو دفع کریں پس والدین محترمین کا نفقہ اولاد پر واجب ہوگا کسب معاش پر قدرت کے باوجود، واللہ اعلم، (ہدایہ ۲/۴۲۷) تو صاحب ہدایہؒ نے کہا کہ کسب معاش پر قدرت کے باوجود اولاد پر ان کا نفقہ واجب ہے، اس پر خوب غور کیا جائے۔

۲۔ وباللہ التوفیق! سن رسیدہ حضرات کا نفقہ وعلاج مندرجہ ذیل صورتوں میں واجب ہوگا۔

صاحب ہدایہؒ لکھتے ہیں: نفقہ کے علاج کے واجب ہونے میں چند صورتیں ہیں: (۱) محتاج ہونا، (۲) صغیر ہونا، (۳) مؤنث ہونا، (۴) اپاہج ومفلوج ہونا، (۵) نابینا ہونا محتاج ہونے کی علامت ہے عجز کے ثابت ہونے کی وجہ سے اس لئے کہ کسب معاش پر قادر غنی مانا جاتا ہے اپنے کسب کی وجہ سے۔

''ثم لا بد من الحاجة والصغر والأنوثة والزمانة، والعمى إمارة الحاجة لتحقق العجز. فإن القادر على الكسب غني بكسبه'' (ہدایہ ۲/۴۲۷)۔

۳۔ وباللہ التوفیق! جب بوڑھے والدین یا خاندان کے بڑے محتاج نہیں ہیں خود صاحب ثروت ہیں تو اس صورت میں وہ اپنی اولاد سے زیادہ سہولت کے لئے یا دوسرے لوگوں پر خرچ کرنے کے لئے یا کچھ رقم محفوظ کرنے کے لئے زائد رقم کا مطالبہ نہیں کرسکتے، اولاد اپنی خوشی سے دیدیں تو دے سکتے ہیں، اس سلسلہ میں کتاب وسنت میں کوئی اشارہ مجھ بندہ ناچیز کو نہیں ملا، نہ ہی فقہاءؒ کی صریح عبارت مل سکی۔

۴۔ وباللہ التوفیق: ایک اہم مسئلہ: والدین اور بزرگوں کی جسمانی خدمت خاص کر جب انسان چلنے پھرنے، اٹھنے بیٹھنے اور کسی ضرورت کو پوری کرنے میں سہارے کا محتاج ہو جائے، ایسی صورت حال میں اگر بیٹا زیادہ پیسہ کمانے کی غرض سے دوسرے شہر یا دوسری ریاست یا دوسرے ملک میں چلا جائے تو بوڑھوں کی دشواریاں بہت بڑھ جاتی ہیں، ان حالات میں۔

الف: تو زیادہ آمدنی لڑکوں کا اپنے ماں باپ کو چھوڑ کر دوسری جگہ جانا ناجائز ہے، اپنے ہی وطن میں رہ کر زیادہ پیسہ والی کمائی کریں اور خدمت بھی کریں اگر یہ میسر نہ ہو اور علاج ومعالجہ میں کافی رقم صرف ہوتی ہے تو ماں باپ کی اجازت سے ہی اپنے وطن کو چھوڑ کر جاسکتے ہیں، وطن میں رہ کر اتنی کافی رقم حاصل نہیں ہوسکتی اور موبائل وغیرہ سے اکثر ان کا حال معلوم کرتے رہیں کہ حالت زیادہ خراب ہونے کی صورت میں چھٹی لے کر آجائیں اور چھٹی نہ ملنے کی صورت میں مالک کو خبر کردیں کہ ماں باپ موت وحیات کے بیچ میں ہیں، ہم اپنے وطن جارہے ہیں گو کہ اجل کو ٹال نہیں سکتا لیکن ایسی صورت حال میں خدمت تو کرسکتا ہے، اللہ تعالیٰ رزاق ہے، محیی وممیت ہے اور شافی وکافی ہے، ماں باپ آپ کے وجود میں موجد ہیں لہٰذا ان کی قدر کی جانی چاہئے اور ان کے ساتھ حسن سلوک کا معاملہ ہونا چاہئے، ارشاد ربانی ہے: ''أن اشكر لي ولوالديك'' (سورہ لقمان: ۱۴) کہ میری قدر کرو اور اپنے والدین کی قدر کرو۔

ب: وباللہ التوفیق: اگر بہو ساس سسر کے ساتھ مشترک نہیں رہنا چاہتی بلکہ علاحدہ رہنا چاہتی ہے تو اس مسئلہ میں قدرے تفصیل ہے،

صاحب ہدایہؒ (۲/۴۲۱ میں) تحریر فرماتے ہیں: ''وعلى الزوج أن يسكنها في دار مفردة ليس فيها أحد من أهله إلا أن تختار ذلك، لأن السكنى من كفايتها فتجب لها كالنفقة وقد أوجبه الله تعالى مقرونًا بالنفقة. قال العلامة العيني: أراد به ما ثبت في قراءة ابن مسعود في قوله تعالى: أسكنوهن من حيث سكنتم وأنفقوا عليهن من وجدكم اى من

طاقتكم يعنى ما تطيقون، وإذا وجب السكنى حقا لها ليس له أن يشرك غيرها فيه لأنها تتضرر به فإنها لا تأمن على متاعها ويمنعها الإشراك عن المعاشرة مع زوجها ومن الاستمتاع بالجماع ودواعيه إلا أن تختار الزوجة لأنها رضيت بانتقاص حقها. وإن كان له ولد من غيرها فليس له أن يسكنه أي ولدًا معها لما بينا أنها تتضرر به. ولو أسكنها في بيت من الدار مفرد وله أي للبيت غلق كفاها، لأن المقصود قد حصل وله أي للزوج أن يمنع والديها أي الزوجة وولدها من غيره أي الزوج وأهلها أي الزوجة من الدخول عليها أي الزوجه وولدها من غيره أي الزوج وأهلها أي الزوجة من الدخول عليها أي الزوجة لأن اعتزل ملكه فله حق المنع من دخول ملكه"۔

(اور شوہر پر واجب ہے کہ رکھے بیوی کو ایسے الگ گھر میں کہ اس میں کوئی نہ ہو شوہر کے لوگوں میں سے مگر یہ کہ بیوی اپنے علاوہ کو اپنے ساتھ رکھنے کو پسند کرے، کیونکہ سکنی بیوی کی کفایت سے ہے تو واجب ہوگا بیوی کے لئے نفقہ کی طرح اور بتحقیق سکنی کو اللہ تعالی نے واجب کیا ہے علامہ عینیؒ نے کہا ہے کہ مراد لیا ہے اس سے اس کو جو کہ ثابت ہے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی قراءت میں اللہ تعالی کے قول میں، "أسكنوهن من حيث سكنتم وأنفقوا عليهن من وجدكم" یعنی رکھو بیویوں کو جہاں تم رہتے ہو اور ان پر خرچ کرو اپنی طاقت سے یعنی جو تم طاقت رکھتے ہو تو سکنی کو نفقہ سے ملا کر اللہ نے واجب کیا ہے اور جب سکنی بیوی کا حق ہو کر واجب ہے تو شوہر کے لئے جائز نہیں ہے کہ شریک کرے سکنی میں بیوی کے علاوہ کو، کیونکہ دوسرے سے بیوی نقصان و تکلیف میں پڑ جاتی ہے، کیونکہ وہ دوسروں کی شرکت سے اپنے سامان پر مامون نہیں رہتی کہ اس کے سامان کے ضائع ہونا کا خطرہ رہتا ہے اور دوسروں کی شرکت بیوی کو اپنے شوہر کے ساتھ معاشرہ ور رہنے سہنے سے روکتی ہے اور ہمبستری اور بوسہ وغیرہ سے روکتی ہے جس سے عورت کو ضرر لاحق ہوتا ہے، مگر یہ کہ بیوی دوسروں کی شرکت کو پسند کرے، کیونکہ بیوی اپنے حق کے کم ہونے سے راضی ہے، اور اگر اس شوہر کے اولاد ہے اس بیوی کے علاوہ دوسری عورت سے تو شوہر کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ دوسری بیوی اولاد کو اپنی بیوی کے ساتھ رکھے ضرر و تکلیف کی وجہ سے، اور اگر شوہر بیوی کو رکھے اپنے گھر کے الگ کسی کمرہ میں اور اس کمرہ کے لئے تالا ہے تو کافی ہوگا اس کو، کیونکہ شوہر کا مقصود بیوی سے حاصل ہے اور شوہر کے لئے جائز ہے کہ روکے بیوی کے والدین کو اور دوسرے شوہر سے عورت کے تو اولاد کو اور عورت کے لوگوں کو بیوی پر داخل ہونے سے، کیونکہ منزل شوہر کی ملک ہے تو شوہر کے لئے روکنے کا حق ہے اپنی ملکیت میں داخل ہونے سے)۔

ہدایہ کی عبارت سے خلاصہ نکلا کہ اگر بہو ساس و سسر کے ساتھ مشترک نہیں چاہتی تو ایسی صورت حال میں سسر کو چاہئے کہ بہو کے لئے گھر کا کوئی ایک کمرہ اس کے لئے خاص کر دے اور اس کا تالا کنجی اس کے پاس رہے کہ اس کا سامان محفوظ رہے اور پوری آزادی کے ساتھ شوہر ہمبستری کرے اور بوسہ وغیرہ دے کہ کسی کے آنے جانے کا کوئی خطرہ باقی نہ رہے، جیسا کہ ہندوستان کے متوسط مسلم گھرانے میں ہوتا ہے حتی کہ شوہر کو شرعاً یہ حق حاصل اپنے ساس سسر اس کمرہ میں جانے سے روک دے، لیکن ہندوستان کے ماحول میں اپنی لڑکی کے کمرہ میں جانے سے داماد نہیں روکتا کہ یہ بجائے صلہ رحمی کے قطع رحمی کا باعث بن سکتا ہے یہ ماحول بہتر ہے حتی کہ داماد اپنے سالے سالیوں کو بھی نہیں روکتا جبکہ شرعاً وہ روک سکتا ہے اور اپنے بھائی، یعنی عورتوں کے دیور ہر حال میں بھابھی کے کمرہ میں آنے جانے سے سختی سے روکے گا، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورت کے دیور کو موت کہا ہے اور بیوی جب بھی کمرہ میں رہے تو دروازہ بند کر دے اور نکلے تو تالا بند کر دے اور بیوی کے نان نفقہ واجبہ کو ادا کرنے کے لئے لڑکا اپنے باپ کے مشورہ سے اس کے نان نفقہ اور کپڑے وغیرہ انتظام کرے اور اپنے ماں باپ کی بھی مدد کرے اور ان سے مدد لے، کیونکہ بیوی کا نان نفقہ وغیرہ شوہر پر واجب ہے نہ کہ ماں باپ پر ہاں اپنے لڑکے کا تعاون کر سکتے ہیں۔

نیز صاحب "ہدایہ" کی عبارت یہ بھی اشارہ نکلا کہ بہو کا ساس سسر سے علاحدہ رہنے کی صورت میں کوئی خدمت گار موجود نہیں ہو تو بہو ساس کی خدمت کر سکتی ہے جیسا کہ صالح بہوئیں ساس کی خدمت کرتی ہیں اور بیٹیوں کو ان کے شوہروں کی طرف سے میکے میں رہنے کی اجازت نہ ہو تو ایسی مجبوری کی صورت میں بہو ساس کی خدمت کی ذمہ داری نبھائے گی، اور ہمارے ہندوستان میں اگر چند بیٹیاں ہیں تو صورت حال یہ ہے کہ باری باری دن کی تعیین کے ساتھ اپنے شوہروں کی اجازت سے آئیں گی اور ماں کی خدمت کریں گی۔

درمختار مع شامی (۲/ ۷۱۹-۷۲۱) میں ہے کہ "وكذا تجب لها السكنى في بيت خال عن أهله سوى طفله الذي لا يفهم الجماع... وأمته وأم ولده وأهلها ولو ولدها من غيره وكذا تجب لها أي للزوجة السكنى أي الإسكان وتقدم اسم النفقة يعمها افردها؛ لأن لها حكما يخصها قوله خال عن أهله الخ؛ لأنها تتضرر بمشاركة غيرها فيه؛ لأنها لا تأمن على متاعها ويمنعها ذلك من المعاشرة مع زوجها ومن الاستمتاع إلا أن تختار ذلك؛ لأنها رضيت بانتقاص حقها.

قوله:وأمته وأم ولده قال فى الفتح. وأما أمته فقيل: أيضًا لا يسكنها معها إلا برضاها. والمختار أن له ذلك؛ لأنه يحتاج إلى استخدامها فى كل وقت غير أنه لا يطأها بحضرتها. كما أنه لا يحل له وطئ زوجته بحضرتها ولا بحضرة الضرة. وذكر أم الولد فى البحر معزيًا إلى آخر الكنز قلت: وذكر فى الذخيرة: أن هذا مشكل. إما على المعنى الأول من التضرر بمشاركة غيرها فظاهر، وأما على الثانى أى منعها من المعاشرة مع زوجها فلأنه تكره المجامعة بين يدى أمته. لو قلت:وقد يكون إضرارا أم ولده لها أكثر من إضرار ضرتها. وفى الدر المنتقى عن المحيط أن أم الولد كأمته. قوله:وأهلها أى له منعهم من السكنى لمعها فى بيته سواء كان ملكا له أو إجارة أو عارية (بقدر حالهما) كطعام وكسوة وبيت منفرد من دار له له غلق (قوله:وبيت منفرد)أى ما يبات فيه ووهو محل منفرد معين. والظاهر أن المراد بالمنفرد ما كان مختصًا بها ليس فيه ما يشاركها به أحد من أهل الدار زاد فى الاختيار. يعنى ومثله فى الزيلعى وأقره فى الفتح بعد ما نقل من القاضى الإمام. أنه إذا كان له غلق يخصه وكان الخلاء مشتركًا ليس لها أن تطالبه بمسكن آخر. ومفاده لزوم كنيف ومطبخ. (قوله ومفاده لزوم كنيف ومطبخ) أى بيت الخلاء وموضع الطبخ بأن يكونا داخل البيت أو فى الدار لايشاركها فيهماأحد من أهل الدار. قلت:وينبغى أن يكون هذا فى غير الفقراء الذين يسكنون فى الربوع والأحواش بحيث يكون لكل واحد بيت يخصه... الخ``۔

خلاصہ کلام: یہ نکلا کہ ساس کو خدمت کی ضرورت ہے اور بہو کے علاوہ کوئی خدمت گار نہیں ہے اور بیٹیوں کو ان کے شوہروں کی طرف سے میکے میں آنے کی اجازت نہیں ہے تو ایسی صورت حال میں بہو کے ساس پر ساتھ نہ رہنے کی وجہ سے اس کی اخلاقی ذمہ داری ہوگی کہ ساس کی خدمت کرے اور شرعاً بہو کو ساس سسر کے ساتھ رہنے پر مجبور نہیں جائے گا، تمام تفصیلات، ہدایہ درمختار اور شامی کی عبارتوں میں ملاحظہ کرلیا جائے۔

ج: وباللہ التوفیق: ماں باپ کی خدمت بیٹے اور بیٹیوں پر دونوں برابری کے ساتھ واجب ہے ظاہر روایت میں اور یہی صحیح ہے، اس لئے کہ ماں باپ کا خدمت کا مستحق ہونا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان مبارک ''أنت ومالک لأبیک'' کی وجہ سے ہے اور یہ فرمان بیٹے اور بیٹیوں دونوں کو شامل ہے تو دونوں خدمت کے سلسلہ میں برابر ہوں گے گو کہ ہندوستان کے ماحول میں مال شوہر کے پاس ہوتا ہے تو لڑکیاں اپنے شوہروں سے طلب کر کے ماں باپ کی خدمت کر سکتی ہیں، اور اگر شوہر نہ دے تو وقتاً فوقتاً بدنی خدمت کر سکتی ہیں اور ہندوستان کے ماحول میں شوہر عورت کے مانگنے پر انکار نہیں کرتا، اور انکار نہیں کرنا چاہئے، اور یہ بھی صورت ممکن نہ ہو تو جو رقم شوہر عورت کو اپنے خرچ کے لئے دیتا ہے اس میں سے ماں باپ کی خدمت کرے۔

بعض اوقات بیٹیاں اپنے والدین کی مجبوری اور بے بسی کو دیکھتے ہوئے اپنے والدین کی خدمت کرنا چاہتی ہیں، لیکن ان کے شوہر ان کو اس کی اجازت نہیں دیتے تو ان کے شوہر کو اس کا حق حاصل ہے، لیکن ان کے شوہر کو اجازت دیدینا چاہئے کیونکہ صلہ رحمی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم دیا ہے اور آپ خود صلہ رحمی کرتے تھے چنانچہ بدء الوحی کی حدیث میں حضرت خدیجہؓ سے یہی مروی ہے کما فی الصحیحین، اور اللہ تعالی نے فرمایا ہے: وصاحبهما فى الدنيا معروفًا (سورہ لقمان: ۱۵)

خلاصہ کلام: یہ کہ شوہر کو تو اجازت نہ دینے کا حق حاصل ہے، لیکن دور حاضر میں اتنی شدت مناسب نہیں ہے اجازت دیدینا چاہئے کہ اس میں زوجین کے ساتھ آپسی حسن معاشرت ہے اس پس منظر کو سامنے رکھنا چاہئے۔

ہدایہ (۲/۴۲۶) میں ہے:

''ولا يشارك الولد فى نفقة أبويه أحد؛ لأن لهما تاويلا فى مال الولد بالنص. وهو قوله ﷺ: ''أنت ومالك لأبيك'' فكانا غنيين بماله (عنايه) ولا تاويل لهما فى مال غيره. ولأن الولد أقرب الناس إليهما فكان الولد أولى باستحقاق نفقتهما؛ لأنها صلة وجبت بالقرابة فمن كان أقرب فهو أولى بالاستحقاق (عنايه) ونفقة الأبوين على الذكور والإناث بالسوية فى ظاهر الرواية احترازًا عما ذكر شمس الأئمة السرخسى فى شرح الكافى عن الحسن عن أبى يوسف عن أبى حنيفة أن النفقة بين الذكور والإناث للذكر مثل حظ الأنثيين على قياس الميراث. وعلى قياس نفقة ذوى الأرحام (عينى) وهو أى ظاهر الرواية الصحيح، لأن المعنى يشملهما وبيانه أن استحقاق الأبوين. إنما هو

باعتبار التاویل وحق الملك لهما فی مال الولد لقوله ﷺ: أنت ومالك لأبيك وهذا المعنى يشمل الذكور والإناث، فيكونان سواء، ولهذا يثبت لهما هذا الاستحقاق مع اختلاف الملة وإن انعدم التوارث (عنايه)۔

علامہ ابن قدامہؒ (۷/ ۲۰) میں لکھتے ہیں: وللزوج منعها من الخروج من منزله إلى مالها بد سواء أرادت زيارة والديها أو عيادتهما أو حضور جنازة أحدهما قال أحمد فی امرأة لها زوج وأم مريضة: طاعة زوجها أوجب عليها من أمها إلا أن يأذن لها وقد روى ابن بطة فی أحكام النساء عن أنس أن رجلًا سافر ومنع زوجته من الخروج فمرض أبوها فاستأذنت رسول الله ﷺ فی عيادة أبيها فقال لها رسول الله ﷺ: اتقی الله ولا تخالفی زوجك فمات أبوها فاستأذنت رسول الله ﷺ فی حضور جنازته فقال لها اتقی الله ولا تخالفی زوجك فأوحى الله إلى النبی ﷺ إنی قد غفرت لها بطاعة زوجها؛ ولأن طاعة الزوج واجبة والعيادة غير واجبة، فلا يجوز ترك الواجب لما ليس بواجب ولا يجوز لها الخروج إلا بإذنه ولكن لا ينبغی للزوج منعها من عيادة والديها وزيارتهما؛ لأن فی ذلك قطعية لهما وحملًا لزوجته على مخالفته، وقد أمر الله تعالى بالمعاشرة بالمعروف، وليس هذا من المعاشرة بالمعروف"۔

۵۔ وبالله التوفیق: ہندوستان کے معاشرہ میں عام طور پر کہ بیٹے اور بیٹیاں اپنی والدہ کے فوت ہونے کے بعد والد کے دوسرے نکاح میں رکاوٹ بنتے ہیں، جبکہ وہ حق زوجیت جماع واسباب جماع اور نان نفقہ وغیرہ پر پوری طرح سے قدرت رکھتا ہے تو ان کا رکاوٹ بننا صحیح نہیں ہے کیونکہ گناہ میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہے، بلکہ اگر اس کی قدرت نہ ہو تو اس عمر کے سرد وگرم کو سہنا اس کے لئے آسان ہوجائے کیونکہ وہ بوڑھاپے میں بھی اس معنی کے لئے بیوی کا محتاج ہوتا ہے اور اگر خود والد میں اپنی بیوی کی کفالت کی استطاعت نہ ہو تو اس سلسلہ میں اولاد پر کفالت کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے کیونکہ وہ باپ کی منکوحہ ہے۔

خلاصہ کلام: یہ ہے کہ ہندوستان کے معاشرہ میں عام طور پر ایسا ہونا شریعت کے مزاج کے منافی ہے اور اگر خود والد میں اپنی بیوی کی کفالت نہیں ہے تو اس سلسلہ میں اولاد پر اس نسبت سے کفالت کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے، کیونکہ وہ بھی باپ کی منکوحہ ہے اور اولاد کی سوتیلی ماں ہے۔

دیکھئے مغنی ابن قدامہ (۶/ ۴۴۶) میں ہے: "قال ابن مسعود: لو لم يبق من أجلی إلا عشرة أيام واعلم أن الموت فی آخرها يومًا ولی طول النكاح فيهن لتزوجت مخافة الفتنة، وقال ابن عباس لسعيد بن جبير: تزوج فإن خير هذه الأمة أكثرها نساء، وقال إبراهيم بن ميسرة: قال لی طاؤس تنكحن أولا قولن لك ما قال عمر لأبی الزوائد مايمنعك عن النكاح إلا عجز أو فجور، قال أحمد فی رواية المروزی ليست العربية من أمر بالإسلام فی شیء وقال: من رغب إلى غير التزويج فقد رغب إلى غير الإسلام ولو تزوج بشر كان قد تم أمره۔

۶۔ وبالله التوفیق: بعض اوقات والد کی زندگی میں ہی جائداد کا مطالبہ شروع کردیتے ہیں اور اس سے اپنا حق سمجھتے ہیں، اولاد کو والد کی زندگی میں والد کی جائداد اور ملکیت اپنی حق سمجھنا نہیں چاہئے والد کے مرنے کے بعد اولاد کا حق ہوتا ہے، لیکن اولاد والد سے جائیداد کے مطالبہ کی گنجائش ہے اگر والد سے جائیداد کا مطالبہ کیا گیا تو والد اپنے لئے اور اپنی بیوی کے لئے حصہ الگ کر کے جائیداد کو تقسیم کرسکتا ہے، یہ گنجائش ایسی صورت میں اور بہتر ہے، جبکہ والدین کی مابقی حالت بہتر اور اولاد محتاج ہوں۔

زندگی میں جائیداد کی تقسیم میں لڑکے اور لڑکیوں کے درمیان برابری کرنا مستحب ہے، اور فتاوی قاضی خاں میں ہے کہ محبت وخدمت گزاری اور علم وتقوی وغیرہ کی وجہ سے بعض اولاد کو دوسرے اولاد سے زیادہ دینے میں کوئی حرج نہیں ہے اگر اس سے دوسروں کو نقصان پہنچانے کا ارادہ نہ ہو تب، اور اگر کسی نقصان پہنچانے اور محروم کرنے کا ارادہ ہو تو امام ابو یوسفؒ کے نزدیک انکے درمیان برابری کرے گا لڑکی کو لڑکے کی طرح دے گا اور اسی پر فتوی ہے اور اگر والد اپنی صحت میں اپنی زندگی میں کل مال لڑکے کو دیدیا تو جائز ہے اور گنہ گار ہوگا کیونکہ اس میں باقی اولاد کو محروم کرنا لازم آرہا ہے جو ناجائز ہے۔

درمختار مع شامی (۴/ ۵۷۳۰) میں ہے: "وفی الخانية: لا بأس بتفضيل بعض الأولاد فی المحبة؛ لأنها عمل القلب وكذا فی العطايا، إن لم يقصد به الإضرار، وإن قصده سوّى بينهم يعطی البنت كالابن عند الثانی أی الامام ابی یوسف وعليه أی على قول أبی يوسف الفتوى من أن التنصيف بين الذكر والأنثى أفضل من التثليث الذی هو قول محمد. ولو وهب فی صحته كل المال للولد جائز وأثم"۔

خلاصہ کلام: یہ ہے کہ والد کی زندگی میں ہی اولاد کا والد سے جائیداد کے مطالبہ کی گنجائش ہے خصوصاً ایسی صورت میں کہ والدین کی معاشی حالت بہتر ہے اور اولاد محتاج ہیں۔

اب حدیث ملاحظہ کیجئے: ''عن النعمان بن بشير أن أباه أتاه إلى رسول الله ﷺ فقال: إني نحلت ابني هذا غلامًا فقال: أكل ولدك نحلت مثله؟ قال لا. قال: فارجعه، وفي رواية أنه قال: أيسرك أن يكونوا إليك في البر سواء قال: بلى قال: فلا إذا. وفي رواية أنه قال: أعطاني أبي عطية فقالت عمرة بنت رواحة لا أرضى حتى تشهد رسول الله ﷺ فأتى رسول الله ﷺ فقال: إني أعطيت ابني من عمرة بنت رواحة عطية فأمرتني أن أشهد لك يارسول الله. قال: أعطيت سائر ولدك مثل هذا؟ قال: لا. قال فاتقوا الله واعدلوا بين أولادكم قال: فرجع فرد عطية. وفي رواية أنه قال: لاأشهد على جور'' (متفق علیہ)۔

حدیث کا حاصل یہ ہے کہ والد اپنی زندگی میں ہی اولاد لڑکے لڑکیوں کے درمیان برابر تقسیم کرے اپنی جائیداد کو، اسی کو رسول اللہ ﷺ نے عدل وانصاف قرار دیا، اور اس کے خلاف کرنے کو جور وظلم قرار دیا۔

۷۔ وباللہ التوفیق: مغربی ملکوں جن میں یہود ونصاریٰ اور غیر اسلام مذہب والوں کا تسلط ہے جن کی اتباع میں اب ہمارے ملک ہندوستان میں بھی جگہ جگہ انہیں کے طرز پر ہاسٹل بن رہے ہیں، جن میں نوجوان اپنے بزرگوں کو داخل کر دیتے ہیں ان میں عمر دراز حضرات اپنی ضرورت کی ساری چیزیں تیار مل جاتی ہیں اور اجنبی ہم عمر لوگ مل جاتے ہیں، لیکن اس کا ایک زبردست نقصان ہے جس کی تلافی ناممکن ہے وہ یہ ہے کہ وہ اپنے رشتہ داروں کی محبت سے محروم ہو جاتے ہیں بوڑھاپے کی عمر میں بلکہ ارزل العمر میں ہر انسان، بلکہ اس کے گھر کے لوگ چاہتے ہیں کہ اس کے بال بچے اس کے قریب رہیں، اولاد اور پوتے پوتیوں کو دیکھ کر اس کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں اور ایسے ہاسٹلوں میں اس کی یہ خواہش ایک حسرت بن جاتی ہے تو ایسے ہاسٹلوں میں شرعی نقطہ نظر یہ ہے کہ اسلام کے خلاف ہے اور اس میں غیروں کی مشابہت ہے اور اللہ کے رسول ﷺ نے غیروں کے ساتھ مشابہت اختیار کرنے والوں کے بارے میں فرمایا: ''من تشبہ بقوم فھو منھم'' (حدیث) یعنی جو کسی قوم کی کسی طرح کی کوئی مشابہت اختیار کرے گا تو وہ ان ہی میں ہوگا، حدیث سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کو ایسے ہاسٹل بنانا جائز نہیں ہے کہ وہ مسلمانوں میں نہیں غیروں میں شمار ہوں گے عند اللہ لہذا ایسے ہاسٹلوں سے اللہ کی پناہ جن میں اسلام کے ضد میں ایک سازش ہے کہ بوڑھے اور معذور مسلمانوں کو ان کے رشتہ داروں اور اولاد اور پوتے پوتیوں سے ملنے سے اور ان کی محبت سے دور ہو جائیں تو اس سازش کی مسلمانوں کو مخالفت لازم ہے اور اپنے بوڑھوں اور معذوروں کو ان میں ہرگز داخل نہ کریں اور ان کو اپنے لوگوں میں رکھیں یہ اسلام کا مزاج ہے اور شرعی نقطہ نظر ہے جس کی اتباع لازم ہے اور ان کو ایسے ہاسٹلوں میں قیام پر مجبور کرنا جائز نہیں ہے۔

خلاصہ کلام:...... ایسے ہاسٹلوں کے بارے میں شرعی نقطہ نظر یہ ہے کہ اسلامی شریعت کے خلاف ہے کہ ان میں غیروں کی نقل اور ان کے ساتھ مشابہت ہے، کوئی شخص اپنے بزرگوں کو ایسے ہاسٹلوں میں قیام پر مجبور کرنا جائز نہیں ہے، ایسے ہاسٹلوں سے الامان والحفیظ کہ اس میں واضح طور سے غیروں کی اسلام کے خلاف ایک سازش ہے جس کی مخالفت ضروری ہے، ''لعن اللہ الیھود والنصاری والہندوس وأمثالہم''۔

۸۔ وباللہ التوفیق: جو لوگ بوڑھاپے کی عمر میں اگر ان کا ہاتھ پیسوں سے خالی ہو اور اس کی اولاد یا قریبی رشتہ دار موجود نہ ہوں تو ایسے لوگوں کی اجتماعی کفالت کے لئے خصوصی طور پر زکوۃ کی رقم استعمال کی جا سکتی ہے۔

خلاصہ کلام: یہ ہے کہ ایسے لوگوں کے لئے زکوۃ کی رقم استعمال کی جا سکتی ہے۔

۹۔ وباللہ التوفیق: عمر دراز لوگوں کے لئے حکومتوں نے مختلف چیزوں بعض خصوصی رعایتیں دے رکھی ہیں جیسے ٹرین وغیرہ میں کرایہ میں تخفیف، حکومت کی طرف سے امدادی وظیفہ، ٹیکس میں رعایت وغیرہ تو جو لوگ ان رعایتوں کے لئے مطلوب مقرر حد عمر کو نہ پہنچے ہوں ان کے لئے ایسی رعایتوں سے فائدہ اٹھانا جائز نہ ہوگا۔

خلاصہ کلام: صورت مسئولہ میں حکومت کی ان رعایتوں کے لئے جو لوگ مطلوب مقررہ حد عمر کو نہ پہنچے ہوں ان کے لئے ایسی رعایتوں سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں۔

خاندان کے معمر افراد اور والدین کے حقوق - اسلامی تناظر میں

مولانا قمر الدین محمود قاسمی[1]

۱۔ والدین کو جو حقوق اور ان کی اطاعت وفرمانبرداری اور ان کو راحت رسانی سے متعلق احکام قرآن وحدیث وغیرہ سے ثابت ہیں ان کی روشنی میں اولاد پر والدین کے حقوق کی انجام دہی لازم وواجب ہے۔

والدین اپنے بچوں کے لئے ان کے بچپن میں بے انتہا تکلیفیں اور مشقتیں اٹھاتے ہیں ان کی ہر خواہش وتمنا کو پورا کرتے ہیں، یہاں تک کہ اکثر لوگ شریعت کے خلاف کی بھی ان کی آرزوئیں پوری کرتے ہیں، اگر وہ بیمار ہوں تو ان کے دوا علاج کے لئے اپنی حیثیت سے بھی زیادہ خرچ کرتے ہیں، اگر اپنی حیثیت نہ ہو تو قرض لے کر بھی ان کا علاج کرتے ہیں اسی طرح ان کی دینی ودنیوی تعلیم کے لئے بھی بے حساب خرچ کرتے ہیں قرض لے کر بھی ان کی تعلیم کے اخراجات کا بندوبست کرتے ہیں یہاں تک کہ ان کی شادی کے لئے بھی فکرمند رہتے ہیں اور مناسب رشتہ مل جانے پر ان کی شادی بھی کرا دیتے ہیں اور شادی کے اخراجات بھی عموماً والدین ہی کرتے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ والدین اپنے بچوں کے لئے ہر قسم کی تکالیف برداشت کرتے ہیں، اسی لئے قرآن وحدیث میں خاص طور پر ان کے حقوق کی ادائیگی کی تاکید کی گئی ہے اور اداء حقوق سے کوتاہی اور غفلت برتنے پر وعیدات مرتب کی گئی ہیں اور اسے حرمان وبدنصیبی شمار کیا گیا ہے بلکہ عقوق والدین (نافرمانی) کو گناہ کبیرہ بتایا گیا ہے۔

قرآن کریم میں حق تعالی کا ارشاد ہے:

"وقضى ربك ألا تعبدوا إلا إياه وبالوالدين إحسانا إما يبلغن عندك الكبر أحدهما أو كلاهما فلا تقل لهما أف ولا تنهرهما وقل لهما قولًا كريمًا واخفض لهما جناح الذل من الرحمة وقل رب ارحمهما كما ربياني صغيرًا" (سورہ بنی اسرائیل: ۲۳، ۲۴)۔

اس آیت کریمہ میں پہلا حکم "ألا تعبدوا إلا إياه" ہے کہ اس معبود برحق کے سوا کسی کی عبادت مت کرو اور دوسرا حکم اداء حقوق والدین کا ہے، چنانچہ فرماتے ہیں کہ تم اپنے ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کیا کرو اگر وہ تیرے پاس ہوں اور ان میں سے ایک یا دونوں بڑھاپے کی عمر کو پہنچ جائیں (جس کی وجہ سے محتاج خدمت ہو جائیں) (اور جبکہ طبعًا ان کی خدمت کرنا بھاری معلوم ہو) (اس وقت بھی اتنا ادب کرو) کہ ان کو کبھی اف بھی مت کہنا اور نہ ان کو جھڑکنا اور ان سے خوب ادب سے بات کرنا اور ان کے سامنے شفقت سے انکساری کے ساتھ جھکے رہنا اور ان کے لئے یوں دعا کرتے رہنا کہ اے میرے پروردگار ان دونوں پر رحمت فرمایئے جیسا انہوں نے مجھ کو بچپن کی عمر میں پالا پرورش کیا ہے۔ اف نہ کہنے کا مطلب ناگوار بات کہنے سے بچنا ہے یہاں تک کہ ان کی بات سن کر اس طرح لمبا سانس لینا جس سے ان پر ناگواری کا اظہار ہو اس کا حکم بھی کلمہ اف کہنے کا ہوگا۔ امام قرطبیؒ فرماتے ہیں کہ اس آیت میں حق تعالی نے والدین کے ادب واحترام اور ان کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کو اپنی عبادت کے ساتھ ملا کر واجب فرمایا ہے، جیسا کہ سورہ لقمان میں اپنے شکر کے ساتھ والدین کے شکر کو ملا کر لازم فرمایا ہے، قوله تعالى: "أن اشكر لي ولوالديك" (سورہ لقمان: ۱۴) یعنی میرا شکر ادا کرو اور اپنے والدین کا بھی۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ جل شانہ کی عبادت کے بعد والدین کی اطاعت سب سے اہم اور اللہ تعالی کے شکر کی طرح والدین کا شکرگزار ہونا واجب ہے، صحیح بخاری کی یہ حدیث بھی اسی پر شاہد ہے جس میں یہ ہے کہ ایک شخص نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب عمل کیا ہے آپ نے ارشاد فرمایا: نماز اپنے وقت میں، اس نے پھر دریافت کیا کہ اس کے بعد کونسا عمل سب سے زیادہ محبوب ہے تو

[1] خادم حدیث دار العلوم بڑودہ، ناظم ادارہ اصلاح المسلمین گجرات بڑودہ، مہتمم دار العلوم محمودیہ دیگاڈ بھوئی۔

آپ نے فرمایا: والدین کے ساتھ اچھا سلوک (صحیح بخاری ۲ / ۸۸۲)۔

(۲) اسی طرح مسند احمد، ترمذی، ابن ماجہ، مستدرک حاکم میں بسند صحیح حضرت ابودرداءؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ باپ جنت کا درمیانی دروازہ ہے، اب تمہیں اختیار ہے کہ اس کی حفاظت کرو یا ضائع کردو (تفسیر مظہری)۔

(۳) اسی طرح بخاری شریف میں ہے کہ ایک شخص حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں آیا اور دریافت کیا کہ میری حسن صحبت (سلوک) کا سب سے زیادہ مستحق کون ہے آپ نے فرمایا کہ تیری ماں، اس نے پوچھا پھر کون آپ نے فرمایا: تیری ماں اس نے پوچھا پھر کون آپ نے فرمایا تیری ماں اس نے پوچھا پھر کون آپ نے فرمایا تیرا باپ (بخاری شریف ۲ / ۸۸۳)۔

مذکورہ آیات واحادیث سے والدین کے حقوق کی اہمیت صاف طور پر معلوم ہوتی ہے، والدین کی خدمت واطاعت کا واجب ہونا کسی زمانہ اور عمر کے ساتھ خاص نہیں ہے ہر وقت حسن سلوک ضروری ہے، بالخصوص بڑھاپے کے وقت انتہائی ضروری ہے، والدین کے بڑھاپے کا زمانہ جبکہ وہ اولاد کے محتاج ہوجائیں ان کی زندگی اولاد کے رحم وکرم پر رہ جائے اس وقت اولاد کی طرف سے ذراسی بے رخی بھی محسوس ہوتی ہے تو وہ ان کے دل کا زخم بن جاتی ہے، دوسری طرف بڑھاپے کے عوارض انسان کو چڑچڑا بنادیتے ہیں، تیسرے بڑھاپے کے آخری دور میں جب عقل وفہم بھی جواب دینے لگتے ہیں تو ان کی خواہشات ومطالبات کچھ ایسے بھی ہوجاتے ہیں کہ ان کا پورا کرنا اولاد کے لئے مشکل ہوجاتا ہے، قرآن حکیم ان حالات میں والدین کی دلجوئی اور راحت رسانی کے لئے احکام دینے کے ساتھ انسان کو اس کے بچپن کا زمانہ یاد دلاتا ہے کہ کسی وقت تم بھی اپنے والدین کے اس سے زیادہ محتاج تھے جس قدر آج وہ تمہارے محتاج ہیں پس جس طرح انہوں نے اپنی راحت وخواہشات تم پر قربان کیں اور تمہاری بے عقلی کی باتوں کو پیار کے ساتھ برداشت کیا اب جبکہ ان پر یہ محتاجی کا وقت آیا تو عقل وشرافت کا تقاضا یہ ہے کہ ان کے سابقہ احسانات کا بدلہ ادا کرو۔

ان مذکورہ تفصیلات کے ضمن میں سوالات کے جوابات حسب ذیل ہیں؛

جواب ۱: اگر باپ اتنا بوڑھا ہوگیا ہے کہ وہ کسب معاش نہیں کرسکتا یا اگر کرسکتا ہے تو بڑی مشقت اور تکلیف کے ساتھ تو ایسی صورت میں اولاد پر لازم ہے کہ وہ ان کو کسب معاش سے سبکدوش کردیں اور ان کا نفقہ اپنے ذمہ لے لیں، اولاد نہ ہونے کی صورت میں ایسے بوڑھے شخص کا نفقہ جن پر شریعت نے واجب کیا ہے، ان کے ذمہ اس کی کفالت واجب ہوگی۔

جواب نمبر ۲: سن رسیدہ حضرات مالی اعتبار سے نہایت کمزور ہوں اور کسب معاش پر وہ قادر نہ ہوں اور نہ ان کے پاس اتنا سرمایہ جمع ہو کہ جس سے وہ اپنی ضروریات پوری کرسکیں تو ان کے روزمرہ کے اخراجات کی کفالت اسی طرح اگر وہ بیمار ہوں تو ان کے دوا علاج وغیرہ کے خرچ کی ذمہ داری اولاد پر ہوگی۔

جواب نمبر ۳: بوڑھے والدین جن کا نفقہ اولاد پر واجب ہے اگر وہ محتاج نہ ہوں خود صاحب مال ہوں اور اولاد بھی صاحب مال ہو تو ایسی صورت میں زیادہ سہولت کے لئے یا خوردونوش میں توسع کے لئے اولاد سے زائد رقم کا مطالبہ کرسکتے ہیں، اسی طرح دوسرے قرابت داروں پر خرچ کرنے کے لئے یا کچھ رقم اپنے پاس محفوظ کرنے کے لئے اگر اولاد کے پاس اتنی وسعت ہو تو زائد رقم کا مطالبہ کرسکتے ہیں، حدیث میں ''أنت ومالک لأبیک'' فرمایا گیا ہے، اس کی روشنی میں والدین کو اپنی اولاد سے اس طرح کے مطالبہ کا حق حاصل ہے۔

لیکن اگر والدین صاحب مال ہوں اور اولاد صاحب مال نہیں ہے تو اس صورت میں اس طرح کی زائد رقم کے مطالبہ کا حق حاصل نہیں ہوگا۔

خاندان کے دوسرے بڑے بوڑھے جن کا نفقہ محتاجی کی صورت میں چھوٹوں پر یا شریعت نے جن پر نفقہ کی ذمہ داری ڈالی ہے ان سے بڑے بوڑھے صرف اپنے اخراجات کے بقدر محتاجی کی صورت میں رقم لے سکتے ہیں۔ زائد رقم کے مطالبہ کا حق ان کو حاصل نہیں ہوگا اور اگر یہ بڑے بوڑھے صاحب مال ہیں تو اس صورت میں چھوٹوں سے نفقہ کی وصولی کا حق انہیں حاصل نہیں ہوگا، اس لئے کہ وہ صاحب مال ہیں تو اپنے ذخیرہ کردہ مال میں سے اپنے ضروری اخراجات پورے کرسکتے ہیں۔

جواب نمبر ۴: والدین جبکہ ضعیف ہوں، چلنے پھرنے اٹھنے بیٹھنے اور کسی ضرورت کو پورا کرنے میں سہارے کے محتاج ہوں، ایسی صورت میں اگر بیٹا

زیادہ کمانے کی غرض سے دوسرے شہر یا دوسرے ملک میں چلا جائے تو اس میں تفصیل ہے۔

(الف) اگر بوڑھے والدین کے دو یا تین لڑکے ہوں اور ان میں سے ایک یا دو لڑکے اپنے والدین کی تیمارداری اور خدمت کے لئے تیار ہوں اور وہ والدین کے ساتھ رہنے کے لئے راضی اور تیار ہوں تو اس صورت میں والدین کی رضامندی اور اجازت سے ایک بیٹا جو دوسرے ملک جانا چاہتا ہے وہ جاسکتا ہے، لیکن وقتاً فوقتاً ان کی خبر گیری کرتا رہے، اور اگر ایک ہی لڑکا ہے اور والدین محتاج ہیں، خدمت اور سہارے کے محتاج ہیں تو اس صورت میں والدین کی خدمت اس پر واجب ہوگی اور مال کمانے کے لئے اس کو دوسرے شہر یا دوسرے ملک میں جانے کی اجازت نہ ہوگی، کیونکہ بخاری شریف کی حدیث میں ہے کہ ایک شخص نے جہاد میں جانے کے لئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت مانگی تو آپ نے پوچھا کہ والدین حیات ہیں اس نے کہا کہ حیات ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ والدین کی خدمت میں جدوجہد کرو (یعنی والدین کی خدمت کرو) مطلب ہے کہ جہاد میں جانے کی اجازت نہیں دی۔

یہ اس صورت میں ہے جبکہ جہاد میں جانا فرض کفایہ کے درجہ میں ہو، اگر کسی وقت جہاد فرض عین بن جائے تو اس صورت میں والدین کی خدمت سے جہاد مقدم ہوگا۔

''أخبرنا سفيان عن حبيب عن أبي العباس عن عبدالله بن عمرو قال: قال رجل للنبي ﷺ: أجاهد قال لك أبوان؟ قال نعم قال ففيهما فجاهد'' (رواه البخاری ۲/ ۸۸۳)۔

جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاد میں جانے کی اجازت نہیں دی تو پھر دنیا کمانے کے لئے جانے کی اجازت کس طرح ہوسکتی ہے۔

(ب) اگر بہو (لڑکے کی بیوی) ساس سسر کے ساتھ رہنا نہ چاہتی ہو یا اس کی ساس کو خدمت کی ضرورت ہو اور کوئی خدمت گار موجود نہ ہو تو بہو کو ساس سسر کے ساتھ رہنے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا، اسی طرح ساس کی خدمت پر بہو کو شرعاً مجبور نہیں کیا جاسکتا، اخلاقی طور پر بہو کے لئے مناسب یہ ہے کہ وہ ساس کی خدمت کرے اور ثواب حاصل کرے جیسے اس کے ماں باپ ہیں اسی طرح شوہر کے ماں باپ بھی اس کے ماں باپ کہلاتے ہیں تو اس اعتبار سے اخلاقی طور پر اس کے لئے مناسب ہے کہ وہ ساس کی خدمت کرے اور اجر وثواب کی مستحق بنے، اصل خدمت کا حق بیٹوں کا ہے خدمت ان پر واجب ہے اگر وہ خدمت نہ کرسکتے ہوں تو بیٹوں پر لازم ہے کہ ایک خادمہ اجرت پر رکھے جو ان کی ماں کی خدمت کرے، فتاوی محمودیہ میں ہے:

ساس کی خدمت:......سوال: زید کی بیوی زچگی کی وجہ سے میکے گئی ہے، زید نے کہا کہ میری ماں کی خدمت کرو ہندہ نے کہا کہ خدمت کے لئے دوسری عورت دیکھ لو میں خدمت نہیں کروں گی اس سلسلہ میں آپ کی کیا رائے ہے؟

الجواب: شرعاً ہندہ کے ذمہ شوہر کی ماں کی خدمت واجب نہیں ہے لیکن اخلاقی طور پر اس کا خیال کرنا چاہئے کہ وہ اس کے شوہر کی ماں ہے تو اپنی ماں کی طرح اس کو بھی راحت پہنچانے کا خیال رکھے اور شوہر کی اطاعت کرے

''وحقه عليها أن تعطيه في كل مباح يأمرها به'' (الدر المختار علی ہامش رد المحتار ۲/)۔

آخر جب ہندہ کو ضرورت پیش آتی ہے تو شوہر کی ماں اس کی خدمت کرتی ہے، اس طرح آپس کے تعلقات خوشگوار رہتے ہیں اور مکان آباد رہتا ہے، البتہ شوہر کو بھی چاہئے کہ اپنی بیوی سے نرمی اور شفقت کا معاملہ کرے اس کو سمجھائے کہ میں تمہاری ماں کا احترام کرتا ہوں اور ان کو اپنی ماں کی طرح سمجھتا ہوں تم بھی میری ماں کو اپنی ماں کی طرح سمجھو......الخ۔

حررہ العبد محمود غفرلہ دار العلوم دیوبند

الجواب صحیح بندہ نظام الدین

(ج) ماں باپ کی خدمت صرف بیٹوں پر واجب ہے، بیٹیاں اگر شادی شدہ ہیں تو ان پر ماں باپ کی خدمت واجب نہیں ہے ہاں اگر ان کے شوہران کو اجازت دیں تو وہ خدمت کرسکتی ہیں، اگر بیٹیاں شادی شدہ نہیں ہیں اور ماں باپ کے ساتھ رہتی ہیں تو اس صورت میں ان پر ماں باپ کی

خدمت واجب ہوگی۔

بیٹیوں کے شوہر ماں باپ کی زیارت وملاقات سے روک نہیں سکتے، لیکن ماں باپ کے گھر جا کر ان کی خدمت کرنے سے روک سکتے ہیں، بیٹوں پر لازم ہے کہ وہ اگر خود خدمت نہ کر سکتے ہوں تو خادم خادمہ رکھ کر ماں باپ کی خدمت کرائیں۔

جواب نمبر ۵: بڑھاپے میں جبکہ اس کی بیوی کا انتقال ہو گیا ہو اگر وہ دوسری شادی کرنا چاہتا ہے تو اس کو اس کی اجازت ہے اولاد کو شادی سے روکنے کا حق نہیں ہے، کیوں کہ مرد کو بعض مرتبہ ایسی مجبوری پیش آجاتی ہے بیماری وغیرہ کی وجہ سے کہ اس کو اس وقت میں عورت کی ضرورت ہوتی ہے اس لئے اگر بڑھاپے میں وہ دوسری شادی کرنا چاہتا ہے تو اس کی اجازت ہے اگر ایسی کوئی مجبوری اور ضرورت نہ بھی ہو تب بھی وہ دوسری شادی کر سکتا ہے، کیونکہ نکاح کرنا یہ اس کا شرعی حق ہے، لہذا اولاد کو اس شرعی حق سے روکنے کا حق نہیں ہے۔

اگر خود والد میں اپنی بیوی کی کفالت کی استطاعت نہ ہو تو اولاد پر کفالت کی ذمہ داری ہوگی، کیونکہ جب والد نے شادی کر لی تو وہ اس کی بیوی ہوگئی اور اولاد کی وہ سوتیلی ماں بن گئی سوتیلی ماں کے ناتے سوتیلی اولاد پر بھی اس کا حق بنتا ہے، اس لئے اگر والد کے اندر کفالت کی استطاعت نہ ہو تو اولاد پر ان کی کفالت کی ذمہ داری عائد ہوگی۔

جواب نمبر ۶: والد نے جو مال کمایا ہے یا اسے جائز طریقہ سے وہ مال یا جائیداد ملی ہے تو وہ خود اس کا مالک ہے اولاد اس کی مالک نہیں ہے اور والد کو اس میں پورا تصرف کا حق حاصل ہے لہذا والد کی حیات میں اولاد کو مال یا جائیداد کے حصہ کے مطالبہ کا حق حاصل نہیں ہے۔

اگر والد اپنی زندگی میں اولاد کو اپنی مرضی اور خوشی سے اپنی جائیداد یا مال میں سے حصہ دینا چاہتا ہے تو یہ تبرع سمجھا جائے گا اور اس صورت میں بہتر یہ ہے کہ تمام اولاد کو خواہ وہ بیٹے ہوں یا بیٹیاں برابر سرابر دے اور اسے تقسیم وراثت نہیں شمار کیا جائے گا، کیونکہ وراثت موت کے بعد جاری ہوتی ہے۔ موت کے بعد وراثت کی تقسیم میں حصص شرعیہ کے مطابق تقسیم ہوگی۔

جواب نمبر ۷: مغربی ملکوں میں عمر دراز لوگوں کے لئے ہاسٹل بنا دیئے گئے ہیں اور ان میں بوڑھے ماں باپ کو داخل کر دیا جاتا ہے اور سال میں ایک دو مرتبہ ان کی خبر گیری کر لیتے ہیں اور اولاد یہ سمجھتی ہے کہ ہم نے ان کا حق ادا کر دیا یہ مغربی معاشرہ اور تمدن ہے، وہاں ہر قسم کی عریانی اور فحاشی اور آزادی ہے یہاں تک کہ ان کا نسب بھی محفوظ نہیں ہے، بچوں کے حقوق ماں باپ پر یا ماں باپ کے حقوق بچوں پر کیا ہیں وہاں کا معاشرہ اس سے عاری ہے، وہاں کے نوجوان اپنی عیاشی میں مست ہیں ان کے بوڑھے ماں باپ کو وہ اپنے لئے بوجھ محسوس کرتے ہیں اس مغربی معاشرہ کا اثر ہندوستان میں بھی آیا ہے اور ہندوستان کے باشندے بھی مغربی اقوام کی تقلید کو باعث فخر سمجھتے ہیں، اس کے برخلاف اسلام نے ایسے معاشرہ کی تشکیل کی ہے جس میں انسانوں کے آپس کے حقوق، رشتہ داروں کے حقوق، پڑوسیوں کے حقوق، ایک محلہ اور شہر اور ملک والوں کے حقوق آپس کے، بچوں کے حقوق ماں باپ پر اور ماں باپ کے حقوق اولاد پر یہ سب واضح طور پر بیان کئے گئے ہیں اور ان کو اپنانے کی ترغیب اور حکم دیا گیا ہے اور اس پر عمل پیرا ہونے کی صورت میں اخروی اجر وثواب کا وعدہ کیا گیا ہے۔

ہندوستان میں بھی ایسے ہاسٹل بوڑھوں کے لئے بنائے جا رہے ہیں، مگر ہندوستان کا معاشرہ یورپی مغربی معاشرہ سے پورا ہم آہنگ نہیں ہے اور ہندوستان میں غیر مسلموں میں بھی ایسی قومیں اور ایسے خاندان وقبائل موجود ہیں جو اپنے بزرگوں کا احترام کرتے ہیں اور ان کی راحت رسانی کو باعث فخر سمجھتے ہیں۔

لہذا ہندوستان میں ایسے ہاسٹلوں میں مسلمانوں کا اپنے بوڑھے والدین کو رکھ دینا یہ اسلامی طور وطریق اور طرز معاشرت سے ہم آہنگ نہیں ہے، اسلام نے بوڑھے ماں باپ کے ساتھ جس حسن سلوک کا حکم دیا ہے اور ان کی خدمت اور راحت رسانی کو واجب قرار دیا ہے اس کی تعمیل ہر مسلمان کا شرعی واخلاقی فریضہ ہے۔

ایسے ہاسٹلوں میں قیام کے اندر بہت ساری قباحتیں ہیں ایک برائی یہ بھی ہے کہ وہاں مسلم اور غیر مسلم بڑے بوڑھوں کا اجتماع ہوگا بلکہ غیر مسلم وہاں زیادہ ہوں گے اور ساتھ رہنے کی صورت میں ان کے عقائد کفریہ، اطوار وعادات اور طرز معاشرت سے کچھ نہ کچھ متاثر ہونا لازم آئے گا جوان کے لئے اخروی اعتبار سے نقصان دہ ہوگا اور اس کے ذمہ دار وہ ہوں گے جو ان کو ایسے ہاسٹلوں میں رکھنے والے ہیں۔

دوسرا نقصان کا پہلو یہ بھی ہے کہ وہ رشتہ داروں کی محبت سے محروم ہو جاتے ہیں اور بسا اوقات وہاں اکیلے رہنے سے کڑھن محسوس کرتے ہیں اور اکیلے پن اور اولاد کی بے توجہی کا احساس بھی انہیں ستاتا ہے۔

ایسے ہاسٹلوں میں بوڑھے ماں باپ کو رکھنے میں ظاہری اعتبار سے تھوڑے بہت فوائد ہوں مگر اس میں نقصانات زیادہ ہیں دنیوی اور اخروی دونوں اعتبار سے اولاد کے لئے بھی اور ماں باپ کے لئے بھی، لہذا شرعی نقطہ نظر سے بوڑھے ماں باپ کو ایسے ہاسٹلوں میں رکھنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی اور ان کو وہاں کے قیام پر مجبور نہیں کیا جاسکتا۔

جواب نمبر ۸: بڑھاپے کی عمر میں اگر انسان کا ہاتھ خالی ہو تو اس کی بے سہارگی اور بڑھ جاتی ہے اور اگر اس کی اولاد یا قریبی رشتہ دار موجود نہ ہوں تب تو انسان اپنے آپ کو اس دنیا میں تنہا محسوس کرنے لگتا ہے، کیا ایسے لوگوں کی اجتماعی کفالت کے لئے خصوصی طور پر زکوۃ کی رقم استعمال کی جاسکتی ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ایسے بے سہارا لوگوں کے لئے زکوۃ کی رقم استعمال کر سکتے ہیں، شریعت نے نادار اور غریب لوگوں کے لئے مال زکوۃ کو ان پر خرچ کرنے کا حکم دیا ہے اللہ جل شانہ کا ارشاد ہے: "إنما الصدقات للفقراء والمساكين والعاملين عليها والمؤلفة قلوبهم وفي الرقاب والغارمين وفي سبيل الله وابن السبيل" (سورہ توبہ: ۶۰)۔

زکوۃ کے مستحق اصناف ثمانیہ میں ایسے بے سہارا لوگ بھی شامل ہیں، زکوۃ وصدقات وانفاق کے جو مستحقین ہیں، ان کی تفصیلات کتب حدیث وفقہ میں موجود ہیں نیز ان کے فضائل قرآن وحدیث میں موجود ہیں۔

ایسے بے سہارا لوگوں کے لئے اجتماعی طور پر بھی زکوۃ کی رقم استعمال کی جاسکتی ہے اور انفرادی طور پر بھی بشرطیکہ وہ صاحب نصاب نہ ہوں۔

جواب نمبر ۹: عمر دراز لوگوں کے لئے حکومتوں نے مختلف چیزوں میں بعض خصوصی رعایتیں رکھی ہیں ان خصوصی رعایتوں سے وہی لوگ فائدہ اٹھا سکتے ہیں جن کے لئے وہ خصوصی رعایتیں رکھی ہیں مثلاً ملک کے بعض طبقات کے لئے کچھ خصوصی مراعات حکومت نے رکھی ہیں تو جو لوگ ان طبقات میں نہیں آتے ان کے لئے ان مراعات سے فائدہ اٹھانے کا جواز نہیں ہوگا، اسی طرح جن عمر رسیدہ لوگوں کے لئے بعض چیزوں میں مراعات رکھی ہیں اور اس کے لئے عمر کا جو نشانہ حکومت نے متعین کیا ہے اس سے کم عمر کے لوگوں کے لئے ان مراعات سے فائدہ اٹھانے کا جواز نہیں ہوگا۔

الف: کیونکہ اس صورت میں حکومت کے ساتھ کے معاہدہ کی خلاف ورزی ہوگی حکومت کے بنائے ہوئے وہ قانون جو شریعت کے خلاف نہ ہوں اس میں مسلمانوں پر بھی ان کی رعایت اور پابندی ضروری ہے۔

ب: نیز اس صورت میں جھوٹ بول کر یا غلط بیانی کر کے ان مراعات کو حاصل کرنا بھی جائز نہیں ہے، کیونکہ جھوٹ بولنا گناہ کبیرہ ہے اور اس سے احتراز لازم ہے۔

ج: نیز اس صورت میں اگر قانون کی خلاف ورزی کی وجہ سے وہ پکڑا جائے گا تو اس میں بے آبروئی اور بے عزتی ہوگی اور ایک مسلمان کو اپنی عزت وآبرو کی حفاظت بھی ضروری ہے۔

☆☆☆

معذوروں اور بوڑھوں کے حقوق - اسلام کی روشنی میں

مولانا مفتی جمیل احمد نذیری [1]

۱۔ اولاد، اپنے والدین کو کسب معاش پر مجبور نہیں کرسکتی، مجبور کرنا درج ذیل آیات کریمہ کے خلاف ہے:

الف: "وقضی ربك ألا تعبدوا إلا إياه وبالوالدين إحسانا، إما يبلغن عندك الكبر أحدهما أو كلاهما فلا تقل لهما أف ولا تنهرهما وقل لهما قولا كريما، واخفض لهما جناح الذل من الرحمة وقل رب ارحمهما كما ربياني صغيرا" (سورہ بنی اسرائیل: ۲۳، ۲۴)

(تمہارے رب نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو، اور والدین کے ساتھ حسن سلوک کیا کرو، اگر تمہارے پاس ایک یا دونوں کے دونوں بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو کبھی ان کو اُف نہ کہنا، اور ان کو جھڑکنا مت، اور ان سے خوب ادب سے بات کرنا اور ان کے سامنے نرمی سے انکساری کے ساتھ جھکے رہنا، اور یوں دعا کرتے رہنا: اے مرے پروردگار! ان دونوں پر رحمت نازل فرمایئے جیسے انہوں نے مجھے بچپن میں پالا ہے)۔

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے: "وصاحبهما في الدنيا معروفاً" (لقمان: ۱۵) (اور دنیا میں ان کے ساتھ خوبی سے بسر کرنا)۔

مذکورہ بالا آیات کی تفاسیر سے صاف ظاہر ہے کہ والدین پر کسی قسم کا دباؤ ڈالنا جس سے ان کے آرام وراحت میں خلل پڑے، اور انہیں صرف اپنے فائدہ کے لئے کسی ایسی چیز سے روکنا جو وہ چاہتے ہیں درست نہیں، ظاہر ہے کہ وہ کسب معاش کے جھمیلے میں نہیں پڑیں گے تو وہ عبادت کے لئے ہی زیادہ فارغ رہیں گے، اور آرام وراحت اور سکون کی زندگی گزاریں گے، اور کسب معاش پر مجبور کرنا انہیں ان چیزوں سے روکنا ہے کہ خوبی کے ساتھ بسر کرنے کے خلاف ہے۔

(۲) اسی طرح اعزہ واقرباء، جن کے ذمہ ان کا نفقہ واجب ہے، کسب معاش پر مجبور نہیں کرسکتے، حدیث نبوی: "ولم يؤقر كبيرنا" (تفسیر طبری الجزء الخامس عشر ص ۶۷، تفسیر قرطبی الجزء العاشر ص ۱۵۸، تفسیر روح المعانی ۱۵/ ۵۶ آیت زیر بحث، ترمذی ۲/ ۱۴) کے خلاف ہے، اپنی ذمہ داری سے فرار اختیار کرتے ہوئے اس قسم کا دباؤ توقیر واکرام کے سراسر خلاف ہے۔ وجوب نفقہ کے لئے صرف "فقر" شرط ہے، کمانے کی طاقت ہونا یا نہ ہونا شرط نہیں ہے، لہذا جس کے ذمہ جس کسی کا بھی نفقہ واجب ہوگیا وہ دوسرے کو کمانے کے لئے مجبور نہیں کرسکتا۔

۲۔ شرعاً فقیر ہونے کی صورت میں واجب ہوگا۔ "وعلى الرجل أن ينفق على أبويه وأجداده وجداته إذا كانوا فقراء وإن خالفوا في دينه" (ہدایہ ۲/ ۴۴۵، فتح القدیر ۳/ ۳۴۹) (آدمی پر لازم ہے کہ وہ اپنے والدین، اپنی اولاد، دادیوں اور نانا، نانیوں کا نفقہ برداشت کرے اگر وہ فقیر ہوں، اگرچہ دین میں اس کے مخالف ہوں (غیر مسلم ہوں)۔

۳۔ زائد رقم کا مطالبہ کرسکتے ہیں، اور اولاد کو جس حد تک پورا کرنے کی گنجائش ہو، مطالبہ پورا کرنا چاہئے تاکہ وہ کبیدہ خاطر نہ ہوں، کیونکہ ان کی خاطر داری اور دل رکھنا، اولاد پر اور چھوٹوں پر لازم ہے، اور ان کا یہ مطالبہ کوئی ناجائز مطالبہ بھی نہیں ہے، یہ سب "وبالوالدين إحسانا" اور "واخفض لهما جناح الذل من الرحمة" (سورہ اسراء: ۲۳، ۲۴) اور "وصاحبهما في الدنيا معروفا" (سورہ لقمان: ۱۵) میں داخل ہے۔

۴۔ الف: سورہ لقمان میں ہے: "أن اشكر لي ولوالديك" (لقمان: ۱۴) (میری اور اپنے والدین کی شکر گزاری کیا کرو)۔

بیان القرآن میں حضرت مولانا اشرف علی تھانوی لکھتے ہیں:

"حق تعالیٰ کی شکر گزاری تو عبادت واطاعت حقیقیہ کے ساتھ، اور ماں باپ کی خدمت اور ادائے حقوق شرعیہ کے ساتھ" (تفسیر بیان القرآن آیت زیر بحث)

---

[1] مہتمم جامعہ عربیہ عین الاسلام نواداہ مبارکپور۔

سورہ لقمان میں دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے: "وصاحبهما في الدنيا معروفا" (لقمان: ۱۵) (اور دنیا میں ان کے ساتھ خوبی کے ساتھ بسر کرو)۔

"بیان القرآن" میں ہے:

"اور ہاں! یہ ضرور ہے کہ دنیا کے (حوائج و معاملات) میں (جیسے انفاق و خدمت وغیرہ) ان کے ساتھ خوبی کے ساتھ بسر کرنا (بیان القرآن آیت زیر بحث)

ان کے علاوہ والدین کی خدمت واطاعت، دیکھ بھال وخبر گیری اور ان کی طلب رضا وغیرہ کے سلسلہ میں بہ کثرت احادیث نبویہ موجود ہیں (مشکوۃ المصابیح کتاب البر والصلۃ ۲/ ۴۱۸)، ان سب کی روشنی میں یہی ثابت ہوتا ہے کہ سوال میں درج صورت حال میں بیٹا، ماں باپ کی دیکھ بھال کا معقول اور مناسب انتظام کردے تو جاسکتا ہے، ورنہ نہیں جاسکتا۔

ب: بہو کو ساس سسر کے ساتھ رہنے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا، شوہر کو خود انتظام کرنا چاہئے، خواہ خدمتگار رکھ کر، البتہ بہو کی اخلاقی ذمہ داری ہے کہ وہ ساس سسر کی خدمت کرے، اور ان کی ضروریات کا خیال رکھے، کیونکہ وہ اس کے والدین کے درجہ میں ہیں۔

ج: ماں باپ کی خدمت اور نفقہ بیٹوں اور بیٹیوں دونوں پر واجب ہے۔

وهي على الذكور والإناث بالسوية في ظاهر الرواية (بدايه ۲/ ۴۴۶، فتح القدير ۳/ ۳۴۹)۔

شوہر کی اجازت نہ دینا درست نہیں، اور ایسی صورت میں شوہر کی اطاعت نہ کی جائے۔

"عن ابن عمر قال قال رسول اللہ ﷺ: السمع والطاعة على المرء المسلم فيما أحب وكره ما لم يؤمر بمعصية. فإذا أمر بمعصية فلا سمع ولا طاعة"، متفق عليه (مشكوة المصابيح ۲/ ۳۱۹)۔

(عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: مرد مسلم پر سمع وطاعت ہے، اس میں بھی جسے وہ پسند کرے اور اس میں بھی جسے ناپسند کرے جب تک معصیت کا حکم نہ دیا جائے، اور جب معصیت کا حکم دیا جائے تو کوئی سمع وطاعت نہیں)۔

"عن علي قال: قال رسول اللہ ﷺ: لا طاعة في معصية إنما الطاعة في المعروف" (متفق علیہ حوالہ مذکورہ)

(حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: معصیت میں کوئی طاعت نہیں، طاعت صرف نیکی میں ہے)۔

۵۔ بیٹے اور بیٹیوں کو، اپنے والد کے دوسرے نکاح میں رکاوٹ بننا درست نہیں، خاص طور پر اس صورت میں جس کا سوال میں تذکرہ ہے، اگر والد اپنی اس دوسری بیوی کی کفالت کی استطاعت نہ رکھتا ہو تو کفالت کی ذمہ داری اس کی اولاد کی ہوگی۔

رد المحتار میں ہے: "(قوله وعليه نفقة زوجة أبيه) أي في رواية، وفي أخرى إن كان الأب مريضا أو به زمانة يحتاج للخدمة" (رد المحتار على الدر المختار ۲/ ۶۷۱)۔

(اولاد پر، باپ کی بیوی (سوتیلی ماں) کا نفقہ ہے، ایک روایت میں (یہ حکم مطلقاً ہے) اور دوسری روایت میں ہے کہ یہ حکم اس وقت ہے جب باپ مریض ہو یا اپاہج ہو اور خدمت کا محتاج ہو)۔

۶۔ زندگی میں اپنی پوری جائیداد کا مالک باپ ہے، اولاد نہیں، لہذا اولاد کو مطالبہ کرنے کا حق نہیں ہے، لیکن اگر والدین کی معاشی حالت بہتر ہو اولاد محتاج ہو تو والدین کو خود ہی دیدینا چاہئے، خاص طور سے اس صورت میں جب ان کے مرنے کے بعد جائیداد کے بٹوارے میں نزاع کا اندیشہ ہو، لیکن سب دے کر اولاد کا بالکل محتاج نہ بن جائے۔

۷۔ نہیں مجبور نہیں کرسکتا، بالکل حرام اور ناجائز ہے، ان کو اذیت پہنچانا ہے جس کی کہیں سے بھی اجازت نہیں، "وصاحبهما في الدنيا معروفا" (سورہ لقمان: ۱۵) کے بھی خلاف ہے، اور ان ساری آیتوں کے بھی جن کا ذکر جواب ۱ اور ۲ کے تحت گزرا۔

۸۔ ایسے لوگوں کی کفالت کے لئے زکوۃ استعمال کی جاسکتی ہے، کیونکہ وہ مصرف زکوۃ بن چکے ہیں۔

۹۔ جو لوگ، رعایت کی مطلوبہ مقررہ حد تک نہ پہنچے ہوں، انہیں اس رعایت سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں۔

والدین وخاندان کے بزرگوں کے مالی حقوق

مولانا انوار الحق بلال قاسمی [1]

۱۔ اگر بوڑھا شخص والدین میں سے ہے تو کسب معاش پر قدرت کے باوجود بھی والدین کو کسب معاش پر مجبور نہیں کر سکتے، لیکن والدین کے علاوہ شخص بوڑھا ہے تو اس کو کسب معاش پر مجبور کیا جا سکتا ہے، لیکن اگر اس کے رشتہ داروں میں بھی قابل استطاعت حضرات موجود ہوں تو فراخ دلی کے ساتھ ایسے ضعیف العمر رشتہ داروں کو نفقہ دینا چاہئے، لیکن یہ امر استحبابی ہوگا نہ کہ وجوبی۔

"قوله تعالى: وبالوالدين إحساناً" (الاسراء: ۲۳). "وصاحبهما في الدنيا معروفاً" (لقمان: ۱۵).

"وقوله عليه الصلاة والسلام: لمن جاء يشكو أباه الذي يريد أن يحتاج ماله (أنت ومالك لوالدك) إن أطيب ما أكلتم من كسبكم وإن أولادكم من كسبكم فكلوه هنيئًا، رواه احمد وابوداؤد عن عمر بن شعيب عن أبيه وجده ورواه أحمد عن عائشة" (الفقه الاسلامی وادلته ۷/ ۸۲۴)۔

يشترط لوجوب النفقة عن القريب ثلاثة شروط: أولًا، أن يكون القريب فقيرًا لا مال له ولا قدرة له على الكسب لعدم البلوغ أو الكبير أو الجنون أو لزمانة المرضية ويستثني الأبوان، فتجب لهما النفقة ولو مع القدرة على الكسب بالصحة والقوة، فإن كان القريب موسر المال أو كسب يستغني به غير الوالدين فلا نفقة له؛ لأنها تجب على سبيل المواساة والموسر مستغن عن المواساة" (فتح القدير ۳/ ۳۴۷، الدر المختار ۲/ ۹۲۳، ۹۲۵)۔

۲۔ سن رسیدہ حضرات کا نفقہ دوسرے پر اس وقت واجب ہوگا، جبکہ اس کے پاس مال بالکل نہ ہو یا بقدر ضرورت نہ ہو اور نہ ان کا کوئی ذریعہ آمدنی ہو اور خود کمانے پر بھی قدرت نہ رکھتا ہو تو ایسے سن رسیدہ حضرات کا نفقہ وعلاج ومعالجہ دیگر رشتہ داروں پر واجب ہوگا۔

"ولا تجب النفقة على الغير إلا بسبب الحاجة فمن كان ذا مال فنفقته في ماله سواء أكان صغيرًا أم كبيرًا" (الفقه الاسلامی وادلته ۷/ ۸۳۲)۔

"وقال الحنفية والشافعية والحنابلة: توزع النفقة على قدر الميراث فلو كان الرجل مريضًا زمنا وله أولاد فعليهم نفقة أبيهم على قدر ميراثهم لقوله تعالى: وعلى الوارث مثل ذلك" (بقرہ: ۲۳۳، الشرح الصغیر ۲/ ۷۵۲، وهكذا فی فتح القدير ۳/ ۳۶۸)۔

۳۔ بوڑھے والدین یا خاندان کے سن رسیدہ حضرات کے لئے اپنی اولاد یا قریبی رشتہ داروں سے دوسروں پر خرچ کرنے یا مال ذخیرہ اندوزی کرنے کے غرض سے زائد رقم کا مطالبہ نہیں کر سکتے ہیں، اس لئے کہ والدین خود صاحب ثروت ہیں، لہذا انکا نفقہ اولاد یا قریبی رشتہ داروں پر واجب نہیں اور دوسروں پر خرچ کرنے کی غرض سے مزید رقم کا مطالبہ یہ کوئی حق واجب نہیں یا مال کی ذخیرہ اندوزی کے لئے اسلام مال کے ذخیرہ اندوزی (بلکہ اسلام میں ذخیرہ اندوزی کا تصور نہیں ہے نیز یہ توکل کے بھی خلاف ہے)، کے لئے کسی سے مطالبہ کا کوئی حق نہیں دیتا، اس لئے بہر صورت مطالبہ نہیں کر سکتے ہیں۔

"ويظهر من هذه المذاهب أن الفقهاء أجمعوا على وجوب النفقة للآباء والأمهات والأولاد ولزوجات في

[1] خادم دار الافتاء معہد الشریعہ لکھنؤ۔

حالة العجز والإعسار'' (الدر المختار ۲/ ۹۲۵)۔

۴۔ محض زیادہ آمدنی کے لئے اپنے والدین سے دور جانا خاص طور سے بیرون ممالک جائز نہیں ہے اور اس وقت اس کی قباحت مزید بڑھ جاتی ہے جبکہ والدین جسمانی خدمت کے محتاج ہوں اور اگر والدین صحت مند ہوں کہ دوسرے کی خدمت کا محتاج نہ ہو اور رضاو خوشی سے بیرونی ممالک زائد آمدنی کے لئے اجازت دے تو پھر جانا جائز ہوگا ورنہ نہیں، جیسا کہ حضرات فقہاء اس کی صراحت کرتے ہیں،

''وقال العلامة الحصكفي: وله الخروج لطلب العلم الشرعي بلا إذن والديه وتمامه في الدر. وقال العلامة ابن عابدين: (قوله: وله الخروج ... الخ) أي إن لم يخف على والديه الضيعة بأن كانا موسرين ولم تكن نفقتهما عليه في الخانية فلو أراد الخروج إلى الحج وكرها ذلك قالوا: إن استغنى الأب عن خدمته. فلا بأس وإلا فلا يسعه الخروج'' (رد المحتار ۵/ ۲۶۱)۔

ب:.....اگر بہو ساس سسر کے ساتھ رہنا نہ چاہتی ہو یا اس کی ساس کو خدمت کی ضرورت ہو، لیکن کوئی خدمت گار موجود نہ ہو اور بیٹیوں کو ان کے شوہروں کی طرف سے میکے میں رہنے کی اجازت نہ ہو تو اس صورت میں بہو کی کیا ذمہ داری ہے؟ اور کیا اسے اس کے ساس سسر کے ساتھ رہنے پر مجبور کیا جاسکتا ہے؟

ج:.....مذکورہ صورت بالا میں بہو کو ساس کے ساتھ قضاءً رہنے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا ہے اور اس سلسلہ میں حضرت حکیم الامت مولانا تھانویؒ کا ایک تحریری اقتباس نقل کر دینا راقم الحروف مناسب سمجھتا ہے حضرت تھانویؒ تحریر فرماتے ہیں: بعضے آدمی اس کو بڑی سعادت مندی سمجھتے ہیں کہ بی بی کو اپنی ماں کا محکوم ومغلوب بنا کر رکھیں اور اس کی بدولت بیبیوں پر بڑے بڑے ظلم ہوتے ہیں سو سمجھ لینا چاہئے کہ بی بی پر فرض نہیں کہ ساس کی خدمت کیا کرے، تم سعادت مند ہو تو خود خدمت کرو، خدمت کے لئے نوکر لاؤ (اصلاح انقلاب ۲/ ۸۸ اھکذا فی فتاوی امدادیہ ۳/ ۵۸، ۳/ ۳۹۵، ۳/ ۴۰۹) لیکن اگر شوہر بی بی کو والدین کے ساتھ رہنے کا حکم کرے تو بی بی حضرات کو دیانۃً ماننا چاہئے اور شوہر کے حکم کی فرمانبرداری ضرور ادا کرنی چاہئے۔

''وحقه عليها أن تعطيه في كل مباح يأمرها به'' (رد المحتار ۴/ ۲۸۸ زكريا)

شرعاً شوہر پر ماں کی خدمت واجب نہیں، لیکن اخلاقی طور پر اس کا خیال رکھنا چاہئے کہ وہ اس کے شوہر کی ماں ہے اپنی ماں کی طرح اس کو بھی راحت پہنچانے کا خیال رکھے اور شوہر کی اطاعت کرے (فتاوی محمودیہ ۲۹/ ۶۱)۔

۵۔ ماں باپ کی جسمانی اور مالی خدمت جس طرح بیٹے پر واجب ہے ایسے ہی بیٹیوں پر بھی واجب ہے کیوں کہ اولاد ہونے میں بیٹا بیٹی، دونوں برابر ہیں لہذا خدمت بھی خواہ جسمانی ہو یا مالی ہو دونوں پر واجب ہوں گے۔

''تجب نفقة الأصول على الولد لا يشاركه في نفقة أبويه أحد؛ لأنه أقرب الناس إليهما فكان أولى باستحقاق نفقتهما عليه وهي عند الحنفية على الذكور والإناث بالسوية؛ لأن المعنى يشملهما'' (فتح القدير ۴/ ۲۲۸. هكذا في الشرح الصغير ۲/ ۷۵۲۰. وكذلك في الفقه الاسلامي ۷/ ۷۸۴)، ''فقال الحنفية: إن تحدت درجة قرابتهم كابنين أو بنتين أو ابن وبنت وجبت النفقة بالتساوي بينهم سواء أكانوا وارثين أم بعضهم وارثا والآخر غير وارث للتساوي في القرب والجزئية ولاينظر إلى أن الأب يأخذ ضعف البنت في الميراث'' (حاشيه ابن عابدين ۲/ ۹۲۴، الفقه الاسلامي وادلته ۷/ ۷۵۵)۔

جب بیٹیاں اپنے والدین کی مجبوری، اور بے بسی کو دیکھتے ہوئے اپنے والدین کی خدمت کرنا چاہتی ہوں تو شوہر کو اجازت دینی چاہئے کہ وہ خوش دلی سے اپنے والدین کی خدمت کریں۔ بلکہ شوہر کو بھی بیوی کا ہاتھ بٹانا چاہئے اور اس وقت تو ضرور اجازت دینی چاہئے، جبکہ بیوی کے والدین کا کوئی پسری اولاد خدمت کے لئے موجود نہ ہوں، اور بلا وجہ شرعی بیوی کو والدین کی خدمت سے روکنا جائز نہیں ہوگا، اس لئے کہ جس طرح شوہر کا اپنی بیوی پر کچھ حقوق ہیں ایسے ہی والدین کا بھی اپنی بیٹی پر کچھ حق ہے، لیکن بیوی کو بھی اس بات کا خیال رکھنا از حد ضروری ہے کہ اپنے والدین کی خدمت کرنے کی وجہ سے شوہر کی خدمت میں کوئی کمی کوتاہی نہیں آنا چاہئے، اس لئے شوہر کی اطاعت وفرمانبرداری عورت کے لئے زیادہ ضروری ہے اور مقدم ہے دیگر اقرباء سے۔

''ولا يمنعها من الخروج إلى الوالدين في كل جمعة إن لم يقدر على إتيانها سألت عائشة رضي الله عنها رسول

اللہ ﷺ أی الناس أعظم حقا علی المرأة؟ قال: زوجها. قلت: أی الناس أعظم حقا علی الرجل؟ قال: أمه''. رواه البزار واسناده حسن (الفقہ الحنفی فی ثوبہ الجدید ۲/ ۱۳۳)۔

''عن أبی هريرة قال: قال رسول اللہ ﷺ: لو كنت آمرًا أحدًا أن يسجد لأحد لأمرت المرأة أن تسجد لزوجها. رواه الترمذی'' (مشکوٰۃ، ۲۸۱ باب عشرۃ النساء وہکذا فی فتاوی دار العلوم دیوبند ۸/ ۴۰۷)۔

۵۔ بیٹے اور بیٹوں کا اپنے والد کے نکاح ثانی میں رکاوٹ بننا کسی بھی طرح سے درست نہیں ہے، بلکہ اولاد پر لازم ہے کہ باپ کی عفت و پاکدامنی کے پیش نظر دوسرے نکاح کرانے کی کوشش کریں نہ کہ رکاوٹ بنیں، اور اگر باپ کی مالی حالت کمزور ہو تو اولاد پر باپ کی بیوی کا نفقہ بھی واجب ہے جیسے باپ کا نفقہ محتاجی کی صورت میں اولاد پر واجب ہے، ایسے ہی باپ کی بیوی کا بھی نان ونفقہ واجب وضروری ہے کیونکہ جس طرح زندہ رہنے کے لئے نان ونفقہ ضروری ہے ایسے ہی پاکدامن زندگی گزارنے کے لئے بیوی کا ہونا ازحد لازم وضروری ہے، خاص طور سے اس وقت جب کہ عمر کا تقاضا بھی ہو تو اور زیادہ ضروری ہوتا ہے۔

يرى جمهور الفقهاء وفی رواية عند الحنفية أن الولد يلزمه تزويج أبيه المعسر ولو كان كافرًا معصومًا. وكذا المشهور عند الشافعية وعند الحنابلة وبعض الحنفية إعفاف الأجداد من الجهتين جهة الأب وجهة الأم؛ لأنه من وجوه حاجاتهم المهمة كالنفقة والسكنى ولئلا يعرضهم للزنا المفضی إلى الهلاك وهو لا يليق بحرمة الأبوة وليس من المصاحبة بالمعروف المأمور لها، فالزواج فما تدعو الحاجة إليه ويتضرر إليه بفقده فلزم ابنه تزويجه كالنفقة۔

يلزم الابن أيضا نفقة زوجة أبيه فی رأی الحنابلة والشافعية والمالكية. وفی رواية عند الحنفية: فكل من لزمه إعفافه لزمته نفقة زوجته كما تقدم، وأما الرواية الأخرى عند الحنفية. فلا تجب نفقة زوجة الأب إلا إذا كان الأب مريضًا أو به زمانة (أی مرض مفرض) قال فی الذخيرة: المذهب عدم وجوب نفقة امرأة الأب وهو معمول به فی مصر'' (رد المحتار ۲/ ۹۲۷، الشرح الصغير ۲/ ۷۵۲، الفقہ الاسلامی ۷/ ۸۳۳، ۸۳۴)۔

''وعلى الولد فی رأی الجمهور نفقة زوجة الأب وإعفافه بالتزويج بزوجة واحدة'' (المغنی ۷/ ۵۹۱)۔

۶۔ میراث کی تقسیم کا مسئلہ بعد انتقال جاری ہوتا ہے، زندگی میں مال کی تقسیم میراث کی تقسیم نہیں ہے، بلکہ یہ ہبہ ہے اور ہبہ کا قاعدہ یہ ہے کہ اولاد خواہ لڑکا ہو یا لڑکی ہو از روئے حدیث وفقہ سب کو برابر دیا جائے (فتاوی رحیمیہ ۹/ ۳۱۲)

''قوله عليه الصلاة والسلام: واتقوا الله واعدلوا بين أولادكم'' (مشکوٰۃ، ۲۶۱ باب العطایا)

کسی بھی اولاد کو والد کی زندگی میں جائیداد کے مطالبہ کا حق نہیں ہے، کیونکہ اولاد کا حق والد کے انتقال کے بعد ہوتا ہے والد اپنی زندگی میں خود مالک مختار ہوتا ہے (چند اہم عصری مسائل ۲۷۷ از مفتی زین الاسلام قاسمی نائب مفتی دار العلوم)، لیکن جب والدین کی معاشی حالت بہتر ہو اور اولاد محتاج ہو تو اولاد کو بطور ہبہ وتبرع کے کچھ نہ کچھ دے دینا چاہئے نہ کہ بطور میراث۔

۷۔ مغرب پرستی کی تقلید میں ہندوستان کے اندر ہاسٹلوں کا قیام انتہائی ناقابل افسوس ہے جو یقیناً شرعی نقطہ نظر سے درست نہیں ہے ایک تو اس لئے کہ ایسے ہاسٹلوں کے قیام سے ہر شخص اپنے والدین اور بزرگوں کو وہاں پڑ ڈالنے کی کوشش کرے گا اور اس بات کا حیلہ اختیار کرے گا کہ اگر ان ہاسٹلوں میں بڑے بزرگوں کو نہ ڈالا جائے تو پھر اس کا قیام بیکار ولغو ہوگا دوسرے والدین اور بزرگوں کو ان کے حقیقی اور خونی رشتہ داروں کی پیار ومحبت سے محروم کرنا لازم آئے گا نیز جو بھی اپنے والدین وغیرہ کو ایسے ہاسٹل میں ڈالے گا یقیناً وہ اپنے والدین سے کنارہ کش ہونا چاہے گا حالانکہ یہی والدین اس کے ظاہری وجود کا سبب ہوتے ہیں اور جب وہ خود اس عمر میں پہنچے کہ اپنی اولاد سے خدمت لے تو اولاد خدمت کرنے کے بجائے سرکاری ہاسٹلوں میں بے یار ومددگار چھوڑ دے تو کتنی تکلیف دہ بات ہوگی حالانکہ اسلام اپنے بڑے بزرگوں خاص طور سے والدین کی اطاعت وفرمانبرداری کی کس قدر تاکیدی حکم دیتا ہے کہ اللہ اور رسول کے بعد سب سے زیادہ حقوق والدین کے ہیں، اولاد پر اس کے علاوہ دیگر وجوہات کی بنا پر بھی ایسے ہاسٹلوں کا قیام شرعی نقطہ نظر سے درست نہیں ہے اور کوئی شخص اپنے بزرگوں کو ایسے ہاسٹلوں میں قیام پر مجبور نہیں کرسکتا ہے، کیونکہ یہ شرعی حقوق کے خلاف کے علاوہ خود دار انسان کے غیرت وحمیت کے بھی خلاف ہے۔

"وبالوالدين إحسانا إما يبلغن عندك الكبر أحدهما أو كلاهما فلا تقل لهما أف ولا تنهرهما وقل لهما قولًا كريمًا واخفض لهما

جناح الذل من الرحمة وقل رب ارحمهما كما ربياني صغيرا" (سورة اسراء: ۲۳، ۲۴)۔

''قال المفسرون: قوله تعالى بعبادته بر الوالدين لبيان حقهما العظيم على الولد لأنهما السبب الظاهر ولوجوده وعيشه ولما كان إحسانهما إلى الولد قد بلغ الغاية العظيمة وجب أن يكون إحسان الولد إليهما كذلك (إما يبلغن عندك الكبر أحدهما أو كلاهما) أي قد أوصيناك بهما ونجاسة إذا كبر أو كبر أحدهما. وإنما خص حالة الكبر لأنهما حينئذ أحوج إلى البر والقيام بحقوقهما لضعفهما (واخفض لهما جناح الذل من الرحمة) أي ألن جانبك وتواضع لهما بتذلل وخضوع من فرط رحمتك وعطفك عليهما'' (صفوة التفاسير ۲/ ۵۹۹). ''وصاحبهما في الدنيا معروفًا'' (لقمان: ۱۵) أي صاحبهما في الحياة الدنيا بالمعروف والإحسان إليهما ولو كانا مشركين. لأن كفرهما بالله لا يستدعي ضياع المتاعب التي تحملاها في تربية الولد ولا التنكر بالجميل'' (صفوة التفاسير ۲/ ۸۴۰)۔

۸۔ ظاہر ہے کہ ایسے لوگ محتاج اور ضرورت مند ہیں، اس لئے ایسے لوگوں کی اجتماعی کفالت کے لئے خصوصی طور پر زکوۃ کی رقم استعمال کی جاسکتی ہے، اس میں بظاہر کوئی حرج معلوم نہیں ہوتا ہے، لیکن اس بات کا خیال رکھا جائے کہ ایسے لوگوں کو زکوۃ کی رقم دے کر خود ان کو مالک مختار بنادے کیونکہ تملیک ادائیگی زکوۃ کے لئے شرط ہے۔

''لكن فسر الكاساني في البدائع سبيل الله بجميع القرب فيدخل فيه كل من سعى في طاعة الله وسبيل الخيرات إذا كان محتاجًا (الفقه الاسلامي وادلته ۲/ ۱۹۵۹). أما الفقراء أصحاب السهم الأول فهم جمع فقير. والفقير في رأي الشافعية والحنابلة هو من ليس له مال ولا كسب يقع موقعًا من كفايته أو حاجته فليس له زوج ولا أصل ولا فرع يكفيه نفقته ولا يحقق كفايته مطعمًا وملبسا ومسكنا كمن يحتاج إلى عشرة ولا يجد إلا ثلاثة حتى وإن كان صحيحًا. يسأل الناس أو كان له مسكن وثوب يتجمل به'' (الفقه الاسلامي ۳/ ۱۹۵۲)۔

۹۔ جو لوگ بھی حکومت کے جانب سے دیئے گئے سہولت پر مقررہ حد عمر کو نہ پہنچے ہوں ان حضرات کا اپنا عمر زیادہ بتلا کر حکومت کے فنڈ سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں ہوگا کیونکہ یہ کھلا ہوا جھوٹ اور حکومت کو دھوکہ دینا ہے جس کی اسلام میں دور تک کوئی گنجائش نہیں ہے اس لئے مسلمانوں کو ایسے فعل قبیح سے بچنا چاہئے۔

''قال رسول اللہ ﷺ: من غش فليس منا'' (الحديث ترمذی ۱/ ۲۴۵)

،اور جیسا کہ حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں کہ ریل پر سواری کا زائد سامان چوری چھپے سے لے جانا تاکہ ریلوے کے کرایہ سے بچا جائے جائز نہیں ہے (احسن الفتاوی ۷/ ۳۱۰)۔

حضرت مفتی احمد مفتی محمود الحسن گنگوہیؒ ایک سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں کہ یہ طریقہ دھوکہ اور خیانت ہے (فتاوی محمودیہ ۲۵/ ۳۲۶)۔

والدین کے شرعی ومالی حقوق

مفتی عبدالمنان [1]

۱۔ اگر کوئی شخص بوڑھاپے کی عمر کو پہنچ گیا، لیکن اتنا کمزور نہیں ہے کہ کسب معاش نہ کرسکے کسی قدر مشقت کے ساتھ وہ کما کر خود اپنی ضرورت پوری کرسکتا ہے تو ایسے شخص کو اس کی اولاد یا اعزہ واقارب جن کے ذمہ اس کا نفقہ واجب ہے کسب معاش پر مجبور نہیں کرسکتا۔ اللہ تعالی کا فرمان ہے:

"إما يبلغن عندك الكبر أحدهما أو كلاهما فلا تقل لهما أف ولا تنهرهما" (سورۂ اسراء: ۲۳)۔

اس آیت سے جہاں ماں باپ کے لئے حسن سلوک کو واجب قرار دیا گیا یہیں حسن سلوک کے اندر اپنے والدین کو تکلیف ومشقت میں نہ ڈالنا بھی داخل ہے۔ نیز حدیث شریف میں بھی ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "أنت ومالک لأبیک"۔ جبکہ اولاد کے مال کو باپ کا مال قرار دیا گیا ہے تو باپ کو کسب معاش کے لئے مجبور کرنا کیسے جائز ہوگا۔

۲۔ سن رسیدہ حضرات کا نفقہ وعلاج اس وقت دوسرے پر واجب ہوتا ہے، جبکہ وہ نفقہ وعلاج کے لئے دوسرے کا محتاج اور کسب معاش سے معذور ہو۔

۳۔ بوڑھے والدین یا خاندان کے وہ بڑے جن کا نفقہ ان کے چھوٹوں پر محتاجگی کی صورت میں واجب ہے اگر وہ محتاج نہ ہو خود صاحب ثروت ہو تو اس وقت وہ اپنی اولاد سے یا ان لوگوں سے جن پر بحالت حاجت نفقہ واجب ہوتا ہے تو ایسے شخص کو زیادہ سہولت کے لئے دوسرے لوگوں پر خرچ کرنے کے لئے دیا یا کچھ رقم محفوظ کرنے کے لئے زائد رقم کا مطالبہ کرسکتے ہیں چونکہ باپ سے حسن سلوک کرنے میں باپ کو خوش رکھنا بھی ضروری ہے، اور "أنت ومالک لأبیک" حدیث کی رو سے بھی جائز معلوم ہوتا ہے۔

۴۔ (الف): زیادہ آمدنی کے لئے لڑکوں کا اپنے ماں باپ کو چھوڑ کر دوسری جگہ جانے کے لئے مندرجہ ذیل باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے: اگر سفر کی وجہ سے والدین یا بیوی بچوں کے ضیاع کا خوف ہو، یعنی وہ خود غنی نہ ہو یا انکی حفاظت کرنے والا کوئی نہ ہو تو اس صورت میں سفر نہ کرے اور اگر اپنے شہر میں روزگار کا کوئی انتظام نہ ہوسکتا ہو تو ان کے لئے نفقہ وحفاظت کا معقول انتظام کرکے سفر کرسکتے ہیں۔ البتہ اگر سفر پر خطر ہے کہ ہلاکت کا ظن غالب ہے تو بہر صورت والدین کی اجازت کے بغیر سفر کرنا جائز نہیں۔

"قال العلامة الحصكفي رحمه الله: له الخروج لطلب العلم الشرعي بلا إذن والديه ولو ملتحيا وتمامه في الدرر"۔

"وقال العلامة ابن عابدين: (قوله: وله الخروج الخ) أي إن لم يخف على والديه الضيعة بأن كان موسرين ولم تكن نفقتهما عليه وفي الخانية ولو أراد الخروج إلى الحج كرها ذلك. قالوا إن استغنى الأب عن خدمته. فلا بأس وإلا فلا يسعه الخروج، فإن احتاجا إلى النفقة ولا يقدر أن يخلف لهما نفقة كاملة أو أمكنه إلا أن الغالب على الطريق الخوف فلا يخرج ولو الغالب السلامة يخرج. وفي بعض الرواية: لا يخرج إلى الجهاد إلا بإذنهما ولو أذن أحدهما فقط لا ينبغي له الخروج لأن مراعاة حقهما فرض عين والجهاد فرض كفاية (إلى أن قال) فلو في سفر تجارة أو حج فلا بأس به بلا إذن الأبوين إن استغنيا عن خدمته، ولو خرج المتعلم وضيع عياله يراعي حق العيال" (رد المحتار

[1] دار الحدیث پرمائی دگاؤ، نوگاؤں، آسام۔

۵/ ۳۶۱. احسن الفتاوی ۸/ ۱۷۸)۔

بصورت استغناء والدین بلا اجازت سفر جائز ہے، جبکہ راستہ پر خطر نہ ہو (رد المحتار، احسن الفتاوی ۸/ ۱۷۹)۔

(ب): اگر بہو ساس سسر کے ساتھ رہنا نہ چاہتی ہو یا اس کی ساس کو خدمت کی ضرورت ہو لیکن کوئی خدمتگار نہ ہو تو اس وقت بہو پر اخلاقی ذمہ داری ہے کہ ساس کی خدمت کرے، یہ موجب سعادت ہے اور بہو ساس سسر کے ساتھ رہنا نہ چاہتی ہو تو اس کو شرعاً مجبور نہیں کیا جاسکتا (آپ کے مسائل اور ان کا حل ۵/ ۱۷۵)۔

(ج): ماں باپ کی بیٹوں پر واجب ہے، لڑکی اگر شادی شدہ ہے، شوہر اجازت نہ دے اور ماں باپ کی خدمت کا محتاج ہو، اس کی خدمت کرنے والا کوئی نہ ہو تو اس کی خدمت کے لئے روزانہ جاسکتی ہے، شوہر کو روکنے کا حق نہیں ہے (آپ کے مسائل اور ان کا حل ۵/ ۱۷۴)۔

(۵) انسان کو جس طرح جوانی میں بیوی کی ضرورت ہوتی ہے، اسی طرح وہ بوڑھاپے میں بھی بیوی کا محتاج ہوتا ہے تا کہ اس عمر کے سرد و گرم سہنا ان کے لئے آسان ہو جائے، ہندوستان کے معاشرہ میں عام طور پر بیٹے اور بیٹیاں اپنی والدہ کے فوت ہونے کے بعد والد کے دوسرے نکاح میں رکاوٹ بنتے ہیں تو ان کا یہ رکاوٹ بننا درست نہیں ہے، اگر خود والد میں اپنی بیوی کی کفالت کی استطاعت نہ ہو تو اولاد پر واجب ہے کہ وہ خود والد کی خدمت کرے یا کسی خدمتگار کا انتظام کرے۔

(۶) والد کی زندگی میں اولاد کے لئے جائیداد کا مطالبہ کرنا اور اس کو اپنا حق سمجھنا صحیح نہیں ہے چونکہ باپ اپنی جائیداد کا خود مالک ہے کسی وارث کا بحیثیت وراثت کوئی حق نہیں ہے باپ کا جب انتقال ہو جائے گا اس وقت وہ حسب قواعد شرعیہ وارث ہوں گے۔ جب تک باپ زندہ ہے تب تک کسی سے زبردستی لینے کا حق نہیں ہے (فتاوی محمودیہ ۱۴/ ۴۴۱)، لیکن جب باپ صاحب ثروت ہو اور اولاد محتاج ہو تو اس صورت میں اولاد کا گزارا بسر کرنے کا انتظام کر دینا باپ پر اخلاقی ذمہ داری ہے تا کہ اولاد بے راہ نہ ہو۔

(۷) جس طرح باپ کو اولاد کی پرورش کی ذمہ داری ہے، اسی طرح جب باپ بوڑھا ہو جائے، اولاد کی خدمت کا محتاج ہو جائے تو اولاد پر واجب ہے، اپنے والدین کے نان ونفقہ و خدمت کا انتظام کرے۔ ہاسٹل میں داخل کر دینا جائز نہیں ہوگا، اگر وہ خود جانا چاہے تو اولاد کو روکنے کا حق ہوگا۔

(۸) بوڑھاپے کی عمر میں اگر انسان ہاتھ خالی ہو تو بے سہارگی اور بڑھ جاتی ہے اور اگر اس کی اولاد یا قریبی رشتہ دار موجود نہ ہو تب تو انسان اپنے آپ کو اس دنیا میں تنہا محسوس کرنے لگتا ہے، ایسے لوگوں کی اجتماعی کفالت کے لئے زکوۃ کا استعمال صاحب نصاب کے لئے جائز نہیں ہوگا۔

(۹) عمر دراز لوگوں کے لئے حکومت نے مختلف چیزوں میں بعض خصوصی رعایتیں رکھی ہیں، جیسے ٹرین وغیرہ میں کرایہ کی تخفیف، حکومت کی طرف سے امدادی وظیفہ، ٹیکس میں رعایت وغیرہ، جو لوگ ان رعایتوں کے لئے مطلوب مقررہ حد عمر کو نہ پہنچے ہوں، ان کے لئے ایسی رعایتوں سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں ہوگا۔

معذوروں اور معمر افراد کے مالی وانسانی حقوق

مولانا حافظ کلیم اللہ عمری مدنی [۱]

کتاب وسنت کی روشنی میں معذوروں اور ضعیفوں کے ساتھ خصوصی توجہ دینا صالح معاشرہ کی بڑی ذمہ داری ہے، اسلام نے معاشرتی زندگی کے کسی گوشہ کو بھی تشنہ نہ چھوڑا، بلکہ ان کی کفالت عامہ کا انتظام وانصرام ہر دور میں تھا، خواہ وہ عہد نبوت ہو یا عہد خلافت راشدہ وغیرہ، جیسا کہ خلافت راشدہ میں مدینہ کے اطراف واکناف ایک نابینا بڑھیا تھی، حضرت عمرؓ روزانہ صبح سویرے اس کے لئے پانی اور دیگر ضروریات فراہم کردیتے تھے، کچھ عرصہ بعد آپ کو محسوس ہوا کہ کوئی شخص ان سے پہلے آکر یہ کام کرجاتا ہے، ایک روز تحقیق کی غرض سے رات کا کچھ وقت گزرنے کے بعد وہاں تشریف لے گئے، تو دیکھا کہ خلیفہ ابوبکر صدیقؓ اس ضعیفہ کی خدمت گزاری سے فارغ ہوکر اس کے جھونپڑے سے نکل رہے تھے۔ پھر آپ نے اپنی خلافت کے دور میں معذور وضعیف اور اپاہج حضرات کے حقوق کا سخت اہتمام کیا کہ کوئی شخص فقر وفاقہ میں مبتلا نہ ہو یہ حکم جاری کردیا کہ ہر مفلوج اور اپاہج فرد کو بیت المال سے وظیفہ جاری کیا جائے۔

دین اسلام میں معذوروں اور ضعیفوں کے ساتھ خصوصی توجہ دی گئی، ان کی عزت واحترام میں کسی بھی طرح کمی نہیں کی گئی، بلکہ نبی کریم ﷺ نے یہاں تک فرمایا کہ کسی مسلمان کے لئے اتنی برائی ہی کافی ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کو حقیر سمجھے (مسلم: ۱۹۸۶، ۲۵۲۴)۔

سوال: کسب معاش پر قادر شخص کا اپنے اعزہ کو کمانے پر مجبور کرنا:

جواب:..... اسلام نے خودداری کی تعلیم دی ہے۔ دست سوال دراز کرنے اور بلا ضرورت لوگوں سے مانگنے کو معیوب قرار دیا، سستی اور کاہلی کو ناپسند فرمایا اور گداگری (Beggar ship) سے نفرت پیدا کی۔ اس کے برعکس اسلام نے محنت کرنے کی ترغیب دی ہے، بلکہ اپنے ہاتھ سے کما کر کھانے کی فضیلت بیان کی ہے۔ حضرت مقدامؓ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: کسی انسان نے اس شخص سے بہتر روزی نہیں کھائی، جو خود اپنے ہاتھوں سے کما کر کھاتا ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام کے سلسلے میں مروی ہے کہ وہ اپنے ہاتھ سے کام کرکے روزی کماتے تھے (صحیح بخاری: ۲۰۷۲)۔

گداگری سے نفرت پیدا کرنے کی خاطر رسول اکرم ﷺ نے مختلف مواقع پر الگ الگ اسالیب میں نصیحت فرمائی ہے۔ حجۃ الوداع کے موقع پر آپ مال تقسیم فرمارہے تھے کہ دو حضرات صف میں شامل ہوگئے، آپ نے ان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا تو وہ تنومند اور تندرست معلوم ہوئے۔ آپ نے فرمایا: اگر تم چاہو تو میں اس میں سے تم دونوں کو دے سکتا ہوں، لیکن صاحب حیثیت، تندرست اور کام کرنے کے قابل لوگوں کا اس میں کوئی حصہ نہیں ہے (سنن ابی داؤد: ۱۶۳۵)۔

حضرت قبیصہؓ مقروض ہوگئے تھے۔ وہ اپنی ضرورت لے کر خدمت نبوی میں حاضر ہوئے۔ آپ نے ان کی مالی مدد کرنے کے بعد ارشاد فرمایا: اے قبیصہؓ! سوال کرنا اور لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلانا صرف تین اشخاص کو روا ہے۔ ایک اس شخص کو جو قرض کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہو، لیکن ضرورت پوری ہوجانے پر مانگنے سے رک جائے۔ دوسرا وہ جس پر ایسی ناگہانی مصیبت آپڑے جو اس کا تمام مالی سرمایہ برباد کردے، وہ حالت کسی قدر درست ہونے تک مانگ سکتا ہے۔ تیسرا وہ شخص جو فقر وفاقہ میں مبتلا ہو، اور محلے کے تین معتبر آدمی اس بات کی گواہی دیں کہ اسے (حقیقت میں) فقر وفاقہ لاحق ہے، ان کے علاوہ جو کوئی مانگ کر کھاتا ہے وہ حرام کھاتا ہے (صحیح مسلم: ۲۴۵۱)۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے صحابہ کرامؓ کو ایسی تعلیم دی کہ وہ بلا ضرورت دست سوال دراز کرنے سے دور رہیں۔ خودداری، اور غیرت کی زندگی گزارنے کی ہر ممکن کوشش کریں، کسی پر بوجھ نہ بنیں، لوگوں کے صدقات وخیرات کی طرف نظر نہ اٹھائیں، صاحب حیثیت بظاہر ان لوگوں کو دیکھ کر یہ سمجھ لیں کہ

---

[۱] استاذ ومفتی جامعہ دارالسلام عمرآباد۔

یہ سب بے نیاز لوگ ہیں، جیسا کہ قرآن کریم اس کی منظر کشی کرتا ہے:

"یَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ لَا يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا" (سورۃ البقرۃ: ۲۷۳)

(یہاں تک کہ نہ مانگنے کی وجہ سے ناواقف شخص اُن کو غنی (مالدار، صاحب حیثیت) خیال کرتا ہے اور تم چہرے سے اُن کو صاف پہچان لوگے (کہ حاجتمند ہیں اور شرم کے سبب) لوگوں سے چمٹ کر نہیں مانگتے)۔

مذکورہ صورت حال میں اگر کوئی شخص بوڑھاپے کی عمر کو پہنچ گیا ہو، لیکن اتنا کمزور نہیں ہے کہ کسب معاش نہ کرسکے کسی قدر مشقت کے ساتھ ہی سہی وہ کما کر خود اپنی ضرورت پوری کرسکتا ہے تو ایسے شخص کو اس کی اولاد کی طرف سے کسب معاش پر مجبور کرنا شرعاً درست نہیں ہے، بلکہ اولاد پر واجب ہے کہ وہ والدین کو حسب استطاعت کھلائیں، پلائیں، ان کی ساری واجبی ضروریات کا پورا خیال رکھیں، انہیں کسب معاش پر مکلف کرنا کسب بھی شکل میں جائز نہیں ہے، البتہ اعزہ واقارب کی طرف سے کسی کی کفالت ہو رہی ہو تو مذکورہ حالت میں (اولاد نہ ہونے کی صورت میں) اعزہ واقارب کی صرف اخلاقی ذمہ داری ہے کہ ان عمر رسیدہ افراد کی خدمت کریں، ان کے قیام وطعام کی پوری سہولت فراہم کریں، لیکن مذکورہ حالت میں یعنی کسی قدر مشقت کے ساتھ ہی سہی معمر افراد کسب معاش پر قادر ہوں تو ایسی صورت میں اعزہ واقارب کو انہیں مجبور کرنے کی اجازت ہوگی۔

حضرت عمرؓ کے دور میں یہ حکم عام تھا کہ ملک کے جس قدر اپاہج، اور معمر اور سن رسیدہ افراد ہیں، ان سبھوں کی تنخواہ بیت المال سے مقرر کردی جائے، یہاں تک کہ غیر مسلم سن رسیدہ افراد کو بھی بیت المال سے وظیفہ مقرر تھا، ایک مرتبہ عمر فاروقؓ نے ایک بوڑھے یہودی نابینا کو بھیک مانگتے دیکھا، آپ نے اس شخص سے بھیک مانگنے کا سبب پوچھا، یہودی نے جواب دیا کہ جزیہ اور بوڑھاپا، حضرت عمرؓ نے اس کا ہاتھ پکڑا۔ اپنے گھر لے گئے، اور اتنا کچھ دیا، جو اس وقت کی ضروریات کے لئے کافی تھا، پھر بیت المال کے خزانچی کو کہلا بھیجا کہ اس شخص کی طرف اور اس جیسے دوسرے افراد کی طرف توجہ دی جائے، خدا کی قسم۔ یہ انصاف نہیں کہ ہم اس کی جوانی کی کمائی کھائیں، اور بڑھاپے میں دھتکار دیں، آپ نے ایسے افراد کو جزیہ سے بری قرار دیا (کتاب الخراج ابو یوسف، ص ۱۳۶، العدالۃ الاجتماعیۃ فی الاسلام، سید قطب شہیدؒ)۔

سوال ۲: سن رسیدہ حضرات کا نفقہ وعلاج کن صورتوں میں دوسروں پر واجب ہوگا؟

جواب:...... ہر سماج میں سن رسیدہ افراد کا نفقہ اور علاج ومعالجہ ان کی اولاد پر واجب ہے، حتی المقدور اولاد خواہ وہ لڑکے ہوں یا لڑکیاں والدین کی خدمت کو شرف سمجھ کر ان کی ہر طرح کی مادی ومعنوی خدمت انجام دیں، ولو بالفرض سن رسیدہ حضرات کی اولاد نہ ہو اور عزیز واقارب صاحب حیثیت ہوں تو ان لوگوں کی ذمہ داری ہوگی کہ وہ ان کے اخراجات برداشت کریں، سن رسیدہ افراد جن کو کمانے کی قوت وطاقت نہ ہو، وہ معذور ومجبور ہوں تو عصبات (باپ کی جانب سے رشتہ دار) کی اہم ذمہ داری ہوگی، الاقرب فالاقرب کے اصول کے تحت معمر افراد کی خدمت ان پر واجب ہوگی، پھر ذوی الارحام (ماں کی طرف سے رشتہ دار) کی ذمہ داری ہوگی، آخر کار ان رشتہ داروں کی غیر موجودگی میں یا ان کی عدم استطاعت کی صورت میں بیت المال کے ذریعہ یا اجتماعی نظام زکوۃ کے فنڈ سے ان کی کفالت کا نظم کیا جائے گا۔

سوال ۳: رقم محفوظ کرنے کی غرض سے نفقہ سے زائد کا مطالبہ:

جواب:...... اولاد دراصل والدین کی کمائی اور ان کی قیمتی سرمایہ ہیں، والد کو حق ہے کہ وہ اولاد کی کمائی اور ان کے مال واسباب میں سے اپنی جائز ضرورتوں کی تکمیل کی غرض سے حسب ضرورت ومصلحت کچھ حاصل کرسکتے ہیں، جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں ایک شخص آیا اور کہا کہ میرے والد نے میرا مال زبردستی لے لیا ہے، تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ تو اور تیرا مال تیرے باپ کی ملکیت ہے، مزید فرمایا تمہاری پاکیزہ کمائی تمہاری اولاد ہیں۔ تم ان کے مال میں کھاؤ، پیو، (صحیح ابن ماجہ، عن ابن عمرؓ)، لہذا بوڑھے والدین کو ہر حال میں خوش رکھنا اولاد کا حق ہے، محض دنیا کے مال ومتاع کی خاطر والدین کو ناراض کرنا شرعاً صحیح نہیں ہے، لیکن اپنی ضروریات کے علاوہ دوسرے کی مدد کرنے کی غرض سے اولاد یا دیگر افراد سے جن پر بحالت حاجت وضرورت نفقہ واجب ہوتا ہے، مزید رقم کا مطالبہ شرعاً درست نہیں ہے، البتہ اپنی اولاد سے زیادہ سہولت پانے کے لئے یا حفظ ماتقدم کے طور پر مزید رقم کے مطالبہ میں کوئی حرج نہیں ہے۔ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے: "أنت ومالک لأبیک" (۲۹۱ سنن ابن ماجہ، صحیح الالبانی) یعنی تم اور تمہاری کمائی تمہارے باپ کی ہے۔

فتاوی محمودیہ میں ہے: الجواب حامداً و مصلیاً

اگر دونوں لڑکوں میں مالدار اور غریب ہونے کے اعتبار سے زیادہ فرق ہے، تو والد کے نفقہ میں بھی فرق ہوگا، یعنی حسب حیثیت واجب ہوگا، جب زید خود بھی صاحب عیال ہے اور اس میں اتنی گنجائش نہیں ہے کہ والد صاحب کو دس روپئے ماہانہ دے اور والد کا گزر اس کے روپئے پر موقوف بھی نہیں، جبکہ وہ خود صاحب حیثیت ہے، اور اپنا خرچ خود برداشت کرسکتا ہے تو پھر زید کے ذمہ دس روپیہ دینا واجب نہیں، بلکہ اپنی استطاعت کے موافق والد کی خدمت کرتا رہے اس میں کوتاہی نہ کرے، اگر والد استطاعت سے زیادہ طلب کرے تو اس کے نہ دینے سے زید پر مؤاخذہ نہیں، واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

حررہ العبد محمود گنگوہی عفا اللہ عنہ معین مفتی مدرسہ مظاہر علوم ۲۲ / ۱۱ / ۵۷ھ

الجواب صحیح۔ سعید احمد غفرلہ مفتی مدرسہ ھذا، صحیح عبد اللطیف ۲۴ ذی قعدہ ۵۷ھ (فتاوی محمودیہ ۱۳ / ۴۶۴)

سوال ۴: (الف) زیادہ آمدنی کی خاطر والدین کو چھوڑ کر دوسری جگہ جانا جائز ہے؟

جواب:...... اولاد کا محض زیادہ آمدنی کی خاطر ضعیف والدین کو چھوڑ کر دوسرے شہر یا ملک کا سفر کرنا شرعاً صحیح نہیں ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں بعض احباب نے جہاد میں شرکت کے لئے اپنا نام مجاہدین کی فہرست میں درج کرایا، جب ضعیف والدین نے ان اولاد کے خلاف شکایت کی، اور ان کی ضرورت کے تعلق سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست پیش کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان مجاہدین کو جہاد جیسے فریضہ کے مقابلہ میں والدین کی خدمت کے لئے واپس بھیج دیا، حالاں کہ اس دور میں ایک ایک مجاہد کی بھی اشد ضرورت تھی (صحیح بخاری، ۲۸۴۲)۔ مذکورہ صورت حال میں والدین کی مرضی اور اجازت کے بغیر اولاد کا والدین سے دوری اختیار کرنا شرعاً معیوب ہے۔

(ب) ساس سسر کے تئیں بہو کی کیا ذمہ داری ہے؟

جواب۔ بیوی پر اولین حق ہے کہ وہ شوہر کی اطاعت کرے، اور اسے خوش رکھے، اس کے مال و متاع کی حفاظت کرے اور انہی کے بال بچوں کی حسن تربیت کرے اور ان کی خدمت کرے، اس کی غیر موجودگی میں اپنی شرمگاہ کی حفاظت کرے، اس کے بستر پر کسی اجنبی کو قریب آنے نہ دے، کتاب و سنت کی روشنی میں بہو کے واجبات میں ساس سسر اور اس کے نندوں یا دیوروں کی خدمت شامل نہیں ہے، ساس بہو کا رشتہ کوئی خونی رشتہ بھی نہیں ہے، زیادہ سے زیادہ بہو کو اپنی ساس کی خدمت ایک بزرگ کی حیثیت سے کرنا ہے، بیوی کی ذمہ داریوں میں ساس سسرال والوں کی خدمت شوہر کی اطاعت کے ضمن میں شامل ہے، ظاہر ہے کہ ساس عمر میں بڑی ہے اور عموماً ضعیف بھی ہوتی ہے، اس لئے انسانیت کے تقاضے کے تحت ساس اور سسر کی خدمت، ادب و احترام اور ان کے راحت کا انتظام کرنا شامل ہے، نیز یہ سوچ کر بھی خدمت کرے یہ میرے شوہر کی خوشی کا باعث ہے، اسی طرح شوہر بھی اپنے ساس و سسر کی خدمت اور حسن سلوک کو لازم سمجھے تو عام طور پر جو جھگڑے ہوتے ہیں، سب کے سب ختم ہو جائیں گے، آپس میں ایک دوسرے کے جذبات کا لحاظ کرنے سے دوریاں ختم ہوں گی، فاصلے میں کمی آئے گی، الفت و محبت کا ماحول عام ہوگا، لہٰذا اخلاقی اعتبار سے یا عرف و معاشرہ کے اعتبار سے بہو کو چاہیے کہ وہ ساس سسر کی خدمت کرے، شوہر کی اطاعت و فرمانبرداری کا ایک اخلاقی حصہ سمجھے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "المراۃ راعیۃ علی بیت زوجہا وولدہ" (صحیح بخاری، ۵۲۰۰) یعنی بیوی اپنے شوہر کے گھر اور اس کی اولاد کی ذمہ دار اور مسؤل ہے، لہٰذا اخلاقی لحاظ سے یا انسانیت کے تقاضوں کے تحت ضعیف ساس سسر کی خدمت عورت کی مسؤلیت میں شامل ہے۔ البتہ مذکورہ حالت میں جب کہ ساس سسر کی خدمت کرنے والے کوئی نہ ہوں، بیٹیوں کو ان کے شوہروں کی طرف سے اجازت نہ ملے، یا وہ بالکل دور ہوں، ایسی مجبوری و بے بسی کی صورت میں حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق "المراۃ راعیۃ علی بیت زوجہا وولدہ" (صحیح بخاری: ۵۲۰۰) یعنی بیوی اپنے شوہر کے گھر اور اس کی اولاد کی ذمہ دار اور مسؤل ہے،) بہو کو ساس سسر کی خدمت پر مجبور بھی کیا جاسکتا ہے۔

سماج کے مسائل میں مشترکہ خاندانی نظام بھی ایک مستقل مسئلہ ہے، اسلامی نقطہ نظر سے جداگانہ اور مشترکہ خاندانی نظام کے ثبوت اور مثالیں عہد نبوت و رسالت اور عہد صحابہؓ سے ہی ملتے ہیں، دونوں نظام زندگی فی نفسہ جائز و درست ہیں، جس نظام میں شریعت کے حدود و قیود کی پاسداری ہو سکے، والدین اور دیگر افراد خاندان، نیز معذورین کا حق و رعایت ممکن ہو سکے، اس نظام پر عمل بہتر ہوگا، جہاں مشترکہ خاندانی نظام ہو ایک دوسرے کو برداشت کرنا، سب کا لحاظ کرنا، بڑوں کا پاس و لحاظ، چھوٹوں پر شفقت، ایک دوسرے کی خوشی میں شریک ہونا اور مرض و الم، رنج و غم میں ڈھال بن کر ساتھ دینا ضروری ہوتا ہے، ہمارے اسلامی معاشرے و تہذیب میں یہ قربانیاں عملاً مطلوب ہوتی ہیں، ایسی صورت حال میں بعض عورتیں پریشان ہو کر یا مزاج میں آزادی کی خواہش موجزن ہو تو شوہروں

سے مطالبہ کرتی ہیں، کہ چلو ہم الگ گھر بسائیں گے، آزاد رہیں گے، کسی کی ہم پر کوئی حکومت نہ ہوگی، لیکن شوہر اپنے بوڑھے والدین، جوان بہنوں، اور چھوٹے بھائیوں کو چھوڑ کر الگ گھر بسانا نہیں چاہتا ہے، اور نہ ہی یہ انسانیت کا تقاضا ہے، دوسری طرف بیوی اور اس کے متعلقین کا اصرار اور دباؤ رہتا ہے، نتیجہ کے طور پر یہ سبب طلاق وخلع کا ایک اہم سبب بن جاتا ہے، حق بات یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں بھی مشترکہ خاندانی نظام موجود تھا، جیسا کہ حضرت جابرؓ نے باکرہ/کنواری کے بجائے ثیبہ (شوہر دیدہ خاتون) سے ہی شادی کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وجہ دریافت فرمائی تو اس کا جواب یہی بتایا کہ میری بہنیں ہیں، ان کی تعلیم وتربیت اور ادب سکھانے کے لئے ہمارے گھر کے لئے ثیبہ (شوہر دیدہ عورت) ہی بہتر ہے، حالات وضروریات کا لحاظ رکھنا بھی ضروری ہے، خصوصا جہاں مشترکہ نظام ہو یہ اس وقت تک کامیاب نظام ہے جب تک کہ افراد میں ایثار، ہمدردی، تحمل اور ایک دوسرے کو برداشت کرنے کی صلاحیت موجود ہو، ایک دوسرے کی چھوٹی چھوٹی لغزشوں کو نظر انداز کرنے کی قوت ہو اور گھر کے سرپرست حضرات عدل وانصاف کو سامنے رکھیں، کسی کو کسی پر بلا ضرورت فوقیت نہ دیں، کسب معاش میں بعض افراد خاندان کا دوسروں کے بالمقابل کم یا زیادہ ہونا اور اسی کی بنیاد پر تفریق کرنا وغیرہ اس نظام کو پارہ پارہ کردیتے ہیں، اس نظام کو چلانے میں سرپرستوں میں عدل وانصاف کا بدرجہ اتم پایا جانا بہت ضروری ہے ورنہ خاندان کا شیرازہ بکھر جائے گا، سرپرست حضرات کی ذمہ داری یہ بھی ہے کہ سنجیدگی کے ساتھ حالات کے مطابق فیصلہ کریں، اگر عافیت اس میں ہے کہ جداگانہ نظام پر عمل ہی بہتر ہو تو فوراً اس پر عمل کیا جائے، خواہ مخواہ کی ضد اچھی چیز نہیں، بعض والدین کا بے جا اصرار ہوتا ہے کہ ہماری زندگی تک ہمارے بچے ہر حال میں ہمارے ساتھ ہی رہیں، پھر ہماری وفات کے بعد اولاد کی مرضی ہے، خواہ مل جل کر رہیں، یا جداگانہ نظام پر عمل کرسکیں، اس سے بہتر صورت تو یہی ہے کہ سرپرست بروقت صحیح فیصلہ کریں، عدل وانصاف کو ملحوظ رکھیں، جو مناسب ہو حکمت عملی کا ثبوت دے کر اولاد کی صحیح رہنمائی کریں، واللہ ہو الموفق (تفصیلات کے لئے۔ فقہ اسلامی، ص ۱۲۴)۔

ساس سسر کی خدمت کے ضمن میں فضیلۃ الشیخ ابن عثیمین کا فتوی درج ذیل ہے:

اس بزرگ وضعیف آدمی کے ساتھ احسان ہے، اور خود آپ کے شوہر کے ساتھ بھی احسان کے مترادف ہے۔ (فتاوی برائے خواتین، ص ۴۳۴)۔

شیخ محمد صالح المنجد حفظہ اللہ کا بہو کے حق میں فتوی یہ ہے:

آپ کی ساس اور نندوں کا آپ پر یہ حق ہے کہ آپ ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کریں، ان سے صلہ رحمی کریں، اور ان کے ساتھ احسان کرنے کی حتی الوسع کوشش کریں، اور آپ کی ساس کا جو یہ ذہن اور خیال ہے کہ آپ ہر معاملہ میں ان کی موافقت اور اجازت لیں تو یہ صحیح نہیں ہے، اور نہ ہی علماء کرام نے اسے بیوی کے حقوق میں ذکر کیا ہے، بلکہ آپ پر واجب یہ ہے آپ اپنے خاوند کی اطاعت کریں اور اس کی اجازت طلب کریں، اور اس کی بھی اطاعت اس وقت تک ہے جب تک کہ وہ برائی اور معصیت کا حکم نہ دے، اگر وہ معصیت کا حکم دیتا ہے تو اس میں اس کی اطاعت نہیں ہوگی۔ واللہ اعلم بالصواب۔

(ج) ماں باپ کی خدمت صرف بیٹوں پر واجب ہے یا بیٹیوں پر بھی، بعض اوقات بیٹیاں اپنے والدین کی مجبوری اور بے بسی کو دیکھتے ہوئے اپنے والدین کی خدمت کرنا چاہتی ہیں، لیکن ان کے شوہران کو اس کی اجازت نہیں دیتے، کیا ان کے شوہر کو اس کا حق حاصل ہے؟

جواب۔ شوہروں کو چاہیئے کہ حالات کی نزاکتوں کا لحاظ کرتے ہوئے اپنی بیویوں کو والدین کی خدمت سے نہ روکیں، خصوصا جب ان کے اور سسرال کے مابین کوئی لمبا فاصلہ نہ ہو، آنے جانے میں کوئی دقت نہ ہو، البتہ سسرال اور شوہروں کے درمیان فاصلہ ہو، خود اس کے بچے ماں کے محتاج ہوں، ان کا دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہ ہو، تو ایسی صورت میں شوہر کو وقتی طور پر اپنی بیوی کو روکنے کا مجاز حاصل ہوگا۔

''فتاوی محمودیہ'' میں ہے کہ شرعا ہندہ کے ذمہ شوہر کی ماں کی خدمت واجب نہیں، لیکن اخلاقی طور پر اس کا خیال کرنا چاہئے، کہ وہ اس کے شوہر کی ماں ہے تو اپنی ماں کی طرح اس کو بھی راحت پہونچانے کا خیال رکھے، اور شوہر کی اطاعت کرے، آخر جب ہندہ کو ضرورت پیش آتی ہے تو شوہر کی ماں ہی اس کی خدمت کرتی ہے۔ اس طرح آپس کے تعلقات خوشگوار رہتے ہیں اور مکان آباد رہتا ہے، البتہ شوہر کو بھی چاہئے کہ اپنی بیوی سے نرمی اور شفقت کا معاملہ کرے، اس کو سمجھائے کہ میں تمہاری ماں کا احترام کرتا ہوں اور ان کو اپنی ماں کی طرح سمجھتا ہوں، تم بھی میری ماں کو اپنی ماں کی طرح سمجھو۔ نیز بیوی پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہ ڈالے۔ فقط واللہ سبحانہ اعلم

حررہ العبد محمود گنگوہی عفا اللہ عنہ دار العلوم دیوبند ۱۷/۱/۹۰ھ

الجواب صحیح۔ بندہ نظام الدین عفی عنہ دار العلوم دیوبند ۱۷/۱ (مکمل ومدلل فتاوی محمودیہ ۱۸/۶۱۶)

اس سلسلہ میں بیسویں فقہی سیمینار۔ یوپی میں یہ تجویز طے کی گئی تھی کہ (والدین کی خدمت وکفالت لڑکوں کے ساتھ لڑکیوں پر بھی حسب استطاعت واجب ہے، اگر ماں کو ایسی خدمت کی ضرورت ہو جس کو کوئی عورت ہی انجام دے سکتی ہو اور بہو کے علاوہ کوئی دوسری قریبی عورت خدمت کرنے والی نہ ہو نیز ماں مجبور ہو خود سے وہ کام انجام دینے کے لائق نہ ہو تو ایسی صورت میں بہو پر ساس کی خدمت واجب ہوگی (نئے مسائل اور فقہ اکیڈمی کے فیصلے ص ۱۲۵)۔

سوال۔ ۵ کیا اولاد کو والد کے دوسرے نکاح میں رکاوٹ بننے کا حق ہے؟

جواب: (۱) والد صحت وتندرستی کی حالت میں ہو اور اسے شادی کی ضرورت ہو تو اولاد کو شرعاً والد کی شادی میں رکاوٹ بننے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے، عہد سلف میں بے شمار مثالیں ملتی ہیں جہاں باپ نے نکاح ثانی کی، یا نکاح ثالث کی، مگر اس میں اولاد کوئی رکاوٹ نہ تھی، نیز والد کی خدمت کے لئے کوئی اولاد نہ ہو، ہر ایک اپنی زندگی میں مگن ہو، عمر رسیدہ باپ کی خدمت کے لئے کوئی تیار نہ ہو تو ایسی صورتِ حال میں باپ اگر شادی کرنا چاہے تو اولاد کو معاون بننا چاہئے۔

(۲) ولو بالفرض باپ حسبِ ضرورت ومصلحت نکاح ثانی کرلے تو اولاد پر سوتیلی ماں کی عزت واحترام واجب ہے، اور ان کے ساتھ حسن سلوک کرنا، صلہ رحمی کرنا، ان کے رشتوں کی عزت واحترام بھی ملحوظ رکھنا واجب ہے، نیز باپ کے حق کے ساتھ سوتیلی ماں کے حق کا لحاظ رکھنا اولاد پر واجب ہوگا، چونکہ باپ کی بیوی بھی ماں کا درجہ رکھتی ہے، لہٰذا اولاد کی ذمہ داری میں خدمت اور نفقہ دونوں چیزیں بھی ضمناً واجبات میں شامل ہیں، اولاد بخوشی یہ خدمت انجام دے، البتہ باپ کی وفات کے بعد سوتیلی ماں کی خدمت یا نان ونفقہ اولاد پر واجب نہیں ہے، بلکہ اس سوتیلی ماں کے رشتہ داروں (عصبت وذوی الارحام) کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس کی کفالت کریں۔

سوال ۶۔ کیا اولاد باپ کی زندگی میں ہی جائداد کا مطالبہ کرسکتی ہے؟

جواب:...... صورت مسؤلہ میں ازروئے شرع والدین اپنی جائداد کے مالک ہیں لہٰذا ان کا حسب ضرورت ومصلحت تصرف کرنا درست ہے البتہ زندگی میں جائیداد کی تقسیم کے لئے دو شرعی صورتیں ممکن ہیں ۱۔ مساویانہ تقسیم ۲۔ لڑکوں کو لڑکیوں کے مقابلہ میں دوگنا حصہ دینا۔ البتہ زندگی میں ہبہ کرنے کی صورت میں کسی وارث کو وراثت سے محروم کرنے کی نیت ہرگز نہ ہو، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "إنما الأعمال بالنیات" (صحیح بخاری) یعنی اعمال کی قبولیت کا دارومدار نیتوں پر موقوف ہے، اولاد کو شرعاً یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ ماں باپ کے زندہ رہتے ہوئے ان کی جائداد میں حصوں کا مطالبہ کریں البتہ ان کی وفات کے بعد اگر کچھ مال رہ جاتا ہے تو بشکل ترکہ تقسیم ہوگا ورنہ نہیں۔

باپ کی ذمہ داری میں اولاد کو خود کفیل بنانا بھی شامل ہے، خصوصاً جب والدین خوش حال ہوں، اسی لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پورے مال کو صدقہ وخیرات کرنے کا سوال ہوا تو منع فرمایا اور وصیت صرف ایک تہائی مال میں کرنے کی اجازت مرحمت فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ تمہارا اورثین کو خوشحال بنا کر چھوڑ جانا بہتر ہے اس سے کہ تم انہیں مجبور وبے کس بنا کر چھوڑ جاؤ، وہ تمہارے بعد لوگوں سے بھیک مانگتے پھریں، دردر کی ٹھوکریں کھائیں (بخاری ومسلم)۔

صورت مسؤلہ میں اولاد کا کسی بھی صورت میں والدین سے جائداد کی تقسیم کا مطالبہ جائز نہیں ہے، خواہ اولاد محتاج ہوں یا نہ ہوں، بلکہ اولاد کا یہ مطالبہ گستاخی پر محمول ہوگا، نیز ہندوانہ رسم ورواج میں شمار ہوگا جو کسی بھی صورت میں مسلمان کے لئے زیب نہیں دیتا۔

سوال۔ ۷ بوڑھوں کے لئے بنائے گئے ہاسٹل کے بارے میں شرعی نقطہ نظر کیا ہے؟

جواب:...... والدین کی اطاعت وخدمت اور ان کے ساتھ حسنِ سلوک:

والدین خواہ مسلم ہوں یا غیر مسلم، اسلام ان کے ساتھ حسنِ سلوک کی تعلیم اور ادائیگی حقوق کی ترغیب دیتا ہے، البتہ شرک کے معاملات میں ان کی اطاعت کو حرام قرار دیتا ہے۔ اس لیے کہ اصولی مسائل الگ ہیں اور حسنِ معاشرت اور حقوق کی ادائیگی الگ چیز ہے۔ حضرت اسماء بنت ابوبکرؓ فرماتی ہیں کہ میرے پاس میری ماں آئی جو مسلمان نہیں ہوئی تھی، میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ کیا میں ان سے صلہ رحمی کروں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں۔ ابن عیینہؒ کا بیان ہے کہ انہی کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: "لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ" (الممتحنہ: ۸) یعنی اللہ تعالیٰ تم کو ان لوگوں کے ساتھ صلہ رحمی کرنے سے منع نہیں کرتا جو تم سے دین میں جنگ نہیں کرتے" (صحیح بخاری: ۹۲۵)۔

ضعیف والدین کی خدمت اسلام میں واجب ہے، بلکہ حقوق اللہ کے بعد اولین حق والدین کی خدمت اور ان کے ساتھ حسن سلوک کرنا، تادم حیات ان کی

اطاعت کرنا، انہیں اف تک نہ کہنا، ان کی زندگی میں ان کے حق میں دعا کرتے رہنا اور ان کی وفات کے بعد ان کے حق میں دعاء مغفرت کرنا، اور ان کے دوست واحباب کی عزت کرنا، جیسا کہ والدین کے ساتھ حسن سلوک کے تعلق سے احکامات وارد ہیں، ارشاد باری تعالی ہے:

وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا (سورۃ الاسراء: ۲۳-۲۴)

(اور تیرا رب صاف صاف حکم دے چکا ہے کہ تم اس کے ساتھ کسی اور کی عبادت نہ کرنا اور ماں باپ کے ساتھ احسان کرنا، اگر تیری موجودگی میں ان میں سے ایک یا یہ دونوں بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو ان کے آگے اف تک نہ کہو، نہ انہیں ڈانٹ ڈپٹ کرو، بلکہ ان کے ساتھ ادب واحترام سے بات چیت کر۔ اور عجز و نیاز سے اُن کے آگے جھکے رہو اور اُن کے حق میں دعا کرو کہ اے اللہ! جیسا انہوں نے مجھے بچپن میں (شفقت سے) پرورش کیا ہے تو بھی اُن (کے حال) پر رحم فرما)۔

دور جدید میں مغربی تہذیب نے انسانی اقدار کو پامال کیا، OLD AGE HOME جگہ جگہ بنادئے، ضعیف ماں باپ کے قیام کے لئے الگ الگ عمارتیں بنوائیں، والدین کو اپنے گھروں سے دور کردیا، اولاد کی محبت سے جدا کردیا، سماج کے معزز شہریوں کو سماج کا عضو معطل بنادیا، لیکن یہ مغربی تہذیب کی تباہ کاریاں ہیں، اسی تہذیب نے انسان کو انسانیت سے محروم کردیا، جب کہ اسلام نے والدین کو اللہ تعالی کے بعد سب سے اونچا مقام دیا، تادم حیات ان کی خدمت کو واجب قرار دیا، ان کی زندگی کے بعد بھی ان کی مغفرت کی دعا کریں، انکے چھوڑے ہوئے روزوں کا قضا کریں، ان کی جائز وصیتوں کو نافذ کریں، اولاد اگر مستطیع ہو تو والدین کی طرف سے حج کریں، اور انہیں ثواب پہنچائیں، صدقہ جاریہ کا انتظام کریں، تا کہ ان کی وفات کے بعد ثواب ملتا رہے، یہ سارے کام بھی صالح اولاد کی ذمہ داریوں میں سے ہیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جنت ماں کے قدموں کے نیچے ہے (احمد، نسائی)۔

اور یہ بھی ارشاد فرمایا کہ اللہ کی رضا مندی باپ کی رضامندی میں ہے اور اللہ کی ناراضگی باپ کی ناراضگی میں ہے (الادب المفرد للبخاری: ۱/ ۱۴)۔

والدین کی اطاعت وفرمانبرداری ہر حال میں فرض ہے الا یہ کہ ان کی اطاعت میں خالق کی نافرمانی لازم آتی ہو تو اللہ تعالی کو ناراض کرنا کسی بھی صورت میں جائز نہیں ہے، مثال کے طور پر والدین شرک پر مجبور کریں، احکام اسلام کی مخالفت کا حکم دیں، یا شرکیہ امور کی طرف دعوت دیں، یا بدعات وخرافات کی ترغیب دیں، اسلام کے خلاف رسم رواج کو اہمیت دیں، یا ناحق بیوی بچوں پر ظلم کرنے پر آمادہ کریں تو ایسی صورت میں اللہ تعالی اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت ہی واجب ہوگی، خواہ سماج کچھ بھی سوچے، کچھ بھی الزام لگائے، رب کی رضامندی ہر چیز پر مقدم ہوگی۔ جیسا کہ حضرت سعد بن ابی وقاص ؓ کے ایمان لانے کی خبر سے ان کی والدہ ناراض ہوگئی تھی، کھانا پینا سب بند کردی تھی، دو دن گزر گئے تھے، مگر حضرت سعد نے فرمایا کہ اے ماں اگر تمہاری ایک جان کے بجائے سو جان بھی چلی جائے پھر بھی میں رب کو ناراض نہیں کروں گا، اسلام کے مقابلہ میں شرک کو قبول نہیں کروں گا (تفسیر صفوۃ التفاسیر ۲/ ۴۱۵)۔

خصوصاً آج کے دور میں ضعیف والدین کا پرسان حال کوئی نہیں ہے الا ما شاء اللہ، والدین کو ترسا کر اولاد اپنی دنیا میں مگن ہیں، اپنی خوشی کی خاطر، اپنی راحت کے لئے بوڑھے والدین کو بوجھ سمجھنا انتہائی بداخلاقی کی بات ہے، وہ شخص خوش نصیب ہے جو تادم حیات ان کی خدمت کرے، ان سے دعائیں لے، اور ان کے حق میں دعا بھی کرے، وفات کے بعد بھی انہیں دعاء خیر میں یاد رکھے، اللہ تعالی ہم سب کو اسلامی تعلیمات کے مطابق والدین کی قدردانی کی توفیق نصیب فرمائے، آمین

سوال ۸: اجتماعی کفالت کے لئے خصوصی طور پر زکوۃ کی رقم کا استعمال:

جواب۔ زکوۃ کی ادائیگی سے بہت سے فائدے حاصل ہوتے ہیں، مثال کے طور پر زکوۃ کی ادائیگی سے دلوں کی کدورت دور ہوجاتی ہے، بغض وحسد کا خاتمہ بھی ہوتا ہے، مال میں برکت کا ذریعہ اور ایک اہم عبادت بھی ہے، ہمدردی، خیر خواہی، باہمی اُلفت ومحبت، اور بھائی چارگی قائم کرنے کا ذریعہ ہے، جس سے اجتماعی کفالت کا کام انجام پاتا ہے، زکوۃ کی ادائیگی سے اخوت کی جہانگیری، محبت کی حکمرانی، مساوات کی فراوانی، اور امن عام کا ماحول عام ہوتا ہے، غربت وافلاس کا خاتمہ زکوۃ کی ادائیگی ہی سے وابستہ ہے، زکوۃ کے مستحقین مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) فقراء (۲) مساکین (۳) زکوۃ کے عمل سے متعلق افراد (۴) تالیف قلب کے مستحقین (۵) غلام آزاد کرنے کے لئے (۶) مقروض (۷) اللہ کی راہ میں (۸) مسافر (توبہ۔ ۶۰)۔

صورت مسؤلہ میں از روئے شریعت عمر رسیدہ افراد جن کا کوئی پرسان حال نہ ہو، اور قریبی رشتہ دار بھی کفالت کے لئے تیار نہ ہوں تو ایسی صورت میں زکوۃ کے مستحقین میں خصوصاً فقراء اور مساکین کی فہرست میں ایسے افراد بھی شامل ہوں گے، اجتماعی کفالت کی خاطر مالِ زکوۃ سے ان کی خدمت، قیام وطعام کا نظم وضبط، اور ان کا علاج ومعالجہ بھی کیا جاسکتا ہے، جیسا کہ صاحب البدائع والصنائع نے فرمایا ہے کہ

''فی سبیل اللہ عبادۃ عن جمیع القرب فیدخل فیہ کل من سعی فی طاعۃ اللہ وسبیل الخیرات إذا کان محتاجا''

(البدائع والصنائع ۲/۴۵)

یعنی زکوۃ کے مصارف فی سبیل اللہ میں تقرب الی اللہ کے تمام ذرائع میں ہر وہ کام جو اللہ کی اطاعت اور خیر کے کاموں پر مشتمل ہو شامل ہے، خصوصاً کوئی شخص محتاج ہو تو فی سبیل اللہ کے مد میں داخل ہے اور مال زکوۃ سے مدد کی جاسکتی ہے۔

سوال ۹: مقررہ حدِ عمر کو نہ پہنچنے کے باوجود حکومت کی مراعات سے استفادہ:

جواب۔ جمہوری حکومت ہمارے انتخاب سے بنتی ہے اور ہم اس کے کل پرزے ہیں، حکومت کی آمدنی کے ذرائع ہمارے ٹیکس وانکم ٹیکس اور تجارتی حلال ذرائع وغیرہ بھی ہیں لہذا حکومت کے فنڈ کو غیر مسلم کا فنڈ قرار دینا درست نہیں ہے، نیز حکومت اپنی رعایا کی سرپرست اور نگران ہے جس طرح حکومت دیگر مذاہب کے لوگوں کیساتھ تعاون کرتی ہے اسی طرح مسلمانوں کی سرپرستی اور ان کے ساتھ تعاون کرنا یا رعایتیں دینا حکومت کے فرائض منصبی میں داخل ہے، صورت مسؤلہ میں سن رسیدہ افراد کا مقررہ عمر کو پہنچے بغیر حکومت کی مختلف رعایتوں سے استفادہ درست نہیں ہے، محض دنیوی فائدے کی خاطر جعلی دستاویز کے ذریعہ دھوکہ کے راستہ سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں ہے، نیز بعض حضرات محض چند دنیوی فائدے کی خاطر عمر کو گھٹا کر یا بڑھا کر مختلف اسکیموں سے مستفید ہوتے ہیں، شرعاً یہ بھی درست نہیں ہے، مثلاً ریٹائرمنٹ کو مؤخر کرنے کی غرض سے جھوٹے دستاویز کا سہارا لینا بھی دھوکہ دینا ہے، کہ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: ''من غشنا فلیس منا'' جو دھوکہ دے وہ ہم میں سے نہیں ہے (مسلم، ابوداؤد، ترمذی اور سنن ابن ماجہ)۔

مسلمان نام ہے ایک فرمانبردار کا، اسلام میں حکام کی اطاعت اللہ تعالی اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت وفرمانبرداری کے بعد واجب ہے بشرطیکہ وہ کسی معصیت کا حکم نہ دیں، شرک پر آمادہ نہ کریں، خواہ حکومت مسلم کی ہو یا نہ ہو، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''لا طاعۃ لمخلوق فی معصیۃ الخالق'' (مسند امام احمد، ۱۰۹۵، الجمع بین الصحیحین ۱۳۲)

یعنی خالق کی معصیت میں کسی مخلوق کی اطاعت وفرمابرداری واجب نہیں ہے، مسلمان بحیثیت ایک معزز شہری اس پر موجودہ حکومتوں کے قوانین کی پاسداری ضروری ہے، مثال کے طور پر انکم ٹیکس کی ادائیگی سود کی رقم سے غیر مناسب ہے اس لئے کہ انکم ٹیکس حکومتِ ہند کی جانب سے تمام ہندوستانیوں پر عائد کردہ ایک فریضہ ہے جو مفاد عامہ میں صرف کی جاتی ہے سود کی رقم سے انکم ٹیکس ادا کرنا گویا اپنی ذات پر سود کی رقم استعمال کرنے کے مترادف ہے۔

معذوروں اور بوڑھوں کے حقوق

مفتی تنظیم عالم قاسمی[1]

۱۔ بوڑھے افراد کو کسب معاش پر مجبور کرنا:

بوڑھے اور کمزور افراد تعاون اور ہمدردی کے محتاج ہوتے ہیں، وہ اپنی ضروریات کی از خود تکمیل نہیں کر سکتے، بالخصوص کھانے پینے، رہنے سہنے اور علاج ومعالجہ میں انہیں دوسروں کے سہارے کی ضرورت پیش آتی ہے، ایسے وقت شریعت نے نوجوان اور طاقت ور افراد کو ان کے ساتھ حسن سلوک کرنے اور ان کے لئے دست تعاون دراز کرنے کی تعلیم دی ہے، البتہ یہ ذمہ داری ان کی مزید بڑھ جاتی جن کی ان کمزوروں اور بوڑھوں سے قرابت اور رشتہ داری ہے۔

پھر قرابت داروں میں ماں باپ کی حیثیت سب سے زیادہ ہے، اس لئے ان کے احکام بھی دیگر افراد سے علیحدہ ہیں، تکریم وتعظیم لین دین، نان نفقہ، علاج ومعالجہ، خدمت گذاری اور دیگر چیزوں میں ان کے مسائل ممتاز ہیں؛ چنانچہ فقہاء احناف کے یہاں ایسے اقرباء جو ذی رحم محرم ہوں اگر وہ محتاج ہوں اور کمانے کے لائق نہ ہوں تو ان کا نفقہ خاندان کے افراد پر بقدر حصص میراث لازم ہے اور اگر انہیں کسب معاش پر قدرت حاصل ہو تو ان کو کمانے پر مجبور کیا جائے گا، تاکہ وہ دوسروں پر بوجھ نہ بنیں اور اپنے نفقہ کا انتظام خود اپنی کمائی سے کرلیں؛ اس لئے کہ والدین کے علاوہ دیگر اقرباء اور رشتہ داروں کا نفقہ مواساۃ اور بروصلہ کے طور پر واجب ہوتا ہے اور جواز خود صاحب حیثیت ہے وہ نفقہ کے وجوب کے لئے بروصلہ کا اہل نہیں، اسی طرح جو کمانے پر قادر ہے اس کا بھی نفقہ مواسات کے طور پر دوسروں پر واجب نہیں کیا جاتا؛ کیونکہ قادر علی الکسب کو فقہاء نے موسر اور غنی قرار دیا ہے، اور یہ عین قیاس کے مطابق بھی ہے اس لئے کہ اصل تو یہی ہے کہ انسان اپنی کفالت خود اپنے ہاتھ کی کمائی سے کرے، مختلف نصوص اس کی تائید میں منقول ہیں۔

البتہ شریعت نے والدین کے ساتھ حسن سلوک اور حسن معاشرت کی تعلیم دی ہے، "وصاحبهما في الدنيا معروفًا" (لقمان: ۱۵) اور حسن معاشرت کا تقاضا ہے کہ ان کا نان نفقہ اور ضروریات زندگی مہیا کی جائیں؛ اس لئے والدین اگر محتاج ہوں تو اولاد پر ان کا نفقہ لازم ہوگا خواہ وہ کسب معاش پر قادر ہی کیوں نہ ہوں؛ اس لئے کہ خود نعمتوں میں رہنا اور ماں باپ کو کمانے پر مجبور کرنا حسن معاشرت نہیں ہے اور کم از کم یہ ایذا رسانی میں داخل ہے جب کہ قرآن نے "فلا تقل لهما أف ولا تنهرهما" (سورہ اسراء: ۲۴) کے ذریعہ معمولی اذیت دینے سے بھی منع فرمایا ہے اسی طرح اگر غور کیا جائے تو اولاد کے مال میں سے کھانے کے باوجود ایسا ہے جیسا کہ وہ اپنے ہاتھ کی کمائی سے کھا رہا ہے؛ اس لئے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"إن أولادكم من أطيب كسبكم فكلوا من كسب أولادكم"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اولاد کو عمدہ کمائی قرار دیا ہے، لہٰذا والدین کے بارے میں یہ نہیں کہا جاسکتا ہے کہ وہ اولاد کے لئے بوجھ ہیں یا دوسروں کے دست نگر ہیں؛ اس لئے فقہاء نے اس بات کی صراحت کی ہے کہ اگر والدین محتاج ہوں تو ان کا نفقہ علاج ومعالجہ بقدر وسعت اولاد پر واجب اور لازم ہے اگر والدین کمانے پر قادر ہوں تو بھی انہیں کسب معاش پر مجبور نہیں کیا جاسکتا۔

"ثم يفرض على الابن نفقة الأب إذا كان محتاجًا والابن موسرًا سواء كان الأب قادرًا على الكسب أولم لكن" (المحيط البرہانی ۳/ ۵۶۴)۔

"وشرط أن يكون عاجزا عن الكسب، فإن القادر عليه غني به بخلاف الأبوين؛ لأنهما يتصران به، والولد مامور بدفعه عنهما" (تبیین الحقائق ۳/ ۶۴)۔

[1] استاذ حدیث دار العلوم سبیل السلام حیدر آباد۔

''اتفق الفقهاء على وجوب النفقة لقريب فقير عاجز عن الكسب، فإن كان قادرًا على الكسب فلا نفقة له بالاتفاق؛ لأن القدرة على الكسب غني لكن باستثناء الأبوين'' (الفقة الاسلامی وادلتہ۔الفصل الخامس' النفقات)۔

تاہم اگر باپ صحت مند ہو کمانے پر قادر ہو تو انہیں از خود چاہئے کہ اولاد کا ہاتھ بٹائیں اور کسب معاش میں ان کا ساتھ دیں، قوت کے باوجود محض عناد اور تعنت کی بنیاد پر کسب معاش اختیار نہ کریں اور مقصد اولاد کو پریشان کرنا ہو تو اس صورت میں اولاد پر نفقہ واجب نہیں ہوگا؛ بلکہ باپ کو کسب معاش پر مجبور کیا جائے گا، اس لئے کہ باپ اور بیٹے کے درمیان شفقت اور محبت کا جو رشتہ تھا اور جس بنیاد پر حسن معاشرت کا وہ اہل تھا باپ نے اپنی بدنیتی سے اسے ضائع کر دیا ہے''الفقہ الاسلامی وادلتہ'' میں ہے:

''يجب على الولد الموسرذكرا كان أو أنثى كبيرًا كان أوصغيرًا نفقة والديه الفقر، أو لو كانا قادرين على الكسب مالم يظهر تعنت الأب فى اختيار البطالة على عمل أمثاله كسلًا أوعنادًا'' (نفقة الاقارب فی القانون السوری)

اجداد اور جدات کا وہی حکم ہے جو ماں باپ کا ہے، اس لئے کہ وہ دونوں ماں باپ کی غیر موجودگی میں ان کے قائم مقام ہوتے ہیں اور وہ درحقیقت ان کی زندگی کے سبب بھی ہیں:

''وأما الأجداد والجدات فكالأبوين، ولهذا يقومان مقام الأب أو الأم فى الإرث وغيره؛ ولأنهم تسببوا لإحيائه فاستوجبوا عليه الإحياء كالأبوين (الموسوعة الفقهية۔القرابة الموجبة للنفقة)۔

۲-سن رسیدہ حضرات کا نفقہ وعلاج واجب ہونے کی صورتیں:

نفقہ اور علاج کے وجوب کی بنیاد معذوری ومجبوری ہے، اس مجبوری کی صورتیں مختلف ہیں جیسے انسان کا اتنا بوڑھا ہونا کہ کسب معاش کی قدرت نہ ہو یا اس طرح بیمار ہو کہ وسائل معاش اختیار نہ کر سکے، یا بالکل اپاہج ہو، فالج زدہ ہو، ہاتھ پاؤں شل ہو گیا ہو، نابینا ہو مجنون اور دیوانہ ہو یا معتوہ ہو۔ یہ تمام شرطیں مردوں کے لئے ہیں عورتوں کے لئے کوئی شرط نہیں ہے ان کا جنس تانیث سے ہونا کافی ہے، اس لئے کہ عورتوں کی طبعی نزاکت ہی کسب معاش سے مانع ہے اور اسی میں ان کی عفت وعصمت کی حفاظت بھی ہے۔ اسی طرح یہ شرطیں والدین اور آباواجداد کے علاوہ دیگر اقرباء اور رشتہ داروں کے لئے ہیں؛ کیونکہ والدین کے لئے صحت اور قدرت علی الکسب کے باوجود بھی نفقہ لازم ہے بشرطیکہ وہ محتاج ہوں:

''ثم لابد من الحاجة والصغر والأنوثة والزمانة والعمى أمارة الحاجة لتحقق العجز، فإن القادر على الكسب غنى بكسبه بخلاف الأبوين؛ لأنه يلحقهما تعب الكسب والولد مامور بدفع الضرر عنهما فتجب نفقتهما مع قدرتهما على الكسب'' (ہدایہ ۲/ ۲۹۳)۔

دور حاضر کے مشہور فقیہ ڈاکٹر وہبہ زحیلی لکھتے ہیں:

''اتفق الفقهاء على وجوب النفقة لقريب فقير عاجز عن الكسب والعجزعن الكسب ألا يستطيع الإنسان اكتساب معيشته بالوسائل المشروعة المعتادة اللائقة به وله صفات هى: أن يكون انثى مطلقًا أو مريضًا زمنا أو صغيرًا أو مجنونا أو معتوها أومصابا بآفة تحول دون العمل كالعمى والشلل أو عاطلا عن العمل فلا يجد عملًا بسبب انتشار البطالة'' (الفقه الاسلامی وادلته، الفصل الخامس' النفقات)۔

۳-ضرورت سے زائد رقم کا مطالبہ کرنا:

ماں باپ ہوں یا دیگر اقرباء اور رشتہ دار، ان تمام کا نفقہ اس وقت لازم ہوتا ہے جب کہ وہ خود فقیر اور محتاج ہوں، چنانچہ اگر وہ صاحب حیثیت ہوں تو ان کا نفقہ اور دیگر ضروریات کی تکمیل ان کے نجی مال سے ہوگی ان کے لئے اولاد یا دیگر افراد سے زائد رقم کا مطالبہ درست نہیں ہے اور طلب کی صورت میں اولاد پر دینا واجب بھی نہیں؛ اس لئے کہ دوسروں پر نفقہ وغیرہ احتیاج کی صورت میں واجب ہوتا ہے انسان جب خود صاحب استطاعت ہو تو اس کے تمام اخراجات اسی کے مال سے ہوں گے یہی وجہ ہے کہ اولاد صغار کا نفقہ باپ پر لازم ہے، مگر جب اولاد صغار خود مال دار ہوں تو باپ پر ان کا نفقہ لازم نہیں ہوگا۔

بوڑھے والدین یا خاندان کے وہ افراد جن کا نفقہ محتاجی کی صورت میں لازم ہے اگر وہ صاحب حیثیت اور مالدار ہوں تو زیادہ سہولت کے لئے یا اپنی زندگی

کو بہتر بنانے یا دوسروں پر خرچ کے لئے زائد رقم کا مطالبہ نہیں کر سکتے، فقہاء نے یہاں تک لکھا ہے کہ اگر باپ کے پاس بڑا گھر ہے تو وہ بیچ کر چھوٹا مکان خرید لے اور فاضل پیسے سے اپنا نفقہ پورا کرے یا مکان کے زائد حصے کو کرایہ پر دے کر اپنی ضروریات کی تکمیل کرے، بعض علماء نے اس کا انکار کیا ہے اور لکھا ہے کہ احتیاج اگر اس حد تک پہنچ جائے کہ مکان کو فروخت کرنا پڑے یا کرایہ پر دینا پڑے تو پھر اولاد پر نفقہ لازم ہو جائے گا؛ لیکن ضرورت سے زائد رقم کے مطالبہ کے عدم جواز میں کسی کا اختلاف نہیں ہے:

''قال فی الذخيرة لو كان للاب مسكن او دابة فالمذهب عندنا أن تفرض النفقة على الابن إلا أن يكون فی المسكن فضل نحو ان يكفيه أن يسكن ناحيته منه فيؤمر الاب ببيع الفضل والانفاق على نفسه ثم تفرض نفقته على ابنه'' (منحة الخالق ۴/۲۲۹)۔

''واختلف الحنفية فيمن يملك منزلًا أوله خادم هل يستحق النفقة على قريبه الموسر على روايتين الأولى أنه لايستحق النفقة على قريبه الموسر، لأن النفقة لا تجب لغير المحتاج ومثل هولاء غير محتاجين؛ لأنه يمكنه بيع بعض المنزل اوكله ويكترى منزلا فيسكن بالكراء أوبيع الخادم إذا كان رقيقا كما كان فی الماضی والثانية انه يستحق؛ لأن بيع المنزل لايقع إلا نادرًا ولايمكن لكل أحد السكنى بالكراء أو بالمنزل المشترك قال الكاسانی وهذا هو الصواب'' (الفقه الاسلامی وادلته۔ الفصل الخامس' النفقات)۔

۴- (الف) زیادہ آمدنی کے لئے لڑکوں کا والدین کو چھوڑ کر دوسری جگہ جانا:

ماں باپ کا سایہ اولاد کے لئے عظیم نعمت ہے۔ یہ نعمت بار بار حاصل نہیں ہوتی، ان کی دعاؤں اور خدمت میں دنیا و آخرت دونوں کی کامیابی ہے، اسی لئے قرآن کریم نے اولاد کو ان کی خدمت کرنے اور اس کے لئے ہر مصیبت برداشت کرنے کی تاکید ہے:

''قَضَىٰ رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدُوٓا۟ إِلَّآ إِيَّاهُ وَبِٱلْوَٰلِدَيْنِ إِحْسَـٰنًا ۚ إِمَّا يَبْلُغَنَّ عِندَكَ ٱلْكِبَرَ أَحَدُهُمَآ أَوْ كِلَاهُمَا فَلَا تَقُل لَّهُمَآ أُفٍّ وَلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُل لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيمًا ۔ وَٱخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ ٱلذُّلِّ مِنَ ٱلرَّحْمَةِ وَقُل رَّبِّ ٱرْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِى صَغِيرًا'' (اسراء: ۲۳-۲۴)۔

(تیرے رب نے فیصلہ کر دیا ہے کہ تم لوگ کسی کی عبادت نہ کرو مگر صرف اس کی۔ والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو۔ اگر تمہارے پاس ان میں سے کوئی ایک یا دونوں بوڑھے ہو کر رہیں تو انہیں اف تک نہ کہو نہ انہیں جھڑک کر جواب دو بلکہ ان سے احترام کے ساتھ بات کرو اور نرمی اور رحم کے ساتھ ان کے سامنے جھک کر رہو اور دعا کیا کرو کہ پروردگار! ان پر رحم فرما جس طرح انہوں نے رحمت و شفقت کے ساتھ مجھے بچپن میں پالا تھا)۔

رسول اکرم ﷺ نے بھی امت کے افراد کو ماں باپ کی خدمت پر مختلف انداز سے ابھارا ہے۔ والد کو آپ ﷺ نے جنت کا دروازہ اور ماں کے قدموں کے نیچے جنت ہونے کا تصور دیا ہے ارشاد فرمایا: ''ألزم قدميها، فإن تحت قدميها الجنة'' (نسائی)۔

اس طرح کی آیات و ارشادات نبوی کی روشنی میں حضرات فقہاء نے اولاد پر والدین کی خدمت کو لازم قرار دیا ہے البتہ خدمت کی مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں، جیسے بدنی و جسمانی خدمت، علاج و معالجہ، نان نفقہ، بہتر رہائش سہولت کی چیز فراہم کرنا وغیرہ۔ بسا اوقات بدنی اور جسمانی خدمت کی ضرورت ہوتی ہے اور کبھی روپیوں اور پیسوں کے فراہم کرنے کی تاکہ ان کی ضروریات کی تکمیل کی جا سکے، نوعیتیں مختلف ہیں، اس لئے حکم حالات کے اعتبار سے ہوگا، اگر والدین جسمانی خدمت کے محتاج نہیں یا ہیں مگر جسمانی خدمت کرنے والا کوئی شخص گھر میں موجود ہے جیسے کوئی بھائی بہن، یا ماں باپ میں سے کوئی ایک صحت مند ہے جو دوسرے کی نگرانی کر سکتا ہے تو اس صورت میں کسب معاش کے لئے دوسرا شہر یا ملک جانا درست ہے اس مقصد سے کہ اس کے ذریعہ والدین کی دیگر ضروریات فراہم کر سکے، اس لئے کہ یہ بھی خدمت کا ایک حصہ ہے، البتہ بیٹے کو چاہئے کہ فون، خط و کتابت یا دیگر ذرائع سے والدین کے احوال معلوم کرتا رہے اور جب بھی ضرورت ہو والدین کے پاس پہنچ جائے:

''إن كان السفر سفر تجارة أوحج لابأس بأن يخرج بغير إذن والديه إذا استغنى الأبوان عن خدمته؛ لأنه ليس فی هذين السفرين إبطال حق الوالدين إذا لم يكن الطريق مخوفا فإن كان مخوفا مثل البحر لا يخرج إلا بإذن والديه وإن كانا مستغنين عن خدمته (فتاوىٰ قاضی خان ۲/ ۳۶۳)۔

اور اگر والدین سخت بیمار ہوں اور ان کی خدمت کرنے والا کوئی نہیں ہے تو لڑکوں کا باہر جانا کسب معاش کے لئے درست نہیں، ایسے وقت ان کو چاہئے کہ گھر سے قریب کوئی ملازمت تلاش کریں خواہ تنخواہ یا آمدنی کم ہو اس پر اکتفا کرتے ہوئے اپنے والدین کی خدمت کریں، اس لئے کہ اب ان کی جسمانی خدمت مقدم ہے۔ ان کی خدمت چھوڑ کر باہر جانا ایذا رسانی اور بدسلوکی ہے جو حرام اور ناجائز ہے، یہ بھی جائز نہیں کہ کسی نوکر یا خادم کے ذریعہ ان کی خدمت کرائیں اور خود باہر کسب معاش کے لئے چلے جائیں، اس لئے کہ بیٹوں کی خدمت سے جو والدین کو راحت ہوگی وہ دوسروں سے حاصل نہیں ہوگی، اس کے علاوہ بیٹوں کے حق میں ماں باپ کی خدمت عبادت کے درجے میں ہے جس میں نیابت جاری نہیں ہوتی، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے لڑکوں کو والدین کی خدمت کا حکم دیا ہے، مقصود لڑکوں کی خدمت ہے نفس خدمت نہیں کہ جس طرح ماں باپ نے تجھے پالا اور تمہاری تمام ضرورت پوری کی، اب جب کہ وہ محتاج ہیں تو تم از خود ان کی خدمت کرو؛ تا کہ کسی حد تک مکافات ہو سکے:

''وعلى هذا فإن طلب والداك أو أحدهما منك الرجوع أو علمت من حالهما أو حال أحدهما أنهما بحاجة إلى وجودك معهما فإنه يتوجب عليك ذلك أما إذا لم يطلبا منك الرجوع ولم يحتاجاك في الواقع وكان بقاؤك بعيدًا عنهما من أجل العمل وبرضاهما فلا يجب عليك الرجوع'' (فتاوى الشبكة الاسلامية ۱۳/ ۲۹۹)۔

ب- بہو کو ساس کی خدمت پر مجبور کرنا:

والدین کی خدمت لڑکوں پر لازم ہے نہ کہ ان کی بیوی پر اس لئے کہ عورتوں کو ان کے شوہر کی خدمت کا مکلف بنایا گیا ہے شوہر کے والدین کا نہیں تاہم شوہر کی خدمت اور ان کے ساتھ حسن سلوک کا تقاضا ہے کہ بضرورت ساس اور خسر کی بھی خدمت کریں اور اس میں اپنے شوہر کا تعاون کریں؛ چونکہ شوہر کی ہر خوشی پر قربان ہونا نیک عورت کی علامت ہے اور شوہر والدین کی خدمت سے خوش ہوں گے گویا اس طرح شوہر کے والدین کی خدمت درحقیقت شوہر کی خدمت ہے، اس لئے بہو کو چاہئے کہ گھر میں نفرت کا ماحول بنانے کے بجائے محبت اور ہمدردی کا ماحول پیدا کریں اور جہاں تک ممکن ہو ساس کے ساتھ رہنے اور ان کی خدمت کو ترجیح دیں، اس امید سے بھی کہ آج جیسا سلوک وہ اپنے ساس کے ساتھ کرے گی کل ان کی بہو بھی وہی سلوک کرے گی اور پھر اس میں بڑوں کا احترام بھی ہے۔ جو قابل اجر و ثواب ہے، مگر یہ تمام چیزیں اخلاقیات کے قبیل سے ہیں، ان پر لازم نہیں، اس لئے کہ بیوی اگر شوہر سے علیحدہ رہائش کا مطالبہ کرے تو اس کی تکمیل شوہر پر شرعاً لازم ہے، خواہ وہ علیحدہ گھر کی صورت میں ہو یا علیحدہ کمرہ کی شکل میں:

''إذا كان للرجل والدة أو أخت أو ولد من أمرأة أخرى أو إنسان ذو رحم محرم من الزوج وكانت المرأة نازلة له معهم في واحد فقالت المرأة للزوج: أنا لا أنزل مع أحد من هؤلاء فصيرني في منزل على حدة فالمسألة على وجهين، إن كان في الدار بيوت فاعطاها بيتا تغلق عليه وتفتح لم يكن لها أن تطالبه بمنزل آخر وإن لم يكن في الدار إلا بيت واحد فلها أن تطالبه بمنزل آخر لوجهين أحدهما أنها تخاف على أمتعتها والثاني أنه يكره المجامعة ومعها في البيت غيرهما'' (المحيط البرهاني: ۳/ ۱۷۲)۔

ج- بیٹیوں کا ماں باپ کی خدمت کرنا:

ماں باپ کی خدمت کی فضیلت اور تاکید کے سلسلہ میں جتنے نصوص وارد ہیں ان میں بیٹے اور بیٹی کا کوئی فرق نہیں ہے؛ اس لئے والدین کی خدمت کے جس طرح بیٹے مکلف ہیں اسی طرح بیٹیاں بھی مکلف ہیں اور ان کی بھی ذمہ داری ہے کہ حسب استطاعت ماں باپ کی خدمت کریں اور ان کی راحت کا انتظام کریں، البتہ لڑکے خود مختار ہوتے ہیں اور وہ خود کمانے والے ہوتے ہیں جب کہ لڑکیوں کی حالت یکسر مختلف ہے وہ شوہر کے ماتحت ہوتی ہیں، ان پر شوہر اور بچوں کی پرورش و پرداخت کی ذمہ داری ہوتی ہے اور وہ کمانے والی بھی نہیں ہوتی، اس لئے لڑکوں پر والدین کی خدمت کی ذمہ داری زیادہ ہوتی ہے، اسی طرح نفقہ اور علاج وغیرہ کی ذمہ داری بھی لڑکوں پر ہے لڑکیوں پر نہیں، لیکن لڑکیاں اگر صاحب جائداد ہوں تو ان پر بھی لڑکوں کی طرح ماں باپ کا نفقہ اور علاج وغیرہ ضروری ہوگا۔

لیکن اگر ماں باپ کی دیکھ ریکھ کرنے والا کوئی نہیں یا ہے مگر نا کافی ہے اور والدین کو بیٹیوں کی خدمت کی اشد ضرورت ہے تو اس صورت میں بیٹیوں پر لازم ہوگا کہ وہ والدین کی خدمت کریں، شوہر خواہ اس کی اجازت دے یا نہ دے شوہر کو والدین کی خدمت کرنے سے روکنے کا حق نہیں ہے جیسا کہ عام حالات میں

ان کو والدین کی زیارت یا عیادت سے روکنے کا حق نہیں ہے، اس لئے کہ والدین کا مقام بہر حال شوہر سے زیادہ ہے۔

''امرأة لها أب زمن ليس له من يقوم عليه غير البنت ويمنعها الزوج عن تعاهده جاز لها أن تعصى زوجها وتطيع أباها مؤمنا كان الأب أو كافرا؛ لأن القيام عليه فرض عليها في هذه الحالة وحق الزوج لا يظهر مع الفرائض'' (المحيط البرهاني ۳/ ۱۷۲)۔

۵- باپ کو شادی سے روکنا:

باپ اگرچہ عمر دراز ہو گیا ہو؛ لیکن اسے جنسی خواہش ہو یا خدمت گذاری کے لئے بیوی کا محتاج ہو تو اس کے لئے دوسری شادی کی اجازت ہے اور اس سلسلے میں وہ اپنی اولاد سے مشورے کا مکلف بھی نہیں، کیونکہ وہ خود آزاد عاقل بالغ اور صاحب حیثیت ہے، ایک آزاد اور عاقل بالغ شخص اپنی شادی میں خود مختار ہوتا ہے، دوسروں کو اس کے نکاح کے درمیان رکاوٹ بننے کا حق نہیں ہے اگر جنسی خواہش نہ ہو محض جسمانی خدمت اور راحت کے لئے شادی کر رہا ہو تو بھی بیٹے اور بیٹیوں کو رکاوٹ بننے کا حق نہیں، اولاد کی جانب سے خدمت کے لئے نوکر اور خادم فراہم کر دیا جائے تو بھی۔ اس لئے کہ بیوی جو خدمت کر سکتی ہے وہ دوسرے نہیں کر سکتے ایسے وقت اولاد کو شادی میں معین اور مددگار بننا چاہئے نہ کہ مانع اس لئے کہ باپ کے ساتھ حسن سلوک اور بہتر معاشرت کی تعلیم دی گئی ہے اور حسن سلوک میں یہ داخل ہے کہ باپ کی خواہش پر ان کے آرام و راحت کے لئے ان کو جوڑا فراہم کیا جائے ان کی جنسی تسکین اور پاک دامنی کا انتظام کیا جائے جس طرح اولاد پر محتاجی کی صورت میں باپ کا نفقہ، لباس، رہائش اور علاج ضروری ہے اسی طرح باپ کا اعفاف اور قلبی تسکین کی فراہمی بھی ضروری ہے۔

اسی وجہ سے ارباب فقہ و افتاء نے صراحت کی ہے کہ اگر باپ کے پاس دوسری شادی کے لئے نفقہ کا انتظام اور اخراجات کا انتظام نہ ہو اور بیٹا صاحب حیثیت ہو تو بیٹے پر باپ کے نفقہ کی طرح ان کی بیوی کا نفقہ بھی واجب ہوگا۔

''جمهور أصحابنا أن إعفافه واجب كنفقته لعموم قول تعالى ''وصاحبهما في الدنيا معروفا'' (لقمان: ۱۵) وإنكاحه من المعروف؛ ولأنه لما وقيت نفس الأب بنفس الابن فلم يقتص من الأب بالابن فأولى أن توفى نفسه بمال الابن في وجوب إعفافه على الابن'' (الحاوی الكبير ۹/ ۱۸۳)۔

''وإن احتاج الأب إلى زوجة والابن موسر وجب عليه أن يزوجه أو يشترى له جارية ويلزمه نفقتها وكسوتها، كما يجب نفقة الأب وكسوته'' (الجوہرة النيرة ۲/ ۹۲)۔

۶- زندگی میں باپ سے تقسیم جائداد کا مطالبہ:

جائداد کی تقسیم کا تعلق وراثت سے ہے اور وراثت موت کے بعد جاری ہوتی ہے زندگی میں نہیں اس لئے باپ کی زندگی میں اولاد کے لئے تقسیم جائداد کا مطالبہ درست نہیں، لڑکے کے بالغ ہونے کے بعد جب کہ وہ معذور اور اپاہج نہ ہو اس پر اپنی ضروریات کی تکمیل خود واجب ہے ان کو چاہئے کہ محنت اور جد و جہد کے ذریعہ اپنے معاش کا انتظام کرے اور اپنی زندگی میں خوشحالی پیدا کرے؛ لیکن اگر اولاد کے پاس ضروریات زندگی کا بھی فقدان ہو اور بسیار کوشش کے باوجود وہ اس کے حصول میں کامیاب نہ ہوں اور باپ صاحب حیثیت اور صاحب جائداد ہو تو باپ کو از خود اولاد کا تعاون کرنا چاہئے کہ یہی اولاد سے محبت کا تقاضا ہے۔ شریعت نے عام محتاج شخص کے ساتھ ہمدردی کرنے اور اخلاق برتنے کی تعلیم دی ہے تو محتاج بیٹے کے ساتھ ہمدردی کرنے کی فضیلت اور تاکید کس قدر ہوگی؟ اپنے آپ کو راحت اور آسائش میں رکھنا اور اولاد کو بے سہارا چھوڑ دینا کون سی ہمدردی اور محبت ہے، تاہم اس کا تعلق اخلاقیات سے ہے، شرعی حق اور وجوب سے نہیں۔

''قوله: إنما يكون بعد الموت؛ لأن كونهم ورثة لايتحقق إلا بعد موت المورث وكذا العقب، فإنه عبارة عمن وجد من الولد بعد موت الإنسان، فأما في حال حيوته فليسوا بعقب (شامی ۶/ ۶۸۸)۔

۷- بوڑھوں کو علیحدہ ہاسٹلوں میں رکھنا:

مغربی ممالک میں بوڑھے لوگوں کا ہاسٹل بنا دیا گیا ہے جس کو Old age home کہا جاتا ہے ایسے لوگ جن کو اپنے بوڑھے ماں باپ اور اپنے خاندان کے بزرگوں کی خدمت کا موقع نہیں ملتا وہ اپنی ذمہ داری سے نجات پانے کے لئے اسی ہاسٹل میں ان کو داخل کر دیتے ہیں اور ماہانہ فیس جمع کرتے رہتے

ہیں۔ یہ طریقہ غیر اسلامی اور غیر شرعی ہے اسلام نے تمام متبعین کو یہ تصور دیا ہے کہ سن رسیدہ افراد بالخصوص ماں باپ کی خدمت انسان کے لئے بڑی سعادت ہے، جہاں تک ممکن ہو سکے ان کی صحبت کو اختیار کریں ان کی خدمت کریں اور ان کی خوشنودی حاصل کریں، اس لئے کہ ان کی خدمت نفلی جہاد سے بھی افضل اور اعلیٰ ترین عمل ہے، ان کی خدمت کی راہ سے اللہ کی محبوبیت حاصل کی جاسکتی ہے۔ قرآن کریم میں والدین کے ساتھ حسن معاشرت اور صحبت بالمعروف کا حکم دیا گیا ہے جس کا تقاضا ہے کہ ماں باپ کے سائے کو اپنے لئے غنیمت جانا جائے اور اپنی ضروری مصروفیت کے بعد ان سے بات چیت، خدمت اور ان کی ضروریات کی تکمیل میں وقت گذارا جائے، اگر والدین ان ہاسٹلوں میں ڈال دیئے جائیں تو خدمت کا اہم فریضہ فوت ہو جائے گا۔ صبح وشام ان کی مزاج پرسی اور دیکھ ریکھ سے ماں باپ کو جو سکون ملتا تھا وہ بھی ختم ہو جائے گا اولاد اپنے گھر میں مزے اڑائیں اور ماں باپ دور علیحدہ زندگی گذارنے پر مجبور ہوں یہ بڑی بدسلوکی اور ایذاء رسانی ہے جس سے قرآن نے سختی سے منع کیا ہے اور اسے شرک باللہ جیسے گناہ کا درجہ دیا گیا ہے:

"قَضَى رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا إِمَّا يَبْلُغَنَّ عِندَكَ الْكِبَرَ أَحَدُهُمَا أَوْ كِلَاهُمَا فَلَا تَقُل لَّهُمَا أُفٍّ وَلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُل لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيمًا. وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُل رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِي صَغِيرًا" (اسراء: ۲۳-۲۴)۔

(تیرے رب نے فیصلہ کر دیا ہے کہ تم لوگ کسی کی عبادت نہ کرو مگر صرف اس کی۔ والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو۔ اگر تمہارے پاس ان میں سے کوئی ایک یا دونوں بوڑھے ہو کر رہیں تو انہیں اف تک نہ کہو نہ انہیں جھڑک کر جواب دو بلکہ ان سے احترام کے ساتھ بات کرو اور نرمی اور رحم کے ساتھ ان کے سامنے جھک کر رہو اور دعا کیا کرو کہ پروردگار! ان پر رحم فرما جس طرح انہوں نے رحمت وشفقت کے ساتھ مجھے بچپن میں پالا تھا)۔

ایک دوسری جگہ ارشاد ہے:

"وَوَصَّيْنَا الْإِنسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا وَإِن جَاهَدَاكَ لِتُشْرِكَ بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا" (العنکبوت: ۸)۔

(ہم نے انسان کو ہدایت کی کہ اپنے والدین کے ساتھ نیک سلوک کرے لیکن اگر وہ تجھ پر زور ڈالیں کہ تو میرے ساتھ کسی ایسے معبود کو شریک ٹھیرائے جسے تو نہیں جانتا تو ان کی اطاعت نہ کر)۔

یعنی اگر وہ کافر یا بدعمل ہوں پھر بھی ان کے ساتھ دنیا میں حسن سلوک کیا جائے گا۔ ایک موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"ألا أخبركم بأكبر الكبائر، قالوا: بلىٰ يارسول الله! قال: الإشراك بالله وعقوق الوالدين" (صحیح بخاری ومسلم)۔

(کیا میں تمہیں سب سے بڑا گناہ نہ بتادوں، صحابہ نے کہا ضرور بتایئے یارسول اللہ! آپ نے فرمایا: اللہ کے ساتھ شرک کرنا اور والدین کی نافرمانی کرنا)۔

اس طرح کی آیات واحادیث کی روشنی میں قطعیت کے ساتھ یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مغربی ممالک کی طرح اپنے ماں باپ کو ان ہاسٹلوں میں داخل کر نادرست نہیں ہے:

"وإن كان الحامل على وضعهما في دار للمسنين هو سوء معاملتهما لأبنائهما، فإنه لايجوز أيضا إذبذا لايسوغ عقوقهما ولايضيع حقوقهما كيف وقد أمر الله بصحبتهما بالمعروف وإن كفرا واجتهدا في ايقاع الابناء في الشرك بالله تعالىٰ" (فتاوىٰ الشبكة الاسلامية ۱۲/ ۴۳)۔

ماں باپ کے علاوہ خاندان کے دیگر بزرگوں کا بھی یہی حکم ہے ان کے ساتھ بھی حسن سلوک اور محبت کی تعلیم دی گئی ہے اور ان ہاسٹلوں میں داخل کرنا محبت کے خلاف ہے پھر سوچنا چاہئے کہ اگر ہم اپنے بزرگوں کی خدمت سے راہ فرار اختیار کریں گے تو ہمارے ساتھ بھی وہی معاملہ ہوگا اور کل ہماری کبرسنی میں کوئی کام نہ آئے گا۔

البتہ اگر بوڑھے ماں باپ اور دیگر بزرگ افراد از خود ان ہاسٹلوں میں رہنا چاہیں اور اسی میں انہیں عافیت محسوس ہوتا ہو کہ ان کے ہم عمر ایک جگہ مل جائیں ضروریات کی چیزیں ایک جگہ مہیا ہوں تو ان ہاسٹلوں میں شریک کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، کیونکہ انہوں نے اپنا حق خود ساقط کر دیا ہے، تاہم اس وقت بھی اولاد پر ذمہ داری ہے کہ وہ ان سے ملاقات کے لئے جاتے رہیں۔ ان کی خدمت کریں، مزاج پرسی کریں کوئی کوتاہی نہ کریں اور جب بھی گھر واپسی کا ارادہ ظاہر کریں انہیں اپنا گھر لانے کو اولین ترجیح دیں۔

۸- بوڑھے افراد کی اجتماعی کفالت کے لئے زکوۃ کا استعمال:

زکوۃ کے مصارف کا بیان قرآن نے ان الفاظ میں کیا ہے:

"إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِينِ وَالْعَامِلِينَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغَارِمِينَ وَفِي سَبِيلِ اللَّهِ وَابْنِ السَّبِيلِ فَرِيضَةً مِّنَ اللَّهِ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ" (التوبہ: ۶۰)۔

(یہ صدقات تو دراصل فقیروں اور مسکینوں کے لئے ہیں اور ان لوگوں کے لئے جو صدقات کے کام پر مامور ہوں اور ان کے لئے جن کا تالیف قلب مطلوب ہو نیز یہ گردنوں کے چھڑانے اور قرض داروں کی مدد کرنے میں اور راہ خدا میں اور مسافر نوازی میں استعمال کرنے کے لئے ہیں۔ ایک فریضہ ہے اللہ کی طرف سے اور اللہ سب کچھ جاننے والا اور دانا و بینا ہے)۔

اگر یہ بوڑھے افراد صاحب نصاب نہ ہوں تو ان کی اجتماعی کفالت کے لئے زکوۃ کی رقم استعمال کی جاسکتی ہے اس لئے کہ یہ فقراء اور مساکین میں اس وقت داخل ہوں گے، جیسا کہ دینی مدارس میں غریب اور یتیم طلبہ کی اجتماعی کفالت کے لئے زکوۃ کی رقم استعمال کی جاتی ہے اسی طرح عہد نبوی میں تالیف قلب کے طور پر اجتماعی طور پر یہ رقم نئے مسلمانوں کو دی جاتی تھی، دینی اور دعوتی کاموں کو بھی بعض اصحاب نے فی سبیل اللہ میں داخل کرتے ہوئے زکوۃ کا استعمال کو درست قرار دیا ہے؛ لیکن اگر یہ بوڑھے افراد صاحب نصاب اور ذی حیثیت ہوں تو ان کی کفالت زکوۃ کی رقم سے درست نہیں ہے۔

اسی طرح اولاد کے لئے جائز نہیں کہ زکوۃ کی رقم سے اپنے ماں باپ کی کفالت کریں کیوں کہ اس میں خود اپنی زکوۃ سے استفادہ لازم آئے گا:

''لايجوز الدفع إلى أبيه وجده، وإن علا ولا إلى ولده وولد ولده، وإن سفل؛ لأن المنفعة لم تنقطع عن الملك من كل وجه (البحر الرائق ۲/ ۲۶۲)۔

۹- عمر دراز لوگوں کے لئے حکومت کی اسکیم سے استفادہ:

سن رسیدہ افراد کی سہولت کے لئے حکومت کی جانب جو اسکیم جاری کی جاتی ہے اس سے استفادہ درست ہے، اس لئے کہ یہ حکومت کی جانب سے عطیہ اور اپنے فریضے کی تکمیل ہے مگر شرط یہ ہے کہ اس اسکیم سے فائدہ اٹھانے کے لئے حکومت نے جو شرطیں رکھی ہوں وہ تمام پائی جائیں اگر کسی عمر کی تحدید ہو تو اس سے کم عمر والے افراد کے لئے اس سے استفادہ درست نہ ہوگا۔

اگر کوئی شخص اپنی عمر بڑھا کر لکھتا ہے تو یہ کذب بیانی اور فریب ہے جو جائز نہیں یا عمر صحیح لکھے مگر کسی عہدہ دار کی قربت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے حکومتی اسکیمات سے فائدہ اٹھا رہا ہو تو یہ بھی جائز نہیں، اس میں حکومت کے ساتھ بدعہدی اور فریب کاری کا گناہ ہوگا:

''الحاصل أنه لا يجوز أخذ الضمان إلا للذى توفرت فيه الشروط التى وضعتها الدولة هذا هو الواجب عليه۔ الواجب أن يتقى الله المؤمن، وأن يحذر أخذ شىء لايحل له'' (فتاوىٰ نور على الدرب للعثيمين ۱۵/ ۳۶۸)۔

عمر رسیدہ شخص کو کسب معاش پر مجبور کرنا

مولانا شاہد علی قاسمی [1]

جواب: سوال نمبر (۱) و (۲):

نفقہ کے وجوب میں تین باتیں بنیادی حیثیت کی حامل ہیں:

اول: عقد کی بنیاد پر التزام، جیسے عقد نکاح کی وجہ سے شوہر پر بیوی کے نفقہ کا وجوب، اس صورت میں خواہ بیوی مال دار ہو پھر بھی شوہر پر نفقہ واجب ہوگا۔

دوم: فقر: یعنی محتاج ہونے کی بنیاد پر نفقہ کا وجوب، جیسے فقیر ماں باپ کا نفقہ اولاد پر، خواہ والدین کمانے پر قادر ہوں۔

سوم: احتیاج: یعنی قریبی رشتہ دار کا نفقہ، یہ اس وقت واجب ہوتا ہے جب کہ وہ فقیر ہونے کے ساتھ ساتھ کمائی کرنے پر قادر نہ ہوں، قریبی رشتہ دار سے مراد ذو رحم محرم ہیں، ان کا نفقہ محض فقر کی بنیاد پر واجب نہیں ہوتا ہے؛ بلکہ فقر ہونے کے ساتھ کمائی پر قادر نہ ہوں تب ہی ان کا نفقہ واجب ہوتا ہے۔ اس تفصیل کی روشنی میں سن رسیدہ حضرات کا حکم ترتیب وار بیان کیا جاتا ہے:

(الف) سن رسیدہ حضرات مالدار ہوں تو ان کا نفقہ نہ تو دوسرے محارم پر واجب ہوگا اور نہ اولاد پر۔

(ب) سن رسیدہ حضرات محتاج ہوں اور کمائی پر بھی قادر نہ ہوں تو ان کا نفقہ اولاً اولاد پر واجب ہوگا، بشرطیکہ وہ نفقہ ادا کرنے پر قادر ہوں، خواہ کمائی کر کے نفقہ ادا کریں، اگر اولاد میں استطاعت نہیں ہے یا اولاد نہیں ہے تو دوسرے محارم پر نفقہ واجب ہوگا، اور محارم پر نفقہ میراث میں استحقاق کے تناسب سے واجب ہوگا، یعنی اگر اس بوڑھے کا انتقال ہو جائے تو اس کے ترکہ میں کون رشتہ دار کس تناسب سے حصہ دار ہوگا؟ اسی تناسب سے اس بوڑھے کا نفقہ رشتہ داروں پر واجب ہوگا۔

(ج) سن رسیدہ شخص محتاج ہو؛ لیکن کمانے پر قادر ہو، تو اگر اس کی اولاد موجود ہے اور وہ نفقہ ادا کرنے پر قادر ہے تو صحیح قول کے مطابق اولاد پر بوڑھے ماں باپ کا نفقہ واجب ہے، شمس الائمہ حلوانیؒ کی رائے میں نفقہ واجب نہیں ہے، گویا باپ کی ذمہ داری ہے کہ وہ خود کمائے؛ لیکن شمس الائمہ سرخسی، خواہرزادہ اور متعدد فقہاء کے نزدیک بیٹے پر نفقہ واجب ہے، یہی ظاہر الروایہ بھی ہے، اور مفتیٰ بہ بھی؛ چنانچہ صاحب محیط تفصیل سے اس پر گفتگو کرتے ہوئے خلاصہ اس طرح تحریر کرتے ہیں:

''فالحاصل: أن في نفقة الوالدين يعتبر الفقر، لا غير على ما هو ظاهر الرواية. إلا على قول شمس الأئمة الحلواني'' (المحيط البرهاني، كتاب النفقات ۳/ ۵۶۴)۔

اگر سن رسیدہ شخص کی اولاد نہ ہو، یا اولاد ہو؛ لیکن استطاعت نہ ہو تو دوسرے قریبی محارم پر نفقہ واجب نہیں ہوگا؛ کیونکہ دوسرے دوسرے محارم پر نفقہ اسی وقت واجب ہوتا ہے جب کہ منفق علیہ کمائی پر قادر نہ ہو، اور مفروضہ صورت میں منفق علیہ کمائی پر قادر ہے۔

''وشرط أن يكون عاجزا عن الكسب، فإن القادر عليه غني به'' (تبيين الحقائق ۳/ ۶۴)۔

جو حکم بوڑھے ماں باپ کی بابت بیان کیا گیا، یہی حکم دادا، دادی اور نانا، نانی کا بھی ہے، یعنی پوتے پوتی اور نواسے و نواسی پر نفقہ واجب ہونے کی وہی تفصیل ہے جو اولاد پر والدین کا نفقہ واجب ہونے کی ہے، اور پوتے، پوتی اور نواسے نواسی نہ ہوں تو دوسرے ذو رحم محرم پر نفقہ واجب

---

[1] معتمد تعلیم المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد۔

ہے، جیسا کہ گزرا (تفصیل کے لئے دیکھئے: ہدایہ ۴/ ۴۱۵)۔

علاج کرانا نفقہ میں داخل ہے یا نہیں؟

عام طور پر فقہاء نے لکھا ہے کہ علاج نفقہ میں داخل نہیں ہے، اس کی وجہ یہ تھی کہ پہلے علاج سستا تھا، جڑی بوٹیوں سے علاج ہوتا تھا، اور جڑی بوٹیاں سستی تھیں؛ لیکن اب صورت حال بدل گئی ہے، طریقۂ علاج کافی مختلف ہو چکا ہے، اور مہنگا بھی، اب تو انسان کی بقا کے لئے کھانے پینے سے زیادہ بڑی ضرورت علاج ہے، اور نفقہ میں وہ چیزیں داخل ہیں، جو زندگی کی بقا کے لئے ضروری ہوں، علامہ عبدالرحمن جزیری فرماتے ہیں:

''وفي الشرع الادرار على شيئ بما فيه بقاؤه'' (الفقه على المذهب الأربعه ۴/ ۵۵۷)۔

اس لئے حقیقت یہ ہے کہ جس کا نفقہ دوسرے پر واجب ہو اس میں اس کا علاج بھی داخل ہے۔

جواب: سوال نمبر (۳)

بوڑھے والدین وغیرہ کا احتیاج کے بغیر رقم کا مطالبہ کرنا:

اگر بوڑھے والدین یا خاندان کے بزرگ حضرات جو خود صاحب ثروت ہوں، خواہ صاحب نصاب ہوں یا نہ ہوں؛ لیکن گزر بسر کے لئے مناسب رقم کے مالک ہوں، ایسے حضرات اولاد وغیرہ سے مزید رقم کا مطالبہ کریں؛ تاکہ گزر بسر کے لئے سہولت مزید حاصل ہو، یا دوسرے لوگوں پر خرچ کر سکیں، یا کچھ رقم محفوظ کر سکیں تو ایسے مطالبہ کو پورا کرنا شرعی قانون کے اعتبار سے واجب نہیں ہے۔

علامہ شامیؒ اس سلسلہ میں گفتگو کرتے ہوئے علامہ کاسانیؒ کی رائے اس طرح پیش فرماتے ہیں:

''أن النفقة لا تجب بغير المحتاج وهؤلاء غير محتاجين؛ لأنه يمكن الاكتفاء بالأدنى'' (منحة الخالق على هامش البحر ۴/ ۲۲۹)

شوافع کی بھی رائے اسی طرح کی ہے؛ بلکہ شوافع کے ایک قول کے مطابق محتاج باپ کمانے پر قادر ہو تب بھی اولاد پر نفقہ واجب نہیں ہوگا۔

''والثاني: لاتجب نفقته على الولد؛ لأنه قادر على الاكتساب فأشبه المكتسب'' (البيان في مذهب الامام الشافعي ۱۱/ ۲۵۲)

جب کمائی پر قادر محتاج باپ کا نفقہ واجب نہیں تو بغیر احتیاج کے اولاد پر نفقہ بہ درجۂ اولیٰ واجب نہیں ہوگا، اگر اولاد نہ ہو تو خاندان کے دوسرے افراد پر بھی ایسے بوڑھوں کا مطالبہ قبول کرنا واجب نہیں۔

تاہم یہ باتیں قانونی حیثیت کی ہیں، جہاں تک اخلاقی قدروں کی بات ہے، تو ظاہر ہے کہ گھر کے بزرگ حضرات کو خوش رکھنا، انہیں مزید سہولتیں پہنچانا اور گاہے گاہے مٹھی بند رقم دینا انتہائی پسندیدہ عمل ہے، اور یہ توقیر کبیر میں داخل ہے؛ اس لئے بوڑھوں کے مزید مناسب مطالبات کو پورا کرنا استحباب میں داخل ہے۔

جواب: سوال نمبر (۴) شق: (الف):

زیادہ آمدنی کے لئے دوسرے ملک جانا جبکہ والدین خدمت کے محتاج ہوں:

زیادہ آمدنی کے لئے دوسرے ملک جانا درست ہے یا نہیں؟ جب کہ گھر میں بوڑھے ماں باپ موجود ہوں، اس کی چند صورتیں ہو سکتی ہیں، ذیل میں وہ صورتیں اور ان کے احکام بیان کئے جاتے ہیں:

۱۔ بوڑھے ماں باپ صحت مند ہوں، خدمت کے محتاج نہ ہوں، اور لڑکوں کا یہ سفر اور جائے قیام پر خطر نہ ہو تو والدین کی اجازت کے بغیر بھی دوسرے ملک کی ملازمت اختیار کرنا درست ہے، اگر والدین سفر سے روکیں تو ان کی بات ماننا اخلاقاً واجب ہے۔

۲۔ اگر مذکورہ صورت ہو لیکن راستہ پر خطر ہو یا جائے قیام پر خطر ہو تو والدین کی اجازت ضروری ہے۔

۳۔ اگر والدین خدمت کے محتاج نہ ہوں؛ لیکن مال کے اعتبار سے محتاج ہوں، تو ان کا خرچ تو واجب ہے؛ لیکن دوسرے ملک کا سفر جائز ہے۔

۴۔ والدین خدمت کے محتاج ہوں اور اولاد کی واپسی پر ان کا اصرار نہ ہو؛ بلکہ وہ خادم کا مطالبہ کر رہے ہوں تو، خادم کا انتظام کرنا بچوں پر واجب ہے، واپسی ضروری نہیں۔

۵۔ والدین خدمت کے محتاج ہوں اور وہ اولاد کی واپسی کا مطالبہ کر رہے ہوں، تو پھر والدین کی خدمت کرنا واجب ہے؛ اس لئے ایسی صورت میں دوسرے ملک کی ملازمت ترک کرنا واجب ہے، قرآن مجید اور احادیث شریفہ میں متعدد موقعوں پر والدین کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید کی گئی ہے، ان آیات واحادیث کا تقاضہ یہی ہے۔

تاہم بسا اوقات اولاد کا ملازمت ترک کر کے اپنے ملک واپس آجانا مالی اعتبار سے کافی کمزور کر دیتا ہے، اور معاشی انحطاط کی وجہ سے والدین کا صحیح اور معیاری علاج دشوار ہو جاتا ہے، ایسی صورت میں اگر لڑکا والدین کے لئے ان کی نگرانی کا مناسب انتظام کر دے، اور گاہے گاہے والدین سے ملاقات اور دیکھ بھال کے لئے آجایا کرے تو اس کی بھی گنجائش معلوم ہوتی ہے، جیسا کہ فقہی قاعدہ ہے:

''إذا تعارض مفسدتان روعی أعظمهما ضررًا بارتكاب أخفهما'' (الأشباه والنظائر: ۲۶۱ القاعدة الخامسة)۔

مذکورہ صورتوں میں بیشتر فتاویٰ ''الشبكة الإسلامية'' سے ماخوذ ہیں (دیکھئے: ۱۳/ ۲۹۹)۔

جواب: شق: (ب)

ساس سسر کی خدمت:

اگر شوہر کا مکان ایسا ہو جس میں چند کمرے ہوں، بیوی کے لئے ایک کمرہ خاص ہو جس کو اپنی مرضی سے کھول بند کر سکتی ہو، شوہر کے والدین اور بھائی بہن وغیرہ کے لئے دوسرے کمرے ہوں تو بیوی کو علاحدہ مسکن کے مطالبہ کرنے کا حق نہیں ہے۔

''إن كان في الدار بيوت فأعطاها بيتا تغلق عليه وتفتح لم يكن لها أن تطالبه بمنزل آخر'' (المحيط البرهاني ۳/ ۱۴۲)

اور اگر مکان کی یہ کیفیت نہ ہو، علاحدہ کمرہ بیوی کو میسر نہ ہو تو اسے علاحدہ مسکن کے مطالبہ کا حق ہے۔

''وإن لم يكن في الدار إلا بيت واحد، فلها أن تطالبه بمنزل آخر'' (حوالہ سابق)

جب بیوی کو علاحدہ مسکن حاصل ہو، اور دوسرے کمروں میں ساس سسر وغیرہ ہوں تو بیوی کو مجبور کیا جا سکتا ہے کہ وہ اسی مکان کے احاطہ میں رہے، اور ساس سسر کے ساتھ رہے، تاہم اگر ساس سسر کی زیادتی کی وجہ سے بہو کا اس احاطہ مکان میں گزران دشوار تر ہو، تو فقہی قاعدہ ''الضرر یزال'' کے تحت بیوی علاحدہ مسکن کا مطالبہ کر سکتی ہے۔

جہاں تک ساس سسر کی خدمت کی بات ہے تو بہو پر قانوناً واجب نہیں؛ بلکہ اخلاقاً و دیانۃً واجب ہے، اور یہ بھی اس وقت جب کہ ساس سسر خدمت کے محتاج ہوں، اصل میں تو یہ خدمت اس کے شوہر پر واجب ہے، کہ وہ اپنے والدین کی دیکھ ریکھ کرے؛ چونکہ شوہر اپنی بیوی اور بچوں کی ضروریات پوری کرنے میں مشغول رہتا ہے، تو اخلاق و دیانت کا تقاضہ ہے کہ بیوی اپنے شوہر کی مدد کرے، اور اس کے ماں باپ کی ضرورتوں کا خیال رکھے۔

جواب: شق: (ج):

شوہر کی اجازت کے بغیر ماں باپ کی خدمت:

ماں باپ کی ضروریات مختلف انواع کی ہوتی ہیں، بعض ضرورتیں ایسی ہوتی ہیں جنہیں بہتر طور پر مرد انجام دے سکتا ہے، اور بعض ضرورتوں کو عورت ہی بہتر طور پر انجام دے سکتی ہے؛ اس لئے بیٹوں کے رہتے ہوئے بھی بیٹیوں پر فرض بنتا ہے کہ وہ والدین کی خدمت کریں، اگر ماں باپ بیٹی سے خدمت لینے کے محتاج ہو گئے ہوں تو بیٹی کی ذمہ داری ہے کہ وہ ضروری خدمت کے لئے جائے، خواہ شوہر کی نافرمانی کرنی پڑے، شوہر پر قضاءً و دیانۃً واجب ہے کہ بیوی کو جانے کی اجازت دے، صاحب محیط فرماتے ہیں:

''امرأة لها أب زمن ليس له من يقوم عليه غير البنت ويمنعها الزوج عن تعاهده جاز لها أن تعصي زوجها وتطيع

أباها مومنًا كان الأب أوكافرا لأن القيام عليه فرض عليها في هذه الحالة وحق الزوج لايظهر مع الفرائض'' (المحيط البرهاني ۳/ ۱۷۲)۔

البتہ اس عبارت کے مفہوم مخالف سے یہ بھی ثابت ہو رہا ہے کہ اگر بوڑھے ماں باپ کی خدمت کے لئے انتظام ہو، خواہ خادم کے ذریعہ یا دوسری اولاد کے ذریعہ ضرورت پوری ہو رہی ہو تو پھر اس شادی شدہ بیٹی کا ماں باپ کی خدمت کے لئے مستقل رہنا اور اس کے شوہر کو اجازت دینے پر مجبور کرنا درست نہیں، ہاں یہ ضرور ہے کہ ہفتہ میں ایک بار شوہر اپنی بیوی کو والدین کی زیارت سے نہیں روک سکتا ہے، اگر روکے بھی تو یہاں شوہر کی نافرمانی جائز ہے، بشرطیکہ والدین خود بیٹی کے پاس آکر ملاقات کرنے کی صلاحیت نہ رکھتے ہوں۔ صاحب محیط فرماتے ہیں:

''لا يمنعها عن زيارة الأبوين في كل جمعة وعن زيارة سائر المحارم في كل سنة۔ لاتخرج إلى زيارة الأبوين. ولكن الأبوان يحضران منزلها بحضرة الزوج تذهب إلى الأبوين للعيادة ان مرضا أومرض أحدهما ولايمنعها الزوج عن العيادة. أما غير هذا فلا'' (دیکھئے: المحيط البرهاني ۳/ ۱۷۰)۔

واضح ہو کہ ہفتہ میں ایک بار والدین سے ملاقات کی اجازت عام حالات میں ہے، اگر والدین یا ان میں ایک بیمار پڑ جائیں تو پھر ہفتہ کی قید نہیں ہے، حسب ضرورت تیمارداری کا حق اسے حاصل رہے گا، جیسا کہ عبارت بالا سے واضح ہے۔

جواب، سوال: ۵

سن رسیدہ شخص کو شادی سے روکنا:

ہندوستان کے حالات میں بوڑھاپے کی عمر میں دوسری شادی کرنا معیوب سمجھا جاتا ہے، اسی لئے بوڑھا باپ ضرورت کے باوجود دوسری شادی کی بات زبان پر نہیں لاتا ہے، اگر کبھی بوڑھا باپ ہمت کر کے دوسری شادی کر لیتا ہے تو اولاد کی طرف سے ہنگامہ شروع ہو جاتا ہے، اور گھر کا سکون ختم ہو جاتا ہے، حالانکہ یہ سوچ غلط ہے، یہ ماحول نامناسب ہے۔

ماں باپ میں جو زندہ ہو، اگر انہیں جسمانی خدمت کے لئے شادی کی ضرورت ہو، اور اولاد میں اتنی صلاحیت ہو کہ بوڑھے جوڑے کی کفالت کر سکے، تو اس کے مطالبہ پر بچوں کی ذمہ داری ہے کہ شادی کرا دے، اگر باپ کے پاس مال ہو تو پھر شادی اور شادی کے بعد سوتیلی ماں کے نفقہ کی ذمہ داری اولاد پر نہیں ہوگی؛ لیکن اگر مال نہ ہو تو اولاد پر دونوں کے نفقہ کی بھی ذمہ داری ہوگی، صاحب جوہرہ فرماتے ہیں:

''وإن احتاج الأب إلى زوجة والابن موسر وجب عليه أن يزوجه أويشتري له جارية ويلزمه نفقتها وكسوتها كما يجب نفقه الأب وكسوته'' (الجوهرالنيرة ۲/ ۱۸۴)۔

شوافع کے یہاں اس صورت میں دونوں طرح کے اقوال ہیں، تاہم راجح قول کے مطابق شوافع کے یہاں بھی بوڑھے باپ کی شادی کرانا اولاد کی ذمہ داری ہے۔

''والقول الثاني: نص عليه في الدعوى والبينات وهو اختيار جمهور أصحابنا أن إعفافه واجب كنفقته. لعموم قوله تعالى: وصاحبهما في الدنيا معروفا'' وإنكاحه من المعروف'' (الحاوى الكبير ۹/ ۱۸۳)۔

جواب، سوال نمبر (۶):

والد کی زندگی میں جائداد کی تقسیم کا مطالبہ:

اولاد بالغ ہو تو ضروریات کی تکمیل خود اسی پر واجب ہے، ہاں اگر لڑکا اپاہج ہو، پاگل ہو وغیرہ تو باپ پر ایسی اولاد کا نفقہ واجب ہے، بہر صورت باپ کو حین حیات جائداد کی تقسیم پر مجبور کرنا جائز نہیں ہے، اسلام نے ہر شخص کو اپنی جائداد و املاک کے تحفظ اور اس پر ملکیت قائم رکھنے کا حق دیا ہے، اسے اس حق سے محروم نہیں کیا جا سکتا، جہاں تک میراث کے اصول سے جائداد کی تقسیم کی بات ہے تو اس کا تعلق مورث کی موت سے ہے، اولاد وارث اسی وقت ہو سکتی ہے جب باپ کا انتقال ہو جائے، باپ کا مال ترکہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب باپ مر جائے، علامہ شامیؒ فرماتے ہیں:

"لأن كونهم ورثة لايستحق إلا بعد الموت" (رد المحتار ٦/ ٦٨٨)۔

اس لئے بوڑھے باپ کو تقسیم جائداد پر مجبور نہیں کیا جاسکتا ہے، ہاں! اگر خوش دلی سے تقسیم کردے، اور سب کے درمیان عدل کا معاملہ کرے تو کوئی حرج نہیں۔

جواب، سوال نمبر (۷):

سن رسیدہ لوگوں کا ہاسٹل میں قیام:

ماں باپ قابل احترام ہوتے ہیں، ان کی خدمت کو جنت میں جانے کا ذریعہ بتایا گیا، قرآن واحادیث میں بہ کثرت ان کے ساتھ صلہ رحمی اور حسن سلوک کی تاکید کی گئی (دیکھئے: الانعام: ۱۵۱، الاسراء ۲۳ / ۲۴)، اولاد کی موجودگی میں بوڑھے باپ کو بیت المعمرین کے حوالہ کرنا انتہائی عجیب بات ہے؛ کیوں کہ اولاد پر شرعاً ماں باپ کی خدمت واجب ہے، اور اس سے پہلوتہی برتنا ناجائز ہے۔

تاہم بعض مرتبہ ایسی مجبوریاں پیش آسکتی ہیں جن میں عمر دراز حضرات کا بیت المعمرین میں رہنا ہی عافیت کا باعث ہوتا ہے، اس سلسلہ میں چند صورتیں اور ان کے احکام پیش کئے جاتے ہیں:

۱۔ اولاد گھر میں موجود ہو، بوڑھے ماں باپ کی خدمت کرنے میں دقت نہ ہو، گھر میں رہنے کی خواہش ہو، ایسی صورت میں اولاد پر خدمت واجب ہے، بوڑھے کو بیت المعمرین کے حوالہ کرنا جائز نہیں ہے۔

۲۔ اولاد گھر میں موجود نہ ہو، باپ کی خواہش گھر میں رہنے کی ہو تو اگر اولاد مستطیع ہو تو بوڑھے باپ کے لئے اس پر خادم کا نظم کرنا واجب ہے، ہاسٹل کے حوالہ کرنا جائز نہیں۔

۳۔ اگر گھر میں بوڑھے باپ کے ساتھ نامناسب برتاؤ ہوتا ہو، اس کی وجہ سے وہ ہاسٹل منتقل ہونا چاہتا ہو تو بچوں پر لازم ہے کہ ماحول تبدیل کریں، خوشگوار فضا بنائیں، اور بوڑھے ماں باپ کو راحت پہونچائیں، اور انہیں ہاسٹل منتقل نہ ہونے دیں۔

۴۔ اگر اولاد معاشی مجبوری یا کسی اور مناسب مجبوری سے ماں باپ سے دور ہو، اور تنگ دستی کی بنیاد پر خادم نہیں رکھ سکتا ہو، یا اولاد ہی نہ ہو، اور دوسرے رشتہ دار صحیح خدمت نہیں کر پارہے ہوں تو پھر ان کا ہاسٹل منتقل ہونا قبیح نہیں۔

۵۔ اگر اولاد خدمت کے لئے تیار ہو، یا خادم رکھنے پر آمادہ ہو، اور عمر دراز حضرات اپنی خوشی ومرضی سے ہاسٹل کی بہتر سہولتوں کی وجہ سے ہاسٹل کا رخ کریں تو اولاد گنہ گار نہیں ہوگی۔

٦۔ اگر بوڑھے حضرات اپنی مرضی سے ہاسٹل منتقل ہو گئے ہوں، یا کسی اور مشکل کی وجہ سے انہیں مجبوراً ہاسٹل کا رخ کرنا پڑا ہو ایسی صورت میں اولاد کا گاہے گاہے ان سے ملاقات کرنا اور ان کی خبر گیری کرنا لازم ہے (ملخص از فتاوی الشبکۃ الاسلامیہ ۱۳ / ۴۳)۔

جواب، سوال نمبر (۸):

زکوۃ کی رقم سے بوڑھوں کی اجتماعی کفالت:

مستحق حضرات کی کفالت کے لئے اجتماعی طور پر بیت المال کا نظم کرنا، اور مستحقین کی مدد کرنا بہت بڑا کار خیر ہے، ہر زمانہ میں اس کی ضرورت رہی ہے، اور آج بھی ہے، البتہ چند باتوں کا خیال ضروری ہے:

۱۔ اجتماعی کفالت کے لئے جتنی بھی رقم اکٹھا کی جائے اسے ایک سال کے اندر مستحقین تک پہونچا دی جائے، زکوۃ کی رقم ایک سال سے زیادہ روک کر رکھنا نامناسب بات ہے۔

۲۔ اگر رقم زیادہ جمع ہو جائے تو مستحقین کی فہرست میں اضافہ کر دیا جائے، اگر وہاں مستحقین کم ہوں تو دوسرے علاقوں میں تقسیم کا نظم کیا جائے، افسوس کہ آج اس طرح کے بعض رفاہی ادارے جو اس طرح کا کام کر رہے ہیں، ان میں تقسیم کا نظم مخدوش ہے، زکوۃ پر زکوۃ وصول

کرتے جاتے ہیں، اور کئی سالوں تک وہ رقم مستحقین تک نہیں پہونچ پاتی، اور مال خرد برد کا شکار ہو جاتا ہے۔

۳۔ جو لوگ اجتماعی کفالت میں زکوٰۃ کی رقم استعمال کرتے ہیں خود ان کے ماں باپ عام طور پر غریب ہونے کے باوجود زکوٰۃ کی رقم نہیں لیتے ہیں، اولاد ان کی ضروریات کا نظم کرتی ہے، تاہم اگر کوئی بوڑھا بہ وجہ غربت اجتماعی کفالت والی زکوٰۃ کی رقم لیتا ہو، جب کہ خود اس کی اولاد پر زکوٰۃ فرض ہو، اور وہ زکوٰۃ کی رقم اجتماعی کفالت میں ادا کرتا ہو، تو پھر یا تو اس کے باپ کو اجتماعی کفالت سے زکوٰۃ کی رقم نہ دی جائے، اور اولاد کو کہا جائے کہ وہ محتاج باپ کا نفقہ ادا کرے، یا کم از کم اجتماعی کفالت کے منتظمین اس کے بیٹے کی رقم کو احتیاط سے رکھیں، اور وہ رقم کسی اور مستحق کو دے دیں، اس کے باپ کو نہ دیں، ورنہ اس بیٹے کی زکوٰۃ کی ادائیگی مشکوک ہو جائے گی؛ کیونکہ ممکن ہے کہ بیٹے کی زکوٰۃ والی رقم اس کے باپ کو مل جائے جب کہ بیٹا باپ کو زکوٰۃ دے تو زکوٰۃ ادا نہیں ہوتی ہے۔

جواب، سوال نمبر (۹):

معمر حضرات کو دی جانے والی سہولتوں سے غیر معمر کا فائدہ اٹھانا:

اگر حکومت نے ٹرین کے کرایہ، امدادی وظیفہ اور ٹیکس وغیرہ میں خاص عمر کے لوگوں کو سہولتیں دے رکھی ہوں، تو ان سہولتوں سے ایسے شخص کا فائدہ اٹھانا جائز نہیں ہوگا، جو حکومت کی مقررہ شرائط کے تحت نہ آتا ہو؛ کیونکہ ہر شہری حکومت کے ہر اس قانون پر چلنے کا پابند ہے جو شریعت حقہ سے متصادم نہ ہو، گویا ہر شہری کا حکومت سے حکماً معاہدہ ہے کہ وہ حکومتی قانون پر چلے گا، اور اس کی خلاف ورزی نہیں کرے گا؛ اس لئے حکومت کو دھوکہ دے کر سہولتیں حاصل کرنا جائز نہیں ہے؛ کیوں کہ حکومت کو دھوکہ دینا بھی مذموم و ناجائز دھوکہ میں شامل ہے۔

معذور اور معمّر افراد کی کفالت کا اجتماعی انتظام

مولانا محمد حذیفہ بن محمود ٹیلر داحودی[1]

سوال: (۱) وہ اولاد یا اعزہ واقارب جن کے ذمہ بزرگ کا نفقہ واجب ہے کسب معاش پر ان کو مجبور کر سکتے ہیں؟

سوال: (۲) سن رسیدہ حضرات کا نفقہ وعلاج کن صورتوں میں دوسروں پر واجب ہوتا ہے؟

جواب: (۱) (۲) شریعت میں اصل یہ ہے کہ ہر شخص کا نفقہ خود اس کے ذمہ اس کے مال میں لازم ہے، سوائے بیوی کے کہ اس کا نفقہ شوہر کے ذمہ ہے، اولاد یا دوسرے اعزاء واقارب کے ذمہ کسی شخص کا نفقہ اسوقت واجب ہوتا ہے جب کہ:

(الف) وہ فقیر ہو، اس کے پاس کچھ نہ ہو اور بوڑھاپے، بیماری وغیرہ کسی عذر کی وجہ سے کمانے کی قدرت بھی نہ ہو۔

''یشترط لوجوب الإنفاق علی القریب ثلاثة شروط: أولا: أن یکون القریب فقیرا لا مال له ولا قدرة له علی الکسب لعدم البلوغ أو الکبر أو الجنون أو الزمانة المرضیة'' (الفقه الاسلامی وادلته ۷/ ۷۲۷)

البتہ والدین اس شرط سے بایں طور مستثنی ہیں کہ اگر وہ معسر ہوں، ان کے پاس کچھ نہ ہوں، تو چاہے وہ کسب معاش پر قدرت رکھتے ہوں، کما سکتے ہوں، تب بھی ان کا نفقہ اولاد پر واجب ہوگا۔

'' ویستثنی الأبوان فتجب لهما النفقة ولومع القدرة علی الکسب بالصحة و القوة ...'' (الفقه الاسلامی وادلته ۷/ ۷۲۷)، ''تجب علی موسر ولو صغیر ایسار الفطرة علی الأرجح ... النفقة لأصوله الفقراء ولو قادرین علی الکسب بالسویة بین الابن والبنت وفی الدر: قوله: (النفقة) أشار إلی أن جمیع ماوجب للمرءة وجب للأب والأم علی الولد من طعام وشراب وکسوة وسکنی حتی الخادم'' (الدر مع الرد ۵/ ۳۵۵-۳۵۰)۔

(ب) جس پر نفقہ واجب ہو وہ صاحب حیثیت ہو، یعنی اس کے پاس اپنی ضرورت سے زیادہ مال ہو یا وہ کما سکتا ہو، کمانے کی قدرت رکھتا ہو۔

''ثانیا: أن یکون الملزم بالنفقة موسرا مالکا نفقة فاضلة عن نفسه إما من ماله. وإما من کسبه. فیلزم القادر علی التکسب أن یعمل للإنفاق علی قریبه الفقیر'' (الفقه الاسلامی وادلته ۷/ ۷۲۷)۔

مذکورہ تفصیلات سے واضح ہوتا ہے کہ جو معسر اور محتاج وتنگدست شخص بوڑھاپے کی عمر کو پہنچ گیا، لیکن اتنا کمزور نہیں ہے کہ کسب معاش نہ کر سکے، کسی قدر مشقت کے ساتھ ہی سہی وہ خود کما کر اپنی ضرورت پوری کر سکتا ہے، تو اس صورت میں اگر ایسے شخص کی اولاد موسر موجود ہیں تو اولاد پر اس شخص، یعنی والدین کا نفقہ واجب ہوگا، اولاد ان کو کسب معاش پر مجبور نہیں کر سکتی اور اگر اولاد موجود نہیں ہیں تو دیگر اعزاء واقارب کے ذمہ ان کا نفقہ واجب نہ ہوگا، وہ ان کو کسب معاش پر مجبور کر سکتے ہیں، کیونکہ وہ کسب معاش کی قدرت رکھتے ہیں۔

علامہ کاسانی فرماتے ہیں:

''یقضی بنفقة الأب وإن کان قادرا علی الکسب بعد إن کان معسرا علی ولده الموسر وکذا نفقة الجد علی ولد ولده إذا کان موسرا'' (البدائع ۳/ ۴۴۷)۔

---

[1] ندی روڈ نزد جمعہ مسجد، کھانچی واڑہ، داحود، گجرات۔

''الاحوال الشخصیۃ'' میں ہے:

''تجب نفقة الأصل على الفرع بشرطين: الأول أن يكون الأصل فقيرا...سواء كان مع فقره قادرا على التكسب أم كان عاجزا عنه. والثانى أن يكون الفرع قادرا على الإنفاق إما بكونه موسرا. وإما بكونه قادرا على الإنفاق...تجب على الفرع الموسر لأصله الفقير كبيرا كان الفرع أوصغيرا ذكرا كان أو أنثى'' (الاحوال الشخصية في الشريعة الاسلامية لمحي الدين عبد الحميد: ۲۲۹)۔

سوال: (۳) بوڑھے والدین کچھ رقم محفوظ کرنے کے لئے زائد رقم کا مطالبہ کرسکتے ہیں؟

جواب: (۳) فقہاء نے لکھا ہے کہ جن لوگوں کا نفقہ معسر ومحتاج ہونے کی صورت میں دوسروں پر واجب ہوتا ہے وہ بقدر کفایت وضرورت واجب ہوتا ہے، اس سے زائد نہیں، پس ظاہر ہے کہ جب منفق علیہم خود موسر اور صاحب حیثیت ہیں تو وہ نہ ہی ضرورت کے بقدر لے سکتے ہیں اور نہ ہی زیادہ سہولت کے لئے یا دوسروں پر خرچ کرنے کے لئے یا کچھ رقم محفوظ کرنے کے لئے زائد رقم کا مطالبہ کرسکتے ہیں۔

''بدائع'' میں ہے:

''قال ﷺ خذى من مال أبي سفيان ما يكفيك وولدك'' نص عليه افضل الصلوة والسلام على الكفاية فدل على أن نفقة الزوجة مقدرة بالكفاية...ووجوب هذه النفقة ليس على وجه الصدقة. بل على الكفاية فتقدر بكفايتها كنفقة الاقارب'' (البدائع ۴/ ۲۲۹) ''نفقة الأقارب مقدرة بالكفاية بلاخلاف؛ لأنها تجب للحاجة فتقدر بقدر الحاجة وكل من وجبت عليه نفقة غيره يجب عليه له المأكل والمشرب والملبس والسكنى والرضاء إن كان رضيعا؛ لأن وجوبها للكفاية والكفاية تتعلق بهذه الأشياء فإن كان للمنفق عليه خادم يحتاج إلى خدمته تفرض له أيضا؛ لأن ذلك من جملة الكفاية'' (البدائع ۳/ ۴۵۱)۔

وھبہ زحیلی لکھتے ہیں:

''اتفقت الفقهاء على أن نفقة الأقارب والزوجات تجب بقدر الكفاية من الخبز والادم والكسوة على حسب حال المنفق وبقدر العادة اوعوائد البلاد لانها وجبت للحاجة والحاجة تندفع بقدر الكفاية كنفقة الزوجة وقد قال النبي ﷺ لهند: خذى مايكفيك وولدك بالمعروف فقدر نفقتها ونفقة ولدها بالكفاية. فإن احتاج القريب أو الزوجة إلى خادم فعلى المنفق أخدامه؛ لأنه من تمام كفايته'' (الفقه الاسلامي وادلته ۷/ ۸۲۶)۔

سوال: (۴) زیادہ پیسہ کمانے کی غرض سے دوسرے شہر، جبکہ والدین خدمت کے محتاج ہوں:

(الف) کیا زیادہ آمدنی کے لئے لڑکوں کا اپنے ماں باپ کو چھوڑ کر دوسری جگہ جانا جائز ہے؟

جواب: والدین چلنے پھرنے اٹھنے بیٹھنے اور اپنی ضروریات کو پورا کرنے میں سہارے کے محتاج ہوجائیں، اولاد کی خدمت وحفاظت کے وہ حاجتمند ہوں تو ایسی صورت حال میں زیادہ پیسہ کمانے کی غرض سے اپنے ماں باپ کو چھوڑ کر دوسرے شہر، دوسری ریاست، یا دوسرے ملک میں جانا لڑکوں کے لئے جائز نہیں ہے۔ بلکہ فقہاء نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ والدین اگر لڑکے کی خدمت کے محتاج ہوں تو ان کی اجازت کے بغیر طلب علم اور ادائیگی حج کے لئے بھی لڑکا نہیں جاسکتا۔

''فى الدر: وله الخروج لطلب العلم الشرعي بلا إذن والديه لو ملتحيا وفى الرد: (قوله: وله الخروج) أى إن لم يخف على والديه الضيعة بأن كانا موسرين ولم تكن نفقتهما عليه وفى الخانية: ولو أراد الخروج إلى الحج وكرها ذلك. قالوا: إن استغنى الأب عن خدمته فلا بأس، وإلا فلا يسعه الخروج وإن احتاجا إلى النفقة ولايقدر أن يخلف لهما نفقة كاملة أو أمكنه إلا أن الغالب على الطريق الخوف، فلايخرج ولو الغالب السلامة يخرج ...فلو فى سفر تجارة أو حج لا بأس به بلا إذن الأبوين إن استغنيا عن خدمته إذ ليس فيه إبطال حقهما...'' (الدر والرد. كتاب

الحظر والاباحة ۹/۵۸۴)۔

حضرت تھانویؒ تحریر فرماتے ہیں:

''جو امر شرعاً نہ واجب ہو اور نہ ممنوع، بلکہ مباح ہو، بلکہ مستحب ہو اور ماں باپ اس کو کرنے نہ کرنے کو کہیں تو اس میں تفصیل ہے، دیکھنا چاہئے کہ اس امر کی اس شخص کو ایسی ضرورت ہے کہ بدون اس کے تکلیف ہوگی، مثلاً غریب آدمی ہے، پاس پیسہ نہیں، بستی میں کوئی صورت کمانے کی نہیں، مگر ماں باپ نہیں جانے دیتے، یا یہ کہ اس شخص کو اس درجہ کی ضرورت نہیں، اگر اس درجہ کی ضرورت ہے، تب تو اس میں ماں باپ کی اطاعت ضروری نہیں اور اگر اس درجہ کی ضرورت نہیں، تو پھر دیکھنا چاہئے کہ اس کام کے کرنے میں کوئی خطرہ و اندیشہ ہلاک یا مرض کا ہے یا نہیں اور یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ اس شخص کے اس کام میں مشغول ہو جانے سے بوجہ کوئی خادم اور سامان نہ ہونے کے خود ان کے تکلیف اٹھانے کا احتمال قوی ہے یا نہیں، پس اگر اس کام میں خطرہ ہے یا اس کے غائب ہو جانے سے ان کو بوجہ بے سروسامانی کے تکلیف ہوگی، تب تو ان کی مخالفت جائز نہیں.....'' (امداد الفتاوی ۴/۴۸۵)۔

(ب) اگر بہو ساس خسر کے ساتھ رہنا نہ چاہتی ہو، یا اس کی ساس کو خدمت کی ضرورت ہو، لیکن کوئی خدمت گار موجود نہ ہو اور بیٹیوں کو ان کے شوہروں کی طرف سے میکے میں رہنے کی اجازت نہ ہو، تو اس صورت میں بہو کی کیا ذمہ داری ہے؟ اور کیا اسے اس کے ساس خسر کے ساتھ رہنے پر مجبور کیا جاسکتا ہے؟

جواب: فقہاء نے لکھا ہے کہ عورت اگر مرد کے ماں باپ اور رشتہ داروں کے ساتھ رہنا نہ چاہتی ہو تو مرد کے ذمہ واجب ہے کہ عورت کو ایک ایسا مکان علاحدہ رہنے کے لئے دے جس میں شوہر کے ماں باپ بھائی بہن وغیرہ رشتہ داروں کا کوئی دخل نہ ہو، بلکہ وہ پورے طور پر بیوی کے قبضہ و تصرف میں ہو،

فی الرد: ''ولو أراد أن يسكنها مع ضرتها أو مع أحمائها كأمه وأخته وبنته فابت فعيه أن يسكنها فى منزل مفرد'' (۳۲۰/۵، البدائع ۴۲۸:۶/۳)

ہاں! اگر عورت ہی اس کو پسند کرے تو پھر اس کی مرضی ہے۔

''تجب لها السكنى عليه فى بيت خال عن أهله وأهلها إلا أن تختار ذلك'' (الهندية ۱/۵۵۶)۔

پس ظاہر ہے کہ شوہر کے ماں باپ چاہے خدمت کے ضرور تمند ہوں تب بھی عورت کو ساس خسر کے ساتھ رہنے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا ہے، مرد کی ذمہ داری ہوگی کہ وہ اپنے ماں باپ کی خدمت کا خود کوئی انتظام کرے، شامی میں ہے:

''إذا احتاج أحدهما لخادم وجبت نفقته، كما وجبت نفقة المخدوم فكان من جملة نفقته. وإذا لم يحتج إليه فلا تجب'' (رد المحتار، باب النفقة ۵/۳۴۴) ''الأب أو الابن إذا احتاج إلى خادم وجبت نفقته كما وجبت نفقة المخدوم لاحتياجه إليه فكان من جملة نفقته وإذا لم يحتج إليه فلا تجب عليه'' (منحة الخالق على البحر الرائق، باب النفقة ۴/۲۵۰)

البتہ اخلاقی طور پر عورت کو اس کا خیال کرنا چاہئے کہ اپنی ساس کی ضعیفی اور محتاجی کی وجہ سے اپنی مرضی اور خوشی سے ان کی خدمت کرے اور ساس خسر کے ساتھ رہنے پر آمادہ ہو جائے، یہ اس کے لئے سعادت مندی ہوگی اور یہ خدمت ان شاء اللہ اس کے لئے باعث اجر و ثواب ہوگی، لیکن اس کو مجبور نہیں کیا جاسکتا۔

''فتاوی رحیمیہ'' میں ہے:

''شوہر کی والدہ اور بھائی بہنوں کے لئے کھانے کا انتظام کرنا عورت پر شرعاً لازم اور ضروری نہیں ہے، البتہ اگر عورت اپنی ساس کی ضعیفی اور کمزوری کی وجہ سے ان کی خدمت کرے اور ان کے لئے کھانا پکائے تو یہ اس کے لئے سعادت مندی ہوگی اور یہ خدمت ان شاء اللہ اس کے لئے باعث اجر و ثواب ہوگی، لیکن اس کو مجبور نہیں کیا جاسکتا، خصوصاً جب کہ اس کے لئے عذر ہو، مثلاً وہ بیمار ہو، یا ایسی نازک ہو کہ گھر کے کام اس کے لئے ناقابل برداشت ہوں تو اس پر اصرار نہیں کیا جاسکتا، شوہر پر لازم ہے کہ اپنی والدہ اور معذور بھائی بہن کے کھانے کا انتظام کرے، والدہ کے لئے

خادم کی ضرورت ہو تو خادم کا بھی انتظام کرے'' (۸/۴۵۷)۔

''کفایت المفتی'' میں ہے:

''زید کے والدین کا ادب واحترام اور معمولی عرفی خدمت جس میں زوجہ پر کوئی مشقت اور تکلیف نہ ہو کرنی بہتر ہے، اس سے زیادہ زوجہ کے ذمہ لازم نہیں'' (۵/۲۳۰)۔

حضرت تھانویؒ تحریر فرماتے ہیں:

''جب تک ساس خسر زندہ رہیں ان کی خدمت کو، ان کی تابعداری کو فرض جانو، اور اسی میں اپنی عزت سمجھو، اور ساس نندوں سے الگ رہنے کی ہرگز فکر نہ کرو کہ ساس نندوں سے بگاڑ ہو جانے کی یہی جڑ ہے (بہشتی زیور ۵/۳۰۵)۔

(ج) ماں باپ کی خدمت کس پر واجب ہے:

جواب: بیٹوں کی طرح بیٹیوں کے لئے بھی ماں باپ کی خدمت بڑی سعادت کی بات ہے اور ضرورت کے وقت واجب بھی ہے اور والدین کا حق بھی، جیسا کہ نفقہ دونوں پر واجب ہے۔

''ولو كان له ابن وبنت كانت نفقته عليهما على السواء'' (الخانية على الهندية ۱/۴۴۸)

''وإذا اختلط الذكور والإناث فنفقة الأبوين عليهما على السوية في ظاهر الرواية'' (الهندية ۱/۵۶۴)

''تجب على موسر ولو صغيرا يسار الفطرة على الأرجح ... النفقة لأصوله الفقراء ولو قادرين على الكسب بالسوية بين الابن والبنت وفي الدر: قوله: (النفقة) أشار إلى أن جميع ما وجب للمرءة وجب للأب والأم على الولد من طعام وشراب وكسوة وسكنى حتى الخادم'' (الدر مع الرد ۵/۳۵۰،۳۵۵)۔ ''تجب على الفرع الموسر لأصله الفقير كبيرا كان الفرع أو صغيرا ذكرا كان أو أنثى'' (الاحوال الشخصية في الشريعة الاسلامية لمحي الدين عبد الحميد: ۲۲۹)

مگران کے لئے ماں باپ کی خدمت کے مقابلہ میں اپنے شوہر کی اطاعت مقدم ہے، اس لئے والدین کی مجبوری اور بے بسی دیکھتے ہوئے اپنے والدین کی خدمت کرنے کی ضرورت ہو تو اولاً تو شوہر ہی کو چاہئے کہ وہ موقع کی مجبوری کو سمجھے اور عورت کو اس کے ماں باپ کی خدمت کے لئے جانے کی اجازت دے دیں، لیکن اگر شوہر ان کو اجازت نہ دیں تو عورت کسی طرح شوہر کو منانے کی فکر و کوشش کریں، تاہم چونکہ بیوی کو ہفتہ میں ایک مرتبہ سے زیادہ ماں باپ کے پاس جانے سے روکنے کا شوہر کو حق حاصل ہوتا ہے، اس لئے عورت اگر شوہر کے انکار کے باوجود اس سے زیادہ مرتبہ ماں باپ کے پاس ان کی خدمت کے لئے جائے - اور والدین کی مجبوری اور بے بسی کے وقت تو ضرور جائے - تو ضرورت کے وجہ سے اور والد کے حق کی بناء پر اس کا جانا درست ہوگا، مگر وہ نفقہ کی حق دار نہ ہوگی۔

علامہ ابن نجیمؒ فرماتے ہیں:

''ولو كان أبوها زمنا مثلا وهو يحتاج إلى خدمتها والزوج يمنعها من تعاهده فعيها أن تعصيه مسلما كان الأب أو كافرا كذا في فتح القدير، وقد استفيد مما ذكرنا أن لها الخروج إلى زيارة الأبوين والمحارم. فعلى الصحيح المفتى به تخرج للوالدين في كل جمعة بإذنه وبغير إذنه وزيارة المحارم في كل سنة مرة بإذنه وبغير إذنه. وأما الخروج للأهل زائدا على ذلك، فلها ذلك بإذنه'' (البحر ۵/۲۳۰)۔

''شامی'' میں ہے:

''ولا يمنعها من الخروج إلى الوالدين في كل جمعة ... ولو أبوها زمنا مثلا فاحتاجها فعيها تعاهده ولو كافرا وإن أبى الزوج۔ في الرد: قوله: (زمنا) أي مريضا مرضا طويلا۔ قوله: (فعيها تعاهده) أي بقدر احتياجه إليها وهذا إذا لم يكن له من يقوم عليه، كما قيده في الخانية۔ قوله: (وإن أبى الزوج) لرجحان حق الوالد وهل لها النفقة؟ الظاهر

لا، وإن كانت خارجة من بيته بحق كما لو خرجت لفرض الحج'' (الدر والرد ۵/۲۲۲۲۴)۔

حضرت تھانویؒ تحریر فرماتے ہیں:

''اگر باپ بہت بیمار ہے اور اس کا کوئی خبر لینے والا نہیں، تو ضرورت کے موافق وہاں روز جایا کرے، اگر باپ بے دین، کافر ہو تب بھی یہی حکم ہے، بلکہ اگر شوہر منع بھی کرے تب بھی جانا چاہئے، لیکن شوہر کے منع کرنے پر جانے سے روٹی کپڑے کا حق نہ رہے گا (بہشتی زیور ۴/ ۲۳۸)۔

سوال: (۵) والد کو نکاح ثانی سے روکنا:

جواب: (۵) بوڑھاپے میں بیوی کے فوت ہوجانے کے بعد ضرورت ہونے کی وجہ سے بوڑھے شخص کے لئے دوسرا نکاح کرنا درست ہے، بیٹے اور بیٹیوں کا اپنی والدہ کے فوت ہونے کے بعد والد کے دوسرے نکاح میں رکاوٹ بننا درست نہیں ہے اور اگر خود والد میں اپنی بیوی کی کفالت کی استطاعت نہ ہو تو اولاد پر کفالت واجب ہوگی یا نہیں؟ اس سلسلہ میں دو قول ہیں: ایک قول یہ ہے: کہ ہر حال میں اولاد پر باپ کی بیوی کی کفالت واجب ہے، چاہے باپ نے ضرورت کی وجہ سے نکاح کیا ہو، چاہے بلاضرورت نکاح کیا ہو، بعض نے اس کو امام ابو یوسف کی روایت قرار دیا ہے، دوسرا قول یہ ہے: کہ اگر باپ نے بشری تقاضے یا کسی اور عذر وضرورت کی وجہ سے نکاح کیا ہے تب تو بیوی کی کفالت اولاد کے ذمہ ہوگی، ورنہ اولاد کے ذمہ نہ ہوگی، یہ اصل مذہب ہے۔ شامی میں ہے:

''قوله: (وعليه نفقة زوجة أبيه) أي في رواية و في أخرى: إن كان الأب مريضا أو به زمانة يحتاج للخدمة ... قال في البحر: وظاهر الذخيرة أن المذهب عدم وجوب نفقة امرأة الأب أو جاريته أو أم ولده حيث لم يكن بالأب علة. وإن الوجوب مطلقا عن رواية أبي يوسف'' (۵/۳۴۴)۔

''تجب على الابن نفقة زوجة أبيه المستحق للنفقة عليه بشرط أن يكون الأب محتاجا إلى هذه الزوجة إما لإعفاف نفسه بها عن الزنا، وإما لكونه زمنا أو ذا عاهة أو مرض لا يستطيع بسبب أحدهما أن يقوم بشؤون نفسه. فإن لم تكن بالأب حاجة مما ذكرنا إلى الزوجة لم تجب نفقتها على ابنه الموسر، وإذا كان للأب الفقير المستحق للنفقة خادم وكان وجوده ضروريا له وكان ابنه موسرا وجبت نفقة ذلك الخادم على الابن'' (الاحوال الشخصية في الشريعة الاسلامية: ۳۲۲)۔

سوال: (۶) والد کی زندگی میں جائیداد کی تقسیم کا مطالبہ:

جواب: (۶) والد کی زندگی میں جائداد کا مالک اور اس کا متصرف مختار خود والد ہوتا ہے، اولاد کا اپنا اس میں کوئی حق وحصہ نہیں ہوتا ہے، اولاد کا استحقاق اس وقت ثابت ہوتا ہے جب جائداد ترکہ بن جائے اور کسی کا مال وجائداد اس کی حیات میں ترکہ نہیں بنتا، اسی لئے قانون وراثت کے متعلق نصوص قرانیہ میں "مماترک"، "مماترکن"، "مماترکتم" کے الفاظ بار بار وارد ہیں اور ایک موقع پر انقطاع حیات کی وضاحت ہے: ''ان امرؤ هلك''۔ پس جب مال وجائداد نہ تو کسی کی حیات میں ترکہ بن سکتا ہے اور نہ ہی کسی کا اس میں حق پیدا ہوسکتا ہے تو ظاہر ہے کہ اولاد کا والد کی زندگی میں جائداد کا مطالبہ کرنا اور اسے اپنا حق سمجھنا درست نہیں ہے، چاہے والدین کی معاشی حالت بہتر اور اولاد محتاج ہوں۔

حضرت مفتی عبدالرحیم صاحب اس طرح کے سوال کے جواب میں فرماتے ہیں:

''آپ مالک ہیں، جن بچوں کو الگ ہونا ہو وہ الگ ہوسکتے ہیں، ان کو آپ سے زبردستی مطالبہ کا حق نہیں ہے'' (رحیمیہ ۶/ ۱۵۰)۔

ہاں! البتہ اگر اولاد کی محتاجگی کے پیش نظر یا پھر اولاد میرے انتقال کے بعد جائداد کے سلسلہ میں آپس میں جھگڑنے نہ لگیں اس غرض سے خود والد ہی اپنی حیات میں اولاد کے درمیان جائداد تقسیم کردیں تو یہ نہ صرف جائز ہوگا، بلکہ بہت ہی بہتر ہوگا۔

سوال: (۷) اولڈ ایج ہوم میں بزرگوں کو قیام پر مجبور کرنا:

جواب: (۷) عمر دراز لوگوں کو داخل کرنے کے لئے مغربی ملکوں اور ہندوستان میں بنائے جانے والے ہاسٹلوں کا قیام شریعت اسلامیہ کی

تعلیمات سے میل نہیں کھاتا، چاہے اس میں ان عمر دراز حضرات کو ایک جگہ اپنی ضرورت کی چیزیں مہیا ہو جاتی ہوں اور اپنے ہم عمر لوگ مل جاتے ہوں، کیونکہ یہ چیز دراصل اپنے بزرگوں کے حق میں جذبۂ خدمت کے فقدان اور ان کو رحمت خداوندی تصور کرنے کے بجائے انہیں بوجھ سمجھنے کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے اور ظاہر ہے کہ اسلام میں اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے، اسلام نے تو بوڑھوں اور بزرگوں کو خدا کی رحمت قرار دیتے ہوئے یہ فرمایا ہے کہ ایسے کمزوروں ہی کی وجہ سے اہل خاندان کی ضروریات کا اللہ تعالیٰ انتظام فرماتے ہیں، ''هل تنصرون وترزقون الا بضعفائكم'' (بخاری، باب من استعان بالضعفاء والصالحين، رقم: ۲۸۹۶)، بڑھاپے کا زمانہ انسان کی زندگی میں سب سے زیادہ قابل رحم، لائق ترس اور محتاج خدمت ہوتا ہے، اس لئے اسلام نے بوڑھوں کی خصوصی رعایت کی ہے، بہت سے احکام شریعت میں ضعیفوں اور کمزوروں کے لئے تخفیف اور سہولت دی گئی ہے، ان کی خدمت اور احترام وتوقیر کا شریعت نے حکم دیا ہے، ایسے لوگوں کی کفالت بھی شریعت نے دوسروں پر واجب کی ہے، اگر ماں باپ کا معاملہ ہو تب تو چاہے ان میں کمانے اور کسب معاش کی صلاحیت اور قدرت ہو پھر بھی ان کو کسب معاش پر مجبور نہیں کیا، بلکہ اولاد پر ان کی ضروریات کی تکمیل ضروری قرار دی ہے۔

نیز ہاسٹلوں میں قیام کی صورت میں بوڑھے اپنے رشتہ داروں کی محبت سے محروم ہو جاتے ہیں، حالانکہ عمر کے بڑھنے کے ساتھ انسان چاہتا ہے کہ اس کے بال بچے اس کے قریب رہیں، اولاد اور اولاد کی اولاد دیکھ کر اس کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں، جبکہ ایسے ہاسٹلوں میں اس کی یہ خواہش ایک حسرت بن جاتی ہے، بچوں کو دیکھنے کے لئے دل تڑپتا ہے، نگاہیں ترستی ہیں، گھڑی دو گھڑی کی ملاقات کے لئے ایک عرصہ تک انتظار کرنا پڑتا ہے، اس لئے کوئی شخص اپنے بزرگوں کو ایسے ہاسٹلوں میں قیام پر مجبور نہیں کر سکتا۔

سوال: (۸) عمر رسیدہ لوگوں کی کفالت کے لئے خصوصی طور پر زکوۃ کا استعمال؟

جواب: (۸) ایسے بے سہارا لوگوں کی اجتماعی کفالت کے لئے زکوۃ کی رقم استعمال کی جا سکتی ہے، بشرطیکہ یہ شرعاً مستحق زکوۃ ہوں اور اداء زکوۃ میں شرط تملیک کی رعایت ہو رہی ہو۔

سوال: (۹) رعایت کی مقررہ حد عمر نہ ہونے کے باوجود حکومتی مراعات سے فائدہ اٹھانا:

جواب: (۹) امور مباحہ میں حکومت کے قانون کی پابندی لازم اور اس کی خلاف ورزی گناہ ہے،

''التصرف على الرعية منوط بالمصلحة'' (شرح القواعد: ۳۰۹، مجلة الاحكام ۱/۵۱)

، علامہ احمد زرقاء اس ضابطہ کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''أي إن نفاذ تصرف الراعي على الرعية ولزومه عليهم شاءوا أو أبوا معلق أومتوقف على وجود الثمرة والمنفعة في ضمن تصرفه دينية كانت أو دنيوية فإن تضمن منفعة ما وجب عليهم تنفيذه وإلا رد'' (شرح القواعد: ۳۰۹)

علاوہ ازیں اس کی خلاف ورزی نفس یا عزت کو خطرہ میں ڈالنا ہے جو کہ جائز نہیں ہے، اس لئے جو لوگ حکومت کی طرف سے دی جانے والی رعایتوں کے لئے حکومت کی طرف سے مطلوب ومقررہ حد عمر کو نہیں پہنچے ہیں ان کے لئے ایسی رعایتوں سے فائدہ اٹھانا جائز نہ ہوگا۔

☆☆☆

معذوروں اور بوڑھوں کے حقوق حالات حاضرہ کے تناظر میں

مفتی محمد ابوبکر قاسمی [1]

(۱)......اگر کوئی شخص بوڑھاپے کی عمر کو پہنچ گیا ہے، لیکن اتنا کمزور نہیں ہے کہ کسب معاش نہ کر سکے بلکہ کسی قدر مشقت کے ساتھ ہی سہی مگر وہ خود کما کر اپنی ضرورت پوری کر سکتا ہے تو ایسے شخص کے لئے بہتر یہی ہے کہ خود کما کر اپنی ضروریات کی تکمیل کرے، کیونکہ خود کما کر اپنی ضروریات کو پورا کرنا شرعاً افضل عمل بتایا گیا ہے، چنانچہ حضرت مقدام سے مرفوعاً مروی ہے۔

''ما أكل أحد طعامًا قط خيرا من أن يأكل من عمل يده وإن نبي الله داؤد كان يأكل من عمل يده'' (بخاری: ۲۴۸)

(خود کما کر کھانے سے بہتر کبھی کسی شخص نے کوئی کھانا نہیں کھایا اور اللہ تعالی کے نبی حضرت داؤد خود کما کر کھانے کا انتظام فرماتے تھے)۔

ہاں ان کی اولاد انہیں کسب معاش پر مجبور نہیں کر سکتی، بلکہ ان کی اولاد کا شرعی واخلاقی فریضہ ہے کہ جب ان کے والدین کمانے میں دشواری محسوس کرتے ہوں تو ان کو عبادت کے لئے مخصوص کر دیں اور ان کی جملہ جائز ضروریات کا بندوبست اپنی کمائی سے کر دیں، حدیث نبوی ہے:

''أنت ومالك لأبيك'' (ابن ماجہ ابواب التجارات باب ۵۶۴، حدیث: ۲۲۱۲) (تم اور تمہارا مال تمہارے باپ کا ہے)۔

یعنی والدین بوقت ضرورت اپنی اولاد کا مال اپنی ضروریات میں خرچ کر سکتے ہیں۔

(۲)......سن رسیدہ عمر دراز بوڑھوں اور معذوروں کا نفقہ اور علاج کا خرچہ حسب استطاعت بیٹا بیٹی اور دیگر قریبی ورثہ پر واجب ہے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

"وعلى الوارث مثل ذلك" (سورہ بقرہ: ۲۳۳)، "وآت ذا القربى حقه" (سورہ اسراء: ۲۶، سورہ روم: ۳۸)۔

''عن أنس بن مالك مرفوعًا من أحب أن يبسط له في رزقه وينسأ له في أثره فليصل رحمه''

(جو شخص رزق میں کشادگی اور اپنی عمر کی درازگی کو پسند کرتا ہے تو اسے صلہ رحمی کرنی چاہئے)۔

(۳)......بوڑھے والدین یا خاندان کے بڑے بزرگوں کا اپنی اولاد یا اپنے عزیز واقارب سے اپنی جائز ضروریات کی تکمیل کے لئے نفقہ (کھانا، کپڑا، مکان) کا طلب کرنا تو شرعاً جائز ہے، لیکن بلا ضرورت بینک میں رقم محفوظ کرنے کے لئے زائد از ضرورت رقم کا مطالبہ کرنا سخت ناپسندیدہ ہے، رہا ضرورت مندوں پر خرچ کرنے یا زیادہ سہولت کی خاطر رقم کا مطالبہ کرنا تو حسب استطاعت درست ہے، لیکن تنگ کرنا درست نہیں ہے، واللہ اعلم۔

قال اللہ تعالی: "لا تضار والدة بولدها ولا مولود له بولده" (سورہ بقرہ: ۲۳۳)۔

(۴)......جب والدین یا خاندان کے کوئی بزرگ جسمانی خدمت خاص کر چلنے پھرنے اٹھنے بیٹھنے، کھانے پینے وغیرہ دیگر ضروریات کو پورا کرنے میں سہارے کے محتاج ہو جائیں تو ایسی صورت میں اس قسم کے بوڑھوں کو چھوڑ کر اولاد کا زیادہ پیسہ کمانے کی غرض سے دوسرے شہر، دوسری ریاست یا دوسرے ملک میں چلے جانا شرعاً درست نہیں ہے، اللہ تعالی نے موضع امتنان میں ذکر کیا ہے،

"ذرني ومن خلقت وحيدا، وجعلت له مالا ممدودًا وبنين شهودا" (سورہ مدثر: ۱۱، ۱۳)

(چھوڑ دو مجھ کو اور جس کو میں نے بلا شرکت غیرے تنہا پیدا کیا ہے، اور اسے میں نے خوب مال دیا ہے اور پاس رہنے والے بیٹوں سے نوازا ہے (لیکن وہ پھر بھی کفر وانکار کو اپنا شیوہ بنائے ہوئے ہے)، مفسرین نے مندرجہ آیات کا مصداق ولید بن مغیرہ کو قرار دیا ہے، جو اہل مکہ میں ایک ذی اثر شخص اور مالدار اور کثیر

---

[1] مہتمم جامعہ رحیمیہ رحمت نگر، برہم پور، دربھنگہ، بہار۔

العیال تھا، اور اس کے بیٹے ہمیشہ اس کے سامنے ہی رہتے تھے جس سے وہ ہمہ دم شاداں وفرحاں اور پر مسرت رہا کرتا تھا، گویا اولاد کا والدین کے قریب رہنا خصوصاً حالت ضعیفی میں خدمت کی غرض سے سامنے رہنا انسانی فطرت بھی ہے اور اسلامی شریعت کے نزدیک پسندیدہ ومطلوب عمل بھی ہے۔

(الف) لہذا زیادہ آمدنی کے حصول کے لئے لڑکوں کا ماں باپ کو چھوڑ کر دوسری جگہ رہنا جبکہ والدین خدمت کے محتاج ہوں شرعاً جائز نہیں ہے، اسلامی شریعت کے خلاف ہے، ارشاد ربانی ہے:

"وصاحبهما في الدنيا معروفا" (سورہ لقمان: ۱۵) (دنیا میں والدین کے ساتھ حسن سلوک کا برتاؤ کرتے ہوئے ساتھ رہو)۔

(ب) ساس کو خدمت کی ضرورت ہو، لیکن کوئی خدمت گار موجود نہ ہو اور بیٹیوں کو ان کے شوہروں کی طرف سے میکے میں رہنے کی اجازت نہ ہو تو ایسی صورت میں بہو اگر چہ ساس سسر کے ساتھ نہ رہنا چاہتی ہو تاہم ان پر واجب ہے کہ وہ مثل بیٹی کے ساس کے ساتھ رہ کر خدمت کرے اور شوہر اسے اپنی والدہ کی خدمت کی تاکید وترغیب دیتا رہے اور اس کی شکر گزاری کر کے اس کی دلجوئی بھی کرتا رہے تاکہ بہو برضا ورغبت خدمت کرے، قال النبی ﷺ:

"من لم يشكر الناس لم يشكر الله" (ابوداؤد کتاب الادب باب ۱۱)،

وقال الله تعالى: "لئن شكرتم لأزيدنكم" (سورہ ابراھیم: ۷)

اور شوہر کو چاہئے کہ اپنی بیوی اپنے والدین کی خدمت کا جذبہ بیدار کرنے کی غرض سے ان کو یہ حدیث نبوی بھی سنائے جسے امام ترمذی نے ابواب البر باب ماجاء فی اجلال الکبیر جلد دوم ۲۳ پر حضرت انسؓ کی سند سے نقل کیا ہے۔

"ما أكرم شابٌ شيخًا من أجل سنه إلا قيض الله له من يكرمه عند سنه" (مشکوۃ الآثار / ۱۵۱)

(جو نوجوان (مرد یا عورت) کسی بوڑھے (مرد یا عورت) کا اس کے عمر کی وجہ سے اکرام کرے گا تو جب اکرام کرنے والا بوڑھاپے کی عمر کو پہنچے گا تو اللہ تعالی (اس کے اکرام واحترام اور خدمت کے سبب) ایسے شخص کو مقرر فرمادے گا جو بڑھاپے میں اس کا اکرام اور اس کی خدمت کرے گا)۔

(ج) ماں باپ کی خدمت بیٹے کی طرح بیٹیوں پر بھی واجب ہے، لہذا جب والدین خدمت کے محتاج ہوں تو داماد پر لازم ہے کہ اپنی بیوی کو والدین کی خدمت سے نہ روکے بلکہ اپنی انا کو فنا کر کے اپنی بیوی کو ترغیب دے کہ اپنے میکے حسب ضرورت جا کر والدین کی خدمت کر دیا کرے، حدیث نبوی ہے:

"من لم يرحم صغيرنا ولم يوقر كبيرنا فليس منا" (رواه الترمذی عن ابن عباس ۲/ ۱۴). والله اعلم۔

(۵)......انسان جس طرح جوانی میں بیوی کی ضرورت محسوس کرتا ہے، اس طرح بڑھاپے میں بھی بیوی کا محتاج ہوتا ہے تاکہ بڑھاپے میں پیش آنے والے سرد وگرم حالات کو سہنا اس کے لئے آسان ہو، لہذا اگر کوئی بوڑھا حصول سکون کی خاطر شادی کرنا پسند کرے تو اس کے بیٹوں اور بیٹیوں کو اپنی والدہ کی وفات کے بعد اپنے والد کی دوسری شادی کرانے میں رکاوٹ پیدا کرانے کے بجائے معاونت کرنا چاہئے، اور اگر خود والدین میں اپنی بیوی کی کفالت کی استطاعت نہ ہو تو اس سلسلہ میں اولاد پر واجب ہے کہ اپنی سوتیلی ماں کا خرچ بھی ادا کرے تاکہ اس کے والد کو خوشی وسکون حاصل ہو۔

قال اللہ تعالی: "وعلى الوارث مثل ذلك" (سورہ بقرہ: ۲۳۳)

"ومن آياته أن خلق لكم من أنفسكم أزواجًا لتسكنوا إليها وجعل بينكم مودة ورحمة" (سورہ روم: ۲۱)

، اور اللہ تعالی کی منجملہ آیات کے ایک یہ ہے کہ اس نے تمہارے فائدے کے لئے تمہارا جوڑا پیدا کیا ہے، تاکہ تم اس سے سکون پاؤ اور اللہ تعالی نے تمہارے درمیان چاہت وشفقت اور محبت وہمدردی رکھ دی ہے۔

لہذا مذکورہ نعمتوں کے حصول کی خاطر بڑھاپے کی بیماری وحشت کا صحیح علاج یہی ہے کہ اس کا کوئی مناسب جوڑا تلاش کر کے اس کی شادی کردی جائے، ہمارے اسلاف کثرت ازدواج کو پسند کرتے تھے لیکن آج ہمارا برا حال ہو گیا ہے کہ ہم اس سے نفرت کرتے ہیں، بخاری میں حضرت ابن عباسؓ کا ارشاد ہے:

"خير هذه الأمة أكثرها نساء" (بخاری، حدیث: ۵۰۶۹)۔

(۶)......اگر والدین کی معاشی حالت بہتر ہو اور اولاد محتاج ہو تو ایسی صورت میں خود والدین کو چاہئے کہ اپنی جائیداد کا کچھ حصہ اپنی زندگی ہی میں اپنی نرینہ اولاد کے نام کر دیں، تاکہ والد کی وفات کے بعد تقسیم ترکہ کے سبب جو اولاد میں باہم شکر رنجیاں ہوتی ہیں وہ نہ ہوں خصوصاً ہندوستانی معاشرہ میں کہ بوقت شادی لڑکی

کو اور داماد کو جہیز وتلک کی صورت میں سب کچھ دینے کی کوشش کی جاتی ہے اور بہو کو صرف لالچ دے کر رکھا جاتا ہے کہ میری وفات کے بعد تمہارا سب کچھ ہوگا، جبکہ شرعاً ایسا نہیں ہے، اس لئے والدین پر لازم ہے کہ بوقت شادی لڑکا لڑکی دونوں کو کچھ دیدیں تا کہ ان کی وفات کے بعد وہ عطیات اولاد کے لئے سہارا ثابت ہوں، کیونکہ ہمارے معاشرہ میں بوقت شادی جو بے اعتدال ہوتی ہے اس کا اثر آخر تک رہتا ہے۔

(۷)......عمر دراز لوگوں کے علاج ومعالجہ کی خاطر اسپتال بنانا تو شرعاً مطلوب ومرغوب ہوسکتا ہے، لیکن ان کی رہائش کے لئے مستقل ہاسٹل بنا کر ان میں بوڑھوں کو پیک کر دینا، اور آخر میں ان کو اپنے اعزہ واقارب، بیٹے پوتے، بیٹی، پوتی وغیرہ سے دور رکھنا سراسر غیر انسانی فعل اور شیطانی حرکت ہے، قرآن کریم نے نیک لوگوں کی دعا یہ نقل کی ہے: "ربنا هب لنا من أزواجنا وذريا تنا قرة أعين واجعلنا للمتقين إماما" (سورہ فرقان: ۷۴) (اے اللہ ہماری بیویوں اور ہماری اولاد سے ہماری آنکھوں کو ٹھنڈی رکھ اور ہمیں متقیوں کا پیشوا بنا)، گویا ہماری اولاد کو نیک بنانا اور ہمیں ان کا امام وپیشوا بنائے رکھ، اب اگر بوڑھوں کو ہاسٹل بنا کر ان کو ان کے اعزہ واقارب سے دور رکھا جائے گا تو یہ اعزہ واقارب بوڑھوں کے حق میں آنکھوں کی ٹھنڈک بننے کے بجائے باعث حسرت بنیں گے دوسرے امام ومقتدی کے درمیان فاصلہ رکھنا امامت وقیادت کے نظام کو فاسد کر دینا ہے، لہذا بوڑھوں کے لئے ہاسٹل بنائے جانے کی مسلمانوں کو ترغیب دینے کے بجائے اس سے نفرت دلائی جائے لیکن اگر کوئی غیر مسلم حکومت ایسا کرتی ہے تو اس کی مخالفت میں اپنا وقت اور مال ضائع کرنے کے بجائے ان کو اسلامی دعوت دینے کی کوشش کی جائے، ہمیں امید ہے کہ مذکورہ شر اور مغربی ملکوں کا بنایا ہوا ہاسٹل ہمیں بوڑھوں کو دین کی دعوت دینے اور ان کی خدمت کر کے ان کو دین اسلام کا شیدائی بنانے میں انشاء اللہ مفید ثابت ہوگا، واللہ اعلم۔

(۸)...... بوڑھاپے کی عمر میں اگر کسی انسان کا ہاتھ خالی ہو، نیز وہ کمانے سے مجبور ہو، خصوصاً ایسا بوڑھا ہو جو لاولد ہو اور اس کے قریبی رشتہ دار بھی نہ ہوں تو ایسے بوڑھوں کی انفرادی یا اجتماعی کفالت کے لئے زکوۃ کی رقم کا بھی استعمال کرنا شرعاً درست ہے، ہاں اگر اس کے پاس زمین وجائیداد ہو تو اس کو فروخت کر کے اپنی ضروریات کا انتظام کرے، بشرطیکہ وہ زمین مکان کے علاوہ ہو، قرآن کریم نے زکوۃ کے مصارف میں سب سے پہلے فقراء ومساکین کو ذکر کیا ہے، جن کے ذیل میں مذکورہ اوصاف کے حاملین بوڑھے بلاشبہ شامل ہیں، نیز قرآن کریم نے جہنم میں جانے کا ایک سبب مساکین پر اپنا مال نہ خرچ کرنا اور ان کو کھانا نہ کھلانا بھی بتایا ہے، چنانچہ سورہ مدثر میں مذکور ہے:

"يتساءلون عن المجرمين ما سلككم في سقر (الى قوله) ولم نك نطعم المسكين" (آیت: ۴۰-۴۵)۔

اسی طرح سورہ بلد میں اللہ تعالی نے دین کی دشوار گزار گھاٹی کا ذکر کرتے ہوئے غلاموں کو آزاد کرنا، اسی طرح فاقہ کے موقع پر بھوکوں کو کھانا کھلانا، رشتہ دار یتیم کی مدد کرنا، ضرورت مند خاک نشیں مسکینوں اور حاجتمندوں کی خدمت کرنا اور ان کا تعاون کرنا (سورہ بلد: ۱۱-۱۶) بھی بتایا ہے۔ اسی طرح سورہ دہر میں اللہ کے نیک بندوں کا حال ذکر کیا گیا ہے کہ وہ اپنا مال اللہ کی رضا وخوشنودی کے لئے مسکینوں، یتیموں اور قیدیوں کو کھانا کھلانے میں خرچ کرتے ہو (ملاحظہ ہو سورہ دہر: ۸-۹)۔

(۹)......حکومتوں نے عمر دراز لوگوں کے لئے ٹرین کے کرایہ میں تخفیف، حکومت کی طرف سے امدادی وظیفہ، اسی طرح ٹیکس میں رعایت کا جو قانون رکھا ہے وہ بر بنائے احتیاج وفقر ہے، لہذا جو شخص مسکین وحاجتمند ہو اگرچہ عمر دراز نہ ہو اس کو بھی اس قسم کی رعایت ملنی چاہئے، اور شرعاً اس قسم کے اشخاص بھی مذکورہ رعایتوں سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں، چنانچہ آنکھ، ہاتھ، پاؤں، سے معذور اسی طرح بیمار، بیوہ عورتیں، پڑھنے والے طلبہ ان سب کو بھی رعایت دی جاتی ہے اور ان سب کے لئے مذکورہ رقم سے فائدہ اٹھانا درست ہے۔

والدین اور دیگر رشتہ داروں کے حقوق

قاضی محمد کامل قاسمی[1]

والدین کا نفقہ:

قرابت کی وجہ سے جن لوگوں کا نفقہ واجب ہوتا ہے ان میں والدین کا نفقہ واجب ہونے پر بھی فی الجملہ فقہاء کا اجماع واتفاق ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے والدین کے ساتھ حسن سلوک کا حکم فرمایا ہے، "وبالوالدین إحسانا" (الاسراء: ۲۳)، اور والدین کی کفالت حسن سلوک میں داخل ہے، اسی طرح حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سب سے پاکیزہ کھانا وہ ہے جو آدمی کی اپنی کمائی کا ہو اور تمہاری اولاد بھی تمہاری کمائی ہے،

''إن أطيب ما أكل الرجل من كسبه وإن ولده من كسبه''.

والدین کا نفقہ اس وقت واجب ہوتا ہے جب ان میں خود اپنی ضروریات مکمل کرنے کی صلاحیت نہ ہو، باپ اگر محتاج ہو اور کسب معاش کی صلاحیت رکھتا ہو، لیکن نہ کماتا ہو، جب بھی اس کا نفقہ بیٹے کے ذمہ واجب ہے، وہ اپنے باپ کو کمانے پر مجبور نہیں کرسکتا، یہ حنفیہ کی رائے ہے، حنابلہ وغیرہ کے نزدیک بشمول والدین اقارب کا نفقہ اسی وقت واجب ہوتا ہے کہ وہ کمانے کی صلاحیت بھی نہ رکھتا ہو۔

والدین کا نفقہ جس میں کھانا، پینا، رہائش سبھی شامل ہیں، بقدر کفایت واجب ہوتا ہے، اگر کسی شخص کے ماں باپ دونوں ہوں اور اس کی معاشی پوزیشن اچھی نہ ہو تو اول تو تنگی کے ساتھ سہی اسی میں دونوں کی کفالت کرنی چاہئے، لیکن اگر ایسا ممکن نہ ہو، تو نفقہ کے اعتبار سے ماں کا حق مقدم ہے، کیوں بظاہر ماں کے لئے کسب معاش دشوار ہے، اور اس کی تائید اس روایت سے بھی ہوتی ہے جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ ہمارے حسن سلوک کا سب سے زیادہ مستحق کون ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے جواب میں تین دفعہ ماں کا اور چوتھی دفعہ باپ کا نام لیا، لیکن اگر باپ کسب معاش سے معذور ہو اور ماں کسب معاش کی صلاحیت رکھتی ہو تو باپ کا حق مقدم ہوگا؛ کیوں کہ باپ ہی نے بچپن میں اس کی کفالت کا فریضہ انجام دیا ہے، اسی لئے بعض فقہاء نے تو مطلق باپ کو ماں پر مقدم رکھا ہے، ''قال بعضهم: الأب أحق''۔

باپ کا نکاح:

اگر باپ نکاح کی حاجت رکھتا ہو اور خود اس موقف میں نہ ہو، کیا اس کا نکاح کرنا بھی اولاد کی ذمہ داری ہوگی؟ شوافع اور حنابلہ کے نزدیک بیٹے پر باپ کی شادی کا انتظام واجب ہوگا اور اس کے مہر کی ذمہ داری بھی اس کے بیٹے پر ہوگی، حنفیہ کے یہاں دو قول ہیں: ایک واجب ہونے کا دوسرا واجب نہ ہونے کا، اسی طرح علامہ ابن قدامہؒ نے ماں کے نکاح کے بارے میں بھی لکھا ہے کہ وہ بھی اولاد کے ذمہ ہوگا۔

سوتیلی ماں کا نفقہ:

اسی سے ایک دوسرا مسئلہ باپ کی بیوی یعنی سوتیلی ماں کے نفقہ کا متعلق ہے، اگر باپ میں نفقہ ادا کرنے کی صلاحیت نہ ہو تو مالکیہ، شوافع اور حنابلہ کے نزدیک بیٹے پر اس کا نفقہ بھی واجب ہوگا، کیونکہ یہ بھی باپ کی ضروریات میں داخل ہے، حنفیہ کا بھی ایک قول یہی ہے جس کو علامہ حصکفیؒ نے ترجیح دی ہے، دوسرا قول یہ ہے کہ اگر باپ مریض ہے یا معذور ہونے کی وجہ سے محتاج خدمت ہو تب اس کی بیوی کا نفقہ بیٹے کے ذمہ ہے؛ کیونکہ وہ گویا باپ کی خادمہ ہے، بہر حال جمہور کا مسلک قرآن وحدیث کے مزاج سے قریب تر ہے، کیونکہ والدین کے ساتھ حسن سلوک اور معروف رویہ اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے، اور ظاہر ہے کہ یہ حسن سلوک نہیں ہوسکتا کہ اس کی بیوی کو نفقہ سے محروم رکھا جائے؛ بلکہ فقہاء نے ان جزئیات سے اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اگر والدین اپنی طبعی

---

[1] قاضی شریعت دار القضاء جنوبی دہلی۔

ضرورت اور خدمت کے لئے نکاح کے ضرورت مند ہوں تو اولاد کو اس کی رعایت کرنی چاہئے۔

خادم کا نظم:

جہاں والدین کی خوراک و پوشاک وغیرہ کی ضروریات کا پورا کرنا واجب ہے، وہیں اگر وہ خادم کے محتاج ہوں تو خادم کا نظم کرنا اور اس کے اخراجات کو برداشت کرنا بھی اولاد کے فرائض میں داخل ہے۔

دادا، نانا وغیرہ کا نفقہ:

نفقہ کے ان احکام میں جو والدین سے متعلق ہیں دادا، دادی، اور نانا، نانی بھی شامل ہیں، اگر وہ محتاج ہوں تو پوتے، پوتیاں اور نواسے، نواسیاں ان کا نفقہ ادا کریں گے۔

دوسرے رشتہ داروں کا نفقہ:

اقرباء میں بیٹے، پوتے، نواسے اور نواسیوں کا ذیلی سلسلہ "فروع" کہلاتا ہے، باپ، ماں، دادا، دادی، نانا، نانی، اور ان کا آبائی سلسلہ "اصول" کہلاتا ہے، جن کے استحقاق نفقہ کی تفصیلات اوپر ذکر کی گئیں، کیا ان کے علاوہ دوسرے رشتہ داروں کا نفقہ بھی واجب ہوگا؟ اس سلسلہ میں اختلاف ہے۔ حنفیہ کے نزدیک ہر ذی رحم محرم رشتہ دار کا نفقہ واجب ہوتا ہے، بشرطیکہ وہ محتاج ہو، نابالغی، نابینائی، مرض یا عورت ہونے کی وجہ سے کسب معاش کرنے سے عاجز ہو، مسلمان ہو اور جس کے ذمہ نفقہ واجب قرار دیا جائے، وہ صاحب گنجائش ہو۔

صاحب گنجائش (خوش حال) ہونے کا مطلب یہ ہے کہ نصاب زکوۃ کا مالک ہو یعنی کسی بھی نوعیت کا اتنا مال ہو جو نصاب زکوۃ کی قیمت کو پہنچ جائے، یہ امام ابویوسفؒ کا قول ہے، اور اسی پر فتوی ہے، امام محمدؒ کے نزدیک اپنی اور اپنے اہل وعیال کی ایک ماہ کی ضروریات سے زیادہ مال اس کے پاس موجود ہو، اور جو روز کماتا اور کھاتا ہو، تو اس کے حق میں صاحب وسعت ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ہر دن نفقہ ادا کرنے کے بعد اس کے پاس بچ رہتا ہو، علامہ ابن ہمامؒ کی رائے ہے کہ جو لوگ کسب معاش میں مشغول نہ ہوں ان کے حق میں تو خوش معاش ہونے یعنی فقہ کی اصطلاح میں "یسار" کا معیار مالک نصاب ہونا ہے، اور جو لوگ کسب معاش پر انحصار کرتے ہوں ان کے لئے وہ قول مناسب ہے جو امام محمدؒ کا ہے۔

متفرق احکام:

نفقہ سے متعلق جو احکام ذکر کئے گئے ہیں، اس سلسلہ میں کچھ ضروری اصول اس طرح ہیں:

۱۔ بیوی کے علاوہ دوسرے اقرباء کا نفقہ اسی وقت واجب ہوتا ہے، جبکہ وہ محتاج وضرورت مند ہوں۔

۲۔ بیوی اور والدین واجداد کے دوسرے اقرباء کا نفقہ اسی صورت میں واجب ہوگا، جب وہ خود کمانے پر قادر نہ ہوں، اگر وہ خود کمانے کی قدرت رکھتے ہوں تو ان کا نفقہ کسی اور پر عائد نہ ہوگا۔

۳۔ بیوی، والدین اور اولاد کے رشتہ سے واجب ہونے والے نفقہ کے علاوہ دوسرے اقرباء کا نفقہ اسی وقت واجب ہوگا، جبکہ اس سلسلہ میں قاضی کا فیصلہ موجود ہو۔

۴۔ بیوی، اولاد اور والدین کے سوا دوسرے لوگوں کا نفقہ اسی وقت واجب ہوگا جبکہ وہ (جس پر نفقہ واجب ہونا ہے) فقہ کی اصطلاح میں موسر (دولت مند) ہو اور اگر وہ موسر نہیں ہے تو اس پر ان لوگوں کا نفقہ واجب نہ ہوگا، بھلے ہی یہ شخص (جس پر نفقہ واجب ہونا ہے) کمانے پر قادر ہو (قاموس الفقہ ۵/ ۲۱۴تا۲۱۶)۔

اصول وفروع کا نفقہ واجب ہونے کے متعلق علامہ شامیؒ نے جو تفصیل لکھی ہے وہ حسب ذیل ہے:

- اصول وفروع کا نفقہ واجب ہونے کا اصول جزئیت کے بعد قرابت ہے، میراث نہیں، یعنی اصول یا فروع کے نفقہ کو واجب کرنے میں اولاً جزئیت کا اعتبار ہوگا اور یہ ذی رحم پر مقدم ہوگا، پھر جزئیت میں الاقرب فالاقرب مقدم ہوگا۔ وراثت کو نہیں دیکھا جائے گا، جزئیت کے مقدم ہونے کی مثال جیسے جس شخص کا

نفقہ واجب ہوتا ہے اگر اس کا ایک حقیقی بھائی ہے اور ایک پوتی ہے تو اس کا نفقہ تنہا پوتی کے ذمہ ہوگا، جزئیت کی وجہ سے، اگر چہ وارث بھائی ہوگا۔

اقرب کے مقدم ہونے کی مثال جیسے جس شخص کا نفقہ واجب ہوتا ہے اس کی ایک لڑکی ہے اور ایک پوتا ہے تو اس کا نفقہ بیٹی کے ذمہ ہوگا، جزئیت میں اقرب ہونے کی وجہ سے، اگر چہ وراثت میں دونوں مشترک ہیں۔

اس کے بعد مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

جزئیت وقرابت کی بنیاد پر جس پر نفقہ واجب ہوتا ہے، وہ ایک ہی ہے تو وجوب نفقہ کی شرطوں کے پورا ہونے کی صورت میں پورا نفقہ اکیلے اسی پر واجب ہوگا۔

جن پر نفقہ واجب ہوتا ہے وہ ایک سے زیادہ ہوں تو ان کی سات شکلیں ہیں۔

ان شکلوں کو بیان کرنے سے پہلے تین اصطلاحوں کو ذکر کیا جاتا ہے (۱) اصول، (۲) فروع، (۳) حواشی۔

اصول: وہ لوگ جن سے آدمی پیدا ہوا ہے جیسے ماں باپ، دادا دادی، نانا نانی وغیرہ اوپر تک۔

فروع: وہ لوگ جو اس آدمی سے پیدا ہوئے جیسے بیٹا بیٹی، پوتا پوتی، نواسا نواسی وغیرہ نیچے تک۔

حواشی: جو نہ اصول ہوں اور نہ فروع جیسے بھائی بہن، چچا پھوپھی وغیرہ۔

سات شکلیں:

(۱) صرف فروع ہوں، (۲) فروع اور حواشی ہوں، (۳) فروع اور اصول ہوں، (۴) فروع، اصول اور حواشی ہوں، (۵) صرف اصول ہوں، (۶) اصول اور حواشی ہوں، (۷) صرف حواشی ہوں۔

پہلی قسم: یعنی صرف فروع ہوں، ان میں قرابت اور جزئیت معتبر ہے، یعنی جزئیت کے بعد قرابت نہ کہ میراث، لہذا ایک مسلمان فقیر کے دو بچے ہوں، اگر چہ ان میں سے ایک نصرانی یا ایک مونث ہو تو اس کا نفقہ دونوں پر برابر برابر واجب ہوگا، قرابت وجزئیت میں برابر ہونے کی وجہ سے، اگر چہ میراث میں برابر نہیں ہیں۔

بیٹے اور پوتے میں صرف بیٹے پر نفقہ واجب ہوگا، اس کے قریب ہونے کی وجہ سے، پوتے پر نفقہ واجب نہ ہوگا۔

بیٹی اور پوتے میں صرف بیٹی پر نفقہ واجب ہوگا، اس کے قریب ہونے کی وجہ سے، پوتے پر نفقہ واجب نہ ہوگا۔

پوتا اور پوتی کی صورت میں دونوں پر برابر برابر نفقہ واجب ہوگا، ان کے قریب اور جز ہونے میں برابر ہونے کی وجہ سے۔

فقہاء کی اس صراحت کی بنا پر کہ فروع میں حصہ وراثت کا اعتبار نہیں، اگر حصۂ وراثت کا اعتبار ہوتا تو بیٹے اور بیٹی کی صورت میں بیٹے پر دو تہائی اور بیٹی پر ایک تہائی نفقہ واجب ہوتا، حالاں کہ دونوں پر برابر برابر نفقہ واجب ہوتا ہے۔

دوسری قسم:...... فروع کے ساتھ حواشی (بھائی بہن وغیرہ) ہوں، اس صورت میں بھی قریب اور جز ہونا معتبر ہے، میراث کا اعتبار نہیں ہے، لہذا بیٹی اور حقیقی بہن کی صورت میں صرف بیٹی پر نفقہ واجب ہوگا، اگر چہ وارث دونوں ہوں گی، نفقہ کے وجوب میں بہن ساقط ہو جائے گی، اس لئے کہ بیٹی جزئیت کی وجہ سے مقدم ہے۔

نصرانی بیٹے اور مسلمان بھائی کی صورت میں صرف نصرانی بیٹے پر نفقہ واجب ہوگا، اگر چہ وارث تنہا مسلمان بھائی ہوگا، بیٹے کے قریب اور جز ہونے میں خاص ہونے کی وجہ سے۔

نواسے اور حقیقی بھائی کی صورت میں صرف نواسے پر نفقہ واجب ہوگا، حالاں کہ وہ وارث نہیں ہوگا، نواسے کے جز ہونے میں خاص ہونے کی وجہ سے، حالاں کہ نواسا اور حقیقی بھائی قریب ہونے میں برابر ہیں، اس لئے کہ دونوں میں سے ہر ایک کے لئے ایک ایک واسطہ ہے، نواسے کے لئے بیٹی ایک واسطہ ہے اور بھائی کے لئے ماں باپ ایک واسطہ ہیں۔

تیسری قسم:.....یعنی فروع، اصول کے ساتھ ہوں، اس صورت میں جزء ہونے میں اقرب ہونا معتبر ہے، اور اگر ترجیح نہ پائی جائے تو حصہ وراثت کا اعتبار ہوگا۔

اگر ایک شخص کا باپ ہے اور بیٹا بھی ہے تو اس کا نفقہ صرف بیٹے پر واجب ہوگا، اس لئے کہ جزئیت کے قریب ہونے میں باپ اور بیٹا برابر ہیں، لہذا ترجیح کا اعتبار کیا جائے گا، اور ترجیح حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ارشاد ہے: "أنت و مالک لأبیک"۔

ماں اور بیٹے میں، بیٹے پر نفقہ واجب ہوگا، متون کے اس قول کی وجہ سے کہ ماں باپ کے نفقہ میں بیٹے کے ساتھ کوئی شریک نہیں ہوگا، متون کے اس قول کی دلیل حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ارشاد ہے: "أنت و مالک لأبیک" یہ ارشاد پاک صرف باپ کے لئے خاص نہیں ہے، بلکہ ماں بھی اس میں شامل ہے۔

دادا اور پوتے کی صورت میں بقدر میراث یعنی چھٹا چھٹا حصہ واجب ہوگا، اس لئے کہ دونوں قرب میں برابر ہیں اور اسی طرح وراثت میں بھی برابر برابر حصہ ہے اور کوئی دوسرا مرجح نہیں ہے۔

باپ اور پوتے یا باپ اور پوتی کی صورت میں باپ پر نفقہ واجب ہوگا، اس لئے کہ باپ جز ہونے میں اقرب ہے، تو برابری نہیں رہی اور مرجح قرب پایا گیا، متون میں یہ قول بھی ہے کہ اولاد کے نفقہ میں باپ کے ساتھ کوئی شریک نہیں ہوگا۔

چوتھی قسم:.....فروع، اصول اور حواشی کے ساتھ ہو، اس کا حکم تیسری قسم کے حکم جیسا ہے، فروع کے ذریعہ حواشی کے ساقط ہوجانے کی وجہ سے، فروع سے قرب اور جزئیت کے ذریعہ راجح ہونے کی وجہ سے، جب فروع کے ذریعہ حواشی ساقط ہو گئے، تو فروع اور اصول کے علاوہ کوئی باقی نہیں رہا اور یہ بعینہ تیسری قسم ہے۔

پانچویں قسم:.....صرف اصول ہوں، اگر ان کے ساتھ باپ ہو تو نفقہ صرف باپ پر واجب ہوگا، متون کے اس قول کی وجہ سے کہ اولاد کے نفقہ میں باپ کے ساتھ کوئی شریک نہیں ہوگا۔

چھٹی قسم:.....اصول حواشی کے ساتھ ہوں، اگر دونوں صنف (اصول اور حواشی) میں سے کوئی ایک صنف وارث نہ ہو تو تنہا اصول کا اعتبار ہوگا، جزئیت کو ترجیح دینے کی وجہ سے، وراثت میں شرکت نہیں ہے جو اس کا اعتبار کیا جائے، لہذا اصول مقدم ہوں گے، خواہ وہی وارث ہوں یا وارث دوسری صنف (حواشی) ہو۔

اصول ہی وارث ہوں اس کی مثال جیسے دادا ہے اور حقیقی بھائی ہے، اس صورت میں نفقہ تنہا دادا پر واجب ہوگا۔

صرف حواشی وارث ہوں اس کی مثال جیسے نانا اور چچا، اس میں نفقہ تنہا نانا پر واجب ہوگا۔

دونوں مثالوں میں جزئیت کو ترجیح دینے کی وجہ سے اور وراثت میں شریک نہ ہونے کی وجہ سے، پہلی مثال میں تنہا دادا وارث ہے اور دوسری مثال میں تنہا چچا وارث ہے۔

اگر دونوں صنفوں (اصول اور حواشی) میں سے وارث ہوں تو نفقہ واجب کرنے میں حصۂ وراثت کا اعتبار ہوگا، لہذا ماں اور عصبہ بھائی، یا ماں اور عصبہ بھتیجا، یا ماں اور عصبہ چچا تینوں مثالوں میں ماں کے ذمہ ایک تہائی نفقہ ہوگا اور دو تہائی عصبہ پر واجب ہوگا۔

اگر اس قسم میں اس کی دونوں صنفوں (اصول اور حواشی) میں اصول متعدد ہوں تو ہم انہیں دیکھیں گے اور ہم ان میں وہی طریقہ اختیار کریں گے جو پانچویں قسم میں اختیار کیا گیا، جیسے چھٹی قسم کی پہلی مثال یعنی دادا اور حقیقی بھائی کے ساتھ نانا بھی ہو تو ہم دادا کو نانا پر مقدم کریں گے، وراثت کے ذریعہ دادا کو ترجیح ملنے کی وجہ سے، حالاں کہ جزئیت میں دونوں برابر ہیں۔

چھٹی قسم کی دوسری مثال یعنی نانا اور چچا کے ساتھ ماں بھی ہو تو ماں کو نانا پر مقدم کریں گے، وراثت اور قرابت کے ذریعہ ترجیح ملنے کی وجہ سے۔

اگر فقیر کی ماں، دادا اور عصبہ بھائی، یا ماں، دادا اور عصبہ بھتیجہ، یا ماں، دادا اور عصبہ چچا ہو تو نفقہ تنہا دادا پر واجب ہوگا، اس لئے کہ دادا، عصبہ بھائی، بھتیجے اور چچا کو محروم کردیتا ہے، اس لئے کہ اس صورت میں دادا باپ کے قائم مقام ہوجاتا ہے، جب دادا باپ کے قائم مقام ہوگیا تو ایسا ہوگیا جیسے باپ حقیقۃً موجود ہو، اور جب باپ حقیقۃً موجود ہو تو نفقہ واجب ہونے میں ماں شریک نہیں ہوتی ہے، بس یہی حکم اس صورت میں ہوگا جب باپ حکماً موجود ہو، لہذا نفقہ صرف دادا پر واجب ہوگا۔

اگر فقیر کی صرف ماں اور دادا ہوں تو دادا باپ کے قائم مقام نہیں ہوتا، لہذا نفقہ دونوں (ماں اور دادا) پر واجب ہوگا، ایک تہائی نفقہ ماں اور دو تہائی نفقہ دادا پر۔

ساتویں قسم: صرف ذی رحم محرم حواشی ہوں: اس قسم میں حصۂ وراثت کے بقدر نفقہ واجب ہوگا، اللہ تعالی کے فرمان: ''و علی الوارث مثل ذلک'' وارث پر اس کے حصہ کے برابر ہے، ذی رحم محرم اگر مونث ہے تو اس کا نفقہ ہر حال میں واجب ہوگا چاہے وہ بالغ ہو یا نابالغ صحیح وتندرست ہو یا اپاہج، صحیح سے مراد کمانے کی قدرت رکھنے والی ہے، اگر وہ بالفعل کماتی ہو تو اس کا نفقہ واجب نہیں ہوگا، ذی رحم محرم اگر مذکر ہے اور نابالغ ہے تو اس کا نفقہ واجب ہوگا، اسی طرح اگر مذکر بالغ ہے لیکن کمانے سے عاجز ہے تو اس کا نفقہ بھی واجب ہوگا۔

کمانے سے عاجز درج ذیل قسم کے لوگ ہیں:

(۱) اندھا، (۲) جن کے دونوں ہاتھ نہ ہوں، (۳) دونوں پیر نہ ہوں، (۴) ایک ہی جانب کا ایک ہاتھ اور ایک پیر نہ ہو، (۵) گونگا، (۶) مفلوج، (۷) کم عقل وغیرہ۔

ان کا نفقہ اسی صورت میں واجب ہے جب یہ کماتے نہ ہوں، اور اگر اتنا کما لیتے ہوں جو ان کے لئے کافی ہو جائے تو پھر ان کا نفقہ واجب نہ ہوگا۔

یہاں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ یہ تفصیل اس صورت میں ہے جب موجودہ سب لوگ مالدار ہوں، اگر ان میں کچھ تنگ دست ہوں تو تنگ دستوں کو کبھی مردہ کے قائم مقام کر دیا جاتا ہے اور نفقہ ان کے علاوہ باقی لوگوں پر واجب ہوتا ہے، اور تنگ دستوں کو کبھی زندہ کے قائم مقام رکھا جاتا ہے اور نفقہ اس کے بعد والوں پر ان کے حصہ وارثت کے برابر واجب ہوتا ہے (درمختار مع ردالمحتار، باب النفقہ ۲/ ۲۷۸ تا ۲۸۱)۔

اس موقع سے میں استاذی قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ کا تبصرہ بھی نقل کرنا ضروری اور مفید خیال کرتا ہوں، فرماتے ہیں:

عام حالات میں تو دوا وعلاج محض جائز ومباح ہے، لیکن جبکہ جسم انسانی مرض کی وجہ سے شدید اذیت کا شکار ہو اور اللہ کی پیدا کی ہوئی جڑی بوٹی اور دواؤں کے ذریعہ اس کی تکلیف سے دور ہو جانے کا ظن غالب ہو اور ان اسباب اور دواؤں تک علم انسانی کی رسائی ہو چکی ہو جنہیں اللہ نے ان امراض سے نجات کے لئے پیدا کیا ہے اور ظن غالب ہو کہ ان دواؤں کے استعمال سے یہ مہلک مرض دور ہو جائے گا اور ہر دو صورت میں ان دواؤں کا استعمال بس میں ہو تو ایسی صورت میں ایسی دواؤں کا استعمال نہ کرنا اور نفس کو تکلیف وہلاکت میں یہ کہہ کر ڈالتے رہنا کہ علاج محض مباح ہے بڑی سخت بات ہے (بحث ونظر شمارہ ۲ص: ۴۲، ۴۹)۔

نیز فرماتے ہیں: دوا وعلاج جو عام حالات میں مباح ہے، ضروری نہیں کہ ہمیشہ یہی حکم رہے، بعض حالات میں دوا کا استعمال واجب بھی ہوتا ہے (بحث ونظر شمارہ ۲ص: ۴۲، ۴۹)۔

علاج ومعالجہ کے وجوب کی رائے ماضی کے بعض محققین وممتاز علماء کی بھی رہی ہے، چنانچہ شوافع وحنابلہ کی ایک جماعت سے وجوب نقل کیا گیا ہے (فتاوی شیخ الاسلام ۲۴/ ۲۶۹)۔

مشہور حنفی عالم ابن تاج الدین حنفی اپنی مایہ ناز کتاب ''احکام المرضی'' میں ایک موقع سے فرماتے ہیں:

مسبب الاسباب نے اپنی سنت یہ رکھی ہے کہ مسببات کو اسباب کے ساتھ جوڑا ہے، تاکہ اس کی حکمت کا اظہار ہو سکے، اور ادویہ بھی دیگر اسباب کی طرح اللہ کے حکم کے تابع ہیں، جیسے روٹی بھوک کی دوا ہے، پانی پیاس کی دوا ہے، سکنجبین صفراء کی دوا ہے، سمونیا اسہال کی دوا ہے، ہاں فرق یہ ہے کہ روٹی وپانی سے بھوک وپیاس کے علاج کو سب جانتے ہیں، اس لئے کہ یہ ایک کھلی ہوئی چیز ہے اور سکنجبین سے صفراء کا علاج بعض ہی لوگ جانتے ہیں تو جس کو تجربہ سے اس کا (اور اس جیسی چیز کا) علم ہو جائے تو وہ اس کے حق میں روٹی اور پانی کی طرح ہوگی (احکام المرضی: ۳۵۹، ۳۶۰)۔

مفتی محمد عبید اللہ اسعدی صاحب لکھتے ہیں: بہر حال احقر یہ سمجھتا ہے کہ علاج ومعالجہ اور دوا کے معاملہ کو اطلاقاً مباح یا صرف مستحب نہیں کہا جا سکتا، اگر اطلاقاً اس کو واجب نہ کہا جائے اس میں کچھ نہ کچھ تفصیل کرنی ہوگی اور بعض صورتوں میں اس کے لئے تاکید کا اور بعض میں وجوب کا حکم ہوگا اور ترک وصرف نظر گناہ ہے (انسانی حقوق اور اسلامی نقطہ نظر: ۱۹۵ تا ۲۰۳)۔

سوال نمبر ۴: ایک اہم مسئلہ والدین اور بزرگوں کی جسمانی خدمت، خاص کر جب انسان چلنے پھرنے، اٹھنے بیٹھنے اور کسی ضرورت کو پوری کرنے میں سہارے کا محتاج ہو جائے، ایسی صورت حال میں اگر بیٹا زیادہ کمانے کی غرض سے دوسرے شہر، دوسری ریاست یا دوسرے ملک میں چلا جائے تو بوڑھوں کی

دشواریاں بہت بڑھ جاتی ہیں، ان حالات میں:

الف: کیا زیادہ آمدنی کے لئے لڑکوں کا اپنے ماں باپ کو چھوڑ کر دوسری جگہ جانا جائز ہے؟

سوال میں مذکور صورت حال میں زیادہ آمدنی کے لئے لڑکوں کا ماں باپ کو چھوڑ کر دوسری جگہ جانا جائز نہیں ہے، اس لئے کہ اس صورت میں ان کی خدمت فرض کفایہ پر بھی مقدم ہے، درج ذیل حدیث اور اس کی تشریح ملاحظہ ہو۔

''سمعت عبدالله بن عمر، يقول: جاء رجل إلى النبي ﷺ فاستأذنه في الجهاد. فقال: أحي والداك؟ قال: نعم. قال: ففيهما جاهد'' (بخاری، حدیث: ۳۰۰۴، باب الجهاد باذن الابوين)۔

حضرت مفتی سعید احمد صاحب پالنپوری دامت برکاتہم نے اس کی تشریح میں تحفۃ القاری میں لکھا ہے کہ اگر والدین خدمت کے محتاج ہیں اور جہاد فرض کفایہ ہے تو والدین کی اجازت سے جہاد میں نکلے، اگر نفیر عام ہونے کی وجہ سے جہاد فرض عین ہوگیا ہے یا والدین خود کفیل ہیں، خدمت کے محتاج نہیں تو جہاد میں نکلنے کے لئے والدین کی اجازت ضروری نہیں۔

حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب دامت فیوضہم نے قاموس الفقہ میں لکھا ہے کہ ''سفر سے دوسروں کے حقوق متاثر نہ ہوں: سفر سے پہلے یہ دیکھ لینا ضروری ہے کہ سفر کرنے کی وجہ سے کسی شخص کا حق جو اس سے متعلق ہے فوت نہ ہو رہا ہو، چنانچہ والدین یا ان میں کوئی ایک مریض ہو اور اپنے بچہ کی مدد کا محتاج ہو، کوئی دوسرا مناسب تیمار دار موجود نہ ہو تو ایسے شخص کا حج یا جہاد کے سفر پر بھی نکلنا جائز نہیں، سوائے اس کے کہ جہاد اس پر فرض عین ہوگیا ہو، البتہ اگر ماں باپ کے لئے خدمت کی متبادل صورت موجود ہو تو نہ ان کا اصرار درست ہے کہ ان کے لڑکے دینی اسفار نہ کریں اور نہ اولاد کے لئے ان کے اصرار کو قبول کرنے کی گنجائش ہے، علم دین کے حصول کے لئے بھی ایسی صورت حال میں سفر کر سکتے ہیں (قاموس الفقہ ۴/۱۵۵)۔

ب: بہو پر ساس سسر کی خدمت لازم نہیں ہے، اور اسے ان کی خدمت کرنے اور ساتھ رہنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ اخلاقی اعتبار سے اسے ان کی خوش دلی سے خدمت کرنی چاہئے۔

ج: ماں باپ کی خدمت بیٹوں اور بیٹیوں سب پر واجب ہے، اگر بیوی کے والدین معذور ہوں اور کوئی دیکھ ریکھ کرنے والا نہ ہو تو بیوی انکی تیمارداری کر سکتی ہے اور شوہر کو اسے اپنے والدین کی تیمارداری کرنے سے روکنے کا حق نہیں ہے۔

''ولو أبوها زمنًا مثلًا فاحتاجها فعليها تعاهده ولو كافرًا. وإن أبي الزوج (قوله زمنًا) أي مريضًا مرضا طويلًا (قوله فعليها تعاهده) أي بقدر احتياجه إليها. وهٰذا إذا لم يكن له من يقوم عليه كما قيده في الخانية'' (درمختار مع رد المحتار ۲/ ۶۶۴)۔

مندرجہ بالا تفصیل کے بعد سوالنامہ میں مذکور سوالوں کے جواب مختصر اور ترتیب وار حسب ذیل ہیں:

۱۔ اگر کوئی شخص بوڑھاپے کی عمر کو پہنچ گیا لیکن اتنا کمزور نہیں ہے کہ کسب معاش نہ کر سکے، کسی قدر مشقت کے ساتھ ہی وہ کما کر خود اپنی ضروریات پوری کر سکتا ہے تو کیا ایسے شخص کو اس کی اولاد یا اعزہ واقارب جن کے ذمہ اس کا نفقہ واجب ہے کسب معاش پر مجبور کر سکتے ہیں؟

جواب: اگر ایسا شخص والدین یا اجداد میں سے ہے اور وہ محتاج وضرورت مند ہے تو اسے کمانے پر مجبور نہیں کر سکتے۔

اگر ایسا شخص والدین یا اجداد کے سوا دوسرے اقرباء میں سے ہے تو اس کا نفقہ کسی اور پر واجب نہ ہوگا۔

۲۔ جن صورتوں میں دوسروں پر نفقہ واجب ہوتا ہے انہی صورتوں میں علاج واجب ہونا چاہئے، یعنی سن رسیدہ حضرات اگر والدین یا اجداد میں سے ہیں اور وہ محتاج وضرورت مند ہیں تو ان کا نفقہ اور علاج دوسروں پر واجب ہوگا، چاہے وہ کسب معاش کی قدرت رکھتے ہوں یا نہیں۔

اور اگر یہ حضرات والدین واجداد کے علاوہ دوسرے اقرباء میں سے ہیں اور یہ محتاج وضرورت مند ہونے کے علاوہ کسب معاش پر قادر نہ ہوں تو ان کا نفقہ دوسروں پر واجب ہوگا۔

۳۔ اس سوال میں مذکور صورت حال میں بوڑھے والدین یا خاندان کے بڑے زیادہ سہولت کے لئے یا دوسرے لوگوں پر خرچ کرنے کے لئے یا کچھ رقم محفوظ

کرنے کے لئے اپنی اولاد سے یا ان لوگوں سے جن پر بحالت حاجت نفقہ واجب ہوتا ہے زائد رقم کا مطالبہ قانوناً نہیں کرسکتے ہیں، اس لئے کہ ان کا نفقہ محتاجی کی بنیاد پر ہوتا ہے اور یہ محتاج نہیں ہیں، بلکہ خود صاحب ثروت ہیں، اور محتاجی کی صورت میں بقدر کفایت واجب ہوتا ہے، یعنی جس سے ضرورت پوری ہوجائے۔

۴۔ الف: والدین بیٹے کی خدمت کے محتاج ہوں اور کوئی دوسرا ان کی خدمت کرنے والا نہیں ہے تو ان کی اجازت کے بغیر بیٹے کو زیادہ آمدنی کے لئے دوسری جگہ جانا جائز نہیں ہے۔

ب: بہو پر ساس سسر کے ساتھ رہنا اور ان کی خدمت کرنا لازم نہیں ہے، لہذا اسے ان کے ساتھ رہنے اور خدمت کرنے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا، البتہ اسے خود کو چاہئے کہ محتاجوں اور بیماروں کی خدمت و تیمارداری کا اجر وثواب جو اسے گھر میں رہتے ہوئے نصیب ہونے کا موقع مل رہا ہے اسے غنیمت سمجھے اور ہاتھ سے جانے نہ دے اور خوب خوش دلی کے ساتھ ان کی خدمت کرے۔

ج: ماں باپ کی خدمت بیٹوں اور بیٹیوں سب پر واجب ہے، اگر بیوی کے والدین معذور ہوں اور کوئی دیکھ ریکھ کرنے والا نہ ہو تو بیوی ان کی تیمارداری کرسکتی ہے اور شوہر کو اسے اپنے والدین کی تیمارداری کرنے سے روکنے کا حق نہیں ہے۔

۵۔ اولاد کو اپنی والدہ کے فوت ہوجانے پر والد کے دوسرے نکاح میں رکاوٹ نہیں بننا چاہئے بلکہ اس سلسلہ میں انہیں اپنی ذمہ داری کو سمجھ کر اسے ادا کرنے کی کوشش کرنی چاہئے، شوافع اور حنابلہ کے نزدیک بیٹے پر باپ کی شادی کا انتظام واجب ہوگا اور اس کے مہر کی ذمہ داری بھی اس کے بیٹے پر ہوگی، حنفیہ کے یہاں دو قول ہیں ایک واجب ہونے کا دوسرا واجب نہ ہونے کا، اور اگر خود والدین میں اپنی بیوی کی کفالت کرنے کی استطاعت نہ ہو اور وہ اس کی خدمت کا محتاج ہو تو اولاد پر اس کا نفقہ بھی واجب ہوگا۔

۶۔ والد کی جائیداد میں والد کی حیات تک اولاد کا حق نہیں ہے، لہذا بطور حق والد کی جائیداد میں سے ان کی حیات میں مطالبہ کی گنجائش نہیں ہے۔

۷۔ ماں، باپ، دادا، دادی اور نانا نانی کا جیسے نفقہ واجب ہے ان کی خدمت بھی واجب ہے اور وہ خدمت کے محتاج ہوں تو ان کی خدمت حج اور جہاد فرض کفایہ پر بھی مقدم ہے اور انسان کو اپنی اولاد اور اولاد کی اولاد کو دیکھ کر اور ان کے ساتھ رہ کر جو راحت وسکون اور آنکھوں کو ٹھنڈک ملتی ہے کوئی چیز اس کا بدل نہیں ہے، لہذا جہاں تک ممکن ہو اپنے بزرگوں کو اپنے ساتھ ہی رکھنا چاہئے اور عمر دراز لوگوں کے لئے بنائے گئے دارالاقامہ میں ان کو منتقل نہیں کرنا چاہئے اور نہ ہی کوئی شخص اپنے بزرگوں کو ایسے دارالاقامہ میں قیام کرنے پر مجبور نہیں کرسکتا ہے۔

البتہ وہ لوگ جو اسے بےکس وبے سہارا ہوں کہ ان کا کوئی قریبی رشتہ دار ان کی دیکھ بھال کرنے والا موجود نہ ہو ان کو ایسے دارالاقامہ میں منتقل کردینا (جہاں ان کی مناسب دیکھ بھال ہوجاتی ہو ان کی ضرورت کی چیزیں مل جاتی ہوں اور ان کے ہم عمر لوگ بھی مل جاتے ہوں) مفید وبہتر معلوم ہوتا ہے۔

۸۔ اگر یہ حضرات زکوۃ کا مصرف ہوں اور ان کی اجتماعی کفالت پر خرچ کرنے میں تملیک ہوسکتی ہو تو ان پر زکوۃ کی رقم خرچ کی جاسکتی ہے۔

۹۔ عمر دراز لوگوں کے لئے حکومتوں نے مختلف چیزوں پر بعض خصوصی رعایتیں رکھی ہیں جیسے ٹرین وغیرہ میں کرایہ میں تخفیف، حکومت کی طرف سے امدادی وظیفہ، ٹیکس میں رعایت وغیرہ جو لوگ ان رعایتوں کے لئے مطلوب مقررہ حد عمر کو نہ پہنچیں ہوں ان کے لئے ایسی رعایتوں سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں ہوگا۔

والدین کے حقوق اور والد کی زندگی تقسیم جائیداد کا مطالبہ

مفتی ظہیر احمد کانپوری[1]

۱۔ اولاد اپنے بوڑھے والدین کو کسب معاش پر مجبور نہیں کر سکتی خواہ وہ کمائی کرنے پر قادر ہی کیوں نہ ہوں، ان کا نفقہ اولاد پر واجب ہے، اگر اولاد مالدار ہے تو اس کے مطابق اور اگر فقیر ہے تو اپنے (اہل وعیال کے) ساتھ رکھ کر، گو کہ جو شخص کسب معاش پر قادر ہو اس کو اپنی کمائی ہی سے کھانا بہتر ہے۔

''إن أطيب ما أكلتم من كسبكم وإن أولادكم من كسبكم فكلوه هنيئًا'' (نيل الاوطار ٦/ ١٢-١١، ترمذی ٣/ ٦٣٩ رقم الحديث: ١٣٥٨)۔

''فإن كان قادرا على الكسب فلا نفقة له بالاتفاق، لأن القدرة على الكسب غنى لكن باستثناء الأبوين. فتجب لهما النفقة فی رأی الحنفية والشافعية مع القدرة على الكسب، لأن الفرع مأمور بمعاشرة أصله بالمعروف وليس منها تكليفه الكسب مع كبر السن'' (١٠/ ٧٣٥٨، الفقه الاسلامی وادلته، كذا فی الدر مع الشامی ٥/ ٣٥٥ زكريا. قاموس الفقه ٥/ ٢١٤ ديوبند)۔

''وكذا جاء فی موضع آخر: يشترط لوجوب الإنفاق على القريب ثلاثة شروط: أولًا أن يكون الفقير قريبا لا مال له ولا قدرة له على الكسب لعدم البلوغ أو الكبر أو الجنون الزمانة المرضية. ويستثنى الأبوان فتجب لهما النفقة مع القدرة على الكسب بالصحة والقوة'' (الفقه الاسلامی وادلته ١٠/ ٧٣٥٣). ''فنفقة أولاده واجبة عليه ولو كان معسرا'' (الفقه الاسلامی وادلته ١٠/ ٧٣٥٣)۔

اسی طرح بیوی کے مالدار یا کسب معاش پر قادر ہونے کے باوجود بیوی کا نفقہ شوہر پر واجب رہے گا، شوہر بیوی کو کسب معاش پر مجبور نہیں کر سکتا ہے۔

''الفقہ الاسلامی وادلتہ'' میں ہے:

''لا تجب النفقة على الغير إلا بسبب الحاجة فمن كان ذا مال فنفقته فی ماله سواء أكان صغيرًا أم كبيرًا إلا الزوجة فإن نفقتهما تجب على الزوج ولو كانت موسرة، لأن نفقتهما لم تجب للحاجة وإنما بسبب احتباسها لحق الزوج'' (الفقه الاسلامی وادلته ١٠/ ٧٣٥٩)۔

سوال نمبر ۲ کا جواب:

والدین اور بیوی کے علاوہ سن رسیدہ خواتین وحضرات کا نفقہ ان کے قریبی رشتہ داروں پر جب واجب ہوگا، جبکہ ان کے پاس اتنا مال نہ ہو جس سے وہ اپنے اخراجات پورے کر سکیں (فقیر ہوں) اور نہ وہ کسب معاش پر قادر ہوں، بڑھاپے کی وجہ سے یا دائمی مریض رہنے کی وجہ سے یا پاگل پن اور جنون کی وجہ سے۔

چنانچہ: ''الفقہ الاسلامی وادلتہ'' میں ہے:

يشترط لوجوب النفقة على القريب ثلاثة شروط: أولًا أن يكون القريب فقيرًا لا مال له لا قدرة له على

[1] ۸/۳۸، ۲۰، مسجد حلوا سوہن رام نارائن بازار کانپور۔

الكسب لعدم البلوغ أو الكبر أو الجنون أو الزمانة المرضية'' (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۱۰/ ۷۳۵۳)۔

یہ شرط تو سن رسیدہ حضرات وخواتین کے لئے ہے جن کا خرچ دوسروں پر واجب ہے۔

شرط (۱) اور جن پر خرچ واجب ہے ان کے اندر ان شروط کا پایا جانا ضروری ہے وہ مالدار ہوں یا کمانے پر قادر ہوں، لہذا فقیر پر اور جو خود کمانے پر قادر نہ ہو تو اس پر اولا د والدین اور بیوی کا نفقہ علاوہ کسی قریبی رشتہ دار کا نفقہ واجب نہیں۔

چنانچہ: ''الفقہ الاسلامی وادلتہ'' میں ہے:

''أن يكون الملزم بالنفقة موسرًا مالكًا نفقة فاضلة عن نفسه إما من ماله وإما من كسبه فيلزم القادر على التكسب أن يعمل للإنفاق على قريبه الفقير، ويستثنى الأب. فنفقة أولاده واجبة عليه ولو كان معسرا. وكذلك الزوج فنفقة زوجته واجبة عليه ولو كان معسرا'' (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۱۰/ ۷۳۵۳)۔

شرط (۲) اور جس پر خرچ واجب ہے، سن رسیدہ حضرات وخواتین کا وہ قریبی رشتہ دار ہو۔

جیسا کہ ''الفقہ الاسلامی وادلتہ'' میں ہے:

''أن يكون المنفق قريبا للمنفق عليه ذا رحم محرم منه مستحقا للإرث منه في مذهب الحنفية'' (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۱۰/ ۷۳۵۴، ۱۰/ ۷۳۵۴)۔

سوال نمبر ۳ کا جواب:

والدین اور بیوی کے مالدار اور صاحب ثروت ہونے کے باوجود شوہر پر بیوی کا نفقہ واجب ہے جبکہ مالدار والدین پر بھی اولاد کو صلہ رحمی کے طور پر بھی خرچ کرنا چاہئے اور بغیر مطالبہ کے دینا چاہئے ان کو خوش رکھنا چاہئے، آپ کے ارشاد: "أنت ومالك لأبيك" پر نگاہ ہونی چاہئے۔ اولاد پر والدین کا خرچ محض فقر کی وجہ سے ہی واجب نہیں ہوتا، بلکہ ان کے ساتھ حسن سلوک "وبالوالدين إحسانا" (بنی اسرائیل: ۲۳)، اور "وصاحبهما في الدنيا معروفا" (لقمان: ۱۵) کا بھی حکم ہے، ''إن أطيب ما أكلتم من كسبكم، وإن أولادكم من كسبكم فكلوه هنيئا'' (نیل الاوطار ۶/ ۶۳۹، ترمذی رقم الحدیث ۱۳۵۸)۔

البتہ والدین اور بیوی کے نفقہ کے علاوہ دیگر خاندان کے بزرگوں کا نفقہ ان کے مالدار نہ ہونے اور نہ کسب پر قادر ہونے ہی کی صورت میں واجب ہے، جیسا کہ اوپر دونوں شرطوں کا بیان ہوا (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۱۰/ ۵۴-۷۳۵۴)۔

لہذا صاحب ثروت ہونے کی صورت میں ان حضرات کا نفقہ سے زائد مزید سہولت یا محفوظ کرنے کے لئے مطالبہ کرنا درست نہ ہوگا۔

سوال (۴) کا جواب:

(الف) جائز نہیں، بلکہ اپنے وطن میں والدین کے پاس رہ کر ان کی خدمت کرنا چاہئے، اور کم آمدنی پر قناعت کرنی چاہئے، والدین کے ساتھ حسن سلوک کا یہی تقاضا ہے، ان کی جسمانی ضروریات سے زیادہ روحانی ضروریات یعنی ان کے احساسات کا خیال رکھنا زیادہ ضروری ہے، ان کو قلبی سکون پہنچانا جسمانی سکون سے زیادہ اہم ہے۔

والدین کی خدمت کرنا جہاد سے بھی زیادہ افضل ہے، چنانچہ ایک حدیث میں آتا ہے کہ

''عن عبدالله بن عمرو قال: جاء رجل إلى رسول الله ﷺ فاستأذنه في الجهاد فقال: أحي والديك؟ قال: نعم. قال: ففيهما فجاهد. وفي رواية: فارجع إلى والديك فأحسن صحبتهما'' متفق عليه (رواه البخاري ۶/ ۱۴۰ رقم الحديث ۳۰۰۴، رواه مسلم ۴/ ۱۹۷۵ رقم الحديث ۲۵۴۶ كتاب الامارة باب ثواب من حبسه)

(حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ ایک آدمی حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں آیا اور جہاد کی اجازت طلب کی، آپ ﷺ نے فرمایا کہ کیا تمہارے والدین حیات سے ہیں؟ اس نے کہا جی ہاں، آپ ﷺ نے فرمایا: انہی میں تمہارا جہاد ہے، یعنی ان کی خدمت میں تم خوب

کوشش کرو، یہ تمہارے حق میں مثل جہاد ہے، ایک دوسری روایت میں ہے کہ تم اپنے والدین کی طرف لوٹ جاؤ اور انہی کے ساتھ رہو اور ان کے حقوق اچھی طرح ادا کرو۔

لہٰذا زیادہ آمدنی بڑھانے کے لئے اور معیار زندگی (High living standard) کے حصول کے لئے والدین کو چھوڑ کر باہر جانا جبکہ وہ تمہاری خدمت کے محتاج ہوں قطعاً شرعاً درست نہ ہوگا۔

حضرت اویس قرنیؒ نے شرف صحابیت کو نظر انداز کر کے والدین کی خدمت کو ترجیح دی، ہم محض چند پیسوں کے لئے والدین کو ان کے بڑھاپے میں چھوڑ کر چلے جاتے ہیں، یہ ہرگز درست نہیں۔

ہم کو تو ان کے پاس رہ کر ان کی خدمت کر کے ان کی دعائیں لینی چاہئے، یہ دنیا تو گذر ہی جائے گی، چاہے تنگی ترشی کے ساتھ ہی سہی۔

(ب) بہو پر ساس سسر کی خدمت شرعی واجب نہیں، البتہ اخلاقی طور پر اس کو اپنے ساس سسر کی خدمت کرنی چاہئے، تاہم ناگہانی حالات پر تو ہر شخص پر وقتی طور پر دوسرے کی خدمت واجب ہوتی ہے، اس لئے بہو پر نہیں بلکہ لڑکے پر اپنے والدین کی خدمت واجب ہے، چاہے وہ خود انجام دے اور اگر کسی وجہ سے یہ سعادت خود نہ حاصل کر سکے تو پھر خادم/ خادمہ کا نظم کرے کہ نفقہ میں خادم اور خادمہ کا نظم بھی شامل ہے خصوصاً جبکہ وہ ضرورت مند اور محتاج ہوں۔

چنانچہ ''شامی'' میں ہے:

''(وعليه نفقة زوجة أبيه) أي في رواية وفي أخرى: إن كان الأب مريضًا أو به زمانة يحتاج للخدمة ...... وإنه إذا احتاج أحدهما لخادم وجبت نفقة كما وجبت نفقة المخدوم فكان من جملة نفقته، وإذا لم يحتاج فلا تجب'' (رد المحتار ۵/ ۳۴۴ زکریا دیوبند)۔

جیسا کہ ''الفتاوی الخانیہ'' میں ہے:

''وكما يجب على الابن الموسر نفقة والده الفقير يجب عليه نفقة خادم الأب امرأة كانت الخادم أو جارية إذا كان الأب محتاجًا إلى من يخدمه (۱/ ۴۴۸، الخانيه مع الهنديه، فتاوى دار العلوم ۱۲/ ۲۷-۵۲۶. وكذا جاء في الفتاوى الهنديه ۱/ ۵۶۵)۔

(ج) والدین کی خدمت بیٹے اور بیٹیوں دونوں پر واجب ہے، لہٰذا اگر بیٹیاں کسی وجہ سے خود خدمت نہیں کر سکتیں تو ان پر بھی خادم/ خادمہ کے نظم کرنے کی ذمہ داری عائد ہوگی، اور والدین کی خدمت کے خرچ میں وہ بھی برابر شریک ہوں گی۔

ویسے تو والدین اور شوہر دونوں کی خدمت کرنی چاہئے تاہم تعارض کی صورت میں شوہر کا حکم مقدم ہوگا۔

''الدر المختار'' میں ہے:

''(النفقة لأصوله) ولو أب أمه ذخيره (الفقر) ولو قادرين على الكسب ...... بالسوية بين الابن والبنت'' (الدر مع الشامي ۵/ ۳۵۵ زكريا ديوبند، قاموس الفقه ۵/ ۲۸۵)۔

''رد المحتار'' میں ہے:

''(النفقة) أشار إلى أن جميع ما وجب للمرأة وجب للأب والأم على الولد من طعام وشراب وسكنى حتى الخادم وقدمنا في الفروع الكلام على خادم الأب وزوجته'' (رد المحتار ۵/ ۳۵۵ زكريا ديوبند، قاموس الفقه ۵/ ۲۱۵-۲۱۴)۔

سوال نمبر (۵) کا جواب:

اولاد کا والد صاحب کے نکاح میں رکاوٹ بننا جائز نہیں، خواہ والد صاحب جوانی میں نکاح عفت کے لئے کریں یا خدمت کے لئے بڑھاپے کی حالت میں، دونوں صورتوں میں والد کے نکاح میں رکاوٹ بننا درست نہیں، بلکہ نکاح کا خرچ بھی بیٹے پر لازم ہوگا اگر باپ تنگ دست ہو۔

چنانچہ ''الفقہ الاسلامی وادلتہ'' میں ہے:

''يرى الجمهور الفقهاء وفي رواية عند الحنفية أن الولد يلزمه تزويج أو إعفاف أبيه المعسر ولو كان كافرًا معصومًا'' (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۱۰/ ۳۶۰ے)۔

''نفقة زوجة الأب يلزم الابن أيضا نفقة زوجة أبيه في رأي الحنابلة والشافعية والمالكية. وفي رواية عند الحنفية: فكل من لزمه إعفافه لزمته نفقة زوجته كما تقدم ......ولا يلزم الابن عند الحنفية في الرواية الأولى نفقة أكثر من زوجة واحدة للأب'' (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۱۰/ ۳۶۱ے، قاموس الفقہ ۵/ ۲۱۵-۲۱۴)۔

تاہم اس صورت میں صرف اپنی ایک سوتیلی ماں (زوجۃ الاب) کا نفقہ واجب ہوگا، اگر باپ کی اور بھی بیویاں ہوں تو صرف ایک کا نفقہ بیٹا دے گا جو سبھی سوتیلی ماؤں کے مابین تقسیم کردیا جائے گا۔

''وكذا جاء في الدر المختار: وعليه نفقة زوجة أبيه وأم ولده. بل وتزويجه أو تسريه. ولو له زوجات فعليه نفقة واحدة يدفعها للأب ليوزعها عليهن'' (۵/ ۳۴۴ زکریا دیوبند)۔

اور اگر والد صاحب بڑھاپے اور مرض کی وجہ سے خدمت کی ضرورت کی وجہ سے نکاح کریں تو ایسی صورت میں حنفیہ کے ہاں بھی بالاتفاق بیٹے پر باپ کے نکاح کا نفقہ وغیرہ اور اپنی سوتیلی ماں کا خرچ واجب ہوگا، بلکہ خادم/ خادمہ کا بھی خرچ واجب ہوگا، اگر ان کو خدمت کی ضرورت ہو۔

چنانچہ ''شامی'' میں ہے:

''(وعليه نفقة زوجة أبيه) أي في رواية وفي الأخرى إن كان الأب مريضًا أو به زمانة يحتاج للخدمة ...وإنه إذا احتاج أحدهما لخادم وجبت نفقته، كما وجبت نفقة المخدوم، فكان من جملة نفقته. وإذا لم يحتاج فلا تجب'' (رد المحتار للشامی ۵/ ۳۴۴ زکریا دیوبند)۔

سوال نمبر (۶) کا جواب:

اولاد کو والد سے جائیداد وغیرہ کا مطالبہ کرنا شرعاً درست نہیں، ان کی زندگی میں ہماری کوئی حق ان کی مملوکہ جائیداد وغیرہ سے متعلق نہیں ہوتا ہے وہ مالک ہیں، اور ہر مالک کو حق ہوتا ہے کہ وہ اپنی مملوکہ اشیاء اور جائیداد جیسا چاہے تصرف کرے، اولاد ان سے کسی مطالبہ کا حق نہیں رکھتی، البتہ اگر والدین کی مالی حیثیت و پوزیشن اچھی ہو، ان کے پاس ضرورت سے زائد جائیداد وغیرہ ہو اور اولاد ضرورت مند اور محتاج ہو تو اخلاقی طور پر والد کو اپنی محتاج اور ضرورت مند اولاد کا خیال رکھنا چاہئے۔

اور اولاد کو اپنی زندگی ہی میں اپنے پیروں پر کھڑا کرنے کی کوشش کرنی چاہئے تاکہ وہ کسی کے دست نگر نہ رہیں اور مالی اعتبار سے مضبوط رہیں۔

قول النبی ﷺ: ''أن تذر ورثتك أغنياء خير من أن تذرهم عالة يتكففون الناس'' (مشکوۃ ۲۶۵ باب الوصایا)

اولاد کی ضرورت مند ہونے کی حالت میں آسودہ حال والدین کو اپنی اولاد کی حتی الامکان مدد کرنی چاہئے، آخر وہ زائد اس مال و جائیداد کا کیا کریں گے، ذخیرہ آخرت کے لئے صلہ رحمی میں سب سے مقدم اور ان کے قریب اولاد ہی ہے، اس لئے اس صورت میں والد کو اپنی اولاد کی مدد کرنی چاہئے، جیسا کہ حدیث پاک میں ارشاد نبوی ہے:

''عن أبي هريرة وحكيم بن حزام قال رسول الله ﷺ: خير الصدقة ما كان عن ظهر غني وابدأ بمن تعول'' (متفق علیہ رواہ البخاری ۲/ ۲۹۳ رقم الحدیث ۱۴۲۶، رواہ مسلم ۲/ ۷۱۷ رقم الحدیث ۹۰-۱۰۳۴)

کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ بہترین صدقہ وہ ہے جو بے پروائی سے ہو اور اس سے شروع کرو جس کا نفقہ تجھ پر لازم ہے۔

''وعن أم سلمة قالت: قلت يا رسول الله! ألي أجر أن أنفق على بني أبي سلمة إنما هم بني فقال: انفقي عليهم فلك أجر ما أنفقت عليهم'' (متفق علیہ، رواہ البخاری ۲/ ۳۲۸ رقم الحدیث ۱۴۶۷، رواہ مسلم ۲/ ۶۹۵ رقم الحدیث ۴۷-۱۰۰۱)۔

(حضرت ام سلمہؓ سے روایت ہے کہ میں نے کہا اے اللہ کے رسول! آیا میرے لئے ابوسلمہ کے بیٹوں پر خرچ کرنے میں ثواب ہے جبکہ وہ میرے ہی بیٹے ہیں تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ خرچ کرو ان پر تمہارے لئے اس چیز کا ثواب ہے جو تم ان پر خرچ کروگی)۔

سوال نمبر (۷) کا جواب:

کسی کو بھی اپنے بزرگوں کو ایسے ہاسٹل میں قیام پر مجبور نہیں کرسکتا، بزرگوں خصوصاً بزرگ والدین کی خدمت اور ان کی دیکھ بھال اور نگہداشت کو اپنی سعادت سمجھنا چاہئے، قرآن وحدیث میں والدین کے ساتھ حسن سلوک کی بڑی تاکید آئی ہے، "وبالوالدین إحسانًا" (بنی اسرائیل: ۲۳)، ان کے ساتھ اچھا برتاؤ اور حسن معاشرت کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا حکم ہے، "وصاحبهما في الدنيا معروفًا" (لقمان: ۱۵)۔

والدین کی خدمت اور ان کا خیال نہ رکھنے پر سخت وعیدیں احادیث میں وارد ہوئی ہیں، مثلاً حدیث جبرئیل کی بددعا اور اس پر آپ ﷺ کی آمین۔

والدین کی خدمت کر کے ہم کو ان کی دعائیں لینی چاہئے، حدیث پاک میں ''ثلاث دعوات مستجابات. لاشك فيهن دعوة الوالد ودعوة المسافر ودعوة المظلوم'' (رواه ابوداؤد ۲/ ۸۹، رقم الحديث: ۱۵۳۶)۔

والدین کو اپنے سے دور رکھنے میں ان کو روحانی تکلیف بھی ہوگی، چاہے وہاں پر دیگر دنیاوی ساری آسائش کے سامان مہیا ہوں، پھر بھی اپنوں کی کمی والدین کو کھلے گی، ہم کو والدین کی خدمت کے وقت اپنا بچپنا اور صغرسنی کو یاد کرنا چاہئے کہ انہوں نے ہماری پرورش کرنے میں کتنی قربانیاں دیں، انہوں نے ہم کو اپنی آنکھوں سے غائب نہیں ہونے دیا، وہ ہماری ذرا سی غیبت پر جب ہم بغیر اطلاع کے غائب ہوجاتے تھے وہ کتنے بے چین اور بے قرار ہوجاتے تھے، وہ ہم کو ذرا بھی اپنے سے دور رکھنے میں بے تاب ہوجاتے تھے، ان کو ہماری تنہائی کا بھی کافی احساس ہوتا تھا وہ ہرگز ہم کو کسی جگہ پر تنہا چھوڑ کر جانے پر راضی نہیں ہوتے تھے، حتی کہ کسی تعلیمی ادارے میں داخلہ دلانے پر بھی جدائی کی ان کو بڑی تکلیف ہوتی تھی۔ انہوں نے ہماری اچھائی اور بھلائی کے لئے کسی طرح جدائی کو برداشت کیا، ورنہ ہرگز اپنے سے ہم کو دور کرنا نہیں چاہتے تھے۔

سوال نمبر (۸) کا جواب:

اگر بزرگوں کے قریبی رشتہ دار نہ ہوں جن پر ان کے اخراجات شریعت نے واجب کئے ہیں تو ایسے حالات میں فقر کی وجہ سے زکوۃ کی رقم بھی ان پر خرچ کی جاسکتی ہے، اور اجتماعی کفالت کا نظام بھی بنایا جاسکتا ہے۔ "إنما الصدقات للفقراء والمساكين. الخ"۔

سوال نمبر (۹) کا جواب:

حکومت نے جن لوگوں کے لئے جو رعایت اور سہولت رکھی اصلاً انہی کے لئے ایسی رعایتوں سے فائدہ اٹھانا شرعاً درست ہوگا، تاہم اگر قانون اور حکومت کے منشا پر نگاہ رکھی جائے اور اس کی حکمت کے پیش نظر جو قبل از وقت بوڑھے ہوگئے ہیں اور ضعیف ہیں حالانکہ متعینہ مدت انہوں نے پوری نہیں کی ہے اور وہ کسی حیلہ سے عزت کو محفوظ رکھتے ہوئے اس رعایت سے فائدہ اٹھالیتے ہیں تو امید ہے کہ عند اللہ ماخوذ نہ ہوں گے، انشاء اللہ، "الأمور بمقاصدها" کے تحت۔

☆☆☆

والدین و معذورین کے حقوق اور اسلام کا نقطہ نظر

مولانا فیضان احمد قاسمی [1]

مذہب اسلام ایک جامع اور ہمہ گیر مذہب ہے، اس کی تعلیمات زندگی کے ہر شعبے اور زاویے کو محیط ہے، عبادات و معاملات، عقائد و اعمال، معاشرت واخلاق غرض یہ کہ زندگی کا کوئی مرحلہ، کردار و عمل کا کوئی موڑ معاشرت کی کوئی پیچیدگی اور خاندانی تعلقات کی کوئی گرہ ایسی نہیں ہے جس کی رہنمائی اس میں موجود نہ ہو اصولی طور پر دین کے پانچ بنیادی ارکان ہیں، عقائد، عبادات، معاملات، معاشرت اور اخلاقیات۔

معاشرت اور اخلاقیات کے شعبے میں ہمارے معاشرے میں زیادہ بے توجہی برتی جارہی ہے، حالانکہ معاشرے کی اصلاح و درستگی اور اسلامی خطوط پر استوار کرنے کے لئے سماج کے ہر فرد بالخصوص کمزوروں، بوڑھوں اور معذوروں کے حقوق کی بابت ان کے ساتھ حسن معاشرت ان کی ضروریات کا تکفل لازمی امر ہے قرآن وحدیث کی تعلیمات اس سلسلہ میں بہت واضح اور روشن ہیں۔

اللہ تعالی نے قرآن کریم میں اپنے حقوق کے ساتھ والدین، رشتہ داروں، یتیموں اور مسکینوں کے حقوق بیان کر کے اس کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے،

"وإذ أخذنا ميثاق بني إسرائيل لا تعبدون إلا إياه وبالوالدين إحسانا وذي القربى واليتامى والمساكين وقولوا للناس حسنا وأقيموا الصلاة وآتوا الزكوة" (سورہ بقرہ: ۸۳) (اور جب ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا کہ تم اللہ کے سوا دوسرے کی عبادت نہ کرنا اور والدین اور رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنا اور لوگوں کے ساتھ اچھی باتیں کہنا، اور نماز قائم کرنا اور زکوۃ دیتے رہنا)۔

حضرت تمیم داری ؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ایک مرتبہ فرمایا: "الدین النصیحة"، دین تو خیر خواہی کا نام ہے، صحابہ نے عرض کہ کیا کس کی خیر خواہی؟ آپ ﷺ نے فرمایا: "لله ولكتبه ولرسوله ولأئمة المسلمين وعامتهم" (مسلم) (اللہ کی، اس کی کتابوں کی، اس کے رسول کی، مسلمان کے حاکموں کی اور عام مسلمانوں کی)، ایک دوسری حدیث میں ارشاد فرمایا: "الخلق كلهم عيال الله فأحب الخلق إلى الله من أحسن إلى عياله" (شعب الایمان) (تمام مخلوق اللہ کا کنبہ ہے اور اللہ کے نزدیک محبوب وہ ہے جو اس کے کنبہ کے ساتھ اچھا سلوک کرے)۔

عام مسلمانوں کے ساتھ خیر خواہی یہ ہے کہ ان کو کوئی ایذاء نہ پہنچائی جائے، نیک کاموں میں ان کا پورا تعاون کیا جائے، ان کے ساتھ محبت، شفقت، ہمدردی اور غم خواری کا معاملہ کیا جائے ان کی ہر ممکن حمایت، خدمت اور معاونت کی جائے، محتاجوں اور معذوروں کے حقوق کی رعایت کی جائے، بڑوں کی عظمت اور چھوٹوں پر شفقت کا لحاظ رکھا جائے۔

(۱) قرآن کریم میں والدین کے ساتھ حسن سلوک کا تاکیدی حکم جا بجا موجود ہے، "بالوالدين إحسانا" (سورہ اسراء: ۲۳) اور سورہ عنکبوت میں: "ووصينا الإنسان بوالديه حسنا" (سورہ عنکبوت: ۸) میں حسن سلوک کا حکم دیا اور حسن سلوک تقاضا یہ ہے کہ والدین کی بنیادی ضروریات کی تکمیل ہو اور یہی نفقہ کی بنیادی وجہ بھی ہے بصورت مشقت کسب معاش پر مجبور کرنا حسن سلوک کے منافی ہے، جیسا کہ علامہ کاسانی نے فرمایا: "والإنفاق عليهما حال فقرهما من أحسن الإحسان"، اور "ذلک عند عجز هما عن القيام بأمر أنفسهما والحوائج لهما" مزید کسب معاش پر مجبور کرنا نفقہ کو روک کر ایذاء رسانی کا سامان مہیا کرنا ہے جو دلالت نص قرآنی، ولا تقل لهما أف ولا تنهرهما کے خلاف ہے، "كان النهي عن التافيف نهيا عن ترک الإنفاق دلالة" (بدائع الصنائع ۴۳۹/۳ مکتبہ زکریا دیو بند)۔ (۸) (۹)

(۲) ذیلی سلسلہ فروع اور آبائی سلسلہ اصول کے علاوہ دوسرے رشتہ داروں کا نفقہ ہر ذی رحم محرم پر واجب ہوتا ہے بشرطیکہ شرعی طور پر مجبور ہوں، علاج و کسب

[1] خادم التدریس جامعہ شیخ الہند قاسم آباد، انجان شہید، اعظم گڈھ، یوپی۔

معاش سے عاجز ہوں، مسلمان ہوں اور جس پر نفقہ کو واجب قرار دیا جائے وہ صاحب گنجائش ہو (قاموس الفقہ بحوالہ فتح القدیر ۴/ ۴۲۳)۔

(۳) بوڑھے والدین یا وہ اقرباء جن کا نفقہ ان کے چھوٹوں پر بصورت احتیاج شرعاً واجب ہوتا ہے، اس وقت ہے جبکہ یہ کسب معاش سے عاجز ہوں، لیکن یہ حضرات صاحب ثروت ہوں کسب معاش پر قادر ہوں تو زائد رقم کا مطالبہ درست نہ ہوگا (قاموس الفقہ بحوالہ فتح القدیر ۴/ ۴۲۳)۔

(۴) ایسے معذور والدین اور بزرگ افراد جو اپنے ذاتی کاموں کو بھی بغیر کسی سہارے کے انجام نہیں دے سکتے، اولاد کی آمدنی اگر اس درجہ ہے کہ ان کے پاس رہ کر گزر بسر کر سکتے ہیں تو والدین کو چھوڑ کر زیادہ پیسہ کمانے کی غرض سے رخت سفر باندھنا والدین کے حقوق کی پامالی کے ساتھ ان کو ایذا اور تکالیف پہنچانے کا باعث ہے، چنانچہ "ووصينا الإنسان بوالديه حسنا" (سورۂ عنکبوت: ۸)، "أن اشكر لي ولوالديك" (سورۂ لقمان: ۱۴) کی مراد بیان کرتے ہوئے علامہ کاسانی رقمطراز ہیں: "الشكر للوالدين هو المكافاة لهما إلى ذلك عند عجزهما عن القيام بأمر أنفسهما والحوائج لهما" (بدائع الصنائع ۳/ ۴۳۹)۔

(ب): اگر بہو ساس سسر کے ساتھ رہنے پر راضی نہ ہو اور بصورت دیگر بیٹیوں کو اپنے والدین کے ساتھ رہنے کی اجازت نہ ہو تو اولا بہو پر ساس سسر کی خدمت شرعاً واجب نہیں ہے، اس لئے بیٹے کی ذمہ داری ہے کہ والدین کی خدمت کا انتظام کرے نہ کہ اپنی بیوی کو حکم دے۔

(ج): جس طرح والدین کی خوراک پوشاک اور دیگر ضروریات کا پورا کرنا اولاد چاہے لڑکا ہو یا لڑکی واجب ہے، اسی طرح خدمت کرنا بصورت دیگر خادم کا نظم کرنا اور ان کے اخراجات کو برداشت کرنے کی ذمہ داری بیٹے اور بیٹی پر مساوی ہوگی (قاموس الفقہ بحوالہ ردالمحتار ۲/ ۶۷۳)۔

نیز بیٹیوں کے شوہروں کو اس والدین کی خدمت سے باز رکھنا صلہ رحمی کے منافی امر ہے جو اسلامی تعلیمات کے منافی ہے،

"ولا يمنعهم من النظر إليها الخ لما في ذلك من قطعية الرحم" (قدوری/ ۱۹۱)۔

(۵) اگر باپ نکاح کی حاجت رکھتا ہے لیکن خود اس کی کفالت کی استطاعت نہیں تو حنفیہ کے یہاں راجح قول یہی ہے کہ اس کا نکاح کرانا بھی اولاد کی ذمہ داری ہے، مزید باپ میں نفقہ ادا کرنے کی صلاحیت نہ ہو، معذور ہونے کی وجہ سے یا محتاج خدمت کی ہونے کی وجہ سے تو اس کی بیوی کا نفقہ بھی بیٹے کے ذمہ ہوگا (فتح القدیر ۴/ ۱۹-۴۱۸)۔

اولاد اگر محتاج ہو تو اس کا نفقہ باپ پر واجب ہوتا ہے، خاص طور پر باپ کی معاشی حالت بہتر ہو اولاد کا نفقہ کا مطالبہ بجا ہے۔

(۷) اولڈ ہومز کا مقصد سراسر مغربی ہے یہ اسلامی تعلیمات وروایات کے خلاف ہے، اسلام نے والدین کے ساتھ حسن سلوک اور ان کی خدمت کا حکم دیا ہے، ان کی نافرمانی ان کے ساتھ بدسلوکی، بلکہ ان سے اف تک کہنے سے منع کیا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "وقضى ربك ألا تعبدوا إلا إياه وبالوالدين إحسانا إما يبلغن عندك الكبر أحدهما أو كلاهما فلا تقل لهما أف ولا تنهرهما وقل لهما قولا كريما" (بنی اسرائیل: ۲۳) (اور تمہارے رب نے حکم دیا ہے کہ تم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو اور والدین کے ساتھ حسن سلوک کرو اگر تمہارے سامنے دونوں میں سے ایک دونوں بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو انہیں اف بھی نہ کہو اور انہیں نہ جھڑکو اور ان سے ادب کے ساتھ بات کرو)۔

بڑھاپے میں خدمت کی ضرورت زیادہ ہوتی ہے اور اس عمر میں ہوش وحواس بھی ٹھکانے نہیں رہتے یہ تو بڑی سعادت مندی کی بات ہے کہ اولاد اس وقت بوڑھے والدین کی خدمت گزاری اور فرمانبرداری سے نہ گھبرائے جھڑکنا اور ڈانٹنا تو دور کی بات ہے زبان سے اف بھی نہ کہے، اسلام کی تعلیمات بوڑھوں اور معذوروں کے متعلق یہ ہیں جبکہ اولڈ ہومز وغیرہ کا مقصد اسلامی تعلیمات کے سراسر منافی ہے۔

(۸) سن رسیدہ حضرات جو اپنے قریب وبعید ہر طرح کے اقرباء سے محروم ہیں اور بے بسی اس درجہ کہ گزر بسر مشکل، ایسے لوگوں کو زکوۃ کی رقم دینا درست ہے، اس لئے کہ شریعت مطہرہ کی اصطلاح میں یہ فقیر کے مانند ہو گیا، إنما الصدقات للفقراء الخ۔

(۹) ہر فرد بشر پر شرعی قوانین کے ساتھ ساتھ ملکی اور شرعی اصول وضوابط کی پاسداری واجب ہے، اسی نقطہ کے پیش نظر حکومت کی طرف سے وہ تمام خصوصی رعایتیں اور سہولیات جن کے حصول کے لئے کچھ شرطوں کو لازم قرار دیا گیا اور ان کے لئے عمر کی ایک حد متعین کی ان کی تمام شرطوں کے ساتھ فائدہ اٹھانا بالکل درست بغیر مطلوب متعین حد عمر کے ان رعایتوں سے فائدہ اٹھانا ناجائز اور ملکی وشہری نظام کی خلاف ورزی ہے، وما توفيقي إلا بالله۔

والدین کی خدمت و مالی حقوق کا مسئلہ

مولانا سید انور سلیم [1]

جواب (۱): اگر کوئی شخص بوڑھاپے کی عمر کو پہنچ گیا لیکن اتنا کمزور نہیں ہے کہ کسب معاش نہ کر سکے، کسی قدر مشقت کے ساتھ ہی وہ کما کر اپنی ضرورت پوری کر سکتا ہے، تو ایسے شخص کو اگر اس کی اولاد ہے تو وہ کمانے پر مجبور نہیں کر سکتے، لیکن اگر اولاد کے علاوہ رشتہ دار ہیں تو ان کا حکم الگ ہے، مذکورہ عبارت سے حنفیہ کا یہی مسلک سمجھ میں آتا ہے۔

''ومن كان صحيحًا غير عاجز عن الكسب لا تجب له النفقة على غيره وإن كان معسرًا إلا الأب خاصة والجد عند عدمه. لأن الشرع نهى الولد عن الحاق أدنى الأذى بالوالدين وهو التأفيف ومعنى الأذى في إلزام الأب الكسب مع غنى الولد أكثر قوله تعالى: ''وقضى ربك ألا تعبدوا إلا إياه وبالوالدين إحسانا'' ومن الإحسان الإنفاق عليهما عند حاجتهما ومثل الوالد الوالدة إذ لا فرق بل إنها أولى فقد نص النبي ﷺ على أنها أحق بحسن الصحبة من الأب'' (رد المحتار ۵/ ۳۵۳)۔

جواب (۲): سن رسیدہ حضرات کا نفقہ و علاج ان تمام صورتوں کی وجہ سے واجب ہوگا جنکی وجہ سے وہ کمانے سے عاجز ہو جائیں، چاہے وہ عاجزی کی زیادتی کی وجہ سے ہو یا بیٹھے رہنے کی وجہ سے معذور ہو گیا ہو یا اس کے اعضاء مفلوج ہو گئے ہوں یا شل پڑ گئے ہوں یا اسے کسی کام کا ہنر معلوم نہ ہو یا جو معلوم ہو اس کو اچھے طریقے سے نہ کر پاتا ہو ان تمام صورتوں میں سن رسیدہ حضرات کا نفقہ و علاج دوسروں پر لازم ہوگا۔

''يشترط إعسار من تجب له النفقة وعجزه عن الكسب بأن يكون صغيرًا أو زمنا أو مقعدًا أو مفلوجًا أو مشلولًا أو به غير ذلك من العوارض التي تمنع الإنسان من الاكتساب وهكذا الأنوثة. لأنها عجز وعلى أن من لا يحسن الكسب لخرقة أو لعدم معرفته عمل اليد'' (ردالمحتار ۵/ ۳۵۳)۔

جواب (۳): بوڑھے والدین یا خاندان کے وہ بڑے جن کا نفقہ ان کے چھوٹوں پر محتاجی کی صورت میں واجب ہے، اگر وہ محتاج نہیں ہیں خود صاحب ثروت ہیں تو ان کے واسطے کسی بھی طرح کا اولاد پر جبر نہیں کیا جائے گا کہ ان کو الگ سے زیادہ سہولیات کے لئے یا دوسرے لوگوں پر خرچ کرنے کے لئے یا کچھ رقم محفوظ کرنے کے لئے الگ سے کچھ دے، ہاں اگر اولاد مالدار ہے، اپنے عیال پر خرچ کرنے کے بعد اس کے پاس بچتا ہے تو اسے دیانۃً کہا جائے گا کہ اپنے والدین کی راحت رسانی کے لئے کچھ رقم خرچ کرے، لیکن اس کو اس پر جبر نہیں کیا جائے گا۔

''وفي البزازية: أن رأى القاضي أنه يفضل من قوته شئي أجبره على النفقة من الفاضل على المختار. وإن لم يفضل فلا شيء في الحكم لكن في ظاهر الرواية يؤمر ديانة بالإنفاق إن كان الابن وحده. ولو له عيال أجبر على ضم أبيه معهم كيلا يضيع ولا يجبر على أن يعطيه شيئًا عليحدة'' (درمختار ۵/ ۳۵۲)۔

جواب (۴، الف): زیادہ آمدنی کی غرض سے لڑکوں کا اپنے ماں باپ کو چھوڑ کر دوسری جگہ جانا صحیح نہیں ہے، کیونکہ بوڑھاپے میں والدین اپنے بچوں کے محتاج ہوتے ہیں، نیز جب وطن میں اس کو بقدر گنجائش رزق مل رہی ہے تو پھر جانے کی کوئی خاص ضرورت سمجھ میں نہیں آتی ہے، مزید برآں اللہ کے نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا خوش نصیب ہے وہ شخص جسے وطن میں رزق مل جائے۔

---

[1] مدرسہ جامع العلوم، بھونیشور۔

(ب): اگر بہو ساس سسر کے ساتھ نہ رہنا چاہے تو اسے الگ مکان دیا جائے گا اس پر جبر نہیں کیا جا سکتا ہے کہ وہ وہاں رہے کیونکہ بہو کے ذمہ ساس اور سسر کی خدمت واجب نہیں ہے، ہاں اگر وہ خود سے خدمت کردے تو الگ بات ہے نیز اگر شوہر حکم کرے والدین کی خدمت کے لئے تو پھر شوہر کی اطاعت واجب ہے۔

اور اگر ساس سسر کے ساتھ شوہر نے بیوی کو رکھا ہے لیکن اس کے واسطے الگ کمرہ مستقل ہے تو پھر اس صورت میں عورت کو حق نہیں ہے کہ الگ جگہ رہنے کا مطالبہ کرے۔

''وكذا تجب لها السكنى فى بيت خال عن أهله وأهلها كفاها وفى البدائع لو أراد أن يسكنها مع ضرتها أو مع أحمائها كأمه وأخته وبنته فأبت فعليه أن يسكنها فى منزل منفرد؛ لأن إبائها دليل الأذى والضرر؛ ولأنه محتاج إلى جماعها ومعاشرتها فى أى وقت يتفق لايمكن ذلك مع ثالث حتى لو كان فى الدار بيوت وجعل لبيتها غلقًا عليحدة قالوا ليس لها أن تطالبه بآخر فهذا صريح فى أن المعتبر عدم وجدان أحد البيت لا فى الدار'' (درمع الرد ۵/ ۳۱۹، فتاوى دار العلوم ديوبند ۱۶/ ۲۷)۔

(ج): ماں باپ کی خدمت جس طرح بیٹوں پر واجب ہے اسی طرح بیٹیوں پر بھی واجب ہے، لیکن چونکہ شادی ہونے کے بعد لڑکی دوسرے کے اختیار میں ہوتی ہے، اس لئے وہ آزاد نہیں رہتی ہے، لیکن پھر بھی شوہر کو حکم ہے کہ بیوی کو اس کے والدین کا ملاقات وزیارت وخدمت کے لئے اجازت دے، نیز بعض علماء فرماتے ہیں کہ شوہر اپنی بیوی کو اس کے والدین کی خدمت کے لئے جبکہ وہ محتاج ہوں نہ روکے ورنہ اگر قریب ہے تو ہر ہفتہ اپنی بیوی کو اس کے والدین کے پاس جانے کی اجازت دے۔

''ولا يمنعها من الخروج إلى الوالدين فى كل جمعة إن لم يقدرا على إتيانها على مااختاره فى الاختيار ولا يمنعها من الدخول عليها فى كل جمعة والحق الأخذ بقول يوسف إذا كان أبوان بالصفة التى ذكرت وإلا ينبغى أن يأذن لها فى زيارتهما فى الحين بعد الحين على قدر متعارف أما فى كل جمعة فهو بعيد فإن فى كثرة الخروج فتح باب الفتنة خصوصًا إذا كانت شابة والزوج من ذوى الهيأة بخلاف خروج الأبوين فإنه أيسر وهذا ترجيح منه لخلاف ماذكر فى البحر أنه الصحيح المفتى به من أنها تخرج للوالدين فى كل جمعة بإذنه وبدونه'' (درمع الرد ۵/ ۳۲۳)۔

جواب (۵): ہندوستان میں مسلمانوں کے اندر جہاں غیر مسلموں کی بہت ساری رسمیں داخل ہوگئی ہیں انہیں رسموں میں سے ایک رسم نکاح ثانی کا ہے کہ اس کو معیوب سمجھا جاتا ہے، جبکہ اگر کسی آدمی کی بیوی کا انتقال ہوجائے اور وہ دوسری شادی کرنا چاہے تو شریعت میں مکمل اجازت ہے کسی کو روکنے کا حق حاصل نہیں ہے، کیونکہ ہر آدمی بوڑھاپے میں محتاج ہوتا ہے وہ چاہتا ہے کہ اسکے عمر کے تقاضے کے مطابق اس کے سرد وگرم کو کوئی سمجھنے والا ہو اس لئے وہ اپنی زندگی کے آخری ایام کو سکون واطمینان سے گزارنے کے لئے رشتہ ازدواج میں جڑ جاتا ہے، لہذا اس سلسلہ میں اولادوں میں سے کسی کو حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اپنے باپ کو نکاح ثانی سے روکیں اور انکا رکاوٹ بننا درست نہیں ہے نیز شوہر کے اندر اگر اپنی بیوی کی کفالت کی استطاعت نہ ہو تب بھی اس کے لئے نکاح کرنا درست ہے، کیونکہ باپ کے نکاح کرنے کے بعد وہ عورت شوہر کے اولادوں کے لئے ماں کا درجہ رکھتی ہے جس طرح والد کی خدمت شادی سے پہلے لازم اور ضروری تھی اسی طرح شادی کے بعد ضروری ہے اور اسی طریقے سے باپ کی بیوی کی خدمت بھی لازم ہے نیز جس طریقے سے باپ کی عدم حیثیت کے وقت نان ونفقہ کی ذمہ داری بچوں پر لازم ہوتی، اسی طرح باپ کی بیوی کے نفقہ کی ذمہ داری بھی بچوں پر عائد ہوتی ہے، نیز حضرت تھانوی نے اصلاح الرسوم میں لکھا ہے کہ نکاح ثانی کو عیب سمجھنے میں خوف کفر ہے کہ حکم شرعی کو باعث توہین وتحقیر سمجھتا ہے، نیز بعض حالات میں نکاح ثانی بھی مثل نکاح اول کے فرض ہے مثلاً عورت جوان ہے قرائن سے طبیعت میں تقاضا معلوم ہوتا ہے تجرد میں اندیشۂ فساد ہے یا نان ونفقہ کی تنگی ہے اور افلاس میں آبرو اور دین کے ضائع ہونے کا احتمال ہے تو بے شک ایسے لوگوں کا نکاح ثانی کرنا فرض ہوگا اور ایسا نہ ہو تب بھی لوگوں کے اسے عار اور معیوب سمجھنے کی وجہ سے اس پر عمل کرنا ضروری ہے (اصلاح الرسوم/ ۱۰۴، فتاوی دار العلوم دیوبند ۱۶/ ۵۲۸)

حصکفی لکھتے ہیں: ''وعليه نفقة زوجة أبيه قوله: وعليه نفقة زوجة أبيه أى فى رواية وفى أخرى إن كان الأب مريضًا أو به زمانة يحتاج للخدمة'' (درمختار مع الرد ۵/ ۳۴۴)۔

جواب (۶): اولادوں کا والد کی زندگی میں ہی جائیداد کا مطالبہ کرنا صحیح نہیں ہے، یہ ان کا حق نہیں ہے، کیونکہ جب تک والدین زندہ ہیں اور انکی معاشی حالت بہتر

ہے اور اولاد محتاج ہیں تو اس صورت میں اولاد کا نفقہ والدین کے ذمہ ہے تو پھر اولاد کو ان کے مال وجائیداد سے مطالبہ کرنے کا حق کیسے حاصل ہو سکتا ہے،

''وتجب النفقة بأنواعها على الحر لطفله الفقير الحر. وكذا تجب لولده الكبير العاجز عن الكسب كأنثى مطلقًا وزمن قوله وزمن أى من به مرض مزمن والمراد هنا من به مايمنعه عن الكسب كعمى وشلل ولو قدر على اكتساب ما لا يكفيه فعلى أبيه'' (تكميل الكفايه، در مع الرد ۵/ ۳۴۱)۔

جواب (۷): اس سوال کا ایک پہلو یہ ہے کہ ہاسٹل میں عمر دراز حضرات کو اپنی ضروریات کی چیزیں مہیا ہوجاتی ہیں، دوسرا پہلو ہے کہ اپنے ہم عمر لوگ مل جاتے ہیں، پہلے پہلو کے اندر جو بات ہے اگر انسان چاہے تو اپنے گھروں میں بھی اس کا انتظام کرسکتا ہے کہ اولاد اپنے والدین کی خدمت کے لئے مستقل کسی کو ملازم رکھ لیں وہ مکمل خدمت کرے اور تمام ضروریات کی اشیاء مہیا کرائے اور خادم کا خرچ اولاد کے ذمہ لازم ہے اگر اولاد حیثیت مند ہے۔ ظاہر ہے کہ اولاد جب اپنے بزرگ کو ہاسٹل میں داخل کرے گا تو اس میں بھی تو اخراجات ہیں وہ انہیں اخراجات کو اپنے گھر میں خرچ کرے تو بات برابر ہے، ردالمحتار کی عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ خادم کا خرچ اولاد کے ذمہ ہے۔

دوسرا پہلو یہ کہ ہم عمر لوگ مل جاتے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ انسان کو بوڑھاپے میں ہم عمر لوگوں سے زیادہ اپنی اولاد اور اولادوں کی اولاد زیادہ محبت ہوتی ہے، یہ تو مجبوری کے درجہ میں ہم عمر لوگوں سے دل بہلاتا ہے کہ رشتہ داروں میں سے کوئی نہیں ہے تو چلو یہی غنیمت ہے، سوال کے پہلے پہلو کے اندر نقصان یہ ہے کہ اولاد اپنے والدین کی خدمت سے محروم ہوجاتے ہیں، کیونکہ عام طور پر ہاسٹلوں میں داخل کرنے کے بعد اولاد لاپرواہ ہوجاتے ہیں مہینوں میں کبھی ایک دفعہ موقع ملتا ہے تو چلے جاتے ہیں، لیکن اگر والدین گھر پر ہو تو جب بھی فرصت ملے آدمی ان کی خدمت کرسکتا ہے، مکمل طور پر محرومی نہیں ہوگی، نیز سوال میں جو لکھا گیا ہے کہ رشتہ داروں کی محبت سے محروم ہوجاتے ہیں بالکل صحیح ہے کیونکہ آدمی کسی کے مکان کو جاتا ہے تو اس میں کئی قسم کے لوگ ہوتے ہیں کوئی باپ کا رشتہ دار ہوتا ہے، کوئی بہو کا رشتہ دار، کوئی لڑکی کا سسرال والا غرضیکہ مختلف قسم کے لوگ آتے ہیں، اس سے گھر کے عمر دراز لوگوں کا دل زیادہ بہلتا ہے، بخلاف ہاسٹلوں کے کیوں کہ وہاں مخصوص لوگ ہی موقع نکال کر جاتے ہیں، چونکہ غرض صرف انہیں کی ملاقات ہوتی ہے، اس لئے آمد ورفت کم رہتا ہے جس سے عمر دراز حضرات رشتہ داروں سے الگ ہوجاتے ہیں اور ایک قسم کی تنہائی محسوس ہوتی ہے اپنے اپنے ہوتے ہیں اور غیر غیر۔ چاہے ہاسٹلوں میں کتنی ہی سہولت اور انس پیدا کرنے والی چیزیں مہیا ہوجائیں گھر کی راحت وہاں نہیں مل سکتی، یہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی ہسپتال میں داخل ہو اور اس کے واسطے وہاں آرام وراحت کی تمام چیزیں مہیا ہوجائیں لیکن اس کے باوجود آدمی کا دل وہاں نہیں لگتا ہے ہمیشہ وہاں سے نکلنے کی فکر میں لگا رہتا ہے، بالکل یہی حال ہاسٹلوں کا بھی ہے، لہذا شرعی نقطہ نظر سے عمر دراز حضرات کو ایسے ہاسٹلوں میں قیام کے لئے ان کی اولاد مجبور نہیں کرسکتی ہے، رہا ان کی راحت وآرام کا مسئلہ تو ان کے لئے خادم کا نظم کیا جائے البتہ عمر دراز حضرات اپنی خوشی سے اگر وہاں رہنا چاہیں تو وہاں رہ سکتے ہیں، ایسی صورت میں یہی سمجھا جائے گا کہ وہ اولاد کو گویا خدمت سے سبکدوش کرنا چاہتے ہیں لیکن اولادوں کا فریضہ ہے کہ اس حالت میں بھی اپنے والدین کا ہاسٹل میں جاکر خبر گیری لیتے رہیں،

''وفى حاشية الرملى والذى تحرر من المذهب أنه لا فرق بين الأب والابن فى نفقة الخادم أنه إذا احتاج أحدهما لخادم وجبت نفقته، كما وجبت نفقة المخدوم فكان من جملة نفقة، وإذا لم يحتج إليه، فلا تجب فاعلم بذلك واغتنمه، فإنه كثير الوقوع'' (رد المحتار ۵/ ۳۴۴)۔

جواب (۸): اگر انسان بوڑھاپے کی حالت میں اس کی اولاد یا قریبی رشتہ دار کوئی نہیں ہے یا ہیں، لیکن خیر خبر نہیں لیتے ہیں اور یہ شخص خود محتاج ہو کوئی ذریعہ آمدنی نہ اس کی ہو نہ اسکی بیوی کی ہو نہ صاحب نصاب ہو تو اس صورت میں اس پر زکوۃ کی رقم خرچ کی جاسکتی ہے، لیکن اجتماعی کفالت کے کیا معنی یہ سمجھ میں نہیں آیا۔

جواب (۹): حکومت نے عمر دراز لوگوں کے لئے جو خصوصی رعایتیں رکھی ہیں ان رعایتوں کے مستحق وہ تبھی ہوں گے جبکہ وہ مطلوبہ مقررہ حد عمر کو پہنچ جائیں ورنہ مقررہ حد عمر کو پہنچنے سے قبل ان کے لئے حکومت کی رعایتوں سے فائدہ اٹھانا درست نہیں ہوگا۔

دوسری صورت یہ ہے کہ حکومت کے قانون دانوں سے معلوم کرلیا جائے کہ یہ سہولت عمر کے بڑھنے کے اعتبار سے ضعف کی وجہ سے ہے یا صرف عمر کی زیادتی مطلوب ہے، اگر حکومت کا معیار باعتبار زیادتی ضعف ہے تو ایسے ضعیف حضرات کے لئے جو مقررہ حد عمر کو نہ پہنچے ہوں نفع اٹھانا درست ہوگا، ورنہ نہیں۔

معذوروں اور بوڑھوں کے حقوق

مولانا حفیظ الرحمن مدنی خیر آبادی[1]

مجمع الفقہ الاسلامی ہند کی جانب سے ۵-۷ ر فروری ۲۰۱۶ء آسام میں پچیسویں فقہی سمینار کے لئے چار موضوعات پر سوالنامے موصول ہوئے، جن میں ایک سوالنامہ ''معذوروں اور بوڑھوں کے حقوق'' پر مشتمل ہے، اسی کے جوابات پر یہ تحریر مرتب ہے۔

اس سوالنامہ میں کل نو سوالات ہیں، سوال ۴ تین اجزاء الف، ب، ج پر مشتمل ہے۔

سوال نمبر ۱: اگر کوئی شخص بوڑھاپے کی عمر کو پہنچ گیا، لیکن اتنا کمزور نہیں ہے کہ کسب معاش نہ کر سکے کسی قدر مشقت کے ساتھ سہی وہ کما کر خود اپنی ضرورت پوری کر سکتا ہو تو ایسے شخص کو اس کی اولاد یا اعزہ واقارب جن کے ذمہ اس کا نفقہ واجب ہو کسب معاش پر مجبور کر سکتے ہیں؟

الجواب بتوفيق الله ملهم الصواب:

بڑھاپے کی عمر کو پہنچ جانے کے بعد اگر مشقت کے ساتھ اپنا خرچ پورا کر سکتا ہے، بسہولت نہیں کر سکتا، تب بھی اس کی اولاد یا اعزہ واقارب جن پر اس کا نفقہ واجب ہے ان پر نفقہ دینا ضروری ہے، کمانے پر مجبور کرنا جائز نہیں ہے، بلکہ اگر لڑکے کو قدرت ہو تو اس کے اوپر والدین کا نفقہ دینا واجب ہے، بلکہ فقہاء لکھتے ہیں کہ اگر نہ دے سکتا ہو تو اپنے نفقہ میں شامل رکھے، البتہ دیگر اعزہ واقارب پر اس وقت واجب ہے جب کہ محارم میں سے ہوں اور قادر ہوں اور عمر رسیدہ شخص محتاج ہو اللہ کے قول "وعلى الوارث مثل ذلك" کی وجہ سے۔

دلائل درج ذیل ہیں:

۱- ''وعلى الرجل أن ينفق على أبويه وأجداده وجداته إذا كانوا فقراء وإن خالفوه في دينه. أما الأبوان فلقوله تعالى: ''وصاحبهما في الدنيا معروفًا''، نزلت الأية في الأبوين الكافرين وليس من المعروف أن يعيش في نعم الله ويتركهما يموتان جوعًا الخ'' (ہدایہ ۲/ ۴۳۶ باب النفقہ)۔

۲- ''وقوله: إذا كانوا فقراء يوافق بإطلاقه قول السرخسي حيث قال: إذا كان الأب قادرًا على الكسب يجبر الابن على نفقته، فالمعتبر في إيجاب نفقة الوالدين مجرد الفقر الخ'' (فتح القدیر شرح الہدایہ ۴/ ۲۲۱ مکتبہ نوریہ بسکھر پاکستان)

۳- ''قال عليه السلام: إن أطيب ما يأكل الرجل من كسبه، وإن ولده لمن كسبه كلوا من كسب أولادكم إذا احتجم إليه بالمعروف'' (النسائی کتاب البیوع ۲/ ۲۱۰، حدیث: ۴۴۵۰، واحمد فی مسندہ ۷/ ۶۳، حدیث: ۲۲۶۱۵)۔

''ولأن للأب في مال الابن حق الملك، قال ﷺ: أنت ومالك لأبيك'' (ابن ماجہ فی التجارات، ص: ۱۵۵، حدیث: ۲۲۹۱، احمد فی مسندہ ۲/ ۴۱۵، حدیث: ۶۸۶۳، المحیط البرہانی ۴/ ۱۵۹، دار احیاء التراث العربی بیروت لبنان)

۴- ''ونفقة الأبوين على الابن الموسر والبنت الموسرة بالسوية في ظاهر الرواية وهو الأصح ولا يشترط العجز فيهما بخلاف نفقة ذي رحم محرم منه، فإن العجز فيه شرط في الذكور دون الإناث، وتجب نفقة ذي الأرحام المعسرين على الموسرين وعن محمد مقدر بما يفضل عن نفقة نفسه وعياله شهرًا'' (فتاوی النوازل

[1] مدرسہ منبع العلوم خیر آباد، ضلع مئو، یوپی۔

للسمرقندی متوفی ۳۷۵، ص: ۲۲۷ دار الایمان سہارنپور)۔

سوال نمبر ۲: سن رسیدہ حضرات کا نفقہ وعلاج کن صورتوں میں دوسروں پر واجب ہوگا؟

الجواب وباللہ التوفیق: سن رسیدہ حضرات کا نفقہ وعلاج تین شرطوں کے ساتھ دوسروں پر واجب ہے:

(۱) اصل فقیر ہو یا کمانے سے عاجز ہو اور احناف وشوافع کے نزدیک کمانے پر قادر ہو تب بھی واجب ہے، اس لئے کہ اللہ تعالی نے ان کے ساتھ احسان کا حکم فرمایا ہے، اور بیٹوں کے غنی ہونے کے باوجود آباء کو کمانے پر مجبور کرنا بدسلوکی ہے۔

(۲) فرع مالدار ہو یا کمائی پر قادر ہو، جمہور کے نزدیک اس کی کمائی اگر اس کے نفقہ سے فاضل ہو، "ابدأ بنفسک ثم بمن تعول" الحدیث کی دلیل سے۔

(۳) فرع حنابلہ کے نزدیک وارث ہو "وعلی الوارث مثل ذلک" (سورہ بقرہ: ۲۳۳) اور احناف کے نزدیک اہل قرابت میں سے ہو اور مستحق وراثت ہو، "وصاحبهما فی الدنیا معروفًا" (سورہ لقمان: ۱۵) اور قدرت کے باوجود انفاق کو چھوڑنا معروف میں سے نہیں ہے (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۱۰/ ۳۱-۷۴۲۲ دار الفکر دمشق بحوالہ البدائع ۴/ ۳۴ بحوالہ فتح القدیر ۳/ ۳۴۷)۔

"وتجب نفقة الأقارب من الحواشي وذي الأرحام لقوله تعالى: وآت ذا القربى حقه (الاسراء) وبالوالدين إحسانا (النساء) وقول النبي ﷺ: يد المعطي العليا، ابدأ بمن تعول أمك وأباك وأختك وأخاك ثم أدناك أدناك" (الفقہ الاسلامی ۱۰/ ۲۵-۷۴۲۶)۔

مذکورہ نصوص فقہیہ سے واضح ہوتا ہے کہ سن رسیدہ حضرات کو محتاجی کے وقت اگر بیٹا خرچ نہ دے سکتا ہو تو درجہ بدرجہ اہل قرابت واہل وراثت پر واجب ہے، "وعلی الوارث مثل ذلک" (سورہ بقرہ: ۲۳۳) (بدائع الصنائع ۳/ ۴۴۳ مکتبہ زکریا دیوبند)۔

سوال نمبر ۳: بوڑھے والدین یا خاندان کے وہ بڑے جن کا نفقہ ان کے چھوٹوں پر محتاجی کی صورت میں واجب ہے، اگر وہ محتاج نہ ہوں، خود صاحب ثروت ہوں تب بھی وہ اپنی اولاد سے یا ان لوگوں سے جن پر بحالت حاجت نفقہ واجب ہوتا ہے، زیادہ سہولت کے لئے یا دوسرے لوگوں پر خرچ کرنے کے لئے یا کچھ رقم محفوظ کرنے کے لئے زائد رقم کا مطالبہ کر سکتے ہیں؟

الجواب بتوفیق اللہ وھو ملھم الصواب:... نفقہ چھوٹوں پر بصورت محتاجی واجب ہوتا ہے اور اولاد پر ولادت وجزئیت کی وجہ سے بقدر کفایت واجب ہوتا ہے، ارشاد باری تعالی ہے: "وصاحبهما فی الدنیا معروفًا" (سورہ لقمان: ۱۵) اور وہ کھانا، پینا، لباس اور رہائش مروجہ طریقے کے مطابق ہے، کیوں کہ معروف اسی کو کہتے ہیں، اور مذکورہ مقاصد قدر کفایت اور قید معروفًا سے زائد ہے، لہذا اس کا مطالبہ نہیں کر سکتے۔

بدائع میں ہے: "نفقة الأقارب مقدر بالكفاية بلا خلاف لأنها تجب للحاجة فتقدر بقدر الحاجة. وكل من وجبت عليه نفقة غيره يجب عليه له المأكل والمشرب والملبس والسكنى والرضاع إن كان رضيعًا. لأن وجوبها للكفاية والكفاية تتعلق بهذه الأشياء، فإن كان للمنفق عليه خادم يحتاج إلى خدمته تفرض له أيضا؛ لأن ذلك من جملة الكفاية" (بدائع الصنائع ۳/ ۴۵۱)۔

سوال نمبر ۴: اگر بیٹا زیادہ کمانے کے لئے بوڑھے والدین کو چھوڑ کر دوسری جگہ چلا جائے تو ان کی دشواریاں بڑھ جاتی ہیں، اس میں تین اجزاء ہیں:

الف: کیا زیادہ آمدنی کے لئے لڑکوں کا اپنے ماں باپ کو چھوڑ کر دوسری جگہ جانا جائز ہے؟

الجواب بتوفیق اللہ عز وجل: زیادہ آمدنی کے لئے لڑکے کو ماں باپ کو چھوڑ کر دوسری جگہ جانا بلا اجازت والدین جائز نہیں ہے، اگر ہلاکت کا خطرہ ہو اور دوسرا نفقہ کا ذریعہ نہ ہو۔

"فتاوی عالمگیری" میں ہے: "وقال محمد في السير الكبير: إذا أراد الرجل أن يسافر إلى غير الجهاد لتجارة أو حج أو عمرة وكره ذلك أبواه، فإن كان يخاف الضيعة عليهما بأن كانا معسرين ونفقتهما عليه وماله لا يفي بالزاد

والراحلة ونفقتهما، فإنه لا يخرج بغير إذنهما'' (عالمگیری ۵/ ۳۶۵ رشیدیہ کوئٹہ پاکستان)۔

(۲) حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب پاکستانیؒ نے ردالمحتار (۵ /۴٦١) کے حوالہ سے لکھا ہے کہ اگر سفر کی وجہ سے والدین یا بیوی بچوں کے ضیاع کا خوف ہو یعنی وہ خود غنی نہ ہوں یا ان کی حفاظت کرنے والا کوئی نہ ہو تو اس صورت میں سفر نہ کرے (احسن الفتاوی ۸ / ۱۷۸، دارالاشاعت دہلی)، اور دوسری جگہ لکھا ہے درج ذیل صورتوں میں والدین کی اجازت کے بغیر سفر کرنا یا دور رہنا جائز نہیں: (۱) والدین جسمانی خدمت کے محتاج ہوں اور کوئی خدمت کرنے والا نہیں ہے، (۲) سفر ایسا پرخطر ہے کہ ہلاکت کا ظن غالب ہے، (۳) لڑکا امرد ہے اس کے فتنہ میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہے (احسن الفتاوی ۸ /۱۸۱ بحوالہ ردالمحتار ۵ /۲٦١)۔

ب: اگر بہو ساس سسر کے ساتھ رہنا نہ چاہتی ہو یا اس کی ساس کو خدمت کی ضرورت ہو، لیکن کوئی خدمت گار موجود نہ ہو اور بیٹیوں کو ان کے شوہروں کی طرف سے میکے میں رہنے کی اجازت نہ ہو تو اس صورت میں بہو کی کیا ذمہ داری ہے؟ اور کیا اس کو اس کے ساس سسر کے ساتھ رہنے پر مجبور کیا جاسکتا ہے؟

الجواب بتوفیق اللہ عز وجل: اگر بہو ساس سسر کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی ہو تو اس کو ان کے ساتھ رہنے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا ہے، اس لئے کہ نفقہ کے ساتھ سکنی بھی اس کا حق ہے، اس لئے کہ باری تعالی نے نفقہ کے ساتھ سکنی کو بھی شامل کر کے ذکر فرمایا:

(۱) "وأسكنوهن من حيث سكنتم من وجدكم" (سورہ طلاق: ٦)۔

(۲) ہدایہ میں ہے: ''(وعلى الزوج أن يسكنها في دار مفردة ليس فيها أحد من أهله إلا أن تختار ذلك)؛ لأن السكنى من كفايتها، فتجب لها كالنفقة وقد أوجبه الله مقرونًا بالنفقة، وإذا وجب حقا لها ليس له أن يشرك غيرها فيه لأنها تتضرر به، فإنها لا تأمن على متاعها ويمنعها ذلك من المعاشرة مع زوجها ومن الاستمتاع إلا أن تختار؛ لأنها رضيت بانتقاص حقها'' (ہدایہ ۲/ ۴۴۱)۔

(۳) ''(وإذا سلمت نفسها إلى منزله فعليه نفقتها وكسوتها وسكناها) والأصل في ذلك قوله تعالى: لينفق ذو سعة من سعته، وعلى المولود له رزقهن وكسوتهن بالمعروف'' (وتعتبر في ذلك حالهما جميعًا) قال العبد الضعيف: وهذا اختيار الخصاف، وعليه الفتوى'' (ھدایہ ۲/ ۴۳۷، فتاوی ہندیہ ۱/ ۵۵٦ کوئٹہ پاکستان)۔

(۴) ''والسكنى بالملك أو الإجارة أو العارية واجبة إجماعا'' (فتح القدیر ۴/ ۲۰۷)۔

(۵) ''وروى أن رجلًا جاء إلى رسول الله ﷺ فقال: ما حق المرأة على الزوج، فقال: يطعمها إذا طعم ويكسوها إذا كسى، وأن لا يهجرها إلا في البيت ولا يضر بها ولا يقبح'' (اخرجه احمد في مسنده، ابوداود في السنن كتاب النكاح باب في حق المرأة على زوجها، وأخرجه ابن ماجه في السنن (بدائع الصنائع ۳/ ۴۱۸)۔

(٦) ''(وكذا تجب لها السكنى في بيت خال عن أهله) سوى طفله الذي لا يفهم الجماع وأمته وأم ولده (وأهلها) ولو ولدها من غيره بقدر حالهما كطعام وكسوة وبيت منفرد من دار له غلق'' (در مختار ۵/ ۳۲۰) (البحر الرائق ۴/ ۳۲۸)

خلاصہ یہ کہ مصالح نکاح حفاظت سامان اور شوہر کے ساتھ خوشگوار معاشرت کے لئے اور نقصان سے بچنے کے لئے اگر رہائش کا مطالبہ کر رہی ہے تو اس کو ساس سسر کے ساتھ رہنے پر یا مشترکہ رہائش پر مجبور نہیں کیا جاسکتا، اس لئے کہ وہ حق شرعی ہے یہاں تک کہ سکنی سے براءت پر خلع کرنا چاہتی ہے تو سکنی ساقط نہیں ہوگا۔

(۷) اسی طرح اگر بہو کی ساس کو خدمت کی ضرورت ہو اور کوئی خدمت گار نہ ہو تو بہو پر خدمت کی ذمہ داری نہیں ہے بلکہ لڑکا خود خدمت کرے یا کوئی خدمت گار رکھ لے، لیکن اخلاقی طور پر بہو کو چاہئے کہ ساس کی خدمت کرے، کیوں کہ وہ اس کے شوہر کی ماں ہے تو اس کی ماں کی طرح ہے، آخر جب بہو کو ضرورت پڑتی ہے تو ساس ہی اس کی خدمت کرتی ہے، اسی طرح مل جل کر رہنے میں زندگی خوشگوار ہوتی ہے، اگر ہر ایک

ضابطہ ہی پر عمل کرنے لگے اخلاق کو پیش نہ کرے تو ماحول ومعاشرت کے اندر اجنبیت پیدا ہو جاتی ہے، اللہ تعالی نے سورہ نحل میں عدل کے ساتھ احسان کا بھی حکم فرمایا ہے:

"إن الله يأمر بالعدل والإحسان" (سورہ نحل: ۹۰)۔

(۸) "وحقه عليها أن تطيعه في كل مباح يأمرها به وله منعها من الغزل، ومن كل ما يتأذى من رائحته" (درمختار ۴/ ۲۸۸ زکریا بکڈپو دیوبند)۔

(۱۰) حضرت تھانویؒ تحریر فرماتے ہیں: بعض آدمی اس کو بڑی سعادت سمجھتے ہیں کہ بیوی کو اپنی ماں کا محکوم ومغلوب بنا کر رکھیں، اور اس کی بدولت بیبیوں پر بڑے بڑے ظلم ہوتے ہیں سو سمجھ لینا چاہئے کہ بیوی پر فرض نہیں ہے کہ ساس کی خدمت کیا کرے، تم سعادت مند ہو تو خود خدمت کرو، خدمت کے لئے نوکر لاؤ (اصلاح انقلاب ۲/ ۱۸۸)۔

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب فرماتے ہیں:

اگر والدین کو خدمت کی ضرورت ہو تو لڑکے کے ذمہ واجب ہوگا کہ وہ خود خدمت کرے، البتہ اس لڑکے کی بیوی کی سعادت مندی ہے کہ وہ اپنے شوہر کے والدین کی خدمت بھی خوش دلی سے اپنی سعادت سمجھ کر انجام دے، لیکن لڑکی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اپنی بیوی کو اپنے والدین کی خدمت پر مجبور کرے جب کہ وہ خوش دلی سے ان کی خدمت پر راضی نہ ہو اور نہ ہی والدین بہو کو خدمت پر مجبور کریں (اصلاحی خطبات ۲/ ۵۰)۔

ج: ماں باپ کی خدمت صرف بیٹوں پر واجب ہے یا بیٹیوں پر بھی بعض اوقات بیٹیاں اپنے والدین کی مجبوری اور بے بسی کو دیکھتے ہوئے اپنے والدین کی خدمت کرنا چاہتی ہیں، لیکن ان کے شوہران کو اس کی اجازت نہیں دیتے کیا ان کے شوہروں کو اس کا حق حاصل ہے؟

الجواب بتوفیق ملہم الصواب: والدین کی خدمت بیٹوں اور بیٹیوں دونوں پر واجب ہے، قرآن پاک میں سورہ لقمان، عنکبوت، احقاف اور اسراء میں، برالوالدین اور احسان کا بغیر بیٹوں اور بیٹیوں کی قید کے مطلق نازل کیا گیا:

(۱) اسی طرح سورہ نساء میں ہے: "واعبدوا الله ولا تشركوا به شيئاً وبالوالدين إحساناً" (سورہ نساء: ۳۶)

حدیث میں ہے: "لو كنت آمرت أحدًا أن يسجد لأحد لأمرت المرأة أن تسجد لزوجها" (ترمذی کتاب الرضاع، باب ماجاء في حق الزوج على المرأة)۔

(۲) "(النفقة لأصوله) ولو أب أمة ذخيرة (الفقراء) ولو قادرين على الكسب (بالسوية) بين الابن والبنت وقيل كالارث" (درمختار ۵/ ۳۵۵ زکریا بکڈپو دیوبند)۔

(۳) "ويرد على هذا ما لو كان له ابن وبنت بأنهما استويا في القرب والجزئية مع عدم المرجح والنفقة عليهما بالسوية" (رد المحتار على الدر ۵/ ۳۵۹)۔

(۴) البحر الرائق (۴/ ۳۴۸ سے ۳۵۱) تک سے بھی یہ واضح ہوتا ہے کہ والدین کی خدمت بیٹوں اور بیٹیوں دونوں پر واجب ہے۔

(۵) لیکن اسی کے ساتھ شوہروں کو بیویوں کا ذمہ دار بھی بنایا گیا جس کی بنا پر شوہر کو حق حبس اور اس پر نفقہ وسکنی لازم ہے، اور بیوی حبس کی خلاف ورزی کی صورت میں ناشزہ نافرمان قرار پاتی ہے، حتی کہ بعض اوقات نفقہ سے بھی محروم ہو جاتی ہے، باری تعالی کا ارشاد ہے:

"الرجال قوامون على النساء بما فضل الله بعضهم على بعض وبما أنفقوا من أموالهم" (سورہ نساء: ۳۴)۔

لہذا اگر شوہر اپنی بیوی کو اس کے والدین کی خدمت کی اجازت نہ دے تو شوہر کو اس کا حق حاصل ہے۔

(۶) "والذي ينبغي تحريره أن يكون له منعها عن كل عمل يؤدي إلى تنقيص حقه أو ضرره أو خروجها من بيته" (رد المحتار ۵/ ۳۲۵ زکریا بکڈپو)۔

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب فرماتے ہیں:

فقہاء نے یہ قانون بھی لکھا ہے کہ اگر شوہر عورت سے یہ کہہ دے کہ تم گھر سے باہر نہیں جاسکتی اور اپنے اعزہ و اقارب سے ملنے نہیں جاسکتیں حتی کہ اس کے والدین سے بھی ملنے کے لئے جانے سے منع کردے تو عورت کے لئے ان سے ملاقات کے لئے گھر سے باہر جانا جائز نہیں، البتہ اگر ہفتہ میں ایک بار ملنے آئیں اور ملاقات کرکے چلی جائیں تو شوہر نہیں روک سکتا یہ اس عورت کا حق ہے (اصلاحی خطبات ۲ / ۵۲ اشاعت اول نعیمیہ دیوبند)۔

سوال نمبر ۵: انسان کو جس طرح جوانی میں بیوی کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح بڑھاپے میں بھی، تاکہ اس عمر کے سرد گرم کو سہنا آسان ہوجائے، ہندوستان کے معاشرے میں عموماً اولاد اپنی والدہ کے فوت ہونے پر والد کے دوسرے نکاح میں رکاوٹ بنتے ہیں کیا یہ درست ہے؟ اور اگر والد میں اپنی بیوی کی کفالت کی استطاعت نہ ہو تو اولاد پر بھی کچھ ذمہ داری عائد ہوتی ہے؟

الجواب بتوفيق ملهم الصواب:

اولاد کو اپنی والدہ کے انتقال کے بعد والد کے دوسرے نکاح میں رکاوٹ بننا درست نہیں ہے، بلکہ اگر والد نکاح کرنا چاہیں تو دوسرا نکاح کرانا ان کی ذمہ داری ہے، اور اگر والد میں بیوی کی کفالت کی استطاعت نہ ہو تو اولاد پر سوتیلی ماں کے نفقہ کی ذمہ داری بھی عائد ہوتی ہے، اس لئے کہ والد کے لئے بہت سی ایسی ضروریات اور خدمتیں ہیں جن کو بیوی کے علاوہ دوسرا پورا نہیں کرسکتا، اور سوتیلی ماں کا نفقہ بھی والد کی خدمت ہی کا انتظام ہے، اور والد کے نفقہ ہی میں شامل ہے۔

(۱) ''وعلى الوالد في رأي الجمهور نفقة زوجة الأب وإعفافه بالتزويج بزوجة واحدة. وكذا عند المالكية والحنابلة بأكثر من زوجة إن لم يحصل الإعفاف بواحدة؛ لأنه معنى يحتاج إليه ويلحقه الضرر بفقده فوجب كالنفقة''۔
اور احناف کی ایک رائے یہ بھی ہے کہ نفقہ واجب نہیں ہے، اور بیوی کو ذریعہ لذت مانتے ہیں حالانکہ اس سے زیادہ والد کو خدمت کی ضرورت ہے (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۱۰ / ۷۴۲۵)۔

(۲) اور وصاحبهما في الدنيا معروفا کے خلاف بھی ہے کہ والد کی بیوی کا نفقہ نہ دیا جائے لہٰذا رعایت ضروری ہے (ردالمحتار ۲ / ۶۷۳، فتح القدیر ۴ / ۴۱۸، ۴۱۹)۔

سوال نمبر ۶: بعض اوقات اولاد والد کی زندگی میں ہی جائیداد کا مطالبہ شروع کردیتے اور اس کو اپنا حق سمجھتے ہیں، کیا اولاد کے لئے اس مطالبہ کی گنجائش ہے، خاص کر ایسی صورت میں جبکہ والدین کی معاشی حالت بہتر ہو اور اولاد محتاج ہوں؟

الجواب بتوفيق ملهم الصواب: اولاد کو والد کی زندگی میں جائیداد کا مطالبہ کرنے کا حق نہیں ہے، اس لئے کہ والد کی زندگی میں اس کی تمام جائیداد اس کی ملک ہے، اور اس کو اس میں تصرف کا اختیار ہے، البتہ اگر والدین کی معاشی حالت بہتر ہو اور اولاد محتاج ہوں تو ان کی تبرع کی ضرورت ہے، لہٰذا تبرع احسان اور ہبہ کے طور پر مطالبہ کرسکتے ہیں، حق کے طور پر نہیں اور اس پر والد کو اختیار ہے اس لئے کہ وہ والد کی طرف سے ہبہ ہوگا، اور واہب کو موہوب میں ہبہ کرنے اور نہ کرنے کا اختیار ہے، اگر والد اپنی زندگی میں تمام اولاد کو ہبہ کردے تو یہ جائز ہے لیکن عدل کرنا بہتر ہے، اگر کسی کو نقصان پہنچانے کی نیت نہ ہو تو کسی کی نیکی، خدمت اور محتاجی کی وجہ سے کمی بیش کرنا بھی درست ہے، لیکن کسی کو زیادہ ہبہ کرنا اور کسی کو محروم کردینا جائز نہیں ہے، کیونکہ اس صورت میں اللہ کے فرض کئے ہوئے حق یعنی حق وراثت سے محروم کرنا ہے جس کا بندہ کو اختیار نہیں ہے کیوں کہ بلاوجہ شرعی کے کمی زیادتی کرنے میں بندہ گنہگار ہوگا تاہم ہبہ صحیح ہوجائے گا اور موہوب لہ کی ملکیت میں موہوب جائیداد میں بعد قبضہ ثابت ہوجائے گی۔

(۱) ''قال النبي ﷺ: فاتقوا الله واعدلوا بين أولادكم'' (مشکوۃ / ۲۶۱)۔

(۲) ''عن النعمان بن بشير ﷺ أن أباه أتى به إلى رسول الله ﷺ فقال إني نحلت ابني هذا غلامًا فقال: أكل ولدك نحلت مثله قال لا قال فارجعه'' (مشکوۃ / ۲۶۰-۶۱)۔

(۳) ''يعطى البنت كالابن عند الثاني، وعليه الفتوى أي على قول أبي يوسف من أن التنصيف بين الذكر والأنثى

أفضل من التثليث الذى هو قول محمد'' (درمختار ورد المحتار ۸/ ۵۰۱، ۵۰۲)۔

(۴) عالمگیری میں ہے: ''وروى عن أبي حنيفة أنه لا بأس به إن كان التفضيل لزيادة فضل له فى الدين وإن كان سواء يكره، وعن أبي يوسف لا بأس به إذا لم يقصد به الإضرار وإن قصد به الإضرار سوّى بينهم يعطى الابنة مثل ما يعطى للابن وعليه الفتوى، هكذا فى فتاوى قاضى خاں، وهو المختار كذا فى الظهيرية'' (عالمگیری ۴/ ۳۹۱ کوئٹہ)۔

(۵) ''عن أنس قال: قال رسول اللهﷺ: من قطع ميراث وارثه قطع الله ميراثه من الجنة يوم القيامة'' (رواہ ابن ماجہ. مشکوۃ ۱/ ۲۶۶)۔

سوال نمبر ۷: آج کل مغربی ملکوں اور خود ہندوستان میں عمر دراز لوگوں کے لئے ہاسٹل بنائے جاتے ہیں، اس میں اگر ساری ضروریات اور ہم عمر لوگ مل جاتے ہیں تو رشتہ داروں اور محبت اولاد سے محرومی بھی ہوتی ہے، ایسے ہاسٹل میں شرعی رائے کیا ہے اور بزرگوں کو اس میں قیام پر مجبور کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب بتوفیق ملہم الصواب: اس قسم کے ہاسٹل بنانا شرعی اعتبار سے بہتر نہیں معلوم ہوتا ہے، اس لئے کہ یہ والدین اور اولاد اور اقارب کے درمیان دوری پیدا کرنے اور معاشرت و ماحول کے اندر اجنبیت پیدا کرنے کا ذریعہ ہے جو کہ بر الوالدين، بر الوالدين إحسانا اور صاحبهما فى الدنيا معروفًا (سورہ لقمان: ۱۵) کے بالکل خلاف ہے، نیز صلہ رحمی کے بھی بالکل خلاف ہے جبکہ باری تعالی نے برالوالدین کے حکم کو توحید کے حکم کے بعد سب سے زیادہ تاکید کے ساتھ نازل فرمایا ہے، یہاں تک کہ ان کے مزاج کے خلاف ادنی حرکت کو بھی "ولا تقل لهما أف" (سورہ اسراء: ۲۳) کہہ کر منع فرمایا ہے، اور صلہ رحمی کی "وآت ذا القربى حقه" (سورہ اسراء: ۲۶) واتقوا الله الذى تساءلون به والأرحام" (سورہ نساء: ۱)، وغیرہ آیتوں کے ذریعہ تاکید فرمایا ہے اور دونوں موضوع کثیر تاکیدی احادیث شریفہ میں وارد ہیں۔

اور برالوالدین میں صرف نفقہ اور خدمت ہی ملحوظ نہیں ہے بلکہ اسی کے ساتھ تالیف قلبی اور طمانینت قلبی بھی بہت زیادہ ملحوظ ہے، جس کی طرف "ربكم أعلم بما فى نفوسكم" (سورہ اسراء: ۲۵) سے اشارہ ملتا ہے، البتہ اگر ایسے عمر دراز کے لئے بنایا جائے جن کے لئے عائلہ وا قارب نہ ہوں تو کوئی حرج نہیں ہے، اگر ہاسٹل بنے ہوئے بھی ہوں تو بوڑھوں و بزرگوں کو اس میں قیام پر مجبور نہیں کیا جاسکتا، اس لئے یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ والدین جنہوں نے اولاد کو ان کے کمزور اور چھوٹے ہونے کی حالت میں ایک لمحہ کے لئے جدا کرنا گوارہ نہ کیا، ان کو مستقل علاحدہ کردیا جائے، آج جب وہ مجبور ہوگئے ہیں تو پرورش اور خدمت کے سلسلہ میں اولاد کا امتحان ہے، کیونکہ معصیت خالق کے علاوہ ہر چیز میں مصاحبت معروف ضروری ہے، ''لا طاعة لمخلوق فى معصية الخالق'' (حدیث)، بوڑھوں کی توقیر کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''ليس منا من لم يرحم صغيرنا ولم يوقر كبيرنا'' (ترمذی ۲/ ۱۴ باب فى رحمة الصبيان)۔

''عن أنس بن مالك قال: قال رسول اللهﷺ: ما أكرم شاب شيخًا لسنه إلا قيض الله من يكرمه عند سنه'' (ترمذی ۲/ ۲۳ فى اجلال الكبير)۔

سوال نمبر ۸: بوڑھاپے کی عمر میں اگر انسان کا ہاتھ خالی ہو تو اس کی بے سہارگی اور بڑھ جاتی ہے اور اگر اس کی اولاد یا قریبی رشتہ موجود نہ ہو تب تو انسان اپنے آپ کو اس دنیا میں تنہا محسوس کرنے لگتا ہے، کیا ایسے لوگوں کی اجتماعی کفالت کے لئے خصوصی طور پر زکوۃ کی رقم استعمال کی جاسکتی ہے۔

الجواب بتوفیق اللہ عز وجل: بوڑھاپے کی عمر میں اولاد پر نفقہ واجب ہوتا ہے، لیکن اگر اولاد کے پاس مال اور کمائی میں سے اتنا نہیں ہے کہ نفقہ دے سکے یا یہ کہ اولاد کمانے سے عاجز ہو تو اس صورت میں اولاد سے نفقہ ساقط ہوجاتا ہے، اسی طرح اقارب میں سے بھی کوئی نفقہ دینے والا نہ ہو تو اب ظاہر ہے کہ فقراء و مساکین میں وہ بوڑھا ضعیف شمار کیا جائے گا۔

''وعلى رأى الجمهور: يشترط أن يكون مال الفرع أو مردود كسبه فاضلًا عن نفقته إما من ماله وإما من كسبه فأما من لا يفضل عنه شئى فليس عليه شئى لحديث جابر، إذا كان أحدكم فقيرًا فليبدأ بنفسه، فإن فضل فعلى

قرابته، وفي لفظ: ابدأ بنفسك ثم بمن تعول'' (الفقه الاسلامي ۱۰/ ۷۴۲۲)، ''ولو دفع إلى فقير له ابن موسر جاز'' (بزازیہ علی الهندیہ ۴/ ۸۵)، ''ولا يجبر الابن على نفقة أبويه المعسرين إذا كان معسرًا إلا إذا كان بهما زمانة أو بهما فقر فقط فإنهما يدخلان مع الابن ويأكلان معه ولا يفرض لهما نفقة على حدة'' (البحر الرائق ۴/ ۲۲۹ زکریا)۔

اسی طرح اگر بڑھاپے کی عمر میں انسان غریب ہوگیا ہو اور اس کی اولاد یا قریبی رشتہ دار موجود نہ ہوں، تب بھی ایسا بوڑھا غریب فقراء اور مساکین میں سے شمار ہوگا اور مصارف زکوۃ میں فقراء اور مساکین اولین مصرف ہیں، لہذا اجتماعی طور پر ایسے لوگوں کی کفالت کے لئے زکوۃ کی رقم خرچ کی جاسکتی ہے، اگر امارت شرعیہ قائم ہو تو اس کی طرف سے ورنہ اپنے طور پر چند مسلمان مل کر کوئی فنڈ قائم کرلیں جس میں زکوۃ کی رقم جمع کر کے ایسے لوگوں پر خرچ کریں۔

سوال نمبر ۹: عمر دراز لوگوں کے لئے حکومتوں نے مختلف چیزوں میں بعض خصوصی رعایتیں رکھی ہیں، جیسے ٹرین وغیرہ میں کرایہ میں تخفیف، حکومت کی طرف سے امدادی وظیفہ، ٹیکس میں رعایت وغیرہ، جو لوگ ان رعایتوں کے لئے مطلوبہ مقررہ حد عمر کو نہ پہنچے ہوں، کیا ان کے لئے ایسی رعایتوں سے فائدہ اٹھانا جائز ہوگا؟

الجواب بتوفیق اللہ عز وجل: حکومت کے قوانین، رعایا اور حکومت کے درمیان ایک معاہدہ کی حیثیت رکھتے ہیں، لہذا رعایت کے لئے عمر وغیرہ کا جو ضابطہ ہے، مباحات میں اس کی پابندی ضروری ہے، ورنہ عہد شکنی ہوگی۔

(۱) اور "وأوفوا بالعهد إن العهد كان مسئولا" (سورہ اسراء) کی خلاف ورزی ہوگی، اور دھوکہ بھی ہے، جس کی بڑی سخت ممانعت حدیث میں وارد ہے۔

(۲) ''من غش فليس منا'' (ترمذی ۱/ ۱۵۷ کتاب البیوع)۔

(۳) ''باب قول النبي ﷺ من غشنا فليس منا'' (مسلم ۱/ ۷۰ کتاب الایمان) (جو شخص دھوکہ دھڑی کرے وہ ہم میں سے نہیں ہے)۔

اور کرایہ میں تخفیف یہ اجارہ کے باب سے ہے، اور بغیر مقررہ حد عمر کو پہنچے ہوئے، فائدہ اٹھانا کرایہ کی چوری ہے اور چوری کی سزا اسلام میں بہت سخت رکھی گئی ہے، فاقطعوا أيديهما (سورہ مائدہ: ۳۸)۔ دوسری بات یہ ہے کہ حکومت کے مال کی چوری اور اس کو غیر قانونی طور پر حاصل کرنا پوری قوم کا مال چوری کرنا ہے، کیونکہ حکومت پوری قوم کی ہے۔

(۴) یہ "والذين ينقضون عهد الله من بعد ميثاقه" (الرعد) میں داخل ہے، لہذا اس سے اجتناب ضروری ہے، اور وہ مال جو اس طرح بچالیا گیا، وہ مال حلال نہیں، بلکہ سحت ہوا جس پر وعید وارد ہوئی ہے۔

(۵) ''قال رسول الله ﷺ: ''ألا لا يحل مال امرئ إلا بطيب نفس منه'' (مشکوۃ: ۲۵۵)۔

(۶) ''من انتهب نهبة فليس منا'' (مشکوۃ شریف: ۲۵۵)۔

خلاصہ یہ کہ ہر شخص اوامر کی پابندی کرے، نواہی سے اجتناب کرے، اور وہ ذمہ داری جو شریعت نے اس کے اوپر عائد کی ہے اس کو پورا کرنے کی کوشش کرے، انشاء اللہ حقوق ادا ہوتے جائیں گے۔

☆☆☆

اسلام میں معذورین کے حقوق اور والدین کا نفقہ

مفتی محمد حکمت علی قاسمی[1]

سوال نمبر ۱: اگر کوئی شخص بوڑھاپے کی عمر کو پہنچ گیا لیکن اتنا کمزور نہیں ہے الخ۔

جواب: اگر کوئی شخص بوڑھاپے کی عمر کو پہنچ گیا لیکن اتنا کمزور نہیں ہے کہ کسب معاش نہ کر سکے، کسی قدر مشقت کے ساتھ سہی وہ کما کر خود اپنی ضرورت پوری کر سکتا ہے تو ایسے شخص کو اس کی اولاد یا اعزہ واقارب جن کے ذمہ اس کا نفقہ واجب ہے کسب معاش پر مجبور نہیں کر سکتے ہیں۔

(۱) ''تجب نفقة الأصل على فرعه الموسر ما دام الأصل فقيرًا مسلمًا كان الأصل أو ذميًا قادرًا على الكسب أو عاجزًا عنه'' (فتاوی دار الافتاء مصریہ)۔

اس عبارت سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ فروع پر اصول کا نفقہ واجب ہے، جبکہ فروع مالدار ہو اور اصول فقیر ہو خواہ اصول کسب معاش پر قادر ہو یا عاجز جب اصول کسب معاش پر قادر ہونے کے باوجود مالدار فروع پر نفقہ واجب ہے تو جب اصول کا حال ایسی ہو کہ کسی قدر سہی کما سکتا ہے تو ایسی حالت میں بدرجہ اولی فروع پر نفقہ واجب ہوگا۔

اس لئے کہ والدین کی خدمت واطاعت والدین ہونے کی حیثیت سے کسی زمانہ اور کسی عمر کے ساتھ مقید نہیں ہر حال اور ہر عمر میں والدین کے ساتھ اچھا سلوک واجب ہے، لیکن واجبات وفرائض کی ادائیگی میں جو حالات عادۃ رکاوٹ بنا کرتے ہیں ان حالات میں قرآن حکیم کا عام اسلوب یہ ہے کہ احکام پر عمل کو آسان کرنے کے لئے مختلف پہلوؤں سے ذہنوں کی تربیت بھی کرتا ہے اور ایسے حالات میں تعمیل احکام کی پابندی کی مزید تاکید بھی والدین کے بڑھاپے کا زمانہ جبکہ وہ اولاد کی خدمت کے محتاج ہو جائیں، ان کی زندگی اولاد کے رحم وکرم پر رہ جائے اس وقت اگر اولاد کی طرف سے ذرا سی بے رخی بھی محسوس ہو تو وہ ان کے دل زخم بن جاتے ہے۔

دوسری طرف بڑھاپے کے عوارض طبعی طور پر انسان کو چڑ چڑا بنا دیتے ہیں۔

تیسرے بڑھاپے کے آخری دور میں جب عقل وفہم جواب دینے لگتے ہیں تو ان کی خواہشات ومطالبات کچھ ایسے بھی ہو جاتے ہیں جن کا پورا کرنا اولاد کے لئے مشکل ہوتا ہے، قرآن حکیم نے ان حالات میں والدین کی دلجوئی اور راحت رسانی کے احکام دینے کے ساتھ انسان کو اس کا زمانہ طفولیت یاد دلایا کہ کسی وقت تم بھی اپنے والدین کے اس سے زیادہ محتاج تھے جس قدر آج وہ تمہارے محتاج ہیں تو جس طرح انہوں نے اپنی راحت وخواہشات کو اس وقت تم پر قربان کیا اور تمہاری بے عقلی کی باتوں کو پیار کے ساتھ برداشت کیا اب جبکہ ان پر محتاجی کا یہ وقت آیا تو عقل وشریعت کا تقاضا ہے کہ ان کے ساتھ سابق احسان کا بدلہ ادا کرو، اللہ تعالی نے فرمایا: "وقل لهما قولا كريمًا" (سورہ اسراء: ۲۳) اور ان سے خوب ادب سے بات کرنا۔ والدین کے ساتھ گفتگو کا ادب سکھلایا گیا ہے کہ ان سے محبت وشفقت کے نرم لہجہ میں بات کی جائے حضرت سعید بن مسیبؒ نے فرمایا جس طرح کوئی غلام اپنی سخت مزاج آقا سے بات کرتا ہے (معارف القرآن ۵ / ۴۶۶)۔

اور اللہ تعالی نے فرمایا: "وآت ذا القربى حقه والمسكين وابن السبيل" (سورہ اسراء: ۲۶) (اور دے قرابت دار کو اس کا حق اور محتاج کو اور مسافر کو)۔

اس آیت میں عام رشتہ داروں کے حقوق کا بیان ہے کہ ہر رشتہ دار کا حق ادا کیا جائے جو کم از کم ان کے ساتھ حسن معاشرت اور عمدہ سلوک ہے۔

---

[1] استاذ دار العلوم لاہری گھاٹ اسلامیہ مدرسہ، موری گاؤں، آسام۔

اور وہ اگر حاجتمند ہوں تو ان کی مالی امداد بھی اپنی وسعت کے مطابق اس میں داخل ہے۔

اس آیت میں اہل قرابت اور مسکین ومسافر کو مالی مدد دینے اور صلہ رحمی کرنے کو ان کا حق فرما کر اس طرف اشارہ کردیا کہ دینے والے کو ان پر احسان جتانے کا کوئی موقع نہیں، کیونکہ ان کا حق اس کے ذمہ فرض ہے۔ دینے والا اپنا فرض ادا کررہا ہے کسی پر احسان نہیں کررہا (معارف القرآن ۵/۴۷۰)۔

سوال نمبر ۲: سن رسیدہ حضرات کا نفقہ وعلاج کن صورتوں میں دوسروں پر واجب ہے:

جواب: جب یہ حضرات کمانے پر قادر نہ ہوں اور فقیر ہوں تو ایسی صورتوں میں دوسروں پر ان کا نفقہ واجب ہوگا۔

• اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "وآت ذا القربی حقه والمسکین وابن السبیل" (سورہ اسراء: ۲۶) قرابت دار کو اس کا حق مالی وغیر مالی دیتے رہنا اور محتاج ومسافر کو بھی ان کے حقوق دیتے رہنا۔

امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک اس فرمان کے تحت جو رشتہ دار ذی رحم محرم ہو، اگر وہ عورت یا بچہ ہے جن کے پاس اپنے گذارہ کا سامان نہیں اور کمانے پر بھی قدرت نہیں، اسی طرح جو رشتہ دار ذی رحم محرم اپاہج یا اندھا ہو اور اس کی ملک میں اتنا مال نہیں ہے جس سے اس کا گذارہ ہوسکے تو ان کے جن رشتہ داروں میں اتنی وسعت ہے کہ وہ ان کی مدد کرسکتے ہیں، ان پر ان سب کا نفقہ فرض ہے (معارف القرآن ۶/۴۷۰)۔

"تجب نفقة الأصل على فرعه الموسر ما دام الأصل فقيرًا مسلمًا كان الأصل أو ذميا قادرا على الكسب أو عاجزا عنه" (فتاوی دار الافتاء مصریہ)۔

اصول کا نفقہ فروع مالدار پر واجب ہے جب تک اصول محتاج ہو خواہ اصول مسلمان ہو یا ذمی کسب معاش پر قادر ہو یا اس سے عاجز ہو، ہر صورت میں فروع مالدار پر نفقہ واجب ہے جبکہ وہ محتاج ہو۔

اسی طرح علاج کرنا بھی واجب ہے اس شخص پر جن کے ذمہ نفقہ واجب ہے۔ اس لئے کہ جس طرح باپ پر اپنے چھوٹے فقیر بچے اور مجنون بچے کا مؤنہ مطلقہ کاملہ واجب ہوتا جیسے صدقۂ فطر، اسی طرح علاج بھی واجب ہوگا اس شخص پر جس کے ذمہ نفقہ واجب ہے۔

کیونکہ کبھی مریض انسان کو ڈاکٹر کا اجرت اور دوا کی قیمت کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے اپنے خادم کی حاجت سے۔

"يجب على الأب القيام بجميع ما يحتاج إليه ابنه من نفقته وطعام وكسوة وغير ذلك بحسب المعروف لأمثالها على مثله وإذن تجب عليه نفقة العلاج والدواء المسكن إن الذى يظهر لنا أنه يدخل فى النفقة الواجبة على العم الموسر جميع ما يحتاج إليه من وجبت له عليه النفقة من طعام وأجرة طبيب وثمن دواء غير ذلك كيف لا وقد تكون حاجة الإنسان المريض إلى أجر الطبيب وثمن الأدوية أشد من حاجته إلى خادم" (فتاوی دار الافتاء مصریہ)۔

سوال نمبر ۳: بوڑھے والدین یا خاندان کے وہ بڑے جن کا نفقہ اس کے چھوٹوں پر محتاجی کی صورت میں واجب ہوتا ہے الخ۔

جواب: بوڑھے والدین یا خاندان کے وہ بڑے جن کا نفقہ ان کے چھوٹوں پر محتاجی کی صورت میں واجب ہے، اگر وہ محتاج نہ ہوں خود صاحب ثروت ہوں تو وہ اپنی اولاد سے یا ان لوگوں سے جن پر بحالت حاجت نفقہ واجب ہوتا ہے زیادہ سہولت کے لئے یا دوسرے لوگوں پر خرچ کرنے کے لئے یا کچھ رقم محفوظ کرنے کے لئے زائد رقم مطالبہ نہیں کرسکتے ہیں، اس لئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

"من سأل الناس وله ما يغنيه جاء يوم القيامة ومسئلته فى وجهه خموش أو خدوش أو كدوح قيل: يا رسول الله وما يغنيه؟ قال خمسون درهما أو قيمتها من الذهب" (مشکاۃ شریف/۱۶۳)۔

اس حدیث کے اندر وعید آئی ہے مانگنے والوں پر اگر مانگنے والا محتاج ہو تو ٹھیک ہے ورنہ وہ اس وعید کے تحت داخل ہے:

"نفقة الوالدين وذوى الأرحام إنما تجب كفاية للحاجة ولا تجب مواليا ويجوز الرجوع عما قدره على نفسه بعد اليسار؛ لأنه التزام ما ليس بلازم شرعًا، صرح الفقهاء بأن نفقة الوالدين وذى الأرحام، إنما تجب كفاية للحاجة حتى لا تجب مع اليسار" (فتاوی دار الافتاء مصریہ)۔

مذکورہ عبارت سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ والدین اور ذوی الارحام کا نفقہ اور جن لوگوں کا نفقہ محتاج ہونے کی صورت میں دوسروں پر واجب ہوتا ہے اگر اس سے محتاجی ہٹ جائے اور اب وہ حاجتمند باقی نہ رہے اور وہ مالدار ہو گیا تو ان پر ابھی نفقہ کا واجبیت باقی نہیں رہے گا۔

اور اس کے لئے یہ بھی حق ہوگا کہ اگر ایک سال کا نفقہ مقرر کر کے دے دیا اور دو یا تین مہینہ کے بعد محتاجی ہٹ گیا تو باقی نفقہ واپس لے سکتا ہے۔

سوال نمبر ۴: ایک اہم مسئلہ والدین اور بزرگوں کی جسمانی خدمت الخ۔

جواب: الف: جو سفر (خواہ تجارت کا ہو خواہ حج وغیرہ کا بشرطیکہ وہ سفر فرض واجب نہ ہو) ایسا ہو جس میں غالب ہلاکی کا اندیشہ نہیں بغیر اجازت والدین درست ہے اگر والدین اس سفر سے منع کریں تو ان کے کہنے سے نہ کرنا ضروری نہیں، چنانچہ یہ مسئلہ درمختار و عالمگیری میں موجود ہے اور جو سفر فرض یا واجب ہو اس میں تو بطریق اولی یہ حکم ہوگا، جیسا کہ ظاہر ہے اور یہ سب اس صورت میں ہے کہ جب والدین اپنی ضروری خدمت کے محتاج نہ ہو خواہ ان کو حاجت ہی نہ ہو دوسرا کوئی خدمت کرنے والا موجود ہو وجہ یہ ہے کہ مذکورہ صورتوں میں والدین کو کوئی رنج و تکلیف واقعی اور قابل اعتبار نہیں جیسا کہ ظاہر ہے، اس لئے اس صورت میں والدین کے خلاف کام کرنا درست ہے نہ حرام نہ مکروہ (اصلاحی نصاب: ۴۴۶)۔

ہاں اگر والدین اپنی ضروری خدمت کے محتاج ہوں اور دوسرا کوئی خدمت کرنے والا موجود نہ ہو اور والدین کو رنج و تکلیف واقعی اور قابل اعتبار بھی ہے اور کسی ضرورت کو پوری کرنے میں سہارے کا محتاج ہو، ایسی صورتحال میں بیٹا کے لئے زیادہ پیسہ کمانے کی غرض سے دوسرے شہر دوسری ریاست یا دوسرے ملک میں جانے کی اجازت نہیں۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں شریک جہاد ہونے کی اجازت لینے کے لئے حاضر ہوا آپ نے اس سے دریافت کیا کہ تمہارے والدین زندہ ہیں اس نے عرض کیا کہ ہاں زندہ ہیں، آپ نے فرمایا: "ففیھما فجاھد"، یعنی بس تو اب تم ماں باپ کی خدمت میں رہ کر جہاد کرو، مطلب یہ ہے کہ ان کی خدمت ہی میں تمہیں جہاد کا ثواب مل جائے گا، دوسری روایت میں اس کے ساتھ یہ بھی مذکور ہے کہ اس شخص نے یہ بیان کیا میں اپنے ماں باپ کو روتا ہوا چھوڑ کر آیا ہوں اس پر آپ نے فرمایا کہ جاؤ ان کو ہنساؤ جیسا کہ ان کو رلایا ہے یعنی ان سے جا کر کہہ دو کہ میں آپ کی مرضی کے خلاف جہاد میں نہیں جاؤں گا (قرطبی)۔

(ب): حضرت مولانا مفتی تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم فرماتے ہیں ایک بات اور سمجھ لیجئے جس میں بڑی کوتاہی ہوتی ہے وہ یہ کہ جب عورت کے ذمہ شوہر کا اور اس کی اولاد کا کھانا پکانا واجب نہیں تو شوہر کے جو ماں باپ، بہن بھائی ان کے لئے کھانا پکانا اور ان کی خدمت کرنا بطریقہ اولی واجب نہیں ہمارے یہاں دستور چل پڑا ہے کہ جب بیٹے کی شادی ہوئی تو اس بیٹے کے ماں باپ یہ سمجھتے ہیں کہ بہو پر بیٹے کا حق بعد میں ہے اور ہمارا حق پہلے ہے لہذا یہ ہماری خدمت ضرور کرے چاہے بیٹے کی خدمت کرے یا نہ کرے۔

البتہ اس لڑکے کی بہو کی سعادت مندی ہے کہ وہ اپنے شوہر کے والدین کی خدمت بھی خوش دلی سے اپنی سعادت اور باعث اجر سمجھ کر انجام دے لیکن لڑکے کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اپنی بیوی کو والدین کی خدمت کرنے پر مجبور کرے جب کہ وہ خوش دلی سے ان کو خدمت پر راضی نہ ہو۔ اور نہ والدین کے لئے جائز ہے کہ وہ اپنی بہو کو اس بات پر مجبور کریں کہ وہ ہماری خدمت کرے، لیکن اگر وہ بہو خوش دلی سے اپنی سعادت مندی سمجھ کر اپنے شوہر کے والدین کی جتنی خدمت کرے گی انشاء اللہ اس کے اجر میں بہت اضافہ ہوگا، اس بہو کو ایسا کرنا بھی چاہئے کہ اگر یہ خدمت انجام دے رہی ہے تو یہ اس کا حسن سلوک ہے، اس کا حسن اخلاق ہے، اس کے ذمہ یہ خدمت فرض واجب نہیں ہے، لہذا ان کو چاہئے کہ وہ بہو کی اس خدمت کی قدر کریں اور اس کا بدلہ دینے کی کوشش کریں، ان حقوق اور مسائل کو نہ سمجھنے کے نتیجہ میں آج گھر کے گھر برباد ہو رہے ہیں، ساس بہو کی اور بھاوج نندوں کی لڑائیوں نے گھر کے گھر اجاڑ دیئے یہ سب کچھ اس لئے ہو رہا ہے کہ ان حقوق کی وہ حدود جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی ہیں وہ ذہنوں میں موجود نہیں ہیں (محمود الفتاوی ۳/۱۰۵ بحوالہ اصلاحی خطبات ۲/۴۱، ۴۲)۔

(ج): والدین کی خدمت کرنا بیٹا اور بیٹی دونوں پر ضروری ہے، اللہ تعالی نے فرمایا: اداء حقوق والدین کے بارے میں، "وبالوالدین إحسانا" (سورہ اسراء: ۲۳) اور تم اپنے ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔

امام قرطبیؒ فرماتے ہیں کہ اس آیت میں حق تعالی نے والدین کے ادب و احترام اور ان کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کو اپنی عبادت سے ملا کر واجب فرمایا ہے جیسا کہ سورہ لقمان میں اپنے شکر کے ساتھ والدین کے شکر کو ملا کر لازم فرمایا ہے، "أن اشکر لی ولوالدیک" (سورہ لقمان: ۱۴)، یعنی میرا شکر ادا کرو اور اپنے

والدین کا بھی۔ اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اللہ جل شانہ کی عبادت کے بعد والدین کی اطاعت سب سے اہم اور اللہ تعالی کے شکر کی طرح والدین کا شکر گزار ہونا واجب ہے۔

سوال نمبر ۵: انسان کو جس طرح جوانی میں بیوی کی ضرورت ہوتی ہے الخ۔

جواب: یہ بات سمجھ لیجئے جس میں بڑی کوتاہی ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ انسان کو جس طرح جوانی میں بیوی کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح وہ بوڑھاپے میں بھی بیوی کا محتاج ہوتا ہے تاکہ اس عمر کے سرد وگرم کو سہنا اس کے لئے آسان ہوجائے۔

لیکن ہمارے یہاں ایک عام دستور چل پڑا کہ بیٹے اور بیٹیاں اپنی والدہ کی فوت ہونے کے بعد والد کے دوسرے نکاح میں رکاوٹ بنتے ہیں جس کے نتیجہ میں یہ سب خرابی پیدا ہوتی ہے جو آپ کے سامنے ہے، ادھر اللہ تعالی نے فرمایا: "فانکحوا ما طاب لکم من النساء مثنی وثلث وربع" (سورہ نساء: ۳)، حلال عورتوں سے تم کو اپنی کسی مصلحت کے اعتبار سے پسند ہوں نکاح کرلو۔ کیونکہ مجبور نہیں آزادی سے اپنی رضا ظاہر کرسکتی ہیں ایک ایک مرد دو دو عورتوں سے یا تین تین عورتوں سے یا چار چار عورتوں سے نکاح کرے۔

جو مذہب اور قانون عفت وعصمت کو قائم رکھنا چاہتا ہو اور زنا کاری کا انسداد ضروری جانتا ہو اس کے لئے کوئی چارہ نہیں کہ تعدد ازواج کی اجازت دے۔

اس میں زنا کاری کا بھی انسداد ہے اور مردوں کی بہ نسبت عورتوں کی جو کثرت بہت سے علاقوں میں پائی جاتی ہے اس کا بھی علاج ہے۔ اگر اس کی اجازت نہ دی جائے تو داشتہ اور پیشہ ور کسبی عورتوں کی افراط ہوگی (معارف القرآن ۲/۲۹۶)۔

جب اسلام میں ایک ایک مرد کے لئے دو دو تین تین چار چار عورتوں سے نکاح کرنے کی اجازت ہے۔

اور اس میں عفت اور عصمت کا پہلو بھی ہے کہ اگر نکاح نہ کرنے دے تو ہوسکتا ہے کہ گناہ میں مبتلا ہوجائے، فطری تقاضا کی وجہ سے زنا کر بیٹھے۔ اس وقت اس گناہ کا سبب اولاد بن جائے گا، لہذا اولاد کے نکاح میں رکاوٹ بننا باعث گناہ ہوا اور جو ہمارے ہندوستان میں ایک عام دستور چل پڑا کہ بیٹے اور بیٹیاں اپنی والدہ کے فوت ہونے کے بعد والد کے دوسرے نکاح میں رکاوٹ بنتے ہیں ان کے لئے یہ رکاوٹ بننا درست نہیں جب کہ والد کو خود اپنی بیوی کی کفالت کی استطاعت ہو اولاد کے لئے یہ رکاوٹ بننا گناہ ہوگا۔ اس لئے اولاد کو چاہئے کہ وہ معاشرہ میں کیا ہو رہا ہے اس کی طرف نہ دیکھے بلکہ شریعت کیا کہہ رہی ہے اس کو دیکھے، اور اگر خود والد میں اپنی بیوی کی کفالت کی استطاعت نہ ہو تو اس سلسلہ میں اولاد پر کچھ ذمہ داری عائد ہوتی ہے، اور یہ فرض اور واجب نہیں، بلکہ بر والد کے طور پر ان کو نکاح کرادینا چاہئے اور ان کی بیوی کی کفالت بھی کرنا چاہئیں تاکہ والد خوش رہے جس سے اللہ بھی خوش رہیں گے، ابن ماجہ کے اس حدیث سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ بروایت حضرت ابوالدرداء کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ باپ جنت کا درمیانی دروازہ ہے، اب تمہیں اختیار ہے اس کی حفاظت کرو یا ضائع کردو۔

سوال نمبر ۶: بعض اوقات میں اولاد والد کی زندگی میں ہی جائیداد کا مطالبہ شروع کردیتے ہیں الخ۔

جواب: قرطبی نے اپنی اسناد متصل کے ساتھ حضرت جابر بن عبداللہ سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور شکایت کی کہ میرے باپ نے میرا مال لے لیا ہے، آپ نے فرمایا کہ اپنے والد کو بلا کر لاؤ اس وقت جبرئیل امین تشریف لائے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ جب اس کا باپ آجائے تو آپ اس سے پوچھیں کہ وہ کلمات کیا ہیں جو اس نے دل میں کہے ہیں خود اس کے کان نے بھی ان کو نہیں سنا جب یہ شخص اپنے والد کو لے کر پہنچا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے والد سے کہا کیا بات ہے آپ کا بیٹا آپ کی شکایت کرتا ہے۔ کیا آپ چاہتے ہیں کہ اس مال چھین لے والد نے عرض کیا کہ آپ اسی سے یہ سوال فرمائیں کہ میں اس کی پھوپھی، خالہ یا اپنی نفس کے سوا کیا خرچ کرتا ہوں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، ایہ، جس کا مطلب یہ تھا کہ جس سے حقیقت معلوم ہوگئی اب اور کچھ کہنے کی ضرورت نہیں اس کے بعد اس کے والد سے دریافت کیا وہ کلمات کیا ہے جن کو ابھی تک تمہارے کانوں نے بھی نہیں سنا اس شخص نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ہمیں ہر معاملہ میں اللہ تعالی آپ پر ایمان اور یقین بڑھا دیتے ہیں جو بات کسی نے نہیں سنی اس کی آپ کو اطلاع ہوگئی جو ایک معجزہ ہے پھر اس نے عرض کیا یہ حقیقت ہے کہ میں نے چند اشعار دل میں کہے جن کو میرے کانوں نے بھی نہیں سنا آپ نے فرمایا کہ وہ ہمیں سناؤ اس وقت اس نے یہ اشعار ذیل سنائے، جن کا ترجمہ یہ ہے:

میں نے تجھے بچپن میں غذا دی اور جوان ہونے کے بعد بھی تمہاری ذمہ داری اٹھائی تمہارا سب کھانا پینا میری ہی کمائی سے تھا جب کسی رات میں تمہیں کوئی بیماری پیش آگئی تو میں نے تمام رات تمہاری بیماری کے سبب بیداری اور بیقراری میں گزاری، گویا کہ تمہاری بیماری مجھے ہی لگی ہے، تمہیں نہیں جس کی وجہ سے میں تمام شب روتا رہا، میرا دل تمہاری ہلاکت سے ڈرتا رہا حالانکہ میں جانتا تھا موت کا ایک دن مقرر ہے پہلے پیچھے نہیں ہوسکتی پھر جب تم اس عمر اور اس حد تک پہنچ گئے جس کی میں تمنا کیا کرتا تھا تو تم نے میرا بدلہ سختی اور سخت کلامی بنا دیا گویا کہ تم مجھ پر احسان وانعام کررہے ہو، کاش اگر تم سے میرے باپ ہونے کا حق ادا نہیں ہوسکتا تو کم از کم ایسا ہی کرلیتے جیسا ایک شریف پڑوسی کیا کرتا ہے، تو کم از کم مجھے پڑوسی کا حق تو دیا ہوتا اور خود میرے ہی مال میں میرے حق میں بخل سے کام نہ لیا ہوتا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ اشعار سننے کے بعد بیٹے کا گریبان پکڑ لیا اور فرمایا: "أنت ومالک لأبیک" یعنی تو بھی اور تیرا مال بھی سب باپ کا ہے (قرطبی، معارف القرآن ۵ / ۴۶۸)۔

مذکورہ عبارت سے تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ بیٹا کا مال میں باپ کا حق ہے، لیکن باپ کے مال میں بیٹا کا حق ثابت نہیں ہوتا۔ اسی طرح فقہاء لکھتے ہیں کہ اگر باپ اپنے لڑکے کی باندی سے وطی کرے تو باپ سے قصاص نہیں لیا جائے گا حق شبہ پائے جانے کی وجہ سے ملکیت کا۔

اولاد کے لئے والد کی زندگی میں جائیداد کا مطالبہ شروع کرنا اور اس سے اپنا حق سمجھتے ہوئے مطالبہ کرنے کی گنجائش نہیں ہے اگرچہ والد کی معاشی حالت بہتر ہو اور اولاد محتاج ہو، ہاں والد کو چاہئے کہ اپنے اولاد پر احسان کا معاملہ کرے، جب والد مالدار ہو تو محتاج اولاد کو کچھ جائیداد دے کر یا تجارت کی طرف راہ دیکھلا دے تا کہ والد صاحب کو دہرا اجر مل جائے ایک قرابت کا دوسرا صدقہ کا۔

سوال نمبر ۷: مغربی ملکوں میں عمر دراز لوگوں کے لئے ہاسٹل بنا دیئے گئے ہیں الخ۔

جواب: مغربی ملکوں میں عمر دراز لوگوں کے لئے ہاسٹل بنا دیئے گئے ہیں، اب ہندوستان میں بھی جگہ جگہ ایسے ہاسٹل بن رہے ہیں جن میں نوجوان اپنے بزرگوں کو داخل کردیتے ہیں، اگرچہ اس میں ایک پہلو یہ ہے کہ ان عمر دراز حضرات کو ایک جگہ اپنی ضرورت کی چیزیں مہیا ہوجاتی ہیں اور اپنے ہم عمر لوگ مل جاتے ہیں، مگر اس کا دوسرا پہلو پہلے پہلو سے بڑھ کر ہے۔ کیونکہ وہ حضرات اپنے رشتہ داروں کی محبت سے محروم ہوجاتے ہیں عمر کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ انسان چاہتا ہے کہ اس کے بال بچے اس کے قریب رہیں اولاد اور اولاد کی اولاد کو دیکھ کر اس کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں تو اب ایسے ہاسٹلوں میں اس کی یہ خواہش ایک حسرت بن جاتی ہے، کیونکہ انسان کو اولاد کے ساتھ اور اس کی اولاد کے ساتھ رہنے سے جو لطف ومحبت حاصل ہوتی اور آنکھیں ٹھنڈی ہوتی ہے، وہ دنیاوی دوسری اور چیزوں سے نہیں حاصل ہوسکتی جیسے قرآن مجید میں ہے: "قال یا أسفی علی یوسف وابیضت عیناہ من الحزن فھو کظیم" (سورہ یوسف: ۸۴) (اور کہنے لگے ہائے یوسف افسوس! اور غم سے روتے روتے ان کی آنکھیں سفید پڑگئیں اور وہ غم سے جی ہی جی میں گھٹا کرتے تھے)، حضرت یعقوبؑ کی یوسفؑ کے ساتھ غیر معمولی محبت اور ان کے گم ہونے پر اتنا اثر کہ اس مفارقت کی ساری مدت میں جو بعض روایات کی بنا پر چالیس سال اور بعض کی بنا پر اسی سال بتلائی جاتی ہے، مسلسل روتے رہنا یہاں تک کہ بینائی جاتی رہی۔

جب صاحبزادے والد کے اس شدید غم واندوہ اور یوسف کو ہمیشہ یاد ہی کرتے رہیں گی یہاں تک کہ آپ بیمار پڑجائیں اور ہلاکت ہونے والوں میں داخل ہوجاتے (معارف القرآن ۵ / ۱۳۰)۔

ماں باپ کو اپنی اولاد کی محبت یہ محبت فطری ہوتی ہے لہذا والدین کو ان سے مفارقت پر جتنا صدمہ اور غم حاصل ہوگی وہ نوک قلم پر لانا ممکن نہیں۔

اور اللہ تعالی نے فرمایا: "فلا تقل لھما أف" (سورہ اسراء: ۲۳) ان کو کبھی ہوں بھی مت کہنا۔

لفظ اف سے مراد ہر ایسا کلمہ ہے جس سے اپنی ناگواری کا اظہار ہو یہاں تک ان کی بات سن کر اس طرح لمبا سانس لینا جس سے ان پر ناگواری کا اظہار ہو وہ بھی اس کلمہ اف میں داخل ہے۔

ایک حدیث میں بروایت حضرت علیؓ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ایذاء رسانی میں اف کہنے سے بھی کم کوئی درجہ ہوتا تو یقیناً وہ بھی ذکر کیا جاتا۔

حاصل یہ ہے کہ جس چیز سے ماں باپ کو کم سے کم اذیت پہنچے وہ بھی ممنوع ہے (معارف القرآن ۵ / ۴۶۴)۔

لہذا بزرگوں کو ایسے ہاسٹلوں میں قیام پر مجبور کرنا بالکل جائز نہیں ہوگا، اس لئے اس آیت سے والدین کو اف یعنی ہوں کہنا منع ثابت ہوا اور جو دوسرا لفظ یا برتاؤ ایسا ہی ہو اس کا بھی یہی حکم ہے۔

سوال نمبر ۸: بوڑھاپے کی عمر میں اگر انسان کا ہاتھ خالی ہو تو اس کی بے سہارگی اور بڑھ جاتی ہے الخ۔

جواب: بوڑھاپے کی عمر میں اگر انسان کا ہاتھ خالی ہو تو اس کی بے سہارگی اور بڑھ جاتی ہے اور اگر اس کی اولاد یا قریبی رشتہ دار موجود نہ ہوں تب تو انسان اپنے آپ کو اس دنیا میں تنہا محسوس کرنے لگتا ہے تو ایسے لوگوں کی اجتماعی کفالت کے لئے خصوصی طور پر زکوۃ کی رقم استعمال کی جا سکتی ہے۔

"قولہ تعالی: إنما الصدقات للفقراء والمساکین الخ" (سورہ توبہ: ۶۰)

اللہ تعالی نے فرمایا صدقات فقراء اور مساکین کا حق ہے اور یہ سب لوگ مصرف ہیں صدقات کا تو ان پر خرچ کرنا جائز ہے۔

''نفيد أن المنصوص عليه شرعًا إن ما يشتغل بيت المال (الحكومة) أربعة أقسام فالقسم الثاني منها ما تأخذه الحكومة من عشر الأرض العشورية وعشر وأموال التجار المسلمين الذى يمرون بتجارتهم على عاملها. وهذا مصرفه كمصرف زكوة السوائم وهو ما نص عليه في قوله تعالى: إنما الصدقات للفقراء الخ'' (فتاوی دار الافتاء مصریہ)۔

سوال نمبر ۹: عمر دراز لوگوں کے لئے حکومتوں نے الخ۔

جواب: عمر دراز لوگوں کے لئے حکومتوں نے مختلف چیزوں میں بعض خصوصی رعایتیں رکھی ہیں جیسے ٹرین وغیرہ میں کرایہ میں تخفیف، حکومت کی طرف سے امدادی وظیفہ، ٹیکس میں رعایت وغیرہ جو لوگ ان رعایتوں کے لئے مطلوب مقررہ حد عمر کو نہ پہنچے ہوں تو ان کے لئے ایسی رعایتوں سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں ہوگا، اس لئے کہ اس میں دو خرابیوں میں سے ایک لازم آئے گا ایک تو ان کو غلط عمر بتانا ہوگا اور وہ جھوٹ ہوا، اور جھوٹ بولنا کبیرہ گناہ اور اس جھوٹ کو گناہ نہ سمجھے تو ڈبل گناہ ہے ایک تو جھوٹ بولنے کا دوسرا گناہ کو گناہ نہ سمجھنے کا اور اگر صحیح عمر بتاتے ہیں تو وہ ان رعایتوں سے فائدہ نہیں اٹھا سکے گا۔

ایک واقعہ نقل کیا جاتا ہے:

افسوس کہ اب اس جھوٹ میں عام ابتلا ہے یہاں تک کہ جو لوگ حرام وحلال اور جائز وناجائز کا اور شریعت پر چلنے کا اہتمام کرتے ہیں ان میں بھی یہ بات نظر آتی ہے کہ انہوں نے بھی جھوٹ کی بہت سی قسموں کو جھوٹ سے خارج سمجھ رکھا اور یہ سمجھتے ہیں کہ گویا یہ جھوٹ ہی نہیں ہے حالانکہ جھوٹا کام کر رہے ہیں غلط بیانی کر رہے ہیں اور اس میں دوہرا جرم ہے ایک جھوٹ بولنے کا جرم اور دوسرے اس گناہ کو گناہ نہ سمجھنے کا۔

اور ایک واقعہ مثلاً اب ٹرین میں سفر کر رہے ہیں اور جس درجہ کا آپ نے ٹکٹ خریدا ہے اس سے اونچے درجے کے ڈبہ میں سفر کر لیا اور دونوں درجوں کے درمیان کرایہ جو فرق ہے اتنے پیسے آپ نے بچا لیے تو جو پیسے بچے وہ آپ کے لئے حرام ہوں گے اور حرام مال آپ کی حلال آمدنی میں شامل ہوں گے اور آپ کو پتہ بھی نہ چلا کہ یہ حرام مال شامل ہو گیا (اسلام اور جو معاشی مسائل ۱ / ۲۷۰)۔

معذورین کے لیے ہاسٹل کی تعمیر اور ان کے حقوق

مفتی محمد ارشاد پالنپوری[1]

۱۔ اگر کوئی آدمی بوڑھاپے کی عمر کو پہنچ گیا، لیکن اتنا کمزور نہیں ہے کہ کسب معاش نہ کر سکے کسی قدر مشقت کے ساتھ سہی وہ خود کما کر اپنی ضرورت پوری کر سکتا ہے تو اس آدمی کے لئے بہتر یہ ہے کہ خود کسب معاش کر کے اپنی ضرورت پوری کریں لیکن وہ خود نہیں کماتا ہے تو ایسے بوڑھے آدمی کی اولاد اس کو کمانے پر مجبور نہیں کر سکتی ہیں بلکہ ایسے والدین کا نفقہ ان کے کسب معاش پر قدرت کے باوجود اولاد پر ہوگا، کیونکہ کمانے میں تھکن اور ضرر لاحق ہوگا اور اولاد کو ان سے ضرر دور کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

اور اگر ایسے بوڑھے شخص کا نفقہ اولاد کے علاوہ دوسرے رشتہ داروں پر ہے اور یہ بوڑھا کمانے کی قدرت رکھتا ہے تو اس صورت میں ان رشتہ داروں پر اس کا نفقہ واجب نہیں ہے اور وہ اس کو کمانے پر مجبور کر سکتے ہیں۔

''وتجب النفقة أيضا لكل ذى رحم محرم إذا كان صغيرًا فقيرًا وذكرًا بالغًا فقيرًا بشرط أن يكون فقيرًا عاجزًا عن الكسب لمرض مزمن أو كان أعمى، فإن الزمانة والعمى دليل على تحقق العجز. فلابد من وجوب النفقة من الحاجة والصغر والأنوثة بخلاف الأبوين كما مر معنا، فتجب نفقتهما مع قدرتهما على الكسب لئلا يلحقهما تعب الاكتساب والولد مأمور بدفع الضرر عنهما، فتجب نفقتهما عليه مع قدرتهما على الكسب'' (الفقه الحنفى فى ثوبه الجديد ۲/ ۲۴۲)۔

۲۔ سن رسیدہ حضرات کا نفقہ دوسروں پر واجب ہونے کے سلسلہ میں تفصیل یہ ہے کہ والدین کا نفقہ اس وقت واجب ہوگا جب ان میں خود اپنی ضروریات مکمل کرنے کی صلاحیت نہ ہو باپ اگر محتاج ہو اور کسب معاش کی صلاحیت رکھتا ہو لیکن نہ کماتا ہو جب بھی اس کا نفقہ بیٹے کے اوپر واجب ہے وہ اپنے باپ کو کمانے پر مجبور نہیں کر سکتا۔

''ويجبر الولد الموسر على نفقة الأبوين المعسرين مسلمين كانا أو ذميين قدرا على الكسب أو لم يقدرا'' (هنديه ۱/ ۶۱۰-۶۱۱، قاموس الفقه ۵/ ۲۱۴)۔

والدین کے علاوہ دوسرے ذی رحم محرم رشتہ دار کا نفقہ بھی واجب ہوتا ہے بشرطیکہ وہ محتاج ہو، نابالغی نابینائی مرض یا عورت ہونے کی وجہ سے کسب معاش سے عاجز ہو، مسلمان ہو اور جس کے ذمہ نفقہ واجب قرار دیا جائے وہ صاحب گنجائش ہو اور صاحب گنجائش ہونے کا مطلب یہ ہے کہ نصاب زکوۃ کا مالک ہو، یعنی کسی بھی نوعیت کا اتنا مال ہو جو نصاب زکوۃ کی قیمت کو پہنچ جائے، یہ امام ابو یوسف کا قول ہے اور اسی پر فتوی ہے۔

''(والنفقة لكل ذى رحم محرم إذا كان صغيرًا فقيرًا أو كانت امرأة بالغة فقيرة أو كان ذكرًا بالغًا فقيرًا زمنًا أو أعمى)؛ لأن الصلة فى القرابة واجبة (ولا تجب نفقتهم مع اختلاف الدين ولا تجب على الفقير) ثم اليسار مقدر بالنصاب أى بنصاب الزكوة على ما روى عن أبى يوسف (فالفتوى على الاول) أى على أن اليسار مقدر بالنصاب'' (هدايه مع فتح القدير ۴/ ۳۷۸، قاموس الفقه ۵/ ۲۱۵)۔

۳۔ بوڑھے والدین یا خاندان کے وہ بوڑھے جن کا نفقہ چھوٹوں پر واجب ہے یہ نفقہ اسی وقت واجب ہوگا جبکہ وہ محتاج ہو، لیکن اگر وہ خود مال دار ہیں اس کے

---

[1] استاذ مدرسہ جامع العلوم وساڑہ، سریندر نگر، گجرات۔

باوجود صرف سہولت کے لئے یا اپنے پاس رقم محفوظ کرنے کے لئے اپنے چھوٹوں سے نفقہ طلب کرتے ہیں تو ان پر شرعاً نفقہ واجب نہ ہوگا پھر بھی اگر والدین نفقہ طلب کرتے ہیں اور بچے کے پاس گنجائش ہے تو بچہ پر اخلاقی تقاضا یہ ہے کہ والدین کو کچھ نفقہ دیدے

''لا يقضى بنفقة أحد من ذوى الأرحام إذا كان غنيا'' (فتاوی عالمگیری ۱/ ۶۱۱)۔

۴۔ الف: اگر والدین بچے کی خدمت کے محتاج ہوں اور ان کے گزارہ کی کوئی صورت نہ ہو اور بچے بھی والدین کی خدمت پوری کر سکتے ہیں اور بچوں کا والدین کو چھوڑ کر دوسری ریاست اور دوسرے ملک میں جانے سے والدین کو بہت دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہو تو ایسے حالات میں بچوں کا والدین کو چھوڑ کر زیادہ پیسے کمانے کی غرض سے دوسرے شہر یا دوسرے ملک میں جانا ہرگز جائز نہیں ہے، بلکہ اپنے مقام میں کسب معاش کا انتظام کر کے والدین کی خدمت کرتے رہیں، ہاں اگر ایک بیٹا باہر کسب معاش کے لئے جاتا ہے اور والدین کی خدمت کرنے والے دوسرے بیٹے موجود ہیں تو یہ بیٹا کسب معاش کے لئے باہر جا سکتا ہے تب بھی اس بیٹے کے لئے بہتر یہ ہے کہ والدین کو راضی کر کے جاوے تا کہ والدین کی دعائیں اس کے ساتھ شامل رہیں۔

''وقال محمد فى ''السير الكبير'': إذا أراد الرجل أن يسافر إلى غير الجهاد لتجارة أو حج أو عمرة، وكره ذلك أبواه، فإن كان يخاف الضيعة عليهما بأن كانا معسرين ونفقتهما عليه وماله لا يفى بالزاد والراحلة ونفقتهما، فإنه لا يخرج بغير إذنهما، سواء كان سفرًا يخاف على الولد الهلاك فيه كركوب السفينة فى البحر، أو دخول البادية ماشيًا فى البرد أو الحر الشديدين، أو لا يخاف على الولد الهلاك، فيه وإن كان لا يخاف الضيعة عليهما، بأن كانا موسرين، ولم تكن نفقتهما عليه، إن كان سفرًا لا يخاف على الولد الهلاك فيه، كان له أن يخرج بغير إذنهما، وإن كان سفرًا يخاف على الولد الهلاك فيه، لا يخرج إلا بإذنهما'' (كذا فى الذخيره، ہندیہ/ ۳۶۲)۔

۴ ب: عورت کو شرعاً یہ حق حاصل ہے کہ وہ شوہر کے ماں باپ سے علاحدہ رہے، اگر وہ اپنے اس حق جائز کا مطالبہ کرتی ہے تو شوہر پر اس کا حق ادا کرنا واجب ہوگا اور چاہے شوہر کے والدین کو خدمت کی ضرورت ہو تب بھی عورت کو ان کے ساتھ رہنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا، اب بہو علاحدہ مکان میں رہے اور حتی الامکان جو ہو سکے ساس کی خدمت کرتی رہی اور ان کے ساتھ ایسا معاملہ رکھے جو چھوٹوں کو بڑوں کے ساتھ رکھنا چاہئے۔

''ولو أراد أن يسكنها مع ضرتها أو مع أحمائها كأمه وأخته وبنته فأبت فعليه أن يسكنها فى منزل منفرد؛ لأن اباءها دليل الأذى والضرر'' (شامی ۵/ ۲۵۵ مکتبہ دار الکتاب)۔

ج: ماں باپ کی خدمت جس طرح بیٹوں پر واجب ہے اسی طرح بیٹیوں پر بھی واجب ہے، اس لئے کہ اس بارے میں جو نصوص وارد ہوئی ہے وہ عام ہیں، مثلاً: ''وقضى ربك ألا تعبدوا إلا إياه وبالوالدين إحسانا'' (سورہ بنی اسرائیل: ۲۳)، ''ووصينا الإنسان بوالديه إحسانا'' (سورہ احقاف: ۱۵، ماخوذ از فتاوی دار العلوم)۔

اگر کوئی والدین کو خدمت کی ضرورت ہو تو بیٹیوں کو چاہئے کہ اپنے شوہر کی اجازت سے میکے میں آوے اگر شوہر اس کی اجازت نہیں دیتے تو کم سے کم اتنی اجازت دینا تو ضروری ہوگا کہ عورت کے اپنے حصے میں جتنے دن خدمت آتی ہے اتنے دن اپنے والدین کو شوہر کے گھر لا کر ان کی خدمت کرے، اس لئے کہ عورت کے ذمہ جس طرح اپنے شوہر کا حق ہے اسی طرح اپنے ماں باپ کی خدمت کا بھی حق ہے۔

۵۔ شریعت نے مرد کو یہ حق دیا ہے کہ اس کے نکاح میں ایک عورت ہوتے ہوئے بھی وہ مزید تین عورتوں سے شادی کر سکتا ہے تو ایک وہ آدمی جس کی بیوی انتقال کر گئی اب وہ دوسری شادی کرنا چاہتا ہے اب اس میں اس کی اولاد رکاوٹ بنتی ہے تو یہ اولاد کا اپنے والد کو ایک جائز حق سے روکنا ہوگا جو اولاد کے لئے بالکل جائز نہیں ہے اگر اولاد باپ کے دوسرے نکاح میں رکاوٹ بنتی ہیں تو وہ لوگ گنہگار ہوں گے۔

''قوله (وأربع من الحرائر والإماء) أى وحل تزويج أربع لا أكثر لقوله تعالى: فانكحوا ما طاب لكم من النساء مثنى وثلث ورباع'' (سورہ نساء: ۳، البحر الرائق ۳/ ۱۸۶)۔

باپ کی بیوی (سوتیلی ماں) کے نفقہ کے متعلق تفصیل یہ ہے کہ اگر باپ مریض یا معذور ہونے کی وجہ سے محتاج خدمت ہو تب اس کی بیوی کا نفقہ بیٹے کے ذمہ ہے کیونکہ وہ گویا باپ کی خادمہ ہے۔

''وإن كان للرجل المعسر زوجة ليست أم ابنه الكبير لم يجبر الابن على أن ينفق على امرأة أبيه. وكذلك أم ولده وأمته لا يجبر الابن على نفقة هؤلاء إلا أن يكون بالأب علة لا يقدر على خدمة نفسه'' (فتاوی ہندیہ ۱/ ۶۱۱)۔

۶۔ باپ اپنی زندگی میں اپنی مملوکہ جائیداد میں خود مختار ہے وہ اس میں جو چاہے تصرف کرسکتا ہے اور کوئی اولاد باپ کی زندگی میں اس کی جائیداد میں اپنے حصہ کا مطالبہ نہیں کرسکتی ہے چاہے اولاد محتاج ہو یا اولاد کی معاشی حالت اچھی ہو (ماخوذ از فتاوی رحیمیہ، فتاوی حقانیہ)۔

۷۔ والدین کی اطاعت اور خدمت والدین ہونے کی حیثیت سے کسی زمانے اور کسی عمر کے ساتھ مقید نہیں، ہر حال اور ہر عمر میں والدین کے ساتھ اچھا سلوک واجب ہے، لیکن فرائض اور واجبات کی ادائیگی میں جو حالات عادۃً رکاوٹ بنا کرتے ہیں ان حالات میں قرآن حکیم کا عام اسلوب یہ ہے کہ احکام پر عمل کو آسان بنانے کے لئے مختلف پہلوؤں سے ذہنوں کی تربیت بھی کرتا رہے اور ایسے حالات میں تعمیل احکام مزید تاکید کرتا ہے تو والدین کے بڑھاپے کا زمانہ جب کہ وہ اولاد کی خدمت کے محتاج ہوجاتے ہیں دوسری طرف بڑھاپے کی وجہ سے ان میں چڑچڑاپن بھی آجاتا ہے تو ایسے حالات میں والدین کی دلجوئی اور راحت رسانی کے احکام دینے کے ساتھ انسان کو اس کا زمانہ طفولیت یاد دلایا کہ کسی وقت تم بھی اپنے والدین کے اس سے بھی زیادہ محتاج تھے جس قدر آج وہ تمہارے محتاج ہیں، لہذا جس طرح انہوں نے تمہاری راحت کا خیال رکھا تم بھی ان کا خیال رکھنا آیت: "كما ربياني صغيرا" (سورہ اسراء: ۲۴) سے اسی طرف اشارہ کیا گیا ہے، نیز اللہ تعالی نے اس سورہ بنی اسرائیل کی آیت ۲۳ میں والدین کے ادب واحترام اور ان کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کو اپنی عبادت کے ساتھ ملا کر واجب فرمایا ہے جیسا کہ سورہ لقمان میں اپنے شکر کے ساتھ والدین کے شکر کو ملا کر لازم فرمایا ہے، "أن اشكر لي ولوالديك" (سورہ لقمان: ۱۴) تو اس سے پتہ چلا کہ اللہ تعالی کی عبادت کے بعد والدین کی اطاعت اور خدمت سب سے اہم ہے، اب والدین پر جب یہی بڑھاپا آتا ہے کہ جس میں ان کی اطاعت اور خدمت کی اس قدر تاکید ہے تو ایسی حالت میں ان کو دوسروں کے حوالے کردیا جائے تو اس سے بڑی احسان فراموشی کوئی نہیں ہوگی نیز انسان اپنے گھر والوں اور رشتہ داروں کے ساتھ رہنا پسند کرتا ہے تاکہ دکھ درد میں ان کی طرف سے اس کو تسلی ملے اور یہ ضرورت بڑھاپے میں، جبکہ انسان ہر طرح سے دوسروں کا محتاج ہوجاتا ہے اور زیادہ بڑھ جاتی ہے، ایسی حالت میں ان کو گھر والوں اور رشتہ داروں سے جدا کرنا یا ان کو تکلیف پہنچانا ہے، لہذا ایسے ہاسٹل جو خاص طور پر بوڑھوں اور عمر رسیدہ لوگوں کے رہنے کے لئے بنائیں جاتے ہیں اپنے بزرگوں کو ایسے ہاسٹلوں میں قیام پر مجبور کرنا بالکل جائز نہ ہوگا۔

۸۔ ایک زکوۃ فنڈ بنایا جائے جس میں لوگ اپنی زکوۃ وصدقات واجبہ جمع کرائیں اور جو لوگ زکوۃ کھاسکتے ہیں اور ایسے بوڑھے جو بے سہارا ہوں اور ان کے گزارہ کی کوئی شکل نہ ہو تو ان کو اس فنڈ میں سے دیا جاسکتا ہے۔

''لا يجوز دفع الزكوة إلى من يملك نصابًا أي مال كان دنانير أو دراهم أو سوائم أو عروضًا للتجارة أو لغير التجارة فاضلًا عن حاجته في جميع السنة'' (فتاوی ہندیہ ۱/ ۲۵۱)۔

۹۔ عمر دراز لوگوں کے لئے حکومت کی طرف سے خصوصی طور پر جو رعایتیں ملتی ہیں جو لوگ ان رعایتوں کے لئے مطلوب مقررہ حد عمر کو نہ پہنچے ہوں، ان کے لئے ایسی رعایتوں سے فائدہ اٹھانا بالکل جائز نہ ہوگا، اگر کوئی آدمی غلط عمر بتا کر ان رعایتوں سے فائدہ اٹھاتا ہے تو یہ شخص حکومت کو دھوکہ دیتا ہے اور جھوٹ بھی بولتا ہے اور یہ دونوں چیزیں اسلام میں ناجائز اور حرام ہے، لہذا کسی شخص کے لئے غلط عمر بتا کر حکومت کی جاری کردہ رعایتوں سے فائدہ اٹھانا جائز نہ ہوگا۔

والدین کی خدمت اور مالی حقوق

مولانا محمد احسن عبدالحق ندوی[1]

کبرسنی کی وجہ سے اپنی اولاد کو کسب معاش پر مجبور کرنا:

جواب (۱): قرابت کی وجہ سے جن لوگوں کا نفقہ واجب ہوتا ہے، ان میں والدین کا نفقہ واجب ہونے پر فی الجملہ فقہاء کا اجماع واتفاق ہے، اس لئے کہ اللہ نے والدین کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا ہے، اور والدین کی کفالت حسن سلوک میں داخل ہے۔

حدیث شریف میں فرمایا گیا: ''ہل تنصرون وترزقون إلا بضعفائكم'' (بخاری: کتاب الجہاد: ۲۸۹۶)
(تمہاری جو مدد کی جاتی ہے اور تمہیں جو رزق دیا جاتا ہے وہ تمہیں تمہارے کمزوروں اور ضعفاء ہی کی وجہ سے دیا جاتا ہے)۔

اسی طرح حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''إن أطيب ما أكل الرجل من كسبه، وإن ولده من كسبه'' (ابوداؤد، کتاب البیوع: ۳۵۲۸)
(سب سے پاکیزہ کھانا وہ ہے جو آدمی کی اپنی کمائی کا ہو اور تمہاری اولاد بھی تمہاری کمائی ہے)۔

حنفیہ کی رائے کے مطابق والدین کا نفقہ اس وقت واجب ہوتا ہے جب ان میں خود اپنی ضروریات مکمل کرنے کی صلاحیت نہ ہو، باپ اگر محتاج ہو اور کسب معاش کی صلاحیت رکھتا ہو، لیکن نہ کماتا ہو جب بھی اس کا نفقہ بیٹے کے ذمہ واجب ہے، وہ اپنے باپ کو کمانے پر مجبور نہیں کر سکتا۔ حنابلہ وغیرہ کے نزدیک بشمول والدین والدین اقارب کا نفقہ اسی وقت واجب ہوتا ہے جب وہ کمانے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو (المغنی ۸/۱۶۹)۔

والدین کے نفقہ میں کھانا، پینا، رہائش سبھی شامل ہیں، یہ چیزیں بقدر کفایت واجب ہوتی ہیں (بدائع الصنائع ۴/۳۸)۔

اگر کسی شخص کے ماں باپ دونوں ہوں اور ان کی معاشی پوزیشن اچھی نہ ہو تو اول تو تنگی کے ساتھ سہی، اسی میں دونوں کی کفایت کرنی چاہئے، لیکن اگر ایسا ممکن نہ ہو تو نفقہ کے اعتبار سے ماں کا حق مقدم ہے، چونکہ بظاہر ماں کے لئے کسب معاش دشوار ہے (درمختار ۲/۶۷۳)۔

ماں کے مقدم ہونے کی تائید اس روایت سے بھی ہوتی ہے، جس میں آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے پوچھا گیا، کہ ہمارے حسن سلوک کا سب سے زیادہ مستحق کون ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے جواب میں تین دفعہ ماں کا اور چوتھی دفعہ باپ کا نام لیا۔

''من أحق الناس بحسن صحابتي؟ قال: أمك ثم قال: من؟ قال: أمك، ثم قال: من؟ قال: أمك، ثم قال: من؟ قال: أبوك'' (بخاری کتاب الادب: ۵۹۷۱، مسلم کتاب البر والصلة: ۲۵۴۸)۔

لیکن اگر باپ کسب معاش سے معذور ہو اور ماں کسب معاش کی صلاحیت رکھتی ہو تو باپ کا حق مقدم ہوگا، کیونکہ باپ ہی نے بچپن میں اس کی کفالت کا فریضہ انجام دیا ہے، اسی لئے فقہاء نے تو مطلقاً باپ کو ماں پر مقدم رکھا ہے، ''قال بعضهم الأب أحق'' (ردالمحتار ۲/۶۷۳)۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اولاد والدین کو کسب معاش پر مجبور نہیں کر سکتے ہیں، والدین چاہے کمانے کی استطاعت رکھتے ہوں اور چاہے نہ رکھتے ہوں، ہر حال میں والدین کا نفقہ اولاد پر واجب ہے، اور اگر اولاد نہیں ہیں تو جو قریبی رشتہ دار ہیں ان پر واجب ہے۔

سوال (۲): سن رسیدہ حضرات کا نفقہ وعلاج:

---

[1] کھنڈ پیڑا، شجاع گنج، فیض آباد، یوپی۔

جواب (۲): اصول وفروع کو چھوڑ کر دیگر اقارب کا نفقہ اس شخص پر واجب ہوگا جس کی آمدنی اتنی ہو جو اس کے ذاتی اور اس کے زیر کفالت افراد کے اخراجات سے زائد ہو، اس شخص پر اس قریبی رشتہ دار کا نفقہ واجب ہوگا، جس کے پاس نہ مال ہو اور نہ کمانے کے لائق ہو (الدر المختار مع رد المحتار ۲ / ۹۸۳)۔

بالغ عورت تنگ جو محتاج ہو اس کا نان ونفقہ اس کے قریبی محرم پر واجب ہوگا، البتہ اگر وہ صاحب حیثیت ہے تو اسی کے مال میں سے اس پر خرچ کیا جائے گا، کسی اور پر اس کی ذمہ داری عائد نہیں ہوگی (ہدایہ ۲ / ۴۲۶)۔

اسی طرح ان کے علاج ومعالجہ کی ذمہ داری بھی اس قریبی رشتہ دار پر ہوگی جس کے ذمہ ان کا نفقہ ہے۔

سوال (۳): ضرورت کے وقت نفقہ سے زائد رقم کا مطالبہ:

جواب (۳): اسلام نے بوڑھوں کی بڑی رعایت رکھی ہے، اور قدم قدم پر ان کے لئے احکام میں سہولتیں برتی گئی ہیں، نماز جیسی اہم چیز اگر بوڑھاپے اور ضعف کی وجہ سے کھڑے ہو کر ادا نہیں کر سکتے تو بیٹھ کر پڑھنے کی اجازت دی ہے، ایسے لوگوں کی کفالت شرعاً واجب ہے، اگر والدین ہیں اور ان میں کمانے اور کسب معاش کی صلاحیت بھی ہو پھر بھی ان کو اس پر مجبور نہیں کیا جا سکتا، بلکہ بال بچوں پر ان کی ضروریات کی تکمیل ضروری ہے (درمختار ۵ / ۳۵۲-۵۵)۔

حنفیہ کی رائے کے مطابق والدین کا نفقہ اس وقت واجب ہوتا ہے جب ان میں خود اپنی ضروریات مکمل کرنے کی صلاحیت نہ ہو، باپ اگر محتاج ہو اور کسب معاش کی صلاحیت رکھتا ہو، لیکن نہ کماتا ہو جب بھی اس کا نفقہ بیٹے کے ذمہ واجب ہے، وہ اپنے باپ کو کمانے پر مجبور نہیں کر سکتا۔ حنابلہ وغیرہ کے نزدیک بشمول والدین اقارب کا نفقہ اسی وقت واجب ہوتا ہے، جب وہ کمانے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو (المغنی ۸ / ۱۶۹)۔

البتہ زیادہ سہولت کے لئے یا اپنے پاس محفوظ رکھنے کے لئے زائد رقم کا مطالبہ کرنے کا حق والدین کو نہیں ہے۔

اولاد پر والدین کا ضروری نفقہ (جیسے کھانا، کپڑا، رہائش کے لئے مکان اور علاج ومعالجہ) واجب ہے۔

سوال (۴، الف): زائد آمدنی کی خاطر والدین کو چھوڑ کر دوسری جگہ کسب معاش کے لیے جانا:

جواب، الف: اس دنیا میں جتنی محبتیں اور تعلقات ہیں، ان سب میں انسان کی کوئی نہ کوئی غرض ضرور وابستہ ہے، اس دنیا میں بے غرض محبت نہیں ملے گی، لیکن والدین کی اپنی اولاد کے ساتھ جو محبت ہوتی ہے وہ بے غرض ہوتی ہے، ان کا جذبہ تو یہ ہوتا ہے کہ اپنی جان بھی چلی جائے لیکن اولاد کو فائدہ پہنچ جائے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے حقوق میں ان کا درجہ سب سے زیادہ رکھا ہے۔

حضرت اویس قرنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں موجود ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے مشرف ہونا چاہتے ہیں لیکن والدہ بیمار ہیں، والدہ کو اویس قرنی کی خدمت کی ضرورت ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو خدمت اقدس میں حاضر ہونے سے منع فرمایا، اور والدہ کی خدمت کا حکم فرمایا (مسلم: ۲۵۴۲)۔

حضرت اویس قرنی نے مقام صحابیت کو ترجیح دی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت وملاقات کو چھوڑ دیا۔

اسی طرح جہاد سے بھی افضل عمل والدین کی خدمت کو بتایا گیا ہے (بخاری: ۲۶۶۲)۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جب والدین کی خدمت پر اہم ترین چیز جہاد اور مقام صحابیت کو قربان کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ تو زیادہ آمدنی کے لئے والدین کو چھوڑ کر کہاں جانا جائز ہو سکتا ہے۔

سوال (ب): بہو پر ساس اور سسر کی خدمت:

جواب، ب: اگر بہو ساس سسر کے ساتھ رہنا نہیں چاہتی تو شوہر اس کو ساس سسر کے ساتھ رہنے پر مجبور نہیں کر سکتا ہے، اس لئے کہ ابن قدامہؒ نے اس بات کی وضاحت کر دی ہے کہ اگر عورت ایسے سماج سے تعلق رکھتی ہو، جس میں خدام اور نوکروں سے کام لیا جاتا ہو تو خادم کا نظم کرنا شوہر

کے ذمہ ہے (المغنی ۳/۴۲۶)۔

البتہ اگر ساس کو خدمت کی ضرورت ہے تو اخلاقی طور پر بہو کو ساس کی خدمت کرنی چاہئے، اس لئے کہ جس طرح اس کے اپنے ماں باپ ہیں اسی طرح ساس سسر بھی ماں باپ ہی کے درجہ میں ہیں، لیکن شوہر بیوی کو خدمت کے لئے مجبور نہیں کرسکتا ہے۔

بیوی کے والدین کو ہفتے میں ایک دن اور دوسرے محرم رشتہ داروں کو سال میں ایک دن آنے کا حق حاصل ہوگا، شوہر بیوی کو اس سے نہیں روک سکتا، اسی طرح بیوی کو بھی حق ہے کہ اگر والدین نے آسکتے ہوں، تو وہ ہفتے میں ایک دن والدین سے ملاقات کے لئے جائے (الدر المختار ۲/ ۶۶۴)۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ شوہر بیوی کو اپنے والدین کی خدمت پر مجبور نہیں کرسکتا ہے۔

سوال (ج): کیا والدین کی خدمت صرف بیٹوں پر واجب ہے؟

جواب، ج: والدین وغیرہ کا نفقہ ادا کرنے میں اولاد کے ساتھ کوئی اور شریک نہیں ہوگا، یعنی اولاد کو تنہا اپنے مال سے ماں باپ کی کفالت کرنی ہوگی، والدین، دادا، دادی وغیرہ کا نفقہ لڑکوں اور لڑکیوں دونوں پر واجب ہے، اگر تنہا ایک لڑکا یا ایک لڑکی ہو تو پورا نفقہ اسی کے ذمہ ہوگا، اگر ایک سے زیادہ ہوں تو سب پر تقسیم ہو جائے گا، سب مل کر ادا کریں گے، پھر اس میں لڑکوں اور لڑکیوں کی ذمہ داری قول صحیح کے مطابق مساوی ہوگی، شوافع، حنابلہ اور امام ابوحنیفہ کے ایک قول کے مطابق حصہ میراث کے تناسب سے لڑکوں کی ذمہ داری بمقابلہ لڑکیوں کے دوگنا ہوگی (ہدایہ و فتح القدیر ۴/ ۴۱۸)۔

اگر بیوی کے والدین معذور ہوں اور کوئی دیکھ ریکھ کرنے والا نہ ہو اور عورت ان کی تیمارداری کرسکتی ہے، تو شوہر کو حق نہیں کہ وہ اس کو اس سے روکے (الدر المختار ۲/ ۶۶۴)۔

ہمارے معاشرہ میں ساس اور بہو کی لڑائی کی ایک اہم وجہ بہو کا اپنے ماں باپ کے گھر جانا ہے، ساس کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کی بہو اپنے نئے گھر میں اپنا دل لگائیں، اس کی خدمت کرے، دوسری طرف لڑکی یہ چاہتی ہے کہ اپنے ماں باپ کو بھی وقت دے، بہو چاہے کتنی ہی خدمت گزار کیوں نہ بن جائے، مگر جیسے ہی وہ میکے جانے کا ارادہ کرتی ہے تو ساس کے چہرے پر شکن پڑ جاتی ہیں، ان سب مسائل سے بچنے کے لئے بیوی کو چاہئے کہ وہ اپنے شوہر کی مدد سے اپنے میکے جانے کا دن متعین کرے، اور اس دن کا انتخاب کرے جس دن اس کے سسرال میں مہمانوں کی آمد کم سے کم ہو۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ والدین کا نفقہ لڑکوں اور لڑکیوں دونوں پر واجب ہے، لڑکیاں اپنے والدین کی خدمت کے لئے اپنے میکے جاسکتی ہیں، شوہر بیوی کو والدین کی خدمت سے نہیں روک سکتا ہے۔

سوال (۵): والد کو نکاح ثانی سے روکنا:

جواب (۵): اگر باپ نکاح کی حاجت رکھتا ہو اور خود اس موقف میں نہ ہو تو کیا اس کا نکاح کرنا بھی اولاد کی ذمہ داری ہوگی؟ شوافع اور حنابلہ کے نزدیک بیٹے پر باپ کی شادی کا انتظام واجب ہوگا، اور اس کے مہر کی ذمہ داری بھی اس کے بیٹے پر ہوگی (شرح المہذب ۱۸/ ۳۱۰، المغنی ۸/ ۱۷۲)۔

حنفیہ کے یہاں دو قول ہیں، ایک واجب ہونے کا دوسرا واجب نہ ہونے کا (درمختار ورد المختار ۲/ ۶۷۳)۔

اگر کسی کے والدین بھی ہوں اور بچے بھی، اور وہ ان دونوں میں سے کسی ایک ہی کا نفقہ ادا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو تو اول تو یہ کوشش ہونی چاہئے کہ جہاں تک ممکن ہو دونوں کی پرورش کی جائے، لیکن اگر ایسا ممکن ہی نہ ہو تو جو بچے کسب معاش کے لائق نہیں ہیں وہ مقدم ہیں (درمختار ۲/ ۶۷۳)۔

علامہ ابن قدامہ نے ماں کے نکاح کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ بھی اولاد کے ذمہ ہوگا (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۷/ ۷۷۷)۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ ماں کے انتقال کے بعد اگر باپ کو دوسرے نکاح کی ضرورت ہے اور اسی طرح اگر باپ کے انتقال کے بعد باپ کو بھی دوسرے نکاح کی ضرورت ہو تو اولاد پر دوسرے نکاح کی ذمہ داری ہے اور ان کا نان ونفقہ بھی اولاد پر واجب ہوگا۔

سوال (۶) والد کی زندگی میں جائیداد تقسیم کا مطالبہ:

جواب (۶): اولاد اپنا حق سمجھ کر والد سے والد کی زندگی میں جائیداد کا مطالبہ نہیں کر سکتے ہیں، اور نہ ہی زبردستی کر سکتے ہیں، البتہ اگر والد صاحب اپنی زندگی میں اپنی مرضی سے دینا چاہیں تو کچھ دے سکتے ہیں، اور بچوں کے درمیان برابری ضروری ہے (دیکھئے فتاوی رحیمیہ ۹ / ۳۱۴)۔

اگر والدین کی معاشی حالت ٹھیک ہو، اور اولاد والد سے الگ رہ رہی ہو، تو والد صاحب کا اخلاقی فریضہ ہے کہ وہ اپنی محتاج اور ضرورت مند اولاد کو کچھ دے دے، جس سے اس کا گذر بسر آسانی سے ہو سکے، اور دوسروں کے سامنے دست دراز سے بچ سکے، لیکن اگر اولاد زبردستی اور والد کو مجبور کر کے اپنا حق سمجھ کر جائیداد میں حصہ لینا چاہے تو نہیں لے سکتا ہے، اور نہ ہی والد صاحب کو مجبور کر سکتا ہے۔ اس لئے کہ میراث کی تقسیم کا مسئلہ انتقال کے بعد جاری ہوتا ہے نہ کہ مرنے سے پہلے، زندگی میں مال کی تقسیم میراث کی تقسیم نہیں ہے بلکہ ہبہ ہے اور ہبہ کا قاعدہ یہ ہے کہ سب کو برابر دیا جائے گا چاہے لڑکی ہو اور چاہے لڑکا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان "فاتقوا الله واعدلوا بين أولادكم" (مسلم) (اللہ سے ڈرو اور اپنی اولاد کے ساتھ انصاف وبرابری کا سلوک کرو)۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اولاد والد کی زندگی میں جائیداد کا مطالبہ نہیں کر سکتے ہیں اور نہ ہی والد کو مجبور کر سکتے ہیں، البتہ والد کا اخلاقی فریضہ ہے کہ محتاج اولاد کو کچھ نہ کچھ حصہ دے دے جس سے اس کا گذر بسر ہو سکے، لیکن اولاد میں برابری ضروری ہے۔

سوال (۷): عمر دراز لوگوں کے لئے ہاسٹل کی تعمیر:

جواب (۷): آج کے مغربی معاشرے میں بوڑھاپے کی حالت میں والدین کی جو درگت بنائی جاتی ہے وہ نہایت قابل رحم اور انسانیت سوز ہے، آج مغربی ممالک میں جا بجا بوڑھوں کے لئے ہاسٹل بنا دیے گئے ہیں، جہاں حقوق انسانی کے تحفظ کے نام نہاد دعوے دار، روشن خیال لوگ اپنے بوڑھے ماں باپ کو (جب وہ اولاد کی خدمت اور نگرانی کے زیادہ محتاج ہوتے ہیں) ہاسٹل میں اجنبی ملازمین کے حوالے کر کے بے فکر ہو جاتے ہیں، یہ مہذب دنیا کی انسانیت کشی کی مکروہ تصویریں اور مناظر ہیں جو آج مغرب میں جگہ جگہ بے کس اور لاچار بوڑھے مردوں اور عورتوں کی شکل میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

باپ کو جنت کا دروازہ اور ماں کے قدموں تلے جنت کہا گیا ہے، ظاہر بات ہے کہ یہ مقام حاصل کرنے کے لئے والدین کی خدمت ضروری ہے، خاص کر بوڑھاپے کی عمر میں، اس لئے والدین کو ہاسٹل وغیرہ میں رہنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی والدہ کی خدمت کے سلسلہ میں فرمایا: کاش میری ماں زندہ ہوتی اور میں چار رکعت (نفل) نماز کی نیت باندھ کر کھڑا ہوتا اور سورہ فاتحہ پڑھ چکا ہوتا، ادھر میری ماں مجھے آواز دیتی اے محمد! اور میں نماز کی نیت توڑ کر ماں کی خدمت میں حاضر ہوتا، اور ماں کی خدمت کرتا۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ والدین کا کیا مقام ومرتبہ ہوگا۔ اس لئے بوڑھاپے کی عمر میں والدین کی خدمت کی جائے نہ کہ ان کو ہاسٹل کے حوالہ کیا جائے۔

اس ضمن میں امریکہ کی ایک مثال ملاحظہ ہو:

جب والد صاحب کا انتقال ہو گیا تو بچوں نے ماں کو ہاسٹل کے حوالہ کر دیا، جب ماں کی طبیعت زیادہ خراب ہوئی تو ہاسٹل سے فون آیا کہ آپ کی ماں کی طبیعت زیادہ خراب ہے؟ چل چلاؤ کا وقت ہے؟ آ کر ملاقات کر جاؤ، بیٹا ہاسٹل پہنچا، ماں کی خدمت میں حاضر ہوا، بولا ماں کس چیز کی ضرورت ہے، ماں نے جواب دیا، بیٹا اب کسی چیز کی ضرورت نہیں، البتہ ایک کام ضرور کرنا، یہاں ہاسٹل میں نئے پنکھے لگوا دینا، بیٹے نے کہا ماں تم یہ کیا کہہ رہی ہو، ماں نے درد بھرے لہجہ میں جواب دیا، بیٹا کل کو جب تم بوڑھے ہو جاؤ گے اور تمہارے بچے تمہیں یہاں ڈال جائیں گے تو تمہیں یہاں گرمی نہ لگے، یہ کہہ کر ماں دنیا سے رخصت ہو گئی، اس وقت بیٹے کو ماں کی خدمت یاد آئی۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ بوڑھے ماں باپ جن کی بدولت تمہیں رزق دیا جاتا ہے، ان کو ہاسٹل کے حوالہ نہ کیا جائے، بلکہ ان کی خدمت کی جائے اور

ان کے ذریعہ جنت حاصل کی جائے، اس لئے کہ ان کی خوشی میں جنت ہے اور ناراضگی میں دوزخ ہے۔

سوال (۸): کمزور لوگوں کی اجتماعی کفالت کے لئے زکوۃ کا استعمال:

جواب (۸): زکوۃ ادا کرنے والے کو چاہئے کہ اچھی طرح تحقیق کر کے صحیح مصرف میں لگانے کی کوشش کرے، افضل یہ ہے کہ سب سے پہلے اپنے عزیز واقارب اور پڑوسی میں مستحقین کی تلاش کرے، رشتہ داروں میں زکوۃ ادا کرنے سے ڈبل ثواب ملتا ہے، ایک تو زکوۃ ادا کرنے کا دوسرے صلہ رحمی کرنے کا، البتہ دو رشتے ایسے ہیں جن میں زکوۃ کی ادائیگی کرنا درست نہیں ہے، ایک ولادت کا رشتہ ہے جس کے تحت تمام اصول وفروع آتے ہیں، چنانچہ اپنے باپ، دادا، نانا، نانی، دادی اور ان سے اوپر والوں کو زکوۃ ادا کرنا درست نہیں ہے، اسی طرح بیٹے، پوتے، بیٹی، پوتی، نواسہ، نواسی، اور ان سے نیچے والوں پر زکوۃ ادا کرنا درست نہیں ہے، دوسرا نکاح کا رشتہ ہے چنانچہ شوہر بیوی کو اور بیوی شوہر کو زکوۃ ادا نہیں کر سکتی، ان دو رشتوں کے علاوہ تمام رشتہ داروں کو زکوۃ دینا جائز ہے، جیسے: بھائی، بہن، چچا، پھوپھی اور خالہ وغیرہ، لیکن شرط یہ ہے کہ جس کو زکوۃ دی جارہی ہو وہ زکوۃ کا مستحق ہو۔

اگر اولاد یا قریبی رشتہ دار موجود نہ ہوں اور اس کے پاس کوئی اور وسائل نہ ہوں اور وہ مستحق زکوۃ بھی ہو تو ایسی صورت میں اس کی کفالت زکوۃ کے مال سے کی جاسکتی ہے۔

سوال (۹): حکومت کی طے کردہ عمر کی حد سے کم ہیں اسکیموں سے فائدہ اٹھانا:

جواب (۹): حکومت کی طرف سے عمر دراز لوگوں کے لئے جو بھی رعایتیں رکھی گئی ہیں ان سے وہ فائدہ اٹھا سکتا ہے، البتہ اس کی تحقیق ضروری ہے کہ جو رعایت اس کے ساتھ کی جارہی ہے وہ کسی سودی پیسوں سے تو نہیں کی جارہی ہے، اگر معاملہ مشکوک ہے تو پھر سے فائدہ اٹھانے میں احتیاط ہی بہتر ہے، اور وہ لوگ جن کی عمر (حکومت کی طرف سے ۶۰ / ۶۵ سال کی عمر متعین ہے) مقررہ حد کو نہیں پہنچی ہے ان کے لئے اس ان رعایتوں سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں ہوگا، اس لئے کہ یہ رعایت ضرورت مندوں کے لئے رکھی گئی ہے، نہ کہ دوسروں کے لئے۔

☆☆☆

والدین کی ضرورت کے باوجود دوسری جگہ ملازمت کے لئے جانا

مولانا محمد صبیح اختر قاسمی[1]

جواب (۱): اگر کوئی شخص بوڑھاپے کی عمر کو پہنچ گیا لیکن اتنا کمزور نہیں ہے کہ کسب معاش نہ کر سکے، کسی قدر مشقت کے ساتھ ہی سہی وہ کما کر خود اپنی ضرورت پوری کرسکتا ہے تو ایسے شخص کو ان کی اولاد کسب معاش پر مجبور نہیں کر سکتی ہیں، بلکہ مستطیع اولاد کو نفقہ دینے پر مجبور کیا جائے گا۔

''ویجبر الولد الموسر علی نفقة الأبوین المعسرین مسلمین کانا أو ذمیین قدرا علی الکسب أو لم یقدرا'' (ھندیہ ۱/ ۵۶۴)

(مالدار اولاد کو نادار والدین کے خرچہ پر مجبور کیا جائے گا، والدین مسلمان ہوں یا ذمی، کسب معاش پر قادر ہوں یا نہیں)۔

البتہ اگر وہ بوڑھا شخص اولاد کے علاوہ دوسرے اقارب کی کفالت میں ہو تو وہ کسب معاش پر مجبور کر سکتے ہیں، کیونکہ والدین کے علاوہ اقارب کا نفقہ اسی صورت میں واجب ہے جب وہ بالکل کسب معاش پر قادر نہ ہوں۔

''والنفقة لکل ذی رحم محرم إلی قوله فإن القادر علی الکسب غنی بکسبه'' (ہدایہ مع الفتح ۴/ ۳۸۰)۔

(ہر ذی رحم محرم کے لئے خرچہ ہے......... جو کمانے پر قادر ہے، وہ اپنی کمائی کی وجہ سے بے نیاز ہے)۔

جواب (۲): سن رسیدہ حضرات کا نفقہ وعلاج دوسروں پر اس صورت میں واجب ہے جب وہ مجبور محض ہوں نہ اپنے پاس مال ہو اور نہ مال کمانے پر قادر ہوں (بہشتی زیور: ۲۸۶ حاشیہ شرح وقایہ: ۲/ ۱۸۴)۔

البتہ والدین کا معاملہ کچھ مختلف ہے، جیسا کہ سوال نمبر ا کے جواب میں گذرا۔

جواب (۳): وہ بڑے بوڑھے جن کا نفقہ چھوٹوں پر محتاجی کی صورت میں واجب ہے، اگر وہ محتاج نہ ہوں خود صاحب ثروت ہوں، تو زیادہ سہولت کے لئے یا دوسرے لوگوں پر خرچ کرنے کے لئے یا کچھ رقم محفوظ کرنے کے لئے زائد رقم کا مطالبہ نہیں کر سکتے ہیں، کیونکہ نفقہ واجب ہونے کی علت احتیاج وضرورت ہے اور قاعدہ ہے ''الضرورات تقدر بقدرھا'' (قواعد الفقہ/ ۸۹)۔

ضرورت بقدر ضرورت ہی ثابت ہوتی ہے، اور ظاہر ہے کہ زیادہ سہولت حاصل کرنا یا دوسروں پر خرچ کرنا یا کچھ رقم محفوظ کرنا ضرورت کی حد میں داخل نہیں ہے۔

جواب (۴): (الف) زیادہ آمدنی حاصل کرنے کے لئے ماں باپ کی اجازت کے بغیر وطن سے باہر جانا جائز نہیں، خاص کر جب والدین خدمت اور سہارے کے محتاج ہوں۔

(ب) مذکورہ صورت میں بہو کو اس کے ساس سسر کے ساتھ رہنے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا ہے (مستفاد از کفایت المفتی ۵ / ۲۴۳، آپ کے مسائل اور ان کا حل ۶/ ۳۴۲)۔

(ج) اگر بوڑھے والدین کے بیٹے نہ ہوں یا خدمت کے لائق نہ ہوں اور بیٹیوں کی خدمت کے وہ محتاج ہوں تو ایسی صورت میں بیٹیوں پر والدین کی خدمت ضروری ہے، اور ان کے شوہروں کے لئے منع کرنا صحیح نہیں ہے

''ولو أبوھا زمنا مثلا فاحتاج فعلیها تعاھده، وإن کان کافرا وإن أبی الزوج'' (درمختار ۲/ ۶۶۴)۔

[1] خادم حدیث وفتوی: جامعہ اسلامیہ جلالیہ ہوجائی، آسام۔

(اگر عورت کا باپ مثلاً اپاہج ہو اور بیٹی کی خدمت کا محتاج ہو تو بیٹی پر اس کی دیکھ بھال واجب ہے گو وہ کافر ہو اور شوہر اس کی اجازت نہ دیتا ہو)۔

جواب (۵): والدہ کے انتقال ہو جانے پر والد صاحب اگر دوسرا نکاح کرنا چاہیں تو اولاد کے لئے رکاوٹ بننا درست نہیں ہے، کیونکہ جس طرح انسان کو جوانی میں بیوی کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح بڑھاپے میں بھی بیوی کی ضرورت ہوتی ہے، تاکہ اس عمر کے سرد گرم کو سہنا آسان ہو جائے، اور اگر والد کو اپنی بیوی کی کفالت کی استطاعت نہ ہو تو ان کی مستطیع اولاد پر اپنے والد کی سہولت کے لئے ان کی شادی اور اخراجات کا انتظام کرنا ضروری ہے۔

لیکن ہمارے معاشرے میں عام طور سے اولاد رکاوٹ بنتی ہیں، یہ بالکل غلط اور قابل اصلاح امر ہے، اور والد کے ساتھ حسن سلوک کے بجائے بدسلوکی ہے جب کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "وبالوالدين إحسانا" (سورہ اسراء: ۲۳) (والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرو) وصاحبهما في الدنيا معروفا (والدین کے ساتھ دنیا میں اچھی زندگی گذارو)

''فتاویٰ عالمگیری'' میں ہے:

''وإن احتاج الأب إلى زوجة والابن موسر وجب عليه أن يزوجه أو يشتري له جارية'' (عالمگیری ۱/ ۵۶۵)۔

(اگر والد بیوی کا محتاج ہو اور بیٹا مالدار ہو تو اس پر والد کی شادی کرانا یا ان کے لئے باندی خرید دینا واجب ہے)۔

جواب (۶): جب تک والدین زندہ ہیں ان کی جائداد میں اولاد کا حق ثابت نہیں ہوتا پھر اولاد کے لئے والدین کی جائداد کا مطالبہ کرنا کیسے درست ہو سکتا ہے۔

''لا يجوز لأحد من المسلمين أخذ مال أحد بغير سبب شرعي'' (ردالمحتار ۴/ ۶۱)۔

(کسی مسلمان کے لئے دوسرے کا مال بلا کسی سبب شرعی کے لینا درست نہیں ہے)۔

اسی طرح مشہور حدیث ہے ''لا يحل مال امرء مسلم إلا بطيب نفسه''

اگر والدین کی معاشی حالت بہتر اور اولاد محتاج ہیں تو اولاد نرمی اور ادب کے ساتھ تعاون کی درخواست کر سکتے ہیں۔

جواب (۷): سوال میں ذکر کردہ صورت میں اپنے بزرگوں کو ایسے ہاسٹلوں میں قیام پر مجبور کرنا شرعاً و اخلاقاً نامناسب ہے، البتہ اگر وہ عمر دراز لوگ خوشی سے ایسے ہاسٹلوں میں رہنے کے لئے تیار ہوں تو کوئی حرج نہیں ہے۔

جواب (۸): مذکورہ صورت میں اگر فقر اور تملیک کی شرط پوری ہوتی ہے تو زکاۃ کی رقم استعمال کی جا سکتی ہے۔

جواب (۹): جو لوگ مذکورہ رعایتوں کے لئے مطلوب مقررہ حدِ عمر کو نہ پہنچے ہوں ان کے لئے ایسی رعایتوں سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں ہے، کیوں کہ اس میں کذب و غدر ہے۔

معذورین اور والدین کے حقوق - غور وفکر کے چند پہلو

مفتی عبدالرزاق قاسمی[1]

بوڑھوں کے حقوق:

اسلام میں بوڑھوں کے حقوق کی ادائیگی ایک اہم ترین عبادت ہے، اس لیے کہ عبادت تو اللہ تعالیٰ کی رضاء کے حصول کا نام ہے اور بوڑھوں کے حقوق کی ادائیگی اللہ کی رضا کے حصول کا بہترین ذریعہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: "وَقَضٰى رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدُوٓا إِلَّآ إِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا الخ" (سورۂ بنی اسرائیل: ۲۳)

"اَللّٰهُ الَّذِي خَلَقَكُم مِّن ضَعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِن بَعْدِ ضَعْفٍ قُوَّةً ثُمَّ جَعَلَ مِن بَعْدِ قُوَّةٍ ضَعْفًا وَشَيْبَةً" (سورۂ روم: ۵۴)

اور بوڑھوں کے حقوق کا دائرہ بڑا وسیع ہے، جس میں ان کا احترام، ان کے ساتھ احسان، ان کی لغزشوں سے صرف نظر، اور ہر طرح کی نیکی کا مظاہرہ کرنا شامل ہے۔

اولاد پر والدین کا نفقہ:

والدین کا نفقہ ان کی اولاد کے اوپر واجب ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "وبالوالدین إحسانا" (سورہ اسراء: ۲۳) اور "صاحبھما في الدنیا معروفا" (سورہ لقمان: ۱۵) ان کے اوپر خرچ کرنا احسان ومعروف پہلا مرحلہ ہے، اگر اولاد اپنے بوڑھے ماں باپ کر خرچ نہ کرے تو ان کی ایذاء کا سبب ہوگا جو از روئے شرع احرام ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے کلمہ "اف" کے ذریعہ ایذا پہنچانے سے بھی منع فرمایا ہے چہ جائے کہ ضرورت کے وقت ان کے اوپر خرچ نہ کرکے ایذا پہنچائی جائے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی اہمیت کو بیان کرنے کے لیے فرمایا:

"إن أطیب ما أكل الرجل من كسبه و ان ولده من كسبه"۔

علامہ ابن المنذر فرماتے ہیں کہ

"أجمع أهل العلم على أن نفقة الوالدين الفقيرين الذين لا كسب لهما ولا مال واجبة في مال الولد"

ہاں البتہ اگر والدین میں سے کوئی کماتا ہے اور اس سے اس کی ضرورت پوری ہوتی ہے تو اولاد سے ان کا نفقہ ساقط ہو جاتا ہے (فتح القدیر ۳/ ۳۴۷)۔

بوڑھوں کے نفقہ کے وجوب کی بنیادی شرائط:

اولاد یا عزیز واقارب کے ذمہ بوڑھوں کا نفقہ واجب ہونے کی شرط یہ ہے کہ کہ سن رسیدہ حضرات فقیر ہوں ان کے پاس ضروریات زندگی پورا کرنے کے لیے مال واسباب نہ ہوں، اگرچہ وہ کمانے پر قدرت رکھتے ہوں، مگر پھر بھی صرف کمانے پر مجبور نہیں کیا جائے گا، کیونکہ اس میں ان کی اہانت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ احسان کا حکم دیا ہے اور اولاد کے غنی ہونے کے باوجود ان کو کمانے پر مجبور کرنے میں ترک احسان اور ایذا رسانی بھی ہے جو کہ جائز نہیں ہے۔

[1] خادم الحدیث والافتا، جامعہ اسلامیہ عربیہ جامع مسجد، امروہہ، یوپی۔

درمختار میں ہے: ''وتجب علی موسرٍ یسار الفطرة النفقة لأصوله الفقراء ولو قادرین علی الکسب'' (درمختار ۲/ ۶۰۸)۔
صاحب ہدایہ فرماتے ہیں: ''المعتبر في إیجاب نفقة الوالدین مجرد الفقر'' (شامی ۲/ ۶۰۸)۔
دوسری شرط یہ بھی ہے کہ اولاد غنی ہو یا کمانے پر قادر ہو اور اس کی کمائی اس کے بیوی بچوں کے نفقہ سے بچ بھی جاتی ہو۔ تبیین الحقائق میں ہے:

''أن اللأب إذا کان عاجزًا والابن فقیر کسوب ینفق علی الأب فضل کسبه'' (تبیین الحقائق ۳/ ۶۴)۔

اور اگر اولاد غنی نہیں ہے یا کمانے پر قادر نہیں ہے تو پھر اس سے بوڑھے والدین کا نفقہ ساقط ہو جائے گا، البتہ اس کی بیوی بچوں کا نفقہ ابھی بھی ساقط نہیں ہوگا۔ صحیح مسلم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد منقول ہے:

''ابدأ بنفسك فتصدق علیها فإن فضل شئی فلأهلك، فإن فضل عن أهلك شئ فلذي قرابتك'' (حدیث-۹۹)
علامہ مرداوی فرماتے ہیں: ''الصحیح من المذهب وجوب نفقة أبویه وإن علوا، وأولاده وإن سفلوا بالمعروف، إذا فضل عن نفسه وامرأته'' (الانصاف ۹/ ۳۹۲)۔

اگر بوڑھے والدین محتاج نہ ہوں تو محض رقم محفوظ کرنے کے لیے اولاد سے زائد رقم کا مطالبہ کر سکتے ہیں یا نہیں؟ اس سلسلہ میں یہ تفصیل ملحوظ رکھنی چاہیے کہ اگر بوڑھے والدین کے زائد مال کا مطالبہ کرنے یا لینے میں اولاد کو ضرر نہیں ہے، اور یہ زائد مال ایک سے لے کر کسی دوسری اولاد کو بھی نہیں دے رہے ہیں، تو پھر زائد مال لے سکتے ہیں؛ لیکن اولاد کے ذمہ ایسی صورت میں دینا واجب نہیں ہے بلکہ محض تبرع اور احسان ہے؛ کیونکہ واجب اسی وقت ہے، جبکہ ان کو حاجت اور ضرورت ہو، جیسا کہ مستدرک حاکم اور سنن بیہقی کی ایک مرفوع روایت بھی ہے:

''عن عائشة قالت: قال رسول الله ﷺ إن أولادکم هبة الله لکم یهب لمن یشاء إناثا ویهب لمن یشاء الذکور، فهو وأموالهم لکم إذا احتجتم''

اس حدیث سے یہ بات واضح ہوگئی کہ اگر والدین کو ضرورت نہ ہو تو وہ محض جمع کرنے کے لیے اولاد سے جبرًا مال نہیں لے سکتے۔

زیادہ آمدنی کے لیے لڑکوں کا اپنے بوڑھے والدین کو چھوڑ کر دوسری جگہ جانا:

محض زائد آمدنی کے حصول کے لیے خدمت کے محتاج بوڑھے والدین کو چھوڑ کر دوسری جگہ کا سفر کرنا جائز نہیں ہے، کیونکہ زائد آمدنی کا حصول کوئی فرض تو ہے نہیں، جب جہاد جیسے عظیم الشان کام کے لیے خدمت کے محتاج والدین کو چھوڑ کر جانے سے منع کیا گیا ہے، تو پھر محض اس وجہ سے کہ دوسری جگہ پر جا کر آمدنی زیادہ حاصل ہو جائے گی درست نہ ہوگا یا بیرون ملک چلے جانا والدین کی ایذا کا سبب بنے گا۔ حضرات فقہاء کے یہاں یہ اصول بھی ہے کہ برّ الوالدین، نفلی عبادات، نماز، صدقہ، حج، جہاد وغیرہ پر مقدم ہے، ظاہر بات ہے کہ زیادہ آمدنی کا حصول ایک نفلی عمل سے کم درجہ کا ہے، اس کے لیے اپنے محتاج ضرورت مند بوڑھے والدین کو چھوڑ کر سفر پر جانا درست نہ ہوگا۔ جہاں تک علامہ سرخسیؒ کی اس عبارت کا تعلق ہے جو انھوں نے ''شرح السیر الکبیر'' میں لکھی ہے:

''کل سفر أراد الرجل أن یسافر غیر الجهاد لتجارة أو حج أو عمرة فکره ذلك أبواه، وهو لا یخاف علیهما الضیعة، فلا بأس أن یخرج، لأن الغالب في هذه الأسفار السلامة ولا یلحقها في خروجه مشقة شدیدة''

تو اس عبارت میں بھی یہ قید لگی ہوئی ہے کہ آدمی کے دوسری جگہ جانے کی وجہ سے والدین کو مشقت لاحق نہ ہو اور صورت مسئولہ میں یہ وضاحت ہے کہ بوڑھے والدین خدمت کے محتاج ہیں اگر بیٹا زیادہ پیسہ کمانے کی غرض سے کسی دوسرے شہر یا دوسری ریاست کا سفر کر رہا ہے تو بوڑھوں کی دشواریاں اور زیادہ بڑھ جاتی ہیں یعنی اس کے جانے میں ان کے لیے مشقت ہے۔ لہٰذا اگر والدین کو مشقت نہ ہو اور ان کے ضائع ہونے کا اندیشہ نہ ہو تو پھر جانے کی اجازت دی جائے گی یا پھر یہ صورت ہو کہ اس کو اپنے شہر میں کوئی ملازمت یا کاروبار نہ مل رہا ہو اور دوسری جگہ کاروبار مل جاتا ہے اور یہ اپنی اولاد، بیوی اور والدین کے اخراجات کے لیے محتاج ہے تو پھر دوسری جگہ کا سفر کر سکتا ہے۔

بہو پر ساس سسر کی خدمت واجب نہیں ہے:

ساس کو بہو کی خدمت کی ضرورت ہو تب بھی بہو کے ذمہ ساس سسر کی خدمت کرنا واجب نہیں ہے، اگر وہ خدمت سے انکار کر دیتی ہے تو گنہ گار

نہ ہوگی۔شوہر کوبھی حق نہیں کہ وہ اپنی بیوی کو مجبور کرے کہ میرے والدین کی خدمت کر، اس لیے کہ زوجیت کے فرائض ولوازمات میں سے یہ نہیں ہے کہ عورت شوہر کے اہل خانہ کی خدمت بھی کرے، ہاں! اگر عورت اپنے شوہر کے والدین کی خدمت کرتی ہے تو یہ اس کی طرف سے تبرع اور احسان ہے، جو اس کے لیے باعث اجر وثواب ہوگا، اور اس کو اللہ تعالیٰ کی ذات سے امید رکھنی چاہیے کہ اگر آج یہ اپنی ساس کی خدمت کرے گی تو کل کو اس کی بہو اس کی خدمت گزار بنے گی۔

ماں باپ کی خدمت بیٹوں اور بیٹیوں دونوں پر واجب ہے:

بڑھاپے کے وقت یا مرض وبیماری کے وقت والدین کی خدمت اس کی مذکر ومؤنث اولاد دونوں ہی پر واجب ہے، اگر محتاج والدین کا صرف شادی شدہ بیٹا ہو یا شادی شدہ بیٹی ہو تو بیٹا اور بیٹی دونوں ہی کے ذمہ ہے کہ وہ والدین کی خدمت کریں، الموسوعۃ الفقہیہ میں ہے

''أما خدمة الولد لوالده أو استخدام الأب لولده فجائز بلا خلاف، بل إن ذلك من البر المأمور به شرعًا. ويكون واجبًا على الولد خدمة أو إخدام والده عند الحاجة''

لیکن یاد رہے کہ زوجہ کے ذمہ شوہر کا حق والد کے حق سے مقدم ہے، پس اگر شوہر اپنی بیوی کو اجازت نہ دے کہ وہ اپنے والد کی خدمت کرے تو پھر یہ عورت اجرت پر کسی سے اپنے والدین کی خدمت کرائے گی۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ فرماتے ہیں:

''المرأة إذا تزوجت كان زوجها أملك بها من أبويها و طاعة زوجها عليها أوجب... فليس لها أن تخرج من منزله إلا بإذنه سواء أمرها أبوها أو أمها أو غير أبويها باتفاق الأئمة'' (فتاویٰ ابن تیمیہ)۔

علامہ ابن حجر ہیثمی الفتاوی الفقہیہ الکبری میں ان ضروری احوال کو بیان کرنے کے بعد جن کی وجہ سے عورت گھر سے باہر نکل سکتی ہے، فرماتے ہیں:

''لا لعيادة مريض و إن كان أباها ولا لموته و شهود جنازته، قاله الحموي''۔

اسی طرح علامہ ابن قدامہ نے المغنی میں لکھا ہے:

''و للزوج منعها من الخروج من منزله إلى مالها منه بد، سواء أرادت زيارة والديها أو عيادتهما أو حضور جنازة أحدهما، قال أحمد في امرأة لها زوج و أم مريضة: طاعة زوجها أوجب عليها من أمها إلا أن يأذن لها''

ان نصوص کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ عورت اپنے شوہر کی اجازت کے بغیر اپنے بوڑھے والدین کی خدمت کے لیے نہیں آئے گی، البتہ اگر وہ اجازت نہ دے تو پھر خادم کے ذریعہ اپنے والدین کی خدمت کرائے گی۔

بوڑھے باپ کی بیوی کا نفقہ بھی اولاد پر ہے:

اگر بوڑھا باپ فقیر ہو اور اپنی بیوی کے اخراجات کی ادائیگی پر قادر نہ ہو اور اس کے مالدار اولاد موجود ہے جو کہ دوسری بیوی سے ہے تو ایسی حالت میں غنی اولاد کے اوپر واجب ہے کہ وہ اپنے بوڑھے والد کی بھی کفالت کرے اور اس کی اس زوجہ کی بھی جو اس اولاد کی ماں نہیں ہے، بلکہ اگر باپ کی اس دوسری بیوی سے اولاد ہو جائے تو ان کا نفقہ بھی اسی غنی اولاد پر ہوگا، علامہ ابن قدامہ المغنی میں تحریر فرماتے ہیں:

''وكل من لزمه إعفافه لزمته نفقة زوجته؛ لأنه لا يتمكن من الإعفاف إلا بذلك'' (المغنی ۸/ ۱۷۳)۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ سے سوال کیا گیا کہ ایک شخص کمانے سے عاجز ہو گیا اور اس کے پاس اپنے اخراجات کے لیے مال نہیں ہے اور نہ ہی اپنی بیوی بچوں کے نفقہ کا وہ متحمل ہے تو کیا اس کے غنی لڑکے پر ضروری ہے کہ وہ اپنے عاجز والد اور اس کے بیوی بچوں کی کفالت کرے؟ شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے جواب دیا کہ ہاں! اگر وہ لڑکا غنی ہے، اگر اس نے کفالت نہیں کی تو وہ عاق سمجھا جائے گا۔

ملاحظہ ہو ''نعم، على الولد الموسر أن ينفق على أبيه و زوجة أبيه و على إخوته الصغار، و إن لم يفعل ذلك كان عاقًا لأبيه، قاطعًا لرحمه، مستحقًا لعقوبة الله تعالى في الدنيا والآخرة'' (مجموع الفتاوی ۳۴/ ۱۰۱)۔

فتاویٰ شرعیہ میں ہے: ''فإن كان لها زوجه فنفقتها على زوجها، لا يشاركه فيها أحد مادام غنيًا. فإن كان فقيرًا عاجزًا عن الكسب فإن كان له أولا قادرين على النفقة عليه وجب على أولاده الانفاق عليه و على زوجته مادام محتاجًا إلى هذه الزوجة'' (الفتاویٰ الشرعیه ۱۹۰/۳)۔

''و يجب على الولد الموسر أيضًا نفقة خادم الوالدين و نفقة خادم زوجة الأب كما يجب عليه إعفاف أبيه بزوجة أو أكثر إن تعفه الواحدة'' (نظام النفقات في الشريعة الاسلامية از: شیخ أحمد ابراهيم)۔

''درمختار'' میں ہے: ''و عليه نفقة زوجة أبيه أي في رواية و في أخرى إن كان الأب مريضًا أو به زمانة يحتاج للخدمة'' (ردالمحتار، باب الفقة، مطلب في نفقة زوجة الأب ۶۱۶/۲)۔

ضرورت منداولاد کا نفقہ والد کے ذمہ ہے:

اگر والدین کی حالت اچھی ہے وہ غنی ہیں اور اولاد اگرچہ شادی شدہ ہے؛ لیکن محتاج ہے، مال کی ضرورت مند ہے تو والد کی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ اپنی ضرورت منداولاد پر خرچ کرے اور اولاد کو حق ہے کہ وہ والد سے اپنے نفقہ کا مطالبہ کرے، اور اگر اولاد کمانے پر قادر ہے تو اس کو کمانے پر مجبور کیا جائے گا کہ وہ کمائے اور اپنے اخراجات کو پورا کرے۔

حضرت امام احمد بن حنبلؒ سے منقول ہے:

''إذا بلغ الولد معسرًا أو لا حرفة له لا تسقط نفقته عن أبيه إذا لم يكن له كسب ولا مال''

کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ میں حنفیہ کے مسلک کو نقل کرتے ہوئے علامہ جزائری فرماتے ہیں:

''أن يكون طالب النفقة صغيرًا فقيرًا إذا كان ذكرًا، و فقيرًا إذا كان انثى و لو كبيرة. فإذا كان ذكرًا كبيرًا قادرًا على الكسب، فلا تجب له نفقة، نعم إذا كان عاجزًا عجزًا يمنعه عن الكسب فإن له النفقة'' (كتاب الفقه على المذاهب الاربعه ۲۸۴/۴)۔

حاصل یہ ہے کہ اصلاً تو بالغ اولاد پر اپنا نفقہ خود پر عائد ہوتا ہے؛ لیکن اگر اس کا کاروبار نہیں ہے اور وہ کمانے سے عاجز ہے تو اپنے غنی والدین سے نفقہ کا مطالبہ کرسکتا ہے؛ لیکن ان کی زندگی میں ان کے مال کی تقسیم کا مطالبہ نہیں کرسکتا ہے، وہ مال ان کے والدین کا ہے۔ ان کو اس میں تصرف کا اختیار ہے اولاد کا حق میراث تو بعد وفات ثابت ہوگا، اگر حیات میں مطالبہ کریں گے تو صرف نفقہ کا مطالبہ کریں گے نہ کہ تقسیم میراث کا۔

بوڑھوں کے ہاسٹلوں کے بارے میں شرعی نقطۂ نظر:

یہاں دو باتیں ہیں: ایک تو عمر رسیدہ لوگوں کے لیے ہاسٹل کا بنانا، دوسری اولاد کا اپنے بوڑھے والدین کو ایسے ہاسٹلوں میں قیام پر مجبور کرنا۔

جہاں تک پہلی بات کا تعلق ہے تو ایسے ہاسٹلوں کا بنانا شرعاً جائز اور درست ہے اور اس میں بہت سے فوائد ہیں، اس لیے کہ کتنے عمر رسیدہ لوگ ایسے ہیں کہ مجبوری اور محتاجگی کے وقت ان کا خیال رکھنے والا کوئی نہیں ہوتا، نہ اولاد ہے جو ان کی خبر گیری کرے اور اگر ہے بھی تو وہ نافرمان اور عاق ہے اپنے بوڑھے والدین پر ظلم کرتی ہے اور نہ کوئی ایسا قریبی رشتہ دار ہے جو ان کی خدمت کرسکے یا ان کی کفالت کرسکے، وہ سڑکوں اور گلیوں میں رات گزارنے اور بھیک مانگنے پر مجبور ہوجاتے ہیں، ایسے بوڑھوں کی خدمت کے لیے اس طرح کے ہاسٹلوں کا قیام یقیناً مفید ہے۔

اور جہاں تک دوسری بات کا تعلق ہے تو انسانیت اور اخلاق حسنہ کا تقاضہ یہ ہے کہ آدمی اپنے بوڑھے والدین کی خدمت کو اپنے لیے سعادت تصور کرے؛ اس لیے کہ بوڑھوں کی خدمت اللہ تعالیٰ کی رضاء کا سبب ہے، اللہ نے برالوالدین کا بار بار حکم دیا ہے۔ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے تو چچا کو بھی باپ کی مانند قرار دیا ہے، اس سے ماں باپ کے مقام و مرتبہ کا اندازہ کیا جاسکتا ہے، جنھوں نے بچپن سے لے کر اس کے بالغ ہونے اور برسر روزگار ہونے تک اس کی مکمل خبر گیری کی اور اس کی راحت کی خاطر ہر طرح کی مشقتوں کو برداشت کیا۔ لہٰذا کسی غیرت مند انسان کے لیے قطعاً جائز نہیں کہ وہ ایسے وقت میں جبکہ بوڑھے والدین خدمت کے محتاج ہیں، اپنے سے دور کرکے ہاسٹلوں میں ڈال دے اور قطع رحمی کا مظاہرہ کرے۔

اس لیے جو شخص والدین کی خدمت پر قادر ہو اس کو شرعاً اس بات کی اجازت نہ دی جائے کہ وہ اپنے بوڑھے والدین کو ہاسٹل میں داخل کرے، ایسا کرنا باب عقوق سے ہے جو اکبر کبائر ہے جیسا کہ حدیث میں ہے:

''سئل رسول الله صلی الله علیه وسلم عن أکبر الکبائر قال: الشرك بالله وعقوق الوالدین''

ہماری اسلامی شریعت ہمیں اس بات کی ترغیب اور تعلیم دیتی ہے کہ ہر عمر رسیدہ کے ساتھ اچھائی کا برتاؤ کیا جائے اگرچہ ہم اس سن رسیدہ کو جانتے بھی نہ ہوں۔

حاصل یہ ہوا کہ محتاج لوگوں کے لیے اس طرح کے ہاسٹل بنانا شرعاً جائز ہیں؛ لیکن خدمت پر قادر لوگوں کے لیے جائز نہیں کہ وہ اپنے بوڑھے والدین کو ایسے ہاسٹلوں میں داخل کریں۔

یہ ہاسٹل تو درحقیقت ایسے افراد کے لیے بنائے جائیں جن کی اولاد، رشتہ داروں اور متعلقین میں سے کوئی خدمت کرنے والا نہ ہو اور وہ راستوں اور گلیوں میں زندگی گزارنے پر مجبور ہو جائیں۔

آج ہمیں اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ ہم اپنے بوڑھے والدین کی خدمت کریں، تاکہ ہمارے بچے ہمارے اس حسن سلوک کو دیکھ کر کل ہمارے ساتھ یہی معاملہ کریں، نیز ہمیں اپنی نسل کو والدین کے حقوق اور ان کے احترام کی حقیقت سے بار بار آگاہ کرنا چاہیے، کیونکہ ہم میں سے ہر ایک کو اس مرحلہ سے گزرنا ہے۔

بوڑھوں کی مالِ زکوٰۃ سے کفالت:

اگر ایسے بوڑھے ہوں جن کی اولاد یا قریبی رشتہ دار موجود نہ ہوں جو ان کی کفالت کر سکیں، تو ان کی کفالت کے لیے زکوٰۃ کی رقم کو استعمال کرنا جائز ہے بلکہ فرض کفایہ ہے۔ ان کے اوپر خرچ کرنے میں ان سے بے چینی اور مشقت کا دور کرنا بھی ہے اور ایک مسلمان بھائی کی مدد بھی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی ترغیب دی ہے۔ ارشاد ہے:

''من نفس عن مؤمن کربةً من کرب الدنیا نفس الله عنه کربة من کرب یوم القیامة...'' (ترمذی)۔

نیز انسان کی زکوٰۃ اور صدقہ کا زیادہ مستحق وہی ہوتا ہے جو زیادہ محتاج اور ضرورت مند ہو جس کے پاس اپنی کفالت کے لیے مال نہ ہو اور جس کے اوپر اس کا نفقہ ہوتا ہے وہ بھی موجود نہ ہو تو ایسے لوگوں پر خرچ کرنے میں زیادہ اجر و ثواب ہوگا؛ لیکن یہاں یہ بھی یاد رہے کہ ایسے ہاسٹلوں میں وہ لوگ مالِ زکوٰۃ ہرگز نہ دیں جن کے اصول ان میں مقیم ہیں، کیوں کہ فروع کی زکوٰۃ اصول کے لیے حلال نہیں ہے۔

حکومت کی رعایتوں سے بوڑھوں کے لیے فائدہ اُٹھانا:

حکومت عمر رسیدہ لوگوں کے لیے جو رعایتیں فراہم کرتی ہے، ان کے لیے ان سے فائدہ اُٹھانے میں شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے؛ بلکہ یہ ان کا حق ہو جاتا ہے جس کو وہ وصول کر رہے ہیں۔

سن رسیدہ افراد اور معذوروں کے احکام

مفتی نذیر احمد یونس کر جیکر حسینی (شافعی)[1]

انسانی زندگی کا سب سے آخری مرحلہ جسے بوڑھاپہ کہا جاتا ہے، یہ مرحلہ انسان کے لئے دشوار کن اور صبر آزما بھی ہوتا ہے، اس عمر میں ان بوڑھوں اور ضعیفوں کے ساتھ حسن سلوک اور ان کی خدمت کی اسلام میں جو اہمیت ہے وہ بالکل واضح ہے، لیکن اس ترقی یافتہ زمانہ میں معاشرہ میں بوڑھے اور سن رسیدہ حضرات ایسے مظلوم بن گئے ہیں گویا وہ اس زمین پر اپنے آپ کو ایک بوجھ تصور کرنے لگ جاتے ہیں، ایسی صورت حال میں اولاد اور بوڑھے والدین کے درمیان جو رشتہ اور حقوق ہیں ان سے متعلق چند سوالات جو خاص طور پر بوڑھوں کے متعلق پیش کئے گئے ہیں ان کے جوابات فقہ شافعی کی روشنی میں درج ذیل سطور میں مرقوم ہیں۔

جواب نمبر (۱) اللہ تعالی کا فرمان ہے "ووصينا الإنسان بوالديه إحسانا" (سورۂ عنکبوت: ۸) کہ ہم نے والدین کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا ہے (احقاف: ۱۵)، اس آیت کی روشنی میں والدین کے ساتھ حسن سلوک اور احسان کا حکم واضح ہے، یہی وجہ ہے کہ شریعت اسلامی میں جب والدین بوڑھے ہو جائیں یا کسی مرض یا عذر کی بناء پر کمائی سے عاجز ہوں تو ان کا خرچہ اور نفقہ اولاد کے ذمہ واجب ہوتا ہے، لیکن بسا اوقات والدین اس قدر کمزور نہیں ہوتے کہ وہ کمانے سے بالکل عاجز ہو جائیں بلکہ کسی طرح کما کر اپنا گذر بسر کر سکتے ہیں، لیکن وہ کمانہیں رہتے ہیں، اس کے باوجود بھی والدین کے ساتھ حسن سلوک کا تقاضہ یہ ہے کہ ان کو کمانے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا، جب کہ اولاد مالدار ہو اور اپنے والدین کے اخراجات مکمل کرنے کی سکت رکھتی ہو، لہذا عمر کے اس حصہ میں ان کو راحت پہنچانے کے لئے ان پر خرچ کرنا ضروری ہے، اس لئے کہ مالی فراوانی کے باوجود والد کو کمانے پر مجبور کرنا خود اولاد کے حق میں کسی طرح مناسب نہیں ہے۔

علامہ غمراویؒ فرماتے ہیں:

"وتجب لفقير غير مكتسب إن كان زمنا، وكذا العاجز بمرض أوعمى أوصغيرا أو مجنونا وإلا بأن قدر على الكسب ولم يكتسب فأقوال: احسنها تجب مطلقا للأصل والفرع، أو لا تجب مطلقا، والثالث تجب لاصل لا فرع، قلت الثالث أظهر" (السراج الوهاج: ۴۷۳)۔

دکتور محمد مطرحیؒ فرماتے ہیں:

"وإن كان من الأصول وجبت على الأظهر نفقته؛ لأن الله تعالى أمر بمصاحبتهم فى الدنيا بالمعروف وليس من المعروف ان يكلفوا الاكتساب مع كبر السن ولحرمة الوالدين" (المجموع: ۱۹/ ۳۰۲)۔

علامہ زحیلیؒ فرماتے ہیں:

أن يكون الأصل فقيرا أوعاجزا عن الكسب، فإن كان قادرا على الكسب، فتجب أيضا نفقته عند الشافعية فى الأظهر؛ لأن الله تعالى أمر بالإحسان إلى الوالدين وفى إلزام الاباء بالاكتساب مع غنى الأبناء ترك للإحسان إليهم وإيذائهم وهو لايجوز ويقبح بالإنسان أن يكلف قريبه الكسب مع اتساعه ماله" (الموسوعة الفقه الاسلامى: ۸/ ۷۸۲) نیز دیکھئے: روضة الطالبين: ۹/ ۸۴، البيان: ۱۱/ ۲۱۹)۔

[1] جامعہ حسینیہ عربیہ شریوردھن۔

جواب نمبر (۲):

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

''انت ومالك لوالدك، إن اولادكم من أطيب كسبكم فكلوا من كسب أولادكم''

کہ تم اور تمہارا مال والد کے لئے ہے، بے شک تمہاری اولاد تمہاری بہترین کمائی ہے، تم تمہاری اولاد کی کمائی میں سے کھاؤ (سنن ابی داود: ۳۵۳۰)

یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ اولاد پر والدین کا نفقہ واجب ہے، لیکن اولاد پر وجوب نفقہ کے لئے چند شرائط کا پایا جانا ضروری ہے۔

(۱) فقر و تنگ دستی: والدین کے پاس اتنا مال نہ ہو کہ جس سے ان کی ضرورتیں پوری ہو سکیں چاہے وہ کمانے پر قادر ہوں یا نہ ہو۔

(۲) اولاد مالدار ہو: کہ اولاد کے پاس اپنا اور اپنی بیوی کے نفقہ سے زیادہ مال موجود ہو تو اس صورت میں والدین کا نفقہ اولاد پر واجب ہوگا۔

(۳) والدین آزاد ہو: اگر والدین غلام ہیں تو ان کا نفقہ آقا پر واجب ہوگا۔

(۴) والدین کمانے سے عاجز ہوں، چاہے لنگڑے لولے ہونے کی بناء پر یا کسی دائمی مرض کی بناء پر، یا پھر مجنون یا دائمی بے ہوش ہونے کی بناء۔

واضح رہے کہ والدہ کا نفقہ اولاد پر اس وقت واجب ہوگا، جبکہ والد اس پر خرچ کرنے سے عاجز ہو، یا والد کا انتقال ہو چکا ہو، البتہ اختلاف دین نفقہ کے سقوط کا سبب نہیں ہے، لہذا مسلمان اولاد پر اپنے غیر مسلم والدین (جب کہ وہ مرتد نہ ہوں) کا نفقہ واجب ہوگا۔

اصحاب فقہ المنہجی فرماتے ہیں:

''يشترط لوجوب نفقة الأصول على الفروع توافر الشروط التالية: أولا: أن يكون الفرع موسرا بمايزيد عن الضرورى من نفقته ونفقة زوجته يومه وليلته، فلو كان الذى عنده من النفقة لايكفى لأكثر من حاجته وحاجة زوجته مدة يوم وليلة. لم يكلف الإنفاق على أبيه وأمه، لأن نفقة الفقير لا تجب على فقير مثله. وثانيا: أن يكون لاصل فقيرا، والمراد بالفقر هنا: أن لا يكتسب ما يسد حاجته الضرورية، سواء قادرا على الكسب، أم لا.۔ثالثا: أن لا تكون الأم مكفية بنفقة زوجها فعلا أوحكما ومعنى هذاالشرط: ان نفقة الأم إنما تجب على ولدها فى حالتين، الحالة الاولى: أن يكون والده عاجزا عن الإنفاق عليها، الحالة الثانية: أن يكون والده متوفى، وهى خلية عن الزوج...'' (الفقه المنهجی: ۲/۱۶۸)۔

''تقدم أنه على الوالد نفقة الولد ومن علا من جهتهما من جد وجد، ووجوب النفقة معتبرة بشروط فى الوالدين، وشروط فى الولد، ففى الوالد: تشترط الحرية، فاذا كانت نفقته على سيده،۔۔ الفقر۔ فإن كان غنيا بمال أو مكتسبا ببدنه لم تجب على الولد نفقته، لأن النفقة مواساة تجب مع الحاجة وتسقط مع القدرة على الكفاية كما يشترط العجز عن الاكتساب، أما بالخلقة كالزمانة، وأما بالاحكام كالجنون'' (المجموع ۱۹۶/۲۰۸-۲۰۹)۔

جواب نمبر (۳):

بوڑھے والدین یا خاندان کے وہ بڑے جن کا نفقہ ان کے چھوٹوں پر تنگدستی کی صورت میں واجب ہوتا ہے، وہ صرف بقدر کفایت ہی واجب ہوتا ہے، اس سے زیادہ رقم دینا واجب نہیں ہے، لہذا اگر والدین یا خاندان کے بڑے افراد محتاج نہ ہوں، بلکہ مالدار ہوں تو ایسی صورت میں وہ اپنی اولاد سے یا ان لوگوں سے جن پر تنگدستی کی وجہ سے نفقہ واجب ہوتا ہے زیادہ سہولت یا دوسروں پر خرچ کرنے کے لئے یا کچھ رقم محفوظ کرنے کے لئے زائد رقم کا مطالبہ نہیں کر سکتے، اگر کریں تب بھی اولاد پر زائد رقم دینا واجب نہیں ہے۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں:

''نفقة القريب لا تتقدر، بل هى قدر الكفاية۔ لأنها تجب لتزجية الوقت، ودفع حاجة الناجزة فتعتبر

الحاجة وقدرها، حتى لواستغنى فى بعض الايام بضيافة وغيرها لم يجب'' (روضة الطالبين ٦/ ٤٩١)۔

''ولايستحق القريب النفقة على قريبه من غير حاجة فان كان موسرا لم يستحق لانها تجب على سبيل المواساة والموسر مستغن عن المواساة'' (المجموع ١٩/ ٢٩٧، موسوعة الفقه الاسلامي وادلته ٨/ ٨٥)۔

جواب نمبر (۴):

(الف) جس طرح ضعیف اور کمزور والدین کا نفقہ مالدار اولاد پر واجب ہے اسی طرح ان کی خدمت بھی اولاد پر واجب ہے، امام شافعیؒ فرماتے ہیں:

''ومن نفقتهم الخدمة'' (الام ٦/ ٢٢٦)، لہٰذا اگر کسی کے والدین چلنے پھرنے اور اٹھنے بیٹھنے اور دیگر ضروریات کو پوری کرنے سے عاجز ہوں تو اس صورت میں ان کی اور اپنی کفالت اپنے وطن یا اپنے علاقہ میں ممکن نہ ہو تو اس شرط کے ساتھ دوسرے علاقوں میں کسب معاش کے لئے جانے کی اجازت ہے کہ وہ اپنے والدین کی خدمت کے لئے کسی خادم کا انتظام کرے، اور اس کی اجرت ادا کرے تاکہ والدین کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہو۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں:

''وإذا زمن الأب أو الأم ولم يكن لهما مال ينفقان منه على أنفسهما انفق عليهما الولد لأنهما قد جمعا الحاجة والزمانة التي لايحترفان معهما والتي مثل حال الصغر أو أكثر ومن نفقتهم الخدمة كما وصفت'' (الام ٦/ ٢٢٦)۔

امام عمرانیؒ فرماتے ہیں:

''إذا كان له ابنا موسران، فحضر أحدهما وغاب الآخر كان على الحاضر نصف النفقة. فإن كان للغائب مال أنفق منه نصف النفقة'' (البيان ١١/ ٢٢٦)۔

(ب) حضرت معاویہ قشیریؓ فرماتے ہیں: کہ میں نے پوچھا اے اللہ کے رسول: ﷺ ہماری بیوی کا ہم پر کیا حق ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم اس کو کھلاؤ جب تم کھاؤ اور اس کو پہناؤ جب تم پہنو (سنن ابی داود: ۲۱۴۲)۔

مذکورہ روایت سے پتہ چلا کہ بیوی کا نان نفقہ شوہر پر واجب ہے، اور بیوی پر اپنے شوہر کی خواہشات کی تکمیل واجب ہے، البتہ خدمت واجب نہیں ہے، بلکہ اخلاقی فریضہ ہے، لہٰذا جب شوہر کی خدمت واجب نہیں تو شوہر کے والدین کی خدمت بھی بدرجہ اولی واجب نہ ہوگی بلکہ اخلاقی فریضہ کے طور پر ایک بہو کو اپنے ساس اور سسر کی خدمت کرنا چاہئے۔ لیکن اگر بیوی والدین کے ساتھ رہنا نہ چاہتی ہو تو شوہر بیوی کو والدین کے ساتھ رہنے پر مجبور نہیں کرسکتا، اس لئے کہ شریعت نے شوہر پر بیوی کے مطالبہ پر اسے الگ گھر میں رکھنا واجب قرار دیا ہے، جب کہ بیوی کے لئے الگ رہنا ناگزیر ہو۔

امام عمرانیؒ فرماتے ہیں:

''ويجب لها مسكن لقوله تعالى "وعاشروهن بالمعروف" (نساء: ١٩)۔

ومن المعروف أن يسكنها بمسكن، ولأنها تحتاج إليه'' (البيان ١١/ ١٨٠)۔

''ولاتجب على الزوجة الخدمة للزوج في الخبز والطبخ والعزل وغير ذلك؛ لأن المعقود عليه هو الاستمتاع. دون هذه الأشياء'' (البيان ٩/ ٤٦٣)۔

(ج) اللہ تبارک وتعالی کا ارشاد ہے "وعاشروهن بالمعروف" کہ اپنی بیویوں کے ساتھ اچھے سلوک کے ساتھ زندگی بسر کرو (نساء: ۱۹)۔

اس آیت کی روشنی میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ شوہر کے لئے اپنی بیوی کو والدین کی عیادت وزیارت سے روکنے کا حق حاصل ہونے کے باوجود نہ روکنا مستحب ہے، اس لئے کہ ایسے موقع پر جب والدین کو اپنی خدمت کے لئے بیٹی کی ضرورت ہو شوہر بیوی کو روکے گا تو اس بات کا امکان ہے کہ میاں بیوی کے تعلقات میں نفرت اور ناخوشگواری پیدا ہوگی جو طرفین کے لئے تکلیف کا سبب ہے، اور بعض علماء نے تو بیوی کے لئے ایسی

صورت میں شوہر کی اجازت کے بغیر بھی والدین کی خدمت کے لئے جانے کی اجازت دی ہے۔

امام الحرمینؒ فرماتے ہیں:

''ولا یمنعها عن زیارة الأبوین وعیادتهما'' (نهایة المطلب ۱۰/ ۲۰۴)۔

''أما فی حال مرض أبویها فله منعها عن عیادتهما وکذلك لو ماتا کان له منعها من حضور جنازاتهما'' (المجموع: ۱۸/ ۹۵)۔

علامہ عمرانیؒ فرماتے ہیں: ''ویستحب للزوج إلا یمنعها من ذلك؛ لأن ذلك ربما أدی العداوة بینهما'' (البیان ۹/ ۳۵۶، الحاوی الکبیر ۹/ ۵۸۵، الفقه الاسلامی وادلته ۷/ ۳۳۴)۔

جواب نمبر: (۵):

جوانی کی طرح اگر بوڑھاپے میں والد کو اپنی خواہش کی تکمیل یا اپنی ضروریات کی تکمیل کے لئے بطور سہارا بیوی کی ضرورت ہو تو پھر اولاد کا والد کو نکاح سے روکنا درست نہیں ہے، یہاں تک کہ اگر والد مالی وسائل کی کمی کی بناء پر نکاح پر قادر نہ ہو اور اولاد مالدار ہوں تو اولاد پر واجب ہے کہ اپنے والد کی عفت کی خاطر اور اس کی آسانی کے لئے اس کا دوسرا نکاح کرا دیں، معاشرتی ملامت اور جگ ہنسی کے خوف سے نکاح میں رکاوٹ بننا شرعاً درست نہیں ہوگا۔ البتہ اگر باپ خود نکاح پر قادر ہے تو بیٹوں پر اس کا نکاح کرانا ضروری نہیں ہے۔ نیز اگر نکاح کے بعد والد اپنی بیوی کا نفقہ برداشت کرنے سے عاجز ہو تو اس صورت میں والد کے ساتھ اس کی بیوی کا نفقہ بھی اولاد پر واجب ہوگا۔

شیخ زکریا انصاریؒ فرماتے ہیں:

إعفاف الأب الحر ولو کافرا لا الولد واجب علی ابنه؛ لأنه من وجوه حاجاته المهمة فیجب علی ابنه القادر علیه کنفقته. ولئلا یعرضه للزنا، وذلك لایلیق بحرمة الأبوة، ولیس من المصاحبة بالمعروف المامور بها'' (اسنی المطالب ۴/ ۶۰۷)۔

''لایجب اعفاف اب قادر علی اعفاف نفسه ولو علی سریة ومن کسبه لانه بذلك مستغن عن ولده۔ نعم إن احتاج للنکاح لا للتمتع بل للخدمة لمرض أونحوه قال ابن الرفعة وجب اعفافة. قال السبکی:۔ هوصحیح إذا تعینت الحاجة إلیه لکنه لایسمی إعفافا'' (اسنی المطالب ۴/ ۶۰۸)۔

علامہ عمرانیؒ نقل کرتے ہیں:

''تجب نفقة الاب علی الولد لقوله تعالی وقضی ربك ألا تعبدوا إلا إیاه'' (الاسراء، البیان ۱۱/ ۵۱۲)۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں:

''ومن وجبت علیه نفقته بالقرابة وجبت نفقته علی قدر الکفایة؛ لأنها تجب للحاجة فقدرت بالکفایة وإن احتاج إلی من یخدمه وجبت نفقة خادمه وإن کانت له زوجة وجبت نفقة زوجته؛ لأن ذلك من تمام الکفایة'' (المجموع ۱۹/ ۳۰۶)۔

''إن الابن یلزمه إعفاف أبیه علی المشهور وأنه إذا اعفه بزوجة أوملکه جاریة لزمه نفقتها ومؤنتها حیث تلزمه نفقة الأب'' (روضة الطالبین ۹/ ۸۶)۔

جواب نمبر (۶):

اللہ تعالی کا ارشاد ہے "للرجال نصیب مما ترك الوالدان والأقربون" (سورہ نساء: ۷) کہ والدین اور قرابت داروں نے جو مال چھوڑا ہے اس میں مردوں کے لئے حصہ ہے (النساء: ۷)، مذکورہ آیت سے پتہ چلا کہ اولاد کے لئے والدین کے مال میں بطور میراث والدین کے انتقال کے بعد حق ثابت ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ میراث کی تقسیم کے لئے ایک بنیادی شرط مورث کا مرنا بھی ہے، لہذا والد کی زندگی میں اولاد کو والد سے جائیداد کا

مطالبہ کرنا درست نہیں ہے، اور اس مال پر اپنا حق جتانا بھی غلط ہے، چاہے والدین کی معاشی حالت بہتر سے بہتر کیوں نہ ہو اور اولاد محتاج ہو، کیونکہ شرعاً و قانوناً باپ اپنے مال کا مالک ہے، اور مال کو تقسیم کرنا اور نہ کرنا یہ اس کا اختیار ہے، جیسا کہ اگر کوئی بیٹا اپنے والد کے مال کو اس کی حیات میں اس کی اجازت کے بغیر فروخت کرنا چاہے تو اس کی اجازت نہیں ہے، اس لئے کہ حدیث شریف میں مذکور ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کسی مسلمان شخص کا مال حلال نہیں ہے مگر اس کی رضامندی سے (سنن دارقطنی: ۲۸۸۵)، البتہ کوئی بیٹا والد کی حیات کا گمان کرتے ہوئے اس کا مال فروخت کرے اور بعد میں معلوم ہو جائے کہ والد مال کے فروخت کے وقت وفات پاچکے تھے تو یہ معاملہ شرعاً درست ہے، کیوں کہ باپ کے انتقال کی بناء پر وہ بیٹا اس مال کا وارث ہو چکا تھا۔ البتہ والدین کو اختیار ہے کہ اپنی زندگی میں اولاد کے حق میں مال ہبہ کرے یا ہدیہ دے، اسی طرح اگر اولاد اس قدر تنگ دست ہوں کہ وہ اپنا نفقہ بھی برداشت نہیں کر پا رہی ہے، تو اس صورت میں والدین پر اولاد کا نفقہ واجب ہوگا۔

علامہ خطیب شربینیؒ فرماتے ہیں:

''وأما شروط الإرث فهي أربعة... أولها تحقق موت الموروث أو إلحاقه بالموتى تقديرا'' (مغنی المحتاج ۴/ ۱۲۶)۔

علامہ شیرازیؒ فرماتے ہیں:

''ولو باع مال مورثه ظانا حياته وكان ميتا صح في الأظهر'' (اسنی المطالب ۵/ ۵۱)۔

شیخ عمراویؒ فرماتے ہیں:

''ولوباع مال مورثه ظانا حياته وكان ميتا صح؛ لأن العبرة بما في نفس الأمر في الأظهر'' (السراج الوهاج: ۱۶۸)

جواب نمبر (۷):

اللہ تعالیٰ نے والدین کے ساتھ حسن سلوک اور ان کی اطاعت وفرمانبرداری کے تعلق سے جو احکامات دیئے ہیں ان پر غور کرنے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کے بعد والدین کی اطاعت مقدم ہے، اللہ تعالیٰ نے اولاد کے تئیں والدہ کی جن تکالیف کا قرآن میں ذکر کیا ہے ان کو سوچنے اور ان پر غور کرنے سے ماں کی عظمت اور مقام ومرتبہ میں چار چاند لگ جاتے ہیں، پوری زندگی والدین اپنی اولاد کی تربیت و پرورش کر کے جو قربانی دیتے ہیں یقیناً دنیا کی کوئی اور ہستی اس طرح کی قربانی دینے سے قاصر ہے، لیکن جب والدین بوڑھے ہو جاتے ہیں تو انھیں اپنی مطیع اور فرمانبردار اولاد کو دیکھ کر ہی سکون اور راحت حاصل ہوتی ہے، جنھیں قدم قدم پر اولاد کی ضرورت ہوتی ہے، گویا وہ اس بات کے خواہشمند ہوتے ہیں کہ اولاد ان کے ساتھ وہی مشفقانہ معاملہ کریں، جیسا کہ انھوں نے اپنی اولاد کے ساتھ کیا تھا، لہٰذا ایسی صورت میں والدین کو گھر سے دور کسی ہاسٹل میں رکھنا اور وہاں ان کے کھانے پینے کا انتظام کرنا نہ صرف فطرت انسانی کے خلاف ہے بل کہ شرعاً بھی کسی طرح درست نہیں، اس لئے ایسے ہاسٹل میں والدین کو داخل کر کے آزادی کے حق سے انھیں محروم کرنا ہے، ایسے ہاسٹل میں کس کے والدین رہنا پسند کرتے ہیں، شریعت اسلامیہ کی تعلیمات کے یہ سراسر منافی ہے کہ والدین کو سب سے الگ تھلگ، گھر دار، گاؤں ومحلہ کو چھوڑ کر کسی ایک کونہ میں زندگی بسر کرنے پر مجبور کیا جائے، الغرض ایسے ہاسٹلوں میں والدین کو رکھنا اس اعتبار سے حرام ہے کہ اس میں والدین کی نافرمانی لازم آرہی ہے اور حدیث میں عقوق الوالدین کو حرام اور گناہ کبیرہ میں شمار کیا ہے۔ البتہ وہ بوڑھے اور ضعیف حضرات جو بے سہارا ہوتے ہیں، جو رہائش اور پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے مارے مارے پھرتے ہیں ایسے افراد کے لئے ایسے ہاسٹل کا قیام اور ان لوگوں کو وہاں رہنے اور زندگی گذارنے کا انتظام ایک معاشرتی اور سماجی ضرورت ہے، جس میں ضروریات زندگی کے علاوہ بے سہارا مسلم بوڑھوں کے لئے اسلامی تعلیمات کا اور ان کے ایمان کے بچانے کے اسباب میسر ہوں، نیز یہ بھی ضروری ہے کہ مردوں اور عورتوں کے لئے الگ الگ ہاسٹل قائم کئے جائیں، چوں کہ اس طرف مسلمانوں نے بہت کم پیش رفت کی ہے جس کے نتیجہ میں بسا اوقات مسلمان بوڑھوں کو بھی مجبوراً غیر مسلم اور عیسائی تنظیموں کے ذریعہ قائم کردہ ہاسٹلوں میں رہنا پڑتا ہے جہاں دنیوی اعتبار سے گرچہ ساری سہولیات مہیا ہوتی ہیں، مگر ان کے ایمان کا باقی رہنا دشوار ہو جاتا ہے۔

جواب نمبر (۸):

بوڑھاپے میں جب انسان بے بس اور مجبور ہو جاتا ہے اور ظاہری اعتبار سے کسی آمدنی کی بھی کوئی توقع نہ ہو اور اولاد بھی نہ ہو کہ وہ اپنے والدین

کا نفقہ برداشت کریں یا ہوں لیکن خود فقر کی بناء پر والدین کی دیکھ بھال کرنے سے عاجز ہوں، یا پھر مالدار ہونے کے باوجود اپنے والدین سے کنارہ کشی اختیار کئے ہوئے ہوں تو اس صورت میں ایسے بوڑھوں کا شمار مصارف زکوۃ میں کیا جانا چاہئے اور انھیں زکوۃ کی رقم دینے کی گنجائش ہوسکتی ہے، اس لئے کہ ایک وہ جوان جس کے پاس ممکنہ کمائی کا کوئی ذریعہ نہ ہونے کی بناء پر اسے فقیر کے ضمن میں مان کر زکوۃ دینے کی گنجائش ہے تو ایسے بوڑھوں کو تو بدرجہ اولی زکوۃ دی جاسکتی ہے۔

''من علم المزكى استحقاقه أعطاه وإلا أعطى مدعى الفقر أو المسكنة أو العجز عن الكسب ولو قويا جلدا بلايمين (العباب ۱/ ۳۲۷)۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں:

''إذا ادعى أنه لا كسب له، فإن كان ظاهره عدم الكسب كشيخ هرم أوشاب ضعيف البنية ونحوهما قبل قوله بغير يمين بلا خلاف؛ لأن الاصل والظاهر عدم الكسب'' (المجموع ۶/ ۱۸۲)۔

''لا يجوز للإنسان أن يدفع إلى ولده ولا والده الذى يلزمه نفقته من سهم الفقراء والمساكين ..... فإن كان ممن لايلزمه نفقته جاز دفعه إليه'' (المجموع ۶/ ۲۱۹)۔

جواب نمبر (۹):

حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو دھوکہ دے وہ ہم میں سے نہیں (سنن ترمذی ۱/ ۲۴۵)۔

اس حدیث پاک سے پتہ چلا کہ کسی کو دھوکہ دینا حرام ہے، چاہے وہ دھوکہ کسی بھی قسم کا ہو یا کسی کے ساتھ بھی ہو، جیسا کہ کسی مالدار شخص کا اپنے آپ کو فقیر ظاہر کر کے لوگوں سے صدقہ وصول کرنا بھی ایک قسم کا دھوکہ ہے اور یہ حرام ہے، اسی طرح حکومت کی طرف سے عمر دراز لوگوں کو جو مخصوص رعایتیں حاصل ہوتی ہیں مثلاً ٹکٹ وکرایہ میں تخفیف، اور دیگر سہولیات، ان سہولیات کے حصول کے لئے ایک مخصوص عمر متعین کی جاتی ہے، اگر کوئی اس متعینہ عمر کو نہ پہنچا ہو تو اسے اپنی عمر بڑھا کر ان سہولیات کو حاصل کرنا بھی ایک قسم کا دھوکہ ہے، اس لئے یہ کام شرعاً حرام اور ناجائز ہے۔

صاحب تحفۃ الاحوذی ''من غش فليس منا'' کے ضمن میں فرماتے ہیں:

''وهو يدل على تحريم الغش وهو مجمع عليه'' (تحفة الاحوذى ۱/ ۲۴۵)۔

امام رملیؒ فرماتے ہیں:

''صدقة التطوع سنة وتحل لغني ويحرم عليه ذلك أن أظهر الفاقة'' (نهاية المحتاج ۶/ ۱۷۱)۔

''لايجوز لغني أن يأخذ من الضمان ولايجوز للشاب أن يعدل سنه ليحتال على المسئولين عن الضمان في استحقاق الضمان؛ لأن ذلك من الغش وأكل المال بالباطل'' (فتاوى اللجنة الدائمة ۲۲/ ۴۸۲)۔

☆☆☆

معذوروں کے حقوق اور بیٹیوں پر والدین کی خدمت

مفتی امانت علی قاسمی

حقوق انسانی کی جتنی رعایت اور احترام انسانیت کی جس قدر تاکید ہمیں اسلام میں ملتی ہے کسی دوسرے مذاہب میں اس قدر رعایت اور احترام نہیں ملتا ہے، اسلام نے انسانی قوی کی رعایت کرتے ہوئے کمزوروں اور معذوروں کے حقوق واضح انداز میں بیان کیا ہے، چنانچہ جو کمزور اور معذور اپنی ضرورت کی کفالت از خود نہیں کر سکتے ہیں اسلام نے اس کے والدین اور دوسرے رشتہ داروں کو اس کے حقوق کا ذمہ دار بنایا ہے، اسی طرح جوانی کی توانائی کو کھو کر بڑھاپے کی دہلیز میں قدم رکھنے والے بوڑھے اور کمزور جو اپنی تمام صلاحیتوں اور طاقتوں کو کھو کر محتاجی کے عالم میں پہونچ جاتے ہیں اور جو کل تک دوسروں کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھایا کرتے ہیں آج عمر کے اس منزل میں ہوتے ہیں کہ کوئی دوسرا اس کے بوجھ کو اٹھائے، شریعت نے ایسے معذوروں اور بوڑھوں کے حقوق متعین کئے ہیں اور ان کی اولاد اور دوسرے رشتہ داروں کو ان کا کفیل اور ذمہ دار بنایا ہے اور اس پر دنیا و آخرت کی ترغیب اور حقوق کی رعایت نہ کرنے پر دنیا و آخرت کی تہدید بھی سنائی ہے، پیش نظر مقالے میں معذوروں اور بوڑھوں کے حقوق اور قرآن و حدیث اور فقہ اسلامی کی روشنی میں اس کے حل سے بحث کی جائے گی۔

بوڑھوں کو اپنے ماتحتوں کو کسب معاش پر مجبور کرنے کا حق:

بعض حضرات جوانی کی آخری سیڑھی پر ہوتے ہیں جہاں سے بڑھاپا سفید بالوں اور جسمانی کمزوریوں کے ساتھ نظر آنے لگتا ہے، لیکن عمر کے اس مرحلے میں اتنی طاقت ہوتی ہے کہ خود سے محنت و مشقت کر کے اپنی ضرورت پوری کر سکتے ہیں ایسے لوگوں کے لئے شریعت کی رہبری یہ ہے کہ خود محنت و مشقت کر کے اپنا بوجھ برداشت کریں کسی پر بوجھ بننا خواہ اپنی اولاد ہی کیوں نہ ہو پسندیدہ عمل نہیں ہے، حدیث میں بہترین کھانا اور افضل ترین عمل اسی کو قرار دیا گیا ہے کہ انسان اپنے ہاتھوں کی کمائی کھائے، بخاری کی روایت ہے:

''ما أكل أحد طعاما قط خيرا أن يأكل من عمل يديه، وإن نبي الله داؤد عليه السلام كان يأكل من عمل يديه'' (صحيح البخاری، باب كسب الرجل وعمله بيديه، حديث نمبر ۹۸۰)۔

لیکن اگر ایسا شخص محنت کرنے کے لئے تیار نہیں ہے اور اس کے پاس مالی ذخیرہ بھی نہیں ہے کہ بیٹھ کر اپنی ضرورت پوری کر سکے اور اس کی اولاد کو اللہ تعالی نے مال و دولت سے بھی نوازا ہے اور وہ کسب پر قادر بھی ہیں تو اس شخص کا نفقہ اس کی اولاد پر واجب ہے اور اولاد کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے بوڑھے باپ کو کسب پر مجبور کریں اس لئے کہ شریعت نے والدین کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید کی ہے اور والدین کو کسی طرح کی اذیت اور تکلیف پہنچانے سے سختی کے ساتھ منع کیا ہے اور والدین کو اس عمر میں جب کہ اس کے قوی کمزور ہو چکے ہیں کسب معاش پر مجبور کرنا اس کو اذیت و تکلیف سے دوچار کرنا ہے۔

''الفقہ الاسلامی وادلتہ'' میں شیخ وھبہ زحیلیؒ لکھتے ہیں:

''تجب نفقة الوالدين وإن علوا عند الجمهور لقوله تعالى: وقضى ربك ألا تعبدوا إلا إياه وبالوالدين إحسانا. ومن الإحسان أن ينفق عليهما عند الحاجة ويشترط لوجوب الانفاق على الأصول ما يأتي: أن يكون الأصل فقيرا أو عاجزا عن الكسب فإن كانا قادرا عن الكسب فتجب ايضا نفقته عند الحنفية لأن الله تعالى أمر بالاحسان إلى الوالدين وفي الزام الآباء بالاكتساب مع غنى الأبناء ترك الاحسان اليهم وهو لا يجوز'' (زحيلی. دكتور محمد وهبه، الفقه الاسلامی ۱/ ۴۲۱،۲۰۰۲ء)۔

ا

''فتاویٰ شامی'' میں ہے: ''تجب على موسر النفقة لأصوله الفقراء ولو قادرين على الكسب'' (شامی، محمد بن عابدين. رد المحتار ۵/ ۳۳۵ مکتبہ زکریا ۱۹۹۶ء)

''عنایہ'' میں ہے: ''ولم يذكر المصنف ههنا أن الأب إذا كان قادرا على الكسب هل يجبر الولد على الإنفاق عليه أم لا. قال شمس الأئمة السرخسي إذا كان الأب كسوبا والابن أيضا كسوبا يجبر ابن على الكسب والنفقة على الأب'' (عنايه. شرح الهدايه. فصل على الرجل ان ينفق على)۔

اگر بوڑھا شخص کسب پر قادر ہے اور اس کے کوئی اولاد نہیں ہے؛ لیکن دیگر عزیز واقارب ہیں جن کے ذمہ اس شخص کا نفقہ لازم ہوتا ہے تو اس کا نفقہ دیگر عزیز واقارب پر واجب نہیں ہوگا؛ بلکہ عزیز واقارب اس کو کمائی پر مجبور کر سکتے ہیں اس لئے کہ فقہاء نے دیگر عزیز واقارب پر نفقہ کے لازم ہونے کی جو شرطیں لگائی ہیں اس میں ایک شرط یہ ہے کہ وہ ایسا تنگ دست ہو کہ نہ اس کے پاس مال ہو اور نہ کمانے کی قدرت ہو جیسے صغیر، بہت بوڑھا، مجنون یا اپاہج، الفقہ الاسلامی میں یہ شرائط اس طرح مذکور ہیں:

''يشترط لوجوب الانفاق على القريب ثلاثة شروط اولا أن يكون القريب فقير الاماله ولا قدرة على الكسب لعدم البلوغ أو الكبر أو الجنون أو الزمانة ويستثنى الأبوان، فتجب له النفقة مع القدرة على الكسب بالصحة والقدرة ثانيا أن يكون الملزم بالنفقة موسرا مالكا نفقة فاضلة عن نفسه إما من ماله وإما من كسبه. ثالثا أن يكون المنفق قريبا للمنفق عليه ذا رحم منه مستحقا للارث في مذهب الحنفية'' (زحیلی. دکتور محمد وھبة، الفقه الاسلامی وادلته ۱/ ۷۵۳، ۲۰۰۲ء)۔

والدین کا اپنی آسائش کی خاطر اولاد سے زائد رقم کا مطالبہ کرنا:

والدین یا دیگر عزیز واقارب جن کا نفقہ ان کے چھوٹوں پر محتاجی کی صورت میں واجب ہے اگر وہ محتاج نہ ہو؛ بلکہ خود صاحب ثروت ہوں اللہ تعالیٰ نے ان کو دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلانے سے بے نیاز کر دیا ہے اور وہ اپنے کسب شدہ مالوں سے اپنی ضرورت پوری کر سکتے ہیں تو ان کا نفقہ کسی پر بھی واجب نہیں ہے، وہ محض اپنی آسائش کے لئے یا دولت اکٹھا کرنے کی ہوس کی بنا پر یا دوسروں پر خرچ کرنے کے لئے یا مستقبل میں ضرورت پڑنے کے خدشے سے اپنی اولاد یا دیگر ذی رحم محرم رشتہ داروں سے زائد رقم کا مطالبہ نہیں کر سکتے ہیں؛ اس لئے کہ شریعت نے والدین کی محتاجی کی صورت میں اولاد پر اور بوڑھے لوگوں کے کسب پر قادر نہ ہونے کی صورت میں دیگر رشتہ داروں پر نفقہ واجب کیا ہے؛ لہٰذا صاحب ثروت ہونے کی صورت میں ان کا زائد رقم کا مطالبہ کرنا درست نہیں ہے؛ کیوں کی دوسروں پر نفقہ کے واجب ہونے کے لئے فقر شرط ہے، کسی مالدار کا نفقہ سوائے بیوی کے دوسروں پر واجب نہیں ہے، فتاویٰ شامی میں ہے:

''تجب النفقة لأصوله الفقراء قيد به لأنه لا تجب نفقة الموسر إلا الزوجة فالمعتبر في إيجاب نفقة الوالدين مجرد الفقر فلو كان كل من الابن والأب كسوبا يجب أن يكتسب الابن وينفق على الأب'' (شامی، محمد بن عابدین. رد المحتار ۵/ ۳۵۵ مکتبہ زکریا دیوبند ۱۹۹۶ء)۔

''ہدایہ'' میں ہے: ''وعلى الرجل أن ينفق على أبويه وأجداده وجداته إذا كانوا فقراء وإن خالفوه في دينه وشرط الفقر؛ لإنه لو كان ذا مال فإيجاب نفقته في ماله أولى من إيجابها في مال غيره'' (مرغینانی. برہان الدین. ہدایہ ۲/ ۴۲۶. اشرفی بکڈپور، سہارنپور، ۱۴۱۸ھ)۔

البتہ حسن سلوک کے طور پر اولاد کو چاہئے کہ والدین کی دلجوئی اور خوشنودی کی لئے اپنی طرف سے والدین کی ہر طرح کی خدمت کو انجام دیا کریں، اور ہر ممکنہ صورت میں والدین کی رضا اور خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کریں، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک محبوب اور پسندیدہ عمل میں سے والدین کے ساتھ حسن سلوک کرنا ہے، حضرت عبداللہ بن مسعود کی روایت ہے:

''عن عبدالله قال: سألت النبي ﷺ أي العمل أحب إلى الله، وفي رواية أفضل قال: الصلاة لوقتها. قال ثم أي؟ قال برّ الوالدين، قال ثم أي؟ قال: الجهاد في سبيل الله'' (صحيح البخاری، باب الصلوات الخمس كفارة. حديث نمبر: ۲۸۲)۔

بوڑھے والدین کو چھوڑ کر ملازمت کے لئے سفر کرنا:

اگر والدین بڑھاپے کی اس عمر میں ہوں کہ انہیں سہارے کی شدید ضرورت ہو اور بلا سہارا اور بلا جسمانی خدمت کے ان کی زندگی کا پہیہ آگے نہ بڑھ سکتا ہو، اسے زندگی کی ہر مرحلے میں اپنے بچوں کی ضرورت محسوس ہوتی ہو دوسری طرف اولاد کو بھی کفایت کی روزی اس کے مقام پر بھی حاصل ہو جاتی ہو تو محض زیادہ مال و دولت حاصل کرنے کے لئے اور اپنی زندگی کو پر تعیش بنانے کے لئے اپنے شہر سے دور چلے جانا درست نہیں ہے، والدین کی خدمت انسان کی سب سے بڑی نعمت اور سب سے اہم فریضہ ہے، عہد نبوی میں ہمیں ایسی ہدایتیں ملتی ہیں کہ جہاد جیسے فرض عمل پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے والدین کی خدمت کو ترجیح دی، اسی طرح فقہاء نے لکھا کہ اگر کسی انسان پر حج فرض ہو جائے اور سفر حج پر جانے کا پختہ ارادہ ہو لیکن اگر والدین اس کی خدمت کے محتاج ہوں تو اس کو والدین کی خدمت کو ترجیح دینی چاہئے اور سفر حج کو موخر کر دینا چاہئے جب جہاد اور حج جیسے مقدس سفر کو والدین کی خدمت کی لئے ترک اور موخر کیا جاتا ہے تو محض زیادہ دولت حاصل کرنے کے لئے جو کہ شریعت کے نزدیک ایک پسندیدہ عمل بھی نہیں ہے اس کے لئے والدین کی خدمت کو ترک کر کے سفر پر جانے کی کیسے اجازت ہو سکتی ہے، اس لئے جو شخص والدین کی خدمت کی ذمہ داری میں مشغول ہو اس کو اپنے شہر میں ہی کسب معاش کی کوشش کرنی چاہئے، اور والدین کی خدمت کو اپنی اہم ذمہ داری اور اپنی سعادت مندی و نیک بختی سمجھ کر انجام دینا چاہئے، امام مسلم نے روایت نقل کی ہے:

''عن عبداللہ قال: جاء رجل إلى النبي ﷺ يستأذنه في الجهاد فقال: أحي والداك؟ قال: نعم. قال: ففيهما فجاهد''

(صحیح مسلم باب بر الوالدین وانھما احق، حدیث نمبر: ۲۵۴۹)۔

''حاشیۃ الطحطاوی'' میں ہے:

''إذا أراد الابن أن يخرج إلى الحج وأبوه كاره لذلك إذا كان الأب مستغنيا عن خدمته فلا بأس به وإن كان محتاجا يكره كذا الأمر'' (طحطاوی، سید احمد، حاشیہ الطحطاوی ۱/ ۴۷۹ مکتبہ نور محمد اصح المطابع کراچی)۔

بیٹیوں پر والدین کی خدمت کا حکم:

والدین کی خدمت جس طرح بیٹوں پر واجب ہے اسی طرح بیٹیوں پر بھی واجب ہے، بعض فقہی عبارتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ والدین کا نفقہ جس طرح بیٹوں پر واجب ہے اسی طرح بیٹیوں پر بھی واجب ہے؛ لیکن شادی کے بعد بیٹیاں اپنے شوہر کے تابع ہو جاتی ہیں اور شوہر کے حقوق مقدم ہو جاتے ہیں، ایسی صورت میں اگر والدین خدمت کے محتاج ہوں اور اس کی صرف بیٹیاں ہوں تو شوہر پر اخلاقی طور پر واجب ہے کہ وہ اپنی بیوی کو شوہر کی خدمت کے لئے بھیج دے، کم از کم ہفتہ میں ایک مرتبہ عورت اپنے ماں باپ کی زیارت اور خدمت کے لئے جا سکتی ہے اور شوہر کے لئے منع کرنا درست نہیں ہے، اس سے زیادہ اگر خدمت کی ضرورت ہو تو شوہر کے حقوق کی ادائیگی کے ساتھ مزید والدین کی خدمت کر سکتی ہے، حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب تحریر فرماتے ہیں:

زوجہ کو شوہر کی تابعداری لازم ہے اور والدین کی خدمت واطاعت اس حد تک کہ وہ شوہر کے حقوق میں خلل انداز نہ ہو (مفتی کفایت اللہ، کفایت المفتی ۵/ ۲۴۴، مکتبہ امدادیہ ملتان)۔

''فتاوی شامی'' میں ہے:

''ولا يمنعها من الخروج إلى الوالدين في كل جمعة إن لم يقدروا على اتيانها ولا يمنعها من الدخول عليهما في كل جمعة وفي غيرهما من المحارم في كل سنة'' (شامی، محمد ابن عابدین فتاوی شامی ۵/ ۲۲۳، مکتبہ زکریا دیوبند ۱۹۹۶ء)۔

بوڑھے شخص کا شادی کرنا:

انسان اپنی زندگی میں ایک رفیقۂ حیات کا محتاج ہوتا ہے جو اس کے دکھ درد کی ساتھی ہوتی ہے اور دونوں ایک دوسرے کے ذریعہ سکون اور اطمینان حاصل کرتے ہیں، جس طرح انسان کو جوانی میں بیوی کی ضرورت ہوتی ہے اس سے کہیں زیادہ اسے بڑھاپے میں سہارے کے طور پر بیوی کی ضرورت ہوتی ہے، بڑھاپے میں آدمی کا سب سے بہترین ساتھی اس کی رفیقۂ حیات ہی ہوتی ہے؛ لیکن بعض مرتبہ اس کی زندگی وفا نہیں کرتی ہے اور وہ اپنے بوڑھے شوہر کو چھوڑ کر اس دنیا سے چلی جاتی ہے، ایسی صورت میں وہ بوڑھا شخص زندگی کے اس آخری مرحلے میں دوسری شادی کا قصد کرتا ہے؛ تا کہ عمر کے آخری مرحلے کو بھی سکون کے

ساتھ گزارا جا سکے؛ لیکن ہندوستانی معاشرے میں بوڑھے کے بچے اپنے آپ کو نکاح سے روک دیتے ہیں، اس کی حکمت ومصلحت سے قطع نظر، یہ باپ پر اس کے بیٹوں کی جانب سے زیادتی ہے اور باپ کو تکلیف دہ زندگی پر جینے کے لئے مجبور کرنا ہے، ایسی نازک صورت حال میں اولاد کا فرض بنتا ہے کہ وہ اپنے باپ کی ضرورت کے پیش نظر از خود اس کا نکاح کرادیں؛ تاکہ باپ کی مابقیہ زندگی بھی سکون واطمینان کے ساتھ گزر سکے؛ غرضیکہ اولاد کا اپنے باپ کو ماں کے انتقال کے بعد دوسری شادی سے منع کرنا شرعاً ناجائز ہے اور باپ پر زیادتی کر کے اس کو تکلیف دینا ہے، اس لئے کہ شریعت نے قضاء شہوت کے لئے نکاح کو مسنون قرار دیا ہے اور بعض حالات میں فرض وواجب، اور کسی مسنون عمل سے روکنا ناجائز ہے، قرآن میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "إلا علی أزواجهم أو ما ملکت أیمانهم فإنهم غیر ملومین" (مومنون: ٦) کہ جو لوگ اپنی باندیوں اور بیویوں سے اپنی جنسی خواہش پوری کرتے ہیں ان پر کوئی ملامت نہیں ہے۔

البتہ بوڑھے شخص کے نکاح کرنے میں قدر تفصیل معلوم ہوتی ہے، اگر وہ شخص عمر کے اس مرحلہ میں بھی عورت کی دیگر ضروریات زندگی کے ساتھ جنسی ضرورت پوری کرنے پر قدرت رکھتا ہے تو اس کے لئے نکاح کرنا مطلقاً جائز ہے، لیکن اگر وہ عورت کی جنسی خواہش پوری کرنے پر قادر نہیں ہے تو ایسی صورت میں اس کو کسی بوڑھی یا عمر دراز عورت سے شادی کرنی چاہئے، جس کی جنسی خواہش کی تکمیل نہ ہونے کی صورت میں فتنہ میں مبتلا ہونے کا اندیشہ نہ ہو۔ کسی جوان عورت سے جس کے مقاصد نکاح میں جنسی خواہش کی تکمیل بھی ہو اور جنسی خواہش پوری نہ ہونے کی صورت میں فتنہ میں پڑنے کا اندیشہ ہو تو ایسی جوان عورت سے اس بوڑھے شخص کا شادی کرنا درست نہیں ہے۔ اس لئے کہ ایسا شخص عنین ہے اور عنین کو نکاح پر اقدام کرنا درست نہیں اور اگر اس نے نکاح کیا تو عورت فسخ نکاح کا مطالبہ کر سکتی ہے۔

باپ کی بیوی کے نفقہ کا حکم:

اگر باپ دوسرا نکاح کرنا چاہے اور بڑھاپے یا کسی دوسرے عذر کی بنا پر اپنی بیوی کی کفالت اور نان ونفقہ برداشت نہ کر سکے تو جمہور کی رائے یہ ہے کہ اولاد پر اپنے والد کی بیوی کا بھی نفقہ لازم ہوگا؛ تاکہ باپ نکاح کر کے اپنی پاکدامنی کو برقرار رکھ سکے اور دیگر مقاصد نکاح مثلاً سکون واطمینان کی زندگی حاصل کر سکے، علامہ شامی نے بھی لکھا ہے: اگر باپ کو کوئی مجبوری ہو جیسے باپ بیمار ہے یا اپاہج ہے اور اس کو خدمت کی ضرورت ہے تو ایسی صورت میں باپ کی بیوی کا نفقہ بھی اولاد پر واجب ہوگا، اس لئے کہ باپ کی بیوی باپ کی خادمہ ہے، اور جس طرح مخدوم کا نفقہ واجب ہے، اسی طرح خادم کا نفقہ بھی واجب ہے۔

''علیه نفقة زوجة أبیه وأم ولده بل وتزویجه أو تسریه، والذي تحرر في المذهب أنه لا فرق بین الابن والأب في نفقة الخادم أنه إذا احتاج أحدهما لخادم وجبت نفقته کما وجبت نفقة المخدوم فکان من جملة نفقته'' (شامی. محمد ابن عابدین فتاوی شامی ۵/ ۳۴۴، مکتبہ زکریا دیوبند ۱۹۹۶ء)۔

بہو کا ساس کی خدمت کرنا:

ہندوستانی معاشرہ میں عام طور پر مشترکہ خاندانی نظام رائج ہے، جہاں بہو پر بہت زیادہ حقوق عائد کردئے جاتے ہیں، شوہر کی خدمت کے علاوہ ساس، سسر اور دیگر اہل خانہ کی خدمت اور ان کی ضرورتوں کی تکمیل ایک بہو کا حق سمجھا جاتا ہے، جو اسلامی اصول کی روشنی میں سراسر باطل ہے، شریعت نے عورت پر اس کے شوہر کے حقوق تو عائد کئے ہیں؛ لیکن کتاب وسنت میں کہیں بھی عورت پر اس کے سسرال والوں بالخصوص ساس کے حقوق کا کوئی تذکرہ نہیں کیا ہے، اس لئے ایک عورت پر شوہر کی تو خدمت لازم ہے؛ لیکن ساس کی خدمت ضروری نہیں ہے اور نہ ہی شوہر بیوی کو اپنی ماں کی خدمت پر مجبور کر سکتا ہے۔

حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں:

بعضے آدمی اس کو بڑی سعادت مندی سمجھتے ہیں کہ بیوی کو ماں کا محکوم ومغلوب بنا کر رکھے اس کی بدولت بیوی پر بڑے بڑے ظلم ہوتے ہیں سو سمجھ لینا چاہئے کہ بیوی پر فرض نہیں کہ وہ ساس کی خدمت کریں (اصلاح انقلاب امت بحوالہ محمود الفتاویٰ ۲/ ۱۰۶، مکتبہ انور ڈابھیل)۔

اگر بہو ساس کے ساتھ نہ رہنا چاہتی ہو اور وہ شوہر سے علیحدہ مکان کا مطالبہ کرے تو بہو کو ساس کے ساتھ رہنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا ہے؛ بلکہ شوہر پر لازم وضروری ہے کہ وہ اپنی استطاعت کے بقدر بیوی کے لئے علیحدہ مکان کا انتظام کرے، لیکن اگر گھر میں کئی کمرے ہوں اور ایک کمرہ بیوی کے لئے خاص کردیا جائے جس میں قفل بند کرنے کی گنجائش ہو تو اس صورت میں عورت کے لئے علیحدہ مکان کا مطالبہ درست نہیں ہے، علامہ شامی تحریر فرماتے ہیں:

''وکذا تجب لها السکنی في بیت خال من أهله وأهلها بقدر حالهما کطعام وکسوة وبیت منفرد من دار له غلق وفي

البدائع: لو أراد أن يسكنها مع ضرتها أو مع أحمائها كأمه أو أخته وابنته فأبت فعليه أن يسكنها في منزل منفرد لأن إبائها دليل الأذى والضرر ولأنه محتاج إلى جماعها ومعاشرتها في أي وقت يتفق ولا يمكن ذلك مع ثالث. حتى لو كان في الدار بيوت وجعل لبيتها غلقا عليحدة قالو ليس لها أن تطالبه بآخر'' (شامی، محمد ابن عابدین فتاوی شامی ۵/ ۳۲۱، مکتبہ زکریا دیوبند۱۹۹۶ء)۔

البتہ اگر ساس بڑھاپے کی اس حد کو پہونچ چکی ہو کہ اسے سہارے کی ضرورت ہو اور کوئی اس کی خدمت کرنے والا نہ ہو تو بہو کی اخلاقی ذمہ داری ہے کہ وہ ساس کے ساتھ رہ کر اس کی خدمت کرے؛ اس لئے کہ اس مرحلے میں اگر چہ بہو پر خدمت شرعا واجب نہیں ہے؛ لیکن اس کے شوہر پر اپنی ماں کی خدمت واجب ہے اور بعض اوقات مرد ہر قسم کی خدمت انجام نہیں دے سکتا ہے ایسی صورت میں اس کی بیوی اپنی ساس کی خدمت کر کے اپنے شوہر کی رضا و خوشنودی حاصل کر سکتی ہے اور اپنے شوہر کو خوش کرنا اور اپنے شوہر کی اطاعت کرنا بیوی کے فرائض میں داخل ہے، ایسی حالت میں جب کہ ساس کو بہو کی خدمت کی ضرورت ہو بہو اپنا شرعی فریضہ نہ بتا کر اگر چہ خدمت سے سبکدوش ہو سکتی ہے؛ لیکن ایسا کر کے یقیناوہ شوہر کو ناراض کرے گی؛ جب کہ خدمت کر کے نہ صرف شوہر اور ساس وسسر کی رضا کو حاصل کرتی ہے؛ بلکہ اللہ تعالی کے یہاں بھی بڑے اجر وثواب کی مستحق ہو جاتی ہے، حضرت عائشہ کی روایت ہے:

''إن المؤمن ليدرك بحسن خلقه درجة الصائم القائم'' (سنن ابی داؤد ۲۶۱، باب فی حسن الخلق)۔

اولاد کا والد کی زندگی میں جائداد کی تقسیم کا مطالبہ:

شریعت نے حقوق کے سلسلے میں عام طور پر دونوں جانب کی رعایت کی ہے، باپ اور بیٹے کے سلسلے میں بھی شریعت نے دونوں جانب حقوق عائد کئے ہیں؛ چنانچہ باپ پر حق یہ ہے کہ اپنے بچوں کی اچھی تعلیم وتربیت کرے اس کے مستقبل کو بہتر سے بہتر بنائے اور اولاد کا حق یہ ہے کہ اپنے والدین کی خدمت واطاعت کرے، ان کی رضا وخوشنودی حاصل کرے، بعض مرتبہ اولاد اپنے باپ سے زندگی میں ہی جائداد کی تقسیم کا مطالبہ کرتی ہے اور اس کو اپنا حق سمجھتی ہے؛ حالانکہ یہ مطالبہ شرعا ناجائز ہے اولاد کو اپنے باپ کی میراث میں حصہ ملتا ہے؛ لیکن یہ میراث مورث کے مرنے کے بعد تقسیم ہوتی ہے، اولاد جس کو اپنا حق سمجھتی ہے وہ میراث ہے جو باپ کے مرنے کے بعد ہی تقسیم ہو سکتی ہے، زندگی میں باپ اگر جائداد تقسیم کرے تو یہ ایک قسم کا ہبہ ہے اور ہبہ کے سلسلے میں ھبہ کرنے والا آزاد ہوتا ہے کسی دباؤ کا پابند نہیں ہوتا ہے؛ اس لئے اولاد کا زندگی میں جائداد کی تقسیم کا مطالبہ شرعا ناجائز ہے؛ البتہ اگر اولاد محتاج ہوں اور باپ کی معاشی حالت بہتر ہو تو باپ پر اخلاقی طور پر ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنی جائداد میں سے اپنی اولاد کو کچھ ھبہ کر دے؛ تا کہ اولاد کی بھی معاشی حالت بہتر ہو سکے؛ لیکن یہ ھبہ ہے، اس کو میراث کی تقسیم کا نام نہیں دیا جا سکتا ہے، والد کے انتقال کے بعد ان کے تمام اولاد شرعی طور پر میراث کے حصہ دار ہوں گے، بحر الرائق میں ہے:

''أما بيان الوقت الذي يجري فيه الارث، قال مشائخ بلخ: الإرث يثبت بعد موت المورث'' (شیخ محمد بن حسین بن علی طوری، تکملہ البحر الرائق۹/ ۳۶۴، کتاب الفرائض، مکتبہ زکریا دیوبند)۔

عمر دراز لوگوں کے لئے ہاسٹل کا قیام:

مغربی ملکوں میں عام طور پر مرد وعورت ملازمت پیشہ ہوتے ہیں اور بوڑھے لوگوں کی نگرانی اور ان کی ضرورتوں کی دیکھ ریکھ کے لئے گھر میں کوئی نہیں ہوتا ہے؛ اس لئے وہاں عمر دراز اور بوڑھے لوگوں کے لئے ہاسٹل بنا دئے جاتے ہیں، جہاں تمام سہولیات مہیا کرائی جاتی ہیں اور بوڑھے حضرات کی ہر طرح کی ضرورت پوری کی جاتی ہے، رفتہ رفتہ اس طرح کے ہاسٹل کا ہندوستان میں بھی رواج بڑھ رہا ہے، اس طرح کے ہاسٹل کے قیام میں شرعی طور پر کوئی قباحت نظر نہیں آتی ہے؛ اس لئے کہ یہ ہاسٹل لوگوں کو ایک سہولت فراہم کرتے ہیں اور اس کے عوض اجرت وصول کرتے ہیں، گویا یہ ایک قسم کا رہائشی ہوٹل ہے، جس میں لوگ ٹھہر کر اپنی ضرورت پوری کرتے ہیں، اگر خاندان کے عمر رسیدہ حضرات اپنی مرضی اور خوشی سے اس طرح کے ہاسٹل میں جانے اور رہنے پر رضا مند ہو جائیں تو اس میں کوئی قباحت نظر نہیں آتی، اس لئے سن رسیدہ حضرات کو اس عمر میں اپنے ہم عمر ساتھیوں کی ضرورت ہوتی ہے، جن کے ساتھ بیٹھ کر اپنی زندگی کو پر بہار بنا سکتے ہیں؛ جب کہ گھروں میں ان کا دل بہلانے والا، ان سے باتیں کرنے والا اور ان کا خیال رکھنے والا کوئی نہیں ہوتا ہے۔

بعض مرتبہ عمر دراز حضرات کی خواہش ہوتی ہے کہ اپنے اولاد کے سامنے ہی رہیں اسی میں وہ اپنی خوشی محسوس کرتے ہیں؛ لیکن اولاد کے ملازمت یا دوسری مصروفیت کی بنا پر اولاد کی طرف سے ان کی نگرانی نہیں ہو پاتی اس لئے وہ ہاسٹل میں قیام کرنے پر راضی ہو جاتے ہیں، ایسی صورت میں بوڑھے حضرات کی

رضامندی مجبوری کے تحت ہے؛ اس لئے اولاد کو چاہئے کہ گھر میں ان کے رہنے کا بہتر انتظام کر دیا جائے اور ہاسٹل میں نہ منتقل کیا جائے، اسی طرح بعض مرتبہ بوڑھے حضرات کسی طرح بھی ہاسٹل میں جانے کے لئے تیار نہیں ہوتے ہیں؛ لیکن ان کے اہل خانہ ان کو زبردستی اس طرح کے ہوٹل میں قیام پر مجبور کرتے ہیں جو شرعاً مذموم اور غیر پسندیدہ حرکت ہے، اس لئے کہ قرآن نے ہمیں والدین کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید کی ہے اور حسن سلوک میں یہ ہے کہ ان کی تمام ضرورتوں کا خیال رکھا جائے اور ان کی ہر خوشی کی قدر کی جائے، ان کے ہر راحت کا انتظام کیا جائے اور ان کی مرضی کے بغیر ان کو ہاسٹل میں ٹھہرانا ان کو اذیت اور تکلیف میں مبتلا کرنا ہے، جس سے شریعت نے سختی کے ساتھ منع کیا ہے۔

بوڑھے حضرات کی اجتماعی کفالت کے لئے زکوٰۃ کی رقم کا استعمال کرنا:

بعض مرتبہ بوڑھے حضرات اپنے بڑھاپے کی بنا پر از خود محنت نہیں کر سکتے ہیں اور بسا اوقات ان کی اولاد اور قریبی رشتہ دار بھی نہیں ہوتے ہیں، ایسے میں ان کی زندگی اجیرن بن جاتی ہے اور معاشی حالت افلاس کو پہونچ جانے کی وجہ سے یہ لوگ دردر کی ٹھوکریں کھانے لگتے ہیں، ایسے حضرات کی اجتماعی کفالت کے لئے اگر زکوٰۃ کی رقم استعمال کی جائے تو اس میں کوئی قباحت نظر نہیں آتی ہے، اس لئے کہ زکوٰۃ کے مصارف میں اہم مصرف فقراء ہیں اور یہ حضرات نہ کسب پر قادر ہیں اور نہ ہی ان کا کوئی کفیل ہے، اس لئے ان پر فقراء کی تعریف صادق آتی ہے، اس لئے ان محتاج اور ضرورت مند بوڑھوں کی طرف سے کوئی ادارہ بحیثیت وکیل زکوٰۃ وصول کر سکتا ہے اور ان کی ضرورتوں پر خرچ کیا جا سکتا ہے اور زیادہ بہتر یہ ہے کہ ان کو زکوٰۃ کا مالک بنا دیا جائے، اس لئے کہ زکوٰۃ میں تملیک شرط ہے، لیکن اگر ان کو مالک نہ بھی بنایا گیا؛ بلکہ ان کی ضرورتوں میں خرچ کر دیا گیا تو بھی درست ہے جیسا کہ مدارس میں مہتمم حضرات بحیثیت وکیل زکوٰۃ کو وصول کر کے طلبہ کی ضرورتوں میں اس کو خرچ کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِينِ" (سورہ توبہ: ۶۰)۔

بخاری کی روایت ہے: "إن رسول الله ﷺ بعث معاذ إلى اليمن فقال: إن الله قد فرض عليهم صدقة تؤخذ من أغنيائهم وترد إلى فقرائهم" (صحيح البخاري ۲/ ۱۱۹)۔

"فتاویٰ شامی" میں ہے: "هي (الزكاة) تمليك خرج الإباحة فلو أطعم يتيما ناويا الزكاة لا يجزيه إلا إذا دفع إليه المطعوم كما لو كساه بشرط أن يعقل القبض جزء مال عينه الشارع من مسلم فقير" (شامي، محمد بن عابدين، ردالمحتار ۳/ ۱۷۱، كتاب الزكوٰة، مكتبه زكريا ۱۹۹۶ء)۔

بوڑھے حضرات کے لئے حکومت کی رعایت کا حکم:

عمر دراز لوگوں کے لئے حکومت کی طرف سے خصوصی رعایتیں ہیں، جیسے ٹرین کرایہ میں تخفیف حکومت کی طرف سے وظیفہ اور ٹیکس میں رعایت وغیرہ، اگر عمر دراز حضرات ان خصوصی رعایتوں کے مستحق ہیں اور ان رعایت کے لئے مطلوبہ شرطوں کو پورا کرتے ہیں تو ان کے لئے یہ رعایت حاصل کرنا جائز ہے؛ اس لئے کہ یہ حکومت کی طرف سے ضعیف اور کمزور لوگوں کی مدد ہے اور حکومت کے امداد سے فائدہ اٹھانا جائز ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی اپنے عہد خلافت میں بوڑھوں اور ضعیف لوگوں کو وظیفہ دیا کرتے تھے؛ البتہ اگر کوئی بوڑھا شخص خصوصی رعایت کے لئے مطلوبہ شرائط کو پورا نہ کرتا ہو تو اس کے لئے جھوٹ بول کر یہ رعایت حاصل کرنا جائز نہیں ہے؛ اس لئے کہ جھوٹ بولنا بہت بڑا گناہ ہے، ایک حدیث میں ہے آپ ﷺ نے فرمایا: یہ بہت بڑی خیانت ہے کہ تم اپنے بھائی سے کوئی بات کہو اور وہ تم کو سچا سمجھے جب کہ تم جھوٹ بول رہے ہو، ایک دوسری حدیث میں حضور ﷺ نے فرمایا: مومن تمام خصلتوں میں ڈھل سکتا ہے سوائے خیانت اور جھوٹ کے، اس لئے جھوٹ بول کر اور عمر زائد بتا کر یہ رعایت حاصل کرنا ناجائز ہے۔

ابوداؤد میں ہے:

"كبرت خيانة أن تحدث أخاك حديثا هو لك به مصدق وأنت به كاذب" (سنن ابی داود ۴/ ۲۴۹، رقم: ۴۹۷۱)۔

"مصنف ابن ابی شیبہ" میں ہے:

"قال النبي ﷺ: يطوى المؤمن على الخلاق كلها غير الخيانة والكذب" (مصنف ابن ابی شیبه، رقم: ۲۵۶۸)۔

معذوروں اور سن رسیدہ لوگوں کی ضروریات کا خیال اور ان کے حقوق

مولانا محمد انیس ندوی[1]

(۱) ماں باپ کی خدمت اور حسب ضرورت ان کی کفالت اولاد پر واجب ہے۔ قرآن میں بھی اور حدیث میں تو کثرت سے اس فریضہ کی طرف توجہ دلائی گئی ہے، لہذا خدا کے بعد سب سے بڑا حق ہوسکتا ہے تو والدین کا اپنی اولاد پر ہے اس لئے کہ ان کی پیدائش اور پرورش و پرداخت کا وہ ذریعہ بنتے ہیں، آیت میں بڑھاپے تک پہنچ جانے کا حوالہ محض اس لئے دیا گیا ہے کہ یہی زمانہ ہوتا ہے جس میں ان لوگوں کو ماں باپ بوجھ محسوس ہوتے ہیں جوان کی ان قربانیوں اور جانفشانیوں کو بھول جاتے ہیں جوانہوں نے ان کے لئے بچپن میں کی ہوتی ہیں، حالانکہ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ احسان کا بدلہ احسان سے دیا جاتا، لیکن افسوس ہر شخص اس بات کو یاد نہیں رکھتا، اس آیت میں اسی بات کی یاددہانی کرائی گئی ہے، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ والدین ہر دور میں محبت اور تعظیم واحسان کے حقدار ہیں، چنانکہ اگلی آیات میں اس بات کو واضح کردیا گیا ہے کہ اطاعت اور فرمانبرداری تمام تر مہربانی ومحبت اور شفقت ورحمت پر مبنی ہے، اس میں کسی اور جذبے کو دخل نہ ہو، بغیر اس جذبے کے کوئی شخص والدین کا حق ان کے بڑھاپے میں ادانہیں کرسکتا۔

اسی فریضہ کی طرف توجہ دلاتے ہوئے ایک شخص کے سوال کرنے پر کہ میں کس کے ساتھ حسن سلوک کروں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ماں کے ساتھ، باپ کے ساتھ، بہن اور بھائی کے ساتھ۔

''فقال: یارسول اللہ! من أبر، قال: أمك وأباك وأختك وأخاك ومولاك الذی یلی ذاك الحق واجب ورحم موصولة'' (ابوداؤد: ۵۱۴۲)

اخیر میں آپ ﷺ نے تاکید کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ حق واجب ہے اور صلہ رحمی کا تقاضا ہے۔

صاحب روح المعانی نے مذکورہ آیت کی تفسیر بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ

''قال الراغب: کل شئی لیشرف فی بابه، فإنه یوصف بالکرم'' (روح المعانی ۹/ ۸۰)۔

لہذا یوں تو والدین کی خدمت ہمیشہ ہی واجب ہے، لیکن خاص کر بڑھاپے میں جبکہ وہ خدمت کے زیادہ محتاج ہوں ان کی خدمت کرنا اہم ترین واجبات میں سے ہے، اس سلسلہ میں فقہاء کی عبارتیں ملاحظہ فرمائیں:

''ویجبر الولد الموسر علی نفقة الأبوین المعسرین مسلمین کانا أو ذمیین قدرا علی الکسب أو لم یقدر'' (الفتاوی الهندیه۱/ ۵۶۴)

مالدار لڑکے کو تنگدست والدین کے نفقہ پر مجبور کیا جائے گا، چاہے والدین مسلمان ہوں یا غیر مسلم، کمانے پر قادر ہوں یا نہ ہوں۔

''فتجب لهما النفقة فی رأی الحنفیة والشافعیة مع القدرة علی الکسب، لأن الفرع مأمورة بمعاشرة أصله بالمعروف ولیس منها تکلیفه الکسب مع کبر السن'' (الفقه الاسلامی ۷/ ۷۷۳)۔

احناف وشوافع کے نزدیک لڑکے پر والدین کا نفقہ واجب ہوگا والد کے کمانے پر قادر ہونے کے باوجود بھی، کیونکہ فروع کو اپنے اصول کے ساتھ حسن سلوک کرنے کا حکم دیا گیا ہے، اور والدین کو بڑی عمر میں کمانے پر مجبور کرنا حسن سلوک کے قبیل سے نہیں ہے۔

---

[1] استاذ جامعہ اسلامیہ انوار العلوم اورنگ آباد، مہاراشٹر۔

''فإنه يقضى بنفقة الأب. وإن كان قادرا على الكسب.'' (بدائع الصنائع ۵/ ۱۸۳)
قاضی والد کے نفقہ کا فیصلہ کرے گا اگر والد کمانے پر قادر ہو۔

نیز حضرت جابر بن عبداللہؓ سے روایت ہے کہ ایک صاحب نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی کہ میرے والد صاحب میرا مال لینا چاہتے ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''أنت ومالك لأبيك''، یعنی تو اور تیرا مال سب تیرے باپ کا ہے (ابن ماجہ کتاب التجارات، ۷۹، ۲۳)۔

علامہ کاسانی اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''أضاف مال الابن إلى الأب بلام التمليك. وظاهره يقتضى أن يكون للأب فى مال ابنه حقيقة الملك. فإن لم تثبت الحقيقة. فلا أقل من أن يثبت له حق التمليك عند الحاجة'' (بدائع الصنائع ۵/ ۱۲۱)
یہاں پر ''لام'' تملیک کا ہے اور اس کا ظاہر تقاضا کرتا ہے کہ باپ کو اپنے بیٹے کے مال میں حقیقی ملکیت ہونا چاہئے، لیکن اگر حقیقی ملکیت نہ بھی ثابت ہو تو کم از کم ضرورت کے وقت میں ملکیت ثابت ہوگی۔

جب مذکورہ عبارتوں سے یہ بات واضح ہو رہی ہے کہ لڑکے پر والدین کا نفقہ بہر صورت واجب ہوگا، خواہ باپ کمانے پر قادر ہو یا نہ ہو تو احقر کی رائے ہے کہ بیٹے باپ کو بڑھاپے کی عمر تک پہنچ جانے کے بعد کسب معاش پر مجبور نہیں کر سکتے، بلکہ از خود کما کر ان کا انتظام کریں گے، تاکہ بیٹوں کے جوان ہو جانے کے بعد والدین کو کسی طرح کی پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے، بلکہ اگر ایسی عمر میں والدین کسب معاش کی فکر میں لگے ہوں تو بیٹوں کو چاہئے کہ ان کو ان سے منع کریں اور ان کی توجہ آخرت کی طرف مبذول کریں، یہی ان کے ساتھ بیٹوں کی طرف سے حسن سلوک ہوگا۔

(۲) جس طرح والدین کا نفقہ واجب ہے اسی طرح حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسرے اقرباء کے ساتھ حسن سلوک اور صلہ رحمی کرنے کا حکم دیا ہے، ایک صاحب نے دریافت کیا کہ میں کس کے ساتھ حسن سلوک کروں؟ آپ نے فرمایا: ماں کے ساتھ، بہن کے ساتھ، اور بھائی کے ساتھ، پھر اخیر میں تاکید کرتے ہوئے فرمایا: ''حق واجب ورحم موصولة'' یعنی یہ حق واجب ہے اور صلہ رحمی کا تقاضا ہے (ابوداؤد باب فی برالوالدین: ۵۱۴۰)۔

البتہ فقہاء نے کفالت کے سلسلہ میں نصوص کی روشنی میں فقہی اصول یہ مقرر کیا ہے کہ اقرباء اور بھائی بہنوں کا نفقہ ادا کرنا اس وقت واجب ہوگا جبکہ وہ محتاج و ضرورت مند ہوں، اور اپنی ذاتی کفالت پر قادر نہ ہوں، ویسے تو اخلاقی طور پر بھی بہنوں اور اقرباء کی مدد کرنا حسن سلوک کا تقاضا ہے، لیکن قانونی طور پر واجب نہیں، جیسا کہ فقہ کی کتابوں میں اعزہ و اقارب کے نفقہ کے سلسلہ میں صراحت کی گئی ہے۔

''اتفق العلماء على أنه يشترط فى وجوب إنفاق الشخص على قريبه أن يكون القريب محتاجا إلى النفقة بأن يكون معسرًا بالمال عاجزا عن الكسب'' (بدائع الصنائع ۵/ ۱۸۰)
،فقہاء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ کسی شخص پر اپنے رشتہ داروں کا نفقہ اس وقت واجب ہوگا، جبکہ اسے نفقہ کی ضرورت ہو بایں طور کہ وہ تنگدست ہو اور کمانے سے عاجز ہو۔

''والنفقة لكل ذى رحم محرم إذا كان صغيرًا أو كانت امرأة بالغة فقيرة أو كان ذكرًا فقيرًا زمنًا أو أعمى يجب ذلك على قدر الميراث ويجبر عليه كذا فى الهداية. أما الكبار الأصحاء فلا يقضى لهم بنفقتهم على غيرهم. وإن كانوا فقراء'' (الفتاوى الهنديه ۱/ ۵۶۵)

نفقہ ہر ذی رحم محرم کو اس وقت ملے گا جبکہ وہ نابالغ اور محتاج ہو یا پھر بالغ عورت ہو اور محتاج ہو یا بالغ مرد ہو اور لیکن محتاج، اپاہج یا اندھا ہو تو ایسی صورت میں اس کا نفقہ میراث کے بقدر دوسروں پر واجب ہوگا اور نہ دینے کی صورت میں اسے مجبور بھی کیا جائے گا، لیکن اگر بالغ ہے اور صحت مند ہے تو چاہے فقیر ہی کیوں نہ ہو اس کا نفقہ دوسروں پر واجب نہیں کیا جائے گا۔

''والأصل أن نفقة كل إنسان فى مال نفسه .... ثم العجز عن الكسب .... وأما الأنثى فعاجزة على كل حال فلذلك أطلقها'' (مجمع الأنهر ۱۰/ ۵۰۰)
اصلاً نفقہ واجب ہونے کے لئے کمائی سے عاجز ہونا ضروری ہے اگر کمانے پر قادر ہے تو ایسی صورت میں نفقہ دوسروں پر واجب نہیں ہوگا،

کیونکہ نفقہ کے سلسلہ میں جو اصول ہے وہ یہ کہ ہر انسان کا نفقہ اپنے مال میں واجب ہوا کرتا ہے وہ نابالغ ہو یا عمر رسیدہ، لیکن صحیح سالم ہو ہاں اگر کمانے سے عاجز ہو تو پھر دوسروں پر واجب ہوگا۔ رہی بات عورت کی تو وہ ہر حال میں عاجز ہی شمار کی جاتی ہے اس کا نفقہ ہر حال میں دوسروں پر واجب ہوگا۔

''اتفق الفقهاء على وجوب النفقة لقريب فقير عاجز عن الكسب. والعجز عن الكسب. ألا يستطيع الإنسان اكتساب معيشته بالوسائل المشروعة المعتادة اللائقة به'' (الفقه الاسلامی ۷/ ۷۷۳)۔

فقہاء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ نفقہ ایسے شخص کا واجب ہوگا جو محتاج ہو اور کمانے سے عاجز ہو، اور کمانے سے عاجز ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے معیشت کے سامان نہ کما سکتا ہو ایسے وسائل کے ذریعہ جو شرعاً جائز ہوں اور عادت کے مطابق اس کے لئے مناسب بھی ہوں۔

''فإن كان قادرًا على الكسب فلا نفقة له بالاتفاق، لأن القدرة على الكسب غنى. لكن باستثناء الأبوين فتجب لهما النفقة في رأى الحنفية والشافعية مع القدرة على الكسب'' (الفقه الاسلامی ۷/ ۷۷۳).

اگر یہ حضرات کمانے پر قادر ہوں تو ان کا نفقہ بالاتفاق دوسروں پر واجب نہیں ہوگا، کیونکہ کمانے پر قدرت مالداری کی علامت ہے، سوائے والدین کے، کیونکہ انکا نفقہ احناف وشوافع کے نزدیک کمانے پر قادر ہونے کے باوجود واجب ہوتا ہے۔

لہذا احقر کی رائے ہے کہ سن رسیدہ حضرات کا نفقہ دوسروں پر اسی وقت واجب ہوگا، جبکہ وہ کمانے پر قادر نہ ہوں، مثلاً عورت مطلقہ ہے، مرد مریض ہو یا اپاہج ہو، یا مجنون ہو یا اندھا ہو یا اتنا سست ہو کہ اس کو کوئی کام پر ہی نہ رکھتا ہو وغیرہ۔ ان تمام صورتوں میں ان کا نفقہ دوسروں پر واجب ہوگا لیکن والدین ان میں شامل نہیں ہوں گے، کیونکہ ان کا نفقہ قدرت کے باوجود بھی بیٹوں پر واجب ہوا کرتا ہے۔

(۳) اگر بوڑھے والدین یا خاندان کے وہ بڑے بوڑھے جن کا نفقہ ان کے چھوٹوں پر محتاجی کی صورت میں واجب ہے، اگر وہ محتاج نہ ہوں، بلکہ خود صاحب ثروت ہو تو ایسی صورت میں محض سہولت کے لئے یا پھر محفوظ کرنے کے لئے زائد رقم کا مطالبہ کرنا درست نہیں ہے، کیونکہ دوسروں پر نفقہ حاجت کی وجہ سے واجب ہے اگر یہ حضرات خود مالدار ہوں تو ان کا نفقہ خود انہیں کے مال سے واجب ہوگا۔

''لا تجب النفقة على الغير، إلا بسبب الحاجة. فمن كان ذا مال فنفقته في ماله'' (الفقه الاسلامی ۷/ ۷۷۴)

دوسروں پر نفقہ محض حاجت کی وجہ سے واجب ہوتا ہے، لہذا جو مالدار ہو تو اس کا نفقہ اسی کے مال میں واجب ہوگا۔

''والأصل أن نفقة كل إنسان في مال نفسه'' (مجمع الانهر ۱/ ۵۰۰)

اصل قاعدہ یہ ہے کہ ہر انسان کا نفقہ اس کے ذاتی مال میں واجب ہوتا ہے۔

''أن النفقة لا تجب لغير المحتاج وهؤلاء غير محتاجين؛ لأنه يمكن الاكتفاء بالأدنى بأن يبلغ بعض المنزل أو كله ويكترى منزله فليسكن بالكراء أو يبيع الخادم'' (بدائع الصنائع ۵/ ۱۸۳)۔

غیر ضرورت مندوں کا نفقہ دوسروں پر واجب نہیں ہوتا اور یہ سب حاجت مند نہیں ہیں، کیونکہ ان کے لئے ادنی معیشت پر اکتفا کرنا ممکن ہے اس طور پر کہ وہ گھر کا کچھ حصہ یا پھر پورا حصہ بیچ کر کرائے سے رہ سکتے ہیں یا خادم وغیرہ بیچ کر فوری ضرورت پوری کر سکتے ہیں۔

''إن كان الأب موسرًا فإن كان المال حاضرًا في يد الأب أنفق منه عليه .... وإن كان المال غائبا ينفق من مال نفسه بأمر القاضي إياه بالاتفاق. ليرجع أويشهد على أنه ينفق من مال نفسه'' (بدائع الصنائع ۵/ ۱۸۳).

اگر باپ مالدار ہو اور مال موجود بھی ہو تو لڑکا اسی کے مال سے اس پر خرچ کرے گا، اور اگر مال موجود نہ ہو تو قاضی کے حکم سے اپنے ذاتی مال سے خرچ کرے، تاکہ اس کو بعد میں رجوع کر سکے، یا پھر گواہ بنالے اس بات پر کہ وہ اپنا ذاتی مال اس پر خرچ کر رہا ہے۔

لہذا احقر کی رائے یہ ہے کہ ان لوگوں سے جن پر بحالت حاجت نفقہ واجب ہوتا ہے زیادہ سہولت یا دوسرے لوگوں پر خرچ کرنے کے لئے یا کچھ رقم محفوظ کرنے کے لئے زائد رقم کا مطالبہ کرنا درست نہیں ہے، ہاں اگر یہ پریشان کن حالات میں گھرے ہوئے ہیں تو اقرباء کو چاہئے کہ ان کے ساتھ صلہ رحمی کرتے ہوئے ان کا تعاون کریں، صاحب ثروت ہونے کے باوجود بھی، کیونکہ وہ ابھی فوری طور پر مجبور سمجھے جائیں گے۔ حضرت جابرؓ کی حدیث اسی بات کا تقاضا بھی کرتی ہے۔

(۴) الف: ...... لڑکے کے اوپر والدین کی خدمت کرنا واجب ہے، خاص کر جب وہ ضعیف ہوں اور خدمت کے محتاج ہوں تو ان کی ذمہ داری اور بھی بڑھ جاتی ہے، لیکن اگر والدین ہی اجازت دیدیں تو جانے میں کوئی حرج نہیں ہے، فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر لڑکا کوئی ایسا عمل کرے جس میں اس کے والدین کا کوئی دینی ودنیاوی نقصان نہ ہو، لیکن انہیں لڑکے کا یہ عمل پسند نہ ہو تب بھی اس کے لئے والدین کی اجازت حاصل کرنا ضروری ہے۔

اگر والدین کی ہلاکت کا اندیشہ نہ ہو بایں طور کہ وہ مالدار ہوں لڑکے پر ان کا نفقہ واجب نہ ہو، صحت یاب وتندرست ہوں اور اس سفر میں لڑکے کی ہلاکت کا بھی اندیشہ نہ ہو تو پھر بغیر اجازت کے جانے میں کوئی حرج نہیں ہے، جیسا کہ مذکورہ عبارت سے پتہ چل رہا ہے:

''وإن كان يخاف الضيقة عليهما .... إن كان سفرًا لا يخاف على الولد الهلاك فيه، كان له أن يخرج بغير إذنهما .... وكذا الجواب فيما إذا للنفقة إلى بلدة أخرى'' (الفتاوی الہندیہ ۵/ ۳۶۵)۔

لہذا احقر کی رائے ہے کہ والدین کی اجازت سے اس کا دوسری جگہ جانا جائز ہے۔

(ب) قرآن وحدیث میں یہ بات نہیں کہی گئی ہے کہ عورت کو شوہر کے والدین کی خدمت نہیں کرنی چاہئے، اگر شوہر کے والدین بہو کی خدمت کے محتاج نہ ہوں تب بھی ان کی خدمت استحباب کے درجہ میں ہے اور اخلاقی واجبات میں ہے اور اگر وہ خدمت کے محتاج ہوں اور دوسرا کوئی خدمت کرنے والا نہیں ہے تو بہو پر واجب ہے کہ وہ اپنی صلاحیت کے مطابق انکی خدمت کرے کیونکہ ساس سسر بھی والدین کے حکم میں ہیں تو جیسے بوقت ضرورت والدین کی خدمت واجب ہے اسی طرح ساس سسر کی خدمت بھی واجب ہے اور جیسے والدین کی خدمت سعادت اور باعث اجر وثواب ہے، اسی طرح ساس سسر کی خدمت بھی باعث اجر وثواب ہے (کتاب الفتاوی ۹/ ۳۵۲)، لہذا احقر بھی حضرت مولانا دامت برکاتہم کی اس رائے سے متفق ہے اور پورے طور پر مطمئن ہے۔

(ج) ماں باپ کی خدمت میں بیٹے اور بیٹیاں دونوں شریک ہوں گی، کیونکہ نفقہ دونوں پر برابر برابر واجب ہے،

''وإذا اختلطت الذكور والإناث فنفقة الأبوين عليهما على السوية في ظاهر الرواية، وبه أخذ الفقيه أبو الليث وبه يفتى'' (الفتاوی الہندیہ ۱/ ۵۶۴)۔

''قال الحنفية والشافعية والحنابلة: توزع النفقة على قدر الميراث، فلو كان الرجل مريضًا زمنًا وله أولاد. فعليهم نفقة أبيهم على قدر ميراثهم'' (الفقہ الاسلامی ۷/ ۷۷۵)

احناف وشوافع اور حنابلہ کے نزدیک اگر آدمی مریض ہو یا اپاہج ہو اور اس کی کچھ اولاد ہو تو والدین کا نفقہ ان تمام اولادوں پر واجب ہوگا چاہے وہ بیٹے ہوں یا بیٹیاں ہوں، میراث کے بقدر''۔

اور اسلام میں نکاح کی وجہ سے والدین اور اولاد کے حقوق ایک دوسرے پر ختم نہیں ہوتے اور یہ حکم بیٹیوں کے لئے بھی ہے اور بیٹوں کے لئے بھی، جب والدین خدمت کے محتاج ہوں اور کوئی خدمت کرنے والا نہیں ہے تو بیٹیوں پر ان کی خدمت واجب ہے اور شوہر کا اس سے روکنا زیادتی ہے۔ فقہاء نے لکھا ہے کہ ماں باپ کے حقوق میاں بیوی کے حقوق پر مقدم ہیں، اس لئے باپ چاہے غیر مسلم کیوں نہ ہو اور چاہے جائز بات میں ان کی اطاعت کرنے میں شوہر کی خلاف ورزی کیوں نہ ہو باپ کی خدمت کی جائے گی، چنانچہ مشہور حنفی فقیہ قاضی فخر الدین لکھتے ہیں:

''امرأة لها أب زمن ليس له من يقوم عليه وزوجها يمنعها عن الخروج إليه وتعاهده كان لها أن تعصى زوجها وتطيع الوالد، مؤمنا كان الوالد أو كافرًا، لأن القيام بتعاهد الوالد فرض عليها فيقدم على حق الزوج'' (الفتاوی الخانیہ حاشیۃ الہندیہ ۱/ ۴۴۳)

کسی عورت کے والد اپاہج ہوں جن کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی موجود نہ ہو اور اس کا شوہر اسے والد کے پاس جانے اور اس کی دیکھ بھال کرنے سے منع کرتا ہو تو عورت کے لئے جائز ہے کہ وہ اپنے شوہر کی بات نہ مانے اور والد کی اطاعت کرے، چاہے وہ مسلمان ہو یا کافر، کیونکہ والد کی دیکھ بھال اس پر فرض ہے، لہذا یہ شوہر کے حق پر مقدم ہوگا۔

لہذا احقر کی رائے یہ ہے کہ ایسی مجبوری اور بے بسی کی حالت میں بیٹیوں کو شوہر کے منع کرنے کے باوجود بھی ان کی خدمت کرنی چاہئے، واجب

ہے، اور شوہر حضرات کو انہیں روکنے کا حق نہیں ہے۔

(۵) حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی دامت برکاتہم اپنی کتاب ''کتاب الفتاوی'' میں فرماتے ہیں کہ نکاح کا مقصد صرف اپنی صنفی ضرورت کی تکمیل ہی نہیں ہے، بلکہ زندگی کے سرد و گرم اور نشیب و فراز میں ایک دوسرے کی رفاقت اور ایک دوسرے کی دستگیری بھی ہے اور اس پہلو سے جیسے انسان جوانی میں بیوی اور شوہر کا محتاج ہوتا ہے اسی طرح بلکہ بعض اوقات اس سے بڑھ کر وہ اخیر عمر میں زندگی کے ساتھ کا ضرورت مند ہوتا ہے۔ لہذا بڑھاپے میں نکاح کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے اور شریعت میں اس کی اجازت بھی ہے۔ جس سے نکاح کر رہا ہے وہ محللات میں سے ہے تو ایسی صورت میں نکاح کر لینا ہی بہتر ہوگا بشرطیکہ حقوق پورا کرنے کی صلاحیت ہو اور بیٹے بیٹیوں کو چاہئے کہ وہ رکاوٹ نہ بنیں، بلکہ اس میں تعاون کریں، کیونکہ یہ بھی باپ کی خدمت کا حصہ ہے اور عمر رسیدہ لوگوں کو بھی اپنے لئے غمگسار اور رفیق کی ضرورت ہوتی ہے او ربچوں کا فریضہ ہے کہ وہ اپنے والد کی اس دوسری بیوی کو ماں کا درجہ دیدیں اور والد اگر اپنی بیوی کا نفقہ ادا کرنے کی پوزیشن میں نہ ہو تو اس کے اخراجات بھی انہی بچوں کی ذمہ داری ہے۔ فقہاء نے اس کی صراحت کی ہے،

''وإن إحتاج الأب إلى زوجة والابن مؤسر وجب عليه أن يزوجه أو يشترى له جارية'' (الفتاوی الهندیه ۱/ ۵۶۵)

، اگر باپ کو بیوی کی ضرورت ہو اور بیٹا مالدار ہو تو بیٹے پر واجب ہے کہ وہ اس کی شادی کردے یا پھر اس کے لئے ایک باندی خریدے۔

بلکہ جمہور فقہاء اور ایک روایت کے مطابق حنفیہ بھی اس بات کے قائل ہیں کہ اگر باپ تنگدست ہو تو اس کا مہر بھی بیٹے پر ہی واجب ہوگا۔

''يرى جمهور الفقهاء وفى رواية عند الحنفية: ''أن الولد يلزمه تزويج أو إعفاف أبيه المعسر؛ لأنه من وجوه حاجاتهم المهمة كالنفقة والسكنى ولئلا يعرضهم للزنا، المفضى إلى الهلاك وهو لا يليق بحرمة الأبوة وليس من المصاحبة بالمعروف المأمور بها فالزواج مما تدعوا الحاجة إليه ويتضرر الأب بفقده، فلزم ابنه تزويجه، كالنفقة'' (الفقه الاسلامی ۷/ ۷۷۶)۔

اس عبارت سے بھی ثابت ہو رہا ہے کہ نکاح باپ کی اہم ترین ضروریات میں سے ہے، جیسے کہ نفقہ سکن وغیرہ ہے۔ لہذا اس میں اولاد رکاوٹ نہ بنے کیونکہ یہ چیز اس باپ کو ہوسکتا ہے کہ زنا تک پہنچادے جو کہ مفضی إلى الهلاك ہے، دوسری چیز اس کا یہ عمل باپ کے احترام کے مناسب نہیں ہے، تیسری چیز وہ حسن سلوک جس کا بیٹے کو حکم دیا گیا ہے، وہ ہاتھ سے نکل جائے گا، لہذا شادی باپ کی ضرورت ہے اور شادی نہ ہونے کی صورت میں باپ نقصان محسوس کر رہا ہے تو اس کے بیٹے پر لازم ہے اس کی شادی کرنا، ایسے ہی جیسے نفقہ لازم ہے۔

اب اگر شادی کے بعد خود والد میں اپنی بیوی کی کفالت کی استطاعت نہ ہو تو اس کے بیٹے کی ذمہ داری ہے کہ اس کا نفقہ برداشت کرے، جیسا کہ ڈاکٹر وہبہ زحیلی فرماتے ہیں:

''يلزم الابن أيضا نفقة زوجة أبيه فى رأى الحنابلة والشافعية والمالكية. وفى رواية عند الحنفية فكل من لزمه إعفافه، لزمته نفقة زوجته كما تقدم، وأما الرواية الأخرى عند الحنفية. فلاتجب نفقة زوجة الأب إلا إذا كان الأب مريضًا، وبه زمانة'' (الفقه الاسلامی ۷/ ۷۷۷)۔

لہذا احقر کی رائے ہے کہ بیٹے اور بیٹیاں اپنی والدہ کے فوت ہوجانے کے بعد والد کے دوسرے نکاح میں رکاوٹ نہ بنیں، بلکہ اگر خود والد میں اپنی بیوی کی کفالت کی استطاعت نہ ہونے کی ضرورت میں تو تمام فقہاء کے نزدیک باپ کی بیوی کا نفقہ واجب ہوگا۔

(۶) بالغ اولاد کا نفقہ باپ پر واجب نہیں ہے، بشرطیکہ وہ کمانے پر قادر ہوں، لہذا اولاد کو مطالبہ کا حق بھی نہیں رہا، کیونکہ جب تک باپ زندہ ہے اولاد کا حق اس کے مال میں بالکل نہیں ہے، لیکن اگر باپ خود ہی بیٹے پر خرچ کر رہا ہے تو یہ اس کی طرف سے مستحب ہے، یہ اس کی طرف سے صلہ رحمی سمجھی جائے گی، اور صلہ رحمی کرنے کا حکم تو ہر ایک کو دیا گیا۔

''أما الولد الكبير: فلا تجب نفقته على الأب إلا إذا كان عاجزًا عن الكسب لآفة فى عقله كالجنون والعتة أو آفة فى جسمه كالأعمى والشلل .... أو بسبب المرض المانع له منا لاكتساب'' (الفقه الاسلامی ۷/ ۸۲۴)

''أما الكبار الأصحاء فلا يقضي لهم بنفقتهم على غيرهم، وإن كانوا فقراء'' (الفتاوى الهنديه ۱/۵۶۶)۔

لہٰذا احقر کی رائے یہ ہے کہ اگر بیٹا کمائی پر قادر ہے اور صحتمند اور تندرست ہے اگر چہ وہ فقیر ہے لیکن ایسی صورت میں بھی باپ کے مال میں اس کا واجبی حق نہیں ہوگا، جس کی وجہ سے اس کو مطالبہ کا حق بھی نہیں ہے، ہاں باپ کو حکم دیا جائے گا کہ وہ صلہ رحمی کے طور پر اس پر خرچ کرے تا کہ وہ دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلانے سے بچ سکے۔

(۷) احقر کی رائے یہ ہے کہ ہندوستان میں دراز عمر لوگوں کے لئے ہاسٹلوں کا قیام اسلامی نقطۂ نظر سے درست ہے، لیکن ایسے لوگوں کے لئے جن کے اعزہ واقارب موجود نہ ہوں، تا کہ ان کی کفالت ایسے ہاسٹلوں میں سرکاری طور پر ہو سکے، وہ بدر بدر کی ٹھوکریں کھانے سے محفوظ رہیں، دوسرے کے سامنے ہاتھ نہ پھیلائیں، اور ایسے لوگوں کا نفقہ بھی بیت المال ہی کے ذمہ ہوا کرتا ہے، جیسا کہ یہ فقہی عبارت ہمیں بتا رہی ہے:

''نفقة الشيخ الكبير والزمن والمريض على بيت المال، إذا لم يكن له مال ولا قرابة'' (الفتاوى الهنديه ۱/۵۷۰)

بڑے بوڑھے اور اپاہج و مریض کا نفقہ بیت المال پر واجب ہے، اگر ان کے پاس مال نہ ہو اور نہ ہی ان کے اعزہ واقارب ہوں۔

اگر بیت المال کا بدل حکومت فراہم کر رہی ہے تو اس کا استعمال کرنے میں احقر کوئی حرج نہیں سمجھتا، کم از کم ایسے لوگ بھیک مانگنے سے بچ جائیں گے جس کو شریعت پسندیدہ نہیں سمجھتی، محض بدرجہ مجبوری اجازت دیتی ہے۔ لیکن جن حضرات کے اعزہ واقارب موجود ہیں ان کے لئے اپنے بزرگوں کو ایسے ہاسٹلوں میں داخل کرنا یا وہاں کے قیام پر مجبور کرنا درست نہیں ہے، کیونکہ ایسے لوگوں کا نفقہ ان کے اقارب پر واجب ہے، اور ان کے ساتھ صلہ رحمی اور حسن سلوک کرنے کا حکم دیا گیا ہے، جیسا کہ اس سے پہلے دلائل ذکر کئے گئے کہ باپ کا نفقہ تو اولاد پر بہر صورت واجب ہے اور دوسرے اقرباء کا نفقہ بصورت محتاجی واجب ہے۔ اگر کوئی شخص ایسا کر رہا ہے تو وہ اپنے اقارب پر ظلم کر رہا ہے اور اس کا یہ عمل جائز نہیں ہے۔

(۸) اسلام میں اس بات کو پسند کیا گیا ہے کہ مسلمانوں کی زکوۃ اجتماعی طور پر جمع ہو اور مستحقین میں تقسیم ہو، خود قرآن مجید میں اس کی طرف اشارہ موجود ہے کہ اللہ نے ارشاد فرمایا: "خذ من أموالهم صدقة تطهرهم وتزكيهم بها وصل عليهم إن صلاتك سكن لهم" (التوبہ: ۱۰۳)، اس آیت میں صدقہ سے مراد جمہور سلف وخلف کے نزدیک زکوۃ ہے (فقہ الزکوۃ از ڈاکٹر یوسف القرضاوی ۲/۲۶۹)، اسی پر عہد صحابہ اور بعد کے زمانوں میں بھی عمل رہا ہے۔

"وإنما الصدقات للفقراء" (سورہ توبہ: ۶۰) کے تحت امین احسن اصلاحی فرماتے ہیں کہ ہمارے فقہاء کا ایک گروہ ''ل'' تملیک ذاتی کے مفہوم کے لئے خاص کرتا ہے، لیکن ہمارے نزدیک یہ رائے کسی مضبوط دلیل پر مبنی نہیں ہے، کیونکہ ''ل'' تملیک ہی کے معنی کے لئے خاص نہیں ہے، بلکہ متعدد معانی کے لئے آتا ہے، علاوہ ازیں یہ امر بدیہی ہے کہ صرف تملیک ذاتی کی صورت میں غرباء کو جتنا فائدہ پہنچایا جا سکتا ہے اس سے کہیں زیادہ نفع ان کو بعض حالات میں اس صورت میں پہنچایا جا سکتا ہے، جبکہ ان کی اجتماعی بہبود کے لئے بڑے بڑے کام کئے جائیں پھر تملیک ذاتی کے ساتھ اس کو خاص کر کے اس نفع کو محدود کیوں کیا جائے؟ (تدبر قرآن ۳/ ۵۹۳)۔

لہٰذا اسلام میں زکوۃ انفرادی فریضہ نہیں ہے، بلکہ ایک سرکاری ذمہ داری ہے کہ وہ اس نظام زکوۃ کو چلائے اور اس کی نگرانی کرے، اور اس نظام کے لئے وصول کنندگان، خازن اور کاتب ومحاسب کے جس عملے کی ضرورت ہو اسے مقرر کرے، ہندوستان میں بھی مسلمانوں پر نظام امارت قائم کرنا واجب ہے (فتح القدیر ۳/۳۶۵)، اور جن صوبوں میں اس طرح نظام امارت قائم ہو وہاں کے مسلمانوں پر واجب ہے کہ وہ اپنی زکوۃ کو اسی امارت کے بیت المال میں جمع کریں، جہاں اس طرح نظام قائم نہ ہو وہاں بھی مسلمانوں کو ایسی اجتماعی شکل پیدا کرنی چاہئے، جو زکوۃ کی وصولی و تقسیم کا نظم سنبھالے۔

جب زکوۃ کا اجتماعی نظم قائم کیا جانا واجب ہے تو مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ بیت المال کو قائم کریں، اور اپنی زکوۃ وہاں پر جمع کریں پھر جہاں ضرورت ہو فقراء اور محتاجوں پر خرچ کریں، فقراء میں ایسے بوڑھے بھی آ جائیں گے جن کے ہاتھ مال سے خالی ہو، اور بے سہارا ہوں، اور وہ بوڑھے تو بدرجہ اولی آ جائیں گے، جن کے قریبی رشتہ دار اور اولاد موجود نہ ہوں، کیونکہ ایسے لوگوں کو نفقہ تو بیت المال ہی پر واجب ہوتا ہے، اور ان کا شمار فقراء ہی میں کیا جائے گا کیونکہ فقہاء کی مندرجہ ذیل عبارتیں ان کے فقراء و مساکین ہونے پر شاہد ہیں۔

☆ ''وعلى هذا نفقة الشيخ الكبير والزمن والمريض على بيت المال إذا لم يكن له مال. ولا قرابة. كذا في المضمرات'' (الهنديه ۱/ ۵۸۰)۔

☆ ''قال قتادة: الفقير الذى به زمانة وله حاجة والمسكين المحتاج الذى لا زمانة به. وهذا يدل على أن الفقير أحوج'' (بدائع الصنائع ۲/ ۳۶۶)۔

☆ ''ويجوز دفعها إلى من يملك أقل من النصاب. وإن كان صحيحًا مكتسبا. كذا في الزاهدى. ويجوز صرفها إلى الأب المعسر وإن كان ابنه موسرا. كذا في شرح الطحاوى'' (الهنديه ۱/ ۱۸۹)۔

☆ ''والفقر شرط عام لصرف جميع الصدقات المفروضة والواجبة ..... فيعطى من الزكاة من كان يملك أقل من نصاب شرعي. ولو كان صحيحًا قويًا قادرًا على الكسب. لأنه فقير والفقراء هم المصارف. فلا بأس أن يعطى من الزكوة من له مسكن وما يتأثث به في منزله وخادم وفرس وسلاح وثياب البدن'' (الفقه الاسلامى ۲/ ۸۰۹)۔

☆ ''عن علي وابن عباس قالا: إذا أعطى الرجل الصدقة صنفًا واحدًا من الأصناف الثمانية أجزأه. ولا يروى عن الصحابة خلافه. فصار إجماعًا من السلف لا يسع أحدًا خلافه لظهوره. وهذا قول أبي حنيفة وأبي يوسف ومحمد وزفر ومالك بن أنس'' (احكام القرآن ۴/ ۳۴۴)۔

لہٰذا احقر کی رائے یہ ہے کہ اگر یہ بوڑھے مال نصاب کے مالک نہ ہوں تو بہرصورت ایسے لوگوں کی اجتماعی کفالت کے لئے خصوصی طور پر زکوۃ کی رقم استعمال کرنا جائز ہے، کیونکہ یہ بھی فقراء میں شامل ہیں اور آٹھ قسموں کے مصارف میں سے ایک ہی قسم پر زکوۃ کی رقم خرچ کرنے سے زکوۃ ادا ہوجاتی ہے۔

(۹) عمر دراز لوگوں کے لئے حکومتوں نے مختلف چیزوں میں جو خصوصی رعایتیں رکھی ہیں وہ ایک خاص عمر کے لوگوں تک کے لئے ہوا کرتی ہیں، اس مقررہ عمر سے کم کے لوگوں کے لئے اس کا استعمال جائز نہیں ہوگا، اگر کوئی ایسی رعایتوں سے مقررہ عمر سے پہلے فائدہ اٹھاتا ہے تو اس کا یہ عمل چوری میں داخل ہوگا۔ چوری اور غصب اسلام میں کتنا شدید جرم ہے اس کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ چند سنگین جرائم ہیں جن کی سزا خود قرآن نے متعین کی ہے ان میں سے یہ سرقہ بھی ہے،''السارق والسارقة فاقطعوا أيديهما'' (المائدہ: ۳۸) کہ چوری کرنے والے مرد اور عورت کا ہاتھ کاٹ دو۔ حدیث میں بھی اس کی شدت بیان کی گئی ہے،

''عن ابن عباس عن النبيﷺ قال: لا يزني الزاني حين يزني وهو مؤمن. ولا يسرق حين يسرق وهو مؤمن'' (صحیح بخاری: ۶۷۸۲)۔

لہٰذا حکومت کی طرف سے یہ رعایتیں کسی ایک عمر دراز شخص کے لئے نہیں ہیں، بلکہ پوری قوم کے بوڑھوں کے لئے ہے، اس لئے گویا کہ ایک فرد مال کی چوری نہیں ہے، بلکہ پوری قوم کے بوڑھوں کے ساتھ بد دیانتی ہے اور بد دیانتی، چوری کسی صورت میں جائز نہیں، نہ مسلمان سے نہ غیر مسلم سے، نہ دیندار سے اور نہ بے دین سے، اس لئے ایسی باتوں سے احتیاط انتہائی ضروری ہے۔

باب چہارم مناقشہ

عمر رسیدہ اور معذوروں کے حقوق/ اسلامی شریعت کے خلاف عالمی پروپیگنڈہ:

مولانا عتیق احمد بستوی:

فقہ اکیڈمی نے جو سوالات اٹھائے ہیں اس پر عرض آپ حضرات نے سنا، آج جو صورتحال ہے اور سماج جس انداز اور راہ پر جارہا ہے، سچی بات یہ ہے کہ ہمارا اپنا پسند کیا ہوا سماج نہیں ہے،۔ اسلامی سماج نہیں ہے، پوری دنیا میں جو تیزی سے تبدیلیاں آرہی ہیں اور ہم چارو ناچار گویا اس کا ایک فرد اور حصہ ہیں اور بنتے جارہے ہیں، اور ان سماجی تبدیلیوں نے جن مسائل کو جنم دیا ہے ان مسائل سے ہم آنکھیں بند نہیں کر سکتے ہیں، ان مسائل کے بارے میں رہنمائی دینا ہماری ذمہ داری ہے، اور جن چیزوں پر نظر رکھنا ضروری ہے وہ یہ کہ ایک تو ہمارا اسلام کا سماجی نظریہ ہے ہماری تجاویز میں اس کی نشاندہی بھی ہو، کہ اسلام کیا چاہتا ہے، اسلام کے نزدیک میاں بیوی کے تعلقات کے تعلق کے بارے میں، حقوق کے بارے میں یا والدین اور اولاد کے حقوق کے بارے میں مطلوبہ معیار کیا ہے اور کیا ہونا چاہئے؟ اور جو موجودہ سماجی صورتحال بن گئی ہے جس مین ہم سب مبتلا ہیں ان حالات میں ہم کیا رہنمائی کر سکتے ہیں، ایک طرف تو ہم کو امت مسلمہ کو متوجہ کرنا ہوگا ان بنیادوں کی طرف جس پر لوٹنا ہمارے لئے دینی اعتبار سے ضروری ہے، اور اسی کے ساتھ ساتھ جو ضرورتیں ہیں اور واقعی جو مجبوریاں ہیں ان کو محسوس کرتے ہوئے جو راہ عمل اور جو گنجائش شریعت میں ہوسکتی ہو اس کی بھی ہم نشاندہی کریں۔

دوسری بات یہ عرض کرنی ہے کہ حضرت علامہ انور کشمیریؒ نے ایک بات بہت بنیادی لکھی ہے کئی بار حضرت نے ذکر فرمایا کہ ہمارے فقہاء نے عام طور پر متون میں جو مسائل ذکر کئے ہیں وہ عام طور سے احکام قضاء سے متعلق ہیں، شوہر بیوی کے تعلقات یا والدین اور اولاد کے حقوق، ان میں بہت سے مسائل میں قضاء اور دیانت کا فرق ہے تو اس فرق کو ہمیں ملحوظ رکھنا چاہئے، اگر یہ بات فقہ میں ہم پڑھتے ہیں کہ بیوی کا علاج کرانا یہ ذمہ داری شوہر کی نہیں ہے، ظاہر بات ہے یہ احکام قضاء سے متعلق چیز ہے، احکام دیانت میں نہیں ہے، یا نفقہ کے تعلق سے بہت سی چیزیں ہمارے سامنے آتی ہیں وہاں بھی اس کا فرق ہے اس فرق کو اپنی تجاویز اور فیصلوں میں ملحوظ رکھنا ہمارے لئے ضروری ہے اور اس کی نشاندہی بھی ہمیں کرنی چاہئے، اس لئے آپ کے یہ فیصلے جہاں مفتیان کرام کے لئے مشعل راہ بنیں گے وہیں دار القضاء کے قاضی بھی آپ کے ان فیصلوں سے رہنمائی حاصل کریں گے، تو اگر ہمیں بحث و مطالعہ سے محسوس ہوتا ہے کہ فلاں مسئلہ میں حکم دیانت الگ ہے اور حکم قضا الگ ہے، تو اس کی وضاحت بھی ہمارے فیصلوں میں ہونی چاہئے۔

یہ جو شوہر اور بیوی کے تعلق سے مسائل زیر بحث آئے، اصل میں میاں بیوی کا مسئلہ خاص طور سے، بہت نازک مسئلہ ہے اور آج جس انداز سے مسائل کو اٹھایا جارہا ہے اور ایک پروپگنڈہ ہے کہ گویا اسلام نے عورتوں کے حقوق کو سلب کیا ہے، ختم کیا ہے یہ ایک پوری مہم ہے اور اس میں میڈیا کا پورا گروپ لگا ہوا ہے، اور افسوس کی بات یہ ہے کہ مسلم خواتین بھی اس میں شامل ہوگئی ہیں اور ان کی جو تنظیمیں ہیں وہ بھی اس میں سرگرم ہیں، تو ہمیں اپنے فیصلوں میں اس کا بھی لحاظ کرنا پڑے گا کہ کوئی ایسا فیصلہ ہم نہ کر جائیں یا اس کی تعبیر ایسی ہم نہ کر جائیں جس کی بنیاد پر میڈیا میں مسئلہ کو گرم کرنے کا ایک بڑا موقع ان کو ہاتھ آجائے، ظاہر ہے کہ اگر آپ یہ بات کہتے ہیں کہ بیوی کا معاملہ منفعت کا معاملہ ہے تو یہ ایک عجیب وغریب بات ہوگی اور ان کو اسلام کو بدنام کرنے کا موقع ملے گا، تو تجویز کی روح بھی صحیح ہو اور اس کی تعبیر بھی صحیح ہو، ان باتوں کا لحاظ ہماری کمیٹی کے حضرات جو تجویز مرتب کریں گے انشاء اللہ ضرور رکھیں گے، میں عرض کے درمیان مداخلت نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن یہ باتیں ذہن میں آئیں کہ ان باتوں کا اگر اپنی تجاویز میں ہم لحاظ کریں تو انشاء اللہ ہماری تجاویز زیادہ بہتر ہوگی۔

مولانا عبید اللہ اسعدی:

مناقشہ میں حصہ لینے کے لئے ہمارے پاس کئی نام ہیں، انشاء اللہ ان حضرات کا نام پیش کیا جائے گا تو تین حضرات نے اپنی رائے لکھ کر بھیج دی ہے، ان

میں کچھ اہم بات بھی ہے، اور حضرت مولانا نعمت اللہ صاحب نے بھی ایک مختصر سی تحریر دی ہے جس میں اس موضوع اور گفتگو سے متعلق اشاعتی بات آئی ہے، حضرت مولانا نے تحریر فرمایا ہے کہ اسلام نے جو خاندانی نظام دیا ہے، اس میں اولڈ ہوم کی ضرورت ہی نہیں ہے جو لوگ خاندانی نظام ہی نہیں رکھتے اور ان کے بوڑھوں کا کوئی وارث ہی نہیں ہے ان کے لئے یہ بات کہی جاسکتی ہے اور اسلام میں بھی اگر ایسے لوگ ہیں جن کا کوئی وارث ہی نہیں ہے تو ان کے لئے بھی ایسا ہوسکتا ہے، اس لئے اس مسئلہ پر بحث اس طرح ہونی چاہئے، یعنی جو تمہید ہے اس کی کہ اسلام میں اس کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے، کیونکہ اسلام اپنا خاندانی نظام رکھتا ہے، اور اس میں سب کے حقوق کا خیال رکھا گیا ہے، اس مضمون کو حضرت نے لکھا ہے کہ اسے سنا دیا جائے تاکہ اس مسئلہ میں کوئی شک نہ ہو۔

مولانا مفتی جنید صاحب فلاحی نے دو باتیں لکھ کر بھیجی ہیں پہلی بات یہ ہے کہ بیوی کا علاج شوہر پر لازم ہوگا یا نہیں اعتدالی رائے عرف کو سامنے رکھ کر اختیار کی جانی چاہئے، ہمارے یہاں مہر عموماً ادھار ہوتا ہے، کم ہوتا ہے عورت کے پاس مال نہیں ہوتا ہے، ماں باپ بھائی بہن سے کوئی مدد نہیں ملتی ہے۔ دوسری طرف بیوی اپنے اوپر لازم حقوق سے ہزار گنا زیادہ خدمت شوہر، اس کے گھر اور اس کی اولاد کی کرتی ہے، اس پس منظر میں اس کا علاج شوہر پر واجب ہونا چاہئے یہ تو بہت ہی عجیب بات ہے کہ بیوی پر شوہر کے ماں باپ کی خدمت بھی لازم کی جائے اور علاج کی ذمہ داری شوہر پر نہ ڈالی جائے، اور دوسری انہوں نے یہ بات لکھی ہے کہ اولڈ ہاسٹل فیشن بنا کر پیش کئے گئے ہیں اسلام اس طرح انہیں تسلیم نہیں کرتا ہے انہیں معیوب سمجھا جائے گا، ہاں غریب ترین اولاد کے وہ ماں باپ جن کے دوا علاج پر بڑا خرچ آرہا ہے اور ان کو صاف ستھری آب ہوا کی انہیں ضرورت ہے ڈاکٹروں کی نگرانی کی ضرورت ہے جو دیہاتوں میں میسر نہیں ہے ان کے لئے مجبوراً ایسا کیا جاسکتا ہے، لیکن معمرین بیزاری کی حوصلہ شکنی ہونی چاہئے، یعنی جن لوگوں نے یہ اختلاف اس نقطہ نظر سے کیا ہے کہ ہم بری ہو جائیں ہم پر بوجھ نہ ہو۔

قاضی نعیم صاحب احمد آباد:

والدین ظاہراً اگر خوشی سے اولڈ ایج ہاسٹل میں قیام پذیر ہونے کو پسند کرلیں تو اس صورت میں اس بات پر بھی غور کرنا چاہئے کہ والدین نے اس کو کیوں پسند کیا؟ اور کیا ان کی یہ خوشی حقیقی ہے یا مصنوعی؟ ہاسٹل میں رہنے سے وہ بہت سی چیزوں سے محروم رہ جاتے ہیں، ہاسٹل کے قیام کے دوران وہ بھی اپنے آپ کو اجنبیت سے دوچار پائیں گے گرچہ وہ قیام پر متفق تھے، لیکن انسیت اور خود مختار گھر اور اپنے خاندان جیسی نہیں مل سکتی۔ ان نکات کو مدنظر رکھنے کی ضرورت معلوم ہوتی ہے، اس کو بھی مدنظر رکھا جائے کہ ہاسٹل میں ان کے قیام کرانے کی اجازت دی جائے تو ان کے انتقال کے بعد میراث کیا شرعی طریقے پر تقسیم ہوسکے گی؟ جبکہ ان کے ساتھ رہتے ہوئے قابض شخص ہی عموماً میراث کا حقدار بن بیٹھتا ہے، یا کم از کم حق سے زائد حصے کو اپنا حق باور کرلے گا، والدین کا نفقہ جن جن صورتوں میں اولاد پر واجب ہوتا ہے ان میں اولاد کے زمرے میں لڑکا اور لڑکی دونوں کو شمار کیا جانا چاہئے، دونوں اپنے پاس آنے والی رقم سے مناسب تناسب سے والدین کا نفقہ ادا کریں، اس لئے اس سلسلہ میں عصبہ کا بھی لحاظ رکھا جائے گا، نیز بعض والدین کے انتقال کے بعد والدین کے میراث کو شرعی طور پر تقسیم کرنے میں عملی طور پر متعین کیا جائے۔

یہ ساری تحریریں انشاء اللہ تجویز کمیٹی کے سامنے رکھ دی جائیں گی وہ ان کو سامنے رکھیں گی۔

مولانا حیدر علی قاسمی:

فقہی ضابطہ ہے "الضرورات تبیح المحظورات"، اور حدیث میں ہے: الدین یسر۔ اسلام میں شریعت مطہرہ میں...... جو بالکل معذور ہے جن کی دیکھ ریکھ کرنے والے کوئی نہیں ہوتے ہیں تو ایسے لوگوں سے تعاون کے ارادے سے ایسے ہوسٹل کے قیام کی گنجائش ہونی چاہئے، اور جو لوگ معذور ہیں مجبور ہیں، ان کو مجبور کرنا تو ٹھیک نہیں ہے، مگر یہ حضرات اپنی مرضی سے جانا چاہیں تو اس کی بھی گنجائش ہونی چاہئے، تیسری بات یہ ہے کہ بیوی کے علاج کی بات ہے تو جو ہمارا سماج ہے عرف ہے اس سماج میں عام طور سے عورتیں مال کی مالک نہیں ہوتی ہیں، بہت کم عورتیں ہوتی ہیں جن کے پاس مال ہوتا ہے، عام طور سے مال نہیں ہوتا ہے ایسی صورت میں اگر عورت پر ضروری قرار دیا جائے یا عورت کے والدین کو مجبور کیا جائے تو یہ تھوڑا سا مشکل نظر آرہا ہے، اس لئے ایسی حالت میں آج کے دور میں عرف کے لحاظ سے عورتوں اور بیویوں کا نفقہ اور اس کے ساتھ ساتھ علاج بھی شوہر کے ذمہ ہونا چاہئے۔

مولانا سلطان کشمیری:

اولڈ ایج ہوم کے متعلق جو باتیں آئی ہیں اس میں ہمارے معزز مقالہ نگاران نے کچھ زیادہ ہی نرمی اختیار کی ہے، اس سلسلہ میں گذارش یہ ہے

کہ قرآن وحدیث کے اندر جو بھی والدین سے متعلق تذکرے آئے ہیں اور ان کی خدمات کے سلسلہ میں جو آیات اور احادیث ہیں میں یہ سمجھتا ہوں کہ جن مقالہ نگاروں نے اس بارے میں نرمی اختیار کی ہے وہ صریح قرآن وحدیث کی مخالفت ہے، اس سلسلہ میں غور کرنے کی ضرورت ہے، دوسری بات مجھے اولڈ ایج ہاؤس کے سلسلہ میں یہ کرنی ہے کہ یہاں جو اس طرح اولڈ ایج ہوم قائم ہیں، ان پر اکثر غیر مسلموں کا قبضہ ہے، اس وجہ سے مجھے بہت زیادہ اس میں مضرت دکھتی ہے اور بہت زیادہ نقصان ہمارے سامنے آسکتے ہیں اگر اس باب میں نرمی کی جائے تو۔

مولانا اقبال احمد قاسمی:

دو باتیں عرض کرنی ہیں: ایک یہ کہ اولڈ ایج ہوم سے استفادہ کے لئے بڑے نقصان کی طرف توجہ دلانا ہے، اولڈ ایج ہوم تو ایک مجبوری کی صورت ہے، لیکن عام حالات میں بوڑھوں کو موت تک رکھنا اخروی اعتبار سے بھی سخت مضر ہے جاں کنی کے وقت کلمہ کی تلقین وغیرہ کا بھی موقع نہیں ملتا جس سے حسن خاتمہ کے مواقع فوت ہوتے ہیں، بزرگوں نے تو مرض وفات میں قریب المرگ مریضوں کو اسپتال سے نکال کر گھروں میں لانے کی ہدایت کی ہے، اس لئے بوڑھوں کو آخری وقت میں لاوارث چھوڑنا اخروی اعتبار سے بھی ٹھیک نہیں ہے، اس لئے اولڈ ایج ہوم میں بوقت مجبوری داخل کرنے کی صورت میں اس کا بندوبست کر کے چلنا ضروری ہے۔

دوسری بات: قبل از وقت بوڑھے ہونے، یعنی عمر دراز ہونے سے پہلے عمر دراز معلوم ہونے والی حکومت کی مراعت سے فائدہ اٹھانے میں جب تک ہم اپنی عمر میں جھوٹ نہیں بولیں گے استفادہ نہیں کر سکتے ہیں، ہمیں دو کارڈ بنوانے ہوں گے، ایک اصل عمر کا اور ایک فراڈ والی عمر کا اس لئے ایسی مجبوری نہیں معلوم ہوتی کہ اس کے لئے جھوٹ کی اجازت دی جائے، اگر قانون میں کوئی لچک معلوم ہو تو استفادہ کر سکتے ہیں اور اس استفادہ کی نظیر فقہ میں بلوغ کی عمر کا مسئلہ ہے، بلوغ ایک عمر کے اعتبار سے ہوتا ہے ۱۵ سال یا ۱۸ سال، ایک علامت کے اعتبار سے ہوتا ہے جس سے بلوغ سے پہلے ہی بلوغ کا حکم لگ جاتا ہے علامتوں سے، تو وہ اس کی نظیر بن سکتی ہے۔

مفتی سعید الرحمن ممبئی:

نفقۂ زوجہ کے سلسلہ میں عرض ہے کہ ایک خاتون کے دل میں سوراخ تھا اور اس کے علاج کا خرچ پانچ لاکھ روپیہ تھا، اس کا ظہور شادی کے بعد ہوا تو اس کا علاج کرنے سے شوہر نے تو انکار کر دیا، گھر والوں نے کہا کہ شوہر کی ذمہ داری ہے تو اس مسئلہ میں فوری طور پر یہ رائے دی گئی کہ دونوں مل کر یہ خرچ اٹھالیں تو زیادہ بہتر ہوگا، کیونکہ ڈاکٹر نے یہ کہا کہ جب تک یہ سوراخ بند نہیں ہوگا اس وقت تک یہ حمل کے لائق نہیں ہوگی تو اس میں بہت غور کرنے کی ضرورت ہے کہ مرض پیدا کہاں سے ہوا، جہاں سے پیدا ہو وہاں کے لوگوں کو زیادہ ذمہ دار بنائیں اگر ہو سکے تو دونوں مل کر اٹھالیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ ایک رواج چل رہا ہے ممبئی میں اور شاید اور علاقوں میں بھی ہو کہ ولادت کے وقت ۵۰ ہزار اور ایک لاکھ کی ضرورت بسا اوقات پڑ جاتی ہے، تو ولادت کا خرچ شوہر نہیں اٹھاتا، بلکہ وہ پہلی دوسری بار لازم رسما رواجا ماں باپ کا حق سمجھتا ہے کہ وہی خرچ دیں اس رسم ورواج کو مٹانے کے لئے اکیڈمی سے ایک کام ہونا چاہئے اگر تبرعا ماں باپ ایسا کچھ کریں تب تو بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ حرج نہیں، لیکن دباؤ، پھر بھی رہے گا، اس لئے اس سلسلہ میں بھی دیکھا جائے کہ ولادت کا خرچ خاص کر اس دور میں وہ کس کے ذمہ ہونا چاہئے نفقۂ زوجہ کے سلسلہ میں اور بھی امور پر ذرا غور کیا جائے۔

ایک گذارش اور تھی میری کہ یہ جو کسب کے سلسلے میں نکلنے کی بات آئی کہ اولاد ماں باپ کی اجازت سے نکل سکتی ہے اس میں بہت معذرت کے ساتھ عرض ہے کہ بعض دفعہ والدین تڑپتے ہیں اور کسب کے لئے نہیں اسلام پھیلانے اور دعوت وتبلیغ کے لئے لوگ نکلتے ہیں، اس پر بھی ایک جملہ کچھ آئے تجاویز میں کہ ضروریات میں وہ بھی شامل ہو اگر والدین محتاج ہوں اگر خدمت کے تو نہیں جا سکتا۔

مفتی ظہیر احمد کانپوری:

ہم سے جو مسئلہ دریافت کیا گیا ہے اس کا شرعی حکم ہم سے پوچھا گیا، ہم سے قانونی حکم یا اس پر قانون پر کیا اثر ہوگا یہ ہم سے نہیں پوچھا گیا، ہم سے پوچھا گیا کہ اللہ کی بارگاہ میں ہماری گرفت کب ہوگی، ہوگی یا نہیں ہوگی، ہم اس کے مجاز ہیں، یہ بات پیش نظر رہے۔

دوسری بات یہ پیش نظر رہے کہ تمام انسانی قوانین معلل بالعلۃ ہیں، لہذا قانون کا منشا ہم کو سمجھنا پڑے گا اور قانون کے منشا کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہم شرعی حکم بیان کریں گے، قانونی حکم ہم بیان نہیں کریں گے۔ اسی کے پیش نظر سب سے پہلے یہ کہ بلوغ کے بارے میں ہمارے فقہاء نے مفتی بہ قول

کے مطابق ۱۵ سال لڑکا ہو یا لڑکی، لیکن کوئی شخص اگر ۱۴ سال میں بالغ ہو جائے تو کیا آپ یہ کہیں کہ فتوی چونکہ ۱۵ سال کا ہے تو اسی پر آپ اس کو مکلف قرار نہیں دیں گے؟ آپ مکلف قرار دیں گے کیونکہ شریعت کو اصل جو مقصود ہے وہ حاصل ہو گیا اگر چہ وہ قانون اور فتوی کی نگاہ میں مکلف نہیں ہوا۔

اپنا حق وصول کرنے کے لئے رشوت کا دینا جائز ہے، حالانکہ رشوت کا دینا در اصل حرام ہے، چونکہ وہ ہمارا حق بن گیا شرعی طور پر، لہذا ہم اپنا حق وصول کرنے کے لئے ایک حرام چیز کا ارتکاب کر سکتے ہیں، اس پر فتاوی موجود ہیں، انکم ٹیکس سے چھوٹ حاصل کرنے لئے یا بچنے کے لئے محفوظ طریقہ اپنایا جا سکتا ہے اس کی میں نے قید پہلے لگا دی ہے کہ آپ عزت کی حفاظت کرنے کے ساتھ، اس لئے ہم نے یہ کہا ہے کہ کوئی شخص اگر قبل از وقت کمزور ہو گیا قانون نے بھی کہا ہے اب تک ۶۰ سال میں جیسا کہ ابھی تک تھا، اب تو ۵۷ سال کرنے جا رہے ہیں، اگر وہ ۶۰ سال کی عمر میں ریلوے وغیرہ کے ریزرویشن میں مراعات حاصل کر سکتا ہے، تو اگر اس نے کوئی آئی ڈی وغیرہ بنوالی اور فائدہ اٹھا لیا تو اللہ کے یہاں انشاء اللہ اس کی پکڑ نہیں ہوگی۔

اسی طرح اگر کوئی شخص ۶۰ سال سے کم ہے، لیکن اس نے آئی ڈی اپنی بنوالی ہے ۶۰ سال کی اور مراعات حاصل کر لی تو آپ بتائیے اس کا کیا حکم ہوگا؟ قانون کی نگاہ میں تو اس کو اجازت ہے، لیکن شرعاً اس کے لئے جائز نہیں ہوگا۔

مفتی محمد اشرف ڈوکرات (ساؤتھ افریقی مہمان):

ایسا شخص جو اپنے بارے میں کوئی فیصلے لیتا ہے کبھی کبھی ان کے جو ڈیسیزن ہوتے ہیں وہ کمزور ہوتے ہیں، تو زوجہ ثانی کے بارے میں ان کے فیصلہ کو معتبر نہیں سمجھتے ہیں جب تک کہ وہ دوسرے امور میں ڈیسیزن اور اپنے امور کو اچھی طریقے سے ڈیسیزن نہیں لے سکتے، قوت فیصلہ نہیں ہے اس میں اور یہ ایک شخص میں نہیں، بلکہ ہر شخص میں مختلف ہوتا ہے تو ہم نے جو فیصلہ کیا اور جو بحث ہو رہی ہے، تو اس کے لئے بھی کچھ کرنا پڑے گا۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

ایسا شخص جس کے قوت فیصلہ کی صلاحیت غیر معمولی طور پر متاثر ہو رہی ہے، اور اس وقت بعض دفعہ وہ ایسے فیصلے کرتا ہے جو خود اس کے لئے نقصان دہ ہوتا ہے، مجھے اس بیماری کا نام یاد نہیں جس سے آدمی کی یادداشت اور قوت فیصلہ یہ ساری چیزیں بہت تیزی سے متاثر ہونے لگتی ہے تو ایسے شخص کے لئے کیا حکم ہوگا؟ میں یہ سمجھتا ہوں کہ آپ کا سوال ہے۔

مولانا غلام رسول قاسمی:

آج کل ہم جس سماج اور سوسائٹی میں رہتے ہیں وہاں پر والدین کی خدمت کو ایک ضروری کام سمجھا جاتا ہے، اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ پورے ہندوستان میں تقریباً یہی ماحول ہے کہ ماں باپ ضروری طور پر اپنا واجبی حق سمجھتے ہیں کہ اولاد کی بیوی ان کی خدمت کرے اور یہ خدمت اگر کسی وجہ سے نہ کر پائے تو والدین یہ سمجھتے ہیں کہ بیٹا میرا باغی ہو گیا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ بہت سارے لوگ ایسے ہیں جو باہر رہتے ہیں اور وہ اپنی بیوی کو اپنے گھر صرف اس لئے چھوڑتے ہیں، تاکہ وہ ہمارے والدین کی خدمت کر سکے، بہت سارے لوگ ہیں جو دو دو سال تین تین سال باہر رہتے ہیں دور دراز علاقے میں رہتے ہیں، اب ظاہر ہے کہ والدین کی خدمت تو ان کے بیٹے کی ذمہ داری ہے یا بیٹی کی ذمہ داری ہے، بہو کی ذمہ داری شرعی طور پر نہیں ہے، لیکن ہمارے اس سماج میں اس کو ضروری سمجھ لیا گیا ہے، اب خدمت کی دو شکلیں ہو سکتی ہیں، ہمارے یہاں تو ایک خدمت یہ ہے کہ کھانا پکا دیا، کھلا دیا، کپڑے وغیرہ صاف کر دیئے، دوسری خدمت ہے جسمانی، اب جسمانی خدمت کو بھی ساس اپنا حق سمجھتی ہے، اگر جسمانی خدمت بہو نہ کرے تو وہ برانگیختہ ہو جاتی ہے کہ اس کا تصور نہیں کیا جا سکتا، ایک ہفتہ پہلے کی بات ہے کہ ایک صاحب جماعت میں اور ایک صاحب نے مسئلہ بتلا دیا اور انہوں نے آ کر اپنی والدہ کو یہ مسئلہ بتلایا کہ آپ کی بہو پر آپ کی خدمت واجب نہیں تو انہوں نے کہا کہ جب وہ خدمت ہی نہیں کرے گی تو گھر میں کس لئے رہے گی، تو اب سماج میں خدمت کے سلسلہ میں یہ تصور ہے، سماج کی صورت حال کو مدنظر رکھتے ہوئے شوہر کو چاہئے کہ اپنی بیوی سے کہے کہ میری ماں کی خدمت آپ پر لازم تو نہیں ہے، مگر آپ کریں گی تو یقیناً آپ کے لئے سعادت ہے اور جہاں تک شرعی گنجائش ہے۔

مولانا انوار الحق جلالی:

بہو اور ساس کا معاملہ بعض مرتبہ بہت سنگین ہو جاتا ہے، اس مسئلہ کو میں نے اپنے مقالہ میں نقل کیا ہے اور وہ عرض مسئلہ میں نہ آسکا، وہ یہ کہ حضرت تھانوی علیہ الرحمہ نقل فرماتے ہیں کہ بعض آدمی اس کو بڑی سعادت سمجھتے ہیں کہ بیوی کو اپنی ماں کا محکوم بنا کر رکھیں اور اس کے چلتے بیویوں پر بڑے بڑے ظلم ہوتے ہیں وغیرہ۔ اور نوبت کبھی کبھی یہاں تک آجاتی ہے کہ ایک لڑکا جو دیندار ہے تبلیغ سے جڑا ہوا ہے تو اپنی بیوی کو مجبور کرتا ہے کہ اگر تم خدمت نہیں کروگی تو میں تم کو طلاق دے دوں گا، ایسی نوبت آتی ہے بعض مرتبہ تو میاں بیوی کے درمیان کوئی رنجش نہیں ہوتی، مگر محض اس بنا پر کہ وہ اس کی والدہ کی خدمت نہیں کرتی تو اس کو طلاق دے دیتے ہیں، اس کو بھی پیش نظر رکھا جائے۔

مولانا عبدالرزاق قاسمی:

معذوروں اور بوڑھوں کے ہاسٹل کے قیام کے تعلق سے یہ عرض کرنا تھا کہ بارہا یہ بات سامنے آئی کہ اس میں نقصانات بہت ہیں شرعی نقطہ نظر سے، یہ بات ٹھیک ہے، لیکن اگر عالمی حالات کو دیکھتے ہیں اور دوسرے ممالک میں جا کر دیکھتے ہیں تو بسا اوقات اس کے بے شمار فوائد بھی ہمارے سامنے آتے ہیں، میرا ایک بار دمام میں معذورین کے ہاسٹل میں خود جانے کا اتفاق ہوا اور بھی بعض ہاسٹلوں میں معذورین اور بوڑھوں سے ملاقات ہوئی جو اس میں مقیم تھے میں نے ان سے حالات دریافت کئے تو وہ بے پناہ راحت محسوس کر رہے تھے، تو میرے خیال میں معذوروں اور بوڑھوں کے لئے ہاسٹل قائم کرنا یقینا مفید ہی ہوگا۔

مولانا عبدالخالق لونا واڑا: ...... ایک طرف تو ہم بہو پر یہ ذمہ داری عائد کرتے ہیں کہ وہ ساس کی خدمت نہ کرے اور دوسری طرف ہم اولڈ ایج ہوم کو بھی منع کر رہے ہیں، تو کیا شکل ہوسکتی ہے، ان بزرگوں اور معذوروں کی خدمت کون کرے۔

مولانا عبدالرشید کانپوری: ...... میرے خیال میں ولادت میں جو خرچ آتا ہے چاہے وہ آپریشن کا ہو یا بغیر آپریشن کا وہ تو شوہر کے ذمہ ہونا ہی چاہئے اور ہمارے معاشرہ میں تو ویسے بھی بیماری کا خرچ بیوی کے ذمہ نہیں ہونا چاہئے، ورنہ اگر نکاح کے وقت یہ کہہ دیا جائے عورت سے کہ تمہیں خرچ نہیں ملے گا تو شاید ہمارا معاشرہ ایسا ہے کہ نکاح ہی نہ ہوسکے اور وہ نکاح ہی سے محروم رہ جائیں۔

مفتی محمد جنید عالم ندوی:

بیوی کے علاج کے سلسلہ میں میری رائے یہ ہے کہ اگر بیوی بیمار ہو اور اس کے پاس مال ہو تو شوہر پر اس کے علاج کا خرچ واجب نہیں ہوگا اور اگر بیوی کے پاس مال نہ ہو اور شوہر کے پاس مال ہو تو اس پر اخلاقا علاج کا خرچ واجب ہوگا، یہ دو چیزیں ہیں ایک ضابطہ اور ایک رابطہ، رابطہ میں تو علاج کا خرچ واجب نہیں، لیکن ضابطہ میں واجب ہونا چاہئے، کیونکہ میاں بیوی کا تعلق رابطہ کا نہیں ہوتا، بلکہ ضابطہ کا ہوتا ہے۔

اور میری دوسری رائے اپنے بوڑھے اور معذور والدین کو اولڈ ایج ہوم میں رہنے کے لئے مجبور کرسکتے ہیں یا نہیں کے تعلق سے کہ یہ جائز نہ ہوگا، بلکہ ان کو اپنے گھر میں رکھ کر ان کی خدمت کرنا حتی الوسع لازم ہوگا اور اولاد از خود خدمت کرے یا خادم رکھ کر کرائے، البتہ اگر گھر میں ان کو رکھ کر خدمت ممکن نہ ہو یا بہت دشواری ہو یا اولڈ ایج ہوم میں اچھی خدمت ہوتی ہو، نیز اولاد کے لئے وہاں آنے جانے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو اور والدین وہاں جانے پر اپنی خوشی سے راضی بھی ہوں تو ایسی صورت میں اولاد اپنے بوڑھے اور معذور والدین کو وہاں داخل کرسکتے ہیں، لیکن اولاد پر اپنے والدین کا دینی اور دنیوی ضروریات کا خیال رکھنا واجب ہے۔

محمد آفتاب الدین نعمانی بنگلہ دیش: ...... ترجمہ (یوسف صاحب): یہ بتا رہے تھے کہ بنگلہ دیش میں اولڈ ایج ہوم بنایا گیا ہے۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی:

یعنی مغربی تہذیب کی بنیاد اصل میں خود غرضی پر ہے، جس آدمی سے جب تک ضرورت متعلق ہو رکھو، جب ضرورت ختم ہوگئی اس کو چھوڑ دو، یہ سلوک انکا بیوی کے ساتھ بھی ہوتا ہے اور ماں باپ کے ساتھ بھی ہوتا ہے، ایک دفعہ برطانیہ میں میرا قیام ہوا، پڑوس میں ایک انگریز جوڑا رہتا تھا، ضعیف، واکر لے کر چلتے تھے وہ، تو میں نے ان کے دونوں صاحبزادوں سے پوچھا کہ ہم لوگوں کے معاشرت اور ان کے معاشرت میں بڑا فرق ہے،

ان کو تنہا دیکھتے ہیں کوئی آتا ہے لے جاتا ہے تو کہنے لگے کہ ہمارے والد صاحب کی نصیحت ہے ہم لوگ روزانہ یا ایک دن کے ناغہ سے ان کی خیریت پوچھ لیتے ہیں، تو جب ہم لوگ جاتے ہیں وہ بے حد خوش ہوجاتے ہیں، اور وہ کہتے ہیں کہ تمہارے والدین کتنے خوش قسمت ہیں کہ تم ان کے پاس رہتے ہو، اور یہ بھی کہتے ہیں کہ میرے بچے بھی اچھے ہیں مجھے ہفتہ میں ایک بار ملاقات کر لیتے ہیں آکر، ورنہ ہمارے ملک میں تو عام طور پر جو پیرنٹس ڈے، مدرڈے یا فادرڈے ہوتا ہے اس میں سال میں بچے ایک دفعہ آکر ماں باپ کو گلدستہ پیش کرتے ہیں، اور ان کو مبارکباد دیتے ہیں۔

ہمارے اسلامی تہذیب کی بنیاد ایثار پر ہے عدل واحسان پر ہے، میں سمجھتا ہوں کہ عدل سے قانونی حقوق مراد ہیں، اور احسان سے اخلاقی حقوق مراد ہیں، جس کی بنیاد ایثار پر ہے، کہنے کا مطلب یہ ہے کہ مغربی تہذیب ہمارے دروازہ پر دستک دے رہی ہے، اس کی وجہ سے یہ مسائل پیدا ہورہے ہیں، اس پر غور کرتے ہوئے ہمیں دونوں باتیں پیش نظر رکھنی چاہئے: ایک یہ کہ واقعات کیا ہیں اور جن واقعات کو ہم ٹال نہیں سکتے ان کا حل کیا ہے اور دوسرے کیا ہونا چاہئے، اسلام کی معیاری اور بنیادی تعلیمات کیا ہیں؟ اس میں ہماری طرف سے نرمی اختیار نہیں کیا جانا چاہئے؟ یہ بہت عجیب بات ہے کہ دنیا میں تمام لوگوں کے حقوق کے لئے اس وقت تنظیمیں موجود ہیں، بچوں کے حقوق کے لئے، عورتوں کے حقوق کے لئے آوازیں اٹھائی جاتی ہیں، مزدوروں کے حقوق کے لئے یہاں تک کہ جانوروں کے حقوق کے لئے بھی، لیکن یہ جو بوڑھوں کا طبقہ ہے جس کی گود میں پل کر ایک سوسائٹی جوان ہوتی ہے ان کے حقوق کے لئے کوئی سوسائٹی یا تنظیم نہیں ہے، تو واقعی اسلامی تعلیمات ہیں اور جو بنیادی بات ہے ہمارے یہاں کہ جو کچھ احکام اخلاقی ہوتے ہیں، لیکن بوقت ضرورت وہ قانون کا درجہ اختیار کر لیتے ہیں، بعض احکام جو اخلاقی ہیں اور وہ عام حالات میں انفرادی حیثیت سے واجب نہیں ہیں، لیکن اگر اس کے سوا مسئلہ کا کوئی حل نہ ہو تو باضابطہ قانونی واجبات میں داخل ہوجاتا ہے تو اس پہلو کو بھی ہمیں پیش نظر رکھنا چاہئے کہ اس کا ایک پس منظر ہے اور یہ مغربی تہذیب کی ہمارے سماجی نظام اور تہذیب پر حملہ کرنے کی ایک کوشش ہے، تو ہم اپنی نئی نسل کے لئے یہ کوشش کریں کہ وہ اسلام کی جو اعلی اخلاقی تعلیمات ہیں ان پر اپنے آپ کو قائم رکھے۔

دوسرا مسئلہ یہ عرض کرنا ہے جتنے مسائل ابھی تک آئے ہیں تو ہم لوگ اگر غور کریں تو اس میں نصوص بہت کم ہیں، اس کی بنیاد زیادہ تر عرف پر ہے، اب جیسے یہ بیوی کے علاج کا مسئلہ ہے تو ایسے مسائل میں فقہی جزئیات کے بجائے فقہاء کے اصول سے بھی ہمیں استفادہ کرنا چاہئے کہ نفقہ کی جو تعریف کی ہے فقہاء نے وہ تمام چیزیں کہ جس سے بقائے حیات متعلق ہو، وہ سب چیزیں نفقہ میں شامل ہیں تو اس پہلو سے بھی ہمیں غور کرنا چاہئے کہ کون کون سی چیز آج کے دور میں نفقہ میں داخل ہوگی؟ اگر کسی عورت سے یہ کہا جائے کہ کھانا تو تم ہمارے یہاں کھالو اور بیمار ہو تو باپ کے گھر چلی جاؤ تو سوچئے کہ اللہ تعالی نے عشر بالمعروف کا جو حکم دیا ہے، تو کیا واقعی اس سے اس حکم کی تعمیل ہوگی اور اسلام کا جو بنیادی مقصد قیام عدل ہے وہ آپ کے بچوں کی ماں بنے، وہ آپ کو صاحب اولاد بنائے، آپ کی خدمت کرے اور جب اس کی خدمت کا موقع ہو تو ماں باپ اس کی خدمت کریں؟ تو سوچئے کہ شریعت میں جو عدل کا حکم دیا گیا ہے تو کیا اس تقاضے کی اس طرح تکمیل ہوسکتی ہے؟ تو میں یہ دو باتیں عرض کرنا چاہتا تھا کہ ان مسائل کے تہذیبی پس منظر کو ملحوظ رکھا جائے اور شریعت کے جو بنیادی مقاصد ہیں قیام عدل اور معروف طریقے کے مطابق معاشرہ اور سوسائٹی اپنے فرائض کو انجام دیں، ان اصولوں پر بھی ہماری نظر ہونی چاہئے۔ بہرحال بہت اہم بحثیں آئیں اور بہت ہی دقیقہ رسی کے ساتھ یہ تحریریں لکھی گئی ہیں، ایک ایک جزئیہ پر گفتگو کی گئی ہے، سد ذریعہ کا پہلو بھی سامنے رکھا گیا ہے، انشاء اللہ ان مفید مناقشات کی روشنی میں جو ہمارے تجویز مرتب کرنے والے حضرات ہیں، وہ تجویز مرتب کریں گے، مفتی سعید الرحمن صاحب نے بھی ایک نکتہ اٹھایا ہے تو تجویز کا لفظ ایسا عام ہو جو تمام صورتوں پر حاوی ہو کسی خاص واقعہ کا ذکر بعض دفعہ مناسب نہیں ہوتا ہے، مصلحت کے خلاف ہوتا ہے، لیکن ایسے اصول آپ مرتب کرسکتے ہیں جو ہر طرح کے مسئلہ پر حاوی ہو۔

مولانا محمد قاسم (ایران):...... میں بہت شکر گذار ہوں آپ حضرات کا کہ مجھے موقع دیا کہ میں اپنی معروضات پیش کرسکوں، اللہ سبحانہ وتعالی نے بڑا فضل فرمایا کہ اجتماعی غور وخوض کی ایک صورت فرمادی، اس سمینار میں جو مقالات پیش کئے گئے اور جو مناقشات ہوئے ہمیں فقہ کا جو ایک بہت بڑا تصور تھا ویسے ہی ہورہا ہے کہ فقہ کا تعلق فکر سے بھی ہے، تمدن سے بھی ہے، تہذیب سے ہے وہ فقہ جو ہم مدرسوں میں پڑھتے تھے اور پڑھاتے ہیں کہ نماز، روزہ طہارت وغیرہ وغیرہ سب اہم چیزیں ہیں، لیکن اب جو ضرورتیں تہذیب وتمدن، اقتصاد، عالمی اقتصاد نے پیدا کی ہیں اس پر بھی الحمد للہ غور وخوض ہورہا ہے اور کافی ہوچکا ہے، اور بعض باتیں تو عرف میں ایسی ہیں جو قابل قبول نہیں ہیں کہ ایک بوڑھے شخص کو ہم کیسے اولڈ ایج ہوم میں داخل کریں، لیکن جب تمدن اور تہذیب یہ شکل اختیار کرے کہ دو بچے ہوں اور عام طور پر کم بچے بہتر زندگی یہ شعار ہو اور ایک بچہ ڈاکٹر ہے اور اس کی بیوی

بھی نرس ہے تو دونوں مشغول ہیں اب اس سے ظاہر ہے کہ اب اگر وہ کام کو جائیں گے تو خدمت نہیں ہوگی، تو اس طرح مجبوری ہو جاتی ہے، بعض چیزیں ہیں جو تعلیم نے جنم دی ہیں، اور ضرورت تو خود ایجاد کی ماں ہے، اسی لئے ان مسائل کے حل کے سلسلہ میں ہمیں ایک نئی سوچ، نئی فکر اور اصولوں کی روشنی میں ان نئے مسائل کو حل کرنا پڑے گا، اور آپ دیکھیں کہ ہاسپٹل کا جو تصور ہے، ہمارے مشرقی ملکوں میں ہاسپٹل تو پہلے بھی تھے، مگر موجودہ ہاسپٹل تو مغرب سے آئے ہیں، اب بات کرتے ہیں بوڑھوں کے ہاؤس کی تو اس کا بھی ایک مغربی تصور ہے، اس مغربی تصور، مغربی اصول اور عرف کے طریقے پر بنائے گئے ہیں، یہ شاید ہمارے لئے قابل قبول نہ ہوگا، ہم اپنے اصولوں سے ایسی چیز بنائیں کہ جس کے ساتھ مسجد بھی ہو، تبلیغی حلقہ بھی ہو، کچھ رضا کار لوگ اس میں خدمت کرنے والے بھی ہوں کہ بھئی کون خدمت کے لئے تیار ہے ایسے لوگوں کے لئے، تو ایسی صورت شاید لوگوں کو قابل قبول ہو اور ہمارے دین کی بھی حفاظت رہے گی، ہم نے بہت سے ضعیف لوگوں کو دیکھا ہے کہ وہ اپنے گھر کو چھوڑ کر تبلیغی مرکز میں رہ رہے ہیں، اور ان کے پرانے ساتھی ان کی خدمت بہتر سے بہتر طریقے پر کر رہے ہیں، ان سے بڑا فیض پہنچ رہا ہے تو اس قسم کے تصور کے لئے ہمیں اپنے حالات دیکھنا ہوگا۔ مجھے امید ہے کہ انشاء اللہ فقہ اکیڈمی فکری، فقہی، اقتصادی طور پر بھی رہنمائی فرمائے گی، ہمیں بڑی امید ہے۔

مولانا عتیق احمد بستوی: ...... اولڈ ایج ہوم جو پوری دنیا میں بنے ہوئے ہیں، امریکہ و یورپ میں خاص طور سے تو ان اولڈ ایج ہوم میں ایک بڑا دعوتی کام جو لوگوں نے شروع کیا ہے، ان اولڈ ایج ہوم میں اکثر غیر مسلم ہوتے ہیں، عیسائی و یہودی وغیرہ تو جو مسلمان ان کی خدمت کرتے ہیں اور بسا اوقات ان لوگوں میں بہت کو ایمان کی توفیق ہو جاتی ہے تو یہ بہت بڑا میدان خدمت اور دعوت کا بھی ہے، جیلوں میں لوگ جا کر کام کر رہے ہیں کچھ اللہ کے بندے ہیں ایسے، یہ پہلو بھی ہمارے ذہن میں ہونا چاہئے کہ گویا یہ ایک نیا میدان فراہم ہو رہا ہے دین کی دعوت کا۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی:

اولڈ ایج ہوم کے سلسلہ میں جو بات چل رہی ہے، تو بہت سی جگہ مسلمان بھی اسلامی ماحول کے ساتھ اس کو قائم کر رہے ہیں، چنانچہ حیدرآباد میں مسلمانوں نے "بیت المعمرین" قائم کیا ہے، اور وہاں پورا انتظام مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے، پورے اسلامی شعائر کے ساتھ ہے، نمازوں کا اہتمام ہوتا ہے، اور خاص کر جن ماں باپ کے بچے باہر ہیں، نہیں آسکتے، اور وہ ان کی خدمت نہیں کر سکتے، ان کو وہاں رکھتے ہیں اور وہ اپنے ماں باپ سے رابطہ میں بھی رہتے ہیں، تو کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ایک اس کا مثبت پہلو بھی ہے، تو پہلے تو ہم کو ان چیزوں سے بچنا چاہئے جو اسلام کے مزاج کے خلاف ہو، لیکن اگر حالات انسان کو اس پر مجبور کریں، تو اس کو بہتر شکل میں پیش کرنے کی کوشش بھی کرنی چاہئے، تو جو تجاویز ہوں تو اگر اس میں تجویز مرتب کرنے والے حضرات اس کے جواز کے اوپر پہنچیں تو وہ اس کے لئے اصول و معیار کو دیکھیں کہ مسلمانوں کو خود اپنے ایسے بوڑھے لوگوں کے لئے جن کا کوئی دیکھ ریکھ کرنے والا نہ ہو تو ان کے لئے ایسے ہوسٹل قائم کریں اور ان میں کن باتوں کی رعایت ہونی چاہئے تو ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس شر سے خیر پیدا فرما دے۔

مولانا نعمت اللہ اعظمی:

بسم اللہ الرحمن الرحیم، میری گذارش ہے، جس کو مولانا عبید اللہ اسعدی صاحب نے پڑھ کر سنایا کہ اس طرح کے نظام کو جو قائم کیا گیا ہے یورپ میں بوڑھوں اور دوسرے تمام معذوروں کو اپنے پاس نہ رکھنے کا، اس کی وجہ کیا ہے؟ اور اس طرح ان اولڈ ایج ہوم میں لوگوں کی دیکھ ریکھ کی جا رہی ہے، ان پر نفسیاتی اثر کیا پڑ رہا ہے؟ اور اسلام نے جو طریقہ اختیار کیا ہے اس کا کیا اثر ہے؟ مجھ کو تو کبھی اتفاق ہوا نہیں ادھر ادھر جانے کا، بس ایک مرتبہ میں لندن گیا اور میں نے ان لوگوں سے کہا کہ مجھے ایسی جگہ لے جایا جائے اگر نہیں تو ان کے احوال کو بتایا جائے، اس پر کتابیں بھی لکھی گئی ہیں، تو جو ہمارا نظام ہے اس کو ہم کو ٹھیک کرنا چاہئے، خدمت کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آدمی براہ راست خدمت کرے، بہتر تو یہی ہے کہ براہ راست خدمت کی جائے، مگر ایسا نہیں ہے تو اگر آدمی استطاعت رکھتا ہے، تو اپنے گھر پر ملازم رکھ کر کرے، تو اس کو دوسری طرف منتقل کر دیتا ہے تو اس کے کیا اثرات مرتب ہوں گے؟ ہمارے خاندانی نظام کا تصور ختم ہو جائے گا، ہمیں ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنے خاندانی نظام کو باقی رکھیں، اور اس کو برقرار رکھنے کے لئے کوشش کریں، بنیادی چیز تو یہ ہے، وہ تو عارض کی بنا پر ایسا ہے، اس لئے ہم سب کو اس بات کی طرف متوجہ رہنا چاہئے، ہمیں پہلے اپنے نظام کو ٹھیک کرنے کی ضرورت ہے نہ کہ اس نظام کی طرف ہم بھاگ جائیں جو کہ اب آ رہا ہے، اسلامی نظام کو ہم کیوں چھوڑیں، کوشش تو اس کی ہونی چاہئے۔

☆☆☆